مضراب

باقر نقوی

وکٹر ہیوگو

باقر نقوی

وکٹر ہیوگو

باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

وکٹر ہیوگو
باقر نقوی

مِضراب

(جلد اوّل) (جلد دوم)

وِکٹر ہیوگو

باقر نقوی

نوبیل انعام یافتگان کی تقریروں کے تراجم پر مشتمل دو ضخیم جلدیں، پھر گنتر گراس کے شہرۂ آفاق ناول 'نقارہ' کا ترجمہ اور اب 'ڈاکٹر ژیواگو' جیسی کتاب کا بھاری بھرکم ترجمہ۔ یہ کام ایسے ہیں کہ کسی ایک فرد کے بس سے باہر دکھائی دیتے ہیں، لیکن باقر صاحب بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور بظاہر کسی ایسے دور کے انسان جیسے، ہمارے عہد کی سہل پسندی سے مناسبت نہیں ہو سکتی۔ یہ سارے کام انھوں نے اتنے کم عرصے میں پورے کیے ہیں کہ یقین نہیں آتا، اور پھر جس احتیاط اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ہم سے کم اردو معاشرے میں تو عام نہیں ہے۔

میں نے یہ کتاب کوئی ساٹھ برس پہلے اپنے الہ آباد کے زمانۂ طالب علمی میں پڑھی تھی اور اب تک اس کے سحر میں گرفتار ہوں۔ باقر صاحب کی ترجمہ کاری بھی اپنا الگ جادو رکھتی ہے۔ حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ باقر صاحب بڑھتے چلے جاتے ہیں، اپنے قاری کو دم لینے کی مہلت دیتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے علمی اور ادبی سرمایے میں جو اضافہ کیا ہے، اور جتنے کم وقت میں کیا ہے، اس کی داد دینے سے زیادہ دراصل اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ میں تو ان سے مرعوب بھی ہوا اور مسحور بھی۔ اکادمی بازیافت نے جس سلیقے کے ساتھ یہ کتابیں شائع کی ہیں اس کی داد بھی دی جانی چاہیے۔ جس زبان کو باقر نقوی جیسے ادیب اور مترجم مل جائیں، وہ وہیں ماند نہیں رہ سکتی۔

شمیم حنفی

تاریخِ ادبیاتِ عالم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول میں کتنا اور کیسا کیسا کام ہوا ہے۔ بہت کڑا انتخاب کرتے ہوئے بھی شمار کیا جائے تو بلا مبالغہ درجنوں نام ایک فہرست میں رکھنا لازمی ہو گا۔ ان میں کتنے ہی ناول ایسے ہوں گے جن کی تخلیق ڈیڑھ دو صدی پہلے ہوئی تھی، لیکن وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اسی وجہ کی ایف آر لیوس ناول کو ادبی اظہار کا سب سے مؤثر ذریعہ سمجھتا ہے۔ لارنس بھی ناول کو سب سے بلیغ صنفِ ادب سمجھتا ہے، اس لیے کہ زندگی کے تجربے کو جس طرح ناول میں پیش کیا جا سکتا ہے وہ کسی اور صنف میں ممکن نہیں۔ یہ باتیں دنیا کے جن عظیم ناولوں پر صادق آتی ہیں، ان میں 'ڈاکٹر ژیواگو' کا 'اضطراب' یقینی طور سے شامل ہے۔

کردار نگاری اور واقعات تسلسل کو پیش کرنے میں ژیواگو کا جواب نہیں۔ اس فن کارانہ صلاحیت کا اظہار دوسری کتابوں میں بھی ہوا ہے، لیکن 'اضطراب' تو منفرد ہی ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں کتنی جان ہے اور ان کی کہانی کس تخلیقی کمال کے ساتھ لکھی گئی ہے، اس کا اندازہ ناول کے ساتھ ساتھ ان ڈراموں اور فلموں سے بھی ہو سکتا ہے جو گزشتہ سو سال میں اس ناول پر بنائی گئی ہیں۔ ان میں حقیقت کا ایک جہان آباد ہے۔ اس ناول کے انگریزی میں متعدد تراجم ہوئے ہیں — لیکن اردو میں اس کام کی ہمت اب تک کسی کو نہیں ہوئی تھی۔ اب باقر نقوی نے یہ قابلِ رشک کارنامہ سرانجام دیا ہے جو عصری ادب کا ایک بڑا واقعہ ہے اور اہلِ اردو کے لیے قابلِ فخر۔

باقر نقوی نے اردو تراجم نگاری کی تاریخ میں اس سے پہلے جو بے مثال کام کیے ہیں، وہ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے کافی ہیں، اور اس ناول کے ترجمے کے بعد تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو ترجمے کی تاریخ جن معدودے چند لوگوں کے کارناموں پر رشک کرے گی، ان میں باقر نقوی اولین مقام رکھتے ہیں۔

رضی مجتبیٰ

میں انتہائی فخر و انبساط کے ساتھ جناب باقر نقوی کے اس تازہ ترین ادبی کارنامے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ انھوں نے شہرۂ آفاق فرانسیسی فلسفی، شاعر و ناول نویس وکٹر ہیوگو کے لافانی فراموش ناول Les Miserables کو ہماری قومی زبان، اردو میں منتقل کرکے ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ڈیڑھ صدی پیشتر منظرِ عام پر آنے والے اس شاہکار ناول کو بیشتر ازیں دنیا کی تمام زبانوں میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ یہ ناول اپنی قدامت کے باوجود ہمارے لیے عصری اہمیت کا حامل بھی ہے۔ آج کے پاکستان اور ڈیڑھ صدی پیشتر کے فرانس میں دہشت و بربریت کے رقصِ ابلیس میں گہری مشابہت ہے۔ شرفِ عمل داری میں تیزی کی بدولت قدروں میں بھی قابلِ تحسین مماثلت ہے۔ وکٹر ہیوگو نے اپنا یہ شاہکار جلا وطنی میں مکمل کیا تھا۔ یوں اس نے انیسویں صدی میں فرانس پر ان جلا وطنی کے سالوں کے دوران جو گزری اسے ماضی کے طویل پس منظر اور مستقبل قریب کے پیش منظر میں ایک حساس شاعر اور ایک درد آشنا فلسفی کے فکر و تخیل کی روشنی میں سمجھا اور سمجھایا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے باقر نقوی نے ایک طویل مدت کی ریاضت سے اس ادبی شاہکار کو اردو میں منتقل کرکے ہمیں آج کے پاکستان کے مصائب سے نجات کا ایک راستہ بھی دکھایا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ان کا یہ ترجمہ صرف ادبی ہی نہیں قومی اہمیت کا حامل بھی ہے۔ میں اس ضمن میں جناب باقر نقوی کی برسہا برس پر پھیلی ہوئی ان تھک محنت پر بھرپور تحسین و آفرین کہتا ہوں۔

فتح محمد ملک

ہمارے دوست باقر نقوی ہمہ جہتی شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں، ان کی شاعری کا ایک اعلیٰ تاثر اہلِ نظر کے ہاں قائم ہے۔ انھوں نے سائنس کے موضوعات پر بہت اعلیٰ کتابیں لکھی ہیں اور ایسے موضوعات پر کام کیا ہے جو اردو میں نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ترجمے کے حوالے سے جو کام کیا ہے، وہ تو بہت لاجواب ہے۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے۔ میں نے ایسے ایسے لوگوں کو ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کہ جن کی طرف سے داد ملنا، آدمی کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اردو میں تراجم نگاری کی بہت اعلیٰ روایت رہی ہے۔ اب بھی لوگ اس حوالے سے کام کرتے ہیں، لیکن باقر نقوی نے جس طرح تحسین سے اور مسلسل یہ کام کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ فرانس کے عظیم ناول نگار وکٹر ہیوگو کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ باقر نقوی نے اس کے جس ناول کا انتخاب کیا ہے، وہ عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ "اضطراب" دیکھنے کو تو ایک ناول ہے، لیکن اس میں فرانس کی سماجی اور سیاسی زندگی کی تاریخ بھی رقم ہوئی ہے۔ باقر نقوی نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے جو محنت کی ہے اور جس عمدگی سے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، اس کا اندازہ ترجمے کے اعلیٰ معیار سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے لگے کہ یہ ناول اسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس ترجمے کو پڑھتے ہوئے یہی لگتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ وکٹر ہیوگو کا ہی شاہکار نہیں ہے، بلکہ اب باقر نقوی کا بھی شاہکار ہے۔ اس کی ہمیں انھیں دل کھول کر داد دینی چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ اردو میں ایک شاہکار کا اضافہ ہو گیا ہے۔ بلاشبہ یہ قابلِ فخر بات ہے۔

عطاء الحق قاسمی

پیارے دوست

مبین مرزا

کی محبت کے نام

فہرست

دوسرا حصہ: کوزیٹ

تیسرا حصہ: ماریوس

■

چوتھا حصہ: دو اہم سڑکیں

پانچواں حصہ: ژاں ولژاں

وِکٹر ہیوگو کی شیشہ گری

عظیم فلسفی افلاطون نے کہا تھا:
''صرف تحریریں ہی زندہ رہیں گی۔''
واقعی، کتنا سچ کہا تھا اس نے۔

ڈیڑھ سو برس پہلے لکھا گیا لازوال ناول Les Miserables اردو زبان کے لیے ''مضراب'' کی شکل میں پیشِ خدمت ہے۔ یہ پہلا اردو ترجمہ ہے اس مشہورِ زمانہ ناول کا جسے ادیب، شاعر اور فلسفی وکٹر ہیوگو نے فرانسیسی زبان میں لکھا تھا۔ یہ ناول 1845ء میں شروع کیا گیا تھا اور 1861ء میں ختم ہوا۔ گویا متن کی تحریر میں 16 برس کا عرصہ لگا تھا۔ اس ناول کے پانچ جز ہیں؛ 365 ابواب ہیں اور یہ لگ بھگ 570,000 الفاظ پر مشتمل ہے۔

اس تصنیف کا شمار اب تک لکھے گئے دنیا کے پچیس سب سے بڑے ناولوں میں ہوتا ہے۔

انگریزی زبان میں اس کا پہلا مکمل ترجمہ Lascelles Wraxall کا لندن سے اکتوبر 1862ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ترجمہ Charles Wilbour کا جو قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوا تھا 1879ء میں مکمل ہوا۔ تیسرا ترجمہ "A.F." کے تخلص نام سے 1863ء میں شائع ہوا۔ چوتھا ترجمہ Isabel Hapgood کا 1887ء میں شائع ہوا جس کو اس اردو ترجمے کے لیے پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد کوئی نوّے برس تک خاموشی رہی۔ پھر، 1976ء میں Norman Denny کا؛ 1987ء میں Norman McAfee and LeeFahnestock کا؛ Julie Rose کا 2007ء میں اور 2013ء میں Christine Donougher کا ترجمہ شائع ہوا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اتنا قدیم ناول ہونے کے باوجود دن گزرنے کے ساتھ ساتھ یورپ کے قارئین کی اس میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ کامیاب اور عظیم تحریریں وہی ہوتی ہیں جو وقت گزرنے کے باوجود زیادہ برمحل معلوم ہوتی ہیں اور جن کے ذریعے ماضی کے تناظر میں حال کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان کے علاوہ اس کتاب کے اب تک بائیس ملکوں کی زبانوں میں ترجمے کیے جا چکے ہیں جن میں جاپان، اسرائیل، ہنگری، آئس لینڈ، ناروے، پولینڈ، سویڈن، ہالینڈ، ڈنمارک، چیکوسلواکیہ، ماریشس، فن لینڈ، ارجنٹائن، پرتگال، میکسیکو، ہسپانیہ ایسٹونیا وغیرہ شامل ہیں۔ اب اس میں اردو زبان کو بھی شامل کیا جائے گا۔

اس کتاب پر مبنی 22 زبانوں میں لکھے گئے کھیل 42 ملکوں کے 319 شہروں میں پیش کیے جا چکے ہیں اور سات کروڑ سے زیادہ افراد ان سے محظوظ ہو چکے ہیں۔ 2 جنوری 2010ء کو اس تصنیف پر مبنی دس ہزارواں کھیل پیش کیا گیا تھا۔ اب تک اس کو ایک سوایوارڈ مل چکے ہیں۔ اس پر کئی بار فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے انگریزی حروفِ تہجی استعمال کرنے والی زبانوں میں کیے جانے والے ترجموں کے لیے اس کتاب کے عنوان کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، غالباً اس لیے کہ ایسا مختصر مگر وسیع معنویت کا حامل کوئی اور عنوان سوجھا نہیں ہوگا۔ اردو ترجمے کے لیے "مضراب" جیسا یک لفظی عنوان اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ یہ نہ صرف صوتی اعتبار سے بالکل اصل جیسا ہے بلکہ اس میں وہ سارے ادبی اشارے اور کنایے بھی پوشیدہ ہیں جو نہ صرف متن کی ثروت اور گہری معنویت کی طرف اشارے کرتے ہیں، بلکہ اس کو ادبی رفعت بھی عطا کرتے ہیں، یہ کتاب واقعی جس کی حق دار بھی ہے۔

انگریزی زبان میں کیے گئے تراجم میں سے بعض ترجمے کچھ قطع و برید کے بعد شائع کیے گئے تھے، اس لیے کہ کچھ ترجمہ نگاروں کے نزدیک اس کے تقریباً 2,780 صفحات میں سے 955 صفحات صرف تاریخ، فلسفے اور اخلاقیات پر مباحث سے پُر تھے جن کا براہِ راست ناول کے پلاٹ سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، اور وہ ناول کے پلاٹ میں دل چسپی کم کرنے کا باعث ہو سکتے تھے۔ تاہم ادبی، تاریخی، علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے وہ حصے مصنف کے فکر و نظر، علم و دانش، ماضی و حال اور تاریخ کی گہرائیوں کی بھی سیر کراتے ہیں، قاری جنھیں پڑھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نئی نسل اس میں زیادہ دل چسپی لے رہی ہے۔ اس اردو ترجمے کے لیے ناول کا مکمل متن پیشِ نظر رکھا گیا ہے تاکہ پورا ناول اُردو قارئین کو دستیاب ہو سکے۔

مثال کے طور پر، مصنف نے سو سے زیادہ صفحات میں پیرس کی زیرِ زمین بدرِوں (sewers) اور ان کی جزئیات اور تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں گویا اس نے خود بدرو میں اُتر کر نہ صرف پورے نظام کو دیکھا ہے، بلکہ اس کا کونا کونا چھان مارا ہے۔ بدرو کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ اس کے دو اہم ترین کردار ان کے ذریعے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح، کئی ابواب عوامی بولیوں (slangs) کے بارے میں بھی شامل کیے گئے ہیں جو مختلف کردار استعمال کرتے ہیں۔ یہ ابواب جہاں مصنف کی علمی استطاعت کو واضح کرتے ہیں، وہیں قاری کے علمِ لسانیات میں اضافے کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ تصنیف بدلتے ہوئے فرانس کی بدحالی کے زمانے کی بہترین عکاس ہے۔اس پر مستزاد ہیوگو کی باریک بینی نے اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔اگرچہ یہ ناول بدنصیبی، خستہ حالی، ظلم، بدامنی، بغاوت، سرکشی، سازش، مکاری، لوٹ مار، قتل و خون وغیرہ سے عبارت ہے؛ اس میں جنگ بھی ہے، مذہب بھی ہے اور محبت بھی۔تاہم اس میں ایسے کردار بھی ہیں جو بے انتہا فیاض ہیں، مذہبی ہیں، نیک نیت والے اور عام شہری ہیں جنھوں نے اس دورِ ابتلا میں پریشان حال لوگوں کے لیے بھلائی کے کام بھی کیے تھے۔اس ناول کو دردِ دل اور وسعتِ نظر کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اپنے زمانے کے حالات کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ اس کو کسی بھی علاقے یا زمانے پر منطبق کیا جا سکتا ہے اور اس کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔اگرچہ یورپ، بالخصوص فرانس اور ترقی یافتہ دنیا بہت آگے جا چکی ہے، لیکن کرۂ ارض پر آج بھی ظلم، جبر اور بربریت تقریباً ان ہی جیسے حالات میں موجود ہے، جیسی کبھی فرانس میں تھی۔

ہر زمانے، ہر نسل اور ہر علاقے کے ادب کی تخلیق کا اپنا انداز ہوتا ہے جس میں خیالات اور تحریریں پیش کی جاتی ہیں جو اپنے دور کی دستاویز بھی ہوتی ہیں اور تاریخ بھی، جن کے آئینوں میں اس دور کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا انداز بھی بدلتا رہتا ہے، جسے نئے زمانے، نئے دور اور نئی نسل کے لوگ از کار رفتہ سمجھ سکتے ہیں، مگر ان کو از کار رفتہ سمجھنا تاریخ کو مٹانے کے مترادف ہوتا ہے۔دراصل تاریخ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے کسی دور کی ترقی یا تنزلی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ہر زبان، اندازِ بیاں اور اندازِ تحریر کی تبدیلیوں سے گزرتی ہے۔اس کتاب کو اس کی اصل سے قریب ترین صورت میں رکھنے کے لیے اس کا اپنے زمانے کا انداز برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو موجودہ زمانے کے متن کے عادی قاری پر گراں ہو سکتی ہے، مگر نئے قاری کے لیے قدیم اسلوب کا تبدیل کیا جانا اصل سے ناانصافی پر مبنی ہو سکتا ہے۔

وکٹر ہیوگو نے اس سے قبل کئی کارہائے نمایاں کیے تھے جن میں سے ایک اس کا ناول ''ناترے ڈیم کا کبڑا'' بھی تھا جو بہت مشہور ہوا۔اپنے زمانے میں ہیوگو کو وہی درجہ حاصل تھا جیسا کہ جرمن زبان میں گوئٹے کو اور اردو میں غالب و میر کو ہوا ہے۔ہیوگو کا انداز اس کی اس خاصیتِ تحریر کو پیش کرتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف موضوع میں اتنا ڈوب کر اور اتنی باریک تفصیلات کے ساتھ تحریر کرتا ہے گویا وہ فکشن نہیں، تاریخ لکھ رہا ہو۔شاید یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل کے لاکھوں افراد آج بھی اس تصنیف کو اصل صورت میں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔اس پر اب تک تقریباً 10,000 تبصرے اور 412,000 کے قریب مضامین لکھے جا چکے ہیں۔نئی نسل کی اس ناول سے مسلسل دل چسپی کا ثبوت یہ ہے کہ 2013ء میں بھی اس ناول کا پورے متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔

متن میں سیکڑوں افراد کے فرانسیسی نام آئے ہیں جن کو اگر اصلاً فرانسیسی تلفظ میں پیش کر دیا جاتا تو نہ صرف پڑھنے میں دشواری ہوتی، بلکہ وہ تحقیق کرنے والوں کے لیے پریشانی کا باعث بھی

ہو سکتے تھے۔اس لیے ہر نام کا وہی تلفظ پیش کیا گیا ہے جو عام طور پر انگریزی زبان میں مستعمل ہے، یا ہو سکتا ہے۔مثال کے طور پر انگریزی میں، اور اردو میں بھی، جس نام کو 'سارتر' لکھا اور بولا جاتا ہے اسے اصل فرانسیسی لہجے میں 'سا ختغ' کہا جاتا ہے۔یہ طریقہ اردو کے قاری کے لیے الجھن کا باعث ہو سکتا تھا۔محققین کی سہولت کے لیے پہلی بار آنے والے ہر فرد کے نام کے ساتھ قوسین میں اس کے اصل ہجے درج ہیں۔بعد میں بار بار آنے والے اسی نام کو انگریزی میں دہرانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ شہروں، مقامات اور سڑکوں کے بیش تر ناموں کو اصل حروف میں ہی رہنے دیا گیا ہے۔

متن کی وضاحت اور روانی کے لیے بعض مقامات پر [ ] قوسین میں کچھ الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔ادبی، اساطیری اور تاریخی اشاروں کی صورت آنے والے بہت سے مشاہیر، مدبرین اور واقعات کے بارے میں بھی حتی المقدور مختصر تفصیلات بھی قوسین میں شامل کی گئی ہیں تا کہ قاری کو ان اشاروں کے سیاق و سباق کا کچھ اندازہ ہو جائے۔چند ایک مقامات پر، باوجود کوشش کے تفصیلات میسر نہیں ہو سکیں، اس لیے ان کے نام یوں ہی رہنے دیے گئے ہیں۔

انگریزی متن میں جگہ جگہ فرانسیسی متن کے مقولے، اشعار اور نظمیں بھی شامل تھیں۔ جہاں تک ممکن ہوا ترجمہ کر دیا گیا، مگر کچھ کو اصل زبان میں رہنے دیا گیا ہے، اس لیے کہ ان کا ترجمہ نہ ہونے کے باوجود ناول کے متن کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

ناول، اس کے متن اور تحریر کی تکنیک کے بارے میں اس مقام پر مزید کچھ کہنا مناسب نہیں، اس لیے کہ مترجم کو قاری کے خیالات پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔پڑھنے والے خود اپنی رائے قائم کریں اور تبصرہ و تجزیہ کرنے والے اس پر اپنے اپنے انداز میں روشنی ڈالیں، یہی بہتر ہوگا۔

ترجمے کے اس کام کو ابھی تک صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا؛ اس لیے کہ یہ اتنا بڑا کام تھا جس کے مکمل نہ ہونے کا بھی امکان ہو سکتا تھا۔ اور 'قبل از مرگ واویلا' سے فائدہ بھی کیا ہوتا۔اب جب کہ، بفضلِ خدا یہ کام تکمیل پا گیا ہے، میں بہت عزیز دوست مبین مرزا کے لیے تہہ دل سے تشکر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کام کے درمیان متعدد بے حد سخت اور اُکتا دینے والے مراحل پر ان کی مشاورت کے علاوہ ہمت افزائی کے دو بول مجھ میں مزید ذہنی توانائی بھر دیتے تھے اور میں زیادہ انہماک اور محنت سے اس کارِ شوق میں مصروف ہو جاتا تھا۔

اس ناول کے بارے میں آخر میں بس یہ کہوں گا کہ:

این کتاب نیست چیزے دیگر است

باقر نقوی

لندن-24 دسمبر 2014ء

موسیو مائریل، ایک انصاف پسند انسان

سن 1815 عیسوی میں موسیو شارل فرانسوا مائریل (M.Charles- Francois- Bienvenu Myriel)، D (یعنی Digne) کا بشپ تھا۔ وہ ستر برس کا بوڑھا آدمی تھا؛ 1806ء سے اس نے D کے سردار پادری کے علاقے (See) پر قبضہ کر رکھا تھا۔

اگرچہ اس تفصیل کا، ہم جس کا تذکرہ کرنے والے ہیں، اس سے کوئی علاقہ نہیں پھر بھی یہ غیر ضروری نہیں ہوگا اگر محض تمام نکات کی درستی کے لیے یہاں ان تمام افواہوں اور اشاروں کا تذکرہ کر دیا جائے جو اس وقت سے گشت میں تھے جب وہ ڈایوسیز (Diocese) آیا تھا۔ صحیح ہو یا غلط، جو اکثر ان لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے جو اپنی زندگی میں بڑی جگہوں پر فائز رہتے ہیں، اس سے زیادہ ان کے مقسوم کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔ مائریل Axis کی پارلیمان کے کاؤنسلر کا بیٹا تھا؛ اس طرح اس کا تعلق بار کی اشرافیہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے باپ نے، اس امید پر کہ وہ اس کی جگہ لے گا، نوعمری، اٹھارہ یا بیس برس، میں ہی اس کی شادی کر دی تھی، پارلیمان کے افراد کے خاندانوں میں جس کا عام رواج تھا۔ اس شادی کے باوجود کہا جاتا تھا کہ موسیو مائریل نے بہت سی باتیں جان بوجھ کر پھیلائی ہیں۔ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا، اگرچہ قد کا کوتاہ تھا، مگر نہایت نفیس، پُروقار اور ذہین آدمی تھا۔ اس کی زندگی کا پہلا حصہ دنیا اور شجاعت کے لیے وقف تھا۔

انقلاب آیا، ایک کے بعد دوسرے واقعات بے ترتیبی سے رونما ہوئے؛ پارلیمانی خاندانوں کو تہ تیغ کیا گیا، ان کا تعاقب کیا گیا اور ان سب کو منتشر کر دیا گیا۔ انقلاب کی ابتدا ہی میں موسیو مائریل اطالیہ ہجرت کر گیا تھا۔ وہاں اس کی بیوی سینے کے ایک عارضے میں، جو اس کو ایک عرصے سے لاحق تھا، انتقال کر گئی۔ اس کے اولاد نہیں تھی۔ اس کے بعد کیا حال ہوا؟ پرانے زمانے کی

فرانسیسی سوسائٹی تباہ ہو گئی، اس کے اپنے خاندان کا زوال ہو گیا اور 93ء کے المناک مناظر، جو شاید ہجرت کرنے والوں کے لیے زیادہ ڈراؤنے ہو گئے تھے جو انھیں دہشت کی دوربین سے دیکھتے تھے۔ تو کیا ان سب نے اس کے ذہن میں دست برداری اور تنہائی کے بیج بو دیے تھے؟ تو کیا وہ جسے عوامی تباہیاں متزلزل نہیں کر سکی تھیں، تمام پریشانیوں کے باوجود، جنھوں نے اس کی زندگی کو جذب کر لیا تھا، اس کے دل پر چوٹ لگائی تھی، اس کے مقدر پر اور خود اس کے وجود پر ضرب لگائی تھی، اور وہ ان خوف ناک جھٹکوں سے مغلوب ہو گیا تھا؟ کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا: بس اتنا ہی معلوم تھا کہ جب اطالیہ سے واپس آیا تو وہ ایک مبلغ تھا۔

1804ء میں مائریل Brignolles کا نائب پادری تھا۔ اس کی کافی عمر ہو چکی تھی، اور وہ فراغت کی زندگی گزار رہا تھا۔

تاج پوشی کے زمانے میں، اس کے مذہبی فرائض سے متعلق کچھ معمولی معاملات نے۔ وہ کیا تھے، جس کے بارے زیادہ علم نہیں — اس کو پیرس پہنچا دیا تھا۔ تمام صاحبانِ اثر و رسوخ میں سے ایک، جن سے وہ اپنے پیرش والوں کے لیے مدد کا طالب ہو سکتا تھا، ایک شخص کارڈینال فیش (Cardinal Fesch) تھا۔ ایک دن، جب شہنشاہ اپنے عمِ محترم نائب پادری سے ملنے کے لیے آیا تھا، اور مائریل انتظار گاہ میں کسی کا انتظار کر رہا تھا، مائریل کا سامنا جلالت مآب سے ہو گیا جو اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا۔

نپولین نے دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص اس کو گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر اچانک پوچھا، ''یہ کون صاحب ہیں جو مجھے گھور کر دیکھ رہے ہیں؟''

''مائی لارڈ'' موسیو مائریل بول پڑا، ''آپ ایک نیک خصلت آدمی کو دیکھ رہے ہیں، اور میں بھی ایک نیک خصلت آدمی کو دیکھ رہا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

اسی شام شہنشاہ نے کارڈینل سے اس نائب پادری کا نام دریافت کیا، اور کچھ دنوں بعد ہی موسیو مائریل کو D کا بشپ بنا دیا گیا۔

کیا موسیو مائریل کی زندگی کے ابتدائی حصے کے بارے میں گھڑی ہوئی مشہور کہانیوں میں کوئی سچائی تھی؟ اس کے بارے میں وثوق سے کہا نہیں جا سکتا تھا۔ انقلاب سے قبل بہت کم خاندانوں کی مائریل سے شناسائی تھی۔ اس چھوٹے سے شہر میں موسیو مائریل کو ہر نووارد کی طرح حالات کا مقابلہ کرنا پڑا تھا؛ بات بنانے والے منہ بہت، اور سوچنے والے سرگرم ہوتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بشپ تھا، پھر بھی اسے یہ سب کچھ جھیلنا پڑا تھا، اس لیے کہ وہ بشپ تھا۔ پھر بھی جن افواہوں سے اس کا نام

منسلک تھا، وہ صرف افواہیں ہی تھیں — شور، باتیں، الفاظ؛ اور الفاظ سے کم — جسے جنوب کی زبان میں — لغویات — کہتے ہیں۔

بہر حال، جو کچھ بھی ہو، نو برس کی کلیسائی طاقت، اور D میں قیام کے بعد، وہ تمام کہانیاں اور گفتگو کے موضوعات جو چھوٹے لوگوں کے ہاتھ سے، چھوٹے شہروں میں بڑے حروف میں لکھے جاتے ہیں، فراموش کر دیے گئے تھے۔ کسی کو ان کے بیان کرنے کی ہمت نہیں ہوئی؛ نہ کسی کو انھیں یاد کرنے کی بھی ہمت ہوتی تھی۔

موسیو مائریل D پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ایک کنواری عمر رسیدہ خاتون میڈموزیل بپتستین (Baptistine) تھیں، جو ان کی بہن تھیں، ان سے دس برس چھوٹی۔ ان کی ایک ہی خادمہ تھی جو میڈموزیل بپتستین ہی کی عمر کی تھی، اور اس کا نام تھا مادام ماگوا (Magloire)، جو موسیو کی خادمہ رہنے کے بعد سے دہرے اعزاز، مادام سے میڈموزیل اور موں سینیور (Monseigneur) کی منتظم خانہ بن گئی تھی۔

میڈموزیل بپتستین، طویل قامت، مدقوق، دُبلی پتلی، مہذب خاتون تھی۔ اسے "قابلِ احترام" جیسے الفاظ کے آدرش کا احساس تھا؛ اس لیے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت کا محترم ہونے کے لیے ماں بننا ضروری ہوتا ہے۔ وہ کبھی خوب صورت نہیں رہی تھی؛ اس کی پوری زندگی کے بعد دیگرے مقدس کاموں کے سوا اور کچھ نہیں تھی، اور بالآخر اس نے اپنے اوپر ایک قسم کی مدقوقیت اور شفافیت طاری کر لی تھی؛ اور بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اس نے وہ کیفیت حاصل کر لی تھی جس کو نیکی کا حسن کہا جا سکتا ہے۔ جوانی کے دنوں کی اس کی نزاکت پکی عمر کی شفافیت بن گئی تھی؛ اور اس شفافیت نے اس کے اندر کے فرشتے کو واضح کر دیا تھا۔ وہ کنواری نہیں، ایک روح تھی۔ اس کی شخصیت سایے سے بنی معلوم ہوتی تھی؛ اس میں جنسیت کے لیے جسم جیسی کوئی شے نہیں تھی؛ وہ ایک مختصر مادّہ تھی جس کے اندر روشنی بھری ہوئی تھی؛ بڑی بڑی آنکھیں، ہمیشہ جھکی ہوئیں؛ کسی روح کے لیے زمین پر رہنے کا محض بہانہ تھی۔ مادام ماگوا چھوٹے قد کی، موٹی، سفید فام عورت تھی، چھریرے بدن کی اور ہمیشہ سرگرم، پھولتی سانسوں والی؛ اوّلاً سرگرمی کے باعث، ثانیاً اپنے دمے کے عارضے کی وجہ سے۔

اس کی آمد پر، موسیو مائریل کا کلیسائی محل میں تمام اعزازات اور شاہی فرامین کے ساتھ تقرر کر دیا گیا، جو ایک بشپ کو فوری طور پر میجر جنرل کے عہدے کے مماثل بنا دیتا ہے۔ سب سے پہلے شہر کا میئر اور صدر اس سے ملنے آیا، جس کے جواب میں وہ جنرل اور ناظم سے ملنے گیا۔

تقرر مکمل ہو گیا، اور اب شہر اپنے بشپ کے کام کا منتظر تھا۔

❁

موسیو مائریل بشپ مبارک بنے

D کا کلیسائی محل اسپتال سے متصل عمارت ہے۔

کلیسائی محل، پچھلی صدی کی ابتدا میں پتھروں سے بنایا گیا۔ ایک بڑا اور خوب صورت مکان تھا جس کو پیرس یونی ورسٹی کے ڈاکٹر آف تھیالوجی، موسیو ہنری پوجے (Puget) نے بنوایا تھا، جو 1712 میں D کا بشپ تھا۔ یہ محل اصل نوابوں کی قیام گاہ تھا۔ اس کی ہر شے بڑی اعلیٰ درجے کی تھی — بشپ کا اپارٹمنٹ، ملاقاتی کمرے، دفتر، مرکزی آنگن، جو بہت وسیع تھا، جس کے اطراف چہل قدمی کے لیے فلورینس فیشن کا راستہ بنا ہوا تھا اور باغ میں عظیم الشان درخت لگائے گئے تھے۔ موسیو ہنری پوجے نے 29 جولائی 1917ء کو ایک سرکاری ضیافت دی تھی جس میں مندرجہ ذیل لوگ مدعو تھے۔

Lords Charles Brulart de Genlis, archbishop;
Prince d'Embrun;
Antoinede Mesgrigny, the capuchin,
Bishop of Grasse;
Philippe de Vendome,
GrandPrior of France,
Abbe of Saint Honore de Lerins;
Francois de Berton deCrillon, bishop,
Baron de Vence;
Cesar de Sabran de Forcalquier, bishop,
Seignor of Glandeve; and

Jean Soanen, Priest of the Oratory, preacher ordinary to the king, bishop, Seignor of Senez.

ان محترم افراد کی تصویریں اس گھر کی زینت تھیں؛ اور یہ یادگار دن، 29 جولائی 1714ء کی تاریخی سنگ مرمر کی میز پر سنہرے حروف میں کندہ تھا۔

اسپتال ایک نیچی تنگ سی یک منزلہ عمارت میں واقع تھا جس میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔

اپنی آمد کے تین دن بعد بشپ نے اسپتال کا دورہ کیا۔ انھوں نے ڈائرکٹر کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

"موسیو ڈائرکٹر!" انھوں نے پوچھا تھا، "اس وقت اسپتال میں کتنے مریض داخل ہیں؟"

"پچیس عدد — موسیو۔"

"جب میں نے گنتی کی تھی اس وقت اتنے ہی مریض تھے۔" بشپ نے کہا۔

ڈائرکٹر نے مزید کہا، "بستروں کے لیے جگہ کافی نہیں۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا۔"

"وہ تالار نہیں، کمرے ہیں، اور ان کی ہوا کی تبدیلی میں بھی مشکل ہوتی ہے۔"

"مجھے بھی یہی محسوس ہوا تھا۔"

"اور، جب سورج نکلتا ہے تو مریضوں کے لیے جگہ کافی نہیں ہوتی۔"

"میں نے بھی اپنے آپ سے یہی کہا تھا۔"

"وبائی امراض کی صورت میں — اس برس ٹائیفس (Typhus) کی وبا پھیلی تھی؛ دو برس پہلے سینے کی بیماری پھیلی تھی، کبھی تو ایک سو مریض بھی ہو جاتے — ہم جانتے نہیں تھے کہ ہمیں کیا کرنا تھا۔"

"یہی خیال میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا۔"

"موسیو ایسی صورت میں آپ کیا کرتے؟" ڈائرکٹر نے پوچھا، "ایسے میں خود استعفیٰ دے دینا چاہیے؟"

یہ گفتگو سب سے نچلی منزل کے ڈائننگ روم کی گیلری میں ہوئی تھی۔

ایک منٹ تک تو بشپ خاموش رہے، پھر اچانک اسپتال کے ڈائرکٹر سے مخاطب ہوئے:

"موسیو، آپ کے خیال میں صرف اس تالار میں کتنے بستر آ سکتے ہیں؟"

"موسیو کے ڈائننگ روم میں؟" گھبرائے ہوئے ڈائرکٹر نے حیرت کا اظہار کیا۔

بشپ نے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، گویا وہ نظروں ہی نظروں میں پیائش اور حساب کر رہے تھے۔

''اس میں پورے بیس عدد بستر آسکتے ہیں۔'' انھوں نے خود ہی جواب دیا؛ گویا وہ خود سے بات کر رہے ہوں۔ پھر فوراً اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا:

''ٹھہریے، موسیو ڈائرکٹر، میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ کوئی غلطی ہوئی ہے۔ پانچ یا چھ چھوٹے چھوٹے کمروں میں آپ چھتیس لوگ ہیں۔ یہاں ہم تین ہیں؛ ہمارے پاس ساٹھ افراد کے لیے جگہ موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی غلطی ہوئی ہے؛ آپ کے پاس میرا گھر ہے، اور میرے پاس آپ کا۔ مجھے میرا گھر واپس کر دیجیے؛ آپ یہاں آرام سے رہیں گے۔''

اگلے دن بشپ کے محل میں چھتیس مریض داخل کیے گئے، اور بشپ کو اسپتال میں جگہ دے دی گئی۔

مائریل کی کوئی جائیداد نہیں تھی، انقلاب نے ان کے خاندان کو تباہ کر دیا تھا۔ ان کی بہن کو پانچ سو فرانک سالانہ ملتے تھے، جو اس کے اخراجات کے لیے کافی ہوتے تھے۔ مائریل کو سرکاری خزانے سے، بشپ کی حیثیت میں، پندرہ ہزار فرانک تنخواہ ملتی تھی۔ اسی روز جب وہ رہائش کی غرض سے اسپتال منتقل ہوا تھا اپنی آمدنی کا مندرجہ ذیل طریقے سے خرچ کرنا طے کر دیا تھا۔ ہم اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی تفصیلات پیش کر رہے ہیں:

میرے گھریلو اخراجات کی تفصیل

مدرسے کے لیے	1,500
لیور مشن سوسائٹی	100
Montdidier کے Lazarists کے لیے	100
پیرس میں غیر ملکی مدرسوں کے لیے	200
ہولی اسپرٹ کے جلسے کے لیے	1500
مقدس سرزمین کے اداروں کے لیے	100
زچگی کی خیراتی سوسائٹیوں کے لیے	300
زچگی کے لیے، فالتو رقم	50
قید خانوں کی بہبود کے لیے	400
رہا کیے جانے والے قیدیوں کو پہنچانے کے لیے	500

قرض میں بندھے خاندانوں کے باپوں کی رہائی کے لیے	1,000
پادری کے حلقے کے مفلس اساتذہ کے علاوہ دی جانے والی رقم	2,000
Hautes-Alpes کے علاقے کے اناج گودام کے لیے	100
Manasoqe کے—D اور Sisteron کی لڑکیوں کی مفت تعلیم	1,500
مساکین کے لیے	6,000
ذاتی اخراجات کے لیے	1,000
میزان:	15,000

مائریل نے D کے بشپ کی حیثیت میں اپنے عہدِ اختیار میں اس بندوبست میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ جیسا کہ دیکھا گیا ہے، اس بندوبست کو اپنے گھریلو اخراجات کی باقاعدگی قرار دیا تھا۔

میڈموذیل بپٹسٹین کی طرف سے یہ بندوبست مکمل اطاعت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ پاک باز عورت D کے موں سنیئر کو بھائی اور اپنا بشپ بھی تسلیم کرتی تھی؛ گوشت پوست کے حوالے سے اور برتر کلیسا کے حوالے سے وہ اس کو پسند بھی کرتی تھی اور احترام بھی دیتی تھی۔ جب مائریل اس سے بات کرتا تو وہ احتراماً جھک جاتی؛ جب وہ اپنا فرض ادا کرتا تو اس کی مدد کرتی۔ ان کی ایک ہی خادمہ تھی مادام ماگوا جو ذرا بڑبڑ بھی کرتی تھی۔ واضح رہے کہ موسیو بشپ نے اپنی ذات کے لیے ایک ہزار لیوز مخصوص کر رکھے تھے، اس طرح میڈموذیل کی پنشن کو ملا کر پندرہ سو فرانک فی سال رقم ہو جاتی تھی۔ ان پندرہ سو فرانک میں یہ دو بوڑھی عورتیں اور بوڑھا مل کر گزارا کرتے تھے۔

جب D میں کوئی پادری آتا تو مادام ماگوا کی کفایت شعاری، اور میڈموذیل بپٹسٹین کے ذہین انتظامات کے طفیل، بشپ اس کی خاطر مدارات بھی کرتا تھا۔

ایک دن، جب بشپ کو D آئے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے، بشپ نے کہا:

''میں ان تمام ذمے داریوں سے خود کو جکڑا محسوس کرتا ہوں!''

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' مادام ماگوا نے چمک کر بولیں، ''موں سنیور نے تو اب تک اس الاؤنس کا مطالبہ بھی نہیں کیا جو ادارے کی جانب سے ان کی گاڑی میں شہر میں سفر کے دوران میں اور diocese جانے میں خرچ ہوتا ہے۔''

''بس'' بشپ نے بلند آواز میں کہا، ''مادام ماگوا تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

اور پھر اس نے اس کا مطالبہ کر دیا۔

کچھ دن بعد جنرل کاؤنسل نے اس مطالبے پر غور کیا، اور ووٹ کے ذریعے طے پایا کہ

بشپ کو گاڑی، ڈاک اور دوروں کے اخراجات کی مد میں تین ہزار فرانک سالانہ فراہم کیے جائیں گے۔

اس پر پارلیمنٹ کے مقامی نمائندوں کی جانب سے بڑا غوغا ہوا۔ سلطنت کی مقننہ کے ایک رُکن، کاؤنسل کے سابق رُکن، جو 18 Brumaire [بغاوت، جس کے ذریعے نپولین بر سرِ اقتدار آیا تھا] کا حمایتی تھا، جس کو شہر D کے قریب اعلیٰ درجے کا سیٹوں والا دفتر فراہم کیا گیا تھا، (موسیو Bigot de Preameneu) پادری برائے بندگی نے بہ صیغۂ راز ایک سخت رقعہ بھیجا تھا، جس کی کچھ مصدقہ سطریں درج ذیل ہیں:

''گاڑی کے اخراجات؟ چار ہزار نفری کے قصبے میں، اس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دوروں کا مصرف کیا ہو سکتا ہے؟ مزید، ایسے پہاڑی علاقوں میں ڈاک کیسے پہنچائی جا سکتی ہے؟ وہاں سڑکیں نہیں۔ سوائے گھڑ سواری کے کوئی سفر نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ Durance اور Chateau-Arnoux کے درمیان کا پُل بیل گاڑیوں کا بوجھ بھی سنبھال نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ سارے مبلّغین لالچی ہیں۔ یہ شخص جب پہلی بار آیا تھا تو اچھے کام کیے تھے۔ اب یہ آرام پسند ہو گیا ہے؛ اب اسے گھوڑا گاڑی بھی چاہیے اور ڈاک گاڑی بھی، اسی طرح عیش کا طلب گار ہے، جیسا کہ پُرانے زمانے کے بشپ کیا کرتے تھے۔ اُف! یہ ساری تبلیغ بازی۔ اللہ کی پناہ! موسیو Comte! حالات اس وقت تک نہیں سدھریں گے جب تک شاہنشاہ ان کالی ٹوپی والے بدمعاشوں سے ہمیں نجات نہیں دلاتا۔ [اب ان معاملات میں ویٹیکن بھی الجھتا جا رہا تھا] پوپ مردہ باد! میں صرف قیصر کا طرف دار ہوں'' وغیرہ وغیرہ۔

دوسری جانب، اس معاملے میں مادام ماگلو بہت خوش تھی۔ ''بہت اچھا ہوا۔'' اس نے میڈموزیل بپتسٹین سے کہا: ''موسیو بئیونو نے دوسرے لوگوں سے شروعات کی تھی، مگر، آخر کار انھیں خود ہی سمیٹنا پڑا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام خیرات میں باقاعدگی پیدا کی ہے۔ بالآخر، اب ہمارے لیے تین ہزار فرانک ہوں گے!''

اسی شام بشپ نے ایک روداد لکھی اور اپنی بہن کے حوالے کر دی، جس کے مندرجات کچھ یوں تھے:

حلقے اور سواری کے اخراجات

اسپتال کے مریضوں کے لیے گوشت کا شوربا	1,500
Aix کی خیراتی زچگی سوسائٹی کے لیے	250
Draguignan کی خیراتی زچگی سوسائٹی کے لیے	250

لاوارث بچوں کے لیے	500
یتیموں کے لیے	500
میزان	3,000

یہ تھا موسیو مارئیل کا بجٹ۔

جہاں تک اتفاقیہ متفرقات، مثلاً شادی کی پابندیوں، داد رسی، نجی جشنوں، خطبات، مناجاتوں، وہ کلیسا کی ہوں یا مقامی گرجا گھروں کی، شادیوں وغیرہ کا معاملہ ہے تو بشپ نے اسے صاحبانِ ثروت پر سختی سے لاگو کر دیا تھا، اس لیے کہ وہ ضرورت مندوں کی امداد کرتا تھا۔

کچھ عرصے بعد چڑھاوے کی رقومات آنے لگی تھیں۔ جو صاحبِ حیثیت تھے وہ بھی، اور جو طلب گار ہوتے وہ بھی موسیو مارئیل کا دروازہ کھٹکھٹاتے — ثانی الذکر خیرات کی تلاش میں، جو اوّل الذکر جمع کرانے آتے تھے۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں بشپ فیضِ رسانی کا خزانے دار اور مصیبت میں گرفتار لوگوں کا کیشئر بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے خاصی رقم گزرتی، مگر یہ بشپ کے طرزِ زندگی میں، یا اس کی بنیادی ضروریات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکی تھی۔

چوں کہ ان حالات میں بدبختی زیادہ، اور برادرانہ کم ہوتا ہے، حاصل ہونے سے پہلے ہی سب کچھ تقسیم ہو جاتا تھا۔ اس کی کیفیت بالکل خشک زمین پر پانی کے مصداق تھی؛ کتنی ہی رقم حاصل ہو، اس کے پاس باقی کچھ نہیں رہتا تھا، خالی ہاتھ ہو جاتا تھا۔

ہوتا یہ تھا کہ بشپ حضرات فیس لینے اور کاغذات دینے سے پہلے جشن کے لیے اپنے نام پیش کرنے کا اعلان کیا کرتے تھے، جو مفلس لوگ، اپنی خوش خلقی کے باعث، بشپ کے اصلی ناموں اور القاب میں سے منتخب کرتے تھے؛ ان میں ہمیشہ کچھ معنی ہوا کرتے تھے؛ مگر لوگ اس بشپ کو خوش آمدید (Monseigneur Bienvenu) کے علاوہ کسی اور نام سے مخاطب نہیں کرتے تھے۔ اب ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور جہاں ان کا نام لینا ہوگا ہم یہی نام استعمال کریں گے۔ مزید یہ کہ، ان کو یہ عرفیت بہت پسند آئی تھی۔

"مجھے یہ نام اچھا لگتا ہے۔" اس نے کہا، "خوش آمدید (Bienvenu)، مون سنیور (Monseigneur) کی کمی کو دور کرتا ہے۔"

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ جو خاکہ ہم نے پیش کیا ہے وہ ممکن ہے؛ ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں کہ یہ اصل سے مشابہ ہے۔

۞

اچھے بشپ کا مشکل عہدہ

بشپ نے کبھی اپنے تبلیغی دورے ترک نہیں کیے، اس لیے کہ اس نے اپنی گاڑی کو خیراتی کاموں کی گاڑی میں تبدیل کر دیا تھا۔ D کا تعلقہ تھکا دینے والا ہے۔ اس میں میدان کم اور پہاڑ زیادہ تھے؛ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، وہاں سڑکیں خال خال ہی ہوتی ہیں؛ بتیس curacies، اکتالیس vicarships اور دو سو بچاسی auxiliary chapels ہیں۔ ان سب کا دورہ کرنا کارے دارد۔

بشپ بہر حال دورے کر لیتا تھا۔ اگر کام قریبی علاقے میں ہوتا تو پا پیادہ چلا جاتا؛ میدانی علاقے کا ہوتا تو اپنی اسپرنگ والی گاڑی استعمال کرتا، اور پہاڑی علاقوں میں گدھے کی سواری پر جاتا۔ دونوں بوڑھی عورتیں اس کے ساتھ جاتی تھیں۔ جب سفر دشوار ہوتا تو بشپ اکیلا جاتا۔

جس دن وہ قدیم کلیسائی شہر Senez پہنچا، اس دن اس نے گدھے کی سواری کی تھی۔ اس کا بٹوہ، جو اس وقت بہت ہلکا تھا، اسے مزید رختِ سفر کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ شہر کا میئر اس کی پیشوائی کے لیے شہر کے پھاٹک تک آیا تھا اور اس کو اپنی اہانت انگیز آنکھوں سے گدھے سے اترتے دیکھا تھا۔ اس کے اطراف کھڑے کچھ باشندے اس پر ہنسے تھے۔ ''جناب میئر'' بشپ نے کہا، ''اور باشندگان حضرات، میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو اچنبھے میں ڈال دیا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ایک مفلس مبلغ کا کسی جانور پر سواری کرنا تکبر کے زمرے میں آتا ہے، جسے یسوع مسیح بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ عمل ضرورت کے پیشِ نظر کیا ہے؛ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دکھاوے کے لیے نہیں کیا ہے۔''

ان دوروں کے درمیان وہ بہت مہربان اور شفیق ہوتا تھا؛ تبلیغ کرنے کے بجائے گفتگو کرتا

تھا۔ دلائل اور مثال کی تلاش میں کبھی زیادہ دور تک نہیں جاتا تھا۔ ایک ضلع کے باشندوں کو دوسرے علاقوں کی مثالیں دیتا تھا؛ جہاں وہ مساکین پر سختی کرتے تھے، وہ کہتا تھا: ”ذرا Briancon کے لوگوں پر نظر کرو۔ انھوں نے مفلس لوگوں، بیواؤں اور یتیموں کو حق دے دیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے تین دن قبل ہی اپنی چراگاہوں کی گھاس کٹوا سکتے ہیں۔ تباہ ہو جانے والے گھروں کو مفت نئے سرے سے بنوا دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایسا ملک ہے جس پر خدا اپنی برکتیں نازل کرتا ہے۔ پوری صدی میں وہاں ایک بھی قتل نہیں ہوا ہے۔“

ان دیہات میں، جہاں منافعے اور فصل کی لالچ کی جاتی تھی، وہ کہتا تھا: ”Embrun کے باشندوں کو دیکھو۔ اگر فصل کے موسم میں کسی خاندان کا باپ اپنے بیٹے کو فوج میں خدمات کے لیے بھیج دیتا ہے، اور اس کی لڑکیاں شہر میں ملازمت کرتی ہیں، اور اگر وہ بیمار یا معذور ہے تو پادری اس کو دعائیہ اجتماع میں جانے کا مشورہ دیتا ہے؛ اور اتوار کے دن، دعائیہ اجتماع کے بعد، گاؤں کے تمام مرد، عورتیں اور لڑکے — اس غریب آدمی کے کھیتوں میں جاتے ہیں؛ کٹائی کرتے ہیں، اور اس کا اناج اور بھوسا اس کے اناج کے گودام میں پہنچاتے ہیں۔“ جن خاندانوں میں دولت یا وراثت کی بنا پر علاحدگی ہو جاتی، وہ کہتا تھا: ”Devolny کے لوگوں کو دیکھو، وہ ملک اتنا بنجر ہے کہ وہاں پچاس برس میں بھی کسی کوئل کی کوک سنائی نہیں دی ہے۔ اگر کسی خاندان کا باپ مرجاتا ہے، لڑکے اپنی قسمت آزمانے چلے جاتے ہیں تو جائیداد لڑکیوں کے حوالے کر جاتے ہیں تا کہ انھیں شوہر مل جائیں۔“ ان صوبوں میں جہاں مقدمے بازی میں لوگوں کو مزہ آتا ہے، اور جہاں خاندان اسٹامپ پیپر کے چکر میں خود کو تباہ کر لیتے ہیں، وہ کہتا تھا: ”ذرا Queyras کی وادی کے کسانوں کو دیکھو۔ وہاں صرف تین ہزار افراد رہتے ہیں۔ میرے خدا! مگر وہ ایک جمہوریہ کی طرح ہے۔ وہاں کے لوگوں نے نہ کبھی جج کا نام سنا ہے نہ قرقی کرنے والے کا۔ سب کچھ میئر ہی کرتا ہے۔ وہ نہایت ایمان داری سے ہرجانے عائد کرتا ہے، محصولات لگاتا ہے، جج لڑائی نہیں کرتا، وارثت بغیر کسی فیس کے تقسیم کرتا ہے، مفت میں سزائیں سناتا ہے؛ اس کے احکام کی تعمیل کی جاتی ہے، اس لیے کہ وہ عام آدمیوں میں انصاف کرتا ہے۔“ ان دیہات میں جہاں اسے اسکول کے استاد نہیں ملے، اس نے ایک بار پھر Queyras کا حوالہ دیا: ”کیا تم جانتے ہو کہ وہ کس طرح کام چلاتے ہیں؟“ اس نے کہا: ”بارہ پندرہ گھروں پر مشتمل چھوٹا سا علاقہ استاد کا بار نہیں اٹھا سکتا، پھر بھی وہاں اسکول میں استاد رکھے جاتے ہیں، مگر ان کا مشاہرہ پوری وادی کے لوگ آپس میں مل کر ادا کرتے ہیں۔ استاد دیہات کے چکر لگاتا ہے؛ اس گاؤں میں سات دن؛ اس گاؤں میں دس دن لگاتا ہے اور ان کو تربیت دیتا ہے۔

اساتذہ جلسوں میں جاتے ہیں۔ میں نے خود انھیں جلسوں میں شریک دیکھا ہے۔ وہاں وہ اپنے پروں کے قلم سے پہچانے جاتے ہیں، جو ان کی ہیٹ میں لگی [ریشمی] رسیوں میں گھنسے ہوتے ہیں؛ جو صرف پڑھنا سکھاتے ہیں، ان کے پاس ایک قلم ہوتا ہے؛ جو پڑھنا اور حساب کتاب کرنا بھی سکھاتے ہیں ان کے پاس دو قلم ہوتے ہیں؛ وہ جو پڑھنا، حساب کتاب کرنا، اور لاطینی زبان سکھاتے ہیں، ان کے پاس تین قلم ہوتے ہیں۔ جاہل ہونا کتنے شرم کی بات ہے۔ تم کو چاہیے کہ Queyras والوں کی پیروی کرو۔"

وہ اس طرح سنجیدگی اور پدرانہ انداز میں گفتگو کرتا تھا؛ مثالیں نہ ہوں تو وہ خود ہی نظیر گھڑ لیتا تھا؛ براہ راست نکتے پر جاتا تھا؛ اس کے چند جملوں اور خاکوں سے جو صفات ملتی تھیں وہ یسوع مسیح کا اندازِ خطابت پیش کرتی تھیں۔ اور چوں کہ وہ خود قائل ہوتا تھا، اس لیے وہ موثر بھی ہوتا تھا۔

۞

الفاظ بہ مقابلہ عمل

اس کی گفتگو خوش اخلاق اور خوب صورت ہوتی تھی۔ وہ خود کو بھی اپنے ساتھ زندگی گزارنے والوں کی سطح پر ہی رکھتا تھا۔ ہنستا تو اس کی ہنسی کسی اسکول کے لڑکے جیسی ہوتی۔ مادام ماگلا اس کو عالی جاہ کہنا پسند کرتی تھی۔ ایک دن وہ اپنی بیٹھنے والی کرسی سے اٹھا اور کسی کتاب کی تلاش میں اپنے کتب خانے میں گیا۔ کتاب کسی اوپری خانے میں رکھی تھی۔ چوں کہ بشپ کا قد چھوٹا تھا، وہ کتاب تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ ''مادام ماگلا'' اس نے کہا، ''مجھے ایک کرسی لا دو۔ میری عالی جاہی اس خانے کی بلندی تک پہنچ نہیں سکتی۔''

اس کے دور کے رشتے داروں میں سے ایک، مادام کاؤنٹس ڈی لو تھی جو اس کی موجودگی میں اپنے تین بیٹوں سے رکھنے والی ''توقعات'' گنانے کا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اس کے کئی رشتے دار تھے، جو بہت عمر کے اور قریب المرگ تھے، اس کے بیٹے جن کے فطری وارث تھے۔ تینوں میں سب سے چھوٹے کو ورثے میں اپنے والد کی پھوپھی سے تقریباً ایک لاکھ لیور ملنے والے تھے؛ دوسرا ورثے میں اپنے چچا سے ڈیوک کا خطاب پانے والا تھا؛ سب سے بڑا اپنے دادا کی جگہ لارڈ بننے والا تھا۔ بشپ خاموشی سے یہ قابلِ معافی اور معصومانہ شیخیاں سننے کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک موقعے پر جب مادام ڈی لو ایک بار پھر ان وراثتوں اور ان تمام ''توقعات'' کی تفصیل بیان کر رہی تھی، اور وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا تو مادام نے بے صبرے پن سے اپنے آپ کو روکا: ''او خدایا! عم زاد! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' بشپ نے جواب دیا، ''ایک انوکھے اشارے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، جو شاید سینٹ آگسٹین میں ملے گا — ''اس آدمی سے توقعات رکھو جس سے تمھیں وراثت ملنے والی نہ ہو۔''

ایک اور موقعے پر ویہی علاقے کے ایک صاحب کے سانحۂ ارتحال پر ملنے والی اطلاع کو پڑھ کر، جس میں ایک پورے صفحے پر نہ صرف مرنے والے کی عظمتوں کا بلکہ اس کی فوجی اور اشرافیہ اسناد کا بھی تذکرہ کیا گیا تھا، اس نے کہا تھا: ”کیا مضبوط کمر ہوتی ہے موت کی بھی!“ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: ”القابات کا اتنا حیرت انگیز بوجھ اور کتنی خندہ پیشانی سے اس پر ڈال دیا گیا ہے۔ مقبرے سے خوش مذاقی کا کام لینے کے لیے بھی آدمی کو ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے!“

اسے موقعے پر قہقہے بازی کے ساتھ کسی سنجیدہ بات پر پردہ ڈالنے کا فن آتا تھا۔ ایک Lent [حضرت عیسیٰ کی چالیس روزہ تجہیز و متبرک کا عرصہ] کے دوران ایک نوجوان وکر D آیا اور کلیسا میں تبلیغ کی۔ وہ خوش گفتار تھا مگر قابلِ برداشت حد تک۔ اس کی گفتگو کا موضوع خیرات تھا۔ اس نے صاحبِ ثروت لوگوں کو جہنم سے بچنے کے لیے، جس کی اس نے نہایت خوف ناک انداز میں تصویر کشی تھی — جو وہ بہت خوبی سے کر سکتا تھا — اور جنت حاصل کرنے کے لیے جس کو اس نے دل کش اور قابلِ خواہش گردانا تھا۔ حاضرین میں ایک دولت مند تاجر، موسیو گبوراں (Geborand)، بھی تھا، جو بھاری شرح سود پر نقد رقم اُدھار دیتا تھا، جس نے کورے کپڑے، سرج، اور اونی ٹوپیوں کی صنعت سے دو ملین کما لیے تھے۔ اپنی زندگی میں موسیو گبوراں نے کبھی بدنصیب مساکین کو خیرات نہیں دی تھی۔ اس خطبے کے بعد دیکھا گیا کہ ہر اتوار کو وہ کلیسا کے دروازے پر مانگنے والی بدنصیب عورتوں کو ایک سو [سب سے کم قیمت فرانسیسی سکہ] دینے لگا اور ایک سکے میں چھ عورتیں حصے دار ہوتی تھیں۔ ایک دن بشپ نے اس کو خیرات دیتے دیکھ لیا، اور اس کی بہن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا، ”وہ دیکھو، موسیو گبوراں ایک سو میں جنت خرید رہا ہے۔“

جب خیرات کا سوال اٹھتا تو انکار بھی اس کو دور نہیں سکتا تھا، اور ایسے موقعوں پر وہ ایسی بات کہہ دیتا تھا کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ شہر میں کسی کے ملاقاتی کمرے میں غربا کے لیے بھیک مانگ رہا تھا؛ اس موقعے پر ایک دولت مند اور لالچی بوڑھا مارکوئی de Champtercier بھی موجود تھا، جو ایک ہی وقت میں غیر معقول حد تک شاہ پرست اور والٹیریائی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ واقعی، اس قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بشپ اس کے پاس گیا، اور اس کا بازو پکڑ کر کہا: ”آپ کو ضرور کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔“ مارکوئی پلٹا اور بڑے خشک انداز میں جواب دیا، ”مسیو رسنیور، ہمارے اپنے بھی غریب لوگ ہیں۔“ بشپ نے فوراً کہا، ”انھیں آپ میرے حوالے کر دیجیے۔“

ایک دن وہ بڑے گرجا گھر میں تبلیغ کر رہا تھا:

میرے بے حد پیارے بھائیو! میرے دوستو! فرانس میں کسانوں کے تیرہ لاکھ بیس ہزار

ایسے مکانات ہیں جن میں صرف تین شگاف ہوتے ہیں؛ اٹھارہ لاکھ سترہ ہزار پچوں کے جھونپڑے ہیں جن میں صرف دو شگاف، یعنی، ایک دروازہ اور ایک کھڑکی، ہوتی ہے؛ چھیالیس ہزار کٹیا ئیں ہیں جن میں صرف ایک شگاف، یعنی ایک دروازہ ہوتا ہے۔ یہ اعداد و شمار ایک ذریعے سے ملے ہیں جس کو دروازوں اور کھڑکیوں کا ٹیکس کہتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے غریب خاندانوں کی ان عمارتوں کو اپنی نظر میں رکھو اور نتیجے میں پیدا ہونے والے بخار اور بیماریوں کا اندازہ کرو! افسوس، صد افسوس! خدا ان کے لیے ہوا فراہم کرتا ہے اور قانون وہی ہوا ان کو فروخت کرنے لگتا ہے۔ میں قانون کو ذمے دار نہیں ٹھہراتا، بلکہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ Isere کے شعبے [دریائے Isere کی وادی] میں، Var میں، Alpes [سلسلۂ کوہ] اور Hautes [جنوب مشرقی فرانس] میں اور Basses [نچلے پہاڑ، جنوب مشرقی فرانس کا علاقہ] میں کسانوں کے پاس ایک پہیے والی ہاتھ گاڑیاں بھی نہیں؛ وہ اپنی کھاد انسانوں کی پیٹھ پر لاد کر لے جاتے ہیں؛ ان کے پاس موم بتیاں بھی نہیں ہوتیں، اس کی جگہ وہ رال میں ڈبوئی، یا لاکھ لگی لکڑیاں جلاتے ہیں؛ تارکول میں ڈبوئے ہوئے رسّی کے ٹکڑے جلاتے ہیں۔ یہ حال ہے پورے Dauphine [جنوب مشرقی فرانس] کے پہاڑی علاقے کا۔ وہ ایک ساتھ چھ مہینے کی ڈبل روٹی پکا کر رکھ لیتے ہیں؛ روٹیوں کو [کالی بھینس کے گوبر سے بنے] اُپلوں پر پکاتے ہیں؛ جاڑے کے زمانے میں ان روٹیوں کو کلھاڑے سے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں، اور کھانے کے قابل بنانے کے لیے چوبیس گھنٹے پانی میں بھگوتے ہیں۔ میرے بھائیو! رحم کرو! اپنے اطراف ہونے والے دکھوں پر نظر کرو!"

Provence کے علاقے کا پیدا، اس نے آسانی سے جنوب کی بولی سیکھ لی تھی۔ اس نے نچلے Languedoc میں کہا تھا: "?En bel moussu, ses sage"؛ بالائی Basses-Alpes کی بولی میں کہا تھا: "?Onte anaras passa"؛ Dauphine بولی میں کہا تھا: "Puerte un bouen moutu embe un bouen fromage grase," ان باتوں سے لوگ بہت خوش ہوتے تھے، اور اس کو ہر قسم کے جذبات کو فتح کرنے کے مواقع مل جاتے تھے۔ پچوں سے بنے جھونپڑوں اور پہاڑوں میں بڑے آرام سے رہتا تھا۔ وہ اعلیٰ ترین باتوں کو لچر محاوروں میں کہنے پر قدرت رکھتا تھا۔ چوں کہ وہ تمام زبانیں بول سکتا تھا، اس لیے وہ سارے دلوں میں گھر کر لیتا تھا۔

مزید یہ کہ اس کا رویہ دنیا والوں کے لیے اور نچلے درجے کے لوگوں، اور سب کے لیے ایک جیسا تھا۔ وہ پورے احوال پر غور کیے بغیر جلدی میں کسی شے کو رد نہیں کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا: "اس طریقے پر نظر کرو جس پر غلطی ہوئی ہے۔"

ساتھ، گنہگار ہوتے ہوئے، جیسا کہ وہ خود کو مسکراتے ہوئے کہتا تھا، مقصد کیے بغیر وہ نیکو کاری کے نظریے کی تبلیغ کرتا تھا جس کو مندرجہ ذیل انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے:

"انسان پر اس کا گوشت ہوتا ہے جو کبھی اس پر بار بن جاتا ہے اور کبھی لالچ۔ اس کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے اور اس کا خمیازہ بھگتتا رہتا ہے۔ اسے اس پر نظر رکھنی چاہیے، اس کو دبا کر رکھنا چاہیے، اور بالکل آخر میں اس کا حکم ماننا چاہیے۔ اس کی فرماں برداری میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، مگر اس طرح کی ہوئی غلطی معافی کے قابل ہوتی ہے؛ یہ ایک قسم کی گراوٹ ہوتی ہے، گھٹنے کے بل گرنے کی گراوٹ، جو بالآخر دعا بن کر ختم ہو سکتی ہے۔"

"صوفی بن جانا استثنا ہوتا ہے؛ اچھا آدمی ہونا اصول ہوتا ہے۔ گراوٹ کے عالم میں بھی گناہ ہو سکتا ہے، مگر اچھے انسان بنو۔"

"گناہ کرنا انسان کا اصول ہے، مگر کم ترین اصول! فرشتہ کبھی گناہ کے خواب بھی نہیں دیکھتا۔ ہر شے جو خاکی ہے، گناہ کے تابع ہوتی ہے۔ گناہ ایک نوعیت کی کشش ہوتا ہے۔"

جب وہ لوگوں کو زور زور سے غُل مچاتے، اور فوراً ہی غصہ کرتے دیکھتا تو "اُف! اُف" کرتا، اور مسکراتے ہوئے کہتا تھا، "یہ سب سے بڑا گناہ ہے جو پوری دنیا کرتی ہے۔ دراصل، یہ مکاریاں ہیں جو خوف زدہ ہوتی ہیں، اور فوراً احتجاج کرنے لگتی ہیں، تا کہ وہ خود محفوظ رہیں۔"

وہ عورتوں اور مفلس لوگوں پر مہربان ہوتا تھا، جن پر پورا انسانی معاشرہ انحصار کرتا ہے۔ وہ کہتا تھا، "غلطیاں؛ عورتوں کی ہوں، بچوں کی ہوں، کم زور لوگوں کی ہوں، مفلسوں کی ہوں، یا جاہلوں کی، دراصل ہمیشہ شوہروں، والدوں، آقاؤں، طاقت وروں، دولت مندوں اور عقل مندوں ہی کی ہوا کرتی ہیں۔"

وہ کہتا تھا، "ان کو، جو لاعلم ہیں، ہر شے کی، جہاں تک ممکن ہو، تعلیم دو؛ سماج قابلِ گرفت ہو سکتا ہے، مگر مفت تعلیم کا بار نہیں اٹھا سکتا؛ اس ظلمت کا ذمے دار معاشرہ ہوتا ہے جو وہ خود پیدا کرتا ہے۔ معاشرہ ظلمات سے بھرا ہوتا ہے، ان ظلمتوں ہی میں گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ مجرم گناہ کرنے والا نہیں؛ مجرم وہ ہوتا ہے جو ظلمات پیدا کرتا ہے۔"

لوگ سمجھیں گے کہ یہ اس کا اپنا خاص انداز تھا ہر شے کو دیکھنے اور فیصلہ کرنے کا: میرا خیال ہے کہ یہ سب خیالات اس نے انجیلِ مقدس سے اخذ کیے ہوں گے۔

ایک دن اس کے سامنے ایک فوج داری مقدمہ پیش ہوا، جو نتیجے پر پہنچنے والا تھا، اور ایک ملاقاتی کمرے میں سنا گیا تھا۔ ایک بدنصیب انسان نے، جس کے سارے ذرائع آمدنی ختم ہو گئے،

تھے ایک عورت کی محبت میں، جس سے اس کا ایک بچہ بھی تھا، جعلی سکہ بنایا تھا۔ اس زمانے میں بھی مالیاتی جعل سازی کی سزا موت تھی۔ عورت کو پہلا جعلی سکہ استعمال کرنے کے جرم میں، جو اس کے مرد نے بنایا تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ وہ قید میں تھی مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔ صرف وہی اپنی گواہی سے اپنے عاشق کو ملزم ٹھہرا سکتی تھی، اور اپنے اعتراف کے ذریعے اس کو تباہ کر سکتی تھی۔ عورت نے گواہی دینے سے انکار کر دیا؛ مدعی اصرار کرتے رہے اور وہ انکار کرتی رہی۔ چناں چہ حکومت کے کارندے کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ اس نے عاشق کے خلاف بیوی سے بے وفائی کے ثبوت گھڑے اور عیاری سے تیار کیے ہوئے کچھ خطوط کے ٹکڑوں کی مدد سے عورت کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کے عاشق کا ایک اور عورت سے معاشقہ چل رہا ہے، یعنی اس کا عاشق اس سے فریب کر رہا ہے۔ اس کی بنیاد پر، اور انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر، عورت نے اعتراف کر لیا، اور مرد کے خلاف جرم ثابت ہو گیا۔

وہ آدمی تباہ ہو گیا۔ جلد ہی اس پر اور اس کے شریکِ کار پر Aix میں مقدمہ چلایا جانے والا تھا۔ سب مجسٹریٹ کی چالاکی پر عش عش کر رہے تھے کہ اس نے حسد کے استعمال سے سچائی کو آشکار کر دیا، اور انتقام کے ذریعے انصاف کر رہا تھا۔ بشپ یہ سب خاموشی سے سنتا رہا۔ جب سب کام ختم کر چکے تو اس نے پوچھا:

"اس آدمی اور عورت پر مقدمہ کہاں چلایا جائے گا؟"

"Assizes کی عدالت میں۔"

اس نے مزید سوال کیا، "اور سرکاری وکیل پر کہاں مقدمہ چلایا جائے گا؟"

D میں ایک الم ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک آدمی کو قتل کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی۔ وہ بدنصیب انسان تھا، پڑھا لکھا نہیں مگر گھامڑ بھی نہیں تھا، ناجائز دوا فروشی کرتا تھا اور عوام کے لیے لکھتا لکھاتا بھی تھا۔ مقدمے میں پورا شہر دل چسپی لے رہا تھا۔ مجرم کی سزا پر عمل درآمد سے ایک دن قبل قید خانے کا پادری علیل ہو گیا۔ مجرم کے آخری لمحات پر موجود ہونے کے لیے ایک پادری کی ضرورت تھی۔ علاقے کے پادری کو طلب کیا گیا، جس نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا کہ "مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس ناخوش گوار واقعے اور دوا فروش سے میرا کوئی تعلق نہیں؛ میں بھی علیل ہوں؛ اس کے علاوہ، یہ میرا مقام نہیں۔" معاملہ بشپ کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے کہا، موسیو کیورٹیگ کہتے ہیں؛ یہ ان کا مقام نہیں، یہ میرا مقام ہے۔"

بشپ فوراً ہی قید خانے روانہ ہو گیا، دوا فروش کی کوٹھری میں پہنچا، دوا فروش کو اس کا نام

لے کر مخاطب کیا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور اس سے باتیں کیں۔ پورا دن اس کے ساتھ گزارا، کھانا پینا، سونا تج دیا، اور مجرم کے لیے خدا سے مغفرت کی دعائیں کیں۔ مجرم کو بہترین، اور سادہ سچائیوں سے آگاہ کیا۔ وہ باپ تھا، بھائی تھا، دوست تھا؛ وہ بشپ تھا برکتوں کی دعا کے لیے۔ اس نے مجرم کو ہر بات بتائی، اس کی ہمت افزائی کی اور دلاسا دیا۔ مجرم مایوسی کی موت مرنے والا تھا۔ موت اس کے لیے جہنم تھی۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا، پسپا ہو رہا تھا۔ اس میں مکمل طور پر لاپرواہی برتنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ اس کی سزا ایک جھٹکا تھی، اس دیوار کی طرح جو ہم کو ان اشیا کے رازہائے درون سے الگ کرتی، ہم جس کو زندگی کہتے ہیں۔ اس کی نظریں اس دیوار کے مہلک رخنوں کے ذریعے مسلسل اس دنیا سے پرے صرف اندھیروں پر لگی ہوئی تھیں۔ بشپ نے اسے روشنی دکھائی تھی۔

اگلے دن جب قید خانے والے اس بدقسمت شخص کو لینے آئے، بشپ اس وقت بھی وہیں تھا۔ وہ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے، مجرم کے ساتھ ساتھ چلا جس کو رسیوں سے باندھا گیا تھا، اور دنیا کے سامنے اپنی گردن میں پڑے اودے رومال اور صلیب کی اہمیت کا مظاہرہ کیا۔ مجرم کے ساتھ سزائے موت کے لیے لے جانے والی گاڑی پر سوار ہوا۔ مصیبت زدہ مجرم کا چہرہ تابندہ ہو گیا جو پچھلے دن بے حد اداس اور رنجیدہ تھا۔ مجرم نے محسوس کیا کہ اس کا اندرون مطمئن ہو گیا ہے اور اس کو خدا سے امید پیدا ہو گئی۔ بشپ نے اسے گلے سے لگایا، اور عین اس وقت جب گلوتراش (گلوٹین) گر نے والا تھا، بشپ نے مجرم سے کہا، "انسان جس کو ذبح کرتا ہے، خدا اس کو زندہ کرتا ہے؛ وہ جسے بھائی ناپسند کرتے ہیں اسے ایک بار پھر باپ مل جاتا ہے؛ دعا کرو! زندگی پر یقین رکھو! آسمانی باپ یہیں کہیں موجود ہے۔" جب بشپ گلوتراش مچان سے نیچے اترا، اس کی آنکھوں میں عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کو دیکھ کر مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور اس کو گزر جانے دیا۔ وہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ اس کے چہرے کی زردی قابل تعریف تھی یا یہ اظہار طمانیت تھا۔ جب وہ اپنی قیام گاہ پہنچا، جسے اس نے خود اپنے لیے محل کے طور پر اختیار کیا تھا، مسکرا کر اپنی بہن سے کہا، "میں نے آج پاپائے اعظم کے شایان شان کام کیا ہے۔" چوں کہ زیادہ تر ارفع چیزیں اکثر وہ ہوتی ہیں جو سمجھ میں آتی ہیں، مگر شہر میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے بشپ کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، "یہ ریاکاری ہے۔"

مگر یہ بات بیٹھکوں تک ہی محدود رہ گئی۔ لوگ جو مقدس کاموں میں مزاح کا تصور نہیں رکھتے، اس عمل سے بہت متاثر ہوئے، اور بشپ کی تعریف کی تھی۔

بشپ سر قلم کرنے کی مشین دیکھ کر سکتے میں آ گیا تھا۔ اس کیفیت سے نکلنے میں اسے کافی وقت لگا تھا۔

دراصل، جب سر قلم کرنے کی مشین تیار ہوتو اس کو دیکھ کر انسان سزائے موت کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ جب تک انسان گلوتراش مشین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیتا سزائے موت کے بارے میں ہاں یا نا کہنے سے گریز کر سکتا ہے مگر جب اس کو کام کرتے دیکھ لیتا ہے تو اس کا اثر شدید ہو جاتا ہے، اور انسان فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور اس مسئلے پر اس کو ہاں یا نا کہنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ لوگ، مثال کے طور پر de Maistre، اس کی تعریف کرتے ہیں جب کہ Beccaria جیسے لوگ اس سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ گلوتراش مشین ایک ٹھوس شکل میں قانون کا اظہار ہوتی ہے؛ یہ انسان کو گناہ سے پاک کرتی ہے؛ غیر جانب دار نہیں ہوتی، آپ کو غیر جانب دار رہنے کی اجازت بھی نہیں دیتی؛ جو اس کو دیکھتا ہے اندر سے کانپ اٹھتا ہے۔ اس مشین کے اطراف تمام سماجی مسائل استفسار کے اپنے مقامات قائم کر دیتے ہیں۔ تکمیلِ سزا کے مچان کا ایک تصور ہوتا ہے۔ یہ مچان محض بڑھئی (carpentry) کا نمونہ نہیں ہوتا؛ لکڑی، لوہے اور رسیوں سے بنا مچان خود کوئی میکانیکی مشین نہیں ہوتا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ کوئی وجود ہوتا مگر مجھے نہیں معلوم اس میں کون سی غم انگیز شے پوشیدہ ہوتی ہے؛ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کاریگری کا یہ ٹکڑا دیکھتا بھی ہے، کہ اس کی مشین سنتی بھی ہے، کہ یہ مشین سمجھتی بھی ہے، کہ اس مشین اور ان رسیوں کی اپنی خواہشات بھی ہوتی ہیں۔ خوف زدہ کر دینے والے مراقبے میں، جس میں اس کا وجود اپنی روح کو ڈھالتا ہے، یہ مچان ایسے بھیانک بہروپ میں ظاہر ہوتا ہے، گویا جو کچھ ہو رہا اس میں یہ بھی حصہ دار ہے۔ مچان جلاد کا شریک کار ہوتا ہے؛ یہ گوشت کھاتا ہے، خون پیتا ہے؛ مچان منصف اور جلاد کا تیار کیا ہوا دیو ہوتا ہے، ایک سایہ ہوتا ہے، ایک بھیانک وقتِ حیات ہوتا ہے اور ان تمام اموات کے عمل پر زندہ رہتا ہے جو اس نے عائد کی ہوتی ہیں۔

اس لیے بشپ پر اس کا تاثر عمیق اور شدید تھا؛ تکمیلِ سزا کے، اور اس بعد کے کئی دنوں تک بشپ بالکل پژمردہ اور پامال دکھائی دیتا تھا۔ شدید تعزیتی طمانیت کے لمحات کے گزر جانے کے بعد سماجی انصاف کی خیالی کیفیات اس کے لیے عذاب بنتی جا رہی تھیں۔ وہ جو اپنے تمام افعال کے بعد عام طور پر شاداں و مطمئن نظر آیا کرتا تھا، اپنے آپ کو سرزنش کرتا دکھائی دینے لگا تھا۔ اکثر وہ دھیمی، رنجیدہ اور لکنت آمیز آواز میں خود کلامی کرتا۔ اس کی بہن نے ایک شام اسے اپنے آپ سے کچھ اس قسم کی باتیں کرتے سنا تھا: "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنی دیو ہیکل نوعیت کا ہوگا۔ کسی مذہبی قانون میں اس قدر غرق نہیں ہو جانا چاہیے کہ انسانی قوانین نظر انداز ہو جائیں۔ موت صرف اللہ کی

ملکیت ہوتی ہے۔ انسان کو اس کو ہاتھ میں لینے کا کس طرح حق پہنچتا ہے؟''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تاثرات کم زور ہوتے گئے، غالباً غائب ہو گئے۔ پھر بھی، یہ دیکھا گیا تھا کہ اس واقعے کے بعد سے بشپ نے موت کی سزا دی جانے والی جگہ کے قریب سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔

کسی بیمار یا قریب المرگ شخص کے پاس موسیو مائریل کو بلایا جا سکتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کرتا تھا کہ یہی وہ لمحات ہیں جن میں اس پر سب سے بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی محنت ہوتی ہے۔ بیوگی اور یتیمی کے مارے خاندانوں کو اسے طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی؛ وہ خود ہی ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے گھنٹوں اس آدمی کے پاس کس طرح بیٹھنا چاہیے، جس کی محبوب بیوی اس سے جدا ہو گئی ہے؛ اس ماں کے پاس، جس کا بچہ اس سے جدا ہو گیا ہے۔ جس طرح وہ خاموشی کے لمحات سے واقف تھا، اس طرح اسے تقریر کے لمحات کا بھی اندازہ تھا۔ وہ قابلِ تعریف دلاسا دینے والا تھا۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ بھول چوک غم کو ملیا میٹ نہ کر دے، بلکہ امید اس کو محترم کر دے۔ وہ کہتا تھا:

''مر جانے والوں کی طرف توجہ دینے کے طریقے میں احتیاط سے کام لو۔ اس شے کے بارے میں بات نہ کرو جو ختم ہو جانے والی ہے۔ غور سے دیکھو۔ تم میں، اپنے پیارے مرنے والے کو جنت کی گہرائیوں میں دیکھنے کی روشنی پیدا ہو جائے گی۔'' وہ جانتا تھا کہ عقیدہ بہت توانا ہوتا ہے۔ وہ بے آس اور متروک ہو جانے والے افراد کی طرف اشارے کر کے مایوس لوگوں کو اپنے غم کی، اس کے غم میں قلبِ ماہیت کا مشورہ دیتا تھا جو اپنی نظریں ستاروں پر مرکوز کرتا ہے۔

۞

بشپ کا اپنے جُبّے کا نادیر استعمال

موسیو مائریل کی نجی زندگی ایسے ہی خیالات سے مملو تھی جیسے کہ عوامی زندگی میں ہوتے تھے۔ از خود عائد کردہ افلاس جس میں D کا بشپ زندگی بسر کر رہا تھا، قریب سے دیکھنے والوں کے لیے ایک متبرک اور خوش گوار منظر ہوتا تھا۔

تمام عمر رسیدہ آدمیوں اور صاحبانِ فکر و نظر کی اکثریت کی طرح، وہ کم ہی سوتا تھا۔ مختصر عرصے کا آرام مگر گہرا ہوتا تھا۔ صبح کے وقت ایک گھنٹے کے لیے مراقبہ کرتا، اس کے بعد اجتماع سے خطاب ہوتا، یا تو کیتھیڈرل میں یا اس کے اپنے گھر میں۔ اجتماع کے بعد اس کی اپنی ہی گائے کے دودھ میں بھیگی رائی کی روٹی سے ناشتا ہوتا۔ اس کے بعد وہ کام پھر شروع کر دیتا تھا۔

بشپ بہت مصروف آدمی ہوتا ہے: بشپ کے دفتری سیکریٹری سے روزانہ کی ملاقات ضروری ہوتی ہے، عام طور پر جو کینن [شرعی مفتی] ہوتا ہے، اور تقریباً ہر روز اس کی معاونت بھی کرتا ہے۔ اس کو سرزنش کرنے کی مجالس منعقد کرنا، استحقاق عطا کرنا، پورے متبرک کتب خانے کی — دعاؤں کی کتب کی، کلیسا کے علاقے کے سوال جواب نامے وغیرہ کی جانچ پڑتال کرنا — الزامات تحریر کرنا، خطبات کی منظوری، پادریوں اور میئروں کے معاملات سلجھانا، مذہبی خط کتابت کرنا، ایک جانب سیاسی اداروں سے اور دوسری جانب پاپائے اعظم کے دفاتر (Holy See) اور ہزاروں کاروباری معاملات سے متعلق تنظیمی خط کتابت کرنا۔

ان سب کے بعد جو کچھ وقت باقی بچ رہتا، کاروبار کی ہزاروں تفصیلات، دفاتر اور اس کی اپنی ضروری مصروفیات کے بعد وہ بیماروں، ضرورت مندوں اور مظلوموں کی داد رسی کرتا؛ اس کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ کبھی اپنے باغیچے میں کھدائی کرتا؛ اور ایک بار پھر لکھتا پڑھتا تھا۔ ان

دونوں مصروفیات اور محنت کے لیے اس کے پاس ایک ہی لفظ ہوتا تھا؛ اس کو وہ باغبانی کہتا تھا۔ اس کا قول تھا: "دماغ ایک باغیچہ ہوتا ہے۔"

دوپہر کے قریب، جب موسم اچھا ہوتا، وہ شہر یا دیہات کی طرف پیدل نکل جاتا، اور کبھی پس ماندہ علاقوں کی طرف بھی جاتا۔ وہ اکیلا چلتا، اپنے خیالات میں مگن، آنکھیں نیچی کیے، اور ایک بڑی سی بید کا سہارا لیے، اپنے اودے ریشمی گدیلے لباس میں جو بہت گرم ہوتا تھا، اپنے سخت جوتوں میں اودے رنگ کے موزے پہنے ہوتا تھا، اور سر پہ ہیٹ لگاتا جس میں تین مختلف جگہوں سے لٹکتے پھندنوں میں چاندی سونے کے تین بٹے گندھے ہوتے تھے۔

جس جگہ بھی وہ ظاہر ہوتا مکمل جشن کی صورت ہو جاتی۔ لوگ کہتے کہ اس کی موجودگی میں گرم جوشی اور تابانی کی کیفیت ہوتی ہے۔ بچے اور عمر رسیدہ اپنے اپنے دروازوں پر اس طرح آ جاتے جیسے لوگ دھوپ کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ سب کو دعائیں دیتا اور لوگ اس کو دعائیں دیتے۔ جس کسی کو بھی کسی قسم کی حاجت ہوتی، اس کے گھر کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تھا۔

اِدھر اُدھر رُکتا، چھوٹے بچوں بچیوں سے چھیڑ کرتا، اور ماؤں کو دیکھ کر مسکرا دیتا۔ جب تک اس کے پاس کچھ نقدی ہوتی مفلسوں کے پاس جاتا، اور جب نقدی ختم ہو جاتی تو صاحبانِ ثروت سے ملنے چلا جاتا تھا۔

چوں کہ وہ اپنے چغے کو زیادہ عرصے تک چلانا چاہتا تھا، اور چاہتا تھا کہ یہ لوگوں کی نظر میں آئے، وہ شہر میں کبھی اپنے اُودے لباس کے بغیر نہیں نکلتا تھا۔ حالاں کہ گرمی کے موسم میں اسے خاصی تکلیف ہوتی تھی۔

واپسی پر ڈنر کھاتا۔ ڈنر اس کے ناشتے جیسا ہی ہوتا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اپنی بہن کے ساتھ رات کا کھانا کھاتا، مادام ماگوا عقب میں کھڑی خدمت گاری کرتی۔ اس کی غذا ایسی ہوتی جس میں مزید کفایت شعاری ممکن نہیں تھی۔ اگر رات کے کھانے پر بشپ کے ساتھ کوئی پادری ہوتا تو مادام اس موقعے سے فائدہ اٹھاتی اور بشپ کو جھیل کی اعلیٰ درجے کی مچھلی، یا پہاڑوں سے آئے ہوئے شکار کا گوشت پیش کرتی۔ کسی پادری کی موجودگی اچھا کھانے کا باعث ہوتی تھی مگر بشپ اس میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ اس استثنا کے علاوہ اس کی عام دنوں کی غذا پانی میں ابلی ہوئی ترکاریوں، اور تیل سے بنے شوربے پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس طرح شہر میں کہا جاتا تھا کہ جب بشپ کسی پادری کی خوش نودی میں مصروف نہیں ہوتا، تو وہ ٹراپیوں کی خاطر داری کر رہا ہوتا ہے۔

رات کے کھانے کے بعد آدھ گھنٹے میڈموزیل بپتستین اور مادام ماگوا سے بات چیت ہوتی؛

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور لکھنا پڑھنا شروع کر دیتا؛ کبھی خوردہ کاغذ پر لکھتا، اس کے بعد اسی کاغذ کے حاشیے پر لکھنے لگتا۔ وہ عالم اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس نے اپنے پیچھے پانچ یا چھے عدد قدیم دستاویزیں چھوڑی تھیں؛ ان میں ایک توضیحی مقالہ بھی تھا، انجیل مقدس کی اس آیت پر کہ "ابتدا میں خدا کی روح پانیوں پر تیرتی تھی۔" اس آیت کے ساتھ وہ تین متون کا تقابل کرتا ہے۔ عربی متن کہتا ہے "خدا کی ہوائیں چلنے لگیں"؛ یہودی تاریخ داں Flavius Josephus کہتا ہے "اوپر سے زمین پر تیز ہوا نازل ہوئی" اور آخر میں آنکیلوس کی کالدائی زبان میں لکھی توضیح کہتی ہے کہ "پانیوں پر خدا کی جانب سے بھیجی گئی ایک ہوا چلی"۔ ایک اور مقالے میں وہ ٹولیما کے بشپ ہیوگو کی مذہبی تحریروں، اور اس حقیقت کا تعین کرتے ہوئے تشریح کرتا ہے، جو اس کتاب کے مصنف کا پرداداتھا، اور ان کاموں کا حوالہ دیتا ہے جو پچھلی صدی میں بارلے کورٹ کے فرضی نام سے شائع ہوئے تھے۔

کبھی اپنے مطالعے کے دوران، اس سے غرض نہیں کہ وہ کون سی کتاب ہوتی، وہ اچانک عمیق استغراق میں چلا جاتا تھا۔ اس سے اسی وقت باہر آتا جب اسے اسی کتاب کے حاشیے پر کچھ لکھنا ہوتا تھا، اس سے قطعِ نظر کہ اکثر ان سطروں کا کتاب کے مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ اب ہمارے پیشِ نظر ایک تحریر ہے جو "لارڈ جرمین کی جنرل کلنٹن، جنرل کارنوالس اور امریکی اڈوں پر موجود ایڈمرلوں کے درمیان خط کتابت" نامی ایک چوورقے کے حاشیے پر لکھی گئی تھی۔ جس پر ورسائی، Poincot، کتاب فروش؛ اور پیرس، Pissot، Quai des Augustins کے کتاب فروش کے نام درج تھے۔

وہ تحریر ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"ارے! تم ہو کون!

Ecclesiastes [انجیل مقدس کا ایک باب، روایت کے مطابق جو یوسف علیہ السلام سے منسوب ہے] تم کو سب سے زیادہ طاقت ور کہتا ہے؛ Maccabees [یہودیوں کا ایک رہنما] تم کو خالق کہتا ہے؛ Ephesians کے نام لکھی Epistle تم کو آزادی کہتی ہے؛ باروق تم کو لا انتہائیت کہتا ہے؛ مناجاتیں تم کو عقل اور صدق کہتی ہیں؛ جان تم کو روشنی کہتا ہے؛ بادشاہوں کی کتابیں تم کو آقا کہتی ہیں؛ Exodus تم کو عاقبت اندیشی کہتی ہے؛ Leviticus، پاکیزگی؛ Esdras، انصاف؛ اور مخلوق تم کو خدا کہتی ہے؛ آدمی تم کو باپ کہتا ہے؛ مگر سلیمان نے تم کو رحم کہا ہے، اور تمھارے ناموں میں سب سے خوب صورت یہی نام ہے۔"

نو بجے کے قریب دونوں عورتیں اپنے اپنے کمروں میں چلی جاتی ہیں؛ بشپ کو اگلی صبح تک کے لیے زمینی منزل پر اکیلا چھوڑ دیتی ہیں۔

اس موقعے پر ضروری ہے کہ ہم D کی اس قیام گاہ کا صحیح تعین کر دیں۔

۞

گھر کا محافظ

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، جس گھر میں بشپ رہتا تھا، اس میں ایک زمینی منزل تھی، اوپر ایک اور منزل تھی۔ زمینی منزل پر تین کمرے، اور تین کمرے پہلی منزل پر بھی تھے، اس کے اوپر ایک دو چھتی تھی۔ گھر کے عقب میں ایک باغیچہ تھا، جو چوتھائی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ دو عورتیں پہلی منزل پر رہتی تھیں؛ بشپ نچلی منزل میں رہتا تھا۔ پہلا کمرہ جو گلی میں کھلتا تھا، کھانے کا کمرہ تھا؛ دوسرا کمرہ بشپ کی خواب گاہ کا کام دیتا تھا، اور تیسرا خطاب کے لیے مخصوص تھا۔ خطاب کے کمرے سے باہر جانا ممکن نہیں تھا؛ خواب گاہ اور کھانے کے کمرے کے راستے سے باہر جانا ممکن تھا۔ زمینی منزل کے آخر، یعنی کمرۂ خطابت میں بنی محراب کے اوپر ایک پلنگ کی جگہ تھی جو مہمانوں کے لیے تھی۔ بشپ یہ پلنگ گاؤں سے یا دوسرے شہروں سے کام کے لیے D آنے والے پادریوں کو فراہم کرتا تھا۔

اسپتال کا دوا خانہ، جو ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا، اس مکان سے ملا دیا گیا تھا، اور باغیچے سے بھی ملا ہوا تھا، باورچی خانے اور تہہ خانے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ باغیچے سے ملا ہوا ایک اصطبل بھی تھا، جو کسی زمانے میں اسپتال کا باورچی خانہ تھا۔ اس میں بشپ نے دو گائیں پال لی تھیں۔ گائیں جیسا بھی اور جتنا بھی دودھ دیتی تھیں، اس کا نصف اسپتال کے بیمار لوگوں کو بھیج دیا جاتا تھا۔ ”میں دودھ کا دسواں حصہ بھیجتا رہتا ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

اس کی خواب گاہ خاصی وسیع تھی؛ خراب موسم میں اس کو گرم رکھنا مشکل ہوتا تھا۔ چوں کہ D میں لکڑی بہت مہنگی ہوتی ہے، اس نے گائے کے لیے بنے برآمدے میں تختوں سے ایک چھوٹا سا حجرہ بنا لیا تھا۔ شدید سردی کے موسم میں وہیں اپنا وقت گزارتا تھا۔ اس حجرے کو وہ 'ونٹر سیلون' کہتا تھا۔

اس 'ونٹر سیلون' میں، کھانے کے کمرے کی طرح، کوئی فرنیچر نہیں تھا سوائے ایک مربع میز

کے جو سفید لکڑی سے بنی تھی، اور مونجھ سے بُنی چار کرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے کے کمرے کو ایک قدیم سائیڈ بورڈ سے سجایا گیا تھا، جس کو گلابی رنگ کے آبی پینٹ سے رنگ دیا گیا تھا۔ اسی قسم کے ایک اور سائیڈ بورڈ سے، جس پر سفید رنگ کے میز پوش کو مصنوعی لیس سے مزین کر کے بشپ نے ایک قربان گاہ بنائی تھی، خطاب کے کمرے کو سجایا گیا تھا۔

اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والے D کے دولت مندوں اور صوفیانہ عورتوں نے ایک سے زیادہ دفعہ بشپ کے خطاب کے کمرے میں ایک نئی قربان گاہ بنانے کے لیے رقم جمع کی تھی؛ اور ہر بار جب اس کو رقم دی جاتی تھی تو وہ مفلسوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ''خوب صورت ترین قربان گاہ'' وہ کہتا تھا، ''ایک ناشاد مخلوق کی روح ہوتی ہے جس کو خدا کے شکرانے کے لیے دلاسا دیا گیا ہو۔''

اس کے خطاب کے کمرے میں پیال سے بنی دو عدد دعائیہ میزیں تھیں اور خواب گاہ میں پیال سے بنی ایک بتھے والی کرسی تھی۔ جب کبھی اتفاق سے ایک ہی وقت میں سات یا آٹھ افراد آجاتے؛ کوئی افسر، یا جرنیل، یا چھاؤنی کی رجمنٹ کے کارکن، یا مدرسے کے کئی شاگرد، تو 'ونٹر سیلون' سے اصطبل میں کرسیاں لائی جاتی تھیں، خطاب کے کمرے سے دعائیہ میزیں، اور خواب گاہ سے بتھے والی کرسی لائی جاتی تھی: اس طرح مہمانوں کے لیے تقریباً گیارہ عدد کرسیاں جمع ہو جاتی تھیں۔ گویا ہر نئے مہمان کے آنے سے ایک کمرہ خالی کیا جاتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بارہ افراد کی پارٹی آجاتی تو بشپ شرمندگی سے بچنے کے لیے چمنی کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا یا اگر گرمی کا موسم ہوتا تو باغیچے میں ٹہل کے بات کرنے لگتا تھا۔

ایک اور کرسی اس محراب والے پلنگ کے پاس رکھی ہوتی تھی مگر اس کا آدھا پیال غائب تھا، اور اس کے صرف تین پائے رہ گئے تھے؛ اس لیے یہ اسی وقت کام آسکتی تھی اگر دیوار کے ساتھ لگا کر رکھی جاتی۔ میڈموزیل پتستیں کے کمرے میں بھی لکڑی سے بنی ایک بڑی آرام کرسی تھی جس پر کسی زمانے میں چاندی کا پانی پھیرا گیا تھا؛ اس کی نشست ایک قسم کے ریشمی کپڑے سے بنائی گئی تھی۔ مگر، چوں کہ گھر کا زینہ بہت تنگ تھا، اس لیے اس کو پہلی منزل پر لے جانے کے لیے کھڑکی استعمال کی گئی تھی؛ اس کو دوسرے فرنیچر کی طرح بار بار نیچے لے جانا ممکن نہیں تھا۔

میڈموزیل کی آرزو ہی رہی کہ وہ زرد رنگ کے مخمل، جس پر گلاب بنے ہوں، اور راج ہنس کے گردن جیسی مہاگنی کے صوفے پر مشتمل فرنیچر اپنے ڈرائنگ روم کے لیے خریدتی؛ اس کے لیے کم از کم پانچ سو فرانک کی ضرورت ہوتی۔ مگر وہ اس کام کے لیے پانچ برسوں میں صرف بیالیس فرانک اور دس سو جمع کر پائی تھی، اس لیے اسے اس آرزو کا خیال دل سے نکال دینا پڑا۔ مگر ایسا کون

ہے جو اس قسم کی اپنی آرزو پوری کر سکا ہے؟

بشپ کی خواب گاہ جیسا تصور پیش کرنے سے زیادہ آسان کیا کام ہوگا۔ایک شیشے کا دروازہ جو باغیچے میں کھلتا تھا؛ اس کے سامنے پلنگ، اسپتال جیسا، لوہے سے بنا، جس پر ہرے رنگ کی سرج سے ڈھکا چھوٹا سا سائبان بنا تھا؛ پلنگ کے قریب، پردے کے پیچھے سنگھار کے برتن، دنیا کے عظیم ترین افراد کی نفیس ترین عادات سے غداری کے مرتکب؛ اس کمرے میں دو دروازے تھے؛ ایک چمنی سے قریب خطاب گاہ میں کھلتا تھا؛ دوسرا، جو کتابوں کی الماری کے قریب تھا، کھانے کے کمرے میں کھلتا تھا۔ کتابوں کی ایک الماری جس میں شیشے لگے تھے، کتابوں سے بھری تھی؛ چمنی لکڑی سے بنی تھی اس پر اس قسم کا پینٹ کیا گیا تھا کہ وہ سنگِ مرمر جیسی نظر آتی تھی، جس میں کبھی آگ نہیں جلائی جاتی؛ جس میں لوہے کے دو عدد چمٹے بھی رکھے ہوتے۔ چمنی کے اوپر سجے دو گل دان اور ایک بانسری، جس پر کبھی چاندی چڑھی رہی ہوگی، جو کسی بشپ کے لیے عیاشی کے زمرے میں آئے گی؛ چمنی کے اوپر تانبے سے بنا، مخمل لگے فریم میں جُڑا، جس کی پالش غائب تھی، حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کا نقش تھا، جس کی چاندی اُڑ چکی تھی؛ شیشے کے دروازے کے قریب ایک بڑی سی میز، جس پر روشنائی والا قلم دان، کاغذ کا ڈھیر؛ میز سے پہلے، پیال سے بنی دعائیہ میز اور خطاب کے کمرے سے مستعار پیال ہی سے بنی ہتھوں والی ایک کرسی۔

پلنگ کے دونوں جانب دیوار پر جڑے دو بیضوی فریم میں دو شبیہیں۔فریم کے اطراف لگے پارچے پر تحریر سے پتا چلتا تھا کہ ایک شبیہ Abbe of Chaliot، سینٹ کلاڈ کے بشپ کی تھی؛ دوسری Abbe Tourteau، اگدے کے وِکر جنرل کی۔ جب اسپتال کے مریضوں کے بعد بشپ اس گھر میں داخل ہوا تو یہ شبیہیں آویزاں تھیں، اور جاتے وقت انھیں چھوڑ بھی گیا تھا۔ یہ لوگ پادری تھے، غالباً چندہ دینے والے بھی تھے— احترام کی دو وجوہ۔ بشپ کو ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ ان کو بادشاہ نے مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک اس کا مذہبی سیکریٹری تھا، اور دوسرا وقف کا نگہبان۔ دونوں 27/ اپریل 1785ء کو ان عہدوں پر فائض کیے گئے تھے۔ مادام ماگوار نے ان تصویروں کو صفائی کے لیے اُتارا تھا، اور بشپ نے یہ تفصیلات ان کے پیچھے چپکے کاغذ سے اخذ کی تھیں، جو وقت سے زرد ہو گئے تھے، اس نے جنھیں واپس وہیں چپکا دیا گیا۔

گھر کی کھڑکیوں میں پرانے زمانے کے کھردرے اونی پردے لگے تھے؛ ان کو تبدیل کرنے کے اخراجات بچانے کے لیے مادام ماگوار کو ان کے بیچ میں خاصی طویل سلائی کرنی پڑی تھی۔ اس سلائی سے صلیب سی بن گئی تھی۔ بشپ اکثر اس پر توجہ کرتا اور کہتا تھا، ''کتنا اچھا لگتا ہے یہ۔''

گھر کی دونوں منزلوں کے ہر کمرے میں، بلا تخصیص، سفیدی کی گئی تھی جو فوجی بیرکوں اور اسپتالوں کا فیشن ہوتا تھا۔

مگر بعد کے برسوں میں مادام ماگوا نے دیوار پر لگے کاغذ سے جس پر سفیدی کر دی گئی تھی میدموزیل باپتستین کے کمرے میں کچھ دیواری نقش پائے، جن کے بارے میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اسپتال بنائے جانے سے پہلے یہ عمارت ایک قدیم دور کی بورژوا پارلیمان تھی۔ اسی وجہ سے اس کی تزئین اس طرح کی گئی تھی۔

کمروں میں اینٹوں کا فرش تھا، جسے ہر ہفتے دھویا جاتا تھا، ساتھ ہی تنکے سے بنی چٹائیوں کو بھی۔ اس گھر کو دو خواتین مل کر اوپر سے نیچے تک صاف شفاف رکھتی تھیں۔ بس یہی ایک عیاشی تھی بشپ نے جس کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ "یہ عیاشی کسی مفلس کا حق نہیں مارتی۔"

اس امر کا پھر بھی اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اس نے اپنی سابقہ ملکیت، چاندی کی چھ چھریاں اور کانٹے، اور شوربا نکالنے کا بڑا چمچا اپنے استعمال میں رکھا تھا اور ہر روز جب وہ اشیا کھانے کی میز پر بچھے کھدر کے رومال پر رکھی جاتی تھیں تو مادام ماگوا انھیں بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ اور چوں کہ اب ہم D کے بشپ کی نقش گری کر رہے ہیں جیسا وہ حقیقتاً ہے، ہمیں اس میں یہ اضافہ ضرور کر دینا چاہیے کہ اس نے کئی بار کہا تھا، "مجھے چاندی کے برتنوں میں کھانے سے دست برداری میں مشکل ہو رہی ہے۔"

چاندی کے ان ظروف میں دو ضخیم شمع دانوں کا بھی اضافہ کر دینا چاہیے جو بشپ کو ورثے میں کسی نانی دادی سے ملے تھے۔ ہر شمع دان میں لاکھ سے بنی دو شمعیں لگائی جا سکتی تھیں، اور عام طور پر یہ بشپ کی چمنی کی زینت ہوتے تھے۔ جب کوئی ڈنر پر مدعو ہوتا تھا، مادام ماگوا دو شمعیں روشن کر دیتی اور دونوں شمع دان کھانے کی میز پر رکھ دیے جاتے تھے۔

بشپ کے اپنے کمرے میں، اس کے سرھانے، ایک چھوٹی سی الماری تھی، ہر رات جس میں مادام ماگوا چاندی کے یہ تمام ظروف رکھ کر تالا لگا دیتی تھی۔ یہاں یہ اضافہ کر دینا ضروری ہے کہ الماری سے کنجی نکالی نہیں جاتی تھی۔

بدصورت عمارتوں کی وجہ سے، ہم جن کا ذکر کر چکے ہیں، باغیچے کا حسن تباہ ہو گیا تھا، جس میں چلنے پھرنے کے لیے دو تنگ پگڈنڈیاں چلیپائی انداز میں بنی ہوئی تھیں۔ ایک اور راستہ باغ کے اطراف تھا، جو سفید چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ ان پگڈنڈیوں کے باعث باغیچہ چار مربع نما ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ان میں سے تین مربعوں میں مادام ماگوا سبزیاں اگاتی تھی؛ چوتھے

مربعے میں بشپ نے کچھ پھول لگا رکھے تھے؛ اور یہاں وہاں چند پھل کے درخت ایستادہ تھے۔ مادام ماگوا نے ایک بار کہا تھا، جس میں ہلکی سی عداوت کا شائبہ بھی تھا: ”محترم بشپ، خود آپ نے، جو ہر ایک کا احتساب کرتے رہتے ہیں، ایک خالی قطعۂ زمین بے کار چھوڑ رکھا ہے۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ پھول اُگانے کے بجائے اس میں سلاد اُگائے جائیں۔“ ”مادام ماگوا، بشپ نے پلٹ کر جواب دیا، ”آپ غلطی پر ہیں۔ یہ خوب صورت قطعہ اتنا ہی فائدہ مند ہے جتنے فائدہ مند دوسرے قطعے ہیں۔“ اور اس نے تھوڑا سا وقفہ دے کر کہا، ”بلکہ شاید زیادہ ہی۔“

یہ قطعۂ زمین، جس میں چار عدد تھالے بنے تھے، بشپ کو اتنا ہی مصروف رکھتا تھا جتنا کہ اس کی کتابیں۔ وہ ایک دو گھنٹے پودوں کی چھنائی، زمین کی کھدائی کرنے، گڑھے بنانے، اور یہاں وہاں بیج ڈالنے میں مصروف رہتا تھا۔ حشرات کے معاملے میں وہ اتنا تنگ دل نہیں تھا، جتنا کسی باغبان کو ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ زراعت کے معاملے میں اسے مہارت کا دعویٰ نہیں تھا؛ وہ گروہ بندی سے احتراز کرتا تھا؛ اس نے کبھی [ماہرِ زراعت] تورنے فورت کے بتائے ہوئے یا عام طریقوں کے درمیان تفریق کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؛ نہ اس نے کبھی کونپلوں کے مقابلے میں پتوں سے قلم لگانے کی کوشش کی تھی، نہ اس نے Linnaeus کے مقابلے میں Jussieu کی پیروی کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پودوں کا مطالعہ نہیں کرتا تھا؛ اسے پھولوں سے پیار تھا۔ وہ عالم افراد کا بہت احترام کرتا تھا، ناواقف لوگوں کا زیادہ احترام کرتا تھا؛ اور ان دو معاملات میں ناکام ہوئے بغیر، گرمی کے موسم ہر شام، سبز رنگ کے دستی فوارے سے پودوں کو خود پانی دیتا تھا۔

اس گھر میں ایسا ایک بھی دروازہ نہیں تھا جس میں تالا لگایا جا سکتا۔ کھانے کے کمرے کا دروازہ، جس کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ براہِ راست کتھیڈرل کے میدان میں کھلتا تھا، ماضی میں قید خانے کے دروازوں کی طرح تالوں اور موٹی موٹی کنڈیوں سے مزین ہوا کرتا تھا۔ بشپ نے لوہے کے یہ تمام 'زیورات' نکلوا دیے، اور، دن ہو یا رات، یہ دروازہ کبھی کسی آلے سے بند نہیں کیا جاتا تھا، سوائے لکڑی سے بنی ایک آڑ کے۔ کسی وقت بھی، سب سے پہلے داخل ہونے والے کو دروازے کو صرف دھکا دینا پڑتا تھا۔ پہلے تو یہ دو عورتیں اس دروازے سے بہت تنگ تھیں، جو کبھی بند نہیں ہوتا تھا، مگر D کے بشپ صاحب نے ان سے کہہ دیا تھا، ”اگر چاہو تو اپنے کمروں میں کنڈیاں لگوا لو۔“ وہ اس اعتماد میں شریک تو ہو گئیں، یا کم از کم اس کا اظہار کرتی تھیں کہ وہ اس اعتماد میں شریک ہیں۔ صرف مادام ماگوا کو وقتاً فوقتاً خوف آلیتا تھا۔ جہاں تک بشپ کا معاملہ تھا، اس کے خیالات کی تشریح اُن تین سطور سے ہوتی تھی جو اس نے انجیلِ مقدس کے حاشیے پر لکھ دی تھیں: ”بس

اتنا ہی فرق ہونا چاہیے: معالج کا دروازہ کبھی بند نہ ہو، اور مبلغ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہو۔"

فلسفے اور طبی سائنس کے موضوع پر ایک کتاب پر اس نے لکھا تھا، "کیا میں ان لوگوں جیسا معالج نہیں؟ میرے بھی مریض ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کو میں بدقسمت کہتا ہوں۔"

کہیں اور بھی اس نے لکھا تھا "جو تم سے پناہ کا طلب گار ہو اس کا نام نہ پوچھو۔ اسی کو، جو اپنا نام بتانے میں شرمندگی محسوس کرے، پناہ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ایک دن کسی محترم پادری نے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ Couloubroux کا پادری تھا یا Pompierry کا، شاید مادام ماگلا کی تحریک پر بشپ سے سوال کر ڈالا۔ کیا موسیو کو یقین ہے کہ، اس کے رحم و کرم پر، جو اس گھر میں داخل ہونے کا قصد کرتا ہے، اپنا دروازہ اس طرح کھلا چھوڑ کر، کسی حد تک، آپ بے احتیاطی کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟ یا، کیا بشپ کو خوف نہیں کہ اس طرح بے نگہبان گھر میں کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے؟" بشپ نے نہایت آہستگی سے اس کے کاندھے کو ہاتھ لگایا اور کہا، "اگر خدا گھر کا حافظ نہیں، تو وہ جو حفاظت کرتے ہیں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے کچھ اور باتیں بھی کیں۔

اس کو ایک قول بہت پسند تھا، "مبلغ بھی بہادر ہوتا ہے، اور کسی رجمنٹ کا کرنل بھی — مگر" اس نے اضافہ کیا "ہماری بہادری کو پُرسکون ہونا چاہیے۔"

کراواتّے

یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقت اپنے اصل میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں اس کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں دکھاتا ہے کہ D کا بشپ کس قسم کا آدمی تھا۔

Gaspard Bes نامی رہزن کے گروہ کی تباہی کے بعد، جو Ollioules کی گھاٹیوں میں پھیل گیا تھا، اس کے ایک نائب کراواتّے نے پہاڑوں میں پناہ لے لی تھی۔ کچھ عرصے کے لیے وہ Gaspard Bes کے غول کی باقیات کے ساتھ Nice کے علاقے میں چھپ گیا تھا؛ اس کے بعد وہ Piedmont چلا گیا، اور اچانک دوبارہ Barcelonette کے جوار میں، فرانس میں نمودار ہو گیا تھا۔ پہلے اس کو Jauziers میں اس کے بعد Tuiles میں دیکھا گیا تھا۔ وہ Joug-de-l'Aigle کی غاروں میں روپوش رہا، پھر اتر کر Ubaye اور Ubayette کے نالوں سے ہوتا ہوا قریوں اور دیہات تک پہنچ گیا تھا۔

وہ Embrun تک پہنچا، ایک رات کتھیڈرل میں داخل ہوا اور کلیسا کی ساری تبرکات لوٹ لیں۔ اس کی ڈکیتیوں کے باعث دیہی علاقے سنسان ہو گئے تھے۔ اس کی تلاش میں سپاہی روانہ کیے گئے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ جُل دے جاتا تھا؛ کبھی کبھی وہ مرکزی طاقت سے مزاحم بھی ہوتا تھا۔ وہ ایک نڈر بدنصیب انسان تھا۔ اس تمام دہشت کے بیچ بشپ ظاہر ہوا۔ وہ Chastelar کے دورے پر تھا۔ میئر اس سے ملنے آیا اور اس سے اُلٹے پاؤں واپس جانے کی درخواست کی۔ Arche اور اس کے پرے پہاڑوں تک کراواتّے کا قبضہ تھا؛ محافظ کے ساتھ جانے میں بھی خطرہ تھا؛ اس طرح تین چار سپاہیوں کی جان خواہ مخواہ خطرے میں پڑ جاتی۔

"اس لیے" بشپ نے کہا، "میں بغیر محافظ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

''موں سنیور، واقعی! کیا آپ محافظ کے بغیر جانے والے ہیں۔''میئر نے حیرت سے کہا۔

''میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ مجھے کوئی سپاہی نہیں چاہیے۔ میں ایک گھنٹے کے اندر روانہ ہو جاؤں گا۔''

''روانہ ہو جاؤں گا؟''

''جی ہاں! روانہ ہو جاؤں گا۔''

''تن تنہا؟''

''بالکل تن تنہا۔''

''موں سنیور، آپ یہ قدم نہیں اٹھائیں گے۔''

''وہاں، پہاڑوں میں، چھوٹی سی ایک کمیونٹی ہے'' بشپ نے کہا، ''اس سے بڑی نہیں جو میں نے ان تین برسوں میں کہیں نہیں دیکھی۔ ان میں میرے اچھے اچھے دوست بھی شامل ہیں، وہ شریف النفس ایمان دار چرواہے ہیں۔ چرائے جانے والے ہر تیس بکروں میں، ایک ان کا ہوتا ہے۔ وہ بہت خوب صورت، مختلف رنگوں کے دھاگے تیار کرتے ہیں، اور چھ سوراخ والی بانسریاں بجاتے ہیں۔ ان کو اکثر و بیشتر خدا کے بارے میں بتایا جانا چاہیے۔ وہ ایسے بشپ کے بارے میں کیا سوچیں گے جو ڈرپوک ہو؟ اگر میں نہیں گیا تو کیا کہیں گے؟''

''مگر ڈاکو — موں سنیور؟''

''ذرا ٹھہریے۔'' بشپ نے کہا، ''مجھے اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان سے بھی ملاقات کر سکتا ہوں۔ ان کو بھی خدا کے بارے میں بتایا جانا چاہیے۔''

''مگر، موں سنیور، ان کا پورا جتھا ہے۔ وہ بھیڑیوں کا غول ہے!''

''موسیو میئر، ہو سکتا ہے کہ بھیڑیوں کے اسی غول کے لیے یسوع مسیح نے مجھے گڈریا بنایا ہو۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب ہوتے ہیں؟''

''وہ آپ کو لوٹ لیں گے! موں سنیور''

''میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''

''وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔''

''ایک مبلغ کا کام ہی کیا ہے۔ دعائیں دیتے جانا؟ کس مقصد کے لیے؟''

''یا خدا! آپ ان سے ملے تو کیا ہوگا؟''

''میں ان سے اپنے مفلسوں کے لیے خیرات مانگوں گا۔''

"نہ جایئے، موں سنیور، خدا کے لیے نہ جایئے۔ آپ جان کا خطرہ مول لے رہے ہیں!"

"موسیو میئر" بشپ نے کہا "بس یہی ہوگا نا؟ میں اس دنیا میں اپنی جان بچانے نہیں آیا ہوں، لوگوں کو بچانے آیا ہوں۔"

اسے اس کی مرضی کے مطابق اجازت دینی پڑی۔ وہ نکل پڑا، صرف ایک بچے کے ساتھ، جو اس کی رہنمائی کرنے والا تھا۔ اس کی ہمت کا پورے دیہات میں چرچا ہوا، ہر طرف خوف پھیل گیا۔

وہ اپنے ساتھ نہ اپنی بہن کو لے گیا، نہ مادام ماگلوا کو۔ خچر کی سواری پر اس نے پہاڑوں کو سر کیا، کہیں کوئی مقابلہ نہیں ہوا، اور وہ اپنے پیارے دوستوں، گڈریوں کے گھر بخیریت پہنچ گیا۔ وہاں دو ہفتے قیام کیا، تبلیغ کی، تبرکات کے انتظامات دیکھے، تعلیم دی، نصیحتیں کیں۔ واپسی کا وقت ہوا تو اس نے پوپ کے نمائندے کی حیثیت میں ایک Te Deum (خدا کی حمد و ثنا کا قصیدہ) گایا۔ پادری کو بھی سکھایا۔ مگر کرتا کیا تھا؟ وہاں کلیسائی نقش و نگار تو تھے نہیں۔ وہ صرف ایک خستہ حال کمرۂ تبرکات ہی اس کے حوالے کر سکتے تھے، جس میں ریشم کی کڑھائی کے چند قدیم chasuble [شال نما ایپرن] تھے جن میں نقلی بیل لگی ہوئی تھی۔

"آیئے" بشپ نے کہا "ہم اپنے Te Deum کو منبر سے پیش کرتے ہیں، اس کے بغیر بھی، موسیو پادری، سب چیزیں خود بخود ہو جائیں گی۔"

انھوں نے پاس پڑوس کے گرجا گھروں میں تلاش شروع کی۔ ان فروتنی علاقوں کی رونقیں ملا کر بھی کتھیڈرل کے شایانِ شان نعت خوانوں کے لباس مہیا نہیں ہو سکتے تھے۔

ابھی وہ شرمندہ ہو ہی رہے تھے کہ دو نامعلوم گھڑ سوار بشپ کے لیے ایک بڑا صندوق لائے، اور فوراً ہی واپس چلے گئے۔ صندوق کھولا گیا؛ اس میں سونے کے تاروں سے بنا ایک سرپوش، ہیروں کا جڑاؤ بشپ کا تاج، آرچ بشپ کی ایک صلیب اور ایک عصا نکلا — ساری پاپائی خلعتیں جو نوٹرے ڈیم عجائب گھر کے خزانے سے پچھلے ماہ چوری ہو گئی تھیں موجود تھیں۔ صندوق میں ایک کاغذ بھی تھا جس پر لکھا تھا "کراواتے کی طرف سے — موں سنیور بیاں وینو کے لیے۔"

"میں نے کہا تھا نا، کہ سب کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔" بشپ نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے اضافہ کیا، "اس کے لیے، جو پادری ایک سفید ڈھیلے ڈھالے لباس پر قناعت کرتا ہے خدا آرچ بشپ کا سرپوش بھی بھیج دیتا ہے۔"

"موں سنیور" پادری نے سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے منہ ہی منہ میں کہا "خدا یا شیطان؟"

"بشپ نے گھور کر پادری کی طرف دیکھا، اور تحکمانہ لہجے میں کہا: "خدا!"

بشپ Chastelar سے ہو کر واپس آیا تو راستے بھر لوگ اس کو پُراسرار نظروں سے گھور رہے تھے۔ مبلغ کے Chastelar کے گھر میں میڈموزیل بپٹسٹین اور مادام ماگوا اس کی منتظر ملیں۔ اس نے بہن سے کہا، "دیکھا تم نے! میں صحیح راستے پر تھا کہ نہیں؟ ایک مفلوک الحال پادری مفلوک الحال پہاڑیوں کے پاس خالی ہاتھ جاتا ہے، اور ان کے پاس سے بھرے ہاتھ واپس آتا ہے۔ میں صرف خدا کے بھروسے نکلا تھا؛ میں کتھیڈرل کا خزانہ واپس لے آیا ہوں۔"

اس شام، سونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر کہا، "ہمیں کبھی ڈاکوؤں اور قاتلوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ یہ سب بیرونی خطرات ہوتے ہیں؛ معمولی خطرات! ہمیں اپنے آپ سے ڈرنا چاہیے۔ اصل ڈاکو تعصبات ہوتے ہیں؛ اصل قاتل خرابیاں ہوتی ہیں۔ اپنے سر اور اپنے بٹوے کی پروا نہیں کرنی چاہیے، ہمیں اپنی روح کے خطرات کی فکر کرنی چاہیے۔"

پھر، اپنی بہن سے مخاطب ہوا، "بہن! کسی مبلغ کی نہیں، ساتھی آدمیوں کی پروا کرنی چاہیے۔ ساتھی جو کچھ کرتا ہے، خدا اس کی اجازت دیتا ہے۔ جب خطرہ ہو تو ہمیں دعا پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے، بلکہ اس پر، کہ ہماری وجہ سے ہمارا بھائی گنہگار نہ ہو جائے۔"

بہر حال، اس زندگی میں ایسے واقعات خال خال ہی ہوئے تھے۔ ہم ان ہی کی بات کرتے ہیں جن کے بارے میں جانتے ہیں؛ مگر عام طور پر اس نے اپنی زندگی وہی کرتے اور اسی وقت کرتے گزاری تھی۔ اس کے سال کا ایک مہینہ اس کے ایک دن جیسا ہوتا تھا۔

اور Embrun کے "خزانے" کا کیا بنا؟ ہمیں اس سلسلے میں تفتیش کی شرمندگی اٹھانی چاہیے۔ اس میں بہت خوب صورت چیزیں تھیں؛ بہت اکسانے والی چیزیں تھیں؛ اور وہ چیزیں تھیں جو کسی بدقسمت کے چرانے کے لائق تھیں، جو کہیں اور سے چرائی گئی تھیں۔ آدھی مہم سر ہوئی تھی؛ چوری کا ایک نیا رُخ تھا جس کا پتا نہیں چلا۔ یہ کسی مفلس کی جانب سے ایک چھوٹا سا قدم تھا۔ بہر حال، اس بارے میں ہم زیادہ دعوے نہیں کرنا چاہتے۔ بشپ کے کاغذات میں ایک غیر واضح رُقعہ ملا تھا جو اس معاملے پر کچھ روشنی ڈالتا تھا، جس کی کلید اس جملے میں پوشیدہ ہے۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خزانہ کتھیڈرل کو دیا جائے یا اسپتال کے حوالے کیا جائے؟"

فلسفہ مابعد مے نوشی

مندرجہ بالا سینیٹر چالاک آدمی تھا۔ ان چیزوں کا لحاظ کیے بغیر جن کو ضمیر، حلفیہ یقین، انصاف اور فرض کہتے ہیں، اس نے اپنی سمت متعین کر لی تھی: شمہ برابر بھی اپنی ترقی کی لکیر سے اور اپنے مفاد سے انحراف کیے بغیر وہ سیدھا اپنے ہدف کی طرف گیا۔ وہ نہایت تجربے کار اور کامیابی کے باعث نرم خو وکیل تھا؛ کسی پہلو سے بُرا آدمی نہیں تھا، جو اپنے حیطۂ اختیار کی تمام چھوٹی چھوٹی خدمات اپنے بیٹوں، داماد، رشتے داروں، حتیٰ کہ دوستوں کو بھی فراہم کرتا تھا، جنھیں اس نے عقل مندی سے حاصل کیا تھا؛ اچھی زندگی، اچھے پہلو، اچھے مواقع اور اچھے غیر متوقع فوائد۔ اس کے نزدیک بقیہ سب چیزیں فضول تھیں۔ وہ عقل مند تھا، اور صرف اس قدر تعلیم یافتہ کہ وہ خود کو [یونانی فلسفی] Epicurus کا مُرید سمجھ سکے؛ جب کہ، درحقیقت، وہ [فرانسیسی ناول نگار] Pigault-Lebrun کی پیداوار تھا۔ وہ ابدی اور لاانتہا چیزوں پر اور "پرانے ساتھی بشپ کی ترنگوں پر" دل کھول کر اور زندہ دلی سے ہنستا تھا۔ کبھی تو خوش دلی کے اظہار میں خود موسیو مائریل پر اس کی موجودگی میں بھی ہنسنے لگتا تھا، جو اسے سنتا رہتا تھا۔

کسی نیم سرکاری یا کسی اور موقعے پر، اب مجھے یاد نہیں کس پر، کاؤنٹ [یہ سینیٹر] اور موسیو مائریل، پریفیکٹ کے ساتھ رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ بعد از طعام شیرینی کے موقعے پر، سینیٹر نے، جو اس وقت ذرا زیادہ ہی شاد تھا، پھر بھی نہایت باوقار انداز میں، حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"بشپ، آیئے ہم ایک موضوع پر گفتگو شروع کرتے ہیں۔ ایک سینیٹر اور ایک بشپ کے لیے یہ خاصا مشکل ہوتا ہے کہ دونوں پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھیں۔ ہم دونوں دور اندیش آدمی ہیں۔ میں آپ کے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ایک فلسفہ ہے۔"

""آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔" بشپ نے جواب دیا۔" جس طرح کوئی اپنا فلسفہ بناتا ہے، اسی طرح اس پر لیٹتا بھی ہے۔ اب آپ ارغوانی رنگ کے بستر پر ہیں، سینیٹر۔"

سینیٹر کی ہمت افزائی ہوئی، اور اس نے کہا

""آیئے ہم اچھے ساتھی بن جائیں۔""

"اور اچھے شیطان بھی۔" بشپ نے فوراً کہا۔

""میں آپ کے سامنے اس بات کا اعلان کرتا ہوں۔" سینیٹر نے کہا،" کہ Marquis d'Argens، Pyrrhon، Pyrrhon اور M. Naigeon گھٹیا لوگ نہیں۔ میرے کتب خانے میں سارے فلسفی سونے چاندی کے ملمعے کے حصار میں محفوظ ہیں۔"

""خود آپ ہی کی طرح، کاؤنٹ۔" بشپ نے لقمہ دیا۔

سینیٹر نے دوبارہ اپنی بات شروع کی:

""مجھے Diderot سے نفرت ہے؛ وہ مثالیت پسند ہے؛ خطابت کرنے والا ہے، اور انقلابی ہے؛ اندر سے خدا پر یقین رکھنے والا ہے، اور والٹیر سے زیادہ تعصبی ہے۔ والٹیر نے Needham سے کھلواڑ کیا، اور وہ غلطی پر تھا، اس لیے کہ Needham کی پھسلن نے ثابت کر دیا کہ خدا کسی کام کا نہیں۔ ایک چمچ آٹے کی لئی میں سرکے کا ایک قطرہ فرمان میں چمک پیدا کر دیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ قطرہ زیادہ بڑا ہو اور چمچے کا حجم بھی زیادہ ہو تو دنیا آپ کی ہوگی۔ آدمی پھسلن ہوتا ہے۔ تو پھر ابدی باپ کا کیا فائدہ؟ Jehovah کا نظریہ مجھے تھکا دیتا ہے، بشپ! یہ کسی کام کا نہیں سوائے اس کے کہ پاپاب انسان پیدا کرتا ہے، جن کی دلیل کھوکھلی ہوتی ہے۔ وہ سارے بڑے مردہ باد جو میرے لیے عذاب ہیں! آفرین اس صفر کے لیے جو مجھے سکون سے رہنے دیتا ہے۔ یہ میرے اور آپ کے درمیان رہے، تا کہ میں اپنا بورا خالی کر دوں، اور اپنے پادری کے سامنے اعتراف کروں، جیسا کہ یہ مجھے کرنے پر مجبور کرتا ہے، میں آپ کے سامنے اعتراف کروں گا، کہ مجھ میں سمجھنے کی اچھی صلاحیت ہے۔ میں آپ کے یسوع کے بارے میں زیادہ پُر جوش نہیں، جو بالکل آخری حد تک دست برداری اور قربانی کی تبلیغ کرتا ہے۔ لالچی آدمی سے فقرا تک، سب کو یہی مشورہ دیتا ہے —— دست برداری! مگر کیوں؟ قربانی! کس حد تک؟ میں کبھی کسی بھیڑیے کو کسی دوسرے بھیڑیے کے لیے خود کو شعلوں کے سپرد کرتے نہیں دیکھتا۔ تو پھر، آیئے، ہم فطرت کے ساتھ رہیں۔ ہم اوپر ہیں؛ ہمیں برتر فلسفہ رکھنا چاہیے۔ اوپر ہونے کا فائدہ کیا ہے، اگر لوگ دوسروں کی ناک سے پرے نہیں دیکھتے؟ ہم کو خوش و خرم زندگی چاہیے۔ زندگی ہی سب کچھ ہے۔ اس آدمی کا مستقبل کہیں اور ہے، اوپر، نیچے، کہیں بھی۔ میں اس کے حرف واحد پر بھی یقین نہیں کرتا۔ اوہ! مجھے قربانی اور دست برداری کا مشورہ دیا جاتا ہے؛ مجھے اپنے ہر کام پر توجہ دینی چاہیے۔ مجھے

اچھے یا برے پر، صحیح یا غلط پر، اپنے دماغ کی سرزنش کرنی چاہیے۔ کیوں؟ اس لیے کہ مجھے اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہوگا۔ کب؟ مرنے کے بعد۔ کیا نادر خواب ہے! اپنی موت کے بعد میں بہت چالاک آدمی ہوں گا؛ کون مجھے پکڑ سکے گا! کسی خیالی ہاتھ میں مٹھی بھر خاک پکڑنے دیجیے، اگر ہو سکے تو، ہمیں سچائی بیان کرنے دیجیے، ہم جنھوں نے ابتدا کی ہے، جنھوں نے Isis کی نقاب اٹھائی ہے؛ اچھائی یا برائی کوئی چیز نہیں؛ وہاں صرف روئیدگی ہے۔ ہمیں حقیقت تلاش کرنی چاہیے۔ ہمیں تہہ تک جانا چاہیے۔ ہمیں پوری طرح دیکھنا چاہیے۔ ہماری کیا ہے! ہمیں اس کی تہہ تک پہنچنا چاہیے! ہمیں سچائی کو سونگھ کر نکالنا چاہیے؛ اس کے لیے زمین کھودنی چاہیے؛ اس کو پکڑ لیا جانا چاہیے۔ تب یہ آپ کو پاکیزہ خوشیاں دیتی ہے؛ تب آپ مضبوط ہونے لگتے ہیں اور ہنسنے لگتے ہیں۔ میں اپنی بنیاد میں مربع ہوں، جی ہاں! ابدیت، بشپ، ایک اتفاق ہوتی ہے؛ مرے ہوئے آدمیوں کے جنتوں کا انتظار۔ اوہ! کیا خوش نما وعدہ ہے۔ آپ چاہیں تو اس پر بھروسا کیجیے۔ آدم کے پاس کیا اچھے لوگ ہیں۔ ہم لوگ روحیں ہیں، اور ہم فرشتے ہوں گے؛ ہمارے شانے کی ہڈیوں پر نیلے رنگ کے پر ہوں گے۔ میری مدد کو آیئے گا: کیا وہ Tertullian نہیں تھا جو کہتا تھا کہ برکتوں والے ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک سفر کریں گے؟ بہت اچھا۔ گویا ہم ستاروں کے بڈے ہوں گے۔ اور پھر، اس کے علاوہ ہم خدا کو دیکھیں گے۔ تا تا تا! یہ جنتیں! کیا — کیوں ان کے بارے میں؟ خدا — کیا ہے — میں خدا پر یقین نہیں رکھتا۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں سب کے سامنے نہیں کہہ سکتا، مگر اپنے دوستوں کے ساتھ کانا پھوسی کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ چائے کی پیالی کی مثال ہے۔ دنیا کو جنت پر قربان کرنا شکار کو بھاگ جانے کا موقع دینا ہے۔ ابدیت کا دھوکا کھاؤں۔ میں ایسا احمق نہیں۔ میں صفر ہوں۔ میں خود کو صفر کاؤنٹ سینیٹر کہتا ہوں۔ کیا پیدائش سے پہلے میرا وجود تھا؟ نہیں۔ کیا موت کے بعد میرا وجود ہوگا؟ نہیں۔ میں کیا ہوں؟ کسی نامیاتی جسم میں جمع تھوڑی سی خاک۔ مجھے اس زمین پر کیا کرنا ہے؟ جو میرا جی چاہے: دکھ اٹھاؤں یا موج کروں۔ دکھ مجھے کدھر لے جائے گا؟ فنا کی طرف؛ مگر میں تو دکھ اٹھا چکا ہوں گا۔ موج مستی مجھے کدھر لے جائے گی؟ فنا کی طرف۔ مگر میں اپنے آپ سے لطف اٹھا چکا ہوں گا۔ کھایئے، یا کھائے جایئے۔ میں ضرور کھاؤں گا۔ مگر گھاس کے بجائے دانت ہونا بہتر ہوتا ہے۔ یہ ہے میری دانش۔ اس کے بعد میں بکھر جاؤں گا اور آپ کو دھکا دوں گا، گورکن وہاں موجود ہے۔ ہم میں سے کسی کے لیے دیوتاؤں کی یادگار موجود ہوگی؛ سب کچھ ایک بڑے شگاف میں گر جاتا ہے۔ تمام۔ مکمل تحلیل۔ یہ غائب ہو جانے کا مقام ہے۔ موت موت ہے، مجھ پر یقین کیجیے۔ میں اس خیال پر ہنس پڑتا ہوں کہ کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے اس موضوع پر کچھ بتائے۔ نرسوں کے قصے؛ بچوں کے ڈرانے کے لیے؛ آدمیوں کے لیے Jehovah۔ نہیں؛ ہمارا کل [دن نہیں] رات ہوگی۔ قبر کے بعد کچھ نہیں مگر فنا۔ آپ Sardanapalus

[ایبیریا کا آخری بادشاہ] رہے ہیں، آپ وِنسینٹ ڈی پال رہے ہیں — اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہی تو سچائی ہے کہ ہر شے سے بڑھ کر اپنی زندگی جیو۔ اپنے "مَیں" کا جب تک ہے، استعمال کرو۔ سچ یہ ہے، بشپ، کہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے اپنے فلسفے ہیں۔ میں خود کو اس حماقت میں پھنسنے نہیں دیتا۔ بلاشبہ، ان لوگوں کے لیے کچھ ہوگا جو درماندہ ہیں — برہنہ پا فقیروں کے لیے، چاقو تیز کرنے والوں کے لیے، بدنصیبوں کے لیے۔ روایتی داستانیں، روحیں، ابدی زندگی، ستارے، سب ان کے نگلنے کے لیے ہیں۔ وہ ان سب کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کو اپنی سوکھی روٹی پر [چٹنی کی طرح] لگاتے ہیں۔ وہ جس کے پاس کچھ نہیں تھا، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ خدا۔ یہی وہ نہیں چاہتا۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، مگر میں موسیو Naigeon کو اپنے لیے محفوظ و مخصوص کرتا ہوں۔ اچھا خدا عوام کے لیے ہے۔"

بشپ نے تالی بجائی۔

اس نے حیرت سے کہا، "اس کو بولنا کہتے ہیں! یہ مادّیت بھی کیا خوب اور کیسی حیرت انگیز شے ہے۔ یہ ہر چاہنے والے کو میسر نہیں ہوتی۔ اور جب مل جاتی ہے، تو وہ سادہ لوح نہیں رہتا، وہ اپنے آپ کو Cato کی طرح ملک بدر کرنے کی اجازت نہیں دیتا، نہ اِسٹفن کی طرح سنگسار ہوتا ہے، نہ جون آف آرک کی طرح جلایا جاتا ہے۔ وہ جو اس قابلِ تعریف مادّیت کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں، انھیں خود کو غیر ذمے دار محسوس کرنے کی مسرت نصیب ہو جاتی ہے، اور یہ خیال کہ وہ بغیر کسی تکلیف کے جو چاہیں ہڑپ کر سکتے ہیں — جگہ، بے فکری کی نوکری جس میں کوئی کام نہ کرنا پڑے، وقار، طاقت، اچھی طرح یا بُری طرح حاصل کی جانے والی، نفع بخش دست برداریاں، فائدے مند دغا بازیاں، ضمیر کی اشتہا انگیز اطاعتیں — اور یہ بھی کہ وہ سب کچھ ہضم کرنے کے بعد اپنے مقبرے میں داخل ہوں گے۔ کس قدر دل پذیر ہوتا ہے یہ سب کچھ۔ میں یہ سب آپ کے حوالے سے نہیں کہہ رہا ہوں، سینیٹر۔ اس کے باوجود میرے لیے آپ کو مبارک باد دینے سے پرہیز کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے عظیم حاکمین، جیسا کہ آپ کہتے ہیں، خود اپنا فلسفہ رکھتے ہیں، اور آپ کے لیے بھی، جو نہایت نفیس، صاف کیا ہوا، صرف دولت مندوں کے قابلِ رسائی، ہر قسم کی چٹنی کے لیے موزوں، اور جو قابلِ تعریف طریقے سے زندگی کی شہوت پرستی کو مزے دار بناتا ہے۔ یہ فلسفہ گہرائیوں سے نتھارا گیا ہے، اور مخصوص تلاش کرنے والوں نے اسے زمین سے کھود کر نکالا ہے۔ مگر آپ نیک نہاد شہزادگان میں سے ہیں، اور آپ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بُرا خیال ہوگا کہ اچھے خدا پر یقین رکھنا عوام کا فلسفہ بن جائے، اسی طرح جیسے chestnut سے بھری بطخ، جیسے مفلس آدمی کی کھچڑی سے بھری ٹرکی۔"

بھائی—بہن کی نظر میں

D کے بشپ کے نجی نظامِ حیات و انتظام کی ایک جھلک پیش کرنے، اور ان طریقوں کا بیان کرنے کے لیے جن میں وہ دو اولیا نما عورتیں اپنے اعمال، اپنے خیالات، اپنی نسوانی جبلتوں کے ذریعے، جو آسانی سے جگائی جا سکتی تھیں، بشپ کی عادات اور مقاصد کے لیے کام کرتی تھیں، اور ان کی تشریح کی خاطر بیان کی زحمت اٹھائے بغیر، ہم اس زیادہ کچھ نہیں کر سکتے، سوائے اس کے کہ میڈموزیل بپتیستین کا ایک خط من و عن نقل کر دیں جو اس نے اپنے بچپن کی دوست مادام Vicomtess de Boischevron کو لکھا تھا۔ یہ خط ہمارے قبضے میں ہے۔

D

81 —— سولہ دسمبر

میری اچھی مادام

سچ پوچھو تو تمھارا ذکر کیے بغیر میرا ایک دن بھی نہیں گزرتا۔ بس یہ ہماری طے شدہ عادت سی ہو گئی ہے؛ مگر اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔ ذرا تصور کرو، دیواروں اور سقف کی دھلائی صفائی کے دوران مادام ماگوانے کچھ دریافتیں کی ہیں؛ اب ہمارے دو کمروں کا مادام ماگوانے سارا کاغذ اکھاڑ دیا ہے، جن میں لگے قدیم طرز کے کاغذ پر سفیدی کر دی گئی تھی، جو تمھارے انداز کے کسی chateau سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔ اس کے نیچے کچھ چیزیں تھیں۔ میرا بیٹھک کا کمرہ، جس میں کوئی فرنیچر نہیں، جسے ہم دھلائی کے بعد کپڑے سکھانے میں استعمال کرتے ہیں، پندرہ فٹ اونچا ہے، اس کا رقبہ اٹھارہ مربع فٹ ہے، جس کی سقف کو پہلے پینٹ اور طلا کاری سے مزین کیا گیا تھا، جس میں کڑیاں بھی ہیں، جیسی تمھارے گھر میں ہیں۔ جب یہ اسپتال کے طور پر استعمال ہوتا تھا ان کڑیوں کو کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس کا لکڑی کا کام ہماری نانی دادی کے عہد جیسا ہے۔ مگر

کمرہ وہ جگہ ہے جو تمھیں ضرور دیکھنی چاہیے۔ مادام ماگوا نے، کم سے کم دس پرت کاغذوں کے نیچے، کچھ پینٹنگ دریافت کی ہیں، جو اچھی نہ ہونے کے باوجود گوارا کی جا سکتی ہیں۔ موضوع نیلی ماکس ہے جو باغات میں، جن کا نام میرے ذہن میں نہیں آ رہا ہے[دانش کی رومن دیوی] عفروا کے ہاتھوں 'نائٹ' بنایا جا رہا ہے۔ المختصر، جہاں ایک ہی رات میں رومن خواتین دوبارہ مل گئی تھیں۔ میں تم کو کیا بتاؤں؟ میرے پاس رومن ہیں، رومن خواتین ہیں (اس مقام پر ایک لفظ ہے جو پڑھا نہیں جاتا)، اور پوری ایک قطار ہے۔ مادام ماگوا نے سب کچھ صاف کر دیا ہے؛ اگلے گرمی کے موسم چھوٹی موٹی مرمت کروانے والی ہے، اور سب پر دوبارہ وارنش کی جائے گی، اور میرا کمرہ ایک باقاعدہ عجائب گھر بن جائے گا۔ دو چھتی کے ایک کونے میں دو کھڑکیوں کے درمیان رکھی جانے والے، قدیم طرز کی میزیں مل گئی ہیں۔ ان کی دوبارہ طلاکاری کے فی میز دو کراؤن چھ پنس مانگ رہے تھے مگر بہتر ہے کہ یہ رقم کسی مفلس کو دے دی جائے؛ وہ بدصورت بھی ہیں؛ اس کی جگہ میں مہاگنی کی گول میز کو ترجیح دوں گی۔

میں ہمیشہ خوش رہتی ہوں۔ میرا بھائی کتنا اچھا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ مفلس اور بیمار کو دے دیتا ہے۔ ہماری جگہ بہت تنگ ہے۔ سردی کے موسم میں یہ ملک بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے اور واقعی ہمیں ضرورت مند لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ہم کو روشنی بھی اور گرمی دونوں وافر مقدار میں مہیا ہے۔ دیکھو تو، یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں!

میرے بھائی کے اپنے طریقے ہیں۔ جب وہ بات کرتا ہے، تو کہتا ہے کہ بشپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ذرا تصور تو کرو! ہمارے گھر کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جو بھی داخل ہونا چاہے فوراً میرے بھائی کے کمرے میں پہنچ سکتا ہے۔ اُسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا؛ رات میں بھی۔ وہ اس کو اپنے قسم کی بہادری کہتا ہے۔

وہ نہیں چاہتا کہ میں اور مادام ماگوا اس سے کس قسم کا خوف کھائیں۔ وہ خود کو ہر قسم کے خطرات کے سامنے پیش کر دیتا ہے، اور ہم کو یہ سب دیکھنے نہیں دیتا۔ آپ کو اس کو سمجھنے کا طریقہ جاننا ہوگا۔ بارش میں نکل جاتا ہے؛ پانی میں چلتا ہے؛ سردی کے موسم میں سفر کرتا ہے۔ اسے نہ مشکوک سڑکوں سے خوف آتا ہے نہ خطرناک لڑائی جھگڑے سے اور نہ رات کے اندھیرے سے۔

پچھلے برس وہ تن تنہا ڈاکوؤں کے علاقے میں گیا تھا۔ ہمیں ساتھ نہیں لے گیا۔ دو ہفتے غائب رہا تھا۔ واپسی پر اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا؛ اس کو مردہ سمجھ لیا گیا تھا، مگر وہ بالکل ٹھیک تھا، اور اس نے کہا تھا، ''ہمیں اس طرح لوٹا گیا تھا'' اور پھر اس نے صندوق کھولا؛ Embrun کے سارے جواہر سے بھرا، جو چوروں نے اس کو دے دیا تھا۔

اس موقعے پر، جب وہ واپس آیا تھا تو میں اسے تھوڑا سا سخت سُست کہنے سے خود کو

روک نہیں پائی تھی مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی سن نہ لے۔ میں اس وقت بات کرتی تھی جب گاڑی چلنے کا شور ہوتا رہتا تھا۔

پہلے تو میں خود سے کہا کرتی تھی، ''ایسے کوئی خطرات نہیں جو اسے روک سکیں؛ وہ ضدی انسان ہے۔'' اب میں نے کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میں مادام ماگوا کو اشارے سے کہہ دیتی ہوں کہ اس کی مخالفت نہ کرے۔ وہ جب مناسب سمجھتا ہے خود کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ میں ایسے وقت مادام ماگوا کو پکڑ کر اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں، اور دعا کرتی ہوں کہ اسے [بھائی کو] نیند آ جائے۔

میں آرام سے ہوں، اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ اس کو کچھ ہو گیا تو میں بھی ختم ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنے اچھے خدا کے پاس اپنے بھائی اور بشپ کے ساتھ ہی جانا چاہیے۔ میرے مقابلے میں مادام ماگوا کو سمجھانا مشکل کام تھا، کہ وہ ان باتوں کی عادی ہو جائے جنھیں وہ نامناسب سمجھتی ہے، مگر اب ہمیں عادت سی ہو گئی ہے۔ ہم ایک ساتھ دعا کرتے ہیں، ایک ساتھ لرزتے ہیں، اور سو جاتے ہیں۔ اگر کبھی اس گھر میں شیطان داخل ہونا چاہے تو اس کو بھی اجازت ہو گی۔ اس گھر میں ہے کیا، جس سے ہم ڈریں؟ ہر وقت ہمارے ساتھ کوئی موجود ہوتا ہے، جو ہم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ شیطان یہاں سے گزر سکتا ہے، مگر ہمارا اچھا خدا تو یہاں رہتا ہے۔

میرے لیے یہی کافی ہے۔ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اس کے بولے بغیر ہی اسے سمجھ لیتی ہوں اور ہم خود کو قسمت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جو شخص روحانی شان رکھتا ہو اس کے ساتھ اسی طرح کرنا پڑتا ہے۔

تم نے فا (Faux) خاندان کے بارے میں جو معلومات کرنی چاہی تھیں ان کی بابت میں نے اس سے پوچھ گچھ کی ہے۔ تم جانتی ہو کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور یہ بھی کہ اس کی اپنی یادداشت بھی ہے، اس لیے کہ اب بھی وہ بہت اچھا شاہی پسند انسان ہے۔ وہ لوگ واقعی ایک بہت قدیم نارمن خاندان کی Caen کی سپہ سالاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ پانچ سو برس قبل ایک شخص Raoul de Faux، اور ایک Thomas de Faux تھا، جو شریف انسان تھے۔ ان میں سے ایک seigneur de Rochefort تھا۔ آخری شخص Guy-Etienne-Alexandre تھا، جو ایک رجمنٹ کا کمان دار، اور Bretagn لائٹ ہارس بریگیڈ میں کچھ تھا۔ اس کی بیٹی ماری لوئیز نے Adrien-Charles de Gramont سے شادی کر لی تھی جو Duke Louis de Gramont فرانس کے نواب، فرانسیسی گارڈ اور فوج کے لیفٹیننٹ جنرل کا بیٹا تھا۔ اس کا نام Faux، Fauq اور Faoucq، تینوں طرح لکھا جاتا ہے۔

اچھی مادام، اپنے صوفی عزیز موسیو کارڈینل سے ہمارے لیے دعا کی سفارش کر دو۔

جہاں تک تمھاری پیاری Sylvanie کا معاملہ ہے، اس نے اچھا کیا تھا کہ ان لمحات کو جن میں وہ تمھارے ساتھ وقت گزارتی ہے، مجھے خط لکھنے میں ضائع نہیں کرتی۔ وہ اچھی ہے، تمھاری مرضی کے مطابق کام کر رہی اور مجھ سے محبت کرتی ہے۔

بس میں اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں۔ اس نے تمھارے ذریعے سے جو تحفہ مجھے بھیجا تھا، بحفاظت مجھ تک پہنچ گیا ہے، اور مجھے مسرت سے دوچار کیا ہے۔ الوداع! میرا کاغذ خاتمے پر ہے اور مجھے تمھیں چھوڑنے پر مجبور کر رہا ہے۔

تمھارے لیے، ہزاروں نیک خواہشات!

پتیمین

پس نوشت: تمھارا پوتا بہت دل رُبا ہے۔ کیا تمھیں علم ہے کہ وہ جلد ہی پانچ برس کا ہو جائے گا؟ کل اس نے کسی کو گھڑ سواری کرتے دیکھا جو knee-caps پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا، "یہ اپنے گھٹنوں پر کیا پہنے ہوئے ہے۔" بڑا دل رُبا بچہ ہے! اس کا چھوٹا بھائی کمرے میں، گاڑی کی طرح، ایک پرانی جھاڑو گھسیٹتا پھر رہا ہے، اور کہہ رہا ہے "ہٹو"۔

جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوگا یہ دو عورتیں اپنی مخصوص نسوانی دانش کے ذریعے اچھی طرح جانتی تھیں، اور ان کا ادراک انھیں بتاتا تھا کہ وہ بشپ کے طریقوں کے مطابق خود کو کس طرح ڈھال سکتی ہیں۔ D کا بشپ اکثر ایسے کام کر جاتا تھا جو بہادرانہ اور عالی شان نوعیت کے ہوتے تھے۔ وہ لرز جاتیں مگر اس کو کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی مادام ماگوا قبل از وقت احتجاج کرتی تھی، مگر عین وقت پر، یا بعد میں نہیں۔ وہ اس کے کسی کام میں، شروع ہو جانے کے بعد، اشارے یا کنائے سے بھی دخل نہیں دیتی تھیں۔ کچھ مواقع پر، کچھ کہے بغیر، جب اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا، کہ اس کا انداز کار بہت سادہ اور مکمل ہوتا تھا، ان کو مشکل سے احساس ہوتا تھا کہ وہ بشپ کے طور پر کام کر رہا ہے؛ اس وقت وہ گھر میں محض دو سایے سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ بغیر مزاحمت کے اس کی خدمت کرتیں؛ اور اگر اطاعت شعاری غائب ہو جانے کی متقاضی ہوتی تو غائب ہو جایا کرتیں۔ وہ اس کی وجاہت کی نزاکتوں کو سمجھتی تھیں، کہ کبھی کبھی معاملات پر قابو پانا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح، اس یقین کے باوجود کہ وہ خطرے میں ہے، وہ اس کی فطرت کو اس حد تک سمجھتی تھیں کہ اس پر نظر رکھنا چھوڑ دیتی تھیں، اور اسے خدا کے حوالے کر دیتی تھیں۔

مزید، جیسا کہ ہم پڑھ سکتے ہیں، باپتیمین نے کہا تھا کہ اس کے بھائی کا خاتمہ اس کا اپنا خاتمہ ثابت ہوگا۔ مادام ماگوا نے یہ کہا تو نہیں، مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

بشپ، اجنبی روشنی میں

گزشتہ صفحات میں نقل کیے گئے ایک خط کے کچھ عرصے بعد، اس عہد میں اس [بشپ] نے ایک کام کیا تھا جسے اگر کسی شہر کا سفر سمجھا جائے تو اس سفر سے کہیں زیادہ خطرناک تھا جو اس نے ڈاکوؤں سے بھرے پہاڑوں میں کیا تھا۔

D کے قریب کے ایک علاقے میں ایک شخص بالکل تنہا رہتا تھا۔ہم ابھی سے بتائے دیتے ہیں کہ وہ آدمی کونشن کا رُکن تھا۔اس کا نام G تھا۔

کونشن کے رُکن G کا، D کی مختصر سی دنیا میں دہشت کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا تھا۔کیا کونشن کے کسی رُکن کے بارے میں اس قسم کی بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ یہ اس زمانے سے وجود میں تھا جب لوگ ایک دوسرے کو تُو کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔اس زمانے میں تو "باشندے" کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔یہ آدمی تقریباً دیو جیسا تھا۔اس نے بادشاہ کی موت کے حق میں ہونے والی رائے شماری میں کھل کر حصہ نہیں لیا تھا۔وہ بظاہر شاہ کُش خیالات رکھتا تھا۔کسی زمانے میں وہ بہت خوف ناک آدمی تھا تو یہ کیسے ہوا کہ قانونی شہزادوں کی واپسی کے بعد اس آدمی کو پرووسٹ کی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا؟ کیا اس کا سر کاٹا نہیں جانا چاہیے تھا؟ رحم دلی کی جانی چاہیے؛ مگر کم از کم زندگی بھر کی سزا تو دی جاتی۔اس کے علاوہ، بقیہ تمام لوگوں کی طرح وہ لا مذہب انسان تھا۔یہ تو "مردہ خور گدھ کے بارے میں بطخوں کی گپ شپ" جیسا معاملہ تھا۔

تو کیا G واقعی مردہ خور گدھ تھا؟ اگر اس کو اس کی تنہائی میں، خوں خواری کے عنصر کے تناظر میں، دیکھا جائے تو جواب اثبات میں ہوگا۔چوں کہ اس نے شاہ کی موت کے بارے میں ووٹ نہیں دیا تھا، اس کو ملک بدری کے احکامات میں شامل نہیں کیا گیا تھا، اور یہ فرانس میں قیام کر سکا تھا۔

وہ شہر سے پینتالس منٹ کی مسافت کے فاصلے پر رہتا تھا؛ کسی بستی سے دور، کسی سڑک سے دور، کسی خفیہ نہایت وحشی وادی میں، جس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ وہاں اس کے پاس ایک قسم کا کھیت، کھوہ، ایک ماند جیسی جگہ تھی۔ کوئی پڑوسی نہیں تھا، حتیٰ کے ادھر سے کوئی گزرتا بھی نہیں تھا۔ چوں کہ وہ وادی میں رہتا تھا، اور جس راستے وہ جاتا تھا وہ راستہ خودرو گھاس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اس مقام کے بارے میں اس طرح بات کی جاتی تھی گویا وہ کسی جلاد کے رہنے کی جگہ تھی۔

پھر بھی بشپ اس موضوع پر مراقبہ کرتا وقتاً فوقتاً افق پر نظر کرتا رہتا تھا۔ اس مقام پر، جہاں پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا، جو سابقہ کنونشن کے ارکان کی وادی کا نشان تھا، اس نے کہا تھا، ''اس طرف روحوں کا راستہ ہے جو سنسان ہے۔''

اور ایک دن اس نے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں سوچ کر مزید کہا تھا، ''مجھ پر ایک سفر قرض ہے۔''

چلیے، ہم اس خیال پر صاد کیے دیتے ہیں، جو پہلے تو فطری لگا، مگر چند لمحوں کے غور کے بعد اس کو خود عجیب، ناممکن اور تقریباً نفرت انگیز لگا تھا۔ پہلے اس نے نچلے درجے پر عام تاثر معلوم کرنے کی کوشش کی اور کنونشن کے ایک پرانے رکن نے اس کی ہمت افزائی بھی کی، مگر اس حقیقت پر غور کیے بغیر کہ خود اس کے اپنے خیال کے مطابق یہ جذبہ نفرت سے قریب تھا۔

پھر بھی، کیا بھیڑ کے زخم سے چرواہے کو پسپا ہو جانا چاہیے؟ نہیں!

مگر، کیسی بھیڑ ہے یہ بھی؟

بشپ الجھن میں پڑ گیا۔ کبھی وہ اس سمت بڑھتا، پھر واپس ہو جاتا۔

بالآخر، ایک دن پورے شہر میں افواہ اُڑی کہ ایک جوان گڈریا، جو کنونشن کے ارکان کی اپنے سائبان میں خدمت کیا کرتا تھا، ڈاکٹر کی تلاش میں شہر آیا ہے؛ کہ وہ پرانا بدنصیب مرنے کے قریب ہے؛ کہ فالج اس پر چھاتا جا رہا ہے، اور یہ بھی کہ صبح تک شاید وہ زندہ نہیں رہے گا -- کسی نے اس میں اضافہ کیا تھا، ''خدا کا شکر ہے۔''

بشپ نے اپنے اہلکاروں کو ساتھ لیا، اپنا لبادہ پہنا، اس لیے کہ اس کا جبہ بہت ہلکا تھا، اور شام کی ہوا ٹھنڈی ہو گی، اور چل پڑا۔

سورج ڈوب رہا تھا اور افق کو تقریباً چھو لیا تھا، جب بشپ اس متروک جگہ پہنچا۔ دل کی ایک مخصوص قسم کی دھڑکن سے بشپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی ماند یا کھوہ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا، باڑ کو پار کرتا، خشک ڈالیوں سے بنی باڑ تک پہنچا اور جانوروں کے ایک

سنسان باڑے میں داخل ہوگیا؛ نہایت بہادری سے چند قدم اٹھائے، اور اچانک، بنجر زمین کے سرے پر بیری کی اونچی اونچی جھاڑیوں کے پیچھے اسے ایک غار نظر آیا۔

وہ بہت تنگ، خستہ حال، چھوٹی، مگر صاف سی کٹیا تھی، جس کی باہر کی دیوار پر کیل کے ذریعے چڑھائی گئی انگور کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔

دروازے کے قریب پہیے اور جھوں والی کساتوں کی ایک کرسی پر بیٹھا سفید بالوں والا آدمی سورج کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

بیٹھے آدمی کے قریب گڈریے کا ایک کم عمر لڑکا کھڑا تھا۔ وہ عمر رسیدہ آدمی کو دودھ سے بھرا برتن پیش کر رہا تھا۔

بشپ نے اس پر نظر ڈالی ہی تھی کہ بوڑھا بولنے لگا، ''تمھارا شکریہ۔'' اس نے لڑکے سے کہا ''مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' اور اس کے تبسم نے لڑکے کو فارغ کر دیا۔

بشپ آگے بڑھا۔ اس کے چلنے سے پیدا ہونے والی آواز سن کر بوڑھے نے سر گھمایا اور اس کے چہرے پر حیرت سی پھیل گئی۔

''جب سے میں یہاں ہوں، ایسا پہلی بار ہوا ہے۔'' بوڑھے نے کہا ''کہ کوئی شخص یہاں داخل ہوا ہے۔ آپ کون ہیں، جناب؟''

بشپ نے جواب دیا:

میرا نام بیاں وینیو مائریل ہے۔''

''بیاں وینیو مائریل؟'' میں نے یہ نام کہیں سنا ہے۔ کیا آپ وہی آدمی ہیں جسے لوگ موں سینیور ویلکم بھی کہتے ہیں؟''

''جی ہاں!''

بوڑھے نے پھر آدھی مسکراہٹ بکھیر دی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے بشپ ہیں؟''

''جی ہاں، کچھ اسی طرح ہے۔''

''تشریف لایئے، جناب۔''

کنونشن کے رکن نے بشپ کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، مگر بشپ نے ہاتھ پکڑا نہیں۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کی:

''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے غلط اطلاع ملی تھی۔ آپ یقیناً مجھے علیل نہیں لگتے۔''

''موسیو!'' بوڑھے نے جواب میں کہا، ''میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

اس نے توقف کیا، پھر کہا:

''اب سے تین گھنٹے بعد میں مر جاؤں گا۔''

اس کے بعد اس نے اپنا کلام جاری رکھا:

''میں ڈاکٹر نہیں مگر ڈاکٹر جیسا ہوں؛ میں جانتا ہوں کہ آخری وقت کس انداز میں آتا ہے۔ کل صرف میرے پیر ٹھنڈے تھے؛ آج وہ ٹھنڈک میرے گھٹنوں تک پہنچ گئی ہے؛ اب میں اس کو کمر تک چڑھتا محسوس کر رہا ہوں؛ جب یہ دل تک پہنچے گی تو میں رُک جاؤں گا۔ سورج کتنا خوب صورت ہے؛ ہے کہ نہیں؟ میں خود یہاں تک پہیوں پر چل کر آیا تھا، تا کہ چیزوں پر آخری نظر ڈال سکوں۔ آپ مجھ سے بات کر سکتے ہیں؛ اس سے مجھے تھکن نہیں ہوتی۔ آپ نے یہاں آ کر اچھا کیا اور ایک آدمی کو دیکھا جو مرنے کے قریب ہے۔ اچھا ہے کہ کوئی اس لمحے گواہ ہو۔ سب کے اپنے اپنے گمان ہوتے ہیں؛ میں فجر تک زندہ رہنا چاہتا تھا، مگر میں جانتا ہوں کہ مشکل سے میں تین گھنٹے زندہ رہ سکوں گا۔ اس وقت رات ہو چکی ہوگی۔ مگر اس سے کیا فرق پڑے گا؟ مرنا ایک سادہ سا ماجرا ہوتا ہے۔ اس کے لیے روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی سہی، کہ میں ستاروں کی چھاؤں میں مروں گا۔''

بوڑھا گڈریے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا:

''اپنے بستر میں جا؛ تو پوری رات جاگا ہے؛ تو تھکا ہوا ہے۔''

لڑکا جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔

بوڑھا اپنی آنکھوں کے ذریعے اس کے پیچھے پیچھے چلا، اور مزید کہا، گویا اپنے آپ سے بات کر رہا ہو:

''میں اس وقت مروں گا جب وہ سو رہا ہوگا۔ دو خوابیدہ، اچھے پڑوسی ہو سکتے ہیں۔''

بشپ پر ویسا اثر نہیں ہوا، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ اسے اس طرح کسی کے مرنے کے دوران کبھی خدا کا مکمل طور پر ادراک نہیں ہوا تھا، اس لیے کہ اوروں کی طرح، بڑے دلوں کے ایسے معمولی تضادات بھی ظاہر ہونے چاہئیں: وہ ''عالی جاہ'' کہنے پر ہنسا پسند کرتا تھا، اس کو اس وقت ایک جھٹکا سا لگا تھا جب اس کو موسیو بنیور کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا تھا، اور جواب میں وہ خود کو ''باشندہ'' کہنے ہی والا تھا۔ اس پر دوستانہ تندخوئی سے حملہ کیا گیا تھا جو ڈاکٹروں اور مبلغوں میں عام ہوتا ہے، مگر بشپ اس کا عادی نہیں تھا۔ یہ آدمی، جو بہر حال کنونشن کا رکن ہے، عوام کا نمائندہ ہے، اور زمین کے طاقت ور لوگوں سے میں ایک تھا؛ موسیو بنیور اپنی زندگی میں شاید پہلی بار سخت بشپ ہونا چاہتا تھا۔

اس دوران کنونشن کا رُکن ذرا گرم جوشی سے اس پر نظر ڈال رہا تھا، جس میں ایک گونہ انکسار تھا جو ایسے شخص پر بجتا ہے جو چند لمحوں میں خاک میں مل جانے والا ہو۔

ادھر بشپ، جو اگر چہ عام طور پر اپنے تجسس کو روک رہا تھا جو اس کے خیال میں تقریباً غلط تھا، کنونشن کے رُکن کی جانچ پڑتال سے پرہیز نہیں کر سکا، اتنی توجہ کے ساتھ گویا اس کو ہم دردی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ G بالکل ساکن تھا، اس کا جسم تقریباً عمودی کیفیت میں تھا، اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی، حالاں کہ وہ اپنے اختتام کے قریب تھا، مگر اس میں صحت مندی کے سارے انداز موجود تھے۔ اس کے صاف اندازِ نظر، اس کے مستحکم لہجے، کاندھوں کی تومند حرکت میں کچھ تھا جو آتی ہوئی موت کے غیر مطابق تھا۔ اس قدر غیر مطابق کہ مسلمانوں کا موت کا فرشتہ عزرائیل شاید یہ سمجھ کر واپس چلا جاتا کہ وہ کسی غلط دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ G خود کو مرتا محسوس کر رہا تھا، اس لیے کہ وہ یہی چاہ رہا تھا۔ اس کے ذہنی کرب میں آزادی تھی۔ اس کے پیر ساکن تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے موت کا سایہ اس کو تیزی سے گرفت میں لے رہا تھا۔ اس کے پاؤں کے پنجے مر چکے تھے، مگر اس کا سر زندگی کی تمام تر قوتوں کے ساتھ بچا تھا، اور پوری طرح روشن محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے آخری سنجیدہ لمحوں میں G مشرق کی داستان کے اس بادشاہ کی مانند تھا جو اوپر سے گوشت اور نیچے سنگِ مرمر جیسا تھا۔

قریب ہی ایک پتھر پڑا تھا، بشپ اس پر بیٹھ گیا۔ بشپ کی تمہید بے ربط اور اچانک تھی:

"میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جو سرزنش کے زمرے میں آتا ہے، "آپ نے، بہر حال شاہ کی موت کے حق میں ووٹ نہیں ڈالا تھا۔"

کنونشن کا پرانا رُکن اس تلخی کو محسوس نہیں کر سکا جو ان دو لفظوں "بہر حال" میں پوشیدہ تھی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ بالکل غائب ہو چکی تھی۔

"مجھے زیادہ مبارک باد نہ دیجیے، جناب، میں نے اس جابر کی موت کے حق میں ووٹ ڈالا تھا۔"

اس کا لہجہ سادگی کا تھا جو تلخی کے لہجے کا جواب دے رہا تھا۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" بشپ نے گفتگو دوبارہ شروع کی۔

میرا مطلب ہے کہ وہ ظالم شخص تھا، اور میں نے ایک ظالم کی موت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ وہ ظلم کے بیج بو رہا تھا، وہ اختیار کو غلط طریقے سے استعمال کر رہا تھا، جب کہ سائنس وہ اختیار ہے جو صحیح طریقے سے سمجھا جاتا ہے۔ انسان کو سائنس کا تابع ہونا چاہیے۔"

"اور ضمیر؟" بشپ نے اضافہ کیا۔

"ایک ہی چیز ہے۔ ضمیر ہمارے اندرون کی سائنس کی مقدار ہے۔"

موں سنیور حیرت سے اس زبان کو سن رہا تھا جو اس کے لیے بالکل نئی تھی۔
کنونشن کے رُکن نے دوبارہ گفتگو شروع کی:

"جہاں تک لوئی شانز دہم کا معاملہ ہے، میں نے 'نہیں' کہہ دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کسی انسان کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں، مگر میں ظلم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کو اپنا فرض جانتا ہوں۔ میں نے ووٹ دیا تھا ظالم کے اختتام کے لیے، یعنی، عورتوں کی جسم فروشی کے اختتام کے لیے، مردوں کی غلامی کے اختتام کے لیے، اور بچوں کے [مستقبل کے] اندھیروں کو ختم کرنے کے لیے۔ جمہوریہ کو ووٹ دے کر میں نے ان سب کے لیے ووٹ دیا تھا۔ میں نے اپنی برادری کے لیے، اتفاقِ رائے کے لیے، نئے سویرے کے لیے ووٹ دیا تھا۔ میں نے تعصبات کو اور غلطیوں کو بے دخل کرنے میں مدد کی تھی۔ تعصبات اور غلطیوں کے ڈھیر جانے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے پرانی دنیا کو ختم کر دیا ہے، اور پرانی دنیا بد نصیبی کا وہ گل دان ہے، جو نسلِ انسانی کو الٹ پلٹ کر دینے کے ذریعے مسرتوں کا کوزہ بن گیا ہے۔"

"مخلوط مسرت!" بشپ نے کہا۔

"آپ اس کو زحمت زدہ مسرت کہہ سکتے ہیں، اور آج، ماضی کی اس مہلک چال کے بعد، جس کو 1814ء کہتے ہیں، مسرت غائب ہو گئی ہے۔ افسوس! مجھے اعتراف ہے کہ کام نامکمل رہ گیا تھا۔ ہم نے فرسودہ نظام کو مسمار کر دیا تھا؛ مگر ہم اس کو خیالوں سے نکال نہیں سکے تھے۔ بد سلوکی کو صرف تباہ کرنا ہی کافی نہیں ہوتا؛ رواج کی تراش خراش ضروری ہوتی ہے۔ پون چکی موجود نہیں، مگر ہوا اب بھی موجود ہے۔"

"آپ نے اس کو مسمار کر دیا ہے۔ مسمار کر دینا فائدہ مند ہو سکتا ہے مگر میں اس مسماری پر بھروسا نہیں کرتا جس میں غصہ شامل ہو۔"

"حق کا اپنا غصہ ہوتا ہے، بشپ! اور حق کا غصہ ترقی کا ایک عنصر ہوتا ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی کہا جا چکا ہے اس کے باوجود، یسوع مسیح کی آمد کے بعد، انقلابِ فرانس انسانیت کا سب سے بڑا قدم ہے۔ یہ نامکمل تو ہو سکتا ہے، مگر رفیع ہے۔ اس نے تمام سماجی مقداروں کو آزاد کر دیا ہے؛ اس نے جذبات کو نرما دیا ہے؛ پُرسکون بنا دیا ہے، دلاسا دیا ہے، روشنی دی ہے؛ اس نے تہذیب کی لہروں کو کرۂ ارض پر پھیلا دیا ہے۔ یہ اچھی چیز تھی۔ انقلابِ فرانس نے انسانیت کی تقدیس کی ہے۔"

اور بشپ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہا تھا:

"جی ہاں...... '93...... !"

کنونشن کا رکن غمگین متانت کے ساتھ اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، اور چیخ کر کہا، اتنی ہی زور سے جتنا کہ ایک قریب المرگ انسان چیخ سکتا ہے:

"اوہ! پھر وہی ....'93 ....! میں اسی لفظ کی توقع کر رہا تھا۔ پچھلے پندرہ برس کے عرصے میں ایک بادل بن رہا تھا؛ پندرہ برس بعد برس گیا ہے۔ آپ برق پر مقدمہ چلا رہے ہیں۔"

بغیر کسی اعتراف کے، شاید بشپ کو محسوس ہو گیا تھا کہ اس کے اندر کی کوئی شے ٹوٹ گئی ہے۔ پھر بھی، اس نے معاملے کا سامنا کیا۔ اس نے جواب میں کہا:

"جج انصاف کے نام پر زبان کھولتا ہے؛ مبلغ ہمدردی کے نام پر بولتا ہے، جو اور کچھ نہیں ہوتا سوائے زیادہ اعلیٰ انصاف کے۔ برق کو کبھی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا،"اور ....لوئی ہفت دہم؟"

کنونشنی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بشپ کا بازو پکڑ لیا۔

"لوئی ہفت دہم! اچھا، آیئے دیکھتے ہیں۔ آپ کس کا سوگ منا رہے ہیں؟ کیا وہ کوئی معصوم بچہ ہے؟ بہت اچھا، اگر ایسا ہے تو میں آپ کے سوگ میں شریک ہوں۔ کیا یہ سوگ شہزادے کے لیے ہے؟ میں سوچنے کے لیے وقت کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ایک معصوم بچے کو صرف اس جرم میں Place de Greve میں بغلوں کے بل اتنی دیر تک ٹانگا گیا تھا کہ اس کی موت واقع ہو گئی تھی؛ کہ وہ Cartouche کا بھائی تھا؛ ایک معصوم بچہ ٹمپل کے بُرج میں لوئی پانزدہم کا پوتا ہونے کے جُرم میں شہید کر دیا جاتا ہے۔"

"موسیو!" بشپ نے کہا،"میں ناموں کے اس ہیر پھیر کو پسند نہیں کرتا۔"

"Cartouche؟ لوئی پانزدہم؟ آپ کا اعتراض کس پر ہے؟"

ایک لمحے کو خاموشی ہو گئی۔ بشپ اپنے آنے پر پچھتا رہا تھا، اس کے باوجود وہ غیر واضح طور پر پریشان ہو گیا تھا۔

کنونشنی نے پھر بات شروع کی:

"اوہ، موسیو مبلغ، آپ کو سچ کے کچے پن سے محبت نہیں۔ یسوع ان سے محبت کرتا تھا۔ اس نے ایک ڈنڈا پکڑا اور عبادت گاہ کو صاف کر دیا تھا۔ بجلی کے کوندے سے بھرا اس کا تازیانہ سخت سچائیوں کا بولنے والا تھا۔ جب اس نے چیخ کر کہا تھا، 'دکھ اٹھاؤ میرے بچو' تو وہ چھوٹے بچوں کے درمیان امتیاز نہیں کر رہا تھا۔ مجھے Barabbas کے ولی عہد اور Herod کے ولی عہد کو برابر سمجھنے میں شرمندگی نہیں ہوتی۔ موسیو! معصومیت خود اپنا تاج ہوتی ہے۔ معصومیت کو بلند بننے کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چیتھڑوں میں بھی اتنی ہی بلند پایہ ہوتی ہے جتنی کہ گلِ نیلوفر میں۔

''اس میں کوئی شبہ نہیں۔'' بشپ نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں اپنے موقف پر اڑا ہوں۔'' کونشی G نے کہا۔'' آپ نے لوئی ہفت دہم کا نام لیا تھا۔ آیئے ہم اس پر سمجھوتا کیے لیتے ہیں۔ کیا ہم ہر معصوم، ہر شہید، تمام بچوں، کم رُتبہ یا بلند رُتبہ کے لیے روئیں؟ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر ایسی صورت میں، جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، ہمیں 93' سے مزید پیچھے جانا ہوگا، اور ہمارے آنسوؤں کو لوئی ہفت دہم سے پہلے سے شروع ہونا ہوگا۔ میں آپ کے ساتھ شاہ کے بچوں کے لیے روؤں گا، بشرطے کہ آپ میرے ساتھ عوام کے بچوں پر بھی روئیں۔''

''میں سب کے لیے روتا ہوں۔'' بشپ نے کہا

''برابر۔'' کونشی G نے چیخ کر کہا؟ ''اور اگر پلڑے کو جھکنا پڑے تو اسے عوام کی طرف جھکنے دینا چاہیے۔ انھوں نے زیادہ دُکھ اٹھائے ہیں۔''

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ کونشی نے خاموشی توڑنے میں پہل کی۔ اپنی کہنیوں کے بل ذرا سا بلند ہوا، اپنے رخسار پر چٹکی لی، جیسا کہ لوگ عموماً اس وقت کرتے ہیں جب کوئی ان پر تفتیش کر رہا ہو، اور بشپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، جان کنی کے عالم کی ساری قوت مجتمع کر کے اپیل کی۔ اپیل کیا تھی، تقریباً ایک دھماکا تھا۔

''جی جناب! لوگوں نے بہت دُکھ اٹھائے ہیں، لیکن ذرا ٹھہریے! مگر یہی سب کچھ نہیں؛ ابھی ابھی آپ نے لوئی ہفت دہم کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ کی ہے، کیوں؟ مجھے اس بات کا علم نہیں۔ جب سے میں ان علاقوں میں ہوں، میں اس کٹیا میں اکیلا رہا ہوں، باہر کبھی قدم نہیں نکالے، نہ کسی سے مدد مانگی سوائے اس بچے کے جو میری مدد کرتا رہتا ہے۔ آپ کا نام مجھ تک بڑے پیچیدہ طریقے سے پہنچا ہے، یہ سچ ہے، اور میں بھی اعتراف کروں گا کہ برے تلفظ کے ساتھ۔ مگر اس سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا: چالاک لوگوں کے پاس بے چارے سادہ آدمی، عوام، کے سامنے خود کو نافذ کرنے کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ ارے ہاں، مجھے آپ کی گاڑی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ آپ نے بلا شبہ، اس کو کچھ فاصلے پر ہی چھوڑ دیا تھا، سڑکوں کے دوشاخے کی جھاڑیوں کے قریب۔ سچ کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ نے خود مجھے بتایا ہے کہ آپ بشپ ہیں؛ مگر اس سے مجھے آپ کی اخلاقی حیثیت کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ مختصراً، میں اپنا سوال دہراتا ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟ آپ بشپ ہیں؛ یعنی کلیسا کے شہزادے، مع شدہ افراد میں سے ایک،

فقیہانہ رویوں اور محصولات والے، جن کو وسیع پیمانے کے وظائف ملتے ہیں؛ D کے بشپ ہیں— پندرہ ہزار فرانک مقررہ آمدنی ہے، دس ہزار بالائی یافت: کل جمع، پچیس ہزار فرانک--- جس کے باورچی خانے ہیں، وردی پوش خدام ہیں، جو اسے خوش رکھتے ہیں؛ جمعے کے دن جو صحرائی پرندے کھاتا ہے، اکڑ اکڑ کر چلتا ہے، ایک خوشامدی آگے، ایک خوشامدی پیچھے، عالی شان بگھی میں، اور جس کے محلات ہیں، جو اس یسوع مسیح کے طفیل بگھیوں میں سفر کرتا ہے جو ننگے پاؤں گیا تھا۔ آپ کلیسا کے عہدے دار ہیں— محصولات ہیں، محلات ہیں، گھوڑے ہیں ملازمین ہیں، اچھا دستر خوان ہے، زندگی کی تمام نفس پرستیاں ہیں؛ دوسروں کی طرح جو سب کو مہیا ہیں، اور دوسروں کی طرح آپ ان سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں؛ یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ سب کچھ یا تو بہت زیادہ ہے یا بہت کم؛ یہ مجھے آدمی کی حقیقی اور لازمی قدر کے بارے میں نہیں بتاتا ہے جو امکانی طور پر مجھے دانش سے سرفراز کرنے کی نیت سے آتا ہے۔ تو میں کس سے بات کروں؟ آپ کون صاحب ہیں؟"

بشپ نے سر جھکا لیا اور جواب میں کہا، "میں کیڑا ہوں۔"

"بگھی میں، اور کیڑا؟" کونشی نے غراتے ہوئے کہا۔

اب کونشی کے لاف زنی کا موقع تھا، اور بشپ کے انکسار کا۔

بشپ نے دھیمے انداز میں پھر بات شروع کی:

"جو ہوا، سو ہوا۔ مگر یہ تو بتایئے کہ میری بگھی، جو پیڑوں سے چند قدم آگے کھڑی ہے، میرا دستر خوان، صحرائی پرندے جو میں ہر جمعے کو نوش کرتا ہوں، میرے محلات اور میرے خوشامدی، یہ سب کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ رحم دلی فرض نہیں ہے، اور وہ '93 سنگ دلی نہیں تھا۔

کونشی نے اپنے ابروؤں پر اس طرح ہاتھ پھیرے گویا کسی رنج کو ہٹا رہا ہو۔

"آپ کو جواب دینے سے پہلے ....." اس نے کہا، "میں التجا کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے ابھی ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے، جناب! آپ میرے گھر آئے ہیں، آپ میرے مہمان ہیں، مجھے خوش خلقی سے پیش آنا چاہیے تھا۔ آپ میرے خیالات پر بات کرتے ہیں، اور میں آپ کے دلائل سے جنگ کرنے لگتا ہوں۔ آپ کی ثروت مندی اور آپ کی مسرتیں آپ کے فوائد ہیں، جن پر میں بحث کر سکتا ہوں؛ مگر خوش خلقی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ان کو استعمال نہ کروں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں ان کو استعمال نہیں کروں گا۔"

"آپ کا شکریہ۔" بشپ نے کہا۔

G نے پھر بات کا سلسلہ شروع کیا:

"آیئے، اب ہم اس تشریح پر بات کرتے ہیں جو آپ نے مجھ سے طلب کی ہے۔ آپ مجھ سے کیا کہہ رہے تھے— کہ 93' بے رحم تھا؟"

"بے رحم، جی ہاں۔" بشپ نے جواب دیا، "گلوٹین کے وقت Marat کی تالی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"فوج کی مدد سے پروٹسٹنٹ فرقے کے کچلنے کے موقعے پر Bossuet کے تقدس، تقدس کے ورد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

پلٹ کر دیا جانے والا جواب سخت تھا، مگر اس کی صفائی نے لوہے کی نوک جیسا نشان ڈال دیا تھا۔ بشپ اندر سے لرز گیا؛ اس کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ایسے وقت میں بہترین دماغ بھی اپنے طلسم بھول جاتے ہیں، اور کبھی کبھی منطق کے احترام میں زخمی ہو جاتے ہیں۔

کنونشنی کا دم چڑھنے لگا تھا؛ آخری سانسوں سے مل جانے والی ضیق النفس کی تکلیف نے اس کی آواز کا تسلسل توڑ دیا تھا؛ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں روح کی تابندگی دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ کہتا رہا:

"مجھے اس ضمن میں کچھ اور کہنے دیجیے۔ انقلاب سے قطع نظر، جس کو اگر من حیث الکل دیکھا جائے تو یہ ایک عظیم انسانی اقرار ہے، افسوس کہ 93' اس کا جواب الجواب تھا۔ آپ اس کو سنگ دلی سمجھتے ہیں جناب، تو شاہی کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ؟ کسی شے کو چھین کر لے جانے والا ڈاکو ہوتا ہے؛ مگر آپ Montrevel کو کیا نام دیں گے؟ Fouquier-Tainville بدمعاش آدمی ہے؛ مگر Lamoignon-Baville کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ Maillard ہولناک ہے؛ مگر Saulx-Tavannes کے بارے میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟ بڑا Duchene خوں خوار ہے؛ مگر بڑے Letellier کے لیے آپ کیا لقب پسند کریں گے؟ Jourdan-Coupe-Tete دیو ہے مگر اتنا بھیانک نہیں جتنا کہ M یعنی Marquis de Louvois ہے۔ جناب!— جناب مجھے Marie Antoinette اور ملکہ کے بارے میں افسوس ہے؛ مگر مجھے اس بے چاری عورت کے بارے میں بھی بہت افسوس ہے 1865ء میں جو لوئی اعظم کے نیچے تھی، جناب؛ جب کہ اسے کمر تک برہنہ کر کے باندھ دیا گیا تھا، اور بچے کو اس عورت سے فاصلے پر رکھا گیا تھا؛ عورت کی چھاتی دودھ سے پھول گئی تھی، اور دل اذیت سے بھر گیا تھا؛ بھوک کی شدت سے زرد بچہ چھاتی کو دیکھتا، تڑپتا اور چیختا رہا؛ جلاد نے عورت سے کہا تھا، جو ماں بھی تھی اور نرس بھی: 'خاموش! نومولود کی موت اور اپنے ضمیر کی موت کے درمیان انتخاب کر لو۔' اور آپ عورت کی طرح Tantalus پر تشدد کے بارے میں کیا کہیں گے؟ اس کو اپنے ذہن میں اچھی

طرح رکھیے جناب کہ انقلاب فرانس کی وجوہ تھیں؛ مستقبل ہی اس کا غصہ دور کر سکے گا، اس کا نتیجہ ایک بہتر دنیا ہو گی۔ اس کی سب سے خطرناک ضربات سے نسلِ انسانی کے لیے پیار ابھرتا ہے۔ اپنی بات مختصر کرتے ہوئے، میں رُک رہا ہوں؛ مجھے بہت فوائد ملے ہیں، اب میں مر رہا ہوں۔"

اور بشپ کی آنکھ سے بچنے کے لیے کنونشنی نے ان سکون انگیز الفاظ پر اپنے خیالات ختم کیے:

"جی ہاں، ترقی کی ورزشوں کو انقلابات کہا جاتا ہے۔ جب یہ ختم ہو جاتی ہیں تب ان کے حقائق کا اندازہ ہوتا ہے — کہ نسلِ انسانی کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا گیا ہے، مگر اس نے ترقی کی ہے۔"

کنونشنی کو اس میں شبہ نہیں تھا کہ اس نے چھپنے والی، بشپ کی، ایک کے بعد دوسری، ساری خندقیں فتح کر لی ہیں۔ بس ایک باقی رہی ہے اور اس خندق سے موں بنیوریاں ویلیو کی مزاحمت کی جانب سے یہ جواب آیا، جس میں ابتدا کی تقریباً ساری سختی واضح ہو گئی تھی:

"ترقی کو خدا پر یقین رکھنا چاہیے۔ خدا فاسق و فاجر خدمت گار رکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ جو خدا پر یقین نہیں رکھتا نسلِ انسانی کے لیے بُرا رہنما ہو گا۔"

سابق رہنمائے عوام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر تھرتھراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، اور اس دوران آہستہ آہستہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بننے لگا۔ جب پلکیں آنسوؤں سے بھر گئیں تو اس کے نیلے رخسار پر ایک آنسو ڈھلک گیا، اور اس نے تقریباً ہکلاتے ہوئے بہت آہستگی سے خود سے کہا جب کہ اس کی آنکھیں گہرائیوں میں غوطے کھا رہی تھیں:

"اے وہ، اے مثالی! تو ہی اکیلا وجود ہے۔"

بشپ کو ایک ناقابلِ بیان جھٹکے کا تجربہ ہوا۔

ایک وقفے کے بعد بوڑھے آدمی نے آسمان کی طرف ایک انگلی بلند کی اور کہا:

"بے انتہا ہے؛ موجود ہے؛ وہاں ہے؛ بے انتہا کی کوئی شخصیت نہیں؛ شخصیت کی کوئی حد نہیں ہوتی؛ جو بے انتہا نہیں ہو گا، دوسرے لفظوں میں اس کا [مادّی] وجود نہیں ہو گا۔ تب، وہاں ایک 'میں' ہے۔ اس لاانتہا کا 'میں' خدا ہے۔"

ایک مرتے ہوئے انسان نے یہ آخری الفاظ بلند آواز میں، اور اس بے حد خوشی کے لرزے میں ادا کیے تھے گویا وہ کسی کو دیکھ رہا ہو۔ وہ بول چکا تو اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کوشش نے اسے تھکا دیا تھا۔ یہ واضح تھا کہ اس نے اپنے زندگی کے آخری لمحات چند گھنٹوں قبل گزارے تھے، کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کو موت سے زیادہ قریب لے گیا تھا۔ سب سے اعلیٰ لمحہ قریب آ رہا تھا۔

بشپ سمجھ رہا تھا؛ وقت آگے بڑھ رہا تھا؛ وہ ایک پادری کے طور پر آیا تھا: شدید سردی سے

کئی درجے شدید جذبات میں، وہ دونوں بند آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہ جھریوں بھرا، عمر رسیدہ اور یخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مرتے آدمی پر جھک گیا۔

''یہ لمحہ خدا کا لمحہ ہے۔ کیا آپ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ اگر ہم نہ ملتے تو بڑے افسوس کی بات ہوتی؟''

کنوینشنی نے پھر اپنی آنکھیں کھولیں۔ اداسی سے بھری متانت اس کے خدوخال پر چھائی ہوئی تھی۔

''بشپ!'' اس نے کہا، ایسی آہستگی کے ساتھ جو اس کی روح کے وقار سے نہ کہ اس کی گرتی ہوئی قوت کے باعث تھی، ''میں نے اپنی زندگی مراقبے، مطالعے اور غور و فکر میں گزاری ہے۔ میری عمر ساٹھ برس کی تھی جب میرے ملک نے مجھے طلب کیا تھا اور مجھے حکم دیا تھا کہ میں اس کے معاملات پر غور و فکر کروں۔ میں نے فرماں برداری کی۔ ناانصافیاں جاری تھیں۔ میں نے ان سے لڑائی کی؛ ظلم ہو رہا تھا، میں نے ان کو تباہ کیا؛ حقوق اور اصول موجود تھے، میں نے ان کا اعلان کیا اور ان کا اعتراف کیا؛ ہمارے علاقے پر حملہ ہوا، میں نے اس کا دفاع کیا؛ فرانس خطرے میں تھا، میں نے اپنی چھاتی پیش کی؛ میں دولت مند نہیں تھا؛ میں مفلس ہوں۔ میں ریاست کے حاکموں میں سے ایک تھا؛ خزانے کے تہہ خانے اس حد تک نقدی سے بھرے ہوئے تھے کہ ہمیں اس کی دیواروں کو تقویت دینے پر مجبور ہونا پڑا تھا جو سونے اور چاندی کے بوجھ سے پھٹ پڑنے والی تھیں؛ میں نے بیس عدد سو (sou) کے حساب سے 'ڈیڈ ٹری اسٹریٹ' میں ڈنر کھایا تھا۔ میں نے مظلوموں کی دست گیری کی؛ میں نے دکھی لوگوں کو آرام پہنچایا؛ میں نے قربان گاہ کے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے، یہ سچ ہے، مگر وہ ملک کے زخموں پر پٹیاں باندھنے کے لیے تھے۔ میں نے ہمیشہ نسلِ انسانی کے قدم آگے کی طرف بڑھائے، آگے، روشنی کی جانب، اور میں نے کبھی کبھی بے رحمی سے ترقیات کی مزاحمت بھی کی تھی۔ جب موقع ہوا، میں نے خود اپنے حریفوں کو، آپ کے پیشے والوں کو تحفظ فراہم کیا۔ اور وہاں Flanders ،Peteghem میں، میں اس جگہ پر جہاں Merovingian شاہوں کے قصرِ تابستانی تھے، Abbey of Sainte Claire en Beaulieu کے نام سے شہریوں کے لیے ایک خانقاہ بنائی تھی، جسے میں نے 1793ء میں بچا لیا تھا۔ حسبِ توفیق اپنے فرائض انجام دیے، اور وہ کچھ کیا میں جس کا اہل تھا۔ جس کے بعد مجھے تلاش کیا گیا؛ مجھ پر ظلم کیا گیا؛ ایذا دی گئی؛ بدنام کیا گیا؛ مجھ پر آوازے کسے گئے؛ مجھ سے نفرت کی گئی، بد دعائیں دی گئیں، رسوا کیا گیا۔ پچھلے کئی برسوں سے، اپنے سفید بالوں کے باعث مجھے احساس ہو چلا تھا کہ بہت سے لوگ مجھ سے نفرت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں؛ بے چارے بے خبر عوام کے لیے میں ایک سزا یافتہ تھا۔ اور میں اس قسم کی

نفرت انگیز علاحدگی کو، کسی سے نفرت کیے بغیر، قبول کرتا ہوں۔ اب میری عمر چھیاسی برس کی ہو چکی ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔ اب آپ مجھ سے کیا لینے آئے ہیں؟''

''آپ کی دعائیں!'' بشپ نے کہا

اور وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

بشپ نے ایک بار پھر اس کا سر اٹھایا، کنونشی کا چہرہ جلیل القدر ہو گیا تھا۔ اسی لمحے وہ انتقال کر گیا۔

بشپ، خیالات میں ڈوبا، جن کا ہمیں علم نہیں، گھر واپس آیا۔ اس نے پوری رات دعاؤں میں گزاری۔ اگلی صبح کچھ بہادر اور متجسس لوگوں نے اس سے، کنونشی G کے رکن کی بابت بات کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھانے پر اکتفا کی۔

اس کے بعد سے اس نے بچوں اور دکھی لوگوں کے لیے اپنی نرم دلی اور برادرانہ احساس دوبالا کر دیا تھا۔

''اس بے چارے بد نصیب G'' کی طرف کوئی اشارہ اس کو ایک انوکھی مصروفیت میں ڈال دیا کرتا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس انسان کے جانے کے واقعے نے، اور اس عظیم ضمیر کے تصور نے، اس کو ایک نئی کاملیت کے حصول کی کوشش پر ڈال نہیں دیا تھا۔

بشپ کے اس مذہبی دورے نے، قدرتی طور پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں کانا پھوسی کا موقع فراہم کر دیا۔

''کیا اس قسم کے قریب المرگ انسان کا بسترِ مرگ ایک بشپ کی موجودگی کے لیے ایک مناسب جگہ تھی؟ بظاہر تبدیلیِ مذہب کی کوئی توقع نہیں تھی۔ وہ تمام انقلابی خطا کار لوگ ہیں۔ وہاں جانے کی ضرورت کیا تھی؟ وہاں کیا نظر آنے والا تھا؟ شاید یہ دیکھنے گیا تھا کہ اس قسم کی روح کو شیطان کس طرح لے جایا کرتا ہے۔''

ایک دن ایک شوخ چشم قسم کی بیوہ نے، جو خود کو روحانی شخصیت سمجھتی تھی، بشپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا، ''مونسنیور، لوگ اب یہ پوچھنے لگے ہیں کہ آپ کو سرخ ٹوپی کب ملنے والی ہے؟۔۔۔ اوہ! مگر وہ تو بہت گھٹیا رنگ ہوتا ہے۔''

بشپ نے جواب دیا تھا، ''کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ وہ جو اس رنگ کو ایک ٹوپی میں تو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مگر اپنی ہیئت میں تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

پابندی

اگر ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا ہو کہ موں سنیور ویلکم "ایک فلسفی بشپ" ہیں یا "وطن دوست پادری" تو ہمیں اپنے آپ کو دھوکا دینے کا بڑا خطرہ مول لینا ہوگا۔ ان کی ملاقات، جسے کنونشنی G سے ان کا ملاپ کہنا چاہیے، ان کے ذہن میں ایک قسم کی حیرت چھوڑ گئی، جس نے ان کو اور بھی نرم خو بنادیا تھا۔ بس، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

حالاں کہ موں سنیور ریاں ویئیو کا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا؛ یہ شاید موقع ہے، بہت مختصر طور پر، واضح کرنے کا کہ اس عہد کے واقعات میں ان کا رویہ کیا تھا، اس قیاس کے ساتھ کہ موں سنیور ریاں ویئیو نے کبھی مخصوص رویہ رکھنے کا خواب دیکھا تھا۔

لہٰذا ہم چند برس پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔

موسیو مائریل کی اسقف کے عہدے پر ترقی کے بعد شہنشاہ نے ان کو کئی اور بشپوں کے ساتھ، اپنی سلطنت کا بیرن بنا دیا تھا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ 1809ء کے جولائی کی پانچ اور چھ تاریخ کی درمیانی رات پوپ کی گرفتاری ہوئی تھی؛ اس موقعے پر نپولین نے موسیو مائریل کو فرانس اور اطالیہ کے بشپوں کے درمیان پیرس میں منعقد ہونے والی کلیسا کی مجلس میں طلب کر لیا تھا۔ یہ مجلس پہلی بار 15 جون 1811ء کو نوترے ڈیم کلیسا میں برپا ہوئی تھی، جس کی صدارت کارڈینل نے کی تھی۔ موسیو مائریل پچانوے بشپوں میں سے ایک تھا جو اس میں شریک ہوا تھا۔ مگر یہ ایک ہی نشست میں، اور تین چار کانفرنسوں میں شریک ہوا تھا۔ ایک پہاڑی علاقے کے بشپ کو، جو محرومی اور خستہ حالات میں اور فطرت سے اتنا قریب رہتا تھا، دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے کچھ خیالات درآمد کیے تھے جنھوں نے اسمبلی کے درجہ حرارت کو تبدیل کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی اپنے علاقے

D میں واپس پہنچا۔ اس کی جلد واپسی کے بارے میں تفتیش کی گئی تو اس نے جواب میں کہا تھا، ”میں نے انھیں شرمندہ کردیا تھا۔ ان تک پہنچنے والی ہیروئی ہوا میرے ذریعے سے ہو کر پہنچ رہی تھی۔ میں نے ان کے لیے ایک کھلے دروازے کا اثر پیدا کردیا تھا۔“

ایک اور موقعے پر اس نے کہا تھا، ”آپ کیا چاہتے ہیں؟ وہ حضرات شہزادے ہیں۔ میں ایک نادار روسی بشپ ہوں۔“

حقیقت یہ ہے کہ اس نے انھیں ناخوش کردیا تھا۔ دوسری تمام حیرت انگیز چیزوں کے علاوہ کہا گیا ہے کہ ایک شام اتفاق سے وہ اپنے ایک مشہور دوست کے گھر گیا تھا جہاں اس نے کچھ جملے کہہ دیے تھے، ”کیا خوب صورت گھڑیاں ہیں۔ کیا خوب صورت قالین ہیں۔ کیا خوب صورت وردیاں ہیں، یہ سب پریشانی کا سبب ہوں گی۔ میں اس قسم کی غیر ضروری اشیا رکھنے کا قائل نہیں جو ہمہ وقت بلا تعطل میرے کانوں میں شور کرتی رہیں: کتنے لوگ بھوکے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں، نادار لوگ بھی تو ہیں — نادار لوگ بھی تو ہیں!“

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشیائے عیش و عشرت سے نفرت عقل مندی نہیں۔ ان سے نفرت، فنونِ لطیفہ سے بھی نفرت کا باعث ہوگی۔ اس کے باوجود، اہلِ کلیسا میں عیش و عشرت کا ہونا صحیح نہیں، سوائے نمائندگیوں اور مذہبی رسوم و رواج کے سلسلوں کے۔ یہ ایسی عادتوں کو آشکار کرتی ہیں جن میں خیرات کا بہت کم عنصر ہوتا ہے۔ مال دار پادری ایک تضاد ہوتا ہے۔ پادری کو ناداروں سے قریب ہونا چاہیے۔ کیا پریشانی میں مبتلا، تنگ دستی کا مارا، اپنے کسی شخص کو بدبختی میں مبتلا کیے بغیر، رات دن تواتر سے رابطہ کرسکتا ہے؟ کیا اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی انگیٹھی کے قریب ہو اور گرم نہ ہو؟ کیا کوئی اس بات کا تصور کرسکتا ہے کہ بھٹی کے قریب کام کرنے والے کا ایک بال بھی جھلسا نہ ہو، ناخن کالے نہ ہوں، نہ ایک قطرہ پسینہ ہو، نہ اس کے چہرے پر راکھ کا کوئی داغ ہو؟ پادری میں خیرات کا اوّلین ثبوت پادری، بالخصوص بشپ کی، اپنی تنگ دستی ہوگا۔

یہی بلا شبہ، یہی وہ امر ہے جو D کے بشپ نے سوچا تھا۔

اس سے یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ اس نے ہمیں اپنے ان خیالات میں شریک کیا ہے جن کو ہم، کچھ نازک معاملات میں ”اس صدی کے خیالات“ کہتے ہیں۔ اس نے وقت کے مذہبی جھگڑوں میں بہت کم حصہ لیا، اور ان معاملات میں خاموشی قائم رکھی جن میں کلیسا اور ریاست ملوث رہے ہیں، پھر بھی اگر اس پر بہت زور ڈالا گیا ہوتا تو، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فرانسیسی ہونے کے بجائے پاپائیت کا وکیل ہوتا۔ چوں کہ ہم ایک خاکہ بنا رہے ہیں، اور چوں کہ ہم کچھ چھپانا نہیں

چاہتے، اس لیے ہمیں یہ اضافہ کرنا پڑ رہا ہے کہ نپولین کے زوال کے زمانے میں اس کا رویہ برف جیسا تھا۔ 1813ء کی ابتدا سے اس نے یا تو نپولین سے وابستگی ختم کردی تھی یا اس کے خلاف معاندانہ اعلانات کی تحسین کی تھی۔ اس نے نپولین سے ملنے سے انکار کردیا تھا جب وہ جزیرۂ ایلبا سے واپسی پر وہاں سے گزر رہا تھا، اور اس نے اپنے علاقے میں شہنشاہ کے لیے 'موذنوں' والی عوامی دعاؤں میں شرکت سے اجتناب کیا تھا۔

اپنی بہن میڈموزیل پتستین کے علاوہ اس کے دو اور بھائی تھے، ایک جرنیل تھا، دوسرا پریفکٹ تھا۔ وہ قابلِ برداشت وقفوں کے ساتھ دونوں سے خط کتابت کرتا تھا۔ کچھ دن تک وہ جرنیل بھائی کے ساتھ درشتگی سے پیش آتا رہا، اس لیے کہ جس زمانے میں Cannes سے انخلا ہو رہا تھا۔ اس نے Provence میں بارہ سونفری کی کمان کی تھی اور اس طرح شہنشاہ کا پیچھا کیا تھا۔ گویا وہ کسی عام انسان کو فرار ہوجانے کا موقع دے رہا ہو۔ دوسرے بھائی، پریفکٹ سے، جو نفیس اور لائق انسان تھا اور ملازمت سے فراغت کے بعد سے پیرس میں Cassette اسٹریٹ پر قیام پذیر تھا، خط کتابت زیادہ شفقت آمیز تھی۔

موں سنیور ریاں ویئیو نے اچھے دن، تلخیوں کے دن اور وہم کے زمانے بھی گزارے تھے۔ وقتی جذبات کے سایے ان کے عظیم اور عجیب جذبات اور ابدی اشیا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ یقینی طور پر اس جیسا انسان اچھا رہتا، اگر وہ سیاسی مشوروں کو خاطر میں نہ لایا ہوتا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے معانی غلط انداز میں لیے جائیں: ہم ان "سیاسی مشوروں" کو جو، ارفع یقین کے ساتھ، وطن پرستی، جمہوری، انسانی صفات پر مبنی ترقیات چاہتی ہیں درہم برہم نہیں کرنا چاہتے، جن کو ہمارے زمانے میں ہر قسم کی دانش کی نہایت فیاضانہ بنیاد ہونا چاہیے۔ اس کتاب کے موضوع سے منسلک معاملات کی گہرائیوں میں گئے بغیر ہم بس اتنا کہیں گے: بہت اچھا ہوتا اگر موں سنیور ریاں ویئیو شاہی پرست نہ ہوتے، اور ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظر اس پُرسکون تصور سے کبھی اور طرف مڑی نہ ہوتی جو واضح طور پر قابلِ امتیاز اور بالا ہے، اس دنیا کی من گھڑت کہانیوں اور نفرتوں سے، انسانی چیزوں کی طوفانی گردشوں سے اور صدق وانصاف وخیرات جیسی تین تابانیوں سے۔

اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے کہ خدا نے موں سنیور ویلکم کو کسی سیاسی عہدے کے لیے خلق نہیں کیا تھا، ہمیں حقوق اور آزادی کے نام پر طاقت ور نپولین کے خلاف ان کی منصفانہ مگر پُرخطر مزاحمت پر ان کے فخریہ اختلاف کو سمجھنا اور تعریف کرنا چاہیے تھا۔ مگر وہ بات جو ہمیں لوگوں کے عروج پر خوش کرتی ہے، لوگوں کے زوال پر کم خوش کرتی ہے۔ ہم اس وقت تک فساد کو پسند کرتے ہیں

جب تک کہ خطرہ ہو، لیکن صرف پہلے گھنٹے کے لڑنے والوں ہی کو آخر والوں کی تباہی کا حق ہونا چاہیے۔وہ جو فروغ کے دور میں سرکش الزام تراش نہیں رہا ہے اسے تباہی کے عالم میں اپنا منہ بند رکھنا چاہیے۔کامیابی کی مذمت کرنے والا ہی زوال کا جائز نجات دہندہ ہوتا ہے۔ جب مشیتِ الٰہی مآل اندیشی کرتی ہے تو ہم اسے کام کرنے دیتے ہیں۔1812ء میں ہمیں غیر مسلح کرنے کی شروعات ہوئی تھی۔ 1813ء میں کم سخن مقننہ کی خاموشی کی بزدلانہ خلاف ورزی میں، خطرِ عظیم نے جس کی ہمت افزائی کی تھی، صرف وہی خصوصیات تھیں جنھوں نے غیظ وغضب کو ابھارا تھا۔اور اس جرم کی 1814ء میں تعریف کی گئی تھی، ان مارشلوں کی موجودگی میں جنھوں نے غداری کی تھی؛ اور اس سینیٹ کی موجودگی میں جو تقدیس کے بعد توہین کرتی ایک گھوڑے سے دوسرے گھوڑے منتقل ہوتی رہی؛ اس بت خانے کی موجودگی میں جو اپنی بنیاد کھو رہا تھا اور اپنے اصنام پر تھوک رہا تھا— جہاں ایک جانب سر موڑنا فرض تھا۔1815ء میں جب شدید ترین تباہیوں سے فضا بھر گئی تھی، جب ان کی شیطانی روش کے باعث فرانس پر لرزہ طاری تھا، جب نپولین کے سامنے واٹرلو مشکل سے ابھرتا دکھائی دیتا تھا، جنھیں قسمت نے ٹھکانے لگا دیا تھا، ان کے بارے میں فوج اور عوام کی تحسینِ سوگوار میں کسی قسم کی مضحکہ خیزی نہیں تھی، حاکم مطلق سے رعایت کے بعد بھی D کے بشپ جیسا دل، تقدس سے مملو اور متاثر کن خدوخال کو فراموش نہیں کر سکتا تھا جو ایک عظیم قوم کے عظیم انسان نے اس وقت پیش کیا تھا جب وہ پاتال میں جانے کے قریب تھا۔

اس استثنا کے بعد، وہ تمام معاملات میں سچا، منصفانہ، دانش مند، منکسر اور باوقار، فیاض و مہربان تھا، جو ایک اور قسم کی فیاضانہ صفت ہوتی ہے۔وہ پادری تھا، خردمند تھا اور آدمی تھا۔اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ سیاسی نظریات میں بھی، جس پر ہم نے اس کی ابھی سرزنش کی ہے، جس کی ہم سختی سے جانچ کرتے ہیں، وہ متحمل مزاج اور اس کے علاوہ، شاید، زیادہ آسان تھا، ہم سے، جو یہاں بات کر رہے ہیں۔شہنشاہ نے ٹاؤن ہال کے دربان کا تقرر کیا تھا۔وہ ایک عمر رسیدہ، درمیانہ درجے کا سابق فوجی افسر تھا، Austerlitz کے لیجن آف آنر کا رکن، اور اتنا ہی بوناپارٹیا تھا جیسے عقاب۔ بے چارہ کبھی کبھی بے پروائی سے کچھ کہہ جاتا تھا، جو اس وقت کے قانون کے مطابق فتنہ انگیزی کے زمرے میں آتا تھا۔جب لیجن آف آنر سے شاہی کا اخراج ہو گیا، جب وہ کبھی اپنے رجمنٹ کی وردی نہیں پہنتا تھا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا، وہ اپنی صلیب لگانے پر مجبور نہیں۔اس نے نپولین کی دی ہوئی صلیب سے شاہی شبیہ خود ہی نکال دی تھی؛ جس کی وجہ سے وہاں ایک سوراخ سا ہو گیا تھا، جس جگہ اس نے کچھ نہیں لگایا تھا۔وہ کہتا تھا کہ مر جانا پسند کروں گا مگر اپنے دل کے قریب یہ تین مینڈک

نہیں لگاؤں گا۔ لوئی ہشت دہم کو دیکھ کر طنز کا اظہار کرنے لگتا تھا، ''یہ قدیم لنگڑی تخلیق اور انگریزی جرابوں میں!'' اس نے کہا، ''اس سے کہو کہ اپنی اس قطار کو لے کر روس چلا جائے۔'' اپنی نفرین میں وہ خوشی سے وہ چیزیں شامل کرتا تھا جو اسے سب سے زیادہ بیزار کرتی تھیں؛ پروشیا اور انگلستان۔ وہ یہ سب اتنی بار کرتا تھا کہ اس کی نوکری چلی گئی۔ اسے، بیوی بچوں سمیت گھر سے نکال دیا گیا۔ بشپ نے ایک دن اسے بلا بھیجا، ہلکی سے سرزنش کی اور کتھیڈرل میں قاصد کی ملازمت دے دی۔

نو برس کے عرصے میں مقدس کاموں اور میانہ رو اطوار کے ذریعے موں بنمیور نے D کے شہر کو ایک قسم کے نرم خو تقدس سے بھر دیا تھا۔ حتیٰ کہ لوگوں نے بھی نپولین کے بارے میں اس کے طور طریقوں کو خاموشی سے نظر انداز کر دیا تھا، اور ان لوگوں کو بھی جو شہنشاہ کی پرستش کرتے تھے، مگر اپنے بشپ سے محبت کرتے تھے۔

۞

موں سِنیور ویلکم کی تنہائیاں

ہر بشپ، تقریباً ہمیشہ، چھوٹے چھوٹے پادریوں کے ایک اسکواڈرن کے نرغے میں رہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک جرنیل نوجوان افسروں کے غول کے حصار میں۔ ان کو دل موہ لینے والا Saint Francois de Sales چوزے پادری کہا کرتا تھا۔ ہر حرفت کے اپنے طالب ہوتے ہیں، جو قطار بناتے ہیں ان لوگوں کی جنھوں نے اس میں برتری حاصل کر لی ہو۔ ایسی کوئی طاقت نہیں ہوتی جس کے اپنے تابعین نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی طالع نہیں ہوتا جس کی اپنی عدالت نہ ہو۔ مستقبل کے جویا شان دار حال کے گرداب ہوتے ہیں۔ ہر بڑے شہر کے اپنے کارکن افسران ہوتے ہیں۔ ہر بشپ جس کے پاس کم روحانی طاقت ہو، اس کے اطراف مدرسوں سے آیا ہوا ایک فرشتہ گشت کرتا رہتا ہے، اور کلیسائی محل میں نظم وضبط برقرار رکھتا ہے اور موں سنیور کے تبسم پر گارڈ تیار کر دیتا ہے۔ کسی ماتحت پادری کے لیے بشپ کو خوش رکھنا ہمہ وقت ایک پیر رکاب میں رکھنے کے برابر ہوتا۔ ضروری ہے کہ انسان اپنے راستے پر احتیاط چلے؛ نبوت مشتق پادریوں کی تحقیر نہیں کرتی۔

جس طرح ہر طرف بڑے وگ پوش ہوتے ہیں، اسی طرح کلیسا میں ہر طرف کلاہ پوش ہوتے ہیں۔ ایسے بشپ بھی ہوتے ہیں جن کا عدالتوں میں احترام کیا جاتا ہے، جو ثروت مند ہوتے ہیں، نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں، ہنرمند ہوتے ہیں، دنیا انھیں تسلیم کرتی ہے، جنھیں دعا کرنی آتی ہے، اور بلاشبہ یہ بھی جانتے ہیں کہ التجا کس طرح کی جاتی ہے، پورے کلیسائی علاقے کو نچانا جن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے، جو تبرکات گاہ اور سفارت گاہ کے درمیان زنجیر کی کڑی ہوتے ہیں، جو مبلغ کے بجائے پادری ہوتے ہیں، بشپ کے بجائے اونچے درجے کے اسقف ہوتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ جن کی ان تک رسائی ہوتی ہے۔ صاحبانِ رسوخ ہونے کے باعث وہ اپنے اطراف

فوارہ تخلیق کر لیتے ہیں، نعمتیں برسانے کے لیے، ثابت قدم اور مراعات یافتہ پر، اور ان تمام جوان آدمیوں پر جو بڑی بیرشوں، پادریوں کی مجلسوں، بڑے پادریوں، کتھیڈرل اسامیوں، اور کلیسائی اعزازات کے حصول کے لیے خوش کرنے کے فن کو سمجھتے ہیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے ہیں، وہ اپنے طفیلیوں کو ترقی بھی دیتے ہیں؛ ایک پورا نظامِ شمسی ہے جو رواں ہوتا تھا۔ان کی درخشندگی ان کے لباسوں پر ارغوانی چھوٹ ڈالتی ہے۔ان کی خوش حالی،پس منظر میں، چھوٹی چھوٹی ترقیوں میں ریزہ ریزہ ہوتی ہے۔ جتنی بڑی مربی کی کلیسائی قلمرو،اتنی ہی فربہ curacy منظورِ نظر کے لیے۔ اس کے بعد آتا ہے روم۔ایک بشپ جو آرچ بشپ بننے کا طریقہ جانتا ہے، ایک آرچ بشپ جو جانتا ہے کہ کارڈینل کیسے بنا جاتا ہے، آپ کو conclavist کی صورت میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے؛ آپ پاپائی حلقۂ اختیار میں داخل ہوتے ہیں، آپ کو ایک جبہ ملتا ہے پہننے کے لیے، اور ہوشیار! آپ ایک آڈیٹر، پھر پاپائی چیمبرلین، پھر موں سنیور،اور پھر Grace سے Eminence صرف ایک قدم ہوتا ہے، اور Eminence سے Holiness تک پہنچنے کے لیے صرف چمنی سے انتخاب کا دھواں نکلتا ہے۔ کھوپڑی کی ہر ٹوپی تاج کا خواب دیکھ سکتی ہے۔ان دنوں صرف مبلغ ہی باقاعدہ طریقے سے بادشاہ بن سکتا ہے؛ اور بادشاہ بھی کیسا؟ سب سے بڑا بادشاہ! پھر کیا خوب پودگاہِ توقعات ہوتی ہے مدرسہ! کتنے شرماتے نغمہ سرا، کتنے جوان چھوٹے پادری اپنے سروں پر دودھ کے برتن رکھ کر چلتے ہیں۔ کون جانے آرزو کو پیشہ بنا کتنا آسان ہوتا؟ اور بے چارہ عقیدت مند، نیک نیتی میں، اتفاقیہ طور پر خود کو دھوکا دینے میں گرفتار رہتا ہے۔

موں سنیور ریاں ویئیو،بے چارہ، فروتن، خلوت پسند، بڑی کلاہ والوں کے درمیان کسی گنتی میں نہیں تھا۔صاف ظاہر ہے کہ اس کے پاس نوجوان پادری نہیں تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے پیرس سے کسی کو نہیں لیا تھا۔ ایک بھی مستقبل [نوجوان پادری] نے اس تنہا بوڑھے کے ساتھ منسلک ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھوٹنے والی ایک کونپل نے بھی اپنے پتے اس کے سایے میں رکھنے کی حماقت نہیں کی۔اس کے تمام منشی، اور عمر رسیدہ گرانڈ وِکر، اس کے جیسے ہی عامیانہ، اس کے عمل داری میں دیوار کے مانند کھڑے تھے، جنھیں درمیاں سے کارڈینل بن کر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اور کون اپنے بشپ جیسا تھا بھی؛ بس اتنا فرق تھا کہ سب چلے ہوئے کارتوس جیسے، کسی کام کے نہیں تھے۔ موں سنیور ریاں ویئیو کے زیرِ سایہ بڑھنے کی عدم امکانیت کا اتنی اچھی طرح احساس تھا کہ ان لوگوں کی بھی، جن کا اس نے خود تقرر کیا تھا، مدرسے سے نکلتے ہی Aix یا Auch کے آرچ بشپوں سے سفارش ہو جاتی اور وہ فوراً نکل بھاگتے تھے۔ مختصر یہ کہ اگرچہ ہم اس بات کو دہرا رہے ہیں، لوگ

چاہتے تھے کہ ان کو دھکا دے کر نکال دیا جائے۔ ایک سینٹ جو اچانک نفس کشی کے دوروں میں مبتلا ہو جائے خطرناک پڑوسی بن جاتا ہے: وہ چھوت، نا قابلِ علاج مفلسی، جوڑوں کے اکڑ جانے جیسے عارضے کے ذریعے آپ سے رابطہ کرتا ہے۔ یہ آگے بڑھنے کے معاملے میں فائدہ مند ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ خواہشوں سے دست برداری کی صورت، اس روگ لگانے والی خوبی کا راستہ روک دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی موں سینیو ریاں وینیو کی علاحدگی کی تنہائی کی۔ ہم ایک بے رونق سماج کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔ کامیابی! یہی وہ سبق ہے جو بد عنوانی کی ڈھلان سے قطرہ قطرہ گرتا رہتا ہے۔

روا روی میں کہا جا سکتا ہے کہ کامیابی نہایت ذرا فنی شے ہوتی ہے۔ اس کی لیاقت سے غلط شباہت لوگوں کو دھوکا دیتی ہے۔ اس لیے کہ عوام کے نزدیک اس کا تقریباً وہی خاکہ ہوتا ہے جیسے کہ برتری کی لیاقت [عظیم یونانی ریاضی دان] Menaechmus کی صورت ایک دھوکا ہوتی ہے، جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔ نوجوان اور کم کو لوگ ہی اس کے شائق ہوتے ہیں۔ ہمارے دور میں، ایک قسم کا فلسفہ، جو تقریباً سرکاری طور پر جاری ہوگیا ہے، کامیابی کی خلعت پہنتا ہے، پیش دالان کا کام دیتا ہے۔ کامیاب ہونا ایک نظریہ ہے۔ خوش حالی وسعت پر بحث کرتی ہے۔ لاٹری جیت لیجیے، اور آپ چالاک آدمی بن جاتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو جیت جاتا ہے محترم ہو جاتا ہے۔ منہ میں چاندی کا چمچا لیے پیدا ہوئیے۔ ہر شے مل جاتی ہے۔ خوش قسمت ہو جائیے، اور آپ کو بقیہ سب کچھ مل جائے گا؛ خوش رہیے، اور لوگ سمجھیں گے کہ آپ اچھے آدمی ہیں۔ پانچ یا چھ لا انتہا استثناؤں سے الگ جو کسی صدی کی چمک دمک کی بنیاد بنتی ہیں، ہم عصر تعریف و توصیف سوائے کم نظری کے کچھ نہیں۔ ملمع کرا سونا ہوتا ہے۔ اتفاق سے پہلے پہنچ جانے میں کوئی ہرج نہیں ہوتا، بشرطے کہ آپ پہنچ جائیں۔ عام افراد کا گلہ Narcissus کی مثال ہوتا ہے جو خود اپنی پرستش کرتا ہے، اور عامیانہ گلّے کی تعریف کرتا ہے۔ کیا بہت بڑی صلاحیت کے طفیل کوئی موسیٰ، اکیلس، دانتے، مائیکل انجیلو یا نپولین بن جاتا ہے، ؟ یکی بہت سی مثالیں ہیں، اور اظہارِ تحسین کے ذریعے بھی، جس سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ کوئی نمایاں شخصیت اپنی نائب کی صورت میں اپنی قلبِ ماہیت کر کے دکھائے؛ کوئی Corneille جیسا [موسیقار] Tiridate تیار کر کے دکھائے؛ کوئی خواجہ سرا ذرا اپنا حرم بنا کر دکھائے؛ کوئی فوجی [شاعر] Prudhomme کسی عہد کی حادثاتی طور پر ہونے والی فیصلہ کن جنگ جیت کر دکھائے؛ کوئی دوا ساز Sambre اور Meuse کی افواج کے لیے دفتی سے بنے جوتوں کے تلے بنائے اور اسی دفتی سے، جو چمڑے کی طرح بیچی جا رہی ہو، چار لاکھ فرانک کی آمدنی کر کے دکھائے؛ تخمِ خنزیر کا بنڈل باندھنے والا معمولی کارکن سود خوری کا کام کرے اور اسی سے سات یا آٹھ ملین پیدا کر

کے دکھائے، وہ خود جس کا باپ ہو اور خود جس کی ماں ہو؛ کوئی مبلغ ناک سے ادا ہونے والی لکنت کی طاقت سے بشپ بن کر دکھائے؛ ذرا کسی نفیس خاندان کا مہتمم ملازمت سے فراغت پر اتنا دولت مند ہو کر دکھائے کہ اس کو مالیات کا وزیر بنا دیا جائے — لوگ اس کو جوہرِ قابل کہیں گے، بالکل اسی طرح جیسے وہ Mousqueton Beauty اور Claude Majesty کے انداز کو پیش کرتے ہیں۔ لوگ تو خلائی کہکشاں کے ساتھ پاتال کے ستاروں کو بھی منتشر کرنے لگتے ہیں جو بطخوں کے پنجوں سے بنے نرم ململ سے بنے ہوتے ہیں۔

❁

اس کا یقین کیا تھا

ہمیں D کے بشپ پر قدامت پسندی کا نشان لگانے کا حق نہیں۔اس جیسی روح کی موجودگی میں ہمارے ذہن میں سوائے احترام کے اور کچھ نہیں آتا۔ایک اچھے انسان کے ضمیر کو اس کے کہے کے مطابق قبول کر لینا چاہیے۔مزید یہ کہ اگر کچھ عادتیں والدین سے ملتی ہیں تو ہمیں اعتراف ہے کہ انسانی جوہر کے حسن کی نشوونما کی بھی جا سکتی ہے جو ہمارے اپنے جوہر سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اس اصول یا اس نظریے کے بارے میں ہم کیا سوچتے ہیں؟ ضمیر کے اس ثالث کے اندرون کے راز تو صرف قبر کو ہی معلوم ہوتے ہیں، جہاں ہماری روحیں بالکل برہنہ داخل ہوتی ہیں۔وہ نکتہ جس پر ہم یقین رکھتے ہیں، یہ ہے کہ ان کے معاملے میں عقیدے کی مجبوریاں کبھی مکر و فریب پر منتج نہیں ہوئی ہیں۔ہیرا کبھی خراب نہیں ہوتا۔جہاں تک ممکن ہوتا وہ یقین کرتا تھا۔وہ اکثر حیرت سے چیخ کر "Credo in Patrem." کہا کرتا تھا۔مزید یہ کہ وہ اچھے کاموں سے اسی قدر اطمینان اخذ کرتا تھا جو اس کے ضمیر کے لیے کافی ہوتا ہے؛ انسان سے سرگوشی میں کہتا، "تم خدا کے ساتھ ہو۔"

وہ نکتہ جس پر غور کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ بشپ کے عقیدے کا اندرون و بیرون، محبت ہی محبت تھا۔اس معاملے میں — چوں کہ وہ بہت محبتی تھا — ہماری افسردہ دنیا کے پسندیدہ انداز بیان کے مطابق، جہاں خود بینی نمود و علم سے احکام وصول کرتی ہے "سنجیدہ لوگ"، "سخت لوگ" اور "معتدل مزاج لوگ" اس کو زد پذیر گردانتے تھے۔یہ فراوانیِ محبت کیا شے تھی؟ یہ ایک پُرسکون جذبہ خیر اندیشی تھا جو لوگوں میں اُبلا پڑتا تھا، اور جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، جو اکثر و بیشتر اشیا تک پہنچ جاتا تھا۔اس کی زندگی تحقیر کے جذبے سے عاری تھی۔وہ خدا کی مخلوق سے شفقت سے پیش آتا تھا۔ہر آدمی، حتیٰ کہ بہترین آدمی میں بھی ایک بے خیال درشتگی ہوتی ہے،

جسے وہ جانوروں کے لیے مخصوص رکھتا ہے۔D کے بشپ میں یہ درشتگی نہیں تھی، جو بہر حال، بہت سے مبلغین سے مخصوص ہوا کرتی ہے۔ وہ بہ ہموں کی حد تک نہیں جاتا تھا، مگر ہمیشہ Ecclesiastes کے اس قول کو نظر میں رکھتا تھا، ''کون جانے کہ جانور کی روح کہاں جاتی ہے''۔ منظر کی ہیبت ناکی، جبلت کا بگاڑ، اس کو پریشان نہیں کرتا تھا، نہ ہی اس کے غضب کو ابھارتا تھا، بلکہ وہ اس کو جذباتی کردیتے تھے، نرم کردیتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبھی کبھی وہ جان بوجھ کر زندگی کی حدوں سے پرے کسی تلاش میں چلا جاتا ہے، جو ظاہر ہے، مقصد ہے، تشریح ہے یا ان کے لیے بہانہ ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ وہ خدا سے ان سزاؤں کی تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ بغیر کسی غصے کے، اور ایک زبان داں کی آنکھ سے جانچتا تھا، جو کسی حجری کاغذ کے ٹکڑے پر لکھے کی رمز کشائی کر رہا ہو، ابتری کے اس حصے کی، جو فطرت میں اب بھی موجود ہے۔ آپتا رجیسا یہ جذبہ اس سے غیر معروف کہاوتیں کہلواتا تھا۔ ایک صبح وہ اپنے باغیچے میں تھا، اور سمجھا کہ وہ اکیلا ہے، مگر اس کی بہن اس کے پیچھے چل رہی تھی، جسے اس نے دیکھا نہیں تھا۔ اچانک وہ رُکا، زمین پر پڑی کسی شے پر نظر کی؛ وہاں ایک بڑی، کالے رنگ کی، خوف ناک مکڑی تھی۔ اور اس کی بہن نے اس کو کہتے سنا:

''بے چاری حیوان! یہ اس کی غلطی نہیں۔''

الٰہی، تقریباً خداداد بچکانہ، مہربانی کی کہاوت کو بیان کیوں نہ کیا جائے؟ کتنی ہی طفلانہ کیوں نہ ہو؛ مگر اس قسم کا ارفع بچکانہ پن سینٹ فرانسیس آف اسیسی اور Marcus Aurelius سے بھی مخصوص تھا۔ ایک دن، ایک چیونٹی کو کچلے جانے سے بچانے کی کوشش میں اس کے پیر میں موچ آگئی تھی۔ اس طرح یہ انصاف پسند انسان زندگی گزارتا تھا۔ کبھی کبھی باغیچے میں اسے نیند آجاتی تھی، تب وہاں زیادہ احترام ممکن نہیں ہوتا تھا۔

اگر اس کے لڑکپن، بلکہ نوجوانی کی باتوں پر یقین کرلیا جائے تو موں سئیور بیاں ویئیو ماضی میں ایک جذباتی اور غالباً متشدد آدمی تھا۔ اس کی خوش خلقی جبلتی کم، عظیم یقین یابی کا نتیجہ زیادہ تھی، جو اس کے اندازِ حیات سے اس کے دل میں اتر گئی تھی، جیسے آہستگی سے قطرہ بہ قطرہ، خیال بہ خیال، مسلسل گرتا ہوا پانی کا قطرہ چٹان میں سوراخ بنادیتا ہے۔ یہ سوراخ مٹائے نہیں جاسکتے، ان بناوٹوں کو تباہ نہیں کیا جاسکتا۔

1815ء میں، جیسا کہ ہمارے خیال میں، ہم کہہ چکے ہیں، اس کی پچھترویں سال گرہ آئی تھی مگر وہ پچاس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ وہ بالا قد نہیں تھا؛ بھرے بھرے جسم کا آدمی تھا؛ اور اس رجحان کا مقابلہ کرنے کے لیے خاصا پیدل چلتا تھا؛ اس کے قدم جمے ہوئے پڑتے تھے، اور اس

کا پیکر قدرے کج تھا، مگر ان تفصیلات کے بہانے ہم کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ گریگوری شانز دہم، اسی برس کی عمر میں خود کو تنا ہوا اور تبسم آمیز رکھتا تھا، جو اس کو خراب بشپ بننے سے روک نہیں سکا تھا موں سنیور ویکم کا، جیسا کہ لوگ کہتے تھے، مرغوب صورت تھا، مگر وہ اتنا خوش خلق آدمی تھا کہ لوگ اس کی اس خوب صورتی کو بھول جایا کرتے تھے۔

جب وہ طفلانہ انداز میں بات کرتا تھا، جو اس کی دل موہ لینے والی خصوصیتوں میں سے ایک تھی، جس کے بارے میں ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لوگ اس کی قربت میں آرام محسوس کرنے لگتے تھے، اور اس کے پورے وجود سے درخشندگی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی گلابی جلد، اس کے بے حد سفید دانت، جو اس نے صحیح و سالم رکھے تھے، جو مسکراہٹ میں واضح ہو جاتے تھے، اس کا سادہ اور کھلا مزاج اس کو وہ کیفیت دیتے تھے جس کے باعث جوان لوگ اس کو "بہت اچھا دوست" اور بوڑھے لوگ اس کو "ایک نفیس آدمی" کہتے تھے۔ اگر یاد کرنے کی کوشش کی جائے تو یہی وہ اثر تھا جو اس نے نپولین پر بھی چھوڑا تھا۔ پہلی ملاقات پر، اور اس کے لیے جو اس سے پہلی بار ملا ہو، سوائے ایک اچھے انسان کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر جب کوئی چند گھنٹے اس کے قریب یا ساتھ رہتا تھا تو نفیس آدمی بالکل تبدیل ہو جاتا اور اس میں کچھ حاوی معیارات سامنے آجاتے تھے، مگر میں بتا نہیں سکتا کہ وہ معیارات کیا ہوتے تھے؛ اس کے چوڑی سنجیدہ بھنویں، اس کے سفید کھلتے ہوئے رنگ پر محترم ہو جاتی تھیں، اور مراقبے کے باعث مزید محترم ہو جاتی تھیں۔ اس کی اچھائیاں جاہ و جلال پھیلاتی تھیں، اگر چہ اس کی اچھائیوں کا جلال کم نہیں ہوتا تھا۔ دیکھنے والے میں عزت، ناقابلِ بیاں عزت، سرایت کرنے لگتی، اور ابھر کر اس کے دل تک پہنچ جاتی تھی؛ اس کے سامنے ہی احساس اتنا عظیم ہو جاتا تھا کہ وہ محض احساس نہیں رہتا تھا، ایک عجیب روح معلوم ہونے لگتا تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مذہبی عہدے کے جشن، عطائے خیرات، دکھ درد سہنے والوں کی دل جوئی، برادری، کفایت شعاری، مہماں نوازی، دست برداری، اعتماد، مطالعہ اور کام وغیرہ سے اس کی زندگی لبریز رہتی تھی۔ لبریز ہی صحیح معنوں میں وہ لفظ ہے جو بشپ کی مصروف زندگی کے، اچھے لفظوں اور اچھے کاموں سے عبارت ہے۔ پھر بھی، اس کا کوئی دن اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا تھا، اگر سونے سے قبل سردی یا بارش اسے باغیچے میں کام کرنے سے روک دیتی، اور دونوں خواتین بھی سونے چلی نہیں جاتی تھیں۔ یہ سب اس کے لیے رسم کی سی حیثیت اختیار کر گئے تھے، جن کے ذریعے وہ خود کو شب خوابی کے لیے، مراقبے کے لیے اور خوابوں کی جنت کے نظاروں کے لیے تیار کرتا تھا۔ کبھی، اگر دونوں عورتیں سوئی نہیں ہوتیں تو وہ بشپ کے رات گئے آہستہ آہستہ چلتے قدموں

کی آوازیں سنی تھیں۔ ایسے میں وہ اکیلا ہوتا تھا، جب وہ اپنے مبہم، پُرسکون، خود سے راز و نیاز کرنے والے دل کا ایتھر کے غیر مضطرب ماحول، اور خدا کی پیدا کردہ خلاؤں اور کہکشاؤں کے قابلِ دید جلووں سے تقابل کرتا تو اس کا دل ان احساسات کے لیے وا ہو جاتا تھا جو اوروں کے لیے نامعلوم ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب گُل ہائے شبینہ اپنی خوش بوئیں بکھیرتے، ستاروں بھری راتوں میں کسی دیے کی طرح جگمگاتے تو وہ اپنا دل پیش کر دیتا تھا؛ جب وہ اپنے آپ کو کائناتِ تخلیق کی سرمستی کے درمیان انڈیل دیتا تھا، وہ خود کو بھی بتا نہیں سکتا تھا کہ اس کے روح کن خیالات سے گزر رہی ہے؛ اس کو محسوس ہوتا تھا گویا کوئی شے اس میں سے پرواز کر رہی ہو۔ یہ ایک قسم کا پُراسرار تبادلہ ہوتا تھا روح کے پاتالوں کا، کائنات کے پاتالوں سے!

وہ خدا کے وجود کے جاہ و جلال کے بارے میں، مستقبل کی ابدیت کے بارے میں، متحیر کر دینے والے اسرار و رموز کے بارے میں؛ ماضی کی ابدیت کے بارے میں جو اب بھی زیادہ حیرت انگیز ہے، سوچتا رہتا تھا؛ ان تمام ابدیتوں کے بارے میں جو اس کے تمام احساسات میں، آنکھوں کے نیچے سوراخ بناتی داخل ہو گئی ہیں؛ اور نا قابلِ فہم کے فہم کی تلاش پر غور کرتا رہتا تھا۔ اس نے خدا کا مطالعہ نہیں کیا تھا، خدا کے وجود کے نور نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ ایٹم کے عظیم الشان اتصال پر غور کرتا تھا جو مادے کو روپ دیتے ہیں، تصدیق کے ذریعے طاقتوں کو آشکار کرتے ہیں، افراد کو ہم آہنگی میں تخلیق کرتے ہیں، ان ہمت کی لاانتہا میں، اور روشنی کے ذریعے حسن کی تخلیق کرتے ہیں۔

وہ لکڑی کی بنچ پر بیٹھا ایک پرانی انگور کی بیل کی جانب پشت کیے ہوتا تھا؛ اس کی نظریں ستاروں پر، ماضی پر اور پھلوں کے درختوں کے نازک نامکمل خاکوں پر جمی ہوتی تھیں۔ ایک چوتھائی ایکڑ کا یہ علاقہ جس پر مشکل سے روئیدگی ہوتی تھی، جو عمارتوں اور سائبانوں سے گھرا ہوا تھا، اس کو بہت عزیز تھا اور اس کی طلب کے عین مطابق تھا۔

اس عمر رسیدہ شخص کو اور کس شے کی ضرورت تھی، جس نے اپنی زندگی کو دن میں باغبانی اور رات میں گیان دھیان میں تقسیم کر رکھا تھا، جس کی تفریح بہت کم ہوا کرتی تھی؟ کیا یہ تنگ احاطہ بندی، جس میں آسمان ایک سقف کی مانند تھا، خدا کے روحانی کاموں کے باعث پرستش کے لیے کافی نہیں تھی؟ کیا ادراک کے لیے یہ سب کافی نہیں؟ ہماری توقعات کے لیے اور خواب دیکھنے کے لیے اور باقی کیا رہ گیا ہے؟ ایک چھوٹا سا باغیچہ جس میں چہل قدمی کرنا، اور بے پایاں وسعتیں جس میں خواب بھی دیکھنا، کسی کے قدموں تلے جو بویا بھی اور اُگایا بھی جا سکتا ہے۔ سر کے اوپر جس کا مطالعہ اور مراقبہ کیا جا سکتا ہے: کچھ پھول زمین پر ہیں اور تمام ستارے آسمان میں ہیں۔

اس کی سوچ

آخری چند جملے!

چوں کہ اس قسم کی تفصیلات، بالخصوص اس موقعے پر، جن کا اظہار اب فیشن بن گیا ہے، D کے بشپ کو وحدت الوجود کی قیافہ شناسی کا موقع فراہم کرتی ہیں، اور اس کے حق میں یا اس کی مخالفت میں، اس یقین کو شامل کرتی ہیں کہ اس نے ان ذاتی فلسفوں میں سے ایک کو ذہن میں رکھا ہے جو ہماری صدی سے مخصوص ہیں، جو کبھی کبھی بالکل تنہا جذبات بن کر ابھرتے ہیں اور اس وقت تک ایک پیکر کی شکل اختیار کیے رہتے ہیں جب تک کہ مذہب کا حق مار نہیں لیتے، اور ہمیں اس پر اصرار ہے کہ ان میں سے کسی بھی شخص نے جو موں سنیور ویکم سے واقف رہا ہوگا، یہ نہیں سوچا ہو گا کہ وہ ان کے بارے میں بھی ایسے خیالات رکھ سکتا ہے۔

نظام کوئی نہیں؛ کام بہت۔ دقیق غور و فکر میں درد سر شامل ہوتا ہے؛ نہیں، وہاں ایسی کوئی شے نہیں جو اشارہ کرتی ہے کہ اس نے اپنے دماغ کو کشف و الہام میں الجھانے کا خطرہ مول لیا ہے۔ نبی ہمت والا ہو سکتا ہے مگر بشپ کو بزدل ہونا چاہیے۔ اس نے شاید بہت پہلے سے خود کو ایسے دور دراز کے معاملات میں الجھا لیا ہے جو بڑے ذہنوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ چیستانوں کے سائبانوں کے نیچے ایک مقدس خوف ہوتا ہے؛ اور افسردگی کے تمام شگاف وہاں منہ کھولے کھڑے ہوتے ہیں، مگر کوئی شے ہے جو آپ کو بتاتی ہے کہ، آپ، یعنی زندگی کی راہ سے گزرنے والے مسافر، کو اس میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ افسوس اس پر، جو اس میں داخل ہو جاتا ہے۔

تجریدیت کی ناقابلِ دخول گہرائیوں اور خالصتاً قیاس آرائیوں میں جوہر قابل لوگ، عقائد سے بلند ہو کر، خدا کے سامنے اپنی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ ان کی التجا گستاخی سے الجھنے لگتی

ہے۔ ان کی پرستش جمع خرچ کرتی ہے۔ مذہب کا یہی سیدھا راستہ ہے، جو اس کے لیے تشویش اور ذمے داری سے بھرا ہوتا ہے، جو اس کی عمودی ڈھلانوں کو سر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

انسانی مراقبے کی حدود نہیں ہوتیں۔ یہ اپنی ذمے داری اور خطرات پر، خود اپنی چندھیاہٹ کی گہرائی میں جاتا ہے اور تجزیہ کرتا ہے: یہ فطرت کو بھی چندھیا دیتا ہے۔ پُر اسرار دنیا جو ہم کو گھیرے ہوتی ہے، ہم کو وہ کچھ فراہم کر دیتی جو اس سے حاصل کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ارادہ کرنے والے ارادہ کیے ہوتے ہیں۔ سو وہ جس طرح کے بھی ہوں زمین پر سے آدمی ہی ہوتے ہیں — کیا وہ آدمی ہوتے ہیں؟ — افق کے کناروں پر غور سے دیکھنے کی کوشش کیجیے، کون ہیں وہ جنھیں لاانتہا پہاڑوں کے خوف ناک مناظر دکھائی دیتے ہیں؟ موں ہتیور ان آدمیوں میں سے ایک تھا؛ موں ہتیور جوہرِ قابل نہیں تھا۔ اسے ان ذیلی حدود کا خوف رہا ہوگا، جہاں سے کچھ بہت بڑے آدمی بھی، مثلاً سویڈن بورگ اور پاسکال، پھسل کر دیوانے پن کے پاتال میں چلے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان طاقت ور لوگوں کی اپنی اخلاقی ضروریات ہوتی ہیں، اور ان مشکل راہوں کے ذریعے مثالی تکمیل کے مدارج تک پہنچا جاتا ہے۔ اس نے وہ راستہ اختیار کیا تھا — انجیلِ مقدس کا راستہ — جو سفر کو کم کر دیتا ہے۔

اس نے اپنے مذہبی بالاپوش کو عالی جاہ کے درجے تک پھیلانے کی کوشش نہیں کی تھی؛ اس نے ابھرتے ہوئے واقعات پر مستقبل کی کوئی کرن نہیں ڈالی تھی؛ اس نے اشیا کی روشنی کی شعلے میں تکشیف کرنا نہیں چاہی تھی؛ اس میں نہ پیغمبری کی کوئی رمق تھی اور نہ جادوگری کی۔ یہ خاکسار شخص محبت کرتا تھا، اور بس۔

یہ کہنا کہ وہ دعا کو کسی 'سپر ہیومن' کی توقعات کے بلند مقام تک لے جانا چاہتا تھا، ممکن ہے؛ مگر کوئی زیادہ محبت تو کر سکتا ہے، زیادہ دعا نہیں کر سکتا؛ اور اگر متون سے بڑھ کر دعا کرنا کفر ہوتا تو سینٹ تھریسیا اور سینٹ جیروم بھی کافر ہوتے۔

وہ ان تمام کراہوں اور تلافیوں کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ پوری کائنات اسے ایک لاانتہا بیماری جیسی لگ رہی تھی؛ ہر جگہ اس کو بخار محسوس ہوا، ہر جگہ اس نے دکھوں کی آوازیں سنیں، اور معما حل کیے بغیر وہ زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگا تھا۔ تخلیق شدہ اشیا کے بھیانک نظارے نے اس کے اندر گداز پیدا کر دیا تھا؛ وہ صرف اپنی تلاش میں مصروف ہو گیا، اور دوسروں کو رحم دلی اور اعانت کرنے کی تلقین کر رہا تھا، کہ جو کچھ بھی تھا، اس اچھے اور غیر معمولی مبلغ کے لیے، ایک مستقل افسردگی کا موضوع تھا جس کی اشک شوئی کی ضرورت تھی۔

کچھ لوگ سونا نکالنے میں محنت کرتے ہیں؛ وہ رحم نکالنے میں محنت کرتا تھا۔ کائناتی دکھ اس کے لیے کان تھی۔ افسردگی جس کا ہر طرف راج تھا، بہانہ تھی کبھی نہ ختم ہونے والی مہربانیوں کا۔ ایک دوسرے سے محبت کرو؛ بس یہی ضروری ہے، اسے اس سے زیادہ کی طلب نہیں تھی؛ یہی اس کا مکمل نظریہ تھا۔ ایک دن اس آدمی، سینیٹر نے جو خود کو فلسفی سمجھتا تھا، جس کا اشاروں میں تذکرہ کیا جا چکا ہے، بشپ سے کہا تھا، "ذرا دنیا کے نظارے پر طائرانہ نظر ڈالو؛ ہر جنگ سب کے خلاف ہے؛ اور جو سب سے طاقت ور ہے وہی سب سے ذہین ہے۔ تمھارا قول ایک دوسرے سے محبت کرو فضول بات ہے۔" "اچھا" بشپ نے جواب میں کہا، "اگر یہ فضول بات ہے تو روح کو بھی اسی طرح بند ہو جانا چاہیے جیسے صدف میں گوہر بند رہتا ہے۔" اس طرح وہ خاموش ہو گیا، وہیں رہتا رہا، وہ اس سے پوری طرح مطمئن تھا۔ ان وکھے سوالات کو ایک طرف رکھتے ہوئے جو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور خوف آور ہوتے ہیں، تجرید کے عمیق تناظر، مافوق الطبیعیات عمودی چٹانیں — وہ تمام گہرائیاں جو خدا کے نبی کے لیے ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں، جب کہ لادین کے لیے نیستی ہوتی ہیں؛ مقدر، اچھا اور بُرا، ایک وجود کا دوسرے وجود کے خلاف ہونا، آدمی کا ضمیر، حیوان کی پُرفکر خواب خرامی، موت میں قلبِ ماہیت، قبروں میں دفن وجودوں کی بازشماری، محبتوں کی متواتر قلم کاری، جوہر، مادّہ، نِل، اور Ens، روح، فطرت، آزادی، ضرورت؛ سارے عمودی مسائل، نامبارک گم نامی ہیں، جہاں ذہنِ انسانی کے قوی ہیکل فرشتے جھکتے ہیں؛ خوف ناک پاتال، Lucretius، Manou، سینٹ پال، دانتے، بجلی برساتی آنکھوں سے جن کو دیکھتے ہیں اپنی مستحکم نظر سے لاانتہا کو گھورتے ہیں جس سے ستارے بھی جل اٹھتے ہیں۔

موں سینیور بیاں ویتیو محض ایک آدمی تھا جو پُراسرار سوالات کے بیرون کو جانچے بغیر، اور اپنے دماغ کو ان میں الجھائے بغیر غور کرتا تھا اور اپنی روح کے اندرون کے اندھیروں کا احترام کرتا تھا۔

❁

ایک شام کا سفر

اکتوبر 1815ء کے ابتدائی دنوں میں، غروب آفتاب سے چند گھنٹے پہلے، ایک شخص جو پاپیادہ سفر کر رہا تھا، D شہر میں داخل ہوا۔ وہاں کے چند باسی اپنی کھڑکیوں میں یا ڈیوڑھیوں سے اس مسافر کو دیکھ رہے تھے، اور قدرے مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے زیادہ بدحال مسافر پہلے کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ اوسط درجے کے فربہ جسم کا مالک، صحت مند، چھیالیس یا اڑتالیس برس کا رہا ہوگا۔ سر پر چرمی ٹوپی، جس کے جھکے ہوئے چھجے نے جزوی طور پر اس کا سورج کی کرنوں سے جھلسا ہوا چہرہ چھپا رکھا تھا، جس سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ زرد رنگ کے کھدر جیسے کپڑے سے بنی قمیص، جس کا گلا چاندی سے بنے لنگر سے بند تھا، مگر اس کا بالوں سے بھرا سینہ دکھائی دے رہا تھا: اس نے دھاگوں سے بنا گلوبند باندھ رکھا تھا، نیلے ڈرل کی پتلون، پرانی اور خستہ، زیادہ استعمال سے ایک گھٹنے سے سفید اور دوسرے گھٹنے پر پھٹی ہوئی تھی؛ پرانا بھورے رنگ کا بلاؤز، ایک کہنی پر سبز کپڑے کا پیوند جس کو سُتلی سے سیا گیا تھا، سامان سے ٹھسا فوجیوں کا ایک تھیلا، بالکل نیا، ہاتھ میں گانٹھوں والی لمبی سی ایک لاٹھی؛ بغیر موزے کا لوہے کی نوک والا جوتا؛ گھٹا ہوا سر اور لمبی ڈاڑھی۔

پسینہ، گرمی، پیدل سفر، اور خاک دھول نے مل کر اس کو نہ جانے کیا بنا دیا تھا۔ چھوٹے کٹے ہوئے، سؤر کے جیسے سخت بال، جو بڑھنے شروع ہو گئے تھے؛ یوں لگتا تھا گویا ایک عرصے سے تراشے نہیں گئے ہیں۔

اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ بظاہر اس کا ادھر سے اتفاقیہ گزر ہو گیا تھا۔ کہاں سے آیا تھا وہ؟ جنوب سے؛ شاید ساحل کی جانب سے، اس لیے کہ وہ D میں اسی سڑک سے داخل ہوا تھا جس نے کان سے پیرس جانے والی نپولین کی شاہی سواری دیکھی تھی۔ یہ شخص سارا دن چلتا رہا ہوگا۔ بہت

تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ قدیم بازار کی کچھ عورتوں نے اس کو فوارے سے پانی پیتے دیکھا تھا جو بولیوارڈ Gassendi پر لگے پیڑوں کے نیچے گلگشت کے آخر میں واقع تھا۔ وہ بہت پیاسا رہا ہوگا: اس لیے کہ ان بچوں نے، جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، دو سو قدم آگے چل کر اس کو ایک بار پھر بازار میں لگے فوارے سے پانی پینے کے لیے رُکتے دیکھا تھا۔

Poichevert اسٹریٹ کے کونے پر پہنچتے ہی، وہ بائیں جانب مُڑ گیا، اور اس کے قدم ٹاؤن ہال کی جانب اٹھنے لگے تھے۔ وہ ٹاؤن ہال میں داخل ہوا اور چوتھائی گھنٹے کے اندر ہی واپس نکل آیا۔ دروازے کے قریب پتھر سے بنی بنچ پر، جسے مارچ کی چار تاریخ کو جنرل Drouot نے خوف زدہ باشندوں کے مجمعے کو Gulf Juan کے اعلان پڑھ جانے کے لیے نصب کرایا تھا، ایک فوجی بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی نے انکسار میں اپنی ٹوپی اتار کر فوجی کو سلام کیا۔

فوجی نے اس کے سلام کا جواب دیے بغیر اسے غور سے دیکھا، تھوڑی دیر تک آنکھوں کے ذریعے اس کا پیچھا کیا، اور پھر ٹاؤن ہال میں داخل ہو گیا۔

اس زمانے میں D میں Cross of Colbas کے نشان کے قریب ایک نفیس قسم کی سرائے تھی۔ سرائے کا مالک جیکوِن لابار (Jacquin Labarre) نام کا آدمی تھا، جو ایک اور Labarre نامی آدمی کے رشتے سے پہچانا جاتا تھا، جو گرنوبل (Grenoble) کی Three Dauphins نامی تین عدد سرائے چلاتا تھا اور Guides میں کام کر چکا تھا۔ شہنشاہ کی آمد کے موقعے پر ملک بھر میں Three Dauphins نامی سرائے کے بارے میں کئی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ گاڑی بان کے بھیس میں جنرل برٹرنڈ (Bertrand) نے جنوری کے مہینے میں کئی پھیرے لگائے تھے، اور یہ بھی کہ اس نے فوجیوں کے اعزاز میں صلیبیں تقسیم کی تھیں اور شہر کے باشندوں میں مٹھی مٹھی بھر سونا تقسیم کیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب شہنشاہ Grenoble میں داخل ہوا تھا تو اس نے پریفیکچر میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا؛ اس نے میئر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا، ''میں اپنے شناسا ایک بہادر آدمی کے گھر جا رہا ہوں'' اور وہ Three Dauphins کی طرف چلا گیا تھا۔ Three Dauphins کے Labarre کی شان Cross of Colbas کے لابار کا باعث ہوئی تھی اور شہر میں کہا جا رہا تھا کہ ''وہ گرنوبل والے کا عم زاد ہے۔''

اس مسافر نے اپنے قدم اس سرائے کی جانب موڑ دیے جو دیہات میں سب سے اچھی تھی۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا جو گلی کی سطح کے برابر تھا۔ تمام چولھے جل رہے تھے۔ آتش دان میں بھی اچھی خاصی آگ روشن تھی۔ میزبان جو باورچیوں کا سردار بھی تھا، اسٹو کی ایک

پتیلی سے دوسری پتیلی کی طرف جاتا، گاڑی والوں کے لیے بہترین ڈنر کی تیاری میں مشغول تھا، جن کی بلند آواز گفتگو، بات چیت اور قہقہے برابر والے کمرے سے آتے سنائی دے رہے تھے۔ ہر وہ شخص جو سفر کر چکا ہے، جانتا ہے کہ ایسا کوئی نہیں جو گاڑی والوں سے بہتر گپ شپ کر سکے۔ گلہری کی قسم کا ایک فربہ جانور لمبی سی ایک سیخ پر لگا، تیتروں اور جنگلی مرغیوں کے ہمراہ، آگ کے اوپر اُلٹا پلٹا جا رہا تھا؛ چولھے پر Lauzet جھیل کی دو بڑی بڑی کارپ مچھلیاں، اور Alloz جھیل کی ایک ٹراؤٹ مچھلی پکنے کے لیے چڑھی ہوئی تھی۔

میزبان نے کھلتے دروازے کی آواز سن کر ایک نو وارد کو داخل ہوتے ایک بار دیکھا، اور پھر اسٹو کی پتیلیوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہا:

''جناب، کیا چاہتے ہیں؟''

''طعام اور قیام۔''

''بہت آسان ہے۔'' میزبان نے جواب میں کہا۔ اسی وقت اس نے اپنا سر گھمایا، مسافر، پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اپنے جملے میں اضافہ کیا ''ادائیگی کے ذریعے۔''

مسافر نے اپنے بلاؤز کی جیب سے ایک بڑا سا چرمی بٹوہ نکالا، اور جواب میں کہا، ''میرے پاس رقم موجود ہے۔''

''تو پھر، ہم آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔'' میزبان نے جواب میں کہا۔

اس آدمی نے بٹوہ واپس اپنی جیب میں رکھ لیا، کاندھے سے اپنا سفری تھیلا اتارا، دروازے کے قریب زمین پر رکھ دیا، لاٹھی ہاتھوں میں لیے رہا، اور آگ کے قریب رکھے ایک نیچے سے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ D پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ وہاں اکتوبر کی راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ مگر میزبان حسبِ معمول ٹہلتے ہوئے، آنکھوں ہی آنکھوں میں مسافر کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔

''کیا کھانا جلد ہی تیار ہو جائے گا؟'' مسافر نے پوچھا۔

میزبان نے جواب میں کہا، ''فوراً۔''

مسافر آگ کے قریب بیٹھا خود کو گرم کر رہا تھا، جب کہ اس کی پشت کی جانب، جیکوئن لابار نے، اپنے جیب سے ایک پنسل نکالی، اور کھڑکی کے قریب ہی ایک میز پر پڑے پرانے اخبار سے ایک ٹکڑا پھاڑا۔ سفید حاشیے پر ایک دو سطریں تحریر کیں اور اس ٹکڑے کو اس بچے کے حوالے کیا جو اوپر کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ میزبان نے لڑکے کے کان میں کچھ کہا، اور بچہ ٹاؤن ہال کی طرف دوڑ پڑا۔

مسافر یہ سب دیکھ نہیں سکا تھا۔

ایک بار پھر اس نے معلوم کیا ''کیا ڈنر جلد ہی تیار ہو جائے گا؟''
''فوراً۔'' میزبان نے جواب میں کہا۔
بچہ واپس پہنچا۔ اپنے ساتھ کاغذ بھی واپس لایا تھا۔ میزبان نے تیزی سے کھول کر دیکھا، ایسے آدمی کی طرح جو کسی جواب کے انتظار میں ہو۔ جواب کو غور سے پڑھا، ایک لمحے اس پر غور کیا، پھر اس نے مسافر کے طرف چند قدم اٹھائے، جو اپنے خیالات میں غرق تھا، جو کچھ پُرسکون نہیں معلوم ہوتے تھے۔
''جناب، میں آپ کو یہاں ٹھہرا نہیں سکتا۔''
مسافر نصف کھڑا ہو گیا۔
''کیا؟ کیا آپ کو خوف ہے کہ میں اُجرت ادا نہیں کر سکوں گا؟ آپ چاہیں تو میں پیشگی ادائیگی کر سکتا ہوں۔ میں نے کہہ نا کہ میرے پاس رقم موجود ہے۔''
''یہ بات نہیں ہے۔''
''پھر کیا بات ہے؟''
''آپ کے پاس رقم ہے... ''
مسافر نے کہا'' ہاں!''
''اور میرے پاس'' میزبان نے کہا، ''جگہ نہیں ہے۔''
مسافر نے پُرسکون انداز میں کہا، ''مجھے اصطبل میں جگہ دے دیجیے۔''
''میں نہیں دے سکتا۔''
''کیوں؟''
''گھوڑوں نے ساری جگہ گھیر رکھی ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔'' مسافر نے جواب میں کہا، ''دو چھتی کا کوئی کونا، پیال کا ایک گٹھا۔ یہ ہم ڈنر کے بعد دیکھ لیں گے۔''
''میں آپ کو ڈنر بھی نہیں دے سکتا۔''
ٹھوس اور نپے تُلے لہجے میں کیا جانے والا یہ اعلان مسافر کو بُرا لگا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔
''اُف، مگر میں تو بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔ میں طلوعِ آفتاب کے وقت سے مسلسل چلتا رہا ہوں۔ میں تین لیگ کے برابر چل چکا ہوں۔ میں قیمت ادا کروں گا۔ میں کھانا چاہتا ہوں۔''
''میرے پاس آپ کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' میزبان نے کہا۔

مسافر قہقہہ مار کر ہنسا، آتش دان اور چولھوں کی طرف مڑا "کچھ نہیں ہے، اور یہ سب؟"

"یہ سب کسی کے لیے ہے۔"

"کس کے لیے؟"

"گاڑی بان حضرات کے لیے۔"

"کتنے ہیں، وہ سب؟"

"بارہ عدد۔"

"یہ کھانا تو بیس افراد کے لیے بھی کافی ہے۔"

"یہ سب انھوں نے اپنے لیے مخصوص کرا رکھا ہے، اور پیشگی رقم ادا کر دی ہے۔"

مسافر ایک بار پھر بیٹھ گیا، اور اپنی آواز اونچی کیے بغیر کہا، "میں ایک سرائے میں ہوں، میں بھوکا ہوں، اور میں یہیں رہوں گا۔"

تب میزبان نے جھک کر اس کے کان میں کہا، اور ایسے لہجے میں کہا کہ وہ جانے کی تیاری کرنے لگا تھا، "چلے جاؤ یہاں سے!"

اس وقت مسافر آگے کو جھکا ہوا لوہے کے چمٹے سے کچھ اشیا آگ میں ڈال رہا تھا؛ وہ فوراً مڑا اور جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ، میزبان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، اور دھیمی آواز میں مزید کہا، "بس! اس قسم کی فضول باتیں بہت ہی ہیں۔ کیا میں تمھارا نام بھی بتا دوں؟ تمھارا نام ہے ژاں ولژاں (Jean Valjean)۔ اب کیا چاہتے ہو، یہ بھی بتا دوں کہ تم کون ہو؟ جب میں نے تم کو اندر آتے دیکھا تھا اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کیا تم لکھ پڑھ سکتے ہو؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا، جو ابھی سرائے سے ٹاؤن ہال، اور ٹاؤن ہال سے سرائے تک سفر کر چکا تھا۔ اس نے کاغذ کے ٹکڑے پر نظر ڈالی۔ ایک لمحے بعد میزبان پھر گویا ہوا۔

"میری عادت ہے کہ میں ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہوں۔ اب تم چلے جاؤ یہاں سے۔"

مسافر نے سر جھکا لیا، اپنا تھیلا اُٹھایا، جو اس نے زمین پر رکھ دیا تھا، اور وہاں سے نکل گیا۔

اس نے مرکزی سڑک کا انتخاب کیا۔ سیدھا ایک طرف کو چل دیا، گھروں کے قریب سے ہوتا ہوا، ایک افسردہ اور ذلیل کیے ہوئے آدمی کی طرح۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو اس نے میزبان کو Cross of Colbas کی ڈیوڑھی پر،

سرائے کے سارے مہمانوں کے گھیرے میں کھڑا دیکھا ہوتا، اور سڑک سے گزرنے والوں کو بھی دیکھا ہوتا، جو اس کے بارے میں پُر جوش ہو کر باتیں کر رہے تھے، اور اس کی جانب انگلیاں اٹھا رہے تھے؛ اس گروہ کی نظروں میں اسے خوف اور بے اعتمادی دکھائی دے رہی تھی، اور اس کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی آمد پورے قصبے کے لیے ایک واقعہ بن جانے والی ہے۔

اس نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا۔ جو لوگ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں وہ پلٹ کر دیکھا نہیں کرتے۔ انھیں پیچھا کرتی اپنی بدقسمتی اچھی طرح نظر آتی ہے۔

اس طرح وہ کچھ دیر تک چلتا رہا، بغیر رُکے آگے کی طرف بڑھتا رہا، مختلف گلیوں پر آڑا چلتا ہوا، جن کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا، اپنی تکان سے لاپروا، جیسا کہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بہت افسردہ ہو۔ عین اسی وقت اس پر بھوک کا غلبہ ہوا۔ رات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنے اطراف نظر کی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا اسے کوئی پناہ مل سکتی ہے یا نہیں۔

ایک نفیس اقامت خانہ اس کے قریب تھا؛ مگر وہ تو کوئی معمولی سی جگہ چاہتا تھا۔ کسی سائباں کی تلاش میں تھا، کتنا ہی کم درجے کا کیوں نہ ہو۔

عین اس وقت سڑک کے بالکل آخر میں ایک روشنی نظر آئی؛ رات کے دھندلکے کے پس منظر میں اسے ایک cross beam سے لٹکی صنوبر کی شاخ نظر آئی۔ وہ اسی طرف چل پڑا۔

وہ در اصل ایک شراب خانہ تھا۔ وہی شراب خانہ جو Chaffaut اسٹریٹ پر واقع تھا۔

مسافر ایک لمحے کے لے رُکا، لوہے کی بڑی بڑی کیلوں سے مزین کھڑکی سے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا، جہاں بڑے سے الاؤ کے قریب میز پر رکھے ایک چراغ سے روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ شراب خانے کا مالک آگ تاپ رہا تھا۔ لوہے کا ایک بڑا سا برتن کسی ہُک سے آگ کے شعلوں کے اوپر لٹکا ہوا تھا اور اس میں کچھ پک رہا تھا۔

شراب خانے میں داخل ہونے کا راستہ، جو ایک قسم کی سرائے جیسا ہی تھا، دو دروازوں سے تھا۔ ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا، دوسرا ایک باڑے کی طرف، جو کھاد سے بھرا تھا۔ مسافر کی گلی والے دروازے سے اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ سے باڑے میں داخل ہوا، کچھ دیر توقف کیا، پھر آہستہ سے کنڈی اٹھائی، اور دروازہ کھول دیا۔

''کون ہے؟'' مالک نے پوچھا۔

''ایک شخص جو رات کا کھانا اور بستر چاہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم یہاں رات کا کھانا اور بستر فراہم کرتے ہیں۔''

وہ اندر داخل ہو گیا۔ سارے لوگوں نے جو شراب نوشی میں مصروف تھے، گھوم کر دیکھا۔ ایک طرف لیمپ کی روشنی تھی اور دوسرے جانب الاؤ کی۔ ان سب نے کچھ دیر اس کی طرف غور سے دیکھا، اس دوران اس نے اپنا سفری تھیلا اتار دیا تھا۔

"یہ رہا آلاؤ۔ اس برتن میں کھانا پک رہا ہے۔ آؤ کامریڈ اپنے آپ کو ذرا گرم تو کرلو۔"

وہ آگے بڑھ کر آلاؤ کے قریب بیٹھ گیا۔ آگ کی جانب اپنے پاؤں پھیلا دیے جو تکان سے چور ہو رہے تھے۔ برتن سے بہت اچھی خوش بو نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے سے جو کچھ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا، جو اس کی جھکی ہوئی ٹوپی کے نیچے تھا وہ ایک مبہم سا اطمینان تھا، جس میں ایسی تلخی کی آمیزش تھی جو دکھوں کا تحفہ ہوتی ہے۔

اس کی شخصیت، ایک مستحکم مگر غم زدہ سی تھی۔ اس کا قیافہ حیرت انگیز طریقے سے بنا تھا؛ اس کی ابتدا انکسار سے محسوس ہوتی تھی اور انتہا سختی پر۔ پلکوں کے نیچے اس کی آنکھیں ایسی نظر آتی تھیں، جیسے کسی جھاڑی کے نیچے جلتی ہوئی آگ۔

میز پر بیٹھے لوگوں میں ایک ماہی فروش تھا جو، Chaffaut اسٹریٹ کے شراب خانے میں آنے سے پہلے لابار کے اصطبل میں اپنا گھوڑا باندھنے گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن کی صبح اس کی Bras d'Asse اور ایک سڑک کے درمیان، جس کا نام بھول گیا ہوں، اس غیر دل کش اجنبی سے ملاقات ہوئی تھی۔ شاید اس کا نام تھا اسکوبلوں (Escoublon)۔ جب وہ اس شخص سے ملا تھا، اس وقت وہ بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا، اور اس نے اس کی لید اٹھانے والی گاڑی پر سفر کرنے کی اجازت طلب کی تھی؛ جس کے جواب میں ماہی فروش نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی چال ڈگنی تیز کردی تھی۔ ماہی فروش آدھ گھنٹا قبل اس گروہ میں شامل تھا جو جیکوِن لابار کے اطراف بیٹھا تھا، اور اس ناگوار واقعے کا گواہ تھا جو اس صبح Cross of Colbas کے قریب پیش آیا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا، اسی جگہ سے اس نے شراب خانے کے منتظم کو کچھ غیر مانوس قسم کے اشارے کیے۔ شراب خانے کا منتظم اس آدمی کے پاس گیا۔ آہستگی سے کچھ باتیں کیں۔ مسافر آدمی کچھ سوچنے لگا۔

منتظم الاؤ کی طرف پاس آیا، اچانک مسافر کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا، اور اس سے کہا: "تم کو یہاں سے جانا ہوگا۔"

اجنبی آہستہ سے پلٹا اور دھیمی آواز میں کہا "اوہ! تم بھی جان گئے ہو؟"

"ہاں۔"

"مجھے دوسری سرائے سے بھی نکال دیا گیا تھا۔"

''اور تمھیں یہاں سے بھی نکلنا ہوگا۔''

''تم مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہو؟''

''اور کہیں۔''

مسافر نے اپنا تھیلا، اور اپنی لاٹھی اٹھائی اور وہاں سے نکل گیا۔

وہاں سے نکلتے ہی، کچھ بچوں نے جو اس کا Cross of Colbas سے پیچھا کرتے آرہے تھے اور اس کے انتظار میں تھے، اس پر پتھر پھینکے۔ وہ غصے میں پلٹا اور ان کو اپنی لاٹھی سے دھمکایا؛ بچے چڑیوں کے جھنڈ کی طرح بکھر گئے۔

اجنبی مسافر کا گزر جیل کی طرف سے ہوا۔ دروازے کے قریب ایک آہنی زنجیر لگی ہوئی تھی، جس سے ایک گھنٹی سے بندھی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی۔

دریچہ کھلا۔

''کلید بردار!'' اس نے اپنی ٹوپی اتارتے ہوئے شائستگی سے کہا، ''مہربانی کر کے، کیا آپ مجھے اندر آنے اور ایک رات بسر کرنے کی اجازت دیں گے؟''

جواب آیا، ''یہ جیل ہے، سرائے نہیں۔ اپنے آپ کو گرفتار کروا لو، تم کو داخلہ مل جائے گا۔'' اور کھڑکی دوبارہ بند ہو گئی۔

اجنبی مسافر ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوا، جس میں بہت سارے باغیچے تھے۔ کچھ باڑھ سے گھرے ہوئے تھے، جو اس گلی کو دل خوش کُن بناتے تھے۔ ان باغیچوں اور باڑھوں کے درمیان اس کو ایک یک منزلہ چھوٹا سا مکان نظر آیا، جس کی کھڑکی روشن تھی۔ اس نے شیشے میں جھانک کر دیکھا، اسی طرح جیسے اس نے شراب خانے میں کیا تھا۔ اندر ایک بڑا سا سفیدی شدہ کمرہ تھا جس میں پھول دار چادر سے ڈھکا ہوا ایک پلنگ بچھا ہوا تھا، اور کونے میں ایک پالنا، چند چوبی کرسیاں، ایک دونالی بندوق دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے بیچ ایک میز تھی۔ معمولی درجے کے کپڑے کے میز پوش پر تانبے کا ایک لیمپ رکھا ہوا تھا، جست کا بنا، چاندی جیسا چمکتا ہوا ایک جگ، وائن سے لبریز، اور شوربے سے پُر بھاپ دیتا ہوا ڈونگا بھی رکھا ہوا تھا۔ میز پر چالیس کے پیٹے کا ایک آدمی، مسکراتے خدوخال والا، ایک چھوٹے سے بچے کو اپنے زانو پر اچھال رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک نوجوان عورت ایک اور بچے کو اپنا دودھ پلا رہی تھی۔ باپ ہنس رہا تھا، بچہ ہنس رہا تھا، ماں بھی مسکرا رہی تھی۔

اجنبی اس پُرسکون منظر کے احترام میں ایک دقیقے کے لیے ٹھٹھک گیا تھا۔ اس کے اپنے اندرون میں کیا ہو رہا تھا، صرف وہی بتا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ خوشیوں سے بھرا یہ گھر

مہمان نواز بھی ہوگا، اور ایسی جگہ سے، جس میں اتنی خوشیاں ہوں، شاید اس کو کچھ رحم بھی ملے گا۔

اجنبی نے آہستگی سے شیشے پر دستک دی۔

انھیں دستک سنائی نہیں دی۔

اجنبی نے ایک بار پھر دستک دی۔

اس نے عورت کو اپنے شوہر سے کہتے سنا، ''ڈارلنگ، مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی دستک دے رہا ہے۔''

''نہیں۔'' شوہر نے جواب دیا۔

اجنبی نے تیسری بار دستک دی۔

شوہر کھڑا ہوا، لیمپ اٹھایا، دروازے کی طرف گیا، اور دروازے کو کھول دیا۔

وہ ایک قد آور، نصف کسان، نصف دست کار آدمی تھا۔ اس نے بڑا سا چرمی ایپرن باندھ رکھا تھا جو اس کے بائیں کاندھے تک پہنچتا تھا، جس میں ایک ہتھوڑی، سرخ رنگ کا رومال لگا ہوا تھا، اور اسی قسم کی دوسری اشیا تھیں جو اندر رنگی کمر کی پیٹی میں اُڑسی ہوئی تھیں جن کا اُبھار، جیب کے ابھار کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر ذرا پیچھے کی طرف تھا؛ اس کی قمیص کھلی تھی جس میں سے بیل جیسی سفید اور صاف گردن نظر آ رہی تھی۔ موٹی موٹی پلکیں، بھری بھری مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، چہرے کا نچلا حصہ تھوتھنی جیسا؛ اور ان سب کے علاوہ اس میں اپنی زمین پر ہونے کا احساس، ناقابل بیان احساس بھی تھا۔

''معاف کیجیے گا جناب'' مسافر نے کہا، ''کیا آپ مناسب اجرت کے عوض مجھے ایک پیالہ شوربا، اور باغیچے کے سائبان کا ایک کونا شب بسری کے لیے عنایت کر سکتے ہیں؟ بتایئے، کیا آپ یہ مہربانی کر سکتے ہیں؟ اجرت کے عوض؟''

مالک مکان نے سوال کیا، ''تم کون ہو؟''

مسافر نے جواب میں کہا ''میں ابھی ابھی Puy-Moisson سے آیا ہوں۔ پورے دن پیدل چلا ہوں۔ میں لیگ کے برابر سفر کیا ہے۔ کیا آپ یہ مہربانی کر سکتے ہیں، اگر میں اس کی اجرت ادا کر دوں تو؟''

''میں کسی معقول آدمی سے، جو اجرت بھی دے رہا ہو، انکار نہیں کروں گا۔'' کسان نے کہا، ''مگر تم سرائے کیوں نہیں گئے؟''

''ان کے پاس جگہ نہیں ہے۔''

''ناممکن۔ آج نہ ہاٹ بازار کا دن ہے نہ کسی میلے ٹھیلے کا۔ تم لاباری کے پاس گئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''تو پھر؟''

مسافر نے شرمندگی سے کہا،''مجھے نہیں معلوم کیوں، اس نے مجھے قبول نہیں کیا؟''

''تم وہاں گئے تھے، کیا نام ہے اس کا، جو Chaffaut اسٹریٹ پر واقع ہے؟

اجنبی کی شرمندگی میں اضافہ ہو گیا؛ اس نے ہکلا کر کہا،''اس نے بھی مجھے قبول نہیں کیا۔''

اب کسان کے خدوخال پر بے اعتمادی مترشح ہو گئی تھی؛ اس نے نووارد کا سر سے پاؤں تک معائنہ کیا، اور اچانک، ایک قسم کی تھرتھراہٹ کے ساتھ کہا،''کیا تم وہی آدمی ہو؟''

کسان نے اجنبی پر ایک تازہ نظر ڈالی، تین قدم پیچھے گیا، لیمپ کو میز پر رکھا، اور دیوار پر سے اپنی بندوق اُتار لی۔

اس دوران، کیا تم وہی آدمی ہو، کے الفاظ سن کر عورت اٹھ کھڑی ہوئی تھی، دونوں بچوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا، اور جلدی سے اپنے شوہر کے پیچھے پناہ لے لی تھی؛ اس کی چھاتیاں کھلی ہوئی تھیں، اور آنکھوں میں خوف لہرا رہا تھا، اس نے آہستگی سے کہا، "Tso-maraude"۔

یہ سب کچھ اس سے کم وقت میں ہو گیا، جتنا اس کی منظر کشی میں لگ جاتا ہے۔ چند دقیقے اس آدمی کا معائنہ کرنے کے بعد، جیسے کسی سانپ کو دیکھتے ہیں، مالک مکان دروازے کی طرف واپس آیا اور اس نے کہا،''نکل جاؤ یہاں سے۔''

''رحم کی خاطر ایک گلاس پانی۔''اجنبی نے کہا۔

''بندوق کی ایک گولی!'' جواب میں کسان نے کہا۔

اس کے فوراً بعد بھڑ سے دروازہ بند کر دیا، اور اجنبی کو دو چٹخنیاں چڑھ جانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک لمحے بعد کھڑکی بھی بند ہو گئی، اور لوہے کی آڑ کے گرنے کی آواز بھی سنائی دی۔

رات ہوتی جا رہی تھی۔ الپس کے پہاڑوں کے سلسلے سے سرد ہوائیں آ رہی تھیں۔ جاتے دن کی روشنی میں اجنبی کو محسوس ہوا تھا کہ ان باغیچوں میں سے ایک میں، جو گلی کے کنارے پر واقع تھا، ایک قسم کی جھونپڑی سی بنی ہوئی تھی، جو شاید پھوس سے بنائی گئی تھی۔ ہمت کر کے وہ باڑھ پر چڑھ کر دوسری جانب کود گیا، اور خود کو ایک باغیچے میں پایا۔ جھونپڑے کی طرف گیا؛ اس کا دروازہ کیا تھا ایک تنگ سا روشن دان تھا۔ جھونپڑا ان تعمیرات سے ملتا تھا جو سڑکیں بنانے والے مزدور سڑکوں کے کنارے عارضی قیام کے لیے بنا لیا کرتے ہیں۔ وہ واقعی یہی سمجھا تھا کہ یہ کسی

مزدور کی بنائی ہوئی جھونپڑی ہو گی؛ بھوک اور سردی مارے ڈال رہی تھی۔ مگر کم از کم یہ ایک پناہ گاہ تو تھی۔ اس قسم کے جھونپڑے رات میں استعمال نہیں کیے جاتے۔ وہ منہ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور رینگتا ہوا جھونپڑے کے اندر داخل ہو گیا۔ اندرون خاصا گرم تھا۔ وہاں اسے قابل برداشت، پیال سے بنا ایک بستر سا مل گیا تھا۔ چند لمحے اس پر لیٹا رہا، اس میں حرکت کرنے کی بھی تاب نہیں رہی تھی، اس قدر تھک گیا تھا۔ پیٹھ سے بندھا سفری تھیلا تکلیف دہ ہو رہا تھا، جو اس وقت تکیے کا کام دے سکتا تھا۔ اس نے تھیلے کو اُتار کر کھولنا شروع کیا۔ عین اس وقت ایک خوف ناک غراہٹ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ اندھیرے کے پس منظر میں اسے ایک بڑے سے کتے کے سر کا ہیولا نظر پڑا، جو جھونپڑے کے داخلے کے قریب کھڑا تھا۔

یہ جھونپڑا کتے کے رہنے کی جگہ تھی۔

وہ خود بھی تنومند اور ڈراؤنا تھا: خود کو اپنی اشیا سے لیس کیا، تھیلے کو ڈھال کے طور پر اٹھایا، اور اس کتے کے گھر سے جتنی آہستگی سے ہو سکا نکل گیا، مگر اس کے لباس میں سوراخ ہو گئے تھے۔

وہ باغیچے سے بھی اسی طرح نکلا، اُلٹے پاؤں، آہستہ آہستہ چلتا ہوا، تا کہ کتا اس پر جھپٹ نہ پڑے۔ تا کہ ضرورت پڑے تو باڑھ سے نکلنے کے لیے اپنی لاٹھی بھی استعمال کر سکے، جس طرح ماہرین اس قسم کی صورتوں میں استعمال کیا کرتے ہیں۔

بغیر زیادہ تکلیف کے وہ باڑھ سے باہر نکلا تو خود کو ایک بار پھر گلی میں پایا، تن تنہا، بغیر کسی پناہ کے، سر پر چھت بھی نہیں، پیال کے بستر سے، کتے کے گھر سے بھگایا ہوا۔ اب وہ بیٹھنے کے بجائے ایک پتھر پر گر پڑا، اور وہاں سے گزرنے والے کسی مسافر نے اس کو چلّا کر کہتے سنا تھا، ”میں تو کتے کے برابر بھی نہیں۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بار پھر اٹھا اپنا مارچ دوبارہ شروع کر دیا۔ شہر سے باہر نکلا، اس اُمید میں کہ کوئی پیڑ یا میدان میں پیال کا کوئی ڈھیر ہی مل جائے گا، جس میں اس کو پناہ مل سکے گی۔

اس طرح وہ دیر تک چلتا رہا، اس کا سر آہستہ آہستہ جھکتا جا رہا تھا۔ جب اس نے خود کو انسانوں کی ہر قسم کی بستی سے دور پایا، تو اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے اطراف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت وہ ایک میدان میں تھا۔ اس کے آگے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں سے ایک ٹیلا تھا جس کی قطع کی کٹائی کے بعد وہ شیو کیے ہوئے انسانی سر کی مانند نظر آ رہا تھا۔

اُفق سیاہ ہو رہا تھا۔ یہ صرف رات کی دھند ہی نہیں تھی: اُفق پر جھکے ہوئے بادلوں نے رات کی سیاہی کو مزید گہرا کر دیا تھا، جو اتنے نیچے آ گئے تھے گویا پہاڑوں کی چوٹیوں پر ٹکے ہوئے

ہوں، اور آہستہ آہستہ آسمان پر چھاتے جا رہے تھے۔ اس دوران چاند بھی نکلنے والا تھا، اور چوں کہ بلندیوں پر دھندلکے کی کچھ چمک باقی تھی اس لیے بادلوں میں روشنی کی محراب سی بن گئی تھی، جس میں سے روشنی کی کرنیں زمین پر گر رہی تھیں۔

اس طرح آسمان کے مقابلے میں زمین پر زیادہ روشنی تھی، جو بالخصوص کسی بدشگون اثر کی مانند تھا۔ افق کے افسردہ تناظر میں پہاڑی کا ہیولا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ پورا منظر ہی ڈراؤنا، رنجیدہ اور تنگ ہو گیا تھا۔

نہ میدان میں کچھ تھا اور نہ پہاڑی پر، سوائے ایک کج شجر کے، جو مسافر سے چند قدم دور بل رہا تھا، کانپ رہا تھا۔

یہ آدمی بظاہر ذہانت اور جذبے کی ان عادتوں سے بہت دور تھا جو انسان کو اشیا کے مختلف پہلوؤں سے پُراسرار اور حساس بنا دیتی ہیں؛ پھر بھی، کچھ تھا ضرور، اس آسمان میں، اس پہاڑی پر، اس میدان میں، اس شجر میں، جو اتنا ویران لگ رہا تھا کہ ایک لمحے کی بے حرکتی اور احترام کے بعد وہ یکا یک واپس پلٹ پڑا۔ کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب فطرت بھی دشمن لگنے لگتی ہے۔

وہ اپنے قدموں واپس گیا؛ D کے پھاٹک بند تھے۔ D، جس نے مذہبی جنگوں کے دوران بہت حملے سہے تھے، اب بھی، 1815ء میں قدیم دیواریں مربع میناروں کے حصار میں تھیں، جو اب گرائی جا چکی ہیں۔ وہ ایک شگاف سے گزر کر ایک بار پھر شہر میں داخل ہو گیا۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ چوں کہ وہ سڑکوں سے واقف نہیں تھا، اس نے اپنا سفر بغیر کسی ترتیب کے پھر شروع کر دیا۔

اپنے راستے میں وہ پریفیکچر تک گیا اس کے بعد مدرسے تک۔ جب وہ کتھیڈرل کے پاس سے گزر رہا تھا، اس نے گرجا گھر کی طرف اپنے مکے لہرائے تھے۔

اس مربع میدان کے کونے پر چھپائی کا ایک ادارہ ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پہلی بار شہنشاہ اور شاہی محافظ دستوں کی جانب سے جزیرہ ایلبا سے لائی گئی فوج کے نام کیے گئے اعلانات، جو خود نپولین نے لکھوائے تھے، چھاپے گئے تھے۔

تھکن سے چور، جب کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تو وہ پتھر کی ایک بنچ پر لیٹ گیا جو چھاپے خانے کے دروازے کے سامنے نصب تھی۔

عین اسی وقت گرجا گھر سے ایک بوڑھی عورت نکلی۔ اس نے سایے میں ایک آدمی کو لیٹے دیکھا، ”تم یہاں کیا کر رہے ہو، میرے دوست؟“ اس نے کہا۔

اس نے سخت لہجے اور غصے سے کہا، ''جیسا کہ آپ دیکھ رہی رہیں، میری اچھی خاتون، میں سو رہا ہوں۔'' وہ اچھی عورت جو اسم با مسمی تھی، دراصل مارکوئی R تھی۔

''اس بنچ پر؟'' اس نے کہا۔

انیس برس تک میرے پاس لکڑیوں سے بنا ایک گدا تھا۔'' آدمی نے جواب میں کہا، ''آج مجھے پتھر کا ایک گدا مل گیا ہے۔''

''کیا تم کبھی سپاہی رہے ہو؟''

''جی ہاں، میری اچھی خاتون، سپاہی!''

''تم سرائے میں کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''اس لیے کہ میرے پاس رقم نہیں۔''

''افسوس!'' مادام نے کہا، ''میرے بٹوے میں اس وقت صرف چار سو ہیں۔''

''مجھے وہی عنایت کر دیجیے۔''

اس آدمی نے چار سو لے لیے۔ مادام نے مزید کہا، ''تمھیں اتنی کم رقم میں کسی سرائے میں جگہ نہیں مل سکے گی، مگر کیا تم نے کوشش کی تھی؟ اس طرح رات بسر کرنا ممکن نہیں۔ تمھیں سردی لگ رہی ہے اور بلاشبہ تم بھوکے بھی ہو۔ کوئی تمھیں خیرات میں ہی رہنے کی جگہ دے سکتا ہے۔''

''میں سارے دروازوں پر دستک دے چکا ہوں۔''

''اچھا؟''

''مجھے ہر جگہ دھتکار دیا گیا ہے۔''

اس اچھی خاتون نے مسافر کا بازو چھوا، اور سڑک کے اس پار ایک چھوٹے سے گھر کی طرف اشارہ کیا، جو بشپ کے محل کے برابر تھا۔

''تم نے سارے دروازوں پر دستک دی ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا تم نے اس پر دستک دی ہے؟''

''نہیں۔''

''اس پر دستک دو۔''

عاقبت اندیشی اور عقل مندی

اس شام D کا بشپ، شہر میں چہل قدمی سے واپسی کے بعد رات گئے تک اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ وہ اپنے بڑے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھا، بدقسمتی سے جو کبھی مکمل نہیں ہوئے۔ پادریوں اور ڈاکٹروں نے اس اہم موضوع پر جو کچھ کہا تھا، وہ ان کی احتیاط سے ترتیب میں مشغول تھا۔ اس کی کتاب دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی: پہلا حصہ سب کے فرائض پر مشتمل تھا؛ دوسرا حصہ ہر فرد کے اپنے درجات کے مطابق اس کے فرائض پر مشتمل تھا۔ سب کے فرائض عظیم فرائض ہوتے ہیں۔ ان کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ سینٹ میتھیو کہتا ہے: فرائض، خدا کے لیے (Matt.vi)؛ فرائض، خود اپنی ذات کے لیے (Matt.v.29,30)، فرائض، ہمسایے کے لیے (Matt.vii.12)، فرائض، جانوروں کے لیے (Matt. vi. 20, 25)۔ ان کے علاوہ جو فرائض بشپ نے دریافت کیے تھے، وہ تھے: سینٹ پال کے رومیوں کے نام لکھے گئے خطوط: بادشاہوں اور رعایا کے لیے۔ سینٹ پیٹر کی جانب سے لکھے گئے خطوط: منصفوں کے لیے، بیویوں کے لیے، ماؤں کے لیے، جوان مردوں کے لیے۔ Ephesians کے خطوط: شوہروں کے لیے، باپوں کے، بچوں اور ملازمین کے لیے۔ عبرانیوں کے لیے لکھے گئے سینٹ پال کے خطوط: عقیدت مندوں کے لیے۔ Corinthians کے نام لکھے گئے سینٹ پال کے خطوط: کنواریوں کے لیے۔ ان احساسات سے پرے، بڑی محنت سے وہ ایک ہم آہنگ وجود تعمیر کر رہا تھا، جسے وہ عام لوگوں کو پیش کرنا چاہتا تھا۔

آٹھ بجے رات تک وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ اپنی عادت کے مطابق بستر کے قریب بکھرے ہوئے چاندی کے برتن سمیٹنے کے لیے مادام ماگلا کمرے میں داخل ہوئی تو بشپ کے سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی ہوئی تھی۔ ایک لمحے بعد، جب بشپ کو

اندازہ ہوا کہ میز سج گئی ہے اور شاید اس کی بہن انتظار کر رہی ہے، تو اس نے کتاب بند کر دی، اپنی میز سے اٹھا، اور کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔

کھانے کا کمرہ بیضوی شکل کا تھا، جس میں ایک آتش دان تھا، جس کا ایک دروازہ (جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں) گلی میں کھلتا تھا، اور ایک کھڑکی باغیچے کی طرف کھلتی تھی۔

مادام ماگوا میز کی تیاری مکمل کر رہی تھی۔

یہ کام کرتے ہوئے وہ میڈموزیل پتیستین سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

میز آتش دان کے قریب رکھی ہوئی تھی، جس میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ میز پر ایک لیمپ رکھا ہوا تھا۔

آپ ان عورتوں کا اچھا خاصا تصور کر سکتے ہیں جن کی عمریں ساٹھ برس سے زیادہ ہو چکی تھیں۔ مادام ماگوا چھوٹے قد کی، بھرے بھرے جسم والی، زندہ دل؛ میڈموزیل پتیستین، شریف النفس، نازک، دُبلی پتلی، کم زور سی، اپنے بھائی سے قدرے بلند قامت، 1806ء کے فیشن کے سیاہی مائل ارغوانی رنگ کے بالاپوش میں ملبوس رہتی تھی، جو اس نے پیرس میں خریدا تھا اور اب تک چل رہا تھا۔ اگر عامیوں کی زبان میں ان کی شخصیتوں کو ایک لفظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو مادام ماگوا ایک دیہاتی عورت، اور میڈموزیل پتیستین اعلیٰ خاندان کی خاتون معلوم ہوتی تھی۔ مادام ماگوا سفید رنگ کی روئی بھری ٹوپی اوڑھتے، گلے میں مخملی ربن میں لگی سونے کی صلیب پہنے رہتی تھی اور یہی اس گھر کا واحد نسوانی زیور تھا۔ لمبی آستینوں والا سیاہ رنگ کا اونی بالاپوش، کمر کے اطراف سبز اور سرخ رنگ کے چارخانے کا ایپرن جو سبز رنگ کے ربن سے بندھا ہوتا تھا، اور دو پنوں سے لگایا گیا تھا۔ اسی کپڑے کا بنا سولھویں صدی کے فیشن کا سینہ بند جو پیٹ تک آجاتا ہے، معمولی درجے کے جوتے، زرد رنگ کے لانبے موزے، جیسے Marseilles کی عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ میڈموزیل کے بالاپوش کی کاٹ 1806ء کے فیشن کے نمونے کی تھی؛ غلاف جیسے اسکرٹ پہنتی تھی، جس میں مختلف نمونوں کے بند اور بٹنوں سے مزین، گچھے دار آستینوں والے بلاؤز، اور اپنے سفید بالوں کو گھنگھریالے بالوں سے بنی چھوٹی سی وِگ میں چھپائے رکھتی تھی۔

مادام ماگوا ذہین، خوش مزاج اور مہربان عورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کے منہ کے دونوں کونے اوپر کی طرح اُٹھے ہوتے، اور اس کا اوپری ہونٹ نچلے ہونٹ سے بڑا تھا، دونوں مل کر اس کا چہرہ کنگڑے جیسا ہو گیا تھا۔ جب تک بشپ خاموش رہتا، اس سے آزادی اور احترام کے ملے جلے انداز میں بات کرتی، مگر جوں ہی بشپ بولنا شروع کر دیتا، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، وہ کسی مزاج

آشنا عورت کی طرح فرماں برداری کرنے لگتی۔ میڈموزیل بپتستین تو بولتی بھی نہیں تھی۔ وہ بشپ کو خوش رکھنے کے لیے اس کی فرماں برداری کرتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی جب وہ جوان اور نوعمر تھی وہ خوب صورت نہیں تھی؛ اس کی بڑی بڑی آنکھیں نیلی، اور بڑی سی محرابی ناک تھی؛ مگر اس کی مجموعی صورت، اس کا پورا وجود، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ایک نا قابلِ بیان نیکی سے عبارت تھا۔ نیکی اس کے مقدر کا نوشتہ تھی؛ مگر یقین، داد و دہش اور امید، ان تین نیکیوں نے جو روح کو گرم رکھتی ہیں، رفتہ رفتہ اس کی شائستگی کو بڑھا کر تقدس کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ قدرت نے اس کو میمنہ بنایا تھا، مذہب نے اسے فرشتہ بنا دیا۔ بے چاری صوفی کنواری— خوش گوار یاد جو کہیں کھو گئی تھی۔

میڈموزیل نے اکثر بتایا ہے کہ بشپ کے محل میں اس شام کیا ہوا تھا۔ اب بھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جن کو معمولی سے معمولی تفصیلات یاد ہیں۔

جس وقت بشپ کمرے میں داخل ہوا، مادام ماگلا خاصی زندہ دلی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ میڈموزیل بپتستین سے پُرجوش انداز میں اس موضوع پر بات کر رہی تھی جس سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف تھی اور بشپ بھی اس کا عادی ہو گیا تھا۔ مسئلہ داخلے کے دروازے میں تالا لگانے کا تھا۔

ایسا محسوس ہوا کہ جس وقت وہ رات کے کھانے کے لیے کچھ خریدنے بازار گئی تھی، مادام ماگلا نے بازار میں کچھ باتیں سنی تھیں۔ لوگ شیطانی صورت والے کسی کوچہ گردکی باتیں کر رہے تھے؛ کہ ان دنوں ایک مشتبہ سیلانی آیا ہوا ہے جو اسی شہر میں کسی جگہ ہوگا، اور جو لوگ دیر سے گھر لوٹنے کا ارادہ کر رہے ہیں ان کو ناخوش گوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔ پولیس والے بہت بدنظمی کے عالم میں تھے، اس کے علاوہ بشپ اور میئر کے درمیان اَن بَن بھی تھی، جو ہمہ وقت ایک دوسرے کو ہونے والے واقعات کے ذریعے نیچا دکھانے میں کوشاں رہتے تھے۔ اس وجہ سے عقل مند لوگ اپنی حفاظت کے لیے خود ہی پولیس کا کردار ادا کر رہے تھے، اپنے گھروں کو مورچہ بند کر رہے تھے، اور دروازوں کو اچھی طرح مقفل رکھنے لگے تھے۔

مادام ماگلا ان آخری لفظوں پر بہت زور دے رہی تھی؛ مگر بشپ ابھی اپنے کمرے سے باہر آیا تھا جہاں خاصی ٹھنڈک تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر آگ کے سامنے بیٹھ گیا اور مختلف باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے مادام ماگلا کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ تب میڈموزیل بپتستین نے، اس خیال سے کہ مادام ماگلا کو اطمینان بھی ہو جائے اور بھائی بھی ناراض نہ ہو، آہستہ سے کہا تھا، ”بھائی، آپ نے کچھ سنا! مادام ماگلا کیا کہہ رہی تھی؟“

”میں نے اس بارے میں کچھ سنا تو ہے۔“ بشپ نے جواب میں کہا، اپنی کرسی گھمائی، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر زور دے کر کھڑا ہو گیا اور اپنا پُرجوش چہرہ اپنی قدیم ملازمہ کے روبرو کیا، جس

پر بڑی آسانی سے خوشی دوڑ گئی تھی، جس کو الاؤ کی آگ نے مزید روشن کر دیا تھا-- "ذرا پھر سے کہو، کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا ہم لوگ بہت خطرے میں ہیں؟"

مادام ماگوا نے پورا قصہ پھر سے سنانا شروع کر دیا؛ حقائق کے پورے علم کے بغیر اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ معلوم ہوا تھا کہ ایک بوہیمیائی آوارہ گرد، ایک خطرناک قسم کا درویش، اس وقت شہر میں موجود ہے۔ اس نے جیکوِن لابار کی سرائے میں قیام کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اسے رکھنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ پھر وہ Gassendi بولیوارڈ کی طرف سے داخل ہوا اور شام کی شفق میں گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ پھانسی گھاٹ کا ایک خوف ناک چہرہ۔

"واقعی؟" بشپ نے کہا۔

یہ سوال پوچھ کر اس نے مادام ماگوا کی ہمت افزائی کی؛ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ بشپ پریشان ہونے لگا ہے؛ اور پھر اس نے فاتحانہ انداز میں بات آگے بڑھائی۔

"ہاں، موں سینیور، ایسا ہی ہوا ہے۔ شہر میں آج رات کچھ ہونے والا ہے۔ ہر ایک یہی کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی پولیس بھی تو اتنی ناکارہ ہو گئی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں رہنا، اس پر مستزاد یہ کہ سڑکوں پر روشنی نہیں کی جاتی۔ آپ باہر جائیے تو لگتا ہے کسی اندھیری بھٹ میں جا رہے ہیں۔ واقعی، میں تو کہتی ہی ہوں، موں سینیور، میڈموزیل بھی یہی کہتی ہیں۔"

"میں" اس کی بہن نے لقمہ دیا "کچھ نہیں کہہ رہی ہوں۔ میرا بھائی جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔"

مادام ماگوا اس طرح جاری رہی جیسے کسی نے احتجاج نہ کیا ہو:

"ہم کہتے ہیں کہ یہ گھر بالکل محفوظ نہیں کہ اگر موں سینیور اجازت دیں تو میں تالا بنانے والے سے کہوں کہ وہ آ کر دروازوں کے قدیم تالے بدل دے؛ ہمارے پاس تالے ہیں، بس اب انھیں لگایا جانا ہے؛ اسی لیے کہ میں کہہ رہی ہوں اس سے زیادہ خطرناک کون سا دروازہ ہو سکتا ہے جس کو پہلے گزرنے والا ہی باہر سے کھول سکتا ہے؛ اور میں کہتی ہوں کہ چٹخنیوں کی بہت ضرورت ہے، موں سینیور، کم از کم آج کی رات کے لیے؛ مزید اس لیے کہ موں سینیور کو ہمیشہ "آجایئے" کہنے کی عادت پڑی گئی ہے؛ اس کے علاوہ آدھی رات کو بھی؛ اوہ، میرے خدا، کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔"

عین اسی وقت دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔

بشپ نے کہا، "اندر آجایئے۔"

فرماں برداری اور بہادری

دروازہ کھل گیا۔

اتنی تیز حرکت سے کھلا تھا گویا کسی نے پوری طاقت سے اسے دھکیلا ہو۔

ایک آدمی اندر داخل ہوا۔

ہم اس آدمی سے پہلے سے واقف تھے۔ یہ وہی کوچہ گرد تھا ہم جس کو کسی پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر جاتے دیکھ رہے تھے۔

اس نے ایک قدم آگے رکھا، اور وہیں کھڑا ہو گیا، اپنے عقب میں دروازے کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک سفری تھیلا تھا، اس کی لاٹھی اس کے ہاتھوں میں تھی، آنکھوں میں ایک سخت، گستاخانہ، تھکن سے بھرا ہوا اور شدت پسند اظہار تھا۔ آتش دان میں جلنے والے آگ نے اس کے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ وہ ڈراؤنا لگ رہا تھا، کسی آسیب جیسا۔

مادام ماگوا میں اتنی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ چیخ سکتی۔ وہ لرزنے لگی، اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

میڈموزیل بپتستین نے پلٹ کر اندر آتے ہوئے آدمی کو دیکھا، خوف سے کانپنے لگی، آہستہ آہستہ اس کا سر آتش دان کی طرف مڑنے لگا۔ اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا چہرہ ایک بار پھر پُرسکون ہو گیا تھا۔

بشپ کی پُرسکون آنکھیں آدمی پر جمی ہوئی تھیں۔

اس کا منہ کھلا ہی تھا، بلاشبہ، نووارد سے پوچھنے کے لیے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس آدمی نے اپنی لاٹھی کو دونوں ہاتھوں کی مضبوطی سے تھاما، اپنی آنکھیں اس بوڑھے آدمی اور دو بوڑھی

عورتوں پر جا ئیں، اور یہ انتظار کیے بغیر کہ بشپ کچھ کہتا، بلند آواز میں کہنا شروع کیا:

میرا نام ژاں ولژاں ہے۔ میں ایک سزا یافتہ جہازی غلام ہوں۔ میں نے پندرہ برس جہازوں پر گزارے ہیں۔ چار دن قبل ہی مجھے آزادی ملی ہے، اور میں Pontarlier جا رہا ہوں، جو میری اصل منزل ہے۔ Toulon سے نکلنے کے بعد، چار دن سے مسلسل پیدل چل رہا ہوں؛ صرف آج ہی میں ایک درجن لیگ پیدل چلا ہوں۔ اس شام جب میں اس علاقے میں آیا، تو پہلے ایک سرائے میں گیا؛ انھوں نے میرے پیلے پاسپورٹ کی وجہ سے مجھے باہر نکال دیا، جو میں نے ٹاؤن ہال میں دکھا دیا تھا۔ مجھے دکھانا ہی تھا۔ ایک اور سرائے میں گیا۔ دونوں جگہ مجھ سے کہا گیا "چلتے بنو۔" کوئی مجھے پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ قید خانے گیا؛ انھوں نے بھی مجھے جگہ نہیں دی۔ میں کتوں کے گھر میں گیا، کتے نے مجھ کاٹا اور دوڑا دیا؛ گویا وہ بھی کبھی آدمی تھا۔ ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ میں کھیتوں میں گیا کہ کھلے میدان میں ستاروں تلے سو جاؤں گا۔ مگر وہاں تو ستارے بھی نہیں تھے۔ میں سمجھا بارش ہونے والی ہے، اور میں پناہ گاہ کی تلاش میں دوبارہ شہر میں داخل ہو گیا۔ کھلے چوراہے پر پتھر کی بنچ پر سونے کی کوشش کی۔ ایک نیک خاتون نے مجھے آپ کے گھر کا راستہ بتایا اور کہا "وہاں دستک دو۔" اور میں نے دستک دے دی ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا تم سرائے چلاتے ہو؟ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ ایک سو نو فرانک اور پندرہ سو، جو میں نے انیس برس جہاز میں محنت کر کے کمایا ہے۔ میں اجرت ادا کروں گا۔ یہ رقم میرے کس کام کی۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں؛ آج پورے بارہ لیگ پیدل چلا ہوں۔ کیا تم مجھے پناہ دو گے؟"

"مادام ماگوا" بشپ نے کہا، "تم ایک اور بستر تیار کرو گی۔"

وہ آدمی تین قدم آگے بڑھا، اور لیمپ کے قریب گیا جو میز پر روشن تھا۔ "خبردار" اس نے پھر بولنا شروع کیا، گویا وہ ان کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔ سنا تم نے؟ میں جہاز کا غلام ہوں، سزا یافتہ ہوں، جہاز سے آیا ہوں" اس نے اپنے جیب سے پیلے رنگ کے بہت سارے کاغذ نکالے اور ان کو کھولا۔ "یہ ہے میرا پاسپورٹ۔ پیلا، جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو۔ یہی مجھ کو ہر جگہ سے نکال دیتا ہے۔ کیا تم اسے پڑھنا پسند کرو گے؟ میں پڑھنا لکھنا جانتا ہوں۔ یہ سب جہاز میں کام کے دوران سیکھا ہے۔ وہاں ان لوگوں کے لیے اسکول تھا، جو کچھ سیکھنا چاہتے تھے۔ دیکھو، انھوں نے اس پاسپورٹ پر کیا لکھا ہے:

"ژاں ولژاں، سزا شدہ قیدی، مسکنہ — آپ کو اس سے کیا مطلب — انیس برس جہاز میں قیدی کی طرح کام کرتے گزارے ہیں: پانچ برس نقب زنی اور چوری کے لیے؛ چودہ برس،

چار بار فرار کی کوشش کے لیے۔ آدمی خطرناک ہے۔

یہ ہے وہ بات جس پر ہر ایک نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ کیا تم مجھے جگہ دینے پر تیار ہو؟ کیا یہ بھی کوئی سرائے ہے؟ کیا تم مجھے کچھ کھانا اور ایک بستر فراہم کر سکو گے؟ کیا تمھارے ہاں کوئی اصطبل ہے؟"

"مادام ماگوا" بشپ نے کہا، "تم محراب کے بستر پر سفید چادر بچھاؤ گی۔"

ہم پہلے ہی ان دو خواتین کے فرماں بردار کردار کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

مادام ماگوا احکام بجالانے کے لیے چلی گئی۔

بشپ اس آدمی کی طرف مڑا۔

"تشریف رکھیے، جناب! اور ذرا اپنی ٹھنڈ دور کیجیے۔ تھوڑی دیر میں ہم آپ کو رات کا کھانا دیں گے اور کھانے کے دوران آپ کا بستر تیار ہو جائے گا۔"

اس مرحلے پر اچانک اس آدمی کو کچھ احساس ہوا۔ اس کے چہرے کا تاثر جو اس وقت تک اداسی اور تلخی سے مملو تھا، مخبوط الحواس، بے اعتماد اور غیر معمولی ہو گیا۔ وہ کسی بیوقوف آدمی کی طرح ہکلانے لگا تھا: "واقعی؟ کیا آپ مجھے رکھ لیں گے؟ آپ مجھے بھگا نہیں دیں گے؟ ایک سزا یافتہ کو! اور آپ مجھے 'جناب' کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔ آپ نے مجھے 'تو' کہہ کر مخاطب نہیں کیا؟ 'نکل جا یہاں سے، کتا کہیں کا' کہہ کر نکال نہیں دیا۔ لوگ مجھ سے تو اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ بھی مجھے نکال دیں گے، اس لیے میں نے پہلے ہی آپ کو سب کچھ بتا دیا تھا، اور کیا اچھی عورت تھی وہ، جس نے مجھے آپ کی طرف بھیجا تھا۔ مجھے کھانا ملے گا، گدے اور چادر کا بستر ملے گا، جس طرح دنیا کے دوسرے لوگوں کو میسر ہوتا ہے۔ انیس برس ہوئے مجھے گدے پر سوئے ہوئے۔ واقعی آپ مجھے نکالنا نہیں چاہتے؟ آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔ میرے پاس رقم ہے، میں اجرت ادا کروں گا۔ معاف کیجیے، موسیو، سرائے کے مالک، آپ کا نام کیا ہے؟ آپ جو مانگیں گے، میں دوں گا۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ آپ سرائے چلاتے ہیں، ہے نا؟"

"میں" بشپ نے کہا، "ایک پادری ہوں، جو اس گھر میں رہتا ہے۔"

"پادری!" آدمی نے کہا، "اور کیا اچھے پادری ہیں آپ۔ تو آپ مجھ سے رقم بھی طلب نہیں کریں گے؟ آپ کیور ہیں، ہیں کہ نہیں؟ اس بڑے سے کلیسا کے کیور؟ میں واقعی بیوقوف آدمی ہوں۔ میں نے آپ کی ٹوپی سے آپ کو پہچانا نہیں۔"

بولنے کے دوران، اس نے اپنا سفری تھیلا اور اپنی لاٹھی ایک طرف رکھ دی، پاسپورٹ

واپس جیب میں رکھ لیا تھا، اور بیٹھ گیا تھا۔ میڈموزیل بپتستین نے اس کی طرف ایک دوبار دیکھا تھا۔

اور وہ کہتا رہا:

"موسیو لی کیور، آپ بہت نرم دل انسان ہیں: آپ نے مجھ سے نفرت نہیں کی۔ اچھا پادری بہت اچھی چیز ہوتا ہے۔ اور آپ مجھ سے کچھ طلب بھی نہیں کر رہے ہیں؟"

"نہیں۔" بشپ نے کہا، "اپنی رقم اپنے پاس رکھیے۔ کتنی رقم ہے آپ کے پاس؟ آپ نے بتایا نہیں تھا کہ ایک سو نو فرانک ہیں آپ کے پاس؟"

"اور پندرہ سو۔" آدمی نے اضافہ کیا۔

"ایک سو نو فرانک، پندرہ سو۔ اس کو کمانے میں آپ کو کتنا عرصہ لگا تھا؟"

"انیس برس۔"

"انیس برس!"

بشپ نے گہرا سانس لیا۔

آدمی کہتا رہا: پوری رقم اب بھی میرے پاس ہے۔ میں نے پچھلے چار دنوں میں صرف پچیس سو خرچ کیے ہیں، جو میں نے Grasse میں ویگن کا سامان اتارنے میں کمائے تھے۔ چوں کہ آپ ایک abbe ہیں، میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ ہمارے جہاز میں ایک چیپلین آیا تھا۔ ایک دن میں نے وہاں ایک بشپ کو بھی دیکھا تھا۔ سب اس کو موں سنیور کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ وہ Marseilles میں Majore کا بشپ تھا۔ وہ ایسا کیور ہے جو دوسرے کیوروں پر حکومت کرتا ہے، آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ معاف کیجیے گا، میں یہ سب کچھ بہت بُری طرح کہہ رہا ہوں، مگر میرے لیے یہ سب اجنبی چیزیں ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم کیا لوگ ہیں۔ اس نے جہاز میں ہی خطاب کیا تھا، ایک قربان گاہ سے۔ اس کے پاس سونے سے بنی ایک نوکیلی سی چیز تھی، اس کے سر پر لگی ہوئی۔ دوپہر کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔ ہم سب، تینوں جانب، قطار میں کھڑے ہوئے تھے، ہمارے سامنے روشنیاں تھیں۔ ہم ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ بولا تھا، مگر ہم سے بہت دور تھا، اور ہم سن نہیں سکے تھے۔ ایسے ہوتے ہیں بشپ لوگ۔"

اس کے بولنے کے دوران بشپ نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا، جو کھلا رہ گیا تھا۔

مادام ماگلوا واپس آئی۔ وہ ایک نقرئی کانٹا اور چمچہ لائی تھی جسے میز پر رکھ دیا۔

"مادام ماگلوا" بشپ نے کہا، "ان سب چیزوں کو آتش دان کے قریب رکھ دو۔" اور مہمان کی طرف واپس ہوتے ہوئے کہا، "ایلپس پر رات میں تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ آپ کو سردی

لگ رہی ہوگی، جناب۔"

ہر بار، جب وہ اپنی نرم اور مہذب آواز میں 'جناب' کہتا تو اس آدمی کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔موں سیئور ایک سزا یافتہ کے سامنے، ایسا ہی ہے جیسے کسی شکستہ جہاز کے پیاسے کے لیے ایک گلاس پانی۔ بدنامی التفات کی پیاسی ہوتی ہے۔

"اس لیمپ میں روشنی کم ہے۔" بشپ نے کہا۔

مادام ماگوا فوراً سمجھ گئی۔ خواب گاہ سے چمنی پر رکھے دو نقرئی شمع دان لے آئی اور میز پر رکھ کر روشن کردیے۔

"موسیو کیور" اس آدمی نے کہا، "آپ بہت اچھے آدمی ہیں، آپ مجھ سے نفرت نہیں کرتے۔آپ مجھ کو اپنے گھر میں جگہ دیتے ہیں۔آپ میرے لیے شمعیں روشن کراتے ہیں۔اس کے باوجود میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں، اور یہ بھی کہ میں بہت بدقسمت انسان ہوں۔"

بشپ نے، جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، آہستگی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ نے خود ہی بتا دیا تھا کہ آپ کون ہیں۔یہ میرا گھر نہیں؛ یہ یسوع مسیح کا گھر ہے۔یہ دروازہ کسی داخل ہونے والے سے یہ تقاضا نہیں کرتا کہ وہ بتائے کہ وہ کون ہے؛ کہ اس کا کوئی نام ہے، بلکہ کیا اسے کوئی تکلیف ہے، غم ہے۔آپ پریشان ہیں، بھوکے پیاسے ہیں؛ آپ آسکتے ہیں۔میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں؛ یہ نہ کہیں کہ میں آپ کو اپنے گھر میں داخل ہونے دے رہا ہوں۔یہ کسی کا گھر نہیں سوائے اس کے جس کو پناہ کی ضرورت ہو۔میں آپ سے کہتا ہوں، جو ایک مسافر شخص ہے، کہ یہ گھر اتنا ہی آپ کا ہے جتنا کہ میرا۔یہاں کی ہر شے آپ کی ہے۔مجھے آپ کا نام جاننے کی ضرورت کیا ہے؟اس سے قبل کہ آپ کہتے کہ آپ کا بھی ایک گھر ہے، میں جان گیا تھا۔"

اس آدمی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"واقعی؟ آپ میرا نام بھی جانتے تھے؟"

"ہاں" بشپ نے جواب میں کہا، "آپ میرے بھائی ہیں"

"بس کیجیے، موسیو کیور" حیرانی کے عالم میں اس نے آدمی نے کہا، "جب میں داخل ہوا تھا، میں بہت بھوکا آدمی تھا۔مگر آپ اتنے اچھے آدمی ہیں، کہ مجھے معلوم نہیں کہ اب مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

بشپ نے اس کی طرف دیکھا، اور کہا، "آپ نے بہت دکھ اٹھائے ہیں؟"

"اُف، وہ سرخ کوٹ؛ ٹخنوں میں پڑی بیڑیاں؛ سونے کے لیے تختہ؛ گرمی، محنت،

سزا یافتہ قیدی! پچاس بلا کسی وجہ کے دہری زنجیر! ایک جملے پر تنگ قید خانہ! بیماری کے بستر پر بھی زنجیر! کتنے! کتنے ہم سے زیادہ خوش ہوتے ہوں گے۔ انیس برس! میں چھیالیس برس کا ہوں۔ اب میرا پاسپورٹ پیلے رنگ کا ہے۔ یہ ہے میرا حال۔"

"ہاں" بشپ نے پھر گفتگو شروع کی، "آپ بہت خراب جگہ سے آئے ہیں۔ بیٹے، ایک نادم گناہگار کے آنسوؤں سے دھلے ہوئے چہرے پر جنت میں زیادہ خوشی ہوگی، بہ نسبت ایک سو سفید بالا پوش ایمان دار آدمیوں کے۔ اگر آپ خراب جگہ سے نفرت کے احساس، اور انسانیت کے لیے غضب کے ساتھ نکلتے ہیں تو ہمدردی کے حق دار ہوں گے؛ اگر آپ نیک نیتی اور امن کے ساتھ نکلتے ہیں تو آپ ہم سے بھی زیادہ قابلِ قدر رہوں گے۔"

اس دوران مادام ماگوا نے کھانا لگا دیا تھا: شوربا، جو پانی، تیل، ڈبل روٹی اور نمک سے بنا تھا: تھوڑا سا بیکن، تھوڑا سا بکری کا گوشت، انجیر، تازہ پنیر، اور رائی کی ڈبل روٹی۔ اس نے خود ہی بشپ کی پرانی وائن کی بوتلوں میں ایک بوتل بھی پیش کر دی تھی۔

بشپ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا، جو مہمان دار فطرت سے مخصوص ہوتا ہے۔ "میز کی طرف چلیے۔" اس نے شوخی سے بلند آواز میں کہا۔ جب کوئی اجنبی رات کے کھانے پر ہوتا تو بشپ اسی طرح خوش ہوتا تھا۔ اس نے مسافر کو اپنی دائیں جانب بٹھایا۔ میڈموزیل بپتستین جو بالکل پُرامن اور فطری لگ رہی تھیں، اس کے بائیں جانب کرسی پر بیٹھیں۔

بشپ نے دعا کی؛ پھر رسم کے مطابق پہلے اپنے لیے شوربا نکالا۔

مسافر نے حریصانہ انداز میں کھانا شروع کیا۔

پھر، اچانک بشپ نے کہا، "مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے اس میز پر کسی چیز کی کمی ہے۔"

دراصل مادام ماگوا نے صرف تین عدد کانٹے اور چمچے رکھے تھے جو ضروری تھے۔ اس گھر کا رواج تھا کہ میز پوش پر ہمیشہ چھ آدمیوں کے لیے برتن اور چاندی کے چھری کانٹے رکھے جاتے تھے، یہ ایک معصومانہ طمطراق تھا۔ اس قسم کی شان دار عیش و عشرت سے ایک قسم کے بچگانہ پن کا اظہار ہوتا تھا، جو شریفانہ اور سخت گھروں کے افلاس کو شان و شوکت کی سطح پر پہنچا دیتا تھا۔

مادام ماگوا اشارہ سمجھ گئی، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر گئی اور ایک لمحے بعد بشپ کے طلب کیے ہوئے نقرئی کانٹے چمچوں کے تین مزید سیٹ میز پوش پر چم چم کر رہے تھے، جنھیں اس طرح سجا دیا گیا تھا گویا میز پر کھانے کے لیے چھ آدمی بیٹھنے والے ہوں۔

❁

پنیر کے کارخانے

یہ بتانے کے بجائے کہ اس دن کھانے کی میز پر کیا ہوا تھا، میدموذیل کے خط سے اقتباس پیش کرنا بہتر ہوگا، جو اس نے مادام Boischevron کے نام لکھا تھا، جس میں سزا یافتہ آدمی اور بشپ کے درمیان گفتگو کو نہایت خوش سلیقہ نکتہ سنجی سے بیان کیا گیا تھا۔

''.....اس آدمی نے کسی پر توجہ نہیں کی تھی۔ وہ کسی فاقہ کش انسان کے ندیدے پن سے کھا رہا تھا، مگر کھانے کے بعد اس نے کہا تھا:

'اچھے خدا کے موسیو دی کیور، یہ سب میرے نزدیک ضرورت سے زیادہ اچھا تھا؛ مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ ان چھکڑے والوں کی میزیں، جنھوں نے مجھے کھانا نہیں دیا تھا، آپ کی میز سے زیادہ اچھی تھیں۔'

یہ بات میرے اور تمھارے درمیان ہی رہے گی کہ اس آدمی کے اس تبصرے نے مجھے تقریباً بدحواس کر دیا تھا۔ میرے بھائی نے جواب میں کہا تھا:

'وہ مجھ سے زیادہ تھکے ہوتے ہیں۔'

'نہیں!' اس آدمی نے جواب میں کہا تھا، 'ان کے پاس زیادہ دولت ہوتی ہے۔ آپ مفلس ہیں؛ یہ تو مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔ آپ تو کیوریٹ بھی نہیں ہو سکتے۔ کیا واقعی آپ کیور ہیں؟ اگر ہمارا اچھا خدا واقعی منصف ہے تو آپ کو یقیناً کیور ہونا چاہیے؟'

'ہمارا اچھا خدا منصف سے بھی زیادہ منصف ہے۔' میرے بھائی نے کہا تھا۔

ایک لمحے بعد اس نے مزید کہا تھا:

'موسیوژاں ولژاں، اس جگہ کا نام Pontarlier ہے، جہاں آپ جا رہے ہیں؟'

'میرے نقشے میں تو یہی بنا ہوا ہے۔'

میرا خیال ہے کہ اس آدمی نے یہی کہا تھا۔ اس کے بعد مزید کہا:

'مجھے کل طلوعِ فجر کے وقت نکل جانا چاہیے۔ سفر مشکل ہے۔ راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں تو دن گرم ہوتے ہیں۔'

'آپ اچھے ملک جا رہے ہیں۔' میرے بھائی نے کہا تھا، 'انقلاب کے دوران میرا خاندان تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے Franche-Comte میں پناہ لی تھی، اور وہاں میں کچھ دن ہی رہا تھا، مشقت بھی کی تھی۔ میرا دادا اچھا تھا۔ پیٹ آپ کو مصروف رکھنے کے لیے بہت کچھ موجود تھا۔ صرف انتخاب کرنا تھا کہ کیا کیا جائے۔ وہاں کاغذ کی ملیں، چرم سازی کے کارخانے، شراب کشید کرنے کے کارخانے، تیل نکالنے کے کارخانے، بڑے پیمانے پر گھڑی سازی کے کار خانے، فولاد بنانے کے کارخانے، تانبے کے کام کے کارخانے، کم از کم بیس عدد ڈھلائی کی بھٹیاں ہیں جن میں سے چار Lods میں، Chatillon میں، Audincourt میں اور Beure میں ہیں، جو خاصی بڑی ہیں۔'

میرا خیال ہے کہ میں یہ کہنے میں غلطی نہیں کر رہی ہوں کہ یہی نام تھے جو میرے بھائی نے بیان کیے تھے۔ پھر اس نے توقف کیا اور مجھ سے مخاطب ہو گیا تھا:

'میری پیاری بہن، کیا اس علاقے میں آپ کے کچھ رشتے دار نہیں؟'

میں نے جواب میں کہا تھا:

'کچھ تھے تو، جن میں de Lucenet موسیو تھا جو پرانی حکومت میں Pontarlier کے پھاٹکوں کا کپتان تھا۔'

'ہاں!' میرے بھائی نے کہا تھا، 'مگر 93' میں تو کوئی رشتے دار نہیں رہ گئے تھے؛ لوگوں کے پاس صرف ان کے بازو تھے۔ میں نے کام کیا تھا۔ Pontarlier میں جہاں آپ جا رہے ہیں، موسیو ژاں ولیوان، وہ واقعی ایک مردمری اور خوب صورت صنعتی علاقہ ہے۔ ان کے پنیر بنانے کے کارخانے ہیں، جن کو وہ fruitieres کہتے ہیں۔'

تب میرے بھائی نے، آدمی سے کھانے پر اصرار کرتے ہوئے، اس کو بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ Pontarlier کی وہ fruitieres کیا تھیں؛ کہ ان کو دو درجوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا: مویشیوں کے بڑے باڑے، جو امرا کی ملکیت تھے جہاں چالیس پچاس گائیں ہوتی تھیں جو گرمی کے موسم میں سات سے آٹھ ہزار ٹن پنیر پیدا کرتی تھیں، اور دوسری منسلکہ fruitieres جو کم مایہ لوگوں کی ملکیت تھیں؛ ان کے مالک نصف پہاڑی علاقے کے کسان ہیں، جو مشترکہ گائیں رکھتے

ہیں، اور ان سے ہونے والے آمدنی آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ وہ کسی پنیر بنانے والے ماہر کی خدمات حاصل کرتے ہیں، جس کو grurin کہا جاتا ہے؛ grurin دن میں تین بار ان مشترک لوگوں سے دودھ وصول کرتا ہے، اور دو لکڑیوں پر نشان لگا کر مقدار کا حساب رکھتا ہے۔ اپریل کے آخر میں پنیر بنانے والے کارخانوں کا کام شروع ہوتا ہے؛ جون کے درمیانہ دنوں میں پنیر بنانے والے اپنی گائیوں کو پہاڑوں میں ہانک دیتے ہیں۔

کھانا کھانے کے دوران اس آدمی کی بشاشت لوٹ آئی تھی۔ میرے بھائی نے اسے اپنی Mauves وائن پلائی، جسے وہ خود نہیں پیتا، اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ وائن مہنگی ہوتی ہے۔ میرے بھائی نے یہ سب تفصیلات اپنے آسان اور خوش دلی کے انداز میں پیش کیں، تم جن سے واقف ہو، اور اس دوران وہ بڑی خوب صورتی سے میری طرف دیکھتا بھی جاتا تھا۔ وہ grurin کے آسودگی سے مملو کاروبار کا بار بار تذکرہ کر رہا تھا، گویا وہ چاہتا تھا کہ یہ آدمی بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ کام اس کی اپنی مستقبل کی زندگی کا ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک چیز مجھے بہت کھٹکی تھی۔ یہ آدمی کیا تھا، یہ تو میں تمھیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ نہ کھانے کے دوران، نہ اس شام کے درمیان، میرے بھائی نے، سوائے یسوع مسیح کے بارے میں چند لفظوں کے، ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، جو اس شخص کو یاد دلاتا کہ وہ کیا تھا، نہ یہ کہ میرا بھائی کیا تھا۔ حالاں کہ ہر طرح سے، یہ موقع تھا تبلیغ کے چھوٹے سے خطبے کا، اور بشپ کا رعب ڈالنے کا، تا کہ سزا یافتہ کے ماضی کا نشان باقی رہے۔ یہ بات کسی ایسے شخص پر بھی واضح ہوئی ہوگی جس کو کبھی موقع ملا ہوگا اس قسم کے کسی بدقسمت آدمی کی روح اور جسم کو غذا پہنچانے کا اور اخلاقی مشورے سے مملو سرزنش کرنے کا تا کہ وہ مستقبل میں اپنے لیے بہتر لائحۂ عمل اختیار کرے۔ میرے بھائی نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کس ملک سے آیا ہے، نہ یہ کہ اس کی تاریخ کیا تھی۔ اس لیے کہ اس کی تاریخ میں ایک خرابی تھی، اور میرا بھائی ہر اس بات سے پرہیز کر رہا تھا جو اس خرابی کی یاد دلا سکتی تھی۔ میرے بھائی نے اس حد تک خیال رکھا تھا کہ ایک وقت، جب میرا بھائی Pontarlier کے پہاڑی باشندوں کے بارے میں بات کر رہا تھا، جو اپنی دوسری دنیا کے لیے کم محنت کرتے ہیں، اور جو خوش رہتے ہیں اس لیے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس دوران ایسی کوئی بات منہ سے نکل نہ جائے جو اس آدمی کے زخموں کو تازہ کر دے۔ اپنی یادداشت پر بھروسا کرتے ہوئے، میں کہہ سکتی ہوں کہ اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے رہے ہوں گے۔ بلاشبہ وہ سوچ رہا تھا کہ اس آدمی کی یادداشتوں میں، جس کا نام ژاں ولژاں ہے، اس کی بدقسمتی کے نقوش تازہ ہوں گے؛ کہ بہترین

بات یہ ہوگی کہ اسے ان سے موڑ دیا جائے، اور اس کو یہ یقین دلایا جائے، خواہ وہ وقتی ہی کیوں نہ ہو، کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ایک عام شخص ہے۔ کیا یہ نیکی کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا طریقہ نہیں؟ میری پیاری مادام! کیا اس نزاکت میں واقعی انجیل کی تعلیمات پوشیدہ نہیں جو خطبے دینے سے، اخلاقیات سکھانے سے اور ایمائیت سے پرہیز کرتی ہے؟ اور کیا یہ حقیقی رحم نہیں، کہ جب کسی آدمی کا کوئی نازک معاملہ درپیش ہو مگر اس کو چھونے سے پرہیز کیا جائے؟ مجھے محسوس ہوا ہے کہ یہ خیالات میرے بھائی کے اپنے نجی ہوں گے۔ بہر حال، میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ ایسے خیالات رکھتا ہے تو اس نے اس کے کبھی کوئی اشارے نہیں دیے تھے؛ ابتدا سے آخر تک، خود میرے نزدیک بھی، اس شام اس کے وہی خیالات تھے جب وہ ژاں ولژاں کے ساتھ ایسے ماحول میں رات کا کھانا کھا رہا تھا، گویا وہ موسیو Gedeon le Provost یا پیرش کی کیوریٹ کے ساتھ کھانا کھا رہا ہو۔"

آخر میں، جب وہ انجیروں تک پہنچا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس بار مدر Gerbaud تھی، بازو میں اپنے چھوٹے بچے کو دبائے ہوئے۔ میرے بھائی نے بچے کے ماتھے کا بوسہ لیا، اور مجھ سے وہ پندرہ سو لیے جو میں مدر Gerbaud کو دینے ہی والی تھی۔ وہ آدمی ان سب باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اب وہ تو بات بھی نہیں کر رہا تھا، اور بہت زیادہ تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مدر Gerbaud کے چلے جانے کے بعد میرے بھائی نے فضلِ ربی کہا؛ اور اس آدمی سے مخاطب ہو کر کہا "آپ کو بستر کی بہت ضرورت ہوگی۔" مادام ماگلا نے پھرتی سے میز خالی کی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ اب ہم کو اپنی خواب گاہ میں چلا جانا چاہیے، تاکہ مسافر سو سکے، اور پھر ہم دونوں اوپر چلے گئے۔ پھر بھی، تھوڑی دیر کے بعد میں نے مادام ماگلا کو نیچے بھیجا تاکہ وہ بلیک فاریسٹ کے بکرے کی کھال، جو میرے کمرے میں تھی، اس آدمی کے بستر کے پاس لے جائے۔ راتیں سرد ہوتی ہیں، اور یہ کھال آدمی کو گرم رکھتی ہے۔ افسوس کہ کھال بہت پرانی ہے؛ اس کے تمام بال جھڑ رہے ہیں۔ میرے بھائی نے یہ کھال، اور ہاتھی دانت کے دستے کا چاقو جو میں میز پر استعمال کرتی ہوں، اس وقت خریدا تھا جب وہ دریائے ڈینیوب کے منبعے کے قریب Tottlingen جرمنی میں مقیم تھا۔

مادام ماگلا فوراً ہی واپس آگئی تھی۔ ہم نے ملاقات کے کمرے میں دعائیں کیں، جہاں ہم اپنے کپڑے سکھانے کے لیے ڈالتے ہیں، اور ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر، اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔"

۞

طمانیت

اپنی بہن کو شب بخیر کہنے کے بعد موں سنیور بیاں وینیو نے میز پر سے ایک نقرئی شمع دان اٹھایا، اپنے مہمان کے حوالے کیا اور کہا:

"موسیو، میں آپ کو آپ کے کمرے تک لے چلوں گا۔"

مہمان اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس گھر کی اس طرح ترتیب کی گئی تھی کہ خطابت کرنے کی جگہ، جہاں محراب بنی ہوئی تھی، پہنچنے یا وہاں سے باہر نکلنے کے لیے بشپ کی خواب گاہ سے گزرنا پڑتا تھا۔

جس وقت وہ کمرے سے گزر رہا تھا، مادام ماگوا نقرئی ساز و سامان کو بستر کے سرہانے رکھی ہوئی الماری میں منتقل کر رہی تھی۔ ہر شب بستر میں جانے سے قبل یہ اس کا آخری کام ہوتا تھا۔

بشپ نے اپنے مہمان کو محراب کے بستر تک پہنچا دیا۔ سفید رنگ کا بستر تیار تھا۔ مہمان نے شمع دان کو بستر کے قریب میز پر رکھ دیا۔

"اچھا،" بشپ نے کہا "شب بخیر۔ کل صبح آپ کے روانہ ہونے سے قبل ہم اپنی گائے کا تازہ دودھ نوش کریں گے۔"

"شکریہ! موسیو l'Abbe" مہمان نے جواب دیا۔

ابھی بڑے اطمینان سے اس آدمی نے یہ جملہ ادا ہی کیا تھا کہ اچانک، اور بغیر کسی تبدیلی کے، اس نے ایک عجیب حرکت کی، جو اگر ان کے سامنے ہوئی ہوتی تو ان دونوں سوفسطائی عورتوں کو جما کر رکھ دیتی۔ آج بھی ہمارے لیے اس کی کوئی توجیہ پیش کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل

اس نے کس جذبے کے تحت کیا تھا۔کیا وہ کسی قسم کی تنبیہ کرنا چاہتا تھا یا محض ڈرانا دھمکانا چاہتا تھا؟ کیا اس نے یہ حرکت اپنی فطری جبلت کے زیر اثر کی تھی، جس کا خود اس کو بھی علم نہیں تھا؟

وہ اچانک بوڑھے آدمی پر اُلٹ پڑا تھا، دونوں ہاتھ باندھ لیے تھے اور اپنے میزبان کو وحشیانہ نظروں سے دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا تھا:

"اوہ واقعی! آپ اپنے گھر میں مجھے رکھ رہے ہیں،اور اپنے آپ سے اس قدر قریب ہیں؟"

پھر اس نے قہقہہ مارتے ہوئے اضافہ کیا، جس میں کچھ خوف ناکی لہرا رہی تھی:

""کیا آپ نے اچھی طرح سوچ لیا تھا؟ آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ میں آپ کے قتل کے ارادے سے نہیں آیا ہوں؟""

بشپ نے جواب دیا،"یہ مسئلہ میرا نہیں میرے مہربان خدا کا ہے۔"

اس کے بعد اس نے سنجیدگی سے اپنے ہونٹ اس طرح ہلائے گویا وہ کوئی دعا یا بات کر رہا ہو، اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیاں بلند کیں اور اس آدمی کے لیے برکت کی دعا کی، جو جھکا نہیں تھا، اور کچھ کہے یا پلٹ کر دیکھے بغیر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

جب محراب والا علاقہ استعمال میں ہوتا تو ایک دیوار سے دوسری دیوار تک مرج سے بنا بڑا سا پردہ کھینچ دیا جاتا تھا جو قربان گاہ کو پوشیدہ کر دیتا تھا۔بشپ اس پردے کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کو رُکا، گھٹنوں کے بل جھکا اور مختصر سی دعا کی۔تھوڑی دیر بعد وہ باغیچے میں ٹہل رہا تھا، مراقبہ کر رہا تھا، اپنے دل و دماغ کو یک جا کر کے ان عظیم الشان چیزوں میں کھو گیا تھا جو خدا رات میں ان آنکھوں کو دکھاتا ہے، جو کھلی رہتی ہیں۔

وہ آدمی اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس نے صاف ستھری سفید چادروں سے استفادہ بھی نہیں کیا۔کسی سزا یافتہ کے انداز میں اپنے نتھنوں سے موم بتی بجھائی، سب کچھ پہنے ہوئے ہی بستر پر گر پڑا، اور فوراً ہی گہری نیند سو گیا۔

بشپ باغیچے سے اپنے کمرے میں واپس آیا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔

چند منٹ کے اندر اس چھوٹے سے گھر کے سارے مکین سو رہے تھے۔

۞

ژاں وِلژاں

آدھی رات کے قریب ژاں ولواں جاگ اٹھا تھا۔

ژاں ولواں کا تعلق Brie کے ایک نادار کسان خاندان سے تھا۔ اس نے بچپنے میں پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ Faverolles میں واقع ایک آدمی کے پیڑوں کی کاٹ چھانٹ کا کام کرنے لگا تھا۔ اس کی ماں کا نام تھا Jeanne Mathieu؛ اس کے باپ کا نام تھا ژاں ویلواں یا ولیواں۔

ژاں ولواں کی سوچنے کی عادت تھی جو شفقت آمیز فطرتوں کی خصوصیت ہوا کرتی ہے۔ ژاں ولواں میں، من حیث الکل، یقینی طور پر کچھ سُستی کی عادت تھی جو نظر آتی تھی۔ نوعمری ہی میں اس کے سر سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ اس کی ماں کا دودھ کے بخار [رضاعت کے دوران چھوت کی بیماری] میں انتقال ہوگیا تھا، جس کا قرینے سے علاج نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا باپ اُسی کی طرح پیڑوں کی تراش خراش کرنے کا کام کرتا تھا، اور ایک پیڑ پر کام کرنے کے دوران گر جانے سے انتقال کر گیا تھا۔ ژاں ولواں کے خاندان میں صرف اس کی ایک بہن بچی تھی، جو ژاں سے بڑی تھی، سات بچوں، لڑکوں اور لڑکیوں ماں تھی، اور بیوہ ہو گئی تھی۔ اس بہن ہی نے ژاں ولواں کی پرورش کی تھی، اور جب تک اس کا شوہر زندہ تھا وہ اپنے چھوٹے بھائی کو کھلاتی پلاتی، اور اپنے ساتھ رکھتی بھی تھی۔

شوہر مر گیا۔ سات بچوں میں سب بڑا آٹھ برس کا تھا اور سب سے چھوٹا ایک برس کا۔

ژاں ولواں پچیس برس کا ہوا تھا کہ اس نے اپنے باپ کی جگہ سنبھال لی اور اپنی بہن کی مدد کی، جس نے اس کو پالا پوسا تھا۔ یہ کام اس نے فرض کے طور پر کیا تھا، مگر ذرا بے ڈھنگے

پن سے۔ اس طرح اس کی نوجوانی بداخلاق اور کم اجرت والے کام میں گزری تھی۔ اس کی اپنے علاقے میں کبھی کسی "مہربان خاتون دوست" سے شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس کو محبت میں گرفتار ہونے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔

وہ تھکا ماندہ رات کے وقت گھر واپس ہوتا، اور ایک لفظ بھی کہے بغیر کھانا کھاتا۔ کھانے کے دوران اکثر اس کی بہن اپنے بچوں کو دینے کے لیے اس کے پیالے میں سے کھانے کے بہترین اجزا— گوشت کا ٹکڑا، بیکن کی پرت، کرم کلّے کا اندرونی حصہ— نکال لیا کرتی تھی۔ جب وہ سر جھکائے کھانا کھا رہا ہوتا، اس کا سر میز پر جھکا اور تقریباً شوربے کے پیالے میں ہوتا تھا، اس کے بال پیالے میں گر جاتے اور اس کی آنکھوں کو ڈھک لیتے تھے۔ وہ ان کو ہٹانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ وہاں Faverolles میں، جو ولژاں کے جھونپڑے سے زیادہ دور نہیں تھا، گلی کے اس پار ایک کسان کی بیوی رہتی تھی جس کا نام Marie-Claude تھا؛ عام طور پر بھوکے ولژاں بچے Marie-Claude کے پاس، اپنی ماں کے نام سے، ایک پائنٹ دودھ اُدھار مانگنے جاتے، جس کو کسی گلی کے نکڑ پر یا کسی باڑھ کی آڑ میں کھڑے ہو کر پی جاتے، اور اس دوران ایسی چھینا جھپٹی کرتے کہ تھوڑا سا دودھ چھوٹی بچی کے ایپرن پر، گر گر اس کے گردن کے نیچے تک چلا جاتا تھا۔ اگر ان کی ماں کو اس غارت گری کا علم ہو جاتا تو خطا کاروں کو سخت سزا ملتی۔ ژاں ولژاں ناراضی کے باوجود، ان کی ماں کو بتائے بغیر، Marie-Claude کو دودھ کی قیمت ادا کر دیا کرتا تھا، اس طرح بچے سزا سے بچ جاتے تھے۔

پیڑوں کی قلم کاری کے موسم میں وہ روزانہ اٹھارہ سُو کما لیتا؛ اس کے بعد وہ پیال کے گٹھر بنانے کا کام کرتا یا مزدوری وغیرہ کیا کرتا تھا۔ جو کچھ بھی ممکن ہوتا وہ کرتا رہتا تھا۔ اس کی بہن بھی کام کرتی تھی، مگر سات بچوں کے ساتھ وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ ان کا گھرانا اداسی اور دُکھوں میں گھرا ہوا تھا، اور آہستہ آہستہ فنا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بار بہت سخت سردی کا موسم آیا۔ ژاں کے پاس کوئی روزگار نہیں تھا۔ خاندان کے پاس روٹی نہیں تھی؛ واقعی روٹی تک نہیں تھی۔ اس پر سات بچے!

ایک اتوار کی شام، Faverolles کا چرچ اسکوائر، Maubert Isabeau بیکری والا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کی دکان کے اگلے حصے کی جالیوں کی جانب سے زور دار آواز سنائی دی۔ آواز سنتے ہوئے وہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ مکّے سے جالی اور شیشے میں بنائے ہوئے ایک سوراخ میں گھسے ایک بازو نے ایک ڈبل روٹی نکالی اور بھاگ نکلا۔ Isabeau اس کے پیچھے تیزی سے دوڑا؛ چوری کرنے والا اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔

Isabeau نے دوڑ کر اس کو پکڑ لیا۔ چور نے ڈبل روٹی پھینک دی تھی، مگر اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ شخص ژاں ولژاں تھا۔

یہ واقعہ 1795ء میں پیش آیا تھا۔ ژاں ولژاں کو چوری اور رات کے وقت ایک گھر میں نقب لگانے کے جرم میں نالش کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس کے پاس ایک پستول بھی تھا جسے وہ دنیا کے ہر شخص سے زیادہ اچھی طرح استعمال کر سکتا تھا؛ وہ ناجائز طور پر شکار کھیلنے کا عادی تھا، اس وجہ سے اس کا مقدمہ اور بھی خراب ہو گیا۔ اس لیے کہ پولیس ناجائز شکاریوں کے خلاف قانونی طور پر سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اسمگلروں کی طرح، ناجائز شکاری بھی ڈاکو جیسا ہی ہوتا ہے۔ پھر بھی، ہم یہ کہیں گے کہ اب بھی ان نسلوں کے انسانوں اور شہر کے بھیانک قاتلوں کے درمیان ایک پاتال جیسا فاصلہ ہوتا ہے۔ ناجائز شکاری جنگل میں رہتا، اسمگلر پہاڑوں یا سمندر پر رہتا ہے۔ شہر خطرناک انسان بناتے ہیں اس لیے کہ وہ آدمی کو بدعنوان بناتے ہیں۔ پہاڑ، سمندر، جنگل وحشی آدمی بناتے ہیں؛ ان کی نرم خوئی کو تباہ کیے بغیر ان کے خون خوار پہلو کو ترقی دیتے رہتے ہیں۔

ژاں ولژاں کو مجرم قرار دے دیا گیا۔ قانون کی شرائط واضح تھیں۔ تہذیبوں میں بھیانک لمحات آیا کرتے ہیں؛ ایسے بھی موقعے آتے ہیں جب تعزیری قوانین کے مطابق جہازوں کی تباہی کا حکم صادر کر دیا جاتا ہے۔ وہ کیسا نامبارک لمحہ ہوتا ہے جس میں تہذیب پسپا ہو جاتی ہے اور ایک باشعور و حساس وجود کی ناقابلِ اصلاح دست برداری کی تکمیل کرتی ہے۔ ژاں ولژاں کو پانچ برس جہازوں میں غلامی [گیلیز] کی سزا سے دی گئی۔

اپریل 1796ء کی بائیسویں تاریخ کو جنرل نپولین بونا پارٹ کے ہاتھوں Montenotte کی فتح کا پیرس میں اعلان کیا گیا تھا؛ اسی دن جہازوں پر کام کرنے والے قیدی غلاموں کے ایک بڑے گروہ کو Bicetre میں زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ ژاں ولژاں اس گروہ کا حصہ تھا۔ ایک پرانے جیلر کو جو تقریباً اسی برس کا ہو چکا ہے، وہ بدقسمت شخص اب بھی اچھی طرح یاد ہے جس کو صحن کے شمالی حصے میں، چوتھی قطار کی زنجیر کے آخر میں باندھ دیا گیا تھا۔ دوسروں کی طرح اس کو بھی زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔ سوائے اس کے کہ حالت خراب تھی، اس کو اپنی حالت کا پورا ادراک نہیں ہو سکا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی نادار آدمیوں کے مبہم تصورات سے گلو خلاصی چاہتا تھا، مگر وہ ہر بات سے واقف نہیں تھا۔ جس وقت اس کے فولادی طوق کو ہتھوڑے کی شدید ضرب سے بند کیا جا رہا تھا، وہ رو رہا تھا، آنسوؤں سے اس کا سانس رک رہا تھا، انھوں نے اس کی تقریر کی صلاحیت کو بھی روک دیا تھا؛ وقتاً فوقتاً وہ صرف اتنا ہی کہہ پاتا تھا ”میں تو

Faverolles میں پیڑوں کی قلم کاری کرتا تھا۔" اس کے بعد، سسکیاں لیتے ہوئے، اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس کو درجہ بہ درجہ سات بار نیچے کیا، گویا وہ سات غیر مساوی قد کے سروں کو چھو رہا ہو، اور اس حرکت سے یہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا تھا سات بچوں کی بھوک کو مٹانے اور برہنگی کو چھپانے کی خاطر کیا تھا۔

اسے Toulon کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ ستائیس دنوں کے گاڑی پر سفر کے بعد، جس کے دوران اس کی گردن زنجیر سے بندھی ہوئی تھی، وہ منزلِ مقصود پر پہنچا تھا۔ Toulon میں اس کو سُرخ رنگ کا لبادہ پہنایا دیا گیا۔ ہر وہ شے جس سے اس کی زندگی بنی تھی مٹا دی گئی؛ حتیٰ کہ اس کا نام بھی ژاں ولژاں نہیں رہا؛ وہ محض 24,601 بنا دیا گیا تھا۔ اس کی بہن کا کیا حال ہوا؟ ان سات بچوں پر کیا گزری؟ کون اس سب کی پروا کرتا ہے؟ اس پودے کی مٹھی بھر پتیوں کا کیا حال ہوتا ہے جس کو جڑ کے قریب سے کاٹ دیا جاتا ہے؟

ہمیشہ یہی قصہ ہوتا ہے۔ یہ نادار زندہ وجود، یہ خدا کی مخلوق، بے سہارا، بے راہ، بے پناہ، بلا ترتیب ماری ماری پھرتی — جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں — ہر ایک اپنی سمت چلتی، رفتہ رفتہ سرد دھند میں خود کو دفن کر لیتی ہے، جو بے یار و مددگار زندگیوں پر چھا جاتی ہے؛ اداس سایے، نسلِ انسانی کا تاریک سفر ہوتے ہیں جس میں نہ جانے کتنے خوش قسمت سر غائب ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنا ملک چھوڑ گئے۔ وہ گھنا گھر جو اُن کا گاؤں تھا ان کو بھول گیا؛ پگڈنڈیاں جو اُن کے کھیتوں کا تعین کرتی تھیں انھیں بھول گئیں؛ جہازوں پر چند برس قیام کے بعد، ژاں ولژاں نے خود ہی ان کو بھلا دیا تھا۔ اس دل میں کبھی ایک زخم تھا، زخم کا ایک نشان تھا، اور بس۔ اس تمام عرصے جو Toulon میں گزرا تھا صرف ایک بار اس نے اپنی بہن کا تذکرہ سنا تھا۔ یہ واقعہ شاید قید کے چوتھے برس کے درمیان ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کن ذرائع سے یہ خبر اس تک پہنچی تھی۔ کسی نے، جو اُن کو اُن کے ملک کے زمانے سے جانتا تھا، اس کی بہن کو دیکھا تھا۔ وہ پیرس میں مقیم تھی۔ وہ ایک افلاس زدہ علاقے کی گلی Rear Saint-Sulpice میں رہتی تھی جو Rue du Gindre میں واقع تھی۔ اس کے پاس اس کا صرف ایک بچہ تھا، چھوٹا سا لڑکا، سب سے چھوٹا والا۔ بقیہ چھ کہاں تھے؟ شاید خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ ہر صبح وہ Sabot اسٹریٹ، 3 پر واقع ایک چھاپے خانے کے دفتر جاتی تھی جہاں وہ کاغذ تہہ کرتی اور جلدوں کی سلائی کرتی تھی۔ اسے جاڑے کے دنوں میں روشنی ہونے سے بہت پہلے، صبح چھ بجے وہاں موجود ہونا ہوتا تھا۔ اسی عمارت میں، چھاپے خانے کے قریب ایک اسکول تھا، اور اس اسکول میں وہ اپنے چھوٹے سے

بچے کو لے جاتی تھی، جس کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ چوں کہ اسے چھاپے خانے کے دفتر چھ بجے صبح پہنچنا ہوتا تھا، اور اسکول سات بجے شروع ہوتا تھا، بچے کو عمارت کے صحن میں اسکول کے کھلنے کے لیے ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ سردی کے موسم کی رات کا ایک گھنٹا، کھلے آسمان کے نیچے۔ چھاپے خانے کے دفتر والے بچے کو اندر آنے نہیں دیتے تھے اس لیے کہ ان کے مطابق بچہ کام میں رکاوٹ بنتا تھا۔ کام کرنے والے جب صبح کو اُدھر سے گزرتے، تو وہ اس ننھی سی جان کو راستے پر بیٹھا دیکھتے، جس پر نیند کا غلبہ ہوتا، اکثر تو وہ سایے میں اپنی جھابی پر ٹیک لگا کر سو جاتا تھا۔ جب بارش ہونے لگتی تو ایک بوڑھی عورت جو دربانی کا کام کرتی تھی، از راہِ رحم، بچے کو اٹھا کر اپنی جگہ پر لے جاتی، جہاں ایک تختہ، ایک چرخہ اور دو عدد چوبی کرسیاں رکھی ہوتی تھیں۔ بے چارہ ننھا ایک کونے میں دبک کر لیٹ جاتا تھا، اور بلی کے جسم سے قریب ہو جاتا تھا تا کہ اس کو سردی کم لگے۔ سات بجے اسکول کھلتا، اور وہ اسکول میں چلا جاتا تھا۔ یہ تھی وہ روئداد جو ژاں ولژاں کو بتائی گئی تھی۔

انھوں نے ولژاں سے ایک دن اس بارے میں بات کی تھی؛ وہ ایک لمحہ تھا، ایک جھما کا تھا، گویا اچانک ایک کھڑکی سی کھل گئی تھی، ان کے نصیب پر، وہ جن سے محبت کرتا تھا، اور پھر ایک بار پھر بند ہو گئی۔ اس کے بعد، اسے ان کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔ اس نے پھر کبھی انھیں نہیں دیکھا، کبھی نہیں ملا، اور اس دردانگیز تاریخ کے تسلسل میں ان سے مزید ملاقات نہیں ہوگی۔

قید کے چوتھے برس کے آخر میں ژاں ولژاں کے فرار کی باری آئی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی مدد کی، جیسا کہ اس بد قسمت جگہ کا رواج تھا۔ وہ فرار ہو گیا۔ کئی دنوں تک میدانوں میں آزاد پھرتا رہا، جہاں، جب چاہے مڑ کر دیکھ سکتا تھا، ہلکی سے ہلکی آواز پر لرز جاتا تھا، ہر شے سے، دھواں دیتی ہوئی چھت سے، گزرتے ہوئے آدمی سے، بھونکتے ہوئے کتے سے، سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے سے، گھنٹا بجاتی گھڑی کی آواز سے، دن کی روشنی سے اس لیے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے، رات کی سیاہی سے اس لیے اس میں کچھ نظر نہیں آتا، شاہراہوں سے، پگڈنڈیوں سے، کسی جھاڑی سے، اور نیند سے خوف زدہ رہتا تھا۔ دوسرے دن کی شام پکڑا گیا۔ چھتیس گھنٹوں سے اس نے نہ کچھ کھایا تھا، نہ سویا تھا۔ بحری ثالثی عدالت نے اس جرم کے عوض اس کی سزا کے عرصے کو مزید تین سال بڑھا دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کی قید کا عرصہ پانچ کے بجائے آٹھ برس کا ہو گیا تھا۔ قید کے چھٹے برس میں ایک بار پھر فرار کی باری آئی، اس نے کوشش کی، مگر فرار مکمل نہیں ہو سکا۔ وہ حاضری کے وقت غائب تھا۔ توپیں داغی گئیں، اور شب

گشتیوں نے مفرور کو زیرِ تعمیر جہاز کے تلے کے نیچے چھپا تلاش کر لیا؛ اس نے جہاز کے محافظوں سے مزاحمت کی، مگر پکڑ لیا گیا۔ فرار اور سرکشی! اس مقدمے کے لیے خاص قانون بنایا گیا تھا۔ اس کی قید کے عرصے میں مزید پانچ برسوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس میں دو برس دہری زنجیر میں، یعنی مجموعی عرصہ تیرہ برس ہو گیا۔ دسویں برس میں پھر اس کے فرار کی باری آئی؛ اس نے ایک بار پھر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کامیابی نہیں ہوئی تازہ کوشش کے مزید تین برس۔ کل سولہ برس۔ آخر میں، میرا خیال ہے کہ تیرھویں برس میں، اس نے فرار کی آخری کوشش کی۔ چار گھنٹوں کے اندر ہی پکڑا گیا۔ ان چار گھنٹوں کے لیے مزید تین برس۔ کُل انیس برس۔ اکتوبر 1815ء میں اس کو رہائی ملی؛ 1796ء میں ایک دکان کا شیشہ توڑنے اور ایک پاؤ نان چرانے کے جرم میں قید شروع ہوئی تھی۔

جملۂ معترضہ! یہ دوسرا موقع ہے کہ سزا اور قانون کے ذریعے پھٹکار کے سوال پر اس کتاب کے مصنف نے دیکھا ہے کہ ایک پاؤ نان کا چرانا مقدر کے لیے کتنا بڑا حادثہ بنتا ہے۔ Claude Gueux نے ایک پاؤ نان چرائی تھی؛ ژاں ولژاں نے ایک پاؤ نان چرائی تھی۔ انگلستان کے اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ لندن میں چوری کی پانچ وارداتوں میں سے چار کی اصل بنیاد بھوک ہوتی ہے۔

ژاں ولژاں سسکیاں لیتا، لرزتا جہازی قید میں داخل ہوا تھا۔ جذبات سے عاری برآمد ہوا۔ مایوسی کے عالم میں داخل ہوا؛ اداسی کے عالم میں نکلا۔

اس روح پر کیا بیتی ہوگی؟

۞

نا اُمیدی کا اندرون

آیئے، اسے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی ان چیزوں پر نظر کرے، اس لیے کہ یہ خود اسی کی پیدا کردہ ہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ ناواقف آدمی تھا مگر بیوقوف نہیں تھا۔ فطرت کی روشنی اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ ناخوشی نے، جو خود اپنے تصور کی شفافیت کی حامل ہوتی ہے، اس کے ذہن کی تھوڑی سی روشنی کو بڑھا دیا تھا۔ ڈنڈے کے نیچے، زنجیر میں بندھے، قید کی کوٹھری میں، تکلیف میں، جہازوں پر آگ برساتے سورج کے نیچے، سزا یافتہ کے لیے بنے تختوں کے بستر پر وہ اپنے شعور میں واپس چلا جاتا اور مراقبہ کرتا تھا۔

اس نے خود کو ایک ثالثی عدالت بنا لیا تھا۔

اور اس نے اپنے آپ پر مقدمہ چلانے سے شروعات کی۔

اس نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا کہ وہ بے خطا آدمی نہیں جس کو غیر منصفانہ طور پر سزا دی گئی تھی۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے قابلِ ملامت جرم کا ارتکاب کیا تھا! کہ اگر اس نے مانگ لیا ہوتا تو ڈبل روٹی دینے سے انکار نہیں کیا جاتا؛ کہ بہر حال بہتر یہ ہوتا کہ اس کی ضرورت رحم یا کام کے ذریعے پوری کی گئی ہوتی؛ یہ کہنا ناقابلِ جواب دلیل ہے کہ "کیا کوئی بھوکا انتظار کر سکتا ہے؟" سب سے پہلے، یہ بعید از قیاس ہے کہ واقعی کوئی بھوک سے مر جاتا ہے؛ دوسری بات یہ ہے کہ، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے انسان اس طرح بنایا گیا ہے کہ مرے بغیر وہ، اخلاقی اور جسمانی دونوں اعتبار سے، دیر تک اور بہت سارے دکھ اٹھا سکتا ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ صبر کیا جائے؛ بے چارے بچوں کے معاملے میں صبر اور بھی بہتر ہوتا؛ یہ عمل اس کا پاگل پن تھا کہ ایک خستہ حال

بدقسمت انسان بہ زور سماج کی گردن پکڑ لے اور یہ تصور کر لے کہ وہ چوری کے ذریعے اپنی خستہ حالی سے نکل سکتا ہے؛ یہ ایک خراب دروازہ ہے جس کے ذریعے اپنی مفلوک الحالی سے نکلا جائے، جس کے ذریعے بے عزتی و بدنامی داخل ہوتی ہے؛ مختصر یہ کہ وہ غلطی پر تھا۔

تب اس نے اپنے آپ سے پوچھا:

کیا اس کی اپنی مہلک تاریخ میں وہی ایک تھا جو غلطی پر تھا؟ کیا یہ سنجیدہ بات نہیں کہ جو ایک بے روزگار حمال اور جفاکش آدمی تھا اس کے لیے روٹی کی کمی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اور اگر غلطی ایک بار کی گئی ہو اور اس کا اعتراف کیا گیا ہو تو، کیا دی گئی تادیب سخت اور غیر متناسب نہیں تھی۔ کیا جرمانے کے معاملے میں قانون کی طرف سے زیادتی نہیں ہوئی، بہ نسبت اس جرم کے جو خطار کار نے کیا تھا۔ کیا میزان کے توازن میں، اس ایک پلڑے میں زیادہ وزن نہیں تھا، جس میں کفارہ بھی رکھا گیا تھا۔ کیا تاوان کی زیادتی، جرم کی نابودی کے برابر نہیں تھی، جس کے بدلے میں حالات میں تبدیلی نہیں آئی، جس میں قصوروار کی غلطی کو جبر کی غلطی میں بدل دیا گیا تھا؛ مجرم محض نشانہ بننے والا بن گیا تھا؛ مقروض قرض خواہ بن گیا تھا اور قانون یقینی طور پر اس کی جانب ہو گیا تھا جس نے اس کو توڑا تھا۔

کیا یہ تادیب، جو فرار کی متواتر کوششوں سے پیچیدہ ہو گئی تھی، آخر میں ایک قسم کی زیادتی نہیں بن گئی تھی، جو زیادہ طاقت والا کم طاقت والے پر کر رہا تھا؛ سماج کا جرم فرد کا جرم بن گیا تھا، وہ جرم جو ہر روز نئے انداز میں کیا جا رہا تھا، وہ جرم جو انیس برس تک ہوتا رہا تھا۔

اس نے خود سے سوال کیا: کیا انسانی سماج کو حق ہے کہ ایک طرف تو اپنی دوراندیشی میں نامعقول کمی پر اور دوسری جانب اپنی بے رحم دوراندیشی کے باعث اپنے ارکان کو برابر برابر دکھ اٹھانے پر مجبور کرے؛ اور ایک نادار آدمی کو نقص اور زیادتی کے درمیان، کام اور ضرورت سے زیادہ سزا کے درمیان پکڑے رکھے۔

کیا یہ سماج کی زیادتی نہیں تھی کہ وہ اپنے ان ارکان سے اس طرح کا سلوک کرے، جو پہلے بھی کم نوازے گئے تھے، اور نتیجے کے طور پر التفات کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔

یہ سوالات اٹھا کر، ان کے جواب دے کر اس نے سماج کو پرکھا اور اس کی مذمت کی۔

اس نے اپنی نفرت کے باعث سماج کی مذمت کی۔

اس نے سماج کو اس حال کا ذمے دار ٹھہرایا وہ جس سے گزر رہا تھا، اور اس نے خود سے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ اس سے حساب کرنے میں تکلف نہ کرے۔ اس نے اپنے

آپ سے کہا کہ جو نقصان اس نے پہنچایا تھا اور جو نقصان اس کو پہنچایا گیا ہے ان کے درمیان مساوات نہیں کی گئی تھی؛ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سچ پوچھا جائے تو اس کی تادیب بے جا نہیں تھی مگر بعید از انصاف ضرور تھی۔

طیش احمقانہ بھی ہوسکتا ہے اور لغو بھی۔ انسان کو بے جا طور پر مشتعل بھی کیا جا سکتا ہے؛ انسان اس وقت برانگیختہ ہوتا ہے صرف جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی حد تک حق پر ہے۔ اور ژاں ولژاں نے خود کو برانگیختہ پایا۔

اس کے علاوہ، انسانی سماج نے اس کو سوائے نقصان کے کچھ نہیں دیا تھا۔ اس نے کبھی کچھ نہیں دیکھا سوائے غصے بھرے چہرے کے، جسے وہ انصاف کہتا ہے، اور اسے ان لوگوں کو دکھاتا ہے جن پر وار کرتا ہے۔ آدمیوں نے اس کو چھوا ضرور تھا مگر صرف زخم دینے کے لیے۔ اس سے ہونے والا ہر ربط اس پر ایک ضرب رہا ہے۔ اپنے زمانۂ شیر خواری کے بعد، ماں کے اور اپنی بہن کے ساتھ گزارے دنوں کے بعد سے اس نے نہ کبھی کوئی دوستانہ لفظ سنا نہ کوئی مہربان نظر دیکھی۔ ایک دکھ سے دوسرے دکھ تک، رفتہ رفتہ وہ اس یقین پر پہنچا کہ زندگی ایک جنگ ہے؛ اور یہ بھی کہ اس جنگ میں اس کو شکست کیا گیا تھا۔ اس کے پاس نفرت کے سوا کوئی ہتھیار نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ جہازوں میں کام کے دوران وہ اپنے ہتھیار کو دھار دے گا، اور جب وہاں سے نکلے گا تو اسے ساتھ لے جائے گا۔

وہاں، Toulon میں، قیدیوں کے لیے ایک اسکول تھا جس کو [عیسائی فرقے] Ignorantin کے راہب چلاتے تھے، جس میں سب سے زیادہ ضروری شعبے میں تعلیم دی جاتی تھی، ان بد قسمت لوگوں میں جس کی صلاحیت ہوتی تھی۔ یہ ان لوگوں میں سے تھا جن میں صلاحیت تھی۔ وہ چالیس برس کی عمر میں اسکول گیا تھا، اور پڑھنا، لکھنا اور حساب کتاب کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنی ذہانت کو مہمیز کرنا نفرت کو مہمیز کرنا تھا۔ کچھ معاملات میں تعلیم اور روشن خیالی بُرائی کو بے دخل کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ سماج کو پرکھنے کے بعد، جو اس کی بدقسمتی کا باعث ہوا تھا، اس نے عاقبت اندیشی کو پرکھا، جس نے سماج بنایا بھی تھا اور اس کی مذمت بھی کی تھی۔

انیس برس کی عقوبت اور غلامی کے دوران، یہ شخص اٹھا بھی تھا اور اسی وقت گرا بھی تھا۔ ایک طرف سے روشنی داخل ہوتی تھی اور دوسری طرف سے اندھیرا۔

ژاں ولژاں میں، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے شیطنت نہیں تھی۔ وہ اس وقت بھی اچھا تھا

جب جہازوں پر گیا تھا۔ وہاں اس نے سماج کی مذمت کی تھی، اور محسوس کیا تھا کہ وہ بدمعاش ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں اس نے عاقبت اندیشی کی مذمت کی تھی، اور وہ باخبر تھا کہ وہ فاسق ہوتا جا رہا ہے۔
اس مرحلے پر مراقبے میں نہ جانا مشکل نہیں تھا۔

کیا انسانی فطرت اوپر سے نیچے تک بالکل تبدیل ہو سکتی ہے؟ کیا خدا کا تخلیق کیا ہوا نیک انسان شیطان بنایا جا سکتا ہے؟ کیا مقسوم روح کو بالکل تبدیل کر سکتی ہے، مقسوم یعنی بدی؟ کیا ناموزوں بدنصیبی کا دبایا ہوا دل مسخ ہو سکتا ہے اور اسے ناقابلِ علاج نقص لگ سکتا ہے، جیسے کسی بہت نیچے، کسی تجوری تلے ریڑھ کی ہڈی؟ کیا ہر انسانی روح کے اندر ایک پہلی چنگاری، ایک خداداد عنصر نہیں ہوتا جو اس دنیا میں فنا پذیر ہوتا ہے اور دوسری دنیا میں لافانی؛ کون سی نیکی نشو ونما پا سکتی ہے، ہوا دے سکتی ہے، بھڑکا سکتی ہے اور طمطراق سے روشن ہو سکتی ہے، جسے بدی کبھی پوری طرح مٹا نہ سکے؟

نہایت مشکل اور مبہم سوالات، ہر ماہرِ نفسیات آخر تک شاید جن کے جوابات نفی میں دیتا اور وہ بھی بلا تامل، اگر اس نے Toulon میں دیکھا ہوتا، آرام کے وقت کے دوران، جو ژاں ولژاں کے لیے دن میں خواب دیکھنے کے اوقات ہوتے تھے۔ یہ مایوس، جہاز کا قیدی اپنے بازو باندھے ہوئے کسی کیپسٹن کی بار پر بیٹھا ہوتا، جس کی زنجیر کا سرا اس کی جیب میں ٹھنسا ہوتا تھا تاکہ زنجیر گھسٹتی نہ جائے، سنجیدہ، خاموش، اور سوچ میں غرق، ان قوانین کا اچھوت جو انسان کو قہر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تہذیب کی مذمت کرتے ہیں، اور جنت سے بدسلوکی کرتے ہیں۔

یقیناً، معائنہ کرنے والے ماہرِ نفسیات نے ناقابلِ علاج بدبختی دیکھی ہوگی؛ اس نے اتفاقیہ طور پر اس بیمار آدمی سے ہم دردی کی ہوگی، مگر اس نے کوئی علاج بھی تجویز نہ کیا ہوگا؛ اس نے اپنی نظریں غاروں کی طرف سے پھیر لی ہوں گی جس کی ایک جھلک اس نے اس روح میں دیکھ لی ہوگی اور دانتے کی طرح جہنم کی ڈیوڑھیوں پر، اس نے اس وجود سے اس لفظ کو مٹا دیا ہوگا جو خدا کی انگلی نے ہر انسان کی جبیں پر لکھ دیا ہے — اُمید!

کیا اس روح کی یہ کیفیت، ہم نے جس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے — جیسی کہ ژاں ولژاں پر واضح تھی — ان کے لیے پیش کی ہے جو ہمیں پڑھتے ہیں؟ کیا ژاں ولژاں نے ان کی تشکیل کے بعد انھیں واضح طریقے سے تصور کر لیا تھا، اور کیا اس نے ان کی تشکیل کے دوران تمام عناصر کو واضح طریقے سے دیکھ لیا تھا جن سے اس کی اخلاقی خستہ حالی ترتیب ہوئی تھی؟ کیا اس نا ملائم اور ان پڑھ آدمی نے تواتر سے ان خیالات کا بالکل صاف تصور کر لیا تھا، جن کے ذریعے

وہ دبیہ بہ دبیہ ان رنجیدہ پہلوؤں پر چڑھتا اور اُترا تھا، جو اتنے برسوں سے اس کے جذبے کے اندرون میں تشکیل پا رہے تھے؟ کیا وہ ان سب سے باخبر تھا جو اس کے اندر داخل ہوئے تھے، اور رہ وہ سب جو وہاں کام کر رہے تھے؟ یہ وہ چیزیں ہیں ہم جنھیں بیان نہیں کرنا چاہتے؛ یہ وہ چیزیں ہیں ہم جن پر یقین بھی نہیں رکھتے۔ژاں ولژاں میں، اتنی بدقسمتی کے بعد بھی بہت دانائی تھی اور رہ وہ اپنے اندر لہراتی ابہامی کیفیت کو روک نہیں پاتا تھا۔بسا اوقات اسے صحیح طرح سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس نے کیا محسوس کیا ہے۔ژاں ولژاں سایوں میں رہا؛ سایوں میں دُکھ اٹھائے؛ سایوں میں رہنے سے نفرت کی؛ اور یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اس نے اپنے آپ سے قبل از وقت نفرت کی ہے۔ وہ عادتاً، کسی نابینا کی طرح راستہ تلاش کرتا، کسی خواب دیکھنے والے کی طرح چلتا اور اسی سایے میں رہتا تھا۔بس اچانک، کبھی کبھی باہر سے اور اندرون سے، اس پر غضب طاری ہو جاتا تھا اور کوئی اضافی دُکھ، کوئی نیلگوں تیز رو جھماکا ہوتا تھا، جو اس کے پورے وجود کو، اس کے اطراف، اس پیش و پس کو، اور خوف زدہ کر دینے والی روشنی کی شعاعوں کے درمیان، مقسوم کی بھیانک چٹانوں کے اداس پہلوؤں کو یکایک روشن کر دیتا تھا۔

وہ جھماکا گزر گیا، پھر رات ہو گئی؛ اور وہ کہاں تھا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔اس قسم کے دُکھوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ، وہ جو بے رحم ہوتا ہے حاوی ہو جاتا ہے تا کہ انسان کی ایک وحشی درندے میں قلب ماہیت کر دے اور رفتہ رفتہ اور کبھی کبھی ایک خوں خوار درندے میں اس کی ایک قسم کی احمقانہ انداز سے شکل تبدیل کر دے۔

ژاں ولژاں کی فرار کی مسلسل اور ضدی کوششیں ہی انسان کی روح پر قانون کی عجیب کارکردگی ثابت کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔ژاں ولژاں نے نتائج اور ان تجربات کی پروا کیے بغیر جن سے وہ گزر چکا تھا، موقع ملنے پر ازسرنو یہ نہایت فضول اور احمقانہ کوششیں بار بار کی ہوتیں۔ وہ، اس بھیڑیے کی طرح سرگرمی سے فرار کرتا رہا جسے قفس کھلا مل جاتا ہے۔فطرت اس سے کہتی، ''فرار ہو جاؤ!'' سمجھ کہتی ''بیٹھے رہو!'' مگر اس قسم کی ترغیب میں سمجھ غائب ہو جاتی تھی؛ کچھ باقی نہیں رہتا تھا سوائے جبلت کے۔ سو وہ وحشی ہی عمل کرتا رہا۔ جب وہ دوبارہ پکڑا گیا تو اس پر کی گئی تازہ سختیوں نے اس کو اور وحشی بنا دیا۔

ایک تفصیل ہمیں جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، یہ ہے کہ اس میں وہ جسمانی طاقت تھی جس کو جہاز کے قیدی پوری طرح استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔کام پر، رسّی نکالتے وقت، کسی کیپسٹن کو گھماتے وقت، ژاں ولژاں چار آدمیوں کے برابر ہوتا تھا۔کبھی کبھی وہ بڑے بڑے وزن

اپنی پیٹھ پر اٹھا لیتا اور دیر تک سنبھالے رکھتا تھا؛ اور جب ضرورت ہوتی تو وہ jack-screw کی طرح بھی کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کو ژاں jack-screw کہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ Toulon کے ٹاؤن ہال کی بالکنی کی مرمت کر رہے تھے، Puget کے نفیس caryatids [نسوانی شکل کے یونانی طرز کے سنگی ستونوں] میں سے ایک ڈھیلا ہو گیا تھا اور گرنے والا تھا۔ ژاں ولژاں نے، جو وہاں موجود تھا، ستون کے ساتھ اپنا کاندھا لگا کر بالکنی کو سنبھال لیا تھا اور ماہرین کو آنے اور اس پر کام کرنے کا وقت مل گیا تھا۔

اس میں طاقت سے زیادہ لچک تھی۔ کچھ قیدی جو ہمیشہ فرار کے خواب دیکھا کرتے تھے، طاقت اور ہنر کو یک جا کر کے طاقت کی ایک حقیقی سائنس بنا لیتے تھے۔ یہ عضلات کی سائنس ہوتی ہے۔ قیدی روزانہ ایک پُراسرار شماریاتی نظام کی مشق کرتے ہیں۔ کسی عمودی سطح پر چڑھنا، اور جہاں کوئی بھی اُبھار نظر نہ آتا ہو وہاں سہارے کے مقامات تلاش کر لینا، ژاں ولژاں کے لیے کھیل تھا۔ اگر کسی دیوار کو زاویہ دیا جا رہا ہو تو وہ اپنی کمر اور پیروں کے تناؤ سے، اپنی کہنیوں اور ایڑیوں کو پتھروں کی ناہمواری میں جما لیتا، اور خود کو جادو کی طرح اٹھا لیتا تھا۔ کبھی وہ جہاز کے قید خانے کی چھت پر بھی اسی طرح چڑھ جاتا تھا۔

وہ بہت کم بولتا تھا۔ ہنستا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ سال میں ایک دوبار، اس میں سے قیدیوں جیسی رنجیدہ ہنسی نچوڑنے کے لیے، جو کسی دیو کی ہنسی کی گونج جیسی ہوتی تھی، ضرورت سے زیادہ جذبے کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ ہمہ وقت کسی خوف ناک شے کی تلاش میں مصروف دکھائی دیتا تھا۔

دراصل وہ ہمیشہ ایک جذب کی کیفیت میں ہوتا تھا۔

نامکمل قسم کے غیر صحت مند تصورات، اور کچلی ہوئی ذہانت کے برخلاف وہ باخبر تھا کہ کوئی بھیانک چیز اس پر انحصار کر رہی ہے۔ اس مبہم اور کم زور سایے میں جس کے اندر وہ رینگ رہا تھا، ہر بار جب اپنی گردن گھماتا اور نظریں اٹھانے کی کوشش کرتا، تو اس کو دہشت کے عالم میں، جس میں غصہ بھی شامل ہوتا، بھیانک قسم کی اشیا کا اجتماع، اپنے اوپر جمع ہوتا نظر آتا، جو اس کی بصری صلاحیت سے پرے ہوتا تھا— قوانین، تعصبات، آدمی، اور ان کے افعال— جن کے خاکے اس کے پاس سے نکل گئے تھے، جن کے انبار نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا، اور جو کچھ بھی نہیں تھا، سوائے ایک حیرت انگیز مخروطی مینار کے ہم جس کو تمدن کہتے ہیں۔ وہ تمیز کر سکتا تھا، یہاں وہاں چھا جانے والے اور بے شکل انبار میں؛ ابھی اس کے قریب، ابھی اس سے بہت دور اور ناقابلِ رسائی زمینوں پر، کوئی گروہ، وضاحت سے روشن کی ہوئی کچھ تفصیل؛ ادھر جہازی

قید خانے کا سرجنٹ اور اس کا ڈنڈا؛ اُدھر سپاہی اور اس کی تلوار؛ سامنے کُلاہ پوش آرچ بشپ دور اور اوپر، کسی سورج کی طرح، شہنشاہ تاج پہنے اور چمکتا ہوا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دور کے جلوے اس کی رات کو برباد کرنے سے بجھی پرے، اس کو ماتمی بلکہ اور زیادہ سیاہ بنا دیں گے۔ یہ سارے قوانین، تعصبات، افعال، آدمی اور اشیا— آئے، گئے اور اس کے اوپر سے گزر گئے، اس پیچیدہ حرکت کے مطابق جو خدا تمدن کو عطا کرتا ہے۔ لوگ ہر قسم کی بدقسمتی کی پاتال میں گرے ہیں، بدقسمت لوگ ان کم ترین نہاں خانوں میں گم ہو گئے ہیں جن کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا؛ قوانین کے تنبیہ کردہ لوگ اپنے سر پر پورے سماج کا بوجھ محسوس کرتے ہیں، جو اُن کے لیے اتنا بڑا ہوتا ہے جو ان کے بغیر ہوتا ہے، اور اتنا خوف ناک اس کے لیے ہوتا ہے کہ ان کے نیچے ہوتا ہے۔

یہ تھی صورت حال جس میں ژاں ولژاں مراقبہ کرتا تھا؛ اور اس کے مراقبے کی نوعیت کیا ہو سکتی تھی؟

اگر چکی کے پاٹ کے بیچ پڑے ہوئے باجرے کے دانے میں سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو، بلا شبہ، وہ بھی وہی سوچتا جو ژاں ولژاں سوچتا تھا۔

ان ساری چیزوں، بھوت پریت سے بھرے حقائق، حقائق سے بھری خیالی اشکال نے آخرکار اس کے لیے ایک ایسی اندرونی ریاست بنا دی تھی جو تقریباً ناقابل بیان ہے۔

اکثر، اپنی مجرموں والی مشقت کے درمیان وہ توقف کرتا تھا۔ سوچنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کی دانش، جو ایک ساتھ، تیار کرنے والی بھی تھی اور زمانہ قدیم سے زیادہ مصائب زدہ بھی، بغاوت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب کچھ جو اس کے ساتھ ہوا اس کو فضول محسوس ہوا؛ ہر شے جو اس کو گھیرے ہوئے تھی اس کو ناممکن محسوس ہوئی۔ اس نے خود سے کہا "یہ ایک خواب ہے۔" اس نے جہازی قید خانے کے سرجنٹ کی طرف غور سے دیکھا جو اس سے چند قدم دور کھڑا تھا؛ سارجنٹ اس کو بھوت جیسا لگا۔ اس بھوت نے اچانک اسے ایک ڈنڈا رسید کر دیا۔

عام نظر آنے والی فطرت اس کے لیے نہیں تھی۔ یہ کہنا تقریباً صحیح ہو گا کہ ژاں ولژاں کے لیے نہ سورج کا وجود تھا اور نہ گرمی کے دنوں کا، نہ نور افشاں آسمان کا اور نہ اپریل کی تازہ صبحوں کا۔ مجھے خبر نہیں کس سوراخ سے عادتاً آنے والے سورج کی روشنی اس کی روح کو روشن کرتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس نتیجے میں جس کو یک جا کیا جا سکتا ہے اور مثبت نتائج میں منتقل کیا جا سکتا ہے، جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے، ہم خود کو اس بیان تک محدود رکھیں گے کہ انیس برسوں کے دوران، بے آزار، Faverolles کے پیڑوں کی قلم کاری کرنے والا، ژاں ولژاں،

Toulon کے ہول ناک مجرم لائق ہو گیا تھا، اس ڈھنگ کے طفیل جس میں جہازی قید خانے نے اسے دو قسم کی بد حرکات کے لیے ڈھال دیا تھا۔پہلی بد حرکت تیزی، طراری سے مکمل طور پر جبلتی اور بغیر کسی تیاری کے ہوتی تھی، اس بدی سے بدلے کے طور پر جو ہو چکی ہوتی تھی؛ دوسری بد حرکت، اس عملِ بد کے لیے ہوتی تھی جو بہت خراب، شعوری طور پر مدلل اور پہلے سے طے کیے ہوئے غلط خیالات کے ساتھ ہوتی تھی جو بد نصیبی ہی کرا سکتی ہے۔اس کے ارادی اعمال تین مسلسل ادوار سے گزرتے تھے، جنھیں ایک مخصوص نشان کی فطرتیں ہی پار کر سکتی تھیں— استدلال، ارادہ اور استقلال۔اس میں غیظ، روح کی تلخی اور برداشت کی جانے والی بے قدری کے گہرے اثرات، حتیٰ کہ اچھائی کے، معصومیت کے اور اچھے لوگوں کے خلاف، اگر ایسے لوگ واقعی ہوتے ہیں، ردِ عمل بھی ہوتا تھا۔اس کے تمام خیالات کا نکتۂ انحراف، نکتۂ قبولیت ہی کی طرح، انسانی قانون سے نفرت تھا؛ وہ نفرت جس کی کسی عاقبت اندیش واقعے کی وجہ سے نشوونما روکی نہ جائے تو وہ کچھ عرصے کے اندر سماج سے نفرت، اس کے بعد نسلِ انسانی سے نفرت بلکہ پوری تخلیق سے نفرت بن کر مبہم، مسلسل اور کسی ذی روح کو نقصان پہنچانے کی خواہش بن کر، خواہ وہ کوئی بھی ہو، آشکار ہونے لگتی ہے۔اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بلاوجہ نہیں تھا کہ ژاں ولژاں کا پاسپورٹ اسے خطرناک آدمی کہتا تھا۔

سال بہ سال، آہستہ آہستہ یہ روح، مہلک تیکھی کے ساتھ خشک ہوتی جا رہی تھی۔ جب دل خشک ہو تو آنکھ بھی خشک ہو جایا کرتی ہے۔جہازوں کی قید سے رہائی تک انیس برس ہو چکے تھے اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں گرا تھا۔

✡

لہریں اور سایے

ایک آدمی سمندر میں گر گیا ہے!

کیا فرق پڑتا ہے! جہاز رُکتا نہیں۔ ہوا چلتی رہتی ہے۔ اداس جہاز کا اپنا ایک راستہ ہوتا ہے جس پر چلنا اس کی مجبوری ہے۔ جہاز چلتا رہتا ہے۔

آدمی غائب ہو جاتا ہے، نمودار ہوتا ہے؛ ڈوب جاتا ہے، ایک بار پھر سطح پر نمودار ہوتا ہے؛ پکارتا ہے، اپنے بازو پھیلاتا ہے؛ اس کو سنا نہیں جاتا۔ طوفان میں لرزتا جہاز پوری طرح اپنے کام میں مصروف ہے؛ مسافر اور ملاح ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتے بھی نہیں؛ لہروں کی لاانتہائیت میں اس کا بدقسمت سر ایک چھوٹے سے دھبے کی طرح ہے۔ وہ گہرائیوں میں سے بے آس آوازیں دے رہا ہے۔ لپا ہوتا ہوا بادبان کیسا ہیولا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور غیظ و غضب کی حالت میں دیکھ رہا ہے۔ بادبان لپا ہو رہا ہے، دھندلاتا جا رہا ہے، چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ ڈوبنے والا کچھ دیر پہلے اس پر تھا، ملاحوں میں سے ایک تھا، سب کے ساتھ عرشے پر آتا جاتا تھا، اپنے حصے کا سانس اور اپنے حصے کی دھوپ لیتا تھا، ایک زندہ آدمی تھا۔ اب کیا ہو گیا ہے؟ وہ پھسل گیا ہے، گر گیا ہے؛ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔

وہ مہیب تاریک سمندر میں گر گیا ہے۔ اس کے پیروں کے نیچے کچھ نہیں ہے سوائے اس شے کے جو بھاگ جاتی ہے، بکھر جاتی ہے۔ ہوا سے بکھرتی اور مار کھاتی وحشت انگیز لہریں اس پر چھاتی جا رہی ہیں؛ پاتال کی اچھال اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں؛ پانی کی تمام زبانیں اس کے سر سے ٹکرا رہی ہیں؛ لہروں کی آبادی اس پر تھوک رہی ہے؛ پیچیدہ غار اس کا نصف کھا چکے ہیں؛ ہر بار جب وہ ڈوبتا ہے، اسے رات کے اندھیرے سے بھری چٹانیں نظر آتی ہیں؛ بھیانک

اور نامعلوم نباتات اس کو گرفتار کر لیتے ہیں، اس کے پیر جکڑ لیتے ہیں، اسے اپنی جانب کھینچتے ہیں؛ اسے احساس ہے کہ وہ پاتال بنتا جا رہا ہے، جھاگ کا حصہ بنتا جا رہا ہے؛ لہریں اسے اِدھر اُدھر اچھال رہی ہیں؛ وہ تلخی پی رہا ہے؛ اسے غرق کرنے کے لیے بزدل سمندر اس پر غضب ناک حملے کر رہا ہے، غیر معمولی زیادتی اس کے کرب سے کھیل رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سارا پانی نفرت بن گیا ہے۔

اس کے باوجود وہ کوشش کر رہا ہے۔

وہ اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا ہے؛ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے؛ کوشش کر رہا ہے؛ پیر رہا ہے۔ اس کی معمولی توانائی سب آناً فاناً صرف ہو گئی ہے، وہ لاانتہاییت سے جنگ کر رہا ہے۔

مگر اب وہ جہاز کہاں ہے؟ سب کچھ کھلا ہوا ہے۔ اُفق کے دھندلے سایوں میں مشکل سے کچھ دکھائی دے رہا ہے۔

ہوا جھونکوں میں چل رہی ہے؛ سارا جھاگ اس پر چھایا جا رہا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں اُٹھا رہا ہے اور اسے صرف بادلوں کی نیلگونی دکھائی دے رہی ہے۔ موت کی ٹیس کے درمیان وہ بھیانک سمندر کی ابتری کا گواہ بن رہا ہے۔ اس کا اپنا پاگل پن اس کو اذیت دے رہا ہے۔ وہ ایسی آوازیں سن رہا ہے جو انسان کے لیے حیرت انگیز ہیں، جو دنیا کی حدود سے پرے سے آتی معلوم ہو رہی ہیں، جن سے پتا نہیں چلتا کہ پرے کیسا خطرناک علاقہ ہے۔

بادلوں میں پرندے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے انسانی پریشانیوں سے مبرا فرشتے؛ مگر اس کے لیے وہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ وہ گاتے ہیں، اُڑتے ہیں اور تیرتے ہیں، اور وہ؛ وہ بے چارہ موت کی اذیت میں تڑپ رہا ہے۔

وہ ایک ہی وقت میں خود کو دو لامحدودیتوں میں مدفون محسوس کر رہا ہے، سمندر اور آسمان: ایک مرقد ہے؛ دوسرا کفن ہے۔

رات اتر رہی ہے؛ وہ کئی گھنٹوں سے پیر تا رہا ہے؛ اس کی قوت جواب دے گئی ہے؛ وہ جہاز، وہ دور کی شے، جس میں آدمی تھے، غائب ہو چکی ہے؛ وہ اس بھیانک دھندلکے کی خلیج میں تنہا ہے؛ وہ ڈوب رہا ہے، خود کو اکڑا رہا ہے، خود کو بل دے رہا ہے؛ وہ اپنے نیچے غیر مرئی [طاقت] کی دیو ہیکل لہروں کو محسوس کر رہا ہے؛ وہ چیخ رہا ہے۔

کہیں کوئی آدمی نہیں ہے۔ خدا کہاں ہے؟

وہ چیخ رہا ہے۔ بچاؤ! بچاؤ!۔ وہ چیخے جا رہا ہے۔

نہ افق پر کچھ ہے؛ نہ آسمان میں کچھ۔

وہ وسعتوں سے، لہروں سے، سمندری گھاس سے، زیرِ آب چٹانوں سے التجا کر رہا ہے؛ سب سماعت سے محروم ہیں۔ وہ طوفانی ہوا سے رقت کر رہا ہے پُر سکون طوفانی ہوا صرف لامحدود کا حکم مانتی ہے۔

اس کے اطراف اندھیرا ہے، کہر ہے، تنہائی ہے، طوفانی بے حس شورش ہے، ان پانیوں کے غیر معین پیچ و خم ہیں۔ اور، اس میں خوف ہے، تھکن ہے۔ اس کے نیچے گہرائیاں ہیں۔ سہارے کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وہ لاانتہا اور افسردہ سایے میں میت کے ماجرے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ بے پایاں ٹھنڈک اس کو مفلوج کر رہی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں اکڑن ہو رہی ہے۔ اس کی مٹھیاں بند ہوتی جاتی ہیں، ان کی پکڑ میں کچھ نہیں ہے؛ [نہ] ہوائیں، بادل، بگولے، ہوا کے جھکڑ، [نہ] بے کار ستارے! تو کیا کیا جائے؟ نراس آدمی ہار مان لیتا ہے؛ وہ تھک چکا ہے، وہ موت کا انتخاب کر لیتا ہے۔ مزاحمت نہیں کرتا؛ ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے؛ اپنی گرفت چھوڑ دیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے رنج کی سنسان گہرائیوں میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

اُف، وہ انسانی سماج کی سنگ دل پیش قدمی! اُف، وہ راستے میں آدمیوں کا ضیاع! سمندر میں سب کچھ گر جاتا ہے، قانون جسے پھسل جانے دیتا ہے۔ سہارے کا خوف ناک فقدان۔ اُف، وہ اخلاقی موت!

سمندر وہ بے رحم سماجی شب ہے جس میں تعزیری قوانین اپنے مجرموں کو پھینک دیتے ہیں۔ سمندر نکبت کی بے پایاں گہرائی ہے۔

۞

نئی مشکلات

جب جہاز کے قید خانے سے اس کے نکلنے کا وقت آیا اور جب ژاں ولژاں نے اپنے کانوں سے وہ نامانوس الفاظ سنے، ''تم آزاد ہو!'' تو اسے وہ لمحہ خلاف قیاس اور ان سنا محسوس ہوا تھا؛ نہایت واضح روشنی کی ایک کرن۔ زندگی کی سچی روشنی کی ایک کرن اچانک اس میں داخل ہو گئی تھی، مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ چمک مدھم ہو گئی۔ آزادی کے تصور ہی نے ژاں ولژاں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا۔ اس سے اسے نئی زندگی کا یقین ہو گیا تھا، مگر فوراً ہی اس نے تصور کیا کہ وہ کیسی آزادی ہوگی جسے ایک زرد رنگ کا پاسپورٹ فراہم کیا جا رہا ہے۔

ایک اور بڑی تلخی اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس نے جہازی قید کے دنوں کی کمائی کا حساب کیا تھا جسے ایک سو اکہتر فرانک ہونا تھا۔ اس میں وہ انیس برسوں کے اتوار اور چھٹیوں کے دنوں کے کام کی اجرت شامل کرنا بھول گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے اتنی فرانک کا گھاٹا ہو گیا تھا۔ ہر واقعے پر اس کا ذخیرہ مقامی محصول وغیرہ کے لگنے کی وجہ سے کم ہو کر ایک سو نو فرانک اور پندرہ سو رہ گیا تھا، جو چلتے وقت اس کو ادا کیا گیا۔ اسے اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آئی، اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ ہم اس کو ڈاکا بھی کہہ سکتے ہیں۔

اپنی آزادی کے دوسرے دن اس نے دیکھا کہ Grasse میں اورنج فلاور شراب کشید کرنے کے کارخانے کے سامنے کچھ لوگ سامان اتروانے میں معاونت کر رہے ہیں۔ اس نے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ کام ضروری تھا، اس کی خدمات قبول کر لی گئیں۔ اس نے کام شروع کر دیا؛ مالک کام سے بہت خوش ہوا۔ جس وقت وہ یہ کام کر رہا تھا وہاں سے کچھ سپاہیوں کا گزر ہوا۔ سپاہیوں نے اسے دیکھا، اور کاغذات طلب کیے۔ زرد پاسپورٹ دکھانا ضروری تھا۔

کاغذات دکھانے کے بعد ژاں ولژاں نے دوبارہ کام شروع کیا۔ تھوڑی دیر پہلے جب اس نے دوسرے مزدوروں سے پوچھا تھا کہ ان کو کیا اُجرت دی جا رہی ہے، اس کو بتایا گیا تھا تیس سو۔ جب شام ہوئی، اور چوں کہ اس کو دوسرے دن آگے جانا تھا، وہ شراب خانے کے مالک کے پاس گیا اور اجرت طلب کی۔ مالک نے کوئی جواب نہیں دیا، بس اس کو پندرہ سو پکڑا دیے۔ اس نے اعتراض کیا۔ اس سے کہا گیا، "یہ تمھارے لیے کافی ہیں۔" اس نے اصرار کیا۔ مالک نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھا اور کہا "جیل سے باز رہو۔"

ایک بار پھر وہاں اسے لوٹا گیا تھا۔

سماج اور ریاست دونوں نے، اس کے خزانے کو کم کر کے اسے تھوک کے بھاؤ لوٹا تھا۔ اب ایک خوردہ فروش فرد تھا جو اسے لوٹ رہا تھا۔

محض رہائی نجات نہیں ہوا کرتی۔ جہازی قید سے آزاد ہو جاتا ہے مگر اسے سزا سے مفر نہیں ہوتا۔

یہ ہے اس کی تفصیل جو اس پر Grasse میں گزری تھی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس سے D میں کیا سلوک کیا گیا تھا۔

۞

جاگا ہوا آدمی

جوں ہی کلیسا کے گھنٹا گھر نے رات کے دو بجائے، ژاں ولژاں جاگ گیا۔

کیوں جاگا، اس لیے کہ اس کا بستر ضرورت سے زیادہ اچھا تھا؟ تقریباً بیس برس ہو گئے تھے اسے کسی بستر میں سوئے ہوئے؛ حالاں کہ اس نے کپڑے نہیں اتارے تھے، اس بستر کی سنسنی اتنی انوکھی تھی کہ نیند میں مخل نہیں ہوئی۔

وہ چار گھنٹے سے زیادہ سویا تھا۔ اس کی تھکن دور ہو گئی۔ وہ زیادہ دیر لیٹے رہنے کا عادی نہیں تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں کمرے کی اداسی کو دیکھا جو اسے گھیرے ہوئے تھی، اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں؛ ارادہ تھا کہ ایک بار پھر سو جائے۔

جب مختلف قسم کے احساسات دل میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں، جب مختلف نوعیت کے معاملات ذہن پر طاری ہو جاتے ہیں، تب بس ایک ہی بار نیند آتی ہے، دوسری بار نہیں۔ پہلی نیند آسان ہوتی، دوبارہ نیند آسان نہیں ہوتی۔ کچھ یہی ژاں ولژاں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ دوبارہ سو نہیں سکا؛ وہ سوچنے لگا تھا۔

وہ ایسے لمحات میں سے گزر رہا تھا، جب ذہن میں ہونے والے خیالات پریشاں ہو جاتے ہیں۔ اس کے دماغ میں ایک قسم کی سیاہ الجھن تھی۔ اس کی گزرے دنوں کی اور حالیہ دنوں کی یادیں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی تھیں، ان کی شکل بگڑی ہوئی تھی، غیر متناسب ہو کر بڑی ہو گئی تھیں، اور اچانک غائب ہو گئی تھیں، جیسے کسی گندے حوض میں گر گئی ہوں۔ اس کے ذہن میں بہت سے خیالات آئے، مگر ایک خیال تھا جو بار بار تازہ ہو کر آ رہا تھا، جس نے دوسرے

خیالات کو بھگا دیا تھا۔ ہم اس خیال کا فوراً ذکر کیے دیتے ہیں: اس نے نقرئی کانٹوں اور چمچوں کے چھ عدد سیٹ دیکھے تھے اور وہ بڑا چمچہ بھی، جو مادام ماگوائے نے میز پر رکھا تھا۔

نقرئی ست اس کے ذہن پر آسیب بن کر چھا گئے تھے — وہ وہیں تھے — صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ جب وہ برابر والے کمرے میں جا رہا تھا، بوڑھی خادمہ پلنگ کے سرہانے رکھی الماری میں انھیں واپس رکھ رہی تھی۔ اس نے اس الماری کو اچھی طرح اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ آپ کھانے کے کمرے میں داخل ہوں تو وہ الماری آپ کے دائیں جانب ہوگی۔ وہ سب ٹھوس تھے، اور قدیم زمانے کی چاندی کے بنے تھے۔ بڑے چمچے سے آپ کم از کم دو سو فرانک آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔ اس رقم کا دوگنا، جو اس نے انیس برسوں میں کمایا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس نے زیادہ کمایا ہوتا اگر ''انتظامیہ نے اسے لوٹا نہ ہوتا۔''

پورے ایک گھنٹے اس کا دماغ لڑکھڑایا، جس میں کچھ جد وجہد بھی مل گئی تھی۔ تین کا گھنٹا بجا۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں کھولیں، اٹھ کر بیٹھ گیا، اپنے ہاتھ پھیلائے اور سفری تھیلے کو ٹٹولا، جسے اس نے ایک کنارے ڈال دیا تھا؛ پھر اس نے اپنی ٹانگیں بستر سے لٹکائیں، اور فرش پر پاؤں رکھ دیے۔ اب وہ اپنے بستر پر تقریباً بیٹھا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی کیفیت میں بیٹھا سوچتا رہا، جس کو اس طرح اندھیرے میں بیٹھا دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے، اس لیے کہ سوائے ایک شخص کے پورا گھر سو رہا تھا۔ اچانک وہ جھکا، اپنے جوتے اتارے اور آہستگی سے بستر کے ساتھ بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ دیے؛ تھوڑی دیر سوچتا رہا اور ایک بار پھر ساکن ہو گیا۔

اپنے گھناؤنے مراقبے کے دوران اس کے خیالات، جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، اس کے دماغ میں مسلسل حرکت کر رہے تھے؛ خیالات داخل ہوتے، واپس ہوتے، دوبارہ داخل ہو جاتے؛ ایک طرح سے وہ اس پر دباؤ ڈال رہے تھے؛ اور پھر اس نے بھی Brevet نامی سزا یافتہ مجرم کی طرح دن میں خواب دیکھنے کے میکانیکی اصرار کے ساتھ سوچنا شروع کیا، جس کو وہ جہازی قید خانے کے زمانے سے جانتا تھا؛ وہی جو اپنے پتلون کو سوت سے بُنی ایک پٹی سے سنبھالے رکھتا تھا۔ اس پٹی پر بنے چارخانے اس کے ذہن میں مسلسل بنتے بگڑتے رہتے تھے۔

وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا، اور شاید اسی طرح طلوعِ فجر کے وقت تک بیٹھا رہتا اگر گھڑی نے ایک چوتھائی یا نصف گھنٹے کا گھنٹا بجا نہ دیا ہوتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا گھنٹے کی

آواز اس سے کہہ رہی تھی، ''شروع ہو جاؤ!''

وہ کھڑا ہوا، ایک لمحے کے لیے ہچکچایا، اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی؛ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا؛ تب وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھا، جو اسے نظر آ گئی تھی۔ رات زیادہ سیاہ نہیں تھی۔ چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا، جس پر سے ہوا کے اُڑائے بادل گزر رہے تھے۔ باہر کی طرف کچھ سایہ سا تھا، کبھی دھیمی روشنی ہوتی، کبھی بادلوں میں روشن ورنہ بنتے کبھی گرہن کا سا منظر ہوتا؛ اندر ایک دھندلکے کا سا سماں تھا۔ دھندلکا جس میں آدمی کو اپنا راستہ نظر آتا تھا، نیلگوں قسم کی روشنی جیسا تھا، جو کسی سوراخ کے ذریعے تہہ خانوں میں بھی پہنچ جاتی ہے، جس میں گزرنے والے والے آ جا سکتے تھے۔ کھڑکی پر پہنچ کر ژاں ولژاں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ کھڑکی میں کوئی جالی یا جنگلا نہیں تھا۔ کھڑکی باغیچے میں کھلتی تھی، اور ملک کے فیشن کے مطابق ایک چھوٹی سی چٹخنی سے اندر سے بند ہوتی تھی۔ اس نے کھڑکی کھولی؛ کھڑکی کھلتے ہی سرد چبھتی ہوا کا جھونکا اندر آیا تو اس نے فوراً ہی کھڑکی بند کر دی۔ اس نے باغیچے کو اسی نظر سے دیکھا جس کو دیکھنا نہیں معائنہ کرنا کہا جاتا ہے۔ باغیچہ سفید رنگ کی ایک نیچی سی دیوار سے گھرا تھا، جسے آسانی سے پار کیا جا سکتا تھا۔ دور، برابر برابر فاصلے پر لگے پیڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ دیوار باغیچے کو اس شاہراہ یا گلی سے علاحدہ کرتی تھی جس پر پیڑ لگائے گئے تھے۔

معائنہ کرنے کے بعد اس نے، اس آدمی کی طرح حرکت کی، جس نے کچھ طے کر لیا ہو؛ محراب کی طرف گیا، اپنا سفری تھیلا پکڑا، اسے کھولا، ٹٹولا، اس میں کچھ نکالا جسے بستر پر رکھ دیا، اپنے جوتے اپنے جیبوں میں اُڑس لیے، تھیلے کو بند کر دیا، سفری تھیلا کاندھے پر ڈالا، اپنی ٹوپی لگائی، ٹوپی کا چھجا چہرے پر نیچا کیا، اپنی لاٹھی تلاش کی، اس کو کھڑکی کے زاویے کے مطابق رکھا؛ تب بستر کی طرف واپس ہوا، اور اس شے کو سختی سے ہاتھوں میں تھاما جو اس نے بستر پر رکھ دی تھی۔ یہ شے لوہے کے چھڑ جیسی تھی، جس کا ایک سرا بھالے کی طرح نوکیلا تھا۔ اس اندھیرے میں یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ لوہے کا وہ چھڑ کس کام کے لیے بنایا گیا تھا۔ شاید وہ ایک قسم کا بیرم (lever) تھا؛ ہو سکتا ہے کہ وہ موٹا سا ڈنڈا رہا ہو۔

دن کی روشنی میں وہ ڈنڈا کسی کان کن کے شمع دان جیسا نظر آتا۔ اس زمانے میں کبھی کبھی قیدی مجرموں سے Toulon کے اطراف کے اونچے اونچے پہاڑوں سے پتھر نکالنے کا کام بھی لیا جاتا تھا، اور یہ عام بات تھی کہ ان کے قبضے میں کان کنوں کے اوزار ہوا کرتے تھے۔

کان کنی کرنے والوں کے شمع دان بڑے بڑے لوہے کی چھڑ ہوا کرتے تھے جن کا ایک سرا نوکیلا ہوتا تھا، جس کے ذریعے انھیں چٹانوں میں نصب کیا جا سکتا تھا۔

اس نے شمع دان اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑا؛ اپنا سانس روکا، اپنے قدموں کی آواز روکنے کی کوشش کی، برابر والے کمرے کی طرف اپنے قدم بڑھائے، جس میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بشپ رہتا تھا۔

دروازے پر پہنچا تو دروازہ آدھا کھلا ملا۔ بشپ نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

کارگزاری

ژاں ولواں نے کان لگا کر سنا۔ بالکل خاموشی تھی۔

اس نے دروازے کو دھکا دیا۔

دروازے کو آہستہ سے انگلی کے سرے سے دھکیلا، اس بلی کی طرح جو دبے پاؤں اندر داخل ہونا چاہتی ہو۔

دروازے پر دباؤ کا اثر ہوا، خاموش حرکت ہوئی اور وہ ذرا زیادہ کھل گیا۔

اس نے ایک لمحہ انتظار کیا؛ اس کے بعد دوسرا دھکا ذرا زیادہ زور سے دیا۔

دروازہ خاموشی میں کھلنے لگا۔ اب اتنا کھل گیا تھا کہ وہ اس میں سے گزر سکتا تھا، مگر دروازے کے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی جس کا زاویہ پریشان کن تھا، اور دروازے کے کھلنے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

ژاں ولواں کو مشکل کا احساس ہوگیا۔ ضروری تھا کہ کسی قیمت پر بھی دروازہ ذرا زیادہ کھل جائے۔

اس نے مزید کھولنے کا فیصلہ کیا اور دروازے کو تیسرا دھکا دیا۔ اس بار خشک قلابے نے خاموشی کی فضا میں ایک طویل بھرائی ہوئی آواز بلند کی۔

ژاں ولواں کانپ گیا۔ قلابے کی آواز روزِ قیامت پھونکے جانے والے صور کی آواز بن گئی تھی۔

پہلے لمحے کے خیالی مبالغے میں وہ سمجھا گویا قلابہ کوئی جان دار شے بن گیا ہے، اس نے اچانک ایک بھیانک وجود اختیار کر لیا ہے، اور وہ ہر ایک کو ہوشیار کرنے، اور جو سو رہے ہیں

ان کو جگانے کے لیے گھنٹے کی طرح بھونک رہا ہے۔ژاں ولجاں رُکا، کانپتے ہوئے، پریشانی کے عالم میں وہ اپنے پنجوں سے اپنی ایڑیوں کے بل واپس ہوا۔وہ سن سکتا تھا کہ اس کی کنپٹی کی شریانیں دو بڑے بڑے ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے سینے سے نکلتی ہوئی سانس غار سے نکلتی ہوئی ہوا کی طرح غرا رہی ہو۔اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس پریشان قلابے کا بھیانک شور زلزلے کی طرح پورے گھر کو جگا دے گا؛ کہ دھکا دیے ہوئے دروازے نے چونک کر شور مچا دیا ہے؛ وہ بوڑھا آدمی اچانک اُٹھ جائے گا؛ دونوں بوڑھی عورتیں خوف سے چیخنے لگیں گی؛ لوگ ان کی مدد کو دوڑے آئیں گے، ایک چوتھائی گھنٹے کے اندر اندر پورا شہر شوروغُل سے بھر جائے گا، اور سپاہی آجائیں گے۔ایک لمحے کے لیے وہ سمجھا کہ وہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔

وہ جہاں تھا وہیں رُک گیا، نمک سے بنے کسی مجسمے کی طرح جم گیا، اس میں حرکت کرنے حوصلہ نہیں رہ گیا تھا۔اسی عالم میں کئی منٹ گزر گئے۔دروازہ پورا کھل گیا تھا۔اس نے کمرے میں جھانکنے کی ہمت کی۔وہاں کوئی شے ہلی تک نہیں تھی۔اس نے اپنے کان لگا دیے۔گھر میں کوئی شے حرکت نہیں کر رہی تھی۔زنگ آلودہ قلابے کی آواز سے کوئی جاگا نہیں تھا۔

پہلا خطرہ ٹل چکا تھا؛ مگر اس کے اپنے وجود میں ایک قسم کی شورش کا راج تھا۔اس کے باوجود وہ پسپا نہیں ہوا۔اس وقت بھی جب وہ سمجھا تھا کہ وہ ختم ہو گیا ہے، وہ واپس نہیں ہوا تھا۔وہ چاہ رہا تھا کہ اس کام کو جتنی جلد ہو سکے، ختم کر ڈالے۔اس نے قدم بڑھائے اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرہ مکمل طور پر پُرسکون تھا۔ اِدھر اُدھر مبہم اور ناقابلِ امتیاز اشکال نظر آ رہی تھیں۔ دن کی روشنی میں یہ میز پر بکھرے کاغذات تھے، کھلی ہوئی فائلیں تھیں، اسٹول پر لدی ہوئی جلدیں تھیں، آرام کرسی پر کپڑوں کا ڈھیر تھا، اوہ خدایا، وہ سب اس وقت سایے تھے، سفیدی مائل دھبے تھے۔ژاں ولجاں احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی فرنیچر سے ٹکرا نہ جائے۔کمرے کے آخر میں محوِ خواب بشپ کا پُرسکون اور متوازی تنفس صاف سنا جا سکتا تھا۔

وہ اچانک رُک گیا۔بستر کے قریب پہنچ چکا تھا۔وہ توقع سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔

کبھی کبھی فطرت ہماری دھندلی اور ذہین موزونیت کو اپنے اثرات اور نظاروں میں گڈمڈ کر دیتی ہے، گویا اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم غور کریں۔پچھلے آدھ گھنٹے سے بادل کا ایک بڑا ٹکڑا آسمان پر چھایا ہوا تھا لیکن اس وقت جب ژاں ولجاں بستر کے سامنے رُکا تھا، بادل پھٹا گویا یہ عمل

کسی مقصد سے ہو رہا تھا، اور روشنی کی ایک کرن نے لمبی کھڑکی سے گزر کر اچانک بشپ کے زردی مائل چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ بشپ آرام سے محوِ خواب تھا۔ وہ کوہ ایلپس سے آنے والی زرد ہواؤں کے باعث اپنے بھورے رنگ کے اون سے بنے تقریباً پورے لباس میں سو رہا تھا، جو بازوؤں اور کلائیوں تک جسم کو ڈھانکے ہوئے تھا۔ اس کا سر لاپرواہی کے انداز میں تکیے پر رکھا ہوا تھا؛ اس کا ہاتھ پادریانہ انگوٹھی پہنے ہوئے، جس نے نہ جانے کتنے مقدس اعمال انجام دیے ہوں گے، بستر کے کنارے لٹک رہا تھا۔ اس کا پورا چہرہ ایک مبہم اطمینان، امید اور آسودگی کے اظہار سے روشن تھا۔ یہ انداز، تبسم بلکہ تابندگی کا مظہر تھا۔ اس کے ابرو ایک ناقابلِ بیان روشنی منعکس کر رہے تھے جو نظر نہیں آتی تھی۔ نیکوکاروں کی روحیں خواب میں پُراسرار جنت کا تصور کرتی ہیں۔

بشپ پر اس جنت کا عکس پڑ رہا تھا۔

یہ ایک تاباں شفافیت بھی تھی، اس لیے کہ وہ جنت اس کے اندرون میں تھی۔ اور وہ جنت اس کا ضمیر تھا۔

اس وقت جب اس کی اندرونی تابانی پر چاند کی کرن خود کو منطبق کر رہی تھی محوِ خواب بشپ کی شخصیت اپنے عروج پر تھی، مگر دھیمی اور ناقابلِ بیان نصف روشنی میں پوشیدہ رہی۔ آسمان کا وہ چاند، وہ خوابیدہ کیفیت، وہ پُرسکون باغیچہ، وہ گھر جو اس قدر پُرسکون تھا، وہ لمحہ، وہ خاموشی، اس شخص کے قابلِ احترام آرام میں اضافہ کر رہا تھا، اور ایک عالی شان نورانی تاج ان سفید بالوں، ان بند آنکھوں، اس چہرے کی جو امید ہی امید تھا، جو اعتماد ہی اعتماد تھا، اس بوڑھے شخص کے سر کی پوشش بنا ہوا تھا۔

اس شخص میں ضرور ایسی کوئی شے تھی جو خداداد تھی؛ اس طرح وہ بلند پایہ ہو گیا تھا جس کا اسے احساس نہیں تھا۔

ژاں والژاں سایے میں بالکل ساکت کھڑا تھا، اس کے ہاتھوں میں اس کی آہنی شمع بردار چھڑی تھی۔ وہ اس نورانی بوڑھے شخص سے ڈرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اعتماد نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اخلاقی دنیا میں اس سے زیادہ پُرشوکت منظر نہیں تھا — ایک پریشان اور بے چین ضمیر، جو ایک شیطانی عمل کے قریب پہنچ چکا تھا، ایک نیک انسان کے سکون پر غور کر رہا تھا۔

اس تنہائی میں اور ایسے پڑوسی کے ساتھ محوِ خواب ہونے میں کوئی شے تھی جو بہت ارفع تھی، جس کے بارے میں وہ غیر واضح مگر باخبر تھا۔

کوئی بتا نہیں سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا ہو رہا تھا؛ وہ خود بھی اس سے واقف نہیں تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کسی نہایت نرم شے کی موجودگی میں کسی سخت شے کا تصور کریں۔ اس کے بشرے سے بھی کسی شے کی شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ ایک طرح کا پراگندہ تحیّر تھا۔ اس نے اس پر نظر ڈالی، اور بس۔ مگر یہ اس کا خیال کیا تھا؟ اس کو بیانی بنانا ممکن نہ ہوتا۔ بس اتنا ظاہر تھا کہ اسے چھوا گیا تھا اور ششدر کر دیا گیا تھا، مگر اس کے جذبے کی نوعیت کیا تھی؟

اس کی آنکھیں بوڑھے سے ہٹی نہیں تھیں۔ صرف ایک بات جو اس کے رویے اور اس کی قیافہ شناسی سے اخذ کی جا سکتی تھی، وہ اس کا حیرت انگیز تذبذب تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دو پاتالوں کے درمیان ہچکچا رہا تھا — ایک پاتال وہ جس میں خود اپنا وجود کھو جاتا ہے اور دوسرا وہ جس میں خود کو بچا لیا جاتا ہے۔ وہ یا تو کھوپڑی کو کچلنے کے لیے تیار ہوتا ہے یا ہاتھ کو بوسہ دینے کے لیے۔

چند منٹ کے وقفے کے بعد اس کا بایاں ہاتھ آہستہ آہستہ ابرو کی طرف بلند ہوا، اور اس نے اپنی ٹوپی اتار لی؛ اس کے بعد اس کا ہاتھ اسی قسم کے سوچ بچار کے بعد واپس گرا، اور ژاں ولژاں ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا، اس کی ٹوپی اس کے دائیں ہاتھ میں، اور اس کے بیابانی سر پر خنزیر جیسے سخت کھڑے بال تھے۔

اس کی خوف ناک نظروں تلے بشپ گہری نیند سوتا رہا۔

چاند کی نرم روشنی نے چمنی کے اوپر لگی صلیب کو اجالے میں ڈال دیا تھا، جو اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلاتی محسوس ہو رہی تھی؛ ایک طرف دعا کے ساتھ، دوسری سمت دعائے معافی کے لیے۔

اچانک ژاں ولژاں نے اپنی ٹوپی دوبارہ پہنی؛ بشپ کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے بستر کے پاس سے گزرا، سیدھا الماری کی طرف گیا جو بستر کے قریب رکھی ہوئی تھی؛ اپنی شمع بردار چھڑی اس طرح بلند کی گویا تالا توڑنا چاہتا ہو؛ کنجی وہیں رکھی ہوئی تھی؛ الماری کھولی؛ سب سے پہلے جو چیز نظر آئی وہ نقرئی اشیا کی جھابی تھی۔ اس نے جھابی نکالی، لمبے لمبے قدم بھرتا کمرے کو پار کیا، بغیر کسی احتیاط کے اور آواز کی پروا کیے بغیر، دروازے تک پہنچا، خطبے کے کمرے میں دوبارہ داخل ہوا، کھڑکی کھولی، اپنا ڈنڈا پکڑا، کھڑکی پھلانگی، نقرئی اشیا اپنے سفری تھیلے میں رکھیں، جھابی کو ایک طرف پھینکا، باغیچے کو پار کیا، کسی چیتے کی طرح دیوار پر چڑھا، اور یہ جا، وہ جا۔

فعال بشپ

دوسرے دن صبح کے وقت موں سنیور ریاں وینیو اپنے باغیچے میں ٹہل رہا تھا۔ خوف زدہ مادام ماگوا دوڑی ہوئی آئی۔

''موں سنیور، موں سنیورا'' اس نے چیخ کر کہا ''جناب عالی، کیا آپ کو علم ہے کہ نقرئی اشیا کی چھابی کہاں ہے؟''

''ہاں۔'' بشپ نے جواب دیا۔

''یسوع مسیح، میرا آقا، خدا اس پر برکتیں نازل کرے۔'' اس نے دوبارہ کہا ''مجھے معلوم نہیں کہ اس کا کیا ہوا۔''

تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے پھولوں کے تھالے میں سے چھابی اٹھائی تھی۔ اس نے مادام ماگوا کو پیش کردی۔

''یہ رہی تمھاری چھابی۔''

''مگر... '' اس نے کہا، ''اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چاندی کہاں گئی؟''

''اوہ'' جواب میں بشپ نے کہا، ''تو دراصل وہ چاندی ہے جو تمھیں پریشان کر رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہاں ہے؟''

''اوہ خدایا! چوری ہوگئی۔ وہ آدمی جو کل رات یہاں رہا تھا، چرا لے گیا ہے۔''

چشم زدن میں، بوڑھی عورت کی زندہ دلی کے ساتھ مادام ماگوا دوڑی دوڑی خطبہ خانے میں گئی، محراب کے حصے میں داخل ہوئی اور واپس بشپ کے پاس گئی۔ بشپ جھکا ہوا افسوس کر رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ سفید پھولوں والے ایک پودے کو چھابی نے توڑ دیا تھا اور وہ

تھالے میں آڑا پڑا ہوا تھا۔ بشپ مادام ماگوا کی چیخ سن کر کھڑا ہو گیا۔

"موں سنیور، وہ آدمی تو رفو چکر ہو گیا۔ چاندی چوری ہو گئی ہے۔"

اپنی چیخ کے ساتھ ہی اس کی نظر باغیچے کے ایک کونے پر پڑی، جہاں دیوار کو پار کرنے کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ دیوار کے اوپر بنا ہوا چھجا ٹوٹ کر گر گیا تھا۔

"ٹھہریے! وہ اس طرف سے گیا ہے۔" وہ اچھل کر Cochefilet لین میں داخل ہو گئی۔ "اوہ، افسوس، وہ ہماری چاندی چرا لے گیا!"

بشپ کچھ دیر خاموش رہا! پھر اس نے اپنی گمبھیر نظریں اٹھائیں اور نرمی سے مادام ماگوا سے کہا، "اور، سب سے پہلی بات تو یہ ہے، کیا وہ چاندی ہماری تھی؟"

مادام ماگوا گنگ ہو گئی۔ خاموشی کا ایک اور وقفہ گزرا؛ تب بشپ نے کہنا شروع کیا:

"مادام ماگوا، میں ایک عرصے سے وہ چاندی دبائے ہوئے تھا۔ وہ ناداروں کی ملکیت تھی۔ وہ آدمی کون تھا؟ ظاہر ہے کہ نادار تھا۔"

"افسوس! یسوع مسیح!" مادام ماگوا نے جواب میں کہا "وہ نہ میرے لیے تھی اور نہ میڈموڈیل کے لیے۔ وہ موں سنیور کے لیے تھی۔ اب موں سنیور کھانا کس سے کھائیں گے؟"

بشپ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"چلو، کوئی بات نہیں۔ کیا جست کے کانٹے اور چمچے نہیں ہوتے؟"

مادام ماگوا اپنے کندھے ہلا کر رہ گئی۔

"جست سے بو آتی ہے۔"

"تو پھر، آہنی کانٹے اور چمچے؟"

مادام ماگوا نے منہ بنایا۔

"آہن میں بھی ایک قسم کی بو ہوتی ہے۔"

"بہت اچھا" بشپ نے کہا، "تو پھر لکڑی کے بنے کانٹے چمچے کیسے رہیں گے؟"

تھوڑی دیر بعد وہ اسی میز پر ناشتا کر رہا تھا، پچھلی شام جس پر ژاں ولژاں بیٹھا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے موں سنیور ویکم نے شوخی سے اپنی بہن کی طرف اشارہ کیا، جس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ مادام ماگوا کی طرف بھی دیکھا جو چپکے چپکے بڑبڑا رہی تھی، کہ کسی کو بھی نہ کانٹے چاہییں نہ چمچے، لکڑی کے بھی نہیں، کہ دودھ بھرے پیالے میں ڈبل روٹی ڈبو کر بھی کھائی جا سکتی ہے۔

"سچ مچ، یہ بہت اچھا خیال ہے۔"

مادام ماگوا نے، آتے جاتے، اپنے آپ سے کہا۔ "اس جیسے آدمی کو اندر آنے دینا، اس کو خود سے قریب رہنے دینا۔ اور یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ اس نے کچھ اور نہیں کیا، سوائے چوری کے۔ اوہ میرے خدا، میں تو سوچ کر ہی کانپ جاتی ہوں۔"

بھائی بہن میز سے اٹھنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"اندر آجایئے۔" بشپ نے کہا۔

دروازہ کھلا۔ ایک سخت کوش گروہ ڈیوڑھی پر ظاہر ہوا۔ تین آدمی چوتھے آدمی کو کالر سے پکڑے ہوئے تھے۔ تین آدمی سپاہی تھے، چوتھا آدمی ژاں ولژاں تھا۔

سپاہیوں کا بریگیڈیئر، جو اس گروہ کا کماں دار معلوم ہوتا تھا، دروازے کے قریب کھڑا تھا، وہ بھی اندر داخل ہوا، بشپ کی طرف بڑھا اور اسے فوجی سیلوٹ کیا۔

"موں سنیور!" اس نے کہا۔

یہ لفظ سنتے ہی، ژاں ولژاں نے، جو رنجیدہ تھا اور بے بس معلوم ہو رہا تھا، بدحواسی میں اپنا سر اٹھایا۔

"موں سینیور!" اس نے دھیمے سے کہا "یعنی یہ کیور نہیں۔"

"خاموش!" سپاہی نے کہا "یہ موں سنیور بشپ ہے۔"

اس دوران موں سنیور ریاں ویئیو، جتنی اس کی عمر اجازت دیتی تھی، تیزی سے آگے بڑھا۔ "اچھا! تو یہ تم ہو!"

اس نے ژاں ولژاں کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا:

"تمھیں دیکھ کر خوشی ہوئی، مگر یہ سب کیا ہے؟ میں نے تو تم کو شمع دان بھی دیے تھے، دوسری چیزوں کی طرح وہ بھی چاندی کے تھے، جن کے عوض تم کو دو سو فرانک ضرور مل جاتے۔ تم اپنے کانٹوں اور چمچوں کے ساتھ ان کو بھی کیوں نہیں لے گئے؟"

ژاں ولژاں نے حیرت سے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں، اور مہربان بشپ کی طرف اس طرح دیکھا، کوئی انسانی زبان جس کو بیان نہیں کر سکتی۔

"موں سنیور!" سپاہیوں کے بریگیڈیئر نے کہا "تو جو کچھ اس آدمی نے کہا ہے، سچ تھا؟ یہ ہمیں مل گیا تھا۔ یہ اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی بھاگا ہوا آدمی چلتا ہے۔ ہم نے یہ دیکھنے کے لیے کہ معاملہ کیا ہے، اس کو روکا۔ اس کے پاس سے یہ چاندی نکلی۔"

"اور اس نے تم لوگوں کو بتایا۔" بشپ نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "یہ سب ایک بزرگ

پادری نے دیا تھا، جس کے ہاں اس نے رات گزاری تھی؟ اب میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اور تم اسے پکڑ کر میرے پاس لائے ہو۔ تم نے غلطی کی ہے۔"

""یعنی" بریگیڈیئر نے کہا، "ہم اسے جانے دیں؟""

"یقیناً۔" بشپ نے جواب میں کہا۔

سپاہیوں نے ژاں ولژاں کو چھوڑ دیا، جوا یک دم پیچھے کی طرف ہٹا۔

""کیا یہ سچ ہے کہ مجھے آزاد کیا جا رہا ہے؟" اس نے ایسی غیر واضح آواز میں کہا گویا خواب میں بول رہا ہو۔

""ہاں تو آزاد ہے؛ کیا تیری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟" ایک سپاہی نے کہا۔

"میرے دوست!" بشپ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جانے سے پہلے، یہ رہے تمھارے شمع دان، انھیں بھی ساتھ لے جاؤ۔"

وہ چمنی کی طرف بڑھا، دو شمع دان اٹھائے اور ژاں ولژاں کے پاس لے آیا۔ دونوں عورتیں ایک لفظ بھی ادا کیے بغیر دیکھتی رہ گئیں، بغیر کسی حرکت کے، بغیر کسی نظر کے، جو بشپ کی پریشانی کا باعث ہوتی۔

ژاں ولژاں کا بند بند کانپ رہا تھا۔ اس نے میکانکی پریشانی کے انداز میں، شمع دان تھام لیے۔

"اب" بشپ نے کہا، "سکون سے جاؤ، مگر سنو! جب واپس لوٹو میرے دوست، تو ضروری نہیں کہ تم باغیچے سے گزر کر جاؤ، تم ہمیشہ گلی والے دروازے سے آ جا سکتے ہو۔ یہ دروازہ، دن ہو یا رات، کبھی بند نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد سپاہیوں سے کہا:

"حضرات، اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

سپاہی واپس چلے گئے۔

ژاں ولژاں اس آدمی کی طرح لگ رہا تھا جو کسی لمحے بے ہوش ہو جانے والا ہو۔

بشپ اس کے قریب گیا، اور دھیمی آواز میں کہا:

""بھولنا نہیں، کبھی نہ بھولنا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس کے استعمال سے تم اچھے آدمی بن جاؤ گے۔"

ژاں ولژاں، جس کو کچھ یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی قسم کا وعدہ کیا تھا، گم سم کھڑا

رہا۔ بشپ نے ان الفاظ کی ادائیگی پر خاصا زور دیا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے دوبارہ کہا:

”ژاں والژاں، میرے بھائی، اب تمھارا بدی سے نہیں، نیکی سے تعلق ہے۔ یہ تمھاری روح ہے جسے میں خرید رہا ہوں؛ میں اس کو سیاہ خیالات سے اور جہنمی جذبے سے واپس لے رہا ہوں، اور اسے خدا کے سپرد کر رہا ہوں۔“

✡

ننھا جَرو ے

ژان ولیژاں نے شہر اس طرح چھوڑا گویا وہاں سے بھاگ رہا ہو۔تیز تیز قدم بڑھاتا میدانوں سے گزرتا، جو بھی سڑک ملی، جو بھی گلی ملی اس پر چلتا چلا گیا، اس تصور کے بغیر کہ وہ مسلسل ان ہی راستوں پر واپس جا رہا تھا جہاں سے آیا تھا۔پوری صبح، بغیر کچھ کھائے پیے، اور بھوک کے احساس کے بغیر اسی طرح گزر گئی۔وہ نئے قسم کے احساسات کے ہجوم کا شکار تھا۔اسے ایک طرح کے غصے کا بھی احساس ہو رہا تھا؛ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ غصہ کس کے خلاف تھا۔ اس پر ایسے لمحات بھی آئے، اس پر ایسے حیرت انگیز جذبات بھی طاری ہوئے جن کا اس نے اس سختی سے مقابلہ کیا تھا جو گزرے ہیں برسوں کی زندگی میں اس کی شخصیت کا حصہ بن گئے تھے۔ دماغ کی اس کیفیت نے اسے تھکا دیا تھا۔اسے احساس ہو چلا تھا کہ خوف زدہ کر دینے والی خاموشی، جو اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں نے اسے عطا کی تھی، اس کے اپنے اندر پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے خود سے سوال کیا کہ اس کو کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔کبھی کبھی تو وہ چاہتا تھا کہ وہ سپاہیوں کی قید ہی میں ہوتا، اور یہ بھی کہ معاملات اس طرح نہیں ہوتے کہ انھوں نے اسے کم اُکسایا ہوتا۔اگرچہ موسم بہت بدل چکا تھا، باڑوں کے تھالوں میں اِکا دُکا پھول اب بھی کھل رہے تھے اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے، ان سے آنے والی خوش بو اس کے بچپنے کی یاد لا رہی تھی۔وہ یادیں اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں، جو اتنے عرصے بعد اس پر طاری ہو رہی تھیں۔

اس طرح پورا دن اس کے اندرون میں ناقابلِ بیان خیالات جمع ہوتے رہے۔

غروب کے لیے سورج کا زوال ہو رہا تھا؛ زمین کے ہر سنگ ریزے کے سایے لمبے ہوتے جا رہے تھے؛ ژان ولیژاں شفق کے گلابی رنگ میں رنگے میدان کی ایک بڑی سی جھاڑی

کے عقب میں بیٹھا ہوا تھا، جو بالکل سنسان ہو رہا تھا۔ افق پر سوائے کوہ ایلپس کے کچھ بھی نہیں تھا، دور کسی گاؤں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کا مرغولہ بھی نہیں۔ ژاں ولژاں D سے تقریباً تین لیگ فاصلے پر رہا ہوگا۔ ایک راستہ جو میدان کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا تھا، جھاڑی سے چند قدم فاصلے سے گزر رہا تھا۔

اس مراقبے کے دوران، جو اس کے چیتھڑوں میں ایسا اضافہ نہیں کر رہا تھا جو اس سے ملنے والے کسی شخص کو خوف زدہ کر دیتا، اسے ایک خوش کر دینے والی آواز سنائی دی۔

اس نے گھوم کر دیکھا کہ سیوائی (Savoy) کے علاقے کا دس برس کا ایک لڑکا گاتا ہوا سڑک پر چلا آ رہا تھا، اس کا باجا (hurdy-gurdy) اس کی کمر پر، اور اس کے موشِ خرمائی (marmot) کا پنجرہ اس کے سر پر دھرا تھا۔

وہ اس قسم کے خوش دل اور مہذب بچوں میں سے تھا جو اپنے پتلون کے سوراخوں سے اپنے گھٹنوں کا نظارہ کراتے، ایک زمین سے دوسری زمین پھرا کرتے ہیں۔

اپنا گانا روکے بغیر، وہ لڑکا چلتے چلتے رُک جاتا اور اپنی انگلیوں کے گانٹھوں پر کچھ سکے اچھالتا، جو شاید اس کا کُل مال و متاع تھا۔

اس رقم میں چالیس سُو کا صرف ایک سکہ تھا۔

بچہ جھاڑی کے قریب رُک گیا۔ وہ ژاں ولژاں کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس نے اپنے مٹھی بھر سِکّے اچھالے، جنھیں وہ اب تک اپنی مہارت سے اپنے ہتھیلی کی پشت پر سنبھال لیتا تھا۔

اس بار چالیس سُو کا سکہ واپس نہیں آیا، لڑھکتا ہوا جھاڑی تک گیا اور ژاں ولژاں تک پہنچ گیا۔

ژاں ولژاں نے اس پر اپنا پیر رکھ دیا۔

اس دوران بچہ اپنے سکے کو تلاش کرتا ژاں ولژاں تک پہنچ گیا، اور اس کو دیکھا۔

اس نے کسی قسم کی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ سیدھا اس آدمی کے پاس گیا۔

وہ جگہ بالکل خالی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی، میدان میں یا راستے پر کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ صرف چڑیوں کے ایک جھنڈ کی مدھم آوازیں تھیں، جو فضا میں بہت بلندی پر اُڑ رہا تھا۔ بچہ سورج کی طرف پشت کیے کھڑا تھا، جس نے اس کے بالوں میں سونے کے تار سے ڈال دیے تھے، اور اپنی خون جیسی سرخ کرنوں سے ژاں ولژاں کے بیابانی چہرے کو ارغوانی بنا دیا تھا۔

''جناب!'' اس ننھے سیوائی نے بچگانہ اعتماد سے کہا جو لاعلمی اور معصومیت سے ترتیب

پاتا ہے، ''میری رقم۔''

''کیا نام ہے تمھارا؟'' ژاں ولژاں نے سوال کیا۔

''چھوٹا جروے، جناب!''

''چلے جاؤ یہاں سے۔'' ژاں ولژاں نے کہا۔

''جناب!'' بچے نے بات جاری رکھی، ''میری رقم واپس کیجیے۔''

ژاں ولژاں نے سر جھکا لیا، اور کوئی جواب نہیں دیا۔

بچے نے پھر کہا، ''میری رقم، جناب!''

ژاں ولژاں کی آنکھیں زمین پر ہی لگی رہیں۔

''میرا سکہ'' بچے نے چیخ کر کہا، ''میرا سفید سکہ، میری چاندی!''

ایسا محسوس ہوا گویا ژاں ولژاں نے سنا ہی نہیں۔

بچے نے اسے کالر سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑا۔ ساتھ ہی اس آہنی جوتے کو ہٹانے کی کوشش کی جو اس کے خزانے پر رکھا ہوا تھا۔

''مجھے اپنی رقم چاہیے، میرا چالیس سُو کا سکہ!'' بچہ رو پڑا۔

ژاں ولژاں نے سر اٹھایا مگر بیٹھا ہی رہا۔ اس کی آنکھوں میں پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے ایک قسم کی حیرت میں بچے کو گھور کر دیکھا، پھر ہاتھ بڑھا کر اپنا ڈنڈا اٹھایا اور خوف ناک آواز میں چیخ کر کہا، ''کون ہو تم؟''

''میں ہوں، جناب'' بچے نے جواب دیا ''چھوٹا جروے! مہربانی کر کے میرا چالیس سُو کا سکہ دے دیجیے۔ جناب! اپنا پیر ہٹایئے، مہربانی کیجیے۔''

باوجود اس کے کہ وہ اتنا چھوٹا تھا، اسے غصہ آ گیا، اور اس نے دھمکی کے انداز میں کہا، ''بس، بہت ہو گیا، اپنا پیر ہٹاؤ گے کہ نہیں؟ پیر ہٹاؤ ورنہ ہم تمھیں دیکھ لیں گے!''

''اچھا! تو یہ تم ہو۔'' ژاں ولژاں نے کہا، اور اچانک اٹھ کھڑا ہوا؛ پیر سکے پر جمائے ہوئے اس نے کہا، ''جاتے ہو کہ نہیں؟''

خوف زدہ بچے نے اس کی طرف دیکھا اور سر سے پیر تک لرزنے لگا، اور چند لمحوں کی بدحواسی کے بعد پلٹ کر دیکھے یا رُک کر روئے بغیر، وہ پوری قوت سے دوڑتا ہوا چلا گیا۔

پھر بھی، سانس چڑھنے کے باعث کچھ دور جا کر اسے رُکنا پڑ گیا تھا، اور ژاں ولژاں نے، اپنے دن میں خواب دیکھنے کے دوران، اس کو سسکی لیتے سنا تھا۔

چند لمحوں بعد بچہ جا چکا تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔

ژاں ویلواں کے اطراف سایے لمبے ہونے لگے تھے۔ اس نے دن بھر کچھ کھایا نہیں تھا، شاید اس لیے کہ اس کو بخار ہو رہا تھا۔

ژاں ویلواں وہیں کھڑا رہا، بچے کے بھاگ جانے کے بعد بھی اس کا رویہ بدلا نہیں تھا۔ اس کا سینہ طویل اور لمبے وقفوں کے بعد لی جانے والی سانسوں کے باعث اونچا نیچا ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں دس یا بارہ قدم آگے جمی ہوئی تھیں، اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ نیلے رنگ کے مٹی کے برتنوں کے کچھ قدیم ٹکڑوں اور ان کی شکلوں کی جانچ کر رہی تھیں جو گھاس پر پڑے ہوئے تھے۔ اسے اچانک کپکپی محسوس ہوئی؛ شام کی ٹھنڈ محسوس ہونے لگی تھی۔

اس نے اپنی ٹوپی اپنے ابرو تک جھکا کر زیادہ سختی سے جمائی، اپنے بلاؤز کے بٹن بند کیے، اور چند قدم آگے بڑھا، پھر اپنا ڈنڈا اٹھانے کے لیے رکا۔

اس لمحے اسے چالیس سو کا سکہ نظر پڑا، جسے اس کے پیر نے زمین میں نصف دفنا دیا تھا، جو وہاں پڑے سنگ ریزوں کے درمیان چمک رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ "یہ کیا ہے؟" اپنے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر اس نے کہا۔ وہ تین قدم پیچھے پلٹا اور اس جگہ سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر رکا جس کو اس کے قدموں نے روند دیا تھا، مگر ایک لمحے قبل ایسا لگا تھا جیسے اس دھندلکے میں پڑی شے ایک کھلی آنکھ تھی جو اس پر جم گئی تھی۔

چند لمحے گزر جانے کے بعد تیر کی طرح اس نقرئی سکے کی طرف بڑھا، اس کو اٹھایا، سیدھا کھڑا ہوا اور دور میدان میں دیکھنے لگا؛ ساتھ ہی وہ ہر طرف افق پر بھی نظریں ڈال رہا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا، کسی جنگلی جانور کی طرح کانپ رہا تھا جس کو پناہ کی تلاش ہو۔

اس کو کچھ نظر نہیں آیا۔ رات ہوتی جا رہی تھی، میدان مسطح، ٹھنڈا اور دھندلا ہو رہا تھا؛ شام کے دھندلکے میں بنفشی رنگ کا غبار اٹھ رہا تھا۔

اس نے "اوہ!" کہا اور تیزی سے اس طرف روانہ ہو گیا جدھر جا کر بچہ غائب ہو گیا تھا۔ تقریباً تیس قدم چلنے کے بعد وہ رکا، ہر طرف نظریں دوڑائیں مگر کچھ بھی نظر نہیں پڑا۔

پھر اس نے اپنی پوری قوت سے چلا کر کہا، "ننھے جروے! ننھے جروے!"

تھوڑی دیر وقفہ کیا اور اس کا انتظار کیا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔

منظر اداس اور سنسان ہو رہا تھا۔ کشادگی نے اسے گھیر رکھا تھا۔ اس کے اطراف سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نہیں تھا، جس میں اس کی نظریں گم ہو گئیں اور ایک خاموشی تھی جس نے اس کی آواز کو جذب کر لیا تھا۔

شمال کی برفیلی ہوا چل رہی تھی اور اطراف کی ہر شے کو معصومانہ زندگی عطا کر رہی تھی۔ جھاڑیاں اپنے پتلے پتلے بازو ناقابلِ یقین غصے سے ہلا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی کو دھمکا رہی ہوں اور کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

اس نے ایک بار پھر چلنا شروع کیا، اس کے بعد دوڑنے لگا؛ وقتاً فوقتاً رُکتا اور تنہائی میں چلّاتا، ایسی آواز سے جو ڈراؤنی اور بے حد فکرمند ہو رہی تھی، ''ننھے جروے! ننھے جروے!'' سننا ممکن ہو رہا تھا۔

یقینی طور پر اگر بچے نے اسے سنا ہوتا تو وہ فکرمند ہو جاتا اور پوری کوشش کرتا کہ بچہ اسے دیکھ نہ سکے، مگر بلاشبہ بچہ بہت دور جا چکا تھا۔

اسے گھوڑے پر سوار ایک پادری ملا۔ اس کی طرف بڑھا اور اس سے پوچھا:

''موسیو لی کیور، کیا آپ نے کسی بچے کو جاتے دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' پادری نے جواب دیا۔

''وہ، جس کا نام ننھا جروے ہے؟''

''جی نہیں! مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔''

اس نے بٹوے سے پانچ فرانک کے دو سکے نکالے اور پادری کو دے دیے۔

''موسیو لی کیور، یہ آپ کے نادار لوگوں کے لیے ہے۔ موسیو لی کیور، وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا، تقریباً دس برس کا، اس کے پاس ایک پہاڑی چوبا بھی تھا، اور شاید باجا بھی تھا۔ سیوائے والوں میں سے ایک تھا وہ۔''

''میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''ننھا جروے؟ اس علاقے میں کیا گاؤں نہیں ہیں؟ کیا آپ مجھے کچھ بتا سکتے ہیں؟''

''اگر وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں تو میرے دوست، وہ کوئی اجنبی رہا ہوگا۔ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

ژاں ولژاں نے پانچ فرانک کے دو اور سکے، مشکل سے نکالے اور پادری کے حوالے کر دیے۔

"یہ بھی آپ کے ناداروں کے لیے ہیں۔" اس نے کہا۔
اور جنگلی انداز میں اس سے کہا،
"موسیو لی ایبے، مجھے گرفتار کرا دیجیے، میں چور ہوں۔"
پادری نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے بھاگا۔
ژاں ولژاں نے اسی سمت دوڑنا شروع کیا، جس پر وہ پہلے دوڑا تھا۔

اس طرح اس نے ایک قابل برداشت طویل فاصلہ دیکھتے، پکارتے، چیختے طے کیا، مگر کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دو یا تین بار اس نے کسی چیز کی طرف، جو کسی آرام سے بیٹھے، جھکے ہوئے انسان جیسی معلوم ہوئی، دوڑ کر میدان پار کیا؛ مگر وہ یا تو کوئی جھاڑی تھی یا زمین کے سطح کے برابر کوئی نکلی ہوئی چٹان۔ کچھ دور چل کر وہ ایک جگہ پہنچا جہاں تین راستے ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے، اور وہاں رُک گیا۔ چاند نکل آیا تھا۔ اس نے دور تک نظر ڈالی اور آخری بار چلا کر کہا، "ننھے جروے! ننھے جروے! ننھے جروے!" اس کی آواز کہر میں کوئی گونج پیدا کیے بغیر ہی غائب ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر کہا، "ننھے جروے" مگر نہایت کم زور اور غیر واضح آواز میں۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی۔ یکا یک اس کے پاؤں جواب دے گئے، گویا کسی نا دیدہ طاقت نے اس پر، اس کے شیطانی ضمیر کا بوجھ ڈال دیا ہو، اچانک اس پر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔ وہ تھک کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا، اس کی مٹھیاں اس کے بالوں کو کھینچے ہوئی تھیں، اس کا چہرہ گھٹنوں کے درمیان تھا اور وہ رو کر کہہ رہا تھا، "میں بہت بدنصیب ہوں۔"

پھر اس کا دل پھٹ گیا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ یہ انیس برسوں میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ رو رہا تھا۔

جب ژاں ولژاں بشپ کے گھر سے نکلا تھا، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، وہ ہر چیز سے جس کے بارے میں سوچ چکا تھا، بیزار تھا۔ وہ بتا نہیں سکتا تھا کہ اس کے اندرون میں کیا ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو بوڑھے کے ملکوتی اور مہربان لفظوں کو یاد کیا، "تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم ایک ایمان دار آدمی بن جاؤ گے۔ یہ تمھاری روح ہے جسے میں خرید رہا ہوں؛ میں اس کو سیاہ خیالات سے اور جہنمی جذبے سے واپس لے رہا ہوں، اور اسے اپنے مہربان خدا کے سپرد کر رہا ہوں۔"

یہ سب کچھ اس کے دماغ میں بار بار گونج رہا تھا۔ اس آسمانی مہربانی کے لیے اس نے نخوت کی مخالفت کی تھی جو ہمارے اندر بدی کا قلعہ ہوتی ہے۔ وہ بلا کسی امتیاز کے جبلتی طور با خبر تھا کہ بشپ کی طرف سے دی جانے والی معافی اس پر سب سے بڑا حملہ تھا جس نے اس پر اثر

کیا تھا، کہ اگر اس نے معافی کی مزاحمت کی ہوتی تو اس کی سنگ دلی طے ہو جاتی؛ کہ اگر اس نے ہار مان لی ہوتی تو اس کو نفرت سے دست بردار ی کرنی پڑتی دوسرے لوگوں نے جس سے اس کے جسم و جاں کو بھر دیا تھا، جو اس کو اچھی لگتی تھی؛ کہ اس بار ضروری تھا کہ یا تو اسے فتح کیا جائے یا مفتوح ہو جایا جائے۔؛ اور یہ بھی کہ آدمی کی نیکی اور بد طینتی کے درمیان بہت بڑی جد و جہد شروع ہو چکی ہے۔

ان روشنیوں کی موجودگی میں، وہ اس آدمی کی طرح آگے بڑھا جو نشے میں ہو۔ جب وہ وحشت زدہ آنکھیں لیے چل رہا تھا، کیا اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ D میں اس کی کارگزاری کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں؟ کیا وہ ان تمام پُراسرار آوازوں کو سمجھ سکتا تھا جو زندگی کے مخصوص لمحات میں جذبے یا طلب کو تنبیہ کرتی ہیں؟ کیا کسی آواز نے اس کے کان میں چپکے سے کہا تھا کہ وہ اپنے مقدر کے سنجیدہ لمحے سے گزر چکا ہے؛ کہ اس کے لیے کوئی درمیانی راستہ باقی نہیں رہا؛ کہ اب وہ بہترین آدمی نہیں بن جاتا تو وہ بدترین آدمی ہو گا؛ کہ اس کو زیب دیتا ہے کہ وہ بشپ سے بڑا آدمی بننے کی کوشش کرے یا کسی سزا یافتہ سے بھی نیچے گر جائے؛ کہ اگر وہ اچھا بننا چاہتا ہے تو اسے فرشتہ بن جانا چاہیے؛ کہ وہ اگر بد رہنا چاہتا ہے تو اسے عفریت بن جانا چاہیے۔

اس موقعے پر اک بار پھر کچھ سوالات کیے جانے چاہئیں، جو ہم اپنے آپ سے کسی اور جگہ بھی کر چکے ہیں: کیا اس نے اپنے خیالات میں ان سب کی کوئی پرچھائیں پیچیدہ طریقے سے گرفت میں لی ہے؟ بلا شبہ بد نصیبی، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، آگاہی کی تعلیم کی بنیاد رکھتی ہے؛ پھر بھی، اس میں شبہ ہے، آیا ژاں ولژاں اس کیفیت میں تھا، ہم نے جن کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ وہ ان سب کو سلجھا سکتا تھا۔ اگر چہ یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے، مگر اس نے انھیں پوری طرح دیکھنے کے بجائے ان کی صرف جھلکیاں دیکھی تھیں، اور انھوں نے اسے نا قابل بیان تکلیف دہ جذبے کی کیفیت میں ڈال دیا تھا۔ اس سیاہ اور بگاڑ دینے والی کیفیت سے نکلنے کے بعد جس کو جہازی قید کہا جاتا ہے، بشپ نے اس کی روح کو زخمی کر دیا تھا، جیسے کسی گہرے اندھیرے سے نکلتے وقت زیادہ شفاف روشنی آنکھوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مستقبل کی زندگی، وہ امکانی زندگی، جس نے اس کے بعد سے اسے سب کچھ خالص اور روشن بنا کر پیش کیا تھا، اسے جھٹکوں اور تشویش سے بھر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ واقعی کہاں تھا۔ یہ سزا یافتہ اس عمل سے جسے ہم نیکی کہہ سکتے ہیں، کسی اُلو کی طرح، جو اچانک سورج کو نکلتا دیکھ لے خیرہ اور نابینا ہو گیا تھا۔

وہ امر جو یقینی تھا، وہ امر جس پر اسے شبہ نہیں تھا، یہ تھا کہ اب وہ ویسا آدمی نہیں رہا تھا: اس کے بارے میں ہر شے تبدیل ہو گئی تھی، کہ اب اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ اسے ویسا ہی بنا سکتا بشپ نے نہ جس سے بات کی ہو اور نہ چھوا ہے۔

اس ذہنی کیفیت میں وہ ننھے جَروے سے ملا تھا، اور اس کے چالیس سو ہڑپ کر لیے تھے۔ کیوں؟ یقیناً وہ اس کی تشریح پیش نہیں کر سکتا؛ تو کیا یہ آخری اثر اور بلند کوشش تھی خیالات بد کی جو وہ اپنے ساتھ جہاز کی قید سے لایا تھا — قوتِ محرکہ کی باقیات۔ اس کا نتیجہ، جس کو شماریات کی زبان میں حاصل کردہ توانائی کہتے ہیں؟ یہ وہی تھا، اور شاید اس سے کم بھی تھا۔ اس کو آسان لفظوں میں کہا جا سکتا ہے یہ وہ شخص نہیں تھا جس نے چوری کی تھی؛ یہ وہ آدمی نہیں تھا؛ درندہ تھا جس نے اپنی عادت اور جبلت کے مطابق بچے کے سکے پر محض پیر رکھ دیا تھا، جب ذہانت اتنی ساری انوکھی، اور اب تک کے ناشنیدہ خیالات کے درمیان جد و جہد کر رہی تھی اور اسے عادی بنا رہی تھی۔

جب ذہانت دوبارہ جاگی اور اس وحشی کے اس عمل پر غور کیا، تو ژاں ولژاں اذیت میں لپپا ہوا اور اس نے خوف کی آواز بلند کی تھی۔

یہ اس لیے ہوا تھا کہ بچے کا سکہ چرانے میں اس نے وہ کام کیا تھا، وہ جس کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔

بہر حال، جو کچھ بھی ہوا، بدی کا یہ آخری عمل اس پر فیصلہ کن انداز میں موثر ہوا تھا؛ اس نے یکا یک اس بے ترتیبی کو پار کیا، جو اس کے ذہن میں جاگزیں تھی، اس کو بکھیر دیا، اس کے ایک جانب گہرا ابہام رکھا اور دوسری جانب روشنی، اور اس کی روح پر عمل کیا، ایسی حالت میں جس میں وہ اس وقت تھا، اسی طرح جیسے کچھ کیمیائی عامل کسی بگڑے ہوئے آمیزے پر کام کرتے ہیں؛ ایک عنصر کو گراتے ہیں اور دوسرے کو صاف کرتے ہیں۔

سب سے پہلے، اپنی جانچ کیے بغیر، اپنے آپ پر غور کیے بغیر، اس شخص کی طرح جو اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، اس نے بچے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ اس کی رقم اسے واپس کر دے؛ جب اسے اس امر کا احساس ہوا کہ یہ ممکن نہیں تھا تو وہ مایوسی کے عالم میں رُک گیا۔ اس لمحے جب اس نے کہا تھا، "میں بہت بد نصیب ہوں" اس نے تصور کیا تھا کہ وہ کیا تھا، اور وہ اپنے آپ سے اس حد تک الگ ہو گیا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ کوئی خیالی صورت نہیں رہ گیا تھا، مگر وہ خون اور گوشت کا بنا، جہاز کا ڈراؤنا قیدی، ژاں ولژاں، ہاتھ میں ڈنڈا لیے، کمر تک کا بلاؤز پہنے، چوری کے مال سے اپنا سفری تھیلا بھرے، اپنے مستحکم اور اداس

بشرے اور مکروہ منصوبوں سے بھرے خیالات کے ساتھ اس وقت، وہاں اس کے سامنے تھا۔

ضرورت سے زیادہ بدقسمتی نے، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اسے ایک قسم کا خیالی انسان بنا دیا تھا۔ اس نے ژاں ولژاں کو، نامبارک چہرے کو اپنے سامنے حقیقت کے روپ میں دیکھ لیا تھا۔ اور وہ تقریباً اس کیفیت میں پہنچ گیا تھا کہ وہ خود سے پوچھتا کہ وہ آدمی کون تھا؟

اس کا دماغ ان سخت، پھر بھی مکمل طور پر پُرسکون، لمحات سے گزر رہا تھا جن میں خیالی کیفیت اتنی عمیق ہوتی ہے کہ حقیقت کو جذب کر لیتی ہے۔ تب وہ اپنے سامنے کی شے کو دیکھ نہیں پاتا، اور وہ اپنے وجود کے علاوہ وہی شکلیں دیکھتا ہے جو اس کے اپنے دماغ میں ہوتی ہیں۔

اس طرح، بقول شخصے، اس نے دو بہ دُو، خود سوچا اور ساتھ ہی اس فریبِ نظر کے برعکس اس نے ایک پُراسرار گہرائی، ایک نوع کی روشنی دیکھی پہلے جسے وہ تارج سمجھا تھا۔ اس روشنی کی چھان بین کے دوران، جو اس کے شعور میں زیادہ توجہ کے ساتھ واضح ہوئی تھی، اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ یہ انسانی پیکر کی مالک تھی، کہ یہ تارج بشپ کی ذات تھی۔

اس کے شعور نے ان دونوں آدمیوں کا باری باری وزن کیا جو ان صورتوں میں اس کے سامنے پیش ہوئے تھے— [یعنی] بشپ اور ژاں ولژاں۔ پہلے اسے اس امر کی توقع نہیں تھی کہ وہ دوسرے کو نرم کرے گا۔ ان انوکھے اثرات کے ذریعے، جو اس قسم کی ہیجانی کیفیت سے مخصوص ہوا کرتے ہیں، جیسے بشپ بڑا ہوا اور روشن آنکھوں والا نکلا، اسی طرح ژاں ولژاں کم ہوا اور غائب ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک سایے سے زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ پورا کا پورا غائب ہو گیا تھا۔ اکیلا بشپ رہ گیا تھا؛ اس نے اس بدنصیب آدمی کی پوری شخصیت کو ایک عالی شان تابانی سے بھر دیا تھا۔

ژاں ولژاں کافی دیر تک روتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے جلتے ہوئے آنسو گر رہے تھے، وہ سسکیاں لے رہا تھا کسی عورت سے بھی زیادہ کم زوری سے، کسی بچے سے زیادہ خوف سے۔

اس کے گرد لپٹے کے درمیان دن کی روشنی زیادہ شفافیت کے ساتھ اس کی روح میں داخل ہو رہی تھی؛ ایک غیر معمولی روشنی؛ ایسی روشنی جو ایک ہی وقت میں وجد آور بھی ہوتی ہے اور ہول ناک بھی۔ اس کی گزری زندگی، اس کی پہلی غلطی، اس کا طویل کفارہ، اس کی خارجی حیوانیت، اس کی اندرونی سنگ دلی، اس کا ردِ آزادی، انتقام کے گوں ناگوں منصوبوں میں اس کی شادمانی، بشپ کے ہاں جو کچھ ہوا تھا، آخری حرکت جو اس نے کی تھی، ایک بچے کے چالیس سو کی چوری، وہ جرم جو بہت بزدلانہ تھا، ننگِ انسانیت تھا اس لیے کہ وہ بشپ کی دی جانے والی معافی کے بعد ہوئی تھی— یہ سب اس کے دماغ میں دوبارہ ابھرے اور اس پر ظاہر ہوئے مگر اس صفائی

کے ساتھ جو اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی پر دوبارہ نظر کی، وہ اس کو بہت ہیبت ناک لگی؛ اس کی روح بھی اسے ڈراؤنی لگی۔ اس دوران اس کی زندگی کو، اس کی روح کو، ایک خلیق روشنی منور کر رہی تھی۔ اس کو محسوس ہوا گویا اس نے جنت کی روشنی کے ذریعے شیطان کو دیکھ لیا تھا۔

اس طرح وہ کتنے گھنٹے رویا تھا؟ رونے کے بعد اس نے کیا کیا تھا؟ کہاں گیا تھا وہ؟ کسی کو اس کا علم نہیں ہوا۔ ایک ہی بات جس کی تصدیق کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسی رات، اس بوجھ لے جانے والے نے جو اس زمانے میں Grenoble میں خدمت گاری کرتا تھا، اور جو تقریباً صبح تین بجے D میں داخل ہوا تھا اور جب وہ بشپ کے گھر کے قریب کی گلی پار کر رہا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ ایک آدمی مونسیور ویکم کے دروازے کے سامنے پختہ راستے پر، دعائیہ انداز میں، گھٹنوں کے بل کھڑا تھا۔

۞

1817ء کی رُوداد

1817ء وہ سال ہے جس میں لوئی ہشت دہم مخصوص شاہی یقین دہانیوں کے ساتھ، فخر و مباہات کے لیے جن کی ضرورت نہیں تھی، اپنی فرماں روائی کے بائیسویں برس میں داخل ہوا تھا۔ یہی وہ سال ہے جس میں موسیو Bruguiere de Sorsum کا جشن منایا گیا تھا۔ تمام حجاموں کی دکانیں جنھیں پاؤڈر کی اور شاہی پرندے کی واپسی کی امید تھی آسمانی رنگ سے پوت دی گئی تھیں، اور گلِ لالہ کے شاہی نشان سے بھر دی گئی تھیں۔ وہ صحیح وقت تھا جب ہر اتوار کاؤنٹ لنچ (Lynch) فرانس کے نوابین کی پوشاک میں ملبوس کلیسا کے نگہبانوں کے لیے مخصوص گدے دار نشستوں پر اپنے سرخ ربن اور اپنی لمبی ناک سمیت ایسے شخص کی جلالت اور کروفر کے ساتھ بیٹھتا تھا جس نے کوئی شان دار کام انجام دیا ہو۔ موسیو کا کیا ہوا شان دار کام یہ تھا: بورڈو کے میئر کی حیثیت میں 12 مارچ 1814ء کو اس نے شہر کو کچھ زرا عجلت میں ڈیوک دان گولیم (Duke d'Angouleme) کے حوالے کر دیا تھا۔ اسی بنا پر اس کو نوابی کا اعزاز دیا گیا تھا۔ 1817ء کا فیشن اسکیمو (Esquimaux) سے مشابہ، مراتش کے چرم سے بنی بڑی بڑی ٹوپیوں والے چار سے چھ برس کے چھوٹے چھوٹے بچوں پر طاری ہو گیا تھا۔ فرانسیسی فوج آسٹریائیوں کی جیسی سفید رنگ کی وردی میں ملبوس ہوتی تھی جن کو پلٹن کہا جاتا تھا؛ نمبروں کے بجائے وہ شعبوں کے نام سے جانے جاتے تھے؛ نپولین سینٹ ہلینا میں تھا؛ اور چوں کہ انگلستان نے اس کو سبز رنگ کے پارچے دینے سے انکار کر دیا تھا، وہ اپنے پرانے کوٹوں کی تجدید کروا رہا تھا۔ 1817ء میں پلگرینی (Pelligrini) گاتا گاتی تھی، بگوٹینی (Bigottini) رقص کرتی تھی؛ اور پوٹیے (Potier) کا راج تھا۔ اوڈری (Odry) کا وجود نہیں تھا۔ مادام ساک (Saqui) فوریوسو

(Forioso) کی جانشین بنی تھی۔ پروشیائی اب بھی فرانس میں مقیم تھے۔ موسیو Delalot ایک معزز آدمی تھا۔ حلال زادگی نے Pleignier کے، Carbonneau اور Tolleron کے ہاتھ کاٹنے، اس کے بعد سر کاٹنے سے اپنے آپ کو مستحکم کیا تھا۔ شہزادے de Talleyrand، گرانڈ چیمبرلین، اور ایبے لوئی، وزیر خزانہ جیسے جب انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا؛ دونوں نے 14 جولائی 1790ء میں Champ de Mars میں عبادت کا جشن منایا؛ Talleyrand نے دعا کی تھی، لوئی نے مہتمم نیاز و صدقات کی خدمات انجام دی تھیں۔ 1817ء میں اسی Champ de Mars کی بغلی گلیوں میں دو بڑے چوبی سلنڈر نیلے رنگ کے پینٹ کیے ہوئے بارش میں پڑے، گھاس کے درمیان گلتے سڑتے رہے تھے، فضا میں چیلیں اور شہد کی مکھیاں اُڑتی رہی ہوں گی جن سے زینت کا سامان گرتا رہا ہوگا۔ یہ وہی ستون تھے جنھوں نے دو برس قبل Champ de Mai میں شہنشاہ کا پلیٹ فارم برقرار رکھا تھا۔ یہ آسٹریا والوں کے پڑاؤ کی آگ سے جھلسنے کی وجہ سے کہیں کہیں سیاہ ہو گئے تھے، جنھوں نے Gros- Caillou کے قریب اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ دو یا تین ان پڑاؤ کی آگ میں غائب بھی ہو گئے تھے، اور انھوں نے شہنشاہی فوج کے بڑے بڑے ہاتھوں کو گرم کیا تھا۔ مئی کے میلے میں یہ خصوصیت تھی کہ یہ جون کے مہینے میں منعقد ہوا تھا۔ اس برس یعنی 1817ء میں دو چیزیں بہت مقبول ہوئی تھیں: Voltaire-Touquet اور la Charter کی ناس کی ڈبیا۔ پیرس کی سب سے تازہ خبر تھی Dautun کا جُرم، جس نے پھول بازار کے فوارے میں اپنے بھائی کا [کٹا ہوا] سر ڈال دیا تھا۔

بدقسمت جنگی جہاز میڈوسا کے بارے میں، جس کا کام Chaumareix کی بدنامی کے ساتھ اور Gericault کی شان و شوکت کے ساتھ دیکھ بھال کرنا تھا، خبر نہ ملنے کے باعث بحریہ کا شعبہ پریشان ہونے لگا تھا۔ کرنل Selves سلیمان پاشا بننے کے لیے مصر جا رہا تھا۔ La Harpe اسٹریٹ پر واقع Thermes کا محل شراب کی دُکان کا کام کر رہا تھا۔ ہوٹل de Cluny کے ہشت پہلو مینار کے پلیٹ فارم پر، تختوں سے بنا سائبان جو لوئی شانزدہم کے ماتحت کام کرنے والے بحری ستارہ شناس Messier کے لیے رصدگاہ کے فرائض انجام دیتا تھا، نظر نہیں آرہا تھا۔ Duras کی بیگم [ڈچس] نے نیلے رنگ کے ساٹن سے مزین اپنی غیر شائع شدہ Ourika تین یا چار دوستوں کو پڑھ کر سنائی تھی۔ Louvre کے عجائب گھر سے [نپولین کے نام کا پہلا حرف N] مٹا دیا گیا تھا۔ Austerlit کا پُل بیٹھ گیا تھا، اور اس کو باغ شاہی کا نام دے دیا گیا تھا۔ یہ دُہرا چیستاں تھا، جس میں Austerlitz کے پُل اور Jardin des

Plantes کو ایک ساتھ پوشیدہ کردیا گیا تھا۔ جب لوئی ہشت دہم اپنی انگلی کے ناخن کی نوک سے ہوریس (Horace) کی شرح لکھ رہا تھا جس میں ہیرو جو شہنشاہ بن چکے تھے، اور لکڑی سے جوتے بنانے والے فرانس کے ولی عہد بن چکے تھے، اسے دو پریشانیاں لاحق تھیں — نپولین اور Mathurin Bruneau۔ فرانسیسی اکادمی نے اپنی بیش بہا شے The Happiness کے عوض دے دی تھی، جو مطالعے سے حاصل کی گئی تھی۔ موسیو Bellart خوش بیانی کر رہا تھا۔ اس کے سایے میں Broe کے ایڈووکیٹ جنرل کے اکھوے پھوٹتے نظر آ رہے تھے جو Paul-Louis Courier کی طنزیہ گفتگو کے لیے وقف تھا۔ وہاں کچھ دنوں کے لیے Marchangy نقلی Chateaubriand [فرانسیسی ادب میں رومانویت کا سرخیل] بنا دیا گیا تھا، جب تک کہ d'Arlincourt کا Marchangy آنہیں گیا تھا۔ Claire d'Albe اور Malek-Adel شاہکار رہتے؛ مادام Cottin اس عہد کی سب سے اہم ادیب مانی گئی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ نے بونا پارٹ جیسے تعلیماتی فرد کا نام اپنے ارکان کی فہرست سے حذف کر دیا تھا۔ ایک شاہی فرمان نے Angouleme میں ایک بحری اسکول میں تعمیر کروا دیا تھا؛ Angouleme کے ڈیوک پر، جو لارڈ ایڈمرل تھا، صاف ظاہر تھا کہ Angouleme شہر میں سمندر کی بندرگاہ بننے کی تمام خصوصیات موجود تھیں، ورنہ شاہی اصول پامال ہو جاتے۔ وزیروں کی کونسل میں اس سوال پر اشتعال پھیل گیا تھا کہ کیا ایسی گل کاریوں جو slack-rope کی نمائندگی کرتی ہیں، جو Franconi کے اشتہارات کی زینت بنتی ہیں، برداشت کیا جائے۔ Agnese کا، کتابی چہرے والا مصنف، جس کے رخسار پر ایک مسا تھا، موسیو Paer جو اچھا آدمی تھا، Rue Ville l'Eveque کی مارکوئی میں منعقد ہونے والے کنسرٹ کو ڈائرکٹ کرتا تھا۔ ساری نوجوان لڑکیاں Edmond Geraud کے الفاظ کے ساتھ Saint-Avelle کے زاہد کا ثنائی گیت گاتی تھیں۔ مادام d'Aulnoy کی پری کہانی آئینے میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ کیفے Valois کے مقابل، جس نے Bourbons [شراب کی فروخت] برقرار رکھی تھی، شہنشاہ کے لیے کیفے Lemblin بنا دیا گیا تھا۔ Berri کے ڈیوک نے، Louvel جس پر نگاہ رکھتا تھا، سسلی کی شہزادی سے شادی کر لی تھی۔ ایک سال قبل مادام de Stael کا انتقال ہو گیا تھا۔ باڈی گارڈ نے میڈموزیل Mars سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ سارے عالی شان اخبار چھوٹے تھے۔ ان کے پیکر محدود کر دیے گئے تھے مگر ان کی آزادی عظیم تھی۔ Constitutionnel اب constitutional لکھا جانے لگا تھا۔ La Minerve، Chateaubriand کو

Chateaubriant کہنے لگا تھا۔ اس عظیم ادیب پر عام لوگوں کو ہنسنے کا موقع مل گیا تھا۔ ان رسائل میں جو خود فروخت ہوتے تھے، ذاتی منفعت حاصل کرنے والے صحافی 1815ء کے جلاوطن افراد کی تضحیک کرتے تھے۔ ڈیوڈ میں کوئی لیاقت نہیں رہ گئی تھی، Arnault میں مزاح نہیں رہ گیا تھا۔ Soult نے کوئی جنگ نہیں جیتی تھی؛ یہ سچ ہے کہ نپولین میں جوہرِ قابل باقی نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھا کہ کسی جلاوطن کو بھیجی ہوئی ڈاک مشکل سے پہنچتی تھی، کہ پولیس نے انھیں روکنا اپنی مذہبی فریضہ بنا لیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی: ڈیکارٹ نے اپنی جلاوطنی میں اس کی شکایت کی تھی۔ ڈیوڈ نے بلجیم کے رسائل میں خطوط نہ ملنے پر ناخوشی کا اظہار کیا تو شاہ پرستوں نے اس موقعے پر ادیب کا مذاق اُڑایا تھا جس بات نے دونوں افراد کو پاتال سے بھی زیادہ الگ کر دیا تھا؛ شاہ کُش کہنا، یا ووٹر کہنا؛ دشمن کہنا یا اتحادی کہنا؛ نپولین کہنا، یا بوناپارٹ کہنا۔ تمام سمجھ دار لوگ مانتے تھے کہ شاہ لوئی ہشت دہم نے، جسے "فرمان کا لافانی مصنف" کا خطاب دیا گیا تھا ہمیشہ کے لیے انقلاب کے عہد کو بند کر دیا ہے۔ Pont-Neuf کے پلیٹ فارم کے پائے پر جو ہنری چہارم کے مجسمے کے انتظار میں تھا لفظ Redivivus کندہ کر دیا گیا تھا۔ Therese اسٹریٹ نمبر 4 میں موسیو Piet شاہی کو مستحکم کرنے کے لیے بنائی جانے والی نجی اسمبلی کے فرمان کا مسودہ تیار کر رہا تھا۔ دائیں بازو کے رہنما گمبھیر اندازوں پر کہتے تھے، "ہمیں Bacot کو لکھنا چاہیے"۔ موسیو Canuel، O'Mahoney اور De Chappedelaine، کسی حد تک موسیو کی منظوری کے خاکے تیار کر رہے تھے جو بعد میں کنارِ دریا کی "Bord de l'Eau کی سازش" بننے والا تھا۔ L'Epingle Noire اپنے علاقے میں پہلے ہی سے سازش کر رہا تھا۔ Delaverderie، Trogoff. M. Decazes سے مشورہ کر رہا تھا جو کسی حد تک آزاد خیال تھا۔ Chateaubriand ہر صبح، 27 Rue Saint-Dominique کی اپنی کھڑکی میں موزے والا پتلون اور چپل پہنے، بھورے بالوں پر مداسی رومال باندھے، آئینے پر جمی آنکھیں، سامنے میز پر دنداں ساز کے سارے اوزار، اپنے دانت صاف کرتا جو بہت خوب صورت تھے، اس دوران وہ اپنی سیکریٹری Pilorge کو فرمان کے مطابق The Monarchy لکھاتا رہا۔ تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے تنقید نے Lafon کو Talma پر فوقیت دی۔ موسیو de Feletez نے A کے نام سے خود دستخط کیے؛ موسیو ہوف مان نے Z کے نام سے خود دستخط کیے تھے۔ Charles Nodier نے Therese Aubert. لکھا۔ طلاق منسوخ کر دی گئی تھی۔ Lyceums خود کو کالج کہنے لگے۔ کالج والے اپنے کالر پر گلِ لالہ کے نشان لگائے، روم کے

بادشاہ کے حوالے سے ایک دوسرے سے لڑنے لگے تھے۔ شتیو کی نجی پولیس نے شہزادی مادام سے Duc d'Orleans کی ہر طرف لگی ہوئی تصویر پر ناراضی کا اظہار کر دیا تھا Duc d'Orleans جو موسیو Duc de Berri کی وردی کے مقابلے میں ہُسار کے کرنل جنرل کی وردی میں زیادہ اچھے لگتے تھے۔ پیرس شہر کی انتظامیہ معذوروں کے گنبد پر اپنے خرچ سے سونے کا ملمع کروا رہی تھی۔ ذمے دار لوگ اپنے آپ سوال کر رہے تھے کہ موسیو de Trinquelague ایسے موقعے پر کیا کریں گے؟ موسیو Clausel de Montals کا موسیو Clausel de Coussergues سے غوطہ مارنے والوں کے معاملے پر اختلاف ہو گیا تھا؛ مسخرہ Picard جس کا تعلق اکادمی سے تھا، جس میں مسخرے Moliere کو شامل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، اور اگر Odeon میں The Two Philiberts کھیلا جاتا، جس کی پیشانی کے کچھ الفاظ مٹانے کے بعد اب بھی "ملکہ کا تھیئٹر" پڑھا جاتا تھا۔ لوگوں نے Cugnet de Montarlot کی موافقت اور مخالفت دونوں میں حصہ لیا تھا۔ Fabvier باغی تھا؛ Bavoux انقلابی تھا۔ روشن خیال Pelicier نے مندرجہ ذیل عنوان سے والٹیئر کا ایک ایڈیشن شائع کیا تھا 'فرانسیسی اکادمی میں والٹیئر کی تحریریں'۔ باکمال ایڈیٹر نے کہا تھا، "یہ گاہکوں کے لیے باعثِ کشش ہوگی۔" عام رائے یہ تھی کہ موسیو چارلس لاکسن اس صدی کا جوہر قابل ہوگا؛ رشک اس کو گھن کی طرح کھانے لگا تھا، جو اس کی بلندی کی نشانی تھی؛ اور اس کے بارے میں یہ مصرع لکھا گیا تھا:

"[اس پر افسوس نہیں کہ] لاکسن نے چوری کی، خوشی یہ ہے کہ اس کے پنجے تو ہیں۔"

چوں کہ کارڈینل Fesch نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا، Amasie کے آرچ بشپ موسیو de Pins نے Lyons کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ Dappes کی وادی کے بارے میں سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے، بین لڑائی کیپٹن کی یادداشتوں کی وجہ سے ہوئی تھی جو بعد میں جنرل Dufour بن گیا تھا۔ سینٹ سیمان اپنا پُرشکوہ خواب تعمیر کر رہا تھا، جس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اکیڈیمی آف سائنس میں ایک نامی گرامی Fourier تھا جسے آنے والی نسلوں نے فراموش کر دیا ہے؛ اور کسی کھوپڑی میں ایک مبہم Fourier ہے مستقبل جسے واپس بلا لے گا۔ لارڈ بائرن نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا تھا؛ Millevoye کی ایک نظم پر لکھے ایک مضمون نے 'ایک لارڈ بیرن' کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ ڈیوڈ d'Angers سنگِ مرمر پر کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایبے Caron، Feuillantines کی بند گلیوں میں مدرسے والوں کے ایک نجی جلسے میں ایک اجنبی پادری Felicite-Robert کی توصیف کر رہا تھا جو بعد میں Lamennais بن گیا

تھا۔ایک شے جو دریائے Seine ایک ٹھٹے کے پیرنے کی آواز کے ساتھ دھواں بھی دے رہی تھی اور کھٹ کھٹ بھی کر رہی تھی، اوجھل ہوئی اور Tullerie کی کھڑکیوں کے نیچے واپس آئی تھی، Pont Royal سے Pont Louis XV تک: یہ ایک قسم کی میکانزم تھی، جو کسی کام کی نہیں تھی، ایک قسم کا کھلونا، کسی خواب دیکھنے والے موجد کی ایجاد، ایک یوٹوپیا ——ایک دخانی کشتی تھی۔ پیرس والے اس بے کار شے کو لاپروائی سے دیکھ رہے تھے۔موسیو Vaubianc de بغاوت کے ذریعے انسٹی ٹیوٹ کا مصلح، ممتاز ماہرِ تعلیم ،حربی محکمہ جات کا، ارکان کے گروہ بنانے والا، جس کے تشکیل کے بعد وہ خود اس کا حصہ بننے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی پارسائی کے باعث Faubourg Saint-Germain اور de Marsan کی خواہش تھی کہ موسیو Delaveau کو پولیس کا حاکم بنا دیا جائے۔اسکول آف میڈیسن کے بیضوی تھیٹر میں یسوع مسیح کی الوہیت کے موضوع پر Dupuytren اور Recamier آپس میں الجھ پڑے اور ایک دوسرے کو مکوں سے دھمکانے لگے تھے۔ابتدائے تخلیق اور فطرت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ Cuvier نے سنگوارے (fossils) اور متون کے درمیان موافقت کرنے اور ہاتھی جیسی مخلوق کے ذریعے موسیٰ کی چاپلوسی کرنے کے متعصبانہ ردِ عمل کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔

Parmentier کے قابلِ تعریف کاشت کرنے والے موسیو Francois de Neufchateau نے ہزار کوشش کی کہ آلو کو parmentiere کہا جائے مگر اس میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ایبے گریگوری، سابق بشپ، سابق روایت پرست، سابق سینیٹر، شاہ پرست مناظرہ کاروں میں "بدنام گریگوری" کی حالت تک پہنچ گیا تھا۔ جس کے اندازِ تقریر اور لفظیات کو ہم نے استعمال کیا تو موسیو Royer Collard کی طرف سے ہماری مذمت کی گئی تھی۔ Pont de Jena کی تیسری محراب کے نیچے، وہ پتھر جس کے ذریعے، دو برس قبل، بلوشر نے پُل اڑانے کے لیے ایک سوراخ بنایا، اور پکڑا گیا تھا، وہ سوراخ اپنی سفیدی کی وجہ سے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔انصاف نے اپنی وکالت داری میں ایک آدمی کو طلب کیا تھا جس نے Comte d'Artois کو نوترے ڈیم میں داخل ہوتے دیکھ کر بلند آواز میں کہا تھا، "Sapristi، میرے لیے وہ وقت کتنا قابلِ افسوس تھا جب میں نے بونا پارٹ اور Talma کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے Bel Sauvage میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔" یہ کھلا اظہارِ بغاوت تھا۔ چھ ماہ کی قید کے قابل۔ غداری برہنہ ہو گئی تھی؛ ہنگامِ جنگ جو دشمن سے جا ملے تھے انھوں نے بدلہ لینے کے جذبے کو راز نہیں رکھا تھا، اور کھلے عام اکڑ اکڑ کر چلے؛ Ligny اور

Quatre-Bras کے مغرورین اپنے کمینے پن کی بے شرمی کے ساتھ شاہی سے اپنے وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

یہ ہے روداد 1817 کی جو اپنے تمام تر الجھاؤ کے ساتھ تیر رہی تھی اور اب بھلا دی گئی ہے۔ تاریخ تقریباً تمام تفصیلات کو بھلا دیتی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں کرتی؛ ابد اس پر غالب آجائے گا۔ پھر بھی، یہ تفصیلات جن کو غلط طور پر معمولی کہا جاتا ہے — نہ انسانیات میں کوئی شے معمولی نہیں ہوا کرتی، نہ نباتیات میں کوئی چھوٹی سی پتی — ہمیشہ کام آتی ہیں۔ یہ برسوں کی قیافہ شناسی ہی ہے جس سے صدیوں کی قیافہ شناسی ترتیب پاتی ہے۔ 1817ء کے سال میں پیرس کے چار نوجوانوں نے ایک "ایک اچھا مزاحیہ ناٹک کھیلا تھا۔"

۞

چار جوڑے

یہ چار پیرسی تھے، جن میں ایک Toulouse کا تھا، دوسرا Limoges سے آیا تھا، تیسرا Cahors کا، اور چوتھا Montauban کا؛ مگر یہ چاروں طالب علم تھے؛ جب کسی کو طالب علم کہا جاتا ہے اس کا مطلب پیرسی (پیرس کا باسی) ہوتا ہے۔ یعنی پیرس میں تعلیم پانے والا: پیرس میں تعلیم پانا پیرس میں پیدا ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔

یہ نوجوان غیر اہم لوگ تھے؛ ہر شخص نے ایسے چہرے دیکھے ہوں گے؛ انسانیت کے یہ چار نمونے انکل سے چنے گئے؛ نہ اچھے اور نہ بُرے، نہ عقل مند اور نہ جاہل، نہ جوہر قابل اور نہ احمق؛ ان میں برسوں کے باعث وجیہ تھے جسے جوانی کی بہار کہا جاتا ہے۔ یہ اس عہد کے چار آسکر تھے؛ آرتھر ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔ رومانس نے چیخ کر کہا، اس کے لیے عربی بخور جلاؤ۔ آسکر آگے بڑھتا ہے۔ آسکر، میں اسے ضرور دیکھوں گا! لوگ حال ہی میں 'آسیان' [Ossian — شاعر میکفرسن کی نظم کا بیان کرنے والا] سے ابھرے تھے؛ [اس کی لطافت] اسکینڈی نیویائی اور کیلی ڈونیائی تھی؛ خالص انگریزی انداز اس پر بعد میں طاری ہوا تھا، اور آرتھروں کا پہلا وِلنگٹن حال ہی میں واٹر لو کی جنگ جیت چکا تھا۔

ان چاروں آسکروں کے نام تھے: Toulouse والے کا، فیلیکس تولومیے (Felix Tholomyes)؛ Cahors والے کا، لیستولیے (Listolier)؛ اس کے بعد والا Limoges کا، فامالیا (Fameuil)؛ آخری Montauban کا، بلاش ویل (Blachevelle) تھا۔ فطری طور پر سب کی اپنی اپنی داشتائیں تھیں۔ بلاش ویل کی داشتہ تھی فیورٹ (Favourite)، اس کا یہ نام اس وجہ سے تھا کہ وہ انگلستان میں رہ چکی تھی۔ لیستولیے، ڈیلیا (Dahlia) کا دیوانہ

تھا جس نے ایک پھول کے نام کی عرفیت اپنائی تھی؛ فامالیا، زفانایا (Zephine) کا پرستار تھا، زفانایا جوزفین کے نام کا خلاصہ ہے؛ تولومیے کے پاس فانتین (Fantine) تھی جس کو، اسے حسین سنہرے رنگ کے بالوں کی وجہ سے بلانڈ کہا جاتا تھا۔

فیوریت، ڈیلیا، زفانایا اور فانتین چار مسرت انگیز جوان عورتیں تھیں، مہکتی، چہکتی، اب بھی کام کرنے والی، یعنی سوئی تاگے سے پوری طلاق یافتہ نہیں؛ کسی حد تک سازشوں سے پریشان، مگر اپنے چہروں پر مشقت کی طمانیت سجائے، اپنے اندر دیانت داری کے وہ پھول کھلائے جو عورت کو پہلی خزاں سے بچا رکھتے ہیں۔ ان چاروں میں سے ایک کو نوجوان کہا جاتا تھا، اس لیے کہ وہ ان سب میں چھوٹی تھی، اور ایک کو بڑی کہا جاتا تھا؛ بڑی کی عمر تیئس برس تھی۔ اگر چھپایا نہ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پہلی تین، بلانڈ فانتین کے مقابلے میں، زیادہ تجربے کار، زیادہ بے پروا اور زیادہ آزادی یافتہ تھیں، جو ابھی اپنے ابتدائی سرابوں میں تھی۔

ڈیلیا، زفانایا اور بالخصوص فیوریت کچھ زیادہ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ ان سب کی رومانیات میں ایک سے زیادہ قسطیں رہی ہوں گی، اگرچہ مشکل سے ہی شروع ہوئی ہوں گی؛ اور وہ عاشق جس نے پہلے باب میں اپنا نام ایڈولف رکھا تھا، دوسرے باب میں الفانسے نکلا، تیسرے میں گستاف۔ افلاس اور نازنخرے دو مہلک مشیر ہوتے ہیں؛ ایک سرزنش کرتا ہے دوسرا چاپلوسی، اور یہ دونوں عوام کی خوب صورت بیٹیوں کے کان میں سرگوشیوں کرتے رہتے ہیں، ایک اس کان میں تو دوسرا اُس کان میں۔ اور یہ غیر محفوظ روحیں سنتی رہتی ہے۔ اور بے داغ اور ناقابلِ رسائی اشیا کی چمک دمک سے مرعوب ہو جاتی ہیں۔ افسوس! اور کیا ہوتا اگر یہ Jungfrau [جوان عورتیں] بھوکی ہوتیں؟

انگلستان میں رہنے کی وجہ سے ڈیلیا اور زفانایا اس کی تعریف کرتی تھیں۔ اپنے اوائلِ زندگی میں اس کا اپنا بھی انتظام تھا۔ اس کا باپ ماضی کا غیر شادی شدہ پروفیسر ریاضیات کا تھا، ایک ظالم آدمی اور شیخی باز، جو اپنی عمر کے باوجود پڑھانے جایا کرتا تھا۔ یہ پروفیسر جب نوجوان تھا، اس نے ایک دن دیکھا کہ ایک گھریلو ملازمہ کا بالاپوش جنگلے میں اُٹک گیا ہے؛ اس واقعے کے نتیجے میں اس سے محبت کرنے لگا۔ اس محبت کا نتیجہ فیوریت تھی۔ وہ اپنے باپ سے ملتی رہتی تھی، اور وہ اس کے سامنے سر جھکایا کرتا تھا۔ ایک دن ایک بوڑھی عابدہ عورت فیوریت کے فلیٹ میں داخل ہوئی، اور اس سے کہا، ”تم مجھے نہیں جانتیں میدموزیل؟“ ”نہیں۔“ ”میں تمھاری ماں ہوں۔“ اس کے بعد بوڑھی عورت نے الماری کھولی، کھایا پیا۔ اس کے پاس ایک گدا تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ یہ مخالف اور دین دار بوڑھی ماں فیوریت سے کبھی نہیں بولتی، گھنٹوں ایک لفظ بھی ادا کیے بغیر بیٹھی

رہتی، ناشتا کرتی، کھانا کھاتی، اور ہمسائے کے گھر میں گپ شپ کے لیے چلی جاتی تھی، جہاں وہ اپنی بیٹی کی برائی کرتی۔

وہ دراصل اس کے کے گلابی ناخن تھے جو بہت خوب صورت تھے، جنھوں نے ڈیلیا کو راستو لیے سے ملایا تھا، شاید اوروں سے بھی۔ وہ ایسے ناخنوں کے ساتھ کام کیسے کرتی تھی؟ وہ جو نیکو کار رہنا چاہتی ہو اس کو اپنے ہاتھوں پر ترس نہیں کھانا چاہیے۔ اور، زفانایا؛ اس نے فامالیا کو اپنے اوباش اور نازبرداری کے انداز میں "جی جناب" کہنے سے رجھا لیا تھا۔

یہ جوان مرد کامریڈ تھے؛ جوان لڑکیاں دوست تھیں۔ ایسی محبتوں میں ہمیشہ ایسی ہی دوستیاں ہوتی ہیں۔

نیکی اور فلسفہ دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں؛ ان کا ثبوت یہ ہے کہ ان بے قاعدہ گھروں میں تمام ضروری سہولیات مہیا کرنے کے بعد، فیوریٹ، زفانایا اور ڈیلیا فلسفیانہ جوان عورتیں تھیں، جب کہ فانتین ایک نیک طینت لڑکی تھی۔

ٹھیک ہے! کوئی پوچھے گا: اور تولومیے؟ سالومن جواب میں کہے گا کہ محبت عقل مندی کا حصہ ہوتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو اتنا ہی کہنے تک محدود رکھیں گے کہ فانتین کی محبت پہلی محبت تھی، ایک اکیلی محبت، ایک باوفا محبت۔

اس چاروں میں وہی ایک تھی جسے 'تو' کہہ کر مخاطب نہیں کیا جاتا تھا۔

فانتین ان اشیا میں سے تھی جو، بقول شخصے لوگوں کی بے کار اشیا سے پھولتی ہیں۔ حالاں کہ وہ سماج کے سایے کی اتھاہ گہرائیوں میں سے ابھری تھی، اس کی پیشانی پر نامعلوم اور بے نام لکھا تھا۔ وہ M. sur M میں پیدا ہوئی تھی۔ کن والدین سے؟ کون بتا سکتا ہے؟ اس نے اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کو فانتین کہا جاتا تھا۔ فانتین کیوں؟ اس کا کبھی کوئی نام نہیں تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت ڈائریکٹری قائم تھی۔ اس کا نہ کوئی خاندانی نام تھا نہ کوئی خاندان؛ نہ بپتسمے کا نام؛ کلیسا کا بھی نہیں۔ اس کو پہلا نام کسی گزرنے والے نے دیا تھا، جو اسے ملا تھا، جب وہ چھوٹی سی بچی تھی، ننگے پیر گلی میں بھاگ رہی تھی۔ اس کو یہ نام اس وقت ملا تھا جب بادلوں سے گرنے والا پانی اس کے ابرو پر گرا تھا۔ یہ انسانی مخلوق اپنی زندگی میں اسی طرح داخل ہوئی تھی۔ دس برس کی عمر میں فانتین شہر چھوڑ کر چلی گئی اور پڑوس کے کسی کسان کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں "اپنی تقدیر بنانے" پیرس آئی تھی۔ فانتین خوب صورت تھی اور جب تک ممکن ہوا پاک باز رہی۔ وہ بہت پیاری، سنہرے بالوں اور خوب صورت دانتوں والی لڑکی تھی۔ اس

کے پاس اپنے جہیز کے لیے سونا اور موتی دونوں تھے؛ مگر اس کا سونا اس کے سر پر تھا، اور اس کے موتی اس کے منہ میں۔

اس نے زندہ رہنے کے لیے کام کیا تھا؛ اور اب بھی اپنی زندگی کی خاطر — اپنے دل کے لیے اور اپنی بھوک کے لیے — جس سے محبت تھی۔

وہ تولومیے سے محبت کرتی تھی۔

مرد کے لیے آشنائی؛ عورت کے لیے ہوائے نفس۔ لاطینی علاقہ جو طالب علم لڑکوں اور مزدور لڑکیوں سے بھرا تھا، اپنے خوابوں کی ابتدا دیکھ رہا تھا۔ فانتین بہت دنوں تک Pantheon کی پہاڑیوں کی بھول بھلیوں میں تولومیے سے لپٹی رہی، جہاں کتنے سارے قسمت آزما حمائل ہوتے ہیں اور الگ ہوتے رہتے ہیں، مگر اس طرح کہ وہ مسلسل ایک دوسرے سے ملتے رہیں۔ گریز کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے جو تلاش سے مشابہ ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دیہاتی گیت گایا گیا۔ بلاش ویل، لیستو لیے، اور فامالیا نے ایک قسم کا گروپ بنایا تولومیے جس کا سردار بنا۔ وہی تھا جس میں فراست تھی۔

تولومیے سب سے پرانا طالب علم تھا؛ امیر کبیر تھا؛ چار ہزار فرانک اس کی آمدنی تھی؛ چار ہزار فرانک! سال جینوویے پر ایک شان دار واقعہ رسوائی ہوا۔ تولومیے تیس برس کا بد صحت، چلتا پرزہ تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ منہ میں دانت نہیں رہ گئے تھے، اس کے سر میں گنج کی ابتدا ہو گئی تھی، جس کے لیے خود اس نے اداسی سے کہا تھا، تیس برس میں کھوپڑی، چالیس برس میں گھٹنے۔ اس کا ہاضمہ اوسط درجے کا تھا، اس کی ایک آنکھ سے پانی بہتا رہا تھا۔ مگر جوانی کی رخصت کے تناسب سے اس کی خوش دلی کی آگ زیادہ تھی؛ دانت کی جگہ مسخرے پن نے لے لی تھی، بال کی جگہ مسرتوں نے گھیر لی تھی، صحت کی جگہ طنز و استہزا سے بھر گئی تھی، روتی آنکھ مسلسل ہنستی رہتی تھی۔ خستہ حال تھا مگر پھولتا رہتا تھا۔ وقت سے بہت پہلے اپنا سامان باندھتی جوانی اپنی پسپائی کو بہترین انداز میں پسپا کر رہی تھی، قہقہے سے بھرپور، اس میں سوائے آگ کے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ Vaudeville میں اس کی ایک نظم مسترد کر دی گئی تھی۔ کبھی کبھی کچھ نئے شعر لکھتا تھا۔ ان کے علاوہ، وہ ہر شے پر آخری درجے تک شبہ کرتا تھا، جو کسی کم زور کی نظر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس طرح، طنز آمیز اور گنج ہوتے ہوئے بھی وہ رہنما تھا۔ آئرن انگریزی کا ایک لفظ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طنز و استہزا اسی سے نکلے الفاظ ہوں؟

ایک دن تولومیے ان تینوں کو ایک طرف لے گیا، اور کسی ندائے غیبی کی طرح ان سے کہا:

''فاسٹینس، ڈیلیا، زفانایا اور فیوریٹ ہم کو ایک برس سے کسی حیرانی سے دوچار کرنے کے لیے تنگ کر رہی ہیں۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ہم کریں گے۔ وہ ہمیشہ ہم سے اسی کی باتیں کرتی رہتی ہیں بالخصوص مجھ سے، اسی طرح جیسے نیپلس کی عورتیں Saint Januarius سے چلا کر کہتی رہتی ہیں 'اے پیلے چہرے والے اپنے معجزے دکھاؤ' اسی طرح ہماری حسینائیں متواتر مجھ سے کہتی رہتی ہیں 'تولومیے تم کب ہمیں حیران کرو گے؟' ساتھ ہی ہمارے والدین ہمیں لکھتے رہتے ہیں۔ دونوں طرف سے دباؤ ہوتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ وقت اب آ گیا ہے۔ کہ ہمیں اس سوال پر بات کرنی چاہیے۔''

چناں چہ تولومیے نے اپنی آواز دھیمی کر لی اور کچھ ایسی خوش گوار باتیں کیں کہ ان چاروں کے چہروں پر ایک ہی وقت میں وسیع اور پُر جوش مسکراہٹ پھیل گئی، اور بلاش ویل نے زور سے کہا ''یہ بھی ایک خیال ہے۔''

ایک دھواں بھرا بار روم حاضر تھا؛ وہ داخل ہوئے اور ان کی بقیہ بات چیت سایے میں گم ہو گئی۔

ان اندھیروں کا نتیجہ ایک چکا چوند کر دینے والی پارٹی تھی جو اگلے اتوار کو ہوئی؛ جس میں چار جوان آدمیوں نے چار نوجوان لڑکیوں کو دعوت دی تھی۔

❂

چار اور چار

آج کل یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ پینتالیس برس قبل طلبا کا اور مزدور لڑکیوں کا ملک میں تفریح کے لیے جانا کیسا ہوتا ہوگا۔ پیرس کے مضافات اب ویسے نہیں رہے؛ پچھلے پچاس برسوں میں پیرس پر محیط زندگی کی قیافہ شناسی مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے؛ جہاں کوئل کوکتی تھی، وہاں اب ریل گاڑی [سیٹی بجاتی] ہے؛ جہاں نگہبان کشتی ہوا کرتی تھی، اب وہاں دخانی جہاز ہوتے ہیں۔ لوگ آج کل Fecamp کیمون کی اسی طرح باتیں کرتے ہیں جیسے اُن دنوں سال کلاؤڈ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ 1862ء کا پیرس ایسا شہر ہے جس کا نواح اب فرانس ہے۔

چاروں جوڑوں نے نہایت ذمے داری سے ملک کی تمام حماقتوں کا جائزہ لیا۔ چھٹی کے دن شروع ہو رہے تھے، اور وہ تابستان کا ایک گرم اور روشن دن تھا۔ اس کے پچھلے دن، فیوریٹ نے، کہ صرف وہی لکھنا جانتی تھی، چاروں کی طرف سے مندرجہ ذیل جملہ لکھا تھا۔ ”خوش وقتی سے نکلنے کا یہ اچھا وقت ہے۔“ یہی وجہ تھی کہ وہ پانچ بجے صبح اٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ سال کلاؤڈ گئے، خشک آبشار کی طرف دیکھا اور چیخ کر کہا، ”پانی ہوتو یہ کتنا خوب صورت ہوتا ہوگا۔“ انھوں نے Tete-Noir میں ناشتا کیا، اس وقت جہاں [ڈاکٹر نے پہلی بار مارفین سے کسی کو قتل کیا تھا] Castaing نہیں تھا؛ کچھ دیر وہ بڑے فوارے کے قریب پیڑوں کے جھنڈ کے نیچے رنگ چھڑکنے کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے رہے؛ Diogene کی لالٹین پر چڑھے، Pont de Sevres کے قمار خانے میں ناریل کے کیک جیتنے کا کھیل کھیلے، Pateaux سے اپنے گل دستے اٹھائے، Neuilly میں نرگل سے بنی بانسریاں خریدیں، سیب کے میوے بھرے سموسے کھائے، اور بہت خوش ہوئے۔

لڑکیاں ادھر اُدھر بھاگیں اور پنجرے سے آزاد ہونے والے منچلے پرندوں کی طرح چہچہائیں۔ وقتاً فوقتاً نوجوانوں نے ایک دوسرے کو تھپکیوں سے نوازا۔ زندگی کا نشۂ سحر گاہی! قابلِ پرستش برس۔ اُڑنے والے کیڑوں کے پر تھرتھراتے ہیں۔ اور آپ جو کچھ بھی ہوں، کیا آپ کو کچھ یاد نہیں؟ کیا آپ نے کبھی جھاڑی سے بھرے میدانوں میں مٹرگشتی کی ہے، اور پیچھے آنے والوں کے سروں کے لیے جھاڑیوں کے شاخیں ہٹائی ہیں؟ کیا آپ کبھی اپنی معشوق کا ہاتھ تھامے، ہنستے کھیلتے، بارش سے بھیگی ڈھلانوں پر پھسلے ہیں، جو چیخ رہی ہو، "ارے میرے نئے جوتے! ان کی کیا حالت ہو گئی ہے؟"

اتنا کہنا ضروری ہے کہ اس زندہ دل پارٹی کی راہ میں کوئی کمی تھی تو صرف بارش کی، حالاں کہ فیوریٹ نے، چلتے وقت حکمانہ اور مادری لہجے میں کہا تھا: "گِگ ڈنڈیوں پر گھونگھے رینگ رہے ہیں — پیارے بچو، بارش کے آثار ہیں۔"

چاروں خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ ایک قدیم کلاسیکی شاعر نے، جو اپنے زمانے میں مشہور تھا، اچھا آدمی تھا جو اپنے ایک دوست le Chevalier de Labouisse کے ساتھ سال کلاؤڈ کے شاہ بلوط کے درختوں کے نیچے تفریح کر رہا تھا، ان جوانوں کو صبح دس بجے گزرتے دیکھا تو کہا تھا، "ان میں ایک فالتو ہے"، جب اس کے دل میں اچانک Graces کا خیال آ گیا تھا [اس کا اشارہ یونانی اور رومن میتھالوجی کی طرف تھا جس میں تین بہنوں Aglaia، Euphrosyne اور Thalia کا ذکر ہے جو دل موہ لینے والے حسن و جمال کی دیویاں مانی جاتی تھیں]۔ بلاش ویل کی دوست، فیوریٹ وہی جس کی عمر تئیس برس تھی، پیڑوں کی بڑی بڑی شاخوں کے سامنے اور نیچے دوڑی، گڑھے پھلانگے، مجنونانہ انداز میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپی، اور جنگل کی نوجوان دیوی کی طرح اس نے اس کھیل کود کی سالاری کی۔ زفاینا اور ڈیلیا، جو اتفاق سے ایسے حسن کی مالک تھیں کہ جب وہ ایک ساتھ ہوتیں تو ایک دوسرے سے الگ ہوتیں، اور جب الگ ہوتیں تو ایک دوسرے کو مکمل کر دیتیں؛ وہ کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئیں، دوستی کے باعث نہیں، جبلّی نازنخرے کی بنا پر، اور ایک دوسرے سے چمٹ کر انگریزی انداز اختیار کر لیتیں؛ ان کی پہلی یادیں اب ظاہر ہو رہی تھیں، عورتوں پر افسردگی واضح ہو رہی تھی، اسی طرح جیسے بعد میں مردوں پر بائرنیت واضح ہو رہی تھی؛ اور صنفِ نازک کے گیسو غم ناکی سے سرنگوں ہونے لگے تھے۔ زفاینا اور ڈیلیا نے اپنے بال رول پر چڑھا لیے تھے۔ لسٹو لیے اور فامالیا نے جو اپنے پروفیسروں سے بحث میں الجھے ہوئے تھے، فانٹین کو اس فرق کے بارے میں تفصیل سے بتایا جو موسیو Delvincourt اور موسیو Blondeau کے درمیان موجود تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بلاشں ویل خلق ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ Ternaux کی بنائی فیورٹ کی ابھرے حاشیے کی نقلی ہندوستانی شال اتوار کے دن اپنے بازو پر ڈال کر چلے۔

تولومیے نے گروپ پر حاوی ہوتے ہوئے اس کی پیروی کی۔ وہ بہت خوش تھا، مگر اس میں حکومت کی طاقت محسوس ہوتی تھی؛ اس کی زندہ دلی میں تحکم ہوتا تھا؛ اس کی اصل زینت اس کے زردی مائل سوتی کپڑے سے بنے اس کے ہاتھی جیسے پتلون، اور چوٹی کی طرح گندھے تانبے کے تار تھے؛ وہ اپنے ہاتھوں میں دو سو فرانک قیمت کی ایک مضبوط بید رکھتا تھا، اور، جس طرح وہ ہر قسم کی اشیا سے لطف اندوز ہوتا تھا، ایک عجیب شے جس کو سگار کہتے ہیں اس کے ہونٹوں میں دبی ہوتی تھی۔ اس کے لیے کوئی شے مقدس نہیں تھی؛ وہ تمبا کو نوشی کرتا تھا۔

"تولومیے دنگ کر دیتا ہے۔" لوگ توقیر کے ساتھ کہتے تھے۔ "کیسی پتلون! کہاں کی طاقت!"

فانٹین کو دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ اس کے دمکتے دانتوں کو خدا کی جانب سے ایک کام ودیعت ہوا تھا— قہقہہ مارنا۔ وہ ٹنکوں سے بنی، لمبے دھاگوں والی اپنی ہیٹ کو سر پر رکھنے کے بجائے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتی تھی۔ اس کے گھنگریالے گھنے سنہرے بال، جو آسانی سے سیدھے ہو جاتے تھے، جن کو بار بار باندھنا ضروری ہوتا تھا، بید مجنوں کے درخت کے نیچے Galatea کی پرواز کے لیے بنے محسوس ہوتے تھے۔ اس کے گلابی ہونٹوں کی سحر انگیزی کی کیفیت ہمیشہ کچھ کہتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے منہ کے کونے جو شہوانی انداز میں اوپر کو اٹھے ہوتے تھے، گستاخی کی ہمت افزائی کرتے تھے؛ مگر اس کی لانبی سایہ دار پلکیں اس کے خوش طبع چہرے کے زیریں حصے پر جھکی ہوتی تھیں گویا رُکنے کا حکم دے رہی ہوں۔ اس کے لباس میں ایک قسم کی نا قابلِ بیان ہم آہنگی نظر آتی تھی۔ وہ ایک چمک دار زم اور مہین اون سے بنا بالا پوش، سرخی مائل بھورے رنگ کے لانگ بوٹ، جن کے بند اس کے سفید رنگ کے نفیس موزوں پر X کی شکل میں نظر آتے تھے، اور اسی قسم کی تن زیب سے بنی صدری پہنتی تھی جو Marseille کی ایجاد تھی، جس کا نام canezou تھا، جو دراصل quinze aout کا بگاڑ تھا، جو Canebiere کے فیشن کے مطابق تھی، اور نفیس موسم، گرمی، اور دوپہر کا اظہار کرتی تھی۔ بقیہ تینوں، جو کم ڈرپوک تھیں، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، بغیر کچھ چھپائے، بڑے گلے کے لباس پہنتی تھیں، جو گرمی کے موسم میں، پھولوں سے مزین ہیٹ کے ساتھ بہت دل فریب لگتا تھا؛ مگر ان گستاخانہ لباس کے ساتھ، سنہرے بالوں والی فانٹین کے canezou اپنی شفافیت، اپنی بے احتیاطی، اور اپنے اخفا کے ساتھ، جو ایک ہی وقت میں چھپاتی بھی اور دکھاتی بھی، لبھانے والی آسمانی نفاست اور مشہور Court of Love محسوس ہوتی تھی،

جس کی سرپرائی، گہری سبز رنگ کی آنکھوں والا Vicomtesse de Cette کرتا تھا، اور اس canezou کو شرم وحیا کے مقابلے میں نا زنخرے کا انعام دیتا۔ کبھی کبھی سب سے زیادہ عقل مند ہی سب سے زیادہ خوش سلیقہ ہوتا ہے، اور واقعی ایسا ہوتا ہے۔

دمکتا چہرہ، نزاکت کا پیکر، گہرے نیلے رنگ کی آنکھیں، بھاری پلکیں، چھوٹے چھوٹے محرابی پیر، قابل تعریف کلائیاں اور ٹخنے، سفید رنگ کی جلد جو شاخوں میں مخفی نسوں کی نیلاہٹ کو نظر آنے سے روکتی نہیں تھی، جوان اور تازہ رخسار، Juno of AEgina, کا جیسا فربہ گلا، لچک دار گدی، Coustou جیسے شانے، جن کے بیچ، زیب تن سے نظر آتے شہوت انگیز گڑھے؛ خواب زدگی سے خنک شادمانی، مجسمے جیسی پاکیزگی — یہ تھی فانتین، نسوانیت کی ان نشوں اور رہن کے نیچے ایک آسمانی مجسمہ، اور اس مجسمے کے اندر ایک روح!

فانتین بہت خوب صورت عورت تھی، مگر خود اسے اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ دن میں خواب دیکھنے والے، کم یاب پُراسرار پادریوں کی طرح تھی جو چپکے سے ہر شے کا مقابلہ کر لیتے ہیں، جنھوں نے پیرسی شان کی شفافیت سے کام کرنے والی اس عورت میں قدیم اور مقدس حسن تکلم کی جھلکیاں دیکھ لی ہوں۔ ظلمات کی یہ بیٹی شریف النسل تھی۔ وہ دو طریقوں سے خوب صورت تھی— انداز اور رفتار سے۔ انداز پیکر ہوتا ہے مثالیت کا؛ رفتار اس کی حرکت ہوتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ فانتین ایک سرور تھی؛ سراپا انکسار بھی تھی۔

دیکھنے والے کو جو اس کا مطالعہ کر رہا ہو، اس کے عہد، اس کے موسموں اور اس کے معاشقوں کی خوش بوؤں کا ایک نغمہ سا ہو جاتا، جو اس کی ہمت اور حیا کا نا قابل تسخیر اظہار ہوتا تھا۔ وہ کچھ حیرت زدہ سی رہا کرتی تھی۔ ایسی با حیا حیرت جو بہت ہلکے سے فرق کی طرح ہوتی ہے اور نفس کو [محبت کی دیوی] زہرہ سے الگ کرتی ہے۔ فانتین ایسی لانبی سفید، نازک انگلیوں کی مالک تھی جو مقدس آگ کی راکھ کو سونے کی سلائی سے کریدتی ہیں۔ حالاں کہ وہ تو لومیئے کی کسی فرمائش سے انکار نہیں کرتی ہوگی، ہمیں آگے چل کر جس کے دیکھنے کے بہت مواقع ملیں گے، آرام کے دوران اس کا چہرہ بے حد باکرانہ ہوتا تھا؛ کبھی کبھی اس پر ایک قسم کا سنجیدہ اور سادگی پسند وقار طاری ہو جاتا تھا اور ایسی کوئی پریشان کن بات نہیں ہوتی تھی جو اس کی مسرت کو اچانک غائب کر دیتی، اور مراقبہ بغیر کسی تغیر کے خوش دلی میں بدل جاتا۔ یہ اچانک بڑھا ہوا بھاری پن کبھی کبھی شدید بددلی میں بدل جاتا جو کسی دیوی کی حقارت کے مشابہ ہوتا تھا۔ اس کے ابرو، اس کی ناک، اس کی ٹھوڑی، ایسے خاکے کا توازن پیش کرتی تھیں جو تناسب کے توازن سے بہت الگ ہوتا ہے،

جس کا نتیجہ خدوخال کی ہم آہنگی ہوتی ہے، ایک خاص وقفے میں جو ناک کی بنیاد کو اوپری ہونٹ سے الگ کرتی ہے، جس میں وہ قاتلِ حِس اور موہ لینے والی شکن پڑ جاتی ہے، جو پاک بازی کا پُراسرار نشان ہوتی ہے، جس نے [سلطنتِ عثمانیہ کے ایک امیر البحر] Barberousse کو اُس ڈایانا کی محبت میں گرفتار کر دیا تھا جو Iconia کے خزانوں میں پائی گئی تھی۔

محبت ایک غلطی ہوتی ہے، تو کیا ہوا۔

فاتیمین وہ معصومیت تھی جو غلطی سے بہت بلند سطح پر تیرتی ہے۔

۞

تولومیے کی خوشی اور ہسپانوی گیت

وہ دن بھی کیا دن تھا۔ ہر طرف سویرا ہی سویرا تھا۔ پورا عالمِ فطرت تعطیل منا تا، اور ہنستا گاتا محسوس ہو رہا تھا۔ سان کلاؤڈ کے پھولوں کے تھالے ہوا کو معطر کر رہے تھے۔ دریائے سین (Seine) کی سانسیں پتیوں میں سرسرا رہی تھیں۔ ٹہنیاں ہوا میں حرکت پیش کر رہی تھیں، شہد کی مکھیاں چنبیلی کو لوٹ رہی تھیں؛ تتلیوں کا جھنڈ تیز پات، لونگ، دار چینی، اور بے جان اوٹس [جنگلی جو کے کھیت] پر حملہ آور تھا؛ فرانس کے شاہ کے عالی شان پارک میں خانہ بدوش پرندوں کا ایک جھنڈ اترا تھا۔

چہلیں کرتے یہ چار جوڑے، سورج کی کرنوں میں نہائے میدانوں میں، پھولوں میں، درختوں میں گھلے ملے شان دار رنگ رہے تھے۔

اور جنت کی اس کمیونٹی کے، باتیں کرتے، گاتے، دوڑتے، رقص کرتے، تتلیوں کا پیچھا کرتے، جنگلی بیلوں کو نوچتے، لمبی گھاس میں اپنے گلابی موزے گیلے کرتے، تازہ، خود رو، بغیر عداوت کے، کسی حد تک سب لوگوں کو، سب کے بوسے مل رہے تھے، سوائے فانتین کے، جو اپنی خواب زدگی اور شوریدہ سری سے مملو مبہم مزاحمت کی آڑ میں رہتی تھی اور محبت کرتی تھی۔ فیورٹ اس سے کہتی تھی، ”تم میں ہمیشہ ایک انوکھی کیفیت ہوتی ہے۔“

اسی کو شادمانی کہتے ہیں۔ ان خوش و خرم جوڑوں کے راستے زندگی اور فطرت کے لیے عمیق اپیل رکھتے ہیں، اور ہر شے سے پیار کرتے ہیں اور ان سے بہاروں کی توقع رکھتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک پری نے میدان بنائے اور جنگل اگائے، بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو محبت میں گرفتار تھے — اس ابدی جھاڑی کے اندر — محبت کرنا سیکھنے والوں کے لیے، جو ہمیشہ نئے انداز میں ہوتی ہے، اور جو اس وقت تک قائم رہے گی جب تک جھاڑیاں اور سیکھنے

والے موجود ہیں۔ اس طرح سوچنے والوں میں بہار کا تصور عام ہوا۔ روما کے شہری اور چاقو تیز کرنے والے، خواتین اور خطاب یافتہ، قانون کے دست و پا، درباری اور شہری، جیسا کہ پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا، سب کے سب اس خیالی مخلوق کی رعایا ہیں۔ وہ قہقہے مارتے ہیں اور شکار کرتے ہیں؛ اس ماحول میں تقدیس کی شان بھی ہوتی ہے — محبت بھی کیا کیا تبدیلی شکل کرتی رہتی ہے۔ دستاویزات تیار کرنے والوں کے منشی خدا بن جاتے ہیں۔ ہلکی کراہیں اُبھرتی ہیں، گھاس کے درمیان تعاقب ہوتا ہے، متر میں لپٹی کمریں بغل گیر ہوتی ہیں، سمجھ میں نہ آنے والی بولیاں نغمہ بن جاتی ہیں، تعریفیں جوش کے عالم میں تلفظ بن جاتی ہیں، ایک کے بعد دوسری پکاریں ٹوٹتی ہیں۔ یہ سب اس طرح ہوتا ہے گویا یہ کائنات کا حصہ ہے۔ خوب صورت عورتیں پیاری پیار میں خود کو ضائع کر دیتی ہیں۔ سمجھتی ہیں کہ یہ سب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ فلسفی، شاعر، مصور ان بہاؤں پر غور کرتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے کہ ان سے کیا اخذ کریں، اس لیے کہ یہ سب انھیں چکا چوند کر دیتے ہیں۔ واٹو [فرانسیسی مصور] جزیرۂ Cythera کی طرف روانگی کا اعلان کرتا ہے۔ عامیوں کا مصور Lancret اپنے ادنیٰ درجے والوں کے خیالات پیش کرتا ہے جو نیلے آسمان میں اُڑ گئے ہیں؛ [فلسفی] دیدرو (Diderot) پیار بھرے مناظر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا ہے، اور ناول نگار d'Urfe اپنی تحریروں میں قدیم دور کے پیش پیش کرنے والے پادریوں کو شامل کر لیتا ہے۔

ناشتے کے بعد چاروں جوڑے اس میدان کی طرف گئے جس کو میدانِ شاہ کہا جاتا ہے، جہاں وہ ہندوستان سے آنے والے ایک پودے کو دیکھنے گئے تھے جس کا نام اس وقت میرے ذہن سے نکل گیا ہے، جو ان دنوں پورے پیرس کو سان کلاؤڈ کی طرف کھینچ رہا تھا۔ یہ ایک عجیب نوعیت کی لمبے تنے اور بہت سے شاخوں والی نہایت خوش نما جھاڑی تھی جس پر پتیاں نہیں، بال جیسے نوکیلے روئیں تھے جس میں لاکھوں سفید رنگ کے گلاب جیسے ننھے ننھے پھول کھلے ہوئے تھے؛ ان کو دیکھ کر پھولوں سے مزین بالوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے اطراف ہر وقت دیکھنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔

اس جھاڑی کو دیکھنے کے بعد، تولومیے نے اعلان کیا، "میں تم سب کو گدھوں کی پیش کش کرتا ہوں!" اور گدھوں کے مالک سے قیمت کا تعین کرنے کے بعد وہ Vanvres اور Issy کے راستے واپس ہوئے۔ Issy کے مقام پر ایک واقعہ رونما ہوا۔ وہ بیچ بیچ کا قومی پارک، جو ان دنوں Bourguin نامی ایک ٹھیکے دار کی ملکیت تھا، اتفاق سے کھلا تھا۔ وہ پھاٹک سے گزرے، اس کے اندر موجود غار میں گوشہ نشین ہونے سے ملنے گئے، اور مشہور آئینوں کی الماری کے پُر اسرار اثرات دیکھنے کی کوشش کی، اس گستاخ پھندے کو جو شہوت پرست کو کروڑ پتی بنا رہا ہے یا Turcaret اور Alain-René

Lesage کے فرانسیسی مزاحیہ کھیل کا خاتم، بد کردار اور بے ایمان مرکزی کردار] کو Priapus [بہت بڑے اور بھدے اینٹھ دہ عضو تناسل والا زرخیزی کا یونانی دیوتا] میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انھوں نے Abbe de Bernis کے شاہ بلوط کے درخت پر پڑے جھولے کو زور سے جھلایا تھا۔ جب وہ، ایک کے بعد دوسری حسینوں کو جھلا رہے تھے، جس کی وجہ سے حسینوں کے لہنگوں میں شکنیں پڑ رہی تھیں جو [فرانسیسی مصور] Greuze کو ضرور اچھی لگتیں، قہقہوں کے شور کے درمیان، تولومیے نے جو کسی حد تک ہسپانوی اور Tolosa کا عم زاد تھا، غم زدہ دھن میں بہت پرانا دیہاتی گیت گانا شروع کر دیا، جو دو درختوں کے درمیان جھولے پر بیٹھی پینگیں بڑھاتی کسی حسین ملازمہ نے اسے یاد دلایا تھا:

Soy de Badajoz,
Amor me llama
Toda mi alma,
Es en mi ojos,
Porque ensenas
A tuas piernas

فانتین نے جھولا جھولنے سے انکار کر دیا۔

فیوریت تنک کر بولی، ”مجھے اس قسم کے نخرے باز لوگ اچھے نہیں لگتے۔“

گدھوں سے اترنے کے بعد ایک نیا لطف منتظر تھا؛ انھوں نے دریائے سین ایک کشتی میں پار کیا اور Passy سے پیدل چل کر l'Etoile پشتے تک پہنچے۔ وہ صبح پانچ بجے کے اٹھے ہوئے تھے، جیسا کہ ان کے رہنما کو یاد ہوگا؛ مگر، ہُنہ! اتوار کے دن تھکاوٹ جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی، فیوریت نے کہا؛ اتوار کے دن تھکاوٹ بھی چھٹی پر ہوتی ہے۔

تقریباً تین بجے چاروں جوڑے، اپنی خوشیوں سے خوف زدہ، روسی پہاڑوں سے نیچے آ رہے تھے، جہاں ایک غیر معمولی عمارت تھی جو اس وقت Beaujon کی بلندیوں پر قبضہ کیے ہوئی تھی، اور جس کی لہر دار لکیر شانزے لیزے کے درختوں کے اوپر سے دکھائی دیتی تھی۔

فیوریت وقتاً فوقتاً کہتی جا رہی تھی:

”اور میری حیرانی!
میں حیرانی کے انتظار میں ہوں۔“

”صبر!“ تولومیے نے جواب میں کہا۔

بومباغدا کے شراب خانے میں

روشن پہاڑوں سے اُترنے کے بعد انھیں رات کے کھانے کی فکر ہوئی۔ آٹھ نور فشاں افراد پر مشتمل پارٹی، تھک جانے کے بعد بومباغدا (Bombarda) نامی شراب خانے میں جا بیٹھی۔ جو اس ادارے کی ایک شاخ ہے جسے ایک مشہور ریستوران والے نے شانزہ لیزے میں بومباغدا کے نام سے قائم کیا تھا، جس کے نشانات Delorme Alley کے قریب Rivoli امزمنٹ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک بڑا، بھدا سا کمرہ، جس کے اندر حجرے میں ایک پلنگ (جو انھوں نے اتوار کے اژدھام کے باعث) بچھا دیا تھا؛ دو کھڑکیاں تھیں جن میں سے سفیدے کے درختوں کے اس پار، کھاڑی اور دریا کا معائنہ کیا جا سکتا تھا؛ کھڑکیوں کے شیشے پر پڑتی اگست کی شاندار دھوپ، دو میزیں، جن میں سے ایک پر پہاڑ سا گل دستہ، اس کے اطراف عورتوں اور مردوں کی ٹولیاں؛ دوسری میز پر سینیاں، قابیں، گلاس اور بوتلیں؛ بیئر کے جگ اور وائن کے کٹوروں کے اطراف بیٹھے چاروں جوڑے؛ میز کے اوپر کچھ ترتیب، جب کہ میز کے نیچے بالکل بے ترتیبی۔ Moliere کہتا ہے:

میز کے نیچے سے آتی آوازیں،
کھٹ کھٹ کرتے پاؤں
جس کو سن کر نفرت ہو

یہ تھی وہ کیفیت، جو کسی چرواہے کے گیت کی طرح، پانچ بجے صبح شروع ہوئی تھی، اور اب شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا؛ ان کی بھوک مطمئن ہو چکی تھی۔

سورج کی کرنوں اور لوگوں سے بھری شانزہ لیزے کچھ نہیں تھی سوائے روشنی اور گرد

کے، کہ یہی وہ اشیا ہیں جو شان پیدا کرتی ہیں۔ ان سے بنے سنہرے بادلوں میں گُلیلیں کرتے Marly کے گھوڑے۔ آتی جاتی بگھیاں۔محافظوں کا ایک شان دار چوکس دستہ، سروں پر اپنے جھونپو سجائے، Neuilly اسٹریٹ پر اتر رہا تھا؛ ان کا سفید پرچم ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہلکا گلابی دکھائی دیتا Tuileries کے گنبد کے اوپر لہرا رہا تھا۔ Place de la Concorde جو Place Louis XV بن چکا تھا، ایک بار پھر خوش باش چہل قدمی کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ سفید فیتوں میں شاہی نشان، چاندی کے گُلِ لالہ لٹکائے ہوئے تھے، جو 1817ء تک پوری طرح بٹن کے کاجوں سے غائب نہیں ہوا تھا۔ یہاں وہاں، چھوٹی چھوٹی بچیاں، آنے جانے والوں کے درمیان حلقہ بنائے گاتی، تالیاں بجاتی، قدامت پسند ماحول کا جشن مناتی جا رہی تھیں، جو سو دنوں میں بجلی کی طرح گرنے والا تھا:

Give us back our father from Ghent,

Give us back our father.

مضافات کے مکینوں کے گروہ، اتوار کے اجتماع میں گُلِ لالہ کے نشانوں سے مزین، ادنیٰ درجے کے لوگوں کی طرح، جو بڑے میدان Marigny میں بکھرے ہوئے تھے، رنگ کھیل رہے تھے، لکڑی کے گھوڑوں پر سواری کر رہے تھے؛ کچھ ناؤ نوش میں مصروف تھے؛ چھاپے خانے کے مزدور کاغذی ٹوپیاں پہنے تھے؛ ان سب کے قہقہے صاف سنائی دے رہے تھے۔ ہر شے چمک رہی تھی۔ یہ وقت تھا غیر متنازعہ امن اور شاہ پرستوں کے تحفظ کا؛ یہ وہ زمانہ تھا جب پیرس کے موضوع پر شاہ کو پولیس کا سربراہ ایک خاص اور نجی رپورٹ دینے والا تھا جو ان سطروں پر ختم ہوتی تھی:

"جنابِ والا، ہر طرح کے غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان لوگوں سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ اتنے لاپروا اور آرام طلب ہیں جیسے بلّیاں۔ صوبوں کے عوام بے چین ہو رہے ہیں؛ پیرس میں یہ کیفیت نہیں ہے۔ جنابِ والا، یہ بہت خوب صورت مرد ہیں۔ ان کے ہر دو مردوں میں سے ایک آپ کا فوجی محافظ بن سکتا ہے۔ دارالحکومت پیرس کے لوگوں سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ غیر معمولی بات یہ ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں اس آبادی کو کم ہو جانا چاہیے تھا؛ مضافات کے رہنے والے آج بھی اتنے ہی لاغر اور کم زور ہیں جیسے انقلاب کے وقت تھے۔ یہ خطرناک بات نہیں۔ مختصر یہ کہ یہ ایک خوش خلق انبوہ ہے۔"

پولیس کے سربراہوں کا خیال ہے کہ کوئی بلّی اپنی قلبِ ماہیت شیر میں نہیں کر سکتی؛ ایسا ہوا ہے، مگر اس میں ایک معجزہ پنہاں ہے جو پیرس کے عوام نے داخل کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ، جس

بلی کو کاونٹ آنگلے (Count Angles) حقیر سمجھتا تھا وہ قدیم جمہور کی تکریم کی حامل تھی۔ ان کی نظروں میں یہ آزادی مجسم تھی؛ گویا یہ Piraeus کے Minerva Aptera کے گلے کے ہار کا کام دیتی ہے۔ اور [شاید اسی وجہ سے] Corinth کے عوامی میدان میں کانسی سے بنا بلی کا ایک بہت بڑا مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔ بحالی کرنے والی سادہ مزاج پولیس پیرس والوں کو بہت زیادہ خوش فہم سمجھ رہی تھی؛ یہ اتنا خوش خلق انبوہ بھی نہیں جیسا کہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی فرانسیسی کے نزدیک پیرس والا ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی یونانی کے نزدیک آتھنس والا: جیسی گہری نیند وہ سوتا ہے، وہ کسی کو نصیب نہیں؛ سچ پوچھا جائے تو اس سے زیادہ غیر سنجیدہ اور کاہل کوئی نہیں؛ کوئی اس سے زیادہ غفلت شعاری کا ماحول پیش نہیں کرسکتا؛ پھر بھی اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا؛ پھر بھی وہ اچھے کام کرنے کے لیے تیار رہتا ہے؛ مگر جہاں آخر میں توصیف کا امکان ہو، وہ ہر قسم کے طیش میں قابلِ تعریف نظر آتا ہے۔ اس کو ایک بہانہ دیجیے اور وہ آپ 10 اگست فراہم کردے گا؛ اسے ایک بندوق دے دیجیے، اور اس سے Austerlitz [تین شاہنشاہوں کی لڑائی] لے لیجیے۔ یہ نپولین کا سہارا ہے اور Danton کا وسیلہ ہے۔ اگر ملک کا سوال ہو تو یہ بھرتی ہو جاتا ہے، اگر آزادی کا معاملہ ہو تو یہ سڑک کھود ڈالتا ہے۔ ہوشیار! اس کا غیظ وغضب سے بھرا بال رزمیہ ہے؛ اس کا بلاؤز اسے کوتاہ یونانی لبادے کی طرح آراستہ کردیتا ہے۔ جب گھنٹے کا گھنٹا بجے گا تب یہ مضافاتی اپنی قامت میں بڑھے گا؛ یہ چھوٹا سا آدمی اٹھے گا اور اس کی نظر خوف ناک ہو گی، اس کی سانس طوفانی جھکڑ ہو گی، اور اس کے نازک سے سینے سے اتنی ہوا نکلے گی جو کوہ ہیلپس کو تہ و بالا کردے گی۔ اور یہ پیرس کے مضافاتی کا طفیل ہے کہ انقلاب اور ہتھیار کے امتزاج نے یورپ کو فتح کرلیا ہے۔ اس کا گانا سرور آور ہے۔ اس کے گانے کو اس کی فطرت سے متناسب کیجیے اور آپ خود دیکھ لیں گے، اور جب تک اسے سوائے la Carmagnole کے کسی چیز سے پرہیز نہیں، وہ صرف لوئی شانزدہم کو تخت سے اتار پھینکے گا؛ اسے [فرانس کا قومی نغمہ] Marseillaise گانے کا موقع دیجیے، یہ پوری دنیا کو آزاد کرادے گا۔

یہ تحریر Angles کی رپورٹ کے حاشیے پر لکھی گئی تھی؛ اب ہم چاروں جوڑوں کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رات کا کھانا ختم ہونے والا ہے۔

۞

ایک دوسرے کی پرستش کرنا

میز پر گپ شپ ۔ محبت کی باتیں ۔ ان سب کا دہرانا ممکن نہیں؛ محبت کی بات بادل کی طرح ہوتی ہے؛ میز کی گپ شپ دھویں جیسی ہوتی ہے۔

فامالیا اور ڈیلیا گنگنا رہے تھے ۔ توکومیے شراب پی رہا تھا۔ زفامایا ہنس رہی تھی ۔ فاعلین مسکرا رہی تھی ۔ لستو لیے چوبی بگل بجا رہا تھا جو اس نے سال ۱۹۳۵ء میں خریدا تھا۔

فیوریت نے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بلاش ویل سے کہا:

''میں تمھاری پرستش کرتی ہوں۔''

اس جملے نے بلاشویل کو سوال کرنے پر مجبور کر دیا:

''فیوریت، اگر میں تم سے محبت کرنا چھوڑ دوں، تو تم کیا کرو گی؟''

''میں'' فیوریت نے کہا، ''خدا کے لیے، تم یہ بات مذاق میں بھی نہ کہنا۔ اگر تم نے مجھ سے محبت کرنی چھوڑ دی تو میں تمھارے پیچھے بھاگوں گی، تمھیں نوچ ڈالوں گی، تمھیں چیر پھاڑ کر رکھ دوں گی، تمھیں پانی میں پھینک دوں گی۔ میں تم کو گرفتار کرا دوں گی۔''

بلاش ویل اس شہوت پرست خودبیں آدمی کی طرح مسکرایا جسے اپنی ذات سے محبت میں چھیڑ دیا گیا ہو۔ فیوریت نے اپنی بات جاری رکھی:

''ہاں! میں چیخ کر پولیس کو بلاؤں گی۔ میں ذرا بھی تکلف نہیں کروں گی، ہرگز نہیں، گھٹیا انسان!''

بلاش ویل نے بے خودی کے عالم میں خود کو کرسی پر گرا دیا، اور بڑے فخر سے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

کھانا کھاتے ہوئے، ڈیلیا نے شور غل کے درمیان، دھیمی آواز میں کہا:

''کیا واقعی تم اس کو پوجنے لگی ہو، اپنے اس بلاش ویل کو؟''

''میں؟ میں اس سے نفرت کرتی ہوں!'' اور ایک بار پھر اپنا کانٹا پکڑتے ہوئے اسی لہجے میں جواب دیا، ''یہ بہت لالچی آدمی ہے۔ میں تو اُس شخص سے محبت کرتی ہوں، وہی جو میرے سامنے والے گھر میں رہتا ہے۔ وہ نوجوان اچھا آدمی ہے، کیا تم اسے جانتی ہو؟ اس کا پیشہ اداکاری ہے۔ مجھے اداکار بہت اچھے لگتے ہیں۔ جوں ہی وہ گھر میں داخل ہوتا ہے، اس کی ماں اس سے کہتی ہے، 'اوہ، میرے خدا! میرا سکون غارت ہو گیا ہے، اور وہ چلّا کر کہتا ہے، 'میری پیاری ماں، تم میرا سر پھاڑے دے رہی ہو۔' اس طرح وہ چوہوں سے بھرے اوپری منزل کے کمرے میں چلا جاتا ہے، سیاہ سوراخوں میں؛ جتنا اوپر وہ پہنچ سکتا ہے؛ اور وہاں بیٹھ کر گانا گانے لگتا ہے؛ جذباتی تقریر کرنے لگتا ہے؛ کیا معلوم کس موضوع پر؟ تاکہ نیچے والے اسے سُن لیں۔ وہ ایک وکیل کے ہاں منشی گیری کرتا ہے اور ہر روز بیس سو کما لیتا ہے۔ وہ Saint- Jacques-du-Haut-Pas کے ایک سابق گویوں کے سردار کا بیٹا ہے۔ واقعی بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ میری بھی اس طرح پرستش کرتا ہے کہ ایک دن جب اس نے مجھے پین کیک بنانے کے لیے کے لیے آٹا گوندھتے دیکھا تو، کہا تھا، 'میڈموزیل، اپنے دستانے کے ٹکڑے بنا کر تل لو، میں اسے بھی کھا جاؤں گا۔' صرف کوئی فن کار ہی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ اور واقعی وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اسے دل دیا ہے؛ کوئی بات نہیں؛ میں بلاش ویل سے کہتی ہوں کہ میں اس کی پرستش کرتی ہوں — میں جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں! میں جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں!''

فیوریٹ تھوڑی دیر کے لیے رُکی، اور پھر گویا ہوئی:

''دیکھو ڈیلیا، میں آج بہت اداس ہوں۔ گرما کے پورے موسم نے کیا کیا ہے؟ بارش ہوتی رہی ہے؛ ہوا مجھے پریشان کر دیتی ہے؛ ہوا تو رُکی ہی نہیں۔ بلاش ویل بڑا کنجوس آدمی ہے؛ بازار میں سبز مٹر عنقا ہے؛ آخر آدمی کھائے بھی تو کیا کھائے؟ جیسا کہ انگریز کہتے ہیں، میں بہت بدمزاج ہوں، مکھن کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ اس پر دیکھو، یہ کتنی خراب بات ہے کہ ہم یہاں اس کمرے میں کھانا کھا رہے ہیں جس میں ایک پلنگ بھی بچھا ہوا ہے، ایسی چیزیں مجھے زندگی سے متنفر کر دیتی ہیں۔

تولومیے کی دانش مندی

اس دوران، جب کوئی گا رہا تھا بقیہ لوگ ایک ساتھ اونچی آوازوں میں بھی باتیں کر رہے تھے؛ اب سوائے شور کے کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے میں تولومیے نے دخل اندازی کی۔

”نہ ہمیں بے تکی بات کرنی چاہیے، اور نہ بہت تیزی سے۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا، ”ہمیں سوچنا چاہیے اگر واقعی ہم ذہین ہونا چاہتے ہیں۔ بہت زیادہ بر جستگی احمقانہ طریقے سے دماغ کو خالی کر دیتی ہے۔ گرتی ہوئی بیئر میں جھاگ نہیں اٹھا کرتی۔ عجلت نہیں، حضرات۔ کھانے سے وقار کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ غور وفکر کے ساتھ کھانا چاہیے؛ ہمیں تیزی بھی آہستگی سے کرنی چاہیے۔ عجلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہار کے موسم پر نظر کیجیے: اگر اس میں عجلت کی جائے تو بہار برباد ہو جائے گی؛ یعنی، برف میں جم کر رہ جائے گی۔ زیادہ سرگرمی آڑو کے اور خوبانی کے درختوں کو برباد کر دیتی ہے۔ نہیں! حضرات، سرگرمی نہیں۔“

سرکشی کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”ہمیں سکون سے رہنے دو، تولومیے۔“ بلاش ویل نے کہا۔

”ظالم، مردہ باد!“ فامالیا نے کہا۔

”بومباندا، Bambochel اور Bombance“ لستولیے نے چیخ کر کہا۔

”ابھی اتوار ختم نہیں ہوا ہے۔“ فامالیا نے مزید کہا۔

”ہم ہوش میں ہیں۔“ لستولیے نے لقمہ دیا۔

”تولومیے!“ بلاش ویل بولا ”میری خاموشی پر غور کرو۔“

”تم تو خاموشی کے شہنشاہ ہو۔“ تولومیے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

ان چھوٹے چھوٹے لفظوں کا کھیل حوض میں پتھر پھینکنے جیسا تھا۔اس زمانے میں Marquis de Montcalm مشہور شاہ پسند تھا۔سارے مینڈک خاموش ہو گئے تھے۔

''دوستو''بلستو لیے ایسے شخص کے لہجے میں چلایا جسے اس کی گم کردہ سلطنت واپس مل گئی ہو، ''ہوش میں آؤ۔ یہ ذو معنویت جو آسمان سے گری ہے زیادہ مدہوشی میں نہیں لی جانی چاہیے۔ ہروہ شے جو اس طرح نازل ہوتی ہے احترام یا پُر جوشی کے قابل نہیں ہوا کرتی۔ ذو معنویت ذہن کا فضلہ ہوتی ہے جو بلند ہو جاتی ہے۔مزاح گرجاتا ہے۔اس سے مطلب نہیں کس جگہ؛ اور ذہن احمقانہ خیال پیش کرنے کے بعد نیلگوں گہرائیوں میں چلا جاتا ہے۔ کسی چٹان سے چپکا سفید چھچھڑا عقاب کو بلند پروازی سے نہیں روکتا۔ذو معنویت کی توہین کرنا میری عادت نہیں، میں اس کا،اس کے تناسب سے، احترام کرتا ہوں؛ اس سے زیادہ نہیں۔ہر شے جتنی عالی شان ہوتی ہے، اتنی ہی ارفع ہوتی ہے، انسانیت کی دل پسند شخصیتیں بھی ذو معنی لطیفے بیان کیا کرتی تھیں۔یسوع مسیح سینٹ پیٹر کے سے، موسیٰ، اسحٰق سے، AEschylus، Polynices سے، قلوپطرہ Octavius سے مذاق کیا کرتی تھی۔اور ذرا دیکھو کہ قلوپطرہ نے تو Actium کی لڑائی سے پہلے بھی مذاق کیا تھا،مگر یاد رہے اس کی وجہ سے لڑائی نہیں ہوئی تھی، کسی کو Toryne کا نام بھی یاد نہیں ہوگا، جو یونانی نام ہے جو ایک بڑے سے چمچے کی طرف اشارہ کرتا تھا۔اتنا کہنے کے بعد، اب میں اپنے پند و نصائح کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔بھائیو، میں کہتا ہوں،مکرر کہتا ہوں، جوش نہیں، افراتفری نہیں، زیادتی نہیں؛ حتیٰ کہ لطائف بھی نہیں، تفریح بھی نہیں؛ الفاظ کے کھیل بھی نہیں۔میری بات سنو۔مجھ میں Amphiaraus کی عاقبت اندیشی ہے، سیزر کا روکھا پن ہے۔ہر چیز کی، حتیٰ کہ پہیلیوں کی بھی حد ہوا کرتی ہے۔

ڈنر کی بھی حد ہونی چاہیے۔خواتین! تم کو سیب کے سموسے بہت پسند ہیں،مگر زیادہ مت کھانا۔سموسوں کے معاملے میں بھی احتیاط اور فن دونوں ضروری ہوتے ہیں۔بسیار خوری خوش خوراک والوں کے لیے تادیب کی مانند ہوتی ہے۔معدے کی اخلاقیات کے لیے خدا نے بدہضمی کو خلق کیا ہے۔اور یہ بات یاد رکھو: ہمارے سارے جوش وجذبے، حتیٰ کہ محبت کا بھی اپنا معدہ ہوتا ہے، جسے ضرورت سے زیادہ بھر نہیں لینا چاہیے۔ہر معاملے میں ''ختم'' جلی حروف میں لکھا ہونا چاہیے۔جب کوئی معاملہ اشد ضروری ہو تو ضبطِ نفس کرنا چاہیے؛ اشتہا کے دروازے پر چٹخنی چڑھا دینی چاہیے۔اپنی نغما سی اپنے وائلن تک محدود رکھنی چاہیے، اور اپنے آپ کو اپنے ہدف تک لے جانا چاہیے۔ دانا وہ شخص ہوتا ہے جسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کس وقت خود کو قابو میں رکھنا چاہیے۔

مجھ پر اعتبار کرو، اس لیے کہ میں قانون کی اپنی تعلیم میں، امتحانات کے فیصلوں کے مطابق، خاصا کامیاب رہا ہوں، اس لیے کہ میں کیے گئے سوالات اور روکے گئے سوالات کے درمیان فرق جانتا ہوں، اس لیے کہ میں نے روم میں کیے جانے والے تشدد کے طریقوں کے بارے میں لاطینی زبان میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا، اس زمانے میں Munatius Demen جب Parricide کا خزانچی تھا؛ اور چوں کہ اب میں ڈاکٹر بننے والا ہوں، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مجھے ضعیف العقل ہو جانا چاہیے۔ میں تم لوگوں کو یہی مشورہ دوں گا کہ اپنی خواہشات کے معاملے میں اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا کرو۔ یہ سچ ہے کہ میرا نام فیلکس تولومیے ہے؛ میں اچھا بوٹا بھی ہوں۔ مطمئن ہے وہ شخص جو، وقت آنے پر، بہادرانہ عزم رکھتا ہے، اور Sylla یا Origenes کی طرح اپنے عہدے سے دست بردار ہو جاتا ہے۔"

فیوریٹ بہت غور سے سُن رہی تھی۔

"فیلکس" اس نے کہا، "کتنا پیارا نام ہے! مجھے اس نام سے محبت ہے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے نا، جس کا مطلب 'فروغ' ہوتا ہے۔"

تولومیے نے اپنی گفتگو جاری رکھی:

"میرے دوستو۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ شادی کے بستر کے بغیر تمھیں لوکیلی شے کا احساس ہو، اور تم محبت کا مقابلہ کرو؟ بہت آسان کام ہے۔ یہ رہا نسخہ: لیموں کا شربت پیو، کسرت کرو، سخت محنت کرو؛ مر جانے کی حد تک محنت کرو؛ بوجھ گھسیٹو، سوؤ نہیں، ہوشیار رہو، خود کو بلبلے والے مشروب سے اور [آبی پودے جس میں رنگ رنگ کے پھول ہوتے ہیں] nymphaea کے عرق سے بھر لو؛ خشخاش اور agnus castus کو گھول کر پیو، اس کے ساتھ موٹی غذائیں بھی استعمال کرو، خود کو بھوکا رکھو، ٹھنڈے پانی سے نہاؤ، جڑی بوٹیاں استعمال کرو، جیسے کے subacetate اور oxycrat سے بنے لوشن سے بدن کو حرارت پہنچاؤ۔"

"میں عورت کو ترجیح دیتا ہوں۔" بلشو لیے نے کہا۔

"عورت!" تولومیے نے بات آگے بڑھائی، "اس پر بھروسا نہ کرو۔ افسوس اس پر، جو عورتوں کے نازک دل پر انحصار کرتا ہے۔ عورت بے وفا اور مطلبی ہوتی ہے۔ وہ پیشہ ورانہ حسد کے باعث سانپ سے نفرت کرتی ہے۔ سانپ راستے کی دُکان جیسا ہوتا ہے۔"

"تولومیے!" بلاش ویل نے چیخ کر کہا، "تم نشے میں ہو۔"

"بخدا! نہیں" تولومیے نے کہا۔

''تم بے فکر رہو۔'' بلاش ویل نے کہا۔

''میں تم سے متفق ہوں۔'' تولیمے نے جواب میں کہا اور اپنا گلاس بھرتے ہوئے اٹھا۔

''وائن زندہ باد Nunc te, Bacche, canam۔ معاف کرنا خواتین، یہ ہسپانوی زبان ہے۔اور سینیورا، اس کا ثبوت یہ ہے: لوگ لکڑی کے پیپوں کی طرح ہوتے ہیں۔Castile کے پیمانے میں سولہ لیٹر ہوتے ہیں؛ Alicante کے برتن میں بارہ؛ Canaries کے almude [حجم ناپنے کا پرتگالی پیمانہ] میں پچیس؛ Balearic کے جزیروں کے پیمانے میں چھبیس؛ Tzar Peter کے boot میں تیس۔زار زندہ باد، جو عظیم تھا؛ اس کا boot بھی زندہ باد جو اس سے بھی عظیم تر تھا۔خواتین! اپنے دوست کا مشورہ مانو؛ اگر مناسب سمجھو تو اپنے پڑوس میں غلطی کر بیٹھو۔غلطی محبت کی خصوصیت ہوتی ہے۔معاشقہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ آپ جھکیں، اور کسی انگریز ملازمہ کی طرح خود پر ظلم کریں، صفائی کرتے کرتے جس کے گھٹنوں میں گھٹے پڑ گئے ہوں۔محبت اسی لیے بنائی گئی ہے کہ غلطی کی جائے؛ ہماری مہربان محبت خوشی خوشی غلطی کرتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ غلطی انسان سے ہوتی ہے: میں کہتا ہوں کہ غلطی محبت سے ہوتی ہے۔خواتین! میں تم سب کو بُت کی طرح پوجتا ہوں۔اے زفایا، اے جوزفائن اگر تمھارے چہرے زیادہ بے ڈول نہ ہوتے، آڑے ترچھے نہ ہوتے تو تم بہت دل ربا ہوتیں۔تم وہ خوب صورت چہرہ ہو جس پر کوئی غلطی سے بیٹھ گیا ہو۔جہاں تک فیوریٹ کا معاملہ ہے، وہ حسینہ ہے، وہ روحِ شاعری ہے۔ایک دن بلاشویل جب Guerin-Boisseau اسٹریٹ میں ایک نابدان پار کر رہا تھا، اس نے ایک خوب صورت لڑکی کو تاڑ لیا تھا جس کے سفید چڑھے ہوئے موزوں کے اوپر اس کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔اس تمہید نے اس کا دل خوش کر دیا، اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔اس نے جس سے محبت کی تھی وہ فیوریٹ تھی۔اے فیوریٹ تیرے لب تو آئیونی [یونانی نسل والوں جیسے] ہیں۔وہاں یوفورین (Euphorion) نام کا ایک یونانی مصور تھا۔جس کا خاندانی نام لبوں کا مصور تھا۔تنہا وہی مصور تیرے لبوں کو پینٹ کرنے کا حق دار ہوتا۔سُنو! تجھ سے پہلے ایسی کوئی مخلوق تھی ہی نہیں جس کو واقعی مخلوق کہا جا سکتا۔تجھے تو وینس کی طرح سیب لینے کے لیے بنایا گیا تھا، یا حوا کی طرح سیب کھانے کے لیے؛ حسن کی ابتدا تجھ سے ہی ہوتی ہے۔میں نے ابھی حوا کا نام لیا ہے۔وہ تو ہی ہے جس نے اسے خلق کیا ہے۔خوب صورت عورت کہلانا تجھ پر ہی جچتا ہے۔اے فوریٹ! اب میں تجھے 'تو' نہیں کہوں گا، اس لیے کہ اب میں نظم سے نثر کی طرف جا رہا ہوں۔تھوڑی دیر قبل تم میرا نام لے رہی تھیں۔میں بہت متاثر ہوا تھا؛

مگر ہم کوئی بھی ہوں، ہمیں نام پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ نام ہمیں فریب دے سکتے ہیں۔ میرا نام نیلکس ہے مگر میں اس سے خوش نہیں ہوں۔ الفاظ جھوٹے ہوتے ہیں۔ ہمیں آنکھ بند کر کے اشاروں کو قبول نہیں کر لینا چاہیے، جو وہ ہمیں فراہم کرتے ہیں۔ Liege کو کارک کے لیے لکھنا، اور Pau کو دستانوں کے لیے لکھنا غلطی ہو گی۔ مس ڈیلیا اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو خود کو Rosa کہلواتا۔ پھول میں اچھی مہک ہونی چاہیے اور عورت میں حاضر جوابی۔ میں فانتین کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ وہ خواب دیکھنے والی، خیالات میں گم، اداس شخصیت ہے؛ وہ ایک خیالی شخصیت ہے جس نے کسی حسین پری کی شکل اور کسی راہبہ کی پاک دامنی اختیار کر لی ہے، جو ایک مزدور عورت کی زندگی میں بکھر گئی ہے، مگر جو سرابوں میں پناہ لیتی ہے، جو گاتی ہے، دعائیں کرتی ہے، اور لاجورد کی پہنائیوں میں دیکھا کرتی ہے، بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے، اور کون ہے وہ، جس کی آنکھیں جنت پر لگی ہوتی ہیں، جو ایک باغیچے میں گھومتی پھرتی رہتی ہے جہاں وجود سے بھی زیادہ پرندے ہوتے ہیں۔ اور اے فانتین! ذرا سنو اور سمجھو: میں تولومیے، ایک سراب ہوں، مگر وہ تو سوچتی ہی نہیں، وہ عجیب الخلقت، سنہرے بالوں والی کنواری لڑکی ہے، اس میں سب کچھ ہے، تازگی ہے، لطافت ہے، جوانی ہے، صبح کی پیاری روشنی ہے۔ اے فانتین، اے کنواری لڑکی جو مارگریت یا موتی کہلانے کی حق دار ہے، تم مشرق کی خوب صورت ترین عورت ہو۔ خواتین، ایک اور مشورہ اپنی گرہ میں باندھ کر رکھ لو: شادی ہرگز نہ کرنا؛ شادی ایک [نباتی] قلم کی مثال ہوتی ہے؛ یہ اچھی بھی ہو سکتی ہے اور خراب بھی؛ اس خطرے سے پرہیز کرو۔ مگر افسوس، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں اپنے الفاظ ضائع کر رہا ہوں۔ شادی کے معاملے میں لڑکیاں لاعلاج ہوتی ہیں، اور ہم عقل مند جو کچھ بھی کہیں، واسکٹ بنانے والیوں اور جوتے سینے والیوں کو ہیرے جڑے شوہروں کے خواب دیکھنے سے روک نہیں سکتے۔ اچھا تو پھر یوں ہی سہی؛ مگر میری پیاری حسیناؤ، تم بہت زیادہ چینی کھاتی ہو۔ اے عورتو تم میں ایک خرابی ہے، کہ تم ہر وقت چینی کھایا کرتی ہو۔ اے شکر خور لڑکیو، تمھارے دانت چینی کی پرستش کرتے ہیں۔ اب مجھے غور سے سنو۔ چینی بھی ایک قسم کا نمک ہوتی ہے۔ سارے نمک پژمردہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ چینی تمام نمکیات میں سب سے زیادہ خشک ہوتی ہے؛ یہ نسوں کے ذریعے خون کی ساری رطوبت چوس لیتی ہے؛ اسی وجہ سے رگوں میں مادے جمنے لگتے ہیں، اور پھر خون بھی جمنے لگتا ہے، اسی سے پھیپھڑوں کو تپ دق کا عارضہ لگ جاتا ہے، جو موت پر منتج ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ذیابیطس بھی جسم کو گھلانے لگتی ہے۔ تو، چینی نہ چباؤ گی تو تم زندہ رہو گی۔ اب میں مردوں سے مخاطب ہوتا

ہوں؛ فتوحات کرو، بغیر کسی تاسف کے، ایک دوسرے سے اپنی پسندیدہ چیزیں چھین لو۔ محبت میں دوست نہیں ہوا کرتے۔ جہاں بھی کوئی خوب صورت عورت ہوتی ہے، دشمنی شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی امان نہیں، موت تک لڑو۔ خوب صورت عورت جنگ کی وجہ ہوتی ہے؛ خوب صورت عورت واضح طور پر بنائے جرم ہوتی ہے۔ تاریخ کے سارے حملے لہنگوں نے ہی کرائے ہیں۔ عورت مرد کا حق ہوتی ہے۔ Romulus سبینی عورتوں کو لے گیا تھا؛ ولیم جرمن عورتوں کو لے گیا تھا؛ سیزر رومن عورتوں کو لے گیا تھا۔ وہ آدمی جس سے محبت نہیں کی جاتی گدھ کی طرح دوسرے مردوں کی داشتاؤں پر منڈلاتا رہتا ہے؛ اور میں ان تمام بدقسمت لوگوں سے جو رنڈوے ہو چکے ہیں، بونا پارٹ کی طرح کہنا چاہتا ہوں، سپاہیو، تمھیں ہر چیز کی ضرورت ہے؛ اور دشمن کے پاس ہر چیز ہوتی ہے۔"

تولومیے نے توقف کیا۔

"سانس تو لے لو، تولومیے!" بلاش ویل نے کہا۔

اور اسی لمحے لستولیے اور فامالیا کی معیت میں بلاش ویل غم زدہ سا ہو گیا تھا؛ اور اسٹوڈیو میں ترتیب دیے گئے وہ گانے جن کے ابتدائی الفاظ نہ صرف اچھی طرح بحر میں تھے بھی، اور نہیں بھی تھے، احساسات سے اس طرح خالی تھے جیسے کسی پیڑ کا انداز، جیسے ہوا کی آواز جو نکیوں کے بخارات سے پیدا ہو کر نکلتی ہے اور ان کے ساتھ بکھر بھی جاتی ہے۔ یہ ہیں وہ اشعار جن کے ذریعے اس گروہ نے تولومیے کی خطابت کا جواب دیا تھا:

The father turkey-cocks so grave
Some money to an agent gave,
That master good Clermont-Tonnerre
Might be made pope on Saint Johns' day fair.
But this good Clermont could not be
Made pope, because no priest was he;
And then their agent, whose wrath burned,
With all their money back returned.

یہ تولومیے کی بدجنگی کو خاموش کرنے کے لیے نہیں کیا گیا تھا؛ اس نے اپنا گلاس خالی کر دیا، بھرا، پھر بھرا، اور پھر شروع ہو گیا:

"برا ہو دانش کا! بھول جاؤ اسے جو کچھ میں نے کہا ہے۔ نہ ہمیں معقول ہونا چاہیے، نہ

مردانِ محتاط، نہ کوئی نائٹ یا جاگیردار۔ میں مسرت کے نام کا ایک جام تجویز کرتا ہوں؛ خوش رہنے کے لیے۔ ہمیں قانون کی تعلیم کو مکمل کرنا چاہیے، ناسمجھی سے اور کھانے سے، بدہضمی اور نظامِ ہضم سے باز رہنا چاہیے۔ [بازنطینی شہنشاہ] جسٹینین [کو مذکر ہونے دو، اور تواضع کرنے والے کو مؤنث۔ گہرائیوں میں خوشی ہوتی ہے! اے مخلوق، زندہ رہ! دنیا بہت بڑا ہیرا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ پرندے مجھے ششدر کر دیتے ہیں۔ کیا جشن ہے ہر طرف! بلبل مفت کی مغنی [اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی گلوکار] Elleviou کی طرح ہے۔ گرما کے موسم میں تجھے آداب کرتا ہوں! اے لکسمبرگ! اے Madame اسٹریٹ اور Allee de l'Observatoire کی Georgics [قبلِ مسیح کی چار جلدوں پر مشتمل نظم]۔ اے پہلی صف کے فکرمند سپاہیو! اے تمام دل ربا نرسو، جو بچوں کی حفاظت بھی کرتی ہیں اور خود کو خوش بھی رکھتی ہیں، اگر ہمارے پاس Odeon کے بازار نہ ہوں تو امریکا کے لق و دق میدان مجھے خوش رکھیں گے۔ میری روح اچھوتے جنگلوں اور سبزہ زاروں میں منڈلاتی رہتی ہے۔ سب کچھ خوب صورت ہے۔ مکھیاں دھوپ میں بھنبھناتی ہیں۔ سورج نے پھولوں پر منڈلانے والی چڑیوں کو دھتکار دیا ہے۔ مجھے گلے سے لگا لو فانتین!"

اس نے غلطی کی، اور فیوریٹ سے بغل گیر ہو گیا۔

۞

گھوڑے کی موت

"یومباندا کے مقابلے میں Edon کے ڈنر بہتر ہوتے ہیں۔" زفایا نے اونچی آواز میں کہا۔

بلاش ویل نے اعلان کیا۔"میں یومباندا کو Edon سے بہتر سمجھتا ہوں۔ وہاں زیادہ آسائش ہوتی ہے۔ وہ زیادہ ایشیائی ہے۔ نیچے کی منزل کے کمرے پر نظر کیجیے: وہاں دیواروں پر [برفانی] آئینے ہیں۔"

فیوریٹ نے کہا۔"میں انھیں [برف کو] اپنی پلیٹ پر زیادہ پسند کرتی ہوں۔"

بلاش ویل اپنے کہے پر مصر رہا۔

"ذرا چاقوؤں پر نظر ڈالیے۔ یومباندا میں دستے چاندی کے ہوتے ہیں، جب کہ Edon میں ہڈی کے۔ اب چاندی ہڈی سے زیادہ قیمتی ہوگئی ہے۔"

"سوائے ان کے جن کی ٹھوڑیاں چاندی کی ہیں۔" تولومیے نے اپنا خیال پیش کیا۔

وہ معذوروں کے گنبد کی طرف دیکھ رہا تھا، جو یومباندا کی کھڑکیوں سے نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ایک وقفہ ہوگیا۔

"تولومیے!" فامالیا نے بلند آواز میں کہا۔"لیستولیے اور میں ابھی گفتگو کر رہے تھے۔"

"گفتگو اچھی چیز ہوتی ہے۔" تولومیے نے جواب میں کہا۔"لڑائی بہتر ہوتی ہے۔"

"ہم فلسفے پر اختلاف کر رہے تھے۔"

"اچھا؟"

"تم کس کو بہتر سمجھتے ہو، دیکارت (Descartes) کو یا اسپنوزا (Spinoza) کو؟"

"دیساگیے (Desaugiers) کو۔" تولوسیے نے کہا۔

اس فیصلے کا اعلان کرنے کے بعد، اس نے ایک چسکی لی اور مزید کہا:

"میں زندہ رہنے پر راضی ہوں۔زمین پر ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے، ہم اب بھی احمقانہ باتیں کر سکتے ہیں۔اس کے لیے میں لافانی خداؤں کا شکر گزار ہوں۔ ہم سب جھوٹ بولتے ہیں۔ ایک جھوٹ بولتا ہے، مگر دوسرا ہنستا ہے۔ایک قسم کھاتا ہے، مگر دوسرا شبہ کرتا ہے۔ استدلال سے غیر متوقع چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں ایسے بھی انسان ہیں جو متناقضات کے حیرت انگیز بکس کو کھولنا اور بند کرنا جانتے ہیں۔ خواتین کرام، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جو آپ اتنے اطمینان سے نوش فرما رہی ہیں Madeira کی وائن ہے، Coural Freiras das کے انگور کے باغات کی، جو سطح سمندر سے تین سو سترہ fathom [ایک فیدم 1.82 میٹر کے برابر ہوتا ہے] بلند ہے۔ پیتے وقت ذرا ہوشیار رہیے گا! تین سو سترہ fathom ! اور موسیو بومباندا بھی کیا لاجواب ریستوران چلانے والا ہے جو آپ کو ساڑھے چار فرانک میں تین سو سترہ fathoms دیتا ہے۔"

فامالیا نے ایک بار پھر مداخلت کی:

"تولوسیے، تمھاری رائے قانون درست کرتی ہے۔ تمھارا پسندیدہ مصنف کون ہے؟"

"بر......"

"کوئن؟"

"جی نہیں۔شو (Choux)"

اور تولوسیے نے اپنی بات جاری رکھی:

"بومباندا کو سلام! وہ Elephanta [اجنتا کے غار—ہندوستان] کے Munophis کے برابر ہو جائے گا، اگر وہ مجھے ایک ہندوستانی رقاصہ فراہم کر سکے، اور وہ Chaeronea [یونان کا ایک علاقہ] کا Thygelion [یونانی جشن] ہو جائے گا اگر وہ میرے لیے ایک یونانی طوائف لا سکے؛ اس لیے کہ اے خواتین! یونان اور مصر میں بھی بومباندا ہوا کرتے تھے۔ Apuleius [پہلی صدی عیسوی کا لاطینی زبان کا ایک نثر نگار] ان کا تذکرہ کرتا ہے۔ افسوس! ہر بار وہی بات، کوئی نئی بات نہیں، کوئی غیر شائع شدہ تخلیق نہیں! سالومن کہتا ہے : ایسی کوئی شے نہیں جو اس سورج کے نیچے نئی ہو۔ورجل کہتا ہے؛ ان سب سے محبت کرو؛ جیسی سے Carabine [چلنے والی بندوق] Saint-Cloud کے بجروں پر نصب کی جاتی ہے، جس طرح [پانچویں صدی قبل مسیح

کے ایک یونانی مدبر [Pericles] کے ساتھ [یونان کے ایک جزیرے Samos] کے بیڑے پر [اس کی داشتہ] Aspasia سوار ہو گئی تھی۔ بس، ایک آخری جملہ — خواتین! کیا آپ جانتی ہیں کہ Aspasia کسے کہتے ہیں؟ حالاں کہ وہ ایسے عہد میں زندہ تھی، جب عورتوں میں روح نہیں ہوا کرتی تھی، وہ روح تھی؛ ایک گلابی اور ارغوانی صورت والی، آگ سے زیادہ سوزاں، سویرے سے زیادہ تازہ۔ Aspasia ایسی مخلوق تھی جس میں نسوانیت کی دو انتہائیں یک جا ہو گئی تھیں؛ وہ دیوی طوائف تھی؛ جیسے Socrates کے ساتھ Manon Lescaut اوپرا۔ Aspasia اس لیے خلق کی گئی تھی کہ شاید Prometheus کو کبھی اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

تولومیے ایک دفعہ شروع ہو گیا تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا، اگر عین اس وقت ایک گھوڑا ساحل کے کنارے گر نہ گیا ہوتا۔ اس جھٹکے نے گاڑی اور خطیب دونوں کو رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ در اصل ایک لاغر اور عمر رسیدہ گھوڑی تھی جو قصائی کے قابل رہ گئی تھی، جو بہت بھاری گاڑی کھینچ رہی تھی۔ بوساندا کے سامنے پہنچتے ہی، اس ناتواں اور تھکی گھوڑی نے مزید چلنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے نے بہت سارے لوگ جمع کر دیے تھے۔ ابھی گاڑی بان نے لعنت ملامت اور برہمی کے عالم میں پوری طاقت سے اپنا بے رحم کوڑا چلایا ہی تھا کہ گھوڑی (jade) زمین پر گر پڑی اور پھر اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ قریب سے گزرنے والوں کے شور و غل کی آواز سن کر تولومیے کے زندہ دل سننے والوں نے اپنے سر گھمائے ہی تھے کہ تولومیے کو اپنی خطابت کو اس اداس یونانی گیت پر ختم کرنا پڑا:

"Elle etait de ce monde ou coucous et carrosses [3]
Ont le meme destin;
Et, rosse, elle a vecu ce que vivant les rosses,
L'espace d'un matin!"

"بے چاری گھوڑی۔" فانتین نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

اورڈیلیا نے بلند آواز میں کہا:

"ذرا فانتین کو دیکھو۔ وہ ایک گھوڑی کے لیے روہانسی ہو رہی ہے۔ بھلا، کوئی اس جیسا نرم دل احمق ہو سکتا ہے؟"

اسی لمحے فیورِیت نے، اپنے ہاتھ باندھ لیے، سر پیچھے کی طرف کیے ہوئے، تولومیے کی طرف گھور کر دیکھا، اور کہا "اب اپنی حیرت انگیز بات تو بتاؤ۔"

"بالکل ٹھیک۔ اب وقت آ گیا ہے۔" تولومیے نے جواب میں کہا، "حضرات، ان

خواتین کو حیران کرنے کا وقت آگیا ہے۔ خواتین! چند اور لمحے انتظار کیجیے۔"

"اس کی ابتدا ایک بوسے سے ہوتی ہے۔" بلاشی ویل نے کہا۔

"ماتھے پر۔" تولومیے نے اضافہ کیا۔

ہر ایک نے متانت سے اپنی معشوق کی پیشانی کو بوسہ عطا کیا؛ اس کے بعد وہ چاروں، اپنے لبوں پر انگلی رکھے، قطار میں دروازے سے باہر نکل گئے۔

فیوریٹ نے ان کی روانگی پر تالی بجائی۔

"اب لطف آنا شروع ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

فانتین نے زیرِ لب کہا "بہت دیر نہ کرنا، ہم تمھارے انتظار میں ہیں۔"

۞

نشاط کی انتہا

جب جوان لڑکیاں تنہا رہ گئیں تو ایک ساتھ دو دو کھڑکی کے چوکھٹ پر سہارا لیے، باتیں کرتیں، سارس کی طرح اپنی گردن نکالتیں، اور ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی باتیں کر رہی تھیں۔

وہ بو میانڈا سے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، نکلتے مردوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ثانی الذکر، پلٹے، ان کی طرف اشارے کیے، مسکرائے اور اتوار کی گرد آلود شام کے ہجوم میں، جو ہر ہفتے شاں زیلیزے پر حملہ آور ہوتا ہے، گم ہو گئے۔

"بہت دیر نہ کرنا۔" فانتین نے چیخ کر کہا۔

"وہ ہمارے لیے کیا لائیں گے؟" زفایا نے کہا۔

"ضرور کوئی نہ کوئی خوب صورت شے ہوگی۔" ڈیلیا نے کہا۔

"میں چاہتی ہوں" فیوریٹ نے کہا، "کہ سونے کی کوئی چیز ہو۔"

جلد ہی ان کی توجہ جھیل کے کنارے ہونے والی حرکات کی طرف مبذول ہو گئی، وہ جنھیں بڑے بڑے پیڑوں کی شاخوں کے درمیان سے دیکھ سکتی تھیں، جنھوں نے ان سب کو اپنے اپنے کام سے ہٹا دیا تھا۔

یہ وقت تھا ڈاک لے جانے والی گاڑیوں کی روانگی اور ان کی چھان بین کا۔ جنوب اور مغرب کی طرف جانے والی تقریباً تمام مسافر گاڑیاں شاں زیلیزے سے ہو کر گزرتی تھیں۔ ان کی اکثریت ساحل کے کنارے کنارے اور Passy نامی پشتے سے گزر کر جاتی تھی۔ لمبے لمبے، کچھ بھاری بھرکم گاڑیاں، کالے اور پیلے رنگ کی، بُری طرح بھری ہوئی، زور شور سے بھاگتی جاتی، صندوقوں، ترپالوں اور سپاہیوں کے تھیلوں سے لدی، گھوڑوں کی نالوں سے نکلنے والی

چنگاریوں سمیت، دھوئیں کی جگہ گرد اڑاتی، غیض و غضب کے ماحول میں، سڑک کے کناروں سے رگڑ کھاتی، پتھروں کو فولاد میں بدلتی، جلد ہی غائب ہو جاتیں۔ یہ شور و غوغا ان نوجوان لڑکیوں کو اچھا لگ رہا تھا۔ فیوریٹ نے خوشی سے چیخ کر کہا:

"کیا شور شرابا ہے! ایسا لگتا ہے، جیسے زنجیروں کا کوئی ڈھیر جا رہا ہو۔"

پھر یوں ہوا کہ ان گاڑیوں میں سے، جن کو درختوں کی آڑ کے باعث مشکل سے دیکھا جا سکتا تھا، ایک گاڑی ایک لمحے کے لیے رکی، پھر سرپٹ روانہ ہو گئی۔ فانتین یہ دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"یہ تو بڑی عجیب بات ہوئی۔" اس نے کہا "میں سمجھتی تھی کہ چھان بین کبھی نہیں رکتی۔"

اور لاپروائی سے فیوریٹ نے اپنے کندھے ہلا دیے۔

"فانتین پریشان ہو رہی ہے۔ میں اپنی تشفی کے لیے آ کر دیکھتی ہوں۔ یہ لڑکی معمولی معمولی باتوں پر گھبرا جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے تصور کر لو: میں ایک مسافر ہوں: میں چھان بین کرنے والوں سے کہتی ہوں کہ 'میں پہلے چلی جاتی ہوں؛ تم ساحل کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے لے لینا۔' چھان بین کرنے والا، میرے پاس سے گزرتا ہے، مجھ پر نظر ڈالتا ہے، اور مجھے لے لیتا ہے۔ یہ تو ہر روز ہی ہوتا ہے۔ جانِ من، تمھیں زندگی کے بارے کچھ علم نہیں۔"

اس سب میں کچھ وقت گزر گیا۔ پھر اچانک فیوریٹ نے ایسے آدمی کی طرح حرکت کی جو سوتے سے جاگ اٹھا ہو۔

"اچھا" اس نے کہا، "تو اس حیرت کا کیا ہوا؟"

"ارے ہاں" ڈیلیا نے لقمہ دیا، "وہ مشہور حیرت؟"

"اس میں ابھی بہت دیر ہے" فانتین نے کہا۔

ابھی فانتین نے اپنی حیرت بھری سانس مکمل کی ہی تھی، کہ ویٹر، جس نے انھیں کھانا پیش کیا تھا، داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خط جیسی کوئی چیز تھی۔

"یہ کیا ہے؟" فیوریٹ نے جواب طلب کیا۔

ویٹر نے جواب میں کہا "یہ کاغذ ہے جو وہ حضرات ان خواتین کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔"

"تم اسے فوراً ہی کیوں نہیں لائے؟"

"اس لیے" ویٹر نے کہا، "کہ ان لوگوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ اس کو ایک گھنٹے بعد خواتین کے حوالے کیا جائے۔"

فیوریٹ نے ویٹر کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ لیا۔ وہ دراصل ایک خط تھا۔

''ذرا ٹھہرو تو'' اس نے کہا، ''مگر اس پر کوئی پتا نہیں لکھا ہے، صرف اتنا لکھا ہے:''

یہی ہے وہ حیرت

اس نے تیزی سے خط پھاڑا، کھولا اور پڑھا [وہ پڑھ سکتی تھی]۔

''ہماری پیاری دوست لڑکیو:

تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے بھی والدین ہیں۔والدین ــــ جن کے بارے میں تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔شہری قانون کے مطابق یہ باپ اور ماں کہلاتے ہیں، جو اگرچہ طفلانہ بات ہے، مگر حقیقت ہے۔اب، یہ والدین آہیں بھرتے ہیں، یہ بوڑھے لوگ ہم سے التجا کرتے ہیں، یہ اچھے مرد اور اچھی عورتیں ہم کو اپنے فضول خرچ بیٹے کہتی ہیں؛ وہ ہماری واپسی کی خواہش کرتے ہیں، اور ہمارے لیے بچھڑے ذبح کرنے کی پیش کش بھی کرتے ہیں۔نیک ہونے کے باعث ہم ان کا حکم مانتے ہیں۔اس گھڑی جب تم اسے پڑھ رہی ہو گی، پانچ آتش نفس گھوڑے ہمیں اپنے پاپاؤں اور ماماؤں کے پاس اڑائے لیے جا رہے ہوں گے۔ہم جا رہے ہیں؛ ہم جا چکے ہیں۔ہم Lafitte [انیسویں صدی کا فرانسیسی قزاق] کے بازوؤں میں اور Caillard کے پروں پر بھاگ رہے ہیں۔Toulouse میں کی جانے والی جان نشانی ہم کو پاتال سے رہا کرا رہی ہے، اور وہ پاتال تم ہو۔اے ہماری پیاری حسیناؤ! ہم اپنی پوری رفتار سے، تین لیگ فی گھنٹے کی رفتار سے، واپس جا رہے ہیں سماج کی طرف، اپنے فرائض کی طرف اور احترام کی طرف۔یہ ہمارے ملک کی بھلائی کے لیے ضروری ہے، کہ بقیہ دنیا کی طرح ہم پریفکٹ بنیں، خاندانوں کے باپ بنیں، دیہی پولیس بنیں اور ریاست کے کاؤنسلر بنیں۔ہمارا احترام کرو۔ہم اپنے آپ کو قربان کر رہے ہیں۔جلد ہمارا غم کرو، اور تیزی سے ہمارا جانشین بناؤ۔اگر یہ خط تمھیں پارہ پارہ کر دیتا ہے تو تم اس کا بھی وہی حشر کرو۔الوداع!

تقریباً دو برس ہم نے تمھیں خوشیاں دی ہیں۔اس کے لیے ہمیں تم سے کوئی شکوہ نہیں۔

دستخط

بلاش ویل

فامالیا

لستولیے

تولومیے

''پس نوشت: ہم نے ڈنر کی قیمت ادا کر دی ہے۔''

ان چاروں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
فیوریت پہلی تھی جس نے سکوت توڑا تھا۔
"ٹھیک!" وہ چلائی، "یہ بہت خوب صورت دھوکا ہے، اور کچھ نہیں۔"
"عجیب بات ہے۔" زفایاما نے کہا۔
"ضرور، یہ بلاش ویل کی کارستانی ہوگی۔" فیوریت نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اب وہ مجھے محبت پر مجبور کر رہا ہے۔ جوں ہی وہ گیا ہے، اس سے محبت کی جارہی ہے۔ دراصل یہ بھی ایک عجیب ماجرا ہے۔"
"نہیں" ڈلیا نے کہا "یہ تولومیے کے خیالات میں سے ایک خیال تھا، صاف ظاہر ہے۔"
"تو پھر" فیوریت فوراً بولی، "بلاش ویل مردہ باد، اور تولومیے زندہ باد!"
ڈلیا اور زفایاما نے ایک ساتھ چیخ کر کہا "تولومیے زندہ باد!"
اور پھر وہ سب ہنس پڑیں۔
فانتیں بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگی۔
ایک گھنٹے بعد جب وہ اپنے کمرے میں واپس گئی تو رونے لگی تھی۔ یہ اس کا پہلا معاشقہ تھا، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں؛ اس نے خود کو شوہر کی طرح تولومیے کے حوالے کر دیا تھا؛ اس بے چاری کے ایک بچہ بھی تھا۔

ملاقات ایک ماں کی دوسری ماں سے

پچھلی صدی کی ابتدا میں پیرس کے قریب Montfermeil میں ایک قسم کی cook-shop تھی جو باقی نہیں رہی ہے۔ ایک صاحب جن کا نام تین آردیئے (Thenardier) تھا، میاں بیوی مل کر اس دکان کو چلاتے تھے۔ دُکان Boulanger نامی گلی میں واقع تھی۔ دُکان کے دروازے کے اوپر کی دیوار پر کیل سے نصب ایک بورڈ تھا۔ اس بورڈ پر ایک تصویر پینٹ کی گئی تھی جس میں ایک شخص، ایک اور شخص کو اپنی پیٹھ پر سوار کیے جاتا دکھائی دیتا تھا۔ پیٹھ پر سوار شخص ایک جرنیل تھا جو سنہرے رنگ کے جھبوں، بڑے بڑے نقرئی ستاروں سے مزین وردی پہنے تھا؛ اس کی وردی پر خون ظاہر کرنے کے لیے سرخ رنگ کے دھبے بنائے گئے تھے؛ تصویر کا بقیہ حصہ دھوئیں سے بھرا تھا، جو شاید کسی لڑائی کا منظر پیش کرنے کی کوشش تھی۔ اس کے نیچے ایک تحریر تھی:

'واٹرلو کا سارجنٹ'

کسی سرائے کے باہر گاڑی یا ٹرک کی موجودگی عام بات ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی، کوئی گاڑی یا اگر زیادہ صحیح طریقے سے کہا جائے تو، گاڑی کا ایک حصہ، جو 1818ء کے موسم بہار کی ایک شام 'واٹرلو کا سارجنٹ' نامی دُکان کے سامنے گلی کے کچھ حصے کو گھیرے ہوئے تھا، اس راستے سے گزرتے ہوئے کسی بھی مصور کو، یقیناً اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

گاڑی کا یہ حصہ، دراصل، ان ٹرکوں میں سامنے سے لگا سامان لے جانے والا ٹھیلا تھا، جو جنگلوں سے موٹے موٹے تختوں اور پیڑوں کے تنوں کو لے جانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ٹھیلے کے نیچے لوہے سے بنا ایک axle-tree نصب تھا جس کے درمیان بہت موٹا سا چھڑ لگا تھا جس میں دو بڑے بڑے پہیے لگے ہوئے تھے۔ یہ ڈھانچا بہت گٹھا ہوا، زبردست اور بدشکل

تھا۔ اس کو دیکھ کسی توپ گاڑی کا گمان ہوتا تھا۔ پہیے، دھرے، ایکسل اور اس میں لگا موٹا سا چھڑ راستے میں بنی ہوئی لیکھ سے اچھلنے والے کیچڑ سے اس قسم کے ڈراونے رنگ کا ہو گیا تھا، لوگ جن کو کتھیڈرلز کی زینت کے لیے بنائے جانے والے لگل بوٹوں میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ پہیوں کی لکڑی کیچڑ میں چھپ گئی تھی اور لوہا زنگ میں۔ axle-tree کے نیچے ایک زنجیر لٹکی تھی، جو اتنی مہیب تھی گویا کسی سزا یافتہ دیو ہیکل شخص کی لیے تیار کی گئی ہو۔ یہ زنجیر ہاتھی جیسے لیم شیم جانوروں کو قابو کرنے میں کام آسکتی تھی؛ یہ زنجیر اُن گیلیز [بادبانی جہازوں کے باورچی خانے جن میں سزا یافتہ مجرم قیدی بن کر کام کرتے ہیں] کے انداز کی تھی، جو کسی دیو کے پاؤں سے نکالی معلوم ہوتی تھی۔ شاید ہومر نے اپنے یک چشم دیو کو، اور شیکسپیر نے Caliban کو باندھنے میں اسے استعمال کیا ہوتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گلی میں عین اس جگہ پر اس ٹھیلے کا کام کیا تھا؟ پہلی وجہ تو شاید گلی میں مزاحمت پیدا کرنا تھی؛ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طرح زنگ لگنے کا عمل ختم ہو جائے گا۔ پرانے سماج میں اداروں کا ایک ہجوم ہوتا ہے، اور جب کوئی چہل قدمی کرنے باہر نکلتا ہے، تو وہ بھی اسی انداز میں سامنے آتا ہے؛ اس کے علاوہ وہاں اس ڈھانچے کی موجودگی کا کوئی اور جواز نہیں تھا۔

زنجیر کا مرکزی حصہ کسی جھولے کی رسّی کی طرح زمین کے بالکل قریب تک لٹک رہا تھا، اور اس شام اس میں دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بیٹھی ہوئی [جھولا جھول رہی] تھیں؛ ایک کی عمر ڈھائی برس رہی ہوگی، اور دوسری کی تقریباً اٹھارہ ماہ؛ چھوٹی عمر والی لڑکی بڑی کے بازوؤں میں تھی۔ وہ دونوں نہایت زیرکی سے ایک رومال میں باندھ دی گئی تھیں جو انھیں گرنے سے روک رہا تھا۔ ایک ماں نے اس خوف ناک زنجیر کو دیکھ کر کہا تھا، "بچوں کی تفریح کے لیے یہاں کچھ موجود تو ہے۔"

دونوں بچیاں خوب صورت لباس میں نفاست سے ملبوس تھیں، اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے؛ جیسے پرانے لوہے کے درمیان دو کھلتے ہوئے گلاب کے پھول؛ ان کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی؛ ان کے بچکانہ رخسار ہنسی سے گلنار ہو رہے تھے۔ ایک کے بال کتھئی رنگ کے اور دوسری کے بادامی رنگ کے تھے۔ ان کے معصوم چہرے دو حیران کن خوشیوں جیسے تھے؛ پھولوں سے بھری ایک جھاڑی کی طرح، قریب سے گزرنے والے جس کی خوش بو سے لطف اٹھاتے ہوں؛ اٹھارہ ماہ کی بچی نے اپنی تمام تر بچکانہ مگر پاک بازبے حیائی سے اپنا چھوٹا سا پیٹ کھلا رکھا تھا۔ ان دو نازک سروں کے اوپر اور اطراف، جو خوشیوں اور روشنی میں نہائے ہوئے تھے، زنگ سے کالا اور بھیانک دیو ہیکل ٹھیلا اپنے تمام پیچ دار خم اور بے ترتیب زاویوں سمیت

کسی غار کے دہانے پر بنی ہوئی محراب کی طرح ایستادہ تھا۔ چند قدم آگے، سرائے کی ڈیوڑھی پر جھکی ہوئی [لڑکیوں کی] ماں جو کسی طرح بھی دل کش نہیں تھی، حالاں کہ اس لمحے بُری بھی نہیں لگ رہی تھی، ایک لمبے سے چھڑ کے ذریعے بچوں کو جھلا رہی تھی، ساتھ ہی حادثات کے خوف کے پیش نظر ان پر کسی جانور جیسے فطری انداز میں، جو مادرانہ جبلت سے مخصوص ہوتی ہے، نظر جمائے ہوئے تھی۔ آگے اور پیچھے جھولتی زنجیروں کی کڑیوں سے غصے کی چیخ جیسی تیز آوازیں آرہی تھیں؛ لڑکیاں بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں؛ ڈوبتے سورج کی روشنی اس خوشی میں گھل مل گئی تھی، جس نے اس بھیانک زنجیر کو دو حور جیسی بچیوں کا جھولا بنا دیا تھا۔

بچیوں کو جھلاتے ہوئے ماں ایک نا موزوں مگر رومانوی آواز میں گنگنا رہی تھی:

It must be, said a warrior.

اپنے گیت کی دھن، اور بچیوں کے دھیان نے اس کو سڑک کے مناظر اور آوازوں سے بے خبر کردیا تھا۔

اس دوران، جب وہ ایک رومانوی شعر کی ابتدا کر رہی تھی، کسی نے بہت قریب آکر اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"آپ کی دونوں بچیاں بہت پیاری ہیں، مادام

"To the fair and tender Imogene--

جواب میں ماں نے اپنے رومانوی گیت کا دوسرا مصرع گنگناتے ہوئے اپنا سر موڑ لیا۔

اس سے چند قدم آگے ایک عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کی گود میں بھی ایک بچی تھی جسے وہ اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے تھی۔

بچی کے علاوہ، وہ عورت ایک بڑا سا تھیلا بھی لیے ہوئے تھی، جو دیکھنے میں بہت بھاری معلوم ہو رہا تھا۔

اس عورت کی بچی ربانی تخلیق کی بہترین مثال، اور واقعی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ بچی دراصل، دو یا تین برس کی تھی۔ جہاں تک اس کے لباس کی عشوہ طرازی کا معاملہ تھا، وہ ان دو بچیوں کے مقابلے میں آسکتی تھی [جو زنجیر پر بیٹھی جھول رہی تھیں]؛ اسے نفیس کپڑے سے بنی ٹوپی پہنائی گئی تھی، اس کے سینہ بند پر ربن بندھے تھے، اور ٹوپی میں لیس کی جھالر لگی تھی۔ اس کی اسکرٹ کی پرتیں اس طرح اوپر کی طرف اٹھی تھیں کہ اس کے سفید، گول اور ننھے ننھے گڑھوں والے پیر نظر آرہے تھے۔ اس کی صحت قابلِ تعریف اور پھول جیسی تھی۔ اس بچی کے چھوٹے چھوٹے

رخسار کو سیب کی طرح کاٹ کھانے کو جی چاہتا تھا۔اس کی آنکھوں کے بارے میں زیادہ نہیں کہا جاسکتا، سوائے اس کے کہ بہت بڑی تھیں اور پلکیں لاجواب تھیں۔لڑکی ماں کی گود میں سو رہی تھی۔

وہ اتنے ہی مکمل اعتبار اور سکون سے سو رہی تھی جو اس کی عمر کا خاصہ تھا۔ ماؤں کی گود نزاکتوں سے بنی ہوتی ہیں؛ بچے ان میں گہری نیند سوتے ہیں۔

اس کی ماں، دیکھنے میں افسردہ اور افلاس کی ماری لگتی تھی۔ وہ ایسا لباس پہنے ہوئے تھی، جو کسی ملازمت کرنے والی عورت کا ہوتا ہے جو ایک بار پھر کسان عورت بننے کی خواہش رکھتی ہو۔عورت نوجوان تھی، مگر کیا وہ خوب صورت تھی؟ شاید! مگر اس کے لباس سے تو ایسا ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے گیسو، جن کا سنہرا پن غائب ہوگیا تھا، بہت موٹے لگ رہے تھے، مگر سختی سے گندھے، نہایت بدصورت، تنگ، اور کسی راہبہ جیسی ٹوپی میں چھپائے گئے تھے، جس کو ٹھوڑی کے نیچے سے باندھا گیا تھا۔تبسم خوب صورت دانتوں کا مظاہرہ کرتا ہے، مگر وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔اس کی آنکھیں زیادہ عرصے سے خشک نہیں تھیں۔ اس کا رنگ ہلکا پیلا سا تھا؛ وہ کم زور اور بیار سی لگتی تھی۔ وہ اپنی گود میں سوئی ہوئی بچی کو ویسی ہی نظروں سے گھور رہی تھی جس طرح کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ پلانے کے بعد دیکھتی ہے۔ایک بڑا سا رومال، جیسا کہ معذور لوگ پہنتے ہیں، کاندھے پر ڈالی جانے والی شال کی طرح عورت کے شانوں پر پڑا تھا، جس سے اس کا جسم بے ڈھنگے پن سے چھپایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ دھوپ سے سیاہ ہو گئے تھے، جس پر جا بجا دھبے تھے، اس کی انگشتِ شہادت سخت اور سوئیوں کے استعمال سے کئی چھدی تھی؛ وہ کتھئی رنگ کا اونی لبادہ اور بھدے جوتے پہنے ہوئے تھی۔

اس کا نام فانتین تھی۔

جی ہاں! وہ فانتین ہی تھی مگر مشکل سے پہچانی جاتی تھی۔ پھر بھی، اگر غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ وہ اب بھی ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس کے دائیں رخسار کی غم زدہ شکن طعن آمیزی کی ابتدا لگ رہی تھی۔ اس کا ہوا جیسے تن زیب اور ریشن پر مشتمل لباس، جو طرب، نافہمی، موسیقی، گھنٹیوں سے بنا، اور بنفشے کے پھولوں کی خوش بو سے معطر معلوم ہوتا تھا، افسردگی کی سفیدی پالے کی طرح اس کے چہرے پر پگھل گئی تھی، جس پر سورج کی روشنی میں کسی ہیرے کا گمان ہوتا تھا جو ایک کالی سطح چھوڑ گیا ہو۔

کھیل تماشے کو دس مہینے گزر گئے تھے۔

ان دس مہینوں میں کیا ہوگیا تھا؟ خدا ہی جانتا ہے۔

ان چار لڑکوں کے اس طرح بھاگ جانے کے بعد حالات بالکل بدل گئے تھے۔
فاتین جلد ہی فیوریٹ، زفایا، اور ڈیلیا سے بچھڑ گئی تھی؛ مردوں کی طرف سے توڑے جانے والے
رشتوں کے بعد عورتوں کی دوستی بھی کم زور ہو گئی تھی؛ اگر دو ہفتے بعد کوئی ان سے کہتا کہ ان کے
درمیان کتنی گہری دوستی تھی تو وہ سُن کر حیرت زدہ رہ جاتیں؛ دوستی کی اب کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی
تھی۔ فاتین اکیلی ہو گئی تھی۔ اس کی بچی کا باپ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا— افسوس! کہ ایسی
جدائیاں ناقابلِ تنسیخ ہوا کرتی ہیں۔ وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی؛ سوائے کام کرنے کی عادت کے، وہ
خوشیوں کا مزہ تک بھول گئی تھی۔ تولومیے سے علاحدگی کے بعد، اور اس کام سے نفرت کے اظہار
کے باعث صرف وہ جس سے واقف تھی، اس نے اپنی دُکان کھلی رکھنے سے غفلت برتی؛ اس کے
لیے اب وہ دُکان بند ہو چکی تھی۔ اس کے پاس اور کوئی ذریعہ معاش کا نہیں تھا۔ فاتین تھوڑا بہت
پڑھ سکتی تھی، لکھ نہیں سکتی تھی؛ بچپن میں صرف اپنا نام لکھنا سیکھا تھا۔ اس نے کرایے کے منشی سے
تولومیے کے نام ایک خط لکھوایا؛ پھر دوسرا؛ پھر تیسرا۔ تولومیے نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ فاتین
لوگوں کو باتیں کرتے سنتی، جو اس کے بچے کو دیکھ کر کہا کرتے تھے، "ایسے بچوں کی بھلا کون پروا
کرتا ہے؟ ایسے بچوں کو دیکھ کر لوگ صرف کاندھے ہی ہلا سکتے ہیں۔" تب اسے تولومیے کا زیادہ
خیال آتا جس نے بھی اس کی بچی کو دیکھ کر اپنے کاندھے ہلا دیے تھے، اور جس نے اس معصوم کی
سنجیدگی سے پروا نہیں کی تھی۔ اب اس کا دل اُس آدمی کی طرف سے بیزار ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ کر
بھی کیا سکتی تھی؟ اب وہ کس سے رابطہ کرتی۔ اس نے ایک غلطی کی تھی، مگر اس کی فطرت کی بنیاد،
جیسی کہ اسے یاد ہے، شرم و حیا اور نیکیوں پر رکھی گئی تھی۔ اس کو احساس ہو چلا تھا کہ وہ مشکلوں میں
گرفتار ہونے والی ہے، اور حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔ اسے ہمت کی ضرورت
تھی؛ وہ ہمت والی تھی، اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا۔ اس کے دل میں اپنے آبائی شہر
واپس جانے کا خیال ابھرا۔ وہاں کے لوگ اسے جانتے ہوں گے، کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے
گا۔ مگر اسے اپنی غلطی کو چھپانا ضروری ہوگا۔ اسی الجھن میں اس نے ایک اور علاحدگی کے بارے
میں سوچا، جو شاید پہلی علاحدگی سے زیادہ پُر درد ہوگی۔ اس کو سوچ کر ہی اس کا دل ڈوبنے لگا تھا،
مگر اس نے اپنے تئیں عہد کر لیا تھا۔ فاتین، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، زندگی کے
معاملے میں بہت ہمت والی تھی۔ اس نے بہادری کے ساتھ اپنا بناؤ سنگھار چھوڑ دیا، صرف تن
زیب پہننا شروع کر دیا، اور اپنی تمام ہنرمندی، اپنے تمام زیورات، سارے ربن، سارے گوٹے
کناری بچی کے لیے مختص کر دیے، جو اس کا سب کچھ تھی؛ اس کے لیے کتنی متبرک شے تھی وہ۔

اس نے اپنا سارا اثاثہ فروخت کر دیا، جس سے دو سو فرانک ملے؛ اس کے چھوٹے چھوٹے قرض ادا ہو گئے، اب اس کے پاس صرف اسّی فرانک بچ رہے تھے۔ بائیس برس کی عمر میں، اپنی بچی کو پشت پر لادے، موسمِ بہار کی ایک صبح اس نے پیرس کو خیر باد کہا۔ جو کوئی بھی ان دونوں کو اس طرح گزرتے دیکھتا، ان پر رحم کھاتا۔ اس عورت کے پاس پوری دنیا میں ایک بچی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا، اور اس بچی کے پاس پوری دنیا میں اس عورت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فانتین اپنی بچی کو اپنا دودھ پلاتی تھی، جس سے اس کی چھاتیاں دکھنے لگی تھیں، اسے کھانسی بھی آنے لگی تھی۔

اب ہم موسیو فیلکس تولومیے کے بارے میں بات نہیں کریں گے۔ بس اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ، بیس برس بعد، شاہ لوئی فلیپ کے زمانے میں، وہ ایک بڑا صوبائی وکیل، دولت مند اور با رسوخ، ہوش مند منتخب کرنے والا، اور نہایت سخت قسم کا جیوری بن گیا تھا؛ اب بھی وہ عیاشی کا رسیا تھا۔

وقتاً فوقتاً آرام کی خاطر رکتی، تین یا چار سُو ئی لیگ کرایے کے عوض ''ملاقاتی بس سروس'' پر سفر کرتی، دوپہر کے وقت فانتین پیرس کے مضافات Montfermeil پہنچی جو Boulanger کی وادی میں واقع ہے۔

جب وہ تین آردیے نامی سرایے کے پاس سے گزر رہی تھی، اسے دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک بھیانک آہنی زنجیر میں جھولا جھولتی دکھائی دیں؛ ان کے انداز نے اس کو اتنا حیران کر دیا کہ وہ اس خوش نما منظر کو دیکھنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

جادو کا وجود ہوتا ہے، اور یہ دو بچیاں اس ماں کے لیے جادو بن گئی تھیں۔

وہ ان کو بڑے جوش و جذبے کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ فرشتے کی موجودگی جنت کا اعلان ہوتی ہے۔ وہ تصور میں اس سرائے کے اوپر عاقبت اندیشی کی ایک پُر اسرار جنت دیکھ رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ دو مخلوق بہت خوش تھیں۔ فانتین نے ان کی جانب غور سے دیکھا، انھیں پسند کیا، ایسے جذبے سے کہ اس وقت جب ان کی ماں گانے کے دو مصرعوں کے بعد سانس لینے کے لیے رکی تھی، وہ اپنا جملہ دہرانے سے باز نہیں رہ سکی تھی، جو ہم ذرا پہلے پڑھ چکے ہیں۔

''آپ کی دونوں بچیاں بہت پیاری ہیں، مادام۔''

خطرناک ترین مخلوقات بھی اپنے بچوں سے محبت دیکھ کر نرم پڑ جاتی ہیں۔

ماں نے سر اٹھا کر اُس کا شکریہ ادا کیا، اور اس مسافر عورت کو دروازے کے سامنے پڑی بنچ پر بیٹھنے کی پیش کش کی، جب کہ وہ خود سرائے کی ڈیوڑھی پر بیٹھی تھی۔ دونوں نے آپس میں بات چیت شروع کی۔

"میرا نام مادام تِن آردیئے" دونوں بچیوں کی ماں نے کہا "ہم یہ سرائے چلاتے ہیں۔"
اور، اپنے روماتوی انداز میں واپس جاتے ہوئے وہ دانتوں تلے گنگنانے لگی:

"یہی سچ ہے، کہ میں بڑا بہادر ہوں۔
میں تو چلا فلسطین کو"

یہ مادام تِن آردیئے جس کا رنگ روپ اسکاٹ لینڈ والوں جیسا تھا— اپنی تمام تر ناپسندیدگی کے ساتھ جیسی کہ فوجیوں کی بیویاں ہوا کرتی ہیں— تیکھے مزاج کی دبلی پتلی عورت تھی؛ اور سب سے عجب، اس کی حسرت زدگی تھی جو معاشقوں کے دیکھنے سے اس پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ ایک سادہ لوح تبسم خیز، مگر مردانہ نوعیت کی مخلوق تھی۔ پرانے معاشقے وہی اثر ڈالتے ہیں جب ان کو cook-shop کی کسی عورت کے تصور سے متصادم کیا جاتا ہے۔ وہ اب بھی جوان تھی؛ مشکل سے تیس برس کی رہی ہو گی۔ اگر یہ خوشامدی عورت تن کر کھڑی ہو جاتی تو اس کی ساخت اور بلند قامتی پہلے تو مسافر کو خوف زدہ کر دیتی، اس کے اعتماد کو مشکل میں ڈال دیتی۔ کوئی جو تن کر کھڑا ہونے کے بجائے بیٹھا ہو، اس کے ساتھ قسمت بھی ویسا ہی سلوک کرتی ہے۔

مسافر عورت نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اپنی کہانی سنا دی۔

کہ وہ ملازمت کرتی تھی؛ کہ اس کا شوہر انتقال کر گیا تھا؛ کہ پیرس میں اس کا کام بگڑ گیا تھا، اور یہ بھی کہ وہ کسی اور جگہ، اپنے وطن کے کسی حصے میں کام کرنے والی تھی؛ کہ آج صبح ہی وہ پا پیادہ پیرس چھوڑ کر روانہ ہوئی تھی؛ کہ چوں کہ اس کی اپنی بچی بھی اس کے ساتھ تھی، اور وہ بہت تھک گئی تھی، Villemomble جانے والی گاڑی ملتے ہی اس پر سوار ہو گئی تھی؛ کہ Villemomble سے Montfermeil تک وہ پیدل چل کر آئی تھی؛ کہ اس کی بچی بھی کچھ دیر پیدل چلی تھی، مگر زیادہ دور تک نہیں، اس لیے کہ وہ بہت چھوٹی تھی، اور یہ بھی کہ اسے بھی ساتھ لانا تھا، اور اس کا نگینہ تھک کر سو گیا تھا۔

یہ کہہ کر اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی بیٹی پر ایک بوسہ جڑ دیا، جس نے بچی کو جگا بھی دیا تھا۔ بچی نے اپنی ماں جیسی بڑی بڑی نیلی آنکھیں کھولیں، ادھر ادھر دیکھا، مگر کس طرف؟ کسی خاص طرف نہیں؛ بالکل اسی طرح جیسے بچے کبھی کبھی پُر اسرار سنجیدگی سے کچھ دیکھنے لگتے ہیں، جو ان کی منور معصومیت اور فطری نیکی کے باعث ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بچے خود کو فرشتوں کی طرح محسوس کرنے لگتے ہیں؛ اور ہمیں انسان سمجھتے ہیں۔ پھر اس بچی نے ہنسنا شروع کر دیا؛ اور حالاں کہ ماں نے اسے بھینچ رکھا تھا، وہ چھوٹے بچوں کی مغلوب نہ ہونے والی طاقت

کے ذریعے پھسل کر زمین پر گر پڑی۔ دراصل اسے اچانک زنجیر میں جھولتی دونوں بچیاں نظر آ گئی تھیں؛ وہ چونک کر رُک گئی، اور تعریف کے اشارے کے طور پر اس نے اپنی زبان باہر نکال دی۔

ماں تھی آردیے نے اپنی بچوں کو رومال سے آزاد کیا، ان کی جھولے سے اترنے میں مدد کی اور کہا، ''جاؤ، اب تم تینوں مل کر کھیلو۔''

ایسی عمر میں بچے بہت جلد ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں؛ اور چند منٹ کے بعد ہی چھوٹی تھی آردیے بچیاں نووارد کے ساتھ مل کر کھیلنے لگیں، زمین میں سوراخ بنانے لگیں جس سے انھیں مزہ آنے لگا تھا۔

نووارد بچی بہت خوش مزاج تھی؛ ماں کی نیکی ہمیشہ بچوں کی نیکیوں میں تحریر ہوتی ہے۔ بچی نے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا، اور پوری تن دہی سے اتنا بڑا گڑھا کھود لیا جو کسی مکھی کے [دفن کے] لیے کافی ہوتا۔ جب کوئی بچہ گورکن کا کام کرنے لگے تو وہ تفریح کا موضوع بن جایا کرتا ہے۔

دونوں عورتیں اپنی گپ شپ میں مصروف رہیں۔

''تمھاری بچی کا نام کیا ہے؟''

''کوزیت۔''

کوزیت کو یوفرازی (Euphrasie) پڑھیے۔ بچی کا نام دراصل یوفرازی ہی تھا، مگر ماں نے ان پیار بھرے جذبات کے زیرِ اثر جو جبلتِ مادری ہوتی ہے یوفرازی کو کوزیت بنا لیا تھا؛ جیسے مائیں اور عام لوگ Josepha کو Pepita، اور Francoise کو Sillette بنا لیتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی مشق ہوتی ہے جس سے لوگ علمِ صرف و نحو کی سائنس کو بے ترتیب بنا دیتے ہیں، الجھا دیتے ہیں۔ ہم ایک دادی کو جانتے ہیں جس نے اپنی Theodore کو Gnon میں تبدیل کر دیا تھا۔

''کیا عمر ہے اس کی؟''

''تین کی ہونے والی ہے۔''

''میری بڑی لڑکی کی بھی یہی عمر ہے۔''

اس دوران جب تینوں بچیاں ایک ساتھ گھل مل کر کھیلنے میں مصروف تھیں، ایک واقعہ رونما ہو گیا؛ زمین کے اندر سے ایک بڑا سا کیڑا نکل آیا، جس سے بچیاں ڈر گئیں؛ اور خوف سے چیخنے لگی تھیں۔

تینوں ماتھے ایک دوسرے سے اس طرح مل گئے، جیسے ایک نورانی تاج میں تین

سرداخل ہو گئے ہوں۔

"کتنی جلد بچے ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں۔" مادر تنی آردیے نے کہا، "ان کو دیکھ کر قسم کھائی جاسکتی ہے کہ یہ تینوں آپس میں بہنیں ہیں۔"

اس جملے نے وہ شرارہ پیدا کردیا، دوسری عورت جس کے انتظار میں تھی۔ اس نے تنی آردیے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا:

"کیا تم میری بچی کو میری خاطر اپنے پاس رکھ لوگی؟"

تنی آردیے نے حیرت میں ویسی ہی حرکات کیں جن سے نہ رضامندی کا اظہار ہوتا ہے نہ انکار کا۔

کوزیٹ کی ماں کہتی گئی:

"دیکھو، میں اپنی بچی کو دیہات نہیں لے جاسکتی۔ میرا کام اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔ ایک بچے کے ساتھ کام کا موقع نہیں ملتا۔ دیہات کے لوگ بہت فضول ہوتے ہیں۔ یہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ میں تمھاری سرائے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ جوں ہی میں نے تمھاری اتنی پیاری پیاری، اتنی صاف ستھری، اتنی خوش مزاج بچیاں دیکھیں، میں بہت خوش ہوئی، اور میں نے خود سے کہا تھا، 'کتنی اچھی ماں ہے یہ۔ بس میں یہی تو چاہتی تھی۔ یہ تینوں بہنیں جیسی ہو جائیں گی۔' مجھے واپسی میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ کیا تم میری خاطر میری بچی کو رکھ لیا کرو گی؟"

"سوچنا پڑے گا۔" تنی آردیے نے کہا۔

"میں تم کو چھ فرانک ماہانہ دیا کروں گی۔"

اور پھر، cook-shop کی گہرائی سے ایک مردانہ آواز ابھری:

"سات فرانک سے کم نہیں؛ چھ ماہ کی ادائیگی پیشگی۔"

تنی آردیے نے کہا، "چھ ضرب سات، بیالیس ہوتے ہیں۔"

ماں نے کہا، "دوں گی۔"

اس کے علاوہ پندرہ فرانک متفرق اخراجات کے لیے۔" مردانہ آواز نے اضافہ کیا۔

"یعنی، کل جمع ستاون فرانک۔" مادام تنی آردیے نے کہا۔ اور پھر وہ مبہم انداز میں وہی گیت گنگنانے لگی۔

"it must be, said a warrior."

"میں یہ رقم ادا کروں گی۔" ماں نے کہا، "میرے پاس اسی فرانک موجود ہیں؛ گاؤں

تک جانے کے لیے کافی بچ رہیں گے؛ گاؤں تک میں پیدل جاؤں گی۔ میں وہاں کماؤں گی، اور جوں ہی کچھ پس انداز ہوگا، میں اپنی پیاری کے پاس واپس آجایا کروں گی۔"

مرد کی آواز پھر آئی:

"بچی کے پاس کپڑے ہیں؟"

"میرا شوہر ہے۔" سرائے والی نے کہا۔

"یقیناً، میری پیاری کے پاس بہت سارے کپڑے ہیں — میں سمجھ گئی تھی کہ یہ تمھارا شوہر ہوگا — اور ایک بہت اچھا لباس بھی ہے! احمقانہ لباس۔ ہر شے درجنوں کی تعداد میں ہے؛ کسی لیڈی کی طرح کا ایک ریشمی گاؤن بھی ہے۔ یہ سب کچھ میرے سفری تھیلے میں موجود ہے۔"

"یہ سب تمھیں ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔" ایک بار پھر مرد کی آواز آئی۔

"یقیناً، میں سب کچھ تمھارے حوالے کر دوں گی۔" ماں نے کہا، "کتنی عجیب بات ہو گی اگر میں اپنی بچی کو ننگی بوچی تمھارے حوالے کروں؟"

اب مالک کا چہرہ نظر آیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

سودا طے ہو گیا۔ ماں نے رات سرائے میں بسر کی، رقم اور بچی کو ان کے حوالے کیا، اپنے سفری تھیلے کو ایک بار پھر ٹھیک ٹھاک کیا کہ بچی کے کپڑے نکل جانے کے بعد تھیلا خاصا ہلکا ہو گیا تھا۔ دوسری صبح وہ روانہ ہو گئی، جلد واپس آنے کے ارادے کے ساتھ۔ لوگ ایسے سفر اطمینان سے کرتے ہیں؛ مگر یہاں تو مایوس لوگ تھے۔

سرائے سے نکلتے وقت ایک پڑوسن اس ماں سے ملی تھی۔ واپس آکر اس نے کہا تھا، "میں نے ابھی سڑک پر ایک عورت کو روتے دیکھا ہے، اس طرح کہ میرا دل پسیج گیا ہے۔"

جب کوزیٹ کی ماں جا چکی تب، اس آدمی نے اپنی عورت سے کہا تھا:

"اب میں اپنے ایک سو دس فرانک کے رقعے کی ادائیگی کر سکوں گا، جو کل ہونی تھی؛ میرے پاس پچاس فرانک کی کمی تھی۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میرے پاس قرق امین آنے والا تھا، اور رقم کا کئی بار تقاضا ہو چکا ہے؟ تم نے اپنی بچیوں کے ذریعے اچھا جال بچھایا۔"

"مگر، جان بوجھ کر نہیں۔" عورت نے کہا۔

دو ناخوش گوار شخصیتوں کا پہلا خاکہ

پکڑا جانے والا موش قابلِ رحم نمونہ تھا؛ مگر بلی تو دُبلے پتلے موش پر بھی خوش ہو جاتی ہے۔

یہ تھی آردیے کون لوگ تھے؟

پہلے ہمیں چند لفظ کہنے دیجیے۔ ان کا خاکہ ہم بعد میں مکمل کریں گے۔

یہ لوگ حرامی قسم کے گھٹیا لوگوں کے طبقے میں سے تھے جو کامیاب ہو گئے ہیں، اور ان عقل مند لوگوں میں سے تھے جو اس سطح پر اتر آئے ہیں جو درمیانہ درجے اور کم تر درجے کی درمیانی سطح کہلاتی ہے، جس میں دوسرے درجے کی کم اور پہلے درجے کی تمام خرابیاں شامل تھیں، جن میں نہ مزدور کی فیاض محنت کو، نہ بورژوا درجے کی ایمان داری کو پرکھا گیا تھا۔

یہ لوگ اس بونی فطرت والوں میں سے تھے جنھیں اگر بجھتی ہوئی آگ اتفاق سے تھوڑی سی گرمی پہنچا دے تو یہ دیوہیکل بن جاتے ہیں۔ اس عورت میں بے رحمی کی ایک زیریں لہر جاری تھی، اور مرد میں بدمعاشی کے سارے عناصر موجود تھے۔ دونوں میں وہ بھیانک نمو پائی جاتی تھی جو بلند ترین درجے کی برائی سے حاصل کی جاتی ہے۔ ان میں کیکڑے جیسی روح تھی جو مسلسل اندھیروں کی طرف پسپا ہوتی اور، زندگی میں آگے بڑھنے کے بجائے واپس ہوتی رہتی ہے اور تجربے کے استعمال سے اپنی بدہیئتی اور سیاہی کو بڑھاتی رہتی ہے۔ یہ دونوں، مرد اور عورت ایسی ہی روحوں کے مالک تھے۔

کسی قیافہ شناس کے لیے بھی، بالخصوص تھی آردیے کے بارے میں، کچھ جاننا مشکل ہوتا ہے۔ آپ صرف کچھ لوگوں کی طرف اعتبار نہ کرنے کے لیے بھی دیکھ سکتے ہیں؛ اس لیے کہ آپ انھیں دونوں جانب سے ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ وہ سامنے سے مضطرب اور پیچھے سے تہدید

آمیز ہوتے ہیں۔ ان کے بارے کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں آپ جن سے واقف نہیں ہوتے۔ کوئی ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے، یا وہ کیا کرنے والے ہیں۔ ان کی نظروں میں جو شبہ لہراتا رہتا ہے وہی ان کو رسوا کرتا ہے۔ ان کے کہے محض چند الفاظ کو سن کر یا ان کو اشارے کرتے دیکھ کر آپ ان کے ماضی کے دھندلے اسرار اور مستقبل میں پیدا ہونے والے رازوں سے واقف ہو سکتے ہیں۔

یہ تین آردیے کبھی ایک سپاہی ہوا کرتا تھا — خود وہ اپنے آپ کو سارجنٹ کہتا تھا۔ شاید وہ 1815ء کی لڑائی میں شامل رہا تھا، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے خاصی بہادری بھی دکھائی تھی۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس میں کتنی سچائی تھی۔ اس کی سرائے کا سائن بورڈ اس کے اپنے خیالات کی کرتب بازی تھا۔ اس نے خود ہی اس کو پینٹ کیا تھا؛ اس لیے کہ وہ تھوڑا بہت ہر کام کرنا جانتا تھا، مگر بری طرح۔

یہ وہی زمانہ تھا جب قدیم کلاسیکی رومان جو Clelie [507 قبل مسیح کی رومی جمہوریہ کی ہیروئن کے بارے میں بنی تصاویر] کے بعد سوائے Lodoiska [اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک اوپیرا] کے کچھ اور نہیں رہ گیا تھا پھر بھی شریفانہ تھا، مگر پہلے سے زیادہ بیہودہ ہو گیا تھا۔ جو میڈموزیل de Scuderi [لوئی چہاردہم کے زمانے کی ایک داستان کی شاعرہ] سے گر کر مادام Bournon-Malarme، اور مادام Lafayett سے مادام Barthelemy-Hadot [اٹھارویں صدی کی ایک ناول نگار] ہو گیا تھا اور پیرس کی زنِ دربانیاں کے محبت بھرے دلوں کو آگ لگا رہا تھا، حتیٰ کہ مضافات کو بھی کسی حد تک تباہ و برباد کر رہا تھا۔ مادام تین آردیے میں بس اتنی ذہنی صلاحیت تھی کہ وہ اس قسم کی کتابوں کو پڑھ سکتی تھی۔ وہ انھیں پر زندہ تھی۔ اس نے ان ہی میں اپنا سارا دماغ غرق کر دیا تھا۔ جب وہ نوجوان تھی، بلکہ اس کے بعد بھی، اپنے شوہر کی طرف ایک قسم کا فکر مندانہ رویہ رکھنے پر مجبور ہو گئی تھی، جو بے دلی سے کام کرنے والا، قواعد کے اعتبار سے غنڈہ، ایک ہی وقت میں کبھی ٹاٹ اور کبھی ریشم، مگر، جہاں تک جذباتیت اور حساسیت کا معاملہ تھا، [اٹھارویں صدی کے ناول اور ڈراما نویس] Pigault-Lebrun کے الفاظ میں اور "جنسیات کے معاملے میں" — خود اس کی اپنی مخصوص بولی میں — سر سے پا تک ایک ناقابلِ ترمیم زبان دراز تھا۔ اس کی بیوی عمر میں اس سے بارہ یا پندرہ برس چھوٹی تھی۔ بعد میں، جب بیوی کے رومانوی انداز میں بنائے جانے والے بال سفید ہونے لگے تھے، وہ Pamela [تتلی] سے Magaera [یونانی اساطیر کی ایک حاسد کردار] بنتی گئی تھی، موٹی تین آردیے سوائے ایک

اکھڑ اور بدکار عورت کے اور کچھ نہیں رہ گئی تھی، اور احمقانہ رومانوں میں لت پت رہنے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے سب سے بڑی لڑکی ایپونین: کہلائی، جب کہ بے چاری چھوٹی لڑکی گلنار (Gulnare) کہی جانے لگی تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس پر Ducray-Dumenil [اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک شاعر، ناول نگار] کے رومان کا کیا اثر پڑا تھا کہ اس کا نام آزیلما (Azelma) پڑ گیا تھا۔

بہرحال، ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اس زمانے میں، ہم جس کو کنایے میں بیان کر رہے ہیں، سب کچھ نامعقول اور سطحی ہی نہیں ہوتا تھا، جس کو پوچھے کے ناموں کی افراتفری کا وجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس رومانوی عنصر کے ساتھ ساتھ جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، یہ سب ایک سماجی علامت بھی ہے۔ آج کل یہ کچھ انوکھی بات نہیں کہ نچلے درجے کے کسی لڑکے کو آرتھر، الفریڈ یا الفانسے کا نام دیا جائے، اور کسی نواب کو — اگر اب بھی کوئی نواب باقی ہے — تھامس، Pierre یا ژاک کہہ کر پکارا جائے۔ یہ بے ترتیبی جو خوش نما نام کو ادنیٰ بنا دیتی ہے اور دیہاتی نام کو شریف کر دیتی ہے، مساوات کے گرداب کے سوا کچھ نہیں۔ نئے خیالات کا یہ ناقابلِ مزاحمت دخول موجود ہے اور ہر جگہ ہے۔ اس واضح بے آہنگی کے نیچے ایک گہرائی ہے — انقلابِ فرانس!

۞

لارک

کسی میدان میں ترقی کرنے کے لیے صرف بدمعاش ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ تین آردیے کی cook-shop کا حال دگرگوں تھا۔

مسافرعورت کے شاون فرانک کے طفیل تین آردیے اپنے دستخط اور اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اگلے مہینے انھیں پھر رقم کی ضرورت ہونے والی تھی۔ سرائے کی مالکن کوزیٹ کے سارے کپڑے لے کر پیرس گئی اوراُن کو ساٹھ فرانک کے عوض رہن رکھ آئی۔ جب وہ ساری رقم بھی خرچ ہو گئی تو تین آردیے نے اس بچی کو محض ایک [لاوارث] بچی سمجھنا شروع کردیا جس کی دیکھ بھال خیرات کے طور پر کی جا رہی ہو؛ اورانھوں نے اس سے ویسا ہی سلوک بھی شروع کر دیا تھا۔ چوں کہ اس کے پاس کپڑے نہیں رہ گئے تھے، انھوں نے بچی کو اپنے ازکار رفتہ زیر جاموں— چیتھڑوں میں لپیٹنا شروع کردیا تھا۔ اسے اپنا بچا ہوا کھانا دینا شروع کر دیا جو ایک کتے کی غذا سے ذرا بہتر اور بلّی کی غذا سے بدتر ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ بلّی اور کتا، دونوں بچی کے کھانے کی میز کے ساتھی بن گئے تھے؛ کوزیٹ ان کے ساتھ، لکڑی کے برتن میں، جو جانوروں کے لیے ہوتے تھے، میز کے نیچے کھانا کھاتی تھی۔

بچی کی ماں جو اَب کام سے لگی تھی، ہر ماہ ایک خط لکھتی، بلکہ لکھواتی تھی، تا کہ اسے اپنی بچی کی خیر خبر ملتی رہے۔ تین آردیے کی جانب سے ہر خط کا یہی جواب جاتا تھا کہ ”کوزیٹ بہت مزے میں ہے۔“

چھ ماہ گزرنے کے بعد بچی کی ماں نے ساتویں مہینے کے سات فرانک روانہ کر دیے، اور پابندی سے ماہ بہ ماہ رقم بھیجتی رہی۔ ابھی سال پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ تین آردیے نے کہا

شروع کر دیا تھا، "بڑی مہربانی کر رہی ہے وہ ہمارے ساتھ! وہ ہم سے سات فرانک کے عوض کیا توقع رکھتی ہے؟" اور انھوں نے بارہ فرانک طلب کرنے کے لیے خط لکھ دیا۔ بچی کی ماں نے، جسے انھوں نے باور کرا دیا تھا کہ "بچی خوش، اور ٹھیک ٹھاک ہے" بارہ فرانک روانہ کر دیے۔

بعض لوگوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتے جب تک کہ دوسرے سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ ماں تینی آردیے اپنی بچیوں سے بے پناہ محبت کرتی تھی، جس کی وجہ سے وہ اجنبی بچی سے نفرت کرنے لگی۔

یہ سوچ کر بھی افسوس ہوتا ہے کہ ایک ماں کی [مقدس] محبت میں بد معاشی کے پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ بے چاری کوزیٹ بہت کم جگہ لیتی تھی، تینی آردیے کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کی بچیوں کی جگہ استعمال کی جا رہی ہے، کہ اس چھوٹی سی بچی کی سانس اس کی بچیوں کی سانس میں کمی کا باعث ہو رہی ہے۔ دوسری عورتوں کی طرح، اس عورت کے پاس بھی روزانہ دینے کے لیے بہت سارا پیار، مکّے، اور زخم ہوا کرتے تھے۔ اگر اس کے پاس کوزیٹ نہ ہوتی تو یقینی طور پر یہ سارا بار اس کی اپنی بچیوں کو ہی برداشت پڑتا؛ مگر اس اجنبی بچی نے مکّے سہہ کر ان بچیوں کی خدمت کی تھی۔ اس کی اپنی بچیوں کو پیار ہی پیار مل رہا تھا۔ بے چاری کوزیٹ کی ایسی کوئی بھی حرکت نہیں ہوتی تھی جس کے عوض اس کے سر کو تند و تیز مکّوں کی برسات اور ناحق سزا سہی پڑتی۔ وہ کم زور بچی، جو اس دنیا یا خدا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی، مسلسل سزا، جھڑکی، بد سلوکی اور پٹائی کی حق دار ہوتی، جب کہ اس کے ساتھ ہی اسی جیسی بچیاں صبح کی سہانی کرنوں میں نہائی ہوتی تھیں۔

مادام تینی آردیے اجنبی بچی کے ساتھ خباثت سے پیش آتی تھی۔ ایپونین اور آزیلما بھی بد طینت تھیں۔ اس عمر کے بچے ہمیشہ صرف اپنی ماں کی نقل کرتے ہیں۔ بس کہ وہ چھوٹے ہوتے ہیں۔

ایک برس گزر گیا؛ اس کے بعد ایک اور برس گزرا۔

گاؤں کے لوگ کہتے تھے:

"یہ تینی آردیے بھی کتنے اچھے لوگ ہیں۔ دولت مند نہیں، پھر بھی ایک مفلس بچی کو پال رہے ہیں جسے اس کی ماں چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے!"

ان کا خیال تھا کہ کوزیٹ کی ماں نے اپنی بچی کو بھلا دیا ہے۔

اس دوران تینی آردیے کو کہیں سے پتا چل گیا تھا، کہا نہیں جا سکتا کس مبہم ذریعے سے کہ یہ بچی شاید ناجائز اولاد ہے، اور یہ بھی کہ اس کی ماں اس امر کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کوزیٹ کی ماں سے ہر ماہ پندرہ فرانک ماہانہ اینٹھنا چاہتا تھا، یہ کہہ کر کہ یہ "مخلوق" بڑھ رہی ہے

اور زیادہ "کھا رہی ہے"، ساتھ ہی دھمکی بھی دیتا جاتا تھا کہ کسی دن اسے کسی کے حوالے کر دے گا۔ وہ کہتا تھا، "میں یہ مصیبت کیوں اٹھاؤں" یا پھر" میں اس کی اولاد کو نکال باہر کروں گا اور اس کے خفیہ راز افشا کر دوں گا۔ میں رقم میں اضافہ چاہتا ہوں۔" اب مجبور ماں پندرہ فرانک ادا کرنے لگی۔

سال بہ سال بچی بڑھ رہی تھی، ساتھ ہی اس کی بدنصیبی بھی۔

جب تک کوزیٹ چھوٹی تھی، دوسری دونوں بچیوں کے ہر قصور کی ذمے دار ٹھہرائی جاتی؛ جب وہ بڑھنے لگی، یعنی قبل اس کے کہ وہ پانچ برس کی ہو تو پورے گھر کے خادمہ بن گئی تھی۔

پانچ برس کی! قاری کہہ سکتا ہے کہ یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ افسوس کہ یہی سچ تھا۔ سماجی دکھ کسی بھی عمر میں شروع ہو سکتا ہے۔ کیا ہم نے Dumollard کے مقدمے کے بارے میں سنا نہیں، جو پانچ برس کی عمر میں ایک یتیم لڑکے سے ڈاکو بن گیا تھا۔ جیسا کی دستاویزات سے ثابت ہوا تھا، دنیا میں تن تنہا ہونے کے باعث وہ "زندہ رہنے کے لیے چوری" کرنے لگا تھا؟

کوزیٹ کو چھوٹے موٹے کام، کمروں، آنگن اور گلی کی صفائی، برتن دھونے، اور بوجھ اٹھانے پڑتے تھے۔ تنی آردیے اس سے کام لینے میں اور بھی شیر ہو گئے تھے کہ اس کی ماں رقم بھیجنے میں ناغہ کرنے لگی تھی۔ کچھ مہینے کی رقم ادھار بھی ہو گئی تھی۔

اگر کوزیٹ کی ماں تین برس بعد Montfermeil واپس آتی تو اپنی بچی کو پہچان نہ پاتی۔ کوزیٹ جو اس گھر میں آمد کے وقت اتنی تر و تازہ اور خوب صورت تھی، آج لاغر اور زرد پڑ گئی تھی۔ اب وہ ایک ناقابل بیان بے چین شخصیت لگتی تھی۔ تنی آردیے کے مطابق وہ بڑی "کائیاں مخلوق" تھی۔

ناانصافی نے اسے تند خو، اور بدنصیبی نے اسے بد صورت بنا دیا تھا۔ آنکھوں کے علاوہ، جو پہلے بھی خوب صورت تھیں، اس کا اپنا کچھ باقی نہیں رہا تھا، جن میں درد انگیزی جھلکتی تھی، اس لیے کہ بڑی ہونے کے باعث ان میں زیادہ افسردگی نظر آنے لگی تھی۔

ایک بچی کو، جس کی عمر چھ برس بھی نہیں ہوئی تھی، سردی کے موسم میں، سوراخوں والے چیتھڑوں میں ملبوس، سُرخ ہاتھوں میں ایک بڑی سے جھاڑو لیے، طلوع صبح سے پہلے سردی سے کانپتی ہوئی، گلی کی صفائی کرتے دیکھ کر دل ریزہ ریزہ ہو جاتا تھا۔

اپنے پڑوس میں وہ مغنی چڑیا (Lark) کہی جاتی تھی۔ اس علاقے کے عوام نے جو اس قسم کی باتیں پسند کرتے ہیں، اس لڑکھڑاتی، خوف زدہ اور کانپتی، پرندے جتنی مخلوق کو یہ نام دیا تھا جو ہر صبح، گاؤں اور گھر میں سب سے پہلے اٹھنے اور صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل گلی میں صفائی کرتی نظر آتی تھی۔

مگر اس ننھی لارک نے کبھی گانا نہیں گایا۔

۞

سیاہ شیشے کے آویزے

اور اس دوران، اس ماں کا کیا حال ہوا جو Montfermeil کے لوگوں کے مطابق اپنی بچی کو چھوڑ کر چلی گئی تھی؟ وہ کہاں تھی؟ کیا کر رہی تھی؟

کوزیٹ کو تھن آردیے کے پاس چھوڑنے کے بعد اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور اپنے علاقے M. sur M پہنچ گئی۔

یاد رہے کہ وہ سال 1818ء تھا۔

فانتین نے اپنے علاقے کو دس برس قبل چھوڑا تھا۔ وہ علاقہ اپنے تمام پہلوؤں سے کافی بدل چکا تھا۔ جس عرصے میں فانتین آہستہ آہستہ بد نصیبی سے بد نصیبی کے غار میں گرتی جا رہی تھی، اس کے آبائی علاقے نے خاصی ترقی کی تھی۔

تقریباً دو برس قبل وہ صنعتی حقائق، جو کسی چھوٹے سے موضع کے لیے عظیم الشان واقعات ہوتے ہیں، اس علاقے میں واقع ہو چکے تھے۔

یہ تفصیل ضروری ہے، اور ہم اس کو تفصیل سے بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں؛ یا یوں کہہ لیجیے کہ ان پر زور دینا چاہتے ہیں۔

زمانۂ نامعلوم سے M. sur M اپنی ایک خاص صنعت، انگریزی سنگِ موسیٰ اور جرمنی کے کالے شیشے کے آویزوں کے لیے مشہور تھی۔ یہ صنعت خام مال کی زیادہ قیمت کے باوجود ہمیشہ پھلی پھولی، جس کا تیاری پر بھی رد عمل ہوا تھا۔ جن دنوں فانتین M. sur M واپس پہنچی تھی "سیاہ مال" کی تیاری کی ناشنیدہ قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ 1815ء کے اختتام کے قریب ایک شخص، ایک اجنبی، نے اس شہر میں اپنے کاروبار کو مستحکم کر لیا تھا۔ اس نے اس صنعت میں رال

کے بدلے گوند کی لاکھ استعمال کرنے کا خیال پیش کیا، اور بالخصوص کنگن بنانے میں ملڈر کی ہوئی لوہے کی چادروں کے بدلے محض ایک ساتھ جوڑی ہوئی لوہے کی دو چادروں کا استعمال شروع کیا تھا۔

اس معمولی سے تبدیلی سے ایک انقلاب آچکا تھا۔

اس بہت معمولی سی تبدیلی نے حیرت انگیز طور پر خام مال کی لاگت میں کمی کر دی، جس کی وجہ سے پہلے تو مال کی تیاری کی لاگت میں اضافہ ممکن ہوا، جو ملک کے لیے فائدہ مند ہوا؛ دوسری جانب، کاریگری میں بہتری آئی، جو صارف کے لیے فائدے کا باعث ہوئی؛ تیسری طرف، کم قیمت پر فروخت کے ساتھ ہی منافع تین گنا ہو گیا، جو صنعت کار کے لیے فائدہ مند ہوا تھا۔

اس طرح ایک خیال سے تین نتیجے اخذ ہوئے تھے۔

تین برس سے کم عرصے میں اس نئے طریقۂ صنعت کاری کا موجد مالا مال ہو گیا، جو اچھی بات تھی، اور اپنے اطراف کے لوگوں کو بھی دولت مند بنا دیا، جو اور زیادہ اچھی بات تھی۔ اس شعبے میں وہ شخص اجنبی تھا۔ وہ کہاں سے آیا تھا، کچھ معلوم نہ تھا؛ جب کہ اس کے پیشے کی ابتدا کے بارے میں بھی معلومات بہت کم تھیں۔ افواہ یہ تھی کہ وہ اس شہر میں بہت کم رقم ساتھ لایا تھا، زیادہ سے زیادہ چند سو فرانک!

اتنے کم سرمایے سے، اور ایک نادر طریقے اور خیال سے، اس نے نہ صرف اپنا مقدر بنا لیا، بلکہ پورے علاقے کی تقدیر بدل کر رکھ دی تھی۔

M. sur M میں اپنی آمد کے وقت اس کا لباس، اس کی شکل وصورت اور اس کی زبان ایک عام قسم کے کام کرنے والے شخص کی سی تھی۔

خبر یہ ہے کہ اس روز جب وہ دسمبر کی ایک شام چھوٹے سے شہر M. sur M میں، ایک سفری تھیلا کاندھے پر اور کانٹے دار ڈنڈا ہاتھ میں لیے داخل ہو رہا تھا، عین اس وقت ٹاؤن ہال میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہ شخص، اپنی جان کی پروا کیے بغیر، بے تحاشا آگ میں کود پڑا اور دو بچوں کو بچالیا تھا، جو فرانسیسی پولیس کے کپتان کے بچے تھے؛ اسی وجہ سے وہ لوگ اس شخص سے پاسپورٹ طلب کرنا بھول گئے تھے۔ بعد میں انھیں اس کے نام کا علم ہوا۔ اس کا نام فادر میڈلن (Madeleine) تھا۔

۞

میدیلن

اس آدمی کی عمر تقریباً پچاس برس تھی، بہت مصروف رہتا تھا، اور اچھا آدمی تھا۔ اس کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔

اس صنعت کی تیز ترقی کے طفیل، جسے اس نے اتنی خوبی سے ازسرِ نو ترتیب دیا تھا، M. sur M تجارت کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ ہسپانیہ، جو سنگِ موسیٰ کا بہت استعمال کرتا ہے، ہر برس بے اندازہ خریداری کرنے لگا۔ اس شعبۂ تجارت میں M. sur M لندن اور برلن کا تقریباً حریف بن گیا۔ فادر میدیلن نے اتنا منافع کمایا کہ دوسرے سال کے آخر تک وہ ایک بڑا سا کارخانہ تعمیر کرنے کے قابل ہوگیا، جس میں کاریگری کے دو بڑے بڑے کمرے تھے، ایک مردوں کے لیے، دوسرا عورتوں کے لیے۔ جو کوئی بھی بھوکا ہوتا اور وہاں آتا، اسے ملازمت بھی مل جاتی اور روٹی بھی۔ فادر میدیلن مردوں سے اچھے ارادے، عورتوں سے کھری اخلاقیات، اور سب سے، حد درجہ دیانت کا طالب ہوتا تھا۔ اس نے کاریگری کے کمرے دو جنسوں کو الگ کرنے کے لیے ہی بنوائے تھے، تاکہ عورتیں اور لڑکیاں محفوظ و محتاط رہ سکیں۔ اس معاملے میں وہ بہت سخت گیر تھا۔ یہی ایک بات تھی جس میں وہ رواداری کا قائل نہیں تھا۔ وہ اپنی اس سخت گیری پر قائم رہا، اس لیے کہ ایک فوجی علاقہ ہونے کے ناتے M. sur M میں بد چلنی کے بے حد امکانات تھے۔ گویا، اس کی آمد ایک نعمت، اور اس کی موجودگی قدرت کا تحفہ تھی۔ فادر میدیلن کی آمد سے قبل اس ملک میں ہر شے کم زور و ناتواں ہو چکی تھی؛ لیکن اب، ہر شے مشقت کی صحت مند زندگی گزار رہی تھی۔ ہر جانب اور ہر شے میں ایک تیز دوران سرایت کر گیا تھا۔ مندی کے موسم، اور افلاس نا دیدہ تھے۔ ایک بھی گم نام جیب نہیں رہ گئی تھی جس میں تھوڑی سے رقم بھی نہ ہو؛ کوئی گھر نہیں تھا

جس میں تھوڑی سے خوشی بھی نہ ہو۔

فادر میدیلین نے ہر ایک کو ملازمت فراہم کی تھی۔اس کا بس ایک ہی مطالبہ ہوتا تھا: ایمان دار آدمی بنو۔ایمان دار عورت بنو۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس سرگرمی کے درمیان وہ جس کی وجہ بھی تھا اور محور بھی، فادر میدیلین نے اپنی تقدیر بنائی تھی؛ مگر ایک منفرد بات اس کاروباری شخص میں تھی؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہی اس کی سب سے اہم بات تھی۔وہ دوسروں کے بارے میں زیادہ اور اپنے بارے میں کم سوچتا تھا۔ 1820ء میں اس نے لافیت (Laffitte) کے نام سے چھ لاکھ تیس ہزار فرانک جمع کر رکھے تھے؛ مگر چھ لاکھ تیس ہزار جمع کرنے سے قبل وہ ایک ملین سے زیادہ شہر پر اور اس کے افلاس زدہ لوگوں پر خرچ کر چکا تھا۔

وہاں کا اسپتال بری حالت میں تھا؛ اس نے چھ عدد بستر دان دیے۔M. sur M بالائی اور زیریں طبقے میں تقسیم شہر تھا۔زیریں شہر میں، جہاں وہ رہتا تھا، ایک اسکول اور ایک خستہ حال اُسارہ تھا جو کھنڈر میں تبدیل ہو رہا تھا۔اس نے دو اسکول بنوائے، ایک لڑکوں کے لیے دوسرا لڑکیوں کے لیے۔اس نے اپنے جیب سے دو استادوں کی تنخواہ بھی باندھ دی تھی، وہ تنخواہ جو ان کی سرکاری تنخواہ سے دگنی تھی، اور جب کسی نے حیرت کا اظہار کیا تو اس نے کہا تھا، ''کسی ریاست کے دو مقدم کارپرداز ہوتے ہیں؛ ایک نرس اور دوسرا استاد۔'' اس نے اپنے خرچ پر شیرخوار بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا تھا، جو فرانس میں تقریباً نادیدہ تھا، اور ایک فنڈ قائم کیا تھا بوڑھے اور ناتواں کام کرنے والے لوگوں کے لیے۔چوں کہ اس کا کارخانہ ایک مرکز تھا، ایک علاقہ جس میں بہت سارے مفلس خاندان رہتے تھے، اس کے اطراف تیزی سے ابھر آیا تھا؛ اس نے وہاں ایک مفت دوا خانہ بھی قائم کر دیا۔

پہلے، جب وہ اس کے ابتدائی اقدام کو غور سے دیکھ رہے تھے، اچھے دل والے لوگوں نے کہا تھا، ''یہ ایک خوش باش انسان ہے جو دولت مند بننا چاہتا ہے۔'' جب انھوں نے اسے اپنے آپ کو دولت مند بنانے سے پہلے ملک کو دولت مند بناتے دیکھا تو اچھے دل والوں نے کہا، ''یہ جرأت مند آدمی ہے۔'' یہ بات کچھ زیادہ قرینِ قیاس لگی، اس لیے کہ وہ مذہبی آدمی تھا، بلکہ کافی حد تک وہ اپنے مذہب پر چلتا بھی تھا، جس کو اس زمانے میں تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔وہ ہر اتوار پابندی سے نچلے درجے کے مذہبی اجتماعات میں جاتا تھا۔ایک مقامی نائب، جو ہر جگہ کی رقابتوں کی تلاش میں رہتا تھا، اس کی مذہبیت سے پریشان ہونے لگا۔یہ شخص سلطنت کی

مقننہ کا رکن رہا تھا اور ایک اوغاتوا (Oratoire) کے والد کے مذہبی خیالات میں شریک بھی تھا جو، فوشے، ڈی اوٹرانت (Fouche, Duc d'Otrante) کے نام سے جانا جاتا تھا اور وہ جس کا دوست بھی تھا۔ وہ دروازوں کے پیچھے خدا کے بارے میں ٹھٹھا کرتا تھا۔ مگر جب اس نے دولت مند میڈلین کو سات بجے صبح نچلے درجے کے اجتماعات میں جاتے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہی اس کا ہدف ہے اور اس کو بہکانے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ایک ریا کار اعتراف کرنے والے کا روپ بھرا، اور بالائی درجے کے اجتماع میں اور شام کی دعا میں شریک ہونے لگا۔ اس وقت جاہ طلبی ملفوظ سے براہِ راست قبولیت کی کیفیت میں تھی؛ جیسے بلندی کی طرف دوڑ لگا۔ مفلس کو اور خدا کو بھی اس کا فائدہ پہنچا، اس لیے کہ معزز نائب نے اسپتال کو دو بستر عطا کر دیے، اس طرح وہاں کل بارہ بستر ہو گئے تھے۔

1819ء میں ایک صبح شہر میں افواہ اُڑی کہ پریفکٹ کی سفارش پر، اور ملک کے لیے اس کی خدمات کے پیشِ نظر، شاہ نے فادر میڈلین کو M. sur M کا میئر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے، جو اس نووارد کو "ایک جاہ طلب انسان" کہتے تھے فوراً موقعے سے فائدہ اٹھایا، جیسا کہ عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں، اور چلّائے، "دیکھا، ہم نے کیا کہا تھا؟" پورا M. sur M چلّا اٹھا۔ افواہ صحیح تھی۔ کئی دنوں بعد مانیٹر میں تقرر کی اطلاع بھی شائع ہو گئی۔ اگلے دن فادر میڈلین نے انکار کر دیا۔

1919ء میں میڈلین کی نئی ایجاد سے بننے والی مصنوعات نمائش میں رکھی گئیں؛ جب جیوری نے شاہ کو اپنی رپورٹ بھیجی تو شاہ نے میڈلین کو لیجن آف آنر کا شیخ بنانے کا اعلان کر دیا۔ چھوٹے سے شہر میں ایک تازہ جوش کی لہر دوڑ گئی۔ یہی وہ تمغا تھا جو وہ چاہتا تھا! فادر میڈلین نے تمغا لینے سے بھی انکار کر دیا۔

یقینی طور پر یہ شخص ایک معمہ تھا۔ اچھے لوگ یہ کہہ کر اپنی ناگوار صورتِ حال سے نکل گئے، "خیر، وہ یہ کسی قسم کا مہم جو شخص ہے۔"

ہم نے دیکھا ہے کہ ملک اس شخص کا قرض دار ہے؛ مفلس لوگوں کو سب کچھ اسی کا دیا ہے؛ یہ شخص اتنا اچھا اور اتنا نرم خو تھا کہ لوگ اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے ملازمین بالخصوص اس کے پرستار تھے، اور وہ اس پرستش کو ایک قسم کی افسردگی سے برداشت کرتا تھا۔ جب لوگوں کو اس کی دولت مندی کا پتا چلا تو "سماج کے لوگ" اس کے سامنے جھک گئے، اور اسے شہر سے دعوت نامے آنے لگے؛ شہر میں اس کو موسیو میڈلین کہا جانے لگا؛ اس کے ملازمین اور گھر

والے اسے فادر میڈلین ہی کہتے رہے؛ اور یہی طریقہ تھا جو اس کو مجسم کرنے کے لیے سب سے اچھا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑھتا گیا، اسی تناسب سے اس پر دعوت ناموں کی برسات ہونے لگی۔ ''سماج'' اس کو اپنانے کا دعویٰ کرنے لگا۔ M. sur M کے ڈرائنگ روم کے تہ ہو جانے والے دروازے جو پہلے عام دستکاروں اور آدمیوں کے لیے بند ہوتے تھے، اس کروڑ پتی کے لیے اپنی پرتیں کھولنے لگے۔ اس کی جانب ہزاروں قدم اٹھنے لگے۔ وہ سب سے انکار کر دیتا تھا۔

اس بار اچھی قسم کی گپ شپ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔ ''یہ لاعلم اور غیر تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ کسی کو پتا نہیں کہاں سے آیا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ سماج سے کس طرح پیش آیا جاتا ہے۔ اب تک ثابت نہیں ہوا کہ اسے پڑھنا بھی آتا ہے۔''

جب لوگوں نے اسے دولت کماتے دیکھا، تو کہا، ''یہ شخص کاروبار کرنا جانتا ہے۔'' جب لوگوں نے اسے دولت لٹاتے دیکھا، تو کہا، ''یہ جاہ طلب آدمی ہے''؛ جب اسے اعزازات ٹھکراتے دیکھا، تو کہا، ''یہ شخص مہم جو ہے۔'' جب لوگوں نے اسے سماج کو پسپا کرتے دیکھا، تو کہا ''یہ شخص جنگلی ہے۔''

1820ء میں، M. sur M میں وارد ہونے کے پانچ برس بعد، علاقے کے لیے کی گئی اس کی خدمات اتنی چکا چوند کرنے والی تھیں، اس کے بارے میں پورے ملک کی رائے کچھ اس طور پر اتنی متفق تھی کہ شاہ نے ایک بار پھر اس کو شہر کا میئر مقرر کر دیا۔ اس نے پھر انکار کر دیا، مگر پریفکٹ نے انکار کی مزاحمت کی؛ علاقے کے تمام نمائندین التجا کرنے اس کے پاس پہنچے، عوام نے اصرار کیا؛ اس پر اتنا شدید دباؤ ہوا کہ اسے تقرر قبول کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ اس کی جانب سے قبولیت کی وجہ عوام میں سے ایک عمر رسیدہ عورت کا ایک جملہ تھا جو اس نے غصے میں آ کر ادا کیا تھا:

''ایک اچھا میئر کارآمد چیز ہوتا ہے۔ کیا وہ اچھائی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے، جو وہ کر سکتا ہے؟''

یہ اس کی ترقی کا تیسرا دور تھا۔ فادر میڈلین موسیو میڈلین بن گیا تھا۔ اور موسیو میڈلین موسیو میئر بن گیا۔

۞

لافیتے میں جمع رقم

دوسری طرف، اس کا رہن سہن اتنا ہی سادہ رہا، جیسا کہ پہلے دن تھا۔اس کے بال بکھرے، آنکھ سنجیدہ، دھوپ سے جلا ہوا کسی مزدور کا سا رنگ، کسی فلسفی کی سی صورت خیالات میں غرق۔عادتاً کھنچے والی ہیٹ پہنتا تھا، اورموٹے کپڑے کا ایک لانبا کوٹ، ٹھوڑی تک بٹن بند رکھتا تھا۔میئر کے فرائض انجام دیتا تھا، مگر اس استثنا کے ساتھ کہ وہ تنہائی میں رہتا تھا، کم لوگوں سے بات کرتا تھا۔خوش اخلاق توجہات سے پرہیز کرتا تھا؛ جلد ہی گزر جاتا تھا؛ باتوں کی ضرورت سے بچنے کے لیے تبسم پر اکتفا کرتا؛ تبسم کی ضرورت کو دور کرنے کے لیے کچھ دے دیتا تھا؛ ایک عورت نے اس کے بارے میں کہا تھا: ''کتنا نیک نہاد آدمی ہے!'' اس کی تفریح میدانوں میں چہل قدمی پر مشتمل ہوتی تھی۔

وہ ہمیشہ اکیلے کھانا کھاتا، سامنے ایک کھلی کتاب ہوتی، جسے پڑھتا جاتا تھا۔اس کے چھوٹے سے کتب خانے میں منتخب کتابیں تھیں۔وہ کتابوں سے محبت کرتا تھا؛ کتابیں سرد مگر بے ضرر دوست ہوتی ہیں۔تناسب کے اعتبار سے، اور خوش قسمتی سے فرصت نصیب ہوتی تو وہ اپنے ذہن کو زرخیز بنانے کے لیے اس سے فائدہ اٹھاتا۔دیکھا گیا ہے کہ جب سے وہ M. sur M میں آیا ہے، ہر گزرتے سال کے ساتھ اس کی زبان زیادہ شستہ، زیادہ منتخب اور زیادہ خلیق ہوتی گئی ہے۔ چہل قدمی کرنے جاتا تو ساتھ پستول رکھنا پسند کرتا تھا، مگر شاذ و نادر ہی استعمال کرتا، اور اگر کرتا تو اس کا نشانہ اتنا بے خطا ہوتا تھا کہ خوف کا باعث ہوتا تھا۔اس نے کبھی کسی بے ضرر جان دار کو نہیں مارا۔اس نے کبھی کسی چھوٹے پرند پر گولی نہیں چلائی۔

حالاں کہ وہ جوان نہیں رہ گیا تھا، لوگ سمجھتے تھے کہ وہ حیرت انگیز طور پر توانا تھا۔کسی

کو بھی مدد کی ضرورت ہوتی تو وہ پیش کش کر دیتا، گھوڑے کو اٹھاتا، کیچڑ میں پھنسے پہیے کو آزاد کراتا، یا بھاگے ہوئے بیل کو سینگ سے پکڑ کر روک لیتا تھا۔ جب باہر جاتا، اس کی جیب ہمیشہ رقم سے بھری ہوتی، مگر واپسی پر خالی ہوتی تھی۔ جب وہ کسی گاؤں سے گزرتا چیتھڑوں والے لونڈے لپاڑی خوش خوش اس کے پیچھے بھاگتے اور مچھروں کے جھنڈ کی طرح اسے گھیر لیتے تھے۔

لوگ سمجھتے تھے کہ ماضی میں اس نے دیہی زندگی گزاری ہوگی، اس لیے کہ وہ ہر طرح کے فائدہ مند راز سے واقف تھا، جسے وہ کسانوں کو سکھاتا تھا۔ اس نے لوگوں کو گندم پر لگی پھپھوند تباہ کرنے کا، سنڈیوں کو پھولوں سے، دیواروں اور چھتوں سے، گھاس سے اور مکانوں سے بھگانے کا طریقہ سکھایا تھا۔

اس کے پاس گندم کی فصل تباہ کرنے والے خودرو پودوں کو نابود کرنے، اور ہر قسم کے طفیلی حشرات کی نشوونما کو روکنے کے نسخے بھی تھے۔ اس نے تجرباتی چوہوں کی بو کے ذریعے خرگوشوں کی شکارگاہ کو چوہوں سے بچایا تھا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ کچھ دیہاتی بچھو بوٹی (nettle) کی جھاڑیاں اکھاڑ رہے تھے؛ اس نے ان پودوں کا معائنہ کیا، جو اکھاڑ دیے گئے تھے اور خشک ہو گئے تھے، اور ان لوگوں سے کہا، ''یہ پودے تو مر چکے ہیں۔ پھر بھی، یہ جاننا اچھا ہوگا کہ ان کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب بچھو بوٹی کا پودا نوعمر ہوتا ہے، اس کی پتیاں بہترین ترکاری بنتی ہیں؛ جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس میں پٹ سن یا بھنگ کی طرح ریشے ہو جاتے ہیں۔ ان ریشوں سے بنے پارچے لینن کی طرح ہوتے ہیں۔ کٹے ہوئے پودے مرغیوں کی خوراک کے لیے اچھے ہوتے ہیں؛ کوٹے گئے ہوں تو سینگوں والے مویشی کے لیے بہترین خوراک ہوتے ہیں۔ جانوروں کی خوراک میں ملے بچھو بوٹی کے بیج ان کے بالوں میں چمک پیدا کرتے ہیں؛ ان کی جڑوں میں نمک ملایا جائے تو خوب صورت پیلے رنگ کا مادہ تیار ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ لاجواب بھوسا ہوتا ہے جسے دوبارہ کاٹا جا سکتا ہے۔ بچھو بوٹی پیدا کرنے کے لیے کیا درکار ہوتا ہے؟ بس تھوڑی سی مٹی، نہ دیکھ بھال، نہ کاشت کاری۔ پک جاتے ہیں تو ان کے بیج جھڑ جاتے ہیں جن کا جمع کرنا مشکل ہوتا ہے، اور بس۔ تھوڑی سی محنت کی جائے تو بچھو بوٹی بہت کام کی ہوتی ہے؛ اس کو نظر انداز کیا جائے تو تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس کو جڑ سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کتنے آدمی بچھو بوٹی جیسے ہوتے ہیں۔ اور پھر، ایک وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا: دوستو میری بات یاد رکھنا، دنیا میں نہ خراب پودے ہوتے ہیں نہ خراب آدمی۔ خراب صرف کاشت کار ہوتے ہیں۔''

بچے اس سے پیار کرتے تھے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں سے دل خوش کر دینے والی چیزیں بنانے کا ہنر جانتا تھا۔

جب کبھی وہ گرجا گھر کے دروازے پر سیاہ کپڑا پڑا دیکھتا تو اندر داخل ہو جاتا: جس طرح لوگ جشن تلاش کرتے ہیں وہ جنازے تلاش کرتا تھا۔ اس کی اپنی عظیم شائستگی اسے دوسروں کے غم اور بیوگی کی طرف متوجہ کرتی تھی۔ وہ سوگوار لوگوں میں، سیاہ لباس میں ملبوس خاندان والوں میں، تابوت کے پاس کراہتے پادریوں میں گھل مل جاتا تھا۔ وہ جنازوں پر پڑھی جانے والی دعاؤں کے متن میں بیان کی جانے والے دوسری دنیا کے تصورات پر غور کرتا۔ جنت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ابد کی پُر اسراریت، غم زدہ آوازوں پر غور کرتا جو موت کے مبہم پاتال کی طرف جاتے وقت گائی یا پڑھی جاتی ہیں۔

وہ طرح طرح کے اچھے کام کرتا، مگر ان میں استعمال ہونے والے اپنے ذرائع کو اسی طرح خفیہ رکھتا تھا جیسے کوئی انسان برائی کرتے وقت اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔ وہ رات کے وقت نجی طور پر گھروں میں داخل ہو جاتا تھا: دبے پاؤں زینے طے کرتا تھا۔ ایک دن ایک بدنصیب گھر والے کو واپسی پر معلوم ہوا کہ اس کے غیاب میں اس کے گھر کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ گھر والے آدمی نے شور مچایا کہ کوئی بدمعاش اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے سب سے پہلے دیکھا کہ میز پر سونے سے بنی کوئی چیز بھولے سے پڑی رہ گئی تھی۔ وہ "بدمعاش" جو اس گھر میں داخل ہوا تھا، فادر میڈیلین تھا۔

وہ اچھے اخلاق والا اداس آدمی تھا۔ لوگ کہتے تھے، "ایسا بھی ایک دولت مند شخص ہے جس میں غرور نہیں۔ ایسا بھی ایک خوش باش انسان ہے جس کو نہ آنے کی خوشی ہوتی ہے نہ گئے کا غم۔"

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک پُر اسرار شخص ہے، اور یہ بھی کہ کوئی اس کے اندرون میں داخل نہیں ہو سکتا، جو کسی گوشہ نشین کی کُٹیا کی طرح تھا: جس میں ریت گھڑی، ہڈیوں سے بنی موت کی علامات اور مُردوں کی کھوپڑیاں ہوتی ہیں۔

اس موضوع پر اتنی باتیں ہوتی تھیں کہ ایک دن M. sur M کے نفیس اور کینہ پرور آدمیوں میں سے کچھ لوگ اس کے پاس آئے اور کہا، "موسیو میئر، آپ سے گزارش ہے کہ آپ کبھی ہمیں اپنی کُٹیا دکھایئے۔" وہ مسکرایا اور فوراً ہی انھیں اپنا "غار" دکھانے لے گیا۔ انھیں اپنے تجسس کی سزا مل گئی۔ کمرے میں نہایت سادہ مہاگنی کا فرنیچر تھا، جو عام قسم کے فرنیچر کی طرح خاصا بدصورت دکھائی دیتا تھا، جس کی دیواروں پر بارہ سو قیمت والا کاغذ لگا تھا۔ وہاں انھیں کوئی

خاص چیز نظر نہیں آئی، سوائے قدیم زمانے کے دو شمع دانوں کے جو چمنی پر رکھے تھے، اور دیکھنے میں نقرئی لگتے تھے، "اس لیے کہ ان پر مہر لگی ہوئی تھی"۔ چھوٹے شہروں کے لوگ اس قسم کی باتوں پر خوب نظر رکھتے ہیں۔

پھر بھی لوگ یہی کہتے رہے کہ کسی نے کبھی اس کا کمرہ نہیں دیکھا ہے، کہ وہ ایک گوشہ نشین شخص کا غار ہے، پُراسرار پناہ گاہ ہے، بِل ہے، مقبرہ ہے۔

یہ سرگوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس نے ایک "خطیر" رقم لافیتے میں جمع کر رکھی ہے، اس خاص طریقے سے کہ وہ جب چاہے اس سے فوری استفادہ کر سکتا ہے؛ کہ موسیو میڈلین کسی صبح لافیتے پہنچ کر، رسید پر دستخط کر کے، دس منٹ کے اندر اپنا "دو یا تین ملین" اندوختہ لے جا سکتا ہے۔ دراصل اس "دو یا تین ملین" کو، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، چھ لاکھ تیس یا چالیس ہزار فرانک تک کم کیا جا سکتا ہے۔

۞

موسیو میدیلن سوگ میں

1820ء کی ابتدا میں اخباروں نے D کے بشپ موسیو مائریل کی موت کی خبر شائع کی، جو موں سینیو ربیان وینیو کے نام سے مشہور تھا، اور اپنے تقدس کی خوش بو سمیت، بیاسی برس کی عمر میں دنیا سے سدھار گیا تھا۔

D کا بشپ— اخباروں میں جو تفصیلات رہ گئی تھیں یہاں ان کا اضافہ کیا جا رہا ہے— موت سے قبل کئی برسوں سے کور چشم ہو گیا تھا، پھر بھی اپنی حالت پر بہت مطمئن تھا، اس لیے کہ اس کی [محبت کرنے والی] بہن اس کے ساتھ تھی۔

اس موقعے پر کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت، کور چشم ہونے میں اور چاہے جانے میں روئے زمین کی، نہایت حیرت انگیز و پاکیزہ قسم کی خوشی میسر ہوتی ہے جس کی کوئی شے مکمل نہیں ہوتی۔ کسی عورت، بیٹی، بہن یا دل پسند وجود کا مسلسل پاس ہونا، اس لیے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، اور اس لیے بھی کہ وہ آپ کے بغیر رہ نہیں سکتی؛ یہ جاننا بھی کہ ہم کسی شخص کے بغیر رہ نہیں سکتے، جو ہمارے لیے ضروری ہے؛ اس قابل ہونا کہ اس کی مسلسل موجودگی سے اس کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکے جو ہم پر نچھاور کی جا رہی ہے، اور خود سے کہنا کہ 'چوں کہ وہ اپنا سارا وقت مجھ پر قربان کر رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے پورے دل کے مالک ہیں؛ کہ اس کے چہرے کے بجائے اس کے خیالات کو دیکھنا؛ کہ گہن لگی دنیا کے درمیان کسی کی وفاداری کی تصدیق کرنے کے قابل ہونا؛ کسی بالا پوش کی سرسراہٹ کو پروں کی آواز گردان سکنا؛ اس کو آتے جاتے، آرام کرتے، بولتے، واپس ہوتے، گاتے سُن سکنا اور یہ سمجھ سکنا کہ ہم ہی اس کی تقریر کا مرکز ہیں؛ کسی کی ذاتی توجہ کا فوراً اظہار کر سکنا؛ کسی کی معذوری کے باوجود اس کو زیادہ

طاقت ور محسوس کرنا؛ کسی کے اندھیرے میں، اور کسی کے اندھیرے کے ذریعے، ایسا ستارہ بن سکنا جس کے اطراف یہ فرشتہ صفت شخصیت طواف کرتی ہے— بہت کم شخص ہیں جو اس کے برابر ہوتے ہیں۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس یقین میں ہوتی ہے کہ اس سے محبت کی جارہی ہے؛ کہ کسی کی خاطر محبت کی جا رہی ہے— بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی کے بغیر محبت کی جارہی ہے؛ کور چشم شخص اس یقین و اعتماد کا حامل ہوتا ہے۔ کرب کے عالم میں کسی کی خدمت کرنا محبت کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ کیا اس کو کسی چیز کی کمی ہے؟ جی نہیں! جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور کیسی محبت! وہ محبت جو مکمل طور پر نیکی سے بنی ہو! جہاں تیقّن ہو وہاں کور چشمی نہیں ہوتی۔ روح ٹٹول کر روح کو تلاش کرتی ہے اور پا لیتی ہے۔ اور یہ تلاش کی گئی اور جانچی گئی روح، ایک عورت ہے۔ ایک ہاتھ آپ کو برداشت کرتا ہے؛ اسی کا ہاتھ ہوتا ہے؛ ایک منہ آپ کی پیشانی کو چھوتا ہے اسی کا منہ ہوتا ہے؛ بہت قریب سے آپ کو ایک سانس سنائی دیتی ہے؛ وہ سانس اسی کی سانس ہوتی ہے۔ اس کی ہر شے کو حاصل کرنا، اس کی عبادت سے اس کی ہم دردی تک، کبھی نہ چھوڑنا؛ اس پیاری کم زوری سے مدد حاصل کرنا؛ ساکن نرگل پر ٹیک لگانا، خدا کو اپنے ہاتھ سے چھونا اور اس کو اپنے بازوؤں میں لینے کے قابل ہونا— کہ خدا قابل لمس بنا دیا گیا ہے— کتنی خوشی کی بات ہوتی ہے! اور دل! وہ مبہم آسمانی پھول، باطنی شگفتگی کے عمل سے گزرتا ہے۔ کوئی تمام چمک دمک کو کسی سایے میں تبدیل نہیں کر سکے گا۔ ایک فرشتہ صفت روح وہاں موجود ہے، بلا کسی مزاحمت کے وہاں ہے؛ اگر وہ چلی بھی جاتی ہے، پھر بھی اس کو واپس آنا ہے؛ وہ خواب کی طرح غائب ہو جاتی ہے، اور حقیقت کی طرح دوبارہ ظہور کرتی ہے۔ ایک گرمی سی آتی محسوس ہوتی ہے، اور لو، دیکھو، وہ تو وہاں موجود ہے۔ اور وہ طمانیت سے، مسرت سے، بے خودی سے چھلکنے لگتی ہے۔ وہ رات کے درمیان تابندہ ہوتی ہے۔ اور وہاں چھوٹے چھوٹے ہزاروں افکار ہوتے ہیں۔ عدم اشیا بھی، جو اس خلا میں بے شمار ہوتی ہیں۔ آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے، اور غائب کائنات کو آپ تک پہنچانے کے لیے ناقابل بیان نسوانی لہجے استعمال کیے جاتے ہیں۔ آپ کو روح سے بہلایا جاتا ہے۔ آپ کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، مگر محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی پرستش کی جارہی ہے۔ دراصل، یہ پرچھائیوں کی جنت ہوتی ہے۔

اور، یہی تھی وہ جنت جہاں سے گزر کر موں سینیور و بیکم دوسری جنت میں گیا ہے۔

اس کی موت کا اعلان M.sur M. کے مقامی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس کے اگلے دن موسیو میریلن مکمل طور پر سیاہ لباس میں ملبوس اور اپنی ہیٹ پر جالی لگائے وارد ہوا۔

شہر بھر میں اس کا سوگ دیکھا گیا ، اس پر تبصرے بھی ہوئے ۔ یہ موسیو میڈیلن کی اصلیت پر روشنی ڈالتا محسوس ہوا۔اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس کے اور محترم بشپ کے درمیان رشتے داری تھی۔ بیٹھکوں میں کہا جانے لگا کہ "وہ D کے بشپ کے سوگ میں بیٹھ گیا ہے"؛ اس سے موسیو میڈیلن کی نیک نامی بہت بڑھ گئی، اور ایک ہی جھٹکے میں M. sur M کی اشرافیہ میں اس کا وقار بڑھ گیا ۔اس جگہ کی خوردبینی نے بشپ کے ممکنہ رشتے دار موسیو میڈیلن کے خلاف قرنطینہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ موسیو میڈیلن نے وہ ترقی دیکھی جو اس نے عمر رسیدہ عورتوں کی تواضعات سے اور نوجوان عورتوں کی بے شمار مسکراہٹوں میں محسوس کی تھی ۔ایک شام ایک حاکم عورت نے جو اپنی بزرگی کے باعث تجسس میں تھی، اس سے پوچھنے کی جسارت کی تھی، "موسیو میئر، کیا واقعی آپ D کے آنجہانی بشپ کے عم زاد ہیں؟"

"جی نہیں، مادام!"

"مگر آپ تو اس کے سوگ میں ہیں" بیوہ خطاب یافتہ نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں لڑکپن میں ان کے گھرانے میں ملازم تھا۔" اس نے جواب دیا۔

ایک اور بات جس پر غور کیا گیا ، یہ تھی کہ جب بھی کوئی Savoy والا دیہات میں گھومتا، چمنی صاف کرنے کے کام کی تلاش میں پایا جاتا تو میئر اس کو طلب کرتا، اس کا نام ونسب دریافت کرتا، اور اس کو رقم دیتا تھا۔ Savoy والا لڑکا ہر ایک کو یہ بات بتاتا پھرتا؛ اور پھر اس جیسے بہت اس کے اطراف سے گزرنے لگتے تھے۔

❂

اُفق پر ہونے والے مبہم جھماکے

وقت گزرنے کے ساتھ، رفتہ رفتہ مخالفت کی ساری گرد بیٹھ گئی۔ پہلے تو موسیو میڈلین کے خلاف اس قسم کے قانون کا اطلاق کیا گیا، جو اُن سب لوگوں پر لاگو ہوتا ہے جو کسی اُبھرتے ہوئے شخص کی بدگوئی کرتے ہیں یا اس کی شخصیت کو کالک لگاتے ہیں؛ پھر وہ بد نہاد ہوئے؛ پھر محض حاسدانہ رائے زنی کی گئی اور اس کے بعد یہ سب بالکل غائب ہوگیا؛ احترام مکمل، متفق الرائے اور پُرجوش ہوگیا؛ اور 1821ء کے آتے آتے جب وقت آیا تو اسے M. sur M میں "موسیو میئر" کہا جانے لگا؛ بالکل اسی لہجے میں جیسے D میں 1815ء میں بشپ کو "موں سینیور بشپ" کہا جانے لگا تھا۔ دور دراز سے لوگ موسیو میڈلین سے مشورے کے لیے آنے لگے۔ اس نے لوگوں کے درمیان کے اختلافات ختم کیے؛ مقدمات کی مزاحمت کی؛ دشمنوں میں صلح کرائی۔ ہر شخص اس کو جج سمجھنے لگا تھا جس کی وجوہ تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ فطری قانون کی ایک کتاب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چھ سات برسوں کے عرصے میں اس کی عزت و توقیر کی ایک وبا تھی جو پورے ضلعے میں پھیل گئی تھی۔

اس شہر میں صرف ایک شخص تھا، جو اس وبا سے بچ رہا تھا، اور فادر میڈلین جو کچھ بھی کرتا، وہ اس کی مخالفت سے باز نہ آتا؛ گویا اس میں ایک دیانت دار اور حلیم جبلت تھی جو اس کو ہوشیار اور بے چین رکھتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ آدمیوں میں ایک کھری حیوانی خصلت تھی، جو تمام جبلتوں کی طرح، اگرچہ خالص اور راست باز تھی، نفرت اور ہمدردی پیدا کرتی تھی؛ جو تباہ کن انداز میں ایک فطرت کو دوسری فطرت سے الگ کرتی تھی؛ جس میں تذبذب نہیں ہوتا؛ جسے بے چینی کا احساس نہیں ہوتا؛ جو اپنا سکون قائم نہیں رکھتی؛ جو کبھی اپنی تکذیب نہیں کرتی؛ جو

اپنے ابہام میں بھی واضح ہوتی ہے؛ غلطی سے پاک ہوتی ہے؛ جابر ہوتی ہے؛ بے لگام ہوتی ہے، دانش کے ہر قسم کے مشوروں اور ادراک کو گلا دینے والے اجزا کی مزاحمت کرتی ہے، اور جو، جس طرح بھی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں، خفیہ طور پر 'سگ صفت آدمی' کو 'گربہ صفت آدمی' کی موجودگی کا، اور 'روباہ صفت آدمی' کو 'شیر صفت آدمی' کی موجودگی کا انتباہ کرتی ہے۔

ایسا اکثر ہوتا تھا کہ جب موسیو میڈیلین کسی گلی سے پُرسکون، شفقت آمیز اور سب کی نیک تمناؤں کے ساتھ گزرتا، تو ایک قد آور آدمی، آہنی رنگ کے فراک کوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں بھاری سی بید لیے، خستہ ہیٹ پہنے، اچانک اس کے عقب میں پہنچ جاتا اور اپنی نظروں سے اس وقت تک اس کا تعاقب کرتا جب تک کہ وہ اوجھل نہیں ہو جاتا تھا، تہہ کیے بازو اور ہلتے ہوئے سر کے ساتھ، اور اس کا اوپری ہونٹ نچلے ہونٹ کی معیت میں ناک تک اٹھا ہوتا، معنی خیز بناوٹ کے ساتھ جس کا کچھ یوں ترجمہ کیا جا سکتا ہے "یہ آدمی ہے کون؟ یقیناً میں نے اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ بہر حال، میں اس جیسا بیوقوف بھی نہیں۔"

یہ آدمی، ایسی سنگین متانت کے ساتھ جو تقریباً تہدید آمیز ہوتی ہے، ان لوگوں میں سے تھا جنھیں اچٹتی ہوئی نظر سے بھی دیکھا جائے تو دیکھنے والے کی توجہ اس کو گرفتار کر لیتی ہے۔

اس کا نام جاویر (Javert) تھا اور وہ مقامی پولیس سے متعلق تھا۔

M. sur M میں وہ ایک پولیس افسر کے ناگوار مگر کارآمد فرائض انجام دیتا تھا۔ اس نے میڈیلین کی ابتدا نہیں دیکھی تھی۔ جاویر کا عہدہ موسیو سابوہیے (Chabouillet) کا مرہون منت تھا جو منسٹر آف اسٹیٹ کاؤنٹ انجلیس (Comte Angeles) کا سیکریٹری اور اس زمانے میں پیرس میں پولیس کا پریفیکٹ تھا۔ جاویر جب M. sur M میں وارد ہوا، اس عظیم صنعت کار کی قسمت عروج پر تھی، اور فادر میڈیلین موسیو میڈیلین ہو چکا تھا۔

کچھ پولیس افسروں کی شخصیت میں عجیب خدوخال ہوتے ہیں جو کمینگی اور اختیار کا ملغوبہ ہوتی ہے۔ جاویر ایسی ہی شخصیت کا مالک تھا، مگر اس میں کمینہ پن نہیں تھا۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ اگر روحیں آنکھوں سے دیکھی جا سکتیں، تو ہم وہ عجیب شے دیکھ سکتے ہیں جو نسلِ انسانی کے کسی شخص میں نسلِ حیوانی جیسی ہوتی ہے؛ اور ہم اس سچائی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، سوچنے والے مشکل سے جس کا تصور کر سکتے، کہ صدف سے عقاب تک، اور خنزیر سے چیتے تک، تمام جانور آدمی میں موجود ہوتے ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک، کسی نہ کسی آدمی میں موجود ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی تو ایک ساتھ کئی موجود ہوتے ہیں۔

جانور کچھ نہیں ہوتے سوائے ہماری اچھائیوں اور برائیوں کے نقوش کے جو ہماری روحوں کے نظر آنے والے توہمات کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے پھرتے رہتے ہیں۔ خدا ہمیں ان کو دکھاتا ہے تا کہ ہم غور کریں۔ چوں کہ جانور محض پرچھائیاں ہوتے ہیں، خدا نے انھیں تعلیم کے قابل نہیں بنایا ہے۔ اس کے برعکس، ہماری روحیں حقیقی ہوتی ہیں اور ان کی مناسبت سے ان کے ہدف ہوتے ہیں؛ خدا نے انھیں آگہی بھی عطا کی ہے؛ جس کا مطلب ہے، تعلیم کا امکان۔ سماجی تعلیم، جب قرینے سے دی جائے تو روح سے وہ افادیت اخذ کی جاسکتی ہے، جیسی بھی ہو، جو اس میں موجود ہوتی ہے۔

اب اگر قاری ایک لمحے کے لیے اعتراف کر لے کہ ہر آدمی میں تخلیق کی نسل کا ایک جانور ہوتا ہے تو ہمارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہو جائے گا کہ پولیس افسر جاویر کے اندرون میں بھی ایک جانور تھا۔

Asturias [شمالی ہسپانیہ کی ایک ریاست] کے دیہاتی اس امر کے قائل ہیں کہ بھیڑیوں کے ہر بے ترتیب جھنڈ میں ایک کتا ہوتا ہے جسے اس کی ماں مار دیتی ہے ورنہ اگر وہ بڑا ہو جائے تو دوسرے چھوٹوں کو کھا جائے گا۔

اگر بھیڑیے کے جھنڈ کے کتے بچے کو انسانی چہرہ دے دیا جائے تو نتیجہ جاویر ہوگا۔

جاویر ایک جوتشی عورت کا بیٹا تھا؛ قید خانے میں پیدا ہوا تھا؛ باپ گیلیز کا قیدی تھا۔ بڑا ہوا تو اس کا خیال تھا کہ وہ سماج کا حصہ نہیں بن سکے گا؛ اور اس بات پر افسردہ رہتا تھا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ اس نے دیکھا کہ سوسائٹی دو درجات کے آدمیوں کو معاف کیے بغیر، آدمیوں کے دونوں درجات سے الگ کر دیتی ہے — وہ جو اس پر حملہ کرتے ہیں، اور وہ جو اس کی حفاظت کرتے ہیں؛ اور اس کو ان دونوں درجات میں سے انتخاب کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا؛ ساتھ ہی اسے ایک ناقابلِ بیان درشتی، باقاعدگی اور سچائی کی بنیاد کا احساس تھا، جو بوہیمیائی نسل کے لوگوں سے ناقابلِ اظہار نفرت کے باعث پیچیدہ ہو گئی تھی، جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ پولیس میں شامل ہو گیا اور اسی میں کامیاب ہوا۔ بیالیس برس کی عمر میں وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔

اپنے دورِ شباب میں وہ جنوب کے سزا یافتہ لوگوں کے اداروں میں ملازم تھا۔

مزید آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں "انسانی چہرے" کے ادراک کے بارے میں بات کرنی چاہیے جس کا ابھی ہم جاویر پر اطلاق کر چکے ہیں۔

جاویر کا انسانی چہرہ چپٹی ناک اور دو گہرے نتھنوں پر مشتمل تھا جہاں سے بڑی بڑی

مونچھیں اس کے رخسار تک جاتی تھیں۔ پہلی بار اس کے ان دو جنگلوں اور دو غاروں کو دیکھنے والا خود کو پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ جب جاویر ہنستا— اور اس کی ہنسی غیر معمولی اور ہول ناک ہوتی تھی— تو اس کے دونوں لب الگ ہو جاتے اور صرف اس کے دانت دکھائی دیتے تھے، مسوڑھے نہیں، اور اس کی ناک کے اطراف ایک مسطح اور وحشیانہ شکن پڑ جاتی تھی، جیسی کسی وحشی درندے کی تھوتھنی میں ہوتی ہے۔ جاویر سنجیدہ ہو تو رکھوالا کتا، ہنستا تو چیتا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ، اس کا کاسۂ سر چھوٹا اور جبڑا بڑا تھا؛ اس کے بال ماتھے کو چھپا لیتے اور ابرو تک پہنچ جاتے تھے؛ اس کی آنکھوں کے درمیان مستقل تیوری چڑھی ہوتی تھی، جیسے وہ غصے کے عالم میں ہو؛ اس کی نظر گہری، منہ بند ہوئے جیسا اور ہول ناک؛ اور اس کا مجموعی تاثر سنگ دلانہ تھا۔

یہ آدمی، نسبتاً، دو بہت سادہ اور بہت اچھے جذبات کا مالک تھا؛ مگر ان کو غیر ضروری طور پر بڑھا کر پیش کرتا تھا— اختیار کے لیے احترام، اور سرکشی کے خلاف؛ اس کی نظر میں قتل، ڈاکا، سارے جرائم صرف سرکشی ہی کی مختلف صورتیں تھیں۔ وہ وزیر اعظم سے دیہی پولیس کے ایک اہل کار تک، ہر شخص کو، جس کا ریاست میں کوئی عمل ہوتا ہے، ایک اندھے یقین کے غلاف میں دیکھتا تھا۔ جو کوئی ایک بار بھی کسی برائی کی قانونی دہلیز کو پار کرتا، اس کے نزدیک کراہت، بیزاری اور نفرت کا حق دار ہوتا تھا۔ وہ غیر مشروط انسان تھا اور کسی قسم کے استثنا کو قبول نہیں کرتا تھا۔ ایک جانب، وہ کہتا تھا، ”سرکاری کارپرداز غلطی نہیں کر سکتا؛ منصف کبھی غلط نہیں ہوتا۔“ دوسری طرف کہتا تھا، ”یہ لوگ ناقابلِ علاج ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی قسم کی اچھائی برآمد نہیں ہو سکتی۔“ وہ ان شدت پسند دماغوں کی رائے سے پوری طرح متفق تھا جو انسانی قانون سے نہ جانے کون سی تخلیقی طاقت منسوب کرنا چاہتے تھے— یا اگر قاری چاہے تو اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے— جو شیاطین کی موجودگی کی تصدیق کرتی ہے یا انھیں بناتی ہے، اور جو سوسائٹی کی بنیاد میں آگ کا ایک دریا رکھ دیتی ہیں۔ وہ رواقی، سنجیدہ اور کفایت شعار تھا؛ افسردہ خواب دیکھنے والا، منکسر المزاج اور اپنا سخت، جیسے متعصب دیوانے۔ اس کی نظریں سوراخ کرنے والے برمے جیسی تھیں؛ سرد اور چھیدنے والی۔ اس کی پوری زندگی ان دو لفظوں پر مشتمل تھی: خبرداری اور نگرانی۔ اس نے دنیا کی سب سے ٹیڑھی لکیر میں ایک سیدھی لکیر متعارف کرائی تھی؛ اسے اپنی افادیت کا، اپنے کارہائے منصبی کے طریقوں کا گہرا شعور تھا؛ اور وہ اس طرح کا جاسوس تھا، گویا سارے آدمی پادری ہوں۔ افسوس اس شخص پر، جو اس کے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ اس نے اپنے والد کو بھی گرفتار کیا ہوتا، اگر وہ باغی جہاز کی قید سے مفرور ہوتا؛ اور وہ اپنی ماں کو بھی رسوا کر دیتا اگر وہ

اپنی پابندی توڑ دیتی۔ اور اس نے یہ سب اپنی اندرونی تسکین کے لیے کیا ہوتا جو اس کی نیکی نے اس کو عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تنگ دستی، تنہائی، نفس کشی اور پاکیزگی کی زندگی گزارتا تھا جس میں کبھی انحراف نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک سنگ دل فرض شناس تھا؛ پولیس کا محکمہ اسے اس طرح سمجھتا تھا، جیسے اسپارٹ کے باشندے اسپارٹا کو سمجھتے تھے؛ جیسے بے رحم گھات، جیسے خوں خوار دیانت داری، جیسے مرمر جیسا شفاف خبر رساں؛ جیسے Vidocq میں بروٹس۔

جاویر کی پوری شخصیت ایک ایسے آدمی کا اظہار تھی جو جاسوسی کرتا ہے اور جو خود کو مشاہدے سے نکال لیتا ہے۔ Joseph de Maistre کا اسکول، جو اس عہد میں بلند نظریہ تحقیق کی ان چیزوں سے رچا ہوا تھا جن کو حد سے بڑھتے ہوئے اخبار کہا جاتا تھا، جاویر کو ایک علامت کہنے سے باز نہیں رہا تھا۔ اس کے ابرو نظر نہیں آتے تھے، اس لیے کہ اس کے ہیٹ میں غائب ہوجاتے تھے؛ اس کی آنکھیں نظر نہیں آتی تھیں، اس لیے کہ وہ ابرو میں چھپ جاتی تھیں؛ اس کی ٹھوڑی نظر نہیں آتی تھی اس لیے کہ وہ اس کے گلوبند میں دب جاتی تھیں؛ اس کے ہاتھ نظر نہیں آتے تھے اس لیے کہ وہ اس کی آستینوں کے اندر کھینچ لیے گئے تھے؛ اور اس کی بید نظر نہیں آتی تھی اس لیے کہ وہ کوٹ کے اندر ہوتی تھی۔ مگر جب ضرورت پڑتی تو یہ سب اس کی تمام پرچھائیوں سے، کمیں گاہوں سے، تنگ اور زاویائی پیشانی سے، غصیلی نظر سے، تہدید آمیز ٹھوڑی سے، جسیم ہاتھوں اور خوف ناک ڈنڈے سے نکل پڑتے تھے۔

اپنے فرصت کے مواقع میں، جو بہت کم ملا کرتے تھے، وہ مطالعہ کرتا تھا، حالاں کہ اسے کتابوں سے نفرت تھی؛ اسی وجہ سے وہ بالکل ناخواندہ نہیں تھا۔ اس کی تقریر میں اس کا بہ خوبی اندازہ ہوجاتا تھا۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس میں کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ جب وہ اپنے آپ سے خوش ہوتا تو خود کو ایک چٹکی ناس سُونگنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ یہ اس کی انسانیت کی علامت تھی۔

قاری کو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہوگی کہ جاویر اس پورے طبقے کے لیے دہشت تھا، جسے وزارتِ انصاف اپنی سالانہ شماریات کی سرخی میں خانہ بدوش شمار کرتی ہے۔ جاویر کے نام کا ذکر ہی انھیں مات دے دیتا تھا؛ جاویر کا چہرہ دیکھ کر ہی وہ خوف زدہ ہوجاتے تھے۔

ایسا ہیبت انگیز آدمی تھا وہ۔

جاویر ایسی آنکھ کی طرح تھا جو ہمیشہ موسیو میڈلین پر جمی رہتی ہو۔ ایسی آنکھ جو شبہات میں تر اور تاویل سے بھری ہو۔ موسیو میڈلین کو بالآخر اس کا اندازہ ہوگیا تھا؛ مگر میرے خیال میں

اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے کبھی جاوید سے ایک سوال بھی نہیں کیا؛ نہ وہ اس کی تلاش میں رہتا تھا نہ اسے نظر انداز کرتا تھا۔ وہ جاوید کی پریشان کر دینے والی تقریباً جارحانہ نظر برداشت کرتا تھا مگر اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ جاوید سے نہایت آرام اور خوش خلقی سے پیش آتا تھا، جس طرح کہ وہ دنیا کے بقیہ لوگوں کے ساتھ کرتا تھا۔

موسیو میدلین کو پتا چل گیا تھا کہ جاوید اس کے معاملات کے بارے میں خفیہ تحقیقات کر رہا ہے۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا اور وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں کبھی کبھی کہہ بھی دیتا تھا کہ کوئی شخص کسی خاندان کے بارے میں خفیہ معلومات اکٹھا کر رہا ہے، جو وہاں سے جا چکا ہے۔ ایک بار تو جاوید نے یہ بھی کہہ دیا تھا، اس طرح جیسے وہ خود سے بات کر رہا ہو، "میرا خیال ہے کہ میں نے اسے پکڑ لیا ہے۔" اس کے بعد تین دن تک وہ مغموم رہا، اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ آنے والا دھاگا ٹوٹ گیا تھا۔

مزید یہ کہ کوئی انسانی مخلوق واقعی معصوم نہیں ہو سکتی، اور جبلت کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ درہم برہم ہو سکتی ہے، بھٹک سکتی ہے اور شکست کھا سکتی ہے، ورنہ یہ ذہانت سے برتر ہو جائے گی، اور حیوان کو انسان کے مقابلے میں زیادہ روشنی میسر ہو جائے گی۔

ظاہر ہے کہ جاوید موسیو میدلین کی مکمل بے ساختگی اور سکون سے پریشان تھا۔

پھر بھی، ایک دن اس کے عجیب رویے سے موسیو میدلین متاثر ہوا۔ یہ ایک اور موقعے پر ہوا تھا۔

فادر فوشلووں

ایک صبح کا ذکر ہے کہ موسیو میڈلین M. surM کی ایک کچی گلی سے گزر رہا تھا؛ اس نے کسی کی آواز سنی، اور کچھ فاصلے پر ایک گروہ کو جمع دیکھا۔ وہ گروہ کے قریب گیا۔ ایک عمر رسیدہ شخص فادر فوشلوون اپنی گاڑی سے نیچے گر گیا تھا، اس لیے کہ گاڑی کا گھوڑا گر پڑا تھا۔

فوشلوون اس وقت موسیو میڈلین کے چند دشمنوں میں سے ایک تھا۔ جب میڈلین اس علاقے میں آیا تھا فوشلوون نوٹری پبلک اور کسان تھا اور تقریباً تعلیم یافتہ بھی تھا، جس کا اپنا کاروبار بھی تھا، مگر مائل بہ خرابی تھا۔ فوشلوون نے خود بھی اس سادہ شخص کو دولت مند ہوتے دیکھا تھا، جب کہ وہ خود جو وکیل تھا تباہ ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ میڈلین سے حسد کرنے لگا، اور ہر موقعے پر اس کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ سب کچھ کرتا جو کر سکتا تھا۔ پھر وہ دیوالیہ ہو گیا؛ اس عمر رسیدہ شخص کے پاس سوائے ایک گاڑی اور ایک گھوڑے کچھ نہیں رہ گیا تھا؛ نہ خاندان تھا نہ بچے تھے۔ اس نے اپنی گاڑی چلانی شروع کر دی تھی۔

گھوڑے کی دو ٹانگیں ٹوٹی تھیں؛ وہ ٹھیک کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ بوڑھا گاڑی بان گاڑی کے پہیوں تلے آ گیا تھا۔ ایسا گرا تھا کہ گاڑی کا پورا بوجھ اس کے سینے پر آ پڑا تھا۔ گاڑی پر بہت سامان لدا ہوا تھا۔ فادر فوشلوون کے گلے سے نہایت افسوس ناک آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگوں نے اس کو گاڑی کے نیچے سے نکالنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ بے قاعدگی سے نکالنے کی کوشش، بے ڈھنگے پن سے دی جانے والی مدد، ایک معمولی سی ناموزوں جنبش اس کی موت پر منتج ہو سکتی تھی۔ پوری گاڑی کو اٹھائے بغیر اس کا نکالنا ممکن نہیں تھا۔ جاویر نے، جو حادثے کے وقت وہاں پہنچ گیا تھا، ایک jack-screw. منگا بھیجا۔

موسیو میڈلین بھی آپہنچا۔ لوگ اس کے احترام میں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''میری مدد کرو۔'' بوڑھے فوشلوون نے چیخ کر کہا، ''ہے کوئی نیک بخت جو اس بوڑھے کو بچا لے؟''

موسیو میڈلین وہاں موجود لوگوں کی طرف متوجہ ہوا:

''کیا کوئی jack-screw مل سکتا ہے؟''

''منگایا گیا ہے۔'' ایک کسان نے جواب میں کہا۔

''آنے میں کتنی دیر لگے گی؟''

''لوگ سب سے قریب جگہ، Flachot کے پاس گئے ہیں، جہاں ایک نعل بندی کرنے والا رہتا ہے؛ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؛ اس میں ایک چوتھائی گھنٹا لگ سکتا ہے۔''

''ایک چوتھائی گھنٹا!'' میڈلین نے حیرت سے کہا۔

پچھلی شب بارش ہوئی تھی؛ مٹی بہت گیلی ہو چکی تھی۔

گاڑی ہر لمحے زمیں میں دھنستی جا رہی تھی، اور بوڑھے گاڑی بان کا سینہ مزید کچلا جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ مزید پانچ منٹ میں اس کی پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔

''ایک چوتھائی گھنٹے انتظار کرنا ممکن نہیں۔'' میڈلین نے کسانوں سے کہا جو اس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

''ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

''مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ تم لوگ دیکھ نہیں رہے ہو کہ گاڑی دھنستی جا رہی ہے؟''

''اچھا!''

''سنو!'' میڈلین نے کہنا شروع کیا، ''گاڑی کے نیچے ابھی کافی جگہ باقی ہے جس کے نیچے ایک آدمی رینگ کر پہنچ سکتا ہے، اور گاڑی کو اپنی پیٹھ پر اٹھا سکتا ہے۔ صرف آدھ منٹ لگے گا، اور یہ بے چارہ آدمی نکالا جا سکتا ہے۔ ہے کوئی جس کے پٹھے اور دل مضبوط ہوں؟ پانچ لوئی d'or جیتنے کا بہترین موقع ہے!''

اس گروہ سے ایک آدمی بھی نہیں ہلا۔

''دس لوئی'' میڈلین نے کہا۔

موجود لوگوں کی نظریں جھک گئیں۔ ان میں سے ایک بڑبڑایا، ''آدمی میں شیطانی

توانائی چاہیے ہوگی۔ساتھ ہی کچلے جانے کا خطرہ بھی ہوگا۔"

"چلو" میڈلین نے پھر ابتدا کی "نہیں کوئی!"

وہی خاموشی۔

"ارادہ نہیں جس کی کمی ہے" ایک آواز نے کہا۔

میڈلین نے گھوم کر دیکھا، اور جاویر کو پہچان لیا۔اس نے آنے پر اس کو نہیں دیکھا تھا۔

جاویر نے مزید کہا۔

"توانائی کی ضرورت ہے۔اتنی بڑی گاڑی کو اپنی پیٹھ پر اٹھانے کے لیے بہت توانا آدمی کی ضرورت ہوگی۔"

اس کے بعد، میڈلین کی طرف غور سے دیکھ کر، اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا:

موسیو میڈلین، میں نے سوائے ایک آدمی کے ایسا کوئی نہیں دیکھا جو وہ کچھ کرسکے جو آپ چاہتے ہیں۔"

میڈلین تھرا کر رہ گیا۔

جاویر نے لاپروائی سے کہا تھا، مگر اس کی آنکھیں میڈلین پر لگی رہیں۔

"وہ ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔"

"اوہ!" میڈلین نے کہا۔

"ٹولون کے باورچی خانے میں۔"

میڈلین پیلا پڑ گیا۔

اس دوران گاڑی آہستہ آہستہ دھنستی جا رہی تھی۔فادر فوشلوون پھر زور سے چیخا۔

"میں گھٹا جا رہا ہوں۔میری پسلیاں ٹوٹ رہی ہیں۔اسکرو منگاؤ، کچھ منگاؤ، اُف!"

میڈلین نے اپنے اطراف نظر کی۔

"تو کیا، یہاں کوئی نہیں جو بیس لوئی کمانا چاہتا ہو، اور اس بے چارے بوڑھے کو بچا لے؟"

"کوئی نہیں ہلا۔" جاویر کہنے لگا۔

"مجھے آج تک سوائے اس کے کوئی آدمی نہیں ملا جو کسی اسکرو کی جگہ لے سکتا ہو، اور وہ وہی سزا یافتہ مجرم تھا۔"

"اُف یہ مجھے کچلے دے رہی ہے۔" بوڑھا زور سے چلایا۔

میڈلین نے سر اٹھایا، جاویر کی عقابی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں جو اس پر جمی ہوئی

تھیں، ساکن کسانوں کی طرف دیکھا، اور افسردگی سے مسکرایا۔ اس کے بعد، ایک لفظ بھی کہے بغیر، وہ اپنے گھٹنوں کے بل زمین پر جھکا، اور قبل اس کے کہ مجمعے میں سے کوئی چلا تا، وہ گاڑی کے نیچے تھا۔

توقعات کا ایک خوف ناک لمحہ، اور خاموشی!

لوگوں نے میڈیلن کو دیکھا، جو اپنے پیٹ کے بل اس خوف ناک گاڑی کے نیچے تھا، اس نے اپنے گھٹنے اور کہنیاں ایک جگہ جمع کرنے کی دو نا کام کوشش کیں۔ مجمع چلایا ''فادر میڈیلن، باہر آ جاؤ!'' خود بوڑھے فوشلوون نے بھی کہا،''موسیو میڈیلن۔ چلے جاؤ یہاں سے! تم دیکھ رہے ہو، میرا مرنا تو مقدر ہو چکا ہے،! چھوڑ دو مجھے، تم بھی کچلے جاؤ گے۔'' میڈیلن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجمعے کی سانسیں چڑھ رہی تھیں۔ گاڑی کا پہیہ مسلسل دھنس رہا تھا؛ میڈیلن کے لیے گاڑی کے نیچے سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

اچانک اس بھیانک ڈھیر میں لرزش ہوئی، گاڑی آہستہ آہستہ اٹھنے لگی، کیچڑ میں سے پہیے آدھے اٹھ گئے ۔ لوگوں نے ایک گھٹی ہوئی چیخ سنی، ''جلدی کرو، مدد کرو!''۔ وہ میڈیلن تھا جس نے آخری کوشش کی تھی۔

سب دوڑ پڑے۔ ایک واحد آدمی کے ایقان نے سب کو ہمت دے دی تھی۔ بیس بازوؤں نے گاڑی کو اُٹھا لیا تھا بوڑھا فوشلوون بچا لیا گیا تھا۔

میڈیلن کھڑا ہوا۔ وہ پیلا پڑ گیا تھا؛ پور پور سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ کپڑے پھٹ گئے تھے، کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ سارے لوگ رو دیے۔ بوڑھے نے اس کے گھٹنوں کو بوسہ دیا اور good God کہا۔ اس کے اپنے خدوخال پر ایک ناقابلِ بیان احساسِ خوشی موج زن تھا۔ اس نے جاویر کی طرف غور سے دیکھا، جو اَب بھی اس کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔

فوشلووں مالی بن گیا

گاڑی سے گرنے کے دوران فوشلووں کا گھٹنا اُتر گیا تھا۔ فادر میڈیلین نے اسے دوا خانے بھجوا دیا جو اس نے اپنے کارخانے کے مزدوروں کے لیے اپنی عمارت ہی میں قائم کیا تھا، جس میں خیرات والوں کی جانب سے دو نرسیں بھی متعین تھیں۔ دوسری صبح بوڑھے آدمی کو اس کے بستر کے قریب رکھی میز پر ایک ہزار فرانک کا ایک بینک نوٹ ملا، جس کے ساتھ ایک رقعہ بھی تھا، جس میں فادر میڈیلین نے لکھا تھا، ”میں تمہارا گھوڑا اور گاڑی دونوں خرید رہا ہوں۔“ گاڑی ٹوٹ گئی تھی اور گھوڑا مر چکا تھا۔ فوشلووں کو شفا ہو گئی تھی، مگر اس کا گھٹنا اکڑا ہوا تھا۔ خیراتی ادارے کی نرسوں کی سفارش پر موسیو میڈیلین نے پیرس میں Saint-Antoin اسٹریٹ پر قائم نسوانی کانونٹ میں بوڑھے کو مالی کی ملازمت دلوا دی تھی۔

کچھ عرصے بعد موسیو میڈیلین کا میئر کی حیثیت میں تقرر ہو گیا۔

پہلی بار جب جاویر نے موسیو میڈیلین کو اس لباس میں ملبوس دیکھا جس نے اس کو شہر پر اختیار تفویض کیا تھا، تو اس پر اسی قسم وحشت طاری ہو گئی جیسی ایک نگراں سگ پر اس وقت طاری ہو جاتی ہے جب اسے مالک کے لباس میں ملبوس بھیڑیے کی بو آنے لگتی ہے۔ اس کے بعد سے جاویر، جہاں تک ممکن ہوا، اس سے دور رہنے لگا، مگر جب ملازمت کی ضروریات اس کو میئر سے ملنے پر مجبور کرتیں تو وہ میئر سے ملتا اور اس کو نہایت احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

M. sur M میں فادر میڈیلین کی لائی ہوئی ترقیات کے علاوہ، دوسری قابلِ دید علامات کے علاوہ جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، ایک اور بھی علامت تھی، اور اس لیے اور بھی اہم تھی کہ نظر نہیں آتی تھی۔ ایسی چیز کبھی دھوکا نہیں دیتی جب آبادی مشکل میں ہو۔

جب ملازمت کی کمی ہو، جب کوئی کاروبار نہ ہو تب محصول دینے والا مفلسی کے باعث لگائے گئے مزید محصول کی مزاحمت کرتا ہے، مجبور ہو کر مہلت کی سرحدیں پار کر جاتا ہے تو ریاست کو محصول کے حصول پر زبردستی کرنی پڑتی ہے اور بہت زیادہ رقم بھی خرچ کی جاتی ہے۔ جب وافر کام موجود ہو، جب ملک دولت مند اور خوش ہو، تو محصولات آسانی سے ادا کیے جاتے ہیں اور ریاست کو کچھ خرچ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ گویا، آبادی کی مفلسی اور دولت مندی کا ایک بے خطا پیمانہ ہوتا ہے— محصولات کی وصولی پر اٹھنے والا خرچ۔ سات برس کے دوران M. sur M کے ریاستی علاقے میں محصولات کی وصولی پر اٹھنے والا خرچ تین چوتھائی کم ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس وقت کے وزیر مالیات موسیو de Villele بار بار اس علاقے کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

یہ تھا ملک کا حال، جب فانتین وہاں واپس پہنچی تھی۔ اس سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے موسیو میڈلین کے کارخانے کا دروازہ ایک دوست کی صورت اس کے سامنے تھا۔ وہ وہاں گئی، اور عورتوں کے کاریگری کے علاقے میں پہنچا دی گئی۔ یہ کاروبار فانتین کے لیے بالکل نیا تھا؛ اس کام میں وہ ہنرمند نہ تھی، اس لیے کہ دن بھر کے کام کے باوجود اس کی آمدنی کم ہوتی تھی، مگر اس کے لیے کافی تھی؛ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا؛ وہ اپنی روزی کمانے لگی تھی۔

۞

اخلاقیات اور مادام وِکٹُغنیاں

جب فاتیمین نے دیکھا کہ وہ اپنی روزی کمانے لگی ہے تو چند لمحوں کے لیے وہ بہت خوش ہوئی۔ اپنی دیانت دارانہ محنت سے زندگی گزارنا، خدا کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس کو کام کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ اس نے ایک آئینہ خریدا اور اپنی جوانی، اپنے بال، اپنے دانت پر نظر ڈال کر خوش ہونے لگی؛ وہ بہت ساری باتیں بھول گئی؛ اس کو صرف اپنے بیٹی اور اس ممکنہ مستقبل کی یاد آتی، اور اب وہ تقریباً خوش رہنے لگی تھی۔ اس نے کرایے پر ایک کمرہ لے لیا اور مستقبل کی آمدنی کی بنیاد پر فرنیچر بھی — وہی فضول خرچی کے پرانے طریقوں کے آثار۔ چوں کہ وہ اپنے آپ کو شادی شدہ نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے اپنی بیٹی کا نام لینے میں بہت احتیاط برتتی تھی۔

جیسا کہ قاری کو علم ہو چکا ہے، پہلے تو وہ تین آرویے کو پابندی سے رقم بھیجتی تھی۔ چوں کہ اسے صرف دستخط کرنا آتا تھا، وہ ایک عوامی منشی سے اپنے خط لکھوایا کرتی تھی۔

وہ اکثر خط بھیجتی تھی، اور اس بات کی لوگوں کو خبر ہو گئی تھی۔ عورتوں کے کام کرنے کے کمرے میں چپکے چپکے کہا جانے لگا کہ فاتیمین "خط لکھواتی ہے" اور یہ بھی کہ "ضرور کوئی بات ہے۔"

کوئی کسی کے معاملات کی جاسوسی نہیں کرتا جب تک کہ اس میں دل چسپی نہ ہو۔ وہ شخص ہمیشہ رات گئے گھر کیوں آتا ہے؟ وہ فلاں اور فلاں صاحب منگل کے دن اپنی کنجی اپنی کیل پر کیوں نہیں ٹانگتے؟ وہ ہمیشہ تنہائی گلیوں کے راستے کیوں جاتا ہے؟ مادام کرایے کی گاڑی سے گھر پہنچنے سے پہلے ہی کیوں اتر جاتی ہے؟ جب خود اس کی اپنی کاغذ قلم کی دکان ہے تو وہ باہر سے لکھنے کے لیے چھ عدد کاغذ کے صفحات کیوں منگواتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ایسے بھی لوگ ہیں جو اس قسم کے معموں کا سراغ لگانے کے لیے، جن سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، رقم خرچ کرتے ہیں، وقت ضائع کرتے ہیں، تکلیف اٹھاتے ہیں؛ جن سے ان

اچھے کام کیے جا سکتے ہیں۔ اور وہ یہ سب بغیر کسی فائدے کے، اپنی خوشی کے لیے، اور اپنے تجسس کے معاوضے کے بغیر تجسس کرتے ہیں۔ فلاں اور فلاں مرد کا پورے پورے دن پیچھا کریں گے؛ سڑکوں کے نکڑ پر، رات کے وقت، گلیوں میں کھلنے والے دروازوں کے نیچے، سردی میں اور بارش میں گھنٹوں سنتری کے فرائض انجام دیں گے؛ چوکی داروں کو رشوت دیں گے، کرایے کی گاڑی کے ڈرائیوروں اور ان کے خدمت گاروں کو نشہ پلائیں گے؛ گھر کی نوکرانی کی خدمات حاصل کریں گے؛ حمال کو رشوت دیں گے۔ مگر کیوں؟ کوئی وجہ نہیں۔ بس، لوگوں میں ایک خاص جذبہ سیکھنے کا، جاننے کا اور معاملات میں دخل دینے کا ہوتا ہے۔ ایک خاص خواہش بات کرنے کی ہوتی ہے۔ اور اکثر جب یہ راز معلوم ہو جاتے ہیں، یہ خفیہ باتیں عام ہو جاتی ہیں، یہ معمے دن کے اجالے میں روشن ہو جاتے ہیں تو تباہیاں، لڑائیاں، ناکامیاں، خاندانوں اور زندگیوں کی بربادی کا باعث ہوتی ہیں، ان لوگوں کے لطف کے لیے جنھیں ان معاملات میں کسی دل چسپی کے اور کسی خاص جبلت کے بغیر ''سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔'' کتنے افسوس کی بات ہے۔

کچھ لوگ محض بات کرنے کی حد تک کینہ پرور ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو، بیٹھک کی باتیں، برآمدوں کی گپ شپ اس چمنی کی طرح ہوتی ہے جو تیزی سے لکڑی جلاتی ہیں؛ ان کو بہت زیادہ ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے؛ یہ ایندھن ان کے پڑوسی فراہم کرتے ہیں۔

فانتین پر اسی طرح نظر رکھی جا رہی تھی۔

اس کے علاوہ، کچھ خواتین اس کے سنہرے بال اور سفید دانتوں سے حسد کرتی تھیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کام کرنے کے کمرے میں، سب کے درمیان مڑ کر، کبھی کبھی وہ ایک آدھ آنسو پونچھ لیتی تھی۔ یہ وہ لمحات ہوتے تھے جب اس کو اپنی بچی کی یاد آتی تھی؛ اور شاید اس آدمی کی بھی جس سے محبت کی تھی۔

ماضی کے اندوہ گیں رشتے توڑنا بھی ایک غم انگیز معاملہ ہوتا ہے۔

لوگوں نے پتا لگا لیا تھا کہ وہ مہینے میں کم از کم دو بار خط لکھتی ہے، اور یہ بھی کہ خط گاڑی کے ذریعے بھیجتی تھی۔ لوگوں نے اس کا پتا بھی معلوم کر لیا: موسیو تھی نآردیے Montfermeil میں سرائے کا مالک۔ کرایے کے منشی کا منہ، جو اپنے جیب کے راز اگلے بغیر سُرخ وائن سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا، وائن کی دُکان پر کھلوا لیا گیا۔ مختصر یہ کہ لوگوں کو یہ پتا چل گیا کہ فانتین کی ایک بچی ہے۔ ''وہ کچھ یوں ہی سی عورت ہوگی۔'' ایک گپ باز عورت تلاش کی گئی جو Montfermeil تک گئی، تھی نآردیے سے بات کی اور واپسی پر اس نے بتایا کہ ''اپنے دماغ کا بوجھ اتارنے کے لیے میں نے اپنے پینتیس فرانک خرچ کیے ہیں۔ میں نے خود اس کی بچی کو دیکھا ہے۔''

وہ گپ باز جس نے یہ کام کیا تھا ایک بدشکل عورت تھی، جس کا نام مادام وکٹنیاں

(Victurnien) تھا، جو ہر ایک کی صفات کی سرپرست اور دربان ہوا کرتی تھی ۔ مادام وکٹنیاں کی عمر چھپن برس تھی ۔ اس کی عمر اس کی بدصورتی کی نقاب تھی ۔ اس کی آواز تھرتھراتی تھی، اور اس کا دماغ وسواسی تھا۔ یہ بوڑھی مادام کسی زمانے میں جوان، اور ایک خوب صورت حقیقت تھی ۔ اپنی جوانی کے دنوں میں اس نے ایک بدھ راہب سے شادی کرلی تھی جو سُرخ ٹوپی میں اپنی خانقاہ سے فرار ہو کر، Bernardines سے ہوتا ہوا Jacobins چلا گیا تھا۔ وہ خشک، سخت، تندخو، تیز، عیب جو، تقریباً زہریلی عورت تھی ۔ یہ سب اس بدھ راہب کے طفیل تھا، وہ جس کی بیوہ تھی، اور جس نے بڑے ماہرانہ انداز میں اس پر حکومت کی تھی، اور اس کے ارادوں کو شکست دے دی تھی ۔ وہ عورت ایسی خاردار جھاڑی کی مثال تھی جس میں سے گزرتے پتے کی سرسراہٹ آتی ہو۔ بہت متعصب عورت تھی وہ۔ چھوٹی سے جائیداد کی مالک تھی، جو اس نے بڑے طمطراق سے ایک مذہبی ادارے کو وراثت میں دے دی تھی ۔ Arras کے بشپ کے محل میں اس کے بہت رسوخ تھے۔ لہٰذا یہی مادام وکٹنیاں فانتین کی کھوج میں Montfermeil گئی تھی اور اس اطلاع کے ساتھ واپس ہوئی تھی کہ "میں نے اپنی آنکھ سے بچی کو دیکھا ہے۔"

اس میں کافی وقت گزر گیا۔ فانتین نے اس کارخانے میں ایک برس سے کچھ زیادہ عرصے کام کیا تھا، جب ایک صبح کارخانے کی سپرنٹنڈنٹ نے میئر کی جانب سے اسے پچاس فرانک دیے اور اس کو بتایا کہ اب وہ اس کارخانے کی ملازم نہیں رہی، اور میئر کی جانب سے اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ کر چلی جائے۔

یہ وہی مہینہ تھا جب تِن آردیے نے چھ فرانک کے بجائے بارہ فرانک طلب کیے تھے، اور اس کے بعد بارہ کے بجائے پندرہ فرانک کا مطالبہ کر دیا تھا۔

فانتین ہیجان زدہ رہ گئی۔ وہ علاقہ نہیں چھوڑ سکتی تھی؛ اس پر کمرے اور فرنیچر کا کرایہ قرض تھا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے پچاس فرانک کافی نہ تھے۔ اس نے ہکلاتے ہوئے بہت منت سماجت کی ۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کو اسی وقت کارخانہ چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔ اس کے علاوہ فانتین بس معتدل درجے کی کام کرنے والی عورت تھی ۔ اداسی سے کہیں زیادہ شرم سے مغلوب، اس نے کارخانہ چھوڑ دیا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی غلطی سب پر عیاں ہو گئی تھی۔

اب اس میں سخت الفاظ کہنے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ میئر سے ملاقات کرے، مگر اس کو ہمت نہ ہوئی۔ میئر نے اسے پچاس فرانک دیے تھے، اس لیے کہ وہ اچھا آدمی تھا، اور اس کو نوکری سے نکال دیا تھا، اس لیے کہ وہ صحیح تھا۔ فانتین نے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

مادام وِکٹغنیاں کی کامیابی

گویا بدھ راہب کی بیوہ کسی کام کے لیے تو اچھی تھی۔

مگر موسیو میڈلین کو اس سب کی کوئی خبر نہ تھی۔ زندگی ایسے ہی واقعات کا امتزاج ہوتی ہے۔ موسیو میڈلین عادتاً عورتوں کے کام کے کمرے میں کبھی داخل نہیں ہوتا تھا۔

اس کمرے سے پہلے بنے کمرے کے لیے اس نے ایک عمر رسیدہ کنواری عورت کو مقرر کیا تھا، جسے ایک پادری نے بھیجا تھا۔ اسے اپنی اس سپرنٹنڈنٹ پر پورا اعتماد تھا— ایک نہایت عزت دار، سخت، منصفانہ، سیدھی سادی، خیرات کرنے والی عورت تھی وہ؛ خیرات دینے پر یقین رکھتی تھی مگر ایسی خیرات نہیں جو مفاہمت اور عفو و درگزر پر مشتمل ہوتی ہے۔ موسیو میڈلین کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ اچھے لوگ اکثر اپنا اختیار دینے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں۔ اسی پورے اختیار اور تفویض شدہ طاقت اور یقین کے ساتھ وہ صحیح کام کر رہی تھی کہ سپرنٹنڈنٹ نے خود ہی مقدمہ چلایا، خود ہی فیصلہ کیا، خود ہی سزا سنائی اور خود ہی فانتین کو سزا بھی دے ڈالی۔

اور جہاں تک پچاس فرانک کا معاملہ تھا، وہ ایک خیرات کے فنڈ سے دی گئی رقم تھی جو موسیو میڈلین نے خاتون ملازمین کو مدد فراہم کرنے کے لیے قائم کیا تھا، جس کا وہ حساب نہیں دیتی تھی۔

فانتین نے پڑوس کے گھروں میں ملازمہ کی حیثیت میں کام کرنے کی کوشش کی؛ ایک ایک کے گھر گئی۔ کسی نے اسے نہیں رکھا۔ وہ شہر چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ استعمال شدہ سامان کے دکان دار کی، جس سے فانتین نے کرایے پر فرنیچر لیے تھے، قرض دار تھی۔ وہ فرنیچر بھی کیا تھا— دکان دار اس نے کہا تھا: "اگر تم یہاں سے گئیں تو میں تمھیں چوری کے الزام میں گرفتار کرا دوں گا۔" مالک مکان نے، جس کا کرایہ اس پر واجب تھا، اس سے کہا تھا، "تم

جوان ہو، خوب صورت ہو؛ تم قرض ادا کر سکتی ہو۔" فانٹین نے ان پچاس فرانک کو مالک مکان اور فرنیچر والے پر برابر تقسیم کر دیا، اور ثانی الذکر کا تین چوتھائی مال واپس کر دیا؛ صرف ضروری چیزیں رکھ لیں۔ اب وہ بے روزگار، بغیر کسی کام کے تھی اور سوائے ایک بستر کے، اس کے پاس کچھ نہیں تھا، جب کہ تقریباً پچاس فرانک قرض بھی باقی تھا۔

اب وہ گیریزن کے سپاہیوں کے لیے معمولی درجے کی قمیصیں سینے لگی اور بارہ سو روزانہ کمانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بیٹی کے قیام کی قیمت دس سو کے برابر تھی۔ اس کے بعد اس نے پابندی سے تین آردیے کو رقم بھیجنی شروع کر دی۔

بہر حال، اس عورت نے جو رات کو اس کی گھر واپسی پر اس کے لیے شمع روشن کرتی تھی، فانٹین کو بدبختی میں بھی زندگی گزارنے کا فن سکھایا۔ بہت کم پر زندگی گزارنے کے علاوہ کچھ نہ ہونے پر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اس کے لیے دو خانے ہوتے ہیں؛ پہلا خانہ اندھیرا اور دوسرا خانہ سیاہ ہوتا ہے۔

فانٹین نے سردی کے موسم میں آگ کے بغیر زندہ رہنا سیکھا؛ اس پرندے کو کس طرح کسی کو دے دیا جاتا ہے جو ہر دو روز میں آدھ فارونگ کی جوار کھا جاتا ہے؛ پیٹی کوٹ سے چادر اور چادر سے پیٹی کوٹ کس طرح بنایا جاتا ہے۔ کھڑکی کے قریب کھانا کھانے سے شمع کس طرح بچائی جاتی ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ کچھ مخصوص کم زور مخلوقات، جو تنگ دستی اور ایمان داری کے ماحول میں پائی جاتی ہیں کس طرح ایک سو میں نکالی جا سکتی ہیں۔ فانٹین نے یہ ارفع لیاقت حاصل کر لی تھی، اور اس میں کچھ ہمت بھی لوٹ آئی تھی۔

اس دور میں وہ ایک پڑوسی سے کہتی تھی، "میں خود سے کہتی ہوں کی صرف پانچ گھنٹے سو کر اور بقیہ وقت سلائی کر کے میں ہمیشہ اپنے لیے ایک روٹی کما لوں گی۔ اور پھر، جب کوئی افسردہ ہوتا ہے تو وہ کھاتا بھی تو کم کھاتا ہے۔ اچھا، تو سارے دُکھ، تکالیف، ایک ہاتھ میں چھوٹی سی روٹی، دوسرے ہاتھ میں مصیبت — یہ سب مجھے سہارا دیں گی۔"

یہ بہت خوشی کی بات ہوتی اگر اس نے اپنی چھوٹی سی بچی کو اس پریشانی کے عالم میں اپنے پاس ہی رکھا ہوتا۔ وہ اس کو بلانے کے بارے میں سوچ رہی تھی، مگر اس کے بعد؟ کیا وہ بچی کو بھی اپنی محرومیوں میں شریک کر لے؟ مزید یہ بھی کہ وہ تو تین آردیے کی قرض دار تھی، اور ان کی رقم کس طرح ادا کرے گی؟ اور سفر؟ اس کا خرچ کہاں سے آئے گا؟

وہ عمر رسیدہ عورت جس نے اس کو سبق دیے تھے، جن کو تنگ دستی کی زندگی کہا جائے

گا، صوفی کے درجے کی کنواری تھی جس کا نام مارگریت تھا، وہ سچی پارسائی والی متقی تھی، مفلس اور مفلسوں کے لیے مخیر، حتیٰ کہ دولت مندوں کے لیے بھی؛ جو صرف اتنا لکھنا جانتی تھی کہ وہ اپنے نام کے دستخط کر سکتی تھی، اور خدا پر یقین رکھتی تھی؛ جو سائنس ہے۔

اس زیریں دنیا میں نیک لوگ بھی ہیں؛ ایک دن وہ اوپر کی دنیا میں ہوں گے۔ اس زندگی کے لیے اگلا دن بھی ہے۔

پہلے تو فانتیمن کو اتنی شرمندگی تھی، وہ گھر سے قدم نکالنے کی ہمت نہیں کرتی تھی۔

جب وہ سڑک پر ہوتی تو اسے غیب سے اطلاع مل جاتی تھی کہ لوگ اس کے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں، اس کی طرف اشارے کرتے ہیں؛ ہر کوئی اسے گھور کر دیکھتا ہے مگر اس سے بات نہیں کرتا؛ اور پاس سے گزرنے والوں کی شمالی ہوا سرد اور تلخ، اس کے گوشت میں سرایت کر جاتی تھی۔

ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک بدقسمت عورت چھوٹے سے شہر کے ہر فرد کے طنز و تشنیع تلے بالکل برہنہ تھی۔ کم از کم پیرس میں اسے کوئی جانتا نہیں تھا، اور یہ گم نامی اس کا لباس بن گئی تھی۔ اف، وہ پیرس واپسی کو کتنا پسند کرتی—— مگر یہ ناممکن تھا۔

وہ اپنے آپ کو بدنامی کا عادی بنانے پر مجبور تھی کہ وہ اپنی ناداری کی عادی ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے راستے کا تعین کر لیا۔ دو تین مہینے گزرنے کے بعد اس نے شرم کی گرد جھاڑ دی، اور باہر نکلنا شروع کر دیا، گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ”میں بالکل ویسی ہی ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

اب وہ سر اٹھا کر، تلخ تبسم کے ساتھ، آنے جانے لگی تھی، اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بے حیا ہوتی جا رہی تھی۔

مادام وِکٹنعتیاں کبھی کبھی اپنی کھڑکی سے اسے گزرتے دیکھتی، اور ”اس مخلوق“ کی پریشانی پر غور کرتی جس کو اس کی ”اپنی جگہ پر واپس رکھ دیا“ گیا تھا، اور خود کو مبارک باد دیتی تھی۔ بداندیش کی خوشی ہمیشہ سیاہ ہوتی ہے۔

ضرورت سے زیادہ مشقت فانتیمن کو کھائے جا رہی تھی، اور اس کی خشک کھانسی جو بہت دنوں سے پریشان کیے ہوئے تھی، بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی پڑوسی مارگریت سے کہتی، ”ذرا میرے ہاتھ چھو کر دیکھو، کتنے گرم ہو رہے ہیں۔“

بہر حال، جب وہ صبح کو ایک پرانی ٹوٹی ہوئی کنگھی سے اپنے بال جھاڑتی، اور وہ کچے ریشم کی طرح لہراتے، تو اس پر ایک لمحے کے لیے نازکی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

۞

کامیابی کا نتیجہ

اس کو سردی کے موسم کے اختتام پر ملازمت سے فارغ کیا گیا تھا۔ گرمی کا موسم گزر گیا، مگر سردی کا موسم پھر آگیا تھا۔ چھوٹے دن، کم کام، سردی کا موسم — گرمی نہیں؛ روشنی نہیں؛ دوپہر نہیں؛ شام صبح سے مسلسل؛ کہر؛ دھندلکا؛ کہر کی دھندلی؛ اس سے پرے دیکھنا ناممکن۔ آسمان ہوا کا سوراخ ہے۔ دن ایک غار ہے۔ سورج ایک بھکاری کے روپ میں ہے۔ خوف ناک موسم۔ سردی کا موسم جنت کا پانی بدل دیتا ہے اور انسان کے دل کو پتھر بنا دیتا ہے۔ اس کے قرض خواہ اس کو پریشان کر رہے تھے۔

فانتین کی آمدنی بہت کم تھی۔ اس کا قرض بڑھ گیا تھا۔ تین آرد یے، جن کو وقت پر ادائیگی نہیں ہو رہی تھی، اس کو مسلسل خط لکھ رہے تھے جن کا متن اس کو اداس کر دیتا تھا، اور جن کی باربرداری نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایک دن انھوں نے لکھا کہ اس کی ننھی کوزیت سردی کے موسم میں بالکل برہنہ تھی؛ کہ اسے ایک اونی اسکرٹ کی اشد ضرورت تھی؛ کہ اس کی ماں کو اس کے لیے کم از کم دس فرانک فوراً بھیجنے چاہئیں۔ اس کا خط ملا۔ اسے سارا دن ہاتھ میں لیے مسلتی رہی۔ اس شام وہ سڑک کے کونے پر واقع ایک حجام کی دکان پر گئی، اور بالوں سے اپنا کنگھا کھینچ نکالا۔ اس کے خوب صورت سنہرے بال اس کے گھٹنوں تک لہرا گئے۔

"کیا شان دار بال ہیں۔" حجام نے حیرت سے کہا۔

"اس کے لیے تم مجھے کتنا دو گے؟" فانتین نے کہا۔

"دس فرانک!"

"کاٹ لو۔"

فانتین نے اون سے بُنا ہوا پیٹی کوٹ خریدا اور تین آردیے کو روانہ کر دیا۔ اس کپڑے نے تین آردیے کو برہم کر دیا۔ وہ دراصل رقم چاہتے تھے۔ انھوں نے وہ پیٹی کوٹ اپنی بیٹی ایپونین کو دے دیا اور بے چاری ننھی چڑیا تھرتھراتی رہی۔

فانتین "میری بچی سردی سے بچ گئی ہے۔ میں نے اسے بال کا لباس پہنا دیا ہے۔ اس نے اپنے گنجے سر کو گول ٹوپیوں میں چھپا لیا۔ اس میں بھی وہ خوب صورت تھی۔

بُرے بُرے خیالات فانتین کے دل پر قابض ہو گئے۔

جب اس نے دیکھا کہ اب وہ اپنے بال سنوار نہیں سکتی تھی، اس نے اپنے اطراف سب سے نفرت کرنا شروع کر دیا۔ ایک عرصے سے وہ فادر میڈلین کے آفاقی احترام میں شریک تھی؛ پھر بھی، اس خیالِ مسلسل نے کہ اس نے ہی اس کو ملازمت سے نکالا تھا؛ کہ وہی اس بدقسمتی کا سبب تھا، اس نے فادر سے نفرت شروع کر دی۔ کام کے اوقات میں جب بھی وہ کارخانے کے پاس سے گزرتی، جب کام کرنے والے دروازے پر ہوتے، تو وہ جھوٹ موٹ ہنسنا اور گانا شروع کر دیتی تھی۔

ایک پرانی کام کرنے والی نے ایک بار اسے اس انداز میں ہنستے گاتے دیکھا تو کہا تھا "اس لڑکی کا انجام بُرا ہوگا۔"

فانتین نے اپنا دلیر پن دکھانے کے لیے ایک عاشق بنا لیا؛ ایک آدمی سے جس سے وہ محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ بدبخت ایک اوباش شخص تھا؛ مانگنے والا موسیقار، کاہل بھکاری، جو اس کو مارتا پیٹتا تھا، جس نے اسے چھوڑ بھی دیا اس لیے کہ وہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔

وہ اپنی بچی سے والہانہ محبت کرتی تھی۔

وہ جتنی گہرائی میں جاتی، اس کے اطراف زیادہ اندھیرا ہوتا جاتا، اور وہ ننھی حور اس کے دل کے نہاں خانے میں زیادہ چمکنے لگتی تھی۔ اس نے خود سے کہا "جب میں دولت مند ہو جاؤں گی تو اپنی کوزیت کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔" اور وہ ہنس پڑی۔ اس کی کھانسی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا؛ اس کی پشت پر پسینہ آنے لگتا تھا۔

ایک دن اسے تین آردیے کا خط ملا جو دھمکیوں میں ملفوف تھا: "کوزیت کو ایسا عارضہ لگ گیا ہے جو اس علاقے میں پھیل گیا ہے۔ بخار میں جسم پر باجرے جیسے دانے ابھر آتے ہیں۔ اس کے لیے مہنگی دوائیں درکار ہوتی ہیں۔ اخراجات ہمیں تباہ کیے ڈال رہے ہیں۔ اگر تم فوراً چالیس فرانک نہیں بھیجتیں تو بچی مر جائے گی۔"

فانتین قہقہہ مار کر ہنسی، اور اپنے پڑوسی سے کہا، ''واہ! خوب ہیں یہ لوگ بھی! چالیس فرانک! واہ کیا طریقہ ہے! اس کا مطلب دو نقرئی نپولین ہوتے ہیں۔ میں انھیں دینے کے لیے کہاں سے لاؤں گی؟ یہ دیہاتی واقعی احمق ہیں۔''

پھر بھی وہ سیڑھی کے قریب کی کھڑکی کے پاس گئی، خط کو ایک بار پھر پڑھا۔اس کے بعد سیڑھیاں اُتری، دوڑتی، اچھلتی، باہر نکلی۔وہ اب بھی قہقہے لگا رہی تھی۔

کوئی اسے ملا اور اس سے کہا، ''تم اتنی خوش کیوں ہو رہی ہو؟''

اس نے جواب میں کہا، ''دیہاتیوں نے مجھے احمق پن کا ایک لا جواب ٹکڑا لکھ بھیجا ہے۔وہ مجھ سے چالیس فرانک طلب کر رہے ہیں۔تم دیہاتیوں کو بس اتنا بتا دینا ہی کافی ہے۔''

ابھی وہ میدان پار ہی کر رہی تھی کہ اس نے بہت سے لوگوں کو ایک عجیب شکل کی گاڑی کے اطراف جمع دیکھا، جس کی چھت پر ایک آدمی سرخ لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔وہ ایک جعلی دنداں ساز تھا جو پھیرے پر نکلا تھا، جو عوام کو دانتوں کے پورے جوڑے، افیونیات، پاؤڈر اور آبِ حیات جیسی اشیا فروخت کر رہا تھا۔

فانتین لوگوں میں گھل مل گئی، اور تمام لوگوں کے ساتھ اس کی خطیبانہ تقریر پر ہنسنے بھی لگی، جس میں عوام کے لیے نا شائستہ الفاظ اور خواص کے لیے اصطلاحات تھیں۔ دانت اکھاڑنے والے نے خوب صورت ہنستی لڑکی کو تاڑ لیا، اور اچانک کہا، ''تمھارے دانت بہت خوب صورت ہیں، اے لڑکی، وہ جو ہنس رہی ہے: اگر تم اپنے palettes بیچنا چاہو تو تمھیں ہر دانے کے عوض ایک طلائی نپولین دوں گا۔''

فانتین نے پوچھا، ''palettes کسے کہتے ہیں؟''

''palettes'' دانتوں کے پروفیسر نے جواب میں کہا، ''سامنے کے وہ اوپر والے دانتوں کو کہتے ہیں۔''

''کتنی بھیانک بات ہے۔'' فانتین نے زور سے کہا۔

''دو نپولین!'' ایک پوپلی بوڑھی عورت بڑبڑائی جو وہیں کھڑی تھی، ''کتنی خوش قسمت لڑکی ہے یہ۔''

فانتین اپنے کان بند کیے وہاں سے بھاگی، تا کہ اس چلاتے آدمی کی بھرائی ہوئی آواز نہ سن سکے: ''غور کر، میری پیاری حسینہ! دو نپولین؛ تیرے کسی کام آئیں گے۔اگر تمھارا دل چاہے تو آج شام Tillac d'Argent کی سرائے میں آجانا۔میں وہیں ملوں گا۔''

فانتینی واپس گھر پہنچی۔ غصے میں بھری، اس نے سارا واقعہ اپنی نیک پڑوسن مارگریت کو سنایا: ''کیا تم اس قسم کی بات سوچ بھی سکتی ہو؟ کیا وہ آدمی قابلِ نفرت نہیں؟ ایسے لوگوں کو اس طرح گھومنے کی اجازت کیوں دی جاتی ہے؟ میرے سامنے کے دو دانت اُکھاڑنے کے لیے! کیوں، میں بھیانک ہو جاؤں؟ میرے بال تو دوبارہ اُگ آئیں گے، مگر میرے دانت؟ کیسا شیطان آدمی ہے۔ میں پانچ منزل اوپر سے سر کے بل کود جانا پسند کروں گی۔ اس نے کہا ہے کہ وہ آج شام Tillac d'Argent میں ہوگا۔''

''اور اس نے کیا پیش کش کی ہے؟'' مارگریت نے پوچھا۔

''دو طلائی نپولین۔''

''یعنی چالیس فرانک۔''

''ہاں'' فانتینی نے کہا، ''اس کے چالیس فرانک ہوتے ہیں۔''

فانتینی سوچتی رہی، اور اپنے کام میں لگ گئی۔ ایک چوتھائی گھنٹا گزر جانے کے بعد اس نے اپنی سلائی چھوڑی اور سیڑھی پر جا کر ایک بار پھر تھن آردیے کا خط پڑھا۔

واپسی پر اس نے مارگریت سے کہا، جو اس کے ساتھ ہی کام کر رہی تھی:

''یہ miliary بخار کیا ہوتا ہے؟ تم جانتی ہو؟''

''ہاں'' کنواری بڑھیا نے کہا، ''ایک بیماری ہوتی ہے۔''

''کیا اس میں بہت ساری دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے؟''

''اُف! خوف ناک دواؤں کی۔''

''یہ بیماری کیسے لگتی ہے؟''

''بس! ایک عارضہ ہے، جو انجانے میں لگ جاتا ہے۔''

''اس کے بعد یہ بچوں پر بھی حملہ آور ہوتا ہے؟''

''خاص کر بچوں کو ہی لگتا ہے۔''

''کیا اس میں لوگ مر بھی جاتے ہیں؟''

''مر بھی سکتے ہیں۔'' مارگریت نے کہا۔

فانتینی کمرے سے باہر گئی، سیڑھی پر، ایک بار پھر وہ خط پڑھنے کے لیے۔

اس شام فانتینی باہر گئی، اس کے قدم Paris اسٹریٹ کی طرف اُٹھ رہے تھے، جہاں سرائے ہیں۔

دوسری صبح، جب اُجالا ہونے سے پہلے مارگریت فانتین کے کمرے میں داخل ہوئی، کہ وہ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ کام کرتی تھیں، اور اس طرح دو کے لیے ایک ہی شمع استعمال ہوتی تھی، اس نے فانتین کو اپنے پلنگ پر بیٹھا پایا؛ زرد رو اور بالکل ساکت۔ وہ لیٹی نہیں تھی۔ اس کی ٹوپی گھٹنوں پر پڑی تھی۔ اس کی شمع پوری رات جلی تھی، اور تقریباً بالکل ختم ہو چکی تھی۔ مارگریت خوف زدہ کھڑی اس بھیانک تباہی کو دیکھ رہی تھی— چلّا کر بولی:

''او خدایا! پوری شمع جل گئی ہے! کیا ہوا ہے تجھ کو؟''

پھر اس نے فانتین پر نظر کی، جس نے بالوں سے محروم اپنا سر اس کی طرف گھمایا۔

پچھلی رات سے اب تک فانتین کی عمر دس برس بڑھ گئی تھی۔

''یسوع مسیح!'' مارگریت نے کہا، ''کیا بات ہے، فانتین؟''

''کچھ نہیں'' فانتین نے جواب دیا، ''اب میری بچی، مدد کی غیر موجودگی میں، اس خوف ناک بیماری سے مرے گی نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے دو نپولین کی طرف اشارہ کیا جو میز پر پڑے چمک رہے تھے۔

''او، خدایا!'' مارگریت چیخ پڑی۔ ''کیوں؟ یہ تو بڑی دولت ہے! یہ louis d'or تمھیں کہاں سے مل گئے؟''

''بس، مل گئے'' فانتین نے جواب دیا۔

ساتھ ہی وہ مسکرائی۔ شمع نے اس کے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ یہ ایک خونی تبسم تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے سُرخی مائل رال بہہ رہی تھی، اور اس کے منہ میں ایک سیاہ غار سا بن گیا تھا۔

وہ دو دانت اکھاڑ لیے گئے تھے۔

فانتین نے چالیس فرانک Montfermeil بھیج دیے۔

یہ سب تھی آردیے کی بہانے بازی تھی، رقم وصول کرنے کے لیے۔ کوزیت بیمار نہیں تھی۔

فانتین نے اپنا آئینہ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ بہت دن ہوئے اس نے دوسری منزل والی اپنی کوٹھری چھوڑ دی تھی اور بالا خانے کی دو چھتی میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس میں صرف ایک چٹخنی تھی بند کرنے کے لیے، چھت کے برابر؛ جس میں آتے جاتے سر ٹکراتا تھا۔ اس بے چاری کو اس کوٹھری کے آخری سرے تک پہنچنے کے لیے، زیادہ سے زیادہ جھکنا پڑتا بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنے مقدر کی انتہا پر ہو۔

اب اس کے پاس پلنگ بھی نہیں تھا؛ ایک چیتھڑا تھا، جسے وہ پلنگ پوش کہتی تھی، فرش پر

ایک گدا، اور ایک بے نشست کرسی باقی رہ گئی تھی۔ ایک شاخِ گلاب جو کبھی تھی، اب خشک ہو گئی تھی، ایک کونے میں پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں مکھن رکھنے کا برتن تھا، پانی رکھنے کے لیے، جو سردی کے موسم میں جم گیا تھا۔ اس میں کئی سطح پر پانی خشک ہو جانے سے برف کے دائرے بن گئے تھے۔ اس کی شرم غائب ہو گئی تھی، اس کے نازنخرے ختم ہو گئے تھے۔ ایک آخری نشان۔ اب وہ گندی ٹوپی میں باہر جانے لگی تھی۔ خبر نہیں یہ کاہلی تھی یا لاپروائی۔ اب وہ اپنی چادر بھی درست نہیں کرتی تھی۔ ایڑیاں پھٹ گئیں تو جرابوں میں چلنے لگی۔ اپنی پرانی اور پھٹی چولی میں سفید ٹھے کا پیوند لگانے لگی، جو ہلکی سے حرکت سے پھٹ جاتا تھا۔ جن کی قرض دار تھی، وہ اس کا مذاق اُڑانے لگے تھے۔ وہ سڑک پر مل جاتے؛ ایک بار تو اس کی سیڑھیوں پر بھی ملے تھے۔ اس کی کئی راتیں روتے اور سوچتے گزر جاتیں۔ اس کی آنکھیں بہت چمک دار تھیں۔ اس کے کاندھوں میں مسلسل درد ہوتا رہتا تھا۔ اسے کھانسی بہت آتی تھی۔ وہ فادر میڈلین سے بے حد نفرت کرنے لگی تھی، مگر کبھی شکایت نہیں کی۔ دن کے سترہ گھنٹے سلائی کرتی؛ مگر قید خانے کے کام کے ایک ٹھیکے دار نے، جس نے قیدیوں سے رعایت پر کام لینا شروع کر دیا تھا، اچانک کام کرنے والی عورتوں کی دہاڑی کم کر دی تھی، جس کی وجہ سے ان کی روزانہ کی آمدنی کم ہو کر صرف نو سو رہ گئی۔ سترہ گھنٹے کی مشقت اور فی یوم صرف نو سو ! اس کے قرض خواہ ہمیشہ کی طرح بے رحم تھے۔ پرانے فرنیچر والا، جو تقریباً تمام سامان لے جا چکا تھا، مسلسل اس سے کہتا رہتا تھا، "میرا قرض کب ادا کرے گی، جانِ من؟" وہ اس سے کیا چاہتے تھے، میرے خدا! اس کو محسوس ہوتا تھا جیسے اس کو شکار کیا جا رہا تھا، اور اس کے اندر ایک وحشی درندہ سا تیار ہو رہا تھا۔ عین اسی دوران تھی آردیے نے اسے لکھا کہ انھوں نے بہت انتظار کیا ہے، اور اسے ایک سو فرانک فوراً درکار ہیں؛ ورنہ وہ کوزیت کو گھر سے نکال دیں گے، جب کہ اتنی سخت بیماری کے بعد وہ رو بہ صحت ہے، سردی میں سڑکوں پر ماری پھرے گی، اور اس کا جو جی چاہے گا کرے گی، اور چاہا تو مر بھی جائے گی۔

"ایک سو فرانک" فانتین نے سوچا، "مگر ایسا کون سا کام ہے جس میں سو سو روز کے مل سکیں گے؟

"چل" اس نے خود سے کہا، "اب وہ بیچتے ہیں جو بچ رہا ہے۔"

اور وہ بد قسمت لڑکی شہر کی عورت بن گئی۔

یسوع نے ہمیں آزاد کردیا

فانتین کی تاریخ کیا ہے؟ سوسائٹی ایک غلام خرید رہی ہے۔

کس سے؟ بدبختی سے۔

بھوک سے؛ ٹھنڈک سے؛ تنہائی سے؛ محرومی سے۔ یہ ایک دردناک سودا ہے۔ ایک لقمہ روٹی کے عوض ایک ضمیر ہے۔ بدبختی پیش کرتی ہے اور سوسائٹی قبول کرتی ہے۔

یسوع مسیح کا مقدس قانون ہمارے سماج کی نگرانی کرتا ہے، مگر ابھی تک اس میں جذب نہیں ہوا ہے؛ کہا جا رہا ہے کہ یورپی سماج سے غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ بالکل غلط! غلامی اب بھی موجود ہے؛ مگر اس کا بوجھ صرف عورت پر ہے، اور اس بوجھ کو عصمت فروشی کہتے ہیں۔

اس کا بوجھ عورت پر ہے، یعنی، عزت پر؛ کم زوری پر؛ حسن پر؛ زچگی پر۔ یہ انسان کی بے عزتی میں سب سے کمتر نہیں۔

اس نقطے پر، اس غمگین ڈرامے میں، ہم جس پر پہنچ چکے ہیں، فانتین کے لیے کچھ نہیں بچا، اس میں سے جو وہ پہلے تھی۔

وہ مر مر بننے کی کوشش میں دلدل بن گئی ہے۔ جو بھی اسے ہاتھ لگاتا ہے بے حس محسوس کرتا ہے۔ وہ گزرتی ہے؛ وہ آپ کو برداشت کرتی ہے؛ وہ آپ کو نظر انداز کرتی ہے؛ وہ سخت گیر اور زردی جوئی علامت ہے۔ زندگی نے اور سماج کے نظام نے اس کے بارے میں آخری لفظ کہہ دیا ہے۔ اس پر جو گزرنی تھی، گزر چکی ہے۔ اس نے ہر شے محسوس کی ہے؛ ہر شے برداشت کی ہے؛ ہر شے کا تجربہ کیا ہے؛ ہر شے کھوئی ہے؛ ہر شے کا ماتم کیا ہے۔ وہ اس بیزاری سے بیزار ہے جو لاپروائی سے مشابہ ہوتی ہے، جیسے موت نیند سے مشابہ ہوتی ہے۔ اب وہ کسی شے سے گریز

نہیں کرتی۔ سارے بادلوں کو اس پر گر جانے دیجیے، اور پورے سمندر کو اس پر سے بہہ جانے دیجیے۔ اس کے نزدیک ان کی کیا حیثیت ہے؟ وہ ایک اسفنج ہے جو رقیق سے بھرا ہوا ہے۔

کم از کم، اسے یقین تو ہے کہ یہ سب کچھ ایسا ہی ہے؛ مگر یہ سمجھنا غلطی ہے کہ مقدر کو کم زور کیا جا سکتا ہے؛ اور یہ بھی کہ کوئی کسی شے کی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔

افسوس! بے ترتیبی کے چلائے ہوئے یہ سارے مقدر کیا ہیں؟ یہ کس طرف جا رہے ہیں؟ اور ایسے کیسے ہیں؟

بس وہی ہے جو جانتا ہے، جو ساری پرچھائیوں کو دیکھتا ہے۔

وہ اکیلا ہے۔ اس کا نام خدا ہے۔

موسیو باماتابوا کا فرار

تمام چھوٹے شہروں میں، بالخصوص M. sur M میں بھی، ایسے نوجوان لوگوں کا ایک طبقہ تھا جو پندرہ سو فرانک کی قلیل آمدنی پر اسی طرح گزارا کرتا تھا جس طرح ان کے نمونے پیرس میں دو لاکھ فرانک فی سال ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ بے جنس قسم کے لوگ ہیں: نامرد مردہ، طفیلی جراثیم، صفر، جن کے پاس تھوڑی زمین، تھوڑی بیوقوفی، تھوڑی ذہانت ہوتی ہے، جو کسی ڈرائنگ روم میں گنوارہ اور شراب خانے میں خود کو شرفا میں سے سمجھتے ہیں؛ اور جو بار بار کہتے ہیں، ”میرے میدان — میرے کسان — میرے جنگلات“؛ جو اداکار عورتوں کو دیکھ کر ناپسندیدگی سے سی سی کرتے ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ باذوق لوگ ہیں؛ گیریژن کے افسران سے لڑائی کرتے ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ جنگجو ہیں؛ شکار کرتے ہیں؛ تمباکو نوشی کرتے ہیں؛ جمائی لیتے ہیں؛ شراب پیتے ہیں، تمباکو سونگھتے ہیں؛ بلیرڈ کھیلتے ہیں، مسافروں کو گھورتے ہیں؛ کبھی کام نہیں کرتے؛ کیفے میں رہتے ہیں؛ سرائے میں کھانا کھاتے ہیں؛ کتا رکھتے ہیں جو میز کے نیچے ہڈیاں چباتا ہے اور ایک محبوبہ رکھتے ہیں جو میز پر رکھی تھالوں میں کھاتی ہے؛ جو فیشن میں زیادتی کرتے ہیں؛ المیے کی تعریف کرتے ہیں؛ عورتوں سے چڑتے ہیں؛ پرانے جوتوں کو پھینک دیتے ہیں؛ پیرس میں لندن کی نقل کرتے ہیں؛ کند ذہن بوڑھے ہو جاتے ہیں؛ کبھی کام نہیں کرتے؛ کسی کام کے نہیں ہوتے اور زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچاتے۔

موسیو فیلکس تولومیے اگر اپنے صوبے میں رہتا اور کبھی پیرس نہ دیکھتا، تو ان آدمیوں جیسا ہوتا۔

اگر وہ زیادہ دولت والے ہوں، تو لوگ کہتے، ”یہ بانکے ہیں۔“ زیادہ مفلس ہوں تو

لوگ کہتے، ''یہ آرام طلب ہیں۔'' یہ محض بے ملازمت لوگ ہیں۔ ان بے ملازمت لوگوں میں اکتا دینے والے، اکتا جانے والے، خواب دیکھنے والے اور کچھ عیار لوگ بھی ہوتے ہیں۔

اس زمانے میں بانکے کی پہچان تھی: اونچا کالر؛ چوڑے گلو بند؛ دستی گھڑی جس میں کوئی پُرتکلف شے آویزاں ہو؛ تین مختلف رنگوں کی صدریاں، ایک دوسرے کے اوپر پہنی ہوئیں، سرخ اور نیلے رنگ والی اندر کی طرف؛ کمر سے اوپر تک کا زیتون کے رنگ کا، کاڈ مچھلی جیسا دنبالہ لگا ہوا کوٹ جس میں، نقرئی بٹن کی دو قطاریں، ایک دوسرے سے قریب اور کاندھے تک جاتی ہوئیں؛ اور ہلکے زیتون کے رنگ کا پتلون، جس کی دو سیونیں بے شمار لکیروں سے مزین، جو ایک سے گیارہ تک ہو سکتی تھیں، مگر اس سے زیادہ نہیں۔ اس میں اونچی ایڑیوں والے جوتوں کا بھی اضافہ کر لیجیے جس میں لوہے کی کیلیں لگی ہوں؛ تنگ چھجوں والی ایک اونچی سی ہیٹ؛ بالوں کے بنے ہوئے گچھے؛ ہاتھ میں ایک بڑی سی بید، اور ہمیشہ Potier کے ذو معنی لطیفوں سے شروع ہونے والی گفتگو۔ اس پر مستزاد، جوتوں میں لگے مہمیز کرنے والے کانٹے اور لمبی لمبی مونچھیں۔ اس زمانے میں مونچھیں درمیانہ درجے کے لوگوں کا نشان ہوتی تھیں اور مہمیز کرنے والے کانٹے پیادوں کا۔

صوبائی بانکے اپنے جوتوں میں سب سے لمبے مہمیزی کانٹے پہنتے تھے اور خوف ناک ترین مونچھیں رکھتے تھے۔ وہ زمانہ جنوبی امریکا کی جمہوریتوں اور ہسپانیہ کے بادشاہ کے درمیان، اور [کولمبیا کے صدر] Simon Bolivar بہ مقابلہ Morillo [جنوب مشرقی فرانس کے علاقے Morillon کے باشندے] کے تنازعات کا تھا۔ تنگ چھجوں کی ہیٹ والے شاہ پرست تھے جن کو morillos کہا جاتا تھا؛ روشن خیال لوگ چوڑے چھجوں کی ہیٹ پہنتے تھے، جن کو bolivars کہا جاتا تھا۔

آٹھ یا دس ماہ، اور اس کے بعد، جو پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے، یکم جنوری 1823ء تک ایک برف باراں شام کو، ان بانکوں میں سے ایک، ان بے روزگار لوگوں میں سے ایک، جو right thinker, تھا، اس لیے کہ وہ morillo لباس میں ملبوس تھا اور ان بڑی عباؤں میں ڈھکا ہوا تھا جو سردی کے موسم کے فیشن والے لباس کی تکمیل کرتے تھے، افسروں کے کیفے کے سامنے ایک لڑکی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہو رہا تھا، جس کی گردن برہنہ تھی اور جس کے بالوں میں پھول تھے۔ بانکا تمباکو نوشی کر رہا تھا، اس لیے کہ وہ یقینی طور پر فیشن کا متوالا تھا۔

ہر بار جب وہ عورت اس کے سامنے سے گزرتی، وہ سگار کے دھوئیں کے ساتھ اس کی طرف کوئی جملہ بھی اچھال دیتا تھا، جس کو اپنے تئیں وہ مزاحیہ اور نشاطیہ سمجھتا تھا؛ مثال کے طور پر ''تم کتنی بدصورت ہو!— میری نظروں سے دور ہو جاؤ— تمھارے تو دانت ہی نہیں! وغیرہ

وغیرہ۔ ان حضرت کا نام تھا موسیو بالا تا یوا۔ اس آسیب جیسی اداس عورت نے جو برف میں آ جا رہی تھی، اسے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ اس کی طرف نظر تک نہیں کی، پھر بھی خاموش اپنی چہل قدمی میں مشغول رہی، اور غم انگیز پابندی سے، ہر پانچ منٹ بعد، اس سزا یافتہ سپاہی کی طرح جو چھڑوں کے نیچے واپس ہوتا ہو، اس طنز و تشنیع کی پہنچ میں ہوتی تھی۔ اس تھوڑے سے اثر کو دیکھ کر جس نے بلاشبہ اس عورت کو ناراض کر دیا تھا؛ اور موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب اس کی پشت مڑی، وہ بانکا بھیڑیے کی رفتار سے عورت کے پیچھے بڑھا، اور اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے جھکا، راستے سے مٹھی بھر برف اٹھائی اور اچانک لڑکی کی پشت میں، برہنہ کاندھوں کے درمیان ٹھونس دی۔ عورت زور سے دہاڑی، گھوم کر چیتے کی طرح اس کی طرف لپکی اور خود کو اس آدمی پر گرا دیا، اور ایسے الفاظ کے ساتھ، جو نابدان میں گرنے کے قابل تھے اور اپنے ناخن اس کے چہرے میں گاڑ دیے۔ یہ توہین آمیز، برانڈی سے سخت شدہ آواز، اس منہ سے نکلی تھی جو سامنے کے دو دانتوں سے محروم تھا۔ وہ عورت فانتین تھی۔

اس طرح نکلی آواز پر، کیفے سے افسروں کے جھنڈ کے جھنڈ نکلے؛ سڑک پر گزرنے والے لوگ اکٹھے ہو گئے، اور ایک بڑا اور ہنگامہ خیز دائرہ، ہلّو بازی کرتا، تالیاں بجاتا، اس بھنور کے سامنے بن گیا تھا، جو دو افراد پر مشتمل تھا، جن کو دیکھ یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ دونوں عورت ہیں یا مرد؛ مرد جد و جہد کر رہا تھا، اس کی ہیٹ زمین بوس ہو گئی تھی؛ برہنہ سر عورت، غراتی، بالوں اور دانتوں سے محروم، غصے سے نیلی پیلی، خوف ناک لاتوں اور گھونسوں سے حملے کر رہی تھی۔

اچانک مجمعے میں سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نکلا، عورت کو اس کی ساٹن کی چولی سے پکڑا، جو کیچڑ میں لت پت ہو چکی تھی، اور کہا، "میرے پیچھے پیچھے چلو۔" عورت نے اپنا سر اٹھایا، اس کی غصے بھری آواز ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں شیشے جیسی تھیں؛ وہ نیلی ہونے کے بجائے پیلی ہو گئی تھی، خوف سے لرز گئی تھی۔ اس نے جاویر کو پہچان لیا تھا۔

بانکے نے واقعے کے موقعے سے فائدہ اٹھایا، اور وہاں سے فرار ہو گیا۔

۞

شہری پولیس کے سوالات کا حل

جاوید نے مجمعے کو ایک طرف دھکیلا، دائرہ توڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پولیس تھانے کے طرف چلا، جو میدان کے بالکل آخر میں واقع ہے۔ وہ اپنے ساتھ بد بخت عورت کو بھی کھینچے لیے جارہا تھا۔ عورت میکانیکی انداز میں چلی جا رہی تھی۔ نہ جاوید نے اپنے منہ سے کوئی لفظ نکالا اور نہ عورت نے کچھ کہا۔ تماشا دیکھنے والوں کا جتھا بھی، باری باری جملے کستا ان کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ حد درجہ بدبختی بے شرمی کا موقع بن گئی تھی۔

پولیس تھانے پہنچے، جو ایک تنگ سے کمرے میں تھا اور اسٹوو سے گرم رکھا گیا تھا، جس میں جالی لگا شیشے کا دروازہ تھا جو سڑک کی جانب کھلتا تھا، اور دروازے پر چند سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ جاوید نے دروازہ کھولا، فاحِین کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا، اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پیچھے آنے والے، جو پنجوں کے بل اچک اچک کر، سارس جیسی گردنیں نکالے ہوئے شیشے میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے، مایوس ہو گئے۔ تجسس بھی ایک قسم کی بسیار خوری ہوتا ہے۔ دیکھ لینا ہڑپ کر جانا ہوتا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی فاحِین ایک کونے میں گر گئی؛ ساکت اور خاموش، کسی خوف زدہ کتے کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

محافظوں کے سارجنٹ نے ایک جلتی ہوئی شمع میز پر لا کر رکھ دی۔ جاوید بیٹھ گیا، جیب سے ایک مہر شدہ کاغذ نکالا اور لکھنا شروع کر دیا۔

ہمارے قوانین اس قسم کی عورتوں کو مکمل طور پر پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ مؤخر الذکر جو چاہیں کرتے ہیں؛ جیسی بہتر سمجھتے ہیں سزا دیتے ہیں، اور اپنی مرضی کے مطابق

ان کی آزادی اور ہنر مندی کو ضبط کر لیتے ہیں۔جاویر جذبات سے عاری تھا؛ اس کے سنجیدہ چہرے پر کوئی جوش یا جذبہ نہیں تھا۔ پھر بھی، وہ سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب وہ بغیر کسی کنٹرول کے، ضمیر کے اضطراب کے باوصف، اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کر رہا تھا۔اس وقت اسے احساس تھا کہ پولیس کے کارندے کی تپائی جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا، ایک عدالت تھی۔ وہ فیصلہ کرنے جا رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور سزا سنادی۔اس نے اپنے تمام احساسات اور خیالات جو اس کے ذہن میں ہوسکتے تھے، اس عظیم کام کے اطراف مجتمع کر لیے تھے جو وہ انجام دینے والا تھا۔جتنا وہ اس عورت کے کرتوت کا معائنہ کرتا ، اسے اتنا ہی جھٹکا محسوس ہوتا تھا۔صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے ایک جرم ہوتے دیکھا تھا۔اس نے سب کے سامنے، سڑک پر، سماج میں، ایک آزاد انسان کو بے عزت ہوتے ، ایک مخلوق کو اس پر حملہ کرتے دیکھا تھا جو بے قصور تھا۔ ایک طوائف نے ایک باشندے کو جان سے مارڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دیکھا تھا، جاویر نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے لکھتا رہا۔

جب وہ لکھ چکا اور کاغذ پر دستخط کردیے، اسے تہہ کیا اوراس کے حوالے کرتے ہوئے محافظوں کے سارجنٹ سے کہا کہ ”تین آدمی ساتھ لو، اور اس مخلوق کو قید خانے لے جاؤ۔“

اس کے بعد، وہ فانتین سے مخاطب ہوا ”اس کے لیے تمھیں چھ ماہ جیل میں رہنا پڑے گا۔“ بدقسمت عورت یہ سن کر کانپ گئی۔

”چھ ماہ— چھ ماہ کی قید!“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”چھ ماہ، جس کے دوران کام کرنے کے سات سو یومیہ ملیں گے! مگر میری کوزیت کا کیا بنے گا؟ میری بچی! میری بچی! مگر اب بھی میں تین آردیے کی ایک سو فرانک سے زیادہ کی قرض دار ہوں؛ سنا تم نے، موسیو انسپکٹر؟“

فرش پر، ان تمام لوگوں کے جوتوں کے درمیان، اٹھے بغیر، بندھے ہاتھوں کے ذریعے گھسٹتی، گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی فانتین آگے بڑھی۔

”موسیو جاویر!“ اس نے کہا ”میں تم سے رحم کی التجا کرتی ہوں۔ میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ میں غلط نہیں تھی۔ اگر تم نے ابتدا دیکھی ہوتی تو تم خود ہی دیکھ لیتے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میری غلطی نہیں تھی۔ ان جناب، بورژوا، نے، جنھیں میں جانتی تک نہیں، میری پشت میں برف بھر دی تھی۔ جب ہم پُرامن طریقے سے چہل قدمی کر رہے ہوں، اور کسی کو تکلیف نہیں دے رہے ہوں تو کسی کو ہماری پشت میں برف بھرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ آپ دیکھ

سکتے ہیں کہ میں بیمار ہوں۔ اس کے علاوہ، ایک عرصے سے وہ میرے بارے میں نامناسب باتیں کہتا رہا ہے: 'تم بدشکل ہو، تمھارے دانت نہیں ہیں!' میں جانتی ہوں کہ میرے وہ دانت نہیں ہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا؛ میں نے خود سے کہا تھا، 'یہ حضرت اپنے آپ کو خوش کر رہے ہیں تو کر لینے دو' مگر میں نے ان سے زیادتی نہیں کی، میں نے ان سے بات تک نہیں کی تھی۔ اس وقت انھوں نے میری پشت کے اندر برف ٹھونس دی تھی۔ موسیو جاویر، اچھے موسیو جاویر! کیا یہاں ایسا کوئی شخص نہیں جس نے یہ سب دیکھا ہو، اور آپ کو بتا سکے کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی سچ ہے؟ شاید میں نے غصہ کر کے غلطی کی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ کبھی کبھی انسان پہلے لمحے قابو میں نہیں رہتا۔ کوئی زندہ دلی سے پیش آتا ہے، اور پھر آپ کی پشت میں کوئی شے ٹھونس دیتا ہے، آپ جس کی توقع نہیں کر رہے ہوں۔ میں نے ان جناب کی ہیٹ خراب کرنے کی غلطی کی تھی۔ تو وہ چلا کیوں گیا؟ میں اس سے معافی مانگ لوں گی۔ اوہ! میرے خدا! مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اس سے معافی مانگ لوں۔ آج مجھ پر مہربانی کر دو، بس ایک بار، موسیو جاویر۔ ٹھہرو! تم نہیں جانتے کہ قید خانے میں کام کرنے کے صرف سات سو روزانہ ملتے ہیں؛ یہ حکومت کی غلطی نہیں، مگر صرف سات سو ہی ملتے ہیں؛ اور ذرا سوچو تو، مجھے ایک سو فرانک دینے پڑیں گے، ورنہ، میری چھوٹی سی بچی مجھے واپس بھیج دی جائے گی۔ اوہ، میرے خدا! میں تو اسے اپنے پاس رکھ بھی نہیں سکتی۔ میں جو کچھ کرتی ہوں وہ بہت حقیر کام ہے۔ ہائے، میری کوزیت! ارے میری پاکیزہ حور! اس بے چاری کا کیا حال ہوگا؟ میں تمھیں بتاتی ہوں: وہ، تین آردیے، سرائے کے مالک، دیہاتی لوگ ہیں۔ ان کو بس رقم چاہیے۔ مجھے قید خانے نہ بھیجو! دیکھو تو سہی، ایک چھوٹی سی لڑکی کا معاملہ ہے، جو گھر سے نکال دی جائے گی، عین سردی کے موسم میں، پھر وہ کیا کرے گی، تمھیں اس پر تو رحم کرنا چاہیے، میرے اچھے موسیو جاویر۔ اگر وہ بڑی ہوتی تو کما کھا لیتی؛ مگر اس عمر میں تو وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ میں اندر سے خراب نہیں ہوں۔ یہ بزدلی یا بے صبری نہیں جس نے مجھے یہ کچھ بنا دیا ہے۔ اگر میں نے برانڈی پی ہے، تو یہ میری بدبختی کی وجہ سے ہے۔ میں برانڈی پسند نہیں کرتی؛ مگر یہ میرے احساسات کو سن کر دیتی ہے۔ جب میں خوش و خرم تھی، صرف میرے کپڑوں کی الماری دیکھ کر ہی واضح ہو جاتا کہ میں چھیل چھبیلی، چنچل یا غلیظ عورت نہیں تھی۔ میرے پاس کپڑے تھے، بہت سارے کپڑے۔ مجھ پر رحم کرو، موسیو جاویر!"

وہ اس طرح بول رہی تھی، سسکیوں سے لرزاں، آنسوؤں کی فراوانی سے نابینا، برہنہ گردن، ہاتھ ملتی ہوئی، خشک کھانسی کھانستی ہوئی، کرب کے باعث ہکلاتی ہوئی۔ بہت زیادہ غم

ربانی ہو جاتا ہے جو بد قسمت کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس لمحے فانتین ایک بار پھر خوب صورت ہو گئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر وہ رُکتی، اور نرمی سے پولیس کے کارندے کے کوٹ کو بوسہ دیتی۔ اس نے سنگِ خارا کے دل کو بھی نرم کر دیا ہوتا؛ مگر لکڑی سے بنے دل کو نرم نہیں کیا جا سکتا۔

"چلو!" جاویر نے کہا "میں نے تمھاری بات سُن لی ہے۔ کیا تم سب کہہ چکی ہو؟ تم کو چھ مہینے ملیں گے۔ اب روانہ ہو جاؤ! ابدی باپ، خود بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔"

ان سنجیدہ الفاظ کے بعد کہ "ابدی باپ، خود بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔" وہ سمجھ گئی کہ اس کے مقدر پر مہر لگ گئی ہے، اور منہ ہی منہ کچھ کہتی بیٹھ گئی، "رحم کرو!"

جاویر نے منہ پھیر لیا۔

سپاہیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

چند لمحے قبل وہاں ایک شخص داخل ہوا تھا، مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا، اس سے ٹیک لگائی، اور فانتین کی مایوسانہ التجا سننے لگا تھا۔

اس لمحے جب سپاہیوں نے اس بد قسمت پر ہاتھ ڈالا، اور ابھی وہ اٹھی نہیں تھی کہ وہ شخص سایے سے باہر آیا، اور کہا:

"ذرا ٹھہرو، ایک لمحے کے لیے"

جاویر نے اپنی نظریں اٹھائیں اور موسیو میڈلین کو پہچان لیا۔ اس نے اپنی ہیٹ اتاری، تکلیف دہ بیزاری سے اسے سیلوٹ کیا:

"معاف کیجیے گا، مسٹر میئر ....."

مسٹر میئر کے الفاظ سن کر فانتین کے چہرے پر تجسس کے آثار رونما ہو گئے تھے۔ وہ ایک ہی حرکت میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی، اس طرح جیسے زمین سے کوئی آسیب نکل پڑا ہو، دونوں بازوؤں سے سپاہیوں کو دھکا دے کر، قبل اس کے کہ کوئی اس روکتا، سیدھی موسیو میڈلین کے پاس پہنچی، اور اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے، حیرانی کے عالم میں چلائی:

"اچھا تو یہ آپ ہیں، موسیو میئر!"

اور اس نے قہقہہ مارا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

موسیو میڈلین نے اپنا چہرہ صاف کیا، اور کہا "انسپکٹر جاویر، اس عورت کو رہا کر دو۔"

جاویر کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اسے اس لمحے ایک ضرب کے بعد دوسری ضرب کا، اور ایسے شدید جذبات کا تجربہ ہوا، جس کا اسے اپنی زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہیں

ہوا تھا۔ کسی عورت کا میئر کے منہ پر اس طرح تھوک دینا اتنا خوف ناک واقعہ تھا، جس کا، وہ اپنی نہایت خیال آفریں پرواز میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا؛ جس کے ہونے کے بارے میں سوچنا بھی بے حرمتی کے زمرے میں آتا ہے۔ دوسری جانب، اپنے خیال کی پہنائیوں میں وہ ایک بھیانک تقابل بھی کر رہا تھا، کہ وہ عورت کیا تھی، اور میئر کیا ہو سکتا ہے۔ مگر جب اس نے میئر کو نہایت پُرسکون انداز میں اپنے چہرے کو صاف کرتے اور اس کے بعد کہتے سنا، ''انسپکٹر جاویر، اس عورت کو رہا کر دو۔'' تو اس پر گویا حیرت انگیزی کا نشہ سا طاری ہو گیا تھا۔ خیالات اور الفاظ دونوں بری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ اس معاملے میں تو تعجب بھی ناکام ہو گیا تھا۔ وہ خاموش رہا۔

ان الفاظ نے فانتین کے چہرے پر بھی کم تعجب پیدا نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنا برہنہ بازو بلند کیا، اور اسٹوو کے ہوا روکنے والے خول سے اس طرح لپٹ گئی جیسے وہ چکرا گئی ہو۔ پھر بھی، اس نے اپنے اطراف دیکھا، اور دھیمی آواز میں اس طرح بولنا شروع کیا، گویا وہ خود کلامی کر رہی ہو:

''میں آزاد ہوں! مجھ جانے کی اجازت ہے! مجھے چھ ماہ کے لیے قید خانے جانا نہیں پڑے گا۔ کس نے کہا ہے؟ ایسا ممکن نہیں کہ کسی نے ایسا کہا ہو۔ میں نے درست نہیں سنا ہے۔ میں اس میئر جیسی بھیانک ہو نہیں سکتی! کیا یہ تم نے کہا تھا، میرے اچھے موسیو جاویر کہ میں آزاد ہوں؟ اچھا، دیکھو میں اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی ہوں؛ اور تم مجھے آزاد کر دو گے۔ وہ عفریت میئر، وہ لنگا میئر ہی اصل وجہ ہے اس خرابی کی۔ ذرا غور تو کرو، موسیو جاویر، اسی نے تو مجھے ملازمت سے نکالا تھا، ان بدمعاش عورتوں کے ٹولے کی بدولت جو کام کے کمرے میں چغل خوری کرتی ہیں۔ اگر یہ خوف ناک نہیں تو، اور کیا ہے؟ ایک بے چاری لڑکی کو نوکری سے نکال دینا جو ایمان داری سے اپنا کام کر رہی ہو! اس کے بعد میں ضرورت کے مطابق کما نہیں سکی، اور یہ ساری بدقسمتی اسی بدقسمتی کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے، پولیس کے ان تمام حضرات کو ایک اصلاح کرنی چاہیے، اور وہ اصلاح یہ ہے کہ قید خانوں کے ٹھیکے داروں کو افلاس زدہ لوگوں کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ میں اس کی وضاحت کیے دیتی ہوں۔ آپ کو ایک قمیص سینے کے بارہ سُو ملتے تھے۔ پھر اچانک اسی سلائی کی اجرت گرا کر نو سُو دی جاتی ہے، اور یہ زندہ رہنے کے لیے کافی نہیں۔ تب آدمی کو کچھ اور بننا پڑ جاتا ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میری ایک بیٹی ہے، اور اس کو پالنے کے لیے مجھے خراب عورت بننا پڑ گیا ہے۔ اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میری تمام خرابی اسی لنگے میئر کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ افسروں کے کیفے کے سامنے میں نے اس

شریف آدمی کی ہیٹ پر پاؤں رکھ دیا تھا، اس نے میرا پورا لباس برف سے تباہ کر ڈالا۔ہم مفلس عورتوں کے پاس شام کے لیے ایک ہی ریشمی لباس ہوتا ہے۔آپ دیکھیں گے کہ میں نے غلطی جان بوجھ کر نہیں کی تھی۔ سچ، موسیو جاویر! اوہ، میں دیکھتی ہوں کہ ہر جگہ مجھ سے زیادہ بدکار عورتیں ہوتی ہیں، مگر وہ مجھ سے زیادہ خوش حال ہوتی ہیں۔موسیو جاویر! وہ آپ تھے جس نے مجھے آزاد کر دینے کا حکم دیا تھا، کیا یہ صحیح نہیں؟ تفتیش کر لیجیے، میرے مالک مکان سے بات کر لیجیے؛ میں اب پابندی سے کرایہ ادا کر رہی ہوں؛ وہ آپ کو بتائیں کہ میں مکمل طور پر ایمان دار انسان ہوں۔ اف، خدایا، میں معذرت چاہتی ہوں: میں نے غیر ارادی طور پر اسٹوو کے ڈیمپر کو چھو لیا تھا۔اب یہ دھواں دینے لگا ہے۔''

موسیو میڈیلین اس کو بہت غور سے سن رہے تھے۔ جب وہ بول رہی تھی، وہ اپنے واسکٹ میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ انھوں نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ بٹوہ خالی تھا۔ بٹوہ واپس جیب میں رکھ لیا۔انھوں نے فانتین سے پوچھا ''کیا کہا تھا تم نے، کتنا قرض ہے تم پر؟''

فانتین جو صرف جاویر ہی کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی طرف پلٹی:

''کیا میں آپ سے بات کر رہی تھی؟''

تب وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوئی:

''تم لوگ بتاؤ، کیا میں نے اس شخص کے چہرے پر تھوکا تھا؟ اوہ، بے نصیب میئر، تم مجھے خوف زدہ کرنے آئے تھے، مگر میں تم سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں موسیو جاویر سے خوف زدہ ہوں۔ میں اچھے موسیو جاویر سے خوف زدہ ہوں!''

یہ کہتے ہوئے، وہ ایک بار پھر انسپکٹر کی طرف مڑی:

''اب بھی، مسٹر انسپکٹر، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایمان دار ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔میں سمجھتی ہوں کہ آپ ایمان دار ہیں، مسٹر انسپکٹر؛ دراصل، یہ بالکل سادہ سی بات ہے۔ ایک آدمی ایک عورت کے لباس کے اندر برف ٹھونس کر خوش ہوتا ہے؛ اور وہ عمل دوسرے افسروں کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتا ہے؛ ان سب کو کسی طرح، کسی اور طرف متوجہ کرنا چاہیے؛ اور ہم بلاشبہ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے موجود ہیں۔اور پھر، آپ آجاتے ہیں؛ یقینی طور پر آپ کا فرض ہے کہ حالات قابو میں رہیں۔آپ اس عورت کو جس نے غلطی کی ہے، لے جاتے ہیں؛ مگر غور و خوض کے بعد، اس لیے کہ آپ اچھے انسان ہیں، آپ کہتے ہیں کہ مجھے آزاد کر دیا جائے؛ یہ صرف اس چھوٹی سی بچی کے لیے تھا، اس لیے کہ قید کا چھ مہینہ مجھے اپنی بچی کی مدد کرنے سے روکے گا۔

آجھا، پھر ایسی غلطی نہ کرنا، میری جان۔' اوہ، اچھا میں دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گی، موسیو جاویر! 'اب وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں ٹس سے مَس ہونے والی نہیں۔ مگر آج، آپ نے دیکھا کہ میں روئی تھی، اس لیے کہ مجھے تکلیف پہنچی تھی۔ مجھے ان صاحب سے برف کی بالکل توقع نہیں تھی؛ اور جیسا کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں، میں بیمار ہوں، مجھے کھانسی کے دورے پڑ رہے ہیں؛ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے پیٹ میں آگ کا ایک گولا ہے، اور ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے۔ 'اپنا خیال رکھو۔' یہاں، اس جگہ چھو کر دیکھیے، ذرا مجھے اپنا ہاتھ دیجیے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں — ہاں، اسی جگہ پر ہے وہ گولا۔

اب وہ رو نہیں رہی تھی، اس کی آواز دردمند تھی؛ اس نے جاویر کا کھردرا ہاتھ پکڑ کر اپنے نازک، سفید گلے پر رکھا اور اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

اس سب کے بعد اس نے تیزی سے اپنا بے ترتیب لباس درست کیا، اپنی اسکرٹ کی شکنیں دور کیں، جو اوپر، تقریباً گھٹنے تک ہو گئی تھیں جب وہ اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے گئی تھی۔ پھر وہ سپاہیوں سے دھیمی آواز میں کچھ کہتی ہوئی، اور دوستانہ اشارے کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی:

"بچو! موسیو انسپکٹر نے کہا ہے کہ مجھے آزاد کر دیا جائے، اور میں جا رہی ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ دروازے کی چٹخنی پر رکھا۔ اور ایک قدم بعد وہ سڑک پر ہوتی۔

اس وقت تک جاویر ساکت کھڑا تھا، اس کی نظریں زمین پر مرکوز تھیں ایسا منظر تھا گویا غلط جگہ پر رکھا ہوا کوئی مجسمہ کسی اور جگہ رکھے جانے کے انتظار میں ہو۔

چٹخنی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے شاہانہ اظہار اختیار کے ساتھ اپنا سر اٹھایا، یہ اظہار تناسب میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے جب اختیار نچلے درجے میں ہوتا ہے، وحشی جانوروں میں خون خوار ہو جاتا ہے، اور بے زمین انسان میں ظالمانہ ہو جاتا ہے۔

"سارجنٹ!" اس نے چیخ کر کہا، تمھیں نظر نہیں آ رہا ہے کہ یہ بدقماش عورت نکلی جا رہی ہے، تم سے کس نے کہا ہے، کہ اس جانے دو؟"

"میں نے۔" میڈیلین نے کہا۔

جاویر کی آواز پر فاتین کانپ گئی، اور چٹخنی کو چھوڑ دیا، اسی طرح جیسے کوئی چور کسی چرائی ہوئی شے کو چھوڑ دیتا ہے۔ میڈیلین کی آواز پر، وہ پلٹی، اور اس کے بعد اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا، نہ اتنی ہمت ہوئی کہ آزادی سے سانس لے سکتی، مگر اس کی نظر میڈیلین سے جاویر، اور جاویر سے میڈیلین، بار بار آتی جاتی رہی، کہ کون بات کر رہا ہے۔

صاف ظاہر تھا کی جاویر حد سے زیادہ برہم رہا ہوگا، قبل اس کے کہ وہ خود سارجنٹ کو حکم دیتا، جیسا کہ اس نے کیا تھا، کہ میئر کے کہنے کے بعد فاتین کو آزاد کردیا جائے گا۔ کیا وہ اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ میئر کی موجودگی میں اس کو نظر انداز کردے؟ کیا اس نے طے کرلیا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی مقتدر ہستی اس قسم کا حکم دے سکتی ہے؛ کہ یقینی طور پر میئر نے غلطی سے، بغیر ارادے کے یہ بات کہہ دی تھی؟ یا اس سنگینی کے پیشِ نظر، جو کچھ ہم پچھلے دو گھنٹے میں دیکھ چکے ہیں، اس نے خود سے کہا تھا، کہ یہ ضروری ہے کہ برتر ارادوں کی طرف مائل ہوا جائے، کہ یہ ناگزیر تھا کہ چھوٹے کو بڑا کردیا جائے، کہ پولیس کا جاسوس مجسٹریٹ میں اپنی قلب ماہیت کرلے، کہ پولیس کا سپاہی انصاف کرنے لگے، اور یہ بھی کہ کیا ایسی حالت میں حکم، قانون، اخلاقیات، حکومت اور سماج مکمل طور پر جاویر میں مجسم ہوگیا تھا؟

جو کچھ بھی رہا ہو، جب موسیو میڈیلن نے وہ لفظ — میں — ادا کیا تھا، جیسا کہ ہم ابھی سن چکے ہیں، پولیس انسپکٹر جاویر کو، زرد، سرد، نیلے ہونٹوں اور مایوسی کی کیفیت میں میئر کی طرف مڑتے دیکھا گیا تھا، اس کا پورا جسم ایک نامعلوم کپکپی اور ایک بے نظیر واقعے سے برافروختہ تھا اور اس نے جھکی ہوئی نظروں سے، مگر مستحکم آواز میں کہا تھا:

"مسٹر میئر، یہ نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں نہیں۔" موسیو میڈیلن نے کہا۔

"اس بدنصیب نے ایک باشندے کی توہین کی ہے۔"

"انسپکٹر جاویر!" میئر نے جواب میں ایک پُرسکون اور مصالحانہ لہجے میں کہا، "سنیے، آپ ایک ایمان دار انسان ہیں، اور مجھے آپ کے لیے معاملات کی تشریح کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ اس معاملے کی اصل صورتِ حال یہ ہے: میں میدان سے گزر رہا تھا، میں اس وقت جب آپ اس عورت کو لے جارہے تھے؛ اس وقت بھی وہاں کئی گروہ کھڑے تھے، اور میں نے ان سے پوچھ گچھ کی تھی اور ساری بات معلوم کرلی تھی۔ دراصل وہ باشندہ غلطی پر تھا، پولیس کو اسے گرفتار کرنا چاہیے تھا۔"

"اس بدنصیب نے ابھی موسیو میئر کی توہین کی ہے۔"

"اس کا تعلق مجھ سے ہے۔" موسیو میڈیلن نے کہا، "میرا خیال ہے کہ میری اپنی توہین، میری ملکیت ہے۔ میں جو چاہوں، اس بارے میں کرسکتا ہوں۔"

"میں موسیو میئر سے معافی کا طلب گار ہوں، مگر یہ ان کی نہیں، قانون کی توہین تھی۔"

"انسپکٹر جاویر!" میڈیلن نے جواب دیا، "سب سے بلند قانون ضمیر ہے۔ میں نے

اس عورت کو سنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

"اور کیا میں، مسٹر میئر، نہیں جانتا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"تو اطاعت شعاری پر قناعت کیجیے۔"

"میں اپنے فرض کی اطاعت کر رہا ہوں۔ میرا فرض کہتا ہے کہ اس عورت کو چھ ماہ کی قید ہونی چاہیے۔"

موسیو میڈلین نے نہایت نرمی سے جواب دیا:

"اچھی طرح سن لیجیے، یہ ایک دن کے لیے بھی قید میں نہیں ہوگی۔"

اس فیصلہ کُن لفظ کے بعد جاویر نے میئر پر ایک سوالیہ نظر کی اور ایسے لہجے میں کہا جو اَب بھی نہایت با ادب تھا:

"میں شرمندہ ہوں کہ میں موسیو میئر سے اختلاف کر رہا ہوں، یہ میری زندگی میں پہلی بار ہو رہا ہے، مگر وہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں گے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے اختیار کی حدود میں کر رہا ہوں۔ جیسا کہ موسیو میئر چاہتے ہیں، میں خود کو اس شریف آدمی کے معاملے تک ہی محدود رکھوں گا۔ میں وہاں موجود تھا۔ یہ عورت موسیو باماتابوا پر کود پڑی تھی، جو ایک الیکٹر ہیں اور بالکنی والے اس خوب صورت مکان کے مالک ہیں، جو اس گھاس کے میدان کا ایک کونا ہے؛ تین منزلہ بلند اور مکمل طور پر کاٹے گئے پتھروں سے بنا ہے۔ ایسی چیزیں بھی دنیا میں ہوا کرتی ہیں۔ بہرحال، موسیو میئر، یہ سڑکوں پر پولیس کے فرائض کا معاملہ ہے، اور مجھ سے متعلق ہے، اور میں اس عورت فانتین کو قید کروں گا۔"

تب موسیو میڈلین نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے، اور سخت لہجے میں کہا، جیسا اب تک شہر کے کسی فرد نہیں سنا تھا:

"جس معاملے کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ شہری پولیس سے متعلق ہے۔ کوڈ آف کرمنل انڑامینیشن کے دفعات 9,11, 15, 66 کے تحت میں جج ہوں۔ اور میں حکم دیتا ہوں کہ یہ عورت آزاد ہوگی۔"

جاویر نے مزید کچھ کہنے کی آخری کوشش کی،

"مگر، مسٹر میئر..."

میں آپ کی توجہ 13 دسمبر 1799ء کے قانون کی دفعہ 81 برائے من مانے حبس بے جا کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔"

''موسیو میئر، مجھے اجازت دیجیے..... ''
''بس، اب ایک لفظ بھی نہیں۔''
''مگر..... ''
''کمرے سے باہر چلے جایئے۔''موسیو میڈیلن نے کہا۔

جاویر نے سیدھے کھڑے، سامنے، چہرے پر، اپنے سینے پر، کسی روسی فوجی کی طرح یہ صدمہ سہا۔ احترام میں زمین تک جھکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

فانتین دروازے کے قریب ایک طرف کھڑی اس کی طرف حیرت سے دیکھتی رہ گئی، اور وہ وہاں سے گزر گیا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ خود ایک حیرت انگیز پیچیدگی کا شکار ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی دو مخالف طاقتوں کے درمیان ایک تنازعہ دیکھا تھا، وہ خود جس کا مرکزی موضوع تھی۔ اس نے دیکھا کہ دو مرد اس کی آزادی، اس کی زندگی، اس کی روح، اس کی بچی کے معاملات اپنے ہاتھوں میں لیے، اس کی آنکھوں کے سامنے، جنگ میں مصروف تھے: ان میں سے ایک اس کو پاتال میں دھکیلنا چاہتا تھا، دوسرا واپس روشنی کی طرف لے جانا چاہ رہا تھا۔ اس تنازعے میں، اگر خوف کے محدب شیشے سے دیکھا جائے تو، یہ دونوں مرد اس کو دو بڑے عفریتوں جیسے دکھائی دے رہے تھے؛ ایک شیطان کی طرح کلام کر رہا تھا، دوسرا مہربان فرشتے کی طرح۔ فرشتے نے شیطان پر فتح پا لی تھی، مگر حیرت اس بات پر تھی، جس نے اسے سر سے پا تک لرزہ کر رکھ دیا تھا کہ یہ فرشتہ، اس کا آزاد کرنے والا شخص، وہی شخص تھا، ایک عرصے سے اس کو جس سے کراہت تھی، جسے اب تک وہ اپنی تمام خرابیوں کا مؤلف سمجھ رہی تھی، اور وہ یہی میئر میڈیلن تھا۔ اور ابھی چند لمحے قبل اس نے، جس کی اس بہیمانہ انداز میں توہین کی تھی، وہی اسے بچا رہا تھا— تو کیا وہ غلطی پر تھی؟ کیا اسے اپنی پوری روح کو تبدیل نہیں کر دینا چاہیے؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی؛ بس کانپ رہی تھی۔ وہ مبہوت سن رہی تھی، خوف زدہ دیکھ رہی تھی، اور موسیو میڈیلن کے ادا کیے ہوئے ہر حرف پر اسے محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے اندرون میں نفرت کے تمام خوف ناک سایے ٹوٹ پھوٹ رہے تھے، پگھلتے جا رہے تھے، اور کوئی ناقابلِ بیان مہربان گرمی، جو خوشی، اعتماد اور محبت کی مانند تھی، اس کے دل میں طلوع ہو رہی تھی۔

جب جاویر وہاں سے چلا گیا، موسیو میڈیلن نے، اس سے مخاطب ہوتے ہوئے اور سوچتی ہوئی آواز میں، ایک نہایت سنجیدہ انسان کی طرح جو رونا نہیں چاہتا ہو، اور جسے بولنے میں

مشکل ہو رہی ہو، کہا تھا:

"میں نے تمھیں سن لیا ہے۔ مجھے اس بارے میں بالکل علم نہیں جس کا تم نے تذکرہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سچ ہو گا، اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ سچ ہے۔ مجھے تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ تم نے میرا کارخانہ چھوڑ دیا تھا۔ تم نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ مگر اب میں تمھارے سارے قرض ادا کروں گا؛ میں تمھاری بچی کو بلواؤں گا، یا تم اس کے پاس جاؤ گی۔ تم یہاں رہو گی یا چاہو تو پیرس میں رہو گی یا جہاں بھی تمھارا جی چاہے۔ میں تمھاری اور تمھاری بچی کی ذمے داری قبول کر رہا ہوں۔ اگر تم مجھے پسند نہیں کرتیں تب بھی اب تم کام نہیں کرو گی۔ میں تمھاری ساری ضروریات پوری کروں گا۔ تم ایک بار پھر دیانت دار اور خوش و خرم انسان بن جاؤ گی۔ اور سنو، جو کچھ تم نے مجھ سے کہا ہے اگر سچ ہے— اور مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں— تو میں اعلان کرتا ہوں کہ خدا کی نظر میں تمھارا نیک اور مقدس درجہ ختم نہیں ہوا ہے۔ اے، مظلوم عورت!"

فانتین اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کوزیت کا واپس ہونا! اس کی بدنام زندگی کا چھوٹنا۔ آزادی، دولت مندی، خوشی اور باعزت طور پر کوزیت کے ساتھ رہنا؛ اپنی بدنصیبی کے درمیان اچانک جنت کی حقیقتوں کے پھول کھلتے دیکھنا۔ وہ بیوقوفوں کی طرح اس آدمی کی طرف دیکھ رہی تھی، جو اس سے بات کر رہا تھا، اور وہ صرف دو یا تین بار ہی سسکیاں لے سکی تھی— اوہ— اوہ— اوہ!

اس کے دست و پا اس کا ساتھ چھوڑ گئے، وہ موسیو میڈلین کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکی اور قبل اس کے کہ میڈلین اُسے روکتا، اسے اپنا ہاتھ فانتین کے ہاتھ میں محسوس ہوا، اور فانتین کے لبوں نے اس کے ہاتھ پر ایک بوسہ ثبت کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔

✡

آرام کی ابتدا

موسیو میڈیلن نے فانتین کو اس دارالشفا بھجوا دیا، جو اس نے اپنے مکان میں قائم کر رکھا تھا۔ اس نے نرسوں کو سب کچھ بتا دیا تھا، جنھوں نے اسے بستر میں لٹا دیا۔ اس کو تیز بخار ہو گیا تھا۔ رات کا ایک حصہ اس نے بے ہوشی میں اور بہکی بہکی باتیں کرتے گزارا، مگر بعد میں وہ سو گئی تھی۔

اگلے دن، دوپہر کے قریب، فانتین کی آنکھ کھلی۔ اس نے کسی کو اپنے پلنگ کے قریب سانس لیتے سنا؛ اس نے اپنے پلنگ کا پردہ ایک طرف سرکایا۔ موسیو میڈیلن کھڑا اس کے سرھانے کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ترحم، روحانی اذیت اور التجا سے مملو تھی۔ فانتین نے اس کی نظر کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی نظریں یسوع مسیح کے مصلوب ہونے کی تصویر پر مرکوز تھیں، جو سرھانے دیوار پر کیلوں سے جڑی ہوئی تھی۔

اس کے بعد سے فانتین کی آنکھوں میں موسیو میڈیلن کی صورت بالکل بدل گئی تھی۔ میڈیلن روشنی کے لباس میں ملبوس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی قسم کی دعا میں مشغول تھا۔ فانتین اس میں مخل ہوئے بغیر دیر تک اس پر اپنی نظریں جمائے رہی تھی۔ بالآخر، اس نے بزدلی سے کہا، ”آپ کیا کر رہے ہیں؟“

موسیو میڈیلن ایک گھنٹے سے وہیں تھا۔ وہ فانتین کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے فانتین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اس کی نبض محسوس کی، اور جواب میں کہا، ”اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔ میں سو رہی تھی۔“ اس نے جواب میں کہا، ”میرا خیال ہے کہ میں بہتر ہوں۔ کوئی بات نہیں۔“

موسیو میڈیلین نے اس کے پہلے سوال کا جواب اس طرح دیا جیسے ابھی سنا ہو۔
"میں بلندی پر، اس شہید سے دعا مانگ رہا تھا۔"
اور اپنے ذہن میں اضافہ کیا، "پستی کی اس شہید کے لیے۔"

موسیو میڈیلین رات بھر تفتیش میں مشغول رہا تھا۔ اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کو فانتیں کی دل دکھا دینے والی تفصیلات کے ساتھ، اس کے ماضی کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اور اس نے کہا:

"بے چاری ماں! تم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ نہیں، اب کوئی شکایت نہ کرنا۔ تمھیں اب اپنی پسند کا جہیز مل گیا ہے۔ اسی طرح ہوتا ہے، جب انسانوں کی فرشتوں میں قلبِ ماہیت ہوتی ہے۔ ان کی غلطی نہیں ہوتی، ان کو علم نہیں ہوتا کہ اس کو اور کس طرح کیا جائے۔ تم نے دیکھا یہ جہنم، تم جس سے ابھی نکلی ہو، جنت کی اوّلین شکل ہے۔ ضروری تھا کہ یہیں سے ابتدا کی جائے۔"

موسیو میڈیلین نے گہرا سانس لیا، مگر فانتیں اس ارفع تبسم سے مسکرائی جس میں دو دانت کم تھے۔

اس رات، جاویر نے ایک خط لکھا۔ اگلی صبح خود M. sur M کے دفتر جا کر اسے روانہ کیا۔ خط پیرس کے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ اس پر تحریر تھا: موسیو شابولیے (Chabouillet)، پولیس کے موسیو پریذیڈنٹ کے سیکرٹری کے نام۔ چوں کہ اس معاملے پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، ڈاک خانے کی مہتمم اور کچھ دوسرے لوگوں نے، بھیجے جانے سے پہلے یہ خط دیکھا تھا، جو جاویر کی تحریر پہچانتے تھے، سب سمجھے تھے کہ وہ اپنا استعفیٰ بھیج رہا تھا۔

موسیو میڈیلین نے تھی آردیے کو خط لکھنے میں جلدی کی۔ فانتیں ایک سو بیس فرانک کی قرض دار تھی۔ اس نے تین سو فرانک بھیج دیے، اور ان سے کہا کہ اس میں سے وہ اپنی رقم لے لیں اور بچی کو فوراً M. sur M بھیجنے میں خرچ ہونے والی رقم بھی اسی میں سے منہا کر لیں، جہاں اس کی بیمار ماں اس کی موجودگی چاہتی ہے۔

اس خط نے تھی آردیے کو چوندھیا دیا۔ "یہ شیطان!" اس آدمی نے اپنی بیوی سے کہا؛ "اس بچی کو جانے نہ دینا۔ یہ معنّی چڑیا دودھ دیتی گائے بننے والی ہے۔ میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ کوئی بدچلن اس کی ماں پر ریجھ گیا ہے۔"

جواب میں تھی آردیے نے پانچ سو اور کچھ فرانک کی فہرست بنا کر روانہ کر دی۔ اس میں تین سو فرانک سے زیادہ کے دو ناقابلِ تردید مد شامل تھے — ایک ڈاکٹر سے متعلق تھا اور

دوسرا دوا ساز کا، جس نے اپیونین کا اور آرنیکا کا دو طویل بیماریوں کے دوران علاج کیا تھا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کوزیٹ بیمار نہیں تھی۔ اس کاغذ میں بس نام بدلنے کا چھوٹا سا کام تھا۔ دوا ساز کے بل کے نیچے "تین سو فرانک وصول پائے" بھی لکھ دیا گیا تھا۔

موسیو میڈیلن نے مزید تین سو فرانک فوراً روانہ کر دیے، اور لکھا "کوزیٹ کو بھیجنے میں جلدی کرو۔"

"کیسوع!" تین آردیے نے کہا، "ہم اس بچی کو نہیں چھوڑیں گے۔"

اس دوران فانتین بحال نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی دارالشفا میں ہی تھی۔

پہلے تو نرسوں نے "اس عورت" کے ساتھ مغائرت کا سلوک کیا، مگر چند دنوں کے اندر فانتین نے ان کو راضی کر لیا تھا۔ اس نے انکسار اور نرمی سے پُر باتیں کیں اور اس کے اندر کی ماں نے نرم دلی کو اُکسا دیا۔ ایک دن نرسوں نے اسے بخار کے دوران کہتے سنا: "میں گنہگار عورت رہی ہوں، مگر جب میری بچی میرے پاس ہو گی تو یہ اس امر کا اشارہ ہو گا کہ خدا نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ جب میں بُری زندگی گزار رہی تھی، میں اپنی کوزیٹ کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھ میں اس کی افسردہ اور حیران آنکھیں دیکھنے کی تاب نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ محض اسی خاطر تھا کہ میں بدکاری کر رہی تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ خدا مجھے معاف کر رہا ہے۔ جب کوزیٹ یہاں میرے پاس ہو گی تب ہی میں اپنے اچھے خدا کی برکتوں کو محسوس کروں گی۔ میں اس کی طرف دیکھ سکوں گی، اس معصوم مخلوق کو دیکھ میرا دل ٹھنڈا ہو گا۔ وہ معصوم کچھ نہیں جانتی۔ میری بہنو، وہ ایک حور ہے۔ اور ایسی عمر میں پر گرا نہیں کرتے۔"

موسیو میڈیلن دن میں دوبار اسے دیکھنے جاتا، اور ہر بار وہ سوال کرتی:

"کیا میں اپنی کوزیٹ کو جلد دیکھ سکوں گی۔"

وہ جواب دیتا:

"شاید کل۔ وہ کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ میں اس کے آنے کی توقع کر رہا ہوں۔"

اور ماں کا زرد چہرہ چمک اٹھتا۔

"اوہ" وہ کہتی، "میں کتنی خوش ہوں گی۔"

ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ وہ پوری طرح شفایاب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس، ہر ہفتے اس کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی تھی۔ اس مٹھی بھر برف نے جو اس کے کاندھے کی ہڈیوں کے درمیان کی جلد پر ٹھونسی گئی تھی، اچانک پسینہ نکلنے کے عمل کو دبا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ عارضہ جو کئی برس سے اس کے اندر دھواں دے رہا تھا، بالآخر پھٹ پڑا تھا۔ اس وقت لوگ Laennec

René [فرانسیسی معالج جس نے 1816ء میں stethoscope ایجاد کیا تھا] کے سینے کی بیماریوں کے طریقۂ علاج کو سمجھنے لگے تھے۔ ڈاکٹر نے فانتین کے سینے کی آواز سنی اور اپنا سر ہلا دیا۔

موسیو میڈیلین نے ڈاکٹر سے پوچھا، ''کیسی ہے؟''

''کیا اس کی کوئی بچی ہے جسے وہ دیکھنا چاہتی ہے؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ہاں''

''تو پھر جلدی کیجیے اور اسے یہاں بلا لیجیے!''

موسیو میڈیلین کانپ گیا۔

فانتین نے پوچھا، ''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

موسیو میڈیلین جبراً مسکرا دیا۔ ''اس نے کہا ہے کہ تمھاری بچی کو جلد لایا جائے، اس سے تمھاری صحت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔''

''اوہ!'' اس نے اتفاق کیا، ''وہ صحیح کہتا ہے۔ مگر تین آردیے میری کوزیٹ کو مجھ سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ اوہ! وہ آنے والی ہے۔ بالآخر میں اسے دیکھ کر خوش ہو جاؤں گی۔''

اس دوران تین آردیے بچی کی جان نہیں چھوڑ رہے تھے، اور اس کے لیے سیکڑوں ناکافی بہانے تلاش کر لیے تھے۔ کوزیٹ سردی کے موسم میں سفر کے قابل نہیں۔ اس کے علاوہ پڑوس کے کئی چھوٹے موٹے قرضے بھی تو ہیں، اور وہ ان سے تفصیلات جمع کر رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

''میں کوزیٹ کو لانے کے لیے کسی کو بھیجوں گا۔'' فادر میڈیلین نے کہا، ''اگر ضروری ہوا تو میں خود جاؤں گا۔''

اور پھر اس نے فانتین کی جانب سے مندرجہ ذیل خط تحریر کیا، اور اس کے دستخط لے لیے:

''موسیو تین آردیے!

آپ کوزیٹ کو اس شخص کے حوالے کر دیں گے۔

آپ کو تمام چھوٹی موٹی چیزوں کی رقم ادا کر دی جائے گی۔

احترام کے ساتھ آپ کو سلام پیش کرتی ہوں۔

فانتین''

اس دوران ایک تشویش ناک واقعہ پیش آ گیا تھا۔

ہم جب بھی اپنی زندگی کو سنوارنے لگتے ہیں، مقدر کی سیاہ لکیر بار بار ابھرنے لگتی ہے۔

۞

ژاں کس طرح شاں بن گیا

ایک صبح میڈلین اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا میئر کے دفتر کے کچھ ضروری معاملات سلجھانے میں مصروف تھا، کہ شاید اسے Montfermeil جانے کا فیصلہ کرنا پڑے۔اس دوران اسے اطلاع دی گئی کہ پولیس انسپکٹر جاویر اس سے بات کرنے کا خواہاں ہے۔اس کا نام سن کر میڈلین اپنے ناموافق احساس کو چھپا نہیں سکا۔پولیس تھانے کے واقعے کے بعد، پہلے کے مقابلے میں بہت دن تک جاویر اسے نظر انداز کرتا رہا۔میڈلین نے بھی اسے دیکھا نہیں تھا۔

''آنے دو۔'' اس نے کہا

جاویر داخل ہوا۔

موسیو میڈلین آتش دان کے قریب، ہاتھ میں قلم تھامے اپنی کرسی پر بیٹھا رہا، اس کی آنکھیں مقدمے کے کاغذات پر مرکوز رہیں جنھیں وہ الٹ پلٹ کر دیکھتا اور کچھ لکھتا جا رہا تھا، جو شاہراہوں پر پولیس کے قوانین کی خلاف ورزی سے متعلق بنے جانے والے مقدمات سے متعلق تھے۔اس نے جاویر کی خاطر اپنے کام میں خلل نہیں ڈالا۔وہ بے چاری فانتین کے معاملے کو بھولا نہیں تھا، اس لیے اس طرح کی سرد مہری اس کے لیے مناسب تھی۔

جاویر نے میئر کو مؤدبانہ سلام پیش کیا۔میئر کی پشت اس کی جانب تھی۔میئر نے اس کی جانب نظر نہیں کی۔کاغذات پر نشانات لگاتا اور لکھتا رہا۔

جاویر دو تین قدم مطالعے کے کمرے میں بڑھا، اور خاموشی توڑے بغیر رُک گیا۔

اگر کوئی قیافہ شناس جاویر سے بے تکلف ہوتا، اور اس نے معاشرے کے لیے کام کرنے والے اس وحشی، رومن، اسپارٹائی، راہب، کارپورل، بے داغ جاسوس اور پولیس کے اہل کار

پر جو جھوٹ بولنے کے لیے نااہل تھا، طویل تحقیق کی ہوتی — اگر کوئی قیافہ شناس اس کے راز سے واقف ہوتا اور ایک عرصے سے موسیو میدیلین سے اس کی کنارہ کشی اور فاتحین کے معاملے میں میئر سے اس کے تنازعے کا راز داں ہوتا، اور اس موقعے پر جاویر کا تجزیہ کرتا، تو وہ خود سے کہتا، ''ارے یہ کیا ہو گیا ہے؟'' اور ہر شخص پر واضح ہو جاتا کہ یہ صاف، سیدھا سادہ، مخلص، ایمان دار، سادگی پسند درشت، وصفت ضمیر والا جاویر کسی اندرونی جدوجہد سے گزرا ہے۔ جاویر کی شخصیت میں کچھ نہیں تھا جو اس کے چہرے مہرے سے عیاں نہ ہوتا۔ عام طور پر تشدد پسند لوگوں کی طرح وہ بھی یکا یک رائے بدل لیتا تھا۔ اس کے خد و خال پہلے اتنے عجیب اور چونکا دینے والے نہیں تھے۔ مطالعے کے کمرے میں داخل ہوتے وقت وہ موسیو میدیلین کے سامنے اس طرح جھکا تھا جس میں پرانی دشمنی، غصے اور بے اعتمادی کا شائبہ تک نہ تھا؛ وہ میئر کی کرسی سے چند قدم پہلے رُک گیا تھا اور وہیں بالکل تنا کھڑا رہا۔ ایسے مہذب انداز میں، جس میں ایک انسان کا سرد، بے خطا اکھڑ پن تھا جو کبھی نرم خو نہ رہا ہو، اور جو ہمیشہ متحمل رہا ہو؛ وہ ایک لفظ بھی ادا کیے بغیر خفیف سی حرکت کیے بغیر، خالص انکسار اور پُرسکون اور استغنا میں، خاموش، احساسِ ذمے داری کے ساتھ، ہاتھ میں ہیٹ لیے، نظریں جھکائے، اور ایسے ملے جلے اسلوب میں کھڑا رہا جیسے کوئی سپاہی اپنے افسر کے سامنے ہو، یا کوئی مجرم اپنے جج کی موجودگی میں ہو، اس وقت تک کہ میئر نے خود پلٹ کر دیکھا نہیں تھا۔ اس کے سارے جذبات اس کی ساری یادیں جو اس سے منسوب تھیں، غائب ہو گئی تھیں۔ اس کے سنگِ خارا جیسے سادہ چہرے پر سوائے افسردگی کے اور دباؤ کے کسی قسم کا سراغ نہیں تھا۔ اس وقت اس کی پوری شخصیت خلوت گزینی اور اُستواری، اور ایک ناقابلِ بیان جرأت مند ناامیدی سے عبارت تھی۔

آخرِ کار، میئر نے اپنا قلم رکھ دیا اور نصف دائرے میں اپنی کرسی گھمائی۔

''اچھا! کیا ہوا؟ کیا بات ہے، جاویر؟''

ایک لمحے کے لیے جاویر نے جواب نہیں دیا، گویا وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا ہو۔ پھر اس نے ایک نوعیت کی افسردہ متانت میں ڈوبی آواز بلند کی، جو کسی طرح بھی سادگی سے مانع نہیں تھی۔

''معاملہ یہ ہے، مسٹر میئر کہ ایک قابلِ مواخذہ فعل کا ارتکاب ہوا ہے۔''

''کون سا فعل؟''

حکام کا ایک کم تر اہل کار رہایت سنگین انداز میں ایک مجسٹریٹ کے احترام میں ناکام ہوا ہے۔ میں اس حقیقت کو آپ کے علم میں لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، اس لیے کہ ایسا کرنا

میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"کون ہے وہ اہل کار؟" موسیو میڈیلین نے سوال کیا۔

"میں!" جاویر نے کہا۔

"تم؟"

"جی ہاں، میں۔"

"اور وہ مجسٹریٹ کون ہے، جس کو اہل کار کے خلاف شکایت کی ضرورت ہوئی ہے۔"

"آپ، مسٹر میئر!"

موسیو میڈیلین سیدھا ہو کر اپنی کرسی میں بیٹھ گیا۔ جاویر سخت انداز میں کہتا رہا اور اس کی آنکھیں اس وقت بھی زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔

"مسٹر میئر! میں آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ آپ ارباب اقتدار کو مجھے برخاست کرنے پر آمادہ کریں۔"

حیرت کے عالم میں موسیو میڈیلین کا منہ کھلا رہ گیا۔ جاویر نے مداخلت کی اور کہا:

"آپ کہیں گے کہ میں نے استعفیٰ دے دیا ہوتا، مگر وہ کافی نہیں ہوتا۔ استعفیٰ دینا عزت کی بات ہوتی ہے۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام ہوا ہوں؛ مجھے سزا ملنی چاہیے: مجھے نکال دیا جانا چاہیے۔"

اور ایک وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا:

"مسٹر میئر، آپ اس دن مجھ سے درشتی سے پیش آئے تھے، مگر ناانصافی سے۔ آج بھی وہی کریں مگر انصاف کے ساتھ۔"

"مگر کیوں؟" موسیو میڈیلین نے چیخ کر کہا۔ "کیا بیہودگی ہے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ تم نے میرے ساتھ کیا قابلِ سزا جرم کیا؟ تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ مجھ سے متعلق تمھاری غلطیاں کیا ہیں۔ تم اپنے آپ کو الزام دے رہے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تم پر کسی کو فوقیت دی جائے۔"

"نکال دیا جائے۔" جاویر نے کہا۔

"نکال دیا جائے؟ اچھا، اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"آپ جلد سمجھ جائیں گے، مسٹر میئر!"

جاویر نے اپنے سینے کی گہرائی سے سانس لیا اور اسی سرد اور افسردہ انداز میں اپنی بات جاری رکھی۔

"مسٹر میئر، چھ ہفتے قبل میں اس عورت کے معاملے میں ہونے والے واقعے کے نتیجے میں غضب ناک ہوا تھا اور میں نے آپ کے خلاف اطلاع دے دی تھی۔"

"میرے خلاف اطلاع دے دی تھی؟"

"پیرس کی پولیس کی کمشنری میں۔"

موسیو میڈیلین جو زور سے ہنسنے کا عادی نہیں تھا، قہقہہ مار کر ہنسا، اور کہا:

"ایک میئر کی حیثیت میں، جس نے پولیس کے حیطۂ اقتدار میں دخل اندازی کی تھی؟"

"ایک سابق سزا یافتہ کی حیثیت میں۔"

میئر نیلا پڑ گیا۔

جاویر، جس نے اپنی نظریں نہیں اٹھائی تھیں، کہتا رہا:

"میں نے سوچا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال ایک عرصے سے گردش کر رہا تھا۔ ایک شباہت؛ تحقیقات جو آپ نے Faverolles میں کرائی تھیں؛ آپ کے پٹھوں کی طاقت؛ بوڑھے [گاڑی بان] فوشلوواں کے ساتھ آپ کی مہم؛ نشانے بازی میں آپ کی ہنر مندی؛ آپ کا پاؤں جو آپ ذرا سا گھسیٹ کر چلتے ہیں؛ میں سب کچھ تو نہیں جانتا— تمام فضولیات، مگر میں تمام واقعات میں، آپ کو ایک مخصوص ژاں ویلژاں ہی سمجھتا رہا ہوں۔"

"ایک مخصوص— کیا نام لیا تھا تم نے؟"

"ژاں ویلژاں۔ وہ ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔ بیس برس قبل جب میں Toulon میں سزا یافتہ لوگوں کے محافظوں کا افسر تھا، میں اس سے ملتا رہتا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ جہاز کے باورچی خانے سے نکلنے کے بعد، اس ژاں ویلژاں نے بشپ کو لوٹا، اس کے بعد اس نے ایک عوامی شاہراہ پر Savoy کے ایک بچے کی چوری کی، جس میں تشدد بھی شامل تھا۔ آٹھ برس کے لیے غائب ہو گیا، کسی کو خبر نہیں کس طرح، اور پھر میری دلچسپی کے باعث اس کی تلاش ہوئی۔ یہ کام میں نے کیا۔ غصے نے مجھے اندھا کر دیا تھا؛ میں نے آپ کو پولیس کے محکمے میں رسوا کیا ہے۔"

میڈیلین، جس نے اس سے کئی منٹ پہلے مقدمے کی مثل دوبارہ اٹھا لی تھی، مکمل لاپروائی سے اس پر دوبارہ کام شروع کر دیا۔

"اور تمھیں کیا جواب ملا تھا؟"

"تم پاگل ہو۔"

"واقعی؟"

"جی، ہاں وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔"

"خوش قسمت ہو کہ تمھیں احساس ہو گیا ہے۔"

"مجھے مجبور کیا جا رہا ہے، اس لیے کہ اصل ژاں ویلژاں مل گیا ہے۔"

موسیو میڈلین کے ہاتھ میں کاغذ کا جو صفحہ تھا ہاتھ سے چھوٹ گیا؛ اس نے اپنا سر اٹھایا، گھور کر جاویر کی طرف دیکھا، اور اپنے نا قابلِ بیان لہجے میں کہا:

"اوہ"

جاویر کہتا رہا:

"کچھ ایسا ہی ہے، مسٹر میئر۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ -Clocher Ailly-le-Haut کے پڑوس میں ایک عمر رسیدہ شخص رہتا تھا جو فادر شومپ ماتُو (Champmathieu) کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بڑا بد بخت انسان تھا۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس قسم کے لوگ کیسے گزر بسر کرتے ہیں۔ حال ہی میں، پچھلی خزاں میں فادر شامپ ماتُو سرکہ بنانے والے سیب کی چوری کے الزام میں گرفتار ہو گیا تھا، کہاں سے — چھوڑیے اس بات کو؛ چوری ہوئی، دیوار پھاندی گئی، پیڑ کی شاخیں توڑی گئیں، اور بس۔ شامپ ماتُو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی سیب کے درخت کی ایک شاخ تھی۔ وہ اوباش اب قید میں ہے۔ اس حد تک تو یہ معاملہ محض ایک بد اعمالی کرنے والے سے متعلق تھا۔ مگر یہی وہ مقام ہے جہاں مآل اندیشی کا دخل شروع ہوتا ہے۔

جیل خراب حالت میں ہے، تفتیش کرنے والے مجسٹریٹ نے شامپ ماتُو کو Arras منتقل کرنا معقول جانا جہاں ایک محکمانہ قید خانہ واقع ہے۔ Arras کے اس قید خانے میں ایک سابق سزا یافتہ بریوے (Brevet) بند ہے، مجھے معلوم نہیں کس لیے۔ اب وہ اچھے چال چلن کے عوض قید خانے کا کلید بردار بنا دیا گیا ہے۔ مسٹر میئر، جوں ہی شامپ ماتُو آیا بریوے نے شور مچا دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ وہ ایک سابق سزا یافتہ ہے۔ کہتا ہے میرے اچھے آدمی، میری طرف دیکھو، تم ژاں ویلژاں ہو۔ ژاں ویلژاں! کون ژاں ویلژاں ہے؟ شامپ ماتُو بناوٹی حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ 'معصومانہ دھوکے بازی نہ کرو' بریوے کہتا ہے۔ 'تم ہی ژاں ویلژاں ہو! تم Toulon کے باورچی خانوں میں رہے ہو؛ یہ بیس برس قبل کا واقعہ ہے؛ ہم دونوں ایک ساتھ تھے! شامپ ماتُو انکار کرتا ہے۔ Parbleu! تم تو سمجھ رہے ہو نا۔ معاملے کی تفتیش ہوتی ہے۔ وہ جگہ میرے نزدیک اچھی طرح ہموار تھی۔ بس اتنا ہی دریافت ہوا تھا۔ تمیں

برس قبل شامپ ماتؤ مختلف علاقوں میں شجر تراشی کرتا تھا، خاص کر Faverolles میں۔ اس کے سارے سراغ مٹ گئے تھے۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ ایک بار پھر Auvergne میں دیکھا گیا تھا؛ اس کے بعد پیرس میں، جہاں، کہا جاتا ہے کہ وہ دولاب سازی کرتا تھا، اور اس کے ایک بیٹی بھی تھی، جو کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی، مگر یہ سب ثابت نہیں ہوا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ چوری کی سزا کے طور پر گیلیز میں بھیجے جانے سے قبل ژاں ویلژاں کیا تھا؟ شجر تراش! مگر کہاں؟ Faverolles میں۔ ایک اور حقیقت۔ اس ویلژاں کا عیسائی نام تھا ژاں، اور اس کی ماں کا خاندانی نام تھا ماتؤ (Mathieu)۔ اس سے زیادہ فطری بات جس کا قیاس کیا جا سکتا ہے، یہ تھی کہ اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے اس کو اپنی ماں کا نام اختیار کر لینا چاہیے تھا اور خود کو ژاں ماتؤ کہلوانا چاہیے تھا؟ وہ Auvergne چلا جاتا ہے۔ وہاں کے مقامی تلفظ کے باعث ژاں شاں میں تبدیل ہو جاتا ہے — اور وہ شاں ماتؤ کہلانے لگتا ہے۔ ہمارا آدمی مخالفت نہیں کرتا، اور اس کو شامپ ماتؤ کہلانے لگتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ Faverolles میں تفتیش کی گئی۔ ژاں ویلژاں کا خاندان اب وہاں موجود نہیں۔ کچھ خبر نہیں کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان طبقات میں کوئی خاندان اکثر غائب ہو جاتا ہے۔ تلاش کی گئی تھی، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ایسے لوگ جب دلدل نہیں بنتے تو خاک بن جاتے ہیں۔ اور چوں کہ واقعے کی ابتدا تیس برس قبل ہوئی تھی، اب Faverolles میں ایسا کوئی نہیں رہا جو ژاں ویلژاں کو جانتا ہو۔ Toulon میں تفتیش کی گئی تھی۔ بریوے کے علاوہ، وہاں صرف دو سزا یافتہ ابھی زندہ ہیں جنھوں نے ژاں ویلژاں کو دیکھا تھا؛ وہ Cochepaille اور Chenildieu ہیں، اور عمر قید جھیل رہے ہیں۔ انھیں باورچی خانے سے لایا گیا اور شامپ ماتؤ بنے شخص کا سامنا کرایا گیا۔ انھوں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا؛ ان کے نزدیک، اور بریوے کے لیے، تو وہ ژاں ویلژاں ہی ہے۔ اتنی ہی عمر، 54 برس — ویسا ہی قد، وہی انداز، وہی آدمی؛ مختصر یہ کہ وہ وہی ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنا الزام پیرس کی پولیس کو بھیجا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے، اور یہ بھی کہ ژاں ویلژاں Arras میں ہے، اور ارباب اختیار کے قبضے میں ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نے مجھے حیران کر دیا ہوگا، جب میں نے سوچا تھا کہ وہی ژاں ویلژاں یہاں ہے۔ میں نے تفتیشی جج کو لکھا؛ مجھے بلایا گیا، اور میرے سامنے شامپ ماتؤ کو پیش کر دیا گیا......"

"اچھا؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے موسیو میڈلین نے کہا۔

جاویر نے جواب دیا؛ اس کا چہرہ معصومانہ چہرہ ہمیشہ کی طرح افسردہ تھا:

"مسٹر میئر، سچ، سچ ہی ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے، مگر وہی آدمی ژاں ویلژاں ہے۔
میں اسے پہچانتا بھی ہوں۔"

موسیو میڈلین نے بہت دھیمی آواز میں بات شروع کی۔

"تمھیں یقین ہے؟"

جاویر نے ہنسنا شروع کر دیا، اس غمگین ہنسی کے ساتھ جو عمیق یقین کے ساتھ آتی ہے۔

"بالکل، یقین ہے۔"

وہ سوچ میں غرق ایک لمحے کھڑا رہا، میکانکی انداز میں، میز پر رکھے ایک چوبی پیالے میں سے، چٹکیوں میں، روشنائی خشک کرنے کے لیے لکڑی کا برادہ اٹھاتے ہوئے، اس نے اضافہ کیا:

"اور اب بھی، جب کہ میں ژاں ویلژاں کو دیکھ چکا ہوں، میں کس طرح سمجھ اور سوچ سکتا تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں، مسٹر میئر۔"

جاویر یہ عاجزانہ مگر سخت باتیں اس شخص سے کر رہا تھا جس نے چھ ہفتے قبل اس کو پورے تھانے کے سامنے ذلیل کر دیا تھا، اور اس کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا تھا— جاویر، وہی خود پسند آدمی تھا، غیر شعوری طور پر سادہ اور باوقار— موسیو میڈلین نے، سوائے ایک بے ربط سوال کے، اس کی التجا کا کوئی جواب نہیں دیا:

"اور وہ آدمی خود کیا کہتا ہے؟"

"اوہ، واقعی مسٹر میئر، یہ بہت گندہ کام ہے۔ اگر وہ ژاں ویلژاں ہے، تو اس کی سابق سزا اس کے خلاف جائے گی۔ دیوار پر چڑھنا، درخت کی شاخ توڑنا، سیب چرانا، یہ سب بچوں کا شرارتی کرتب ہوتا ہے؛ کسی آدمی کے لیے بد اعمالی کسی سزا یافتہ کے لیے جرم ہوا کرتی ہے۔ چوری کرنا اور نقب لگانا— یہ سب ہمارے سامنے ہے۔ یہ اصلاحی پولیس کا معاملہ نہیں رہتا؛ یہ Assizes کی عدالت کا کام ہے۔ یہ چند دنوں کی قید کا معاملہ بھی نہیں، یہ زندگی بھر گیلیز میں کام کرنے کی سزا کا معاملہ ہے۔ اور اس کے علاوہ، اس Savoy کے بچے والا معاملہ بھی تو ہے، جو، مجھے امید ہے واپس آئے گا۔ یہ دہرا تماشا ہے۔ اس معاملے پر بحث کرنے کے لیے بہت کچھ ہے، ہے کہ نہیں؟ ہاں، مگر صرف ژاں ویلژاں کے لیے۔ مگر ژاں ویلژاں تو عیار رکھتا ہے۔ میں نے اس کو اسی سے پہچانا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس کو احساس ہوتا کہ حالات بگڑتے جا رہے ہیں؛ جدوجہد کرتا، شور مچاتا— آگ لگنے سے پہلے کیتلی سیٹی بجاتی ہے؛ وہ ژاں ویلژاں نہیں ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس میں سمجھنے کے آثار نظر نہیں آتے؛ وہ کہتا ہے، 'میں شامپ ماتھیو ہوں اور میں اپنے

موقف سے نہیں ہٹوں گا۔ اس کا انداز ششدر ہو جانے والے جیسا ہے، وہ خود کو بیوقوف ظاہر کرتا ہے؛ یہ بہت بہتر ہے۔ اوہ، وہ بدمعاش، بہت چالاک آدمی ہے، مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ثبوت موجود ہیں۔ چار افراد نے اسے پہچانا ہے؛ وہ ازلی اوباش پکڑا جائے گا۔ معاملہ Arras کی عدالت Assizes کے سامنے ہے۔ میں گواہی کے لیے ضرور جاؤں گا۔ مجھے طلب کیا گیا ہے۔''

موسیو میڈلین اپنی میز پر واپس جاچکا تھا، اور مقدمے کی مثل اٹھا لی تھی، اور کسی مصروف آدمی کی طرح بڑے سکون سے ورق پلٹنے اور لکھنے لگا تھا۔ اور وہ جاویر سے مخاطب ہوا:

''جاویر، بس اتنا کافی ہے۔ سچ پوچھو تو ان تفصیلات میں مجھے دلچسپی ہے مگر ہم۔ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں بہت سارے کام کرنے ہیں۔ جاویر تم فوراً اس عورت Buseaupied کے گھر جاؤ گے، جو Saint-Saulve اسٹریٹ کے نکڑ پر جڑی بوٹیاں بیچتی ہے۔ تم اس سے کہو گے کہ وہ گاڑی والے Pierre Chesnelong کے خلاف شکایت درج کرائے۔ وہ آدمی وحشی ہے، جس نے اس عورت اور اس کے بچے کو تقریباً کچل دیا تھا۔ اس کو ضرور سزا ملنی چاہیے۔ اس کے بعد تم Montre-de- Champigny اسٹریٹ جاؤ گے موسیو Charcellay کے پاس۔ اس نے شکایت کی ہے کہ اس کے پڑوس کی گھر کا بارش کا پانی برابر والے گھر پر گرتا ہے، اور اس کے مکان کی بنیاد تباہ ہو رہی ہے۔ اس کے بعد تم تصدیق کرو گے کہ Guibourg اسٹریٹ میں، Widow Doris میں، اور Garraud-Blanc اسٹریٹ میں مادام Renee le Bosse کے قریب پولیس کے قوانین کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں، مجھے شکایات ملی ہیں، اور تم سارے کاغذات تیار کرو گے، مگر میں تمھیں بہت سارا کام دے رہا ہوں۔ آج تمھاری چھٹی تو نہیں؟ کیا تم نے بتایا نہیں تھا کہ اس معاملے کے لیے ہفتے دس دن کے اندر تم Arras جانے والے ہو؟''

''اس سے بھی پہلے، مسٹر میئر!''

''تو، کس دن؟''

''میں نے موسیو میئر سے کب کہا کہ کل مقدمے کی تاریخ ہے، کہ مجھے رات کو جانا ہے۔''

موسیو میڈلین نے ایک خفیف سی حرکت کی۔

''اور اس مقدمے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک دن۔ کل شام تک فیصلہ سنا دیا جائے گا، مگر میں سزا کا انتظار

نہیں کروں گا جو حق ہے۔ میں اپنی گواہی کے بعد جتنی جلد ہو سکا یہاں واپس آ جاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" موسیو میڈیلین نے کہا۔

اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے جاویر کو جانے کے لیے کہا۔

جاویر گیا نہیں۔

"معاف کیجیے گا، مسٹر میئر!" اس نے کہا۔

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"مسٹر میئر، بس آپ کو ایک بات یاد دلانا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟"

"مجھے برخاست کیا جائے۔"

موسیو میڈیلین اٹھ کھڑا ہوا۔

"جاویر، تم عزت دار آدمی ہو اور میں تمھاری قدر کرتا ہوں۔ تم اپنی غلطی کو کچھ زیادہ ہی بڑھا رہے ہو۔ مزید یہ کہ یہ جرم مجھ سے متعلق ہے۔ جاویر، تم تنزلی کے بجائے ترقی کے حق دار ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے عہدے پر فائض رہو۔"

جاویر نے اپنی راست باز آنکھوں سے موسیو میڈیلین کو گھور کر دیکھا جن کی گہرائیوں میں اس کا بہت روشن خیال نہیں مگر پُرخلوص اور بے لوچ ضمیر دکھائی دیتا محسوس ہو رہا تھا، اور پُرسکون آواز میں کہا، "مسٹر میئر، میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"میں اپنی بات دہرا رہا ہوں۔" میڈیلین نے جواب میں کہا، "یہ معاملہ مجھ سے متعلق ہے۔"

مگر جاویر اپنی دھن میں مگن، کہتا رہا:

"جہاں تک بڑھا چڑھا کر بات کرنے کا معاملہ ہے، میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، اسی لیے تو میں حجت کر رہا ہوں۔ میں نے آپ پر بے جا شبہ کیا ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ شبہات کرنا ہمارا کام بھی ہے اور حق بھی، حالاں کہ ہم سے بالا بالا شبہ کرنا ہمارے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے۔ مگر ثبوت کے بغیر، غصے کے عالم میں، بدلہ لینے کی غرض سے میں نے آپ کو سزا یافتہ گردانا تھا، آپ کو، ایک معزز آدمی کو، ایک میئر کو، ایک مجسٹریٹ کو۔ یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔ میں نے آپ کے اختیار کی توہین کی ہے۔ میں، جو اربابِ اختیار کا کارندہ ہوں۔ اگر میرے کسی ماتحت نے یہ کیا ہوتا جو میں نے کیا ہے تو میں اس کو ملازمت کے لائق نہیں سمجھتا، اور اسے کان پکڑ کر نکال باہر کر دیتا۔ بس مسٹر میئر، بس! ایک اور بات۔ اپنی زندگی کے دوران میں

دوسروں کے لیے بہت سخت رہا ہوں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ میں نے اچھا کام کیا ہے۔ اب اگر میں اپنے بارے میں سختی نہیں کروں گا تو میں نے جتنے منصفانہ کام کیے ہیں سب غیر منصفانہ ہو جائیں گے۔ تو کیا دوسروں کے مقابلے میں مجھے اپنے ساتھ زیادہ رواداری برتنی چاہیے؟ نہیں! کیا میں صرف دوسروں کی تادیب کروں مگر اپنے ساتھ وہی سلوک نہ کروں؟ کیوں! میں لفنگا کیوں بنوں! وہ جو مجھے 'جاویر لفنگا' کہتے ہیں، صحیح ہو جائیں گے۔ مسٹر میئر، میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھ پر مہربانی کریں؛ آپ کی مہربانیوں نے مجھے بہت خراب کیا ہے، جب کہ وہ دوسروں کے لیے تھیں۔ مجھے ان کی بالکل ضرورت نہیں۔ وہ مہربانی جو ایک عورت کو ایک باشندے پر، پولیس کو میئر پر، نچلے درجے کے آدمی کو برتر درجے کے آدمی پر فوقیت دے، اس کو میں غلط مہربانی سمجھتا ہوں۔ اسی قسم کی مہربانیاں معاشرے کو ابتر کر دیتی ہیں۔ مہربان ہونا بہت آسان ہوتا ہے؛ مشکل انصاف پرور ہونے میں ہوتی ہے۔ دیکھیے، اگر آپ وہی ہوتے جو میں سمجھا تھا، تو میں آپ پر مہربان نہیں ہوتا۔ مسٹر میئر، مجھے اپنے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جیسا کہ میں دوسروں کے ساتھ کروں گا۔ جب میں نے ایذا رسانوں کو زیر کرلیا ہے، جب میں بدمعاش لوگوں سے سختی سے نمٹا ہوں، تو میں نے اکثر اپنے آپ سے بھی کہا ہے، 'اگر تم دبے، اگر میں نے کبھی تم کو غلطی کرتے پکڑا تو پھر تمھیں آرام ہی کرنا پڑے گا۔ اب میں دب گیا ہوں، میں نے خود کو غلطی کرتے پکڑ لیا ہے۔ بہت بُرا ہوا ہے۔ سو، برخاست کیے جاؤ، رسوا کر کے نکالے جاؤ! ٹھیک ہے۔ میرے ہاتھ ہیں، میں کاشت کاری کراوں گا؛ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مسٹر میئر، خدمات کی اچھائی مثال کی طلب گار ہوتی ہے۔ بس، میں انسپکٹر جاویر کی برخاستگی چاہتا ہوں۔''

یہ سب متکبرانہ، منکسرانہ، مایوسانہ پھر بھی معقول لہجے میں کہا گیا تھا، جس نے اس منفرد، ایمان دار آدمی کی شان میں ناقابلِ بیان اضافہ کیا تھا۔

''ہم سوچیں گے۔'' موسیو میڈلین نے کہا۔

اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

جاویر پیچھے ہٹا، اور وحشیانہ آواز میں کہا۔ ''معاف کیجیے، مسٹر میئر، مگر یہ نہیں ہو گا۔ ایک میئر ایک پولیس کے جاسوس سے ہاتھ نہیں ملاتا۔''

اور اپنے دانت بند کیے ہوئے، اضافہ کیا:

''پولیس کا جاسوس، ہاں؛ اس وقت سے جب میں نے پولیس کا غلط استعمال کیا تھا۔ میں اب پولیس کے جاسوس سے زیادہ نہیں رہا۔''

پھر وہ مؤدبانہ انداز میں خم ہوا، اور دروازے کے طرف اپنے قدم بڑھائے۔ ایک بار پھر، اس کی آنکھیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"مسٹر میئر، میں اس وقت تک کام کرتا رہوں گا۔" اس نے کہا، "جب تک میری تنزلی نہیں ہوتی۔"

وہ واپس ہوا۔ موسیو میڈلن اس کے مستحکم، اور پُراعتماد قدموں کی چاپ سن رہا تھا، جو راہداری میں پہنچ کر ختم ہوگئی۔

۞

سسٹر سمپلیس

اب قارئین جن واقعات کو پڑھنے جا رہے ہیں M. sur M. والوں کو ان سب کا علم نہیں تھا، مگر ان کا ایک چھوٹا سا حصہ جو مشہور ہو گیا تھا، اس شہر میں ایسی یادیں چھوڑ گیا ہے کہ اگر ان کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی بیان نہیں کی جاتیں تو اس کتاب میں بہت بڑا خلا رہ جائے گا۔ ان تفصیلات میں قاری کو دو ایسے غیر ممکنہ حالات پیش آئیں گے جو ہم سچ کے احترام کی خاطر محفوظ کرنا چاہیں گے۔

جاویر کی آمد کے بعد کی دوپہر، موسیو میڈلین اپنے معمول کے مطابق فانتین کو دیکھنے گیا۔

فانتین کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے، انھوں نے سسٹر سمپلیس (Simplice) کو طلب کیا تھا۔

دو راہبائیں جو اس دارالشفا میں نرس کے فرائض انجام دیتی تھیں، Sisters of Charity تھیں، ان کے نام سسٹر پرپیچو (Perpetue) اور سسٹر سمپلیس تھے۔

سسٹر پرپیچو ایک عام دیہی Sister of Charity تھی جو خدا کے کام میں شامل ہوئی تھی۔ یہ راہبہ تھی جب کہ دوسری خواتین پکانے والی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی لڑکیاں اتنی نادر بھی نہیں ہوتیں۔ خانقاہ کے آرڈر ان مٹی کے برتنوں [دیہی لڑکیوں] کو شوق سے اپنے نظام میں قبول کر لیتے ہیں جنھیں آسانی سے Capuchin [رومن کلیسا کے آرڈر] یا Ursuline میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ اکثر دیہاتیوں سے عبادات کے بنیادی کام لیے جاتے ہیں۔ کسی مویشی فروش کو [رومن کلیسا کے آرڈر] Carmelite میں بدلنا بالکل مشکل نہیں ہوتا؛ بغیر زیادہ کوشش کے ایک کو دوسرے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؛ جہالت کا خزینہ جو گاؤں اور خانقاہ دونوں میں مشترک ہوتا ہے، وہ نسخہ ہے

جو ہمیشہ تیار رہتا ہے، اور ایک دہقان کو فوراً راہب کے برابر بنا دیتا ہے؛ کسی بالا پوش میں معمولی سی فراخی ہو، تو وہ جبہ بن جاتا ہے۔ سسٹر پیغ ِپیچو، Pontoise کے قریبی علاقے Marines کی ایک تنومند راہبہ تھی جو اپنی patois [مقامی بولی] میں بھن بھن کرتی، بدبداتی، معذوروں کی منافقت یا تعصب کے مطابق ان کی خوراک میٹھی کر دیتی، مریضوں سے ناہموار انداز، غیر مہذب طریقے سے پیش آتی، قریب المرگ لوگوں سے ترش روئی کرتی، تقریباً خدا کو ان کے منہ پر مارتی، ان کی جانکنی کو غصے میں کی گئی دعاؤں سے سنگسار کرتی؛ دلیر، ایمان دار اور سُرخ وسفید عورت تھی۔

سسٹر سمپلیس سفید فام، موم جیسی، زردی مائل لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ سسٹر پیغ پیچو، جیسے شمع کے ساتھ اس کی مخروطی لَو۔ Vincent de Paul نے نہایت مقدس طریقے سے Sister of Charity کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے، جس میں وہ اسی قدر آزادی کی آمیزش کرتا ہے جتنی کہ محکومی کی: ''ان کو خانقاہ کے لیے صرف بیماروں کا مکان ملے گا؛ حجرے کے لیے کرائے کا ایک کمرہ؛ عبادت گاہ کے لیے پیرش کا گرجا گھر۔ خانقاہ کے لیے صرف شہر کی سڑکیں اور اسپتال کے وارڈ؛ احاطے کے لیے اطاعت شعاری؛ چوبی جالی کی جگہ خوفِ خدا، نقاب کے لیے صرف حیا۔'' سسٹر سمپلیس کی جان دار شخصیت میں یہ مثالیت رکھی گئی تھی: وہ کبھی جوان نہیں ہوئی، اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا دنیا کی کبھی نشوونما نہیں ہوگی۔ کوئی سسٹر سمپلیس کی عمر نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ ایک فرد تھی— اس کو عورت کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی— جو نرم خو، سادہ مزاج، اعلیٰ نسل کی، سرد عورت تھی، جس نے کبھی دروغ گوئی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی مہذب تھی کہ نازک لگتی تھی مگر سنگِ خارا سے زیادہ سخت اور ٹھوس تھی۔ وہ بد قسمت لوگوں کو اپنی انگلیوں سے مس کرتی تھی جو دل آویزی کی حد تک خالص اور نفیس تھیں۔ اس کی گفتگو میں، بقول شخصے، خموشی بولتی تھی؛ اس کے پاس بس وہی کچھ تھا جو ضروری تھا۔ وہ ایسے لہجے کی مالک تھی جو اعتراف گاہ کی شان بڑھا دیتا یا ملاقات کے کمرے کو سحر زدہ کر دیتا تھا۔ اس کی نفاست نے خود کو سرج کے بالا پوش کے مطابق کر لیا تھا، اور اس کے سخت لمس میں جنت کی مسلسل یاددہانی ہوتی تھی۔ ہمیں تفصیل پر ذرا زور ڈالنے دیجیے۔ کسی قسم کے فائدے کے لیے کبھی جھوٹ نہ بولنا، بے توجہی کے باعث بھی، وہ سچ بھی نہ کہنا جو سچ ہو، بلکہ مقدس سچ ہو۔ یہ تھی سسٹر سمپلیس کی خصوصی جبلت؛ یہ تھا لہجہ اس کی خوبیوں کا۔ وہ اجتماعات میں اپنی راست گوئی میں اس قسم کے سکون کے لیے مشہور تھی۔ Massieu t ابی گونگے بہرے کے نام ایک خط میں Abbe Sicard کہتا ہے: ہم کتنے بھی خالص اور مخلص کیوں نہ ہوں، ہم سب اپنی صاف دلی پر چھوٹے چھوٹے غیر ارادی جھوٹ کے شگاف لیے پھرتے ہیں۔ وہ کوئی

شگاف نہیں رکھتی تھی۔ چھوٹا جھوٹ یا معصومانہ جھوٹ — کیا اس قسم کی چیزیں واقعی ہوتی ہیں؟ شیطنت کی سب سے بڑی شکل دروغ گوئی ہوتی ہے۔ معمولی یا کم دروغ گوئی ممکن نہیں۔ وہ جو دروغ گوئی کرتا ہے، پوری دروغ گوئی کرتا ہے۔ جھوٹ بولنے کا عمل ہی تو شیطان کا چہرہ ہوتا ہے۔ شیطان کے دو نام ہوتے ہیں: اس کو شیطان کہتے ہیں، اسی کو دروغ گوئی کہتے ہیں۔ ایسی تھی اس کی سوچ۔ وہ جو سوچتی تھی وہی کرتی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ سفیدی تھی، ہم جس کا تذکرہ کر چکے ہیں — وہ سفیدی جو اس کے ہونٹوں اور چمکتی آنکھوں تک کو ڈھانپے رکھتی تھی۔ اس کا تبسم شفاف تھا، اس کی نظر شفاف تھی۔ اس کے ضمیر کی کھڑکی کے شیشے پر ایک بھی مکڑی کا جالا نہیں تھا، ایک بھی ذرہ خاک کا نہیں تھا۔ Saint Vincent de Paul کے آرڈر میں داخل ہوتے وقت اس نے اپنی پسند کا نام سمپلیس اختیار کیا تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں سسلی کی سمپلیس وہ سینٹ ہے جس نے اپنی چھاتیوں کا نکال دیا جانا پسند کیا تھا؛ بجائے یہ کہنے کے کہ وہ Segesta میں پیدا ہوئی تھی، جب کہ وہ Syracuse میں پیدا ہوئی تھی، ایک جھوٹ جس نے اسے بچا لیا ہوتا۔ ایک مربی سینٹ ایک روح کے قابل ہو گئی تھی۔

آرڈر میں داخل ہوتے وقت سسٹر سمپلیس میں دو شگاف تھے، رفتہ رفتہ جو صحیح کر دیے گئے تھے۔ اسے نفاست پسند تھی، اور وہ خط وصول کرنا پسند کرتی تھی۔ سوائے لاطینی زبان میں چھپی معمولی درجے کی دعائیہ کتابوں کے وہ کچھ نہیں پڑھتی تھی۔ اسے لاطینی زبان نہیں آتی تھی، مگر وہ کتاب کو سمجھتی تھی۔

اس دین دار عورت میں فانتین کے لیے پسندیدگی پیدا ہو گئی تھی، شاید اس کی وجہ اس کی کوئی مخفی خوبی تھی، اور اس نے اس کی نگہداشت کے لیے خود کو تقریباً وقف کر دیا تھا۔

موسیو میڈیلن سسٹر کو ایک طرف لے گئے اور ایک محکم لہجے میں فانتین کی سفارش کی، جو اس نے بعد میں دہرائی تھی۔

سسٹر سے الگ ہونے کے بعد وہ فانتین کی طرف گیا تھا۔

فانتین موسیو میڈیلن کی آمد کا اسی طرح انتظار کرتی تھی، جیسے کوئی گرمی اور مسرت کا منتظر ہوتا ہے۔ اس نے سسٹروں سے کہا تھا، ”میں اسی وقت تک زندہ رہوں گی، جب تک موسیو میئر یہاں ہیں۔“

اس دن فانتین کو تیز بخار ہو گیا تھا۔ جوں ہی اس نے موسیو میڈیلن کو دیکھا، اس سے پوچھا تھا، ”اور کوزیٹ؟“

موسیو نے مسکرا کر کہا تھا، ''بہت جلد۔''

موسیو میدیلین فاتیمیں سے معمول کے مطابق ملا۔ اس دن آدھ گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے تک اس کے ساتھ رہا تھا، اور فاتیمیں بہت خوش تھی۔ اس نے ہر شخص سے بار بار کہا تھا کہ اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ لوگوں نے دیکھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے خدوخال پر ایک افسردگی سی پھیل گئی تھی، مگر اس کی تشریح مل گئی تھی، جب یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے جھک کر اس کے کان میں کہا تھا، ''اس کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔''

پھر وہ ٹاؤن ہال واپس چلا گیا، اور کلرک نے اسے فرانس کے نقشے پر کچھ تلاش کرتے دیکھا تھا، جو اس کے مطالعے کے کمرے میں آویزاں تھا، اور اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ ہندسے بھی لکھے تھے۔

❁

ماسٹر اسکافلیر کی فراست

ٹاؤن ہال سے وہ سیدھا شہر کے کنارے ماسٹر اسکافلیر (Scaufflaire) نامی ایک شخص کے پاس گیا جو ضرورت کے مطابق گھوڑے اور بگھیاں کرایے پر فراہم کرتا تھا۔ اسکافلیر کا تعلق Flanders سے تھا۔

اس تک پہنچنے کے لیے، جس کو کم لوگ استعمال کرتے تھے، جس پر ایک پادری کا مکان تھا، موسیو میڈیلین جس میں رہتا تھا، قریب ترین راستہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پادری ایک لائق، محترم، اور سمجھ دار آدمی تھا۔ اس وقت جب موسیو میڈیلین پادری کے مکان کے سامنے پہنچا، وہاں صرف ایک راہگیر تھا، اور اس شخص نے دیکھا: میئر جب پادری کے مکان سے گزر گیا، تو تھوڑی دور جا کر رُکا، ساکت کھڑا رہا، اور پھر الٹے پاؤں واپس ہوا۔ پادری کے مکان کے دروازے تک گیا، جس پر کھٹکھٹانے والا لوہے کا ایک کنڈا لگا تھا۔ اس نے تیزی سے کنڈے پر ہاتھ رکھا، اس کو بلند کیا ہی تھا کہ رُک گیا، کچھ سوچا، اور چند سیکنڈ بعد کنڈے کو یوں ہی چھوڑ دینے کے بجائے آہستہ سے اس کی جگہ پر واپس رکھ دیا، اور دوبارہ اپنے راستے پر ایسی تیزی سے چل پڑا، جو پہلے دیکھی نہیں گئی تھی۔

موسیو میڈیلین کو ماسٹر اسکافلیر اپنے گھر پر مل گیا، جو ایک لگام کی مرمت کرنے میں مشغول تھا۔

”ماسٹر اسکافلیر“ اس نے پوچھا، ”آپ کے پاس کوئی اچھا سا گھوڑا ہے؟“

”موسیو میئر“ اس نے جواب میں کہا، ”میرے سارے گھوڑے اچھے ہیں۔ اچھے گھوڑے سے آپ کا کیا مطلب تھا؟“

"میرا مطلب ہے ایسا گھوڑا جو دن میں بیس لیگ جا سکتا ہو۔"

"دوگنا، یعنی بیس لیگ؟" اس نے جواب میں کہا۔

"ہاں۔"

"بگھی میں جُتا ہوا؟"

"ہاں۔"

"اور اس سفر کے بعد اس کو کتنی دیر آرام کرنا ہوگا؟"

"ضروری ہو تو اگلے دن روانہ ہو سکتا ہے۔"

"اسی سڑک پر چلنے کے لیے؟"

"ہاں"

موسیو میدیلین نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر پنسل سے کچھ ہندسے لکھے تھے۔ اس شخص کو دکھائے۔ وہ ہندسے 5, 6, 8 1/2 تھے۔

"دیکھیے،" اس نے کہا، "سب ملا کر ساڑھے انیس ہوتے ہیں؛ آپ اسے بیس لیگ کہہ سکتے ہیں۔"

"مسٹر میئر!" اس نے جواب میں کہا "میرے پاس بالکل وہی ہے جو آپ چاہتے ہیں۔ ایک سفید گھوڑا ہے — آپ نے اسے اکثر گزرتے دیکھا ہوگا؛ زیریں Boulonnais کا جانور ہے۔ توانائی کی آگ سے بھرپور۔ پہلے یہ سواری کے لیے سدھایا جانے والا تھا۔ اس دوران وہ اچھلا، دولتیاں جھاڑیں، اور ہر ایک کو چت کر دیا۔ خطرناک سمجھا گیا تھا، اور کوئی بھی اس سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ میں نے اسے گاڑی میں جوت دیا۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا، وہ اتنا ہی نرم خو ہے جیسے کوئی لڑکی؛ دوڑتا ہے تو ہوا کی طرح۔ افسوس کہ اس پر سواری نہیں کی جا سکتی۔ شاید زین والی سواری بننا اسے پسند نہیں۔ سب کے اپنے اپنے شوق ہوا کرتے ہیں۔ کھینچنا؟ ہاں! لے جانا؟ نہیں! شاید اس نے خود سے بھی یہی کہا ہوگا۔"

"آپ کے بیس لیگ، ایک دوڑ میں، آٹھ گھنٹے سے کم عرصے میں ہو جائیں گے مگر مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ۔"

"بیان کیجیے۔"

"پہلی بات: آدھے سفر کے بعد اس کو آدھ گھنٹا سانس لینے کے لیے درکار ہوگا؛ چارہ کھائے گا؛ اور جب وہ چارہ کھا رہا ہو تو کسی کو نگاہ رکھنی ہوگی کہ اصطبل کے لونڈے اوٹس چرا نہ

لیں؛ اس لیے کہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ سرائے میں گھوڑے کے کھانے کے مقابلے میں زیادہ تر اوٹس اصطبل کے لونڈے کھا جایا کرتے ہیں۔"

"کوئی نہ کوئی اس کے پاس ضرور رہوگا۔"

"دوسری بات — کیا بگھی موسیو میئر کی ہوگی؟"

"ہاں۔"

"کیا موسیو میئر کو گاڑی ہانکنی آتی ہے؟"

"آتی ہے۔"

"مگر چوں کہ موسیو میئر کے ساتھ کوئی اور نہیں ہوگا، تو مہربانی کرکے انھیں خود نگاہ رکھنی ہوگی کہ اوٹس چرائے نہ جا رہے ہوں۔"

"مجھیں اس کا احساس ہے۔"

"اجرت، تیس فرانک یومیہ ہوگی۔ آرام کے دن کی بھی اسی حساب سے ادائگی ہوگی — ایک فارونگ بھی کم نہیں ہوگا؛ جانور کی غذا کا خرچ موسیو میئر پر ہوگا۔"

موسیو میڈیلن نے بٹوے سے تین نپولین نکال کر میز پر رکھ دیے۔

"یہ رہے، دو دن کے پیشگی۔"

"چوتھے، ایسے سفر کے لیے بگھی بہت وزنی ہوگی؛ گھوڑا تھک جائے گا۔ موسیو میئر کو میری دو نفری گاڑی میں سفر کرنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"وہ گاڑی ہلکی ہے، مگر اس پر چھتری نہیں ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"کیا موسیو میئر کو احساس ہے کہ یہ سرما کا موسم ہے؟"

موسیو میڈیلن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مزید کہا، "بہت سردی ہے؟"

موسیو میڈیلن خاموش رہے۔

ماسٹر اسکافلیر جاری رہا "اس دوران بارش بھی ہوسکتی ہے؟"

موسیو میڈیلن نے سر اٹھایا اور کہا:

"گاڑی اور گھوڑا کل صبح ساڑھے چار بجے میرے دروازے کے سامنے ہوں گے۔"

"یقیناً! موسیو میئر!" اسکافلیر نے کہا؛ اس کے بعد میز کی لکڑی کے ایک داغ کو اپنے

ناخن سے کھرچتے ہوئے اس قسم کی لاپروائی سے اس کے قبیلے والے جس میں اپنی چالاکی کو آمیز کرنے کا فن اچھی طرح جانتے ہیں، مزید کہا:

''مگر میں سوچ رہا ہوں کہ موسیو میتر نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کہاں جانے والے ہیں۔ موسیو میتر کہاں جا رہے ہیں؟''

وہ گفتگو کی ابتدا سے کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا، مگر نہ جانے کیوں یہ اسے سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

''تمھارے گھوڑے کے اگلے پاؤں مضبوط تو ہیں، نا؟''

''جی ہاں، موسیو میتر۔ آپ کو ڈھلان پر اترتے وقت احتیاط کرنی ہو گی۔ کیا جہاں آپ جا رہے ہیں، اس راستے میں کئی ڈھلانیں بھی ہیں؟''

''کل صبح ٹھیک ساڑھے چار بجے میرے دروازے پر، بھولنا نہیں۔'' جواب میں موسیو میدیلن نے کہا اور رخصت لی۔

جیسا کہ اس نے بعد میں کہا تھا، وہ شخص احمقوں کی طرح دیکھتا رہ گیا تھا۔

ابھی میتر کو گئے دو یا تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک بار پھر دروازہ کھلا، اور ایک بار پھر میتر موجود تھا۔

اس کا چہرہ اب بھی ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔

''موسیو اسکافلیر'' اس نے کہا، ''آپ کے خیال میں یہ گھوڑا اور گاڑی جو آپ مجھے کرایے پر دے رہے ہیں، ان کی کیا قیمت ہو گی؟''

''کیا موسیو میتر ان کو یا مجھے خریدنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں، پھر بھی! میں تمھیں ضمانت دینا چاہتا ہوں۔ تم یہ رقم واپسی پر مجھے واپس کر دو گے۔ تمھارے خیال میں گاڑی اور گھوڑے کی کل قیمت کیا ہو گی؟''

''پانچ سو فرانک، موسیو میتر۔''

''یہ لو۔''

موسیو میدیلن نے میز پر بینک کا نوٹ رکھ دیا، اور کمرے سے باہر چلا گیا؛ اس بار واپس نہیں آیا۔

ماسٹر اسکافلیر کو بہت افسوس ہوا کہ اس نے ایک ہزار فرانک نہیں کہے تھے۔ جب کہ گھوڑا اور گاڑی ملا کر، قیمت ایک سو کراؤن سے زیادہ نہیں رہی ہو گی۔

اسکافلیر نے اپنی بیوی کو آواز دی، اور سب کچھ کہہ سنایا۔ "یہ شیطان میئر کہاں جا سکتا ہے۔" دونوں نے ایک ساتھ غور کرنا شروع کیا۔ "پیرس جانے والا ہے۔" بیوی نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔" شوہر نے کہا۔

موسیو اپنا وہ کاغذ بھول گئے تھے جس پر کچھ ہندسے لکھے ہوئے تھے، جو چمنی پر رکھا ہوا تھا۔ گھوڑے والا اسے اٹھا کر دیکھنے لگا، "پانچ، چھ، اور ساڑھے آٹھ؟ یقیناً یہ ڈاک کی چوکیاں ہوں گی۔" اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔

"مجھے پتا چل گیا ہے۔"

"کیا؟"

"پانچ لیگ یہاں سے Hesdin, چھ لیگ Hesdin سے Saint-Pol، اور ساڑھے آٹھ لیگ Saint-Pol سے Arras تک۔ وہ Arras جا رہا ہے۔

اس دوران موسیو میڈلین گھر واپس پہنچ گیا تھا۔ اس نے واپسی کے لیے سب سے طویل راستہ اختیار کیا تھا، گویا پادری کا دروازہ اسے کوئی ترغیب دے رہا تھا اور وہ اس سے پرہیز کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا، جو بہت آسان کام تھا، اس لیے کہ وہ جلد سو جانا چاہتا تھا۔ پھر بھی، کارخانے کی خاتون چوکیدارنے، جو اس کے کام کے ساتھ اس کی خدمت بھی کرتی تھی، دیکھا کہ آج ساڑھے آٹھ بجے ہی کمرے کی روشنی بجھ گئی تھی۔ یہ بات اس نے خزانچی کو بھی بتا دی تھی، جب وہ گھر آیا تھا، اور اس میں یہ اضافہ بھی کر دیا تھا:

"کیا موسیو کچھ علیل ہیں؟ مجھے آج وہ کچھ غیر معمولی سے لگ رہے تھے۔"

"خزانچی جس کمرے میں رہتا تھا وہ موسیو میڈلین کی خواب گاہ کے بالکل اوپر تھا۔ اس نے دربان عورت کی باتوں کی کوئی پروا نہ کی اور جا کر سو گیا۔ آدھی رات کے وقت وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ نیند میں اپنے اوپر سے آنے والی اس نے کوئی آواز سنی تھی۔ اب اس نے غور سے سننا شروع کیا، اور موسیو میڈلین کے قدموں کی چاپ پہچان گیا۔ اسے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ عام طور پر موسیو میڈلین کے کمرے سے اس وقت تک کوئی آواز نہیں آتی تھی جب تک کہ صبح وہ اٹھ نہیں جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی الماری کھولی گئی ہو اور پھر بند بھی کر دی گئی ہو؛ پھر کوئی فرنیچر ہٹایا گیا؛ پھر وقفہ ہو گیا؛ پھر قدموں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ خزانچی اٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا؛ اب وہ بالکل جاگ گیا تھا اور گھور رہا تھا؛ اپنی کھڑکی کے شیشے سے اس نے دیکھا کہ سرخی مائل روشنی کی کرن نکل کر سامنے کی دیوار پر پڑ رہی تھی؛ اس کی

سمت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ صرف موسیو میدیلن کے کمرے کی کھڑکی سے ہی آ سکتی تھی۔ منعکس ہونے والی روشنی اس طرح لہرا رہی تھی گویا آگ کے شعلوں سے یا کسی جلتی ہوئی شمع سے نکل رہی ہو۔ کھڑکی کے چوکھٹے کا سایہ نظر نہیں آ رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا اس سردی کے موسم میں کھلا ہونا حیرت کی بات تھی۔ گھڑیال ایک بار پھر ہو گیا۔ ایک یا دو گھنٹے کے بعد پھر جاگا۔ اوپر وہی قدم اب بھی آہستہ آہستہ آ جا رہے تھے۔

روشنی کا دیوار پر انعکاس اب بھی نظر آ رہا تھا، مگر اب وہ زردی مائل اور کسی لیمپ سے نکلنے والی روشنی کی طرح پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی اب بھی کھلی تھی۔

یہ سب موسیو میدیلن کے کمرے میں ہوا تھا۔

۞

کاسۂ سر میں طوفان

بلاشبہ قاری کو اندازہ ہو گیا ہے کہ موسیو میڈلین ہی ژاں ولژاں ہے۔

ہم اس کے ضمیر کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ چکے ہیں؛ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس میں ایک بار اور جھانک کر دیکھیں۔ ہم یہ عمل جذبات اور لرزش کے بغیر نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے غور و فکر سے زیادہ خوف ناک کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے نفس کی آنکھ کو آدمی کے اندرون سے زیادہ چکا چوند کرنے والی چمک اور سایے کہیں نہیں مل سکتے؛ یہ اپنے آپ کو کسی اور شے پر جما نہیں سکتی، جو زیادہ ڈراونی، زیادہ پیچیدہ، زیادہ پُراسرار اور زیادہ غیر محدود ہو۔ سمندر سے زیادہ شان دار ایک نظارہ ہوتا ہے؛ وہ جنت ہے: جنت سے بھی زیادہ شان دار ایک نظارہ ہے، وہ نفس کے اندرون ترین کے ورقنے ہیں۔

انسان کے ضمیر کی تنظیم کرنا، خواہ وہ صرف ایک فرد واحد کے حوالے سے ہو یا آدمیوں کی عمیق ترین بنیادوں سے متعلق ہو، تمام رزمیوں کو ایک بالادست اور فیصلہ کُن رزمیے میں یک جان کر دینا ہوتا ہے۔ ضمیر عجیب الخلقت توہمات کی؛ ہوائے نفس کی؛ اور تحریصات کی اتھری؛ خوابوں کی بھٹی اور ایسے خیالات کی آرام گاہ ہوتا ہے ہم جن سے شرمندہ ہوتے ہیں؛ یہ سوفسطائیت کی افراتفری ہوتا ہے؛ جوش و جذبے کا میدان کارزار ہوتا ہے۔ انسان کے کبود چہروں سے گزرتے ہوئے جو فکر میں مشغول ہوں، مخصوص اوقات میں اس میں داخل ہو جایئے، اس کے نفس میں اور اس کے ابہام میں گھور کر دیکھیے۔ وہاں، اس بیرونی خاموشی کے نیچے، دیوؤں کی لڑائیاں جاری ہوتی ہیں جیسی ہومر میں ملتی ہیں، اژدہوں کی، مار صد سر کی اور واہمی اشکال کے ہجوم کی چھیڑ چھاڑ ملے گی جیسی ملٹن میں تھی؛ بصری دائرے نظر آئیں گے جیسے دانتے میں تھے۔ کیسی بے لطف شے

ہے یہ لامحدودیت بھی ہر انسان جو اپنے اندر رکھتا ہے، جس کی پیائش کرتا ہے، مایوسی سے، اپنے ذہن کے وسوسوں سے اور اپنی زندگی کے اعمال سے۔

Alighieri ایک دن ایک بدشگون والے دروازے پر تھا، جس کے سامنے وہ ہچکچایا تھا۔ اب ایک اور دروازہ ہمارے سامنے ہے، جس کی دہلیز پر ہم ہچکچا رہے ہیں۔ پھر بھی، آیئے ہم اس میں داخل ہو کر دیکھتے ہیں۔

ہمارے پاس مزید کچھ بتانے کے لیے نہیں ہے، کہ قاری کو خود معلوم ہے کہ ننھے جروے کے واقعے کے بعد ژاں ولجاں پر کیا گزری تھی۔ اس واقعے کے بعد، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ مکمل طور پر ایک مختلف انسان بن گیا تھا۔ کہ اس نے وہی کچھ کیا جو بشپ اسے بنانا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا وہ قلبِ ماہیت سے زیادہ تھا؛ وہ تبدیلیِ شکل کی کیفیت تھی۔

وہ غائب ہونے میں کامیاب ہو گیا، بشپ کا نقرئی مال فروخت کر دیا، یادگار کے طور پر صرف دو شمع دان رکھ لیے؛ ایک شہر سے دوسرے شہر رینگتا پھرا؛ فرانس کو عبور کیا، M. sur M پہنچا، اس کے بارے میں سوچا ہم جس کا تذکرہ کر چکے ہیں؛ وہ حاصل کیا ہم نے جو چاہا تھا؛ اپنے آپ کو گرفت سے محفوظ کیا؛ اس کے بعد خود کو M. sur M میں قائم کیا؛ ضمیر کو افسردہ کر دینے والے ماضی، اور اپنی زندگی کے اس نصف کو بھلا دیا؛ اور پُر امیدی اور اطمینان سے رہنے لگا۔ اس کے بعد اسے صرف دو مسئلے درپیش تھے — اپنا نام چھپانا اور اپنی زندگی کو ماضی کی آلائشوں سے پاک کرنا؛ آدمیوں سے فرار ہونا اور خدا کی طرف متوجہ ہونا۔

یہ دو خیالات اس کے دماغ میں اس طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے، کہ دونوں مل کر ایک ہو گئے تھے؛ دونوں یکساں طور پر جذب کر لینے والے تھے، ناگزیر تھے اور اس کے معمولی سے معمولی اعمال پر حکمرانی کرتے تھے، یعنی وہ اس کی زندگی گزارنے کے طریقے کو چلانے کی سازش کرتے تھے؛ انھوں نے اس کو داہنی کی طرف موڑ دیا تھا؛ انھوں نے اس کو مہربان اور سادہ کر دیا تھا؛ اور اس کو انھی چیزوں کے طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر کبھی کبھی وہ آپس میں متصادم بھی ہو جاتے تھے۔ اس سلسلے میں، جیسا کے قاری کو یاد ہو گا، اس آدمی نے جسے سارا M sur M موسیو میڈلین کہتا تھا، اپنے اول کو اپنے ثانی پر — اپنے تحفظ کو اپنی نیکی پر — قربان کرنے میں بالکل تامل نہیں کیا تھا۔ اس طرح، باوجود تمام احتیاط اور ہوش مندی کے، اس نے بشپ کے شمع دانوں کو محفوظ رکھا، اس کا غم کیا، Savoy کے اُن تمام بچوں کو، جو اس شام اس راستے سے گزرے تھے، طلب کیا اور تفتیش کی۔ Faverolles کے تمام خاندانوں کے کوائف

اکٹھا کیے، اور جاویر کے پریشان کر دینے والے اشاروں کے باوجود بوڑھے گاڑی بان فوشلووں کی جان بچائی۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا اس نے ان عقل مند، مقدس اور منصف لوگوں کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے طے کر لیا تھا کہ اب اس کا اولین فرض صرف اس کے اپنے لیے نہیں تھا۔

ساتھ ہی اس کا اعتراف بھی کیا جانا چاہیے کہ ابھی تک، ایسی کوئی بات ہوئی بھی نہیں تھی۔

کبھی یہ دو خیالات جو اس بدقسمت انسان پر حکمرانی کر رہے تھے، ہم جس کے دکھوں کو بیان کر رہے ہیں، ایک سنجیدہ قسم کی جد و جہد میں الجھے ہوئے تھے۔ پہلے چند الفاظ سنتے ہی، جو جاویر نے اس کے مطالعے کے کمرے میں داخل ہوتے وقت ادا کیے تھے، وہ سب کچھ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس وقت، جب وہ نام جسے اس نے اتنی تہوں کے نیچے دفن کر دیا تھا، اتنی چابک دستی سے اکھاڑا گیا تھا کہ اس پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، گویا وہ اپنے مقسوم کی کسی نامبارک بے قاعدگی سے مدہوش ہو گیا ہو، اور اس مدہوشی کے ذریعے اسے ویسی کپکپی محسوس ہو رہی تھی جیسی آنے والے زلزلے کے جھٹکوں سے پہلے محسوس ہوا کرتی ہے۔ وہ کسی شاہ بلوط کے درخت کی طرح، طوفان کی آمد پر، اس طرح جھک گیا تھا جیسے حملے کی آمد سے پہلے کوئی سپاہی جھک جایا کرتا ہے۔ اس کو اپنے سر پر گرج چمک سے بھرے سایے اُترتے محسوس ہوئے۔ جاویر کو سنتے ہوئے، پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا تھا: بھاگ جاؤ! اپنے آپ پر ملامت کرو! شامپ ماتیو کو قید سے نکال کر اس کی جگہ خود قید ہو جاؤ؛ یہ خیال اتنا ہی دردانگیز، اتنا ہی دل خراش تھا جیسے کسی زندہ گوشت میں چاک کا لگنا۔ پھر ایک جھماکے کی طرح وہ خیال گزر گیا، اور اس نے اپنے آپ سے کہا تھا، ”اچھا، دیکھیں گے! اچھا، دیکھیں گے!“ اس نے اپنی پہلی فیاض جبلت کو کچل دیا اور جاں بازی کے سامنے پسپا ہو گیا۔

بلاشبہ یہ بہت اچھا ہوا تھا۔ بشپ کے مقدس الفاظ کے بعد، اتنے برسوں کی ندامت اور دست برداری کے بعد؛ شروع کیے جانے والے استغفار کے درمیان، اگر یہ آدمی ایک لمحے کے لیے پسپا نہیں ہوتا، اتنے ہول ناک احتمال کی موجودگی میں، اور اس کھڑی چٹان کی طرف بڑھتا رہتا، جس کے نیچے جنت تھی تو بہت اچھا ہوتا؛ مگر ایسا ہوا نہیں۔ ہمیں وہ کیفیت بیان کرنی چاہیے جو اس نفس پر گزر رہی تھی اور ہم وہی کچھ کہہ سکتے ہیں جو وہاں ہو رہا تھا۔ پہلے تو حفظِ ما تقدم کے طور پر وہ پریشان سا ہو گیا تھا؛ بعد میں اس نے اپنے حواس مجتمع کیے، اپنے جذبات کو ٹھنڈا کیا، جاویر کی موجودگی کا خیال کیا جو ایک بڑا خطرہ تھا؛ ہر قسم کے فیصلے کو موخر کیا؛ اس خیال سے باز آیا کہ اسے

کچھ کرنا چاہیے؛ اور اپنے ذہنی سکون کو اس طرح سنبھالا جیسے کوئی جنگجو اپنی ڈھال اُٹھا لیتا ہے۔

اس دن کا بقیہ وقت اسی کیفیت میں گزرا: اندر بگولا تھا، اور باہر گہری خاموشی تھی۔ اس نے، بقول شخصے، کوئی تحفظاتی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے دماغ میں سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا تھا۔ اس کی مشکل اتنی بڑی تھی کہ وہ کسی ایک موضوع پر اپنی توجہ مرکز نہیں کر پا رہا تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی بتا نہیں سکتا تھا سوائے اس کے کہ اسے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔

اپنے معمول کے مطابق فانتیں کے بستر کے قریب گیا، اپنی ملاقات طویل کی؛ اپنی مہربان جبلت کے ذریعے خود سے کہتے ہوئے کہ اسے اس طرح پیش آنا چاہیے راہبہ نرسوں سے فانتیں کی اچھی طرح سفارش کی، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اسے کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جانا پڑ جائے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے Arras جانا پڑے گا؛ اور اس نے دنیا کی پروا کیے بغیر اس سفر کا مصمم ارادہ کر لیا تو اس نے خود سے کہا تھا کہ چوں کہ وہ تمام شبہات سے بالاتر ہے، جو کچھ ہونے والا تھا اس کا شاہد بننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے؛ اس نے ہر طرح کے حالات کے مقابلے کے لیے تیار رہنے کے لیے کرایے پر سکافلیر سے گاڑی لے لی۔

اس نے جی بھر کے رات کا کھانا کھایا۔

اپنے کمرے میں واپسی پر اس نے اپنے آپ سے کچھ باتیں کیں۔

اس نے حالات کا بغور مطالعہ کیا اور ان کو غیر معمولی پایا؛ اس قدر غیر معمولی کہ سوچ بچار کے دوران اچانک اپنی کرسی سے اٹھا، اور کسی ناقابلِ تشریح تشویش کے باعث اس نے اپنے دروازے کی چٹخنی چڑھا لی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ اور بھی اس کمرے میں داخل ہو جائے۔ وہ امکانات کے پیشِ نظر اپنی مورچہ بندی کر رہا تھا۔

ایک لمحے بعد اس نے روشنی گل کر دی؛ روشنی اسے پریشان کر رہی تھی۔

اسے محسوس ہوا گویا کوئی اس دیکھ رہا ہے۔

مگر، کون؟

افسوس! جس کے خوف سے اس نے دروازہ بند کیا تھا، وہ داخل ہو چکا تھا؛ جسے وہ کور چشم جانتا تھا، وہی اسے گھور رہا تھا — اس کا ضمیر!

اس کا ضمیر؛ یعنی، خدا۔

پھر بھی، پہلے اس نے اپنے آپ کو دھوکا دیا؛ اسے اپنے تحفظ اور اپنی تنہائی کا احساس تھا؛ چٹخنی چڑھی ہونے کے باوجود وہ خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھ رہا تھا؛ شمع گل ہوئی تو اسے اپنے مخفی

ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے ہوش وحواس درست کیے؛ اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں؛ ان پر اپنا سر رکھا اور اندھیرے میں مراقبہ کرنے لگا۔

"میری کیا کیفیت ہے؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے کیا سنا ہے؟ کیا واقعی یہ سچ ہے کہ میں نے جاوید کو دیکھا ہے؛ اور اس نے مجھ سے اس انداز میں بات کی ہے؟ وہ شام پہ مات تو کون ہو سکتا ہے؟ اچھا تو وہ مجھ مشابہ بھی ہے! کیا یہ سب ممکن ہے؟ کل جب میں غور کر رہا تھا، کتنا آسودہ تھا؛ کسی قسم کے شبہے سے بہت دور تھا کل، اسی وقت میں کیا کر رہا تھا؟ اس ماجرے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا۔ کیا جانا چاہیے؟

یہ تھا وہ عذاب جس میں اس نے خود کو پایا۔ اس کے دماغ میں خیالات مجتمع کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی؛ خیالات لہروں کی طرح گزرتے جا رہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی تھامے انھیں گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے سر میں جلن ہو رہی تھی؛ وہ کھڑکی کے قریب گیا اور دونوں پٹ کھول دیے۔ آسمان میں ایک بھی ستارہ نہیں تھا۔ واپس آ کر اپنی کرسی میں بیٹھ گیا۔

اسی کیفیت میں ایک گھنٹا گزر گیا۔

آہستہ آہستہ مراقبے میں طرح طرح کے خطوط ابھرنے لگے؛ اور اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں — پوری حقیقت کی نہیں، بس کچھ تفصیلات۔ اس کو احساس ہو چلا تھا کہ کیفیات کچھ بھی ہوں، تشویش ناک یا غیر معمولی، حالات پوری طرح اس کے قابو میں تھے۔

اس کی خمار کی سی کیفیت میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ مذہبی اور دوسرے اہم مقاصد سے پرے جن پر وہ اپنا وقت صرف کرتا تھا، اس دن تک جو کچھ اس نے کیا تھا صرف اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے کیا تھا۔ اپنی خود کلامی اور جاگتی راتوں کے درمیان اس پر خوف طاری رہتا تھا کہ کہیں وہ نام پھر سنائی نہ دے جائے؛ وہ خود سے کہتا تھا کہ اگر کبھی ایسا ہوا تو اس کے لیے وہ آخری دن ہوگا؛ جس دن وہ نام دوبارہ ظاہر ہو گیا، اس کی موجودہ زندگی غائب ہو جائے گی اور کون جانے، شاید اس کا یہ نیا اندرون بھی تحلیل ہو جائے گا۔ بے شک، ایسے موقعے پر اگر کوئی اس سے کہتا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب یہ نام اس کے کانوں میں بجے گا، جب اچانک اندھیرے سے اس کے سامنے دو لفظ، ژاں ولژاں، ظہور کریں گے اور اس کے سامنے آ کھڑے ہوں؛ جب وہ ہیبت ناک روشنی اس راز کو برباد کر دینے کے قابل ہو جائے گی جس میں اس نے خود کو چھپا رکھا ہے اور اچانک اس کے سر پر لہرانے لگے گی اور وہ نام اس کے لیے خطرہ نہیں رہ

جائے گا؛ کہ جب وہ روشنی مزید گہری دھند پیدا کرے گی؛ کہ یہ کرایے کی نقاب اس معمے کو اور پیچیدہ کر دے گی؛ کہ یہ زلزلہ اس عمارت کو اور مستحکم بنا دے گا؛ کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے، اس غیر معمولی ماجرے کا کوئی اور نتیجہ نہیں نکلے گا؛ اور اگر ایسا ہوا تو اسے اپنے وجود کو زیادہ صاف اور زیادہ ناقابلِ تسخیر بنا دینے کے بجائے اس کو اچھا محسوس ہوگا، اور خیالی ژاں ولژاں سے اس کے مقابلے سے ایک زیادہ اچھا اور قابلِ قدر باشندہ موسیو میڈلین، زیادہ باعزت، زیادہ پُرامن، اور ہمیشہ سے زیادہ محترم ہو کر ابھرے گا — اور اگر پہلے کسی نے اس سے یہ سب کہا ہوتا تو اس نے اپنا سر جھٹک دیا ہوتا؛ اس کے الفاظ کو ایک پاگل انسان کی بڑ سمجھ کر رد کر دیتا۔ اور اب، بالکل یہی ہونے والا تھا؛ ان سارے امکانات کا مجتمع ہونا ایک حقیقت تھی اور ان خودسر و بے بنیاد خیالوں کو حقیقت بننے کی اجازت مل گئی تھی۔

اس کی خیالی کیفیت زیادہ صاف ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنی حیثیت کا زیادہ سے زیادہ ادراک ہو چلا تھا۔

اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ایک ناقابلِ بیان خواب سے جاگا ہے اور آدھی رات کے وقت کسی ڈھلان پر سرکتا، کپکپاتا، پاتال کے کنارے کھڑا اپنے آپ کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک اجنبی کا تصور کر رہا تھا؛ ایک نامعلوم آدمی کا، مقسوم نے غلطی سے جسے اس کی جگہ سمجھ لیا تھا، اور جسے وہ خلیج میں دھکیل رہی تھی؛ تاکہ وہ خلیج ایک بار پھر بند ہو جائے؛ ضروری تھا کہ وہ خود یا وہ دوسرا آدمی اس خلیج میں گر جائے؛ اس نے حالات کو اپنا راستہ بنانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

روشنی مکمل ہو گئی، اور اس نے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ کیلیر میں جگہ خالی ہے؛ کہ خواہ وہ کچھ بھی کرتا، باورچی خانہ اس کے انتظار میں تھا؛ کہ ننھے جروے سے کی جانے والی چوری اسے واپس وہیں لے جا رہی تھی؛ کہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ اس کا انتظار کرے گی اور اس کو اپنی طرف کھینچتی رہے گی جب تک کہ وہ اس جگہ کو بھر نہیں دیتا؛ کہ یہ ہونا ناگزیر اور مہلک ہے؛ اور پھر اس نے خود سے کہا تھا، ”کہ اس لمحے تو اس کا نعم البدل موجود ہے؛ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کسی شامپ ماٹ ٹو کی خوش قسمتی تھی؛ اور جہاں تک اس کا اپنا معاملہ تھا، وہ کیلیر میں اس شخص شامپ ماٹ ٹو کے نام سے اور سماج میں موسیو میڈلین کے نام سے موجود تھا۔ اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی اگر وہ لوگوں کو شامپ ماٹ ٹو کے ماتھے پر لگے نشانِ رسوائی پر مہر صداقت ثبت کرنے سے روک نہیں دیتا، جو کسی سنگِ مزار کی طرح کبھی نہ اٹھنے کے لیے ایک بار گرتا ضرور ہے۔“

یہ سب کچھ اتنا حیرت انگیز اور شدید تھا کہ اچانک اس میں وہ ناقابل بیان حرکت ہوئی جیسی کوئی شخص اپنی زندگی میں صرف دو یا تین بار ہی محسوس کرتا ہے، ایک قسم کا تشنج ضمیر کا جو دل کی تمام شکایات کو ابھار دیتا ہے؛ جو ستم ظریفی؛ مسرت اور مایوسی سے تیار ہوتا ہے؛ جسے قہقہے کا اندرونی طوفان کہا جا سکتا ہے۔

اس نے جلدی سے اپنی شمع روشن کر دی۔

"اچھا، تو اب کیا ہوگا؟" اس نے خود سے کہا۔ "میں خوف زدہ کس بات سے ہوں؟ اس میں میرے سوچنے کی کون سی بات ہے؟ میں محفوظ ہوں؛ بس اتنا کافی ہے۔ میرا بس ایک ہی دروازہ ہے، وہ بھی نیم وا، جس کے ذریعے میرا ماضی میری زندگی پر حملہ آور ہو سکتا تھا؛ اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کروا دو! وہ جاویر، جو مجھے اتنے عرصے سے پریشان کر رہا تھا؛ وہ خوفناک جبلت جو مجھے غیب کی باتیں بتاتی تھی؛ جس نے مجھے غیب کی باتیں بتائی تھیں— خدایا!— جو ہر جگہ میرا پیچھا کرتی رہتی تھی؛ اور وہ خوفناک شکاری کتا، جو ہمیشہ میری طرف اشارہ کرتا تھا، اب گم راہ کر دیا گیا ہے؛ کسی اور جگہ مصروف ہو گیا ہے؛ تلاش کے راستے سے بالکل ہٹا دیا گیا ہے: اب وہ مطمئن ہو گیا ہے؛ وہ مجھے سکون سے رہنے دے گا! اسے اس کا ژاں ویلژاں مل گیا ہے۔ کون جانے؟ یہ بھی ممکن ہے کہ شاید وہ شہر ہی چھوڑ جائے۔ یہ سب کچھ میری کسی قسم کی مدد کے بغیر ہوا ہے، اور میں اس میں سے کچھ اپنانا نہیں چاہتا! اوہ! اگر اس میں بدقسمتی کہاں سے آ جاتی ہے؟ میری عزت کی بنا پر لوگ مجھ سے ملنا چاہیں گے، یہ دیکھنے کے لیے کہ مجھ پر کوئی آفت آ گئی ہے، اور اگر مجھے اس سے کچھ نقصان پہنچ جاتا ہے تو اس میں کسی طرح بھی میری غلطی نہیں؛ یہ مآل اندیشی ہے، جس نے یہ سب کیا ہے؛ ظاہر ہے کہ وہ یہی چاہتی ہے۔ کیا جو کچھ ترتیب دیا جا چکا ہے مجھے اس کو بے ترتیب کرنے کا حق ہے؟ آخر میں چاہتا کیا ہوں؟ میں کیوں دخل اندازی کروں؟ یہ میرا معاملہ نہیں ہے؛ کیا میں مطمئن نہیں ہوں؟ مگر میں اور کیا چاہتا ہوں؟ میں اتنے برسوں سے جس ہدف کا متمنائی رہا ہوں، میری راتوں کے خواب، جنت جانے کی میری دعاؤں کا منشا— تحفظ— اب مجھے مل گیا ہے؛ خدا یہی چاہتا ہے؛ میں خدا کی خواہش کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا، اور خدا یہ چاہتا کیوں ہے؟ تاکہ میں نے جو کچھ شروع کیا ہے اسے جاری رکھوں؛ کہ میں اچھے کام کروں؛ کہ میں ایک دن عالی شان اور ہمت افزا مثال بن جاؤں؛ کہ بالآخر یہ کہا جائے کہ میری توبہ میں تھوڑی سی خوش قسمتی بھی شامل تھی، اور اس نیکی میں بھی تھی، میں جس کی طرف واپس ہوا ہوں۔ واقعی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس پیارے پادری کے گھر میں داخل ہونے

اور اس سے مشورہ مانگنے میں خوف زدہ کیوں ہوا تھا؛ بظاہر، وہ مجھ سے یہی کہتا: سب کچھ طے ہو چکا ہے؛ ہونے دو جو کچھ ہوتا ہے؛ جو خدا چاہے گا وہی ہوگا۔

اس طرح وہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں اپنے آپ سے مخاطب ہوا تھا؛ اپنی کرسی سے اٹھا اور کمرے میں چلنے لگا: ''چلو'' اس نے کہا، ''اس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے؛ میں نے طے کر لیا ہے!'' مگر اسے خوشی نہیں ہو رہی تھی۔

معاملہ بالکل برعکس تھا۔

آپ اپنے خیال کو کسی تصور کی طرف بار بار جانے سے روک نہیں سکتے، جس طرح سمندر کو ساحل تک واپس جانے سے روکا نہیں جا سکتا؛ ملاح اس کو جزر و مد کہتے ہیں؛ مجرم آدمی اس کو پشیمانی کہتا ہے؛ خدا نفس کو اسی طرح بلند کرتا ہے جیسے سمندر کو۔

چند لمحوں بعد، اس نے وہی کیا جو اسے کرنا تھا؛ اس نے وہ اداس گفتگو دوبارہ شروع کی جس میں وہی بولنے والا تھا اور وہی سننے والا۔ اور وہی کہہ رہا تھا جسے وہ نظر انداز کرنا پسند کرتا، اور وہی سن رہا تھا جسے سننا پسند نہ کرتا، اور اس پُر اسرار طاقت سے ہار مانتے ہوئے جس نے اس سے کہا تھا، ''سوچو'' جس طرح اس نے، ایک اور سزا یافتہ آدمی سے دو ہزار برس قبل کہا تھا، ''چل پڑو۔''

مزید کچھ کہنے سے قبل، تاکہ ہمیں پوری طرح سمجھا جا سکے، ہمیں ضروری مشاہدے پر اصرار کرنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ لوگ اپنے آپ سے بھی باتیں کرتے ہیں؛ ایسا کوئی آدمی نہیں جس نے اس طرح نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ لفظ کبھی زیادہ شاندار اسرار نہیں بن سکتا جب تک انسان کے خیال سے ضمیر تک اور ضمیر سے خیالات میں واپس نہیں آ جاتا؛ ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے کہ اس باب میں اکثر استعمال کیے گئے الفاظ کو اچھی طرح سمجھا جانا چاہیے؛ ہم اپنے آپ سے بات کرتے ہیں، بیرونی خاموشی کو توڑتے ہیں؛ اپنے آپ سے چیخ کر بات کرتے ہیں؛ اور پھر بڑے ہنگامے کا عالم ہوتا ہے؛ اور سوائے ہمارے منہ کے ہر شے ہمارے بارے میں بات کرنے لگتی ہے۔ نفس کی یا روح کی حقیقتیں اس لیے کم تر حقیقتیں نہیں ہوتیں کہ وہ نظر آتی نہیں آتیں نہ ان کو چھوا جا سکتا ہے۔

اس لیے اس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ اس کیا حیثیت ہے۔ اس نے اپنے آپ سے اس ''طے شدہ قصد'' پر بھی جرح کی تھی۔ اس نے خود سے اعتراف کیا تھا کہ وہ سب جو اس نے ابھی اپنے ذہن میں ترتیب دیا ہے، وحشت انگیز تھا، کہ ''ہونے دو جو کچھ ہوتا ہے؛ جو خدا

چاہے گا وہی ہوگا!" سادہ لفظوں میں یہ بہت خطرناک بات ہے: کہ معصوم کی اس غلطی کو، اور آدمیوں کی غلطی کو ہونے دینا؛ اس بارے میں کچھ نہ کرنا؛ اس کی مزاحمت نہ کرنا؛ خاموشی سے خود کو اس کے حوالے کر دینا، المختصر، سب کچھ گرانے کے برابر تھا کہ یہ کمترین درجے کی منافقانہ ذلالت تھی، کہ یہ بنیادی پست ہمتی، قابلِ نفرت، فرومایہ، کریہہ جرم تھا۔

اس بدنصیب کو آٹھ برس میں پہلی بار شیطانی خیال اور شیطانی عمل کا تجربہ ہوا تھا۔

اس نے اسے نفرت سے اُگل دیا۔

وہ اپنے آپ سے سوال کرتا رہا۔ اس نے اپنے آپ سے سختی سے پوچھا، "کیا میرا مقصد پورا ہو گیا ہے؟" سے اس کی مراد کیا تھی۔ اس نے خود اعلان کیا تھا کہ اس کی زندگی کا واقعی ایک مقصد تھا: کیا مقصد تھا؟ اپنے نام کو پوشیدہ رکھنا؟ پولیس کو دھوکا دینا؟ کیا وہ اتنی اچھی شے تھی جس کے لیے اس کو وہ کچھ کرنا پڑا جو اس نے کیا تھا؟ کیا اس کا کوئی اور بڑا مقصد بھی تھا جو اصل مقصد تھا؛ بچانا، اپنی شخصیت کو نہیں بلکہ اپنے نفس کو؛ ایک بار پھر ایمان دار اور اچھا آدمی بننا؛ ایمان دار آدمی بننا؟ کیا اس نے ہمیشہ یہ خواہش نہیں کی تھی، بشپ نے بھی جس کی تاکید کی تھی کہ اس کو اپنے ماضی کے دروازے کو بند کر دینا چاہیے؟ مگر وہ بند نہیں کر رہا تھا۔ میرے خدا! وہ ایک بدنامِ زمانہ کام کر کے اس کو دوبارہ کھول رہا تھا۔ وہ پھر چور بن رہا تھا، اور وہ بھی چوروں میں سب سے زیادہ نفرت انگیز چور! وہ کسی اور کو اس کے وجود، اس کی زندگی؛ اس کے امن اور سورج کی روشنی میں اس کے مقام پر ڈاکا مار رہا تھا۔ وہ قاتل بن رہا تھا۔ وہ ایک بدنصیب شخص کا قتل کر رہا تھا، اخلاقی قتل۔ اس پر وہ خوف ناک موت مسلط کر رہا تھا؛ کھلے آسمان تلے وہ موت دے رہا تھا جس کو کیلیر کہا جاتا ہے۔ دوسری جانب، اس آدمی کو بچانے کے لیے خود کو حوالے کر رہا تھا؛ ایسی غمگین غلطی سے؛ اپنا اصل نام دوبارہ اختیار کر کے؛ فرض نہ ہونے کے باوجود سزا یافتہ ژاں ولژاں بن کے، جو واقعی وہ تھا، دوبارہ اپنی زندگی حاصل کرنے کے لیے اور ہمیشہ کے لیے اس جہنم کو بند کر کے جہاں سے ابھی نکلا ہے؛ کہ اس صورت میں ظاہر ہو کر واپس ہونا دراصل حقیقت سے فرار ہوا تھا۔ کیا جانا چاہیے؟ اگر یہ نہیں کرتا تو گویا اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا؛ اس کی پوری زندگی بے مقصد تھی؛ اس کا سارا استغفار ضائع ہو گیا تھا۔ پھر "اس کا فائدہ کیا ہے؟" کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کو محسوس ہوا کہ بشپ وہاں موجود تھا؛ بشپ وہاں موجود تھا اس لیے اور بھی کہ وہ مر چکا تھا؛ گویا بشپ کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں؛ کہ اب کے بعد سے میئر میڈلین، اپنی تمام نیکیوں کے ساتھ اس کے نزدیک قابلِ نفرت ہوگا اور اس کی نظروں میں سزا یافتہ ژاں ولژاں

پاک صاف اور قابل تعریف ہوگا؛ کہ لوگوں نے اس کی نقاب دیکھی تھی، مگر بشپ نے اس کا چہرہ دیکھا تھا؛ کہ لوگوں نے اس کی زندگی دیکھی تھی مگر بشپ نے اس کا ضمیر دیکھا تھا۔ اس لیے اس کو Arras جانا چاہیے، نقلی ژاں ولژاں کو آزاد کرنا چاہیے، اور اصلی ژاں ولژاں کی مذمت کرنی چاہیے۔ افسوس کہ وہ تمام قربانیوں میں سب سے بڑی قربانی تھی؛ تمام فتوحات میں سب سے زیادہ دل خراش فتح تھی؛ وہ آخری قدم تھا؛ مگر اٹھایا جانا چاہیے تھا۔ افسوس اس کی قسمت پر کہ وہ خدا کی نظر میں تقدس میں صرف اس وقت داخل ہوگی جب وہ لوگوں کی نظروں میں رسوا ہو جائے گا۔

''اچھا'' اس نے کہا ''ہمیں اس کا فیصلہ کرنا چاہیے؛ ہمیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں اس آدمی کو بچانا چاہیے۔'' اس نے یہ الفاظ زور سے ادا کیے۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ زور سے بول رہا تھا۔

وہ اپنی کتابیں لے گیا؛ ان کی جانچ پڑتال کی، اور ان کو قاعدے سے رکھ دیا۔ اس نے بلوں کا بنڈل آگ میں پھینک دیا جو چھوٹے موٹے اور شرمندہ تاجروں پر واجب الادا تھا۔ ایک خط لکھا، اس پر مہر لگائی اور لفافے پر لکھا تھا: بنام موسیو لافیت (Laffitte)، بینکار، Rue d'Artois، پیرس۔ اپنی دراز سے ایک جیبی کتاب نکالی جس میں کئی بینک نوٹ تھے اور ایک پاسپورٹ تھا جسے اس نے اسی سال استعمال کیا تھا جب انتخابات میں حصہ لیا تھا۔

جس کسی نے اسے یہ سارے مختلف قسم کے کام کرتے دیکھا ہو، جن پر وہ بہت سوچ سمجھ عمل کر رہا تھا، اُسے اس بات پر کوئی شبہ نہیں ہوتا کہ اس کے اندرون میں کیا ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی صرف اس کے لب حرکت کرتے؛ کبھی وہ اپنا سر اٹھاتا اور دیوار پر کسی جگہ اپنی نظریں گاڑ دیتا، گویا اس جگہ پر کوئی چیز تھی وہ جس کو واضح کرنا یا اس پر تفتیش کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ موسیو لافیت کے نام خط مکمل کر چکا تھا، اسے جیبی کتاب کے ساتھ اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور ایک بار پھر اپنی چہل قدمی شروع کر دی تھی۔

اس کی توجہ اس کے مقصد سے ہٹی نہیں تھی۔ وہ اپنے فرائض کو، روشن لفظوں میں لکھا، واضح طور پر دیکھ سکتا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے شمع کی لَو کی صورت لہرا رہے تھے، اور جب ان کی جگہ بدل جاتی تو وہ اپنی نظر کی سمت بھی بدل لیتا تھا۔

''جاؤ! اپنا نام بتاؤ! اپنی مذمت کرو!''

اس نے دیکھا اس طرح، گویا وہ اس کے سامنے سے کسی نظر آنے والی شکل میں گزر گئے تھے، وہ دونوں تصورات جنھوں نے، اس وقت تک اس کے نفس کے دوہرے کردار تشکیل کر

لیے تھے — نام کو اخفا میں رکھنا، اپنی زندگی کی تقدیس کرنا۔ پہلی بار وہ اس کے سامنے مکمل طور پر واضح ہوئے تھے، اور اسے فاصلے کا احساس ہو گیا تھا جو اُن کو الگ کر رہا تھا۔ اسے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ ان تصورات میں سے ایک یقینی طور پر اچھا تھا، جب کہ دوسرے تصورات خراب ہو سکتے تھے؛ کہ پہلا تصور ایثارِ ذات تھا، اور دوسرا شخصیت تھا؛ ایک نے کہا، میرا ہم سایہ؛ دوسرے نے کہا، میں خود؛ ایک روشنی سے باہر آیا؛ دوسرا اندھیرے سے نکلا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں خیالات میں سے ایک، ضروری طور پر، اچھا تھا جب کہ دوسرا خراب ہو سکتا تھا؛ کہ پہلا ایثارِ ذات تھا اور دوسرا شخصیت تھا۔

وہ تصورات معاندانہ تھے۔ اس نے انھیں تنازعے کے طور پر دیکھا تھا۔ جس تناسب سے اس نے مراقبہ کیا تھا اسی تناسب سے وہ اس کی آنکھوں کے سامنے بڑھتے تھے۔ اب اُنھوں نے دیوہیکل صورت اختیار کر لی تھی، اور اسے ایسا محسوس ہوا تھا گویا اس کے نقوش ان کے اندر موجود تھے، اسی لا متناہیت کے ساتھ جس کے بارے میں ہم حال ہی میں بات کر رہے تھے، اندھیروں اور روشنیوں کے درمیان، جس میں دیوی اور دیو مقابل تھے۔

وہ خوف سے معمور تھا؛ مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اچھا خیال بھاری ہو رہا تھا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقسوم اور اپنے ضمیر کے دوسرے فیصلہ کن بحران کے کنارے پر تھا؛ کہ بشپ نے اس کی پہلی زندگی پر نشان ثبت کیے تھے، کہ دوسرے نشانات شامپ ماتئو کے تھے۔ گویا بڑے بحران کے بعد بڑا امتحان درپیش تھا۔

مگر وہ حرارت جو ایک لمحے کے لیے کم ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ اس پر چھاتی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ہزاروں خیالات موج زن تھے، مگر اس کے عزم کو مستحکم کر رہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے اس نے خود سے کہا تھا کہ شاید وہ معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے لے رہا تھا؛ کہ بہر حال یہ شامپ ماتئو دل چسپی کا باعث نہیں تھا، کہ واقعی اس نے چوری کی تھی۔

اس نے خود ہی جواب دیا، ''اگر واقعی اس آدمی نے، کچھ سیب چرا لیے تھے، تو اس کا مطلب تھا ایک ماہ کی قید۔ اور کون جانے؟ واقعی چرایا بھی تھا کہ نہیں؟ کیا چوری ثابت ہوئی تھی؟ ژاں ولژاں کا نام اس پر طاری ہو جاتا ہے، اور ثبوت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ کیا سرکاری وکیل بھی ہمیشہ اسی طرح آگے نہیں بڑھتے ہیں؟ اسے چور سمجھا جا رہا ہے، اس لیے کہ وہ ایک سزا یافتہ شخص تھا۔''

دوسرے لمحے، جب اس نے خود اپنی مذمت کی تھی، اسے ایسا ہی خیال آیا تھا کہ شاید

سات برس کی اس کی ایمان دارانہ زندگی، اور اپنے علاقے کے لیے جو کچھ اس نے کیا تھا، اور ان کاموں کے درمیان جو بہادری اس نے دکھائی تھی اسے قابلِ اعتنا سمجھا جاتا اور اس کے باعث اس سلسلے میں شاید وہ اس پر رحم کھاتے۔

مگر یہ قیاس بہت تیزی سے غائب ہوگیا، اور وہ تلخی سے مسکرا دیا تھا جب اسے یاد آیا کہ ننھے بجروے کے چالیس سو کی چوری کے الزام نے اسے سزا کے بعد دوسرے جرم کا گنہگار بنا دیا تھا؛ کہ ایک دن یہ ماجرا ضرور چھڑے گا، اور قانون کے الفاظ کے مطابق اسے زندگی بھر کی سزا کے لائق گردانا جائے گا۔

اس نے سارے التباسات کو ایک طرف رکھا؛ اپنے آپ کو زمین سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا، اور کہیں اور سے طاقت اور تشفی تلاش کی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اس کو اپنا فرض ضرور انجام دینا چاہیے؛ کہ فرض انجام دینے کے بعد افسردہ ہونے کے بجائے اسے پہلو تہی کرنے پر شرمندہ ہونا چاہیے؛ اور اگر اس نے حالات کو اپنی نہج پر چھوڑ دیا؛ اگر وہ M. sur M میں ٹھہرا رہا، تو اس کا لحاظ؛ اس کی نیک نامی؛ اس کے اچھے کام؛ اس کو دیا جانے والا احترام اور تقدس؛ اس کی خیرات؛ اس کی دولت؛ اس کی شہرت؛ اس کی نیکی سب ایک جرم کے مسالے میں سان دیے جائیں گے۔ اور جب تمام متبرک اشیا اس بھیانک مسالے میں رَمی جائیں گی تو ان کا مزہ کیسا ہوگا۔ اور اگر اس نے اپنی جانب سے یہ قربانی دے دی، تو ایک اعلیٰ درجے کا سماوی خیال، گیلیز میں، ستون میں، گلو بند میں، ہری ٹوپی میں، کبھی نہ ختم ہونے والی مشقت میں، اور ناقابلِ رحم شرمندگی میں گھل مل جائے گا۔

وہ اپنے آپ سے کہتا رہا کہ ایسا ہی ہونا چاہیے؛ کہ اس کا مقسوم اسی طرح طے کر دیا گیا تھا؛ کہ اسے اوپر طے کیے گئے انتظامات میں تبدیلی کا اختیار نہیں تھا؛ کہ اسے ہر صورت میں اپنا انتخاب خود کرنا ہوگا: اندرونی نیکی کے بغیر اور اندرونی کراہت کے ساتھ، یا اندرونی تقدس کے ساتھ اور باہر سے ملنے والی بدنامی کے بغیر۔

اس قسم کے غم انگیز خیالات کی ہلچل اس کی ہمت کی ناکامی کا باعث نہیں ہوئی، مگر اس کے ذہن کو تھکا مارا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں سوچنے کے بجائے دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اس کی کنپٹیوں کی شریانیں شدت سے پھڑک رہی تھیں؛ اب بھی وہ آگے پیچھے چل رہا تھا؛ آدھی رات کی آمد کا گھنٹا بجا، پہلے پیرش گرجا گھر سے، اس کے بعد ٹاؤن ہال سے؛ اس

نے دونوں گھڑیوں کے بجائے گئے بارہ گھنٹے سنے، اور دونوں کی آوازوں کا موازنہ کیا؛ اس سلسلے میں اسے یاد آیا، کہ چند دن قبل اس نے ایک آہن فروش کی دکان پر ایک قدیم طرز کی گھڑی برائے فروخت دیکھی تھی، جس پر نام Antoine-Albin de Romainville لکھا تھا۔

اسے سردی لگ رہی تھی؛ اس نے آتش دان میں آگ جلائی مگر کھڑکی بند کرنے کا خیال نہیں آیا۔

اس دوران اس پر پھر مدہوشی طاری ہوگئی تھی؛ آدھی رات کے گھنٹے سے پہلے وہ کن خیالات میں غرق تھا، ان کو یاد کرنے میں کافی محنت کرنی پڑی تھی؛ بالآخر وہ کامیاب ہوگیا۔

"ارے، ہاں!" اس نے خود سے کہا "میں نے اپنے بارے میں اطلاع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

اور پھر، بالکل اچانک، اسے فانتینی کا خیال آیا۔

"مگر ٹھہرو" اس نے کہا "اس بےچاری عورت کا کیا حال ہوگا؟"

اب ایک تازہ بحران نے اپنا اعلان کردیا۔

اچانک فانتینی کے خیال نے ظاہر ہو کر اس کے ذہن میں ایک غیر متوقع روشنی کی کرن کا سا اثر پیدا کردیا تھا؛ اسے محسوس ہوا گویا اس کے اطراف کی ہر شے پہلو بدل رہی تھی: اس نے چلا کر کہا:

"ارے ہاں، مگر ابھی تک میں نے اپنے سوا کسی اور کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ میرے لیے اپنی زبان روکنا ضروری ہے یا اپنی مذمت کرنا؛ اپنی شخصیت کو چھپانا یا اپنے نفس کو بچانا؛ قابلِ حقارت مجسٹریٹ ہونا یا ایک بدنام اور قابلِ احترام سزا یافتہ؛ یہ میں ہوں، میں ہمیشہ سے یہی ہوں، اور صرف میں ہی ہوں؛ مگر میرے خدا! یہ سب خود فریبی ہے؛ یہ خود فریبی کی مختلف شکلیں ہیں، مگر یہ خود فریبی ہے اور کچھ نہیں۔ اور اگر میں کبھی دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگوں تو؟ سب سے بڑا تقدس دوسروں کے بارے میں سوچنا ہوتا ہے۔ آیئے ذرا ہم اپنا امتحان لیتے ہیں۔ استثنا شدہ 'میں'؛ مٹایا ہوا 'میں'؛ بھلایا ہوا 'میں': ان سب کا حاصل کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اگر میں خود اپنی مذمت کردوں؟ میں گرفتار ہو جاتا ہوں؛ شامپ ماتھیو رہا ہو جاتا ہے؛ میں دوبارہ گیلیز میں چلا جاتا ہوں؛ تو؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اوہ! یہ ایک ملک ہے؛ یہ ایک شہر ہے؛ یہاں کارخانے ہیں؛ ایک صنعتی کارخانہ ہے؛ کاریگر ہیں؛ مرد اور عورت دونوں؛ دادا ہیں؛ بچے ہیں؛ افلاس زدہ لوگ ہیں! یہ سب میں نے ہی بنائے ہیں؛ ان سب کو میں ہی روزی دیتا ہوں؛

ہر طرف ایک دھواں دیتی چمنی ہے؛ وہ میں ہوں جس کی ہر جلتے چولھے پر اور ہر ہانڈی میں پکتے ہوئے گوشت پر مہر ہے؛ میں نے سہولت دی ہے؛ گردش دی ہے؛ میں نے قرض دیے ہیں؛ مجھ سے پہلے یہاں کچھ نہیں تھا؛ میں نے شہر کو ترقی دی ہے؛ میں نے ان میں ولولہ پیدا کیا ہے؛ ان کو زندگی کا طریقہ بتایا ہے؛ بارور کیا ہے؛ میں نے انھیں جوش دلایا ہے؛ میں نے دیہات کو دولت مند بنایا ہے؛ میں نہیں تو نفس نہیں ہوگا؛ میں ہٹ جاؤں تو ہر شے مر جائے گی؛ اور یہ عورت بھی جس نے اتنے دکھ اٹھائے ہیں، جس میں زوال کے باوجود بہت صلاحیتیں ہیں، مر جائے گی؛ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان سب کے دکھوں کا بھی میں ہی ذمے دار ہوں۔ اور وہ بچی مجھے جس کی تلاش میں جانا تھا، جس کی ماں سے میں نے وعدہ کیا تھا؛ کیا میں اس عورت کا مقروض نہیں، اس کی برائی دور کرنے کا، جس کا میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ اگر میں غائب ہو جاؤں تو کیا ہوگا؟ ماں مر جائے گی؛ بچی جو ہو سکے گی بن جائے گی؛ بس یہی کچھ ہوگا، اگر میں اپنی مذمت کروں گا۔ اور اگر میں اپنی مذمت نہیں کرتا؟ تو آیئے اور دیکھیے کہ میں نے اپنی مذمت نہیں کی تو کیا ہوگا۔

خود سے یہ سوال کرنے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوا؛ وقتی تامل کا شکار ہوتا محسوس ہوا تھا؛ مگر یہ کیفیت زیادہ دیر باقی نہیں رہی، اور اس نے پُرسکون انداز میں جواب دیا:

یہ شخص گیلیر میں جانے والا ہے؛ یہ سچ ہے، مگر اس نے کیسی ٹکیا چرائی ہے! یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ یہ چوری کا مجرم نہیں تھا، اس لیے کہ اس نے چرایا ہے۔ میں یہیں رہتا ہوں: میں چلا جاتا ہوں: میں دس ملین کما لیتا ہوں؛ میں ان کو پورے ملک میں پھیلا دیتا ہوں؛ میرا کچھ نہیں رہ جاتا؛ میرے لیے یہ سب کیا ہے؟ یہ سب میں اپنے لیے نہیں کر رہا ہوں؛ سب کی ترقی ہوتی رہے گی؛ صنعتیں متحرک ہو جاتی ہیں، زیادہ فعال ہو جاتی ہیں؛ کارخانے اور دکانیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں؛ خاندان، سیکڑوں خاندان، ہزاروں خاندان خوش حال ہو جاتے ہیں؛ علاقے کی آبادی بڑھ جاتی ہے، جہاں پہلے صرف زرعی فارم ہوتے تھے وہاں نئے گاؤں بن جاتے ہیں، اور جہاں کچھ نہیں تھا وہاں فارم بن جاتے ہیں؛ بدنصیبی غائب ہو جاتی ہے، اور بدنصیب عیاشی کے ساتھ عصمت فروشی، چوری، قتل؛ تمام خرابیاں، تمام جرائم غائب ہو جاتے ہیں؛ اور وہ بدنصیب ماں اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے؛ اور پورا ملک دولت مند اور ایمان دار ہو جاتا ہے۔ اوہ، میں کتنا بیوقوف تھا؛ میں نامعقول تھا۔ کس کے لیے میں اپنی مذمت کرنا چاہتا تھا؟ واقعی مجھے غور کرنا چاہیے؛ مجھے کسی کام میں جلد باز نہیں ہونا چاہیے۔ کیا اس لیے کہ مجھے بڑے اور فیاضی کے کھیل نہیں کھیلنے چاہییں؛ یہ بہر حال ایک جذبات انگیز ناٹک ہے؛ اس لیے کہ مجھے اپنے علاوہ کسی کے

بارے میں سوچنا نہیں چاہیے تھا۔ سزا سے بچنے کا تصور، ذرا سا مبالغہ کرنا چاہیے تھا۔ شاید بالکل نیچے، کسی کو پتا نہیں ہوتا کون ہے، کوئی چور ہے، بظاہر ایک فضول سا آدمی ہے؛ کیا پورے وسیع علاقے کو تباہ ہو جانا چاہیے؟ بدنصیب عورت کو اسپتال میں مر جانا چاہیے، بدنصیب بچی کو سڑک پر مر جانا چاہیے؛ کتوں کی طرح؛ یہ کس قدر نفرت انگیز تصور ہے۔ اپنی بچی کو ایک بار دیکھے بغیر ماں، اور بچی اپنی ماں سے ملے بغیر؛ اور یہ سب ایک بدنصیب چور کی وجہ سے ہے، جو بلاشبہ، گیلیز کے لائق تھا، اگر اس کے لیے نہیں؛ تو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے لیے؛ بلاشبہ، جو ایک مجرم کو بچا لیتا ہے اور ایک معصوم کو قربان کر دیتا ہے۔ ایک اوباش کو بچا لیتا ہے جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ چند برسوں کی ہے؛ جو سا تبان کے بجائے گیلیز میں زیادہ خوش ہوگا؛ جو پوری آبادی کو، ماؤں کو، بیویوں کو بچوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ بے چاری کوزیٹ جس کا دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں، اور جو بلاشبہ، اس لمحے تنی آر دیے کی مانند میں سردی سے نیلی نہیں ہے؛ وہ بدمعاش لوگ ہیں؛ اور میں ان کے بارے میں اپنے فرائض سے لاپروا ہونے والا تھا، اور اپنی مذمت کرنے جا رہا تھا؛ اور میں وہ ناقابلِ بیان حماقت کرنے جا رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا خرابی ہوگی۔ فرض کر لیجیے کہ اس معاملے میں مجھ سے غلطی ہو جاتی ہے؛ میرا ضمیر ایک دن مجھے ملعون کرے گا، تا کہ میں دوسروں کی خاطر ان رسوائیوں کو قبول کر لوں جو صرف مجھ پر بھاری ہوں گی؛ یہ خراب عمل ہے جو صرف میرے نفس سے صلح کر لیتا ہے؛ اسی میں ایثارِ ذات کی کیفیت ہوتی ہے؛ اور صرف اسی میں نیکی ہوتی ہے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر ٹہلنا شروع کر دیا؛ اس بار وہ قانع معلوم ہو رہا تھا۔

ہیرے صرف زمین کی اندھیری جگہوں میں پائے جاتے ہیں؛ سچائیاں صرف خیالات کی گہرائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان گہرائیوں میں اترنے کے بعد، ان عمیق ترین پرچھائیوں میں ایک عرصے کی تلاش کے بعد، بالآخر اسے ایک ہیرا مل گیا تھا؛ ایک سچائی مل گئی تھی؛ اور اب وہ اسے اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا، اور جوں ہی اس پر نظر کی تو وہ چکا چوند ہو گیا تھا۔

"ہاں" اس نے سوچا، "یہ بالکل صحیح ہے؛ میں صحیح راستے پر ہوں؛ میرے پاس اس کا حل ہے؛ مجھے کچھ نہ کچھ قابو کر لینے کے بعد ہی معاملہ ختم کرنا چاہیے؛ میں تیار رہوں؛ جو ہونا ہے ہونے دو؛ مزید ڈگمگانا نہیں چاہیے؛ ماضی کی پروا نہیں کرنی چاہیے؛ یہ ہم سب کے مفاد میں ہے، صرف میرے لیے ہی نہیں؛ میں میڈیلین ہوں؛ اور میں میڈیلین ہی رہوں گا۔ افسوس اس آدمی پر جو ژاں ولژاں ہے۔ اب میں وہ نہیں؛ میں اس آدمی کو نہیں جانتا؛ اب مجھے کچھ معلوم نہیں؛ اسے خود تلاش کرنا چاہیے؛ اس سے مجھے سروکار نہیں؛ وہ ایک مہلک نام ہے جو اس رات سمندر کے اس پار

تیر رہا تھا؛ اگر وہ رُکتا ہے اور کسی راس پر اترتا ہے، تو اس راس کی زیادہ سے زیادہ خرابی کیا ہو گی؟

اس نے آئینے پر نظر ڈالی جو چمنی کے اوپر ٹنگا ہوا تھا، اور کہا:

"ٹھہرو! اس نے مجھے فیصلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے؛ میں اب کوئی اور ہی آدمی ہوں۔"

"وہ چند قدم آگے بڑھا، پھر رُک گیا۔

"آؤ" اس نے کہا، "میں نے جو طے کرلیا ہے اس کے نتائج سے گھبرانا نہیں چاہیے؛ اب بھی کچھ دھاگے ہیں جو مجھے اس ژاں ولژاں سے منسلک کرتے ہیں؛ ان کا توڑنا ضروری ہے؛ اسی کمرے میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مجھ سے غداری کریں گی؛ بے زبان چیزیں ہیں جو میرے خلاف گواہی دیں گی؛ طے ہوا کہ ان چیزوں کو بھی مٹ جانا چاہیے۔"

اس نے اپنی جیب ٹٹولی، اپنا بٹوہ نکالا، اسے کھولا، اس میں سے ایک چھوٹی سی کنجی نکالی؛ کنجی ایک تالے کے سوراخ میں ڈالی جو دیوار پر لگے پیچیدہ قسم کے نقوش اور رنگ سے بنے کاغذ میں مشکل سے نظر آتا تھا؛ یہ ایک قسم کی الماری تھی جو ایک زاویے سے چمنی اور دیوار کے درمیان بنائی گئی تھی، اس کا ایک خفیہ ظرف کھل گیا؛ اس خفیہ جگہ میں کچھ چیتھڑے چھپائے گئے تھے — نیلے رنگ کا ایک بلاؤز؛ پرانے جوتوں کا ایک جوڑا؛ ایک پرانا سفری تھیلا؛ ایک بڑی سی لاٹھی جس کے دونوں سروں پر لوہا لگا تھا۔ وہ لوگ جنھوں نے اکتوبر 1815ء میں ژاں ولژاں کو D کے علاقے سے گزرتے دیکھا تھا، لاٹھی کو آسانی سے پہچان سکتے تھے۔

اس نے ان سب اشیا کو اسی طرح محفوظ رکھا تھا جیسے شمع دان کو رکھا تھا، تا کہ یہ اسے اس کے ابتدائی دنوں کی یاد دلاتے رہیں؛ مگر اس نے وہ سب جو اپنے ساتھ قید سے لایا تھا، چھپا رکھا تھا، جب کہ بشپ کے شمع دان دیکھے جا سکتے تھے۔

اس نے کمرے کے دروازے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کی، گویا چٹخنی چڑھا دینے کے باوجود بھی وہ کھل سکتا تھا؛ پھر اس نے اچانک وہ سب سامان اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا، اور ان پر نظر ڈالے بغیر جسے اتنی خطرناک اور عقیدت بھری احتیاط سے سنبھال کر رکھا تھا، چیتھڑے، سفری تھیلے اور لاٹھی، سب کو آگ میں جھونک دیا۔

اس کے بعد اس نے وہ خفیہ دروازہ بند کر دیا، وہری احتیاط کے ساتھ جو اتنی ضروری نہیں رہ گئی تھی، اس لیے کہ الماری اب خالی ہو گئی تھی، اور دروازے کو گھسیٹ کر سامنے لائے گئے بھاری فرنیچر کے پیچھے چھپا دیا۔

چند سیکنڈ گزرنے کے بعد، پورا کمرہ، اور سامنے کی دیوار ایک لرزاں خوف ناک روشنی

سے روشن ہو گئی۔ سب کچھ تیزی سے جل رہا تھا؛ لاٹھی چیخ رہی تھی اور اس کے جلنے سے چنگاریاں نکل رہی تھی جو کمرے کے درمیان تک پہنچ گئی تھیں۔

جب سفری تھیلا، اس میں موجود چیتھڑوں سمیت جل گیا، تو اس میں سے کوئی شے نکلی تھی، جو راکھ میں پڑی چمک رہی تھی۔ آگے کی طرف جھک کر اس شے کو دیکھ کر کوئی بھی پہچان سکتا تھا کہ وہ ایک سکہ تھا— بلاشبہ یہ وہ وہی ننھے جروے کا چالیس سو کا چرایا ہوا سکہ تھا۔

اس نے آگ کی طرف نظر نہیں کی؛ بس آگے پیچھے چہل قدمی کرتا رہا۔

پھر اچانک اس کی نظر دو شمع دانوں پر پڑی، جو چمنی پر رکھے، اس روشنی میں چمک رہے تھے۔ "ٹھہرو" اس نے سوچا، "ان میں ابھی پورا ژاں ولیواں موجود ہے۔ ان کو بھی تباہ کر دینا چاہیے۔" اس نے دونوں شمع دان اٹھا لیے۔

آتش دان میں ابھی اتنی آگ موجود تھی جو ان کی صورت بگاڑ کر انھیں دھات کی ایک ناقابلِ شناخت سلاخ میں تبدیل کر سکتی تھی۔

وہ ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے آگ کی طرف جھکا۔ اسے آرام دہ سکون کا احساس ہوا۔ "گرمی کتنی اچھی محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے خود سے کہا۔

اس نے ایک شمع دان سے جلتے کوئلوں کو کریدا۔

اور، ایک منٹ بعد وہ دونوں شمع دان بھی آگ میں تھے۔

اس دم اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے اپنے اندرون سے "ژاں ولیواں، ژاں ولیواں" کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے: وہ ایسے آدمی کی طرح ہو گیا جو کوئی خوف ناک آواز سن رہا ہو۔

"ہاں، اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔" آواز کہہ رہی تھی، "جو کچھ بھی ہو، اب اپنے آپ کو بھی مکمل کر لو! ان شمع دانوں کو بھی تباہ کر دو۔ اس تختے کو مٹا ڈالو۔ بشپ کو بھول جاؤ۔ سب کچھ بھلا دو! اس شامپ ماتھیو کو بھی تباہ کر دو، کر دو نا! بس، اب ٹھیک ہے۔ اپنے آپ کو شاباشی دو۔ اب سب کچھ طے ہو گیا ہے؛ حل ہو گیا ہے اور سب پر اتفاق ہو گیا ہے: اب سامنے ایک بوڑھا آدمی ہے جسے کچھ نہیں معلوم کہ اس سے کیا توقع رکھی جا رہی ہے، شاید جس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے، ایک معصوم شخص جس کی ساری بدقسمتی تمھارے نام میں پوشیدہ ہے؛ جس پر تمھارا نام جرم کے بوجھ کی طرح ہے؛ تمھاری جگہ جسے لے جایا جائے گا؛ جسے سزا دی جائے گی؛ جو اپنے بقیہ دن ذلت و خواری اور خوف میں گزارے گا۔ بہت اچھا ہوا۔ اب تم ایک ایمان دار انسان بن جاؤ!

موسیو میئر ہی رہو؛ باعزت رہو اور تمھاری عزت کی جائے؛ علاقے کی دولت مندی میں اضافہ کرو؛ مفلس کو غذا فراہم کرو؛ یتیم کی نگہ داشت کرو؛ خوش رہو؛ نیک رہو؛ پسند کیے جاؤ؛ اور اس دوران، جب تم یہاں مسرتوں اور روشنیوں کے درمیان ہوگے، ایک آدمی ہوگا جو تمھارا سرخ بلاؤز پہنے گا؛ جو تمھارے رسوا نام سے موسوم ہوگا۔ اور جو قید میں تمھاری زنجیروں کا بوجھ سنبھالے گا۔ ہاں، یہ سب اچھی طرح سے طے کر دیا گیا ہے۔ ہائے، بدنصیبی!

پسینہ بہہ بہہ کر اس کے ابرو تک آ پہنچا تھا۔ اس کی وحشت زدہ نظریں شمع دانوں پر جمی ہوئی تھیں، مگر وہ، جو اس کے اندرون بول رہا تھا، خاموش نہیں ہوا تھا۔ اس کی آواز آتی رہی:

''ژاں ولژاں! تمھارے اطراف بہت سی آوازیں ہوں گی، جن سے شور ہوگا؛ جو زور زور سے بولیں گی، اور تم کو مبارک باد دیں گی؛ انھیں تمھارے سوا کوئی نہیں سنے گا؛ جو اندھیرے میں تم پر لعنت کریں گی۔ اچھا، سن، اے بے عزت انسان! وہ ساری برکتیں جنت تک پہنچنے سے پہلے واپس آجائیں گی؛ صرف بددعائیں ہی خدا تک پہنچیں گی۔''

یہ آواز جو پہلے کم زور تھی، جو اس کے ضمیر کی اندھیری گہرائیوں سے آرہی تھی، پریشان کُن اور بھیانک ہوتی جارہی تھی؛ جسے اب وہ اپنے کان ہی میں سن رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اس سے الگ ہوگئی ہے؛ کہ وہ اب اس کے باہر سے بول رہی ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے آخری الفاظ اتنے صاف سنے، کہ اس نے خوف سے پلٹ کر پورے کمرے پر نظر ڈالی ہے۔

''کیا یہاں کوئی ہے؟'' اس نے سراسیمہ ہو کر زور سے سوال کیا۔

پھر وہ کسی بیوقوف کی طرح خود ہی ہنس پڑا۔

''میں بھی کتنا احمق ہوں! یہاں کوئی نہیں ہو سکتا۔''

وہاں کوئی تھا ضرور؛ مگر جو شخص وہاں تھا، ان میں سے تھا جنھیں انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔

اس نے شمع دان واپس چمنی پر رکھ دیا۔

پھر وہ ایک ہی انداز میں اپنے رنجیدہ بھاری بھاری قدم دوبارہ چلنے لگا جو نیچے سونے والے کی خوابوں میں مخل ہو رہے تھے، اور اس کو فوراً ہی جگا دیا تھا۔

بھاری قدموں سے آگے پیچھے چہل قدمی اس کو تسکین دے رہی تھی، ساتھ ہی اس پر نشہ آور کیفیت طاری کر رہی تھی۔ بڑے بڑے موقعوں پر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا لوگ ہر اس کیفیت کے بارے میں مشورہ چاہتے ہیں جو اپنی جگہ بدلنے کے دوران انھیں پیش آسکتی ہے۔ چند منٹ بعد اسے اپنی کیفیت کا اندازہ نہیں رہ گیا تھا۔

اب وہ یکساں خوف کے باعث دونوں تجاویز سے پسپا ہو رہا تھا جن پر وہ پہنچ چکا تھا۔ دونوں تجاویز جو اس کو آمادہ کر رہی تھیں اس کو یکساں مہلک معلوم ہو رہی تھیں۔ کیسی جبر یت ہے یا کیسا اتصال ہے کہ اس کی اس کی جگہ وہ شامپ ماٹ تو لیا گیا تھا؛ بالکل جیسے تک اندیشی سے مغلوب ہو کر پہلے اس کی حیثیت مستحکم کر دی گئی ہو۔

ایسا بھی ایک لمحہ آیا تھا جب اس نے مستقبل کے بارے میں غور کیا۔ اپنی مذمت کرے! او وہ خدایا! اپنے آپ کو پیش کر دے! بے حد بیزاری سے اس نے ان سب کا تصور کیا جن کو وہ چھوڑ سکتا تھا، اور وہ سب جسے اسے ایک بار پھر جھیلنا پڑے گا۔ اس وجود کو وداع کرنا پڑے گا جو اتنا اچھا، اتنا کھرا، اتنا روشن تھا، جسے ہر ایک کا احترام ملتا تھا، عزت تھی اور آزادی تھی۔ وہ کبھی میدانوں میں چہل قدمی نہیں کرے گا؛ مئی کے مہینے میں پرندوں کے چہچہے نہیں سنے گا؛ کبھی چھوٹے بچوں کو خیرات نہیں دے گا؛ اب تشکر کی اور محبت کی نظریں دیکھنے کو نہیں ملیں گی؛ وہ گھر چھوڑنا پڑے گا جو اس نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا، اور چھوٹا سا دفتر بھی۔ اس وقت اس کو ہر شے خوب صورت لگ رہی تھی۔ اب کبھی وہ کتابیں نہیں پڑھے گا؛ اس کی وہ پرانی خادمہ صبح کے وقت اس کے لیے کافی نہیں لائے گی۔ خدایا! اس کے برعکس، سزا یافتہ لوگوں کا گروہ ہوگا؛ آہنی طوق ہوں گے؛ سرخ واسکٹیں ہوں گی؛ ٹخنوں میں زنجیر ہوگی؛ تھکن ہوگی؛ کوٹھری ہوگی؛ اور کیمپ کے بستر کے ساتھ وہی دہشت ہوگی، وہی کراہت ہوگی، وہ جن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس عمر میں، اور یہ سب اتنا کچھ بن جانے کے بعد ہوگا۔ کاش وہ پھر جوان ہو جاتا — کہ اس عمر میں جو بھی چاہے اسے "تو" کہہ کر پکار نہ سکتا؛ کہ سزا یافتہ چوکیدار اس کی تلاشی نہ لیتا؛ کہ وہ باورچی خانے کے سارجنٹ کی لاٹھیاں نہ سہتا؛ کہ ننگے پاؤں میں لوہے کی جوتے نہ پہننے پڑتے؛ کہ پاؤں پھیلانے پر چوکیدار کے ڈنڈے نہ سہنے پڑتے؛ اجنبی لوگوں کے تجسس کو برداشت نہ کرنا پڑتا جن کو بتایا جاتا کہ یہ سامنے والا شخص مشہور ژاں والژاں ہے، جو کبھی M. sur M کا میئر تھا؛ اور رات کے وقت پسینے میں شرابور، کاہلی کا مارا، آنکھوں پر جھکی سبز ٹوپی، سارجنٹ کے کوڑے کے سایے تلے دو دو کو ایک ساتھ سیڑھی نہ چڑھنی پڑتی۔ ہائے رے بدنصیبی! کیا قسمت بھی کسی ذہین شخص کی طرح کینہ پرور ہو سکتی ہے اور انسانی دل کی طرح بھیانک ہو سکتی ہے؟

اور اسے وہی کرنا چاہیے جو وہ کر سکتا ہے؛ وہ ہمیشہ دل خراش تذبذب پر تکیہ کرتا ہے جو اس کے خیالات کی بنیاد ہوتا ہے۔ کیا وہ جنت میں رہے اور آسیب بن جائے؟ کیا وہ جہنم کی طرف واپس چلا جائے اور فرشتہ بن جائے؟

اسے کیا کرنا چاہیے؟ خدایا، اسے کیا کرنا چاہیے؟

جس عذاب سے وہ اتنی مشکل سے نکلا تھا، ایک بار پھر اس کے اندرون میں اس کے ساتھ تھا۔اس کے تصورات ایک بار پھر الجھنے لگے تھے؛ انھوں نے ایک احمقانہ اور میکانکی کیفیت اختیار کر لی تھی، جو نا اُمیدی کے لیے اجنبی ہوتی ہے۔اس کے ذہن میں بار بار Romainville کا نام ابھر رہا تھا، ایک گانے کے دو مصرعوں کے ساتھ، جو اس نے ماضی میں سنے تھے۔اس کا خیال تھا کہ Romainville پیرس کے نواح کا ایک چھوٹا سا جنگلی علاقہ تھا، جہاں جوان محبت کرنے والے جوڑے اپریل کے مہینے میں بنفشی رنگ کے پھول یاس توڑنے جاتے ہیں۔

اور وہ اندرون اور بیرون دونوں میں متزلزل ہو رہا تھا۔ایک چھوٹے سے بچے کی طرح چل رہا تھا جسے صرف گھٹنوں چلنے کی اجازت ہو۔

جب وقت ملتا، وہ سُستی سے مبارزت کرتا؛ اپنے ذہن کے کمال کی بازیافت کی کوشش کرتا تھا۔وہ یقینی طور آخری بار، اس مسئلے کا سامنا کرنا چاہتا تھا جس میں تکان کے باعث وہ پہلے چت ہو چکا تھا۔کیا اس کو اپنی مذمت کرنی چاہیے؟ کیا اس کو اپنے سکون کو گرفت میں رکھنا چاہیے؟ وہ کسی چیز کو قطعی طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے استدلال کے راستوں کے تمام مبہم پہلو، اس کے مراقبے جن کی خاکہ بندی کی تھی، ایک ایک کر کے دھویں کی صورت تحلیل ہو گئے تھے۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ، اس نے کوئی بھی طریقہ سوچ رکھا ہو، ضرورت کے پیش نظر، حقیقت سے فرار کے بغیر، اس کے اندرون کی کسی شے کو مرنا ہوگا؛ کہ وہ ایک مزار میں داخل ہو رہا ہے، جس میں دائیں بائیں دونوں جانب قبر ہے؛ وہ موت کے شدید درد سے گزر رہا تھا—مسرت کے شدید درد سے، یا اپنی نیکی کے شدید درد سے۔

افسوس! اس کے سارے عزم واستقلال نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔وہ اس نشان سے آگے نہیں بڑھا ہے، جہاں ابتدا میں تھا۔

اس طرح اس بدقسمت نفس نے جدو جہد کی تھی۔ اس بدقسمت آدمی سے اٹھارہ سو برس پہلے اس پُراسرار وجود نے بھی، جس میں تمام تقدس، اور انسانیت کے تمام دُکھ جمع ہیں، جب لامحدود کی تیز ہوا میں زیتون کے درخت لرز رہے تھے۔اپنے ہاتھوں سے اس خوف ناک پیالے کو ایک طرف کر دیا تھا جو ظلمات اور پرچھائیوں سے لبریز اس کے سامنے پیش ہوا تھا، جس کی پہنائیوں میں ستارے جڑے ہوئے تھے۔

۞

خواب کے درمیان

رات کے تین بجے تھے۔ وہ پانچ گھنٹے تک اپنے کمرے ہی میں مسلسل ٹہلتا رہا تھا۔ اب اس نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اسی عالم میں اس کو نیند آگئی اور وہ خواب دیکھنے لگا۔

تمام خوابوں کی طرح اس خواب کا بھی حالات سے کوئی ربط نہیں تھا، سوائے ایک درد انگیز اور دل خراش کردار کے، مگر اس پر اس کردار کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس ڈراؤنے خواب نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا کہ اسے تحریر میں رکھنا پڑا تھا۔ یہ تحریر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اور ہمیں ورثے میں ملی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اس کے متن کو من و عن پیش کردینا چاہیے۔

یہ خواب خواہ کسی نوعیت کا ہو، اگر ہم اسے نظر انداز کردیتے ہیں تو اس رات کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی: یہ ایک بیمار روح کی اداسی بھری مہم تھی۔

متن حاضرِ خدمت ہے:

لفافے پر یہ سطر لکھی ہوئی ہے: ''خواب جو میں نے اس رات دیکھا تھا''

''میں ایک مسطح میدان میں تھا: وسیع، چٹیل میدان، جس میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہ تھا۔ یہ دن کا وقت تھا یا رات کا، مجھے معلوم نہیں۔

میں اپنے بھائی کے ساتھ جا رہا تھا، میرے بچپن کے زمانے کا بھائی، جس کو میں نے کبھی بھائی نہیں سمجھا تھا، اور جو اب مجھے بالکل یاد نہیں۔

ہم باتیں کرتے جا رہے تھے۔ راستے میں ہمیں کچھ لوگ ملے۔ ہم اپنے ماضی کے دنوں

کی ایک پڑوسن کے بارے میں بات کر رہے تھے، جو کام کرتے وقت ہمیشہ اپنی کھڑکی کھلی رکھا کرتی تھی، اس وقت سے جب وہ اس گلی میں رہنے آئی تھی۔ ہم جب اس کی بات کر رہے تھے تو اس کھلی کھڑکی کے خیال سے ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔

میدان میں پیڑ نہیں تھے۔ ہم نے ایک آدمی کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا۔ وہ مادر زاد ننگا تھا، راکھ کے رنگ کا، گھوڑے پر سوار جس کا رنگ خاکی تھا۔ اس آدمی کے سر پر بال نہیں تھے؛ ہم اس کی کھوپڑی اور اس کی نسیں بھی دیکھ سکتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاخ تھی جو اتنی لچک دار تھی جیسے انگور کی نئی شاخ، اور اتنی بھاری جیسے لوہے کا تار۔ گھڑسوار پاس سے گزر گیا، اور ہم سے کچھ نہیں کہا۔

میرے بھائی نے مجھ سے کہا، 'ہمیں کوئی خالی سڑک لینی چاہیے'

اس علاقے میں ایک سنسان راستہ تھا جہاں نہ کوئی بوٹی تھی اور نہ کائی۔ ہر شے گرد کے رنگ کی تھی، حتیٰ کہ آسمان بھی۔ چند قدم چلنے کے بعد، جب میں نے بات کی تو کوئی جواب نہیں ملا: میں سمجھ گیا کہ اب میرا بھائی میرے ساتھ نہیں تھا۔

میں ایک گاؤں میں داخل ہوا جسے دور سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ Romainville ہوگا۔

پہلی گلی، میں جس میں داخل ہوا، ویران تھی۔ میں ایک اور گلی میں گیا۔ دو گلیوں سے بننے والے زاویے کے عقب میں ایک آدمی دیوار کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا، 'یہ کون سا ملک ہے؟ میں کہاں ہوں؟' اس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک گھر کا دروازہ کھلا دیکھا، اور اس میں داخل ہو گیا۔

پہلا کمرہ سنسان تھا۔ میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کے دروازے کے پیچھے ایک آدمی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا، 'یہ کس کا گھر ہے؟ میں کہاں ہوں؟' آدمی نے جواب نہیں دیا۔

اس مکان میں ایک باغیچہ تھا۔ میں گھر سے نکلا اور باغیچے میں داخل ہو گیا۔ باغیچہ سنسان تھا۔ پہلے پیڑ کے پیچھے مجھے ایک آدمی بالکل سیدھا کھڑا ملا۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا، 'یہ کس کا باغیچہ ہے؟ میں کہاں ہوں؟' آدمی نے جواب نہیں دیا۔

میں گاؤں میں چہل قدمی کرنے نکل گیا اور محسوس کیا کہ یہ ایک شہر سا تھا۔ ساری سڑکیں سنسان تھیں، سارے دروازے کھلے تھے۔ گلیوں میں چلتا، کمرے سے نکلتا، باغیچوں میں ٹہلتا ایک آدمی بھی دکھائی نہیں دیا، مگر ہر دیوار کے زاویے کے پیچھے، ہر دروازے کے پیچھے، ہر درخت کے پیچھے، ایک خاموش آدمی کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی آدمی نظر آتا تھا۔

یہ آدمی مجھے گزرتا دیکھتے تھے۔

میں نے شہر چھوڑ کر میدانوں میں آوارہ گردی شروع کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مڑا تو میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے ایک بڑا مجمع چلا آرہا ہے۔ میں تمام لوگوں کو پہچان گیا جنھیں میں شہر میں دیکھ چکا تھا۔ ان کے سر عجیب طرح کے تھے۔ وہ لوگ عجلت میں محسوس نہیں ہوتے تھے، پھر بھی مجھ سے زیادہ تیز چل رہے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اس مجمعے نے آگے بڑھ کر مجھے گھیر لیا تھا۔ ان کے چہرے خاکی رنگ کے تھے۔

تب، پہلے شخص نے، جسے میں نے شہر میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا اور سوال کیا تھا، مجھ سے کہا،"تم کدھر جا رہے ہو! کیا تمھیں خبر نہیں کہ تمھیں مرے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے؟"

میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو محسوس ہوا کہ میرے قریب کوئی نہیں تھا۔"

وہ جاگ اٹھا۔ وہ برف جیسا ٹھنڈا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کھڑکی کے پٹ کھڑ کھڑا رہی تھی، جو اپنے قلابوں میں، کھلے چھوڑ دیے گئے تھے۔ آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ شمع اپنے اختتام تک پہنچنے والی تھی۔ رات ابھی اندھیری تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑکی پر گیا۔ آسمان میں ابھی تک ستارے نہیں تھے۔

اس کھڑکی سے مکان کا صحن اور گلی دکھائی دیتی تھی۔ ایک تیز، کریہہ آواز جس نے اس کی آنکھ بند کر دی تھی، زمین میں گونج رہی تھی۔

اس کے نیچے، اسے دو سرخ رنگ کے ستارے محسوس ہوئے، جن کی کرنیں اندھیرے میں باقاعدہ طریقے سے بڑھ گھٹ رہی تھیں۔

چوں کہ اس کے خیالات اب بھی نیم خوابیدگی کی شبنم میں ڈوبے تھے"ٹھہرو" اس نے کہا،"آسمان میں ایک بھی ستارہ نہیں۔ وہ اب زمین پر ہیں۔"

مگر یہ الجھن دور ہوگئی؛ پہلی جیسی ایک اور آواز نے اسے پوری طرح جگا دیا تھا؛ اس نے دیکھا اور اس حقیقت کا احساس ہوگیا کہ وہ دو سرخ ستارے دراصل ایک بگھی کی لالٹین تھے۔ ان میں سے نکلنے والی روشنی سے وہ بگھی کی قسم پہچان گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی بگھی (tilbury) تھی جس میں سفید رنگ کا گھوڑا جتا ہوا تھا۔ جو آوازیں اس نے سنی تھیں وہ گھوڑے کی ٹاپوں کی تھیں جنھیں وہ پکے راستے پر رہ رہ کر مار رہا تھا۔

"یہ کون سی گاڑی ہے؟" اس نے خود سے کہا"اتنے سویرے سویرے کون آیا ہے؟"

عین اسی وقت کمرے کے دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔
وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا، اور خوف ناک آواز میں چلایا:
"کون ہے؟"
کسی نے کہا "میں ہوں، موسیو میڈ۔"
وہ بوڑھی عورت کی آواز پہچان گیا، جو اس کی دربان تھی۔
"اچھا۔" اس نے پوچھا، "کیا ہے؟"
"موسیو میڈ، اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔"
"تو میں کیا کروں؟"
"بگھی آئی ہے۔"
"کیسی بگھی؟"
"tilbury"
"کیسی tilbury؟"
"کیا موسیو میڈ نے tilbury منگائی نہیں تھی؟"
"نہیں۔" اس نے کہا۔
"کوچوان کہتا ہے کہ وہ موسیو میڈ کے لیے آیا ہے۔"
"کیسا کوچوان؟"
"موسیو اسکافلیر کا کوچوان۔"
"موسیو اسکافلیر؟"
یہ نام سن کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا، گویا اس کے چہرے پر بجلی سی کوند گئی ہو۔
"ارے ہاں!" اس نے کہا، "موسیو اسکافلیر۔"
اگر اس بوڑھی عورت نے اس وقت اسے دیکھ لیا ہوتا تو وہ خوف زدہ ہو جاتی۔
خاموشی کا ایک عرصہ گزر گیا۔ اس نے شمع کی لو کی طرف احمقانہ نظروں سے دیکھا، اور اس کے اطراف سے جلتی ہوئی کچھ موم لی، جسے اپنے انگلیوں کے درمیان مسل رہا تھا۔ بوڑھی عورت اس کے انتظار میں کھڑی رہی۔ ایک بار پھر اس نے اپنی آواز بھی اونچی کرنی چاہی۔
"موسیو میڈ، میں اس سے کیا کہوں؟"
"اس سے کہو، ٹھیک ہے میں نیچے آرہا ہوں۔"

۞

رُکاوٹیں

Arras سے M. sur M ڈاک پہنچانے کا نظام سلطنت کے زمانے کی چھوٹی چھوٹی بگھیوں کے ذریعے چلایا جا رہا تھا۔ یہ ڈاک گاڑیاں دو پہیوں والی بگھیاں ہوتی تھی، جن کے اندر چرمی گدے لگے ہوتے تھے، ان کے پہیے اسپرنگ کے ذریعے گاڑی سے منسلک ہوتے تھے، اور ان میں مسافر کے لیے صرف دو نشستیں ہوا کرتی تھیں، ایک ڈاکیے کے لیے اور دوسری مسافر کے لیے۔ان گاڑیوں میں لوہے کے مہیب چھڑوں کے ڈھرے لگائے جاتے تھے جو دوسرے پہیے کو فاصلے پر رکھتے تھے۔ ایسی گاڑیاں اب بھی جرمنی کی سڑکوں پر دیکھی جاتی ہیں۔ڈاک کا بکس بیضوی شکل کے زیورات رکھنے والے بکسوں جیسا ہوتا تھا، جو گاڑی کے عقب میں نصب ہوتا تھا اور گاڑی کا حصہ ہوتا تھا۔بکس سیاہ رنگ سے رنگا جاتا تھا، اور بگھی زرد رنگ سے۔

ان گاڑیوں کی شکل، جن کا آج کل کوئی نعم البدل نہیں، کچھ عجیب کوب جیسی ہوتی تھی؛ اور جب کوئی انھیں فاصلے سے گزرتے، چڑھائی پر چڑھتے دیکھتا، تو یہ کیڑوں جیسی نظر آتی تھیں، میرے خیال میں جن کو دیمک کہا جاتا ہے۔ یہ گاڑیاں بہت مضبوط ہوتی تھیں، اور بہت وزن کھینچتی تھیں، مگر بہت تیز چلتی تھیں۔پیرس سے آنے والی ڈاک کی وصولی کے بعد ہر شب ایک بجے Arras سے چلنے والی ڈاک گاڑی پانچ بجے صبح سے ذرا قبل M. sur M پہنچتی تھی۔

اس رات جب گاڑی Hesdin روڈ سے ہوتی ہوئی M. sur M جا رہی تھی، عین اس وقت جب شہر میں داخل ہو رہی تھی، ایک چھوٹی بگھی ٹلبری (tilbury) سے ٹکرا گئی تھی جس میں سفید رنگ کا گھوڑا جُتا ہوا تھا، جو مخالف سمت جا رہی تھی، جس میں عبا میں ملبوس صرف ایک آدمی سوار تھا۔ٹلبری کے پہیے کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ ڈاکیے نے چلّا کر اس آدمی سے رُکنے کے

لیے کہا، مگر مسافر نے بالکل پروا نہیں کی اور پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں رہا۔

"اس آدمی کو نہ جانے کیوں اتنی جلدی ہے۔" ڈاکیے نے کہا۔

وہ آدمی جس کو اتنی عجلت تھی، وہی شخص ہے جسے ہم نے کچھ دیر پہلے تشنج کی کیفیت میں دیکھا تھا، اور یقینی طور پر ہم دردی کا مستحق تھا۔

وہ کہاں جا رہا تھا؟ بتا نہیں سکتا تھا۔ کیوں عجلت میں تھا؟ اسے علم نہیں تھا۔ وہ بس سیدھا اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ کس طرف؟ بلا شبہ Arras کی طرف، مگر ممکن ہے کہ وہ کہیں اور بھی جا تا رہا ہو۔ کبھی کبھی اسے اس بات کا احساس ہو جاتا تھا، اور وہ کانپ اٹھتا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے کسی خلیج میں کود گیا ہو۔ کوئی بات ضرور تھی جو اسے رواں رہنے پر اُکسا رہی رہی تھی۔ کوئی بات تھی جو اسے کھینچے لیے جا رہی تھی؛ کوئی بتا نہیں سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا ہو رہا تھا؛ ہر شخص سمجھ نہیں سکتا تھا۔ کون ہے وہ آدمی جو کبھی، کم از کم زندگی میں ایک بار بھی، اس اجنبی اندھیرے غار میں داخل نہیں ہوا تھا۔

بہر حال، اس نے کوئی ارادہ نہیں کیا تھا، کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا، کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے ضمیر کا کوئی بھی عمل فیصلہ کن نہیں تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلے دن تھا۔

وہ Arras کیوں جا رہا تھا؟

اس نے وہی بات دہرائی، جو اس نے خود سے اس وقت کہی تھی، جب وہ اسکافلیر کی بگھی کرایے پر لے رہا تھا: کہ نتیجہ کچھ بھی نکلے، کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ خود اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لے، اور خود فیصلہ نہ کر لے؛ کہ یہی مناسب تھا؛ کہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ کیا ہوا تھا؛ کہ بغیر دیکھے اور جانچے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا؛ کہ فاصلے سے دیکھ کر رائی کا پہاڑ بنایا جا سکتا تھا؛ کہ کسی بھی حالت میں، اگر اس نے اس بدنصیب شامپ ماتھو کو دیکھا ہوتا تو شاید اس کے ضمیر کو سکون ہو جاتا، اور اس کے بجائے خود قید میں چلا جاتا؛ کہ جاویر بھی وہاں ہوتا؛ اور یہ بھی کہ بریوے، Chenildieu، Cochepaille وغیرہ، سارے پرانے سزا یافتہ وہاں ہوتے جن سے وہ اچھی طرح واقف تھا؛ مگر یقینی طور پر وہ سب اسے پہچان نہ پاتے — ہونہہ! جاویر سچائی سے ایک سو لیگ دور تھا؛ کہ سارے اندازے اور سارے مفروضے شامپ ماتھو پر ہی مرکوز تھے، اور یہ بھی کہ ایسا کوئی سرکش قیاس یا اندازہ نہیں تھا جس کی بنا پر یہ سمجھا جاتا کہ وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

آخر میں، سچ بات تو یہ تھی، کہ اگر ممکن ہوتا تو وہ Arras نہ جاتا۔

مگر، وہ وہیں جا رہا تھا۔

اپنے مراقبے کے دوران، اس نے گھوڑے کو چابک لگائی، حالاں کہ وہ ٹھیک ٹھاک، ڈھائی لیگ فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

جیسے جیسے بگھی آگے بڑھ رہی تھی، اس کے اندرون میں کچھ ہوتا جا رہا تھا۔

دن نکلا تو وہ کھلے میدانی علاقے میں تھا؛ M. sur M کا شہر کا علاقہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ افق کو روشن ہوتے دیکھ رہا تھا؛ سردی کے موسم کی صبح کی تمام ٹھٹھرتی چیزیں اس کے نظروں کے سامنے سے گزرتی جا رہی تھیں، مگر وہ انھیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ شام کی طرح صبح کی بھی اپنی خوف ناکیاں ہوتی ہیں۔ وہ انھیں دیکھ نہیں رہا تھا؛ مگر ان کا علم ہوئے بغیر بھی، ایک قسم کے دخول کے ذریعے جو تقریباً فطری ہوتا ہے؛ درختوں اور پہاڑیوں کے سیاہ ہیولے اس کی روح میں ایک نوع کی شدید کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

ہر بار جب وہ ان الگ تھلگ مکانوں کے سامنے سے گزرتا جو شاہ راہوں کے کنارے بنے ہوتے ہیں تو خود سے کہتا تھا، ''ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو سو رہے ہیں!''

گھوڑے کی ڈبکی چال، گاڑی کے ساز و سامان میں لگی گھنٹیاں، سڑکوں پر چلنے والے پہیے، سب مل کر ایک دھیمی، یکساں قسم کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ یہ چیزیں اس وقت اچھی لگتی ہیں جب انسان خوش ہو؛ اور مغموم لگتی ہیں جب انسان افسردہ ہو۔

جب وہ Hesdin پہنچا، اجالا پھیل چکا تھا۔ گھوڑے کے کچھ دیر سستانے کے لیے ایک سرائے کے سامنے رُکا، تا کہ اسے کھانے کے لیے کچھ اوٹ دیے جا سکیں۔

جیسا کہ اسکافلیر نے بتایا تھا، گھوڑا اس چھوٹی نسل کا تھا، جس کا سر بڑا، پیٹ بڑا ہوتا ہے مگر اس کی گردن، اس کے پٹھے بڑے نہیں ہوتے، سینہ چوڑا، پتلی اور خوب صورت ٹانگیں، ٹھوس سُم، ایک گھریلو قسم کا تنو مند، صحت مند نسل کا جانور تھا۔ یہ جانور دو گھنٹوں میں پانچ لیگ طے کر چکا تھا مگر اس کی رانوں پر پسینے کا ایک قطرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ بگھی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اصطبل والا جو اس کا چارہ لے کر آیا تھا، اچانک جھکا اور بائیں پہیے کا معائنہ کرنے لگا۔

''کیا آپ اس حالت میں اتنی دور جا رہے ہیں؟'' اس آدمی نے کہا۔

اس نے حیرانی کا اظہار نہ کرتے ہوئے جواب میں کہا، ''کیوں؟''

''کیا آپ بہت دور سے آ رہے ہیں؟'' اس آدمی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''پانچ لیگ۔''

''اوہ!''

''تم نے 'اوہ' کیوں کہا؟''

وہ آدمی ایک بار پھر جھکا، ایک لمحے خاموش رہا، اس کی آنکھیں پہیے پر گڑی ہوئی تھیں؛ پھر وہ کھڑا ہوا اور کہا ''حالاں کہ یہ پہیہ پانچ لیگ چل چکا ہے، اب یہ ایک چوتھائی لیگ بھی نہیں چلے گا۔''

وہ اچھل کر بگھی سے باہر نکلا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میرے دوست؟''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم پانچ لیگ سفر کر چکے ہو اور یہ معجزہ ہے کہ تم اور تمھارا گھوڑا کسی گڑھے میں گرا نہیں۔ ذرا ادھر دیکھو!''

پہیے میں واقعی بہت خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاک کی گاڑی سے لگنے والی ضرب سے پہیے کے دو ڈنڈے پھٹ گئے تھے اور اس کی وجہ سے اس کے مدار پر زور پڑ رہا تھا، اور اس کے ڈھیری کی گرفت مضبوط نہیں رہ گئی تھی''۔

''دوست،'' اس نے کہا ''یہاں کوئی پہیہ بنانے والا ہے؟''

''بالکل ہے، جناب!''

''مہربانی کرو، ذرا اسے بلا لاؤ۔''

''صرف ایک قدم دور ہے۔''

''اے ماسٹر بورگیلار (Bourgaillard) ذرا ادھر تو آنا۔''

ماسٹر بورگیلار، پہیہ بنانے والا جو اپنی دہلیز پر ہی کھڑا تھا، آیا، پہیے کا معائنہ کیا اور کسی سرجن کی طرح منہ بنایا، جیسے اس کے خیال میں کوئی عضو ٹوٹ گیا ہو۔

''کیا تم اس پہیے کی فوراً مرمت کر سکتے ہو؟''

''جی ہاں، جناب!''

''ہم دوبارہ کب سفر کر سکتے ہیں؟''

''کل۔''

''کل!''

''اس کی مرمت میں ایک پورا دن لگے گا۔ کیا آپ عجلت میں ہیں، جناب؟''

''بہت عجلت میں۔ مجھے زیادہ سے زیادہ۔ ایک گھنٹے کے اندر نکلنا ہوگا۔''
''ناممکن جناب!''
''منہ مانگی اجرت دوں گا۔''
''ناممکن!''
''اچھا تو پھر دو گھنٹے میں؟''
''آج تو ممکن نہیں۔ دو نئے ڈنڈے اور ایک مدار بنانی ہو گی۔ موسیو کل صبح سے پہلے نہیں جا سکیں گے۔''
''میرا کام کل تک نہیں رُک سکتا۔ مرمت کے بجائے کیا پہیہ نہیں بدلا جا سکتا؟''
''وہ کیسے؟''
''تم اس کے ماہر ہو نا؟''
''یقیناً جناب!''
''کیا تمھارے پاس کوئی فاضل پہیہ نہیں جو تم مجھے بیچ سکو؟ تب میں فوراً روانہ ہو سکوں گا۔''
''فاضل پہیہ؟''
''ہاں!''
''میرے پاس ایسا فاضل پہیہ نہیں جو تمھاری بگھی میں لگ سکے۔ دو پہیے مل کر ایک جوڑا بنتا ہے۔ دو پہیے یوں ہی ایک ساتھ بدلے نہیں جا سکتے۔''
''اچھا تو پہیے کا ایک جوڑا مجھے بیچ دو۔''
''سارے پہیے، سارے ڈھروں میں نہیں لگتے جناب!''
''پھر بھی، کوشش تو کرو۔''
''فضول ہو گا جناب۔ میں گاڑی کے پہیے کے علاوہ اور کچھ نہیں بیچتا۔ ہم مفلس ملک والے ہیں۔''
''کیا تمھارے پاس کوئی بگھی ہے، مجھے کرایے پر دینے کے لیے؟''
پہیہ ساز پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ بگھی کرایے پر لی گئی تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔
''آپ نے بگھی کا کیا حال کیا ہے، جو آپ کو اچھی حالت میں دی گئی تھی۔ اگر میرے پاس بگھی ہوتی تو آپ کو کبھی کرایے پر نہ دیتا۔''
''اچھا، تو پھر فروخت کر دو۔''

"میرے پاس ایک بھی نہیں۔"

"کیا ایک اسپرنگ والی گاڑی بھی نہیں؟ مجھے منانا مشکل کام نہیں، جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو۔"

"ہم ایک مفلس ملک کے باشندے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ایک گاڑی ہے۔" پیپہ بنانے والے نے کہا "ایک پرانی کیلاش (calash - چھوٹے پہیوں والی گاڑی) ادھر برآمدے میں کھڑی ہے، جو اس شہر کے ایک بوڑھا کی ملکیت ہے، جس نے مجھے حفاظت سے رکھنے کے لیے دی ہے، جو اسے ہر مہینے کے چھتیسویں دن استعمال کرتا ہے — یعنی کبھی نہیں۔ میں تمھیں وہ گاڑی دے سکتا ہوں، مگر اس کا مالک اس کو دیکھ نہ پائے — مگر اس میں دو گھوڑے لگتے ہیں۔"

"میں ڈاک والوں کے دو گھوڑے لے لوں گا۔"

"موسیو کہاں جا رہے ہیں؟"

"Arras تک۔"

"اور موسیو وہاں آج ہی پہنچنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، بلاشبہ!"

"ڈاک کے دو گھوڑے لے کر؟"

"کیوں نہیں؟"

"اگر موسیو وہاں چار بجے صبح پہنچ جائیں، تو کیا کوئی فرق پڑے گا؟"

"نہیں، آج ہی پہنچنا ہے۔"

"ڈاک کے گھوڑے لینے کے بارے میں ایک بات ضروری ہوگی — کیا موسیو کے پاس پاسپورٹ ہے؟"

"ہاں!"

"مگر ڈاک گھوڑے لینے کے باوجود موسیو کل سے پہلے Arras نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہم ایک چوراہے پر ہیں۔ پیغام رسانی دشوار ہوتی ہے۔ گھوڑے میدان میں ہوتے ہیں۔ جتائی کا موسم شروع ہو گیا ہے، کرایہ بہت زیادہ ہوگا، گھوڑوں کی مانگ بہت بڑھ جاتی ہے، ڈاک والوں کی طرف سے بھی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی۔ ہر پیغام کے بعد موسیو کو کم از کم، دو یا تین گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر گاڑی اس طرح چلتی ہے جیسے گھوڑے چہل قدمی کر رہے ہوں — بے شمار پہاڑیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔"

"چلو، پھر ہم گھڑ سواری کرلیں گے۔ بگھی کو کھول دو۔ کوئی پڑوسی مجھے زین تو ضرور فروخت کردے گا۔"

"بلاشبہ، مگر کیا یہ گھوڑا زین برداشت کرلے گا؟"

"اچھا ہوا، تم نے مجھے یاد دلادیا؛ یہ زین برداشت نہیں کرے گا۔"

"پھر؟"

"کیا میں گاؤں سے کوئی گھوڑا کرایے پر لے سکتا ہوں؟"

"ایسا گھوڑا، جس پر ایک جست میں Arras کا سفر کیا جاسکے؟"

"ہاں!"

اس کے لیے جس قسم کے گھوڑے کی ضرورت ہوگی وہ یہاں نہیں مل سکے گا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو گھوڑا خریدنا ہوگا، اس لیے کہ آپ کو یہاں کوئی نہیں جانتا، مگر آپ کو یہاں کوئی گھوڑا نہیں ملے گا؛ نہ فروخت کے لیے، نہ کرایے پر۔ نہ ہزار فرانک کے عوض، اور نہ پانچ سو فرانک پر۔"

"تو میں کروں کیا؟"

"بہتر ہوگا کہ آپ مجھے ایک ایمان دار آدمی کی طرح پہیے کی مرمت کرنے دیں، اور آپ سفر پر کل روانہ ہوں۔"

"کل، بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ کیا یہاں سے Arras کوئی ڈاک گاڑی نہیں جاتی؟ کس وقت گزرے گی؟"

"آج رات۔ دونوں ڈاک گاڑیاں رات میں ہی گزرتی ہیں؛ جانے والی بھی اور واپس آنے والی بھی۔"

"کیا کہا تھا تم نے۔ پہیے کی مرمت میں تمھیں کتنا وقت لگے گا؟"

"ایک دن، ایک طویل دن۔"

"اگر تم دو آدمی کام پر لگا دو تو؟"

"اگر میں دس آدمی لگا دوں، پھر بھی۔"

"کیوں نہ ٹوٹے ڈنڈوں کو رسیوں سے باندھ دیا جائے؟"

"اس طرح پہیے تو باندھے جاسکتے ہیں، مگر مدار نہیں۔ پہیے کے rim کی بھی حالت اچھی نہیں۔"

''اس گاؤں میں ایسا کوئی ہے جو یہ کرائے پر دے سکے؟''

''نہیں۔''

''یہاں اور کوئی پہیہ ساز ہے؟''

اصطبل والے اور پہیہ ساز نے ایک ساتھ سر ہلا کر کہا: ''نہیں۔''

اسے بہت خوشی محسوس ہوئی۔

ظاہر ہے کہ قدرت دخل دے رہی تھی کہ قسمت نے ہی بگھی کا پہیہ توڑا تھا، اور وہی اس کو سڑک پر روک بھی رہی تھی۔ اس نے اب تک اس قسم کے بلاوے پر دھیان نہیں دیا تھا؛ اس نے اپنا سفر جاری رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی تھی؛ اس نے فرماں برداری اور ذمے داری سے تمام ذرائع استعمال کیے تھے؛ اس نے نہ تھکن یا کسی اور وجہ سے، نہ خرچ کی وجہ سے خود کو باز رکھا تھا؛ اسے خود اپنی سرزنش کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر اس نے مزید کچھ نہیں کیا تو اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کے ضمیر کا نہیں قدرت کا عمل تھا۔

اس نے ایک بار پھر سکون کا سانس لیا۔ جاویر کی آمد کے بعد، پہلی بار اس نے سینہ بھر سانس لیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس آہنی ہاتھ نے، جس نے پچھلے بیس گھنٹوں کے دوران اس کے دل کو جکڑ رکھا تھا، اسے آزاد کر دیا ہے۔

اسے محسوس ہو رہا تھا گویا اب خدا اس کے ساتھ تھا اور اپنا جلوہ دکھا رہا تھا۔

اس نے خود سے کہا کہ اس نے وہ سب کچھ کیا ہے جو کر سکتا تھا، اور اب اسے کچھ اور نہیں کرنا تھا، سوائے اس کے کہ وہ خاموشی سے اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے۔

اگر پہیہ بنانے والے سے اس کی گفتگو سرائے کے کسی کمرے میں ہوئی ہوتی، تو اس کے گواہ نہ ہوتے، کسی نے اسے سنا نہ ہوتا، سب کچھ وہیں ختم ہو جاتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں یہ سب بتانے کی ضرورت بھی نہ ہوتی، جسے قاری پڑھنے والا ہے؛ مگر یہ گفتگو سڑک پر ہوئی ہوتی۔ سڑک پر ہونے والی بات چیت پر لوگوں کا جمع ہو جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کچھ نہیں پوچھتے مگر بہتر تماشائی ہو جاتے ہیں۔ جس وقت پہیہ ساز سے سوال جواب ہو رہے تھے، کچھ لوگ آ جا رہے تھے اور کچھ گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ چند منٹ ان کی گفتگو سننے کے بعد، ایک نوجوان لڑکا، جس پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی، مجمعے سے باہر نکلا اور ایک طرف بھاگ گیا۔

اس وقت جب سفر کرنے والا، اپنے اندرونی غور و فکر کے بعد، جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، اُلٹے قدموں واپس جانے ہی والا تھا، کہ وہ لڑکا واپس آیا۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی

عورت بھی تھی۔

''موسیو!'' عورت نے کہا، ''میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بگھی کرایے پر لینا چاہتے ہیں۔''

ایک بوڑھی عورت کے کہے گئے ان سادہ الفاظ سنتے ہی، جسے ایک لڑکا اپنے ساتھ لایا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں پر پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگے۔اس نے سوچا کہ جس ہاتھ نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی تھی، اسے ایک بار پھر اپنی گرفت میں لینے کے لیے وہ ہاتھ اس کے عقب کے اندھیروں میں نظر آ گیا ہے۔

اس نے جواب دیا، ''جی ہاں محترم خاتون؛ میں کرایے پر لینے کے لیے ایک بگھی کی تلاش میں ہوں۔'' اور اس نے فوراً ہی اس میں اضافہ بھی کر دیا، ''مگر یہاں کوئی بگھی میسر نہیں۔''

''یقیناً ہے۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔

''کہاں ہے؟'' پہیہ بنانے والے نے لقمہ دیا۔

''میرے گھر میں۔'' بوڑھی عورت نے جواب میں کہا۔

یہ سُن کر وہ لرز گیا۔اس مہلک اور غیر مرئی ہاتھ نے اسے ایک بار پھر گرفت میں لے لیا تھا۔

واقعی، اس بوڑھی عورت کے سائبان میں اسپرنگ والی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ پہیہ بنانے والے اور اصطبل والے، دونوں نے اس خیال سے کہ مسافر ان کے چنگل سے نکلا جا رہا ہے، لقمہ دیا، ''وہ تو ایک بھیانک پرانا چھکڑا ہے؛ مسطح دھرے پر بنا ہوا؛ دراصل اس کی نشستیں چرمی پٹیوں پر لٹکی تھیں؛ اس میں بارش کا پانی آ گیا تھا؛ پہیوں کو نمی لگ گئی تھی اور زنگ کھا گیا ہے؛ وہ بھی اس ٹِلبری کی طرح زیادہ دور نہیں جا سکے گی۔یہ ٹوٹی پھوٹی عام قسم کی گاڑی ہے۔ان صاحب نے اگر اس پر بھروسا کیا تو بہت بڑی غلطی کریں گے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ساری بات صحیح تھی، مگر یہ چھکڑا، یہ ٹوٹی پھوٹی گاڑی، جو کچھ بھی تھی، وہ پہیوں کی گاڑی تھی اور Arras تک جا سکتی تھی۔

مسافر نے منہ مانگی رقم ادا کر دی؛ ٹِلبری کو مرمت کے لیے پہیہ ساز کے پاس چھوڑ دیا جسے واپس آ کر وصول کرنا تھا؛ سفید گھوڑے کو اس گاڑی میں جتوایا، اس میں سوار ہوا، اور اس سڑک پر واپس آ گیا جس پر صبح سے سفر کر رہا تھا۔

گاڑی کے چل پڑنے کے بعد اس نے [اپنے آپ سے] اعتراف کیا کہ ایک لمحہ قبل،

وہ اس خیال سے خوش ہو گیا تھا کہ اسے وہاں نہ جانا پڑے گا، جہاں اب جا رہا تھا۔اس نے اس خوشی کو ایک غضب کے طور پر دیکھا، اور اس کو ایک واہیات خیال تصور کیا۔اسے واپسی پر خوشی کیوں ہو؟ یہ سفر وہ بہر حال اپنی مرضی سے کر رہا تھا۔ کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا تھا۔

یقینی طور پر، جب تک وہ خود طے نہ کرے، کچھ نہیں ہوگا۔

Hesdin سے روانہ ہوتے ہی، اسے ایک آواز چلاتی سنائی دی: "ٹھہرو، ٹھہرو!" اس نے بڑی مشکل سے گاڑی روکی ۔روکنے کے اس عمل میں ،امید سے مشابہ، ایک بخار زدہ تشنجی عنصر بھی شامل تھا۔

وہ آواز بوڑھی عورت کے چھوٹے سے لڑکے کی تھی۔

"موسیو!" لڑکے نے کہا "وہ میں تھا جس نے آپ کو یہ گاڑی دلائی تھی۔"

"اچھا، تو پھر؟"

"آپ نے مجھے کچھ نہیں دیا۔"

اس کے نزدیک، جو ہر شخص کو دیا کرتا تھا، یہ طلب غیر ضروری تھی، بلکہ معیوب تھی۔

"اچھا، تو یہ تم ہو، اوباش انسان؟" اس نے کہا، "تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔"

اس نے گھوڑے کو چابک لگائی اور پوری رفتار سے روانہ ہو گیا۔

Hesdin میں اس کا بہت وقت ضائع ہو گیا تھا۔ وہ یہ نقصان پورا کرنا چاہتا تھا۔ گھوڑا بہت ہمتی تھا، دو سواری لے جا سکتا تھا؛ مگر یہ فروری کا مہینہ تھا، بارش بھی ہو چکی تھی، سڑکیں خراب تھیں ۔اور اب تو ٹلبری بھی نہیں تھی ۔یہ گاڑی بہت بھاری تھی، اس کے علاوہ راستے میں چڑھائیاں بھی بہت تھیں۔

Hesdin سے Saint-Pol تک سفر میں تقریباً چار گھنٹے لگے: پانچ لیگ میں چار گھنٹے!

Saint-Pol پہنچ کر پہلی سرائے کے قریب ہی اس نے گھوڑے کو گاڑی سے کھلوایا اور اصطبل کی طرف لے گیا؛ اسکا فلیر سے وعدے کے مطابق جب تک گھوڑا چارہ کھاتا رہا وہ منیجر کے ساتھ کھڑا رہا۔اس کے ذہن میں افسردہ اور الجھے خیالات آ رہے تھے۔

سرائے والے کی بیوی اصطبل میں آئی۔

"موسیو، کیا آپ ناشتا نہیں کریں گے؟"

"کیوں نہیں، ضروری ہے؛ مجھے تو بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

"پھر وہ عورت کے ساتھ روانہ ہو گیا، جس کا چہرہ گلابی اور شادمان تھا؛ عورت اسے

عام کمرے میں لے گئی جہاں موم جامے کے میز پوش سے بجی میزیں بچھی ہوئی تھیں۔

"جلدی کرو! مجھے فوراً روانہ ہونا ہے۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔"

بلجیم کی ولندیزی خادمہ نے تیزی سے اس کے لیے چھری کانٹا رکھا؛ وہ اس لڑکی کی طرف احساسِ تشفی سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا، یہ وجہ تھی جس کے باعث مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔" اس نے سوچا۔ "میں نے ناشتا نہیں کیا تھا۔"

ناشتا پیش کیا گیا؛ اس نے ڈبل روٹی اٹھائی، ایک لقمہ منہ میں لیا، اور آہستہ سے اسے واپس میز پر رکھ دیا، اور پھر اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

ایک اور میز پر بیٹھا ایک گاڑی بان ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے اس آدمی سے کہا، "یہاں کی ڈبل روٹی اتنی کڑوی کیوں ہے؟"

گاڑی بان جرمن تھا، اور اس کا لہجہ سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

مسافر واپس اصطبل کی طرف گیا اور گھوڑے کے ساتھ ہی رہا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے Saint-Pol چھوڑا، اور Tinques جانے والا راستہ اپنایا، جہاں سے Arras صرف پانچ لیگ کے فاصلے پر ہے۔

سفر کے دوران وہ کیا کر رہا تھا؟ کس بارے میں سوچ رہا تھا؟ صبح کی طرح، ایک بار پھر وہ درختوں، پھوس سے بنی چھتوں، بوئے ہوئے کھیتوں کو گزرتے دیکھ رہا تھا۔ ہر موڑ پر کس طرح پیش منظر کا سلسلہ ٹوٹ جایا کرتا ہے اور سب کچھ غائب ہو جاتا ہے؛ یہ ہے وہ تصور جو کبھی کبھی روح کے لیے کافی ہوتا ہے اور خیالات کے چنگل سے چھڑا دیتا ہے۔ ہزاروں اشیا کو پہلی اور آخری بار دیکھنے پر کم احساسِ افسردگی نہیں ہوتا۔ سفر کرنا، پیدا ہونے اور ہر لمحے موت سے ہم آغوش ہونے جیسا ہوتا ہے؛ شاید وہ اپنے ذہن کے مبہم ترین علاقے میں، گزرتے ہوئے افق اور انسانی وجود کا تقابل کر رہا تھا۔ زندگی کی تمام چیزیں ہمیشہ ہمارے سامنے فرار ہوتی رہتی ہیں؛ اندھیرے اور روشن وقفے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں؛ چکاچوند کے بعد، گرہن لگ جاتا ہے؛ ہم دیکھتے ہیں؛ ہم عجلت کرتے ہیں؛ ہم گزرتی چیزوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں؛ ہر واقعہ سڑک میں ایک موڑ کی مانند ہوتا ہے؛ اور ایکبارگی ہم بوڑھے ہو جاتے ہیں؛ ہمیں جھٹکا سا لگتا ہے؛ سب کچھ سیاہ ہو جاتا ہے؛ ہم کسی مبہم دروازے کی تلاش میں ہوتے ہیں؛ زندگی کا غم زدہ گھوڑا جو ہمیں کھینچتا رہتا تھا، رُک جاتا ہے، اور ایک نامعلوم نقاب پوش دکھائی دیتا ہے جو

اندھیرے میں ہمیں زندگی کی گاڑی کے ساز و سامان سے علاحدہ کر دیتا ہے۔

شام ہو رہی تھی، بچے اسکول سے نکل رہے تھے جب انھوں نے اس مسافر کو Tinques میں داخل ہوتے دیکھا تھا؛ یہ سچ ہے کہ دن ابھی چھوٹے تھے؛ وہ Tinques میں رُکا نہیں؛ گاؤں سے نکلا تو ایک مزدور نے، جو پتھروں سے سڑک کی مرمت کر رہا تھا، اپنا سر اٹھایا اور اس سے کہا، ''تمھارا گھوڑا بہت تھک گیا ہے۔''

بے چارہ جانور، دراصل، اب صرف چل رہا تھا۔

''کیا تم Arras جا رہے ہو؟'' مزدور نے مزید کہا۔

''ہاں۔''

''اگر تم اسی رفتار سے چلتے رہے تو بہت صبح نہیں پہنچ سکو گے۔''

اس نے گھوڑا روک لیا اور مزدور سے پوچھا، ''Arras یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''تقریباً سات لیگ کے برابر۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈاک والوں کے نشان کے مطابق تو یہ فاصلہ سوا پانچ لیگ ہے۔''

''ہنہہ!'' جواب میں مزدور نے کہا، ''کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ سڑک کی مرمت ہو رہی ہے؟ پندرہ منٹ بعد آگے سڑک بند ہوگی۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔''

''واقعی؟''

''سڑک پر بائیں جانب چلنا؛ جو تمھیں Carency لے جائے گی؛ دریا پار کرنا؛ جب Camblin پہنچو تو دائیں جانب مُڑ جانا؛ وہی Mont-Saint-Eloy جانے والی سڑک ہے جو تمھیں Arras لے جائے گی۔''

''مگر اب تو رات ہو گئی ہے، میں بھٹک جاؤں گا۔''

''کیا تم اس علاقے کے نہیں ہو؟''

''نہیں۔''

''اور اس کے علاوہ، آگے تمام چوراہے ہیں جناب، رُک جایئے۔'' مزدور کہہ رہا تھا ''ایک مشورہ دوں؟ آپ کا گھوڑا تھک گیا ہے؛ Tinques واپس جایئے؛ وہاں ایک اچھی سے سرائے ہے؛ وہاں آرام کیجیے؛ آپ کل ہی Arras پہنچ سکتے ہیں۔''

''مجھے تو آج شام وہاں ہونا ہے۔''

''وہ الگ بات ہے؛ سرائے میں جایئے، ایک فالتو گھوڑا لیجیے؛ اصطبل والا آپ کو

چوراہوں کے بارے میں مشورے فراہم کر دے گا۔"

اس نے سڑک کے مزدور کے مشورے پر عمل کیا، الٹے پاؤں واپس گیا، اور آدھ گھنٹے بعد وہ اسی جگہ سے گزر رہا تھا، مگر اس بار پوری رفتار سے، ایک تازہ دم گھوڑے کی مدد سے؛ ایک اصطبل والا جو خود کو کوچوان کہتا تھا، گاڑی کے آگے، بم کے ڈنڈے پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس کے باوجود اسے احساس تھا کہ وقت ضائع ہوا ہے۔

رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔

"وہ چوراہے پر مڑے؛ راستہ بہت خراب ہو گیا تھا؛ گاڑی دائیں بائیں جھک رہی تھی؛ اس نے کوچوان سے کہا،" دُلکی چلتے رہو، تمھاری فیس دُگنی ہو گی۔"

لگنے والے جھٹکوں میں سے ایک جھٹکے میں گاڑی کا whiffle-tree ٹوٹ گیا۔

"جناب والا، whiffle-tree ٹوٹ گیا ہے۔" کوچوان نے کہا،"پتا نہیں، اب میں گھوڑے کو گاڑی میں کیسے جوتوں گا؛ رات کے وقت یہ سڑک بہت خراب ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو ہم واپس Tinques چلتے ہیں، اور وہیں آرام کرتے ہیں؛ ہم کل صبح سویرے Arras پہنچ سکتے ہیں۔"

"تمھارے پاس رسی اور چاقو ہے؟" جواب میں اس نے کہا۔

"جی ہاں۔"

مسافر نے قریبی درخت سے ایک شاخ کاٹی اور اس سے whiffle-tree بنا لیا۔

اس میں مزید بیس منٹ ضائع ہو گئے؛ وہ ایک بار پھر دُلکی چل پڑے تھے۔

میدان بھیانک ہو رہا تھا؛ سیاہ، نچلی سطح کے کہرے کے بادل دھوئیں کی طرح پہاڑیوں پر لہرا رہے تھے؛ بادلوں سے سفیدی مائل روشنی نکل رہی تھی؛ سمندر سے آنے والی تیز ہوائیں افق پر ہر طرف ایسی آوازیں پیدا کر رہی تھیں جیسے کوئی فرنیچر ہٹا رہا ہو؛ ہر دکھائی دینے والی شے خوف کی مظہر تھی۔ رات کی پہنائیوں میں کیسی کیسی چیزیں کانپتی ہیں۔

وہ سردی سے اکڑ رہا تھا؛ پچھلی رات کے بعد سے اس نے کچھ کھایا نہیں تھا؛ اسے D کے علاقے کے میدانوں میں راتوں کے سفر کے مبہم خیالات آ رہے تھے، جو آٹھ برس پہلے ہوئے تھے مگر کل کی بات معلوم ہوتے تھے۔

ایک دور کے گھنٹا گھر سے گھنٹا بجنے کی آواز آئی؛ اس نے لڑکے سے پوچھا،"کیا وقت ہوا ہے؟"

"صبح کے سات بجے ہیں جناب؛ ہم آٹھ بجے تک Arras پہنچ جائیں گے؛ بس تین لیگ کا سفر باقی رہ گیا ہے۔"

اس وقت، پہلی بار اس نے سوچنا شروع کیا، جس پر اس نے پہلے غور نہیں کیا تھا: تمام پریشانیاں جو یہ اٹھا رہا ہے، شاید بے کار ہی جائیں گی؛ اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس کی آزمائش کب شروع ہوگی؛ اس نے کم از کم خود کو بتا تو دیا ہوتا؛ وہ اتنا احمق تھا کہ اس طرح سیدھا چلا جا رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ وہ کسی کام آئے گا بھی کہ نہیں، پھر اس نے دل ہی دل میں کچھ تیاریاں کر لیں؛ کہ عام طور پر Assizes کی عدالتیں نو بجے صبح لگتی ہیں؛ کہ یہ کوئی طوالتی معاملہ نہیں ہوگا؛ سیب کی چوری کے معاملے پر زیادہ وقت نہیں لگے گا؛ وہاں معاملہ صرف شناخت کا ہوگا، چار یا پانچ گواہیاں ہوں گی؛ وکیلوں کو زیادہ کہنا نہیں پڑے گا؛ کہ اسے ایسے وقت پہنچنا چاہیے جب سب کچھ ہو چکا ہو۔

کوچوان نے گھوڑوں کو چابک لگائی؛ وہ دریا پار کر چکے تھے اور Saint- Mont- Eloy پیچھے رہ گیا تھا۔

رات کی سیاہی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

۞

سسٹر سمپلیس کا امتحان

مگر اس وقت فانتین بہت خوش تھی۔

اس نے بہت مشکل سے رات گزاری تھی؛ کھانسی خوف ناک حد تک بڑھ گئی تھی؛ بخار کی شدت دُگنی ہو گئی تھی؛ اس کو خواب آرہے تھے؛ صبح کے وقت جب ڈاکٹر دیکھنے آیا تھا وہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گیا، اور حکم دیا کہ جیسے ہی موسیو میدلین واپس آتے ہیں، اس کو اطلاع دی جائے۔

صبح کے وقت وہ افسردہ تھی، بہت کم بات کی، اپنے بستر کی چادروں میں شکنیں ڈالتی رہی، ساتھ ہی دھیمی آواز میں کچھ بڑبڑاتی جا رہی تھی، کچھ حساب کر رہی تھی جو فاصلے کے حسابات معلوم ہوتے تھے۔ اس کی خالی خالی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے بالکل بجھ جاتیں، پھر روشن ہونے لگتیں، اور ستاروں کی طرح چمکتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب بُرا وقت آنے لگتا ہے، جو لوگ زمین کی روشنی چھوڑنے والے ہوتے ہیں ان میں جنت کا نور بھر جاتا ہے۔

ہر بار جب سسٹر سمپلیس اس کی خیریت دریافت کرتی تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا، ”میں موسیو میدلین سے ملنا چاہتی ہوں۔“

کچھ مہینے قبل جب اس نے آخری بار اپنی حیا کھوئی تھی، اپنی شرمندگی کھوئی تھی، اور اپنی خوشی کھوئی تھی، وہ اپنے وجود کی پرچھائیں بن کر رہ گئی تھی۔ اب وہ خود اپنا آسیب بن گئی تھی۔ جسمانی دکھ نے اخلاقی دکھ کا کام پورا کر دیا تھا۔ پچیس برس کی اس مخلوق کے ابرو شکن آلود ہو گئے تھے؛ رخسار ڈھل گئے تھے؛ نتھنے سکڑ گئے تھے؛ دانت تھے مگر مسوڑھے ڈھل گئے تھے؛ رنگ سیسے جیسا ہو گیا تھا؛ گردن ہڈیوں کی مالا ہو گئی تھی؛ کاندھے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں؛ دست و پا

کم زور ہو گئے تھے؛ جلد مٹی کے رنگ کی ہو گئی تھی اور اس کے سنہرے بالوں میں چاندی بکھر گئی تھی۔افسوس! بیماری بڑھاپا ایجاد کر دیتی ہے۔

دو پہر کے وقت ڈاکٹر واپس آیا، کچھ احکام جاری کیے، معلوم کیا کہ مسٹر شفا خانے آیا تھا یا نہیں، اور اپنا سر ہلا دیا تھا۔

میدیلن عام طور پر اس مریض کو دیکھنے تین بجے سہ پہر آیا کرتا تھا۔چوں کہ وقت کی پابندی مہربانی ہوتی ہے، وہ وقت کا پابند تھا۔

تقریباً دو بجے، فانتین بے چین ہونے لگی۔بیس منٹ کے اندر اس نے راہبہ سے دس بار پوچھا تھا، "بسسٹر، کیا وقت ہوا ہے؟"

گھڑی نے تین بجائے۔تیسرے گھنٹے پر فانتین بستر پر اٹھ بیٹھی؛ اس نے، جو بڑی مشکل سے کروٹ بدل سکتی تھی، گوشت سے عاری اپنے زرد ہاتھ ایک تشنج کی کیفیت میں باندھ لیے، اور راہبہ نے اس کی سب سے گہری سانس کی آواز سنی، جس سے لگا کہ وہ اپنی اداسی کو اتار پھینکنا چاہتی تھی۔پھر فانتین مڑی اور دروازے کی طرف دیکھا۔

نہ کوئی دروازے سے داخل ہوا؛ نہ دروازہ کھلا۔

پندرہ منٹ تک وہ اسی حالت میں رہی، اس کی آنکھیں دروازے پر گڑی رہیں، ساکت اور بظاہر سانس رکی رہی۔بسسٹر کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔گھڑی نے سوا تین بجائے۔فانتین تکیے پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

فانتین نے کچھ نہیں کہا، بس ایک بار پھر اپنے بستر کی چادر میں شکنیں بنانے لگی تھی۔

آدھا گھنٹا گزر گیا؛ پھر ایک گھنٹا گزرا، کوئی نہیں آیا؛ ہر بار جب گھڑی کا گھنٹا بجتا، فانتین اٹھتی، دروازے کی طرف دیکھتی، اور واپس بستر پر گر جاتی۔اس کی سوچ قابلِ فہم تھی، اس نے کسی کو الزام نہیں دیا۔مگر وہ بہت اداس انداز میں کھانس رہی تھی۔اسے دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ اس پر سیاہی سی چھا رہی تھی۔اس کا رنگ سیسے جیسا ہو گیا تھا، اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی۔

گھڑی نے پانچ بجائے۔تب بسسٹر نے اسے، بہت دھیمی اور نرم آواز میں کہتے سنا تھا، "اس نے آج نہ آ کر غلطی کی ہے، اس لیے کہ میں کل جانے والی ہوں۔"

موسیو میدیلن کے نہ آنے پر بسسٹر ہمپلیس بھی حیران تھی۔

اس دوران فانتین کی نظریں بستر پر لگے شامیانے پر گڑی ہوئی تھیں۔ایسا معلوم ہوتا

تھا گویا وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک اس نے سانس جیسی کم زور آواز میں گانا شروع کر دیا۔ رابعہ سن رہی تھی۔ یہ تھا وہ گانا جو فائتیں گا رہی تھی:

اچھے اچھے کھیل کھلونے لائیں گے
شہر کے باہر ہم سب گھومنے جائیں گے
پھول گلابی، نیلے نیلے، مکئی کے پھول
میری پیاری، پیاری میری
نیلے نیلے مکئی کے پھول

پچھلے دنوں کنواری مریم، کشیدہ کاری سے مزین جُبّہ پہنے میرے اسٹوو کے قریب آئی اور مجھ سے کہا، 'میرے نقاب تلے اس بچے کو چھپا دو جو تم مجھ سے مانگ کر لائے تھے۔ جلد شہر جاؤ، کپڑے خریدو، سوئی خریدو، دھاگا خریدو۔'

اچھے اچھے کھیل کھلونے لائیں گے
شہر کے باہر ہم سب گھومنے جائیں گے

'پیاری مقدس کنواری! اپنے اسٹوو کے برابر میں نے ایک پالنا رکھ دیا ہے جس میں رِبن لگے ہوئے ہیں۔ خدا مجھے اپنا سب سے پیارا ستارہ عطا فرمائے، مجھے وہی بچے پسند ہیں جو تم نے مجھے عطا کیے تھے۔ مادام، میں یہ نفیس کپڑا کیا کروں؟ تمھارے نو زائیدہ بچے کے لیے کپڑے بناؤں۔'

پھول گلابی، نیلے نیلے، مکئی کے پھول
میری پیاری، پیاری میری
نیلے نیلے مکئی کے پھول

'اس کپڑے کو دھوئے — کہاں؟ — چشمے میں۔ اسے گندہ نہ کر دینا، خراب نہ کر دینا، اس سے ایک اچھا سا چھوٹا کوٹ اور اس کی انگیا بناؤ، جس پر میں کشیدہ کاری کر دوں گی، اور اسے پھولوں سے بھر دوں گی۔' 'مادام بچہ اب تو یہاں نہیں ہے: اب کیا کرنا ہوگا؟' — تو اس سے کفن بناؤ، میرے دفن کے لیے۔'

اچھے اچھے کھیل کھلونے لائیں گے
شہر کے باہر ہم سب گھومنے جائیں گے
پھول گلابی، نیلے نیلے، مکئی کے پھول
میری پیاری، پیاری میری

نیلے نیلے مکئی کے پھول

یہ گیت پالنے کا قدیم رومان تھا، جس سے وہ کوزیٹ کو سُلانے کے لیے لوری کی صورت سنایا کرتی تھی۔ اسے اس امر کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی بچی سے پچھلے پانچ برسوں سے علاحدہ ہے۔ وہ بڑے غمگین انداز میں گایا کرتی تھی، جو اس ماحول میں اتنا اچھا لگتا تھا، جس کو سن کر ہر کوئی، حتیٰ کہ راہبہ بھی رو پڑتی تھی۔ بسنز کو بھی، جو سادگی کی عادی تھی، اپنی آنکھوں میں آنسو آتا محسوس ہونے لگتا تھا۔

صبح چھ کا گھنٹا بج گیا۔ شاید فانتین نے سنا بھی نہیں۔ اب اسے کسی بات کی پروا محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔

بسنز ہمپلیس نے ایک خادمہ کو کارخانے کی دربان عورت کے پاس بھیجا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میئر واپس آیا کہ نہیں؛ کہ وہ جلد ہی شفا خانے آئے گا یا نہیں۔ چند منٹ کے اندر لڑکی واپس آ گئی۔

فانتین بے سدھ پڑی اپنے خیالات میں مگن تھی۔

خادمہ نے بسنز ہمپلیس کو بہت دھیمی آواز میں بتایا کہ میئر ایک دن قبل چھ بجے صبح چھوٹی سی ایک ٹمبری میں، جس میں سفید رنگ کا گھوڑا بندھا ہوا تھا، کہیں گیا تھا؛ کہ وہ اکیلا ہی گیا تھا، اس کے ساتھ کوئی کوچوان بھی نہیں تھا؛ کسی کو علم نہیں کہ وہ کس راستے سے گیا تھا؛ کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ وہ Arras جانے والی سڑک پر مڑا تھا؛ کچھ نے کہا کہ ان کی اس سے پیرس جانے والے سڑک پر ملاقات ہوئی تھی۔ جس وقت وہ گیا تھا، عادت کے مطابق بہت مہربان تھا۔ اس نے دربان عورت کو صرف اتنا بتایا تھا کہ رات گئے تک واپس آنے کی توقع تھی۔

جس وقت وہ دونوں عورتیں آپس میں سرگوشی کر رہی تھیں، ان کی پشت فانتین کے بستر کی طرف تھی؛ بسنز سوال کر رہی تھی اور خادمہ قیاسی جواب دے رہی تھی۔ بخار زدہ خوش دلی جو کچھ بیماریوں کی نامیاتی خصوصیت ہوتی ہے، صحت کی حرکات اور موت کی خوف ناک لاغری کو یک جا کر دیتی ہے۔ فانتین، گھٹنوں کے ذریعے بستر سے بلند ہو کر اپنے سوکھے ہاتھوں کے سہارے پردے سے باہر اپنا سر نکالے سب کچھ سُن رہی تھی۔ اچانک اس نے چلانا شروع کر دیا:

"تم لوگ موسیو میڈلین کے بارے میں بات کر رہی ہو؟ اتنی رازداری میں کیوں بات کر رہی ہو؟ وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ آتا کیوں نہیں؟"

اس کی آواز اتنی بھاری اور عجیب سی ہو گئی تھی کہ دونوں عورتیں سمجھیں کہ کوئی مرد بول

رہا ہے؛ وہ دہشت زدہ ہو کر بولیں۔

"جواب دو؟" فانتین نے چیخ کر کہا۔

خادمہ ہکلانے لگی، "دربان نے بتایا ہے کہ وہ آج نہیں آسکے گا۔"

"اطمینان رکھو، بچی،" سسٹر نے کہا، "لیٹ جاؤ۔"

اپنے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی کیے بغیر، اور ایسے لہجے میں جو منہ زور بھی تھا اور دل خراش بھی، بولتی رہی، "وہ کیوں نہیں آسکتا؟ کیوں نہیں؟ تم کو سب معلوم ہے۔ تم آپس میں سرگوشی کیوں کر رہی ہو؟ میں وجہ جاننا چاہتی ہوں۔"

خادمہ نے جلدی سے سسٹر کے کان میں کہا، "کہہ دو کہ وہ سٹی کاؤنسل میں مصروف ہے۔"

سسٹر سمپلیس شرما گئی، اس لیے کہ خادمہ کا مشورہ جھوٹ پر مبنی تھا۔

اس کے علاوہ، سسٹر نے سوچا کہ معذور مریض کو محض سچ بتا دینے سے اس کو خوف ناک جھٹکا لگے گا، اور فانتین کی زندگی کی موجودہ حالت کے لیے یہ معاملہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس کی شرمندگی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی؛ سسٹر نے فانتین کی طرف اپنی پُرسکون، افسردہ آنکھیں کرتے ہوئے کہا، "موسیو میئر شہر سے باہر گئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی فانتین اپنی ایڑیوں کے بل بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں؛ اس کے افسردہ چہرے پر ایک ناقابلِ بیان خوشی سی پھیل گئی۔

"گئے ہیں؟" اس نے چیخ کر کہا، "کوزیت کو لینے گئے ہیں۔"

پھر اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے؛ اس کا چہرہ ناقابلِ بیان حد تک سُرخ ہو گیا تھا؛ اس کے ہونٹ حرکت کرنے لگے تھے؛ وہ دھیمی آواز میں دعائیں مانگ رہی تھی۔

دعا ختم ہوئی تو اس نے کہا، "سسٹر، میں لیٹنا چاہتی ہوں؛ اب وہی کروں گی جو تم کہو گی؛ میں ذرا شریر ہو گئی تھی؛ تم سے معافی چاہتی ہوں کہ میں نے اتنی زور سے بات کی تھی۔ زور سے بولنا بہت بری بات ہوتی ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں، پیاری سسٹر، مگر تم دیکھ سکتی ہو کہ میں کتنی خوش ہوں؛ کہ میرا اچھا خدا بہت مہربان ہے؛ میڈلین کتنا اچھا آدمی ہے؛ ذرا سوچو تو — وہ میری ننھی کوزیت کو لینے Montfermeil گیا ہے۔"

وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گئی، راہبہ نے اس کی مدد کی، اس کا تکیہ ٹھیک کیا اور فانتین نے گلے میں پڑی چھوٹی سی نقرئی صلیب کو چوم لیا، جو سسٹر سمپلیس نے اسے تحفے میں دی تھی۔

"بچی!" سسٹر نے کہا، "آرام کرو، بہت بات نہ کرو۔"

فانتین نے اپنے نم ہاتھوں میں بسٹر کے ہاتھ تھام لیے۔ بسٹر کو اس کا پسینہ محسوس کر کے دکھ ہوا۔

"وہ آج صبح پیرس کے لیے نکلا ہے؛ دراصل اسے پیرس کے راستے جانے کی ضرورت ہی نہیں؛ تم اِدھر سے جاؤ تو Montfermeil بائیں جانب پڑتا ہے۔ یاد ہے نا! کل جب میں نے کوزیت کے بارے میں بات کی تھی تو اس نے مجھ سے کہا تھا 'جلد، بہت جلد'۔ شاید وہ مجھے حیران کرنا چاہتا ہے؛ تمھیں پتا ہے کہ اس نے مجھ سے ایک خط پر دستخط کرائے تھے تا کہ کوزیت کو تین آردیے سے واپس لایا جاسکے۔ اب وہ کوئی بہانہ نہیں کر سکیں گے؛ کیا خیال ہے تمھارا؟ انھیں کوزیت واپس دینی پڑے گی اس لیے کہ انھیں اجرت دی جا چکی ہے؛ سرکار ان کو بچی کو رکھنے کی اجازت نہیں دے گی؛ اس لیے کہ ان کو اجرت ادا کی جا چکی ہے۔ مجھے اشارے نہ کرو بسٹر، کہ مجھے بات نہیں کرنی چاہیے؛ میں بہت خوش ہوں؛ میں اب ٹھیک ہو رہی ہوں؛ میں اب بالکل بیمار نہیں ہوں؛ میں کوزیت سے ملوں گی؛ اس وقت تو مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کوزیت کو دیکھے ہوئے پانچ برس ہو چکے ہیں۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ ماں کو بچوں سے کتنا پیار ہوتا ہے، اور وہ تو بہت خوب صورت بھی ہے؛ دیکھ لینا! کاش تم اس کی پیاری پیاری انگلیاں دیکھ سکتیں! سب سے پہلے تو، اب اس کے ہاتھ بہت خوب صورت ہوں گے؛ جب وہ ایک برس کی تھی اس کے ہاتھ اچھے نہیں لگتے تھے؛ اسی طرح کے تھے۔ اب وہ بڑی لڑکی ہے؛ سات برس عمر ہے اس کی؛ وہ تو اب ایک نوجوان لڑکی ہو گی؛ میں اسے کوزیت کہہ کر بلاتی ہوں، مگر اس کا اصل نام یوفرازی ہے۔ ذرا ٹھہرو! آج صبح میں چمنی پر پڑی گرد دیکھ رہی تھی، اور مجھے کچھ خیال سا آیا تھا کہ میں جلد ہی کوزیت سے ملوں گی۔ خدایا! کیا یہ ظلم نہیں کہ ماں اپنے بچوں کو برسوں دیکھ نہ پائے۔ زندگی ابدی نہیں ہوتی۔ اور کتنا اچھا ہوا کہ موسیو میئر خود گئے ہیں۔ سردی کا زمانہ ہے نا! انھوں نے کم از کم اپنا کوٹ ضرور پہنا ہوگا؟ وہ کل واپس آجائیں گے، ہے نا؟ کل جشن کا دن ہوگا؛ کل صبح بسٹر مجھے یاد دلانا، میں اپنی وہ ٹوپی پہنوں گی جس پر لیس لگی ہے۔ کیا جگہ ہے Montfermeil بھی۔ میں نے وہ سفر پیدل ہی کیا تھا، پہلی بار گیا تھا۔ میرے لیے وہ سفر بہت طویل ہو گیا تھا، مگر جاں فشانی ہو تو سب کچھ جلد ہو جاتا ہے۔ وہ کل صبح یہاں کوزیت کے ساتھ موجود ہوں گے: یہاں سے Montfermeil کا کتنا فاصلہ ہوگا؟"

بسٹر نے، جسے فاصلوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا، جواب میں کہا، "اوہ! میرا خیال ہے کہ وہ کل تک آجائیں گے۔"

"کل — کل!" فانتین کہہ رہی تھی، "میں کل کوزیت کو دیکھوں گی! دیکھو نا، میری اچھی سسٹر، میرے خدا! اب میں بالکل بیمار نہیں؛ میں پاگل ہو رہی ہوں۔ اگر کوئی کہے تو میں رقص بھی کر سکتی ہوں۔"

اگر کسی نے اسے پندرہ منٹ پہلے دیکھا ہو تو اسے اس تبدیلی پر یقین نہیں آئے گا۔ وہ اب گلابی ہو رہی تھی؛ اپنی زندہ دل فطری آواز میں باتیں کر رہی تھی؛ اس کا پورا چہرہ متبسم تھا؛ اب وہ باتیں کر رہی تھی، ہنس رہی تھی؛ ماں کی خوشی بالکل بچگانہ خوشی ہوتی ہے۔

"اچھا" راہبہ نے کہا "اگر اب تم خوش ہو تو میرا کہا مانو، اب مزید بات نہ کرو۔"

فانتین نے تکیے پر سر رکھ دیا اور دھیمی آواز میں خود سے بولی، "ہاں، لیٹ جاؤ، آرام کرو، اس لیے کہ تمھاری بچی آنے والی ہے۔ سسٹر سمپلیس ٹھیک کہتی ہے؛ یہاں ہر ایک ٹھیک ہے۔"

اور پھر بغیر کوئی حرکت کیے، بغیر سر ہلائے، کھلی آنکھوں اور خوش دلی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔

سسٹر نے پردہ کھینچ دیا، اس اُمید پر کہ وہ سو جائے گی۔ سات اور آٹھ بجے کے درمیان ڈاکٹر آیا؛ کوئی آواز نہیں سنی، تو سمجھا کہ فانتین سو رہی ہے۔ پنجوں کے بل چلتا اس کے بستر کے پاس پہنچا، پردہ تھوڑا سا سرکایا؛ فانتین اپنی بڑی بڑی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اسے میرے پاس، ایک چھوٹے سے بستر میں، سونے کی اجازت ہوگی، کیوں جناب؟"

ڈاکٹر سمجھا کہ وہ بہک رہی ہے۔ فانتین نے مزید کہا "دیکھو نا، یہاں کافی جگہ ہے۔"

ڈاکٹر سسٹر سمپلیس کو ایک طرف لے گیا، سسٹر سمپلیس نے اس کو سب کچھ بتا دیا؛ کہ موسیو میدلین ایک دو دن سے غیر حاضر ہے؛ ان کے خیال میں معذور کو سچ بتا دینا مناسب نہیں تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ Montfermeil گئے ہیں؛ ممکن ہے کہ قیاس درست ہو: ڈاکٹر نے اتفاق کیا۔

وہ فانتین کے پلنگ کی طرف واپس آیا، تو اس نے بات شروع کر دی:

"جب وہ صبح کو اٹھے گی، میں اس بے چاری کو صبح بخیر کہہ سکوں گی، اور جب رات کو میں نہیں سو سکتی، اور میں اس کے سونے کی آوازیں سنتی رہتی ہوں؛ اس کی ہلکی ہلکی سانس کی آواز سن کر مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"مجھے اپنا ہاتھ دو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اس نے اپنے بازو پھیلائے، اور زور زور سے ہنسنے لگی، "اوہ، پکڑو نا تمھیں پتا بھی

نہیں؛ میں صحت یاب ہو چکی ہوں؛ کوزیت کل صبح آنے والی ہے۔"

ڈاکٹر یہ سب دیکھ کر حیران ہو رہا تھا؛ واقعی وہ بہت بہتر تھی؛ اس کے سینے کا دباؤ بہت کم ہو گیا تھا؛ اس کی نبض میں قوت آ گئی تھی؛ اچانک اس میں ایک نوع کی زندگی عود کر آئی تھی؛ اور اس کا بد قسمت، ناتواں وجود دوبارہ متحرک ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر!" وہ کہے جا رہی تھی، "کیا سسٹر نے تمھیں بتایا ہے کہ موسیو میئر اس ننھی سی گڑیا کو لانے گئے ہیں؟"

ڈاکٹر نے اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا، اور یہ بھی کہ ہر قسم کے درد انگیز جذبات سے پرہیز کیا جائے؛ اس نے سنکونا کی چھال کا جوشاندہ تجویز کیا، اور اگر رات میں پھر بخار تیز ہو تو ایک خوراک اور پلا دی جائے۔ ڈاکٹر نے جاتے وقت سسٹر سے کہا:

"اس کا حال بہتر ہو رہا ہے؛ قسمت اچھی ہوئی تو کل صبح بچی سمیت میئر آ جائے گا، کون جانے؟ ایسے حیرت انگیز واقعات ہوتے رہتے ہیں؛ دیکھا گیا ہے کہ بڑی خوشیاں بیماریوں کو بڑھنے سے روک دیا کرتی ہیں؛ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک نامیاتی عارضہ ہے، اور بڑھا ہوا ہے، مگر یہ سب عجیب اسرار ہوا کرتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ ہم اسے بچا لیں۔

۞

واپسی کے لیے احتیاط

شام کے آٹھ بجنے والے تھے جب گاڑی، جسے ہم نے سڑک پر چھوڑا تھا، Arras کے Hotel de la Poste کے برآمدے میں داخل ہوئی، اور وہ شخص، اس وقت تک ہم جس کے بارے میں بات کررہے تھے گاڑی سے برآمد ہوا۔ سرائے والوں کے تپاک کا جواب دیا، فالتو گھوڑے کو واپس روانہ کیا، سفید گھوڑے کو خود اصطبل لے گیا؛ پھر اس نے بلیرڈ کے کمرے کا دروازہ کھولا، جو زمینی منزل پر واقع تھا، وہاں بیٹھ گیا۔ اپنی کہنیاں بلیرڈ کی میز پر ٹکا دیں؛ جس سفر کو چھ گھنٹے میں طے ہونا تھا اس کو چودہ گھنٹے لگ گئے تھے؛ اس نے یہ کہہ کر، کہ یہ اس کی غلطی نہیں تھی، اپنے ساتھ انصاف کیا، اور واقعی وہ شرمندہ نہیں تھا۔

ہوٹل کی مالکن کمرے میں داخل ہوئی۔

''موسیو کو بستر چاہیے؟ کیا موسیو کو رات کا کھانا چاہیے؟''

اس نے سر کے اشارے سے انکار کر دیا۔

''اصطبل والا کہہ رہا ہے کی موسیو کا گھوڑا بہت خستہ ہو گیا ہے۔''

بالآخر اس نے اپنی خاموشی توڑی۔

''کیا گھوڑا کل صبح تک اس قابل نہیں ہوگا کہ روانہ ہو سکے؟''

''موسیو، اسے کم از کم دو دن آرام کے درکار ہوں گے۔''

اس نے پوچھا، ''کیا یہاں قریب کوئی ڈاک خانہ نہیں؟''

''ہے، جناب!''

میزبان خاتون اسے دفتر میں لے گئی؛ اس نے اپنا پاسپورٹ دکھایا، اور معلوم کیا کہ ایسا

کوئی طریقہ ہے کہ وہ اسی رات واپس ڈاک گاڑی کے ذریعے M. sur M واپس پہنچ سکے؟ اتفاق سے ڈاکیے کے ساتھ والی ایک نشست خالی تھی؛ اس نے وہ نشست اپنے لیے مخصوص کرالی اور کرایہ ادا کر دیا۔ کلرک نے کہا، "موسیو، وقت پر آ نا نہ بھولیے گا۔ گاڑی صبح کے ٹھیک ایک بجے روانہ ہو جائے گی۔"

اس کے بعد وہ ہوٹل سے چلا گیا اور شہر میں گھومنے پھرنے لگا۔

اسے Arras سے زیادہ واقفیت نہیں تھی، بس یوں ہی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ شاید اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی گزرنے والے سے راستہ نہیں پوچھے گا۔ اس نے Crinchon t می دریا پار کیا، اور خود کو تنگ گلیوں کی بھول بھلیاں میں پایا، جہاں پہنچ کر راستہ بھول گیا۔ وہیں کا ایک باشندہ ہاتھ میں لالٹین لیے پاس سے گزرا۔ کچھ دیر تامل کے بعد اس نے اس شخص سے دریافت کرنے کا فیصلہ کر لیا، مگر پہلے اِدھر اُدھر دیکھ کر اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ اس کا سوال کوئی اور سن نہ لے۔

"موسیو!" اس نے کہا "مہربانی کر کے بتایئے کی عدالت کی عمارت کدھر ہے؟"

"آپ یہاں کے رہنے والے نہیں معلوم ہوتے، جناب؟" بوڑھوا نے جواب دیا، جو ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ "اچھا، آپ میرے ساتھ آیئے۔ اتفاق سے میں بھی عدالت ہی کی طرف جا رہا ہوں، یعنی پریفیکچر کے ہوٹل کی طرف، اس لیے کہ عدالت میں مرمت کا کام ہو رہا ہے، اور عدالتیں اپنی نشستیں عارضی طور پر پریفیکچر میں کر رہی ہیں۔"

"کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں Assizes کے اجلاس ہو رہے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ آج کا پریفیکچر انقلاب سے پہلے بشپ کا محل تھا۔ موسیو de Conzie نے، جو 82' میں بشپ تھے، محل میں ایک بڑا سا ہال تعمیر کرایا تھا۔ اسی عظیم الشان ہال میں آج کل عدالتیں لگ رہی ہیں۔" راستے میں بوڑھوا نے کہا

"اگر موسیو کسی مقدمے میں شریک ہونا چاہتے ہیں، تو خاصی دیر ہو چکی ہے۔ عدالتیں عام طور پر چھ بجے اٹھ جاتی ہیں۔"

بہر حال، جب وہ بڑے چوراہے پر پہنچے، تو اس آدمی نے چار لمبی کھڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو ایک بڑی بے رونق سی عمارت کے سامنے تھیں، اور سب روشن تھیں۔

"جناب، میری مانیے تو کہوں کہ آپ اچھے موسم میں نہیں آئے ہیں۔ کیا آپ ان کھڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں؟ وہی Assize کی عدالت ہے۔ وہاں روشنی ہو رہی، اس کا مطلب ہے کہ ابھی عدالت برخاست نہیں ہوئی ہے۔ معاملہ طول پکڑ گیا ہوگا، اور شاید عدالتیں دیر تک کھلی رہیں گی۔ کیا آپ ان معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ کیا آپ کا مقدمہ فوج داری کا ہے؟ کیا آپ گواہ ہیں؟"

اس نے جواب میں کہا، ''میں کسی معاملے میں نہیں آیا ہوں؛ مجھے صرف ایک وکیل سے بات کرنی ہے۔''

''وہ الگ بات ہے۔'' بوڑھا نے کہا، ''ٹھہریے جناب؛ وہ ہے دروازہ جہاں سنتری کھڑا ہے۔ آپ کو صرف مرکزی سیڑھیاں چڑھنی ہوں گی۔''

اس نے بوڑھا کے کہنے پر عمل کیا، چند منٹ بعد وہ ہال میں موجود تھا جس میں بہت سے آدمی جمع تھے، جہاں وکیل حضرات سیاہ بالاپوش میں ملبوس، ادھر ادھر گھوم رہے تھے، آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

سیاہ بالاپوش میں ملبوس لوگوں کے اجتماعات بہت دل خراش ہوتے ہیں، جو عدالتوں کی دہلیز پر دھیمی آوازوں میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کا نتیجہ کسی قسم کی بھلائی یا رحم دلی ہو۔ عام طور پر ان کا نتیجہ قبل از وقت ملامت کا بیان ہی ہوا کرتا ہے۔ ایسے تمام گروہ، غور و فکر کرنے والے مشاہد کو ایسے بے شمار خانہ ہائے زنبور کی طرف بھیج دیتے ہیں جہاں بھن بھن کرتے جذبات ایک ساتھ مل کر، ہر قسم کے شبہات کے چھتے تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

یہ کشادہ ہال، جو صرف ایک واحد لیمپ سے روشن تھا، بشپ کے محل کا پرانا تالار تھا، اور عدالتی اجتماعات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ دو پٹوں کا دروازہ، جو اس وقت بند تھا، اس کو ایک بڑی سی قیام گاہ سے الگ کرتا تھا، جہاں عدالت کی نشست ہو رہی تھی۔

ایسا دھندلا ماحول تھا کہ اسے پہلے ہی وکیل سے ہم کلام ہونے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔

''جناب، وہ لوگ کہاں تک پہنچے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ختم ہو گیا ہے۔'' وکیل نے جواب میں کہا۔

''ختم ہو گیا ہے؟''

یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے گئے تھے کہ وکیل اس کی طرف مڑا۔ ''معاف کیجیے گا، جناب، کیا آپ کوئی رشتے دار ہیں؟''

''جی نہیں، میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ کیا فیصلہ سنا دیا گیا ہے؟''

''بلا شبہ، اور کچھ ممکن نہیں تھا۔''

''تعزیری غلامی؟''

''تا عمر۔''

وہ اتنی دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا کہ اس کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی۔

''گویا، اس کی شناخت ثابت ہو گئی ہے؟''

''کیسی شناخت؟'' وکیل نے جواب میں کہا، ''اس میں شناخت کے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ معاملہ بالکل سادہ تھا۔ عورت نے اپنے بچے کو قتل کیا تھا؛ طفل کشی ثابت تھی؛ جیوری نے قتلِ عمد کے سوال کو رد کر دیا تھا، اور اس کو عمر قید دے دی گئی۔''

''اچھا، تو وہ عورت تھی؟'' اس نے کہا۔

''یقیناً، مگر کیوں؟ لیموزین والی عورت! وہی نا جس کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ مگر وہ معاملہ تو اب ختم ہو چکا ہے، تو اب ہال میں روشنی کیوں ہو رہی ہے؟''

''ایک اور مقدمے کے سلسلے میں، جو دو گھنٹے قبل شروع ہوا ہے۔''

''وہ کیسا مقدمہ ہے؟''

''اوہ، یہ مقدمہ بھی آسان سا ہے۔ یہ ایک قسم کی بدمعاشی کا معاملہ ہے؛ ایک آدمی دوسری بار جرم کے الزام میں گرفتار ہوا ہے؛ ایک سزا یافتہ ہے، جس نے پھر چوری کی ہے۔ مجھے ٹھیک سے اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ ایک ڈاکو کی شکل وصورت کا معاملہ ہے۔ میں ہوتا تو صرف اس کے چہرے کی بنا پر ہی، سزا کے طور پر، اسے گیلیو بھیج دیتا۔''

''کیا کسی طرح عدالت کے کمرے میں جانا ممکن ہو سکے گا، جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، کہ ممکن نہیں۔ مجمع بہت ہے۔ پھر بھی، کارروائی معطل کر دی گئی ہے۔ کچھ لوگ چلے گئے ہیں۔ جب کارروائی شروع ہو تو آپ کوشش کر سکتے ہیں۔''

''اس کا راستہ کدھر سے ہے۔''

''سامنے والے بڑے دروازے سے۔''

وکیل چلا گیا۔ چند لمحے تو اس مسافر کو، ایک ساتھ آپس میں الجھے ہوئے ہر قسم کے جذبات کا تجربہ ہوا۔ محض تماشا دیکھنے والے اس شخص کے الفاظ، ایک ایک کر کے، برف کی سوئیوں، اور آگ کے چاقوؤں کی طرح اس کے دل میں کھبتے رہے۔ جب اس نے دیکھا کہ کچھ طے نہیں ہوا تھا، تو اس نے ایک بار پھر شاہد کا سانس لیا؛ مگر وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ جو کچھ اسے محسوس ہو رہا تھا وہ درد تھا یا خوشی تھی۔

وہ کئی گروہوں کے قریب گیا، اور سنا کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس اجلاس کے خلاصے کے کاغذات بہت تھے؛ صدرِ عدالت نے اسی دن دو چھوٹے اور سادہ مقدمات کی سماعت مقرر کی تھی۔ پہلا مقدمہ طفل کشی تھا، اور اب وہ ''پرانے پاپی'' سزا یافتہ کے مقدمے پر تھے۔ اس شخص نے سیب چرائے تھے، مگر اس کا پورا ثبوت نہیں ملا؛ بس یہ ثابت ہوا تھا کہ وہ پہلے بھی Toulon میں قید رہا تھا۔ اس مقدمے کا خراب پہلو یہی تھا۔ اس شخص پر اور گواہوں کے بیانات پر جرح ہو چکی تھی،

مگر وکیلِ صفائی کے عذر، اور وکیلِ سرکار کے بیان کا انتظار تھا۔ یہ مقدمہ آدھی رات سے قبل ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اس شخص کو سزا ہونے کے بہت امکانات تھے: سرکار کا وکیل بہت چالاک آدمی تھا، اور خطاکار اس سے بچ نہیں پاتے تھے، وہ بہت ذہین انسان تھا، اور شاعری بھی کرتا تھا۔

Assizes کے ہال کے دروازے پر ایک پیش کار متعین تھا۔ اس نے پیش کار سے پوچھا، ''کیا دروازہ جلد ہی کھلنے والا ہے، جناب؟''

''اب یہ بالکل نہیں کھلے گا۔'' پیش کار نے جواب دیا۔

''کیا! سماعت شروع ہو گی، تب بھی نہیں کھلے گا؟ کیا سماعت معطل نہیں؟''

''دوبارہ سماعت ابھی شروع ہوئی ہے۔'' پیش کار نے جواب دیا، ''مگر دروازہ دوبارہ نہیں کھلے گا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ ہال بھر چکا ہے۔''

''کیا ایک آدمی کی بھی جگہ نہیں؟''

''ایک کی بھی نہیں۔ دروازہ بند ہے۔ اب کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔''

پیش کار نے ایک لمحہ توقف کیا، ''سچ پوچھو تو صدرِ عدالت کے عقب میں دو یا تین کرسیاں خالی ہیں، مگر موسیو صدر صرف سرکاری افسروں کو ہی آنے کی اجازت دیں گے۔''

یہ کہتے ہی پیش کار نے اپنا رُخ پھیر لیا۔

یہ شخص سر جھکائے واپس ہوا، برآمدہ پار کیا، آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا، جیسے وہ ہر قدم تامل کر رہا ہو۔ ممکن تھا کہ وہ خود کو مشورہ دے رہا تھا۔ وہ شدید تنازعہ جو اس کے اندرون میں جاری تھا ابھی تک طے نہیں ہوا تھا۔ ہر لمحے اسے ایک نئے دور کا سامنا تھا۔ سیڑھیوں سے اترنے کے بعد وہ جنگلے کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، اور اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ پھر اچانک اس نے اپنا کوٹ کھولا، جیبی کتاب نکالی، اس میں اُڑسی پنسل نکالی، کتاب کا ایک صفحہ پھاڑا، اور لالٹین کی روشنی میں تیزی سے لکھا: موسیو میڈیلن، M.sur. M کا میئر: لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک بار پھر سیڑھیاں چڑھا، مجمعے میں راستہ بناتا ہوا، سیدھا پیش کار کے پاس پہنچا، اسے وہ رقعہ پیش کیا، اور تحکمانہ انداز میں کہا، ''اسے موسیو صدر تک پہنچا دو۔''

پیش کار نے اس کے ہاتھ رقعہ لیا، اس پر ایک نظر ڈالی اور حکم پر عمل کیا۔

۞

سفارش کے ذریعے داخلہ

حالاں کہ اسے اس بات پر شبہ نہیں تھا کہ M. sur M کے میئر کو ایک قسم کا نام ور آدمی سمجھا جاتا تھا۔ سات برس کے عرصے میں اس کی نیکی کی شہرت پورے Bas Boulonnais میں پھیل گئی تھی؛ آخر کار شہرت دو یا تین شعبوں کے ذریعے، چھوٹے سے علاقے سے نکل کر سرحد پار تک پھیل گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے سنگ موسیٰ کی صنعت کو نئی زندگی دینے کے سلسلے میں جو کارنمایاں انجام دیے تھے، فرانس کے انتظامی ضلعوں کے ایک سو چالیس کمیون میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی فائدے کے باعث اس کا احسان مند نہیں تھا۔ اس نے ضرورت کے وقت دوسرے انتظامی اضلاع کی صنعتوں کی امداد کے بہانے تلاش کیے تھے۔ اس طرح، جب بھی موقع ملا، اس نے اپنے سرمایے کی مدد سے Boulogne کے پارچہ بافی کے کارخانے، Frevent میں پٹ سن کے دھاگے بنانے کی صنعت اور Boubers-sur-Canche کے آب رسائی (hydraulic) کی قوت سے بنائے جانے والے پارچے کی صنعت کی امداد کی تھی۔ ہر جگہ، موسیو میڈلین کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا تھا۔ Arras اور Douai میں بھی۔

سب M. sur M جیسے چھوٹے علاقے اور اس کے میئر پر رشک کرتے تھے۔

Douai کی شاہی عدالت کا کونسلر بھی، جو Arras کی Assizes کی عدالت کی اس نشست کی صدارت کر رہا تھا، دوسروں کی طرح، اس نام سے اچھی طرح واقف تھا، جو بے حد عزت و احترام سے لیا جاتا تھا۔ جب پیش کار بہت آہستگی سے کاؤنسل کے کمرے اور عدالت کا درمیانی دروازہ کھول کر صدر عدالت کی کرسی کے عقب میں آ کر جھکا اور اسے وہ رقعہ پیش کیا جس

پر لکھا تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اور کہا "یہ صاحب مقدمے کی سماعت میں موجود ہونا چاہتے ہیں۔" تو صاحبِ صدر نے نہایت پھرتی سے اور مودبانہ انداز میں قلم اٹھایا اور رقعے کے نیچے "آنے دیا جائے" لکھ کر پیش کار کو دے دیا۔

وہ بدقسمت شخص ہم جس کی تاریخ بیان کر رہے ہیں، ہالار کے دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا، اسی جگہ اور اسی انداز میں پیش کار جس میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ کوئی اس سے کہتا سنائی دیا، "کیا موسیو مجھے میرے ساتھ چلنے کی عزت بخشیں گے۔" یہ وہی پیش کار تھا جس نے چند لمحے قبل اس کی جانب اپنی پشت کر لی تھی، جو اس کے سامنے اب زمین تک جھکا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے رقعہ اسے بھی پکڑا دیا۔ اتفاق سے وہ روشنی کے قریب تھا اور وہ رقعے پر لکھی عبارت پڑھ سکتا تھا۔

"Assizes کی عدالت کا صدر موسیو میڈلین کی خدمت میں آداب پیش کرتا ہے۔"

اس نے یہ کاغذ اس طرح مسل ڈالا گویا اس میں لکھی عبارت نے اس کے منہ کا مزہ خراب کر دیا تھا۔

وہ پیش کار کے پیچھے چل پڑا۔

چند منٹ کے بعد وہ چوبی تختوں سے منڈھی دیواروں والے دفتر میں موجود تھا، جس میں میز پر بچھے سبز پارچے پر شمع دان میں موم کی دو شمعیں روشن تھیں۔ پیش کار نے واپس جاتے وقت جو الفاظ کہے تھے وہ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے، "موسیو، اس وقت آپ کونسل چیمبر میں ہیں؛ آپ کو سامنے والے دروازے میں لگے پیتل کی گھنڈی کو گھمانا پڑے گا، اور آپ خود کو عدالت کے کمرے میں پائیں گے، صدرِ عدالت کی نشست کے بالکل پیچھے۔" یہ الفاظ اس کے خیالات، تنگ راہداریوں، اندھیری سیڑھیوں اور مبہم یادوں میں گھل مل گئے تھے جو اس نے ابھی پار کیے تھے۔

پیش کار اس کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ عظیم ترین موقع آ گیا تھا۔ اس نے اپنی لیاقت اور اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ عین اس لمحے جب انھیں زندگی کی تلخ اور تکلیف دہ یادوں سے منسلک کرنا ضروری ہوتا ہے ذہن میں یادوں کے دھاگے ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ اس وقت وہ ایسی جگہ تھا جہاں جج غور کرتے ہیں، فیصلے سناتے ہیں۔ ایک بے حس طمانیت سے اس نے اس خوف ناک کمرے کا معائنہ کیا جس میں نہ جانے کتنی زندگیاں تباہ ہوئی تھیں، جلد ہی جس میں اس کا نام گونجے گا، اس وقت جس سے وہ گزر رہا

تھا۔ اس نے دیوار کو گھورا، پھر اپنی طرف دیکھا، اور سوچا کہ یہی کمرہ ہوگا اور اسی کا نام ہوگا۔

پچھلے چوبیں گھنٹوں میں اس نے کچھ کھایا نہیں تھا؛ گاڑی کے جھٹکوں نے اسے خستہ کر دیا تھا مگر اسے احساس نہیں تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی حس ختم ہو گئی تھی۔

وہ دیوار پر ٹنگے ایک سیاہ رنگ کے فریم کی طرف بڑھا جس میں شیشے کے نیچے پیرس کے میئر اور وزیر Jean Nicolas Pache کا ایک قدیم دستخط شدہ خط لگا ہوا تھا، جس پر، بلا شبہ غلط تاریخ، 9 جون 11 لکھی تھی، جس میں Pache نے کمیون کو ان وزرا اور نائبین کی فہرست روانہ کی تھی جن کو انھوں نے گرفتار کر رکھا تھا۔ کوئی بھی دیکھنے والا اگر اس کو اتفاق سے اس وقت دیکھ لیتا، جس نے پہلے نہ دیکھا ہوتا تو بلا شبہ یہ تصور کر لیتا کہ یہ خط اس کے نزدیک بہت راز جو تھا، اس لیے کہ اس نے اس پر سے اپنی آنکھیں ہٹائی نہیں تھیں، اور اسے دو یا تین بار پڑھا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اور بغیر توجہ کے اس خط کو پڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہ دراصل فانتیں اور کوزیٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ خواب کی سی کیفیت میں تھا، ایک بار گھوما، دروازے میں لگی پیتل کی گھنڈی پر اس کی نظر پڑی جو اس کمرے کو Assizes عدالت سے الگ کرتا تھا۔ وہ اس دروازے کو تقریباً بھول چکا تھا۔ اس کی نظر، جو پہلے پُر سکون تھی، اس پر ٹھہری، پیتل کی گھنڈی پر جمی رہی، اس کے بعد خوف زدہ ہو گئی اور رفتہ رفتہ خوف نے اسے جذب کر لیا۔ بالوں کے نیچے سے پسینے کی قطرے پھوٹ پڑے اور کنپٹیوں پر ڈھلکنے لگے۔

اچانک اس نے وہ ناقابلِ بیان طرز اختیار کیا جس میں اختیار اور بغاوت گھل مل جاتے ہیں، جس کے ذریعے یہ اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے "خدایا! کون مجھے اس پر مجبور کر سکتا ہے؟" پھر وہ کمرے میں پھرا، اس دروازے پر نظر پڑی جس سے داخل ہوا تھا، اس تک گیا، دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا؛ اب وہ اس کمرے میں نہیں تھا؛ وہ باہر تھا، ایک راہداری میں، ایک طویل اور تنگ راہداری میں، جس میں ہر قسم کے زاویے بنے ہوئے تھے، یہاں وہاں آویزاں لالٹینوں سے روشن، وہی راہداری جس کے ذریعے یہاں آیا تھا۔ اس نے سانس لیا، اس نے سننے کی کوشش کی؛ نہ سامنے کوئی آواز تھی، نہ پیچھے کوئی آواز تھی، اور اس طرح بھاگا گویا اس کا پیچھا کیا جا رہا ہو۔

وہ راہداری کے کئی زاویے مڑ چکا تھا، مگر سن رہا تھا۔ اسی خاموشی کی حکمرانی تھی، اس کے اطراف وہی اندھیرا بھی تھا۔ اس کا سانس چڑھ رہا تھا؛ وہ لڑکھڑا رہا تھا؛ اس نے دیوار کا سہارا

لیا۔ پتھر ٹھنڈا تھا، پسینہ ابرو پر جم گیا تھا؛ اس نے جھرجھری لی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

تب، تنہا اندھیرے میں، سردی اور کسی شے سے کانپتے ہوئے، اتفاق سے اس نے مراقبہ شروع کر دیا۔

اس نے پوری رات مراقبہ کیا تھا؛ اس نے پورا دن مراقبہ کیا تھا؛ اس نے اپنے اندر کی ایک ہی آواز سنی تھی جس نے کہا تھا، ''افسوس ہے!''

اس میں ایک چوتھائی گھنٹا گزر گیا۔ بالآخر اس نے اپنا سر خم کر دیا، درد سے کراہا، اپنے بازو گرا دیے، اور اپنے پاؤں واپس چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، گویا کچل دیا گیا ہو۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا دوڑ میں کوئی اس سے آگے نکل گیا ہو اور اس کو واپس دھکیل رہا ہو۔

وہ کاؤنسل کے کمرے میں دوبارہ داخل ہوا۔ سب سے پہلی چیز جو اسے نظر پڑی، دروازے کی گھنڈی تھی۔ گھنڈی جو گول اور پالش شدہ تھی؛ اس کے لیے کسی خوفناک ستارے کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ گھنڈی کو یوں گھور رہا تھا جیسے کوئی میمنہ کسی چیتے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر گھور رہا ہو۔

وہ اس سے اپنی آنکھ ہٹا نہیں سکتا تھا۔ کبھی کبھی ایک قدم آگے بڑھتا اور دروازے کی طرف جاتا۔

اگر اس نے سننے کی کوشش کی ہوتی تو، اس نے برابر والے ہال کی آوازیں ایک پیچیدہ سرگوشی کی طرح سنی ہوتیں؛ مگر اس نے سنی نہیں۔

اچانک، خود اسے پتا نہیں چلا کہ یہ کیسے ہوا، اس نے خود کو دروازے کے قریب کھڑا پایا؛ اس نے مضطربانہ انداز میں گھنڈی پکڑ لی؛ دروازہ کھل گیا۔

اب وہ عدالت کے کمرے میں تھا۔

۞

جہاں سزائیں تشکیل پاتی ہیں

وہ ایک قدم آگے بڑھا، دروازے کو میکانکی انداز میں بند کیا، اور کھڑا سوچتا رہا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔

وہ ایک وسیع اور ناکافی روشن اُطاق تھا، ابھی شور وغوغا سے بھرپور، ابھی خاموشی سے پُر، جس میں، ہجوم کے درمیان اپنی معمولی اور غمگین متانت کے ساتھ، ایک فوج داری کے مقدمے کے تمام ساز و سامان تیار کیے جا رہے تھے۔

ہال کے ایک سرے پر، جس طرف وہ موجود تھا، سارے جج استغراق کی کیفیت اور فرسودہ قباؤں میں ملبوس، اپنے ناخنوں سے کچھ کھرچ رہے تھے یا اپنی آنکھوں کے پپوٹے بند کر رہے تھے؛ دوسرے سرے پر خستہ لباس ہجوم؛ ہر طرح کے رویوں والے وکلا؛ سخت مگر ایمان دار چہروں والے فوجی؛ قدیم داغ دار چوبی نقوش؛ گندی سقف؛ سبز رنگ کے سرج کے میز پوشوں سے ڈھکی میزیں؛ جو وقت کے ساتھ زرد ہو گئے تھے؛ ہاتھوں کے نشانات سے سیاہ دروازے؛ مے نوشی کے کمرے کی دیواروں پر لگے چوبی تختوں میں کیل پر ٹنگے لیمپ جو روشنی کم اور دھواں زیادہ دیتے تھے؛ میزوں پر پیتل کے شمع دانوں میں لگی موم بتیاں؛ اندھیرا؛ بھونڈا پن؛ اداسی اور ان سے جدا ایک سادہ اور عالی شان تصور تھا، اس لیے کہ وہاں اس عظیم انسانی شے کا جو قانون کہا جاتا ہے، اور عظیم ربانی شے کا، جس کو انصاف کہتے ہیں، احساس ہوتا تھا۔

اس ہجوم میں سے ایک شخص نے بھی اس پر توجہ نہیں دی؛ ساری نظریں ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں، ایک چوبی بنچ پر جو ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس رکھی ہوئی تھی، اس دیوار کے قریب جو جج کی بائیں جانب تھی؛ اس بنچ پر، دو فوجی سپاہیوں کے درمیان کئی شمعوں کی روشنی

سے درخشاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

وہ آدمی، وہی آدمی تھا۔

اس [آنے والے شخص] نے اسے تلاش نہیں کیا تھا؛ بس اسے دیکھا؛ اس کی آنکھیں فطری طور پر ادھر ہی اُٹھ گئیں، گویا انھیں پہلے سے علم تھا کہ وہ شخص کس جگہ تھا۔

اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس نے خود کو ایک عمر رسیدہ کی صورت میں دیکھا ہو؛ چہرہ بالکل اس جیسا نہیں تھا مگر رویے اور انداز میں بالکل اس جیسا ہی تھا؛ سؤر کے جیسے سخت بال، وحشی اور بے چین آنکھیں؛ اسی بلاؤز میں ملبوس؛ نفرت سے بھرے خوف ناک خیالات چھپائے، جب D کے علاقے میں داخل ہوا تھا، جنھیں جمع کرنے میں اس نے اپنی انیس برس کی قید صرف کی تھی۔

اس نے لرزتے ہوئے اپنے آپ سے کہا، ''میرے خدا!، کیا ایک بار پھر میں اسی طرح کا ہو جاؤں گا؟''

وہ شخص کم از کم ساٹھ کا معلوم ہوتا تھا؛ اس میں کوئی اکھڑ پن، احمقانہ یا خوف زدہ بات نہیں تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر لوگ اسے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گئے تھے؛ صدر نے مُڑ کر دیکھا، اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ شخصیت جو ابھی داخل ہوئی ہے M. sur M کی میئر ہے، اس کی جانب ذرا سا خم ہوا؛ سرکاری وکیل نے جو M. sur M میں موسیو میڈلین کو دیکھ چکا تھا، جہاں وہ اپنے عہدے کے فرائض کے باعث کئی بار گیا تھا، اس کو پہچانا اور اسے سیلوٹ بھی کیا: وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ اس شخص کو دیکھ رہا تھا، ایک قسم کے فریبِ نظر کا شکار ہو گیا تھا۔

جج، کلرک، فوجی سپاہی، ظالمانہ حد تک ایک پُر اسرار مجمع؛ جنھیں ایک بار وہ ستائیس برس قبل دیکھ چکا تھا؛ وہ سب یہاں موجود تھے؛ وہ سب اس کی خاطر بنے؛ اب یہ اس کی یادداشت کا، اس کے سرابِ خیال کا معاملہ نہیں تھا؛ وہ سب اصلی فوجی اور حقیقی جج تھے؛ اصلی مجمع تھا؛ حقیقی گوشت پوست کے انسان تھے۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا، اس کے اپنے دوبارہ بھیانک ظہور کے سارے پہلو اُجاگر ہو رہے تھے اور اس کے اطراف چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور یہ سب ایک ہول ناک حقیقت تھی۔

یہ ساری حقیقتیں اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی تھیں۔

ان حقیقتوں نے اسے دہشت زدہ کر دیا؛ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی روح کے عمیق ترین شگاف میں چیخ کر کہا تھا، ''کبھی نہیں!''

اور تقدیر کے الم ناک کھیل نے، اس کے سارے خیالات کو لرزہ دیا؛ اور اسے تقریباً پاگل بنا دیا۔ وہ شخص اسی کا ایک اور وجود تھا جو وہاں موجود تھا! مقدمے میں زیرِ سماعت اس آدمی کو سب ژاں ولژاں کہہ رہے تھے۔

اس کی اپنی نظر کے سامنے ایک منظر تھا جیسا کبھی دیکھا نہیں گیا تھا؛ اس کی اپنی زندگی کے ایک خوف ناک لمحے کی حقیقت نگاری تھی؛ جس کا کھیل اس کا اپنا آسیب کھیل رہا تھا۔

وہاں سب کچھ موجود تھا؛ سارے ساز و سامان مہیا تھے؛ رات کا وقت؛ جج؛ فوجی سپاہی اور ناظرین؛ سب وہی تھے؛ صرف صدر کے سر کے اوپر ایک صلیب ٹنگی تھی، اس کے اپنے مقدمے کے وقت جو عدالت میں نہیں تھی۔ خدا اس وقت غیر حاضر تھا، جب اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔

اس کے پیچھے ایک کرسی تھی جس میں وہ گر پڑا، اس خیال سے خوف زدہ کہ وہ دیکھ لیا جائے گا؛ جب بیٹھ گیا تو اس نے کمرے والوں سے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے وفتی کے ڈبوں کی آڑ کا فائدہ اٹھایا، جو جج کی میز پر رکھے تھے؛ اب وہ خود نظر نہیں آرہا تھا مگر سب کچھ دیکھ رہا تھا؛ اب اسے حالات اور حقیقتوں کا دوبارہ ادراک ہو گیا؛ وہ رفتہ رفتہ بحال ہو رہا تھا؛ اب وہ دل جمعی اور تشفی کے اس دور میں داخل ہو گیا جس میں اس کے لیے سننا ممکن ہو گیا تھا۔

جیوری میں موسیو باماتا بوا (Bamatabois) شامل تھا۔

وہ جاویر کو تلاش کر رہا تھا، مگر دکھائی نہیں پایا؛ کلرک کی میز سے گواہوں کی میز چھپ گئی تھی، اور جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، ہال میں روشنی کم تھی۔

اس کے داخلے کے لمحے، وکیلِ صفائی عذر ختم کر چکا تھا۔

سب کی توجہات کا جوش بلند ترین سطح پر پہنچ گیا تھا؛ مقدمے کی سماعت تین گھنٹے جاری رہی تھی؛ تین گھنٹوں تک مجمع ایک اجنبی آدمی کو دیکھ رہا تھا، انسانیت کی بدنصیبی کے ایک نمونے کو یا تو وہ بہت احمق تھا یا بے حد بلند تخیل والا؛ رفتہ رفتہ خوف ناک حد تک مماثلت کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ جیسا کہ ناظرین جانتے ہیں، یہ شخص ایک آوارہ گرد انسان تھا جسے پکے ہوئے سیب سے لدی ایک شاخ لے جاتے دیکھا گیا تھا، جو ایک پڑوسی کے Pierron نامی باغ سے توڑی گئی تھی۔ کون تھا یہ آدمی؟ اس کی باقاعدہ تفتیش کی گئی؛ گواہیاں گزریں، اور سب یک زبان تھے؛ مقدمے کے دوران ہوش مندی کی افراط تھی؛ اس پر الزام یہ تھا: "ہمارے قبضے میں نہ صرف ایک لٹیرا، پھل چوری کرنے والا ہے، بلکہ ایک ڈاکو، پرانا مجرم ہے جس نے اپنے اوپر کی جانے والی پابندی سے انحراف کیا ہے؛ سابق سزا یافتہ، خطرناک صفات کا غنڈا، قانون شکن ہے جس کا نام

ژاں ولژاں ہے؛ انصاف ایک عرصے سے جس کی تلاش میں تھا؛ جو آٹھ برس قبل Toulon کی قید سے رہا ہوا تھا؛ جس نے شاہراہ پر Savoy کے ایک لڑکے کی، جس کا نام تھا ننھا جروے، ڈکیتی کی تھی؛ جس میں تشدد بھی شامل تھا۔ یہ جرم زیرِ دفعہ 383 قابلِ تعزیر ہے۔ ملزم کی قانون کے مطابق شناخت ہو جائے گی تو اس کے تحت اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس نے ایک اور تازہ چوری کی ہے؛ یہ ایک اور جرم ہے؛ اس کو اس نئے جرم کی سزا دی جائے گی؛ اس کے بعد اس پر پرانے جرم پر بھی مقدمہ چلایا جائے گا۔" اس الزام کے پیشِ نظر، اور گواہوں کے اتفاق کے پیشِ نظر ملزم زیادہ حیران ہوا؛ اس نے ایسے اشارے کیے اور ایسا رویہ اختیار کیا تھا جس سے مراد "نہیں" تھا، اس کے علاوہ، سارے وقت وہ اپنی نظریں سقف پر گاڑے رہا: مشکل سے بول پاتا تھا، شرمندگی سے جواب دیتا تھا؛ مگر اس کا پورا وجود، سر سے پیر تک، انکار تھا؛ ان تمام دماغوں کی موجودگی میں جو اس کے خلاف اکٹھے تھے اور تیزی سے اسے گرفت میں لے رہے تھے، وہ کم عقل معلوم ہوتا تھا؛ پھر بھی اس کے نہایت پریشان کن مستقبل کا سوال تھا؛ اس کی شباہت ہر لحظہ بڑھتی ہی گئی، اور سارے مجمعے نے خود اس کے اپنے مقابلے میں، اسے زیادہ تشویش سے دیکھا؛ سزا پر بدبختی کا بوجھ تھا، جو ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی، اور اگر اس کی شناخت مصدق ہو جاتی تو قید کے علاوہ سزائے موت کا بھی امکان تھا۔ جروے کا معاملہ بھی سزا پر ختم ہو جاتا۔ کون تھا یہ آدمی؟ اس کی بے حسی کی وجہ کیا تھی؟ حماقت تھی یا ہنرمندی؟ کیا وہ بہت ہوشیار تھا، یا بالکل کچھ نہیں پاتا تھا؟ یہ تھے سوالات جنھوں نے مجمعے کو تقسیم کر دیا تھا، اور جیوری کے حضرات بھی تقسیم ہوتے محسوس ہو رہے تھے؛ اس مقدمے میں کچھ تھا، جو بہت وحشت ناک بھی تھا اور اُلجھا دینے والا بھی۔ یہ ڈراما نہ صرف غم انگیز تھا، بلکہ مبہم بھی تھا۔

وکیلِ صفائی کا بیان اچھا تھا، اس صوبائی زبان میں تھا جو ہمیشہ سے بار کی خطابت کا طریقہ رہا ہے، اور جو تمام سابقہ وکلا اپناتے رہے ہیں، پیرس میں بھی اور Romorantin یا Montbrison میں بھی، جو آج کلاسیکی ہونے کے باوجود بولی نہیں جاتی، سوائے سرکاری مجسٹریٹ خطیبوں کے، کہ اس کی بلند آہنگی اور شان دار بے تابی ان پر پھبتی ہے، وہ زبان جس میں شوہر ساتھی ہوتا ہے اور عورت شریکِ زندگی؛ پیرس فن اور تہذیب کا مرکز؛ بادشاہ؛ حاکم موں سنیور بشپ؛ برگزیدگی؛ پوپ؛ سرکاری وکیل؛ عوامی پیروی کرنے والا خوش گفتار ترجمان؛ دلائل؛ وہ لہجے ہم ابھی جنھیں سن چکے ہیں؛ لوئی چہارم کا عہد، ایک عظیم دور؛ تھیٹر، Melpomene کی عبادت گاہ؛ حاکم خاندان؛ ہمارے شاہوں کا محترم خون؛ کنسرٹ، مغنائی متانت؛ صوبے کا کمانڈنٹ، نام ور

جنگجو ؛ وغیرہ؛ مدرسے کے طالب علم، بے چارے بچے؛ اخباروں کی غلطیاں، وہ جملے بازی جو کالموں کے ذریعے زہر گھولتی ہے؛ وغیرہ۔لہٰذا، وکیل نے سیب کی چوری سے شروعات کی تھی، ایک بے ذھب معاملہ جو نفیس انداز میں پیش کیا گیا تھا؛ [سترھویں صدی کے ایک فرانسیسی بشپ] Bossuet Benigne نے بھی جنازے کے ایک خطبے کے دوران مرغی کا کنایہ پیش کیا تھا، مگر بڑے پُروقار انداز میں خود کو الگ کرلیا تھا۔وکیل نے یہ حقیقت ثابت کر دی تھی کہ قرائن کے اعتبار سے سیب کی چوری ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مؤکل، جس کو وہ کاؤنسل کے کردار کے مطابق شامپ ماتِ تو کہنے پر اصرار کر رہا تھا، نہ دیوار پر چڑھتا دیکھا گیا تھا، اور نہ شاخیں توڑتا۔ وہ شاخیں (وکیل جسے ڈالی کہنے پر مصر تھا) لے جاتا پکڑا گیا تھا؛ مگر ملزم نے کہا تھا کہ اسے یہ شاخ ٹوٹی اور زمین پر پڑی ملی تھی، اور اس نے صرف زمین سے اٹھائی تھی۔کیا اس کے برخلاف کوئی ثبوت پیش کیا گیا تھا؟ اس میں شبہ نہیں کہ شاخ توڑی گئی تھی اور دیوار پر چڑھنے کے بعد چھپائی گئی تھی، اس کے بعد سہمے ہوئے لٹیرے نے پھینک دی تھی؛ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معاملے میں چوری ہوئی تھی۔مگر کیا ثبوت تھا کہ چوری کرنے والا شامپ ماتِ تو ہی تھا؟ ہاں ایک بات اہم ضرور تھی ۔اس کا سابق سزا یافتہ کردار۔وکیل نے اس بات سے انکار نہیں کیا تھا کہ بد قسمتی سے یہ کردار با قاعدہ ثابت ہو چکا تھا؛ کہ ملزم Faverolles میں رہتا تھا؛ کہ ملزم نے وہاں شجر کی قلم کاری کا کام کیا تھا؛ کہ شامپ ماتِ تو کے نام کی اصل Jean Mathieu میں تھی؛ یہ سب سچ تھا— مختصر یہ کہ چار گواہ قطعی طور پر اور بغیر کسی تامل کے شامپ ماتِ تو کی مجرم ژاں ولژاں کی حیثیت میں شناخت کر رہے ہیں؛ ان علامتوں میں، اس گواہی کے خلاف وکیلِ صفائی کچھ پیش نہیں کر سکا تھا سوائے اپنے مؤکل کے انکار کے؛ مگر فرض کیا کہ وہ سزا یافتہ ژاں ولژاں ہی تھا، تو کیا اس سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ وہی سیب کا چور بھی تھا؟ یہ زیادہ سے زیادہ قیاس تھا، ثبوت نہیں تھا۔یہ سچ ہے کہ قیدی اور اس کے وکیل، دونوں نے "صدقِ نیت" سے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انھوں نے دفاع میں ناقص طریقہ اپنایا تھا۔وہ ڈھٹائی سے، چوری کا اور سزا یافتہ کردار کا، ہر بات کا انکار کرتا رہا ہے۔اس کی جانب سے آخری نکتے کے اعتراف نے یقیناً ججوں کا لطف حاصل کر لیا ہوتا؛ وکیل نے مشورہ دیا تھا؛ مگر ملزم نے ڈھٹائی سے انکار کر دیا تھا، بلاشبہ یہ سوچ کر کہ وہ کسی بات کا اعتراف نہ کر کے سب کچھ بچا لے گا۔یہ غلطی تھی؛ مگر کیا اس میں ذہانت کی کمی پر توجہ نہیں کی جانی چاہیے تھی؟ یہ آدمی صریحاً بیوقوف تھا۔قید و بند کے دوران کی طویل بد نصیبی، قید کے باہر کے طویل دکھوں نے اس کو سنگ دل بنا دیا تھا؛ اس نے اپنا

دفاع ناقص طریقے سے کیا تھا؛ تو کیا اسے سزا دینے کی یہی وجہ تھی؟ جہاں تک ننھے جروے کا معاملہ تھا، وکیل کو اس پر بحث نہیں کرنی چاہیے؛ یہ معاملہ مقدمے میں اٹھایا نہیں گیا تھا۔ وکیلِ صفائی نے اپنے دلائل، جج اور جیوری سے التجا پر ختم کیے تھے، کہ اگر ان کے نزدیک ژاں ولژاں کی شناخت واضح محسوس ہوئی ہے، تو اس پر پولیس کے جرمانے کیے جائیں جو پابندی توڑنے پر عائد کیے جاتے ہیں، نہ کہ وہ سزا دی جائے جو کسی سزایافتہ کو دوسرے جرم کی صورت میں دی جاتی ہے۔

سرکاری وکیل نے وکیلِ صفائی کو جواب دیا تھا۔ وہ تند اور شوخ ہو رہا تھا، جیسے کہ سرکاری وکیل ہوا کرتے ہیں۔

اس نے وکیلِ صفائی کو اس کی ''وفاداری'' پر مبارک باد دی اور فن کاری سے وفاداری کا فائدہ اٹھایا۔ وہ ملزم تک ان تمام رعایات کے ذریعے پہنچا تھا جو اس کے وکیل نے دی تھیں۔ وکیل نے کنایۃً اعتراف کیا تھا کہ قیدی ژاں ولژاں ہی ہے۔ اس نے یہ بات گرفت میں لے لی تھی۔ لہٰذا یہ شخص ژاں ولژاں ہی تھا۔ یہ نکتہ استغاثہ کو فراہم کیا جا چکا تھا جس پر بحث نہیں ہو سکتی تھی۔ اس موقعے پر، چالاک علامتی عرفیتوں کے ذریعے، جو جرم کے ماخذات تک جاتی تھیں، سرکاری وکیل رومانوی دبستان کی اخلاقیات کے خلاف خوب گرجا برسا۔ اس کے بعد شیطانی دبستان پر پہنچ گیا جو اسے Quotidienne اور Oriflamme [اخباروں] نے عطا کیا تھا؛ اس نے فحش ادب کے اثرات کو شامپ ماتھیو کے یا صحیح طور پر کہا جائے تو ژاں ولژاں کے جرم سے منسوب کر دیا تھا۔ ان تمام ملاحظات کے ختم ہو جانے کے بعد وہ ژاں ولژاں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کون تھا یہ ژاں ولژاں؟ ژاں ولژاں کا بیان: خونخوار بڑھاپا ہوا عفریت وغیرہ۔ اس قسم کے بیان کی شخصیت [چوتھی صدی قبلِ مسیح کے ایک یونانی مدبر] Theramene کی داستان میں ملتی ہے، جو المیے کے لیے مناسب نہیں ہوتی، مگر روزانہ کی عدالتی زور بیانی کے کام آتی ہے۔ سامعین اور جیوری ''لرز گئے''۔ یہ بیان ختم ہوا تو سرکاری وکیل نے خطیبانہ انداز میں شروعات کی جس کا مقصد اگلے دن پریفیکچر کے اخبارات کے جذبات کو بلند ترین درجے تک بھڑکانا تھا: اور، یہ اس قسم کا انسان ہے وغیرہ وغیرہ وغیرہ، آوارہ ہے، بھکاری ہے، اس کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ نہیں وغیرہ وغیرہ، ماضی کے مواخذے کے قابل کام کا عادی ہے، سوائے قید خانے میں گزارے ہوئے اصلاحی دنوں کے، جیسا کہ جروے کے خلاف کیے ہوئے جرم سے ثابت ہوا تھا وغیرہ وغیرہ، یہ ایسا شخص ہے جو شاہراہ پر چوری کے جرم میں پکڑا گیا تھا، اس دیوار سے چند قدم آگے جو چوری کی شے لیے دیوار پر چڑھا تھا، جو جرم سے، چوری سے،

دیوار پر چڑھنے سے، ہر الزام سے انکار کرتا ہے؛ خود اپنی شناخت سے بھی انکار کرتا ہے۔ سو قسم کے دوسرے ثبوت ہے، جسے وہ قبول نہیں کرے گا، چار گواہاں اس کی شناخت کرتے ہیں— جاویر، راست باز پولیس انسپکٹر ہے؛ جاویر کے علاوہ اس شخص کے تین دوسرے شاملِ رسوائی ساتھی، سزا یافتہ بریوے، Chenildieu اور Cochepaille تھے۔ اس بے انتہا اتفاق تکلی کے خلاف یہ کیا پیش کرتا ہے؟ صرف ملزم کا انکار۔ کیا ہٹ دھرمی ہے! جیوری کے حضرات آپ یقیناً انصاف کریں گے ...... وغیرہ وغیرہ۔ جب سرکاری وکیل بول رہا تھا، ملزم منہ کھولے، ایک قسم کے استعجاب میں، جس میں یقینی طور پر کچھ تعریف ملی ہوئی تھی، سن رہا تھا۔ وہ بظاہر حیران تھا کہ کوئی آدمی اس طرح بھی بول سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً، استغاثہ کے بیان کے ان ''زبردست'' لمحات میں، جب خطابت خود کو روک نہیں سکتی، جب پژمردہ القابات کا سیلاب ملزم پر طوفان کی طرح چھا جاتا ہے، اس نے دھیرے دھیرے ایک نوع کے افسردہ احتجاج میں اپنا سر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں پھیرا، جس کو جرح کی ابتدا سے خاموشی سے برداشت کرتا رہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھے ناظرین نے اسے دو یا تین بار دھیمی آواز میں کہتے سنا تھا، ''موسیو Baloup کو نہ پوچھا جائے تو یہی ہوتا ہے۔'' سرکاری وکیل نے جیوری کی توجہ اس رویے کی طرف دلائی، جو بظاہر حماقت نہیں، فن کاری تھی، جبر تھا، انصاف کو دھوکا دینے کی عادت تھی، جو اپنی تمام تر برہنگی کے ساتھ اس انسان کی کی گمراہی کا ثبوت تھی۔ اس نے ننھے جروے کے معاملے میں اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے سخت سزا کا مطالبہ کیا۔

قاری کو یاد ہوگا کہ اس وقت اس جرم کی سزا عمر قید تھی۔

وکیلِ دفاع کھڑا ہوا، موسیو ایڈوکیٹ جنرل کو اس کی ''قابلِ تعریف'' تقریر پر مبارک باد دی، اس کے بعد جس قدر ممکن ہوا جواب دیا؛ مگر موقف کم زور ہونے کے باعث اس کے پاؤں تلے سے زمین سرکتی جا رہی تھی۔

۞

انکار کی حکمتِ عملی

سماعت کے ختم ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ صدر نے ملزم کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، اور اس سے رسمی سوال کیا، ”تمھیں اپنے دفاع میں مزید کچھ کہنا ہے؟“

ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ سمجھا نہیں، اس لیے کہ وہیں کھڑا اپنی ٹوپی سے کھیل رہا تھا، جو اس کے ہاتھوں میں تھی۔

صدر نے اپنا سوال دہرایا۔

اس بار اس نے سوال سنا۔ اب وہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے حرکت کی جو ایسا آدمی کرتا ہے جو اچانک سوتے سے جاگ گیا ہو، اپنے اطراف نظر ڈالی، سامعین، فوجی سپاہیوں، اپنے وکیل، جیوری اور عدالت کو دیکھا، اپنی بنچ کے سامنے بنے چوبی کام پر اپنی بھیانک مٹھی رکھی، ایک بار پھر نظر دوڑائی، سرکاری وکیل کی طرف دیکھا اور بولنا شروع کیا۔ یہ کسی آتش فشاں کے پھٹ پڑنے جیسی کیفیت تھی۔ اس کا رویہ جس میں الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے ایسا تھا — بے ربط، تیز و تند، گڈمڈ، ایک دوسرے پر لوٹ پوٹ — گویا سب الفاظ ایک ساتھ، اور فوراً نکل پڑنا چاہتے ہوں۔ اس نے کہا:

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں پیرس میں، موسیو بالو (Baloup) کے ساتھ پہیوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ یہ بہت مشکل پیشہ ہے۔ اس پیشے میں ہمیشہ کھلی فضا میں کام کرنا ہوتا ہے، صحنوں میں اور سائبانوں میں، جب مالک اچھے ہوں؛ ورک شاپ میں کبھی نہیں، اس لیے کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس کے لیے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرد موسم میں اتنی ٹھنڈ ہوتی ہے کہ آدمی کو اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے ہاتھوں کو ملنا پڑتا ہے، مگر مالک اس کو پسند نہیں کرتے۔

کہتے ہیں، اس میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ جب سڑکیں برف سے بھری ہوں تو لوہے سے کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آدمی جلد تھک جاتا ہے۔ اس پیشے میں آدمی جلد بوڑھا ہو جاتا ہے۔ چالیس برس کی عمر میں، یوں سمجھو کہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں ترپن کا تھا۔ میری بہت بُری حالت تھی۔ اس پر یہ بھی کہ کام کرانے والے بہت کم ظرف ہوتے ہیں۔ جب آدمی جوان نہیں رہتا تو اس کو کچھ نہیں، صرف پرانی چڑیا، خبیث بوڑھا کہتے ہیں۔ میری آمدنی تیس سو یومیہ سے زیادہ نہیں تھی۔ مالک مجھے کم سے کم دینا چاہتا تھا۔ میری عمر کا ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ میری ایک بیٹی بھی تھی، جو دریا پر کپڑے دھوتی تھی۔ وہ بھی کم زور سی تھی۔ ہم دونوں کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ اس کو بھی مشکل ہوتی تھی؛ پورے دن پانی کے حوض میں، بارش ہو یا برف باری۔ جب سرد ہوا آپ کے چہرے کو کاٹ رہی ہو، جب چہرہ جم رہا ہو تب بھی سب کام اسی طرح چلتا رہتا ہے، دھلائی کرنی پڑتی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے پاس زیادہ کپڑے نہیں ہوتے، وہ زیادہ انتظار نہیں کرتے؛ اگر دھوبی نے وقت پر کپڑے نہیں دیے تو اپنا گاہک کھو دیتا ہے۔ تختے ٹھیک سے جڑے نہیں ہوتے، اس لیے کہ دھونے والی پر ہر طرف سے پانی گرتا رہتا ہے؛ پیٹی کوٹ، اوپر اور نیچے، نم رہتا ہے۔ نمی اندر سرایت کرتی ہے۔ اس نے Enfants-Rouges کی لانڈری میں بھی کام کیا ہے، جہاں ٹونٹیوں کے ذریعے پانی آتا ہے۔ وہاں حوض میں نہیں رہنا ہوتا؛ سامنے کی ٹونٹی سے کپڑے دھوئے جاتے ہیں، پیچھے کے بیسن میں کھنگالے جاتے ہیں۔ چوں کہ وہ حصہ بند ہوتا ہے اس لیے سردی نہیں لگتی؛ مگر وہاں بہت گرم بھاپ ہوتی ہے، جو خوف ناک ہوتی ہے اور آنکھوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

میری بیٹی سات بجے شام واپس آتی اور فوراً بستر میں چلی جاتی، بہت تھکی ہوتی تھی۔ اس کا شوہر مارتا تھا۔ اب وہ مر چکی ہے۔ ہم کبھی خوش نہیں رہے ہیں۔ بہت اچھی لڑکی تھی۔ رقص گاہ بھی نہیں جاتی تھی۔ بہت پُرسکون رہتی تھی۔ مجھے ایک Shrove منگل یاد ہے، جب وہ آٹھ بجے رات بستر میں گئی تھی۔ میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔ ارے ہاں، میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ پیرس ایک خلیج کی مانند ہے۔ وہاں فادر شامپ ماتھو کو کون جانتا ہے؟ مگر موسیو بالو جانتا ہے۔ میں بتا رہا ہوں نا، موسیو کے ہاں جا کر دیکھ لیجیے؛ مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔"

اس نے بولنا بند کر دیا، اور کھڑا رہا۔ اس نے ساری باتیں بلند، تیز اور بھرائی آواز میں کی تھیں جس میں ایک قسم کی سفاک سادگی شامل تھی۔ ایک بار وہ سامعین میں سے کسی کو سلام کرنے کے لیے رُکا تھا۔ جس بے ترتیبی سے وہ لوگوں کے سامنے جس قسم کی باتیں کر رہا تھا، وہ

پھیکی معلوم ہو رہی تھیں، اور ہر جملے میں اس نے کسی لکڑ ہارے کا سا انداز شامل کر دیا تھا جو لکڑی کو پھاڑ رہا ہو۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو سامعین زور سے ہنسنے لگے۔ اس نے لوگوں کی طرف گھور کے دیکھا، اور یہ تصور کیا کہ وہ ہنس رہے ہیں تو خود اس نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔

یہ بد شگونی تھی۔

صدر نے جو مستعد اور نیک خو آدمی ہے، اپنی آواز بلند کی۔

اس نے "جیوری حضرات" کو یاد دلایا کہ بالو، سابق پہیہ ساز کو جس کے ساتھ ملزم نے، بقول اس کے، کام کیا تھا، بے کار طلب کیا گیا تھا۔ وہ دیوالیہ ہو گیا ہے، اور اس کا کچھ پتا نہیں۔" اس کے بعد وہ ملزم کی طرف متوجہ ہوا اور تاکید کی کہ وہ کچھ کہنے والا ہے، اور اسے غور سے سنا جائے۔ "تم ایسی حالت میں ہو جس میں غور کرنا ضروری ہے۔ تم پر سب سے زیادہ مشکل مفروضات کا انحصار ہے اور تم ہی اہم نتائج فراہم کر سکتے ہو۔ قیدی! میں تمھارے اپنے مفاد میں آخری بار تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم دو نکات پر اپنی وضاحت پیش کرو۔ پہلا نکتہ: کیا تم Pierron نامی باغ کی دیوار پر چڑھے تھے یا نہیں چڑھے تھے، اور سیب چرائے تھے؛ یعنی تم نے بلا اجازت داخل ہونے اور چوری کا جرم کیا تھا؟ دوسرا نکتہ: کیا تم رہا شدہ سزا یافتہ ژاں ولژاں ہو — ہاں، یا نہیں؟

قیدی نے بڑے اعتماد سے اپنا سر ہلایا، ایسے آدمی کی طرح جو اچھی طرح سمجھ گیا ہو، اور جانتا ہو کہ وہ کیا جواب دینے والا ہے۔ اس نے اپنا منہ کھولا، صدر کی طرف مڑا اور کہا:

"سب سے پہلی بات ......"

پھر اس نے اس کی ٹوپی کی طرف گھور کر دیکھا، سقف کی طرف گھور کر دیکھا، اور اپنا سکون برقرار رکھا۔

"قیدی!" وکیلِ سرکار نے فہمائشی انداز میں کہا، "توجہ دو! تم سے جو کچھ پوچھا گیا ہے اس کا جواب نہیں دے رہے ہو۔ تمھاری پریشانی تمھیں مجرم بنا رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تمھارا نام شامپ ماتھیو نہیں؛ کہ تم سزا یافتہ ژاں ولژاں ہو، جو پہلے ژاں ماتھیو کے نام میں پوشیدہ تھا، جو اس کی ماں کا نام تھا؛ کہ تم Auvergne گئے تھے؛ کہ تم Faverolles میں پیدا ہوئے تھے جہاں تم درختوں کی قلم تراشی کرتے تھے۔ یہ واضح ہو گیا ہے کہ تم Pierron نامی باغ میں داخل ہونے اور سیب چرانے کے مجرم ہو۔ جیوری حضرات اپنی رائے خود پیش کریں گے۔"

قیدی بالآخر اپنی نشست پر بیٹھ گیا تھا؛ پھر جب وکیلِ سرکار اپنی بات ختم کر چکا تو وہ اچانک اٹھا، اور زور سے کہا تھا:

''تم بہت بدکار ہو؛ اور واقعی تم ہو! میں یہ کہنا چاہتا تھا؛ مگر پہلے مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ میں نے کچھ نہیں چرایا۔ میں وہ انسان ہوں جس کے پاس ہر روز کے کھانے کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ میں Ailly سے آرہا تھا؛ میں بارش کے بعد ملک سے گزر رہا تھا، جس نے پورے ملک کو زرد کر دیا تھا: جوہڑ تک لبریز ہو گئے تھے، اور سوائے گھاس کی پتیوں سے، ریت سے کچھ نہیں اُگا تھا۔ مجھے راستے میں ایک ٹوٹی شاخ پڑی ملی جس میں سیب لگے ہوئے تھے۔ میں نے شاخ اٹھالی، یہ جانے بغیر کہ میں مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ اب میں قید ہوں اور وہ مجھے تین ماہ سے گھسیٹے پھر رہے ہیں؛ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا؛ لوگ میرے خلاف باتیں کرتے ہیں، وہ مجھے 'جواب' بتاتے ہیں۔ فوجی سپاہی، جو اچھا آدمی ہے، مجھے کہنی مارتا ہے، اور دھیمی آواز میں کہتا ہے 'چلو! جواب دو'۔ میں نہیں جانتا کہ میں کس طرح وضاحت کروں؛ میں جاہل ہوں، میں مفلس ہوں؛ اسی وجہ سے وہ سب میرے خلاف ہیں، اس لیے کہ وہ اس پر غور نہیں کرتے۔ میں نے چوری نہیں کی ہے؛ میں نے وہی چیزیں اٹھائی ہیں جو وہاں زمین پر پڑی تھیں۔ تم کہہ رہے ہو، ژاں ولژاں، ژاں ماتھو! میں ان لوگوں کو نہیں جانتا؛ یہ دیہاتی لوگ ہوں گے۔ میں موسیو بالو کے لیے l'Hopital بلیوارڈ پر کام کرتا تھا؛ میرا نام شامپ ماتھو ہے۔ تم بڑے چالاک ہو۔ مجھے بتا رہے ہو کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا؛ مجھے تو خود بھی نہیں معلوم؛ میں خود اپنے آپ کو نہیں جانتا؛ ہر آدمی ایسا نہیں ہوتا جس کے پاس دنیا میں آنے کے لیے اپنا گھر ہو؛ ویسے اس میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے، کہ میرے والدین وہ لوگ تھے جو شاہراہوں پر گھوما کرتے تھے؛ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم۔ جب میں بچہ تھا، وہ مجھے پیارے دوست کہہ کر پکارا کرتے تھے؛ اب وہ مجھے پرانا دوست کہتے ہیں؛ یہ میرے بپتسمے کے نام ہیں؛ تم جو بھی چاہو سمجھو۔ میں Auvergne میں رہا ہوں، یا Faverolles میں یا Pardi میں۔ اچھا! تو کیا کوئی آدمی جہازی قید میں رہے بغیر Auvergne یا Faverolles میں رہ نہیں سکتا؟ میں تم کو بتا رہا ہوں کہ میں نے چوری نہیں کی ہے، اور یہ بھی کہ میں فادر شامپ ماتھو ہی ہوں؛ میں موسیو بالو کے ساتھ رہا ہوں؛ میرا باقاعدہ گھر تھا۔ تم مجھے اپنی فضولیات سے پریشان کر رہے ہو۔ لوگ آخر میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟''

وکیلِ سرکار کھڑا رہا تھا؛ وہ صدر سے مخاطب ہوا:

''موسیو صدر! قیدی کے پیچیدہ اور بے حد ہنر مندانہ انکار کے بعد، جو اپنے آپ کو بیوقوف کہہ کر بچنا چاہتا ہے، مگر جو ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا— اس پر ہم بعد میں غور

کریں گے — ہمارا مطالبہ ہے، اگر آپ پسند کریں، اور عدالت بھی پسند کرے، کہ یہاں سزا یافتہ بریوے، Cochepaille اور Chenildieu، اور پولیس انسپکٹر جاویر کو طلب کیا جائے، اور ان سے آخری بار سزا یافتہ ژاں ولژاں کی شناخت کے بارے میں سوالات کیے جائیں۔"

"میں وکیلِ سرکار کو یاد دلانا چاہتا ہوں" صدر نے کہا "کہ ایک پڑوسی علاقے کے دارالحکومت میں فرائض کی بجا آوری کے لیے، اپنی گواہی کے فوراً بعد، انسپکٹر جاویر اس عدالت اور اس شہر سے جا چکا ہے؛ ہم اسے وکیلِ سرکار اور وکیلِ دفاع دونوں کی رضامندی سے جانے کی اجازت دے چکے ہیں۔"

"یہ سچ ہے، موسیو صدر!" وکیلِ سرکار نے جواب میں کہا "میں جاویر کے غیاب میں، جیوری حضرات کو یاد دلانا اپنے فرض سمجھتا ہوں جو کچھ اس نے چند گھنٹے قبل یہاں کہا تھا۔ جاویر ایک قابلِ قدر انسان ہے جو محنت اور سخت راست بازی سے اپنے فرائض پورے کرتا ہے۔ اس نے اپنے بیان میں یہ الفاظ کہے تھے، 'میں قیدی کے انکار کو جھوٹ کہنے کے لیے قرائنی شہادت اور اخلاقی قیاس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ شخص شامپ ماتئو نہیں، سابق سزا یافتہ ژاں ولژاں ہے؛ بہت خطرناک آدمی ہے؛ اس سے بچنا چاہیے۔ مجھے بے انتہا افسوس ہے کہ یہ اپنی قید کی مدت پوری ہونے پر رہا کر دیا گیا ہے۔ اس نے چوری پر انیس برس کی سزا کاٹی ہے۔ اس نے پانچ یا چھ بار فرار کی کوشش کی تھی۔ ننھے جروویے سے اور Pierron باغ سے چوری کے علاوہ میں اسے D کے عزت مآب بشپ کے گھر سے چوری کا بھی ملزم سمجھتا ہوں۔ جب میں Toulon میں گیلیز کا داروغہ تھا، میں اسے اکثر دیکھا کرتا تھا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'"

اتنے واضح الفاظ میں دیا گیا بیان عوام اور حضرات جیوری پر اثر ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ وکیلِ سرکار نے بااصرار درخواست کی کہ تین گواہان بریوے، Chenildieu اور Cochepaille کو ایک بار پھر سنا جائے اور ان پر زیرِ حلف جرح کی جائے۔

صدرِ عدالت نے پیش کار کو حکم دیا، اور ایک لمحے میں گواہوں کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک مسلح مددگار سپاہی کے ساتھ پیش کار نے سابق سزا یافتہ بریوے کو پیش کیا۔ تمام حاضرین سکتے میں آ گئے؛ ہر سینے نے اس طرح سانس لی گویا سب کے اندر ایک ہی روح تھی۔

سابق سزا یافتہ، مرکزی قید خانے کی سیاہ اور بھورے رنگ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ بریوے کی عمر ساٹھ برس تھی؛ اس کا چہرہ کاروباری حضرات جیسا تھا جس میں بدمعاشی لہریں

لے رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ دو عادتیں ایک ساتھ ہو جایا کرتی ہیں قید خانے میں، جہاں اس کی تازہ بدکاریاں اسے لے گئی تھیں، وہ ایک قسم کا کلید بردار ہو گیا تھا۔ یہ ایسا آدمی تھا جس کے بارے میں اس کے افسران کہتے تھے کہ "یہ کوشش کرتا ہے کہ اس سے کام لیا جائے۔" پادری بھی اس کی مذہبی عادات کے گواہ تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ شخص بحالی کے عمل سے گزر چکا تھا۔

"بریوے" صدرِ عدالت نے کہا، "تم رسوا کن سزا جھیل چکے ہو، اس لیے تم سے حلف نہیں لیا جا سکتا۔"

بریوے نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

"بہر حال" صدرِ عدالت نے اپنا کلام جاری رکھا، "اس آدمی میں بھی، جسے عدالت نے کم رتبہ کر دیا ہو، اگر رحمتِ ربانی چاہے تو عزت اور انصاف کے جذبات باقی رہ سکتے ہیں۔ اس فیصلہ کن وقت پر میں ان ہی جذبات سے اپیل کر رہا ہوں۔ اگر یہ تم میں اب بھی موجود ہیں — اور مجھے اُمید ہے کہ ہیں — تو جواب دینے سے قبل اچھی طرح غور کر لو۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایک انسان ہے جسے تمھارا ایک لفظ تباہ و برباد کر سکتا ہے؛ دوسری جانب انصاف ہے جسے تمھارا ایک لفظ روشن کر سکتا ہے۔ یہ ایک متبرک لمحہ ہے؛ تمھارے پاس اب بھی اپنے الفاظ واپس لینے کا موقع ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم سے غلطی ہو گئی ہے۔ اٹھو قیدی، بریوے! اس ملزم کو غور سے دیکھو، اپنی یادوں کو ٹٹولو اور اپنے ضمیر اور اپنے نفس کے صدقے ہمیں بتاؤ کہ تم اس آدمی کو اپنے قید کے ساتھی کی حیثیت میں پہچانتے ہو کہ یہ ژاں ولژاں ہی ہے؟"

بریوے نے قیدی کی طرف دیکھا اور عدالت کی طرف مُڑا۔

"جی ہاں، جانبِ صدر، میں پہلا شخص تھا جس نے اس کی شناخت کی تھی، اور میں اس پر قائم ہوں: یہ آدمی ژاں ولژاں ہے، جو 1796ء میں Toulon میں داخل ہوا تھا اور 1815ء میں چلا گیا تھا۔ میں ایک سال بعد گیا تھا۔ اب یہ مجھے جنگلی سا لگتا ہے؛ مگر ہو سکتا ہے کہ عمر نے اسے جنگلی بنا دیا ہو۔ قید میں یہ بہت چالاک لگتا تھا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"تم بیٹھ جاؤ۔" صدرِ عدالت نے کہا، "قیدی کھڑا رہے گا۔"

اب عمر بھر کا قیدی Chenildieu لایا گیا، یہ اس کی سبز ٹوپی اور سرخ بالاپوش سے واضح تھا۔ وہ Toulon کے باورچی خانے میں قید تھا اور وہاں سے گواہی کے لیے لایا گیا تھا۔ ایک پستہ قد آدمی جس کی عمر پچاس برس تھی، تیز، جھریوں بھرا، لاغر، زرد، بے حیا اور بخار زدہ چہرہ، اس کے دست وپا اور پورے جسم میں بیماروں جیسی ناتوانی تھی، مگر نظروں میں لا انتہا طاقت

تھی۔قید میں اس کے ساتھیوں نے اس کا نام "خدا کا انکاری" رکھا تھا۔

صدر نے اس سے بھی تقریباً اسی طرح کلام کیا جیسا بریوے کے ساتھ کیا تھا۔جب صدر نے اس کی رسوائی یاد دلائی جس کے باعث وہ حلف نہیں لے سکتا تھا، Chenildieu نے سر اٹھایا اور مجمعے کی طرف گھور کر دیکھا۔صدر نے اسے بھی غور کرنے کی دعوت دی، جیسی بریوے کو دی تھی کہ اسے بھی قیدی کی شناخت پر اصرار تھا۔

Chenildieu قہقہہ مار کر ہنسا۔

"بخدا! میں اسے کیوں نہیں پہچانوں گا۔ہم پانچ برس ایک زنجیر میں بندھے رہے تھے۔اچھا، تم غصے میں ہو، بڑے میاں؟"

"جاؤ بیٹھو۔" صدر نے کہا۔

اب پیش کار نے Cochepaille کو پیش کیا۔وہ بھی عمر قید میں تھا، جو قید خانے سے آیا تھا اور Chenildieu کے جیسے لباس میں تھا، وہ Lourdes کا دیہاتی تھا، اس کا Pyrenees سے بھی تعلق تھا۔وہ پہاڑوں میں بھیڑیں چراتا تھا، اور گڈریے سے ڈاکو بن گیا تھا۔ Cochepaille کم وحشی نہیں تھا مگر ملزم قیدی سے زیادہ بیوقوف انسان تھا۔یہ ان بدنصیب لوگوں میں سے تھا جسے فطرت نے وحشی جانور جیسا بنایا، اور جسے سماج نے قیدی بنا دیا تھا۔

صدر نے اس سے بھی ویسے ہی سخت اور دل سوز الفاظ کہے، جس طرح پچھلے دو سے سوال کیے تھے؛ کیا وہ بغیر کسی تامل یا مشکل سے اس شخص کی شناخت پر اصرار کرے گا جو اس کے سامنے کھڑا ہے؟

"یہ ژاں ولژاں ہے۔" Cochepaille نے کہا "اس کو تو 'ژاں پیچ' (Jean the screw) بھی کہا جاتا تھا، اس لیے یہ بہت طاقت ور آدمی تھا۔"

ان تینوں کے اثباتی اقرار کے ساتھ ہی، جو بظاہر سنجیدہ اور نیک نیتی سے کیے گئے تھے جن سے مجمعے میں قیدی کے بارے میں بدشگونی کی سرگوشی ہوئی تھی — ایسی سرگوشی جو بڑھتی رہی اور دیر تک ہوتی رہی تھی، جب بھی مقدمے کی کارروائی میں کوئی تازہ بیان شامل ہوتا تھا۔

قیدی نے ان کو ایسے تاثرات کے ساتھ سنا تھا جو الزام کے مطابق، اس کے مرکزی دفاع کا ذریعہ بننے والے تھے؛ پہلے سپاہی، پھر اس کے قریب بیٹھے لوگوں نے اس کو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے سنا تھا، "ہاں، یہ اچھا والا ہے!" دوسرے کی گواہی کے بعد اس نے کہا تھا، "اچھا ہے۔" مگر ذرا بلند آواز اور ایسے انداز میں جس میں طمانیت تھی، اور تیسرے کی گواہی کے بعد اس

نے چلا کر کہا، ''مشہور ا''

صدر اس کی طرف متوجہ ہوا:

''قیدی! تم نے سنا؟ اب تم کیا کہتے ہو؟''

''میں کہوں گا مشہور ا!''

سامعین میں شور برپا ہو گیا، اور جیوری کو اس کی اطلاع دی گئی؛ ظاہر ہے کہ وہ آدمی ضائع ہو گیا تھا۔

''پیش کار!'' صدر نے کہا ''خاموشی کی جائے! میں دلائل کا خلاصہ پیش کرنے جا رہا ہوں۔''

عین اس وقت صدر کے پہلو میں کچھ حرکت ہوئی؛ ایک آواز چیخی سنائی دی:

''Brevet! Chenildieu! Cochepaille! ادھر دیکھو۔''

جنھوں نے بھی وہ آواز سنی، سب سرد پڑ گئے تھے، اتنی افسوس ناک اور بھیانک تھی وہ آواز۔ ساری نظریں اس طرف اٹھ گئیں جہاں سے آواز اٹھی تھی۔ عدالت کے عقب میں ایک آدمی جو خواص میں سے تھا، اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے وہ نصف دروازہ بھی کھول دیا جس نے عدالت اور سامعین کو الگ کر رکھا تھا، اور وہ ہال کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا؛ صدرِ عدالت، وکیلِ سرکار، موسیو مابابا تو اور بیس افراد نے اس کو پہچان لیا اور سب یک زبان ہو کر چلائے:

''موسیو میڈلین، آپ!''

✡

حیرت زدہ شامپ ماٹ ٹو

واقعی وہ موسیو میڈیلن ہی تھا۔ کلرک کے لیمپ سے اس کا چہرہ روشن ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کی ہیٹ تھی۔ لباس میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی۔ کوٹ کے بٹن احتیاط سے بند کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت بے رونق اور لرز رہا تھا؛ اس کے بال جو Arras میں آمد پر کھچڑی تھے، اب بالکل سفید ہو گئے تھے۔ یہ تبدیلی اسی وقت کے دوران ہوئی جب وہ عدالت میں بیٹھا تھا۔

سب کے سر اٹھے ہوئے تھے۔ سنسنی نا قابلِ بیان تھی۔ آواز اتنی دل خراش تھی کہ مجھے میں ایک قسم کا وقتی تذبذب پیدا ہو گیا تھا؛ وہ آدمی جو وہاں کھڑا تھا، اتنا پُرسکون تھا کہ پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں پائے۔ گویا وہ اپنے آپ سے پوچھ رہے تھے، آیا وہ چیخ اسی کی تھی؛ وہ یقین نہیں کر پا رہے تھے کہ واقعی اتنا پُرسکون شخص اس طرح چیخ بھی سکتا ہے۔

تذبذب صرف چند سیکنڈ باقی رہا۔ قبل اس کے کہ صدر اور وکیلِ سرکار منہ سے ایک لفظ بھی نکال سکتے، قبل اس کے پیشکار اور فوجی سپاہی کچھ اظہار کر سکتے، وہ آدمی جسے اس لمحے بھی سب موسیو میڈیلن کے نام سے جانتے تھے، گواہوں Chenildieu، Cochepaille, اور بریوے کی طرف گیا۔

"کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

وہ تینوں گونگے سے ہو گئے، اور سر کے اشارے سے کہا کہ اسے نہیں جانتے۔ Cochepaille نے جو ذرا رعب میں آ گیا تھا، فوجی سیلوٹ کیا۔ موسیو میڈیلن مڑ کر جیوری اور عدالت سے مخاطب ہوا، اور نہایت شائستہ زبان میں گویا ہوا:

"جیوری کے حضرات، قیدی کو آزاد کرنے کا حکم دیجیے۔ جناب صدر، مجھے گرفتار

کرائیے۔ یہ وہ آدمی نہیں آپ کو جس کی تلاش ہے؛ وہ میں ہوں۔ میں ہی ژاں ولژاں ہوں۔''

لوگ سانس لینا بھول گئے؛ استعجاب کی پہلی ہلچل کے بعد قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی تھی۔ ہال میں بیٹھے لوگوں کو اس قسم کی مذہبی دہشت کا تجربہ ہوا جو مجمعے کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ جب کوئی عظیم واقعہ ہو جاتا ہے۔

اس دوران صدر کے چہرے پر ہم دردی اور اداسی پھیل گئی؛ اس نے سُرعت سے وکیلِ سرکار کی طرف دیکھا، اور دھیمی آواز میں مددگار ججوں سے چند الفاظ کہے؛ پھر وہ عوام کی طرف متوجہ ہوا اور ایسے لہجے میں پوچھا جسے سب سمجھ رہے تھے:

''کیا یہاں کوئی معالج موجود ہے؟''

وکیلِ سرکار نے جملے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''جیوری کے حضرات! ایسا حیرت انگیز اور غیر متوقع واقعہ جو عوام کو پریشان کر دیتا ہے، ہمیں ذہنی طور پر متحرک کر دیا کرتا ہے۔ کم از کم شہرت کے ذریعے، آپ سب M. sur M. کے میئر عزت مآب موسیو میڈلین سے ضرور واقف ہوں گے؛ اگر سامعین میں کوئی معالج موجود ہے تو ہم جنابِ صدر سمیت اس سے درخواست کریں گے کہ وہ موسیو میڈلین کا علاج کرے اور انھیں ان کے گھر تک بہ حفاظت پہنچا دے۔''

موسیو میڈلین نے وکیلِ سرکار کو مزید کچھ کہنے کی اجازت نہیں دی؛ انھوں نے شائستہ اور تحکمانہ لہجے میں اس کے بیان میں مداخلت کی۔ اور یہ تھے وہ الفاظ جو انھوں نے کہے تھے؛ بالکل اسی طرح جیسے لکھے گئے تھے، اور موقعے کے گواہوں نے سنے تھے اور چالیس برس بعد بھی ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''جنابِ وکیلِ سرکار! میں آپ کا شکر گزار ہوں، مگر آپ دیکھیں گے کہ میں دیوانہ نہیں؛ آپ بہت بڑی غلطی کرنے والے تھے؛ اس آدمی کو آزاد کر دیجیے! میں ایک فرض پورا کر رہا ہوں؛ میں ہی وہ بد نصیب مجرم ہوں۔ اس وقت صرف میں ہی ہوں جو معاملے کو صفائی سے دیکھ سکتا ہے اور میں سچ کہہ رہا ہوں۔ خدا، جو سب سے اوپر ہے، گواہ ہے کہ اس وقت میں کیا کر رہا ہوں، میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ آپ لوگ مجھے قید کر سکتے ہیں، اسی لیے میں یہاں ہوں: میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی ہے؛ میں نے اپنے آپ کو ایک اور نام میں چھپایا؛ میں دولت مند ہو گیا؛ میں میئر بن گیا؛ میں نے ایمان دار لوگوں کی صف میں دوبارہ شامل ہونے کی کوشش کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ مختصر یہ کہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں

میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو اپنی زندگی کی کہانی نہیں سناؤں گا؛ چند دن میں آپ خود ہی سُن لیں گے۔ میں نے موں سینیور بشپ کے ہاں چوری کی، یہ سچ ہے؛ یہ بھی سچ ہے کہ میں نے ننھے جروے کو لوٹا تھا؛وہ سچ کہہ رہے تھے کہ ژاں ولژاں بہت خطرناک بدنصیب ہے۔ شاید یہ سب اس کی اپنی غلطی سے ہوا تھا۔ عزت مآب جج صاحبان غور سے سنیے، ایک آدمی کو اتنی بری طرح مغلوب کیا گیا ہو، جیسا کہ میں تھا، جسے قدرت سے کرنے کے لیے نہ کوئی گلہ ہو، نہ سماج کو دینے کے لیے کوئی مشورہ؛ مگر وہ رسوائی میں نے جس سے فرار کی کوشش کی ہے طرز رساں چیز ہوتی ہے۔ گیلیز کے سزا یافتہ کو وہ بنا دیتی ہے جو وہ آج ہے؛ مہربانی کر کے اس پر غور کیجیے۔ قید میں جانے سے پہلے میں بہت کم ذہانت والا، ایک قسم کا بیوقوف اور مفلس دہقان تھا۔ قید نے مجھے تبدیل کر دیا تھا۔ میں احمق تھا؛ میں خطرناک بن گیا تھا؛ میں لکڑی کے لٹھے کی طرح [ناتراشیدہ] تھا؛ میں سلگتی لکڑی بن گیا۔ بعد میں توبہ اور مہربانی نے مجھے بچا لیا، کہ سخت گیری نے مجھے تباہ کر دیا تھا، مگر معاف کیجیے گا، آپ سمجھ نہیں سکتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آپ کو میرے گھر کے آتش دان کی راکھ میں وہ چالیس سو کا سکہ ملے گا جو میں نے سات برس قبل ننھے جروے سے چرایا تھا۔ اب میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بخدا! وکیل سرکار انکار کر رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ موسیو میڈلین پاگل ہو گیا ہے۔ آپ مجھ پر یقین نہیں کر رہے ہیں۔ یہ بہت پریشان کن بات ہے۔ کم از کم اس آدمی تو رسوا نہ کیجیے۔ کیا یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے؟ کاش جاویر یہاں ہوتا؛ وہ مجھے پہچان لیتا۔"

ان لفظوں کے ساتھ لہجے میں جو دل گداز اور مہربان غمگینی تھی، وہ کسی طرح دوبارہ پیدا نہیں کی جا سکتی۔

پھر وہ تینوں سزا یافتہ مجرموں کی طرف متوجہ ہوا، اور کہا، میں تمھیں پہچانتا ہوں، بریوے، تمھیں یاد ہے نا؟

اس نے ایک لمحے تامل کیا اور بولا:

"تمھیں بُنائی کے وہ گیلس یاد ہے جس پر چارخانے کے نمونے بنے ہوئے تھے، جو تم قید میں پہنا کرتے تھے؟"

بریوے نے اسے سر سے پیر تک خوف زدہ نظر سے دیکھا۔

اور وہ جاری رہا:

"Chenildieu تم وہی ہو، جس نے اپنا نام 'Jenie-Dieu,' رکھ لیا تھا؛ تمھارے دائیں کاندھے پر جلنے کا ایک گہرا نشان ہے، اس لیے کہ ایک دن تم نے اپنا کاندھا

گودے ہوئے حروف T.F.P مٹانے کے لیے کوئلے سے بھرے آتش دان پر رکھ دیا تھا، جو اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی، جواب دو، کیا یہ صحیح ہے؟"

"یہ سچ ہے۔" Chenildieu نے کہا۔

اب وہ Cochepaille سے مخاطب ہوا:

"Cochepaille، تمھارے بائیں بازو کے خم کے قریب، جلے ہوئے پاؤڈر سے نیلے حروف میں ایک تاریخ ثبت کی گئی تھی؛ وہ تاریخ کان (Cannes) میں شہنشاہ کے نزول کی تاریخ تھی، یکم مارچ 1815ء، اپنی آستین اوپر کرو۔"

Cochepaille نے اپنی آستین اوپر سرکائی: تمام آنکھیں اس پر، اور اس کے برہنہ بازو پر مرتکز ہو گئیں۔

ایک فوجی نے اس کے قریب روشنی کی۔ تاریخ موجود تھی۔

وہ بدقسمت آدمی تماشائیوں اور ججوں کی طرف ایک تبسم کے ساتھ مڑا، جو اب بھی ان لوگوں کے دل چیر کر رکھ دیتا ہے جو کبھی اس کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ وہ تبسم کامرانی کا تھا؛ وہ تبسم ناامیدی کا بھی تھا۔

"تم صاف دیکھ سکتے ہو۔" اس نے کہا، "کہ میں ژاں ولژاں ہوں۔"

اس کمرے میں اب نہ جج تھے، نہ الزام تراشی کرنے والے، نہ فوجی سپاہی؛ وہاں کچھ نہیں تھا سوائے کھچی کھچی آنکھوں اور دردمند دلوں کے۔ اب کسی کو وہ کردار یاد نہیں رہ گئے تھے جو انھیں ادا کرنے تھے؛ وکیلِ سرکار بھول گیا تھا کہ وہ مقدمے کی پیروی کے لیے تھا؛ صاحبِ صدر بھول گیا تھا کہ وہ صدارت کے لیے تھا؛ وکیلِ صفائی بھول گیا تھا کہ وہ دفاع کے لیے تھا۔ ایسا حیرت انگیز حال تھا کہ وہاں کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا، کسی اختیار نے دخل اندازی نہیں کی۔ ارفع نظاروں کی خصوصیت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ تمام نفوس کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور گواہوں کو تماشائی بنا دیتے ہیں۔ غالباً کوئی بتا نہیں سکتا تھا کہ اس نے کیا محسوس کیا؛ نہ کسی نے خود سے کہا تھا کہ وہ ایک عظیم روشنی کا شاندار طوفان دیکھ رہا تھا؛ اندرونی طور پر سب چندھیا گئے تھے۔

یہ واضح تھا کہ ژاں ولژاں ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ مسئلہ تو صاف تھا۔ اس شخص کی موجودگی اس مسئلے کو روشنی کے ذریعے منتشر کرنے کے لیے کافی تھی جو ایک لمحہ قبل بغیر کسی تشریح کے بہت مبہم ہو گیا تھا۔ پورا مجمع ایک نوع کے برقی انکشاف کے ذریعے فوراً، اور ایک ہی نظر میں اس آدمی کی سادہ اور عالی شان تاریخ کو سمجھ گیا تھا جو خود کو پیش کر رہا تھا، تا کہ اس کے

بجائے کسی اور آدمی کو سزا نہ ہو جائے۔ وہ وسیع اور منور حقیقت، تفصیلات، تاملات اور چھوٹے چھوٹے ممکنہ اختلافات کو نگل گئی تھی۔

وہ ایک تاثر تھا جو تیزی سے غائب ہو گیا، مگر اس وقت دل کش لگ رہا تھا۔

"میں عدالت کو زیادہ پریشان نہیں کرنا نہیں چاہتا۔" ژاں ولژاں نے مزید کہا "چوں کہ آپ لوگ مجھے گرفتار نہیں کرنا چاہتے، اس لیے میں لپسپا ہو جاؤں گا۔ مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ وکیلِ سرکار کو علم ہے کہ میں کون ہوں؛ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں کدھر جا رہا ہوں؛ وہ جب چاہے مجھے گرفتار کرا سکتا ہے۔"

اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ نہ کوئی آواز اٹھی، نہ کوئی بازو بڑھا اس کو روکنے کے لیے۔ سب کنارے کھڑے رہے۔ اس وقت اس کے اطراف کوئی ربانی شے تھی جو ہجوم کو کنارے لگا دیتی ہے اور ایک آدمی کے لیے راستہ بنا دیتی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ مجمعے کو پار کیا۔ یہ کبھی پتا نہیں چلا کہ دروازہ کس نے کھولا تھا، مگر دروازہ یقیناً کھلا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ مڑا اور کہا، "جناب وکیلِ سرکار، میں آپ کے حکم کا منتظر رہوں گا۔"

اس کے بعد اس نے مجمعے سے خطاب کیا:

"آپ سب لوگ جو یہاں موجود ہیں — مجھے رحم کے قابل سمجھتے ہیں، ہے نا؟ خدایا! جب میں سوچتا ہوں کہ میں کیا کرنے والا تھا، تو میں خود کو رشک کے قابل سمجھنے لگتا ہوں۔ پھر بھی، میں پسند کرتا کہ یہ نہ ہوا ہوتا۔"

وہ واپس ہوا، اور جس طرح دروازہ کھلا تھا اسی طرح بند ہو گیا۔ ان کے لیے کہ جو کچھ شاہانہ کام کرتے ہیں، یقینی طور پر ہجوم میں کوئی نہ کوئی ہوتا ضرور ہے جو اُن کی خدمت کرتا ہے۔

اس کے بعد، ایک گھنٹے سے کم عرصے میں جیوری کے فیصلے نے مذکور شامپ ماتیو کو تمام الزامات سے بری کر دیا تھا؛ اور شامپ ماتیو اپنی اچانک آزادی پر، یہ سوچتا ہوا، ایک بے ہوشی کی سی کیفیت میں چلا گیا، کہ تمام آدمی بیوقوف تھے، اور اس نظارے سے اس نے کوئی سبق نہیں لیا۔

۞

آئینہ اور موسیو میدیلن کے بال

دن نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ فانتین نے بخار کی کیفیت میں پوری رات جاگ کر گزاری تھی، جس میں خوشیوں کی جھلکیاں بھی تھیں۔ فجر کے وقت اسے نیند آگئی تھی۔ بسسٹر سیمپلیس کو جو اس کے ساتھ جاگ رہی تھی، موقع فراہم ہوگیا اور وہ chinchona کی خوراک تیار کرنے چلی گئی۔ اسے شفا خانے کی تجربہ گاہ میں گئے چند ہی منٹ گزرے تھے، اور اس دوران وہ صبح کی پھیلتی ہوئی ملگجی روشنی میں دواؤں اور ٹکیوں پر گہری غور سے معائنہ کر رہی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ موسیو میدیلن اس کے سامنے کھڑا تھا؛ چند لمحے پہلے ہی وہ خاموشی سے داخل ہوا تھا۔

”ارے! یہ آپ ہیں، موسیو میئر؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

میئر نے دھیمی آواز میں پوچھا، ”بے چاری عورت کیسی ہے؟“

”اس وقت تو کچھ بہتر ہے، مگر ہم سب بہت پریشان تھے۔“

اس نے تفصیل سے اسے بتایا کہ کیا ہوا تھا، ایک دن قبل فانتین کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اب وہ بہت بہتر ہے، اس لیے کہ وہ سمجھ رہی تھی کہ میئر اس کی بچی کو لانے Montfermeil گئے ہیں۔ بسسٹر کی میئر سے کچھ پوچھنے کی ہمت تو نہیں ہوئی، مگر اسے حالات سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ Montfermeil سے نہیں آیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا، ”تم لوگوں نے اچھا کیا کہ اس سے غلط بیانی نہیں کی۔“

”جی ہاں!“ بسسٹر نے جواب میں کہا، ”مگر اب، مسٹر میئر وہ آپ کو دیکھے گی اور اپنی بچی کو نہیں پائے گی، تو ہم اسے کیا بتائیں گے؟“

میئر ایک لمحے کے لیے سوچنے لگا۔

”خدا ہمیں توفیق دے گا۔“ اس نے کہا۔

بسسٹر نے ہلکی آواز میں سرگوشی کی، ”مگر ہم غلط بیانی تو نہیں کر سکتے!“

کمرہ دن کی روشنی سے بھر گیا تھا۔ موسیو میڈیلین کے پورے چہرے پر روشنی پڑ رہی تھی۔ بسسٹر نے اس کی طرف دیکھنے کی ہمت کی۔

”خدایا! اس نے حیرت سے چلا کر کہا۔ ”آپ کو کیا ہو گیا ہے، جناب؟ آپ کے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں!“

”سفید!“ اس نے کہا۔

بسسٹر سمپلیس کے پاس اس وقت کوئی آئینہ نہیں تھا۔ اس نے میز کی دراز میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا، اور وہ چھوٹا سا شیشہ نکالا، شفا خانے کے ڈاکٹر جس کو کسی مریض کو یہ دیکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے کہ وہ مرا ہے کہ نہیں، کہ وہ سانس لے رہا ہے کہ نہیں۔ موسیو میڈیلین نے آئینہ لیا، اپنے بال دیکھے اور کہا، ”اچھا!“

اس نے یہ لفظ بڑی لاپروائی سے استعمال کیا تھا، گویا اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

اس دوران بسسٹر کچھ دیکھ کر پُرسکون ہو گئی تھی۔

میئر نے پوچھا، ”کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟“

”کیا موسیو اس کی بچی کو واپس نہیں لائیں گے؟“ بسسٹر مشکل سے یہ سوال کر سکی تھی۔

”ضرور لائیں گے مگر اس میں دو یا تین دن لگ جائیں گے۔“

”اگر اس وقت تک وہ میئر کو نہیں دیکھے گی“ بسسٹر جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھی ”تو اسے پتا نہیں چلے گا کہ آپ واپس آگئے ہیں۔ اس طرح اس کا دل بڑھا کر اس کی اُمید قائم رکھنا آسان ہو جائے گا؛ اور جب بچی آجائے گی، تو فطری طور وہ یہی سمجھے گی کہ موسیو میئر اس کی بچی کے ساتھ ابھی ابھی لوٹے ہیں۔ ہمیں جھوٹ تراشنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔“

موسیو نے چند لمحے غور کیا؛ اس کے بعد پُرسکون انداز میں کہا، ”نہیں بسسٹر۔ میں اس سے ملوں گا ضرور، مگر شاید ذرا جلدی میں۔“

”راہبہ نے اس لفظ ”شاید“ پر غور نہیں کیا تھا جو میئر کی گفتگو کی ایک مبہم اور غیر معمولی جس کی ترسیل کر رہا تھا۔ اس نے احترام سے اپنی نظریں اور آواز نیچی کرتے ہوئے جواب دیا:

”مگر، اس وقت تو وہ سو رہی ہے؛ پھر بھی موسیو میئر کمرے میں جا سکتے ہیں۔“

میئر نے چلتے چلتے ایک دروازے کے بارے کچھ باتیں کہیں جو بُری طرح بند ہوتا تھا،

جس کی آواز سے بیمار عورت کی نیند خراب ہو سکتی تھی؛ اس کے بعد وہ فانتین کے کمرے میں داخل ہوا، پلنگ کے قریب گیا اور پردے ایک طرف کر دیے۔ وہ سو رہی تھی۔ اس کی سانس اس کے سینے سے ایسی الم ناک آواز نکال رہی تھی جو اس قسم کی بیماریوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے، اور ماؤں کے دل توڑ دیتی ہے جب وہ رات بھر بچے کے پاس بیٹھی اپنے بچے کو سوتا دیکھتی رہتی ہیں، جو کسی وقت موت کی آغوش میں جانے والا ہوتا ہے، مگر یہ دردناک تنفس اس کے ناقابلِ بیان سکون کو خراب نہیں کر رہا تھا جو اس کے بشرے پر چھایا ہوا تھا، اور جس نے نیند میں اس کی ظاہری شکل بدل دی تھی۔ اس کا پیلا پن سفیدی میں تبدیل ہو گیا تھا؛ اس کے رخسار گلابی ہو گئے تھے؛ اس کی لانبی سنہری پلکیں، اس کی جوانی اور کنوار پن کی واحد خوب صورتی تھی جو باقی رہ گئی تھی، رہ رہ کر ہل رہی تھیں، حالاں کہ بند اور مضمحل تھیں۔ اس کا پورا وجود اس طرح لرز رہا تھا جیسے ناقابلِ بیان پھیلتے ہوئے پر اس کو اڑا لے جانے کے لیے کھلنے والے ہوں، جن کی سرسراہٹ محسوس کی جا سکتی ہو، حالاں کہ انھیں دیکھا نہیں جا سکتا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کوئی خواب میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ معذور تھی، جس کی پوری زندگی تقریباً مایوسی میں بدل جانے والی تھی۔ وہ کسی ایسی شے سے مشابہ تھی جو بجائے مرجانے کے، تیزی سے بلند ہو جانے والی ہو۔

جب کوئی ہاتھ پھول توڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو شاخِ گل لرز جاتی ہے، اور وہ، ایک ہی وقت میں پسپا بھی ہوتی اور پیش کش بھی کرتی محسوس ہوتی ہے۔ انسان کے جسم میں بھی کچھ اسی قسم کے جھٹکے آتے ہیں جب وہ وقتِ معین آتا ہے جس میں موت کی پُراسرار انگلیاں روح کو جسم سے نکالنے لگتی ہیں۔

موسیو میڈیلین پلنگ کے پاس کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا؛ اس کی نظر کبھی بیمار عورت پر ہوتی کبھی صلیب پر، بالکل اسی طرح جیسے دو ماہ قبل وہ اسی پناہ گاہ میں اسے دیکھنے آیا تھا۔ دونوں اسی انداز میں وہاں آج بھی موجود تھے — لڑکی سو رہی تھی، میئر دعا کر رہا تھا؛ فرق صرف اتنا تھا کہ لڑکی کے بال کھچڑی تھے اور میئر کے بال سفید تھے۔

سسٹر اس کے ساتھ کمرے میں نہیں آئی۔ وہ بستر کے پاس کھڑا رہا، اس کی انگلی ہونٹوں پر تھی، گویا اس کمرے میں کوئی تھا جسے وہ خاموشی کا حکم دے رہا تھا۔

فانتین نے آنکھیں کھولیں، اس کو دیکھا، مسکراتے ہوئے، اور دھیمی آواز میں پوچھا:

"اور کوزیٹ؟"

۞

خوش باش فانتین

اس نے کوئی حرکت نہیں کی؛ نہ حیرت کی اور نہ مسرت کی۔ وہ خود مسرت تھی۔ اس کا وہ سادہ سا سوال "اور کوزیت" ایسے یقین کے ساتھ کیا گیا تھا، اتنے اعتبار کے ساتھ کیا گیا تھا اور اتنے زور سے اور شبہے کے ساتھ کیا گیا تھا کہ میئر کو جواب کا ایک لفظ بھی نہیں مل سکا۔

فانتین کہتی رہی:

"میں جانتی تھی کہ آپ وہاں موجود تھے۔ میں سو رہی تھی مگر آپ کو دیکھ رہی تھی۔ میں ایک زمانے سے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ میں اپنی آنکھوں سے پوری رات آپ کو دیکھتی رہی ہوں۔ آپ اوج پر تھے، اور آپ کے اطراف ہر قسم کے آسمانی پیکر ہجوم کیے ہوئے تھے۔"

میئر نے صلیب کی طرف اپنی نظر اٹھائی۔

"مگر" وہ کہتی رہی، "مجھے بتایئے کہ میری کوزیت کہاں ہے؟ آپ نے میرے جاگتے اسے میرے بستر پر کیوں نہیں بٹھایا؟"

میئر نے کچھ میکانکی جواب تراش لیے تھے، بعد میں جو اسے یاد نہیں رہے۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر کو تنبیہ کر دی گئی تھی، اور وہ آموجود ہوا۔ اس نے موسیو میڈلین کی مدد کی۔

"صبر کرو، میری بچی!" ڈاکٹر نے کہا "تمھاری بچی یہیں ہے۔"

فانتین کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کے چہرے کو روشنی سے بھر دیا۔ اس نے اس طرح اپنے ہاتھ باندھ لیے جیسے وہ دہشت اور نرم دلی کے درمیان، ہر ممکنہ دعا مانگ رہی ہو۔

"ارے!" وہ چلائی "اسے میرے پاس تو لاؤ!"

دل گداز، ماورانہ فریب نظر تھا۔ اس کے نزدیک کوزیٹ اب بھی چھوٹی سی بچی تھی جو لائی جا رہی تھی۔

''ابھی نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا، ''ابھی تمھیں بخار ہے۔ بچی کا نظارہ تم میں ہیجان برپا کردے گا، جو تمھارے لیے نقصان دہ ہوگا۔ پہلے تم ٹھیک تو ہو جاؤ۔''

اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی:

''مگر میں ٹھیک ہو گئی ہوں۔ ارے، میں بتا رہی ہوں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیسا احمق ہے یہ ڈاکٹر، اور اس کا خیال، میں اپنی بچی کو دیکھنا چاہتی ہوں!''

''دیکھا تم نے۔ کتنی جذباتی ہوجاتی ہو تم۔ جب تک تم اس حالت میں ہو، میں بچی کو تمھارے پاس آنے کی مخالفت کروں گا۔ اتنا کافی نہیں کہ تم اسے دیکھ لو، تمھیں اس کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو میں خود بچی کو تمھارے پاس لاؤں گا۔''

بے چاری ماں نے اپنا سر جھکا لیا۔

''میں معافی چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر، میں واقعی تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی؛ مجھ پر اتنی مصیبتیں گزر چکی ہیں کہ کبھی کبھی مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں تمھاری بات سمجھ رہی ہوں۔ تمھیں میرے جذبات سے خوف آرہا ہے۔ جب تک کہو گے میں انتظار کروں گی، مگر تمھیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اپنی بچی کو دیکھنے سے مجھے نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں اسے ہر وقت دیکھتی رہتی ہوں۔ کل شام کے بعد سے میری نظر اس سے ہٹی نہیں ہے۔ سمجھے؟ اگر وہ ابھی میرے پاس لائی جاتی، تو میں اس سے بہت نرمی سے بات کرتی۔ بس۔ کیا یہ بالکل فطری بات نہیں کہ میں اپنی بچی کو دیکھنا چاہتی ہوں، جو خاص کر میرے لیے Montfermeil سے لائی گئی ہے؟ میں ناراض نہیں ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں خوش ہونے والی ہوں۔ پوری رات میں سفید چیزیں دیکھتی رہی ہوں، اور لوگوں کو، جو میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جب موسیو ڈاکٹر کی مرضی ہوگی وہ کوزیٹ کو میرے پاس لے آئیں گے۔ مجھے اب بخار نہیں ہے؛ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں، مگر میں یہی سمجھوں گی کہ میں بیمار ہوں، اور ان خواتین کو خوش رکھنے کے لیے بالکل حرکت نہیں کروں گی۔ جب میں بالکل پُرسکون نظر آنے لگوں گی تو کیا یہ خواتین کہیں گی اس کو اس کی بچی ملنی چاہیے؟''

موسیو میڈلین پلنگ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ ان کی طرف مڑی؛ بہ ممکن

کوشش کر رہی تھی کہ پُرسکون اور "بہت اچھی" نظر آئے جیسی کہ وہ بیماری کی لاغری میں ظاہر کر رہی تھی، جو عالمِ شیر خوارگی سے مشابہ تھی؛ تا کہ اس کو پُرسکون دیکھ کر انھیں کوزیٹ کو اس کے پاس لانے میں کوئی قباحت نہ ہو، مگر اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے بھی وہ موسیو میڈلین سے سوال کرنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

"آپ کا سفر کیسا رہا، موسیو میئر؟ اوہ! آپ کتنے اچھے ہیں کہ میری خاطر اسے لینے گئے، بس مجھے اتنا بتا دیجیے کہ وہ کیسی ہے؟ کیا اس نے سفر اچھی طرح برداشت کر لیا تھا؟ افسوس! وہ مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ اب تک تو وہ مجھے بھول چکی ہوگی، میری پیاری بچی! بچوں کی یادداشت کم زور ہوتی ہے۔ وہ پرندوں کی مثال ہوتے ہیں۔ پرندہ ایک دن کچھ دیکھتا ہے، دوسرے دن کچھ اور، اور کسی شے کے بارے میں سوچتا نہیں۔ میری بچی کے پاس سفید چادریں وغیرہ تھیں؟ کیا ان تھن آردیے نے اسے صاف ستھرا رکھا تھا؟ کیسا کھلایا پلایا ہوگا؟ کاش آپ سمجھ سکتے کہ میں اپنی بدنصیبی کے دنوں میں کن دکھوں سے گزر رہی ہوں۔ اب سب کچھ ماضی ہو چکا ہے۔ میں خوش ہوں۔ اوہ، میں اسے کیسی دیکھنا چاہوں گی۔ کیا وہ آپ کو خوب صورت لگی تھی؟ موسیو میئر، کیا میری بچی خوب صورت نہیں؟ اس معاملے میں آپ نے بہت سختی کی ہوگی۔ کیا اسے ایک لمحے کے لیے بھی میرے پاس نہیں لایا جا سکتا تھا؟ اس کے بعد اسے سیدھے گھر لے جاتے۔ مجھے بتایئے؛ آپ مالک ہیں؛ آپ چاہتے تو ایسا بھی ہو سکتا تھا۔"

موسیو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کوزیٹ خوب صورت ہے" اس نے کہا، "کوزیٹ ٹھیک ہے۔ تم اسے جلد دیکھو گی؛ مگر صبر کرو؛ تم بہت شگفتہ مزاجی سے باتیں کر رہی ہو اور اپنے بازو لباس سے باہر نکال رہی ہو۔ اس لیے تمھیں کھانسی آ رہی ہے۔"

واقعی، تقریباً ہر لفظ کے بعد اسے کھانسی آ رہی تھی۔

فانتین نے سرگوشی نہیں کی: اسے خوف تھا کہ اس نے اپنی جذباتی فریادوں سے اپنے اعتماد کو نقصان پہنچایا ہے، جس کو وہ بڑھانا چاہتی تھی۔ اب اس نے بے مقصد چیزوں پر باتیں کرنی شروع کر دیں۔

"Montfermeil بہت خوب صورت جگہ ہے؛ ہے کہ نہیں؟ گرمی کے موسم میں لوگ وہاں تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ کیا تھن آردیے خوش حال ہیں؟ ان علاقوں میں زیادہ سیاح نہیں آتے ہیں۔ ان کی سرائے ایک طرح سے کھانے کی دُکان ہے۔"

موسیو میڈلین اب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور اس کی طرف تشویش

سے دیکھ رہے تھے؛ ظاہر تھا کہ وہ فانتین کو وہ باتیں بتانے آئے تھے جن پر پہلے تامل کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اپنا کام کر کے چلا گیا۔ صرف سسٹر سمپلیس ان کے ساتھ رہ گئی تھی۔

مگر، اس وقفے کے درمیان فانتین چیخ پڑی:

"میں اس کی آواز سن رہی ہوں، بخدا، میں اس کی آواز سن رہی ہوں۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اپنی سانس روک لی اور بے خودی کے عالم میں کچھ سننے لگی تھی۔

احاطے میں کوئی بچہ کھیل رہا تھا — دربان عورت کا یا کام کرنے والی کسی عورت کا۔ یہ ویسے ہی حادثوں میں سے ایک تھا، جو ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں، اور جو غم انگیز مناظر کے پُراسرار منظر کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ ایک بچہ — دراصل وہ بچی تھی — آ، جا رہی تھی، جسم کو گرم کرنے کے لیے دوڑ بھاگ رہی تھی، ہنس رہی تھی، اور اپنی پوری آواز سے گا رہی تھی۔ افسوس! ان کھیلوں پر جن میں بچے ملتے جلتے نہیں۔ اسی بچی کو فانتین نے گاتے سنا تھا۔

"اوہ" اس نے ایک بار پھر کہا "وہ میری کوزیت ہی ہے۔ میں اس کی آواز پہچانتی ہوں۔"

وہ بچی جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی؛ آواز آنی بند ہو گئی۔ فانتین کافی دیر تک سننے کی کوشش کرتی رہی، پھر اس کا چہرہ مغموم ہو گیا اور موسیو میڈلین نے اسے دھیمی آواز میں کہتے سُنا، "کتنا بدمعاش ہے ڈاکٹر کہ مجھے اپنی بچی سے ملنے نہیں دیتا۔ بشرے سے وہ شیطان لگتا ہے، واقعی وہ ہے بھی۔"

مگر، اس کے خیالات کے پس منظر کی مسکراہٹیں ایک بار پھر سامنے آ گئیں۔ تکیے پر سر دھرے وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔ "ہم کتنے خوش باش ہونے والے ہیں۔ سب سے پہلے، ہمارا اپنا باغیچہ ہو گا؛ موسیو میڈلین نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ باغیچے میں میری بچی کھیلا کرے گی۔ اب اسے حروف کی پہچان ہو جانی چاہیے۔ میں اسے ہجے کرنا سکھاؤں گی۔ وہ تتلیوں کے تعاقب میں گھاس پر دوڑا کرے گی، اور میں اسے دیکھا کروں گی۔ پھر وہ اپنی پہلی عبادت میں شامل ہو گی۔ مگر کب؟"

اس نے اپنی انگلیوں پر حساب لگانا شروع کر دیا۔

"ایک، دو، تین، چار — وہ سات برس کی ہے۔ پانچ برس بعد اس کو سفید نقاب اور نقشین موزے ملیں گے؛ اور وہ ایک چھوٹی سی عورت بن جائے گی۔ اے میری پیاری سسٹر، تم کیا جانو کہ جب میں اپنی بچی کی پہلی عبادت کے بارے سوچتی ہوں تو میں کتنی بیوقوف ہو جاتی ہوں۔"

اس نے ہنسنا شروع کردیا۔

میبڑ نے فانٹین کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے لفظوں کو اسی طرح سن رہا تھا جیسے کوئی ہوا کو سانس لیتے سنتا ہو۔ اس کی نگاہ زمین پر تھی۔ اس کا ذہن اس تصور میں تھا جس کا کوئی انت نہیں تھا۔ اچانک فانٹین نے بولنا بند کردیا، جس کی وجہ سے اس نے میکانکی انداز میں اپنا سر بلند کیا۔

فانٹین وحشت زدہ ہو گئی تھی۔

نہ وہ بول رہی تھی، نہ سانس لے رہی تھی؛ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، اس کا نازک کاندھا اس کی قمیص سے باہر آگیا تھا؛ اس کا چہرہ جو چند لمحے قبل دمک رہا تھا، مردہ سا ہو گیا تھا، اور ایسا لگتا تھا جیسے کمرے کی دوسری جانب کسی شے پر اس کی آنکھیں جم سی گئی تھیں۔

''خدایا! میبڑ نے چیخ کر کہا، ''تمھیں کیا ہوا، فانٹین۔''

اس نے جواب نہیں دیا، اس شے سے اپنی آنکھیں نہیں ہٹائیں جسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کے بازو سے ہٹایا، اور دوسرے ہاتھ سے پیچھے دیکھنے کا اشارہ کیا۔

موسیو میڈلین مڑا۔

وہاں جاویر کھڑا تھا۔

۞

مطمئن جاوید

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تھے، جب موسیو میڈلین Arras کی عدالت Assizes کے ہال سے نکلا تھا۔ وقت پر سرائے واپس پہنچ گیا تھا، تا کہ اسے ڈاک گاڑی مل جائے، جس میں اس نے اپنے لیے نشست مخصوص کرائی تھی۔ صبح چھ بجے سے ذرا پہلے وہ M. sur M پہنچ گیا تھا، اور اس کا پہلا کام موسیو لافیت کے نام لکھا خط ڈاک میں ڈالنا تھا، پھر شفا خانے جانا اور فانتین سے ملنا تھا۔

ابھی وکیلِ سرکار Assizes کی عدالت کے ہال سے باہر نکلا ہی تھا اور پہلے دھچکے سے جانبر ہوا تو اس نے M. sur M کے عزت مآب میئر کے کارِ دیوانگی کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس واقعے سے کسی طرح بھی دی جانے والی سزاؤں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جس کی تشریح بعد میں پیش کی جائے گی اور مطالبہ کیا جائے گا کہ شامپ ماتھو کو دی جانے والی سزا کو بحال کیا جائے جو صاف ظاہر ہے کہ ژاں ولژاں تھا۔ وکیلِ سرکار کا اصرار عوام، جیوری اور عدالت کے جذبات کے خلاف تھا۔ وکیلِ صفائی وکیلِ سرکار کی پُرجوش خطابت کو غلط ثابت کرنے میں، اور یہ ثابت کرنے میں کہ موسیو میڈلین، یعنی اصلی ژاں ولژاں کے انکشافات کے نتیجے میں اس معاملے کے زاویے بدل گئے تھے، اور جیوری کے سامنے صرف ایک بے خطا انسان کھڑا تھا، کچھ مشکلات کے باعث ناکام رہا تھا۔ اس کے بعد وکیلِ سرکار نے عدالتی غلطیوں کے کچھ نظائر وغیرہ پیش کیے، جو نیا وہ تازہ نہیں تھے؛ صدرِ عدالت نے مقدمے کی تلخیص پیش کرتے ہوئے وکیلِ دفاع کا ساتھ دیا، اور چند منٹ میں جیوری نے شامپ ماتھو کو مقدمے سے باہر پھینک دیا تھا۔

پھر بھی، وکیلِ سرکار مصر تھا کہ ایک ژاں ولژاں ہونا چاہیے؛ اور چوں کہ شامپ ماتھو

اس معاملے سے باہر ہو گیا تھا، اس لیے میڈیلین ہی ژاں ولژاں تھا۔

شامپ ماتھیو کی رہائی کے فوراً بعد وکیلِ سرکار صدرِ عدالت کے سامنے بالکل خاموش ہو گیا۔ انھوں نے "M. sur M. کے میئر جیسی شخصیت کو گرفت میں لینے کی ضرورت" پر غور کیا۔ پہلا جذبہ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد، صدر نے زیادہ اعتراضات نہیں کیے۔ انصاف کو بہر حال اپنا کام کرنا تھا۔ اور پھر سب کچھ کہے جانے کے بعد، حالاں کہ صدرِ عدالت مہربان اور ذہین انسان تھا، ساتھ ہی شاہی کا پُر جوش وفادار بھی، یہ سُن کر حیران بھی ہوا تھا کہ میئر نے کان کے دورے کے سلسلے میں 'بوناپارٹ' نہیں 'شہنشاہ' کا لفظ استعمال کیا تھا۔

لہٰذا، موسیو میڈیلین کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا گیا۔ وکیلِ سرکار نے اس حکم کو ایک خاص ہرکارے کے ذریعے، پوری رفتار سے M. sur M روانہ کر دیا اور کی تعمیل کی ذمے داری انسپکٹر جاویر کو سونپ دی گئی۔

قاری کو علم ہے کہ اپنے حلفیہ بیان کے فوراً بعد جاویر M. sur M واپس چلا گیا تھا۔

جاویر بستر سے اُٹھ ہی رہا تھا کہ ہرکارے نے اسے گرفتاری اور قیدی کے پیش کرنے کے احکامات دے دیے۔

خود ہرکارہ بھی پولیس کا بہت چالاک رُکن تھا، جس نے دو لفظوں میں جاویر کو بتا دیا کہ Arras میں کیا ہوا تھا۔ وکیلِ سرکار کا دستخط شدہ حکمِ گرفتاری ان الفاظ میں ملفوف کیا گیا تھا: "انسپکٹر جاویر M. sur M. کے میئر جناب میڈیلین کے جسم کو گرفتار کر لیں گے، جو عدالت کی اس دن کی نشست میں رہا شدہ سزا یافتہ ژاں ولژاں شناخت کیا گیا تھا۔"

کوئی بھی جو جاویر سے واقف نہیں تھا، اور جس نے اتفاقیہ اس کو شفاخانے کے دالان میں داخل ہوتے دیکھا تھا، معمولی سی غیب دانی سے معلوم کر سکتا تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔ وہ پُر سکون تھا، سنجیدہ تھا، اس کی کنپٹی کے کھچڑی بال قرینے سے بنے تھے اور معمول کے مطابق وہ غور کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھا تھا۔ کوئی بھی جو اس سے اچھی طرح واقف تھا، اور اس وقت اس کا معائنہ کرتا تو لرز جاتا۔ اس کے چمڑے کے کالر کا بکسوا گدی کے بجائے بائیں کان کے نیچے تھا، جو رسمی حرکات کے خلاف تھا۔

جاویر ایک مکمل کردار تھا جس کے فرائض میں یا وردی میں کبھی شکن نہیں دیکھی گئی تھی؛ جو بد معاشوں کے ساتھ باضابطہ ہوتا تھا، اور کوٹ کے بٹن کے معاملے میں سخت۔

یہ ناقابلِ یقین تھا کہ اس نے روا روی میں اپنے چرمی کالر کو غلط انداز سے باندھ لیا

ہوگا۔ یقیناً یہ اس کے جذبات میں ہونے والے کسی اندرونی زلزلے کا باعث ہی تصور کیا جا سکتا تھا۔

وہ بالکل سادہ انداز میں آیا۔ پڑوس کے تھانے سے ایک کارپورل اور چار سپاہی طلب کر لیے تھے؛ سپاہیوں کو کو صحن میں ہی چھوڑ دیا، دربان عورت سے فانتین کا کمرہ معلوم کر لیا، جسے کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا تھا، اس لیے کہ اکثر افراد اس سے میئر کے بارے معلومات کیا کرتے تھے۔

فانتین کے کمرے کے قریب پہنچ کر جاوید نے دروازے کا ہتھا گھمایا، کسی نرس یا پولیس کے جاسوس کی طرح بہت آہستگی سے دروازے کو دھکا دے کر کھول دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

صحیح معنوں میں وہ داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ ادھ کھلے دروازے پر سیدھا کھڑا تھا، اس کی ہیٹ سر پر تھی اور بایاں ہاتھ کوٹ کے جیب میں ٹھنسا ہوا تھا، کوٹ کے بٹن ٹھوڑی تک بند تھے۔ کہنی کے خم میں اس کی بڑی سے بید کا سیسے سے بنا اوپری سرا صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ تقریباً ایک منٹ اس کیفیت میں رہا؛ اس کی موجودگی کی کسی کو خبر نہ تھی۔ اچانک، فانتین نے اپنی نظریں اٹھائیں، اس کو دیکھا، موسیو میڈلین نے بھی پلٹ کر اس پر نظر کی۔

عین اس لمحے جب میڈلین کی نظریں جاوید کی نظروں سے ملیں، بغیر حرکت کیے، اپنی جگہ سے ہلے بغیر، اس کی طرف بڑھے بغیر ہی جاوید کا چہرہ خوف ناک ہو گیا تھا۔ کوئی انسانی جذبہ مسرت سے زیادہ خوف ناک نہیں ہو سکتا۔

گویا وہ کسی آسیب کی شکل وصورت تھی جسے سزا یافتہ روح مل گئی تھی۔

وہ ژاں ولژاں کو بالآخر پکڑ لینے کی طمانیت تھی جس نے وہ سب کچھ جو اس کی روح میں تھا، اس کے بشرے میں ظاہر کر دیا تھا۔ اس کے اندرون کی گہرائیاں ابھر کر سطح پر آ گئی تھیں۔ شامپ ماٹ ٹو کے معاملے میں ہو جانے والی غلطی کی بے عزتی کو ایک عرصے کی خواہش کے پورا ہو جانے کے فخر نے دھو دیا تھا۔ جاوید کی شخصیت کا جوہر اس کے شاہانہ رویے میں چمک گیا تھا۔ کامیابی کی صورت میں ہو جانے والی بدنمائی اس کی تنگ پیشانی پر پھیل گئی تھی۔ خوف کے وہ تمام مظاہر جو ایک مطمئن چہرے پر پیدا ہو سکتے تھے، صاف نظر آ رہے تھے۔

اس لمحے جاوید خود کو جنت میں محسوس کر رہا تھا۔ چیزوں کو صاف طریقے سے دیکھے بغیر جاوید نے، بدی کو کچل دینے کے مساوی افعال میں انصاف کی، روشنی کی اور سچائی کی تجسیم کر دی تھی۔ اس کے آگے اور اس کے پیچھے اختیار تھا، دلیل تھی؛ مقدمہ تھا؛ قانونی ضمیر تھا اور استغاثہ تھا؛ اس کے کاندھے پر تمام ستارے لگے تھے؛ وہ نظام کی حفاظت کر رہا تھا؛ قانون کو اپنی گھن گرج نکالنے

پر مجبور کر رہا تھا؛ سماج سے بدلا لے رہا تھا؛ کامل کو سہارا دے رہا تھا اور اوج کے درمیان مستعدی سے کھڑا تھا۔ اس کی کامیابی میں سرکشی کا اور مقابلے کا ایک چھوٹا سا عنصر بھی موجود تھا۔ مستعد، خود پسند، تیز طبع جاوید، کسی خطرناک رئیس الملائکہ کی سپر ہیومن درندگی کا مظہر تھا۔ عمل کے اس خوف ناک مظاہرے نے جو وہ مکمل کر رہا تھا، اس کی مٹھی میں سماجی تلوار کی مبہم جھلک کو قابلِ دید بنا دیا تھا: خوشی اور بریہم، دونوں کیفیات میں وہ جرم، بدی، بغاوت، بربادی، دوزخ سب پر اپنی ایڑی جمائے ہوئے تھا۔ وہ تابندہ تھا؛ نابود کر دیتا تھا؛ مسکراتا تھا اور اس بھیانک سینٹ مائیکل میں ایک تسلیم شدہ جاہ و جلال تھا۔

جاوید اگرچہ وحشت انگیز تھا، اس میں کمینہ پن نہیں تھا۔

دیانت، خلوص، صاف دلی، عزم، اثباتِ جرم، احساسِ فرض وہ چیزیں ہوتی ہیں جو غلط طریقے سے کی جائیں تو ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، مگر جو ڈراؤنی ہونے کے باوجود بھی شان دار رہتی ہیں: کہ ان کا جلال — وہ جلال جو انسانی ضمیر سے مخصوص ہوتا ہے — خوف کے درمیان ان سے چمٹا جاتا ہے؛ نیکیوں میں بھی ایک خرابی ہوتی ہے جس کو غلطی کہتے ہیں۔ کسی متعصب کی بے رحم خوشی، اس کی سفاکی کے سیلاب میں بھی ایک مخصوص قسم کی مغموم اور قابلِ احترام تابندگی کی مظہر ہوتی ہے۔ ہر کم علم کامیاب آدمی کی طرح جاوید کو بھی اس کی مہیب خوشی میں قابلِ رحم سمجھا جانا چاہیے۔ کوئی شے اتنی دل خراش اور اتنی خوف ناک نہیں ہو سکتی جتنا کہ وہ چہرہ جس پر وہ کچھ نمایاں ہو جس کو نیکی کی بدی سمجھا جا سکتا ہے۔

۞

اختیار کے حقوق

فانتین نے جاویر کو اس دن کے بعد سے دیکھا نہیں تھا جب میئر نے فانتین کو اس آدمی سے چھین لیا تھا۔ اس کا بیمار ذہن کچھ سمجھ نہیں سکا سوائے اس کہ وہ اس کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ اس کا خوف ناک چہرہ برداشت نہیں کرسکی تھی؛ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے تن سے جان نکلنے والی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا، اور اذیت کی کیفیت میں اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"موسیو میڈلین، مجھے بچا لیجیے!"

ژاں ولژاں — اب ہم اس کے بارے میں کسی اور نام سے بات نہیں کریں گے — کھڑا ہو گیا۔ اس نے فانتین سے شائستہ ترین اور پُرسکون ترین آواز میں کہا:

"تم مطمئن رہو، یہ شخص تمھیں لینے کے لیے نہیں آیا ہے۔"

پھر وہ جاویر سے مخاطب ہوا، اور کہا: "میں جانتا ہوں کہ تمھیں کیا چاہیے۔"

جاویر نے جواب دیا، "جلدی کرو!"

جاویر اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے یہ نہیں کہا: "Be quick about it!" بے اختیار اس کے منہ نکلا تھا "Bequiabouit."

ہجے یا املا کا علم ایسے لہجے سے انصاف نہیں کرسکتا جس میں یہ جملہ بولا گیا تھا۔ یہ انسانی الفاظ نہیں رہ گئے تھے: یہ جملہ نہیں تھا، ایک حیوانی دہاڑ تھی۔

اس نے کام قاعدے کے مطابق نہیں کیا؛ اس نے مسئلے پر بات نہیں کی؛ اس نے حکم گرفتاری پیش نہیں کیا تھا۔ اس کی نظروں میں ژاں ولژاں ایک نوع کا جنگجو تھا، جس پر ہاتھ

نہیں ڈالتا تھا؛ اندھیرے کا پہلوان جو پچھلے پانچ برسوں سے اس کی پہنچ میں تھا مگر جسے چت نہیں کیا جا سکا تھا۔یہ گرفتاری ابتدا نہیں، اختتام تھی۔ جاویر نے صرف "جلدی کرو" کہنے پر اکتفا کی تھی۔

جب وہ اس طرح بات کر رہا تھا،اس نے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تھا؛ اس نے ژاں ولژاں پر ایک نظر ڈالی جسے اس نے آنکڑے کی طرح پھینک دیا، جس سے وہ بدنصیبوں کو زبردستی کھینچنے کا عادی ہو گیا تھا۔

یہی وہ نظر تھی، فانتین نے دو ماہ قبل جو اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس کی تھی۔

جاویر کی تیز آواز سن کی فانتین نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔مگر میئر وہاں موجود تھا؛ اسے کس بات کا ڈر ہو سکتا تھا؟

جاویر کمرے کے درمیان آ گیا اور چلایا:

"تو آ رہا ہے کہ نہیں، ابھی اور فوراً؟"

بدقسمت عورت نے اپنے اطراف دیکھا۔سوئے میئر اور راہبہ کے وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ کون تھا وہاں جس کو"تو" کے اہانت آمیز لفظ سے پکارا جا سکتا تھا؟ صرف اس سے! وہ کانپ گئی۔

تب اس نے ایسا بے نظیر منظر دیکھا جو بخار کی بدترین مدہوشی میں بھی نہ آیا ہوگا۔

اس نے دیکھا کہ پولیس کے جاسوس، جاویر نے میئر کو کالر سے پکڑ رکھا تھا؛اس نے دیکھا کہ میئر نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔اسے ایسا محسوس ہوا گویا یہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔

دراصل، جاویر نے ژاں ولژاں کو کالر کے ذریعے گرفت میں لے لیا تھا۔

"موسیو میئر!" فانتین چیخی۔

جاویر نے ایسا خوفناک قہقہہ مارا کہ اس کے مسوڑھے تک ظاہر ہو گئے تھے۔

"اب یہاں کوئی موسیو میئر نہیں۔"

ژاں ولژاں نے اس کا ہاتھ جھٹکنے کی کوشش نہیں کی، جس نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ رکھا تھا۔

"جاویر......"

جاویر نے دخل اندازی کی، "مجھے انسپکٹر جاویر کہو۔"

"موسیو!" ژاں ولژاں نے کہا"میں تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"زور سے! جو کہنا ہے زور سے کہو!" جاویر نے جواب میں کہا،"لوگ مجھ سے بلند

آواز میں بات کرنے کے عادی ہیں۔"

ژاں ولژاں نے لہجہ اور دھیما کر لیا: "میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں...."

"میں نے تم سے کہا ہے نا کہ زور سے بات کرو۔"

"مگر صرف تمہیں سننا چاہیے۔"

"مجھے کیا فرق پڑے گا؟ میں نہیں سنوں گا۔"

ژاں ولژاں اس کی طرف مڑا اور دھیمی آواز میں بہت تیزی سے کہا:

"مجھے تین دن کی مہلت دے دو! صرف تین دن، جس کے دوران میں اس بد قسمت عورت کی بچی کو لانا چاہتا ہوں۔ جتنی ضرورت ہو میں رقم ادا کروں گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گے، اگر چاہو تو۔"

"مجھ سے کھلواڑ کر رہے ہو!" جاویر نے چلا کر کہا۔ "ابھی چلو میرے ساتھ! میں تمہیں اتنا بیوقوف نہیں سمجھتا تھا۔ تم تین دن کی مہلت مانگ رہے ہو تا کہ تم فرار ہو سکو۔ تم کہتے ہو کہ یہ مہلت اس مخلوق کی بچی کو لانے کے لیے چاہیے۔ واہ وا! کیا خوب! واقعی بڑی مزے کی بات ہے۔"

فانتین پر کپکپی کا دورہ پڑ گیا۔

"میری بچی!" وہ چلائی "میری بچی کو لانے کے لیے؟ گویا، وہ یہاں نہیں ہے؟ سسٹر جواب دو، کوزیٹ کہاں ہے؟ مجھے میری بچی چاہیے۔ موسیو میڈلین! موسیو میڈلین!"

جاویر نے زمین پر زور سے اپنا پیر پٹخا۔

"لو اور سنو! اپنی زبان بند رکھو، بد معاش لڑکی؟ کیا خوب جگہ ہے یہ بھی، جہاں سزا یافتہ مجسٹریٹ ہوتے ہیں، اور جہاں عورتوں کی بیگمات کی طرح خدمت کی جاتی ہے، مگر اب ہم یہ سب بدلنے والے ہیں؛ اب وقت آ گیا ہے!"

اس نے فانتین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، اور اپنی بات میں اضافہ کیا، اور اس دوران اس نے ایک بار پھر ژاں ولژاں کے گلو بند، قمیص اور کالر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا:

"میں تم سے کہہ چکا ہوں، یہاں کوئی موسیو میئر نہیں ہے۔ یہاں ایک چور ہے، ایک ڈاکو ہے، اور ژاں ولژاں نامی ایک سزا یافتہ ہے۔ اور وہ میری گرفت میں ہے۔ بس! یہاں یہی کچھ ہے۔"

فانتین اچھل کر، اپنے اکڑے بازوؤں اور ہاتھوں کے سہارے، اپنے بستر میں اٹھ

بیٹھی؛ اس نے ژاں ولیواں کی طرف غور سے دیکھا؛ اس نے جاویر کی طرف غور سے دیکھا؛ اس نے راہبہ کی طرف غور سے دیکھا؛ اس نے اپنا منہ کھولا گویا وہ بولنا چاہتی تھی؛ اس کے حلق کی گہرائی سے صرف گڑگڑ کی آواز نکلی، اس کے دانت بجنے لگے؛ اس نے اذیت میں اپنے بازو پھیلا دیے، تشنج سے اپنے ہاتھ کھولے اور کسی ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح ہاتھ پیر مارنے لگی؛ پھر اچانک اپنے تکیے پر گر پڑی۔

اس کا سر پلنگ کے سرہانے سے ٹکرایا، اور وہ کھلے ہوئے منہ اور گھورتی ہوئی بے نور آنکھوں سمیت چھاتی کے بل گر پڑی۔

وہ مر چکی تھی۔

ژاں ولیواں نے جاویر کے روکنے والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، اور اس کو اس طرح کھول دیا جیسے وہ کسی بچے کا ہاتھ ہو؛ تب اس نے جاویر سے کہا، "تم نے اس عورت کو قتل کر دیا ہے۔"

"ختم کرو، یہ سب!" جاویر چلایا، "میں یہاں فضول باتیں کرنے نہیں آیا ہوں؛ نیچے گارڈ موجود ہیں؛ فوراً مارچ کرو، ورنہ تمھیں thumb-screw ملے گا۔"

اس کمرے کے ایک کونے میں مسہری کا ایک ڈھانچا سا پڑا ہوا تھا، راہبائیں جسے کیمپ کے پلنگ کے طور پر استعمال کرتی تھیں جب انھیں کسی بیمار پر نظر رکھنی ہوتی تھی۔ ژاں ولیواں اس بستر کے قریب گیا، پلک جھپکتے اس کا سرہانا اکھاڑا، جو پہلے ہی بہت خراب حالت میں تھا جو اس جیسے شخص کے بازوؤں کے لیے آسان چیز تھا؛ اس کے مرکزی چھڑ کو ڈنڈے کی طرح پکڑ کر نکال لیا اور جاویر کی طرف دیکھا۔ جاویر، دروازے کی طرف پسپا ہو گیا۔ ژاں ولیواں لوہے کا چھڑ پکڑے آہستہ آہستہ فانتین کی طرف گیا۔ وہاں پہنچ کر پلٹا اور جاویر سے کہا، ایسی آواز میں جو مشکل سے سنائی دیتی، "اس وقت مجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرنا۔"

ایک بات یقینی تھی، اور وہ یہ تھی کہ جاویر لرز گیا تھا۔

اس نے سوچا کہ وہ گارڈ کو طلب کرے، مگر ژاں ولیواں اس وقت کو فرار ہونے میں استعمال کر سکتا تھا؛ اس لیے وہ کھڑا رہا، اپنی بید کو مٹھی میں پکڑا اور ژاں ولیواں سے نظریں ہٹائے بغیر، دروازے کے چوکھٹ پر ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

ژاں ولیواں نے پلنگ کے سرہانے لگی ایک گھنڈی پر اپنی کہنی ٹکائی، پیشانی اپنے ہاتھ پر رکھی اور فانتین کے بے حرکت بدن پر غور کرنا شروع کر دیا، جو بستر پر پھیلا پڑا تھا۔ اسی طرح خاموش، عالمِ استغراق میں کھڑا رہا بظاہر جس کا اس جسمِ خاکی سے کوئی ناتا نہیں تھا۔ اس کے

چہرے اور اس کے رویے پر سوائے ناقابلِ اظہار رحم کے کچھ نہیں تھا۔ اس مراقبے کے چند لمحوں بعد، وہ فانتین کی طرف جھکا اور اس سے دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگا۔

اس نے فانتین سے کیا کہا تھا؟ یہ آدمی، جس پر ملامت کی گئی تھی، اس عورت سے کیا کہہ سکتا تھا، جو مر چکی تھی؟ وہ کیا الفاظ تھے؟ روئے زمین کے کسی شخص نے وہ الفاظ نہیں سنے تھے۔ کیا اس مردہ عورت نے سنے تھے؟ کچھ لمحے دل گداز فریب نظر ہوتے ہیں جو شاید ارفع حقیقتیں ہوتی ہیں۔ سسٹر سمپلیس، جو اس واقعے کی واحد گواہ ہے، اکثر کہتی ہے کہ جس لمحے ژاں ولژاں فانتین کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا، اس نے واضح طور پر ان زرد لبوں پر ایک ناقابلِ بیان تبسم اور دھندلی آنکھوں کے جوف میں حیرانی دیکھی تھی۔

ژاں ولژاں نے فانتین کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور تکیے پر اس طرح رکھ دیا جیسے کسی ماں نے اپنے بچے کے ساتھ کیا ہوتا؛ اس کے بعد اس کی شمیض کے بند باندھے، اور اس کے بال قرینے سے اس کی ٹوپی کے نیچے کر دیے۔ اس کے بعد اس کی آنکھ بند کر دی۔

اس لمحے فانتین کے چہرے پر ایک نور سا پھیلا ہوا تھا۔

موت، کسی عظیم روشنی میں داخلے کا اظہار ہوتی ہے۔

فانتین کا ہاتھ بستر کے کنارے لٹکا تھا۔ ژاں ولژاں اس ہاتھ کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ اس کو نرمی سے اٹھایا اور اس پر ایک بوسہ ثبت کر دیا۔

اس کے بعد وہ اُٹھا، اور جاویر سے مخاطب ہوا۔

"اب" اس نے کہا، "میں خود کو تمھارے حوالے کرتا ہوں۔"

❁

مناسب مقبرہ

جاوید نے ژاں ولژاں کو شہر کے قید خانے میں داخل کرا دیا۔

موسیو میڈلین کی گرفتاری سے M. sur M میں سنسنی، بلکہ غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان چند لفظوں "وہ سزا یافتہ مجرم تھا" کے بعد تقریباً ہر شخص اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ دو گھنٹوں سے بھی کم عرصے میں اس نے جتنے اچھے کام کیے تھے، سب بھلا دیے گئے، اور وہ سوائے "گیلیز کا قیدی" کے کچھ نہیں رہا تھا۔ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جو کچھ Arras میں ہوا تھا، ابھی تک اس کی کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ دن بھر شہر کے ہر حصے میں مندرجہ ذیل قسم کی باتیں ہوتی رہیں:

"سنا تم نے؟ — وہ آزاد کردہ قیدی تھا — کون؟ — میئر — ارے! — وہی اپنا موسیو میڈلین؟ — ہاں! — واقعی؟ — اس کا نام میڈلین نہیں تھا! — اس کا خوف ناک سا نام تھا — Bejean, Bojean, Boujean — اچھا! — وہ گرفتار ہوگیا ہے! — گرفتار! — قید خانے میں — شہر کے قید خانے میں ہے — منتقلی کے انتظار میں ہے — جب تک منتقل نہیں ہو جاتا — اچھا! — اس کا تبادلہ ہو جائے گا! — کہاں لے جایا جائے گا؟ — اس پر Assizes میں مقدمہ چلے گا، شاہراہ پر ڈکیتی کا، جو اس نے بہت دن پہلے کی تھی — اچھا! — مجھے بھی کچھ شبہ سا تھا — وہ تو اچھا آدمی تھا، بہت اچھا، بہت کامل، بہت محبت کرنے والا تھا! — اس نے صلیب کو رد کر دیا تھا — وہ تمام بے ملازمت لوگوں میں سو تقسیم کرتا تھا! — مجھے ہمیشہ سے شبہ تھا کہ اس کا ماضی داغ دار ہوگا ..... وغیرہ وغیرہ"

شہر کی "بیٹھکیں" بالخصوص اس قسم کے جملوں سے گونج رہی تھیں۔

ایک بزرگ خاتون نے جو Drapeau Blanc کی رُکن تھی، مندرجہ ذیل جملہ کہا تھا جس کی گہرائی نا قابلِ پیمائش تھی؛

"مجھے بالکل افسوس نہیں۔ یہ بونا پارٹ والوں کے لیے ایک سبق ہوگا۔"

اس طرح وہ خیالی شخص جس کو موسیو میڈلین کہا جاتا تھا M. sur M. سے غائب ہو گیا۔ پورے شہر میں تین یا چار افراد تھے جو اس کی یادوں کے وفادار تھے۔ بزرگ دربان عورت، اس کی خدمت گاران میں سے تھی۔

اس شام وہ غیر معمولی بزرگ خاتون اپنے گھر میں بیٹھی، اب بھی خوف کے عالم میں، ملول تصورات میں غرق تھی۔ کارخانہ پورے دن بند رہا تھا؛ گاڑیوں والے پھاٹک کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی؛ اس کی سڑک سنسان تھی۔ گھر میں سوائے دو راہباؤں، سسٹر پرپیچو اور سسٹر سمپلیس کے کوئی نہیں تھا جو فانتین کی میت کی نگہبانی کر رہی تھیں۔

اسی لمحے — جب موسیو میڈلین گھر واپس آیا کرتا تھا — وہ دربان عورت میکانکی انداز میں اٹھی، ایک دراز سے موسیو میڈلین کے کمرے کی کنجی نکالی اور وہ سادہ سا شمع دان لے گئی جسے وہ اوپر جانے کے لیے ہمیشہ استعمال کرتا تھا؛ اس کے بعد وہ کنجی اسی جگہ ٹانگ دی وہ جہاں سے اسے لینے کا عادی تھا۔ ایک طرف شمع دان رکھ دیا، گویا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی، اور ایک بار پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ اس بے چاری عورت نے یہ سب بلا ارادہ کیا تھا۔

دو گھنٹے بعد وہ اپنے خیالوں سے نکلی، اور حیرت سے بولی، "دیکھو! میرے پیارے خداوند، یسوع مسیح! میں نے اس کی کنجی کیل میں ٹانگ دی ہے۔"

عین اسی لمحے گھر کی چھوٹی والی کھڑکی کھلی، ایک ہاتھ اندر آیا، کنجی اور شمع دان اٹھایا، جلتی ہوئی موم بتی سے موم بتی جلا دی۔

دربان عورت نے نظریں اٹھائیں، جو وہیں کھڑی ہوئی تھی، حیرت سے اس کا منہ کھل گیا تھا، اس نے ایک چیخ ماری، جو اس کے گلے تک ہی محدود رہی تھی۔

وہ اس ہاتھ، اس بازو، اور کوٹ کی اس آستین کو پہچانتی تھی۔

وہ موسیو میڈلین تھا۔

کئی لمحے بعد وہ بول سکی تھی: اس کو سکتہ ہو گیا تھا، جیسا کہ وہ خود بتاتی تھی، جب کبھی ان واقعات کا تذکرہ ہوتا تھا۔

"خدایا! موسیو میئر!" وہ بالآخر چیخی، "میں جانتی تھی کہ یہ تم..."

اتنا کہہ کر وہ فوراً ہی رُک گئی؛ ابتدا میں اس کا جملہ احترام سے عاری تھا۔ اس کے لیے ژاں والژاں ابھی موسیو میئر ہی تھا۔

اس نے دربان عورت کو خیالات سے جگا دیا تھا۔

''میں قید میں تھا۔'' اس نے کہا، ''میں نے قید خانے کی ایک کھڑکی کی ایک دو سلاخیں توڑ ڈالیں، چھت پر سے کودا، اور اب میں یہاں ہوں۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں؛ سسٹر سمپلیس کو بلاؤ۔ بلا شبہ، وہ اس بے چاری مفلس عورت کے پاس ہوگی۔''

اس نے عورت کو کوئی حکم نہیں دیا۔ اسے یقین تھا وہ عورت اس کی بہتر حفاظت کرے گی۔

کسی کو خبر نہیں کہ پھاٹک کھولے بغیر وہ صحن میں کیسے داخل ہوا تھا۔ وہ اپنے پاس ہمیشہ ایک خفیہ کنجی رکھتا تھا جس سے پھاٹک کا بغلی دروازہ کھلتا تھا۔ مگر اس کی تو تلاشی لی گئی ہوگی، اور خفیہ کنجی لے لی گئی ہوگی۔ یہ راز کبھی نہیں کھلا۔

وہ سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے موم بتی سیڑھی کے سب سے اوپری تختے پر رکھ دی۔ بغیر آواز کیے دروازہ کھولا، اپنی کھڑکی بند کی، موم بتی اٹھائی اور دوبارہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

یہ اچھی احتیاط تھی۔ یاد ہوگا کہ یہ کھڑکی سڑک سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے اطراف نظر دوڑائی، اپنی میز پر، کرسی پر، بستر پر جو تین دن سے استعمال نہیں ہوا تھا، پچھلی رات کے ہنگامے کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ دربان عورت نے اس کے کمرے کی صفائی کی تھی؛ اس نے آتش دان کی راکھ سے ڈنڈے کے دونوں آہنی سرے اٹھائے اور میز پر قرینے سے رکھ دیے تھے، اور چالیس سو کا سکہ بھی جو آگ کے دھوئیں سے کالا ہوگیا تھا۔

اس نے ایک کاغذ لیا، اور اس پر لکھا، ''یہ ہیں میری لاٹھی کے دو آہنی سرے، اور چالیس سو کا سکہ جو میں نے ننھے جروے سے چرایا تھا، میں نے جس کا تذکرہ Assizes کی عدالت میں کیا تھا۔'' اور اس نے کاغذ کے ٹکڑے اور سکے کو اس طرح رکھ دیا تھا کہ کمرے میں داخلے کے وقت یہ چیزیں پہلے نظر آجائیں۔ الماری سے ایک پرانی قمیص نکالی، اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ان چیتھڑوں میں دونوں شمع دانوں کو لپیٹا، اور جس وقت وہ شمع دانوں کو لپیٹ رہا تھا، کالے رنگ کی ڈبل روٹی کو کتر کتر کر کھاتا جا رہا تھا۔ وہ ڈبل روٹیاں شاید قید خانے کی تھیں جو فرار میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اس کا ثبوت ڈبل روٹی کے ٹکڑے تھے جو کمرے کے فرش پر پائے گئے تھے، ارباب

اختیار نے جس کا بعد میں معائنہ کیا تھا۔

دروازے پر دو کھٹکے ہوئے۔

''آجایئے!'' اس نے کہا۔

سسٹر سمپلیس نے کھٹکا کیا تھا۔

سسٹر زرد ہو رہی تھی؛ آنکھیں سرخ تھیں، شمعیں جو اس کے ہاتھ میں تھیں لرز رہی تھیں۔ مقسوم کے صدمات کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انسان کتنا ہی شائستہ اور ٹھنڈے مزاج کا ہو، وہ انسان کی فطرت کو ہمارے اندرون سے نچوڑ کر چہرے پر ہویدا کر دیتے ہیں۔ اس دن کے جذبات نے اس راہبہ کو ایک بار پھر عورت بنا دیا تھا۔ وہ روئی تھی اور کانپ رہی تھی۔

ژاں ولژاں نے ایک کاغذ پر چند سطور لکھی تھیں، جسے یہ کہہ کر راہبہ کے حوالے کر دیا ''سسٹر، آپ یہ رقعہ موسیو کیور کے حوالے کر دیجیے گا۔''

اس نے رقعے کو تہہ نہیں کیا۔ راہبہ نے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

''آپ اسے پڑھ سکتی ہیں۔'' اس نے کہا۔

وہ پڑھنے لگی۔

''موسیو کیور سے درخواست کی جاتی ہے کہ جو کچھ میں چھوڑے جا رہا ہوں اس پر نظر رکھیں گے۔ وہ مہربانی کر کے اسی میں سے میرے مقدمے کے اخراجات ادا کریں گے، اور اس عورت کے دفن کے، جو کل انتقال کر گئی تھی۔ باقی ماندہ مفلسوں کے لیے ہے۔''

سسٹر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر سوائے ہکلاہٹ اور چند بے ربط الفاظ کے کچھ کہہ نہیں سکی۔ پھر بھی وہ کچھ کہنے میں کامیاب ہو گئی تھی:

''کیا موسیو میئر اس بدقسمت عورت پر آخری نظر ڈالنا پسند کریں گے۔''

''نہیں۔'' اس نے کہا ''میرا پیچھا کیا جا رہا ہے، میں اسی کمرے میں پکڑا جا سکتا ہوں، اور وہ مناسب نہیں ہوگا۔''

ابھی اس کا کلام ختم نہیں ہوا تھا کہ سیڑھی پر سے تیز آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ ان سب کو چڑھتے ہوئے قدموں کا ہنگامہ سنائی دیا، اور بوڑھی دربان بلند ترین اور کان میں سوراخ کر دینے والے لہجے میں کہہ رہی تھی:

''جناب! میں خدا کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ اس گھر میں پورے دن، بلکہ پوری شام، ایک متنفس بھی داخل نہیں ہوا ہے۔ میں دروازے سے ہٹی تک نہیں۔''

اس شخص نے جواب میں کہا، "مگر اس کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔"

ان لوگوں نے جاوید کی آواز پہچان لی۔

اس کمرے کی ترتیب ایسی تھی کہ کھلا دروازہ دائیں جانب کی دیوار کے کونے کو ڈھانپ لیتا تھا۔ ژاں ولژاں بھاگ کر اس کونے میں کھڑا ہو گیا۔ سسٹر سمپلیس میز کے قریب گھٹنوں کے بل گر پڑی تھی۔

دروازہ کھلا۔

جاوید داخل ہوا۔

بہت سے مردوں کی سرگوشی اور بوڑھی دربان کے احتجاج کی آوازیں راہداری میں سنائی دے رہی تھی۔

راہبہ اپنی آنکھیں جھکائے رہی۔ وہ دعا کر رہی تھی۔

چمنی پر موم بتی جل رہی تھی اور ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

جاوید کی نظر راہبہ پر پڑی اور وہ حیرانی کے عالم میں رُک گیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جاوید کا بنیادی اصول، اس کا عنصر، اور وہ ہوا بھی جس میں وہ سانس لیتا تھا، ہر قسم کے اختیار کی توقیر قائم رکھنا تھا۔ اس کی یہ عادت نا قابلِ تسخیر تھی۔ وہ نہ اعتراض قبول کرتی تھی نہ ممانعت کو۔ اس کے نزدیک، بلاشبہ آسمانی اختیار سب سے اہم تھا؛ وہ، دوسرے معاملات کی طرح اس نقطے پر مذہبی، سچی طرح سے درست ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک مذہبی رہنما ایک ذہن ہوتا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا؛ راہبہ وہ مخلوق ہوتی ہے جو کبھی گناہ نہیں کرتی؛ وہ سارے نفوس اس دنیا سے دیوار کے ذریعے الگ کر دیے گئے ہیں جس میں ایک ہی دروازہ ہوتا ہے جو کبھی نہیں کھلتا تھا جس میں سے صرف سچائی ہی گزر سکتی ہے۔

سسٹر کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی، اس کی پہلی حرکت وہاں سے ہٹ جانا تھا۔

مگر، ایک فرض بھی تھا جو اسے مخالف سمت جانے پر مجبور کر رہا تھا، حکم دے رہا تھا۔ اس کی دوسری حرکت وہیں رُک جانا اور کم از کم ایک سوال کرنا تھا۔

وہاں سسٹر سمپلیس تھی جس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ جاوید کو اس بات کا علم تھا، جس کے نتیجے میں اس کو خاص عزت دیتا تھا۔

"سسٹر!" اس نے سوال کیا، "کیا آپ کمرے میں اکیلی ہیں؟"

یہ ایک خوف ناک لمحہ تھا، جس کے دوران بے چاری دربان کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ

بے ہوش ہو جائے گی۔

ہسٹر نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور جواب میں کہا "ہاں۔"

"معاف کیجیے گا؛ میں اصرار کر رہا ہوں، اس لیے کہ یہ میرا فرض ہے۔" جاویر نے پھر پوچھا، "آپ نے کسی شخص — ایک آدمی — کو اس شام دیکھا ہے۔ وہ فرار ہوا ہے، اور ہم اس کی تلاش میں ہیں — ژاں ولژاں — آپ نے اسے دیکھا ہے؟"

سسٹر نے جواب میں کہا، "نہیں۔"

اس نے دروغ گوئی کی۔ اس نے دو بار، تواتر سے، بلا تامل، مستعدی سے دروغ گوئی کی، اس شخص کی طرح جو خود کو قربان کر رہا ہو۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔" جاویر نے کہا، جھکا اور واپس چلا گیا۔

☆

"اے صوفی خاتون! کئی برس پہلے تم دنیا سے چلی گئی ہو؛ تم اپنی ساتھی کنواری بہنوں، اور اپنے فرشتے بھائیوں سے روشنی میں مل گئی ہو؛ خدا کرے تمھارا یہ جھوٹ جنت میں مثبت انداز میں لیا جائے!"

☆

ہسٹر کا کہا جاویر کے لیے اتنا فیصلہ کن تھا کہ اس نے اس موم بتی کے انوکھے پن پر غور بھی نہیں کیا جو ذرا دیر پہلے بجھائی گئی تھی، اور میز پر رکھی دھواں دے رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد، ایک آدمی، دھند اور پیڑوں کے درمیان تیزی سے M. sur M سے نکل کر پیرس کی طرف جا رہا تھا۔ وہ آدمی ژاں ولژاں تھا۔ دو یا تین گاڑی بانوں کی گواہی سے ثابت ہوا، جو اس سے ملے تھے کہ وہ ایک بنڈل لیے جا رہا تھا؛ کہ وہ ایک بلاؤز میں ملبوس تھا۔ وہ بلاؤز اسے کہاں سے ملا تھا؟ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا، مگر ایک عمر رسیدہ کام کرنے والا چند روز قبل کارخانے کے شفاخانے میں انتقال کر گیا تھا، جس نے کچھ نہیں چھوڑا تھا سوائے ایک بلاؤز کے۔ شاید یہ وہی بلاؤز تھا۔

اب کچھ آخری الفاظ فانتین کے بارے میں:

ہم سب کی ایک ماں ہے — یہ زمین۔ فانتین اسی ماں کو واپس کر دی گئی۔

کیور سمجھا کہ وہ جو کر رہا ہے صحیح کر رہا ہے، اور ژاں ولژاں کا چھوڑا ہوا اثاثہ مساکین کے لیے وقف کرنے میں شاید وہ صحیح تھا۔ کون اس سے متعلق تھا؟ ایک سزا یافتہ آدمی اور

شہر کی ایک عورت۔ اسی وجہ سے اس نے فاطمیں کی سادہ تدفین کی، اور اسے سختی سے اس حد تک محدود رکھا جسے ایک مفلس کی قبر کہا جاتا ہے۔

لہذا، فاطمیں کو قبرستان کے اس کونے میں دفن کیا گیا جو سب کا ہے، ہر ایک کا ہے، جہاں مفلس ڈال دیے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے، خدا جانتا ہے کہ وہ روح کہاں ملے گی۔ فاطمیں کو عوامی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر اس کے پلنگ سے مشابہ تھی۔

❖

ایک منظر

پچھلے برس (1861ء) مئی کی ایک حسین صبح، ایک مسافر، جس نے یہ کہانی بیان کی ہے، Nivelles سے آرہا تھا اور La Hulpe کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ پیدل تھا۔ وہ ایک چوڑی سی پکی سڑک پر آگے بڑھ رہا تھا جو درختوں کی دو قطاروں کے درمیان لہراتی نظر آرہی تھی، ایک کے بعد دوسری پہاڑی پر، جو ایک دوسرے کے بعد آرہی تھیں، کبھی اوپر جاتی، کبھی نیچے گرتی، ایک مہیب لہر سی پیدا کر رہی تھی۔

مسافر Lillois اور Bois-Seigneur-Isaac سے گزرا تھا۔ مغرب کی جانب اسے سلیٹ سے بنی چھتوں والا Braine-l'Alleud کا مینار نظر آیا تھا جو کسی الٹے ہوئے گل دان کی شکل کا ہے۔ ابھی وہ بلندی پر ایک لکڑی اور چوراہے کے زاویے پر، جس کے کنارے ایک کافی ابھرا ہوا پھانسی گھاٹ تھا، جس پر لکھا تھا قدیم رکاوٹ نمبر 4، ایک شراب خانے سے گزر کر آیا تھا جس کے سائن بورڈ پر لکھا تھا: At the Four Winds، Echabeau پرائیویٹ کیفے۔

ایک چوتھائی لیگ آگے، وہ ایک چھوٹی سی وادی کی پاتال میں پہنچا جہاں سڑک کے پشتے میں بنی ہوئی محراب کے نیچے سے پانی گزرتا ہے۔ کم مقدار میں لگائے ہوئے مگر سبز درختوں کا کنج، سڑک کے ایک جانب وادی کو سرسبز کرتا ہے، دوسری طرف مرغزاروں میں بکھر جاتا ہے، اور Braine-l'Alleud کی جانب بڑی شان سے غائب ہو جاتا ہے۔

دائیں طرف، سڑک سے ملحق ایک سرائے تھی، جس کے دروازے پر چار پہیوں والی گاڑی، بانسوں کا ایک بڑا سا بنڈل، ایک ہل، نئی اگتی ہوئی جھاڑیوں کے قریب خشک ڈالیوں کا ڈھیر، اور ایک پرانے پمپ ہاؤس اور بھوسے سے بنے ڈھیروں سے لگی سیڑھی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی میدان کی خودرو گھاس صاف کر رہی تھی، جہاں ہونے والے کسی قسم کے بیرونی تماشے کا،

جیسے نئے بیرش کا جشن، پیلے رنگ کا بڑا سا اشتہار تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سرائے کے ایک کاؤنٹر کے قریب، حوض کے کنارے، جس میں بطخوں کا بحری بیڑا بہہ رہا تھا، ایک بُری طرح بنایا ہوا پکا راستہ جھاڑیوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ مسافر اس سے ٹکرا گیا تھا۔

پندرھویں صدی کی ایک دیوار کے کنارے کنارے سو قدم چلنے کے بعد، جس پر محصول کی وصولی جیسا ایک ٹکوا کھینچا تھا، جس میں مختلف تقابلی اینٹیں لگی تھیں، اسے محرابی پتھروں سے بنا ایک بڑے سے دروازے کا سامنا ہوا جس میں لوئی چہاردہم کے زمانے کے فیشن کی ایک کھڑکی تھی، جس کی دونوں جانب چپٹے تمغے جیسے نقش بنے ہوئے تھے۔ اس دروازے کے اوپر ایک مہیب عمارت تھی۔ دروازے کے سامنے کے مرغزار میں دندانے دار تین عدد پھرے پڑے ہوئے تھے جن میں بے ترتیبی سے مئی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ دروازے کے دو شکستہ پٹ تھے جن پر دستک دینے والا زنگ آلود ضربیہ لگا تھا۔

سورج دل فریب تھا؛ نئی شاخوں پر مئی کی نرم چمک تھی، جو ہوا کے بجائے پرندوں کے گھونسلوں سے چل رہی تھیں۔ ایک بہادر چڑیا، جو شاید نر تھا، ایک بڑے سے درخت میں بے چینی کے انداز میں چہچہا رہا تھا۔ مسافر آگے کی طرف جھک کر بائیں جانب، دروازے کے پشتے کے قریب، کچھ کھلے کُرے کی شباہت والی گول دائرے نما کھدائی کا معائنہ کر رہا تھا۔

عین اس وقت دروازے کے پٹ کھلے اور ایک دہقان عورت بر آمد ہوئی۔

اس نے مسافر کو دیکھا اور سمجھ گئی کہ وہ کیا دیکھ رہا تھا۔

"یہ فرانسیسی توپ کے گولے نے بنایا تھا۔" اس نے مسافر کو بتایا۔ اور مزید کہا "اور وہ جو تم دیکھ رہے ہو، دروازے کے اوپر، کیل کے بالکل قریب، وہ مرغی کے انڈے کے برابر آہنی گولی کا نشان ہے۔ گولی لکڑی میں داخل نہیں ہوسکی تھی۔"

"اس جگہ کا نام کیا ہے؟" مسافر نے سوال کیا۔

"ہوگومونت (Hougomont)۔" دہقان عورت نے جواب دیا۔

مسافر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ چند قدم آگے بڑھا اور باڑھ کی دوسری طرف دیکھنے کے لیے بڑھا۔ درختوں کے اس پار اُفق پر اسے ایک قسم کا ابھار نظر آیا، اور اس ابھار پر دور کوئی شے نظر آئی جو کسی شیر جیسی تھی۔

اس وقت وہ واٹرلو کے میدانِ جنگ میں تھا۔

✿

ہوگومونت

ہوگومونت — یہ قبرستان جیسی جگہ تھی، رکاوٹ کی ابتدا، پہلی مزاحمت تھی؛ یورپ کے عظیم لکڑ ہارے کو، جس کو نپولین کہا جاتا تھا، جہاں واٹرلو کا سامنا تھا، جو اس کے کلہاڑے کے نیچے کی پہلی گانٹھ تھی۔

یہ ایک شیتو تھا، اب ایک زرعی باڑہ بن گیا ہے۔ قدما کے لیے ہوگومونت Hougomont دراصل ہوگومونس تھا۔ یہ حویلی Somerel کے نواب جناب ہیوگو نے تعمیر کرائی تھی، وہی جس نے Abbey of Villiars کے چھٹے پادری کا عہدہ عطا کیا تھا۔

مسافر نے دروازے کو دھکا دے کر کھول دیا، پیش گاہ (porch) کے نیچے کھڑی قدیم گاڑی کو ایک طرف کیا اور صحن میں داخل ہو گیا۔

سب سے پہلے جانوروں کے اس احاطے کی جس چیز نے اسے حیران کیا وہ سولھویں صدی کا ایک دروازہ تھا جو اس مقام پر ایک محرابی راستے کی یاد دلاتا ہے، ہر شے جس کے اطراف سجدہ ریز تھی۔ کبھی کبھی کسی بڑے منظر کی پیدائش بھی کسی کھنڈر میں ہوتی ہے۔ محرابی راستے کے قریب کی ایک دیوار میں ہنری چہارم کے زمانے کا ایک اور محرابی دروازہ کھلتا ہے؛ جس سے باغ میوہ کے درختوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے؛ اس دروازے کے ساتھ ہی، کھاد کا سوراخ ہے؛ کچھ کلہاڑے، کچھ پھاوڑے، کچھ باربردار گاڑیاں اور اپنے فرشی پتھر اور آہنی گراری سمیت ایک قدیم کنواں؛ اچھلتی کودتی ایک مرغی اور اپنی دُم پھیلائے ایک ٹرکی؛ چھوٹے سے گھنٹا گھر کا بوجھ لادے ایک گرجا گھر؛ گرجا گھر کی دیوار پر چڑھنے کا تربیت یافتہ پھول دیتا ہوا ناشپاتی کا پیڑ — صحن ایسا جس کی فتح نپولین کے خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔ اگر اس نے کرۂ ارض کے

اس کونے پر قبضہ کرلیا ہوتا تو اسی طرح شاید اسے پوری دنیا بھی مل جاتی۔ مرغیاں اپنی چونچوں کے ذریعے ہر طرف اس کی خاک پھیلا رہی ہیں۔ ایک غراہٹ سنائی دے رہی ہے؛ یہ ایک مہیب کتا ہے جو اپنے دانت دکھا رہا ہے اور انگریزوں کو بھگا رہا ہے۔

وہاں انگریزوں کا رویہ قابلِ تعریف تھا۔ کک کے محافظوں کے چار دستوں نے دشمن کی پوری فوج کو سات گھنٹے تک روکے رکھا تھا۔

عمارات اور ان سے ملحق احاطے، جیومیٹری کے منصوبے کی صورت، نقشے پر نظر آنے والا ہوگومونت ایک کٹا پھٹا مثلث دکھائی دیتا ہے، جس کا ایک زاویہ کاٹ دیا ہو۔ یہی وہ زاویہ تھا جس میں جنوب کی جانب ایک دروازہ تھا یہ دیوار جس کی حفاظت کرتی تھی، جو صرف ایک توپ کے برابر فاصلے پر تھا۔ ہوگومونت کے دو دروازے ہیں — جنوبی دروازہ جو شیتو میں واقع ہے؛ شمالی دروازہ فارم کا حصہ ہے۔ نپولین نے اپنے بھائی جیروم کو ہوگومونت فتح کرنے بھیجا تھا؛ Foy، Guilleminot اور Bachelu ڈویژن اس پر ٹوٹ پڑے تھے؛ Reille کی تقریباً پوری 'کور' اس کے خلاف استعمال کی گئی تھی اور ناکام ہوئی۔ دیوار کے اس حصے پر کیلر مان کے گولے ناکام ہو گئے تھے۔ بودواں (Bauduin) کا بریگیڈ اتنا طاقت ور نہیں تھا کہ شمال سے ہوگومونت پر دباؤ ڈال سکتا، اور Soye کا بریگیڈ اس پر قبضہ کیے بغیر جنوب کی جانب سے دراڑ کی ابتدا کرنے سے زیادہ اثر نہیں ڈال سکا تھا۔

فارم کی عمارتیں صحن کے جنوب میں واقع ہیں۔ فرانسیسیوں کے توڑے ہوئے شمالی دروازے کا ایک ٹکڑا، دیوار سے منسلک، لٹکا ہوا ہے۔ جو دو cross-beams پر کیل سے جڑے دو تختوں پر مشتمل ہے، جس پر حملے کے نشانات نظر آتے ہیں۔

شمالی دروازہ جسے فرانسیسیوں نے توڑ دیا تھا، اور جس کو دیوار پر نصب کرنے کے لیے کیل سے ایک ٹکڑا لگا دیا تھا، باڑے کے آخر میں نصف کھلا رہتا ہے؛ یہ نیچے پتھر اور اوپر اینٹوں سے بنی دیوار کو کاٹ کر لگایا گیا ہے، جو باڑے کے شمال میں اندر سے بند ہوتا ہے۔ یہ گاڑیوں کے آنے جانے کے لیے ایک سادہ سا دروازہ ہے، جیسا تمام باڑوں میں لگا ہوتا ہے، جس کے دو پٹ دیہاتی قسم کے تختوں سے بنے ہیں۔ اس سے آگے چراگاہیں ہیں۔ اس میں داخلے پر بہت سخت تنازعہ تھا۔ ایک عرصے تک دروازے کی چوکھٹوں پر خون بھرے ہاتھوں کے نشانات نظر آتے تھے۔ اسی جگہ بودواں مارا گیا تھا۔

اس صحن میں لڑائی کا طوفان اب بھی لہراتا محسوس ہوتا ہے، اس کی خوفناکی بھی نظر آتی ہے؛ خوف زدگی پتھر بن کر رہ گئی ہے؛ وہیں زندہ رہتی ہے، اور وہیں مرتی ہے؛ جیسے کل کی بات

ہو۔ دیواریں موت کی اذیت میں ہیں، پتھر گرتے ہیں، شاخیں زور سے چیختی ہیں؛ سوراخ زخم بن گئے ہیں؛ افسردہ اور لرزتے درخت وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

صحن 1815ء میں آج سے بہتر حالت میں تھا۔ عمارتیں جو گرائی جا چکی ہیں اس وقت پشتے اور زاویے بنتی تھیں۔

انگریزوں نے وہاں خود کو محصور کر لیا تھا؛ فرانسیسی اندر داخل تو ہو گئے مگر ٹھہر نہیں سکے تھے۔ گرجا گھر کے قریب، شیٹو کے ایک حصے میں، جو کھنڈر باقی رہ گیا ہے وہ ہوگومونٹ کی حویلی تھی، جو بہت خراب حالت میں تھی۔ شیٹو کمیں گاہ کا کام دیتا اور گرجا گھر مورچے کا، جہاں سے مخالف قوتوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ آدمی ایک دوسرے کو مٹا رہا تھا۔ فرانسیسی ہر مقام سے گولیاں برسا رہے تھے — دیواروں کے پیچھے سے، عمارتوں کی اونچائیوں سے؛ تہ خانوں کی گہرائیوں سے؛ ہر جھروکے سے؛ ہر ہوا دان سے؛ پتھروں کے شگاف سے — وہ، لکڑیوں کے گٹھے لاتے اور دیواروں اور آدمیوں کو آگ لگا دیتے؛ گریپ شاٹ [Grape-shot – چھوٹی چھوٹی گولیوں والے توپ کے گولے] کا جواب آگ دے رہے تھے۔

تباہ شدہ حصے میں آہنی چھڑ لگی کھڑکیوں سے، اینٹوں سے بنی عمارت کے تباہ شدہ کمرے نظر آتے ہیں؛ انگریزی محافظ ان میں گھات لگائے بیٹھے تھے؛ سیڑھیوں کا پیچ، جو زمین سے چھت تک شگافتہ تھا، ٹوٹے ہوئے خول کی طرح نظر آتا ہے۔ سیڑھیاں دو منزلہ ہیں؛ انگریز نے سیڑھیوں پر قبضہ کر لیا تھا، اوپری منزل پر جمع ہو کر نیچے کی منزل سے راستہ کاٹ دیا تھا۔ سیڑھی کے قدمچے نیلے پتھر کے بنے ہوئے تھے، بچھو بوٹی کے درمیان جن کا انبار ہے۔ نصف کے قریب قدمچے اب بھی دیوار میں پیوست ہیں؛ پہلے قدمچے پر سہ شاخہ برچھی کا نقش کندہ ہے۔ پیچ سے باہر یہ قدمچے اپنے جوف میں مضبوطی سے لگے ہوئے ہیں۔ باقی جوف بغیر دانت کے کھلے ہوئے دہنوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں دو قدیم درخت ہیں؛ ایک سوکھ گیا ہے؛ دوسرا اپنی بنیاد کے پاس سے زخمی ہے جسے اپریل کی ہریالی ڈھک لیتی ہے۔ 1815ء کے بعد سے سیڑھیوں پر موسم میں ہری بیلیں چڑھنے لگی ہیں۔

گرجا گھر میں قتلِ عام ہوا تھا۔ اس کا اندرون، جس کی خاموشی بحال ہو گئی ہے، منفرد ہے۔ خوں ریزی کے بعد سے وہاں کوئی مذہبی اجتماع نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی قربان گاہ سالم چھوڑ دی گئی ہے — غیر پالش شدہ لکڑی کی قربان گاہ کھردرے پتھروں کے پس منظر میں قائم کی گئی تھی۔ چار سفیدی شدہ دیواریں، قربان گاہ کے سامنے ایک دروازہ، دو چھوٹی محرابی کھڑکیاں؛ دروازے کے اوپر ایک بڑی چوبی صلیب، صلیب کے نیچے بھوسے کے بنڈل سے بھرا ہوا مربع ہوا دان؛ ایک کونے میں رکھا ایک

کھڑکی کا ڈھانچا جس کے سارے شیشے ریزہ ریزہ— یہ حال ہے گرجا گھر کا۔ قربان گاہ کے قریب سینٹ این کا پندرھویں صدی کا چوبی مجسمہ کیل سے نصب ہے۔ توپ کا ایک بڑا گولا یسوع مسیح کا سر اڑا لے گیا تھا۔ فرانسیسیوں نے جو کچھ دیر کے لیے گرجا گھر پر قابض ہو گئے تھے، اور بعد میں بے دخل کر دیے گئے تھے، اس کو آگ لگا دی تھی۔ عمارت شعلوں سے بھر گئی تھی؛ بالکل بھٹی بن گئی تھی؛ دروازہ جل گیا تھا، فرش جل گیا تھا، چوبی یسوع مسیح نہیں جلا تھا۔ آگ اس کے قدموں تک پہنچ گئی تھی، جن کے جلے ہوئے ٹکڑے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں، اس کے بعد رُک گئی تھی— پڑوس کے لوگوں کے مطابق یہ ایک معجزہ تھا۔ سر بریدہ شیر خوار یسوع، بالغ یسوع مسیح کے مقابلے میں کم خوش قسمت تھا۔

دیواریں کندہ کاری سے پٹی ہیں۔ یسوع مسیح کے بازوؤں کے پاس ایک نام کندہ ہے Henquinez: ۔ اس کے بعد دوسرے نام ہیں: Conde de Rio Maior، Marques y Marquesa de Almagro (Habana)۔ کچھ فرانسیسی نام بھی ہیں جن کے آخر میں استعجاب کے نشان بنے ہیں— جو غیظ و غضب کے اشارے سمجھے جاتے ہیں۔ وہیں قوموں نے ایک دوسرے کی توہین کی تھی۔

اس گرجا گھر کے دروازے پر ہی ایک آدمی کی لاش ملی تھی جو اپنے ہاتھ میں ایک کلھاڑا پکڑے ہوئے تھا؛ یہ لاش سب لفٹنٹ Legros کی تھی۔

گرجا گھر سے نکلتے ہی بائیں جانب ایک کنواں ہے۔ اس احاطے میں دو کنویں ہیں۔ اس سوال پر کہ ان پر چرخی اور رسی کیوں نہیں، جواب ملا کہ اب ان میں سے پانی نہیں نکالا جاتا۔ پانی کیوں نہیں نکالا جاتا؟ اس لیے کہ یہ انسانی ڈھانچوں سے بھرے ہیں۔

آخری آدمی جس نے کنویں سے پانی نکالا تھا Guillaume van Kylsom تھا۔ ایک دہقان جو ہوگومونت میں رہتا تھا، اور مالی کا کام کرتا تھا۔ 18 جون 1815ء اس کے اہلِ خانہ فرار ہو کر جنگل میں جا چھپے تھے۔

Abbey of Villiers کے اطراف کے جنگلوں نے ان بدقسمت افراد کو پناہ دی تھی جو ایک عرصے تک دن رات مارے مارے پھرتے تھے۔ آج بھی ایسے نشانات موجود ہیں، جیسے درختوں کے جلے ہوئے تنے، جو ان غریب بے گھر لوگوں کی جائے پناہ کی نشان دہی کرتے ہیں، جو کبھی گنجان پیڑوں کی گہرائیوں میں لرزاں تھے۔ Guillaume van Kylsom خود "شیٹو کی حفاظت کے لیے" ہوگومونت میں رہ گیا تھا۔ انگریزوں نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کو پناہ گاہ سے نکال کر لے گئے اور جنگجوؤں نے اس خوف زدہ شخص کو تلواروں کے چپٹے حصے سے ضرب لگا

کرانے خدمات پر مجبور کیا۔ وہ لوگ پیاسے تھے؛ Guillaume ان کے لیے پانی لایا تھا۔ یہی کنواں تھا، وہ جس سے پانی لایا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اپنا آخری پانی یہیں پیا تھا۔ وہ کنواں جس سے بے شمار لوگوں نے پانی پیا تھا، خود بھی مرجانے والا تھا۔

لڑائی کے بعد انھیں مرنے والوں کو دفن کرنے کی جلدی تھی۔ موت ہمیشہ فتح کو پریشان کرتی ہے، اور اوج کے عقب میں وبائیں چلتی ہیں۔ ٹائیفس اور فتح لازم و ملازم ہیں۔ یہ کنواں گہرا تھا جسے قبر میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ اس میں تین سو لاشے ڈالے گئے تھے۔ شاید انھیں بہت عجلت تھی۔ کیا وہ سب مردے تھے؟ روایت کے مطابق سب مرے نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بھرے جانے کے بعد کی رات کنویں سے کم زور کراہیں سنائی دی تھیں۔

یہ کنواں اکیلا صحن کے بیچ واقع ہے۔ اس کے اطراف پتھروں اور اینٹوں سے تین دیواریں ایک چھوٹے سے مربع مینار سے مشابہ ہیں، اور ہر جانب سے کسی ٹٹی کے پٹ کی طرح تہ کردی گئی ہیں۔ چوتھی سمت کھلی ہے۔ اس جگہ سے پانی نکالا جاتا تھا۔ دیوار کی بنیاد میں بے ہنگم شکل کا ایک سوراخ ہے، جو شاید کسی گولے سے بنا ہے۔ اس چھوٹے سے مینار کا ایک شہ نشین تھا، جس کی صرف شہتیریں ہی باقی رہی ہیں۔ لوہے سے بنے اس کے سہارے صلیب کی شکل کے ہیں۔ جھک کر دیکھو تو نظریں کھوکھلی سی بیلن نما گہرائی میں بھرے سایوں میں گم ہو جاتی ہے۔ کنویں کے اطراف کی دیواروں کی بنیاد بچھو بوٹی سے چھپی ہوتی ہے۔

اس کنویں کے سامنے نیلے رنگ کی سِل نہیں، جیسی کہ بلجیم کے کنووں میں ہوتی ہیں۔ یہاں سِل کے بجائے cross-beam بنائی گئی ہیں، جن کے مقابل پانچ یا چھ عدد گانٹھوں والے لکڑی کے ٹھنٹھ لگائے گئے ہیں جو مہیب ہڈیوں کے مشابہ ہیں۔ اس کنویں پر کوئی زنجیر اور گراری نہیں؛ پتھر سے بنا ایک بیسن ہے جو سیلاب کے پانی کو کنویں میں جانے سے روکتا ہے۔ بارش کا پانی اسی میں جمع ہوتا رہتا ہے، اور پاس پڑوس کے جنگلوں کے پرندے پانی پینے آتے ہیں، اور اڑ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کھنڈر کی ایک عمارت اب بھی آباد ہے۔ اس عمارت کا دروازہ صحن میں کھلتا ہے۔ اس دروازے میں لگی گوتھک پلیٹ کے ساتھ لوہے کا ایک ہینڈل لگا ہے۔ جس وقت ہینوور کے لفٹننٹ ولڈا (Wilda) نے اس فارم میں پناہ لینے کے لیے اس ہینڈل کو پکڑا تھا تو سرنگ بنانے والے ایک فرانسیسی سپاہی نے کلھاڑے سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔

اب جو خاندان اس میں رہتا ہے اس کا دادا Guillaume زمانہ ہوا انتقال کرچکا ہے۔ کھچڑی بالوں والی ایک عورت نے ہمیں بتایا تھا، "میں وہیں تھی۔ میری عمر تین برس کی

تھی۔میری بہن جو مجھ سے بڑی تھی،خوف زدہ ہو کر رونے لگی تھی۔وہ ہمیں جنگل میں لے گئے تھے۔ وہاں میں اپنی ماں کے بازوؤں میں گئی تھی۔ہمارے کان سننے کے لیے زمین سے لگے ہوئے تھے۔میں نے توپ کی نقل کی تھی، اور بوم! بوم! کرنے لگی تھی۔"

ہمیں بتایا گیا ہے کہ صحن کا ایک دروازہ باغ میوہ میں کھلتا تھا۔باغ بہت خوف ناک ہے۔ اس کے تین حصے ہیں؛ کوئی انھیں تین کردار بھی کہہ سکتا ہے۔پہلا حصہ ایک باغیچہ ہے، دوسرا باغ میوہ ہے، تیسرا جنگل ہے۔ان تینوں کا ایک مشترکہ احاطہ ہے؛ داخلے کی جانب شیتو کی عمارتیں اور فارم ہے؛ بائیں جانب جھاڑیوں کی باڑھ ہے؛ دائیں جانب ایک دیوار اور آخر میں بھی دیوار ہے۔ دائیں جانب کی دیوار اینٹوں سے بنی ہے جب کہ اس کا نچلا حصہ پتھر کا ہے۔داخل ہوتے ہی پہلے باغیچہ پڑتا ہے۔اس کی ڈھلان پرگزش انگور کی جھاڑیاں ہیں، جن پرخودرو سبزہ حاوی ہے،جسے سنگ تراشی سے بنا ایک بالا خانہ اور دُہرا جنگلا روکے ہوئے ہے۔

باغیچہ قدیم فرانسیسی انداز کا ہے جو Le Notre سے بھی قدیم ہے؛ آج یہ کھنڈر اور سفید جھاڑیوں سے بھرا ہے۔چوکور ستونوں پر توپ کے گولے سے مشابہ پتھر رکھے تھے۔جنگلوں کے بیالیس ستون گنے جا سکتے ہیں؛ بقیہ گھاس میں پڑے ہوئے ہیں۔تقریباً سب ستونوں میں گولیوں کے نشان ہیں۔ایک تکون پر رکھا ہوا شکستہ ستون ٹوٹے ہوئے پاؤں کی طرح نظر آتا ہے۔

یہ وہی باغیچہ ہے جس میں باغ میوہ سے مزید آگے،پیدل فوج کے چھ سپاہی گھس آئے اور بھاگ نہیں سکتے تھے تو انھوں نے ریچھ کی طرح شکار ہو جانے کے بجائے ہینوور کے دو دستوں سے مقابلے کی ٹھانی، جن میں سے ایک چھوٹی بندوقوں سے لیس تھا۔ہینوور والوں نے جنگلے کے ستونوں کے ساتھ کھڑے ہو کر گولیاں چلانی شروع کردی تھیں۔ دو سو کے مقابلے میں پیدل سپاہیوں نے نیچے سے جواب دیا جنھیں یوفی کشمش کی جھاڑیوں کے علاوہ پناہ کی جگہ نہیں ملی، اور تقریباً ایک چوتھائی گھنٹے تک مزاحمت کے بعد مارے گئے۔

چند قدم چڑھائی چڑھتے ہی باغ میوہ آجاتا ہے۔اسی جگہ، چند مربع میل کے گھیرے میں، آدھ گھنٹے کے اندر پندرہ سو آدمی کھیت ہو گئے تھے۔وہ دیوار آج بھی لڑائی کے لیے تیار نظر آتی ہے۔مختلف سطحوں پر انگریزوں کے بنائے توپوں کے اڑتیس سوراخ آج بھی موجود ہیں۔ سوراخ صرف جنوبی دیوار میں ہیں اس لیے کہ حملہ اسی جانب سے ہوا تھا۔دیوار باہر کی جانب ایک اونچی جھاڑی سے چھپی ہوئی ہے؛ فرانسیسی یہ سمجھ کر آئے تھے کہ انھیں ایک ہی جھاڑی کا سامنا ہوگا، اس کو پار کیا، تو دیوار کو رکاوٹ اور کمیں گاہ پایا، جس کے پیچھے انگریز محافظ چھپے ہوئے تھے؛ اڑتیس سوراخوں سے گریپ شاٹ کی برسات ہو رہی تھی، اور اس کے خلاف حملہ آور

Soye کا بریگیڈ تباہ ہوگیا تھا۔ واٹرلو کی جنگ اس طرح شروع ہوئی تھی۔

اس کے باوجود باغ میوہ پر قبضہ ہوگیا۔ چوں کے ان کے پاس سیڑھیاں نہیں تھیں، فرانسیسی اپنے ناخنوں کی مدد سے دیوار پر چڑھے تھے۔ درختوں کے درمیان دست بدست لڑائی ہوئی تھی۔ یہ ساری گھاس خون سے تر بتر ہوگئی تھی۔ اس جگہ سو افراد کی بٹالین زیر کر لی گئی تھی۔ دیوار کا بیرونی حصہ جس پر کیلرمین (Kellermann) کا دو توپ خانہ مشق کر رہا تھا، گریپ شاٹ کے گولوں سے چھلنی ہے۔

یہ باغ میوہ بھی، دوسرے باغوں کی طرح، مئی کے مہینے میں جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے اپنے بٹر کپ (گل اشرفی) اور گل بہار پھولتے ہیں؛ یہاں کی گھاس لانبی ہوتی ہے۔ گاڑی کے گھوڑے یہاں گھاس چرتے ہیں؛ بالوں سے بٹی رسیوں پر کپڑے سوکھتے ہیں؛ ان درختوں کے نیچے سے گزرنے والوں کو اپنے سر جھکا کر چلنا پڑتا ہے؛ اس غیر مزروعہ زمین پر پڑنے والے قدم موش کے بلوں میں دھنس جاتے ہیں۔ گھاس کے درمیان ایک گرے ہوئے درخت کا تنا نظر آرہا ہے جو گرنے کے باوجود سبز و شاداب ہے۔ اسی کے سہارے میجر بلیک مین (Blackmann) نے جان دی تھی۔ اسی علاقے کے ایک بڑے درخت کے نیچے جرمن جرنیل ڈوپلاٹ (Duplat) مرا تھا، جو ایک فرانسیسی خاندان سے تھا جو Edict of Nantes کے زوال کے بعد وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ سیب کا گرتا ہوا ایک پرانا درخت ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ اس کے زخم کی مرہم پٹی چکنی مٹی کے گارے سے کی گئی ہے۔ تقریباً سارے درخت اپنی عمر کی وجہ سے گر رہے ہیں۔ وہاں ایک بھی درخت نہیں جس کو گولی نہ لگی ہو۔ اس باغ میوہ میں مرے ہوئے درختوں کے ڈھانچے بافراط ہیں۔ ان کی شاخوں کے درمیان سے زاغ اُڑتے ہیں، اور آخر میں ان کے ڈھانچے جھنگے کی بیل سے بھر جاتے ہیں۔

بودواں مارا گیا، فائے (Foy) زخمی ہوا، آتش زنی؛ قتلِ عام؛ خوں ریزی؛ انگریزی خون اور فرانسیسی خون سے بنی نالیاں؛ غصے سے آلودہ جرمن خون؛ لاشوں سے بھرا کنواں؛ Nassau کی رجمنٹ اور برنس وِک کی رجمنٹ تباہ؛ ڈوپلاٹ مردہ؛ بلیک مین مُردہ؛ انگریزی محافظ ٹکڑے ٹکڑے؛ رائیلے کی کور چالیس نفر کے ساتھ اور فرانسیسی بٹالین کا بیشتر حصہ تباہ؛ صرف ہوگومونٹ کے سائبان میں تین ہزار افراد کاٹ ڈالے گئے؛ ٹکڑے کر دیے گئے؛ گولی مار دی گئی؛ جلا دیے گئے؛ گلے کاٹ دیے گئے تھے —— یہ سب اس لیے کہ آج کا دہقان مسافروں سے کہہ سکے، "موسیو مجھے تین فرانک دیجیے اور اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو واٹرلو کے واقعے کی تفصیل بیان کر دوں گا۔"

18 جون 1815ء

آیئے، کچھ دیر کے لیے ہم ایک بار پھر 1815ء میں واپس چلتے ہیں— کہ یہ کہانی کہنے والے کا حق ہوتا— بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے، اس پورے عہد میں، جب اس کتاب میں ہونے والے واقعات جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، واقع ہو رہے تھے۔

اگر 17 اور 18 جون 1815ء کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا حال کچھ اور ہی ہوتا۔ بارش کے، کم و بیش، چند قطروں نے نپولین کے زوال کا فیصلہ کیا تھا۔ واٹرلو میں Austerlitz کا اختتام ہو گیا ہوتا، اگر اس وقت ذرا زیادہ بارش ہو گئی ہوتی، اور آسمان سے گزرتے ہوئے بادل دنیا کو توڑ پھوڑ دینے کے لیے کافی ہوتے۔

واٹرلو کی جنگ ساڑھے گیارہ بجے تک شروع نہیں ہو سکتی تھی اور [جرمنی کے جنگی جہاز] بلوخر کو پہنچنے کا موقع مل گیا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ زمین گیلی تھی توپ بردار افواج کو زمین کے سخت ہو جانے کا انتظار کرنا پڑا تھا۔

نپولین توپ خانے کا افسر تھا اور اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس حیرت انگیز کپتان کی بنیاد وہ شخص تھا جس نے ایوجر کی ڈائرکٹری میں کہا تھا، ہمارے ایسے ایک گولے نے چھ آدمی مار ڈالے۔ اس جنگ کا سارا منصوبہ گولوں کے استعمال پر منحصر تھا۔ فتح کی کلید یہ تھی کہ توپ خانہ ایک ہی نقطے پر ارتکاز کرے گا۔ اس نے دشمن جرنیل کی حکمتِ عملی کو قلعہ سمجھ کر اس میں دراڑ ڈال دی۔ اس نے کم زور مقامات پر گریپ شاٹ کی توپ اندازی سے غلبہ حاصل کیا؛ وہ لڑائیوں میں شامل ہوا اور ان کو توپ کے ذریعے ختم کر دیا۔ اس کے جوہرِ قابل میں نشانے بازی کمال پر تھی۔ میدانوں میں شکست دینا، رجمنٹوں کو ریزہ ریزہ کر دینا، صفوں کو منتشر کر دینا، عوام کو

کچلنا اور منتشر کر دینا — اس کے نزدیک مارو، مارو، اور تواتر سے مارتے رہو — میں پوشیدہ تھا اور اس نے یہ فرض توپ کے گولے کو سونپ دیا تھا۔ ایک زبردست طریقے نے، اس کے جوہرِ قابل سے مل کر، جنگ کے اس ملکے باز کو پندرہ برس کے عرصے کے لیے؛ ناقابلِ شکست بنا دیا تھا۔

18 جون 1815ء کو اس نے توپ خانے پر زیادہ انحصار کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے کہ اسے عددی برتری حاصل تھی۔ ویلنگٹن کے پاس آگ اگلنے والے صرف ایک سو انسٹھ دہان تھے؛ نپولین کے پاس دو سو پچاس تھے۔

اگر زمین خشک ہوتی، اور توپ خانہ آگے بڑھ سکتا تو حملہ صبح چھ بجے شروع ہو گیا ہوتا۔ جنگ جیت لی گئی ہوتی اور پروشیائیوں کی تقدیر بدلنے سے پہلے، دو بجے دن تک جنگ ختم ہو گئی ہوتی۔ اس جنگ کی شکست کی کتنی ذمے داری نپولین پر عائد ہوتی ہے؟ کیا جہاز کی تباہی صرف پائلٹ کی وجہ سے ہوئی تھی؟

کیا یہ بہ ظاہر نپولین کا زوال تھا جس نے اس عہد کی اندرونی طاقت میں کمی کی پیچیدگی پیدا کر دی تھی؟ کیا بیس برس کی جنگ نے تلوار کی دھار کے ساتھ ساتھ اس کی نیام کو بھی خراب کر دیا تھا۔ یعنی روح اور جسم دونوں کو؟ کیا ایک آزمودہ کار شخص اپنے رہنما کی نظروں میں خود کو نالائق محسوس کر رہا تھا؟ یعنی، بیشتر اہم تاریخ دانوں کی نظر میں، اس کو گرہن لگ گیا تھا۔ کیا اپنے آپ سے اپنی کم زوری کو چھپانے کے لیے وہ جنونی ہو گیا تھا؟ کیا اس نے مہم کے خیال سے ہی گھبرانا شروع کر دیا تھا؟ کیا وہ خطرے سے — جو کسی جرنیل کے لیے بہت اہم ہوتا ہے — بے خبر ہو گیا تھا؟ کیا اس قسم کے لوگوں کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے جس میں — اہم اور اونچے درجے کے لوگ جنھیں کار کردگی کے میدان کا دیو کہا جاتا ہے — جوہرِ قابل کم نظر ہونے لگتا ہے؟ بڑھاپا مثالی جوہرِ قابل پر اثر انداز نہیں ہوتا، اس لیے کہ دانتے اور مائیکل انجلو جیسے افراد کا بوڑھا ہونا عظمت میں بڑھنا ہوتا ہے: تو کیا Hannibals اور بونا پارٹ کم بوڑھے تھے؟ کیا نپولین نے براہِ راست فتح کا احساس کھو دیا تھا؟ کیا وہ اس نقطے پر پہنچ گیا تھا جس میں وہ پتھریلے ساحل کو پہچان نہیں سکتا تھا؛ جال کو مزید ربانی نہیں بنا سکتا تھا؛ گہرائیوں کے جھڑتے ہوئے کناروں کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا؟ کیا اس میں آفتوں کو سونگھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی؟ کیا وہ جو ماضی میں فتح کے سارے راستوں سے واقف تھا، اور جو آسمانی بجلی کے اپنے رتھ کی بلندی سے، اپنی شاہانہ انگلی سے ان کی طرف اشارہ کر سکتا تھا، کیا وہ اب اس نامبارک تعجب کی حالت میں بھی اس سے بندھے اپنے ژرگوں لشکروں کو بلند چٹانوں تک لے جا سکتا تھا؟ کیا چھیالیس برس کی عمر میں

ایک بلند تر پاگل پن میں گرفتار ہوگیا تھا؟ کیا وہ مقدر کا دیو پیکر رتھ چلانے والا اب محض ایک ڈرانے والا بھوت ہو کر رہ گیا تھا؟

ہم ایسا نہیں سمجھتے۔

اس کا جنگی منصوبہ، سب کے اعتراف کے مطابق، ایک شاہکار تھا۔ سیدھے Allie کے مرکز تک جانا، دشمن کی صفوں میں شگاف ڈالنا؛ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا؛ نصف برطانویوں کو Hal تک پسپا کر دینا اور پروشیائیوں کو بلجیم کے Tongres t ای شہر تک دھکیل دینا؛ ویلنگٹن اور بلوخر[لڑا کا بحری جہازوں] کے دو تباہ شدہ ٹکڑے بنا دینا؛ Mont-Saint-Jean کو ساتھ لے جانا؛ برسلز پر قبضہ کر لینا؛ جرمنوں کو دریائے رہائین میں اور انگریزوں کو سمندر میں پھینک دینا۔ نپولین کے مطابق اس جنگ میں یہ سب ہونا تھا۔ اس کے بعد لوگ دیکھتے۔

بلاشبہ ہم واٹر لو کی جنگ کی تاریخ پیش کرنے کا بہانہ نہیں تراش رہے ہیں۔ اس کہانی کی بنیاد کے مناظر میں سے ایک منظر ہم جس کا تذکرہ کرنا چاہ رہے ہیں، جنگ کے متعلق ہے، مگر یہ تاریخ ہمارا موضوع نہیں؛ مزید یہ کہ یہ تاریخ تو ختم کی جا چکی ہے، ایک نپولین کے نقطۂ نگاہ سے اور دوسری سارے خوشہ پروین تاریخ دانوں کے نقطۂ نگاہ سے۔

جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہم تاریخ دانوں کو تنازعوں میں الجھتا چھوڑے دیتے ہیں؛ ہم محض دور سے دیکھنے والوں میں سے ہیں؛ میدان سے گزرنے والے؛ انسانی گوشت سے بنی مٹی میں جھک کر کچھ تلاش کرنے والے؛ اتفاقیہ طور پر حقیقتوں کا روپ دھارنے والے؛ ہمیں کوئی حق نہیں سائنس کے نام پر مخالفت کرنے کا اور ان حقائق کو جمع کرنے کا جن میں بلاشبہ سراب خیال ہوں؛ ہم نہ فوجی مشق کے حامل ہیں، نہ ہم میں اتنی حکمتِ عملی کی صلاحیت ہے جو کسی نظام کو اختیار دے سکے؛ ہماری رائے میں واٹر لو کے دونوں رہنماؤں پر حادثات کا تسلسل حاوی رہا ہے؛ اور جب یہ مقدر کا معاملہ بن جاتا ہے، تو وہ پُراسرار خطا کار جسے ہم جج کی طرح پرکھتے ہیں، عوام ہوتے ہیں۔

۞

A

وہ لوگ جو واٹرلو کی لڑائی کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں انھیں ذہنی طور پر زمین پر اپنے سامنے انگریزی کا حرف تہجی A رکھ لینا چاہیے۔

A کی بائیں شاخ کو Nivelles تصور کرلیا جائے، دائیں شاخ کو Genappe جانے والی سڑک، اور دونوں شاخوں کو ملانے والی لکیر کو Ohain سے Braine-l'Alleud جانے والی خالی سڑک سمجھ لیا جائے۔ A کا بالائی سرا Mont-Saint-Jean سمجھا جائے، جہاں ویلنگٹن موجود ہے؛ بائیں شاخ کا نچلا کونا ہوگومونٹ ہے، جہاں جیروم بوناپارٹ کے ساتھ رائیلے (Reille) مقیم ہے؛ دایاں اوپری سرا Belle-Alliance ہے جہاں نپولین تھا۔ اس کے بالکل مرکز میں وہ مقام ہے جہاں لڑائی کی ابتدا کا اعلان ہوا تھا۔ وہیں پر ایک شیر رکھا گیا تھا، جو امپیریل گارڈ کی بہادری کا نشان سمجھا جاتا تھا۔

وہ مثلث جس میں A کی چوٹی اور دونوں شاخوں کو مربوط کرنے والی لکیر سے مل کر بننے والا علاقہ Mont-Saint-Jean کی سطح مرتفع ہے، اسی کے تنازعے پر پوری لڑائی ہوئی تھی۔ دونوں فوجوں کے بازو دائیں اور بائیں Genappe اور Nivelles تک جانے والی سڑکوں تک پھیلے ہوئے تھے؛ d'Erlon کے سامنے Picton تھا اور Hill کے سامنے رائیلے۔

A کی چوٹی کے عقب میں اور Mont-Saint-Jean کی سطح مرتفع کے عقب میں Soignes کا جنگل ہے۔

قاری کو اس میدان کی جگہ ایک لہریں لیتا ہوا میدان تصور کرنا چاہیے؛ ہر لہر یا ہر بلندی، اگلی بلندی کا حکم دیتی ہے، اور تمام لہریں Mont-Saint-Jean کی طرف اُبھرتی چلی جاتی

ہیں، اور جنگل پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔

لڑائی کے میدان کی دو دشمن فوجیں دو پہلوانوں جیسی ہوتی ہیں۔ اپنے مخالف کو کمر سے پکڑ لینا ہی کامیابی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو پٹخ دینا چاہتا ہے۔ دونوں اپنے مخالف کی ہر شے کو پکڑنے کوشش کرتے ہیں؛ جھاڑی مقام مددہوتی ہے؛ دیوار کا زاویہ کاندھے کو آرام فراہم کرتا ہے؛ اس لیے کہ سائبان کی ناموجودگی کی صورت میں، جس کے نیچے وہ رُک سکتے ہیں، رجمنٹ اپنی زمین کھو دیتی ہے؛ زمین کی نابرابری اتفاقیہ موڑ یا چوراہا ہوتا ہے، جہاں صحیح وقت پر کوئی کنج یا کوئی پہاڑی چشمہ اس دیو پیکر کی ایڑی کو روک سکتا ہے، جس کو فوج کہا جاتا ہے؛ اور جو میدان چھوڑ دے وہ ہار جاتا ہے؛ اسی لیے ایک ذمے دار رہنما کی ضرورت ہوتی ہے، سب سے غیر اہم درختوں کے جھنڈ کا معائنہ کرنے، اور میدان سے ملنے والی کمترین مدد کا بھی بہ غائر معائنہ کرنے کے لیے۔

دونوں جرنیلوں نے Mont-Saint-Jean کے میدان کا، جسے واٹرلو کا میدان کہا جاتا ہے، پوری توجہ سے مطالعہ کیا تھا۔ پچھلے برس ویلنگٹن نے اپنی پیش بینی کی فراست کے استعمال سے اس کو عظیم جنگ کا ممکنہ مقام بنانے پر غور کیا تھا۔ اس نقطے پر، اور اس مبارزت کے لیے، جون کی اٹھارویں تاریخ کو ویلنگٹن کی چوکی اچھی تھی اور نپولین کی چوکی خراب تھی۔ انگریزی فوج اوپر قیام پذیر تھی، نپولین کی فوج نیچے کھڑی تھی۔

اس مقام پر جون 1815ء کی اٹھارویں تاریخ کو نپولین کے ظہور کا نقشہ کھینچنا تقریباً فضول ہوگا: فجر کے وقت گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں شیشہ لیے، Rossomme کی بلندیوں پر ہمارے دکھانے سے پہلے پوری دنیا اسے دیکھ چکی ہے۔ Brienne اسکول کی تکونی ٹوپی کے نیچے پُرسکون شخصیت، سبز وردی، سفید پلٹا ہوا کالر جس کے نیچے چھپا ہوا تمغہ آف آنر، بڑے سے کوٹ کے نیچے پوشیدہ تمغے، واسکٹ کے نیچے سے جھانکتا ہوا سرخ ربن کا کونا، چرمی پتلون، سفید گھوڑا جس پر کسی زین پر ارغوانی رنگ کے مخمل کا غلاف، جس کے کونوں پر کڑھائی سے نپولین کا حرف تہجی N اور عقابیں بنی ہوئیں، ریشمی موزوں پر چڑھائے گئے فوجی بوٹ، جس میں ایڑ لگانے کے لیے لگے نقرئی کانٹے، Marengo کی تلوار — اس کا پورا وجود آخری زاروں جیسا تھا؛ کچھ کا اظہار تحسین کے ساتھ سیلوٹ تھا جب کہ دوسروں کا پوری توجہ سے نظروں ارتکاز۔

وہ وجود رات کے اندھیرے میں دیر تک کھڑا رہا؛ وہ ہیروؤں کی اکثریت کے ایک مخصوص روایتی ابہام سے پیدا ہوا تھا اور جو ہمیشہ سچ کو طویل عرصے یا قلیل عرصے تک چھپاتا رہا ہے؛ مگر آج تاریخ آگئی ہے اور دن کی روشنی نکل آئی ہے۔

روشنی کی لائی ہوئی تاریخ بے رحم ہوا کرتی ہے؛ اس میں ایک مخصوص نوعیت کی زبانی خصوصیت ہوتی ہے، وہ روشنی جسے خالص روشنی کہتے ہیں، اس لیے اور بھی کہ وہ مکمل طور پر روشنی ہوتی ہے اور اکثر ایسی جگہوں پر سایے ڈالتی ہے جہاں اب تک لوگ روشنی کی کرنیں دیکھتے رہے ہیں؛ اسی شخصیت سے یہ دو مختلف خیالی وجود تخلیق کرتی ہے، اور ایک دوسرے پر حملہ کرتی ہے اور اس پر انصاف کی تکمیل کرتی ہے، اور جابر کے سایے رہنما کی ذکاوت سے مقابلہ کرتے ہیں؛ اس طرح قوموں کے معتبر فیصلے میں ایک سے زیادہ سچا معیار پیش کرتے ہیں۔

بابل کی تباہی سکندر کے قد کو گھٹا دیتی ہے؛ روم کی زنجیر بندی سیزر کو گھٹا دیتی ہے؛ یروشلم کا قتل ٹائیٹس کو چھوٹا کر دیتا ہے؛ جبر جابر کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے پیچھے ایسی رات چھوڑ جاتا ہے جو اس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

۞

لڑائیوں کے اِبہامات

ہر شخص اس لڑائی کے پہلے دور سے واقفیت رکھتا ہے؛ وہ ابتدا جو پریشان کُن، غیر یقینی، متذبذب اور دونوں فوجوں کے لیے خطرناک تھی، مگر فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کے لیے زیادہ خطرناک تھی۔

پوری رات بارش ہوئی تھی، موسلا دھار پانی نے زمین کو کاٹ کر رکھ دیا تھا، میدان کے گڑھوں میں جا بجا پانی جمع ہو گیا، جیسے لکڑی سے بنے ٹبوں میں رکھا جاتا ہے؛ کچھ مقامات پر توپ خانے کی گاڑیاں پہیوں کے دُھروں تک کیچڑ میں پھنس گئی تھیں۔ گھوڑوں کی پشت پر زین کسنے والے پٹوں تک سے رقیق کیچڑ ٹپک رہا تھا۔ اگر پیش قدمی کرتی ہوئی گاڑیوں کے کچلے ہوئے گیہوں اور رائی سے پہیوں کی لیکھ بھر نہ گئی ہوتی تو Papelotte کی طرف لے جانے والی ہر قسم کی وادیوں میں حرکت ممکن ہو جاتی۔

ماجرا دیر سے شروع ہوا تھا۔ جیسے کہ تشریح کی جا چکی ہے، نپولین اپنے پورے توپ خانے کو اپنے ہاتھ میں پستول کی طرح — ابھی اِس طرف نشانہ، ابھی اُس طرف نشانہ [کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا کے مصداق] — لڑائی کے لیے تیار رکھنا پسند کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک گھوڑوں سے کھینچی جانے والی توپیں حرکت میں آ سکیں، بلکہ آزادانہ سرپٹ دوڑ سکیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سورج نکل آئے اور زمین کو خشک کر دے، مگر سورج نے اپنا مکھڑا نہیں دکھایا۔ اب Austerlitz کا میدان طے شدہ ملاقات کی جگہ نہیں رہ گیا تھا۔ جب پہلی توپ داغی گئی، انگریز جرنیل کالول نے اپنی دستی گھڑی دیکھی تھی، اس وقت گیارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔

لڑائی پورے جوش وخروش سے شروع ہو گئی تھی، شاید اس سے بھی زیادہ جوش و جذبے سے، شہنشاہ جسے پسند کرتا، ہوگومونت میں متیم دستہ تیزی سے حرکت میں آ گیا تھا۔عین اس وقت نپولین نے La Haie-Sainte کے مرکز پر Quiot کے بریگیڈ سے حملہ کر دیا تھا، اور Ney نے فرانسیسی فوج کے میمنے کو انگریزی فوج کے میسرے کی طرف آگے بڑھایا تھا، جو Papelotte میں انتظار کر رہا تھا۔

ہوگومونت پر حملہ ایک قسم کا دھوکا تھا؛منصوبہ یہ تھا کہ ویلنگٹن کو وہاں سے ہٹایا جائے اور بائیں جانب جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا اگر انگریزی فوجوں اور بلجیم کے بہادر Perponcher ڈویژن نے اپنی جگہ کو مستحکم طور پر قبضے میں نہ رکھا ہوتا، اور ویلنگٹن اپنی فوجیں وہاں جمع کرنے کے بجائے، اُدھر کمک کے طور پر گارڈ کی صرف چار کمپنیوں اور برنسوک کی بٹالین کو بھیجنے پر خود کو محدود رکھتا۔

Papelotte پر فرانسیسی میمنہ کا حملہ سوچا سمجھا تھا۔دراصل، اس کا مقصد انگریزی فوج کے میسرہ کو دھکیلنا، برسلز جانے والی سڑک کو کاٹنا، پروشیائیوں کی ممکنہ آمد کو روکنا، Mont-Saint-Jean پر دباؤ ڈالنا، ویلنگٹن کو ہوگومونت، اس کے بعد Braine-l'Alleud، اس کے بعد Hal کی طرف واپس کرنا تھا؛ ان میں سے کوئی بھی کام آسان نہیں تھا۔چند ناگہانیوں کے علاوہ یہ حملہ کامیاب ہوا، Papelotte پر قبضہ ہو گیا اور La Haie-Sainte بھی لے لیا گیا۔

اس جگہ ایک تفصیل قابلِ غور ہے۔ انگریزوں کی پیدل فوج، بالخصوص کیمپٹ (Kempt') کے بریگیڈ میں، بہت سے ناتجربے کار رنگروٹ تھے۔مضبوط پیدل فوج کی موجودگی میں یہ رنگروٹ شیر ہو گئے؛ ان کی ناتجربے کاری نے خفیہ طور پر ان کے تذبذب کو دور کر دیا تھا؛ وہ چھیڑ چھاڑ کرنے کا کام بہت عمدگی سے کر رہے تھے۔چھیڑ چھاڑ کرنے والا سپاہی اکیلا چھوڑ دیا جائے تو خود اپنا جرنیل بن جاتا ہے۔ان رنگروٹوں نے فرانسیسیوں کی کچھ ہنرمندی اور جذبے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔یہ نوآموز پیدل فوج جیسے لوگ بہادری سے ٹکرا جاتے تھے۔ویلنگٹن اس بات سے ناخوش تھا۔

La Haie-Sainte پر قبضے کے بعد جنگ کچھ ڈگمگا گئی تھی۔

آج کے دن ایک مبہم سا وقفہ ہے، دوپہر سے چار بجے شام تک؛ اس جنگ کا درمیانہ حصہ تقریباً غیر واضح ہے جس میں دست بدست لڑائی کی غمناکی شامل ہو رہی ہے۔شام کا دھندلکا حاوی ہو گیا ہے۔ہم تصور کر سکتے ہیں: اس کہر میں، چکرا دینے والا سراب، جنگ کے وہ ساز وسامان جن کا آج علم نہیں، آویزاں colback، لہراتے sabre-tache [منقش تھیلے]، صلیبی

بیٹیاں، سپاہیوں کے لیے کارتوس کے بکس، ہنگری کے گھڑسواروں کے پٹے، ہزاروں شکن زدہ سرخ بوٹ، گھنی کڑھائی کی مخروطی ٹوپیاں، برنسوک کے تقریباً بالکل سیاہ لباس میں ملبوس پیدل فوجی، انگلستان کے سُرخ لباس پیدل فوجیوں میں گھلے ملے، انگریزی سپاہیوں کے کاندھوں کی ڈھلانوں پر سفید رنگ کے گول چھتے، چرمی پیٹھوی خود والے ہینوور کے گھڑسوار، پیتل کے ہاتھ اور سرخ horse-tails، برہنہ گھٹنوں اور چوخانے والی چادروں کے لہنگوں والے اسکاٹش سپاہی، سیاہ ساق پوش دستی گولا پھینکنے والے سپاہی؛ تصویریں، حکمتِ عملی کے خطوط کی نہیں — Salvator Rosa [سترہویں صدی کا باروق مصور] کی طلب نہیں، بس وہی جو Gribeauval [فرانسیسی توپ خانے کا جرنیل جس نے توپوں کو بہتر بنایا تھا] کی ضرورت کے لیے مناسب ہو۔

لڑائی میں ہمیشہ ایک قسم کی طوفانی کیفیت بھی شامل ہوتی ہے۔ [لاطینی مقولہ ہے کہ] جو شے مبہم ہو، وہی ربانی ہوتی ہے۔ ہر تاریخ داں کسی حد تک اسی شے کی تلاش میں ہوتا ہے جو اس کی بے ترتیبی میں اس کو خوش کرتی ہو۔ جرنیلوں کے اتحادات کچھ بھی ہوں، مسلح لوگوں کے صدمے کی سطح بے انداز ہوتی ہے۔ لڑائی کے درمیان دو رہنماؤں کے منصوبے ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہیں اور خود ہی بے شکل بھی ہو جاتے ہیں۔ لڑائی کا میدان اسی طرح ضرورت سے زیادہ جنگجوؤں کو کھا جاتا ہے جیسے اسفنجی قسم کی زمینیں تیزی سے اس پانی کو جذب کر لیتی ہیں جو ان پر انڈیلا جاتا ہے۔ کبھی اپنی مرضی کے خلاف زیادہ سپاہی فراہم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے: جیسے اخراجات کا ایک غیر متوقع سلسلہ۔ جنگ کا خط دھاگے کی طرح لہریں لیتا ہے: خون کی دھاریاں غیر منطقی طور پر پھوٹ نکلتی ہیں؛ فوجوں کے محاذ بدلتے رہتے ہیں؛ رجمنٹ پیش قدمی کرتی ہیں یا پسپا ہوتی ہیں تو میدانِ جنگ میں راس اور خلیج جیسے علاقے بنائی جاتی ہیں، سارے ڈھلوان پشتے ایک دوسرے کے مقابل بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں بھی پیدل فوج کھڑی تھی وہاں توپ خانہ آجاتا ہے؛ جہاں توپ خانہ تھا وہاں گھڑسوار آجاتے ہیں؛ بٹالین دھوئیں کی مانند ہوتی ہیں۔ ابھی وہاں کوئی شے تھی، اس کو تلاش کرنے جایئے، وہ غائب ہو چکی ہے۔ کھلے علاقے جگہ بدلتے رہتے ہیں؛ دھندلی پرتیں آگے پیچھے ہوتی رہتی ہیں؛ قبرستان جیسی ہوا آگے دھکیلتی ہے، پیچھے پھینکتی ہے، جھلاتی ہے، اور ان الم ناک کثرتوں کو بکھیرتی رہتی ہے۔ ذرا اور دھکم کیا ہوتی ہے؟ آگے پیچھے جاتا جھولا ہوتا ہے؟ کسی ریاضیاتی منصوبے کی بے حرکتی ایک ایک منٹ کا اظہار کرتی ہے، دن کا نہیں۔ کسی لڑائی کی صورت گری کرنے کے لیے ایسے مصوروں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے برش میں ابتری اور بے ترتیبی بھری ہو۔ [باروق مصور] Vandermeulen سے بہتر ریمبراں

ہے۔Vandermeulen بارہ بجے دوپہر تو ٹھیک ہوتا اور تین بجے جھوٹ بولتا ہے۔ جیومیٹری گمراہ کن ہوتی ہے۔صرف آندھی ہے جو بھروسے کے قابل ہوتی ہے۔وہی ہے جو سترہویں صدی کا فوجی اور ادیب] Folard کو [قبل مسیح کے تاریخ دان]Polybius پر تنقید کرنے کا حق دیتی ہے۔ مجھے اس میں اتنا اضافہ کرنے دیجیے کہ ایک خاص وقت ہوتا ہے جب جنگ زوال پذیر ہوکر دست بدست لڑائی میں بدل جاتی ہے، ماہرانہ ہو جاتی ہے اور بکھر کر بے شمار تفصیلات کی کرتب بازی ہو جاتی ہے، جسے اگر نپولین کے الفاظ میں کہا جائے۔ ”جنگ بجائے فوجی کی تاریخ کے رجمنٹ کی آپ بیتی بن جاتی ہے۔“ ایسی صورت میں بظاہر تاریخ دان کو حق ہوتا ہے کہ وہ کُل کو خلاصے میں بدل دے۔وہ جدوجہد کے اصل خاکے کو گرفت میں لے لینے سے زیادہ نہیں کرسکتا، اور یہ سب کسی ایک بیان کرنے والے کو نہیں دیا جا سکتا، وہ کتنا ہی با اصول کیوں نہ ہو، کہ وہ مکمل طور پر اس خوف ناک دھند کو ٹھیک کردے جس کو لڑائی کہا جاتا ہے۔

اس کا، جو تمام مسلح مقابلوں میں ہوتا ہے، خاص کر واٹرلو پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

پھر بھی، دوپہر کے ایک خاص لمحے میں، لڑائی ایک نقطے پر پہنچ گئی تھی۔

چار بجے شام

چار بجے کے قریب انگریزی فوج کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ پرنس آف آرنج مرکز کا، ہل میمنہ کا، پکٹن میسرہ کا کمان دار تھا۔ بے خوف و پریشان پرنس آف آرنج نے چلا کر ہالینڈ اور بلجیم والوں سے کہا: ''ناساؤ (Nassau)! برنسوک! خبردار کبھی پسپا نہ ہونا!'' ہل کم زور ہو جانے کے بعد ولنگٹن کی مدد کو آ گیا تھا؛ پکٹن مارا گیا تھا۔ عین اس وقت انگریزوں نے فرانسیسیوں سے 105 کا پرچم چھینا تھا؛ فرانسیسیوں نے انگریز جنرل پکٹن کو سر میں گولی مار کر ختم کر دیا تھا۔ ولنگٹن کے نزدیک لڑائی کی دو بنیادیں تھیں، ہوگومونت اور La Haie-Sainte۔ ہوگومونت اب بھی دشمن کے پاس تھا، مگر اس میں آگ لگی ہوئی تھی؛ La Haie-Sainte فتح کر لیا گیا تھا۔ اس کا دفاع کرنے والی جرمن بٹالین کے صرف بیالیس نفر بچے تھے؛ تمام افسران، سوائے پانچ کے یا تو قتل کر دیے گئے تھے یا گرفتار کر لیے گئے تھے۔ غلے کے گودام میں تین ہزار جنگجو مارے گئے تھے۔ انگلش گارڈ کا ایک سربرآوردہ باکسر، جو ناقابلِ شکست مشہور تھا، فرانسیسی ڈرم بجانے والے لڑکے کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بارنگ کو نکال دیا گیا تھا، آلٹن تلوار کا شکار بنا۔ بہت سے پرچم کھوئے گئے تھے، ایک آلٹن کے ڈویژن سے، اور ایک لونس برگ کی بٹالین سے، جس کی کمان Deux-Ponts کے خاندان کا ایک شہزادہ کر رہا تھا۔ Scotch Grays کا وجود نہیں رہ گیا تھا؛ پانسانبی (Ponsonby) کے عظیم شہ سوار ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔ بہادر گھڑ سوار رسالہ Bro کی برچھیوں تلے اور زرہ پوش سواروں تلے ختم ہو گیا تھا۔ بارہ سو گھوڑوں میں سے چھ سو بچے تھے؛ تین لفٹنٹ کرنلوں میں سے دو زمین پر لیٹے تھے، ہملٹن زخمی تھا اور میٹر (Mater) قتل ہو گیا تھا۔ پانسانبی سات برچھیوں سے چھلنی ہوا تھا۔ گارڈن مر گیا تھا۔ مارش مر گیا تھا۔ دو

ڈویژن ـــ، پانچواں اور چھٹا ـــ دونوں صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے تھے۔

ہوگومونٹ زخم خوردہ، La Haie-Sainte مفتوح ـــ اب ایک ہی نقطہ رہ گیا تھا ـــ یعنی مرکز۔ مرکز پر قبضہ اب بھی مستحکم تھا۔ ویلنگٹن نے اسے مزید مضبوط کر دیا۔ ہل کو طلب کر لیا جو Merle-Braine میں تھا؛ شاسے (Chasse) کو طلب کیا جو Alleud Braine' میں تھا۔

انگریزی فوج کا، کمان کی شکل کا مرکز، بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ مرکز Mont Saint کی سطح مرتفع پر بنایا گیا تھا، جس کے عقب میں ایک گاؤں تھا، Mont Saint Jean اور سامنے اس وقت برداشت کے قابل ڈھلان تھی۔ یہ پتھر سے بنے مکان میں تھا جو Nivelles کے علاقے میں آتا تھا، جہاں ستھویں صدی کا ایک چوراہا تھا۔ عمارت اتنی ٹھوس تھی کہ توپ کے گولے نقصان پہنچائے بغیر اس پر ٹکتے اور گر جاتے تھے۔ سطح مرتفع پر ہر طرف، یہاں وہاں، باڑھیں کاٹ دی گئی تھیں؛ جھاڑیوں میں جھروکے بنا دیے گئے تھے؛ درختوں کی شاخوں کے درمیان توپ کے دہانے ٹھونس دیے گئے تھے؛ اور جھاڑیوں میں مورچہ بندی کر دی گئی تھی۔ توپ خانے کو اونچی اونچی جھاڑیوں میں چھپا دیا گیا تھا۔

فونیشیائی مزدوروں نے، جنھیں جنگ کے دوران کام کرنے کی اجازت تھی، اتنا اچھا کام کیا تھا کہ Haxo جس کو شہنشاہ نے صبح نو بجے غنیم کی توپوں پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا، اسے کچھ نہیں ملا اور وہ نپولین کے پاس واپس پہنچا اور اس کو مطلع کیا کہ سوائے دو کچے پشتوں کے Nivelles اور Genappe جانے والی سڑکوں پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس وقت اونچے پودوں والی گندم کی فصل کا موسم تھا، اور سطحِ مرتفع کے کنارے کیمپٹ کے بریگیڈ کی ایک بٹالین، چھوٹی بندوقوں سے لیس گندم کے لمبے پودوں میں چھپی ہوئی تھی۔

اس طرح مطمئن اور پشت بند اینگلو ڈچ فوج نے اچھی طرح چوکیاں بنائی تھیں۔ اس جگہ خطرہ Soigne کے جنگل سے ہو سکتا تھا، اس کے بعد اس جگہ سے متصل لڑائی کا میدان تھا اور Groenendael اور Boitsfort کے تالاب تھے۔ وہاں کوئی فوج بکھرے بغیر پسپا نہیں ہو سکتی تھی؛ وہاں رجمنٹ فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتیں۔ وہاں کے دلدلوں میں توپ خانے غائب ہو جاتے۔ بہت سے فن کاروں کے مطابق، اگرچہ اس پر اختلاف کیا گیا ہے، پسپائی صرف ایک بدنظم اُڑان ہوتی ہے۔

ویلنگٹن نے اس مرکز میں میمنہ کے شاسے کے بریگیڈوں میں سے ایک بریگیڈ، اور میسرہ میں سے ونکے کے بریگیڈوں میں سے ایک بریگیڈ اور کلنٹن کے ڈویژن کو شامل کر لیا تھا۔ اپنی انگریزی فوجوں کو، ہالکیٹ کی رجمنٹ کو مچل کے بریگیڈوں کو، میٹ لینڈ کے گارڈز کو اس

نے کمک اور امداد کے طور پر برنسوک کی پیدل فوج، ناساؤ کا دستہ، کیل مان سیگ۔ کے بینو ور والے، اور اومپیڈا کے جرمن فوجی دے دیے تھے۔اس طرح اس کی اپنی کمان میں چھبیس بٹالین آگئی تھیں۔شاراس کہتا ہے کہ میمنہ مرکز میں ڈال دیا گیا تھا۔جس جگہ آج کل واٹرلو کا عجائب خانہ ہے وہاں بوروں میں بھری مٹی سے بنے پشتوں کے پیچھے توپ خانہ چھپایا گیا تھا۔اس کے علاوہ ویلنگٹن نے میدان کے ایک ٹیلے کے پیچھے سمرسٹ کے چودہ سوگھوڑوں پر مشتمل ڈراگون گارڈوں کا دستہ متعین کر رکھا تھا۔ یہ تھا، حقیقی معنوں میں نام ور بقیہ انگریزی گھڑسواروں کا نصف۔ پونسا نبی تباہ؛ سمرسیٹ باقی۔

توپ خانہ— جو اگر مکمل کرلیا گیا ہوتا تو تقریباً قلعے کے برابر ہو جاتا— باغیچے کی ایک نیچی دیوار کے پیچھے صف بستہ تھا جس کے تحفظ کے لیے ریت سے بھری بوریاں اور مٹی سے بنی بڑی سی ڈھلان تھی۔کام ختم نہیں ہوا تھا؛ نوک دار لٹھوں سے بنا باڑہ بنانے کے لیے وقت نہیں تھا۔

ویلنگٹن گھوڑے پر سوار تھا۔اس کا چہرہ پُرسکون اور جذبات سے عاری تھا، اور پورے دن اسی کیفیت میں رہا تھا، Mont-Saint-Jean کی پرانی مل سے ذرا آگے تھا، جو اَب بھی موجود ہے، ایک جنگلی درخت کے نیچے جسے ایک پُر جوش انگریز خانہ بدوش نے بعد میں دو سو فرانک میں خرید لیا، کٹوایا، اور اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ویلنگٹن سرد مہر ہیرو تھا۔گولیاں اس کے اطراف برستی تھیں۔اس کا مددگار، گارڈن، اس کے قریب ہی گر گیا تھا۔لارڈ ہل نے ایک گولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو پھٹ چکا تھا، اس سے کہا تھا،"مائی لارڈ، اگر آپ مارے گئے تو میرے لیے کیا حکم ہوگا؟" اس کا جواب تھا، "وہی کرنا جو میں کر رہا ہوں۔" کلنٹن سے اس نے مختصراً کہا تھا،"آخری آدمی تک اس جگہ پر قابض رہنا۔" دن بظاہر بُرا ہوتا جا رہا تھا۔ویلنگٹن نے Talavera کے، Vittoria کے، Salamanca کے پرانے ساتھیوں سے چلّا کر کہا تھا، "لڑکو، کیا پسپائی کے بارے میں سوچا بھی جا سکتا ہے؟ قدیم انگلستان کے بارے میں سوچو!"

چار بجے کے قریب انگریزی صفیں واپس ہو گئیں۔اچانک سطح مرتفع کی چوٹی پر سوائے توپ خانے اور نشانہ بازوں کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا؛ بقیہ سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔توپ کے گولوں اور فرانسیسی گولیوں کے باعث نکلنے والی رجمنٹ پیچھے کی طرف پسپا ہوگئیں، جہاں اب Mont-Saint-Jean کے فارم کی عقبی گلیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں؛ ایک معکوس حرکت ہوئی۔انگریزی محاذ نے خود کو چھپا لیا، ویلنگٹن واپس ہو گیا۔

"پسپائی کی ابتدا!" نپولین نے چیخ کر کہا تھا۔

۞

نپولین کیفیتِ مزاح میں

شہنشاہ اگرچہ بیمار اور ایک مقامی مشکل کے باعث تکلیف میں تھا، اس دن سے پہلے کبھی اس قسم کی مزاحی کیفیت میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ صبح سے مسلسل مسکرا رہا تھا۔ جون کی اٹھارہ تاریخ کو خاموش سنگِ مرمر کی نقاب میں چھپا وہ چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ شخص جو Austerlitz میں غم زدہ تھا، واٹرلو میں شاداں تھا۔ قسمت کی پسندیدہ ترین شے بھی غلطی کر جایا کرتی ہے۔ ہماری خوشیاں سایے سے ترتیب پاتی ہیں۔ اعلیٰ ترین تبسم خدا خود ہے۔

''سیزر ہنسا اور پامپی رویا'' Fulminatrix Legion والوں نے کہا تھا۔ [اس مقام پر یہ اشارہ ہے اس جنگ کی طرف جس میں سیزر اور اس کی فوجوں نے، جس میں Fulminatrix Legion بھی شامل تھے، ق۔م 48 کی لڑائی میں پامپی کو شکست دے دی تھی۔ یہاں سیزر سے مراد نپولین تھا حالاں کہ واٹرلو کی لڑائی میں نپولین کو شکست ہوئی تھی] اس موقعے پر Pompeius کا مقسوم گریہ نہیں تھا، اور یہ طے ہے کہ سیزر ہنسا تھا۔ پچھلی رات، طوفان باد و باراں میں گھوڑے پر سوار، جستجو کرتا، برٹرینڈ (Bertrand) کی معیت میں، روسوم (Rossomme کے اطراف کی کیموں میں، Frischemont سے Braine-l'Alleud تک کے پورے افق پر انگریز فوجوں کے جلتے الاؤ دیکھ کر مطمئن [نپولین کو] اسے محسوس ہوا تھا کہ قسمت، جس کے لیے اس نے واٹرلو کے میدان میں ایک دن مختص کیا تھا، بالکل وقت پر آ رہی تھی؛ اس نے اپنا گھوڑا روکا اور چند لمحے ساکت، بجلی کی چمک گرج سنتا رہا؛ اور اس قائلِ تقدیر کو اندھیرے میں یہ پُر اسرار جملہ کہتے سنا گیا تھا، ''ہم متفق ہیں۔''

نپولین غلطی پر تھا۔ وہ لوگ اب متفق نہیں تھے۔

وہ ایک لمحے کے لیے بھی سویا نہیں تھا؛ رات کا ہر لمحہ اس کے لیے مسرت بھرا تھا۔ اس نے خاص خاص چوکیاں پار کیں، یہاں وہاں، چوکی داروں سے بات کرنے کے لیے رُکا۔ ڈھائی بجے ہوگومونت کے جنگل کے قریب، اسے فوجیوں کی گاڑیوں کے مارچ کی آوازیں سنائی دیں؛ اس وقت وہ سمجھا تھا کہ ویلنگٹن پسپا ہو رہا ہے۔ اس نے کہا تھا، ''یہ انگریزی فوج کا پچھلا محافظ دستہ ہے جو کسی اور جگہ کیمپ بنانے کے لیے جا رہا ہے۔ میں ان چھ ہزار انگریزوں کو قیدی بناؤں گا جو ابھی آسٹنڈ پہنچے ہیں۔'' وہ بڑائی کے انداز میں باتیں کر رہا تھا؛ اس نے ویسی ہی حرکات کیں جیسی پہلے مارچ کی ابتدا میں کی تھی جب اس نے خلیج ہوان کے پُرجوش دہقان کمانڈ مارشل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا تھا، ''اچھا، برٹرینڈ، یہ رہی کمک۔'' جون کی سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی رات میں اس نے ویلنگٹن کا محاصرہ کرلیا تھا۔ ''اس انگریز بچے کو سبق سکھانا ہے'' نپولین نے کہا تھا۔ جب شہنشاہ بول رہا تھا بارش کی شدت دُگنی ہوگئی تھی، گرج چمک مسلسل ہو رہی تھی۔

صبح ساڑھے تین بجے اس کا ایک سراب غائب ہوگیا؛ غنیم کی جاسوسی پر متعین افسروں نے اس کو اطلاع دی کہ دشمن کسی قسم کی حرکت نہیں کر رہا ہے؛ کسی قسم کی پُرجوشی نظر نہیں آتی؛ پڑاؤ کا ایک بھی الاؤ ٹھنڈا نہیں کیا گیا ہے؛ انگریزی فوج محوِ خواب ہے۔ زمین کی خاموشی گہری تھی؛ آواز صرف آسمانوں سے آ رہی تھی۔ چار بجے کے قریب اسکاؤٹ ایک دہقان کو اس کے پاس پکڑ لائے تھے؛ اس دہقان نے انگریزی گھڑسوار رسالے، غالباً ویوین (Vivian) کے بریگیڈ کی رہنمائی کی تھی، جو بائیں جانب، Ohain نامی گاؤں کے قریب صف بندی کے لیے جا رہا تھا۔ پانچ بجے صبح بلجیم فوج کے دو بھگوڑوں نے اس کو خبر دی کہ وہ ابھی اپنی رجمنٹ چھوڑ کر آئے ہیں، اور یہ بھی کہ انگریز فوج لڑائی کے لیے بالکل تیار ہے۔ ''یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔'' نپولین نے اونچی آواز میں کہا ''میں واپس بھگانے کے بجائے ان کو شکست دینا پسند کروں گا۔''

صبح کے وقت وہ ڈھلان کی کیچڑ میں اترا جو Plancenoit نامی سڑک سے مل کر ایک زاویہ بناتی ہے؛ باورچی خانے سے ایک میز اور ایک دیہاتی کرسی طلب کی جو Rossomme کے فارم سے منگوائی گئی تھی اور اس پر پیال بچھا کر تشریف فرما ہوا؛ میز پر میدانِ جنگ کا نقشہ پھیلایا، اور سول (Soult) سے وہی کہا جو وہ خود بھی کہنے ہی والا تھا، ''کیا خوب صورت بساط بچھی ہے!''

رات میں ہونے والی بارش کے نتیجے میں، سڑکوں کی بدحالی کے باعث، صبح تک

ضروریات زندگی پہنچ نہیں سکتی تھیں؛ سپاہیوں کو آرام کو موقع نہیں ملا تھا؛ وہ بھیگے ہوئے اور فاقے سے تھے۔ اس کے باوجود اس کی خوش دلی میں فرق نہیں آیا تھا اور Ney سے بولا، "سو میں سے نوے امکانات ہمارے حق میں ہیں۔" آٹھ بجے شہنشاہ کو ناشتا پیش کیا گیا۔ اس نے کئی جرنیلوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ ناشتے کے دوران بتایا گیا کہ گزشتہ رات قبل ولنگٹن برسلز میں ڈچس آف رچمنڈ کے ہاں رقص کے لیے گیا تھا؛ سول جو ایک بڑا جنگجو شخص ہے، کسی آرچ بشپ کی طرح صورت بنا کر بولا، "رقص تو آج ہونے والا ہے۔" شہنشاہ نے Ney سے دل لگی کی، اور کہا "ولنگٹن اتنا بیوقوف نہیں کہ وہ آپ کا انتظار کرے گا۔" خیر یہ تو اس کا طریقہ تھا۔ "وہ مزاج کا رسیا تھا۔" Fleury de Chaboulon نے کہا: "خوش گوار مزاج اس کے کردار کی بنیاد میں ہے۔" گورگا (Gourgaud) نے کہا "وہ اپنی خوش باشی میں مست رہتا ہے جو مزاج سے بڑھ کر ہوتی ہے۔" بنیامین کونستاں (Benjamin Constant) نے لقمہ دیا۔ ایک دیو پیکر انسان پر اس قسم کی تفریحات زیب دیتی ہیں۔ وہ اپنے سپاہیوں کو "اپنے شاکی" کہتا تھا؛ ان کے کان پکڑتا تھا، ان کی مونچھیں کھینچتا تھا۔ "شہنشاہ نے ہم سے خوش مستی کے سوا کچھ نہیں کیا۔" یہ ان لوگوں میں سے ایک کا کہنا تھا۔ جزیرۂ ایلبا سے فرانس تک کے خفیہ سفر کے دوران، فروری کی ستائیس تاریخ کو، کھلے سمندر میں فرانس کے دو مستولی جنگی جہاز Le Zephyr کا سامنا دو مستولی جنگی جہاز L'Inconstant سے ہوا جس پر نپولین چھپا تھا، اور L'Inconstant سے نپولین کے بارے میں استفسار پر، خود شہنشاہ نے جو اس وقت بھی سدا بہار کے پھولوں کی کلغی والی ہیٹ پہنے ہوئے تھا، جو اس نے جزیرۂ ایلبا سے اختیار کی تھی، ہنستے ہوئے بھونپو چھینا اور خود ہی جواب دیا، "شہنشاہ خیریت سے ہے۔" ایک آدمی جو اس طرح ہنس رہا ہو حالات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ واٹرلو کے ناشتے کے دوران بھی نپولین پر اس قسم کے قہقہے کے دورے پڑے تھے۔ ناشتے کے بعد پندرہ منٹ مراقبہ کیا؛ پھر دو جرنیل بھی اس کے ساتھ پیال پر بیٹھ گئے، قلم ہاتھ میں، کاغذ گھٹنوں پر، اور شہنشاہ نے انھیں لڑائی کے بارے میں احکامات لکھوا دیے۔

نو بجے صبح نو کالموں میں جب فرانسیسی فوج کی ترتیب اور حرکت شروع ہو گئی تھی—
ڈویژن دو صفوں میں، دو بریگیڈوں کے درمیان توپ خانہ، سامنے موسیقی اور نقاروں کی دھما دھم، دنگل کا اُبلتا ہوا طوفان، طاقت ور، وسیع، پُر مسرت، افق پر فوجی خود، تیغوں اور سنگینوں کا بڑھتا ہوا سمندر—شہنشاہ اتنا متاثر ہوا کہ دو بار اس نے چیخ کر کہا تھا، "عظیم الشان! عظیم الشان!"

نو اور ساڑھے دس بجے کے درمیان شہنشاہ کے مطابق "چھ S V کی صورت" میں

مرتب ہو کر پوری فوج نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لی تھیں۔لڑائی کے لیے پوری تیاری کے چند لمحوں بعد، گہری خاموشی میں جو کسی طوفان کی آمد سے پہلے اورلڑائی کی شروعات سے پہلے طاری ہو جایا کرتی ہے، شہنشاہ نے Haxo کے کاندھے پر ہلکی سے ضرب دے کر، جب وہ بارہ پاؤنڈ گولوں کی توپوں کو دیکھ رہا تھا، Reille،Erlon اور Lobau کی علاحدگی کا حکم دیا تھا، جنھیں Mont-Saint-Jean کی جانب سے، جو Nivelles اور Genappe کی سڑکوں کے چوراہے پر واقع تھا، حملے کی ابتدا کرنی تھی، اس نے کہا تھا،''دیکھا تم نے، جنرل، ادھر چوبیس عدد خوب صورت خواتین بھی ہیں۔''

معاملے سے پوری طرح مطمئن، اس نے اپنے سامنے سے گزرنے والوں کی مسکرا کر ہمت بڑھائی، اور پہلی کور کے سپاہیوں کی کمپنی کو حکم دیا کہ جوں ہی گاؤں ہتھیار ڈالے Mont-Saint-Jean کا محاصرہ کر لیا جائے۔سکون کی اس ساری کیفیت میں ہم دردی کا صرف ایک جملہ نکلا تھا، جب اس نے بائیں جانب، لاجواب گھوڑوں والے Scotch Grays کے ایک بڑے سے مزار کو دیکھ کر کہا تھا،''مجھے بہت افسوس ہے۔''

پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، Rossomme سے پرے تک گیا، اور اس نے Genappe سے برسلز جانے والی سڑک کی دائیں جانب، اپنے معائنے کی چوکی کے لیے ایک سرسبز قطعۂ زمین منتخب کیا، جو لڑائی کے دوران اس کا دوسرا مقامِ قیام تھا۔تیسرا مقام، جو پچھلے دن سات بجے شام، La Belle-Alliance اور La Haie-Sainte کے درمیان قائم کیا گیا تھا زبردست بلند ٹیلہ تھا، جو آج بھی موجود ہے، جس کے عقب میں میدان کی ڈھلان پر گارڈ جمع تھے۔اس ٹیلے کے اطراف سڑک سے ٹکرا کر اچھلتے گولے خود نپولین تک پہنچ رہے تھے۔اسی طرح جیسے Brienne کے مقام پر اس کے سر سے گزرتی ہوئی گولیوں اور بڑی توپوں کے گولوں کی تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔جس جگہ اس کے گھوڑے کا پاؤں تھا اسی جگہ، کھردری سطح پر، ڈھلائی والے گولے اور پرانی زنگ آلودہ تلواریں پائی گئی تھیں۔چند برس قبل ساٹھ پاؤنڈ وزنی ایک گولا بھی ملا تھا جس میں بارود موجود تھا اور اس کا فیوز ٹوٹ گیا تھا۔اپنی پچھلی چوکی پر شہنشاہ نے دشمن اور خوف زدہ دیہقان راستہ دکھانے والے لاکوسٹے (Lacoste) سے کہا تھا، جو ایک انگریز سپاہی کے ساتھ تھا، اور ہر گولے کے بعد نپولین کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا تھا،''احمق، کتنی شرمناک بات ہوگی کہ تم پشت پر لگنے والے گولے سے ہلاک ہوگے۔''ان سطور کے لکھنے والے کو خود بھی اس ٹیلے کی نرم بھربھری مٹی ہٹاتے وقت بم کا اوپری حصہ ملا تھا جو چھیالیس برس کی زنگ

آلودگی سے بکھر گیا تھا، اور لوہے کے ایسے ٹکڑے بھی ملے تھے جو مرجھائے ہوئے اکھوے کی طرح انگلی لگاتے ہی ٹوٹ جاتے تھے۔

سب جانتے ہیں کہ میدان کے مختلف انداز کے لہر جیسے نشیب و فراز، جہاں نپولین اور ویلنگٹن کے درمیان مقابلہ ہوا تھا، 18 جون 1815ء جیسے نہیں رہے ہیں۔ جب اس لڑائی کی یادگار بنانے کے لیے اس الم ناک میدان سے وسائل لے جائے گئے، تو دراصل اس کا حقیقی سکون چھین لیا گیا تھا، اور اب منقطع کی ہوئی تاریخ کے اپنے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس کی شان بڑھانے کے لیے اس کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ دو برس بعد جب ویلنگٹن نے واٹرلو کے میدان کو دیکھا تو کہا تھا، "لوگوں نے میرے میدانِ جنگ کو تبدیل کر دیا ہے۔" اس جگہ آج جہاں مٹی کا بڑا سا مخروطی تودہ ہے جس پر ایک شیر رکھا ہوا ہے، وہاں ایک پہاڑی تھی، Nivelles جانے والی سڑک کی جانب جس کی ڈھلان تھی، مگر جو Genappe جانے والی شاہراہ کی طرف تقریباً ایک کھائی کی طرح تھی۔ اس کھائی کی بلندی آج بھی دو قبروں کے دو ٹیلوں سے ناپی جا سکتی ہے جو Genappe سے برسلز جانے والی سڑک کو گھیرے ہوئے ہیں: بائیں جانب والا ایک انگریزی مزار ہے؛ دوسرا دائیں جانب والا جرمن ہے۔ وہاں کوئی فرانسیسی مزار نہیں ہے، کہ پورا میدان ہی فرانس کا مزار ہے۔ ہزاروں ہزار گاڑیوں بھر مٹی سے بنائی گئی پہاڑی ایک سو پچاس فٹ بلند ہے جس کا دائرہ نصف میل ہے؛ جس کے ذریعے Mont-Saint-Jean تک آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ لڑائی کے دن، بالخصوص La Haie-Sainte کی جانب سے اس پر پہنچنا مشکل تھا۔ اس جگہ ڈھلان اتنی عمودی ہے کہ فارم سے انگریزی توپ دیکھی نہیں جا سکتی تھی، جو اس وادی کے بالکل نیچے ہے جو لڑائی کا مرکز تھی۔ 18 جون 1815ء کی بارش نے چڑھائی کو مزید مشکل کر دیا تھا، اس لیے کہ کیچڑ نے چڑھائی کے عمل کو پیچیدہ کر دیا تھا؛ نہ صرف یہ کہ لوگ پیچھے کی جانب پھسل رہے تھے، دلدل میں پھنستے بھی جا رہے تھے۔ سطحِ مرتفع کی چوٹی کے اطراف ایک قسم کی خندق بنی تھی جس کی موجودگی میں فاصلے سے دیکھنے والا حقیقت تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔

یہ خندق کیا شے تھی؟ اس کی تشریح یہ ہے۔ Braine-l'Alleud بلجیم کا ایک گاؤں ہے؛ دوسرا گاؤں Ohain ہے۔ یہ دونوں جو پیش منظر کی گولائی میں چھپ گئے ہیں، ڈیڑھ لیگ لمبی سڑک کے ذریعے، جو میدان کی اونچی سطح سے گزرتی ہے، کبھی نالی کی صورت پہاڑی میں گم ہو جاتی ہے، جو اس سڑک کو کہیں کہیں پہاڑی نالہ بنا دیتی ہے۔ 1815ء میں بھی آج ہی کی طرح، یہ سڑک Genappe اور Nivelles سے آنے والی شاہراہوں کے درمیان

Mont-Saint-Jean کی سطح مرتفع کی چوٹی کو کاٹتی ہے۔ اب یہ صرف میدان کی سطح کے برابر ہے؛ اُس وقت یہ سوراخ جیسا راستہ تھی۔ اس کی دونوں ڈھلانیں یادگاری پہاڑی کے کام آ گئی ہیں۔ یہ سڑک پہلے بھی خندق تھی اور آج بھی خندق ہی ہے؛ ایک کھوکھلی خندق، کہیں بارہ فٹ گہری، جس کے کنارے، بہت عمودی ہونے کے باعث یہاں وہاں سے جھڑتے رہتے ہیں، بالخصوص سردی کے موسم میں، جب تیز بارش ہو رہی ہو۔ اس جگہ پر حادثے ہوئے ہیں۔ Braine-l'Alleud کی جانب سڑک اتنی تنگ تھی کہ ایک مسافر گاڑی کے نیچے آ گیا تھا، جس کا ثبوت قریبی قبرستان کی ایک لوحِ مزار ہے، جس پر مرنے والے کا نام موسیو Bernard Debrye، برسلز کا تاجر، اور تاریخِ وفات فروری 1637ء کندہ ہے۔ Mont-Saint-Jean کی جانب خندق یہ اتنی گہری تھی کہ 1783ء میں وہاں Mathieu Nicaise نامی ایک دہقان اوپر سے آنے والے تودے کے نیچے دفن ہو گیا تھا، جیسا کہ ایک اور سنگی صلیب پر کندہ ہے، جس کا اوپری حصہ زمین کی صفائی کے دوران غائب ہو گیا تھا، مگر جس کا اُلٹا ہوا پایہ La Haie-Sainte اور Mont-Saint-Jean کے فارم کے درمیان گھاس بھری ڈھلان میں پڑا دکھائی دیتا ہے۔

لڑائی کے دن، یہ کھوکھلی سڑک جس کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں تھا، Mont-Saint-Jean کی چوٹی کے کنارے اور کھائی کے اوپر، مٹی میں پوشیدہ ایک لکیر جیسی تھی، یعنی خوف ناک تھی۔

۞

شہنشاہ کا 'لاکوسٹے' سے سوال

لہٰذا واٹرلو کی جنگ کی صبح نپولین مطمئن تھا۔

وہ بالکل صحیح تھا؛ اس کا سوچا ہوا جنگ کا منصوبہ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، واقعی قابلِ تعریف تھا۔

لڑائی شروع ہو گئی۔ اس میں مختلف تبدیلیاں ہوئیں — ہوگومونٹ کی مزاحمت؛ La Haie-Sainte کا استحکام؛ بودواں کا مارا جانا؛ Foy کی معذوری؛ اس غیر متوقع دیوار کا موجود ہونا سوئے(Soye) کا بریگیڈ جس سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا؛ Guilleminot کی مہلک لاپروائی جب کہ اس کے پاس نہ چھوٹا بم تھا نہ پاؤڈر کے بورے؛ توپ خانوں کا دلدل میں دھنسنا؛ انگریزی صفوں میں گرنے والے بموں کا معمولی اثر ہونا اور ان کو بارش سے بھیگی زمین میں دھنس جانا اور صرف کیچڑ کا آتش فشاں جیسا منظر پیدا کرنا اور بارودی ڈبوں کا صرف چھینٹ اڑانا؛ Braine-l'Alleud میں Pire کے مظاہرے کی بے کاری؛ گھڑ سواروں کے تمام پندرہ اسکواڈرن کا تقریباً مٹ جانا؛ انگریز کی دائیں بازو کی ناقص چوکسی؛ بائیں بازو کی ناقص تعمیر؛ پہلی کور کے چار ڈویژنوں کی ترتیب کے بجائے Ney کی جمع ہونے کی غلطی؛ سپاہیوں کی ستائیس نفری گہرائی اور سامنے کی دو سو نفری ترتیب کو گریپ شاٹ کے حوالے کر دینا؛ ان ہجوموں میں توپ کے گولوں کی خوف ناک دراڑیں پڑنا؛ بد انتظامی سے کالموں پر حملہ کرنا؛ بغلی توپ خانے کے قلب کا اچانک واضح ہو جانا؛ بوڑواء Donzelot اور Durutte سے مصالحت کر لینا؛ Quiot کا پسپا ہو جانا؛ پالی ٹیکنک اسکول میں لفٹنٹ Vieux کا ایسے وقت میں زخمی ہو جانا جب وہ La Haie-Sainte انگریز کی مورچہ بندی سے بے تحاشا برسنے والی گولیوں کی باڑھ میں

دروازے کو کلہاڑے سے کاٹ رہا تھا، جس نے Genappe سے برسلز تک کی سڑک میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی؛ Marcognet کے پیدل اور گھڑسوار ڈویژن کا پکڑا جانا، اور Best اور Pack کے انہدام کے درمیان، توپوں کے دہانے کے درمیان، گولیوں سے مارا جانا، پانسانی کا تہہ تیغ کیا جانا؛ اس کی سات عدد توپوں کے دہانوں میں کیل کا داخل ہو جانا؛ Saxe-Weimar کے شہزادے کا Comte d'Erlon کے باوجود Frischemont اور Smohain کو روکنا اور اس کی حفاظت کرنا؛ 105 کے پرچم کا چھین لیا جانا؛ 45 کے پرچم کا پکڑا جانا؛ سیاہ پروشیائی ہُسار کا Wavre اور Plancenoit کے تین سو گھڑ سواروں کے کالم کے درمیان روکا جانا؛ قیدیوں کا پریشان کُن باتیں کہنا؛ Grouchy کا دیر کرنا؛ ایک گھنٹے سے کم عرصے میں ہوگومونٹ کے باغ میوہ میں پندرہ سو آدمیوں کا مارا جانا؛ La Haie-Sainte کے اطراف اس سے بھی کم عرصے میں اٹھارہ سو افراد کا پسپا کر دیا جانا — نپولین کے سامنے سے یہ سارے طوفانی حالات بادل کی طرح گزرتے گئے اور شاہی نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نہ انھوں نے شاہی یقین کو متزلزل کیا۔ نپولین جنگ پر کڑی نگاہ رکھنے کا عادی تھا؛ وہ دل خراش جزئیات کو کبھی یک جا کر کے نہیں دیکھتا تھا؛ اسے جزئیات کی پروا نہیں ہوتی تھی بہ شرطے کہ وہ مکمل فتح فراہم کرنے والی نہ ہوں؛ ابتدائی اقدامات کا ضیاع اسے پریشان نہیں کرتا تھا اس لیے کہ وہ خود کو آخر دم تک مالک سمجھتا تھا؛ اسے انتظار کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ خود کو ہمیشہ صحیح سمجھتا تھا اور مقسوم کو اپنے برابر سمجھتا تھا: شاید وہ مقدر سے کہتا تھا "تیری کیا مجال!"

نصف روشنی اور نصف سایے کا بنا، نپولین خود کو اچھائی میں محفوظ اور برائی میں برداشت کے قابل سمجھتا تھا۔ وہ اپنے فائدے کے واقعات سے، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ، ساز باز سے چشم پوشی کرتا تھا، یا اس کے خیال میں اس میں یہ عادت تھی، جو قدامت کی شکست ناپذیری کے برابر تھی۔

بہرحال جب کسی شخص کی جھولی میں Beresina، لائپزگ اور Fontainebleau ہوں تو، ایسا محسوس ہوتا ہے گویا، وہ واٹرلو پر بھروسا نہیں کرے گا۔ آسمانوں کی گہرائیوں میں ایک پُراسرار تکبر کا تصور ممکن ہو جاتا ہے۔

اس وقت جب ولنگٹن پسپا ہوا، نپولین تھرا سا گیا تھا۔ اسے اچانک Mont-Saint-Jean کا علاقہ خالی ہوتا، اور انگریز کا اگلا دستہ غائب ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ انگریز دستہ جمع ہو رہا تھا مگر خود کو چھپا رہا تھا۔ فرطِ مسرت سے شہنشاہ اپنی رکابوں میں تقریباً کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فتح کے جھماکے ہونے لگے تھے۔

ویلنگٹن کا Soignes کے جنگل میں ایک کونے میں دھکیل دیے جانے اور تباہ ہو جانے کا مطلب تھا فرانس کی انگلستان پر یقینی فتح؛ یعنی Crecy, Poitiers, Malplaquet اور Ramillies کا بدلہ لے لیا گیا تھا۔ Marengo کا فاتح اب Agincourt کی صفائی کر رہا تھا۔

لہٰذا اپنے مقدر کی شدید کروٹ پر مراقبہ کرتے ہوئے، شہنشاہ نے لڑائی کے میدان کے مطلعٔ نظر سے، آخری بار اپنی عینک کا شیشہ صاف کیا تھا۔ اس کے عقب میں کھڑے محافظین نے اسے ایک قسم کے تقدس کی نظر سے دیکھا۔ شہنشاہ نے غور کیا؛ ڈھلانوں کا معائنہ کیا، ہر جھکاؤ کو دیکھا، درختوں کے کنجوں، رائی کے رقبوں کو، راستے کو جانچا؛ وہ ہر جھاڑی کو گن رہا تھا۔ اس نے دو شاہراہوں پر انگریز کی مورچہ بندی کو آرزومندی سے اور غور سے دیکھا— درختوں سے بنائی گئی رکاوٹوں کو دیکھا جو Genappe جانے والی سڑک پر La Haie-Sainte کے اوپر تھیں، جن پر دو توپیں متعین تھیں-- صرف وہی انگریزی توپ خانے سے الگ ہوئی تھیں— جو لڑائی کے میدان کی انتہاؤں تک مار کر سکتی تھیں، اور Nivelles جانے والی سڑک پر بھی، جہاں شاسے کے بریگیڈ کی ولندیزی سنگینیں چمک رہی تھیں۔ اس مورچے کے قریب اسے Saint Nicholas کا، سفید پینٹ کیا ہوا قدیم گرجا گھر نظر پڑا جو Braine-l'Alleud کے چوراہے کے قریب واقع تھا؛ وہ جھکا اور اپنے رہنما لاکوسٹے سے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ رہنما نے سر کے اشارے سے نفی میں جواب دیا، جو غالباً بے وفائی کے مترادف تھا۔

شہنشاہ سیدھا کھڑا ہو کر سوچنے لگا تھا۔

ویلنگٹن پسپا ہو گیا تھا۔

بس اس قدر کام باقی رہ گیا تھا کہ کچل کر اس کی پسپائی کی تکمیل کر دی جائے۔

اچانک، نپولین گھوما، ایک ہرکارے کو پوری رفتار سے پیرس روانہ کیا، یہ اعلان کرنے کے لیے کہ لڑائی جیت لی گئی ہے۔

نپولین ان جوہر قابل لوگوں میں سے تھا جن میں تیز گرجتے ہیں۔

اس کی گرج کی تالی بج گئی تھی۔

اس نے Milhaud کے بکتر پوشوں کو Mont-Saint-Jean پر قبضہ کر لینے کا حکم دے دیا تھا۔

۞

انہونی

تین ہزار پانچ سو نفر تھے۔ ایک چوتھائی لیگ کے برابر محاذ تھا۔ دیو پیکر افراد، جیم شحیم گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے کل چھبیس اسکواڈرن تھے؛ ان کے عقب میں Lefebvre-Desnouettes کا ڈویژن کمک کے لیے موجود تھا — ایک سو چھ، چیدہ سپاہی، گارڈ کے گھڑ سوار، گیارہ سو ستانوے افراد، اور آٹھ سو اسی نیزہ بردار سپاہی۔ ان کے سروں پر خود اور جسموں پر آہنی زرہیں اور چمڑے کی پیٹیوں سے لٹکتے گھوڑے والے پستول اور لمبی تلواریں تھیں۔ اس صبح پوری فوج ان کی تعریف کر رہی تھی، جب نو بجے، گدھے جیسی آواز نکالتے بگل، ڈرم اور تمام موسیقی کے آلے "آؤ ہم اپنی سلطنت کی حفاظت کریں" گاتے سب ایک مضبوط کالم میں آئے تھے۔ ان کی دونوں جانب، اور مرکز میں توپ خانے تھے جنھوں نے Genappe اور Frischemont جانے والی سڑکوں پر، طاقت ور دوسری لائن میں، لڑائی کے لیے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لی تھی، نپولین نے جسے بڑی چالاکی سے ترتیب دیا تھا۔ ان کے دائیں جانب کیلرمان کے زرہ پوش تھے اور بائیں جانب Milhaud کے زرہ پوش، گویا فولاد کے دو بازو تھے۔

فوجی سیکریٹری برنارڈ شہنشاہ کا حکم لے کر گیا۔ Ney نے اپنی تلوار نکال کر اس کے سامنے اپنا سر رکھ دیا۔ قوی ہیکل اسکواڈرن حرکت میں آ گئے۔

پھر ایک بھیانک ماجرا دیکھا گیا۔

ان کے تمام گھڑ سوار، اپنی تلواریں اٹھائے، ہوا میں پرچم اور بگل بلند کیے، کالم کی شکل میں، یکساں حرکت کرتے، ایک فردِ واحد کی طرح اترتے، شوخ، سینگیں مارتے مینڈھے کی طرح شگاف بناتے ہوئے، ان خوف ناک گہرائیوں میں گر گئے جس میں کتنے لوگ گر چکے تھے، دھویں

میں غائب ہو گئے، پھر سایے میں سے ابھرتے ہوئے، تومند، وادی کی دوسری جانب دوبارہ نمودار ہوئے، گرے پ شاٹ کے طوفان میں سے گزرے جو اُن پر پھٹ پڑا تھا، Mont-Saint-Jean کے میدان کی خوف ناک پھسلن والی ڈھلان پر تیزی سے چڑھتے ہوئے نظر آئے تھے۔ وہ سنجیدہ، پُرسکون، دھمکی آمیز سنجیدگی اور پُرسکون کیفیت میں چڑھے تھے؛ دستی بندوقیں اور توپ خانے کے درمیان وقفے میں، ان کے دیو ہیکل قدموں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ دو ڈویژن ہوتے ہوئے بھی ان کے دو کالم تھے؛ میمنے پر Wathier کا ڈویژن تھا، اور میسرے پر Delort کا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا فولاد سے بنے دو سانپ میدان کی بلندی کی طرف رینگ رہے ہوں۔ یہ کسی حیرت انگیز مخلوق کی طرح لڑائی کے درمیان سے گزر گئے تھے۔

ماسکووا کے عظیم قبضے کے بعد سے، بھاری توپ خانے کا اس جیسا واقعہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا؛ اس موقعے پر Murat نظر نہیں آیا مگر Ney ایک بار پھر موجود تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ ہجوم ایسا عفریت بن گیا ہے جس کی روح ایک ہی ہے۔ ہر کالم کسی مرجان کے حلقے کی طرح لہراتا پھولتا جا رہا تھا۔ وہ دھوئیں کے جا بجا پھیلے وسیع بادل میں کہیں کہیں دکھائی دے جاتے تھے۔ توپوں اور بگلوں کی اٹھان، آہنی ٹوپیوں، پیٹیوں، تلواروں اور گھوڑوں کے ٹُرین کی موجودگی کی پیچیدگی ایک خوف ناک مگر باضابطہ بے چینی کی کیفیت بن گئی تھی؛ اس پر مستزاد، زرہ بکتر، کسی آبی سانپ کے فلس جیسے لگتے تھے۔

یہ بیانات کسی اور عہد کے واقعات معلوم ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کے نظارے آرفیس کے بہادرانہ کارناموں میں دیکھنے میں آئے تھے، جن میں دو نسلے جانور، جیسے گھوڑے کے جسم والے انسان، ایسی خوف ناک، ناقابلِ تسخیر، ارفع دیو پیکر مخلوقات جن کے سر انسان کے اور جسم جانوروں کے تھے، جو ایک چھلانگ میں پہاڑوں کے سلسلے عبور کر لیتے تھے — دیوتا اور درندے وغیرہ۔

عددی مماثلت بھی عجیب تھی — چھبیس بٹالین سے مقابلے کے لیے، چھبیس بٹالین آگے بڑھی تھیں۔ سطحِ مرتفع کی بلندی کے عقب میں، پوشیدہ توپ خانے کے سایے میں، انگریز پیدل فوج، تیرہ مربعے میں تقسیم، جس کے ہر مربعے میں دو قطاروں میں دو بٹالین، پہلی قطار میں سات، دوسری میں چھ؛ کاندھوں پر بندوقیں، ہر نظر آنے والی شے کا نشانہ لیتیں، بالکل پُرسکون، بالکل خاموش، بالکل بے حرکت۔ انھیں زرہ پوش نظر نہیں آئے، اور زرہ پوشوں کو وہ نظر نہیں آئے۔ وہ انسانوں کے اس سیلاب کی آواز سن رہے تھے۔ وہ گھوڑوں کی پھولتی ہوئی ناک، ان کے پڑتے ہوئے سُم، زرہوں کی جھنکار، تلواروں کی کھٹ کھٹ، اور ایک قسم کی بلند اور وحشی

سانسوں کی ملی جلی آوازیں سن رہے تھے۔ پھر ایک خوف ناک خاموشی طاری ہوئی؛ اس کے بعد، سطحِ مرتفع کی بلندی پر اچانک تلواریں اٹھائے بازو، خود، بگل اور پرچم، اور بھوری موجوں والے تین ہزار چہرے 'شہنشاہ زندہ باد' کے نعرے لگاتے نظر آئے۔ یہ سارے گھڑ سوار سطحِ مرتفع پر اس طرح نازل ہوئے تھے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

اچانک ایک الم ناک واقعہ رونما ہوا؛

انگریز کے بائیں، ہمارے دائیں، ایک خوف ناک شور کے ساتھ زرہ پوشوں کے کالم والوں کے سر ظاہر ہوئے۔ بلندی کی انتہا پر پہنچتے ہی، مربعوں اور توپوں کو ختم کرنے کے بے لگام، بے حد غصے کی حالت میں زرہ پوشوں کو ان کے اور انگریز کے درمیان ایک خندق نظر آئی۔ دراصل یہ Ohain جانے والے کھوکھلی سڑک تھی۔

یہ ایک خوف ناک لمحہ تھا۔

بالکل غیر متوقع، گھوڑوں کے پاؤں کے بالکل نیچے، دو ڈھلانوں کے درمیان، منہ کھولے ایک پہاڑی نالا موجود تھا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ اگلی صف سنبھلنے کے لیے رکی تو اس کے عقب والی صف اس سے ٹکرائی، دوسری صف پہلی صف سے، تیسری صف دوسری صف سے؛ گھوڑے پیچھے ہٹے اور کمر کے بل گر پڑے، پھسلے، چاروں پاؤں ہوا میں بلند؛ سوار کچلے گئے؛ بدقسمتی سے وہاں پسپائی کا کوئی راستہ نہیں تھا — پورا کالم کسی گولے کے سوا کچھ نہیں تھا: اس طاقت نے جو انگریز کو کچلنے کے لیے جمع کی گئی تھی فرانسیسیوں کو کچل دیا تھا۔ بے رحم نالا اس وقت کام آیا جب پوری طرح بھر چکا تھا؛ گھوڑے اور سوار ایک دوسرے میں گڈمڈ، ایک دوسرے کو پیستے ہوئے اس نالے میں گر کر گوشت کا ایک ڈھیر بن گئے تھے۔ جب یہ خندق، یعنی پہاڑی نالا، زندہ آدمیوں سے بھر گیا تو بقیہ اس پر چڑھ کر دوسری طرف پہنچ گئے۔ Dubois کے بریگیڈ کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس پاتال میں گر گیا تھا۔

اس سے جنگ کی ہار کی ابتدا ہو گئی تھی۔

مقامی روایات کے مطابق، جو ظاہر ہے کہ معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہیں، Ohain جانے والی اس کھوکھلی سڑک میں دو ہزار گھوڑے اور پندرہ سو انسان آناً فاناً دفن ہو گئے تھے۔ ان اعداد میں دوسری لاشیں بھی شامل ہیں جو لڑائی کے دوسرے دن اس پہاڑی نالے میں ڈال دی گئی تھیں۔

اس ذکر کے دوران یہ معلوم ہونا چاہیے کہ Dubois کی بے حد آزمودہ بریگیڈ نے

جو ایک گھنٹے قبل، اس طرح حملہ کر رہا تھا کہ لونس برگ کے پرچم پر قبضہ کر لیا تھا۔

Milhaud کے زرہ پوشوں کو حملے کا حکم دینے سے پہلے نپولین نے میدان کا تجزیہ کیا تھا، مگر اس کھوکھلی سڑک کو دیکھ نہیں سکا تھا، جو سطحِ مرتفع پر ایک شکن کے برابر بھی نہیں تھی۔ Nivelles جانے والی شاہراہ پر واقع سفید گرجا گھر کو دیکھ کر اس نے کسی رکاوٹ کے امکان کے بارے میں غالباً اپنے رہنما لاکوسٹے سے سوال کیا تھا۔ رہنما کا جواب نفی میں تھا۔ ہم تقریباً وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نپولین کی تباہی کی ابتدا اس دہقان کے سر کی جنبش سے ہوئی تھی۔

اور بلاکتیں بھی ہونے والی تھیں۔

کیا یہ ممکن تھا کہ نپولین یہ جنگ جیت جاتا؟ ہمارا جواب 'نہیں' میں ہو گا۔ کیوں؟ ولنگٹن کی وجہ سے؟ بلوچر کی وجہ سے؟ نہیں، خدا کی وجہ سے!

واٹرلو کا فاتح — بونا پارٹ! یہ انیسویں صدی کے قانون میں نہیں آتا۔ حقیقتوں کا ایک اور سلسلہ مرتب ہو رہا تھا، جس میں نپولین کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ واقعات کی خرابیاں بہت پہلے سے اعلان کر رہی تھیں۔

اس بڑے آدمی کے زوال کا وقت آ گیا تھا۔

انسانی مقسوم میں اس آدمی کے زیادہ بوجھ نے توازن بگاڑ دیا تھا۔ یہ اکیلا انسان بہت سے آفاقی گروہوں میں شامل تھا۔ تمام حیاتِ انسانی کا افراط خون ایک واحد سر میں جمع ہو گیا تھا؛ پوری دنیا ایک آدمی کے دماغ پر سوار ہو گئی تھی — ایسی کیفیت، اگر دیر تک جاری رہے تو تہذیب کے لیے موت ہو جایا کرتی ہے۔ اب دیانت دار اور بلند و برتر انصاف کے لیے اپنے منصوبے میں تبدیلی کا وقت آ گیا تھا۔ شاید اصولوں اور عناصر نے، جن پر اخلاقیات، اور اس سے متعلق مادوں کی دنیا کی کشش کا دار و مدار ہوتا ہے، شکایت کر دی تھی۔ بھاپ دیتا ہوا خون، اُبلتے ہوئے قبرستان، ماؤں کے آنسو — بھیانک وکیل ہوتے ہیں۔ جب زمین بہت وزن سے دُکھی ہو، تو یہی پُراسرار کراہوں کے سائے ہوتے ہیں، پاتال جن پر کان دھرتا ہے۔

نپولین لا انتہاؤں میں رسوا ہو گیا تھا، اور اس کے زوال کا فیصلہ ہو گیا تھا۔

اس نے خدا کو شرمندہ کیا تھا۔

واٹرلو لڑائی نہیں ہے؛ یہ کائنات کی جانب سے محاذ کی تبدیلی ہے۔

سطحِ مرتفع

نالے کے حادثے کے وقت توپ خانہ کھل کر سامنے آگیا تھا۔

ساٹھ توپوں اور تیرہ مربعوں نے زرہ پوش سواروں کو آناً فاناً نشانے پر رکھ لیا۔ گویا نڈر جنرل ویلور (Delort) نے انگریزی فوج کو سیلوٹ کیا تھا۔

انگریزوں کا پورا تیز رفتار توپ خانہ ایک آن میں مربعوں میں داخل ہو گیا تھا۔ زرہ پوش گھڑ سواروں کو رکنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ کھوکھلی سڑک پر ہونے والی تباہی نے اگرچہ ان کو کم زور کردیا تھا، مگر ان کی ہمت نہیں ٹوٹی تھی۔ ان کا تعلق اس درجے کے لوگوں سے تھا جو عدد میں کم ہو جائیں تو ہمت میں بڑھ جاتے ہیں۔

اس تباہی میں صرف ویدیے (Wathier) کے کالم کو نقصان ہوا تھا؛ ویلور کا کالم، جسے Ney نے بائیں جانب موڑ دیا تھا، گویا اس نے گھات کے خطرے کا اندیشہ ہو گیا تھا، پورا پہنچ گیا۔

زرہ پوش گھڑ سوار انگریزی مربعوں پر ٹوٹ پڑے۔

پوری رفتار سے، لگامیں ڈھیلی ہو گئیں، دانتوں میں تلواریں پکڑ لی گئیں اور مٹھیوں میں پستول آگئے تھے — اس قسم کا تھا وہ حملہ۔

لڑائیوں میں ایسا بھی وقت آتا ہے کہ آدمی کو اس کا نفس اس وقت کے لیے سخت بنا دیتا ہے جب تک کہ وہ مجسمے میں بدل نہیں جاتا اور جب تک اس کا گوشت سنگِ خارا نہیں بن جاتا۔ انگریزی بٹالین، بے جگری سے حملے کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔

یہ بڑی خوف ناک بات تھی۔

سارے انگریزی مربعوں پر ایک ساتھ حملہ کیا گیا تھا۔ وہ ایک جنون آمیز بھنور میں گھر

گئے۔ان کی بے حس پیدل فوج غیر متحرک رہی۔ پہلی صف والے گھٹنوں کے بل جھکے اور زرہ پوشوں کو سنگینوں پر لے لیا، جب کہ دوسری صف نے انھیں گولیوں سے بھون ڈالا۔ دوسری صف کے پیچھے والے توپچیوں نے اپنی توپیں بھریں، پہلی صف والے بیچ میں سے پھٹے، گریپ شاٹ کی ایک باڑھ کے لیے راستہ دیا، اور پھر یک جا ہو گئے۔ زرہ پوشوں نے ان کو کچل دیا۔ان کے گھوڑے پسپا ہوئے، صفوں پر چڑھ دوڑے، سنگینوں کے اوپر چھلانگ لگائی اور گر پڑے۔توپ کے گولے زرہ پوشوں پر گرے، زرہ پوشوں نے مربعوں میں دراڑیں ڈال دیں۔آدمیوں کی پوری کی پوری قطاریں غائب ہو گئیں، گھوڑوں کے سموں کے نیچے پامال ہو گئیں فوجیوں کے پیٹوں میں سنگینیں داخل ہو گئیں؛ایسے خوف ناک زخم اس سے پہلے شاید کبھی دیکھے نہیں گئے تھے۔توپوں کی پھیلائی اس تباہی کے بعد مربعے کی صفیں یک جا ہو گئیں۔گریپ شاٹ سے نہ دبنے والوں نے اپنے حملہ آوروں کے درمیان دھماکے کیے۔ اس قسم کا مقابلہ بہت بھیانک تھا۔ مربعے بٹالین نہیں رہ گئے تھے، ہر طرف گڑھے ہی گڑھے تھے؛ اب وہ زرہ پوش گھڑ سوار نہیں رہ گئے تھے، طوفان کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ہر مربع حملے سے آتش فشاں بن گیا تھا؛ لاوہ کوندوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

سب سے دور، دایاں مربع، جو زیادہ غیر محفوظ تھا، پہلے ہی حملے میں تقریباً مسمار ہو گیا تھا۔ یہ پچھترویں اسکاٹش [Highlanders] رجمنٹ پر مشتمل تھا۔درمیان میں موجود بیگ پائپ بجانے والوں کی آنکھیں اداسی سے جھک گئیں،[اسکاٹ لینڈ کے] جنگلوں اور جھیلوں کے تصور سے لبریز ہو گئیں، جب کہ ان کے اطراف لوگ مارے جا رہے تھے وہ بڑی لاپروائی سے اپنے ڈرم پر، بغلوں میں بین دبائے، پہاڑی نغمے بجائے جا رہے تھے۔اس وقت اسکاٹش لوگ اسی طرح Ben Lothian کا تصور کیے مر رہے تھے، جس طرح یونانی Argos کو یاد کرتے مرا کرتے تھے۔ایک زرہ پوش کی تلوار نے جو bagpipe میں داخل ہو کر اس کی بغل تک پہنچ گئی تھی جس میں bagpipe دبا ہوا تھا، بجانے والے کو مار کر موسیقی کو خاموش کر دیا۔

زور پوش، نسبتاً تعداد میں کم تھے، اور پہاڑی نالے میں ہونے والی تباہی سے مزید کم ہو گئے تھے۔ان کے مقابلے میں پوری انگریزی فوج تھی، مگر ان کا ایک فرد [جوش وجذبے کی بنا پر] دس کے برابر ہو گیا تھا۔ ویلنگٹن نے فوراً اپنی پیدل فوج جھونک دی۔اگر نپولین کو اپنی فوج کا خیال آیا ہوتا تو وہ جنگ جیت جاتا۔اس کی بھول اس کی سب بڑی اور مہلک غلطی تھی۔

ایکبارگی، زرہ پوش، جو حملہ آور تھے، خود حملہ برداشت ہو گئے۔ان کے عقب میں انگریزی گھڑ سوار فوج تھی۔ان کے سامنے دو مربعے تھے، ان کے پیچھے سمرسٹ تھے؛ سمرسٹ کا

مطلب تھا پندرہ ہزار سوار۔ سمرسٹ کی دائیں جانب ڈارن برگ کے گھڑ سوار تھے، اور ان کی بائیں جانب ٹرپ کے بلجیم بندوق بردار تھے؛ زرہ پوشوں پر پہلو سے اور سامنے سے حملہ کیا گیا تھا، اس کے بعد پیدل فوج اور گھڑ سوار تھے۔ وہ بھنور بن گئے تھے۔ ان کی شجاعت نا قابلِ بیان تھی۔

اس کے علاوہ، ان کے پیچھے توپ خانہ گرج رہا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ پیچھے سے زخمی نہ ہوئے ہوتے۔ ان کی زرہوں میں سے ایک زرہ، جس کے شانے پر گولا لگا تھا، واٹرلو کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

ایسے فرانسیسیوں کے لیے ایسے ہی انگریزوں کی ضرورت تھی۔ اب دست بدست لڑائی نہیں رہ گئی تھی۔ اب سایہ تھا، غصہ تھا، انفاس اور ہمت کا مدہوش کارواں تھا، لہراتی برق کا طوفان تھا۔ ایک لمحے کے اندر چودہ سو سپاہی صرف آٹھ سو رہ گئے تھے۔ ان کا لفٹنٹ کرنل مارا گیا۔ Ney اپنے نیزہ برداروں کے ساتھ، اور Lefebvre-Desnouettes اپنے گھڑ سواروں کے ساتھ آگے بڑھے۔ Mont-Saint-Jean پر قبضہ ہوا، دوبارہ قبضہ ہوا، ایک بار پھر قبضہ ہوا۔ زرہ پوش گھڑ سوار رسالے کو چھوڑ کر پیدل فوج سے جا ملے؛ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بھیانک تباہی دونوں پر ایک ساتھ آئی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مربعے اب بھی مستحکم تھے۔

درجنوں حملے ہوئے۔ Ney کے چار گھوڑے اس کی سواری کے دوران مارے گئے۔ نصف زرہ پوش سطحِ مرتفع پر ہی رہے۔ لڑائی دو گھنٹے جاری رہی تھی۔

انگریز فوج بُری طرح ہل گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کھوکھلی سڑک کی تباہی ان کے لیے پہلا دھچکا نہ بنا ہوتا جس نے انھیں کم زور کر دیا تھا تو زرہ پوشوں نے مرکز پر غلبہ پا لیا ہوتا اور فیصلہ کُن فتح پا لی ہوتی۔ غیر معمولی گھڑ سوار رسالے نے ولنگٹن کو متحیر کر دیا تھا، جو Talavera اور Badajoz [ہسپانیہ کی] لڑائیاں دیکھ چکا تھا۔ تین چوتھائی فاتح ولنگٹن نے بہادرانہ انداز میں تعریف کی اور دھیمی آواز میں کہا تھا، ''پُرشکوہ!''

زرہ پوشوں نے تیرہ میں سے سات مربعے مٹا دیے؛ آرڈیننس کی چھ گاڑیاں چھلنی کر دیں؛ اور انگریزی فوج سے چھ پرچم چھین لیے تھے جنھیں تین زرہ پوش اور پیدل فوجیوں نے La Belle Alliance کے سامنے نپولین کو پیش کیا تھا۔

ولنگٹن کی حالت زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ یہ حیرت انگیز لڑائی دو زخمی آدمیوں کے درمیان ہو رہی تھی، جو لڑ بھی رہے تھے اور مزاحمت بھی کر رہے تھے، اور اپنا سارا خون بہائے دے رہے تھے۔

ان دونوں میں سے پہلے کون گرنے والا تھا؟

سطحِ مرتفع کی لڑائی جاری رہی۔ بکتر پوش سپاہیوں کا کیا بنا؟ کوئی بتا نہیں سکتا تھا۔ ایک بات یقینی تھی کہ لڑائی کے دن ایک زرہ پوش اور اس کا گھوڑا، دونوں اس جگہ مردہ پائے گئے تھے جہاں La Hulpe ،Genappe ،Nivelles اور برسلز جانے والی چاروں سڑکیں ہر ایک کو کاٹتی ہیں۔ یہ گھڑسوار انگریزی صفوں میں گھس گیا تھا۔ جس شخص نے ان کو وہاں سے اٹھایا تھا اب بھی Mont-Saint-Jean میں رہتا ہے۔ اس کا نام Dehaze ہے۔ اس وقت وہ اٹھارہ برس کا تھا۔

وِلنگٹن سمجھا کہ وہ ہار رہا ہے۔ بحران جاری تھا۔

زرہ پوش کامیاب نہیں ہوئے، اس لیے کہ مرکز توڑا نہیں جا سکا تھا۔ چوں کی ہر ایک سطحِ مرتفع پر قابض تھا، کسی نے فتح نہیں کیا تھا، دراصل کافی حد تک وہ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ وِلنگٹن کے قبضے میں گاؤں اور میدان کا بلند حصہ تھا؛ Ney کے پاس صرف چوٹی اور ڈھلان تھی۔ دونوں اس مہلک مٹی میں پاؤں گاڑے ہوئے تھے۔

مگر انگریزی کم زوری ناقابلِ تلافی محسوس ہو رہی تھی۔ اس فوج کی بڑھتی ہوئی کم زوری خوف ناک تھی۔ کیمپٹ میسرے کے لیے کمک طلب کر رہا تھا۔ "کمک موجود نہیں۔" وِلنگٹن نے جواب میں کہا "اسے چاہیے کہ خود قتل ہو جائے۔" عین اسی لمحے ایک ایسا واقعہ ہوا جو دونوں فوجوں کی تھکن کا مظہر تھا۔ Ney نے نپولین سے پیدل فوج طلب کی، اور نپولین نے جواب میں کہا تھا، "پیدل فوج! کہاں سے لاؤں؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں فوج پیدا کر سکتا ہوں؟"

پھر بھی، دونوں فوجوں میں سے انگریزی فوج کی حالت زیادہ خراب تھی۔ لوہے کی زرہوں اور فولاد کی سینہ پوش فوجوں کے بڑے اسکواڈرن کے خوف ناک حملوں نے پیدل فوج کو پیس کر رکھ دیا تھا۔ کچھ لوگ ایک رجمنٹ کے پرچم کے قریب جمع ہو گئے؛ فلاں اور فلاں بٹالین کو صرف ایک کپتان یا لفٹنٹ کمان کر رہا تھا؛ La Haie-Sainte میں Alten کے ڈویژن کا حال بُرا تھا، تقریباً تباہ ہو گیا تھا؛ بلجیم کے Van Kluze کا بریگیڈ Nivelles جانے والی سڑک کے کنارے رائی کے کھیتوں میں پھیل گیا تھا؛ ان ولندیزی سپاہیوں میں سے جو 1811ء میں ہسپانویوں کے ساتھ مل کر ہماری صفوں میں گھس گئے تھے، وِلنگٹن کے خلاف لڑے؛ اور وہ جو 1815ء میں انگریزی پرچم تلے جمع ہو گئے تھے، نپولین کے خلاف لڑے۔ بہت افسر مارے گئے۔ لارڈ اکسبرج کا گھٹنا ریزہ ریزہ ہو گیا اور اگلے دن اس کی ٹانگ دفن کر دی گئی۔ اگر فرانسیسی زرہ پوشوں کی اس لڑائی میں Delort, l'Heritier, Colbert, Dnop, Travers, اور Blancard معذور ہو گئے تھے، تو انگریزوں میں آلٹن زخمی، بارن زخمی، اور ڈیلانسی مارا گیا، وان میرن مارا گیا،

آمپریڈ امارا گیا، ویلنگٹن کے رفقائے کار کا ایک بڑا حصہ ختم ہو گیا، اور اس خونیں لڑائی میں انگریزوں کا بہت نقصان ہوا تھا۔ پیدل گارڈز کی دوسری رجمنٹ کے پانچ لفٹنٹ کرنل، چار کیپٹن، اور تین پرچم ضائع ہو گئے تھے۔ تیسویں پیدل ڈویژن کی پہلی بٹالین کے تیس افسر اور بارہ سو سپاہی مارے گئے؛ اسکاٹ لینڈ کی اٹھترویں بٹالین کے چوبیس افسر زخمی ہوئے، اٹھارہ افسر مارے گئے، اور چار سو پچاس سپاہی مارے گئے تھے۔ کمبرلینڈ کے ہینوورعالے مسلح سپاہی نے، جن کا کماں دار کرنل ہاکے تھا، جس پر بعد میں مقدمہ چلا اور ملازمت سے نکال دیا گیا تھا، خوف کے پیشِ نظر اپنی لگام موڑ لی اور برسلز تک شکست کے بیج بوتا، بھاگ کر Soignes کے جنگل میں جا چھپا تھا۔ اس خیال سے کہ فرانسیسی کامیاب ہو رہے تھے، نقل و حمل، گولہ بارود اور سامان لے جانے والی گاڑیاں جنگلوں کی طرف رواں دواں تھیں۔ فرانسیسی گھڑ سواروں کے روندے ولندیزی "خطرہ بخطرہ" چلاتے جا رہے تھے۔ Vert-Coucou سے Groentendael، برسلز کی جانب تقریباً دو لیگ فاصلے تک، ان لوگوں کی زبانی جو آج بھی زندہ ہیں، سڑکیں فراریوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسی افراتفری تھی کہ Mechlin پر Prince de Conde، اور لوئی شانزدہم بھی پریشان ہو گئے تھے۔ سوائے ان کم زور طبقوں کے جو Mont-Saint-Jean میں ایمبولینس کے فارم کے عقب میں قائم کیے گئے تھے، اور Vivian اور Vandeleur کے بریگیڈوں کے میسرہ کے بازو تھے، ویلنگٹن کے پاس کوئی گھڑ سوار دستہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ بہت سی توپیں گھوڑوں کے بغیر بے کار کھڑی تھیں۔ یہ حقیقتیں Siborne کی تصدیق شدہ ہیں؛ اور پرنگل نے تو اس تباہی کو یہاں تک کہا ہے کہ انگریز اور ولندیزی فوجیں کم ہو کر چونتیس افراد پر مشتمل رہ گئی تھیں۔ آہنی ڈیوک پُرسکون تھا، مگر اس کے لب زرد تھے۔ آسٹریا کے کمشنر وینسنٹ، ہسپانیہ کے کمشنر آلاوا، جو لڑائی کے دوران برطانیہ کے اہل کاروں کے ساتھ موجود تھے، سمجھے تھے کہ ڈیوک ختم ہو گیا ہے۔ پانچ بجے شام ویلنگٹن نے اپنی گھڑی نکالی، اور اس کے منہ سے یہ نامبارک الفاظ سنے گئے تھے، "بلوخر، یا رات۔"

عین اس وقت Frischemont کی جانب بلندیوں پر سنگینوں کی ایک صف چمکتی دکھائی دی۔

دیو پیکر ڈراما تبدیل ہو رہا تھا۔

۞

اچھے اور بُرے قائد

نپولین کی دردناک حیرت سے سب واقف ہیں۔ اسے [فرانسیسی جرنیل] گراوچی (Grouchy) کے آنے کی امید تھی، بلوشر آپہنچا۔ زندگی کے بجائے موت۔

مقسوم میں ایسے موڑ آیا کرتے ہیں؛ اسے دنیا کے تخت کی توقع تھی؛ سینٹ ہلینا کا جزیرہ مقدر میں لکھا تھا۔

اگر وہ گڈریا جس نے بلوشر کے نائب بولو کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے تھے، اس کو Plancenoit کے بجائے Frischemont کے جنگل سے نکلنے کا مشورہ دیتا تو شاید انیسویں صدی کی شکل کچھ اور ہی ہوتی۔ نپولین نے واٹرلو کی جنگ جیت لی ہوتی۔ پروشیائی فوج Plancenoit کے نیچے کے علاوہ، جو توپ خانے کے لیے مناسب نہیں تھا، کسی اور راستے سے پہاڑی نالے پر آگئی ہوتی تو بولو (Bulow) وہاں پہنچا نہ ہوتا۔

پروشیائی جنرل مفلنگ (Muffling) اس ایک گھنٹے کی تاخیر کا اعلان کر دیتا تو بلوشر کو ولنگٹن تیار نہ ملتا۔ ''جنگ ختم ہوگئی ہوتی۔''

وہ وقت تھا جب بولو کو آنا چاہیے تھا۔ مزید یہ کہ اس کو بہت دیر ہوگئی تھی۔ اس نے Dion-le-Mont پر پڑاؤ ڈالا تھا اور صبح ہوتے ہی نکل پڑا تھا؛ مگر راستے ناقابلِ سفر تھے، اور جلد ہی اس کے ڈویژن کیچڑ میں پھنس گئے تھے۔ لیکیں اونچی ہو کر توپوں کے دھروں تک پہنچ گئی تھیں۔ مزید یہ کہ اسے Wavre کے تنگ پُل سے دریائے Dyle پار کرنا تھا؛ پُل کے طرف لے جانے والی سڑک کے مکانوں میں فرانسیسیوں نے آگ لگا دی تھی، تاکہ دو رویہ جلتے گھروں کے درمیان سے گولا بارود لے جانے والی گاڑیاں گزر نہ سکیں، اور اس کو اس وقت تک رُکنا پڑا تھا

جب تک کہ آگ بجھا نہیں دی گئی تھی۔ بولو کے ہراول دستے کو Saint-Lambert کے کلیسا تک پہنچتے پہنچتے آدھا دن گزر گیا تھا۔

اگر جنگ دو گھنٹے قبل شروع ہوگئی ہوتی تو چار بجے شام تک ختم ہو جاتی، اور نپولین کی جیتی ہوئی جنگ پر بلوخر حاوی ہوجاتا۔ یہ لا انتہا خطرات ہوتے ہی ایسے ہیں، ہم جن کا ادراک نہیں کر سکتے۔

شہنشاہ پہلا شخص تھا جس نے دوپہر سے قبل اپنی دوربین سے افق پر بہت دور ایسی کوئی شے دیکھ لی تھی، جس پر اس کی توجہ مبذول ہوگئی تھی۔ اس نے کہا تھا، ''میں سامنے ایک بادل دیکھ رہا ہوں، جو میرے خیال میں سپاہی ہیں۔'' پھر اس نے ڈیوک Dalmatie سے ''ڈیوک کے اصل نام سے مخاطب کرتے ہوئے] پوچھا ''Soult تمہیں Saint-Lambert کلیسا کی جانب کیا دکھائی دے رہا ہے؟'' مارشل نے اپنی دوربین برابر کرتے ہوئے کہا، ''چار یا پانچ ہزار آدمی، جناب: بہ ظاہر گراوچی'' مگر یہ سب کچھ کہر کے بادلوں میں بے حرکت رہا۔ تمام افسران کی دوربینوں نے اس بادل کا معائنہ کیا، شہنشاہ نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کچھ نے کہا تھا، ''وہ درخت ہیں۔'' سچ تو یہ ہے کہ وہ بادل اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ شہنشاہ نے Domon کے ڈویژن کے گھڑ سواروں کو علاحدہ کر کے اس طرف نظر رکھنے پر مامور کر دیا۔

دراصل بولو اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ اس کا ہراول دستہ بہت کم زور تھا، اور کسی کام کا نہیں تھا۔ اسے فوجی کور کا انتظار کرنا پڑا تھا، اور اسے حکم ملا تھا کہ وہ صف میں داخل ہونے سے پہلے اپنی فوج پر کڑی نظر رکھے، مگر ویلنگٹن کے خطرے کے تصور ہی سے بلوخر نے بولو کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا، اور یہ غیر معمولی الفاظ کہے تھے، ''ہمیں انگریزی فوج کو سانس لینے کا موقع دینا چاہیے۔''

تھوڑی دیر کے بعد Losthin, Hiller, Hacke اور Ryssel کے ڈویژن Lobau کے کور کے سامنے صف آرا کر دیے گئے، پروشیا کے شہزادے ولیم کا گھڑ سوار دستہ پیرس کے جنگل سے نکلا گیا، Plancenoit میں آگ لگی ہوئی تھی، اور پروشیائی توپوں کے گولے نپولین کے عقب میں متعین گارڈ کی صفوں پر برسنے لگے تھے۔

محافظ

باقی سب کچھ سب کو معلوم ہے!

تیسری فوج کا دھاوا؛ لڑائی کا ٹکڑوں میں بٹ جانا؛ آگ کے چھپا سی دہانوں کا ایک ساتھ گرجنا؛ Pirch کا بولو کے ساتھ آنا؛ بلوخر کا بذات خود Zieten کے گھڑسواروں کی کمان داری کرنا، اور فرانسیسیوں کا پسپا ہونا؛ Ohain کی سطح مرتفع سے Marcognet کا صفایا کر دیا جانا؛ Papelotte سے Durutte کا نکال دیا جانا؛ Donzelot اورQuiot کی پسپائی؛ Lobau کا پکڑا جانا؛ سر شام ہماری برباد شدہ رجمنٹوں کا جنگ پر مجبور کیا جانا؛ تمام انگریزی صفوں کا نئے سرے سے حملہ کرنا اوران کی پیش قدمی؛ فرانسیسی فوج میں خوف ناک دراڑ پڑ جانا؛ انگریزی گرےپ شاٹ اور پروشیائی گرےپ شاٹ کا ایک دوسرے کی مدد کرنا؛ قتل و غارت؛ محاذ پر تباہی؛ مرکز میں تباہی؛ ہر شے کی خوف ناک بربادی کے دوران گارڈ کا صفوں میں داخل ہو جانا۔

اس بات کا احساس ہوتے ہوئے کہ وہ لوگ مرنے والے ہیں، انھوں نے "شہنشاہ زندہ باد!" کے نعرے بلند کیے۔ تاریخ اس سے زیادہ پُر درد بات نہیں پیش کرتی کہ نعرہ ہائے مسرت سے نزع کی کیفیت پھوٹی پڑتی تھی۔

سارا دن آسمان پر بادل چھائے تھے۔ اچانک — شام کے آٹھ بجے — اُفق پر چھائے بادل پھٹے اور Nivelles کی سڑک پر لگے درختوں میں سے چھن چھن کر ڈوبتے سورج کی نامبارک دمک آنے لگی تھی۔ انھوں نے Austerlitz میں بھی یہی دیکھا تھا۔

آخری آفت سے نمٹنے کے لیے گارڈ کی ہر بٹالین کی کمان ایک جنرل کر رہا تھا۔ سب Friant, Michel, Roguet, Harlet, Mallet, Poret de Morvan,

کے سب وہیں تھے۔ جب جنگ کے دوران گارڈ کے وقتی گولے پھینکنے والے سپاہیوں کی بلند ٹوپیاں، جن پر عقاب کے بڑے بڑے نشانات لگے تھے، ایک صف میں، متناسب اور پُرسکون انداز میں ظاہر ہوئیں تو دشمنوں کو بھی فرانس کے لیے احترام کا احساس ہوا؛ وہ سمجھے کہ انھوں نے میدانِ جنگ میں فتوحات کو داخل ہوتے دیکھ لیا تھا، جن کے بازو پھیلے ہوئے تھے، اور وہ جو فاتحین میں سے تھے، یہ یقین کرتے ہوئے کہ وہ فاتح ہو گئے ہیں، پسپا ہوئے؛ مگر ویلنگٹن چلایا "محافظو، اٹھو اور نشانہ باندھ لو۔" انگریزی گارڈ کی سرخ رجمنٹ، جو جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر لیٹی تھی، اچھل کر کھڑی ہو گئی، اور گریپ شاٹ کے بادل نے ہمارے ترنگے پرچموں کو چھلنی کر دیا گولے ہمارے عقابوں کے اطراف سے گزرنے لگے تھے؛ سب آگے کی طرف کود پڑے اور فیصلہ کن قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔ اندھیرے میں شاہی گارڈ کو محسوس ہوا گویا فوج کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں، اور تباہی کے اس وسیع تصادم کے دوران انھیں محسوس ہوا کہ "شہنشاہ زندہ باد" کے نعروں کی جگہ ہراس فرار نے لے لی ہے؛ سپاہی گرتے پڑتے، زیادہ کچلے ہوئے، مگر آگے بڑھتے گئے اور ہر بڑھتے قدم پر مزید آدمی ضائع ہوتے گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا جو تامل کرتا کہ ان کی صفوں میں بزدل لوگ نہیں تھے۔ اس فوج کا عام سپاہی بھی جرنیل کی طرح ہیرو تھا۔ اس خودکشی کے عمل کے دوران ایک بھی آدمی غیر حاضر نہیں تھا۔

حیران پریشان، قبول شدہ موت کے جاہ و جلال کے ساتھ، Ney خود بھی اس طوفان میں کود پڑا تھا۔ اس کا پانچواں گھوڑا بھی اس کے زانوؤں کے نیچے وہیں کھیت ہو گیا تھا۔ پسینے میں شرابور، آنکھیں شعلہ بار، منہ سے نکلتا جھاگ؛ وردی کے بٹن کھلے ہوئے؛ بٹنوں میں سے ایک کسی گھڑسوار کی تلوار کی ضرب سے کٹا ہوا؛ اس کا عقابی نشان کسی گولی سے پچکا ہوا؛ خون بہتا ہوا؛ کیچڑ میں لت پت؛ عالی شان، ہاتھ میں ایک ٹوٹی تلوار تھامے، اس نے کہا "آؤ دیکھو، فرانس کا ایک مارشل میدانِ جنگ میں کس طرح اپنی جان دیتا ہے!" مگر بے کار؛ وہ مرا نہیں۔ وہ وحشت زدہ اور ناراض تھا۔ Drouet d'Erlon کے قریب اس نے سوال کیا تھا، "کیا تم خود مرنا نہیں چاہتے؟" مٹھی بھر آدمیوں کو کچلنے میں مشغول اس گولا باری کے درمیان اس نے چلا کر کہا تھا: "گویا، میرے لیے کچھ نہیں ہے! اُف! کاش یہ ساری انگریزی گولیاں میرے پیٹ میں اتر جاتیں!"

بدقسمت انسان، وہ فرانسیسی گولیوں کے لیے بچا لیا گیا تھا!

تباہی

محافظین کی تباہی افسوس ناک تھی۔

اچانک فوج — Haie-Sainte, Papelotte, Plancenoit.
Hougomont, La — ہر طرف پسپا ہو گئی تھی۔

"بے وفائی" کی چیخ کے ساتھ ہی "جو بچ سکے، خود کو بچا لے!" کی چیخیں بھی سنائی دیں۔ منتشر ہوتی ہوئی فوج پگھلتی برف کی مانند ہوتی ہے۔ ہر قسم کی شکست و ریخت، شگاف، گشت، جلو مارہ، زوال، دھکے، عجلت ایک ساتھ سب کچھ ہونے لگتا ہے۔ ایسا انتشار جو پہلے کبھی دیکھا نہیں گیا۔ Ney ایک گھوڑا ڈھونڈ نکالتا ہے، اچھل کر اس پر سوار ہوتا ہے، اور بغیر ہیٹ، بغیر گلوبند یا ٹائی یا تلوار، انگریزوں اور فرانسیسی دونوں کو روکتا برسلز کی سڑک پر چل پڑتا ہے۔ وہ فوج کو ٹھہرانے کی کوشش کر رہا ہے، اسے وہ اپنا فرض سمجھتا ہے، اس کی توہین کرتا ہے، دنگا کرتا ہے۔ اس پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ سپاہی "مارشل زندہ باد" چلاتے ہوئے بھاگتے ہیں۔ Durutte کی خوف زدہ رجمنٹوں میں سے دو Uhlans کی تلواروں کی باڑھ پر ہیں، اور کیمپٹ، جیسٹ، پیک، اور رائیلانڈ کے درمیان آگے پیچھے ہو رہی ہیں؛ دست بدست لڑائی کا بدترین نتیجہ شکست ہوتا ہے؛ دوست فرار ہونے کی کوشش میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگتے ہیں؛ اسکواڈرن اور بٹالین ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، لڑائی کے خوف ناک غصے کی طرح، ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف Lobau، دوسری جانب Reille، انارچی کے بہاؤ میں گرفتار ہے۔ نپولین اپنے بچے کھچے گارڈ سے بے کار دیواریں تیار کر رہا ہے؛ اپنے اسکواڈرن کو کام کے قابل بنانے کی بے کار کوشش کر رہا ہے؛ Vivian کے آگے Quiot، Vandeleur کے آگے

Morand ،Kellermann ،Bulow کے آگے Lobau، Pirch سے آگے Morand، پرنس آف پروشیا کے آگے Domon اور Subervic سب پسپا ہو رہے ہیں؛ Guyot جس نے شہنشاہ کے اسکواڈرن کی کمان کی تھی، انگریزی سواروں کے پیروں تلے گرتا ہے۔نپولین بھگوڑوں، بڑی بڑی باتیں کرنے والوں کے سامنے سے گزرتا ،مطالبہ کرتا ہے، دھمکی دیتا ہے اور التجا کرتا ہے۔وہ تمام منہ جو صبح کو "شہنشاہ زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے اس وقت کھلے رہ گئے، اس کو مشکل سے پہچان رہے تھے۔تازہ دم آئی ہوئی پروشیائی گھڑسوار فوج آگے بڑھتی ہے، صفوں کو کاٹتی ہے، سپاہیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے، قتل کرتی ہے، اور صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔گھوڑے جڑ سکتے ہیں، توپیں فرار ہوتی ہیں؛ توپ خانے کی قطار کے سپاہی گولا بارود کی گاڑیوں سے گھوڑوں کو بے لگام کرتے ہیں اور اپنے فرار میں استعمال کرتے ہیں؛ گاڑیاں الٹی پڑی ہیں، چاروں پہیے ہوا میں معلق ہیں؛ راستے بند ہو جاتے ہیں اور قتلِ عام کا موقع مل رہا ہے۔آدمی کچلے اور پیروں تلے روندے جا رہے ہیں؛ کچھ لوگ زندہ مردہ جسموں پر سے گزر رہے ہیں یا زو کٹ گئے ہیں۔ سڑکیں، راستے، پُل، میدان، پہاڑیاں، وادیاں چالیس ہزار فوجیوں کے حملے سے بے ہوش لوگوں سے پُر ہو گئی ہیں۔شور و غوغا، مایوسی، رائی کے کھیتوں میں بکھرے سفری تھیلے اور بندوقیں، تلواروں کی لوکوں سے بنائے جانے والے راستے میں ہیں؛ نہ ساتھی ہیں، نہ افسر ہیں، نہ جنرل ہیں، بس ایک ناقابلِ بیان عالمِ دہشت ہے۔ Zieten اپنی تفریح کے لیے فرانس کو تلوار کی دھار پر رکھے ہوئے ہے۔شیر بکریوں میں بدل دیے گئے ہیں۔ یہ عالم تھا اس دن فرار کا۔

Genappe کے مقام پر محاذ پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ Lobau نے تین سو نفر جمع کر لیے تھے۔گاؤں میں داخلے کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی، مگر پروشیائیوں کے ایک ہی حملے پر سب بھاگ کھڑے ہوئے، اور Lobau پکڑ لیا گیا۔ اس حملے کے گریپ شاٹ کے نشانات آج بھی اینٹوں سے بنی اس عمارت کی دیواروں پر دیکھے جا سکتے ہیں جو Genappe میں داخلے سے چند منٹ قبل کے فاصلے پر سڑک کی دائیں جانب واقع ہے۔پروشیائی Genappe میں گھس گئے؛ بلا شبہ غصے کے عالم میں تھے، کہ وہی اکیلے فاتح نہیں تھے۔تعاقب حیرت ناک تھا۔بلوخر نے قتلِ عام کا حکم دے دیا تھا۔ Roguet نے اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی فرانسیسی سپاہی پروشیا کے کسی قیدی کو پکڑ لاتا ہے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔بلوخر Roguet پر سبقت لے گیا۔Young Guard کا جنرل Duhesme، Genappe کی ایک سرائے میں داخل ہوا، اپنی تلوار ڈال دی، ایک سپاہی نے وہی تلوار اٹھائی اور اسے قتل کر

دیا۔ ایک مغلوب کے قتل سے فتح مکمل ہو گئی تھی۔ چوں کہ ہم تاریخ ہیں، اس لیے ہم سزا دیں گے
بلوخر نے خود کو رسوا کر لیا۔ درندگی نے تباہی کی تکمیل کی۔ نا امیدی کا راستہ Genappe سے
آگے بڑھا، Quatre-Bras سے آگے بڑھا، Gosselies سے آگے بڑھا، Frasnes
سے آگے بڑھا، Charleroi سے آگے بڑھا، Thuin سے آگے بڑھا اور سرحد پر ہی جا کر
رکا۔ افسوس! کون تھا جو اس انداز میں فرار ہو رہا تھا؟ ایک عظیم فوج!

یہ دوران سر، یہ دہشت، بلند ترین بہادری کا یہ زوال جس نے ہمیشہ تاریخ کو حیران
کیا تھا — کیا بلا وجہ ہوا تھا؟ نہیں۔ ایک بہت بڑے حق کا سایہ واٹرلو کی آڑ میں آگے بڑھا تھا۔
وہ نصیب کا دن تھا۔ اس قوت نے جو انسان سے زیادہ طاقت ور ہے، وہ دن پیدا کیا تھا۔ یہی
ہے وجہ ابروؤں کے شکنوں کی: یہی وجہ ہے ان تمام عظیم انفاس کی جو اپنی تلواریں ڈال دیا کرتے
ہیں۔ وہ جنھوں نے یورپ فتح کیا تھا منہ کے بل زمین پر پڑے ہوئے ہیں، جن کے پاس کہنے یا
کرنے کے لیے کچھ رہ نہیں گیا ہے، سوائے ایک خوف ناک سایے کی موجودگی کے احساس
کے۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اس دن نسلِ انسانی کا منظر نامہ تبدیل ہو گیا تھا۔ واٹرلو انیسویں صدی
کا قلابہ تھا۔ ایک بڑے آدمی کی گم شدگی ایک بڑی صدی کی ابتدا کے لیے ضروری تھی۔ کسی شخص
نے، جس کو کوئی جواب نہیں دیتا تھا، ذمے داری سنبھال لی تھی۔ بہادروں کے خوف کی تشریح کی
جا سکتی ہے۔ واٹرلو کی جنگ میں بادل سے بھی زیادہ کچھ ہے؛ شہاب ثاقب سا کچھ ہے۔ شاید
وہاں سے خدا گزرا ہے۔

سرِ شام، Genappe کے مرغزار کے قریب، Bernard اور Bertrand نے
ایک پریشان حال، متفکر، پُر اسرار، ملول آدمی کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا تھا، جسے تباہی وہاں تک
گھسیٹ لائی تھی، جو گھوڑے سے اُترا ہی تھا، اس کی باگ اپنے بازو پر ڈال لی تھی، اور وحشی
آنکھوں کے ساتھ واٹرلو واپس جا رہا تھا۔

وہ نپولین تھا، وہ اس خواب میں چلنے والا آدمی تھا جو ڈھہ چکا تھا، اور ایک بار پھر پیش
قدمی کی کوشش کر رہا تھا۔

آخری مربع

فرانسیسی گارڈ کے کئی مربعے، شکست کے اس چشمے کے درمیان، جیسے بہتے پانی میں چٹانیں، اپنے آپ کو رات تک سنبھالے رہے۔ رات آئی، ساتھ موت بھی لائی۔ وہ دُہرے سایوں کا انتظار کرتے رہے اور ناقابلِ تسخیر [جذبے] نے انھیں چھپ جانے کی اجازت دی۔ ہر رجمنٹ بقیہ سے الگ، فوج سے کوئی بندھن نہ رکھنے کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اکیلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس آخری کارروائی کی تیاری کر رکھی تھی، کچھ Rossomme کی بلندیوں پر تھے، کچھ Mont-Saint-Jean کے میدان میں۔ وہاں متروک، مفتوح، خوف میں غرق اور افسردہ مربعے خوف ناک انداز میں موت کے کرب کو برداشت کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ Ulm, Wagram, Jena, Friedland موت کی نیند سو گئے تھے۔

اندھیرا ہوتے، رات کے نو بجے کے قریب، ان میں سے ایک Saint-Jean کی سطحِ مرتفع کے پائیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس مہلک وادی میں، ڈھلان کے آخری درجے پر، زرہ پوش جہاں تک بکھر چکے تھے، اور اب انگریزوں کے ہجوم میں غرق تھے، چاروں طرف سے بڑھتے ہوئے فاتح گھڑسواروں کی گولیوں کی بھیانک چھاؤں میں یہ مربع لڑتا رہا۔ اس کی کمان ایک غیر معروف افسر Cambronne کر رہا تھا۔ ہر نکلتے گولے کے ساتھ مربع کم ہو رہا تھا مگر حملے کا جواب دے رہا تھا۔ وہ گریپ شاٹ کا جواب بندوق برداروں کے ایک باڑے سے دے رہے تھے جس کا احاطہ مسلسل سکڑتا جا رہا تھا۔ فراری دم چڑھنے کے باعث سانس لینے کے لیے دور جا کر رُکتے، اور اس اندھیرے میں اس ملول کر دینے والی، ہمہ وقت کم ہوتی، گرج کو سن رہے تھے۔

جب یہ لشکر مٹھی بھر لوگوں تک کم ہو چکا تھا؛ جب ان کا پرچم چیتھڑے سے زیادہ نہیں

رہ گیا تھا؛ جب ان کی توپیں، گولیاں سب ختم ہو چکی تھیں؛ جب سوائے تلواروں کے ان کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا؛ جب مردہ جسموں کے ڈھیر بچ جانے والوں سے بڑے ہو چکے تھے، فاتحین کے درمیان، ان لوگوں کے درمیان جو اتنے ارفع انداز میں مر رہے تھے؛ ایک قسم کی دہشت کا راج تھا اور انگریزی توپ خانہ سانس لینے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ اس سے ایک عارضی مہلت ملی۔ ان لڑنے والوں کے اطراف بھوت پریت جیسا خوف انگیز ایک ہجوم تھا، گھڑ سواروں کا، سیاہ توپوں کا؛ جن کے پہیوں کے پار آسمان کی سفیدی دکھائی دیتی تھی، موت کا اٹھتا ہوا بھیانک سر جسے ہیرو، دھوئیں میں، لڑائی کی گہرائیوں میں، دیکھ رہے تھے، جو ان کی طرف بڑھ رہا تھا، ان کو گھور رہا تھا۔

شام کے اندھیرے میں انھیں سامان لادے جانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں؛ جلتی دیا سلائیوں کے شعلے، جیسے رات کے اندھیرے میں چیتے کی چمکتی آنکھیں، ان کے سروں کے اطراف دائرہ بنا رہے تھے؛ انگریزی توپ خانے کے تمام شعلے توپوں کی طرف بڑھے، اور پھر چند لمحوں کے بعد ایک انگریز جنرل — کچھ کے مطابق کالول، کچھ کے مطابق میٹ لینڈ — نے چیخ کر کہا تھا: ''بہادر فرانسیسی فوجیو، ہتھیار ڈال دو!''

Cambronne نے جواب دیا، ''......''

⁂

کمبرون

اگر کسی فرانسیسی قاری کو اعتراض ہو کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو ہمیں اس کی موجودگی میں وہ نفیس ترین جواب دُہرانے سے پرہیز کرنا چاہیے، جیسا شاید ہی کسی فرانسیسی نے کبھی دیا ہوگا۔

مگر اپنی تمام تر ذمے داری پر ہم اس تاکید کو نظر انداز کریں گے۔

اور اب، ہمیں ان دیو ہیکل انسانوں کے درمیان ایک دیو ہیکل انسان رہا ہے — کمبرون (Cambronne) نظر آرہا ہے۔

ایسا جواب دینا اور اس کے بعد برباد ہو جانا! اس سے بڑھ کر شان دار بات کیا ہو سکتی ہے؟ موت کے لیے تیار رہنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے مر جانا! اور یہ اس آدمی کی غلطی نہیں تھی، اگر گولی مارے جانے کے بعد بھی وہ بچ گیا تھا۔

اس لڑائی کا فاتح نپولین نہیں تھا، جس کو فرار ہونا پڑا تھا! نہ ویلنگٹن فاتح تھا جو چار بجے راستہ دے رہا تھا، اور پانچ بجے پچھتا رہا تھا! نہ بلوخر تھا، جس نے دست بدست لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ واٹرلو کا اصل فاتح کمبرون تھا۔

اس قسم کا گرج دار جواب، ایک جھماکے کی طرح دینا ہی، جو آپ کو مار دینے والا ہو، فتح کرنا ہوتا ہے!

اس طرح کسی تباہی کا جواب دینا، تقدیر سے اس طرح کلام کرنا، مستقبل کے کسی شیر کو اس قسم کا پائیدان فراہم کرنا، چیلنج کرنے کے مترادف ہے: آدھی رات کے طوفانِ باد و باراں کو، ہوگومونٹ کی دیوار کو، Ohain کی خستہ سڑک کو، گراوچی کی تاخیر کو، بلوخر کی آمد کو، گر جانے کے

بعد بھی خود کو کھڑا ظاہر کرنا؛ یورپی اتحاد کے دو ٹکڑوں میں غرق ہو جانا؛ بادشاہوں کو وہ راز داری فراہم کرنا، کبھی سیزر بھی جس سے آشنا تھے؛ کمترین الفاظ کو فرانس کی شان میں لپیٹ کر ارفع ترین بنا دینا؛ واٹرلو کو گستاخی سے جشن پر ختم کر دینا؛ Rabellais کے ذریعے Leonidas کو ختم کر دینا؛ اس فتح کے سر پر ایسے لفظ کا تاج پہنا دینا جس کا بولا جانا ممکن نہیں؛ میدان ہار جانا مگر تاریخ کو محفوظ رکھنا؛ اس قسم کے قتلِ عام کے بعد بھی ہنسی کو اپنے ساتھ رکھنا— یہی عظیم ہوتا ہے۔

یہ ایسی توہین تھی جیسی کوئی گرجتا بادل ہی دے سکتا ہے۔ یہ تو AEschylus کے شکوہ تک پہنچ گئی تھی۔

کمبرون کا جواب ایک شدید پیدا ہونے والی رُکاوٹ کا اثر رکھتا ہے۔ یہ نفرت سے کسی کا دل توڑ دینا ہے۔ یہ سینے توڑ کر نکل پڑنے والے کرب جیسا ہے۔ فتح کس نے پائی؟ ویلنگٹن نے؟ جی نہیں۔ اگر بلوخر نہ ہوتا تو یہ شخص ختم ہو گیا ہوتا تو پھر کیا بلوخر نے فتح کیا تھا؟ جی نہیں۔ اگر ویلنگٹن نے شروعات نہ کی ہوتی تو بلوخر ختم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کمبرون، یہ آدمی جو اپنا آخری لمحہ تک خرچ کر رہا تھا، یہ نامعلوم سپاہی، جنگ کا یہ حقیر ترین حصہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب غلط بیانی ہے؛ غلط بیانی اور وہ بھی تباہی کے عالم میں، اور دُہرا کرب پیدا کرنے والی غلط بیانی؛ اور ایسے وقت میں جب اس کا غصہ اسی کی وجہ سے قابو سے باہر ہو رہا ہے، اس کو اسی کا تمسخر پیش کیا جا رہا ہے— یعنی، زندگی! وہ کس طرح خود کو روک سکتا ہے؟ سامنے یورپ کے سارے بادشاہ ہیں؛ فتح سے مست جنرل ہیں؛ ان کے پاس ہزاروں فاتح سپاہی ہیں، اور پشت پر کروڑوں ہیں؛ ان کی توپیں منہ کھولے کھڑی ہیں، اور [فلیتوں میں آگ لگانے کے لیے] دیا سلائیاں روشن ہو گئی ہیں؛ وہ اپنی ایڑیوں کے نیچے شاہی گارڈ کو، اور عظیم فوج کو پیسے ڈال رہے ہیں؛ انھوں نے ابھی نپولین کو کچلا ہے، اور صرف کمبرون باقی بچا ہے— احتجاج کے لیے صرف یہ کیچوا ہی بچا ہے۔ یہ کیچوا احتجاج کرے گا لہٰذا مناسب لفظ کی تلاش میں ہے، اسی طرح جیسے کوئی تلوار کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے، اور جھاگ ہی وہ لفظ ہے۔ اس معمولی اور زور آور فتح کے سامنے، جو کسی کو فاتح قرار نہیں دے رہی ہے، یہ بے چارہ سپاہی تنا کھڑا ہے۔ وہ اپنی تمام تر عظمت پیش کر رہا ہے، مگر اس کی بے بضاعتی بھی قائم کر رہا ہے؛ اور اس پر تھوک بھی رہا ہے۔ کثرت اور بے رحم کے دباؤ کے پیشِ نظر اسے اپنے نفس میں ایک لفظ "فضلہ" مل جاتا ہے۔ گویا، ہم ایک بار پھر کہنا چاہ رہے ہیں کہ اس لفظ کا استعمال، یا ایسے اظہار کی ایجاد ہی اسے فاتح بناتی ہے

ان زبردست دنوں کے جذبے کا عین اس لمحے اس غیر معروف آدمی پر نزول ہوا۔
کمبرون نے واٹرلو کے لیے اسی طرح کا ایک لفظ ایجاد کیا تھا جس طرح Rouget پر اوپر سے اچانک "Marseillaise" کا لفظ نازل ہوا تھا۔ ان آدمیوں کو ایک ربانی بگولا گھیر لیتا ہے، وہ لرز جاتے ہیں، اوران میں سے ایک سب سے برتر گیت گانے لگتا ہے، جب کہ دوسرے کے منہ سے ایک خوف ناک چیخ ابھرتی ہے۔

یورپ پر خود، یا سلطنت کی جانب سے، کمبرون ایک دیو پیکر نفرت کا چیلنج اچھالتا ہے— یہ ایک چھوٹی سے بات ہوگی؛ دراصل، یہ کام وہ ماضی پر، اور انقلاب کے نام پر کر رہا ہے۔ چیلنج سنا جاتا ہے، اور کمبرون کو قدیم عفریتی جذبے کے زیر اثر سمجھا جاتا ہے۔ [اس لمحے] Danton بولتا محسوس ہوتا ہے۔ Kleber ڈکارتا محسوس ہوتا ہے۔

کمبرون کے منہ سے اس لفظ ["........."] کے نکلتے ہی ایک انگریزی آواز گونجی "چلاؤ گولی!" توپوں کے دہانوں سے آگ نکلنے لگی، پہاڑی لرز گئی، ان تمام کھلے دہانوں سے گریپ شاٹ کا آخری لاوا ابلا؛ چاند کی روشنی میں، تقریباً سفید رنگ کا دھواں پھیل گیا، اور جب دھواں بکھرا تو وہاں کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ تمام باقیات صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تھیں؛ گارڈ مر چکے تھے۔ مورچے کی چاروں دیواریں ختم ہو گئی تھیں، اور یہاں وہاں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا، حتیٰ کی جسموں میں ہلکا سا لرزہ بھی نہیں تھا؛ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا Mont-Saint-Jean پر، روما کے لشکروں سے بھی بڑا فرانس کا لشکر موت کی نیند سو گیا ہے، اس مٹی پر جو بارش اور خون سے سینچی گئی تھی، اس مقام پر جہاں سے آج کل جوزف، جو Nivelles سے ڈاک کی گاڑیاں چلاتا ہے، گھوڑوں کو چابک مارتا، خوش خوش سیٹی بجاتا، صبح کے چار بجے گزرتا ہے۔

۞

جرنیلوں کی تاریخ

واٹرلو کی جنگ کیا ہے، ایک معما ہے۔ یہ جیتنے والوں کے لیے بھی اتنی ہی مبہم ہے، جتنی کہ ہارنے والوں کے لیے۔ نپولین کے لیے یہ ایک پریشانی تھی؛ بلوخر کو اس میں سوائے آگ کے کچھ دکھائی نہیں دیتا؛ ویلنگٹن اس بارے میں کچھ سمجھ نہیں پاتا۔ ذرا ان اطلاعات پر نظر کیجیے۔ اعلانات الجھے ہوئے ہیں، مذکرے گرفتہ ہیں۔ کچھ لوگ ہکلاتے ہیں، کچھ تھتلاتے ہیں۔ Jomini نے واٹرلو کی جنگ کو چار لمحوں میں تقسیم کیا ہے؛ Muffling اس کو تین تبدیلیوں میں کاٹتا ہے؛ صرف Charras کے، اگرچہ اس کے کچھ نکات کے بارے میں ہمارا فیصلہ کچھ اور ہے، انسانی جوہر قابل کی تباہی کے اتفاقیہ تنازعات کی نمایاں صفات کے بارے میں کچھ اور خود پسندانہ نظریات ہیں۔ بقیہ سارے تاریخ داں چکا چوند کے ستائے ہوئے ہیں، اور اس چکا چوند کی کیفیت میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ وہ دن برق کی سی روشنی اور چمک دمک کا دن تھا؛ دراصل عسکری شہنشاہی کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد، جس نے شاہوں کو حواس باختہ کر دیا تھا، تمام بادشاہتیں اس کی اپنی لپیٹ میں آگئی تھیں؛ یعنی طاقت کا زوال ہو گیا تھا اور جنگ کو شکست ہو گئی تھی۔

اس فوق البشر واقعے میں آدمیوں کا ادا کیا کردار صفر کے برابر تھا۔

اگر ہم ویلنگٹن سے واٹرلو کو علاحدہ کر لیں تو کیا اس طرح ہم انگلستان اور جرمنی کو کسی شے سے محروم کر دیتے ہیں؟ جی نہیں۔ واٹرلو کے مسئلے میں نہ معروف انگلستان شامل ہے، نہ بلند پایہ جرمنی۔ شکر خدا، کہ معصومانہ کنفی کارناموں کے باوجود یہ دونوں قومیں عظیم ہیں۔ تلوار کی نیام کے اندر نہ انگلستان پوشیدہ ہے، نہ جرمنی پوشیدہ ہے اور نہ فرانس۔ ایسے دور میں جب واٹرلو صرف تلوار کا تصادم سمجھا جاتا ہے، بلوخر سے بلند، جرمنی کے پاس شلر ہے؛ ویلنگٹن سے بلند، انگلستان

کے پاس بائرن ہے۔ ہماری صدی کا وسیع سویرا خیالات کی ندرت ہے، اور اس طلوعِ فجر میں انگلستان اور جرمنی کی پُر شکوہ تابندگی شامل ہے۔ یہ پُرجلال ہیں، اس لیے کہ یہ سوچتے ہیں۔ درجات کی بلندی جو یہ تہذیب کو فراہم کرتے ہیں، ان کے باطن کا حصہ ہیں۔ یہ بلندی کسی حادثے سے نہیں خود ان ہی میں سے نکلتی ہے۔ انیس ویں صدی کی سرفرازی جو ان کی لائی ہوئی ہے، اس کا منبع واٹرلو نہیں۔ وہ وحشی لوگ ہوتے ہیں جو کسی فتح کے بعد تیزی سے ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ یہ طوفانی سیلابوں جیسی عارضی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ ہمارے زمانے کے مہذب لوگ کسی اچھے یا بُرے کپتان کے ذریعے نہ باعزت ہوتے ہیں، نہ رُسوا ہوتے ہیں۔ نسلِ انسانی کی "ثقافتِ اضافی" (specific gravity) لڑائی کے بجائے کسی اور ارفع شے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خدا کا شکر کہ ان کی عزت، ان کا وقار، ان کی ذہانت، ان کا جوہر قابل محض اعداد نہیں ہوتے جسے قمار باز، ہیرو اور فاتحین جنگوں کی قرعہ اندازی میں رکھ سکیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگ ہاری جاتی ہے اور ترقی جیتی جاتی ہے۔ اس میں شان کم ہوتی، آزادی زیادہ ہوتی ہے۔ نقارہ خاموش ہو جاتا ہے، دانش حرف سنبھال لیتی ہے۔ یہ ایسا کھیل ہے جس میں ہارنے والا جیت جاتا ہے۔ لہٰذا دونوں جانب سے ہمیں واٹرلو کے معاملے میں سرد مہری برتنی چاہیے۔ اتفاق کو وہی کچھ دینا چاہیے جو اتفاقیہ ہوتا ہے، اور خدا کو، جو خدا کے لیے ہوتا ہے۔ واٹرلو کیا ہے؟ فتح ہے؟ جی نہیں، قرعہ اندازی میں نکلنے والا محض ایک ہندسہ ہے!

وہاں کسی شیر کو لا کر رکھ دینا بے کار ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ واٹرلو تاریخ کا انوکھا ترین مقابلہ ہے۔ نپولین اور ویلنگٹن! وہ دشمن نہیں؛ مخالفین ہیں۔ نہ خدا نے، جو صنعتِ تضاد کو پسند کرتا ہے، ان میں کچھ زیادہ جاذبِ نظر فرق بنایا ہے، نہ غیر معمولی تقابل ممکن ہے۔ ایک جانب درستی ہے؛ دور اندیشی ہے؛ جیومیٹری ہے، سوچی سمجھی پسپائی ہے؛ فاصل پس اندازی ہے جس میں ایک قسم کی ضد کی بے مہری ہے؛ ایک غیر مغشوش طریقہ ہے؛ حکمتِ عملی ہے، جو بنیادی فائدہ اٹھاتی ہے؛ جوڑ توڑ ہے جو بٹالینوں کے درمیان توازن برقرار رکھتی ہے؛ اصولوں کے مطابق قتلِ عام کیا جاتا ہے؛ ہاتھ میں گھڑی تھام کر باقاعدہ جنگ کی جاتی ہے؛ کوئی بات رضاکارانہ طور پر اتفاق پر نہیں چھوڑی جاتی؛ قدیم کلاسیکی ہمت میں مکمل یکسانیت ہوتی ہے۔ دوسری جانب وجدان ہے؛ پیشین گوئی ہے؛ فوجی انوکھا پن ہے؛ سپر فوق البشر جبلت ہے؛ شعلہ بار نظر ہے؛ کوئی ناقابلِ بیان شے ہے جو عقابی نظروں سے دیکھ رہی ہے، اور جو بجلی کی طرح گرتی ہے؛ نفرت انگیز تعجیل کے ساتھ ایک نرالا فن ہے؛ ایک عمیق نفس

کے تمام راز ہیں جو مقسوم سے منسلک ہیں؛ چشمہ ہے؛ میدان ہے؛ جنگل ہے؛ پہاڑی ہے؛ جن کو ایک حکم سے طلب کیا جاتا ہے؛ فرماں برداری پر مجبور کیا جاتا ہے؛ جابر حکمران میدانِ جنگ میں بھی ظلم کرتا ہے؛ ستارے پر یقین کیا جاتا جس میں حکمتِ عملی کی سائنس بھی ملی ہوتی ہے، جو بڑھاتی ہے مگر اسے پریشان کرتی رہتی ہے۔ ویلنگٹن جنگ کا باریم [Bareme۔ مشہور فرانسیسی ریاضی داں] تھا؛ نپولین اس کا مائیکل انجیلو تھا؛ اور اس موقعے پر جوہرِ قابل کو حساب دانی نے زیر کر لیا تھا۔ دونوں جانب کسی کا انتظار تھا۔ درست حساب داں کامیاب ہوا تھا۔ نپولین گراوچی کا منتظر تھا؛ وہ آیا نہیں۔ ویلنگٹن بلوخر کے انتظار میں تھا؛ وہ آ گیا تھا۔

ویلنگٹن ایک کلاسیکی جنگ کی طرح ہے جو اپنا بدلہ لے رہا ہے۔ نپولین نے، اپنی ابتدا میں اطالیہ میں اس کا مقابلہ کیا تھا اور شان و شوکت سے اسے شکست دی تھی۔ نوجوان گدھوں کے مقابلے سے پرانا بوم فرار ہو گیا تھا۔ پرانی چالوں نے اسے نہ صرف برق کی طرح مارا تھا، بلکہ رسوا بھی کیا تھا۔ کون تھا وہ چھبیس آدمیوں والا کارسیکائی؟ اس دل فریب احمق کی اہمیت کیا تھی، جو اپنی مخالف ہر شے کے بغیر جب کہ اس کے حق میں کوئی نہیں تھا، بغیر سامان کے، بغیر گولا بارود کے، بغیر توپ کے، بغیر جوتوں کے، تقریباً بغیر کسی فوج کے، ایک ہجوم کے مقابلے پر، مٹھی بھر آدمیوں کے بل پر، متحد یورپ پر کود پڑا تھا اور بے سروپا اور ناممکن جنگیں جیت لی تھیں؟ کس نے اس سزا یافتہ کو آزاد کیا تھا، جس نے تقریباً ایک سانس میں، صرف اتنے ہی سپاہیوں کے ساتھ، جرمنی کے شہنشاہ کی، ایک کے بعد دوسری، پانچ فوجوں کو پیس کر رکھ دیا تھا، Alvinzi نے Beaulieu کو، Beaulieu نے Wurmser کو، Wurmser نے Melas کو، Melas نے Mack کو الٹ کر رکھ دیا تھا؟ کون تھا وہ، جنگ میں نیّرِ تاباں کی سی دیدہ دلیری رکھنے والا نو آموز؟ عسکری اکادمی نے اسے نکال باہر کیا تھا، جس کے باعث اس کا مقام چھن گیا تھا؛ جب سے قدیم سیزری سنگ دلانہ عداوت نئے سیزر کے خلاف ہو گئی تھی، عام تلوار شعلہ بار تلوار کے خلاف ہو گئی تھی اور محکمۂ مالیات جوہرِ قابل کے خلاف ہو گیا تھا۔ 18 جون 1815ء کو آخری موقع ملا تھا اور Lodi، کے بعد Montebello, Montenotte, Mantua, Arcola، نے لکھا تھا: واٹرلو — درمیانہ درجے کے لوگوں کی فتح تھی، جو اکثریت کے لیے اچھی تھی۔ نصیب نے اس ستم ظریفی کو قبول کر لیا تھا۔ اپنے زوال میں نپولین کو Wurmser مل گیا تھا، ایک بار پھر ایک نوجوان اس کے رُوبہ رُو تھا۔

دراصل Wurmser کو گرفت میں لینے کے لیے ویلنگٹن کے بال سفید کر دینے کافی تھے۔

واٹرلو اوّل درجے کی لڑائی ہے، جو دوسرے درجے کے کپتان نے جیت لی ہے۔

واٹرلو کی لڑائی میں جس کی تعریف کی جانے چاہیے وہ انگلستان خود ہے؛ انگریزی استقلال؛ انگریزی ہمت؛ انگریزی خون۔ انگلستان کی سب سے بڑی خوبی خود انگلستان تھا؛ اس کی فوج کا کپتان نہیں، اس کی فوج تھی۔

ویلنگٹن نے لارڈ باتھ ہرسٹ کو لکھے ایک خط میں بڑے عجیب انداز میں اعلان کیا تھا کہ اس کی فوج، وہ فوج جو 18 جون 1815ء کے دن لڑی تھی ''نفرت انگیز فوج'' تھی۔ واٹرلو کے کھیتوں میں دفن ملی جلی ہڈیاں کیا سوچیں گی؟

ویلنگٹن کے معاملے میں انگلستان زیادہ ہی محتاط رہا ہے۔ ویلنگٹن کو اس قدر عظیم بنانے میں انگلستان کی سبکی ہوتی ہے۔ ویلنگٹن کئی دوسرے بہادروں کی طرح ایک بہادر تھا۔ وہ اسکاٹش Grays؛ وہ گھڑ سوار گارڈ؛ میٹ لینڈ اور مچل کی وہ رجمنٹیں؛ پیک اور کیمپٹ کی پیدل افواج؛ پانسانبی اور سمرسٹ کی وہ گھڑسوار فوج؛ گریپ شاٹ کی بارش میں بینڈ باجا بجانے والے وہ پہاڑی لوگ؛ رائیلانڈز کی وہ بٹالین؛ وہ بالکل نئے رنگروٹ جنھیں ٹھیک سے توڑا بندوق بھرنا بھی نہیں آتا تھا جو Essling اور Rivoli کے سپاہیوں کے سامنے ڈٹ گئے تھے — یہ بہت بڑی بات تھی۔ ویلنگٹن مضبوط اعصاب کا انسان تھا؛ اسی میں اس کی خوبی پنہاں تھی، اور ہم اس کو کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں؛ اس کے پیدل سپاہیوں اور گھڑسواروں میں اس جیسے کم ہی رہے ہوں گے۔ ایک آہنی سپاہی، آہنی ڈیوک جیسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں، ہماری تمام تعریفیں انگریزی سپاہی، انگریزی فوج، انگریزی عوام کے لیے ہیں۔ اگر اس کا کوئی انعام ہوتا تو وہ انگلستان ہی کو دیا جاتا۔ واٹرلو کا تاریخی ستون زیادہ حقیقی ہوتا، اگر اس کی بلندی پر ایک فردِ واحد کے بجائے عوام کا مجسمہ ہوتا۔

مگر عظیم انگلستان ہماری اس بات پر ناراض ہوگا۔ وہ اپنے 1688ء اور ہمارے 1789ء کے بعد بھی اپنے جاگیردارانہ التباس پر نازاں ہے۔ وہ قوم اپنی وراثت اور اپنے نظام پر یقین رکھتی ہے۔ وہ عوام، جو طاقت اور شان میں سب سے آگے نکل گئے ہیں، خود کو عوام نہیں، ایک قوم گردانتے ہیں۔ اور عوام کی حیثیت میں وہ بالارادہ خود کو محکوم سمجھتے ہیں اور ایک لارڈ کو اپنا حاکم مانتے ہیں۔ ایک کاریگر کی حیثیت میں، وہ خود کو نالائق سمجھنے کی اجازت دیتے ہیں؛ ایک سپاہی کی حیثیت میں خود پر کوڑہ زنی کی اجازت دیتے ہیں۔

یہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ Inkermann کی لڑائی میں ایک سارجنٹ نے پوری

فوج کو بچا لیا تھا، مگر لارڈ پیگلان (Paglan) اس کی ذاتی بہادری کا تذکرہ نہیں کر سکا تھا، اس لیے کہ انگریزی فوجی نظام اپنی اطلاعات میں افسر کے عہدے سے کم، کسی فرد کی بہادری کے بیان کی اجازت نہیں دیتا۔

واٹرلو جیسی لڑائی میں ہم سب سے زیادہ جس بات کی تعریف کرتے ہیں وہ اتفاق کی حیرت انگیز چالاکی ہے۔ شبینہ بارش؛ ہوگومونٹ کی دیوار؛ Ohain کی کھوکھلی سڑک؛ گراؤچی کا توپ کے سلسلے میں بہرا پن؛ نپولین کے رہنما کی دھوکا دہی؛ بولو کے رہنما کا اسے باخبر رکھنا — یہ ساری طوفانیت حیرت انگیز طور پر سرانجام ہو گئی تھی۔

ہمیں کہنے کی اجازت دیجیے کہ مجموعی طور پر، واٹرلو میں جنگ کم ہوئی تھی، قتلِ عام زیادہ ہوا تھا۔

میدانوں کے دو بدو مقابلوں میں، واٹرلو کی لڑائی وہ واحد لڑائی تھی جس میں اتنے بہت سے لڑنے والوں کی تعداد کے مقابلے میں محاذ بہت چھوٹا تھا؛ نپولین کے پاس تین چوتھائی لیگ، اور ویلنگٹن کے پاس نصف لیگ کے برابر میدان تھا؛ دونوں جانب بہتر ہزار لڑنے والے تھے۔ اس قتلِ عام کی اصل وجہ یہ گنجان پن تھی۔

مندرجہ ذیل حساب کیا گیا ہے اور اس میں مندرجہ ذیل تناسب دیکھا گیا ہے۔ سپاہیوں کے نقصانات: Austerlitz میں: فرانسیسی چودہ فی صد؛ روسی تیس فی صد؛ آسٹریائی چوالیس فی صد۔ Wagram میں فرانسیسی تیرہ فی صد؛ آسٹریائی چودہ فی صد۔ ماسکو میں: فرانسیسی سینتیس فی صد؛ روسی چوالیس فی صد۔ Bautzen میں: فرانسیسی تیرہ فی صد؛ روسی اور پروشیائی چودہ فی صد۔ واٹرلو میں: فرانسیسی چھپن فی صد۔ کُل جمع ایک لاکھ چالیس ہزار لڑنے والے تھے، اور ساٹھ ہزار موت کا شکار ہوئے تھے۔

آج واٹرلو کے میدان میں وہی سکون ہے جو زمین کا حق ہے؛ آدمی کی جذبات سے عاری مدد حاصل ہے، اور یہ تمام میدانوں سے مشابہ ہے۔

رات کے وقت اس میں سے ایک قسم کی تصوراتی دھند بلند ہوتی ہے؛ اور اگر کوئی مسافر یہاں ٹہلتا ہے، اگر سنتا ہے، اگر دیکھتا ہے، اگر وہ ورجل کی طرح Philippi کے میدانوں میں خواب دیکھتا ہے، تو تباہی کا فریبِ نظر اس پر چھا جاتا ہے۔ جون کی خوف انگیز اٹھارویں تاریخ ایک بار پھر تازہ ہو جاتی ہے؛ جھوٹی یادگار پہاڑی غائب ہو جاتی ہے؛ شیر ہوا میں معدوم ہو جاتا ہے؛ میدانِ جنگ اپنا حقیقی روپ دھار لیتا ہے؛ پیدل افواج کی صفیں میدان میں لہرانے لگتی ہیں؛

ایک برہم تندی افق کو پار کرتی ہے؛ خوف زدہ خواب دیکھنے والا تلواروں کی کوند دیکھتا ہے، سنگینوں کی چمک دیکھتا ہے، بموں کے شعلے دیکھتا ہے، گرج دھمک کا خوف ناک تبادلہ دیکھتا ہے۔ وہ سب کچھ سنتا ہے: مزار کی گہرائیوں میں موت کھڑکھڑ؛ خیالی جنگ کا مبہم ہنگامہ؛ وہ سایے سپاہی ہیں، وہ روشنیاں زرہ پوش ہیں؛ وہ ڈھانچا نپولین ہے، دوسرا ڈھانچا ویلنگٹن ہے؛ ان سب کا اب وجود نہیں؛ اس کے باوجود آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں، اب بھی لڑتے ہیں؛ اور پہاڑی ندیاں ارغوانی ہو گئی ہیں؛ درخت لرز رہے ہیں؛ بادلوں میں، پرچھائیوں میں بھی غصہ ہے؛ وہ تمام خوف ناک بلندیاں، ہوگومونٹ، Mont-Saint-Jean، Frischemont، Papelotte، Plancenoit سب آپس میں ابھی نظر آتی ہیں، اور بھوتوں کے بگولوں کے تاج سے مزین، ایک دوسرے کو تہس نہس کرنے میں مشغول ہیں۔

کیا واٹرلو کو اچھا سمجھا جائے؟

ایسا ایک بڑا دبستان بھی ہے جو واٹرلو سے نفرت نہیں کرتا۔ ہم اس سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہمارے نزدیک واٹرلو محض ایک احمقانہ تاریخِ آزادی ہے۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ ایسے انڈے سے ایسا عقاب برآمد ہونا چاہیے۔

اگر کوئی اس سوال سے بلند ہو کر دیکھے تو واقعی واٹرلو کی فتح بالارادہ ایک ردِ انقلاب نظر آتی ہے۔ یہ یورپ بمقابلہ فرانس ہے؛ یہ پیٹرزبرگ، برلن اور ویانا بمقابلہ پیرس ہے؛ یہ بد ستور بمقابلہ پیش قدمی ہے؛ یہ چودہ جولائی 1789ء بمقابلہ بیس مارچ 1815ء ہے؛ یہ منہ زور فرانسیسی فسادات کے مقابلے میں شاہی کی اپنے گھر کی صفائی ہے۔ یہ خواب تھا ان تمام لوگوں کی مکمل صفائی کا جو چھبیس برس سے ابال پر تھے۔ یہ برنسوک والوں کا، نساؤ والوں کا Romanoff والوں کا، Hohenzollern والوں کا، Hapsburg والوں کا Bourbon والوں سے اتحاد تھا۔

واٹرلو کو اپنے crupper پر [گھوڑے کی دُم کے نیچے سے گزارا جانے والا تسمہ جو زین کو مستحکم رکھنے کے لیے کسا جاتا ہے] ابدی حق تھا۔ یہ سچ ہے کہ جابرانہ ہونے کے باوجود بادشاہت روشن خیال ہونے پر مجبور تھی، اور ایک آئینی حکم واٹرلو کا، فاتحین کے نزدیک، ایک ناپسندیدہ نتیجہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلاب کو واقعی فتح نہیں کیا جا سکتا ہے، اور مکمل طور پر مہلک ہونے کے باعث، یہ ہمیشہ تازہ ہو کر ابھرتا رہتا ہے: واٹرلو سے پہلے بوناپارٹ کے پیکر میں جس نے پرانے تخت تہہ و بالا کر دیے تھے؛ واٹرلو کے بعد لوئی ہشتدہم کے پیکر میں ظاہر ہوا تاکہ وہ فرمان کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے۔ بوناپارٹ نے ایک کوچوان کو نیپلز کے تخت پر، اور ایک سارجنٹ کو سویڈن کے تخت پر بٹھا دیا تھا، جو برابری کے اظہار کے ذریعے نابرابری کا استعمال تھا؛ لوئی ہشتدہم Saint-Ouen میں آدمی کے حقوق کے اعلان کی تصدیق کرتا ہے۔ اگر

آپ جاننا چاہتے ہیں کہ انقلاب کیا ہوتا ہے تو اس کو ترقی کہیے؛ اور اگر آپ قدرتی ترقی کے بارے میں معلومات مہیا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو آنے والا کل — فردا — کہیے۔ فردا پنا کام تیزی سے پورا کرتا ہے، اور آج بھی اسے تیزی سے پورا کر رہا ہے۔ یہ حیرت انگیز طور پر اپنے ہدف تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ویلنگٹن سے Foy کا کام لیتا ہے، جو محض ایک سپاہی، ایک خطیب تھا۔ Foy ہوگوموںٹ میں گرتا ہے اور ایک بار پھر tribune کی صورت میں اٹھتا ہے۔ اسی طرح ترقی آگے بڑھتی ہے۔ کام کرنے والے کے لیے کوئی اوزار خراب نہیں ہوا کرتا۔ یہ الگ نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ اپنے مقدس کام کے مطابق خود کو ترتیب دے لیتا ہے، اس آدمی کی طرح جس نے ایلپس کو سر کیا ہے اور قدیم لڑکھڑاتے Father Elysee پر چڑھتا ہے۔ یہ گٹھیا کے مارے آدمی کے ساتھ ساتھ فاتح کو بھی استعمال کرتا ہے؛ فاتح کے بغیر اور اندرونی گٹھیا کے مارے آدمی کے ساتھ تلوار کی مدد سے یورپ کے تخت و تاج کی تباہی کی جلد تکمیل سے کوئی اثر نہیں پڑا تھا، سوائے اس کے کہ واٹرلو نے انقلابی کام کو کسی اور طرف جاری رکھنے میں مدد کی تھی۔ کاٹنے والے کام ختم کر چکے ہیں؛ اب سوچنے والوں کی باری ہے۔ اس صدی نے، واٹرلو نے جس کو روکنے کی کوشش کی تھی، اپنی پیش قدمی جاری رکھی ہے۔ اس نامبارک فتح کو آزادی نے زیر کر لیا تھا۔ المختصر، غیر متازعہ انداز میں وہ جو واٹرلو میں فاتح رہا تھا؛ وہ جو ویلنگٹن کے پیچھے مسکرایا تھا؛ وہ جو اس تک فرانس کے سپہ سالار سمیت، یورپ کے تمام سپہ سالاروں کو لایا تھا؛ وہ جو شیر کے مجسمے کا ٹیلا بنانے کے لیے بہ خوشی ہڈیوں سے بھرے تھیلے لایا تھا؛ وہ جس نے اس کے پائیدان پر فاتحانہ انداز میں "June 18, 1815" کندہ کیا تھا؛ وہ جس نے بلوخر کی اس وقت ہمت افزائی کی تھی جب اس نے سریع الحرکت فوج کو تلوار کی باڑھ پر رکھ لیا تھا؛ وہ جو Mont- Saint-Jean کی سطح مرتفع سے فرانس پر شکاری پرندے کی طرح چکر لگا رہا تھا، وہی ردِ انقلاب تھا۔ وہ ردِ انقلاب تھا جس نے سرگوشی میں بدنامِ زمانہ الفاظ "ٹکڑے ٹکڑے کر دینا" ادا کیا تھا۔ پیرس پہنچنے پر اس نے قریبی گڑھے دیکھے تھے؛ اس نے وہ راکھ محسوس کی تھی جس نے اس کے پاؤں جلا دیے تھے، اور اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا تھا؛ وہ ایک فرمان کی لکنت پر واپس ہوا تھا۔

آیئے، ہم واٹرلو میں صرف وہی کچھ دیکھتے ہیں جو واٹرلو میں موجود ہے۔ اس میں ارادی آزادی جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ ردِ انقلاب از خود روشن خیال تھا، اسی طرح جیسے نپولین از خود انقلابی تھا۔ 1815ء جون کی اٹھارہویں تاریخ کو گھوڑے پر سوار روبز پیاغ [Robespierre فرانس کے مشہور قانون دان] کو اس کی زین سے دھکیل دیا گیا تھا۔

خداداد حقوق کی علامات کا اعادہ

آمریت کا خاتمہ۔ یورپ کے پورے نظام کی مسماری۔

پوری سلطنت اس طرح اداسی میں ڈوب گئی جیسا کہ ختم ہوتے وقت روما کی دنیا کا حال تھا۔ ایک بار پھر ہمیں وحشیوں کے زمانے کا پاتال نظر آرہا ہے۔ مگر صرف 1815ء کے وحشیوں کا جس کو اس کے پیار بھرے نام ردِ انقلاب سے پکارا جانا چاہیے، جو زیادہ سانس نہیں لے سکا تھا، جلد ہی جس کا دم چڑھ گیا، اور جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ سلطنت پر آنسو بہایا گیا — اور ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے — کہ اس پر بہادر آنکھیں بھی روئی تھیں۔ اگر شان اس تلوار میں ہوتی ہے جو کھوٹ پر بت میں تبدیل ہو گئی ہو، تو سلطنت اپنی ذات میں شان ہی شان تھی۔ اس نے زمین کی تمام روشنیوں کو بھسم کر دیا تھا جسے ظلم صرف غمگین روشنی دے سکتا ہے۔ ہم اسے مبہم روشنی کہیں گے۔ دن کی اصل روشنی سے اس کا تقابل کیا جائے تو یہ رات ہی تھی۔ رات کے اس طرح غائب ہو جانے سے گرہن کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

لوئی ہشت دہم پیرس میں داخل ہوا۔ 8 جولائی کے رقصِ دائرہ نے 20 مارچ کی پُرجوشیوں کو مٹا دیا تھا۔ ایک کارسیکائی Bearnese کا متضاد بن گیا تھا۔ Tuileries کے گنبد پر سفید رنگ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ جلاوطنی عام ہو گئی تھی۔ Hartwell کے صنوبر سے بنی میز سوس کے پھولوں سے بھرے لوئی چہاردہم کے تخت کے سامنے لگائی گئی تھی۔ Bouvines اور Fontenoy کا اس طرح تذکرہ کیا گیا گویا وہ کل کے واقعات تھے، جب کہ Austerlitz بہت قدیم ہو گیا تھا۔ قربان گاہ [کلیسا] اور تخت [شاہی] کے درمیان شاندار اخوت قائم ہو گئی تھی۔ سماج کا سب سے غیر متنازعہ اندازِ صحت انیسویں صدی کے فرانس میں، اور پورے یورپ میں قائم کر دیا گیا تھا۔ یورپ نے سفید طرّہ اختیار کر لیا۔ Trestaillon کا جشن منایا گیا۔

سورج کی شکل کے بہت سے نقلی نقوش Quai d'Orsay کی بیرکوں کے سامنے کے پتھروں پر ظاہر ہوئے تھے۔ وہاں، جہاں کبھی امپیریل گارڈ ہوا کرتے تھے، اب ایک سرخ مکان تھا۔ Arc du Carrousel جو بری طرح حاصل کی گئی فتوحات سے بھرے Duc d'Angouleme کے مجسمے کے باعث اپنی مشکلات سے عہدہ برا ہوگئی۔ Madeleine کا قبرستان جو 1793ء تک مفلسوں کا قبرستان تھا، زبرجد اور سنگِ مرمر سے بھر گیا تھا اس لیے کہ اس کی خاک میں لوئی شانزدہم اور Marie Antoinette کی ہڈیاں دفن تھیں۔

خندق سے گھرے Vincennes میں زمین سے ایک لوحِ مزار بلند تھی جو اس حقیقت کی یاد دلاتی تھی کہ Duc d'Enghien اسی مہینے مارا گیا تھا جس میں نپولین کی تخت نشینی ہوئی تھی۔ پوپ Pius ہشتم، جس نے اس کی جاں کنی کے عالم میں رسمِ تخت نشینی ادا کی تھی، اسی پُرسکون انداز میں زوال پر برکات کی دعائیں کی تھیں، جس طرح عروج پر کی تھیں۔ Schoenbrunn میں ایک چار سالہ پرچھائیں براجمان تھی جس کو روما کا بادشاہ کہنا سراسر فتنہ انگیزی تھی۔ اور یہ سب چیزیں اس وقت ہوئی تھیں، اور بادشاہ تخت نشین ہوئے تھے؛ یورپ کا مالک پنجرے میں بند کردیا گیا تھا؛ اس کی پرانی حکومت نئی حکومت بن گئی تھی؛ زمین کی تمام پرچھائیاں اور تمام روشنیاں اپنی جگہیں بدل چکی تھیں، اس لیے کہ موسمِ گرما کی ایک شام ایک چرواہے نے جنگل میں ایک پروشیائی سے کہا تھا، "اس راستے جاء، ادھر سے نہیں!"

1815ء کے برس کا اپریل ایک قسم کا غمگین اپریل تھا۔ قدیم زمانے کی غیر صحت مند اور زہریلی حقیقتیں نئے اظہارات میں چھپا دی گئی تھیں۔ 1789ء میں ایک جھوٹ گھڑا گیا تھا؛ اصل حقیقت ایک فرمان میں پوشیدہ کردی گئی تھی؛ افسانے آئینی بن گئے تھے؛ آزاد خیالی پر تعصبات، توہم پرستی اور ذہنی تحفظات کی — دل میں دفعہ 14 رکھتے ہوئے — وارنش کردی گئی تھی۔ سانپ کی کینچلی اتر گئی تھی۔

نپولین آدمی کو سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا بنا دیتا تھا۔ اس کے دورِ شہنشاہی میں مثالیت کو خیال پرستی کا حیرت انگیز نام دے دیا گیا تھا۔ ایک عظیم آدمی کے لیے یہ سخت ناعاقبت اندیشی کی بات ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کو استہزا میں بدل دے۔ عوام، توپوں کی غذا، جو توپچیوں کو بہت پسند ہوتی ہے، اس کو تلاش کر رہے تھے۔ "کہاں ہے وہ؟ کیا کر رہا ہے وہ؟ Marengo اور واٹرلو کے ایک سپاہی سے ایک گزرنے والے کہا تھا، "نپولین ختم ہو چکا ہے۔" "وہ مر گیا ہے۔" سپاہی نے چلا کر کہا، "تم اسے نہیں جانتے۔" وہ معزول کر دیا جائے تب بھی تصور اس

آدمی پر یقین نہیں کرے گا۔ یورپ کی گہرائیاں واٹر لو کے بعد ظلمات سے بھر گئی تھیں۔ نپولین کے غیاب کے دوران کچھ خالی خالی سا محسوس ہوتا تھا۔

بادشاہوں نے اس خلا کو بھر دیا۔ قدیم یورپ نے اصلاحات سے فائدہ اٹھایا۔ ایک مقدس اتحاد تھا: Belle-Alliance، جسے واٹر لو کے مہلک میدان نے پہلے ہی خوب صورت اتحاد کہہ دیا تھا۔

اس قدیم یورپ کی تعمیرِ نو اور اس کی موجودگی میں نئے فرانس کے خد و خال کا خاکہ تیار کیا جا رہا تھا۔ شہنشاہ نے جس مستقبل کا اہتمام کیا تھا، شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک ستارہ درخشاں تھا— آزادی۔ نئی نسل کی چمکتی آنکھیں اس پر لگی تھیں۔ واحد حقیقت یہ تھی کہ لوگ، ایک ہی وقت میں، مستقبل، آزادی اور ماضی کے نپولین کی محبت میں گرفتار تھے۔ شکست نے شکست پانے والے کو زیادہ بڑا بنا دیا تھا۔ گرا ہوا بونا پارٹ، کھڑے نپولین سے زیادہ بلندی پر تھا۔ وہ جو فاتح ہوئے تھے، زیادہ فکر مند تھے۔ انگلستان نے Hudson Lowe کو فرانس پر نظر رکھنے پر مامور کیا تھا، اور فرانس نے انگلستان پر نگاہ رکھنے کے لیے Montchenu کو متعین کیا تھا۔ اس کے تہہ کیے بازو شاہوں کے لیے بے چینی کا باعث تھے۔ الیگزانڈر اس کو اپنی "بے خوابی" کہتا تھا۔ اس کے اندر پوشیدہ انقلاب کی مقدار خوف کا باعث تھی۔ یہی تھی وہ شے جو بونا پارٹ کی روشن خیالی کی تشریح کرتی تھی اور اس کا عذر تھی۔ ایک خیالی وجود پرانی دنیا میں لرزہ پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہ حکومت تو کر رہے تھے، مگر افق پر نظر آنے والی سینٹ ہلینا کی پہاڑیوں سے نامطمئن تھے۔

جس وقت نپولین لانگ وڈ میں زندگی اور موت کی جد و جہد سے گزر رہا تھا، واٹر لو کے میدان میں جان سے جانے والے خاموشی سے گل سڑ رہے تھے، اور ان کے سکون کا کچھ حصہ دنیا کے ملکوں میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ویانا کی کانگریس، اور یورپ نے 1815ء میں کیے جانے والے میثاق کو بحالی کا میثاق قرار دے دیا۔

یہ تھا واٹر لو!

مگر لا انتہا پر اس کا اثر کیا تھا؟ سارے طوفان، تمام بادل، جنگ، اور اس کے بعد امن؟ اس عظیم آنکھ کی روشنی کو ایک لمحے کے لیے بھی اندھیرا پریشان نہیں کر سکا تھا، جس کے سامنے خوراک کا ایک لقمہ گھاس کی ایک پتی سے دوسری پتی اچھلتا جا رہا تھا؛ جیسے کوئی عقاب 'نوتر دیم' کے میناروں کے ایک گھنٹا گھر سے دوسرے گھنٹا گھر پرواز کر رہا ہو۔

۞

میدانِ جنگ کی رات

آیئے، اب ہم مہلک میدانِ جنگ واپس چلتے ہیں۔ یہ اس کتاب کی ضرورت ہے۔

جون کی اٹھارہ تاریخ پورے چاند کی رات تھی۔ اس کی روشنی بلوخر کے خوف ناک ارادوں میں معاون ہوئی تھی، فراریوں کے نشانات سے دغا کرنے والی تھی اور پروشیائی گھڑسوار فوج کو وہ تباہ کن منتخب ہجوم مہیا کرنے والی تھی جس نے قتلِ عام میں مدد کی تھی۔ اس قسم کی مصیبتوں کے دوران رات کے اندھیرے کیسی الم ناک امداد پہنچاتے ہیں۔

توپ کا آخری گولا پھینکے جانے کے بعد Mont-Saint-Jean کا میدان سنسان ہوگیا تھا۔

انگریز نے فرانسیسی لشکرگاہ پر قبضہ کرلیا تھا؛ زیر کیے جانے والوں کے بستر میں سونا فتح کی عام نشانی ہوا کرتی ہے۔ انھوں نے Rossomme سے پرے تک اپنا پڑاؤ قائم کر لیا۔ پروشیائی، پسپا ہونے والوں کو شکست دے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ویلنگٹن لارڈ باتھ ہرسٹ کے لیے اپنی رپورٹ تیار کرنے واٹر لو کے گاؤں چلا گیا تھا۔

اگر کبھی کسی پر 'sic vos non vobis......' [ورجل کا یہ نامکمل جملہ جو اس نے آگسٹس سیزر سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھا تھا۔] صادق آیا ہے تو وہ واٹر لو کا گاؤں تھا۔ واٹر لو میدانِ جنگ سے صرف نصف لیگ دور تھا مگر اس لڑائی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ Mont- Saint-Jean پر بے پناہ گولا باری ہوئی، ہوگومونٹ نذرِ آتش کر دیا گیا، La Haie- Sainte پر حملے سے قبضہ ہوا، Papelotte جلایا گیا، Plancenoit جلایا گیا، La Belle-Alliance نے دو فاتحین کو گلے سے لگایا؛ یہ سارے نام ہرگز مانوس نام نہیں۔ اور واٹر لو، جس

نے جنگ میں کوئی کام نہیں کیا تھا، سارے اعزاز لے گیا۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو جنگ کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں؛ جب بھی موقع ملتا ہے، ہم صرف سچ بیان کر دیتے ہیں۔ جنگ کے بڑے خوف ناک روپ ہوتے ہیں، ہم نے جنھیں چھپایا نہیں ہے؛ ہمیں یہ اعتراف بھی ہے کہ اس کے کچھ گھناؤنے خد و خال بھی ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ نفرت انگیز حرکت ہوتی ہے جنگ کے فوراً بعد مُردوں کو برہنہ کر دینا۔ جنگ کے بعد ہونے والی صبح ہمیشہ برہنہ لاشوں پر طلوع ہوتی ہے۔

ایسا کون کرتا ہے؟ فتح کو اس طرح گندہ کون کرتا ہے؟ کس قدر گھناؤنا ہے وہ ہاتھ، جو فتح کی جیب میں داخل کیا جاتا ہے؟ کس قسم کے جیب کترے ہوتے ہیں وہ لوگ جو نام وری کے عقب میں اپنا کاروبار کرتے ہیں؟ کچھ فلسفی — جن میں والٹیئر بھی شامل ہے — کہتے ہیں کہ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو خود بھی بدنامی کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق اس گھناؤنے کام میں ہمیشہ وہی لوگ ہوتے ہیں: کوئی لاش بچ نہیں پاتی؛ جو ایستادہ ہوتے ہیں۔ ان کو لوٹتے ہیں جو زمین پر اوندھے پڑے ہوتے ہیں۔ اس دن کی ہیرو رات کی خوں آشام چمگادڑ ہوتی ہے۔ جو لاش کو لاش بناتا ہے یقیناً اسے ہی لاش کو برہنہ کرنے کا کچھ حق بھی ہوتا ہے۔ اپنے طور پر ہم اس طرح نہیں سوچتے؛ ہمارے نزدیک تو یہ ناممکن ہے کہ وہی ہاتھ اعزاز سنبھالے جو مرے ہوئے آدمی کا جوتا چوری کرتا ہے۔

ایک بات یقینی ہے، جو یہ ہے کہ عام طور پر فتح کرنے والے چوروں کی پیروی کرتے ہیں، مگر ہمیں سپاہیوں کو ان میں شامل نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً ہم عصر سپاہی کو۔

ہر فوج کے عقب میں حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں، اور ان ہی کو یہ الزام دیا جانا چاہیے۔ چمگادڑ جیسی مخلوق، نصف ڈاکو، نصف خدمت گار؛ ہر قسم کی چمگادڑیں جنھیں اندھیرا جنگ پیدا کرنے والا کہتا ہے؛ وردی پوش جو جنگ میں حصہ نہیں لیتے؛ معذوری کا بہانہ کرنے والے؛ ڈراؤنے لنگڑے؛ لشکر میں دخل اندازی کرنے والے بنیے جو اپنی بیویوں سمیت چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں ساتھ دوڑتے رہتے ہیں اور وہ اشیا چراتے ہیں جنھیں بعد میں بیچ سکیں؛ بھکاری جو راہ دکھانے والے بن کر افسروں کے سامنے پیش ہوتے ہیں؛ سپاہیوں کے ملازمین؛ غارت گری کرنے والے؛ پرانے زمانے کی فوجیں — ہم اس زمانے کی بات نہیں کر رہے ہیں — اپنے پیچھے یہ سب لیے ہوتی تھیں، اسی وجہ سے انھیں ''آوارہ گرد یا لٹیرے'' کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی ذمے دار نہ کوئی فوج ہوتی اور نہ کوئی قوم؛ وہ اطالوی زبان بولتے ہیں اور جرمنوں کے پیچھے چلتے ہیں؛ اس کے بعد فرانسیسی بولنے لگتے ہیں اور انگریز کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایک

ہسپانوی بد قماش نے جو فرانسیسی زبان بولتا تھا، Fervacques کا مارکوئی جس کی Picard [فرانسیسی سے ملتی جلتی زبان۔] سے دھوکا کھا کر اس کو اپنا آدمی سمجھ بیٹھا، اور میدان جنگ میں اس کی بے وفائی سے اسی رات مارا اور لوٹا گیا تھا، جس کے بعد Cerisoles کی فتح ہوئی تھی۔وہ بد معاش ڈاکو نکلا۔اس قابلِ نفرت قول 'دشمن کے خون چوس' نے یہ جذام پیدا کیا تھا جسے صرف سخت نظم و ضبط ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔ایسی بھی شہرت و نام وری ہوتی ہے جو فریب ہوتی ہے؛کسی کو کیا معلوم کہ دوسرے قسم کے کاموں میں بڑے، کچھ جرنیل بھی ہر دل عزیز ہو جایا کرتے ہیں۔جنرل Turenne کو اس کے سپاہی پوجتے تھے، اس لیے کہ وہ مالِ غنیمت کی لوٹ مار کو برداشت کرتا تھا۔برائی کی دی گئی اجازت اچھائی کا حصہ بن جایا کرتی ہے۔Turenne اتنا اچھا تھا کہ اس نے Palatinate [جرمن سلطنت کے ایک علاقے] کو آگ اور خون میں جھونک دینے کی اجازت دے دی تھی۔Hoche اور Marceau کے ساتھ "آوارہ گرد لٹیرے" نہیں ہوتے تھے؛ ولنگٹن کے ساتھ چند تھے، اور یہ بیان کر کے ہم اس کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں۔

بہر حال، اٹھارہ اور انیس جون کی رات مرے لوگ لوٹے گئے تھے۔ولنگٹن سخت آدمی تھا؛ اس نے حکم دیا کہ جو بھی یہ کام کرتا پکڑا جائے اسے گولی مار دی جائے؛ مگر لوٹ مار سخت خراب عادت ہوتی ہے۔میدانِ جنگ کے ایک کونے میں لوٹ مار ہوتی رہتی ہے اور دوسرے کونے میں گولی ماری جاتی رہتی ہے۔

اس میدان میں رات کا چمکتا چاند بہت پُر اسرار لگ رہا تھا۔

آدھی رات کے قریب، ایک آدمی اِدھر اُدھر مارا پھر رہا تھا، بلکہ Ohain کی کھوکھلی سڑک سے اوپر چڑھ رہا تھا۔وہ اپنی حرکات و سکنات سے وہی لگ رہا تھا جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا ہے— نہ انگریز، نہ فرانسیسی، نہ کسان، نہ سپاہی؛ آدمیت سے ماورا، مردہ جسموں کی بو پہچاننے والا، چوری جس کی فتح ہوتی ہے، جو واٹر لو میں لوٹ مار کے لیے آتا ہے۔اس نے کوٹ جیسا بلاؤز پہن رکھا تھا؛ وہ بے چین اور گستاخ لگ رہا تھا؛ آگے چلتا، پلٹ کر پیچھے دیکھتا جاتا۔کون تھا یہ آدمی؟ شاید، دن کی روشنی کے مقابلے میں رات کی سیاہی زیادہ جانتی تھی؛ اس کے پاس کوئی تھیلا نہیں تھا، مگر بظاہر اس کے کوٹ کے اندر بڑے بڑے جیب تھے۔وقتاً فوقتاً رُکتا، اپنے اطراف میدان کو اس طرح دیکھتا بھالتا گویا اس کا پیچھا کیا جا رہا ہو؛ اچانک جھکتا، زمین پر پڑی کسی خاموش اور ساکت شے کو درہم برہم کیا، اٹھا اور بھاگ گیا۔اس کی پھسلنے جیسی حرکت، اس کا رویّہ، اس کی پُر اسرار حرکات دھندلکے کے ان کیڑوں جیسی تھیں جو کھنڈرات میں آتے جاتے

رہتے ہیں، جنھیں قدیم رومن Alleurs کہتے تھے۔

اندھیرے میں اڑنے والے کچھ پرندے سمندری دلدل میں اسی قسم کے خاکے پیدا کرتے ہیں۔

اگر دھند کو چیر کر دیکھنے والی کوئی نگاہ کچھ فاصلے پر نظر ڈالتی تو اس کو کسی لشکری پیٹے کی گاڑی نظر آجاتی جس پر بید سے بنا ٹوپ لگا ہوا تھا، جو Nivelles جانے والی شاہراہ کے کنارے ایک سائبان کے عقب میں چھپی ہوئی تھی، جس میں بکس یا بنڈلوں پر ایک عورت جیسی کوئی شے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اس گاڑی اور چوری چکاری کرنے والے کے درمیان کوئی ربط تھا۔

اندھیرا پُرسکون تھا۔ آسمان پر بادل کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ اگر زمین سرخ ہو تو کیا فرق پڑتا ہے، چاند تو ہمیشہ سفید رہتا ہے؛ آسمان کی بے اعتنائیاں ہمیشہ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میدان میں گریپ شاٹ کی زد میں آئی درختوں کی ڈالیاں جو ٹوٹی نہیں تھیں، اپنی چھال کے بل پر لٹکی، رات کی ہلکی ہلکی ہوا میں جھول رہی تھیں۔ ہلکی سے ایک سانس بھی پودوں کو ہلا دیتی تھی۔ گھاس پر ایسی ہلکی لرزش تھی جیسے اس پر سے کوئی روح گزر رہی ہو۔

انگریزوں کے پڑاؤ سے آنے جانے والی شب گشتی کرنے والوں اور عام چلنے والوں کے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ہوگومونت اور La Haie-Sainte میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک آگ مغرب میں تھی تو دوسری مشرق میں۔ انگریزی پڑاؤ میں جگہ جگہ جلائی جانے والی آگ اور ان دو بڑے شعلوں سے مل کر، پڑاؤ کی آگ یاقوت کے ایسے ہار کی صورت اختیار کر گئی تھی جس کے دونوں سروں پر شب چراغ ہوں۔

ہم نے Ohain کی سڑک پر ہونے والی تباہی بیان کی ہے۔ ہمارا دل یہ سوچ خوف زدہ ہو رہا ہے کہ اتنے سارے بہادر آدمیوں کے لیے اس قسم کی موت کیسی رہی ہوگی۔

اگر [اس دنیا میں] کوئی ہولناک شے ہے، کوئی حقیقت ہے جو خوابوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے تو یہ ہے: سورج کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنا؛ مردانہ طاقت کا پوری طرح حاصل ہونا؛ صحت مند ہونا اور خوش رہنا؛ مردانہ وار ہنسنا؛ سامنے موجود چکا چوند کر دینے والی شان وشوکت کی طرف تیزی سے بڑھنا؛ اپنے سینے کے اندر موجود پھیپھڑے کو محسوس کرنا جو سانس لیتا ہے، دل جو دھڑکتا ہے، وہ ارادہ جو کوئی وجہ رکھتا ہے؛ بولنا، سوچنا، امید رکھنا، محبت کرنا؛ ماں کا ہونا؛ بیوی کا ہونا؛ بچوں کا ہونا؛ روشنی کا ہونا — سب کچھ ایک ساتھ، صرف ایک پکار کے فاصلے پر ہونا، ایک

منٹ سے کم عرصے میں، کسی پاتال میں غرق ہو جانا؛ پلٹ جانے کے لیے گرنا، کچلنا کچلا جانا؛ کان کی سطح تک گندم، پھولوں، پتیوں، شاخوں کا ہونا؛ کسی شے کو پکڑنے کے قابل نہ ہونا؛ اپنی تلوار کو بے کار محسوس کرنا؛ آدمیوں کا نیچے ہونا، گھوڑوں کا اوپر ہونا؛ بے کار کی کوشش کرنا اس لیے کہ اندھیرے کی مار میں ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں؛ ایسی ایڑی کو محسوس کرنا جس سے آنکھیں اپنے خول سے باہر نکل پڑتی ہیں؛ غصے میں گھوڑوں کی نعل کو دانت سے کاٹنا؛دم روک لینا، چلانا، کسمسانا، نیچے ہو جانا اور خود سے کہنا، مگر ذرا دیر پہلے تو میں ایک زندہ آدمی تھا!'

جہاں، کبھی قابلِ افسوس تباہی نے موت کی کھڑکھڑاہٹ کی تھی، اب وہاں خاموشی ہے۔

کھوکھلی سڑک کے کنارے گھوڑوں اور سواروں سے بھرے ہوئے تھے۔اب وہاں کوئی ڈھلان نہیں رہی تھی، اس لیے کہ لاشوں کے ڈھیروں نے سڑک کو میدان کے برابر کردیا تھا، اور اس کے کنارے پوری طرح بھرے ہوئے پیالے کی طرح ہو گئے تھے۔سڑک کی اوپری حصے میں مردہ جسموں کا انبار تھا، نچلے حصے میں خون کا دریا— یہ حالت تھی اس سڑک کے اٹھارہ جون کی شام۔Nivelles جانے والی شاہراہ پر بھی خون بہہ رہا تھا، اور ابل کر درختوں سے بنے مورچے کے سامنے ایک بڑا سا جوہڑ بن گیا تھا، جس نے سڑک کا راستہ روک لیا تھا، جس کی جانب اب بھی اشارہ کیا جاتا ہے۔

قاری کو یاد ہوگا کہ اس کے بالمقابل وہ مقام ہے جہاں زرہ پوشوں کی تباہی ہوئی تھی۔

مردہ جسموں کی تہہ کھوکھلی سڑک کی گہرائی کے تناسب سے تھی۔ درمیان میں، اس مقام پر جہاں سڑک برابر ہو گئی تھی، جہاں سے ڈیلور کا ڈویژن گزرا تھا، مردہ جسموں کی تہہ نسبتاً پتلی ہو گئی تھی۔

رات کے اندھیرے کا لٹیرا جس کے بارے میں ہم قاری کو بتا چکے ہیں، اسی طرف جا رہا تھا۔وہ اس وسیع مقبرے کی تلاشی لے رہا تھا۔اس نے اپنے اطراف نظر کی۔اس نے مرنے والوں کا نہایت گھناؤنے انداز میں معائنہ کیا۔وہ خون میں چل رہا تھا۔

وہ ایک دم وہاں سے گزر گیا۔

چند قدم، اس کے آگے، کھوکھلی سڑک میں، اس مقام پر جہاں لاشوں کا انبار ختم ہونے والا تھا، انبار کے نیچے سے ایک ہاتھ نکلا ہوا تھا جو چاند کی روشنی میں نظر آرہا تھا۔اس کی انگلی میں کوئی چمکیلی شے تھی، جو دراصل سونے کی انگوٹھی تھی۔

وہ آدمی جھکا، تھوڑی دیر اسی حالت میں جھکا رہا، اور جب واپس اٹھا تو مردہ ہاتھ میں انگوٹھی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ بالکل اٹھا نہیں تھا؛ اسی کیفیت میں اور خوف زدہ حالت میں گھٹنوں کے بل جھکا

ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا، اس کا پورا جسم صرف دو انگلیوں پر ٹکا ہوا تھا، انگلیاں زمین پر جمی ہوئی تھیں، اور اس کا سر کھوکھلی سڑک کے اوپر نظریں دوڑا رہا تھا۔ اس وقت اس کی حرکات کسی گیدڑ کے پنجوں کے مماثل تھیں۔

پھر، کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ پیروں کے بل کھڑا ہو گیا۔

وہ اچانک چونک پڑا۔ اسے محسوس ہوا گویا کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا ہو۔

وہ فورائز ۱! ایک کھلا ہوا ہاتھ تھا، جو بند ہو گیا تھا، اور اس کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا تھا۔

ایسے میں کوئی ایمان دار آدمی ہوتا تو خوف زدہ ہو گیا ہوتا؛ مگر یہ آدمی زور سے ہنس دیا۔

"چلو" اس نے خود سے کہا، "یہ ایک لاش ہی تو ہے۔ میں تو زندہ سپاہی سے ڈرتا ہوں"

مگر وہ ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا، اور اس کو چھوڑ دیا۔ کہ قبر میں کوشش جلد ختم ہو جایا کرتی ہے۔

"اچھا" اس لٹیرے نے کہا "تو کیا یہ مردہ زندہ ہے؟ ذرا دیکھیں تو"

وہ ایک بار پھر جھکا، ڈھیر پر لڑکھڑایا، سب کچھ ایک طرف کر دیا جو اس کے راستے میں مزاحم ہو رہا تھا، ہاتھ کو تھاما، اس کا بازو پکڑا، اس کے سر کو آزاد کیا، جسم کو کھینچ کر نکال لیا، اور چند لمحوں کے اندر وہ بے جان، یا کم از کم بے ہوش، آدمی کو گھسیٹ رہا تھا۔ وہ آدمی ایک زرہ پوش افسر تھا، بلکہ ایک خاص بڑے درجے کا افسر تھا؛ سونے کا ایک بڑا سا شانہ زیب زرہ کے نیچے سے جھانک رہا تھا؛ اس کے سر کی ہیلمٹ نہیں رہ گئی تھی۔ ایک غضب ناک تلوار نے اس کے چہرے کو کاٹ دیا تھا، کہ خون کے باعث کچھ پہچانا نہیں جاتا تھا۔

بظاہر اس کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی، اور کسی خوش قسمت اتفاق سے، اگر یہ لفظ اس لمحے موزوں ہو تو، مردہ جسم اس پر اس طرح پڑے تھے گویا اسے کچل جانے سے بچا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

زرہ پر اس کی لیجن آف آنر کی نقرئی صلیب لگی ہوئی تھی۔

لٹیرے نے صلیب نوچ لی، جو اس کے کوٹ کے اندر کے جیبوں میں غائب ہو گئی۔

پھر اس نے افسر کی گھڑی رکھنے والی جیب ٹٹولی۔ گھڑی دریافت ہوئی، اور اس نے قبضے میں لے لی۔ واسکٹ کی تلاشی لی، ایک بٹوہ پایا، اور اس کو بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔

جب وہ مرتے ہوئے آدمی کی مدد کرنے لگا، تو افسر نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

اس نے کم زور آواز میں کہا، "شکریہ!"

اس کو نکالنے میں بے ربطی نے، رات کی تاریکی نے، اور ہوا نے جس میں وہ آسانی

سے سانس لے سکتا تھا، اس کی بے جانی کی کیفیت دور کر دی تھی۔

لٹیرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنا سر بلند کیا۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی؛ شاید کوئی گشت والا ادھر آ رہا تھا۔

افسر بہت آہستگی سے بولا۔ موت کی اذیت اس کی آواز میں سنائی دے رہی تھی:

"جنگ کس نے جیتی ہے؟"

"انگریزوں نے۔" لٹیرے نے جواب دیا۔

افسر کہتا رہا، میری جیبیں دیکھو؛ تمھیں ایک گھڑی اور ایک بٹوہ ملے گا۔ تم لے لینا۔"

وہ کام تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔

لٹیرے نے دھوکے بازی کی، اور کہا، "وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میں لٹ گیا ہوں۔" افسر نے کہا، "مجھے افسوس ہے۔ وہ سب تمھیں ملنا چاہیے تھا۔"

گشت کرنے والے کی چاپ زیادہ واضح ہو گئی تھی۔

"کوئی آ رہا ہے۔" لٹیرے نے یہ کہتے ہوئے ایسی حرکت کی جیسی کوئی جانے والا کرتا ہے۔

افسر نے اپنا کم زور ہاتھ اٹھایا، اور اس کو روکتے ہوئے کہا، "تم نے مجھے بچا لیا ہے۔ بتاؤ تم کون ہو؟"

لٹیرے نے تیزی سے، مگر دھیمی آواز میں جواب دیا،

"تمھاری طرح، میں بھی فرانسیسی فوج سے متعلق تھا۔ مجھے فوراً چلا جانا چاہیے۔ انھوں نے دیکھ لیا تو مجھے گولی مار دیں گے۔ میں نے تمھاری جان بچائی ہے۔ اب تم بھی کسی طرح یہاں سے کھسک جاؤ۔"

"تمھارا عہدہ کیا ہے؟"

"سارجنٹ"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"تھنارڈیے!"

"میں تمھارا نام کبھی نہیں بھولوں گا۔" افسر نے کہا، "تم بھی میرا نام یاد رکھنا۔ میرا نام پون مرسی (Pontmercy) ہے۔"

۞

اعداد کی تبدیلی

ژاں ولژاں دوبارہ پکڑا گیا۔

قاری ہمارا شکر گزار ہوگا، اگر ہم زبوں واقعات تیزی سے بیان کردیتے ہیں۔ ہم خود کو عبارت کے صرف ان دو ٹکڑوں تک محدود رکھیں گے، جن میں دو ماہ قبل M. sur M کے حیرت انگیز واقعات درج تھے، جو اس دن کے اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔

یہ ٹکڑے محض خلاصہ ہیں۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں Tribunaux گزٹ شروع نہیں ہوا تھا۔

پہلا ٹکڑا ہم پرچم سفید (Drapeau Blanc) نامی اخبار سے مستعار لے رہے ہیں۔ اس پر 25 جولائی 1823ء کی تاریخ درج ہے۔

"Pas de Calais نامی قصبے میں ان دنوں کچھ غیر معمولی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ایک شخص نے، جو اس علاقے میں اجنبی تھا، جس کا نام موسیو میڈلین تھا، نئے صنعتی طریقوں کے ذریعے ایک قدیم مقامی صنعت کو نئی جان بخش دی تھی، جس میں سنگِ موسیٰ، اور سیاہ شیشوں سے کان کے بندے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس نے نہ صرف اپنی تقدیر، بلکہ اس قصبے کی بھی تقدیر بدل کر رکھ دی تھی، ہم جس کے معترف ہیں۔ اپنی خدمات کے عوض اس کو میئر کے رتبے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ پولیس کو پتا چلا ہے کہ موسیو میڈلین دراصل ایک سابق سزا یافتہ تھا جس نے خود پر لگائی گئی پابندی توڑ دی تھی، جسے 1796ء میں چوری کے جرم میں سزا دی گئی تھی۔ اس کا نام ژاں ولژاں ہے۔ ژاں ولژاں کو جیل بھیج دیا گیا ہے۔ پتا چلا ہے کہ وہ اپنی گرفتاری سے قبل موسیو لافیت کے

ذریعے نصف ملین سے زیادہ رقم نکلوانے میں کامیاب ہوگیا تھا جو اس نے جمع کی تھی، جو اس نے باقاعدہ اور بالکل شفاف طریقے سے اپنے کاروبار میں کمائی تھی۔ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ Toulon کی جیل میں بھیجے جانے سے قبل وہ رقم اس نے کہاں چھپائی ہے۔''

دوسرا مضمون، جس میں کچھ زیادہ تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اسی تاریخ کے Journal de Paris سے لیا گیا ہے۔

''ایک سابق سزا یافتہ، جو آزاد کردیا گیا تھا، جس کا نام ژاں ولژاں ہے، صوبے Var کے شہر Assizes کی عدالت میں پیش کیا گیا ہے، اور حالات کے پیش نظر اس پر شہر والوں کی توجہ مرکوز ہوگئی ہے۔ یہ بد بخت پولیس کی نگرانی سے غائب ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا، اس نے اپنا نام بدل لیا تھا، اور ایک شمالی قصبے کا میئر بننے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس قصبے میں اس نے اچھا خاصا کاروبار قائم کرلیا تھا۔ بالآخر، اس کی قلعی کھل گئی ہے اور سرکاری مستغیث کے ناقابل شکست جذبے کے طفیل اسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس شہر کی ایک عورت اس کی داشتہ تھی، جو اس کی گرفتاری کے صدمے میں عین گرفتاری کے وقت انتقال کرگئی تھی۔ یہ بد معاش، جو ہرقلیس جیسی طاقت کا مالک ہے، فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا؛ مگر فرار کے تین یا چار دن بعد پیرس میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا، عین اس وقت جب وہ، ان چھوٹی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی میں، جو دارالحکومت اور Montfermeil کے درمیان چلتی ہیں، سوار ہو رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ان تین یا چار دنوں کی آزادی سے فائدہ ہوا تھا، جن میں وہ ہمارے سربرآوردہ بینکوں میں جمع رقم نکلوانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس رقم کا تخمینہ چھ یا سات لاکھ فرانک لگایا گیا ہے۔ اگر فردِ جرم پر بھروسا کیا جاسکے تو، اس نے یہ رقم ایسی جگہ چھپائی ہے جس سے صرف وہی واقف ہے، اور بازیاب نہیں ہوسکی ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی ہو، ژاں ولژاں کو Var کی Assizes عدالت کے سامنے آٹھ سال قبل شاہراہ پر ایمان دار بچوں میں سے ایک کی رقم چھین لینے کے الزام میں پیش کیا گیا ہے۔ اس واقعے کو Ferney کے ایک سردار نے اپنے ایک لافانی شعر میں یوں بیان کیا ہے:

'...... بچے جو Savoy سے آتے ہیں،
اور نازک نازک ہاتھوں سے

ان لمبی لمبی نہروں کی
ہر سال صفائی کرتے ہیں
جو کائی سے بھر جاتی ہیں .....؟

ڈاکو نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا۔ سرکاری مستغیث کے نمائندے کی ہنر مندی سے ثابت کر دیا گیا تھا کہ چوری دوسرے لوگوں کی معیت میں کی گئی تھی، اور یہ بھی کہ ژاں ولژاں جنوب کے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا رُکن تھا۔ ژاں ولژاں کو مجرم قرار دیا گیا جس کے عوض سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا تھا۔ مجرم نے اپیل کرنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اپنی فراواں بخشش سے سزائے موت کو تاحیات قید میں تبدیل کر دیا ہے۔ ژاں ولژاں کو فوراً Toulon کی جیل لے جایا گیا ہے۔"

قاری بھولا نہیں ہوگا کہ ژاں ولژاں M. sur M کے مذہبی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ کچھ اخباروں نے، جن میں Constitutional بھی شامل تھا، اس تبدیلی کو مذہبی گروہ کی کامیابی قرار دیا تھا۔

ژاں ولژاں نے گیلیز میں اپنا نمبر بدلوا لیا ہے اور اس کو 9,430 کہا جانے لگا ہے۔

بہر حال، ہمیں فوراً ہی یہ سب بیان کر دینا چاہیے تاکہ ہمیں اس موضوع پر دوبارہ آنا نہ پڑے: کہ میڈلین کے ساتھ ہی M. sur M کی ترقی رُک گئی تھی؛ جو کچھ اس نے اس رات کیفیتِ بخار اور تامل میں دیکھا تھا وہ تو حاصل ہو گیا تھا؛ مگر، اس کے علاوہ، ایک نفس بھی تو تھا جو نقصان میں تھا۔ اس کے زوال کے بعد، M. sur M کے بڑے بڑے انا پسند گر چکے ہیں، ہر روز ترقی کرتی ہوئی چیزوں کی مہلک قطع و بُرید ہو رہی ہے، انسانی سماج میں جو کچھ مبہم طریقے سے ہو رہا ہے، جس کو تاریخ نے صرف ایک بار دیکھا ہے، سب الیگزانڈر کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ لفٹنٹ تاج پوش بادشاہ بن گئے؛ سپرنٹنڈنٹ فی البدیہہ صنعت کار بن گئے۔ قابلِ رشک مقابلے ہوئے۔ موسیو میڈلین کا کارخانہ بند ہو گیا؛ اس کی عمارتیں کھنڈر ہو گئیں؛ اس کے کارکن بکھر گئے۔ کچھ ملک چھوڑ گئے، کچھ نے پیشہ ترک کر دیا ہے۔ اس کے بعد سے ہر چیز بڑے پیمانے کے بجائے چھوٹے پیمانے پر ہونے لگی ہے؛ عام بھلائی کے بجائے ذاتی فائدے حاصل کیے جانے لگے ہیں۔ کوئی مرکز نہیں رہا؛ ہر طرف دشمنی اور مسابقت تھی۔ موسیو میڈلین سب پر حکومت کرتا تھا اور احکام دیتا تھا۔ اس کے زوال کے ساتھ ہی، بجائے اپنے لیے کام کرنے کے، تنظیم

کے جذبے کو لڑائی کے جذبے میں بدل دیا گیا؛ سب کی بھلائی کا جذبہ ایک دوسرے سے نفرت کے جذبے میں تبدیل ہو گیا؛ موسیو میڈیلن نے جو دھاگے تانے تھے وہ الجھ گئے اور ٹوٹ گئے؛ طریقوں میں خرابی پیدا کر دی گئی؛ مصنوعات بے قدر ہو گئیں؛ اعتماد کا خون ہو گیا؛ خرید کم ہونے کے باعث کاروبار کوتاہ ہو گئے؛ تنخواہیں کم کر دی گئیں، کارخانے ساکت ہو گئے؛ دیوالیہ پن کا دور دورہ ہو گیا؛ اور مفلس کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔ سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔

ریاست خود سمجھ گئی کہ کوئی کہیں کچل دیا گیا ہے۔ Assizes کی عدالت میں، گیلیر کے فائدے کے لیے کی جانے والی ژاں ویلژاں اور موسیو میڈیلن کی شناخت کے بعد M. sur M کے قصبے میں محاصل کی وصولی کا خرچ دوگنا ہو گیا، اور موسیو de Villele نے فروری 1827ء میں مجمعِ عام میں حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا۔

۞

بد روح کی لکھی دو سطریں

مزید کچھ کہنے سے قبل مناسب ہوگا کہ Montfermeil میں اس زمانے میں ہونے والے واقعے کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے؛ ایک منفرد واقعہ جو اسی زمانے میں Montfermeil میں ہوا تھا جو اتفاقیہ نہیں تھا اور فرد جرم کی کچھ تاویلات سے کسی حد تک ملتا تھا۔

Montfermeil میں ایک بہت قدیم توہم پرستی کی روایت ہے، جو نیا دہ پُراسرار اور زیادہ اہم ہے، اس لیے کہ پیرس کے علاقے کی ایک پسندیدہ توہم پرستی کچھ اسی قسم کی ہے جیسے سائبیریا میں کوئی تمو بیز کا درخت۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر اس شے کو بہت عزیز رکھتے ہیں جو کسی غیر معمولی پودے کی فطرت میں ہو۔ Montfermeil کی توہم پرستی یہ ہے:

خیال کیا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم سے بد روح نے اپنے خزائن کو پوشیدہ رکھنے کے لیے جنگل کو منتخب کر رکھا ہے۔ نیک اطوار بیویاں قسمیں کھا کر کہتی ہیں کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ رات ہوتے ہی جنگل کے مخصوص الگ تھلگ علاقے میں ایک سیاہ فام آدمی چھکڑے والے یا کٹائی کرنے والے کے بھیس میں، پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں، بدن پر بلاؤز اور پتلون میں ملبوس ملتا ہے جس کی خاص پہچان یہ ہے کہ اس کے سر پر ٹوپی یا ہیٹ کے بجائے دو بڑی بڑی سینگیں ہیں۔ ان ہی کے ذریعے وہ پہچانا جاتا ہے۔ یہ آدمی عادتاً گڑھا کھودتا رہتا ہے۔ اس سے تین طرح سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس آدمی سے ملنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس سے بات کی جائے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک دیہاتی انسان ہے؛ کہ وہ سیاہ نظر آتا ہے اس لیے کہ یہ رات کا وقت ہوتا ہے؛ کہ وہ گڑھا نہیں کھود رہا ہے بلکہ اپنے مویشیوں کے لیے گھاس کاٹ رہا ہے، کہ جس کو سینگ سمجھا گیا تھا وہ گوبر پھیلا دینے کا دوشاخہ ہے جسے وہ اپنے پشت پر رکھے

جا رہا ہے، اور شام کے دھندلکے کے پس منظر میں اس کے دانت ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آدمی گھر واپس پہنچتا ہے اور ایک ہفتے کے اندر مر جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ اس پر نظر رکھنے کا یہ ہے کہ جب تک وہ گڑھا کھودے، جب تک اس کو بھر نہ دے اور چلا نہ جائے، اس کا انتظار کیا جائے۔ اس کے بعد تیزی سے اس خندق کی طرف دوڑا جائے، اس کو ایک بار اور کھولا جائے اور وہ خزانہ نکال لیا جائے جو سیاہ فام آدمی نے وہاں چھپایا ہے۔ ایسی صورت میں آدمی ایک ماہ بعد مر جاتا ہے۔ آخری طریقہ یہ ہے کہ اس سے بات کرنے سے پرہیز کیا جائے، نہ اس کی طرف دیکھا جائے، اور ایک پاؤں سے جتنا تیز ممکن ہو بھاگا جائے۔ تب موت ایک برس بعد واقع ہوتی ہے۔

اپنی تمام تر مخصوص کم زوریوں کے ساتھ یہ تینوں طریقے اختیار کیے گئے ہیں، جب کہ پہلا طریقہ جو ہر حالت میں خزانہ حاصل کرنے کے کام میں کچھ فائدہ مند معلوم ہوتا ہے، عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمت ور لوگوں نے، جنھیں ہر ملنے والا موقع آکساتا رہتا ہے، اس سیاہ فام آدمی کے دفینے کو کھودنے اور نکال لے جانے کی کوشش کی ہے۔ اس معاملے میں احتمال کے مطابق کامیابی کے امکانات ہوتے ہیں۔ کم از کم، اگر روایت پر یقین کیا جائے، اور بالخصوص پُراسرار اور خوف ناک لاطینی متن کی ان دو سطروں پر جو طریفوں (طریفوں) نامی ایک بدنہاد، جادوگری کرنے والے نارمن راہب نے اس موضوع پر چھوڑا ہے۔ یہ طریفوں نامی راہب، Rouen کے Saint-Georges de Bocherville کے قریب دفن ہے۔

لہٰذا، بڑی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس قسم کی خندقیں عام طور پر خاصی گہری ہوتی ہیں: کوئی آدمی محنت کرتا ہے، رات میں کھدائی کرتا ہے — کہ کھدائی رات ہی میں کی جاتی ہے؛ اپنی قمیض گیلی کرتا ہے؛ اپنی موم بتی جلاتا ہے؛ اپنی کدال توڑتا ہے، اور جب وہ سوراخ کے قریب پہنچتا ہے، جب وہ "خزانے" پر ہاتھ دھرتا ہے تو اسے کیا ملتا ہے؟ اس بد روح کا خزانہ ہے کیا؟ صرف ایک سو، کبھی کبھی صرف ایک کراؤن، پتھر کا ایک ٹکڑا، ایک ڈھانچا، کبھی خون بھرا جسم، کبھی کبھی کوئی خوف ناک شے کاغذ کی طرح چار بار تہ کی ہوئی، اور کبھی کچھ بھی نہیں۔

راہب طریفوں، کی دو غیر محتاط اور متجسب سطریں یہ کہتی معلوم ہوتی ہیں:

"Fodit, et in fossa thesauros condit opaca,
As, nummas, lapides, cadaver, simulacra, nihilque."

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہمارے زمانے میں کبھی کبھی گولیوں سمیت بارود سے بھری سینگ، کبھی کبھی چکنائی بھرے کٹے پھٹے پرانے کارڈ پائے گئے ہیں جو اس بظاہر بد روح کے کام

آئے ہوں گے۔ طریقوں نے ان دونوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اس لیے کہ وہ بارھویں صدی میں زندہ تھا، اور چوں کہ اس کے پاس اتنی دانش نہیں تھی کہ وہ 'راجہ بینگ' سے پہلے بارود اور چارلس ششم سے پہلے کارڈ ایجاد کر لیتا۔

مزید یہ کہ اگر کوئی شخص کارڈ کھیلتا ہے تو ان کے پاس جتنے پتے ہوں گے ان سب کو ہار سکتا ہے۔ اور جہاں تک بارود بھری مینگ کا سوال ہے، تو اس میں وہ خصوصیت بھی ہوتی ہیں کہ وہ آپ کی بندوق کو خود آپ پر ہی چلا دے۔

اس زمانے کے بعد جب سرکاری مستغیث کو محسوس ہوا کہ آزاد کردہ سزا یافتہ ژاں ولیواں اپنے فرار کے دنوں میں کئی دن تک Montfermeil میں پھرتا رہا تھا؛ گاؤں والے کہہ رہے تھے کہ بولاترویل کے نام کا ایک مزدور جنگل میں عجیب عجیب حرکات کرتا دیکھا گیا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کو معلوم تھا کہ بولاترویل بھی گیلیز میں قید رہا تھا۔ اس پر پولیس والے نگاہ رکھتے تھے، اور چوں کہ اسے کوئی ملازمت نہیں مل رہی تھی، انتظامیہ نے اس کو Gagny سے Lagny تک سڑک کی مرمت کے کام کے لیے کم تنخواہ پر ملازم رکھ لیا تھا۔

بولاترویل وہ آدمی تھا گاؤں والے جسے بے حد تہذیب، بے حد انکسار اور بے حد مستعدی سے ٹوپی اتارنے، اور سپاہیوں کی موجودگی میں مسکرانے کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے — ان کا خیال تھا کہ شاید وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا؛ ان کو شبہ تھا کہ رات ہوتے ہی وہ جھاڑیوں میں گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ صرف ایک بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ وہ بلانوشی کرتا تھا۔

لوگوں کو اس میں مندرجہ ذیل باتیں نظر آئی تھیں:

کافی دنوں سے بولاترویل نے پتھر توڑنا، ہر گھنٹے سڑک کی نگہداشت کرنا، اور کھاڑا لے کر خود جنگل جانا ترک کر دیا تھا۔ اس کو شام کے وقت نہایت سنسان علاقوں، گنجان جھاڑیوں میں جاتا دیکھا جاتا تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ کسی شے کی تلاش میں ہو، اور کبھی تو وہ گڑھے کھودتا بھی دکھائی دیتا تھا۔ گزرنے والوں کی نیک خو بیویاں پہلے تو اسے 'بعل الذباب' (مکھیوں کا دیوتا) سمجھتیں، پھر وہ بولاترویل کو پہچان لیتیں، مگر انھیں قطعی اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ بہ ظاہر وہ چھپنے کی کوشش کرتا، اور ان حرکات میں کوئی پُراسرار بات ضرور ہوتی تھی۔

گاؤں والے کہتے تھے، "صاف ظاہر ہے کی بدروح ظاہر ہو گئی ہے۔ بولاترویل نے اسے دیکھا ہے، اور اس کی تلاش میں ہے۔ سچائی میں وہ اتنا تیز ہے کہ وہ شیطان کے پورے جتھے

کو اپنی جیب میں رکھ لے۔"

والنٹیر والے کہتے تھے، "کیا بولاتر یویل اس بد روح کو پکڑ لے گا، یا بد روح اس کو پکڑ لے گی؟" بزرگ عورتیں اپنے سینوں پر صلیب کے نشان بنانے لگتی تھیں۔

اس دوران، بولاتر یویل کی جنگل کی چالاکیاں ختم ہو گئیں؛ اس نے سڑکوں کی مرمت کا اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا اور لوگ کسی اور بارے میں فضول گوئی کرنے لگے تھے۔

کچھ لوگ اب بھی متجسس تھے، اور ان کا خیال تھا کہ شاید یہ سب کوئی بہت بڑا روایتی خزانہ نہیں تھا، بلکہ یہ سب کوئی باد آور (windfall) تھا یا سڑک مرمت کرنے والے کو کہیں سے چھپائی گئی بینک کے نوٹوں کی گڈیاں مل گئی ہوں گی۔ اسکول ماسٹر اور سرائے کا مالک جن آردیے زیادہ فکرمند تھا جو ہر ایک کا دوست تھا جس کو بولاتر یویل سے دوستی کرنے میں کوئی کراہت نہیں تھی۔

"یہ شخص گیلیر میں قید رہا ہے۔" جن آردیے کہتا تھا، "خدا ہی جانے وہاں کون کون رہا ہے اور آئندہ کون کون ہو گا؟"

ایک شام اسکول ماسٹر نے تسمیہ بیان کیا کہ بولاتر یویل جنگل میں جو کچھ کرتا پھر رہا ہے، اگر پچھلے زمانے میں کیا جاتا تو اس پر تحقیقات کی جاتی اور اس کو بولنے پر مجبور کیا جاتا، اور ضرورت پڑتی تو اس پر تشدد بھی کیا جاتا، اور بولاتر یویل نے تو، مثال کے طور پر، پانی سے تجربے کی مزاحمت بھی نہ کی ہوتی۔ "کیوں نہ ہم اس پر وائن کا تجربہ کریں۔" جن آردیے نے کہا۔

ایک دن انھوں نے سڑک کی مرمت کرنے والے کو شراب پلانے کی کوشش کی۔ بولاتر یویل شراب کی بہت بڑی مقدار پی گیا مگر بہت کم بات کی۔ جن آردیے نے قابلِ تعریف فن کاری اور ماہرانہ تناسب سے ایک بسیار خور کی پیاس کا کسی جج کے اختیار سے موازنہ کیا۔ پھر بھی اس پر لگائے گئے الزامات اور ان چند لفظوں کے تناظر میں، جو اس کے منہ سے نکل گئے تھے، جن آردیے اور اسکول ماسٹر سمجھے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں:

ایک صبح فجر کے وقت، جب بولاتر یویل اپنے کام پر جا رہا تھا، اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا تھا کہ جنگل کے ایک کونے میں جھاڑیوں کے نیچے ایک کھاڑا اور ایک پھاوڑا چھپایا گیا تھا۔

اس نے سوچا ہو گا کہ شاید یہ پھاوڑا اور کھاڑا Father Six-Fours نامی بہشتی کے ہوں گے۔ اس نے ان کے بارے میں مزید کچھ نہیں کیا، مگر اسی شام اس نے چھپ کر دیکھا، جب وہ ایک بڑے سے پیڑ پر چھپا ہوا تھا، "ایک آدمی جو اس علاقے سے متعلق نہیں تھا اور جسے بولاتر یویل اچھی طرح جانتا تھا" جنگل کے سب سے گھنے علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ جن آردیے

کا خیال تھا کہ یہ شخص ٹیلیر کے زمانے کا ساتھی ہوگا۔ وہ شخص، بولاتریویل نے جس کا نام بتانے سے سختی سے انکار کر دیا تھا، ایک مربع قسم کی کوئی شے، جیسے کوئی بکس یا چھوٹا سا صندوق لیے ہوئے تھا۔ بولاتریویل حیران تھا۔ بہر حال، چند ہی منٹ گزرے تھے کہ اسے اس شخص کا پیچھا کرنے کا خیال آیا۔ مگر دیر ہو چکی تھی؛ وہ شخص جنگل کے سب سے گھنے علاقے میں داخل ہو چکا تھا، رات ہو چکی تھی، اور بولاتریویل اس کا پیچھا کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جنگل کے کنارے بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ دو یا تین گھنٹے کے بعد بولاتریویل نے اس شخص کو جھاڑیوں سے نکلتے دیکھا، مگر اس وقت اس کے پاس کوئی بکس نہیں تھا، صرف ایک پھاوڑا اور ایک کلہاڑا تھا۔ بولاتریویل نے اس کو گزر جانے دیا، وہ اس شخص کو روک کر پوچھ گچھ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ جسامت اور طاقت میں وہ بولاتریویل سے کئی گنا زیادہ تھا، اور وہ کلہاڑے سے مسلح تھا، اور اس تصور ہی سے کہ شاید وہ پہچان لیا جائے گا اس کا کلہاڑے ایک ہی ضرب میں اس کا کام تمام کر سکتا تھا۔

دونوں ساتھیوں نے دوبارہ ملاقات پر اس معاملے پر اچھی طرح غور کیا۔ بولاتریویل کے نزدیک پھاوڑا اور کلہاڑا روشنی کی ایک کرن فراہم کر رہے تھے؛ وہ صبح سویرے جنگل کے گھنے علاقے میں گیا، مگر اسے وہاں نہ کوئی پھاوڑا ملا اور نہ کلہاڑا۔ اس نے یہ اخذ کیا کہ اس شخص نے جنگل میں داخل ہونے کے بعد بڑا سا گڑھا کھودا تھا، اور اس میں بکس کو دفن کر دیا تھا۔ چوں کہ بکس چھوٹا تھا، اس میں کوئی جسم نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا اس میں رقم ہی رہی ہو گی۔ بولاتریویل نے جنگل کے گھنے علاقے کو چھان مارا تھا، اور وہ تمام جگہیں کھود ڈالی تھیں جہاں کی مٹی حال ہی میں کھدی محسوس ہوئی تھی، مگر اسے کچھ نہیں ملا۔

اس کی ساری محنت بے کار گئی۔ اس کے بعد سے Montfermeil والوں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے رہے، "چوں کہ سڑک کی مرمت کرنے والا خواہ مخواہ ہی محنت نہیں کر رہا تھا، اب یقین ہو جانا چاہیے کہ ضرور کوئی بد روح آئی ہو گی۔"

ٹخنوں کی زنجیر

ماہ اکتوبر 1823ء کے اختتام تک، Toulon کے باسیوں نے Orion نامی جہاز کو بندرگاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کا بندرگاہ میں داخلہ موسم کی خرابی یا کسی قسم کی مرمت کے باعث نہیں ہو رہا تھا۔ بعد میں اس جہاز کو Brest میں ایک اسکول کے طور پر استعمال کیا گیا، جس کے بعد وہ بحیرۂ روم کے بیڑے کا حصہ بن گیا تھا۔

یہ جہاز پہلے ہی بہت خستہ ہو چکا تھا اس لیے کہ سمندر نے اس کو بہت نقصان پہنچایا تھا پھر بھی بندرگاہ میں اس کے داخلے نے اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس نے کچھ پرچم بلند کیے جن کے باعث اس کو گیارہ توپوں کی سلامی دی گئی، جن کے عوض اس نے بھی ہر سلامی کے جواب میں ایک سلامی پیش کی؛ یعنی بائیس بار توپیں داغی گئیں۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر سلامی؛ شاہی اور فوجی شائستگی؛ مہذب شور و غوغا کا تبادلہ؛ ساحلوں اور قلعوں کی رسوم؛ طلوع و غروب آفتاب پر، جہازوں اور قلعوں کی ایک دوسرے کو سلامی؛ ہر روز بندرگاہ کے کھولنے اور بند کرنے کے وقت سلامی پر مہذب دنیا میں چوبیس گھنٹوں کے اندر ایک لاکھ پچاس ہزار بے مقصد گولے داغے جاتے ہیں۔ چھ فرانک فی گولے کے حساب سے ہر سال تین سو ملین فرانک دھواں بنا کر اڑا دیے جاتے ہیں۔ یہ تو محض تفصیل ہے۔ اس دوران مفلس لوگ بھوک کے باعث لقمۂ اجل بھی بنتے رہتے ہیں۔

1823ء بحالی کا سال تھا جسے "ہسپانوی جنگ کا عہد" کہا گیا ہے۔

اس جنگ میں بہت سے واقعات ہوئے تھے، اور بہت سی خصوصیات تھیں۔ Bourbon کے خاندان کے لیے ایک بڑا اجتماع؛ فرانسیسی شاخ کا میڈرڈ کی شاخ کی دست گیری اور حفاظت کرنا، یعنی وہ کام کرنا جو بڑے چھوٹوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں؛ بہ ظاہر اپنی قومی روایات کی

جانب واپسی اور شمالی کہساروں کے زیر اثر کیے جانے کی پیچیدگی؛ موسیو le Duc d'Angouleme کا، جسے Andujar کے اخباروں نے ہیرو بنا دیا تھا، ایک فاتحانہ انداز میں دباؤ ڈالنا جسے اس کے پُرامن انداز نے متنازعہ بنا دیا تھا؛ مقدس اور بہت قدیم طاقت ور دہشت گردی؛ روشن خیال لوگوں میں عجیب الخلقت اختلافی دہشت گردی؛ مال دار بیواؤں کو خوف زدہ کرنے کی غرض سے ہسپانوی تشدد پسند انقلابیوں کے نام سے بیرن کے نچلے درجے کے ریپبلکن کا احیا؛ شاہی کا ترقی کو لاقانونیت کہہ کر اس کے خلاف ہو جانا؛ '89 کے نظریات کا بنیادی معاملات میں خلل انداز ہونا؛ فرانس کے خیالات کا یورپ میں روکا جانا جو دنیا بھر میں گھوم رہے تھے؛ فرانس کے بیٹے شہزادے Carignan کا بحیثیت حاکمِ اعلیٰ افواج ہونا، اس کے بعد Charles Albert کا عوام کے خلاف بادشاہوں کی جنگ میں رضاکار کے طور پر سرخ پوشوں کے ساتھ بھرتی ہو جانا؛ سلطنت کے سپاہیوں کا آٹھ برس کے آرام کے بعد سفید کلغی پہن کر نئی جنگ کے لیے نکلنا؛ مٹھی بھر بہادر فرانسیسیوں کا ملک کے باہر ترنگے پرچم کا لہرانا، جس طرح کہ تیس برس قبل Coblentz میں سفید پرچم لہرایا گیا تھا؛ راہبوں کا ہمارے سپاہیوں میں گھل مل جانا؛ سنگین کی نوک پر آزادی اور جدت کے جذبات کو ہوش میں لانا؛ گولا باری سے اصولوں کا ذبح کیا جانا؛ فرانس کا اس شے کو اپنے ہتھیاروں سے برباد کرنا جسے اس نے اپنے دماغ سے بنایا تھا؛ اس کے علاوہ، منحرف رہنما کا فروخت کیا جانا؛ سپاہیوں کا تذبذب میں پڑ جانا؛ لاکھوں کا شہروں کا محاصرہ کرنا؛ فوجی خطرات کے نہ ہونے کے باوجود دھماکوں کا امکان ہونا، اسی طرح جیسے کسی کان کو حیرت زدہ کر دینا اور اس پر حملہ کر دینا؛ مگر کم خوں ریزی کرنا، کم عزت حاصل کرنا، کچھ کے لیے شرمندگی، کسی کے لیے توصیف کا نہ ہونا۔ ایسی تھی وہ جنگ جو لوئی چہار دہم کے شاہزادوں سے ہوتی ہوئی آئی تھی، اور ان جرنیلوں نے لڑی تھی جو نپولین کے ماتحت رہ چکے تھے۔

ہتھیاروں کے کچھ کارنامے خاصے اہم تھے؛ Trocadero پر قبضہ کیا جانا ایک اچھی فوجی کارگزاری تھی؛ مگر بہرحال — ہم یہ بات دہرا رہے ہیں کہ اس جنگ کے بگل سے بھرائی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کا مکمل اثر شک انگیز تھا؛ تاریخ نے فرانس کی اس جھوٹی فتح کو قبول کرنے میں مشکل پیدا کرنے کے عمل کو قبول کیا ہے۔ خاصا واضح محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہسپانوی افسران، جن کو مزاحمت کا کام سونپا گیا تھا، آسانی سے ہار گئے تھے؛ فتح کو بدعنوانی کے شبہات سے منسلک کر دیا گیا تھا؛ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا جنگ نہیں جرنیل فتح کر لیے گئے تھے، اور فاتح سپاہی رسوا واپس ہوئے تھے۔ مختصراً، یہ ایک رسوا کر دینے والی جنگ تھی جس کے پرچم کی شکنوں

میں بینک آف فرانس دیکھا جا سکتا ہے۔

1808ء کی جنگ کے سپاہی، جن پر Saragossa کی تباہی کا الزام تھا، 1823ء میں قلعوں کی آسانی سے دست برداری پر جلیں بہ جبیں ہو رہے تھے، Palafox پر ملول ہو رہے تھے۔ یہ فرانس کی فطرت ہے کہ وہ [جرنیل] Ballesteros کے مقابلے میں [ناول نگار] Rostopchine کو آگے رکھنا پسند کرتا ہے۔

ایک اور زیادہ سنجیدہ نقطۂ نظر سے، اس مقام پر جس پر زور دیا جانا چاہیے، یہ جنگ، جس نے فرانس کی فوجی روح کو زخمی کیا تھا، اس کے جمہوری جذبے کے غصے کا باعث ہوئی ہے۔ یہ گرویدہ کر دینے والا ایک کارِ عظیم تھا۔ اس لڑائی میں جمہوریت کے بیٹے فرانسیسی سپاہی کا اصل مقصد دوسروں کی غلامی کو شکست دینا تھا۔ کتنا بھیانک تضاد تھا۔ فرانس کو قوموں کی روح کو جگانے کا، نہ کہ اس کا گلا گھونٹنے کا کام سونپا گیا تھا۔ 1792ء کے بعد کے یورپ کے سارے انقلابات [کی جان] انقلابِ فرانس رہا ہے: فرانس ہی سے آزادی اپنے عزم چلا رہی ہے۔ یہ اظہر من الشمس حقیقت ہے۔ بونا پارٹ کہتا ہے کہ اچھا وہ ہوتا ہے جو دیکھا نہیں جا پاتا۔

جہاں 1823ء کی جنگ ایک فیاض ہسپانوی قوم پر زیادتی تھی، وہیں انقلابِ فرانس پر بھی زیادتی تھی۔ وہ فرانس ہی تھا جس نے یہ خوف ناک تشدد کیا تھا؛ اور یہ غلط طریقے سے کیا گیا تھا، اس لیے کہ جنگِ آزادی کے علاوہ قومیں جو کچھ بھی کرتی ہیں وہ غلط طریقے سے کرتی ہیں۔ مجہول فرماں برداری کے الفاظ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ فوج ایک حیرت انگیز شاہکار ہوتی ہے، جہاں بے حد کم زوری ہی کا نتیجہ طاقت ہوتی ہے۔ جنگ اسے کہتے ہیں جو انسانیت کے باوجود، انسانیت کے خلاف، انسانیت کے ہاتھوں کی جاتی ہے۔

1823ء کی جنگ [فرانسیسی شاہی خاندان والے] Bourbons کے لیے مہلک تھی۔ انھوں نے اسے کامیابی سمجھا۔ انھیں اس خطرے کا اندازہ نہیں ہوا تھا جو کسی خیال کو قتل کر دینے میں پوشیدہ تھا۔ وہ اپنی معصومیت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ انھوں نے اپنے نظامِ استحکام میں جرم کی کم زوری کو طاقت کا عنصر بنا کر متعارف کرا دیا تھا۔ گھات لگا کر مارنے کا جذبہ ان کی سیاست کا حصہ بن گیا تھا۔ 1830ء کے جراثیم 1823ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ہسپانوی جنگ ربانی فرض بنا کر پیش کی گئی تھی۔ فرانس نے ہسپانیہ میں دوبارہ elrey netto [شاہی جال] قائم کرنے کے بجائے خود اپنے ملک ہی میں ایک مطلق بادشاہت قائم کر دی ہوتی۔ وہ سپاہی کی وفاداری کو قومی رضا مندی سمجھنے کی خوف ناک غلطی کر بیٹھے تھے۔ ایسا اعتماد ہی

شاہیوں کو کھنڈر بنا دیتا ہے۔ کسی machineel [کڑوے اور زہریلے رس والے] درخت کے نیچے یا کسی فوج کے زیرِ سایہ سونے کی اجازت نہیں ہوا کرتی۔

آیئے، اب ہم Orion جہاز کے موضوع پر واپس چلتے ہیں۔

حاکمِ اعلیٰ افواج کے حکم پر کی جانے والی فوجی کارروائی کے دوران بحری جہازوں کا ایک بیڑا بحیرۂ روم میں گشت کر رہا تھا۔ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ Orion اسی بیڑے سے متعلق تھا، اور سمندر میں ہونے والے حادثات کے باعث اسے Toulon کی بندرگاہ میں آنا پڑا تھا۔

بندرگاہ میں کسی جنگی جہاز کی موجودگی ایسی اہم بات ہوتی ہے جو عوام کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ یہ جہاز بڑا اہم ہوتا ہے اور عوام ہر بڑی چیز کو پسند کرتے ہیں۔

بحری بیڑے میں شامل جہاز قدرتی طاقت اور انسانی جوہرِ قابل کا بہترین اتصال ہوتا ہے۔

ساتھ ہی، جہاز میں شامل وزنی ترین اور سبک ترین اشیا ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس کو ایک ساتھ مختلف اقسام کی اشیا— جامد، رقیق اور سیال — سے واسطہ پڑتا ہے اور اس کو ان تینوں سمیت لڑائی میں شرکت بھی کرنا پڑتی ہے۔ اس میں فولاد سے بنے گیارہ شکنجے ہوتے ہیں جن سے سطحِ سمندر پر پڑے سنگِ خارا اور کئی شاخوں کے لنگیٹا سے بادل کی ہواؤں کو پکڑنا پڑتا ہے۔ اس کی سانس اس کی انگل جیسی ایک سو بیس سے زیادہ توپوں کے دہانوں سے نکلتی ہے، اور فخریہ انداز سے گرج کا جواب دیتی ہے۔ سمندر اپنی موجوں کی حیرت انگیز یکسانیت میں اس کو بہا لے جانا چاہتا ہے، مگر جہاز کی اپنی بھی ایک روح ہوتی ہے، اس کا اپنا قطب نما ہوتا ہے، جو مشورے دیتا ہے اور ہمیشہ شمال دکھاتا رہتا ہے۔ سیاہ ترین راتوں میں بھی اس کی لالٹین ستاروں کا کام کرتی ہے۔ اس طرح، ہوا کے مقابل، اس کی رسیوں کے ڈھیر اور ترپالیں ہوتی ہیں؛ پانی کے مقابل لکڑی؛ اور چٹانوں کے مقابل اس کا فولاد، پیتل اور سیسہ؛ سایوں کے مقابل اس کی روشنی؛ لامحدودیت کے مقابل، [قطب نما کی] سوئی ہوتی ہے۔

اگر کسی کو ان تمام خوف ناک تناسبات کا اندازہ لگانا ہو جو اس جہاز کی تعمیر میں شامل ہوتے ہیں، تو اس کو کسی چھ منزلہ تعمیراتی سامان کے انبار میں داخل ہونا ہوگا جو Brest یا Toulon کی بندرگاہوں میں ڈھیر ہوتے ہیں۔ وہاں تعمیر کے مراحل سے گزرنے والا جہاز گویا کسی شیشے سے بنے [مہیب] گھنٹے کے نیچے ہوتا ہے۔ زمین پر پڑی ایک بہت بڑی شہتیر بادبان لگانے کے کام آتی ہے۔ ایک طویل شہتیر جس کی لمبائی ساٹھ تقریباً ہوگی (fathoms) [ایک تقریباً برابر ہوتا ہے چھ فٹ کے] جو جہاز کا مرکزی مستول ہوگی جس کے نچلے سرے کا قطر تین

فٹ کے برابر ہوگا، یہ انگریزی مستول سطح آب سے دو سو ستر وفٹ بلند ہوگا۔ ہمارے بزرگوں کے زمانے کی بحریہ تار استعمال کرتی تھی، ہم زنجیر استعمال کرتے ہیں۔ جہاز پر رکھے زنجیر کے ڈھیر کی اونچائی چار فٹ اور چوڑائی تین فٹ کے برابر ہوتی ہے۔ غور کیجیے کہ جہاز کی تعمیر میں کتنی لکڑی لگتی ہوگی؟ تین ہزار مکعب فٹ! گویا، یہ تیرتا ہوا جنگل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے، اور ہم بات کر رہے ہیں چالیس برس قبل کے عام جہازوں کی، کہ دخانی جہاز اس زمانے میں اپنے ابتدائی مراحل میں تھے، جو اب ترقی پا کر معجزہ بن گئے ہیں جن کو جنگی جہاز کہا جاتا ہے۔ اس وقت بیچ سے ملا کر بنائے گئے جہاز ایک حیرت انگیز مشین ہوتے تھے، جن کو تین ہزار مربع میٹر ترپال [کے بادبان]، اور ڈھائی ہزار ہارس پاور کے انجن چلاتے تھے۔

کرسٹوفر کولمبس اور De Ruyter کے زمانے کے قدیم جہازوں کے مقابلے میں یہ نئے حیران کن جہاز کیا چیز ہوں گے۔ بے حد تیز ہواؤں میں بھی یہ کبھی نہ ختم ہونے والی طاقت کا حامل ہوتا ہے لہروں کی اتنی خوفناک وسعتوں میں بھی تیرتا پھرتا ہے، اور پانی پر حکومت کرتا ہے۔

پھر بھی، ایسا وقت آتا ہے جب طوفانی ہوا اس ساٹھ گز اونچی شہتیر کو جس پر بادبان لٹکایا جاتا ہے تنکے کی طرح توڑ ڈالتی ہے، جب ہوا اس چار سو فٹ اونچے مستول کو جھکا دیتی ہے، جب وہ لنگر، جن کا وزن ہزاروں ٹن ہوتا ہے، لہروں کے جبڑوں میں اس طرح نگل کھاتا ہے جیسے مچھلی کے شکار میں استعمال ہونے والا کانٹا، جب دیو ہیکل توپیں غم انگیز اور بے نتیجہ دہاڑ پیدا کرتی ہیں، جسے طوفانی رات میں، دور تک، خلا میں لے جاتا ہے، جب وہ تمام طاقت اور سارا کروفر ایک طاقت میں بدل جاتا ہے جو اعلیٰ طاقت ہوتی ہے۔

Orion ایک عرصے سے بیمار تھا؛ اپنے پچھلے سفروں کے دوران اس کے تلے میں بحری قشریوں (barnacles) کی اتنی تہیں جم گئی تھیں کہ اس کی رفتار کم ہو کر نصف رہ گئی تھی۔ ایک برس قبل اس کو خشک بندرگاہ میں پہنچا دیا گیا تھا، تا کہ اس کے تلے میں بنی تہوں کو کھرچ کر نکال دیا جائے، اور اس کو دوبارہ پانی میں اتارا جا سکے، مگر اس صفائی سے تلے میں لگی کیلیں متاثر ہوئیں: جزائر Balearic میں اس کی مرمت کی گئی، اور چوں کہ اس زمانے میں لوہے کی بڑی بڑی چادریں استعمال نہیں کی جاتی تھیں، جہاز میں لگی کیلوں کے اطراف سوراخ ہو گئے تھے۔ اور ایک طوفان کی زد میں آ کر اس کو زیادہ نقصان پہنچ گیا تھا جس کی وجہ سے Orion کو واپس Toulon لے جانا پڑا۔

جہاز Arsenal کے قریب لنگر انداز تھا، اور اس کی مرمت شروع ہو گئی تھی۔ اس کے بیرونی خول (hull) کو نقصان نہیں پہنچا تھا، بس اس کے دائیں رُخ سے، یہاں وہاں، کچھ تختوں سے کچھ کیلیں نکال دی گئی تھیں تا کہ اندر تازہ ہوا داخل ہو سکے۔

ایک صبح جب عوام اس کو دیکھ رہے تھے، ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ملاح بادبان اتارنے میں مشغول تھے؛ سب سے اوپر والا آدمی، جسے بادبان کا اوپری حصہ تھامنا تھا، اپنا توازن کھو بیٹھا؛ اس کو لڑکھڑاتے دیکھا گیا؛ Arsenal کی گودی میں جمع لوگوں کی چیخیں نکل گئیں؛ اس آدمی کے سر نے جسم کو غیر متوازن کر دیا؛ وہ بادبان لٹکانے والی شہتیر کے قریب گرا، نیچے گرتے وقت اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے؛ اس کے ہاتھ ایک رسی آ گئی، جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، اور ہوا میں جھولنے لگا؛ نیچے چکرا دینے والی سمندر کی گہرائیاں تھیں؛ اس کے گرنے سے رسی بھی تیزی سے جھولنے لگی تھی؛ وہ آدمی، رسی پکڑے اس طرح جھول رہا تھا جیسے کسی ڈور سے سرے سے بندھا ہوا پتھر۔

اس کی مدد کرنے کی کوشش میں خطرات تھے؛ کسی ملاح کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کی مدد کو پہنچتا۔ اس دوران اس بے چارے آدمی کی قوت کم ہوتی جا رہی تھی؛ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تو نہیں تھے، مگر اس کے دست و پا میں تھکن صاف دکھائی دے رہی تھی؛ بازوؤں میں خوف ناک پھڑکن ہو رہی تھی؛ اوپر چڑھنے کی ہر کوشش رسی کو زیادہ جھلا رہی تھی؛ وہ چلایا نہیں تا کہ اس کی قوت میں کمی نہ ہو۔ سب اس بدقسمت لمحے کے منتظر تھے جب رسی پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی، اور لمحہ بہ لمحہ لوگوں کے سر مُڑ رہے تھے تا کہ وہ اس کے گرنے کو نہ دیکھ سکیں۔ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب رسی کا کوئی ٹکڑا، کوئی چھڑ، درخت کی کوئی شاخ خود زندگی بن جاتی ہے، اور وہ منظر بہت خوف ناک ہوتا ہے جب کوئی زندہ وجود اس سے الگ ہو کر پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔

اچانک ایک آدمی چیتے کی پھرتی سے رسیوں اور مستول کے درمیان چڑھتا دکھائی دیا؛ یہ آدمی سرخ لباس میں تھا؛ وہ ایک سزا یافتہ قیدی تھا؛ اس نے سبز رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی؛ وہ عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ اوپر جاتے وقت ہوا کا ایک جھکڑ اس کی ٹوپی اڑا لے گیا، اور اس کا سفید سر دکھائی دینے لگا؛ وہ جوان آدمی نہیں تھا۔

ہوا یوں تھا کہ گیلیر میں کام کرنے والا ایک سزا یافتہ دوڑا ہوا وہاں موجود ایک افسر کے پاس گیا، اور ملاحوں کی حیص بیص کے دوران، جب سب کانپ رہے تھے، اور پیچھے ہٹتے جا

رہے تھے،اس نے افسر سے اس شخص کو بچانے میں اپنی جان کی بازی لگادینے کی اجازت طلب کی تھی؛افسر کے اثباتی اشارے کے ملتے ہی اس نے اپنے ٹخنوں میں لگی زنجیر ہتھوڑے کی ایک ہی ضرب میں توڑ ڈالی، پھر اس نے ایک رسی ہاتھ میں لی اوراوپر چڑھنے لگا۔کسی نے اس وقت اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ زنجیر کتنی آسانی سے توڑ دی گئی؛اس امر پر بعد میں توجہ کی گئی تھی۔

پلک جھپکتے ہی وہ بادبان کی شہتیر پر تھا؛ایک لمحے کے لیے رُکا کہ وہ نظروں سے ہی اس کی پیائش کر رہا تھا؛وہ لمحے جن میں ہوا رسی سے لٹکے ہوئے آدمی کو جھلا رہی تھی ان لوگوں کو صدیوں جیسے لگ رہے تھے جو نیچے کھڑے دیکھ رہے تھے۔بالآخر،سزا یافتہ نے آسمان کی جانب نظر کی اورایک قدم آگے بڑھا؛ہجوم نے لمبی سانس لی۔اس کوشہتیر پر دوڑتے دیکھا گیا:اس کے سرے پر پہنچ کراس نے رسی کا ایک سرا شہتیر سے باندھا جو وہ ساتھ لے کر گیا تھا،دوسرا نیچے کی جانب لٹکا دیا،اوردھیرے دھیرے اس پر اُترنے لگا— اب اذیت دوبالا ہوگئی تھی،اب ایک آدمی کے بجائے دو آدمی سمندر کے اوپر جھول رہے تھے۔

اس منظر کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا گویا مکڑی مکھی کو پکڑنے جا رہی ہےمگراس موقعے پر زندگی دینے کے لیے،شکار کو کھانے کے لیے نہیں۔ہزاروں نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں؛نہ کوئی آواز اور نہ منہ سے کوئی لفظ نکل رہا تھا۔ہرابرو پرایک ہی قسم کا لرزہ طاری تھا۔ہر منہ اپنی سانس روکے ہوئے تھا،گویا اسے خوف تھا کہ نکلنے والی سانس اس ہوا میں اضافہ کردے گی جس میں وہ دو بدقسمت انسان جھول رہے تھے۔

اس دوران سزا یافتہ خود کو ملاح کے قریب لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔وقت آگیا تھا؛ایک منٹ دیر ہوتی تو تھکا ہوا— اورافسردہ ملاح کے ہاتھ سے رسی چھوٹ جاتی اور وہ پاتال میں چلا جاتا۔سزا یافتہ اس آدمی کواسی رسی سے باندھ چکا تھا جس میں ایک ہاتھ کے بل وہ جھول رہا تھا،بعد میں وہ دوسری رسی پر کام کر رہا تھا۔بالآخر،اس کو بادبان کی شہتیر پر چڑھتے اور اپنے بعد ملاح کواوپر کھینچتے دیکھا گیا؛اس کوتھوڑی دیر اپنا سانس درست کرنے اورقوت بحال کرنے کا وقت فراہم کیا اوراس کواپنے ساتھ شہتیر پر چلتے ہوئے،وہاں سے بلندی پر لے گیا اوراس کو ساتھیوں کے حوالے کردیا۔

اس لمحے مجمع تالی بجا رہا تھا؛پرانے سزا یافتہ سارجنٹ آپس میں گلے مل کر رو پڑے اور مال چڑھانے والے گھاٹ پر جمع عورتیں ایک دوسرے سے گلے ملنے لگیں،اورتمام آوازیں ایک نرم غصے کی سی کیفیت میں چلا پڑیں،''اس آدمی کی سزا معاف کردو۔''

اس دوران سزا یافتہ اپنے گروہ میں جلد واپس پہنچنے کی خاطر کودتا پھاندتا بادبان کی نچلی شہتیر تک پہنچ گیا؛ ساری نظریں اسی کا پیچھا کر رہی تھیں۔ کسی لمحے اس پر خوف کا غلبہ ہوگیا تھا؛ وہ تھکن کے باعث تھا، یا اس کا سر چکرا گیا تھا کہ لوگ سمجھے کہ وہ تذبذب میں ہے اور لڑکھڑا رہا ہے اچانک مجمع چیخ پڑا۔ سزا یافتہ سمندر میں گر پڑا تھا۔ اس کا گرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ Orion کے ساتھ ہی جنگی جہاز Algesiras لنگر انداز تھا، اور بے چارہ سزا یافتہ دونوں جہازوں کے درمیان پانی میں جا گرا تھا۔ اس بات کا خوف کیا جا رہا تھا کہ وہ ان دونوں جہازوں میں سے ایک کے نیچے غائب ہو جائے گا۔ چار آدمی فوراً ایک کشتی میں کودے؛ مجمعے نے ان کی تعریف میں تالیاں بجائیں؛ مجمع ایک بار پھر متوحش ہوگیا؛ وہ آدمی سمندر کی سطح پر ابھرا نہیں تھا؛ وہ سمندر میں ایک بھی لہر اٹھائے بغیر ہی غائب ہوگیا تھا، جیسے وہ کسی تیل کے پیپے میں گر گیا ہو۔ انھوں نے آوازیں دیں، انھوں نے پانی میں غوطہ مارا، مگر سب بے کار۔ شام تک تلاش جاری رہی۔ انھیں اس کی لاش بھی نہیں ملی۔

دوسرے دن Toulon کے اخبارات میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی:

"17 نومبر 1823ء۔ کل، Orion جہاز پر قید ایک سزا یافتہ، ایک ملاح کو بچانے کے بعد واپس ہوتے وقت سمندر میں گر کر ڈوب گیا۔ ابھی تک لاش نہیں ملی ہے؛ قیاس ہے کہ وہ Arsenal پوائنٹ کے اندرونِ سمندر انبار میں الجھ گیا ہوگا۔ یہ شخص 9,430 نمبر کا سزا یافتہ تھا اور اس کا نام ژاں والژاں تھا۔"

۞

پانی کا مسئلہ

Montfermeil، لیوری اور شیل کے درمیان جنوبی کنارے کے اس بلند مقام پر واقع ہے جو Ourcq کو Marne سے علاحدہ کرتا ہے۔ فی زمانہ یہ ایک بڑا شہر ہے۔ تمام سال سفید بنگلوں اور اتوار کے دن خوش باش بوژوا لوگوں سے بارونق رہتا ہے۔ 1823ء میں Montfermeil میں نہ اتنے سفید مکانات تھے نہ اتنے مطمئن باشندے: جنگل کے درمیان ایک بڑا سا گاؤں تھا۔ اس میں پچھلی صدی کے کچھ تفریحی امکانات پائے جاتے تھے جو اپنی اعلیٰ درجے کی تعمیر، آہنی جنگلوں، اپنی بالکنیوں، اور بڑی بڑی کھڑکیوں سے پہچانے جاتے تھے جن کے مختلف رنگ کے چھوٹے چھوٹے رنگین شیشے سفید رنگ کے بند کواڑوں پر اپنے رنگ بکھیرتے تھے۔ پھر بھی Montfermeil ایک گاؤں ہی تھا۔ کام سے فارغ سوداگران پارچہ اور وکیلوں نے ابھی تک اسے دریافت نہیں کیا تھا؛ یہ ایک پُرسکون اور دل موہ لینے والی جگہ تھی، جس میں سے ہوکر کوئی سڑک نہیں گزرتی تھی: لوگ سستے داموں زندگی بسر کرتے تھے؛ اس قسم کی دیہی زندگی اتنی افراط اور اتنی آسان تھی: بس، وہاں صرف پانی کی کمی تھی، اس لیے کہ اس علاقے کی سطح بلند تھی۔

پانی لانے کے لیے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا؛ گاؤں کا Gagny کی جانب کا حصہ جنگل کے دو تالابوں سے پانی لیتا تھا۔ دوسرا سرا جو گرجا گھر کو گھیرے ہوئے ہے اور Chelles کی جانب ہے، Chelles کی سڑک کے قریب ایک ڈھلان کے قریب قدرتی چشمے سے پینے کا پانی حاصل کرتا تھا جو Montfermeil سے ایک چوتھائی گھنٹے کے سفر پر واقع تھا۔

اس طرح گاؤں کے ہر گھر کو پانی مہیا کرنے میں مشکل اٹھانی پڑتی تھی۔ بڑے مکانات، اشرافیہ، اور تھینارڈیے کی سرائے جس کا حصہ تھی، ایک شخص کو جس نے پانی کی فراہمی کو اپنا کاروبار

بنا لیا تھا، ایک بالٹی پانی کے عوض نصف فارڈنگ ادا کیا جاتا تھا۔ وہ شخص Montfermeil کو پانی کی فراہمی سے تقریباً آٹھ سو روزانہ کما لیتا تھا؛ مگر وہ نیک انسان گرمی کے دنوں میں شام کے سات بجے تک، اور سردی کے دنوں میں شام کے پانچ بجے تک کام کرتا تھا؛ رات ہوتے ہی، جب اس کا دروازہ بند ہو جاتا، تو جس کے پاس پینے کو پانی نہیں ہوتا، وہ یا تو خود جا کر پانی لاتا یا رات بھر اس کے بغیر ہی گزارا کرتا تھا۔

یہ حالات بے چاری کوزیٹ کے لیے اندوہ ناک تھے، قاری جسے غالباً بھولا نہیں ہوگا۔ قاری کو یاد ہوگا کہ تھن آردیے خاندان کے لیے کوزیٹ دو طرح سے فائدے کا باعث تھی۔ اس کی ماں ان کو اجرت دیتی تھی، اور وہ اس سے خدمت گاری کا کام لیتے تھے۔ جب سے اس کی ماں نے رقم بھیجنی بند کر دی تھی، جس کی وجہ ہم پچھلے ابواب میں پڑھ چکے ہیں، تھن آردیے خاندان نے کوزیٹ کو اپنی ملازمہ بنا لیا تھا۔ اس حیثیت میں جب بھی درکار ہوتا، اسے پانی لانے کے دوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ بچی رات کے وقت چشمے سے پانی لانے کے خیال ہی سے خوف زدہ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اس بات کا خیال رکھتی تھی کہ اس گھر میں کبھی پانی کی کمی نہ ہونے پائے۔

1823ء کا کرسمس، بالخصوص Montfermeil میں شان دار گزرا تھا۔ موسم کی ابتدا میں ہی سردی کم ہو گئی تھی؛ اس وقت تک نہ برف گری تھی اور نہ پالا پڑا تھا۔ پیرس کے چند نیم حکیم اور دوا فروشوں نے میئر کی اجازت سے گاؤں کی سب سے اہم سڑک پر اپنی عارضی دکانیں لگا لی تھیں؛ پھیرے لگانے والے سوداگروں کے ایک گروہ نے بھی چرچ اسکوائر میں اپنی عارضی دکانیں کھول لی تھیں، بلکہ وہ تو Boulanger Alley تک پھیل گئے تھے جہاں، جیسا کہ قاری کو علم ہے تھن آردیے خاندان کی سرائے واقع تھی۔ یہی لوگ سرائے اور مے نوشی کی دکانوں میں جمع رہتے تھے اور اس پُرسکون علاقے کو ایک پُرشور اور خوش باش ماحول سے آشنا کر رہے تھے۔ ایک ایمان دار تاریخ داں کا کردار ادا کرنے کے لیے ہمیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس میدان میں تجسس پیدا کرنے والی بہت سی اشیا میں سے ایک شے وہ پنجرہ تھا جس میں، خوف ناک مسخرے چیتھڑوں میں ملبوس 1823ء میں Montfermeil کے دیہاتیوں کو برازیل کے وہ خوف ناک گدھ دکھا رہے تھے، جیسے شاہی عجائب گھر والوں کے پاس بھی نہیں تھے، جن کے سروں پر سہ رنگی کلغیاں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس پرندے کو Polyborus Caracara بتاتے تھے؛ کہ ان کا تعلق Apicide کے خاندان کے گدھوں سے ہے۔ کچھ اچھے بوناپارٹی فوجی بھی جو ملازمت سے فارغ ہو کر اس گاؤں میں آباد ہو گئے تھے، بڑے تقدس سے ان کو دیکھنے گئے تھے۔ ان نیم حکیموں

نے دیکھنے والوں کو بتایا کہ ان کی سہ رنگی کلغیاں خدا نے خاص کر ان کے پنجروں کے لیے بنائی ہیں۔

کرسمس کی رات گاڑی بانوں اور پھیری لگانے والوں میں کئی افراد تبھی آر دیے کی سرائے کے عام کمروں میں سے ایک کمرے میں، چار یا پانچ شمعوں کے اطراف، ایک میز پر بیٹھے ہوئے شراب اور سگریٹ نوشی میں مشغول تھے۔ یہ کمرے مے خانوں کے کمروں سے مشابہ تھے — میزیں، جست کے بنے جگ، بوتلیں، مے نوشی کرنے والے، تمباکو نوشی کرنے والے، مگر کم روشنی اور بے حد شور و غوغا، کہ یہ 1823ء تھا۔ دو اشیا سے معلوم ہوتا تھا، جو اس زمانے کے بورژوا درجے کے لوگوں میں رائج تھیں: ایک کلائیڈوسکوپ، اور ایک ٹین سے بنا لیمپ۔ خاتون تین آر دیے رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھی، جو ایک کھلی آگ میں پکایا جا رہا تھا؛ اس کا شوہر گاہکوں کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول سیاست پر باتیں کر رہا تھا۔

سیاسی باتوں کے علاوہ جن کا مرکزی موضوع جنگِ ہسپانیہ اور موسیو ڈیوک d'Angouleme ہوتے تھے اور، شور و غوغا کے باوجود، مندرجہ ذیل مقامی معاملات بھی سنائی دیتے تھے:

"Nanterre اور Suresnes کے اطراف انگور کی اچھی پیداوار ہوئی ہے۔ جہاں دس داٹوں کا اندازہ لگایا جاتا تھا وہاں بارہ نکلتے تھے۔ اس وجہ سے زیادہ عرق نکل رہا ہے۔" "مگر انگور تو زیادہ پک نہیں سکتے؟" "ان علاقوں کے انگور زیادہ پکنے نہیں چاہئیں؛ جوں ہی بہار کا موسم آتا ہے وائن میں چکناہٹ آجاتی ہے۔" "تب وائن بہت ہلکی ہو جاتی ہے؟" "اس سے خراب وائن بھی ہوتی ہیں۔ انگور جب سبز ہوں اس وقت توڑ لیے جانے چاہئیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

یا پن چکی والا کہتا سنا جاتا ہے:

"کیا جو کچھ بوروں میں ہوتا ہے اس سب کی ذمے داری ہماری ہوتی ہے؟ ان میں چھوٹے چھوٹے بیج بھی ہوتے ہیں ہم جنھیں نکال نہیں سکتے۔ ہمیں سب کچھ چکی کے پاٹوں کے درمیان ڈالنا پڑتا ہے؛ اس میں موٹھ، سویا، پھلیاں، سن کے بیج، گھاس کے اور طرح طرح کے بیج ہوتے ہیں؛ کنکر تو ہوتے ہی ہیں جو کچھ قسم کے گندم میں زیادہ پائے جاتے ہیں، بالخصوص Breton کے گندم میں۔ مجھے Breton کے گندم کی پسائی اچھی نہیں لگتی، بالکل اسی طرح جیسے آرے مشین والے ایسی شہتیروں کی کٹائی پسند نہیں کرتے جن میں کیلیں ہوتی ہیں۔ آپ اس گرد کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو پسائی کے دوران اٹھتی ہے۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں۔ آٹے کی خرابی ہماری غلطی نہیں ہوا کرتی۔"

دو کھڑکیوں کے درمیان جگہ میں رکھی ایک میز پر ایک گھاس کاٹنے والا اور ایک زمین دار بیٹھا تھا جو بہار کے موسم میں چراگاہ میں کچھ کام کرانے کا سودا کر رہا تھا۔ گھاس کاٹنے والا کہہ رہا تھا، گھاس اگر گیلی ہو تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ زیادہ اچھی طرح کٹتی ہے۔ شبنم اچھی چیز ہوتی ہے، جناب۔ گھاس پر اس سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے ہاں کی گھاس بہت نرم ہوتی ہے، اور مشکل سے کٹتی ہے۔ بہت زیادہ نرم ہوتی ہے۔ لوہے کے سامنے بچھ جاتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

کوزیت اپنی مخصوص جگہ، چمنی کے قریب رکھی باورچی خانے کی میز کے نیچے بیٹھی تھی؛ چیتھڑوں میں ملبوس تھی؛ اس کے برہنہ پیر لکڑی سے بنے جوتوں میں ٹھنسے ہوئے تھے، اور آگ کی روشنی میں تین آر دیے کی لڑکیوں کے لیے اونی موزے بُننے میں مصروف تھی۔ کرسیوں کے درمیان بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ گھوم پھر رہا تھا۔ ملحقہ کمرے سے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آرہی تھیں، جن میں بچوں کی آوازیں بھی شامل تھیں؛ ایپونین اور آزیلما کی بچگانہ آوازیں۔

چمنی کے کونے میں کیل پر ایک کوڑا ٹنگا تھا۔

وقفے وقفے سے ایک چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ وہ ایک لڑکا تھا جو پچھلے سردی کے موسموں میں کسی ایک موسم میں تین آر دیے کے ہاں پیدا ہوا تھا— اس کو خبر نہیں کیوں۔ شاید، یہ سردی کے موسموں کا نتیجہ تھا۔ لڑکا تین برس کے قریب کی عمر کا تھا۔ ماں نے اس کو دودھ پلایا تھا، مگر اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب اس کے رونے کی مسلسل آواز پریشان کرنے لگی تو تین آر دیے نے اپنی بیوی سے کہا، "تمھارا بیٹا چیخ رہا ہے۔ جاؤ دیکھو کیا چاہتا ہے۔"

"ہونہہ" ماں جواب دیتی، "مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔" اور بچے کو اندھیرے میں چیختا چھوڑ دیتی۔

دو مکمل خاکے

ابھی تک اس کتاب میں تین آردیے کا خاندان ایک خاکے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے؛ اب وقت آ گیا ہے کہ اس جوڑے کا مکمل اور یک جا خاکہ بنایا جائے، اور اس کو ہر زاویے سے پرکھا جائے۔

مسٹر تین آردیے اپنی عمر کے پچاسویں سال میں تھا؛ مادام تین آردیے چالیس کی ہونے والی تھی، جو دیکھنے میں پچاس کے برابر ہوگی؛ گویا شوہر اور بیوی کی عمر میں ایک توازن موجود تھا۔

ہمارے قارئین میں اس عورت کے بارے میں کچھ یادیں محفوظ ہوں گی — قد آور، سنہرے بالوں والی، سرخ، فربہ، اکھڑ، مہیب اور پھرتیلی؛ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس کا تعلق عورتوں کے اس طبقے سے تھا جو مہیب اور وحشی قسم کی ہوتی ہیں، جو اپنے بالوں میں پتھر کے ٹکڑے باندھ کر تماشا کرتی ہیں۔ وہ گھر کا ہر کام کرتی تھی — بستر ٹھیک کرنا، کپڑے دھونا، کھانا پکانا وغیرہ۔ کوزیت اس کی واحد خادمہ تھی، جیسے کسی ہتھنی کی خدمت میں ایک چوہیا۔ اس کی آواز سے ہر چیز لرز جاتی تھی، کھڑکی کے شیشے، فرنیچر اور لوگ۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ سرخ رنگ کے دھبے تھے۔ اس کے چہرے پر بھی بال تھے۔ وہ عورتوں کے لباس میں بھی بازاری حمال جیسی لگتی تھی۔ وہ شان سے گالی بکتی تھی؛ ایک مکے کی ضرب سے بادام توڑ سکنے کا دعویٰ کرتی تھی۔ ان رومانسوں کے سوا جو اس نے پڑھ رکھے تھے، جو اس متاثرہ خاتون کو عجیب انداز میں مرد خور بنا دیتے تھے، کوئی اس کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ "یہ عورت ہے"۔ یہ مؤنث تین آردیے، چیخنے والی فاحشہ عورت جیسی مخلوق تھی۔ اس کو بولتے سن کر محسوس ہوتا تھا گویا کوئی سپاہی حکم دے رہا ہو۔ جب کوئی اسے شراب پیتے دیکھتا تو کہتا کہ یہ ضرور کوئی گاڑی بان ہے؛ جب اسے کوزیت سے

معاملہ کرتے دیکھتا تو کہتا، "یہ جلاد ہے۔" چہرہ پُرسکون ہوتو ایک دانت باہر نکلا دکھائی دیتا تھا۔

مسٹر تین آردیے ایک پستہ قد، دُبلا، زرد رو، اکھڑ، ہڈی کا ڈھانچا، کم زور آدمی تھا، جو اگر چہ بیمار دکھائی دیتا تھا مگر حیرت انگیز طور پر صحت مند انسان تھا۔ اس کی چالاکی یہیں شروع ہوئی تھی؛ وہ احتیاط کے طور پر عادتاً مسکراتا رہتا تھا اور ہر ایک سے بہت خوش دلی سے پیش آتا تھا، حتیٰ کہ اس فقیر سے بھی جس کو فاروِنگ بھی خیرات میں دینے سے انکار کر دیتا تھا۔ اس کی نظریں تیکھی نیولے کی سی اور ڈھنگ ایک دانش ور جیسا تھا۔ اس میں [اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی شاعر اور مترجم] Abbe Delille کی مشابہت تھی۔ اس کے ناز نخرے گاڑی بانوں کے ساتھ شراب نوشی تک محدود رہتے تھے۔ کوئی بھی کبھی اس کو مدہوش کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑا سا پائپ پیتا تھا۔ بلاؤز پہنتا تھا، اور بلاؤز کے نیچے ایک سیاہ رنگ کا کوٹ پہنے رہتا تھا۔ ادب اور مادیت کے دعوے کرتا تھا۔ کچھ مخصوص نام تھے جنھیں وہ اپنی تقریباً ہر بات میں کسی نہ کسی طرح شامل کر لیتا تھا— شعرا والٹیئر، پارنی (Raynal Parny) رینال اور خصوصاً سینٹ آگسٹین وغیرہ۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا اپنا "ایک نظام" ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک فن کار ٹھگ بھی تھا، فلسفیانہ اور سائنسی چور بھی۔ اس کی قسم کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ کہتا تھا کہ وہ فوج میں بھی رہ چکا ہے؛ اسے فراوانی سے متعلق ہونے کی عادت تھی، اور کس طرح وہ واٹر لو میں کسی چھٹی اور نویں رجمنٹ میں سارجنٹ رہا تھا، اس نے تن تنہا موت کے کھلاڑی ہُساروں کے اسکواڈرن کی موجودگی میں، گریپ شاٹ کی بارش میں ایک جنرل کے جسم کو اپنے جسم سے ڈھانپ کر اس کی جان بچائی تھی جو بہت خطرناک حد تک زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہی سے وہ اپنی سرائے کی دیوار پر ایک بھڑکیلا سا نشان لگائے رکھتا تھا اور سرائے کے لیے "واٹر لو کے سارجنٹ کی رقص گاہ" جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ وہ بہت روشن خیال، کلاسیکی اور "بونا پارٹی" انسان تھا۔ Champ d'Asile کا رُکن بھی تھا۔ گاؤں والے کہتے تھے کہ اس نے رہبانیت کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

وہ Flander والوں میں Lille، پیرس میں فرانسیسی، برسلز میں بلجیم والا ہوتا، اور دونوں سرحدوں کی دونوں جانب آرام سے گھومتا پھرتا تھا۔ واٹر لو میں اس کی جواں مردی کے بارے میں قاری بہت کچھ جانتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ ذرا بڑھا چڑھا کر بات کرتا تھا۔ اوپر نیچے ہونا، گھومتے پھرتے رہنا، مہم جوئی کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا؛ پرزہ پرزہ شعور ایک نامکمل زندگی پر منتج ہوتا ہے، اور بظاہر 18 جون 1815ء کے طوفانی دور میں تین آردیے غارت گر لشکری

کبا گیری کرتا تھا، ہم جن کے بارے میں بتا چکے ہیں؛ جو ملک کے اطراف گھومتے رہتے تھے، کسی کو کچھ بیچتے، کہیں سے کچھ چوری کرتے، اور گھریلو آدمی کی طرح، ایک کھٹیچر سی گاڑی میں بیوی بچوں کے ساتھ، آگے بڑھتی فوجوں کے پیچھے پیچھے سفر کرتے تھے۔ اس کی جبلت ہمیشہ اسے جیتنے والی فوج سے متعلق رکھتی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو جیسا کہ اس نے خود کہا تھا کہ "کچھ موضوعات" تھے جن کی وجہ سے اس نے Montfermeil میں آکر ایک سرائے قائم کر لی تھی۔

دراصل وہ بٹوے اور گھڑیاں، سونے کی انگوٹھیاں اور نقرئی صلیبیں، جو لاشوں سے بھرے کھیتوں کی فصل سے جمع کی گئی تھیں، اتنی بڑی مقدار کی نہیں تھیں کہ اس کو قیام و طعام والی سرائے سے زیادہ بنا سکتیں۔

تین آردیے کی عادتوں میں ایک خاص قسم کا خطِ مستقیم تھا، جس میں کوئی اور قسم شامل ہو جاتی تو فوجی بیرکس یاد آنے لگتیں؛ صلیب شامل ہو جاتی تو مدرسہ یاد آتا تھا۔ وہ اچھا بات کرنے والا تھا، اتنا کہ لوگ اس کو تعلیم یافتہ سمجھنے لگتے تھے۔ مگر اسکول ماسٹر نے دیکھا تھا کہ وہ تلفظ کی غلطیاں کرتا تھا۔

وہ مسافروں کے لیے قیمتوں کی اعلیٰ درجے کی فہرستِ قیمت تیار کرتا تھا، مگر اس کی ماہر آنکھیں کبھی کبھی اس کی غلطیوں کی چغلی کھاتی تھیں۔ تین آردیے بہت ہوشیار، لالچی، سُست اور چالاک آدمی تھا۔ وہ اپنے ان ملازمین سے نفرت نہیں کرتا تھا جنھیں اس کی بیوی نکال دیتی تھی۔ یہ دیوی بہت شکی مزاج عورت تھی۔ اس کو شبہ تھا کہ اس کا دبلا اور زرد رو شوہر لوگوں کی نظروں کا مرکز ہوگا۔

تین آردیے زیرک اور متوازن انسان ہونے کے باوجود معتدل قسم کا بدمعاش انسان تھا۔ یہ بدترین قسم کی مخلوق ہوتی ہیں؛ اس میں منافقت سرایت کر جاتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اکثر اوقات تین آردیے اپنی بیوی کی طرح ظلم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا؛ مگر ایسا شاذ ہی ہوتا تھا؛ جب وہ نسلِ انسانی سے ناراض ہوتا تھا تو اس لیے کہ اس کے اندر نفرت کی بھٹی جلتی رہتی تھی۔ اور چوں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہمہ وقت اینٹ کا جواب پتھر دینے پر آمادہ ہوا کرتے ہیں؛ جو اپنی مشکلات پر کسی نہ کسی کو موردِ الزام ٹھہراتے رہتے ہیں؛ جو سامنے آنے والے پہلے شخص کو ہر خرابی، دیوالیہ پن، اور زندگی کی ہر مصیبت کا ذمے دار گردانتے ہیں — جب وہ سب جمع ہو کر اس کو متحرک کر دیتے اور اس کے منہ اور آنکھ سے اُبلنے لگتے تو وہ اور بھی خطرناک ہو جاتا تھا۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ایسے وقت میں اس کے زیرِ عتاب آتے ہیں!

ان تمام خصوصیات کے علاوہ، تھن آردیے متوجہ اور تیز فہم، خاموش یا بسیار گو اور حالات کے مطابق بہت ذہین تھا۔ وہ اُن ملاحوں جیسا دکھائی دیتا تھا جو سمندری چشموں کے ذریعے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تھن آردیے ایک مدبر انسان تھا۔

ہر نووارد شخص جو اس کی سرائے میں داخل ہوتا مادام تھن آردیے کو دیکھتے ہی کہہ اٹھتا تھا کہ "اس گھر کی مالک یہی عورت ہے۔" مگر یہ غلط بات تھی۔ وہ تو مجبوبہ بھی نہیں تھی۔ اس کا شوہر خود مالک بھی تھا اور مجبوب بھی۔ بیوی کام کرتی تھی؛ شوہر کام تخلیق کرتا تھا۔ وہ ایک قسم کی غیر مرئی اور مسلسل مقناطیسیت کے ذریعے ہر کام کی ہدایت جاری کرتا تھا۔ اس کے لیے ایک لفظ ہی کافی ہوتا تھا، کبھی کبھی صرف ایک اشارہ ہی؛ اور مستو دون [ہاتھی سے مشابہ قدیم جانور جو معدوم ہو چکے ہیں] فرماں برداری کرتی۔ تھن آردیے بیوی کی نظروں میں ایک قسم کی خاص اور شاہانہ شخصیت تھا، اگر چہ بیوی کو اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوتا تھا۔ بیوی میں خود اس کی اپنی اچھائیاں بھی تھیں؛ اگر کسی معاملے میں اس کا موسیو تھن آردیے سے اختلاف ہو جاتا — جو ایک ناقابلِ قبول مفروضہ ہوتا تھا، پھر بھی وہ لوگوں کے سامنے اپنے شوہر کو کسی معاملے میں بھی ذمے دار نہیں ٹھہراتی تھی۔ وہ کبھی "غیروں کے سامنے" وہ غلطی نہیں کرتی تھی جو عام طور پر عورتیں کیا کرتی ہیں جس کو پارلیمانی زبان میں "شاہی کو بے نقاب کرنا" کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ ان کے اتفاق کا نتیجہ اکثر صرف بدی ہوتا تھا، مادام تھن آردیے کی نظر میں ہمیشہ اپنے شوہر سے وفاداری مقدم ہوتی تھی۔ وہ آواز اور گوشت کا پہاڑ عورت اس مختی آمر کی انگلیوں کے نیچے ہی حرکت کرتی تھی۔ اس کے شوہر کی پست قدی اور مضحکہ خیزی کے زاویے سے دیکھا جائے تو، وہ ایک عالی شان اور کائناتی شے تھا، جسے مادے کی، دماغ کی پرستش کہا جاتا ہے؛ اس لیے کہ کچھ بدصورت اشکال میں بھی ابدی خوب صورتی کی گہرائیاں ہوتی ہیں۔ تھن آردیے میں ان کی مقدار لامحدود تھی؛ اس مرد کی اس عورت پر مطلق حاکمیت کی یہی وجہ تھی۔ اکثر موقعوں پر یہ بیوی اپنے شوہر کو ایک جلتی ہوئی شمع کی صورت دیکھتی تھی؛ دوسرے موقعوں پر اس کو کسی دبوچنے والے پنجے جیسا محسوس کرتی تھی۔

وہ عورت ایک بھیانک مخلوق تھی جو اپنے بچوں کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتی تھی، اور اپنے شوہر کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتی تھی۔ وہ ماں تھی اس لیے کہ اس کے سینے پر پستان تھے، مگر اس کی زچگی لڑکیوں تک ہی محدود رہی تھی، اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے، لڑکوں تک نہیں بڑھی تھی۔ اس کے آدمی کو صرف یہی فکر رہتی تھی — کہ کس طرح خود کو دولت مند بنائے۔

اس معاملے میں اس کو کامیابی نہیں ملی۔ تھن آردیے خود کو Montfermeil میں تباہ

کر رہا تھا۔ اگر بے دلی سے کام کرنے والا یہ محتاج شخص سوئٹزرلینڈ میں یا Pyrenees کے پہاڑی علاقے میں ہوتا تو لکھ پتی بن گیا ہوتا؛ مگر سرائے والے کو دیکھنا چاہیے تھا کہ مقدر نے اسے کہاں جانے سے روک رکھا ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہاں 'سرائے والا' محدود معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، کسی خاص طبقے کے لیے نہیں۔

اسی برس، 1823ء میں، تین آردیے پر پندرہ سو فرانک پر مشتمل چھوٹے چھوٹے قرضوں کا بوجھ ہو گیا تھا، جو اس کو پریشان رکھتا تھا۔

اس معاملے میں مقدر کی جو بھی ناانصافی رہی ہو، تین آردیے ان آدمیوں میں سے تھا جو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ شے جو وحشی لوگوں کے درمیان نیکی ہوتی ہے، مہذب لوگوں کے درمیان تجارتی جنس بن جاتی ہے — یعنی مہمان نوازی۔ اس علاقے میں وہ ایک قابلِ تعریف شکاری تھا اور شکار کے ہنر میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس کی پُرسکون ہنسی میں ایک مخصوص قسم کی ٹھنڈک ہوتی تھی جو بالخصوص خطرناک تھی۔

سرائے کے مالک کے طور پر اس کے نظریات کبھی کبھی روشنی کے جھماکوں کی طرح نکل پڑتے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کے ذہن میں پیشہ ورانہ کہاوتیں جاگزیں کر دی تھیں۔ اس نے ایک دن اپنی بیوی سے سختی سے مگر دھیمی آواز میں کہا تھا:

''سرائے کے مالک کا فرض ہوتا ہے کہ وہ پہلے آنے والے مہمان کو چکلے، آرام، روشنی، آگ، گندی چادریں، ملازم، لڑکی، اور تبسم پیش کرے؛ ہر راہ گیر کو روکے؛ ہلکی جیب خالی کروا لے؛ بھاری جیب ایمان داری سے ہلکی کر دے؛ مسافر خاندانوں کو احترام سے پناہ دے تاکہ آدمی کی حجامت بنے، عورت کو چھین لے، بچوں کو صاف ستھرا رکھوائے؛ کھڑکی کھولنے بند کرنے کی تنبیہ کرے؛ چمنی کے کونے، ہتھوں والی کرسی، اسٹول، پَروں کے بستر وغیرہ کو صاف رکھنے کی ہدایت دے؛ یہ معلوم کرے کہ انھوں نے آئینے کو کتنی بار استعمال کیا ہے اور اس کی قیمت کا تعین کرے؛ اور پانچ لاکھ بدروحوں کے ذریعے مسافر سے ہر چیز اور ہر کام کی اجرت، حتیٰ کہ ان مکھیوں کی بھی قیمت وصول کر لے جو اُن کے کتے نے کھائی ہوں۔''

وہ آدمی اور وہ عورت، فریب اور طیش کا آمیزہ تھے — یعنی یہ ایک بھیانک ٹیم تھی۔

شوہر سوچتا اور منصوبے بناتا رہتا؛ مادام تین آردیے نے نہ غائب قرض داروں کی پروا کی، نہ آنے والے کل کی، بس ہمیشہ غصے ہی میں رہتی تھی۔

ایسی تھیں یہ دو شخصیتیں۔ کوزیٹ ان کے درمیان، ان کے دہرے دباؤ میں، اس مخلوق کی طرح تھی جو دو پاٹوں کے درمیان پس بھی رہی تھی، اور چمٹی سے پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے بھی کی جا رہی تھی۔ اس آدمی اور اس عورت، دونوں کے اپنے اپنے طریقے تھے: کوزیٹ پر گھونسوں کی بارش کی جاتی ―― یہ عورت کی کارگزاری تھی ―― کوزیٹ سردی کے موسم میں ننگے پاؤں پھرتی ―― یہ اس مرد کی کارستانی تھی۔

کوزیٹ دوڑتی سیڑھیاں چڑھتی اترتی، کپڑے دھوتی، جھاڑو دیتی، گرد جھاڑتی۔ ادھر ادھر بھاگتی پھرتی، لمبے لمبے سانس لیتی، بھاری بھاری چیزیں ہلاتی اور نازک ہونے کے باوجود مشکل کام کرتی تھی۔ اس کے لیے بالکل رحم نہیں تھا؛ ایک طرف سخت کوش مالکن تھی، اور دوسری جانب زہریلا مالک۔ تھن آردیے کی سرائے کسی مکڑی کے جالے کی طرح تھی کوزیٹ جس میں پھنسی، لرزتی رہتی تھی۔ اس نامبارک گھرانے میں مثالی ظلم کیا جا رہا تھا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی مکھی کسی مکڑی کی خدمت کرنے پر مامور ہو۔

بے چاری بچی تحمل سے سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔

ایسے نفوس، جب خدا کو چھوڑ دیتے ہیں تو، خود کو زندگی کی صبح کے ابتدائی مرحلے میں پاتے ہیں، آدمیوں کے درمیان، بہت چھوٹے اور بالکل برہنہ!

❋

آدمیوں کے لیے وائن، گھوڑوں کے لیے پانی

چار نئے مسافر آ گئے تھے۔

کوزیٹ افسردگی کے عالم میں خاموش بیٹھی تھی؛ اس لیے کہ اگر چہ وہ صرف آٹھ برس کی تھی، اس نے اتنے دُکھ سہے تھے کہ وہ ایک غم زدہ بوڑھی عورت کی طرح سوچنے لگی تھی۔

مادام تھن آردیے کے مُکّوں کے طفیل اس کی آنکھ کے اطراف سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، جن کو دیکھ وہ سوچتی تھی کہ "آنکھ پر ایک ہی مُکّے کی ضرب سے وہ کتنی بدصورت ہو گئی تھی۔"

سوچ رہی تھی کہ باہر کس قدر اندھیرا ہے، بہت اندھیرا تھا؛ کہ مسافروں کے کمروں کے جگ اور صراحیاں سب بھر دی گئی ہوں گی؛ کہ ٹنکی میں بالکل پانی نہیں بچا ہوگا۔

اسے اس بات سے کچھ اطمینان تھا کہ تھن آردیے کے ملازمین پانی زیادہ نہیں پیتے تھے، مگر وہاں پیاسوں کی کمی نہیں تھی؛ مگر ان پیاسوں کی پیاس ایسی ہوتی تھی کہ وہ گلاس کے بجائے جگ منہ سے لگا لیتے تھے۔ شراب کے اتنے سارے جام کے درمیان اگر کوئی ایک گلاس پانی طلب کرتا تو موجود لوگوں کو وہ وحشی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ایک وقت آیا جب بچی لرکھڑانے لگی تھی؛ مادام تھن آردیے نے کھانا پکانے والی پتیلی کا ڈھکنا اٹھایا جو چولھے پر رکھی تھی، اس میں پانی اُبل رہا تھا، اس کے بعد اس نے ایک گلاس اٹھایا اور تیزی سے ٹنکی کی طرف گئی۔ اس نے ٹونٹی کھولی؛ بچی نے سر اٹھایا اور وہ عورت کی تمام حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ ٹنکی سے پانی کی ایک پتلی سے دھار نکل رہی تھی، جس سے گلاس صرف آدھا بھر سکا تھا۔ "لو" اس نے کہا، "اس سے زیادہ پانی نہیں ہے۔" ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ بچی نے سانس تھم تھیں لی۔

مادام تھن آردیے نے نصف بھرے گلاس کا معائنہ کیا اور کہا، "اتنا کافی ہوگا۔"

کوزیٹ ایک بار پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی، مگر ایک چوتھائی گھنٹے تک اسے اپنے سینے میں دل اُچھلتا محسوس ہوا۔

اس حالت میں وہ لمحہ لمحہ گنتی رہی، اور خواہش کرتی رہی کہ کسی طرح صبح ہو جائے۔

وقتاً فوقتاً پینے والے سڑک پر نظر ڈالتے اور حیرت سے کہتے، "ایسا کالا اندھیرا ہے جیسے تنور۔" یا یہ کہتے، "اس وقت سڑک پر بغیر لالٹین کے جانے کے لیے بلّی بننا پڑے گا۔" اور کوزیٹ خوف سے لرزاں ہو رہی تھی۔

اچانک پھیری لگانے والوں میں سے ایک شخص سرائے میں داخل ہوا اور تیز آواز میں بولا، "میرے گھوڑے کو پانی نہیں دیا گیا۔"

"ہاں، دیا گیا ہے۔" مادام تھن آردیے نے کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ اس کو پانی نہیں دیا گیا ہے۔" پھیرے لگانے والے نے جواب میں کہا۔

کوزیٹ میز کے نیچے سے نکل آئی تھی۔

"جی ہاں جناب!" اس نے کہا "گھوڑے نے پانی پیا ہے؛ ایک بالٹی سے پیا ہے، پوری بالٹی پی ہے، اور وہ میں تھی جو اس کے پاس پانی لے گئی تھی، میں نے تو اس سے باتیں بھی کی تھیں۔"

یہ بات سچ نہیں تھی؛ کوزیٹ جھوٹ بولی تھی۔

"میری مٹھی برابر لونڈیا ہے، اور اس گھر کے برابر بڑا جھوٹ بول رہی ہے۔" پھیرے لگانے والے نے حیرت سے کہا "میں کہہ رہا ہوں کہ پانی نہیں دیا گیا ہے، حرافہ کہیں کی! جب اسے پانی نہیں ملتا تو اس کے ہنہنانے کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے، میں جسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

کوزیٹ نے اصرار کیا، اور ایسی آواز میں کہا جو اذیت سے بھرا گئی تھی اور مشکل سے سنی جا سکتی تھی، "اس نے جی بھر کے پانی پیا تھا۔"

"بس کرو!" پھیرے والے نے غصے میں کہا "یہ سب نہیں چلے گا، میرے گھوڑے کو پانی چاہیے، تب ہی یہ معاملہ ختم ہوگا۔"

کوزیٹ ایک بار پھر میز کے نیچے رینگ گئی۔

"بات سچ معلوم ہوتی ہے۔" مادام تھن آردیے نے کہا "اگر جانور کو پانی نہیں ملا ہے تو ضرور دیا جانا چاہیے۔" اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو وہ دوسری جانور کہاں چلی گئی؟"

اس نے جھک کر میز کے نیچے دیکھا۔ کوزیٹ دوسری جانب، بالکل اس مسافر کے پیروں

کے قریب، خوف سے دُبکی ہوئی تھی۔

''نکلتی ہے کہ نہیں!'' مادام تھن آردیے زور سے چیخی۔

کوزیٹ سوراخ جیسی جگہ سے برآمد ہوئی، جہاں چھپی تھی۔

تھن آردیے نے بات دوبارہ شروع کی:

''میڈموزیل کتیا صاحبہ، جایئے اور اس گھوڑے کو پانی دیجیے۔''

''مگر، مادام'' کوزیٹ نے دھیمے سے کہا، ''پانی تو ختم ہو گیا ہے۔''

تھن آردیے نے سڑک کی طرف کا دروازہ کھول دیا، ''تو، جایئے اور پانی لے آیئے۔''

کوزیٹ نے سر جھکا لیا اور چمنی کے کونے کے قریب سے خالی بالٹی اٹھائی۔

بالٹی کوزیٹ کے قد سے بڑی تھی، اور یہ بچی اس میں آسانی سے بیٹھ سکتی تھی۔

تھن آردیے اپنے چولھے کی طرف واپس گئی؛ پتیلی میں جو کچھ پک رہا تھا اسے لکڑی کے چمچے سے چکھا، ساتھ ہی بڑبڑاتی جا رہی تھی:

اس نے میز کی دراز میں ہاتھ ڈال کر کچھ ڈھونڈا جس میں سوکے کچھ سکے، مرچیں اور پیاز رکھی ہوئی تھی۔

''سنیے میڈموزیل مینڈکی صاحبہ'' اس نے کہا، ''واپسی پر نانبائی کے ہاں سے ڈبل روٹی بھی لیتی آیئے گا۔ یہ رہے پندرہ سو۔''

کوزیٹ کے ایپرن کی ایک جانب جیب سی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر سکہ لے کر جیب میں ڈال لیا۔

وہ ساکت کھڑی رہی، ہاتھ میں بالٹی لیے، سامنے دروازہ کھلا تھا۔

وہ اس امید میں تھی کہ کوئی اس کی مدد کو آئے گا۔

''جا، فوراً جا!'' تھن آردیے زور سے چیخی۔

اور کوزیٹ باہر چلی گئی۔

دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔

۞

گڑیا کا منظر

کھلے میدان میں لگی عارضی دُکانیں گرجا گھر سے شروع ہوکر، جیسا کی قاری کو یاد ہوگا، تین آروپے سرائے تک جاتی تھیں۔ یہ ساری دُکانیں روشنیوں سے سجائی گئی تھیں، اس لیے کہ وہاں کے باشندے جلد ہی، کاغذوں سے بنی لالٹینوں میں موم بتیاں جلائے، آدھی رات کے عبادتی اجتماع میں شرکت کے لیے جائیں گے جس کو دیکھ کر اسکول ماسٹر نے، جو اس وقت تین آروپے کی سرائے میں بیٹھا ہوا تھا، کہا تھا، ''کیسا جادوئی منظر ہوگا۔'' ان کے بدلے میں آسمان پر ایک بھی ستارہ نظر نہیں آتا تھا۔

ان دُکانوں میں سب سے آخری دُکان، جو تین آروپے کی سرائے کے بالکل سامنے تھی، کھلونوں کی دُکان تھی، جو پنّیوں، شیشے اور ٹین سے بنی خوب صورت چیزوں سے دمک رہی تھی۔ پہلی صف میں، اور بہت آگے، دکان دار نے سفید رومالوں کے پس منظر میں، ایک بہت بڑی سے گڑیا رکھی تھی، تقریباً دو فٹ اونچی، جو گلابی رنگ کے کریپ سے بنے گاؤن میں ملبوس تھی، جس کے سر پر سنہرے رنگ کا ایک پرندہ تھا، جس کے اصلی بال تھے اور تام چینی سے بنی آنکھیں تھیں۔ اس پورے دن، یہ حیران کُن شے — دس برس کی عمر سے کم تمام گزرنے والوں کو حیران کرنے والی چیز رکھی رہی۔ پورے Montfermeil میں ایک بھی ایسی کوئی صاحب حیثیت ماں نہیں تھی جو اس کو خرید کر اپنے بچّی کو دے سکتی۔ ایپونین اور آزیلما گھنٹوں اس کا تصور کیے بیٹھی رہیں، اور کوزیت خود بھی، چالاکی سے اس کو ایک نظر دیکھنے گئی تھی۔

تین اس وقت جب، بالٹی ہاتھ میں لیے، افسردہ کوزیت گھر سے نکلی تھی، وہ بھی اس حیرت انگیز گڑیا کو ایک نظر دیکھنے گئی، جسے وہ لیڈی کہتی تھی۔ ابھی تک اس نے اس گڑیا کو قریب

سے نہیں دیکھا تھا۔ پوری دُکان اس کے نزدیک ایک محل سے کم نہیں تھی۔ وہ گڑیا، گڑیا نہیں تھی ،ایک تصور تھی، ایک خواب تھی۔ وہ مسرت تھی؛ چمک دمک تھی؛ فراوانی تھی؛ سرخوشی تھی، جو اس بدقسمت لڑکی کے نزدیک ایک عجیب اخلاقت بانہ نور تھا، جس نے اسے اداسی اور سرد مہر بدحالی میں غرق کردیا تھا۔ بچپنے کی افسردہ اور معصوم فراست کے ساتھ کوزیٹ نے اس پاتال کی پیائش کی جو اسے اس گڑیا سے دور کیے ہوئے تھا۔ اس نے خود سے کہا تھا کہ اس قسم کی ''شے'' کو حاصل کرنے کے لیے کوئی ملکہ یا شاہزادی ہونا ضروری تھا۔ وہ اس کے نازک اور گلابی ملبوس پر، ان چکنے بالوں پر اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھی، اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ 'یہ گڑیا کتنی خوش ہوگی!' وہ اس حیرت انگیز دُکان پر سے اپنے نظریں ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ جتنا زیادہ اس کی طرف دیکھتی اتنی ہی اس کی چکا چوند بڑھتی جاتی تھی۔ بڑی گڑیا کے پیچھے اور بھی گڑیاں تھیں، جو اس کو پریوں اور جناتوں جیسی محسوس ہو رہی تھیں۔ دُکان دار جو اپنی دُکان کے سامنے ٹہل رہا تھا، اس پر ایک ابدی باپ کا سا تاثر چھوڑ رہا تھا۔

اس استغراق کی کیفیت میں وہ سب کچھ بھول گئی تھی، وہ کام بھی جس کے لیے گھر سے نکلی تھی۔

اچانک، مادام تھی آردیے کی بھترائی ہوئی کرخت آواز سنائی دی اور وہ ہوش میں آگئی۔ ''کیوں، حرافہ، تو ابھی تک گئی نہیں ہے؟ ٹھہر میں ابھی تجھے بتاتی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ جا، اپنا کام کر کُٹنی!''

مادام تھی آردیے نے سڑک پر ایک نظر ڈالی ہی تھی کہ کوزیٹ اسے بے خودی کے عالم میں کھڑی دکھائی دے گئی۔

کوزیٹ جتنی تیزی سے ممکن ہو سکا لمبے لمبے قدم بھرتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

۞

جنگل اورتنِ تنہا بچی

چوں کہ تین آروبے کی سرائے گاؤں کے اس حصے میں تھی جو گرجا گھر کے قریب ہے، Chelles کی جانب جنگل میں وہ چشمہ ہے جہاں سے کوزیٹ کو پانی لانے کے لیے جانا پڑتا تھا۔

اس نے کسی سوداگر کی دُکان کی نمائش پر نظر نہیں ڈالی۔ جب تک وہ Boulanger گلی میں، اور گرجا گھر کے جوار میں تھی، روشنیوں سے بھی دکانوں نے سڑک کو روشن کر رکھا تھا؛ مگر جلد ہی آخری دکان کی روشنی آنی ختم ہو گئی۔ بے چاری بچی نے خود کو بالکل اندھیرے میں پایا اور وہ اندھیرے میں کود پڑی۔ اس پر صرف ایک خاص قسم کا جذبہ طاری ہو گیا تھا، چلتے ہوئے جس قدر ممکن ہوا وہ خالی بالٹی کے ہینڈل کو ہلاتی رہی۔ اس طرح ایک آواز پیدا ہو رہی تھی جو اس کی ہم سفر تھی۔

وہ جتنی دور ہوتی جا رہی تھی، اندھیرا اتنا ہی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سڑکوں پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی اسے ایک عورت ملی، جو اس کو دیکھ کر مڑی اور ساکت کھڑی ہو گئی اور منہ ہی منہ میں کہہ رہی تھی، "یہ بچی کہاں جا رہی ہو گی؟ کیا بچی کی شکل میں یہ کوئی بھیڑیا ہے؟" پھر اس نے کوزیٹ کو پہچان لیا۔ "اچھا" اس نے کہا، "ارے یہ تو منحنی چڑیا ہے!"

پس، کوزیٹ پیچ دار بھول بھلیاں اور سنسان سڑکوں پر آگے بڑھتی رہی جو Chelles کی جانب Montfermeil کے گاؤں میں ختم ہوتی ہیں۔ جب تک اس کی دونوں جانب گھریلو صرف دیواریں تھیں وہ بڑی بہادری سے چلتی رہی۔ وقتاً فوقتاً کسی دروازے کی درز سے اسے موم بتی کی جھلمل کرتی روشنی ملتی رہتی — یہ روشنی زندگی تھی؛ وہاں لوگ تھے اور یہ خیال ہی اس کے اطمینان کا باعث تھا۔ مگر تناسب کے اعتبار سے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی گئی میکانکی انداز میں اس کی رفتار کم ہوتی گئی۔ جب وہ آخری گھر کے کونے تک پہنچ گئی تو کوزیٹ رُک گئی۔ اس کے لیے

آخری دُکان سے آگے جانا مشکل تھا؛ اب آخری مکان سے آگے جانا ناممکن ہو رہا تھا۔ اس نے بالٹی زمین پر رکھ دی، اپنا ہاتھ اپنے بالوں میں ٹھونس دیا، اور آہستہ آہستہ اپنا سر کھجانا شروع کیا — یہ ایک مخصوص انداز ہوتا ہے بچوں کا جب وہ خوف زدہ ہوتے ہیں اور فیصلہ نہیں کرپاتے کہ کیا کریں۔ اب Montfermeil کا علاقہ نہیں تھا؛ کھلا میدان تھا۔ سیاہ اور سنسان خلا اس کے سامنے تھا۔ اس نے بیزاری سے اس اندھیرے کی طرف دیکھا؛ اب وہاں کوئی نہیں تھا، صرف جنگلی جانور تھے، شاید بھوت پریت بھی تھے۔ اس نے بہت غور سے اندھیرے کی جانب دیکھا، وحشی جانوروں کو گھاس پر چلتے سنا، اور بھوت پریت کو درختوں کے درمیان چلتے دیکھا۔ اس نے اپنی بالٹی پھر اٹھائی؛ خوف نے اسے جرأت عطا کر دی تھی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا، ''میں ان سے کہہ دوں گی کہ وہاں پانی نہیں رہ گیا تھا۔'' اور وہ استقلال کے ساتھ Montfermeil میں دوبارہ داخل ہو گئی۔

ابھی وہ مشکل سے سو قدم چلی ہوگی کہ ایک بار پھر رکی اور اپنا سر پھر کھجانا شروع کر دیا۔ اب، اپنے ڈراؤنے لگڑ بگھے جیسے منہ اور طیش میں چمکتی آنکھوں سمیت تھن آردیے کی بیوی اس کے سامنے تھی۔ بچی نے غم زدہ نظروں سے اس کے سامنے دیکھا اور پیچھے دیکھا۔ وہ کیا کر رہی تھی؟ اس کا کیا بنے گا؟ وہ کہاں جا رہی تھی؟ بچی کے سامنے تھن آردیے کی بھٹنی کھڑی تھی؛ اس کے پیچھے رات کے اور جنگل کے تمام خیالی وجود بھی تھے۔ تھن آردیے کے سامنے وہ پسپا ہو گئی۔ اس نے چشمے کے راستے پر پھر قدم رکھے اور دوڑنا شروع کر دیا۔ گاؤں سے باہر نکل گئی، ایک ہی دوڑ میں جنگل میں پہنچ گئی؛ اب وہ نہ کچھ دیکھ رہی تھی نہ سُن رہی تھی۔ وہ اپنے راستے پر صرف اس وقت تھوڑی دیر کے لیے رکی جب اس کا سانس چڑھنے لگا تھا، مگر اس نے اپنی پیش قدمی نہیں روکی۔ شدید خواہش کے زیرِ اثر وہ سیدھی بڑھتی چلی گئی تھی۔

جب وہ دوڑ رہی تھی تو اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

جنگل کی رات کی کپکپی اس پر پوری طرح حاوی ہو گئی تھی۔

اب نہ وہ کچھ سوچ سکتی تھی اور نہ کچھ دیکھ سکتی تھی۔ اس چھوٹی سی مخلوق کو رات کی مہیب وسعت کا سامنا تھا۔ ایک طرف تمام سایے تھے؛ دوسری جانب ایک معمولی سا ذرّہ تھا۔

گاؤں کے کنارے سے چشمے تک کا راستہ صرف سات یا آٹھ منٹ کا تھا۔ کوزیٹ کو راستہ معلوم تھا، کہ وہ دن کے اُجالے میں کئی بار جاتی رہتی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ راستہ بھولی نہیں۔ جبلت کا بچا ہوا حصہ غیر واضح طریقے پر اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ مگر اس نے جھاڑیوں اور درختوں پر

چیزیں دیکھنے کے خوف سے اپنی آنکھ نہ دائیں موڑیں اور نہ بائیں۔ اس طرح وہ چشمے پر پہنچ گئی۔

وہ ایک تنگ سا تالاب جیسا علاقہ تھا۔ پانی تقریباً دو فٹ گہرا تھا۔ اس کے چاروں طرف کائی اور بلند قسم کی گھاس تھی جس کو جنگلی چھارم کی جھاڑ کہا جاتا ہے، جس میں بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک چشمہ جاری تھا، جس کی آواز بہت سکون آسا تھی۔

کوزیٹ نے سانس لینے تک کا وقت بھی نہیں لیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا مگر وہ یہاں آنے کی عادی تھی۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے شاہ بلوط کے اس چھوٹے سے درخت کو محسوس کیا جو چشمے پر جھکا ہوا تھا، جسے وہ عام طور پر سہارے کے لیے پکڑا کرتی تھی؛ اس کی ایک شاخ ہاتھ میں آ گئی؛ اس کو پکڑا؛ نیچے کی طرف جھکی، اور بالٹی کو پانی میں ڈال دیا۔ اس وقت وہ ایسی شدید جذباتی کیفیت میں تھی کہ اس کی قوت سہ گنا بڑھ گئی تھی۔ جب وہ پانی پر جھکی تھی، اس کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس کی جیب پانی کے اوپر کھل گئی تھی اور پندرہ سو کا سکہ پانی میں گر گیا تھا۔ کوزیٹ نے سکے کو گرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ اس نے بالٹی تقریباً بھر کر نکالی اور گھاس پر رکھ دی۔

یہ کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ بہت تھک گئی ہے۔ وہ فوراً چلنا پڑنا چاہتی تھی مگر بالٹی کو بھرنے کے لیے اتنی قوت کی ضرورت پڑی تھی کہ اس کو ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ اس کو مجبوراً بیٹھنا پڑ گیا۔ وہ گھاس پر گر گئی اور وہیں جھکی بیٹھی رہی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں؛ پھر ایک بار کھولیں، مگر نہ جانے کیوں؟ مگر وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے قریب رکھی بالٹی کا ہلتا ہوا پانی سانپ جیسے دائرے بنا رہا تھا۔

اوپر آسمان پر دھوئیں جیسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ سایے ایک الم ناک نقاب کی صورت بچی کے اوپر جھکے محسوس ہو رہے تھے۔

اُفق پر نمایاں عطارد گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

بچی اس عظیم الشان سیارے کو پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھی، وہ جس سے واقف نہیں تھی، اور جو اس کو خوف زدہ بھی کر رہا تھا۔ سیارہ دراصل اس وقت افق کے بالکل قریب آ گیا تھا، اور دھند کی ایک دبیز تہہ سے گزر رہا تھا جو اسے سرخ رنگ دے رہی تھی۔ دھند کے ارغوانی رنگ نے سیارے کو بڑا کر دیا تھا۔ جو بھی اسے دیکھتا، تابندہ زخم کہتا۔

میدان کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ جنگل بالکل سیاہ ہو رہا تھا؛ گرمی کے موسم کی تازہ اور مبہم روشنیوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ بڑی بڑی شاخیں ڈراؤنے انداز میں اوپر اٹھی تھیں۔ نازک اور بے ہنگم جھاڑیوں میں سے گزرتی ہوا سیٹی بجا رہی تھیں۔ باد شمال میں لمبی لمبی گھاس

بام مچھلی کی طرح لہریں لے رہی تھی۔ بچھو بوٹی شکار کی تلاش میں پنجوں والے لمبے لمبے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی۔ گلابی پھولوں والی خشک جھاڑی کے، ہوا کے اچھالے کچھ ٹکڑے تیزی سے اڑ رہے تھے، جیسے کوئی کسی پیچھا کرتی شے کے خوف سے بھاگ رہا ہو۔ ہر طرف ایک غمگین فضا تھی۔

اندھیرا پریشان کن تھا۔ آدمی کو روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بھی دن کی مخالف کیفیت میں خود کو روپوش کر لیتا ہے، اس کو اپنا دل سکڑتا محسوس ہوتا ہے۔ جب آنکھ سیاہی دیکھتی ہے تو دل کو مصیبت نظر آنے لگتی ہے۔ رات میں ہونے والے گرہن کے دود آلود دھندلے پن میں مضبوط ترین دل بھی مشوش ہو جاتا ہے۔ لرزے بغیر کوئی بھی جنگل میں چل نہیں سکتا۔ وہاں سایے اور درخت — دو خوف ناک کثافتیں ہوتی ہیں۔ غیر واضح گہرائیوں میں ایک عجیب الخلقت حقیقت نمایاں ہوتی ہے۔ آپ سے چند قدم آگے ایک ناقابلِ تصور شے کا خاکہ روحوں کی طرح صاف نظر آنے لگتا ہے۔ آپ کسی خلا میں یا خود اپنے دماغ میں کوئی مبہم شے تیرتی دیکھتے ہیں مگر آپ کو علم نہیں ہوتا کہ خوابیدہ پھولوں کے خواب کی تعبیر کیا ہوتی ہے۔ افق کے انداز تند و تیز ہوتے ہیں۔ آپ اندھیرے کی بدبودار ہوا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ آپ پیچھے مڑ کر دیکھتے ڈرتے ہیں، مگر دیکھنا چاہتے ہیں۔ رات کے سوراخ، بے ترتیب اگی ہوئی چیزیں، خاموش نقوش سب غائب ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی ان کی جانب بڑھتا ہے، مبہم ژولیدگی؛ بکھرے بالوں کے گچھے؛ نیلگوں خوشے؛ ماتمی رنجیدگی؛ خاموشی کی غم انگیز وسعت؛ نامعلوم مگر ممکنہ وجود؛ پُراسرار شاخوں کے خم؛ درختوں کے ڈراؤنے تنے؛ مٹھی بھر لرزاں پودے — ان سب کے مقابل کوئی بچاؤ نہیں ہوتا۔ ایسی کوئی دلیری نہیں ہوتی جسے پریشانی کا احساس نہ ہو۔ آپ کو ایک قسم کے ڈراؤنے پن کا احساس ہوتا ہے گویا آپ کی روح میں ظلمات کی آمیزش ہونے والی ہے۔ کسی بچے میں پرچھائیوں کی اس طرح کی آمیزش ناقابلِ بیان حد تک نفرت انگیز ہوتی ہے۔

جنگل الہامی کتابوں کے مانند ہوتے ہیں، اور کسی ننھی سی روح کے پروں کی حرکت بھی ان کے خوف ناک گنبد کے نیچے ہول ناک آوازیں پیدا کر دیتی ہے۔

اپنے احساسات کو سمجھے بغیر، کوزیت باخبر تھی کی فطرت کی سیاہ وسعت نے اسے گرفت میں لے لیا ہے؛ اب وہ محض خوف نہیں تھا جو اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا؛ وہ خوف سے زیادہ خوف زدہ کر دینے والی کوئی شے تھی؛ وہ کانپ گئی۔ اس کپکپی کے نرالے پن کے بیان کے لیے الفاظ نہیں تھے جس نے اس کی دل کی گہرائیوں تک اسے خوف زدہ کر دیا تھا؛ اس کی آنکھ وحشی ہو گئی تھی؛ وہ سوچ رہی تھی، کہ اسے محسوس ہو رہا ہے، کہ وہ اگلے دن اس جگہ اسی وقت آ نہیں سکے گی۔

پھر ایک قسم کی جبلت کے زیر اثر، اس نے بلند آواز میں، ایک، دو، تین، چار، اور اس کے بعد دس تک گنتی گننی شروع کر دی، تا کہ وہ اس کیفیت سے نکل سکے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، مگر جو اس کو خوف زدہ کر رہی تھی؛ اور جب ایک بار گنتی ختم کر چکی تو اس نے دوبارہ گنتی شروع کر دی۔ اس عمل نے اسے اپنے اطراف کے صحیح ادراک کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں، جو پانی نکالنے کے دوران بھیگ گئے تھے، سردی لگنے لگی تھی؛ وہ کھڑی ہوئی؛ اس کا خوف، ایک فطری ناقابل تسخیر خوف، دوبارہ شروع ہو گیا؛ اب وہ صرف یہی سوچ سکتی تھی کہ اپنی پوری رفتار سے جنگل سے، میدانوں سے نکل کر گھروں، کھڑکیوں اور جلتی ہوئی شمعوں کی طرف بھاگ جائے۔ اس کی نظر پانی پر پڑی جو اس کے سامنے رکھا تھا۔ تین آردیے نے اس بچی میں ایسا خوف داخل کر دیا تھا کہ وہ پانی سے بھری بالٹی لیے بغیر بھاگ نہیں سکتی تھی: اس نے بالٹی کا ہینڈل دونوں ہاتھوں سے تھاما؛ مگر وہ اسے مشکل ہی سے اٹھا سکتی تھی۔

اس طرح وہ صرف ایک درجن قدم آگے بڑھ سکی تھی؛ بالٹی بھری ہوئی تھی؛ بالٹی بھاری تھی؛ اسے مجبوراً ایک بار پھر زمین پر رکھ دینا پڑا۔ اس نے کچھ دیر اپنی سانس درست کی، اس کے بعد پھر بالٹی اٹھائی اور چل پڑی، مگر چند قدم چلنے کے بعد ایک بار پھر اسے رکنا پڑا تھا۔ چند سیکنڈ آرام کے بعد وہ پھر روانہ ہوئی۔ وہ آگے جھک کر چل رہی تھی؛ اس کا سر کسی بوڑھی عورت کی طرح جھکا ہوا تھا؛ بالٹی کے وزن نے اس کے نازک بازوؤں کو سخت کر دیا تھا۔ بالٹی کے ہینڈل نے اس کے گیلے ہاتھوں کی بے حسی کو مکمل کر دیا تھا؛ اسے بار بار چلنا اور رکنا پڑ رہا تھا، اور ہر بار جب وہ بالٹی لے کر چلتی تو پانی چھلک کر اس کی برہنہ ٹانگوں پر گرتا۔ یہ سب، جنگل کی گہرائیوں میں، رات کے وقت، سردی کے موسم میں، انسان کی نظروں سے دور ہو رہا تھا؛ وہ بے چاری صرف آٹھ برس کی تھی؛ سوائے خدا کے یہ اداس منظر اور کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔

اور، بلاشبہ افسوس، کہ اس کی [آنجہانی] ماں [کی روح] دیکھتی رہی ہوگی!

اس لیے کہ ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں جو مرے ہوؤں کی قبر میں بھی آنکھیں کھول دیتی ہیں۔

اس کا دم پھول رہا تھا؛ سسکیوں سے اس کا گلا رندھ رہا تھا، مگر اسے رونے کی ہمت نہیں ہوئی، اس لیے کہ اتنے فاصلے کے باوجود وہ تین آردیے سے خوف زدہ تھی: اس کو عادت سی پڑ گئی تھی کہ وہ تین آردیے کو ہمیشہ اپنے سامنے موجود دیکھتی تھی۔

مگر اس طرح اسے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی؛ وہ بہت آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ رکنے کے وقت میں کمی کرنے، اور ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے باوجود بھی، اس

کے اندازے کے مطابق Montfermeil پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ سکتا تھا، اور واپسی پر اسے ریتی آرو بیے کی مار بھی سہنی تھی۔ اس اذیت میں خوف کی آمیزش اور جنگل میں اتنی رات گئے اکیلے ہونے کے خیال نے اسے اور بھی تھکا مارا تھا۔ ابھی وہ جنگل سے نکل نہیں سکی تھی۔ راستے میں ایک شاہ بلوط درخت کے قریب پہنچ کر، وہ جس سے اچھی طرح واقف تھی، اس نے آخری، اور زیادہ طویل قیام کیا، تا کہ اس کے جسم کی طاقت واپس آسکے؛ اس کے بعد اس نے بڑی ہمت سے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا، مگر وہ بے چاری "اوہ! میرے خدا! اوہ! میرے خدا!" کہے بغیر نہ رہ سکی۔

عین اس وقت اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی بالٹی کا بالکل وزن ہی نہیں رہ گیا تھا؛ ایک ہاتھ نے جو بڑا مہیب تھا ہینڈل پکڑلیا تھا اور بالٹی اٹھا لی تھی۔ اس نے سر اُٹھایا۔ ایک سیاہ پیکر، سیدھا اور تنا ہوا، اندھیرے میں اس کے ساتھ چل رہا تھا؛ یہ پیکر ایک آدمی تھا جو اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا، وہ جس کے آنے کی آہٹ سن نہیں سکی تھی۔ اس آدمی نے ایک لفظ بھی کہے بغیر، وہ بالٹی اس کے ہاتھوں سے لے لی تھی۔

زندگی کے تمام مقابلوں میں جبلت کام کرتی ہے۔

اور اب، بچی بالکل خوف زدہ نہیں تھی۔

۞

بولاتریویل کی ذہانت

1823ء کے کرسمس کے دن، دوپہر کو اسپتال روڈ پیرس کے ایک سنسان علاقے میں ایک شخص کافی دیر سے ٹہل رہا تھا۔ یہ آدمی اپنے لیے کسی قیام گاہ کی تلاش میں تھا، اور وہ پیرس کی مضافاتی بستی Saint-Marceau کی سرحد کے خستہ حال علاقے کے معمولی مکانوں کے سامنے رُکتا محسوس ہوتا تھا۔

ہم اس پر بعد میں غور کریں گے کہ اس آدمی نے پہلے ہی اس سنسان علاقے میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔

یہ شخص اپنے لباس میں اس قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا جس کو تربیت یافتہ بھکاری کہا جا سکتا ہے——بے حد بدنصیب اور بے حد صفائی کا امتزاج۔ یہ بہت غیر معمولی امتزاج ہوتا ہے جو ذہین دلوں کو اس کے احترام پر ابھارتا ہے جو بہت مفلس ہوتا ہے، اور جو اس کا مستحق بھی ہوتا ہے۔ وہ بہت پرانی مگر صاف کی ہوئی ہیٹ اور موٹے سے کپڑے کا ہلکے پیلے رنگ کا کوٹ پہنے تھا، وہ رنگ جو اس زمانے میں کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں تھا؛ معزز وضع قطع کے جیبوں والی واسکٹ؛ سیاہ رنگ کی برجس جو گھٹنے پر گھِس کر بھورے رنگ کی ہوگئی تھی؛ سیاہ ورسٹیڈ کے لمبے موزے، اور موٹے جوتے جن میں تانبے کے بکسوے لگے ہوئے تھے۔ کسی اچھے خاندان میں ایسے شخص کو وطن واپس آنے والا استاد کہا جاتا ہے۔ اس کے مکمل طور پر سفید بال، شکن آلود پیشانی، سیاہی مائل ہونٹ اور اس کے بشرے سے زندگی کے دباؤ کے سارے آثار رکے باعث اس کی عمر کا اندازہ ساٹھ سے اوپر کا ہوتا تھا، مگر اپنی چال ڈھال اور غیر معمولی صحت سے وہ مشکل سے پچاس برس کا رہا ہوگا۔ اس کی پیشانی کی شکنوں کا انداز ایسا تھا کہ اسے غور سے دیکھنے والا

اسی کا ہوجاتا تھا۔ اس کے لب حیرت انگیز طور پر سکڑے ہوتے تھے، جو سخت ہونے کے باوجود انکسار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کی نگاہ میں گہرائی اور ناقابل بیان غم انگیز طمانیت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں رومال میں بندھا ایک چھوٹا سا بنڈل تھا؛ وہ دائیں ہاتھ سے لاٹھی کا سہارا لیتا تھا، جو کسی جھاڑی سے کاٹ کر نکالی گئی تھی۔ لاٹھی قرینے سے چھانٹی گئی تھی جس سے خوف نہیں آتا تھا؛ اس میں زیادہ تر گانٹھیں تھیں، اور اس کا اوپری سرا مرجان جیسا تھا، جو سرخ رنگ کی لاکھ سے بنایا گیا تھا۔ وہ لاٹھی تھی، مگر بید جیسی نظر آتی تھی۔

اس شاہراہ پر مسافر ہوتے ہیں مگر کم کم، خاص کر سردی کے موسم میں۔ یہ شخص ملنے کے بجائے ان سے کنارہ کشی کرتا محسوس ہوتا تھا، مگر اس میں کسی قسم کا تصنع نہیں تھا۔

اس زمانے میں شہنشاہ لوئی ہشت دہم تقریباً روزانہ Choisy-le-Ro جایا کرتا تھا: یہ اس کی پسندیدہ تفریح ہوتی تھی۔ تقریباً دو بجے شاہی گاڑی اور سواروں کا دستہ اسپتال روڈ سے ہوتا ہوا پوری رفتار میں گزرتا دکھائی دیتا تھا۔

اس علاقے کی مفلس عورتوں کے لیے یہ سفر گھڑی کا متبادل تھا جو کہا کرتی تھیں، "دو بج گئے ہیں؛ وہ اب Tuileries واپس جا رہا ہے۔"

لوگ کچھ آگے کی طرف بھاگتے، کچھ قطار میں کھڑے رک جاتے، اس لیے کہ گزرتا ہوا بادشاہ ہمیشہ شورش کا باعث ہوتا ہے۔ لوئی ہشت دہم کا ظہور اور غیاب پیرس کی سڑکوں پر ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ اس کا گزر تیز، مگر شان دار ہوتا تھا۔ اس ناتواں بادشاہ کو تیز چلنا پسند تھا؛ وہ چل پھر نہیں سکتا تھا، مگر دوڑنا چاہتا تھا: اگر اس معذور کو برق کھینچتی لے جاتی تو وہ زیادہ خوش ہوتا۔ وہ ننگی تلواروں کی چھاؤں میں، شادانی اور تندی سے گزر جاتا۔ اس کی دیو ہیکل منقش گاڑی، جس کے بیرون پر سوسن ونسترن کے نقش بنے تھے، دہاڑتی گزر جاتی تھی۔ اس پر نظر ڈالنے کا مشکل سے موقع ملتا تھا۔ اس کے عقبی شیشوں سے سفید رنگ کے ساٹن کے بنے گدے، سُرخ چہرہ، پیشانی پر تازہ تازہ پاؤڈر لگا ہوا، متکبر، سخت، ہنرمند آنکھوں والا چہرہ، تعلیم یافتہ کا تبسم، بورژوا کوٹ پر لٹکتے ہوئے دو سنہری جھالروں والے بڑے بڑے جھبّے سنہرا گلوبند، سینٹ لوئی کی صلیب، لیجن آف آنر کی صلیب، Saint-Esprit کی نقرئی لوح، بڑے سی توند اور سفید نیلا ربن: یہ تھا بادشاہ۔ پیرس کے باہر شتر مرغ کے پر کی کلغی لگی ہیٹ کو اپنے زانو پر رکھے رہتا، جس پر بہترین انگریزی اون کے بنے موزے چڑھے ہوتے تھے؛ جب وہ شہر میں دوبارہ داخل ہوتا تو ہیٹ پہن لیا کرتا اور کبھی کبھی سلیوٹ بھی کر لیتا تھا؛ وہ عوام کی طرف سرد مہری سے

دیکھتا، اور وہ بھی اس سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ جب وہ پہلی بار Saint-Marceau کے علاقے میں نکلا تھا اس کی پوری کامیابی ایک مضافاتی شخص نے اپنے اس جملے میں سمو دی تھی: "یہ موٹا آدمی ہی حکومت ہے۔"

بادشاہ کے بارے میں یہ ناقابلِ فراموش جملہ اسپتال روڈ کا روزانہ کا واقعہ ہوتا تھا۔

یہ چہل قدمی کرنے والا پیلا کوٹ بظاہر اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا، اور شاید پیرس کا بھی نہیں تھا، وہ اس کی تفصیل سے نابلد تھا۔ جب دو بجے، نقرئی جھالروں سے مزین محافظوں کا دستہ شاہی گاڑی کو گھیرے Salpetriere کا موڑ کاٹتا ہوا نکلا تو وہ نہ صرف متعجب تھا، بلکہ تقریباً پریشان ہو گیا تھا۔ شاہراہ کو کاٹنے والی گلی پر اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا، مگر وہ موسیو ڈیوک Havre کی سراغ رساں آنکھ سے اوجھل نہیں ہو سکا تھا۔

موسیو ڈیوک Havre اس دن محافظوں کے کپتان کی حیثیت میں گاڑی میں بادشاہ کے سامنے کی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے جلالت مآب سے کہا تھا، "اس طرف مجھے بدقماش قسم کا ایک آدمی دکھائی دے رہا ہے۔" پولیس کے ارکان نے بھی جو بادشاہ کی سواری کے راستے کو صاف کر رہے تھے، اس پر نظر کی تھی۔ ان میں سے ایک کارندے کو اس آدمی کی پیچھے لگا دیا گیا تھا، مگر وہ آدمی مضافات کی سنسان گلیوں میں کود گیا، اور جیسے ہی رات کا اندھیرا بڑھنے لگا، پولیس کے کارندے اس کا سراغ کھو بیٹھے، جیسا کہ وزیرِ مملکت موسیو le Comte کو پیش کی گئی رپورٹ میں کہا گیا تھا۔

جب پیلے کوٹ والے آدمی کو اس راستے سے ہٹا دیا گیا، تو اس نے اپنی رفتار دُگنی کر لی، مگر وہ خود کو مطمئن رکھنے کے لیے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ سوا چار بجے کے قریب، جب پوری طرح رات کا اندھیرا چھا چکا تھا، وہ Porte-Saint-Martin تھیٹر کے سامنے سے گزرا جہاں اُس دن "دو مزا یافتہ" نامی ڈرامہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے اشتہار نے، جسے لالٹینوں سے روشن رکھا گیا تھا، اس کو اپنی جانب متوجہ کیا؛ حالاں کہ وہ تیزی سے جا رہا تھا، اس اشتہار کو پڑھنے کو رُک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ La Planchette کی ایک بند گلی میں تھا، اور پھر وہ Plat d'Etain میں داخل ہو گیا جہاں ان دنوں Lagny جانے والی کوچ کا دفتر واقع تھا۔ یہ کوچ ساڑھے چار بجے جانے والی تھی۔ گھوڑے جوت دیے گئے تھے، اور کوچوان کی ہدایت پر مسافر تیزی سے گاڑی میں لگی ہوئی لوہے کی سیڑھی چڑھ رہے تھے۔

اس آدمی نے سوال کیا، ''کیا ایک مسافر کی جگہ خالی ہے؟''
''صرف میرے برابر، بکس کے اوپر۔'' کوچوان نے کہا۔
''منظور ہے۔''
''سوار ہو جاؤ۔''
پھر بھی، چلنے سے پہلے، کوچوان نے مسافر کے خستہ حال لباس، چھوٹے سے بنڈل پر نظر کی اور کرایہ طلب کیا۔
''کیا تم Lagny تک جاؤ گے؟'' کوچوان نے سوال کیا۔
''ہاں'' مسافر نے جواب میں کہا۔
مسافر نے Lagny تک کا کرایہ ادا کر دیا۔
گاڑی کی روانگی کے بعد، جب وہ کچھ دور چل چکے تو کوچوان نے تکلم کا سلسلہ جاری کرنے کی کوشش کی، مگر مسافر ہاں، ناں سے آگے نہیں بڑھا۔ مجبور ہو کر کوچوان سیٹی بجانے اور گھوڑوں کو گالی دینے میں مصروف ہو گیا۔
موسم سرد تھا۔ کوچوان نے خود کو اپنے لبادے میں لپیٹ لیا تھا مگر وہ آدمی اس کے بارے سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ اس طرح وہ Gournay اور Neuilly-sur-Marne سے گزر گئے۔
چھ بجے کے قریب وہ Chelles پہنچے۔ کوچوان نے اپنی گاڑی سرائے کے سامنے کھڑی کر دی جو رائل ایبے کی قدیم عمارت میں قائم تھی، تا کہ گھوڑوں کو کچھ آرام مل جائے۔
''میں یہیں اُتر جاؤں گا۔'' اس آدمی نے کہا۔
اس نے اپنا بنڈل اور لاٹھی اٹھائی اور گاڑی سے کود پڑا۔
ایک لمحے کے بعد وہ غائب ہو گیا تھا۔
وہ سرائے میں داخل نہیں ہوا تھا۔
چند منٹ بعد گاڑی Lagny کے لیے روانہ ہوئی تو وہ Chelles کی اہم سڑکوں پر کہیں نظر نہیں آیا۔
اب کوچوان اندر کے مسافروں سے مخاطب تھا۔
''وہاں'' اس نے کہا ''ایک آدمی ہے جس کا اس جگہ سے تعلق نہیں، اس لیے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ اس کے حال سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس ایک سو بھی نہ ہوگا۔ مگر اسے مال کی پروا نہیں تھی؛ اس نے Lagny تک کا کرایہ ادا کیا تھا، اور صرف Chelles تک گیا۔

اب رات ہو چکی ہے؛ تمام گھر بند ہیں؛ وہ سرائے میں گیا نہیں، اور اس کا کوئی پتا نہیں۔ شاید وہ زمین میں سما گیا ہے۔"

وہ آدمی زمین میں تو سمایا نہیں، مگر اندھیرے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا، Chelles کی اہم سڑکوں پر چلا، گرجا گھر پہنچنے سے پہلے دائیں جانب مڑا تھا، چوراہے سے گزرنے والی سڑک پر چلا، جو Montfermeil کی طرف جاتی ہے، ایسے آدمی کی طرح جو اس علاقے سے واقف ہو اور پہلے یہاں آ چکا ہو۔

آدمی اس سڑک پر تیزی سے چلا۔ اس جگہ پر جہاں قدیم دو رویہ پیڑوں والی سڑک شاہراہ کو کاٹتی ہے جو Gagny سے Lagny جاتی ہے، اسے کچھ لوگوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک گڑھے میں پناہ لے لی، اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ وہ لوگ دور نہیں چلے گئے۔ احتیاط کسی حد تک غیر ضروری تھی، پھر بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وہ دسمبر کی بہت سیاہ رات تھی۔ آسمان میں صرف دو یا تین ستارے ہی نظر آ رہے تھے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے پہاڑوں کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ وہ آدمی Montfermeil جانے والی سڑک پر واپس نہیں آیا؛ میدان پار کرنے کے بعد دائیں جانب مڑ گیا تھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا جنگل میں داخل ہو گیا تھا۔

جنگل میں داخل ہوتے ہی اس کی رفتار کم ہو گئی، اور اس نے احتیاط سے تمام پیڑوں کا معائنہ شروع کر دیا، آگے بڑھتے ہوئے، قدم بہ قدم، گویا وہ کسی پُراسرار سڑک کی تلاش میں ہو جس کا صرف اسے ہی علم ہے۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب وہ خود کو گم ہوتا محسوس کرنے لگا تھا۔ بالآخر ایک ایک انچ راستہ تلاش کرتا وہ ایک کھلی جگہ پہنچ گیا جہاں سفیدی مائل پتھروں کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا۔ وہ پھرتی سے ان پتھروں پر چڑھ گیا، اور رات کی دھند میں پوری توجہ سے ان کا معائنہ کرنے لگا، گویا ان پر کوئی تبصرہ کرنے والا ہو۔ ایک بڑا سا پیڑ، جس کے تنے پر بے شمار پھوڑے جیسے اُبھار تھے جو روئیدگی کے مہاسے کی طرح ہوتے ہیں، پتھروں کے ڈھیر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ اس پیڑ تک گیا اور اس کی چھال پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگا جیسے اس کے تمام مہاسے گن رہا ہو۔

اس جنگلی درخت کے مقابل، ایک شاہ بلوط درخت بھی تھا جس کو چھال اکھڑنے کی بیماری لگ گئی تھی، جس پر علاج کے طور پر، جست کی پٹی سے بنا ایک بند کیلوں سے لگایا گیا تھا۔ اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس بندش کو چھوا۔

پھر وہ کچھ دیر کے لیے اس پیڑ اور پتھر کے ڈھیر کے درمیان زمین پر چلتا رہا، اس

آدمی کی طرح جو خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو کہ حالیہ دنوں میں وہاں کی زمین کو چھیڑا نہیں گیا ہے۔

اس کے بعد اس نے اپنی سمت کا تعین کیا، اور جنگل کے درمیان اپنا سفر شروع کر دیا۔

یہ وہی آدمی تھا جو کوزیٹ سے ملا تھا۔

جب وہ گنجان جھاڑیوں میں سے Montfermeil کی جانب گزر رہا تھا، اس نے ایک چھوٹی سے کمزور سی پرچھائیں کا پیچھا کیا تھا، جو اپنا بوجھ زمین پر رکھتی، پھر اٹھاتی، پھر رکھتی اور پھر اٹھا کر چلنا چاہ رہی تھی۔ جب وہ اس پرچھائیں کے قریب گیا تو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی پانی سے بھری مہیب بالٹی لے کر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بچی کی طرف گیا اور خاموشی سے بالٹی کا ہینڈل تھام لیا۔

۞

کوزیٹ اجنبی اندھیرے میں

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، کوزیٹ خوف زدہ نہیں تھی۔
وہ آدمی اس سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز سنجیدہ اور بہت دھیمی تھی۔
''بچی، یہ جو تم لیے جا رہی ہو، تمھارے لیے بہت بھاری ہے۔''
کوزیٹ نے سر اُٹھا کر جواب دیا، ''جی ہاں جناب!''
''یہ مجھے دے دو۔'' آدمی نے کہا، ''میں تمھاری خاطر لے چلوں گا۔''
کوزیٹ نے بالٹی کا ہینڈل چھوڑ دیا۔ آدمی اس کے ساتھ چلنے لگا۔
''یہ واقعی بہت بھاری ہے۔'' اس نے اپنے منہ ہی منہ میں کہا۔ اس کے بعد مزید کہا، ''تمھاری عمر کیا ہے؟''
''آٹھ، جناب!''
''اور اسی طرح تم اتنی دور سے آئی ہو؟''
''جنگل میں چشمے سے۔''
''کیا تم بہت دور جا رہی ہو؟''
''یہاں سے تقریباً پندرہ منٹ کا راستہ ہے۔''
آدمی کچھ لمحے بالکل خاموش رہا، پھر اچانک کہا، ''اچھا، تو تمھاری ماں نہیں ہے کیا؟''
''مجھے معلوم نہیں۔''
بچی نے جواب دیا۔
قبل اس کے کہ آدمی اور کچھ کہتا، اس نے اضافہ کیا:

"مجھے معلوم نہیں۔ اور لوگوں کی مائیں ہیں، میری کوئی ماں نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوئی، "میرا خیال ہے کہ میری کبھی کوئی ماں نہیں تھی۔"

وہ آدمی رُک گیا؛ اس نے بالٹی زمین پر رکھ دی، جھکا اور دونوں ہاتھ بچی کے کاندھوں پر رکھ دیے، اور اندھیرے میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

کوزیٹ کا دُبلا اور بیمار جیسا چہرہ آسمان کی ہلکی نیلی روشنی میں مبہم سا دکھائی دے رہا تھا۔

"تمھارا کیا نام ہے؟" آدمی سوال کیا۔

"کوزیٹ!"

ایسا محسوس ہوا جیسے آدمی کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس نے بچی کی طرف ایک بار پھر دیکھا؛ اپنے ہاتھ کوزیٹ کے کاندھے پر سے ہٹا لیے، بالٹی اُٹھائی اور پھر چل پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پوچھا، "بچی، تم رہتی کہاں ہو؟"

"Montfermeil میں، اگر آپ جانتے ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"

"وہیں، جہاں ہم جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں، جناب!"

"وہ رُکا، پھر گویا ہوا، "کس نے تمھیں ایسے وقت میں جنگل سے پانی لانے کے لیے بھیجا ہے؟"

"وہ مادام تینی آردیے ہی تو تھی۔"

وہ آدمی، ایسی آواز میں جو لاپروا معلوم ہوتی تھی، مگر جس میں غیر معمولی لرزہ تھا، پھر گویا ہوا، "تمھاری مادام تینی آردیے کیا کام کرتی ہے؟"

"وہ میری مالکن ہے۔" بچی نے کہا، "وہ سرائے کا انتظام کرتی ہے۔"

"سرائے؟" آدمی نے کہا، "اچھا، تو میں آج اسی سرائے میں قیام کروں گا۔ مجھے راستہ دکھاؤ۔"

"ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔" بچی نے کہا۔

آدمی قابلِ برداشت تیزی سے چلتا رہا۔ کوزیٹ آسانی سے ساتھ چلتی رہی۔ اب اسے تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ آدمی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی، ایک طرح کے سکون اور ناقابلِ بیان اعتماد کے ساتھ۔ اسے کبھی نہ عاقبت اندیشی اور نہ دعا کے بارے میں بتایا

گیا تھا؛ پھر بھی اس کے اندر کوئی کیفیت تھی جو امید اور مسرت سے مشابہ تھی، اور آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ آدمی دوبارہ گویا ہوا، "مادام تھن آردیے کے گھر میں کیا کوئی ملازم نہیں ہے؟"

"نہیں، جناب!"

"کیا وہاں تم اکیلی ہی ہو؟"

"جی ہاں، جناب!"

ایک اور وقفہ گزرا۔ کوزیٹ نے اپنی آواز بلند کی، "کہنے کے لیے، وہاں دو چھوٹی بچیاں بھی ہیں۔"

"کون، چھوٹی بچیاں؟"

"اپونین اور آزیلما۔"

اس طرح بچی نے ان دو رومانوی ناموں کو آسان بنا دیا، جو مادام تھن آردیے کو بہت پیارے تھے۔

"کون ہیں یہ پونین اور زیلما؟"

"وہ دونوں مادام تھن آردیے کی نوجوان خواتین ہیں؛ جنھیں آپ بیٹیاں کہیں گے۔"

"اور یہ لڑکیاں کیا کرتی ہیں؟"

"اوہ!" بچی نے کہا، "ان کے پاس خوب صورت گڑیاں ہیں؛ ان کے پاس سونے کی چیزیں ہیں۔ وہ دونوں ان سے کھیلتی رہتی ہیں؛ خوب ہنستی رہتی ہیں۔"

"سارا دن؟"

"جی ہاں، جناب!"

"اور تم؟"

"میں! میں کام کرتی ہوں۔"

"سارا سارا دن؟"

بچی نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھائیں، جن میں آنسو لٹک رہے تھے، جو اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہے تھے، اور شائستگی سے جواب دیا، "جی ہاں، جناب!"

ایک مختصر سے وقفے کے بعد، بچی پھر گویا ہوئی، "کبھی، جب میں اپنا کام ختم کر لیتی

ہوں اور وہ مجھے اجازت دیتی ہیں، تو میں بھی کھیل کر خوش ہو لیتی ہوں۔"

""تم خود کو کس طرح خوش کر لیتی ہو؟""

""جس طرح ممکن ہو۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دیتی ہیں؛ مگر میرے پاس بہت کھلونے نہیں۔ پونین اور زیلما مجھے اپنی گڑیاں نہیں دیتیں۔ میرے پاس چھوٹی سی ایک تلوار ہے، اس سے بڑی نہیں۔" بچی نے اپنی چھوٹی سی انگلی اٹھا کر بتایا۔

""اور یہ تلوار کاٹتی نہیں؟""

""جی ہاں، جناب!" لڑکی نے کہا،" یہ تلوار سلاد اور مکھیوں کے سر کاٹتی ہے۔"

وہ اب گاؤں میں پہنچ گئے تھے۔ کوزیٹ نے اجنبی کی سڑکوں پر رہ نمائی کی تھی۔ وہ نان بائی کی دکان کے پاس سے گزرے مگر کوزیٹ کو وہ ڈبل روٹی یاد نہیں آئی جسے لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ آدمی نے سوال پوچھنے بند کر دیے تھے، اور اب ایک غم ناک خاموشی تھی۔

گرجا گھر پیچھے رہ گیا تو آدمی نے کھلے میدان میں لگی دکانیں دیکھ کر کوزیٹ سے پوچھا،" اچھا، تو یہاں میلا لگا ہوا ہے؟"

"نہیں جناب! یہ کرسمس ہے۔"

اور جب وہ سرائے کے قریب پہنچے تو کوزیٹ نے ڈرتے ڈرتے اس کا بازو چھوا،"موسیو؟"

""کیا ہے، میری بچی؟""

""ہم گھر سے بہت قریب ہیں۔"

"اچھا؟"

"""کیا اب آپ بالٹی مجھے تھما دیں گے؟"

""کیوں؟""

"اگر مادام نے دیکھ لیا کہ بالٹی کوئی اور لیے آ رہا ہے تو وہ میری پٹائی کرے گی۔"

آدمی نے بالٹی اسے پکڑا دی۔ ایک لمحے بعد وہ سرائے کے دروازے پر تھے۔

۞

مفلس مہمان جو دولت مند نکلا

کوزیٹ اس بڑی سی گڑیا کو چور نظروں سے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکی تھی جو اس وقت بھی کھلونے کے سوداگر کی دکان پر نمائش کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں جلتی شمع لیے تس آردیے برآمد ہوئی۔

"اوہ! اچھا یہ تو ہے کم بخت! خدا کا شکر ہے، مگر آخر تو نے اپنا وقت لے ہی لیا۔ چھنال، عیش کرتی رہی ہے کیا!"

"مادام!" کوزیٹ نے کہا، اس کا پورا جسم لرز رہا تھا، "ایک صاحب ہیں جو قیام کی جگہ چاہتے ہیں۔"

تس آردیے نے تیزی سے اپنا چولا بدل لیا۔ اس کی سخت مزاجی اچانک ملنسار بناوٹ میں بدل گئی۔ شکل کی اچانک تبدیلی جو تمام سرائے والیوں میں عام ہوتی ہے، جو ہمیشہ نوارد کی منتظر رہتی ہیں۔

"تو، آپ ہیں وہ صاحب؟" اس نے کہا۔

"جی ہاں، مادام!" اس آدمی نے ہیٹ تک اپنا ہاتھ لے جاتے ہوئے جواب دیا۔

صاحبِ ثروت مسافر اتنے شائستہ نہیں ہوا کرتے۔ اس انداز اور اجنبی کے لباس اور سامان پر نظر ڈالتے ہی، جو تس آردیے نے ایک نظر ہی میں دیکھ لیا تھا، اس کی ملنسار بناوٹ غائب ہوگئی اور سخت مزاجی واپس آ گئی۔ اس نے بہت خشکی سے بات شروع کی:

تشریف لائیے، جنابِ والا"

'جنابِ والا' داخل ہوئے۔ تس آردیے نے ایک بار پھر ان پر نظر ڈالی، اس کے فراک

کوٹ پر خاص طور سے نظر کی جو بالکل تار تار اور فرسودہ تھا، اور اس کی ہیئت، ذرا خستہ سی تھی۔ سر ہلاتے، ناک چڑھاتے، آنکھیں نچاتے ہوئے، اس نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا، جو اس وقت بھی گاڑی بانوں کے ساتھ مے نوشی میں مشغول تھا۔ شوہر نے اس طرح پہلی انگلی کو نچاتے ہوئے، جس کے ساتھ ہونٹ بھی پھول رہے تھے، سوچا کہ یہ تو کوئی معمولی فقیر ہے۔ اس کے بعد تین آردیے نے اونچی آواز میں کہا، "اوہ! دیکھیے، جناب والا! مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔"

"آپ جہاں چاہیں مجھے رکھ سکتے ہیں۔" اس آدمی نے کہا "دوچھتی میں، اصطبل میں۔ مگر میں وہی اجرت ادا کروں گا جو کمرے میں رہنے پر ادا کی جاتی ہے۔"

"چالیس سو۔"

"چالیس سو، منظور!"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

"چالیس سو!" ایک گاڑی بان نے تین آردیے سے آہستگی سے کہا، "کیوں، کرایہ تو صرف بیس سو ہوتا ہے۔"

"اس کے لیے چالیس سو ہی ہوگا۔" مسز تین آردیے نے اسی لہجے میں کہا "ہم مفلس مسافروں کو کم اجرت پر جگہ نہیں دیتے۔"

"یہ سچ ہے۔" اس کے شوہر نے آہستگی سے کہا "ایسے لوگوں کو رکھنے میں کمرہ تباہ ہو جاتا ہے۔"

اس دوران اس آدمی نے اپنی پوٹلی اور لاٹھی ایک بنچ پر رکھ دی، خود ایک میز کے قریب جا کر بیٹھ گیا، جس پر کوزیت نے جلدی سے وائن کی ایک بوتل اور ایک گلاس لا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوداگر جس نے اپنے گھوڑے کے لیے پانی طلب کیا تھا خود بالٹی کو اپنے گھوڑے تک لے گیا۔ کوزیت باورچی خانے کی میز کے نیچے اپنی بنائی لے کر بیٹھ گئی۔

وہ آدمی، جس نے وائن سے اپنے لب مشکل سے تر کیے ہوں گے جو اس نے خود انڈیلی تھی، اس بچی کو بڑی توجہ سے دیکھنے لگا۔

کوزیت بدصورت لڑکی تھی۔ اگر وہ خوش ہوتی تو شاید خوب صورت دکھائی دیتی۔ ہم اس کی اداس شخصیت کا خاکہ پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ کوزیت دبلی اور زرد تھی؛ تقریباً آٹھ برس کی تھی مگر مشکل سے چھ برس کی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، ایک قسم کے سایے میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور روتے وقت تقریباً نکلی پڑتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے کونے میں روحانی اذیت کا ایک عام قسم کا خم سا تھا جیسا سزا یافتہ اور شدید بیمار لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ جو اسے اپنی ماں سے ملے تھے، سردی سے پھٹ کر تباہ ہو گئے تھے۔ چوں کہ وہ ہمیشہ کانپتی رہتی تھی، اسے اپنے گھٹنے ایک

دوسرے سے دبائے رکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔اس کا پورا لباس چیتھڑوں پر مشتمل تھا جو گرمی کے دنوں میں زخم، اور سردی کے موسم میں خوف کو ابھارتا تھا۔اس کے پاس صرف سوراخوں سے بھری ایک چادر تھی، اون کا ایک ریشہ بھی نہیں تھا۔یہاں وہاں اور ہر جگہ، لباس سے اس کی جلد دکھائی دیتی تھی جس پر سیاہ اور نیلے رنگ کے دھبے دیکھے جا سکتے تھے، جو اُن جگہوں کے نشان تھے جہاں جہاں مسز تِن آردیے نے اسے مارا تھا۔اس کی برہنہ ٹانگیں پتلی اور سُرخ تھیں۔اس گردن کی دونوں جانب کے گڑھے دیکھنے والے کو رُلا دینے کے لیے کافی تھے۔اس بچی کی پوری شخصیت، اس کی صورت، اس کا انداز، اس کی آواز کی گہرائی، وقفے جو ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے درمیان آتے تھے، اس کی نظر، اس کی خاموشی، اس کا ہلکا سا بھی جذباتی اظہار صرف ایک ہی خیال کا اظہار کرتا اور چغلی کھاتا تھا — خوف!

اس کی پوری شخصیت پر خوف کا اختیار تھا؛ یوں سمجھیے کہ وہ اس کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ خوف سے اس کی کہنیاں کمر سے جا لگی تھیں؛ اس کی ایڑیاں اس کے پیٹی کوٹ میں چلی گئی تھیں؛ اسے کم سے کم جگہ درکار ہوتی تھی؛ اتنی ہی سانس لیتی تھی جتنی کہ اشد ضروری ہوتی تھی اور یہ اس کے جسم کی عادت سی بن گئی تھی، جو سوائے اضافے کے کسی اور ممکنہ تبدیلی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک ششدر گوشہ تھا جس میں دہشت پوشیدہ رہتی تھی۔

اس کا خوف ایسا تھا کہ واپسی پر بھیگی ہونے کے باوجود کوزیت کو آگ کے قریب جانے اور خود کو سکھانے کی ہمت نہیں ہوئی، بلکہ خاموشی سے پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

آٹھ برس کی اس بچی کی آنکھ کا اظہار اتنا غم انگیز اور اتنا المناک تھا کہ اکثر موقعوں پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک احمق یا شیطان بن جانے والی ہے۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، اسے معلوم نہیں تھا کہ دعا کیا چیز ہوتی ہے؛ اس نے کبھی کسی گرجا گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔"کیا اس کے لیے میرے پاس وقت ہوگا؟" تِن آردیے کہا کرتا تھا۔

پیلے کوٹ والے آدمی کی نظریں کوزیت سے ہٹیں نہیں۔

اچانک مسز تِن آردیے نے شور مچا دیا:

"ارے کم بخت! وہ پاؤ روٹی کیا ہوئی؟"

اپنی عادت کے مطابق جب بھی تِن آردیے کی آواز بلند ہوتی، کوزیت جلدی سے میز کے نیچے سے برآمد ہو جاتی تھی۔

وہ بے چاری پاؤ روٹی لینا بالکل بھول ہی گئی تھی۔اسے ان بچوں کی طرح جو مسلسل خوف کے عالم میں ہوتے ہیں، آسان طریقہ آتا تھا۔اس نے جھوٹ بول دیا۔

"مادام، نان بائی کی دُکان بند تھی۔"

"تم نے کھٹکا کیا ہوتا۔"

"مادام، میں نے کھٹکا کیا تھا۔"

"پھر؟"

"اس نے دروازہ نہیں کھولا۔"

"اچھا، میں کل معلوم کرلوں گی کہ یہ بات سچ ہے کہ نہیں۔" مادام تِھن آردیے نے کہا۔ "اور اگر تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو تو میں تم کو نچا کر رکھ دوں گی۔" بہرحال، میرے پندرہ سو واپس کرو۔"

کوزیت نے اپنی ایپرن کے جیب میں ہاتھ ڈالا، اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ سکہ غائب تھا۔

"چلو، نکالو!" مادام تِھن آردیے نے کہا، "سنا کہ نہیں؟"

کوزیت نے اپنی جیب اُلٹ دی؛ اس میں کچھ نہیں تھا۔ وہ سکہ کیا ہوا؟ وہ بدقسمت بچی ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی۔ بس پتھر بن گئی۔

"کیا تو نے وہ پندرہ سو کا سکہ کھو دیا ہے؟" تِھن آردیے چیخی "یا تو مجھے لوٹ لینا چاہتی ہے؟"

اسی وقت اس نے کوڑے کی طرف ہاتھ بڑھائے جو چمنی کے کونے میں ایک کیل سے لٹکا ہوا تھا۔

اس خوف ناک حرکت نے کوزیت کو چیخ پڑنے کی کافی قوت فراہم کر دی تھی۔

"رحم، مادام — مادام! آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا!"

تِھن آردیے نے کوڑا اتار لیا تھا۔

اس دوران، پیلے کوٹ والا آدمی اپنی واسکٹ میں گھڑی رکھنے والی جیب کی تلاشی لے رہا تھا، جسے کوئی دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس کے علاوہ، سارے مسافر مے نوشی اور تاش کھیلنے میں مصروف تھے، اور کسی بات پر توجہ نہیں دے رہے تھے۔

کوزیت نے چمنی کے قریب کونے میں سکڑ کر ایک گیند کی سی صورت اختیار کر لی تھی، اس کوشش میں کہ وہ اپنے نصف برہنہ اعضا کو اکٹھا کر کے چھپا لے۔ تِھن آردیے نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"معاف کیجیے گا مادام!" اس آدمی نے کہا، "مگر ابھی مجھے کوئی شے دکھائی دی تھی جو اس لڑکی کے ایپرن کی جیب سے گری تھی، اور ایک طرف لڑھک گئی ہے۔ شاید یہ وہی سکہ تھا۔"

ساتھ ہی وہ جھک گیا اور ایسا لگا جیسے وہ ایک لمحے کے لیے فرش پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"بالکل صحیح؛ یہ رہا۔" کہتے ہوئے وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہوگیا۔

اور اس نے مادام تھن آردیے کی جانب ایک نقرئی سکہ بڑھا دیا۔

''ہاں، یہی تو ہے۔'' اس نے کہا۔

یہ وہ سکہ نہیں تھا، اس لیے کہ یہ بیس سو کا سکہ تھا؛ مگر مادام تھن آردیے کا اس میں فائدہ تھا۔ اس نے سکہ خاموشی سے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور بچی کو خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگی، اور کہا، ''ایسا پھر کبھی نہیں ہونا چاہیے!''

کوزیت اپنی سونے کی جگہ، جس کو تھن آردیے 'اس کا سنگ خانہ' کہتے تھے، چلی گئی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو مسافر پر لگی ہوئی تھیں، ایسی کیفیت کا اظہار کرنے لگی تھیں جیسی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اب تک صرف ایک معصومانہ حیرت تھی، مگر اب اس میں ایک قسم کے معصومانہ اعتماد کی بھی آمیزش ہو گئی تھی۔

''کیا آپ رات کا کھانا پسند کریں گے؟'' مادام تھن آردیے نے مسافر سے سوال کیا۔

مسافر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے خیالات میں غرق تھا۔

''کس قسم کا آدمی ہے یہ؟'' اس نے منہ ہی منہ میں کہا، ''یہ کوئی بہت ہی بد بخت شخص ہے۔ اس کے پاس رات کے کھانے کے لیے ایک سو بھی نہیں تو کیا یہ کمرے کا کرایہ بھی ادا کر سکے گا؟'' ساتھ ہی یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس نے فرش پر پڑا سکہ چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔''

اس دوران ایک دروازہ کھلا اور ایپونین اور آزیلما داخل ہو گئیں۔

وہ دونوں واقعی خوب صورت لڑکیاں تھیں، دیکھنے میں کسان سے زیادہ بورژوا، اور دل موہ لینے والی؛ ایک کتھئی رنگ کی زلفوں والی؛ دوسری کی لمبی سیاہ رنگ کی چوٹیاں پیٹھ پر پڑی تھیں۔ دونوں شگفتہ مزاج، صاف ستھری، گول مٹول، گلابی اور صحت مند اور دیکھنے والی آنکھوں کے لیے راحت۔ وہ دونوں گرم لباس میں ملبوس تھیں مگر اس قدر مادرانہ فن سے مزین کہ لباس کی موٹائی ان کی عشوہ گری کو چھپا نہیں رہی تھی۔ سردی کا موسم شروع ہو گیا تھا، مگر بہار کا زمانہ پوری طرح گیا نہیں تھا۔ ان دونوں کے وجود سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے علاوہ، وہ تخت پر براجمان تھیں۔ ان کے لباس کی زیبائش میں، ان کی زندہ دلی میں، ان کی مچائے ہوئے شور میں حاکمیت تھی۔ جب وہ داخل ہوئیں تو تھن آردیے نے شکایت کے لہجے میں، جس میں محبت ہی محبت تھی، ان سے کہا تھا، ''اچھا! بچیو، تم آ گئیں!''

تب ایک کے بعد دوسری کو اپنی طرف بلا کر، ان کے بال درست کیے، ان کے ربن دوبارہ باندھے، اور ان کو مادرانہ انداز میں دھکا دے کر الگ کیا، جو ماؤں سے مخصوص ہوتا ہے، اور اونچی آواز میں کہا، ''کتنی شریر ہیں یہ دونوں!''

وہ گئیں اور چمنی کے قریب کونے میں بیٹھ گئیں۔ ان کے پاس ایک گڑیا تھی، جسے وہ اپنے گھٹنوں پر بار بار لٹاتیں، اٹھاتیں، اور ہر قسم کی شوخی کرنے لگیں۔ وقتاً فوقتاً کوزیت بُنائی سے اپنی آنکھیں اٹھا کر غم زدہ انداز میں ان کے کھیل کو دیکھ لیتی تھی۔

اپونین اور آزیلما نے کوزیت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ ان کے نزدیک وہ کتے جیسی تھی۔ ان بچیوں کو ابھی تک احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں کو مل کر صرف چوبیس برس گزرے تھے، مگر وہ انسان کے پورے سماج کی نمائندگی کر رہی تھیں؛ ایک جانب رشک تھا اور دوسری جانب حقارت تھی۔

تین آردیے بہنوں کی گڑیا پھیکی اور ٹوٹی پھوٹی تھی؛ اس کے باوجود کوزیت کے نزدیک کم قابلِ ستائش نہیں تھی؛ جس کی زندگی میں کبھی کوئی گڑیا، اصلی گڑیا نہیں آئی تھی۔

اور اچانک مادام تین آردیے کو، جو کمرے میں ادھر اُدھر آ جا رہی تھی، گمان ہوا کہ کوزیت کا ذہن بھٹک رہا تھا کہ کام کرنے کے بجائے، اس کا دھیان بچیوں کے کھیل میں لگا تھا۔

"اوہ اچھا! میں نے دیکھ لیا ہے۔" اس نے چلّا کر کہا، "تو اس طرح تو کام کرتی ہے۔ میں تجھ سے کوڑے کے ذریعے کام لوں گی؛ یقیناً لوں گی۔"

اجنبی شخص کرسی سے اٹھے بغیر ہی تین آردیے کی طرف متوجہ ہوا۔

"مادام!" اس نے قدرے بزدلی سے کہا، "بچی کو کھیل لینے دو!"

اس قسم کی خواہش کا اظہار، ایک مسافر کی جانب سے، جس نے رات کے کھانے میں گوشت کا ایک سینڈوچ کھایا ہو اور دو بوتل وائن پی ہو، جس کا انداز مفلسوں جیسا نہ ہو، ایک حکم کے برابر ہوتا ہے، مگر کیا اس قسم کی ہیٹ پہننے والے کو اس قسم کی خواہش کے اظہار کی اجازت ہوگی؛ یہ ایسی بات تھی جو مادام برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے تُرشی سے جواب میں کہا، "اس کو کام کرنا ہوگا، اس لیے کہ وہ ہمارا دیا کھاتی ہے۔ میں اسے کچھ نہ کرنے کے لیے کھانا نہیں کھلاتی ہوں۔"

"یہ کیا بنا رہی ہے؟" اجنبی نے نرم لہجے میں پوچھا، جو حیرت انگیز طور پر اس کے فقیرانہ لباس اور حمال جیسے کاندھوں کے مطابق نہیں تھا۔

"موزے! میری بچیوں کے لیے، جن کے پاس ایک بھی نہیں، جو اس وقت بھی ننگے پاؤں ہیں۔"

اجنبی نے کوزیت کے چھوٹے چھوٹے سُرخ پیروں کی طرف دیکھا، اور گفتگو جاری رکھی، "کب تک اسے موزے کے یہ جوڑے مکمل کرنے ہیں؟"

"اس کے لیے دو یا تین پورے دن کا کام باقی ہے، کاہل کہیں کی!"

"اور جب یہ موزے مکمل ہو جائیں گے تو ان کی قیمت کیا ہو گی؟"
تین آردیے نے کوزیت پر حقارت کی نظر ڈالی، "کم از کم، تیس سو۔"
"کیا تم مجھے یہ موزے پانچ فرانک میں بیچ دو گی؟" وہ اجنبی کہتا رہا۔
"اللہ اکبر!" ایک گاڑی بان نے چیخ کر، زور سے ہنستے ہوئے کہا، جو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا؛ "پانچ فرانک! کیا یہ شیطنت نہیں، یعنی پانچ گولے!"
مرد تین آردیے نے سوچا کہ یہی وقت ہے دخل دینے کا۔
"جی ہاں جناب! اگر آپ کی یہی خواہش ہے، تو ٹھیک۔ آپ کو موزے کا یہ جوڑا پانچ فرانک میں لینے کی اجازت ہے۔ ہم مسافروں سے انکار نہیں کیا کرتے۔"
"مگر قیمت آپ کو فوراً ادا کرنی ہو گی۔" تین آردیے نے اپنے روکھے اور قطعی انداز میں کہا۔
"میں موزوں کا یہ جوڑا خرید لوں گا۔" اجنبی نے جواب دیا، اور اس نے اپنی جیب سے پانچ فرانک کا سکہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا "میں اس کی قیمت ادا کر رہا ہوں۔"
اس کے بعد وہ کوزیت کی طرف متوجہ ہوا۔
"اب تیرا یہ کام میری ملکیت ہے؛ کھیل، میری بچی، کھیل!"
گاڑی بان پانچ فرانک کا سکہ دیکھ کر اس قدر جذباتی ہو گیا کہ اس نے گلاس ایک طرف رکھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔
"مگر، یہ تو اصلی ہے۔" اس نے معائنہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا "بالکل اصلی! جعلی ہرگز نہیں!"
تین آردیے آگے بڑھا اور خاموشی سے سکہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔
مادام تین آردیے کے پاس الفاظ نہیں تھے جواب دینے کے لیے۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹے اور اس کے چہرے پر نفرت کے آثار ہویدا ہو گئے۔
اس دوران کوزیت خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس نے پوچھنے کی ہمت کی، "کیا یہ سچ ہے، مادام؟ کیا میں اب کھیل سکتی ہوں؟"
"کھیل، ضرور کھیل۔" تین آردیے نے خوفناک آواز میں کہا۔
جس وقت اس کا منہ تین آردیے کا شکریہ ادا کر رہا تھا، اس کا پورا وجود مسافر کی شکر گزاری کر رہا تھا۔
موسیو تین آردیے مے نوشی میں مصروف ہو گیا؛ اس کی بیوی نے اس کے کان میں سرگوشی کی، "یہ پیلے کوٹ والا آدمی کون ہو سکتا ہے؟"
میں نے ایسے کوٹوں میں بہت سے ملیونیر لکھ پتی دیکھے ہیں۔" تین آردیے نے شاہانہ

انداز میں جواب دیا۔

کوزیٹ نے بنائی چھوڑ دی، مگر اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ کوزیٹ ہمیشہ جہاں تک ممکن ہوتا کم ہی حرکت کرتی تھی۔ اس نے کچھ پرانے چیتھڑے اٹھائے اور اپنی سیسے کی چھوٹی سی تلوار پیچھے رکھے بکس سے نکالی۔

ایپونین اور آزیلما نے اپنے اطراف ہونے والے واقعات پر توجہ نہیں کی تھی۔ انھوں نے تھوڑی دیر پہلے ایک کام کیا تھا۔ انھیں ایک بلی مل گئی تھی۔ انھوں نے اپنی گڑیا زمین پر پھینک دی اور ایپونین جو بڑی لڑکی تھی، بلی کی میاؤں اور ناراضی کے باوجود اسے بہت سارے کپڑوں اور سرخ و کبود ٹکڑوں میں لپیٹ رہی تھی۔ اس سنجیدہ اور مشکل کام کے دوران وہ اپنی چھوٹی بہن سے بچوں کی اس میٹھی اور محبت بھری زبان میں کہہ رہی تھی، جس کا حسن تتلی کے پروں کے جلوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے، جب تیزی سے بات کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

"دیکھو بہن، یہ گڑیا ہماری پہلی گڑیا سے زیادہ دل چسپ ہے۔ یہ کلبلاتی ہے، یہ چیختی ہے، یہ گرم ہے۔ آؤ بہن ہم اس سے کھیلتے ہیں۔ یہ میری چھوٹی لڑکی ہوگی۔ میں لیڈی ہوں گی۔ میں تم سے ملنے آؤں گی، اور تم اس کو دیکھو گی۔ رفتہ رفتہ تم اس کے مونچھوں کے بال محسوس کروگی، اور تم متعجب رہ جاؤ گی۔ پھر تم اس کے کان دیکھو گی، اور پھر اس کی دُم دیکھو گی اور حیران ہو جاؤ گی۔ اور تم مجھ سے کہو گی، "اوہ خدایا۔" اور میں تم سے کہوں گی 'جی ہاں مادم، یہ میری چھوٹی لڑکی ہے۔ ان دنوں چھوٹی لڑکیاں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔"

آزیلما بڑے شوق سے ایپونین کو سن رہی تھی۔

اس دوران، مے نوشی کرنے والوں نے ایک بیہودہ گیت گانا اور اتنی زور زور سے ہنسنا شروع کردیا کہ اندرونی چھت ہلنے لگی تھی۔ تین آردیے بھی ان میں شامل ہو گیا اور ان کی ہمت افزائی کرنے لگا تھا۔

جس طرح پرندے ہر شے سے اپنے گھونسلے بنا لیتے ہیں، اسی طرح بچے جو کچھ ہاتھ آئے، اس سے گڑیاں بنا لیتے ہیں۔ جس وقت ایپونین اور آزیلما اپنی بلی سے کھیل رہی تھیں کوزیٹ اپنے انداز میں اپنی تلوار کو گڑیا کی طرح کپڑے پہنا رہی تھی۔ اس کے بعد اس کو اپنے بازوؤں میں لٹا لیا اور دھیرے دھیرے لوریاں سنا کر اس کو سلانے لگی تھی۔

نسوانی بچپن کی دلچسپیوں میں سب سے من موہنی اور متکبرانہ ضرورت گڑیا ہوتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا؛ اس کو آراستہ کرنا؛ اس کو لباس پہنانا؛ اس کے کپڑے اتارنا؛ اس کو پڑھانا، تھوڑی سی سرزنش بھی کرنا؛ اس کو جھلانا؛ گود میں اچھالنا؛ سونے کے لیے لوریاں گانا؛ یہ تصور کرنا کہ وہ

واقعی کوئی شے ہے — اسی میں عورت کا پورا مستقبل سمویا ہوتا ہے۔خواب دیکھتے اور بک بک کرتے ہوئے، چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانا؛ بچگانہ کپڑے سینا؛ چھوٹے چھوٹے گاؤن، سینہ بند اور انگیا ئیں بناتے ہوئے بچی ایک نوجوان لڑکی میں تبدیل ہو جاتی ہے؛ نوجوان لڑکی بڑی لڑکی، اور بڑی لڑکی عورت بن جاتی ہے۔اس طرح عورت کا پہلا بچہ آخری گڑیا کا تسلسل ہوتا ہے۔

گڑیا کے بغیر، کوئی چھوٹی لڑکی تقریباً اسی طرح بد قسمت ہوتی ہے جیسے بغیر بچوں والی کوئی عورت۔لہٰذا کوزیٹ نے اپنی چھوٹی سی تلوار سے اپنے لیے ایک گڑیا بنائی تھی۔

مادام تین آردیے نے پیلے کوٹ والے سے رابطہ پیدا کیا، ''میرا شوہر صحیح کہتا ہے۔'' اس نے سوچا، ''شاید یہ آدمی موسیو لافیت ہے؛ ایسے انوکھے آدمی بھی ہوتے ہیں!''

وہ آئی اور میز پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں۔

''موسیو!'' اس نے کہا۔اس لفظ کے سنتے ہی، موسیو، یعنی وہ شخص اس کی طرف متوجہ ہو گیا، اس سے پہلے تین آردیے اس کو بہادر آدمی یا بڑے میاں کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

''دیکھیے جناب!'' اس نے اپنے لہجے میں مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا ''میں اس بات پر راضی ہوں کہ بچی کو کھیلنا چاہیے؛ میں اس کی مخالفت نہیں کرتی، مگر ایک بار کے لیے ٹھیک ہے، اس لیے کہ آپ فیاض آدمی ہیں۔آپ نے دیکھا ہے کہ اس کے پاس تو کچھ نہیں؛ اس لیے اسے کام کرنا ہوگا۔''

''تو کیا یہ آپ کی بچی نہیں؟'' آدمی نے سوال کیا۔

''اوہ خدایا! نہیں جناب! یہ ایک فقیرنی ہے جسے ہم نے خیراتی ادارے سے لیا ہے؛ ایک قسم کی ضعیف العقل بچی ہے۔اس کے دماغ میں پانی بھرا ہوگا؛ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا سر بڑا ہے۔ہم جو کچھ کر سکتے ہیں، اس کے لیے کرتے ہیں، اس لیے کہ ہم دولت مند لوگ نہیں؛ ہم نے اس کے آبائی وطن کئی بار لکھا ہے مگر پچھلے چھ ماہ سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ہو سکتا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہو۔''

''اچھا!'' آدمی نے کہا، اور ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔

''اس کی ماں مفلس تھی۔'' تین آردیے کہتی رہی، ''اس نے اپنی بچی کو چھوڑ دیا تھا۔''

اس پوری گفتگو کے دوران کوزیٹ کی نظریں تین آردیے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، گویا کسی جبلت نے اسے متنبہ کر دی ہو کہ اسی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے؛ وہ مبہم انداز میں سننے کی کوشش کرتی رہی؛ بس، ادھر اُدھر سے ایک آدھ لفظ اس کے کان میں پڑ گیا ہوگا۔

اس دوران مے نوش لوگ، جن کی اکثریت نشے میں دُھت ہو رہی تھی، اپنی گندی باتوں کو دُگنی شرارت سے دہرا رہے تھے؛ وہ بہت چھچھورا اور بیہودہ گانا گا رہے تھے، جس میں کنواری اور نوزائیدہ یسوع مسیح متعارف کرائے جا رہے تھے۔تین آردیے بھی ان کے قہقہوں میں شریک

تھا۔ میز کے نیچے، اپنی جگہ سے کوزیٹ آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کو دیکھ رہی تھی، جو اس کی آنکھوں سے منعکس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بنائے ہوئے بچے کو جھلایا، اور ساتھ ہی اس نے دھیمی آواز میں گانا شروع کردیا، "میری ماں مرگئی ہے، میری ماں مرگئی ہے، میری ماں مرگئی ہے!"

میزبان کے ایک بار پھر یاد دلانے پر، پیلے کوٹ والا "لکھ پتی" آدمی بالآخر رات کا کھانا کھانے پر راضی ہوگیا۔

"موسیو کیا کھانا چاہتے ہیں؟"

"روٹی اور پنیر۔" آدمی نے کہا۔

"یقینی طور پر یہ شخص بھک منگا ہے۔" مادام تین آردیے نے سوچا۔

نشے میں مست لوگ اب بھی گانا گا رہے تھے اور میز کے نیچے بچی اپنا گانا گا رہی تھی۔

اچانک کوزیٹ رُک گئی؛ وہ مڑی ہی تھی کہ اس کو تین آردیے کی بچیوں کی گڑیا نظر آگئی تھی جسے انھوں نے بلی مل جانے کے بعد ایک طرف، باورچی خانے کی میز کے قریب، فرش پر پھینک دیا تھا۔

تب اس نے کپڑے میں لپٹی اپنی چھوٹی سے تلوار بھی پھینک دی، جو اس کی صرف آدھی ضرورت پوری کر رہی تھی، اور دھیرے دھیرے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مادام تین آردیے اپنے شوہر کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور کچھ رقم گن رہی تھی۔ ایپونین اور آزیلما اپنی بلی کے ساتھ کھیل رہی تھیں؛ مسافر کھانا کھا رہے تھے، شراب پی رہے تھے اور گانا گا رہے تھے؛ کسی کی نظریں اس پر نہیں تھیں۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں پر رینگتی ہوئی میز سے باہر نکلی اور یہ احتیاط کرلی تھی کہ کوئی اس دیکھ نہیں رہا ہے؛ پھر تیزی سے گڑیا کی طرف بڑھی اور اس کو اٹھا لیا۔ ایک ہی لمحے میں واپس اپنی جگہ پہنچ گئی، تھوڑی دیر ساکت بیٹھی رہی، اور صرف اس قدر مڑی تھی کہ گڑیا پر اس کا سایہ پڑجائے جسے اس نے اپنے بازو میں لے لیا تھا۔ اس کے لیے گڑیا سے کھیلنے کی خوشی اتنی غیر معمولی تھی کہ اس میں عیاشی کا تشدد بھی شامل ہوگیا تھا۔

سوائے اس آدمی کے جو اپنا معمولی کھانا کھانے میں مصروف تھا، اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔

کوزیٹ کی مسرت تقریباً صرف ایک چوتھائی گھنٹے باقی رہی تھی۔ مگر، تمام تر احتیاط کے باوجود جو کوزیٹ نے کی تھی، اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ گڑیا کی ایک ٹانگ باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی، اور آتش دان کی آگ میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گلابی اور چمک دار پیر، سایے سے باہر، اچانک آزیلما کی نگاہوں میں آگیا، جس نے ایپونین سے کہا "وہ دیکھو بہن۔"

دونوں بہنیں حیرت زدہ، ایک لمحے کو ساکت ہوگئیں؛ کوزیٹ نے ان کی گڑیا اٹھانے

کی ہمت کی تھی۔

اپونین اپنی جگہ سے اٹھی اور بلی کو بغل میں دبائے، دوڑی ہوئی ماں کے پاس گئی، اور اس کا لہنگا پکڑ کر کھینچنے لگی۔

"چھوڑو مجھے!" ماں نے کہا، "کیا چاہتی ہو؟"

"ماں" بچی نے کہا "ذرا اُدھر دیکھو!"

اور اس نے کوزیت کی طرف اشارہ کیا۔

کوزیت اپنے قبضے کے وجد میں کھوئی ہوئی تھی؛ اسے نہ کچھ سنائی، نہ دکھائی دے رہا تھا۔

مادام تین آردیے کے چہرے نے وہ مخصوص اظہار اختیار کر لیا جس کے باعث اس انداز کی عورتوں کو "حاسد عورت" کا نام دیا جاتا تھا۔

اس موقعے پر، اس کے زخم خوردہ تکبر نے طیش کو اور زیادہ کر دیا تھا۔ کوزیت ساری سرحدیں پھلانگ گئی تھی؛ کوزیت کے بے قابو ہاتھ "ان نوجوان خواتین" کی ملکیت گڑیا تک پہنچ گئے تھے۔ اگر [روس کی ملکہ] زارینہ کسی دیہاتی کو اپنے شاہزادے کا نیلا ربن لگائے دیکھ لیتی تو اس کا چہرہ بھی اس سے مختلف نہیں ہوتا۔

وہ اتنی زور سے چیخی کہ کہ اس کی آواز بھرا گئی۔

"کوزیت!"

کوزیت کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کے پاؤں تلے کی زمین لرز گئی ہو؛ وہ پلٹی۔

"کوزیت!" وہ دوبارہ چیخی۔

کوزیت نے گڑیا اٹھائی اور اس کو ایک قسم کی توقیر کے ساتھ، جس میں اداسی شامل تھی، شائستگی سے فرش پر رکھ دیا۔ پھر اس پر سے نظر ہٹائے بغیر، اس نے اپنے ہاتھ باندھ لیے اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس چھوٹی سی عمر کی بچی نے اپنے ہاتھ ملنے شروع کر دیے تھے؛ اس کے بعد — نہ جنگل کا پھیرا، نہ پانی بھری بالٹی کا وزن، نہ رقم کا گم ہو جانا، نہ کوڑے کا منظر، نہ وہ الفاظ بھول سکی جو اس نے مادام تین آردیے کو ادا کرتے سنے تھے — وہ رونے لگی؛ زور زور سے سسکیاں لینے لگی تھی۔

اس دوران پیلے کوٹ والا مسافر کھڑا ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے مادام تین آردیے سے پوچھا۔

"کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟" مادام تین آردیے نے کہا، اور اس گڑیا کی طرف اشارہ کیا جو کوزیت کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔

"اچھا، تو کیا ہوا؟"

"اس فقیرنی نے" مادام تِن آردیے نے جواب میں کہا "بچیوں کی گڑیا کو چھونے کی ہمت کی ہے۔"

"بس اتنی سے بات پر اتنا شور!" آدمی نے کہا، "کیا ہوا، اگر وہ گڑیا سے کھیلی ہے؟"

"اس نے اسے اپنے گندے ہاتھ لگائے ہیں۔" مادام تِن آردیے نے مزید کہا، "اپنے خوف ناک ہاتھ لگائے ہیں۔"

اس پر کوزیٹ کی سسکیاں اور زیادہ ہو گئیں۔

"اب خاموش بھی ہوگی کہ نہیں؟" مادام تِن آردیے چیخی۔

وہ آدمی سیدھا باہر جانے والے دروازے کی طرف گیا، دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

جوں ہی وہ باہر گیا، مادام تِن آردیے نے اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میز کے نیچے کوزیٹ کو زور سے ٹھوکر ماری، جس کی وجہ سے بچی زیادہ زور سے رونے لگی۔

ذرا دیر بعد دروازہ دوبارہ کھلا، وہ آدمی واپس نظر آیا؛ اس کے ہاتھ میں وہ ناقابلِ یقین گڑیا تھی، ہم جس کا تذکرہ کر چکے ہیں اور جسے گاؤں کی تمام لڑکیاں صبح سے دیکھتی رہی ہیں۔ اس نے، گڑیا کو یہ کہتے ہوئے کوزیٹ کے سامنے رکھ دیا، "لو! یہ تمھارے لیے ہے۔"

یاد رہے کہ اس گھنٹے یا اس سے سوا عرصے کے دوران، جو اس نے یہاں گزارا تھا، اس نے اپنے خیال میں کھلونے کی اس دکان کا اندازہ کر لیا تھا جسے شمعوں اور fire-pots سے اتنی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا کہ وہ مے خانے کی کھڑکی سے صاف دکھائی دیتی تھی۔

کوزیٹ نے اپنی نظریں اٹھائیں؛ اس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا جو اس کی جانب گڑیا اٹھائے آ رہا تھا، گویا اس نے سورج کی طرف گھور کر دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ بے نظیر الفاظ بھی سن لیے تھے، "لو، یہ تمھارے لیے ہے"؛ وہ کبھی آدمی کو دیکھتی اور کبھی گڑیا کو؛ پھر وہ پیچھے ہٹی، اور میز کے نیچے، آخری کنارے تک جا کر، دیوار کے کونے میں چھپ گئی۔

وہ اب نہ چیخ رہی تھی، نہ رو رہی تھی؛ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اسے سانس بھی لینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ایپونین اور آزیلما بُت جیسی ہو گئی تھیں؛ مے نوشی کرنے والے ٹھہر گئے تھے؛ ایک مقدس خاموشی پورے کمرے پر طاری ہو گئی تھی۔

پتھر جیسی اور گونگی مادام تِن آردیے نے دل ہی دل میں دوبارہ اپنے قیاس شروع کر دیے، "یہ شخص کون ہے؟ کیا یہ مفلس آدمی ہے؟ کیا یہ لکھ پتی آدمی ہے؟ شاید یہ دونوں ہی ہے، یعنی چور ہے۔"

موسیو تِن آردیے کے چہرے پر وہ معنی خیز شکن ظاہر ہوئی جو انسانی بشرے کو نمایاں کر دیتی ہے جب بھی جبلت اپنی تمام تر وحشیانہ قوت کے ساتھ ظہور کرتی ہے۔ سرائے والا کبھی گڑیا کو دیکھتا کبھی

مسافر کو، وہ اس آدمی کو سونگھ رہا تھا، اسی طرح جیسے وہ رقم سے بھرے تھیلے کو سونگھتا تھا۔ یہ کیفیت بجلی کے کوندے سے زیادہ دیر قائم نہیں رہی پھر وہ اپنی بیوی کی طرف بڑھا اور اس سے دھیمی آواز میں کہا،

"اس مشین کی قیمت کم از کم تیس فرانک ہوگی۔ اب کوئی احمقانہ بات نہیں ہوگی۔ اس آدمی کے سامنے اپنے پیٹ کے بل لیٹ جا۔"

بری فطرتوں اور سادہ لوح فطرتوں میں یہ بات مشترک ہوتی ہے کہ، ان میں عبورِ تغیر کی کیفیت نہیں ہوا کرتی۔

"اچھا کوزیت!" تین آردیے نے کہا، ایسے لہجے میں جو میٹھا ہونے کی کوشش کر رہا تھا، اور جو کینہ پرور عورتوں کے تلخ شہد سے ترتیب پاتا ہے، "کیا تم اپنی گڑیا نہیں لوگی؟"

کوزیت اپنے سوراخ سے باہر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ان صاحب نے تمھیں یہ گڑیا لا کر دی ہے، میری پیاری کوزیت۔" مادام تین آردیے نے پچکارتے ہوئے کہا، "لے لو، یہ تمھاری ہی ہے۔"

کوزیت نے اس شان دار گڑیا کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اب بھی آنسوؤں سے لبریز تھا مگر اس کی آنکھیں، طلوعِ فجر کے وقت کے آسمان کی طرح، حیرت انگیز خوشیوں کی کرنوں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے اچانک اس سے کہہ دیا ہو کہ "بچی، اب تم فرانس کی ملکہ ہو۔"

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہی وہ اس گڑیا کو ہاتھ لگائے گی اس میں سے کڑک کر بجلی نکل پڑے گی۔

شاید اس نے خود سے کہا ہو کہ مادام تین آردیے اس پر چیخے گی اور اسے مارے پیٹے گی۔

بہرحال، یہ اس دن کا سب سے بڑا واقعہ تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مادام تین آردیے کے قریب جا کر بزدلی کے لہجے میں پوچھا تھا، "مادام، کیا میں ......؟"

اس اداس اور خوف کے لمحے کا اچانک شادماں بن جانا ایسا واقعہ تھا جس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ میسر نہیں تھے۔

"یہ تیری ہے۔ ہاں، یہ صاحب تیرے لیے لائے ہیں۔" مادام تین آردیے نے چیخ کر کہا۔

"سچ مچ؟" کوزیت نے کہا "کیا یہ واقعی میری ہے؟ یہ لیڈی میری ہے؟"

اجنبی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی محسوس ہوئیں۔ وہ جذبات کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں آدمی اس خوف سے منہ نہیں کھولتا کہ وہ کہیں رو نہ پڑے۔ اس نے کوزیت کو دیکھ کر سر ہلایا اور اس 'لیڈی' کا ہاتھ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں دے دیا۔

کوزیٹ نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا گویا 'لیڈی' نے اسے جلا دیا ہو، اور فرش کی طرف دیکھنے لگی۔ ہم یہ بیان کرنے پر خود کو مجبور پا رہے ہیں کہ اس وقت اس نے غیر معقول طریقے سے اپنی زبان باہر نکال دی تھی۔ اچانک وہ گھومی اور دوڑ کر گڑیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''میں اسے کیتھرین کہہ کر پکاروں گی۔'' اس نے کہا۔

یہ ایک انوکھا موقع تھا جب کوزیٹ کے جسم کے چیتھڑے گڑیا کے ربن اور تازہ گلابی تن زیب سے گلے مل رہے تھے۔

''مادام!'' اس نے بات پھر شروع کی، ''کیا میں اسے کرسی پر بٹھا سکتی ہوں؟''

''ہاں، میری بچی!'' مادام تھن آردیے نے جواب دیا۔

اب کوزیٹ کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے کی باری اپونین اور آزیلما کی تھی۔

کوزیٹ نے کیتھرین کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے ہی فرش پر بیٹھ گئی، ایک لفظ بھی کہے بغیر، تصور کرنے کی تصویر سی بن گئی تھی۔

''کوزیٹ، اب کھیلو نا!'' اجنبی نے کہا۔

''اوہ! میں کھیل تو رہی ہوں۔''

اس اجنبی، اس نامعلوم شخص سے جو کوزیٹ کے لیے رحمت ثابت ہوا تھا، تھن آردیے اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کر رہی تھی، مگر ضروری تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھے۔ اپنے شوہر کی ہر بات کی نقل کرنے کی منافقت اس کی عادت سی بن گئی تھی، مگر یہ جذبات اس کی برداشت سے کہیں زیادہ تھے۔ اس نے اپنی بچیوں کو جلد ہی خواب گاہ میں بھیج دیا، اس کے بعد اس آدمی سے کوزیٹ کو بھی بھیج دینے کی اجازت طلب کی؛ اور مادرانہ کیفیت میں اس جملے کا بھی اضافہ کر دیا تھا، ''اس لیے کہ وہ سارا دن کام کرتی رہی ہے۔''

کوزیٹ، کیتھرین کو اپنے بازوؤں میں لیے سونے چلی گئی۔

وقتاً فوقتاً مادام تھن آردیے کمرے کے دوسرے سرے تک آتی جاتی، جیسا کہ خود اس نے کہا تھا تسکین کا سانس لینے کے لیے، جہاں اس کا شوہر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے تبادلۂ الفاظ کیا جو زیادہ تلخ و تیز تھے جنھیں وہ زور سے ادا نہیں کر سکتی تھی۔

''خبیث بوڑھا! اس کی توند میں نہ جانے کیا بھرا تھا کہ وہ ہمیں اس طرح پریشان کرنے آ گیا ہے۔ اس ننھی دیوی کو کھیل کود کرانے کے لیے۔ ایک چھنال کو چالیس فرانک کی گڑیا دلانے کے لیے، جسے میں چالیس سو میں بیچ ڈالوں۔ ہاں میں بیچ ڈالوں گی۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ کچھ دیر بعد یہ آدمی اس کو جلالت مآب ملکہ کہے گا۔ کیا یہ کوئی عقل مندی کی

بات ہے؟ کیا یہ پُراسرار بوڑھا بالکل پاگل ہو گیا ہے۔''

موسیو تین آردیے نے جواب میں کہا، ''کیوں، یہ بالکل سادہ سی بات ہے۔ اسے بھی اچھا لگتا ہے۔ تمھیں بھی تو اس لڑکی سے کام لینا اچھا لگتا ہے؛ اس کو اس کا کھیلنا اچھا لگتا ہے۔ وہ ٹھیک آدمی ہے۔ مسافر جو چاہے کر سکتا ہے، اگر وہ اس کی اجرت ادا کر رہا ہے۔ اگر یہ بوڑھا مخیّر اور ہم درد ہے تو تمھیں اس سے کیا مطلب۔ اگر وہ احمق ہے تو تمھیں کیا۔ جب تک اس کے پاس دولت ہے، تم کس لیے پریشان ہو رہی ہو؟''

ایک ماہر کی زبان اور ایک سرایے کے مالک کا استدلال تھا، دونوں کو کسی جواب کی ضرورت نہیں تھی۔

اس آدمی نے میز پر دونوں کہنیاں رکھ دیں اور سوچ میں پڑ گیا۔ دوسرے تمام مسافر، پھیرے والے اور گاڑی بان، پیچھے ہٹ گئے، اور گانا بند ہو گیا تھا۔ سب فاصلے سے اس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے، جس میں احترام کا استعجاب تھا۔ خستہ حال لباس میں ملبوس یہ آدمی، جو اتنے آرام سے جیب سے مال نکال رہا تھا اور لکڑی کی کھڑاؤں پہننے والی ننھی لونڈیا کو دیو ہیکل گڑیا دے رہا تھا یقیناً یہ شخص شان دار انسان تھا، اور اس سے خوف کھانا چاہیے۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ گرجا گھر کا نیم شب کا دعائیہ اجتماع ختم ہو گیا تھا؛ گھنٹیاں خاموش ہو گئی تھیں؛ مے نوش واپس چلے گئے تھے؛ شراب خانہ بند ہو گیا تھا؛ دیوان خانہ اجاڑ ہو گیا تھا؛ آگ بجھ گئی تھی؛ وہ اجنبی اب بھی اسی انداز میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ بس، جس پر جھکا ہوا تھا جس پر سہارا لیے ہوئے تھا، وقتاً فوقتاً وہ کہنی بدل لیتا تھا۔ جب سے کوزیت کمرے سے گئی تھی، اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔

محض خوش خلقی اور تجسس کی خاطر، کمرے میں صرف تین آردیے میاں بیوی ٹھہرے رہے۔

کیا یہ پوری رات اسی طرح گزارنے والا ہے؟'' تین آردیے بڑبڑایا۔ جب رات کے دو بج گئے۔ تو مادام نے غائب ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے شوہر سے کہا، ''میں تو چلی سونے۔ تم جو چاہو کرو۔'' اس کا شوہر کونے میں رکھی ایک میز کے قریب بیٹھ گیا، ایک موم بتی جلائی اور Courrier Francais نامی اخبار پڑھنے بیٹھ گیا۔

پورا ایک گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ سرائے والا اخبار کو تین بار تاریخ سے چھاپے خانے کے نام تک چاٹ چکا تھا، مگر اجنبی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

تین آردیے نے کئی بار بے مقصد حرکت کی، کھانسا، تھوکا، اپنی ناک صاف کی اور اپنی کرسی چرچرائی۔ ''کیا یہ شخص سو گیا ہے۔'' تین آردیے نے سوچا۔ وہ آدمی سویا نہیں تھا، مگر کوئی

طریقہ اسے اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں سکا تھا۔

بالآخر تین آردیے نے اپنی ٹوپی اتاری، آہستہ سے اس کے قریب گیا، اور جھک کر پوچھا، ''کیا موسیو آرام کرنا چاہیں گے؟''

'سونا چاہیں گے' کہنا ذرا عامیانہ اور نامناسب تھا۔ 'آرام کریں گے' کہنے میں تعیش اور احترام تھا۔ ایسے الفاظ سے اگلے دن کا بل بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔ ایک کمرہ جس میں کوئی سوتا ہے تین سُو میں ملتا ہے؛ ایک کمرہ جس میں آرام کیا جاتا ہے بیس فرانک میں ملتا ہے۔

''اچھا'' اجنبی نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کا اصطبل کدھر ہے؟''

''جناب!'' تین آردیے نے، تبسم کے ساتھ، بلند آواز میں کہا۔ ''میں آپ کو لے چلوں گا''

اس نے موم بتی اٹھائی؛ آدمی نے اپنی پوٹلی اور لاٹھی اٹھائی، اور تین آردیے اس کو پہلی منزل کے کمرے میں لے گیا، جو غیر معمولی شان و شوکت والا تھا، سارا فرنیچر مہاگنی کا، نیچی مسہری، سرخ چھینٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

''یہ کیا؟'' مسافر نے پوچھا۔

''یہ حجلۂ عروسی ہے۔'' سرائے والے نے کہا۔ ''میں اور میری بیوی ایک اور کمرے میں رہتے ہیں۔ یہ کمرہ سال میں دو یا تین بار ہی استعمال ہوتا ہے۔''

''میں تو اصطبل کو زیادہ پسند کرتا۔'' آدمی نے اچانک کہا۔

تین آردیے نے سنی ان سنی کر دی۔

اس نے دو تازہ موم بتیاں روشن کر دیں جو چمنی کے پتھر پر رکھ دی گئیں۔ آتش دان میں آگ روشن تھی۔

چمنی کے پتھر پر، شیشے سے بنے ایک گُھرے پر، عورت کا چاندی کے تار اور نارنجی پھولوں سے مزیّن ایک [تاج نما] سرپوش رکھا ہوا تھا۔

''اور یہ کیا ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''یہ، جناب'' تین آردیے نے کہا، ''میری بیوی کا عروسی سرپوش ہے۔''

مسافر نے ایک ہی نظر میں اس شے کا جائزہ لے لیا جو کہتی محسوس ہو رہی تھی کہ ''واقعی، ایک وہ دن بھی تھا جب یہ عفیفہ کنواری دوشیزہ تھی؟''

تین آردیے جھوٹ بولا تھا۔ جب اس نے اس عمارت کو سرائے بنانے کے لیے لیز پر لیا تھا، اسے یہ کمرہ بالکل اسی حالت میں آراستہ ملا تھا؛ اس نے صرف فرنیچر خریدا تھا اور نارنجی رنگ کے پھول خریدے تھے تاکہ اس کی بیوی پر اچھا اثر پڑے اور اس کے نتیجے میں اس کے گھر کو احترام ملے۔

مسافر مڑا تو میزبان غائب تھا۔ شب بخیر کہے بغیر ہی تین آردیے چپکے سے کمرے سے نکل گیا تھا، اس لیے کہ وہ اس شخص سے بے ادب گرم جوشی سے پیش نہیں آنا چاہتا تھا جس کو آنے والے صبح شاہانہ انداز میں مونڈنے والا تھا۔

سرائے والا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس کی بیوی بستر میں دراز تھی، مگر وہ سو نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ سُنی تو اُٹھ بیٹھی اور اس سے کہا، "تمھیں بتا رہی ہوں، میں کل کوزیٹ کو گھر سے نکال باہر کرنے والی ہوں۔"

تین آردیے نے سرمہری سے جواب دیا، "تم یہ کام کیسے کروگی؟"

ان کے درمیان مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی، اور چند لمحوں بعد ان کی موم بتی بجھ گئی تھی۔

اُدھر، مسافر نے اپنی پوٹلی اور لاٹھی ایک طرف کونے میں رکھ دی تھی۔ سرائے والے کے چلے جانے کے بعد، وہ آرام کرسی میں گر پڑا اور کچھ دیر اپنے خیالوں میں غرق رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے جوتے اتارے، ایک موم بتی ہاتھ میں لی، دوسری کو پھونک مار کر بجھا دیا، دروازہ کھولا، کمرے سے باہر نکلا اور اپنے اطراف اس آدمی کی طرح دیکھنے لگا جو کسی شے کی تلاش میں ہو۔ اس نے ایک راہداری پار کی اور سیڑھی تک پہنچا۔ وہاں اسے کسی بچے کے سونے کے دوران سانس لینے کی ہلکی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کی جانب چلا اور ایک تکونے گوشے میں پہنچا جو سیڑھی کے نیچے بنایا گیا تھا، بلکہ خود سیڑھی سے بن گیا تھا۔ یہ قدمچوں کے نیچے کی جگہ تھی۔ وہاں، ہر قسم کے پرانے کاغذات اور ٹھیکریوں کے درمیان، گرد اور مکڑی کے جالوں میں، ایک بستر تھا — اگر کوئی ایک پیال کے تختے کو بستر کہہ سکے تو، جس میں اتنے سوراخ ہوں کہ پیال نظر آتا ہو، جس پر ایک رضائی ہو، اتنی پھٹی کہ اس کے نیچے کا تختہ نظر آتا ہو، کوئی چادر نہ ہو اور سب کچھ فرش پر ہی رکھا ہوا تھا۔

اس بستر میں کوزیٹ سو رہی تھی۔

آدمی اس کے قریب گیا اور اس کو غور سے دیکھا۔

کوزیٹ گہری نیند سو رہی تھی؛ وہ پورے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ سردی کے زمانے میں وہ سوتے وقت اپنا لباس نہیں اُتارتی تھی کہ اسے سردی نہ لگ جائے۔

اس کی چھاتی پر گڑیا رکھی ہوئی تھی، جس کی بڑی بڑی آنکھیں، پوری کھلی ہوئیں، اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً وہ ایک گہرا سانس لیتی، گویا بس اُٹھنے ہی والی ہو؛ اس نے گڑیا کو اپنے بازوؤں میں بھینچ رکھا تھا۔ اس کے بستر کے قریب صرف ایک ہی کھڑاؤں رکھی ہوئی تھی۔

کوزیٹ کے بستر کے قریب ہی ایک دروازہ کھلا ہوا تھا جس کے ذریعے ایک بڑا سا اندھیرا کمرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اجنبی اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کی دوسری جانب، شیشے کے

ایک دروازے سے اسے دو چھوٹے چھوٹے، بہت سفید بستر دکھائی دیے۔ وہ اپونین اور آزیلما کے بستر تھے۔ بستروں کے پیچھے، نیم پوشیدہ، بید سے بنا بغیر پردوں کا ایک پالنا تھا جس میں ایک چھوٹا سا لڑکا جو ساری شام روتا رہا تھا، لیٹا سو رہا تھا۔

اجنبی نے قیاس کر لیا کہ اس کمرے سے ملحق تینارڈیے جوڑے کی خواب گاہ ہوگی۔ وہ واپس ہونے ہی والا تھا کہ اس کی نظر روشن دان پر پڑی— سرائے کی ان بڑی چمنیوں میں سے ایک پر، جن میں شاید ہی کبھی آگ ہوتی تھی، اور اگر آگ ہوتی تھی تو اتنی کم کہ انھیں دیکھ کر سردی لگنے لگتی تھی۔ اس آتش دان میں آگ نہیں تھی؛ راکھ بھی نہیں تھی؛ مگر کوئی شے تھی جس نے اجنبی کی نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ وہ شے، بچوں کے دو چھوٹے چھوٹے جوتے تھے، شکل میں ناز آفریں، اور ناپ میں نا برابر۔ مسافر کو اچانک وہ شان دار اور قدیم رسم یاد آگئی جس کے مطابق بچے کرسمس کی رات اپنے جوتے چمنی میں رکھ دیتے تھے، اس امید پر کہ اس اندھیرے آتشدان میں کسی پری کی جانب سے کوئی چمک دار تحفہ رکھا ہوگا۔ اپونین اور آزیلما نے احتیاط کی تھی کہ یہ رسم ترک نہ ہو، اور دونوں نے اپنا ایک ایک جوتا آتش دان میں رکھ دیے تھے۔

مسافر نے جھک کر ان کو دیکھا۔

وہ پری، یعنی ان کی ماں، وہاں آ چکی تھی اور ہر جوتے میں دس سو کے، بالکل نئے، چمک دار سکے، رکھے ہوئے تھے۔

آدمی سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا، اور واپس ہونے ہی والا تھا، کہ آتش دان کے دوسرے اندھیرے کنارے پر دور اس کو کوئی شے نظر آئی۔ اس کی طرف غور سے دیکھا اور وہ لکڑی کا جوتا پہچان لیا، جو ایک خوف ناک حد تک کھردرا، نصف تلف شدہ، اور پورا راکھ اور کیچڑ میں بھرا تھا۔ یہ دراصل کوزیت کی کھڑاؤں تھی۔ کوزیت نے بچپنے کے اس دل موہ لینے والے اعتماد سے، جس کو ہمیشہ دھوکا دیا جا سکتا ہے مگر ہمت شکنی نہیں کی جا سکتی، اپنی کھڑاؤں بھی آتش دان کے پتھر پر رکھ دی تھی۔

کسی بچے کی امید، جس نے سوائے نا امیدی کے کچھ نہ دیکھا ہو، ایک پیاری اور دل موہ لینے والی شے ہوتی ہے۔

کھڑاؤں میں کچھ نہیں تھا۔

اجنبی نے اپنی واسکٹ کی جیب ٹٹولی، جھکا اور کوزیت کی کھڑاؤں میں ایک louis d'or [سونے کا سکہ] رکھ دیا۔

اس کے بعد وہ بھیڑیے کی سی خاموش چال چلتا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

۞

تن آردیے کی کارستانیاں

دوسرے دن صبح کے وقت، طلوعِ فجر سے کم از کم دو گھنٹے پہلے، سرائے کے عوامی کمرے میں بیٹھا تن آردیے شمع کی روشنی میں پیلے کوٹ والے مسافر کا بل بنا رہا تھا۔

اس کی بیوی، اس کے قریب کھڑی، اس کے اوپر نصف جھکی ہوئی، اس کے کام کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا۔ ایک طرف گہرا مراقبہ تھا، دوسری جانب وہ مذہبی احساس تھا جس کے ذریعے آپ انسانی دماغ کی حیرتوں کو پیدا ہوتے اور بڑھتے دیکھتے ہیں۔ گھر میں ایک آواز تھی، ننھی چڑیا کی جو بے چاری سیڑھیوں کی صفائی کر رہی تھی۔

ایک چوتھائی گھنٹے کے، اور کچھ قطع و بُرید کے بعد، تن آردیے نے مندرجہ ذیل شاہکار بنا کر پیش کیا تھا:

کمرہ نمبر ایک کے اخراجات

	فرانک
رات کا کھانا	03
کمرے کا کرایہ	10
شمع	05
آگ	04
سروس	01
کُل جمع	23

"تئیس فرانک!" عورت پُرجوش ہو کر زور سے بولی جس میں کچھ تذبذب کی ملاوٹ تھی۔

بڑے فن کاروں کی طرح تین آردیے بھی کچھ غیر مطمئن تھا۔

''اُف!'' اس نے زور سے کہا۔

یہ Castlereagh کا جیسا لہجہ تھا جو ویانا کی کانگریس کے اخراجات کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔

''موسیو تین آردیے آپ ٹھیک کہتے ہیں؛ یقینی طور پر اس پر اتنا واجب ہے۔'' اس کی بیوی بڑ بڑائی۔ وہ اس وقت اس گڑیا کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کی بیٹیوں کی موجودگی میں کوزیٹ کو عطا کی گئی تھی۔ ''یہ منصفانہ تو ہیں، مگر بہت زیادہ ہیں۔ وہ اتنا ہرگز نہیں دے گا۔''

تین آردیے عادت کے مطابق سرد مہری سے ہنسا۔ ''ادا کرے گا۔''

اس کی ہنسی یقین اور اختیار کا اعلیٰ ترین اظہار تھی۔ یہ جملہ جس انداز میں کہا گیا تھا ویسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کی بیوی نے اصرار نہیں کیا۔

بیوی نے میزیں لگانی شروع کیں؛ اس کا شوہر کمرے میں آگے پیچھے خیالات میں ڈوبا، ٹہل رہا تھا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے کہا، ''میں پورے پندرہ سو فرانک کا قرض دار ہوں۔''

وہ چمنی کے کونے میں جا کر بیٹھ گیا، اپنے پاؤں گرم راکھ پر رکھ دیے اور غور وفکر کرنے لگا۔

''ارے ہاں!'' اس کی بیوی نے پھر کہا ''یہ نہ بھولنا کہ میں کوزیٹ کو آج گھر سے باہر کرنے والی ہوں؟ وہ دیونی، وہ اپنی اس گڑیا سے میرا دل توڑے دے رہی ہے۔ میں لوئی ہشت دہم سے شادی کرلوں گی مگر اس کو اس گھر میں نہیں رکھوں گی۔''

تین آردیے نے اپنا پائپ جلایا، اور دو کش کے درمیان جواب دیا، ''یہ بل تم اس شخص کے حوالے کرو گی۔'' اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

ابھی وہ باہر گیا ہی تھا کہ مسافر کمرے میں داخل ہوا۔

تین آردیے اس کے پیچھے فوراً ہی واپس آیا، اور آدھ کھلے دروازے کے پیچھے کھڑا رہا۔ اس طرح صرف اس کی بیوی اسے دیکھ سکتی تھی۔

پیلے کوٹ والا اپنی پوٹلی اٹھائے اور ہاتھ میں اپنی لاٹھی لیے ہوئے تھا۔

''بہت جلد اٹھ گئے؟'' مادام تین آردیے نے کہا ''کیا موسیو ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟''

مادام اس سے بات کرتے ہوئے، شرمندگی کے عالم میں، اپنے ہاتھ میں تھامے بل کو مروڑ رہی تھی، ناخن سے اس میں شکنیں ڈال رہی تھی۔ اس کا سخت چہرہ ایک پرچھائیں سی پیش کر

رہا تھا وہ جس کی عادی نہیں تھی — بُزدلی اور احساسِ اضطراب کی۔

ایسے آدمی کو ایسا بل پیش کرنا، جو اس قدر مکمل طور پر مفلس معلوم ہوتا تھا، اس کو بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

مسافر بھی کچھ مصروف اور غائب الدماغ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جواب دیا:

"ہاں مادام، میں جا رہا ہوں"

"یعنی موسیو کو Montfermeil میں اور کوئی کام نہیں ہے؟"

"نہیں، میں تو یہاں سے گزر رہا تھا، بس۔ مجھے کتنا ادا کرنا ہے، مادام؟" اس نے مزید کہا۔

مادام تھن آردیے نے تہہ کیا ہوا بل اسے خاموشی سے پیش کر دیا۔

اس نے بل کھول کر اس پر ایک نظر ڈالی؛ مگر بظاہر، اس وقت اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

"مادام، کیا یہاں، Montfermeil میں، کاروبار اچھا ہے؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"بس یوں ہی سا ہے۔" تھن آردیے نے جواب میں کہا، جو ایک اور قسم کے دھماکے نہ ہونے پر پریشان سی تھی۔

اس نے بے لطف اور غم ناک لہجے میں مزید کہا "اوہ! موسیو، بہت مشکل وقت ہے! اس پر مستزاد، ہمارے پڑوس میں اتنے کم بورژوا لوگ رہتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ مفلس ہیں، آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم کو موسیو جیسے دولت مند اور فیاض مسافر نہ ملیں تو ہمارا بالکل پورا نہ پڑے۔ ہمارے اتنے اخراجات ہیں۔ یہی دیکھ لیجیے کہ یہ بچی ہم پر کتنا بڑا بار ہے۔ ہماری آنکھیں نکلی پڑ رہی ہیں۔"

"کون بچی؟"

"کیوں، وہی ننھی آپ جس سے واقف ہیں! کوزیت — لارک [مغنی چڑیا]، جیسا کہ آس پاس کے لوگ اُسے کہتے ہیں۔"

"اوہ!" اس آدمی نے کہا۔

اور مادام کہتی گئی:

"کتنے بیوقوف ہیں یہ دیہاتی لوگ، اپنے عرفیت رکھنے والے۔ یہ لڑکی مغنی چڑیا نہیں چمگادڑ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں جناب، نہ ہم خیرات نہیں مانگتے ہیں، نہ عطا کر سکتے ہیں۔ ہماری کمائی زیادہ نہیں، دینا زیادہ پڑتا ہے۔ لائسنس ہوا، چنگی ہوئی، دروازے اور کھڑکی کا ٹیکس ہوا،

سیکڑوں ہیں۔ موسیو تو جانتے ہی ہیں کہ حکومت بہت مال طلب کرتی ہے۔ اور پھر، ہماری بچیاں بھی تو ہیں نا۔ ہمیں دوسروں کے بچے پالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اس آدمی نے بات شروع کی، ایسی آواز میں جو لاپروائی کی کوشش کر رہی تھی، اور جس میں ایک لرزہ سا شامل تھا۔

"تم کیا کروگی، اگر کوئی تم پر سے اس کا بار اٹھا لے؟"

"کس کا؟ کوزیت کا؟"

"ہاں!"

مالکن کا چہرہ سرخ اور متشدد چہرہ اچانک چمک اٹھا۔

"اوہ جناب، میرے محترم جناب! لے جایئے اسے؛ اپنے پاس رکھیے اسے؛ اپنے ساتھ لے جایئے؛ پیار کیجیے، اسے کھمبیاں کھلایئے، اسے پلایئے، کھلایئے؛ مقدس کنواری کی اور جنت کے تمام سینٹ حضرات کی برکات ہوں آپ پر۔"

"منظور ہے۔"

"واقعی، کیا آپ اس لے جائیں گے؟"

"ہاں، میں اسے لے جاؤں گا۔"

"ابھی؟"

"فوراً۔ بلاؤ بچی کو۔"

"کوزیت!" مادام تھی آردیے زور سے چیخی۔

"اس دوران" اس آدمی نے مزید کہا، "تمھارا جو کچھ ہے میں ادا کردوں۔ کتنا ہے؟"

اس نے بل پر ایک نظر ڈالی اور وہ اپنی حیرت کو روک نہ سکا، "تیئیس فرانک؟"

اس نے مالکن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تیئیس فرانک؟"

"ان دہرائے گئے الفاظ میں، فریاد اور استفسار کے درمیان ایک لہجہ پوشیدہ تھا۔

مادام تھی آردیے کے پاس اس دھماکے سے نمٹنے کے لیے ایک چھوٹا سا وقفہ تھا۔ اس نے یقین کے ساتھ جواب دیا، "جی ہاں، جناب عالی! یہ تیئیس فرانک ہی ہیں۔"

اجنبی نے میز پر پانچ فرانک کے برابر سکے رکھ دیے۔

"جاؤ اور بچی کو لے آؤ۔" اس نے کہا۔

اس موقعے پر موسیو تھی آردیے اس کمرے میں آیا اور کہا،

”موسیو کو صرف چھبیس سو ادا کرنے ہیں۔“

”چھبیس سو!“ اس کی بیوی نے حیرت سے کہا۔

”تیس سو کمرے کا کرایہ۔“ مردِ مہربان سے تبن آردیے نے مزید کہا۔ ”چھ سو ادا ت کے کھانے کے۔ اور جہاں تک بچی کا معاملہ ہے، میں جناب سے ذرا بات کرنا چاہتا ہوں، بیگم، ذرا یہاں سے چلی جایئے۔“

مادام تبن آردیے اپنے شوہر کی بجلی کے جھماکے جیسی غیر متوقع لیاقت سے چندھیا گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بڑا اداکار اسٹیج پر آرہا ہے۔ اس نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

جوں ہی وہ دونوں تنہا رہ گئے، تبن آردیے نے مسافر کو کرسی پیش کی۔ مسافر بیٹھ گیا؛ تبن آردیے کھڑا رہا، اور اس کے چہرے نے اچھے میل ملاپ اور سادگی کا ایک غیر معمولی روپ دھار لیا تھا۔

”جنابِ والا!“ اس نے کہا، ”میں آپ سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ہم اس بچی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔“

اجنبی توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کون بچی؟“

تبن آردیے نے گفتگو جاری رکھی، ”کتنی حیرت کی بات ہے، بچہ لگاؤ کے ساتھ پلتا ہے۔ اس کی بھلا کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ اپنا سو سو کا سکہ واپس اٹھا لیجیے۔ میں بچی سے محبت کرتا ہوں، بس!“

”تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟“ اجنبی نے جواب طلب کیا۔

”ارے، وہی اپنی کوزیٹ! کیا آپ اس کو ہم سے دور لے جانے کی بات نہیں کر رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ میں اب کھل کر بات کرنا چاہوں گا؛ بالکل سچ، اس لیے کہ آپ ایک ایمان دار آدمی ہیں۔ میں اس کی منظوری نہیں دوں گا۔ میں بچی کو بہت یاد کروں گا۔ میں نے اسے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ ننھی سی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم اس کا خرچ برداشت کرتے ہیں؛ یہ سچ ہے کہ اس میں خامیاں ہیں؛ یہ سچ ہے کہ ہم دولت مند نہیں؛ یہ سچ ہے کہ میں نے چار سو فرانک سے زیادہ اس کے صرف ایک علاج پر خرچ کیا تھا! تو پھر خدا کے لیے آپ کو کچھ سوچنا تو چاہیے۔ اس کا نہ باپ ہے نہ ماں۔ میں نے اسے پالا پوسا ہے۔ ہمارے پاس اس کے اور اپنے کھانے کو کافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس بچی کو بہت چاہتا ہوں۔ آپ سمجھ رہے

ہیں تا کہ آدمی کو کسی سے پیار بھی تو ہو جاتا ہے؛ میں ایک اچھے قسم کا درندہ ہوں، میں واقعی ہوں؛ میں بحث نہیں کرتا؛ میں اس بچی کو بہت چاہتا ہوں؛ میری بیوی ذرا تند مزاج ہے، مگر وہ بھی اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ بچی ہمارے لیے اسی طرح ہے جیسے ہماری اپنی بچیاں۔ میں اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں گھر میں اس سے ذرا بڑ بڑ کرنے کے لیے۔"

اجنبی کی آنکھیں تین آردیے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تین آردیے نے مزید کہا:

"معاف کیجیے گا، جناب! کوئی کسی چلتے پھرتے آدمی کو اپنی بچہ یوں ہی نہیں دے دیا کرتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، ہے کہ نہیں؟ اس کے باوجود میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دولت مند آدمی ہیں؛ جہاں تک اس کی بھلائی کا معاملہ ہے، آپ اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں معلوم تو ہونا چاہیے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں: فرض کر لیجیے کہ میں اپنی قربانی دے کر اسے آپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتا ہوں، تو مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا کیا حال ہوگا: میں اس سے بالکل جدا نہیں ہونا چاہتا؛ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس کے پاس رہ رہی ہے، تا کہ میں وقتاً فوقتاً اس سے مل سکوں، اسے دیکھ سکوں؛ تا کہ اسے معلوم رہے کہ اس کا رضاعی باپ زندہ ہے، کہ وہ اس کی خبر گیری کرتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسی باتیں بھی ہیں جو ممکن نہیں۔ میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتا۔ اگر آپ اسے لے جاتے ہیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اچھا ہوا، مگر اس بے چاری چڑیا کا کیا حال ہوگا؟ مجھے کم از کم کوئی دستاویز تو دیکھنی چاہیے، جیسے پاسپورٹ۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔"

اجنبی، جواب بھی اس کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو بقول شخصے، اندر، شعور کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں؛ اس نے بہت متین اور سخت لہجے میں جواب دیا:

"موسیو تین آردیے، کسی کو پیرس سے پانچ لیگ سفر کرنے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اگر میں کوزیٹ کو لے جانا چاہوں گا تو اسے لے جاؤں گا، بس۔ تم کو نہ میرا نام معلوم ہوگا، تم کو نہ میرا گھر معلوم ہوگا، تم کو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ وہ کہاں رہے گی؛ اور میرا ارادہ ہے کہ وہ پھر کبھی، اپنی پوری زندگی، تمھارا چہرہ نہیں دیکھے گی۔ میں وہ دھاگا ہی توڑ دینا چاہتا ہوں جس سے اس کا پاؤں بندھا ہوا ہے، اور وہ تم سے الگ ہو جائے گی۔ کیا یہ تمھارے لیے موزوں ہے؟ ہاں یا نہیں میں جواب دینا؟"

چوں کہ غیر معمولی ذہانت، شیاطین کی طرح، ایک اعلیٰ وارفع خدا کی مخصوص قسم کی نشانیوں کے ذریعے موجودگی کی قائل ہوتی ہے، تین آردیے کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک طاقت ور شخصیت سے معاملہ کر رہا ہے۔ یہ بالکل الہام کی سی کیفیت تھی؛ اسے اس کا اچھی طرح ادراک

ہوگیا تھا۔ گاڑی بانوں کے ساتھ مے نوشی کرتے، تمباکو نوشی کرتے اور پچھلی شام بیہودہ گانے گاتے ہوئے وہ اس اجنبی پر غور کر رہا تھا، اس پر بلّی کی طرح اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا، کسی ریاضی دان کی طرح اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے خود اپنے لیے، تفریح طبع کے لیے، اور جبلت کے زیرِ اثر اس کی جاسوسی بھی کی تھی، اس طرح جیسے اسے اس کام کی اُجرت دی جا رہی ہو۔ اس پیلے کوٹ والے آدمی کی ایک بھی حرکت، ایک بھی انداز اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب اجنبی نے اتنی وضاحت سے کوزیت میں اپنی دل چسپی کا اظہار کیا تھا، تھن آردیے نے اس کے مقصد کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس نے بوڑھے آدمی کی بچی کی طرف بار بار اٹھتی ہوئیں نگاہیں دیکھ لی تھیں۔ کون تھا یہ آدمی؟ کیوں ہے یہ دل چسپی؟ کیوں ہے اس کا یہ پھٹیچر لباس، جب کہ اس کے بٹوے میں اتنی بڑی رقم موجود ہے؟ یہ تھے سوالات جو وہ خود سے پوچھ رہا تھا، مگر حل نہیں کر پا رہا تھا، جو اس کو پریشان کر رہے تھے۔ اس نے پوری رات اس پر غور کیا۔ یہ شخص اس کا باپ نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ اس کا دادا ہے؟ تو یہ حقیقت ظاہر کیوں نہیں کر دیتا؟ جس کسی کا حق ہوتا ہے وہ اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ بظاہر اس آدمی کا کوزیت پر کوئی حق نہیں، تو پھر یہ سب کیوں؟ تھن آردیے ان تمام تاویلات میں گم ہو گیا تھا۔ اسے ہر بات کے اشارے مل گئے تھے مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ جو کچھ بھی ہو، اس شخص سے بات کرنے کے دوران، کچھ راز ضرور تھے کہ اسے اخفا میں رہنے میں دل چسپی تھی، کہ وہ خود کو طاقت ور محسوس کرتا تھا؛ اور یہ دیکھنے کے بعد کہ اجنبی کے واضح اور سخت جواب سے یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ کم زور تھا۔ اسے اس قسم کی توقع نہیں تھی۔ اس کے ارادے فسخ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے میں نے اس ہر چیز کو تول لیا تھا۔ تھن آردیے ان لوگوں میں سے تھا جو معاملات کو ایک نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ وہ صاف صاف اور تیزی سے اپنے مقصد کی طرف بڑھے۔ اس نے وہی کیا جو بڑے رہنما فیصلہ کُن موقعوں پر کیا کرتے ہیں، جسے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اکیلے ہی جانتے ہیں؛ اور اس نے اچانک اپنی توپ کا دہانہ کھول دیا۔

"جنابِ والا!" اس نے کہا "مجھے پندرہ سو فرانک کی سخت ضرورت ہے۔"

اجنبی نے اپنے بغلی جیب میں سے سیاہ رنگ کے چمڑے کی ایک جیبی کتاب نکالی، اسے کھولا، تین عدد بینک کے نوٹ نکالے، اور میز پر رکھ دیے۔ اس کے بعد اس نے نوٹوں پر اپنا بڑا سا انگوٹھا رکھ دیا اور سرائے کے مالک سے کہا "جاؤ اور کوزیت کو لے کر آؤ۔"

جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، کوزیت کیا کر رہی تھی؟

بستر سے اٹھتے ہی کوزیٹ دوڑی دوڑی اپنا جوتا لینے گئی۔اس میں اسے سونے کا ایک سکہ ملا۔وہ نپولین [کا سکہ] نہیں تھا؛ وہ ان نئے بیس فرانک کے بحالی کے زمانے کے سکوں میں سے تھا جس پر پروشیائی قطار کی جگہ لارل کا سنہرا ہار بنا ہوا تھا۔کوزیٹ چندھیا گئی تھی۔اس کی قسمت نے اسے مدہوش کرنا شروع کر دیا تھا۔اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ سونے کا سکہ کیا ہوتا ہے؛ اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا؛ اس طرح جلدی سے جیب میں رکھ لیا گویا اسے چرایا تھا۔اس کے باوجود اسے احساس ہوا کہ یہ سکہ اسی کا تھا؛ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سکہ کہاں سے آیا تھا مگر جس مسرت کا اسے تجربہ ہوا تھا وہ خوف سے مملو تھا۔وہ خوش تھی؛ بلکہ مکمل طور پر مدہوش ہو گئی تھی۔ایسی پُرشکوہ اور خوب صورت چیزیں اصلی معلوم نہیں ہوتیں۔گڑیا نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا؛ سونے کے اس ٹکڑے نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔اس شان و شوکت والی چیز کی موجودگی سے وہ لرز سی گئی تھی۔اجنبی نے اسے صرف خوف زدہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس نے کوزیٹ کی خود اعتمادی کو بحال کر دیا تھا۔گزری شام کے بعد سے، تمام تر استعجاب کے درمیان، حتیٰ کہ نیند کے دوران بھی وہ اپنے بچگانہ دماغ میں اس آدمی کے بارے میں سوچتی رہی تھی، جو اتنا مفلس اور اتنا افسردہ معلوم ہوتا تھا مگر اتنا دولت مند اور اتنا مہربان آدمی تھا۔جب سے وہ اس آدمی سے جنگل میں ملی تھی، اس کے لیے ہر شے تبدیل ہو گئی تھی۔کوزیٹ کو، جو جنت کی حقیر ترین ابابیل سے بھی کم خوش قسمت تھی، کبھی علم نہیں ہوا تھا کہ ماں کے سایے اور کسی پر و بال کے نیچے پناہ لینا کیا ہوتا ہے۔پچھلے پانچ برسوں سے، جہاں تک یادداشت مدد کرتی ہے، یہ بے چاری بچی لرزتی تھرتھراتی رہی تھی۔وہ ہمیشہ بدبختی کی تیز ہواؤں میں مکمل طور پر برہنہ رہی تھی؛ مگر اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لباس میں تھی۔پہلے اس کا پورا وجود سرد محسوس ہوتا تھا، اب گرم ہو گیا تھا۔کوزیٹ اب تین آردیے سے خوف زدہ نہیں تھی؛ کہ اب وہاں کوئی اور بھی تھا۔

وہ تیزی سے صبح کے فرائض سے فارغ ہوئی۔وہ لوئی، جو اس کے پاس تھا، ایپرن کی اسی جیب میں تھا جس میں سے پچھلی رات پندرہ سو کا سکہ گر گیا تھا؛ اس سکے نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا تھا۔اسے اس سکے کو چھونے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، مگر اس نے پانچ منٹ، اپنی زبان نکالے ہوئے، اس کو گھور کر دیکھنے میں صرف کر دیے تھے۔جب وہ سیڑھیوں کی صفائی کر رہی تھی، تھوڑی دیر کے لیے رکی اور ساکت کھڑی رہی تھی، جھاڑو سے بلکہ پوری کائنات سے بے بہرہ، ایک ستارے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی جو اس کی جیب میں پڑا چمک رہا تھا۔

یہی وہ لمحات تصورات تھے جن کے دوران مادام تین آردیے اس کے پاس پہنچی تھی۔

وہ اپنے شوہر کے حکم پر کوزیٹ کو تلاش کرنے گئی تھی۔ سب سے بے مثال بات یہ تھی اس نے نہ اس کو مارا، نہ اس کی توہین کرنے والا ایک بھی لفظ منہ سے نکالا تھا۔

''کوزیٹ!'' اس نے بڑی شائستگی سے کہا تھا، ''فوراً چلو!''

ایک لمحے بعد کوزیٹ عوامی کمرے میں تھی۔

اجنبی نے اپنی پوٹلی اٹھائی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اور اسے کھولا۔ اس میں ایک چھوٹا سا اونی گاؤن تھا، ایک ایپرن، ایک سوتی کپڑے سے بنی انگیا، ایک رومال، ایک پیٹی کوٹ، اونی موزے، جوتے — سات آٹھ برس کی لڑکی کے لیے ایک پوری پوشش تھی۔ ہر شے کا رنگ سیاہ تھا۔

''میری بچی!'' آدمی نے کہا، ''انھیں لے جاؤ، اور جلدی سے لباس تبدیل کر کے واپس آؤ۔''

صبح کا اجالا پھیل رہا تھا جب Montfermeil کے وہ باشندے جنھوں نے اپنے دروازے کھولنے شروع کر دیے تھے، معمولی لباس میں ملبوس ایک بوڑھے کو ماتمی لباس میں ملبوس ایک چھوٹی سی لڑکی کے آگے چلتے دیکھا تھا، جو گلابی رنگ کی ایک خوب صورت سی گڑیا کو اپنے بغل میں دابے ہوئے تھی۔ وہ دونوں پیرس جانے والی سڑک سے گزر رہے تھے۔ ان کا رُخ Livry کی جانب تھا۔

یہ تھا ہمارا آدمی اور کوزیٹ۔

اس آدمی کو کوئی نہیں جانتا تھا؛ اور چوں کہ اس وقت کوزیٹ چیتھڑوں میں نہیں تھی بہت سے لوگ اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ کوزیٹ جا رہی تھی۔ کس کے ساتھ؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ کہاں؟ اسے خبر نہیں تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ تھنارڈیے کی سرائے کو پیچھے چھوڑے جا رہی تھی۔ کسی نے اسے الوداع کہنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا؛ نہ وہ کسی سے رخصت ہونے گئی تھی۔ وہ اس نفرت کے قابل، اور نفرت کرنے والے مکان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہی تھی۔

بے چاری، شریف مخلوق، جس کا دل اس لمحے تک دباؤ میں تھا۔

کوزیٹ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے، آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی سنجیدگی سے چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سونے کا سکہ اپنے نئے ایپرن کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وقتاً فوقتاً جھک کر اس کو دیکھ لیتی تھی؛ پھر وہ اس نیک آدمی کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا اس وقت وہ کسی مہربان خدا کے ساتھ تھی۔

۞

بہتری اور خرابی

مادام تمن آردیے اپنی عادت کے مطابق اپنے شوہر کو اس کے اپنے طریقے سے کام کرنے دیتی تھی اور وہ بہت اچھے نتائج کی توقع رکھتی تھی۔ جب وہ آدمی اور کوزیٹ چلے گئے تو تمن آردیے نے ایک چوتھائی گھنٹا گزر جانے دیا؛ پھر اپنی بیوی کو ایک طرف لے گیا اور اس کو پندرہ سو فرانک دکھائے۔

''بس! اتنا ہی؟'' بیوی نے کہا۔

گھربار چلانے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے آقا کے کاموں میں سے ایک کام پر تنقید کی تھی۔

حملہ کارگر ہو گیا۔

''سچ مچ تم ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے کہا، ''میں بڑا بیوقوف آدمی ہوں۔ ذرا میری ہیٹ تو دینا۔''

اس نے تینوں بینک نوٹ تہہ کر کے اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور فوراً بھاگا؛ مگر اس نے ایک غلطی کر دی، وہ پہلے دائیں جانب مڑ گیا تھا۔ کچھ پڑوسیوں نے، جن سے اس نے پوچھا، اس کو صحیح راستے پر ڈال دیا؛ اس چڑیا اور آدمی کو Livry کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ فی الحال، اس نے اسی جانب رُخ کیا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور خود کلامی کرتا چلا۔

''وہ پیلے کوٹ میں ملبوس آدمی بظاہر لکھ پتی ہے؛ اور میں بالکل جانور ہوں۔ پہلے اس نے مجھے بیس سُو دیے، پھر پانچ فرانک دیے، اس کے بعد پچاس فرانک دیے، اور پھر پندرہ سو فرانک؛ اور یہ سب کام اس نے اپنی مرضی سے کیے تھے۔ وہ تو مجھے پندرہ ہزار فرانک بھی دے

سکتا تھا، مگر اب میں اسے جا پکڑوں گا۔"

اور پھر کپڑوں کی وہ پوٹلی بچی کے لیے پہلے سے تیار کی گئی تھی یہ سب بالکل غیر معمولی تھا؛ اس کے اندر بہت سے معمے پنہاں تھے۔ ایک بار ہاتھ آجائیں تو کوئی انھیں افشا نہیں کیا کرتا۔ دولت مندوں کے راز سونے کے اسپنج کی طرح ہوتے ہیں؛ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس پر دباؤ کس طرح ڈالا جاتا ہے۔ اس قسم کے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

"میں جانور ہوں" اس نے خود سے کہا۔

آپ Montfermeil سے نکلتے ہیں اور اس موڑ تک پہنچتے ہیں تو وہاں سے سڑک آپ کو اس سڑک تک لے جاتی ہے جو Livry تک جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر اس نے حساب لگایا کہ اب وہ بوڑھے آدمی اور اس بچی کو جلد ہی دیکھ سکے گا۔ اس نے اس حد تک دیکھا، جہاں تک اس کی نظر جاتی تھی، مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے تازہ معلومات کیں، مگر کوشش تضیعِ اوقات تھی۔ کچھ گزرنے والوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ آدمی اور بچی جن کی تلاش تھی، Gagny کی جانب جنگل میں گئے ہیں۔ وہ فوراً اسی جانب چل پڑا۔

وہ دونوں اس سے بہت آگے جا چکے ہوتے؛ کہ بچی آہستہ چلتی ہے، اور وہ تیز چل رہا تھا؛ اور یہ بھی کہ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔

اچانک وہ رُکا اور اس آدمی کی طرح اپنا ماتھا پیٹ لیا، جو بہت اہم بات بھول گیا ہو، اور جو واپس جانے کے لیے تیار ہو۔

اس نے خود سے کہا، "مجھے اپنا پستول لے لینا چاہیے تھا۔"

تین آردیے ان دہری فطرت والوں میں سے ایک تھا جو حقیقت سے آشنا ہوئے بغیر ہمارے درمیان سے گزر جاتے ہیں، اور قبل اس کے کہ ہم انھیں پہچان لیں وہ غائب ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ مقسوم انھیں صرف ان کا ایک ہی پہلو دکھاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس طرح کی نصف غرقاب کیفیت میں ہی زندہ رہتے ہیں۔ پُرسکون اور مساوی حالت میں تین آردیے میں وہ صلاحیت موجود ہوتی تھی جو آدمی کو ایک ایمان دار تاجر، ایک اچھا بورژوا بنا دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، کچھ مخصوص حالات میں، اس میں ایک بدمعاش بننے کی ساری ضروریات عود کر آتی تھیں۔ وہ ایسا دُکان دار تھا جس میں کسی عفریت کی سی کچھ خرابی تھی۔ شیطان نے اس میں چھپ کر اس خوف ناک شاہ کار تخلیق، تین آردیے، کو خواب دیکھتے ضرور دیکھا ہوگا۔

اس نے تھوڑی دیر سوچا:

تذبذب کے دوران وہ سوچ رہا تھا "ان کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ فرار ہو جائیں گے۔"
کسی لومڑی نے تیتر کے بچوں کی خوش بو سونگھ لی تھی۔ اسی سڑک پر تقریباً یقین کی کیفیت میں، تیزی سے بالکل سیدھے چلتے ہوئے، ان کی تلاش جاری رکھی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ جب وہ سارے جوہڑوں سے گزر چکا تھا اور اس میدان کو پار کرلیا تھا جو Bellevue اسٹریٹ کے دائیں جانب پڑتا تھا، اور گھاس کی اس تنگ پٹی تک پہنچ گیا تھا جو پہاڑی کے اطراف ایک دائرہ بناتی تھی، اور Chelles کے قدیم گرجا گھر کی نہر کی محراب سے ہو کر جاتی تھی، اسے جنگلی جھاڑی کے اوپر سے ایک ہیٹ دکھائی دی جس پر اس نے نہ جانے کتنے قیاس تعمیر کیے ہوں گے؛ وہ اسی آدمی کی ہیٹ تھی۔ جھاڑی اونچی نہیں تھی۔ تین آردیے کو اس حقیقت کا احساس ہوگیا تھا کہ وہاں وہ آدمی اور کوزیت بیٹھی ہوئی تھی۔ بچی اپنے چھوٹے سے پن کے باعث نظر نہیں آئی تھی، مگر گڑیا کا سر نظر آرہا تھا۔

تین آردیے کو مغالطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ آدمی وہیں بیٹھا تھا، اور کوزیت کو آرام کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ سرائے والا جھاڑی کے اطراف سے ہوتا ہوا اچانک ان لوگوں کے سامنے وارد ہوگیا، جن کی اسے تلاش تھی۔

"معاف کیجیے گا، جناب!" اس نے چڑھتے ہوئے سانس کے ساتھ کہا "یہ رہے آپ کے پندرہ سو فرانک!"

یہ کہتے ہوئے اس نے بینک کے تین نوٹ اجنبی کے حوالے کر دیے۔

آدمی نے اپنی نظریں اٹھائیں، اور کہا، "اس کا مطلب کیا ہے؟"

تین آردیے نے احترام کے ساتھ جواب دیا، "اس کا مطلب یہ ہے جناب کہ میں کوزیت کو واپس لے جاؤں گا۔"

کوزیت کانپ کر بوڑھے آدمی سے لپٹ گئی۔

آدمی نے تین آردیے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لفظ کے ہر ٹکڑے کا اعلان کرتے ہوئے جواب دیا، "تم — کوزیت — کو — واپس — لے — جاؤ — گے؟"

"جی ہاں جناب! میں اسے لے جانے والا ہوں۔ میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے اس معاملے پر غور کیا ہے۔ دراصل ہمیں تو اسے آپ کو دینے کا حق ہی نہیں۔ میں ایمان دار آدمی ہوں، آپ جانتے ہیں کہ یہ بچی میری نہیں؛ یہ اپنی ماں کی ملکیت ہے۔ میں اسے اس کی ماں ہی کو واپس کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے کہیں گے، مگر اس کی ماں تو مر چکی ہے۔ ٹھیک! تو

میں ایسی صورت میں اس بچی کو اسی شخص کے حوالے کر سکتا ہوں جو مجھے اس کی ماں کی دستخط شدہ تحریر فراہم کرے گا، جس کی رو سے میں بچی کو اس تحریر میں بیان کیے گئے شخص کے حوالے کروں گا۔ سمجھ میں آیا آپ کی۔"

اس آدمی نے کوئی جواب دیے بغیر، اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور تین آردیے کو ایک بار پھر بینک کے نوٹوں سے بھری تھیلی کتاب نظر آئی۔

سرائے والا خوشی سے لرز گیا۔

'اچھا!' اس نے سوچا، 'تیار ہو جاؤ [میاں]؛ اب یہ [بد بخت] مجھے رشوت دینے والا ہے۔'

تھیلی کتاب کھولنے سے پہلے مسافر نے اس کے اطراف ایک نظر ڈالی: وہ جگہ بالکل سنسان تھی؛ اس جنگل اور وادی میں ایک بھی ذی روح موجود نہیں تھا۔ اس آدمی نے ایک بار پھر اپنی تھیلی کتاب کھولی مگر اس میں سے، مٹھی بھر بینک نوٹ نہیں نکالے تین آردیے جن کی توقع کر رہا تھا، بلکہ تہہ کیا ہوا ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا، جس کو کھولا اور پورا کھول کر سرائے کے مالک کو یہ کہتے ہوئے پیش کر دیا، "تم ٹھیک کہتے ہو، اسے پڑھو!"

تین آردیے نے کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا:

"M. SUR M., March 25, 1823.

موسیو تین آردیے کے نام

تم کوزیت کو اس شخص کے حوالے کرو گے۔

تمھیں تمام چھوٹے موٹے اخراجات ادا کیے جائیں گے۔

میں نہایت احترام سے تم کو اپنا سلام پیش کرتی ہوں۔

.....فانتین"

تم اس دستخط سے واقف ہو نا؟ اس آدمی نے پھر بات شروع کی۔

یقیناً وہ فانتین کے دستخط تھے؛ تین آردیے اسے پہچان گیا تھا۔

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا؛ اسے دو شدید رنجیدگیوں کا تجربہ ہوا؛ رشوت سے دست برداری کی رنجیدگی، وہ جس کی امید کر رہا تھا؛ اور شکست کھا جانے کی رنجیدگی۔

اس آدمی نے مزید کہا، "تم اس کاغذ کو رسید کے طور پر اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔"

تین آردیے پسپا ہو گیا۔

"دستخط بہت قرینے سے بنائی گئی ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں غرایا۔ "مگر میں اسے جانے نہیں دوں گا۔"

تب اس نے ایک اور کوشش کی۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے، جناب!" اس نے کہا "چوں کہ آپ ہی وہ شخص ہیں، تو مجھے وہ چھوٹے موٹے اخراجات ادا کیے جانے چاہئیں۔ میرا اس پر خاصا بڑا قرض ہے۔"

آدمی اپنی فرسودہ آستین کی گرد جھاڑتا ہوا، کھڑا ہو گیا۔

موسیو تین آردیے! پچھلی جنوری تک ماں کے حساب سے اس پر ایک سو بیس فرانک دینا واجب تھا۔ فروری میں تم نے اسے پانچ سو فرانک کا بل بھیجا تھا؛ تمھیں فروری کے آخر میں تین سو فرانک ملے تھے، اور تین سو فرانک مارچ کے شروع میں۔ اس کے بعد نو مہینے گزر رہے ہیں، پندرہ فرانک فی ماہ کے حساب سے، جو طے ہوا تھا، ایک سو پینتیس فرانک بنتے ہیں۔ تم کو ایک سو فرانک زیادہ مل چکے ہیں؛ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم صرف پینتیس فرانک کے حق دار ہو۔ میں نے ابھی تم کو پندرہ سو فرانک دے دیے ہیں۔"

اس وقت تین آردیے کی ویسی ہی حالت تھی جیسی کسی بھیڑیے کی ہوتی ہے جو پکڑا گیا ہو اور پھندے کے آہنی جبڑے کی گرفت میں ہو۔

"کون ہے یہ شیطان آدمی؟" اس نے سوچا۔

اور اس نے وہی کیا جو ایک بھیڑیا کرتا ہے:

اس نے خود کو جھنجھوڑا۔ جرأت ایک بار پھر کامیاب ہو گئی تھی۔

"موسیو — میں — تمھارا — نام — نہیں — جانتا۔" اس نے نہایت عزم سے کہا اور اس بار اس نے احترام ایک طرف رکھ دیا تھا۔ "اگر تم نے مجھے ایک ہزار کراؤن نہیں دیے تو میں کوزیٹ کو تم سے چھین کر لے جاؤں گا۔"

آدمی نے بڑے اطمینان سے کہا "چلو کوزیٹ، چلیں۔"

اس نے بائیں ہاتھ میں کوزیٹ کا ہاتھ لیا اور دائیں ہاتھ سے اپنی لاٹھی اٹھائی، جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

تین آردیے نے لاٹھی کی مہیب قامت اور موٹائی پہلے ہی دیکھ لی تھی، اور اب اسے اس مقام کی تنہائی کا بھی خیال آ گیا تھا۔

وہ آدمی، بچی کے ساتھ جنگل میں داخل ہو گیا۔ سرائے والا بے حرکت و بے زبان

وہیں کھڑا رہ گیا۔

جب وہ دونوں جا رہے تھے، ٹمی آردیے اس آدمی کے بڑے بڑے اور گول کاندھے اور بڑے بڑے ٹخنے دیکھ رہا تھا۔

پھر اپنی شخصیت پر نظر کی اور اس کی نظریں اس کے کم زور بازوؤں اور پتلے پتلے ہاتھوں پر پڑیں۔ "میں نہایت احمق آدمی ہوں کہ میں اپنا پستول ساتھ نہیں لایا۔" اس نے خود سے کہا، "اس لیے کہ میں شکار کے لیے نکل رہا تھا۔"

پھر بھی سرائے والا باز نہیں آیا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟" اس نے خود سے کہا، اور کچھ فاصلے سے ان کا پیچھا کرنے چل پڑا۔ اس کے ہاتھوں میں صرف دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ فانتین کے دستخط شدہ خط کی ستم ظریفی، اور پندرہ سو فرانک کی صورت میں اشک شوئی۔

وہ آدمی کوزیٹ کو Livry اور Bondy کی جانب لے کر چلا۔ وہ آہستگی سے چل رہا تھا، اس کا سر سوچنے اور اداسی کے انداز میں جھکا ہوا تھا۔ سردی کے موسم نے جنگل کو ہلکا کر دیا تھا، تاکہ یہ لوگ ٹمی آردیے کی نگاہ سے اوجھل نہ ہو سکیں، حالاں کہ اس نے اچھا خاصا فاصلہ رکھا تھا۔ آدمی وقتاً فوقتاً پلٹ کر دیکھ لیتا تھا کہ اس کا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ اچانک اس کو ٹمی آردیے نظر آ گیا۔ آدمی اچانک کوزیٹ سمیت جھاڑیوں میں گھس گیا، جہاں وہ دونوں خود کو چھپا سکتے تھے۔ ٹمی آردیے نے اپنی رفتار دگنی کر دی۔

جھاڑیوں کے گھنے پن نے اس کو ان کے قریب کر دیا تھا۔ جب وہ آدمی جنگل کے سب سے گھنے حصے میں پہنچا تو اس نے گھوم کر دیکھا۔ ٹمی آردیے کے لیے اب خود کو شاخوں میں چھپانا فضول تھا۔ وہ خود کو آدمی سے چھپا نہیں سکتا تھا۔ آدمی نے اس پر ایک نامہربان نظر ڈالی، اپنا سر بلند کیا اور اپنے راستے چلتا رہا۔ سرائے والا بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

اس طرح وہ تین سو قدم چلے ہوں گے۔ اچانک، وہ آدمی ایک بار پھر مڑا؛ اس نے سرائے والے کو دیکھا۔ اس بار اس نے اتنی سنجیدگی سے اس کی جانب گھور کر دیکھا کہ ٹمی آردیے نے فیصلہ کر لیا کہ مزید پیچھا کرنا بے کار ہوگا۔

ٹمی آردیے الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

9430 کا دوبارہ ظہور

ژاں ولژاں مرا نہیں تھا۔

جب وہ سمندر میں گرا، بلکہ جب اس نے خود کو سمندر میں گرا دیا تھا، وہ زنجیر میں بندھا نہیں تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ گرنے کے بعد، وہ پانی کے اندر ہی تیرتا ایک لنگر انداز جہاز تک پہنچا، جس سے ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ رات آنے تک اس نے خود کو چھپانے کی سبیل کر لی تھی۔ رات میں وہ پھر تیرا، اور Cape Brun سے کچھ فاصلے پر موجود ساحل پر پہنچ گیا۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی، اس لیے اس نے وہاں پہنچ کر اپنے لیے نیا لباس خرید لیا۔ Balaguier کے نواح میں ایک چھوٹا سا دیہی مکان ان دنوں بھاگے ہوئے سزا یافتہ لوگوں کا ڈریسنگ روم تھا — جو ایک نفع بخش تجارت بن گئی تھی۔ اس کے بعد ژاں ولژاں کو، دوسرے تمام فراریوں کی طرح جو قانون کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر نقل و حرکت کرنا چاہتے ہیں پہلی پناہ Beausset کے نزدیک علاقے Pradeaux میں ملی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنا رخ ایلپس کی بلندیوں میں Briancon کے قریبی علاقے Grand-Villard کی طرف کر لیا۔ یہ ایک بے ڈھنگا اور پریشان کن فرار تھا — ایک کورموش کے راستے پر، جس کے ناقابلِ دریافت راستے تھے۔ بعد میں، Civrieux کے علاقے میں Ain جانے والے کچھ راستے دریافت ہوئے؛ Pyrenees میں Accons کے مقام پر؛ اس جگہ پر جس کو Grange-de-Doumec کہا جاتا ہے جو Chavailles کے بازار کے قریب، اور Brunies کے مضافات میں، La Chapelle-Gonaguet کے صوبے میں واقع ہے۔ پھر وہ پیرس پہنچ گیا اور ہم ابھی اس کو Montfermeil میں دیکھ چکے ہیں۔

پیرس پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک سات سے آٹھ برس تک عمر کی لڑکی کے لیے ماتمی لباس خریدے؛ اس کے بعد قیام کی جگہ تلاش کی۔ اس بعد وہ خود Montfermeil کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس کے پچھلے فرار میں اس نے اسی جگہ یا اس کے اطراف ایک خفیہ پھیرا کیا تھا، قانون کو جس کی بھنک مل گئی تھی۔

مگر اس کو مردہ تصور کر لیا گیا تھا، جس نے اس کے بارے میں مزید ابہام پیدا کر دیا تھا۔ پیرس کا ایک اخبار اس کے ہاتھ لگ گیا تھا جس نے اس واقعے کا روزنامچہ شائع کیا تھا۔ اب اسے اطمینان ہو گیا تھا، گویا وہ واقعی مر چکا ہے۔

اس شام جب ژاں ولژاں نے کوزیت کو تین آردیے کے چنگل سے بازیاب کرایا تھا، وہ پیرس واپس پہنچا۔ رات ہونے کے بعد وہ Monceaux کی چنگی کے راستے شہر میں دوبارہ داخل ہوا تھا۔ وہاں ایک بگھی میں سوار ہوا، جو اس کو Observatoire کے مرغزار تک لے گئی۔ اس جگہ پہنچ کر اس نے بگھی کو خیر باد کہا، کوچوان کو کرایہ ادا کیا، کوزیت کا ہاتھ تھاما اور دونوں نے اپنے قدم ایک ساتھ اندھیرے کی جانب اٹھا دیے — سنسان سڑکوں کے ذریعے جو Ourcine اور Glaciere سے متصل تھیں، اسپتال روڈ کی طرف۔

کوزیت کے لیے وہ دن بہت حیران کن دن اور جذبات سے پُر تھا۔ انھوں نے ایک سنسان جگہ پر قائم ایک سرائے سے کچھ ڈبل روٹی اور پنیر خرید کر کھایا تھا؛ بار بار سواری بدلی تھی؛ مختصر فاصلے پیدل عبور کیے تھے۔ کوزیت نے کوئی شکایت نہیں کی، مگر وہ تھک گئی تھی اور ژاں ولژاں کو اس بات کا احساس بھی ہو گیا تھا، اس لیے کہ سفر کے دوران کبھی کبھی کوزیت کو گھسیٹنا پڑتا تھا۔ اس نے کوزیت کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ کوزیت نے، کیتھرین کو چھوڑے بغیر، ژاں ولژاں کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور سو گئی۔

Gorbeau House

چالیس برس قبل، ایک آوارہ گرد انسان جو Salpetriere کے اس نامانوس علاقے میں داخل ہوا تھا اور بولیوارڈ کے ذریعے Barriere d'Italie پر چڑھا تھا، ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں یہ کہا جا سکتا تھا کہ پیرس غائب ہو گیا ہے۔ اب تنہائی نہیں تھی، اس لیے کہ وہاں چلنے پھرنے والے تھے؛ یہ ملک نہیں تھا، اس لیے کہ مکانات تھے اور سڑکیں تھیں؛ یہ شہر نہیں تھا، اس لیے کہ سڑکوں پر شاہراہوں کی طرح لیکیں تھیں جن میں گھاس اُگی ہوئی تھی؛ یہ گاؤں نہیں تھا، اس لیے کہ یہاں کے مکانات بہت اونچے تھے۔ تو پھر یہ کیا تھا؟ یہ ایک غیر آباد جگہ تھی جہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا؛ یہ ایک عظیم شہر کی بولیوارڈ تھی، پیرس کی ایک سڑک تھی: رات کے وقت جنگل سے زیادہ وحشت ناک؛ دن میں قبرستان سے زیادہ غم انگیز۔

یہ Marche-aux-Chevaux کا قدیم علاقہ تھا۔

وہ آوارہ گرد، اگر Marche-aux-Chevaux کی چار خستہ دیواروں کے باہر اپنے لیے خطرہ مول لیتا؛ اگر وہ اپنی دائیں جانب واقع چار اونچی دیواروں سے محفوظ کیے ہوئے باغ کو نظر انداز کرتے ہوئے Petit-Banquier اسٹریٹ سے گزر جانے پر بھی راضی ہو جاتا؛ اس کے بعد، ایک میدان تھا، جس میں پیڑ کی چھالوں سے چرم رنگنے کے کارخانے تھے؛ اس کے بعد، ایک حصہ جس میں عمارتی لکڑیاں، ٹھوں کا اور برادے کا ایک ڈھیر تھا، جس پر کھڑا بڑا سا کتا کھڑا بھونک رہا تھا؛ اس کے بعد، ایک طویل، نیچی، بے حد خستہ دیوار تھی جس پر کائی لگی ہوئی تھی جس پر بہار کے موسم میں پھول کھل جایا کرتے تھے، ایک چھوٹا سا ماتمی سیاہ رنگ کا ایک دروازہ تھا؛ اور ایک اور خستہ حال عمارت تھی جس پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا: اشتہار

چسپاں کرنا منع ہے"— تو یہ بہادر آوارہ گرد Vignes-Saint-Marcel اسٹریٹ کے کونے کے ایک غیر معروف حصے پر پہنچ جاتا ۔وہاں ایک کارخانے کے قریب، باغ کی دو دیواروں کے درمیان، اس زمانے میں، ایک معمولی سے عمارت دیکھی جاسکتی تھی، جو پہلی نظر میں پھوس کی چھت کے چھوٹے سے سائبان جیسی نظر آتی تھی، جو دراصل ایک بڑے گرجا گھر کے برابر تھی۔ اس کا ایک پہلو اور ایک کونا عام شاہراہ پر تھا؛ اسی وجہ سے یہ عمارت بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ تقریباً پورا گھر پوشیدہ تھا۔صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی دیکھی جاسکتی تھی۔

یہ صرف ایک منزلہ عمارت تھی۔

دیکھنے والے کو سب سے پہلے جو چیز نظر آتی تھی، وہ ایک دروازہ تھا جو کسی تنگ و تاریک مکان ہی کے قابل ہوتا؛ جب کہ کھڑکی، اگر بجائے معمولی معماری مسالے کے کٹے ہوئے پتھروں سے بنائی گئی ہوتی تو کسی نواب کی حویلی کا دریچہ معلوم ہوتی۔

گھن لگے تختوں کو آڑے تختوں سے جوڑ کر بنایا گیا دروازہ کٹے ہوئے لٹھوں سے مشابہ تھا۔ دروازہ اونچی اونچی قدمچوں والی، کیچڑ اور کھریا مٹی اور گرد سے بھری سیڑھیوں کے قریب کھلتا تھا جو دو دیواروں کے درمیان اندھیرے میں گم ہو جاتی تھیں ۔بے وضع شہ نشین کے اوپری سرے کو جس میں وہ دروازہ بند ہوتا تھا لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے ڈھانپ رکھا تھا جس کے مرکز میں ایک تکونا سوراخ بنایا گیا تھا، جو اس وقت دریچے اور ہوادان کا کام دیتا تھا، جب دروازہ بند ہوتا تھا۔دروازے کے اندر کی جانب روشنائی میں ڈوبے برش سے 52 کا ہندسہ بنایا گیا تھا، اور اس کے اوپر لگے لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے پر اسی ہاتھ نے 50 کا ہندسہ بھی بنا دیا تھا، جس سے آدمی تذبذب میں پڑ جاتا تھا۔دروازے کے اوپر 50 کا ہندسہ بنا ہوا تھا جب کہ اندر 52 لکھا تھا۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ خاکی رنگ کے کون کون سے نقوش سہ پہلو کھڑکی پر پردوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔

کھڑکی بڑی، خاصی بلندی پر، جھلملی سے مزین تھی، جس کے چوکھٹے میں مربعے بنے ہوئے تھے؛ صرف انھی بڑے مربعوں میں کئی قسم کے زخم لگے ہوئے تھے جن کو کاغذ کی پٹیوں سے ہوشیاری سے چھپایا گیا تھا۔اور بے ترتیب جھلملی بجائے اس کے کہ رہنے والوں کو پردے میں رکھتی، راہگیروں کے لیے خطرہ تھی۔افقی انداز میں لگے تختے کہیں کہیں سے غائب تھے اور ان کی جگہ اناڑی پن سے لکڑی کے تختے عمودی انداز میں کیل سے جڑ دیے گئے تھے، اس طرح جو جھلملی کی صورت شروع ہوا تھا وہ ٹھکر سا بن گیا تھا۔گھر کا دروازہ گندہ اور کھڑکی صاف

حالت میں۔ دروازے اور کھڑکی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا دو افراد ایک ساتھ چل رہے ہوں، جن میں سے ایک ہمیشہ سے فقیر ہے اور دوسرا مہذب آدمی۔

ایک سیڑھی عمارت کے ایک سامنے کے وسیع حصے کی طرف لے جاتی تھی جو ایسے سائبان کی طرح تھا جسے مکان میں تبدیل کر دیا گیا ہو۔عمارت کے سامنے سے ایک غلام گردش شروع ہوتی تھی جس میں دائیں اور بائیں سے مختلف پیمائش کے کئی قسم کے کمرے کھلتے تھے جو حالات کے دباؤ کے پیشِ نظر خالی رہتے تھے اور کوٹھڑیوں کے بجائے دکانوں جیسے نظر آتے تھے۔ان کمروں کو اطراف کی غیر آباد زمینوں سے مدھم روشنی ملتی تھی۔

چھت اور دروازوں کی درازوں سے آنے والی ٹھنڈی کرنیں اور برفیلی ہواؤں کے باعث یہ جگہ اندھیری، مریضانہ، اور غم انگیز تھی۔اس قسم کے گھر کی ایک دل چسپ اور دلکش خصوصیت اس کی بڑی بڑی مکڑیاں تھیں۔

صدر دروازے کی بائیں جانب، بولیوارڈ کی طرف، زمین سے قدِ آدم اوپر ایک کھڑکی تھی جس کو دیوار اٹھا کر بند کر دیا گیا تھا جو ایک مربع طاق سا بن گئی تھی جس میں گزرتے ہوئے بچوں کے پھینکے ہوئے پتھر جمع تھے۔

اس عمارت کا ایک حصہ حال ہی میں منہدم کیا گیا ہے۔اس کی موجودہ باقیات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے گزرے دنوں میں یہ کیا چیز رہی ہوگی۔یہ سو برس سے زیادہ پرانی عمارت نہیں تھی۔گرجا گھر کے لیے تو سو برس جوانی کے ہوتے ہیں جب کہ گھر کے لیے یہ عرصہ ایک عمر ہو جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کے رہنے کی جگہ میں اس کا عارضی کردار شریک ہو گیا ہے، اور خدا کے گھر میں اس کی ابدیت۔

ڈاکیے اس گھر کو 52-50 کہتے تھے، مگر اپنے علاقے میں یہ Gorbeau ہاؤس کہلاتا تھا۔

یہ عرفیت کہاں سے لی گئی تھی، ہم اس کی وضاحت کیے دیتے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی تفصیلات اکٹھا کرنے والے جو حکایتوں کے عطار بن جاتے ہیں، اور اپنی یادداشتوں میں فراموش ہو جانے والی تاریخوں کو پن سے لگا لیتے ہیں، جانتے ہیں کہ پچھلی صدی کے دوران، تقریباً 1770ء میں پیرس میں دو وکیل تھے جن میں سے ایک کا نام تھا Corbeau (پہاڑی کوا) اور دوسرے کا Renard (لومڑی) تھا۔وکیلوں کے لیے موقع بہت اچھا تھا؛ انھوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔فوراً ہی عدالت کی غلام گردش میں ایک ہجو یہ نظم

مشتہر کر دی گئی، اگر چہ اس کے مصرعوں میں ذرا جھول تھا:

Maitre Corbeau, sur un dossier perche,
Tenait dans son bee une saisie executoire;
Maitre Renard, par l'odeur alleche,
Lui fit a peu pres cette histoire:
He! bonjour. Etc.

ان دو ایمان دار پیشہ وروں نے، مزاح سے شرمندہ ہو کر، اپنے ناموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کے سامنے ان کے ناموں کی تبدیلی کی درخواست پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

یہ عرضداشت لوئی پانزدہم کے سامنے اسی دن پیش ہوئی، جب ایک جانب پاپائے اعظم کے سفیر اور دوسری جانب کارڈینل de la Roche-Aymon، دونوں خلوص کے ساتھ گھٹنوں کے بل جھک رہے تھے، اور دونوں اپنے بادشاہ کی موجودگی میں مادام du Barry کے ننگے پیروں میں پاپوش پہنانے میں مصروف تھے، جو اسی وقت بستر سے باہر آئی تھی۔ بادشاہ نے جو ہنس رہا تھا، اور دل کھول کر ہنستے ہوئے دونوں بشپ اور دو وکیلوں کے سامنے شاداں و فرحاں گزر رہا تھا، قانون کے ان دونوں کارندوں کے ساتھ نام میں، اضافے سے ان سے قریبی نام عطا کر دیے۔ بادشاہ کے فرمان کے مطابق ماسٹر Corbeau کو اس کے نام کے ابتدائی حرف کی جگہ ایک مختلف حرف کے اضافے کی اجازت دے دی گئی اور وہ خود کو Gorbeau کہلانے لگا۔ ماسٹر Renard کم خوش قسمت تھا؛ اس کو اپنے نام کے حرف R سے پہلے حرف P کا اضافہ کرنے کی اجازت دے دی گئی، اور وہ خود کو Prenard کہلانے لگا؛ اس طرح اس کا دوسرا نام پہلے نام سے تقریباً مشابہ ہو گیا تھا۔

مقامی روایت کے مطابق Gorbeau کو اسپتال بولیوارڈ کی عمارت نمبر 50-52 کا مالک بنا دیا گیا تھا۔ وہی اس یادگار کھڑکی کا بنانے والا بھی تھا۔

اسی وجہ سے یہ عمارت Gorbeau ہاؤس کہلانے لگی تھی۔

اس عمارت کے سامنے، دو رویہ درختوں والی بولیوارڈ کے درمیان، ایک بڑا سا شاہ بلوط کا درخت تھا جس کا تین چوتھائی حصہ خشک ہو چکا تھا؛ اس کے بالکل سامنے سے de la Barriere des Gobelins اسٹریٹ شروع ہوتی تھی، جو کچی اور بغیر درختوں کی سڑک تھی جس پر بیمار درخت لگائے گئے تھے، جس پر اس زمانے میں ایک بھی مکان نہیں تھا اور جو موسم کے مطابق گرد آلود یا سبز ہوا کرتی تھی، اور پیرس کی بیرونی دیوار پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ قریبی کارخانوں

کی چھتوں سے زنگار کے دھوئیں کی بدبو پھیلتی رہتی تھی۔

[شہر کی] دیوار میں بنی رکاوٹ زیادہ دور نہیں تھی۔ 1823ء میں یہ دیوار موجود تھی۔ خود رکاوٹ بھی دیکھنے والوں کے دماغ میں غم زدہ تصورات پیدا کرتی تھی۔ یہاں سے نکلنے والی سڑک Bicetre کی طرف جاتی تھی۔ اسی سڑک سے سلطنت اور بحالی کے زمانے میں سزائے موت کے قیدی سزا پر عمل درآمد کے لیے پیرس لائے جاتے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں 1829ء میں وہ پُراسرار قتل کی واردات ہوئی تھی، جو "Fontainebleau کے قتل والی رکاوٹ" کہلائی، جس کے انصاف کرنے والوں کا کبھی پتا نہیں چل سکا؛ یہ ایک غم انگیز مسئلہ تھا جس کی کبھی وضاحت نہیں ہو سکی تھی، ایک خوف ناک معمہ تھا جو کبھی سلجھایا نہیں جا سکا تھا۔ چند قدم آگے بڑھیے اور آپ مہلک Croulebarbe اسٹریٹ پہنچ جاتے ہیں، جہاں Ulbach نے Ivry کی ایک بکری کو بادلوں کی گرج کی آواز پر چھرا مار دیا تھا، جیسا کی تفریحی ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔ مزید چند قدم، اور آپ کو Saint-Jacques والی رکاوٹوں والے شاہ بلوط کے درخت نظر آئیں گے جنھیں پھانسی گھاٹ کو چھپانے کے لیے اوپر سے چھانٹ دیا گیا تھا، اور بورژوا سماج کی دکانوں والی وہ شرم ناک Place de Grove ملے گی جو سزائے موت کے تصور پر پسپا ہو گئی تھی؛ نہ اس کو ختم کرنے کی ہمت کر سکی نہ اس کو ہمت کے ساتھ قائم رکھ سکی تھی۔

Place Saint-Jacques کو ایک جانب رکھتے ہوئے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ یہ جگہ ہمیشہ خوف ناک رہے گی؛ سینتیس برس پہلے بھی یہ ماتمی جگہ بولیوارڈ کی سب سے زیادہ ماتمی جگہ تھی، وہ جگہ جو آج بھی اتنی غیر دل چسپ ہے جہاں 52-50 نمبر کی عمارت واقع تھی۔

صرف پچیس برس بعد ہی یہاں بورژوا مکانات بننے شروع ہوئے تھے۔ یہ جگہ نہایت ناخوش گوار تھی۔ اداسی بھرے خیالات کے علاوہ جو یہاں کسی پر حملہ آور ہو سکتے ہیں، کسے احساس تھا کہ یہ جگہ Salpetriere، جس کے گنبد کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی تھی، اور Bicetre کے درمیان تھی، جس کے مضافات دل کو چھو لینے والے تھے؛ یعنی عورتوں کے پاگل پن اور مردوں کے پاگل پن کے درمیان تھے۔ جہاں تک نظر جاتی کچھ بھی نہیں تھا، سوائے مذبح کے، شہر کی دیوار کے اور نئے کارخانوں کی سامنے کی عمارتوں کے، خانقاہوں اور ان سے مشابہ بیرکوں کے؛ ہر طرف سائبان تھے، گندگی کے ڈھیر تھے، موٹی کپڑے جیسی سیاہ کی ہوئی قدیم دیواریں تھیں، کفن جیسی نئی سفیدی شدہ دیواریں تھیں؛ ہر جگہ درختوں کی متوازی قطاریں تھیں؛ ایک خط پر بنی ہوئی عمارتیں

تھیں؛ سپاٹ تعمیرات تھیں؛ لمبی ٹھنڈی قطاریں تھیں اور زاویہ بلاے قائمہ کی اداس افسردگی تھی۔ نہ میدان میں ناہمواری تھی، نہ تعمیرات میں تلون مزاجی تھی، نہ کوئی شکن تھی مجموعی اثر یخ بستہ، باضابطہ اور بھیانک تھا۔موزونیت سے زیادہ کوئی شے دل نہیں دُکھاتی۔ اس لیے کہ موزونیت بیزاری ہوتی ہے، اوربیزاری رنج کی بنیاد میں ہوتی ہے۔ مایوسی جمائی لیتی ہے۔ یہ جہنم سے بھی زیادہ خوف ناک چیز ہوتی ہے جب کوئی اس کی زد میں ہوتا ہے، اور وہ جہنم ہوتا ہے جب کوئی بیزار ہوتا ہے۔اگر ایسے کسی جہنم کا وجود ہے تو اسپتال روڈ کے اس حصہ کو اس کا داخلہ بننا چاہیے تھا۔

پھر بھی رات کے اترتے وقت، اس وقت جب دن کی روشنی غائب ہو رہی ہو، بالخصوص سردی کے موسم میں، اس لمحے جب شام کی ہوا شاہ بلوط کے درختوں سے آخری سرخ پتی بھی توڑ لیتی ہے، جب اندھیرا گہرا اور بے ستارہ ہوتا ہے یا جب چاند اور ہوائیں بادلوں میں کھڑکیاں بناتی ہیں اور خود ان کی پرچھائیوں میں گم ہوجاتی ہیں، یہ بولیوارڈ اچانک بھیانک ہو جاتی ہے۔سیاہ لکیریں اندر کی طرف ڈوب جاتی ہیں اور لامحدود کے ٹکڑوں کی طرح سایوں میں گم ہو جاتی ہیں۔اس وقت راہ گیر اس جگہ کی بے شمار روایتوں کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو پھانسی کے تختے سے منسلک ہوتی ہیں۔اس جگہ کی تنہائی میں، جہاں اتنے جرائم کیے گئے ہوں، کوئی وحشت ناک شے ضرور ہوتی تھی۔ ایک ڈراؤنی میٹنگ ہوتی تھی جو اس اندھیرے میں پھنسا لیتی تھی؛ اندھیرے کے تمام پیچیدہ پیکر پُر اسرار محسوس ہوتے تھے، اور وہ طویل اور کھوکھلا علاقہ، جو ہر درخت کے درمیان نظر آتا تھا، قبروں جیسا معلوم ہوتا تھا؛ دن میں یہ بدصورت ہوتا تھا؛ شام کے وقت افسردہ اور رات تک نامبارک ہوجاتا تھا۔

گرمی کے موسم میں، شام کے دھندلکے میں، شاہ بلوط کے درختوں کے نیچے بارش سے کائی زدہ بنچوں پر کچھ بوڑھی عورتیں اِدھر اُدھر بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ عورتیں بھیک مانگنا پسند کرتی تھیں۔

بہرحال یہ علاقہ جس کا انداز قدیم کے بجائے فرسودہ تھا، اس وقت بھی قلبِ ماہیت کی طرف مائل تھا۔ اس وقت بھی جو کوئی اس کو دیکھنا چاہتا تھا اسے جلدی کرنا پڑتی تھی۔ ہر روز اس کے اثرات کی کوئی نہ کوئی تفصیل غائب ہو جاتی تھی۔پچھلے بیس برسوں سے Orleans کی ریلوے پرانے مضافات کے برابر کھڑی ہوتی تھی اور اس سے توجہ ہٹاتی تھی، جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے۔جہاں کہیں یہ دارالحکومت کی سرحدوں کے قریب لے جائی جاتی ہے، ریلوے اسٹیشن مضافات کی موت کا اور ایک نئے شہر کی پیدائش کا باعث ہوجاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے گویا،

لوگوں کی ان بڑے مراکز کے اطراف حرکت سے زمین جراثیم سے بھر جاتی ہے، لرزتی ہے اور اپنا منہ کھول لیتی ہے؛ آدمیوں کے قدیم مکانات کو نگلنے کے لیے اور نئے مکانات کو پیدا ہونے کی اجازت دینے کے لیے؛ ان طاقت ور مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور تہذیب کے ان دیو ہیکل گھوڑوں کی سانسوں کے ذریعے جو کوئلہ کھاتے ہیں اور آگ اگلتے ہیں۔ پرانے مکانات ڈھے جاتے ہیں، اور نئے مکانات اُبھرنے لگتے ہیں۔

چوں کہ Orleans کی ریلوے نے Salpetriere کے علاقے پر حملہ کر دیا ہے، قدیم، تنگ گلیاں Saint-Victor کی خندقوں سے ملتی ہیں، اور Jardin des Plantes لرزتا ہے اس لیے کہ دن میں تین یا چار بار چار پہیوں والی بگھیاں اور عوامی گاڑیاں اپنی پوری قوت اور رفتار سے گزرتی رہتی ہیں اور گھروں کے دائیں بائیں اژدہام کا باعث ہوتی ہیں؛ اور یہ بھی صحیح ہے کہ بڑے شہروں میں سورج مکانوں کے جنوبی حصوں میں سبزہ اُگاتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ بار بار آنے جانے والی گاڑیوں سے سڑکیں وسیع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ایک نئی زندگی کی علامتیں واضح ہونے لگتی ہیں۔ اس صوبائی علاقے میں، وحشی ترین گوشوں میں، پکے راستے نظر آنے لگتے ہیں، پگڈنڈیاں رینگنے اور لمبی ہونے لگتی ہیں، اس کے باوجود کہ وہاں ابھی تک پیدل چلنے والے نہیں ہیں۔ ایک صبح — جولائی 1845ء کی ایک یادگار صبح — وہاں کولتار کے سیاہ گنبد دھواں دیتے دیکھے گئے تھے؛ اس دن یہ کہا جا سکتا تھا کہ l'Ourcine اسٹریٹ میں تمدن کے قدم آ گئے ہیں، اور یہ بھی کہ Saint-Marceau کے مضافات میں پیرس داخل ہو گیا ہے۔

⁂

آشیانہ، بوم کا اور خوش گُلو پرندے کا

وہ Gorbeau ہاؤس ہی تھا جس کے سامنے ژاں ولژاں رُکا تھا۔ جنگلی پرندوں کی طرح اس نے بھی اپنا آشیانہ بنانے کے لیے ایک سنسان جگہ پسند کی تھی۔

اس نے اپنی واسکٹ کی جیب ٹٹولی، ایک ہر قفلی قسم کی کنجی نکالی، دروازہ کھولا، داخل ہوا، احتیاط سے دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں چڑھا۔ اب بھی کوزیت اسی کے ساتھ تھی۔

سیڑھی کے اوپر پہنچ کر اس نے اپنی جیب سے ایک اور کنجی نکالی، جس سے ایک اور دروازہ کھولا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔ یہ دراصل ایک درمیانہ درجے کی وسعت کی ایک دو چھتی تھی، جس میں فرش پر ایک گدا بچھا تھا، ایک میز تھی اور کئی کرسیاں تھیں؛ ایک اسٹوو، جس میں آگ جل رہی تھی، جس کے انگارے نظر آ رہے تھے، ایک کونے میں رکھا تھا۔ بولیوارڈ پر لگی ایک لالٹین اس افلاس زدہ کمرے میں اپنی دھندلی روشنی ڈال رہی تھی۔ اس کے آخری سرے پر ایک ڈریسنگ روم تھا، جس میں تہہ ہو جانے والا ایک پلنگ تھا؛ ژاں ولژاں بچی کو اس پلنگ پر لے گیا اور اس کو جگائے بغیر پلنگ پر لٹا دیا۔

اس نے دیا سلائی جلائی اور شمع روشن کر دی۔ یہ سب کچھ پہلے سے میز پر رکھ دیا گیا تھا اور جیسا کہ اس نے پچھلی شام کی طرح پوری توجہ سے کوزیت کے چہرے کو جانچنا شروع کیا، جس میں دردمندی اور نرم دلی کا اظہار کج روی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بچی، اس پُرسکون اعتماد کے ساتھ جو بے انتہا قوت والے اور بے انتہا کمزور کے پاس ہوتا ہے، یہ جانے بغیر سو گئی تھی کہ وہ کس کے پاس تھی اور کہاں تھی، سوتی رہی۔

ژاں ولژاں نے جھک کر بچی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

نو مہینے قبل اس نے اس کی ماں کے ہاتھ کو اسی طرح بوسہ دیا تھا، اور وہ بھی اسی طرح سو گئی تھی۔

ویسے ہی افسردہ، دل چھیدنے والے مذہبی جذبات اس کے دل میں بھی موج زن تھے۔

وہ کوزیت کے بستر کی ایک جانب گھٹنوں کے بل کھڑا تھا۔

اس وقت دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، اور بچی سو رہی تھی۔ دسمبر کی ایک زرد کرن دو چھتی کی کھڑکی سے گھس آئی تھی اور روشنی اور سایے کی لمبی لمبی کرنیں دو چھتی کے فرش پر پڑ رہی تھیں۔ اچانک، ایک لدی پھندی بار برداری کی گاڑی گھر کے پاس سے گزر گئی اور اس کی برق جیسی گرج دھمک نے نازک سے پلنگ کو اوپر سے نیچے تک ہلا کر رکھ دیا۔

''جی مادام!'' کوزیت چلائی اور ''آرہی ہوں، آرہی ہوں'' کہنے لگی تھی۔

اور وہ اچھل کر بستر سے باہر نکلی، نیند کے خمار سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، اور وہ دیوار کے کونے کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے بڑھی۔

''اوہ خدایا! ارے میری جھاڑو کہاں گئی؟'' اس نے کہا۔

اس کی آنکھیں پوری طرح کھلیں تو ژاں ولژاں کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے تھا۔

''اوہ، تو یہ سب کچھ سچ ہے!'' بچی نے کہا، ''صبح بخیر، موسیو!''

بچے خوشیوں کو فوراً اور عادتاً قبول کر لیتے ہیں، اس لیے کہ وہ فطری طور پر ہمہ تن مسرت ہی ہوا کرتے ہیں۔

کوزیت کی نظر کیتھرین پر پڑی جو اس کے بستر کے پائینتی پڑی تھی؛ اس نے کیتھرین کو اٹھا لیا، اور اس سے کھیلتے ہوئے اس نے ژاں ولژاں پر سیکڑوں سوالات کی بھرمار کر دی۔ میں کہاں ہوں؟ کیا پیرس بہت بڑا شہر ہے؟ کیا مادام تناردیے یہاں سے بہت دور ہے؟ کیا مجھے وہاں واپس جانا پڑے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے اچانک بلند آواز میں کہا ''یہ کتنی اچھی جگہ ہے؟''

یہ ایک خوف ناک کھوہ کی مانند تھا، مگر وہ خود کو آزاد محسوس کر رہی تھی۔

''کیا مجھے جھاڑو دینی چاہیے؟'' اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''کھیلو، کودو!'' ژاں ولژاں نے کہا۔

وہ دن اسی طرح گزر گیا۔ خود کو پریشان کیے بغیر کہ اس کے اطراف کیا ہو رہا ہے، وہ ناقابلِ بیان حد تک اس گڑیا سے اور اس قسم کے آدمی سے خوش تھی۔

۞

دو سیہ بختوں کی ایک خوش قسمتی

دوسری صبح طلوعِ فجر کے وقت ژاں ولژاں کوزیت کے بستر کے کنارے تھا؛ ساکت کھڑا اس کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کی روح میں کوئی نئی شے سما گئی تھی۔

ژاں ولژاں نے کبھی کسی چیز سے محبت نہیں کی تھی؛ پچیس برس سے اس دنیا میں وہ تنہا تھا۔ وہ نہ کبھی باپ، نہ عاشق، نہ شوہر، نہ کسی کا دوست رہا تھا۔ قید میں وہ خطرناک، پژمردہ، پاک دامن، لاپروا اور شرمیلا تھا۔ اس سابقہ قیدی کا دل کنوارپن سے لبریز تھا۔ اس کی بہن اور بہن کے بچوں کی صرف مبہم یادیں ہی رہ گئی تھیں جو بالآخر بالکل محو ہو گئیں؛ انھیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، اور نہ ملنے پر ان کو فراموش کر دیا تھا۔ انسانی فطرت اسی طرح کی بنائی گئی ہے؛ اس کی نوجوانی کی یادیں، اگر تھیں بھی تو پاتال میں چلی گئی تھیں۔

جب اس نے کوزیت کو دیکھا، جب اس کو حاصل کیا، اور اس کو ساتھ لے آیا تو اس کے اندر دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

اس میں جوش اور محبت کا جذبہ جاگ اٹھا تھا اور اس بچی کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ بستر کے قریب گیا، جہاں کوزیت لیٹی سو رہی تھی۔ وہ خوشی سے کانپ گیا تھا۔ اس کے اندر تمام مادرانہ درد جاگ اٹھے تھے، مگر اسے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا تھا؛ اس لیے کہ دل کی وہ عظیم اور غیر معمولی حرکت جو محبت بن جاتی ہے، بہت مبہم اور میٹھی شے ہوتی ہے۔

بے چارہ بوڑھا آدمی، جس کے سینے میں بالکل نیا دل تھا۔

چوں کہ وہ پچپن برس کا تھا، اور کوزیت کی عمر صرف آٹھ برس تھی، یہ سب کچھ ایک قسم

کی محبت ہی رہی ہوگی جو ایک نا قابلِ بیان روشنی کی طرح اس کے اندرون میں تیر رہی تھی۔
یہ دوسرا سفید آسیب تھا اسے جس کا سامنا تھا۔ بشپ نے اس کے دل میں نیکی کی صبح کی ابتدا کر دی تھی؛ کوزیت نے محبت کے اس سویرے کو ابھار دیا تھا۔
ابتدائی دن چکاچوند کی سی کیفیت میں گزر گئے۔
کوزیت بھی، اپنے طور پر جو خود سے ناواقف تھی، ایک بے چاری لڑکی بن گئی تھی! جب اس کی ماں اسے چھوڑ کر گئی تھی، وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسے یاد بھی نہیں رہ گئی تھی۔ تمام بچوں کی طرح، جو انگور کی بیل کی طرح ہوتے ہیں اور ہر شے سے چمٹ جاتے ہیں، اس نے بھی محبت کرنے کی کوشش کی تھی؛ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ سب نے اسے متنفر کر دیا تھا — تن آردیے نے، اس کی بچیوں نے، اور دوسرے بچوں نے۔ اس نے ایک کتے سے محبت کی تھی مگر وہ بھی مر گیا۔ جس کے بعد سے کسی چیز نے، یا کسی نے اس سے تعلق نہیں رکھا تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے، جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اس کا آٹھ برس کا دل بالکل برف جیسا تھا۔ اس میں اس کی غلطی نہیں تھی؛ ایسا نہیں تھا کہ اس میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں تھی؛ افسوس کہ یہ ممکن تھا۔ اس طرح، پہلے ہی دن سے اس کی تمام حسیت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس قسم کے آدمی کو پسند کرنے لگی تھی۔ اسے اب وہ احساس ہو رہا تھا جس کا پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا — کشادگی کا احساس!
اس آدمی نے کبھی اپنے آپ میں عمر رسیدہ ہونے یا مفلس ہونے کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا تھا؛ وہ ژاں ولژاں کو اسی طرح خوب صورت سمجھتی تھی جس طرح وہ اس گھر کو خوب صورت سمجھتی تھی۔
بچپنے کی صبح کے اور مسرتوں کے اثرات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ زمین کی اور اس پر زندگی کی ندرت بھی کچھ چیزوں کی حق دار ہوتی ہے۔ اوپری منزل کی مسرت کے رنگوں کی یادوں سے زیادہ حسین کوئی یاد نہیں ہوتی۔ اور ہم سب کی زندگی میں یہ خوب صورت اوپری منزل ہوا کرتی ہے۔
فطرت نے ژاں ولژاں اور کوزیت کے درمیان پچاس برس کی خلیج حائل کر دی تھی؛ قسمت نے یہ خلیج بھر دی تھی۔ قسمت نے جڑ سے اکھاڑی ہوئی دو قوتوں کو جا تک ان کی اپنی غیر معمولی طاقت سے متحد اور یک جا کر دیا تھا، جن کے درمیان اگر چہ تفاوت عمری تھا مگر ان کا غم ایک جیسا تھا۔ دراصل ایک نے دوسرے کی تکمیل کر دی تھی۔ کوزیت کی جبلت ایک باپ کو تلاش میں تھی، جس طرح ژاں ولژاں کی جبلت اولاد کی تلاش کر رہی تھی۔ دونوں کی ملاقات ایک دوسرے کے پا جانے کا عمل تھا۔ اس پُر اسرار لمحے جب جنگل کے اندھیرے میں ان کے ہاتھوں نے ایک

دوسرے کو چھوا تھا، اسی وقت دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ جب ان دونوں نے
ایک دوسرے کا تصور کیا تھا، ایک کو دوسرے کے لیے ضروری جانا اور ایک دوسرے سے قریب ہو
کر بغل گیر ہو گئے تھے۔

اگر ہم الفاظ کو ان کے مکمل اور محیط معنوں میں استعمال کریں تو ہمیں کہنا چاہیے کہ
مقبرے کی دیوار سے الگ کیا ہوا ژاں ولژاں ایک رنڈوا تھا، اور کوزیٹ ایک یتیم لڑکی تھی اس
کیفیت نے ژاں ولژاں کو سماوی انداز میں کوزیٹ کا باپ بنا دیا تھا۔

اور سچ پوچھا جائے تو، Chelles کے جنگل کی پہنائیوں کے اندھیرے میں ژاں
ولژاں نے کوزیٹ کے ہاتھ تھام کر اس پر جو پُراسرار اثر چھوڑا تھا وہ سراب نہیں تھا، ایک حقیقت
تھی۔اس بچی کے مقسوم میں اس آدمی کا داخل ہونا ایک خدائی عمل تھا۔

اس کے علاوہ، ژاں ولژاں نے اپنی پناہ کا اچھا انتخاب کیا تھا۔اس میں وہ مکمل طور پر
محفوظ تھا۔

وہ کمرہ، کوزیٹ کے ساتھ وہ جس میں مقیم تھا، لباس تبدیل کرنے کی جگہ تھی اور ان
کمروں میں سے ایک تھا جس کی کھڑکی بولیوارڈ کی طرف کھلتی تھی۔ چوں کہ اس پورے گھر میں
یہی ایک کھڑکی تھی، یہاں تک کسی پڑوسی کی نظریں پہنچنے کا یا گزرنے کا احتمال نہیں تھا۔

نمبر 52-50 کی زمینی منزل، جو ایک خستہ حال اوپری منزل جیسی تھی، بازاری
باغبانوں کے لیے ایک قسم کا گاڑی کا اڈا بن گئی تھی؛ اس کے اور اوپری منزل کے درمیان کوئی
رابطہ موجود نہیں تھا۔ایک فرش نے ان دونوں کو الگ کر دیا تھا، جس میں نہ کوئی فرشی در تھا اور نہ
سیڑھی، اور جو، بقول شخصے، ایک ڈایا فرام جیسا تھا۔جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، پہلے منزل میں کئی
کمرے اور کئی سقف تھے، جن میں سے صرف ایک، اس بوڑھی عورت کے استعمال میں تھا جس
نے ژاں ولژاں کی گھرداری کی ذمے داری سنبھال لی تھی؛ بقیہ سب کچھ خالی تھا۔

یہ عورت ہی، جس کو سربراہ مہمان کا خوب صورت لقب دیا گیا تھا، دراصل اس قلعہ نما
عمارت کی رکھوالی تھی، جس نے ژاں ولژاں کو کرسمس کی رات ایک کمرہ کرایے پر دیا تھا۔اس نے
خود کو ایک شریف آدمی کے طور پر متعارف کرایا تھا جسے اس کے ہسپانوی سلسلے نے تباہ کر دیا تھا،
جو اپنی بچی کے ہمراہ یہاں رہنے کے لیے آیا تھا۔اس نے چھ ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کر دیا تھا، اور
اس عورت کو، اس کمرے اور لباس تبدیل کرنے کی جگہ کو، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ٹھیک کرنے کی
ذمے داری بھی سونپ دی تھی۔یہی وہ عورت تھی جس نے اسٹوو میں آگ روشن کر دی تھی، اور اس

شام ان کی آمد کے سارے انتظامات کر دیے تھے۔

ہفتوں پر ہفتے گزرتے گئے اور اس کمرے میں یہ دونوں وجود آرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ کوزیت ہنستی، باتیں کرتی، اور صبح سے گانا شروع کر دیتی تھی۔ بچوں کے بھی پرندوں کی طرح صبح کے گیت ہوا کرتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ژاں ولژاں اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو، جو سردی سے پھٹ گئے تھے، اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیتا اور ان کو بوسے دیتا۔ بے چاری بچی جو مار کھانے کی عادی تھی، اس کا مطلب سمجھ نہیں پاتی اور گھبرا کر دور ہو جایا کرتی تھی۔

کبھی وہ سنجیدہ ہو جاتی اور اپنے سیاہ فراک کی طرف دیکھنے لگتی۔ کوزیت اب چیتھڑوں میں نہیں ہوتی تھی۔ وہ بدبختی سے نکل کر زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔

ژاں ولژاں نے اسے پڑھنا سکھانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ کبھی کبھی، جب وہ بچی کو ہجے کرنا سکھاتا تو اسے یاد آ جاتا تھا کہ برائی کے عوض اس نے قید خانے میں پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اب بچی نے بھی پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ یہ سابقہ سزا یافتہ شخص فرشتوں جیسے متفکرانہ انداز میں مسکراتا تھا۔

اسے یہ خیال اوپر سے آتا محسوس ہوتا تھا، جو اس شخص کا خیال تھا جو آدمی نہیں تھا، اور پھر وہ نیکی میں مشغول ہو جاتا۔ اچھے خیالات کے بھی برائیوں کے جیسے پاتال ہوا کرتے ہیں۔

کوزیت کو پڑھانا اور اس کو کھیلتے دیکھنا، اب یہی ژاں ولژاں کے وجود کا مقصد رہ گیا تھا۔ اور پھر وہ اس کی ماں کے بارے میں باتیں کرتا اور اسے دعا کرنا بھی سکھاتا تھا۔

کوزیت اسے باپ کہتی تھی۔ اسے اور کوئی نام معلوم نہیں تھا۔

گھنٹوں، وہ اپنی گڑیا کو کپڑے پہناتے اتارتے، اس سے بچوں کی طرح غوں غاں کرتے دیکھتا۔ زندگی اب اس کے نزدیک دل چسپیوں سے بھر گئی تھی؛ لوگ اس کو اچھا آدمی سمجھتے تھے؛ اب وہ اپنے خیالات میں بھی کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتا تھا؛ اب، جب کہ یہ بچی اس سے محبت کرتی تھی، اس کے نزدیک کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ بوڑھے آدمی کی طرح زندگی گزارے۔ اب اسے ایک مستقبل نظر آنے لگا تھا، جس میں کوزیت ایک خوب صورت روشنی کی مثال تھی۔ اچھے سے اچھا آدمی بھی خودغرضانہ خیالات سے مبرا نہیں ہوتا۔ اکثر وہ اس تصور سے ہی خوش ہوتا تھا کہ کاش کوزیت بدصورت ہوتی۔

یہ محض ایک ذاتی رائے ہے، مگر اپنے پورے خیال کا بیان کرنا، جس تک ژاں ولژاں پہنچ گیا تھا جب اس نے کوزیت سے محبت کرنا شروع کر دیا تھا، ہم پر کسی طرح واضح نہیں ہو رہا تھا

کہ اسے نیکی کرنے کے لیے ہمت افزائی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ابھی آدمیوں کی عداوت اور سماج کی بدبختی کو نئے پہلو سے دیکھا تھا— نامکمل پہلوؤں میں، بدقسمتی سے جو سچائی کا ایک ہی پہلو پیش کر رہے تھے، عورت کا مقسوم فانتین کے روپ میں، اور عوامی اختیار جاویر کی صورت میں تھا۔ وہ واپس قید میں پہنچ گیا تھا، کہ اس بار اس نے نیکی کی تھی؛ اس نے تازہ تلخی نگل لی تھی؛ نفرت اور ماندگی نے اس کو مغلوب کر دیا تھا؛ حتیٰ کہ بشپ کی یاد کو بھی عارضی گہن لگ گیا تھا، حالاں کہ بعد میں یقینی طور پر یہ فاتحانہ انداز میں روشن ہو گی؛ مگر بہر حال، وہ مقدس یاد مدھم ہوتی جارہی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ ژاں ولژاں ترقی کی ابتدا پر مایوس نہیں ہو رہا تھا، اور ایک بار پھر گرنے والا تھا؟ اس نے محبت کی اور پھر طاقت ور ہو گیا۔ افسوس کہ کوزیت کے مقابلے میں وہ کم تذبذب میں نہیں تھا۔ اس نے لڑکی کو تحفظ دیا، اور لڑکی نے اسے مستحکم کیا تھا۔ اس کے طفیل کوزیت زندگی کے راستے پر چل سکتی تھی؛ کوزیت کے طفیل، وہ نیکی جاری رکھ رہا تھا۔ ژاں ولژاں اس بچی کی طناب تھا، اور بچی اس کا سہارا تھی۔ آہ! یہ مقسوم کا توازن اور یہ لامتناہی ربانی معما!

❁

جاسوس بُڑھیا

ژاں ولژاں عاقل آدمی تھا کہ وہ دن میں باہر نہیں نکلتا تھا۔ ہر شام جھٹپٹے کے وقت وہ گھنٹے دو گھنٹے چہل قدمی کے لیے اکیلا نکلتا تھا؛ کبھی کوزیٹ بھی ساتھ ہوتی تھی۔ چہل قدمی بولیوارڈ سے نکلنے والی سنسان گلیوں میں ہوتی اور گرجا گھر میں بھی آنا جانا رہتا تھا۔ وہ قریب ترین گرجا گھر Saint-Medard جانا زیادہ پسند کرتا تھا۔ جب وہ کوزیٹ کو ساتھ نہیں لے جاتا تو وہ بوڑھی عورت کے پاس ہوا کرتی تھی؛ مگر بچی اس اچھے آدمی کے ساتھ جانے پر بہت خوش ہوتی تھی۔ ژاں ولژاں کی خواہش ہوتی کہ کیتھرین کے ساتھ اس کے شور و غل اور کھیل کود میں وہ بھی ساتھ ہوتا۔ چہل قدمی کے وقت وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رہتا، اور اس سے اچھی اچھی باتیں کرتا رہتا تھا۔

اس دوران کھلا کہ کوزیٹ بڑی خوش مزاج لڑکی تھی۔

بوڑھی عورت گھر کے کام کاج کرتی، کھانا پکاتی اور سودا سلف لینے بازار بھی جایا کرتی تھی۔

یہ لوگ معقول انداز میں زندگی بسر کر رہے تھے؛ کبھی کبھی کچھ گرمی سردی ہو جایا کرتی تھی، بالکل اسی طرح جیسے لوگ عام قسم کے ماحول میں رہتے ہیں۔ ژاں ولژاں نے فرنیچر میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی، اور سب کچھ پہلے دن ہی کی طرح تھا؛ اس نے صرف شیشے کے دروازے کے بجائے ٹھوس لکڑی کا دروازہ لگوا لیا تھا جو کوزیٹ کے ڈریسنگ روم میں کھلتا تھا۔

ژاں ولژاں اب بھی اپنے پیلے کوٹ، سیاہ برجس، اور اسی پرانی ہیٹ میں ہوتا تھا۔ سڑکوں پر وہ مفلس آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی دردمند دل رکھنے والی عورت اس کو ایک آدھ سو پکڑانے کی کوشش کرتی۔ ژاں ولژاں آداب کے ساتھ جھک کر خیرات قبول کر لیا کرتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ کوئی مفلس اس سے خیرات کا طالب ہوتا؛ ایسی صورت میں وہ پلٹ

کر دیکھتا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے، اور چپکے سے اس کے ہاتھ پر ایک آدھ سکہ رکھ دیتا، جو کبھی نقرئی سکہ بھی ہوتا، اور وہ تیزی سے آگے بڑھ جاتا تھا۔اس میں کچھ خرابی بھی تھی۔ پاس پڑوس کے لوگ اس کو ایسا بھکاری کہتے جو خود خیرات بھی کرتا ہے۔

جہاں تک پڑوسیوں کا معاملہ تھا، مگر اں بوڑھی چالاک اور کھوجی عورت تھی۔ وہ ژاں ولژاں پر بڑی چالاکی سے نظر رکھتی تھی جس کا شبہ تک نہیں ہوتا تھا۔وہ ذرا اونچا سنتی تھی، جس کی وجہ سے باتونی ہوگئی تھی۔ اس کے منہ میں صرف دو دانت باقی رہ گئے تھے، ایک اوپر کا اور دوسرا نیچے کا— جسے وہ کھٹکھٹایا کرتی تھی۔اس نے کوزیٹ سے سوال جواب کیے تھے،مگر وہ کچھ بتا نہیں سکی تھی، اس لیے کہ اسے خود بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں سوائے اس کے کہ وہ Montfermeil سے آئی تھی۔ایک صبح اس جاسوس عورت نے ژاں ولژاں کو اس گھر کے ایک غیر آباد کمرے میں جاتے دیکھا۔اس نے بلی کی طرح دبے پاؤں اس کا پیچھا کیا اور اس کی نظروں سے بچتے ہوئے کمرے کے دروازے کے ایک شگاف سے اس کو دیکھا جو اس کے بند دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ژاں ولژاں نے بلا شبہ تحفظ کی خاطر اپنی پشت دروازے کی طرف کر رکھی تھی۔بوڑھی عورت نے اس کو اپنی جیب ٹٹول کر ایک قینچی اور دھاگا نکالتے دیکھا؛ اس کے بعد اس نے اپنے کوٹ کے اندرون کا استر کاٹا اور اس میں سے زرد رنگ کا ایک کاغذ نکالا اور اسے کھول کر دیکھا۔ بوڑھی عورت نے،خوف زدہ نظروں سے پہچان لیا تھا کہ وہ کاغذ دراصل بینک کا ایک ہزار فرانک کا نوٹ تھا۔اپنی پوری زندگی میں اس نے ایسے صرف دو یا تین نوٹ دیکھے تھے۔ وہ خوف سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

چند لمحوں بعد ژاں ولژاں نے بوڑھی عورت کو اس طرح اشارے سے بلایا جیسے فاحشہ عورتوں کو راغب کیا جاتا ہے، اور اس سے نوٹ کو یہ کہتے ہوئے بھنا لانے کی درخواست کی کہ یہ اس کی سہ ماہی آمدنی تھی جو اسے ایک دن قبل ہی موصول ہوئی تھی، ''کہاں سے؟'' بوڑھی عورت نے دل ہی دل میں سوچا۔''یہ شخص چھ بجے شام تک تو گھر سے باہر نہیں نکلا تھا، اور سرکاری بینک یقیناً اس وقت تک کھلا نہیں رہتا ہے۔بوڑھی عورت نوٹ بھنانے گئی، اور اس نے اپنے جاننے والوں سے سارے راز بیان کر دیے۔اس نوٹ کے بارے میں Vignes Saint-Marcel اسٹریٹ کے گپ بازوں کے درمیان طرح طرح کی خوف آور باتیں ہوئیں۔

چند دن بعد، اتفاق سے ژاں ولژاں راہداری میں آری سے کوئی لکڑی کاٹ رہا تھا۔ بوڑھی عورت کمرے کے اندر صفائی ستھرائی کر رہی تھی۔اس وقت وہ کمرے میں اکیلی تھی۔کوزیٹ

راہداری میں لکڑی کی کٹائی کی تعریف کر رہی تھی۔ بوڑھی عورت کو ژاں ولیواں کا کوٹ مکمل پر منگا نظر آیا، اور اس نے موقع پا کر اس کی تلاشی لی۔ کوٹ کا استر دوبارہ سی دیا گیا تھا۔ عورت نے اسے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا، اور اس کے خیال میں کاغذ کی موٹائی بتاتی تھی اس میں بلاشبہ ہزار فرانک کے مزید نوٹ پوشیدہ تھے۔

اس نے دیکھا کہ کوٹ کے جیبوں میں طرح طرح کی چیزیں بھی رکھی تھیں۔ اس میں سوئیاں، دھاگا اور قینچی کے علاوہ، جو وہ پہلے دیکھ چکی تھی، ایک موٹی سی جیبی کتاب، اور ایک بڑا سا چاقو بھی تھا— اور سب سے حیرت انگیز— کئی رنگ کے مصنوعی بالوں کے سرپوش (wig) رکھے ہوئے تھے۔ ہر جیب میں غیر متوقع حادثات میں استعمال ہونے والے چیزیں بھی رکھی تھیں۔

اس طرح، اس گھر کے باسیوں نے سردی کے موسم کے آخری دن گزار دیے۔

✡

سکّے کی ہنگامہ خیزی

Saint-Medard نامی گرجا گھر کے قریب ایک مفلس آدمی ہوتا تھا جو ایک عوامی کنویں کے کنارے جو بے کار ہو گیا تھا، جھکا بیٹھا رہتا تھا، جس کو ژاں ولواں خیرات دینا پسند کرتا تھا۔ اس آدمی کو چند سو دیے بغیر وہ کبھی ادھر سے گزرتا نہیں تھا۔ وہ کبھی اس سے کچھ بات بھی کر لیا کرتا تھا۔ وہ لوگ جو اس گداگر سے رشک کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ یہ پولیس کا آدمی ہے۔ وہ عدالت کا سابق کارندہ تھا، اس کی عمر پچھتر برس تھی، اور وہ مسلسل منہ ہی منہ میں دعائیں مانگتا رہتا تھا۔

ایک شام، جب ژاں ولواں وہاں سے گزر رہا تھا، اور کوزیت اس کے ساتھ نہیں تھی، اس نے اس فقیر کو سرکاری لالٹین کے نیچے اپنی جگہ پر بیٹھے دیکھا جو تھوڑی دیر قبل ہی جلائی گئی تھی۔ وہ دعاؤں میں مصروف معلوم ہو رہا تھا اور حسبِ معمول جھکا ہوا تھا۔ ژاں ولواں اس کے پاس گیا اور حسبِ عادت اس کے ہاتھ میں خیرات کے چند سکے رکھ دیے۔ اچانک فقیر نے اپنی آنکھیں اٹھائیں، ژاں ولواں کی طرف گھور کر دیکھا اور فوراً ہی اپنا سر جھکا لیا۔ یہ حرکت بجلی کے جھماکے کی طرح ہوئی تھی۔ ژاں ولواں تھرا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا سرکاری لالٹین کی روشنی میں نظر آنے والا چہرہ محض کسی سرکاری کارندے کا نہیں بلکہ وہ کوئی بہت معروف اور چونکا دینے والا چہرہ تھا۔ اس وقت اسے ویسا ہی تجربہ ہوا جیسے کسی کا اچانک، اندھیرے میں رو بہ رُو، کسی چیتے سے سامنا ہو جائے۔ ژاں ولواں پسپا ہوا، خوف زدہ ہوا، پتھرایا، جسے نہ سانس لینے کی، نہ بولنے کی، نہ کھڑے رہنے کی، نہ بھاگ جانے کی ہمت ہوئی اور اس فقیر کے چہرے کو گھور کر دیکھتا رہا، جس نے اپنی سر جھکا دیا تھا، جو چیتھڑوں میں ملبوس تھا جسے خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں تھا۔ اس حیرت ناک لمحے ایک جبلت — ممکنہ طور پر ایک پُراسرار بچاؤ کرنے والی جبلت نے — ژاں ولواں کو منہ

سے ایک لفظ بھی نکالنے سے روک دیا۔ فقیر کی وہی صورت تھی، وہی چیتھڑے تھے اور وہی ظاہر صورت تھی جو روز ہوا کرتی تھی۔ ارے! ژاں ولژاں نے [خود سے] کہا، 'یا تو میں پاگل ہو گیا ہوں یا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔' اور وہ بہت پریشان گھر واپس آیا۔

اسے، اپنے آپ سے بھی اقرار کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، کہ وہ چہرہ جو اس نے دیکھا تھا، اس کے خیال میں جاویر ہی کا چہرہ تھا۔

اس رات، اس معاملے پر غور کرتے ہوئے، اسے افسوس ہوا کہ اس نے اس شخص سے کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا، تاکہ وہ دوبارہ اپنا چہرہ اٹھاتا۔

دوسرے دن، رات ہوتے ہی، ژاں ولژاں وہیں چلا گیا۔ فقیر حسبِ معمول اپنے اڈے پر تھا۔ "دن بخیر، میرے اچھے دوست۔" ژاں ولژاں نے کہا اور اس کو ایک سو خیرات میں دے دیا۔ فقیر نے اپنا سر اٹھایا، اور رنہنانے والی آواز میں کہا، "شکریہ، جنابِ عالی!" صریحاً وہ سابق سرکاری کارندہ تھا۔

ژاں ولژاں مکمل طور پر مطمئن تھا۔ اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس نے سوچا، "یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں سمجھا کہ وہ جاویر ہی تھا؟" کیا میں اندھا ہو چلا ہوں؟" اس کے بعد اس نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

چند دن بعد — تقریباً رات کے آٹھ بجے ہوں گے — وہ اپنے کمرے میں تھا، اور کوزیت کو زور زور سے ہجے کرانے میں مشغول تھا — جب اس نے گھر کا صدر دروازہ کھلتے اور بند ہوتے سنا۔ یہ اس کو غیر معمولی لگا۔ بوڑھی عورت جو اس گھر میں رہتی تھی، رات ہوتے ہی سو جایا کرتی تھی، تاکہ اس کی موم بتیاں جل کر ختم نہ ہو جائیں۔ ژاں ولژاں نے اشارے سے کوزیت کو خاموش کر دیا۔ اسے کسی کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بوڑھی عورت ہو، بیمار ہو گئی ہو اور دوا خانے گئی ہو۔ ژاں ولژاں کان لگائے سن رہا تھا۔

قدم بھاری تھے، اور کسی مرد کے معلوم ہوتے تھے؛ مگر بوڑھی عورت بھی تو بھاری جوتے پہنتی تھی؛ آدمی کے قدم بوڑھی عورت کے قدم سے اتنے مشابہ نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر بھی، ژاں ولژاں نے اپنی موم بتی بجھا دی۔

اس نے کوزیت کو سونے بھیج دیا، اور دھیمی آواز میں کہا، "بہت آہستہ سے بستر میں جانا۔" اور اس نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا ہی تھا کہ وہ قدم رک گئے۔

ژاں ولژاں خاموش، ساکت رہا۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی، کرسی پر بیٹھا

تھا جو بلی بھی نہیں، اندھیرے میں اس نے اپنی سانس بھی روک لی تھی۔

ایک ذرا طویل وقفے کے بعد وہ مڑا، اس لیے کہ اسے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، اور جوں ہی اس نے دروازے کی طرف نظر کی تو کنجی کے سوراخ سے اسے روشنی دکھائی دی۔ دروازے اور دیوار کی سیاہی کے درمیان وہ روشنی ایک نا مبارک ستارے جیسی بن گئی تھی۔ بظاہر وہاں کوئی تھا، جو اپنے ہاتھ میں موم بتی تھامے سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے قدموں کی کوئی آواز سنائی نہیں دی، جس سے پتا چلتا تھا کہ جو شخص دروازے کے پاس کھڑا سُن رہا تھا، اس نے اپنے جوتے اتار دیے تھے۔

ژاں ولژاں جس حالت میں تھا، اسی طرح کپڑے پہنے بستر پر گر گیا۔ وہ پوری رات سویا نہیں۔

صبح ہوتے ہی، ابھی ژاں ولژاں پر تھکن کا غلبہ تھا کہ اسے کسی دو چھتی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی، پھر کسی مردانہ قدموں کی آواز آئی، جو پچھلی رات سیڑھیاں چڑھے تھے۔ قدم اس کی طرف ہی آ رہے تھے۔ وہ بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور کنجی کے سوراخ سے اپنی آنکھ لگا دی، جو خاصا بڑا تھا، اس امید میں کہ وہ اس شخص کی صورت دیکھ لے گا، جو کل رات گھر میں داخل ہوا تھا اور اس کے دروازے کے پاس کھڑا سن رہا تھا۔ اس وقت ژاں ولژاں کے کمرے کے سامنے سے جوکر کے بغیر گزر رہا تھا، کوئی مرد ہی تھا۔ راہداری میں بہت اندھیرا تھا جس کے باعث چہرہ پہچاننا مشکل تھا، مگر جب وہی آدمی سیڑھی کے قریب پہنچا تو روشنی کی کرن نے اس کا ایک ہیولا سا بنا دیا تھا، اور ژاں ولژاں کو اس کی پشت مکمل طور پر نظر آ گئی۔ وہ بلند قامت آدمی تھا، اور سیاہ فراک کوٹ میں ملبوس تھا، اور اس کے بغل میں ایک لاٹھی دبی ہوئی تھی۔ وہ خوف ناک گردن اور بھاری کاندھے جاویر ہی کے تھے۔

ژاں ولژاں اپنی بولیوارڈ کی طرف والی کھڑکی سے اس کی ایک اور جھلک دیکھ سکتا تھا، مگر اسے کھڑکی کھولنی پڑتی؛ اس کی وہ ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ آدمی اس ہی کی طرح کنجی کے ذریعے ہی داخل ہوا تھا۔ اسے کنجی کس نے دی تھی؟ اس کا مطلب کیا تھا؟

صبح کے سات بجے، جب بوڑھی عورت کام کرنے آئی تو ژاں ولژاں نے اس پر چبھتی ہوئی ایک نظر ڈالی، مگر کوئی سوال نہیں کیا۔ ژاں ولژاں ہمیشہ کی طرح نظر آ رہا تھا۔

جب وہ جھاڑو دے رہی تھی، اس نے ژاں ولژاں سے کہا، "کل رات موسیو نے کسی

شخص کے آنے کی آواز سنی ہوگی؟"

اس زمانے میں، اس بولیوارڈ پر، شام کے آٹھ بجے، بالکل رات ہو جاتی تھی۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔" اس نے بالکل فطری آواز میں جواب دیا، "کون تھا وہ؟"

وہ ایک نیا کرایہ دار تھا، جو گھر میں آیا ہے۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

"اچھا! اس کا نام کیا ہے؟"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں، Dumont یا Daumont یا اسی قسم کا کوئی نام ہے اس کا۔"

"اور یہ موسیو ڈیمونٹ ہے کون؟"

بوڑھی عورت نے ریچھ کی جیسی آنکھوں سے اسے گھورا اور جواب دیا:

"آپ ہی کی طرح کا جائیداد والا کوئی شخص ہے۔"

شاید پس پردہ اس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ژاں ولژاں کا خیال تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔

جب بوڑھی عورت رخصت لے کر جا چکی، ژاں ولژاں نے ایک سو فرانک جمع کیے جو اس نے الماری میں رکھ چھوڑے تھے، ان کا ایک رول بنایا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اپنی تمام تر احتیاط کے باوجود جو اس نے اس کام میں کی تھی، تا کہ وہ چاندی کے سکے کھنکھناتے سنائی نہ دیں، ایک صد سو کا ایک سکہ پھسل کر زمین پر گر پڑا اور لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔

جب اندھیرا ہو گیا، وہ اترا اور بہت احتیاط سے اس نے بولیوارڈ کی دونوں جانب نظر دوڑائی۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ بولیوارڈ مکمل طور پر سنسان تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، کوئی آدمی پیڑوں کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو سکتا تھا۔

ژاں ولژاں دوبارہ اوپر چلا گیا۔

"آؤ چلیں!" اس نے کوزیٹ سے کہا۔

اس نے کوزیٹ کا ہاتھ پکڑا اور دونوں باہر چلے گئے۔

۞

حکمتِ عملی کے پیچ و خم

ان اوراق کے باعث قاری جنھیں اب پڑھنے والا ہے، اور ان کے باعث بھی جو مزید آگے آئیں گے، اس مقام پر ایک مشاہدہ ضروری ہو گیا ہے۔

اس کتاب کا مصنف جو اپنے بارے میں کچھ بیان کرنے پر شرمندگی محسوس کر رہا ہے، کئی برسوں سے پیرس سے غیر حاضر رہا ہے۔ جب سے اس نے پیرس چھوڑا ہے، اس شہر کی قلبِ ماہیت ہو چکی ہے۔ ایک نیا شہر پیدا ہو گیا ہے اور وہ، فیشن کے مطابق، اس سے لاعلم ہے۔ اسے یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ پیرس سے محبت کرتا ہے۔ پیرس جنم جنم سے اس کے خیالوں کا شہر رہا ہے۔ اس میں کیے جانے والے انہدام اور تعمیرِ نو کے نتیجے میں، اس کی جوانی کے زمانے کا پیرس، وہ پیرس جسے وہ مذہب کی مانند اپنے ذہن میں بسائے رہا ہے، اب گزرے دنوں کا پیرس بن چکا ہے۔ مصنف کو اس پیرس کے بارے میں اس طرح کچھ کہنے کی اجازت دی جانی چاہیے، گویا وہ ابھی موجود ہے۔ ممکن ہے کہ جب مصنف اپنے قارئین کو ان مقامات پر لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ایسی سڑک پر جہاں ایسا مکان موجود ہے'' تو اس علاقے میں نہ ایسی سڑک ہوگی اور نہ ایسا مکان موجود ہوگا۔ قاری اگر زحمت اٹھانا چاہیں تو ان حقائق کی تصدیق ضرور کر سکیں گے۔ مصنف اب خود نئے پیرس سے ناواقف ہے اور وہ، پرانے پیرس کو سراب کے مانند اپنی نظروں کے سامنے رکھ کر یہ سب لکھ رہا ہے جو اس کے نزدیک بیش قیمت ہے۔ اس کے لیے، ان چیزوں کے خواب دیکھنا مسرتوں کا باعث ہوگا جو اس کی یادوں میں اب بھی لہرا رہی ہیں، جنھیں اس نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے ملک میں مقیم تھا، گویا وہ سب ابھی تک غائب نہیں ہوا ہے۔ جب تک آپ اپنے وطن آتے جاتے رہتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سڑکیں وہ گلیاں آپ کے نزدیک غیر اہم ہیں؛ کہ وہ

کھڑکیاں، وہ چھتیں، اور وہ دروازے آپ کے لیے کچھ نہیں ہیں؛ کہ وہ دیواریں آپ کے لیے اجنبی ہیں؛ کہ وہ درخت پہلے محض آڑے آنے والی رکاوٹیں تھیں؛ کہ وہ مکانات آپ جن میں داخل نہیں ہوتے آپ کے لیے بے کار ہیں؛ کہ وہ پختہ پگڈنڈیاں آپ جن پر چل رہے ہیں آپ کے لیے محض پتھر ہیں، مگر بعد میں جب آپ وہاں نہیں ہوتے ہیں تب آپ کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ سڑکیں آپ کو محبوب ہیں، کہ وہ چھتیں، اور دروازے آپ کو بہت یاد آتے ہیں؛ اور یہ بھی کہ وہ دیواریں آپ کے لیے ضروری ہیں، وہ درخت آپ کو بہت پیارے ہیں؛ کہ آپ ان گھروں میں داخل ہو گئے ہیں آپ جن میں کبھی داخل نہیں ہوا کرتے تھے، اور یہ بھی کہ آپ اپنے دل کا، اپنے لہو کا، اپنی روح کا ایک حصہ ان سڑکوں پر چھوڑ آئے ہیں۔ وہ تمام جگہیں جو اب آپ کو نظر نہیں آتیں، اور شاید جنھیں کبھی نہیں دیکھیں گے، اور جن کی یادیں آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک رہی ہیں، اب ایک غم انگیز طلسم بن چکی ہیں؛ آپ کے ذہن میں غم انگیز طیف، بھوت کی مانند ابھرتے ہیں، جو آپ کو وہ مقدس زمین دکھاتے ہیں، کہ وہی سب فرانس کے پیکر ہیں، اور آپ ان سے محبت کرتے ہیں؛ اور انھیں ان کی موجودہ شکل میں ہی یاد کر لیتے ہیں، گویا آپ ان ہی کے لیے اصرار کرتے ہیں، اور آپ کسی تبدیلی کو قبول نہیں کریں گے: اس لیے کہ آپ اپنے وطن کی شکل سے اسی طرح منسلک ہیں جیسے کوئی بچہ اپنی ماں کی شکل سے منسلک ہوتا ہے۔

تو کیا ہمیں اب اجازت ہے کہ ہم حال میں رہ کر ماضی کے بارے میں بات کر سکتے ہیں؟ اس کے بعد، قاری سے ہماری گزارش ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھے، اور اب ہم اپنی بات شروع کرتے ہیں۔

ژاں ولژاں فوراً بولیوارڈ سے کنارہ کش ہو گیا، گلیوں میں گھس گیا، اور ایسے خطوط پر چلنے لگا جنھیں وہ ایجاد کر سکتا تھا، اور کبھی، یہ یقین کرنے کے لیے کہ اس کا پیچھا نہیں کیا جا رہا ہے، اپنے راستے پر واپس آ جاتا تھا۔

اس قسم کا داؤ پیچ شکار کیے جانے والے بارہ سنگھے سے مخصوص ہوتا ہے۔ اس مٹی پر جہاں قدموں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں، اس داؤ پیچ میں، دوسرے فوائد کے علاوہ، وہ فائدے بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعے آدمی یا کتے کو، غلط قسم کی خوشبو پر ڈال کر چکمہ دیا جا سکتا ہے۔ شکار کے عمل میں اس کو غلط بازادائی کہا جاتا ہے۔

اُس رات چاند اپنے شباب پر تھا۔ ژاں ولژاں کو اس پر افسوس نہیں تھا۔ چاند، جو اب بھی اُفق سے بہت قریب تھا، سڑکوں پر روشنیاں اور سایے ڈال رہا تھا۔ ژاں ولژاں اندھیرے علاقے کے مکانوں کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چل سکتا تھا، اور روشنی کے علاقے پر نظر بھی رکھ

سکتا تھا۔شاید اس نے اس حقیقت کے بارے میں کافی احتیاط نہیں برتی تھی کہ اندھیرا علاقہ اس سے الگ ہوگیا تھا۔اس کے باوجود جو سنسان گلیاں Poliveau اسٹریٹ سے ملحق تھیں ان پر، اسے یقین تھا کہ اس کا کوئی پیچھا نہیں کر رہا تھا۔

کوزیٹ کسی قسم کے سوالات کیے بغیر اس کے ساتھ رواں تھی۔اس کی زندگی کے پہلے چھ برسوں کے دکھوں نے اس کی فطرت میں مجہول کرنے والی کوئی شے شامل کر دی تھی۔اس کے علاوہ— اور یہ صرف ایک مشاہدہ ہے، ہم جس پر بار بار واپس آتے رہیں گے— وہ اس بات سے خود واقف ہوئے بغیر،اس نیک آدمی کی خصوصیات اور مقسوم کی پریشان خیالیوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔اور جب وہ اس کے ساتھ ہوتی، وہ خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی۔

نہ ژاں ولژاں کو اور نہ کوزیٹ کو کچھ پتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے تھے۔وہ خدا پر بھروسا کرتا تھا، اور کوزیٹ اس پر بھروسا کرتی تھی۔ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ خود بھی کسی ایسے ہاتھ سے تھما ہوا تھا جو اس کے مقابلے میں بہت بڑا تھا؛ اسے احساس تھا کہ کوئی وجود اس کی رہنمائی کر رہا تھا، اگر چہ وہ نظر نہیں آتا تھا۔پھر بھی اس کا کوئی طے شدہ خیال، کوئی منصوبہ نہیں تھا۔اسے اس بات کا بھی پورا یقین نہیں تھا کہ وہ شخص جاویر ہی تھا، اور یہ بھی کہ وہ جاویر ہو بھی سکتا تھا، اور جاویر کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ ژاں ولژاں ہی تھا۔تو کیا وہ کسی بھیس میں نہیں تھا؟ کیا اس کی موت کا یقین نہیں کیا گیا تھا؟ پھر بھی، کئی دنوں سے عجیب عجیب باتیں ہو رہی تھیں۔اسے مزید کی خواہش نہیں تھی۔

اس نے Gorbeau ہاؤس واپس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔کسی وحشی جانور کی طرح، جس کا اس کی ماند سے تعاقب کیا جا رہا ہو، وہ کسی نئے سوراخ کی تلاش میں تھا جس میں اس وقت تک چھپ سکتا جب تک اسے رہنے کی اور کوئی جگہ مل نہ جاتی۔

ژاں ولژاں نے Mouffetard کے علاقے میں کئی بھول بھلیوں کی نشان دہی کر لی تھی، جو اس وقت موجود تھیں، گویا قرونِ وسطیٰ کا جبر اور خانہ بندی اب بھی موجود تھی؛ اس نے کئی طریقوں، اور چالاک حکمتِ عملی سے، Censier اسٹریٹ اور Copeau اسٹریٹ، Battoir-Saint-Victor اسٹریٹ اور Puits l'Ermite اسٹریٹ کو یک جا کر لیا تھا۔اس علاقے میں مکانات تھے، مگر وہ ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہوا، کہ وہاں ایسا کوئی مکان نہیں تھا جو اس کے لیے مناسب ہوتا۔اسے یقین تھا کہ اگر کسی نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی،تو وہ اسے گم کر چکا ہوگا۔

جس وقت Saint-Etienne-du-Mont کے گھنٹا گھر سے گیارہ بجنے کی آواز آئی تھی، وہ Pontoise اسٹریٹ پر واقع پولیس کی کمشنری کے 14 نمبر دفتر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔چند لمحوں بعد، اس جبلت نے، ہم جس کے بارے میں بات کر چکے ہیں، اسے واپس

جانے کا اشارہ کیا۔ اس لمحے، کمشنری کی لالٹین کے طفیل، اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ تین افراد جو اس کا پیچھا کر رہے تھے، لالٹین کے نیچے سے ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس گلی میں مڑ گیا جو کمشنر ہاؤس تک جاتی تھی۔ وہ جو اُن کے آگے چل رہا تھا، یقیناً مشکوک آدمی تھا۔

''آؤ بچی!'' اس نے کوزیت سے کہا؛ اور انھوں نے جلدی سے Pontoise اسٹریٹ کو چھوڑ دیا۔

ژاں ولژاں نے ایک چکر لگایا، دونوں Patriarches گلی میں مڑے جو اس وقت بند تھی l'Epee-de-Bois اسٹریٹ اور l'Arbalete اسٹریٹ پر چلتے رہے اور Postes اسٹریٹ میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں سڑکوں کے چوراہے پر ایک مربع سا بن گیا تھا، آج جس جگہ College Rollin واقع ہے، اور جہاں سے Neuve-Sainte-Genevieve اسٹریٹ مڑ جاتی ہے۔ بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ Neuve-Sainte-Genevieve اسٹریٹ ایک قدیم سڑک ہے اور یہ بھی کہ ڈاک لے جانے والی گاڑی Poistes اسٹریٹ سے دس سال میں ایک بار بھی نہیں گزرتی۔ انیسویں صدی میں اس سڑک پر کمہار رہا کرتے تھے۔ اس کا اصل نام Rue des Pots اسٹریٹ ہے۔

چاند خلا میں اپنی نیلی روشنی پھیلا رہا تھا۔ ژاں ولژاں ایک دروازے کی گزرگاہ میں گھات لگا کر بیٹھ گیا، کہ اگر لوگ اب بھی اس کا پیچھا کر رہے ہیں تو جوں ہی وہ اس روشن جگہ سے گزریں گے، وہ ان کا چہرہ دیکھ لے گا۔

ابھی تین منٹ گزرے تھے کہ وہ لوگ آ پہنچے۔ اب وہ چار آدمی تھے۔ سب کے سب قد آور، لمبے لمبے بادامی رنگ کے کوٹ میں ملبوس، گول گول ہیٹ پہنے اور ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے ہوئے تھے۔ ان کے بھاری بھرکم جثے اور بڑی بڑی مٹھیاں اندھیرے سے گزرتے ہوئے مکروہ قدموں سے کم خوف ناک نہیں تھیں۔ ان کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ بورژوا بھیس میں یہ چار عفریت تھے۔

وہ لوگ اسی جگہ پہنچ کر ایک گروہ کی صورت رُک کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں تذبذب کی کیفیت دیکھی جا سکتی تھی۔ ان میں سے ایک، جو اُن کا رہنما معلوم ہوتا تھا، تیزی سے مڑا اور اُس جانب اشارہ کیا جہاں ژاں ولژاں پوشیدہ تھا؛ دوسرا خاصے ضدی انداز میں دوسری جانب اشارہ کر رہا تھا۔ تین اس وقت جب پہلا آدمی مڑا تھا، چاندنی اس کے پورے چہرے پر پڑی تھی۔ ژاں ولژاں نے جاویر کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

D'Austerlitz میں موجود گاڑیاں

ژاں ولژاں کے لیے بے یقینی کی کیفیت ختم ہونے والی تھی، خوش قسمتی کہ ان آدمیوں کی اب بھی باقی تھی۔ ژاں ولژاں نے ان کے تذبذب سے فائدہ اٹھایا۔ ان لوگوں کے لیے وقت گزر گیا تھا، جب کہ اس کے لیے اب بھی باقی تھا۔ وہ اس پھاٹک سے کھسک گیا جہاں اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا، اور Poistes اسٹریٹ سے ہوتا ہوا Jardin des Plantes کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوزیٹ کو تھکن شروع ہو گئی تھی۔ ژاں ولژاں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور چل پڑا۔ اس وقت وہاں راہ گیر نہیں تھے اور چاندنی ہونے کی وجہ سے سڑک کی روشنیاں جلائی نہیں گئی تھیں۔

اس نے اپنی رفتار دگنی کر دی تھی۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ Goble برتن سازی کے کارخانے پہنچ گیا تھا، جس کے سامنے چاندنی نے ایک قدیم کندہ کاری کو وضاحت سے اُجاگر کر دیا تھا:

> De Goblet fils c'est ici la fabrique;[14]
> Venez choisir des cruches et des broos,
> Des pots a fleurs, des tuyaux, de la brique.
> A tout venant le Coeur vend des Carreaux.

اس نے Clef اسٹریٹ کو نظر انداز کر دیا، اس کے بعد Fountain Saint-Victor، اور پھر Jardin des Plantes کے اطراف سے ہوتا ہوا، ذیلی گلیوں کے ذریعے گودی تک پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس ہوا۔ گودی سنسان تھی۔ گلیاں سنسان تھیں۔ اس کے عقب

میں کوئی نہیں تھا۔اس نے سکھ کا سانس لیا۔

وہ Pont d'Austerlitz پہنچ گیا۔

اس زمانے میں بھی وہاں محصول لیا جاتا تھا۔

وہ محصول کے دفتر کے سامنے پہنچا اور ایک سو ادا کر دیا۔

''محصول چار سو ہے۔'' پُل کے منتظم نے کہا،'' آپ کے ساتھ ایک بچی ہے جو چل سکتی ہے۔آپ کو دو افراد کے محصول ادا کرنے ہوں گے۔''

اس نے محصول ادا کر دیا، اور ناراضگی کا اظہار کیا کہ اس کے سفر پر توجہ دی جانی چاہیے تھی۔

ایک بھاری گاڑی بھی اسی کی طرح دریائے سین پر سے گزر رہی تھی، اور اسی کی طرح دائیں کنارے پر جانے والی تھی۔یہ اس کے کام آسکتی تھی۔وہ اس گاڑی کے سایے میں پل پار سکتا تھا۔

پُل کے وسط میں، کوزیٹ، جس کے پاؤں سُن ہو چکے تھے، پیدل چلنا چاہتی تھی۔اس نے لڑکی کو زمین پر اتار دیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پُل کے پار کرتے ہی اسے عمارتی لکڑی کی کچھ دکانیں دکھائی دیں۔وہ ان ہی کی طرف مڑ گیا۔ان تک پہنچنے کے لیے اسے خاصی بڑی غیر محفوظ اور روشن کی گئی جگہ کا خطرہ مول لینا پڑا تھا۔اس نے تامل نہیں کیا۔وہ جو اس کے پیچھے لگے تھے بظاہر راستہ بھٹک گئے تھے، اور ژاں ولژاں خود کو خطرے سے باہر محسوس کر رہا تھا۔شکار کیا جا رہا تھا، ہاں؛ پیچھا کیا جا رہا تھا، نہیں۔

ایک چھوٹی سی سڑک Chemin-Vert-Saint-Antoine لکڑی کے دو کارخانوں کے درمیان سے نکلتی تھی۔یہ سڑک اندھیری اور تنگ تھی؛ ایسا لگتا تھا کہ خاص کر اسی کے لیے بنائی گئی تھی۔اس میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنے عقب پر ایک نظر ڈال لی تھی۔

اس نقطے سے جہاں وہ کھڑا تھا، وہ پورے Pont d'Austerlitz کو دیکھ سکتا تھا۔

عین اس وقت چار سایے پُل پر چڑھ رہے تھے۔

ان سایوں کی پشت Jardin des Plantes کی طرف تھی اور وہ دائیں کنارے کی طرف جانے والے تھے۔

وہ چار سایے دراصل چار مرد تھے۔

ژاں ولژاں اس وحشی درندے کی طرح کانپ گیا تھا جسے پکڑ لیا گیا ہو۔

اس کے لیے ایک امید باقی تھی؛ کہ وہ لوگ پُل پر چڑھے نہ ہوتے اور کوزیٹ کا ہاتھ پکڑے اسے اس بڑی روشن جگہ سے گزرتے دیکھ نہ پاتے۔

ایسی صورت میں سامنے کی چھوٹی سے سڑک میں داخل ہو کر وہ لکڑی کی دکانوں، دلدلوں، بازاری باغوں، غیر آباد زمینوں تک پہنچ پاتا جن پر تعمیرات نہیں کی گئی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہوا گویا اسے اسی سنسان سڑک کو اختیار کرنا پڑے گا۔

اور، وہ اسی سڑک پر چل پڑا۔

۞

پیرس کا نقشہ 1727ء میں

مزید تین سو قدم اور وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سڑک ایک دو شاخے میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ اس ایک سڑک سے دو سڑکیں بن گئی تھیں، ترچھی لکیر کی طرح آگے بڑھ گئی تھیں، ایک دائیں جانب اور دوسری بائیں جانب۔

ژاں ولژاں کے سامنے انگریزی حرف Y جیسا نقشہ تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کون سی سڑک منتخب کی جائے؟ اس نے تامل نہیں کیا، مگر وہ سڑک لی جو دائیں جانب جاتی تھی۔

کیوں؟

اس لیے کہ بائیں جانب والی سڑک مضافات کی طرف جاتی تھی، یعنی آباد علاقوں کی طرف، اور دائیں جانب والی شاخ کھلے میدانوں کی طرف جاتی تھی، یعنی، سنسان علاقوں کی طرف۔

پھر بھی، اب وہ تیز نہیں چل رہے تھے۔ کوزیت کی رفتار نے ژاں ولژاں کو سست کر دیا تھا۔

ژاں ولژاں اسے پھر اپنے کاندھے پر لاد کر چلنے لگا؛ کوزیت بالکل خاموش تھی۔

وہ بار بار مڑتا اور اپنے پیچھے کی طرف دیکھتا اور سڑک کے اندھیرے کنارے کی طرف رہنے کی کوشش کرتا۔ اس کے پیچھے سڑک بالکل سیدھی تھی۔ پہلے دو تین بار مڑا تھا مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ سناٹا گہرا تھا؛ اس نے اپنا سفر قدرے اطمینان سے جاری رکھا۔ پھر اچانک مڑتے ہوئے، اسے محسوس ہوا گویا اس نے سڑک کے اس حصے پر کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھ لیا ہے، بہت فاصلے پر، دھند میں، جہاں سے وہ گزر چکا تھا۔

وہ بغیر سمجھے بوجھے آگے کی طرف چلنے کے بجائے تیزی سے بڑھا، اس امید پر کہ کوئی بغلی گلی مل جائے گی، جس سے وہ فرار ہو سکے گا، اور اس طرح ایک بار پھر اپنا سراغ ختم کر سکے گا۔

اب اس کے سامنے ایک دیوار آ گئی تھی۔
مگر، یہ دیوار اس کی مزید پیش رفت روک نہیں سکی؛ یہ دیوار اس سڑک کے کنارے تھی جو ایک سڑک کو عرضاً کاٹ رہی تھی۔ ان میں سے جو سڑک اس نے منتخب کی تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔
ایک بار پھر اسے فیصلہ کرنا تھا؛ وہ دائیں طرف جائے یا بائیں طرف۔
اس نے دائیں جانب نظر ڈالی۔ جگہ جگہ سے گلی سڑک کے درمیان طویل عمارتیں تھی، جن میں یا تو شیڈ تھے یا زرعی باڑے تھے؛ اس کے بعد یہ ایک اندھی گلی پر ختم ہو جاتی تھی۔ اندھی گلی کا اختتام صاف نظر آ رہا تھا— یعنی، ایک اونچی سفید دیوار!
اس نے بائیں جانب نظر ڈالی۔ اس طرف کی گلی کھلی تھی، اور تقریباً دو سو قدم آگے جا کر، ایک سڑک سے مل جاتی تھی جس پر تو نگری تھی۔ اس جانب تحفظ تھا۔
اس وقت جب ژاں ولژاں بائیں جانب مڑنے پر غور کر رہا تھا، تا کہ اس سڑک تک پہنچ سکے جسے اس نے گلی کے آخر میں دیکھا تھا، اسے اس گلی اور سڑک کے کونے پر، جس کی جانب وہ اپنا قدم بڑھانے والا تھا، ایک غیر متحرک، سیاہ رنگ کا مجسمہ سا نظر آیا۔
دراصل وہ کوئی آدمی تھا، بظاہر جسے وہاں تعینات کیا گیا تھا اور وہی راستے کو تنگ کر رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا۔
ژاں ولژاں پسپا ہو گیا۔
پیرس کا وہ مقام ژاں ولژاں نے جہاں خود کو پایا تھا، پیرس کی مضافاتی بستی Saint-Antoine اور la Rapee کے درمیان تھا۔ حالیہ ترقیات نے جس کی اوپر سے نیچے تک قلب ماہیت کر دی تھی— بہت سے لوگوں کے نزدیک خرابی پر منتج ہوئی تھی، جب کہ کچھ لوگ اس کو شکل کی تبدیلی کہتے تھے۔ مقامی ضروریات کی کھیتیاں، تعمیری لکڑیوں کے کارخانے اور پرانی عمارتیں مسمار کر دی گئی تھیں۔ اب وہاں بالکل نئی بغلی سڑکیں، تھیٹر، سرکس، گھڑ دوڑ کے میدان، ریلوے اسٹیشن تھے اور ایک قید خانہ تھا؛ قاری کے نزدیک وہ ترقیات اپنے تریاق کے ساتھ موجود تھیں۔
نصف صدی قبل، اس عام اور ہر دلعزیز زبان میں، جو ہر قسم کی روایات کا مرکب ہے، جو Institut les Quatre-Nations اور Opera-Comique Feydeau کو ٹھیک جگہ کہنے پر اصرار کرتی تھی، وہی جگہ تھی جہاں ژاں ولژاں پہنچا تھا اور وہ Petit Picpus کہلاتی تھی۔ The Porte Saint-Jacques, the Porte Paris, the

Porcherons, la Galiote, les Celestins, Barriere des Sergents, les Capucins, le Mail, la Bourbe, l'Arbre de Cracovie, la Petite-Pologne وغیرہ قدیم پیرس کے وہ نام ہیں جو نئے ناموں کے درمیان بچ رہے ہیں۔عوام کی یادداشت ماضی کی ان یادگار رنگینیوں پر منڈلاتی رہتی ہے۔

Le Petit-Picpus، جس کا شاید ہی کبھی وجود رہا ہو، اوراگر تھا تو کسی علاقے کے خاکے سے زیادہ نہیں رہا ہوگا، ہسپانوی شہروں کی خانقاہوں جیسا تھا۔ پختہ سڑکیں زیادہ نہیں تھیں؛ گلیوں کے اطراف مکان نہیں تھے۔ دو یا تین سڑکوں کے علاوہ، ہم جن کے بارے میں بات کریں گے، سب کچھ دیوار تھا اور تنہائی تھی۔ نہ کوئی دکان، نہ کوئی گاڑی تھی، کھڑکیوں میں اِکا دُکا موم بتیاں جلتی ہوتی تھیں؛ رات کے دس بجنے کے بعد ساری روشنیاں گُل کردی جاتی تھیں۔ باغات، خانقاہیں، تعمیری لکڑی کے کارخانے، دلدل؛ اتفاقیہ ملنے والی کمتر درجے کی قیام گاہیں اور عظیم دیواریں، مکانوں جیسی اونچی ہوتی تھیں۔

پچھلی صدی کے علاقے ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ انقلاب نے ان کو اچھی طرح صاف کردیا تھا۔ جمہوری حکومت نے ان کو منہدم کیا اور کم کردیا تھا۔ کوڑے ڈالنے کی جگہیں بنادی گئی تھیں؛ تمیں برس قبل، یہ علاقہ نئی تعمیرات کے عمل کے ذریعے مٹایا جا رہا تھا۔ آج اس کا بالکل صفایا ہو چکا ہے۔ Petit-Picpus کی، جس کے کسی منصوبے کا نشان نہیں ملتا، 1727ء کے نقشے میں کافی وضاحت کی گئی ہے، جسے Rue Saint Jacques Denis Thiery, سے؛ اور Lyons میں Jean Girin, Rue Merciere, Prudence سے شائع کیا گیا ہے۔جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے Petit-Picpus میں سڑکوں کا ایک Y بنایا گیا تھا جو دو شاخہ ہے، جس کے بائیں حصے کا نام Little Picpus Street ہے، دائیں جانب کے حصے کا نام Polonceau اسٹریٹ ہے۔ Y کی دو اوپری شاخیں ایک خط سے ملادی گئی ہیں؛ اس خط کو Droit-Mur اسٹریٹ کا نام دیا گیا ہے۔ Polonceau اسٹریٹ اسی جگہ پر ختم ہو گئی تھی؛ Petit-Picpus اسٹریٹ آگے بڑھ گئی تھی، اور Lenoir بازار کی جانب پہنچی ہو گئی تھی۔[دریائے] سین کی طرف سے آنے والا Polonceau اسٹریٹ کے آخری حصے پر پہنچ جاتا تھا، اور اس کے دائیں ہاتھ Droitur اسٹریٹ ہوا کرتی تھی، جو ایک قائمہ زاویے پر مڑتی تھی، اور اس کے سامنے اس سڑک کی دیوار ہوتی تھی، اوراس کی دائیں جانب Droit-Mur اسٹریٹ کا ایک کٹا ہوا حصہ ہوتا تھا، جس سے کوئی راستہ نہیں نکلتا تھا اور اس کو بند

گلی Genrot کہا جاتا تھا۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں ژاں ولژاں کھڑا تھا۔

جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، Droit-Mur اسٹریٹ اور Petit-Picpus اسٹریٹ کے ایک زاویے پر کھڑے اس سیاہ ہیولے کو دیکھتے ہی ژاں ولژاں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بھوت اس کے انتظار میں تھا۔

اب اسے کیا کرنا تھا؟

پسپا ہونے کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ جس کو اس نے ایک لمحہ قبل، دور اندھیرے میں حرکت کرتے دیکھا تھا، بلا شبہ اپنے ساتھیوں سمیت جاویر ہی تھا۔ جس سڑک کی ابتدا پر وہ پہلے ہی سے موجود تھا، اسی کے آخری سرے پر ژاں ولژاں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جاویر اس بھول بھلیاں سے واقف تھا اور اس نے احتیاط کے خیال سے اپنے آدمیوں میں سے ایک کو نکلنے کے راستے پر متعین کر دیا تھا۔ یہ اندازے، جو ثبوت سے اتنے قریب تھے، ژاں ولژاں کے غمگین دماغ میں اچانک ہوا کے جھونکے میں مٹھی بھر گرد کی مانند گھوم گئے تھے۔ اس نے Genrot کا معائنہ کیا؛ وہاں سے وہ جا نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے Petit-Picpus کا معائنہ کیا؛ وہاں ایک پہرے دار کھڑا تھا۔ اس نے سفید راستے پر اس سیاہ پیکر کو کھڑے دیکھ لیا تھا، جس پر چاندنی پڑ رہی تھی؛ آگے بڑھنے کا مطلب اس آدمی کے ہاتھ لگ جانا تھا؛ پسپا ہونے کا مطلب خود کو جاویر کے بازوؤں میں ڈال دینا تھا۔ ژاں ولژاں اب خود کو ایک جال میں پھنسا محسوس کر رہا تھا، جو آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے مایوسی سے آسمان کی طرف نظر کی۔

۞

فرار کی مشکلات

آگے جو کچھ آنے والا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ Droit-Mur نامی گلی کا صحیح تعین کیا جائے، اور بالخصوص اس زاویے کا جو بائیں جانب رہ جاتا ہے، جب آپ Polonceau اسٹریٹ سے نکل کر اس گلی میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ گلی دائیں جانب، Petit-Picpus اسٹریٹ تک، تقریباً مکانوں کے مکمل طور پر حصار میں تھی۔ بائیں جانب ایک تنہا عمارت تھی جس کے خطوط شدید تھے، جو کئی حصوں پر مشتمل تھی جو Petit-Picpus اسٹریٹ کی جانب رفتہ رفتہ ایک یا دو منزل بڑھتی جا رہی تھی۔ اس طرح یہ عمارت جو Petit-Picpus اسٹریٹ کی جانب بہت بلند تھی، Polonceau اسٹریٹ کے قریب جا کر کافی نیچی ہو جاتی تھی۔ وہاں، اس زاویے پر ہم جس کے بارے میں بات کر چکے ہیں، وہ اس حد تک نیچی ہو جاتی تھی کہ محض ایک دیوار سی ہو جاتی تھی۔ یہ دیوار براہِ راست سڑک سے ملحق نہیں تھی؛ یہ پیچھا ہوتی ہوئی، ایک جوف سی بن جاتی تھی، جو دونوں کونوں سے مشاہدہ کرنے والے دو افراد سے چھپ جاتی تھی، جن میں سے ایک Polonceau اسٹریٹ پر اور دوسرا Droit-Mur اسٹریٹ ہو سکتا تھا۔

جوف کے ان زاویوں سے شروع ہو کر، وہ دیوار Polonceau اسٹریٹ تک جاتی تھی، اس جگہ تک جہاں ایک مکان تھا، جس پر 49 لکھا ہوا تھا، اور اس کے ساتھ Droit-Mur اسٹریٹ تک جہاں اس عمارت کا حصہ بہت چھوٹا تھا۔ اس طرح سڑک پر پیچھا ہوتا ہوا زاویہ، دیوار کا ایک تکون سا بن گیا تھا۔ اس تکون کے پہلو دھندلے تھے؛ ان میں سے صرف ایک پہلو نظر آتا تھا، یا سچ کہا جائے تو جست کی چادروں سے بنے دو شگر اس کو مستقل طور پر ڈھانپے رکھتے تھے۔

ان جگہوں کی حالت ہم جن کو اس وقت بیان کر رہے ہیں، بالکل صحیح ہے، اور یقینی طور

پر اس علاقے کے لوگوں کی مخصوص یادداشت کو جگا دے گی۔

یہ جوف پوری طرح ایک شے سے بھرا ہوا تھا جو ایک بڑے خستہ دروازے سے مشابہ تھا؛ یہ عمودی تختوں سے تیار کی ہوئی، ایک وسیع، بے ہیئت تشکیل تھی، جس کے اوپری تختے نیچے والے تختوں سے چوڑے تھے، جنھیں ایک آہنی پٹی سے یک جا کر دیا گیا تھا۔ ایک جانب گاڑیوں کے لیے معمولی نوعیت کا پھاٹک تھا، جو بظاہر پچاس سے زیادہ برس کا نہیں تھا۔

جوف کے اوپر سے ٹرشی کا ایک درخت اپنی کلغی دکھا رہا تھا، اور Polonceau اسٹریٹ کی جانب دیوار پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔

درپیش خطرے کے پیش نظر، اس وقت ژاں ولژاں جس میں تھا، یہ تاریک، ویران اور تنہا نظر آنے والی عمارت اُسے اُکسا رہی تھی۔ اس نے تیزی سے اس عمارت پر اپنی نظر دوڑائی؛ اور خود سے کہا کہ اگر وہ اس میں کسی طرح داخل ہو جائے تو وہ خود کو بچا سکتا ہے۔ اُمید کرنے سے پہلے اس نے ایک طریقہ سوچ لیا۔

Droit-Mur اسٹریٹ کی جانب، اس عمارت کے مرکزی حصے میں مختلف منزلوں پر کھڑکیاں اور جست کے بنے، قدیم ٹنکیوں کے پائپ لگے ہوئے تھے۔ مرکزی پائپ سے نکل کر تمام ہودوں میں جانے والی مختلف شاخیں سامنے سے ایک پیڑ کا سا خاکہ پیش کرتی تھیں۔ ان میں لگے سیکڑوں موڑ، پتوں سے ماورا، انگور کی قدیم بیلوں کی نقل تھے جو زرعی باڑوں کے صدر دروازوں سے چمٹی ہوا کرتی ہیں۔

فولاد اور سیسے سے بنی شاخوں پر مشتمل یہ نرالا نمائش، پہلی چیز تھی جس نے ژاں ولژاں کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ اس نے کوزیت کو پتھر کے ایک ستون سے لگا کر بٹھا دیا، اور خاموش رہنے کا حکم دے کر اس مقام کی طرف دوڑا جہاں وہ پائپ پختہ راستے سے نکل رہا تھا۔ شاید اس پر چڑھنے اور اس کے ذریعے عمارت کے اندر داخل ہونے کا کوئی طریقہ تھا۔ مگر پائپ خستہ اور ازکار رفتہ، مشکل سے اپنے بندھنوں سے پیوستہ تھا۔ اس کے علاوہ، اس خاموش عمارت کی ساری کھڑکیوں، بلکہ چھت میں بنی دو چھتی کی کھڑکیوں تک میں، لوہے کے چھڑوں سے بنی بھاری بھاری جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ عمارت کے چہرے پر چاندنی بکھری ہوئی تھی، اور وہ آدمی جو سڑک کے کونے پر نگہداری کر رہا تھا، ژاں ولژاں کو چڑھتے دیکھ لیتا۔ اس کے علاوہ کوزیت کے ساتھ کیا کیا جاتا؟ اس تین منزلہ عمارت کے اوپر اسے کس طرح لے جایا جاتا؟

اس نے پائپ پر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا، اور دیوار کے کنارے رینگتا ہوا Rue

Polonceau اسٹریٹ کی طرف واپس جانے لگا۔

وہ دیوار کی ڈھلان تک پہنچا، جہاں کوزیٹ کو چھوڑا تھا تو اسے احساس ہوا کہ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم ابھی تشریح کر چکے ہیں، وہ تمام آنکھوں سے پوشیدہ تھا، خواہ وہ کسی طرف سے آگے بڑھ رہی ہوں؛ اس کے علاوہ وہ سایے میں بھی تھا۔ بالآخر، وہاں دو دروازے تھے؛ شاید انھیں زبردستی کھول کر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ وہ اس دیوار کی آڑ میں، جس کے اوپر سے درخت کی کلغی نظر آئی تھی اور بظاہر عشق پیچاں کی بیل اس باغیچے سے مل رہی تھی، کم از کم وہ خود کو چھپا سکتا تھا اور باقی رات وہیں بسر کر سکتا تھا، حالاں کہ وہاں درختوں پر ابھی پتیاں نہیں آئی تھیں۔

وقت گزرتا جا رہا تھا؛ اس کو جلد کوئی قدم اٹھانا تھا۔

اس نے گاڑی کے پھاٹک کو اوپر نیچے چھو کر دیکھا، اور فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس کے ذریعے باہر سے اندر جانا ناقابلِ عمل تھا۔

اب اس نے دوسرے دروازے کو زیادہ امید سے آزمایا؛ وہ خوف ناک حد تک خستہ حال تھا؛ اس کے بڑے حجم نے اس کو زیادہ مخدوش بنا دیا تھا۔ تختے دیمک خوردہ تھے؛ آہنی پٹیاں — جو صرف تین عدد تھیں — زنگ آلودہ تھیں۔ ایسا محسوس ہوا گویا اس دیمک خوردہ رکاوٹ میں سوراخ بنایا جا سکتا تھا۔

اس کے معائنے سے معلوم ہوا کہ وہ دروازہ، دراصل دروازہ نہیں تھا؛ صرف آہنی پٹیاں ایک طرف سے دوسری طرف بغیر کسی شگاف کے لگائی گئی تھیں۔ تختوں کی درزوں سے جھانکتے ہوئے اسے ناتراشیدہ پتھروں کی سلیں اور ٹکڑے نظر آئے جنھیں بے ڈھنگے پن سے سیمنٹ سے جوڑا گیا تھا، دس برس پہلے جنھیں راہگیروں نے ضرور دیکھا ہوگا۔ اسے یہ دیکھ کر خوف بھی آیا اور حیرانی بھی ہوئی کہ یہ بظاہر دروازہ اس عمارت کی محض چوبی زینت تھا، جس میں اسے نصب کیا گیا تھا۔ اس میں سے ایک تختہ آسانی سے نکالا جا سکتا تھا؛ مگر پھر داخل ہونے والے کا ایک دیوار سے سامنا ہوتا۔

۞

گیس لالٹین کے نیچے

عین اس وقت کچھ فاصلے سے نپی تُلی اور بھاری آواز آتی سنائی دی۔ ژاں ولژاں نے سڑک کے کنارے جا کر دیکھنے کا خطرہ مول لیا۔ سات یا آٹھ سپاہی ایک پلٹن کی صورت Polonceau اسٹریٹ میں گھس آئے تھے۔ اُسے سنگینوں کی چمک بھی دکھائی دی۔ وہ اسی کی جانب بڑھ رہے تھے؛ یہ سپاہی جن کے آگے اسے جاویر کی قد آور شخصیت صاف نظر آ رہی تھی، آہستگی اور احتیاط سے بڑھ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ رُک جاتے تھے؛ صاف ظاہر ہے کہ وہ ہر دیوار کے کونے کھدرے کی، اور تمام دروازوں اور تنگ گلیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔

یہ کوئی گشتی گروہ تھا، جاویر کی جس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی — اس قیاس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی — اور اس نے ان سے مدد طلب کر لی تھی۔

جاویر کے دو خدمت گار اپنے عہدوں کے حساب سے مارچ میں شامل تھے۔

جس طرح سے وہ مارچ کر رہے تھے، اور بار بار رُکنے سے پڑنے والے خلل کے حساب سے، انھیں اس جگہ تک پہنچنے میں کم از کم ایک چوتھائی گھنٹا لگنے والا تھا جہاں ژاں ولژاں کھڑا تھا۔ یہ ایک خوف ناک لمحہ تھا۔ ژاں ولژاں اور اس خوف ناک اور تباہ کن لمحے کے درمیان صرف چند منٹ تھے۔ تیسری بار خطرہ اس کے سامنے منھ کھولے کھڑا تھا۔ اب قید خانے کا مطلب قید خانہ ہی تھا، مگر کوزیٹ اب ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ تھی؛ اس کا مطلب ایسی زندگی تھی جو کسی مزار کے اندرون سے مشابہ ہونے والی تھی۔

اب صرف ایک ہی بات ممکن تھی۔

ژاں ولژاں کی ایک خصوصیت تھی کہ وہ بھکاری کے دو سُوے ہمیشہ ساتھ لیے پھرتا

تھا: ایک میں وہ اپنے صوفیانہ خیالات رکھتا تھا؛ دوسرے میں سزا یافتہ کی دہشت انگیز صلاحیتیں۔حالات کی مناسبت سے وہ دونوں میں سے کچھ نہ کچھ نکال لیا کرتا تھا۔

Toulon کے قید خانے سے کئی بار فرار ہونے کے طفیل بہ وقتِ ضرورت، وہ اپنی عضلاتی قوت کے بل پر، بغیر سیڑھی کے اوپر چڑھ جانے کا، اپنی گدی، اپنے کاندھوں، اپنی کمر اور اپنے گھٹنوں کے سہارے، عمودی دیوار پر، چھ منزلہ عمارت پر چڑھ سکتا تھا۔ اسی فن نے Conciergerie of Paris کے مشہور قید خانے کی دیوار کے اس کونے کو شہرت دی تھی، جہاں سے سزائے موت پانے والا مجرم Battemolle بیس برس قبل فرار ہو گیا تھا۔

ژاں ولژاں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس دیوار کو ناپ لیا تھا جس پر سے اس نے ترشی کے درخت کی کلغی کو دیکھا تھا۔دیوار کی بلندی تقریباً اٹھارہ فٹ رہی ہوگی۔جس زاویے سے یہ دیوار بنائی گئی تھی، اس سے ایک ایسا کونا بن گیا تھا جسے اگر بھر نہ دیا گیا ہوتا تو وہ گندی مخلوق جس کو راہ گیر کہتے ہیں اس کو اپنے کوڑے کرکٹ سے بھر دیا کرتی ۔پیرس میں دیوار کے کونوں کو بھرنے کی روایت عام ہے۔

بھرے کونے کا یہ ڈھیر اندازاً پانچ فٹ بلند رہا ہوگا؛ اس کے اوپری حصے کی بلندی، جس پر اس وقت چڑھنا ضروری تھا، چودہ فٹ سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔

اس دیوار پر پتھر کی ایک سپاٹ سِل رکھی ہوئی تھی، جس پر منڈیر نہیں تھی۔

سب سے بڑی مشکل کوزیٹ تھی، اس لیے کہ وہ دیوار چڑھنا نہیں جانتی تھی۔تو کیا وہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لے؟ ژاں ولژاں نے ایک بار بھی اس موضوع پر نہیں سوچا ۔مگر اس کو ساتھ لے جانا ناممکن ہو گیا تھا۔اس قسم کی غیر معمولی چڑھائیوں کو کامیابی سے سر کرنے کے لیے آدمی کو پوری قوت درکار ہوتی ہے۔بہت کم بوجھ بھی اس کے مرکزِ ثقل میں خلل ڈال کر اسے نیچے کی طرف کھینچ کر گرا دے گا۔

اسے ایک رسّی درکار ہوگی؛ ژاں ولژاں کے پاس رسّی نہیں تھی۔آدھی رات کو اسے Polonceau اسٹریٹ میں رسی کہاں سے مل سکتی تھی۔اگر ژاں ولژاں بادشاہ ہوتا تو اس وقت ایک رسی کے عوض وہ اپنی بادشاہت تک دے دیتا۔ہر قسم کے شدید حالات میں بجلی جیسے جھماکے ہوتے ہیں جو کبھی چندھیاتے ہیں اور کبھی ہمیں روشن کر دیتے ہیں۔

ژاں ولژاں کی نا امید نگاہ اندھی گلی Genrot کی سرکاری لالٹین کے کھمبے پر پڑی۔

اس زمانے میں پیرس کی سڑکوں پر گیس جیٹ [گیس کو روشن کرنے والے شعلے] نہیں

ہوتے تھے۔شام ہوتے ہی برابر برابر فاصلے پر ٹنگی لالٹینیں روشن کی جاتی تھیں۔ انھیں رسی کے ذریعے اوپر نیچے کیا جاتا تھا۔ رسی، سڑک پر ایک جانب سے دوسری جانب لے جائی جاتی تھی اور کھمبے میں بنی جھری میں لپیٹ دی جاتی۔ جس گراری پر رسی چلتی تھی وہ لالٹین کے نیچے ایک آہنی ڈبے میں ہوتی تھی، جس کی کنجی لالٹین جلانے پر مامور آدمی کے پاس ہوتی تھی، اور خود رسی بھی دھات سے بنے ایک ڈبے میں محفوظ کی جاتی تھی۔

ژاں ولژاں اپنی اعلیٰ جدوجہد کی طاقت سے ایک ہی چھلانگ میں بند گلی میں داخل ہوگیا تھا، اس نے ایک چھوٹے سے ڈبے کو چاقو کی نوک سے توڑا۔ اب اس کے پاس ایک رسی تھی، اور وہ ایک بار پھر کوزیٹ کے پاس تھا۔ ضروریات ایجاد کرنے والے جب کسی ناگہانی کے خلاف جنگ میں ہوتے ہیں تو تیزی سے کام کرتے ہیں۔

ہم پہلے ہی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس رات لالٹینیں روشن نہیں کی گئی تھیں۔ اس طرح بند گلی Genrot کی لالٹین فطری طور پر، بقیہ سڑکوں کی طرح غائب تھی؛ آپ براہِ راست اس کے نیچے سے گزر سکتے تھے اور آپ کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ لالٹینیں اپنی جگہ پر موجود نہیں تھیں۔

پھر بھی، وہ وقت، وہ جگہ، وہ اندھیرا، ژاں ولژاں کی مصروفیت، اس کی غیر معمولی حرکات نے اور اس کے اس طرح آنے جانے نے کوزیٹ کو پریشان کردیا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور بچی ہوتی تو بہت پہلے ہی چیخنا شروع کردیتی۔ کوزیٹ، صرف ژاں ولژاں کے کوٹ کی اسکرٹ کو نوچنے لگی تھی۔ گشت کرنے والوں کے آنے کی آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی، جسے وہ صاف سن سکتے تھے۔

"بابا!" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ سامنے سے کون آرہا ہے؟"

"ششش" اس بدقسمت انسان نے جواب میں کہا، "مادام تِن آردیے آرہی ہے۔"

کوزیٹ خوف سے تھرا گئی۔ ژاں ولژاں نے جواب میں مزید اضافہ کیا، "بولو نہیں، میرے معاملے میں دخل نہ دو۔ اگر تم چیخیں، اگر تم روئیں، تو یاد رکھو مادام تِن آردیے تمھارے انتظار میں ہے۔ وہ تمھیں واپس لے جانے کے لیے آرہی ہے۔"

اس کے بعد، بڑے آرام سے، کسی غیر ضروری حرکت کے بغیر اور باقاعدگی کے ساتھ جو اس وقت غیر معمولی ہوتی جارہی تھی، جب گشت والے اور جاویر کسی بھی لمحے اس کو آلینے والے تھے، اس نے اپنا گلوبند کھولا، اس کو کوزیٹ کی بغلوں کے نیچے سے نکالتے ہوئے، اس کے جسم سے باندھ دیا، اس احتیاط کے ساتھ کہ یہ بچی کو تکلیف نہ دے، اور گلوبند کے ایک سرے کو مضبوطی سے رسی سے، ایسی گرہ سے باندھا جسے ملاح "swallow knot." کہتے ہیں، اور رسی کے

دوسرے سرے کو اپنے دانت سے پکڑا، اپنے جوتے اور موزے اتارے اور دیوار کی دوسری جانب پھینک دیے، تعمیری سامان کے ڈھیر پر قدم جمائے، اور اپنے آپ کو دیوار کے اور کونے کے زاویے سے اس طرح بلند کرنا شروع کیا گویا اس کے پیروں اور کہنیوں کے نیچے سیڑھی کے قدمچے ہوں۔ ابھی نصف منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ دیوار پر بیٹھا سستا رہا تھا۔

کوزیٹ، ایک لفظ بھی کہے بغیر، اسے احمقانہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ژاں ولژاں کے حکم اور مادام تن آردیے کے نام نے اس کا خون سرد کردیا تھا۔

اچانک اسے ژاں ولژاں کی دھیمے لہجے میں چیختی آواز سنائی دی، "اپنی پشت دیوار سے لگا لو۔"

اس نے فرماں برداری کی۔

"بالکل خاموش رہنا، اور گھبرانا نہیں۔" ژاں ولژاں نے مزید کہا۔

اور اسے اپنا وجود زمین سے بلند ہوتا محسوس ہوا۔

قبل اس کے کہ اس کے ہوش و حواس درست ہوتے، وہ دیوار کے اوپر تھی۔

ژاں ولژاں نے اسے اپنی گرفت میں لیا، اپنی پیٹھ پر لادا، اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لیے، پیٹ کے بل لیٹ گیا، اور دیوار کے اوپر رینگتا ہوا ڈھلان تک گیا۔ جیسا کہ اس کا قیاس تھا، سامنے ایک عمارت تھی جس کی چھت چوبی رکاوٹ کے اوپر سے شروع ہوئی تھی اور زمین سے ذرا فاصلے پر ختم ہوتی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سڑک کی جانب کے مقابلے میں اس طرف دیوار بہت اونچی تھی۔ ژاں ولژاں صرف اپنے نیچے کی گہرائی کی زمین دیکھ سکتا تھا۔

ابھی وہ رینگتا ہوا چھت کی ڈھلان تک ہی پہنچا تھا، اور دیوار کی چوٹی چھوڑ نہیں پایا تھا، کہ ایک تند شور نے گشت والوں کی آمد کا اعلان کردیا۔ [اس شور میں] جاویر کی گرج دار آواز سنی جا سکتی تھی۔

"بند گلی کی تلاشی لو! Droit-Mur اسٹریٹ پر پہرا ہے۔ Petit-Picpus اسٹریٹ پر بھی پہرا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بند گلی ہی میں کہیں چھپا ہے۔"

سپاہی Genrot بند گلی کی طرف دوڑ پڑے۔

کوزیٹ کو پکڑے ہوئے، ژاں ولژاں چھت سے پھسلنے لگا تھا، تُرشی کے درخت تک پہنچا، اور اچھل کر زمین پر کود گیا۔ وہ خوف تھا یا اس کی ہمت تھی کہ کوزیٹ نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی تھی، حالاں کہ اس کے ہاتھوں پر معمولی خراش آ گئی تھی۔

۞

چیستان کی ابتدا

ژاں ولژاں نے خود کو ایسے باغیچے میں پایا جو بہت وسیع اور غیر معمولی پہلوؤں کا حامل تھا۔ یہ ایسے غم انگیز باغیچوں میں سے تھا جو شاید سردی کے موسم میں اور رات کے وقت دیکھنے کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔ باغیچہ بیضوی شکل کا تھا، جس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دو رویہ سفیدے کے درختوں سے ایک گلی سی بنی ہوئی تھی؛ کونوں میں نہایت قد آور درخت تھے؛ مرکز میں کھلی جگہ تھی، جس میں ایک بہت بڑا اور اکیلا درخت دیکھا جا سکتا تھا؛ اس کے بعد میووں کے بہت سے درخت تھے، ناہموار گتھی دار سخت بالوں جیسے پتوں کی جھاڑیاں تھیں، ترکاریوں کے تھالے تھے، خربوزے کا ایک تھالا، اور ایک قدیم کنواں تھا۔ یہاں وہاں پتھر سے بنی بنچیں رکھی ہوئی تھیں، جو سیاہ کائی جیسی دکھائی دیتی تھیں۔ راہداریوں کے کنارے تنی ہوئی چھوٹی چھوٹی بوٹیوں سے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے نصف حصے پر گھاس اُگ آئی تھی، اور بقیہ حصہ سبز رنگ کائی سے بھر گیا تھا۔

ژاں ولژاں کے بالکل قریب ایک عمارت تھی جو اترنے کے دوران اس کے کام آئی تھی۔ وہاں لکڑیوں کے تختوں کے ڈھیر تھے، اور ان ڈھیروں کے پیچھے، دیوار سے متصل، پتھر کا ایک مجسمہ تھا، جس کا ٹوٹا پھوٹا چہرہ ایک بے ہیئت نقاب کی طرح تھا جو اداسی کے ماحول میں دھندلا دکھائی دیتا تھا۔

عمارت کھنڈر بن چکی تھی، جس کے منہدم کمرے پہچانے جاتے تھے، جن میں سے ایک، جس میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا، سائبان جیسا معلوم ہوتا تھا۔

Droit-Mur اسٹریٹ کی بڑی عمارت کا ایک بازو Petit-Picpus اسٹریٹ پر

تھا، اس کے دو چہرے اس باغیچے کے بالکل سامنے تھے۔اندرونی چہرے بیرونی چہروں سے زیادہ الم ناک تھے۔تمام کھڑکیوں پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔کسی کھڑکی میں روشنی کا نام ونشان نہیں تھا۔اوپر کی منزل میں قید خانوں جیسے روشن دان تھے۔ان چہروں میں سے ایک کا سایہ دوسرے چہرے پڑتا تھا، جو باغیچے پر آ کر جنازے کی مہیب سیاہ چادر کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

اس باغیچے سے زیادہ وحشت اور تنہائی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔وہاں کوئی انسان نہیں تھا، جو وقت کے اعتبار سے بالکل فطری تھا؛ مگر ایسا نہیں لگتا تھا کہ یہ جگہ چہل قدمی کے لیے بنائی گئی تھی، دن کی روشنی میں بھی۔

ژاں ولژاں کا پہلا کام اپنے جوتے تلاش کرنا اور انھیں پہن لینا تھا، اس کے بعد کوزیٹ سمیت سائبان کے نیچے جانا تھا۔کوئی شخص جو فرار کی کیفیت میں ہو خود کو کبھی مناسب طور پر چھپا محسوس نہیں کرتا ہے۔وہ بچی جس کے ذہن پر اب بھی مادام تینارد یے چھائی تھی، جہاں تک ممکن ہوا، نظروں سے اوجھل ہونے کی اس عجلت میں شریک تھی۔

کوزیٹ کانپ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔بند گلی اور سڑک پر کی جانے والی تلاش کی ہڑبونگ اور پتھروں سے ٹکراتی بندوقوں کی نالوں کی آوازیں ان تک پہنچ رہی تھیں؛ جاویر کی پولیس کے جاسوسوں سے اپیل سے، جنھیں اس نے اس کام پر مامور کیا تھا، اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے مل کر ایسی آوازیں پیدا ہو رہی تھی جو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک چوتھائی گھنٹے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہڑبونگ کرنے والے دور ہوتے جا رہے تھے۔ژاں ولژاں بالکل ساکت بیٹھا تھا۔

اس نے کوزیٹ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

پھر بھی، وہ جس تنہائی کے عالم میں تھا، حیرت انگیز طور پر اتنا پُرسکون تھا کہ خوف آمیز ہڑبونگ، اتنی قریب ہونے کے باوجود اس کو خوف زدہ نہیں کر سکی تھی۔ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ دیواریں بہرے پتھروں سے بنائی گئی تھیں، جن پر صرف لکھی عبارتیں ہی بول سکتی تھیں۔

اچانک، گہری خاموشی کے درمیان ایک نئی آواز بلند ہوئی؛ ایسی آواز جو اتنی ہی سماوی، ربانی، ناقابلِ بیان اور وجد آور تھی جتنی کہ دوسری آوازیں بھیانک تھیں۔یہ ایک حمدیہ گیت تھا جو اداسی سے طلوع ہو رہا تھا، خاموش اور پریشان کن اور دھندلی رات میں چکاچوند کر دینے والے آہنگ اور دعا کی مانند؛ آوازیں عورتوں کی، مگر کنواریوں کی اور بچوں کے خالص معصوم لہجوں کی تھیں—آوازیں جو زمین کی نہیں تھیں، جو ان آوازوں سے مشابہ تھیں جو نوزائیدہ بچوں کو پیدا ہونے کے

بعد بھی سنائی دیتی ہیں، جو مرتے وقت آدمی کو سنائی دیتی ہیں۔ گیت عمارت کے اداسی بھرے چہرے سے نکل کر باغیچے کے اوپر چھا گیا تھا۔ اس وقت جب شیطانوں کا غل غپاڑہ وبپا ہو رہا تھا، گیت کو سن کر آپ کہہ اٹھتے کہ یہ فرشتوں کا یہ دعائیہ گیت ہے جو اداسی کے عالم سے نکل رہا ہے۔

کوزیٹ اور ژاں ولواں، دونوں گھٹنوں پر گر گئے۔

انھیں خبر نہیں تھی کہ وہ کیا شے تھی، انھیں خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں تھے، مگر وہ آدمی اور وہ بچی، شرمسار اور معصوم، دونوں کو احساس ہوا کہ انھیں جھک جانا چاہیے۔

ان آوازوں کی حیرت انگیز خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے عمارت کو سنسان محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ ایک غیر آباد گھر میں ایک مافوق الفطرت نغمہ تھا۔

جس دم یہ آوازیں گیت گا رہی تھیں، ژاں ولواں بالکل خالی الدماغ ہو گیا تھا۔ اسے اب رات دکھائی نہیں دے رہی تھی، صرف نیلا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اب وہ پر محسوس ہونے لگے تھے جو ہم سب کے اندر ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی کھلنے لگتے ہیں۔

گیت ختم ہو گیا۔ کافی دیر چلا ہوگا۔ ژاں ولواں بتا نہیں سکتا تھا کتنی دیر۔ وجد و سرمستی کے گھنٹے کبھی لمحوں سے زیادہ طویل نہیں ہوتے۔

ایک بار پھر سب خاموش ہو گئے۔ سڑک پر اب کچھ نہیں تھا؛ باغیچے میں بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ جس نے پریشان کر رکھا تھا، وہ جس نے اسے مطمئن کیا تھا — سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ دیوار پر اُگی خود رو گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی؛ ان سے مدھم، سریلی اور غم انگیز آواز نکل رہی تھی۔

❁

چیستان کا تسلسل

رات کی ہوا تیز ہو گئی تھی، جس کا مطلب یہ تھا اس وقت صبح کے دو یا تین بجے ہوں گے۔ بے چاری کوزیت کچھ نہیں بولی۔ جب اس نے پاس بیٹھ کر اپنا سر ژاں ولژاں کے سہارے رکھ دیا، تو ژاں ولژاں سمجھا کہ وہ سو گئی ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ کوزیت کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں؛ اس کی سوچ میں ڈوبی کیفیت دیکھ کر ژاں ولژاں کو بہت تکلیف ہوئی۔

کوزیت ابھی تک لرز رہی تھی۔

"کیا تمھیں نیند آ رہی ہے؟" ژاں ولژاں نے پوچھا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔" اس نے جواب میں کہا۔

ایک لمحے بعد اس نے خود سوال کیا، "کیا وہ ابھی تک موجود ہے؟"

"کون؟" ژاں ولژاں نے پوچھا۔

"مادام تھن آردیے۔"

ژاں ولژاں بھول ہی گیا تھا کہ اس نے کوزیت کو چپ کرانے کے لیے یہ ذریعہ استعمال کیا تھا۔

"اوہ، اچھا!" اس نے کہا، "وہ تو چلی گئی ہے۔ اب تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

بچی نے سکھ کا سانس لیا گویا اس کے سینے کا بوجھ اتر گیا تھا۔

زمین نم تھی، سائبان ہر طرف سے کھلا تھا، ہوا ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ نیک آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر کوزیت کے جسم سے لپیٹ دیا۔

"کیا اب تمھیں سردی کم لگ رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، بابا!"

"اچھا، تم ذرا دیر انتظار کرو، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔"

وہ اس کھنڈر سے باہر نکلا اور کسی بہتر پناہ کی تلاش میں اس بڑی عمارت کے ساتھ رینگتا چلا گیا۔ راستے میں کئی دروازے آئے، مگر سب بند تھے۔ زمینی منزل کی تمام کھڑکیوں پر آہنی سلاخیں لگی تھیں۔

جوں ہی وہ عمارت کے چہرے کے اندرونی زاویے سے مڑا اس نے دیکھا کہ وہ محرابی کھڑکیوں کے قریب آ رہا تھا، جہاں اسے ایک روشنی دکھائی دی تھی۔ وہ پنجوں کے بل کھڑا ہو کر ان کھڑکیوں میں جھانکنے لگا۔ وہ سب کھڑکیاں ایک وسیع ہال کمرے میں کھلتی تھیں جس میں بڑے بڑے باقاعدہ کٹے ہوئے پتھروں کا فرش تھا۔ اس میں بہت ہلکی روشنی اور بڑے بڑے سائے نظر آ رہے تھے۔ روشنی ایک دیے کی تھی جو ایک کونے میں جل رہا تھا۔ کمرہ بالکل سنسان تھا۔ وہ تھوڑی دیر غور سے معائنہ کرتا رہا تو اسے محسوس ہوا گویا فرش پر کوئی شے پڑی تھی جو چادر سے ڈھکی ہوئی تھی، جس کا ڈیل ڈول انسانی پیکر سے مشابہ تھا۔ یہ پیکر، چپت اوراوندھا پڑا تھا؛ اس کے دونوں ہاتھ کسی صلیب کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ پیکر کسی مردے کی طرح ساکت تھا۔ فرش پر پڑی سانپ جیسی لہراتی ہوئی ایک شے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس پیکر کی کمر میں رسی بندھی تھی۔

پورے کمرے میں دھند جیسی فضا تھی جو خوف میں اضافے کا باعث ہو رہی تھی۔

بعد میں، ژاں ویلواں اکثر کہا کرتا تھا کہ اپنی زندگی میں اسے بہت سے جنازے جیسے بھوت پریت نظر آئے تھے، مگر اس نے کبھی اس سے زیادہ خون جما دینے والا پُراسرار منظر نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اس رات اور ایسے غم انگیز ماحول میں دیکھا تھا۔ یہ قیاس کرنا بھی وحشت انگیز تھا کہ شاید وہ شے مردہ تھی؛ اس سے بھی زیادہ وحشت انگیز وہ تصور تھا کہ وہ شے شاید زندہ تھی۔

مگر اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اپنا چہرہ شیشے سے لگائے ہوئے تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ شے حرکت کرتی ہے یا نہیں۔ اس کا اس حالت میں رہنا، جب کہ پیکر میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی، ایک لمبا عرصہ معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک اس پر ایک ناقابلِ بیان خوف کا غلبہ ہو گیا، اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے سائبان کی طرف بھاگنا شروع کیا، اور اسے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اگر اس نے اپنا سر موڑا تو اُسے وہ پیکر لمبے لمبے قدموں سے تعاقب کرتا لہراتا نظر آئے گا۔

وہ کھنڈر پہنچا تو اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اس کے گھٹنے اس کا بار سنبھال نہیں پا رہے

تھے؛ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

کہاں تھا وہ؟ پیرس جیسے شہر کے بیچوں بیچ؛ اس قسم کی موت کے منظر کا کون تصور کر سکتا تھا؟ ایک عمارت جو شبینہ پُر اسراریت سے مملو ہو، جو فرشتوں کی آواز میں لوگوں کو اندھیروں سے پکار رہی ہو اوراچانک اس قسم کا خوف ناک منظر پیش کردے، اور جنت کا تابندہ دروازہ کھول دینے کا وعدہ کرے، اور پھر مزار کے ہیبت ناک پھاٹک کھول دے۔اور واقعی یہ ایک عمارت تھی، ایک مکان تھا، جس پر سڑک کا نمبر بھی تھا۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ خود کو یقین دلانے کے لیے کہ یہ حقیقت تھی، اسے وہاں پڑے پتھروں کو چھونا پڑا تھا۔

سردی، تشویش، بے چینی اوراس رات کے جذبات نے مل جل کر اس کو بخار میں مبتلا کردیا تھا،اور یہ سارے خیالات اس کے دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔

۞

چیستان کی دُگنی پُراسراریت

بچی بے چاری پتھر پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔

ژاں ولواں اس کے قریب بیٹھا کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بچی کو گھور کر دیکھتا، پُرسکون ہوتا جا رہا تھا اور دوبارہ اپنے دماغ پر قابو پاتا جا رہا تھا۔

اسے اب اس حقیقت کا احساس ہوگیا تھا کہ جب تک وہ بچی اس کے پاس ہے، اس کی زندگی کی بنیاد وہ بچی ہی رہے گی؛ کہ جب تک بچی اس کے پاس ہوگی اسے بچی کے مفاد کے سوا کسی چیز سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ جب سے اس نے بچی کو ڈھکنے کے لیے اپنا کوٹ اُتارا تھا اس کا اپنا جسم ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

اس کے باوجود، اس فکر کے علاوہ وہ جس میں تھا، وہ کافی دیر سے عجیب قسم کی آواز سُن رہا تھا۔ وہ گھنٹی بجنے کی سی آواز تھی۔ آواز باغیچے سے آ رہی تھی۔ اگرچہ مدھم تھی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ یہ آواز ان ہلکی، مبہم آوازوں سے مشابہ تھی جو رات میں چراگاہوں میں مویشیوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں سے حرکت کے وقت پیدا ہوتی ہے۔

اس آواز نے ژاں ولواں کو پلٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے باغیچے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔

آدمی سے مشابہ ایک وجود، خربوزے کے تھالے میں، شیشے کی شکل کی گھنٹیوں [جو پودوں کو سردی سے بچانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں] کے درمیان چلتا، اُٹھتا، جھکتا، رُکتا، بار بار اس طرح حرکت کر رہا تھا گویا وہ خود کو گھسیٹ رہا تھا، یا زمین پر کوئی شے بکھیر رہا تھا۔ وہ آدمی لنگڑا کر چلتا معلوم ہو رہا تھا۔

ژاں ولژاں ان آدمیوں کی طرح کانپ گیا تھا جو مسلسل بدقسمتی کے جھٹکے سہتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے ہر شے دشمن اور مشکوک ہوتی ہے۔ وہ دن پر بھروسا نہیں کرتے، اس لیے اس کی روشنی میں لوگ انھیں دیکھ سکتے ہیں؛ اور رات پر اس لیے بھروسا نہیں کرتے کہ وہ ان کو حیرت زدہ کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ ذرا دیر پہلے وہ کانپ گیا تھا، اس لیے کہ باغیچہ سنسان تھا، اور اس وقت اس لیے کانپ رہا ہے کہ وہاں کوئی تھا۔

اب وہ عجیب الخلقت دہشتوں سے حقیقی دہشتوں پر آگیا تھا۔ اس نے خود سے کہا تھا کہ جاویر اور اس کے جاسوس شاید ابھی تک رُخصت نہیں ہوئے ہیں؛ بلاشبہ وہ سڑک پر نظر رکھنے کے لیے لوگوں کو چھوڑ گئے ہوں گے؛ کہ اگر یہ آدمی اسے باغیچے میں دیکھ لیتا ہے تو چور سمجھ کر شور مچا دے گا، اور یہ پکڑا جائے گا۔ اس نے سوئی ہوئی گوزیت کو آہستہ سے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور پرانے فرنیچر کے اس ڈھیر کے پیچھے لے گیا جو استعمال میں نہیں تھا، اور سائبان کے سب سے دور کونے میں رکھا تھا۔ گوزیت نے حرکت نہیں کی۔

اس کے بعد وہ خربوزے کے تھالے میں اس وجود کی موجودگی پر غور کر رہا تھا۔ اس کی بابت حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی ہر حرکت پر گھنٹی بجتی تھی۔ جب آدمی آگے بڑھتا تو گھنٹی کی آواز بھی آگے بڑھتی؛ جب وہ آدمی پیچھے ہٹتا تو آواز بھی پیچھے ہٹتی؛ اگر وہ تیز حرکتیں کرتا تو آواز کا ایک سلسلہ اس کے پیچھے چلتا؛ جب وہ رُک جاتا تو آواز بھی رُک جاتی۔ تو یہ واضح ہوا کہ گھنٹی اس آدمی سے بندھی ہوئی تھی؛ مگر اس سے ظاہر کیا ہوتا تھا؟ کون تھا وہ آدمی، کسی مینڈھے یا کسی بیل کی طرح جس سے گھنٹی باندھ دی گئی تھی۔

جس وقت وہ خود سے یہ سارے سوالات کر رہا تھا، اس نے گوزیت کے ہاتھ چھوئے۔ وہ برف جیسے ٹھنڈے تھے۔

"اوہ خدایا!" وہ تقریباً چیخ پڑا۔

اس نے بہت دھیمی آواز میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی، "گوزیت!"

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

اس نے گوزیت کو زور سے ہلایا۔

وہ نہیں جاگی۔

"کیا گوزیت مر گئی ہے؟" اس نے خود سے کہا، اور اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سر سے پیر تک لرز رہا تھا۔

اس کے ذہن میں ملے جُلے نہایت ڈراؤنے خیالات دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ایسے لمحے بھی ہوتے ہیں جب بھیانک قیاسات غصے کے قبیلے والوں کی طرح ہم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں، اور زبردستی ہمارے دماغوں کو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔جب ان کا معاملہ ہوتا ہے ہم جن سے محبت کرتے ہیں تو ہماری دوراندیشی ہر قسم کا پاگل پن ایجاد کر لیتی ہے۔ژاں ولژاں کو یاد آیا کہ سرد رات میں کھلے میدان میں سونا مہلک ہو سکتا ہے۔

کوزیت زرد ہو گئی تھی، اور اس کے قدموں کے قریب زمین پر لیٹی ہوئی تھی، بالکل بے حرکت۔

اس نے کوزیت کے تنفس کو سننے کی کوشش کی: وہ ابھی تک سانس لے رہی تھی، مگر اس کا تنفس کم زور، اور ختم کے قریب محسوس ہوا۔

ژاں ولژاں کس طرح گرمی پہنچا کر اسے بچا سکتا تھا؟ کس طرح وہ اسے جگا سکتا تھا؟ ان خیالات کے سوا، اس کے ذہن سے سب کچھ اوجھل ہو گیا تھا۔وہ دیوانہ وار کھنڈر سے نکل بھاگا۔

اشد ضروری ہو گیا تھا کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر کوزیت آگ کے قریب کسی بستر میں ہو۔

۞

گھنٹی والا آدمی

ژاں ولژاں سیدھا اس آدمی کے پاس گیا جو باغیچے میں نظر آیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں نقرئی سکّوں کا رول لیے ہوئے تھا جو اس کی واسکٹ کی جیب میں تھا۔

وہ آدمی اپنا سر جھکائے تھا اور اس نے اُسے آتا نہیں دیکھا تھا۔ چند قدم، اور ژاں ولژاں اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔

ژاں ولژاں نے بلند آواز سے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''ایک سو فرانک!''

آدمی نے آنکھ اُٹھائی۔

''تم ایک سو فرانک کما سکتے ہو؟'' ژاں ولژاں نے کہا، ''اگر تم ہمیں اس رات پناہ دے دو۔''

ژاں ولژاں کے خوف زدہ بشرے پر چاندنی پڑ رہی تھی۔

''کیا! اچھا، تو یہ تم ہو، فادر میڈلین!'' اس آدمی نے کہا۔

ایسے اندھیرے وقت میں، اس نامانوس جگہ پر، اس اجنبی کی زبان سے اپنا نام سنتے ہی ژاں ولژاں اُلٹے قدم اپنی یادوں میں چلنے لگا تھا۔

ژاں ولژاں کو اس کی قطعی توقع نہیں تھی۔ وہ شخص جس نے اسے اس طرح مخاطب کیا تھا— کبڑا، لنگڑا بوڑھا آدمی تھا، جس نے دیہاتیوں جیسا لباس پہن رکھا تھا، جس کے گھٹنوں پر چمڑے کی knee-cap چڑھی ہوئی تھی، جس سے ایک قدرے بڑی گھنٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ، جو اس وقت سایے میں تھا، پہچانا نہیں جاتا تھا۔

پھر بھی، اس نیک آدمی نے اپنی ٹوپی اتاری اور لرزتے ہوئے کہا:

''اوہ خدایا! یہ کیا! تم یہاں ہو، فادر میڈلین؟ تم یہاں کیسے داخل ہوئے؟ یسوع

مسیح! کیا تم سیدھے جنت سے اتر کر آئے ہو؟ اس میں کوئی قباحت نہیں، اگر تم کبھی گرے تو وہیں سے گرو گے۔ اور یہ تم کس حال میں ہو!؟ نہ تمھارا گلو بند ہے، نہ تمھاری ٹوپی ہے، نہ تمھارا کوٹ ہے۔ سنو، جو تمھیں نہ جانتا ہو، اسے تو تم خوف زدہ کر دو گے۔ کوٹ بھی نہیں ہے۔ میرے خدا! کیا آج کل کے سارے سینٹ پاگل ہو گئے ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں داخل کیسے ہوئے؟"

اس کے الفاظ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ وہ نیک آدمی دیہاتی چرب زبانی کر رہا تھا، جس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، احمقانہ پن اور معصومانہ مہربانی کا ملغوبہ تھا۔

"تم کون ہو اور یہ مکان کس کا ہے؟" ژاں ولژاں نے سوال کیا۔

"اوہ، خدا قسم، بس بہت ہو گیا!" بوڑھے نے چیخ کر کہا، "میں وہی ہوں جسے تم نے یہاں رکھوایا تھا، اور یہ وہی مکان ہے جس میں تم نے مجھے ملازمت دلوائی تھی۔ کیا، تم مجھے پہچانتے بھی نہیں؟"

"نہیں۔" ژاں ولژاں نے کہا "اور یہ کیسے ہوا کہ تم مجھے جانتے ہو؟"

"تم نے میری زندگی بچائی تھی۔" اس آدمی نے کہا۔

بوڑھا آدمی مڑا۔ چاندنی کی ایک کرن اس کے رخ پر پڑی اور ژاں ولژاں نے بوڑھے فوشلوں کو پہچان لیا۔

"اوہ!" ژاں ولژاں نے کہا، "اچھا، تو یہ تم ہو! ہاں، مجھے یاد آ گیا کہ تم کون ہو۔"

"خوش قسمتی کی بات ہے۔" بوڑھے آدمی نے ملامتی انداز میں کہا۔

"اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ژاں ولژاں نے پوچھا۔

"کیوں؟ میں اپنے خربوزے ڈھانپ رہا ہوں نا!"

دراصل جس وقت ژاں ولژاں نے اسے مخاطب کیا تھا، بوڑھے فوشلوں کے ہاتھ میں پیال سے بنی ایک چٹائی تھی جسے وہ خربوزے کے تھالے پر پھیلا رہا تھا۔ اس دوران کچھ گھنٹے باغیچے میں رہ کر وہ کئی چٹائیاں پھیلا چکا تھا۔ یہی وہ کام تھے جس کے دوران اسے عجیب عجیب حرکات کرنی پڑی تھیں، سائبان سے جنھیں ژاں ولژاں دیکھ رہا تھا۔

اس نے خود سے کہا:

"میں نے سوچا آج کی رات چاند روشن ہے: پالا پڑنے والا ہے۔ کیوں نہ میں خربوزوں کو ان کے کوٹ پہنا دوں؟ اور" ژاں ولژاں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے اضافہ کیا،

"خدا کی قسم، تم ہوتے تو تم نے بھی یہی کیا ہوتا ــــ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں آئے کیسے؟"

ژاں ولژاں یہ جان کر وہ محتاط ہو گیا کہ یہ آدمی مجھے جانتا ہے، میڈیلن کے نام سے بھی۔ اس کے سوالات بڑھتے جا رہے تھے۔ تعجب کہ اب ان کے کردار اُلٹے ہو گئے تھے۔ اب بن بلایا مہمان تفتیش کرنے لگا تھا۔

"اور یہ گھنٹی کیسی ہے، جو تم نے اپنے گھٹنے پر باندھ رکھی ہے؟"

"یہ!" فوشلوون نے جواب میں کہا "یہ اس لیے ہے کہ مجھ سے دور رہا جائے۔"

"کیا، یعنی تم سے دور رہا جائے؟"

بوڑھے فوشلوون نے ناقابلِ بیان انداز میں آنکھ ماردی۔

"اوہ! اس گھر میں صرف عورتیں ہی رہتی ہیں ــــ کئی جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ شاید میں ان کے لیے خطرناک آدمی ہوں۔ گھنٹی ان کو خبردار کرتی ہے۔ جب میں آتا ہوں تو وہ چلی جاتی ہیں۔"

"کیسا مکان ہے یہ؟"

"بس کرو، تم سب جانتے ہو۔"

"نہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"نہیں، تم ہی نے تو مجھے یہاں مالی کے طور پر رکھوایا تھا؟"

"سچ کہو، میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔"

"اچھا! ــــ تو یہ Petit-Picpus کی خانقاہ ہے۔"

"ژاں ولژاں کو کچھ کچھ یاد آنے لگا تھا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ مقدر نے اسے کتنی خوبی سے اس علاقے Saint-Antoine میں لا ڈالا تھا۔ بوڑھا فوشلوون گاڑی گرنے سے معذور ہو جانے کے بعد دو برس قبل اسی کی سفارش پر یہاں ملازم ہو گیا تھا۔ اور، اس نے خود کلامی کی کیفیت میں دہراتے ہوئے کہا "Petit-Picpus خانقاہ۔"

"بالکل صحیح!" بوڑھے فوشلوون نے لقمہ دیا، "مگر تم بتاؤ فادر میڈیلن کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟ تم اگر سینٹ ہو تب بھی، تم مرد بھی تو ہو، اور یہاں کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا۔"

"یقیناً! مگر تم بھی تو ہو، یہاں۔"

"میرے سوا، یہاں کوئی مرد نہیں۔"

"پھر بھی" ژاں ولژاں نے کہا "مجھے یہاں ٹھہرنا ہے۔"

"اوہ خدایا!" فوشلوون نے زور سے کہا۔

ژاں ولژاں اس بوڑھے کے قریب گیا اور سنجیدہ آواز میں کہا: ''فادر فوشلوں، میں نے تمھاری جان بچائی تھی نا!''

''یہ تو میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا۔'' فوشلوں نے جواب میں کہا۔

''اچھا! تو آج تم میرے ساتھ وہی کرو، جو میں پہلے تمھارے ساتھ کر چکا ہوں۔''

فادر فوشلوں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں میں ژاں ولژاں کے توانا ہاتھ پکڑ لیے، چند لمحے اس طرح کھڑا رہا جیسے وہ گونگا ہو گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے حیرت سے کہا:

''اوہ— یہ تو خدا کی مہربانی ہوگی، اگر اس کے عوض میں تمھارے ساتھ کچھ کر سکتا ہوں۔ تمھاری جان بچاؤں! موسیو میئر، بس کرو!''

ایک حیرت ناک مسرت نے بوڑھے کی شکل تبدیل کر دی تھی۔ اس کے بشرے سے روشنی کی کرن پھوٹنے لگی تھی۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے جواب میں کہا۔

''وہ تو میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ تمھارے کوئی پاس کمرہ ہے؟''

''اس طرف میرے پاس ایک حصہ ہے، خانقاہ کے پرانے کھنڈر کے پیچھے، ایک کونے میں جہاں کوئی جھانکتا بھی نہیں۔ اس میں تین کمرے ہیں۔''

وہ جھونپڑا کھنڈر کے پیچھے اس طرح پوشیدہ تھا، اور اتنی چالاکی سے چھپایا گیا تھا، جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ژاں ولژاں بھی اس دیکھ نہیں سکا تھا۔

''اچھا!'' ژاں ولژاں نے کہا: ''اب میں تم سے دو باتیں کہنا چاہوں گا۔''

''کیا ہیں وہ، مسٹر میئر؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم کسی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے کہ تم مجھے جانتے ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''جیسا تم چاہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گے جو ایمان داری پر مبنی نہ ہو، اس لیے کہ تم ہمیشہ اچھے آدمی رہے ہو۔'' اور اس نے یہ بھی کہا: ''تم نے ہی مجھے یہاں رکھوایا تھا۔ تم کو ضرورت ہے۔ میں تمھاری خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

''تو یہ طے رہا۔ اب تم میرے ساتھ آؤ۔ ہم چل کر اس بچی کو لے آتے ہیں۔''

''اوہ!'' فوشلوں نے کہا: ''تو ایک بچی بھی ہے۔''

اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور ژاں ولژاں کے پیچھے اس طرح چل پڑا، جیسے کتا اپنے

آقا کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر کوزیت، جو آگ کے شعلوں کے سامنے آ کر، ایک بار پھر گلابی ہوگئی تھی، ماں کے بستر میں لیٹی سو رہی تھی۔ ژاں ولژاں نے اپنا گلوبند اور کوٹ پہن لیا تھا؛ اس کی ہیٹ جو اس نے دیوار کے اوپر سے پھینکی تھی، پائی گئی اور اٹھالی گئی تھی۔ جب ژاں ولژاں اپنا کوٹ پہن رہا تھا، فوشلوون نے اپنے گھٹنوں پر بندھی گھنٹی اُتار دی تھی، جو دیوار کی زینت ایک قدیم جھابی کے ساتھ، اَب دیوار پر لگی ایک کیل پر ٹنگی ہوئی تھی۔ دو مرد میز پر اپنی کہنیاں لگائے خود کو گرمی پہنچا رہے تھے، جس پر فوشلوون نے تھوڑا سا پنیر، سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی، ایک بوتل وائن اور دو عدد گلاس رکھ دیے تھے۔ اور بوڑھا ژاں ولژاں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اس سے کہہ رہا تھا:

"اوہ! فادر میڈلین! تم مجھے فوراً پہچان نہیں سکے تھے؛ تم لوگوں کی زندگیاں بچاتے ہو، اور انھیں بھول بھی جاتے ہو، یہ اچھی بات نہیں۔ مگر وہ لوگ تمھیں یاد رکھتے ہیں۔ تم بڑے ناشکرے انسان ہو۔"

ژاں ولژاں کا سراغ

وہ تمام واقعات جن کے تاریک پہلو ہم دیکھ چکے ہیں، سادہ طریقے سے پیش آئے تھے۔

جب ژاں ولژاں، فانتین کے بستر مرگ کے قریب سے گرفتار کیے جانے کے بعد، M. sur M کی ٹاؤن جیل سے فرار ہوا، پولیس کا خیال تھا کہ وہ پیرس چلا گیا ہوگا۔ پیرس ایک گرداب ہے جس میں ہر شے گم ہو جاتی ہے، اور ہر شے اس دنیا کے شکم میں غائب ہو جاتی ہے، جیسے سمندر کا پیٹ سب کچھ ہضم کر جاتا ہے۔ کوئی جنگل بھی کسی آدمی کو اس طرح چھپا نہیں سکتا جیسے آدمیوں کا ایک مجمع چھپا لیتا ہے۔ ہر قسم کے فراری اس سے واقف ہیں۔ وہ پیرس میں اس طرح جاتے ہیں جیسے پاتال میں جا رہے ہوں؛ وہاں ایسی خلیجیں ہیں جو آدمیوں کو محفوظ بھی کر لیتی ہیں۔ پولیس بھی اس سے واقف ہے؛ پیرس ہی وہ مقام ہے جہاں اُسے ڈھونڈا جاتا ہے جو کہیں کھو گیا ہو۔ پولیس والے M. sur M کے سابق میئر کی تلاش میں تھے۔ جاویر کو ان کی تحقیقات پر روشنی ڈالنے کے لیے پیرس طلب کیا گیا تھا۔ دراصل جاویر ہی نے ژاں ولژاں کی دوبارہ گرفتاری میں مدد کی تھی۔ اس موقعے پر جاویر کی سرگرمی اور ذہانت کا موسیو Chabouillet نے تذکرہ کیا تھا جو پریفیکچر کا سیکریٹری تھا، اور جاویر کا سرپرست بھی تھا اور ان دنوں پیرس کی پولیس میں تعینات تھا۔ جاویر نے غوطہ خوروں کے سلسلے میں خدمات فراہم کی تھی، اگرچہ یہ لفظ معزز خدمات کے سلسلے میں عجیب سا محسوس ہوگا۔

وہ ژاں ولژاں کو بھول چکا تھا — آج کا بھیڑیا ان کتوں کو جگا دیتا ہے جو کل کے بھیڑیے کو بھلانے کی کوشش میں رہتے ہیں — جب دسمبر 1823ء میں اس نے ایک اخبار پڑھا تھا، جو کبھی اخبار نہیں پڑھتا تھا، تو دراصل، وہ Prince Generalissimo کے Bayonne

میں فاتحانہ داخلے کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا۔ ابھی وہ مضمون ختم ہی ہوا تھا، کہ ایک نام، یعنی ژاں ولژاں کے نام نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی، جو اخبار کے صفحے کے بالکل آخر میں لکھا ہوا تھا۔

اخبار نے اعلان کیا تھا کہ سزا یافتہ ژاں ولژاں انتقال کر گیا ہے، اور اس حقیقت کو اس طرح پیش کیا تھا کہ جاویر نے اس پر شبہ نہیں کیا۔ اس نے صرف ایک جملہ کہنے پر اکتفا کی تھی "اچھا مضمون ہے۔" اس کے بعد اس نے اخبار پھینک دیا تھا، اور پھر اس کے بارے کبھی نہیں سوچا۔

کچھ دنوں کے بعد ایسا ہوا کہ پولیس کی ایک رپورٹ بھیجی گئی تھی، Seine-et-Oise کے پریفیکچر کی جانب سے پیرس پولیس پریفیکچر کے نام، جس میں ایک بچی کے اغوا کا تذکرہ کیا گیا تھا، جو Montfermeil کے علاقے میں، عجیب حالات میں ہوا تھا۔ رپورٹ میں بیان کیا گیا تھا کہ سات یا آٹھ برس کی ایک لڑکی کو جسے اس کی ماں نے اس علاقے کی ایک سرائے کے مالک کے حوالے کیا تھا، ایک اجنبی چرا کر لے گیا تھا؛ یہ بچی کوزیٹ کے نام پر جواب دیتی تھی، اور فانتیں نامی ایک لڑکی کی بچی تھی، جو اسپتال میں انتقال کر گئی تھی؛ کس جگہ اور کب؛ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس رپورٹ پر جاویر کی نظر پڑ گئی اور وہ سوچنے لگا۔

وہ فانتیں کے نام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے یاد تھا کہ ژاں ولژاں نے اس عورت کی بچی کو واپس لانے کے لیے تین دن کی مہلت مانگ کر جاویر کو قہقہہ مار کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ژاں ولژاں پیرس میں عین اس وقت گرفتار ہوا تھا جب وہ Montfermeil جانے والی گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ کچھ اشارے ایسے مل رہے تھے جن کی بنا پر اس وقت وہ مشتبہ ہو رہا تھا، اس لیے کہ وہ دوسری بار اسی گاڑی میں سوار ہو رہا تھا؛ کہ وہ پچھلے دن بھی اس گاؤں کے پڑوس میں گیا تھا؛ مگر اس گاؤں میں دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ Montfermeil کے اس علاقے میں کیا کرنے گیا تھا؟ اس کا قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جاویر اب سب کچھ سمجھ گیا۔ وہیں فانتیں کی بچی تھی۔ ژاں ولژاں اس کی تلاش میں وہیں جا رہا تھا اور اب اس بچی کو ایک اجنبی چرا لے گیا ہے۔ وہ اجنبی کون ہو سکتا ہے؟ کیا وہ ژاں ولژاں ہو سکتا ہے؟ مگر ژاں ولژاں تو مر چکا ہے۔ کسی کو بتائے بغیر جاویر نے Pewter Platter کی بند گلی la Planchette سے گاڑی پکڑی اور Montfermeil کا پھیرا لگانے چلا گیا تھا۔

اسے توقع تھی کہ اس موضوع پر اسے اشارے ملیں گے، مگر اسے صرف ابہام ملا تھا۔

کوزیت کے جانے کے بعد تھی آردیے نے غصے میں آ کر کچھ دن بہت الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔ معتمی چڑیا کے غائب ہونے سے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ اس نے فوراً کہانی کے بے شمار انداز جمع کیے؛ جو بچی کے اغوا پر منتج ہوئے تھے۔ اسی لیے پولیس رپورٹ لکھائی گئی تھی۔ ابتدائی ناراضی گزر جانے کے بعد، اپنی حیرت انگیز جبلت کے باعث تھی آردیے کو اندازہ ہوگیا تھا کہ سرکاری وکیل سے چھیڑ چھاڑ کبھی اچھی نہیں ہوا کرتی۔ کوزیت کے اغوا کی شکایت کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ قانون کی چمک دار آنکھ اس کے بہت سے سیاہ کارناموں پر جم جائے گی۔ الو کبھی نہیں چاہتے کہ ان کے سامنے جلتی ہوئی شمع لائی جائے۔ سب سے پہلے تو پندرہ سو فرانک کی وضاحت کرنی پڑے گی جو وصول کیے گئے تھے۔ اس نے فوراً قلا بازی کھائی، اپنی بیوی کا منہ بند کیا، اور اغوا کی گئی بچی کے بارے میں سوال پر استعجاب کا ڈھونگ رچایا؛ اس کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا؛ اس میں شبہ نہیں کہ بچی کے اتنی سرعت سے چھینے جانے پر وہ بہت بڑبڑایا تھا؛ کہ شفقت کے جذبے کے تحت اسے دو چار دن مزید رکھنا چاہتا تھا؛ مگر اس کا ''نانا'' بالکل فطری طور پر اسے لینے کے لیے آ گیا تھا۔ اس نے کہانی میں ''نانا'' کا اضافہ کر دیا جس کا اچھا اثر ہوا تھا۔ یہ تھی کہانی جو جاویر نے Montfermeil پہنچے ہی سنی۔ گویا نانا نے ژاں ولژاں کو غائب کر دیا تھا۔

اس کے باوجود جاویر نے تھی آردیے کی کہانی میں شاقول کی مانند کئی سوال ڈال دیے تھے۔ ''نانا کون تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ تھی آردیے نے سادگی سے جواب دیا تھا، ''وہ ایک دولت مند کسان تھا۔ میں نے اس کا پاسپورٹ دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نام موسیو Guillaume Lambert تھا۔''

Lambert ایک باعزت اور بھروسے کا نام ہے۔ اس پر جاویر پیرس واپس چلا گیا۔

''ژاں ولژاں یقینی طور پر مر گیا ہے۔'' اس نے کہا، ''اور میں بالکل بدھو ہوں۔''

وہ تاریخ بھول گیا تھا، جب مارچ 1824ء میں ایک غیر معمولی آدمی کے بارے میں اس نے سنا تھا جو Saint-Medard کے پیرش میں رہتا تھا اور ''سخی فقیر'' کے نام سے موسوم تھا۔ کہانی یہ ہے کہ یہ شخص صاحب ثروت تھا جس کے اصل نام کا کسی کو علم نہیں تھا، اور جو ایک آٹھ سالہ لڑکی کے ساتھ اکیلا رہتا تھا جو اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی سوائے اس کے کہ وہ Montfermeil سے آئی تھی۔ Montfermeil! یہ نام ہمیشہ سامنے آتا تھا جس کو سن کو جاویر اپنے کان پکڑ لیا کرتا تھا۔ ایک بوڑھے پولیس کے جاسوس نے جس کو یہ شخص خیرات دیتا تھا، کچھ اضافی باتیں بتائی تھیں۔ یہ کوئی شریف زمیں دار شرمیلا انسان تھا— سوائے شام کے کبھی گھر سے

باہر نہیں نکلتا تھا، کسی سے بات نہیں کرتا تھا، سوائے مفلس لوگوں کے، اور کسی کو بھی اپنے قریب آنے نہیں دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک بد ہیبت پیلے رنگ کا کوٹ پہنے رہتا تھا جو لاکھوں کا تھا جس کے استر میں بینک کے نوٹ سلے ہوئے تھے۔ اس اطلاع نے جاویر کے تجسس کو فیصلہ کن تحریک دی۔ اس شان دار آدمی کو چونکا ئے بغیر قریب سے دیکھنے کی خاطر، اس نے ایک دن کے لیے سرکاری کارندے کی وردی اور وہ جگہ ادھار لی جہاں وہ بوڑھا جاسوس ہر شام جھک کر بیٹھا، گنگنا کر مناجات پڑھا کرتا تھا، اور دعا کرنے والے کے بھیس میں جاسوسی کرتا تھا۔ وہ ''مشتبہ فرد'' اس بھیس میں ملبوس جاویر سے ملا اور اسے خیرات دی۔ اسی لمحے جاویر نے اپنا سر اٹھایا تھا اور وہ جھٹکا جو ژاں ولژاں کو جاویر کو پہچاننے پر لگا تھا، اس جھٹکے کے برابر تھا جب جاویر کے خیال میں اس نے ژاں ولژاں کو پہچانا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ اندھیرے نے اسے گمراہ کیا ہو؛ ژاں ولژاں کی موت سرکاری طور پر صحیح تھی؛ جاویر کو اس کے بارے شدید شبہات تھے؛ اور جہاں شبہ ہو وہاں جاویر جیسا اصولی آدمی کسی کے گریبان پر انگلی بھی نہیں رکھتا تھا۔

جاویر اس شخص کے تعاقب میں Gorbeau ہاؤس گیا اور اس ''بوڑھی عورت'' کو باتوں میں لگا لیا جو مشکل کام نہیں تھا۔ بوڑھی عورت نے لاکھوں نوٹوں کے استر والے کوٹ کی تصدیق کی اور ہزار فرانک کے نوٹ والا قصہ بھی بیان کیا۔ اس نے خود وہ نوٹ دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لیا تھا۔ جاویر نے اسی گھر میں ایک کمرہ کرایے پر لے لیا؛ اسی شام وہ کمرے میں منتقل بھی ہوگیا۔ وہ پُراسرار مہمان کے کمرے تک گیا، سننے کی کوشش کی، اس امید پر کہ وہ اس کی آواز سن لے گا، مگر ژاں ولژاں نے کنجی کے سوراخ کے ذریعے اس کی جلتی ہوئی موم بتی دیکھ لی تھی، اور خاموش رہ کر جاسوس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔

دوسرے دن ژاں ولژاں وہاں سے فرار ہوگیا؛ مگر بوڑھی عورت نے پانچ فرانک کا سکہ گرنے کی آواز سن لی تھی، اور اسے شبہ ہوگیا تھا وہ جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اور اس نے جاویر کو فوراً آگاہ کر دیا تھا۔ رات کے وقت جب ژاں ولژاں باہر نکلا، جاویر دو افراد کے ہمراہ بولیوارڈ کے درختوں کے پیچھے چھپا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

جاویر نے پولیس سے امداد طلب کر لی مگر اس آدمی کا نام نہیں بتایا جسے گرفتار کرنے کی امید تھی؛ وہ اس کا راز تھا، اور اس نے تین وجوہ کی بنا اس کو راز ہی رکھا۔ پہلی بات یہ تھی کہ معمولی سی غلطی بھی ژاں ولژاں کو ہوشیار کر سکتی تھی؛ دوسری بات، کسی سابق سزا یافتہ کو ہاتھ لگانا جو

فرار ہو چکا تھا اور مرا مشہور ہو گیا تھا، ایک مجرم جسے انصاف نے ہمیشہ کے لیے بدمعاشوں میں شمار کیا تھا، ایک شان دار کارنامہ ہوتا جسے پیرس کے پرانے ارکان جاویر جیسے نو وارد کے لیے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اسے خوف تھا کہ وہ اپنے سزا یافتہ سے محروم کر دیا جائے گا؛ اور آخری بات، چوں کہ جاویر کو، جو ایک فن کار تھا، انہونی کو ہونی کرنے کا شوق تھا، وہ ایسی پیش گوئیوں سے نفرت کرتا تھا جن کے بارے قبل از وقت باتیں ہونے لگتی ہیں، اور اصل تماشا ہونے سے رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے شاہکار کو اندھیرے میں بیان کرنا اور آخر میں اچانک بے نقاب کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

جاویر نے ژاں ولژاں کا ایک درخت سے دوسرے درخت، سڑک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیچھا کیا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں؛ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب ژاں ولژاں سمجھ رہا تھا کہ وہ جاویر کی نظروں سے زیادہ محفوظ تھا۔ جاویر نے ژاں ولژاں کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟ اس لیے کہ وہ اس وقت بھی شبہے میں تھا۔

یاد رہے کہ اس زمانے میں پولیس کو سکون نہیں تھا؛ آزاد پریس اس کو پریشان کرتا رہتا تھا؛ کئی بے قاعدہ گرفتاریوں پر اخباروں میں ملامت کی گئی تھی، جن کی گونج عدالت کے کمروں تک پہنچ گئی تھی اور پولیس کے لیے ندامت کا باعث ہوئی تھی۔ انفرادی آزادی میں دخل اندازی سنگین مسئلہ تھا۔ پولیس کے کارندے غلطی کرنے سے خوف کھاتے تھے؛ پولیس کا سربراہ ان پر ہی الزام دھرتا تھا؛ غلطی کا مطلب نوکری سے برطرفی تھا۔ قاری اس اثر کا تصور کر سکتا ہے جو اس مختصر سے پیراگراف سے پیرس میں ہو سکتا تھا، جسے بیس اخباروں نے نقل کیا ہوتا:

''کل، ایک عمر رسیدہ دادا، سفید بالوں والا، باعزت شریف اور صاحبِ حیثیت آدمی، جو اپنی آٹھ برس کی پوتی کو ٹہلانے نکلا تھا، سابق سزا یافتہ مفرور کے طور پر گرفتار کر کے پولیس تھانے لے جایا گیا!''

مکرر، کہ جاویر کے اپنے اصول اور قاعدے تھے؛ اس کے اپنے ضمیر کے احکام پریفیکٹ کے احکام میں شامل کر دیے گئے تھے۔ وہ واقعی شبہے میں تھا۔

ژاں ولژاں نے اسے نظر انداز کر دیا، اور اندھیرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

افسردگی، بے چینی، تشویش، دباؤ، رات میں فرار پر مجبور ہونے کی بدقسمتی، اپنے اور کوزیت کے لیے پیرس میں کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے کی ضرورت، اس کی اپنی رفتار کو بچی کی رفتار کے برابر کرنے کی ضرورت — ان سب وجوہ نے ژاں ولژاں کی چال ڈھال میں تبدیلی کر دی تھی جس کا خود اسے بھی احساس نہیں تھا، اور اس کے اس قسم کے بڑھاپے کے خیال سے متاثر ہو کر خود پولیس

نے، جاوید کی شخصیت میں حلول کر کے واقعی غلطی کی تھی۔اس سے بہت قریب ہونے کا ممکن نہ ہوتا، اس کا مہاجر کے لباس میں ہونا، زین آرد یے کے بیان کا اسے ٹھا بنا دیا تھا، اور، آخر میں، قید خانے میں اس کی موت پر یقین نے مزید بے یقینی پیدا کر دی تھی جو جاوید کے دماغ میں جم کر رہ گئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اسے یہ خیال آیا کہ وہ اس کے کاغذات اچانک طلب کرے؛ لیکن، اگر وہ آدمی ژاں ولژاں نہیں تھا، اور اگر یہ شخص ایک اچھا، ایمان دار، اپنی کمائی پر زندگی گزارنے والا انسان نہیں تھا تو شاید وہ کوئی محض خوش باش انسان ہوگا جو پیرس کی گہری چالاکیوں سے بدمعاشوں کے تاریک جال میں پھنس گیا تھا؛ کسی خطرناک گروہ کا سرغنہ تھا، جو اپنی دوسری 'ہنرمندیوں' کو چھپانے کے لیے خیرات دے رہا تھا، جو ایک بہت فرسودہ دھوکا تھا۔اس کے بھروسے کے دوست بھی ہوں گے، فوری ضرورت میں کام آنے والے دوستوں کی پناہ گاہیں بھی ہوں گی، بلاشبہ جن میں وہ پناہ لے سکتا تھا۔وہ سارے موڑ جو وہ سڑکوں پر لے رہا تھا اس امر کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ وہ شریف اور ایمان دار آدمی نہیں تھا۔جلدی میں اس کی گرفتاری کا مطلب ''سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ذبح'' کرنا ہوتا تو مشکل کس بات کی تھی؟ جاوید کو پورا یقین تھا کہ وہ فرار نہیں ہوگا۔

گویا اس نے، اس شخص کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں سیکڑوں سوالات سے پیدا ہونے والی دماغی الجھن کی کیفیت میں کام شروع کیا تھا۔

Pontoise اسٹریٹ پر اندھیرا چھا چکا تھا، مگر ایک شراب کی دُکان سے نکلنے والی تیز روشنی کے طفیل صریحاً اس نے ژاں ولژاں کو پہچان لیا تھا۔

اس دنیا میں دو وجود ایسے ہوتے ہیں جو عمیق ابتدا فراہم کرتے ہیں—وہ ماں جو اپنے بچے کو دریافت کر لیتی ہے، اور وہ چیتا جو اپنے شکار کو پا لیتا ہے۔جاوید نے ویسی ہی ابتدا کی تھی۔

جوں ہی، حتمی طور پر اس نے خوف ناک سزا یافتہ ژاں ولژاں کو پہچان لیا تھا، اسے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صرف تین افراد تھے، اور اس نے Pontoise اسٹریٹ کے پولیس تھانے سے کمک طلب کر لی تھی۔کانٹے دار لاٹھی پکڑنے سے پہلے دستانہ پہنا جاتا ہے۔

اس تاخیر سے اور Carrefour Rollin کے قریب اپنے کارندوں سے مشورے کے لیے رُکنے کی وجہ سے وہ سراغ کھو دینے کے قریب ہو گیا تھا۔اس نے تیزی سے غیب دانی کی کہ ژاں ولژاں اپنے اور تلاش کرنے والوں کے درمیان دریا کو حائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر شکاری کتے کی طرح سوچنا شروع کیا جو اپنی ناک کو زمین پر رکھ کر یقین کر

لیتا ہے کہ وہ صحیح خوش بو کے پیچھے چل رہا ہے۔جاویر اور اس کی طاقت ور راست بازی کی جبلت اسے سیدھی Austerlitz کے پُل لے گئی۔ محصول وصول کرنے والے سے ذرا سی بات نے وہ اطلاع فراہم کر دی جو اسے چاہیے تھی۔

''کیا تم نے کسی آدمی کو ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ دیکھا ہے؟''

''میں نے تو اسے دو سو دینے پر مجبور بھی کر دیا تھا۔'' محصول والے نے جواب میں کہا۔

جاویر عین اس وقت پُل پر پہنچ گیا جب اس نے دیکھ لیا تھا کہ دریا کے اس پار چھوٹی سی روشن جگہ سے ژاں والژاں گزر رہا تھا اور کوزیٹ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔اس نے اسے Chemin-Vert-Saint-Antoine اسٹریٹ میں داخل ہوتے بھی دیکھا تھا؛ اسے یاد تھا کہ بند گلی Genrot کو پھندے کی طرح بنا دیا گیا تھا، اور Petit-Picpus اسٹریٹ میں داخل ہونے کا واحد راستہ Droit-Mur اسٹریٹ سے نکلتا تھا۔جیسا کہ شکاری کہتے ہیں، اس نے اپنی پناہ گاہ کو یقینی بنا لیا تھا؛ اس نے فوراً اپنے کارندوں میں سے ایک کو اس جگہ کو محفوظ بنانے کے لیے روانہ کر دیا۔ایک گشت جو Arsenal سے واپس ہو رہی تھی، اس کے پاس سے گزر رہی تھی کہ اس نے اس کو طلب کر لیا اور اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔ایسے کھیلوں میں سپاہی [تاش کے] اکّے کی طرح ہوتے ہیں۔مزید، اصول یہ ہوتا ہے کہ جنگلی خنزیروں میں سے ایک کو حاصل کرنے کے لیے شکاری سائنس اور کافی کتے استعمال کرنے ہوتے ہیں۔اس قسم کے اتحاد کا انتظام کر لینے کے بعد، اس خیال سے کہ ژاں والژاں دائیں جانب بند گلی Genrot اور بائیں جانب اس کے ہرکارے کی درمیان پھنس گیا تھا، اور جاویر خود عقب میں تھا، کہ اسے ہلکی سی خوش بو مل گئی تھی۔

اس کے بعد اس نے کھیل شروع کیا۔اسے وجد میں لانے والا اور طاغوتی لمحہ بھی مل گیا تھا؛ اس نے اپنے آدمی کو آگے چلتے رہنے کی اجازت دے دی تھی، یہ جانتے ہوئے کہ وہ اب بھاگ نہیں سکے گا، مگر وہ گرفتاری کے موقعے کو جس قدر ممکن ہو طول دینا چاہتا تھا، اس خیال سے خوش کہ وہ پکڑ لیا گیا ہے، اس کے باوجود اسے آزاد دیکھ رہا تھا، اور اس پر اپنی پُرشوق نظریں جمائے ہوئے تھا، کسی مکڑی کی نفس پرستی کی طرح جو جال میں پھنسی مکھی کو پھڑ پھڑانے دیتی ہے، اور اس بلّی کی طرح جو موش کو دوڑنے دیتی ہے۔پنجے اور ناخن بے پناہ نفسانیت کے حامل ہوتے ہیں— ان کی پکڑ میں گرفتار کی ناقابلِ بیان حرکات— یہ پکڑ بھی کیسی مسرور کُن ہوا کرتی ہے۔

جاویر لُطف لے رہا تھا۔اس کے جال کے پھندے مضبوطی سے باندھے گئے تھے۔اسے کامیابی کا یقین تھا؛ اسے اب صرف اپنی مٹھی بند کر لینی تھی۔ژاں والژاں کتنا ہی پریشان، پھرتیلا یا طاقت ور کیوں نہ رہا ہو، اب مزاحمت کا تصور بھی محال تھا۔جاویر آہستہ آہستہ راستے میں پڑتے سڑک

کے ہر کونے کو چھانتا ہوا، جیسے کہ وہاں چوروں کے بہت سارے ڈیرے ہوں، آگے بڑھ رہا تھا۔
جب وہ جالے کے مرکز میں پہنچا تو وہاں مکھی موجود نہیں تھی۔
اس کی برہمی کا تصور کیا جا سکتا تھا۔
اس نے Droit-Mur اسٹریٹ اور Petit-Picpus اسٹریٹ کے اپنے پہرے داروں سے جواب طلب کیا؛ اس کارندے نے جو نہایت پُرسکون انداز میں اپنے مقام پر موجود رہا تھا، اس آدمی کو وہاں سے گزرتے دیکھا نہیں تھا۔
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بارہ سنگھا اپنی سینگ اور سر سمیت گم ہو جاتا ہے؛ یعنی اس کے پیروں میں وزن بندھے ہوتے ہیں پھر بھی وہ نکل جاتا ہے، اور سب سے پرانے شکاری کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہوتا۔ Duvivier، Ligniville اور Desprez بھی ناکام رہے۔ اس قسم کی ایک ہزیمت میں Artonge کہتا ہے، وہ بارہ سنگھا نہیں تھا، چھلاوا تھا۔ ایسے وقت جاویر بھی اسی قسم کی چیخ نکالنا پسند کرتا۔
ایک لمحے اس کی ناامیدی، مایوسی اور غصے کے برابر ہو گئی تھی۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نپولین نے روس سے جنگ کے دوران غلطیاں کی تھیں؛ کہ سکندر سے ہندوستان میں فاش غلطیاں ہوئی تھیں؛ کہ سیزر نے افریقا کی جنگ میں غلطی کی تھی؛ کہ سائرس اعظم تورانی جنگ میں غلطی پر تھا، اور جاویر نے ژاں ولیواں کے خلاف اپنی جنگ میں فاش غلطی کی تھی۔ وہ غلطی پر تھا، کہ شاید وہ سابق سزا یافتہ کی پہچاننے میں تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ پہلی نظر ہی اس کے لیے کافی تھی۔ اس نے پرانی عمارت میں اسے گرفتار نہ کرنے کی غلطی کی تھی؛ وہ غلطی پر تھا جب اس نے Pontoise اسٹریٹ میں اسے پہچان لینے کے باوجود گرفتار نہیں کیا تھا۔ اس نے Carrefour Rollin میں پورے چاند کی چاندنی میں اپنے مددگاروں سے مشورہ لینے کی غلطی کی تھی۔ مشورہ یقینی طور پر فائدہ مند ہوتا ہے؛ ان ہرکاروں کو جاننا اور ان سے پوچھ کچھ کر لینا بھی اچھی بات ہوتی ہے جو اعتماد کے حق دار ہوتے ہیں؛ مگر جب کوئی شکاری بھیڑیے اور سزا یافتہ جیسے جانوروں کا پیچھا کر رہا ہو تو اسے زیادہ محتاط نہیں ہونا چاہیے۔ جاویر نے اس بات پر زیادہ سوچ بچار کر کے کہ شکاری کتوں کے جھنڈ کو کس طرح سراغ پر لگایا جائے، درندے کو آتے ہوئے تیر کی ہوا دے کر ہوشیار کر دیا تھا، اور اسے بھاگ جانے دیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ جب اسے Austerlitz کے پُل پر دوبارہ سراغ مل گیا تھا تو اس نے ایسے آدمی کو دھاگے کے دوسرے سرے پر رکھتے ہوئے طفلانہ اور خوفناک کھیل کھیلا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے اصل سے زیادہ طاقت ور سمجھ لیا تھا، اور یقین کر لیا تھا کہ وہ چوہے اور شیر کے

درمیان کھیل میں شریک ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی، اس نے اس وقت خود کو کم زور سمجھا، جب اس نے کمک کے حصول کا فیصلہ کیا تھا۔ مہلک احتیاط اور قیمتی وقت کا ضیاع! جاوید نے یہ سب فاش غلطیاں کی تھیں، جب کہ وہ اب تک پیدا ہونے والے چالاک ترین اور صحیح ترین جاسوسوں میں سے تھا۔ جاوید وہ شے تھا، شکار کی اصطلاحات میں جسے "عقل مند کتا" کہا جاتا ہے، مگر وہ کیا جو غلطیوں سے پاک ہونا کہلاتا ہے؟

ذہنی صلاحیت والے لوگ بھی چوک جاتے ہیں۔

طویل ترین رسّی کی طرح عظیم ترین حماقتیں بھی اکثر بے شمار دھاگوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ رسّے کو دھاگا دھاگا کیجیے، تمام معمولی فیصلہ کن مقاصد الگ الگ کیجیے اور آپ ایک کے بعد دوسرے سب کو توڑ سکتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں "بس، اس میں یہی کچھ تھا۔" انھیں گوندھیے، انھیں ایک ساتھ موڑ دیجیے؛ نتیجہ قوی ہیکل نکلتا ہے: یہ، مشرق میں [پانچویں صدی کا بازنطینی شہنشاہ] Marcian اور مغرب میں [روما کے شہنشاہ] Valentinian کے درمیان متذبذب Attila [ہنگری کا شہنشاہ] ہوتا ہے؛ یہ Capua میں سستی کرتا ہوا Hannibal [قبل مسیح کا جرنیل] ہوتا ہے؛ یہ Arcis-sur-Aube میں سوجانے والا [انقلاب فرانس کا پہلا صدر] Danton ہوتا ہے۔

وہ جو کچھ بھی ہو، اس لمحے بھی جب اس نے ژاں ولجواں کو فرار ہوتے دیکھا، اس نے اپنے اوسان بحال رکھے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ سزا یافتہ جس نے اپنی پابندی توڑی تھی، زیادہ دور نہیں رہ سکتا تھا، اس نے پہرے لگائے، اس نے کھٹکے اور کمیں گاہیں منظم کیں اور تمام رات علاقے میں گشت کیا۔ پہلی چیز جو اس نے دیکھی تھی وہ سڑک کی لالٹینوں میں بے ترتیبی تھی، جن کی رسیاں کاٹ دی گئی تھیں۔ ایک قیمتی اشارہ، بہرحال جس نے اسے گمراہ کیا تھا، اس لیے کہ اس نے اپنی تمام تحقیقات کا رُخ بند گلی Genrot کی طرف کر دیا تھا۔ اس بند گلی میں نیچی دیواریں تھیں، جو باغیچوں سے ملی ہوئی تھیں، جن کی حدیں وسیع بنجر علاقوں سے متصل تھیں۔ ظاہر ہے کہ ژاں ولجواں اسی طرف فرار ہوا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ بند گلی Genrot میں ذرا زیادہ دور تک گیا ہوتا، اور شاید اس نے ایسا ہی کیا ہوتا اور کھو گیا ہوتا۔ جاوید نے ان باغیچوں اور بنجر علاقوں میں اتنی چھان بین کی تھی، گویا وہ کسی سوئی کا شکار کر رہا تھا۔

طلوعِ فجر کے وقت اس نے دو ذہین آدمیوں کو نگاہ رکھنے پر چھوڑ دیا، اور پولیس کے ہیڈکوارٹر واپس پہنچا، ایسا شرمندہ جیسے پولیس کے کسی جاسوس کو ڈاکو نے پکڑ لیا ہو۔

۞

62 Rue Petit-Picpus

نصف صدی قبل Petit-Picpus اسٹریٹ کے مکان نمبر 62 کے پھاٹک جیسا کوئی پھاٹک نہیں تھا۔ یہ راستہ عام طور پر پُرکشش دعوت دینے والے انداز میں کھلا رہتا تھا اور دو چیزوں کا منظر پیش کرتا تھا، جس میں افسردگی کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔۔۔ انگور کی بیلوں سے ڈھکی دیواروں کے درمیان ایک صحن، اور ایک کاہل سا دربان۔ دیوار کے اوپر سے لمبے لمبے درخت دکھائی دیتے تھے۔ جب سورج کی کرن صحن کو روشن کر دیتی، جب وائن کا ایک جام دربان کا دل خوش کر دیتا تو چہرے پر تبسم سجائے بغیر اس مکان کے قریب سے گزرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہ ایک اداس جگہ نظر آتی تھی۔

دہلیز تبسم خیز؛ اور مکان دعا کرتا، بسورتا ہوا۔

اگر کبھی کوئی دربان سے بچ کر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا، جو آسان کام نہیں۔۔۔ جو ہر ایک کے لیے تقریباً ناممکن بات ہوتی تھی، اس لیے کہ وہاں ایک ''کھل جا سم سم'' ہوتا تھا جس کا علم ہونا ضروری تھا۔۔۔ اگر آپ دربان سے گزر کر اس میں داخل ہو جاتے ہیں تو دائیں جانب ایک چھوٹا سا پیش دالان پڑتا ہے اور ایک زینہ جو دو دیواروں کے درمیان، اور اتنا تنگ کہ اس پر ایک وقت میں ایک ہی آدمی چڑھ سکتا ہے اور اگر آپ چیکیلے زرد پلاسٹر اور چاکلیٹ کے رنگ کی کناری سے، جو سیڑھیوں پر لگی ہوتی ہے، وحشت زدہ ہو جانے کے باوجود چڑھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ پہلی landing پر پہنچ جاتے ہیں، اس کے بعد دوسری landing اور پھر پہلی منزل کی راہداری میں جہاں پیلے اور چاکلیٹ رنگ کی تواتر سے چلتی بنیاد نظر آتی ہے۔ سیڑھی اور راہداری دو خوب صورت کھڑکیوں سے روشن ہوتی ہیں۔ راہداری ایک موڑ کے بعد

اندھیری ہو جاتی ہے۔ چند قدم آگے، ایک دروازہ آتا ہے جو اور بھی پُر اسرار ہو جاتا ہے، اس لیے کہ وہ بند نہیں ہوتا۔ آپ اس میں داخل ہوں تو خود کو چھ مربع فٹ چھوٹے، ٹائل لگے، اچھی طرح سے رگڑ کر صاف کیے، سرد، ہرے رنگ کے، پندرہ سو فی رول، پھولوں والے کاغذ لگے کمرے میں پاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنی بڑی سی کھڑکی سے، جو کمرے کی بائیں جانب کی پوری چوڑائی کو گھیرے ہوتی ہے، ہلکی سفید روشنی آتی ہے۔ آپ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہیں، مگر کوئی نظر نہیں آتا؛ آپ سننے کی کوشش کرتے تو نہ کوئی انسانی قدم کی آہٹ اور نہ انسانی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ دیواریں خالی اور بغیر فرنیچر کی؛ حتیٰ کہ ایک کرسی بھی نہیں۔

ایک بار پھر دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ دروازے کے سامنے دیوار پر ایک چوکور سوراخ، تقریباً ایک مربع فٹ کا ہے، جس پر کالے رنگ کی ٹھوس گرہوں والی آہنی جالی لگی ہوئی ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ انچ قطر کی لمبائی کے مربعے بنے ہوئے ہیں۔ دیواری کاغذ پر سبز رنگ کے پھول آہنی جالیوں تک مسلسل اور باقاعدگی سے بنے نظر آتے ہیں اور ان کے ماتمی انداز سے کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی زندہ وجود، اس قدر مخفی ہو کہ اس چوکور سوراخ سے اندر آنے یا باہر جانے کی کوشش کرے، تو یہ جالیاں اسے روک لیں گی۔ اس سے کوئی جسم تو اندر آ نہیں سکے گا مگر اس کی نظریں یا اس کا ذہن اندر داخل ہو جائے گا۔ یہ سب آنے والے کو محسوس ہو جاتا ہے، اس لیے کہ دیوار میں پیچھے ٹین کی چادر لگا دی گئی ہے جس میں ہزاروں سوراخ ہیں جو شمار میں کسی مہین چھلنی سے بھی زیادہ تھے۔ اس چادر کے نیچے دروازے میں خط ڈالنے کا سا شگاف بنا ہوا تھا۔ ٹیپ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جالی لگے سوراخ کی دائیں جانب لٹکتی ہوئی گھنٹی کی ڈور سے لگا دیا گیا تھا۔

''کون ہے؟'' اچانک ایک آواز نے سوال کیا۔

یہ کسی عورت کی آواز تھی؛ مہذب آواز، اس قدر مہذب کہ ماتمی لگتی تھی۔

یہاں بھی ایک جادوئی لفظ تھا جس کا معلوم ہونا ضروری تھا۔ اگر آپ نہیں جانتے، تو آواز آنی بند ہو جاتی ہے اور ایک بار پھر خاموشی ہو جاتی ہے، اس طرح کہ جیسے دوسری جانب قبر کا سا اندھیرا ہو۔

اگر آپ کو وہ جادوئی لفظ، یعنی بسم بسم، معلوم ہو اور اسے دہرا دیں تو آواز کہتی، ''داخلہ دائیں جانب ہے۔''

تب دائیں جانب، آپ کو ایک بڑے سے چوکھٹ میں، کھڑکی کے سامنے لگا شیشے کا دروازہ نظر آئے گا جس پر بھورے رنگ کا پینٹ ہوتا ہے۔ چٹخنی اٹھانے اور دہلیز پار کرنے کے

بعد آپ کو بالکل ویسا ہی احساس ہوتا ہے جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے جیسے آپ کسی تھیٹر میں، کسی جالی لگے تہ خانے کے ٹب میں، جالی نیچے کیے اور فانوس روشن کیے بغیر داخل ہو جاتے ہیں۔ گویا آپ کسی تنگ، تھیٹر باکس قسم کی جگہ میں ہیں جس میں دو کرسیاں رکھی ہوئی ہیں اور پیال سے بنی ایک گھسی ہوئی چٹائی پڑی ہو، اور شیشے سے مدھم سے روشنی آ رہی ہو؛ یعنی وہ ایک عام قسم کا باکس ہے جس کا سامنے کا حصہ ٹیک لگانے کے قابل بلند ہوتا ہے اور اس میں سیاہ رنگ کی لکڑی سے بنی تختہ بندی ہوتی ہے۔ اس باکس میں جالی لگی ہو، مگر اس کی جالی مع چوبی لکڑی کی نہ ہو، جیسا کہ اوپیرا میں ہوتا ہے؛ یہ لوہے کے چھڑوں سے بنی خوف ناک جالی، بھیانک طریقے سے الجھی اور ایسی موٹی موٹی کیلوں سے دیوار میں جڑی ہوئی تھی جن کی شکل بند مٹھی کی طرح ہوتی ہے۔

پہلے چند منٹ گزر گئے؛ جب آنے والے کی آنکھیں اس کوٹھڑی جیسے، نصف روشن ماحول کی عادی ہو جاتی ہیں، اور وہ جالی کے پاس سے گزر چکا ہوتا ہے، مگر چھ انچ سے زیادہ آگے نہیں۔ وہاں سیاہ رنگ کا شٹر، یعنی زرد پینٹ کی ہوئی لکڑی کی مضبوط آڑی شہتیروں سے بنے، مورچے جیسی رکاوٹ کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ شٹر ہمیشہ بند ہوتے ہیں۔ چند منٹ کے بعد شٹر کے عقب سے آتی ایک آواز سنائی دیتی ہے:

"میں یہاں ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

یہ محبت بھری آواز تھی۔ کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ صرف سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی، وہ بھی مشکل سے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ادھر کوئی روح تھی جس کو جگا دیا گیا تھا، جو قبر کی دیوار کے اس پار سے بات کر رہی تھی۔

اگر آپ اتفاق سے کچھ مخصوص اور پہلے سے طے شدہ حالات میں وہاں ہوں تو آپ کے سامنے کے شٹر کی پٹیوں میں سے ایک پٹی اٹھتی ہے: اور جگائی ہوئی روح آسیب بن جاتی ہے۔ جالی کے اور شٹر کے پیچھے، جہاں تک جالی اجازت دیتی ہے، ایک سر ابھرتا ہے، جس کا صرف منہ دکھائی دیتا ہے؛ بقیہ حصہ سفید نقاب میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ آپ کو اس کے زیب گلو کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے، اور سیاہ رنگ کی چادر میں لپٹا ایک پیکر دکھائی دیتا ہے۔ وہ سر آپ سے بات کرتا ہے، مگر جو آپ سے نہ آنکھ ملاتا ہے اور نہ مسکراتا ہے۔

آپ کے پیچھے سے آنے والی روشنی اس انداز سے آتی ہے کہ عورت آپ کو سفید، اور آپ عورت کو سیاہ دکھائی دیتے ہیں۔

پھر بھی، آپ کی نظریں اس دراز سے داخل ہو جاتی ہیں جو اس جگہ بنائی گئی ہے۔ ماتمی لباس

میں ملبوس پیکر پر ایک ابہام کی سی کیفیت طاری نظر آتی ہے۔ آپ کی آنکھیں آسیب کے گرد و پیش ابہام میں کچھ تلاش کرنے لگتی ہیں۔ تھوڑے سے عرصے کے بعد آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ نے دیکھا ہے وہ محض رات تھی، خالی پن تھا، پرچھائیاں تھیں، قبر سے نکلنے والے پھوار میں ملی سرد دھند تھی، ایک خوف ناک سکون تھا، ایک خاموشی تھی جس سے آپ کچھ اخذ نہیں کر سکتے، آہ تک نہیں، بس ایک افسردگی کا عالم، جس میں آپ کسی شے کی تمیز نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ خیالی پیکر بھی نہیں۔

آپ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خانقاہ کا اندرون تھا۔

وہ اس عمارت کے چہرے کی شدید افسردگی تھی، جس کو Convent of the Bernardines of the Perpetual Adoration کہا جاتا ہے۔ وہ باکس آپ جس میں کھڑے تھے، ایک خلوت خانہ تھا۔ پہلی آواز جس نے آپ کو مخاطب کیا تھا وہ خاتون دربان کی آواز تھی جو ہمیشہ بے حس و حرکت اور خاموش، دیوار کی دوسری جانب، مربع سوراخ کے قریب، آہنی جالی اور ہزاروں سوراخ والی چادر کے پیچھے بیٹھی ہوتی ہے۔ وہ ابہام، جالی لگا باکس جس میں ڈوبا ہوا تھا اس حقیقت سے ابھرا تھا کہ وہ پارلر، جس میں دنیا کی جانب ایک کھڑکی تھی، مگر خانقاہ کی جانب ایک بھی نہیں تھی۔ ناپاک نظروں کو مقدس جگہ کی کوئی شے نظر نہیں آنی چاہیے۔

پھر بھی، اس پرچھائیں سے پرے کوئی شے تھی؛ ایک روشنی تھی؛ ادھر موت کے درمیان زندگی تھی۔ اگرچہ یہ تمام خانقاہوں میں سب سے زیادہ فصیل بند خانقاہ تھی، ہم اس میں، طے حدود کو پار کیے بغیر داخل ہونے کی کوشش کریں گے، اور قاری کو اپنے ساتھ لے چلیں گے،، وہ سب کچھ دیکھنے کے لیے جنھیں نہ کبھی داستان گویوں نے دیکھا ہے، اور نہ کبھی بیان ہی کیا گیا ہے۔

۞

مارٹن ورگا کی فرماں برداری

یہ خانقاہ جو 1824ء سے کئی برس پہلے سے Petit-Picpus اسٹریٹ میں قائم تھی، Bernardines of the Obedience of Martin Verga کی کمیونٹی سے متعلق تھی۔

Bernardine کے Bernardines راہبوں کی طرح Clairvaux سے نہیں، Citeaux سے منسلک تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ سینٹ برنارڈ کے نہیں بلکہ سینٹ Benoit کے پیروکار تھے۔

وہ جس نے قدیم کے اوراق کھنگالے ہیں، جانتا ہو گا کہ مارٹن ورگا (Verga Martin) نے 1425ء میں Bernardines کے Benedictines کا اجتماع کیا تھا جس میں سالامانکا (Salamanca) کو آرڈر کا سربراہ بنایا گیا تھا، اور الکالا (Alcala) کو تنظیم کی شاخ بنایا گیا تھا۔

اس اجتماع نے یورپ کے تمام کیتھولک ممالک میں شاخیں قائم کی تھیں۔

لاطینی کلیسا میں فرقوں کے درمیان اس قسم کی قلم کاری غیر معمولی نہیں تھی۔ صرف ایک واحد آرڈر آف Saint-Benoit کی تفصیل بیان کرنے کے لیے، جس کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے، کہا جائے گا کہ مارٹن ورگا Martin Verga کی فرماں برداری پر انحصار کیے بغیر، اس آرڈر سے چار اجتماعات منسلک تھے — اطالیہ میں دو، Mont-Cassin اور Padua کے سینٹ جسٹینیں؛ فرانس میں دو، Cluny اور سینٹ Maur؛ اس کے علاوہ مزید نو آرڈر تھے — Vallombrosa، Granmont، Celestins، Camaldules، Carthusians،

Silvestrins ،Olivateurs ،Humilies کے، اور آخر میں Citeaux؛ اس لیے کہ خود Citeaux بھی، جو کئی دوسرے آرڈر کا منبع تھا، Saint-Benoit کی ایک شاخ تھا۔ Citeaux کا قیام سینٹ رابرٹ، Abbe de Molesme کی مدد سے Langres کے مذہبی علاقے میں 1098ء میں عمل میں آیا تھا۔ اب 1529ء تھا جس میں وہ شیطان ریٹائر ہو کر Subiaco کے صحرا میں جا بسا تھا— بوڑھا ہونے کے باعث— گوشہ نشین بن گیا تھا— اپالو کی قدیم عبادت گاہ سے، جہاں وہ رہتا تھا، Saint-Benoit نے، جو اس وقت سترہ برس کا تھا، اسے نکال باہر کیا تھا۔

Carmelites کے بعد— جو ننگے پاؤں رہتے ہیں، گلے میں willow پہنتے ہیں، اور کبھی بیٹھتے نہیں— سب سے زیادہ سخت حاکمیت مارٹن ورگا کے Bernardines-Benedictines کی تھی۔ یہ لوگ گلو بند سمیت، سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں، جو Saint-Benoit کے احکام کے مطابق ٹھوڑی تک پہنچتا ہے۔ سرج سے تیار کردہ لمبی آستینوں والا لبادہ، چوبی نقاب، سینوں پر کٹے ٹھوڑیوں تک پہنچتے گلو بند، ابرو سے لٹک کر آنکھوں تک لٹکتی پٹی— یہ تھا ان کا لباس۔ سوائے پٹی کے سب کچھ سیاہ ہوتا ہے۔ نو وارد بھی وہی پہنتے ہیں، مگر سب سفید ہوتا ہے۔ اقراری راہبائیں مالا بھی پہنتی ہیں۔

مارٹن ورگا کے Bernardines-Benedictines دائمی عبادت کرتے ہیں، Benedictines کے، جنھیں Ladies of the Holy Sacrament کہا جاتا ہے، اس صدی کی ابتدا میں پیرس میں دو مکان تھے— ایک Temple کے علاقے میں اور دوسرا Neuve-Sainte-Genevieve اسٹریٹ میں۔ مگر Petit-Picpus کے Bernardines Benedictines، ہم جن کے بارے میں بات کر رہے ہیں، Temple کے علاقے Neuve-Sainte-Genevieve اسٹریٹ میں Ladies of the Holy Sacrament سے بہت مختلف آرڈر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی حاکمیت میں بہت اختلافات تھے؛ کچھ اختلافات ان کی لباس کے بارے میں بھی تھے۔ Petit-Picpus کے Bernardines سیاہ رنگ کے گلو بند پہنتے تھے، اور Neuve-Sainte-Genevieve Benedictines اسٹریٹ والے سفید رنگ کے پہنتے تھے، اس کے علاوہ ان کے سینے پر پہنے جانے والے شعائر مقدسہ تقریباً تین انچ زیادہ لمبے ہوتے تھے، جو یا تو نقرئی ہوتے تھے یا ملمع شدہ تانبے کے ہوتے تھے۔ Petit-Picpus کی راہبائیں یہ شعائر مقدسہ نہیں پہنتی تھیں۔ Perpetual Adoration

جو Petit-Picpus کے خاندان اور Temple والے خاندان میں عام تھا، وہ آرڈر کو بالکل الگ رکھتا تھا۔ ان کی شباہت Ladies of the Holy Sacrament اور مارٹن ورگا کے Bernardines سے اس طرح ملتی تھی، جیسی ان دو آرڈر کے درمیان مماثلت یسوع مسیح کی پیدائش سے متعلق ان کے مطالعے، ان کی زندگی اور ان کی اور کنواری کی موت سے ملتی تھی، مگر دونوں بہت مختلف تھے، اور اکثر ایک دوسرے کے دشمن بھی ہو جایا کرتے تھے۔ Oratory of Italy کو Philip de Neri نے فلورنس میں قائم کیا تھا، اور Oratory of France کی بنیاد Pierre de Berulle نے ڈالی تھی۔ Oratory of France اپنی برتری کا دعویٰ کرتی تھی اس لیے کہ Philip de Neri صرف ایک سینٹ تھا، جب کہ Berulle کارڈینل تھا۔

اب ہم مارٹن ورگا کی سخت حکمرانی کی طرف واپس چلتے ہیں۔

اس حلقے کی Bernardines-Benedictines سال بھر روزے رکھتی ہیں، گوشت خوری سے پرہیز کرتی ہیں، پہلی نیند کے بعد، صبح کے ایک سے تین بجے تک جاگتی ہیں، ہر روز کی مخصوص دعائیں پڑھتی ہیں اور تسبیح نیم شمی کرتی ہیں، ہر موسم میں سرج سے بنی چادر اور پیال کے درمیان سوتی ہیں، غسل سے پرہیز کرتی ہیں، آگ کبھی نہیں جلاتیں، جمعے کے دن خود کو سزا دیتی ہیں، خاموشی کا حکم بجا لاتی ہیں، ایک دوسرے سے صرف تفریح کے اوقات میں بات کرتی ہیں، جو بہت مختصر ہوتی ہیں، 14 ستمبر سے Exaltation of the Holy Cross تک سال میں چھ ماہ موٹے اون کی قمیص پہنتی ہیں۔ سال کو چھ مہینوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے: حکم کہتا ہے پورے سال مگر اونی قمیصیں گرمی کے موسم میں ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں، جو بخار اور اعصابی تشنج پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے تبدیلی کے ذریعے اس کے استعمال کو محدود کرنا پڑا تھا۔ اس مجرمانہ تخفیف کے باوجود، جب راہبائیں 14 ستمبر کو یہ قمیص پہنتی ہیں تو انھیں تین چار دنوں تک بخار رہتا ہے۔ فرماں برداری، افلاس، پاکیزگی، اور اپنی علاحدگی پر قائم رہتی ہیں — یہ ان کے اقرارِ صالحات ہوتے ہے حکم جس کو سنگین کر دیتا ہے۔

نائب راہبہ کا انتخاب مادر کے ہاتھوں تین برس کے لیے ہوتا ہے، جنھیں 'meres vocales' [بولنے والی مائیں کہا جاتا ہے] اس لیے مجلس خانے (chapter) میں ان ہی کا دخل ہوتا ہے۔ کوئی عورت صرف دو بار ہی نائب راہبہ منتخب ہو سکتی ہے، اس طرح کسی نائب راہبہ کی مدت نو برس تک محدود ہو جاتی ہے۔

وہ عارضی مبلغ کو کبھی نہیں دیکھ پاتیں جو نو فٹ بلند سرج کے پردے کے پیچھے ان سے چھپایا جاتا ہے۔خطبے کے دوران، جب مبلغ گرجا گھر میں ہوتا ہے، وہ اپنے چہروں پر اپنی نقابیں ڈال لیتی ہیں۔وہ ہمیشہ دھیمی آواز میں بات کرتی ہیں، چلتے وقت اپنی نظریں زمین پر رکھتی ہیں اور ان کے سر جھکے ہوتے ہیں۔صرف ایک مرد کو خانقاہ میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے— یعنی، تعلقے کا آرچ بشپ۔

بس، ایک مرد اور ہوتا ہے— خانقاہ کا مالی، مگر وہ ہمیشہ کوئی بوڑھا شخص ہوتا ہے۔ باغیچے میں وہ ہمیشہ تنہا رہتا ہے، راہباؤں کی تنبیہ کے لیے اور اس کے گھٹنے پر ایک گھنٹی باندھ دی جاتی ہے۔

نائب راہبہ کی اطاعت سب کے لیے حتمی ہوتی ہے۔

باری باری ہر ایک پر استغفار کرنا لازمی ہوتا ہے۔استغفار دعا ہے تمام گناہوں کی، تمام غلطیوں کی، تمام اختلافات کی، تمام خلاف ورزیوں کی، تمام ناانصافیوں کی اور زمین پر کیے گئے تمام جرائم کی۔مسلسل بارہ گھنٹے کے عرصے کے دوران، چار بجے شام سے چار بجے صبح تک، یا چار بجے صبح سے چار بجے شام تک، سسٹر جو استغفار کرتی ہے اس میں مقدس Sacrament کے سامنے پتھر پر اپنے گھٹنوں کے بل جھکی ہوتی ہے، ہاتھ باندھے ہوتی ہے، اور اس کے گلے میں پھندا لگا ہوتا ہے۔جب تھکن ناقابلِ برداشت ہونے لگتی ہے، وہ زمین پر منہ کے بل لیٹ جاتی ہے،اور اس کے بازو صلیب کی شکل میں پھیلے ہوتے ہیں: اس کے لیے صرف اتنا ہی آرام ہوتا ہے۔اس حالت میں وہ کائنات کے تمام گناہگاروں کے لیے دعائیں کرتی ہے۔رفعت کے لیے یہ اچھا عمل ہوتا ہے۔

چوں کہ یہ عمل ایک ستون کے سامنے کیا جاتا ہے جس پر ایک شمع فروزاں ہوتی ہے، اس کو بلا امتیاز استغفار کرنا یا ستون کے سامنے ہونا کہتے ہیں۔راہبائیں، انکسار کے طور پر اس اظہارِ بیان کو ترجیح دیتی ہیں جس میں اذیت رسانی اور ذلت کا پہلو ہوتا ہے۔استغفار کرنا ایک عمل ہوتا ہے جس میں پورا نفس منہمک ہوتا ہے۔اگر استغفار کرنے والی کے عقب میں آسمانی بجلی بھی گر جائے تب بھی اس کی توجہ استغفار سے مبذول نہیں ہوگی۔

اس کے علاوہ ہمیشہ ایک سسٹر مقدس Sacrament کے سامنے جھکی ہوتی ہے۔یہ کیفیت ایک گھنٹے جاری رہتی ہے۔ایک دوسرے کو فارغ کرتی رہتی ہیں جیسے پاسبانی پر مامور سپاہی۔یہی Perpetual Adoration کہلاتا ہے۔راہباؤں کے نام پر مخصوص مذہبیت ثبت

ہوتی ہے، جن سے سینٹ ہی نہیں، بلکہ یسوع مسیح کی زندگی کے لمحات بھی یاد آتے ہیں۔ جیسے Mother Presentation, Mother Nativity, Mother Conception, Mother Passion وغیرہ۔ مگر سینٹ کے ناموں کی شمولیت کی ممانعت نہیں ہوتی۔

ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی ہے، سوائے منہ کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

ان کے سارے دانت پیلے ہوتے ہیں۔ خانقاہ میں دانتوں کا برش کبھی داخل نہیں ہو سکا ہے۔ دانتوں کو برش سے صاف کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے سب سے بالا قدمچے پر دانت ہو اور سب سے نیچے قدمچے پر نفس ہو۔

وہ کبھی 'میرا یا میری' نہیں کہتیں۔ ان کی اپنی کوئی شے نہیں ہوتی، انھیں اپنے آپ کو کسی سے منسلک ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہر چیز کو وہ 'ہمارا' یا 'ہماری' کہتی ہیں: جیسے ہماری نقاب، ہماری تسبیح؛ اگر وہ اپنی قمیص کے بارے میں بات کر رہی ہوں تو وہ 'ہماری قمیص' کہیں گی۔ کبھی کبھی وہ کسی معمولی چیز سے منسلک ہو جاتی ہیں— کسی بات سے، کسی یادگار شے سے، کسی تمغے سے جو انھیں عطا ہوتا ہے۔ جوں ہی انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی شے سے منسلک ہو رہی ہیں، تو انھیں اس شے کو چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس وقت انھیں Saint Therese کے الفاظ یاد آجاتے ہیں، جس سے ایک خاتون نے اس وقت کہا تھا جب وہ آرڈر میں داخل ہو رہی تھی "ماں مجھے اجازت دیجیے کہ میں ایک بائبل منگا لوں۔ میں بائبل سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"او، تم کسی شے سے منسلک ہو! ایسی صورت میں ہمارے آرڈر میں داخل نہیں ہو سکتیں۔"

کسی بھی فرد کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اپنے آپ کو بند کر لینے، الگ اپنا کمرہ لینے کی ممانعت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ کھلی کوٹھریوں میں زندگی گزارتی ہیں۔ جب وہ ملتی ہیں، ایک کہتی ہے "متبرک اور قابلِ پرستش ہے قربان گاہ کا مقدس Sacrament۔" دوسری جواب میں کہتی ہے، "ہمیشہ کے لیے۔" جب کوئی کسی کے دروازے پر دستک دیتی ہے، تو یہی رسم دہرائی جاتی ہے۔ دستک تو کجا، دروازہ چھوتے ہی ایک نرم آواز کہہ دیتی ہے، "ہمیشہ کے لیے۔" تمام عادتوں کی طرح، یہ بھی تکنیکی طاقت کی عادت بن جاتی ہے؛ اور کبھی تو وہ "ہمیشہ کے لیے" کہہ دیتی ہے، اس سے پہلے ہی کہ وہ ذرا طویل جملہ 'متبرک اور قابلِ پرستش ہے، قربان گاہ کا مقدس Sacrament" ادا کیا جائے۔

Visitandines والوں میں وہ جو "Ave Maria" کہتی ہے اور وہ جس کی کوٹھری میں داخلہ ہوتا ہے، کہتی ہے "Gratia plena."۔ یہ ان کا 'دن بخیر' کہنے کا ایک

انداز ہے جو دراصل "بڑے کرم والا" کہنا چاہتی ہے۔

دن کے ہر گھنٹے خانقاہ کے گرجا گھر کی گھڑی تین اضافی گھنٹیاں بجاتی ہے۔ اس اشارے پرنائب راہبہ، بولنے والی مائیں، اقراری راہبائیں، نو واردین، امید رکھنے والیاں، جو کچھ کہہ رہی ہیں اور کچھ کر رہی، یا جس کے بارے میں سوچ رہی ہیں، اس کو منقطع کر دیتی ہیں، اور سب ایک ساتھ مل کر مثال کے طور پر، کہہ دیتی ہیں "پانچ بجے کے بعد اور ہر گھنٹے پر متبرک اور قابل پرستش ہو، قربان گاہ کا مقدس Sacrament"۔ اور اگر اس وقت آٹھ بجے ہوتے ہیں تو "پانچ بجے کے بعد اور ہر گھنٹے" کے بجائے "آٹھ بجے اور ہر گھنٹے" کہہ دیتی ہیں، اور اسی طرح وقت کے مطابق یہ ٹکڑا بدلتا جاتا ہے۔

یہ طور طریقہ، جس کا مقصد خیالات کی رَو کو توڑنا اور اس کو فوراً خدا کی جانب کر دینا ہوتا ہے، بہت سے سماجوں میں رائج ہے؛ صرف ترتیب بدل جاتی ہے۔ اسی طرح نوزائیدہ یسوع مسیح کے لیے وہ کہتی ہیں "یہ گھنٹا اور ہر گھنٹا یسوع کی محبت میرے دل کو روشن کرے"۔ مارٹن ویرگا والی Bernardines-Benedictines جو پچاس برس پہلے Petit-Picpus خانقاہ میں رہا کرتی تھیں، ایک متبرک دعا کا ورد کرتی تھیں، جو خالص گریگری ورد ہوتا تھا اور پوری آواز سے گایا جاتا تھا۔ پادریوں کی دعائیہ کتب میں ہر جگہ جہاں ستارے کا نشان بنا ہوتا تھا، وہاں وہ توقف کرتی تھیں اور دھیمی آواز میں کہتی تھیں "یسوع — مریم — یوسف"۔ کسی مرے ہوئے کی جانب سے ورد کے لیے اتنا دھیما لہجہ اختیار کرتی تھیں جس تک کوئی عورت پہنچ نہیں سکتی تھی۔ اس کا اثر شدید اور الم ناک ہوتا تھا۔

Petit-Picpus کی راہباؤں نے، اپنی کمیونٹی والوں کے دفن کے لیے اپنی عظیم قربان گاہ کے نیچے ایک تہہ خانہ بنا رکھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ حکومت اس تہہ خانے میں جنازے وصول کرنے کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے جب وہ مرتی تھیں تو خانقاہ چھوڑ دیتی تھیں۔ ان کے لیے یہ ایک بیماری تھی جو ان میں خوف پیدا کر دیتی تھی اور یہ قوانین کی صریح خلاف ورزی ہوتی تھی۔

انھوں نے درمیانہ درجے کی تسلی ایجاد کر لی تھی — خاص وقت پر قدیم Vaugirard قبرستان میں مٹی میں دبانے کی اجازت ہوتی تھی جو پہلے ان کی کمیونٹی کی ملکیت تھا۔

جمعے کے دن، اتوار کی طرح، راہبائیں بلند آواز عبادات اور شام کی دعائیں سنتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ نہایت توجہ سے تمام چھوٹے چھوٹے تہوار مناتی تھیں، دنیا والے جن سے واقف نہیں تھے، جن کے بارے میں فرانس کا کلیسا قدیم دنوں میں بہت مُسرف ہوا کرتا تھا اور جو

ہسپانیہ اور اطالیہ کے گرجا گھروں میں آج بھی مُصرف ہے۔ گرجا گھروں میں رہنے کی جگہوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ان کی دعاؤں کے شمار اور عرصے کے تعین کا معاملہ ہے، تو ہم ان کے ذہین خیالات کی ان کی اس رائے سے بہتر ترجمانی نہیں کر سکتے: "امید واروں کی دعائیں خوف ناک ہوتی ہیں، نو واردین کی دعائیں ان سے بھی خراب ہوتی ہیں، اور اقراری راہباؤں کی دعائیں خراب ترین ہوتی ہیں۔"

ہفتے میں ایک دن ان کا مجلس خانہ برپا ہوتا ہے۔ نائب راہبہ صدارت کرتی ہے؛ بولنے والی مائیں مدد کرتی ہیں۔ باری باری ہر سسٹر پتھر پر گھٹنوں کے بل کھڑی ہوتی ہے، سب کی موجودگی میں اور بلند آواز میں اعتراف کرتی ہے، تمام غلطیوں کا اور گناہوں کا جو اس نے ہفتے کے دوران کیے ہوتے ہیں۔ بولنے والی مائیں ہر اعتراف کے بعد مشورہ کرتی ہیں اور بلند آواز میں کفارے کا اعلان کرتی ہیں۔

بلند آواز میں کیے جانے والے اس اعتراف کے علاوہ، ان کے ہر قابلِ معافی جرائم کے لیے coulpe [عملِ احساسِ گناہ] کرایا جاتا ہے۔ کسی سے coulpe کرانے کا عمل، راہبہ کے سامنے منہ کے بل اس وقت تک لیٹے رہنا ہوتا ہے جب تک کہ وہ، جس کو سوائے مادر کے کچھ اور نہیں کہا جاتا، مجرم کے پیر پر لکڑی کی ہلکی چپت کے ذریعے اس کو مطلع نہیں کر دیتی کہ اس کو اٹھ جانے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ احساسِ گناہ یا اعترافِ گناہ چھوٹے چھوٹے معاملات کے لیے کرایا جاتا ہے، جیسے کوئی شیشہ توڑ دیا، یا نقاب ہٹا دی یا عبادت میں غیر ارادی تاخیر کر دی، گرجا گھر میں کوئی غلط بات کر دی، وغیرہ۔ ان کے لیے coulpe کافی ہوتا ہے۔ یہ coulpe بالکل فوری ہوتا ہے؛ لائقِ تعزیر شخصیت خود اپنے آپ کو پرکھتی ہے اور خود ہی اپنے آپ کو سزا بھی دیتی ہے۔ تہوار کے دنوں، اور اتوار کو دعا شروع کرنے کے لیے چار مائیں بڑی سے مطالعاتی میز کے سامنے خاص لہجے میں دعائیہ گیت گاتی ہیں۔ ایک دن گانے والی ماؤں میں سے ایک نے Ecce سے شروع ہونے والا ایک دعائیہ گیت گایا، اور Ecce کے بجائے تین بار do si sol کہہ دیا؛ اس بھول کے بدلے اسے ایک coulpe کرنا پڑا تھا جو اجتماع کے پورے عرصے جاری رہا تھا: یہ غلطی اس لیے بڑی ہو گئی تھی کہ اس پر پورا مجلس خانہ ہنس پڑا تھا۔

جب کسی راہبہ کو پارلر میں طلب کیا جاتا ہے، خواہ وہ نائب راہبہ ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنا نقاب گرا دیتی ہے، جیسا کہ قاری کو یاد ہوگا، تاکہ اس کا صرف منہ نظر آئے۔

صرف نائب راہبہ ہی اجنبی لوگوں سے بات کر سکتی ہے۔ دوسری عورتیں صرف اپنے

قریبی اعزہ سے مل سکتی ہیں، اور بہت کم۔ اگر اتفاق سے کوئی بیرونی خاتون کسی راہبہ سے ملنا چاہتی ہے، یا اس سے جسے وہ بیرونی دنیا میں جانتی تھی یا جس سے محبت کرتی تھی، تو پہلے سلسلے وار بات چیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ شخصیت عورت ہوئی تو اکثر اجازت دے دی جاتی ہے؛ راہبہ آتی ہے، اور ملاقاتی اس سے شگر کے ذریعے بات کرتے ہیں، جو صرف ماں یا بہن کے لیے کھولا جاتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مردوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

یہ ہے Saint-Benoit کا قانون، جسے مارٹن ورگا نے سنگین کردیا تھا۔

راہبائیں ہنس مکھ، امید افزا، اور تازہ مزاج نہیں ہوتیں، جیسی کہ اکثر دوسرے آرڈر کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ زرد رُو اور سنجیدہ رہتی ہیں۔

1825ء اور 1830ء کے درمیان تین راہبائیں پاگل ہو گئی تھیں۔

کفایت شعاری

اگر آپ کو خانقاہ میں داخلہ لینا ہے تو آپ کو کم از کم دو برس تک امیدوار رہنا پڑتا ہے، اکثر چار برس کے لیے بھی؛ نو وارد کو چار برس انتظار کرنا پڑتا ہے۔ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ تیئیس یا چوبیس برس کی عمر پہلے حتمی عہدِ رہبانیت کی قسم اٹھائی جائے۔ مارٹن ورگا کے Bernardines-Benedictines اپنے آرڈر میں عہد کی اجازت نہیں دیتے۔

ان کی کوٹھڑیوں میں کئی نامانوس قسم جسمانی نرم سازیاں کی جا سکتی ہیں، مگر ان کو بیان کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہوتی۔

جس دن ایک نو وارد عہد و اقرار کرتی ہے، وہ اپنے بہترین لباس میں ہوتی ہے، اس کو سفید پھولوں کا تاج پہنایا جاتا ہے، اس کے بال اس وقت تک جھاڑے جاتے ہیں جب تک چمک دار اور گھنگھریالے نہیں ہو جاتے۔پھر وہ سجدہ ریز ہو جاتی ہے؛ اس پر سیاہ رنگ کا بڑا سا نقاب ڈال دیا جاتا ہے اور مرنے والوں کے لیے دعائیہ گیت گائے جاتے ہیں۔اس کے بعد راہبائیں دورویہ قطاروں میں کھڑی ہو جاتی ہیں؛ ایک قطار دوسری قطار کے پاس سے گزرتی ہے، سادہ لہجوں میں کہتی ہوئی، "ہماری بہن مر گئی ہے" اور دوسری قطار سرمستی میں جواب دیتی ہے "ہماری بہن یسوع مسیح میں زندہ ہے!"

اس زمانے میں جب یہ واقعہ ہو رہا تھا اشرافیہ اور دولت مند خاندانوں کی لڑکیوں کا ایک اقامتی اسکول اس خانقاہ سے منسلک تھا جس میں میدموزیل Saint-Aulaire، میدموزیل Belissen، اور تالبٹ نامی ایک کیتھولک انگریز لڑکی پڑھتی تھی۔یہ نوجوان لڑکیاں چار دیواروں کے درمیان کی ان راہباؤں کی تربیت میں اس عہد کے خوف ناک ماحول میں پل بڑھ

رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے ایک دن کہا تھا، "سڑک کے پختہ راستے کو دیکھ کر میں سر سے پیر تک کانپ گئی تھی۔" وہ نیلے رنگ کے لباس میں تھی؛ سر پر سفید رنگ کی ٹوپی تھی، اور چھاتی پر نقرئی ملمعے کا یا تانبے کا مقدس روح کا نشان آویزاں تھا۔ مخصوص جشن کے دنوں میں، بالخصوص سینٹ مارتھا کے دن پر، رعایت اور خوشی کی خاطر، ان کو سارا دن راہباؤں کے لباس میں Saint-Benoit کے دفاتر چلانے اور کام نمٹانے کی اجازت دی جاتی تھی۔ ابتدائی دنوں میں راہبائیں طالبات کو اپنے سیاہ کپڑے عاریتاً دے دیا کرتی تھیں۔ اس کو مقدس اشیا کی بے حرمتی تصور کیا جاتا تھا اس لیے نائب راہبہ نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ صرف نوواردوں کو اس کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس قسم کے عمل کو خانقاہوں میں نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا، بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کی جاتی تھی، بلاشبہ، تبدیلیِ مذہب کے خفیہ جذبے کے تحت، تاکہ ان بچوں کو مقدس عادت کا پیشگی مزہ مل جائے، جس سے طالبات کو مسرت اور حقیقی تفریح حاصل ہوتی تھی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ یہ ایک نئی بات تھی؛ اس سے انھیں تبدیلی کا احساس ہوتا تھا۔ بچپن کی راست باز وجوہ، جو ہمیں دنیا دار بنانے میں کامیاب نہیں ہوتیں، اس مسرت کا اندازہ لگا سکتی ہیں جو ہاتھ میں مقدس پانی کے چھڑکاؤ کا فوارہ لیے مطالعے کی میز کے سامنے گھنٹوں کھڑی لڑکیوں کے زور زور سے گانے سے حاصل ہوتی ہے۔

طالبات کفایت شعاری کے خانقاہ کے تمام ضابطوں کی پاس داری کرتی تھیں۔ وہاں ایک خاص نوجوان خاتون تھی جو [خانقاہ چھوڑ کر] دنیا میں داخل ہوئی تھی اور کئی برسوں کی شادی شدہ زندگی کے باوجود، جب کوئی اس کے دروازے پر دستک دیتا تو راہباؤں کی طرح فوراً "ہمیشہ کے لیے" کہنے کی عادت سے باز نہیں آتی تھیں۔ راہباؤں کی طرح طالبات بھی اپنے عزیزوں سے پارلر ہی میں ملاقات کرتی تھیں۔ ان کی اپنی ماؤں کو بھی انھیں گلے لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ مندرجہ ذیل واقعہ واضح کرتا ہے کہ اس معاملے میں کس درجے سختی روا رکھی جاتی تھی۔ ایک دن ایک لڑکی سے اس کی ماں ملنے آئی، جس کے ساتھ اس کی تین سالہ بہن بھی تھی۔ بچی بہت روئی اس لیے کہ وہ اپنی بہن کو گلے لگانا چاہتی تھی، مگر یہ ناممکن تھا۔ ماں نے التجا کی کہ اس چھوٹی سی بچی کو کم از کم سلاخوں سے اپنا چھوٹا سا ہاتھ داخل کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ اس کی بہن اس کے ہاتھ کو بوسہ دے سکے۔

درخواست غضب ناکی کے ساتھ رد کر دی گئی تھی۔

۞

شگفتہ مزاجی

پھر بھی، ان نوجوان لڑکیوں نے اس سنگین گھر کو موہ لینے والی نشانیوں سے بھر دیا تھا۔

مخصوص وقتوں میں اس خانقاہ میں بچپنا جگمگ جگمگ کرتا تھا۔ تفریح کا وقت شروع ہوا۔ ایک دروازہ اپنے قلابوں میں گھوم گیا۔ چڑیوں نے کہا "اچھا ہے کہ اب بچے آ رہے ہیں۔" نوجوان لڑکیوں کی بھرمار نے صلیب جیسے اس باغیچے کو کفن کی طرح کاٹ دیا تھا۔ فروزاں چہرے سفید پیشانیاں، معصوم آنکھیں، ہنگامہ خیز روشنی، ہر قسم کی قطبی روشنیاں ان پرچھائیوں کے درمیان بکھری ہوئی تھیں۔ دعائیہ گیتوں کے بعد، گھنٹیوں کی، گھن گرج کی، ماتمی گھنٹیوں کی، اور ان چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی گنگس سے زیادہ میٹھی آوازیں پھوٹ پڑیں۔ خوشی کا چھتا کھل گیا تھا اور ہر ایک اپنے حصے کا شہد لانے لگی تھی۔ لڑکیاں کھیل رہی تھیں، ایک دوسرے کو پکار رہی تھیں، سب نے اپنے اپنے گروہ بنا لیے تھے، اور دوڑ بھاگ رہی تھیں؛ خوب صورت سفید دانت کونے میں گنگنا رہے تھے؛ فضائیں دور سے قہقہوں کی نگرانی کر رہیں، پر چھائیاں سورج کی کرنوں کی نگہبانی کر رہی تھیں مگر اس کا مطلب کیا تھا؟ اس کے باوجود وہ سب ہنس کھیل رہی تھیں۔ وہ چاروں رنجیدہ دیواروں کے لیے چکاچوند کر دینے والے چمک دار لمحات تھے۔ وہ مسرتوں سے دھلے سفید گنگس کے ان چھتوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا اس ماتمی گھر پر گلاب کے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ نوجوان لڑکیاں راہباؤں کی نظروں کے سامنے چہلیں کر رہی تھیں؛ بے گناہی کی گھورتی نگاہیں معصومیت کو شرمندہ نہیں کرتیں۔ ان بچیوں کے طفیل، سادگی کے اتنے گھنٹوں کے بعد معصومیت کا ایک گھنٹا میسر ہوا تھا۔ چھوٹی بچیاں رسی کود رہی تھیں، بڑی رقص میں تھیں۔ اس خانقاہ میں کھیل کود جنت سے ملا جلا ہوتا تھا۔ ان بڑھتی ہوئی تازہ اور جوان نفوس جیسی کوئی شے اتنی

مسرت آ گئیں اور اتنی جلیل القدر نہیں تھی۔ ہومر[سترہویں صدی کا فرانسیسی ادیب] Perrault کے ساتھ ہنسنے کے لیے وہاں آ گیا ہوتا؛ اس سیاہ باغیچے میں جوانی تھی، صحت تھی، شور تھا، چیخیں تھیں، تلون تھا، مسرت تھی، ان تمام بزرگ عورتوں کی تھکنوں کو دور کرنے کے لیے، ان شجیع اور پری کہانیوں والیوں، ان تخت نشینوں اور ان کے ساتھ Hecuba سے la Mere-Grand تک کی پھوس کی جھونپڑیوں والیوں کے لیے راحت تھی۔

کسی اور جگہ کے مقابلے میں، اس گھر میں ایسی کہاوتیں جنم لے رہی تھیں جو اتنی شان دار ہیں، اور ایسا تبسم پیدا کرتی ہیں جو غور و فکر سے مملو ہوتا ہے۔ان ہی چار دیواروں کے درمیان ایک پنج سالہ بچی نے چیخ کر کہا تھا، ''مادر! بڑی لڑکیوں میں سے ایک نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ میں یہاں زیادہ سے زیادہ نو برس اور دس مہینے رہوں گی۔ کتنی خوشی کی بات ہے؟''

یہی وہ جگہ تھی جہاں مندرجہ ذیل، یادگار مکالمہ ہوا تھا:

ایک رائے دہندہ مادر: ''بچی، تم رو کیوں رہی ہو؟''

بچی (چھ برس کی): ''میں نے Alix کو بتا دیا ہے کہ مجھے اپنی فرانسیسی تاریخ کا علم ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نہیں جانتی، مگر جانتی ہوں۔''

بڑی لڑکی Alix (نو برس کی): ''جی نہیں، اسے تاریخ کا علم نہیں ہے۔''

مادر: ''وہ کس طرح؟ میری بچی؟''

Alix: ''اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں کہیں سے کتاب کھول لوں اور اس سے کوئی سوال پوچھ لوں، وہ جواب ضرور دے گی۔''

''اچھا؟ تو، پھر کیا ہوا؟''

''اس نے جواب نہیں دیا۔''

''اچھا دیکھتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس سے کیا پوچھا تھا؟''

''اس کے کہنے کے مطابق میں نے کہیں سے کتاب کھول لی تھی، جو پہلا سوال نظر آیا وہی پوچھ لیا تھا۔''

''وہ سوال کیا تھا؟''

''سوال یہ تھا— اس کے بعد کیا ہوا؟''

یہی وہ موقع تھا جب ایک لالچی طوطے کے حوالے سے ایک جملہ کہا گیا تھا جو ایک مہمان خاتون کی ملکیت تھا۔

"کتنا مہذب ہے وہ مکھن لگی ڈبل روٹی بالکل کسی آدمی کی طرح کھاتا ہے!"

اس خانقاہ کے فرش کے پتھروں پر کندہ، ایک ہفت سالہ بچی کا اعتراف لیا گیا تھا، جو قبل از وقت لکھ لیا گیا تھا، تاکہ وہ بھول نہ جائے۔

"فادر، میں نے لالچ کی ہے۔"

"فادر، میں نے بدکاری کی ہے۔"

"فادر، میں نے شریف مردوں پر نظر ڈالی ہے۔"

اس باغیچے میں گھاس پر رنگی بنچوں میں سے ایک پر ایک چھ سالہ گل فام منہ نے مندرجہ ذیل داستان ترتیب دی جسے چار اور پانچ سالہ نیلی آنکھوں نے سنا تھا:

"تین تھے مرغے، جو ایک ملک کے مالک تھے جہاں بے شمار قسم کے پھول ہوا کرتے تھے۔ وہ پھول توڑتے اور اپنی کھلونوں کی چھاتی میں رکھ لیتے تھے۔ اسی ملک میں ایک بھیڑیا رہتا تھا؛ اس میں جنگل بہت تھے؛ بھیڑیا جنگل میں رہتا تھا؛ اور وہ چھوٹے مرغے کھا جاتا تھا"

اس کے بعد ایک اور نظم:

"چھڑی سے لگی چوٹ

وہ Punchinello تھا جس نے بچی کو یہ انعام دیا تھا

بچی کے لیے یہ اچھا نہیں تھا؛ اسے تکلیف پہنچی تھی

تب، ایک خاتون نے Punchinello کو جیل میں ڈال دیا تھا۔"

یہی وہ جگہ تھی جہاں ایک لاوارث بچی تھی، اس لاوارث بچی نے، جسے خانقاہ خیرات میں پال رہی تھی، ایک دل گداز حکایت بیان کی تھی۔ جب اور لڑکیوں کو اپنی ماؤں کے بارے میں بات کرتے سنا تو بچی اپنے کونے میں بڑبڑائی:

"جہاں تک میری ماں کا سوال ہے، جب میں پیدا ہوئی تھی اس وقت ماں وہاں موجود نہیں تھی۔"

ایک تھی موٹی لنگڑی دربان، وہ ہمیشہ اپنی کنجیوں کے گچھے کے ساتھ دوڑتی بھاگتی رہتی تھی، جس کا نام تھا سسٹر Agatha۔ بڑی لڑکیاں — دس برس سے زیادہ عمر والیاں — اس کو Agathocles کہتی تھیں۔

خانقاہ میں کھانے کا کمرہ، ایک وسیع اور بیضوی شکل کی جگہ تھی جہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا سوائے محرابی اور گنبد والی چھت کے جو باغیچے کی سطح پر بنی ہوئی تھی، جو اندھیرا اور

مرطوب تھا، اور، جیسا کہ بچیاں کہتی ہیں، گوشت خور کیڑوں سے بھرا تھا۔ ہر طرف کیڑوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے۔

اس کے چاروں کونوں کو، شاگردوں کی زبان میں، عجیب نام دیے گئے تھے۔ ایک مکڑی کونا تھا، دوسرا سُنڈی کونا، تیسرا گھُنی کونا اور چوتھا جھینگر کونا تھا۔

جھینگر کونا باورچی خانے کے قریب تھا اور بہت محترم سمجھا جاتا تھا۔ وہ اتنا سرد نہیں تھا جتنی کہ دوسری جگہیں تھیں۔ کھانے کے کمرے کے کونوں کے نام اقامتی اسکول تک پہنچ گئے تھے، اور وہاں قدیم کالج Mazarin کی طرح ان کے ذریعے چار قوموں کو پہچانا جاتا تھا۔ ہر شاگرد ان چار کونوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہوتی تھی، جس میں وہ کھانے کے وقت بیٹھا کرتی تھی۔

ایک دن موسیو آرچ بشپ نے اپنے دورے کے دوران سنہرے بالوں والی ایک نہایت خوب صورت گل فام لڑکی کو دیکھا۔

اس نے ایک اور، سیاہ بالوں، گلابی رخساروں والی من موہنی شاگرد لڑکی سے پوچھا، جو اس کے قریب کھڑی ہوئی تھی:

"وہ کون ہے؟"

"وہ مکڑی ہے، موں سینیور!"

"ارے، اچھا! اور وہ جو آگے کھڑی ہے؟"

"وہ جھینگر ہے۔"

"اور وہ؟"

"وہ سُنڈی ہے۔"

"واقعی! اور تم خود؟"

"میں گھُنی ہوں، موں سینیور!"

اس قسم کے ہر گھر کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس صدی کی ابتدا میں Ecouen ان شان دار اور سخت جگہوں میں سے تھی جہاں نوجوان لڑکیاں اپنا بچپن ایسے سایے میں گزارتی تھیں جو شان دار اور محترم ہوتا تھا۔ Ecouen میں شعائرِ مقدسہ کے جلوس میں عہدہ دینے کے لیے لڑکیوں میں — کنواریوں اور گل فروشوں (غیر کنواری) کے درمیان — امتیاز برتا جاتا تھا۔ ان میں "dais" اور "censors." بھی ہوتی تھیں — پہلی وہ ہوتی تھی جو dais کے تار پکڑتی تھی، اور دوسری شعائرِ مقدسہ کے آگے خوش بو لے کر چلتی تھی۔ گل فروش پھولوں کی حق دار ہوتی

تھیں۔ چار کنواریاں آگے چلتی تھیں۔ اُس بڑے دن کی صبح، خواب گاہ میں پوچھا جانے والا یہ سوال ''کون کنواری ہے؟'' انوکھا نہیں ہوتا تھا۔

مادام Campan عام طور پر یہ جملہ بیان کیا کرتی تھی، جو ایک ہفت سالہ ''چھوٹی بچی'' سے سولہ برس کی ''بڑی لڑکی'' نے کہا تھا، جو جلوس کی سربراہی کرتی تھی، جب کہ چھوٹی والی پیچھے رہتی تھی۔ پیچھے چلنے والی لڑکی سے اس نے کہا تھا:

''تم کنواری ہو، مگر میں کنواری نہیں۔''

❂

خلل اندازیاں

طعام خانے کے دروازے پر مندرجہ ذیل دعا لکھی ہوئی تھی جو Paternoster [یعنی کنویں سے پانی نکالنے والا 'رہٹ' جیسا نظام] کہلاتی ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ لوگوں کو سیدھی جنت میں لے جاتی ہے۔ دعا سیاہ رنگ کے بڑے لفظوں میں کندہ تھی۔

"پیارا سفید Paternoster جسے خدا نے بنایا ہے، جسے خدا نے سنایا ہے، جسے خدا نے جنت میں رکھ دیا ہے۔ شام کو جب میں سونے گیا تو میں نے تین فرشتوں کو اپنے پلنگ پر بیٹھے پایا، ایک پائنتی بیٹھا تھا، دو سرہانے بیٹھے تھے، اور پیاری مریم بیچ میں بیٹھی تھی، جس نے مجھے بلا تامل لیٹ جانے کا حکم دیا۔ پیارا خدا میرا باپ ہے، پیاری کنواری میری ماں ہے، تینوں فرشتے میرے بھائی ہیں، تین کنواریاں میری بہنیں ہیں۔ وہ قمیص جس میں خدا پیدا ہوا تھا میرے جسم کو ڈھانپے ہوئے ہے؛ سینٹ مارگریٹ کی صلیب میرے سینے پر بنی ہوئی ہے۔ مادام کنواری چراگاہ سے گزر رہی تھی، جب وہ موسیو سینٹ جان سے ملی تھی، خدا کے لیے رو رہی تھی۔ 'موسیو سینٹ جان آپ کب آئیں گے؟ میں Ave Salus سے آ رہی ہوں۔' 'تم نے خدا کو نہیں دیکھا؟' 'کہاں ہے وہ؟' 'وہ صلیب کے درخت پر ہے، لٹکا ہوا ہے، اس کے پاؤں لٹکے ہیں، اس کے ہاتھ کیلوں سے جڑے ہیں، کانٹوں کی ٹوپی اس کے سر پر ہے۔' جو شخص اس کو تین بار ہر شام، تین بار صبح پڑھے گا، بالآخر جنت پا جائے گا۔"

1827ء میں یہ خصوصی دعا رنگ روغن ہو جانے کے باعث دیوار سے غائب ہو گئی تھی۔ اب، آخری بار یہ کئی لوگوں کی یادوں سے غائب ہو رہی ہے، ان کی یادوں سے جو اُس وقت نوجوان لڑکیاں تھیں، اور اب بوڑھی ہو گئی ہیں۔

ایک بڑی صلیب جو زینت کے طور پر طعام خانے کی دیوار پر جڑی ہوئی تھی، جس کا دروازہ، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، باغیچے میں کھلتا تھا۔ اس کے سامنے رکھی دو تنگ تنگ میزیں اور دو چوبی بنچیں طعام خانے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دو متوازی خطوط بناتی تھیں۔ دیواریں سفید تھیں، میزیں سیاہ رنگ کی؛ یہ دو ماتمی رنگ ہی خانقاہوں میں تنوع کا باعث ہوتے تھے۔ غذا سادہ ہوتی تھی، بچیوں کی غذا بھی معمولی ہوتی تھی۔ گوشت اور ترکاری ملا سالن، یا نمک لگی مچھلی ان کی عیاشی ہوتی تھی۔ یہ معمولی کھانا پینا صرف شاگردوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ بچیاں خاموشی سے اس مادر کی نگرانی میں کھانا کھاتی تھیں جس کی اس دن باری ہوتی تھی؛ اگر ایک مکھی بھی اڑنے کا ارادہ کر لیتی یا کسی قانون کی خلاف ورزی کرتی تو مادر اپنی چوبی کتاب کھولنے بند کرنے لگتی تھی۔ خاموشی میں سینٹ کی زندگی کے حالات کا مصالحہ لگا ہوتا، جو منبر اور اس کے قریب رکھی میز سے بلند آواز میں بیان کیے جاتے تھے۔ چوبی کتاب صلیب کے نیچے رکھی ہوتی تھی۔ ان کو پڑھنے والی بڑی لڑکیوں میں سے کوئی ایک ہوتی تھی، جس کی ہفتے ہفتے باری آتی تھی۔ برہنہ میزوں پر برابر برابر فاصلے پر وارنش کیے ہوئے بڑے بڑے پیالے رکھے ہوتے تھے جن میں شاگرد اپنے تعزئی پیالے، چاقو اور کانٹے دھوتی تھیں، جن میں کبھی کبھی سخت گوشت اور خراب مچھلی کے ٹکڑے ڈال دیتی تھیں؛ اس پر انھیں سزا ملتی تھی۔ پیالوں کو ronds d'eau کہا جاتا تھا۔ وہ بچی جو خاموشی توڑ دیتی تھی اسے اپنی زبان سے صلیب بنانی پڑتی تھی۔ کس جگہ؟ زمین پر۔ اسے پختہ راستے کو چاٹنا پڑتا تھا۔ وہ خاک جو ساری خوشیوں کو خاک میں ملا دیتی ہے، اس پر بے چاری گلاب کے پھول کی پتیوں کو سزا دینے کی ذمے داری سونپی گئی تھی جنھوں نے زندہ دلی سے بات کرنے کا جرم کیا تھا۔

اس خانقاہ میں ایک کتاب تھی جس کی کبھی طباعت نہیں ہوئی سوائے ایک منفرد جلد کے، جس کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ کتاب Saint-Benoit کے احکام پر مبنی ہے۔ ایک اکسیر اعظم، جس پر ناپاک نگاہ نہیں پڑنی چاہیے۔

ایک دن شاگرد اس کتاب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور بڑے حریصانہ انداز میں اس کا مطالعہ شروع کیا، مطالعہ جس پر اکثر اس خوف سے خلل پڑتا تھا کہ پڑھنے والیاں کہیں پکڑ نہ لی جائیں۔ انھوں نے حفظِ ما تقدم کے طور پر کتاب بند کر دی تھی۔

اس طرح کیے جانے والے خطرناک کام سے انھیں یک گونہ مسرت بھی حاصل ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ ”دل چسپ بات“ یہ تھی کہ انھیں اس میں کچھ ایسے ناقابلِ فہم صفحات بھی

ملے تھے جو نوجوان لڑکیوں کے گناہ کے بارے میں تھے۔

طالبات ایک گلی میں کھیلتی تھیں جس کے کنارے چند اونی قسم کے میووں کے درخت تھے۔ سخت اور کڑی نگرانی، اور شدید سزائیں دی جانے کے باوجود، جب ہوا کے جھکڑ درخت کو ہلاتے تھے تو کبھی ان انھیں سبز سیب، ایک آدھ خراب خوبانی، یا کوئی از کار رفتہ ناشپاتی ہاتھ آجاتی تھی۔ اب میں اس موضوع پر اپنے کلام پر ایک شاگرد کے پچیس برس قبل لکھے گئے ایک خط کو فوقیت دوں گا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ وہ شاگرد مادام la Duchesse ہیں جو پیرس کی سب سے زیادہ خوب صورت عورتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اب میں اس خط کا حرف بہ حرف اقتباس پیش کرتا ہوں: ''کوئی لڑکی کسی کی ناشپاتی، یا کسی کا سیب، جتنی اچھی طرح ممکن ہوتا، چھپا لیتی تھی۔ جب وہ لڑکی رات کے کھانے سے قبل نقاب ڈالنے کے لیے اوپر جاتی تو انھیں اپنے تکیے کے نیچے ٹھونس دیتی، رات کے وقت اپنے بستر میں انھیں کھاتی تھی، اور جب یہ ممکن نہ ہوتا تو انھیں بیت الخلا میں لے جا کر کھاتی تھی۔'' یہ ان کی عظیم ترین عیاشیوں میں سے تھی۔

ایک بار، جب آرچ بشپ خانقاہ کے دورے پر تھا، نوجوان لڑکیوں میں سے ایک، میدموزیل Bouchard نے، جس کا تعلق Montmorency خانوادے سے تھا، شرط لگائی کی وہ ایک دن کی چھٹی طلب کرے گی ۔۔۔ جو اس قسم کے کٹر ماحول میں سخت بد اخلاقی تھی۔ شرط لگ گئی، مگر شرط لگانے والیوں میں سے ایک کو یقین تھا کہ میدموزیل شرط جیت لے گی۔ جب وہ لمحہ آیا، اور جس وقت آرچ بشپ شاگردوں کے سامنے سے گزر رہا تھا، میدموزیل اچانک، اپنی ساتھیوں کے ناقابلِ بیان خوف کے باوجود، اپنی صف سے آگے بڑھی اور کہا، ''موں سنیور، ایک دن کی چھٹی!'' میدموزیل قد آور تھی، اپنے شباب پر تھی، اور اس کا پھول جیسا چہرہ دنیا میں سب سے خوب صورت چہرہ تھا۔ موسیو Quelen مسکرایا اور کہا، ''کیا میری پیاری بچی، ایک دن کی چھٹی! تین دن کی، اگر تم چاہو۔ میں تمھیں تین دن کی چھٹی دیتا ہوں۔'' ناخب راہبہ کچھ نہ کر سکی۔ آرچ بشپ نے حکم صادر کر دیا تھا۔ خانقاہ کا خوف، مگر شاگرد کی خوشی۔ اس کے اثر کا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ سخت ترین خانقاہ اتنی محفوظ بھی نہیں تھی، پھر بھی، بیرونی دنیا کے ہیجانات، ڈراما، حتیٰ کہ رومان اس کے اندر پہنچ نہیں سکتے تھے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے ہم خود کو ایک واقعی اور ناقابلِ دفاع حقیقت پیش کرنے تک محدود رکھیں گے جس کا اگرچہ اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو خانقاہ کے صرف خد وخال کو مکمل کرنے کی خاطر بیان کر رہے ہیں۔

اُن دنوں، اُس خانقاہ میں ایک پُر اسرار شخصیت شامل تھی، جو راہبہ نہیں تھی، جس کا بہت احترام کیا جاتا تھا، اور جس کو مادام Albertine کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ پاگل عورت تھی اور اس دنیا کے نزدیک وہ مر چکی تھی۔کہا جاتا ہے کہ اس کہانی میں قسمت نے ایک عظیم شادی کی ضرورت کا انتظام کر رکھا تھا۔

وہ عورت مشکل سے تیس برس کی رہی ہوگی، گہرا رنگ، اور قبول صورت، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک مبہم سا انداز تھا۔کیا وہ دیکھ سکتی تھی؟ اس کے بارے میں کچھ شبہات تھے۔وہ چلتی کیا تھی، لہراتی تھی۔وہ کبھی بات نہیں کرتی تھی؛ خبر نہیں کہ وہ سانس لیتی بھی تھی یا نہیں۔اس کے نتھنے سانس لینے کے بعد نیلے پڑجاتے اور سکڑ جاتے تھے۔اس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہوتے تھے۔وہ ایک عجیب قسم کے آہنی انداز کی حامل تھی۔اس کے داخل ہوتے ہی لوگ سردی محسوس کرنے لگتے تھے۔ایک دن ایک سسٹر نے اس کو گزرتے دیکھ کر دوسری سسٹر سے کہا تھا، ”وہ عورت تو بالکل مردہ لگتی ہے۔“ دوسری سسٹر نے جواب میں کہا ”شاید وہ مردہ ہے ہی۔“

مادام Albertine کے بارے میں سیکڑوں کہانیاں مشہور تھیں۔یہ کہانیاں شاگردوں کے تجسس سے ابھرتی تھیں۔گرجا گھر میں ایک گیلری تھی جس کو L'OEil de Boeuf کہا جاتا تھا۔صرف یہی ایک گیلری تھی جو ایک دائرہ نما برآمدے پر مشتمل تھی۔وہ ہمیشہ اسی برآمدے میں اکیلی بیٹھتی تھی کہ یہ پہلی منزل پر تھی، جہاں سے واعظ یا قائم مقام پادری دیکھا جا سکتا تھا، جو راہباؤں کے لیے ممنوع تھا۔ایک دن منبر پر اعلیٰ رُتبے کا ایک نوجوان پادری موسیو ڈیوک Rohan، جو فرانس کا لارڈ، 1815ء میں Red Musketeers کا افسر تھا، Prince de Leon تھا، جو بعد میں 1830ء میں کارڈینل اور Besancon کے آرچ بشپ کی حیثیت میں انتقال کر گیا تھا۔وہ پہلا موقع تھا جب موسیو Rohan نے Petit-Picpus خانقاہ میں تبلیغ کی تھی۔مادام Albertine عام طور پر، خطبات اور اجتماعات میں مکمل طور پر خاموش اور ساکت رہا کرتی تھی۔اس دن، جیسے ہی اس نے موسیو Rohan کو دیکھا، اس نے قدرے اُٹھ کر، گرجا گھر کی خاموشی کے دوران بلند آواز میں کہا، "Ah! Auguste!" پورے مجمعے نے حیرت میں پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، مبلغ نے اپنی آنکھیں بلند کیں، مگر مادام Albertine بڑے اطمینان سے اپنی بے حرکتی کی کیفیت میں واپس چلی گئی تھی۔اس سرد اور بے جان چہرے پر، ایک لمحے کے لیے آسمان سے ایک سانس آئی، زندگی کا ایک جھماکا ہوا، پھر غائب ہوگیا، اور وہ پاگل عورت

ایک بار پھر لاش بن گئی تھی۔

ان دو لفظوں نے خانقاہ کی ہر شخصیت کو، جسے تقریر کا حق تھا، بک بک کرنے پر لگا دیا تھا۔ اس "Ah Auguste!" میں کتنی باتیں پوشیدہ تھیں، کیا انکشافات تھے۔ موسیو Rohan کا نام واقعی Auguste تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ مادام Albertine اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے وہ موسیو Rohan کو جانتی تھی، اور یہ بھی کہ وہاں اس کا رتبہ سب سے بلند تھا، اس لیے کہ وہ ایک بڑے لارڈ سے اس تکلف سے بولی تھی، کہ ان کے درمیان کوئی سلسلہ تھا، شاید کوئی قریبی رشتے داری تھی، اس لیے کہ وہ اس کا پیار کا نام جانتی تھی۔"

دو بڑی سخت خواتین ڈچس، مادام Choiseul، اور مادام Serent اکثر اس کمیونٹی میں آتی جاتی رہتی تھیں، بلکہ تھمی رہتی تھیں اور بلاشبہ انھوں نے اس اقامتی اسکول میں بہت خوف پیدا کر دیا تھا۔ جب یہ دو خواتین گزرتی تھیں تو تمام مفلس نوجوان لڑکیاں خوف سے لرز جاتی تھیں اور اپنی آنکھیں نیچی کر لیتی تھیں۔

مزید یہ کہ موسیو Rohan، جو خود کو بھی کم ہی جانتا تھا، اسکول کی لڑکیوں کے لیے ایک توجہ والی شے تھا۔ انھی دنوں، جب وہ ایک اسقفیہ عہدے کے انتظار میں تھا، پیرس کے آرچ بشپ کا vicar-general بنا دیا گیا تھا۔ اس کو کچھ عادت سی پڑ گئی تھی کہ وہ Petit-Picpus کی راہباؤں کے گرجا گھر میں اپنے اختیارات کی نمائش کے لیے اکثر آ جایا کرتا تھا۔ نوجوان گوشہ نشین لڑکیوں میں سے ایک بھی، سرج کے پردے کی وجہ سے اسے دیکھ نہیں پاتی تھیں، مگر وہ میٹھی اور تیز آواز کا مالک تھا، لڑکیاں جس سے واقف ہو گئی تھیں۔ وہ تفنگ بردار سپاہی رہا تھا، اور کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا عشوہ باز آدمی تھا، کہ اس کے خوب صورت سنہرے بال سر کے اطراف بہت قرینے سے بنے ہوتے تھے، اور یہ بھی کہ وہ کمر میں ایک چوڑا سا، لہریا دار پٹکا باندھتا تھا، اور یہ بھی کہ اس کا سیاہ رنگ کا جبہ پوری دنیا میں سب سے عمدہ کاٹ کا ہوتا تھا اور وہ سولہ سالہ کے تصورات میں بسا تھا۔

اس خانقاہ میں کوئی آواز داخل نہیں ہو سکتی تھی، مگر ایک برس ایسا ہوا کہ ایک بانسری کی آواز وہاں داخل ہو گئی تھی۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا، جو تمام لڑکیوں کو جو اس وقت اس اسکول میں تھیں، اب بھی یاد ہے۔

پڑوس میں کہیں ایک بانسری تھی جو بجائی جاتی تھی۔ وہ بانسری ہمیشہ اس گیت کے انداز میں بجائی جاتی تھی، جو آج کل قدیم ہو گیا ہے — "میری Zetulbe، آ اور میرے دل پر

چھا جا"— اور یہ دن میں دو تین بار سنائی دیتا تھا۔نوجوان لڑکیاں اس کو سننے میں گھنٹے گزار دیا کرتی تھیں، ناحق مائیں بہت پریشان رہا کرتی تھیں، سارے دماغ مصروف رہتے تھے، سزائیں پھوار بن گئی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی مہینے چلتا رہا۔تقریباً تمام لڑکیاں اس نامعلوم موسیقار پر فریفتہ ہو گئی تھیں۔ ہر ایک دعویٰ کرتی کہ وہی Zetulbe تھی۔بانسری کی آواز Droit-Mur اسٹریٹ کی جانب سے نکلتی تھی؛ اور وہ ہر شے فدا کر دیتیں، ہر بات پر آمادہ ہو جاتیں، ہر بات کی کوشش کرتیں، اسے دیکھنے کے لیے،صرف ایک نظر دیکھنے کے لیے، خواہ وہ نظارہ ایک سکنڈ ہی کا کیوں نہ ہو۔وہ "جوان آدمی" اتنے پُر لطف انداز میں بانسری بجاتا تھا، اور جو بلاشبہ ایک وقت میں ان تمام نفوس پر حاوی ہو جاتا تھا۔ان میں سے کچھ عقبی دروازے سے فرار ہو گئیں، اور Droit-Mur اسٹریٹ پر تیسری منزل پر پہنچ گئی تھیں، تاکہ وہ درزوں میں جھانک کر اس کی ایک جھلک ہی دیکھ لیں۔ناممکن! ایک تو اس حد تک چلی گئی تھی کہ وہ جنگلے میں اپنے بازو نکال دیتا اور اپنا سفید رومال ہلانا چاہتی تھی۔دو لڑکیاں زیادہ بہادر تھیں۔انھیں ایک چھت پر چڑھنے کا ذریعہ مل گیا تھا،انھوں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی، اور بالآخر اس "نوجوان آدمی" کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

وہ ایک بوڑھا مہاجر، نابینا اور بے زر آدمی تھا جو اپنی دو چھتی میں بیٹھا، وقت گزاری کے لیے بانسری بجایا کرتا تھا۔

❁

خانقاہِ صغیر

Petit-Picpus کے اس احاطے میں تین مکمل طور پر جداگانہ عمارتیں تھیں — عظیم کانونٹ جس میں راہبائیں رہتی تھیں، اقامتی اسکول جہاں طالبات قیام کرتی تھیں؛ اور آخری عمارت وہ تھی جسے خانقاہِ صغیر کہا جاتا تھا۔ اس عمارت کے ساتھ ایک باغیچہ بھی تھا۔ اس میں مختلف آرڈر کی ہر عمر کی راہبائیں تھیں، ان تمام خانقاہوں کی نشانیاں انقلاب میں تباہ ہو گئی تھیں۔ یہ ایک از سرِ نو اتحاد تھا، سیاہ، بھوری اور سفید کیمونٹی کے تمام ممکنہ انواع و اقسام کا ملغوبہ تھا، جسے اگر اس قسم کے الفاظ کے جوڑ کی اجازت ہو تو، خانقاہوں کا ایک قسم کا چپ سوانگ کہا جا سکتا تھا۔

جب سلطنت کا قیام عمل میں آیا تھا، تمام مفلس عمر رسیدہ بکھری اور جلا وطن عورتوں کو آنے اور Bernardines-Benedictines کے پروں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت تھی۔ حکومت ان کو ایک معمولی سی پنشن دیتی تھی، اور Petit-Picpus کی خواتین نے انھیں بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی گڈمڈ ملغوبہ بن گیا تھا۔ ہر حصے کا اپنا قانون تھا۔ کبھی کبھی اقامتی اسکول کی طالبات کو، تفریح کے طور پر، ان سے ملاقات کی اجازت ہوتی تھی؛ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام نوجوان یادداشتوں نے اپنے اندر، دوسری تمام نشانیوں کے علاوہ، مادر Sainte-Bazile، مادر Sainte-Scolastique اور مادر Jacob کی نشانیاں بھی محفوظ کر لی تھیں۔

ان مہاجرات میں ایک تھی جس کو یہ جگہ بالکل اپنے گھر جیسی لگی تھی۔ وہ Sainte-Aure کے آرڈر کی واحد شخصیت تھی جو بچ رہی تھی۔ Sainte-Aure کی خواتین کی قدیم خانقاہ جس کا تعلق مارٹن ورگا کی Benedictines سے تھا Petit-Picpus کے اسی مکان میں رہتی

تھیں۔ یہ مقدس عورت اپنے آرڈر کا شان دار لباس، جو قرمزی رنگ کے شانوں والی ایک سفید قبا تھی، پہننے کی مالی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے بڑے بڑے احترام سے ایک چھوٹے سے چوبی انسانی ڈھانچے کو پہنا رکھا تھا، جس کی وہ بڑے اطمینان سے نمائش کرتی تھی، اور جسے اپنی موت پر اس ادارے کو دینے کی وصیت کردی تھی۔ 1824ء میں اس آرڈر کی صرف ایک راہبہ باقی رہ گئی تھی، جو آج وہاں صرف مجسمہ ہے۔

ان محترم ماؤں کے علاوہ، قدیم سماج کی کچھ عمر رسیدہ عورتوں نے بھی، نائب راہبہ کی اجازت سے، اس خانقاہ صغیر میں بقیہ عمر بسر کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ ان میں مادام Beaufort d'Hautpoul اور مارکوئی Dufresne شامل تھیں۔ ایک اور تھی جو اس خانقاہ میں غیر معروف تھی، سوائے اس خوف ناک آواز کے جو اس وقت نکلتی تھی جب وہ اپنی ناک صاف کیا کرتی تھی۔ شاگرد لڑکیاں اسے مادام Vacarmini [غوغا] کہا کرتی تھیں۔

1820ء یا 1821ء کے لگ بھگ، مادام Genlis کو بھی، جو اس وقت l'Intrepide نام کا ایک رسالہ شائع کرتی تھی، Petit-Picpus کی خانقاہ میں اقامتی خاتون کے طور پر شامل ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ Orleans کے ڈیوک نے اس کی سفارش کی تھی۔ خانۂ زنبور میں ہلچل مچ گئی؛ ناطق مائیں پریشان ہو گئیں؛ مادام Genlis نے کئی رومانس کیے تھے۔ مگر اس نے اعلان کردیا تھا کہ اسے ان سے پہلے ہی نفرت ہو گئی تھی، اور پھر وہ دین داری کے شدید درجے پر پہنچ گئی تھی۔ خدا اور شاہزادے [یسوع مسیح] کی مدد سے وہ خانقاہ میں داخل ہو گئی تھی۔ چھ یا آٹھ ماہ بعد، اس الزام کے ساتھ وہ رخصت ہو گئی کہ باغیچے میں کوئی سایہ نہیں تھا۔ راہبائیں خوش ہو گئیں۔ حالاں کہ مادام بہت بوڑھی تھی، وہ اب بھی اپنا بربط بجاتی، اور بہت اچھی طرح بجاتی تھی۔

وہ خانقاہ سے سدھار گئی، مگر اپنی کوٹھڑی میں اپنا ایک نشان چھوڑ گئی تھی۔ مادام Genlis بڑی اوہام پرست اور لاطینی زبان کی ماہر تھی۔ ان دو لفظوں سے اس کی شخصیت کا خاصا اچھا نقشہ ابھرتا ہے۔ چند برس پہلے تک، پیلے کاغذ پر سرخ روشنائی سے اس کے ہاتھ کی لکھی لاطینی زبان کی وہ پانچ سطریں دیکھی جا سکتی تھیں، جو اس نے اس الماری کے اندر چپکا رکھی تھی جس میں وہ اپنے نقرئی ظروف، اور جواہرات بند رکھا کرتی تھی، جو، اس کے خیال کے مطابق، چوری کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے کے خواص کی حامل تھیں:

Imparibus meritis pendent tria corpora ramis:
Dismas et Gesmas, media est divina potestas;
Alta petit Dismas, infelix, infima, Gesmas;

Nos et res nostras conservet summa potestas.
Hos versus dicas, ne tu furto tua perdas.

چھٹی صدی عیسوی کے یہ لاطینی مصرعے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ Calvary کے دو چوروں کو Dismas اور Gestas، یا Dismas اور Gesmas کے ناموں سے پکارا گیا تھا یا نہیں۔ اس علمِ حروف نے اس ڈھونگ کو گڑ بڑ کر دیا ہوگا جو پچھلی صدی میں Vicomte de Gestas نے ایک بدمعاش چور کے نزول کے بارے میں پیش کیا تھا۔ پھر بھی، Hospitallers کے آرڈر میں یہ مصرعے اپنی نیکی کے باعث عقیدے کے مقالے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

اس مکان کا گرجا گھر اس انداز میں تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ عظیم خانقاہ اور اقامتی اسکول کے درمیان واقعی ایک خندق نظر آتا تھا، مگر اقامتی اسکول، عظیم خانقاہ اور خانقاہِ صغیر کے درمیان مشترک تھا۔ اس میں عوام کو بھی ایک قسم کے جذامیوں کی طرح ایک بغلی دروازے سے داخل کیا جاتا تھا جو براہ راست سڑک پر کھلتا تھا، مگر ان سب کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ خانقاہ کی مقیم خواتین بیرونی دنیا کی جھلک بھی نہ دیکھ سکیں۔ فرض کر لیجیے کہ ایک گرجا گھر ہے جس کی سرودگاہ کو ایک عفریت صورت ہاتھ نے گرفت میں لے رکھا ہے، اور وہ اس کو وہ شکل نہیں دینا چاہتا جیسی کہ عام گرجا گھروں میں قربان گاہ کی درازی کی صورت میں ہوتی ہے، بلکہ وہ ایک ہال کمرے کی طرح ہو، یا کسی اندھیری کوٹھڑی کی طرح، قائم مقام پادری کی دائیں جانب ہو؛ اور فرض کر لیجیے کہ اس ہال کمرے کو سات فٹ اونچے پردے سے بند کر دیا جائے، ہم جس کے بارے میں پہلے ہی بتا چکے ہیں؛ اور اس پردے کے سایے میں سرودگاہ کی راہباؤں کو بائیں جانب؛ اسکول کی لڑکیوں کو دائیں جانب اور عام ہمسفروں اور نوواردوں کو نیچے جمع کر دیا جائے تب آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ Petit-Picpus کی راہبائیں عبادت کے اجتماعات میں کس طرح مدد کرتی ہیں۔ اور اس غار کو، جسے سرودگاہ کہا جاتا ہے، ایک لابی کے ذریعے خانقاہ سے منسلک کر دیا جائے۔ گرجا گھر میں باغیچے کی جانب سے روشنی آتی تھی۔ جب راہبائیں اجتماعات میں شریک ہوتی تھیں، جہاں ان کا قانون خاموشی کی تاکید کرتا تھا تو عوام کو تنبیہ کر دی جاتی تھی کہ ان کی موجودگی کا اندازہ تبھی ہوتی، اٹھتی گرتی کرسیوں سے ہوگا۔

اندھیروں کی پرچھائیاں

چھ برسوں کے اس درمیانی عرصے میں جو 1819ء کو 1825ء سے الگ کرتا ہے، Petit-Picpus کی نائب منتظم راہبہ میڈموزیل Blemeur تھی، مذہب میں جس کا نام مادر Innocente تھا۔ اس کا تعلق Lives of the Saints of the Order of Saint-Benoit کی مصنف Marguerite de Blemeur کے خاندان سے تھا۔ وہ بارہا اس رتبے پر منتخب کی گئی تھی۔ وہ تقریباً ساٹھ برس کی عورت تھی، اور اس خط کے مطابق جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے، پستہ قد، فربہ، ''پھٹے بانس کی طرح گانے والی'' تھی۔ وہ ایک لاجواب خاتون تھی؛ مزید یہ کہ پوری خانقاہ میں صرف وہی تھی جو ایک خوش باش شخصیت تھی اور اسی وجہ سے بے حد پسند کی جاتی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ، زیرک، لائق، حیرت انگیز طور پر تاریخ میں پختہ کار، لاطینی زبان کی ماہر، یونانی زبان سے مملو، عبرانی زبان سے لبریز، Benedictine راہبہ کم اور Benedictine راہب زیادہ تھی۔

نائب منتظم راہبہ کی معاون مادر Cineres ایک عمر رسیدہ ہسپانوی راہبہ تھی، جو تقریباً نابینا تھی۔

ناطق ماؤں میں سب سے محترم مادر Sainte-Honorine تھی؛ خازن، مادر Sainte-Gertrude تھی؛ نووارد لڑکیوں کی چیف مسٹریس، مادر Saint-Ange تھی، معاون مسٹریس، مادر Annonciation تھی؛ داروغہ کلیسا، مادر Saint-Augustin تھی جو نرس بھی تھی، اور خانقاہ کی تنہا کینہ پرور عورت تھی؛ اس کے بعد مادر Sainte-Mechtilde تھی (اصل نام میڈموزیل Gauvain) جو بہت کم عمر اور نہایت خوب صورت آواز والی تھی؛

مادر Anges (اصل نام میڈموزیل Drouet) جو Filles-Dieu کی خانقاہ اور Tresor کی خانقاہ میںGisors اور Magny کے درمیان رہ چکی تھی؛ مادر Saint-Joseph (اصل نام میڈموزیل Cogolludo)؛ مادر Sainte-Adelaide (اصل نام میڈموزیل d'Auverney)؛ مادر Misericorde (اصل نام میڈموزیل Cifuentes جو سادگی کی مزاحمت نہیں کرسکتی تھی)؛ مادرCompassion (اصل نام میڈموزیل Miltiere جسے قانون کے خلاف ساٹھ برس کی عمر میں خانقاہ میں داخل کرلیا گیا تھا، بہت مال دار عورت تھی)؛ مادر Providence (اصل نام میڈموزیل Laudiniere)؛ مادر Presentation (اصل نام میڈموزیلSiguenza) جو 1847ء میں نائب منتظم رہ چکی تھی؛ اور آخر میں، مادر Sainte-Celigne (مشہورمجسمہ ساز Ceracchi کی بہن) جو پاگل ہوگئی تھی؛ اور مادر Sainte-Chantal (اصل نام میڈموزیل Suzon) جو پاگل ہوگئی تھی۔

وہاں Isle de Bourbon کی ایک اور نہایت دل کش لڑکی تھی جس کی عمر 23 برس کی تھی جو Chevalier Roze کے خاندان سے تھی جس کا نام میڈموزیل Roze تھا، جس کو مادر Assumption کہا جاتا تھا۔

مادر Sainte-Mechtilde جو گانے اور سرودگاہ کی ذمے دار تھی، اس علاقے کی شاگردوں کو استعمال کرنا پسند کرتی تھی۔دو دس سے سولہ برس کی، مختلف قد والی لڑکیوں کو، کم سے زیادہ عمر کے مطابق، ایک قطار میں کھڑے کھڑے گیت گواتی تھی۔اس طرح یہ لڑکیاں نرکل کی نلکیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔

عام بسسٹر، طالبات جنھیں زیادہ پسند کرتی تھیں وہ Sainte-Euphrasie, Marguerite اور Sainte-Marthe تھیں جن کا بڑھاپہ سالی کے باعث طفلانہ پن، اور Sainte-Michel جس کی لمبی ناک تھی، سب کو ہنساتی تھی۔

وہ تمام خواتین بچوں سے نرمی سے پیش آتی تھیں۔راہبائیں سختی صرف اپنے ساتھ کرتی تھیں۔اسکول کے علاوہ کہیں آگ نہیں جلائی جاتی تھی، اور غذا کا انتخاب خانقاہ کرتی تھی۔وہ بچوں پر ہزاروں مسرتیں نچھاور کرتی تھیں۔صرف جب کوئی بچی کسی راہبہ کے پاس جاکر اسے مخاطب کرتی تو راہبہ کبھی جواب نہیں دیتی تھی۔

خاموشی کے قانون کا یہ اثر تھا کہ پوری خانقاہ میں انسانی مخلوقات سے گویائی سلب کر لی گئی تھی، اور بے جان اشیا کو عطا کردی گئی تھی۔اب گرجا کی گھنٹیاں تھی جو بولتی تھیں؛ مالی کی گھنٹیاں

تھیں جو کام کرتی تھیں۔ اب نائب منتظم راہبہ کے پاس رکھی، زور سے بجنے والی ایک گھنٹی، جو پوری خانقاہ میں سنائی دیتی تھی، صوتی ٹیلی گراف بن گئی تھی، جس کی بدلتی ہوئی صدا بتاتی تھی کہ زندگی کا کون سا کام کیا جانا تھا، کسے پارلر میں طلب کیا جا رہا تھا۔ ہر شخص اور ہر شے کی ایک متعینہ صدا تھی۔ نائب منتظم راہبہ کے لیے ایک تھی، اس کی معاون کی دو صدائیں تھیں چھ پانچ' سبق میں جانے کا اعلان تھا، اس طرح شاگرد کبھی یہ نہیں کہتیں تھی کہ "سبق کے لیے جاؤ" بلکہ وہ کہتی تھیں کہ "چھ پانچ کے لیے جاؤ"۔ 'چار اور چار' مادام Genlis کا اشارہ تھا۔ یہ بہت کم ہی سنائی دیتا تھا۔ 'دس نو' کسی بڑے واقعے کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ تنہائی کا دروازہ جو نوکیلی کیلوں سے بھری خوف ناک آہنی چادر کی مانند تھا، صرف آرچ بشپ کی موجودگی ہی میں اپنے قلابوں میں گھوم سکتا تھا۔

سوائے آرچ بشپ اور وہاں کے مالی کے، کوئی آدمی خانقاہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ لڑکیوں نے دو اور استثنا دیکھی تھیں: ایک پادری مذہبی استاد، Abbe Banes، بوڑھا منحوست تھا، سرود گاہ میں جس کا تصور کیا جا سکتا تھا، وہ بھی جالی کے ذریعے؛ دوسرا مصوری سکھانے والا استاد موسیو Ansiaux، جسے اس خط میں، ہم جس کی کچھ سطریں دیکھ چکے ہیں، موسیو Anciot تھا۔ خط نے اسے خوف ناک کوز و پشت کہا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کتنی احتیاط سے ان لوگوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔

ایسا تھا وہ حیران کُن مکان۔

۞

پتھر سے پہلے پھول

اس خانقاہ کے اخلاقی چہرے کا خاکہ بنانے کے بعد، یہ غیر سود مند نہیں ہوگا کہ چند الفاظ میں اس کے مادّے کی ترتیب اجزا کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ حالاں کہ قاری کو پہلے ہی ان کا کچھ اندازہ ہو چکا ہے۔

Petit-Picpus-Sainte-Antoine خانقاہ تقریباً اس پورے علاقے پر اثر انداز ہوئی تھی جس کا مندرجہ ذیل سڑکیں احاطہ کرتی تھیں: Droit-Mur, Polonceau, Petit-Picpus, اور ایک گلی جو استعمال نہیں ہوتی تھی جس کو قدیم نقشے میں Aumarais اسٹریٹ کے نام سے دکھایا گیا تھا۔ چار سڑکیں خندق کی طرح اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔

خانقاہ میں کئی عمارتیں اور ایک باغیچہ تھا۔ مرکزی عمارت، من حیث الکل، دوغلی تعمیرات کا نمونہ تھی، جس پر اگر آسمان سے نظر ڈالی جائے تو یہ زمین پر لٹائے ہوئے کسی 'پھانسی گھاٹ' کا خاکہ نظر آئے گی۔ اس پھانسی گھاٹ کا مرکزی بازو وہ حصہ تھا جو Droit-Mur اسٹریٹ، Petit-Picpus اسٹریٹ اور Polonceau اسٹریٹ کے درمیان واقع ہے۔ اس کا چھوٹا حصہ ایک بلند، بھورا اور آہنی سلاخوں سے گھری عمارت کا چہرہ ہے جو Petit-Picpus کے بالکل سامنے ہے؛ گاڑیوں کے گزرنے کا پھاٹک نمبر 62 اس کی آخری سرحد کا تعین کرتا ہے۔ اس چہرے کے مرکز کی جانب سفیدی شدہ، گرد اور راکھ آلودہ، ایک نیچا محرابی دروازہ تھا جس میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے، جو صرف ایک یا دو گھنٹے کے لیے اس وقت کھولا گیا تھا جب کسی راہبہ کا تابوت خانقاہ سے باہر لے جایا گیا تھا۔ یہ عام افراد کے لیے گرجا گھر میں جانے کا راستہ تھا۔

'پھانسی گھاٹ' کی کنجی دراصل ایک مربع ہال کمرہ تھا جو ملازمین کے ہال کمرے کے

طور پر استعمال ہوتا تھا اور راہبائیں جسے buttery کہا کرتی تھیں۔ مرکزی بازو کی کہنی میں ماؤں، بہنوں اور نو واردوں کی کوٹھڑیاں تھیں۔ عمارت کے نسبتاً چھوٹے بازو میں باورچی خانے تھے، طعام خانہ تھا جس کے عقب میں گرجا گھر تھا۔ 62 نمبر دروازے اور بند گلی Aumarais کے درمیان اسکول تھا جو باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ اس پورے علاقے کے بقیہ حصے پر باغیچہ تھا جس کی سطح Polonceau اسٹریٹ سے بہت نیچے تھی جس کے باعث اس کی دیوار باہر کے مقابلے میں اندر سے خاصی اونچی نظر آتی تھی۔ باغیچہ ذرا محرابی سا تھا جس کے مرکز میں جو ایک ٹیلے پر تھا، چوٹی پر صنوبر کا ایک نوکیلا درخت تھا، اور وہاں سے، کسی ڈھال پر لگی نوک بنی لکیروں کی طرح، چار شاندار گلیاں نکلتی تھیں ان کے درمیان ان کی آٹھ شاخیں، اس طرح کہ اگر یہ مرکز دائرہ نما ہوتا تو کسی پہیے پر رکھی صلیب سے مشابہ ہوتا۔ چوں کہ تمام گلیاں باغیچے کی بے ترتیب دیواروں پر جا کر ختم ہوتی تھیں، اس لیے ان کی لمبائی مختلف تھی۔

گلیوں کے کنارے یونانی کشمش کی جھاڑیاں تھیں۔ قدیم خانقاہ کے کھنڈر سے گلیوں کے آخر تک سفیدے کے اونچے اونچے درختوں کی ایک قطار تھی، جو Droit-Mur اسٹریٹ سے خانقاہِ صغیر تک ایک زاویہ بناتی تھی جو Aumarais گلی کے زاویے پر تھی۔ خانقاہِ صغیر کے آخر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ اگر قاری اس پورے علاقے میں اضافہ کر دے، ایک صحن کا، اندرونی عمارتوں سے بننے والے کئی زاویوں کا، قید خانے کی دیوار کا، Polonceau اسٹریٹ کے کنارے چھتوں کی ایک سیاہ قطار کا، تو چالیس برس قبل کی Bernardines کی خانقاہ، Petit-Picpus کا منظر مکمل ہو جائے گا۔ وہ مقدس مکان چودھویں اور سولھویں صدی کے درمیان ایک مشہور ٹینس کے میدان پر بنایا گیا تھا جسے "گیارہ ہزار عفریتوں کا ٹینس میدان" کہا جاتا تھا۔

یہ تمام سڑکیں پیرس سے بھی زیادہ قدیم تھیں۔ یہ نام، Droit-Mur اور Aumarais بہت قدیم ہیں؛ لہٰذا جن سڑکوں کے یہ نام ہیں وہ بھی اتنی ہی قدیم ہیں۔ Aumarais گلی کو Maugout کہا جاتا تھا؛

Droit-Mur کا قدیم نام Eglantiers اسٹریٹ تھا، اس لیے کہ انسان کی سنگ تراشی سے پہلے خدا نے پھول کھلا دیے تھے۔

۞

گلو بند تلے ایک صدی

چوں کہ ہم یہ بیان کرنے میں مصروف ہیں کہ سابقہ دنوں میں Petit-Picpus خانقاہ کیا تھی، اور چوں کہ ہم نے اس پُر اسرار جائے پناہ میں ایک کھڑکی کھولنے کی کوشش کی ہے، قاری ہمیں ایک اور معمولی سے انحراف کی اجازت دے گا، جو اس کتاب کے لیے بالکل اجنبی، مگر نمایاں اور فائدہ مند ہوگا، اس لیے کہ اس سے نظر آئے گا کہ اس خانقاہ کی الگ اپنی خصوصیات بھی تھیں۔

خانقاہِ صغیر میں ایک صد سالہ خاتون بھی تھی جو Fontevrault کے کلیسا سے آئی تھی۔ وہ قبل از انقلاب بھی سماج کا حصہ رہی تھی۔ وہ موسیو Miromesnil کے بارے میں بہت باتیں کرتی تھی، جو لوئی شانزدہم کی سرکاری مہروں کا ذمے دار تھا، ساتھ ہی Presidentess Duplat کی جس کے وہ بہت قریب رہی تھی۔ وہ ان ناموں کو کسی نہ کسی بہانے ہر گفتگو میں گھسیٹ کر جھوٹی شان دکھاتی اور لطف لیا کرتی تھی۔

وہ Picard [فرانس کے ایک قصبے کی بولی] کے لہجے میں بات کرتی تھی، جس کو سن کر طالبات بہت محظوظ ہوتی تھیں۔ وہ ہر سال بڑے احترام سے اپنے عہد کی تجدید کرتی تھی، اور حلف لیتے وقت پادری سے کہتی، "موں سنیور Saint-Francois نے موں سنیور Saint-Julien کو دیا، موں سنیور Saint-Julien نے موں سنیور Saint-Eusebius کو دیا، موں سنیور Saint-Eusebius نے موں سنیور Saint-Procopius کو دیا، وغیرہ، وغیرہ؛ اور فادر اب میں تمھیں دے رہی ہوں۔" یہ سن کر اسکول کی طالبات ہنسنا شروع کر دیتیں، منہ اپنی آستینوں میں چھپا کر نہیں، بلکہ اپنی نقاب کے اندر، خوب صورت گھٹی گھٹی ہنسی ہنستیں جن کو سن کر ناقح مائیں چیں بہ جبیں ہو جاتی تھیں۔

ایک اور موقعے پر وہ صد سالہ کہانیاں سنا رہی تھی۔اس نے کہا کہ اس کی جوانی کے دنوں میں Bernardine راہبوں کا رُواں رُواں بندوق بردار سپاہیوں جیسا تھا۔وہ صدی ان کی زبان بولتی تھی،مگر وہ اٹھارویں صدی تھی۔اس نے ہمیں وائن کے رسم و رواج بتائے جو انقلاب سے پہلے شمپین (Champagne) اور .Bourgogne میں رائج تھے۔جب کوئی معزز شخصیت، فرانس کا کوئی مارشل،کوئی ڈیوک Burgundy یا Champagne کے کسی قصبے سے گزرتا تو میر شہر نکلتے اس کا خطاب بنتے اس کو چار نقرئی کنڈولے [خوردہ فروش دُکان پر لگائی گئی الماریاں] پیش کرتے جس میں مرطبانوں میں چار مختلف قسم کی وائن بھری ہوتی تھیں۔ پہلے مرطبان پر میمون [بندر] وائن؛ دوسرے پر شیر وائن؛ تیسرے پر میش وائن؛ چوتھے پر خنزیر وائن کندہ کیا ہوتا تھا۔ یہ چار دیو مالائی صورتیں ان چار درجات کا اظہار ہوتی تھیں شراب میں دھت آدمی جن سے گزرتا ہے؛ پہلا نشہ وہ ہوتا ہے جو چکاتا ہے، دوسرا بھڑکاتا ہے،تیسرا شست کردیتا ہے چوتھا ظالم اور ہوس پرست بناتا ہے۔

تالے کنجی لگی الماری میں اس نے ایک پُر اسرار شے چھپا رکھی تھی جسے وہ بہت اچھی سمجھتی تھی۔ Fontevrault کے قانون میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔وہ شے کسی کو دکھاتی نہیں تھی۔بس خاموش ہوجاتی تھی اس کا قانون جس کی اجازت دیتا تھا،اور جب بھی اس کا تصور کرنا چاہتی تو خود کو چھپا لیتی تھی۔اگر وہ راہداری میں قدموں کی آواز سن لیتی تو الماری کو ایک بار پھر جتنی جلد ممکن ہوتا اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اندر سے بند کر لیتی تھی۔جوں ہی اس کو یہ بتایا جاتا تو، وہ جو بات کرنا بہت پسند کرتی تھی،خاموش ہو جاتی تھی۔بہت متجسس عورتیں اس کی خاموشی پر چکرا جاتیں، اور اس کے صندوق پر پرسخت ہوجاتی تھیں۔اس طرح ان عورتوں کو جو خانقاہ میں خالی بیٹھی اُکتا جاتی تھیں چہ میگوئیاں کرنے کے لیے ایک موضوع ہاتھ آجاتا تھا۔اس صد سالہ کا خزانہ کیا ہوسکتا تھا، جو اتنا قیمتی اور اتنا خفیہ تھا۔ بلاشبہ کوئی مقدس صحیفہ ہوگا؟ کوئی منفرد تسبیح؟ کوئی متبرک؟ وہ قیاس گمان میں کھوجاتی تھیں۔ جب وہ بے چاری عورت مری تو بے تحاشا سب عورتیں اس کی الماری کی طرف دوڑ پڑیں، اور اسے کھول بھی لیا تھا۔انھیں وہ شے، روٹی رکھنے والی کسی مقدس رکابی کی طرح، کپڑوں کی تین تہوں کے نیچے رکھی مل گئی۔ وہ Loves کی نمائندگی کرتی Faenza [اطالوی شہر] کی تھالی تھی، بڑی بڑی سوئیوں سے لیس دواخانے والے اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔یہ تلاش بناوٹ اور مضحکہ خیزی پر منتج ہوتی تھی۔ایک پیارے Loves کا پہلے ہی بہت مذاق اڑایا گیا تھا۔وہ اپنے ننھے ننھے پروں سے مزاحمت کررہا ہے، اور اُڑنے کی

کوشش کر رہا ہے مگر ناچنے والا شیطانی انداز میں ہنس رہا ہے۔ سبق؟ Love کو درد نے فتح کر لیا ہے۔ یہ تقابلی، جو بہت متجسس ہے جسے Moliere کو ایک خیال پیش کرنے کا اعزاز تھا، وہ ستمبر 1845ء میں بھی وجود میں تھی: اسے Beaumarchais بولیوارڈ کے ایک کباڑی کی دکان پر فروخت کے لیے رکھا گیا تھا۔

وہ شریف عورت کسی باہر سے آنے والے سے ملاقات کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے کہ اس نے کہا تھا کہ وہ پارلر بہت بارونق ہے۔

۞

'پرستشِ دائمی' کی بنیادگزاری

بہر حال، یہ تقریباً مقبرے جیسا پارلر، ہم نے جس کی تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے، خالص مقامی خاصیت تھی جس پر دوسری خانقاہوں میں اسی سختی سے اور نئے سرے سے عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ Temple اسٹریٹ کی خانقاہ میں، جو دراصل کسی اور آرڈر سے متعلق تھی ان سیاہ دروازوں کو بھورے پردوں سے بدل دیا گیا تھااور پالش شدہ چوبی فرش والاپارلرخود ایک دیوان خانہ بن گیا تھا، جس کی کھڑکیاں سفید ململ کے پردوں سے آراستہ کردی گئی تھیں اوردیواروں پر ہر قسم کے فریم، ایک Benedictine راہبہ کی بے پردہ تصویر، پینٹ کیے ہوئے گلدستے، حتیٰ کہ کسی ٹرک کا سر [کا مجسمہ] بھی لگا ہوا تھا۔

Temple خانقاہ کے اسی باغ میں شاہ بلوط کا وہ مشہور درخت تھا جو فرانس کا سب سے بڑا اورنفیس درخت مانا جاتا تھا، جس کے بارے میں اٹھارہویں صدی کے لوگ کہا کرتے تھے وہ تمام شاہ بلوط کے درختوں کا باپ تھا۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، Temple کی یہ خانقاہ 'دائمی پرستش' والوں (Perpetual Adoration) کے قبضے میں تھی جو ان لوگوں سے بہت مختلف تھے جن کا Citeaux پر انحصار تھا۔ 'دائمی پرستش' کا یہ آرڈر زیادہ قدیم نہیں، اوراس کا سلسلہ دوسو برس سے زیادہ پرانا نہیں۔ 1649ء میں، چند دنوں کے اندر اندر، پیرس کے دوگرجا گھروں Saint-Sulpice اور Saint-Jean en Greve میں، دوموقعوں پر مقدس شعائر کی بے حرمتی کی گئی تھی، جو ایک غیر معمولی اورخوف ناک عمل تھا جس پر پورے شہر میں ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ Saint-Germain des Pres کے منتظم اور پادریِ اعظم نے تمام اہلِ کلیسا کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جس کی صدارت پاپائے

اعظم کے سفیر نے کی تھی تحریر تلافیِ کفارہ دو بینٹ خواتین مادام Courtin Marquise de Boucs اور Chateauvieux کو مطمئن نہیں کر سکی تھی۔ ''قربان گاہ کے مقدس ترین 'شعائرِ دینی' کے ساتھ کی جانے والی ناجائز دست اندازی، اگرچہ عارضی تھی، ان مقدس نفوس کے دل سے نکل نہیں سکی تھی اور انھیں محسوس ہوا تھا کہ کسی نسوانی ذیرے پر کی جانے والی 'دائمی پرستش' کے ذریعے ہی اس جرم کی اہمیت میں کمی کی جاسکتی تھی۔ دونوں نے — ایک نے 1652ء میں اور دوسری نے 1653ء میں — مادر Catherine de Bar کو Saint-Benoit کے آرڈر کی بنیاد رکھنے کے لیے نمایاں عطیات دیے تھے؛ پہلی بنیاد کی اجازت موسیو Metz نے جو Saint-Germain کے پادری تھے مادر Catherine de Bar کو دی تھی ''اس شرط پر کہ کسی عورت کو اس وقت تک داخل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ وہ تین سو livres کی آمدنی کا عطیہ نہیں دے دیتی، جو چھ ہزار اصل رقم کے برابر ہوتی ہے۔'' Saint-Germain کے پادری کے بعد بادشاہ نے تحریری حکم جاری کر دیا اور پارلیمان کے متعلقہ محکموں نے 1654ء اس کی تصدیق کر دی تھی۔

پیرس میں شعائرِ مقدسہ کی ''پرستشِ دائمی'' کی قانونی بنیاد گزاری اس طرح ہوئی تھی۔ پہلی خانقاہ Cassette اسٹریٹ میں ''ایک نئی عمارت'' تھی جو مادام Boucs اور Chateauvieux کے عطیات سے تعمیر ہوئی تھی۔

یہ آرڈر، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، Citeaux کی Benedictine راہباؤں میں خلط ملط نہیں کیا جاسکتا۔ یہ Saint-Germain des Pres کے پادری سے اسی طرح شروع کیا گیا تھا جس طرح کہ Sacred Heart کی خواتین Jesuits اور Lazarists میں ہوا تھا۔

یہ Petit-Picpus کی Bernardines سے بہت مختلف بھی تھا، جس کے اندرون کا منظر ہم نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ 1657ء میں پاپائے اعظم الیگزانڈر ہشتم نے، ایک خاص تحریر کے ذریعے Petit-Picpus کی Bernardines کی تصدیق کی تھی تاکہ شعائرِ مقدسہ کی Benedictine راہباؤں کی طرح ''پرستشِ دائمی'' پر عمل کیا جائے، مگر یہ دونوں آرڈر ایک دوسرے سے الگ رہے۔

۞

Petit-Picus کا اختتام

تجدیدِ فرانس کے وقت Petit-Picpus کی خانقاہ اپنی تباہی کے دور سے گزر رہی تھی؛ یہ حکمرانی کی تحلیل کا حصہ تھی جو اٹھارہویں صدی کے بعد ہر قسم کی مذہبی حکمرانی کی طرح غائب ہوتی جا رہی تھی۔تصورِ عبادت کی طرح انسانی ضروریات میں سے ہوتا ہے؛ مگر ہر اس شے کی طرح جس پر انقلاب کا اثر پڑا تھا، اس کی بھی تقلیبِ ماہیت ہوگی، اور دشمنی کے سماجی ترقی ہو جانے تک، یہ بھی پسندیدہ ہو جائے گا۔

Petit-Picpus کا مکان تیزی سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ 1840ء میں خانقاہِ صغیر ختم ہو گئی تھی۔ وہاں کوئی بوڑھی عورت نہیں رہ گئی تھی نہ کوئی جوان لڑکی؛ پہلے والیاں مر چکی تھیں، بعد میں آنے والیاں وہاں سے رخصت ہو گئی تھیں۔

'پرستشِ دائمی' کی حکمرانی اپنی فطرت میں اتنی سخت ہے کہ یہ تنبیہ کرتی ہے، پیشے اس کے سامنے پسپا ہو جاتے ہیں، اور آرڈر میں نئے لوگ بھرتی نہیں ہوتے۔ 1845ء تک اس میں کبھی کبھار عام قسم کی عورتیں شام کو جایا کرتی تھیں، مگر باقاعدہ راہبائیں، بالکل نہیں۔ چالیس برس قبل راہباؤں کی تعداد سو تھی؛ پندرہ برس قبل ان میں سے اٹھائیس رہ گئی تھیں۔ آج کتنی ہیں؟ 1847ء میں نائب منتظم راہبہ نوجوان تھی، یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ انتخاب کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔وہ چالیس سے زیادہ کی نہیں تھی۔تناسب کے اعتبار سے تعداد گھٹتی جاتی ہے، تھکن بڑھتی جاتی ہے، ہر ایک کی خدمات زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہیں؛وہ وقت دور نہیں رہ گیا تھا کہ Saint-Benoit کا وزنی بارِ حکمرانی اٹھانے کے لیے صرف ایک درجن دُکھتے ہوئے کاندھے رہ جائیں گے۔یہ بار چند کے لیے ہی نہیں، سب کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ بڑھتا

اور پھیلتا جا رہا ہے۔اس طرح وہ مرتی جا رہی ہیں۔اس زمانے میں جب مصنف پیرس میں مقیم تھا، دو انتقال کر گئی تھیں۔ ایک پچیس برس کی تھی اور دوسری تئیس برس کی۔یہ دوسری والی، Julia Alpinula کی طرح کہتی تھی، Hic jaceo. Vixi annos viginti et tres. اس انحطاط کے نتیجے میں خانقاہ نے لڑکیوں کی تعلیم ترک کر دی تھی۔

اس غیر معمولی مکان میں داخل ہوئے بغیر، ان دماغوں کا تعارف کرائے بغیر ہم جنھیں ساتھ لیے پھرتے ہیں، اور جو ہماری داستان سن رہے ہیں، کچھ لوگوں کے فائدے کے لیے اور اتفاق سے ژاں ولژاں کی خاطر بھی، ہم اس کے آگے سے گزر نہیں سکتے تھے۔ہم اس کمیونٹی میں، اپنی ان پرانی عادتوں سمیت جو آج اتنی انوکھی محسوس ہوتی ہیں، سرایت کر گئے ہیں۔ یہ ایک متروک باغیچہ ہے۔ ہم نے اس نادر جگہ کے بارے میں تفصیل سے باتیں کی ہیں۔ ہم سب سمجھ نہیں سکتے مگر ہم کسی کی توہین بھی نہیں کرتے۔ہم بھی Joseph de Maistre کے نعرۂ حمدیہ سے اتنے ہی دور ہیں جس نے جلاد کو تیل مالش سے تیار کیا تھا اور والٹیر کے تنک چڑھے پن سے، جو صلیب کی تضحیک تک کرنے سے باز نہیں آتا۔

چلتے چلتے ہم اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ والٹیر کا عمل غیر منطقی تھا؛ اس لیے کہ والٹیر کو یسوع مسیح کا اسی طرح دفاع کرنا چاہیے تھا جیسا اس نے Calas [فرانسیسی تاجر ژاں کیلاس، جس پر پروٹسٹنٹ ہونے کی پاداش میں مقدمہ چلایا گیا تھا] کا دفاع کیا تھا ؛ بلکہ ان لوگوں کا بھی جو فوق البشر مظاہر کے منکر ہیں؛ تو صلیب کس شے کی نمائندگی کرتی ہے؟ کسی متقی کے قتل کی!

اس انیسویں صدی میں مذہبی خیال ایک بحران سے گزر رہا ہے۔لوگ کچھ چیزوں کو بھلائے دے رہے ہیں، اور وہ اچھا کر رہے ہیں، بہ شرطیکہ جان بوجھ کر بھولنے کے دوران وہ اس امر کو سیکھ رہے ہوں کہ قلبِ انسانی ہوا سے خالی نہیں ہوتا، کہ خاص قسم کے انہدامات ہوتے رہتے ہیں، اور اچھا ہے کہ ہوتے رہیں، مگر اس شرط پر کہ ان کی بازتعمیر ہوتی رہے۔

اس دوران، ہمیں ان چیزوں پر غور و فکر کرنا چاہیے جو باقی نہیں رہی ہیں۔ان سے صرفِ نظر کرنے کی غرض سے ان کا جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔ماضی کی جعل سازیاں مصنوعی نام اختیار کر لیتی ہیں اور بڑی خوشی سے انھیں مستقبل کہتی ہیں۔یہ سایہ، یہ ماضی، ان کے اپنے پاسپورٹ میں رد و بدل کے لیے دیا جاتا ہے۔ہمیں اپنے آپ کو اس چال سے خبردار کر دینا چاہیے۔ہمیں اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔

ماضی کا ایک چہرہ وہم اور ایک چہرہ نقاب ہوتا ہے، منافقت۔ ہمیں اس چہرے پر ملامت کرنی چاہیے اور اس نقاب کو چاک کر دینا چاہیے۔

جہاں تک خانقاہوں کا معاملہ ہے، ان کا ایک بہت پیچیدہ مسئلہ ہے— تہذیب کا سوال، جو اُن کی مذمت کرتا ہے؛ آزادی کا سوال، جو ان کی حفاظت کرتا ہے۔

۞

خانقاہ، ایک تجریدی خیال

یہ کتاب ایک ڈراما ہے، جس کا اہم کردار لامتناہیت ہے۔

دوسری شخصیت آدمی ہے۔

ایسی صورت میں، جب کہ ایک خانقاہ ہمارے راستے میں پڑتی ہے، ہمارا فرض تھا کہ ہم اس میں داخل ہوتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ خانقاہ جو مشرق اور مغرب دونوں میں مشترک ہے، قدامت اور جدید دور کے لیے؛ بت پرستی کے لیے، بدھ مت کے لیے؛ محمدیت کے لیے؛ اور عیسائیت کے لیے، آلاتِ بصری میں سے ایک ہے جو ہمیشہ کے لیے آدمی سے متعلق رہی ہے۔

یہ موقع مخصوص خیالات کو بے آہنگی سے بڑھانے کا نہیں؛ پھر بھی مکمل طور پر اپنے تحفظات، اپنی پابندیاں، حتیٰ کی اپنی برہمی یا پریشانی کو برقرار رکھتے ہوئے، ہمیں کہنا چاہیے کہ ہر بار جب ہم کسی آدمی کو لامحدودیت میں پاتے ہیں، جسے اچھی یا بری طرح سمجھا جاتا ہے، تو ہمیں احترام کے ساتھ زیر کر لیا جاتا ہے۔ کسی مینا گاگ میں، مسجد میں، پگوڈا میں، جھونپڑی میں ایک بھیانک پہلو ہوتا ہے جسے ہم خارج کر دیتے ہیں، اور ارفع پہلو ہوتا ہم جس کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

انسانی دیوار پر خدا کی گونج، دماغ کے لیے کیا خوب تصور ہوتی ہے، اور خیال کے لیے کیسی لامتناہی غذا ہوتی ہے!

خانقاہ، ایک تاریخی حقیقت

تاریخ، سبب اور سچائی کے نقطۂ نگاہ سے راہبانہ زندگی لائقِ مذمت ہے۔ جب کسی قوم میں خانقاہیں زیادہ ہو جائیں تو اس کے دورانِ خون میں رکاوٹیں، بے ڈول ادارے اور آرام طلبی کے مراکز بن جاتی ہیں جنھیں دراصل مزدوروں کے مراکز ہونا چاہیے۔ خانقاہی سماج کی کسی عظیم سماجی کمیونٹی میں وہی حیثیت ہوتی ہے جیسے کسی صنوبر کے درخت کے لیے آکاس بیل اور انسانی جسم کے لیے مہاسا۔ ان کی خوش حالی، ان کی فربہی کا مطلب قوم کا افلاس ہوتا ہے۔ خانقاہی حکومتیں تہذیب کی ابتدا کے لیے اچھی ہوتی ہیں، روحانیت کے ذریعے وحشی پن میں کمی فائدہ مند ہوتی ہے، مگر اس وقت خرابی کا باعث ہونے لگتی ہیں جب عوام اپنی بلوغت کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ جب یہ سست ہو جاتی ہیں تو ان ہی وجوہ کی بنا پر اپنی ابتری کے دور میں داخل ہو جاتی ہیں جنھوں نے اسے اپنے پاکیزگی کے عرصے میں صحت بخش بنایا تھا، اس لیے کہ یہ مثال بناتی رہتی ہیں۔

محصوریت ختم ہو چکی ہے۔ خانقاہوں نے، جو جدید تہذیب کی ابتدا میں فائدہ مند تھیں، اپنی نشو ونما کو سراسیمہ کر دیا ہے، اور اپنی ترقی کے لیے مضر ہو گئی ہیں۔ جہاں تک آدمی کے حوالے سے ان کی تدوین اور تشکیل کا معاملہ ہے تو خانقاہیں جو دسویں صدی میں اچھی تھیں، پندرہویں صدی میں قابلِ اعتراض بنیں اور انیسویں صدی میں قابلِ نفرت ہو گئی ہیں۔ راہبانہ زندگی کے جذام نے دو حیرت انگیز قوموں، اطالیہ اور ہسپانیہ کے ڈھانچے کو تقریباً چبا ڈالا ہے: ایک قوم روشنی تھی، دوسری صدیوں یورپ کی شان وشوکت رہی تھی؛ آج دونوں کے عوام 1789ء کے توانا حفظانِ صحت کے طفیل رو بصحت ہیں۔

خانقاہ — بالخصوص قدیم مؤنث خانقاہ، جیسی کہ اس صدی کی دہلیز پر اطالیہ میں، آسٹریا

میں اور ہسپانیہ میں آج بھی موجود ہے— قرونِ وسطیٰ کے سب سے دھندلے انجمادات میں سے ایک ہے۔ تجرد اب خوف کا چوراہا بن چکا ہے۔ کیتھلک تجرد، صحیح معنوں میں موت کی سیاہ تابندگی سے مکمل طور پر بھر چکا ہے۔

ہسپانوی خانقاہیں سب سے زیادہ تعزیتی یا ماتمی ہیں۔ ان میں گم نامی اور اداسی سے بھرے کمروں تلے، مبہم سایوں کے گنبدوں تلے، بابل کی، کیتھیڈرل جیسی بلند اور جسیم قربان گاہیں ہیں؛ ان کے اندھیرے میں زنجیروں سے بندھی خوف ناک صلیبیں آویزاں ہیں؛ آبنوسی عریانیت ہے، ہاتھی دانت سے بنے یسوع کے عظیم الشان مجسمے ہیں جو جریانِ خون سے زیادہ خوں بھرے ہیں؛ استخوان کی مظہر ان کی کہنیاں ہیں؛ جلد کا مظاہرہ کرتی گھٹنوں کی ہڈیاں ہیں؛ زخم کا مظاہرہ کرتا ہوا جسم کا گوشت ہے؛ نقرئی خار کے تاج پہنے ہوئے ہیں؛ طلائی کیلوں سے جڑے ہوئے ہیں؛ ان کی پیشانی پر یاقوت سے بنے خون کے قطرے ہیں، اور ان کی آنکھوں میں ہیرے سے بنے آنسو ہیں۔ ان میں لگے ہیرے اور یاقوت نم محسوس ہوتے ہیں اور نقاب تلے وجود کو روتا دکھاتے ہیں؛ بالوں سے چھپی زخمی کنپٹیاں ہیں اور نوکیلے لوہے کے کوڑے ہیں؛ بید کی ٹہنیوں سے چھِلی ان کی چھاتیاں ہیں؛ طویل دعاؤں کے باعث ادھڑی جلد والے گھٹنے ہیں۔ ان میں ایسی عورتیں رہتی ہیں جو خود کو بیویاں سمجھتی ہیں؛ آسیب رہتے ہیں جو خود کو فرشتہ گردانتے ہیں۔ کیا یہ عورتیں سوچتی بھی ہیں؟ نہیں! کیا ان کی اپنی کوئی خواہش بھی ہوتی ہے؟ نہیں! کیا وہ محبت بھی کرتی ہیں؟ نہیں! کیا وہ زندہ رہتی ہیں؟ نہیں! ان کے اعصاب ہڈی بن چکے ہیں؛ ان کی ہڈیاں پتھر بن چکی ہیں۔ ان کی نقاب بُنی ہوئی رات ہے۔ نقاب کے اندر ان کی سانس الم ناک موت کی سانس جیسی ہے۔ افسر راہبہ، بھتنی، انھیں مقدس بناتی ہے اور انھیں ڈراتی بھی ہے۔ وہاں بے داغ و عفیف لڑکیاں ہیں، اور بہت خوں خوار ہیں۔ یہ ہیں ہسپانیہ کی خانقاہیں! یہ دین داری کے خوف ناک باڑے ہیں، کنواریوں کے غار ہیں، سفاک جگہیں ہیں۔

کیتھلک ہسپانیہ خود روم سے زیادہ رومن ہے۔ ہسپانوی خانقاہ سب سے بڑھ کر کیتھلک خانقاہ تھی۔ اس کے اطراف مشرق کی خوش بو تھی۔ آرچ بشپ، جنت کا خواجہ سرا داروغہ، خدا کے لیے مخصوص حرم کو تالے میں بند اور ان پر نظر رکھتا تھا۔ راہبہ داشتہ تھی، پادری خواجہ سرا تھا۔ گرم جوش لوگ خوابوں میں منتخب کیے جاتے تھے، اور یسوع کے مالک ہوتے تھے۔ رات کے وقت، خوب صورت، برہنہ آدمی صلیب سے نیچے اترا اور حجرے والیوں کے لیے سرمستی ہو گیا تھا۔ بلند دیواریں عارفہ سلطانہ کی حفاظت کر رہی تھیں، جس نے مصلوب کو اپنا سلطان بنا لیا تھا۔ بیرونی دنیا پر نظر ڈالنا کفر تھا۔ وہ شے جو مشرق میں دنیا بُرد کی جاتی، مغرب میں زمین کے اندر

ڈال دی جاتی تھی۔ دونوں علاقوں میں عورتیں اپنے ہاتھ ملتی تھیں: پہلی کے لیے لہریں تھیں؛ آخری کے لیے قبریں تھیں؛ ایں جا غرق شدہ، آں جا دفن شدہ۔ کیسی خوف ناک مشابہت ہے!

آج ماضی کے حامیوں نے، جو ان چیزوں کی نفی سے قاصر ہیں، تبسم کو اپنا وتیرہ کر لیا ہے۔ اب تاریخ کے انکشافات کو دبانا، فلسفے کی تشریحات کو باطل کر دینا، تمام پریشان کن حقیقتوں اور اندوہ گیں سوالات سے صرفِ نظر کرنا، عجیب اور آسان طریقہ ہوگیا ہے۔ چالاک اس کو خطیبانہ تقریر کا معاملہ سمجھتے ہیں۔ بیوقوف خطیبانہ تقریریں دہراتے ہیں۔ Jean-Jacques، جوشیلا مقرر تھا، Diderot، جوشیلا مقرر تھا؛ والٹیئر Calas، Labarre, Calas اور Sirven سب جوشیلے مقرر تھے۔ مجھے علم نہیں، کس نے دریافت کیا ہے کہ Tacitus جوشیلا مقرر تھا، کہ نیرو ایک شکار تھا، اور یہ بھی کہ رحم طے شدہ طور پر اس "بے چارے Holofernes" کا حق ہے۔

حقیقتوں کو بگاڑ دینا آسان کام نہیں ہوتا، یہ بہت سرکش ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ برسلز سے آٹھ لیگ کے فاصلے پر — قرونِ وسطیٰ کی قدیم نشانیاں ہیں جو ہر شخص کے لیے قابلِ حصول ہوتی ہیں— کہ Villers کے کلیسا میں، میدان کے بیچ، جو کبھی خانقاہ کا صحن تھا ایک خفیہ قید خانہ ہے، اور دریائے Thil کے ساحل پر چار تنگ عقوبت خانے تھے، نصف زیرِ زمین اور نصف زیرِ آب۔ چاروں قریب قریب تھے۔ ہر عقوبت خانے میں اس کے آہنی دروازے کی باقیات تھیں، ایک کوٹھڑی، اور ایک جالی دار کھڑکی تھی جو باہر کی جانب دریا کے پانی کی سطح سے دو فٹ اوپر، اور اندر کی جانب زمین کی سطح سے چھ فٹ اوپر کھلتی تھی۔ چار فٹ اونچا پانی کا بہاؤ بیرونی دیوار کے پاس سے گزرتا تھا۔ وہاں کی زمین ہمیشہ گیلی ہوتی ہے۔ یہ گیلی زمین اس کے باسی کے لیے بستر کا کام دیتی تھی۔ ان قید خانوں میں سے ایک میں دیوار میں لگے ایک چھلّے کا ایک ٹکڑا باقی رہ گیا تھا؛ دوسرے والے میں سنگِ خارا کی چار سِلوں سے بنا ایک مربع بکس تھا، جو کسی آدمی کے لیٹنے کے لیے بہت چھوٹا، اور کھڑے ہونے کے لیے بہت نیچا ہے۔ انسانی وجود کو اس کے اندر ڈال کر اوپر پتھر کی سِل رکھ دی جاتی تھی۔ وہ بکس اب بھی موجود ہے۔ اسے دیکھا جا سکتا ہے، چھوا جا سکتا ہے۔ یہ عقوبت خانے، یہ آہنی قبضے، یہ چھلّے، بلندی پر سے جھانکنے والے وہ سوراخ جو پانی کے بہاؤ کے برابر تھے، وہ پتھر سے بنے اور سنگِ خارا کی سِل سے بند کیے جانے والے بکس جیسے مقبرے، جس میں بند کیا جانے والا انسان مردہ نہیں زندہ ہوتا تھا، وہ مٹی جو کیچڑ ہوتی تھی، کمروں کے وہ سوراخ، وہ ٹپکنے والی دیواریں!

کیا ہوئے وہ جوشیلے مقررین!

✡

ماضی کے احترام کی شرائط

خانقاہی زندگی، جیسی کہ ہسپانیہ میں تھی، جیسی تبت میں آج بھی موجود ہے، کسی بھی معاشرے کے لیے ایک قسم کے تپِ دق کے مانند ہوتی ہے۔ یہ زندگی کو مختصر کر دیتی ہے، اجاڑ دیتی ہے۔ اس قسم کی علاحدگی آختہ کر دیتی ہے۔ یہ یورپ کے لیے سزا کے مانند رہی تھی۔ اس میں شامل کر دیجیے تشدد کو جو اکثر کیا جاتا تھا، خانقاہ کی سہارا دی ہوئی جاگیرداری کے ذریعے، زبردستی کرائے جانے والے پیشے کے ذریعے، پہلی اولاد کی پیدائش پر خاندان کے فالتو افراد کے خانقاہی زندگی میں بھیج دیے جانے کے ذریعے۔ اس خوں خواری پر، منہ بند رکھنے پر، دماغ بند کیے رکھنے پر، عقوبت خانوں میں ڈالے ہوئے اتنے ہمارے بدقسمت دماغوں پر، عادات کے بن جانے پر اور افراد کے زندہ دفن کر دیے جانے پر ہم ابھی بات کر چکے ہیں۔ اس میں انفرادی عقوبتوں سے قومی رسوائی تک، اور آپ جو بھی ہوں، انسان کے بنائے ہوئے کفن کی دو چادروں کے، فراک کے اور نقاب کے سامنے لرز جائیں گے۔ پھر بھی بعض موقعوں اور بعض مقامات پر، فلسفے کے باوجود، ترقی کے باوجود، انیسویں صدی کے درمیان، حجرے کا جذبہ قائم رہتا ہے، اور ایک انوکھے ناہدانہ زور کا اس طرح بڑھ جانا اس لمحے مہذب دنیا کو حیران کر رہا ہے۔ کہنہ اداروں کی خود کو سدا قائم رکھنے کی ہٹ دھرمی مشابہ ہوتی ہے اس اتری ہوئی خوش بو سے جو ہمارے بال اُڑا دیتی ہے؛ اس خراب شدہ مچھلی کے دعوے سے جو کھائے جانے پر اصرار کرتی ہے؛ بچے کے اس لباس سے جو پورے آدمی کو ملبوس کرنے پر جبراً اصرار کرتا ہے اور لاشوں کی نرمی سے جو کسی زندہ انسان سے بغل گیر ہونے پر اصرار کرتی۔

"ناشکرے جسمو!" لباس کہتا ہے، "میں نے تمھیں نامہربان موسم سے بچایا ہے، تم

مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہو؟" مچھلی کہتی ہے، "میں ابھی گہرے سمندر سے نکلی ہوں۔" خوش بو کہتی ہے، "میں گلاب رہی ہوں۔" میت کہتی ہے، "میں نے تم سے محبت کی ہے۔" خانقاہ کہتی ہے، "میں نے تمھیں مہذب بنایا ہے۔"

ان سب کا بس ایک ہی جواب ہے، "گزرے دنوں میں۔"

ازکار رفتہ اشیا کو لامتناہی عرصے تک طول دینے کا خواب دیکھنا؛ آدمیوں کی حکومت کا حنوط کاری کے ذریعے خراب اصولوں کو بحال کرنا؛ مقبروں کی نئی ملمع کاری کرنا؛ حجروں کی مرمت کرنا؛ تبرکات کے صندوق کو دوبارہ فیض یاب کرنا؛ توہم پرستی کو پھر سے آراستہ کرنا؛ مذہبی جنون کو نئے ذخائر فراہم کرنا؛ عسکریت اور آبِ مقدس کے موٹھوں میں نئے دستے لگانا؛ خانقاہیت اور عسکریت کی نئے سرے سے ترتیب کرنا؛ طفیلی جراثیم کی افزائش کے ذریعے سوسائٹی کی نجات پر یقین رکھنا؛ حال پر ماضی کو زبردستی حاوی کرنا— کیا یہ سب کچھ انوکھا عمل نہیں؟ پھر بھی، ایسے اصول ساز ہیں جو ایسے اصولوں پر اصرار کرتے ہیں۔ ان اصول سازوں کا جو دوسرے معنوں میں صاحبانِ دانش ہیں، ایک بہت سادہ سا طریقہ ہوتا ہے؛ یہ لوگ ماضی پر ایسی پالش لگاتے ہیں جسے وہ سماجی نظام، خداداد حق، اخلاقیات، خاندان، بزرگوں کا احترام، اختیارِ عتیق، مقدس روایت، جواز اور مذہب کا نام دیتے ہیں اور چلاتے پھرتے ہیں "اے اہلِ ایمان! اسے اختیار کرو۔" یہ منطق تو قدیم لوگوں کی تھی، مگر پیش گوئی کرنے والے اس پر آج بھی عمل کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک سیاہ رنگ کی بچھیا پر سفیدی مل کر کہتے ہیں، "یہ پیدائشی سفید بچھڑا ہے۔"

جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہم یہاں وہاں، ماضی کا احترام کرتے ہیں، اور ہم اس کو چھوڑ دیتے ہیں، بہ شرطے کہ یہ مردہ ہونے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ زندہ ہونے پر اصرار کرتا ہے تو ہم اس پر حملہ کرتے ہیں، اور اس کو مردہ بنا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

توہم پرستی، ہٹ دھرمی، بناوٹی زہد اور تعصبات، یہ سب زندگی سے چمٹے ہوتے ہیں؛ ان کے دھوئیں میں بھی دانت ہوتے ہیں، ناخن ہوتے ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے بغل گیر رکھنا چاہیے، ان سے جنگ کرنی چاہیے، ایسی جنگ جس میں عارضی جنگ بندی نہ ہو؛ یہ ان انسانی بلاکتوں میں سے ہے، جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیالی اجسام سے جنگ میں مشغول رکھنا چاہیے۔ ظلمت کو گلے سے پکڑنا اور زمین پر پٹخ دینا مشکل کام ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کے فرانس میں دن دہاڑے کسی خانقاہ کی موجودگی روشنی کے سامنے الوؤں کے اجتماع کے مماثل ہے۔ 1789ء اور 1830ء اور 1848ء کے شہر کے بیچوں بیچ،

پرہیز گاری کے عمل میں مشغول پکڑی جانے والی خانقاہ، پیرس میں روم کا شگوفہ ہے،ایک خطائے تاریخی ہے۔عام ذہنوں میں، کسی خطائے تاریخی کو تحلیل کرنے اور اس کو غائب کردینے کے لیے تاریخ کے ہجے کردینا ہی کافی ہوتا ہے، مگر ہم عام دلوں میں نہیں ہیں۔

ہمیں جنگ کرنی چاہیے۔

ہمیں جنگ کرنی چاہیے،مگرایک امتیاز بھی کرنا چاہیے۔سچائی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی زیادتی نہیں کرتی۔تو پھر مبالغے کی ضرورت کیا ہے؟ ہمارے سامنے وہ سب ہے جس کو تباہ کرنا ضروری ہے، اور ہمارے سامنے وہ بھی ہے جس کی وضاحت کرنا اور جانچ پڑتال کرنا بھی ضروری ہے۔کیا خوب قوت ہوتی ہے مہربان اور سخت جانچ پڑتال بھی۔جہاں صرف روشنی کی ضرورت ہو وہاں شعلہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

لہٰذا اس انیسویں صدی میں،ایک عام انداز میں اور تمام لوگوں میں، ایشیا میں اور یورپ میں بھی، ہندوستان میں اور ترکستان میں بھی، ہم زاہدانہ علاحدگی کے خلاف ہیں۔جو کوئی بھی حجرہ کہتا،تو وہ دراصل دلدل کہنا چاہتا ہے۔ان کی اخلاقی خرابی واضح ہوتی ہے، ان کا جمود غیر صحت بخش ہوتا ہے؛ان کی تخمیر لوگوں میں بخار پیدا کرتی ہے؛ ان کو رنگ باختہ کردیتی ہے؛ ان میں اضافہ مصری طاعون بن جاتا ہے۔ہم خوف کے بغیر ان ریتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جہاں فقیر، بدھ پیشوا،سنت، یونانی راہب، مرابط [شمالی افریقا کے بزرگوں کے طبقات]، بھکشو، اور درویش موذی کیڑوں کے دل ہجوم کی طرح بڑھتے نہ ہوں۔

یہ کہنے کے باوجود وہ مذہبی سوال باقی رہ گیا۔اس سوال کے کچھ مخفی بلکہ خطرناک پہلو بھی ہیں۔تو ہمیں ان کو غور سے دیکھنے کی اجازت دی جائے۔

۞

خانقاہ اور اس کے اُصول

مرد متحد ہو جاتے ہیں اور کمیونٹی بن کر رہتے ہیں۔ کس حق کے سبب؟

شراکت کے حق کے سبب۔

وہ اپنے آپ کو گھروں میں بند کر لیتے ہیں۔ کس حق کے سبب؟ اسی حق کے سبب جس کے ذریعے ہر آدمی کو اپنا دروازہ کھولنا اور بند کرنا پڑتا ہے۔

وہ آگے نہیں بڑھتے۔ کس حق کے سبب؟ اسی حق کے سبب جس کے ذریعے وہ جاتے اور آتے ہیں، جس سے مراد گھر پر رہنے کا حق ہوتا ہے۔

گھر پر ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟

دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہیں؛ اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں؛ محنت کرتے ہیں۔ دنیا سے، شہروں سے، شہوت پرستی سے، سرور سے، خودنمائی سے، تکبر سے، مفادات سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ موٹے اونی یا موتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ کسی بھی شے کے بلاشرکت غیرے مالک نہیں ہوتے۔ وہاں داخل ہونے کے بعد ہر ایک جو دولت مند ہوتا ہے خود کو مفلس کر لیتا ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، سب پر تقسیم کر دیتا ہے۔ وہ جو رئیس، معزز آدمی اور نواب تھا، ایک عام دیہی آدمی کے برابر ہو جاتا ہے۔ کوٹھڑی سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ سب کے سر مونڈ دیے جاتے ہیں، ایک قسم کے فراک پہنتے ہیں، ایک جیسی کالی روٹی کھاتے ہیں، اسی پیال پر سوتے ہیں، اسی خاک پر مرتے ہیں۔ ایک جیسے تھیلے ان کی پشت پر ہوتے ہیں، اور ایک جیسی رسی ان کی کمر سے بندھی ہوتی ہے۔ ننگے پاؤں چلنے کا فیصلہ ہو تو ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ ان کے درمیان شہزادہ بھی ہو سکتا ہے؛ شہزادے کا سایہ بھی دوسروں کے سایے جیسا ہوتا ہے۔ خطابات

نہیں ہوتے، حتیٰ کے خاندانی نام بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کے صرف عرفی نام ہوتے ہیں۔ سب اپنے مقتسے کے نام کے آگے جھک جاتے ہیں انھوں نے اپنے جسمانی خاندان تحلیل کر دیے ہیں اور اپنی ایک کمیونٹی، ایک روحانی خاندان بنا لیا ہے۔ آدمیوں کے علاوہ ان کے کوئی رشتے دار نہیں۔ وہ مفلس کی مدد کو جاتے ہیں، بیمار کی تیمارداری کرتے ہیں۔ان کو منتخب کرتے ہیں جس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ''میرے بھائی'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

آپ مجھے چُپ کرا سکتے ہیں یہ کہہ کر: ''مگر یہ تو مثالی خانقاہ ہوتی ہے۔''

یہی کافی ہے کہ یہ ممکنہ خانقاہ ہو سکتی ہے، ہمیں جس پر نظر ڈالنی چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے اگلی کتاب میں خانقاہ کے بارے میں احترام کے لہجے میں باتیں کی ہیں۔ قرونِ وسطیٰ ایک طرف، ایشیا ایک طرف، تاریخی اور سیاسی سوال الگ، خالصتاً فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے، عسکری ضرورت کی پالیسی کے علاوہ، اس شرط پر کہ خانقاہ مکمل طور پر ایک ارادی معاملہ ہوگا اور اس میں صرف متفقہ پارٹیاں شامل ہوں گی، میں خانقاہ کی کمیونٹی پر مخصوص توجہ سے، اور کچھ معاملات میں مؤدبانہ سنجیدگی سے غور کروں گا۔ جہاں بھی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے، وہاں مشترکہ سماج ہوتا ہے؛ جہاں مشترکہ سماج ہوتا ہے وہاں حق ہوتا ہے۔ خانقاہ اس ضابطے کی پیداوار ہوتی ہے جس میں مساوات اور اخوت ہوتی ہے۔ خانقاہ کی جمہور میں قلبِ ماہیت کے لیے آزادی کافی ہوتی ہے۔

اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔

مگر یہ مرد و زن، یا یہ عورتیں جو ان چار دیواروں کے پیچھے ہیں، یہ لوگ خود کو موٹے اونی کپڑوں میں ملبوس رکھتے ہیں۔ یہ لوگ برابر ہیں، ایک دوسرے کو بھائی کہتے ہیں، یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر یہ کرتے کچھ اور ہیں؟

جی ہاں۔

وہ کیا؟

یہ اندھیرے میں گھورتے رہتے ہیں، گھٹنوں کے بل جھکے ہوتے ہیں اور اپنے ہاتھ باندھے رکھتے ہیں۔

اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

۞

عبادت

وہ لوگ عبادت کرتے ہیں۔

کس کی؟

خدا کی!

خدا کی عبادت کرتے ہیں— ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

کیا ہم سے پرے بھی کوئی لامحدود ہے؟ اگر ہے تو جبلی طور پر دائمی ہے؛ حقیقی ہے، اس لیے کہ لامحدود ہے؛ اور چوں کہ اس میں مادے کی کمی ہے تو یہ حد بند ہوگا؛ لازماً ذہین بھی ہو گا، اور چوں کہ وہ لامحدود ہے، اور اگر اس میں ذہانت نہیں ہوگی، تو کیا وہیں پر ختم ہو جائے گا؟ کیا اس لامحدود نے خیال کے جوہر کو ہمارے اندر جگا دیا ہے؟ دوسرے معنوں میں، ہم جس کے صرف رشتے دار ہیں، کیا وہ بالکل مکمل نہیں ہے؟

ساتھ ہی، چوں کہ ہمارے بغیر بھی ایک لامحدود ہے، تو کیا ہمارے اندر ایک لامحدود نہیں ہے؟ تو کیا یہ دو لامحدود ایک دوسرے کے اوپر رکھے نہیں ہیں؟ کیا یہ، بقول شخصے، دوسرا لامحدود نہیں ہے جو پہلے محدود کے نیچے ہے؟ کیا ثانی الذکر لامحدود کا آئینے جیسا عکس، اس کی گونج، کسی پاتال سے ہم مرکز نہیں؟ تو کیا یہ دوسرا لامحدود ذہین بھی ہے؟ کیا یہ سوچتا ہے؟ کیا یہ محبت کرتا ہے؟ کیا یہ خواہش کرتا ہے؟ کیا یہ دونوں لامحدود ذہین ہیں، ہر ایک کا اپنا اصول ہے، اور کیا اوپری لامحدود میں اُسی طرح ایک "میں" ہے جس طرح کہ نچلے لامحدود میں ہے؟ نیچے والا "میں" نفس ہے؛ اوپر والا "میں" خدا ہے۔

اس نیچے والی لامحدودیت کا اوپر والی لامحدودیت سے خیال کے ذریعے رابطہ کرنے کو

عبادت کرنا کہا جاتا ہے۔

اچھا، تو ہم انسانی ذہن سے کچھ نہیں لیتے، کسی شے کو دبا کر رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ ہم کو نئے سرے سے مرتب ہونا اور اپنی شکل کو تبدیل کرنا چاہیے۔ انسان کی کچھ لیاقتیں کسی نامعلوم کی طرف متوجہ ہوتی ہیں: یعنی خیال، مراقبہ، عبادت۔ نامعلوم ایک سمندر ہوتا ہے۔ ضمیر کسے کہتے ہیں؟ یہ نامعلوم کا ہرکارہ ہوتا ہے۔ خیال، مراقبہ، عبادت — یہ عظیم اور پُراسرار تاب کاریاں ہیں۔ ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ نفس کی یہ عالی شان شعاع ریزیاں کہاں جاتی ہیں؟ سایے میں یا روشنی میں؟

جمہوریت کی عظمت، انسانیت کی کسی شے سے دست بردار نہ ہونے، اور کسی شے کا انکار نہ کرنے میں ہی ہوتی ہے۔ کم از کم، آدمی سے قریب ہو جایئے کہ قربت ہی میں اس کا فقص ہوتا ہے۔

مذہبی کفر پن کو کچلنا اور لامحدود کا احترام کرنا، یہی قانون ہوتا ہے۔ ہمیں شجر تخلیق کے سامنے سجدہ ریز ہو جانے اور اس کی ہر شاخ پر ستارے تصور کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کرنی چاہیے۔ نفسِ انسانی پر محنت کرنا، معجزے کے خلاف معمے کا دفاع کرنا، ناقابلِ فہم سے محبت کرنا اور فضولیات کو رد کر دینا، جو ضروری ہو اُس کو قبول کر لینا، یقین کو پاکیزہ کرنا، مذہب سے توہم کو دور کرنا، لاروے کے خدا کو واضح کر دینا ہمارا فرض ہے۔

❁

عبادت کی فضیلت

جہاں تک عبادت کے طریقوں کا معاملہ ہے، سب طریقے اچھے ہوتے ہیں بہ شرطے کہ خلوص پر مبنی ہوں۔ اپنی کتاب کو الٹی رکھ دیجیے اور لامحدود میں مل جائیے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسا ایک فلسفہ ہے جو لامحدود سے انکار کرتا ہے۔ ایک مرضیاتی فلسفہ بھی ہے جو آفتاب کا انکار کرتا ہے؛ ایسے فلسفے کو بے عقلی کہتے ہیں۔ ایسے احساس کی تعبیر سے، سچائی کی جس میں کمی ہو، اچھے نابینا آدمی کی خود کفالت ہو جاتی ہے۔

بالادست، خود پسند اور رحم دل کیفیات ہی وہ پُر اسرار چیزیں ہوتی ہیں جنھیں ٹٹول کر تلاش کرنے والا فلسفہ، وہ فلسفہ ہو جاتا ہے جسے خدا نظر آتا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ کسی کو بتاتا ہے، "مجھے ان سے اور ان کے آفتاب سے ہمدردی ہے!"

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دنیا میں بہت سے طاقت ور اور معروف الحاد پرست بھی ہیں۔ مگر اپنی اندرونی سچائی کی قوت کے باعث انھیں پورا یقین نہیں کہ واقعی وہ الحاد پرست ہیں؛ ان کے پاس صرف ایک سوال معرفت کا ہے، اور عالی دماغ ہوتے ہوئے بھی، اگر چہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے، وہ خدا کے وجود کو ثابت کر دیتے ہیں۔

پوری سنگ دلی سے ان کے فلسفے کو رَد کرتے ہوئے بھی، فلسفی ہونے پر ہم انھیں سلام پیش کرتے ہیں۔

آیئے اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔

اس بارے میں بھی، خاص بات یہ ہے کہ ان میں الفاظ سے کھیلنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ مثال کا ایک مابعد الطبیعیاتی اسکول، جس کے دماغ میں کسی حد تک دھند بھری ہوئی ہے،

کہتا ہے کہ اس نے ''قوت'' کے لفظ کو ''ارادے'' کے لفظ سے بدل کر انسانی ادراک میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

''پودا بڑھتا ہے'' کے بجائے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ''پودا ارادہ کرتا ہے'' ؛ اب اگر ہم اس میں ''پودے'' کے لفظ کو ''کائنات'' کے لفظ سے بدل کر کہیں کہ ''کائنات ارادہ کرتی ہے'' تو اس سے بہت سارے نتائج نکلنے لگتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ پھر ہم اس مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ''پودا ارادہ کرتا ہے''، اس لیے اس کے اندر ایک ''میں'' ہے؛ اور اگر کائنات ارادہ کرتی ہے تو خدا کا وجود ہے۔

اس اسکول سے تفریق کے باوجود ہم اس امر کو رد نہیں کرتے کہ ہمارے نزدیک، پودے میں ارادے کا ہونا، جسے اس اسکول نے قبول کیا ہے، زیادہ مشکل ہے، بجائے اس کے کہ ہم کائنات کے ارادے ہی سے انکار کر دیں۔

لامحدود کے ارادے کا انکار، یعنی کسی بھی صورت میں خدا کا انکار، خود لامحدود کے انکار سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ہم نے یہ امر ثابت کر دیا ہے۔

لامحدود کا انکار ہمیں سیدھا عدمیت، یا انکارِ کُل کی طرف لے جاتا ہے۔ اور پھر ہر شے ''ایک ذہنی گمان'' بن جاتی ہے۔

عدمیت سے مباحثہ ممکن نہیں؛ اس لیے کہ عدمیت کی منطق ہم سخن کے وجود پر شبہ کرتی ہے، اور اسے پورا یقین نہیں کہ خود اس کا بھی کوئی وجود ہے۔

اس کے نقطۂ نگاہ سے یہ ممکن ہے کہ وہ خود بھی صرف ''ایک ذہنی گمان'' ہو سکتی ہے۔

مگر، اسے یہ احساس نہیں کہ محض ''ذہن'' کا ایک لفظ منہ سے نکال کر، تمام اشیا کو، جس کا اس نے انکار کیا ہے، ایک انبار کی صورت میں قبول کر رہی ہے۔

مختصر یہ کہ کسی فلسفیانہ خیال کے لیے کھلا کوئی راستہ نہیں جو ایک لفظ ''نہیں'' پر سب کچھ ختم کر دے۔

''نہیں'' کا صرف ایک ہی جواب ہے ''ہاں''۔

عدمیت کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔

عدم وجود جیسی کوئی شے نہیں۔ صفر کا وجود نہیں۔ ہر چیز کوئی چیز ہوتی ہے۔ ''کچھ نہیں''، کچھ بھی نہیں ہوتا۔

آدمی کو زندہ رہنے کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضرورت عمل تو ثیق کی ہوتی ہے۔

دیکھنا اور دکھانا ہی کافی نہیں۔ فلسفے کو توانائی ہونا چاہیے۔ اس میں آدمی کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش اور اثر ہونا چاہیے۔ سقراط کو آدم میں حلول کر کے Marcus Aurelius [جیسا فلسفی] پیدا کرنا چاہیے؛ دوسرے لفظوں میں مسرت کے آدمی میں سے دانش کا انسان برآمد ہونا چاہیے۔ باغ عدن کو درس گاہ عوام میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ سائنس کو مشروب ہونا چاہیے۔ لطف کے لیے — کیسا افسردگی بھرا مقصد ہے، اور کیا آرزو ہے! وحشی لطف اندوز ہوتا ہے۔ انسانوں کی پیاس کو خیالات کی پیش کش ایسی ہی ہے جیسے خدا کے تصور کو آب حیات، تا کہ ضمیر اور سائنس آپس میں رشتے استوار کریں، اور ان میں ایک پُراسرار مقابلہ رہے؛ حقیقی فلسفے کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ اخلاقیات سے سچائیوں کے پھول کھلتے ہیں۔ گیان دھیان عمل کی طرف لے جاتے ہیں۔ فلسفے کو قابلِ عمل ہونا چاہیے۔ ضروری ہے کہ مثال انسانی دماغ کے لیے سانس لینے، پی سکنے اور کھانے کے قابل ہو۔ وہ مثال ہی ہے جس کو حق ہے کہنے کا، اسے لو! اس شرط پر کہ یہ سائنس کی بے ثمر محبت نہیں رہے گی، کہ یہ انسانی اجتماع کا اقتدار اعلیٰ بنے گی، اور فلسفہ خود بڑھ کر مذہب بن جائے گا۔

فلسفے کو معمے پر تعمیر کیا گیا برج نہیں ہونا چاہیے، آرام سے جس کا نظارہ کیا سکے، سوائے اس کے کہ وہ تجسس کے لیے آسانی کا باعث ہو۔

اپنے خیال کی ترقی کو کسی اور وقت پر ملتوی کرنے کی خاطر ہم اپنے آپ کو اتنا کہنے تک محدود رکھیں گے کہ ہم آدمی کو ان دو قوتوں کے بغیر نہ نقطۂ انحراف سمجھتے ہیں اور نہ نقطۂ ارتقا، جو ان کے دو محرک ہیں: یقین اور محبت۔

ارتقا، ہدف ہے؛ مثال، نمونہ ہے۔

تو یہ مثال کیا ہے؟

یہی خدا ہے۔

معیار، مطلق، کمال، لامحدودیت — چاروں ہم معنی الفاظ ہیں۔

۞

الزام میں احتیاط کرنا

تاریخ اور فلسفے کے کچھ ابدی فرائض ہوتے ہیں، ساتھ ہی کچھ معمولی فرائض بھی ہیں: بڑے پادری Caiphas سے، قانون ساز Draco سے، آئین ساز Trimalcion سے، شہنشاہ سے مبارزت کرنا؛ صاف، راست اور شفاف ہے، جس میں کوئی ابہام نہیں۔

الگ رہنے کا حق، جس میں ناراحتی بھی ہو اور بینائیاں بھی ہوں، اصرار کرتا ہے کہ اس کا بیان اور اس کا حساب لیا جائے۔خانقاہ نشینی ایک انسانی مسئلہ ہے۔

جب خانقاہ کی، غلطیوں کے مساکن کی معصومیت کی، کج روی مگر نیک نیتی کی، ناواقفی مگر زہد کی، تشدد مگر شہادت کی بات ہوتی ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ 'ہاں' کہا جائے یا 'نہیں'۔

خانقاہ ایک تضاد ہے۔اس کا مقصد، نجات، جس کا مطلب قربانی ہوتا ہے۔خانقاہ بلند ترین انانیت ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کا نتیجہ تیاگ یا نفس کشی ہوتا ہے۔

حکم چلانے کے مقصد سے دست برداری کرنا، خانقاہیت کی اختراع معلوم ہوتی ہے۔

[مستقبل میں] لطف لینے کے لیے لوگ تجربے کا دکھ اٹھاتے ہیں۔موت کے مبادلے کی ہنڈی بناتے ہیں۔آسمانی روشنی کے لیے خاکی اندھیرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جنت کی خاطر حجرے میں جہنم کو پیشگی قبول کر لیتے ہیں۔

نقاب یا فراک پہن لینا ایسی خودکشی ہے جو ابد کی قیمت ادا کرتی ہے۔

ہمارے خیال میں ایسے معاملات میں تمسخر کی اجازت نہیں ہوتی۔اچھائی ہو یا برائی، ایسے معاملات میں سنجیدگی ہونی چاہیے۔

یقین اور اصول

کچھ مزید گفتنی!

ہم کلیسا کو الزام دیتے ہیں جب وہ سازشوں سے لبریز ہو جاتا ہے؛ ہم اس روحانیت سے نفرت کرتے ہیں جو دنیوی زندگی سے ساتھ تنگی سے پیش آتی ہے؛ مگر ہم ہر جگہ صاحبِ فکر آدمی کی عزت کرتے ہیں۔

ہم اس آدمی کو سلام کرتے ہیں جو جھکتا ہے۔

اور عقیدہ، یہ آدمی کی ضرورت ہوتا ہے۔ تف ہے اس پر، جو کسی چیز پر یقین نہیں رکھتا۔

کسی کام میں جذب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ مصروف نہیں۔ محنت دو طرح کی ہوتی ہے؛ وہ جو دکھائی دیتی ہے اور وہ جو دکھائی نہیں دیتی۔

ارادہ کرنا، محنت ہوتی ہے؛ سوچنا، عمل کرنا ہوتا ہے۔

بندھے ہاتھ مشقت کرتے ہیں، ملے ہوئے ہاتھ کام کرتے ہیں۔ جنت پر گڑی نظر، بھی کام ہی ہوتا ہے۔

Thales چار برس بے حس و حرکت رہا۔ اس نے فلسفے کی بنیاد رکھی تھی۔

ہمارے خیال میں خانقاہ نشین کاہل آدمی نہیں ہوتے؛ گوشہ نشین کاہل نہیں ہوتے۔

پرچھائیں سے تلاش کرنا سنجیدہ معاملہ ہوتا ہے۔

جو کچھ ہم نے ابھی کہا ہے، اس کو رد کیے بغیر، ہم یقین رکھتے ہیں کہ مقبرے کا دائمی حافظہ زندہ لوگوں کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ اس نقطے پر، پادری اور فلسفی دونوں اتفاق کرتے ہیں۔ Trappe کے پادری نے بھی Horace کو جواب دیا تھا کہ ہمارا مرنا یقینی ہے۔

انسانی زندگی میں قبروں، مزاروں کی آمیزش کی موجودگی — یہ خردمندوں کا قانون ہے؛ یہ زاہدوں کا قانون ہے۔اس معاملے میں زاہد اور خردمند اکٹھے ہو جاتے ہیں۔اس میں ایک قسم کی مادی ترقی ہوتی ہے؛ ہمیں اس سے اتفاق ہے۔اس میں اخلاقی شان وشوکت بھی ہے، ہم اس کو بھی مانتے ہیں۔بے فکر اور زندہ دل نفوس کہتے ہیں:

''ان بے حرکت شخصیتوں سے ان معموں کو کیا فائدہ ہوگا؟ یہ کس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں؟ یہ کرتے کیا ہیں؟''

افسوس! اس اندھیرے کی موجودگی میں جو ہم پر محیط ہے، اور جو ہمارے انتظار میں ہے،اور اپنی بے خبری میں ہم کس قسم کے انتشار کا شکار ہوں گے، ہمارے خیال میں اس کا جواب ہے: ''ان نفوس نے جو کام کیے ہیں ان سے بہتر نیک کام ہو نہیں سکتا تھا۔'' مزید یہ کہ ''شاید اس سے زیادہ مفید کوئی کام ہے بھی نہیں۔''

یقینی طور پر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان لوگوں کے لیے مسلسل دعا کرتے ہیں جو کبھی عبادت نہیں کرتے۔

ہمارے نزدیک سارا مسئلہ اس خیال میں ہوتا ہے، جو عبادت میں ملا ہوتا ہے۔

Leibnitz کی عبادت شان دار ہے، والٹیر کی پسندیدگی بھی ٹھیک ہے۔

ہم مذہب کو اتنا ہی مانتے ہیں جتنی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو مناجاتوں کی بے چارگی اور عبادات کی رفعت پر یقین رکھتے ہیں۔

مزید، اب اس لمحے جس سے ہم گزر رہے ہیں — ایک منٹ، خوش قسمتی سے، جو انیسویں صدی پر اپنا نشان نہیں چھوڑے گا — اس گھنٹے، جب اتنے سارے لوگ جن کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں مگر جن کے نفوس بلند ہیں، اتنے سارے فانی لوگوں کے درمیان جن کی اخلاقیات تفریح پر مشتمل ہے، اور خراب ہو جانے والے معاملات کو سلجھانے میں مصروف ہیں،اور جو بھی خود ولیس نکالا لے لیتے ہیں ہمارے نزدیک لائقِ احترام ہیں۔

خانقاہیت ایک نوع کی دست برداری ہے۔غلط انداز میں دی جانے والی قربانی بھی قربانی ہی ہوتی ہے۔کسی فرض کی ادائیگی میں سخت غلطی کی بھی اپنی شان ہوا کرتی ہے۔

خانقاہ کے تمام اہم معاملات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، جب تک کہ ہر پہلو — بالخصوص خانقاہ کے نسوانی حصے کے معاملات کی سچائیوں کی جانچ پرکھ نہ کر لی جائے اس لیے کہ ہماری صدی

میں عورت ہی کو سب سے زیادہ دُکھ دیے گئے ہیں۔ خانقاہ کے نسوانی حصے میں، احتجاج کی سی کچھ صورت ابھرتی دکھائی دے رہی ہے۔ خانقاہ کے نسوانی حصے کی اپنی مخصوص شان ہوتی ہے۔

خانقاہ کی رہائش جو اتنی سادہ، اتنی اداس کرنے والی ہے، جس کے کچھ نقوش ہم نے ابھی بنائے ہیں، زندگی نہیں اس لیے وہ آزادی نہیں ہے؛ یہ مقبرہ نہیں اس لیے کہ اس میں فراوانی نہیں؛ یہ وہ عجیب علاقہ ہے جس پر اس طرح نظر پڑتی ہے، جیسے کوئی پہاڑ کی چوٹی سے دیکھ رہا ہو، جس میں ایک جانب وہ پاتال ہے جہاں ہم ہیں، اور دوسری جانب وہ پاتال ہے جہاں ہمیں جانا ہے؛ یہ وہ دنیاؤں کو علاحدہ کرنے والا ایک تنگ اور دھند آمیز سرحدی علاقہ ہے، جو ایک ہی وقت میں روشن بھی ہوتا ہے اور مدھم بھی، جہاں زندگی کی کرن جو کم زور ہو چکی ہے، موت کی کرن سے ہم آغوش ہو جاتی ہے؛ اس کو مقبرے کا نصف ابہام کہتے ہیں۔

ہم، جو اس پر یقین نہیں رکھتے جس پر یہ عورتیں یقین رکھتی ہیں، مگر ہم ان کی طرح اپنے یقین پر زندہ رہتے ہیں — ہم کبھی کسی قسم کے نرم تشدد کے بغیر، ایسے جذبۂ ہم دردی کے بغیر جو رشک سے معمور ہوتی ہے، ان قابلِ احترام نفوس کے درمیان موجود، زاہد، عابد، لرزاں اور بھروسے کے قابل مخلوق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے ہیں جو اس معمے پر انحصار کرتی ہے، اور منتظر رہتی ہے، درمیان اس دنیا کے جو بند ہے، اور بہشت کے جو ابھی تک کھلی نہیں ہے، اس روشنی کی طرف متوجہ، جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا، اس تنہا خوشی کی حامل، اس خیال میں، اس نادیدہ خلیج کی آرزو میں، کہ اسے علم ہے کہ وہ کہاں ہے، اور وہ جھکی، حیران، مدہوش، لرزاں آنکھیں، جنھیں ابدیت کی گہری سانسیں کبھی کبھی نصف بلند کر دیتی ہیں، اندھیرے پر جمی ہوتی ہیں۔

۞

خانقاہ میں داخل ہونے کا طریقہ

یہی وہ گھر تھا جس میں، فوشلوون کے مطابق، ژاں ولژاں ''آسمان سے ٹپکا'' تھا۔

وہ باغیچے کی اس دیوار پر چڑھا تھا جو Polonceau اسٹریٹ کا زاویہ بناتی تھی۔ جہاں فرشتوں کے گائے حمدیہ گیت اس نے آدھی رات کے وقت سنے تھے، راہباؤں کی تسبیح خوانی کی نغمہ خوانی تھی۔ وہ ہال کمرہ اُداسی کے عالم میں جس کی جھلک اس نے دیکھی تھی، دراصل گرجا گھر تھا۔ وہ خیالی جسم جسے اس نے زمین پر پھیلا دیکھا تھا، وہ سسٹر تھی جو غلطی کی تلافی کر رہی تھی؛ وہ گھنٹی جس نے اسے اچنبھے میں ڈال دیا تھا، فوشلوون کے گھٹنے سے بندھی تھی۔

کوزیت کو بستر میں لٹا دینے کے بعد، ژاں ولژاں اور فوشلوون نے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، روشن دان کی چٹختی ہوئی آگ کے سامنے بیٹھ کر کچھ وائن پی، کچھ پنیر کھایا اور چوں کہ وہاں ایک ہی بستر تھا جس پر کوزیت سو رہی تھی، دونوں پیال کے ڈھیر پر لیٹ رہے۔

اپنی آنکھیں بند کرنے سے پہلے ژاں ولژاں نے کہا تھا، ''اب مجھے یہیں رہنا چاہیے۔''

فوشلوون کے دماغ میں رات بھر یہی جملہ گردش کرتا رہا۔

سچ کہا جائے تو دونوں ہی سو نہیں سکے تھے۔

ژاں ولژاں کو فکر تھی کہ وہ دریافت کر لیا گیا ہے؛ کہ جاویر کو اس کی بھنک لگ گئی ہے اور یہ بھی کہ اگر وہ دونوں پیرس پہنچ گئے تو گم ہو جائیں گے۔ اس نئے طوفان نے جو ان پر آپڑا تھا، انھیں اس حجرے میں لا چھوڑا تھا۔ اس کے بعد سے ژاں ولژاں کا ایک ہی خیال تھا — یہیں قیام کرنے کا۔ اب اس بد قسمت انسان کے لیے اس حالت میں خانقاہ محفوظ ترین بھی تھی اور مخدوش ترین بھی۔ مخدوش ترین اس لیے کہ یہاں کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا تھا، اگر وہ دریافت کر

لیا گیا تو یہ کھلا جرم ہوگا، اور ژاں ولژاں کے لیے اس خانقاہ اور قید خانے کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوگا۔ محفوظ ترین اس لیے کہ اگر وہ کسی طرح یہاں رہنے کے قابل ہو جاتا ہے تو ایسی جگہ اسے کون تلاش کر سکتا ہے؟ ایک ناممکن جگہ رہنا بہترین تحفظ تھا۔

اُدھر فوشلوون تھا، جو اپنے دماغ پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اسے اس معاملے کا کچھ علم نہیں۔ موسیو میڈلین یہاں کس طرح پہنچ گیا جہاں کی دیواریں واقعی دیواریں تھیں۔ خانقاہ کی دیواریں پار نہیں کی جا سکتی تھیں۔ وہ یہاں ایک بچی سمیت کس طرح داخل ہو گیا تھا؟ ایک بچی کو بغل میں داب کر کسی عمودی دیوار پر چڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بچی کون تھی؟ یہ کہاں سے آ رہے تھے؟ جب سے فوشلوون اس خانقاہ میں ملازم ہوا تھا، اسے M. sur M کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ اسے معلوم تھا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ فادر میڈلین کی شخصیت ایسی تھی جس سے سوال نہیں کیے جا سکتے تھے؛ اس کے علاوہ فوشلوون نے خود سے کہا تھا، ''کسی سینٹ سے پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی۔'' فوشلوون کی نظروں میں موسیو میڈلین کا بھرم قائم تھا۔ ژاں ولژاں کے منہ سے نکل جانے والے کچھ الفاظ سے مالی یہ سمجھا تھا کہ خراب حالات میں شاید موسیو میڈلین دیوالیہ ہو گیا ہے، اور قرض خواہ اس کا پیچھا کر رہے ہیں؛ یا شاید سیاسی معاملات میں اس نے کچھ مفاہمت کر لی ہے اور روپوش ہو گیا ہے؛ فوشلوون اس بات سے ناخوش نہیں ہوا، کہ اس میں ابھی تک شمال کے دوسرے دیہاتیوں کی طرح، پرانی بونا پارٹزم سے ہم دردی کے جذبات باقی تھے، کہ روپوشی کے دوران موسیو میڈلین نے خانقاہ کو پناہ گاہ کے طور پر منتخب کیا ہے، اور بالکل واضح تھا کہ وہ یہاں قیام کرنا چاہتا تھا۔ اور جو بات اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی، فوشلوون کا ذہن جسے بار بار متھ رہا تھا، وہ یہ تھی کہ موسیو میڈلین یہیں رہے گا اور اس کے ساتھ یہ لڑکی بھی رہے گی۔ فوشلوون نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان کو چھوا، پھر بھی اسے یہ سب خواب لگ رہا تھا۔ ان ہونی اس کی جھونپڑی میں داخل ہو گئی تھی۔ فوشلوون قیاس کی گتھیوں میں الجھا ہوا کچھ تلاش کر رہا تھا، مگر سوائے اس کے کہ ''موسیو میڈلین نے میری جان بچائی تھی'' وہ کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

بس یہی بات کافی تھی جس کی بنا پر اس نے اپنے عمل کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے خود سے کہا، ''اب میری باری ہے۔'' اپنے ضمیر میں اس نے یہ بات بھی شامل کر دی تھی کہ ''جب مجھے بچا کر نکالنے کے لیے گاڑی کے نیچے گھسنے کا سوال پیدا ہوا تھا، اس وقت موسیو میڈلین نے سوچنے کے لیے بھی توقف نہیں کیا تھا۔'' اب اس نے بھی موسیو میڈلین کو بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پھر بھی، اس نے اپنے آپ سے کئی سوال کیے اور ان کے جواب بھی طلب کیے تھے،

'جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا، اگر وہ چور ہو تب کیا میں اس کے ساتھ وہی کروں؟ بالکل وہی کرو۔ اگر وہ قاتل ہو تب بھی کیا میں اس کے ساتھ وہی کروں؟ بالکل وہی کرو۔ چوں کہ وہ ایک سینٹ ہے، تو کیا میں اسے بچالوں؟ بالکل وہی کرو۔'

مگر اس کو خانقاہ میں رکھ لینے کا انتظام کرنا کتنا بڑا مسئلہ تھا! اس قسم کی عجیب نوعیت کی ذمے داری میں بھی فوشلوں پسپا نہیں ہوا؛ Picardy کے اس غریب کسان نے اپنی دین داری، اپنی نیک نیتی، اور ذرا سی پرانی ہوشیاری کی سیڑھی کے بغیر ہی، اس موقعے پر ایک نیک کام انجام دینے کی خاطر، خانقاہ کی مشکلات کو سر کرنے اور Saint-Benoit کے کڑی چٹان جیسے قانون سے نبرد آزما ہونے کا بیڑا اُٹھالیا تھا۔ بوڑھا فادر فوشلوں اپنی تمام زندگی ایک انا پسند انسان رہا تھا، اپنے آخری دنوں میں، ناتواں، ٹھہرا ہوا آدمی تھا جسے اس دنیا سے اب کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی، اور شکرگزاری، اور فیاضانہ عمل کا موقع کا پاکر، اُس آدمی کی طرح کود پڑا تھا جسے مرتے وقت وائن کا وہ جام میسر آگیا ہو جسے اس نے کبھی چکھا نہیں، اور اس جام کو شوق سے انڈیل لینے کا موقع مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ خانقاہ کہ اس ہوا نے جس میں اس نے برسوں سانس لی تھی، اس کی پوری شخصیت کو تباہ کر دیا تھا، اور اس کے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اچھا کام کر دکھائے۔

اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود کو موسیو میڈیلین کے لیے وقف کر دے گا۔

ابھی ہم نے اس کو Picardy کا غریب کسان کہا ہے۔ یہ بیان صحیح، مگر نامکمل تھا۔ اس کہانی کے جس مقام پر ہم پہنچ گئے ہیں، وہاں فادر فوشلوں کی جسمانی کیفیات کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ کسان تھا مگر قانونی آدمی تھا اور نوٹری رہ چکا تھا جس کام نے اس کی چالاکی میں فریب کاری کی آمیزش اور اس کی اختراع پسندی میں تیز فہمی شامل کر دی تھی۔ مختلف وجوہ کی بنا پر کاروبار کی ناکامی نے اس کو گاڑی بان، بلکہ مزدور کے درجے تک گرا دیا تھا مگر گالیوں اور کوڑوں کے باوجود، گھوڑوں کو جن کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں کچھ قانونی پن باقی رہ گیا تھا۔ اس میں کچھ فطری ذہانت بھی تھی؛ وہ اچھی زبان میں بات کرتا تھا؛ اس انداز میں بات کرتا تھا جو دیہات میں کم ہوتا ہے؛ دوسرے کسان اس کے بارے میں کہتے تھے: "یہ کسی ہیٹ والے مہذب آدمی کی طرح بات کرتا ہے۔" فوشلوں کا تعلق، دراصل، اس نوعِ انسانی سے تھا جسے پچھلی صدی کی بدلحاظ اور غیر سنجیدہ لغت نیم بورژوا، نیم زبان دراز گردانتی تھی؛ کچھ دیہاتی، کچھ شہری؛ گویا وہ نمک مرچ جیسا تھا۔ فوشلوں جسے مقدر نے بُری طرح استعمال کیا تھا، ضرر رسیدہ، مفلس، پامال شدہ نفس، مگر جذباتی اور اعمال میں بے حد برجستہ آدمی تھا؛ یہ سب وہ انمول معیار ہوتا ہے جو انسان کو بدمعاش

ہونے سے بچاتا ہے۔اس کے نقص اور اس کی برائیاں، کہ اس میں کچھ تھیں بھی، تمام سطحی تھیں؛ اس کے خد و خال اس قسم کے تھے جو اس پر نگاہ رکھنے والوں کو جیت لیتے تھے۔اس کے عمر رسیدہ چہرے پر پیشانی کی وہ نا موافق سلوٹیں نہیں تھیں جو کینہ یا حماقتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

کافی سوچ بچار میں مصروف رہنے کے بعد، فجر کے وقت فادر فوشلووں نے آنکھیں کھولیں، اور موسیو میدیلین کو پیال پر بیٹھا دیکھا، جو گوزیٹ کو بستر میں لیٹے دیکھے جا رہا تھا۔فوشلووں اُٹھ بیٹھا اور بولا:

"اب، جب کہ آپ یہاں موجود ہیں، آپ یہاں داخلے کا کیا عذر پیش کر سکیں گے؟"

اس جملے نے حالات کا خلاصہ پیش کر دیا تھا اور ژاں ولژاں کو مراقبے سے جگا دیا۔

دونوں آدمیوں نے آپس میں مشاورت شروع کر دی۔

"سب سے پہلے" فوشلووں نے کہا "آپ اپنے قیام کی ابتدا اس طرح کریں گے کہ آپ اور یہ بچی اس کمرے سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔باغیچے میں ایک قدم بھی آپ کا کھیل ختم کر دے گا۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"موسیو میدیلین!" فوشلووں نے کہنا شروع کیا، "آپ بڑے مبارک موقعے پر آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے بہت نا مبارک موقعے پر: کہ خواتین میں سے ایک بہت بیمار ہے۔یہ کیفیت ان لوگوں کو ہماری سمت زیادہ دیکھنے سے باز رکھے گی۔شاید وہ قریب المرگ ہے۔پوری کمیونٹی الجھن میں ہے۔یہ الجھن ان کو مصروف رکھے ہے۔رخصت ہونے والی عورت سینٹ ہے۔ دراصل یہاں ہم سب سینٹ ہیں؛ ان کے اور میرے درمیان بس اتنا فرق ہے کہ وہ کہتے ہیں "ہماری کوٹھڑی" اور میں کہتا ہوں، 'میرا کیبن'۔مرنے والی کے لیے دعا کی جانے والی ہے؛ اس کے مرجانے کے بعد تک دعا کی جاتی رہے گی۔آج کے دن ہم سکون سے رہیں گے؛ کل کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"پھر بھی" ژاں ولژاں نے کہا، "تمہاری یہ کٹیا دیوار کے جوف میں واقع ہے؛ اس کو ایک قسم کے کھنڈر نے چھپا رکھا ہے؛ کچھ درخت بھی ہیں؛ یہ جگہ خانقاہ سے نظر نہیں آتی۔"

"میں اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ راہبائیں کبھی اس کے قریب نہیں آتیں۔"

"اچھا؟" ژاں ولژاں نے کہا۔

وہ سوالیہ نشان جس نے اس "اچھا" کو اجاگر کیا ہے، کہتا ہے:

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے کوئی یہاں آرام سے جب تک چاہے چھپا رہ سکتا ہے؟"

تفتیش کے اس نقطے پر فوشلووں نے جواب میں کہا، "یہاں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی

رہتی ہیں۔"

"کیسی، چھوٹی چھوٹی لڑکیاں؟" ژاں ولیواں نے سوال کیا۔

ابھی فوشلوون نے اپنے کہے ہوئے الفاظ کی تشریح کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ گھنٹا بجا۔

"راہبہ انتقال کر گئی ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ گھنٹا اعلانِ مرگ ہے۔"

اور اس نے ژاں ولیواں سے چپ رہ کر سننے کا اشارہ کیا۔

گھنٹا دوسری بار بجا۔

"یہ اعلانِ مرگ ہے، موسیو میدلین۔ گھنٹا، چوبیس گھنٹے تک ہر منٹ بجتا رہے گا جب تک کہ میت گرجا گھر سے لے جائی نہیں جاتی — دیکھا آپ نے، لڑکیاں کھیل رہی ہیں۔ ایسے میں تفریح کے وقت ایک گیند پھینک دینا کافی ہوتا ہے، جو انھیں اِدھر اُدھر کر دیتا ہے۔ ممانعت کے باوجود وہ کھیلتی ہیں اور ادھر ادھر دوڑتی رہتی ہیں۔ یہ بڑی شیطان ہیں۔"

"کون؟" ژاں ولیواں نے پوچھا۔

"وہی، چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ اب آپ بہت جلد دریافت کر لیے جائیں گے۔ وہ چیخیں گی، 'اوہ، ایک آدمی!' مگر آج کوئی خطرہ نہیں۔ آج کھیل کا گھنٹا نہیں ہوگا۔ پورا دن عبادت میں گزرے گا۔ آپ گھنٹا سن رہے ہیں نا، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، ہر منٹ گھنٹا بجے گا۔ یہ موت کا اعلان ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں، فادر فوشلوون۔ یہ لڑکیاں شاگرد ہیں۔"

اور ژاں ولیواں نے سوچا، "یہاں کوزیت کی تعلیم کا بندوبست بھی موجود ہے۔"

فوشلوون نے بلند آواز میں کہا،

"معاف کیجیے گا، یہ واقعی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ یہ آپ کے اطراف چیخنے چلانے لگیں گی۔ اور یہ آپ کو بھگا دیں گی۔ یہاں کسی آدمی کی موجودگی طاعون کی طرح ہوتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، کس طرح یہ لوگ میرے گھٹنوں سے گھنٹیاں باندھ دیتی ہیں، گویا میں کوئی درندہ ہوں۔"

ژاں ولیواں اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "یہ خانقاہ ہماری نجات ہوگی۔" اس نے اپنے منہ ہی منہ میں کہا۔

پھر اس نے اپنی آواز بلند کی، "ہاں، مگر مشکل یہاں رہنے کی ہے۔"

"نہیں۔" فوشلوون نے کہا، "مشکل یہاں سے نکلنے کی ہے۔"

ژاں ولیواں کو اپنے بدن کا سارا خون دل کی جانب دوڑتا محسوس ہوا۔

"نکلنے کی؟"

"جی ہاں، موسیو میڈیلن۔ یہاں واپس داخل ہونے کے لیے پہلے نکلنا ضروری ہوگا۔"
"ایک اور گھنٹا بجنے تک اس نے توقف کیا، اور فو شلوون پھر بولا:

"آپ کو یہاں اس انداز میں پکڑا نہیں جانا چاہیے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ میرے لیے تو آپ آسمان سے آگرے ہیں، اس لیے کہ میں آپ کو جانتا ہوں؛ مگر راہبائیں تو آپ کو دروازے سے داخل ہوتے دیکھنا چاہیں گی۔"

فوراً ہی انھوں نے ایک اور ذرا پیچیدہ قسم کی آواز سنی، جو ایک اور گھنٹے سے نکلی تھی۔

"اوہ" فوشلوون نے کہا، "وہ ناطق ماؤں کو طلب کر رہی ہیں۔ اب وہ مجلس میں جا رہی ہیں۔ جب کوئی مرتا ہے تو ہمیشہ ایک مجلس ہوتی ہے۔ یہ عورت علی الصباح مری تھی۔ لوگ عام طور پر سویرے ہی مرتے ہیں، مگر کیا آپ اسی راستے سے نکل نہیں سکتے جس سے آئے ہیں؟ میں آپ سے خوامخواہ سوال نہیں کرنا چاہتا، مگر آپ اندر آئے کیسے تھے؟"

ژاں ولژاں پیلا پڑ گیا۔ اس خوف ناک سڑک پر واپس اترنے کے خیال نے اسے لرزہ دیا تھا۔ آپ چیتوں سے بھرے کسی جنگل سے نکل آتے ہیں، اور پھر ذرا واپس جانے کے دوستانہ مشورے کا تصور کریں۔ آپ کے دوست آپ کو مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ وہیں واپس چلے جائیے۔ ژاں ولژاں اپنی چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ پولیس کی پوری طاقت اس علاقے میں جمع ہو رہی ہے؛ ہرکارے نظر رکھے ہیں؛ ہر طرف پہرے دار ہیں؛ خوف ناک ہاتھ اس کے کالر کی طرف بڑھ رہے ہیں، اور سڑک کے کونے پر جہاں سے دوسری سڑک گزرتی ہے، جاویر موجود ہے، شاید۔

"ناممکن!" اس نے کہا، "فادر فوشلوون، بس تم کہہ دینا کہ میں آسمان سے گرا ہوں۔"

"مگر مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے۔" فوشلوون نے دہراتے ہوئے کہا، "آپ کو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اچھے خدا نے آپ کو غور سے دیکھنے کے لیے، اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوگا اور پھر آپ کو یہاں گرا دیا ہوگا۔ وہ آپ کو مردوں کی خانقاہ میں رکھنا چاہتا ہوگا؛ مگر [معاذ اللہ] اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ سنا آپ نے، ایک اور چیخ بلند ہوئی ہے۔ یہ چیخ دربان کے لیے حکم ہے کہ وہ میونسپلٹی کو مطلع کرے کہ موت کا ڈاکٹر یہاں آ کر میت کا معائنہ کرے۔ یہ سب کچھ مرنے کی تقریبات کا حصہ ہے۔ یہ نیک خواتین یہ سب پسند نہیں کرتیں۔ ڈاکٹر مرد ہوتا ہے اور وہ کسی چیز پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ ان کی نقاب اٹھا دیتا ہے۔ کبھی کبھی اور کوئی چیز بھی اٹھاتا ہے۔ اس بار انھوں نے کتنی جلدی ڈاکٹر کو طلب کر لیا ہے۔ کیا معاملہ ہے۔ تمھاری بچی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"کوزیٹ!"

''کیا یہ تمھاری بچی ہے؟ یا تم اس کے دادا ہو؟''

''ہاں!''

''اس کے لیے یہاں سے باہر نکلنا آسان ہو گا۔ ایک خاص دروازہ ہے، ملازمین کے لیے۔ میں دستک دیتا ہوں۔ دربان دروازہ کھول دیتی ہے؛ میں اپنی تدیمی جھابی کاندھے پر رکھے نکلتا ہوں، بچی اس کے اندر ہے، اور میں باہر چلا جاتا ہوں۔ فادر فوشلوواں اپنی جھابی کے ساتھ باہر جاتا ہے۔ یہ بالکل عام بات ہے۔ آپ بچی کو بتادیں گے کہ وہ بالکل ساکت رہے گی۔ اس پر چادر پڑی ہوگی۔ میں اس کو اپنے پرانے دوست میوہ فروش کے پاس چھوڑ دوں گا، جو Chemin-Vert اسٹریٹ پر رہتا ہے، بہرا آدمی ہے، اس کے پاس ایک چھوٹا سا پلنگ بھی ہے۔ میں اس کے کان میں چیخ کر کہہ دوں گا کہ یہ میری بھانجی ہے اور تمھیں اس کو کل تک کے لیے رکھنا ہوگا۔

اس کے بعد وہ تمھارے ساتھ خانقاہ میں دوبارہ داخل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ میں تمھارے دوبارہ داخلے کی لیے کوئی بہانہ تراش لوں گا، یہی کرنا ہوگا۔ مگر آپ یہاں سے نکلیں گے کیسے؟''

ژاں ولژاں نے اپنا سر ہلا دیا۔

''مگر کوئی مجھے دیکھے نہیں، سارا مسئلہ تو یہی ہے۔ فادر فوشلوواں، میرے لیے بھی، چادر کے نیچے جھابے میں چھپ کر باہر جانے کا کوئی طریقہ نکالو۔ کوزیت کی طرح۔''

فوشلوواں نے درمیان والی انگلی سے اپنے کان کی لو کھجائی، جو شدید شرمندگی کی نشانی ہوتی ہے۔

تیسری چیخ ان کی بات میں مخل ہوئی۔

''موت کی تصدیق کرنے والا ڈاکٹر رخصت ہو رہا ہے۔'' فوشلوواں نے کہا، ''اس نے میت کو دیکھ کر کہہ دیا ہے 'وہ مر چکی ہے، یہ بالکل درست ہے۔' جب ڈاکٹر جنت کے لیے پاسپورٹ پر دستخط کر دیتا ہے، تو کفن دفن کا انتظام کرنے والی کمپنی تابوت بھیجتی ہے۔ اگر مرنے والی مادر ہوتی ہے تو مائیں اسے تابوت میں لٹاتی ہیں؛ اگر سسٹر ہے تو سسٹر لٹاتی ہیں۔ اس کے بعد میں تابوت میں کیلیں جڑ دیتا ہوں۔ یہ کام مالی کے فرائض میں سے ہے۔ مالی تھوڑی بہت کورکنی بھی کرتا ہے۔ مردہ عورت کو گرجا گھر کے نیچے والے کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے جس کا دروازہ سڑک پر کھلتا ہے، جس میں سوائے ڈاکٹر کے کوئی مرد داخل نہیں ہوتا۔ میں، خود کو اور کفن دفن والوں کو مردوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس ہال کمرے ہی میں تابوت میں کیل جڑنا میری ذمے داری ہوتی ہے۔ اس کے بعد کفن دفن والے تابوت لے جا کر گاڑی پر رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح مرنے والا جنت میں جاتا ہے۔ وہ ایک خالی بکس لاتے ہیں، اور اسے کسی شے سمیت لے جاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے دفن کا طریقہ۔''

سورج کی نرم کرن کوزیت کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ اس کا دہن کھلا ہوا تھا؛ جیسے کوئی فرشتہ روشنی پی رہا ہو۔ژاں ولژاں اس میں کھویا ہوا تھا۔فوشلوون کو سُن نہیں رہا تھا۔

کوئی سن نہ رہا ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کی خاموش رہا جائے۔خاموشی میں مالی بڑبڑاتا رہا۔"Vaugirard قبرستان میں قبر کھودی جاتی ہے۔ اعلان کیا گیا تھا کہ Vaugirard قبرستان بند کیا جا رہا ہے۔ یہ قدیم قبرستان ہے، جس پر قانون لاگو نہیں ہوتا، جس کی کوئی وردی نہیں، اور وہ بند ہونے والا ہے۔افسوس کہ قریب ہونے کے باعث یہ قبرستان بہت سہل ہے۔ وہاں میرا ایک دوست ہے، فادر Mestienne گورکن۔یہاں کی راہبائیں ایک حق رکھتی ہیں کہ انھیں رات میں لے جایا جائے۔ان کے لیے پریفیکچر نے اجازت دے دی ہے، مگر کل کے بعد سے ایسے کتنے واقعات ہوئے ہیں۔مادر Crucifixion مر گئی ہے، اور فادر میڈلین——"

"دفن ہو گیا ہے!" ژاں ولژاں نے افسردگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

فوشلوون سمجھ گیا۔

"خدایا! اگر آپ یہاں آگئے تو واقعی کفن دفن ہوگا۔"

چوتھی بار چیخ ابھری۔فوشلوون نے تیزی سے کیل پر لٹکی گھنٹی اتاری اور اپنے گھٹنے پر باندھ لی۔

"اس بار میرا بلاوا ہے۔نائب منتظم راہبہ مجھے بلا رہی ہے۔موسیو میڈلین یہاں سے ہلیے گا نہیں، میرا انتظار کیجیے۔کوئی نئی بات ہوئی ہے۔اگر آپ بھوکے ہوں تو اُدھر وائن، روٹی اور پنیر کا انتظام ہے۔"

اور وہ اپنے جھونپڑے سے چلاتا ہوا چلا، "آرہا ہوں! آرہا ہوں!"

فوشلوون باغیچے سے اتنی تیزی سے جا رہا تھا جتنا کہ اس کے میڑھے پاؤں اجازت دے رہے تھے۔جاتے وقت وہ اپنے خربوزے کے تھالے پر بس یوں ہی نظر ڈال رہا تھا۔تیز تیز جاتے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

دس منٹ کے اندر ہی فادر فوشلوون کی گھنٹی کی آواز پر راہبائیں اِدھر اُدھر بھاگنے لگی تھیں۔اس نے دھیمے انداز میں دروازے پر دستک دی، اور ایک مہذب آواز نے "ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے" کہا، جس کا مطلب تھا "اندر آجاؤ"۔

وہ دروازہ مالی کو پارلر میں کام پر بلانے کے لیے تھا۔پارلر مجلس کے ہال کمرے سے متصل تھا۔نائب منتظم راہبہ پارلر میں رکھی واحد کرسی پر بیٹھی فوشلوون کا انتظار کر رہی تھی۔

۞

فوشلووں مشکل میں

کچھ لوگوں اور کچھ پیشوں کے لوگوں کو، بالخصوص پادریوں اور راہباؤں کو، نازک مراحل پر سخت اور ہیجان زدہ کیفیت میں رہنا پڑتا ہے۔ جس وقت فوشلووں وہاں پہنچا، نائب منتظم راہبہ کے خد و خال پر اسی قسم کی دہری کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ ذہین اور موہنی صورت والی میدموؤیل Blemeur، مادر Innocente تھی، جو عام طور پر خوش باش ہوا کرتی ہے۔

مالی بزدلانہ انداز میں خم ہوا، اور کوٹھڑی کے دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ نائب منتظم راہبہ نے، جو تسبیح پڑھ رہی تھی، نظریں اٹھائیں، اور کہا، "اوہ، تو یہ تم ہو فادر Fauvent۔"

خانقاہ میں مالی کے نام کا یہ مخفف اختیار کر لیا گیا تھا۔

مالی ایک بار پھر خم ہوا۔ "جی ہاں، محترم مادر۔"

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"اور مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔" فوشلووں نے دلیری سے کہا، جس نے اس کے اندر خوف پیدا کر دیا تھا۔ "مجھے بے حد محترم مادر سے کچھ کہنا ہے۔"

نائب منتظم راہبہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ "اوہ، تو تمھیں بھی مجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ایک درخواست ہے۔"

"ٹھیک ہے، کہو۔"

نیک خو فوشلووں، سابق نوٹری، دیہاتیوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جن میں اعتماد ہوتا ہے۔ ایک خاص قسم کی چالاک جہالت ایک قوت بن جاتی ہے۔ آپ اس پر بھروسا نہیں کرتے، اور آپ اس میں پکڑے جاتے ہیں۔ فوشلووں پچھلے دو برسوں میں، جو اس نے خانقاہ

میں گزارے تھے، کامیاب رہا ہے۔ ہمیشہ تن تنہا اور باغیچے کے کام میں منہمک، مگر اس کے لیے ایسا کوئی کام نہیں ہوتا تھا جس میں وہ اپنے تجسس کو استعمال کر سکتا۔ چوں کہ وہ ان نقاب پوش خواتین سے فاصلے پر ہوتا تھا، جو آتی جاتی رہتی تھیں، وہ اپنے اطراف صرف پر چھائیوں کی ہلچل دیکھا کرتا تھا۔ اپنی توجہ اور تیز نگاہی کے بل پر وہ ان تمام سایے جیسے وجود کو اپنے خیالوں میں گوشت پہنا چکا تھا، اور وہ لاشیں اس کے لیے زندہ تھیں۔ وہ ایسے بہرے آدمی کی طرح تھا جس کی نگاہیں تیز ہو جاتی ہیں، اور اس نابینا کی طرح، جس کی سماعت زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اس نے مختلف قسم کی چیخوں کے معنی اخذ کرنے میں مہارت حاصل کر لی تھی، اور اس کم گو پُر اسرار خانقاہ کا کوئی راز اس کے نزدیک راز نہیں رہ گیا تھا۔ ابوالہول اس کے کانوں میں سارے راز ڈالتا رہتا تھا۔ فوشلوون سب کچھ جانتا تھا، اور سب کچھ راز رکھتا تھا۔ پوری خانقاہ اسے بیوقوف آدمی سمجھتی تھی جو مذہب کے لیے لیاقت ہوتی ہے۔ ناظم مائیں اس سے خوب کام لیتی تھیں۔ یہ متجسس گونگا تھا۔ اس نے ان کے اعتماد میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ آدمی تھا، باہر کبھی نہیں جاتا تھا، سوائے میوے اور ترکاریوں کے باغیچے کی بہت واضح اور اہم ضروریات کے لیے۔ کردار کی اس صوابدید نے اس کو معتمد بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود، وہ خانقاہ کے دو افراد سے باتیں کرتا رہتا تھا: خانقاہ کے دربان سے جو ان کے پارلر کے تمام انوکھے پن سے واقف تھا، اور قبرستان کے گورکن سے جو ان کی تدفین کے معاملات سے واقف تھا؛ اس طرح وہ راہباؤں کے موضوعات کی دہری روشنی کا حامل ہو گیا تھا، پہلی زندگی کے بارے میں، اور دوسری ان کی موت کے بارے میں۔ مگر اس نے اس علم کو کبھی خراب معنوں میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اجتماعات والے اس کے بارے میں اچھے خیالات رکھتے تھے۔ یہ بوڑھا، لنگڑا، ہر شے کے لیے اندھا، لینے دینے کے معاملے میں شاید کچھ بہرا بھی تھا — کیا خوبیاں تھیں اس میں، اس کا بدل ملنا مشکل تھا۔

یہ شخص، اس اعتماد کے ساتھ، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تعریف کی جا رہی ہو، نائب منتظم راہبہ سے ایک پُر جوش، منتشر اور دیہاتی مکالمے میں مصروف ہو گیا۔ بہت دیر تک وہ اپنی عمر، اپنی معذوری، کام کے بڑھتے ہوئے اضافے، باغیچے کے بڑے رقبے، راتوں کے بارے میں جو گزارنی ہوتی ہیں، مثال کے طور پر پچھلی رات، جب چاندنی کی وجہ سے اس کو خربوزوں کے تھالے پر چٹائیاں ڈالنی پڑ گئی تھیں وغیرہ باتیں کرتا رہا؛ اور اس نے اپنی بات اس طرح ختم کی تھی، ''کہ اس کا ایک بھائی ہے'' (نائب منتظم راہبہ نے پہلو بدلا) ''ایک بھائی، جو جوان نہیں ہے'' (نائب منتظم راہبہ کی دوسری حرکت، اظہارِ اعتماد) ''کہ اگر اجازت دی جائے تو بھائی اس

کے ساتھ رہ سکتا ہے، کہ وہ بہت اچھا مالی ہے، کہ کمیونٹی کو اس سے فائدہ پہنچے گا، اس کی اپنی خدمت سے زیادہ؛ اور اگر اس کے بھائی کو اجازت نہیں ملی تو چوں کہ وہ خود بوڑھا اور کم زور ہوتا جا رہا ہے، اور کام کے لیے کافی نہیں، افسوس کے ساتھ اسے رخصت لینی پڑے گی؛ کہ اس کے بھائی کہ ایک بچی بھی ہے، جسے وہ ساتھ لا سکتا ہے، جو اس خانقاہ میں خدا کے کام آئے گی، اور کون جانے، کسی دن وہ راہبہ بھی بن سکتی ہے۔

جب اس کی گفتگو ختم ہو گئی، تو راہبہ نے تسبیح روک دی اور اس سے کہا،

""کیا تم، اس وقت اور شام کے درمیان، ایک آہنی چھڑ مہیا کر سکتے ہو؟""

""کس کام کے لیے؟""

""لیور کا کام کرنے کے لیے۔""

""جی ہاں، محترم مادر" فوشلوون نے جواب دیا۔"

ایک لفظ بھی کہے بغیر، نائب منتظم راہبہ اٹھی اور ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گئی، جو مجلس کا ہال کمرہ تھا، شاید جہاں ماتحت مائیں جمع تھیں۔

اب فوشلوون اکیلا رہ گیا تھا۔

۞

مادر Innocente

تقریباً ایک چوتھائی گھنٹا گزرا۔ نائب منتظم راہبہ واپس ہوئی اور ایک بار پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گفتگو کرنے والے دونوں افراد اپنے اپنے کام میں محو ہو گئے تھے۔ ہم ان کے درمیان ہونے والی بات چیت کی، ایک اسٹینوگرافر جیسی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔

"فادر Fauvent!"

"جی محترم مادر!"

"تم نے گرجا گھر دیکھا ہے؟"

"وہاں ایک چھوٹا سا جنگلا ہے، جہاں سے میں اجتماع کا خطبہ اور احکامات سنتا ہوں۔"

"اور اپنے فرائض کے سلسلے میں، تم سرودگاہ میں بھی گئے ہو گے؟"

"صرف دو یا تین بار۔"

"وہاں ایک پتھر ہے جسے ہٹانا ہے"

"بھاری ہے؟"

"راستے کا پتھر، جو قربان گاہ کے کنارے ہے۔"

"وہی جو تہہ خانے کے اوپر رکھا ہوا ہے؟"

"ہاں!"

"اس کام کے لیے دو آدمی ہوں تو بہتر ہوگا۔"

"مادر Ascension، جو آدمی جیسی طاقت ور ہے، تمھاری مدد کرے گی۔"

"عورت کبھی مرد جیسی نہیں ہو سکتی۔"

''اپنی طاقت کے مطابق کام کرنے میں لیاقت کام آتی ہے۔ خانقاہ بند رکاوٹ نہیں ہوتی۔''

''اور ایک عورت مرد نہیں ہوتی، مگر میرا بھائی بہت طاقت ور ہے۔''

''اور، کیا تم مجھے ایک لیور لا دو گے؟''

''یہ ایک نوعیت کی کنجی ہے جو اسی نوعیت کے تالے میں لگتی ہے۔''

''اس پتھر میں ایک چھلا لگا ہے۔''

''میں لیور کو اس میں سے گزار دوں گا۔''

''اور وہ پتھر اس طرح رکھا ہوا ہے کہ وہ ایک مدار پر گھومتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، محترم مادر! میں تہہ خانہ کھول دوں گا۔''

''اور گیت کی ابتدا کرنے والی چار مائیں تمھاری مدد کریں گی۔''

''اور، وہ تہہ خانہ کب کھلے گا؟''

''اس کو فوراً بند ہو جانا چاہیے۔''

''بس اتنا ہی۔''

''نہیں۔''

''محترم مادر، حکم کیجیے!''

''Fauvent، ہمیں تم پر پورا اعتماد ہے۔''

''آپ حکم دیجیے، میں بجا لاؤں گا۔''

''اور تم ہر بارے میں مطمئن ہو!''

''جی ہاں، محترم مادر!''

''جب تہہ خانہ کھلا ہو—''

''میں اسے دوبارہ بند کر دوں گا۔''

''مگر اس سے پہلے—''

''کیا، محترم مادر؟''

''اس میں کوئی چیز اتاری جانی چاہیے۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ نائب منتظم راہبہ نے تذبذب ختم کر دیا۔

''فادر Fauvent!''

''جی، محترم مادر!''

"تمھیں خبر ہے کہ آج صبح ایک مادر کا انتقال ہو گیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا تم نے گھنٹا نہیں سنا؟"

"باغیچے کے آخر تک کوئی آواز نہیں پہنچتی۔"

"واقعی؟"

"میں تو اپنے اشارے بھی پہچان نہیں سکتا۔"

"اس کا فجر کے وقت انتقال ہو گیا تھا۔"

"اور پھر، آج صبح ہوا کا رُخ میری جانب نہیں تھا۔"

"وہ مادر Crucifixion تھی۔ برکتوں والی عورت۔"

اس کے بعد نائب منتظم راہبہ خاموش ہو گئی، اپنے ہونٹ ہلائے، جیسے چپکے چپکے دعا کر رہی ہو اور پھر بولی، "تین برس قبل مادام Bethune مادر Crucifixion کو عبادت کرتے دیکھ کر آرتھوڈاکس ہو گئی تھی۔"

"ہاں، محترم مادر، میں ماتمی گھنٹی سن رہا ہوں۔"

"مائیں اسے موت کے کمرے میں لے گئی ہیں، جس کا دروازہ گرجا گھر میں کھلتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تمھارے علاوہ، کسی مرد کو اس میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا خیال رکھنا۔ کسی مرد کو موت کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھنا اچھا نہیں لگے گا۔"

"بار بار!"

"خبردار؟"

"بار بار!"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میرا مطلب ہے: اکثر و بیشتر۔"

"اکثر سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"محترم مادر! میں نے صرف 'اکثر و بیشتر' کہا ہے۔"

"میں سمجھ نہیں سکی ہوں۔ تم 'اکثر و بیشتر' کیوں کہہ رہے ہو؟"

"تاکہ میں آپ کی طرح بول سکوں، محترم مادر!"

"مگر میں نے تو اکثر ویشتر' نہیں کہا تھا۔"

ٹھیک اس وقت نو بجنے کا گھنٹا بجا۔

"نو بجے صبح، اور ہر گھنٹے، تعریف اور پرستش ہو قربان گاہ کے مقدس شعائر کی!" نائب ناظم راہبہ نے کہا۔

"آمین!" فوشلوون نے جواب میں کہا۔

گھڑی نے بر وقت گھنٹا بجایا تھا۔ اس 'اکثر ویشتر' نے اس کو مختصر کر دیا ممکن ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو نائب ناظم راہبہ اور فوشلوون نے وہ گتھی سلجھائی نہ ہوتی۔

فوشلوون نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

نائب ناظم راہبہ نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا، شاید کوئی مقدس متن تھا، اور پھر بلند آواز میں بولی، "زندگی بھر مادر Crucifixion لوگوں کے مذہب بدلواتی رہی ہے؛ مرنے کے بعد بھی معجزہ دکھائے گی۔"

"ضرور!" فوشلوون نے تڑکی بہ تڑکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

"فادر Fauvent! مادر Crucifixion کمیونٹی کے لیے خدا کی نعمت تھی۔ ہر ایک کو کارڈینل Berulle جیسی موت نصیب نہیں ہوتی، جس نے آخری سانس اس وقت لی تھی جب اس نے مقدس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، "آسمانی باپ، یہ پیش کش قبول کیجیے۔" مگر ایسی خوشی حاصل کیے بغیر بھی مادر Crucifixion کی موت بہت اہم تھی۔ آخر وقت تک وہ ہوش و حواس میں تھی۔ ہم سے بات کی، پھر فرشتوں سے باتیں کیں۔ پھر اس نے آخری احکامات جاری کیے۔ اگر تم میں ذرا زیادہ یقین ہوتا، اور تم اس کی کوٹھڑی میں ہوتے، تو اس نے تمھارے پیروں کو ہاتھ لگا کر شفایاب کر دیا ہوتا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو ابدی زندگی مل رہی ہے۔ اس موت میں کچھ جنت جیسا انداز تھا۔"

فوشلوون سمجھا کہ یہ کوئی مناجات تھی جو وہ ختم کر رہی تھی۔

اور اس نے کہا "آمین۔"

"فادر Fauvent! مرنے والی کی خواہش پوری ہونی چاہیے۔"

نائب ناظم راہبہ نے اپنی تسبیح کے کئی دانے اکٹھے گن لیے۔ فوشلوون خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

نائب ناظم راہبہ نے مزید کہا "میں نے بہت سے خدامانِ دین سے اس نکتے پر

مشورہ کیا ہے، جو خود بھی پادری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور خوش حال بھی ہیں۔"

"محترم مادر! آپ باغیچے کے مقابلے میں یہاں بیٹھی موت کے اعلان کو بہتر طور پر سن سکتی ہیں۔"

"اس کے علاوہ، وہ مری ہوئی عورت سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ سینٹ ہے۔"

"بالکل آپ ہی کی طرح، محترم مادر۔"

"وہ بیس برس سے، مقدس باپ Pius VII کی اجازت سے، اپنے تابوت میں سوتی تھی۔"

"وہی جس نے شہنشاہ بوناپارٹ کی تاج پوشی کی تھی۔"

فوشلوون جیسے چالاک انسان کی جانب سے یہ ایک نامعقول کنایہ تھا۔ خوش قسمتی سے ناظم راہبہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی، اور شاید سن نہیں سکی تھی۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا، "فادر فوشلوون؟"

"محترم مادر؟"

"Cappadocia کے آرچ بشپ سینٹ Didorus کی خواہش تھی کہ اس کے مقبرے پر صرف 'Acarus' کندہ کر دیا جائے جس کا مطلب ہوتا ہے زمین کا کیڑا! اس کی خواہش پوری کر دی گئی تھی۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں! محترم مادر!"

"Aquila کے پادری، مکرم Mezzocane نے وصیت کی تھی کہ اسے دار کے نیچے دفن کیا جائے: خواہش پوری کر دی گئی تھی۔"

"یہ بھی سچ ہے۔"

"Port کے بشپ سینٹ Terentius نے، جہاں دریائے Tiber سمندر میں گرتا ہے، وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر وہی الفاظ کندہ کر دیے جائیں جو غداروں کے قبروں پر لکھے جاتے ہیں، تا کہ اس کے مزار کے پاس سے ہر گزرنے والا اس پر تھوکے۔ یہ بھی کر دیا گیا تھا۔ مرے ہوئے کی خواہش پوری ہونی چاہیے۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"Castile کے بادشاہ کی مرضی کے خلاف، جو Roche-Abeille کے قریب فرانس میں پیدا ہوا تھا، Bernard Guidonis کی میت اس کی خواہش کے مطابق Limoges کے Dominicans کے کلیسا میں دفنائی گئی تھی۔ حالاں کہ Bernard Guidonis

ہسپانیہ میں Tuy کا بشپ تھا۔ کیا اس کے خلاف شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں؟"

"جہاں تک مجھے علم ہے، جی نہیں، محترم مادر۔"

"اس کی تصدیق Plantavit de la Fosse نے کی تھی۔"

خامشی کے درمیان تسبیح کے کئی دانے نظرانداز کر دیے گئے تھے۔ نائب ناظم راہبہ نے کہا، "فادر Fauvent، مادر Crucifixion کو اسی تابوت میں رکھا جائے گا جس میں وہ بیس برس سوئی تھی۔"

"صحیح!"

"یہ اس کے خواب کا تسلسل ہوگا۔"

"تو کیا مجھے اس کے تابوت کی کیلیں جڑنی ہوں گی؟"

"ہاں!"

"کیا دفن کرنے والوں کے بھیجے ہوئے تابوت کو واپس کر دیا جائے گا؟"

"یقیناً!"

"میں مقدس کمیونٹی کا تابع دار ہوں۔"

"چار مائیں تمھاری مدد کریں گی۔"

"کیل جڑنے میں؟ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں، تابوت میں اس کا جسم اتارنے میں۔"

"کہاں؟"

"تہہ خانے میں۔"

"کس تہہ خانے میں؟"

"قربان گاہ کے نیچے والا۔"

فوشلوون نے سوال کیا، "قربان گاہ کے نیچے والے تہہ خانے میں؟"

"قربان گاہ کے نیچے۔"

"مگر ــــ"

"تمھارے پاس آہنی چھڑ ہوگا۔"

"ہاں، مگر ــــ"

"تم اس پتھر کو چھڑ اور جھٹکے کی مدد سے ہٹاؤ گے۔"

"مگر___"

"مرنے والی کی خواہش پوری ہونی چاہیے۔ اسے کلیسا کی قربان گاہ کے نیچے دفن کیا جائے، بے حرمتی کرنے والی زمین میں نہیں؛ اسی زمین میں رہنے کے لیے جہاں زندگی بھر عبادت کرتی رہی ہے؛ یہ تھی مادر Crucifixion کی آخری خواہش۔ اس نے ہم سے اس کی درخواست کی تھی، یا یوں کہا جائے کہ ہمیں اس کا حکم دیا تھا۔"

"مگر یہ تو ممنوع ہے۔"

"آدمیوں کی جانب سے ممنوع ہے، مگر خدا کی جانب سے تاکید ہے۔"

"اور اگر لوگوں کو اس کا علم ہو گیا تو؟"

"ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔"

"اچھا، تو گویا میں آپ کی دیواروں میں لگا ہوا پتھر ہوں۔"

"مجلسِ خانہ [اجلاس گھر] جمع تھا۔ مطلق ماؤں نے، میں نے جن سے ایک بار پھر مشورہ کیا تھا، اور جو اس وقت آپس میں مشورہ کر رہی تھیں، فیصلہ کیا ہے کہ مادر Crucifixion کو اس کی خواہش کے مطابق، اس کے اپنے تابوت میں، ہماری قربان گاہ کے نیچے ہی دفنایا جائے گا۔ فادر Fauvent ذرا سوچو تو، وہ یہیں معجزہ دکھائے گی۔ خدا کی کمیونٹی کے لیے یہ کتنی شان دار بات ہوگی کہ اس مزار سے معجزے نکلتے ہیں۔"

"مگر محترم مادر، اگر حفظانِ صحت کمیشن کے ہرکارے ..."

"سینٹ Benoit دوئم نے قبور کے معاملات میں Constantine Pogonatus کے حکم کو رد کر دیا تھا۔"

"مگر پولیس کمشنری والے ..."

"سات جرمن بادشاہوں میں سے ایک Chonodemaire نے جو Constantius کی سلطنت میں داخل ہوا تھا، راہباؤں کا مذہبی طریقے سے، یعنی قربان گاہ کے نیچے دفن ہونے کے حق کا اعتراف کیا تھا۔"

"مگر پریفیکچر کے انسپکٹر کی طرف سے ..."

"صلیب کی موجودگی میں دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ Carthusians کے گیارہویں جنرل نے اپنے اہل کاروں کو حکم دیا تھا: دنیا بدلتی رہتی ہے، مگر صلیب اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔"

"آمین!" فوشلوں نے کہا، جو جب بھی لاطینی زبان کا کوئی متن سنتا تھا تو خود کو

بڑے اطمینان سے اتنا ہی کہہ کر گومگو کی حالت سے نکال لے جاتا تھا۔

اس آدمی کے لیے جو ضرورت سے زیادہ دیر تک پُرسکون رہا ہو، ہر قسم کے سننے والے کافی ہوتے ہیں۔اس دن جب فنِ خطابت کا ماہر Gymnastoras، اپنے اندر کئی قسم کے تذبذب اور بے شمار قسم کی منطق لیے جو اس میں داخل ہو چکی تھیں، قید سے رہا ہوا تھا تو سب سے پہلے سامنے آنے والے درخت کے سامنے کھڑا ہوا اور تقریر جھاڑنے لگا تھا اور اسے قائل کرنے کے ہر قسم کی کوشش کر ڈالی تھی۔ تب منتظم راہبہ جسے عام طور پر خاموشی کی رُکاوٹ کا سامنا ہوتا تھا، اور جس کا مخزنِ معلومات ہمیشہ لبریز ہوتا تھا، اک دم کھڑی ہو گئی اور اس میں سے، کسی ٹوٹے ہوئے بند کی طرح لفظوں کا سیلاب اُمڈنے لگا تھا۔

”میرے دائیں جانب Benoit ہے اور بائیں جانب Bernard۔ برنارڈ کون ہے؟ Clairvaux کا پہلا سر براہ راہب۔ برگنڈی کا Fontaines ایک مبارک علاقہ ہے جس نے اسے پیدا کیا تھا۔اس کے باپ کا نام تھا Tecelin اور ماں کا نام Alethe۔وہ Clairvaux میں ختم ہونے کے لیے Citeaux میں شروع ہوا تھا؛ وہ Guillaume de Champeaux کے Chalon-sur-Saone کا صدر راہب مقرر کیا گیا تھا؛ اس کے پاس سات سو مبتدی کارکن تھے، اور اس نے ایک سو ساٹھ خانقاہیں قائم کی تھیں؛ اس نے 1140ء میں Sens کی کاؤنسل سے Abeilard، اور اپنے مُرید Pierre de Bruys اور ہنری کو نکال باہر کیا تھا، اور ایک اور قسم کے غلط کار رجحانات کو، جن کو Apostolics کہا جاتا تھا؛ Arnauld de Brescia کو درہم برہم کیا؛ یہودیوں کے قاتل راہب Raoul پر بجلی بن کر گرا، 1148ء میں Reims کی کاؤنسل پر حاوی ہو گیا؛ Poitiers کے بشپ Gilbert de Porea کو رسوا کیا؛ Eon de l'Etoile کی رسوائی کا باعث ہوا؛ شہزادوں کے تنازعات کا انتظام کیا؛ بادشاہ Louis the Young کی تربیت کی؛ پاپائے اعظم Eugene سوئم کو مشورے دیے؛ Temple کو ٹھیک کیا؛ مذہبی جنگ کی تبلیغ کی؛ اپنی زندگی میں دو سو پچاس معجزے دکھائے؛ ایک دن میں زیادہ سے زیادہ اننالیس۔ Benoit کون تھا؟ وہ Mont-Cassin کا سردار تھا؛ وہ Saintete Claustrale کا دوسرا بنیاد گزار تھا؛ وہ مغرب کا Basil تھا۔اس کے آرڈر نے چالیس پاپائے اعظم، دو سو کارڈینل، پچاس سردار، سولہ آرچ بشپ، چار ہزار چھ سو بشپ، چار شہنشاہ، بارہ سلطانائیں، چھیالیس بادشاہان، اکتالیس ملکائیں، تین ہزار چھ سو اولیا سینٹ بنائے ہیں اور چودہ سو برس سے قائم ہے۔ایک طرف سینٹ Bernard اور دوسری طرف محکمہ حفظانِ صحت کا

ہرکارہ۔ ایک طرف Saint Benoit اور دوسری جانب شاہراہوں کا انسپکٹر۔ ریاست، سڑکوں کے کمشنر، عوامی کفن دفن کرنے والے، قوانین، انتظامیہ، ہم ان سب کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ شاید ہی ایسا کوئی راہگیر ہو جو یہ دیکھ کر برہم نہ ہوگا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ ہمیں تو اتنی بھی اجازت نہیں کہ ہم یسوع مسیح کو اپنی گرد بھی دے سکیں۔ آپ کا حفظانِ صحت کا محکمہ ایک انقلابی ایجاد ہے۔ پولیس کمشنری کے سامنے تو [معاذ اللہ] خدا بھی ماتحت تھا! ایسا ہے یہ زمانہ۔ بس، چپ ہو جاؤ Fauvent!“

الفاظ کی اس بارش تلے فوشلوون پریشان تھا۔ نائب منتظم راہبہ کہتی رہی:

”خانقاہ کے حق تدفین پر کسی کو شبہ نہیں۔ صرف متعصب اور بدخود غلط ہی اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ ہم بڑے پیچیدہ عہد میں جی رہے ہیں۔ ہمیں خبر نہیں کہ ہمیں کیا جاننا ضروری ہے، اور ہم وہ کچھ جانتے ہیں جسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ہم جاہل اور فاسق ہیں۔ اس زمانے میں ایسے بھی لوگ ہیں جو عظیم Saint Bernard اور اس Saint Bernard میں امتیاز نہیں کر سکتے جو بے چارے کیتھولک مخصوص پادریوں پر جو تیرہویں صدی میں زندہ تھے، حاوی رہا تھا۔ بہت سے لوگ تو اتنے گستاخ ہیں کہ وہ لوئی شانزدہم کی سولی کا یسوع مسیح کی صلیب سے موازنہ کرتے ہیں۔ لوئی شانزدہم محض ایک بادشاہ تھا۔ ہمیں خدا سے واقف ہونا چاہیے۔ اب نہ منصف باقی رہے ہیں نہ منصف مزاج، نہ بے ایمان۔ لوگ والٹیئر کو جانتے ہیں مگر Cesar de Bus سے ناواقف ہیں۔ اس کے باوجود Cesar de Bus نیک پادریوں کا انسان تھا، جب کہ والٹیئر نامبارک پادریوں والا تھا۔ آخری آرچ بشپ، کارڈینل de Perigord تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ Berulle کا وارث Gondren de Charles تھا، اور Gondren کا وارث Francois Bourgoin تھا، اور Jean-Francois Senault کا وارث فادر Sainte-Marthe تھا۔ لوگ فادر Coton سے واقف ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ ان تینوں میں سے تھا جنھوں نے Oratorie کی بنیادگزاری کی خواہش ظاہر کی تھی، بلکہ اس لیے کہ اس نے ہنری چہارم کو حلف کی ضروریات فراہم کی تھیں۔ کہ دنیا والے Saint Francois de Sales کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ کھیل میں دھوکا دیتا تھا۔ اور پھر مذہب پر حملہ کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمارے ہاں خراب پادری رہے ہیں، اس لیے کہ Gap کا بشپ Sagittaire بھائی تھا Embrun کے بشپ Salone کا، اس لیے بھی کہ دونوں Mommol کے پیروکار تھے۔ مگر اس کا اس سوال سے کیا رشتہ؟ کیا اس نے Martin

de Tours کو ملعنت ہونے سے، اور ایک فقیر کو اپنا آدھا جبہ دینے سے روک دیا تھا؟ وہ ملعنت لوگوں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ سچ پر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اندھیرا ان کا قانون ہے۔ سب سے زیادہ مشہور درندے وہ درندے ہوتے ہیں جو نابینا ہوتے ہیں۔ کوئی جہنم کو حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور لوگ کتنے شیطان ہو گئے ہیں! کسی کو خبر نہیں کہ زندہ کا یا مردہ کا حق کیا ہے۔ مقدس موت ممنوع ہے۔ دفن شہری معاملہ ہے۔ یہ بہت خوف ناک بات ہے۔ Saint Leo II نے دو خاص قسم کے خط لکھے تھے، ایک Pierre Notaire کو، دوسرا Visigoths کے بادشاہ کو مردہ لوگوں سے متعلق سوالات پر صوبے کے حکمران اور بادشاہ اور شہنشاہ کے اقتدار اعلیٰ کے درمیان چپقلش کے بارے میں، کہ ان کا مقابلہ کیا جائے یا رد کر دیا جائے۔ Chalons کے بشپ Gauthier کی، برگنڈی کی ڈیوک Otho کے خلاف رائے الگ تھی۔ قدیم فوج داری کی عدالت اس سے متفق تھی۔ سابقہ دنوں میں مجلس خانے میں، روزانہ کے معاملات پر بھی آوازیں اٹھی تھیں۔ Citeaux کا سربراہ پادری، آرڈر کا جنرل، پیدائشی حق کے باعث برگنڈی کی پارلیمان کا کاؤنسلر تھا۔ ہم اپنے مرنے والوں کے بارے میں جو چاہیں کرتے ہیں۔ کیا خود Saint Benoit کی میت فرانس میں، Fleury کے گرجا گھر میں نہیں ہے، جسے Benoit- sur-Loire کہا جاتا ہے، حالاں کہ اس کا انتقال اطالیہ کے مقام Mont-Cassin میں ۲۱ مارچ 543ء کو ہوا تھا۔ ان سب پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ میں مناجات گانے والوں سے نفرت کرتی ہوں۔ میں priors سے نفرت کرتی ہوں، میں ملحدوں پر لعنت بھیجتی ہوں، مگر مجھے اس سے کراہت رکھنی چاہیے جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ آپ صرف Arnoul Wion کا، Gabril Bucelin کا، Trithemus کا، Maurolics کا اور Dom Luc d'Archery کا مطالعہ کر لیجیے۔"

نائب منتظم راہبہ ایک لمحے کے لیے رکی، اور فوشلوں سے مخاطب ہوئی:

"سب طے ہو گیا کہ نہیں، فادر Fauvent؟"

"طے ہو گیا ہے، محترم مادر!"

"ہم تم پر بھروسا کر سکتے ہیں؟"

"فرماں بردار ہوں آپ کا۔"

"ٹھیک۔"

"میں نے خود کو خانقاہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں۔ تم تابوت کو بند کرو گے۔ سسٹرز اس کو گرجا گھر کے اندر لے جائیں گی۔

مرنے والی کے لیے دعا کی جائے گی۔اس کے بعد ہم خانقاہ واپس ہو جائیں گی۔گیارہ بجے اور نصف شب کے درمیان تم اپنے آہنی چھڑ کے ساتھ آؤ گے۔سب کچھ بے حد خفیہ انداز میں کیا جائے گا۔گرجا کے اندر صرف چار افراد ہوں گے— مادرPrecentors، مادر Ascension، اورتم۔"

"اور سسٹر دربان؟"

"وہ واپس نہیں آئے گی۔"

"مگر وہ سن لے گی۔"

"وہ نہیں سنے گی۔اس کے علاوہ، خانقاہ کو جو معلوم ہوتا ہے، دنیا کو معلوم نہیں ہوتا۔"

ایک وقفہ۔اور تب ناظم راہبہ پھر گویا ہوئی:

"تم اپنی گھنٹی اتار دو گے۔ضروری نہیں کہ دربان سسٹر کو تمھاری موجودگی کا علم ہو۔"

"محترم مادر؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو، فادر؟"

"کیا موت کا ڈاکٹر آچکا ہے؟"

"وہ آج چار بجے آئے گا۔گھنٹا، جو ڈاکٹر کو طلب کرتا ہے بجایا جا چکا ہے مگر تم تو ان گھنٹوں کو نہیں سمجھتے؟"

"میں اپنے گھنٹے کے علاوہ کسی پر دھیان نہیں دیتا۔"

"بالکل ٹھیک، فادرFauvent۔"

"محترم مادر، کم از کم چھ فٹ لمبا لیور درکار ہوگا۔"

"کہاں سے حاصل کرو گے؟"

"جہاں جالیوں کی کمی نہیں وہاں چھڑوں کی کمی نہیں۔باغیچے کے آخر میں میرا اپنا قدیم آہنی ڈھیر ہے۔"

"نصف شب سے تین چوتھائی گھنٹے پہلے؛ بھولنا نہیں۔"

"محترم مادر؟"

"کیا ہے؟"

"اگر آپ کے پاس اس قسم کے کام کی کوئی جگہ خالی ہو تو، میرا بھائی آپ کے لیے طاقت ور آدمی ہوگا۔ تھل ٹرک!"

"تم جتنی جلد ممکن ہو، یہ کام کرو گے۔"

"میں بہت تیزی سے کام نہیں کر سکتا۔ میں معذور ہوں؛ اسی لیے مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہے۔ میں لنگڑاتا ہوں۔"

"لنگڑانے میں کوئی گناہ نہیں، شاید یہ نعمت ہے۔ شہنشاہ ہنری دوئم کے، جس نے پاپائے اعظم کی مخالفت کی تھی، اور Benoit ہشتم کو دوبارہ قائم کیا تھا، دو خاندانی نام تھے، Saint اور Lame۔"

"دو فراک کوٹ والے اچھی بات ہوگی۔" فوشلوون بڑبڑایا، جو واقعی کم سنتا تھا۔

"اب جب کہ میں اس بارے میں سوچتی ہوں، فادر Fauvent، ہمیں پورے ایک گھنٹے کی ضرورت ہو گی۔ وہ زیادہ نہیں ہوگا۔ مرکزی قربان گاہ کے قریب، اپنے آہنی چھتر کے ساتھ، گیارہ بجے موجود رہنا۔ دعا نصف شب شروع ہو گی۔ اس سے ایک چوتھائی گھنٹے قبل سب کچھ ہو جانا چاہیے۔"

"میں کمیونٹی سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ یہ میرا کام ہے۔ میں تابوت میں کیلیں جڑوں گا۔ ٹھیک گیارہ بجے، میں گرجا کے اندر ہوں گا۔ مادر Precentors وہاں موجود ہو گی۔ مادر Ascension وہاں ہوگی۔ دو آدمی کافی ہوں گے۔ پھر بھی، کوئی بات نہیں۔ میرے پاس میرا لیور ہوگا۔ ہم تہہ خانہ کھولیں گے، اس میں تابوت اتاریں گے، اور تہہ خانے کو دوبارہ بند کر دیں گے۔ اس کے بعد کسی شے کا کوئی سراغ نہیں ہوگا۔ حکومت کو شبہ نہیں ہوگا۔ اس طرح یہ سب انتظام کیا گیا ہے، محترم مادر؟"

"نہیں۔"

"کیا اور کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

"خالی تابوت باقی رہ جائے گا۔"

تھوڑی دیر کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ فوشلوون اپنی سوچ میں غرق ہو گیا۔ منتظم راہبہ اپنی سوچ میں غرق ہو گئی۔

"اس تابوت کا کیا کیا جائے، فادر Fauvent؟"

"زمین کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"خالی؟"

پھر خاموشی ہو گئی۔ فادر فوشلوون نے ایسے انداز سے اپنے ہاتھ ہلائے جو کسی مشکل

موضوع کو رد کر دیتا ہے۔

"محترم مادر، میں ہی گرجا گھر کے پیچھے والے کمرے میں تابوت میں کیلیں جڑوں گا، اور وہاں میرے سوا کوئی داخل نہیں ہو سکتا ہے،اور میں تابوت کو جنازے کی چادر سے ڈھک دوں گا۔"

"مگر اٹھانے والے جب اس جنازے کو گاڑی میں رکھیں گے، اور قبر میں اتاریں گے تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔"

"او و خدایا!" فوشلوون نے بلند آواز میں کہا۔

نائب منتظم راہبہ نے صلیب کا نشان بنانا شروع کیا، اور گھور کر مالی کی طرف دیکھنے لگی۔

مالی نے فوراً کچھ کرنے کا قصد کیا تا کہ اسے اپنی قسم یاد نہ رہے۔

"میں تابوت میں مٹی بھر دوں گا۔ اس سے لاش جیسا اثر پیدا ہو جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مٹی، وہ بھی تو آدمی ہی کی طرح کی شے ہوتی ہے۔لہٰذا تم خالی تابوت کا معاملہ سنبھال لو گے؟"

"میں اس کو اپنا خاص کام سمجھوں گا۔"

نائب منتظم راہبہ کا چہرہ جو اَب تک مغموم اور پریشان سا تھا، ایک بار پُرسکون ہو گیا۔ اس نے اشارہ کیا، جیسا کوئی برتر آدمی کمتر کو چلے جانے کے لیے کرتا ہے۔فوشلوون دروازے کی طرف چلا گیا۔ابھی وہ باہر نکلنے والا تھا، کہ نائب منتظم راہبہ نے نرمی سے اپنی آواز بلند کی، "میں تم سے بہت خوش ہوں فادرFauvent؛ اپنے بھائی کو، دفن کے بعد، کل میرے پاس لے آؤ۔اور اس سے کہو کہ وہ اپنی بچی کو بھی ساتھ لے آئے۔"

ژاں ولژاں اور Austin Castillejo

کسی تنگ انسان کی شترگامی ایسی ہی ہوتی ہے جیسے یک چشم انسانوں کی عشوہ گری؛ وہ اپنے ہدف تک بہت تیزی سے پہنچ نہیں سکتے۔ مزید یہ کہ فوشلوون گومگو کی کیفیت میں تھا۔اس کو باغیچے کے جھونپڑے تک پہنچنے میں تقریباً ایک چوتھائی گھنٹا لگ گیا تھا۔کوزیت جاگ اٹھی تھی۔ ژاں ولژاں نے اسے روشن دان کی آگ کے قریب بٹھا دیا تھا۔جس وقت فوشلوون داخل ہوا، ژاں ولژاں کوزیت سے دیوار پر ٹنگے ہوئے فروشوں کے جھابے کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا،

"میری پیاری کوزیت،غور سے میری بات سنو۔ہمیں اس مکان سے جانا پڑے گا،مگر ہم پھر یہیں واپس آجائیں گے، اور یہاں بہت خوش رہیں گے۔یہ نیک آدمی جو یہاں رہتا ہے،تم کو اس جھابے میں رکھ کر، اپنی پشت پر لاد کر لے جائے گا۔تم ایک عورت کے گھر میں میرا انتظار کروگی۔میں تمھیں لینے آؤں گا۔اگر تم نہیں چاہتیں کہ مادام تھن آردیے تمھیں پکڑ لے جائے، وہی کرنا جو کہا جائے۔"

کوزیت نے سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

فوشلوون کے داخل ہونے کی آواز پر ژاں ولژاں نے مڑ کر دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"سب کچھ طے بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔" فوشلوون نے کہا، "مجھے تمھیں اندر لانے کی اجازت مل گئی ہے؛ مگر پہلے تمھیں باہر جانا ہوگا۔یہی سب سے بڑی مشکل ہے۔ بچی کے معاملے میں تو یہ آسان بات ہوگی۔"

"اس کو تم ہی باہر لے جاؤ گے؟"

"ہاں، مگر اس کو اپنی زبان بند رکھنی ہو گی۔"

"اس کا میں ذمے دار ہوں۔"

"مگر آپ، فادر میڈیلن؟"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، جس میں تشویش بھی شامل تھی، فوشلووں نے بلند آواز میں کہا "جس طرح اندر آئے تھے ویسے ہی واپس جا بھی سکتے ہیں۔"

پہلے کی طرح ژاں ولژاں نے "ناممکن" کہنے پر اکتفا کی تھی۔

فوشلووں اپنے آپ کچھ بڑبڑا رہا تھا:

"ایک اور بات ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ میں اس میں مٹی بھر دوں گا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میت کی جگہ مٹی بھر دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔ مٹی اِدھر اُدھر ہو گی۔ انھیں معلوم ہو جائے گا۔ فادر میڈیلن، آپ سمجھ رہے ہیں نا، کہ حکومت کو پتا چل جائے گا۔"

ژاں ولژاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا، جیسے وہ دیوانہ ہو گیا ہو۔

فوشلووں کہتا رہا "مگر، آپ اس میں سے نکلیں گے کیسے؟ یہ سب کچھ کل صبح سے پہلے ہو جانا چاہیے۔ کل ہی مجھے آپ کو یہاں لانا ہے۔ محترم مادر آپ کا انتظار کرے گی۔"

پھر اس نے ژاں ولژاں کو ساری تفصیل بتائی کہ یہ اس خدمت کے عوض ہے جو وہ کمیونٹی کے واسطے کرنے والا ہے، کہ تدفین کے سلسلے میں اس کو کچھ ذمے داری سونپی گئی ہے، کہ وہ تابوت میں کیلیں جڑتا ہے اور قبرستان میں گورکن کی مدد بھی کرتا ہے، کہ اس راہبہ نے جو صبح مری ہے، وصیت کی ہے کہ اس کو اسی تابوت میں دفن کیا جائے جسے اس نے بیس برس اپنے بستر کے طور پر استعمال کیا تھا، اور یہ بھی کہ اسے گرجا گھر کی قربان گاہ کے نیچے تہہ خانے ہی میں رکھ دیا جائے۔ پولیس کے قوانین اس کی ممانعت کرتے ہیں، مگر وہ ان میں سے تھی جس کی کسی خواہش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محترم مادر اور نائب مائیں اس کی وصیت پوری کرنا چاہتی ہیں۔ کہ حکومت کے نزدیک یہ بُری بات ہوگی، کہ فوشلووں کو اس کے تابوت میں کیلیں جڑنی ہیں، گرجا گھر کے پتھر کو اٹھانا ہے، اور میت کو تہہ خانے میں اتارنا ہے۔ اور اس کے شکرانے کے طور پر محترم مادر اس کے بھائی کو مالی کے طور پر، اور اس کی بھتیجی کو شاگرد کے طور پر، گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے گی، کہ ژاں ولژاں اس کا بھائی ہے، اور کوزیٹ اس کی بھتیجی ہے، کہ محترم مادر نے، قبرستان میں جعلی تدفین کے بعد، اس کے بھائی کو لانے کا حکم دیا ہے۔ مگر وہ موسیو میڈیلن کو باہر سے لا نہیں سکے گا جب تک کہ انھیں باہر نہ بھیج دیا جائے۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے۔ اس

کے بعد ایک اور مسئلہ ہے، خالی تابوت کا۔

"خالی تابوت کیا ہے؟" ژاں ولژاں نے سوال کیا۔

فوشلوون نے جواب میں کہا، "انتظامیہ کا تابوت۔"

"کیسا تابوت؟ اور کیسی انتظامیہ؟"

"ایک راہبہ مر جاتی ہے۔میونسپلٹی کا ڈاکٹر آ کر بتاتا ہے کہ راہبہ مر چکی ہے۔حکومت والے ایک تابوت بھیجتے ہیں۔دوسرے دن میت لے جانے والی گاڑی بھیجی جاتی ہے، اور تدفین کے ذمے دار تابوت کو اٹھا کر قبرستان لے جاتے ہیں۔تدفین والے جب آ کر تابوت اٹھائیں گے تو اس میں کچھ نہیں ہوگا۔"

"تو، اس میں کچھ رکھ دو۔"

"میت؟ مگر وہ تو ہے نہیں۔"

"نہیں۔"

"تو پھر، کیا ہوگا؟"

"اس میں ایک زندہ آدمی ہوگا۔"

"کون سا آدمی؟"

"میں! اور کون؟" ژاں ولژاں نے کہا۔

فوشلوون جو اس وقت بیٹھا ہوا تھا، اس طرح اچھل پڑا جیسے اس کی کرسی کے نیچے بم پھٹ پڑا ہو۔ "آپ؟"

"کیوں نہیں؟"

ژاں ولژاں پر ویسی ہی انوکھی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے سردی کے موسم میں آسمان سے روشنی کا جھماکا ہوگیا ہو۔

"سنا تم نے، فوشلوون کہ تم نے کیا کہا ہے، کہ مادر Crucifixion مر چکی ہے اور میں اس میں اضافہ کر رہا ہوں کہ فادر میدیلن دفن کر دیا گیا ہے۔"

"واہ، کیا خوب! آپ ہنس رہے ہیں، سنجیدگی سے بات نہیں کر رہے ہیں۔"

"میں بہت سنجیدہ ہوں۔ مجھے اس جگہ سے کسی طرح نکلنا ہے۔"

"بلاشبہ!"

"میں نے کہا ہے کہ ایک جھابا تلاش کرو اور اس میں مجھے چھپا دو۔"

"اچھا، تو پھر؟"

"چھالی صنوبر کی لکڑی کی ہوگی، اور چادر سیاہ رنگ کی۔"

"سب سے پہلی بات، چادر سفید رنگ کی ہوگی۔ راہبائیں سفید کفن میں دفنائی جاتی ہیں۔"

"اچھا تو پھر سفید ہی سہی۔"

"فادر میڈیلین، آپ اور لوگوں کی طرح نہیں۔"

ایسے طریقے دکھا کر، جو قید خانے کی وحشیانہ چیزوں سے کسی طرح کم نہیں، جو اس کے اطرف کی سادہ سی چیزوں سے پیدا کی جا سکتی ہیں جنھیں وہ "خانقاہ کی زندگی کے معمولات" کہتا ہے، اس نے فادر فوشلوون کو اس طرح حیران کر دیا تھا جیسے کسی راہ گیر نے کسی پرندے کو Saint-Denis اسٹریٹ کی نالی میں مچھلی شکار کرتے دیکھ لیا ہو۔

ژاں ولژاں کہتا رہا۔

"مسئلہ یہاں سے نکلنے کا ہے، بہ شرطے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ اس کا بھی کوئی طریقہ ضرور ہوگا۔ پہلے مجھے کچھ تفصیلات تو بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیسے کیا جاتا ہے؟ تابوت کہاں ہے؟"

"خالی تابوت؟"

"ہاں!"

"نیچے، اس کمرے میں ہے، جسے مردہ لوگوں کا کمرہ کہا جاتا ہے۔ قینچی نما گھوڑی پر رکھا ہے، جس پر جنازے کی چادر پڑی ہوئی ہے۔"

"تابوت کتنا لمبا ہے؟"

"چھ فٹ۔"

"یہ مردے والا کمرہ کیا چیز ہے؟"

"ایک کمرہ ہے، جو زمینی منزل پر ہے، جس کی باغیچے میں کھلنے والی کھڑکیوں پر جالیاں لگی ہیں، جنھیں باہر سے، ایک شٹر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کمرے میں دو دروازے ہیں، ایک خانقاہ میں کھلتا ہے، دوسرا گرجا گھر میں۔"

"کون سا گرجا گھر؟"

"وہی گرجا گھر جو سڑک پر واقع ہے، جس میں کوئی بھی داخل ہو سکتا ہے۔"

"تمھارے پاس ان دونوں دروازوں کی کنجیاں ہیں؟"

"نہیں، میرے پاس صرف اس دروازے کی کنجی ہے جو خانقاہ میں کھلتا ہے۔"

"دربان اس دروازے کو کب کھولتا ہے؟"

''صرف دفن کرنے والے آدمیوں کے لیے، جب وہ تابوت لے جانے کے لیے آتے ہیں۔ تابوت کے جانے کے بعد دروازہ بند کردیا جاتا ہے۔''

''تابوت میں کیلیں کون جڑتا ہے۔''

''میں جڑتا ہوں۔''

''اس پر چادر کون پھیلاتا ہے؟''

''میں پھیلاتا ہوں۔''

''کیا اس وقت تم اکیلے ہوتے ہو؟''

''پولیس ڈاکٹر کے سوا اور کوئی آدمی اس کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ حکم اس کی دیوار پر لکھا ہے۔''

''جب سب لوگ سو گئے ہوں تو کیا، آج رات تم مجھے اس کمرے میں چھپا سکو گے؟''

''نہیں، مگر میں تمھیں اس سے متصل چھوٹے سے کمرے میں چھپا سکتا ہوں، جس کا دروازہ موت کے کمرے میں کھلتا ہے، جہاں میں اپنے اوزار رکھتا ہوں جو دفن میں استعمال ہوتے ہیں، جس کی کنجی میرے پاس رہتی ہے۔''

''تابوت لینے کے لیے کل کس وقت گاڑی آئے گی؟''

''سہ پہر تین بجے کے قریب۔ تدفین Vaugirard قبرستان میں ہوگی۔ قبرستان زیادہ قریب نہیں ہے۔''

''میں پوری رات اور صبح تک، تمھارے اوزار کی کوٹھری میں چھپا رہوں گا۔ اور کھانا؟ میں بھوکا رہوں گا۔''

میں آپ کے لیے کچھ لا دوں گا۔''

''تم رات کے دو بجے آ کر مجھے تابوت میں بند کر دینا۔''

فوشلوون گھبرا کر اپنی انگلیاں چٹخانے لگا۔

''مگر یہ ناممکن ہے۔''

''نہیں! ہتھوڑی سے چند کیلیں جڑ دینا، اور ناممکن؟''

وہ کام جو فوشلوون کو ناممکن لگ رہا تھا، ژاں ویلژاں کے نزدیک معمولی کام تھا۔ ژاں ولژاں اس سے بھی زیادہ مشکل حالات میں رہ چکا تھا۔ ہر شخص جو قیدی رہ چکا ہو، جانتا ہے کہ فرار کے لیے اسے اپنے آپ کو کس قطر تک محدود کرنا پڑتا ہے۔ قیدی کا فرار کے درمیان وہی حال ہوتا ہے جیسا کسی بیمار کا، کہ وہ مر جائے گا یا بچ جائے گا۔ فرار شفا کی صورت ہوتا ہے۔ انسان شفا کے

لیے کیا کچھ نہیں کرتا؟ خود کو ڈبے کے اندر کیلوں سے جڑوانا؛ سامان کی طرح لے جایا جانا؛ کافی دیر تک ڈبے میں بند رہنا؛ ڈبے میں ہوا کے حصول کی کوشش کرنا جس میں ہوا نہیں ہوتی، گھنٹوں سانس کی بچت کرنی پڑتی ہے، اور یہ جاننا پڑتا ہے کہ مرے بغیر کس طرح نکلا جائے — یہ سب ژاں ولژاں کی غمگین لیاقتوں میں سے ایک لیاقت تھی۔

مزید یہ کہ ایک تابوت جس میں ایک زندہ وجود پوشیدہ ہو — کسی سزا یافتہ کی ضرورت — شاہانہ سہولت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ہمیں راہب Austin Castillejo کو کریڈٹ دینا ہو تو، یاد رہے کہ یہی طریقہ چارلس پنجم نے بھی اپنایا تھا جو تخت سے دست برداری کے بعد Plombes کو آخر بار دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے میت کو Saint-Yuste کی خانقاہ سے اسی طرح لانے کا بندوبست کیا تھا۔

فوشلوواں نے، جو کچھ بحال ہو گیا تھا، ذرا بلند آواز میں کہا:

”مگر، آپ اس میں سانس کس طرح لیں گے؟“

”میں سانس لے لوں گا۔“

”اس بکس میں؟ میرا تو سوچ کر ہی دم نکلا جا رہا ہے!“

”تمھارے پاس برما تو ضرور ہوگا، تم اس سے تابوت میں، میرے منہ کے آس پاس، کچھ سوراخ بنا سکتے ہو، اور تم تختے کو ذرا ڈھیلے انداز میں جڑو گے۔“

”اچھا، اگر تمھیں کھانسی یا چھینک آ گئی تو کیا ہوگا؟“

”وہ آدمی جو فرار کر رہا ہو نہ کھانستا ہے نہ چھینکتا ہے۔“

ژاں ولژاں نے مزید کہا، ”فادر فوشلوواں اب ہمیں فیصلہ کرنا پڑے گا، یا تو میں یہیں پکڑا جاؤں یا میت گاڑی کے ذریعے فرار کو قبول کروں۔“

ہر شخص نے کبھی نہ کبھی اس کیفیت پر غور کیا ہوگا جو نصف بند دروازے کے پٹوں کے درمیان رُک کر کھڑی بلیوں پر طاری ہوتی ہوگی۔ کون ہے جس نے کسی بلی سے کہا ہوگا، ”اندر آجاؤ۔“ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے اسی طرح واقعات پیش آتے ہیں اور ان میں تذبذب کے درمیان فیصلہ نہ کر پانے کا ویسا ہی میلان ہوتا ہے، جس میں کسی مہم کے دوران، قسمت کے دروازے کے اچانک بند ہو جانے سے کچلے جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ بلیاں اپنی فطرت کے مطابق غیر ضروری طور پر محتاط ہونے کے باوجود کبھی کبھی جرأت سے زیادہ خطرہ مول لے لیتی ہیں۔ فوشلوواں ویسا ہی متذبذب قسم کا انسان تھا۔ مگر ژاں ولژاں کی سرد مزاجی غالب

آ گئی تھی۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا، ''اچھا، اب کوئی اور راستہ رہ نہیں گیا ہے۔''

ژاں ولژاں نے مزید کہا۔

''بس ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے کہ قبرستان میں کیا ہوگا؟''

''یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' فوشلوون نے کہا، اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ تابوت سے صحیح سالم نکل آئیں گے، تو مجھے پورا یقین ہے کہ میں آپ کو قبر سے باہر نکال لوں گا۔ گورکن مے خوار آدمی ہے، اور میرا دوست ہے۔ اس کا نام فادر Mestienne ہے۔ اسکول کا پرانا ساتھی ہے۔ گورکن میتیں قبروں میں رکھتا ہے اور میں گورکن کو اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہوگا کیا۔ وہ لوگ رات ہونے سے قبل آئیں گے، جب قبرستان کے پھاٹک بند ہونے میں تین چوتھائی گھنٹا باقی ہوتا ہے۔ میت گاڑی قبر کے بالکل قریب تک آئے گی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ آؤں گا؛ کہ یہی میرا کام ہے۔ میرے پاس ایک ہتھوڑی اور ایک چھینی ہوتی ہے، اور جیب میں کچھ چٹیاں بھی ہوں گی۔ گاڑی رکے گی، دفن کرنے والے آپ کے تابوت کے اطراف رسی باندھ کر آپ کو قبر میں اتاریں گے۔ پادری دعا کرے گا، صلیب کا نشان بنائے گا، مقدس پانی چھڑکے گا اور رخصت ہو جائے گا۔ فادر Mestienne کے ساتھ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اب، دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی۔ یا تو وہ ہوش میں ہوگا یا وہ مدہوش ہوگا۔ اگر وہ مدہوش نہیں ہوگا تو میں اس سے کہوں گا، 'آؤ دوست ایک دو جام ہو جائیں' اور میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، پلا کر مدہوش کرنے کے لیے۔ اسے مدہوش ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میں اسے میز کے نیچے لٹا دوں گا، اس کا شناختی کارڈ لے لوں گا، تاکہ دوبارہ قبرستان میں داخل ہوسکوں اور اکیلا ہی واپس آسکوں۔ اس کے بعد، میرے سوا وہاں کوئی اور نہیں ہوگا۔ اگر وہ پہلے سے ہی مدہوش ہوگا تو میں اس سے کہوں گا 'تم ایک طرف ہو جاؤ، میں تمھارا کام کردوں گا۔' وہ چلا جائے گا اور میں تمھیں سوراخ سے باہر نکال لوں گا۔''

ژاں ولژاں نے اپنا ہاتھ بڑھایا، اور فوشلوون نے دیہاتیوں کی طرح اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔

''تو یہ طے رہا، فادر فوشلوون! کہ سب کچھ ٹھیک ہوگا۔''

''بہ شرطے کہ کوئی اور خرابی نہیں ہو جاتی۔'' فوشلوون نے سوچا، 'اور اگر ہوگئی تو بہت برا ہوگا'۔

۞

لافانی بننے کے لیے مدہوشی ضروری نہیں

دوسرے دن، جب سورج ڈھل رہا تھا، بولیوارڈ Maine پر کم کم نظر آنے والے راہ گیر جنازہ لے جانے والی قدیم گاڑی کو، جس پر چلیپائی انداز میں دو ہڈیاں، کھوپڑیاں اور آنسو بنے ہوئے تھے، اپنی پرانے طرز کی ہیٹ اٹھا اٹھا کر احترام پیش کر رہے تھے۔ اس گاڑی میں ایک تابوت تھا، جس پر سفید رنگ کی چادر پڑی ہوئی تھی، جس پر پھیلے ہوئے ہاتھوں والی بڑی سی لاش نما صلیب بنی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں سوگواروں کی گاڑی تھی جس میں ڈھیلے ڈھالے سفید لباس میں ملبوس ایک پادری، اور سُرخ ٹوپی میں سرودگاہ کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ سفید کناری لگے بھورے رنگ کے لباس میں دفن کرنے والوں کے دو ہرکارے میت گاڑی کے دائیں بائیں جانب چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے مزدور کے لباس میں لنگڑاتا ایک بوڑھا چل رہا تھا۔ جلوس Vaugirard قبرستان کی جانب رواں تھا۔ اس آدمی کی جیبوں سے ہتھوڑی کا دستہ، چھینی کی دھار اور دو عدد چمٹیوں کی نوکیں نظر آ رہی تھیں۔

پیرس کے قبرستانوں میں Vaugirard قبرستان کو استثنائی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اپنے مخصوص طریقے تھے، جس میں گاڑیوں کے داخلے کے لیے پھاٹک بنے ہوئے تھے، جنھیں علاقے کے بزرگ لوگ جو مضبوطی سے اپنے قدیم الفاظ سے چمٹے ہوئے تھے، اب بھی 'بہادروں کا دروازہ' اور 'پیادوں کا دروازہ' کہتے تھے۔ Petit-Picpus کی باسی Bernardines کے Benedictines نے، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، قبرستان کے ایک کونے میں، رات کے وقت، اپنے مُردوں کو دفن کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی، جو ماضی میں اسی کمیونٹی کے لوگوں کی زمین پر بنایا گیا تھا۔ اسی طرح، گرمی کے موسم میں شام تک، اور سردی

کے موسم میں رات گئے تک گورکنوں کو کام کرنا پڑتا تھا، اور ان کے اپنے نظم و ضبط تھے جن پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ پیرس کے قبرستانوں کے دروازے میونسپلٹی کے قوانین کے مطابق سرِشام بند ہو جاتے تھے، اور دوسرے قبرستانوں کی طرح Vaugirard قبرستان کو بھی اس قانون پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ گاڑی کے پھاٹک اور دفتر کے دروازے پر آہنی جالیاں لگی ہوئی تھیں، جن سے منسلک، ماہرِ تعمیرات Perronet کی بنائی ہوئی ایک خیمہ نما عمارت تھی، جس میں قبرستان کا دربان رہتا تھا۔ گنبدِ معذورین کے عقب میں سورج کے جاتے ہی یہ دروازے اپنے قلابوں پر گھوم جاتے تھے۔ اگر کسی گورکن کو قبرستان پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو اس کے باہر جانے کے لیے، اس زمانے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جہاں اس کو اپنا گورکنی کا شناختی کارڈ دکھانا پڑتا تھا جو عوام کی تدفین کے محکمے کی جانب سے جاری کیا جاتا تھا۔ دربان کی کھڑکی میں ایک لیٹر بکس بنایا گیا تھا۔ گورکن اپنا شناختی کارڈ اس ڈبے میں ڈال دیتا، اور اس کی آواز سن کر دربان رسی کھینچتا اور دروازہ کھل جاتا تھا۔ اگر گورکنی کے پاس اس وقت اس کا کارڈ نہ ہوتا تو وہ اپنا نام بتاتا، اور دربان جو عام طور اپنے بستر میں محوِ خواب ہوتا تھا، نکل کر باہر آتا، اس کی شناخت کرتا اور اپنی کنجی سے دروازہ کھول دیتا تھا؛ گورکن باہر چلا جاتا مگر اس کو پندرہ فرانک جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

قوانین سے مبرا اس قبرستان کی انفرادیت انتظامیہ کے لیے باعثِ شرمندگی ہوتی تھی۔ کچھ عرصے بعد 1830ء میں اس کی انفرادیت ختم کر دی گئی تھی۔ Mont-Parnasse قبرستان، جس کو مشرقی قبرستان کہا جاتا تھا، اس میں ضم کر دیا گیا تھا، اور اس کو ورثے میں وہ مشہور شراب کی دکان ملی تھی جو Vaugirard قبرستان سے متصل تھی، جس کے اوپر لگے سائن بورڈ پر ایک بڑی سی بہی (quince) پینٹ کی گئی تھی، جس کی ایک جانب رکھی پینے والوں کی میزوں اور دوسری جانب کے مزاروں سے ایک زاویہ سا بن جاتا تھا۔ اس جگہ پر Au Bon Coing کا سائن بورڈ لگا تھا۔

Vaugirard قبرستان کو ختم شدہ قبرستان کہا جانا چاہیے تھے۔ اس کا استعمال کم ہوتا جا رہا تھا۔ سیکنی اس پر حملہ آور تھی، پھول اسے چھوڑتے جا رہے تھے۔ بورژوا لوگ Vaugirard میں دفن ہونا پسند نہیں کرتے تھے؛ اس سے افلاس کی بو آتی تھی۔ لوگوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ Pere-Lachaise میں دفن ہوں۔ Pere-Lachaise میں دفن ہونا مہاگنی کا فرنیچر حاصل کرنے کے برابر ہوتا تھا۔ اس کو نفیس اور خوش نما سمجھا جاتا تھا۔ Vaugirard قبرستان ایک محترم احاطہ سمجھا جاتا تھا، جو قدیم طرز کے فرانسیسی باغیچے کی طرح اس میں شامل کر دیا گیا تھا۔

اس میں سیدھی گلیاں، سرو کے درخت، عمر رسیدہ شمشاد کے درختوں کے نیچے مقدس اور قدیم مزارات اور اونچی اونچی گھاس ہوتی تھی۔ شام کے وقت اس کا منظر بہت الم ناک اور اداس ہوتا تھا۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ میت گاڑی، جنازے کی سفید چادر، سیاہ رنگ کی صلیب کے ساتھ Vaugirard قبرستان کی سڑک میں داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں آنے والا لنگڑا آدمی فوشلوون کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

مادر Crucifixion کا قربان گاہ کے نیچے تہہ خانے میں اتارا جانا، کوزیٹ کا خروج، موت کے کمرے میں ژاں ولژاں کا دخول، سب کچھ بغیر کسی مشکل کے انجام پا گیا تھا؛ اس میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہوئی۔

روا روی میں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری نظر میں قربان گاہ کے نیچے تہہ خانے میں مادر Crucifixion کی تدفین قابلِ عفو جرم تھا۔ یہ ان غلطیوں میں سے ہے جو فرض سمجھ کر کی جاتی ہیں۔ راہباؤں نے نہ صرف بغیر کسی مشکل کے، بلکہ اپنے ضمیر کی پُر زور تحسین کے باعث، یہ غلطی کی تھی۔ کسی خانقاہ میں جسے "حکومت" کہا جاتا ہے صرف اختیارات میں خلط ملط ہوتی ہے، جو ہمیشہ قابلِ گرفت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے، ہم اصول کی بات کر رہے ہیں، قوانین کے بارے میں، بعد میں دیکھا جائے گا۔ مردو! تم جتنے قانون بنانا چاہو بنا لو، مگر ان کو اپنی حد تک ہی محدود رکھو۔ قیصر کو خراج دینا، خدا کے باقی ماندہ خراج کے سوا، کچھ نہیں ہوتا۔ اصول کی موجودگی میں شہزادے کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

فوشلوون بغیر سوچے سمجھے لنگڑاتا گاڑی کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ راہباؤں کے ساتھ، خانقاہ کے لیے، اس کے خلاف اور موسیو میڈیلین کے لیے، اس کے سارے منصوبے بظاہر کامیاب ہو گئے تھے۔ ژاں ولژاں کا اطمینان ان طاقت ور فرصتوں جیسا تھا جو متعدی بیماری کی طرح ہوتی ہیں۔ فوشلوون کو اپنی کامیابی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

اب کرنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ پچھلے دو برسوں میں اس نے بڑے جبڑوں والے، فادر Mestienne سے دوستی کر لی تھی جو کم از کم دس بار مدہوش پایا گیا تھا۔ وہ فادر Mestienne سے کھیل کھیلتا رہتا۔ اس کے ساتھ جو چاہتا کرتا۔ اس کو اپنی مرضی پر نچاتا۔ Mestienne نے خود بخود اپنے سر کو فوشلوون کی ٹوپی کے برابر کر لیا تھا۔ اس کو فوشلوون پر مکمل اعتماد تھا۔

عین اس وقت جب قافلہ قبرستان جانے والی سڑک میں داخل ہوا، فوشلوون نے میت گاڑی کی طرف دیکھ کر خوش مزاجی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا، "کیا خوب دھوکا ہو رہا ہے!"

پھاٹک پر پہنچ کر گاڑی اچانک رُک گئی۔داخلے کی اجازت دکھانی ضروری تھی۔دفن والوں کے نمائندے خود ہی قبرستان کے دربان سے کچھ باتیں کرنے لگے۔اس گفتگو کے دوران، جو ہمیشہ چند منٹوں کی تاخیر کا باعث ہوتی ہے، کوئی اجنبی شخص آیا اور فو شلوون کے ساتھ میت گاڑی کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ وہ مزدوری کرنے والا کوئی آدمی تھا، جو بڑی جیبوں والا کوٹ پہنے ہوئے تھا، اور اپنے بغل میں کدال سی کوئی شے دبائے ہوئے تھا۔

فو شلوون نے اس اجنبی کو دیکھتے ہوئے مطالبے کے انداز میں سوال کیا:

""تم کون ہو؟""

""میں گورکن ہوں۔""

اگر کوئی شخص اپنی چھاتی پر لگنے والا توپ کا گولا برداشت کر سکتا ہو، تو ویسا ہی منہ بنائے گا جیسا کہ اس وقت فو شلوون نے بنایا تھا۔

""گورکن؟""

""ہاں۔""

""تم؟""

""ہاں میں۔""

""گورکن تو فادر Mestienne ہے۔""

""کبھی تھا۔""

""کیا مطلب — وہ کبھی تھا؟""

""وہ مر گیا ہے۔""

Mestienne سے وہ کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا سوائے اس کے، کہ ایک گورکن مر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گورکن خود بھی مر سکتے ہیں۔دوسروں کی قبریں کھودتے کھودتے، لوگ اپنی قبر بھی کھود لیا کرتے ہیں۔

فو شلوون حیرانی کے عالم میں بھاڑ سا منہ کھولے کھڑا تھا۔اس میں ہکلانے کی بھی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔

""مگر، یہ ممکن نہیں۔""

""مگر، ایسا ہی ہے۔""

""مگر...."" اس نے ہچکچاتے ہوئے اصرار کیا، ""یہاں کا گورکن تو فادر Mestienne ہے۔""

"نپولین کے بعد، لوئی شانزدہم آتا ہے۔ Mestienne کے بعد Gribier۔
ارے دہقان، میرا نام Gribier ہے۔"
فوشلوون نے، جو کسی مردے کی طرح زرد پڑ گیا تھا، Gribier کو گھور کر دیکھا۔
وہ ایک قد آور، دبلا پتلا، سُرمئی رنگ کا، بالکل ماتمی سا آدمی تھا۔ اس کا انداز کسی ناکام ڈاکٹر کا سا تھا جو گورکنی کا کام کرنے لگا ہو۔
فوشلوون نے اچانک زوردار قہقہہ لگایا۔
"اچھا!" اس نے کہا "کیسی عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔ فادر Mestienne مر چکا ہے، مگر زندہ باد فادر Lenoir۔ تم فادر Lenoir کو جانتے ہو؟ وہ تو سُرخ وائن کا جگ ہے۔ وہ فسادی، جگ ہے Surene کا! پیرس کا اصلی Surene! او اچھا، تو بے چارہ Mestienne مر گیا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے، بڑا خوش مزاج آدمی تھا، مگر تم بھی تو خوش مزاج آدمی لگتے ہو۔ کیا ہم آپس میں دوست نہیں بن سکتے؟ فی الحال تو ہم دونوں جا کر کچھ پیتے پلاتے ہیں۔"
اس آدمی نے جواب میں کہا "میں طالب علم رہا ہوں۔ میں نے اپنا چوتھا امتحان پاس کر لیا ہے۔ میں مے نوشی نہیں کرتا۔"
میت گاڑی ایک بار پھر چل پڑی تھی، اور قبرستان کی شان دار سڑک پر لڑھکتی جا رہی تھی۔
فوشلوون کی چال سُست پڑ گئی تھی۔ اب، وہ کم زوری نہیں پریشانی کے باعث زیادہ لنگڑا رہا تھا۔
گورکن اس کے آگے چل رہا تھا۔
فوشلوون نے ایک بار پھر Gribier کو پینے پلانے کی کوشش کی۔
وہ ان لوگوں میں سے تھا، جو کم عمر ہوتے ہوئے بھی، عمر رسیدہ لگنے لگتے ہیں، اور دبلے پتلے ہونے کے باوجود بہت مضبوط نظر آتے ہیں۔
"یارا" نے تقریباً چیخ کر کہا تھا۔
وہ آدمی مُڑا۔
"میں خانقاہ کا گورکن ہوں۔"
یعنی، میرے ساتھی ہو۔" آدمی نے جواب میں کہا۔
فوشلوون جو جاہل مگر بہت تیز آدمی تھا، سمجھ چکا تھا کہ اس کا پالا کسی بھیانک قسم کی مخلوق سے پڑا ہے، جو خاصا باتونی بھی ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا

''اچھا، تو فادر Mestienne مر گیا ہے۔''

آدمی نے جواب میں کہا، ''مکمل طور پر۔ خدا اپنی کتاب میں دیکھتا ہے، جس میں ہر ایک کے وقت کا پورا ہونا لکھا ہوتا ہے۔ اس وقت فادر Mestienne کی باری تھی۔ سو فادر کا انتقال ہو گیا۔''

فوشلوون نے مشینی انداز میں دہرایا، ''ہمارا اچھا خدا—''

''ہمارا اچھا خدا۔'' اس آدمی نے تحکم کے انداز میں کہا، ''فلسفیوں کے مطابق، ہمارا ابدی خدا؛ Jacobins کے مطابق، سب سے برتر وجود۔''

فوشلوون نے ہکلاتے ہوئے کہا، ''کیوں نہ ہم ذرا ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں؟''

''ہماری واقفیت تو کب کی ہو چکی ہے۔ تم دہقان ہو، اور میں پیرس کا باسی ہوں۔''

''لوگ ایک دوسرے سے اس وقت تک واقف نہیں ہوتے جب تک کہ ایک ساتھ مے نوشی نہ ہو جائے۔ وہ جو اپنا جام خالی کر دیتا ہے اپنا دل بھی خالی کر دیتا ہے۔ تم کو میرے ساتھ مے نوشی کرنی چاہیے۔ ایسی پیش کش رد نہیں کی جاتی۔''

''پہلے کام، بعدۂ طعام۔''

فوشلوون کو ایسا محسوس ہوا گیا، ''میں گم ہو گیا ہوں۔''

راہباؤں کا کونا زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔

''دہقان! میرے سات بچے ہیں جن کو مجھے کھلانا پہنانا ہوتا ہے۔ چوں کہ ان کی غذا زیادہ ضروری ہوتی ہے اس لیے میں پی پلا نہیں سکتا۔''

اور اس نے، اس آدمی کی طرح اپنی بات بڑھائی جو خوب صورت جملے بول سکتا ہے،

''ان کی بھوک میری پیاس کی دشمن ہے۔''

میت گاڑی شمشاد کے درختوں کے اطراف سے گزرتی ہوئی، بڑی سڑک کو چھوڑ کر ایک تنگ گلی میں، اور پھر ویران علاقے میں داخل ہو کر ایک جھاڑی میں گھس گئی۔ اس سے قبر کے مقام کی قربت کا پتا چل رہا تھا۔ فوشلوون نے اپنی رفتار کم کر دی تھی، مگر وہ میت گاڑی کو روک نہیں سکا تھا۔ خوش قسمتی کہ سرما کی بارش سے نم ہونے والی مٹی گاڑی کے پہیے میں پھنس گئی، اور اس کی رفتار کم ہو گئی تھی۔

وہ ایک بار پھر گورکن سے مخاطب ہوا۔

''ان کے پاس اتنی اعلیٰ درجے کی وائن ہے۔'' فوشلوون نے دھیمی آواز میں کہا۔

''دہقان!'' اس آدمی نے پلٹ کر کہا، ''مجھے گورکن نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرا باپ Prytaneum کے ٹاؤن ہال میں دربان تھا۔ اس نے مجھے ادب پڑھنے پر لگا دیا تھا، مگر اس پر

بُرا وقت پڑا تھا۔اس کے پاس فالتو رقم کی کمی تھی۔مجبوراً مجھے مصنف کے پیشے کو چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ مگر، میں عوام میں اب بھی ادیب ہی ہوں۔"

"تب تو تم گورکن نہیں ہوئے،" فوشلوون نے اس کے نازک بازو کو تھامتے ہوئے کہا۔

"کسی کو دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔ I cumulate"

فوشلوون اس کے آخری جملے کو سمجھ نہیں سکا۔"آؤ، ذرا کچھ پی لیتے ہیں" اس نے کہا۔

اس مرحلے پر ایک بات کہنا ضروری ہے، جو کچھ بھی پریشانی رہی ہو فوشلوون مے نوشی کی دعوت تو دے رہا تھا مگر یہ نہیں بتا رہا تھا کی اس کی قیمت کون ادا کرے گا۔ ماضی میں عام طور پر پیش کش فوشلوون کرتا تھا مگر قیمت فادر Mestienne چکایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی فوشلوون قیمت ادا کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے وہ بہت مشکل میں تھا۔

گورکن نے مسکراتے ہوئے کہا:

"کھانا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔میں فادر Mestienne کی رجعت کو تسلیم کرتا ہوں۔ جب تعلیم مکمل ہوجاتی ہے تو آپ فلسفی بن جاتے ہیں۔ہاتھ سے مزدوری کرنے والے کے بازو کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ Sevres اسٹریٹ کے بازار میں میری کتابت کی دکان ہے۔ تم نے Umbrella مارکیٹ دیکھی ہے۔سارے ریڈ کراس والے میرے ہی پاس آتے ہیں۔ محبت ناموں سے لے کر سپاہیانہ وعدے تک، سب کچھ میں ہی لکھتا ہوں۔ صبح کے وقت میں عشقیہ خطوط لکھتا ہوں؛ شام کے وقت قبریں کھودتا ہوں۔ دیہاتی! ایسی زندگی ہے میری۔"

میت گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔فوشلوون شدید بے چینی کے عالم میں اس کے اطراف بار بار دیکھ رہا تھا۔اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"مگر" گورکن کہہ رہا تھا، "کوئی شخص دو معشوقائیں نہیں رکھ سکتا۔ مجھے قلم اور کدال میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کدال میرے ہاتھ برباد کیے دے رہی ہے۔"

میت گاڑی رُک گئی تھی۔

میت گاڑی کے عقب میں چلنے والی سوگواروں کی گاڑی سے پہلے سر ودگاہ کا لڑکا باہر نکلا، اس کے بعد پادری برآمد ہوا۔

گاڑی کے اگلے پہیوں میں سے ایک پہیہ مٹی کے ڈھیر میں دھنس گیا تھا، جس کے پرے کھلی قبر دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا مذاق ہے، یہ بھی!" خوف اور حیرت کے ملے جلے لہجے میں فوشلوون دہرا رہا تھا۔

چار تختوں کے درمیان

تابوت کے اندر کون تھا؟ قاری کو معلوم ہے۔ ژاں ولیواں تھا۔

ژاں ولیواں نے اس طرح سارے انتظامات کر لیے تھے کہ وہ تابوت میں زندہ رہ سکتا تھا، تقریباً سانس بھی لے سکتا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ ضمیر کا احساسِ تحفظ بقیہ ہر شے کو بھی احساسِ تحفظ فراہم کر دیتا ہے۔ گزرے دن کا، ژاں ولیواں کا سوچا سمجھا ہر منصوبہ مکمل ہو رہا تھا۔ فو شلوون کی طرح وہ بھی فادر Mestienne پر انحصار کر رہا تھا۔ اسے اپنے بچ نکلنے پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ پہلے، نہ کبھی ایسی تشویش ناک صورت پیدا ہوئی تھی، نہ کبھی اتنا اطمینان ہوا تھا۔

تابوت کے چار تختے ایک قسم کا خوف ناک امن پیش کر رہے تھے، مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا، گویا مرنے والے کے آرام جیسی کوئی شے ژاں ولیواں کے سکون میں بدل گئی تھی۔

تابوت کی گہرائی میں لیٹے ہوئے بھی وہ اس خوف ناک کھیل کے تمام ادوار سے واقف تھا، جو موت کے ساتھ کھیلے جا رہے تھا۔

فو شلوون اوپری تختے پر کیل جڑ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ژاں ولیواں کو محسوس ہوا کہ اسے باہر لے جایا جا رہا ہے، اور پھر گاڑی کا سفر شروع ہوا۔ جھٹکوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پکی سڑک سے اتر کر کچی سڑک میں داخل ہو گیا ہے۔ دھیمی آوازوں سے اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ Austerlitz کا پُل پار کر رہے ہیں۔ پہلے پڑاؤ پر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں؛ دوسرے پڑاؤ پر اس نے خود سے کہا تھا، "اب قبر آ گئی ہے۔"

اچانک اسے تابوت کو پکڑنے والے ہاتھوں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ پھر تختوں میں لگنے

والی رگڑ کی سی آواز سنائی دی۔اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ آواز رسی کی ہے جو تابوت کو قبر میں اتارنے کے لیے باندھی جا رہی ہے۔

پھر اسے کچھ چکر سا محسوس ہوا۔

شاید تابوت اٹھانے والے اور گورکن کے ہاتھوں سے تابوت پھسل گیا تھا، اور تابوت کے پیروں والے حصے کے بجائے سر والا حصہ نیچا ہو گیا تھا۔جب اسے افقی انداز میں چلنے کی کیفیت محسوس ہوئی تو وہ پوری طرح ٹھیک ہو گیا۔اب وہ قبر کی سطح پر پہنچ گیا تھا۔

اب اسے ٹھنڈک جیسی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔

اوپر سے برف جیسی سنجیدہ آواز سنائی دی۔اسے لاطینی الفاظ سنائی دے رہے تھے، مگر انھیں سمجھ نہیں پا رہا تھا، مگر ایک کے بعد دوسرا لفظ، اتنی آہستگی سے آ رہا تھا کہ وہ انھیں صاف سن سکتا تھا، ''وہ جو زمین کی خاک پر سو رہے ہیں، ایک دن اٹھیں گے۔کچھ کو ابدی زندگی نصیب ہو گی، اور کچھ رُسوا ہوں گے، اور ہمیشہ کی رسوائی میں ہی رہیں گے۔''

بچکانہ آواز نے کہا'' گہرائیوں سے نکلیں گے۔''

''سنجیدہ آواز پھر بولی، ''اس کو ابدی سکون عطا فرما، میرے آقا۔''

بچکانہ آواز نے جواب میں کہا''اور اس کو اپنی ابدی روشنی عطا فرما۔''

پھر تختوں پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز سنائی دی۔شاید مقدس پانی چھڑکا جا رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا:

'یہ سب جلد ہی ختم ہو جائے گا۔' صبر کر صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں'۔جلد ہی پادری رخصت لے گا، فوشلوون اپنے دوست Mestienne کو پینے پلانے لے جائے گا۔میں اسی طرح چھوڑ دیا جاؤں گا۔پھر فوشلوون اکیلا واپس آئے گا، اور میں باہر آ جاؤں گا۔اس میں تقریباً ایک گھنٹا لگ جائے گا۔'

سنجیدہ آواز نے مزید کہا''خدا اس کی مغفرت کرے۔''

بچے کی آواز نے کہا،'' آمین!''

ژاں ولژاں کان لگائے سن رہا تھا۔اس کو واپس جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

'اب وہ واپس جا رہے ہیں۔' اس نے سوچا، 'اور میں اکیلا ہوں۔'

اچانک اسے بادلوں کی گرج جیسی آواز سنائی دی۔

تابوت پر پھاوڑے بھر مٹی گری۔

دوسری بار پھر مٹی گری۔

جن سوراخوں سے وہ سانس لے رہا تھا، ان میں سے ایک بالکل بند ہوگیا۔

تیسری بار مٹی گری۔

پھر چوتھی بار مٹی گری۔

یہ وہ چیزیں تھیں، جو طاقت ور ترین آدمی کے لیے بھی بہت زیادہ ہو جاتی ہیں۔

ژاں ولژاں بے ہوش ہوگیا تھا۔

اپنا کارڈ کبھی نہ کھونا

جس تابوت میں ژاں دیلواں دراز تھا اس کے اوپر جو گزری اس کے تفصیل ملاحظہ ہو۔

جب میت گاڑی جا چکی، جب پادری اور سرود گاہ کا لڑکا سوگواروں کی گاڑی میں داخل ہو کر چلا گیا، فوشلوون نے، جس کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی گورکن پر سے ہٹی نہیں تھیں، اس کو جھک کر اپنا بیلچہ اٹھاتے دیکھا، جو مٹی کے ڈھیر میں گڑا ہوا تھا۔

فوشلوون کو بہت دور کی سوجھی۔

وہ قبر اور گورکن کے درمیان بازو باندھے تن کر کھڑا ہو گیا اور کہا، "میں ہی ادا کروں گا۔"

گورکن نے اس کی طرف استعجاب سے دیکھا، اور جواب دیا، "دہقان، کیا ادا کرو گے؟"

فوشلوون نے اپنی بات دہرا دی، "میں ہی ادا کروں گا۔"

"کیا؟"

"وائن کی قیمت۔"

"کس وائن کی قیمت؟"

"Argenteuil وائن کی قیمت۔"

"کہاں ہے Argenteuil؟"

"Bon Coing میں۔"

"جاؤ جہنم میں۔" گورکن نے کہا۔

اور ایک پھاوڑے بھر مٹی تابوت پر پھینک دی۔

تابوت سے کھوکھلی سی آواز آئی۔ فوشلوون نے خود کو لڑکھڑاتا محسوس کیا، اور سر کے بل

قبر میں گرنے ہی والا تھا۔ ایسی آواز میں چلایا جس میں موت کی گھٹی گھٹی آواز شامل ہو چلی تھی، کہا، ''دوست! قبل اس کے کہ Bon Coing بند ہو جائے!''

گورکن اپنے پھاوڑے میں کچھ مٹی اور بھر رہا تھا۔ فوشلوں نے اپنی بات جاری رکھی، ''میں ہی ادا کروں گا۔''

اور اس نے گورکن کا بازو پکڑ لیا۔

''سنو، میرے دوست! میں خانقاہ کا گورکن ہوں۔ میں تمھاری مدد کرنے آیا ہوں۔ یہ کام تو رات میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ آؤ، ہم اس کی ابتدا مے نوشی سے کرتے ہیں۔''

جس وقت وہ بول رہا تھا، اور اصرار پر بضد تھا، اس پر ایک غم انگیز تصور طاری ہوا: 'اور، اگر یہ پیتا ہے، تو کیا یہ مدہوش ہو جائے گا؟'

''دہقانی! اگر واقعی تم اس پر اصرار کر رہے ہو تو میں، وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اکٹھے بیٹھ کر پئیں گے، مگر کام کے بعد، اس سے پہلے ہرگز نہیں۔''

اور اس نے تیزی سے اپنا بیلچہ اٹھایا۔ فوشلوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''تو Argenteuil طے رہی، چھ بجے!''

اوہ! گورکن نے کہا ''تم تو گھنٹی بجانے والے ہو۔ ڈنگ ڈانگ، ڈنگ ڈانگ، بس تم یہی کہہ سکتے ہو۔ جاؤ، سولی پر چڑھ جاؤ۔''

ساتھ ہی اس نے بیلچہ بھر اور مٹی ڈال دی۔

فوشلوں اب اس نقطے پر پہنچ گیا تھا کہ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

''آؤ یار، پینے چلیں اس نے چیخ کر کہا ''اس لیے کہ میں ہی اس کی قیمت ادا کروں گا۔''

''اس وقت جب ہم اس بچے کو بستر میں لٹا دیں گے تب۔''

اس نے ایک بیلچہ بھر مٹی اور ڈال دی۔

اس کے بعد اس نے بیلچے کو مٹی کے ڈھیر میں گاڑ دیا، اور کہا:

''آج رات سرد ہو گی، اور اگر ہم نے اسے بغیر رضائی کے گاڑ دیا تو میت چیخے گی۔''

اور جب وہ اپنا بیلچہ بھر رہا تھا، گورکن آگے کو جھکا، اور اس کی واسکٹ کی جیب کھل گئی تھی۔ بالکل میکانکی انداز میں فوشلوں کی تیز نظریں اس کی جیب میں پڑیں اور وہیں رک گئیں۔

سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا؛ اب بھی اتنی روشنی موجود تھی کہ اس نے اس کے منہ کھولے جیب میں رکھی کوئی شے پہچان لی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اور جب گورکن بیلچے

میں مٹی بھرنے میں مصروف تھا اس نے نظر بچا کر اس کی جیب سے وہ شے نکال لی تھی۔

گورکن نے چوتھی بار بیلچہ بھر مٹی قبر میں ڈال دی۔

جوں ہی گورکن پانچویں بار مٹی ڈالنے کے لیے مڑا تو فوشلوون نے پُرسکون انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا، ''نووارد، کیا تمھارے پاس تمھارا گورکن کا کارڈ ہے؟''

''کیسا کارڈ؟''

سورج ڈوبنے والا ہے۔

''اچھا ہے اسے اپنی نائٹ کیپ پہننی ہوگی۔''

''قبرستان کا پھاٹک فوراً ہی بند ہو جائے گا۔''

''اچھا، تو پھر کیا ہوگا؟''

''کیا تمھارے پاس کارڈ ہے؟''

''اوہ، میرا کارڈ؟'' گورکن نے کہا۔

اور وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ ایک جیب کی تلاشی کے بعد دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے بعد خفیہ جیبوں کی تلاشی لی۔

''کیوں، نہیں!'' اس نے کہا، ''میرے پاس کارڈ تو نہیں۔ میں لانا بھول گیا ہوں گا۔''

''پندرہ فرانک جرمانہ۔'' فوشلوون نے کہا۔

گورکن یہ سُن کر حواس باختہ ہو گیا۔

''اوہ! یسوع مسیح — میرے خدا!'' وہ چیخ پڑا، ''پندرہ فرانک جرمانہ؟''

''ہاں، سو ہو کے، تین سکے۔''

گورکن نے اپنا بیلچہ پھینک دیا۔

اب فوشلوون کی باری تھی۔

''اوہ، چلو نووارد!'' فوشلوون نے کہا، ''پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ قبر کے فائدے کے لیے خودکشی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ پندرہ فرانک پندرہ فرانک ہوتے ہیں، اور شاید تم ادا کرنے کے قابل بھی نہ ہو گے۔ میں پرانا آدمی ہوں، تم نئے ہو۔ میں ساری رسموں اور آلوں سے واقف ہوں۔ میں تمھیں ایک دوستانہ مشورہ دوں گا۔ ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ سورج ڈوبنے والا ہے۔ قبرستان مزید پانچ منٹ بعد بند ہو جائے گا۔''

''یہ سچ بات ہے۔'' اس آدمی نے جواب دیا۔

مزید پانچ منٹ، اور تمھارے پاس قبر بھرنے کا وقت نہیں رہے گا، یہ تو شیطان کی آنت ہے، اور پھاٹک بند ہونے سے پہلے یہاں سے نکلنا بھی ضروری ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اس صورت میں، پندرہ فرانک جرمانہ کیسا رہے گا؟"

"پندرہ فرانک؟"

"مگر ابھی وقت ہے، پر تم رہتے کہاں ہو؟"

"رُکاوٹ سے چند قدم آگے، یہاں سے پندرہ منٹ۔ نمبر 89 Vaugirard"

"تمھارے پاس تیزی سے دوڑ کر جانے کے لیے وقت ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"پھاٹک سے نکلتے ہی تم دوڑ کر اپنے گھر جاؤ، اپنا کارڈ نکالو، واپس آؤ، قبرستان کا دربان تم کو اندر آنے کی اجازت دے گا۔ چوں کہ تمھارے پاس کارڈ ہوگا، کچھ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ اور تم میت کو دفن کر دو گے۔ اس دوران میں تمھاری طرف سے نگہبانی کروں گا، تا کہ مُردہ کہیں بھاگ نہ جائے۔"

"میں زندگی بھر تمھارا احسان نہیں بھولوں گا، دہقان!"

"بھاگو۔" فوشلوواں نے کہا۔

گورکن بار احسان اُٹھائے، سر ہلاتا دوڑتا ہوا گیا۔"

جب وہ آدمی جھاڑیوں میں گم ہو گیا، فوشلوواں اس وقت تک کان لگائے سنتا رہا، جب تک اس کے قدموں کی چاپ آنی بند نہ ہو گئی۔ پھر وہ قبر کے قریب جا کر جھکا، اور دھیمی آواز میں کہا، "فادر میڈیلین!"

کوئی جواب نہیں آیا۔

فوشلوواں خوف سے کانپنے لگا۔ قبر میں داخل ہونے کے بجائے لڑکھڑایا، خود کو تابوت پر گرا دیا اور چیخا، "آپ کہاں ہیں؟"

تابوت میں بالکل خاموشی تھی۔

فوشلوواں مشکل سے سانس لے پایا تھا، کہ اس نے اپنی چھینی اور ہتھوڑی نکالی اور تابوت کا ڈھکنا کھول دیا۔

دھندلکے میں ژاں ویلژاں کا چہرہ نظر آیا؛ چہرہ زرد تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

خوف سے فوشلوون کے سر کے بال کھڑے ہو گئے، وہ خود بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور فوراً ہی قبر کے کنارے گر پڑا۔ ابھی غش کھا کر تابوت پر گرنے ہی والا تھا کہ اس نے ژاں ولژاں کو گھور کر دیکھا۔

ژاں ولژاں اب بھی زرد اور بے حس و حرکت تھا۔

فوشلوون نے دھیمی آواز میں خود سے کہا، "یہ شخص مر چکا ہے۔"

اس نے اٹھتے ہوئے اپنے بازو اتنی شدت سے بھینچے کی اس کی مٹھیاں اس کے بازوؤں سے جا لگیں، اور وہ چیخ پڑا:

"یہ کون سا طریقہ ہے، جس سے میں نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی ہے؟"

تب وہ بے چارہ سسکیاں لینے لگا۔ ایک لمحے کے لیے وہ کسی ڈرامے کی طرح خود کلامی کرنے لگا، کہ یہ قیاس کرنا غلطی ہوتی ہے کہ خود کلامی ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ طاقت ور جذبات اکثر بلند آواز میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔

یہ تو سراسر فادر Mestienne کی غلطی ہے۔ وہ احمق مر کیوں گیا؟ عین اس وقت جب کوئی اس کی توقع نہیں کر رہا تھا، اس نے اپنی جان کیوں دے ڈالی؟ وہی ہے، جس نے موسیو میدلین کو قتل کیا ہے۔ فادر میدلین! بے چارہ تابوت میں لیٹا ہے۔ اب سب کچھ بالکل آسان ہو گیا ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ کیا اب کچھ باقی رہا ہے؟ او میرے خدا! یہ مر گیا ہے! اچھا، تو میں اب اس چھوٹی سی بچی کا کیا کروں؟ وہ میوہ فروش سے کیا کہے گی؟ ایسے آدمی کا اور اس کیفیت میں مر جانا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس نے اس دن، اپنے آپ کو گاڑی کے نیچے کس طرح ڈال دیا تھا؟ فادر میدلین! فادر میدلین! شاید، اس کا دم گھٹ گیا تھا۔ میں نے کہا تھا نا۔ وہ میری بات نہیں مانا۔ یہ بھی کوئی کھیل ہوا۔ وہ مر گیا ہے؛ اچھا آدمی؛ اچھے خدا کی تمام مخلوق میں سب سے اچھا آدمی! اور وہ چھوٹی سی بچی! سب سے پہلے تو میں خود ہی وہاں واپس نہیں جاؤں گا۔ اب تو میں یہیں رہوں گا۔ اس جیسا کام کرنے کے بعد! دو بوڑھوں کا ایک ساتھ زندہ رہنے کا فائدہ بھی کیا ہے، اگر ہم دونوں بیوقوف انسان ہیں، مگر سب سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ خانقاہ میں پہنچا کیسے تھا؟ وہی اس سب کی ابتدا تھی۔ آدمی کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ فادر میدلین! فادر میدلین! فادر میدلین! میدلین! موسیو میدلین! موسیو میئر! یہ شخص تو میری بات سن ہی نہیں رہا ہے۔ اب چلو، ممکن ہو تو یہاں سے بھاگ چلو!"

اور وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

درختوں کے پیچھے سے آنے والی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ قبرستان کے پھاٹک کے بند ہونے کی آواز تھی۔

فوشلوون، ژاں ولژاں پر جھک رہا تھا کہ اچانک پیچھے کی طرف ہو گیا؛ اس قدر پسپا ہوا، قبر کی جگہ جتنی اجازت دیتی تھی۔

ژاں ولژاں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔

کسی مردے کو دیکھنا کتنا ڈراؤنا ہوتا ہے؛ کسی کا دوبارہ زندہ ہونا بھی اتنا ہی ڈراؤنا ہوتا ہے۔ فوشلوون پتھر کا سا ہو گیا تھا، زرد، پراگندہ صورت، ضرورت سے زیادہ جذبات کا مارا، جسے اتنا بھی علم نہیں تھا کہ وہ کسی زندہ انسان کے سامنے ہے یا مردہ شخص، اور مسلسل ژاں ولژاں کی طرف گھور کر دیکھنے لگا، جو اس کو گھور رہا تھا۔

"میں سو گیا تھا" ژاں ولژاں نے کہا۔

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

فوشلوون نے گھٹنے ٹیک دیے۔

"اچھی، پیاری کنواری! آپ نے مجھے کتنا ڈرا دیا تھا!"

اور پھر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور چیخا، "شکریہ، فادر میڈلین!"

ژاں ولژاں صرف بے ہوش ہو گیا تھا اور تازہ ہوا نے اسے جگا دیا تھا۔

خوشی بھی آپ ہی آپ کم نہیں ہوا کرتی۔ فوشلوون کے اوسان درست ہونے میں بھی اتنا ہی وقت لگا جتنا کہ ژاں ولژاں کو لگا تھا۔

"یعنی آپ مرے نہیں ہیں؟ اُف! کتنے عقل مند ہیں آپ! میں نے آپ کو اتنا پکارا، کہ آپ واپس آ گئے ہیں۔ جب میں نے آپ کی آنکھیں بند دیکھیں تو میں نے خود سے کہا تھا، 'لو، یہ تو چل بسے ہیں'، مجھے واقعی پاگل ہو جانا چاہیے تھا؛ اتنا پاگل کہ مجھے جیکٹ میں جکڑ دیا جائے۔ یہ لوگ مجھے Bicetre میں بند کر دیتے۔ اگر آپ مر گئے ہوتے تو میں، آپ کے خیال میں کیا کرتا؟ اور آپ کی چھوٹی سی لڑکی کیا کرتی؟ اور اُدھر وہ میوہ فروش کیا کرتی، وہ تو کچھ سمجھ بھی نہ پاتی۔ بچی آپ کی گود میں ڈال دی جاتی۔ اور پھر، دادا جان انتقال کر جاتے ہیں۔ کیسی کہانی تھی! جنتی سینٹ لوگوں کی بھی کیا کہانی ہوتی ہے بھی۔ اوہ، آپ زندہ ہیں۔ یہی سب سے اچھی بات ہے۔"

"مجھے شدید سردی لگ رہی ہے۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

یہ جملہ سن کر فوشلوون پوری طرح حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا تھا، جس کی سخت

ضرورت تھی۔ یہ دونوں افراد بحال ہونے کے بعد بھی مشکل میں تھے، حالاں کہ انھیں اس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کے بارے میں کوئی پُراسرار بات ہوگئی تھی، جو اس جگہ کی نامبارک وحشت کی پیدا کردہ تھی۔

''ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔'' فوشلوون نے کہا۔

اس نے اپنے جیب سے خشک کدو کی تونبی نکالی، جس میں اس نے اپنے لیے تھوڑی سی برانڈی رکھ لی تھی۔

''مگر، پہلے دو چار قطرے پی لیے جائیں۔'' اس نے کہا۔

تونبی نے اس کیفیت کو ختم کردیا جو تازہ ہوا نے شروع کی تھی۔ ژاں والژاں نے برانڈی کا ایک گھونٹ لیا، اور اس کے ہوش و حواس واپس آگئے۔

وہ تابوت سے باہر نکلا اور ڈھکنے کو کیل سے جڑنے میں فوشلوون کی مدد کی۔

تین منٹ بعد وہ قبر سے باہر تھے۔

مزید یہ کہ فوشلوون پوری طرح بحال ہو چکا تھا۔ اس نے تھوڑا سا وقت لیا تھا۔ قبرستان بند ہو چکا تھا۔ گورکن Gribier کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ ''نوواردٗ'' اپنے گھر میں اپنے کارڈ کی تلاش میں مصروف تھا، جو اسے مل نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ وہ فوشلوون کی جیب میں تھا۔ بغیر کارڈ کے وہ قبرستان میں واپس آ نہیں سکتا تھا۔

فوشلوون نے بیلچہ اٹھایا، اور ژاں والژاں نے کدال، اور دونوں نے مل کر خالی تابوت کو دفن کردیا۔

قبر پوری ہوگئی تو فوشلوون نے ژاں والژاں سے کہا،

''اب ہمیں چل دینا چاہیے۔ میں بیلچہ اٹھاتا ہوں، آپ کدال لے چلیں۔''

رات ہوتی جا رہی تھی۔

ژاں والژاں کو ہلنے اور چلنے میں کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ تابوت میں ساکت لیٹے رہنے سے اس کا جسم اکڑ کر مُردے جیسا ہوگیا تھا۔ ان چار تختوں کے درمیان موت کی سختی اس پر چھا گئی تھی۔ اسے خود کو، ایک طرح سے، مزار سے نکال کر پگھلانے کی ضرورت تھی۔ ایک پیر میں لنگ تھا۔

''آپ بالکل سُن ہوگئے ہیں۔'' فوشلوون نے کہا، ''افسوس کہ میرے ایک پیر میں لنگ ہے، ورنہ میں تیزی سے نکل آتا۔''

''نہیں!'' ژاں والژاں نے جواب دیا، ''چار قدم چل لوں تو میرے پیروں میں جان

آجائے گی۔"

دونوں اسی گلی میں واپس چل پڑے جس سے میت گاڑی گزر رہی تھی۔ پھاٹک سے قبل فوشلوں نے گور کن کا کارڈ جو اس کے ہاتھ میں تھا، ڈبے میں ڈال دیا، دربان نے رسی کھینچی، پھاٹک کھل گیا اور وہ باہر نکل گئے۔

"کتنی خوبی سے سب کام ہوتا جارہا ہے۔" فوشلوں نے کہا، "کیا زبردست منصوبہ تھا آپ کا، فادر میڈیلن!"

وہ Vaugirard کے پھاٹک سے بڑی آسانی سے گزر گئے۔ قبرستان کے قریب، بیلچہ اور کدال پاسپورٹ کا درجہ رکھتے ہیں۔

Vaugirard اسٹریٹ پر ہو کا عالم تھا۔

"فادر میڈیلن!" فوشلوں نے راہ چلتے اور مکانوں کا نمبر پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "آپ کی آنکھیں میری آنکھوں سے بہتر ہیں۔ ذرا مجھے نواسی نمبر والا مکان بتایئے۔"

"ادھر ہے۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

"سڑک پر اس وقت کوئی نہیں ہے۔" فوشلوں نے کہا، "مجھے کدال دیجیے، اور چند منٹ میرا انتظار کیجیے۔"

فوشلوں اندازے سے اوپری منزل پر چڑھا اور بالا خانے کے دروازے پر دستک دی۔ "اندر آجاؤ" اندر سے آواز آئی۔

آواز Gribier کی تھی۔

Gribier نے دروازہ کھولا۔ گورکن کا مکان، آراستگی سے مبرا، تمام بدنصیبوں کے مکانوں جیسا بالا خانہ تھا۔ کموڈ کی جگہ ایک لکڑی کا ڈبا — شاید کوئی تابوت تھا — پینے کے پانی کے فوارے کی جگہ ایک butter-pot تھا؛ پیال کا بنا گدا بستر کی جگہ تھا، اور میز کرسی کی جگہ فرش۔ ایک کونے میں ایک بوسیدہ ٹکڑے پر، جو شاید پرانا قالین تھا، ایک دبلی پتلی عورت اور کئی بچے ڈھیر تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا مکان الٹ پلٹ دیا گیا ہو، جیسے یہاں زلزلہ آیا ہو۔ غلاف بکھرے، جگ ٹوٹا، ماں روتی ہوئی، بچے چیختے ہوئے، جیسے ان کو مارا پیٹا گیا ہو۔ یہ سب دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ گورکن اپنا کارڈ تلاش کر رہا تھا، اور، جگ سے لے کر اس کی بیوی تک، ہر ایک کو کارڈ کی گمشدگی کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ہر طرف مایوسی اور لاپروائی کا راج دکھائی دیتا تھا۔

فوشلوں جلدی میں تھا اور اپنی کامیابی کے اس مایوس پہلو کو جلد نظر انداز کر دینا چاہتا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوا اور کہا، ”میں تمھارا بیلچہ اور کدال لے آیا ہوں۔“

Gribier اس کو احمقانہ نظروں سے سے گھور رہا تھا۔

”یہ تم ہو، دہقان؟“

”اور کل تم کو تمھارا کارڈ قبرستان کے دربان کے پاس مل جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کدال اور بیلچہ فرش پر رکھ دیا۔

”اس کا مطلب؟“ Gribier نے سوال کیا۔

”اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمھارا کارڈ جیب سے گر گیا تھا، اور تمھارے جانے کے بعد مجھے ملا تھا، کہ میں نے مردے کو دفن کر دیا ہے، کہ میں نے قبر بھی بھر دی ہے، کہ میں نے تمھارا کام مکمل کر دیا ہے، اور یہ بھی کہ تمھیں پندرہ فرانک جرمانہ ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ سمجھے، میاں نووارد!“

”شکریہ، دہقان!“ دمکتے چہرے والے Gribier نے کہا

”اگلی بار مے نوشی میری جانب سے ہوگی۔“

کامیاب استفسار

ایک گھنٹے بعد، رات کے اندھیرے میں، دو آدمی اور ایک بچی 62-Petit- Picpus اسٹریٹ پر حاضر ہوئے۔ بڑی عمر والے نے دروازے پر دستک دی۔

وہ لوگ تھے، فوشلوون، ژاں ولجاں اور کوزیت۔

دونوں بزرگ کوزیت کو میوہ فروش کے گھر سے لانے کے لیے گئے تھے، جہاں، Chemin-Vert اسٹریٹ پر ایک دن قبل کوزیت پہنچا دی گئی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے کا عرصہ کوزیت کے لیے خاموشی سے لرزتے گزرا تھا، جب کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کا لرزہ اس درجے کا تھا کہ وہ رونے لگی تھی۔ اس دوران اس نے نہ کچھ کھایا تھا اور نہ سوئی تھی۔ نیک میوہ فروش نے اس سے سیکڑوں سوالات کر ڈالے تھے مگر سوائے غم انگیزی اور مسلسل گھورنے کے اس سے کچھ اخذ نہیں کیا جا سکا تھا۔ کوزیت نے پچھلے دو دنوں میں جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اسے فاش نہیں کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ ایک سخت نوعیت کے بحران سے گزر رہے تھے۔ اسے اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ اس دوران اس کا 'اچھا رہنا' ضروری تھا۔ اکثر لوگوں کو ان دو لفظوں کے ایسے تحکم کا تجربہ ہوا ہو گا، جنھیں ایک مخصوص لہجے میں کسی چھوٹے سے بچے کے کان میں ڈال دیا جاتا ہے: بولنا نہیں! خوف تو یوں بھی گونگا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کوئی بچے کی طرح راز نہیں رکھ پاتا۔

مگر جب ایسے غمگین چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد ژاں ولجاں نظر پڑا، تو وہ اس طرح کی خوشی سے چیخی تھی کہ کوئی بھی سمجھ دار آدمی اس کو پاتال سے آتی چیخ ہی سمجھتا۔

فوشلوون خانقاہ سے متعلق تھا اور اسے خفیہ الفاظ کا علم تھا۔ اور اس کے لیے سارے دروازے کھلتے چلے گئے۔

اس طرح وہ دہرے اور پریشان کن مسائل حل کر لیے گئے تھے— کیسے نکلا جائے اور کیسے واپس داخل ہوا جائے۔

دربان کو ہدایات مل چکی تھیں اور اس نے، صحن اور باغیچے کو ملانے والا ملازمین کا چھوٹا دروازہ کھول دیا تھا، جسے آج تیس برس بعد بھی سڑک سے دیکھا جا سکتا ہے جو گاڑی کے داخلے کے پھاٹک کے سامنے کی دیوار میں تھا۔

دربان نے ان لوگوں کو اسی دروازے سے داخل کیا۔ وہاں سے وہ اس پارلر تک جا سکتے تھے جہاں پچھلے روز فوشلوون کو نائب منتظم راہبہ کی جانب سے احکامات مل چکے تھے۔

تسبیح بدست محترم منتظم راہبہ ان کے انتظار میں تھی۔ ایک ناطق مادر، اپنی نقاب نیچی کیے، اس کے پہلو میں موجود تھی۔

ایک مختصر سی شمع نے پورا پارلر روشن کر دیا تھا۔

نائب منتظم راہبہ نے ژاں ولژاں کو نظرثانی کے بعد قبول کر لیا تھا۔ نیچی نظروں سے بہتر تفتیش کرنے والی کوئی شے نہیں ہوتی۔

اس کے بعد اس نے ژاں ولژاں سے سوال کیا، ''تم ہی وہ بھائی ہو؟''

''جی ہاں، محترم مادر!'' فوشلوون نے جواب دیا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

فوشلوون نے جواب دیا، ''Ultime فوشلوون!''

فوشلوون کا اس نام کا واقعی ایک بھائی تھا جو مر چکا تھا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

فوشلوون نے جواب دیا،

''Amiens کے قریب کے علاقے Picquigny سے۔''

''تمھاری عمر کیا ہے؟''

فوشلوون نے جواب میں کہا، ''پچاس۔''

''تمھارا پیشہ کیا ہے؟''

فوشلوون نے جواب میں کہا، ''مالی۔''

''کیا تم اچھے عیسائی ہو؟''

فوشلوون نے جواب میں کہا، ''خاندان کا ہر شخص اچھا عیسائی ہے۔''

"یہ لڑکی تمھاری ہے؟"

فوشلوون نے جواب میں کہا، "جی ہاں، محترم مادر!"

"تم اس کے باپ ہو؟"

فوشلوون نے جواب میں کہا، "میں اس کا دادا ہوں۔"

ناطق مادر نے جھجک کر دھیمی آواز میں کہا، "یہ شخص جواب ٹھیک دے رہا ہے۔"

اس دوران ژاں ولژاں نے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔

نائب منتظم راہبہ نے کوزیٹ کو غور سے دیکھا اور بلند آواز میں ناطق مادر سے کہا تھا:

"یہ لڑکی بڑی ہو کر بدصورت ہوگی۔"

دونوں مائیں پارلر کے کونے میں چند دقیقے دھیمی آواز میں آپس میں مشورے کرتی رہیں۔ اس کے بعد نائب منتظم راہبہ مڑی اور بولی، "فادر Fauvent، کل تمھیں گھٹنے پر باندھنے والی ایک اور گھنٹی مل جائے گی۔ اب دو گھنٹیوں کی ضرورت ہوگی۔"

اس لیے دوسرے دن سے باغیچے میں دو گھنٹیاں بجنے لگیں اور راہبائیں اپنی نقابوں کے کونے اٹھانے کی شدید ترغیب کی مزاحمت نہیں کر سکتی تھیں۔ باغیچے کی دوسری جانب، پیڑوں کے نیچے، دو آدمی Fauvent اور دوسرا شخص، ایک ساتھ کام کرتے نظر آنے لگے تھے۔ یہ ایک بڑا واقعہ تھا، اور رہباؤں کی خاموشی کا ٹوٹنا اس جملے تک ہی محدود رہا تھا، "یہ مددگار رماقی ہے۔"

ناطق ماؤں نے اس میں اضافہ کر دیا تھا، "یہ فادر Fauvent کا بھائی ہے۔"

ژاں ولژاں باقاعدہ ملازم رکھ لیا گیا تھا؛ اس کو بھی گھٹنے کی گھنٹی مل گئی تھی؛ اس کے بعد سے وہ خانقاہ کا کارکن ہوگیا تھا۔ اس کا نام Ultime فوشلوون ہوگیا تھا۔

اس کی ملازمت کی سب سے اہم وجہ نائب منتظم راہبہ کا یہ تبصرہ تھا، "یہ لڑکی بڑی ہو کر بدصورت ہوگی۔"

نائب منتظم راہبہ جلد ہی کوزیٹ سے مانوس ہوگئی اور اس نے اسے اسکول میں خیراتی شاگرد کی حیثیت سے داخل کرا دیا۔

اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو سخت منطقی نہیں تھی۔

خانقاہ میں آئینوں کی اجازت نہ ہونا فضول ہے، اس لیے کہ عورتیں اپنے چہروں کا اچھا خاصا شعور رکھتی ہیں؛ اب وہ لڑکیاں جو اپنے حسن سے واقف ہیں، آسانی سے راہبہ نہیں بن سکتی ہیں؛ اچھی صورت کے تناسب سے یہ کام کارِ معکوس ہوگیا تھا، اور خوب صورت کے بجائے بدصورت

سے زیادہ امیدیں وابستہ کی جاتی تھیں۔ اب عام صورت کی لڑکیاں زیادہ پسندیدہ ہو گئی تھیں۔

اس پوری مہم نے فوشلوں کی اہمیت میں اضافہ کر دیا تھا؛ اسے تین گنا کامیابی ہوئی تھی؛ ژاں ولژاں کی نظروں میں، فوشلوں نے اسے بچا لیا اور پناہ دی تھی: اس گورکن Gribier کی نظروں میں جس نے خود سے کہا تھا "اس نے مجھے جرمانے سے بچا لیا۔" خانقاہ والیوں کی نظروں میں اس نے مادر Crucifixion کی قربان گاہ کے نیچے دفن ہونے کی وصیت پوری کرنے میں مدد فراہم کی تھی، اور جس نے قیصر کو باز پرس سے بچا لیا اور خدا کو مطمئن کر دیا تھا۔ ایک تابوت Petit-Picpus میں تھا جس میں ایک میت تھی، اور ایک تابوت Vaugirard قبرستان میں تھا جس میں کوئی میت نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کی سخت قانون شکنی ہوئی تھی، مگر کسی کو اس کا علم نہیں ہوا تھا۔

فوشلوں کے لیے خانقاہ کا تشکر بہت بڑی بات تھی۔ فوشلوں خانقاہ کا سب سے اچھا خدمت گار اور بہترین مالی بن گیا تھا۔ آرچ بشپ کی آئندہ آمد کے موقعے پر نائب ناظم راہبہ نے سارا معاملہ اس کے گوش گزار کر دیا، جو ایک قسم کا اعتراف بھی تھا، ساتھ ہی اپنے کام کی لن ترانی بھی۔ خانقاہ سے واپسی پر اس نے سرگوشی میں اور منظوری کے ساتھ Reims کے آرچ بشپ اور کارڈینل کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ فوشلوں کی تعریف اس حد تک پھیلی کہ روم تک جا پہنچی تھی۔ ہماری نظروں سے اس وقت کے پاپائے اعظم، لیو دوازدہم کا پیرس کے Nuncio میں اپنے ایک رشتے دار Della Genga کے نام ایک نوشتہ گزرا ہے جس میں یہ سطریں بھی شامل تھیں؛ "معلوم ہوا ہے کہ پیرس کی ایک خانقاہ میں Fauvent نام کا ایک لاجواب مالی ہے، جو نہایت مذہبی انسان بھی ہے۔" اس کامیابی کی گونج فوشلوں کی جھونپڑی تک نہیں پہنچی تھی؛ وہ اپنی اس فضیلت اور تقدس سے بے خبر، قلم لگانے، خود رو گھاس اکھاڑنے، خربوزے کے تھالے ڈھانکنے میں مصروف رہا۔ اس غریب کو اتنی توصیف بھی نصیب نہیں ہوئی جتنی کہ Durham یا Surrey کے اس بیل کو لندن کے مشہور اخبار میں نصیب ہوئی تھی، جب بیل کی تصویر کے نیچے لکھا گیا تھا:
"وہ بیل جسے Cattle Show میں انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔"

خانقاہی زندگی

کوزیت نے خانقاہ میں اپنی زبان بالکل بند رکھی۔

یہ بات بالکل فطری تھی کہ کوزیت خود کو کوزیت کی لڑکی سمجھے۔ اور چوں کہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی،اور پھر اس معاملے میں اسے کچھ کہنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں بچوں کو خاموشی کی تربیت دینے میں بدقسمتی سے زیادہ کوئی شے موثر نہیں ہوتی۔ کوزیت نے اتنے دکھ سہے تھے کہ اسے ہر شے سے خوف آنے لگا تھا، حتیٰ سانس لینے یا بولنے سے بھی۔ ایک واحد لفظ بھی اس پر پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑتا تھا۔ جب سے وہ ژاں ولژاں کے ساتھ تھی، اسے اپنا اعتماد بحال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ تیزی سے خانقاہی زندگی کی عادی ہو گئی تھی۔ اسے صرف افسوس کیتھرین کا تھا، مگر اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ پھر بھی، ایک بار اس نے ژاں ولژاں سے کہا تھا، "بابا اگر مجھے یہ سب معلوم ہوتا، تو میں اسے بھی اپنے ساتھ لے آتی۔"

کوزیت کو خانقاہ کی طالب بن کر شاگردوں کے لباس میں ملبوس ہونا پڑا تھا۔ ژاں ولژاں اس کے لیے الگ لباس پہننے کی اجازت لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ وہی سوگ والا لباس تھا جسے پہن کر وہ تین آردیے کی سرائے سے نکلی تھی۔ وہ لباس اب بھی فرسودہ نہیں ہوا تھا۔ ژاں ولژاں نے یہ لباس، موزے اور جوتے، کافور کی گولیوں اور خانقاہ میں مروج خوش بوؤں سمیت ایک چھوٹی سی پیٹی میں بند کر کے رکھ دیے تھے۔ وہ پیٹی اس کے اپنے پلنگ کے قریب رکھی کرسی پر ہوتی تھی۔ اس کی کنجی وہ اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ کوزیت نے ایک بار اس سے پوچھا تھا، "بابا! اس پیٹی میں کیا چیز ہے جس سے اتنی اچھی خوش بو آتی ہے۔"

فادرفوشلوں کو اس کے اچھے کام کا جو صلہ اور جو شہرت ملی تھی، جس کا ہم ابھی مذکرہ کر چکے ہیں، جس کا اسے علم نہیں تھا، اس نے پہلے تو اسے خوش کر دیا تھا؛ دوسرے یہ کہ اس کے کام کا بوجھ کم ہوگیا تھا، اس لیے کہ اس میں ژاں ولواں کی شرکت ہوگئی تھی۔ آخر میں، چوں کہ اسے ناس لینا بہت پسند تھا، موسیو میدیلین کی موجودگی اس کے لیے فائدہ مند ہوئی تھی، کہ اسے اب یہ سہولت دن میں تین بار مہیا ہوتی تھی، وہ بھی نہایت آرام دہ کیفیت میں، اس لیے اور بھی کہ اس کی قیمت کا بار موسیو میدیلین اُٹھاتا تھا۔

راہبائیں Ultime کا نام نہیں لیتی تھیں؛ وہ ژاں ولواں کو دوسرا Fauvent کہتی تھیں۔

اگر ان دین دار عورتوں کو اس کا علم ہوجاتا جو جاویر نے دیکھا تھا، تو انھیں احساس ہو جاتا کہ جب بھی باغیچے سے متعلق خانقاہ سے باہر جانے کوئی کام ہوتا تھا، تو صرف بڑا فوشلوں بوڑھا، کم زور اور لنگ آدمی ہی جاتا تھا؛ مگر چوں کہ ان کی آنکھیں ہمہ وقت خدا پر مرکوز ہوتی تھیں انھیں جاسوسی کرنا نہیں آتا تھا، یا ہمہ وقت وہ ایک دوسرے پر نگاہ رکھنے میں اتنی مصروف ہوتی تھیں کہ ان کی اس امر کی طرف توجہ نہیں ہونے پاتی تھی۔

مزید یہ کہ ژاں ولواں کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اندر رہتا تھا، باہر نہیں جاتا تھا۔ جاویر نے اس علاقے پر ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک اپنی توجہ مرکوز رکھی تھی۔

ژاں ولواں کے لیے خانقاہ وہ جزیرہ تھی جس کے اطراف خلیجیں تھیں۔ لہٰذا اس کے لیے خانقاہ کی چار دیواریں ہی دنیا تھیں۔ اسے اپنے سکون کے لیے اور کوزیت کی خوشی کے لیے کافی آسمان دیکھنے کو مل جاتا تھا۔

اب اس کے لیے بہت اچھی زندگی کی ابتدا ہوگئی تھی۔

وہ فوشلوں کے ساتھ باغیچے کے کنارے بنی قدیم جھونپڑی میں رہتا تھا۔ پرانے گھاس پھوس سے بنے اس تنگ و تاریک جھونپڑے کے، جو 1845ء میں بھی موجود تھا، تین حصے تھے، جن میں دیوار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اگرچہ ژاں ولواں نے اس کے خلاف بہت اصرار کیا تھا، اس کا مرکزی حصہ جبراً موسیو میدیلین کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے کی دیوار کی زینت کے لیے، دو کیلوں کے علاوہ جو گھنٹیاں اور چھابی ٹانگنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں، زینت کے لیے چمنی والی دیوار پر شاہی کے زمانے کا 93' کا ایک بینک نوٹ لگا دیا گیا تھا۔

کاغذی دولت کا یہ نمونہ پچھلے مالی Chouan نے کیل سے لگایا تھا، جس کا انتقال خانقاہ کی ملازمت کے دوران ہوا تھا۔ اسی کی جگہ فوشلوں کا تقرر ہوا تھا۔

ژاں ولژاں روزانہ باغیچے میں کام کرتا تھا، اور اس نے خود کو کافی کارآمد بنا لیا تھا۔ پہلے بھی وہ درختوں کی تراش خراش کا کام کرتا تھا، اور ایک بار پھر مالی بن جانے پر بہت خوش تھا۔ قاری کو یاد ہوگا کہ اسے زراعت کے سارے رموز سے واقفیت تھی۔ اس نے اس واقفیت کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اس باغیچے کے کسی درخت میں کبھی قلم نہیں لگائی گئی تھی اور سب بے لگام بڑھتے جا رہے تھے۔ اس نے ان میں قلمیں لگائیں اور ان سے لاجواب میوے پیدا کیے۔

کوزیٹ کو اس کے ساتھ روزانہ ایک گھنٹا صرف کرنے کی اجازت تھی۔ چوں کہ بہنیں ہمیشہ غم زدہ رہتی تھیں، اور وہ بہت مہربان رہتا تھا، کوزیٹ ان کا تقابل کرتی اور اس شخص سے بہت محبت کرتی تھی۔ مقررشدہ وقت پر وہ اُڑ کر جھونپڑی میں پہنچ جاتی تھی۔ جب وہ اس خاک بسر جھونپڑے میں داخل ہوتی تو اسے گلزار کر دیتی تھی۔ ژاں ولژاں کھل اٹھتا تھا اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ کوزیٹ کو دی ہوئی خوشی خود اس کی خوشی میں بھی اضافہ کر دیتی تھی۔ اس مسرت میں جو ہم ولولے کی صورت پیدا کرتے ہیں، وہ دل فریب خاصیت ہوتی ہے کہ کم ہونا تو کجا، تمام تصورات کی طرح یہ ہم کو زیادہ دمکتی واپس ملتی ہے۔ تفریح کے اوقات میں ژاں ولژاں اسے دوڑتے کھیلتے دور سے دیکھا کرتا تھا، اور اسے دوسروں کی ہنسی کے مقابلے میں اس کی ہنسی ممتاز نظر آتی تھی۔

اس لیے کہ کوزیٹ اب ہنسنے لگی تھی۔

کسی حد تک کوزیٹ کے چہرے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ اداسی اس سے دور ہو گئی تھی۔ تبسم سورج کی کرن کی طرح ہوتا ہے؛ یہ انسان کے چہرے بشرے سے زمستان کو دور کر دیتا ہے۔

تفریح کے خاتمے کے بعد کوزیٹ گھر واپس چلی جاتی تھی۔ ژاں ولژاں اس کے کلاس روم کو غور سے دیکھتا، اور رات کے وقت اُٹھ کر اس کے سونے کے ہال کمرے کی کھڑکیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔

خدا کے اپنے طریقے ہیں؛ کوزیٹ کی صورت میں خانقاہ نے بھی ژاں ولژاں میں بشپ کے ابتدا کیے ہوئے کام کی تکمیل کی کر دی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ راست بازی ایک جانب سے فخر کے متصل ہوتی ہے۔ وہیں بدی کا بنایا ہوا ایک پُل بھی موجود ہوتا ہے۔ شاید لاشعوری طور پر ژاں ولژاں اسی جانب اور اس پُل کے پاس تھا، جب دور اندیشی نے اسے Petit-Picpus کی خانقاہ میں لا پھینکا تھا؛ اور جب تک وہ اپنا تقابل صرف بشپ سے کرتا رہا، وہ خود کو نااہل شخص سمجھتا تھا اور فروتن رہا تھا؛ مگر کچھ دنوں سے وہ اپنا تقابل عام لوگوں سے کرنے لگا تھا، اور اس میں تفاخر کے انکھوے پھوٹنے لگے تھے۔ کون جانے؟ ہوسکتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ نفرت کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔

خانقاہ نے تنزلی کے اس راستے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدم روک دیے تھے۔

یہ پابندی کی دوسری جگہ تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ اپنے جوانی کے دنوں میں جب اس کی زندگی شروع ہو رہی تھی، اور حالیہ دنوں میں ایک بار پھر، اسے دوسری جگہ دکھائی دی تھی — نہایت ڈراؤنی جگہ، ایک خوف ناک جگہ جس کی مشکلات اسے ہمیشہ انصاف کی نابرابری جیسی اور قانون کا جرم نظر آنے لگی تھیں۔ اب، گیلیو کے بعد اس کو خانقاہ نظر آئی تھی؛ اور جب اس نے اس امر پر غور کیا کہ وہ کس طرح گیلیو کا حصہ بنا تھا، اور اب وہ خانقاہ کا ناظر بن گیا تھا، وہ اپنے ذہن میں تشویش کے ساتھ دونوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

کبھی کبھی وہ اپنے بازو باندھ لیتا اور بیلچے یا اپنے کدال پر ٹیک کر لیتا تھا اور دن میں خوابوں کے لامتناہی پیچ دار زینے پر آہستہ آہستہ اترنے لگتا تھا۔

اسے اپنے سابقہ ساتھی یاد آنے لگتے تھے۔ کتنے بدقسمت تھے وہ لوگ؛ فجر کے وقت اٹھتے تھے، رات تک جفاکشی کرتے تھے؛ سونے کا مشکل سے موقع ملتا تھا؛ کیمپ کے پلنگوں پر پڑے رہتے تھے، جہاں سوائے دو انچ کے گدے کے کوئی اور شے برداشت نہیں کی جاتی تھی، ان کمروں میں رہتے تھے، جہاں سال کے صرف سخت ترین مہینوں میں گرمی پہنچانے کا انتظام ہوتا تھا؛ انھیں خوف ناک سرخ رنگ کے بلاؤز پہننے پڑتے تھے؛ گرم ترین موسم میں انھیں بڑی مہربانی کے طور پر سوتی پارچے کے پاجامے پہننے کی اجازت ہوتی تھی، اور جب سخت سردی ہوتی تھی تو پشت پر گاڑی بانوں کا جیسا اونی بلاؤز پہننے کو دیا جاتا تھا؛ نہ پینے کے لیے وائن ملتی تھی، نہ کھانے کے لیے گوشت، سوائے اس وقت کے جب وہ سخت مشقت کے کام پر لگائے جاتے تھے۔ وہ بے نام زندہ رہتے تھے، نمبروں سے پہچانے جاتے تھے، صفر میں تبدیل ہو جاتے تھے، ان کی آنکھیں جھکی ہوتی تھیں، آوازیں دھیمی ہوتی تھیں، سر گنجے ہوتے تھے اور لاٹھیوں اور رسوائیوں تلے زندہ رہتے تھے۔

تب اس کا ذہن اس مخلوق کی طرف مبذول ہوا جو اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔

یہ مخلوق بھی گنجے سروں، نیچی نظروں، دھیمی آوازوں کے باوجود زندہ تھی، رسوائی میں نہیں، مگر دنیا کے دھتکارے لوگوں کے درمیان، ان کی پشت لاٹھیوں کی چوٹوں سے نہیں، ان کے کاندھے نظم و ضبط کی دریدگی سے آلودہ تھے۔ آدمیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان کے نام غائب ہو گئے تھے؛ عام قسم کی عرفیتوں کے علاوہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا۔ کبھی گوشت نہیں کھاتی تھیں، کبھی وائن نہیں پیتی تھیں؛ کبھی تو شام تک بغیر غذا کے رہتی تھیں؛ وہ سُرخ بلاؤز میں نہیں، بلکہ سیاہ رنگ کی اونی چادروں میں ملبوس ہوتی تھیں، جو گرمی کے موسم میں بھاری اور سردی

کے موسم میں ہلکی ہوا کرتی تھیں، جن میں نہ اضافے کی اور نہ کمی کی اجازت ہوتی تھی؛ نہ موسم کے لحاظ سے سوتی کپڑے، یا گرم کوٹ دیے جاتے تھے؛ سال کے چھ ماہ انھیں سرج کی قمیص پہننی پڑتی تھی جس سے ان کو بخار ہو جاتا تھا۔ ایسے کمروں میں رہتی تھیں جسے صرف سخت سردی کے موسم میں گرم کیا جاتا تھا، ایسی کوٹھریوں میں جن میں کبھی آگ روشن نہیں کی گئی تھی؛ وہ دو انچ موٹے گدّوں پر نہیں پیال پر سوتی تھیں۔ اور آخر میں، انھیں اپنی نیند بھی میسر نہیں ہوتی تھیں؛ ہر شب، دن بھر کی مشقت کے بعد، جب وہ گہری نیند میں ہوتیں، اور ان کا جسم گرم ہونے لگتا تو انھیں اٹھا دیا جاتا تھا، اور گرجا گھر کے برف جیسے کمروں کے پتھروں پر گھٹنے کے بل کھڑے ہو کر دعائیں کرنی پڑتی تھیں۔

مخصوص دنوں میں اس مخلوق کے ہر فرد کو مسلسل بارہ گھنٹے تک گھٹنوں کے بل، یا سجدے کی کیفیت میں رہنا پڑتا تھا جس میں منہ زمین پر ہوتا تھا اور ہاتھ صلیب کے انداز میں پھیلے ہوتے تھے۔

پہلی مخلوق مرد تھی؛ اور یہ مخلوق عورت تھی۔

ان مردوں نے کیا کیا تھا؟ انھوں نے چوری کی تھی، تشدد کیا تھا، لوٹ مار کی تھی، عام قتل کیے تھے، سیاسی قتل کیے تھے۔ وہ لوگ ڈاکو تھے، جعل ساز تھے، قیدی تھے، آتش زن تھے، قاتل تھے، محسن کش تھے، غدار تھے۔

ان عورتوں نے کیا کیا تھا؟ انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

ایک جانب، شاہراہوں پر ڈکیتی تھی، دھوکے بازی تھی، عیاری تھی، تشدد تھا، شہوانیت تھی، قتل تھا، ہر قسم کی بے حرمتی تھی، ہر قسم کا جرم تھا؛ دوسری جانب صرف ایک شے تھی: صرف معصومیت!

مکمل معصومیت جنت کے پُراسرار قیاس میں گرفتار تھی، نیکی کے باعث زمین سے منسلک تھی اور کچھ آسمانی قسم کی تقدیس کی حامل بھی تھی۔

ایک طرف جرم پر یقین تھا، سرگوشیوں میں جس کا تبادلہ ہوتا تھا؛ دوسری طرف بہ آوازِ بلند غلطیوں کا اعتراف کیا جاتا تھا، اور وہ جرم کیا تھے! اور وہ غلطیاں کیا تھیں!

ایک طرف بدبو تھی؛ دوسری طرف ناقابلِ بیان خوش بو تھی۔ ایک طرف، ایک اخلاقی ضرررساں کیڑا، نظروں سے پوشیدہ، مذہبی اصولوں کے زیرِ اثر اور واقعتاً طاعون زدہ شکاروں کو کھا رہا تھا؛ دوسری جانب ایک ہی آتش دان کے نیک شعلوں میں گھرے نفوس تھے۔ وہاں ظلمت تھی؛ یہاں پرچھائیں تھی، مگر وہ پرچھائیں جو روشنی کی کرنوں اور تابندگی سے معمور تھی۔

غلامی کے دو گڑھے تھے، مگر پہلے والے گڑھے میں نجات ممکن تھی، قانونی حد ہمیشہ نظر کے سامنے ہوتی تھی، اور اس کے بعد فرار ہوتا تھا۔ دوسرے گڑھے میں دوام تھا؛ ایک واحد امید تھی، مستقبل کی انتہا تھی، آزادی کی وہ مبہم روشنی تھی لوگ جسے موت کہتے ہیں۔

پہلے میں، آدمی زنجیروں میں بندھے ہوتے ہیں؛ دوسرے میں یقین کی زنجیر میں شامل ہوتے ہیں۔

پہلے سے کیا برآمد ہوتا تھا؟ بھیانک دشنام، دانتوں کا پیسنا، نفرت، مایوسانہ بدنیتی، انسانی سماج کے خلاف طیش، دوسری دنیا کے خلاف طنز و طعن۔

دوسرے سے کیا نکلتا تھا؟ دعائے فضل و رحمت اور محبت۔

اور ان دو جگہوں پر، اتنی مشابہت تھی مگر اتنی مختلف۔ وجود کی یہ دو اقسام اتنی مختلف ہونے کے باوجود تلافی کے لیے ایک ہی قسم کے کام کر رہی تھیں۔

ژاں ولژاں دوسرے کی تلافی کو اچھی طرح سمجھتا تھا، کہ وہ ذاتی تلافی ہوتی ہے جو اپنے آپ کی تلافی کرتی ہے۔ مگر وہ آخری والوں کی تلافی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا، بغیر سزا کے اور بغیر بدنامی کے، اور وہ لرزتا جا رہا تھا اور اپنے آپ سے سوال کرتا جا رہا تھا: تلافی کس بات کی؟ کیسی تلافی؟

اس کے اپنے ضمیر نے جواب دیا تھا: "انسانوں کی سب سے مقدس فراخ دلی کی، یعنی دوسروں کی تلافی۔"

یہاں ہر قسم کا ذاتی نظریہ روک لیا جاتا ہے؛ ہم صرف بیان کرنے والے ہیں؛ ہم ژاں ولژاں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اور اس کے تاثرات کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اس کے سامنے انکار کی رفعت کی بلند ترین سطح تھی، نیکی کا ممکنہ طور پر بلند مقام تھا؛ ایسی معصومیت تھی جو آدمیوں کی غلطیاں معاف کر دیتی ہے، اُن کے بدلے تلافی کر دیتی ہے؛ محکومی کے آگے سر جھکا دینا، اذیت کو قبول کر لینا، نفوس کا سزاؤں کا طالب ہونا جنھوں نے گناہ نہیں کیے ہیں، ان نفوس کو بچانے کے لیے جو گزر چکے ہیں؛ خدا کی محبت میں انسانیت کی محبت کو نگل لینا، اور ایسے موقعے پر بھی اس کی غور و فکر کی صلاحیت برقرار رکھنا؛ پیارے اور کم زور وجود جو ان لوگوں کے دکھوں کے حامل ہوتے ہیں جن کو سزا دی جاتی ہے، اور ان کے تبسم کو جن کی تلافی ہو جاتی ہے۔

اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے سرگوشی کی ہمت کی تھی۔

اکثر وہ رات کو ان معصوم مخلوقات کے تشکراتی گیتوں کو سننے اٹھ جایا کرتا تھا جو محکومی

کے بوجھ کے نیچے دبی تھیں، اوران لوگوں کا خیال آتے ہی اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون ٹھنڈا ہو جاتا تھا، جن کو منصفانہ طور پر سزا دی گئی تھی جنھوں نے صرف ارتکاب کفر میں آسمانوں کی طرف اپنی آوازیں بلند کی تھیں، اوراس بد قسمت انسان نے خدا کو اپنے مُکّے دکھائے تھے۔

ایک اور قابلِ توجہ شے تھی، جس نے اسے گہرے غور وخوض کی طرف متوجہ کردیا تھا۔ اس دیوار پر چڑھنا، رکاوٹوں سے گزرنا، اس مہم کا قبول کرنا جس میں جان کے خطرات بھی لاحق تھے، تکلیف دہ اور مشکل چڑھائی، وہ ساری مشکلات جو اس نے تلافی کی اس دوسری جگہ سے فرار کے لیے اوراس میں داخل ہونے کے لیے جھیلی تھیں۔ کیا یہ اس کے نصیب کی علامت تھی؟ یہ مکان بھی اس جیسا اداس تھا جہاں سے وہ فرار ہوا تھا۔

ایک بار پھر اس نے نظر کی ان جالیوں، چٹخنیوں، آہنی چھڑوں پر — کس کے تحفظ کے لیے تھیں وہ سب؟ فرشتوں کے لیے!

یہ اونچی دیواریں، جیسی اس نے شیر چیتوں کے اطراف دیکھی تھیں، ایک بار پھر ویسی ہی دیواریں دیکھ رہا تھا، مگر یہ میمنوں کے اطراف تھیں۔

یہ جگہ تھی تلافی کے لیے، سزا کے لیے نہیں! پھر بھی یہ زیادہ سادہ، زیادہ اداس، اوردوسری جگہ کے مقابلے میں زیادہ بے رحم تھی۔

سزا یافتہ لوگوں کے مقابلے میں یہ کنواریاں بہت زیادہ زیر بار تھیں۔ ایک جانب، ایک تیز اورسرد ہوا، ویسی ہوا جس نے اس کی نوجوانی کو یخ کردیا تھا، کرگسوں کی مقفل جالیوں سے گزر رہی تھی؛ جب کہ، دوسری جانب، اس سے بھی زیادہ بے رحم سرد ہوا ان فاختاؤں کے پنجرے میں جا رہی تھی۔

کیوں؟

جب اس نے ان چیزوں کے بارے میں سوچا، اس کے اندر جو کچھ تھا سب ترفع کی پُراسراریت کی حیرانی میں غائب ہوگیا تھا۔

ان مراقبوں میں اس کا تفاخر غائب ہوگیا۔ اس نے ہر طریقے سے اپنے دل کی جانچ پڑتال کی؛ اسے اپنی کمتری کا احساس ہوگیا، اور وہ کئی بار رویا بھی تھا۔ پچھلے چھ ماہ میں جو کچھ اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اسے بشپ کی مقدس ہدایات کی طرف واپس لے گیا تھا؛ کوزیٹ کی جانب محبت کے ذریعے، خانقاہ کی طرف انکسار کے ذریعے۔ کبھی سرِ شام، کبھی فجر کے وقت، جب باغیچہ سنسان ہوتا تھا، اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا دیکھا جا سکتا تھا، روش کے درمیان جو گرجا گھر کے

اطراف جاتی تھی، اس کھڑکی کے سامنے، جس کے ذریعے اپنی آمد پر اس نے دیکھا تھا، اور اس جگہ کی طرف گیا تھا جہاں، جیسا کہ اسے علم تھا، سسٹر سجدے میں پڑی تلافی کی دعائیں کر رہی تھی ۔اس طرح سسٹر کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے بھی دعا کی تھی۔

ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اسے براہِ راست خدا کے سامنے جھکنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ہر وہ شے جو اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھی، وہ پُر امن باغیچہ، وہ مہکتے پھول، وہ بچے جو خوش چلا رہے تھے، وہ سنجیدہ اور سادہ عورتیں، وہ خاموش خانقاہ، آہستہ آہستہ اس میں سرایت کر رہی تھی، اور بتدریج اس کا نفس خانقاہ کی طرح خاموشی کا مرکب بن گیا تھا، خوش بو کا، پھولوں کا، سادگی کا ان عورتوں کی، خوشیوں کا ان بچوں کی۔ اور پھر اس نے غور کیا کہ یہ خدا کے دو گھر تھے جنھوں نے انھیں یکے بعد دیگرے وصول کیا تھا؛ پہلا گھر، جہاں سارے دروازے بند تھے اور جب انسانی سماج نے اسے مسترد کردیا تھا؛ دوسرا گھر، اس لمحے جب انسانی سماج ایک بار پھر اس کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا تھا، اور جب گیلیز ایک بار پھر منہ کھولے ہوئے تھیں؛ اور یہ بھی اگر پہلے کے لیے نہ ہوتا تو وہ جرم میں مبتلا ہو جاتا، اور اگر دوسرے کے لیے نہ ہوتا تو عذاب میں گرفتار ہو جاتا۔

اس کا پورا دل تشکر میں پگھل گیا تھا، اور اس کی محبت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

اسی انداز میں کئی برس گزر گئے؛ اور کوزیت بڑی ہوتی جا رہی تھی۔

✡

Parvulus

پیرس کا ایک بچہ ہے، اور جنگل میں ایک چڑیا ہے؛ اس چڑیا کو گنجشک (عام لفظوں میں گوریا) کہتے ہیں؛ بچے کو لاوارث لڑکا کہتے ہیں۔

ان دونوں خیالات کو یک جا کر دیجیے، جن میں: ایک مکمل بھٹی [گرم ترین جگہ] ہے، دوسرا مکمل سویرا ہے۔ دونوں چنگاریوں کو آپس میں لڑا دیجیے، پیرس اور بچپن کو، تو اس میں سے ایک چھوٹا سا وجود نکلتا ہے۔ Plautus نے Homuncio [لاطینی زبان کا لفظ جس کا معنی ہے "چھوٹا سا لڑکا"] کہا ہے گا۔

یہ چھوٹا سا لڑکا خوش مزاج ہے۔ اسے ہر روز غذا میسر نہیں ہوتی، جو اگر چاہتا ہے تو ہر شام کھیلنے جاتا ہے۔ اس کے جسم پر قمیض نہیں ہوتی، پیروں میں جوتے نہیں ہوتے، سر پر کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ وہ فضائی مکھیوں کی طرح ہے جن کے پاس یہ سب چیزیں نہیں ہوتیں۔ اس کی عمر سات سے تیرہ برس تک کی ہوتی ہے، وہ دائروں میں ہوتا ہے، سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہے، کھلی ہوا میں رہتا ہے، اپنے والد کا پرانا پاجامہ پہنتا ہے، جو اس کی ایڑیوں تک اتر آتا ہے، اس کے سر پر باپ کی پرانی ہیٹ ہوتی ہے، جو اس کے کانوں تک آجاتی ہے؛ پیلے رنگ کی واحد گیلس پہنے رہتا ہے؛ وہ دوڑتا ہے، انتظار میں رہتا ہے، کسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، وقت ضائع کرتا ہے، نلکوں کو کالا کرتا ہے، سزا یافتہ کی طرح گالیاں بکتا ہے، شراب کی دکان کی تلاش میں رہتا ہے، چوروں کو جانتا ہے، کھلنڈری لڑکیوں کو "تم" کہتا ہے، بازاری زبان بولتا ہے، بیہودہ گانے گاتا ہے، اور اپنے دل میں بدی نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں ایک موتی ہے، معصومیت؛ اور موتیوں کو کیچڑ میں حل نہیں کیا جاتا۔ جب تک آدمی اپنے بچپن میں ہوتا ہے، خدا

چاہتا ہے کہ وہ معصوم رہے۔

اگر کوئی اس بے حد بڑے سے شہر سے پوچھ لے کہ "یہ کیا ہے؟" تو اس کا جواب ہوگا "یہ میرا چھوٹا بیٹا ہے۔"

❂

اس کی کچھ نمایاں خصوصیات

پیرس کا وہ لاوارث لڑکا — عام قسم کا عرب — کسی دیوہیکل وجود کا بونا ہے۔

ہمیں مبالغہ آرائی سے گریز کرنا چاہیے۔ اس نالی کے فرشتے کے پاس کبھی ایک قمیص ہوتی ہے، مگر صرف ایک ہی قمیص؛ کبھی کبھی اس کے پاس جوتے بھی ہوتے ہیں، مگر ان میں تلے نہیں ہوتے؛ کبھی اس کے پاس رہنے کی جگہ ہوتی ہے، اور وہ اس سے محبت کرتا ہے، اس لیے کہ اسے وہاں اس کی ماں مل جاتی ہے؛ مگر وہ سڑک کو ترجیح دیتا ہے، اس لیے کہ وہاں اسے آزادی ہوتی ہے۔ اس کے اپنے کھیل ہیں، اس کی اپنی شرارتیں ہیں، جس کی بنیاد بورژوا سے نفرت ہوتی ہے؛ اس کے استعارے نرالے ہیں: مرنے کے لیے dandelion کو جڑ سمیت کھا لینا؛ اس کی مصروفیات ہوتی ہیں: کرایے کی گاڑیاں طلب کرنا؛ گاڑی کی سیڑھی نیچے کرنا؛ تیز بارش میں سڑک کے دونوں کناروں کو پار کرنے کا ذریعہ بنانا؛ جسے وہ پُل بنانے کا فن کہتا ہے؛ چیخ کر ان باتوں پر اظہارِ خیال کرنا، اربابِ اختیار فرانسیسی عوام کے حق میں جس کا اعلان کرتے ہیں؛ فٹ پاتھ کے شگافوں کی صفائی کرنا؛ سکے کا اس کا اپنا ایک نظام ہے جو استعمال شدہ تانبے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے، جو عام سڑکوں پر پائے جاتے ہیں۔ یہ انوکھی نقدی، جس کو چیتھڑے کہا جاتا ہے، ان چھوٹے سے آزاد مشرب بچوں کا باقاعدہ بنایا ہوا سکوں کا نظام ہے۔

آخر میں: اس کے اپنے حیوانات بھی ہیں، جنھیں وہ پوری توجہ سے کونوں میں دیکھتا ہے؛ lady-bird، پودوں کا کیڑا جسے death's-head کہا جاتا ہے، daddy-long-legs [دیوہیکل مچھر جو نہ زہریلے ہوتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں]؛ the devil، ایک سیاہ رنگ کا مکوڑا، جس کی دُم میں دو ڈنک ہوتے ہیں، جنھیں موڑ کر وہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لڑکے کا اپنا

ایک فرضی دیو ہے جس کے پیٹ پر مچھلی کے چھلکے جیسے ٹکڑے ہوتے ہیں، مگر یہ گرگٹ کی نسل کا نہیں ہے؛ جس کی پشت پر چھوٹی چھوٹی پھنسیاں ہوتی ہیں، مگر یہ مینڈک کی نسل کا نہیں جو چونے کی ناکارہ اور پرانی بھٹیوں کے کونوں کھدروں میں رہتا ہے۔ اس کا رنگ کالا ہے، بالوں والا ہے، چپک دار ہے، جو رینگتا ہے، کبھی آہستہ اور کبھی تیز، جو چیختا نہیں، مگر اس کی شکل اتنی خوف ناک ہوتی ہے جیسی کسی نے آج تک دیکھی نہیں ہوگی؛ وہ لڑکا اس کو "بہری شے" کہتا ہے۔ پتھروں کے درمیان اس "بہری شے" کی تلاش اس کی خوف ناک قسم کی تفریح ہے۔ ایک اور تفریح ہے اس کی: وہ فرش میں لگے پتھروں کو اچانک اٹھا کر wood-lice کو دیکھتا ہے۔

پیرس کا ہر علاقہ اپنے دل چسپ خزانوں کے لیے مشہور ہے، جو وہاں پائے جاتے ہیں۔ Ursuline کی لکڑی کی نالوں میں ear-wigs ہوتے ہیں، Pantheon میں ہزار پا (کنکھجورے) ہوتے ہیں؛ Champs-de-Mars کے جوہڑوں میں مینڈک کے نامکمل بچے ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس لڑکے کے پاس بھی اتنی ہی کہاوتیں ہیں جتنی کہ Talleyrand میں سنائی دیتی ہیں۔ وہ کم ترش رو نہیں، مگر ایمان دار زیادہ ہے۔ اس کو ایک مخصوص اور ناقابلِ بیان زندہ دلی سے نوازا گیا ہے؛ وہ اپنے وحشیانہ قہقہے سے دکان داروں کے اطمینان میں خلل ڈال دیتا ہے۔ وہ بڑی بہادری سے، اعلیٰ ظرافت سے پھکڑ ناٹک بازی پر اتر آتا ہے۔

جنازے کا جلوس پاس سے گزرتا ہے۔ مرنے والوں کے اقربا کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی ہوتا ہے۔ کوئی بازاری عرب چیخ کر کہتا ہے، "سنو بھائی! کب سے یہ رواج ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر اپنی کارگزاری کو گھر تک پہنچانے جانے لگے ہیں؟"

وہ ایک اور مجمعے میں موجود ہوتا ہے۔ ایک نہایت ثقہ آدمی، جو عینک اور معمولی بُندے سے آراستہ ہے، غضب ناک ہو کر پلٹ پڑتا ہے: "تم!— ناکارہ انسان!— تم نے میری بیوی کی کمر چھین لی ہے!— کون!— میں، جناب!— لیجیے، میری تلاشی لے لیجیے!"

❁

راضی بہ رضا

چند سو کے طفیل، جو وہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ حاصل کر لیتا ہے، شام کے وقت homuncio کے ایک تھیٹر میں داخل ہوتا ہے۔ اس جادوئی ڈیوڑھی کو پار کرتے ہی اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے: ابھی بازاری عرب تھا، ابھی مرغی بن گیا ہے۔ تھیٹر ایک قسم کے اُلٹے ہوئے بحری جہاز ہوتے ہیں، جن کا تلا اوپر کی جانب ہوتا ہے۔ ان ہی تکوں کے نیچے مرغیاں گھس جاتی ہیں۔ لاوارث لڑکے کے لیے مرغیاں وہی کچھ ہوتی ہیں جیسے لاروا کے لیے پتنگے۔ لاروا کو پَر اور بلندی عطا ہو جاتی ہے۔ خوشی کی دمک کے ساتھ، پُرجوشی اور خوشی کی طاقت کے ساتھ، تالیوں کے ساتھ جو پَروں کے پھڑ پھڑانے سے مشابہ ہوتی ہیں، اس تنگ، تاریک، بدبودار، فرومایہ، بیمار، گھناؤنے، قابلِ نفرت تلے کے ساتھ جس کو جنت کہتے ہیں، اس کے وہاں موجود ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

کسی فرد کو فضولیات عطا کر دیجیے، اسے ضروریات سے محروم کر دیجیے، اور آپ کو وہ لاوارث لڑکا مل جائے گا۔

لاوارث لڑکا ادبی وجدان سے محروم نہیں۔ اس کا میلان، اور ہم یہ بات بہت ندامت سے کہہ رہے ہیں، کلاسیکی ذوق کی تشکیل نہیں کر سکے گا۔ فطرتاً وہ علم دوست نہیں ہے۔ لہٰذا محض مثال کے طور پر مختصر سے ہنگامہ خیز سامعین بچوں میں میدموزیل Mars کی مقبولیت ایک سنک ولانہ ملاوٹ تھی۔ لاوارث لڑکا اس کو میدموزیل Muche — "مخفیہ" — کہتا تھا۔

وہ چیختا اور طعن و تشنیع کرتا ہے؛ تضحیک کرتا ہے اور لڑائی کرتا ہے؛ بچے جیسے چیتھڑے اور فلسفی جیسی خستہ حالی میں ہوتا ہے؛ گندی نالیوں میں مچھلی پکڑتا ہے؛ غلاظت کے جوہڑ میں شکار کرتا ہے؛ نا راستی سے نشاط کشید کرتا ہے؛ علاقوں کو اپنی دانش، زہر خند اور فریب سے، سیٹیوں اور

گانوں سے، چیخ وپکار سے، حمد میں Matantur کے کلام کی ملاوٹ کردیتا ہے؛ De Profundis سے Jack-pudding تک ہر ایک کے بحر اور تال کا ورد کرتا ہے؛ بغیر تلاش کے معلوم کرلیتا ہے کہ وہ کس سے ناواقف ہے؛ چوری کی حد تک جرأت مندی دکھاتا ہے، دانش کے لیے پاگل رہتا ہے؛ غلیظ چیزیں گاتا ہے، Olympus کے سامنے جھک جاتا ہے؛ گوبر کے ڈھیر میں لوٹتا ہے؛ اور اس میں سے ستارے لیے نکلتا ہے۔ پیرس کا لاوارث لڑکا ویسا ہی ہے جیسا اپنی نوجوانی میں Rabelais [فرانسیسی مزاح نگار] تھا۔

وہ اپنی پتلون سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک اس میں گھڑی رکھنے کی جیب نہ بنی ہو۔

وہ آسانی سے متعجب نہیں ہوتا؛ خوف زدہ کم ہوتا ہے؛ بھوت پریت پر گانے بناتا ہے؛ مبالغہ آرائی کی ہوا نکال دیتا ہے؛ رازوں کو مذاق بنادیتا ہے؛ بھوت پریت کو زبان نکال کر چڑاتا ہے، بانسوں پر بلند چیزوں سے شاعری پیدا کرتا ہے؛ مزاحیہ خاکوں سے بہادرانہ کھیل متعارف کراتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بد ذوق ہے؛ بد ذوقی سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں؛ سنجیدہ تصورات کو مزاحیہ خوابوں میں بدل دیتا ہے۔ اس کے سامنے Adamastor [یونانی ادب کا ایک دیو مالائی کردار] بھی آجائے تو بازاری عرب اس سے کہے گا:

"کیسے ہو میاں بھوت؟"

۞

کام کے قابل ہو سکتا ہے

پیرس کی ابتدا تفریح کرنے والوں سے ہوتی ہے اور ختم بازاری عرب پر؛ یہ دو ایسے وجود ہیں کوئی شہر جن کی صلاحیت نہیں رکھتا؛ ایک کاہل جو صرف دیکھنے پر اکتفا کرتا ہو اور دوسرا کبھی نہ جھکنے والا جو پیش قدمی پر تیار رہتا ہو؛ ایک Prudhomme جیسا جنر مند باشندہ ہے اور دوسر Fouillou جیسا سیاست داں۔ صرف پیرس ہی کو اس کی فطری تاریخ میں یہ کردار ملے ہیں۔ پوری بادشاہت تفریح کرنے والوں پر مشتمل ہے؛ پوری طوائف الملوکی لاوارث لڑکے میں حلول کر گئی ہے۔

پیرس کے مضافات کا زرد رو بچہ، سماجی حقیقتوں میں، انسانی کیفیتوں میں زندہ رہتا ہے، نشوونما پاتا ہے؛ تعلقات پیدا کرتا ہے؛ دکھوں میں بھی مطیع رہتا ہے، اور با مروّت گواہ ہوتا ہے۔ وہ خود کو لاپروا سمجھتا ہے مگر ایسا ہوتا نہیں۔ بس وہ ایسا نظر آتا ہے اور قہقہہ مارنے کے قریب ہے؛ وہ کچھ اور بھی کرنے والا ہے۔

تم کوئی بھی ہو، اگر تمھارا نام تعصب ہے، بد سلوکی ہے، جہالت ہے، جبر ہے، بد اعمالی ہے، استبدادیت ہے، ناانصافی ہے، مذہبی جنون ہے، ظالم ہے تو اس وحشی لاوارث لڑکے سے ہوشیار رہنا۔

یہ لڑکا ایک دن بڑا بھی ہوگا۔

یہ کس مٹی کا بنا ہے؟ پہلا گارا جو ہاتھ آیا ہوگا۔ مٹھی بھر گرد! ایک سانس، اور لو دیکھو، آدم موجود ہے۔ خدا کے لیے یہی کافی تھا۔ ایک بازاری عرب۔ خدا نے بازاری عرب کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ قسمت اس ننھے سے وجود پر کتنی محنت کر رہی ہے۔ قسمت سے ہماری مراد اتفاق ہے، وہ بھی کسی حد تک۔

وہ بیٹا جو عام مٹی گوندھ کر بنایا گیا ہے، نادان، ناخواندہ، لاابالی، بیہودہ، پست۔ کیا وہ کبھی Ionian یا Boeotian بن سکے گا؟ ٹھیر، اے وقتِ دوراں، اے روحِ پیرس، وہ بد روح جو بچوں کو اتفاق بنا دیتی ہے، اور آدمیوں کو متذکر کا سکندر بنا دیتی ہے، لاطینی کمہار کے چاک کو اُلٹا گھما دیتی ہے، جام کو مینا بنا سکتی ہے۔

❋

اس کی سرحدیں

وہ بازاری لڑکا — وہ بھی تنہائی سے محبت کرتا ہے، اس لیے کہ اس میں بھی کچھ دانائی ہے۔ شہری عاشق تنگی بن سکتا ہے، تو دیہاتی عاشق Fuscus [قبلِ مسیح کا ایک رومن سیٹرسٹ] بھی بن سکتا ہے۔

سوچ سمجھ کر گھومنا، جس کو تفریح کرنا کہتے ہیں، فلسفیوں کی نگاہ میں وقت کا بہترین استعمال کہلاتا ہے؛ بالخصوص اس تقریباً ناجائز مہم میں جو برداشت کی حد تک خراب ہو، مگر اس کی دو اقسام ہوں، جو بڑے شہروں کو گھیرے ہوتی ہے، بالخصوص پیرس۔ مضافات کا مطالعہ کرنا کسی خاکی و آبی جانور کے مطالعے جیسا ہی ہوتا ہے۔ درختوں کا سلسلہ ختم تو چھتوں کا سلسلہ شروع؛ گھاس کا سلسلہ ختم تو کچے راستے شروع؛ کھیتوں کی نالیاں ختم تو دکانوں کا سلسلہ شروع؛ گاڑیوں کی لیکھیں ختم تو جذبات شروع؛ آسمانی سرگوشی ختم تو انسانی ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے؛ یہی وجہ ہوتی ہے غیر معمولی دلچسپیوں کی۔

اسی وجہ سے، ان عام قسم کی جگہوں میں، جن پر وقت کا گزر تا ہوا بیلن اپنے کبھی نہ مٹنے والے نام کی مہر لگاتا چلا جاتا ہے: خواب دیکھنے والے کے لیے ایک اداس اور بہ ظاہر بے مقصد تفریح گاہ پر۔

وہ جو یہ سطریں لکھ رہا ہے، ایک عرصے سے پیرس کی رکاوٹوں کے اطراف کسی تلاش میں پھرتا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے دل میں اس کی یادیں بسی ہوئی ہیں۔ وہ مہین گھاس کے تختے، وہ سنگ ریزوں سے بنے راستے، وہ کھریا مٹی کے ٹیلے، وہ جوہڑ، وہ بنجر اور کاشت کی گئی زمینوں کی بے لطف یک رنگی، وہ ابتدائی موسم میں لگائی گئی نیریاں، وہ وحشی اور دیسی باشندوں کا ملغوبہ، وسیع ویرانوں کے وہ گوشے جہاں فوجیوں کے نقارے زور شور سے اپنی مشق کرتے ہیں اور ایک نوع کی توتلی [مصنوعی] جنگیں لڑتے رہتے ہیں؛ وہ جو دن میں زاہد و دین دار ہوتے ہیں، اور رات کو گلے

کاٹتے ہیں، وہ بدسلیقہ پون چکیاں جو کان کنی کے پہیے، اور قبرستان کے کونوں کے جائے کے باغات کے پہیے گھماتی ہیں؛ سورج کی روشنی اور تتلیوں سے بھرے زمین کے قطعے کی وہ پُراسراریت جن کو مہیب اور اداس دیواریں ٹکڑوں میں تقسیم کرتی ہیں — وہی اس کو اپنی جانب کھینچتی رہی ہیں۔

روئے زمین پر شاید ہی ایسا کوئی فرد ہوگا جو ان غیر معمولی جگہوں، برف سے ڈھکی چٹانیں، نالے، توپ کے گولوں کے نشانوں والی Grenelle کی بھیانک دیواریں؛ Mont-Parnasse، Fosse-aux-Loups؛ دریائے Marne کے ساحل پر واقع Pierre-Plate de ،Tombe-Issoire ،Mont-Souris ،Aubiers Chatillon، جہاں ایک پرانی اور از کار رفتہ کان ہے جس میں سوائے کھمبیوں کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتا جس کو دیمک زدہ لکڑی کے تختوں سے زمین کی سطح کے برابر بند کردیا گیا ہے۔ روما کے صوبے ایک طرف اور پیرس کے مضافات دوسری جانب؛ دور دور تک جہاں سوائے میدانوں کے، مکانات کے یا درختوں کے سلسلے دکھائی دیتے ہیں، سارے پہلو خدا کے سوچے ہوئے ہیں۔ وہ جگہ جہاں ایک میدان شہر سے ملتا ہے، وہاں ایک دل چھیدنے والی اداسی چھائی ہوتی ہے۔ اس مقام پر فطرت اور انسان دونوں آپ کو اچھے لگتے ہیں۔ اسی جگہ پر مقامی آہنگ اپنا اظہار کرتی ہے۔

ہماری طرح جو بھی ہمارے مضافات سے متصل ان تنہائیوں میں گھومتے پھرتے ہوں گے، جن کو پیرس کا برزخ کہا جاتا ہے، انھوں نے سب سے ویران علاقے میں غیر متوقع موقعوں پر چھدری جھاڑیوں کے پیچھے یا بے رنگ دیواروں کے کونوں کے قریب گندے، گرد آلود، چیتھڑوں میں ملبوس، کیچڑ میں لت پت، بکھرے بالوں والے فتنہ پرور لڑکوں کو، یہاں وہاں، کھیلتے کودتے دیکھا ہوگا۔ سب کے سب مفلس خاندان والے اپنے گھروں سے بھاگے ہوئے لڑکے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بیرونی بولیوارڈ وہ جگہ ہے جہاں وہ آزادی سے سانس لیتے ہیں؛ یہ سارے مضافات ان ہی کے ہیں۔ وہ سب اسکول سے بھاگے طلبہ ہوتے ہیں۔ معصومانہ انداز میں ترتیب سے گندے گندے گانے گاتے ہیں۔ ہر آنکھ سے دور، مئی اور جون کے مہینوں کی نرم دھوپ میں، زمین میں بنے ایک سوراخ کے اطراف گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے، اپنے انگوٹھوں سے شیشے کی گولیاں پھینکتے ہوئے، نصف فارذنگ پر جھگڑا کرتے، غیر ذمے دار، زندہ دل، آزاد اور خوش لوگ وہیں رہتے ہیں؛ جوں ہی آپ پر ان کی نظر پڑتی ہے، انھیں احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کی بھی ایک صنعت ہے؛ کہ انھیں اپنی روزی کمانی ہے؛ اور وہ آپ کو بھنوروں اور بکائن کے پھولوں سے بھرے اونی موزے بیچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اجنبی بچوں کے ساتھ اس قسم کے مقابلے

دل کش ہوتے ہیں کہ یہی ساری چیزیں پیرس کے تحت کوش مضافات کے ماحول کا حصہ ہیں۔

کبھی کبھی لڑکوں کے اس ہجوم میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں— کیا وہ ان لڑکوں کی بہنیں ہوتی ہیں؟— کہ وہ نوجوان کنواری، دبلے پتلے، بخار زدہ، دھوپ سے جھلسے ہوئے ہاتھوں والی، جن پر چھائیاں پڑی ہوتی ہیں، بالوں میں خشخاش کے پھول لگائے خوش، منہ زور، اور ننگے پیر۔ ان کو گندم کے کھیت میں چیری کھاتے دیکھا جا سکتا ہے۔ شام کے وقت انھیں ہنستے کھیلتے دیکھا جا سکتا ہے۔

پیرس، اس کا مرکز، اس کے مضافات اور ان کے محیط: ان بچوں کے لیے یہی پوری زمین ہے۔ وہ اس سے باہر نکلتے ہی نہیں۔ وہ اسی طرح پیرس سے نکل نہیں سکتے۔ جیسے پانی سے مچھلی نکل نہیں سکتی۔ ان کے نزدیک Ivry, Gentilly, Arcueil, Belleville, Aubervilliers, Menilmontant, Choisy-le-Roi, Billancourt, Mendon, Issy, Vanvre, Sevres, Puteaux, Neuilly, Gennevilliers, Colombes, Romainville, Chatou, Asnieres, Bougival, Nanterre, Enghien, Noisy-le-Sec, Nogent, Gournay, Drancy, Gonesse; اور ان کی رکاوٹوں سے دو ڈگ آگے کائنات ختم ہو جاتی ہے۔

۞

کچھ تاریخ کے بارے میں

اس زمانے میں، جو تقریباً ہم عصر تھا، جب اس قسم کے کام ہو رہے تھے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے، سڑک کے کونے کونے پر پولیس کا آدمی نہیں ہوتا تھا (اس موقعے پر اس تذکرے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا)؛ پیرس میں آوارہ لڑکوں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں پولیس والے بے نام جگہوں سے، زیرِ تعمیر مکانوں سے، پُلوں کے نیچے سے سال میں تقریباً دو سو ساٹھ بے گھر بچے پکڑ لایا کرتے تھے۔ ایک جگہ، جہاں سے بہت بچے پکڑے جاتے تھے "Arcola کی ابابیلوں کا پُل" کے نام سے بہت مشہور ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سماجی بربادی کی خراب ترین علامت تھی۔ بچوں کی خانہ بدوشی ہی سے انسانوں کے جرائم شروع ہوا کرتے ہیں۔

پھر بھی، ہم پیرس کے بارے میں کچھ اچھی باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو جن "تحائف" کا ابھی تذکرہ کیا جا چکا ہے، نسبتاً زیادہ نہیں تھے۔ جب کہ دنیا کے کسی اور بڑے شہر کا آوارہ بچہ گم کردہ آدمی ہوتا ہے، اس لیے کہ اسے معاشرے کی خرابیوں میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے جو اس کے ضمیر اور اس کی ایمان داری کو کھا جاتی ہیں، پیرس کی سڑک کا لڑکا — اور اس نکتے پر ہم اصرار کریں گے — خواہ سطحی طور پر وہ کتنا ہی بدنام اور زخمی کیوں نہ ہو، اندر سے بالکل ثابت و سالم ہوتا ہے۔ اور دستاویز پر رکھنے کے لیے یہ بہت عالی شان بات ہے، اور جو ہمارے عوامی انقلابات کی دیانت داری کی اعلیٰ ترین روشن مثالیں ہیں، کہ پیرس کی راست بازی اس کے اپنے ماحول کا نتیجہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے سمندر کے پانی میں نمک کا وجود۔ خود کو زندہ رکھنے کے پیرس نے اپنی روح کو محفوظ کر رکھا ہے۔

ہم نے ابھی جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس دل کی روحانی اذیت کا مداوا نہیں کر سکتا جس

کا ہمیں ہر بار تجربہ ہوتا ہے، جب ہمیں کوئی بچہ دکھائی دیتا ہے جس کے اطراف کسی بکھرے ہوئے خاندان کے ٹوٹے دھاگے تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس زمانے کی تہذیب میں، جو ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے، یہ بہت غیر معمولی بات نہیں کہ ہمارے شکستہ خاندان اپنے آپ کو اندھیروں میں انڈیل رہے ہیں، جب کہ ان کو اس بات کا بالکل اندازہ نہیں کہ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ان کے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ ہے ہمارا حال۔اس قسم کے مایوس حالات سے ہی ''پیرس کی سڑکوں پر ڈال دینا'' جیسا اندازِ اظہار اپنایا گیا ہے۔

ہمیں یہ کہنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے کہ قدیم شاہی اس طرح بچوں سے دست برداری کی ہمت شکنی نہیں کرتی تھی۔مصر کا ایک مختصر حصہ، اور بوہیمیا میں نچلے علاقے بالائی طبقوں کے کام آتے تھے، طاقت ور کے مقاصد پورے کرتے تھے۔عوام کے بچوں کی تعلیم سے نفرت اصول بن چکی تھی۔ان ''نصف روشنیوں'' کا فائدہ کیا ہوگا؟ اس قسم کی باتیں کی جاتی تھیں۔اب، غلطی کرنے والا بچہ، جاہل بچہ، بن چکا ہے۔

اس کے علاوہ، کبھی کبھی شاہی کو بھی بچوں کی ضرورت ہوتی تھی، اور ایسی صورت میں بچے سڑکوں سے مل جایا کرتے تھے۔

دور کیوں جایئے، لوئی چہاردہم نے ایک بحری بیڑا تیار کرنے کی خواہش کی تھی۔خیال اچھا تھا، مگر ہمیں ان کے ذرائع پر غور کرنا ہوگا۔بحری بیڑا تیار نہیں ہو سکتا تھا، اگر بادبانی جہازوں کے علاوہ، ضرورت کے وقت جہازوں کو آگے بڑھانے کے لیے چپو یا بھاپ سے کام لیا جا سکتا۔ اس زمانے کی پتواری کشتیاں وہی تھیں جو آج کل دخانی جہاز ہیں۔اس لیے پتواری کشتیاں ضروری تھیں؛ مگر پتواری کشتیاں کشتیوں والے غلام ہی چلاتے تھے؛ اس لیے، کشتیوں والے غلاموں کی ضرورت ہوتی تھی۔ Colbert [نامی پتواری کشتی] کے لیے پارلیمان اور صوبوں کے کمشنر جس قدر ممکن ہوتا، سزا یافتہ افراد فراہم کرتے تھے۔اس معاملے میں نظام منتقلی خاصی فراخ دلی دکھاتا تھا۔ایک آدمی جلوس کی موجودگی میں اپنے سر پر ٹوپی پہنے تھا— جو Huguenot فرقے کا رواج تھا؛ اس کو سزا کے طور پر پتواری جہاز پر بھیج دیا گیا تھا۔گلیوں میں پایا جانے والا کوئی بچہ اگر پندرہ برس کا ہوتا تو اسے پتواری جہاز پر بھیج دیا جاتا تھا۔عالی شان راج! عالی شان صدی!

لوئی پانزدہم کے عہد میں پیرس میں لڑکے غائب ہو جایا کرتے تھے۔پولیس انھیں پکڑ لے جاتی تھی؛ کن خفیہ وجوہ کی بنا پر، کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔لوگ خوف سے بادشاہ کے ارغوانی غسل خانوں کے بارے میں سرگوشی کے انداز میں باتیں کیا کرتے تھے۔Barbier نے [فرانسیسی

فوج کا کپتان جو نقطوں کی مدد سے الفاظ لکھنے کا موجد تھا، ان کے بارے میں بڑی بے تکلفی سے باتیں کی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب لڑکوں کی کمی ہو جاتی تھی تو محافظوں کے استثنائی ان کو پکڑ لیتے تھے جن کے باپ ہوتے تھے۔ مایوسی کے عالم میں باپ استثنائیوں پر حملہ کر دیتے تھے۔ ایسی صورت میں پارلیمان مداخلت کرتی تھی اور کوئی لٹکا دیا جاتا تھا؟ استثنائی؟ جی نہیں، باپ لٹکا دیے جاتے تھے۔

❂

لاوارث لڑکے

پیرس کی سڑکوں کے لاوارث بچے ایک قسم کی ذات کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ہم اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی اس ذات میں داخل ہونے کے خواہش کے باوجود داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

لفظ gamin (یعنی لاوارث لڑکا) پہلی بار 1834ء میں لکھا گیا تھا اور عام افراد کی گفتگو میں پہنچ کر ادبی زبان کا حصہ بن گیا تھا۔ یہ لفظ Claude Gueux کے عنوان سے لکھی گئی ایک مختصر سی تحریر کے ذریعے عام ہوگیا تھا۔ ان دنوں خوف زوروں پر تھا، اور یہ لفظ استعمال میں آگیا تھا۔

وہ عناصر لاوارث لڑکوں کو جن کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے بہت مختلف تھے۔ ایک واقعہ جس کا ہمیں علم ہے اور جو ایک ایسے شخص سے متعلق ہے جس کا بہت احترام کیا جاتا تھا اور تعریف کی جاتی تھی اس لیے کہ اس نے ایک شخص کو ناترے ڈیم کے منارے سے گرتے دیکھا تھا؛ ایک اور واقعہ یہ تھا کہ وہ شخص عقبی صحن میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا جہاں عارضی طور پر Dome of the Invalides کے کچھ مجسمے رکھے ہوئے تھے جن میں سے اس نے کچھ سیسہ نکالا تھا؛ تیسرا واقعہ، کہ اس نے احتیاط سے پہلو تہی ہوتے دیکھی تھی؛ اس کے علاوہ ایک اور بھی، کہ وہ ایک سپاہی سے واقف تھا جو ایک باشندے کی آنکھ نکال لینے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

یہ پیرس کے ایک لاوارث کی چیخ پکار کی تشریح کرتا ہے، ایک تمہ، جس کو سن کر اور سمجھے بغیر ہی وہ بازاری گروہ ہنسنے لگتا ہے— ''خدایا، میرے خدا، میں بھی کتنا بدقسمت ہوں! اب مجھے سوچنا پڑے گا کہ میں نے کبھی کسی کو پانچویں منزل کی کھڑکی سے گرتے دیکھا نہیں ہے۔''

بلا شبہ کسی دیہاتی کا یہ کہنا کتنا ٹھیک ہے: فادر فلاں اور فلاں، تمھاری بیوی اپنے مرض میں مبتلا ہوکر مرگئی، تم نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا کیوں نہیں؟''— ''جناب، کیا عرض کریں، ہم مفلس

لوگ خود ہی مر جاتے ہیں۔" مگر جب دیہاتی کا پورا مجہول پن اُس کے اس قول میں پنہاں ہو، مضافات کے سارے آزاد خیال لونڈوں کی ہنگامہ آرائی یقینی طور پر دوسرے قول میں پنہاں ہو گی۔ ایک شخص جس کو موت کی سزا سنائی گئی تھی، فوجی گاڑی میں بیٹھا اعتراف کرنے والے کو سن رہا تھا۔ پیرس کا لڑکا چیختا ہے، "وہ اپنے کالی ٹوپی والے سے بات کر رہا ہے۔ بزدل کہیں کا!"

مذہبی معاملات میں ایک قسم کی گستاخی لاوارث بچے کو آمادہ کر دیتی ہے۔ قومی طبیعت کا مالک ہونا الگ معاملہ ہوتا ہے۔

موت کی سزا کے وقت موجود ہونا فرض ہوتا ہے۔ وہ گلا کاٹنے کی مشین تک پہنچ کر ہنسنے لگتا ہے۔ اس کو ہر قسم کے نام سے پکارتا ہے: شوربے کا آخری پیالہ، غرانے والا، آسمان والی مادر، آخری لقمہ وغیرہ وغیرہ۔ تاکہ اس معاملے کی کوئی شے رہ نہ جائے، وہ دیواریں چڑھتا ہے، خود کو بالکنیوں پر بلند کرتا ہے، درختوں پر چڑھتا ہے، خود کو جالیوں میں باندھ لیتا ہے، چمنیوں پر تیزی سے چڑھ جاتا ہے۔ لاوارث لڑکا جس طرح ٹائل لگانے والا پیدا ہوتا اسی طرح ملاحی بھی کرتا ہے۔ مستول کے خوف سے زیادہ اسے چھت آ کساتی ہے۔ ایسا کوئی جشن نہیں ہوتا جس میں Place de Greve میں موت کی سزا دی جاتی ہو۔ Samson اور Abbe Montes بہت ہر دل عزیز نام ہیں۔ وہ مجرم کا دل بڑھانے کے لیے اس پر آوازے کستے ہیں۔ کبھی تو مجرم کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ جب Lacenaire لاوارث لڑکا تھا، اس نے بھیانک Dautin کو بہادری سے مرتے دیکھا تو یہ الفاظ کہے تھے جن میں ایک پورا مستقبل پوشیدہ تھا، "میں اس سے حسد کرتا تھا۔" لاوارث لڑکوں کی برادری میں والٹیئر کو کوئی نہیں جانتا مگر وہ Papavoine [اٹھارہویں صدی کے پیرس کی ایک موسیقار خاتون] کو جانتے ہیں۔ سیاست داں قاتلوں کے بارے میں بہت الجھن میں ہوتے ہیں۔ ان میں آخری لباس کا رواج ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ Tolleron نے آخری لباس کے ساتھ آگ بجھانے والوں کی ٹوپی لگا رکھی تھی؛ Avril اود بلاؤ کے کھال کی ٹوپی میں تھا؛ Losvel گول ٹوپی لگائے تھا؛ Delaporte گنجا اور ننگے سر تھا؛ Castaing سراپا سُرخ اور خوب صورت تھا؛ Bories کے چہرے پر چھوٹی سی رومانی داڑھی تھی؛ Jean Martin اپنی گیلس لگائے تھا؛ Lecouffe اور اس کی ماں آپس میں لڑ رہے تھے۔ "اپنے تابوت کے لیے ایک دوسرے کو برا بھلا نہ کہو" ایک لاوارث لڑکے نے چلا کر کہا تھا۔ Debacker کو گزرتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی نظر گودی کی ایک لالٹین پر پڑ گئی تھی اور وہ اس پر چڑھ گیا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا سپاہی غرایا، "موسیو سپاہی،

مجھے چڑھ جانے دیجیے۔" لاوارث بچے نے کہا تھا اور اس نے صاحبانِ اختیار کا دل نرم کرنے کے لیے مزید کہا تھا، "میں نہیں گرنے والا۔" جواب میں سپاہی نے کہا تھا، "مجھے اس کی پروا نہیں۔"

لاوارث لڑکوں کی برادری میں یادگار حادثے بہت اہم ہوتے ہیں۔ جب کوئی سوچ بچار کی بلندی تک پہنچ جاتا ہے تو اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے۔

مُکا معمولی احترام کا عنصر نہیں رہ جاتا۔ آوارہ لڑکے کہتے ہیں، "میں اب طاقت ور ہوں؛ اب آؤ۔" بائیں ہاتھ والا ہوا قابلِ فخر ہوتا ہے۔ بھینگے کو معزز سمجھا جاتا ہے۔

۞

آخری بادشاہ کی دل چسپ باتیں

گرمی کے موسم میں وہ مینڈک بن جاتا ہے۔ شام کے وقت، جب رات اترنے لگتی ہے تو وہ Austerlitz اور Jena کے پلوں کے سامنے، کوئلے لے جانے والی گاڑیوں کے اوپر سے، اور دھوبنوں کی کشتیوں سے، سر کے بل دریائے سین میں کود پڑتا ہے۔ یہ پولیس کے اور شرم وحیا کے ہر قسم کے قانون کی صریحی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس کے باجود پولیس اس پر صرف نظر رکھتی ہے جس کا نتیجہ ایک ڈرامائی صورت ہوتا ہے، جس نے ایک دفعہ برادرانہ اور مشہور ومعروف ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ وہ ہنگامہ جس کا 1830ء میں جشن منایا گیا تھا، جو ہر لاوارث لڑکے کے لیے ایک تنبیہ تھی؛ یہ تنبیہ ہومر کے ایک شعر کی مانند تھی جس میں Panathenaea کا نغمہ بھی شامل تھا، جس میں ایک بار پھر قدیم Evohe کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے:

اوہو! تی تی!

پولیس والا آ رہا ہے

پولیس آ رہی ہے

اپنا مال اٹھا اور بھاگ جا

نالی سے ہوتا بھاگ جا!

کبھی کبھی یہ مچھر — وہ اپنے آپ کو اسی نام سے پکارتا تھا — پڑھ بھی سکتا ہے؛ کبھی کبھی لکھ بھی سکتا ہے؛ اسے لیپا پوتی کرنی بھی آتی ہے۔ کام کرنے میں ہچکچاتا بھی نہیں، مگر کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون سے احکامات ہیں، وہ کون سی صلاحیتیں ہیں جو عوام کے کام آ سکتی ہیں؛ 1815ء سے 1830ء تک اس نے ترکیہ کے ہنگامے کی نقل کی تھی؛ 1830ء سے 1848ء

تک وہ دیواروں پر ناشپاتیاں بناتا رہا تھا۔گرمی کے موسم کی شاموں میں، جب Louis Philippe پیدل اپنے گھر جا رہا تھا، اس نے ایک بونے کو دیکھا، جس کا قد اس کے گھٹنے سے زیادہ نہیں تھا، پسینے میں شرابور Neuilly کے پھاٹک کے ستونوں میں سے ایک ستون پر کوئلے سے ایک بڑی سی ناشپاتی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔بادشاہ نے، اپنی ان نیک صفات کے باعث جو اسے ہنری چہارم سے ملی تھیں، اس لاوارث لڑکے کو، یہ کہتے ہوئے ناشپاتی مکمل کرنے کی کوشش میں مدد کی تھی، ”ناشپاتی تو اس جسم پر بھی ہے۔“ [اس دن بنائی جانے والے تمام مزاحیہ خاکوں میں لوئی شانزدہم کا سر ناشپاتی جیسا بنایا گیا تھا]۔

لاوارث لڑکے کو شور وغل بہت پسند ہے۔اسے تھوڑا بہت تشدد بھی قابلِ قبول ہوتا ہے۔وہ پادریوں سے اظہارِ نفرت کرتا ہے۔ایک دن l'Universite اسٹریٹ میں ان آوارہ گردوں میں سے ایک، گاڑی کے پھاٹک نمبر 69 پر، اپنی ناک پر انگوٹھا لگائے کھڑا ہوا تھا۔”تم یہ کیا کر رہے ہو؟“ ایک راہ گیر نے اس سے پوچھا۔لڑکے نے جواب دیا، ”یہاں ایک پادری رہتا ہے۔“ یہ وہی جگہ تھی جہاں پاپائے اعظم کا سفیر رہتا تھا۔

بہر حال، لاوارث لڑکوں کی Voltairianism کچھ بھی ہو، اگر اسے سرودگاہ میں گانے والا بننے کا موقع مل جائے تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ وہ اسے قبول کرلے گا۔اور ایسی صورت میں وہ لوگوں سے شائستگی سے پیش آتا ہے۔وہاں دو چیزیں ہوتی ہیں جن میں وہ Tantalus [یونانی دیومالا کا ایک کردار] کا کردار ادا کرتا ہے مگر خود وہ کردار بننا نہیں چاہتا: حکومت کو تہ وبالا کر دینا، اور دوبارہ اپنے پاجامے سلوانا۔

اپنی مکمل حالت میں، لاوارث لڑکا پیرس کے پولیس والے جیسا ہوتا ہے؛ وہ ہر ملنے والے کا نام بتا سکتا ہے؛ اپنی انگلی کے اشارے سے ان کو بھگا سکتا ہے؛ ان کی عادتوں کا مطالعہ کرتا ہے، اور سب کے بارے میں مخصوص باتیں لکھتا رہتا ہے۔وہ پولیس والوں کے چہروں کو کتاب کی مانند پڑھتا ہے۔وہ آپ کو بلا کسی جھجک کے بتا سکتا ہے، فلاں شخص غدار ہے؛ فلاں شخص بڑا کینہ پرور ہے؛ فلاں شخص بہت عظیم انسان ہے؛ فلاں شخص نامعقول انسان ہے(اس کے نزدیک یہ سارے الفاظ — غدار، کینہ پرور، عظیم، نامعقول — خصوصی معنی رکھتے ہیں)۔اسے دیکھنے والے کو احساس ہوتا ہے گویا وہ Pont-Neuf کا مالک ہے، اور وہ لوگوں کو پشتے کے باہر، کارنس پر چلنے سے منع کرتا ہے؛ کہ اسے لوگوں کے کان، وغیرہ وغیرہ پکڑنے کا خبط ہے۔

۞

قدیم فرانسیسی

Poquelin کے مچھلی بازار والے لڑکے میں کوئی خاص بات ضرور تھی؛ کہ Beaumarchais [مشہور فرانسیسی ڈراما نگار، گھڑی ساز، موجد، موسیقار، سفارت کار، فراری، جاسوس، ناشر، زراعت کا ماہر، اسلحہ فروش، طنز نگار، ماہر مالیات اور انقلابی] میں بھی اس جیسی کچھ باتیں تھیں۔ لاوارث لڑکے میں کچھ قدیم فرانسیسی خصوصیات بھی ہوتی ہیں۔ وہ نیک نیتی سے گھل مل جاتا ہے تو دوسرے کی قوت میں اضافہ کر دیتا ہے، وہی جو وائن میں مل کر الکوحل کر دیتی ہے۔ کبھی یہ اس کا نقص بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہومر اپنے آپ کو دہراتا ہے؛ آپ کہہ سکتے ہیں کہ والٹیئر لاوارث لڑکے جیسا لگتا ہے۔

Camille Desmoulins پیرس کے مضافات کا باشندہ تھا۔ Championnet، جو معجزوں کے ساتھ ظالمانہ انداز میں پیش آتا تھا، پیرس کی گلیوں کی پیداوار تھا۔ جب وہ لڑکا تھا، اس نے Saint-Jean de Beauvais اور Saint-Etienne du Mont کو سیلاب میں غرق کر دیا تھا؛ اس نے Sainte-Genevieve کے مقبرے کو دوستانہ انداز میں Saint Januarius کی دوائی کی شیشی بھرنے کا حکم دیا تھا۔

پیرس کا لاوارث لڑکا باتمیز، طنز آمیز اور سرکش ہوتا ہے۔ اس کے دانت رقیبانہ انداز کے ہوتے ہیں، اس لیے کہ اسے اچھی غذا نہیں ملتی؛ اس کا پیٹ خراب رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں خوب صورت ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس میں فراست ہوتی ہے۔ اگر Jehovah خود موجود ہوتا تو جنت کی سیڑھیوں پر ایک پیر سے اچھلتا جاتا۔ وہ باکسنگ میں بہت ماہر ہوتا ہے۔ اس کے لیے سارے عقیدے ممکن ہوتے ہیں۔ وہ نالیوں میں کھیلتا ہے اور بڑا ہو کر باغی ہو جاتا ہے۔ گریپ

شات [توپ کے گولوں کی برسات] میں بھی اس کی شوخی قائم رہتی ہے؛ کبھی وہ لاابالی بچہ تھا، آج وہ ہیرو ہے۔ Thebes کے باشندوں کی طرح وہ شیر کی کھال اُتار لیتا ہے؛ Barra ڈھول بجانے والا پیرس کا لاوارث لڑکا تھا۔ وہ چلّا کر کہتا ہے، ''آگے بڑھو!'' جب کہ آسمانی پنکھے کا گھوڑا کہتا ہے، "Vah!" اور ایک لمحے بعد ہی وہ لونڈے سے دیو بن جاتا ہے۔

جوہڑ کا بچہ مثالی بچہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے پھیلاؤ کی پیمائش کیجیے جو Moliere سے Barra تک پہنچتا ہے۔

پوری بات کو ایک لفظ میں مختصر کیا جائے تو پیرس کا لاوارث لڑکا وہ وجود ہوتا ہے جو اپنا دل خود بہلاتا ہے، اس لیے کہ وہ بدقسمت ہوتا ہے۔

۞

پیرس کو دیکھو، آدمی کو دیکھو

اگر اس کو اور مختصر کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ آج کے پیرس کا لاوارث لڑکا، گزرے دنوں کے روم کے بدتہذیب لڑکوں کی نوزائیدہ آبادی کی مثال ہے، جس کی پیشانی پر ہمیشہ پرانی دنیا کے بل پڑے ہوتے تھے۔

لاوارث لڑکا قوم کے ماتھے کا کلنک ہے، ساتھ ہی بیماری بھی ہے؛ وہ بیماری جس سے شفا ہونی چاہیے، مگر کس طرح؟ روشنی سے۔

روشنی صحت افزا ہوتی ہے۔

روشنی چراغ نفی ہے۔

تمام فائدہ مند سماجی تابانیاں سائنس، ادب، فنون اور علم سے ظہور کرتی ہیں۔ آپ کسی انسان سے گرم جوشی سے پیش آیئے، وہ آپ کے دل کو گرما دے گا۔ بالآخر، عالم گیر تعلیم کا سوال اپنے پُرکشش اور مکمل اختیار کے ساتھ سامنے آہی جائے گا؛ اور پھر انھیں جو فرانسیسی خیالات کی نگرانی میں حکومت کرتے ہیں، انتخاب کرنا پڑے گا کہ فرانس کے بچے یا پیرس کے لاوارث بچے؛ روشنی میں شعلے یا بے رونق اندھیروں میں عفریتی روشنیوں کے جھماکے ہوتے ہیں۔

لاوارث لڑکا پیرس کا اظہار ہے، اور پیرس دنیا کا اظہار ہے۔

پیرس ایک کُل ہے؛ پیرس نسلِ انسانی کا اوج ہے۔ یہ نرالا شہر مردہ طریقوں اور زندہ طریقوں کا عملِ تصغیر ہے۔ وہ جو پیرس دیکھتا ہے، سمجھتا ہے کہ پوری تاریخ کے پاتال سمیت، آسمانوں کو اور کہکشاؤں کے فاصلوں کو دیکھ رہا ہے۔ پیرس کا اپنا دارالحکومت ہے، ٹاؤن ہال ہے، Parthenon ہے، Notre-Dame ہے، Mount Aventine ہے،

Saint-Antoine ہے، Asinarium ہے، Sorbonne ہے، Pantheon ہے، Via Sacra ہے، Boulevard des Italiens ہے، ہواؤں کا مندر ہے؛ اور یہ Gemoniae [قدیم روما کے زینے جو سزائے موت کی جگہ ہوتے تھے] کو تضحیک سے بدل دیتا ہے۔اس کا نچلا طبقہ "لاف زن" کہلاتا ہے؛اس کا قوال مضافات کا آدمی ہے؛ اس کا قوال بازار کا مزدور ہے؛ اس کی بازاری زبان Ghent کی بولی ہے۔ ہر وہ شے جو کہیں موجود ہو پیرس میں موجود ہوتی ہے۔ Dumarsais کی ماہی فروش عورت [یونان کے المیہ نویس] یوری پیڈیز کے مسالہ فروش پر طعنہ زنی کر سکتی ہے؛ Vejanus کا قدیم زمانے کا قرص انداز Forioso میں پھر زندہ ہو جاتا ہے؛تنی ہوئی رسی پر رقص کرنے والا Therapontigonus Miles کا سپاہی Vadeboncoeur کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل سکتا ہے؛ پرانا مال فروش Damasippu نوادر فروشوں کے درمیان رہ کر خوش ہو سکتا ہے؛ جس طرح Agora [فلسفی] Diderot کو قید کر سکتا ہے اس طرح Vincennes سقراط کو اپنی مٹھی میں لے سکتا ہے۔ [ماہر مالیات] Grimod de la Reyniere نے چربی بھلا گائے کا بھنا گوشت پکانا سکھا دیا تھا، جس طرح Curtillus نے بھنا خارپشت پکانا ایجاد کیا تھا؛ Arc of l'Etoile کے نیچے Plautus ہمیں جھولے پر کرتب دکھاتا ہے؛ Poecilus کے تلوار خور کا مقابلہ Apuleius سے ہوا جو Pont Neuf پر تلوار نگل لیتا ہے؛ Rameau کا بھتیجا Curculio کے ساتھ جوڑا بنا لیتا ہے؛Ergasilus، d'Aigrefeuille کے ذریعے Cambaceres کے سامنے پیش ہو سکتا ہے؛ روم کے چار بانکے Alcesimarchus, Phoedromus, Diabolus اور Argyrippus، Courtille سے Labatut کی ڈاک گاڑی میں آتے ہیں؛ Congrio کے سامنے Aulus Gellius اتنی دیر تک ٹھہر نہیں سکتا جتنا کہ Charles Nodier، Punchinello کے سامنے ٹھہرا تھا؛ Marto مونث چیتا نہیں، مگر Pardalisca بھی ڈریگن نہیں تھا؛ Nomentanus کے مقام پر مسخرہ Pantolabus تمسخر کرتا ہے؛ Hermogenus، Champs-Elysees پر گھومتا پھرتا ہے؛ اور اس کے اطراف Bobeche کی طرح ایک ملبوس فقیر Thracius دولت جمع کرتا ہے؛ اور اکتا دینے والا فقیر جو Tuileries کے درمیان آپ کے کوٹ کا بٹن پکڑ کر آپ کو دو ہزار برس پرانا جملہ Quis properantem me prehendit pallio? دہرانے پر مجبور کرتا ہے۔ Surene کی وائن Alba کی وائن کی مزاحیہ نقل بن جاتی ہے؛ Desaugiers کا سُرخ

کنارہ Balatro کی قطع گری کا توازن بن جاتا ہے؛ Pere Lachaise شبینہ بارش میں وہی خارج کرتا ہے جو Esquiliae نے کیا تھا؛ اور وہ قبر جو مفلس نے پانچ برس کے لیے خریدی تھی یقینی طور غلام کے تابوت کے ایک حصے کے برابر تھی۔

پیرس میں کیا نہیں ہے۔ Trophonius کی حوض میں کون سی شے ہے جو Mesmer کے ٹب میں نہیں تھی۔ Ergaphilas ایک بار پھر Cagliostro میں پایا جاتا ہے؛ Vasaphanta کا برہمن Comte de Saint-Germain کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے؛ Saint-Medard کے قبرستان میں بھی اتنے ہی اچھے معجزے ہوتے ہیں جیسے کہ دمشق کی Oumoumie مسجد میں ہوتے تھے۔

پیرس میں ایک AEsop-Mayeux ہے اور ایک Canidia میڈموزیل Lenormand۔ یہ Delphos کی طرح حقیقتوں کے تصوراتی جھماکوں سے خوف زدہ ہوتا ہے؛ اس نے میزوں کو الٹ دیا تھا جب Dodona تپائی بنا رہا تھا۔ یہ مزدور عورت کو اسی طرح تخت افروز کرتا ہے جیسے روم نے درباریوں کو تخت افروز کر دیا تھا؛ اور یہی ہوتا رہتا اگر لوئی پانزدہم Claudian سے بدتر ہوتا، اور Messalina مادام Dubarry سے بہتر ہوتی۔ پیرس بے مثال طریقے سے متحد ہو جانے والوں کی طرح ہے، جو قائم رہا ہے جس نے یونانی برہنگی کو عبرانی ناسور کو، اور شیخی بگھارنے والوں کی ذو معنویت کو رَد کر دیا ہے۔ اس نے [فلسفیانہ اور انسانیت کے] رسائل کو، مزدور اور مسخروں کو یک جا کر دیا ہے جو بھوت پریت کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور Chodruc Duclos کی تشکیل کرتے ہیں۔

حالاں کہ [یونانی نوافلاطونی فلسفی] Plutarch کہتا ہے: ظالم کی کبھی نشو ونما نہیں ہوتی، روم Sylla کے اور Domitian کے عہد میں دست بردار ہو گیا تھا اور جان بوجھ کر شراب میں پانی ملا دیا [یعنی دھوکا دیا] گیا تھا۔ Tiber [اطالیہ کے دریا] کو فراموش کر دیا گیا تھا، بلکہ اسے نظریاتی شاخسانہ بنا دیا گیا تھا جس کا کریڈٹ Varus Vibisvus کو ملتا تھا: Tiberim, id est Contra Gracchos Tiberim habemus, Bibere seditionem oblivisci. [یعنی ہم نے دریائے Tiber کو Gracchi [جو دونوں بھائی تھے جو بعد میں کے درمیان زمین کی تقسیم کے دوران قتل کر دیا گیا تھا] کے خلاف کر دیا ہے۔ دریائے Tiber کا پانی پیو [یعنی فساد ختم کرو]] پیرس روزانہ ایک ملین لیٹر پانی پیتا ہے مگر کبھی شور مچانے سے باز نہیں آتا۔

اس سے قطع نظر، پیرس دل آویز شہر ہے۔ ہر ایک کو شاہانہ انداز میں قبول کر لیتا ہے، محبت

کی پروا نہیں کرتا؛ اس کے خوب صورت ترین اس کے Hottentot [وحشی قبائل] ہیں؛ بہ شرطے کہ اس کو ہنسایا جا سکے، یہ ہر بات کو معاف کر دیتا ہے؛ بدصورتی اس کو خوش کر دیتی ہے؛ عضویاتی بدنمائی اس کو قہقہے پر اُکساتی ہے؛ برائی اس کو دوسری طرف موڑ دیتی ہے؛ کج رو ہو جایئے اور آپ کج رو ہو سکتے ہیں؛ بلکہ منافقت بھی کر سکتے ہیں؛ اعلیٰ درجے کی ترش روئی بھی اس کو متنفر نہیں کرتی؛ یہ شہر اتنا ادبی ہے کہ Basile [عام بولی بولنے] والوں کی طرف نظر بھی نہیں ڈالتا، اور Horace کے بجائے Tartuffe کی دعا سے بدنام نہیں ہوتا جتنا کہ [زرخیزی کے دیوتا] Priapus کی ہچکی سے پسپا ہو گیا تھا۔ پیرس کے تشخص میں عالم گیریت کی کمی نہیں۔

پیرس نظامِ کائنات کا مترادف ہے؛ پیرس ایتھنز ہے، Sybaris ہے، یروشلم ہے، Pantin ہے۔ اس میں، مختصر انداز میں، تمام تہذیبیں ہیں، تمام جہالتیں بھی ہیں۔ اگر پیرس میں گلوٹین نہ ہوتا تو اسے بہت افسوس ہوتا۔

تھوڑا سا Place de Greve [وہ میدان جہاں مجرموں کے سر قلم کیے جاتے تھے] کا ہونا بھی اچھا ہوتا ہے۔ مصالحے کے بغیر ابدی جشن کا کیا مزہ۔ ہمارے قوانین عقل مندی سے بنائے گئے ہیں، اور ان کے طفیل ہی، Shrove Tuesday میں گلوٹین سے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔

طنز و تشنیع کرنا، بادشاہت کرنا

پیرس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس شہر جیسا کوئی شہر نہیں؛ جس پر حکومت کرتا ہے، کبھی کبھی ان کا مذاق بھی اُڑاتا ہے۔ تم کو خوش کرنے کے لیے اسکندر نے بلند آواز میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا، اے ایتھنز والو! پیرس قانون سے زیادہ ایک اور شے بناتا ہے؛ پیرس فیشن بناتا ہے۔ پیرس فیشن سے بھی کچھ زیادہ کرتا ہے؛ معمول طے کرتا ہے۔ ضرورت پڑے تو پیرس احمق بھی ہو سکتا ہے؛ پیرس کبھی کبھی یہ عیاشی بھی کر لیتا ہے؛ مگر اس کے ساتھ سب ہی یہ عیاشی کرنے لگتے ہیں؛ تب پیرس جاگ جاتا ہے، اپنی آنکھیں ملتا ہے، اور کہتا ہے، ”میں بھی کیسا احمق ہوں۔“ اور پھر نسلِ انسانی کے سامنے قہقہہ لگانے لگتا ہے۔ ایسا شہر کیسا عجیب و غریب شہر ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کا یہ طمطراق اور یہ ٹھٹھول، دونوں دوستانہ پڑوسی کی طرح ایک ساتھ رہتے ہیں؛ اس کا مزاحیہ انداز اس کی شان کو خراب نہیں کرتا، اور یہ بھی کہ وہی منہ جو آج یومِ حساب کا بگل بجا سکتا ہے، کل اسے بانسری کی ضرورت بھی ہوگی۔ پیرس کی خوش مزاجی بھی شاہانہ ہوتی ہے۔ اس کی خوشی بادلوں کی گرج جیسی ہوتی ہے، اور اس کا تماشا ہاتھ میں عصائے سلطانی لیے ہوتا ہے۔

یہ وہ آندھی ہے جو کبھی تصنع کی بھی پیداوار ہوتی ہے۔ اس کے دھماکے، اس کے دن، اس کے شاہکار ہیں، اس کے حیرت انگیز کارنامے ہیں، رزمیے ہیں، جو کائنات کی حدوں تک جاتے ہیں، اس کے قصے من گھڑت قصے ہیں۔ اس کی ہنسی وہ آتش فشاں ہے جو پورے کرۂ ارض پر ریزہ ریزہ گرتا ہے۔ اس کا مزاح چنگاریاں بکھیرتا ہے۔ یہ لوگوں پر اپنی مضحکہ نقل اور اپنی مثالیت نافذ کر دیتا ہے؛ انسانی تہذیب کی بلند ترین یادگار اس کی سنگ دلی قبول کر لیتی ہے اور اس کی شرارتی خرمستی کو ابدی بنا دیتی ہے۔ یہ نہایت شان دار ہے؛ اس میں چودہ جولائی کا ایک نرالا دن ہے جو

پورے کرۂ ارض پر چھا جاتا ہے، یہ تمام قوموں سے حلف لیتا ہے؛ اس کی چوتھی اگست کی رات تین گھنٹوں کے اندر ہزاروں برس کی منصب داری کو تحلیل کر دیتی ہے؛ یہ اپنی متفق الرائے منطق کو حضلہ بنا دیتا ہے؛ یہ خود کو ہر قسم کے ارفع پیکروں میں تبدیل کر لیتا ہے؛ یہ Washington, Kosciusko, Bolivar, Bozzaris, Riego, Bem, Manin, Lopez, John Brown, Garibaldi وغیرہم کو اپنی روشنی سے منور کر دیتا ہے؛ یہ ہر اس جگہ ہوتا ہے جہاں مستقبل کو روشن بنایا جاتا ہے، 1779ء میں بوسٹن میں، 1820 میں Isle de Leon میں، 1848ء میں Pesth میں، 1860ء میں Palermo میں طاقت وروں کے کان میں سرگوشی کر دیتا ہے— آزادی، اور امریکی حامیان انسداد غلامی Harper کی کشتی پر جمع ہو جاتے ہیں، اور اس نے Ancona کے وطن دوستوں کے جو سایے میں جمع تھے، اور Archi کے جو سمندر کے ساحل پر Gozzi سرائے میں جمع کانوں میں سرگوشی کر دی تھی؛ اس نے Canaris بنایا؛ اس نے Quiroga پیدا کیا؛ اس نے Pisacane کی تشکیل کی ہے؛ یہ عظیم لوگوں کو زمین پر روشن کرتا ہے؛ یہ سب کس وقت ہوا تھا، جب بائرن Missolonghi میں چل دیا گیا تھا، اور Mazet بارسلونا میں مر گیا تھا؛ وہ وکیل جمہور تھا جو Mirabeau کے پیروں تلے دبا ہوا تھا، اور ایک گڑھا تھا جو Robespierre کے پیروں تلے تھا؛ اس کی کتابیں، اس کے تھیٹر، اس کا فن، اس کی سائنس، اس کا ادب، اس کا فلسفہ انسانی نسل کے کتابچے ہیں؛ ان میں Jean-Jacques Pascal, Regnier, Corneille, Descarte موجود ہیں: والٹیئر ہمہ وقت، مولیئر ہر صدی کے لیے اپنی زبان کو آفاقی دہانوں کے قابل بنا دیتا ہے، اور زبان لفظ بن جاتی ہے؛ یہ تمام دماغوں میں ترقی کے خیال، اور عقائد کو آزاد کرتا ہے جو اپنے معتقد دوستوں کی نسلوں کے لیے ہوتے ہیں، اور جو اس کے سوچنے والوں کے نفوس کے لیے ہوتے ہیں، اس کے شاعروں کے لیے ہوتے ہیں اور تمام قوموں کے ہیروؤں کے لیے ہوتے ہیں جو 1789ء سے ہیرو بنے ہیں؛ یہ آوارہ گردی کو اور عظیم جوہر قابل کو روکتا نہیں ہے۔ اسی کو پیرس کہتے ہیں۔ یہ اپنی روشنی سے دنیا کی ظاہری شکل کو بدلتے ہوئے Theseus کی دیواروں پر کوئلے سے خاکے بناتا ہے اور اہرامِ مصر پر چور Credeville کا نام لکھوا دیتا ہے۔

پیرس کے دانت ہمیشہ نظر آتے رہتے ہیں؛ جب یہ ڈانٹتا نہیں تو ہنستا رہتا ہے۔

یہ ہے پیرس۔ اس کی چھتوں سے نکلنے والا دھواں کائنات کے خیالات پیش کرتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مٹی کا تودہ اور پتھر کہہ لیں، مگر سب سے بڑھ کر یہ ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہ

بڑے سے بھی زیادہ بڑا ہے، بلکہ بے پایاں ہے۔

ہمت ہو تو یہ بھی کہا جا سکتا کہ ترقی کی قیمت بھی ہوتی ہے۔

تمام ارفع فتوحات، کم و بیش، ہمت کا انعام ہوتی ہیں۔ انقلاب لانے کے لیے ضروری نہیں کہ [مدبر سماجیات] Montesquieu ہی اس کی پیش بینی کرے۔ Condorcet [جیسا فرانسیسی فلسفی اور ماہر ریاضیات] ہی اس کا حساب لگائے، Diderot [جیسا فلسفی اور ادیب] ہی اس کی تبلیغ کرے، Beaumarchais [جیسا ڈراما نگار] ہی اس کا اعلان کرے۔ روسو [جیسا فلسفی] اور ادیب ہی اس کے لیے مراقبہ کرے، ضروری ہے کہ Danton اس کی ہمت کرے۔

جرأت کا شور ایک مفید آمرانہ حکم ہوتا ہے۔ انسانی ترقی کی خاطر یہ ضروری ہوتا ہے، کہ ہمت کی مثالیں مستقلاً بلندی پر رہیں۔ دلیری کے کام تاریخ کو چمک دمک عطا کرتے ہیں، اور آدمی کے لیے روشنی کا منبع ہوتے ہیں۔ سویرا ہمت کرتا ہے تب ہی سویرا ہوتا ہے۔ جد و جہد کرنا، ثابت قدم رہنا، اپنے آپ سے وفادار رہنا، مقسوم کا دلیری سے سامنا کرنا، جب اس کا سامنا ہو تو تھوڑے سے خوف سے حیرت زدہ کر دینا، کبھی غیر منصفانہ گستاخی کرنا، کبھی بدمست فتح کی توہین کر دینا، اپنی حیثیت کو قائم رکھنا، اپنے پیروں پر کھڑا ہونا؛ وہ مثالیں ہیں قوموں کو جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ روشنی ہے جو ان میں پھرتی بھر دیتی ہے۔ وہی خوف ناک کندا پرومتھیوس [یونانی دیو مالا کا کردار] کی مشعل سے [فرانسیسی جرنیل] کا تمباکو نوشی کا پائپ بن جاتا ہے۔

۞

عوام کا پوشیدہ مستقبل

جہاں تک پیرس کے عوام کا معاملہ ہے، جب آدمی بڑا ہو جاتا ہے تب بھی وہ ہمیشہ گلی کا عرب ہی کہلاتا ہے؛ بچے کو کسی رنگ میں رنگ دینے کا مطلب ہوتا ہے کہ پورے شہر کو رنگ دیا گیا ہے؛ اسی وجہ سے ہم نے اس بدنام کنجشک (گوریا) میں پوشیدہ عقاب کا مطالعہ کیا ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ وہ پیرس کے مضافات ہی ہیں جہاں پیرس کی نسلیں وجود میں آتی ہے؛ وہیں خالص خون ملتا ہے؛ وہیں اس شہر کے اصلی خدوخال ملتے ہیں؛ وہیں یہ لوگ محنت کرتے ہیں اور دُکھ اٹھاتے ہیں؛ محنت کرنا اور دُکھ اٹھانا آدمی کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ وہی جگہ ہے جہاں بے شمار نامانوس لوگ رہتے ہیں، جن میں جھنڈ کی صورت میں لوگ ہوتے ہیں، قتال سے لے کر پسے ہوئے سے Montfaucon کے کباڑیے تک۔ Cicero ان کو Fex urbis کہتا ہے؛ برک انھیں برہم ہو کر مجمع، اژدہام، کثرتِ عوام کہتا ہے۔ یہ سارے الفاظ تیزی سے ادا کر دیے جاتے ہیں۔ تو پھر یوں ہی سہی۔ اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ اگر وہ ننگے پیر پھرتے ہیں تو مجھے کیا۔ وہ پڑھنا نہیں جانتے، بہت بُری بات ہے۔ مگر کیا اس وجہ سے آپ انھیں چھوڑ دیں گے؟ کیا آپ ان کی مشکل کو بد دعا میں بدل دیں گے؟ کیا ان لوگوں میں روشنی داخل نہیں ہو سکتی؟ آیئے، ذرا ہم اس شور کی طرف واپس چلتے ہیں— روشنی! ہمیں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ روشنی! روشنی! کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کثافتیں شفاف نہیں بنیں گی؟ کیا انقلابات تبدیلِ ہیئت نہیں ہوتے؟ آؤ فلسفیو، انھیں پڑھاؤ، آگاہ کرو، روشن کرو، با آواز بلند سوچو، با آواز بلند بات کرو، خوشی خوشی دھوپ کی طرف جاؤ، عوامی جگہوں کو اپناؤ، اچھی خبروں کا اعلان کرو، اپنے الفاظ کو بے دردی سے خرچ کرو، حقوق کا اعلان کرو، فرانس کا قومی ترانہ گاؤ، ولولے کاشت کرو، شاہ بلوط کے درختوں کی

ٹہنیاں توڑو۔ خیالات کا گرداب بناؤ۔ اس طرح مجمع بھی رفیع ہو جائے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اصولوں اور خوبیوں کو، جو خاص اوقات میں جھلملاتی ہیں، پھوٹتی ہیں، لرزتی ہیں، استعمال کر سکیں۔ ان ننگے پیروں کو، ان ننگے بازوؤں کو، ان چیتھڑوں کو، ان جہالتوں کو، ان پستیوں کو، ان اندھیروں کو، اپنے معیار کے حصول کے لیے استعمال کرو۔ ذرا گزرے ہوؤں کو غور سے دیکھو، تمھیں سچ کا ادراک ہو جائے گا۔ اس حقیر ریت کو جسے تم اپنے پیروں تلے کچلتے ہو بھٹی میں ڈال دو، اسی میں اسے پگھلنے اور اُبلنے دو، یہ ایک شان دار بلور میں ڈھل جائے گی، اور اسی کے طفیل گیلیلیو اور نیوٹن ستارے دریافت کریں گے۔

۞

ننھا گاوروش

اس قصے کے تیسرے حصے کے واقعات میں، جو آٹھ یا نو برس بعد بیان کیے گئے تھے، لوگوں نے دیکھا تھا کہ Boulevard du Temple پر، اور Chateau-d'Eau کے علاقوں میں ایک چھوٹے سا لڑکا تھا، جس کی عمر گیارہ یا بارہ برس رہی ہوگی، اور کسے یہ احساس ہوا ہوگا کہ یہی بچہ کا وہ لاوارث لڑکا ہے جس کا گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اگر اس کی عمر کے مطابق اس کے لبوں پر ہنسی نہ ہوتی، اور اس کے سینے میں مکمل طور پر سنجیدہ اور بالکل خالی دل نہ ہوتا۔ یہ لڑکا مردوں والی پتلون میں ملبوس تھا، مگر یہ اسے اس کے باپ سے نہیں ملی تھی، اور عورتوں کی قمیص پہنے تھا جو اسے اس کی ماں سے نہیں ملی تھی۔ بس، کچھ لوگوں نے اسے پرانے کپڑے پہنا دیے تھے جو خیرات میں ملے تھے، مگر اس کا اپنا باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ مگر اس کے باپ کو اس کی پروا نہیں تھی، اور اس کی ماں اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔

وہ ان قابلِ رحم بچوں میں سے تھا، جن کے ماں باپ موجود ہوتے ہوئے بھی وہ یتیم ہوا کرتے ہیں۔ وہ بچہ سڑک پر آنے سے پہلے کبھی اتنا خوش نہیں تھا۔ یہ پتھریلے راستے اس کی ماں کے دل کے مقابلے میں کم سخت تھے۔

اس کے والدین نے اسے ایک ٹھوکر مار کر زندگی میں ڈال دیا تھا۔

اور وہ فرار ہو گیا تھا۔

وہ غل غپاڑہ کرنے والا، بے رونق، پھرتیلا، ہشیار، طعنہ زن مگر زندہ دل اور پیچکے بالوں والا لڑکا تھا۔ آتا، جاتا، گاتا، کھیلتا، نالیاں کھرچتا، تھوڑی بہت چوری بھی کر لیتا تھا، مگر بلیوں اور گوریاؤں کی طرح؛ جب اس کو بدمعاش کہا جاتا تو وہ خوش دلی سے ہنستا، اور اگر چور کہا جاتا تو

ناراض ہو جاتا تھا۔ اس کی کوئی پناہ گاہ نہیں تھی؛ نہ روٹی تھی، نہ آگ تھی، نہ محبت، مگر وہ ہمیشہ خوش رہتا تھا، اس لیے کہ وہ آزاد تھا۔

جب یہ بے چارے لڑکے بڑے ہو کر مرد بن جاتے تھے تو سماج کی چکّی ان کو پیس ڈالتی تھی، مگر جب تک وہ بچے رہتے، اپنی کم عمری کی وجہ سے بچ جاتے تھے؛ چھوٹے سے چھوٹا سوراخ بھی انھیں بچا لیتا تھا۔

باوجود اس کے کہ وہ لاوارث بچہ تھا، ہر دو یا تین ماہ بعد کچھ ایسا ہوتا تھا کہ وہ کہتا تھا، "چلو، اب میں مما سے ملنے جا رہا ہوں۔" اور پھر وہ بولیوارڈ، Cirque، Porte Saint-Martin چھوڑ دیتا اور پشتوں پر چلا جاتا، پُل پار کرتا، مضافات میں پہنچ جاتا، Salpetriere میں داخل ہو جاتا، اور وہاں پہنچ کر رُک جاتا، کہاں؟ بالکل اسی جگہ پر جہاں وہ دہرے نمبروں والا مکان تھا، قاری جس سے واقف ہے — یعنی Gorbeau منزل۔

اس زمانے میں وہ جگہ یعنی 52-50 نمبر کی عمارت جو عام طور پر ویران ہوتی تھی، ابدی طور پر ایک اشتہار "کرایے کے لیے کمرے" سے مزیّن رہتی تھی۔ اس میں بہت سے افراد رہتے تھے، مگر جیسا کہ پیرس میں عام طور پر ہوتا ہے، ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ سب کچھ اس مفلس طبقے کے لوگوں کی ملکیت تھا جو بورژوا طبقے کے نچلے درجے سے الگ ہو کر اس درجے تک جاتا تھا جو سماج کے بدترین درجے پر ختم ہوتا تھا، یعنی نالی کے انسانوں پر جو کیچڑ کی صفائی کرتے ہیں اور چیتھڑے چننے والے جو کباڑ جمع کرتے ہیں۔

ژاں ولژاں کے دنوں میں اس عمارت کی "مرکزی کرایہ دار" خاتون مر گئی تھی، اور بالکل اسی جیسی ایک اور عورت اس کام کے لیے منتخب کر لی گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس فلسفی کا کیا مطلب تھا جب اس نے کہا تھا "بوڑھی عورتوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔"

اس نئی بوڑھی عورت کا نام مادام Bourgon تھا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ ایک خاندان کے تین طوطوں نے یکے بعد دیگرے اس کے نفس پر حکومت کی تھی۔

اس مکان میں قیام کرنے والوں میں سب سے بدحال چار نفوس پر مشتمل ایک خاندان تھا جس میں باپ، ماں اور دو بیٹیاں تھیں، جو پوری طرح جوان تھیں اور یہ چاروں دو چھتی کی ایک ہی کوٹھری میں رہتے تھے، جن کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔

پہلی نظر میں تو اس خاندان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی سوائے اس کی بے حد

بد حالی کے؛ جب اس کے باپ نے کمرہ کرایے پر لیا تھا، اپنا نام ژاندریت (Jondrette) بتایا تھا۔ وہاں منتقل ہونے کے کچھ عرصے بعد اس ژاندریت نے اس عورت سے کہا تھا، جو اپنے سے قبل والی خاتون کی طرح، دربان بھی تھی اور سیڑھیوں کی صفائی کرنے والی بھی، "مادر فلاں اور فلاں، اگر اتفاق سے کوئی تم سے کسی پول کے، یا اطالوی کے، حتیٰ کہ ہسپانوی کے بارے میں بھی دریافت کرے تو وہ میں ہی ہوں گا۔"

یہ اسی خوش حال ننگے پاؤں لڑکے کا خاندان تھا۔ وہ یہاں پہنچا، اور اسے پریشانی کا سامنا ہوا، اور جو سب زیادہ افسوس کی بات تھی کہ سب کے لبوں سے تبسم غائب تھا؛ گھر بھی سرد مہر تھا اور دل بھی سرد مہر تھے۔ جب وہ مکان میں داخل ہوا اور اس سے سوال کیا گیا کہ "تم کہاں سے آرہے ہو؟" تو اس نے جواب میں کہا تھا، "سڑک پر سے۔" جب وہ جانے لگا، تو انھوں نے سوال کیا تھا، "تم کہاں جانے والے ہو؟" تو اس نے جواب میں کہا تھا، "سڑکوں پر۔" اس کی ماں نے اس سے کہا تھا، "تم یہاں کس لیے آئے تھے؟"

بچہ، محبت کی غیر موجودگی میں کوٹھڑیوں میں رکھے ان پودوں کی طرح پلا بڑھا تھا جو بے رنگ ہوتے ہیں۔ اسے کوئی دُکھ نہیں ہوا، اور اس نے کسی کو دوش نہیں دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ماں باپ کو کیسا ہونا چاہیے۔

اس کے باوجود، اس کی ماں اس کی بہنوں سے محبت کرتی تھی۔

ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ سڑک پر رہنے والے اس چھوٹے سے بچے کا نام گاوروش (Gavroche) تھا۔ اسے گاوروش کیوں کہا جاتا تھا؟

شاید اس لیے کہ اس کے باپ کا نام ژاندریت تھا۔

کچھ بد بخت خاندانوں کی یہ فطرت ہوتی تھی کہ وہ اپنے رشتوں کے دھاگے توڑ دیا کرتے تھے۔

Gorbeau منزل کی وہ کوٹھڑی جس میں ژاندریت خاندان رہتا تھا راہداری کے بالکل آخر میں تھا۔ ان کی کوٹھری کے برابر والی کوٹھری میں ایک بہت مفلس نوجوان رہتا تھا جس کا نام موسیو (Marius) ماریوس تھا۔

آیئے ہم بتاتے ہیں کہ یہ موسیو ماریوس کون صاحب تھے۔

❋

نوے برس اور بتیس دانت

Boucherat، Normandie اور Saintonge کی سڑکوں پر ایسے چند قدیم خاندان اب بھی رہتے ہیں جن کے دلوں میں ایک نیک انسان موسیو ﮊیلر نورما (Gillenormand) رہا کرتا تھا اور جو اس کا تذکرہ بہت اخلاق سے کیا کرتے تھے۔ یہ نیک دل انسان اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا جب وہ لوگ جوان تھے۔ اس کا یہ ہیولا — ان لوگوں کے لیے جو سایوں کے اس ہجوم کو افسردگی سے یاد کرتے تھے — ابھی تک اس مندر کے اطراف پھیلی سڑکوں کی اس بھول بھلیاں سے پوری طرح غائب نہیں ہوا ہے، لوئی چہاردہم کے دور حکومت میں جن کے نام فرانس کے تمام صوبوں کے نام پر رکھے گئے تھے، بالکل اس طرح جیسے کہ آج Tivoli کے نئے علاقے کی سڑکوں کو یورپ کے تمام دارالحکومتوں کے نام دیے جا رہے ہیں؛ ایسی ترقی جس میں ترقی نظر بھی آتی ہے۔

موسیو Gillenormand جو 1831ء میں بھی زندہ تھا، ان لوگوں میں سے تھا جو دیکھنے جانے والی شے بن چکے تھے، محض اس لیے کہ انھیں ایک طویل عمر ملی تھی، جو حیرت انگیز تھے، اس لیے کہ پہلے ان میں ہر شخص کی شباہت آتی تھی، مگر اب کسی کی بھی شباہت نہیں آتی۔ وہ ایک خاص قسم کا عمر رسیدہ انسان جو صحیح معنوں میں مکمل طور پر ایک خود پسند و مغرور بوڑھا تھا۔ اس کی عمر نوے برس سے تجاوز کر چکی تھی؛ وہ بالکل ایستادہ ہو کر چلتا تھا؛ زور سے بولتا تھا؛ اسے صاف دکھائی دیتا تھا؛ خالص شراب پیتا؛ خالص کھانا کھاتا؛ خوب سوتا اور خوب خراٹے لیتا تھا۔ اس کے سارے بتیس دانت سلامت تھے۔ وہ صرف عینک لگاتا تھا، وہ بھی اس وقت جب کچھ پڑھنا ہوتا تھا۔ وہ عاشق قسم کا انسان تھا، مگر اس نے اعلان کر دیا تھا کہ پچھلے دس

برس سے اس نے کسی عورت کو مس بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا، وہ انھیں مطمئن نہیں کر سکتا تھا، مگر اس میں یہ اضافہ نہیں کیا تھا کہ "میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔" بلکہ وہ کہتا تھا کہ "میں بہت مفلس ہو چکا ہوں۔" وہ کہتا تھا، "اگر میں تباہ نہ ہو گیا ہوتا...... ہی ہی ہی۔" دراصل اب اس کی صرف پندرہ ہزار فرانک آمدنی رہ گئی تھی۔ اس کا خواب کسی وراثت میں شامل ہونا اور داشتاؤں کے لیے ایک لاکھ livres آمدنی کا مالک ہونا تھا۔ جیسا کہ قاری کو اندازہ ہو گیا ہوگا، اس کا تعلق ایسے ناتواں قسم کے اسی سالہ انسانوں میں سے نہیں تھا جو موسیو والٹیئر کی طرح تمام زندگی اسی تمنا میں رہتے تھے، وہ بوڑھا کھوسٹ نہیں تھا۔ یہ خوش وخرم شخص ہمیشہ تندرست رہا تھا۔ سطحی قسم کا تیز مزاج، اور آسانی سے غصے میں آجانے والا انسان تھا۔ وہ ہر بات میں جذباتی ہو جاتا تھا، عام طور جس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ جب اس کی کسی بات کی تردید کی جاتی تو وہ اپنی بید اٹھا لیتا؛ اور لوگوں کو پیٹ ڈالتا تھا، جیسا کہ اس نے پچھلی عظیم صدی میں کیا تھا۔ اس کی پچاس برس سے زیادہ عمر کی ایک لڑکی تھی، جس کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور جب وہ غصے میں ہوتا تو اپنی زبان سے اس کی سرزنش کرتا تھا، اور اسے بید لگانا بھی پسند کرتا تھا۔ اس کے نزدیک، اس کی بیٹی محض آٹھ برس کی تھی۔ اپنے ملازموں کے کان کھینچتا اور انھیں "ارے مردار!" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کی قسموں میں سے ایک By the pantoufloche of the pantouflochade! تھی۔ اس کی سب سے انوکھی بات اس کی طمانیتِ قلب تھی۔ وہ روزانہ ایک حجام سے ڈاڑھی بنواتا تھا، جو پاگل آدمی تھا اور موسیو بلیر نورماں سے، اپنی بیوی کی وجہ سے، حسد کرتا تھا جو خوب صورت بھی تھی اور نخرے باز حجامت بنانے والی عورت بھی۔ موسیو بلیر نورماں ہر شے کے بارے میں اپنی بصیرت پر بہت نازاں تھا، اور کہتا تھا کہ وہ بہت تیز فہم انسان ہے۔ اس کا ایک جملہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، "سچ پوچھا جائے تو مجھ میں اب بھی دخول کی کچھ صلاحیت موجود ہے؛ اگر کوئی مچھر مجھے کاٹ لے تو میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کس عورت کے پاس سے ہو کر آیا ہے۔"

وہ الفاظ جو وہ عام طور پر استعمال کرتا تھا 'سمجھ دار آدمی' اور 'فطرت' تھے۔ اس نے اس آخری لفظ کو وہ عام معنی نہیں دیے جو ہمارے عہد نے دیے ہیں مگر ان کو اپنے سطحی طنزیہ انداز میں داخل ہونے دیا تھا؛ "فطرت نے" اس نے کہا، "تاکہ تہذیب کو ہر شے کی تھوڑی تھوڑی مقدار مل جائے، اس کو تفریحی بربریت کا نمونہ بھی عطا کیا ہے۔ یورپ کے پاس ایشیا اور افریقہ کے نمونے بھی ہیں۔ بلی ڈرائنگ روم کی چیتا ہے، چھپکلی جیبی گھڑیال ہے۔ اوپرا کی

رقاصائیں گلابی وحشی جادوگرنیاں ہیں۔

وہ آدمیوں کو کھاتی نہیں، انھیں چباتی ہیں؛ یا وہ جادوگری کرتی ہیں؛ان کی سیپیوں میں قلب ماہیت کر کے انھیں نگل جاتی ہیں۔جزائرِ غرب الہند والے صرف ہڈیاں چھوڑتے ہیں، وہ صرف خول چھوڑ دیتی ہیں۔ایسے ہیں ہمارے اخلاق۔ ہم کھاتے نہیں ہیں، ہم مسلسل کُترتے رہتے ہیں؛ ہم بالکل نیست و نابود نہیں کرتے، ہم پنجوں میں پکڑے رہتے ہیں۔

۞

جیسا مالک ویسا مکان

وہ مکان نمبر 6، Filles-du-Calvaire اسٹریٹ، Marais میں رہتا تھا۔ مکان اس کی ملکیت تھا۔ یہ مکان گرا کر دوبارہ بنایا گیا ہے، اور پیرس میں ہونے والے انقلابات کے عملِ بحالی میں اس کا نمبر بھی تبدیل کر دیا گیا ہے۔ وہ سڑک اور باغیچے کے درمیان، پہلی منزل کے ایک وسیع فلیٹ میں رہتا تھا، جس کی وہیں مناظر والے Gobelins اور Gobelins کے بنائے ہوئے پردوں سے سقف تک آرائش کی گئی تھی؛ اور ان ہی مناظر کے مختصر نقوش کرسیوں پر بھی بنائے گئے تھے۔ اس کا بستر نو پتیوں والی Coromandel چقوں میں چھپایا گیا تھا۔ کھڑکیوں پر لمبے لمبے، بڑی بڑی تہوں والے خوب صورت پردے پڑے تھے۔ باغیچے کے قریب والی کھڑکی کے پاس سے بارہ قدموں والا زینہ شروع ہوتا تھا جس پر وہ نہایت تیزی سے اترتا چڑھتا تھا۔ اس کے کمرے سے ملحق کتب خانے کے علاوہ، خواتین کی ایک خواب گاہ بھی تھی، جس کا وہ بہت خیال رکھتا تھا، جو ایک پُر تکلف اور نفیس خلوت خانہ تھا، جس میں تنکوں سے بنی شان دار تصویریں آویزاں تھیں جن پر لوئی چہاردہم کا تین پھولوں والا خصوصی نشان بھی تھا، وہی نشان جو اس کے پھانسی گھاٹ پر اس کی داشتہ کے حکم پر موسیو Vivonne نے بنایا تھا۔ موسیو ہلیر نورما کو یہ آرائش اپنی پھانی سے وراثت میں ملی تھی جس کا سو برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ اس کے آداب درباریوں اور وکیلوں کے درمیان جیسے کسی شخص کے تھے، حالاں کہ وہ کبھی درباری نہیں رہا تھا؛ شاید کبھی وکیل رہا ہوگا۔ جب اس کا جی چاہتا بہت خوش مزاج ہوتا اور خوب نازبرداری بھی کرتا تھا۔ نوجوانی کے دنوں میں وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو ان کی بیویاں اور داشتائیں کبھی دھوکا نہیں دیتیں، اس لیے کہ ان کا وجود، ایک ہی وقت میں، بیزار شوہروں اور

بے حد دل فریب عاشقوں جیسا ہوتا ہے۔ وہ پینٹنگ کا صاحبِ ذوق ماہر تھا۔ اس کے اپنے کمرے میں ایک لاجواب تصویر تھی، نہ جانے کس کی تھی، جسے Jordaens نے برش کی بڑی بڑی لکیروں سے پینٹ کیا تھا، جس میں نہایت پیچیدہ اور بے ترتیب انداز کی لاکھوں تفصیلات تھیں۔

موسیو بلیز نورما کی پوشاک نہ تو لوئی چہاردہم جیسی تھی، نہ لوئی شانزدہم جیسی ہو سکی تھی؛ بس ڈائرکٹری کے بانکوں جیسی ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس وقت تک جوان سمجھتا تھا اور فیشن کی پیروی کرتا تھا۔ اس کا کوٹ ہلکے کپڑے، اور بڑے بڑے گھیر کا ہوتا تھا، جس کی ایک لمبی ابابیل جیسی دوشاخہ دُم ہوتی تھی جس میں آہنی بٹن لگے ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ گھٹنے تک کی برجس اور بکسوئے والے جوتے پہنتا تھا۔ اس کے ہاتھ ہمیشہ جیبی گھڑی والی جیب میں ہوتے تھے۔ اس نے [ایک بار] بڑے تحکمانہ انداز میں کہا تھا، ”انقلاب فرانس لفنگے پن کا ڈھیر ہے۔“

❁

LUC-ESPRIT

سولہ برس کی عمر میں، ایک شام اوپرا میں اسے یہ اعزاز ملا کہ اوپیرا کی دوربینوں سے دو حسینائیں ایک ساتھ اسے گھور رہی تھیں — جو اس وقت تجربے کار اور مشہور حسینائیں تھیں جن کی تعریف والٹیئر نے، Camargo نے اور Salle نے بھی کی تھی ۔دو شعلوں کے درمیان گھرے اس شخص نے ایک چھوٹی سی رقاصہ کی طرف بہادرانہ پسپائی کی تھی، جو Nahenry نام کی ایک غیر معروف نوجوان لڑکی تھی جس کی عمر اسی کی طرح، سولہ برس کی رہی ہوگی، وہ جس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔اس کی یادیں وافر تھیں، اور اپنی عادت کے مطابق وہ کہا کرتا تھا، "کتنی خوب صورت تھی وہ — وہی جس کا نام تھا Guimard Guimardini Guimardinette، جسے میں نے پچھلی بار Longchamps میں دیکھا تھا، اس کے بال جذبات کی برداشت سے، آتے جاتے نظر پڑنے والے فیروزوں سے، نووارد لوگوں کی عبا کے رنگوں سے اور اونی دست پوش سے گھنگھریالے تھے۔" اپنی جوانی کی مردانگی کے دنوں میں وہ Nain-Londrin کی ایک واسکٹ پہنا کرتا تھا، جس کے بارے میں بڑے جوش سے باتیں کرنا اسے بہت پسند تھا۔ وہ کہتا تھا، "میں مشرق کے کسی ترک کی طرح ملبوس تھا۔" مادام Boufflers، جنھوں نے اتفاق سے اسے اس وقت دیکھا تھا جب اس کی عمر بیس برس رہی ہوگی، اس کو ایک "ایک دل فریب احمق" کہا تھا۔ وہ ان تمام ناموں سے خوف زدہ ہو جاتا تھا جنھیں اس نے سیاست اور اقتدار میں دیکھا تھا، جنھیں وہ بیہودہ اور بورژوا گردانتا تھا۔وہ رسائل، اخبارات اور گزٹ پڑھا کرتا تھا، اس لیے کہ اکثر وہ سانس روک دینے والے قہقہوں کے ساتھ کہتا تھا، "اوہ! کیسے لوگ ہیں یہ لوگ! Corbiere! Humann! Casimir Perier!۔

آپ کے لیے بھی ایک وزیر موجود ہے۔ میں نے ایک رسالے میں خود دیکھا ہے، موسیو Gillenorman وزیر! مگر یہ کیسی مزاحیہ بات ہے۔ اچھا ہے، یہ لوگ اتنے احمق ہیں کہ جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔

تقریباً، وہ ہر شے کو اس کے اصل نام سے ہی پکارتا تھا، خواہ وہ باحیا ہو یا بے حیا، حتیٰ کہ خواتین کے سامنے بھی اسے ایسی باتوں سے حجاب نہیں آتا تھا۔ وہ گھٹیا قسم کی تقریریں، فحاشی اور گندی باتیں بڑے سکون اور بلاتکلف، اور بغیر کسی تعجب کے کیا کرتا تھا۔ گفتگو کا یہ طریقہ اس صدی کے اکھڑ پن کی دین تھا۔ آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ گھما پھرا کر شاعرانہ انداز میں بات کرنے کا زمانہ، نثر میں کچے پن کا زمانہ تھا۔ اس کے گاڈ فادر نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ بڑا ہو کر ایک جوہرِ قابل نکلے گا۔ اسی وجہ سے اس نے اسے دو معنی خیز نام — Luc-Esprit — دیے تھے۔

❁

صد سالہ عمر کی خواہش

لڑکپن کے زمانے میں اسے Moulins کے، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، کالج میں انعامات ملے تھے، اور جہاں ڈیوک Nivernais کے ہاتھوں، جس کو وہ ڈیوک de Nevers کہا کرتا تھا اس کی تاج پوشی ہوئی تھی۔ نہ کنونشن، نہ لوئی شانزدہم کی موت، نہ نپولین، نہ ہی Bourbons کی واپسی، نہ کسی اور بات سے اس تاج پوشی کی یاد اس کے ذہن سے محو ہو سکی تھی۔ اس کی نظروں میں ڈیوک Nevers اس صدی کی بڑی شخصیت تھا۔ "کیسا دل فریب اور عالی شان جنیو رتھا۔" وہ کہتا تھا، "اور نیلے رنگ کے ربن میں اس کا کیا اچھا انداز ہوتا تھا۔"

موسیو لیر نورما کی نظروں میں کیتھرین دوئم نے پولینڈ کی تقسیم کے جرم کی تلافی Bestucheff سے تین ہزار روبل کے عوض طلائی اکسیر کا راز خریدنے سے کی تھی۔ اس موضوع پر وہ بہت پُر جوش ہو جایا کرتا تھا۔ "طلائی اکسیر" وہ بلند آواز میں کہتا تھا:

"Bestucheff کا پیلا رنگ! جنرل Lamotte کے قطرے! اٹھارہویں صدی میں یہ بہت اچھا علاج تھا، محبت کی بیماریوں کا، محبت کی دیوی کے خلاف امرت تھا۔ ایک لوئی میں نصف اونس کی ایک شیشی۔ لوئی پانزدہم نے اس کی دو سو شیشیاں پاپائے اعظم کو بھیجی تھیں۔"

اگر کوئی اس سے کہہ دیتا کہ طلائی اکسیر لوہے کے perchloride کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، تو وہ غصے میں غیر متوازن ہو جاتا تھا۔

وہ Bourbons کو بہت پسند کرتا تھا۔ اسے 1789ء کا ایک خوف ناک قصہ یاد تھا۔ اس قصے کو وہ ہمیشہ بیان کرتا تھا کہ اس نے دہشت کے ایام میں خود کو کس طرح بچایا تھا، اور کس طرح وہ اپنی خوش دلی اور چالاکی سے اپنا سر کٹنے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور اگر

کوئی نوجوان اس کی موجودگی میں جمہوریہ کی مدح سرائی کرتا تو وہ نیلا پیلا ہو جاتا، اور اتنے غصے میں آجاتا تھا کہ اس پر غشی جیسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اشارے کنایے میں وہ کبھی اپنے نوے برسوں کی باتیں کرتے ہوئے کہتا تھا، ''مجھے اُمید ہے کہ میں ترانوے برس کو نہیں دیکھوں گا۔'' [مگر] ان موقعوں پر وہ لوگوں کو اشاروں میں بتاتا تھا کہ وہ سو برس زندہ رہنا چاہتا ہے۔

۞

نِکولے اور باسک

اس کے اپنے نظریات تھے۔ ان میں سے ایک نظریہ حاضرِ خدمت ہے۔

"جب کوئی شخص عورتوں کا پُر جوش رسیا ہو، اور جب اس کی اپنی بھی ایک بیوی ہو، جس کی وہ قدر کرتا ہو مگر کم، جو گھریلو ہو، اکھڑ ہو، صحیح النسب ہو، اس کے بہت سارے حقوق ہوں، قوانین کی پابند ہو اور ضرورت کے وقت حسد کرنے والی ہو تو گومگو کی کیفیت سے خود کو نکالنے، اور پُرامن رہنے کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے؛ کہ وہ اپنی بیوی پر گھربار چلانے کا سارا بوجھ منتقل کر دے۔ یہ دست برداری اسے آزاد کر دیتی ہے۔ تب، اس کی بیوی خود کو مصروف کر لیتی ہے، ٹھکے سنبھالنے میں لگ جاتی ہے، اور اس عمل میں وہ اپنی انگلیوں کو تانبے کے زنگار میں آلودہ کر لیتی ہے؛ نصف حصے والے کرایہ داروں، کسانوں کی تربیت کرنے لگتی ہے؛ وکیلوں کو اکٹھا کرتی ہے؛ نوکری والوں پر حکم چلاتی ہے؛ عرائض نویسوں سے خطاب کرنے لگتی ہے؛ قانونی موشگافیوں پر غور کرنے لگتی ہے؛ مقدموں کی پیروی کرتی ہے؛ پٹے (لیز) تیار کراتی ہے؛ دستاویزات لکھواتی ہے؛ خود کو مختارِ کل محسوس کرنے لگتی ہے؛ خرید و فروخت کرتی ہے؛ اصول بناتی ہے؛ وعدے اور موافقت کرتی ہے؛ خود کو پابند کرتی ہے، منسوخ کرتی ہے، تسلیم کرتی ہے، پسپا ہوتی ہے، انتظامات کرتی ہے، درہم برہم کرتی ہے، ذخیرہ اندوزی کرتی ہے، مسرف ہو جاتی ہے؛ اور اپنی ذاتی تسکین کے لیے غلطیاں کرنے لگتی ہے۔ جب اس کا شوہر اس سے نفرت کرنے لگتا ہے تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو برباد کر رہی ہے۔"

اس نظریے کا موسیو بلیر نورما نے اپنے اوپر بھی اطلاق کیا اور یہ اس کی تاریخ بن گیا تھا۔ اس کی دوسری بیوی نے اس کی ساری دولت اس طرح استعمال کی تھی کہ ایک دن، جب

موسیو نے خود کو رنڈوا پایا تو اس کے پاس صرف اتنا باقی رہ گیا تھا کہ ساری دولت وقف کرنے کے بعد محض پندرہ ہزار سالانہ آمدنی مہیا ہو سکتی تھی جو اس کی زندگی کے لیے کافی تھی، جس کا تین چوتھائی حصہ اس کے ساتھ ہی غرق ہو جانے والا تھا۔ اس نکتے پر وہ ہچکچایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے بعد کوئی جائیداد چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ، اس نے دیکھا تھا کہ مرد کی جانب سے چھوڑے جانے والے ترکے میں خطرات ہوتے ہیں، جو مثال کے طور پر قومی جائیداد بن جاتے ہیں؛ اس نے اس قسم کے مظاہر دیکھے تھے اور اسے سرکاری قرضوں کی بڑی بڑی کتابوں پر یقین نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ "یہ سب Quincampois اسٹریٹ کی نذر ہو جانے والا ہے۔" Filles-du-Clavaire پر واقع مکان، جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں، اس کی ملکیت تھا۔ اس کے دو ملازم تھے، ایک مرد اور ایک عورت۔ جب کوئی ملازم اس کے گھریلو نظام میں داخل ہوتا تھا تو اس کا نئے سرے سے نام رکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے مرد ملازمین کو ان کے صوبوں کے نام سے پکارتا تھا: Nimois, Comtois, Poitevin, Picard وغیرہ۔ اس کا آخری خدمت گار پچپن برس کا، بڑے پیٹ کا آدمی تھا؛ جو بیس قدم دوڑنے کے بھی قابل نہیں تھا؛ مگر چوں کہ وہ Bayonne میں پیدا ہوا تھا، موسیو جلینورما اس کو باسک (Basque) کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ اس کے گھر کی تمام ملازمائیں نکولے (Nicolette) کہلاتی تھیں، Magnon بھی، جس کے بارے میں آگے چل کر ہم بہت کچھ سنیں گے۔ ایک دن ایک خود پسند باورچن، جو دربانوں کی نسل سے تھی، اس کے سامنے حاضر ہوئی۔ "تم ماہانہ کیا تنخواہ لوگی؟" موسیو جلینورما نے اس سے پوچھا۔ "تیس فرانک۔" "تمھارا نام کیا ہے؟" "Olympie" "تمھیں پچاس فرانک ملیں گے، اور تم کو نکولے کے نام سے پکارا جائے گا۔"

میگنن اور اس کے بچے

موسیو بلیر نورما کا ملال قہر میں بدل جاتا تھا؛ وہ مایوسی میں برہم رہا کرتا تھا۔ اس میں بہت سارے تعصبات تھے اور انھیں ہر قسم کی آزادی سے استعمال کیا کرتا تھا۔ ان حقیقتوں میں سے ایک حقیقت، جس کے بارے میں ہم نے ابھی اشارے کیے ہیں، یہ تھی کہ وہ جلد بھڑک اٹھتا تھا، اور یہ بھی کہ وہ اس نے ہمیشہ اسی کیفیت پر قائم رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو وہ "شاہانہ شہرت" کہتا تھا۔ یہ شاہانہ شہرت اس کے لیے اکثر غیر متوقع فوائد کا باعث ہوتی تھی۔

ایک دن اس کے پاس ایک چھابی لائی گئی جس میں، حالاں کہ وہ سیپیوں کی چھابی تھی، ایک تنومند نوزائیدہ بچہ موجود تھا، جو گلا پھاڑ کر چلا رہا تھا، جسے کپڑوں میں لپیٹا گیا تھا، جسے ایک خدمت گار عورت نے، جو چھ ماہ پہلے ملازمت سے نکال دی گئی تھی، اس کی اولاد بتایا تھا۔ موسیو بلیر نورما اپنی عمر کے چوراسی برس مکمل کر چکا تھا۔ گھر میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ وہ آوارہ لڑکی کیا سمجھتی تھی کہ لوگ اس کے کہے پر یقین کر لیں گے؟ کیسی جرأت کی تھی اس نے! کیسی مکروہ تہمت تھی یہ! مگر موسیو بلیر نورما کو اس بات پر بالکل غصہ نہیں تھا۔ اس نے ایک نیک انسان کی طرح اس لونڈیا کی طرف ایسے خوش خلق تبسم کے ساتھ گھور کر دیکھا تھا، گویا یہ تہمت اس کے لیے چاپلوسی سے کم نہ تھی، اور کہا

"اچھا، تو اب کیا ہوگا؟ معاملہ کیا ہے؟ سچ جانو کہ تم نہایت بیوقوف لڑکی ہو۔ موسیو d'Angouleme نے، جو جلالت مآب چارلس نہم کا t جائز بیٹا تھا، ایک پندرہ سالہ احمق فاحشہ سے شادی کر لی تھی، جب وہ پچاسی برس کا تھا۔ موسیو d'Alluye ،Virginal کے مارکوئی کا، جو Bordeaux کے آرچ بشپ، کارڈینل Sourdis کا بھائی تھا، تراسی برس کی عمر میں اس کی

اپنی خدمت گار، بنام la Presidente Jacquin سے ایک بیٹا تھا، جو واقعی محبت کی پیداوار تھا، جو بعد میں Chevalier of Malta اور ریاست کا کاؤنسلر بنا تھا؛ اس صدی کے عظیم انسانوں میں سے ایک، پادری Tabaraud سٹاسی برس کے ایک آدمی کا بیٹا ہے۔ یہ سب عام قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ اور اب ہمارے سامنے انجیل مقدس ہے۔ میں اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اعلان کرتا ہوں کہ یہ چھوٹے حضرت مجھ سے نہیں ہیں۔ پھر بھی، ان کی نگہداشت کی جائے گی۔ کہ اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔"

یہ ایک نہایت بردبار طریقہ تھا۔ اس عورت نے، جس کا نام میگنن (Magnon) تھا، اگلے برس اس کی خدمت میں ایک اور پوٹلی بھیج دی۔ اس بار پھر ایک لڑکا تھا۔ اس بار موسیو ہلیر نورما نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے دونوں لونڈوں کو ان کی ماں کے پاس بھیج دیا اور وعدہ کیا کہ اس کو ہر ماہ اسی فرانک ان کی پرورش کے لیے دیے جایا کریں گے، اس شرط پر کہ ان کی ماں مزید ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ اس نے مزید کہا تھا، "میرا اصرار ہوگا کہ ان کی ماں ان کی اچھی طرح پرورش کرے گی۔ وقتاً فوقتاً میں ان کو دیکھنے بھی جایا کروں گا۔" اور اس نے اس بات پر عمل بھی کیا۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا جو پادری تھا، اور جو تینتیس برس تک Academy of Poitiers کا رجسٹرار رہا تھا، اور 79 برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس موقعے پر اس نے کہا تھا "بے چارہ بہت کم عمری میں مرگیا۔" یہ بھائی جو اب کم یاد رہ گیا تھا، بڑا پُرسکون کنجوس آدمی تھا۔ پادری ہوتے ہوئے وہ خود کو خیرات دینے پر مجبور گردانتا تھا، مگر اس نے کسی کو کچھ نہیں دیا سوائے خراب اور منسوخ شدہ سوسکوں کے۔ اس طرح اس نے جنت کے راستے جہنم جانے کا طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ اور جہاں تک بڑے موسیو ہلیر نورما کا معاملہ تھا، اس نے خیرات کے معاملے میں کبھی بھاؤ تاؤ نہیں کیا، ہمیشہ خوشی اور شرافت سے خیرات دیا کرتا تھا۔ وہ بہت مہربان، بہت بے ربط، خیرات دینے والا انسان تھا، اور اگر وہ دولت مند ہوتا تو بہت اچھے مزاج کا آدمی ہوتا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ جو کچھ بھی اس سے متعلق ہو، خواہ بدمستیاں ہی کیوں نہ ہوں، شان دار طریقے سے ہونی چاہئیں۔ ایک دن، جب کسی وراثت کے معاملے میں ایک کاروباری آدمی نے اس سے، بڑے اور کھلے انداز میں دھوکا کیا تھا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا، "یہ کام بہت بُرے طریقے سے کیا گیا ہے! اس چوری پر مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ اس صدی میں ہر شے انحطاط پذیر ہو گئی ہے، حتیٰ کہ بدمعاش لوگ بھی۔ یا وحشت! میرے معیار کے آدمی کو لوٹنے کا یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اس طرح لُوٹا گیا ہے گویا میں جنگل میں رہتا ہوں، اور

بُری طرح پٹا گیا ہوں۔ اے جنگل! ان کی تربیت کی ضرورت ہے۔"

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس کی دو بیویاں تھیں؛ پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی، جو کنواری ہی رہی؛ دوسری سے بھی ایک بیٹی تھی، جو تیس برس کی عمر میں انتقال کر گئی تھی، جس نے محبت کی یا اتفاقیہ یا کسی اور طرح شادی کی تھی، ایک دولت مند سپاہی سے جس نے جمہوریہ اور سلطنت کی فوجوں میں خدمات انجام دی تھیں، جسے Austerlitz میں بہادری کا نشان دیا گیا تھا، اور واٹر لو میں اسے کرنل بنا دیا گیا تھا۔"وہ میرے خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکا ہے۔" اس پرانے بورژوا نے کہا تھا۔ وہ ناس بہت لیتا تھا۔ وہ خدا پر بہت کم یقین رکھتا تھا۔

۞

مہمانی: صرف شام کے وقت

ایسی شخصیت تھی موسیو بلیر نورما عرف Luc-Esprit کی جس کے سر کے بال جھڑے نہیں تھے — سفید تو نہیں تھے، صرف کھچڑی ہو گئے تھے — اس کے کان کتے کی طرح ہمیشہ کھڑے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان سب کے باوجود وہ ہمیشہ محترم رہا ہے۔

اس میں کچھ اٹھارہویں صدی کی عادات موجود تھیں: یعنی، غیر سنجیدگی اور بڑا پن۔

1814ء میں اور فرانس کی بحالی کے زمانے میں، موسیو بلیر نورما خاصا جوان تھا — صرف چوہتر برس کا — اور پیرس کے مضافات میں Saint-Sulpice کے قریب Saint Germain کے علاقے میں Servandoni اسٹریٹ پر رہتا تھا۔ اسّی کی عمر کو پہنچنے کے بہت بعد اس نے سماج سے فراغت حاصل کر لی تھی اور Marais کے علاقے میں جا بسا تھا۔

سماج کو چھوڑ دینے کے بعد اس نے خود کو اپنی عادتوں میں محصور کر لیا تھا۔ اس کی سب سے اہم عادت یہ تھی، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ دن کے وقت اس کے گھر کا دروازہ بالکل بند رہا کرتا تھا؛ شام سے پہلے وہ کسی کو آمد کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ پانچ بجے شام، وہ رات کا کھانا کھاتا تھا، اور اس کے بعد اس کے گھر کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ ”دن بہت عامیانہ ہوتا ہے۔“ وہ کہتا تھا، ”جس میں دروازہ ہمیشہ بند ہونا چاہیے۔“ صاحبانِ طرز و اطوار اپنے دماغوں کو اسی وقت روشن کرتے ہیں جب سمت الراس (zenith) اپنے نجوم روشن کرتا ہے۔“ اور وہ خود کو ہر ایک سے، خواہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، علاحدہ رکھتا تھا۔

یہی قدامت اس کے دنوں کی شان ہوا کرتی تھی۔

دو مل کر جوڑا نہیں بنتے

ہم ابھی موسیو بلیر نورما کی دو بیٹیوں کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ان کی دنیا میں آمد کے دوران دس برس کا عرصہ حائل تھا۔جوانی کے زمانے میں، وہ کردار ہو یا بشرئی، ان میں آپس میں بہت کم شباہت تھی؛ جس قدر ممکن ہوتا وہ آپس میں بہنوں ہی کی طرح رہتی تھیں۔ چھوٹی لڑکی بڑے دل فریب نفس کی مالک تھی،اور ہر اس شے کی طرف متوجہ ہوتی تھی جس میں روشنی ہوتی تھی۔ وہ پھولوں سے، اشعار سے، موسیقی سے پیار کرتی تھی، جو اس کو خلاؤں میں پہنچا دیتی، پُرجوش اور ملکوتی بنا دیتی تھی۔نوجوانی کی ابتدا ہی میں اس کی ایک مبہم مگر دلیر شخص سے شادی ہو گئی تھی۔

بڑی لڑکی کے بھی اپنے عجیب وغریب توہمات تھے: وہ نیلگوں خلاؤں میں کسی دولت مند، کاروباری، ٹھیکے دار، بلکہ افسر قسم کے لاجواب بیوقوف شوہر کی تلاش میں رہا کرتی تھی؛ افسرانہ شان وشوکت، بنگلے میں زنجیر پوش دربان، سرکاری ضیافتیں، ٹاؤن ہال کی تقاریر اور Madame la Prefete کی حیثیت— ان سب سے مل کر اس کے ذہن میں خیالات کا ایک گرداب سا گھومتا رہتا تھا۔اس طرح دونوں بہنیں، اپنے عنفوانِ شباب کے عرصے میں اپنے اپنے خیالات میں بھٹکتی رہتی تھیں۔ دونوں کے اپنے اپنے پَر تھے، ایک کا فرشتوں جیسا پَر تھا، دوسری میں کسی بَط جیسا۔

ایسی کوئی تمنا نہیں ہوتی جو پورے طور پر آ جائے۔ ایسی کوئی جنت نہیں ہوتی جو ہمارے اپنے زمانے میں ارضی بن جائے۔چھوٹی بہن نے اپنے خوابوں کے آدمی سے شادی کر لی، مگر اس کا انتقال ہو گیا تھا۔بڑی نے شادی ہی نہیں کی۔

اس وقت جب وہ اس تاریخ میں داخل ہو رہی ہے، ہم جس کا تذکرہ کر رہے ہیں، وہ نوکیلی ناک اور بے حد کُند ذہن والی ایسی دقیانوسی اور ہٹ دھرم شخصیت بن چکی تھی جس کی مثال

تلاش کرنا ممکن نہیں۔ اس کی ایک ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس کے قریبی اہلِ خاندان کے علاوہ، کسی کو اس کا اپنا اصل نام معلوم نہیں تھا۔ وہ صرف میدموزیل بلیر نورما کلاں کہلاتی تھی۔ اپنی ظاہری کیفیات میں میدموزیل کسی کنواری سے کم نہ تھی۔ اس کا انکسار انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے خوف ناک یاد یہ تھی کہ ایک آدمی نے اس کا گارٹر دیکھ لیا تھا۔

بڑھتی عمر نے اس کی بے رحم پاک دامنی کو نمایاں کردیا تھا۔ اس کا گلوبند نہ کبھی غیر شفاف، اور نہ کبھی کافی بلند ہوتا تھا۔ وہ اپنے جسم کی ان جگہوں پر بھی بے شمار کانٹے اور چٹیاں لگائے رکھتی تھی جن کے بارے میں کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بناوٹی شرم وحیا کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے جیسے قلعہ کم خطرناک ہوتا جاتا ہے اس کے دربانوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

پھر بھی اس نے اپنے بھانجے تھیوڈول (Theodule) کو، جو نیزہ بردار فوج میں افسر تھا، بغیر کسی خفگی کے گلے سے لگ جانے کا موقع فراہم کردیا تھا۔

اس پسندیدہ نیزہ باز افسر کے علاوہ، اس کا مصنوعی رکھ رکھاؤ ہم اسے جس درجے میں رکھتے ہیں، اس کو خوب راس آتا تھا۔ میدموزیل بلیر نورما ہتھ کے والی روح تھی۔ بناوٹی شرم و حیا نصف نیکی اور نصف بُرائی ہوا کرتی ہے۔

اپنی بناوٹی شرم وحیا میں اس نے تعصب کا اضافہ کرلیا تھا۔ وہ کنواریوں کے سماج سے تعلق رکھتی تھی، مخصوص جشن کے موقعوں پر سفید رنگ کا نقاب ڈال لیتی تھی، مخصوص مناجاتیں پڑھتی، "مقدس خون" پر مراقبہ کرتی "مقدس دل" کا احترام کرتی، ایسے گرجا گھر کی قربان گاہ پر گھنٹوں دھیان لگاتی جہاں عام عبادت گزار پہنچ نہیں سکتے تھے، جہاں اس کی روح سنگِ مرمر کے چھوٹے چھوٹے بادلوں اور ملمع کاری سے مزین لکڑیوں سے نکلنے والی شعاعوں کے درمیان محوِ پرواز رہتی تھی۔

اس کی ایک گرجا گھر والی دوست تھی، جو اس کی جیسی قدیم کنواری تھی، جس کا نام میدموزیل Vaubois تھا، جو ایسی احمق تھی کہ اس کے سامنے میدموزیل بلیر نورما عقاب جیسی شخصیت معلوم ہوتی تھی۔ Agnus Dei اور Ave Maria سے پرے، سوائے مختلف قسم کے جام جیلی بنانے کے، میدموزیل Vaubois کو اور کسی شے کا علم نہیں تھا۔ میدموزیل Vaubois حماقت کی ایسی گٹھری تھی جس کے دماغ میں عقل کا ہلکا سا بھی دھبا نہیں تھا۔

سادہ لفظوں میں کہا جائے تو، میدموزیل بلیر نورما نے بڑھتی عمر میں کچھ کھونے کے عوض کچھ پایا بھی تھا۔ مجہول لوگوں کی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ اس نے کبھی کینہ پروری نہیں کی، جو نسبتی مہربانی جیسی ہوتی ہے؛ اس کے ساتھ ہی کونے اور زاویے گھستے جاتے ہیں، وقت کے

ساتھ ساتھ جس سے نرمی آتی جاتی ہے، جو اس میں بھی آ گئی تھی۔اس کی شخصیت کی غم نا کی ایسی دھندلی اداسی تھی جس کا راز خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔اس کے اندر ایسی شخصیت سانس لیتی تھی جس کی زندگی کی مدہوشی ختم ہو چکی تھی، جس کی کبھی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی۔

اپنے والد کا گھر بار وہی چلاتی تھی۔موسیو بلیر نورما کے قریب اس کی بیٹی ہوتی تھی، بالکل اسی طرح جیسے موں سنیور ریباں وینیو کے ساتھ اس کی بہن رہتی تھی۔ایسے گھرانوں میں ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی کنواری کا ہونا عجیب نہیں ہوتا، جن میں دو کم زوریاں ایک دوسرے کو سہارا فراہم کرتی ہیں۔

اس گھرانے میں، اس بوڑھے آدمی اور اس قدیم کنواری کے درمیان، ایک بچہ، ایک چھوٹا سا لڑکا بھی تھا جو موسیو بلیر نورما کی موجودگی میں ہمیشہ خاموش اور لرزاں رہتا تھا۔موسیو بلیر نورما اس سے اونچی آواز، اور کبھی کبھی اٹھی ہوئی بید کے علاوہ بات نہیں کرتا تھا، "ادھر تو آیئے جناب! بدمعاش! اوئچے، ذرا ادھر تو آ! کاہل الوجود، جواب دے! فضول انسان، ذرا میرے سامنے تو آ" وغیرہ وغیرہ۔اس طرح کے رویے سے اس نے لڑکے کو بُت بنا دیا تھا۔

یہ لڑکا اس کا نواسہ تھا۔آگے چل کر اس سے ہماری پھر ملاقات ہو گی۔

ایک قدیم دیوان خانہ

جس زمانے میں موسیو بلیر نورما کا قیام Servandoni اسٹریٹ پر ہوتا تھا، وہ بہت سے اچھے اور حکمرانوں کے پسندیدہ ایوان خانوں [کلبوں] میں جایا کرتا تھا۔ حالاں کہ وہ بورژوا تھا، پھر بھی موسیو بلیر نورما سماج میں بہت مقبول تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ دوہری ذہانت کا مالک تھا جو اس کی پیدائشی صفت تھی؛ دوسری بات یہ ہے کہ جو ذہانت اس کو ملی تھی اس کے باعث اس کی بہت مانگ ہو گئی تھی، یعنی اس کی اس صفت کو بہت استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ وہ کسی محفل میں نہیں جاتا تھا جب تک کہ اسے خاص شخصیت کا درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو کسی بھی قیمت پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ مصروف کر لیتے ہیں، مگر موسیو بلیر نورما اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ شاہ پرست ایوانوں میں جہاں اس کا اکثر جانا ہوتا تھا، ان کا غلبہ اس کے نفس پر بار نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر جگہ سرِ وِش غیبی ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوا تھا کہ اسے اپنے آپ کو موسیو Bonald، حتیٰ کہ موسیو Bengy-Puy-Vallee کے خلاف خاموش کرنا پڑا تھا۔

1817ء کے آس پاس، وہ ہفتے میں دو سہ پہریں Rue Ferou اسٹریٹ میں مادام دیرونس T کے ساتھ، اپنے پڑوس کے ایک مکان میں گزارتا تھا جو ایک محترم خاتون تھی، جس کا شوہر برلن میں فرانس کی جانب سے سفیر تھا، جس کو مقناطیسی تصورات کے دورے پڑتے تھے اور جس کا ترکِ وطن کے دوران دیوالیہ پن میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس نے دس مراقشی جلدوں پر مشتمل، جس کے کناروں پر ملمع کیا گیا تھا، Mesmer اور اس کے نہانے کے ٹب کے بارے میں اپنے ہاتھ سے لکھی یادداشتیں چھوڑی تھیں۔ مادام T نے اپنے تکبر کے باعث ان کو شائع نہیں

کرایا تھا، اور نہ معلوم کس طرح نہایت معمولی آمدنی پر گزارا کرتی تھی۔

مادام T دربار سے بہت دور رہتی تھی؛ جیسا کہ اس نے خود بتایا ہے کہ میں ''ایک بہت ملی جلی سوسائٹی'' کی شریفانہ تنہائی میں رہتی تھی جس میں مفلس مگر خود پسند لوگ رہتے تھے۔ اس بڑھوے گھر کے اطراف کچھ دوست اکٹھا ہوجاتے تھے، اور یہ خالصتاً ایک شاہ پرست لوگوں کا دیوان خانہ سا بن گیا تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ جانے کی چسکیاں لیتے تھے، اور صدی کی خوف ناک کراہوں، فراسین، پوناپارٹیت، نیلے رَس کی ذِلّت یا لوئی شانزدہم کے زمانے کی انتہائی بائیں بازو کی تحریک کے بارے میں شکایات کرتے تھے؛ اور چارلس دہم کے زمانے کی طرح دھیمے لہجے میں اپنی امیدیں پیش کیا کرتے تھے۔

ماہی فروش عورتوں کے گیت، جن میں نپولین کو Nicolas کہا جاتا تھا، مسرتیں بکھیرتے تھے۔ ڈیوک حضرات کی دنیا کی حسین ترین بیویاں مندرجہ بالا اشعار کو سن کر وارفتہ ہو جاتی تھیں جن میں وفاق پسندوں کو مخاطب کیا گیا تھا:

اپنی قمیصوں کے لہراتے دامن کو
اپنے پتلونوں میں اُڑس لو
ورنہ لوگ کہیں گے، یہ وطن پرست
سفید پرچم بلند کر رہے ہیں

وہ اپنے آپ کو زہریلے ذومعنی الفاظ میں پیش کیے جانے والے قطعات اور دو مصرعوں والے اشعار سے خوش کرتی تھیں جن میں معصومانہ انداز میں پیش کیے جانے والے الفاظ سے کھیلا جاتا تھا، جو خوف ناک سمجھے جاتے تھے؛ اس طرح Dessolles کی وزارت پر، ایک اعتدال پسند کابینہ پر، موسیو Decazes اور موسیو Deserre جس کے ارکان تھے، جملے کسے جاتے تھے: لرزتے ہوئے شاہی خاندان کو اس کی اپنی بنیاد پر دوبارہ قائم کرنے کے لیے، خشر خانے کی مٹی (Dessolles) کو اور گھر (Decazes) کو بدلنا ہوگا۔ یا وہ ایوانِ بالا کے ارکان کے ناموں کی فہرست بناتے، اور اس فہرست سے وہ اس طرح ناموں کو ملاتے تھے جس سے اس قسم کے جملے بن جاتے تھے: .Sabran, Gouvion-Saint-Cyr, Damas اور یہ سب خوشی خوشی کیا جاتا تھا۔ اس سماج میں وہ انقلاب کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ گاتے تھے:

Ah! ca ira ca ira ca ira!

Les Bonapartistes a la lanterne! گیت گلوٹین کی طرح ہوتے ہیں؛

بلاتفریق سرکاٹ دیتے ہیں، بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ آج اس کا سر ہے، تو کل اُس کا سر ہوگا۔

Fualdes والے معاملے میں، جو اس زمانے سے متعلق ہے، 1816ء میں انھوں نے Bastide اور Jausion کی طرف داری کی تھی، اس لیے کہ Fualdes ”بونا پارٹی“ تھا۔ انھوں نے آزاد خیال والوں کو دوست اور بھائی قرار دیا تھا؛ یہ عمل نہایت مہلک توہین تھا۔

کچھ گرجا گھروں کے میناروں کی طرح، مادام T کے دیوان خانے پر بھی دو مُرغ تھے۔ ان میں سے ایک مرغ موسیو جلیر نورما تھا، اور دوسرا Lamothe-Valosi جس کے بارے میں ایک قسم کے احترام کے ساتھ سرگوشیاں ہوتی تھیں، ”کیا تمھیں خبر ہے؟ یہ وہی Lamothe ہے، گلے کے ہار کے معاملے والا۔“ پارٹیوں میں اس قسم کی غیر معمولی لاپروائیاں ہوتی رہتی ہیں۔

اس میں اتنا اضافہ کر لیجیے: بورژوائیوں میں، باعزت حالات میں بھی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں؛ آپ کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں کس کو داخل کر رہے ہیں؛ بالکل اسی طرح سرد علاقے کے رہنے والوں میں حرارتی (caloric) نقصانات ہو جاتے ہیں اور وہاں ناپسند لوگوں سے معاملہ کرنے میں خسارہ ہو جاتا ہے۔ قدیم سماج کے اونچے درجے کے لوگ خود کو اسی طرح قانون سے بالاتر سمجھتے تھے جیسے کہ دوسرے افراد سے۔ Pompadour کے بھائی Marigny کا داخلہ موسیو شہزادے Soubise کے ساتھ ہوا تھا۔ بدرجہ مجبوری نہیں، اس لیے کہ Vaubernier کا گاڈ فادر Du Barry کو موسیو le Marechal de Richelieu کے گھر میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ یہ سوسائٹی اولیمپیائی ہے۔ Mercury اور Prince de Guemenee وہاں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہاں تو چور کو بھی داخل ہونے کی اجازت ہے بہ شرطے کہ وہ دیوتا ہو۔

Comte de Lamothe میں جو 1815ء میں پچھتر برس کا بوڑھا انسان تھا، کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ خاموش اور بناوٹی شخصیت کا مالک تھا؛ اس کا چہرہ تیکھا اور سرد تھا؛ اس کی عادات شائستہ تھیں؛ اس کے کوٹ کے بٹن گلوبند تک بند ہوتے تھے؛ اس کے پاؤں سیاہی مائل پارچے سے بنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کے اندر رہتے تھے۔ اس کا چہرہ بھی اس کے پتلون کے رنگ جیسا تھا۔

موسیو Lamothe کو اس دیوان خانے کے لیے ”زیرِ غور“ رکھا گیا تھا اور حیرت اس بات کی ہے، جو سچ بھی ہے، اس لیے کہ اس کے نام میں Valois شامل تھا۔

موسیو بلیر نورما بہترین درجے کا انسان تھا۔اس کے چھچھورے پن کے باوجود جو کسی طرح بھی اس کے وقار میں حائل نہیں ہوتا تھا، وہ شان دار، وجیہ، ایمان دار اور بورژوائی انداز کی قد آور شخصیت کا مالک تھا؛ اور اس کی عمر اس کی قدر میں اضافہ کرتی تھی۔ مروت اور آزادی کے ساتھ صد سالہ عمر نہیں ملتی۔ عمر، بالآخر، سر کے اطراف قابل احترام ژولیدہ موئی پیدا کر دیتی ہے۔

اس کے علاوہ، اس نے وہ باتیں کہیں جن میں قدامت کی اصل چنگاریاں تھیں۔ اس طرح، لوئی شانز دہم کو بحال کر دینے کے بعد جب پروشیا کا بادشاہ Count de Ruppin کے نام سے اس سے ملنے آیا، تو لوئی پانز دہم کے خلف نہایت نازک گستاخی سے اس کی پیشوائی کے لیے آئے تھے گویا وہ Marquis de Brandebourg تھا۔ موسیو بلیر نورما نے اس کو قبول کرتے ہوئے کہا تھا، ''تمام بادشاہاں جو فرانس کے بادشاہ نہیں، صوبائی بادشاہ ہیں۔'' ایک دن مندرجہ ذیل سوال کیا گیا اور مندرجہ ذیل جواب دیا گیا تھا، ''Courrier Francais کے مدیر کو کیا سزا دی گئی تھی؟'' جواب ملا تھا، "To be suspended." موسیو نے کہا تھا، ''اس میں Sus غیر ضروری ہے۔'' [یعنی اسے لٹکا دیا جانا چاہیے تھا] اسے اس قسم کے جملے کا موقع مل گیا تھا۔

Bourbons کی واپسی کی سال گرہ کے موقعے پر Te Deum میں، موسیو Talleyrand کو گزرتے دیکھ کر اس نے کہا تھا ''جلالت مآب فاسقِ اول تشریف لے جا رہے ہیں۔''

موسیو بلیر نورما کے ہمراہ ہمیشہ اس کی بیٹی ہوتی تھی، وہ قد آور میڈموزیل، جو چالیس سے زیادہ کی تھی مگر پچاس کی نظر آتی تھی، اور ایک خوب صورت سات سالہ لڑکا، سفید فام، گلابی رنگ، جس کی آنکھیں خوش اور پُر اعتماد ہوتی تھیں، اور جب بھی وہ اس دیوان خانے میں نظر آتا تو اپنے اطراف سرگوشیاں سنتا تھا، ''کتنا خوب صورت ہے یہ لڑکا! کتنے افسوس کی بات ہے! بے چارہ لڑکا!'' یہ وہی بچہ ہے جس کے بارے میں ہم نے تھوڑی دیر قبل کچھ لفظ کہے تھے۔ اسے بچارہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ ''Loire کا ڈاکو'' تھا۔

Loire کا ڈاکو موسیو بلیر نورما کا داماد تھا، جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، اور جسے موسیو بلیر نورما ''خاندان کے ماتھے کا کلنک'' کہتا تھا۔

۞

اس زمانے کے سُرخ عفریت

جس کسی کو اس زمانے میں Vernon t می قصبے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو، اور وہ اس نفیس یادگار پُل پر سے، امید ہے کہ جلد ہی جس کی جگہ ایک معیب آہنی تاروں سے بنا پُل بنایا جائے گا، پا پیادہ گزرا ہو اور اگر اس نے نیچے نظر ڈالی ہو تو اسے تقریباً پچاس برس عمر کا، چرمی ٹوپی، بھورے رنگ کے کھدر کی پتلون میں ملبوس جس میں کبھی سرخ ربن سلا رہا ہو گا، لکڑی کی کھڑاویں پہنے، سورج کی کرنوں سے سنولایا، جس کا چہرہ تقریباً سیاہ اور اس کے بال تقریباً سفید، ماتھے سے رخسار تک ایک بڑے سے زخم کا نشان، آگے کو جھکا ہوا، قبل از وقت بوڑھا، ایک شخص نظر آیا ہو گا، جو ہر روز ہاتھ میں بیلچہ اور درانتی لیے، دیواروں سے گھرے ان گھروں سے، جو پُل کو سہارا دیے ہوئے تھے، جہاں دریائے سین کے بائیں کنارے مکانوں کا ایک سلسلہ ہے، پھولوں سے لدے دل فریب گھر ہیں، جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ''یہی باغیچے ہیں'' اور اگر یہ گھر چھوٹے ہوتے تو ''گل دستے'' کہلاتے۔

واسکٹ میں ملبوس، کھڑاویں پہنے جس آدمی کے بارے میں ہم ابھی بات کر رہے تھے، 1817 کے ان ہی معمولی گھروں میں رہتا تھا۔ وہ اکیلا، خاموشی سے ایک عورت کے ساتھ رہتا تھا جو نہ جوان تھی نہ بوڑھی؛ نہ گھریلو، نہ خوب صورت؛ نہ دیہاتی نہ بورژوا تھی جو اس کی خدمت کرتی تھی۔ زمین کا وہ ٹکڑا جسے ہم باغیچہ کہہ رہے تھے، قصبے میں اپنے پھولوں کے حسن کے باعث پسند کیا جاتا تھا جو اس نے وہاں کاشت کیے تھے۔ پھولوں کی کاشت اس کا پیشہ تھی۔

محنت، استقامت، توجہ اور بالٹیوں بھر پانی کے ذریعے وہ، خالق کے بعد تخلیق میں کامیاب ہو گیا تھا، اور اس نے مخصوص قسم کے گُلِ لالہ اور گُلِ کوکب ایجاد کیے شاید جنھیں فطرت

نے بھلا دیا تھا۔ وہ ذہین انسان تھا؛ اس نے امریکا اور چین سے لائی گئی قیمتی جڑی بوٹیوں کی زراعت کے لیے تیار کی جانے والی مٹی کے سلسلے میں [مشہور ماہر زراعت] Soulange Bodin کی پیش بینی کی تھی۔ وہ گرمی کی موسم میں فجر کے وقت سے باغیچے کی گلیوں میں پودے لگاتا، چھنٹائی کرتا، تھالوں کی کھدائی کرتا، پانی دیتا؛ اپنے پھولوں کے درمیان محبت کے، اداسی کے اور پیار کے انداز میں گھومتا پھرتا؛ کبھی ساکت کھڑا ہو جاتا؛ گھنٹوں غور وفکر کرتا، درختوں پر بیٹھی چڑیوں کے چہچہے، گھر کے بچے کی بڑبڑاہٹ سنتا؛ یا گھاس کی پتی کی نوک پر آویزاں شبنم کے ایک قطرے پر اپنی نظریں مرکوز رکھتا، سورج کی کرنیں جس کو ہزار چشمہ بنا دیتی تھیں۔ اس کی میز بالکل صاف رہتی تھی؛ اور وہ وائن کے مقابلے میں دودھ زیادہ پیتا تھا۔ وہ ایک بچے کو بھی راستہ دیتا تھا، اس کا ملازم بھی اس کو جھڑک دیتا تھا۔ وہ اتنا بزدل تھا کہ شرمیلا محسوس ہوتا تھا؛ شاذ و نادر ہی باہر نکلتا تھا، اور سوائے مفلس لوگوں کے جو اس کی کھڑکی کے شیشے پر کھٹکا کرتے تھے، وہ کسی اور کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی، اگر شہر کے باشندے، یا اجنبی، یا اس کے گل لالہ میں دل چسپی رکھنے والے اتفاقیہ نووارد آتے تو وہ تبسم کے ساتھ اپنا دروازہ کھول دیتا تھا۔ وہ "Loire کا لٹیرا تھا۔"

جس کسی نے فوجی یادداشتیں، سوانح عمریاں اور عظیم الشان فوج کے سرکاری اعلانات پڑھے ہوں گے، انھیں ایک نام، ژورج پوں مرسی (Georges Pontmercy)، ضرور نظر آیا ہوگا اور بار بار نظر آیا ہوگا۔ جب اس کی عمر کم تھی، یہی شخص، Saintonge کی رجمنٹ میں سپاہی تھا۔ انقلاب آگیا۔ Saintonge کی رجمنٹ رہائن کی فوج کا ایک حصہ بن گئی؛ اور چوں کہ شاہی کی قدیم رجمنٹوں نے شکست کے بعد بھی اپنے صوبوں کے نام باقی رکھے تھے، وہ 1794ء میں صرف بریگیڈوں میں منقسم ہو گئی تھیں۔ پوں مرسی، Spire میں، Worms میں، Neustadt میں، Turkheim میں، Alzey میں، Mayence وغیرہ میں لڑا تھا، جہاں وہ ان دو سو افراد میں سے تھا جو Houchard کے فوج کے عقبی دستے کے سپاہی تھے۔ وہ بارہواں شخص تھا جو Hesse کے شہزادے کی کور کے سامنے، Andernach کے قدیم پشتے کے پیچھے، ڈٹا رہا اور اصل فوج میں دوبارہ شامل ہو گیا تھا، جب دشمن کی فوجوں نے قلعے کی ڈھلان والی دیوار میں شگاف ڈالنے کے لیے اپنی توپوں کے دہانے کھول دیے تھے۔ وہ Marchiennes میں اور Mont-Palissel کی جنگ میں Kleber کے ماتحت تھا اور biscaien سے آنے والے ایک گولے نے اس کا بازو توڑ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اطالیہ کی

سرحد کے پار چلا گیا؛ وہ ہاتھ سے گولا پھینکنے والے ان تیس سپاہیوں میں سے تھا جس نے Joubert کے ساتھ کرنل Tende کا دفاع کیا تھا۔ Joubert کو ایڈ جونٹ جنرل اور یوں مرتی کو سب لفٹنٹ بنا دیا گیا۔ یوں مرتی اس دن Lodi میں ہونے والے گریپ شاٹ کے حملوں کے درمیان Berthier کی طرف تھا، جس نے بوناپارٹ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا: ''Berthier توپچی، گھڑ سوار، اور ہاتھ سے گولا پھینکنے والا رہا ہے۔'' اس نے اپنے پرانے جنرل Joubert کو Novi کے مقام پر اس وقت زمین پر گرتے دیکھا تھا جب وہ اپنی تلوار اٹھائے چلا رہا تھا، ''آگے بڑھو!'' مہم کی اہم ضرورتوں کے دوران اس کپتنی کے ساتھ ہو کر وہ ایک چھوٹی سے مستول والی کشتی پر سوار، جو Genoa کے ساحل کی کسی نامعلوم بندرگاہ کی طرف جا رہی تھی، انگریزوں کے سات بڑے جہازوں کے درمیان گر پڑا تھا۔ Genoa کا کمان دار اپنی توپ کو سمندر میں پھینکنا چاہ رہا تھا تاکہ وہ سپاہیوں اور جہاز کے عرشے کے درمیان چھپ کر تجارتی جہاز کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں نکل جائے۔ یوں مرتی نے اپنے پرچم بلندی پر لہرا دیے اور فاخرانہ انداز میں برطانوی جنگی جہازوں کی توپوں کے نیچے سے اپنی کشتی نکال لے گیا تھا۔ بیس لیگ آگے، جب اس کی جرأت میں اضافہ ہو گیا تھا، اس نے مستول والی اپنی چھوٹی سی کشتی سے حملہ کیا اور ایک بڑے برطانوی باربردار جہاز کو گرفتار کر لیا تھا، جو فوجیوں کو سسلی لے جا رہا تھا، جس پر اتنے آدمی اور گھوڑے لدے تھے کہ جہاز کا عرشہ پانی کی سطح کے برابر آ گیا تھا۔ 1805ء میں وہ Malher ڈویژن میں شامل تھا جس نے Archduke Ferdinand سے Gunzberg چھین لیا تھا۔ Weltingen میں اس نے گولیوں کی بوچھاڑ میں Colonel Maupetit کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا تھا جو نویں Dragoons کی کمان داری کے دوران مہلک طور پر زخمی ہو گیا۔ وہ Austerlitz کی اس قابلِ تعریف پیش قدمی میں پیش پیش تھا جو دشمن کی گولیوں کی باڑھ کے دوران کی جا رہی تھی۔ جب روسی گارڈ گھڑ سواروں نے چوتھی قطار کی بٹالین کو کچل دیا تھا، یوں مرتی ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اس کا بدلہ لیا اور گارڈ کو پسپا کر دیا تھا۔ شہنشاہ نے اسے بہادری کا صلیبی نشان عطا کیا تھا۔ یوں مرتی نے Mantua، Melas اور اسکندریہ میں Wurmser کا، Ulm میں Mack کا مقابلہ کیا اور یکے بعد دیگرے سب کو قیدی بنا لیا تھا۔ اس نے عظیم الشان فوج کے آٹھویں کور کے ایک حصے کی ترتیب کی تھی Mortier جس کا کمان دار تھا، اور جس نے ہمبرگ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس کا Flanders کی قدیم رجمنٹ میں 55th سطح پر تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ Eylau میں وہ اس قبرستان میں موجود تھا

جہاں دو گھنٹے تک، اس کتاب کے مصنف کے برادرِعم کیپٹن لوئی ہیوگو نے اپنی تراسی سپاہیوں پر مشتمل کمپنی سے دشمن کی تمام کوششوں کا مقابلہ کیا تھا۔ پوں مرسی ان تین افراد میں شامل تھا جو اس قبرستان سے زندہ بچ نکلے تھے۔ وہ Friedland میں رہا۔ اس کے بعد ماسکو گیا۔ اس کے بعد La Beresina، اس کے بعد Lutzen, Bautzen, Dresden, Wachau, Leipzig، اور Gelenhausen کی گھاٹی میں رہا؛ اس کے بعد اس نے Montmirail, Craon, Chateau-Thierry اور Marne کے ساحل اور Laon کی دہشت ناک حالت دیکھی تھی۔ Arnay-Le-Duc میں، کپتان کی حیثیت میں، اس نے دس Cossack سپاہیوں کو تہ تیغ کیا تھا، اور اپنے جنرل کو نہیں، بلکہ اپنے کارپورل کو بچا لیا تھا۔ اس موقعے پر اس کو بہت زخم لگے تھے، اور اس کے صرف بائیں بازو سے ستائیس آہنی ٹکڑے نکالے گئے تھے۔ پیرس کے زوال سے آٹھ دن قبل اس نے اپنے ایک ساتھی سے تبادلہ کر لیا اور گھڑسوار دستے میں شامل ہو گیا۔ پوں مرسی ان لوگوں میں سے تھا پرانی حکومت کے دوران جن کو "ڈبل ہینڈ" کہا جاتا تھا، یعنی اس میں سپاہی کی حیثیت میں تلوار اور بندوق دونوں چلانے یا افسر کی حیثیت میں اسکواڈرن یا بٹالین کی کمان کرنے کی یکساں صلاحیت تھی۔ فوجی تعلیم اور اس صلاحیت کے اتصال سے، جن کی فوج کے کچھ مخصوص حصوں میں ضرورت ہوتی ہے، مثال کے طور پر dragoons میں جو ایک ساتھ پیدل فوجی بھی اور گھڑسوار فوجی بھی ہوتے ہیں۔ وہ جزیرہ Elba میں نپولین کے ساتھ تھا۔ واٹر لو میں Duboi کے بریگیڈ کے زرہ بکتر پوشوں کے اسکواڈرن کا سردار رہا تھا۔ اسی نے Lunenburg کی بٹالین کا پرچم چھین لیا تھا۔ وہ واپس آیا اور پرچم کو شہنشاہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ پرچم کو پھاڑ کر اتارتے ہوئے اس کے چہرے پر تلوار کا زخم لگا تھا۔ شہنشاہ بے حد خوش ہو کر چلایا تھا، "تم کرنل ہو، تم بیرن ہو، تم Legion of Honor کے افسر ہو!" پوں مرسی نے جواب میں کہا تھا، "میں اپنی بیوہ کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" ایک گھنٹے بعد وہ Ohain کی وادی میں گر گیا۔ کون تھا یہ ژورج پوں مرسی Pontmercy؟ یہ وہی "Loire کا لٹیرا" تھا۔

ہم نے ابھی اس کی تاریخ کا کچھ حصہ دیکھا ہے۔ واٹر لو کے بعد پوں مرسی، جسے Ohain کی کھوکھلی سڑک سے جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا، زندہ نکال لیا گیا تھا، فوج میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا، اور خود کو Loir کی کنٹونمنٹ میں ایمبولنس سے ایمبولنس کھینچے پھرا تھا۔

بحالی کے زمانے میں اس کو نصف تنخواہ پر ڈال دیا گیا، اس کے بعد گھر بھیج دیا گیا اور

Vernon میں حراست میں رکھا گیا تھا۔ بادشاہ لوئی ہشت دہم نے، سو دنوں میں ہونے والی سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، نہ صرف یہ کہ لیجن آف آنر کے افسر کے طور پر اس کی خوبیوں کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ نہ کرنل کے عہدے کا اعتراف کیا گیا اور نہ بیرن کے خطاب کا۔ اپنے طور پر اس نے خود کو" کرنل بیرن پوں مرسی" لکھنے کے کسی موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس کے پاس صرف ایک پرانا نیلا کوٹ تھا اور وہ کبھی اس کو پہنے بغیر، اور لیجن آف آنر کا پھول لگائے بغیر باہر نہیں نکلا۔ بادشاہ کے وکیل نے اس کو تنبیہ کی تھی کہ" غیر قانونی" طور پر اس اعزاز کو پہننے پر اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ جب ایک متوسط درجے کے افسر کے ذریعے یہ نوٹس بھیجا گیا تو پوں مرسی نے مسکراتے ہوئے حاضر جوابی سے کہا تھا،" یا تو مجھے فرانسیسی زبان نہیں آتی ہے، یا آپ نے اب یہ زبان بولنی چھوڑ دی ہے، مگر، حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکا ہوں۔" اس کے بعد مسلسل آٹھ دنوں تک وہ پھول پہن کر باہر جاتا رہا۔ کسی کو روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دو یا تین بار وزیر جنگ اور شعبے کے کمان دار جنرل نے A Monsieur le Commandant Pontmercy کے نام سے مراسلے بھیجے۔ اس نے کھولے بغیر ہی مراسلے واپس بھیج دیے تھے۔ اسی وقت نپولین Saint Helena میں اسی انداز میں، Sir Hudson Lowe کی جانب سے' جنرل بوناپارٹ' کے نام بھیجے گئے مراسلوں کا ویسا ہی حشر کر رہا تھا۔ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ پوں مرسی کے منہ میں بھی ویسی ہی رال تھی جیسی کہ اس کے شہنشاہ کے منہ میں تھی۔

اسی طرح روم میں Carthaginian قیدی تھے جنھوں نے Flaminius کو سلام کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان میں بھی Hannibal کا کچھ جذبہ موجود تھا۔

ایک دن Vernon کی سڑک پر اس کا سرکاری وکیل سے سامنا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا تھا،" جناب سرکاری وکیل صاحب، کیا مجھے یہ زخم کا نشان لگانے کی اجازت ہے؟"

اسکواڈرن کے سردار کی نصف تنخواہ جتنی معمولی آمدنی کے علاوہ اس کی اور کوئی آمدنی نہیں تھیں۔ وہ Vernon کے سب چھوٹے کرایے کی مکان میں رہتا تھا۔ اس میں بھی وہ اکیلا رہتا تھا، جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ سلطنت کے دور میں، دو جنگوں کی درمیان، اس کو میڈموزیل ژیلنورما سے شادی کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ اس پرانے بورژوا نے، جو اندر سے برہم تھا، ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے شادی قبول کی تھی،" عظیم ترین خاندان بھی اس پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" 1815ء میں مادام پوں مرسی جو ہر معنوں میں ایک قابل تعریف خاتون تھی، ایک

بچہ چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوگئی۔ کرنل کی تنہائیوں میں یہ بچہ ہی خوشیوں کا باعث تھا؛ مگر نانا نے اپنے نواسے کو واپس طلب کر لیا تھا، یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اگر بچہ اس کو نہیں دیا گیا تو وہ اس کو وراثت سے خارج کر دے گا۔باپ نے بچے کی خیر خواہی میں ہتھیار ڈال دیے، اور اپنی محبت پھولوں کی جانب منتقل کر لی تھی۔

مزید یہ کہ پوں مرسی نے سب کچھ تج دیا تھا۔ نہ اس نے کوئی شرارت کی نہ کوئی سازش کی۔ وہ اپنے خیالات میں ان چیزوں کو شریک کرتا تھا جو وہ کرتا رہتا تھا، اور وہ عظیم الشان چیزیں جو اس نے کی تھیں۔ وہ گلابوں کی توقع کرنے میں یا Austerlitz کو یاد کرنے میں اپنا وقت گزارتا تھا۔

موسیو ژیلیر نورما نے اپنے داماد سے کوئی سلسلہ نہیں رکھا۔اس کے نزدیک کرنل "ڈاکو" تھا۔موسیو ژیلیر نورما نے کرنل کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی، سوائے اس کے کہ وہ اس کے بیرن کے خطاب کا مذاق اڑاتا تھا۔

یہ باقاعدہ طے ہوگیا تھا کہ پوں مرسی کبھی نہ اپنے بیٹے سے ملنے کی نہ بات کرنے کی کوشش کرے گا۔اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو بچے کو وراثت سے محروم کرنے کا خط دے دیا جائے گا۔ژیلیر نورما کے نزدیک پوں مرسی طاعون کا شکار تھا۔وہ لوگ بچے کو اپنے طریقے سے پالنا چاہتے تھے۔شاید یہ شرط قبول کرنا کرنل کی غلطی تھی، مگر اس نے یہ شرط قبول کر لی تھی، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ صحیح قدم اٹھا رہا ہے، اور وہ کسی اور کو نہیں، خود کو قربان کر رہا ہے۔

فادر ژیلیر نورما کی وراثت زیادہ نہیں تھی، مگر بڑی میڈموزیل کی وراثت خاصی تھی۔اس کی خالہ، جس نے کبھی شادی نہیں کی، اپنے ننھیال کی جانب سے بہت دولت مند تھی، اور اس کی بہن کا بیٹا اس کا فطری وارث تھا۔وہ لڑکا جس کا نام ماریوس تھا، جانتا تھا کہ اس کا باپ تھا، مگر اس سے زیادہ اسے علم نہیں تھا۔وہ اس بارے میں زبان نہیں کھولتا تھا۔پھر بھی اس سماج نے، جس میں اس کا نانا اسے لے گیا تھا، سرگوشیوں، اشاروں، کنایوں اور آنکھ مارنے سے، بالآخر لڑکے کے دماغ کو روشن کر دیا تھا؛ وہ اپنے بارے میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا، اور چوں کہ فطری طور پر سارے خیالات اور رائیں ہی وہ فضا تھیں جن میں وہ سانس لیتا تھا، اور جو رفتہ رفتہ اس میں سرایت کرتی جا رہی تھیں، اسے اپنے باپ کے بارے میں سوچ کر شرمندگی اور کبھی کبھی دل میں درد اٹھنے لگتا تھا۔

جب اس انداز میں اس کی نشوونما ہو رہی تھی، کرنل ہر دو تین ماہ بعد خاموشی سے غائب ہو جاتا جیسے کوئی سزا یافتہ اپنے اوپر لگی پابندی توڑ رہا ہو؛ عیاری سے پیرس پہنچ جاتا، اور ایسے وقت میں Saint-Sulpice میں ہوتا جب مادام ژیلیر نورما ماریوس کو گرجا گھر عبادت کے

لیے لے جاتی تھی۔وہاں پہنچ کر وہ کسی ستون کے پیچھے دبک کر بے حس و حرکت کھڑا ہو جاتا اور اپنے بیٹے کو دیکھتا رہتا تھا۔وہ زخم خوردہ پختہ کار سپاہی اس بوڑھی کنواری سے ڈرتا تھا۔

اس کے باعث، Vernon کے پادری موسیو l'Abbe Mabeu سے اس کے رشتے استوار ہو گئے۔

وہ معزز مبلغ Saint-Sulpice کے وارڈن کا بھائی تھا، جو اکثر بچے کو گھورتا اور اس کے رخسار کے زخم کے نشان اور آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو دیکھ لیتا تھا۔وہ انسان جو اس قدر مردانگی کا حامل تھا،عورتوں کی طرح روتا تھا، اور یہ بات وارڈن کو بڑی عجیب لگی تھی۔وہ چہرہ اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ایک دن، جب وہ اپنے بھائی سے ملنے Vernon گیا تھا، پُل پر اس کی کرنل پوں مرسی سے مڈبھیڑ ہو گئی، اور اس نے Saint-Sulpice کے آدمی کو پہچان لیا تھا۔وارڈن نے پادری کو سارے حالات سے آگاہ کیا اور دونوں ایک ساتھ کسی بہانے کرنل سے ملنے گئے۔اس ملاقات کے بعد ملاقاتیں ہونے لگیں۔کرنل نے، جو پہلے بہت محتاط رہتا تھا، اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالیں اور بالآخر پادری اور وارڈن کے خاندان کو پوری تاریخ کا علم ہو گیا، کہ پوں مرسی بچے کے مستقبل کی خاطر کس طرح اپنی خوشیوں کو قربان کر رہا تھا۔اس وجہ سے پادری اس کو احترام اور ہمدردی کی نظر سے دیکھنے لگا، اور کرنل پادری کو پسند کرنے لگا تھا۔اور اس کے علاوہ، جب دونوں مخلص اور اچھے لوگ ہیں تو، کوئی بھی، بوڑھے مبلغ اور بوڑھے سپاہی کی طرح، اس طرح گھل مل نہیں جایا کرتا۔کیوں کہ اندر سے آدمی تو وہی تھا، وہ جس نے اپنے ملک کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے یہاں نیچے ہے، اور دوسرا اونچائی پر ہے؛ بس ان میں اتنا ہی فرق تھا۔

سال میں دو بار، جنوری کی پہلی تاریخ، اور سینٹ جارج کے دن ماریوس اپنے باپ کو خط لکھتا تھا، جس کے مندرجات اس کی پھوپھی کے الفاظ ہوتے تھے، جو کسی فارمولے کی نقل ہوتے تھے؛ موسیو ہیلر نورما بس اسی قدر برداشت کرتا تھا؛ اور اس کا باپ ان کے جواب میں بہت پیار بھرے خط لکھتا تھا، جو اس کا tt پڑھے بغیر اس کی جیب میں ٹھونس دیتا تھا۔

۞

ماریوس پوں مرسی

ماریوس پوں مرسی کے نزدیک مادام T کا سیلون ہی ایک دنیا تھا۔ یہی وہ ذریعہ تھا جس کے راستے اسے زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ سوراخ دھندلا تھا، اس سے آنے والی روشنی میں دن کم اور رات زیادہ، گرمی کم اور سردی زیادہ ہوتی تھی۔ اس دنیا میں داخل ہوتے وقت جس بچے کو تمام خوشیاں اور تمام روشنیاں ملی تھیں، اب وہ سراپا افسردگی تھا، بلکہ اپنی عمر کے برخلاف اس کے نزدیک سب کچھ بے حد خراب تھا۔ ان غیر معمولی اور حاوی ہو جانے والے شخصیتوں کے حصار میں، وہ اپنے آپ کو نہایت حیرت انگیز کیفیت میں پاتا تھا۔ ہر شے اس حیرتوں کو بڑھانے کی سازش کر رہی تھی۔ مادام de T کے سیلون میں کچھ بہت معزز خواتین ہوتی تھیں، جن کے نام تھے Mathan، Noe، Levis اور Cambis جس کو Cambyse پکارا جاتا تھا۔ یہ قدیم شکلیں اور یہ توراتی و انجیلی نام بچے کے ذہن میں عہد نامہ عتیق کے نام سے گڈمڈ ہو جاتے تھے وہ جسے حفظ کر رہا تھا، اور جب وہ سب وہاں ہوتی تھیں، بجھتی ہوئی آگ کے اطراف دائرے میں بیٹھی، سبز رنگ کے شیڈ والے لیمپ سے علاحدہ علاحدہ روشن، اپنے اپنے خاکوں کے ہمراہ، جن کے غم انگیز رنگ ممیز نہیں کیے جا سکتے تھے، جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک آدھ لفظ بول دیتی تھیں جو عالی شان بھی ہوتے تھے اور سخت بھی، تو ننھا ان کو خوف زدہ آنکھوں سے گھورنے لگتا، اس یقین کے ساتھ گویا وہ عورتوں کو نہیں بزرگوں اور آتش پرستوں کو، حقیقی چیزوں کو نہیں، خیالی ہیولوں کو دیکھ رہا تھا۔

اس قدیم سیلون میں اکثر آنے والے لوگوں میں اور ان خیالی ہیولوں میں کبھی کبھی کچھ پادری بھی شامل ہوتے تھے، اور کچھ حضرات بھی؛ جیسے Marquis de Sass جو مادام de Berry

کا پرائیوٹ سیکریٹری تھا، Vicomte de Val جس نے یک قافیہ نظموں جیسے قصائد شائع کیے تھے، شہزادہ de Beauff جو اگرچہ کم عمر تھا، اس کے بال سفید تھے اور جس کی ایک بہت خوب صورت اور خوش مزاج بیوی تھی، جس کے لباس میں گلنار مخمل اور سنہری ڈوریوں سے بنے نیچے گلے حاضرین کو متوحش کیے دیتے تھے، Marquis de C d'E وہ دل آویز ٹھوڑی والا مہربان انسان اور Chevalier de Port-de-Guy جو Louvre کتب خانے ایک اہم ستون تھا جس کو شاہی کابینہ کہا جاتا تھا، موسیو de Port-de-Guy جو گنجا اور عمر رسیدہ ہی نہیں بوڑھا بھی تھا، جو 1793ء کو بیان کرنے کا عادی تھا، جسے سولہ برس کی عمر میں چپوؤں والی کشتی میں قید کردیا گیا تھا، اور ایک اسّی سالہ انسان کے ساتھ زنجیر کردیا گیا تھا، Mirepoix کا بشپ، جو منحرف بھی تھا، مگر پادری بھی، جب کہ اس میں وہ سپاہی کی حیثیت میں قید کیا گیا تھا۔ یہ Toulon میں رہتا تھا۔ یہ سب رات کے وقت جمع ہوکر سولی کے مچانوں پر لٹکائے جانے والے لوگوں کے سر اور جسم اکٹھا کرتے جن کو دن میں گلوٹین کے ذریعے موت کی سزا دی گئی جاتی تھی؛ وہ ان خون ٹپکتے جسموں کو اپنی پشت پر اٹھا کر لے جاتے، اور ان کے، غلاموں والے سرخ بلاؤزوں میں ملبوس پشت پر خون جم جایا کرتا تھا، جو صبح کو خشک اور رات کو نم ہوتا تھا۔ یہ المناک قصے مادام کے سیلون میں سنائے جاتے تھے: Marat پر لعنت بھیجنے کے ذریعے وہ Trestaillon کی تعریف کرتے تھے۔

کچھ ناقابلِ دریافت قسم کے نائبین بھی وہاں اپنے کھیل کھیلتے تھے؛ موسیو Thibord du Chalard، موسیو Lemarchant de Gomicourt، اور مشہور ومعروف، دائیں بازو والوں پر طعنہ زنی کرنے والا موسیو Cornet-Dincourt اور Ferrette کا قزاقی کرنے والا افسر، اپنی مختصر برجیس، اور دبلی پتلی ٹانگوں سمیت موسیو de Talleyrand کی طرف جانے والا اس سیلون سے ہوکر جایا کرتا تھا۔ وہ موسیو le Comte d'Artois کی عیاشیوں کا ساتھی تھا، ارسطو کی طرح نہیں جو Campaspe کے آگے جھک گیا تھا، اس نے Guimard کو چار ہاتھ پاؤں کے بل رینگنے پر مجبور کردیا تھا، اور اس طرح اس نے زمانے کو قزاقی کے افسر سے فلسفی سے بدلہ لیتے دکھایا تھا، اور جہاں تک مبلغین کا معاملہ تھا، وہاں پادری Halma تھا، وہی جس سے la Foudre کے شریک کار موسیو Larose نے کہا تھا، "افسوس! وہاں کون ہے جو پچاس سالہ نہیں ہے؟ شاید چند احمق ہوں گے۔" پادری Letourneur، بادشاہ کا مبلغ، پادری Frayssinous جو ابھی تک نہ کاؤنٹ، نہ بشپ، نہ منسٹر نہ نواب تھا جو ایک قدیم cassock

پہنتا تھا جس کے بٹن غائب ہوتے تھے، اور پادری Keravenant جو Saint-Germain-des-Pres کا منتظم تھا؛ پاپائے اعظم کا Nuncio تھا؛ اس کے بعد موسیو Macchi تھا جس کی غیر معمولی طور پر دل گیر ناک تھی، اور ایک اور موسیو تھا جس کو Abbate Palmieri کہا جاتا تھا؛ جو Holy See کے سات عدالتی کلرکوں میں سے ایک تھا جو لائبریا کا معروف Canon تھا؛ سینٹوں کا وکیل Postulatore dei Santi جو فتاوٰی سے متعلق تھا اور بخت کے حصے کا Master of Requests تھا۔ آخر میں دو کارڈینل موسیو de la Luzerne اور موسیو de Cl T ، اور [سوئٹزر لینڈ کے شہر] Luzerne کا کارڈینل ادیب تھا اور کچھ دنوں بعد Chateaubriand کے ساتھ چیزوں کی حفاظت کرنے والا بننے والا تھا؛ موسیو de Cl T آرچ بشپ آف Toul، جو اپنے بھتیجے Marquis de T سے ملنے اکثر پیرس جایا کرتا تھا جو ہری اور جنگ کا وزیر تھا۔ Cl T کا کارڈینل بہت خوش دل انسان تھا اور اپنے cassock کے نیچے پہنی ہوئی سبز رنگ کی جرابوں کی نمائش کیا کرتا تھا؛ اس کی خصوصیت سے نفرت تھی اور وہ بلیرڈ کھیلنے کے لیے بے چین رہا کرتا تھا؛ ایک اور بھی شخص تھا جو گرمی کی شاموں میں Rue M سے گزرا کرتا تھا جہاں اس زمانے میں de Cl T نام کا ایک ہوٹل ہوتا تھا، جہاں [بلیرڈ کی] گیندوں کے ٹکرانے کی اور گرجا کے خادم موں سیئیور Cotiret پر کارڈینل کی چیخ پکار سننے کے لیے ٹھہر جایا کرتا تھا؛ de Cl T جسے مادام de T کے سیلون میں اس کا قریبی دوست موسیو de Roquelaure لایا کرتا تھا جو Senlis کا بشپ اور چالیس میں سے ایک تھا۔ موسیو de Roquelaure اکادمی میں اپنی طویل قامت اور انہماک کے باعث مشہور تھا؛ شیشے کے دروازے کے اس پار کتب خانے کے ہال میں جہاں ان دنوں فرانسیسی اکادمی اپنے اجتماعات کرتی تھی، تجسس کرنے والے، ہر منگل وہاں Senlis کے سابق بشپ کو تازہ دم و مستعد، دروازے کی طرف پیٹھ کیے کھڑا دیکھتے تھے، جو بظاہر اپنے کالر دکھانے کے لیے ایسا کرتا تھا۔ ان سب مذہبی لوگوں کے باعث، حالاں کہ ان میں زیادہ تر درباری اور گرجا گھر والے تھے، T کلب کا وقار بڑھ گیا اور، جس کا جاگیر دارانہ پہلو فرانس کے پانچ نوابین Vicomte Marquis de Tal, Marquis de Herb, Marquis de Vib, Damb اور Duc de Val کی وجہ زیادہ زور آور ہو گیا تھا۔ Duc de Val کو فرانس کی نوابی کا زیادہ اندازہ نہیں تھا۔ یہی تھا جس نے کہا تھا "یہ سارے کارڈینل فرانس کے انگلستانی نوابین ہیں۔" مزید یہ کہ انقلاب کا اثر اس صدی میں سارے فرانس میں ہونا چاہیے، اس

جاگیردارانہ سیلون میں، جس کے بارے اس نے کہا تھا کہ ایک بورژوا حاوی ہو گیا ہے۔ وہاں موسیو Gillenormand راج کر رہا تھا۔

اسی سیلون میں پیرس کے سفید فام سماج کا نچوڑ اور لب لباب تھا۔ ان کی نام وری شہرت، حتیٰ کہ شاہ پرستوں کی نام وری، بھی قرنطینے میں رکھی جاتی تھی۔ شہرت میں ہمیشہ نراجیت کے نشانات ملتے ہیں۔ اگر Chateaubriand اس کلب میں شامل ہو گیا ہوتا، تو اس میں بھی Pere Duchene کے اثرات آ جاتے۔ کچھ لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تھا۔ Comte Beug کی شمولیت اس کی اصلاح سے مشروط تھی۔

اس زمانے کے شریفانہ سیلون ان سیلونوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب تو Saint-Germain کے مضافات کی زنجیریں بھی دھواں دینے لگی ہیں۔ آج کے شاہ پرست ہر دل عزیز ہیں، ہمیں ان کے کمال کی داد دینی چاہیے۔

اعلیٰ درجے کی شائستگی کے اظہار کے پردے میں مادام de T کے سیلون کا ماحول اعلیٰ درجے کا پاکیزہ اور خود پسند ہو گیا تھا۔ وہاں کے آداب میں ہر قسم کی غیر ارادی نفاستیں جنھیں قدیم پابندیوں نے قبول کر لیا تھا اور دفن ہو گئی تھیں، اب بھی زندہ تھیں۔ ان عادتوں میں سے کچھ، بالخصوص زبان کے مسائل، انوکھے معلوم ہوتے تھے۔ وہ افراد جو معمولی طور پر ان سے واقف تھے ان کو مقامی سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ ایک عورت مادام جنرل کہلاتی تھی۔ مادام کرنل بھی کبھی کبھی استعمال ہوتا تھا۔ دل فریب مادام de Leon اس کے لیے شہزادی کے لقب کو پسند کرتی تھی۔ مارکوئی de Crequy بھی مادام کرنل کہلاتی تھی۔

یہ Tuileries کے اعلیٰ درجے کے سماج کی ایجاد تھی کہ تنہائی میں بادشاہ سے گفتگو کے دوران جلالت مآب کے بجائے ہمیشہ بادشاہ کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا تھا، کہ اس لقب کو بالجبر قبضہ کرنے والے نے خراب کر دیا تھا۔

وہاں آدمیوں کے اور ان کے اعمال کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ ان کی عمر پر لعن طعن کی جاتی تھی جو انھیں سمجھنے کی ضرورت سے آزاد کر دیتی تھی۔ وہ حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہتے۔ وہ ایک دوسرے سے روشنی کی اسی قلیل مقدار میں، جو انھیں حاصل تھی، ترسیل کرتے تھے۔ Methuselah [انجیل مقدس کے مطابق جو دنیا کا سب سے زیادہ عمر رسیدہ انسان تھا جس کی موت 969 برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ مترجم] رابطے کے ذریعے Epimenides کو [قبل مسیح کا فلسفی اور شاعر جو دیومالائی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی

جھیڑیں چرانے کے دوران سوگیا تھا اور ستاون برس تک جزیرۂ Crete کے ایک غار میں سوتا رہا تھا۔مترجم] اطلاعات فراہم کرتا تھا۔ایک گونگا آدمی ایک نابینا آدمی کو، ہونے والی باتوں سے آگاہ کیا کرتا تھا۔انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ Coblentz کے وجود میں آنے سے پہلے گزر جانے والے وقت کا وجود نہیں تھا۔اسی طرح وہ کہتے تھے کہ، خدا کے فضل سے، لوئی ہشت دہم اپنی بادشاہت کے پچیسویں برس میں تھا، اور ترکِ وطن کرنے والے اپنے حق کے باعث، اپنے بلوغ کے پچیسویں برس میں تھے۔

وہاں ہر قسم کی ہم آہنگی تھی؛ کوئی شے بہت زیادہ زندہ نہیں تھی؛ گویائی مشکل سے ایک سانس برابر ہوئی تھی؛ سیلون سے موافقت کرنے والے اخبارات محض papyrus[قدیم دور کے کاغذ] محسوس ہوتے تھے۔کچھ جوان لوگ تھے، مگر وہ مُردوں جیسے تھے۔پیش دالان کے خدام قدیم ہو چکے تھے۔یہ نہایت از کار رفتہ شخصیتیں بھی اسی قسم کی داخلیت کا شکار تھیں۔

وہ سب بہت پہلے زندہ رہنے والوں کی طرح تھے، اور سختی سے موت کی مزاحمت کر رہے تھے۔ پوری لغت محفوظ کرنے والا، تحفظ، تحفظ پسند جیسے الفاظ سے بھری ہوئی تھی۔صحیح بو باس میں ہونا—یہی اصل نکتہ تھا۔ دراصل، ان قابلِ احترام گروہوں کی رائے میں خوش بویات رہتی ہیں، اور ان کے خیالات سے بھی ان ہی کی خوش بو آتی ہے۔وہ ایک حنوط شدہ سوسائٹی تھی۔ مالکان حنوط شدہ تھے اور ملازمین بھُس بھرے ہوئے تھے۔

ایک محترم قدیم مارکوئی، جو ترکِ وطن کر چکا تھا اور برباد ہو چکا تھا، اور جس کے پاس صرف ایک خاتون ملازمہ تھی، اس کو "میرے عوام" کہتا تھا۔

وہ مادام T۔ کے سیلون میں کیا کر رہے تھے؟ وہ سب ماورا تھے۔

ماورا ہونا! اس لفظ کے، جس چیز کو یہ پیش کرتا ہے، اگر چہ وہ غائب نہیں ہوئی ہے، آج کوئی معنی نہیں رہ گئے ہیں۔ہم اس کی تشریح کرنا چاہیں گے۔

ماورا ہونا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہوتا ہے۔ یہ تخت کے نام پر اختیارِ اعلیٰ پر حملہ؛ اور عطار کے نام سے خوش بو پر حملہ ہوتا ہے۔یہ اس چیز سے بُری طرح پیش آتا ہے وہ جس کو گھسیٹ رہا ہے، لکیر کو ٹھوکر مارتا ہے؛ کم درجے کی بت پرستی سے بُت کو ذلیل کرتا ہے، زیادہ عزت افزائی سے توہین کرتا ہے؛ یہ دریافت کرتا ہے کہ پاپائے اعظم حسبِ ضرورت پاپائے اعظم نہیں ہے، کہ بادشاہ حسبِ ضرورت بادشاہ نہیں، اور یہ بھی کہ رات میں زیادہ روشنی ہو رہی ہے؛ یہ سنگِ جراحت کے ساتھ، برف کی، ہنس راج کی اور گلِ سوسن کی سفیدی کے نام سے غیر مطمئن ہوگا؛ یہ چیزوں

کے معاملے میں دشمنی کی حد تک جانب دار ہو گا؛ اس کے خلاف ہونے سے زیادہ تحقیق اس کے ساتھ ہونے سے ہوگی۔

حد سے زیادہ جذبہ خاص طور پر بھائی کے پہلے دور کی خصلت کی نشان دہی کرتا ہے۔

تاریخ کے صفحات میں ایسی کوئی شے نہیں جو اس چوتھائی گھنٹے کے عرصے کے مشابہ ہو سکے جو 1814ء میں شروع ہو کر دائیں بازو کے صاحبِ عمل انسان موسیو de Villele کی آمد پر 1820ء میں ختم ہوتا ہے۔ یہ چھ سال ایک غیر معمولی لمحہ تھے؛ ساتھ ہی شان دار بھی اور اداس کن بھی، مسکراتے اور سنجیدہ بھی، فجر کی دمک سے روشن بھی، اور ساتھ ہی بڑی مصیبتوں کی پرچھائیوں سے مکمل طور پر ڈھکے ہوئے بھی تھے، جو اب بھی افق پر چھائے ہوئے ہیں اور آہستہ آہستہ ماضی میں غرق ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ موجود تھے اس روشنی میں اور اس پرچھائیں میں بھی، ایک مکمل نئی اور پرانی دنیا میں بھی، مسخرے اور اداس کم سنی اور عمر رسیدگی میں، جو اپنی آنکھیں مل رہی تھی؛ کسی شے کی واپسی جاگ اٹھنے سے مشابہ نہیں ہوتی؛ ایک گروہ جو فرانس کو بد مزاج سمجھتا تھا، فرانس اس سے سنگ دلی سے پیش آتا تھا؛ 'مارکوئیوں' کے بے شمار پرانے زمانے کے بوم جو واپس آگئے تھے اور وہ عفریت، ماضی میں ہر شے جس سے حیران ہوتی تھی، بہادر اور شریف النفس انسان جو فرانس میں ہونے پر مسکراتے تھے مگر روتے بھی تھے، اس بات پر خوش بھی تھے کہ وہ ایک بار پھر فرانس کو دیکھ رہے ہیں، اور اس بات سے مایوس بھی کہ اب اس کی وضع باقی نہیں رہ گئی ہے؛ مذہبی جنگوں کی اشرافیہ، فرانس کی اشرافیہ، یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تلوار کی اشرافیہ کے ساتھ کراہت سے پیش آتی تھی؛ تاریخی نسلیں جنھیں تاریخ کا احساس نہیں رہ گیا تھا، Charlemagne کے ساتھیوں کے بیٹے نپولین کے ساتھیوں سے نفرت کر رہے تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، تلواریں نفرت کا جواب دے رہی تھیں؛ Fontenoy کی تلوار مضحکہ خیز ہی نہیں تھی، جس کی حیثیت لوہے کے کباڑ سے زیادہ نہیں تھی؛ Marengo کی تلوار نفرت انگیز تھی اور صرف تلوار ہی تھی۔ سابق دن، گزرے کل کو پہچانتے نہیں تھے۔ لوگوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں رہ گیا تھا کہ شان و شوکت کیا ہوتی ہے۔ ایسے بھی کچھ لوگ تھے جو بونا پارٹ کو Scapin [ایک اطالوی نام۔ مترجم] کہتے تھے۔ وہ سماج اب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اور ہم اس بات کو دہرا رہے ہیں کہ وہ بالکل باقی نہیں رہ گیا ہے۔ جب ہم اس میں سے بلا تفریق کسی فرد کو منتخب کرتے ہیں اور اس کو اپنے خیالات میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں یہ دنیا طوفانِ نوح جیسی عجیب سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہے کہ، دراصل، اس دنیا کو بھی طوفان نے ڈھانپ لیا

ہے۔ یہ دنیا دو انقلابوں تلے غائب ہو گئی ہے۔کون سی موجیں خیالات ہیں؟ جن کو تباہ کرنا اور دفن کردینا ان کا مشن ہے کتنی جلدی وہ ان سب پر حاوی ہو جاتی ہیں، اور کتنی مستعدی سے خوف ناک خلیج پیدا کر دیتی ہیں۔

ایسی تھی ایسے سیلون اور صاف گو زمانے کی قیافہ شناسی۔ جب موسیو Martainville میں والٹیئر سے زیادہ فراست پائی جاتی تھی۔

اس سیلون کا اپنا ادب اور اپنی سیاست ہوا کرتی تھی۔وہ Fievee [فرانس کا مشہور صحافی، ناول نگار، ڈراما نویس، سرکاری ملازم اور خفیہ جاسوس۔مترجم] پر یقین رکھتے تھے۔موسیو Agier نے انھیں قانون سکھایا تھا۔وہ Quay Malaquais کے قدیم کتب فروش اور بین الاقوامی قانون داں پر تبصرہ کرتے تھے۔نپولین ان کے نزدیک ایک مکمل کارسیکائی[جزیرۂ کارسیکا کا] دیو تھا۔بعد میں تاریخ میں موسیو le Marquis deBonaparte کا شاہ کی فوج کے لفٹنٹ جنرل کی حیثیت میں تعارف ہوا تھا، جو اس عہد کے جذبے کے لیے رعایت تھی۔

یہ سیلون اپنی پاک بازی کا تحفظ نہیں کرتے تھے۔1818ء کی ابتدا سے ان میں نظریات فراہم کرنے والوں کی بھر مار ہو گئی تھی جو کسی حد تک تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ان کا طریقہ کار یہ ہو گیا تھا کہ وہ شاہ پرست ہوتے بھی تھے اور ایسا ہونے پر خود کو معاف بھی کر دیتے تھے۔جہاں حد سے زیادہ ہونے والے لوگ فخر کرتے تھے، اور نظریاتی لوگ شرمندہ ہوتے تھے۔ان میں دانش ہوتی تھی؛ ان میں خاموشی ہوتی تھی؛ ان کے سیاسی نظریات میں نخوت کی آمیزش بھی ہوتی تھی۔انھیں کامیاب ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ کوٹ اور نکٹائی کے معاملے میں ذرا زیادہ ہی دخل دیتے تھے۔نظریاتی پارٹی کے لوگوں کی غلطی یا بدقسمتی یہ تھی کہ انھوں نے عمر رسیدہ نوجوان تخلیق کر لیے تھے۔انھوں نے عقل مند لوگوں کا انداز اختیار کر لیا تھا۔وہ حتمی اور ضرورت سے زیادہ طاقت پیدا کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔وہ مخالفت کرتے تھے مگر نرالی دانش سے، قدامت پسند روشن خیالی سے اس روشن خیالی تک جو تباہ کر ڈالتی ہے۔ان کو کہتے سنا جاتا تھا، ”شاہ پرستی کا شکریہ! اس نے ایک خدمت سے زیادہ خدمت کی ہے۔یہ روایات، پرستش، مذہب اور احترام کو واپس لائی ہے۔یہ ایمان دار ہے، بہادر ہے، محبت کرنے والی ہے، اور وفادار ہے۔اس نے شاہی کی لادینی شان و شوکت میں، اگرچہ معذرت کے ساتھ، قوم کی نئی شان وشوکت کو مخلوط کر دیا ہے۔ اس کی غلطی انقلاب، سلطنت، توصیف، آزادی، نوجوان خیالات، نوجوان نسلوں، اور عمر کا ادراک نہیں۔ بلکہ یہ غلطی، جو یہ ہمارے بارے میں کرتی ہے— کیا ہم

نے کبھی ان کے بارے میں بھی یہ غلطی نہیں کی ہے؟ ہمیں اس انقلاب کے، ہم جس کے وارث ہیں، تمام نکات کے بارے میں ذہین ہونا چاہیے۔شاہ پرستی پر حملہ کرنا آزاد خیالی کی غلط تعبیر ہوگی۔کیسی غلطی ہے یہ!اور کیسی بے بصارتی ہے یہ! انقلابی فرانس، تاریخی فرانس کے معاملے میں، بلکہ اپنی ماں کے معاملے میں، خود اپنے معاملے میں، کم معیاری ہو جاتا ہے۔پانچویں تھرمیڈور کے بعد شاہی کی اشرافیہ سے وہی برتاؤ کیا جاتا ہے جیسا برتاؤ سلطنت کی اشرافیہ کے ساتھ پانچ تھرمیڈور کے بعد کیا جاتا تھا۔وہ عقاب کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے، ہم fleur-de-lys کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہمارے پاس ممنوع کردینے کے لیے کچھ نہ کچھ ہمیشہ ہونا چاہیے۔کیا لوئی چہاردہم کے تاج شاہی کو بے ملمع کردینے سے، ہنری چہارم کے کوٹ آف آرمز کو کھرچ دینے سے کوئی مقصد حل ہو جاتا ہے؟ ہم Jena کے پُل سے N کے حروف کھرچ دینے پر موسیو de Vaublanc کی سرزنش کرتے ہیں۔ایسا کیا تھا جو اس نے کیا تھا؟ ہم کیا کر رہے ہیں؟ Bouvines اسی طرح ہمارا ہے جیسے Marengo کا ہے۔fleurs-de-lys اسی طرح ہمارے ہیں جیسے کہ N والوں کے۔وہ ہماری میراث ہے۔ہم کس مقصد کے لیے اسے کم کرنا چاہتے ہیں؟ جیسا کہ ہم نے حال میں کیا ہے، ہمیں اپنے ملک سے حال کی طرح ماضی کو بھی رد نہیں کرنا چاہیے۔تو کیوں نہ پوری تاریخ ہی کو قبول کر لیا جائے؟ کیوں نہ ہم پورے فرانس سے ہی محبت کرنے لگیں؟"

اسی طرح نظریہ سازی کرنے والوں نے شاہی پر تنقید کی تھی، جو تجربے سے ناخوش تھے اور تحفظ پر غصے میں تھے۔

حد سے بڑھتے ہوئے لوگوں نے شاہیت کے پہلے عہد کی نشان دہی کی تھی، اجتماعیت نے دوسرے کی تصویر کشی کی۔ہر سرگرمی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ہمیں خود کو اس خاکے تک محدود رکھنا چاہیے۔

اس بیانیے کے سلسلے میں اس کتاب کے مصنف کا عصری تاریخ کے اس راز جو لمحے سے واسطہ پڑا ہے!اسے اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے اور ایک بار پھر اس سوسائٹی کے غیر معمولی خد و خال تلاش کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے جو آج بھی نا معلوم ہیں، مگر وہ اسے تیزی سے، اور کسی تلخ اور تضحیک آمیز خیال کے بغیر کر رہا ہے۔نشانیاں، باتمیز اور شفقت آمیز، دونوں اس کو ماضی سے منسلک کرتی ہیں، اس لیے کہ وہ اس کی ماں سے بھی متعلق ہیں۔اس کے علاوہ، ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے، کہ اسی حقیر دنیا کی اپنی شان و شوکت بھی ہے۔آپ اس پر مسکرا سکتے ہیں، مگر آپ

نہ اس سے نفرت کر سکتے ہیں نہ اسے کمتر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سابقہ دنوں کا فرانس تھا۔

جیسا کہ تمام بچے کرتے ہیں پوں مرسی Pontmercy نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب وہ اپنے عم Gillenormand کے ہاتھوں سے باہر نکلا تو اس کے نانا نے اس کو ایک خالصتاً کلاسیکی اور پارسا پروفیسر کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ نوجوان روح جو کھِل رہی تھی، ایک متکبر المزاج شخصیت سے نکل کر ایک اصول پرست گنوار کے ہاتھ لگ گئی تھی۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد پوں مرسی نے قانون کے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ ایک شاہ پرست، شدت پسند اور سخت آدمی تھا۔ اسے اپنے نانا سے زیادہ محبت نہیں تھی، اس لیے کہ ثانی الذکر کی زندہ دلی ترش روئی اسے ناپسند تھی، اور اس کے باپ کے بارے میں اس کے احساسات اندوہ گیں تھے۔

وہ، من حیث الکل، ایک سرد اور سرگرم، مہذب، فیاض، متکبر، مذہبی اور پُر جوش لڑکا تھا؛ سختی میں باوقار، اور لجاجت میں خالص۔

۞

رہزن کا اختتام

ماریوس کی کلاسیکی تعلیم کا اختتام بلیر نورما کے سوسائٹی سے نکل جانے کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ بڑے میاں نے پیرس کے مضافاتی علاقے Saint-Germain اور مادام T کے سیلون کو ایک ساتھ خدا حافظ کہا، اور خود Mardis میں Filles-du-Calvaire اسٹریٹ پر واقع اپنے مکان میں جا بسے۔ وہاں ملازمین میں، دربان کے علاوہ، اس کی ملازمہ نکولیٹ بھی تھی جس نے میگنلن کی جگہ لے لی تھی، اور ہمیشہ ہانپنے والا موٹا باسک بھی تھا جس کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

1827ء میں، ماریوس سترہ برس کا ہو گیا تھا۔ ایک دن گھر واپسی پر اس نے اپنے نانا کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

"ماریوس" موسیو بلیر نورما نے کہا "تم کل Vernon کے لیے روانہ ہو جاؤ گے۔"

"کیوں؟" ماریوس نے کہا۔

"اپنے والد سے ملنے کے لیے۔"

ماریوس پر کپکپی کا دورہ سا پڑ گیا۔ وہ سب کچھ سوچ سکتا تھا سوائے اس کے — کہ ایک دن اسے اپنے باپ کو دیکھنے کے لیے جانا پڑے گا۔ اس سے بڑھ کر غیر متوقع، زیادہ تعجب خیز اور اس کے لیے ناقابل قبول کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کشیدگی سے زبردستی مصالحت کرنے جیسی بات تھی۔ یہ کوئی مصیبت تو نہیں تھی، مگر ایک ناخوش گوار فرض ضرور بن گیا تھا۔

ماریوس، اپنے سیاسی دشمنی کے ساتھ، اس امر کا قائل تھا کہ اس کا باپ، ضرب لگانے والا، جیسا کہ موسیو بلیر نورما اس کو اپنے خوش حال دنوں میں کہتا تھا، اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا، اس لیے کہ اس نے اسے دوسروں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس احساس کے ساتھ

اس سے محبت نہیں کی جا سکتی تھی، جب کہ وہ بھی اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔

"اس سے زیادہ آسان بات نہیں ہو سکتی۔" وہ اپنے آپ سے کہتا تھا۔

ماریوس اس قدر ہکا بکا ہو گیا کہ اس نے موسیو بلیر نورمانے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔ tt نے مزید کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیمار ہے۔ تمھاری موجودگی کا طالب ہے۔"

تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوا، "تم کل سویرے روانہ ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ Cour des Fontaines سے چھ بجے صبح ایک کوچ روانہ ہوتی ہے، اور شام تک وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی بات مان لو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔"

اس کے بعد اس نے خط کو اپنے ہاتھ سے مسل کر اپنے جیب میں ٹھونس لیا۔ ماریوس چاہتا تو اسی شام روانہ ہو کر اگلی صبح اپنے باپ کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ اسی رات Bouloi اسٹریٹ پر ایک گاڑی Rouen جانے والی تھی جو Vernon سے ہو کر گزرتی تھی۔ نہ ماریوس نے اور نہ اس کے tt نے اس کے بارے میں معلومات کی کوئی کوشش کی۔

دوسرے دن شام ہوتے ماریوس Vernon پہنچ گیا۔ لوگ ابھی اپنی شمعیں جلانا شروع ہی کر رہے تھے۔ اس نے پہلے ہی آدمی سے، جو اسے ملا تھا، موسیو پوں مرسی کے گھر کا پتا دریافت کیا۔ چوں کہ وہ خود فرانس کی بحالی کی تحریک سے اتفاق کرتا تھا، اس لیے اسے اپنے باپ کے کرنل یا بیرن ہونے کے دعوے سے اتفاق نہیں تھا۔

مکان کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ماریوس نے دروازے پر دستک دی؛ ایک عورت نے، جو اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چراغ لیے آئی تھی، دروازہ کھول دیا۔

"موسیو پوں مرسی؟" ماریوس نے سوال کیا۔

وہ عورت بالکل ساکت رہی۔

"کیا یہ انھیں کا گھر ہے؟" ماریوس نے مطالبہ کیا۔

عورت نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"کیا میں ان سے ملاقات کر سکتا ہوں؟"

عورت نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔

"مگر میں ان کا بیٹا ہوں۔" ماریوس نے اصرار کرتے ہوئے کہا، "وہ میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اب وہ آپ کے منتظر نہیں۔" عورت نے کہا۔

اس نے غور سے دیکھا تو وہ عورت رو رہی تھی۔

اس نے زمینی منزل کے ایک کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کردیا؛ ماریوس کمرے میں داخل ہوگیا۔

اس کمرے میں، جہاں چمنی کے قریب رکھی چربی سے بنی موم بتی روشن تھی، تین آدمی موجود تھے، ایک سیدھا کھڑا تھا، دوسری گھٹنے کے بل جھکا ہوا تھا، تیسرا اپنی قمیص میں ملبوس زمین پر منہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ زمین پر لیٹا آدمی ہی کرنل تھا۔

ان دو میں ایک ڈاکٹر تھا اور دوسرا پادری تھا جو دعا میں مصروف تھا۔

کرنل پر تین دن قبل دماغی بخار کا حملہ ہوا تھا۔ چوں کہ اپنی بیماری کی ابتدا ہی میں اس کے خیال میں کچھ بدشگونی ہوگئی تھی، اس نے موسیو بلیر نورما کو خط لکھ کر اپنے بیٹے کو طلب کرلیا تھا۔ بیماری تیزی سے بڑھ گئی تھی۔ جس شام ماریوس Vernon آیا، کرنل کو سرسام ہوگیا تھا؛ ملازموں کی اسے روکنے کی کوشش کے باوجود وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چلا کر کہا تھا، ''میرا بیٹا ابھی تک نہیں آیا ہے۔ میں اس سے ملنے ضرور جاؤں گا۔'' اس کے بعد وہ کمرے سے باہر بھاگا اور ڈیوڑھی کے فرش پر اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

ڈاکٹر اور پادری کو طلب کیا گیا۔ ڈاکٹر دیر سے پہنچا۔ بیٹے کو بھی پہنچنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔

موم بتی کی کم روشنی میں کرنل کے زرد رخسار پر آنسو کا ایک بڑا سا قطرہ دیکھا جا سکتا تھا جو اس کی مردہ آنکھ سے بہہ نکلا تھا۔ آنکھ بجھ چکی تھی مگر آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ بیٹے سے دیر سے آنے کے شکوے کا آنسو تھا۔

ماریوس اس آدمی کو گھور رہا تھا، جسے وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس قابلِ احترام مردانہ چہرے پر، ان کھلی آنکھوں پر جو کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں، ان توانا دست و پا پر، جن پر یہاں وہاں، تلوار کے زخموں کی بھوری لکیریں اور ایک قسم کے سُرخ ستارے تھے جو گولیوں کے سوراخوں کی نشان دہی کرتے تھے، صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے اس بڑے سے نشان کا تصور کیا جو اس کے بشرے پر بہادری کی علامت بنا ہوا تھا، جس پر خدا نے نیکی کی مہر لگا دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ آدمی اس کا باپ تھا، اور یہ بھی کہ یہ آدمی مر چکا تھا۔ یہ سوچ کر سردی کی ایک لہر سی اس کے سارے وجود پر دوڑ گئی۔

اسے اس وقت افسوس تھا، ایسا افسوس تھا جو کسی بھی مرے ہوئے آدمی کو اتفاقیہ لیٹا

دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے۔

اس کمرے میں اذیت بھرا، تیز روحانی اذیت کا ماحول تھا۔ ملازمہ ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی؛ پادری دعا کر رہا تھا، اور اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں؛ ڈاکٹر اپنے آنسو پونچھ رہا تھا؛ خود میت بھی رو رہی تھی۔

ڈاکٹر، پادری اور اس عورت نے، اپنے دکھوں کے دوران، بغیر کچھ کہے گھور کر ماریوس کو دیکھا؛ اس جگہ وہ بالکل اجنبی تھا جس پر بہت کم اثر ہوا تھا۔ ماریوس کو، جس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ اس نے اپنی ہیٹ جسے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا فرش پر گرا دی، تا کہ ایسے غم کا اظہار ہو سکے جس نے اسے پکڑے رہنے کی قوت سے محروم کر دیا تھا۔

ساتھ ہی اسے ندامت کا تجربہ بھی ہوا، اور اس کو اپنے رویے پر شرمندگی بھی ہوئی، مگر کیا اس میں اس کی کوئی غلطی تھی؟ اسے اپنے باپ سے محبت نہیں تھی؟ وہ محبت کرتا بھی کیوں؟

کرنل نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے گھر کے بڑے بڑے فرنیچر کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم مشکل سے اس کے کفن دفن کے اخراجات کے لیے کافی ہوئی تھی۔

ملازمہ کو کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا تھا، جو اس نے ماریوس کے حوالے کر دیا۔ اس میں مندرجہ ذیل متن کرنل کی اپنی تحریر میں تھا:

"میرے بیٹے کے لیے — شہنشاہ نے واٹر لو کے میدانِ جنگ میں مجھے بیرن بنایا تھا۔ چوں کہ فرانس کی بحالی والے اس خطاب پر، میرے حق پر معترض ہیں جسے میں نے اپنے خون سے خریدا تھا، میرا بیٹا اس کو لے گا اور اپنے پاس رکھے گا۔ وہ فطری طور پر اس کا حق دار ہوگا۔" اس کے بعد کرنل نے اس متن میں اضافہ کیا تھا: "واٹر لو کی اسی جنگ میں، ایک سارجنٹ نے میری جان بچائی تھی۔ اس آدمی کا نام تھی آردیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان دنوں وہ پیرس کے مضافات میں، Chelles یا Montfermeil نامی علاقے میں ایک سرائے چلا رہا ہے۔ اگر میرا بیٹا اس سے ملے گا تو وہ تھی آردیے سے جتنا ممکن ہو سکے گا، اچھا سلوک کرے گا۔"

ماریوس نے وہ کاغذ لے کر محفوظ کر لیا، اپنے باپ کے حکم کی بجا آوری کے لیے نہیں، موت کے ایک مبہم اور مغرور احترام پر، جو آدمی کے دل میں ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔

کرنل کا کچھ باقی نہیں رہا۔ موسیو بلیر نورماں نے اس کی تلوار اور اس کی وردی پرانے کپڑوں کا کاروبار کرنے والے کے ہاتھ فروخت کر دی تھے۔ پڑوسیوں نے باغیچے کو تباہ کر دیا تھا اور نادر پھول پودے اکھاڑ لے گئے تھے۔ باقی ماندہ پودے زہر بوٹی اور خود رو پودوں میں تبدیل

ہو کر مر گئے تھے۔

ماریوس صرف اڑتالیس گھنٹے Vernon میں ٹھہرا۔ دفن کے بعد وہ پیرس واپس چلا گیا، اور اپنی قانون کی تعلیم میں جت گیا۔ اس کے دل میں باپ کی کوئی یاد باقی نہیں رہی، گویا اس کا کبھی وجود ہی نہیں تھا۔ دو دنوں کے اندر کرنل دفن کر دیا گیا، اور تین دنوں میں بھلا دیا گیا۔

سوگ کی علامت کے طور پر ماریوس نے اپنی ہیٹ پر سیاہ رنگ کی جالی لگا لی تھی، اور بس۔

۞

انقلابی اور مذہبی اجتماعات

ماریوس نے اپنے بچپن کی مذہبی عادتیں برقرار رکھی تھیں۔ ایک اتوار وہ Saint-Sulpice کے اسی گرجا گھر میں اجتماع میں شرکت کے لیے گیا جہاں اس کا عم اسے لڑکپن میں لے جایا کرتا تھا۔ اس موقعے پر وہ کچھ زیادہ ہی بے خیالی میں ستون کے پیچھے رکھی ایک مخمل سے بنی کرسی پر مافیہا سے بے پروا گھٹنوں کے بل جھکا تھا جس پر موسیو Mabeuf وارڈن کا نام کندہ تھا۔ ابھی دعا سے شروع ہی ہوئی ہوگی کہ ایک بوڑھا آدمی اس کے پاس آیا اور ماریوس سے مخاطب ہوا، ”جناب عالی، یہ میری جگہ ہے۔“

ماریوس جلدی سے ایک طرف ہو گیا اور بوڑھا آدمی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عبادت ختم ہو گئی۔ چند قدم پیچھے ماریوس کسی سوچ میں ڈوبا کھڑا تھا کہ بوڑھا آدمی اس کی طرف آیا اور کہا، ”جناب عالی! مجھے افسوس ہے کہ میں مخل ہوا، اور اس وقت بھی مخل ہو رہا ہوں۔ آپ مجھے بے جا مداخلت کرنے والا سمجھ رہے ہوں گے۔ میں اپنے بارے میں صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کی چنداں ضرورت نہیں۔“ ماریوس نے کہا۔

”جی ہاں، ضرورت ہے۔“ بوڑھے شخص نے کہا، ”میں نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں آپ کی رائے خراب ہو۔ دیکھیے، میں اس جگہ کا عادی سا ہو گیا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس جگہ سے اجتماع اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں؟ میں اس کی وجہ بھی بتانا چاہوں گا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میں ایک بے چارے، بہادر باپ کو آتا دیکھتا رہا ہوں، اور پچھلے دس برسوں سے اسے اپنے بیٹے سے ملنے یا اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے، اس لیے کہ اس کے خاندان والوں نے اسے اپنے بیٹے سے ملنے سے باز رکھا ہے۔ اس وقت وہ یہاں آتا تھا جب اس کی اطلاع کے مطابق اس کا لڑکا اس گرجا گھر میں لایا جاتا تھا۔ اس بچے کو بھی خبر نہ تھی کہ اس کا باپ بھی یہاں ہوتا ہے۔ شاید اسے یہ

بھی علم نہیں تھا کہ اس کا کوئی باپ بھی ہے! بے چارہ معصوم لڑکا! باپ ایک ستون کے پیچھے کھڑا ہو جاتا تھا تا کہ وہ نظر نہ آ سکے۔ وہ اپنے بچے کو دیکھتا اور زار وقطار روتا تھا۔ بے چارہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا۔ مجھے اس کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب یہ جگہ میرے نزدیک متبرک ہو گئی ہے، اور میں نے اپنی عادت بنالی کہ میں عبادت کے لیے یہیں آتا ہوں۔ وارڈن کی حیثیت میں مجھے اس جگہ کو اپنے لیے مخصوص کر لینے کا حق ہے۔ میں اس بدقسمت انسان سے واقف تھا۔ اس کا ایک سُسر بھی تھا، ایک دولت مند عم، اور کئی اعزہ، میں سب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ بس اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر باپ بچے سے ملنے لگا تو وہ بچے کو اپنی وراثت سے محروم کر دے گا۔ لہٰذا اس نے قربانی دی، تا کہ ایک دن اس کا بیٹا دولت مند اور خوش حال ہو جائے۔ اسے سیاسی نظریات کے باعث اپنے بچے سے الگ کیا گیا تھا۔ بلاشبہ، میں سیاسی نظریات کا قائل ہوں، مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے جو نہیں جانتے کہ اس معاملے میں کس حد تک جانا چاہیے۔ میرے خدا! کوئی آدمی صرف اس لیے عفریت نہیں بن جایا کرتا کہ وہ واٹر لو میں شریک تھا؛ کسی باپ کو اپنے بیٹے سے صرف اس قسم کی بات پر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شخص بونا پارٹ کے کرنلوں میں سے تھا۔ شاید اب اس کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔ وہ Vernon میں، جہاں کا پادری میرا بھائی ہے، رہتا تھا اور اس کا نام کچھ پوں مری یا موں پری جیسا تھا۔ میری ہی وجہ سے اسے تلوار کا زخم بھی لگا تھا۔"

"موں پری!" ماریوس نے کہا اور اس کا رنگ زرد ہو گیا۔

"جی ہاں! بالکل یہی تھا 'موں پری'۔ کیا آپ اسے جانتے تھے؟"

"جنابِ عالی!" ماریوس نے کہا، "وہ میرا باپ تھا۔"

بوڑھے آدمی نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا، "اوہ! اچھا، تم ہی اس کے بیٹے ہو۔ ہاں، بالکل ٹھیک۔ اس وقت تک وہ لڑکا یقیناً پورا آدمی بن جاتا۔ اچھا، بدقسمت لڑکے، اب تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارا بھی ایک باپ تھا جو تم سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔"

ماریوس نے بوڑھے آدمی کو اپنا بازو پیش کیا، اور سہارا دے کر اسے اس کی قیام گاہ تک لے گیا۔

اگلے دن، ماریوس نے موسیو ژیلیر نورما سے کہا، "میں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر شکار کھیلنے کا انتظام کیا ہے۔ کیا آپ مجھے تین دن تک غائب رہنے کی اجازت دیں گے؟"

"چار!" نانا نے جواب میں کہا، "جاؤ، بیٹا! مزے کرو۔"

اور اس نے اپنی بیٹی سے دھیمی آواز میں، آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا، "ضرور کوئی محبت وغیرہ کا معاملہ ہے۔"

❁

وارڈِن سے ملاقات

ماریوس کہاں گیا تھا؛ اس راز کو آگے چل کر افشا کیا جائے گا۔

ماریوس تین دن غائب رہا۔ اس کے بعد پیرس واپس پہنچا، سیدھا قانون کے اسکول کے کتب خانے میں گیا، اور مانیٹر کی فائل طلب کی۔

اس نے مانیٹر کو پڑھا، تمام جمہوریتوں کی، Sainte-Helene کی اور سلطنت کی تاریخ پڑھی، تمام یادداشتیں، تمام اخبارات، سارے سرکاری اعلانات، سارے فرامین پڑھے۔ اس نے سب کچھ چاٹ ڈالا تھا۔ پہلی بار جب اسے اپنے باپ کا نام نظر آیا، وہ عظیم فوج کے ایک اعلان میں ملا تھا۔ ایک ہفتے وہ بخار میں مبتلا رہا۔ وہ ان جنرلوں سے ملاقات کے لیے گیا جن کی ماتحتی میں کرنل پوں مرسی نے کام کیا تھا، جن میں چرچ وارڈن مابوف (Mabeuf) بھی شامل تھا، جس سے وہ دوبارہ ملنے گیا اور اسے Vernon کی زندگی، کرنل کی پسپائی، اس کے [سرکاری نشان کی علامت] پھولوں، اس کی تنہائی کے بارے میں بتایا۔ بالآخر، ماریوس کو معلوم ہوگیا کہ اس کا باپ کیسا نادر، میٹھا اور ارفع، شیر۔بکری قسم کا آدمی تھا۔

اس دوران، اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود جو اس کا تمام وقت اور تمام خیالات لے لیتی تھیں، اس کی مشکل سے ہی بلیر نورماؤں سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ طعام کے وقت ظہور کرتا تھا؛ اس کے بعد لوگ اسے تلاش کرتے مگر پاتے نہیں تھے۔ ناناجیلر نورما مسکراتا اور کہتا، ”یہ لڑکا اس وقت لڑکیوں کے کام کا ہے۔“ کبھی بڑے میاں یہ اضافہ بھی کر دیتے، ”میں تو سمجھا تھا کہ کچھ بہادری وغیرہ کا معاملہ بھی ہوگا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ جذبات کا معاملہ ہوگیا ہے۔“

دراصل وہ معاملہ جذبات ہی کا تھا۔ ماریوس اپنے باپ سے محبت کی راہ پر گامزن تھا۔

اسی دوران، اس کے خیالات میں غیر معمولی تبدیلیاں ہو گئی تھی۔ تبدیلیوں کے کئی دور تھے، اور یکے بعد دیگرے آئے تھے۔ چوں کہ یہ ہمارے عہد کے ذہن کے کئی دماغوں کی تواریخ سے متعلق ہے، ہمارا خیال ہے کہ یہ سود مند ہوگا اگر ہم درجہ بہ درجہ اُن اَدوار پر نظر ڈالیں اور ان سب کی نشان دہی کریں۔

وہ تاریخ جس پر اس نے حال ہی میں نظر ڈالی تھی، اس نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

اس کا پہلا اثر اسے چندھیا دینے والا تھا۔

اس وقت تک جمہوریہ اور سلطنت وغیرہ اس کے نزدیک صرف عفریتی نام تھے۔ جمہوریہ کا نام ابہام کی روشنی میں گلوٹین سے عبارت تھا؛ سلطنت کا نام رات کی تلوار سے عبارت تھا۔ ماریوس نے ان پر ایک نظر ہی ڈالی تھی؛ اور جہاں اسے پر چھائیوں کی ابتری کی توقع تھی، اسے ایک قسم کی بے مثل حیرتوں کا سامنا ہوا تھا، جس میں خوف اور خوشیاں دونوں مدغم تھیں، ستارے جھلملا رہے تھے۔ Robespierre ،Saint-Just ،Vergniaud ،Mirabeau، Camille ،Desmoulins ،Danton تھے اور ایک اُبھرتا ہوا سورج تھا— نپولین۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کا مقام کیا تھا۔ روشنیوں کی چمک نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، اور وہ پسپا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ جب اس کی حیرت ختم ہوئی تو وہ تابندگی کا عادی ہو گیا۔ اس نے یہ سارے کام کرنے کا ارادہ بغیر سرگرانی کے کیا اور ان شخصیتوں کا مطالعہ بغیر خوف کے کیا؛ انقلاب اور سلطنت، دونوں از خود اس کے ذہن کی آنکھوں کے سامنے تابندگی اور تناظر میں ظاہر ہوئے۔ اس نے ان تمام گروہوں اور واقعات اور آدمیوں کا دو بڑے حقائق میں خلاصہ تیار کیا: جمہوریہ؛ شہری حقوق کی حاکمیت میں بحالی تھی۔ سلطنت؛ فرانس کی حاکمیت کے تصور میں یورپ پر نافذ کر دی گئی تھی؛ اسے انقلاب سے ابھرنے والی عظیم شخصیتیں دکھائی دیں، اور سلطنت سے فرانس کی عظیم شکل ابھری تھی۔ اس نے اپنے ضمیر کے مطابق یہ دعویٰ کیا کہ یہ سب کچھ اچھا ہوا تھا۔ اس کی چندھیائی کیفیت نے کیا نظر انداز کر دیا؛ اس کا پہلا تخمینہ بہت زیادہ مصنوعی تخمینہ تھا، ہم اس موقعے پر جس کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ آگے بڑھنے والی ایک ذہنی کیفیت ہے ہم جس کو محفوظ کر رہے ہیں۔ ایک بار یہ سب کہہ دینے کے بعد کہ کیا ہونے والا ہے، اور اس کے بعد کیا ہوگا، ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ اس وقت تک، وہ اپنے ملک کا اپنے باپ سے زیادہ ادراک نہیں کر سکا تھا۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ ایک قسم کے اختیاری حق نے اس

کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ اب اسے نظر آنے لگا تھا کہ ایک طرف اسے پسند کیا جا رہا ہے؛ دوسری جانب اس سے محبت کی جا رہی تھی۔

وہ پشیمانی اور اداسی سے لبریز تھا۔ مایوسی کے عالم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے اندر جو کچھ پوشیدہ ہے اسے صرف کسی مزار سے متعلق ہی کہا جا سکتا ہے۔ اوہ، اگر اس کا باپ اب بھی موجود ہوتا اور وہ اس کے پاس ہوتا؛ اگر خدا اپنی مہربانیوں کے ذریعے اس کے باپ کو اب تک زندہ رہنے کی اجازت دے دیتا، تو وہ کس طرح اس کی طرف بھاگا ہوتا؛ اس نے خود کو کیسے بلند مقام سے گرایا ہوتا اور کس طرح اس نے چلّا کر اپنے باپ سے کہا ہوتا ''بابا! میں یہاں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں! میرے اندر بھی آپ کا جیسا ہی دل ہے، میں آپ کا ہی بیٹا ہوں۔'' اس نے کس طرح باپ کے سفید سر کو گلے سے لگایا ہوتا؛ اس کے بالوں کو اپنے آنسوؤں سے بھگویا ہوتا؛ اس کے زخموں کے نشانات کو آنسوؤں سے نہلایا ہوتا؛ اس کے زخموں کے نشانات کو غور سے دیکھا ہوتا؛ اس کے ہاتھوں کو پیار سے دبایا ہوتا؛ اس کے لباس کو آنکھوں سے لگایا ہوتا؛ اس کے پیروں کے تلووں کو چوما ہوتا۔ اُف، اس کا باپ اتنی جلدی مر کیوں گیا تھا، اپنے وقت سے پہلے؛ انصاف ہو جانے سے پہلے اور اپنے بیٹے کی محبت کے اس تک پہنچنے سے پہلے؟ ماریوس دل ہی دل میں مسلسل سسکیاں لے رہا تھا، جو ہر لمحہ اس سے کہہ رہا تھا، 'بہت افسوس ہے!' ساتھ ہی وہ واقعی سنجیدہ بھی تھا؛ اپنے خیالات میں اور اپنے یقین میں پکا ہو گیا تھا۔ سچائی کی جھلک ہر لمحے اس کے یقین کو پختہ کرنے آ رہی تھی۔ اس کے اندرون میں ایک باطنی ترقی نشوونما پاتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ایک قسم کے فطری پھیلاؤ کا احساس ہو رہا تھا، جس نے اسے دو چیزیں عطا کر دی تھیں — اس کا باپ، اور اس کا ملک۔

جس طرح کلید ہونے سے ہر شے کھل جاتی ہے، اس نے اپنے آپ کو وہ سب کچھ بھی بتا دیا جس سے وہ نفرت کرتا تھا؛ اس میں داخل ہو گیا جسے وہ حقارت سے دیکھتا تھا؛ اس کے بعد سے وہ ان بڑی چیزوں کو صاف طور پر منجانب اللہ، روحانی اور انسانی سمجھ سکتا تھا، اسے جن سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا اور ان بڑے لوگوں کے بارے میں جن سے دور رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب اس نے اپنی سابقہ رائے پر غور کیا، جو اَب بھی قائم تھی، مگر کل کی ہو گئی تھی، پھر بھی، جو پہلے ہی سے اسے بہت قدیم محسوس ہونے لگی تھی تو اس پر برہمی طاری ہونے لگی تھی؛ مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

اپنے باپ کے [فرانس کی] بحالی سے لگاؤ کے باعث، فطری طور پر وہ نپولین کی بحالی پر آ گیا۔

مگر، ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ ثانی الذکر بغیر محنت کے کامیاب نہیں ہوا تھا۔

اپنے دورِ شیر خواری سے ہی وہ 1814ء میں کیے جانے والے پارٹی کے فیصلوں میں رنگا ہوا تھا۔اب، دورِ بحالی کے تمام تر تعصبات، اس کے تمام مفادات، اور اس کی تمام جبلتیں نپولین کی شکل بگاڑنے پر تُلی تھیں۔اس عمل نے اُس سے اتنا اظہارِ نفرت کیا تھا جتنا کہ Robespierre سے بھی نہیں کیا گیا تھا۔اس نے بڑی چالاکی سے اسے قوم کی محنت کی تفصیلات کی طرف، اور ماؤں کی نفرت کی طرف موڑ دیا تھا۔بونا پارٹ ایک مصنوعی عفریت بن چکا تھا؛ عوام کے تصورات کے مطابق پینٹ کرنے کے لیے 1814ء کی پارٹی نے یکے بعد دیگرے اسے ہر قسم کے خوف ناک نقابوں میں نمایاں کیا تھا، جو اگرچہ خوف انگیز تھے پھر بھی شان دار تھے اور وہ [رومن شہنشاہ] Tiberius سے بھوت پریت تک، آدھا تعز آدھا بُھیر ہو گیا تھا۔اس طرح بونا پارٹ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہر کسی کو اختیار تھا کہ وہ سسکیاں لے یا قہقہہ مار کر ہنسے، بہ شرطے کہ، نفرت سب سے نیچے کے سب سے آخری درجے پر رہے۔ ماریوس نے کبھی — اس آدمی کے بارے میں کسی اور خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دینے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔اس کے خیالات استحکام سے یک جا ہو گئے تھے جو اس کی فطرت میں تھے۔اس کے اندر ایک سرکش آدمی موجود تھا جو نپولین سے نفرت کرتا تھا۔

تاریخ پڑھتے ہوئے، اس کا مطالعہ کرتے ہوئے، بالخصوص تاریخ سے ملنے والی دستاویزات اور معلومات میں، وہ نقاب جس نے نپولین کو ماریوس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا، رفتہ رفتہ شگافتہ ہوتا جا رہا تھا۔اسے کسی بہت بڑی شے کی جھلک نظر آ گئی تھی، اور اسے شبہ تھا کہ اس لمحے تک اس سے بونا پارٹ کے بارے میں فریب کیا جا رہا تھا، جیسا کہ اوروں کے بارے میں کیا گیا تھا؛ ہر روز وہ اسے زیادہ صاف دکھائی دینے لگا تھا؛ اس نے آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم، چڑھنا شروع کر دیا؛ ابتدا میں تقریباً افسوس کے ساتھ، اس کے بعد نشے کی سی کیفیت میں، جیسے کوئی ناقابلِ مزاحمت افسوں اس کو اپنی جانب کھینچے لیے جا رہا ہو، پہلے دھندلے زینوں پر، اس کے بعد کم روشن زینوں پر، اور بالآخر ولولوں کے منور اور شان دار زینوں پر۔

ایک رات وہ چھت کے قریب اپنے چھوٹے سے کمرے میں اکیلا تھا۔اس کی شمع جل رہی تھی؛ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب رکھی میز پر اپنی کہنیاں ٹکائے کچھ پڑھ رہا تھا۔طرح طرح کے توہمات خلا سے آ آ کر اس کے خیالات میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔رات بھی کیسا نظارہ پیش کرتی ہے۔ اس کو مبہم آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اور اسے معلوم نہیں ہے کہ کہاں کہاں سے آ رہی ہیں۔وہ

عطارد سیارے کی طرف نظر کرتا جو زمین سے بارہ سو گنا بڑا ہے؛ آگ کے گولے کی طرح روشن ہے؛ آسمان کی لاجوردی سیاہ ہو رہی ہے، ستارے چمک رہے ہیں؛ کیسا ڈراؤنا منظر ہے!

اس وقت وہ عظیم الشان فوج کے اعلانات اور بہادرانہ غنائیے پڑھ رہا تھا جو جنگ کے میدان میں لکھے گئے ہیں؛ اس مقام پر، وقفے وقفے سے اسے اپنے باپ کا نام بھی دکھائی دے جاتا، مگر ہمیشہ شہنشاہ کے نام کے ساتھ؛ اس عظیم سلطنت نے اپنا سب کچھ اس کے سامنے پیش کر دیا تھا؛ اسے اپنے اندر ایک سیلاب چڑھتا اور پھیلتا دکھائی دے رہا تھا؛ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کا باپ اس کے پاس سے سانس کی طرح گزر گیا ہے، اور اس کے کان میں سرگوشی کر گیا ہے؛ وہ رفتہ رفتہ ایک انوکھی کیفیت میں آ گیا ہے؛ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ سن رہا ہے: ڈھول، توپیں، بگل، بٹالین کے نپے تلے قدم، گھڑ سواروں کے دوڑنے کی دور سے آتی آوازیں؛ کبھی کبھی اس کی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھ جاتیں اور وہ خلا کی ناقابلِ پیمائش پہنائیوں میں پھیلے، چمکتے ہوئے مجمع النجوم کو گھور کر دیکھنے لگتا؛ پھر اس کی نگاہیں اس کے سامنے کھلی کتاب پر پڑنے لگتیں، اور اس میں بھی اسے دوسری دیوہیکل اور بے ترتیبی سے چلتی پھرتی خوش نما چیزیں دکھائی دینے لگتیں۔ اس کے سینے میں اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ اس وقت نقل و حمل کی کیفیت سے، لرزتا، گہری گہری سانسیں لیتا گزر رہا تھا۔ اچانک، یہ جانے بغیر کہ اس کے اندر کیا تھا، کہ وہ کس وقتِ محرکہ کی تعمیل کر رہا تھا، وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، کھڑکی کے باہر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، اور لامتناہی اندھیرے کی خاموشی، ابدی اور لامحدود پہنائیوں میں گھورتے ہوئے چلایا،

”شہنشاہ زندہ باد!“۔

اس لمحے سے پرے سب کچھ ختم ہو گیا؛ کارسیکا کا عفریت — بالجبر قبضہ کرنے والا، ظالم، وہ عفریت جو خود اپنی بہنوں کا عاشق تھا — اور اداکار جس نے Talma سے اداکاری سیکھی تھی — Jaffa کو زہر دینے والا — چیتا — بوناپارٹ — سب کچھ اس کے دماغ سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک ناقابلِ رسائی بلندی پر، سیزر کا زرد خیالی ہیولا تھا، ایک مبہم اور شان دار تابندگی تھی جو اپنی روشنی پھیلا رہی تھی۔ شہنشاہ اس کے باپ کے نزدیک بہت پیارا کپتان تھا جسے وہ پسند کرتا تھا، جو شہنشاہ کے لیے قربانیاں دیتا تھا؛ جو ماریوں کے لیے کوئی بڑی شے تھا۔ وہ فرانسیسی گروپ کا طے شدہ معمار تھا، جو کائنات کی حاکمیت میں رومن گروپ کی جگہ لے رہا تھا۔ وہ ایک نرالا معمار تھا، ایک تباہی کا [سلطنتِ روما کے پہلے شاہنشاہ] شارلیمین (Charlemagne) کے تسلسل کا، لوئی یازدہم کا، ہنری چہارم کا، Richelieu کا؛ لوئی چہاردہم کا، اور عوام کی حفاظتی کمیٹی کا؛

جس کی اپنی خرابیاں بھی تھیں، بلاشبہ غلطیاں بھی تھیں، بلکہ جرم بھی تھے مگر آدمی کی حیثیت میں؛ اپنی غلطیوں میں بھی وہ بلند پایہ تھا، اپنی خرابیوں میں بھی وہ شان دار تھا، اپنے جرم میں بھی وہ طاقت ور تھا۔

وہ ایک طے شدہ مقدر والا آدمی تھا، جس نے تمام قوموں کو اپنی قوم کے بارے میں کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ "یہ ایک عظیم قوم ہے۔" وہ تو اس سے بھی اچھا تھا؛ وہ فرانس کا اوتار تھا، جس نے یورپ کو تلوار سے فتح کیا تھا اور اس پر قبضہ کر لیا تھا، اور دنیا پر روشنی بن کر چھا گیا تھا۔ بوناپارٹ کی خاصیت میں ماریوس ایک تابندہ آسیب دیکھ رہا تھا جو ہمیشہ سرحد پر ابھرتا ہے، اور جو مستقبل کا تحفظ کرے گا۔ جابر حکمران مگر آمر؛ جابر حکمران جو ایک جمہوریہ کی پیداوار تھا اور انقلاب کا خلاصہ تھا۔ نپولین اس کے نزدیک آدمی کی صورت میں عوام بن گیا تھا، جس طرح یسوع مسیح آدمی کی صورت میں خدا ہے۔

لوگ سمجھیں گے کہ کسی مذہب میں نئے نئے داخل ہونے والوں کی طرح اس کی تبدیلی نے بھی اسے مدہوش کر دیا تھا؛ اس نے پیروی میں سر کے بل چھلانگ لگا دی تھی، اور وہ بہت آگے چلا گیا تھا۔ اس کی فطرت ہی ایسی بنائی گئی تھی؛ ایک بار وہ نیچے لے جانے والی ڈھلان پر آ گیا تھا تو اس کی رفتار کو کم کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ تلوار کے جنون نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، اور اس کے ذہن کو اس کے ولولے کو خیالات کے لیے پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے جوہرِ قابل اور بے ترتیبی میں طاقت کو شامل کر رہا تھا، یعنی وہ اپنی بت پرستی کے دو تجربوں میں، ایک طرف اسے قائم کر رہا تھا جو ربانی ہے، اور دوسری جانب اسے جو وحشی ہے۔ کئی معنوں میں، وہ خود کو دھوکا دینے پر چل پڑا تھا۔ وہ سب کچھ قبول کر رہا تھا۔ سچائی کی طرف چلتے ہوئے غلطی سے مقابلہ کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اس پر ایک متشدد قسم کی نیک نیتی سوار ہو گئی تھی جس نے سب کچھ ایک جگہ انبار کر دیا تھا۔ نئے راستے میں جس میں وہ داخل ہوا تھا، پرانی حکومت کی غلطیوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے، جس طرح اس نے نپولین کی شان و شوکت کا اندازہ لگایا تھا، اسی طرح اس نے تخفیف کرنے والے حالات سے غفلت برتی تھی۔

تمام واقعات میں، ایک غیر معمولی قدم اٹھایا گیا تھا۔ جہاں اس نے شاہی کا زوال دیکھا تھا، وہاں اب نئے فرانس کا ظہور دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمت بدل گئی تھی۔ جو اس کا مشرق تھا وہ مغرب بن گیا تھا۔ وہ بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ تمام انقلابات اس کے اندر ہی بنے تھے، اس کے خاندان والوں کو جن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

جب، اپنی پُراسرار محنت کے دوران، اس نے اپنی قدیم Bourbon کینچلی اتار

پھینکی؛ جب اس نے اپنے اندر کے مغرور انسان کو، جگیبیوں کو اور شاہ پرستوں کے اثرات سے نکال باہر کیا؛ اور جب وہ پوری طرح ایک انقلابی، بے حد جمہوری بن گیا، تو وہ Quai des Orfevres کے ایک قلم کار کے پاس گیا، اور اس نے سو عدد کارڈ بنانے کی فرمائش کی تھی جن پر اس کا نام اس طرح لکھا گیا تھا: Le Baron Marius Pontmercy۔

اس کی تبدیلی کا صرف یہی ایک منطقی نتیجہ تھا جو اس پر طاری ہوگیا تھا۔ ایسی تبدیلی جس میں ہر شے اس کے باپ کے اطراف گھومتی تھی۔ چوں کہ وہ کسی کو جانتا نہیں تھا اور اپنے کارڈ کسی باربردار کو پیش نہیں کرسکتا تھا، اس نے انھیں اپنی جیب میں ہی ڈال رکھا تھا۔

ایک اور فطری نتیجے کی صورت میں، جب وہ اپنے باپ سے قریب ہو رہا تھا، اس کی یادوں سے، اور ان چیزوں کے پانے میں جن کے لیے اس نے پچیس برس پہلے جنگ لڑی تھی وہ اپنے نانا سے دور ہوگیا تھا۔ ہم بہت پہلے بتا چکے ہیں کہ موسیو جلیر نورما کا غصہ اسے پسند نہیں تھا۔ ان کے درمیان، اس میں ایک سنجیدہ نوجوان کی تمام ناہمواریاں اور ایک بوڑھے آدمی کا کھلنڈرا پن موجود تھا۔ [مزاحیہ کردار] Geronte کی خوش دلی [گوئٹے کے ایک ناول کے غم انگیز کردار] ورتھر کی غم انگیزی کو ہلا دیتی ہے۔ جب تک ایک جیسے سیاسی خیالات اور ایک جیسے تصورات دونوں کے درمیان مشترک تھے، ماریوس اور موسیو جلیر نورما اس طرح ملتے رہے جیسے وہ کسی پُل پر مل رہے ہوں۔ جب وہ پُل گر گیا تو دونوں کے درمیان ایک پاتال پیدا ہوگئی تھی اور ان سب کے علاوہ، ماریوس بھی بغاوت کے ناقابلِ بیان تجربات سے گزر رہا تھا، جس میں اس نے سوچا کہ وہ موسیو جلیر نورما ہی تھا جس نے اپنے احمقانہ مقاصد کے پیشِ نظر ظالمانہ انداز میں اس کو کرنل سے جدا کردیا تھا؛ اس طرح ایک باپ کو اس کے بیٹے کی، اور بیٹے کو باپ کی رفاقت سے محروم کردیا تھا۔

اپنے باپ پر ترس کھانے کے باعث ماریوس تقریباً اپنے نانا سے نفرت کی سطح پر آگیا تھا۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، بیرون سے کسی طرح کی بے وفائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف سرد سے سرد ترین ہوتا جا رہا تھا؛ کھانے کے دوران کوتاہ، اور گھر میں شاذ۔ اس بات پر جب اس کا ماموں اس کی سرزنش کرتا تب بھی وہ مہذب ہوتا اور اپنی تعلیم، اپنے لیکچر، اپنے امتحانات کا بہانہ کردیتا تھا۔ اس کا نانا اپنی معصومانہ تشخیص ”یہ محبت [کے باعث] ہے، میں اس کے بارے میں سب جانتا ہوں“ سے کبھی ہٹا نہیں۔

وقتاً فوقتاً ماریوس غائب بھی ہو جایا کرتا تھا۔

اس کا ماموں کہتا، ”وہ کون سی جگہ ہے جہاں جا کر یہ غائب ہو جاتا ہے؟“

ایسے ہی موقعوں پر، جو بہت مختصر ہوتے تھے، وہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرنے Montfermeil گیا اور واٹر لو کے سارجنٹ، سرائے کے مالک، تبن آردیے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ تبن آردیے ناکام ہو چکا تھا، سرائے بند ہو چکی تھی؛ وہ کہاں چلا گیا تھا، کسی کو علم نہیں تھا۔ اس تلاش کے سلسلے میں وہ چار دن گھر سے باہر رہا تھا۔

نانا کہتا تھا، "یہ یقینی طور پر وحشی ہوتا جا رہا ہے۔"

اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے سینے پر، قمیص کے نیچے، کوئی شے پہنتا ہے، جو ایک سیاہ ربن کے ذریعے اس کی گردن سے لٹکی ہوتی ہے۔

کوئی سایا، کوئی لہنگا ہوگا

ہم ایک نیزے باز کا ذکر کر چکے ہیں۔

وہ باپ کی جانب سے موسیو بلیر نورما کا پڑپوتا تھا، جو، خاندان سے دور اور الگ رہ کر، گیریزن کی زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ لفٹنٹ تھیوڈول بلیر نورما میں ایک نفیس افسر بننے کے تمام لوازم موجود تھے۔ اس کی ''عورتوں جیسی کمر'' تھی۔ فاتحانہ انداز میں چلتا تو اس کی تلوار زمین پر خط دیتی جاتی، اور وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا جاتا تھا۔ پیرس کم ہی جاتا تھا، اس قدر کم کہ ماریوس نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ دونوں عم زاد ایک دوسرے کو صرف نام سے جانتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم بتا چکے ہیں کہ لفٹنٹ تھیوڈول اپنے عم بلیر نورما کا پسندیدہ تھا، جو اسے اس لیے زیادہ پسند کرتا تھا کہ اسے دیکھا نہیں تھا۔ لوگوں کو نہ دیکھنے میں اس بات کا موقع ہوتا ہے کہ ان سے ہر طرح کی ممکنہ خوبیاں منسوب کر دی جائیں۔

ایک صبح بڑی میڈموزیل بلیر نورما اپنے فلیٹ پر اتنی پریشان واپس ہوئی جتنی کہ اس کی ہمت اجازت دیتی تھی۔ ماریوس نے ذرا دیر پہلے اپنا نانا سے اجازت چاہی تھی، کہ اسے اسی شام کہیں جانا تھا، ''چلے جاؤ'' نانا کا جواب تھا، اور موسیو بلیر نورما نے اپنی بھنویں سکیڑتے ہوئے اس میں اضافہ کیا تھا، ''تو، آج پھر یہ کہیں رات بسر کرنے والا ہے۔'' میڈموزیل بلیر نورما حیران پریشان اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہہ رہی تھی، ''بہت ہو گیا'' اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ سے جرح بھی کرتی جا رہی تھی، ''مگر، یہ جاتا کہاں ہے؟'' اس نے تاڑ لیا تھا کہ 'یہ دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں'، جو کم و بیش ناجائز ہے! اس سایے میں کوئی عورت ہے؛ ملاقات کا کوئی مقام ہے؛ کوئی راز ضرور ہے؛ اور اس معاملے میں اسے اپنی [تجسس کی] عینک سے کام لینے پر ذرا بھی افسوس

نہ ہوتا۔ کسی راز کا مزہ پا جانا کسی معاشقے کی خوش بو پا جانے کے برابر ہوتا ہے، پارسا نفوس اس کو برداشت کر لیتے ہیں۔ تعصب کے خفیہ حجروں میں اس معاشقے کے بارے میں کچھ تجسس ضرور تھے۔ لہٰذا وہ تاریخ سے سیکھنے کی بے مقصد بھوک کا شکار ہو گئی تھی۔

اس تجسس سے اپنا پیچھا چھڑانے کی خاطر جو معمول سے بڑھ کر اسے مشتعل کر رہا تھا، اس نے اپنی صلاحیتوں میں پناہ لینے کی ٹھانی اور روئی کی ایک تہہ کے بعد دوسری تہہ جمانے، اور سلطنت اور فرانس کی بحالی سے متعلق ان کشیدہ کاریوں سے آرائش و زیبائش کا شغل شروع کر دیا جن میں گاڑی کے بہت سے پہیے بنے ہوتے ہیں۔ کام بہت بے ڈھنگا تھا، اور کرنے والی اناڑی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے اس کام میں جتی ہوئی تھی، کہ دروازہ کھلا۔ میڈموزیل بلیر نورما نے اپنی ناک بلند کر کے دیکھا۔ اس کے سامنے لفٹنٹ تھیوڈول کھڑا اسے قانونی سیلوٹ کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ کوئی بوڑھی عورت ہو، بناؤ سنگھار والی ہو، پھوپھی بھی ہو سکتی ہے، مگر اپنے کمرے میں ایک نیزہ باز کو داخل ہوتے دیکھنا اسے ہمیشہ قابل قبول ہوتا ہے۔

"ارے یہ تم ہو تھیوڈول!" اس نے اچنبھے سے کہا۔

"پھوپھی جان! میں شہر سے گزر رہا تھا۔"

"مجھے گلے سے لگا لو۔"

"یہ لیجیے!" تھیوڈول نے کہا، اور اس نے پھوپھی کا بوسہ لیا۔ پھوپھی بلیر نورما جا کر لکھنے والی اپنی میز پر بیٹھ گئی اور کتاب کھول لی۔

"تم ہمارے ساتھ کم از کم ایک ہفتہ تو رہو گے، نا!"

"میں اسی شام واپس چلا جاؤں گا، پھوپھی جان!"

"یہ ناممکن ہے!"

"از روئے ریاضی!"

"ٹھہر جاؤ میرے پیارے تھیوڈول، میں تم سے التجا کرتی ہوں۔"

"میرا دل تو کہہ رہا ہے 'ہاں' مگر میرا فرض کہتا ہے 'نہیں'۔ معاملہ بالکل سادہ ہے۔ وہ لوگ ہمارا گیریزن بدل رہے ہیں؛ ہم Melun میں رہے ہیں، ہمارا Gaillon تبادلہ کیا جا رہا ہے۔ پرانی جگہ سے نئی جگہ جانے کے لیے پیرس سے گزرنا ضروری تھا۔ میں نے ان سے کہا— میں اپنی پھوپھی سے ملنے ضرور جاؤں گا۔"

"تمھاری اس تکلیف کے لیے یہ کم ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے بھتیجے کے ہاتھ پر بن سو رکھ دیے۔

"میری خوشی کے لیے! آپ کہنا چاہ رہی ہیں نا، میری پیاری پھوپھی جان!"

تھیوڈول نے ایک بار پھر پھوپھی کا بوسہ لیا، اور پھوپھی کو فوجی کی وردی پر کڑھی ہوئی نشانوں کی رگڑ سے اپنے گردن کی جلد پر ہونے والے احساس کے لطف کا تجربہ ہوا۔

"کیا تم اپنی رجمنٹ کے ساتھ گھوڑے پر سفر کر رہے ہو؟" اس نے تھیوڈول سے سوال کیا۔

"جی نہیں، پھوپھی جان! مجھے خصوصی اجازت دی گئی ہے۔ میرا خادم میرا گھوڑا لے جا رہا ہے؛ میں اپنی ضرورت پر سفر کر رہا ہوں۔ ارے ہاں، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔"

"کیا— ضرور پوچھو۔"

"کیا میرا عم زاد ماریوس پوں مرسی بھی کہیں جا رہا ہے؟"

"تمھیں کیسے پتا چلا؟" پھوپھی نے کہا، اور اس میں اچانک تجسس کی لہر دوڑ گئی۔

"یہاں پہنچ کر میں عوامی کوچ کے کوپے میں اپنی نشست محفوظ کرانے گیا تھا۔"

"تو؟"

"ایک مسافر، عوامی کوچ کے امپیریل میں اپنی نشست محفوظ کرانے آیا تھا۔ میں نے اس کا نام کارڈ پر دیکھا تھا۔"

"کیا نام تھا؟"

"ماریوس پوں مرسی"

"وہ بدمعاش!" اس کی پھوپھی نے غصے سے کہا۔ "اوہ! تمھارا عم زاد تم جیسا مستعد آدمی نہیں۔ سوچو تو، وہ عوامی کوچ ہی میں رات گزارے گا۔"

"بالکل میری ہی طرح۔"

"مگر تم تو اپنا فرض ادا کرنے جا رہے ہو؛ اس کا معاملہ بدمعاشی کا ہے۔"

"احمق!" تھیوڈول نے کہا۔

اس موقعے پر بڑی میدموزیل ژیلنورما کو کچھ خیال گزرا۔ اگر وہ مرد ہوتی تو اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا ہوتا۔ اس نے خطیبانہ انداز میں تھیوڈول سے کہا:

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارا عم زاد تم سے واقف ہے؟"

"جی نہیں، میں نے اسے دیکھا ہے؛ مگر اس نے میری طرف توجہ بھی نہیں کی۔"

''یعنی تم دونوں ایک ساتھ سفر کرو گے؟''

''وہ امپیریل میں ہوگا، اور میں کوپے میں''

''یہ کوچ جاتی کہاں ہے؟''

''Andelys تک۔''

''تو ماریوس بھی وہیں جا رہا ہے۔''

ورنہ، شاید میری طرح وہ بھی کہیں راستے ہی میں اُتر جائے۔ میں تو Vemon میں اتروں گا، تا کہ وہاں سے Gaillon جانے والی کوچ میں چلا جاؤں۔ مجھے ماریوس کے سفر کا کچھ علم نہیں۔''

''ماریوس! کتنا بھدا نام ہے۔ نجانے انھوں نے اس کا نام ماریوس کیوں رکھا تھا؟ جب کہ تم کو کم از کم، تھیوڈول کے نام سے پکارا جاتا ہے۔''

''میں الفریڈ کہلانا زیادہ پسند کروں گا۔'' اس افسر نے کہا۔

''سنو، تھیوڈول!''

''جی! پھوپھی جان۔''

''توجہ دو۔''

''میں متوجہ ہوں۔''

تم کچھ سمجھے بھی؟''

''جی ہاں۔''

''ماریوس غائب ہو جاتا ہے۔''

''اوہ، اوہ!''

''وہ سفر بھی کرتا ہے۔''

''آہ، آہ!''

''رات باہر گزارتا ہے۔''

''اوہو، اوہو!''

''ہم جاننا چاہیں گے کہ اس سب کے پیچھے کیا ہے؟''

تھیوڈول نے کانسی سے بنے آدمی کی جیسی دل جمعی سے جواب دیا، ''کوئی لہنگا، کوئی سایا ہوگا!'' اور پھر ایک اندرونی ہنسی سے، جو یقین کی نشانی ہوتی ہے، اس نے مزید کہا، ''کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں!''

''ظاہر ہے۔'' پھوپھی نے کہا جسے ایسا لگا گویا اس نے موسیو بلیر نورما کو کچھ کہتے سنا تھا۔ اور لفظ fillette [چھوٹی سی بچی] سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس لفظ کو تیز آواز میں اسی طرح ادا کیا گیا تھا جیسے کوئی نانا یا دادا اپنی نواسی یا پوتی سے مخاطب ہوتا ہے۔ میڈموزیل نے مزید کہا، ''مہربانی کرو۔ ذرا ماریوں کا پیچھا تو کرو۔ وہ تم سے واقف نہیں، تو یہ کام آسان ہو گا۔ چوں کہ یہ کسی معشوق کا معاملہ ہے، اس کو دیکھنے کی کوشش بھی کرو۔ ہمیں لکھنا ضرور۔ تمھارے دادا بہت محظوظ ہوں گے۔''

تھیوڈول کو اس قسم کی جاسوسی میں چنداں دل چسپی نہیں تھی؛ پھر بھی اسے دس سو ملنا بہت اچھا لگا تھا، اور اس نے سوچا کہ اس قصے کے انجام کے بہت امکانات ہیں۔ اس نے حکم قبول کر لیا اور کہا، ''جیسا آپ کہیں، پھوپھی جان!''

اور اس نے منہ ہی منہ میں کہا، ''بہت اچھا، استانی جی۔''

میڈموزیل بلیر نورما نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''تم شوخیاں کرنے والے آدمی تو نہیں، تھیوڈول۔ تم نظم و ضبط کی پابندی کرتے ہو، تم احکام کے غلام ہو، تم فرض اور احتیاط کے آدمی ہو، اور تم نہیں چاہو گے کہ تمھارے خاندان والے خود ایسی مخلوق کو دیکھنے کے لیے باہر نکلیں۔''

نیزے باز نے اپنی دیانت داری کی تعریف سن کر بناوٹی تبسم کیا۔

شام کو ماریوں عوامی کوچ میں سوار ہو گیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی جاسوسی کی جا رہی ہے۔ اس پر نگاہ رکھنے والے نے پہلا کام تو یہ کیا کہ وہ سو گیا۔ اس کی نیند گہری تھی، اور سچی تھی۔ وہ پوری رات خراٹے لیتا رہا۔

صبح ہوتے ہی کنڈکٹر نے آواز لگائی، ''!Vernon—Vernon چوکی— Vernon کے مسافر!'' اور لفٹنٹ تھیوڈول جاگ اٹھا۔

''اچھا'' اس نے نیم خوابیدہ عالم میں غرا کر کہا، ''یہیں مجھے اترنا ہے۔''

تب، جب اس کی یادداشت پوری طرح عود کر آئی، نیند کا غلبہ ختم ہو گیا تو اسے اپنی پھوپھی یاد آئی اور وہ دس سو بھی یاد آئے، اور وہ کام بھی یاد آ گیا جس کے ذریعے وہ ماریوں کی حرکات کی تفصیل بیان کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ یہ تمام باتیں سوچ کر وہ ہنس پڑا۔

''شاید وہ اس کوچ میں نہیں۔'' وہ سوچنے لگا، اور وہ اپنی اتاری ہوئی وردی پہن کر بٹن دوبارہ بند کر رہا تھا۔ ''وہ Poissy پر ہی اتر گیا ہوگا؛ یا Triel میں اتر گیا ہوگا؛ اگر وہ Meulan

میں نہیں اترا تو Mantes میں اتر گیا ہوگا؛ بہ شرطے کہ وہ Rolleboise میں نہ اترا ہو، یا پھر وہ Pacy تک آیا ہی نہیں ہوگا، جہاں سے Evreus پہنچ کر بائیں یا Laroche-Guyon سے دائیں مڑا جاسکتا تھا۔ پھوپھی جان، کیا میں اس کے پیچھے ڈوبتا رہوں۔ میں بھی کتنا احمق آدمی ہوں، اب میں اپنی بوڑھی پھوپھی کو کیا لکھوں گا؟"

عین اسی وقت امپیریل سے اترنے والا سیاہ رنگ کا پتلون کوپے کی کھڑکی سے نظر آیا۔

"کیا یہ ماریوس ہوسکتا ہے؟" لفٹنٹ نے خود سے کہا۔

وہ ماریوس ہی تھا۔

گھوڑوں اور کوچوانوں کے درمیان، کوپے کے آخر میں ایک چھوٹی سی دیہاتی لڑکی مسافروں کو پھول پیش کر رہی تھی، "اپنی خواتین کے لیے پھول لے جائیے! وہ چلا کر کہہ رہی تھی"۔

ماریوس اس کے قریب گیا اور بہترین قسم کے پھول خرید کر اپنی چوکور جھابی میں رکھ لیے۔

"چلو میاں!" تھیوڈول نے کوپے سے کودتے ہوئے کہا "اس نے میرے تجسس کو متحرک کردیا ہے۔ کون ہے وہ دوغلی چھنال، جس کے لیے یہ پھول خریدے جارہے ہیں؟ ضرور وہ بہت خوب صورت عورت ہوگی۔ جس کے لیے اتنا نفیس گل دستہ لیا گیا ہے۔ اب تو میں اس کو ضرور دیکھوں گا۔"

اب، حکم بجالانے کے لیے نہیں محض اپنے ذاتی تجسس کی بنیاد پر— کتوں کی طرح، جو اپنے لیے شکار کرتے ہیں— وہ ماریوس کے پیچھے چل پڑا۔

ماریوس نے تھیوڈول پر کوئی توجہ نہیں دی۔ عوامی کوچ سے خوب صورت عورتیں بھی اتریں، مگر اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا گویا اسے اپنے اطراف کی کوئی خبر نہیں تھی۔

"اسے واقعی بہت محبت ہوگئی ہے" تھیوڈول سوچ رہا تھا۔

"زبردست!" تھیوڈول نے خود سے کہا "وہ ملاقات جس میں تھوڑی سی مجمعے کی ملاوٹ ہو، بہترین ملاقات ہوتی ہے۔ اس نگاہِ شوق سے لطیف کوئی شے نہیں ہوتی جو [معاذ اللہ] اچھے خدا کے بھی سر سے گزر جاتی ہے۔"

ماریوس نے اپنے قدم گرجا گھر کی طرف بڑھائے۔

گرجا گھر پہنچ کر ماریوس اس میں داخل نہیں ہوا مگر اس کے اطراف گھوما اور پھر ایک زاویے کے پیچھے غائب ہوگیا۔

"ملاقات باہر طے ہوئی ہے۔" تھیوڈول نے خود سے کہا "ذرا اس معشوق کو دیکھا تو جائے۔"
اور اس نے اپنے جوتے کی نوکیں اسی کونے کی طرف کیں جہاں سے ماریوس مڑا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی تھیوڈول حیرانی کے عالم میں رُک گیا۔

ماریوس، اپنا سر تھامے کسی قبر کی گھاس پر گھٹنوں کے بل کھڑا تھا۔ اس نے اپنا گل دستہ وہاں بکھیر دیا تھا۔ قبر کی ایک جانب ایک چھوٹا سا ابھار تھا جو سرھانے کی نشانی تھا، جہاں سیاہ چوبی صلیب گڑی تھی جس پر "کرنل بیرن پوں مرسی" کندہ تھا۔ ماریوس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

"معشوق" دراصل ایک قبر تھی۔

✧

سنگِ مرمر بہ مقابلہ سنگِ خارا

یہی وہ جگہ ہے جہاں ماریوں پہلی بار پیرس سے غائب ہو کر آیا تھا۔یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ ہر بار آتا تھا جس کے بارے میں موسیو بیلر نورما کہتا تھا، "وہ گھر سے باہر ہونے جاتا ہے"۔

لفٹنٹ تھیوڈول کے ایک قبر سے غیر متوقع مقابلے نے اس کو حواس باختہ کر دیا تھا؛ اسے ایسا غیر معمولی تجربہ ہوا اور ایسی نا موافق سنسنی پیدا ہوئی تھی، وہ جس کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا، جس میں ایک قبر کا احترام بھی تھا اور [نا آشنائی] کرنل کا بھی۔ماریوں کو قبرستان میں تنہا چھوڑ کر وہ الٹے پاؤں واپس ہوا، اور اس واپسی میں ایک قسم کی تہذیب بھی تھی۔موت اس کو بڑے بڑے جھبے پہنے نظر آئی تھی، اور اس نے تقریباً کرنل کو سیلوٹ بھی کر دیا تھا۔وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ پھوپھی کو کیا لکھے؛ اس نے بالکل کچھ نہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا؛ تھیوڈول کی دریافت کے نتیجے میں ماریوں کے معاشقوں پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں تھا، اگر ان خفیہ انتظامات میں، جن میں اتفاقات ہو جاتے، پیرس میں کوئی اور واقعہ نہیں ہو جاتا۔

ماریوں Vernon سے تیسرے دن سویرے واپس لوٹا اور اپنے نانا کے دروازے پر وارد ہوا؛ عوامی کوچ میں دو رات کے سفر کی تھکاوٹ کا مارا، جسے بے چین نیند کو پورا کرنے کے لیے کم از کم ایک گھنٹا حوض میں گزارنا تھا، سیدھے اپنے کمرے میں گیا، جلدی سے اپنا سفری کوٹ اور سیاہ ربن جو اپنے گلے میں پہنے ہوئے تھا، اتار پھینکا اور حوض میں کود گیا۔

موسیو بیلر نورما نے، جو تمام صحت مند بوڑھوں کی طرح سویرے ہی بستر چھوڑ دیتا تھا، ماریوں کے داخلے کی آواز سنتے ہی، جتنی جلدی اس کے پاؤں اجازت دے سکتے تھے، سیڑھیاں چڑھتا، اسے گلے لگانے اور بہت سارے سوالات پوچھنے اس کمرے تک پہنچا جس میں ماریوں

رہتا تھا، تا کہ وہ معلوم کر سکے کہ ماریوں کہاں گیا تھا۔

مگر نوجوان ماریوں کو، نیچے اترنے میں بوڑھے آدمی کے سیڑھیاں چڑھنے کے مقابلے میں، کم وقت لگا تھا؛ اور جب فادر بلیر نورما دو چھتی میں داخل ہوا تو ماریوں وہاں موجود نہیں تھا۔

بستر جوں کا توں تھا، اور اس پر وہ عظیم سنہری کوٹ اور ایک سیاہ رنگ کا ربن آرام فرما تھا۔

''مجھے یہ زیادہ پسند ہے۔'' موسیو بلیر نورما نے فرمایا۔

اور ایک لمحے بعد وہ سیلون میں داخل ہوا جہاں میڈموزیل بلیر نورما پہلے سے تشریف فرما تھیں، اور گاڑی کے پہیوں کی کشیدہ کاری میں مصروف تھیں۔

داخلہ فاتحانہ انداز میں ہوا تھا۔

موسیو بلیر نورما ایک ہاتھ میں وہ عظیم کوٹ سنبھالے تھا، اور دوسرے ہاتھ میں سیاہ ربن، اور کہا، ''فتح ہو گئی ہے! ہم راز کھولنے والے ہیں۔ ہم جلد ہی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے واقف ہو جائیں گے؛ ہم اپنے عیار دوست کی عیاشیوں کا پردہ چاک کرنے والے ہیں۔ لیجیے خود رومانس بھی یہاں موجود ہے۔ ہمارے پاس اس کی شبیہ بھی موجود ہے۔''

دراصل، کالے رنگ کی ایک کھردری سی ڈبیا سیاہ ربن سے بندھی لٹکی ہوئی تھی۔

بڑے میاں نے یہ ڈبیا اپنے ہاتھ میں لی اور خوشی کے جذبات، سرمستی اور غضب کے ساتھ — جیسے ایک مفلس اور گرسنہ دوست انواع و اقسام کے چُنے ہوئے کھانوں کو دیکھ کر کرتا ہے جو اس کے کھانے کے لیے نہیں ہوتے صرف اس کی ناک کے قریب سے گزارے جاتے ہیں — ڈبیا کو کھولے بغیر کچھ دیر اس گھورتے رہے۔

''بظاہر یہ ایک شبیہ ہے۔ میں ایسی چیزوں کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ یہ چیز بڑے پیار سے دل کے قریب لٹکائی جاتی ہیں۔ کتنے احمق ہیں یہ لوگ! کچھ خوف ہے جو غالباً ہم میں تھرتھری پیدا کر دے گا۔ آج کل کے نوجوانوں کا ذوق بھی کتنا خراب ہو گیا ہے۔''

''بابا، ذرا ہمیں بھی دیکھنے دیجیے۔'' بوڑھی کنواری نے کہا۔

زور ڈالنے پر اسپرنگ سے ڈبیا کھل گئی۔ اس میں کچھ نہیں تھا سوائے احتیاط سے تہہ کیے ہوئے کاغذ کے ایک ٹکڑے کے۔

''اس کی جانب سے — اس کے لیے۔'' موسیو بلیر نورما نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا، ''میں جانتا ہوں، یہ کیا چیز ہے — یہ محبت کا پروانہ ہے۔''

''واہ! تو آیئے ہم اسے پڑھتے ہیں۔'' پھوپھی نے کہا۔

اور اس نے اپنی عینک سنبھال لی۔ انھوں نے کاغذ کی تہہ کھولی اور مندرجہ ذیل تحریر پڑھنی شروع کی:

"اپنے بیٹے کے نام:

شہنشاہ نے میدانِ جنگ میں مجھے بیرن کا خطاب عطا کیا تھا۔ حالاں کہ بحالیات والے میرے اس حق پر معترض ہیں، جسے میں نے اپنے خون سے خریدا تھا، میرا بیٹا اسے ضرور اختیار کرے گا۔ وہ اس کا حق دار ہوگا۔"

اس وقت باپ اور بیٹی پر طاری احساسات کی ترجمانی نہیں کی جا سکتی۔ ان پر موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ انھوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

صرف موسیو ہلیر نورما نے بہت دھیمی آواز میں کہا جیسے وہ خود کلامی کر رہا ہو،

"یہ اسی کاٹنے والے کے ہاتھ کی تحریر ہے۔"

پھوپھی نے بھی کاغذ کا معائنہ کیا، اُلٹ پلٹ کر دیکھا، پھر اسی ڈبیا میں واپس رکھ دیا۔

عین اسی وقت، نیلے رنگ کے کاغذ سے بنی بیضوی شکل کا ایک چھوٹا سا پیکٹ اس بڑے سے کوٹ کی جیب سے گر پڑا۔ میڈموزیل ہلیر نورما نے اس کو اٹھایا اور نیلے کاغذ کو کھولا۔

اس میں سو عدد کارڈ تھے۔ اس نے موسیو ہلیر نورما کے لیے کارڈ پر لکھی عبارت پڑھی:

"بیرن ماریوس پونٹ مرسی"

بڑے میاں نے گھنٹی بجائی۔ نکولے آئی۔ موسیو ہلیر نورما نے ربن، ڈبیا اور کوٹ اُٹھایا اور کمرے کے درمیان فرش پر پھینک دیا، اور کہا، "لے جاؤ، یہ سب خرافات یہاں سے۔"

گہری خاموشی میں ایک گھنٹا گزر گیا۔ بڑے میاں اور بوڑھی کنواری، دونوں ایک دوسرے کی جانب پشت کیے بیٹھے، اپنے حساب سے، انھی چیزوں کی بابت اور تمام امکانات کے بارے میں سوچتے رہے۔

ایک گھنٹا گزر جانے کے بعد پھوپھی ہلیر نورما نے کہا، "بہت خوب!"

چند لمحوں بعد ماریوس ظاہر ہوا۔ وہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ابھی اس نے ڈیوڑھی پار ہی کی تھی کہ اسے اپنے نانا کے ہاتھ میں اس کا ایک کارڈ نظر آیا، جسے دیکھتے ہی، نانا نے نہایت بورژوائی انداز اور تبسم خیز دنداں شکن برتری کے ساتھ کہا:

"واہ وا—— واہ وا—— واہ——! اچھا تو آپ اب بیرن ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

ماریوس کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا۔ اس نے جواب میں کہا:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔"

موسیو ہیلر نورما کا تبسم رُک گیا، اور اس نے سختی سے کہا "تمھارا باپ میں ہوں۔"

"میرا باپ" ماریوس نے جھکی آنکھوں اور سخت انداز میں پلٹ کر جواب دیا، "ایک فروتن اور بہادر آدمی تھا؛ جس نے شان دار طریقے سے جمہوریہ اور فرانس کی خدمت کی تھی؛ جو عظیم ترین تاریخ کا پیدا کردہ عظیم شخص تھا؛ جس نے ایک ربع صدی آسمان تلے اپنی زندگی گزاری تھی، گریپ شاٹ اور گولیوں کی بارش میں، دن میں برف اور کیچڑ میں، رات میں بارانِ ابر میں؛ جس نے دو پرچم چھینے تھے؛ جس نے بیس زخم کھائے تھے؛ جو فراموش کردہ اور بے کس حالات میں مرا تھا؛ اور جس نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی تھی سوائے ایک غلطی کے جو یہ تھی کہ اس نے ٹوٹ کر محبت کی تھی، اپنے ملک سے اور مجھ سے۔"

موسیو ہیلر نورما کے لیے یہ سب سننا اور برداشت کرنا مشکل تھا۔ جمہوریہ کا نام سنتے ہی وہ کھڑا ہو گیا، بلکہ صحیح معنوں میں کہا جائے تو، وہ اچھل پڑا تھا۔ ہر لفظ نے، جو ماریوس نے ابھی ادا کیا تھا، اس پرانے شاہ پرست کے چہرے پر ویسا ہی اثر کیا تھا جیسے کسی جلتی ہوئی شے پر پھونک ماردی جائے۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلکے گلابی سے بڑھ کر سُرخ ہو گیا، سُرخ سے ارغوانی اور ارغوانی سے شعلے کے رنگ کا ہو گیا۔

"ماریوس!" اس نے چیختے ہوئے کہا "قابلِ نفرت بچے! میں نہیں جانتا کہ تیرا باپ کیا تھا۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، نہ جاننا چاہتا ہوں، مگر جو میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس گروہ کے درمیان سوائے غنڈے کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سب بدمعاش، قاتل، سرخ ٹوپی والے اور چور تھے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ سب۔ اور سب۔ ایسے ہی تھے۔ میں کسی اور کو نہیں، انھیں کو کہہ رہا ہوں، کہ وہ سب ایسے ہی تھے، سنا تم نے۔ ماریوس! اور یہ بھی سن لو کہ تمھارا بیرن کا خطاب میری جوتی کے تلے سے بھی کم تر ہے۔ Robespierre کے سارے ساتھی ڈاکو تھے۔ وہ سب جنھوں نے بوناپارٹ کا ساتھ دیا تھا، لٹیرے تھے۔ وہ سب غدار تھے جنھوں نے دغا کی، دغا کی تھی، دغا کی تھی، اپنے حقیقی اور جائز بادشاہ سے۔ وہ سارے بزدل تھے، جو واٹرلو میں، اور پروشیائیوں کے مقابلے سے بھاگ گئے تھے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمھارے باپ اس زمرے میں آتے ہیں یا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں! مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔"

اپنی باری آنے پر، ماریوس شعلۂ جوالہ تھا اور موسیو ژیلنورما کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ ماریوس کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے؛ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا ہوگا؛ اس کے دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کی مثال اس پادری کی تھی جو اپنے تمام تبرکات ہوا میں اڑتے دیکھ رہا ہو؛ اس فقیر کی طرح جو ایک راہ گیر کو اپنے صنم پر تھوکتے دیکھ رہا ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا! ایسی باتیں اس کے سامنے کہی گئی تھیں۔ اسے کیا کرنا تھا؟ اس کے باپ کو اس کی موجودگی میں پاؤں تلے روند دیا گیا تھا، مگر کس نے روندا تھا؟ اس کے نانا نے روندا تھا۔ وہ ایک چیز کا بدلہ دوسری چیز سے زبردستی کیے بغیر کیسے لے سکتا تھا؟ مگر اس کے لیے اپنے نانا کی توہین کرنا ممکن نہیں تھا، اور یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ اپنے باپ کا بدلہ نہ لے۔ ایک جانب ایک متبرک قبر تھی، دوسری جانب سفید بالوں کے گچھے تھے۔

وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا، اس طرح لرزاں، جیسے نشے میں ہو۔ یہ سارے گولے اس کے سر کو پاش پاش کیے دے رہے تھے؛ پھر اس نے اپنی آنکھیں بلند کیں، اپنے نانا کی طرف غور سے دیکھا اور گرج دار آواز میں چیخا، "Bourbon والے، اور لوئی ہشت دہم مردہ باد!"

لوئی ہشت دہم عرصہ ہوئے مر چکا تھا؛ مگر اس کے لیے آج بھی ویسا ہی تھا۔

بڑے میاں، جو قرمزی تھے، اپنے سفید بالوں سے زیادہ سفید ہو گئے۔ وہ موسیو ڈیوک de Berry کے نصف مجسمے کے سامنے سے گزرے، جو چمنی کے قریب رکھا ہوا تھا، اور ایک مخصوص قسم کی جلالت کے ساتھ اس کے سامنے سر خم کر دیا۔ اس کے بعد وہ آہستگی اور خاموشی سے، روشن دان سے کھڑکی کی طرف، اور کھڑکی سے روشن دان کی طرف، پورے کمرے میں چلنے لگا؛ اس وقت وہ پتھر کے چلتے ہوئے مجسمے کی طرح تھا؛ اس کے قدموں تلے چوبی پالش شدہ فرش چڑ چڑا رہا تھا۔

دوسری بار وہ اپنی بیٹی کی طرف جھکا، جو کسی معصوم میمنے جیسی حماقت کے انداز میں سب کچھ دیکھ رہی تھی، اور بالکل خاموش مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "اس قسم کے بیرن صاحب اور میرا جیسا بورژوا، اکٹھے ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔"

اور اچانک اپنے چھکے، لرزتے آپے کو سنبھالتے ہوئے، جب کہ اس کی بھنویں غضب کی دمک سے زیادہ اونچی ہو گئی تھیں، اس نے اپنا ہاتھ ماریوس کی طرف بڑھایا اور چیخ کر کہا:

"دور ہو جاؤ یہاں سے!"

ماریوس گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

اگلے دن، موسیو ژیلنورما نے اپنی بیٹی سے کہا، "تم ہر چھ ماہ بعد اس خون خوار کو ساتھ

pistoles[ہسپانوی طلائی سکے] بھیجو گی، اور میرے سامنے اس کا کبھی نام نہیں لوگی۔"

اتنی ساری پریشانیوں سے نکلنے کی کوشش میں، جب کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا، وہ اپنی بیٹی کو اگلے تین ماہ تک "آپ" سے مخاطب کرنے کے بجائے "تم" کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔

ماریوں کا یہ حال تھا کہ اس کی جانب طیش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال تھی جس نے، اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اس کی برہمی میں سنگینی پیدا کر دی تھی۔ طرح طرح کی ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں جو گھریلو معاملات میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ رنجشوں کو بڑھاتی بھی ہیں، حالاں کہ حقیقت میں یہ نا انصافیاں ان کی بڑھائی ہوئی نہیں ہوتیں۔ ماریوں کی "خرافات" کو نانا کے حکم پر اس کے کمرے میں لے جاتے ہوئے نکولے نے، غالباً غفلت سے زینوں پر، جہاں اندھیرا تھا، اس تمغے جیسی سیاہ ڈبیا کو گر جانے دیا تھا جس میں کرنل کے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ بند تھا۔ بعد میں نہ وہ کاغذ پایا گیا اور نہ وہ ڈبیا۔ ماریوں کو یقین تھا کہ موسیو ژیلنورمانے۔۔۔ اس دن کے بعد سے ماریوں نے اپنے نانا کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔۔۔ اس کے والد کی وصیت کو آگ میں پھینک دیا تھا۔ اسے وہ چند سطریں یاد تھیں، جو کرنل نے لکھی تھیں، لہذا کچھ کھویا نہیں تھا، مگر وہ کاغذ، اور وہ تحریر، وہ متبرک یادگار ہی اس کا دل تھی۔ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا؟

بغیر بتائے کہ وہ کہاں جا رہا ہے، ایک دستی تھیلے میں، تیس فرانک، اپنی گھڑی اور چند کپڑے لیے اور ماریوں وہاں سے چلا گیا۔ اس نے گھنٹے کے حساب سے ایک کرایے کی سواری لے لی، اور گاڑی بان کو راستہ بتاتا ہوا لاطینی علاقے کی طرف چل پڑا۔

ماریوں کا کیا حال ہوا؟

❋

گروہ جو تاریخی حیثیت نہ پا سکا

اس زمانے میں، جو ہر طرح سے مختلف تھا، ایک خاص قسم کا انقلابی لرزہ عام تھا۔ 89 اور '93 میں شروع ہونے والی سانسیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ قاری ہمیں اس لفظ کے استعمال پر معاف فرمائے— کہ نوجوان نسل اپنی کینچلی سے نکلنے کی منزل پر تھی۔ انھیں اس کا بالکل احساس نہیں تھا مگر عمر کے ساتھ ساتھ لوگوں میں تبدیلیِ ہیئت ہو رہی تھی۔ وہ سوئی جو قطب نما میں گھومتی ہے، نفسوں میں بھی گھومتی رہتی ہے۔ ہر شخص کو جو قدم اٹھانا پڑتا تھا وہ قبل از وقت اٹھا رہا تھا۔ شاہ پرست روشن خیال ہوتے جا رہے تھے، اور روشن خیال جمہوری ہو رہے تھے۔ یہ ایک سیلابی لہر تھی جس میں پیچیدہ اُتار کی ہزاروں حرکتیں تھیں: اُتار کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں باہمی اختلاط ہوتا ہے اسی وجہ سے بہت غیر معمولی خیالات متحد ہو جاتے ہیں: عوام نپولین اور آزادی سے پرستش کی حد تک محبت کرتے تھے۔ ہم یہاں تاریخ تخلیق کر رہے ہیں۔ یہ اس دور کے سراب تھے۔ خیالات ادوار کی تردید کرتے ہیں۔ والٹیریائی شاہیت، ایک انوکھی قسم کی کم غیر معمولی بوناپارٹی روشن خیالی نہیں تھی۔

اذہان کے دوسرے گروہ زیادہ سنجیدہ تھے۔ اس سمت، وہ اصول جیسے لگتے تھے؛ دائیں بازو سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ کامل کے لیے پُرجوش تھے، انھیں لامتناہی احساسات کی جھلک مل گئی تھی؛ کامل خود اپنی سختی کے ذریعے نفسوں کو آسمان کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کو لامتناہی خلا میں تیراتا ہے۔ خواب لانے کے لیے عقیدے جیسی کوئی شے نہیں ہوتی، اور مستقبل کو وجود میں لانے کے لیے عقیدے جیسی بھی کوئی شے نہیں ہوا کرتی۔ آج کا یوٹوپیا، کل کا تازہ خون اور گوشت ہوتا ہے۔

روشن خیالات کی بنیادیں دُہری تھیں۔ راز میں کی جانے والی ایک شروعات نے ”دوسری اشیا کی ترتیب“ کے عمل کو خطرے میں ڈال دیا تھا جو مشتبہ اور خفیہ تھا۔ یہ ایک اشارہ تھا جو

بلند ترین درجے کا انقلابی تھا۔ طاقت کی سوچی سمجھی سوچ سرنگ میں عوام کی دوسری سوچی سمجھی سوچ ملتی ہے۔ بدامنی کی سوچی سمجھی پیداوار عمداً کی جانے والے فوجی بغاوتوں کا حاضر جواب ہوتی ہے۔

فرانس میں اب تک وہ وسیع اساسی ادارے موجود نہیں، جیسے جرمنی کا Tugendbund اور اطالیہ کا Carbonarism؛ مگر یہاں وہاں، کچھ حتمی اشارے تھے جو اپنی کونپلیں نکالنے کے عمل سے گزر رہے تھے۔ Aix میں Cougourde کا خاکہ پیش کیا جا رہا تھا۔

یہ A B C کے دوست کون لوگ تھے؟ ایک سوسائٹی تھی جس کا مقصد بچوں کی تعلیم تھی، دراصل یہ آدمی کو سرفراز کر رہی تھی۔

انھوں نے خود A B C کے دوست — رنگوں کی شوخی کو کم کرنے والے سیاہ رنگ — ہونے کا اقرار کیا، یعنی عوام کی تذلیل کی۔ وہ عوام کو سرفراز کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایک ذومعنی لفظ تھا ہم جس پر مسکرانے کی غلطی کرتے تھے۔ ذومعنی الفاظ کبھی کبھی سیاست کے تحت عناصر ہوتے ہیں؛ Castratus ad castra [کیمپ میں آختہ کیے جانے کے عمل] کو دیکھیے، جس نے [زنخے] Narses کو فوج کا جنرل بنا دیا تھا؛ Barbari et Barberini؛ کو دیکھیے Tu es: Petrus et super hanc petram [آپ پطرس ہیں اور اس پتھر پر میں پطرس بن جاؤں گا] کو دیکھیے، وغیرہ وغیرہ۔

A B C کے دوست زیادہ نہیں تھے؛ یہ ایک خفیہ سوسائٹی تھی جو اپنی تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھی؛ اگر چند لوگوں کی ٹولی والے ہیرو بن جاتے ہیں تو ہم ان کو ٹولی کہہ سکتے ہیں۔ وہ پیرس میں دو جگہ جمع ہوتے تھے، مچھلی بازار کے قریب Corinthe نامی ایک وائن کی دکان میں، آگے چل کر جس کا مزید تذکرہ ہوگا، اور Saint-Michel اسٹریٹ پر واقع Cafe Musain میں، جو اب مسمار ہو چکا ہے ملاقات کرنے والی جگہوں میں سے پہلی جگہ عام مزدور کے لیے، اور دوسری جگہ طلبہ کے لیے ہوتی تھی۔

Friends of the A B C کے اجتماعات عام طور پر Cafe Musain کے عقبی کمرے میں ہوتے تھے۔ اس ہال کمرے میں، جو کیفے سے کچھ فاصلے پر تھا، جسے یہ ایک بہت طویل راہداری سے منسلک کرتا تھا، دو کھڑکیاں اور ایک باہر جانے کا راستہ تھا جو Gres اسٹریٹ پر نکلتا تھا۔ یہاں لوگ تمبا کو نوشی کرتے، شراب نوشی کرتے، جوا کھیلتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ وہاں وہ ہر شے کے بارے میں زور زور سے، دوسری چیزوں کے بارے سرگوشی کرتے تھے۔ دیوار پر جمہوریہ کے زمانے کا فرانس کا ایک پرانا نقشہ لگا ہوا تھا، ایک اشارہ جو پولیس کے

ہرکارے کے جذبۂ تجسس کو ابھارنے کے لیے کافی تھا۔

Friends of the A B C کا بڑا حصہ طلبہ پر مشتمل تھا جن کے عام مزدوروں سے اچھے تعلقات تھے۔ نیچے ان کے بڑے بڑے نام دیے جا رہے ہیں۔ کافی حد تک ان کا تعلق تاریخ سے ہے:

انجولرا (Enjolras)

کومفیر (Combeferre)

فوئی (Feuilly)

ژاں پرووییر (Jean Prouvaire)

کوفیراک (Courfeyrac)

باؤریل (Bahorel)

لیگلے (Laigle) یا (Lesgle)

ژولی (Joly)

گرانتیر (Grantaire)

یہ نوجوان لوگ، دوستی کے بندھن کے ذریعے، آپس میں ایک خاندان کی طرح تھے۔ لیگلے کے سوا سب کا تعلق جنوب سے تھا۔

یہ ایک غیر معمولی گروہ تھا۔ یہ گروہ ان نادیدہ گہرائیوں میں غائب ہو گیا تھا جو ہمارے عقب میں ہیں۔ ڈرامے کے اس نقطے پر، اب ہم جہاں پہنچ چکے ہیں، نوجوانی سے بھرپور ان سربراہوں پر روشنی کی ایک کرن ڈالنا شاید غیر ضروری نہیں ہوگا، قبل اس کے کہ قاری ان کو المناک مہمات کے سایوں میں چھلانگ لگاتے دیکھ لے۔

انجولرا (Enjolras) ہم نے جس کا سب سے پہلے نام لیا ہے — قاری کو بعد میں معلوم ہوگا کیوں — اکلوتا امیر زادہ تھا۔ انجولرا ایک دل ربا نوجوان آدمی تھا، جو ہولناک ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ فرشتوں جیسے حسن کا مالک تھا۔ وہ ایک وحشی [یونانی] نوجوان تھا۔ اس کی نظروں سے مترشح ہونے والی دل گیر فکر مندی کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی سابقہ حیثیت میں انقلابی الہام کا ابطال کر چکا تھا۔ وہ اس کی روایات کا حامل تھا، گویا وہ ان پر گواہ تھا۔ اس کی اس عظیم معاملے کی تمام خفیف ترین تفصیلات سے واقفیت تھی۔ اس کی فطرت پاپائیت اور جنگجو جیسی تھی جو نوجوانوں میں ایک غیر معمولی شے ہوا کرتی ہے۔ وہ سرکاری پادری، دراصل جنگ کا

آدمی تھا؛ بہت قریب سے دیکھیے تو جمہوریت کا سپاہی؛ عصری تحریک سے بلند ہو کر دیکھیے ایک تو مثالی پادری تھا۔ اس کی آنکھیں گہری تھیں، اس کی پلکیں ہلکی سُرخ، اس کے نچلے لب موٹے اور جلد ہی بُرے لگنے لگتے تھے، اس کی بھنویں بلند تھیں۔ کسی چہرے کی بڑی بھنویں منظر میں بڑے افق کی طرح ہوتی تھیں۔ کچھ مخصوص لوگوں کی طرح، اس صدی کی ابتدا میں، اور پچھلی صدی کے آخر میں، جو نوعمری ہی میں مشہور ہو گیا تھا؛ اسے ضرورت سے زیادہ جوانی ودیعت ہوئی تھی؛ ایسا گلابی تھا جیسے کوئی نوجوان لڑکی، حالاں کہ اس کا چہرہ گھنٹوں بے رنگ رہتا تھا۔ آدمی ہو گیا تھا پھر بھی بچے جیسا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے بیس اور دو [بائیس] برس صرف سترہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ بہت سنجیدہ رہتا تھا؛ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اسے اتنا علم تھا کہ روئے زمین پر ایک شے ہوتی ہے جس کو عورت کہتے ہیں۔ اس میں بس ایک جذبہ تھا -- راستی؛ مگر ایک اور خیال بھی تھا -- رکاوٹ کو تہہ و بالا کر دینا۔ ماؤنٹ Aventine [ریاست ہائے متحدہ کا ایک تاریخی علاقہ] پر وہ [رومن سیاست دان] گراکس (Gracchus) ہوتا؛ کنونشن میں وہ Saint-Just ہوتا۔ وہ گلابوں کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا، موسمِ بہار کو نظر انداز کر دیتا تھا، چڑیوں کے زمزموں کو سنتا نہیں تھا؛ [یونانی مدبر] Aristogeiton کی طرح [یونانی اسیر کا ایک عورت جو بچہ جن کر اسے جنگل میں چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی] Evadne کا کھلا گلا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا؛ [قدیم یونان کے مدبر] Harmodius کی طرح اس کے خیال میں پھول سوائے تلوار کو چھپانے کے کسی کام کے نہیں تھے۔ تفریحات کے معاملے وہ بہت سخت گیر تھا۔ وہ ہر اس شے کے سامنے حجاب سے آنکھیں نیچی کر لیتا تھا جو جمہوری نہیں ہوتی تھی۔ آزادی کا ذہین چاہنے والا تھا۔ اس کی تقریر [سننے والے کو] مشکل ہی سے اُکساتی تھی؛ اس میں مذہبی گیتوں کی تاثیر ہوتی تھی۔ اس کو نفس کے غیر متوقع ہیجانات کا سامنا تھا۔ تُف ہے اس معاشقے پر جس نے اس کے ساتھ خطرہ مول لیا ہو۔ Place Cambrai یا Saint-Jean-de-Beauvais اسٹریٹ کی کوئی فرانسیسی مزدور عورت کالج سے بھاگتے اس نوجوان کا چہرہ — وہ کم عمر وردی پوش، وہ لانبی سنہری پلکیں، وہ نیلی آنکھیں، وہ ہوا میں لہراتے بال، وہ گلابی رخسار، وہ تازہ لب اور وہ نفیس دانت — دیکھ لیتی تو مکمل قطبی روشنیوں سے رغبت کا تصور کر سکتی تھی؛ اور اگر اس کے حسن کو انجولراس پر آزمایا جاتا تو دنگ کر دینے والی اور ڈراؤنی نظر نے اسے فوراً پاتال دکھا دیا ہوتا اور اس کو سبق سکھا دیا ہوتا کہ وہ آئندہ [تورات کی کتاب] ذوالکفل [Ezekiel] کے فرشتے کو [ڈراما نگار] Beaumarchais کے بہادر [کردار] Cherubino سے گڈمڈ نہ کرے۔

انجولرا کی طرف سے، جو انقلاب کی منطق کی نمائندگی کر رہا تھا، کامفیر نے اس کے فلسفے کی نمائندگی کی تھی ۔ انقلاب کی منطق اور اس کے فلسفے میں ایک فرق ہے— کہ منطق جنگ ختم کر سکتی ہے، جب کہ اس کا فلسفہ صرف امن میں ختم ہو سکتا ہے ۔ کامفیر نے انجولرا کی تکمیل کی اور غلطی درست کی ۔ وہ کم اونچا، مگر چوڑا تھا ۔ اس کی خواہش تھی کہ عمومی خیالات کے لیے چوڑے اصولوں کو تمام دماغوں میں انڈیل دیا جائے: اس نے کہا تھا، ''انقلاب، مگر شائستگی کے ساتھ''؛ اور اس نے پہاڑی چوٹی کے اطراف آسمان کا ایک وسیع منظر کھول دیا تھا ۔ انقلاب انجولرا کے بجائے کامفیر کے ساتھ سانس لینے میں زیادہ سہولت محسوس کرتا تھا ۔ اول ڑولفا نے اپنے ربانی حق کا اظہار کیا، اور کا ہے نیغ نے اپنے فطری حق کا ۔ پہلے نے خود کو Robespierre سے متعلق کر لیا؛ دوسرے نے خود کو Condorcet تک محدود رکھا ۔ انجولرا کے مقابلے میں کامفیر نے پوری دنیا جیسی زندگی بسر کی ۔ اگر ان دونوں نوجوانوں کو تاریخ میں شامل نہ کر دیا گیا ہوتا تو ایک منصف ٹھہرتا، دوسرا عقل مند انسان کہلاتا ۔ انجولرا زیادہ مردانہ، کامفیر زیادہ ملائم تھا ۔ Homo اور Vir یہ ان دونوں کے مختلف انداز کا اثر تھا ۔ عام پاکیزگی کے ذریعے بھی، انجولرا جتنا سخت تھا، کامفیر اتنا ہی حلیم تھا ۔ 'شہری' لفظ سے محبت کرتا تھا، مگر لفظ 'آدمی' کو زیادہ پسند کرتا تھا ۔ وہ ہسپانوی کی طرح شوق سے کہہ دیتا 'Hombre' [آدمی] ۔ اس نے سب کچھ پڑھا تھا؛ تھیٹر گیا تھا؛ عوامی خطاب کے طریقے سیکھے تھے؛ چاند کے گڑھے Arago سے آنے والی روشنی کی سمتی تقطیب (polarization) کا مطالعہ کیا تھا؛ گلے سے گزرنے والی بیرونی شہ رگ کے دہرے کام کی تشریح پر Geoffrey Sainte-Hilaire کے دیے جانے والے سبق پر، اور ایک اندرونی شہ رگ پر جو چہرے کو بناتی ہے، دوسری جو دماغ کو بناتی ہے اس پر بہت پُر جوش ہو گیا تھا؛ وہ واقف تھا کہ کیا ہو رہا ہے، اور قدم بہ قدم سائنس پر نظر رکھتا تھا، Saint-Simon کا Fourier سے تقابل کرتا تھا؛ تصویری تحریر کی رمز کشائی کرتا؛ پتھر کے اس ٹکڑے کو توڑ دیتا تھا جس میں اس کو ارضیات ملتیں؛ ریشم کے کیڑے سے یادداشت حاصل کرتا تھا؛ اکادمی کی لغت میں غلط فرانسیسی زبان کی نشان دہی کرتا؛ [عملِ تنویم کا موجد اور فرانسیسی اشرافیہ کا حصہ] Puysegur اور Deleuze کا مطالعہ کرتا؛ کسی چیز کے بارے میں دعوے نہیں کرتا، حتیٰ کہ معجزوں کے بارے میں بھی؛ کسی چیز سے انکار نہیں کرتا، حتیٰ کہ بھوتوں سے بھی؛ مانیٹر کی فائلیں تہ و بالا کر دیتا اور سوچنے لگتا ۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ مستقبل ہمیشہ اسکول ماسٹر کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور تعلیمی سوالات سے خود کو زخمی کر لیتا تھا ۔ اس کی خواہش تھی کہ سوسائٹی کو اخلاقی اور عقلی سطح کی بلندی کے

لیے، سائنس کے وضع کرنے کے لیے، خیالات کو پھیلانے کے لیے، نوجواں دماغوں کو بڑھانے میں بغیر آرام کیے محنت کرنا چاہیے، اور اسے خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ طریقوں کے افلاس کو، ادبی نقطۂ نگاہ کی دو یا تین صدیوں کی کم مائیگی کو، جسے کلاسیک کہا جاتا ہے، سرکاری نظریہ پرستوں کے ظالمانہ تکبر کو، عالمانہ تعصبات اور طور وطریق کو اور ہمارے کالجوں کو مصنوعی صدقہ گاہ بنا کر ختم کر دیا جائے۔ وہ پڑھا لکھا، نکتہ سنج، درست، پالی ٹیکنک کا گریجویٹ، زیرک طالب علم تھا، اور ساتھ ہی عجیب الخلقت تخلیقات کے بارے میں بھی سوچتا تھا۔ وہ خوابوں پر، ریلوے پر، جراحی میں ہونے والی تکالیف کو کم کرنے پر، طبیعیات و حیاتیات کے نقوش کو پیوست کرنے پر، برقیات پر، ٹیلی گراف پر اور غبارے اڑانے پر یقین رکھتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ ان قلعوں سے خوف زدہ نہیں تھا جنھیں وہم پرستی، ظلم و جبر اور تعصب نے انسانی دماغ کے خلاف ہر طرف تعمیر کر رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سوچتے ہیں کہ سائنس آخر کار اپنا موقع و محل تبدیل کر لے گی۔ انجولرا سردار اور کامفیر پیش رو بن گیا تھا۔ کوئی ایک کی ماتحتی میں لڑنا پسند کرتا ہے اور کوئی دوسرے کے عقب میں چلنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کامفیر لڑنے کے قابل نہیں تھا، مگر اس نے رکاوٹ کے خلاف دست بہ دست لڑائی سے، اور اپنی پوری قوت سے اور دھماکے سے حملہ کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، مگر اسے نسلِ انسانی کو بتدریج، اس کے نصیب کے خلاف، تعلیم کے خلاف، جامع باتوں کی نصیحت اور مثبت قوانین کی تشہیر کے خلاف رضامند کرنا زیادہ موزوں لگا تھا؛ اور دو روشنیوں کے درمیان، اس کی ترجیح آتش زنی کے بجائے تابانی کی طرف تھی۔ آتش زنی، بلاشبہ، ایک تعلی روشنی تخلیق کر سکتی ہے، مگر کیوں نہ طلوعِ فجر کا انتظار کیا جائے؟ آتش فشاں بھی روشنی کرتا ہے، مگر دن اس سے کہیں بہتر روشنی پیدا کرتا ہے۔ شاید کامفیر نے کسی ارفع قسم کی آگ کے مقابلے میں خوب صورتی کی روشنی کو ترجیح دی تھی۔ وہ روشنی جس کے ساتھ دھوئیں کی پریشانی اور تشدد کے عوض خریدی ہوئی ترقی بھی ہو، اس نرم و نازک اور سنجیدہ جذبے کو محض نصف مطمئن کر سکے گی۔ لوگوں کا سچائی میں سر کے بل کود پڑنا، اور '93 نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا؛ اس کے باوجود اس کے نزدیک ٹھہراؤ زیادہ نفرت انگیز تھا، جس میں اسے اخلاقی بگاڑ اور موت نظر آ رہی تھی؛ مجموعی طور پر، اس نے بدبو کے مقابلے میں کف کو ترجیح دی تھی، اور اس نے غلاظت کے جوہڑ کے مقابلے میں بوچھاڑ اور Montfaucon جھیل پر نیاگرا کے آبشار کو ترجیح دی تھی۔ مختصر یہ کہ اس نے نہ ٹھہرنے کی خواہش کی نہ عجلت کی۔ جب کہ اس کے فتنہ انگیز دوست، کامل کے گرفتار وعالی شان انقلابی مہمات کو پسند کر رہے تھے اور شروع کر رہے تھے؛ کامفیر ترقی کو اور

اچھی ترقی کو اپنا راستہ اختیار کرنے پر مائل تھا؛ وہ خشک رہا ہوگا، مگر سچا تھا؛ قاعدے کا پابند تھا مگر بے قصور، سُست تھا مگر مطمئن تھا۔ کامفیر گھٹنے کے بل کھڑا ہو گیا ہوتا، اپنے ہاتھ باندھے لیے ہوتے تا کہ مستقبل کو اپنی تمام سفیدی کے ساتھ آنے دیتا، اور ایسی کسی شے کو آنے نہیں دیتا جو نسلوں کے مہیب اور صالح ارتقا کے عمل میں مخل ہو سکے۔ نیکی کو معصوم ہونا چاہیے، اور وہ اس بات کو مسلسل دہراتا رہتا تھا۔ اور دراصل، اگر انقلاب کی شان چکا چوند کرنے والی مثال کو مضبوطی سے نظر کے سامنے رکھنے میں ہو، اور اس طرف بڑھتی ہوئی روشنیاں اپنے پنجوں میں آگ اور خون لیے ہوں تو ترقی کا حسن بے عیبی میں ہوگا؛ واشنگٹن ایک کی نمائندگی کر رہا ہے، اور ڈانٹن، دوسرے کی تجسیم کر رہا ہے۔ دونوں میں وہی فرق ہے جو راج ہنس کو اس فرشتے سے الگ کرتا ہے جس میں کسی عقاب کے پر لگے ہوں۔

ژاں پروویر کامبے فیر سے بھی زیادہ نرم دل تھا۔ اس کا نام ژیہاں (Jehan) تھا، اس وقتی پریشان خیالی کی وجہ سے، جو طاقت ور اور عمیق تحریک میں ملی ہوتی ہے، جن میں سے قرون وسطیٰ کا بہت ضروری مطالعہ ہوا تھا۔ ژاں پروویر محبت کرتا تھا؛ اس نے [اپنے لیے] پھولوں کا ایک گملا بنا رکھا تھا؛ بانسری بجاتا تھا؛ اشعار لکھتا تھا؛ عوام سے محبت کرتا تھا؛ عورتوں پر رحم کھاتا تھا؛ بچے کے لیے روتا تھا؛ خدا اور مستقبل دونوں کو ایک ہی اعتماد میں گڈمڈ کر دیتا تھا، اور انقلاب کو ایک شاہی سر، یعنی Andre Chenier کے قلم ہونے کا الزام دیتا تھا۔ اس کی آواز معمولی طور پر سُریلی تھی مگر اچانک بلند ہو جاتی تھی۔ وہ علمیت کی حد تک پڑھا لکھا، اور تقریباً ایک مستشرق تھا۔ سب سے بڑھ کر، وہ اچھا آدمی تھا؛ اور ان لوگوں کے نزدیک جو جانتے ہیں کہ نیکی کے، شان و شوکت سے کتنے قریب سے ڈانڈے ملتے ہیں، شاعری کے معاملے میں وہ بہت بڑے کو فوقیت دیتا تھا۔ اسے اطالوی، لاطینی، یونانی اور عبرانی زبان آتی تھی؛ اور یہ صرف چار شاعروں کے مطالعے میں اس کے کام آتی تھی: دانتے (Dante)، جووینال (Juvenal)، ایسکائلس (AEschylus) اور آئزایا (Isaiah)۔ فرانسیسی زبان میں وہ راسین (Racine) پر کارنیل (Corneille) کو، اور کارنیل پر آگرپا دوبینے (Agrippa d'Aubigne) کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ جنگلی جو، اور بھٹے کے کھیتوں میں آوارہ گردی کرتا تھا، اور خود کو بادلوں میں اتنا مصروف رکھتا جتنا کہ واقعات میں۔ اس کے ذہن کے دو رویے تھے، ایک آدمی کی طرف داری میں، اور دوسرا اس پر جو خدا کی طرف لے جاتا تھا۔ یا تو وہ مطالعہ کرتا تھا یا تصور کرتا تھا۔ سارا سارا دن وہ تنخواہ، سرمایے، قرض، شادی، مذہب، آزادیٔ خیال، تعلیم، تعزیراتی خدمات،

افلاس، دوستی، ملکیت، پیداوار اور حصے داری، نچلے درجے کی دنیا کے معمے میں انسانی ant-hill کے اندھیرے وغیرہ سے متعلق سماجی سوالات میں غرق رہتا تھا؛ رات کے وقت سیاروں کے قوی ہیکل وجود کو دیکھتا۔ انجولرا کی طرح وہ دولت مند اور اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ نرمی سے بولتا، سر جھکائے رہتا، آنکھیں نیچی کیے رکھتا، شرمندگی سے مسکراتا، خراب لباس میں ملبوس ہوتا، بدسلیقہ انداز میں ہوتا، بلا کسی وجہ کے شرماتا اور بہت بزدل تھا۔ اس کے باوجود وہ شیر دل انسان تھا۔

فوئی ملازم پیشہ آدمی تھا؛ پنکھے بناتا تھا؛ اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے تھے؛ وہ مشکل سے تین فرانک یومیہ کماتا تھا، اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ جتنا ہو سکے دنیا کو دینا چاہیے۔ اس کی ایک اور فکر تھی کہ وہ تعلیم حاصل کر سکے؛ اس کو بھی وہ اپنے آپ کو کچھ دینا کہتا تھا۔ اس نے خود ہی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا؛ جو کچھ بھی وہ جانتا تھا، اس نے خود ہی سیکھا تھا۔ فوئی کا دل بہت کشادہ تھا۔ اس کی پہنچ بہت وسیع تھی۔ اس یتیم نے لوگوں کو گود لیا تھا۔ اس کی ماں اس کے کام نہیں آئی تھی، اس لیے وہ اپنے ملک کے لیے کام کرتا تھا۔ اب ہم جس کو قومیت کہتے ہیں، اس کے بارے میں وہ بہت فکر کیا کرتا تھا، اس نے اس مقصد سے تاریخ پڑھی تھی کہ جب وہ غصے میں ہو تو اپنے آپ پر قابو رکھ سکے۔ نوجوان یوٹوپیائیوں کے اس کلب میں فرانس جس پر قابض تھا، وہ بیرونی دنیا کی نمائندگی کرتا تھا۔ اپنے مخصوص کام کے لیے اس نے یونان، پولینڈ، ہنگری، رومانیہ اور اطالیہ کو ساتھ رکھا تھا۔ مناسب یا نامناسب طور پر اپنے حق کے استحکام کے طور پر یہ سارے نام مسلسل دہرایا کرتا تھا۔ یونان اور Thessaly پر ترکی کی، وارسا پر روس کی، وینس پر آسٹریا کی غلط اندازی پر اسے طیش آتا تھا۔ سب سے زیادہ تو 1772ء کی غلط اندازی نے اس کو ہوشیار کر دیا تھا۔ طیش میں سچائی سے بڑھ کر کوئی شاہانہ خطابت نہیں ہوتی؛ وہ ایسی ہی خطابت کرنے والا خطیب تھا۔ اس نے 1772ء کی اس بدنام تاریخ کے بارے میں اور غداری سے دبائی گئی اس شریف اور بہادر نسل کے موضوع پر، اس سہ طرفہ جرم پر، اس بڑے خفیہ حملے پر، ریاستوں پر ڈالے جانے والے ان تمام طرح کے خوف ناک دباؤ پر جو بہت سی شریف قوموں پر ڈالے گئے ہیں، اور جنھوں نے ان کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ کو منسوخ کر دیا ہے، بے حد و حساب لکھا تھا۔ تمام سماجی خلاف ورزیوں کا منبع پولینڈ میں ہے۔ پولینڈ کی تقسیم ایک کلیہ ہے تمام موجودہ سیاسی زیادتیاں جس کے منطقی نتائج ہیں۔ ایک صدی پیچھے سے وہاں ایسا کوئی جابر حکمران نہیں ہوا ہے، جس نے پولینڈ کی تقسیم کو منظور نہ کیا ہو، اور اس پر دستخط نہ کیے ہوں۔ جب جدید دور کی غداریوں کے ریکارڈ کی جانچ ہوئی تھی، یہی وہ چیز تھی جو ظاہر ہوئی تھی۔ ویانا کانفرنس نے اپنے

جرم کو مکمل کرنے سے قبل اس جرم پر بات کی تھی۔ 1772ء نے آغاز کا اعلان کیا تھا؛ 1815ء کھیل کا اختتام تھا۔ یہ تھا قوانی کا عادی متن۔ اس بے چارے ملازمت کرنے والے نے خود کو انصاف کا اتالیق بنا لیا تھا، اور اس نے اس کو عظیم بنا کر اپنا قرض ادا کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سچ ابدی ہوتا ہے۔ وارسا مزید Tartar نہیں بن سکتا جب کہ وینس Teuton ہو سکتا ہے۔ بادشاہات با عزت بننے کی کوشش میں اپنی عزت کھو دیتے ہیں۔ جلد یا بدیر، غرق شدہ حصہ سطح پر تیرتا ہے اور دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یونان ایک بار پھر یونان بن جاتا ہے، اطالیہ ایک بار پھر اطالیہ ہو جاتا ہے۔ حرکات کے خلاف سچائی کا احتجاج ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ قوم کی چوری ہدایت کے ذریعے نہیں کی جا سکتی۔ بدمعاشی کی ان بڑی حرکتوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ ایک قوم اپنے نشان کو جیب کے رومال کی طرح نہیں نکال سکتی۔

کوفیراک کے باپ کا نام تھا موسیو de Courfeyrac۔ بورژوائیوں میں سے ایک کے بحالیِ فرانس کے بارے میں حکمران طبقے اور اشرافیہ کے بارے میں باطل خیالات تھے کہ وہ ریزے پر یقین رکھتے تھے۔ ریزے کی، جیسا کہ سب جانتے ہیں، کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر Minerve کے عہد کے بورژوا نے بے چارے de کو اتنا بڑا تصور کیا کہ وہ سب اس کے سامنے دستبردار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ موسیو de Chauvelin اپنے آپ کو موسیو Chauvelin کہتا تھا؛ موسیو de Caumartin، موسیو Caumartin تھا؛ موسیو de Robecque، Benjamin Constant ہو گیا؛ موسیو de Lafayette، موسیو Lafayette ہو گیا۔ کوفیراک کب کسی سے پیچھے رہنے والا تھا، اور وہ خود کو سادہ کوفیراک کہتا تھا۔

جہاں تک کوفیراک کا معاملہ ہے، ہمیں اس مقام پر رُک جانا چاہیے اور جو کچھ بچ رہا ہے اسے کہنا چاہیے، ''کوفیراک کے لیے، دیکھیے تولومیے (Tholomyes)''۔

کوفیراک دراصل نوجوانی کی وہ جان آفرینی تھی جس کو ذہن کا حُسنِ آسیب کہا جانا چاہیے۔ اس کے بعد یہ سب کسی بلی کے بچے کے کھیل کی طرح غائب ہو گیا اور بورژوا کی یہ ساری شان چار ٹانگوں، دو پاؤں والے ایک tomcat پر ختم ہو گئی تھی۔

اس قسم کا مزاج نوجوانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہتا ہے، جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو دیتے رہتے ہیں اور، quasi cursores، یہ ہمیشہ بالکل ایک جیسا ہی رہتا ہے؛ تاکہ جیسا ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے، ہر کوئی جس نے 1828ء میں کوفیراک کو سنا ہو، سمجھے کہ وہ 1817ء میں تولومیے کو سن رہا ہے۔ سادہ کوفیراک محترم آدمی تھا۔ بیرونی

دماغ کی ظاہرہ یکسانیوں تلے، اس میں اور تولومیے میں فرق بہت زیادہ تھا۔ اندرونی انسان جو ان دونوں میں موجود تھے، ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ تولومیے کے اندرون میں ایک وکیل سرکار تھا، اور کوفیراک کے اندرون ایک بانکا بہادر۔

انجولرا سردار تھا، کامفیر پیش رو اور کوفیراک مرکز۔ دوسرے زیادہ روشنی فراہم کرتے تھے، یہ زیادہ گرمی فراہم کرتا تھا؛ سچ تو یہ ہے کہ یہ مرکز کی تمام خصوصیات، چکنائی اور دمک، کا حامل تھا۔

باؤرل جون 1822ء کی خوں ریز شورش میں، نوجوان لیماں (Lallemand) کی تدفین کے دوران نظر آیا تھا۔ وہ ایک نیک طینت فانی انسان تھا، جس کے ساتھی خراب، بہادر، مزاج مسرف، اور فیاضی کی حد تک مسرف، بسیار گو اور اکثر خطیب تھے مگر گستاخی کی حد تک؛ ممکنہ طور پر بہترین ساتھی تھا؛ اس کے پاس منچلی واسکٹیں تھیں، لگنار خیالات تھے؛ وہ سرتاپا ہنگامہ خیز تھا، یعنی لڑائی کو زیادہ پسند کرتا تھا، بشرطیکہ انقلاب نہ ہو؛ کسی کھڑکی کا شیشہ توڑنے پر ہمہ وقت تیار ہوتا تھا، اس کے بعد پختہ راستے اکھاڑ دیتا، صرف اس کا اثر دیکھنے کی خاطر اس کی حکومت کو مسمار کردیتا تھا؛ وہ گیارہویں درجے کا طالب علم تھا۔ قانون سونگھ چکا تھا مگر کبھی وکالت نہیں کی۔ اس نے ''کبھی وکیل نہ بن'' کا مشورہ قبول کرلیا تھا، اور اپنی خاندانی نشانیوں کے لیے ایک رات اپنی چوکور ٹوپی میں نظر آتا تھا۔ ہر بار جب وہ قانون کے اسکول کے پاس سے گزرتا تو، جو شاذ ہی ہوتا تھا، اپنے فراک کوٹ کے بٹن بند کرلیتا — اس وقت تک چغہ ایجاد نہیں ہوا تھا — اور مفید صحت پیش بندیاں کرتا تھا۔ اسکول کے چوبی دار کے بارے میں اس نے کہا تھا، ''کتنا نفیس بوڑھا ہے۔'' اور ڈین موسیوDelvincourt کے بارے میں، ''کیا یادگار خوف ہے۔'' اپنے خطابات میں وہی گیت گاتا اور اپنے پروفیسروں کے خاکے بناتا۔ وہ ایک بڑا وظیفہ، تقریباً تین ہزار فرانک سالانہ، کچھ کیے بغیر ہی اڑا دیتا تھا۔

اس کے والدین کسان تھے جن کو اپنے آپ کا احترام کرنا سکھا دیا تھا۔

ان کے بارے میں کہتا تھا، ''وہ کسان ہیں، بورژوا نہیں؛ اسی وجہ سے وہ ذہین ہیں۔''

باؤرل من موجی آدمی تھا، بے شمار ریستورانوں میں جاتا تھا؛ اس کی اور کوئی عادت نہیں تھی۔ آوارہ گردی کرتا تھا۔ بھٹکنا انسان کی خصلت ہے۔ آوارہ گردی کرنا پیرس کی خاصیت ہے۔ درحقیقت، اس کا ذہن بہت تیز تھا اور وہ جتنا صاحبِ فہم تھا اتنا نظر نہیں آتا تھا۔

وہ ABC کے دوستوں کے درمیان جوڑنے والی کڑی تھا، جب کہ دوسرے لوگ غیر منظم گروہ تھے جن کی بعد میں تجسیم ان کا مقدر تھی۔

نوجوان سروں کی جلسہ گاہ میں صرف ایک ہی گنجا تھا۔

Marquis d'Avaray جسے لوئی ہشت دہم نے اس لیے ڈیوک بنا دیا تھا کہ جس دن ترکِ وطن کر رہا تھا اس نے عوامی سواری میں سوار ہونے میں اس کی مدد کی تھی، یہ بیان کرنے کا عادی ہو گیا تھا کہ 1814ء میں فرانس میں اپنی واپسی پر، جب بادشاہ Calais کی بندرگاہ پر اتر رہا تھا تو ایک آدمی نے اس کے سامنے ایک عرضی پیش کی تھی۔

''تمھاری درخواست کیا ہے۔'' بادشاہ نے پوچھا۔

''جناب عالی، ایک ڈاک خانہ۔''

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''لیگلے۔''

بادشاہ نے تیوری چڑھا کر درخواست کے دستخط کی طرف نظر ڈالی اور اس پر لکھے نام کی طرف دیکھا جو کچھ یوں تھا: LESGLE۔ بادشاہ کو یہ عدم بونا پارٹی ہجے اچھے لگے اور اس نے مسکرانا شروع کیا۔ ''جناب عالی!'' اس آدمی نے درخواست کے ساتھ گفتگو دوبارہ شروع کی ''میرے اجداد کے پاس ایک شخص تھا جو کتوں کی رکھوالی کرتا تھا، اس کا خاندانی نام Lesgueules تھا۔ اسی خاندانی نام سے میرا نام بنایا گیا تھا۔ مجھے Lesgueules کہا جاتا ہے، چھوٹا کیا تو Lesgle اور بگاڑا گیا تو l'Aigle ہو گیا۔'' اسے سن کر بادشاہ مزید مسکرایا۔ اس کے بعد اس نے اس آدمی کو Meaux کا ڈاک خانہ عطا کر دیا، وہ ارادتاً تھا یا اتفاقاً؟

گروہ کا گنجا رکن اسی Lesgle یا Legle کا بیٹا تھا اور وہ de Meaux Legle نام کے دستخط کرتا تھا۔ تخفیف کے طور پر اس کے ساتھی اسے بوسے (Bossuet) پکارتے تھے۔

بوسے ایک خوش مزاج مگر بدقسمت آدمی تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی کام میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ تلافی کے طور وہ ہر بات پر ہنس دیتا تھا۔ پانچ اور بیس [پچیس برس] میں ہی گنجا ہو گیا تھا۔ اس کا باپ مرا تو اس کے پاس ایک مکان تھا اور ایک کھیت؛ مگر اس نے، یعنی بیٹے نے جلد ہی سٹے میں مکان اور کھیت دونوں کھو دیے۔ اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ اس کے پاس صرف علم تھا اور مزاج؛ وہ جو کچھ بھی کرتا غلط ہو جاتا تھا۔ ہر چیز اس کے خلاف گئی؛ ہر شخص نے اسے دھوکا دیا؛ جو کچھ وہ تعمیر کرتا اسی پر آن گرتا۔ اگر وہ لکڑی چیرتا تو انگلی کٹ جاتی۔ اگر اس کے پاس داشتہ ہوتی تو جلد ہی دریافت ہو جاتا کہ اس کا ایک اور دوست بھی ہے۔ ہر لمحے اسے بدقسمتی کا سامنا ہوتا تھا، اس کی زندہ دلی کی یہی وجہ تھی۔ وہ کہتا تھا: ''میں گرتے ہوئے کھپریلوں

کے نیچے رہتا ہوں۔" وہ آسانی سے حیران نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ اس کے نزدیک حادثہ ہی وہ تھا جس کی وہ ہمیشہ پیش بینی کرتا تھا؛ وہ اپنی بدقسمتی کو بڑے سکون سے برداشت کرتا تھا، اور قسمت کے دھوکے پر مسکراتا تھا، اس طرح جیسے وہ مبارک بادیاں سن رہا ہو۔ وہ مفلس تھا مگر اس کے مزاح کا خزینہ بے شمار تھا۔ وہ جلد ہی اپنے آخری سو پر پہنچ جاتا، مگر کبھی آخری قہقہے پر نہیں۔ جب نحوست اس کے دروازے سے داخل ہوئی تو اس نے اپنی شناسا کو بڑے پیار سے سیلوٹ کیا، مصیبت کے پیٹ پر تھپکیاں دیں؛ وہ ہلاکت کا اتنا خوگر ہو چکا تھا کہ اس کو اس کی عرفیت سے پکار کر کہتا تھا، "Good day, Guignon!"۔

مقدر کی ان عقوبتوں نے اسے موجد بنا دیا تھا۔ اس کے پاس وسائل کی کمی نہ تھی، مگر جب اسے "بے لگام اسراف" کے طریقے مل جاتے تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک رات تو وہ اس حد تک چلا گیا کہ جب اس نے ایک فاحشہ کے ساتھ "ایک سو فرانک" کا رات کا کھانا کھا لیا تو اس نے اپنی بدمستی کے دوران وہ یادگار جملہ کہا تھا، "پانچ لوئی کی چھنال، چل میرے جوتے اُتار۔"

بوسے رفتہ رفتہ وکالت کے پیشے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا؛ باورِیل کے رنگ ڈھنگ کے بعد اس نے قانون پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس رہنے کی زیادہ جگہ نہیں تھی، کبھی تو بالکل نہیں ہوتی تھی۔ کبھی اس کے پاس رہتا، کبھی اس کے پاس رہتا، زیادہ تر شولی کے پاس رہتا تھا۔ شولی ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ وہ بوسے سے عمر میں دو برس چھوٹا تھا۔

شولی کو بیماری کا خبط ہو گیا تھا۔ ادویہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے معذور بن گیا تھا۔ تیئس اور میں [تیئیس برس] میں وہ خود کو جنم روگی سمجھنے لگا تھا، اور اپنی زندگی آئینے میں اپنی زبان کا معائنہ کرنے میں گزارتا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ آدمی قطب نما کی سوئی کی طرح مقناطیسی ہو جاتا ہے اور اپنے کمرے میں اس نے اپنا پلنگ اس طرح بچھا لیا تھا کہ اس کا سر جنوب کی جانب اور پاؤں شمال کی جانب ہوتے تھے، تا کہ رات کے وقت کرۂ ارض کی بجلی کا کرنٹ خون کے دوران میں مخل نہ ہو سکے۔ گرج چمک کے طوفان کے دوران وہ اپنی نبض ٹٹولا کرتا تھا۔ ورنہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ زندہ دل آدمی تھا۔ یہ تمام نوجوان، سودائی، ناتواں، زندہ دل اور پریشان، ایک ساتھ مل کر رہتے تھے، اور نتیجہ ایک کج رو اور موافق وجود تھا جو اپنے ایسے ساتھیوں کے ساتھ جنھیں Jollly کہا جاتا تھا، "تم اپنے چار L's پر اڑ سکتے ہو۔" ژاں پرووِیر نے اس سے کہا تھا۔

شولی کا اپنی بید کی نوک سے اپنی ناک چھونے کا ایک طریقہ تھا جو اس کے تیز فہم

دماغ کا ایک اشارہ تھا۔

یہ تمام نوجوان لوگ جن میں اتنا بڑا فرق تھا، جن کے بارے میں، بحیثیت مجموعی، بات کی جا سکتی تھی ان سب کا ایک ہی مذہب تھا — ترقی!

وہ سب انقلابِ فرانس کی براہِ راست پیداوار تھے۔ ان میں سب سے زیادہ چمکانے والا بہت مذہبی ہو گیا تھا، جب انھوں نے تاریخ کا اعلان کیا تھا، '89 کے گوشت و پوست میں ان کے باپ شاہ پرست نظریات والے تھے، اس سے مطلب نہیں کہ وہ نظریات کیا تھے؛ اس الجھن نے جو اُن کے اندرون میں تھی، جو نوجوان تھے، ان سے قطعاً متعلق نہیں تھی؛ اصول کا خالص خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ وہ مکمل فرض اور ناقابلِ تحلیل حق، اور بغیر کسی رنگ کے ایک دوسرے سے متعلق ہو گئے تھے۔ ایک ساتھ ملحق اور ایک دوسرے سے آشنا، انھوں نے مثالی زمیں دوزی کا خاکہ بنا لیا تھا۔

ان سارے روشن دلوں اور مکمل طور پر قائل دماغوں کے درمیان، ایک زندیق تھا۔ وہ کس طرح وہاں پہنچا؟ ایک دوسرے سے تقابل کے ذریعے۔ اس زندیق کا نام گرانتیر تھا، اور اس کی عادت تھی کہ وہ خود کو علامتی طور پر R. Grantaire سمجھتا اور اسی نام سے دستخط کرتا تھا۔ وہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ وہ کسی پر یقین نہیں رکھتا۔ مزید یہ کہ، وہ ان طلبہ میں سے تھا جنھوں نے سب سے زیادہ اس وقت سیکھا تھا جب وہ پیرس میں رہا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بہترین کافی کیفے Lemblin میں ملتی ہے اور بہترین بلیرڈ کیفے والتیر میں ہوتا ہے؛ کہ اچھے کیک اور اچھی معشوقائیں Ermitage یا Boulevard du Maine میں پائی جاتی ہیں؛ آگ پر بھنی مرغیاں Mother Sauget's میں؛ سفید وائن اور پیاز میں پکی لاجواب مرغیاں Barriere de la Cunette میں، اور مخصوص قسم کی ہلکی سفید وائن Barriere du Com pat میں ملتی ہے۔ اسے ہر چیز کی بہترین جگہ معلوم تھی؛ اس کے علاوہ، وہ باکسنگ اور foot-fencing اور ہر طرح کے رقص کا اور single-stick کھیل کا ماہر کھلاڑی تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف آدمی تھا؛ اس زمانے کی سب سے مشہور جوتے سینے والی Irma Boiss نے اس کی بے تکلف سادگی سے تنگ آ کر اس کو دی جانے والی مندرجہ ذیل سزا کا اعلان کر دیا تھا، ''گرانتیر ناممکن انسان ہے۔'' مگر گرانتیر کی حماقت سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہر عورت کی طرف بڑے پیار سے گھور کر دیکھتا تھا گویا ان سے کہہ رہا ہو: "If I only chose!" گویا اپنے دوستوں کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کی بہت مانگ ہے۔

تمام الفاظ: عوام کے حقوق، آدمی کے حقوق، معاہدۂ عمرانی، انقلاب فرانس، جمہوریہ، جمہوریت، انسانیت، تمدن، مذہب، ترقی وغیرہ گراں تیر کے نزدیک کوئی خاص معنی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ان پر مسکراتا تھا۔ تشکیک، ذہانت کی بوسیدگی اس کے نزدیک از کار رفتہ چیز تھی۔ وہ طعن و تشنیع میں زندہ رہتا تھا۔ اس کا قول تھا: "یقین بس ایک ہی ہوتا ہے، کہ میرا گلاس بھرا ہے۔" وہ ہر قسم کی دین داری کے مظاہرے پر تمام پارٹیوں پر ناک چڑھاتا تھا؛ وہ باپ ہو، بھائی Robespierre جونیئر ہو یا Loizerolle ہو۔ "یہ سب اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ انھیں مر جانا چاہیے۔" وہ کہتا تھا۔ وہ صلیب کے بارے میں کہتا تھا: "یہ ایک پھانسی کا تختہ ہے جو کامیاب ہوا ہے۔" وہ ایک متر گشت، جواری، آزاد آدمی تھا؛ اکثر نشے میں دھت ہوتا تھا؛ ہر وقت گنگنانے سے نوجوان خواب دیکھنے والوں کو یہ کہہ کر بیزار کرتا رہتا تھا: "J'aimons les filles, et j'aimons le bon vin." Air: Vive Henri IV.

بہر حال، اس زندیق میں ایک شدت پسندی تھی۔ یہ شدت پسندی نہ کوئی اصول تھی، نہ خیال تھی، نہ فن تھی اور نہ سائنس؛ بس ایک آدمی تھا: انجولرا۔ گراں تیر انجولرا کو پسند کرتا تھا، اس سے محبت کرتا تھا اور اس کا احترام کرتا تھا۔ اس بدنظم اور طعنہ زن انسان نے خود کو اس قسم کے کامل لوگوں کے دستے میں کس طرح متحد کیا تھا؟ کامل ترین شخص ہے۔ انجولرا نے اسے کس طرح مطیع کیا تھا؟ اپنے تصورات کے ذریعے؟ جی نہیں، اپنے کردار کے ذریعے۔ عجیب و غریب واقعہ کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک زندیق کا کسی ایمان دار آدمی سے وابستہ ہو جانا تکمیلی رنگوں کے قوانین جیسا سادہ عمل ہوتا ہے، وہ جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کسی نابینا کی طرح روشنی سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ بونا شخص ڈرم میجر سے بہت محبت کرتا ہے۔ مینڈک کی آنکھیں ہمیشہ آسمان پر جمی ہوتی ہیں۔ کیوں؟ تا کہ وہ چڑیا کو اس کی اڑان کے دوران دیکھ سکے۔ گراں تیر جس میں شبہ کروٹیں لے رہا تھا، انجولرا میں بلند ہوتے یقین کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اسے انجولرا کی ضرورت تھی۔ اس کی پرہیز گار، صحت مند، توانا، سچی، سخت، راست باز فطرت نے پوری طرح سمجھے بغیر ہی اسے تسخیر کر لیا تھا۔ وہ جبلت کے ذریعے اپنے مخالف کو پسند کرتا تھا۔ اس کے نرم، مغلوب، بے ترتیب، بیماروں جیسے اور بے وضع تصورات نے ریڑھ کی ہڈی کی طرح خود کو انجولرا سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس کا اخلاقی سہارا اس کی سختی پر انحصار کرتا تھا۔ انجولرا کی موجودگی میں گراں تیر ایک بار پھر کوئی شخصیت بن گیا تھا۔ اس کا اپنا وجود دو عناصر پر مشتمل تھا، جو زاویے میں متضاد تھے۔ وہ طنز آمیز اور پُرجوش انسان تھا۔ اس کی غیر جانب داری پسند کی جاتی تھی۔ اس کا ذہن یقین کے بغیر چل

سکتا تھا، مگر اس کا دل بغیر محبت کے نہیں چل سکتا تھا۔ بہت عمیق تضاد تھا؛ اس کے لیے موانست ایک قسم کا ایقان ہوتی تھی۔ اس کی فطرت اسی طرح بنی تھی۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو پیدائشی اُلٹے ہوتے ہیں، غلط طرف کے ہوتے ہیں، جیسے Pollux, Patrocles, Nisus, Eudamidas, Ephestion, Pechmeja۔ ان کا وجود اس شرط پر ہوتا ہے کہ ان کو دوسرا آدمی سہارا فراہم کرے گا؛ ان کا نام ایک خاتمہ ہوتا ہے، اور جن کے نام سے پہلے ربط کے حروف لکھے جاتے ہیں؛ ان کا وجود اپنا نہیں ہوتا؛ ان کا وجود ایک وجود کا دوسرا رخ ہوتا ہے، جو اُن کا اپنا نہیں ہوتا۔ گرانتیر ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ انجولرا کا عکسِ معکوس تھا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرابتیں حروفِ تہجی سے شروع ہوتی ہیں۔ O اور P حروف کے سلسلے میں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔ آپ چاہیں تو O اور P کو یا Orestes اور Pylades کو الگ الگ پڑھ سکتے ہیں۔

گرانتیر انجولرا کا سچا طفیلی سیارہ تھا، جو نوجوان آدمیوں کے دائرے میں رہتا تھا؛ وہ وہیں رہتا تھا، اسے وہاں کے علاوہ کہیں لطف نہیں ملتا تھا؛ وہ ہر جگہ ان کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ اس کی خوشی اسی میں تھی کہ وہ لوگ وائن سے اٹھنے والے بخارات سے گزر کر جاتے اور آتے تھے۔ وہ لوگ اس کی خوش طبعی کی وجہ سے اسے برداشت کرتے تھے۔

انجولرا یقین کرنے والا، اس زندیق کو حقیر اور خود کو ایک سنجیدہ انسان سمجھتا تھا، اور اس مدہوش کی تضحیک کرتا تھا۔ وہ اس سے ذرا زیادہ ہمدردی کرتا تھا۔ گرانتیر ناقابلِ قبول Pylades تھا۔ انجولرا ہمیشہ اس سے سختی سے پیش آتا تھا اور بے دردی سے جھڑک دیتا تھا؛ اور یہ شخص رد ہو جانے کے باوجود واپس آ جاتا تھا اور انجولرا کے بارے میں کہتا تھا، "کتنا نفیس ماربل ہے۔"

بوسے کے ہاتھوں بلوندو کی تدفین

ایک مخصوص شام جس میں، جیسا کہ آگے چل کر دیکھا جائے گا، کچھ اتفاقیہ واقعات ہوئے تھے، جن میں لیگلے کو Cafe Musain کے دروازے کے قریب نسوانی شکل کے ایک ستون سے شہوانی انداز میں ٹیک لگائے کھڑا دیکھا گیا تھا۔ اس وقت اس کا انداز خام خیالی جیسا تھا۔ اس کی نظریں Place Saint-Michel پر گڑی ہوئی تھیں۔ کسی شے کے سہارے کھڑا ہونا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے گویا وہ سیدھا لیٹا ہوا ہو، جو طریقہ سوچنے اور غور کرنے والوں کو ناپسند نہیں ہوتا۔ لیگلے بغیر اداسی کے کچھ ایک المناک واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دو دن قبل قانون کے اسکول میں ہوا تھا، جس نے اس کے مستقبل کے بارے ذاتی منصوبوں میں تبدیلی کر دی تھی جو بہرحال قدرے غیر واضح تھے۔

خام خیالی کسی گاڑی کو سامنے سے گزرنے سے روکتی نہیں، نہ ہی خام خیالی میں مست انسان گزرنے والی گاڑی پر غور کرنے لگتا ہے۔ لیگلے نے جس کی نظریں منتشر انداز میں ادھر اُدھر پڑ رہی تھیں، اپنی خواب خرامی کے باوصف دیکھا کہ دو پہیوں کی ایک گاڑی اس مقام سے اس طرح آہستہ گزر رہی تھی گویا بظاہر اس کے چلنے کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ یہ چھوٹی سی سواری گاڑی کس کے لیے تھی؟ وہ اس قدر آہستہ کیوں چل رہی تھی؟ لیگلے نے اپنے اطراف پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس گاڑی میں کوچوان کے علاوہ ایک نوجوان آدمی بیٹھا ہوا تھا، اور اس نوجوان آدمی کے سامنے ایک قدرے بڑا سا دبیز تھیلا رکھا ہوا تھا۔ اس تھیلے پر نمائش کے لیے ایک کارڈ سِلا ہوا تھا جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا: ماریئس پوں مرسی۔

اس نام کو دیکھ کر لیگلے نے اپنا انداز بدلا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور سواری گاڑی

میں بیٹھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا، ''موسیو ماریوس پوں مرسی؟''

اس سوال کو سنتے ہی ساری گاڑی رُک گئی۔

نوجوان آدمی نے، جو کسی گہرے خیال میں غرق معلوم ہوتا تھا، اپنی نظریں اٹھائیں:

''جی، فرمایئے؟''

''آپ موسیو ماریوس پوں مرسی ہیں؟''

''یقیناً۔''

''میں آپ ہی کی تلاش میں تھا۔'' لیگلے نے کہا۔

''کیوں بھلا؟'' ماریوس نے سوال کیا؛ اس لیے کہ وہ ماریوس ہی تھا۔ دراصل اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے نانا کا گھر چھوڑا تھا اور اب اس کے سامنے ایک چہرہ تھا جو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ''میں آپ سے واقف نہیں۔''

''میں بھی آپ سے واقف نہیں۔'' لیگلے نے جواب میں کہا۔

ماریوس نے سوچا کہ اس کا کسی مسخرے سے پالا پڑ گیا ہے۔ وہ اس وقت مزاح کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تیوری چڑھا کر اس کی جانب دیکھا۔ لیگلے نے بلا تکلف کہا:

''تم کل اسکول نہیں گئے تھے۔''

''ممکن ہے۔''

''یقیناً۔''

''کیا تم بھی وہیں کے طالب علم ہو؟'' ماریوس نے سوال کیا۔

''ہاں، تمھاری ہی طرح۔ پرسوں میں اتفاق سے اسکول میں داخل ہوا۔ تم جانتے ہی ہو کہ اکثر غیر معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر حاضری لگا رہا تھا۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ ایسے موقعوں پر یہ لوگ بڑے مضحکہ خیز ہو جایا کرتے ہیں۔ تیسری بار نام پکارے جانے پر اگر جواب نہ ملے تو طالب علم کا نام فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے اور ساٹھ فرانک غرق ہو جاتے ہیں۔''

ماریوس نے اب توجہ سے سننا شروع کر دیا تھا۔

''وہ بلوندو (Blondeau) تھا جو حاضری لگا رہا تھا۔ تم تو اسے جانتے ہو گے، وہی جس کی بہت نوکیلی اور کینہ پرور ناک ہے؛ جسے حاضری کے وقت غائب کو نکال باہر کر دینے میں مزہ آتا ہے۔ اس نے عیاری سے حرف P کے ناموں کی ابتدا کی تھی۔ حاضری بُری نہیں تھی۔ کوئی کاٹ چھانٹ نہیں ہو رہی تھی؛ ساری کائنات جمع تھی۔ بلوندو کو دُکھ ہو رہا تھا۔ میں نے خود سے

کہا،'میرے پیارے بلوندو، آج تمھیں کسی کو قتل کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔' اچانک بلوندو نے پکارا 'ماریوس پوں مرسی!' کوئی جواب نہیں آیا۔ امید بھرے بلوندو نے ذرا زیادہ زور سے نام دہرایا، 'ماریوس پوں مرسی!' کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا قلم اٹھایا۔ موسیو مجھ میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں نے خود سے جلدی سے کہا، 'لو، ایک بہادر آدمی تو نکلا جس کا نام کاٹا جانے والا ہے۔ ہوشیار! ایک کھرا آدمی تو نکلا۔ وہ اچھا طالب علم نہیں۔ یہاں تم جیسا کوئی نہیں؛' ایسا طالب علم جو واقعی پڑھتا ہے؛ نا تجربے کار ادیب ہے، الفاظ، دینیات، اور سائنس میں تیز، اور پیشے میں تیز۔ یہ رہا ایک باعزت آرام طلب جو بے مقصد گھومتا پھرتا ہے؛ ملک بھر میں مٹر گشتی کرتا پھرتا ہے؛ رنڈیاں بناتا ہے، خواتین کو رجھاتا ہے؛ جو اس وقت بھی شاید اپنی کسی داشتہ کے پاس ہوگا۔ ہمیں اس کو بچانا چاہیے۔' بلوندو مردہ باد۔ عین اس وقت اس نے اپنا قلم روشنائی میں ڈبویا جو کاٹے ہوئے ناموں سے زیادہ سیاہ ہو گئی تھی، کمرے پر ایک جائزانہ نظر ڈالی، اور تیسرے بار دہرایا، 'ماریوس پوں مرسی!' میں نے جواب دیا 'حاضر جناب!' یہ وجہ ہے کہ تمھارا نام کاٹا نہیں گیا ہے۔''

''موسیو!'' ماریوس نے کہا۔

''اور میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟'' لیگلے نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

''میں تمھیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔'' ماریوس نے کہا۔

لیگلے دوبارہ شروع ہو گیا:

''کوئی بات آسان نہیں ہوا کرتی۔ میں حاضری کا جواب دینے کے لیے میز سے قریب تھا اور نکل بھاگنے کے لیے دروازے سے قریب تھا۔ پروفیسر نے مجھے مخصوص قسم کی شدت کی نظر سے دیکھا اور اچانک بلوندو، جو یقیناً کینہ پرور آدمی ہوگا، جس کی ناک بالکل فرانسیسی شاعر بوالو (Boileau) سے مشابہ تھی، حرف L پر پہنچ گیا۔ L میں میرے نام کا پہلا حرف ہے۔ میرا تعلق Meaux سے ہے اور میرا نام لیگلے ہے۔''

''L'Aigle!'' ماریوس نے لقمہ دیا، ''کتنا اچھا نام ہے!''

''موسیو، پروفیسر بلوندو اس نام پر آ گیا اور پکارا، 'لیگلے'۔ میں نے جواب دیا، ''حاضر جناب!'' بلوندو نے چیتے کی جیسی شرافت سے مجھے گھور کر دیکھا، اور مجھ سے کہا: 'اگر تم پوں مرسی ہو تو تم لیگلے نہیں ہو سکتے۔'' یہ جملہ جو تمھارے لیے بدلحاظ تھا، مگر صرف میرے لیے غمناکی سے پُر تھا۔ یہ کہہ کر اس نے میرا نام کاٹ دیا تھا۔''

ماریوس نے بلند آواز میں کہا، ''میں بہت نادم ہوں جناب۔''

''پہلی بات تو یہ ہے۔'' لیگلے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا'' میں مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے بلوندو کو قصیدے کے چند مصرعوں میں حنوط کر دینے کی اجازت دی جائے۔ میں فرض کر لوں گا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کے دُبلے پن میں، زرد روئی میں، خشکی میں اور بو میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور میں یہ بھی کہوں گا، اے کرۂ ارض کے منصفو، لو دیکھو، بلوندو یہاں لیٹا ہوا ہے، بڑی ناک والا بلوندو، بلوندو Nasica، نظم و ضبط کا بیل، پاس ورڈ کا خوف ناک کتا، حاضری لگانے والا فرشتہ، جو سیدھا سادہ آدمی تھا، سخت ایمان دار اور ڈراؤنا بلوندو۔ جس طرح اس نے میرا نام کاٹا تھا، خدا نے اس کا بھی نام کاٹ دیا ہے۔''

ماریوس نے مزید کہا'' مجھے بہت افسوس ہے۔''

''نوجوان!'' لیگلے دی موک نے کہا'' یہ تمھارے لیے ایک سبق ہے۔ آئندہ ٹھیک رہنا۔''

''میں واقعی تم سے ہزار بار معافی کا طلب گار ہوں۔''

''آئندہ ایسا کام نہ کرنا کہ تمھارے ساتھی کا نام کٹ جائے۔''

''مجھے بے حد افسوس ہے۔''

لیگلے زور سے ہنسا۔

''اب میں بہت خوش ہوں۔ میں وکیل بننے کے قریب تھا۔ اس فارغ خطی نے مجھے بچا لیا ہے۔ میں بار کی کامیابیوں سے دستبردار ہوتا ہوں۔ میں بیوہ سے دغا نہیں کروں گا، میں یتیم پر حملہ نہیں کروں گا۔ اب نہ چغہ ہوگا اور نہ اسٹیج ہوگا۔ میری فارغ خطی میرے لیے اچھی ہے۔ میں تمھارا شکر گزار ہوں، موسیو پوں مرسی۔ مجھے تم سے شکریہ کرنے کے لیے کسی دن تمھارے پاس چل کر آنا پڑے گا۔ تم کہاں رہتے ہو؟''

''اسی گاڑی میں۔'' ماریوس نے جواب دیا۔

''دولت مندی کی نشانی۔'' لیگلے نے پُرسکون انداز میں کہا'' تم کو مبارک ہو۔ تمھیں نو ہزار سالانہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔''

عین اس وقت کیفے سے کوفیراک نمودار ہوا۔

ماریوس اداسی سے مسکرایا۔

''میں نے پچھلے دو گھنٹے کا یہ کرایہ ادا کر دیا ہے، اور میری کوشش ہے کہ اس سے جان چھڑا لوں؛ مگر اس سے ایک قسم کی تاریخ وابستہ ہے، اور مجھے معلوم نہیں کہ مجھے جانا کہاں ہے۔''

''میرے گھر آ جائیے جناب۔'' کوفیراک نے کہا۔

"مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے۔" لیگلے نے اپنا خیال ظاہر کیا، "مگر میرے پاس گھر نہیں۔"

"چپ ہو جاؤ بوسے۔" کوفیراک نے کہا۔

"بوسے" ماریوس نے کہا، "مگر تمھارا نام تو لیگلے تھا۔"

"De Meaux" لیگلے نے جواب میں کہا، "استعارے کے طور پر بوسے۔"

کوفیراک سواری میں بیٹھ گیا۔

"کوچوان!" اس نے کہا "Porte-Saint-Jacques ہوٹل چلو۔"

اور اسی شام ماریوس Porte-Saint-Jacques ہوٹل میں کوفیراک کے کمرے کے برابر والے کمرے میں فروکش تھا۔

۞

ماریوس کی حیرانیاں

چند دنوں کے اندر ماریوس کوفیراک کا دوست بن گیا۔ جوانی فوراً یک جا ہونے اور تیزی سے زخموں کے نشانات بھرنے کا موسم ہوتا ہے۔ کوفیراک کی سوسائٹی میں ماریوس آسانی سے گھل مل گیا تھا جو اس کے لیے یقینی طور پر نئی بات تھی۔ کوفیراک نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس عمر میں چہرہ ہی سب کچھ بتا دیتا ہے۔ الفاظ غیر ضروری ہوا کرتے ہیں۔ ایسے نوجوان بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے چہرے بشرے تک بولتے ہیں۔ لوگ ان کو صرف دیکھ کر ہی جان جاتے ہیں۔

ایک صبح اچانک کوفیراک نے اس سے سوال کرنے شروع کر دیے:

''سیاست کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟''

''خیال؟'' ماریوس نے کہا، اسے یہ سوال کچھ گستاخ سا لگا۔

''تم کون ہو؟''

''ایک جمہوری بونا پارٹی۔''

''بھورے رنگ کے چوہے کی طرح۔'' کوفیراک نے کہا۔

اس سے اگلے دن کوفیراک نے ماریوس کا کیفے Musain میں تعارف کرایا۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی میں کہا، ''مجھے تمھیں انقلاب سے بھی ملانا چاہیے۔'' اور پھر وہ اسے Friends of the A B C میں لے گیا۔ اس کو دوسرے کا مریدوں سے ملایا، ایک سادہ سا لفظ ''شاگرد'' کہتے ہوئے جسے ماریوس سمجھ نہیں سکا تھا۔

ماریوس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ حالاں کہ وہ خاموش اور سنجیدہ تھا،

پھر بھی وہ ہر طرح سے تیار تھا۔

اس وقت تک ماریوس تنہائی پسند اور مائل بہ خود کلامی تھا، اور اپنی عادت اور ذوق دونوں کے مطابق دوسروں کے لیے، اطراف پھرتے مضطرب نوجوانوں کے گروہ والوں کی طرح تھا۔ جلد ہی وہ اپنی ہر قسم کی پیش بندیوں کے باعث لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا، اور ادھر اُدھر کھینچا جانے لگا تھا۔ آزادی اور کام کے وقت ان افراد کے اذہان کی ہنگامہ خیز حرکات نے اس کو ایک گرد باد سا بنا کر رکھ دیا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ مشکل میں ہوتا تو یہ لوگ اس سے اتنی دور بھاگ جاتے کہ ان کو واپس لانا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ اسے فلسفے، ادب، فنی معاملات، تاریخ، مذہب سے متعلق غیر متوقع انداز میں باتیں کرتے سنتے تھے۔ وہ ان کے عجیب پہلوؤں کی جھلکیاں دیکھ لیتا، اور چوں کہ وہ انھیں دوسرے تناسب میں شمار نہیں کرتا تھا اسے پوری طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ سب واقعی بے ترتیب نہیں ہوتی تھی، جو اسے نظر آتی تھی۔ اپنے باپ کے بارے میں اپنے نانا کے خیالات سے بے اعتنائی برتنے کے بعد اس نے خود کو اپنے خیالات پر جما ہوا تصور کر لیا تھا؛ اب بے چینی کے ساتھ اور خود سے اقرار کیے بغیر اسے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ جما ہوا نہیں ہے۔ وہ زاویہ جس سے وہ ہر شے کو دیکھتا تھا اسے نئے سرے سے بے محل نظر آنے لگا تھا۔ ایک مخصوص قسم کے ارتعاش نے اس کے دماغ کے تمام آفاق کو متحرک کر دیا تھا۔ یہ ایک عجیب اندرونی پریشانی تھی، اور یہ عارضہ اسے لگ گیا تھا۔

ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان نوجوان لوگوں کے نزدیک تقدیس کوئی مسئلہ نہیں۔ ماریوس ہر موضوع پر ہر قسم کی غیر معمولی تجاویز سنتا، جو اس کے بزدل ذہن کو الجھن میں ڈال دیتی تھیں۔

ایک دن جب تھیئٹر کا ایک اشتہار لگایا گیا جس میں کلاسیکی المیے کے ایک کھیل پیش کیے جانے کا اعلان تھا، تو باؤریل نے با آوازِ بلند کہا تھا، "بورژوا کا پسندیدہ المیہ مردہ باد۔" اور ماریوس نے کومفیر کو جواب میں کہتے سنا تھا:

"تم غلطی پر ہو باؤریل۔ بورژوا المیہ پسند کرتے ہیں اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آرائشی المیے کے وجود کی بھی وجہ ہوا کرتی ہے، اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ایسکولس کے حکم کے مطابق جو اس کے وجود کے حق پر اعتراض کرتے ہیں۔ فطرت میں بھی ناہموار خطوط ہوتے ہیں؛ تخلیقات میں بھی پہلے سے تیار شدہ تحریفات ہوتی ہیں؛ ایسی چونچ بھی ہوتی جو درحقیقت چونچ نہیں ہوتی، بال و پر جو بال و پر نہیں ہوتے، گھونگھے جو گھونگھے نہیں ہوتے، پنجے جو پنجے نہیں ہوتے؛ درد کی آہ قہقہے کی خواہش کو ابھارتی ہے؛ یہ سب حقیقتیں ہوتی

ہے۔ اب، جب کہ مرغیاں پرندوں میں شمار ہوتی ہیں تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ قدیم المیے کے سامنے کلاسیکی المیہ کیوں نہیں ہو سکتا۔"

کیا یہ اتفاق نہیں کہ ماریس، انجولرا اور کوفیراک کے درمیان Jean-Jacques Roussea اسٹریٹ سے گزرے گا۔

کوفیراک نے اس کا بازو تھام لیا:

"غور سے سنو۔ یہ Platriere اسٹریٹ ہے جو اس غیر معمولی گھرانے کے باعث جو اس پر ساٹھ برس قبل رہا کرتا تھا، اب Jean-Jacques Roussea اسٹریٹ کہلاتی ہے۔ ژاں ژاک (Jean-Jacques) اور تھیریز (Therese) اس خاندان میں شامل تھے۔ وقتاً فوقتاً ان میں چھوٹے چھوٹے بچے پیدا ہوتے رہتے تھے۔ تھیریز ان کی ماں ہوتی تھی اور ژاں ژاک لاوارثوں کی نمائندگی کرتا تھا۔"

اور انجولرا نے کوفیراک کی فہمائش کرتے ہوئے کہا تھا:

"ژاں ژاک کی موجودگی میں خاموشی رہتی ہوگی۔ میں اس شخص کو پسند کرتا ہوں۔ اس نے اپنے بچوں سے انکار کیا تھا، وہ ایک الگ بات ہے؛ مگر اس نے عوام کو گود لے لیا تھا۔"

ان نوجوان لوگوں میں سے کسی کے منھ سے "شہنشاہ" کا لفظ نہیں نکلا۔ صرف ژاں پروویر نے کئی بار نپولین کہا تھا؛ دوسرے تمام لوگوں نے "Bonaparte" کہا تھا۔ انجولرا نے اس لفظ کا تلفظ "Buonaparte" کیا تھا۔

ماریس کو معمولی حیرت ہوئی۔

یہ دانش کی ابتدا تھی۔

۞

کیفے کا عقبی کمرہ

نوجوان آدمیوں کے درمیان ہونے والی باتوں میں سے ایک گفتگو جس میں ماریئس بھی کبھی کبھی شریک ہو جاتا، صحیح معنوں میں اس کے ذہن پر بہت گراں گزرتی تھی۔

یہ گفتگو عام طور پر کیفے Musain کے عقبی کمرے میں ہوتی تھی۔ اس شام ملاقات میں Friends of the A B C کے تقریباً تمام ارکان شامل تھے۔ گیس لیمپ کو بڑے اہتمام سے روشن کیا گیا تھا۔ بغیر کسی شور و غوغا کے مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ انجولرا اور ماریئس کے علاوہ جو پُرسکون تھے، ہر ایک اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہا تھا۔ کامریڈوں کے درمیان ہونے والی گفت گو میں کبھی کبھی پُرسکون بے ترتیبی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ گفتگو کیا تھی؛ ایک قسم کا کھیل تھی، شورش تھی۔ ایک دوسرے پر باری باری الفاظ کی بارش ہو رہی تھی۔ باتیں مختلف موضوعات پر ہو رہی تھی۔

اس کمرے میں، سوائے کیفے کی برتن دھونے والی خاتون Louison کے کسی خاتون کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کو یہاں سے وقتاً فوقتاً "بیت الخلا" میں جانے کی اجازت تھی جہاں وہ برتن دھویا کرتی تھی۔

نشے میں دُھت گرانتیر نے اس کونے کو جہاں وہ بیٹھا تھا، اپنے پھیپھڑے کی پوری طاقت سے مباحثے، تردید اور چیخنے سے ناقابلِ سماعت بنا دیا تھا:

میں پیاسا ہوں! اے فانی لوگو، میں خواب دیکھ رہا ہوں: ہائیڈل برگ کے پیپے پر مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے، اور ان درجنوں جونکوں میں سے ایک میں ہوں جو اسے لگائی جاتی والی ہیں۔ میں پینا چاہتا ہوں۔ میں زندگی کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ زندگی ایک ڈراؤنی ایجاد ہے، مجھے خبر نہیں کس

کی۔ یہ زیادہ دیر نہیں چلتی۔ زندگی میں ہی ایک دوسرے کی گردن توڑ دیتی ہے۔ زندگی تھیٹر کا ایک اسٹیج ہے جس میں چند ہی عملی راستے ہیں۔ مسرت، تبرکات رکھنے کا ایک قدیم صندوق ہے جسے صرف ایک جانب سے پینٹ کیا گیا ہے۔ پادری کہتے ہیں، 'سب کچھ خود نمائی ہے۔' میں اس نیک انسان سے متفق ہوں، جس کا کبھی وجود نہیں تھا، شاید! صفر بالکل برہنہ نہیں ہونا چاہتا؛ اس نے خود کو خود نمائی سے ڈھانپ لیا ہے۔ اے خود نمائی! ہر شے کو بڑے بڑے الفاظ سے چھپانا! باورچی خانہ تجربہ گاہ ہوتا ہے؛ رقاصہ پروفیسر ہوتی ہے؛ قلابازی کھانے والا جمناسٹک کا ماہر ہوتا ہے؛ باکسر مکے باز ہوتا ہے؛ دواساز کیمیا گر ہوتا ہے؛ سر پوش (وِگ) بنانے والا فن کار ہوتا ہے؛ گارے کا ٹوکرا اٹھانے والا معمار ہوتا ہے؛ گھوڑے پر سواری کرنے والا کھلاڑی ہوتا ہے؛ لکڑی کا کیڑا pterigybranche ہوتا ہے۔ خود نمائی کے نیک اور بد، دو پہلو ہوتے ہیں۔ نیک پہلو گند ذہن، شیشے کی تسبیح والا سیاہ فام ہوتا ہے؛ بد پہلو احمق، فلسفی ہوتا ہے اپنے چیتھڑوں سمیت۔ میں ایک پر روتا ہوں اور دوسرے پر ہنستا ہوں۔ اعزازات اور شوکت کیا ہوتی ہیں؛ یہ دونوں عام طور پر pinchbeck [پیتل، تانبے اور جست کا آمیزہ] ہوتے ہیں۔ بادشاہ انسانی فخر کو کھلونا بناتے ہیں۔ [روما کے شہنشاہ] Caligula نے ایک سفارت کار کو گھوڑا بنا لیا تھا؛ چارلس دوئم نے گائے کے گوشت سے ایک سورما (Knight) بنا لیا تھا۔ اپنے آپ کو سفارت کار Incitatus [Caligula کا تیز رفتار گھوڑا] اور بیروٹ Roastbeef میں لپیٹ لیجیے۔ جہاں تک لوگوں کی اصل قدر کا سوال ہے، اب یہ قابل احترام نہیں رہا ہے۔ اس قصیدے کو سنیے جو ایک ہمسایہ اپنے ہمسایے کے لیے لکھتا ہے۔ سفیدی پر سفیدی خطرناک ہوتی ہے؛ اگر للی سوسن بول سکتا تو فاختہ کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہتا۔ کسی دین دار عورت کے بارے میں کسی متعصب عورت کی یاوہ گوئی بچھو اور کالے ناگ سے زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ میں کم علم انسان ہوں ورنہ میں آپ کے سامنے اقوال کے ڈھیر لگا دیتا؛ مگر مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ مثال کے طور پر میں ہمیشہ سے بذلہ سنج رہا ہوں؛ جب میں Gros کا شاگرد تھا، بے کار تصویریں چپکانے کے بجائے سیب چراتا تھا؛ rapin تصویریں بنانے والے کا مددگار کہلاتا ہے rapine اس کی مونث کو کہتے ہیں؛ اپنے لیے بس اتنا ہی؛ اور جہاں تک بقیہ تم لوگوں کا معاملہ ہے، تمھاری قدر و قیمت مجھ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کے کمالات، اعزازات اور معیارات پر طنز و تشنیع کرتا رہتا ہوں۔ ہر اچھی شے کسی نقص کی طرف مائل ہوتی ہے؛ کفایت شعاری کے ڈانڈے طمع سے ملتے ہیں، فیاض انسان مسرف کا پڑوسی ہوتا ہے، بہادر آدمی کی کہنیاں شیخی باز کی کہنیوں

سے رگڑ کھاتی ہیں؛ وہ جو خود کو بڑا دین دار کہتا ہے، تھوڑا سا متعصب بھی ہوتا ہے؛ خوبی میں اتنی ہی خرابیاں ہوتی ہیں جتنی کہ Diogene کی چادر میں سوراخ۔ ہم کس کی تعریف کرتے ہیں، مقتول کی یا قاتل کی، سیزر کی یا بروٹس کی؟ عام طور پر لوگ قاتل کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بروٹس زندہ باد، اس نے قتل کیا! یہ ہے وہ خوبی۔ خوبی کی خرابی منظور، بلکہ پاگل پن بھی منظور۔ عظیم لوگوں پر عجیب قسم کے دھبے بھی ہوتے ہیں۔ بروٹس، جس نے سیزر کو قتل کیا تھا ایک لڑکے کے مجسمے سے پیار کرتا تھا۔ وہ مجسمہ ایک یونانی سنگ تراش نے بنایا تھا، وہی جس نے اس شجیع عورت کا مجسمہ بنایا تھا جسے خوب صورت پیروں والی Eucnemos کہا جاتا تھا، نیرو جسے اپنے سفر میں اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ Strongylion نے دو مجسمے بنائے تھے جس پر نیرو اور بروٹس ایک ساتھ ہو گئے تھے۔ ایک مجسمے سے بروٹس محبت کرتا تھا، دوسرے سے نیرو۔ پوری تاریخ تھکا دینے والی تکرار سے بھری پڑی ہے۔ ایک صدی دوسری صدی کا مضمون سرقہ کرتی ہے۔ Marengo کی لڑائی Pydna کی لڑائی کی نقل کرتی ہے؛ فرانس کے شہنشاہ کی Tolbiac جنگ، اور نپولین کی Austerlitz کی لڑائیاں اسی طرح ہیں جیسے پانی کے دو شفاف قطرے۔ میں فتح کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ فتح کرنے سے زیادہ احمقانہ کوئی شے نہیں ہوتی۔ قائل کر لینے میں بڑی شان ہوتی ہے۔ آپ کسی چیز کو ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ کامیابی پر مطمئن ہونا عام سی بات ہوتی ہے؛ فتح کر لینا نکما پن ہوتا ہے۔ افسوس کہ ہر طرف خود نمائی اور بزدلی ہے۔ ہر شے، حتیٰ کہ قواعد بھی، کامیابی کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ ہوریس کہتا ہے کہ نسلِ انسانی استعمال ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نسلِ انسانی کو حقیر سمجھتا ہوں۔ کیا ہم پارٹی کرنا شروع کر دیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں عوام کی تعریف کرنا شروع کر دوں؟ مہربانی کر کے یہ بتایئے کہ کون سے عوام کی؟ کیا یونانی عوام کی؟ ایتھنز کے، پیرس والوں کے دن لد گئے، Coligny کی طرح ایتھنز کا مدبر Phocion قتل کر دیا گیا، اور جابروں کی اتنی چاپلوسی کی گئی کہ Pisistratus کے بارے میں Anacephorus نے کہا تھا، "اس کے پیشاب پر شہد کی مکھیاں آتی ہیں۔" پچاس برس تک یونان کا سب سے مشہور و معروف قواعد کا ماہر Philetas رہا تھا، جو اتنا نحیف اور اتنا چھوٹا آدمی تھا کہ وہ اپنے جوتوں میں سیسہ بھر لیتا تھا تا کہ ہوا اسے اڑا نہ لے جائے۔ Corinth کے عظیم میدان میں ایک مجسمہ نصب ہے جسے Silanion نے تراشا تھا اور Pliny نے فہرست میں شامل کیا تھا؛ یہ مجسمہ Episthates کی نمائندگی کرتا تھا۔ Episthates کیا کرتا تھا؟ اس نے کسی مشین کو چلانے اور روکنے کا آلہ ایجاد کیا تھا۔ یہ تھا یونان اور اس کی شان و شوکت۔

اب ہم دوسروں کی طرف چلتے ہیں۔ کیا میں انگلستان کی تعریف کروں؟ کیا میں فرانس کی تعریف کروں؟ صرف فرانس کی؟ کیوں؟ پیرس کی وجہ سے؟ میں ابھی ایتھنز کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں۔ انگلستان؟ کیوں؟ لندن کی وجہ سے؟ مجھے [حال کے ملک تیونس کے شہر] Carthage سے نفرت ہے۔ اس کے بعد، لندن، عیش وعشرت کا گڑھ، جو بدنصیبی کا مرکز بھی ہے۔ صرف چیئرنگ کراس کے علاقے میں ہر سال ایک سو آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں۔ یہی حال Albion کا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ میں نے وہاں گلابوں کے ہار اور نیلے چشمے پہنے عورتوں کو رقص کرتے دیکھا ہے۔ تو ایک انجیر انگلستان کے لیے بھی۔ مجھے جان بُل پسند نہیں، تو کیا میں برادر جوناتھن کی تعریف کروں؟ ہمیں اس غلام رکھنے والے سے زیادہ دل چسپی نہیں۔ ضائع کیا جانے والا وقت دولت ہوتا ہے؛ انگلستان میں کیا بچا ہے۔ روئی سب سے اہم ہوتی ہے، روئی چھین لیجیے، تو امریکا میں کیا بچے گا؟ جرمنی ژلال (lymph) ہے؛ اطالیہ صفرا (bile) ہے۔ کیا روس کے معاملے میں ہم بالکل بے خود ہو جائیں؟ والٹیر اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ چین کو بھی پسند کرتا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ روس کا اپنا حسن ہے، اور خوب صورتی کے علاوہ ایک ضدی مطلق العنانی بھی؛ مگر مجھے مطلق العنان لوگوں پر رحم آتا ہے۔ اُن کی بیماریاں پیچیدہ ہیں۔ ایک سر کٹا Alexis؛ ایک تنجر زدہ پیٹر؛ ایک پھانسی پایا ہوا پال؛ ایک اور پال جس کو ٹھوکریں مار مار کر فراش کر دیا گیا تھا؛ Ivans کے غوطہ خور پھانسی پر لٹکائے گئے؛ ان کے گلے کاٹے گئے؛ کئی نکولاس اور بیسل زہر دے کر مار دیے گئے؛ یہ سب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ روس کے سارے شہنشاہ واضح طور پر بیمار ذہنیت والے ہیں۔ سارے متمدن لوگ صاحبانِ فکر کو یہ تفصیلات مہیا کرتے ہیں؛ جنگ؛ اب جنگ، مہذب جنگ تھکا دیتی ہے اور Mont Jaxa کی وادیوں کے غارت گر Comanche قبیلے کے جنوبی امریکی انڈین لوگوں تک، ہر قسم کی شدت پسندی کا خلاصہ پیش کر دیتی ہے۔ 'افسوس کی بات ہے' تم مجھ سے کہو گے کہ 'یورپ تو ایشیا سے یقینی طور پر بہتر ہے؟' میں مانتا ہوں کہ ایشیا ایک دھوکا ہے؛ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم، مغرب کے لوگ، جنھوں نے ملکہ ازابیلا کی گندی شمیض سے، Dauphin کی خواب گاہ کی کرسی سے، شاہی کی تمام شاہانہ پیچیدگیوں تک، ہر شے کو اپنے فیشن اور اپنی نفاستوں سے خلط ملط کر دیا ہے؛ کس بنا پر عظیم لاما پر ہنستے ہو؟ نسلِ انسانی کے معزز حضرات، میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ برسلز وہ جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ بیئر پی جاتی ہے؛ اسٹاک ہوم میں برانڈی سب سے زیادہ پی جاتی ہے؛ میڈرڈ میں سب سے زیادہ چاکلیٹ کھائی جاتی ہے؛

ایمسٹرڈیم میں سب سے زیادہ غلے سے کشید کی ہوئی شراب، لندن میں سب سے زیادہ انگور کی شراب، قسطنطنیہ میں سب سے زیادہ کافی، پیرس میں ناگ دانے سے بنی شراب پی جاتی ہے۔ یہ ہیں وہ سارے نظریات۔ مختصر یہ ہے کہ پیرس ان میں سب سے آگے ہے۔ پیرس میں تو چیتھڑے چننے والے بھی اطالوی ہوتے ہیں؛ Piraeus کے فلسفی ہونے سے بہتر ہے کہ Diogenes Place Maubert میں چیتھڑے چننے والے ہوتے۔ اور سنیے؛ چیتھڑے چننے والوں کی وائن کی دکانیں، چاپس (chops) کہلاتی ہیں؛ ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ saucepan اور مذبح کہلاتی ہیں۔ اس طرح جائے کے باغات، گانے کی سوسائٹیاں، عوامی شراب خانے، شراب کی دکانیں، ریستوران، رقص گاہیں، چیتھڑے چننے والوں کی bibines، خلفا کی کارواں سرائے بھی ہیں؛ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں شہوت پرست ہوں؛ میں Richard's میں چالیس سو فی نفر کھانا کھاتا ہوں؛ میرے پاس برہنہ قلوپطرہ کو لٹانے کے لیے ایرانی قالین ہونے چاہئیں، مگر قلوپطرہ ہے کہاں؟ اوہ! سو یہ تم ہو؛ Louison؛ السلام علیکم۔"

ضرورت سے زیادہ مدہوش گرانتیر نے یہ سب کہا؛ تقریر کی اور برتن دھونے والی کو کیفے Musain کے عقبی کمرے کی راہداری میں پکڑ لیا تھا۔

بوسے، اس کی جانب لپکا، اس کو خاموش کرنے کی کوشش کی، اور گرانتیر اس بھی زیادہ خراب کیفیت میں شروع ہو گیا:

"Meaux کے لیگڑے، تمھارے پنجے مردہ باد۔ تم [بابائے ادویات] بقراط کی طرح Artaxerxes کو نوادر سے محروم کر کے مجھ پر رعب نہیں جما سکتے۔ مجھے سکون پہنچانے کی کوشش کرنے پر میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ مزید یہ کہ میں اس وقت بہت افسردہ ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو، کہ میں تم سے کیا کہوں؟ انسان شیطان ہے، انسان بدشکل ہے، تتلی کامیابی ہے، انسان ناکامی ہے۔ خدا نے [معاذ اللہ] اس جانور کو بنانے میں غلطی کی ہے۔ مجمع بدصورتی کا انتخاب پیش کرتا ہے۔ سب سے پہلے آنے والا بدنصیب ہوتا ہے۔ لفظ Femme [عورت] infame، یعنی، بدنامی کا ہم آواز [قافیہ] ہے۔ ہاں، میرے اندرون میں تلی ہے، مگر اداسی، دلیں گلن، اور مراقیت سے پیچیدہ ہو گئی ہے۔ میں آزردہ ہوں؛ مجھے غصہ آتا ہے؛ میں جماہی لیتا ہوں؛ میں اکتا گیا ہوں، میں موت کی حد تک تھک چکا ہوں؛ اور میں احمق بھی ہوں۔ خدا جانے اور شیطان جانے۔"

"اب خاموش بھی ہو جاؤ بڑے R!" بوسے نے کہا، جو پس منظر میں ایک قانونی معاملے پر گفتگو کر رہا تھا، اور جس نے عوامی قانونی زبان کے ایک جملے کے ساتھ کمر کمر پانی میں

چھلانگ لگا دی تھی جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

"اور جہاں تک میرا سوال ہے، اگرچہ میں بہت زیادہ قانونی آدمی نہیں ہوں، اور زیادہ سے زیادہ وکیل ہوں، میں اس پر اصرار کروں گا کہ نارمنڈی کی روایات کے مطابق ہر سال لارڈ میئر کے منافعے کے برابر ایک رقم سینٹ مائیکل کو دی جانی چاہیے؛ دوسروں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا چاہیے، جن میں تمام مالکان، اور وہ بھی شامل ہوں گے جن کی وراثت چھین لی گئی ہے، اور اس کا اطلاق emphyteuses پر بھی ہو[وہ حق جو کسی غیرمنقولہ جائیداد پر اس شرط پر دیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت بھی کی جائے گی، اس سے کمایا بھی جائے گا، اور اس سے کچھ آمدنی کی توقع بھی کی جائے گی]، پٹے پر ہو، ملکیت پر ہو، معاہدوں پر ہو اور رہن کی جانے والی جائیدادوں پر ہو—"

"اے افسردہ نازنین، کچھ تو بول۔" گرانتیر نے گنگناتے ہوئے کہا۔

گرانتیر کے قریب ایک تقریباً خاموش میز پر، کاغذ کا ایک ورق اور برانڈی کے دو جام کے درمیان ایک دوات اور ایک قلم رکھا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ موسیقی کے ایک ہفت رنگی تماشے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔

اس معاملے پر دھیمی آواز میں گفتگو کی جا رہی تھی، اور دوسرے لوگ ایک دوسرے کے قریب کام کر رہے تھے، "ہمیں ناموں کی تلاش سے ابتدا کرنی چاہیے۔ آپ کے پاس نام ہو تو موضوع بھی مل جاتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لکھاؤ، میں لکھتا جاؤں گا۔"

"موسیو Dorimon۔"

"آزاد آدمی؟"

"بلاشبہ۔"

"اس کی بیٹی، Celestine۔"

"اس کے بعد۔"

"کرنل Sainval۔"

"Sainval بہت ڈھیلا آدمی ہے۔ اس کے بدلے میں کہوں گا Valsin۔"

ہفت رنگی تماشے کے آرزومندوں کے علاوہ بھی ایک اور گروہ تھا جو شور وغل کے بہانے دھیمے انداز میں بات کرنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، دست بدست لڑائی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ تیس برس کی عمر کا ایک شخص اٹھارہ برس کے ایک نوجوان کو سمجھا رہا تھا، اور تشریح کر

رہا تھا کہ اسے کس قسم کے دشمن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ارے احمق؛ خود ہی دیکھ لے نا! وہ بہت اچھا تیغ آزما ہے۔ اس کا کام صفائی سے ہوتا ہے۔ وہ حملہ کرتا ہے، نہ تیکھل کرتا، نہ کلائی پکڑتا، نہ ٹکر مارتا، نہ چمک دکھاتا، بس نمائش کرتا، حسابی انداز میں وار خالی دیتا۔ یاد رہے کہ وہ بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے۔

مخالف زاویے پر گرانتیر، شولی اور باؤریل وغیرہ dominoes کھیل رہے تھے، اور محبت کی باتیں کر رہے تھے۔

''تم واقعی بڑے خوش قسمت انسان ہو۔'' باؤریل کہہ رہا تھا، ''تمھاری ایک داشتہ بھی ہے اور وہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔''

''یہ اس کی غلطی ہے۔'' شولی نے جواب دیا، ''داشتہ ہنستی ہے تو غلطی کرتی ہے۔ اس کے باعث لوگ اسے دھوکا دینے کی کوشش کریں گے۔ اس کو خوش دیکھ کر پشیمانی دور ہو جاتی ہے؛ اگر وہ افسردہ نظر آئے تو تمھارا ضمیر ملامت کرے گا۔''

''تم ناشکرے ہو! ہنستی رہنے والی عورت کتنی اچھی چیز ہوتی ہے۔ اس سے کبھی لڑائی نہیں ہوتی۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آپس میں معاہدہ کر رکھا ہے۔ اپنے مقدس اتحاد کے وقت ہم نے اپنی اپنی سرحدیں متعین کر لی تھیں، ہم جنھیں کبھی پار نہیں کرتے۔ جو ہماری سرحد کے اندر ہو وہ Vaud کا ہوتا ہے، اور دوسری جانب والا Gex اسی لیے ہمارے درمیان امن رہتا ہے۔''

''امن خوشی کا باعث ہوتا ہے۔''

''اور تم، Jollly، میم زیل کے چنگل میں کیسے رہتے ہو — تم سمجھ گئے ہو گے کہ میرا مطلب کیا ہے؟''

''وہ بڑے ظالمانہ انداز میں مجھ سے ناراض ہو جاتی ہے۔''

''پھر بھی تم عاشق ہو، اور تمھیں خاموشی سے اس کا دل نرم کرنا پڑتا ہے۔''

''افسوس۔''

''میں تمھاری جگہ ہوں تو اس کو اکیلا چھوڑ دوں۔''

''کہنا بہت آسان ہوتا ہے۔''

''اور کرنا بھی! ارے ہاں، اس کا نام Musichetta تو نہیں؟''

''ہاں میرے پیارے باؤریل، وہ لاجواب لڑکی ہے، بہت پڑھی لکھی، چھوٹے پاؤں

والی، چھوٹے ہاتھوں والی، اچھے کپڑے پہنتی ہے، سفید فام ہے، چاہ زنخداں والی، اور قسمت کا حال بتانے والوں جیسی آنکھیں ہیں اس کی۔ میں اس کا دیوانہ ہوں۔"

"پیارے دوست! اس کو خوش رکھنے کے لیے تمھیں خوش وضع ہونا چاہیے۔ اپنے گھٹنوں کے اثرات استعمال کرنے چاہئیں۔ Staub کی دُکان سے اچھا سا پتلون خرید لو۔ بہت کام آئے گا۔"

"کس قیمت پر؟" گرامتیر نے چیخ کر کہا۔

ادھر، تیسرے کونے میں، ایک شاعرانہ بحث چل رہی تھی۔ بُت پرستی اور عیسائی اساطیر میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ سوال اُلمپس کے بارے میں تھا، ژاں پرووپر محض رومانویت کی بنا پر جس کی طرف داری کر رہا تھا۔

صرف آرام کی کیفیت میں ژاں پرووپر بزدلی دکھاتا تھا۔ ایک بار جوش میں آجاتا تو پھٹ پڑتا تھا؛ اس کے اندر ایک قسم کی خوشی تھی جو اس کی پُر جوشی کو بڑھا دیتی تھی؛ اور ایک ہی وقت میں وہ ہنستا بھی تھا اور گانے بھی لگتا تھا۔

"ہمیں خداؤں کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے کہا "خدا شاید ابھی رخصت نہیں ہوئے ہیں۔ مُردے جیسا عطارد مجھے متاثر نہیں کرتا۔ تم کہتے ہو کہ خدا خواب ہوتے ہیں، مگر فطرت میں بھی، جیسی کہ آج بھی ہے، ان خوابوں سے جنگ کے بعد، ہمیں اب بھی بڑی قدیم بُت پرستی کی وہی باتیں ملتی رہتی ہیں۔ فلاں اور فلاں پہاڑ، قلعے جیسا، وہ اب بھی پہاڑ کی چوٹی Vignemale کی طرح، مثال کے طور پر، [اناطولیائی دیوی]Cybele کا سر پوش نظر آتا ہے۔ ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا جا سکا ہے کہ [مویشیوں اور جنگلوں کا دیوتا] Pan رات کے وقت بید مجنوں کے درختوں کے کھوکھلے تنوں میں اپنی سانس بھرنے اور اپنی انگلیوں سے سارے سوراخ بند کرنے کے لیے نہیں آتا ہے، اور جیسا کہ میں نے ہمیشہ سمجھا ہے کہ Io[شمالی امریکا کے انڈین لوگوں] کا Pissevache کے آبشار سے کوئی واسطہ رہا ہے۔"

آخری کونے والے لوگ سیاست پر باتیں کر رہے تھے۔ وہی فرمان جو جاری کیا گیا تھا، بری طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔ کامفیر اس کو کم زوری سے سنبھال رہا تھا۔ کامفیر تن دہی سے اس میں دراڑ ڈال رہا تھا۔ میز پر Touquet فرمان کی ایک نقل پڑی ہوئی تھی۔ کامفیر نے اسے چھینا تھا اور اس کو دکھا رہا تھا، ساتھ ہی اس کاغذ کے ٹکڑے کی کھڑکھڑ کی آواز میں اپنے دلائل ملاتا جا رہا تھا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی بادشاہ نہیں رکھوں گا؛ اگر یہ صرف معاشی نقطۂ نظر سے ہے تو مجھے کسی کی ضرورت نہیں؛ بادشاہ طفیلی کیڑا ہوتا ہے۔ بادشاہ مفت میں نہیں ملتا۔

بادشاہ کی گرانی کے بارے میں بھی سُن لو فرانسوا اول کے انتقال کے بعد فرانس کا قومی قرضہ تیس ہزار لیورے کی آمدنی کے برابر رہ گیا تھا؛ لوئی چہاردہم کی موت کے بعد، یہ قرضہ دو بلین، چھ سو ملین ہوگیا تھا، جو Desmarets کے مطابق 1760ء میں چار بلین پانچ سو ملین تھا، آج کے حساب سے جو بارہ بلین کے برابر ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں کامفیر کو برا نہیں کہہ رہا ہوں؛ کسی بے چارے تمدن کے لیے صرف فرمانِ شاہی کا اعلان ہی کافی نہیں ہوتا۔ تبدیلی کو بچانے کے لیے، گزرتے وقت کو آسان کرنے کے لیے، لگنے والے جھٹکے کو ختم کرنے کے لیے، قوم کو، آئینی کہانیوں کے استعمال سے، ایک شاہی سے دوسری شاہی تک بتدریج جانے کے لیے — وہ کون سی قابلِ نفرت وجوہ ہوتی ہیں؟ نہیں، نہیں! عوام کو جھوٹے اجالوں سے روشن خیال بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ آئینی تجوری میں رکھے اصولوں کی قدر کم ہوتی جاتی ہے، اوران کا رنگ زرد پڑجاتا ہے۔ [لہٰذا] نہ خلافِ قانون جانا چاہیے، نہ مصالحت کرنی چاہیے اور بادشاہ سے عوام کے لیے کوئی بخشش نہیں لینی چاہیے۔ ان ساری بخششوں کے سلسلے میں ایک چودھویں شق بھی ہوتی ہے۔ اسی ہاتھ میں، جو دیتا ہے، ایک پنجہ بھی ہوتا ہے جو بخشش کو واپس چھین لیا کرتا ہے۔ میں تمھارے فرمان کو یک لخت مسترد کرتا ہوں۔ فرمان ایک نقاب ہوتا ہے؛ اس کے نیچے فریب تاک میں رہتا ہے۔ وہ عوام جو فرمان کو قبول کر لیتے ہیں، دراصل اپنے حق سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ قانون صرف قانون ہوتا ہے بہ شرطے کہ مکمل ہو۔ نہیں، ہمیں کوئی فرمان نہیں چاہیے۔

وہ سردی کا موسم تھا؛ آتش دان میں دو چار لکڑیاں پڑی چیخ رہی تھیں۔ یہ ایک قسم کی ترغیب تھی، اور کامفیر مزاحمت نہیں کر سکا۔ اس نے بے چارے Touquet فرمان کو اپنی مٹھی میں لے کر مروڑ کر آگ میں ڈال دیا۔ کاغذ جل اٹھا۔ کامفیر لوئی ہشت دہم کے شاہکار کو جلتے دیکھ رہا تھا اورفلسفیانہ انداز میں یہ کہہ کر خود کو تسلی دے رہا تھا:

"فرمان کی شعلوں میں کایا پلٹ ہو رہی ہے۔"

اور طنزیات، تاخت، مزاح، وہ فرانسیسی انداز جس کو ہیئت میں تبدیلی کہتے ہیں، جسے انگریزی میں مزاح کہتے ہیں، اچھے اور بُرے انداز میں، اچھے اور بری وجوہ کی بنا پر، بات چیت کی تمام بے لگام آتش بازی بن کر، کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے سروں پر بمباری کر رہے تھے۔

اُفق کی توسیع

نوجوان دماغوں کی قابلِ تعریف خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جھٹکے لگنے کے باجود ان میں سے نہ چنگاریاں نکلنے کے امکانات ہوتے ہیں، نہ کسی رُبانی جھماکے کے۔ تو اس کیفیت میں ان میں سے کیا نکل سکتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ بس کسی نرم احساس سے قہقہے کا ایک طوفان شروع ہو جاتا ہے۔

مذاق کے وقت، ان میں ایک قسم کی سنجیدگی داخل ہو جاتی ہے۔ تحریکات کا انحصار پہلے کسی اتفاقیہ لفظ پر ہوتا ہے۔ ہر لفظ کا جذبہ شاہانہ ہوتا ہے، اور مزاح غیر متوقع میدان وا کر دیتا ہے۔ یہی وہ بے ربط باتیں ہوتی ہیں جن کا منظر نامہ اچانک تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسی باتوں میں اتفاق ہی سب کچھ کرتا ہے۔

ایک شدید خیال، جو الفاظ کے ٹکراؤ سے عجیب انداز میں شروع ہوا تھا، اچانک ایسی باتوں میں تبدیل ہو گیا جس میں گرانتیر، باؤریل، پروویر، بوسے، کامفیر اور کوفیراک پریشان ہو کر اپنا اپنا بچاؤ کرنے لگے تھے۔

کسی گفتگو میں کوئی جملہ کس طرح ابھر آتا ہے؟ اور جب آجاتا ہے تو اچانک سننے والوں کی توجہ پر کس طرح اثر انداز ہونے لگتا ہے؟ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس شور وغل کے درمیان بوسے نے اچانک مندرجہ ذیل تاریخ کے ذریعے کامفیر کے دیے ہوئے وقفے کو ختم کر دیا تھا۔

"واٹرلو، 18 جون 1815ء"

واٹرلو کا نام سنتے ہی، ماریوس نے جو میز پر، پانی سے بھرے گلاس کے قریب اپنی کہنیاں ٹکائے بیٹھا تھا، کلائی اپنی ٹھوڑی سے ہٹائی اور سننے والوں کو گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔

"Pardieu" کوفیراک نے کہا [اس زمانے میں "بخدا" (Parbleu) کا استعمال ختم ہو رہا تھا] "یہ 18 تاریخ حیرت انگیز ہے، اور مجھے عجیب سی لگ رہی ہے۔ یہ بوناپارٹ کا مہلک نمبر ہے۔ لوئی کو سامنے رکھو اور Brumaire کو عقب میں، اور تمھیں اس آدمی کا پورا مقدر نظر آ جائے گا، اس کے ساتھ ہی اس کی خصوصیت بھی معلوم ہو جائے گی، اور یہ بھی کہ اس کا اختتام اس کی ابتدا کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

انجولرا نے، جو اس نکتے پر بالکل چپ رہا تھا، خامشی توڑی اور کامفیر سے یوں مخاطب ہوا، "تمھارا مطلب ہے، جرم اور اس کی تلافی۔"

لفظ جرم وہ حد عبور کر گیا تھا جسے ماریوں قبول کر سکتا تھا، مگر واٹر لو کے نام کے اچانک ابھر آنے پر وہ مشتعل ہو گیا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فرانس کے نقشے کی طرف چلا جو دیوار پر لگا ہوا تھا، جس کے نچلے حصے میں موجود ایک جزیرہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اس مقام پر اپنی انگلی رکھی اور کہا، کارسیکا، ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، جس نے فرانس کو بہت عظیم بنا دیا ہے۔" یہ جملہ برفیلی ہوا جیسا تھا۔ سب خاموش ہو گئے۔ انھیں احساس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

باؤریل جس کا ذہن بوسے کو جواب دیتے ہوئے کہیں اور بھٹک رہا تھا، خاموش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

انجولرا نے، جس کی نیلی آنکھیں کسی ایک پر مرکوز نہیں تھیں، جو شاید خلا میں گھور رہا تھا، ماریوں پر نظر کیے بغیر جواب دیا، "فرانس جزیرۂ کارسیکا کو عظیم نہیں ہونے دینا چاہتا۔ فرانس خود عظیم ہے، اس لیے کہ وہ فرانس ہے۔ اس لیے کہ وہ خود شیر ہے۔"

ماریوں کو پسپائی کی کوئی خواہش نہیں تھی؛ وہ انجولرا کی طرف متوجہ ہوا، اور اس کی آواز جو خود اس کے لرزاں وجود سے آ رہی تھی پھٹ پڑی تھی:

"خدا نہ کرے کہ میں فرانس کو کمتر سمجھوں، مگر نپولین کو اس میں شامل کرنا اس کو کمتر کرنا نہیں ہوگا۔ آؤ، ہم اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں۔ میں تمھارے گروہ میں نو وارد ہوں، مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ تم مجھے حیرت زدہ کر دیتے ہو۔ ہمارا مقام کیا ہے؟ ہم کون ہیں؟ تم کون ہو، میں کون ہوں؟ ہم شہنشاہ کے بارے میں توضیح پیش کرتے ہیں۔ میں تمھیں شہنشاہ کو بوناپارٹ (Buonaparte) کہتے سنتا ہوں، اور تم u کے حرف کو شاہ پرستوں کی طرح ادا کرتے ہو۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کی میرا نانا اسے بہتر طریقے سے ادا کرتا ہے؛ وہ بوناپارٹ کہتا ہے۔

میں سمجھا تھا کہ تم نوجوان لوگ ہو۔ تمھاری پُر جوشی کہاں چلی گئی؟ تم اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو؟ اگر تم شہنشاہ کو پسند نہیں کرتے، تو کس کو پسند کرتے ہو؟ اور مزید کیا چاہتے ہو؟ اگر تمھارے پاس عظیم لوگوں میں ایک بھی نہیں، تو تم کیسے عظیم لوگ چاہو گے؟ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ وہ مکمل شخص تھا۔ اس کے دماغ میں انسانی دانش کا نچوڑ تھا۔ اس نے [بازنطینی شہنشاہ اوّل] Justinian جیسے رمز ایجاد کیے تھے؛ وہ سیزر کی طرح حکم دیتا تھا؛ اس کی گفتگو میں پاسکال کی روشنی کے جھماکے اور [روما کی سلطنت کے مؤرخ] Tacitus کی گرج ہوتی تھی؛ اس نے تاریخ بنائی بھی اور لکھی بھی تھی؛ اس کی اطلاعات [ہومر کی رزمیہ نظم] Iliads ہیں؛ اس نے نیوٹن کے صفر کو محمد کے استعارے سے ملا دیا تھا؛ اس نے اہرام مصر جیسے بڑے مشرقی الفاظ پیچھے چھوڑ دیے تھے؛ Tilsit کے مقام پر وہ شہنشاہوں کی جلالت کی تعلیم دیتا تھا؛ سائنس کی اکادمی میں اس نے [ریاضی داں] Laplace کو جواب دیا تھا؛ ریاست کی کاؤنسل میں اس نے اپنے خلاف Merlin کو پیش کیا تھا؛ اس نے پہلے کی اقلیدس میں روح بھر دی تھی؛ آخری والے کی فریب کاری کے لیے ماہر قانون تھا اور وکیلوں کے ساتھ وہ ماہر فلکیات تھا؛ کراموبل کی طرح اس نے دو قندیلوں میں سے ایک کو بجھا دیا تھا اور ایک پردے کی جھالر کا مول تول کرنے مندر میں گیا تھا؛ اس نے سب کچھ دیکھا تھا؛ وہ سب کچھ جانتا تھا؛ کسی شے نے اسے اپنے چھوٹے سے بچے کے پالنے کے قریب خوش دلی سے ہنسنے سے روک دیا تھا؛ اور اچانک خوف زدہ یورپ اس کی بات سننے لگا؛ فوجیں حرکت میں آ گئیں؛ توپ خانوں کے احاطوں میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی؛ دریاؤں پر کشتیوں کے پُل بننے لگے؛ گھڑ سواروں کے پرے بادل کے طوفان بن کر سرپٹ دوڑنے لگے؛ چیخیں ہونے لگیں؛ بگل بجنے لگے؛ ہر سمت شاہی تخت لرزنے لگے؛ نقشوں پر بادشاہتوں کی سرحدیں آگے پیچھے ہونے لگیں؛ کسی سپر ہیومن کی تلوار کی نیام سے نکلنے کی آواز آنے لگی؛ انھوں نے اسے دیکھا، اٹھتے ہوئے، اپنے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹھی لیے اُفق پر ایستادہ ہوتے، آنکھوں میں چمک لیے، گرج کے درمیان آشکار ہوتے، اپنے دو بازوؤں، شان دار فوج، اور پرانے گارڈ کے ساتھ، اور وہ جنگ کا سب سے بڑا فرشتہ بن گیا تھا۔"

سب خاموش تھے اور اُنجولرا اپنا سر جھکائے تھا۔ خاموشی ہمیشہ رضامندی جیسے اثرات پیدا کرتی ہے اور دشمن کو آخری حد تک لے جاتی ہے۔ ماریوس بڑھتی ہوئی پُرجوشی کے ساتھ، اور تقریباً سانس کا وقفہ لیے بغیر، کہتا چلا گیا، "پیارے دوستو! ہمیں انصاف پسند ہونا چاہیے۔ اس قوم کی کتنی شان دار قسمت ہوگی جو ایسے شہنشاہ کی سلطنت میں ہوگی، جب کہ وہ قوم فرانس ہو، جہاں وہ اپنے

جوہر قابل کو اس انسان کے جوہر قابل سے ملا دے۔ تا کہ وہ انسان ظاہر ہو اور حکومت کرے؛ فتوحات کی طرف پیش قدمی کرے؛ تمام دارالحکومتوں میں قیام کرے؛ ہاتھ سے گولا پھینکنے والے سپاہیوں کو ساتھ لے جائے اور ان کو بادشاہ بنا دے؛ خاندانوں کے زوال کے فیصلے کرے، اور حملے جیسی تیزی سے یورپ کی شکل بدل دے؛ اور تمھیں یہ احساس دلائے کہ جب تم دھمکی دیتے ہو تو تمھارا ہاتھ خدائی تلوار کے دستے پر ہوتا ہے؛ تم ایک فرد واحد، یعنی عل، سیزر، شارلیمین کی پیروی کرو؛ تم ان عوام میں سے ہو جو تمھارے سویروں کو جیتی ہوئی جنگ کے چونکا دینے والے اعلان سے خلط ملط کر دیتے ہیں، تا کہ معذور لوگوں کی توپیں تمھیں سویرے سویرے جگا دیں؛ تا کہ تم کو بلکے اور انوکھے الفاظ کے پاتال میں پھینک دیا جائے جو ہمیشہ Marengo, Arcola, Austerlitz, Jena, Wagram کی لڑائیوں کو روشن کر دیتے ہیں۔ صدیوں کی فتوحات کی بلندیوں کی کہکشاں کے نقطۂ عروج کے حرکت میں آنے کے لیے، فرانسیسی سلطنت کو رومی سلطنت کے گلے کا ہار بنائے؛ تمھاری قوم ایک بڑی قوم بنے اور ایک شان دار فوج پیدا کرے؛ اور اس کے دستوں کو پورے کرۂ ارض پر اس طرح پہنچا دے جیسے کوئی سلسلۂ کوہ اپنے عقابوں کو ہر طرف فتوحات کرنے، حاوی ہو جانے، بجلی کی سی سرعت سے حملہ کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ تا کہ وہ یورپ میں ایک شان دار قوم کی صورت رہے؛ تا کہ وہ دنیا کو دوبارہ فتح کرے، ایسی فتح کے اور چکاچوند کے ذریعے جو ارفع ہوتی ہے؛ وہاں اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوگی؟

"رہنے کی آزادی۔" کامفیر نے کہا۔

اپنی باری آنے پر ماریوس نے اپنا سر جھکا لیا؛ وہ سرد اور سادہ لفظ فولاد کے پھل کی طرح اس کی رزمیہ فضول گوئی کے آر پار ہو گیا تھا، اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کے اندر غائب ہوتا جا رہا ہے۔ جب اس نے اپنی نظریں اٹھائیں تو کامفیر وہاں موجود نہیں تھا۔ غالباً تقدلیس کے بارے میں اس کے جواب سے مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا تھا، اور سوائے انجولرا کے، سب اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ وہ کمرہ خالی ہو گیا تھا۔ وہاں ماریوس کے ساتھ انجولرا رہ گیا تھا اور وہ ماریوس کو سنجیدگی سے گھور رہا تھا۔ ماریوس نے، جو کسی حد تک اس کے خیالات سے متفق تھا، خود کو ہارا تصور نہیں کیا؛ اس کے اندر اسے اندرونی کابلی کے آثار نظر آ رہے تھے، جو اسے انجولرا کے خلاف صف آرا قیاس میں تبدیل کر رہے تھے، کہ اچانک انھیں زینے پر جاتے ہوئے کوئی گاتا سنائی دیا۔ وہ کامفیر تھا، اور یہ ہیں وہ اشعار جو وہ گا رہا تھا:

اگر سیزر مجھے شہرت دیتا اور جنگ دیتا اور اس کے عوض مجھے اپنی ماں کی

محبت چھوڑنی پڑتی تو میں عظیم سیزر سے کہہ دیتا، کہ لے جا اپنا عصائے سلطانی اور اپنا تختِ حکمرانی؛ کہ مجھے اپنی ماں کی محبت زیادہ عزیز ہے۔"

جس وحشی تکبرزدہ لہجے میں کامفیر گا رہا تھا، اس نے ان اشعار میں ایک قسم کی حیرت انگیز شان وشوکت بھر دی تھی۔ کسی سوچ میں غرق ماریوس کی نظریں چھت سے لگی تھیں اور وہ میکانکی انداز میں گیت کے الفاظ دہراتا جا رہا تھا:

"میری ماں؟——"

عین اسی وقت اس نے اپنے کاندھے پر انجولرا کا ہاتھ محسوس ہوا۔

"اے باشندے!" انجولرا نے اس سے کہا:

"میری ماں تو جمہوریہ ہے۔"

❂

رے انگستا

(RES ANGUSTA)

اس شام ماریوس بہت پریشان تھا اور اس کا نفس ایک غم زدہ پرچھائیں کے مانند ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے اسی قسم کا احساس ہو رہا تھا جیسا کہ زمین پر ہل چلاتے وقت ہوتا ہے تا کہ اس میں اناج کے بیج ڈالے جا سکیں؛ اس وقت صرف زخم کا احساس ہوتا ہے، اس میں سے نکلنے والے انکھوے کی لرزش اور پھل کے نکلنے کی خوشی بعد میں ہوتی ہے۔

ماریوس بہت مغموم تھا۔ اس نے حال میں ایک عقیدہ اپنایا تھا؛ تو کیا وہ اسے رد کر دے؟ اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ اس نے خود سے کہا تھا کہ وہ ہرگز [اپنے عقیدے پر] شبہ نہیں کرے گا، مگر اس نے شبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ دو عقائد کے درمیان ہونا، ایک وہ، جس سے آپ ابھی پوری طرح باہر نہیں نکلے ہیں، اور دوسرا، وہ جس میں آپ ابھی داخل نہیں ہوئے ہیں، ناقابلِ برداشت ہوتا ہے؛ اُجالے اور اندھیرے کے درمیان کی دھندلی کیفیت صرف چمگادڑ صفت نفوس ہی کو پسند آتی ہے۔ ماریوس روشن آنکھوں والا انسان تھا اور اسے اصلی روشنی کی ضرورت تھی۔ شبہات کے دھندلکے اسے تکلیف دیتے تھے۔ جہاں وہ تھا وہاں ہونے کی جو بھی خواہش رہی ہو، وہ وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ اب، وہ آگے بڑھنے، جانچ کرنے، سوچنے اور مزید آگے بڑھنے پر مجبور تھا۔ یہ کیفیت اسے کدھر لے جا رہی تھی؟ اتنے قدم اٹھانے کے بعد، جو اسے اپنے باپ سے قریب لے گئے تھے اب وہ ایسے قدم اٹھانے پر خوف زدہ ہو رہا تھا جو اسے اپنے اس باپ سے بیگانہ کر دیں گے۔ اس کے ذہن میں ابھرنے والے تصورات نے اس کی بے چینی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے اطراف ایک ڈھلان سی پیدا ہو گئی

تھی۔ وہ نہ اپنے نانا سے متفق تھا اور نہ اپنے دوستوں سے۔ایک کی نظروں کے سامنے ہمت کرتا تو دوسروں کی نظروں میں پیچھے رہ جاتا، اور اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ اپنی عمر اور اپنے شباب دونوں جانب، اس کی تنہائی دہری ہو گئی تھی۔اس نے کیفے Musain جانا بند کر دیا۔

اپنے ضمیر کی الجھنوں میں گرفتار، اس نے اپنے وجود کے کئی سخت پہلوؤں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔زندگی کی حقیقتیں خود کو بھلا دینے کی اجازت نہیں دیتیں۔انھوں نے جلد ہی اسے اچانک کہنی مار دی تھی۔

ایک صبح، ہوٹل کا مالک ماریوس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس سے کہا:

''موسیو کوفیراک نے آپ کی جانب سے جواب دے دیا ہے۔''

''ہاں۔''

''مگر مجھے اپنی رقم ملنی چاہیے۔''

''کوفیراک سے کہو کہ وہ آ کر مجھ سے ملے۔'' ماریوس نے کہا۔

کوفیراک آیا تو میزبان جا چکا تھا۔ماریوس نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، کہ وہ دنیا میں پہلے کی طرح اکیلا تھا، کہ اس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔

''تمھارا کیا حال ہوگا؟'' کوفیراک نے کہا۔

''میں بالکل کچھ نہیں جانتا۔'' ماریوس نے جواب دیا۔

''تم کیا کرو گے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

تمھارے پاس کچھ رقم ہے؟''

''پندرہ فرانک۔''

''کیا میں تمھیں کچھ رقم دے دوں؟''

''ہرگز نہیں۔''

''تمھارے پاس کپڑے ہیں؟''

''بس یہی ہیں۔''

''انگوٹھی، چھلا وغیرہ، کچھ ہے؟''

''ایک گھڑی ہے۔''

''چاندی ہے؟''

"سوا ہے، یہ رہا۔"

"میں لباس کے ایک تاجر کو جانتا ہوں، جو تمھارا فراک کوٹ اور پتلون خرید لے گا۔"

"بہت خوب۔"

تب تمھارے پاس ایک پتلون، ایک واسکٹ، ایک ہیٹ اور ایک کوٹ رہ جائے گا۔"

"اور میرے جوتے۔"

"کیا کہا؟ تم ننگے پاؤں تو نہیں جاؤ گے؟ کیا دولت مندی ہے یہ بھی۔"

"بس اتنا کافی ہوگا۔"

"میں ایک گھڑی ساز کو جانتا ہوں۔ وہ تمھاری گھڑی خرید لے گا۔"

"بہت خوب۔"

"نہیں، یہ خوب نہیں۔ اس کے بعد تم کیا کرو گے؟"

"جو بھی بن پڑا، کروں گا۔ کوئی ایمان دارانہ کام، بس یہی کہہ سکتا ہوں۔"

"کیا تم انگریزی جانتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"جرمن جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"یہ تو بہت بُری بات ہوئی۔"

"کیوں؟"

"ایک ناشر میرا دوست ہے، جو انسائیکلوپیڈیا قسم کی کوئی شے تیار کر رہا ہے، جس کے لیے تم انگریزی یا جرمن مضامین کے ترجمے کا کام کر سکتے تھے۔ اس میں اجرت زیادہ تو نہیں ملتی، مگر اس میں گزارا ہو سکتا ہے۔"

"میں انگریزی اور جرمن دونوں زبانیں سیکھ لوں گا۔"

"اور اس دوران کیا کرو گے؟"

"اس دوران میں اپنے کپڑے اور گھڑی بیچ کر گزارا کروں گا۔"

لباس فروش کو بلایا گیا۔ اس نے اُترن لباس کے بیس فرانک دیے۔ وہ گھڑی ساز کے پاس گئے۔ اس نے پینتالیس فرانک میں گھڑی خرید لی۔

"بُرا نہیں رہا۔" کوفیراک نے ہوٹل واپسی پر ماریوں سے کہا، "اور میرے پندرہ

فرانک ملا کر اسّی فرانک ہو جائیں گے۔"

"اور ہوٹل کا بل؟" کوفیراک نے پوچھا۔

"اُسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔" ماریوس نے کہا۔

ہوٹل کے مالک نے بل پیش کیا تھا، جو فوراً ادا ہوا تھا۔ ہوٹل کا بل ستّر فرانک کا تھا۔

"میرے پاس صرف دس فرانک بچے ہیں۔" ماریوس نے کہا۔

"نالائق آدمی۔" کوفیراک نے کہا، "انگریزی سیکھنے کے دوران تم پانچ فرانک کھا جاؤ گے، اور پانچ فرانک جرمن سیکھنے کے دوران۔ یہ اس وقت ہوگا جب تم زبان جلد سیکھ لوگے، ورنہ آہستہ سیکھنے میں مزید "سو عدد سالگیں گے۔"

اس دوران نیک دل خاتون، آنٹی ہلیر نورمانے، جو خود بھی مشکلوں میں گرفتار تھی، بالآخر ماریوس کی قیام گاہ ڈھونڈ نکالی تھی۔ ایک صبح، قانون کے اسکول سے واپسی پر ماریوس کو اپنی آنٹی کا خط اور ایک سربمہر ڈبے میں ساٹھ pistoles، یعنی چھ سو طلائی فرانک کے سکے ملے۔

ماریوس نے جواب میں احترام سے لبریز ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا تھا کہ اب اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کافی ذرائع موجود ہے، جو آئندہ اس کے کام آئیں گے؛ اور خط کے ساتھ سکے واپس بھیج دیے۔ اس وقت اس کے پاس صرف تین فرانک باقی بچے تھے۔

اس کی آنٹی نے اس کے نانا کے غصے کے خوف سے اس انکار کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس کے علاوہ کیا وہ کہہ نہیں چکا تھا کہ "میں اس خون آشام کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔"

ماریوس نے ہوٹل چھوڑ دیا، اس لیے کہ وہ مزید قرض کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

۞

کنگال ماریوس

ماریوس کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ کپڑوں اور گھڑی سے تو پیٹ کی آگ بجھائی نہیں جا سکتی۔ وہ ایسی خوف ناک چیزیں کھانے پر مجبور ہو گیا تھا جنھیں مویشی بھی نہ کھاتے؛ یعنی اس پر بہت تنگی اور عسرت کے دن آ گئے تھے۔ وحشت ناک دن گزرنے لگے تھے، دن بغیر روٹی کے، راتیں بغیر نیند کے، شامیں بغیر شمعوں کی، بھٹے بغیر کام کے، مستقبل بغیر امید کے۔ کوٹ کی آستینوں سے کہنیاں جھانکنے لگی تھیں، پرانی ہیٹ دیکھ کر لڑکیاں ہنسنے لگتی تھیں؛ کمرے کا دروازہ بند ہوتا اس لیے کہ کرایہ ادا نہیں ہوتا تھا؛ اشیائے خوردنی کی دکانوں کے مالکوں اور دربانوں کی گستاخیاں، پڑوسیوں کی چبھتی تیوریاں، توہین آمیز نظریں اور کچلی ہوئی شان برداشت کرنی پڑتی تھی؛ جیسی تیسی ملازمتیں کرنا پڑ رہی تھیں؛ زندگی حقر، تلخی، دل شکستگی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ ماریوس ان سب باتوں کا عادی ہو گیا، اور ہر قسم کی اشیا کھانے پر مجبور تھا۔ ایسے لمحات میں جب انسان کو خود بینی اور تفاخر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کہ اسے محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اس پر جملے کسے جانے لگے تھے اس لیے کہ اس کا لباس خراب حالت میں، اور قابلِ تضحیک ہوتا تھا؛ اس لیے کہ وہ مفلس ہو گیا تھا۔ ایسی عمر میں جب نوجوان دل شاہانہ تفاخر سے لبریز ہوا کرتے ہیں، اس کی نظریں بار بار اپنے پھٹے جوتوں پر پڑتی تھیں، اور بدنصیبی نے اسے سکھا دیا تھا کہ بے جا شرم کسے کہتے ہیں۔ قابلِ تعریف اور خوف ناک آزمائش سے کم زوروں میں نفرت پیدا ہوتی ہے، اور توانا کی رفعتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ مقدر کی کٹھالی میں انسان، اور جب ضرورت ہوتو، غنڈے یا سورماؤں جیسے دیوتا ڈھل کر نکلتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ معمولی مقابلوں میں عظیم کارنامے انجام پائے ہیں۔ ایسے بھی

مواقع آئے ہیں جس میں بہادری نظرانداز کی گئی ہے، اور بدطینتی اور ضروریات کے مہلک حملوں میں سرکشوں نے ہر قدم اپنا دفاع کیا ہے۔ شریفانہ اور مخفی فتوحات کو کوئی آنکھ نہیں دیکھتی؛ انھیں جلسے میں شہرت نہیں ملتی؛ اور بگل کا دھما کا انھیں سلام نہیں پیش کرتا۔ زندگی، بدقسمتی، تنہائی، دست کشی تہی؛ افلاس لڑائی کے وہ میدان ہوتے ہیں جن کے اپنے ہیرو ہوتے ہیں؛ کبھی غیر معروف ہیرو ان سے زیادہ عظیم ہوتے ہیں جو بام شہرت تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس طرح توانا اور غیر معمولی فطرتیں تخلیق ہوتی ہیں؛ کبھی کبھی سوتیلی ماں بھی حقیقی ماں بن جاتی ہے؛ بدنصیبی نفس اور جذبے کو توانائی دیتی ہے؛ پریشانی تفاخر کی پرورش کرتی ہے؛ بدقسمتی عالی حوصلگی کے لیے شیر مادر ہو جاتی ہے۔

ماریوس کی زندگی میں ایسا بھی وقت آیا تھا کہ اس نے خود اپنی سیڑھیاں صاف کی تھیں؛ اس نے میوہ فروش سے صرف چند سو قیمت کا 'بری' چیز خریدا تھا؛ اس نے ڈبل روٹی خریدنے کے لیے شام کے جھٹپٹے کا انتظار کیا تھا، اور ایسے خفیہ انداز میں اسے اپنی دوچھتی میں لے گیا تھا گویا اسے چرا لیا گیا ہو۔

کبھی نکو والی قصاب کی دکان میں، دل لگی کرتے باورچیوں کے مجمعے کے درمیان ایک بدسلیقہ نوجوان بغل میں بڑی بڑی کتابیں دبائے، پچھے سے داخل ہوتے دیکھا جاتا، جس کے چہرے پر بزدلی کے ساتھ خفگی بھی عیاں ہوتی تھی؛ جو دکان میں داخل ہوتے ہی پسینے کے قطروں سے بھرے ابرو سے اپنی ہیٹ اتار لیتا، قصاب کی حیران بیوی کے سامنے شائستگی سے اپنا سر خم کرتا، مٹن کی ایک کٹلٹ خریدتا، چھ یا سات سو قیمت ادا کرتا، کاغذ میں لپٹی کٹلٹ کو اپنے کتابوں کے درمیان چھپا لیتا اور دکان سے باہر چلا جاتا۔ وہ شخص ماریوس تھا۔ اسی کٹلٹ پر، جسے وہ خود پکاتا تھا، تین دن گزارا کرتا تھا۔

پہلے دن وہ گوشت کھاتا، دوسرے چربی، اور تیسرے دن ہڈی چباتا تھا۔ آنٹی ہلیر نورما نے بارہا کوشش کی، اور کئی بار ساٹھ طلائی سکے بھیجے۔ ماریوس ہر بار یہ کہہ کر واپس کر دیتا کہ اسے کسی شے کی ضرورت نہیں۔

اس وقت بھی ماریوس اپنے باپ کا غم منا رہا تھا، جب اس کے اندر وہ انقلاب آ گیا تھا، ہم نے ابھی جس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد سے اس نے اپنا سیاہ لباس نہیں اتارا، مگر لباس خود اس کا ساتھ چھوڑے جا رہا تھا۔ وہ دن بھی آ گیا جب اس کے پاس کوٹ نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد پتلون بھی گئی۔ اب کیا کیا جاتا؟ کورفیراک نے، جس نے اب تک اس کا ساتھ دیا

تھا، اسے ایک پرانا کوٹ دے دیا۔ تمیں سو کے عوض اس نے کسی دربان سے، یا کسی اور شخص سے کوٹ کو اُلٹوا لیا، اور کوٹ نیا نظر آنے لگا تھا۔ مگر اب یہ کوٹ سبز رنگ کا ہو گیا تھا۔ ماریوں نے رات ہونے سے قبل باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اندھیرے میں یہ کوٹ سیاہ رنگ کا نظر آتا تھا۔ چوں کہ وہ ہمیشہ سوگ میں رہنا چاہتا تھا، وہ صرف رات میں ہی ملبوس ہوتا تھا۔

ان سب کے باوجود اسے وکالت کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کوفیراک کے کمرے میں رہتا تھا، جو نہایت نفیس تھا، جہاں مختلف نوعیت کی قانون کی کتابیں رکھی تھیں، جس کے ساتھ کچھ خستہ حال رومانوی کتابیں بھی تھیں، جو ضابطے کے مطابق اس کا کتب خانہ ٹھہرا۔ اس کے سارے خطوط کوفیراک ہی کے پتے پر آتے تھے۔

جب ماریوں وکیل بن گیا تو اس نے اپنے نانا کو سرد مہری کے ساتھ بہ کمالِ فرماں برداری و احترام ایک خط تحریر کیا، جس میں اس امر کی اطلاع دی گئی تھی۔ موسیو ژیلنورمانط کھولتے ہی غصے سے کانپ اٹھا؛ خط پڑھا، اس کے چار ٹکڑے کیے اور کوڑے دان میں ڈال دیا تھا۔ دو یا تین دن بعد میڈموزیل ژیلنورمانے اپنے باپ کو، جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا، زور زور سے خود کلامی کرتے سنا تھا۔ جب بھی وہ بہت غصے میں ہوتا تو یہی کرتا تھا۔ وہ سن رہی تھی، اور بڑے میاں کہہ رہے تھے ”اگر تم بالکل احمق نہ ہوتے تو تمھیں معلوم ہو جاتا کہ تم ایک ساتھ بیرن اور وکیل نہیں بن سکتے۔“

بے چارہ ماریوس

بدنصیبی میں بھی وہی ہوتا جو دوسرے حالات میں ہوتا ہے۔ جو ہوا ہوتا ہے نا قابلِ برداشت ہو کر ختم ہو جایا کرتا ہے۔ وہ بالآخر ایک شکل اختیار کر لیتا ہے، اور خود کو درست کر لیتا ہے۔ نشوونما ہوتی ہے، اور ایک خاص انداز میں، مگر کم تر انداز میں ہوتی ہے، جو زندگی کے لیے کافی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی ماریوس پوں مرسی کا وجود جس سے گزر رہا تھا۔

وہ بدترین آزمائے سے گزر چکا تھا؛ یہ تنگ راستہ آگے چل کر اس کے سامنے وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ سخت محنت، مستقل مزاجی اور ارادے کے ذریعے وہ اپنے کام میں سات سو فرانک سالانہ کما لیتا تھا۔ اس نے جرمن اور انگریزی زبانیں سیکھ لی تھی؛ کوفیراک کا شکریہ کہ اس نے ماریوس کی ایک ناشر سے ملاقات کرا دی تھی، اور وہ ادب کے ناشر ادارے میں ایک چھوٹے سے عہدے پر کام کرنے لگا تھا۔ وہ کتابچے تیار کرتا، اخباروں کے ترجمے کرتا، اشاعتوں کی شرحیں لکھتا، سوانح وغیرہ مرتب کرتا تھا؛ سال میں سات سو فرانک ہاتھ آجاتے تھے۔ ان پر ہی گزارا ہو رہا تھا۔ مگر کیسے؟ بُری طرح نہیں۔ ہم اس کی تشریح کر دیں گے۔

ماریوس تیس فرانک سالانہ کرایے پر Gorbeau ہاؤس میں رہتا تھا؛ بغیر آتش دان کا اڈا، جس کو الماری کہا جا سکتا تھا، جس میں واجبی سا فرنیچر تھا۔ فرنیچر اس کی اپنی ملکیت تھا۔ اس عمارت کی سب سے قدیم کرایے دار کو وہ ماہ صفائی کے لیے، ہر صبح گرم پانی لانے کے لیے، ایک تازہ انڈا اور ڈبل روٹی لانے کے لیے ساڑھے تین فرانک ادا کرتا تھا۔ اس انڈے اور ڈبل روٹی سے وہ ناشتا کرتا تھا۔ اس کے ناشتے کی قیمت دو سے چار سو تک ہوتی تھی، اور یہ رقم انڈے کی بڑھتی گھٹتی قیمت پر منحصر ہوتی تھی۔ Mathurins اسٹریٹ کے نکڑ پر، Basset اسٹامپ فروش کے

بالکل سامنے واقع مادام روسو (Rousseau) کے طعام خانے میں ڈنر کے لیے شام کے چھ بجے اترتا تھا۔ ڈنر میں سوپ شامل نہیں ہوتا تھا۔ چھ سو قیمت کی ایک پلیٹ گوشت کی ملتی تھی جس میں تھوڑی سی ترکاری بھی شامل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ تین سو کا میٹھا۔ تین سو میں حسب ضرورت روٹی۔ وائن کے بجائے پانی۔ جب وہ قیمت ادا کرنے کے لیے مادام روسو کی میز پر جاتا جو اس زمانے میں، گلابی اور خاصی فربہ ہونے کے باوجود شاہانہ انداز میں ریستوران چلاتی تھی، تو وہ ویٹر کو ایک سو خدمت کے ادا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے چلا جاتا تھا۔ پندرہ سو میں اس سے ڈنر اور ایک تبسم مل جاتا تھا۔

یہ ریستوران روسو، جہاں روزانہ شراب کی بوتلیں کم اور پانی کے زیادہ قرابے خالی ہو جاتے تھے، ریستوران کم تھا، مسکّن دوا کی خوراک زیادہ تھا۔ اب اس کا وجود نہیں۔ اس کے مالک کی بہت اچھی سی عرفیت تھی: لوگ اس کو 'آبی روسو' کہتے تھے۔

اس طرح، ناشتا چار سو میں، ڈنر سولہ سو میں؛ ایک دن کا کھانا بیس سو میں ہو جاتا تھا، یعنی سال بھر میں 365 فرانک۔ اس میں تیس فرانک کمرے کے کرایے کے، اور صفائی کرنے والی عورت کے چھتیس فرانک؛ اس میں چھوٹی چھوٹی متفرقات شامل کر دیجیے۔ گویا، چار سو پچاس فرانک میں ماریوس کو کھانا، رہنے کی جگہ اور خدمت گزاری میسر ہوتی تھی۔ لباس پر اور کپڑوں کی دھلائی پر پچاس فرانک؛ سب ملا کر سال میں چھ سو پچاس فرانک سے زیادہ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ کبھی کبھی اپنے دوست کو دس فرانک قرض بھی دے دیا کرتا تھا۔ ایک بار کورفیراک نے اس سے ساٹھ فرانک قرض لیے تھے۔ جہاں تک آگ کا معاملہ تھا، ماریوس کے کمرے میں آتش دان کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کے سارے معاملات بالکل سادہ تھے۔

ماریوس کے پاس لباس کے دو مکمل جوڑے تھے، ایک پرانا جوڑا تھا، جو "روزانہ" پہننے کے لیے تھا، دوسرا بالکل نیا تھا جو خاص خاص موقعوں پر پہنا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ رنگ کا لباس پہنتا۔ اس کے پاس صرف تین قمیصیں تھیں؛ ایک جسم پر ہوتی، دوسری طشت میں اور تیسری دھلائی کرنے والی خاتون کے ہاتھوں میں۔ جب یہ قمیصیں خراب ہونے لگتیں، تو ان کی جگہ نئی خرید لی جاتی تھی۔ قمیصیں ہمیشہ بغیر استری کے ہوتی تھیں، اسی وجہ سے وہ ٹھوڑی تک کوٹ کے سارے بٹن بند رکھتا تھا۔

خوش حالی کی کیفیت تک پہنچنے میں اسے کئی برس لگ گئے۔ سخت زمانہ تھا؛ ان میں سے کچھ حالات بہت مشکل تھے۔ ماریوس کا ایک دن بھی ناکامیابی کی کیفیت میں نہیں گزرا۔

اس نے اپنی محرومیوں کے راستے کی ہر مشکل جھیل لی تھی۔ اس نے سب کچھ کیا، مگر قرض کبھی نہیں لیا تھا۔ اس نے اچھا کام یہ کیا تھا کہ وہ کبھی کسی کا ایک سو کا بھی قرض دار نہیں رہا تھا۔ اس کے نزدیک قرض غلامی کی ابتدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا تھا کہ قرض دینے والا حاکم سے بدتر ہوتا ہے؛ اگر چہ قرض دینے والا صرف آپ کے وجود کا مالک ہوتا ہے، وہ آپ کے وقار کا بھی مالک ہو جاتا ہے، اور وہ آپ کو تمانچہ بھی مار سکتا ہے۔ قرض لینے کے بجائے ماریوس بھوکا رہنا پسند کرتا تھا۔ اس نے کئی کئی دن فاقے بھی کیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر آپ محتاط نہیں ہوں گے تو بدقسمتی آپ کی ذلالت پر منتج ہوگی۔ وہ اپنے وقار کی کسی حاسد کی طرح حفاظت کرتا تھا۔ فلاں فلاں رسم یا عمل، جو اگر کسی دوسری حالت میں کیا جاتا اس کے نزدیک محض پاس ادب ہوتا تھا، مگر اب اسے بےلطفی جیسا محسوس ہوتا تھا اور وہ اس کے بارے میں فکرمند رہتا تھا۔ اس کے باعث اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ وہ گستاخی کی حد تک بزدل ہو جاتا تھا۔

ان تمام امتحانات کے دوران، اس طاقت کے باعث جو اس کے اندر موجود تھی، وہ خود کو پُر امید، حتیٰ کہ کبھی کبھی بہتر اور بلند محسوس کرتا تھا۔ روح جسم کی مدد کرتی ہے، اور اکثر اوقات اس کو بڑھاتی بھی ہے۔ روح وہ واحد پرندہ ہے جو اپنے قفس کی خود حفاظت کرتا ہے۔

اپنے والد کے نام کے علاوہ، ماریوس کے دل پر ایک اور نام کندہ تھا۔ وہ نام تین آردیے کا تھا۔ ماریوس، اپنی سنجیدہ اور پُر جوش فطرت کے باعث، اپنے خیالوں میں ایک قسم کی نورانی تاج والی شخصیت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا، اس پر جس کے باپ کی جان کا قرض تھا — وہ دلیر سارجنٹ جس نے واٹرلو کے میدانِ جنگ میں برستی گولیوں اور توپ کے گولوں کے درمیان کرنل کو بچایا تھا۔ وہ اس آدمی کی یاد کو اپنے والد کی یاد سے کبھی علاحدہ نہیں کر سکا تھا، اور اس کا ہمیشہ احترام کرتا تھا۔ یہ ایک قسم کی پرستش تھی، جو دو درجوں میں کی جا رہی تھی، جس میں کرنل کے لیے ایک عالی شان قربان گاہ تھی اور تین آردیے کے لیے اس سے کم درجے کی۔ جس بات نے تین آردیے کے بارے میں اس کے تشکر کے احساس کو دوبالا کر دیا تھا، وہ اس کی پریشانیاں تھیں جن کا ماریوس کو علم تھا، جنھوں نے بعد میں اسے گھیر لیا تھا۔ ماریوس کو Montfermeil میں اس بدقسمت سرائے والے کی بربادی اور دیوالیہ ہونے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے، اس نے تین آردیے کو تلاش کرنے اور بدقسمتی کی اس بھیانک پاتال تک پہنچنے کی بے انتہا کوشش کی تین آردیے جس میں غائب ہو گیا تھا۔ ماریوس نے پورا ملک چھان مارا؛ وہ Chelles گیا، Bondy گیا، Gourney گیا، Nogent

گیا، Lagny گیا ۔ وہ تین برس تک اس کوشش میں لگا رہا ، اور جو کچھ بھی انداز کیا، اس جستجو میں سب ختم ہو گیا تھا ۔کوئی بھی تین آر دیے کے بارے میں کوئی خبر فراہم نہیں کر سکا۔ امکان اس بات کا تھا کہ وہ ملک سے باہر کہیں چلا گیا تھا۔ اس کے قرض خواہ بھی اس کی تلاش میں تھے، ماریوس سے کم، مگر وہ سخت محنت کے بعد بھی اس تک پہنچ نہیں پائے تھے ۔ ماریوس خود کو الزام دیتا تھا، تلاش کی ناکامیوں کی بنا پر اپنے آپ سے تقریباً ناراض رہتا تھا۔ کرنل نے یہی ایک قرض چھوڑا تھا، اور ماریوس اس کو ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے سوچا، وہ کس قسم کا قرض تھا، جب میرا باپ میدان جنگ میں پڑا مر رہا تھا، جس کے باعث تین آر دیے دھوئیں اور توپ کے گولوں کی بارش میں کود کر اسے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لے گیا تھا، اور میں جو اخلاقی اعتبار سے تین آر دیے کا قرض دار ہوں، اس پریشانی میں ہوں کہ جہاں بھی وہ موت کی اذیت میں پڑا ہے میں اس کو موت کے چنگل سے چھڑا کر واپس زندگی کی طرف لے نہیں جا سکتا ہوں ۔

اوہ، ایک دن میں اسے ضرور ڈھونڈ لوں گا ۔ دراصل تین آر دیے کو تلاش کرنے میں ماریوس اپنا ایک بازو تک دے سکتا تھا؛ وہ اپنا سارا خون اس پر قربان کر سکتا تھا؛ وہ تین آر دیے کو دیکھنا چاہتا تھا، تین آر دیے کی کچھ خدمت کرنا چاہتا تھا، اور اس کو کہنا چاہتا تھا، ’’تم مجھے نہیں جانتے، مگر میں تمھیں جانتا ہوں ۔ میں موجود ہوں ۔ لو مجھے ٹھکانے لگا دو ۔‘‘

ماریوس کا سب سے پیارا اور سب سے عالی شان خواب یہی تھا۔

❂

ماریوس کی بلوغت

اس زمانے میں ماریوس کی عمر بیس برس تھی۔ اس کو اپنے نانا کا گھر چھوڑے تین برس ہو گئے تھے۔ دونوں اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے تھے؛ دونوں نے ایک دوسرے کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھنا چاہا تھا۔ اس کے علاوہ، ایک دوسرے کو دیکھنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ ماریوس پیتل کا مکمل دان تھا جب کہ فادر ہلیر نورما لوہے کا برتن۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ماریوس اپنے نانا کے دل کے معاملے میں غلطی پر تھا۔ اس نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ نانا اس سے محبت نہیں کرتا، اور یہ بھی کہ وہ ایک بدمزاج، تندخو اور مسکرانے والا بوڑھا اس پر ہمیشہ لعنت بھیجتا، چلاتا، طوفان اٹھاتا اور اپنا بید نکالتا رہتا تھا؛ اپنے نزدیک اسی محبت کو پسند کرتا تھا جو ایک ساتھ، ہلکی بھی ہو اور شدید بھی۔ ماریوس غلطی پر تھا۔ ایسے بھی باپ ہوتے ہیں جو اپنے بچوں سے محبت نہیں کرتے؛ ایسا کوئی نانا دادا نہیں جو اپنے پوتے پوتی سے ٹوٹ کر محبت نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ موسیو ہلیر نورما اپنے اندرون میں ماریوس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے انداز سے اس کی پرستش کرتا تھا، جس کے لوازمات میں چڑچڑاپن بھی تھا اور چانٹے بھی تھے؛ مگر جب ماریوس اس کے گھر سے ایک بار چلا گیا تو، اسے اپنے دل اندھیرا محسوس ہونے لگا تھا؛ کسی کو اس کے سامنے اس بچے کا تذکرہ کرنے کی اجازت نہیں تھی، مگر ہمہ وقت خفیہ طور پر، افسوس کیا کرتا تھا کہ وہ کتنا فرماں بردار نواسہ تھا۔ پہلے تو اسے امید تھی کہ یہ بونا پارٹیائی، یہ جیکبیائی، یہ شدت پسند، یہ تمبریائی ایک دن واپس آ جائے گا، مگر ہفتے گزرے، سال گزر رے گئے؛ موسیو ہلیر نورما کو افسوس اس بات کا تھا کہ وہ ''خوں آشام'' واپس نہیں آیا۔ ''میں اس کو نکالنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔'' نانا نے اپنے آپ سے پوچھا

بھی تھا، "اگر مسئلہ یہ تھا کہ مجھے یہ کام کرنا پڑ جائے تو کیا میں وہی کروں گا؟" اس کے غرور نے فوراً جواب دیا تھا، ہاں، مگر اس کا تجربے کار سر نے جسے اس نے خاموشی سے ہلا دیا تھا، افسردگی سے جواب دیا تھا "نہیں۔" گھنٹوں اس پر افسردگی طاری رہتی تھی۔ وہ ماریوس کو بہت یاد کرتا تھا۔ بوڑھے لوگوں کو چاہت کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے جیسے سورج کی۔ یہ چاہت گرمی ہوتی ہے۔ وہ فطری طور پر سخت مزاج تھا، پھر بھی ماریوس کی غیر موجودگی نے اس میں کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں۔ دنیا کی کوئی شے اُسے اُس "بدمعاش" کی طرف قدم بڑھانے پر مائل نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اس کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا، مگر وہ اسے مسلسل یاد کرتا تھا۔ وہ پنشن یافتہ لوگوں کی طرح Marais میں رہتا تھا؛ پہلے کی طرح اب بھی خوش دل اور شدت پسند تھا، مگر اس کی خوش دلی میں تشنج زدہ سنگ دلی آ گئی تھی، اور اس کی شدت پسندی ہمیشہ ایک قسم کی غم انگیز افسردگی پر ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کہتا تھا، "اور اگر وہ واپس آ گیا تو دیکھنا میں اسے کیسا اچھا تماچہ رسید کروں گا۔"

جہاں تک اس کی آنٹی کا معاملہ تھا، اسے محبت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک ماریوس ایک بھولی بسری شے ہو گیا تھا، اور وہ ماریوس کے مقابلے میں اپنی بلی یا طوطے میں زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ جس بات نے فادر ہلیر نورما کے خفیہ غم میں اضافہ کر دیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس نے سب کچھ اپنے سینے کے اندر بند کر لیا تھا۔ اس کی آزردگی حال ہی میں ایجاد کی جانے والے اُن بھٹیوں کی طرح تھی جو اپنا دھواں خود ہی صرف کر لیتی ہیں۔ اگر کبھی کوئی دخل درمعقولات کرنے والا اس سے پوچھ بیٹھتا کہ "تمھارا نواسہ کیا کام کرتا ہے، اس کا کیا حال ہے۔" تو وہ قدیم بورژوا، ایک سرد آہ بھر کر طنزاً جواب دیتا، "موسیو لی بیرن آج کل کسی کونے میں چھپا قانونی دھوکے بازی کی تربیت دے رہا ہے۔"

اِدھر یہ بوڑھا افسوس کا اظہار کرتا، اُدھر ماریوس خود بھی اس کی تعریف کرتا تھا۔ جیسا کہ ہر نیک دل انسان کے ساتھ ہوتا ہے، بدقسمتی نے اس کی تلخی کو ختم کر دیا تھا۔ وہ موسیو ہلیر نورما کو خوش خلقی کی روشنی میں دیکھتا تھا، مگر اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس شخص سے مزید کچھ نہیں لے گا، اس کے باپ کے ساتھ جس کا رویہ ظالمانہ رہا تھا۔ یہ اس کے پہلے غصے کی ہلکی سی تعبیر تھی۔ مزید یہ کہ اسے دکھ سہنے میں اور سہتے رہنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے باپ کی خاطر ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی کی سختیاں اسے مطمئن اور خوش کر دیتی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے یک گونہ خوشی سے کہا کرتا تھا — یقینی طور پر وہ اس سے زیادہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، کہ یہی کفارہ تھا — کہ اگر اس نے یہ سب نہ کیا ہوتا تو بعد میں، اس کی اپنے باپ سے، اور ایسے باپ سے،

فاسقانہ لاتعلقی کی وجہ سے اسے کوئی اور سزا مل جاتی؛ کہ یہ صحیح نہیں ہوتا کہ اس کا باپ ہی سارے دکھ اٹھائے، یہ خود بالکل دکھ نہ اٹھائے؛ اور یہ بھی، کہ کرنل کی بہادرانہ زندگی کے مقابلے میں اس کی مشقتوں اور محرومیوں کی کیا حیثیت تھی؟ مختصراً یہ کہ اپنے باپ سے قریب ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ اس سے مشابہ ہو، کہ وہ مفلسی کے سامنے سینہ سپر ہو جائے، بالکل جس طرح اس کے باپ نے بہادری سے اپنے دشمن کا سامنا کیا تھا؛ اور یہ بھی کہ بلاشبہ کرنل نے اپنے [وصیت کے] الفاظ "اور وہ اس کا مستحق ہوگا" میں اسی امر کی جانب اشارہ کردیا تھا۔ یہ الفاظ جو ماریوس مسلسل اپنے جسم پر سجائے رکھتا تھا، اپنے سینے پر نہیں، اس لیے کہ اگرچہ کرنل کی تحریر بظاہر مٹ چکی تھی، مگر اس کے دل پر اب بھی کندہ تھی۔

اور اس دن جب اس کے نانا نے اسے گھر سے نکال دیا تھا، اس وقت وہ بچہ تھا، اور اب وہ پورا آدمی بن چکا ہے۔ اسے بہت محسوس ہوا تھا۔ ہم یہ بات دہرانا چاہتے ہیں کہ بدبختی اس کے لیے نیکی ہو گئی تھی۔ نوجوانی کا افلاس جب کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنی تمام تر خواہشات کو ارادے میں، اور پورے نفس کو توقع میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ افلاس مادی زندگی کو کھول کر رکھ دیتا ہے اور اس کو بھیانک بنا دیتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ مثالی زندگی کی ناقابلِ اظہار حدود ہوتی ہیں۔ نوجوان دولت مند کے لیے، گھڑ دوڑ، شکار، کتے، تمباکو، قمار، اچھی غذاؤں جیسے باوقار اور زیادہ نفیس پہلوؤں کے مقابلے میں نفس کے لیے سیکڑوں گمراہ کن بنیادی توجہات ہوتی ہیں۔ نوجوان بڑی مشکل سے روٹی حاصل کرتا ہے، کھاتا ہے اور جب کھا چکتا ہے تو اس کے پاس سوائے غور و فکر کے کچھ نہیں ہوتا۔ تب وہ بن مانگے ہونے والے ربانی معجزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے؛ آسمان، خلا، ستاروں، پھولوں، بچوں اور اس انسانیت کی طرف، جن کے درمیان وہ دکھ اٹھاتا ہے، ان تخلیقات کے درمیان جن کے درمیان وہ متبسم ہوتا ہے۔ وہ انسانیت پر اس حد تک غور کرتا ہے کہ اسے خدا نظر آنے لگتا ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے، اور خود کو عظیم محسوس کرنے لگتا ہے؛ وہ مسلسل خواب دیکھتا رہتا ہے اور خود کو مشفق محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ ایک دکھی انسان کی خود فریبی سے اس انسان کی دردمندی کی طرف بڑھتا ہے جو غور و فکر کرتا ہے۔ اس کے اندر قابلِ تعریف جذبہ پھوٹ پڑتا ہے؛ [یعنی] خود کو بھول جانا اور سب پر ترس کھانا۔ اور جب وہ ذہن کا ارب پتی، دولت کا ارب پتی، ان بے شمار خوشیوں پر غور کرتا ہے جو فطرت پیش کرتی ہے، فراہم کرتی ہے، ان نفوس پر بارش کرتی ہے جو کھلے دل کے ہوتے ہیں، اور ان نفوس سے صرفِ نظر کرتی ہے جن کے دل بند ہوتے ہیں، تو وہ ذہن کا ارب

پتی اور دولت کا ارب پتی ان پر ترس کھاتا ہے۔ اور جب اس کی روح میں روشنی داخل ہو جاتی ہے تو اس کے دل سے، اسی تناسب سے، نفرت دور ہونے لگتی ہے۔ تو کیا وہ ناخوش ہوتا ہے؟ جی نہیں۔ کسی نوجوان آدمی کا دکھ بدبختی نہیں ہوتا۔ پہلا لڑکا جو سامنے آتا ہے، کتنا ہی مفلس کیوں نہ ہو، اپنی توانائی، اپنی صحت، اپنی تیز رفتاری، اپنی چمک دار آنکھوں، اپنے گرم دورانِ خون، اپنے سیاہ بالوں، اپنے گلابی ہونٹوں، اپنے سفید دانتوں، اپنی تازہ سانس کے باعث ہمیشہ کسی عمر رسیدہ بادشاہ کے لیے باعثِ رشک ہوتا ہے۔ اور پھر، ہر صبح وہ نئے سرے سے اپنا رزق کمانے کے لیے نکلتا ہے؛ اور جب اس کا ہاتھ اس کی روٹی کماتا ہے، تو اس کی پشت کو وقار حاصل ہوتا ہے، اس کے دماغ میں خیالات آنے لگتے ہیں۔ اور جب اس کا کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ ناقابلِ بیان سرمستی کی جانب، قناعت کی جانب، خوشیوں کی جانب لوٹ جاتا ہے؛ اور وہ اپنے پاؤں آزار میں، رکاوٹوں میں، ریگزاروں میں، بچھو بوٹیوں میں، اور کبھی دلدل میں پڑتے دیکھتا ہے؛ اس کا سر ہلکا ہو جاتا ہے؛ وہ مستحکم، پُرسکون، کم پر قانع اور مہربان ہو جاتا ہے؛ اور وہ خدا کا شکر گزار ہوتا ہے، اس تمام دولت کے لیے جو اس نے اسے عطا کی ہے، بہت سارے دولت مند لوگ جس سے عاری ہوتے ہیں: [یعنی] کام، جو انھیں آزاد کرتے ہیں؛ اور خیالات جو اُن کو باوقار بناتے ہیں۔

ماریوس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ قناعت کی طرف جھکاؤ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے جب اس نے کسی حد تک استقلال سے اپنی روزی کمانی شروع کر دی تھی، اس نے یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ مفلس ہونا بہتر ہوتا ہے، اور وہ، سوچ بچار کے لیے، اپنے کام سے کچھ وقت نکال لیا کرتا تھا؛ یعنی کبھی کبھی وہ سارا سارا دن کسی صاحبِ بصیرت انسان کی طرح غور و فکر میں غرق، خاموش نفس پرستی کے وجدان اور باطنی تابندگی کے عالم میں گزارتا تھا۔ اس طرح، اس نے اپنی زندگی کے مسائل کے لیے خود کو کچھ تجاویز پیش کر دی تھیں: مادی محنت پر کم سے کم توجہ دینا، تا کہ اس محنت پر زیادہ توجہ دی جا سکے جو محسوس نہیں ہوتی؛ یعنی حقیقی زندگی کے لیے کچھ گھنٹے فراہم کرنا، اور بقیہ وقت کو لامحدود پر صرف کرنا۔ اور، چوں کہ اسے یقین تھا کہ اس میں کسی چیز کی کمی نہیں، اس نے کبھی یہ تصور نہیں کیا کہ قیت سُستی کی شکل میں ڈھل کر ختم ہو جاتی ہے؛ کہ وہ خود اپنی زندگی کی اوّلین ضروریات کے حصول پر قانع ہو گیا تھا، اور اپنی محنتوں سے قبل اس وقت کنارہ کش ہو گیا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ اس قسم کی توانا اور پُرجوش فطرت کے لیے، یہ کیفیت عارضی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی کہ، مقدر کی ناگزیر پیچیدگیوں پر لگنے والا پہلا صدمہ ماریوس کو جگا دے گا۔

اس دوران، حالاں کہ وہ خود قانون داں تھا، اور اس معاملے پر فادر بلیر نورما کا جو بھی خیال ہو، وہ عمل نہیں کر رہا تھا، کہ وہ قانونی دھوکا دہی بھی نہیں کر رہا تھا۔ غور و فکر نے اسے عذر داری سے دور کر دیا تھا۔ وکیلوں سے رابطہ کرنا، عدالت کے فیصلوں پر عمل کرنا، مقدمات پر غور کرنا— کیسی اکتا دینے والی کیفیت ہوتی ہے یہ سب۔ وہ یہ سب کیوں کرے؟ اسے اپنی روزی کمانے کے طریقے میں تبدیلی کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ غیر واضح اور کم اجرت دینے والے اشاعتی اداروں سے ملنے والا کام، جس میں بہت محنت نہیں ہوتی تھی، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس کی زندگی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی تھا۔

جن ناشروں کے ساتھ وہ کام کرتا تھا، ان میں سے ایک، میرے خیال میں، موسیوMagimel نے اسے پیش کش کی تھی کہ اس کو اپنے گھر میں قیام کی سہولت فراہم کرے گا، اور اس کو باقاعدگی سے کام بھی دے گا اور سالانہ پندرہ سو فرانک تنخواہ بھی دے گا۔ اچھا قیام، پندرہ سو فرانک۔ سب کچھ بہت اچھا تھا، مگر اس کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ معقول طے شدہ تنخواہ، ملازم ادیب۔ ماریوس کی اپنی رائے کے مطابق، اگر وہ اس پیش کش کو قبول کر لیتا تو اس کی حیثیت بہتر بھی ہو جاتی اور بدتر بھی؛ کہ وہ آرام سے رہتا اور اپنا وقار کھو دیتا۔ یہ ایک اچھی اور مکمل بدقسمتی تھی جو مکروہ اور مضحکہ خیز حالت، اذیت بن جاتی: تقریباً اسی طرح جیسے کسی مکمل نابینا کو صرف ایک آنکھ کی روشنی واپس مل جائے۔ اس نے ناشر کی پیش کش ٹھکرا دی۔

ماریوس تنہا رہتا تھا۔ چوں کہ اسے ہر چیز سے باہر رہنا پسند تھا اور چوں کہ اسے ہمہ وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گروہ میں شامل نہیں ہوگا انجولرا جس کا سربراہ تھا۔ وہ اچھے دوست رہے تھے؛ انھوں نے مختلف مواقع پر ایک دوسرے کی مدد بھی کی تھی، مگر اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھے۔ ماریوس کے دو دوست تھے؛ ایک نوجوان کوفیراک، دوسرا عمر رسیدہ موسیو مابوف (Mabeuf)۔ ماریوس اس عمر رسیدہ آدمی سے زیادہ مانوس تھا۔ سب سے پہلے تو، وہ موسیو مابوف کو اپنے اندر ہونے والے انقلاب کا باعث سمجھتا تھا؛ بالخصوص اس لیے کہ یہ شخص اس کے باپ سے واقف تھا اور اسی کی بدولت، اس میں اپنے باپ کی محبت پیدا ہوئی تھی۔

بالخصوص گرجا گھر کے وارڈن کا بھی اس میں بڑا کردار تھا۔

یہی نہیں کہ اس سلسلے میں موسیو مابوف نے صرف ایک خاموش اور عاقبت اندیش عامل کا کردار ادا کیا تھا۔ اسے اتفاق سے ماریوس کو روشن خیال بنانے کا موقع مل گیا تھا، جس کا اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شمع اجالے کا باعث ہوتی ہے جسے کوئی اور

شخص لے آتا ہے؛ مگر اس معاملے میں شمع وہ خود تھا، کوئی اور نہیں۔

جہاں تک ماریوں کے اندرون میں ہونے والے انقلاب کا سوال تھا، موسیو مابوف میں انقلاب پیدا کرنے، یا اس کی ہمت افزائی کرنے کی لیاقت ہی نہیں تھی۔

چوں کہ آگے چل کر ہماری موسیو مابوف سے پھر ملاقات ہوگی، اس کے بارے میں کچھ معروضات غیر ضروری نہیں ہوں گے۔

۞

موسیو مابوف

ایک دن جب موسیو مابوف نے ماریوس سے کہا، "یقیناً میں سیاسی خیالات سے اتفاق کرتا ہوں۔" تو اس نے اپنے ذہن کی صحیح عکاسی کی تھی۔ تمام سیاسی خیالات اس کے نزدیک بے اعتنائی کے مسائل ہوتے تھے، اور وہ ان سب کا احترام کرتا تھا، بشرطے کہ وہ اس کے اطمینان میں خلل انداز نہ ہوں، جیسے کہ اہل یونان Furies کو [یونانی دیو مالا میں انتقام کی دیوی، جو عام طور سے تین لڑکیوں پر مشتمل سمجھی جاتی تھی] "خوب صورت، اچھی اور دل فریب" کہتے تھے۔ موسیو مابوف کی سیاسی رائے پودوں اور کتابوں سے والہانہ محبت سے عبارت ہوتی تھی۔ بقیہ دنیا کی طرح وہ 'ist' کو اپنا قرار دیتا تھا، جس کے بغیر اس زمانے میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا، مگر وہ خود نہ Royalistist نہ Bonapartist، نہ Chartist، نہ Orleanist اور نہ انارکسٹ سمجھتا تھا؛ دراصل وہ bouquinist تھا، اور پرانی کتابوں کو جمع کرنے والا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی کہ لوگ فرمان، جمہور، جوازِ شاہی، جمہوری ملک، وغیرہ جیسی احمقانہ چیزوں کے باعث ایک دوسرے سے نفرت کرنے میں کیوں مشغول رہتے ہیں جب کہ اس دنیا میں ہر قسم کی کائی، گھاس اور پودے ہیں وہ جن پر غور کر سکتے ہیں، اور folio کے، حتیٰ کہ 32mos کے ڈھیر موجود ہیں جن کو الٹ پلٹ سکتے ہیں۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ بے کار ہرگز نہ رہے؛ کتاب رکھنا اسے پڑھنے سے روک نہیں سکتا، اور ماہرِ نباتیات ہونا اسے مالی بننے سے روک نہیں سکتا تھا۔ جب اس کی پون مرسی سے شناسائی ہوئی اس وقت کی ہم دردی کرنل اور اس کے درمیان تھی— کرنل جو پھولوں کے لیے کرتا تھا، یہ پھلوں کے ساتھ کرتا۔ موسیو مابوف St. Germain جیسی خوش گوار ناشپاتیوں کے پودے تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا؛ اسی

قسم کی قلم کاریوں میں ایک قلم سے بظاہر اکتوبر آلوچے کی قلم تیار کی گئی تھی، جو موسم گرما کے کے مشہور آلوچوں سے کم خوش بو دار نہ تھے۔ وہ گرجا گھر پارسائی کی وجہ سے نہیں نیکی کی خاطر جاتا تھا اس لیے کہ وہ انسان کے چہروں کو پسند کرتا تھا، مگر اسے شور وغل سے نفرت تھی، کہ گرجا گھر ہی میں وہ لوگوں کو خاموش اور جمع پاتا تھا۔ اس احساس کے ساتھ کہ وہ ریاست میں کوئی کردار ادا کرے، اس نے وارڈن بننے کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود وہ کسی عورت سے محبت میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا، کہ وہ ایک گلِ لالہ سے یا کسی شائع شدہ کتاب سے محبت کرتا تھا۔ اسے ساٹھ برس کا ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تھا، اور جب کسی نے اس سے سوال کیا، ''کیا تم نے شادی کی ہی نہیں؟'' تو اس نے جواب میں کہا تھا، ''میں بھول گیا ہوں۔'' اور جب کچھ ہو جاتا — کس کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا؟ — تو وہ کہتا تھا، ''اوہ، کاش میں دولت مند ہوتا!''، اور یہ اس وقت نہیں ہوتا تھا جب وہ کسی لڑکی پر نگاہِ شوق ڈالتا تھا، جیسا کہ فادر ہیلیر نورما کیا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ کسی پرانی کتاب کا تصور کرتا تھا۔ ایک بوڑھی خادمہ کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اس کو گٹھیا کا عارضہ ہو گیا تھا، اور جب وہ گٹھیا کے وجہ سے اکڑا محوِ خواب ہوتا تو اس کی بوڑھی مڑی ہوئی انگلیاں بستر کی چادر کی سلوٹوں میں لپٹی پڑی ہوتی تھیں۔ اس نے Cauteretz پر رنگین پلیٹوں سے مزین ایک نباتات نامہ شائع کیا تھا، وہ ایک کام جس کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور جو خوب بک رہا تھا۔ لوگ دن میں دو یا تین بار Mesieres اسٹریٹ پر اس کی گھنٹی بجاتے، اور اس کو خریدتے تھے۔ اس سے اسے سال میں دو ہزار فرانک کے قریب آمدنی ہو جاتی تھی؛ تقریباً یہی اس کا سرمایہ تھا۔ وہ اگرچہ مفلس انسان تھا، اس میں صبر، تنگ دستی اور وقت کے باعث طرح طرح کی اشیا کی انوکھی نقلیں بنانے کی لیاقت تھی۔ وہ بغل میں کوئی کتاب دابے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں جاتا تھا، اور واپسی پر اکثر اس کے پاس دو کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کی قیام گاہ کی زمینی منزل کے چاروں کمرے کی ساری دیواروں کی آرائش فریم کیے ہوئے خشک پودوں کے بوٹی خانوں، اور قدیم ماہرین کے نقش ونگار پر مشتمل ہوتی تھی۔ کسی تلوار یا بندوق کا نظارا اس کے دورانِ خون میں سردی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ وہ زندگی بھر کبھی، کسی توپ کے قریب نہیں گیا، حتیٰ کہ Invalides کے عجائب گھر میں بھی۔ اس کا سفید بالوں والا ایک بھائی بھی تھا، جو پادری تھا جس کے نہ منہ میں دانت تھے نہ عقل میں، جس کے جسم کا ہر عضو تھرتھراتا رہتا تھا؛ جس کا لہجہ Picard کا لہجہ تھا؛ جس کی ہنسی نوزائیدہ بچوں جیسی ہوتی تھی؛ جس کا بشرہ کسی بھیڑ جیسا تھا اور جو جلد ہی خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ طُرفہ تماشا یہ تھا کہ زندہ لوگوں میں Porte-Saint-Jacques پر واقع رائل؛ می

کتابوں کی دکان کے مالک کے سوا اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس کا خواب تھا کہ فرانس کا سرکاری رنگ نباتی نیلا ہو جائے۔

اس کا ملازم بھی بھولا بھالا انسان تھا۔ اس کی بے چاری عمر رسیدہ خادمہ کنواری ہی تھی۔ اس کی زندگی کا رفیق سلطان نام کا ایک بلا تھا، جو Sixtine Chapel میں [مشہور اطالوی موسیقار] Allegri کی دعائیہ دھن میں ممیاتا پھرتا تھا۔ مرد کے معاملے میں اس کے تمام خواب ادھورے ہی رہ گئے تھے۔ وہ اپنے بلے سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ بلے کی طرح اس کے چہرے پر بھی مونچھوں کے چند بال اُگ آئے تھے۔ اس کی شان اس کی ٹوپیوں میں نظر آتی تھی، جو ہمیشہ [بُراق جیسی] سفید ہوتی تھیں۔ اتوار کے دن اس کا وقت الماری میں رکھی چادروں تولیوں اور دوسرے لوازمات کو گننے میں، اور اپنے بستر پر ان پارچوں کو پھیلا کر دیکھنے میں گزرتا تھا جو اس نے خریدے تھے مگر جن سے لباس تیار نہیں ہو سکے تھے۔ وہ پڑھنا جانتی تھی۔ موسیو مابوف اسے مادر پلوٹارک (Plutarque) کہا کرتا تھا۔

موسیو مابوف کو ماریوس اچھا لگتا تھا، اس لیے کہ ماریوس نوجوان ہونے کے علاوہ نرم مزاج تھا اور اس کی بزدلی کو چونکائے بغیر اس کی عمر کو تمازت فراہم کرتا تھا۔ نرم مزاجی سے ملی نوجوانی عمر رسیدہ لوگوں میں بغیر دھوپ کی ہوا جیسا اثر ڈالتی ہے۔ جب ماریوس فوجی شان و شوکت، بارود، پیش قدمی اور پیش قدمیوں کو روکنے والی پیش قدمی، اور ان تمام انوکھی لڑائیوں کے خیالات سے اکتا جاتا جن میں اس کے باپ نے تلوار کے زخم کھائے تھے اور دیے تھے تو وہ موسیو مابوف سے ملنے چلا جاتا، اور موسیو مابوف اس سے پھولوں کے نقطۂ نگاہ سے اپنے ہیروؤں کی باتیں کرتا تھا۔

اس کا پادری بھائی 1830ء میں انتقال کر گیا، اور اس کے فوراً بعد سے، جب راتیں لمبی ہونے لگتی تھیں موسیو مابوف کے لیے پورا افق تاریک ہونے لگتا تھا۔ دستاویزات کی تصدیق کرنے والے کی کوتاہی نے اسے دس ہزار فرانک کی وراثت سے محروم کر دیا تھا جو اس کے بھائی کے چھوڑے ہوئے اثاثے میں سے اسے ملنے والے تھے۔ جولائی کے انقلاب نے نشر و اشاعت میں بحران پیدا کر دیا تھا۔ مشکلوں سے پُر زمانے میں جس شے کی فروخت نہیں ہوتی وہ نباتات سے بنی آرائشی اشیا ہوتی ہیں۔ Cauteretz کے مضافات کی نباتی آرائشوں کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ ہفتوں کسی خریدار کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی موسیو مابوف گھنٹی کی آواز سنتے ہی دوڑ پڑتا تھا۔ ''موسیو!'' مدر پلوٹارک افسردہ لہجے میں کہتی، ''بہشتی پانی بھرنے آیا ہے۔'' مختصر یہ کہ ایک دن موسیو مابوف Mesieres اسٹریٹ سے نقلِ مکانی کر گیا، وارڈن کی ذمے داریوں سے

فارغ ہوگیا، Saint-Sulpice کو چھوڑ دیا، اور اپنی کتابیں نہیں، صرف وہ مطبوعات فروخت کر دیں — جن میں اس کی کم سے کم دل چسپی تھی — اور Montparnasse اسٹریٹ کے ایک مکان میں فروکش ہوگیا جہاں وہ دو وجوہ کی بنا پر صرف ایک سہ ماہی کے عرصے رہا تھا: سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زمینی منزل اور باغیچے کا کرایہ تین سو فرانک تھا، اور اس میں دو سو سے زیادہ کرایہ دینے کی سکت نہیں تھی؛ دوسری وجہ یہ تھی، کہ Faton چاند ماری کے قریب رہنا، جہاں سے ہر وقت پستول چلنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں، اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

وہ اپنی نباتی آرائشیں، اپنی تانبے کی پلیٹیں، اپنی فائلیں، اور اپنی کتابیں ساتھ لے گیا اور Salpetriere کے قریب Austerlitz کے گاؤں میں ایک پھونس کی چھت والے ایک جھونپڑے میں رہنے لگا، جہاں صرف پچاس کراؤن کرایے کے عوض اسے تین کمرے اور ایک باغیچہ مل گیا تھا جس کے اطراف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں اور ایک کنواں بھی تھا۔ اس نقل مکانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا تقریباً تمام فرنیچر فروخت کر دیا تھا۔ اپنی نئی قیام گاہ میں داخلے کے وقت وہ بہت خوش تھا، اور اس نے فوراً ہی دیواروں میں کیلیں گاڑنی شروع کر دی تھیں، جن پر خشک نباتات سے بنی آرائشیں آویزاں ہونے والی تھیں، اور بقیہ دن خود اپنے ہاتھوں سے باغیچے میں کھدائی کرتا رہا۔ اور رات کے وقت جب اسے احساس ہوا کہ مدر پلوٹارک اداس ہے اور غور و فکر میں مشغول ہے، تو اس کے کاندھے پر تھپکی دی اور مسکرا کر کہا، "ہمیں نیلا رنگ مل گیا ہے!"

صرف دو افراد، Porte-Saint-Jacque کے کتاب فروش اور ماریس، کو Austerlitz کے جھونپڑے میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ Austerlitz ایک لڑاکا نام تھا جو، سچ پوچھا جائے تو، اس کے مزاج سے بالکل نہیں ملتا تھا۔

پھر بھی، جیسا کہ ہم نے ابھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ دماغ جن میں ذرا بھی دانش ہو یا حماقت ہو یا جیسا اکثر ہوا کرتا ہے کہ ایک وقت میں دونوں ہی کیفیتیں ہوں، رفتہ رفتہ زندگی کے حقائق بارے میں واقف ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی اپنی قسمت دور کی بات ہوتی ہے۔ اس قسم کی مجہولیت کے ارتکاز کے نتائج، جو اگر دلائل کا نتیجہ ہوں، تو فلسفے سے مشابہ ہوں گے۔ کوئی انکار کرتا ہے، اپنے مقام سے نیچے اترتا ہے حتیٰ کی دور ہو جاتا ہے، بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک وقت آتا ہے جب یہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، مگر اس سے پیدا ہونے والی ہوش مندی دیر سے آتی ہے۔ اس دوران، ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا ہم نے خود کو اس کھیل سے باہر رکھا ہے جو ہماری خوشی اور ناخوشی کے درمیان جاری

رہتا ہے۔ ہم داؤ پر لگے ہوتے ہیں، اس لیے ہم اس کھیل کو لاپروائی سے دیکھتے رہتے ہیں۔

یہ سب اسی طرح ہوتا رہتا ہے، سوائے اس بادل کے جو ان کے اوپر بنتا رہتا ہے، جب ساری امیدیں ایک ایک کر کے بکھرتی جاتی ہیں، تب بھی موسیو مابوف طفلانہ انداز میں مگر پُرسکون رہتا ہے۔ ان کا ذہن شاقول کی طرح ہمہ وقت حرکت میں رہتا ہے۔ ایک بار کوئی فریب نظر کا شکار ہو جائے تو فریب نظر کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ جس وقت گھڑی کی چابی غائب ہو جائے تو گھڑی اسی وقت بند نہیں ہو جایا کرتی۔

موسیو مابوف کی اپنی معصومانہ خوشیاں تھی۔ یہ خوشیاں نہ ارزاں تھیں نہ غیر متوقع؛ محض اتفاق ان کی فراہمی کا باعث ہوا تھا۔ ایک دن مدر پلوٹارک ایک کونے میں بیٹھی رومانس کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ یہ قصہ وہ زور زور سے پڑھ رہی تھی، اس خیال سے کہ اس طرح وہ بہتر طور پر سمجھ سکے گی۔ زور سے پڑھنا انسان کو یقین دلاتا ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو [کسی متن کو] بہت زور سے پڑھتے ہیں، جو بظاہر اپنے آپ کو بتاتے رہتے ہیں کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔

اسی قسم کی توانائی تھی جس سے مدر پلوٹارک رومان کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ وہ اس کو سننے کی کوشش کے بغیر بھی سُن رہی تھی۔ پڑھنے کے دوران مدر پلوٹارک اس جملے پر پہنچی۔ یہ جملہ ایک گھڑسوار اور ایک حسینہ کا معاملہ تھا:

"— حسینہ شعلہ باری کر رہی تھی، اور گھڑسوار —"

اس موقعے پر وہ اپنی عینک صاف کرنے کے لیے رُکی۔

"بدھا اور شعلہ بار اژدھا" موسیو مابوف نے دھیمی آواز میں لقمہ دیا، "ہاں، یہ سچ ہے کہ وہاں ایک اژدہا رہتا تھا، جو اپنی ماند کی گہرائیوں سے، اپنے منہ سے شعلے اُگلتا تھا، اور آسمانوں میں آگ لگا دیا کرتا تھا۔ اس عفریت نے، جس کے پنجے کسی چیتے جیسے تھے کئی ستارے بھسم کر دیے تھے۔ بدھا اس کی ماند میں داخل ہوا اور اژدھے کو رام کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مدر پلوٹارک، تم بہت اچھی کتاب پڑھ رہی ہو۔ اس سے زیادہ خوب صورت کوئی فی جنڈ نہیں۔"

اور موسیو مابوف اپنے دل خوش کن خیالات میں غرق ہو گیا۔

۞

بدنصیبی کا قریبی ساتھی ــــ افلاس

ماریوس کو وہ راست باز آدمی بہت پسند تھا جو خود کو بتدریج ناداری کے چنگل میں جاتا دیکھ رہا تھا اور جسے رفتہ رفتہ شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی، مگر اس سے وہ اداس نہیں ہو رہا تھا۔ ماریوس کو فیراک سے ملا اور موسیو مابوف کو تلاش کرلیا، مگر ان کی ملاقات زیادہ سے زیادہ مہینے میں دو بار ہوتی تھی۔

ماریوس کی خوشیاں شہر کے باہر کی بولیوارڈ پر یا Champs-de-Mars پر، لکزمبرگ کی کم استعمال ہونے گلیوں میں طویل چہل قدمی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ مارکٹ گارڈن کو، برگِ کاہو کے تھالوں کو، گوبر کے ڈھیر پر چرتی مرغیوں کو اور گھوڑوں کے ذریعے چلائے جانے والے رہٹ کو بھی دیکھا کرتا تھا۔ راہ گیر اس کو حیرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے، جب کہ کچھ اس کے پہناوے کی وضع قطع کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ صرف ایک بے چارہ نوجوان آدمی تھا جو بالکل بے مقصد انداز میں خواب دیکھا کرتا تھا۔

اسی چہل قدمی کے دوران ایک دن اسے Gorbeau ہاؤس نظر پڑا، اور کم کرایے، اور اس کی تنہائی کے باعث اس نے اسی میں قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مکان میں وہ صرف موسیو ماریوس کے نام سے جانا جاتا تھا۔

جب اس کے والد کے شناسا کچھ جنرلوں اور پرانے ساتھیوں کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے اس سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔ ماریوس نے ملاقات کی دعوت سے انکار نہیں کیا۔ ان سے مل کر اسے اپنے باپ کے بارے میں باتیں کرنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔ اس طرح، وہ کبھی کبھی Comte Pajol سے جنرل Bellavesne تک اور جنرل Fririon سے ملاقاتیں

ہوتیں، اور وہ Invalides بھی جایا کرتا تھا۔ وہاں کچھ موسیقی اور رقص بھی ہوتا تھا۔ ایسی شاموں میں وہ اپنا نیا کوٹ زیب تن کرتا تھا، مگر وہ شام کی پارٹیوں یا رقص گاہوں میں کبھی نہیں جاتا تھا، سوائے ان دنوں کے جب سخت سردی ہوتی تھی، اس لیے کہ وہ سواری لینے کا مقدور نہیں رکھتا تھا، اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ آئینے کی طرح چمکتے جوتوں کے بجائے [بھدے اور گندے] بوٹوں میں وارد ہو۔

وہ، بغیر کسی تلخی کے، کبھی کبھی کہتا، آدمی کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ کسی بھی ڈرائنگ روم میں آپ پر ہر طرح کی گندگی لگ سکتی ہے، سوائے آپ کے جوتوں کے۔ اگر آپ اپنا استقبال اچھا چاہتے ہیں، تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے: آپ کا ضمیر بے داغ ہو؟ جی نہیں، آپ کے جوتے بے داغ ہوں۔"

عالمِ غور و فکر میں انسان کے دل کے سوا سارے جذبے ہوا ہو جاتے ہیں۔ ماریوس کے سارے سیاسی بخارات اسی طرح غائب ہو گئے تھے۔ 1830ء کے انقلاب نے اس عمل میں اس کو مطمئن اور پُرسکون کرنے میں اس معاونت کی تھی۔ وہ غیظ و غضب کو ایک جانب رکھنے کے باوجود ویسا ہی رہا تھا۔ اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ بس، ان میں اعتدال آگیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے اپنے کوئی خیالات ہی نہیں تھے؛ بس ایک جذبۂ ہم دردی باقی رہ گیا تھا۔ اس کا تعلق کس پارٹی سے تھا؟ انسانیت کی پارٹی سے! انسانیت میں اس نے فرانس کا انتخاب کیا؛ قوم میں اس نے عوام کا انتخاب کیا؛ عوام میں اس کا انتخاب ایک عورت تھی۔ یہی وہ سب سے اہم نقطہ تھا اس کا جذبۂ ہم دردی جس کی جانب ہو گیا تھا۔ اب وہ Marengo جیسے واقعے کے مقابلے میں Job جیسی ایک کتاب کو پسند کرتا تھا؛ عمل کے مقابلے میں خیال کو، ہیرو کے مقابلے میں شاعر کو فوقیت دیتا تھا۔ اور جب وہ مراقبے میں ایک پورا دن صرف کرنے کے بعد شام کو بولیوارڈوں کی طرف واپس ہوتا اور پیڑوں کی شاخوں کے درمیان سے نظر آنے والے لامتناہی خلا پر، بے نام کرنوں پر، پاتال پر، پرچھائیوں پر، معموں پر اور ان تمام کیفیات پر نظر ڈالتا تو اسے انسانیت نظر آتی تھی اور ہر شے بہت خوب صورت محسوس ہونے لگتی تھی۔

اس کا خیال تھا، بلکہ اصلاً یہی بات تھی، کہ اس کی رسائی انسانی فلسفے، اور زندگی کی حقیقتوں تک ہو گئی تھی، اور اس نے سوائے آسمان کے ہر شے پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا؛ کہ یہی وہ واحد شے تھی، سچائی جس کا اپنے کنویں کی تہہ سے بھی تصور کر سکتی ہے۔

اس عمل نے اس کو اپنے منصوبوں کو، اپنے اتصالات کو، اپنی مچان بندیوں کو، مستقبل

کے بارے میں تجاویز کو آگے بڑھانے سے روکا نہیں۔ ایسے عالمِ غور و فکر میں، کوئی آنکھ جو ماریوس کے اندرون میں جھانک کر دیکھ سکتی تو اس کے نفس کی پاکیزگی سے چندھیا جاتی۔ دراصل، اگر ہماری آنکھ میں وہ ہمت ہوتی جس سے وہ دوسروں کے ضمیر میں جھانک سکتی تو ہم ایک انسان کو زیادہ یقینی طور پر پرکھنے کے قابل ہو سکتے، کہ وہ کیسے خواب دیکھ رہا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ سوچ میں ارادہ ہوتا ہے، خواب میں کوئی ارادہ نہیں ہوا کرتا۔ مراقبہ، جو قطعی طور پر فطری ہوتا ہے، ہمارے مثالی، بلکہ مہیب جذبوں کی شکل سازی بھی کرتا ہے اور ان کو محفوظ بھی رکھتا ہے۔ ہمارے نفس کی گہرائیوں میں سے کوئی شے زیادہ براہِ راست اور زیادہ سنجیدگی سے نہیں ابھرتی، سوائے ان لاانتاہی اور غیر ارادی آرزوؤں کے جو نصیب کی درخشانی کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان آرزوؤں اور معقول اور مربوط خیالات ہی میں، نہ کہ ارادی کوششوں میں، آدمی کا اصلی کردار نظر آتا ہے۔ ہمارے عجیب و غریب اوہام اور خیالات ہی وہ شے ہوتے ہیں جو ہم سے سب سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی فطرت کے مطابق نامعلوم اور ناممکنات کے خواب دیکھتا ہے۔

1831ء کے درمیان ماریوس کی بوڑھی خادمہ نے اسے بتایا کہ اس کے پڑوسی بدنصیب ژاندریت خاندان کو گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ ماریوس، جس کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا، اپنے پڑوسیوں کو جانتا تک نہیں تھا۔ "انھیں کیوں نکالا گیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ وہ کرایہ ادا نہیں کرتے۔ ان پر دو سہ ماہی کرایہ قرض ہو گیا تھا۔"

"قرض کی رقم کتنی ہے؟"

"بیس فرانک۔" بوڑھی خادمہ نے کہا۔

ماریوس نے تیس فرانک اپنی میز کی دراز میں پس انداز کر رکھے تھے۔

"لو، یہ بیس فرانک۔" اس نے بوڑھی خادمہ سے کہا "ان بے چارے لوگوں کی طرف سے ادا کر دو، اور پانچ فرانک ان کے ہاتھ پر رکھ دو، مگر یہ نہ بتانا کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔"

قائم مقام تھیوڈول

اتفاق کی بات ہے کہ وہ رجمنٹ، لفٹنٹ تھیوڈول جس کا رکن تھا، پیرس کی چھاؤنی میں خدمات انجام دینے کے لیے آئی تھی۔ اس واقعے نے آنٹی ہلیر نورما کے ذہن میں ایک اور خیال ڈال دیا۔ پہلے موقعے پر اس نے لفٹنٹ تھیوڈول کے ذریعے ماریوس کی جاسوسی کی منصوبہ بندی کی تھی؛ اب اس نے منصوبہ بنایا کہ تھیوڈول ماریوس کی جگہ لے لے۔

ہر صورت میں اگر نانا کو کسی بھی نوجوان چہرے کی ضرورت محسوس ہوئی تو — کبھی کبھی صبح کی کرنیں اتنی پیاری ہوتی ہیں کہ [انسان کو] تباہ کر دیتی ہیں — اسے ایک اور ماریوس کی ضرورت ہوگی۔ ''اس کو ایک معمولی غلطی ہی سمجھنا چاہیے'' اس نے سوچا، ''جیسا کہ کتابوں میں ہوا کرتا ہے کہ اب ماریوس کی جگہ تھیوڈول پڑھا جائے۔''

[گویا] بھائی کا پوتا یا نواسہ بھی تقریباً اپنا ہی پوتا یا نواسہ ہوگا؛ ایک وکیل کی جگہ ایک نیزہ بردار ہوگا۔

ایک صبح جب موسیو ہلیر نورما اخبار Quotidienne پڑھنے ہی والا تھا کہ اس کی بیٹی اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور نہایت نرم لہجے میں کہا، اس لیے کہ یہ اس کا پسندیدہ معاملہ تھا:

''بابا، آج صبح تھیوڈول آپ کو سلام کرنے آنا چاہتا ہے۔''

''کون تھیوڈول؟''

''آپ کے بھائی کا پوتا۔''

''اوہ، اچھا۔'' نانا نے کہا۔

اس کے بعد وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا؛ اپنے بھائی کے پوتے کو بھول گیا؛ اس

کے نزدیک جو محض کوئی تھیوڈول یا کوئی اور تھا؛ اور پھر اچانک اسے غصہ آگیا جو اسے ہمیشہ اس وقت آیا کرتا تھا جب وہ کچھ پڑھا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو "صفحہ" تھا، اگرچہ شاہ پرست تھا جس میں بغیر کسی تکلف کے پیرس میں ہونے والے واقعات درج ہوتے ہیں، اعلان کیا گیا تھا کہ اگلے دن "قانون اور ادویہ کے طلبہ دوپہر کے قریب Place du Pantheon میں گفتگو کے لیے جمع ہونے والے ہیں۔" گفتگو کا موضوع اس وقت ایک سوال تھا جو وزیر جنگ اور "شہری ملیشیا" کے درمیان Louvre کے صحن میں کھڑی کی گئی توپ کے بارے میں پیش کیا جانے والا تھا۔ طلبہ اس پر بات کرنا چاہتے تھے۔ اس اعلان کو دیکھ کر موسیو بلیر نورما غصے سے بھڑک اٹھا۔

[اس کے ساتھ ہی] اسے ماریوس کا خیال آگیا جو قانون کا طالب علم تھا، جو غالباً سب کے ساتھ "دوپہر کے وقت Place du Pantheon میں ہونے والے گفتگو" میں شریک ہونے والا تھا۔

جس وقت وہ اپنے تکلیف دہ خواب سے گزر رہا تھا، سادہ لباس میں ملبوس لفٹنٹ تھیوڈول [اس کے کمرے میں] داخل ہوا، اور یہ اس کی ہوشیاری تھی، اور میدموزیل بلیر نورما نے بھی ہوشیاری سے اس کا تعارف کرایا۔ نیزہ باز نے اس لباس میں ہونے کی یہ توجیہ سوچی تھی "اس بوڑھے کے سامنے، جس نے اپنی ساری دولت زندگی بھر کے لیے پنشن میں یوں ہی تو نہیں جھونک دی ہے، [یعنی وہ بالکل احمق بھی نہیں] وقتاً فوقتاً یہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو ایک عام شہری کی صورت میں پیش کیا کرے۔"

میدموزیل بلیر نورما نے بلند آواز میں اپنے باپ سے کہا، "آپ کا پوتا، تھیوڈول۔"

اور دھیمی آواز میں لفٹنٹ سے کہا، "جو کچھ کہے، منظور کر لینا۔" اور وہاں سے کھسک لی۔

لفٹنٹ نے، جو اس قسم کے محترم موقعوں کا عادی نہیں تھا، نہایت بزدلی سے کہا، "گڈ ڈے، انکل!" اور فوجیوں کی طرح خود بخود میکانکی انداز میں سیلوٹ کیا جس کا اختتام بورژوائی سیلوٹ پر ہوا۔

"اوہ، اچھا! تو یہ تم ہو۔ ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔" بزرگ آدمی نے کہا۔

اتنا کہہ کر وہ نیزے باز کو بالکل بھول ہی گیا۔

تھیوڈول بیٹھ گیا اور موسیو بلیر نورما کھڑا ہو گیا۔

موسیو بلیر نورما نے تیز تیز [کمرے کے اندر] آگے پیچھے چلنا شروع کر دیا، اس کے ہاتھ جیب میں تھے؛ وہ زور زور بول رہا تھا، اور اپنی لرزاں انگلیوں سے جیبوں میں رکھی دو

کھڑیوں سے کھیل رہا تھا۔

"سنا ہے کہ لونڈے لپاڑیوں کا گروہ Place du Pantheon پر جمع ہو رہا ہے۔ بدمعاش، جو کل تک اپنی کھلائیوں کی گودوں میں تھے۔ اگر ان کی ناک پکڑ کر دبائی جائے تو اب بھی چھٹی کا دودھ نکل پڑے گا۔ وہ کل مذاکرات کریں گے، دوپہر کے وقت۔ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ ہم پاتال کی طرف سرکتے جا رہے ہیں۔ ان ننگے بوچے لونڈوں نے ہمارا یہ حال کیا ہے۔ یہ عوام کی توپوں سے کھلونا کھیل رہے ہیں۔ کھلے بندوں نیشنل گارڈ سے پک پک کرنے چلے ہیں۔ وہاں کس سے ملنے آ رہے ہیں؟ دیکھنا یہ Jacobinism انھیں کہاں لے جاتی ہے۔ میں تم سے ایک ملین کی شرط لگانے کو تیار ہوں کہ وہاں کل کوئی نہیں ہوگا سوائے سزا یافتہ اور آزاد کردہ غلاموں کے۔ یہ ری پبلکن اور جہازوں کے آزاد کردہ غلام! ایک ناک ہے تو دوسرا رومال ہے۔ Carnot کہا کرتا تھا، 'غدار، تو مجھے کہاں بھیجنا چاہتا ہے؟' Fouche جواب میں کہتا تھا، 'جہاں تو کہے گا، احمق!' ری پبلکن ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" تھیوڈول نے کہا۔

موسیو جلیر نورماں نے اپنا سر گھما کر تھیوڈول کی طرف دیکھا، اور کہتا رہا:

"ذرا سوچو تو، وہ غنڈا، اتنا کمینہ تھا کہ [اطالیہ کی خفیہ] carbonaro کا رکن بن گیا ہے۔ ابے تو نے میرا گھر کیوں چھوڑا تھا؟ تاکہ تو جائے اور ری پبلکن بن جائے۔ تُف ہے تجھ پر! سب سے پہلی بات تو لوگ ری پبلک نہیں چاہتے؛ وہ عقلِ سلیم رکھتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمیشہ بادشاہ ہی رہے ہیں، اور آئندہ بھی بادشاہ ہی ہوں گے؛ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام عوام ہی ہوتے ہیں، وہ تمھاری ری پبلک کا کھلونا بنا لیتے ہیں — احمق، تو سمجھ بھی رہا ہے کہ نہیں؟ یہ کھیل تماشا نہیں ہے۔ Pere Duchesne [جمہور دشمن اخبار] سے محبت کرنا، گلوٹین کی طرف شرما کر دیکھنا، رومانوی گیت گانا، 93' کی بالکنی کے نیچے گٹار بجانا — یہ نوجوان لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ ان پر تھوک دینا ہی کافی ہے۔ وہ سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ ان میں ایک بھی بھاگتا نہیں۔ ان کے لیے، اپنے حواس کھو دینے کے لیے، سڑک سے آنے والی ہوا میں سانس لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ انیسویں صدی زہر ہے۔ پہلی حماقت یہ ہوتی ہے کہ بکرے جیسی ڈاڑھی چھوڑ دیتا ہے؛ اپنے آپ کو سب سے بڑا غنڈہ سمجھنے لگتا ہے؛ اور اپنے پرانے عزیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ری پبلکن ہوتا ہے، وہ رومانٹک ہوتا ہے۔ یہ رومانٹک کیا بلا ہے؟ مہربانی کر کے مجھے بتا دو کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ ساری ممکنہ حماقتیں کرتا ہے۔ ایک برس قبل، وہ بھاگ کر

Hernani چلا گیا تھا۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ Hernani کیا ہے؟ یہ صنعتِ تضاد کیا ہوتی ہے؟ حقارت ہے، جسے فرانسیسی زبان میں لکھا تک نہیں جاتا۔ اور اب، Louvre کے صحن میں ان کے لیے توپیں موجود ہیں۔ اس عہد میں کیسی کیسی بدمعاشیاں ہوتی ہیں۔"

"انکل، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" تھیوڈول نے کہا۔

موسیو بلیر نورمانے دوبارہ کہنا شروع کیا:

"عجائب گھر کے صحن میں توپیں! کس لیے؟ کیا تم لوگ Apollo Belvedere پر گولا باری کرنا چاہتے ہو؟ ان کارتوسوں کا Venus de Medici سے بھلا کیا تعلق ہے؟ اُف! اس زمانے کے نوجوان سارے فحش کلامی کرتے ہیں۔ یہ Benjamin Constant کتنا اچھا آدمی ہے۔ اور جو بدمعاش نہیں وہ اناڑی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بدصورت بنانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں؛ خراب لباس پہنتے ہیں؛ عورتوں سے خوف زدہ رہتے ہیں؛ پیٹی کوٹ کی موجودگی میں درویشی کرنے لگتے ہیں، جس پر لڑکیاں قہقہے لگانے لگتی ہیں؛ میرے وعدہ کرنے پر [کہ میں اس کا نام نہیں ظاہر کروں گا]، ایک کہتی ہے کہ وہ بے چارے تو محبت کرنے سے شرماتے ہیں۔ ان میں عیب ہوتا ہے، اور وہ احمق بن کر اپنی کم زوری چھپا لیتے ہیں؛ وہ Tiercelin کے اور Potier کے لطیفے دہرانے لگتے ہیں؛ ان کے کوٹ ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں؛ اصطبل والوں کی واسکٹیں پہنے ہوتے ہیں؛ کھدر کی قمیصیں اور پتلون پہنتے ہیں؛ ان کے جوتے بھی کھردرے چمڑے کے ہوتے ہیں اور ان کی بے سروپا باتیں پرندوں کے پروں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ بازاری زبان سے اپنے پرانے جوتوں کے تلے لگواتے ہیں۔ اور اگر آپ پسند کریں تو لونڈوں کا یہ ٹولا سیاسی رائے بھی رکھتا ہے۔ سیاسی باتیں کرنے پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔ لوگ نظاموں کی نقل بناتے ہیں؛ سماج کو نئے سرے سے بناتے ہیں؛ شاہی کو مسمار کرتے ہیں؛ تمام قوانین کو زمین پر دے مارتے ہیں، اپنی دو چھتی کو گودام میں رکھ دیتے ہیں؛ اور قلی کو بادشاہ کی جگہ بٹھا دیتے ہیں؛ یورپ کو اُلٹ پلٹ دیتے ہیں؛ دنیا کو نئے سرے سے بنانے لگتے ہیں؛ ان کا عشق احمقانہ انداز میں دھوبن کے ٹخنوں کو تکنے میں ہوتا ہے جب وہ اپنی گاڑیوں میں سوار ہونے لگتی ہیں۔ اے بے ماریوں! اے فحش کلام! جا اور عوامی جگہوں پر گلا پھاڑ کر چلا۔ گفتگو کے لیے، بحث کرنے کے لیے، ضروری اقدام کے لیے، وہ ضروری اقدامات کو ہی سچا خدا کہتے ہیں۔ بے ترتیبی انکسار برتتی ہے، اور بیوقوف بن جاتی ہے۔ میں نے ابتری دیکھی ہے، اب میں بے ترتیبی دیکھ رہا ہوں۔ طلبہ نیشنل گارڈ سے مذاکرات کر رہے ہیں — ایسی چیزیں تو [قدیم امریکی] Ogibewas میں اور [لوئیریا!

کے وحشی [Cadodaches میں بھی دیکھی نہیں گئی ہیں۔ جنگلی لوگ برہنہ ہو جاتے ہیں؛ ان کے سر شٹل کاک کی طرح ہو جاتے ہیں؛ ان کے پنجوں میں ڈنڈے ہوتے ہیں؛ فنون کے گریجویٹ کے مقابلے میں زیادہ وحشی ہو جاتے ہیں۔ چار پیسے کے بندر! اور منصف بن بیٹھتے ہیں! یہ مخلوق مذاکرات کرتی ہے اور استدلال کرتی ہے۔ دنیا کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ یہ اس بدنصیب کرۂ آبی و خاکی کا اختتام ہے۔ بس ایک آخری ہچکی کی ضرورت تھی، اور وہ فرانس نے لے لی ہے۔ غنڈو، مذاکرات کرو۔ جب تک وہ Odeon کی محرابی چھتوں والے بازار میں اخبارات پڑھتے رہیں گے، ایسی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ان کی خوش مزاجی، ان کے دل، ان کے نفس اور ان کی دانش، سب ایک سو میں خریدی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد وہ اُبھرتے ہیں، اور اپنے اہلِ خاندان کو چھوڑ کر دور چلے جاتے ہیں۔ سارے اخبارات، حتیٰ کہ Drapeau Blanc بھی وبا کی مانند ہیں۔ Martainville اندر سے Jacobin تھا۔ تم شیخی کر سکتے ہو کہ تم نے اپنے دادا کو مایوس کر دیا ہے، ضرور کرو۔

"یہ بالکل واضح ہے۔" تھیوڈول نے کہا، اور اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ موسیو ییلر نورما سانس لینے کے لیے رکا تھا، تیزے بازنے کسی منصف کے انداز میں اضافہ کیا، Moniteur کے سوا کوئی اخبار نہیں ہونا چاہیے، اور Annuaire Militaire کے علاوہ کوئی کتاب نہیں ہونی چاہیے۔"

موسیو ییلر نورمانے اپنی بات پھر شروع کی:

"یہ تو [فرانسیسی رومن کیتھلک پادری] Sieyes جیسی بات ہوئی۔ شاہ کشی جو سینیٹر پر ختم ہوتی ہے کہ اسی پر ان کا کام ختم ہوتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو داغ دار کرتے ہیں، اور شہریوں کو آپ کہہ کر پکارتے ہیں، تاکہ بالآخر خود انھیں موسیو le Comte کہا جائے۔ موسیو le Comte میرے بازو جتنا بڑا، ستمبر کا قاتل۔ اور فلسفی Sieyes کے بارے میں کیا کہا جائے۔ میں اپنے ساتھ واقعی انصاف کروں گا، اگر میں کہوں کہ ان فلسفیوں کے بارے میں، سوائے Tivoli کے مسخرے باز کے پیش کردہ مناظر کے، میری رائے اچھی نہیں رہی ہے۔ ایک دن میں نے سینیٹروں کو ہنری چہارم کی جیسی بنفشی مخمل کی ٹوپیاں پہنے، جن پر شہد کی مکھیاں بکھری ہوئی تھی، Malplaquet گودی پار کرتے دیکھا تھا۔ وہ مجھے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ انھیں چیتوں کی عدالت سے نکلتے ہوئے بندر ہی کہا جا سکتا تھا۔ شہر کے باشندو! میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ تمھاری ترقی پاگل پن ہے؛ کہ تمھاری انسانیت ایک خواب ہے؛ کہ تمھاری جمہوریہ ایک عفریت ہے؛ کہ

تمھارا انقلاب ایک جرم ہے' کہ تمھارا نوجوان اور کنوارا ایک بندی خانے سے نکل کر آرہا ہے، اور یہ میں سب کے بارے میں کہنے پر اصرار کروں گا، وہ کوئی بھی ہو، وہ صحافی ہوں، ماہرِ معاشیات ہوں، قانون ساز ہوں، حتیٰ کہ تمھاری آزادی کے، مساوات کے بہتر جج، اور گلوٹین کی دھار کے فرقے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور میرے دوستو، یہ بات میں بہ بانگِ دہل کہہ رہا ہوں۔

"بہتر!" لفٹننٹ نے چیخ کر کہا "یہ حیرت انگیز سچ ہے۔"

موسیو بلیر نورما نے ایک لمحے توقف کا سا انداز اختیار کیا، اپنی ایڑیوں پر گھوما، تیزے بازتھیوڈول کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور کہا، "تم احمق ہو!"

❋

عرفیت — خاندانی ناموں کی تشکیل کے طریقے

اس زمانے میں ماریوس درمیانے قد کا ایک گبرو جوان تھا، گھنے اور بے حد سیاہ بال، بلند اور ذہانت گیر ابرو، چوڑے اور جذباتی نتھنے، پُر سکون اور معصومانہ بشرہ جس پر ناقابلِ بیان نوعیت کا تکبر اور تفکر پھیلا ہوتا تھا۔ چہرے کے تمام خطوط اپنے گداز سمیت اس طرح ہموار تھے کہ اس کے چہرے پر ایک قسم کی جرمن دل آویزی تھی جس میں [جرمنی کے قدیم مغربی علاقوں] Alsace اور Lorraine سے ہوتا ہوا فرانسیسی قیافہ شامل ہو جاتا تھا، اور ان زاویوں کا مکمل طور پر غائب ہونا، جس نے دریائے رہائن کے کنارے کے Celtic [شمال یورپی] اور جرمنوں کو رومن افراد کے درمیان آسانی سے قابلِ پہچان بنا دیا تھا اور جو [شیر صفت] leonine کو [عقابی ناک والی] aquiline نسل سے الگ کرتا تھا۔ اس وقت وہ زندگی کے اس دور میں تھا جب سوچنے والوں کے دماغ میں گہرائی اور بھولے پن کی برابر برابر حصوں میں ترتیب ہوتی ہے۔ اگر صورتِ حال کو خراب تصور کر لیا جائے تو اس کو وہ تمام خصوصیات مل گئی تھیں جو احمق بنانے کے لیے کافی ہوتی ہیں: کہ بس ایک بار گتھی گھمائی جائے اور وہ ارفع خیالات کا مالک ہو سکتا ہے۔ اس کے طریقے محتاط، سرد مہر اور شائستہ مگر بہت خلیق نہیں تھے۔ چوں کہ اس کا منہ دل فریب، اس کے لب سُرخ ترین اور اس کے دانت دنیا بھر میں سب سے زیادہ سفید تھے، اس کے تبسم نے چہرے کی سختی کو درست کر دیا تھا۔ کچھ موقعوں پر اس کے ابرو اور شہوت انگیز تبسم ایک غیر معمولی تفریق پیش کرتے تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں، مگر اس کا دیکھنے انداز بڑا ہوتا تھا۔

اپنی بدنصیبی کے بدترین زمانے میں اس نے دیکھا تھا کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھیں جب وہ ان کے پاس سے گزرتا تھا؛ وہ بھاگ جاتا یا چھپ جایا کرتا تھا، اور اس کی روح

پر موت کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔وہ سوچتا تھا کہ شاید اس کے پرانے کپڑوں کی وجہ سے وہ اسے گھور کر دیکھتی اوران پر ہنستی تھیں؛ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی شان وشوکت کی وجہ سے اسے دیکھتیں، اوراس کے خواب دیکھتی تھیں۔

اس کے اور خوب صورت راہگیروں کے درمیان اس قسم کی خاموش غلط فہمی اسے شرمیلا کردیتی تھی ۔جن سے وہ بھاگتا تھا ان کو پسند نہ کرنے کے سو بہانے تھے۔وہ ہمیشہ اسی طرح زندگی گزارتا رہا— نہایت بیوقوفی سے، جیسا کہ کوفیراک کہتا تھا۔

کوفیراک اس سے یہ بھی کہتا تھا کہ "محترم بننے کی آرزو نہ کیا کرو" (وہ آپس میں ایک دوسرے سے آپ کہہ کر بات کرتے تھے؛ نوجوانی کی دوستی میں اسی قسم کا انداز تخاطب ہوتا ہے)۔پیارے دوست میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں ۔کتابیں زیادہ نہ پڑھا کیجیے، اور معشوقاؤں کی طرف ذرا زیادہ دیکھا کیجیے۔ماریوں!بد مزاج یا بدمعاش عورتوں میں بھی کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں۔اس طرح شرمانے اور بھاگنے سے آپ حیوان بن جائیں گے۔"

دوسرے موقعوں پر کوفیراک اس سے ملتا تو "موسیو پادری" کہہ کر اس سے مخاطب ہوتا تھا۔ جب کوفیراک اس سے اس قسم کا تخاطب کرتا تو ماریوں، زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے تک عورتوں کو، جوان ہوں یا بوڑھی، نظر انداز کردیتا تھااور کوفیراک سے دور رہتا تھا۔

پھر بھی، اتنی ساری مخلوقات میں دو عورتیں ایسی تھیں ماریوں جن سے دور نہیں بھاگتا تھا، اوران کی بالکل پروا بھی نہیں کرتا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اگر اس کو بتادیا جاتا کہ وہ دونوں عورتیں ہیں تو اسے بہت حیرانی ہوتی ۔ایک ڈاڑھی والی عورت تھی جو اس کے کمرے کی صفائی کرتی تھی، جس کو دیکھ کوفیراک کہتا تھا، "اس عورت کو ڈاڑھی میں دیکھ کر ماریوں ڈاڑھی نہیں رکھتا۔" دوسری ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، جو بارہا نظر آتی تھی مگر ماریوں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔

ایک برس سے ماریوں لکزمبرگ کی گلیوں میں جو Pepiniere کے پشتے کے اطراف جاتی تھیں،ایک آدمی اورایک بہت کم عمر لڑکی کو دیکھ رہا تھا، جو l'Ouest اسٹریٹ سے نکلنے والی ایک گلی کے بالکل آخری سرے پر ہمیشہ ایک ہی بنچ پر ایک ساتھ بیٹھے ہوتے تھے۔ہر بار وہ اتفاق، جو ان لوگوں کی چہل قدمی میں مخل ہوتا تھا جن کی نگاہیں اپنے اندرون ہی کی طرف ہوتی ہیں، ماریوں کو اسی گلی کی طرف لے جاتا تھا— اور یہ تقریباً ہر روز ہوتا تھا— کہ وہ دونوں وہیں موجود ہوتے تھے۔اس آدمی کی عمر ساٹھ برس کے قریب رہی ہوگی؛ وہ بہت مایوس اور سنجیدہ لگتا

تھا: اس کی توانا اور بے زار شخصیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فوج کی ملازمت میں رہا ہوگا۔ اگر وہ تمغا لگائے ہوتا تو ماریوس کہتا کہ "یہ فوج کا کوئی سابق افسر ہے۔" اس کا انداز مہربان مگر نا آشناؤں جیسا تھا، اور وہ کسی کی آنکھوں کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ وہ نیلے رنگ کا پتلون، نیلے رنگ کا فراک کوٹ اور بڑے چھجے والی ہیٹ پہنتا تھا، جو ہمیشہ نئی نظر آتی تھی اور ایک سیاہ رنگ کا گلوبند اور قمیص جو شفاف سفید مگر موٹے کپڑے کی ہوتی تھی۔ ایک مزدور عورت ایک دن اس کے پاس سے گزری تو اس نے کہا تھا، "کتنا صاف ستھرا رنڈوا ہے۔" اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے۔

پہلی بار جب وہ لڑکی جو آدمی کے ساتھ ہوتی تھی، آئی اور اسی بنچ پر بیٹھ گئی، گویا وہ اس کی تھنی ہو؛ وہ تیرہ یا چودہ برس کی عمر کی تھی، دُبلی پتلی، سیدھی سادی، بدسلیقہ اور نا قابلِ توجہ تھی مگر اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں، مگر کچھ یوں تھا کہ وہ ہمیشہ ایک قسم کے ناگوار انداز میں اٹھتی تھیں۔ اس کا لباس بچکانہ اور عمر رسیدہ دونوں انداز کا ہوتا تھا، ویسا ہی لباس جیسا کہ خانقاہوں کی لڑکیاں پہنتی ہیں؛ سیاہ اونی پارچے سے بنے لبادے پر مشتمل تھا۔ دونوں باپ بیٹی جیسے لگتے تھے۔

ماریوس اس عمر رسیدہ آدمی کو اور اس لڑکی جس کی ابھی شخصیت بنی نہیں تھی، چند دنوں تک غور سے دیکھتا رہا اور اس کے بعد ان پر توجہ دینا چھوڑ دیا۔ اور بہ ظاہر دوسرے لوگ تو انھیں دیکھتے بھی نہیں تھے۔ وہ بڑے پُرسکون انداز میں اور لاپروائی سے باتیں کرتے تھے۔ لڑکی مسلسل اور خوش مزاجی سے بولتی رہتی تھی۔ وہ آدمی بولتا تھا مگر کم اور کبھی کبھی؛ اس کی نظریں لڑکی پر ناقابلِ بیان پدری انداز سے لبریز جمی ہوتی تھیں۔

ماریوس کی اس گلی میں چہل قدمی کی عادت میکانکی سی ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ انھیں وہیں پاتا تھا۔

پھر، کچھ یوں ہونے لگا:

ماریوس گلی کے اس سرے تک آنا پسند کرتا تھا جو بنچ سے سب سے زیادہ دور تھا؛ وہ پوری گلی چہل قدمی کرتا؛ ان کے سامنے سے گزرتا پھر اسی سرے تک جاتا جہاں سے داخل ہوتا، اور ایک بار پھر چہل قدمی شروع کر دیتا تھا۔ یہ عمل وہ پانچ یا چھ بار کرتا تھا، اور وہ ہفتے میں پانچ یا چھ بار وہاں آتا تھا، مگر ان میں سے کسی کو سلام دعا کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ وہ شخص، اور وہ نوجوان لڑکی، حالاں کہ وہ ہر نظر کو نظر انداز کرتے تھے، فطری طور پر ان پر ان پانچ یا چھ طالب علم لڑکوں کی نظر پڑی جو Pepiniere کے ساتھ ساتھ اکثر چہل قدمی کیا کرتے تھے؛ مطالعے کے شائق لیکچر کے بعد جب دوسرے بلیئرڈ کے کھیل کے بعد کوفیراک نے، جو ان میں

سب سے آخر میں تھا۔ ان دونوں کو کئی بار دیکھا تھا، مگر لڑکی کو عام گھریلو لڑکی سمجھ کر تیزی اور احتیاط سے الگ ہو گیا تھا۔ وہ ان دونوں کو ایک عرفیت دے کر وہاں سے تیر کی طرح بھاگ نکلا تھا۔ اس لڑکی کے لبادے اور عمر رسیدہ انسان کے سفید بالوں سے متاثر ہو کر اس نے بیٹی کو میڈموڈیل Lanoire اور باپ کو موسیو لیبلا نک (Leblanc) کی عرفیت دے دی تھی، تا کہ لوگ انھیں کسی اور نام سے نہ جانیں، اور کسی اور نام کی غیر موجودگی میں یہ عرفیت ان کا نام بن گئی تھی۔ طالب علم کہتے، "اوہ، موسیو لیبلا نک اپنی بنچ پر موجود ہے۔" اور دوسروں کی طرح ماریوس بھی اس نامعلوم آدمی کو موسیو لیبلا نک کہنے لگا تھا۔

ہم بھی، ان لوگوں کی پیروی اور کہانی میں سہولت کے لیے، اسے موسیو لیبلا نک ہی کہیں گے۔

لہٰذا پہلے برس میں اسی وقت ماریوس انھیں ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ وہ آدمی اس کے مزاج کا تھا، جب کہ لڑکی محض لڑکی ہی تھی۔

۞

نئی کرن

اگلے برس، بالکل اسی مقام پر، آج جہاں قاری پہنچ چکا ہے، کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ لکسمبرگ کی اس عادت میں خلل پڑ گیا، ماریوس کو جس کی بالکل خبر نہ تھی۔ کیوں؟ اور چھ ماہ گزر گئے، جس دوران اس نے اس گلی میں اپنا قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

بالآخر، ایک دن وہ وہاں واپس پہنچا؛ وہ موسمِ گرما کی پُرسکون شام تھی اور ماریوس نہایت خوش گوار کیفیت میں تھا، ایسی کیفیت میں جب موسم اچھا ہوا کرتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے دل میں جھاڑیوں کے چھپے ہوتے سن رہا ہو، اور پیڑ کے پتوں کے درمیان سے نیلے آسمان کے تمام ٹکڑے جو اس کی نظر کے سامنے تھے، اس کی طرف جھانک رہے ہوں۔

ماریوس سیدھا اپنی گلی میں گیا اور جب گلی کے آخری سرے پر پہنچا تو اسی بنچ پر وہی مشہور جوڑا بیٹھا نظر آیا، مگر جب وہ ان کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ آدمی تو وہی تھا مگر ایسا محسوس ہوا گویا لڑکی وہ نہیں تھی۔ اس وقت جو شخصیت سامنے تھی وہ ایک قد آور اور خوب صورت مخلوق تھی جس میں کسی عورت کے تمام دل فریب خطوط واضح تھے جو اس بچی کی شخصیت میں شامل ہو گئے تھے ہم جن کا صرف ان دو لفظوں میں اظہار کر سکتے تھے — "پندرہ برس"۔ اس کے خوب صورت بال گہرے بادامی رنگ کے؛ رخسار گلاب کی پنکھڑیوں سے بنے محسوس ہوتے تھے جن پر زردی مائل مشتعل سفیدی پھیلی ہوئی تھی؛ اس کے لب اتنے نفیس تھے کہ وہ مسکراتی تو ان سے سورج کی کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں؛ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ گیا تھے موسیقی کے راگ تھے؛ اس کا سر گیا تھا [سولھویں صدی کے مشہور ترین اطالوی مصور] رفائیل نے اپنے کسی شاہکار کا کنواری مریم کی اس گردن پر رکھ دیا تھا جسے اسی صدی کے عظیم سنگ تراش نے وینس کے لیے تراشا تھا۔

اس سحر آمیز چہرے میں کسی شے کی کمی نہ رہ جائے، اس لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کی ناک بہت خوش نما نہیں تھی — بس اچھی تھی؛ نہ زیادہ ستواں تھی، نہ مڑی ہوئی، نہ اطالوی تھی نہ یونانی؛ وہ ناک خالص پیرس کی ناک تھی، یعنی روحانی، نازک، بے ترتیب و ناہموار ناک، مگر بے داغ ناک — ایسی جو مصوروں کو مایوس مگر شاعروں پر جادو کر دیتی ہے۔

ماریوس جب اس کے پاس سے گزرا تو اس کی آنکھیں دیکھ نہیں سکا تھا، جو ہمہ وقت جھکی رہتی تھیں۔صرف اس کی بھورے رنگ کی لانبی پلکیں نظر آئی تھیں جو اس کی آنکھ پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔

ان سب نے اس خوب صورت لڑکی کو سفید بالوں والے عمر رسیدہ آدمی کی باتیں سن کر مسکرانے سے روکا نہیں، جھکی ہوئی ان پلکوں سے مل کر اس کا تبسم پہلے سے زیادہ تر و تازہ اور مزید مسحور کن ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو ماریوس یہ سمجھا کہ شاید یہ اس آدمی کی دوسری لڑکی تھی، یعنی پہلی لڑکی کی بہن، مگر جب اپنے ہمیشہ کی طرح چہل قدمی کا دوسرا پھیرا اسے بنچ کے قریب لے آیا، اور اسے لڑکی کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا تو اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی لڑکی تھی۔ چھ مہینے کے اندر وہ چھوٹی سی لڑکی ایک دوشیزہ بن گئی تھی۔قدرت کے ایسے مظاہر ہمیشہ نظر آتے رہتے ہیں۔ایسا بھی لمحہ ہوتا ہے کہ اچانک لڑکیاں لجائی ہوئی کلی سے کھلا ہوا گلاب کا پھول بن جاتی ہیں۔ وہ جو کل آپ کے سامنے بچی تھی آج آپ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والی عورت بن جاتی ہے۔

بچی زیادہ بڑی نہیں ہوئی تھی، بس مثالی عورت ہو گئی تھی۔جس طرح اپریل [بہار] کے مہینے کے تین دن کسی درخت کو پھولوں سے بھر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں، چھ ماہ کا مختصر عرصہ اس لڑکی کو حسن کے لباس میں ملبوس کرنے کے لیے کافی تھا۔اس کے بہار کے دن آگئے تھے۔

کبھی کبھی ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو مفلس اور حقیر ہوتے ہیں مگر اک دم جاگ اٹھتے ہیں؛ عسرت سے عیش و عشرت میں پہنچ جاتے ہیں؛ ہر قسم کے اخراجات میں غرق ہو جاتے ہیں اور اچانک چکا چوند کرنے والے، مسرف اور شان و شوکت والے ہو جاتے ہیں۔

اور اب وہ لڑکی اپنی نمدے سے بنی ہیٹ، اونی پارچے سے بنے لبادے، طالبات والے جوتوں، اور سُرخ ہاتھوں والی اسکول کی لڑکی نہیں رہ گئی تھی؛ اپنے حسن کے ساتھ اسے حسن کا قرینہ بھی آگیا تھا؛ اب وہ ایک خوش پوشاک لڑکی تھی جس میں، تصنع سے عاری، ایک قسم کی نزاکت آگئی تھی۔اس کے جسم پر سیاہ دمشقی پارچے کا لباس تھا، جس پر اسی پارچے کا گلا بنا ہوا تھا اور سر پر سفید جالی سے بنی ٹوپی تھی۔اس کے سفید رنگ کے دستانے اس کی انگلیوں کی نزاکت کا

اظہار کر رہے تھے جو جھتری کے ہاتھی دانت سے بنے ہتھے سے کھیل رہی تھیں؛ اس کے ریشمی جوتے اس کے پیروں کی تچھوٹائی کو واضح کر رہے تھے۔ کوئی اس کے پاس سے گزرتا تو اس کے سنگھار سے آنے والی اثر انگیز خوش بو کو محسوس کر سکتا تھا۔

مگر وہ آدمی، ہمیشہ کی طرح ہی تھا۔

دوسری بار جب ماریوں اس بنچ کے قریب پہنچا تو اس نوجوان لڑکی نے اپنی پلکیں اٹھائی تھیں؛ اس کی آنکھیں گہرے آسمانی رنگ کی تھیں، مگر نقاب کے پیچھے کی آسمانی گہرائی میں سوائے بیگانہ نظر کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے ماریوں کی طرف ایسی لاپروائی سے دیکھا، جیسے کوئی انجیر کے درختوں کے نیچے بھاگتے آوارہ لڑکوں کو دیکھتا ہے؛ یا مرمر کے بنے اس گل دان کو دیکھتا ہے جو بنچ پر اپنا سایہ ڈال رہا ہو۔ اپنے طور پر، ماریوں چہل قدمی میں مصروف تھا جب کہ اس دوران اُس کا خیال کہیں اور تھا۔

ماریوں اس بنچ کے قریب سے جہاں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی پانچ یا چھ بار گزرا تھا، مگر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

بعد کے دنوں میں بھی، اپنی عادت کے مطابق وہ لکسومبرگ کی طرف جاتا؛ اور ہمیشہ کی طرح اسے 'باپ بیٹی' بیٹھے ملتے، مگر اب وہ ان پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ وہ لڑکی کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا، حالاں کہ اب وہ پہلے والی سادہ مزاج لڑکی نہیں، ایک خوب صورت عورت بن گئی تھی۔ ماریوں بنچ کے بہت پاس سے گزرا جہاں لڑکی بیٹھی تھی، اس لیے کہ یہ اس کی عادت تھی۔

۞

بہار کا اثر

ایک دن جب ہوا گرم تھی، ٹنگمبرگ میں سایوں اور روشنیوں کا ہجوم تھا، آسمان اس قدر صاف تھا گویا اس صبح اسے فرشتوں نے مَل مَل کر دھویا ہو، شاہ بلوط کے درختوں کے سایوں میں زور شور سے گونجتی ہوئیں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ماریوس نے اپنا پورا نفس فطرت کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا؛ وہ بالکل خالی الذہن تھا، اس طرح کہ بس وہ سانس لے رہا تھا اور زندہ تھا؛ وہ بنچ کے قریب سے گزرا تو نوجوان لڑکی نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا اور دو نظریں آپس میں ٹکرا گئیں۔

اس موقعے پر لڑکی کی آنکھوں میں کیا تھا؟ ماریوس بتا نہیں سکتا تھا۔ اس میں کچھ نہیں بھی تھا، اور سب کچھ تھا۔ بس ایک حیرت انگیز جھماکا سا ہو گیا تھا۔

لڑکی نے اپنی نظریں نیچے کر لیں، اور ماریوس اپنے راستے چلتا چلا گیا۔

ماریوس نے اس موقعے پر جو کچھ دیکھا تھا وہ کسی لڑکی کی سادہ اور بے تکلف نظریں نہیں تھیں؛ ایک خفیہ خلیج سی تھی جو نصف وا ہو گئی تھی، اور پھر یکا یک بند ہو گئی تھی۔

اب وہ دن آ گیا تھا جب لڑکی اس طرح نظریں ملا رہی تھی۔ اور نتانہ وہ بنا جو اتفاق سے وہاں موجود تھا۔

نفس کی وہ پہلی نظر، جو خود سے بھی واقف نہیں ہوتی، آسمان میں سویرے کے مانند ہوتی ہے۔ یہ کسی حیرت انگیز اور تابناک شے کے اچانک جاگ اٹھنے کا عمل ہوا کرتا ہے۔ دنیا میں ایسی کوئی شے نہیں جو اس غیر متوقع، خطرناک مگر دل فریب نظر کے بارے میں کچھ بتا سکے، جو محترم اور مبہم سایوں سے نکل کر اچانک جھماکا کرتی ہے؛ جو وقتِ موجود کی اور مستقبل کی تمام تر معصومیت سے لبریز ہوتی ہے۔ اس میں ایک قسم کی ناقابلِ بیان نرمی اور لجاجت ہوتی ہے جو خود

کو اتفاق کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور انتظار کرنے لگتی ہے۔ یہ معصوم کنوار پنے کا ایک قسم کا جال ہوتا ہے جس کا خود کنوار پنے کو بھی علم نہیں ہوتا، جو بغیر کسی خواہش، ارادے اور علم کے دلوں کو گرفتار کر لیتا ہے۔ وہ کنواری لڑکی ہوتی ہے، مگر اس کی نظریں کسی عورت کی سی ہو جاتی ہیں۔

یہ ناممکن ہے کہ ایسی نظر، پڑنے والی نظر کو کسی خواب میں مبتلا نہ کر دے۔ اس نظر کی ساری پاکیزگی اور ہر قسم کا کھرا پن ایسی آسمانی اور مہلک نظر سے مل جاتا ہے جو عشوہ گری کے نرم و نازک اور طے شدہ طریقے سے نظروں میں وہ جادوئی طاقت پیدا کر دیتی ہے جو روح کی گہرائیوں میں اچانک غم انگیز پھول کھلانے لگتی ہے، جس میں خوش بو بھی ہوتی ہے اور زہر بھی، اور اسی کو محبت کہتے ہیں۔

اس شام، اپنے کمرے میں واپس آتے ہی ماریوس نے اپنے لباس پر تنقیدی نظر کی، اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ کیسے فقیرانہ، نازیبا، اور ناقابلِ بیان حد تک احمقانہ روز مرۂ کے لباس میں لکسمبرگ میں چہل قدمی کرنے جاتا ہے؛ کناروں سے خستہ ہیٹ؛ پیروں میں گاڑی بانوں کے سے بھدے بوٹ. سیاہ رنگ کا پتلون جو گھٹنے پر سفید ہو چکا ہے؛ اور سیاہ رنگ کا کوٹ کہنیوں کے پاس سے جس کا رنگ اڑ چکا ہے۔

❁

ابتدائے عشق ہے....

اگلے دن حسب معمول اپنے وقت پر ماریوس نے کپڑوں کی الماری میں سے اپنا نیا کوٹ نکالا، نیا پتلون نکالا، نئی ہیٹ نکالی، اور نئے بوٹ نکالے؛ اس نے خود کو مکمل زرہ بکتر سے آراستہ کیا، دستانے پہنے جو ایک بڑی عیاشی تھی اور لکسمبرگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں اس کی کوفیراک سے مڈبھیڑ ہو گئی، مگر وہ اس طرح گزر گیا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ کوفیراک نے گھر واپسی پر اپنے دوستوں سے کہا، "میری ابھی ماریوس کی نئی ہیٹ اور نئے کوٹ سے ملاقات ہوئی ہے، جن کے اندر پوشیدہ ماریوس ہی تھا۔ بلاشبہ وہ کسی امتحان میں کامیاب ہونے جا رہا تھا۔ مجھے تو وہ بالکل بیوقوف لگ رہا تھا۔"

لکسمبرگ پہنچ کر ماریوس نے فوارے والے تالاب کا ایک چکر لگایا، راج ہنسوں پر نظر ڈالی؛ اس کے بعد دیر تک اس مجسمے کے سامنے کھڑا رہا جو کائی سے بالکل سیاہ ہو رہا تھا اور جس کے کولھوں میں سے ایک کولھا غائب تھا۔ تالاب کے قریب ہی ایک چالیس سالہ بورژوا نظر پڑا، جس کا بڑا سا پیٹ نکلا تھا، جس کے ہاتھوں میں ایک پانچ سالہ شریر لڑکے کا ہاتھ تھا، جس سے وہ کہہ رہا تھا، "بیٹا فاصلے کا خیال رکھا کرو؛ جابرانہ حاکمیت اور نراجیت سے برابر فاصلہ رکھا کرو۔" ماریوس نے بورژوا کی بات سنی۔ اس کے بعد اس نے فوارے کے تالاب کا ایک بار پھر چکر لگایا۔ بالآخر اس نے 'اپنی گلی' کی طرف، آہستگی سے مگر افسوس کے ساتھ، قدم بڑھانے شروع کیے۔ اس کا انداز دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ اسے وہاں جانے کے لیے دھکیلا بھی جا رہا تھا، اور روکا بھی جا رہا تھا۔ خود اسے بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق وہی کر رہا تھا، جیسا کہ ہمیشہ کیا کرتا تھا۔

اپنی گلی قدمی پر آتے ہی اسے گلی کی دوسری جانب موسیو لیبلانک اور وہ لڑکی 'اپنی بنچ' پر

بیٹھے نظر آئے۔ اس نے گلے تک اپنے کوٹ کے سارے بٹن بند کر لیے؛ کوٹ کو نیچے کی جانب کھینچا تا کہ اس میں کوئی سلوٹ نہ رہ جائے؛ مہذب انداز میں اپنے پتلون کی چمک دمک کا معائنہ کیا اور بنچ کی طرف چل پڑا۔ یہ پیش قدمی بالکل کسی حملے کی طرح کی جا رہی تھی، یقینی طور پر جو فتح کی امنگ سے بھرپور تھی۔ میں اس کی اس پیش قدمی کو ہنی بال کی روم کی جانب پیش قدمی" کہہ سکتا ہوں۔

بہرحال، اس کی ساری حرکات و سکنات بالکل میکانکی تھیں اور اس نے اپنے ذہن کے حسبِ معمول استغراق میں کوئی خلل نہیں آنے دیا۔ اس وقت اس کے نزدیک بیکالوریا [فرانسیسی سیکنڈری تعلیم] کی تمام درسی کتابیں احمقانہ تھیں؛ اور یہ بھی کہ شاید کسی خاص قسم کے گدھے نے ان کی تالیف کی تھی، جن سے Racine کے تینوں المیوں اور مولیئر کی صرف ایک کامیڈی کے شاہکاروں کا تجزیہ کیا جانا مقصود تھا۔ اس کے کان میں تیز سیٹی سی بجنے لگی تھی۔ وہ بنچ کی جانب بڑھ رہا تھا اور اپنے کوٹ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کی نظریں نوجوان لڑکی پر مرکوز تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا لڑکی نے پوری گلی کو ایک مبہم نیلی روشنی سے بھر دیا تھا۔

جیسے جیسے وہ قریب ہوتا جا رہا تھا، اس کے قدم آہستہ ہوتے جا رہے تھے۔ بنچ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر، اور قبل اس کے کہ گلی کا سرا آ جاتا، وہ رک گیا اور وہ خود بھی بتا نہیں سکتا تھا کہ اچانک اس نے الٹے قدموں چلنا کیوں شروع کر دیا تھا۔ اس نے خود سے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ گلی کے سرے تک نہیں جائے گا۔ اتنے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے لڑکی اسے مشکل سے اس کے نفیس لباس میں دیکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ مستعد کھڑا رہا، مبادا کوئی عقب سے اسے دیکھ رہا ہو۔

وہ گلی کے آخری سرے تک پہنچا اور واپس آیا، اور اس بار وہ بنچ کے ذرا زیادہ قریب پہنچ گیا تھا۔ اتنا قریب کہ اس کے اور بنچ کے درمیان صرف تین پیڑ رہ گئے تھے، مگر وہاں پہنچ کر اسے مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، اور وہ ہچکچا کر رہ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا لڑکی کا چہرہ اس کی جانب ہو گیا تھا۔ مگر اس نے شدت کے ساتھ مردانہ کوشش کی، اپنی ہچکچاہٹ کو دبایا، اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ بنچ کے سامنے تھا۔ اس کے کان کی لویں سُرخ ہو گئی تھیں؛ اور کسی مدبر کی طرح کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے، دائیں بائیں دیکھے بغیر، بنچ کے سامنے مستعدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس لمحے جب وہ بڑھ رہا تھا، اس کا دل وحشیانہ انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ پچھلے دن کی طرح، وہ لڑکی دمشقی پارچے کا لبادہ اور سر پر کریپ کی جالی ڈالے ہوئے تھی۔ ماریوس کے کانوں میں ایک ناقابلِ بیان آواز آئی، جو شاید لڑکی کی رہی ہو گی۔ وہ بڑے پُرسکون انداز میں بات کر رہی تھی۔ اگرچہ ماریوس نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔

اس نے سوچا، "اگر لڑکی کو علم ہو جاتا کہ میں ہی وہ قابلِ احترام شخص ہوں جس نے Marcos Obregon de la Ronde پر ایک مقالہ لکھا تھا، جس کے بارے میں موسیو Francois

de Neufchateau نے کہا تھا کہ یہ مقالہ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے خود لکھا ہو؛ جو Gil Blas کے سرورق پر شائع ہوا تھا تو اس کے دل میں میرے لیے جذبات موجزن ہو جاتے۔" وہ بنچ کے اس قدر قریب گیا جہاں تک جانا ممکن تھا، اس بعد وہ اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا اور ایک بار پھر اس پیاری سی لڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔اس بار اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔اس کی حرکات وسکنات اس کے قابو میں نہیں تھیں۔وہ بنچ سے گزر کر آگے تک چلا گیا، اور اس دوران گمان کر رہا تھا کہ لڑکی اس کی جانب دیکھ رہی ہے، اور اس خیال کے آتے ہی وہ لڑکھڑا گیا تھا۔

اس نے دوبارہ بنچ کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی؛ اپنی چہل قدمی کے درمیان رُک گیا، اور وہیں بیٹھ گیا، جیسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا، اور اپنے جذبات کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر غور کرنے لگا، اس لیے کہ اس کے نزدیک یہ عجیب بات تھی کہ ان افراد کے سیاہ لبادے اور سفید چھتریوں کی اس نے ہمیشہ تعریف کی تھی، مگر اس کے نئے کوٹ اور شان دار پتلون کی تعریف کے معاملے میں بے وہ حس ہو گئے تھے۔

ایک چوتھائی گھنٹا گزرنے کے بعد وہ اس طرح اُٹھا گویا ایک بار پھر ہم اس بنچ کی طرف پیش قدمی کرنے والے تھے جسے ایک قسم کا نورانی تاج گھیرے ہوئے تھا۔مگر وہ بے حس وحرکت اسی جگہ کھڑا رہا۔پندرہ مہینے کے عرصے میں پہلی بار اس نے خود سے کہا کہ ان حضرت نے، جو ہر روز اپنی بیٹی کے ساتھ آ کر بنچ پر بیٹھے رہتے ہیں، اپنے طور پر اس پر نظر کی ہے، اور غالباً اس کی محنت کو غیر معمولی سمجھا ہے۔

اور یہ بھی پہلی بار ہوا کہ اپنے خفیہ خیالات میں، اسے اجنبی کو موسیو لیبلا نک کا فرضی نام دینے کے سلسلے میں اپنی بدلحاظی کا احساس ہو رہا تھا۔چند منٹ، وہ اپنا سر جھکائے کھڑا رہا اور اپنی بید کی نوک سے، جو اس کے ہاتھ میں تھی، ریت پر کچھ نقش ونگار بناتا رہا۔

پھر وہ اچانک موسیو لیبلا نک اور اس کی بیٹی کی بنچ کی مخالف سمت چل پڑا، اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس دن وہ ڈنر کھانا بھول گیا تھا۔رات کے آٹھ بجے اسے اس بات کا احساس ہوا، اور چوں کہ Saint-Jacques اسٹریٹ جانے میں بہت دیر ہو چکی ہے، اس نے خود سے کہا، "کوئی پروا نہیں" اور تھوڑی سی روٹی کھائی تھی۔

جب تک اس نے اپنے کوٹ کو برش سے جھاڑ کر تہہ نہیں کر دیا، بستر پر دراز نہیں ہوا تھا۔

۞

مادام بوگوں پر گرنے والی بجلیاں

اگلے دن Gorbeau سرائے کی بوڑھی دربان اور مرکزی کرایے دار نے جسے کوفیراک نے مادام بوگوں (Bougon) کا نام دے دیا تھا حالاں کہ اس کا اصل نام مادام Burgon تھا، تقریباً بے ہوشی کے عالم میں دیکھا کہ ماریوس ایک بار پھر اپنے نئے کوٹ میں ملبوس گھر سے باہر جا رہا ہے۔

ماریوس پھر لکسمبرگ کی طرف گیا، مگر اس بار وہ گلی کے درمیان رکھی بنچ سے آگے نہیں گیا۔ وہیں بیٹھ گیا اور پچھلے دن کی طرح، فاصلے سے بیٹھ کر جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور اسے وہ سفید چھتری اور سیاہ لبادہ، اور اس سے بڑھ کر نیلی روشنی نظر آ گئی تھی۔ اس بار وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، اور اسی وقت گھر واپس گیا جب لکسمبرگ کے پھاٹک بند ہونے لگے تھے۔ اس نے موسیو لیبلا تک اور اس کی بیٹی کو گھر واپس جاتے نہیں دیکھا۔ اس طرح اس نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ وہ l'Ouest اسٹریٹ والے پھاٹک سے نکل کر باغ سے باہر چلے گئے ہوں گے۔ بعد میں، جب کئی ہفتے گزر گئے تو اسے خیال آیا کہ اس شام بھی اس نے کچھ کھایا نہیں تھا۔

اس سے اگلے دن بھی، جو اس کا تیسرا دن تھا، مادام بوگوں پر بجلی سی گری۔ ماریوس اپنے نئے کوٹ میں ملبوس باہر جا رہا تھا۔ "مسلسل تین روز" مادام نے اپنے آپ سے حیرت سے خود کلامی کی تھی۔

مادام نے ماریوس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی، مگر وہ لمبے لمبے قدم رکھتا تیزی سے چلا گیا، یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی دریائی گھوڑا کسی سانبھر کے تعاقب میں چلے۔ دو منٹ کے اندر ہی ماریوس مادام کی نظر سے اوجھل ہو گیا، مادام کا تنفس اس کا ساتھ نہیں دے سکا، کہ ضیق النفس

اس کا گلا گھونٹے دے رہا تھا، اور اسے غصہ بھی آ گیا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے خود سے کہا، "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ انسان اپنا بہترین لباس زیب تن کرے اور لوگوں کو اس طرح اپنے تعاقب میں دوڑائے۔"

ماریوں ایک بار پھر لکسمبرگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

نوجوان لڑکی موسیو لیبلانک کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ ماریوں جس قدر ممکن ہو سکا اس کے قریب گیا، مگر اس بار وہ ایک کتاب پڑھنے کا بہانہ کرتا ہوا چلا تھا، مگر اس مقام سے بہت پہلے ہی رک گیا، واپس ہوا، اور اپنی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا، جہاں وہ چار گھنٹے گھریلو چڑیوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا؛ اور ایسا محسوس ہوا گویا چڑیاں اس سے کھیل کر رہی تھیں۔

اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ اب ماریوں وہاں چہل قدمی کے لیے نہیں، بلکہ ہمیشہ ایک ہی جگہ پر صرف بیٹھنے جایا کرتا، مگر کس لیے، یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ ایک بار وہاں پہنچ جاتا تو وہاں سے ہلتا بھی نہیں تھا۔ ہر صبح وہ اپنے نئے کوٹ میں ملبوس ہوتا تھا تا کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے؛ اور یہ تماشا ہر روز دہرایا جاتا رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک تعجب خیز حسن کی مالک لڑکی تھی۔ اگر تنقید کی کوشش کی جائے تو بس اتنا کہا جا سکتا تھا، کہ اس کی نظر اور اس کے تبسم کے درمیان ایک غم زدگی کی کیفیت ہوا کرتی تھی، جو اس کے بشرے کو ایک وحشیانہ اثر دیتی تھی، مگر اس کی دل ربائی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی تھی۔

قیدی

دوسرے ہفتے کے دنوں میں سے ایک دن ہمیشہ کی طرح ماریوس اپنی بنچ پر بیٹھا تھا؛ اس کے ہاتھ میں ایک کھلی کتاب تھی، دو گھنٹے سے جس کا ایک صفحہ بھی پلٹا نہیں گیا تھا۔ اور پھر اچانک کچھ شروع ہو گیا۔ چہل قدمی کے علاقے کے اس پار ایک واقعہ ہونے والا تھا۔ لیبلا نک اور اس کی بیٹی نے اپنی جگہ چھوڑ دی، بیٹی نے اپنے باپ کا ہاتھ اپنی ہاتھ میں لے لیا، اور دونوں آہستہ آہستہ گلی کے درمیان والے حصے کی طرف بڑھ رہے تھے، ماریوس جہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ماریوس نے کتاب بند کر دی، دوبارہ کھولی اور اپنے آپ کو کتاب پڑھنے پر مجبور کیا؛ وہ کانپ گیا کہ نورانی تاج سیدھا اسی کی طرف آرہا تھا۔ 'او و خدایا!' اس نے سوچا، 'میرے پاس تو کچھ کرنے کا بہانہ بھی نہیں۔' سفید سر والا آدمی، اور وہ لڑکی اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ عرصہ جو محض ایک سیکنڈ کے برابر تھا، پوری ایک صدی جیسا طویل محسوس ہو رہا تھا۔ ''وہ اس طرف کس لیے آ رہے ہیں؟'' اس نے خود کلامی کے عالم میں کہا، 'یہ کیا، وہ یہاں سے گزرے گی؟ اس کے قدم اس ریت پر نشان بنائیں گے؛ یہ جگہ جو مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر ہے؟' وہ پریشان ہو گیا۔ اس وقت وہ جمیل دکھائی دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی جانب آتے ان کے نپے تلے قدموں کی چاپ سنی۔ اس نے تصور کیا کہ موسیو لیبلا نک کی غصہ ور نظریں اس پر تیر کی طرح پڑ رہی ہیں۔ 'کیا یہ صاحب مجھ سے مخاطب ہونے والے ہیں؟' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور اس نے اپنا سر جھکا لیا؛ سر کو پھر اٹھایا، تو وہ دونوں اس کے بالکل قریب آ گئے تھے، مگر لڑکی اس کے قریب سے گزر گئی، اور جاتے ہوئے اس نے ماریوس کو دیکھا تھا۔ وہ ماریوس کو فکر مند اور پیار بھری نظروں سے غور سے دیکھ رہی تھی جس نے سر سے پیر تک، اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑا

دی تھی۔ ماریوس کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ اسے اپنے قریب آنے میں اتنی دیر لگانے پر سرزنش کر رہی تھی، اور کہنے والی تھی، "اب میں خود ہی آ رہی ہوں۔" ماریوس کی آنکھوں کو روشنی کی کرنیں اور پاتال سے بھری اس کی نظریں چکا چوند کر رہی تھیں۔

اسے اپنے دماغ میں ایک آگ سی محسوس ہوئی۔ لڑکی اس کی طرف آئی، کتنی بڑی اور خوشی کی بات تھی، اور پھر اس نے ماریوس کی طرف کیسی نظروں سے دیکھا بھی تھا۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی ایسے حسن کی خوب صورتی تھی جس میں نسوانیت تھی اور وہ بھی ملکوتی نسوانیت، ایسا مکمل حسن جو Petrarch کو گانے پر اور دانتے کو گھٹنے کے بل ہو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ ماریوس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں تیر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی، اسے بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جوتے گرد آلود تھے۔

اسے یقین ہو رہا تھا کہ لڑکی نے اس کے جوتوں کی جانب ضرور دیکھا ہوگا۔

ماریوس لڑکی کی آنکھوں کا اس وقت تک تعاقب کرتا رہا جب تک کہ وہ غائب نہیں ہو گئی۔ پھر، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لکسمبرگ باغ میں پاگلوں کی طرح چل پڑا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ پر ہنسا بھی ہو، اور خود سے باتیں بھی کی ہوں گی اب وہ ایسے خوابیدہ عالم میں تھا کہ بچوں کی نرس کی طرح ہو گیا تھا کہ ہر بچہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

وہ لکسمبرگ باغ سے باہر چلا گیا، اس امید میں کہ سڑک پر اس سے پھر ملاقات ہو جائے گی۔

Odeon کے محرابی بازار میں اس کی کوفیراک سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کو دعوت دیتے ہوئے ماریوس نے کہا، "آؤ میرے ساتھ کھانا کھا لو۔" اور وہ دونوں روسو ما می ریستوران میں گئے اور چھ فرانک خرچ کر دیے۔ ماریوس کسی دیو کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے خدمت گار کو چھ سو دیے۔ میٹھا کھاتے ہوئے اس نے کوفیراک سے کہا تھا، "تم نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟ Audry de Puyravea نے کتنی نفیس باتیں کی ہیں۔"

وہ محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔

ڈنر کے بعد اس نے کوفیراک سے کہا، "میں تمھیں تھیٹر دیکھنے کی دعوت دیتا ہوں۔" اور وہ دونوں فریڈرک کو l'Auberge des Adrets میں دیکھنے Porte-Sainte-Martin چلے گئے۔ ماریوس بظاہر بہت خوش تھا۔

ٹھیک اسی وقت اس پر شرم کا دہرا دورہ دورہ پڑ گیا۔ تھیٹر سے نکلتے وقت، اس نے خواتین کی پوشاک تیار کرنے والی خاتون کے موزے پر نظر ڈالنے سے انکار کر دیا جو اس وقت ایک نالہ پار کر رہی تھی، اور کوفیراک نے اسے دیکھ کر کہا تھا، ”میں اس عورت کو اپنے ذخیرۂ خواتین میں شامل کرنا پسند کروں گا۔“ ماریوس اس کی بات سن کر تقریباً پریشان ہو گیا تھا۔

کوفیراک نے اگلی صبح ماریوس کو کیفے والٹیر میں ناشتے کی دعوت دی۔ ماریوس وہاں پہنچ گیا، اور پچھلی شام سے کہیں زیادہ کھانا کھایا۔ اس دن وہ خیالات میں ڈوبا ہوا اور بہت خوش تھا۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے کے ہر موقعے کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس نے دوسرے صوبوں سے آنے والے ایک شخص کو بڑے چاؤ سے گلے لگایا، جو اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ طلبہ کا ایک حلقہ میز کے اطراف اکٹھا ہو گیا تھا، اور وہ Sorbonne کے رو سے ریاست کی جانب سے فضولیات پیش کی جانے پر تنقید کر رہے تھے۔ اس کے بعد Guicherat کے لغات اور قواعد کے بارے میں بات ہونے لگی۔ ماریوس نے اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کر دیا، ”تو یہ طے ہوا کہ سب کو تمغا دیا جائے گا۔“

”یہ تو بڑی عجیب بات ہوئی۔“ کوفیراک نے سرگوشی میں ژاں پرووریر سے کہا۔

”نہیں۔“ پرووریر نے کہا، ”یہ بہت سنجیدہ بات ہے۔“

یہ واقعی سنجیدہ معاملہ تھا۔ ماریوس اس پہلے شدید اور دل فریب موقعے پر تھا جس میں عظیم ولولے شروع ہوتے ہیں۔

ایک نظر نے یہ سب کر دیا تھا۔

جب بارود کی سرنگ بھری ہو، جب آگ تیار ہو، تو کوئی بات معمولی بات نہیں ہوا کرتی۔ ایک نظر ہی چنگاری بن جایا کرتی ہے۔

اس کے نزدیک کچھ ہو گیا تھا۔ ماریوس کو ایک عورت سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کا مقدر ایک کیفیتِ نامعلوم میں داخل ہو رہا تھا۔

عورتوں کی نظریں مختلف پہیوں کے اتحاد کے مماثل ہوتی ہیں، جو بظاہر ساکن ہوتے ہوئے بھی طاقت ور ہوتے ہیں۔ آپ روزانہ ان کے قریب سے، بلا خوف، آرام سے گزرتے رہتے ہیں اور آپ کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوتا۔ ایک لمحہ آتا ہے جب آپ بھول چکے ہوتے ہیں کہ کچھ ہو گیا ہے۔ آپ آتے ہیں، جاتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں۔ اور اچانک آپ خود کو کسی چنگل میں کسا ہوا پاتے ہیں! اور کچھ ہو چکا ہوتا ہے۔ پہیے آپ کو جکڑ لیتے ہیں، نظر آپ

کو دام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ خواہ آپ کہیں ہوں، اور کیسے بھی ہوں، یہ آپ کو آپ کے خیال کے کسی لہراتے ہوئے ٹکڑے سے، کسی اضطراب سے، جس نے آپ پر حملہ کر دیا ہو، پکڑ لیتی ہے۔ آپ بالکل گم ہو جاتے ہیں۔ آپ کا پورا وجود اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ پُر اسرار قوتوں کا ایک سلسلہ آپ کو قابو میں کر لیتا ہے۔ آپ کوشش کرتے ہیں مگر رائگاں جاتی ہے؛ اس کے بعد کسی قسم کی انسانی مدد کام نہیں آتی۔ آپ، ایک ہذیانے سے دوسرے ہذیانے، ایک اذیت سے دوسری اذیت، ایک تشدد کے بعد دوسرے تشدد سے گزرتے رہتے ہیں، آپ اور آپ کا دماغ، آپ کی تقدیر، آپ کا مستقبل، آپ کا نفس گرتا چلا جاتا ہے؛ اور آپ کسی بدنہاد طاقت، یا کسی مہذب دل کے چنگل میں ہوتے ہیں؛ آپ اس مشین سے فرار نہیں پا سکتے جب تک کہ شرم سے یا جذبات کے باعث آپ کی صورت بگڑ نہیں جاتی۔

❂

حرف U کی گل کاریاں

تنہائی، ہر شے سے علاحدگی، افتخار، خود مختاری، فطرت کے تجربات، روزانہ کی مادّی سرگرمیوں کا نہ ہونا، اندرون کی زندگی، پاک دامنی کی مخفیہ آویزشیں، تمام مخلوقات کے لیے ایک ہی قسم کی خیر خواہانہ سرمستیاں؛ ان سب نے مل کر ماریوس کو اس ملکیت کے لیے تیار کر دیا تھا، جس کو سرمستی کہا جاتا ہے۔ ماریوس کی پدر پرستی، اس کا مذہب بن چکی تھی، اور تمام مذاہب کی طرح، یہ بھی اس کی روح کی گہرائیوں میں پسپا ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے کسی شے کی سخت ضرورت تھی اور محبت سامنے آ گئی تھی۔

پورا ایک مہینہ گزر گیا؛ ماریوس ہر روز لگزمبرگ جاتا۔ جب وہ لمحہ آتا تو کوئی طاقت اسے روک نہیں پاتی تھی۔ کوفیراک کہتا تھا، "وہ ڈیوٹی پر ہے۔" ماریوس کی زندگی ایک قسم کے سرور کی کیفیت میں گزر رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لڑکی اس کی طرف دیکھتی تھی۔

بالآخر ماریوس میں ہمت پیدا ہو گئی، اور وہ بنچ کی طرف جانے لگا۔ اس کے باوجود، بزدلی کی جبلت، اور عام محبت کرنے والوں کی نیک خو جبلت کی فرماں برداری کے باعث، وہ سامنے جانے سے پرہیز کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ "باپ کی توجہ" اپنی جانب مبذول کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ اس نے نہایت سیاسی انداز میں درختوں اور مجسموں کے پایوں کے عقب میں چھپنا شروع کر دیا، تا کہ وہ جس قدر زیادہ نوجوان لڑکی کی نظروں میں آئے اتنا ہی کم اس کے باپ کی توجہ مبذول کرے۔ کبھی تو وہ نصف گھنٹے تک اپنے ہاتھوں میں کتاب لیے Leonidas یا Spartacus کے مجسموں کے سایوں میں چھپا رہتا۔ اس طرح کہ اس کی آنکھیں کتاب سے اوپر ہوتیں اور اس کی نظریں خوب صورت لڑکی کو تلاش کرتی ہوتیں؛ جب کہ لڑکی ایک مبہم تبسم کے

ساتھ اپنا چہرہ اس کی جانب کر لیتی تھی۔ سفید بالوں والے آدمی سے دنیا کے سب سے زیادہ پُرسکون انداز میں جھک کر گفتگو کرتے ہوئے، لڑکی اپنی کنوار پنے کی پُرجوش آنکھوں کی توجہ ماریوس کی جانب کر لیتی تھی۔ زمانۂ قدیم سے چالاکیوں کو سمجھنے والی جبلت کے زیرِ اثر، اماں حوا جن سے روزِ ازل سے واقف تھی، اور جسے عورت اپنی زندگی کے پہلے دن سے سمجھنے لگتی ہے، اس کا منہ کچھ کہتا اور اس کی نظریں کچھ اور کہتی تھیں۔

یہ قیاس کر لینا ضروری ہے کہ بالآخر موسیو لیبلانک کو احساس ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے، اس لیے کہ جب ماریوس آتا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چہل قدمی کرنے لگتا تھا۔ اب اس نے اپنی جگہ پر بیٹھنا ترک کر دیا تھا اور کبھی Gladiator کے قریب والے راستے پر رکھی بنچ پر جا بیٹھتا، گویا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماریوس کی نظریں اس طرف بھی اس کا پیچھا کرتی ہیں یا نہیں۔ ماریوس یہ بات سمجھ نہیں سکا تھا، اور اس کی نظریں یہ غلطی کرنے لگی تھیں۔ اب باپ کو اس بات کا اندازہ ہونے لگا تھا؛ اب وہ لڑکی کو روزانہ اپنے ساتھ نہیں لاتا تھا۔ کبھی وہ اکیلا ہی آ جاتا، اور اس دن ماریوس وہاں ٹھہرتا نہیں تھا۔ اس سے ایک اور غلطی ہونے لگی تھی۔

ماریوس نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اب وہ اپنے دورِ بزدلی سے گزر کر، ایک فطری اور مہلک ترقی کے باعث، دورِ بے بصارتی میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی محبت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہر شب اسی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اور پھر ایک دن اس پر ایک ناقابلِ توقع نعمت کا نزول ہو گیا؛ جلتی پر تیل پڑ گیا؛ اور اس کی آنکھوں پر پڑنے والے سایے دوچند ہو گئے تھے۔ ایک دن، شام ڈھلے، اس بنچ پر جہاں موسیو لیبلانک اور اس کی بیٹی دونوں آ کر بیٹھا کرتے تھے اسی وقت چلے گئے، ماریوس کو ایک رومال، سادہ سا نسوانی رومال پڑا نظر آیا، جس پر نہ زردوزی تھی نہ گل کاری، بس سفید رنگ کا نرم و نازک سا رومال تھا، جس سے ایک ناقابلِ بیان خوش بو پھوٹ رہی تھی۔ ماریوس نے لپک کر رومال اٹھا لیا۔ اس رومال پر دو حرف .U .F بنے ہوئے تھے۔ ماریوس اس خوب صورت بچی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا — نہ اس کا خاندانی نام، نہ اس کا اپنا نام، نہ اس کے رہنے کی جگہ؛ بس یہ دو حرف، لائقِ پرستش حروف، پہلی شے تھے جو اس کے ہاتھ آئے، جن پر اس نے اپنے خیالوں کا محل تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ U سے بظاہر، اس کے خیال میں، ''اس کا عیسائی نام Ursule بنتا تھا، اور کتنا پیارا نام تھا! اب وہ دن رات رومال کو بوسہ دیتا، اس کو سونگھتا، اپنے دل کے قریب، سینے پر، اپنے گوشت پوست پر رکھتا، اور اپنے لبوں کے قریب رکھتا تاکہ نیند آئے تو اسی پر گر کر سو جائے۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس کی روح اسی میں پوشیدہ ہوگئی ہے۔" وہ اپنے آپ سے کہتا تھا۔

یہ رومال، دراصل اس بوڑھے آدمی کا تھا، جس نے [جان بوجھ کر] اس کو اپنی جیب سے گر جانے دیا تھا۔

اس خزانے کے پائے جانے کے بعد کے دنوں میں، وہ لگو بیرگ میں صرف رومال کو بوسہ دینے، اس کو اپنے سینے سے لگانے کے عمل کا اظہار کرتا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکی ان تمام حرکات کو سمجھ نہیں سکتی تھی، اور انھیں نامعلوم قسم کے اشاروں پر محمول سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تھی۔

اور ماریوس "ہائے رے اگسارد!" کہہ دیتا تھا۔

۞

تجربے کار لوگ بھی خوش رہ سکتے ہیں

جب سے ہم نے انکسار کا ذکر کیا ہے، ہم نے کچھ چھپایا نہیں ہے پھر بھی ہم ایک بار اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اپنی تمام تر بدمستیوں کے باوجود "اس کی Ursule" نے اسے بہت دُکھ پہنچایا ہے۔ ان ہی دنوں میں سے ایک دن وہ دن تھا جب اس لڑکی نے موسیو لیبلانگ کو بنچ چھوڑنے اور اسی پگڈنڈی پر چہل قدمی کرنے پر آکسایا تھا۔ اس دن مئی کی تیز ہوا چل رہی تھی۔ باپ اور بیٹی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ماریوں کے بنچ کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے ماریوں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جیسا کہ اس نوعیت کی کیفیت میں اس جیسے آدمی کے لیے مناسب ہوتا ہے، وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

اچانک پونگاہ کی جانب سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ جو پہلے جھونکوں سے زیادہ چنچل تھا، شاید جسے موسم بہار کے کچھ کام کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی، جس نے وہاں کی حسینہ، اور Theocritus کے ہرن کے کھلنڈرے بچوں کی طرح، اس کے لباس کو اس حد تک اٹھا دیا تھا، جو Isis کے لبادے سے زیادہ متبرک تھا، کہ لڑکی کے موزوں کی گیٹس نظر آنے لگی۔ ماریوں کو لڑکی کے نفیس اور سڈول پیر نظر آگئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ماریوں غصے سے برانگیختہ ہو گیا۔

نوجوان لڑکی نے بالکل فطری انداز میں جلدی سے اپنے لباس کو نیچے کر لیا، پھر بھی ماریوں کا غصہ فرو نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت گلی میں وہ اکیلا تھا، مگر وہاں کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اور کیا ہوتا، اگر کوئی اور شخص بھی اس وقت وہاں موجود ہوتا۔ کیا کوئی اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ لڑکی نے اس وقت جو کچھ کیا تھا، وہ بہت بُری بات تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ اس بچی نے خود کچھ بھی نہیں کیا تھا؛ سب کچھ ہوا کے جھونکے کا کیا دھرا تھا، مگر ماریوں، جس کے اندر اس وقت Cherubin

کے اندر والا Bartholo گردنیں لے رہا تھا، آزردہ ہو گیا؛ وہ خود اپنے ہی سایے سے بدگمان ہو گیا تھا۔ایسی کیفیت میں انسانی گوشت پوست میں پیدا ہونے والی بدگمانی آدمی کے دل کو مہمیز کر دیتی ہے، اس پر قبضہ کر لیتی ہے، جس پر اس کا حق نہیں رہ جاتا ہے۔مزید یہ کہ اگر اس بدگمانی کو ایک طرف کر بھی دیا جائے، تب بھی اس کے دل فریب پاؤں میں اس کے لیے کوئی خوش گوار بات نہیں تھی؛ بس پہلی بار کسی لڑکی کے سفید موزے کی گیٹس دیکھنے کے اتفاق نے اسے زیادہ مسرت فراہم کر دی تھی۔

جب "اس کی Ursule" پگڈنڈی کے آخری حصے پر پہنچتے ہی موسیو لیبلا تک کی طرف واپس ہوئی، اور اس بنچ کے سامنے سے گزری ماریوس جس پر ایک بار پھر براجمان ہو چکا تھا، تو ماریوس نے اس پر خفگی کی چبھتی ہوئی نظر ڈالی تھی۔لڑکی پیچھے مڑی، اور اپنی پلکیں اس طرح اٹھائیں گویا وہ کہہ رہی تھی، "کیوں، کیا بات ہے؟"

یہ ان کی پہلی لڑائی تھی۔

ماریوس کی لڑکی سے آنکھ ملی ہی تھی کہ کوئی چہل قدمی کرنے والا ان کے درمیان سے گزر گیا۔وہ کوئی تجربے کار سپاہی تھا؛ جھکا ہوا سر، جھریوں سے بھرا زرد چہرہ، لوئی پانزدہم کے زمانے کی وردی میں ملبوس، سینے پر سلے سرخ رنگ کے بیضوی پارچے پر آمنے سامنے دو تلواریں بنی تھیں؛ سینٹ لوئی کی صلیب آویزاں تھی؛ اس کے علاوہ کوٹ میں آستینیں تو تھیں مگر ایک آستین میں بازو نہیں تھا؛ ٹھوڑی پر نقرئی زنجیر تھی؛ اور اس کا ایک پیر لکڑی کا تھا۔ماریوس کو وہ شخص خاصا مطمئن نظر آیا۔ماریوس کو ایسا محسوس ہوا گویا اس سنکی بوڑھے نے جو اس کے سامنے سے اُچکتا ہوا گزر رہا تھا، اس طرح دوستانہ انداز میں آنکھ ماری تھی جیسے کسی اتفاق نے ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر دی ہو، گویا انھیں ایک ساتھ کسی قسم کی خوش قسمتی کا موقع فراہم ہوا تھا۔[جنگ کے دیوتا] مریخ کی کس شے نے اس کے قدیم باسی کو اتنا مطمئن کر دیا تھا؟ اس کے لکڑی اور گوشت و پوست کے پیروں کے درمیان کیا بات ہو گئی تھی؟ ماریوس پر حسد کا دورہ سا پڑ گیا— "شاید یہ شخص گلی میں تھا!" اس نے خود سے کہا؛ "شاید اس نے وہ سب دیکھا تھا—" اور اس کے دل میں اس بوڑھے کو مار ڈالنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، ہر شے ماند پڑ جایا کرتی ہے۔"Ursule" کے خلاف ماریوس کا غصہ بھی، جو اگرچہ بلا جواز نہیں تھا، ٹھنڈا پڑ گیا۔بالآخر ماریوس نے اسے معاف بھی کر دیا؛ مگر اسے یہ بہت مہنگا پڑا؛ وہ تین دن تک دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔

یہ سب ہونے کے باوجود، اس کا جوش بڑھتے بڑھتے پاگل پن بن گیا۔

۞

گرہن

قاری نے دیکھ لیا کہ ماریوس نے اس لڑکی کو، جسے Ursule کا نام دیا گیا تھا، کس طرح دریافت کیا تھا۔

محبت ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کی بھوک بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ جان لینا کہ اس کا نام Ursule تھا، بڑی بات تھی، مگر یہ بہت چھوٹی سی بات تھی۔ تین یا چار ہفتوں کے اندر یہ نعمت ہضم ہوگئی۔ اب اسے کسی اور نعمت کی تلاش تھی۔ اب وہ جاننا چاہتا تھا کہ لڑکی رہتی کہاں ہے۔

ماریوس کی پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ Gladiator کے قریب والی بنچ پر بیٹھنے لگا تھا۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ وہ اس وقت لکسمبرگ میں نہیں ہوتا تھا جب موسیو لیبلا نک اکیلا ہی آتا تھا۔ اب اس نے تیسری غلطی کی جو بڑی خوف ناک تھی۔ اس نے "Ursule" کا تعاقب کیا تھا۔

وہ لڑکی l'Ouest اسٹریٹ پر واقع، ایک معمولی سی سہ منزلہ، الگ تھلگ، عمارت میں رہتی تھی۔ اس کے بعد، ماریوس نے اس لڑکی کو دیکھنے کی مسرت میں اس کے گھر تک اس کا تعاقب کرنے کی مسرت کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔

ماریوس کی بھوک بڑھتی جا رہی تھی۔ ماریوس کو، کم از کم، لڑکی کا پہلا نام معلوم ہوگیا تھا؛ دل فریب نام، اصلی نام؛ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؛ اب اسے یہ جاننے کی خلش تھی کہ وہ ہے کون۔

ایک شام، جب وہ ان دونوں کے تعاقب میں ان کے گھر تک پہنچ گیا، اور گاڑی کے پھاٹک سے اندر جاتے انھیں دیکھ لیا تھا، وہ ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگیا اور دلیری سے دربان سے پوچھا تھا:

""کیا یہ صاحب، جو ابھی اندر گئے ہیں، پہلی منزل پر رہتے ہیں؟""

"جی نہیں،" دربان نے نے جواب دیا، "یہ صاحب تیسری منزل پر رہتے ہیں۔"
ایک اور منزل سر ہو گئی۔ اس کامیابی نے ماریوس کو زیادہ دلیر بنا دیا۔
"سامنے کی طرف؟" اس نے دربان سے پوچھا۔
"واللہ!" دربان نے کہا "مکان سڑک پر ہی تو ہے۔"
"اور یہ صاحب کرتے کیا ہیں؟" ماریوس نے مزید شروعات کی۔
"جناب، یہ صاحب زمین دار ہیں؛ بہت مہربان انسان ہیں؛ زیادہ دولت مند نہیں، پھر بھی بدقسمت لوگوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔"
"ان کا نام کیا ہے؟" ماریوس نے سوال کیا۔
دربان نے سر اٹھایا اور پوچھا، "جناب، کیا آپ پولیس کے جاسوس ہیں؟"
ماریوس کو جھٹکا سا لگا، مگر اسے خوشی ہوئی کہ وہ آگے بڑھ رہا تھا۔
"خوب" اس نے سوچا، "مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ لڑکی کا نام Ursule ہے، وہ ان صاحب کی لڑکی ہے، جو زمین کی آمدنی پر گزارہ کرتے ہیں، تیسری منزل پر، l'Ouest اسٹریٹ پر واقع اس عمارت میں رہتے ہیں۔"
اگلے دن، لکسمبرگ میں موسیو لیبلا نک اور اس کی بیٹی کا قیام بہت مختصر تھا؛ ابھی دن کی روشنی باقی تھی کہ وہ چلے گئے۔ ماریوس نے اپنی عادت کے مطابق l'Ouest اسٹریٹ تک ان کا تعاقب کیا۔ گاڑی کے پھاٹک پر پہنچ کر موسیو لیبلا نک نے پہلے اپنی بیٹی کو اندر جانے کا اشارہ کیا، رکا، اور ڈیوڑھی پار کرنے سے قبل ماریوس کی طرف گھور کر دیکھا۔
اگلے دن وہ لکسمبرگ نہیں آئے۔ ماریوس نے پورا دن ان کا انتظار کیا۔
رات ہونے کے بعد وہ l'Ouest اسٹریٹ گیا، تیسری منزل کے کمرے میں روشنی دیکھی۔
ماریوس اس وقت تک کھڑکی کے نیچے ٹہلتا رہا جب تک کہ روشنی بجھ نہیں گئی تھی۔
اگلے دن بھی لکسمبرگ کوئی نہیں آیا۔ ماریوس نے پورا دن انتظار کیا، اس کے بعد ان کی کھڑکی کے نیچے چوکی داری کا فرض ادا کیا۔ رات کے دس بج گئے۔
اس رات کھانا بے کار گیا۔ بخار بیمار کی پرورش کرتا ہے، محبت، محبت کرنے والی کی پرورش کرتی ہے۔
اسی عالم میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ موسیو لیبلا نک نے لکسمبرگ آنا چھوڑ دیا تھا۔
ماریوس غم انگیز قیاس آرائیوں میں مصروف رہا؛ وہ گاڑی کے پھاٹک کی دربانی کی ہمت

نہیں کر سکتا تھا؛ بس، رات کے وقت کھڑکی کی سرخ روشنی پر اکتفا کرتا۔ کبھی کبھی سایے آتے جاتے نظر آتے تو اس دل دھڑ کنے لگتا تھا۔

آٹھویں دن، جب وہ کھڑکی کی نیچے پہنچا، تو وہاں روشنی نہیں تھی۔

"میلو" اس نے کہا، "ابھی تک لیمپ روشن نہیں ہوا ہے، مگر اب تو اندھیرا ہو چلا ہے۔ کیا وہ باہر چلے گئے ہیں؟" ماریوس نے دس بجے رات تک انتظار کیا۔ بارہ بج گئے۔ رات کا ایک بج گیا۔ نہ تیسری منزل کی کھڑکی میں روشنی ہوئی، نہ کوئی عمارت میں داخل ہوا۔

ماریوس افسردہ واپس چلا گیا۔

اگلے دن — روزانہ ہی اگلا دن ہوتا ہے، یعنی ماریوس کے لیے آج کا دن نہیں نکلا تھا — اگلے دن لکسمبرگ سنسان رہا۔ ماریوس کو اسی کی توقع تھی۔ شام ہوتے ہی وہ اس عمارت کی طرف گیا۔

کھڑکی میں روشنی نہیں تھی۔ پردے پڑے تھے؛ تیسری منزل پر بالکل اندھیرا تھا۔

ماریوس نے پھاٹک پر دستک دی، اندر داخل ہوا، اور دربان سے پوچھا:

"تیسری منزل والے صاحب؟"

"وہ لوگ کہیں اور منتقل ہو گئے ہیں۔" دربان نے جواب دیا۔

ماریوس چکرا گیا۔ اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا، "کتنا عرصہ پہلے؟"

"کل۔"

"اب وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"یعنی وہ کوئی پتا نہیں چھوڑ گئے ہیں۔"

"جی نہیں۔"

دربان نے سر اٹھا کر دیکھا؛ اور ماریوس کو پہچان لیا۔

"اچھا، تو یہ تم ہو۔" اس نے کہا، "تب تو یقینی طور پر تم جاسوس ہو۔"

❁

بارودی سرنگیں، اور سرنگیں بنانے والے

ہر انسانی سماج میں ایک بولی ہوتی ہے جس کو ڈرامائی بولی کہتے ہیں، یعنی تیسرے درجے کے کلام کی نچلی منزل۔ سماج کی مٹی ہر جگہ کبھی اچھی اور کبھی ناقص وجوہ کی بنا پر خراب کر دی جاتی ہے اور یہ ساری خرابیاں ایک دوسرے کے اوپر لاد دی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ بلند درجے کی بارودی سرنگیں ہوتی ہیں اور کچھ کمتر درجے کی۔ اس مبہم مٹی کی ایک اوپری سطح ہوتی اور دوسری نچلی سطح ہوتی ہے، جو کبھی کبھی تہذیب کے بوجھ تلے دب جاتی ہے، اور جو ہماری لاپروائی اور غیر جانب داری کے باعث پیروں تلے کچلی جاتی ہے۔ پچھلی صدی کا مجمع العلوم، وہ بارودی بم تھا جو آسمان کے لیے تقریباً کھلا تھا۔ پرانی عیسائیت کی مبہم اور فرسودہ پرچھائیاں پیدا کرنے والے ہمیشہ شہنشاہوں کے زیرِ سایہ دھماکا کرنے کے منتظر ہوتے تھے تا کہ انسانی نسل کو روشنی میں غرق کر دیا جائے۔ اس لیے کہ مقدس پرچھائیوں میں ہمیشہ ایک مخفی روشنی ہوا کرتی ہے۔ آتش فشاں ایسی پرچھائیوں سے پُر ہوتے ہیں جن میں جھماکا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہر پیکر رات کے اندھیرے میں شروع ہوتا ہے۔ تہہ خانوں کی قبریں جن میں پہلا ڈھیر دفن کیا گیا تھا، وہ صرف روما کا تہہ خانہ نہیں تھا، وہ دنیا بھر کے گنبد تھے۔

سماجی تعمیر کے نیچے — جو ایک ناقابلِ یقین اور پیچیدہ ڈھانچا ہوتا ہے — ہر قسم کی کھدائیاں ہوتی ہیں۔ ان میں مذہبی بم، فلسفیانہ بم، معاشی بم اور انقلابی بم ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خیالات کی کدالوں سے، اور کچھ صفر کی کدالوں سے، اور کچھ غیظ و غضب کی کدالوں سے کھود کر نکالے جاتے ہیں۔ ایک تہہ خانے سے دوسرے تہہ خانے تک لوگ ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ خیالی یا مثالی دنیائیں زیرِ زمین نلکیوں میں سفر کرتی ہیں اور

وہیں سے، ہر طرف، ان کی شاخیں پھیلتی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ آپس میں مل بھی جاتی ہیں اور ان میں رشتے استوار ہو جاتے ہیں۔ ژاں ژاک اپنے دریافتیں Diogenes کو دے دیتا ہے جو اسے اپنی لالٹین فراہم کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ لڑائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ Calvin Socinius کو بالوں سے پکڑ لیتا ہے، مگر اپنے ہدف کی طرف جانے والی ان قوتوں کے تناؤ کو، تسلسل سے ہونے والی سرگرمی کو، نہ پکڑا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے، جو آتی جاتی ہے، کھلتی ہے اور جھنڈلکوں میں بھر بڑھ جاتی ہے، اور ایک خوف ناک ہجوم، رفتہ رفتہ، اوپری اور نچلی، اندرونی اور بیرونی سطح بن جاتا ہے۔ سماج کو اس کھدائی کی ہوا بھی نہیں لگتی، جو سطح کو سالم رہنے دیتی ہے اور اپنی ہمدردیاں تبدیل کر لیتی ہے۔ ان میں مختلف نوعیت کے زمین دوز درجات ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان کے کام مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کھدائیوں سے کیا برآمد ہوتا ہے؟ مستقبل۔

آپ جتنا نیچے جاتے ہیں، آپ کو اتنے ہی پُر اسرار اور سخت محنت کرنے والے ملتے ہیں۔ کام اچھا ہوتا ہے مگر اس درجے تک، سماجی فلسفے جسے پہچان سکیں؛ اس سے پرے کام مشتبہ اور مخلوط ہو جاتا ہے اور نیچے جا کر خوف ناک ہو جاتا ہے۔ کھدائیوں میں، مخصوص گہرائیوں تک، تہذیب کے جذبے داخل نہیں ہو سکتے؛ وہ حد جہاں تک انسان سانس لے سکتا ہے گزر چکی ہوتی ہے؛ وہیں سے عفریتوں کی شروعات ممکن ہو جاتی ہے۔

نیچے لے جانے والا زینہ حیران کن ہوتا ہے؛ اس زینے کا ہر قدمچہ اُس درجے کے برابر ہوتا جہاں فلسفے کو قدم جمانے کی جگہ مل جاتی ہے اور جہاں ان کام کرنے والوں سے مقابلہ ہوتا ہے جو کبھی ربانی ہوتے ہیں اور کبھی مسخ شدہ۔ جان ہُس کے نیچے لوتھر ہوتا ہے؛ لوتھر کے نیچے دیکارت؛ دیکارت کے نیچے، والٹیر؛ والٹیر کے نیچے Condorcet ملتا ہے؛ Condorcet کے نیچے Robespierre ہوتا ہے؛ Robespierre کے نیچے Marat ہوتا ہے؛ Marat کے نیچے بابوف ہوتا ہے۔ اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس کے مزید نیچے، اس حد پر، جو غیر مرئی کو غیر واضح سے الگ کرتی ہے، آپ کو دوسرے پژمردہ لوگ ملتے ہیں، جو شاید ابھی وجود میں نہیں ہوتے ہیں۔ گزرے ہوئے کل کے لوگ بھوت پریت ہوتے ہیں؛ آئندہ کل والے پیکر کہلاتے ہیں۔ جذبے کی آنکھ انھیں شناخت کر لیتی ہے مگر مبہم انداز میں۔ مستقبل میں شروع ہونے والا کام فلسفے کی بصیرتوں میں سے ایک ہوتا ہے۔

اعراف کی ایک دنیا، جنین کی کیفیت میں؛ عجیب بھوت ہے، جو نہ دیکھا گیا ہے نہ سنا گیا ہے۔

سینٹ سائمن، اووین، فوریر بھی وہاں موجود ہیں، مگر بغلی غلام گردشوں میں۔

یقیناً، ایک غیر مرئی اور ربانی زنجیر، جس کا انھیں علم نہیں ہوتا، بستہ رکھتی ہے ان تمام زمین دوز پیش کاروں کو، جو خود کو ہمیشہ تنہا محسوس کرتے ہیں، مگر تنہا ہوتے نہیں، جن کے کام مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ کی روشنی دوسروں کی آگ کے برابر ہوتی ہے۔ پہلے والے جنتی ہوتے ہیں اور بعد والے دوزخی۔ پھر بھی، تفریق کچھ بھی ہو، یہ تمام سخت محنت کرنے والے، سب سے بلند سے لے کر سب سے زیادہ شب خیز تک، سب سے عقل والوں سے احمق ترین تک، ایک جیسے ہوتے ہیں؛ اسی کو عدم دل چسپی کہتے ہیں۔ Marat خود کو یسوع مسیح کی طرح فراموش کر دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک طرف ڈال دیتے ہیں، وہ خود کو اُگل دیتے ہیں، وہ اپنے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ ان کا دیکھنے کا اپنا انداز ہوتا ہے، وہ انداز مکمل کی تلاش میں ہوتا ہے۔ پہلے والے کی آنکھوں میں پورا آسمان ہوتا ہے؛ آخری والے کی پلکوں تلے، جس کا انداز رمزیہ ہو سکتا ہے، لامتناہی کی ایک پھیکی سی کرن ہوتی ہے۔ اس آدمی کا احترام کرو——وہ کوئی بھی ہو——ستارے جیسی آنکھ جس کی نشانی ہوتی ہے۔

مشتبہ آنکھ دوسری نشانی ہوتی ہے۔

اسی سے بُرائی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر اس شخص کی موجودگی سے ڈرو جس کی اپنی کوئی نظر نہیں ہوتی۔ سماجی انتظام کے اپنے سیاہ [دھوکے باز] کان کن بھی ہوتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں گہرائی دفن کے مماثل ہو جاتی ہے، اور جہاں روشنی ختم ہو جاتی ہے۔

ان تمام بارودی سرنگوں کے نیچے جن کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے، ان تمام غلام گردشوں کے نیچے، اس خوف ناک، زمین دوز، زہر آلود ترقی اور یوٹوپیائی نظام کے نیچے، زمین مزید اندر، Marat کے نیچے، بابوف کے بھی نیچے، نیچے، بہت نیچے، جس کا اوپری سطح سے کوئی رابطہ نہ ہو، وہیں پر آخری بارودی سرنگ ہوتی ہے۔ ایک خوف ناک جگہ۔ یہ وہ جگہ ہے ہم نے جس کو le troisieme dessous کا نام دیا ہے۔ یہی پرچھائیوں کی قبر ہے۔ یہ نابینا کا حجرہ ہے۔ یہ پاتال سے رابطے میں رہتا ہے۔

عمیق ترین گہرائیاں

یہ وہ مقام ہے جہاں عدم دل چسپی ختم ہو جاتی ہے۔ شیطان کی غیر واضح طور پر نشان دہی ہو جاتی ہے؛ اور ہر ایک کا شیطان الگ الگ ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے اندر کا "میں" غرانے لگتا ہے، تلاش کرنے لگتا ہے، ٹھوکر کھاتا ہے، اور کاٹ کھاتا ہے۔ سماجی [اطالوی نواب] Ugolino اسی خلیج میں ہوتا ہے۔

وحشی بھوت پریت جو قبروں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں، جو تقریباً درندے ہوتے ہیں، تقریباً خیالی ہوتے ہیں، آفاقی ترقی میں مصروف نہیں ہوتے؛ وہ خیال سے اور خیال کے لفظ سے بھی نابلد ہوتے ہیں؛ سوائے اپنی انفرادی تشفی کے وہ کچھ سوچتے ہی نہیں۔ تقریباً بے ہوش ہوتے ہیں اور خود ان کے اندر بھی ایک قسم کی خوف ناک نابودی کی فضا ہوتی ہے۔ ان کی دو مائیں ہوتی ہیں؛ دونوں مائیں سوتیلی ہوتی ہیں؛ ایک لاعلمی ہوتی ہے تو دوسری بدنصیبی۔ اور ایک شے ان کی رہنما ہوتی ہے ــــ ضرورت؛ اور ہر قسم کی تشفی، اور اشتہا۔ یہ وحشیانہ حد تک بسیار خور ہوتی ہیں، یعنی، خوف ناک ہوتی ہیں، کسی جابر کے انداز میں نہیں، بلکہ کسی چیتے کے انداز میں۔ یہ آسیب اس مرحلے سے گزر کر جرم کی طرف چل پڑتے ہیں؛ ان کی مہلک پریشانی چکرا دینے والی مخلوق، ظلمات کی منطق ہوتی ہے۔ وہ جرم جو سماج کے تیسرے زیریں درجے میں رینگتا ہے کبھی مکمل نہیں ہوتا؛ وہ احتجاج محض ہوتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان اژدہا بن جاتا ہے۔ جو بھوکا بھی ہوتا ہے، اور پیاسا ہوتا ــــ اسی مقام سے وہ سب سے الگ ہو جاتا ہے؛ شیطان بن جاتا ہے، اور اس کے اندرون کے تہہ خانے سے [مشہور فرانسیسی شاعر اور قاتل] Lacenaire برآمد ہوتا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے، چوتھی کتاب میں، ہم نے اوپری سرنگ کے خانے میں بہت بڑی سیاسی، انقلابی، اور فلسفیانہ کھدائی دیکھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے سب کچھ خالص ہے، شریفانہ

ہے، حرمت والا ہے اور ایمان دارانہ ہے۔ اس مقام پر ہم یقینی طور گم راہ ہو جاتے ہیں مگر، اس مقام پر غلطی بھی محترم ہو جاتی ہے۔ اور اس کیے ہوئے کام کو، من حیث الکل "ترقی" کا نام دیا جاتا ہے۔

اب ہمارے سامنے وہ مرحلہ آ گیا ہے جہاں ہمیں دوسری گہرائیوں، ڈراؤنی گہرائیوں کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ اس مقام پر، جب تک کہ لاعلمی ختم نہیں ہو جاتی، ہم یہ کہنے پر اصرار کریں گے کہ سماج کے نیچے بُرائی کا ایک بڑا سا غار ہوتا ہے۔

یہ غار سب سے نیچے ہوتا ہے اور سب کا دشمن ہوتا ہے۔ یہ بلاتفریق نفرت ہوتی ہے۔ یہ غار کسی فلسفی کو نہیں پہچانتا؛ مگر اس تلوار نے کبھی کسی قلم کو نہیں کاٹا ہے۔ اس کی سیاہی کا دوات کی روشنائی کے ترفع سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ رات کی انگلیوں نے، دم گھونٹنے والی اس حقف کے نیچے، کبھی نہ کسی کتاب کا ورق پلٹا ہے نہ کسی اخبار کو تہہ کیا ہے۔ بابوف فرمان پر سٹہ لگاتا ہے؛ [اٹھارہویں صدی کے بدنام اور مشہور ڈاکو] Schinderhannes [جرمن ڈاکو جس کا اصل نام Johannes Bückler تھا] کو شریف انسان سمجھتا تھا۔ اس غار کا کام ہر شے کی تباہی ہوتا ہے۔

ہر شے کی تباہی۔ اوپری درجے کی باردی سرنگوں سمیت، انسان خود جس سے نفرت کرتا ہے۔ یہ نہ صرف اس کی جڑ کاٹتا ہے، اپنے ڈراؤنے ہجوم میں، سماجی نظام میں؛ یہ فلسفے کی جڑ کاٹتا ہے، تہذیب کی جڑ کاٹتا ہے، انقلاب کی جڑ کاٹتا ہے، ترقی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس کا نام چوری، عصمت فروشی، قتل، سیاہی قتل ہو جاتا ہے۔ یہ ظلمت بن جاتا ہے، ابتری چاہتا ہے۔ اس کا غار لاعلمی سے بنا ہے۔

ان کے علاوہ، جو ان کے اوپر تھے، ان کا بس ایک ہی مقصد تھا، اس کو دبا کر رکھنا۔ یہی وہ منزل تھی جہاں اپنے تمام اعضا سمیت، حقیقت کو بہتر بنانے، اور مکمل طور پر تیار کرنے کے ساتھ فلسفہ ترقی کر سکتا تھا۔ آپ غار کی لاعلمی کو نظر انداز کر دیں تو آپ جانوروں کی ماند کو تباہ کر دیں گے۔

آیئے، ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے، ہم اس کو چند لفظوں میں سموئے دیتے ہیں۔ سماج کا سب سے بڑا خوف اور خطرہ ظلمت ہے۔

انسانیت شناخت ہوتی ہے۔ سارے انسان ایک ہی مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ جہاں تک قضا و قدر کا معاملہ ہے، ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے بھی، جب وہ گوشت پوست میں ہوتے ہیں، ایک ہی قسم کا سایہ ہوتا ہے، اور بعد میں ان سب کی ایک ہی جیسی راکھ ہوتی ہے، مگر جب انسانی بُدی میں لاعلمی مل جاتی ہے تو سب کچھ کالا ہو جاتا ہے۔ یہ لاعلاج سیاہی انسان کے اندرون کو بھی سیاہ کر دیتی ہے، اور یہی شیطنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

❁

غنڈوں کی چوکڑی

1830ء سے 1835ء تک بابے(Babet)، گولیمر (Gueulemer)، کیا کسو، اور مونٹ پارناس(Montparnasse) پر مشتمل غنڈوں کی ایک چوکڑی [ruffian] کی پیرس کی سطح کی تیسری زیرِ زمین منزل پر حکمرانی تھی۔

گولیمر ایک ہرقلیس تھا جس کی کوئی طے شدہ حیثیت نہیں تھی۔ اپنی سطح پر وہ Arche-Marion کا داروغہ مطبخ تھا۔ چھ قد کا انسان، اس کی چھاتی کے عضلات سنگِ مرمر کے، بازو کی مچھلیاں پیتل کی، سانسیں غار کی ہوا، دھڑ دیو پیکر اور سر چڑیا کا جیسا تھا۔ دیکھنے والوں کو وہ ننخ کے پاجامے اور مخمل کی واسکٹ میں ملبوس Farnese Hercules نظر آتا تھا۔

مجسمے کے انداز کا بنا گولیمر عفریت کو بھی فتح کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی اس ہیئت سے فائدہ بھی خوب اٹھایا تھا۔ نچلی بھنویں، بڑی بڑی کنپٹیاں، چالیس سے کم عمر، زاغ جیسے پاؤں، سخت، چھوٹے چھوٹے بال، نرم نرم رخسار، جنگلی سؤر جیسی تھوڑی؛ قاری اب اس شخص کا با آسانی تصور کر سکتا ہے۔ اس کے عضلات کام کے لیے بے چین ہوتے تھے، جب کہ اس کی حماقت کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بڑی مگر مجہول قوت کی مانند تھا۔ اس کی سرد مہری دیکھنے والے کو مار ڈالتی تھی۔ لوگ اسے creole [جزائر غرب الہند] کا آدمی سمجھتے تھے۔ 1815ء میں Avignon میں حمال ہونے کے ناتے شاید اس کا سلسلہ [فرانسیسی] فیلڈ مارشل برون(Brune) سے ملتا تھا۔ اس کے بعد وہ غنڈہ بن گیا تھا۔

بابے کی شفافیت گولیمر کی کراہت کا تقابل تھی۔ بابے دبلا پتلا اور پڑھا لکھا تھا۔ وہ شفاف تھا مگر اس کے اندر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی ہڈیوں سے دن کی روشنی گزر جاتی تھی، مگر

آنکھ سے کچھ گزر نہیں سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ کیمیا گر ہے۔ وہ ہر فن مولا تھا۔ اس نے Saint-Mihiel میں vaudeville[مختلف قسم کے گانوں پر مشتمل کھیل] میں کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک بامقصد انسان تھا، اچھی گفتگو کرنے والا تھا اور اپنے تبسم اور اندازِ گفتگو پر زور دیتا تھا۔ اس کا پیشہ کھلے میدان میں ریاست کے حاکم کے پلاسٹر سے بنے مجسمے بیچنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کے دانت بھی اکھاڑتا تھا۔ نمائشوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا تھا، جہاں اس کی دُکان میں ایک بھونپو اور ایک بڑا سا اشتہار لگا ہوتا تھا: "بابے، دانتوں کا فن کار، اکادمیات کا رکن، دھاتوں اور دھات سے بنی اشیا پر تجربے کرنے والا، دانت نکالتا ہے اپنے ہمادر معالجوں کے چھوڑے ہوئے دانتوں کے ٹکڑے بھی نکال دیتا ہے۔ قیمت: فی دانت، ایک فرانک پچاس سینٹ؛ دو دانت، دو فرانک؛ تین دانت، دو فرانک، پچاس سینٹ: موقعے کا فائدہ اٹھایئے۔" موقعے کا فائدہ اٹھانے سے مطلب تھا، جتنا زیادہ ممکن ہو دانت اکھڑوا لیجیے۔ اس کی شادی ہو چکی تھی، اور بچے بھی تھے، مگر اسے خبر نہیں کہ بیوی اور بچوں کا کیا ہوا۔ انھیں اس طرح کھو دیا جیسے کوئی اپنے رومال کھو دے۔ بابے اخبار پڑھتا تھا؛ جس دنیا سے اس کا تعلق تھا اس میں یہ عجیب سی بات ہوا کرتی تھی۔ ایک دن، اس زمانے میں جب اس کی ٹھیلے والی دُکان پر اس کے ساتھ اس کا پورا خاندان ہوا کرتا تھا، اس نے ایک خبر پڑھی تھی کہ ایک عورت نے ایسے بچے کو جنم دیا ہے جس کا منہ کسی بچھڑے کی تھوتھنی جیسا ہے۔ ماں اور بچہ بخیریت ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر اس نے بلند آواز میں کہا تھا، "کتنی خوش قسمتی کی بات ہے۔ میری بیوی میں صلاحیت نہیں کہ مجھے بھی ایسا ہی بچہ دیتی!" اس کے بعد اس نے "پیرس کی تدفین" کی خاطر سب کچھ تج دیا تھا۔ یہ اس کا اندازِ اظہار تھا۔

کیا کسو کون تھا؟ وہ رات کی مانند ایک انسان تھا۔ جب تک آسمان سیاہی سے بھر نہیں جاتا، وہ باہر نہیں نکلتا تھا۔ رات ہوتے ہی وہ اپنے سوراخ سے نکلتا اور دن کی روشنی نکلنے سے پہلے اسی میں واپس چلا جاتا تھا۔ وہ سوراخ کیا تھا؟ کسی کو علم نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مکمل اندھیرے میں بات کرتا تھا، جب اس کی پشت ان کی جانب ہوتی تھی۔ کیا اس کا اصلی نام کیا کسو تھا؟ ہرگز نہیں۔ اگر اس کے سامنے کوئی شمع لائی جاتی تو وہ نقاب اوڑھ لیتا تھا۔ وہ ماہرِ جوف صوتیات تھا[وہ لوگ جو کٹھ پتلی کی منہ سے اپنی آواز نکالنے کا تماشا کرتے ہیں]۔ بابے کہتا تھا، "کیا کسو دو آوازوں میں نغمہ سرائی کرنے والا" انسان ہے۔ کیا کسو بے مقصد، خوف ناک اور آوارہ گرد انسان تھا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس کا اپنا کوئی نام تھا۔ کیا کسو اس شخص کی عرفیت تھی؛ کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس کی اپنی بھی کوئی آواز تھی، اس لیے کہ جب وہ بولتا تھا تو آواز منہ کے بجائے پیٹ سے نکلتی

محسوس ہوتی تھی؛ کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس کا اپنا بھی کوئی چہرہ تھا، اس لیے کہ کسی نے کبھی اسے نقاب کے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس طرح غائب ہو جاتا تھا، جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اور جب ظاہر ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اچانک زمین سے نکل پڑا ہو۔

مونٹ پارناس رنجیدہ شخصیت کا مالک تھا۔ مونٹ پارناس بچہ تھا؛ بیس برس سے کم عمر، خوب صورت چہرہ، چیری جیسے ہونٹ، دل فریب سیاہ بال، آنکھوں میں بہار کے زمانے کی چمک دار روشنی؛ اس میں ہر قسم کی بُرائی تھی اور وہ ہر قسم کے جرم کی تمنا کرتا تھا۔

ہر قسم کی برائی ہضم کر لینے کی عادت نے اس میں زیادہ برائی کی اشتہا پیدا کر دی تھی۔ آوارہ گرد لونڈا، جیب کترا بن گیا تھا، جیب کترے سے ٹھگ [گلا گھونٹ کر مارنے والا] بن گیا تھا۔ وہ خلیق، زنخا، حسین، صحت مند، کاہل، خوں خوار انسان تھا۔ اس کے ہیٹ کا چھجا بائیں جانب اٹھا ہوتا تھا تا کہ وہاں سے بالوں کا گچھا نکلا دکھائی دے، جو 1829ء کا انداز تھا۔ وہ تشدد کے ساتھ ڈاکا مارنے کا عادی تھا۔ اس کے کوٹ کی تراش بہترین، مگر کوٹ تار تار ہوتا تھا۔ مونٹ پارناس بدنصیبی کی وہ نشانی تھا جسے قتل کرنے پر مامور کر دیا گیا ہو۔ اس کی نوجوانی کے تمام جرائم خوش لباسی کی خواہش کے باعث ہوتے تھے۔ پہلی طوائف نے، جس نے اس سے کہا تھا، "تم بہت خوب صورت ہو!" اس کے دل میں سیاہی کا دھبا ڈال دیا تھا، اور اسے اس ہابیل کا قابیل بنا دیا تھا۔ یہ جان کر کہ وہ بہت خوب صورت ہے، وہ نفیس دکھائی دینا چاہتا تھا۔ اب اس کی نفاست کاہلی ہو گئی ہے؛ مفلس انسان کی کاہلی کا مطلب جرم ہوتا ہے۔ مونٹ پارناس جیسے خوف ناک کوچہ گرد کم ہی ملتے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کئی لاشیں گرا چکا تھا۔ اس بدنصیب کے سامنے ایک سے زیادہ، ہاتھ پھیلائے، خون میں لت پت چہرے والے راہگیر راہ میں پڑے ہوتے تھے۔ خم دار بال؛ لباس میں خوش بو؛ کمر میں کسی جھالر والی عورت؛ پروشیائی فوجی افسر جیسی چھاتی؛ بولیوارڈ کے اطراف کی فاحشاؤں کی تعریفی سرگوشیاں؛ جان بوجھ کر سختی سے باندھا گیا گلوبند؛ جیب میں ڈنڈے کی مٹھیا کا ابھار؛ کاج میں لگا پھول۔ یہ ہوتا تھا اس گورستانی عفریت کا بناؤ سنگھار۔

❈

طائفے کی ساخت

ان چار لفنگوں پر مشتمل ایک قسم کا Proteus [جلد جلد شکل بدلنے والا یونانی دیوتا] تشکیل پا چکا تھا، جو پولیس کے درمیان اژدھے کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور [جرائم کے ماہر] Vidocq کی نظروں سے بچ کر، ڈرائیور، درخت، شعلے، فوارے جیسے نام کے ذریعے جال، سایے، خفیہ ڈبے اور پناہ گاہیں بن کر فرار کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس طرح اپنی شخصیتیں بدلتا رہتا ہے، جیسے کسی نقاب پوش کی رقص کے دوران چہرے پر لگی مصنوعی ناک نکال دی جائے؛ اور کبھی کبھی اتنے روپ اختیار کر لیتا ہے کہ خود Coco-Latour بھی انھیں مکمل طور پر ایک مجمع سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

یہ چاروں افراد محض چار افراد ہی نہیں تھے؛ یہ سب چار سروں والے کسی پُر اسرار ڈاکو کی طرح تھے جو بڑے پیمانے پر پیرس میں وارداتیں کرتا تھا؛ یہ لوگ بدی کے خوف ناک مشروم کی طرح تھے جو سوسائٹی کے غار میں اُگتے رہتے ہیں۔

ان کے اپنے درمیان شاخ در شاخ رشتوں اور نیٹ ورک کے باعث بابے، گوئمر، کیاکسو اور مونٹ پارناس پر Seine کے محکمے نے اس سے کیے جانے والے دھوکے کے الزام لگائے تھے۔ اس قسم کے خیالات کے موجد شبینہ تصورات کے مالک اپنے خیالات پر عمل درآمد کے لیے ان سے رابطے کرتے تھے۔ اس طرح ان چار بدمعاشوں کو مواقع فراہم ہوتے تھے، ثانی الذکر جن سے اپنے منظرنامے تخلیق کرتے تھے۔ یہ لوگ مواقع فراہم ہونے کے لیے محنت کرتے۔ وہ ہمیشہ اس قسم کے مواقع فراہم کرنے کی کیفیت میں ہوتے تھے جن سے ان کے کاندھوں سے جرائم کے بوجھ اُتارنے کی مناسب قوت مل جاتی تھی، جو خاصی فائدہ مند بھی ہوتی تھی۔ جب کوئی

جرم پکڑ میں آجاتا تو وہ اپنے ساتھیوں کو فرار میں مدد دیتے تھے۔ تمام خفیہ الیوں کے لیے ان کے پاس مجرمانہ کارروائی کرنے والوں کا ایک طائفہ ہوا کرتا تھا۔

یہ ہمیشہ رات کے اندھیرے میں جمع ہوتے، اور جب جاگنے کا وقت ہوتا تو Salpetriere سے ملحقہ میدانوں میں ہوتے تھے۔ وہیں اپنی کانفرنسیں بھی منعقد کرتے تھے۔ اس سے پہلے ان کے سامنے بارہ سیاہ گھنٹے ہوتے تھے اور اس دوران وہ اپنے کام کی باقاعدہ تنظیم کرتے تھے۔

افراد کی ان متفقہ خفیہ کارگزاریوں کو Patron-Minette کا نام دیا گیا تھا۔ اس خیالی، قدیم اور عمومی زبان میں، جو روز بہ روز غائب ہوتی جا رہی ہے، Patron-Minette سے مراد گھتے کی صبح اور بھیڑیے کی شام ہوتی ہے۔ Patron-Minette کا یہ اطلاق شاید ان کے اوقات کار سے لیا گیا تھا جب ان کا کام ختم ہوتا تھا؛ یعنی صبح خیالی ہیولوں کے غائب ہونے کا اور بد معاشوں کے جدا ہونے کا وقت ہوتا تھا۔ یہ چاروں افراد اسی عنوان سے جانے جاتے تھے۔ جب Assizes کا صدر Lacenaire سے ملنے اس کے قید خانے گیا تھا اور اس جرم کے بارے میں پوچھ گچھ کی Lacenaire کو جس سے انکار تھا، تو صدر نے اس سے سوال کیا "تو پھر یہ کام کس نے کیا تھا؟" Lacenaire نے جواب دیا، جو مجسٹریٹ کے لیے آج بھی معما ہے، مگر پولیس کے لیے واضح ہے: "یہ شاید Patron-Minette کی کارستانی تھی۔"

کبھی کبھی عالی مرتبہ افراد کی شخصیات کے بیان کے لیے ایک فلکا پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح جیسے بد معاشوں کی کسی فہرست سے لیے جانے والے ناموں سے کوئی گروہ تیار کیا جا رہا ہو۔ یہ ہے ان ناموں کا اطلاق Patron-Minette کے سر کردہ ارکان جن کو سُن کر جواب دیا کرتے تھے — اتفاق سے یہ نام خاص خاص یادداشتوں میں باقی رہ گئے ہیں۔

Panchaud عرف Printanier عرف Bigrenaille۔

بروژوں Brujon — اس نام کا ایک خاندان تھا، مگر ہم اس نام کو شامل کرنے سے انکار نہیں کر سکتے]۔

سڑک کی مرمت کرنے والا، بولاتروئیل، ہم جس کا پہلے تعارف کرا چکے ہیں۔

Laveuve لاویو

Finistere فنستیر

Homere-Hogu — ہومیر ہوگو یعنی سیاہ فام)

Mardisoir (یعنی منگل کی شام)

Depeche (یعنی جلدی کرو)

Fauntleroy عرف Bouquetiere (یعنی گل فروش لڑکی)

Glorieux (یعنی رہا شدہ سزا یافتہ)

Barrecarrosse (یعنی گاڑی روکو)۔ موسیو Dupont کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔

L'Esplanade-du-Sud

Poussagrive

Carmagnolet

Kruideniers، جسے Bizarro کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

Mangedentelle (یعنی فیتہ کھانے والا)

Les-pieds-en-l'Air (یعنی ہوا میں معلق پاؤں)

Demi-Liard، جس کو Deux-Milliards کہا جاتا تھا۔

وغیرہ، وغیرہ۔

ہم کچھ [ناموں] سے صرف نظر کر رہے ہیں، جو بہت زیادہ خراب نہیں تھے۔ ان تمام ناموں سے متعلق چہرے بھی ہیں۔ یہ نام صرف وجود کا نہیں، اصناف کا اظہار کرتے ہیں۔ ان ناموں میں سے ہر نام، جرم کی اس پھپھوند کی قسم کے مطابق ہوتا ہے جو تہذیب کے نیچے لگتی ہیں۔

وہ وجود جو اپنے خد و خال کے بارے میں بہت مسرف نہیں تھے ان میں سے نہیں تھے جو سڑکوں پر پائے جاتے ہیں۔ راتوں سے گزرنے کی صعوبت کے باعث، وہ دن میں سو جایا کرتے تھے، کبھی چونے کی بھٹیوں میں، کبھی Montmatre یا Montrouge کی از کار رفتہ کانوں میں، اور کبھی گندی نالیوں میں۔ اس طرح وہ زمین پر پھیل جاتے تھے۔

ان لوگوں کا کیا حال ہوا؟ یہ اب بھی موجود ہیں۔ یہ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ہوریس (Horace) نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے: Ambubaiarum مجلسی، عطار، فقیر، اداکار؛ جہاں تک سوسائٹی ان کو سمجھتی ہے کہ وہ کون ہیں، وہ وہی رہیں گے جو وہ ہیں۔ اپنے غار کی دھندلی چھت کے نیچے سماج کی نرم مٹی سے یہ بار بار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھوت پریت بن جاتے ہیں، مگر ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں؛ ان کے وہی نام نہیں ہوتے، نہ وہ اسی بھیس میں ہوتے ہیں۔ افراد نیست و نابود ہو جاتے ہیں، قبیلے باقی رہتے ہیں۔

ان کی استعداد ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔ خانہ بدوش سے پامال کنندہ تک، ان کی نسل اپنی پاکیزگی برقرار رکھتی ہے۔ یہ جیبوں کے بٹوؤں کو بھانپ لیتے ہیں، جیبی گھڑیاں انھیں اشارے کرتی ہیں۔ نقرہ اور طلا ان کے نزدیک بو باس رکھتے ہیں۔ ان ہی میں سادہ بورژوا بھی ہوتے ہیں، جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی عادتیں "چوری" کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ان بورژوا لوگوں کی پیروی کرتے ہیں۔ کسی دیہاتی آدمی کو دیکھ کر ان میں ویسا ہی لرزہ ہوتا ہے جیسا کہ جال میں پھنسنے والے کسی اجنبی کو دیکھ کر مکڑی میں پیدا ہوتا ہے۔

یہ لوگ خوف ناک ہو جاتے ہیں، جب رات کے اندھیرے میں کسی شاہراہ پر یہ لوگ نظر آجائیں یا ان سے مقابلہ ہو جائے۔ یہ انسان نہیں، زندہ کہرے سے بنے پیکر معلوم ہوتے ہیں؛ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمیشہ کسی سایے سے منسلک کسی انبار کی طرح ہوتے ہیں، کہ ان میں کسی خاص قسم کی دانش نہیں ہوتی، کہ ان کا نفس ظلمات پر مشتمل ہوتا ہے اور صرف چند لمحے کی خوف ناک زندگی کے لیے ان میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اِن بھوتوں کو بھگانے کے لیے کس شے کی ضرورت ہوتی ہے؟ روشنی — سیلاب جیسی روشنی کی!

چمگادڑ سویرے کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔
اپنے سماج کو نیچے سے روشن کرو۔

لڑکی کی تلاش میں

گرمی کا موسم گزر گیا۔ خزاں آ گئی۔ سرما کا موسم آ گیا۔ لکسمبرگ باغ میں نہ موسیو لیبلانک نے قدم رکھا، نہ اس نوجوان لڑکی نے۔ اس کے بعد سے ماریوس کی ایک ہی دلی آرزو تھی، کہ اس پیاری حسینہ کا چہرہ ایک بار پھر نظر آ جائے۔ وہ مستقل تلاش میں رہا، اسے ہر جگہ تلاش کیا، کامیاب نہیں ہوا۔ اب وہ پر جوش خواب دیکھنے والا، مستحکم، مستقل مزاج، ولولہ انگیز اور مقدر سے لڑنے والا بہادر، وہ دماغ جو مستقبل پر مستقبل بناتا تھا، منصوبوں سے پُر نوجوان نفس، ماریوس نہیں تھا، جس کے ذہن میں منصوبے بھی تھے اور خود بینی بھی، خیالات بھی اور خواہشیں بھی؛ اب وہ کسی گم شدہ کتے کے مانند تھا۔ وہ غم انگیزی کے سیاہ غار میں گر چکا تھا۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اسے کام سے نفرت ہو گئی تھی۔ چہل قدمی تھکا دیتی تھی۔ قدرت کا وسیع خزانہ جو پیکروں، روشنیوں، آوازوں اور مشوروں، نظاروں، تعلیمات سے لبریز ہوا کرتا تھا، اس کے سامنے خالی پڑا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شے غائب ہو گئی ہے۔

وہ مسلسل کسی سوچ میں ہوتا تھا، اس لیے کہ اب وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا؛ مگر اب اسے اپنی سوچ سے مسرت بھی نہیں ملتی تھی۔ سرگوشی میں پیش کی جانے والی ہر تجویز پر اس کے اندر کے ظلمات سے جواب آتا تھا، ''کیا فائدہ؟''

اس نے اپنے اوپر سیکڑوں ملامتیں ڈھیر کر لی تھیں۔ ''میں نے اس کا پیچھا کیوں کیا تھا؟ میں تو اسے دیکھ کر ہی خوش ہو لیتا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتی تھی؛ کیا یہی بہت نہیں تھا؟ اس میں میری محبت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کیا یہی سب کچھ نہیں تھا؟ میں کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ اس کے بعد اور کچھ نہیں تھا۔ میں بہت نامعقول آدمی رہا ہوں۔ یہ میری اپنی غلطی تھی۔'' وغیرہ

وغیرہ۔ کوفیراک کے نزدیک، جس سے وہ کچھ نہیں چھپاتا تھا — یہ اس کی فطرت تھی — مگر جو ہر بات پر نگاہ رکھتا تھا — جو اس کی عادت تھی — اس کا خیال تھا کہ لڑکی نے اس سے محبت کرنی شروع کردی تھی، حالاں کہ اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی؛ یہ دیکھ کر ماریوس غم انگیز کیفیت میں گرتا جا رہا تھا اور ماریوس سے کہتا تھا: ''مجھے تو تم سیدھے سادھے جانور لگتے تھے۔ اب تم کہیں میرے جھونپڑے میں آجاؤ۔''

ایک دفعہ، جب ستمبر کی دھوپ میں اسے اعتماد پیدا ہوگیا تھا ماریوس اپنے دوستوں کوفیراک، بوسے اور گرانتیر کے ساتھ رقص میں شامل ہوا تھا، اس امید پر، اور وہ امید بھی کیا تھی، بس یہی کہ شاید وہاں وہ مل جائے گی۔ مگر وہ، جس کی تمنا کی تھی، نہیں ملی — ''مگر یہی وہ جگہ ہے جہاں تمام کھوئی ہوئی عورتیں مل جاتی ہیں۔'' گرانتیر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ماریوس رقص گاہ میں اپنے دوستوں کو چھوڑ کر پیدل تنہا، رات کے اندھیرے میں، تھکا ماندہ، بخار کی کیفیت میں، افسردہ اور دُکھتی آنکھوں کے ساتھ، گاڑیوں میں ٹھسے دعوت سے واپس جاتے گاتے شور کرتے لوگ سامنے اس کے قریب سے گزر کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے، جب کہ وہ اپنی مایوسیوں میں، سڑک کے کنارے لگے اخروٹ کے درختوں کی تیز خوش بو میں سانسیں لیتا، تا کہ اس کا سر ہلکا ہو جائے، اپنے گھر واپس چلا آیا تھا۔

اب وہ روز بہ روز بے حد گھلا ہوا، اپنی اندرونی اذیت میں، جال میں پھنسے بھیڑیے کی طرح، جو ہر طرف اپنے غائب کو تلاش کر رہا ہو، اور محبت میں بُری طرح گرفتار ہو، زیادہ تنہا ہوتا جا رہا تھا۔

ایک اور موقعے پر وہ ایسے مقابلے سے دوچار ہوا جو اس پر غیر معمولی طریقے سے اثر انداز ہوا تھا۔ Boulevard des Invalides کے علاقے کی تنگ گلیوں میں، ایک کام کرنے والے آدمی کے ملبوس میں، سر پر لمبے چھجے کی ٹوپی لگائے جس میں سے سفید بالوں کا گچھا نکلا ہوا تھا، ایک آدمی ملا تھا۔ ماریوس، اس کے بالوں کے حسن میں گرفتار، اس آدمی کو غور سے دیکھ رہا تھا، جو کسی گہرے اور درد انگیز خیال میں غوطہ زن آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سمجھا کہ اس نے موسیو لیبلانک کو پہچان لیا تھا۔ وہی بال تھے، وہی انداز تھا، اور جہاں تک ٹوپی کا معاملہ تھا، وضع قطع میں ویسی ہی تھی، مگر زیادہ دبی ہوئی تھی۔ مگر کام کرنے والوں جیسا لباس کیوں؟ اس کا کیا مطلب تھا؟ یہ بہروپ کیا اشارہ کر رہا تھا؟ ماریوس حیرت میں ڈوب گیا۔ وہاں سے نکلتے اس نے سوچا کہ اس شخص کا تعاقب شروع کر دیا جائے۔ کسے خبر تھی کہ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی، وہ جس کی تلاش میں تھا؟ بہر حال، اسے اس آدمی پر غور کرنا چاہیے اور

اس راز کو آشکار کر دینا چاہیے۔ مگر یہ خیال دیر سے آیا اور وہ آدمی وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ کسی بغلی گلی میں مڑ گیا تھا، اور پھر ماریوس اسے تلاش نہیں کر سکا۔ یہ واقعہ تین دن تک اس کے ذہن پر سوار رہا، اس کے بعد محو ہو گیا تھا۔

اس نے خود سے کہا، "شاید یہ صرف شباہت تھی۔"

۞

دفینہ

ماریوس نے Gorbeau ہاؤس میں رہنا ترک نہیں کیا، مگر وہ وہاں رہنے والے کسی شخص پر توجہ نہیں دیتا تھا۔

سچ پوچھیے تو اس زمانے میں اس گھر میں کوئی کرایہ دار نہیں تھا، سوائے اس کے اور ژاندریت [جس آردیے کا تبدیل شدہ نام] کے جن کا کرایہ، ان ماں باپ یا بیٹیوں سے بات کیے بغیر ایک بار اس نے ادا کیا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے کرایہ دار یا تو کہیں اور منتقل ہو گئے تھے یا انتقال کر گئے تھے، یا کرایہ نہ دینے کی صورت میں بے دخل کر دیے گئے تھے۔

سردی کے موسم میں ایک دن دوپہر کے بعد ذرا دیر کے لیے سورج نے اپنا چہرہ دکھایا تھا، مگر وہ فروری کی دوسری تاریخ تھی جب قدیم Candlemas کے دن کے ناقابلِ اعتبار سورج نے جو چھ ہفتوں کی شدید سردی کا باعث ہوا تھا، Mathieu Laensberg کے دل میں مندرہ ذیل دو مصرعے ڈال دیے تھے جو کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے ہیں:

سورج تیز چمکے یا دھندلا رہے
ریچھ اپنی ماند میں واپس چلا جائے گا

ماریوس ابھی اپنی night was falling سے نکلا ہی تھا کہ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا؛ اس لیے کہ وہ چھ سے رات کا کھانا کھانے لگا تھا۔

ابھی اس نے اپنی ڈیوڑھی پار ہی کی تھی اس وقت جہاں مادام صفائی کر رہی تھی، اور اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی:

''آج کل سستا کیا ہے؟ ہر چیز تو مہنگی ہو گئی ہے۔ دنیا میں اب کوئی شے سستی نہیں

سوائے پریشانی کے؛ دنیا بھر کی پریشانی آپ کو مفت مل سکتی ہے۔"

ماریوس Saint-Jacques اسٹریٹ کی طرف جانے کے لیے بولیوارڈ کی رکاوٹ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی راہ چلا جا رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کسی نے اسے کہنی ماردی ہو؛ وہ مڑا اور اسے چیتھڑوں میں ملبوس دو نوجوان لڑکیاں دکھائی دیں، ایک لمبی اور دبلی پتلی تھی، دوسری چھوٹی تھی جو تیز تیز چل رہی تھی؛ خوف سے اور بھاگنے سے ان کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں؛ وہ ماریوس سے ملنے آئی تھیں، اسے دیکھ نہیں سکی تھیں اور دھکا دیتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ اس دھندلکے میں بھی ماریوس ان کے نیلے چہرے، ان کے وحشی سر، ان کے بکھرے بال، ان کے ڈراؤنے بچھے، ان کے چیتھڑوں جیسے پھٹے کوٹ اور ان کے ننگے پاؤں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بھی باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ لمبی والی لڑکی نے نہایت دھیمی آواز میں کہا تھا: "پولیس والے آگئے ہیں۔ وہ نصف دائرے میں مجھے پکڑنے ہی والے تھے۔"
دوسری لڑکی نے جواب میں کہا تھا: "میں نے انھیں دیکھا۔ میں بھاگی، بھاگی اور بھاگتی چلی گئی۔"

یہ مکروہ بازاری زبان سن کر، ماریوس سمجھ گیا کہ پولیس والے یا فوجی ان دونوں بچیوں کو پکڑنے کے قریب تھے کہ یہ وہاں سے بھاگ نکلی ہیں۔

دونوں لڑکیاں بولیوارڈ کے کنارے لگے درختوں کے درمیان کود پڑیں، تھوڑی دیر کے لیے اندھیرے میں ایک سفید سا دھبا بنا اور پھر غائب ہوگیا تھا۔

ماریوس تھوڑی دیر کے لیے رک گیا تھا۔

وہ اپنے راستے چلا جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹے سے پیکٹ پر پڑی جو اس کے پیروں کے قریب زمین پر پڑا تھا۔ ماریوس رکا اور پیکٹ اٹھالیا۔ یہ ایک قسم کا لفافہ تھا جس میں شاید کچھ کاغذات تھے۔

"اچھا!" اس نے خود سے کہا "شاید ان بدقسمت لڑکیوں نے گرادیا ہے۔"

وہ الٹے قدموں واپس گیا، آواز دی، مگر لڑکیاں ملی نہیں: اس نے سوچا کہ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔ اس نے پیکٹ کو اپنی جیب میں رکھ لیا، اور کھانا کھانے چلا گیا۔

راستے میں، Mouffetard اسٹریٹ کی بغلی گلی میں، سیاہ چادر میں لپٹا، تین کرسیوں پر کسی بچے کی میت کا تابوت رکھا ہوا تھا، جہاں شمعیں جل رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں دھندلکے والی دونوں لڑکیاں پھر ابھر آئیں۔

"بے چاری مائیں!" اس نے سوچا، "بچوں کے مرنے سے زیادہ افسوس ناک صرف ایک

منظر ہوتا ہے، جب وہ بدنام زندگی گزارتی دکھائی دیتی ہیں۔"

یہ پرچھائیاں، جنھوں نے اس کے غم کو کم کردیا تھا، اس کے خیالات سے غائب ہو گئیں، اور ایک بار پھر وہ زندگی کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ ایک بار پھر اسے محبت اور مسرتوں کے وہ چھ ماہ یاد آ گئے جو اس نے گلمرگ کے خوب صورت پیڑوں تلے کھلی ہوا میں اور دن کی روشنی میں گزارے تھے۔

"میری زندگی کتنی اداس ہو گئی ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "مجھے نوجوان لڑکیاں نظر آتی ہیں، پہلے وہ حوروں جیسی ہوتی تھیں، مگر اب وہ بد روحیں ہیں۔"

۞

چوطرفہ مشکل

اس شام وہ سونے کی تیاری میں لباس تبدیل کر ہی رہا تھا کہ اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گیا جس میں وہ پیکٹ رکھا تھا، جو اسے بولیوارڈ میں پڑا ملا تھا۔وہ اس پیکٹ کو بالکل بھول ہی گیا تھا۔اس نے سوچا کہ اس پیکٹ کو کھول کر دیکھ ہی لیا جائے؛ اگر یہ ان ہی کا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس میں ان نوجوان لڑکیوں کا پتا بھی موجود ہو۔ بہر حال، پیکٹ واپس کرنے کے لیے بھی تو اس کا کھولنا ضروری ہوگا۔

اور اس نے پیکٹ کھولا۔

پیکٹ بند نہیں کیا گیا تھا۔اس میں چار خط تھے۔خط بھی بند نہیں کیے گئے تھے۔

خطوں میں پتے لکھے ہوئے تھے۔

چاروں خطوں میں سے تمباکو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

پہلا خط ''مادام la Marquise de Grucheray، بالمقابل Chamber of Deputies'' کے نام تھا۔

ماریوس نے سوچا، شاید اس میں وہ اطلاع مل جائے گی جس کی تلاش ہے؛ اس کے علاوہ، کھلے خط کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

خطوط کی تحریر مندرجہ ذیل تھی:

''مادام la Marquise

درگزر اور پارسائی کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ یہ سوسائٹی کو متحد رکھتی ہے۔اپنے عیسائی جذبے کو استعمال کیجیے اور وفاداری کے اس بد قسمت ہسپانوی شکار پر رحم اور مقدس جواز کی ایک

نظر ڈالیے، جس نے اپنا خون دیا ہے؛ جس نے اپنے مقدر کو، بلکہ ہر شے کو اپنے مقصد پر وار دیا ہے، اور جو اس کے باوجود آج بھی خود کو بدترین بدنصیبی میں پاتا ہے۔اسے اس امر پر ہرگز کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی محترم شخصیت ،ایک نہایت دردانگیز شخصیت کے وجود کے تحفظ کی خاطر اس زخم زخم، باعزت اور تعلیم یافتہ فوجی کی دست گیری کرے گی تا کہ وہ جذبہ جو مادام la Marquise کے دل میں اس بدنصیب قوم کے لیے ہے، آپ کو اور آپ کی دل چسپیوں کو اس بدنصیب قوم کے لیے متحرک کردے گا۔امید ہے کہ یہ درخواست ضائع نہیں جائے گی، اور تشکر اس دل فریب یادگار کا تحفظ کرے گا۔

بے حد عزت واحترام کے ساتھ

Don Alvares

گھڑسوار دستے کا کپتان

شاہی پرست جو فرانس میں پناہ گزین ہے،

جو خود کو اپنے ملک کی خاطر سفر میں پاتا ہے،

اور جس کے پاس اس سفر کو جاری رکھنے کے ذرائع مہیا نہیں"

اس دستخط کے ساتھ کوئی پتا نہیں لکھا گیا تھا۔ماریوس کو امید تھی کہ دوسرے خط میں کوئی پتا مل جائے گا، جس پر لکھا تھا:

Madame la Comtesse de Montvernet

Rue Cassette, No. 9.

کے نام

اس خط میں لکھا تھا:

"مادام la Comtesse

یہ خط تحریر کرنے والی، چھ افراد پر مشتمل ایک بدنصیب خاندان کی ماں ہے، جس کے آخری فرد کی عمر صرف آٹھ ماہ ہے۔میں خود کو اس وقت سے بیمار پاتی ہوں جب کہ پانچ ماہ قبل میرے شوہر نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور اس نہایت خوف ناک دنیا میں اس مفلس کے پاس [زندگی بسر کرنے کے] ذرائع بھی نہیں۔

مادام la Comtesse کی توجہات کی امیدوار

بہ صد خلوص واحترام

داشتہ Balizard"

اب ماریوس نے تیسرے خط کی طرف توجہ کی جس کی تحریر مندرجہ ذیل تھی:

"موسیو Elector، Pabourgeot، ہول سیل مرچنٹ کے نام

Rue Saint-Denis

Rue aux Fers کے کنارے۔

میں آپ کو یہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر ہم دردی، اور اس ادیب شخص میں دل چسپی فرمائیں گے جس نے حال ہی میں Theatre-Francais کے لیے ایک کھیل بھیجا ہے۔ کھیل کا موضوع تاریخی ہے، اور اس کی شروعات دورِ سلطنت میں Auvergne میں ہوتی ہے؛ میرے خیال میں اس کھیل کا انداز فطری اور جامع ہے، اور اس میں کچھ خوبی بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں چار مقامات پر کچھ اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ مزاح، سنجیدگی اور انھونی کو کئی قسم کے کرداروں میں ملا دیا گیا ہے، اور ہر قسم کی سازش میں رومانویت کا ہلکا سا رنگ بھی پھیلا ہے، جو پُراسرار طریقے سے آگے بڑھتی ہے؛ [کھیل] متوجہ کرنے والی تبدیلیوں کے بعد، بے شمار لطائف اور لاجواب خوب صورت مناظر کے درمیان ختم ہو جاتا ہے۔

میرا اصل مقصد ان خواہشات کو پورا کرنا ہے جو ہماری صدی کے انسان کو رفتہ رفتہ متحرک کرتی ہیں، یعنی اس فیشن، اس تلون اور انوکھے بادنما کو [متحرک کرنا]، جو تقریباً ہر نئی ہوا کے ساتھ [اپنا رُخ] تبدیل کرتا رہتا ہے۔

ان خصوصیات کے باوجود مجھے خوف ہے کہ ممتاز ادیبوں کی خود بینی مجھے تھیٹر سے نکال سکتی ہے، اس لیے کہ میں ان فسادات سے لاعلم نہیں، نئے آنے والوں کو جن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

موسیو Pabourgeot

اہلِ علم کے روشن خیال سرپرست ہونے کی آپ کی شہرت نے مجھے یہ کہنے کی ہمت دی ہے کہ میری بیٹی جو آپ کو ہمارے خراب حالات کے بارے میں بتائے گی، کہ اس موسمِ سرما میں ہمارے پاس نہ آگ روشن کرنے کے لیے لکڑی ہوگی نہ کھانے کے لیے روٹی۔ یہ کہتے ہوئے میں آپ سے اپنے اس کھیل اور آئندہ لکھے جانے والے تمام کھیلوں کے انتساب کو قبول فرمانے کی استدعا کر رہا ہوں، جو میں آپ کے نام کرنے والا ہوں، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مجھے آپ کے تحفظ کا اعزاز حاصل ہے، کہ میں اپنی تخلیقات کو آپ کے نام معنون کر رہا ہوں۔

اگر آپ میری اس حقیر پیش کش کو اپنی قبولیت سے نوازیں گے تو میں اس تشکر کے لیے ایک نظم لکھنے میں مصروف ہو جاؤں گا۔ اور یہ نظم جسے میں اپنی تمام تر کوشش سے بہترین کرنے کی

کوشش کروں گا، اس کھیل کے ابتدائیے میں شامل کردی جائے جو شہ نشین پر پیش کی جایا کرے گی۔

موسیو اور مادام Pabourgeot کے لیے

تشکر کے بہترین جذبات کے ساتھ۔

ادیب، Genflot

پس نوشت: اپنی بیٹی کو بھیجنے اور خود نہ حاضر ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں، مگر افسوس کہ کچھ حالات مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

اس کے بعد ماریوس نے آخری خط کھولا۔

اس پر مندرجہ ذیل پتا اور یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:

"Saint-Jacquesdu-haut-Pa

کلیسا کی مہربان شخصیت اور ایک شریف انسان کے لیے۔

مہربان انسان: اگر آپ میری بیٹی کے ہمراہ آنا مناسب سمجھیں تو آپ کو ایک بدنصیب بربادی دکھائی دے گی، اور میں آپ کو اپنی اسناد دکھاؤں گا۔

ان تحریروں کے تناظر میں، آپ کا فیاض نفس اپنے واضح احساس سے خیر خواہی پر آمادہ ہوگا، اس لیے کہ سچے فلسفی ہمیشہ خوش طبع جذبات کو محسوس کرتے ہیں۔

اے رحم دل انسان، اقرار کر کہ ضرورت سے زیادہ ظالمانہ ضرورت کو برداشت کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ یہ عمل معمولی سے سکون حاصل کرنے کے دوران تکلیف دہ ہوجاتا ہے، گویا آپ تکلیف اٹھانے میں آزاد نہیں ہیں، اور اس انتظار میں، کہ بدنصیبی سے مفر ہو، لوگ غذا کی کمی کے باعث ہونے والی کم زوری سے انتقال کر جایا کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے لیے مقسوم بہت مہلک ہوتا ہے، جب کہ کچھ کے لیے زیادہ محفوظ گمں ہوتا ہے، جو زیادہ مسرف ہوتے ہیں۔

اپنی پیش کش کے دوران، اگر آپ آنا مناسب سمجھیں تو میں آپ کا منتظر رہوں گا، اور میں التجا کرتا ہوں کہ آپ میرے ادب سے بھرپور احساسات کو قبول فرمائیں گے، میں جنھیں پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص ترین اور نہایت فرماں بردار خادم

P. Fabantou

تھیٹر کا اداکار"

ان چاروں خطوط کو پڑھنے کے بعد، ماریوس نے خود کو زیادہ باخبر نہیں کیا۔

سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی خط میں کوئی پتا نہیں ملا تھا۔
اس کے علاوہ یہ بھی ؛ کہ یہ مختلف افراد کے خطوط تھے، Don Alveras، داشتہ Balizard، شاعر Genflot اور تھیٹر کے اداکار بنایاں تو (Fabantou) کے؛ مگر ان میں ایک غیر معمولی بات تھی، کہ یہ چاروں خطوط ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔
اس سے کیا پیچیدگی اخذ کی جاسکتی تھی؟ سوائے اس کے، کہ یہ سب ایک ہی فرد کی طرف سے آئے تھے؟

مزید یہ کہ ان سے پتا چلا کہ چاروں کی تاویلات ایک جیسی تھیں، چاروں میں ایک جیسا موٹا اور پیلا کاغذ استعمال ہوا تھا، تمباکو کے بھبکے بھی ایک جیسے تھے، اور، حالاں کہ تحریر میں لہجے کا انداز بدلنے کی کوشش کی گئی تھی، پھر بھی، بڑے اطمینان سے ایک ہی طرح کی املا اور ہجے کی غلطیاں کی گئی تھیں؛ حتیٰ کہ ہسپانوی کپتان اور ادیب Genflot میں کوئی فرق نہیں تھا۔
اس معمولی سے راز کو کھولنا ایک غیر ضروری مشکل اٹھانے کے مترادف تھا۔ اگر اتفاق سے یہ سب معلوم نہ ہوگیا ہوتا تو یہ معاملہ ہمیشہ پُر اسرار ہی سمجھا جاتا۔ ماریوس اس قدر غمگین رہا کرتا تھا کہ کسی مسرت سے حظ نہیں اٹھا پاتا تھا؛ نہ وہ کسی ایسے کھیل میں شامل ہوسکتا تھا، سڑکوں کی پگڈنڈیاں جو اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ ان چاروں خطوط کے درمیان کسی نابینا شخص کے ساتھ نابینا کا کردار ادا کر رہا تھا، اور یہ بھی کہ وہ لوگ اس کے ساتھ کھلواڑ کر رہے تھے۔
بہر حال، ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا کہ یہ خطوط ان دونوں لڑکیوں کے تھے، ماریوس کی جن سے بولیوارڈ پر ملاقات ہوئی تھی۔ پھر بھی، ان کاغذات کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ماریوس نے انھیں ان کے لفافوں میں واپس رکھ کر ایک کنارے ڈال دیا اور سونے چلا گیا۔ صبح سات بجے کے قریب، ابھی اس نے اٹھ کر ناشتا کیا ہی تھا، اور اپنا کام شروع کرنے والا ہی تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔
چوں کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا، وہ کبھی اپنا دروازہ بند نہیں کرتا تھا، بشرطیکہ اسے کوئی اہم کام درپیش نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ کمرے سے غیر حاضر ہوتا، تب بھی دروازے کے تالے میں لگی کنجی چھوڑ جاتا تھا۔

"چوری ہو جائے گی۔" مادام بوگوں کہتی؛
"کس چیز کی؟" جواب میں ماریوس کہہ دیتا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن اس کے پرانے جوتوں کی ایک جوڑی چوری ہو گئی، اور

مادام بوگوں کا کہنا سچ ہوگیا۔

دروازے پر ایک بار پھر پہلے جیسی ہلکی سی دستک ہوئی۔

"اندر آجایئے۔" ماریوں نے کہا۔

دروازہ کھلا۔

"کیا چاہیے آپ کو، مادام بوگوں؟" ماریوں نے اپنی میز پر رکھی کتابوں پر سے نظریں اُٹھائے بغیر ہی سوال کیا۔

ایک آواز نے، جو مادام بوگوں کی نہیں تھی، جواب میں کہا:

"معاف کیجیے گا، جناب والا!"

یہ برانڈی اور شراب کے نشے سے بگڑی ہوئی کسی بوڑھے شخص کی آواز تھی، بالکل بے دم، بھرائی ہوئی، گویا بولنے والے کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔

ماریوں تیزی سے مڑا، اور ایک نوجوان لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

۞

بدنصیب گلاب

نصف وا دروازے میں ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی ۔اوپری منزل کی بے جان کھڑکی جس سے روشنی آ رہی تھی، دروازے کے بالکل سامنے تھی، اور اس ہلکی سی روشنی میں ایک وجود کھڑا تھا۔وہ ایک نحیف، لاغر، نازک سی مخلوق تھی؛ سردی اور برہنگی کے باعث لرزتے ہوئے اس جسم پر سوائے ایک قمیص اور ایک پیٹی کوٹ کے کچھ نہیں تھا۔کمر بند کی جگہ ڈور بندھی تھی؛ سر کے ربن کی جگہ بھی ڈور بندھی تھی؛ اس کے نوکیلے کاندھے قمیص سے باہر نکلے ہوئے تھے؛ زردی مائل سنہرا پن، مٹی کے رنگ کی بغلی کی ہڈیاں، سرخ ہاتھ، نصف کھلا اورگندہ منہ، دانت غائب، بے چمک آنکھیں؛ وہ پیکر کسی ایسی لڑکی کا تھا جسے جوانی کا حسن ملا نہ ہو؛ جس کا انداز کسی بد کار عورت کا سا تھا؛ پندرہ برس کی عمر میں پچاس کی سی صورت؛ ایسی شخصیت جو کم زور بھی تھی اور خوف ناک بھی، اوران لوگوں کو لرزہ دینے والی، جنھیں رونے کے لیے کوئی جواز میسر نہ ہو۔

ماریوس کھڑا ہو گیا تھا، اور اس وجود کو ایک قسم کی بے ہوشی کی کیفیت میں گھورے جا رہا تھا، جو ان پرچھائیوں کی طرح ہوتے ہیں جو خوابوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سب سے زیادہ دل خراش بات یہ تھی کہ یہ نوجوان لڑکی اس دنیا میں ایک گھریلو شخصیت بننے کے لیے نہیں آئی تھی ۔اپنے بچپن کی ابتدا میں وہ خوب صورت رہی ہوگی۔اس کی عمر، بھیانک قبل از وقت بدکاری اور افلاس کے باعث ہونے والی خستہ حالی سے جدو جہد کی کیفیت میں تھی ۔اس سولہ برس کے چہرے کے حسن کی باقیات ختم ہوتی جا رہی تھیں، سورج کی زرد کرن کی طرح جو سردی کے موسم میں صبح کے وقت بھیانک بادلوں سے نکلتی دکھائی دیتی ہے۔

وہ چہرہ ماریوس کے لیے بالکل اجنبی نہیں تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اسے کہیں

دیکھا ضرور ہے۔

"میڈموزیل، آپ کیا چاہتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

نوجوان لڑکی نے کسی سزا یافتہ قیدی کی بدمست جیسی آواز میں جواب دیا:

"موسیو ماریوس آپ کے لیے ایک خط ہے۔"

اس نے ماریوس کو اس کے نام سے مخاطب کیا تھا؛ اسے یقین تھا کہ وہی وہ شخصیت ہے لڑکی کو جس کی تلاش ہے، مگر وہ لڑکی کون تھی؟ لڑکی کو اس کا نام کیسے معلوم ہو گیا تھا؟

ماریوس کی اجازت کا انتظار کیے بغیر، لڑکی کمرے کے اندر آ گئی تھی۔ وہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ اندر آئی اور اعتماد کے ساتھ پورے کمرے پر، بے ترتیب بستر پر نظر ڈالی۔ اسے دیکھ کر دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔ اس کے پھٹے کوٹ میں بڑے بڑے سوراخ تھے جو اس کی لمبی لمبی ٹانگوں اور دبلے پتلے گھٹنوں کی جھلک دیکھنے کی اجازت دے رہے تھے۔ لڑکی کانپ رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا، جو اس نے ماریوس کو پیش کر دیا۔

خط کھولتے وقت ماریوس نے محسوس کیا تھا کہ لفافہ ابھی تک نم تھا، کہ یہ پیغام دور سے نہیں آیا ہو گا۔ اس نے خط پڑھنا شروع کیا:

"میرے خوش خلق پڑوسی نوجوان!

مجھے آپ کی اس نیکی کا علم ہے کہ آپ نے چھ ماہ قبل میرے گھر کا کرایہ ادا کیا تھا۔ میں آپ کے لیے برکت کی دعا کرتی ہوں نوجوان! میری بڑی بیٹی آپ کو بتائے گی کہ ہم چار افراد کو پچھلے دو دن سے روٹی کا ایک لقمہ بھی نصیب نہیں ہوا ہے۔ میرا شوہر علیل ہے۔ اگر میرا خیال مجھے دھوکا نہیں دے رہا ہے، اور میرا خیال ہے اور میں امید کرتی ہوں کہ اس بیان کو سن کر آپ کا فیاض دل پسیج جائے گا، اور میری خواہش آپ کو مجھ پر ایک معمولی سی مہربانی کرنے پر مجبور کر دے گی۔

آپ کی قابلِ ذکر مہربانیوں اور انسانی احسان کی سزاوار۔

ژاندریت

پس نوشت: میرے پیارے موسیو ماریوس! میری سب سے بڑی بیٹی آپ کے احکامات کی منتظر رہے گی۔"

یہ خط ایسے وقت میں آیا تھا جب پچھلی شام ہونے والے پُراسرار واقعات کے خیالات

نے ماریوس کے ذہن کو گھیر رکھا تھا۔ یہ خط کسی اندھیری کوٹھری میں ایک شمع کی مانند تھا۔ اچانک سب کچھ روشن ہو گیا تھا۔

یہ خط بھی اسی جگہ سے آیا تھا، جہاں سے پہلے چار خطوط آئے تھے۔ اس کی تحریر بھی پچھلے خطوط کی تحریر سے مشابہ تھی؛ تحریر کا لہجہ بھی وہی تھا اور املا کی غلطیاں بھی ویسی ہی تھیں؛ کاغذ بھی اسی قسم کا تھا، اور اس میں سے اٹھنے والا تمباکو کا بھپکا بھی ویسا ہی تھا۔

اب پانچ خطوط تھے، پانچ تاریخیں تھیں، پانچ دستخط تھے، اور واحد دستخط کرنے والا تھا۔ ہسپانوی کپتان Don Alvares؛ بدقسمت داشتہ Balizard؛ ڈرامے لکھنے والا شاعر Genflot؛ مزاح نگار Fabantou؛ ان سب کی جگہ ژاندریت ہی ہوتی، اگر ژاندریت نے ہر خط میں اپنا اصل نام ژاندریت ہی لکھ دیا ہوتا۔

ماریوس اس گھر میں کافی عرصے سے مقیم تھا، اور اسے اپنے ان بے حد مفلس پڑوسیوں سے ملنے یا ان پر ایک نظر ہی ڈال لینے کا کوئی موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا، اور جہاں ذہن ہوتا ہے وہیں آنکھ بھی ہوا کرتی ہے۔ کئی بار زینوں پر چڑھتے یا راہداری میں اس کی نظریں ژاندریت کے گھر والوں پر پڑی ہوں گی؛ مگر اس کے لیے وہ محض پیکر ہی تھے؛ اس نے ان پر اس قدر کم توجہ دی تھی کہ پچھلی شام جب بولیوارڈ پر اس کا ژاندریت لڑکیوں سے سامنا ہوا تو ماریوس انھیں پہچان نہیں سکا تھا، اس لیے کہ بظاہر وہ لڑکیاں تھیں؛ اور اس لڑکی نے جو اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی، ماریوس کو جھنجھوڑ دیا تھا؛ نفرت اور ہم دردی کے باوجود اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اسے اور کہیں بھی دیکھا تھا۔

اب اسے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ماریوس سمجھ گیا کہ اس کا پڑوسی، اپنی پریشانی میں فیاض لوگوں کی خیرات پر انحصار کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کہ اس نے ان لوگوں کے پتے حاصل کر لیے ہیں، اور یہ بھی کہ اس نے جعلی ناموں سے ان لوگوں کے نام خط بھی لکھے تھے، جو اس کے نزدیک صاحبانِ ثروت تھے، ترس کھانے والے تھے؛ اور خود کو خطرے میں ڈال کر اس کی بیٹیاں لوگوں کو خطوط پہنچاتی تھیں؛ کہ ان کا باپ اب اس حال کو پہنچ گیا تھا کہ وہ قسمت سے کھیل رہا تھا، حتیٰ کہ اس نے اپنی بیٹیاں بھی داؤ پر لگا دی تھیں؛ پچھلی شام ان کی پرواز کے دوران لڑکیوں کی گھٹی ہوئی سانسیں، ان پر طاری خوف اور ان کی بازاری زبان سن کر ماریوس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بدقسمت مخلوق کسی ناقابلِ تشریح اور افسوس ناک پیشے میں پڑ گئی ہیں، وہی پیشہ جس کے نتیجے میں انسانی سماج اس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ یہ دو بدقسمت

بچیاں اب نہ لڑکیاں رہ گئی ہیں نہ عورتیں؛ بدنصیبی نے ایسی مخلوق پیدا کردی تھی جو بدکار بھی تھی اور معصوم بھی۔

بدقسمت مخلوق، جس کا نہ کوئی نام ہوتا ہے، نہ جنس، نہ عمر؛ جس کے نزدیک اچھائی اور برائی کوئی شے نہیں رہ جاتی ہے؛ جس کے لیے بچپن سے نکل کر بھی، اس دنیا میں کچھ نہیں رہ جاتا ہے؛ نہ آزادی، نہ نیکی، نہ کسی قسم کی ذمے داری۔ وہ نفوس، جو کل پھول تھے، آج مرجھا گئے ہیں، جو سڑکوں پر گر جاتے ہیں، غلاظت میں مل جاتے ہیں، اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی پہیہ انھیں کچل دے۔ اس کے باوجود ماریوس نے اس لڑکی پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کی؛ وہ لڑکی، اپنے عالم بدبختی کے باوجود بھوت پریت کی طرح کمرے میں لہراتی پھر رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی، پھٹی شمیض سرک کر تقریباً اس کی کمر تک آ گئی تھی۔ اس نے کرسیاں ادھر اُدھر کردی تھیں، اور واش روم میں کموڈ پر رکھی اشیائے صفائی بکھیر دی تھیں۔ ماریوس کے کپڑے بھی ادھر اُدھر کردیے تھے، اور کونوں میں نہ جانے کیا تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

"ہیلو!" اس نے کہا "تمھارے پاس آئینہ ہے؟"

اور وہ نوٹنکی میں گائے جانے والے گیتوں کے چنچل اور ناگوار ٹکڑے گنگنانے لگی، گویا وہ بالکل اکیلی تھی، اس کے حلق سے نکلتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز نے جنھیں مغموم بھی بنا دیا تھا۔

اس جفاکش شخصیت کے پیچھے ایک ناقابلِ بیان جبر، جھکن، اور ذرّتی دیکھی جا سکتی تھی۔ گستاخی بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔

اس لڑکی کو کمرے کے اندرون کی روشنی سے خوف زدہ ہو کر کسی پرندے کی طرح جس کا بازو زخمی ہوگیا، کمرے میں ادھر سے ادھر پھڑ پھڑاتے دیکھنے سے زیادہ غم انگیز منظر اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس سماج میں اس قسم کی خوش مزاج اور ضرورت سے زیادہ آزاد طریقوں والی لڑکیاں کتنی پیاری اور کتنی دل فریب بھی ہوتی ہیں۔ جانوروں میں بھی ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ فاختہ کے انڈوں سے نکلنے والا چوزہ فاختہ بننے کے بجائے ماہی خور عقاب بن گیا ہو۔ یہ سارے کمالات صرف انسان ہی میں پائے جاتے ہیں۔

ماریوس سوچتا رہا اور اس نے لڑکی کو جو کچھ کرنا چاہتی تھی کرنے دیا۔

لڑکی اس کی میز کے قریب آئی۔

"اوہ" اس نے کہا، "کتابیں!"

اس کی شفاف آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے کہنا شروع کیا، اور اس

لہجے میں بڑبولے پن کا سا انداز تھا، کوئی انسان جسے نظر انداز نہیں کر سکتا:

"میں پڑھ سکتی ہوں، جی ہاں، میں!" اس نے بڑے شوق سے میز پر کھلی رکھی ایک کتاب اٹھائی اور فر فر پڑھنا شروع کر دیا:

"......جنرل بودوین (Bauduin) کو ہوگوموٹ کے شیٹو پر حملہ کرنے کے احکامات ملے، جو واٹر لو کے میدان کے درمیان واقع تھا جہاں اس بریگیڈ کی پانچ بٹالین موجود تھیں"

لڑکی نے توقف کیا۔

"اوہ، واٹر لو! میں اس کے بارے میں بھی جانتی ہوں۔میرا باپ اس لڑائی میں شریک تھا۔میرا باپ فوج میں کام کر چکا ہے۔اپنے گھر کے اندر ہم لوگ 'بونا پارٹی' ہوتے ہیں، جو واقعی ہم ہیں۔واٹر لو انگریزوں کے خلاف جنگ تھی۔"

اس نے کتاب میز پر واپس رکھ دی، ایک قلم اٹھا لیا اور زور سے کہنا شروع کیا:

"میں تو لکھنا بھی جانتی ہوں۔" لڑکی نے قلم کو دوات میں ڈبوتے ہوئے ماریوس سے کہا، "تم دیکھنا چاہتے ہو؟ دیکھو تمھیں دکھانے کے لیے میں لکھ رہی ہوں۔"

قبل اس کے کہ ماریوس کو کچھ کہنے کا موقع ملتا، اس نے سفید کاغذ کے ایک صفحے پر لکھنا شروع کیا، جو اس کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا:

"پولیس والے آگئے ہیں۔"

اس کے بعد لڑکی نے قلم کو میز پر رکھتے ہوئے کہا:

"اس میں املا اور ہجے کی غلطیاں نہیں ہیں۔خود دیکھ لو۔ہم نے تعلیم حاصل کی ہے، میری بہن، اور میں، دونوں نے۔ہم لوگ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے، جیسے اب دکھائی دیتے ہیں۔ہم ایسے بنائے نہیں گئے تھے۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے توقف کیا، گھور کر ماریوس کی طرف دیکھا، اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگی، اور ایسے لہجے میں کہا جو ہر قسم کے درد اور ترش روئی سے لبریز تھا، "اُف!"

اس کے بعد اس نے خوش دلی سے مندرجہ ذیل مصرعے گنگنانے شروع کر دیے:

"بابا، میں بھوکی ہوں
کھانے کو کچھ نہیں ہے،
ماما، مجھے سردی لگ رہی ہے
پہننے کو کچھ نہیں ہے
Lolotte

کاٹپ
سسکیاں لے
"Jacquot

ابھی یہ مصرعے مشکل سے ختم ہی ہوئے تھے کہ اس نے زور سے کہا:

"موسیو ماریوں! آپ کبھی تھیٹر بھی جاتے ہیں ؟ میں تو جاتی ہوں ۔ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے، جس کی بہت سے فن کاروں سے دوستی ہے، جو کبھی کبھی مجھے تھیٹر کے ٹکٹ لا کر دیتا ہے، مگر مجھے گیلری کی بنچیں اچھی نہیں لگتیں ۔ بہت تنگ اور تکلیف دہ ہوتی ہیں ۔ اکثر وہاں بہت بدتمیز لوگ بھی ہوتے ہیں؛ وہ بھی، جن کے جسم سے بد بو آتی ہے۔"

اس کے بعد، اس نے ماریوں پر غیر معمولی انداز میں تنقیدی نظر ڈالی اور کہا:

"موسیو ماریوں، آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ بہت خوب صورت آدمی ہیں؟"

اور ساتھ ہی، دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں ایسا ہی احساس ہوا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے، اور شرما سے گئے ۔لڑکی ماریوں کی جانب بڑھی، اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا اور بولی، "تم میری پروا نہیں کرتے، مگر میں تمھیں جانتی ہوں، مسٹر ماریوں ۔ ان سیڑھیوں پر میری تم سے ملاقات ہوتی ہے، اور تم اکثر ایک صاحب، فادر مابوف کے ساتھ جاتے ہو جو Austerlitz کی طرف کہیں رہتا ہے؛ میں اس علاقے میں اکثر ٹہلا کرتی ہوں ۔ کیا تم کو اپنے بال اس طرح بکھرائے اچھے لگتے ہیں؟"

اس دوران اس نے اپنی آواز بہت دھیمی کرنے کی کوشش کی تھی، مگر صرف بہت گہری کرنے میں کامیاب ہوئی تھی ۔غرغرے سے لب تک آتے آتے الفاظ آدھے ہو رہے تھے، بالکل اسی طرح جیسے پیانو کے کچھ سُر کبھی کبھی غائب ہو جایا کرتے ہیں۔

ماریوں آہستگی سے پیچھے ہٹا۔

"میڈموزیل!" اس نے بڑے پُرسکون انداز میں کہا "میرے پاس ایک لفافہ ہے میرے خیال میں جو آپ کا ہے ۔اجازت دیجیے کہ میں اسے آپ کو لوٹا دوں ۔" اور اس نے، وہ لفافہ جس میں چار عدد خطوط تھے، اس کی طرف بڑھا دیا۔

لڑکی نے تالی بجائی، اور بلند آواز میں بولی، "ارے واہ! ہم تو اسے ہر جگہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔"

پھر اس نے لفافہ لے لیا، اسے کھولا، اور کچھ اس طرح کہا:

"اوہ، خدایا! میں اور میری بہن نے اس کو کتنا تلاش کیا ہے۔ اچھا، تو وہ تم تھے جسے یہ لفافہ مل گیا تھا۔ بولیوارڈ پر، یہ تمھیں بولیوارڈ پر ملا ہوگا! ہے کہ نہیں؟ جب ہم بھاگے جا رہے تھے، ہم نے اسے گر جانے دیا تھا۔ وہ ہماری بہن تھی، جو اتنی احمق تھی۔ جب ہم گھر پہنچے، تو لفافہ غائب تھا، تلاش کرنے کے باوجود کہیں نہیں ملا۔ اس خوف سے کہ کہیں ہماری پٹائی نہ ہو جائے، اس لیے کہ یہ ایک فضول شے ہے، ہم نے کہہ دیا تھا کہ خطوط متعلقہ لوگوں تک پہنچا دیے گئے ہیں۔ انھوں نے ہماری بات کا اعتبار نہیں کیا۔ یہ بے چارے خط اب مل گئے ہیں۔ اور تم کو یہ کیسے پتا چلا کہ یہ خطوط میرے ہیں؟ ارے، ہاں تحریر سے پہچان لیا ہوگا۔ اچھا، تو کل رات وہ تم ہی تھے، ہم جسے دھکا دیتے ہوئے گزر گئے تھے۔ ہم ٹھیک سے دیکھ نہیں سکے تھے۔ میں نے اپنی بہن سے پوچھا تھا 'کیا یہ شریف آدمی ہے؟' میری بہن نے جواب میں کہا تھا 'میرا خیال ہے کہ یہ شریف آدمی ہے۔'"

اس دوران لڑکی نے وہ درخواست کھول لی تھی جو Saint- Jacquesdu-haut-Pa کلیسا کی مہربان شخصیت اور ایک شریف انسان کے لیے تھی۔

"یہ خط" لڑکی نے کہا "یہ اس بوڑھے آدمی کے لیے تھا جو گرجا گھر جایا کرتا ہے۔ ارے ہاں اس کے گرجا گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں ابھی جا کر یہ خط اسے پہنچادوں گی۔ شاید وہ ناشتے کے لیے ہمیں کچھ دے دے۔"

اس نے ایک بار پھر ہنسنا شروع کر دیا، اور کہا، تمھیں کیا پتا کہ اگر آج ہمیں ناشتا مل گیا تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ پرسوں کا ناشتا ہوگا، کل کا ناشتا ہوگا، اور آج کا ڈنر بھی، سب ایک ساتھ ہوگا۔ اگر تمھیں یقین نہیں تو خدا ہی جانے ہمارا کیا حال ہوگا، مجھے بھی رونیں گے!"

اس پر، ماریوس کو اس لڑکی کا اس کے پاس آنا یاد آ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، مگر اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

نوجوان لڑکی کہے جا رہی تھی، گویا اسے ماریوس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔

"میں اکثر شام کو باہر نکلتی ہوں۔ کبھی تو میں گھر واپس بھی نہیں جاتی۔ پچھلے سال سردی کے موسم میں، جب تک ہم یہاں نہیں آئے تھے، ہم پلوں کی محرابوں کے نیچے رہتے تھے۔ سردی سے جم جانے سے بچنے کے لیے ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے تھے۔ میری بہن رویا کرتی تھی۔ کتنا بھیانک تھا وہ سردی کا موسم۔ جب میرا جی چاہا تھا کہ دریا میں کود کر

جان دے دوں، تو میں نے خود سے کہا تھا، 'نہیں، پانی بہت ٹھنڈا ہوگا۔' میں جب چاہتی ہوں اکیلی ہی جاتی ہوں۔ کبھی تو میں کسی گڑھے میں ہی سو جاتی ہوں۔ تمھیں پتا ہے، رات کے وقت، جب میں بولیوارڈ پر چلتی ہوں، تو مجھے یہ دورویہ درخت کھانے کے کانٹے کی طرح نظر آتے ہیں؛ سارے گھر مجھے سیاہ اور اتنے بڑے نظر آتے ہیں جیسے نا تر ے ڈیم'۔ مجھے سفید دیواریں دریا جیسی نظر آنے لگتی ہیں، اور میں خود سے کہنے لگتی ہوں: 'اس طرف، پانی کیوں ہے؟' ستارے لالٹین میں جلتے ہوئے چراغ کی مانند ہیں؛ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے دھواں بھی نکلتا ہے، اور ہوا اسے اڑا لے جاتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، گویا گھوڑے میرے کان میں اپنی سانسیں نکال رہے ہوں! اگرچہ وہ رات کا وقت ہوتا ہے، مجھے باجوں کی اور بنائی کرنے والے مشینوں کی آوازیں آتی ہیں، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے گویا لوگ مجھ پر پتھر پھینک رہے ہیں، میں نہ معلوم کدھر بھاگ جاتی ہوں۔ ہر شے مجھے گھومتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب آدمی بھوکا ہو تو اسے ہر چیز عجیب سی دکھائی دینے لگتی ہے۔"

اور لڑکی ماریوس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

بار بار جیب تلاش کرنے پر، بالآخر ماریوس کو پانچ فرانک اور سولہ سو مل ہی گئے۔ اس وقت دنیا بھر میں اس کا پورا اثاثہ بس یہی تھا۔ "آج کا ڈنر تو ہو ہی جائے گا۔" اس نے سوچا "کل ڈنر بھی ہو جائے گا، بقیہ کیا ہوگا، دیکھا جائے گا۔" اس نے سولہ سو' پاس رکھ لیے اور پانچ فرانک لڑکی کے حوالے کر دیے۔

لڑکی نے سکہ لے لیا۔

"اچھا!" لڑکی نے کہا، "سورج چمک رہا ہے۔" اور اس طرح، گویا، اس کے ذہن میں بازاری زبان کا برفانی طوفان پھیلتا جا رہا تھا، وہ کہتی گئی:

"پانچ فرانک! چمک دار سکہ! اس پر بادشاہ کی شبیہ— ہے کہ نہیں! تم واقعی خوش مزاج ہو۔ میں تمھاری نوکرانی ہوں۔ دوستوں کے لیے، واہ وا! دو دن کی وائن اور گوشت! اور اسٹیو! اب ہم شاہی دعوت اُڑائیں گے۔ خوب پیٹ بھر کے کھائیں گے۔"

لڑکی نے اپنی شمیص گھٹنے تک اُٹھائی، ماریوس کے سامنے خم ہوئی، اس کے بعد اپنے ہاتھ سے ایک آشنا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف یہ کہتی ہوئی چلی گئی، "صبح بخیر، جناب والا! یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب میں جاتی ہوں، اپنے بوڑھے آدمی کی تلاش میں۔"

جاتے ہوئے، اسے کموڈ پر رکھا ہوا روٹی کا ایک ٹکڑا نظر آیا، جو گرد میں اٹا تھا اور اس میں بھنوی بھی لگی تھی؛ لڑکی اس کی طرف لپکی، اور بڑ بڑ کرتی، اس کو کھانے لگی:

"بہت اچھی ہے؛ سخت ہے؛ میرے دانت توڑے ڈال رہی ہے۔"

اس کے بعد لڑکی وہاں سے چلی گئی۔

۞

خداداد جھروکا

ماریوس اگرچہ پانچ برس افلاس، محرومی، حتیٰ کہ سخت مشکل میں رہ چکا تھا، پھر بھی اسے اندازہ تھا کہ حقیقی بدنصیبی کیا ہوتی ہے۔ اصل بدنصیبی اسے نظر آئی تھی۔ ایک آسیب سا تھا جو اس کی نظروں کے سامنے سے گزرا تھا۔ وہ جس نے صرف کسی مرد کی بدنصیبی دیکھی ہو، کچھ نہیں دیکھا۔ عورت کی بدنصیبی وہ بدنصیبی ہوتی ہے جسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ وہ جس نے کسی عورت کی بدنصیبی نہ دیکھی ہو، اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اسے بچے کی بدنصیبی دیکھنا بھی ضروری ہے۔

جو شخص اپنی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے، اس وقت اس کے سارے ذرائع بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہے ان بے یار و مددگار لوگوں پر جو اطراف ہوتے ہیں۔ کام، اُجرت، روٹی، آگ، ہمت، نیک نیتی، ان کے لیے سب ایک ساتھ ناکام ہو جاتے ہیں۔ سوائے اندرون کی روشنی کے، دن کی روشنی بھی بجھی بجھی سی محسوس ہونے لگتی ہے: اس قسم کی پرچھائیوں میں ہی آدمی کو عورت اور بچے کی کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے جو شدت کے ساتھ، ان کو رُسوائی کے طرف جھکا دیتی ہیں۔

تب ہی ساری ذہنیتیں ممکن ہوتی ہیں۔ مایوسی کے اطراف کم زور رُکاوٹیں ہوا کرتی ہیں، جو سب بدی میں یا جرم کی صورت میں ہٹ جاتی ہیں۔

صحت، نوجوانی، عزت، نوجوان جسم کی تمام پوشیدہ نزاکتیں، دل، بکارت، انکسار، نفس کی جلد، سب کچھ ختم ہوتے ہوئے ذرائع کے باعث سبب رسوائی بن جاتے ہیں۔ باپ، مائیں، بھائی، بہنیں، مرد، عورت، لڑکیاں، جنسی بے راہ روی، رشتے، عمریں، بدنامیاں اور معصومیتیں سب کچھ اکٹھے ہو کر معدنیات کی بناوٹوں کی طرح یک جان ہو جاتے ہیں۔

سب ایک قسم کی مقدر کی اس جھونپڑی میں پیٹھ سے پیٹھ ملا کر اکڑوں بیٹھ جاتے

ہیں۔ان کی غم زدہ نظریں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اُف، یہ بد قسمت! کتنے بے رنگ ہوتے ہیں یہ لوگ۔ کتنے سرد ہو جاتے ہیں یہ لوگ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ ایسے سیاروں میں رہتے ہیں جو ہمارے کرے سے بھی زیادہ سورج سے دور ہوتے ہیں۔

ماریوس کے نزدیک وہ نوجوان لڑکی اداس پرچھائیوں کی طرف سے ایک قسم کی پیغام رساں تھی۔اس نے اندھیرے کے ڈراؤنے پہلوؤں کو اجاگر کر دیا تھا۔

ان جذبات اور محویت کی بنا پر جنھوں نے اس دن تک اسے اپنے پڑوسیوں پر ایک نظر ڈالنے سے باز رکھا تھا، ماریوس نے تقریباً اپنی سرزنش کر ڈالی۔ان لوگوں کے کرایے کی ادائگی ایک تکنیکی عمل تھا جو کسی سے بھی ہو سکتا تھا؛ مگر اسے، یعنی ماریوس کو، اس سے بہتر کی توقع تھی۔ کیا؟ ان راندہ لوگوں اور اس کے درمیان صرف ایک دیوار ہی تو تھی جو بقیہ دنیا کے بے رنگ پھیکے حصے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے زندگی گزار رہے تھے؛ اس کی اور ان لوگوں کی کہنیاں آپس میں ٹکراتی تھیں؛ ان لوگوں کے لیے وہ انسانی سلسلے کی آخری کڑی تھا جسے وہ چھو سکتے تھے؛ ماریوس ان کی آوازیں سن سکتا تھا، یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں اور موت کے درمیان ہونے والی جدوجہد کی کھڑکھڑاہٹ سن سکتا تھا، مگر اس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ ہر دن، ہر لمحے، وہ دیوار کے اس پار انھیں آتے جاتے اور بولتے سنتا رہتا تھا، مگر اس نے ان کی جانب اپنے کان نہیں دھرے تھے۔اور ان الفاظ میں کراہیں پوشیدہ تھیں، جنھیں اس نے سنا بھی نہیں تھا، کہ اس کے خیالات کہیں اور ہی ہوا کرتے تھے، خوابوں میں، ناممکن تابندگیوں میں، ہوا میں تحلیل محبتوں میں، غلط باتوں میں الجھے ہوتے تھے؛ ہمہ وقت، یسوع مسیح کے روپ میں، انسانی مخلوقات، اس کے بھائی، اس کے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی تڑپ رہے تھے! بلکہ یہ تو ان کی بدنصیبی کا حصہ تھا، جو ان کے حالات کو سنگین کرتا رہتا تھا۔کوئی کم مہیب اور زیادہ متوجہ، عام اور متخیر انسان بھی ان کا پڑوسی ہوتا تو اس پر بھی ان کی تنگ دستی عیاں ہو جاتی؛ اسے بھی ان کی تکلیف کے اشارے نظر آ گئے ہوتے؛ ان کو سہارا ہو گیا ہوتا اور ان کو نجات مل گئی ہوتی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ بظاہر بدعنوان اور بدکردار، نہایت پست صفت، حتیٰ کہ مردہ صورت نظر آتے تھے، مگر وہ جو کم رتبہ ہوئے بغیر ہی تباہ ہو جائیں، کم ہی ہوا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ایسا بھی ایک مقام ہوتا ہے جہاں بدقسمت اور بدنام ایک لفظِ واحد میں، ایک مہلک لفظ، بدنصیبی، میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔اس میں قصور کس کا ہوتا ہے؟ اور پھر، کیا ہونے والی تباہی کے تناسب سے فیاضی کو زیادہ عمیق نہیں ہونا چاہیے؟

اس اخلاقی سبق کو پڑھتے ہوئے، ایسے لمحات آئے تھے جن میں ماریوس، نیک دل

انسانوں کی طرح، خود ہی اپنا معلم اور مصلح بن گیا تھا، اور اس نے اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ مطعون بھی کیا تھا، اس دیوار کو اس طرح تکتا رہتا تھا جس نے اسے ثاندریت خاندان سے علاحدہ کر دیا تھا، گویا اس کی رحم دل نظریں اس دیوار کو چھید کر گزر سکتی تھیں اور ان بدنصیب لوگوں کی دل جوئی کر سکتی تھیں۔ وہ دیوار کیا تھی، پلستر کی ایک تہہ تھی جس کو شہتیروں نے سہار رکھا تھا، اور جیسا کہ قاری کو ابھی معلوم ہوا ہے، اس دیوار میں سے تمام آوازیں گزر سکتی تھیں اور صاف پہچانی جا سکتی تھیں۔ صرف ماریوس جیسا ہمہ وقت خواب دیکھنے والا انسان ہی انھیں پہچاننے سے معذور رہ سکتا تھا۔ دیوار پر کاغذ چسپاں نہیں کیا گیا تھا، نہ ثاندریت خاندان کی جانب اور نہ ماریوس کی جانب؛ دیوار کی بھدی تعمیر صاف نظر آتی تھی۔ اب ماریوس نے تقسیم کرنے والی دیوار کا غیر ارادی طور پر معائنہ شروع کیا، جیسے کبھی کبھی خیالات اور محویت بھی معائنہ کر لیتی ہے۔ اچانک ماریوس اچھل پڑا؛ اسے دیوار میں، سقف کے بالکل قریب، ایک تکونا سوراخ نظر آ گیا تھا۔ دراصل، اس سوراخ کی جگہ کا پلستر غائب تھا، یعنی کموڈ پر کھڑے ہو کر اس سوراخ سے ثاندریت خاندان کی دو چھتی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ دردمندی کا اپنا بھی جستجو کا طریقہ ہوا کرتا ہے، اور ہونا بھی چاہیے۔ امداد پہنچانے کے خیال سے نادار کی طرح بدقسمتی کو چھپ کر دیکھنے کی اجازت بھی ہوا کرتی ہے۔

"آؤ، اندازہ کرتے ہیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟" ماریوس نے سوچا، "اور ان کے حالات کیسے ہیں؟"

وہ کموڈ پر چڑھ گیا، اس سوراخ سے اپنی آنکھ لگائی اور اس پار دیکھنے لگا۔

۞

وحشی انسانوں کا غار

جنگلوں کی طرح شہروں میں بھی ایسے غار ہوتے ہیں جن میں بد معاش ترین اور بھیانک مخلوقات پناہ لیتی ہیں؛ شہروں کے غاروں میں صرف خوں خوار، غلیظ اور کم رتبہ انسان رہتے ہیں؛ جنگلوں کے غاروں میں رہنے والی مخلوقات کو خوں خوار، درندے اور عالی شان، بلکہ خوب صورت بھی کہا جا سکتا ہے۔ کسی ایک جھونپڑے کا دوسرے سے موازنہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ درندوں کے غار انسانوں کے تنگ و تاریک مکانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

ماریوس اب جسے دیکھ رہا تھا وہ ایک تنگ و تاریک مکان تھا۔

ماریوس مفلس تھا، اور اس کا کمرہ افلاس کا شکار تھا، مگر چوں کہ اس کا افلاس شریفانہ تھا، اس کا خانہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ اب وہ جگہ، جس پر اس کی نظریں گڑی ہوئی تھیں پست درجہ، گندی، بد بو دار، وبائی، کم رتبہ اور ناند کی مانند تھی۔ فرنیچر کی جگہ پیال سے بنی ایک کرسی، ایک کم زور سی میز، دو چار برتن، اور چار کونوں میں سے دو کونوں میں لکڑی کے ناقابلِ بیان تختے نما پلنگ رکھے ہوئے تھے۔ روشنی صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی سے آتی تھی، پردوں کی جگہ جن پر مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ اس کھڑکی سے بس اتنی روشنی آتی تھی کہ اس میں انسان کا چہرہ بھوت جیسا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دیواریں کسی کوڑھی کی جلد کی طرح تھیں، جن پر لگے نشانات مندمل زخموں کی طرح، ایسے چہرے کی طرح نظر آتے تھے جسے کسی بھیانک بیماری نے آلودہ کر دیا ہو؛ ان میں سے مکروہ قسم کی نمی ٹپکتی نظر آتی تھی۔ ان پر کوئلوں سے بنائے گئے بیہودہ قسم کے نقوش بھی دیکھے جا سکتے تھے۔

جس حصے میں ماریوس رہتا تھا اس کا فرش ٹوٹا پھوٹا، اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اس کے

فرش پر نہ ٹائل لگے تھے نہ تختے ۔اس پر چلنے والوں کے قدم براہِ راست قدیم پلستر پر پڑتے تھے، جو ایک عرصے سے مسلسل پڑتے ہوئے پیروں کے دباؤ سے کالا پڑ گیا تھا۔ اس ناہموار فرش پر، جس پر گرد کی تہہ چڑھی نظر آتی تھی، اور جس کی پاک دامنی کی گواہ کونے میں رکھی ایک جھاڑو تھی، جس کے اطراف پرانے جوتوں،موزوں اور گندے کپڑوں کا ایک جھرمٹ تھا؛ مگر اس کمرے میں ایک آتش دان بھی تھا، اسی لیے اس کا کرایہ چالیس فرانک سالانہ تھا۔اس آتش دان کے آس پاس ہر قسم کی اشیا تھیں؛ آگ کو کریدنے والا پیتل کا ایک چمٹا، ایک برتن، ٹوٹے پھوٹے تختے، کیلوں پر لٹکے چیتھڑے، پرندوں کا ایک پنجرا، کچھ راکھ، حتیٰ کی ایک چھوٹی سے آگ بھی موجود تھی ۔اس آگ میں پڑی دو لکڑیاں غمگین انداز میں دھواں دے رہی تھیں۔

جس بات نے عمارت کے اس حصے کی خوفناکی میں اضافہ کر دیا تھا وہ اس کی وسعت تھی ۔اس میں طرح طرح کے نکلے ہوئے کونے، زاویے، سیاہ سوراخ، سقف کے دونوں جانب کا نچلا ابھرا جس میں کئی جگہ ابھار تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کونوں میں جدھر کوئی نہیں جاتا تھا ،انسانی مٹھی کے برابر مکڑیاں، پیروں کے برابر لکڑی خور جراثیم، اور کون جانے، شاید کوئی عفریت نما انسان بھی چھپا ہوتا ہو۔

ایک بستر دروازے کے قریب تھا، دوسرا کھڑکی کے قریب۔ دونوں کے ایک ایک سرے آتش دان سے ملتے تھے، اور دوسرے سرے ماریوس کے کمرے کے سامنے تھے۔ ماریوس جس سوراخ سے جھانک رہا تھا اس کے قریب کونے کی دیوار پر کیل سے لٹکے ایک سیاہ فریم میں لگی ایک تصویر تھی جس پر The Dream کا عنوان کندہ تھا۔اس تصویر میں ایک عورت سو رہی تھی، ایک بچہ تھا وہ بھی سو رہا تھا، بچہ عورت کی گود میں تھا؛ بادلوں میں ایک عقاب، عقاب کی منقار میں ایک تاج، عورت تاج کو بچے کے سر سے پرے کرتی ہوئی،اس طرح کہ بچہ جاگ نہ اُٹھے؛ پس منظر میں، نپولین اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ نیلے رنگ کے ستون کے سہارے کھڑا تھا جس کے اوپر طغرے کے انداز میں مندرجہ ذیل حروف لکھے ہوئے تھے:

Maringo
Austerlits
Iena
Wagramme
Elot

فریم کے نیچے، دیوار سے ٹکا، ایک مربع چوبی تختہ رکھا تھا۔ یہ تختہ بھی کسی تصویر کے

فریم جیسا تھا جس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا، جس کا شیشہ نکلا ہوا تھا اور فریم دیوار میں دوبارہ ٹانگے جانے کا منتظر تھا۔

میز کے قریب، جس پر ماریوس کو ایک قلم، دوات، اور کاغذ رکھا دکھائی دیا تھا، ایک آدمی، جس کی عمر اندازاً ساٹھ برس رہی ہوگی، چھوٹے سے قد کا، دبلا پتلا، پریشان حال، چالاک، ظالم اور بے چین، آدمی بیٹھا تھا، جو صورت سے غنڈا نظر آتا تھا۔

اگر [مشہور سوئٹس شاعر اور قیافہ شناس] Lavater نے اس کے چہرے کا بہ غور مطالعہ کیا ہوتا تو اسے نظر آتا، گویا ایک مردار خور گدھ اپنے ساتھی سمیت، پنجوں میں شکار دبائے ہوئے ہے اور دونوں اس ناجائز شکار سے فیض یاب ہو رہے ہیں؛ عیار شکاری، شکار شدہ پرندے کو بے غیرت، اور شکار شدہ پرندہ عیار شکاری کو خوف ناک بنا رہا ہے۔

اس آدمی کی لمبی سے ڈاڑھی تھی۔ زنانی شمیس میں ملبوس تھا جس میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ، برہنہ بازو اور سفید بال نظر آرہے تھے۔ شمیس کے نیچے کیچڑ بھرا پتلون اور بوٹ جن سے باہر نکلا ہوا اس کے پاؤں کا پنجہ نظر آ رہا تھا۔

منہ سے لگے پائپ سے وہ تمباکو نوشی کر رہا تھا۔ گھر میں روٹی نہیں تھی، مگر تمباکو تھا۔

شاید، وہ ویسے ہی مزید کچھ خط لکھ رہا تھا جیسے ماریوس کو مل گئے تھے۔

میز کے کونے پر ایک قدیم، خستہ حال، سُرخ جلد والی، رومانس کے عنوان کی، ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ کتاب کی جلد پر جہازی حروف میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی:

''خدا، بادشاہ، عزت اور خواتین؛

مصنف Ducray Duminil

مطبوعہ 1814ء''

وہ آدمی جو لکھتا اسے زور زور سے پڑھتا بھی جاتا تھا۔ ماریوس اس کے الفاظ سن رہا تھا۔

''اس وقت بھی مساوات نہیں ہوتی، جب آپ مر چکے ہوتے ہیں۔ ذرا اس پر نظر کیجیے۔ وہ تمام عظیم لوگ جو دولت مند ہیں، اوپر ببول کے درختوں والی گلی میں ہیں جس کا راستہ پختہ ہے۔ وہ گاڑی میں سوار ہو کر وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ چھوٹے لوگ، مفلس لوگ، بدقسمت لوگ، ان کے بارے میں کیا کہا جائے؟ ان کو نیچے ڈال دیا جاتا ہے، نم جگہوں پر، جہاں گھٹنوں تک کیچڑ ہوتا ہے۔ ان کو وہاں اس لیے ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وہ جلد ختم ہو جائیں۔ آپ کیچڑ میں دھنسے بغیر ان کو دیکھنے بھی نہیں جا سکتے۔''

اس نے کچھ دیر توقف کیا، میز پر مکّے مارے، اور دانت پیستے ہوئے چیخ کر کہا:
"اُف! اب میں پوری دنیا کو کھا سکتا ہوں۔"
ایک موٹی سی عورت، چالیس برس کی، یا سو برس کی، آتش دان کے قریب اپنی برہنہ ایڑیوں کے بل پر اکڑوں بیٹھی تھی۔
وہ بھی صرف قمیص اور بنا ہوا جیکٹ کوٹ پہنے ہوئے تھی، جس میں جگہ جگہ پرانے کپڑے کے پیوند لگے تھے۔ موٹے کپڑے کا ایپرن اس کے آدھے جیکٹ کوٹ کو چھپائے ہوئے تھا۔ اگر چہ یہ عورت دہری ہو کر بیٹھی تھی، با آسانی دیکھا جا سکتا تھا کہ وہ لمبے قد کی تھی۔ اپنے شوہر کے قریب، وہ دیوتی سی لگتی تھی۔ بُرجی مائل سنہرے ڈراونے بالوں کو، جن میں سفیدی آ چلی تھی، اپنے سپاٹ ناخنوں والے بڑے چمک دار ہاتھوں سے بار بار پیچھے کی طرف جھٹک رہی تھی۔
عورت کے قریب، فرش پر رکھی، کھلی ہوئی ایک کتاب تھی جس کا بھی وہی رومانس والا عنوان تھا۔ یہ شاید اسی کتاب کی دوسری جلد تھی۔
تختوں کے بستر پر ماریوس کو ایک مدقوق لڑکی دکھائی دی، جو نیم برہنہ تھی، اس کے پاؤں گھڑی کے پنڈولم کی طرح جھول رہے تھے، جو، نہ سن رہی تھی، نہ دیکھ رہی نہ زندہ معلوم ہوتی تھی۔
اس میں شبہ نہیں کہ وہ اسی لڑکی کی چھوٹی بہن تھی جو اس کے کمرے میں آئی تھی۔
اس کی عمر گیارہ کی رہی ہوگی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دراصل وہ چودہ برس کی تھی۔ یہ وہی بچی تھی جس نے پچھلے شام بولیوارڈ پر کہا تھا، "میں بھاگ گئی، بھاگ گئی، بھاگ گئی تھی۔"
وہ ان لاغر قسم کی لڑکیوں میں سے تھی جو کافی عرصے تک پس ماندہ رہتیں، اور اچانک تیزی سے بڑھنے لگتی ہے۔ یہ تنگ دستی ہوتی ہے جو ایسے غم انگیز انسانی پودے پیدا کرتی ہے۔ ان مخلوقات کا نہ بچپنا ہوتا ہے نہ جوانی۔ پندرہ برس کی عمر میں بارہ کی دکھائی دیتی ہیں، اور سولہ برس میں بیس کی نظر آتی ہیں۔ آج کی چھوٹی سی لڑکی، کل کی عورت۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لڑکیاں زندگی کے سفر کو تیزی سے طے کرنے کے لیے لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگتی ہیں۔
اس لمحے وہ بالکل بچی جیسی نظر آ رہی تھی۔
اس گھرانے میں کام جیسی شے کا کوئی سراغ نہیں ملا؛ نہ کوئی دست کاری، نہ کاتنے کا پہیہ، نہ کوئی اوزار۔ ایک کونے میں کچھ مشکوک قسم کا لوہاری کا سامان پڑا تھا۔ ایسی بے حسی کا عالم تھا جو مایوسی کے بعد، اور موت کی اذیت سے پہلے ہوا کرتی ہے۔
کافی دیر تک ماریوس اس غم زدہ حجرے کے اندرون کو دیکھتا رہا، جو کسی مزار کے

اندرون سے بھی زیادہ خوف ناک تھا، اس لیے کہ اس میں انسانی روح پھڑ پھڑاتی اور زندگی دھڑکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ منزل، وہ حجرہ، وہ پست ماحول جہاں کچھ کنگال، بد نصیب سماجی عمارت کی پست ترین منزل میں رینگتے پھر رہے تھے، واقعتاً کوئی قبر یا مزار نہیں، صرف ایک بغلی کمرہ تھا؛ مگر چوں کہ دولت مند لوگ اپنے محلوں کے داخلے کے مقام کی زینت پر بہت توجہ دیتے ہیں، ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا موت، جو براہِ راست ان کے پہلو بہ پہلو کھڑی نظر آ رہی تھی، اس ڈیوڑھی میں اپنی بدترین بد نصیبی لیے موجود تھی۔

وہ آدمی پُرسکون تھا؛ اس نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا؛ نوجوان لڑکی سانس لیتی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بس کاغذ پر چلتے قلم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اپنی تحریر کو روکے بغیر، وہ آدمی بڑ بڑا رہا تھا۔ ''بدتمیز! بدتمیز! یہاں ہر فرد بدتمیز ہے!''

اس سلیمانی آواز کے اتار چڑھاؤ نے بالآخر عورت کے منہ سے ایک آہ خارج کر دی۔

''صبر کرو، پیارے دوست!'' عورت نے کہا، ''اپنے آپ کو اذیت نہ دو، میری جان۔ یہاں کون ہے جو ان لوگوں کو تم سے بہتر خطوط لکھ سکتا ہے، میرے سرتاج۔''

ٹھنڈ کی طرح بد نصیبی میں بھی جسم ایک دوسرے سے لپٹ جایا کرتے ہیں، مگر دل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اس عورت کے اندر کی محبت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس آدمی سے محبت کرتی ہوگی؛ مگر شاید روزانہ کی ایک دوسرے کی سرزنش جو سب پر بھاری پڑ رہی تھی، اب ختم ہو چکی تھی۔ اس کے اندر اپنے شوہر کی محبت کی راکھ کے سوا کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ پھر بھی، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، اس میں پچکارنے والا لہجہ ابھی باقی رہ گیا تھا۔ عورت کا منہ اس کو ''میری جان، پیارے دوست، میرے اچھے آدمی'' وغیرہ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جب کہ اس کا دل بالکل خاموش تھا۔

آدمی نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔

۞

حکمتِ عملی اور جوڑ توڑ

منظر دیکھنے والے اس سوراخ سے نظارہ کرنے کے بعد اپنے سینے پر بوجھ لیے ماریوں اترنے ہی والا تھا کہ ایک آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا، اور وہ اس مچان پر جما کھڑا رہا۔

حجرے کا دروازہ اچانک کھل گیا تھا۔ سب سے بڑی لڑکی ڈیوڑھی پر وارد ہوئی۔ اس پیروں میں ایک بڑا سا بد ہیئت مردانہ جوتا تھا جس پر کیچڑ کے نشانات تھے، جو اس کے سُرخ ٹخنوں تک پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک پرانا چوغہ پہنے ہوئے تھی جو تار تار ہو رہا تھا۔ ماریوں نے ایک گھنٹا قبل اس کے جسم پر یہ چوغہ نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے اسے دروازے کے قریب ٹانگ دیا تھا، تا کہ وہ اور بھی قابلِ رحم دکھائی دے۔ داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا؛ سانس لینے کے لیے ایک لمحہ رُکی؛ اس لیے کہ اس کے سینے میں سانس سما نہیں رہی تھی۔ اس نے فاتحانہ انداز میں اور خوش ہوکر اعلان کیا، ''وہ آرہا ہے!''

باپ نے مڑ کر اس پر نظر کی، عورت نے بھی اپنا سر گھمایا؛ بہن اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔''

''کون آرہا ہے؟'' باپ نے جواب طلب کیا۔

''وہی شریف آدمی!''

''فیاض آدمی؟''

''ہاں۔''

''Saint-Jacques کے گرجا گھر والا؟''

''ہاں۔''

''وہی پرانا ساتھی؟''

"ہاں۔"

"اور وہ آ رہا ہے؟"

"وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔"

"تمھیں یقین ہے؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"واقعی، وہ آ رہا ہے؟"

"ہاں۔"

"خچر گاڑی میں، اور ساتھ چاندی!"

یہ کہہ کر باپ کھڑا ہو گیا۔

"تمھیں اس بات کا یقین کیسے ہو گیا؟ اگر وہ خچر گاڑی میں آ رہا ہے تو تم اس سے پہلے کیسے پہنچ گئیں؟ کم از کم تم نے اسے ہمارا پتا تو بتا دیا ہوگا؟ کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ ہمارا دروازہ راہداری کا آخری دروازہ ہے، دائیں جانب والا؟ اگر اس نے غلطی نہ کی تو!— تو، وہ تمھیں گرجا گھر میں ملا تھا؟ کیا اس نے میرا خط پڑھ لیا تھا؟ اس نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"تا، تا، تا—" لڑکی نے جواب میں کہا "تم تو بالکل چڑھتے ہی آ رہے ہو۔ سنو!— میں گرجا گھر میں داخل ہوئی تو معمول کے مطابق وہ اپنے مقام پر بیٹھا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی تکریم کی اور خط اس کے حوالے کر دیا؛ اس نے خط پڑھا اور مجھ سے کہا، 'بچی! تم کہاں رہتی ہو؟' میں نے کہا، 'موسیو، میں آپ کو راستہ دکھاؤں گی۔' اس نے کہا، 'نہیں تم مجھے پتا بتا دو، میری بیٹی کو کچھ خریداری کرنی ہے۔ میں سواری لے لوں گا اور تمھارے پہنچنے کے وقت میں بھی پہنچ جاؤں گا۔' میں نے اسے پتا دے دیا۔ جب میں نے گھر کا نام لیا تو وہ حیران ہو گیا، ایک لمحے کے لیے توقف کیا، اس کے بعد کہا 'کوئی بات نہیں، میں آ جاؤں گا۔' جب عبادت ختم ہو گئی، تو میں نے اسے اپنی بیٹی کے ساتھ گرجا گھر سے باہر جاتے دیکھا، اور میں نے اسے ایک سواری میں بیٹھتے بھی دیکھا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ راہداری کا آخری والا دروازہ ہمارا دروازہ ہے، دائیں جانب۔"

"اور— تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ وہ آئے گا؟"

"میں نے ابھی خچر گاڑی کو Petit-Banquier اسٹریٹ میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اسی وجہ سے تو میں دوڑتی ہوئی آئی ہوں۔"

"تم کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ وہی فچر گاڑی ہے؟"

"اس لیے کہ میں نے وہیں اس گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تھا۔"

"کیا نمبر تھا؟"

"چار سو چالیس"

"اچھا!— تم بڑی چالاک لڑکی ہو۔"

لڑکی نے اپنے باپ کی طرف فاخرانہ انداز میں دیکھا، اور اسے اپنا جوتا دکھایا، جو وہ پہنے ہوئے تھی، "چالاک لڑکی! شاید اگر میں تمھیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ اب میں یہ جوتا نہیں پہنوں گی؛ اپنی صحت کے خیال سے، اور صفائی کے خیال سے۔ میں نے آج تک ایسا تکلیف دہ جوتا نہیں دیکھا جو کیچڑ میں بھی بھد بھد، اور کچھ کچھ کرتا ہو۔ میں ننگے پاؤں چلنا زیادہ پسند کروں گی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" باپ نے کہا، نرم لہجے میں جو لڑکی کی بدتہذیبی کے بالکل برعکس تھا، "مگر اب تمھیں گرجا گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس لیے غریب لوگوں کے جوتے بھی تو یہی کرتے ہوں گے، مگر خدا کے گھر میں ننگے پاؤں نہیں جایا جاتا۔" اس نے تلخی سے اضافہ کیا۔

پھر وہ اپنے موضوع پر واپس ہوا۔ "تو تمھیں یقین ہے کہ وہ آئے گا۔"

"وہ میری ایڑیوں کا تعاقب کر رہا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس کے خد و خال میں ایک طرح کی چمک سی آ گئی تھی۔

"بیگم!" اس نے بلند آواز میں کہا، "تم سن رہی ہو، وہ فیاض آیا چاہتا ہے۔ اب آگ بجھا دو۔"

مدہوش ماں اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔

قلابازی کی سی پھرتی سے باپ نے ٹوٹی ہوئی ناک والا جگ اٹھایا جو چمنی کے اوپر رکھا تھا، اور جلتی ہوئی لکڑیوں پر پانی ڈال دیا۔

اس کے بعد اپنی بڑی لڑکی سے کہا، "سن، کرسی پر سے پیال ہٹا دے۔"

بچی سمجھی نہیں۔

اس نے خود ہی کرسی پکڑی اور ایک ٹھوکر سے اسے نشست سے محروم کر دیا۔ اس کا پیر کرسی کے بیچ خلا میں سے گزر گیا۔

پاؤں نکالتے ہوئے، اس نے بیٹی سے پوچھا، "کیا تمھیں سردی لگ رہی ہے؟"

"بہت۔ باہر برف پڑ رہی۔"

باپ اپنی چھوٹی بیٹی سے مخاطب ہوا جو کھڑکی کے قریب پلنگ پر بیٹھی تھی، اور گرج دار آواز میں کہا، ''جلد کر پلنگ سے اتر، کاہل کہیں کی۔ تو کبھی کچھ کرے گی بھی۔ کھڑکی کا شیشہ توڑ دے۔''

لڑکی لرز کر پلنگ سے اتر گئی۔

''شیشہ توڑ دے۔'' باپ نے اپنا حکم دہرایا۔

بچی حیران پریشان کھڑی رہی۔

''سنتی ہے کہ نہیں۔'' باپ نے اپنا حکم دہرایا، ''میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دے۔''

بچی ایک قسم کی خوف زدہ فرماں برداری سے، پنجوں کے بل آگے بڑھی اور کھڑکی کے ایک شیشے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ شیشہ ٹوٹا اور کھڑ کھڑا کر گر گیا۔

''ٹھیک۔'' باپ نے کہا۔

اس وقت وہ بہت سخت اور بے ربط ہو رہا تھا۔ اس نے حجرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کے انداز کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ ایک جنرل جنگ شروع ہونے قبل آخری تیاریاں کر رہا ہے۔

ماں، جس نے اب تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا، کھڑی ہو گئی اور اپنے مدہوش دھیمے اور ناتواں لہجے میں مطالبہ کیا، جس کے الفاظ کسی منجمد سی کیفیت سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔

''تم کیا کرنا چاہ رہے ہو، میری جان؟''

''بستر میں واپس جاؤ۔'' شوہر نے جواب میں حکم دیا۔

اس کے لہجے میں غور و فکر کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ لڑکیوں کی ماں نے فرماں برداری کی، اور کپڑے کے تختوں سے بنے بستر میں زور سے گر پڑی۔

اس دوران، ایک کونے سے سسکی کی آواز سنائی دی۔

''اب کیا ہوا ہے؟'' باپ نے چیخ کر کہا۔

چھوٹی لڑکی نے، کونا چھوڑے بغیر جہاں وہ دبکی ہوئی تھی، اپنا ہاتھ دکھایا جس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ توڑنے میں وہ زخمی ہو گئی تھی؛ لڑکی اپنی ماں کے بستر کے قریب گئی اور آہستہ آہستہ سسک کر رونے لگی۔

''ذرا دیکھو تو، تم کیسی احمقانہ حرکتیں کرتے ہو۔ تمھارے لیے شیشہ توڑتے ہوئے اس نے خود کو زخمی کر لیا ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔'' اس آدمی نے کہا، ''مجھے اس کی توقع تھی۔''

''کیا؟ یہ اور بھی اچھا ہوا ہے؟'' بیوی نے پلٹ کر پوچھا۔
''شانتی!'' باپ نے جواب دیا، ''اب میں پریس کی آزادی سلب کر رہا ہوں''
اس کے بعد اپنی شمیص میں سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر ایک پٹی بنائی جس سے بچی کے خون ریز زخم کو باندھ دیا۔
اس کے بعد اس نے اپنی پھٹی ہوئی شمیص پر اطمینان کی ایک نظر ڈالی۔
''اب یہ شمیص بھی ٹھیک نظر آئے گی۔''
کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے کمرے میں آتی ہوئی برفیلی ہوا کی سیٹی سنائی دے رہی تھی۔ باہر کا کہر بادل جیسی دھند کی طرح کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی نادیدہ انگلیاں کمرے میں سفید رنگ کا نمدہ پھیلا رہی ہوں۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر گرتی برف دیکھی جا سکتی تھی۔ پچھلے دن کے چمکیلے سورج کے بعد برف کا گرنا لازمی تھا۔
باپ نے تیزی سے اپنے اطراف ایک نظر ڈالی، اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ وہ کچھ بھولا نہیں ہے۔ اس نے اپنا پرانا بیلچہ اٹھایا اور گیلی لکڑیوں کو چھپانے کے لیے ان پر راکھ بکھیر دی۔
اس کے بعد وہ چمنی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا:
''اب'' اس نے کہا، ''فیاض انسان اندر آ سکتا ہے۔''

✿

حجرے میں روشنی کی کرن

بڑی لڑکی نے بڑھ کر باپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”دیکھو بابا! میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”چل ہٹ!“ باپ نے جواب میں کہا، ”میں تجھ سے زیادہ ٹھنڈا ہو رہا ہوں۔“

بیوی نے تھک کر کہا، ”تم ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتے ہو، گویا تم سب سے بڑھ کر ہو، ہاں تم یہی کرتے ہو۔ یہ بہت بُری بات ہوتی ہے۔“

”لعنت ہو تم پر۔“ باپ نے جواب دیا۔

ماں نے اپنی زبان قابو میں رکھی۔

ایک لمحے کے لیے حجرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ بڑی لڑکی لاپروائی سے اپنے چوغے کے زیریں حصے سے کیچڑ چھڑانے لگی؛ اس کی چھوٹی بہن سسکیاں لیتی رہی؛ ماں نے اس کا سر اپنے ہاتھوں کے درمیان لے لیا تھا، اور اس کو بوسے دے رہی تھی۔ اس دوران باتیں بھی کرتی جا رہی تھی، ”میری جان! میں یقین دلاتی ہوں کہ اب کچھ نہیں ہوگا، مت رو میری بچی، ورنہ تیرا باپ غصے میں آ جائے گا۔“

”نہیں!“ باپ نے بلند آواز میں کہا، ”بلکہ رو، روتی رہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔“

اس کے بعد وہ بڑی بچی سے مخاطب ہوا، ”وہ آنے ہی والا ہے۔ اگر وہ نہیں آتا تو میں نے یہ سب کیوں کیا ہوتا۔ میں نے آگ بجھا دی ہے، اپنی کرسی توڑ ڈالی ہے، اپنی قمیص پھاڑ ڈالی ہے، اپنی کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا ہے۔“

”اور اپنی بچی کو زخمی کر ڈالا ہے۔“ ماں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تمھیں پتا ہے۔" باپ کہتا رہا، "کہ اس شیطانی حجرے میں غضب کی سردی ہے اور اگر وہ شخص نہیں آیا تو کیا ہوگا، وہ شاید جان بوجھ کر انتظار کرا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہے، 'اچھا ہے، وہ ہمارا انتظار کریں۔ وہ پیدا اسی لیے ہوئے ہیں۔' اُف! میں ایسے لوگوں سے بہت نفرت کرتا ہوں، اور مجھے کتنی خوشی ہوگی، کتنا جوش اور اطمینان ہوگا اگر میں ان سب دولت مندوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالوں۔ یہ لوگ جو فیاضی کا ڈھونگ رچاتے ہیں، گرجا گھر جاتے ہیں، پادریوں کو تحائف دیتے ہیں، خود کو سب سے بلند سمجھتے ہیں، ہمیں ذلیل کرنے کے لیے آتے ہیں، ہمارے لیے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں، 'لباس' لاتے ہیں، جو ہمارے نزدیک چار سو کے بھی برابر نہیں۔ اور روٹی؟ بدمعاش گروہ والو، اس کی ہمیں ضرورت نہیں، ہمیں رقم، صرف رقم چاہیے؛ مگر وہ رقم کبھی نہیں دیتے، اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کو پینے پلانے میں اڑا دیں گے؛ کہ ہم شرابی ہیں، سست لوگ ہیں۔ اور وہ خود — وہ خود کیا ہیں، اور پہلے وہ کیا تھے؟ چور! ورنہ وہ کبھی دولت مند نہ بن سکتے تھے۔ اور سماج — اس کو تو چار کونوں والی چادر میں ڈال کر ہوا میں اچھال دینا چاہیے، سب کو ایک ساتھ — تاکہ سب تباہ ہو جائیں، بہت ممکن ہے، مگر کم از کم، کسی کے پاس کچھ رہ تو نہیں جائے گا، اور بس یہی حاصل ہوگا۔ ارے، وہ احمق فیاض کہاں مر گیا ہے؟ کب آئے گا؟ آئے گا بھی کہ نہیں؟ شاید اس جانور کو ہمارا پتا یاد نہیں رہا ہے، میں اس پر شرط لگانے کو تیار ہوں۔"

عین اس وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، آدمی تیزی سے بڑھا، دروازہ کھول دیا، اور جھک کر تعظیم و تکریم میں مصروف ہو گیا۔

تشریف لائیے، سرکار! بے حد محترم فیاض صاحب! آپ بھی اور آپ کی دل فریب خاتون کے لیے بھی ہم چشم بہ راہ ہیں۔ تشریف لائیے۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی، اور ایک نوجوان لڑکی حجرے کی ڈیوڑھی پر ظاہر ہوئی۔

ماریوں نے اپنا ہیجان نہیں چھوڑا تھا۔ اس پر انسانی زبان سے کہیں زیادہ طاقت ور احساس کا غلبہ ہو گیا۔

یہ تو وہی لڑکی تھی!

جس کسی نے کبھی محبت کی ہو اُسے "وہی" کے تین حرفوں کے معنی کی دمک کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بالیقین، یہ وہی لڑکی تھی۔ ماریوں اپنی آنکھوں پر اچانک ایک تاباں نمی پھیل جانے کے باعث اس کو قرینے سے پہچان نہیں سکا تھا۔ یہی تھی وہ پیاری، غائب شخصیت، وہ ستارہ جو اس

پر چھہ ماہ تک چپکا تھا؛ وہی آنکھیں، وہی بھنویں، وہی دہن، وہی اوجھل ہو جانے والا چہرہ جس کے غائب ہونے سے رات کی تخلیق ہوئی تھی۔ نگاہ کو گہن لگ گیا تھا، اب وہ واپس آگئی تھی۔

وہ اسی اداسی میں، اس حجرے میں، اس بدشکل دو چھتی میں واپس آئی تھی، اور اس بھیانک کیفیت میں۔

ماریوس خوف سے لرز گیا۔ ارے یہ تو وہی لڑکی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی اس کے دل کی دہری دھڑکن نے اس کی نظر کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کہ وہ رو پڑے گا۔ ارے اتنے دنوں تک اس کی تلاش کے بعد اسے ایک بار پھر دیکھ رہا تھا! اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کی روح اس کے جسم سے نکل گئی تھی، اور ایک بار پھر واپس آگئی ہے۔

وہ بالکل پہلے جیسی ہی تھی، بس ذرا زردی مائل ہو گئی تھی؛ اس کا نازک چہرہ، ارغوانی مخمل کے فریم میں جڑا ہوا تھا، اس کا جسم سیاہ رنگ کے ساٹن کی عبا میں چھپا تھا۔ اس کی طویل عبا کے نیچے اس کا نازک سا پیر ریشمی جوتوں میں سے جھانک رہا تھا۔

اب بھی وہ موسیو لیبلانک ہی کے ہمراہ تھی، چند قدم کمرے میں چلی اور میز پر ایک بڑا سا پارسل رکھ دیا۔

بڑی ژاندریت دروازے کے پیچھے چلی گئی تھی، اور اپنی اداس آنکھوں سے اس کے ریشمی گھونگھٹ کو اور اس دل فریب اور بشاش چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

۞

اشک بار ژاندریت

وہ مکان اتنا تاریک ہو رہا تھا کہ باہر سے آنے والوں کو داخل ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ کسی تہہ خانے میں آ گئے ہوں، لہٰذا یہ دو نئے آنے والے قدرے تامل سے آگے بڑھے تھے۔ اس لیے کہ انھیں اپنے اطراف کا ماحول صاف نظر نہیں آ رہا تھا، جب کہ اس میں رہنے والے لوگوں کی آنکھیں سب کچھ با آسانی دیکھ اور سمجھ سکتی تھیں، اس لیے کہ وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی تھیں۔

موسیو لیلا نگ اداس مگر مہربان آنکھوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھا اور ژاندریت باپ سے کہا، موسیو، اس گٹھری میں آپ کو کچھ نئے لباس، کچھ اونی موزے اور کمبل ملیں گے۔"

"ہمارا فرشتہ صفت مہربان ہمیں اپنی عنایات سے مغلوب کر رہا ہے۔" ژاندریت نے فرش تک جھکتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد اپنی سب سے بڑی بیٹی کے کان تک جھک کر، جب کہ دونوں ملاقاتی آنکھوں ہی آنکھوں میں اس افسوس ناک ماحول کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھے، دھیمی آواز میں کہا،

"دیکھا تم نے، میں نے کیا کہا تھا؟ بیوقوف! کوئی رقم نہیں ہے، یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ارے ہاں، اس احمق کے لیے خط پر کس نام سے دستخط کیے تھے؟"

"فاباں تو۔" لڑکی نے جواب دیا

"یعنی ڈرامے کا فن کار، بالکل ٹھیک!"

یہ ژاندریت کی خوش قسمتی تھی کہ اسے یہ بات یاد آ گئی، اس لیے کہ ایک ہی لمحے بعد موسیو لیلا نگ اس سے اس انداز سے مخاطب ہوا گویا وہ کوئی نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں پر زیادہ ترس کھانے کی ضرورت ہے، موسیو ....."

ژاندریت نے جلدی سے کہا "فاباں تو۔"

موسیو فاباں تو، ہاں یہی تو نام تھا نا، مجھے یاد آ گیا ہے۔"

"تھیٹر کا فن کار، جناب عالی، وہی جسے کچھ کامیابی نصیب ہوئی تھی۔"

یہاں بظاہر ژاندریت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس فیاض کو گرفت لانے کا موقع آ گیا ہے۔ اس نے بلند آواز میں ایسے لہجے میں کہا جو کسی جاہل شخص کی لاف زنی اور کسی سڑک کے بھکاری کے انکسار کے زمرے میں آتا تھا:

"Talma کا شاگرد، جناب عالی! میں Talma کا شاگرد ہوں۔ پہلے قسمت مجھ پر مہربان ہوا کرتی تھی— افسوس کہ اب بدقسمتی کی باری ہے۔ میرے مہربان، آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ [ہمارے پاس] نہ روٹی ہے نہ آگ۔ میرے بے چارے بچوں کے لیے آگ تک نہیں۔ میری ایک ہی کرسی تھی، جس میں نشست باقی نہیں رہی۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ بھی ایسے موسم میں۔ میری بیوی بستر سے لگ گئی ہے۔ بیمار ہے۔"

"بے چاری عورت۔" موسیو لیبلانک نے کہا۔

"میری بچی زخمی ہو گئی ہے۔" ژاندریت نے اضافہ کیا۔

بچی اجنبی لوگوں کی آمد پر "نوجوان خاتون" کے نام سے مخاطب کیے جانے کے انتظار میں اپنی سسکیاں بھول گئی تھی۔

ژاندریت نے بچی سے نہایت دھیمی آواز میں کہا "بدبخت رو، چیخیں مار" ساتھ ہی اس نے لڑکی کے زخمی ہاتھ میں چٹکی بھی لے لی۔ یہ سب کسی بازیگر کی پھرتی سے کیا گیا تھا۔

بچی زور شور سے چیخنے لگی۔

وہ پیاری سی نوجوان لڑکی، ماریوس جسے اپنے دل میں 'میری Ursule' کہتا تھا، تیزی سے اس بچی کی طرف بڑھی۔

"بے چاری، پیاری بچی۔" اس نے کہا۔

"آپ دیکھ رہی ہیں نا، میری نہایت خوب صورت نوجوان خاتون!" ژاندریت کہتا رہا "اس بچی کی زخمی کلائی، چھ سو یومیہ اجرت پر مشین سے کام کرتے ہوئے حادثے میں اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ شاید اسے قطع کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔"

"واقعی؟" بوڑھے شخص نے ڈرتے ہوئے کہا۔

بے چاری بچی، ان تمام باتوں کو صحیح سمجھ کر پہلے سے اور بھی زیادہ زور سے رونے لگی۔

""افسوس، جی ہاں، میرے مہربان۔" باپ نے جواب میں کہا۔

کئی منٹ سے ژاندریت اس 'مہربان' کا غیر معمولی انداز میں غور سے تجزیہ کر رہا تھا۔ جب مہربان بولتا تو وہ بڑی توجہ سے اس کی بات سنتا، گویا وہ اپنی یادوں میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پھر اچانک، جب وہ لوواردو بچی سے اس کے زخمی ہاتھ کے بارے میں سوال کر رہے تھے، وہ اپنی بیوی کے پاس سے گزرا جو اپنے بستر میں احمقوں کی طرح لیٹی ہوئی تھی؛ اس سے بھی دھیمے لہجے میں کہا، "ذرا، اس آدمی کو غور سے دیکھو" اس کے بعد وہ موسیولیبلانک کی طرف متوجہ ہوا، اور اپنی جا ستانی شروع کر دی:

"جناب والا! میرے پاس پہننے کو کچھ نہیں سوائے اپنی بیوی کی قمیص کے، اور وہ بھی نیچے سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس سرد موسم میں، میں باہر نہیں جا سکتا، اس لیے کہ میرے پاس کوٹ بھی نہیں۔ اگر میرے پاس کسی قسم کا کوٹ ہوتا تو میں میڈموزیل Mars سے ملنے جاتا، جو مجھے جانتی ہے اور مجھے بہت چاہتی بھی ہے۔ کیا وہ اب Tour-des-Dames اسٹریٹ میں نہیں رہتی؟ آپ کو پتا ہے جناب عالی! صوبوں کی زندگی میں ہم ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ میں اس کو اپنی کامیابیوں کے بارے میں بتایا کرتا تھا۔ Celimene بھی میری مدد کو آ سکتی ہے، جناب! Belisaire میں Elmire خیرات بانٹتی ہے، مگر نہیں جناب! میرے گھر میں ایک سو بھی نہیں۔ میری بیوی بیمار ہے، ایک سو بھی نہیں! میری بچی خوف ناک انداز میں زخمی ہے، ایک سو بھی نہیں! میری بیوی پر حبس دم کے دورے پڑتے ہیں۔ یہ اس کی عمر کی وجہ سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ، اس کا اعصابی نظام بھی متاثر ہوا ہے۔ اس کو امداد کی ضرورت ہے، افسوس کہ میری بچی کو بھی — مگر ڈاکٹر، مگر دواخانے والے۔ کچھ دیے بغیر دوا علاج کیسے کرا سکتا ہوں؟ میں تو ایک پیٹی کے لیے بھی جھک جاؤں گا۔ جناب عالی! یہ ہیں وہ حالات، فن کار جن پستیوں تک گر گئے ہیں۔ اور آپ کو پتا ہے، دل فریب خاتون، اور آپ، میرے فیاض نگہبان، جو نیکیوں اور خوبیوں کی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں، اور جو اس کلیسا کی ہواؤں کو جہاں میری بچی آپ کو روزانہ دیکھتی ہے، اپنی خوش بو سے لبریز کر دیتے ہیں؟ اور جناب عالی، چوں کہ میں نے اپنے بچوں کو مذہبی انداز سے پالا پوسا ہے، میں انھیں تھیٹر نہیں لے جانا چاہتا۔ اُف وہ چنچل لڑکیاں، کاش میں انھیں کچھ سکھا سکتا۔ میں مذاق نہیں کرتا، اس لیے کہ میں اس کا عادی نہیں ہوں۔ کاش میں ان کو احترام پر، اخلاقیات پر، خوبیوں پر لیکچر دے سکتا۔ ان سے کہہ سکتا کہ انھیں سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ وہ بدنصیب

لوگ ہیں جو اپنی زندگی کی ابتدا اس طرح کرتی ہیں کہ ان کا اپنا کوئی خاندان نہیں ہوگا، اور انجا اس بات پر کہ وہ عوام کی بیویاں بن جائیں گی۔ کبھی وہ 'میڈموزیل نامعلوم' ہوتی ہیں اور کبھی 'مادام بر کسی' ہو جاتی ہیں۔ خدا انھیں غارت کرے۔ فاباں تو خاندان کی لڑکیاں ایسی نہیں ہیں، میرا مطلب ہے کہ میں نے ان کی نشوونما فن شناسی کی بنیاد پر کی ہے؛ کہ وہ ہمیشہ ایمان دار رہیں، نیک رہیں، اور خدا پر اور اس کے نیک ناموں پر یقین رکھیں۔ جناب والا، میرے محترم جناب والا، کیا آپ جانتے ہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ کل فروری کے مہینے کا چوتھا دن ہوگا؛ مہلک دن، مالک مکان نے جب تک کرایہ ادا کرنے کی مہلت دی ہے! اگر اس شام تک کرایہ ادا نہیں ہوا تو، کل میری سب سے بڑی بیٹی، میری بخارزدہ بیوی، میری زخم خوردہ بیٹی — سب کے سب سڑکوں پر ہوں گے، شاہراہوں پر، بغیر کسی سائبان کے، بارش کے درمیان، برف باری کے درمیان۔ مجھ پر چار چوتھائیوں کا — پورے سال کا کرایہ واجب ہے، یعنی ساٹھ فرانک۔"

ژاندریت نے غلط بیانی کی۔ چار چوتھائیوں کا کُل کرایہ صرف چالیس فرانک ہوتا ہے، اور اس پر چار چوتھائیوں کا بقایا ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ ماریوس دو چوتھائیوں کا کرایہ ادا کر چکا تھا۔

موسیو لیبلانک نے اپنی جیب سے پانچ فرانک نکالے اور میز پر ڈال دیے۔

ژاندریت کو اپنی بڑی بیٹی کے کان میں سرگوشی کا موقع مل گیا۔

"ٹھنڈا کہیں کا! کیا سمجھتا ہے کہ میں ان پانچ فرانکوں سے کیا کر سکوں گا؟ ان سے تو میری کرسی کی نشست اور کھڑکی کا شیشہ بھی نہیں لگ سکے گا۔ یہ ہوتا ہے اخراجات کرنے کا نتیجہ!"

اس دوران موسیو لیبلانک نے کتھئی رنگ کا اپنا بڑا سا کوٹ جو وہ نیلے رنگ کے کوٹ کے اوپر پہنے ہوئے تھا، اتار کر کرسی پر ڈال دیا۔

"موسیو فاباں تو!" اس نے کہا، "میرے پاس اس وقت بس یہی پانچ فرانک تھے، مگر اب میں اپنی بیٹی کو گھر لے جاؤں گا اور شام کو واپس آؤں گا — اسی شام آپ کو کرایہ ادا کرنا لازمی ہے، ہے نا؟"

ایک عجیب قسم کی کیفیت کے ساتھ ژاندریت کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے بڑے مشتاقانہ انداز میں جواب دیا:

"جی ہاں، جناب محترم! ٹھیک آٹھ بجے مجھے مالک مکان کے پاس ہونا ہے۔"

"میں چھ بجے یہاں پہنچ جاؤں گا، اور آپ کے لیے ساٹھ فرانک لے کر آؤں گا۔"

"میرے محسن!" پُرجوش ژاندریت نے بلند آواز میں کہا، اور دھیمے انداز میں اپنی

بات میں اضافہ کیا، ''میری بیوی کے حالِ زار پر بھی نظر کر لیجیے۔''

موسیو لیبلا نک نے ایک بار پھر اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام لیا، اور وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ ''شام تک کے لیے الوداع، میرے دوستو'' اس نے کہا۔

''چھ بجے؟'' ژاندریت کہا۔

''ٹھیک چھ بجے۔''

اس لمحے ژاندریت کی بڑی بیٹی کی نظر کرسی پر ٹنگے کوٹ پر پڑی۔

''جناب والا! آپ اپنا کوٹ بھولے جا رہے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

ژاندریت نے قہر کی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھا، ساتھ ہی [لاپروائی کا اظہار کرنے کے لیے] اپنے کندھے ہلا دیے تھے۔

موسیو لیبلا نک پلٹا اور مسکراتے ہوئے بولا،

''میں اسے بھولا نہیں، بلکہ اس کو چھوڑے جا رہا ہوں۔''

''اے میرے نگہبان!'' ژاندریت نے کہا، ''میرے عالی شان مربی، میں اپنے آنسوؤں میں گھلا جا رہا ہوں! اجازت دیجیے کہ میں آپ کی سواری تک آپ کے ساتھ آؤں۔''

''اگر آپ باہر آ رہے ہیں۔'' موسیو لیبلا نک نے کہا، ''تو یہ کوٹ پہن لیجیے۔ واقعی، آج بہت سردی ہے۔''

ژاندریت سے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جلدی سے اس نے وہ بڑا سا کتھئی رنگ کا کوٹ پہن لیا، اور تینوں باہر گئے؛ ژاندریت اجنبیوں کے آگے آگے چل رہا تھا۔

❁

سواری کا کرایہ، دو فرانک فی گھنٹا!

ماریوس نے اس پورے منظر کا کوئی حصہ کھویا نہیں تھا، پھر بھی درحقیقت، اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔اس کی نظریں ہمہ وقت اس نوجوان لڑکی پر جمی رہیں اور اس کے دل نے، بقول شخصے، اس حجرے میں داخل ہونے والے پہلے قدم سے ہی اس کے پورے وجود پر قابو پا لیا تھا۔ لڑکی کے قیام کے پورے وقت ماریوس ایسے عالمِ بے خودی میں تھا جو مادّی تصورات کو معطّل کر دیتا ہے، اور پورے نفس کو ایک نقطے پر مرتکز کر دیتا ہے ۔اس کا تصور اس لڑکی پر نہیں، بلکہ اس [سراپا] روشنی پر تھا جو ساٹن کی عبا پہنے ہوئے تھی اور مخمل کا ہیٹ لگائے ہوئے تھی ۔ اگر سنگ ستارہ بھی [جو سارے ستاروں میں سب سے روشن سمجھا جاتا ہے] کمرے میں داخل ہوتا تو ماریوس کو اس سے زیادہ چکاچوند نہ کر پاتا۔

نوجوان لڑکی گٹھری کھولنے میں مشغول تھی، وہ لباس اور کمبل نکال رہی تھی، بیمار ماں سے ہمدردی سے اور زخمی لڑکی سے نرمی سے سوالات کرتی جا رہی تھی۔ماریوس اس کی ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا، اور اس کے منہ سے نکلنے والے لفظوں کو سننا چاہتا تھا۔ماریوس اس کی آنکھوں، اس کے ابروؤں، اس کے حسن، اس کے پیکر، اس کی چال سے واقف تھا مگر اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ ایک بار اسے گمان ہوا تھا کہ لکسمبرگ میں اس کے کچھ الفاظ سنے تھے، مگر اس بات کا پورا یقین نہیں تھا۔اس کی آواز سننے کے لیے وہ اپنی زندگی کے دس برس تک قربان کر دینے پر تیار تھا، تا کہ اس [آواز] کی موسیقی کا ایک چھوٹا سا حصہ اپنی روح میں اتار سکتا۔مگر سب کچھ ژاندریت کے رونے دھونے، اور اپنا بگل بجانے میں غرق ہو گیا تھا۔ژاندریت نے ماریوس کی مدہوشی میں غضب کو بھی شامل کر دیا تھا۔ماریوس اپنی آنکھوں سے ہی اس کا لطف لے رہا تھا۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ

یہ وہی ربانی مخلوق ہے جسے وہ ان خبیث مخلوقات کے درمیان اس بھیانک ماند میں دیکھ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا گویا وہ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ کے درمیان کسی گنگناتی چڑیا کو دیکھ رہا ہو۔

لڑکی وہاں سے جانے لگی تو ماریوس کے دل میں بس ایک ہی خیال تھا، کہ کسی طرح اس کا پیچھا کیا جائے، کہ وہ اس کے سراغ سے چمٹا رہے، کہ اس کو اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک یہ معلوم نہیں ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے، کہ وہ اسے ایک بار پھر کھو نہ دے، جسے ایسے معجزانہ طور پر دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے کموڈ سے ایک چھلانگ لگائی اور اپنی ہیٹ اٹھائی۔ جوں ہی اس کا ہاتھ اپنے دروازے کے تالے پر پڑا اور وہ اسے کھولنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خیال نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ راہداری طویل تھی، زینہ ڈھلوان تھا، ژاندریت باتونی تھا، موسیو لیبلانک کو کوئی شبہ نہیں تھا، اور اس کو سواری ملی نہیں تھی؛ اگر راہداری میں مڑتے ہوئے یا زینے سے اترتے ہوئے وہ ماریوس کو دیکھ لیتا، کہ ماریوس اور اس گھر میں — تو ظاہر ہے کہ وہ چوکنا ہو جاتا اور اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا، اور اس بار یہ واقعی آخری موقع ہوتا۔ تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا تھوڑی دیر انتظار کرے؟ مگر انتظار کے دوران سواری جا چکی ہوگی۔ ماریوس الجھن میں تھا۔ بالآخر، اس نے خطرہ مول لے لیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

رہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے زینے کے طرف بڑھا، وقت پر بولیوارڈ پہنچ گیا، اور دیکھا کہ ایک خچر گاڑی Petit-Banquier اسٹریٹ سے مڑ کر واپس پیرس کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔

ماریوس سرپٹ اسی سمت دوڑ پڑا۔ بولیوارڈ کے کونے پر پہنچ کر اسے خچر گاڑی پھر نظر آئی جو تیزی سے Mouffetard اسٹریٹ کی ڈھلان پر اتر رہی تھی؛ گاڑی کافی دور جا چکی تھی، اور اس سے آگے جانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا؛ اب کیا کیا جائے؟ اس کا تعاقب کیا جائے؟ ناممکن؛ اس کے علاوہ، دوسری گاڑیوں کے سوار لوگ دیکھیں گے کہ ایک شخص خچر گاڑی کے تعاقب میں پوری رفتار سے دوڑ رہا ہے؛ اور یہ بھی کہ لڑکی کا باپ اسے پہچان لے گا۔ عین اس وقت، حیرت انگیز اور غیر متوقع خوش قسمتی، کہ ماریوس کو بولیوارڈ سے گزرتی ایک خالی سواری نظر آ گئی۔ اب ایک ہی راستہ تھا، کہ اس سواری میں سوار ہو کر خچر گاڑی کا تعاقب کیا جائے۔ بس یہی ایک یقینی، کارگر اور خطرات سے مبرا طریقہ تھا۔

ماریوس نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا اور پکار کر کہا: ”گھنٹے کے حساب سے؟“

ماریوس کے گلے میں گلوبند نہیں تھا، وہ اپنے کام کے کوٹ میں ملبوس تھا، جو بٹنوں

سے عاری تھا، اس کی قمیص سینے پر بنی چنٹ کے پاس سے پھٹی ہوئی تھی۔

کوچوان رُکا، آنکھ ماری، پہلی انگلی کو انگوٹھے سے نرمی سے رگڑتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ ماریوس کی طرف بڑھا دیا۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' ماریوس نے پوچھا۔

''پیشگی ادائیگی!'' کوچوان نے کہا۔

ماریس کو یاد آیا کہ اس کے پاس صرف سولہ سو ہیں۔

''کتنا؟''

''چالیس سو۔''

''واپسی پر ادا کروں گا۔''

کوچوان کا جواب La Palisse کی ہوا میں سیٹی بجانا اور گھوڑے کو چابک رسید کرنا تھا۔

ماریوس واپس جاتی ٹیکسی کو حیرت کی نظر سے دیکھتا رہ گیا۔ اس لیے کہ صرف چوبیس سو کی کمی کے عوض اس کی خوشی، اس کی خوش قسمتی اور اس کی محبت اس سے چھوٹ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا، وہ ایک بار پھر اندھا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے تلخی سے سوچنا شروع کیا؛ اور اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اسی صبح اس نے ایک بدنصیب لڑکی کو پانچ فرانک عطا کیے تھے۔ اگر اس کے پاس اس وقت وہ پانچ فرانک بچے ہوتے تو اسے پھر سے نئی زندگی مل گئی ہوتی؛ وہ اس ظلمت اور اس برزخ سے نکل گیا ہوتا، اسے اس تنہائی، اس بداندیشی اور اس رنڈوے پن سے نجات مل گئی ہوتی؛ اس نے اپنے مقسوم کی کالی ڈور کو اس خوب صورت سنہرے دھاگے سے باندھ لیا ہوتا، جو ابھی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا تھا، اور، اسی وقت ایک بار پھر ٹوٹ بھی گیا تھا۔

وہ مایوس اپنے حجرے میں واپس چلا گیا۔

اس نے اپنے آپ سے کہا ہوتا کہ موسیو لیبلانک نے اسی دم واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، اور اسے بس اتنا کرنا تھا کہ یہ کام ہنرمندی سے کیا جاتا، تاکہ اس موقعے پر اس کا تعاقب کر سکتا؛ مگر اس کے اپنے خیال کے مطابق اسے شبہ تھا کہ اس نے یہ بات سُنی بھی تھی یا نہیں۔

وہ زینے پر چڑھنے ہی والا تھا، کہ اس نے بولیووارڈ کی دوسری جانب دیکھا کہ ٹانڈریت ویران Barriere-des-Gobelins اسٹریٹ پر فیاض شخص کا کوٹ لپیٹے ہوئے اُن آدمیوں میں سے ایک سے گفتگو میں مصروف تھا جنھیں سب لوگ رکاوٹوں کے کوچہ گرد کہتے ہیں؛ مشکوک چہروں والے، مشتبہ خود کلامی کرنے والے جو شیطانی دماغ کے حامل نظر آتے ہیں عام طور پر جو

دن میں سوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ رات میں اپنا کام دکھاتے ہیں۔

ان دو افراد نے، جو گرد باد کی صورت میں گرتی ہوئی برف میں بے حرکت کھڑے باتیں کر رہے تھے اپنا ایک گروہ بنا لیا تھا یقینی طور جسے پولیس نے دیکھا ہوگا، مگر ماریوس جسے مشکل سے دیکھ پایا تھا۔

پھر بھی، غم ناک مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے آپ سے کہنے سے باز نہیں رہ سکا تھا کہ یہ رُکاوٹوں کے کوچہ گرد ڈانڈریت جن سے باتیں کر رہا تھا، Panchaud عرف Printanier عرف Bigrenaille سے مشابہ تھا، جسے کوفیراک نے ایک بار نہایت خوف ناک شبینہ کوچہ گرد کی حیثیت میں اسے دکھایا تھا۔ قاری اس شخص کے بارے میں پچھلی کتاب میں واقف ہو چکا ہے۔ یہ Panchaud عرف Printanier عرف Bigrenaille بعد میں کئی مجرمانہ مقدمات میں ملوث پایا گیا تھا، اور مشہور بد معاش سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک مشہور بد معاش تھا۔ آج وہ غنڈوں اور کرایے کے قاتلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پچھلی سلطنت کے آخری دنوں میں وہ ایک اسکول کا سربراہ تھا۔ اور شام میں، آغاز شب میں، اس وقت جب گروہ بنتے ہیں اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں، La Force کے Fosse-aux-Lions میں اس پر بحث کی جاتی تھی۔ ایک رات، اس قید خانے میں بھی، عین اس مقام پر جہاں سے بدرَو نکلتی ہے، جس کے ذریعے 1843ء میں، دن دہاڑے تیس قیدیوں کا مشہور زمانہ فرار ہوا تھا اور اس پُل کے نیچے سے گزرتی ہے جس پر اس نے اپنا نام Panchaud پڑھا تھا، جسے فرار کی کئی کوششوں میں سے ایک میں، نہایت دیدہ دلیری سے، خود اس نے اپنے ہاتھ سے کندہ کیا تھا۔ 1832ء میں پولیس اس پر نظر رکھے ہوئے تھی مگر اس نے اس وقت تک کوئی سنجیدہ شروعات نہیں کی تھی۔

۞

خدمات کی پیش کش، بدحالی سے بدنصیبی تک

ماریوس آہستہ آہستہ اپنی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا؛ عین اس وقت جب وہ اپنے حجرے میں واپس جا رہا تھا، اسے بڑی ژاندریت لڑکی نظر پڑی جو راہداری میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھنا ہی اس پر بار ہو رہا تھا؛ یہی لڑکی تھی جسے ماریوس نے پانچ فرانک دیے تھے، اب ان کی واپسی کے تقاضے کو بہت دیر ہو چکی تھی کہ وہ سواری جس کو ماریوس نے روکا تھا، موجود نہیں تھی؛ خچر گاڑی بھی بہت دور جا چکی تھی۔ مزید یہ کہ وہ فرانک واپس کرنے والی بھی نہیں تھی۔ ان افراد کی رہائش کے بارے میں سوالات کرنا جو کچھ دیر پہلے اس کے گھر آئے تھے بے کار تھا؛ ظاہر ہے کہ اسے خود بھی علم نہیں تھا، اس لیے کہ اس فیاض کے نام لکھے جانے والے خط پر Fabantou فاباں تو نے صرف "Saint-Jacquesdu-Haut-Pas کلیسا کے محترم فیاض کے نام" لکھا تھا۔

ماریوس اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بند کرنے کے لیے حسبِ معمول دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ بند نہیں ہوا؛ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے ایک ہاتھ نظر آیا، جس نے دروازے کو نیم بند کیفیت میں پکڑ رکھا تھا۔

"یہ کیا؟" اس نے پوچھا، "کون ہے؟"

وہ ژاندریت لڑکی تھی۔

"کیا یہ آپ ہیں؟" ماریوس نے تقریباً سختی سے کہا، "آپ پھر آگئی ہیں۔ کیا چاہتی ہیں آپ مجھ سے؟"

لڑکی بہت متفکر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ماریوس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس

وقت اس میں وہ اعتماد نظر نہیں آیا جو صبح کے وقت تھا۔ لڑکی کمرے میں داخل نہیں ہوئی، بلکہ راہداری کے اندھیرے میں ہی کھڑی رہی، جہاں ماریوس اسے نصف کھلے دروازے کے ذریعے دیکھ سکتا تھا۔

''اندر آجائیے نا.....آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟'' ماریوس نے بلند آواز میں کہا، ''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

لڑکی نے اپنی پژمردہ آنکھیں اوپر کیں، جن میں ایک قسم کی مبہم سے کرن جھلملا رہی تھی، اور کہا، موسیو ماریوس، آپ بہت افسردہ دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟''

''میں اور افسردہ؟'' ماریوس نے کہا۔

''ہاں آپ۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''جی ہاں، کوئی بات ہے ضرور۔''

''نہیں۔''

''میں آپ سے کہہ رہی ہوں نا کہ کوئی بات ہے ضرور!''

''چلی جائیے یہاں سے۔''

ماریوس نے دروازے کو ایک اور دھکا دیا، مگر وہ دروازے کو پکڑے کھڑی رہی۔

''ٹھہر جائیے۔'' لڑکی نے کہا، ''آپ غلطی پر ہیں۔ آپ اگرچہ دولت مند نہیں، اس صبح آپ مجھ پر مہربان تھے۔ ایک بار پھر مہربانی کیجیے۔ آپ نے مجھے کچھ کھانے کو دیا تھا۔ بتائیے تو سہی کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ میں آپ کو پریشان دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیا میں کوئی خدمت انجام دے سکتی ہوں؟ مجھ سے کام لیجیے۔ میں آپ کے راز جاننا نہیں چاہتی، مجھے کچھ بتانا بھی ضروری نہیں۔ پھر بھی، میں آپ کے کام آ سکتی ہوں؛ میں اپنے باپ کی بھی مدد کرتی ہوں۔ جب ضروری خطوط لے جانا ہو، گھروں میں جانا ہو، در در جا کر معلومات اکٹھا کرنی ہوں، کوئی پتا معلوم کرنا ہو، کسی کا تعاقب کرنا ہو، میں کام آ سکتی ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسا کیجیے، آخر کیا بات ہے؛ میں آپ کے لیے لوگوں سے بات بھی کروں گی؛ کبھی کبھی لوگوں سے بات کرنا بھی کافی ہوتا ہے، اس سے معاملات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے، اور سب کچھ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے استعمال کیجیے۔''

ماریوس کے ذہن میں جھماکے سے ایک خیال گزرا۔ گرتے ہوئے شخص کے نزدیک کوئی شاخ حقیر نہیں ہوا کرتی۔

وہ ژاندریت لڑکی کے قریب گیا۔ ”بیٹھیے...“ اس نے کہا۔
لڑکی کی آنکھوں میں آئی ہوئی خوشی کی لہر نے ایک لمحے کے لیے اسے ششدر کر دیا تھا۔
”ارے ہاں، آپ مجھے ’تم‘ کہہ کر مخاطب کیجیے، مجھے یہ انداز اچھا لگتا ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ اس نے پھر سے بات شروع کی، ”تو تم ہی اس شریف انسان اور اس کی لڑکی کو یہاں لائی تھیں؟“
”جی ہاں۔“
”تم اس کا پتا جانتی ہو؟“
”جی نہیں۔“
”معلوم کرو گی، میرے لیے؟“
ژاندریت کی آنکھوں میں آئی ہوئی خوشی کی چمک، اب غمگینی میں بدل گئی تھی۔
”بس اتنی سی خواہش؟“ اس نے سوال کیا۔
”ہاں۔“
”تم انھیں جانتی ہو؟“
”نہیں۔“ ”یعنی“ اس نے پھرتی سے کہا، ”آپ اسے نہیں جانتے، مگر اسے جاننا چاہتے ہیں۔“
ان لوگوں کے بارے میں ماریوس کی ان باتوں نے اسے ناقابلِ بیان حد تک تلخ کر دیا تھا۔
”اچھا، تو کیا تم یہ کام کر سکتی ہو؟“
”آپ کو اس ’خوب صورت خاتون‘ کا پتا مل جائے گا۔“
’خوب صورت خاتون‘ پر اس کے زور دینے نے ماریوس کو پریشان کر دیا۔ ماریوس نے دوبارہ بات شروع کی۔
”نہیں، نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ باپ اور بیٹی کا پتا، یعنی اُن کا پتا۔“
لڑکی نے ماریوس کی طرف گھور کر دیکھا۔ ”اس کے بدلے میں آپ مجھے کیا دیں گے؟“
”جو بھی تم چاہو گی۔“
”جو کچھ بھی میں چاہوں گی؟“
”ہاں۔“
”آپ کو پتا مل جائے گا۔“
لڑکی نے اپنا سر جھکا لیا؛ اس کے بعد وہ اکھڑ پنے سے دروازے کی طرف گئی اور

دروازہ بند کر دیا۔

ماریوں اب اکیلا تھا۔

وہ کرسی میں گر گیا، اوراپنا سر اور دونوں کہنیاں اپنے بستر پر رکھ لی تھیں؛ ماریوں خیالات میں غرق ہو گیا، جن کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، گویا اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ سب کچھ جو صبح سے ہو رہا تھا؛ اس حور کا ظاہر ہونا؛ اس کا غائب ہو جانا؛ جو کچھ اس لڑکی نے اس سے ابھی کہا تھا؛ مایوسی کے بھیانک اندھیرے میں امید کی ایک لہراتی کرن—یہ سب پیچیدگیاں تھیں جو اس کے دماغ میں بھر گئی تھیں۔

اور پھر اچانک کسی آواز نے اسے مراقبے سے چونکا دیا۔

ماریوں کو ایک چیخ سنائی دی؛ ژاندریت کی سخت آواز میں یہ الفاظ کہے گئے تھے، اس کے لیے جو دل چسپی سے لبریز تھے:

"میں تم سے کہہ رہا ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے اس شخص کو پہچان لیا ہے۔"

ژاندریت کس کے بارے میں بات کر رہا تھا؟ اس نے کسے پہچان لیا ہے؟ موسیو لیبلانک کو؟ اس کی اپنی Ursule' کے باپ کو؟ کیا؟ کیا ژاندریت اسے پہلے سے جانتا تھا؟ کیا ماریوں کو اس بے ربط اور غیر متوقع انداز میں وہ اطلاعات ملنے والی ہیں جن کے بغیر اس کی زندگی اب تک اس قدر اندھیری تھی؟ کیا اسے معلوم ہونے والا ہے کہ وہ کس سے محبت کرنے لگا تھا؛ وہ نوجوان لڑکی کون ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟ کیا وہ تمام اندھیرے چھٹ جانے والے ہیں جو انھیں گھیرے ہوئے تھے؟ کیا نقاب اٹھنے والا ہے؟ او خدایا!"

اب وہ کموڈ پر چڑھنے کے بجائے کموڈ سے چپک گیا تھا۔ وہ دیوار میں بنے سوراخ کے قریب اپنے مچان پر تھا۔

اور ایک بار پھر، وہ ژاندریت کے حجرے کے اندرون پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

۞

موسیو لیبلانک کے پانچ فرانک

اس خاندان کی کسی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سوائے اس کے کہ بیوی اور لڑکیوں نے گٹھری میں سے اونی موزے اور جیکٹ نکال کر پہن لی تھیں۔ دو نئے کمبل، دو بستروں پر ڈال دیے گئے۔

ژاندریت واپس آیا۔ باہر جانے کی وجہ اس اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ اس کی بیٹیاں آتش دان کے قریب فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں، بڑی بیٹی چھوٹی کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ بیوی اپنی حیران صورت لیے واپس آتش دان کے قریب بستر میں جا کر لیٹ رہی تھی۔ ژاندریت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی ہو رہی تھیں۔

بیوی نے، جو اپنے شوہر کی موجودگی میں بزدل اور مغلوب ہو جاتی تھی، پلٹ کر سوال کیا:

"سچ مچ؟ تمھیں یقین ہے؟"

"پورا یقین ہے۔ آٹھ برس گزر گئے ہیں، مگر میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔ اوہ، میں اسے پہچانتا ہوں۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا! تمھیں اندازہ نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں۔"

"مگر میں نے کہا تھا نا اس پر توجہ دو۔ کیا وجہ ہے کہ چہرے بشرے سے یہ بوڑھا نہیں لگتا؟ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو بوڑھے نہیں ہوتے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح سنبھالتے ہیں — اس کی آواز بالکل وہی ہے۔ اب وہ بہتر لباس میں ہے، بس! او شیطان، میں نے تجھے پکڑ لیا ہے، ہاں، پکڑ لیا ہے۔"

وہ رکا، اور اپنی بیٹیوں سے کہا:

"نکل جاؤ یہاں سے، تم سب۔ عجیب بات ہے کہ تم بھی اسے پہچان نہیں سکیں۔"

لڑکیاں فرماں برداری میں اُٹھ کر چلی گئیں۔

ماں بکلائی، ''زخمی ہاتھ سمیت؟''

''تازہ ہوا فائدہ کرے گی۔خاموش رہا کرو۔''

صاف ظاہر تھا کہ یہ آدمی ان لوگوں میں سے تھا لوگ جس کو جواب دینے سے پرہیز کرتے تھے۔دونوں لڑکیاں کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئیں۔

وہ دروازے سے گزرنے والی ہی تھیں کہ ان کے باپ نے بڑی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر روک لیا، اور اس سے عجیب لہجے میں کہا، ''تم کل یہاں ٹھیک پانچ بجے موجود رہنا،تم دونوں۔ مجھے تمھاری ضرورت ہوگی۔''

ماریوس نے اپنی توجہ دُگنی کر دی۔

اپنی بیوی کے پاس اکیلا ہوتے ہی ژاندریت نے ایک بار پھر کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی، اور تین یا چار چکر خاموشی سے لگائے۔اس کے بعد اس نے زنانہ شمیص کے نچلے حصے کو پتلون کے اندر اڑستے میں دو چار لمحے لگائے۔اس کے فوراً بعد وہ اپنی بیوی کا مخاطب ہوا، اپنے ہاتھ باندھ لیے، اور بلند آواز میں کہا، ''کہو تو میں تمھیں ایک بات بتاؤں؟ وہ نوجوان خاتون—''

''اچھا......کیا؟'' اس کی بیوی نے پلٹ کر کہا، ''وہ نوجوان خاتون؟''

ماریوس کو یقین نہیں آیا کہ وہ لوگ واقعی اسی لڑکی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اب وہ زیادہ توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔وہ ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔

مگر ژاندریت بیوی سے سرگوشی کرنے کے لیے اس کی جانب جھک گیا۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور زور سے نتیجے کا اعلان کیا، ''وہ خوب صورت خاتون، وہی لڑکی ہے۔''

''وہی والی؟'' بیوی نے کہا۔

''بالکل وہی والی۔'' شوہر نے کہا۔

ماں کے ادا کیے جانے والے الفاظ کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔حیرت، غصہ، نفرت، غضب سب مل کر ایک بھیانک لہجے میں تبدیل ہو گئے تھے۔وہ چند الفاظ، بلاشبہ جو اس خاتون کا نام تھا، جو اس کے شوہر نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے لیا تھا، اس اونگھتی عورت کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھے، اور وہ مکروہ سے خوف ناک بن گئی تھی۔

''یہ ہرگز ممکن نہیں۔'' عورت نے چیخ کر کہا، ''جب میں سوچتی ہوں کی میری بیٹیاں ننگے پاؤں گھوم رہی ہیں، ان کے شانوں کے لیے ایک گاؤن تک نہیں ہے، اور اُدھر ریشمی ساٹن کا

لبادہ ہے، مخمل کا گھوگھٹ ہے، بوٹ ہیں، اور ہر چیز ہے تو میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے! دوسو فرانک سے زیادہ قیمت کے لباس، تا کہ لوگ سمجھیں کہ وہ کوئی اعلیٰ درجے کی خاتون ہے۔ نہیں، تم غلطی پر ہو، مگر کیوں؟ وہ لڑکی تو ڈراؤنی تھی، یہ لڑکی اتنی بدصورت بھی نہیں۔ یہ واقعی بدصورت نہیں۔ یہ خاتون وہ لڑکی نہیں ہو سکتی۔"

"میں تم سے کہہ رہا ہوں نا، یہ وہی ہے۔ تم دیکھ لوگی۔"

اس کے محکم اصرار پر خاتون تھانڈریت نے اپنا بڑا سا، سرخ وسفید چہرہ اٹھایا، اور خوف ناک انداز میں چھت کو گھورنے لگی۔ اس لمحے ماریوس کو وہ عورت اپنے شوہر سے بھی زیادہ ڈراؤنی لگی۔ اس وقت وہ بہت سے بچوں والی مادہ خنزیر تھی جو مادہ چیتے جیسی نظر آ رہی تھی۔

"کیا!" اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا، "وہ بھیانک 'خوب صورت نوجوان خاتون' جو میری بیٹیوں کو رحم دل نظروں سے گھور رہی تھی — وہی چھنال فقیرنی ہے؟ ابھی مل جائے تو میں اس کا پیٹ پھاڑ ڈالوں۔"

وہ اچھل کر بستر سے کود پڑی، چند لمحے کھڑی رہی، اس کے بال بکھر گئے تھے، اس کے نتھنے پھول رہے تھے، اس کا منہ آدھا کھلا ہوا تھا، اس کی مٹھیاں پیچھے کی طرف تھیں اور بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بستر میں گر گئی۔ اس آدمی نے پھر آگے پیچھے چلنا شروع کر دیا، اور اپنی عورت پر توجہ نہیں کی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ خاتون تھانڈریت کی طرف گیا اور اپنے ہاتھ باندھے ہوئے اس کے سامنے رُک گیا، جیسا کہ اس نے ایک لمحہ پہلے کیا تھا۔

"تمھیں ایک اور بات بتاؤں؟"

"کیا بات ہے؟" عورت نے پوچھا۔

اس نے نہایت روکھے انداز میں جواب دیا، "میرا مقدر سنور گیا ہے۔"

عورت نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، "کیا وہ آدمی جو مجھ سے مخاطب ہے، پاگل ہونے والا ہے؟"

مرد نے اپنا کلام جاری رکھا:

"دھماکا! زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے کہ میں معمولی رُکن تھا اس پیرش کا جس میں: اگر — آگ — ہے — تو — بھوک — سے — مر جاؤ..... اگر — روٹی — ہے — تو — سردی — سے — ٹھٹھر — کر — مر جاؤ۔ میں پریشانیوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ اپنے حصے کی پریشانیوں سے اور دوسروں

کے حصے کی پریشانیوں سے۔ واقعی، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، اب یہ لطیفہ نہیں رہا، ذومعنویت سے اکتا گیا ہوں، میرے خدا، بس! بہت تنگ ہو چکا، میرے ابدی خدا! میں اس وقت تک کھانا چاہتا ہوں جب تک میرا پیٹ بھر نہ جائے، میں جی بھر کر پینا چاہتا ہوں، بسیار خوری کے لیے۔ سو جانے کے لیے۔ کچھ نہ کرنے کے لیے۔ اب مجھے اپنی باری چاہیے، اس لیے، قبل اس کے میں مر جاؤں، میں تھوڑا سا کروڑ پتی بن جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے حجرے کا ایک چکر لگایا، اور اپنا کلام جاری رکھا، "دوسرے لوگوں کی طرح۔"

"اس سے کیا مطلب ہے تمھارا؟" عورت نے سوال کیا۔

اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا، آنکھ ماری، ایک آنکھ اوپر اٹھائی، اور ادبیات کے پروفیسر کی طرح اپنی آواز اونچی کی جو تجربہ گاہ میں مظاہرہ کرنے جا رہا ہو، "اس سے میرا کیا مطلب ہے؟ تو، لو سنو!"

"شی شی!" عورت نے دھیمی آواز میں کہا، "اتنے زور سے نہیں۔ کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کے کانوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

"یہاں ہے کون؟ ہمارا پڑوسی؟ میں نے ذرا دیر پہلے اسے باہر جاتے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ، وہ احمق اعظم سنتا نہیں ہے۔ میں بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے باہر جاتے دیکھا ہے۔"

پھر بھی ایک قسم کی جبلت نے اس کی آواز نیچی کر دی تھی، مگر اتنی نہیں کہ ماریوس اس کے باتیں سن نہ سکے۔ ایک اتفاق، جس نے ماریوس کو ایک لفظ بھی ضائع نہ ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا، یہ تھا کہ برف گرنی شروع ہو گئی تھی، جس کے باعث بولیوارڈ پر چلنے والی گاڑیوں کا شور تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ماریوس نے جو کچھ سنا، وہ یہ تھا:

"غور سے سنو۔ Croesus [Lydia کا بادشاہ جو بہت دولت مند تھا، جسے سائرس اعظم نے شکست دی تھی؛ اس سے مراد ہے: بے حد دولت مند آدمی] ہمارے ہاتھ آ گیا ہے، یا پکڑے جانے کے قریب ہے۔ سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا ہے۔ سب انتظام کر دیا گیا ہے۔ میں کچھ لوگوں سے مل چکا ہوں۔ وہ آج شام چھ بجے یہاں آئے گا۔ ساٹھ فرانک دینے کے لیے، سالا! بدمعاش! دیکھا تم نے، میں نے کیسا کھیل کھیلا ہے اس کے ساتھ — میرے ساٹھ فرانک — میرا مالک مکان — میرا چار فروری کا دن؟ مجھ پر تو ایک چوتھائی برس کا بھی کرایہ قرض نہیں۔ ہے نا، وہ بیوقوف! سو، وہ شام چھ بجے آنے والا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب ہمارا پڑوسی ڈنر کے لیے باہر جاتا ہے۔ مادر بوگوں برتن دھونے شہر چلی جاتی ہے۔ عمارت میں ایک بھی ذی روح نہیں ہوتا۔ پڑوسی گیارہ بجے رات

سے پہلے واپس نہیں آتا۔ بچیاں نگاہ رکھیں گی۔ تم ہماری مدد کروگی۔ وہ ہتھیار ڈال دے گا۔"
"اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو؟" بیوی نے سوال کیا۔
ژانڈریت نے مکاری سے اس کی طرف دیکھا، اور کہا، "ہم اس کو ٹھیک کر دیں گے۔"
یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔
یہ پہلا موقع تھا کہ ماریوس نے اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ہنسی ظالمانہ بھی تھی اور پیار بھری بھی، جس نے ماریوس کو لرزہ دیا تھا۔
ژانڈریت نے آتش دان کے قریب رکھی الماری کھولی، اس میں سے ایک پرانی ٹوپی نکالی، اپنی قمیص کی آستین سے صاف کی اور سر پر رکھ لی۔
"اب" اس نے کہا، "میں باہر جا رہا ہوں۔ کچھ لوگ ہیں مجھے جن سے ضرور ملنا ہے۔ اچھے لوگ۔ تم دیکھنا، یہ سب کچھ کس طرح ہو جائے گا۔ میں کم سے کم وقت کے لیے جا رہا ہوں۔ کام ٹھیک ہو جائے گا، تم گھر کا خیال رکھنا۔ اور اس نے اپنی دونوں مٹھیاں پتلون کے جیبوں میں ٹھونس لیں، ایک لمحے کے لیے کھڑا سوچتا رہا، اور پھر بلند آواز میں بولا، "جانتی ہو! آج میرا خوش قسمتی کا دن ہے، کہ اس نے اب تک مجھے پہچانا نہیں ہے۔ اگر اس نے مجھے پہچان لیا ہوتا تو واپس نہیں آتا۔ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ یہ میری ڈاڑھی تھی جس نے مجھے بچا لیا ہے۔ میری رومانوی ڈاڑھی، میری بے چاری رومانوی ڈاڑھی!" اور ایک بار پھر وہ زور سے ہنسا۔
وہ کھڑکی کی طرف گیا۔ اب بھی برف گر رہی تھی، اور آسمان کو روشن کر رہی تھی۔
"کیسا ظالم موسم ہے!" اس نے کہا۔ اس کے بعد اس نے کوٹ اپنے سینے پر لپیٹ لیا، "یہ پوست میرے لیے بہت بڑی ہے۔ کوئی بات نہیں۔" اور مزید کہا، "بدمعاش نے اچھا کام کیا کہ میرے لیے کوٹ چھوڑ گیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں باہر جا نہیں سکتا تھا، اور سارا کام بگڑ گیا ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں کیسے کام آجاتی ہیں، بہر حال۔" اس نے ٹوپی اپنی آنکھ تک کھینچی، کمرے سے باہر نکل گیا۔
ابھی وہ چند قدم ہی چلا ہوگا کہ دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس کا وحشی مگر ذہین چہرہ ایک بار پھر نمودار ہوا۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا۔" اس نے کہا، "کوئلہ لے آنا۔" اور اس نے بیوی کے ایپرن میں پانچ فرانک کا سکہ اچھال دیا، وہی سکہ جو "فیاض" دے گیا تھا۔
"کوئلہ؟" بیوی نے پوچھا۔
"ہاں۔"
"کتنے پیمانے بھر؟"

"دو۔"

"اس میں تیس سو لگیں گے۔ بقیہ سے ڈنر کے لیے کچھ لے آؤں گی۔"

"نہیں۔"

"کیوں۔"

"پورے سو نہ خرچ کر دینا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے بھی کچھ خریدنا ہے۔"

"کیا؟"

"کوئی چیز۔"

"تمھیں کتنے کی ضرورت ہوگی؟"

"کیا ہمارے علاقے میں کسی آہن گر کی دکان ہے؟"

"Mouffetard اسٹریٹ پر ہے۔"

"ارے ہاں، گلی کے نکڑ پر کی دکان، میں نے دیکھی ہے۔"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تمھیں کتنے کی ضرورت ہوگی، اور کیا خریدو گے؟"

"پچاس سو— تین فرانک۔"

"پھر تو، ڈنر کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔"

"آج کا مسئلہ کھانے کا نہیں ہے۔ کوئی بہتر کام کرنا ہے۔"

"میرے ہیرے الیس بہت ہو چکا۔"

بیوی کے ان الفاظ کے ساتھ ژاندریت نے دروازہ بند کر دیا اور اس بار ماریوس نے راہداری میں اس کے قدموں کی دور ہوتی ہوئی، زینے اترنے کی آواز سنی۔

ٹھیک اس وقت Saint-Medard کے گھنٹا گھر نے ایک بجا دیا۔

۞

ژاندریت خاندان کی خباثت

ماریوس، خواب دیکھنے والا جیسا کہ وہ ہمیشہ سے تھا، اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، فطرتاً ایک مستعد انسان تھا۔ تنہائی میں مراقبے کی عادت نے جو اس میں ہم دردی اور خدا پرستی کے جذبے نے ابھاری تھی، شاید اس کے اندر ہیجان پیدا کرنے کی لیاقت کم کردی تھی، مگر اس میں برائی سے پنجہ آزمائی کی طاقت باقی رہ گئی تھی؛ اس میں برہمن کی سی ہم دردی تھی، اور جج کی سی سختی؛ وہ مینڈک پر رحم کھاتا تھا، مگر سانپ کو کچل دیتا تھا۔ اس وقت اس کی نگاہیں زہریلے سانپوں کے سوراخ کی طرف منعطف ہوگئی تھیں، واقعی وہ عفریتوں کا اڈا تھا جو اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

"ان بدنصیبوں کو دبا دینا چاہیے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

ایک بھی معمے کی جسے وہ حل دیکھنا چاہتا، وضاحت نہیں ہوئی تھی؛ اس کے برعکس سب کے سب زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اسے نہ لکسمبرگ کی کنواری دوشیزہ کی کوئی خبر تھی نہ اس آدمی کا کوئی پتا تھا جس کو وہ موسیو لیبلانک کہتا تھا۔ صرف ژاندریت ہی ان دونوں سے واقف تھا۔ ان پراسرار الفاظ کے علاوہ جو سرگوشی میں کہے گئے تھے، اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ کسی خفیہ حملے کی تیاری ہو رہی ہے، کہ ایک ہول ناک پھندا تیار کیا جا رہا ہے؛ کہ وہ دونوں — لڑکی غالباً، اور اس کا باپ یقیناً — خطرے میں تھے؛ کہ ان دونوں کو بچایا جانا چاہیے، کہ ژاندریت خاندان کی گھناؤنی سازش ناکام بنادی جانی چاہیے، اور ان مکڑیوں کا جالا توڑ دیا جانا چاہیے۔

ماریوس نے خاتون ژاندریت پر ایک لمحے کے لیے اپنی نگاہ مرکوز کر دی تھی۔ اس عورت نے کمرے کے ایک کونے سے لوہے کی چادر سے بنا ایک اسٹوو نکالا، اور لوہے کے کباڑ میں کوئی شے تلاش کرنے میں مشغول تھی۔

جس قدر آہستگی سے ممکن ہوا، ماریوس کموڈ سے اترا، اور اس بات کا خیال رکھا کہ ہلکی

سے بھی آواز نہ ہو۔ اس دہشت میں کہ کس بات کی تیاری کی جارہی ہے، اور اس جوش سے، جو ژاندریت خاندان نے اس میں پیدا کر دیا تھا، اسے ایک قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اس فرد کی خدمت کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔

مگر یہ کس طرح کیا جاتا؟ ان لوگوں کو کیسے متنبہ کیا جائے جو خطرے میں ہیں؟ اسے ان کا پتا تک معلوم نہیں تھا۔ وہ لوگ ایک بار پھر، اس کی آنکھوں کے سامنے اور پیرس کی لا انتہا گہرائیوں میں کھو گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا— کیا وہ چھ بجے شام کو دروازے کے قریب موسیو لیبلانک کے آنے کا انتظار کرے اور اس کو اس پھندے کے بارے میں آگاہ کر دے؟ مگر ژاندریت اور اس کے لوگ اسے دیکھ لیں گے، کہ وہ جگہ عام طور پر سنسان ہوتی ہے؛ کہ وہ لوگ ماریوس سے زیادہ طاقت ور ہیں، اسے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے کی کوشش کریں گے اور وہ آدمی، ماریوس جس سے ملنے کے لیے بے چین ہے، ایک بار پھر گم ہو جائے گا۔

ایک بجے کا گھنٹا بج چکا تھا۔ پھندا چھ بجے شام لگنے والا تھا۔ ماریوس کے پاس پانچ گھنٹے رہ گئے تھے۔

اب اس کے سامنے بس ایک ہی کام تھا۔

ماریوس نے اپنا سب سے اچھا کوٹ پہنا، گلے میں ریشمی رومال باندھا، ہیٹ اٹھائی اور باہر چلا گیا، آواز کیے بغیر، اس قدر آہستگی سے گویا وہ کائی پر ننگے پیر چل رہا ہو۔

خاتون ژاندریت اپنے پرانے لوہے کے انبار میں کچھ تلاش کرنے میں مشغول تھی۔

گھر سے باہر نکلتے ہی وہ Petit-Banquier اسٹریٹ پہنچ گیا۔

وہ سڑک کے بالکل درمیان میں پہنچ گیا تھا، ایک بہت نیچی سی دیوار کے قریب جسے ایک خاص جگہ سے عبور کیا جا سکتا تھا، جس سے ملی ہوئی ایک بنجر زمین تھی۔ ماریوس بہت آہستہ چل رہا تھا، اور گرتی ہوئی برف کے باعث اس کے قدموں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک، اسے قریب سے کچھ آوازیں آتی سنائی دیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا، سڑک سنسان پڑی تھی، اس پر ایک ذی روح بھی نہیں تھا؛ دن کا وقت تھا؛ پھر بھی وہ کچھ آوازیں صاف سن رہا تھا۔

اس نے سوچا کہ دیوار کے اس پار دیکھا جائے، وہ جس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

دیوار کی دوسری جانب سپاٹ برف پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ان کی پشت دیوار کی جانب تھی، اور وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

ماریوس ان دونوں افراد سے واقف نہیں تھا؛ ایک کے چہرے پر ڈاڑھی تھی اور وہ بلاؤز پہنے ہوئے تھا؛ دوسرا لمبے بالوں والا چیتھڑوں میں تھا۔ ڈاڑھی والا مراکشی ٹوپی پہنے تھا، دوسرا ننگے سر تھا اور اس کے بالوں پر برف پڑی تھی۔

دیوار کے اوپر سے جھانکنے سے ماریوس کو ان کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔

بال والے نے دوسرے آدمی کو کہنی ماری اور کہا "...... [غنڈوں کے گروہ] Patron-Minette کی مدد کے بعد یہ منصوبہ ناکام نہیں ہو سکتا۔"

"واقعی؟" داڑھی والے نے کہا۔

لمبے بالوں والے نے اپنی بات دوبارہ شروع کی، "اب صورتِ حال یہ تو ایسی ہے گویا ہر ایک کے لیے پانچ سو فرانک کا پروانۂ گرفتاری جاری کر دیا گیا ہو، اور ان کو کم سے کم پانچ، چھ یا دس برس کی سزا ہو سکتی ہے۔"

اپنی مراکشی ٹوپی کے نیچے کانپتے ہوئے، دوسرے آدمی نے کچھ تامل سے جواب میں کہا، "واقعی، یہ کام تو پکا ہے، ایسے کام ناکام نہیں ہو سکتے۔"

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ یہ کھیل خراب نہیں ہوگا۔" لمبے بالوں والے نے کہا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک تماشے کے بارے باتیں شروع کر دیں جو پچھلی شام Gaite تھیٹر کے دروازے پر ہوا تھا۔

ماریوس اپنے راستے چلا گیا۔

اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان آدمیوں کی مخفی گفتگو جو اس دیوار کے پیچھے گرتی برف میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے، ژاندریت خاندان والوں کے مکروہ منصوبوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر نہیں تھی۔ معاملہ یقیناً وہی تھا۔

ماریوس نے پیرس کی مضافاتی بستی کی طرف رخ کیا، اور پہلی دکان جو راستے میں پڑی اس سے پولیس کمشنری کا پتا دریافت کیا۔

اس کو Pontoise اسٹریٹ کی 14 نمبر عمارت کی طرف جانے کا مشورہ دیا گیا۔

ماریوس اسی طرف چل پڑا۔

اتفاق سے راستے میں ایک بیکری کی دکان پڑی جہاں سے اس نے ایک رول خرید کر کھایا، اس خیال سے کہ اسے آج رات کا کھانا گول کرنا پڑے گا۔

راستے میں اسے خیال آیا کہ اگر اس نے ژاندریت لڑکی کو اس صبح پانچ فرانک نہ دیے ہوتے تو اس نے موسیو لیبلانک کی ٹو گاڑی کا پیچھا کیا ہوتا، اور وہ معاملے سے اتنا بے خبر نہ رہتا، اور یہ بھی کہ ژاندریت خاندان کے منصوبے خاک میں مل جاتے اور بلاشبہ موسیو لیبلانک اور اس کی بیٹی ان کے مکروہ جال سے بچے رہتے۔

۞

پولیس اہل کار اور دو پستول

ماریوس Pontoise اسٹریٹ چودہ نمبر عمارت پہنچا، پہلی منزل پر گیا اور پولیس کمشنری کے بارے میں دریافت کیا۔

"پولیس کمشنری یہاں نہیں۔" وہاں موجود ایک کلرک نے کہا "مگر یہاں ایک پولیس انسپکٹر ہوتا ہے۔ کیا تم اس سے بات کرنا پسند کرو گے؟ کیا تم عجلت میں ہو؟"

ماریوس نے کہا "ہاں۔"

کلرک نے اسے دفتر کے اندر بلا لیا۔ وہاں جالی کے پیچھے ایک قد آور آدمی اسٹوو پر ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں سے اپنے تین کالروں والے کوٹ کے عقبی دامن کو پکڑے کھڑا تھا۔ چوڑا چہرہ، بھینچے ہوئے ہونٹ، بھوری اور نباتات خوف ناک مونچھیں، اور ایسی خشمگیں نظریں جو آپ کو پریشان کر دیں۔ ان نظروں کی بابت یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ چھیدتی نہیں، کچھ تلاش کرتی رہتی ہیں۔

اس آدمی کا انداز بھی ژاندریت کے انداز سے کم خوف ناک اور کم خوں خوار نہ تھا؛ کبھی کبھی ایک کتا بھی بھیڑیے سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔

"کیا چاہتے ہو؟" اس نے ماریوس سے کہا، "موسیو" کا اضافہ کیے بغیر۔

"کیا آپ موسیو پولیس کمشنر نہیں؟"

"وہ آج غیر حاضر ہیں۔ ان کی جگہ میں ہوں۔"

"معاملہ بہت نجی قسم کا ہے۔"

"تو کہو۔"

"بہت سرعت کی ضرورت ہے۔"

"تو جلد بولو۔"

وہ پُرسکون اور بے ربطی سے بولنے والا انسان خوف ناک بھی تھا اور مطمئن کر دینے والا بھی۔ وہ خوف زدہ بھی کرتا تھا اور اطمینان کا باعث بھی ہوتا تھا۔ ماریوس نے خود کلامی کے انداز میں کہنا شروع کیا، "وہ آدمی جسے، سوائے اسے دیکھ لینے کے میں اس سے بالکل واقف نہیں تھا، آج شام پھنسا دے کر ایک پھندے میں پھنسایا جانے والا ہے؛ اور چوں کہ میں، یعنی ماریوس مون پرسی وکیل، نانا کے برابر والے کمرے میں رہتا ہوں، میں نے خود ایک سوراخ کے ذریعے اس سازش کے بارے میں سنا ہے؛ کہ وہ مفلوک الحال جس نے اس پھندے کا منصوبہ بنایا ہے ژاندریت نامی ایک شخص ہے؛ کہ پشتوں کے قریب لوٹ مار کرنے والے اس کے کچھ ساتھی بھی ہوں گے، جن میں ایک شخص Panchaud عرف Printanier, عرف Bigrenaille ہے؛ کہ ژاندریت کی لڑکی اس کا انتظار کرنے والی ہے؛ کہ اس آدمی کو جو خطرے میں ہے اسے کسی طرح مطلع نہیں جا سکتا اس لیے کہ اس کا نام بھی نہیں معلوم؛ اور یہ بھی کہ اس سازش پر Boulevard de l'Hopita کی عمارت نمبر 52-50 میں اس شام عمل کیا جانے والا ہے۔

اس نمبر پر، انسپکٹر نے اپنا سر اٹھایا، اور سرد مہری سے بولا، "اچھا، تو وہ کمرہ راہداری کے بالکل آخر میں ہے؟"

"بالکل صحیح۔" ماریوس نے جواب میں کہا، اور اس میں اضافہ کیا، "کیا آپ اس مکان سے واقف ہیں؟"

انسپکٹر ایک لمحے خاموش رہا، اس کے بعد بولا، جب وہ اپنے بوٹ کی ایڑی کو اسٹوو کے دروازے سے لگا کر گرم کر رہا تھا، "ظاہر ہے۔" اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس طرح کہا، گویا وہ ماریوس سے نہیں اپنے گلوبند سے باتیں کر رہا ہو، "یقیناً اس میں Patron-Minette کا ہاتھ ہوگا۔"

یہ لفظ سن کر ماریوس چونک پڑا۔

"Patron-Minette" اس نے کہا، "دراصل میں نے یہ نام سنا ہے۔"

اس کے بعد ماریوس نے انسپکٹر کے سامنے وہ گفتگو دہرائی جو اس نے Petit-Banquier اسٹریٹ کی دیوار کے پیچھے برف پر بیٹھے لمبے بالوں والے اور ڈاڑھی والے کے درمیان سنی تھی۔

انسپکٹر بڑبڑایا، لمبے بالوں والا بروژوں ہوگا اور ڈاڑھی والا Demi-Liard عرف

Milliards Deux رہا ہوگا۔"

اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے خیالات میں گم ہوگیا۔

"جہاں تک باپ کا معاملہ ہے، کیا نام ہے اس کا، میں اسے پہچانتا ہوں۔ وہاں میرا کوٹ جل گیا تھا۔ ان کے کمرے کے متعلق اسٹوو میں ہمیشہ ضرورت سے زیادہ آگ بھری ہوتی ہے۔ نمبر 50-52۔ Gorbeau کی سابقہ ملکیت ہے۔"

پھر اس نے ماریوس پر نظر کی۔

"کیا تم نے صرف اس ڈاڑھی والے اور لمبے بالوں والے کو دیکھا ہے؟"

"Panchaud کو بھی۔"

"تم نے کسی خوش لباس شخص کو اس جگہ پر گھومتے پھرتے نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"نہ اس گوشت کے پہاڑ، ہاتھی جیسے شخص Jardin des Plantes کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"نہ شکرے جیسے انداز والے اس اٹھائی گیر کو؟"

"نہیں۔"

"یہ چوتھا شخص، جسے اس کے مددگار، کلرک، اور ملازم بھی نہیں دیکھتے۔ اسے تم نے بھی نہیں دیکھا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔"

"نہیں دیکھا، مگر یہ ہیں کون لوگ؟" ماریوس نے سوال کیا۔

انسپکٹر نے جواب دیا، "مگر، یہ ان لوگوں کے کام کرنے کا وقت نہیں۔"

اس کے بعد وہ پھر خاموش ہوگیا؛ اور دوبارہ کہنا شروع کیا:

"50-52۔ میں اس بیرک کو جانتا ہوں۔ اس میں، فن کاروں کی نظر سے بچ کر چھپنا ممکن نہیں، اور وہ لوگ نوٹنکی [کھیل] کو روک کر ہی اٹھ سکتے ہیں۔ کتنے نیک لوگ ہیں وہ، تماشائی انھیں شرمندہ کر دیتے ہیں۔ یہ والا نہیں کرو، یہ والا نہیں، وہ والا کرو۔ میں انھیں گاتے سننا اور ناچتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کی خود کلامی ختم ہوئی تو انسپکٹر ماریوس سے مخاطب ہوا، اس کو ایک لمحہ گھور کر دیکھتے ہوئے کہا، "کیا تم خوف زدہ ہو؟"

"کس بات سے؟"

"ان لوگوں سے۔"

"تم سے زیادہ خوف زدہ نہیں۔" ماریوس نے تلخی سے جواب میں کہا، جس کو اب احساس ہو چکا تھا کہ اس پولیس اہل کار نے اسے "موسیو" کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔

انسپکٹر نے اور زیادہ توجہ سے ماریوس کو گھور کر دیکھا، اور بناوٹی سنجیدگی سے کہا، "تم ایک بہادر اور ایمان دار آدمی کی طرح بول رہے ہو۔ ہمت جرم سے خوف زدہ نہیں ہوتی، اور ایمان داری اختیار سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔"

ماریوس اس کی گفتگو میں مخل ہوا، "یہ سب تو ٹھیک ہے مگر تمھارا ارادہ کیا ہے؟"

انسپکٹر نے بس اتنا کہنے پر اکتفا کی:

"کرایہ داروں کے پاس رات کے وقت اندر جانے کے لیے کنجی ہوتی ہے۔ تمھارے پاس بھی ضرور ہوگی۔"

"ہاں ہے۔" ماریوس نے کہا۔

"کیا اس وقت بھی تمھارے پاس ہے؟"

"ہاں۔"

"ذرا مجھے دینا تو۔" انسپکٹر نے کہا۔

ماریوس نے اپنی واسکٹ کی جیب سے کنجی نکال اور انسپکٹر کو دے دی۔

"میرا مشورہ مانو تو، تمھیں کچھ طاقت دکھانی پڑے گی۔"

انسپکٹر نے ماریوس پر ایسی نظر ڈالی جیسی کہ والٹیئر نے کسی صوبائی ریاضی داں پر ڈالی تھی جس نے اس کو ایک مصرع دیا تھا: ایک ہی حرکت میں اس نے اپنی بڑی بڑی جیبوں میں اپنے مہیب ہاتھ ڈالے اور دو چھوٹے چھوٹے آہنی پستول نکالے، اس قسم کے جن کو knock-me-downs کہا جاتا تھا۔ اور تیزی سے سخت لہجے میں کہا،

"یہ لو، اور گھر جاؤ۔ اپنے کمرے میں اس طرح چھپ جاؤ گویا تم باہر گئے ہوئے ہو۔ دونوں پستول بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں دو دو گولیاں ہیں۔ تم نے بتایا ہے کہ تمھارے کمرے کی دیوار میں سوراخ ہے، اس ذریعے سے ان پر نظر رکھو۔ وہ لوگ آئیں گے۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تم سمجھو کہ معاملہ سنگین ہو رہا ہے، اور ان لوگوں کو روکنے کا وقت آگیا ہے تو ایک گولی داغ دو، مگر بہت جلدی نہ کر دینا۔ بقیہ میری ذمے داری ہوگی۔ ایک گولی چلانا، ہوا میں یا چھت کی طرف، جس طرح بھی تم چاہو۔ سب چیزوں سے اوپر، مگر بہت جلد نہیں۔ اس

وقت تک انتظار کرنا جب تک کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل شروع نہیں کر دیتے؛ تم خود وکیل ہو، موقع محل کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔" ماریوس نے دونوں پستول لے کر اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیے۔

"یہ ابھار تو نظر آئیں گے۔" انسپکٹر نے کہا، "ان کو اپنی پتلون کی جیبوں میں رکھ لو۔"

ماریوس نے پستول اپنی پتلون کی جیبوں میں چھپا لیے۔

"اب" انسپکٹر نے کہا، "کوئی شخص ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرے گا۔ کیا وقت ہوا ہے؟ ڈھائی بجے ہیں۔ ہدف سات بجے شام کا ہے۔"

"چھ بجے شام۔" ماریوس نے جواب میں کہا۔

"میرے پاس بہت وقت ہے۔" انسپکٹر نے کہا، "مگر بہت زیادہ بھی نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، بھولنا نہیں۔ ٹھائیں۔ پستول کی ایک گولی، اور بس۔"

"اطمینان رکھو۔" ماریوس نے کہا۔

اور جوں ہی ماریوس نے باہر جانے کے لیے دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھا، انسپکٹر نے اس سے کہا،

"ارے ہاں، اب اور اس وقت کے درمیان میری خدمات کی ضرورت ہو تو آ کر مجھ سے مل لینا، میرا نام انسپکٹر جاویر ہے۔"

۞

ژاندریت کی خریداریاں

چند لمحوں بعد، اندازاً تین بجے، کوفیراک اتفاق سے بوسے کے ساتھ Mouffetard اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ برف باری کی شدت دُگنی ہو گئی تھی اور فضا میں برف ہی برف تھی۔ بوسے کوفیراک سے کہہ رہا تھا، ''گرتی ہوئی برف، ایسی لگتی ہے گویا آسمان سے پریاں اتر رہی ہوں۔'' اچانک بوسے کو پشتے کی جانب، سے کچھ عجب انداز میں ماریوس آتا دکھائی دیا۔

''ٹھہرو!'' بوسے نے کہا، ''وہ دیکھو ماریوس۔''

''میں نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔'' کوفیراک نے کہا، ''مگر ہم اس سے بات نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟''

''وہ مصروف ہے۔''

''کس کام میں؟''

''تمھیں اس کا انداز نظر نہیں آرہا ہے؟''

''کیسا انداز؟''

''جیسے وہ کسی کا پیچھا کر رہا ہو؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' بوسے نے کہا۔

''ذرا دیکھو تو، اس کی آنکھیں کیسی ہو رہی ہیں!'' کوفیراک نے کہا۔

''مگر وہ پیچھا کس کا کر رہا ہے؟''

''ایک پھول دار ترچھے والی فاحشہ کا۔ محبت ہو گئی ہے اس کو۔''

''مگر'' بوسے نے کہا ''مجھے نہ تو کوئی پھول دار ترچھا نظر آرہا ہے نہ کوئی فاحشہ عورت!''

کوفیراک نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور بلند آواز میں بولا، "وہ یقیناً کسی آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔"
واقعی وہ بھورے رنگ کی ٹوپی پہنے ایک آدمی تھا جس کی ڈاڑھی پہچانی جا سکتی تھی حالاں کہ انھیں صرف اس کی پشت نظر آ رہی تھی جو ماریوس سے تقریباً بیس قدم آگے جا رہا تھا۔
وہ آدمی بڑا سا کوٹ پہنے تھا جو بالکل نیا تھا اور اس کے جسم کے لحاظ سے بہت بڑا تھا، اور ڈراؤنے قسم کا پتلون پہنے تھا جس سے چیتھڑے لٹک رہے تھے اور اس میں سیاہ رنگ کا کیچڑ بھرا تھا۔
بوسے زور سے ہنس پڑا۔
"کون ہے یہ آدمی؟"
"کون، وہ آدمی؟" کوفیراک نے کہا، "شاعر ہو گا کوئی۔ شاعروں کو خرگوش کی کھال کے پتلون اور فرانس کے نوابوں کے کوٹ بہت پسند آتے ہیں۔"
"دیکھتے ہیں، ماریوس جاتا کدھر ہے۔" "دیکھیں وہ آدمی کدھر جاتا ہے۔ آؤ، ہم بھی ان کا پیچھا کرتے ہیں۔"
"بوسے!" کوفیراک نے زور سے کہا، "Meaux کے عقاب! تم عجیب وحشی ہو۔ اس آدمی کا پیچھا کر رہے ہو جو کسی اور آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ واہ!"
وہ الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔
دراصل ماریوس نے ژاں والژاں کو Mouffetard اسٹریٹ پر جاتے دیکھ لیا تھا، اور اس کی جاسوسی کر رہا تھا۔
ژاں والژاں سیدھا چلا جا رہا تھا۔ اسے شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس کو تاڑ رہا ہے۔
اس شخص نے Mouffetard اسٹریٹ چھوڑ دی، اور ماریوس نے اسے Gracieuse اسٹریٹ پر بنے نہایت ڈراؤنے جھونپڑوں میں داخل ہوتے دیکھا؛ وہ شخص وہاں تقریباً چوتھائی گھنٹے رہا اور پھر Mouffetard اسٹریٹ پر واپس آ گیا۔ اب وہ ایک لوہار کی دکان کے قریب رکا، جو Pierre-Lombard اسٹریٹ کے نکڑ پر واقع تھی، اور چند منٹ بعد ماریوس نے اسے دکان سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی آہنی چھینی تھی جس میں لکڑی کا دستہ لگا تھا جس کو اس نے اپنے بڑے سے کوٹ کے اندر چھپا لیا تھا۔ Petit-Gentilly اسٹریٹ کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ Petit-Banquier اسٹریٹ کی طرف تیزی سے بڑھا۔ دن تیزی سے ختم ہو رہا تھا؛ اور برف، جو تھوڑی دیر کے لیے رکی تھی، ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔ ماریوس نگاہ رکھنے کے لیے Petit-Banquier اسٹریٹ کے نکڑ پر کھڑا ہو گیا جو عام طور پر سنسان

ہوتی ہے اور اس نے ژاندریت کا تعاقب نہیں کیا۔ اچھا ہوا کہ اس نے تعاقب نہیں کیا تھا، اس لیے کہ اس دیوار کے قرب و جوار میں آنے پر، جہاں اس نے لمبے بالوں اور داڑھی والے کی گفتگو سنی تھی، ژاندریت نے مڑ کر دیکھا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے، اور جب اس نے دیکھا کہ کوئی تعاقب میں نہیں ہے تو دیوار کے اس پار کود کر غائب ہو گیا۔

دیوار کے قریب کی بنجر زمین ایک بدنام اصطبل والے کے آنگن کی دیوار سے ملی تھی، جس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا جس کے سائبان کے نیچے اب بھی چند پرانی گھوڑے گاڑیاں کھڑی تھیں۔

ماریوس نے سوچا کہ ژاندریت کے غیاب سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ دیر ہوتی جا رہی تھی؛ ہر شام مادام بوگوں جب برتن دھونے کے لیے شہر جاتی تو حسبِ معمول دروازے میں تالا لگا جاتی تھی، جو ہر شام بند ہو جایا کرتا تھا۔ ماریوس نے اپنی کنجی انسپکٹر پولیس کو دے دی تھی، اس لیے اسے جلدی کرنا تھی۔

شام ہو چکی تھی، رات سر پر آ گئی تھی؛ افق پر اور پورے خلا میں ایک ہی شے رہ گئی تھی جسے سورج نے روشن کر رکھا تھا، اور وہ چاند تھا۔

چاند Salpetriere کے گنبد کے پیچھے شفق کی سرخیوں کے درمیان سے بلند ہو رہا تھا۔

ماریوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا 52-50 پہنچا۔ وہ پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پنجوں کے بل سیڑھیاں چڑھا اور راہداری کی دیوار سے لگا پھسلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ قاری کو یاد ہو گا کہ راہداری کی دونوں جانب بالاخانے تھے جو اس وقت کرایے کے لیے خالی تھے۔ ماریوس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے خالی کوٹھریوں میں چار آدمیوں کے سر دیکھے ہوں، ایک چھوٹی سی کھڑکی سے آنے والی روشنی میں جن کے بال چمک رہے تھے۔

ماریوس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ چاہا کہ اسے دیکھا جائے۔ وہ بغیر کسی قسم کی آواز کیے اپنے کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وقت آ گیا تھا۔ ایک لمحے بعد اس نے مادام کو رخصت ہوتے اور دروازے کو قفل لگاتے دیکھا۔

۞

انگریزی الفاظ کا فیشن

ماریوں اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت ساڑھے پانچ بجے رہے ہوں گے۔ اس کے اور آج کے ہونے والے واقعے میں صرف نصف گھنٹے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اسے اپنی شریانوں کی دھڑکن اس طرح سنائی دی جیسے اندھیرے میں گھڑی کی ٹک ٹک۔ اس وقت وہ دہری دوڑ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اندھیرے میں جاری تھی — ایک جانب جرم بڑھ رہا تھا، دوسری جانب انصاف آرہا تھا۔ اسے خوف تو نہیں تھا مگر کپکپی کے بغیر وہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن پر اچانک ایک غیر متوقع حملہ ہو جائے۔ سارا دن اس پر خواب کی سی کیفیت طاری رہی، اور اس خیال سے کہ وہ کسی ڈراؤنے خواب کا شکار نہ ہو جائے اسے اپنے پتلون کی جیبوں میں رکھے پستولوں کی ٹھنڈی نالیوں کو بار بار محسوس کرنا پڑ رہا تھا۔

برف پڑنی بند ہو گئی تھی؛ چاند نے خود کو دھند سے الگ کر لیا تھا، اور اس کی روشنی اور گرتے ہوئے برف کے انعکاس مل کر کمرے میں ایک قسم کے جھٹپٹے کا سماں پیش کر رہے تھے۔

ادھر ژاندریت کی ماند میں روشنی ہو رہی تھی۔ ماریوں نے اپنے کمرے کی دیوار کے سوراخ میں ایک سرخ سی لپک دیکھ لی تھی جو اسے خون آلود محسوس ہو رہی تھی۔

یہ سچ ہے کہ شمع ایسی روشنی پیدا نہیں کر سکتی، مگر ژاندریت کے کمرے سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہاں کوئی نہ حرکت کر رہا تھا نہ بول رہا تھا؛ سانس تک کی آواز نہیں تھی؛ خاموشی برفانی اور گہری تھی؛ اگر وہاں روشنی نہ ہوتی تو اس کے پڑوس پر تربت کا گمان ہوتا۔

ماریوں نے نہایت آہستگی سے اپنے بوٹ اتارے اور اپنے پلنگ کی نیچے سرکا دیے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ ماریوں کو نیچے کے دروازے کے قلابوں کی آواز سنائی دی؛ بھاری

قدم اوپر آرہے تھے، اور راہداری میں آ کر تیز تیز چلنے لگے تھے؛ کمرے کے دروازے کی چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی؛ یہ ژاندریت کی واپسی تھی۔

اس کے ساتھ ہی کئی آوازیں سنائی دیں۔ پورا خاندان اوپری منزل پر آ گیا تھا صرف سردار کے غیاب میں خاموشی تھی، جیسے بھیڑیے کی غیر موجودگی میں بھیڑیے کا بچہ خاموش ہو جاتا ہے۔

"یہ میں ہوں۔" اس نے کہا۔

"شام بخیر، ڈیڈی!" لڑکیوں نے نعرہ لگایا۔

"اچھا!" ماں نے کہا۔

"سب کچھ بہترین طریقے سے ہو رہا ہے۔" ژاندریت نے جواب میں کہا "مگر میرے پیر شدید ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ بہت خوب! تم بالکل تیار ہو۔ تم نے اچھا کام کیا ہے۔ اب تمھیں جوش دلانا چاہیے۔"

"سب باہر جانے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں نے جو کچھ کہا تھا اسے بھولنا نہیں۔ تم لوگ سب کچھ یقین کے ساتھ کرو گے۔"

"یقیناً، سب آسان ہو جائے گا۔"

"اس لیے کہ ....." ژاندریت نے کہا اور اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

ماریوس نے اسے کوئی بھاری سی چیز میز پر رکھتے سنا تھی، شاید وہ چھینی تھی، جو اس نے خریدی تھی۔

"ارے ہاں" ژاندریت نے کہا، "کیا تم کچھ کھا رہی تھیں؟"

"ہاں" ماں نے کہا، "میں نے تین بڑے بڑے آلو اور کچھ نمک لیا تھا۔ جلتی آگ سے فائدہ اٹھایا اور ان کو پکا لیا۔"

"ٹھیک" ژاندریت نے جواب میں کہا، "کل میں تم لوگوں کو ڈنر کے لیے لے چلوں گا۔ ہم بطخ کھائیں گے۔ تم لوگ چارلس دہم کی طرح کھانا کھاؤ گے۔ سب کام ٹھیک ہو رہا ہے۔"

اس کے بعد اضافہ کیا، "چوہے دان کھلا ہوا ہے۔ بلیاں موجود ہیں۔" اس نے اپنی آواز مزید دھیمی کر لی، اور کہا، "اس کو آگ میں رکھ دو۔"

ماریوس نے چمٹے سے یا کسی آہنی شے سے کوئلوں کو ہٹانے اور چٹخنے کی آواز سنی، اور ژاندریت کہتا رہا، "تم نے دروازے کے قلابوں میں گریس لگا دی ہے، تا کہ شور نہ مچے؟"

"ہاں۔" ماں نے جواب میں کہا۔

''کیا وقت ہوا ہے؟''

''تقریباً چھ بجے ہیں۔تھوڑی دیر پہلے Saint-Medard نے آدھا گھنٹا بجایا تھا۔''

''شیطان کہیں کا!'' ژاندریت نے الفاظ اگلتے ہوئے کہا، ''بچے جائیں اور انتظار کریں۔تم میرے ساتھ آؤ، سن رہی ہو؟''

اس کے بعد سرگوشی میں کچھ باتیں ہوئیں۔

ژاندریت کی آواز ایک بار پھر سنائی دینے لگی تھی، ''کیا بونگوں چلی گئی ہے؟''

''ہاں۔'' ماں نے کہا۔

''تمھیں یقین ہے کہ پڑوس کے کمرے میں کوئی نہیں ہے؟''

''سارا دن وہ کمرے میں نہیں تھا، اور تم تو جانتے ہو کہ یہ اس کے ڈنر کا وقت ہے۔''

''تمھیں یقین ہے؟''

''قطعی۔''

''اس کے باوجود'' ژاندریت نے کہا ''دیکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں۔لو بیٹی، شمع لو اور وہاں جاؤ۔''

ماریوس ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھکا اور خاموشی سے اپنے پلنگ کے نیچے رینگ گیا۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چھپایا ہی تھا کہ اسے دروازے کے شگاف میں روشنی دکھائی دی۔''پاپا'' آواز بلند ہوئی، ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

اس نے بڑی بیٹی کی آواز پہچان لی تھی۔

''تم اندر گئی تھیں؟'' باپ نے مزید جرح کی۔

''نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا، ''چوں کہ اس کی کنجی دروازے میں لگی ہوئی ہے، وہ باہر گیا ہوگا۔''

باپ نے چیخ کر کہا ''پھر بھی اندر جاؤ۔''

دروازہ کھلا اور ماریوس نے طویل قد والی ژاندریت کو شمع لیے اندر آتے دیکھا۔وہ اس وقت بھی ویسی ہی تھی، جیسی صبح تھی، بس اس وقت روشنی میں زیادہ کریہہ لگ رہی تھی۔

لڑکی سیدھی پلنگ تک گئی۔ماریوس کو ناقابلِ بیان تشویش برداشت کرنی پڑی تھی؛ مگر بستر کے قریب ہی دیوار پر ایک آئینہ لگا ہوا تھا، اور اسی جانب لڑکی کے قدم بڑھ رہے تھے۔اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا۔پڑوس کے کمرے سے آہنی اشیا کے بنائے

جانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بال ٹھیک کیے؛ خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرائی اور اپنی بھرائی ہوئی اور غمگین آواز نے میں گنگنانے لگی:

ہماری محبت صرف ایک ہفتے رہی
مگر خوشیوں کے لمحات بھی کتنے چھوٹے ہوتے ہیں
آٹھ دن ایک دوسرے سے پیار کرنا کافی نہیں ہوتا
محبت کا وقت ابدی ہونا چاہیے

اس دوران ماریوں پر کپکپی طاری تھی۔اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ لڑکی اس کی سانس کی آواز نہ سننے پائے۔

لڑکی کھڑکی کی طرف گئی اور اپنے نیم احمقانہ انداز میں باہر دیکھا۔

''سفید قمیص پہن لے تو پیرس کتنا بدصورت دکھائی دینے لگتا ہے!''

لڑکی آئینے کی طرف واپس آئی اور اسی انداز میں اپنے پورے چہرے کو اور اس کے بعد تین چوتھائی چہرے کو دیکھا۔

''ارے کیا ہوا؟'' باپ نے چلا کر کہا، ''وہاں کیا کرنے لگی ہو؟''

میں پلنگ اور فرنیچر کے پیچھے دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے اپنے بال برابر کرتے ہوئے جواب دیا، ''یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''ارے احمق؟'' باپ چلایا ''فوراً واپس آ۔زیادہ وقت ضائع نہ کر۔''

''آرہی ہوں، آرہی ہوں۔'' لڑکی نے کہا، ''اس کمرے میں کسی چیز کے لیے وقت نہیں ہے۔''

وہ گنگنا رہی تھی:

مجھ کو چھوڑ کر اپنی شان بڑھانے چلے گئے
میرا اداس دل ہر جگہ تمھارا پیچھا کرے گا

لڑکی نے آئینے پر الوداعی نظر ڈالی، باہر چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ماریوں کو دو نوجوان لڑکیوں کی راہداری میں ننگے پاؤں چلنے کی آواز سنائی دی۔ثانڈریت کی آواز ان کو احکامات دے رہی تھی:

''بختی سے نگاہ رکھو۔تم میں سے ایک پشتے کے اس پار رہے اور دوسری Petit-

Banquier اسٹریٹ کے نکڑ پر۔ اس عمارت کے دروازے سے نظر ہٹنے نہ پائے۔ کچھ بھی دیکھو فوراً بھاگ کر اندر آؤ، جتنی جلد ہو سکے۔ اندر آنے کے لیے تمھارے پاس کنجی ہے۔"

بڑی لڑکی بڑبڑائی، "برف پر ننگے پاؤں کھڑے ہو کر نظر رکھنے کا خیال بھی عجیب ہے۔"

"کل تمھیں سبز ریشم کے جوتے ملیں گے۔" باپ نے کہا۔

وہ لوگ سیڑھی سے نیچے کی طرف بھاگے اور چند ثانیے بعد باہر کے دروازے کی دستک نے اعلان کیا کہ وہ لوگ آ گئے ہیں۔

مکان کے اندر اب صرف ماریوس، ژاندریت کے گھر والے اور شاید وہ پُراسرار وجود رہ گیا تھا، ماریوس نے جس کا ہیولا دھندلی روشنی میں دروازے کے پیچھے والے خالی بالاخانے میں دیکھا تھا۔

۞

ماریوس کے سکّے کا استعمال

ماریوس نے طے کرلیا کہ وقت آگیا ہے، کہ اب وہ نگاہ رکھنے والی اپنی چوکی، یعنی سوراخ پر پہنچ جائے۔ ایک ہی لمحے میں نہایت پھرتی سے وہ درمیانی دیوار کے سوراخ پر پہنچ گیا تھا۔

اس نے دیکھا۔

ژاندریت کے فلیٹ کا اندرون بے حد پُراسرار ہو رہا تھا۔ ماریوس کو اب اس ایک روشنی کا راز معلوم ہوا، جو اسے نظر آئی تھی۔

ایک شمع دان میں جو زنگار سے ڈھکا ہوا تھا، ایک موم بتی روشن تھی، اور صرف اسی سے کمرہ روشن نہیں تھا۔ حجرہ جلتے ہوئے کوئلوں سے بھری آہنی چادر سے بنی ایک بڑی سی انگیٹھی سے روشن تھا جو خاتون ژاندریت نے اسی دن تیار کی تھی۔ کوئلے پوری طرح دہک رہے تھے اور انگیٹھی سرخ ہو گئی تھی؛ اس کے اوپر ایک نیلا شعلہ لہرا رہا تھا، اور کوئلوں کے درمیان وہ چھینی گرم کرنے کے لیے ٹھونس دی گئی تھی جو ژاندریت نے Pierre-Lombard اسٹریٹ سے خریدی تھی۔ دروازے کے قریب کونے میں، اس طرح جیسے کسی مخصوص کام کے لیے بنائے گئے ہوں، دو ڈھیر نظر آ رہے تھے، جن میں بظاہر ایک ڈھیر لوہے کی پرانی اشیا کا تھا اور دوسرا رسیوں کا تھا۔ جس کو کچھ معلوم نہ ہو کہ کس کام کی تیاری تھی، اس کا ذہن ان ڈھیروں کو دیکھ کر کسی نامبارک کارستانی اور سادہ سے کام کے درمیان پس و پیش میں رہتا۔ اس طرح یہ ماند روشن ہونے اور جہنم کا منہ بننے کے بجائے آہن گر کی دکان بن گئی تھی مگر ژاندریت اس روشنی میں آہن گر کے بجائے دیو جیسا نظر آ رہا تھا۔

انگیٹھی کی حرارت اتنی شدید تھی کہ میز پر رکھی شمع کا وہ پہلو جو انگیٹھی کی طرف تھا پگھلنے لگا تھا اور موم بتی ایک طرف جھکتی جا رہی تھی۔ آتش دان کی چمنی پرانے سے بنی ایک قدیم

لالٹین رکھی ہوئی تھی، جو Diogenes کا قدیم مصری کتبہ معلوم ہوتی تھی۔
تقریباً بجھی ہوئی گٹھلیوں کے ساتھ، آتش دان میں رکھی انگیٹھی چمنی کے ذریعے اپنے بخارات خارج کر رہی تھی مگر اس سے کسی قسم کی بو نہیں نکل رہی تھی۔
کھڑکی کے چار شیشوں کے ذریعے داخل ہونے والا چاند گلابی رنگ میں نہائے شعلہ بار اندرون میں اپنی سفیدی بکھیر رہا تھا؛ اور ماریوس کے شاعرانہ جذبے کے لیے، جو عمل کے لمحے کے دوران بھی اپنے خیالات میں گم تھا، ایسا لگتا تھا جیسے آسمان کے خیالات زمین کے بدنما خیالات میں گڈمڈ ہو گئے ہوں۔
تازہ ہوا نے جو کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے جھروکے میں سے داخل ہو رہی تھی، کوئلے کی بدبو کو اُڑا دیا اور انگیٹھی کی موجودگی کو چھپا لیا تھا۔
ژاندریت کی ماند، اگر قاری کو یاد ہو کہ ہم نے Gorbeau منزل کے بارے میں کیا کہا تھا، بڑی خوبی سے ایک بدخو کام کے تھیٹر کے لیے اور ایک جرم کو چھپانے کے لیے منتخب کی گئی تھی۔ یہ پیرس کی سب سے سنسان، سب سے الگ تھلگ عمارت کی سب سے زیادہ ازکار رفتہ جگہ تھی۔ اگر گھات لگا کر بیٹھنے یا جال بچھانے کا کوئی نظام بن نہ چکا ہوتا تو شاید وہ سب اسی جگہ ایجاد ہوتے۔
اس عمارت کی پوری موٹائی اور بے شمار غیر آباد کمرے ژاندریت ماند کو بولیوارڈ سے الگ کرتے تھے، اور اس میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی جو غیر آباد زمینوں کی جانب کھلتی تھی جنھیں دیواروں اور نوکیلی لکڑیوں سے گھیرا گیا تھا۔
ژاندریت نے اپنا پائپ جلا لیا، بغیر سیٹ کی کرسی پر بیٹھ گیا اور تمباکو نوشی میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی اس سے دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔
جب اس کی نظریں خاتون ژاندریت پر پڑیں تو اگر ماریوس کی جگہ کوفیراک ہوتا، یعنی ان لوگوں میں سے ایک، جو زندگی کے ہر موقعے پر ہنستے ہیں، تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ اس عورت نے اپنے سر پر سیاہ رنگ کا ہیٹ لگا لیا تھا جس پر ایک کلغی لگی ہوئی تھی، جو ان ٹوپیوں جیسی تھی جو heralds-at-arms نے چارلس ہم کی تاج پوشی کے وقت پہنی تھی؛ بُنے ہوئے بنٹے کوٹ کے اوپر ایک بڑی سی tartan [اسکاٹ لینڈ کی چوخانے والی اونی شال] تھی، اور پاؤں میں مردوں کے جوتے تھے جو صبح کے وقت اس کی بڑی بیٹی نے خراب کر دیے تھے۔ لباس کے یہی انداز تھے جس نے ژاندریت سے کہلوایا تھا، "خوب! ہو تم تیار ہو گئی ہو۔ تم نے اچھا کام کیا ہے۔ تمھیں اعتماد کی فضا پیدا کرنی چاہیے!"

خود ژاندریت نے بھی وہ نیا کوٹ نہیں اتارا تھا جو اس کے لیے بہت بڑا تھا، جسے موسیولیبلانک نے اسے دیا تھا، اور اس کی پوشاک میں کوٹ اور پتلون کا وہی تقابل تھا جو کوفیراک کی نظروں میں پہننے والے کو ایک مثالی شاعر بنا دیتا ہے۔

اچانک ژاندریت نے اپنی آواز بلند کی:

"ارے ہاں، اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس موسم میں وہ کسی سواری میں آئے گا۔ لالٹین جلاؤ، اسے نیچے لے جاؤ۔ اور تم نچلے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گی۔ جوں ہی تمھیں گاڑی کے رُکنے کی آواز سنائی دے، تم فوراً دروازہ کھولوگی، وہ اوپر آئے گا، تم زینے اور راہداری کو روشن کروگی، اور جب وہ یہاں داخل ہو گا تب جتنی جلد ممکن ہو سکے تم نیچے چلی جاؤ گی، کوچوان کو کرایہ ادا کروگی اور پھر گاڑی کو فارغ کر دوگی۔"

"اور رقم؟" عورت نے سوال کیا۔

ژاندریت نے اپنے پتلون کی جیب ٹٹولی اور پانچ فرانک کا سکہ اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

ژاندریت نے نہایت جاہ وجلال کے ساتھ جواب دیا:

"یہ وہی بادشاہ [شاہی سکہ] ہے، جو ہمارے پڑوسی نے آج صبح ہمیں دیا تھا۔"

اس کے بعد مزید کہا، "سنو! یہاں دو کرسیوں کی بھی ضرورت ہوگی۔"

"کس لیے؟"

"ان پر بیٹھنے کے لیے۔"

ژاندریت کی زبان سے یہ معمولی سا جواب سنتے ہی ماریوس کے دست و پا میں کپکپی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

"بہتر، میں جاتی ہوں اور اپنے پڑوسی کی کرسیاں اٹھا لاؤں گی۔"

نہایت تیزی سے عورت نے ماند کا دروازہ کھولا اور باہر راہداری میں چلی گئی۔

ماریوس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا کہ وہ کموڈ سے اترتا، اپنے پلنگ تک جاتا اور اس کے نیچے چھپ جاتا۔

"موم بتی لیتی جاؤ۔" ژاندریت چیخا۔

"نہیں۔" عورت نے جواب دیا، "مجھے پریشانی ہو گی کہ مجھے دو کرسیاں اٹھانی ہیں۔ وہاں چاندنی تو ہے نا۔"

ماریوس کو اندھیرے میں خاتون ژاندریت کے بھاری ہاتھوں سے تالا ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھل گیا۔ خوف نے اسے اپنی جگہ پر ساکت کر دیا تھا۔

ژاندریت کمرے میں داخل ہو گئی۔

چھت کی ڈھلان میں بنی کھڑکی سے دو بلاکوں کی پرچھائیں کے درمیان چاندنی داخل ہو رہی تھی۔ ایک بلاک کی پرچھائیں نے اس دیوار کو ڈھک لیا تھا ماریوس جس سے لگا کھڑا تھا، اس طرح کہ وہ اس میں غائب ہو گیا تھا۔

خاتون ژاندریت نے اپنی آنکھیں اٹھائیں، مگر وہ ماریوس کو دیکھ نہیں سکی؛ دو کرسیاں اٹھائیں، ماریوس کے پاس یہی دو کرسیاں تھیں، اور دروازے کو کھلا چھوڑ کر چلی گئی، جو خود ہی زور سے بند ہو گیا تھا۔

عورت دوبارہ اپنی ماند میں داخل ہوئی۔

"یہ رہیں دو کرسیاں۔"

"اور یہ رہی لالٹین۔ جتنی جلد ہو سکے نیچے چلی جاؤ۔"

عورت نے تیزی سے حکم پر عمل کیا اور ژاندریت اکیلا رہ گیا۔

اس نے میز کی دونوں جانب کرسیاں رکھ دیں، انگیٹھی کی آگ میں دبی چھینی کو گھمایا، آتش دان کے سامنے ایک پرانی سی آڑ کھڑی کر دی جس نے chafing-dish کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے بعد کونے میں گیا جہاں رسیوں کا ڈھیر بنا ہوا تھا، اور جھک کر کسی چیز کا معائنہ کرنے لگا۔ اس وقت ماریوس کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ جسے وہ ایک بے ہنگم ڈھیر سمجھ رہا تھا قرینے سے بنائی گئی رسیوں کی سیڑھی تھی، جس کے پائیدان چوبی تھے، اور اس میں دو آنکڑے لگے ہوئے تھے جن کے ذریعے اسے لٹکایا جا سکتا تھا۔

یہ سیڑھی، اور کچھ بڑے بڑے اوزار، آہنی اشیا کا ڈھیر، ژاندریت کی ماند میں صبح کے وقت موجود نہیں تھا، ظاہر ہے کہ یہ سب ماریوس کی غیر موجودگی میں سہ پہر کے وقت وہاں لایا گیا تھا۔

"یہ سب دھار والے اوزار بنانے کے آلات ہیں۔" ماریوس نے سوچا۔

اگر ماریوس اس صنعت کے بارے میں زیادہ جانتا ہوتا، تو اس نے پہچان لیا ہوتا کہ جسے وہ تیز دھار بنانے والے اوزار کا انجن سمجھا تھا، اس میں سے کچھ آلے تالا توڑ سکتے ہیں، یا تالا کھول سکتے ہیں، اور دوسرے آلے، آلوں کے اس خاندان سے ہیں جو نقب زنوں کے کام آتے ہیں۔

آتش دان اور دو کرسیاں ماریوس کی چوکی [دیوار کے سوراخ] کے بالکل مقابل رکھی ہوئی

تھیں۔ انگیٹھی اب چھپا دی گئی تھی، کمرے کی روشنی صرف ایک شمع کی مرہون منت تھی۔ میز پر رکھا کراکری کا چھوٹا سے چھوٹا برتن بھی لمبی پرچھائیں بنا رہا تھا۔ اس کمرے میں کوئی شے تھی جو قابل بیان حد تک پُرسکون اور ڈراؤنی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا کسی خوف کے پیش بندی کی گئی ہے۔

ژاندریت نے اپنے پائپ کو بجھ جانے دیا جو کسی آنے والی مصروفیت کا اشارہ تھا اور ایک بار پھر وہ بیٹھ گیا تھا۔ موم بتی اس کے چہرے بشرے کے تند خو اور نفیس زاویے پیش کر رہی تھی۔ وہ کبھی ناک بھوں چڑھاتا، کبھی دائیں ہاتھ کو کھول دیتا گویا وہ اپنے اندرون میں ہونے والی خودکلامی سے ملنے والے اشاروں پر ردعمل ظاہر کر رہا ہو۔ اسی دوران اس نے تیزی سے میز کی دراز کھولی، ایک لمبا سا چاقو نکالا جو اس میں چھپایا گیا تھا، اور اس کی دھار کو اپنے ناخن پر آزمایا۔ اس کے بعد چاقو کو واپس دراز میں رکھ دیا۔

ادھر ماریوس نے اپنی دائیں جیب میں پستول کو گرفت میں لیا، باہر نکالا اور اس کا گھوڑا چڑھا دیا۔

گھوڑا چڑھاتے وقت ایک تیز آواز پیدا ہوئی۔

ژاندریت فوراً کھڑا ہو گیا، ایک لمحے کچھ سننے کی کوشش کی، پھر خود ہی ہنستا بھی شروع کر دیا، اور بولا، ”میں بھی کتنا احمق ہوں۔ ہمارے درمیان کی دیوار چیخ رہی ہے۔“

ماریوس پستول اپنے ہاتھ میں رکھے رہا۔

۞

ماریوس کی دو کرسیاں آمنے سامنے

اچانک گھڑی کی دور سے آنے والی غم انگیز لرزش نے کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنا دیے۔ Saint-Medard کا گھنٹا گھر چھ بجا رہا تھا۔

گھنٹے کی ہر چوٹ پر ژاندریت اپنا سر جھٹکتا۔ جب چھٹی چوٹ پڑی تو اس نے موم بتی کے جلتے ہوئے فلیتے کو انگلیوں سے مسل کر موم بتی بجھا دی۔

اس کے بعد اس نے آگے پیچھے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا، راہداری میں کچھ سننے کی کوشش کی؛ ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا، اور ایک بار پھر سننے کی کوشش کی۔

"اگر وہ آیا۔" اس نے منہ ہی منہ میں کہا۔ اس کے بعد اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

ابھی وہ بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ دروازہ کھلا۔

خاتون ژاندریت نے دروازہ کھولا تھا، اور اندھیری راہداری کو دل کش بنانے کے لیے بناوٹی مسکراہٹ کی کوشش کرتی رہی، جسے نیچے کی لالٹین سے آنے والی روشنی نے روشن کر دیا تھا۔

"تشریف لائیے، جناب!" اس نے کہا۔

"تشریف لائیے میرے فیاض مہمان!" ژاندریت نے تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے دہرایا۔

موسیو لیبلانک ظاہر ہوا۔

وہ نہایت پُرسکون نظر آ رہا تھا جس کے باعث وہ زیادہ قابلِ احترام ہوا۔

اس نے میز پر چار لوئی رکھ دیے۔

"موسیو فاباں تو!" اس نے کہا "یہ آپ کے کرایے کی ادائیگی کے لیے ہیں جو آپ کی اشد ضروریات میں سے ہے۔ باقی مسائل پر بعد میں غور کیا جائے گا۔"

"خدا آپ کو اس کا اجر دے گا، میرے فیاض مہربان!" ژاندریت نے کہا۔
اور وہ تیزی سے اپنی بیوی سے مخاطب ہوا، "گاڑی والے کو فارغ کردو۔"
عورت وہاں سے کھسک لی۔ اس کا شوہر آداب و تسلیمات میں مصروف ہوگیا، اور مہمان کو کرسی پیش کی۔ ایک لمحے بعد عورت واپس آئی اور سرگوشی میں ژاندریت کے کان میں کہا:
"کام ہوگیا ہے۔"
"برف، جو صبح سے رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، اتنی گہری ہوگئی تھی کہ فچر گاڑی کی آمد سنائی نہیں دی تھی، نہ ہی اس کی رخصتی سنائی دی۔
اس دوران موسیولیبلانک بیٹھ گیا تھا۔
ژاندریت نے موسیولیبلانک کے روبرو دوسری کرسی پر قبضہ جما لیا تھا۔
اب یہ دیکھنے کے لیے کہ آگے کیا ہونے والا ہے، قاری کو چاہیے کہ وہ تصور کرے، ایک سرد رات کا، Salpetriere کی تنہائیاں چاندنی میں، برف میں ڈھکی ہوئی سفید ہو رہی ہیں؛ سڑکوں پر لگی لالٹینوں کی مخروطی شکل کی سرخ روشنیاں، یہاں وہاں، ان الم ناک بولیوارڈوں پر نظر آرہی ہیں، اور سیاہ رنگ کے شاہ بلوط درختوں کی لمبی قطاروں میں شاید ایک لیگ کے فاصلے پر، Gorbeau منزل تک، ایک بھی راہ گیر نہیں ہے؛ خوف میں اور اندھیرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے؛ اس عالم میں اس عمارت میں ان تنہائیوں کے درمیان، ان اندھیروں کے درمیان، ژاندریت کی وسیع منزل پر ایک واحد موم بتی جل رہی ہے، اور اس کیفیت میں اس ناند میں دو آدمی ایک میز پر بیٹھے ہوئے ہیں، موسیولیبلانک پُرسکون ہے، ژاندریت مسکرا رہا ہے مگر چوکنا ہے، بھیڑیے کی مادہ، ژاندریت خاتون ایک کونے میں دبکی ہوئی ہے، اور اس کے عقب کی دیوار کے پیچھے، ماریوس ہے، مخفی، ایستادہ، ایک ایک لفظ غور سے سن رہا ہے، ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا ہے، اس کی آنکھیں کلائی کی گھڑی پر ہیں، اور ہاتھ میں پستول ہے۔
ماریوس کو خوف کے جذبے کا تجربہ ہو رہا تھا، مگر وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ اس نے دونوں پستولوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور خود کو مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ "میں اس بدخصلت شخص کو جب چاہوں روک سکتا ہوں۔" اس نے سوچا۔
اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں گھات میں کہیں پولیس طے شدہ اشارے کے انتظار میں ہے اور اپنے بازو پھیلانے کے لیے تیار ہے۔
اس کے علاوہ، اسے امیدیں تھیں، کہ موسیولیبلانک اور ژاندریت کے درمیان یہ پُرتشدد مقابلہ ان چیزوں پر روشنی ڈالے گا جنھیں سیکھنے میں اسے دلچسپی ہے۔

❁

اندھیری گہرائیوں کی مصروفیتیں

موسیو لیبلا نک ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اس نے گھوم کر اس تختوں والے بستر پر نظر کی، جو خالی تھا۔

"وہ بے چاری زخمی لڑکی کیسی ہے؟" اس نے معلوم کیا۔

"خراب" ژاندریت نے شگفتہ دل تبسم کے ساتھ جواب دیا، "بہت خراب حالت ہے، میرے محترم جناب۔ بڑی بہن مرہم پٹی کرانے اسے Bourbe لے گئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ اسے موجود دیکھیں گے، بس وہ آتی ہی ہوں گی۔"

"مادام فاباں تو کی صحت مجھے بہتر معلوم ہو رہی ہے۔" موسیو لیبلا نک نے کہا، ساتھ ہی ژاندریت خاتون کے احمقانہ لباس پر نظر ڈالی، جو دروازے کے درمیان اس انداز میں کھڑی تھی گویا اس کے اخراج کو روکنے کے لیے تیار ہے، اور اسے ڈرانے، بلکہ تقریباً لڑنے کے انداز میں اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

"یہ تو مر رہی ہے۔" ژاندریت نے کہا، "آپ کیا توقع کر سکتے ہیں، جناب! اس میں اس قدر ہمت ہے، جی ہاں اس عورت میں بہت ہمت ہے۔ یہ عورت نہیں بیل ہے۔"

اپنے بارے میں تعریفی کلمات پر خاتون ژاندریت نے چاپلوس دیوی کی طرح ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"موسیو ژاندریت، تم ہمیشہ مجھ پر بہت مہربان رہتے ہو۔"

"ژاندریت!" موسیو لیبلا نک نے کہا، "میرے خیال میں آپ کا نام تو فاباں تو تھا؟"

"فاباں تو عرف ژاندریت!" شوہر نے جلدی سے جواب دیا، "فن کارانہ عرفیت ژاندریت ہے۔" اور کاندھے اچکاتے ہوئے اپنی بیوی پر غصے سے نظر کی، جسے موسیو لیبلا نک دیکھ

نہیں سکا تھا، اُس نے تاکید اور بہلاوے کی گردش زدہ آواز میں کہا:

"اوہ، یہ بے چاری، عزیز از جان بیوی اور میں! ہماری زندگی بہت خوش گوار ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو ہمارے پاس کیا رہ جاتا؟ ہم کتنے بدنصیب ہیں، میرے فیاض محسن، جناب! ہمارے پاس بازو ہیں مگر کام نہیں۔ ہمارے پاس ارادہ ہے مگر کام نہیں۔ نجانے حکومت یہ سب کیسے کرتی ہے، مگر آپ یقین کیجیے، جناب کہ میں جنگلی نہیں، میں ڈیمو کریٹ نہیں۔ میں ان کی برائی نہیں چاہتا، مگر ہم وزیر ہوتے تو میرے الفاظ مقدس ہوتے اور معاملات بہت مختلف ہوتے۔ مثال کے طور پر، میں چاہتا تھا کہ میری لڑکیوں کو کاغذ کے ڈبے بنانے کی تربیت دی جاتی۔ آپ مجھ سے فوراً کہیں گے، 'یہ کیا پیشہ ہوا؟' جی ہاں، یہ بھی ایک پیشہ ہے، سادہ سا پیشہ۔ روٹی کمانے کا ذریعہ۔ کیسی پستی ہے یہ، میرے مہربان! کتنی رسوائی کی بات ہوتی ہے جب کوئی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ افسوس! ہمارے اچھے دنوں کا کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ بس ایک چیز ہے، ایک تصویر ہے، جو مجھے بہت عزیز ہے مگر میں اس کی جدائی کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ ہمیں زندہ بھی تو رہنا ہے نا۔ سب سے پہلے زندگی۔

جب ژاندریت بہ ظاہر بے ربطی سے یہ باتیں کر رہا تھا، اور ماریوس کی ذہین قیافہ شناسی اس سے کچھ اخذ نہیں کر پا رہی تھی، اسے کمرے کے دوسرے سرے پر ایک شخص دکھائی دیا جو پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ یہ آدمی اسی وقت کمرے میں داخل ہوا تھا، اتنی آہستگی سے کہ دروازے کے قلابے کی حرکت تک سنائی نہیں دی۔ یہ شخص بنفشئی رنگ کی بُنی وائی واسکٹ پہنے تھا، جو پرانی تھی، پھٹی ہوئی تھی، اس پر داغ لگے ہوئے تھے، جگہ جگہ سے کٹی تھی اور اس کی ہر شکن میں سوراخ تھے، سفید رنگ کی سوتی پتلون، پاؤں میں لکڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ بدن پر قمیص نہیں تھی، گردن خالی تھی، برہنہ بازوؤں پر گدائی سے نقوش بنے ہوئے تھے، اور چہرے پر سیاہی ملی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے قریب ترین بستر پر بیٹھ گیا تھا، اور چوں کہ وہ ژاندریت کے عقب میں تھا، اس کو صاف نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ایک قسم کی مقناطیسی جبلت نے، جو نظر کے علاوہ چلتی رہتی ہے، موسیو لیبلانک کو بھی اسی وقت مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا جب ماریوس نے اس پر نظر کی تھی۔ مہمان اپنی حیرانی کو چھپا نہیں سکا تھا، ژاندریت نے جسے دیکھ بھی لیا تھا۔

"اوہ اچھا! ژاندریت نے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے فروتنی کے انداز میں بلند آواز میں کہا، "آپ اپنے کوٹ کی جانب دیکھ رہے ہیں؟ مجھ پر کیسا فٹ ہو گیا ہے۔ میرا کہیں ہے، بس

یہ مجھ پر فٹ ہو گیا ہے۔"

"یہ آدمی کون ہے۔" لیبلا نک نے پوچھا۔

"یہ شخص" ژاندریت نے فوراً جواب دیا، "میرا پڑوسی ہے۔ اس پر کوئی توجہ نہ دیجیے جناب!"

پڑوسی غیر معمولی شکل و صورت کا انسان تھا۔ Saint-Marceau کے مضافات کے اطراف کیمیائی مصنوعات بنانے والے کارخانے تھے۔ ان میں کام کرنے والوں میں سے بہت سوں کے چہرے سیاہ تھے۔ ادھر، موسیو لیبلا نک کی پوری شخصیت راست بازی اور دلیری کی آئینہ دار تھی۔

لیبلا نک نے گفتگو پھر شروع کی، "معاف کیجیے گا، موسیو فاباں تو، آپ کچھ کہہ رہے تھے؟"

"جناب عالی، اور میرے پیارے محافظ، میں عرض کرنا چاہ رہا تھا۔" ژاندریت نے اپنی کہنیوں کو میز پر لکاتے ہوئے، جمی ہوئی آنکھوں سے، جو کسی اژدھے کی آنکھوں سے مختلف نہیں تھیں، جواب دیا، "کہ میرے پاس فروخت کے لیے ایک تصویر ہے۔"

دروازے کی جانب سے ہلکی سی آواز آئی۔ ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہو گیا تھا، اور ژاندریت کے عقب میں بستر پر بیٹھ گیا تھا۔

پہلے آدمی کی طرح اس کے بازو بھی برہنہ تھے، اور اس کے چہرے پر بھی کسی روشنائی یا سیاہی کی نقاب تھی۔

اگر چہ یہ شخص بھی، کمرے میں صحیح معنوں میں چپکے سے گھس آیا تھا پھر بھی وہ موسیو لیبلا نک کی آنکھوں سے بچ نہیں سکا۔

"ان کی پروا نہ کیجیے۔" ژاندریت نے کہا "یہ وہ لوگ ہیں جو اس عمارت سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایک بہت قیمتی تصویر ہے۔ مگر ذرا ٹھہریے جناب، پہلے اس پر ایک نظر تو ڈال لیجیے۔"

ژاندریت اٹھا، دیوار کی طرف گیا، جس کے نیچے وہ [تصویر نما] تختہ رکھا ہوا تھا، ہم جس کا ذکر کر چکے ہیں؛ اسے اٹھا کر گھمایا اور دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ یہ کوئی شے تھی جو تصویر سے مشابہ تھی، جسے موم بتی نے کسی حد تک روشن کر دیا تھا۔ ماریوس اس سے کچھ اخذ نہیں کر سکا؛ اس لیے کہ اس کے اور تصویر کے درمیان ژاندریت کھڑا تھا؛ تختے پر صرف ایک بھدا سا پلستر کیا گیا تھا، اور غیر ملکی کینوسوں اور اسکرین پینٹنگ کی طرح، اس پر نہایت بھدے انداز میں ایک قسم کا معزز آدمی بنا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" موسیو لیبلا نک نے سوال کیا۔

ژاندریت نے کہا، "ایک بہت بڑے استاد کی بنائی ہوئی تصویر ہے یہ، گراں قیمت

تصویر ہے، میرے محسن! یہ مجھے اتنی ہی عزیز ہے جتنی میری دونوں بیٹیاں : یہ مجھے گئے دنوں کی نشانیوں کی یاد دلاتی، مگر میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں اسے واپس نہیں لوں گا؛ کہ میں اتنا بدنصیب کہ اس کی جدائی کو بھی قبول کر لوں گا۔"

یا تو یہ اتفاق تھا، یا اس لیے کہ اسے ایک قسم کی بے چینی سے محسوس ہونے لگی تھی، موسیو لیبلا نک تصویر کا معائنہ کرتے ہوئے کمرے کے آخر تک پہنچ گیا۔

اب وہاں چار آدمی تھے، ایک دروازے کی چوکھٹ کے پاس کھڑا تھا۔ چاروں کے بازو برہنہ اور بے حرکت تھے، اور ان کے چہروں پر سیاہی ملی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک، جو دیوار سے ٹیک لگائے تھا، سوتا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ عمر رسیدہ تھا۔ اس کے سیاہ چہرے کے مقابل اس کے سفید بال بہت خوف ناک تاثر پیدا کر رہے تھے۔ دوسرے دو آدمی جوان دکھائی دیتے تھے؛ ایک کے چہرے پر داڑھی تھی، دوسرے کے بال لمبے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے؛ جنھوں نے موزے بھی نہیں پہنے تھے؛ بالکل ہی ننگے پاؤں تھے۔

ژاندریت نے دیکھ لیا تھا کہ موسیو لیبلا نک کی نظریں ان آدمیوں پر جمی ہوئی ہیں۔

"یہ لوگ دوست ہیں۔ یہ میرے پڑوسی ہیں۔" اس نے کہا "ان کے چہرے اس لیے سیاہ ہیں کہ یہ کوئلے کا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ چمنی بناتے ہیں۔ ان لوگوں سے پریشان نہ ہوں، میرے محسن، بس آپ میری تصویر خرید لیجیے۔ میری بدبختی پر رحم کی کیجیے۔ میں آپ سے بہت زیادہ طلب نہیں کروں گا۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا قیمت ہو گی؟"

"اچھا" موسیو لیبلا نک نے کہا اور ژاندریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، اس آدمی کی طرح جو چوکنا ہو گیا ہو۔ "یہ تو کسی شراب خانے کے سائن بورڈ جیسا ہے، اور اس کی قیمت تقریباً تین فرانک ہو گی۔"

ژاندریت نے بہت نرمی سے جواب میں میں کہا:

"کیا آپ کے پاس آپ کی پاس بک ہو گی؟ میں ایک ہزار کراؤن پر مطمئن ہو جاؤں گا۔"

موسیو لیبلا نک اچھل کر کھڑا ہو گیا، اس کی پشت دیوار کی جانب تھی، اس نے تیزی سے پورے کمرے پر نظر ڈالی۔ اس کے بائیں جانب کھڑکی کے قریب ژاندریت تھا اور ژاندریت خاتون، اور چاروں افراد اس کے دائیں جانب تھے، دروازے کے قریب۔ وہ چار آدمی تھے جو اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں، اور نہ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ژاندریت نے پھر بڑے غم زدہ انداز میں بولنا شروع کیا، ایسی بے آسرا نظر اور ایسے

افسوس ناک لہجے میں، کہ موسیو لیبلا نک کو قیاس ہوا ہوگا کہ پہلے اس کے سامنے جو آدمی تھا وہ اپنی بدنصیبی کے باعث بالکل پاگل ہو گیا تھا۔

"میرے محسن، اگر آپ نے میری تصویر نہیں خریدی۔" ژاندریت نے کہا، "تو میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں رہے گا؛ میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ میں خود کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دوں۔ میں اپنی دونوں لڑکیوں کو درمیانہ درجے کے کاغذ کے ڈبے بنانے کی تربیت دلانا چاہتا تھا، نئے سال کے تحفوں کے لیے کاغذ کے ڈبے بنانے کے لیے۔ اس کے لیے ایک میز کی اور میز کے سرے پر ایک بورڈ کی ضرورت ہوگی جو شیشے گرنے سے روک سکے؛ اور ایک خاص قسم کا اسٹوو ضروری ہوگا؛ ایسا ایک برتن بھی چاہیے ہوگا جس میں مختلف قسم کی طاقت کی گوند رکھنے کے لیے تین خانے بنے ہوں، جو لکڑی پر، کاغذ پر یا کسی اور شے پر لگائی جا سکے؛ دفتی کاٹنے کے لیے ایک تیز چاقو، ڈبے کو ٹھیک رکھنے کے لیے ایک سانچا، ایک ہتھوڑی کیلیں لگانے کے لیے، اور کچھ چمٹیاں، اور خدا ہی جانے کیا کیا چیزیں درکار ہوں گی؟ اور اتنا سب صرف چار سُو یومیہ کمانے کے لیے ہوگا۔ اور ہمیں روزانہ چودہ گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ اور ہر ڈبے کو کام کرنے والوں کے ہاتھ سے تیرہ دفعہ گزرنا ہوگا۔ آپ کاغذ کو گیلا نہیں کر سکتے۔ آپ کو انھیں دھبوں سے بچانا ہوگا۔ اور آپ کو لئی کو گرم رکھنا ہوگا۔ اُف خدایا، میں یہ سب جو آپ کو بتا رہا ہوں، صرف چار سُو یومیہ اُجرت کے لیے ہے۔ ایک انسان اس میں بھلا کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟"

ژاندریت نے بولتے وقت موسیو لیبلا نک کی طرف نظر نہیں کی تھی، جو اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ موسیو لیبلا نک کی نگاہیں ژاندریت پر جمی ہوئی تھیں، اور ژاندریت کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں۔ ماریوں کی متجسس نظریں ایک سے دوسرے پر منتقل ہو رہی تھیں۔ موسیو لیبلا نک شاید خود سے سوال کر رہا تھا، "کیا یہ آدمی بالکل احمق ہے؟" ژاندریت نے یہ بات کئی بار ہر قسم کی کراہ اور التجائیہ انداز میں دہرائی تھی، "میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ میں خود کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دوں۔ میں ایک دن اسی مقصد سے تین بار Austerlitz کے پُل پر گیا تھا"۔

اور پھر، اچانک اس کی احمقانہ آنکھیں ایک ڈراؤنے جھماکے سے چمک اٹھیں؛ وہ منحنی سا آدمی ایک دم خوف ناک ہو گیا؛ موسیو لیبلا نک کی طرف ایک قدم بڑھا، اور گرج دار آواز میں بولا، "سوال یہ نہیں ہے! سوال یہ ہے کہ تم مجھے جانتے ہو؟"

پھندا

اس منزل کا دروازہ اچانک کھل گیا تھا؛ نیلے رنگ کے پارچے کے بلاؤز اور سیاہ رنگ کے کاغذ کی نقاب میں تین آدمی نظر آئے۔ پہلا آدمی دُبلا پتلا تھا، جس کے ہاتھوں میں ایک لمبی سی لاٹھی تھی۔ دوسرا آدمی دیو پیکر قسم کا تھا جس کے ہاتھ میں جانوروں کو ذبح کرنے والا تیشہ تھا جسے اس نے دستے کے بیچ سے پکڑ رکھا تھا، اور اس کی دھار نیچے کی جانب کر رکھی تھی۔ تیسرا آدمی بھاری کاندھوں والا تھا مگر پہلے آدمی جیسا نازک نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی کنجی تھی جیسے کسی قید خانے کے دروازے سے چرائی گئی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ژاندریت ان آدمیوں کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کے اور لاٹھی والے دبلے آدمی کے درمیان تیزی سے کچھ گفتگو ہوئی۔

"سب کچھ ٹھیک ہے نا؟" ژاندریت نے پوچھا۔

"ہاں۔" دبلے والے آدمی نے جواب میں کہا۔

"مونٹ پارناس کہاں ہے؟"

"نوجوان بڑا اداکار تمھاری لڑکی سے بات کرنے لگا تھا۔"

"کس لڑکی سے؟"

"سب سے بڑی لڑکی سے۔"

"کیا دروازے پر کوئی گاڑی کھڑی ہے؟"

"ہاں۔"

"ٹیم پوری طرح چوکس ہے؟"

''ہاں۔''

''دو اچھے سے گھوڑوں کے ساتھ۔''

''لاجواب۔''

''کیا وہیں انتظار کر رہی ہے جہاں حکم دیا گیا تھا؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک۔'' ژاندریت نے کہا۔

موسیولیبلا نک زرد ہو رہا تھا۔ اب وہ اس ماند میں موجود ہر شے کو جانچ رہا تھا، اس آدمی کی طرح جو سمجھ رہا ہے کہ وہ کسی جال میں پھنس گیا ہے؛ اس کا سر ایک کے بعد دوسرے سر کی طرف مڑا جو اس کو گھیرے ہوئے تھے، اس کی گردن حیرت انگیز آہستگی سے حرکت کر رہی تھی، مگر اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو خوف سے مشابہ ہوتی۔ اس نے میز کو اپنی پناہ کا ذریعہ بنا لیا تھا؛ وہ آدمی جو چند لمحے قبل مہربان عمر رسیدہ انسان دکھائی دیتا تھا، اچانک پہلوان بن گیا تھا، اور اس نے حیرت انگیز اور ہیبت ناک انداز میں اپنی توانا مٹھی کرسی کی پشت پر رکھ لی تھی۔

وہ بوڑھا انسان، جو ایسے خطرے کی کیفیت میں بھی اتنا مستحکم اور بہادر تھا، ایسی فطرتوں کا مالک دکھائی دیتا تھا جو باہمت بھی ہوتی ہیں، مہربان بھی اور سادہ بھی۔ ہم جس عورت سے محبت کرتے ہیں اس کا باپ ہمارے لیے کبھی اجنبی نہیں ہوتا۔ ماریوں کو اس نامعلوم آدمی پر فخر محسوس ہوا۔

ان تینوں آدمیوں نے جن کے بارے میں ژاندریت نے کہا تھا کہ ''یہ چمنی بنانے والے ہیں'' خود کو پرانی آہنی اشیا کے ڈھیر میں پڑی چیزوں سے مسلح کر لیا تھا؛ ایک کے ہاتھ میں بڑی سی قینچی تھی، دوسرے کے ہاتھ میں بھاری سا چمٹا تھا، تیسرے کے پاس ہتھوڑا تھا اور سب داخلے والے دروازے کے سامنے ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر کھڑے تھے۔ چوتھا آدمی جو بوڑھا تھا اور بستر پر پڑا تھا اس نے صرف اپنی آنکھ کھولی تھی۔ خاتون ژاندریت اس کے برابر بستر پر بیٹھی تھی۔

ماریوں نے فیصلہ کیا کہ چند لمحوں کے اندر ہی مداخلت کا لمحہ آ جائے گا؛ اس نے اپنا دایاں ہاتھ راہداری کی سمت، سقف کی طرف بلند کر لیا، اس تیاری میں کہ اس کا پستول استعمال ہونے والا ہے۔

لاٹھی بردار آدمی سے اپنی گفتگو ختم کرنے کے بعد ژاندریت ایک بار پھر موسیولیبلا نک کی طرف متوجہ ہوا، اور دھیمی اور دبی ہوئی ہنسی کے ساتھ، جو اس سے مخصوص تھی، اپنا سوال دہرایا:

''یعنی، آپ مجھے نہیں پہچانتے؟''

موسیو لیبلا نک نے اسے غور سے دیکھا، اور جواب دیا، ''نہیں۔''

تب ژاندریت میز کی طرف بڑھا۔ میز پر رکھی ہوئی شمع کے سامنے اپنے ہاتھ باندھے ہوئے جھکا، اپنا اکھڑ اور خوں خوار جبڑا موسیو لیبلا نک کے پُر سکون چہرے کی طرف جس قدر قریب جا سکتا تھا، لے گیا اور اس کو پسپائی پر مجبور کیے بغیر، ایک وحشی درندے کے انداز میں جو کاٹ کھانے والا ہو، چیخ کر کہا،

میرا نام فابان تو نہیں، میرا نام ژاندریت نہیں، میرا نام تنی آردیے ہے۔ میں Montfermeil کا سرائے والا ہوں! سمجھے؟ تنی آردیے! اب تم مجھے پہچان گئے ہو گے؟''

موسیو لیبلا نک کی پیشانی پر ایک ناقابلِ تصور سرخی دوڑ گئی، اور اس نے اپنے معمول کے انداز کی آواز میں جواب دیا جو نہ کانپ رہی تھی، نہ عام درجے سے بلند ہوئی تھی:

''پہلے سے زیادہ نہیں۔''

ماریوس کو یہ جواب سنائی نہیں دیا تھا۔ اس لمحے اگر کوئی اندھیرے میں اسے دیکھتا تو وہ نہایت پریشان، احمق، اور اس آدمی جیسا دکھائی دیتا جس پر بجلی گری ہو۔ اس لمحے جب ژاندریت نے کہا تھا، ''میرا نام تنی آردیے ہے'' ماریوس کے دست و پا میں لرزہ آ گیا تھا، اور اس نے دیوار کا سہارا لے لیا، گویا اُسے دل کے اندر کسی آہنی چاقو کے پھل کی ٹھنڈک داخل ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ تب اس کا دایاں بازو جو گولی چلانے کے لیے تیار تھا آہستہ سے ڈھلک گیا، اور جس وقت ژاندریت نے دہرایا تھا، ''سمجھے تنی آردیے؟'' ماریوس کی لڑکھڑاتی انگلیوں سے پستول گرنے ہی والا تھا۔ ژاندریت نے اپنی شناخت کا انکشاف کرتے ہوئے موسیو لیبلا نک کو ہی جھٹکا نہیں دیا تھا، ماریوس کو بھی بدحواس کر دیا تھا۔ یہ نام تنی آردیے موسیو لیبلا نک جس سے واقف نہیں معلوم ہوتا تھا، ماریوس اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم قاری کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ماریوس کے نزدیک اس نام کی کیا اہمیت تھی۔ یہ نام اس کے دل پر چھایا ہوا تھا، جو اس کے والد کی وصیت میں لکھا تھا۔ اس نے اس کو اپنے دماغ میں، اپنی یاد کی گہرائیوں میں، ایک مقدس ہدایت کے باعث محفوظ کر لیا تھا: ''ایک شخص نے جس کا نام تنی آردیے ہے، میری جان بچائی تھی۔ اگر میرے بیٹے کی کبھی اس سے ملاقات ہو تو وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کے ساتھ نیکیاں کرے گا۔'' یاد رہے کہ یہ نام اس کی روح کی پارسائی کی بنیاد میں سے تھا؛ اپنی دعاؤں میں وہ اس نام کو اپنے والد کے نام کے ساتھ شامل رکھتا تھا۔ کیا یہ آدمی وہی تنی آردیے ہے، Montfermeil کی سرائے والا، اتنے دنوں سے وہ جس کی تلاش لاحاصل میں تھا۔ بالآخر، ماریوس نے اسے پا لیا تھا، مگر کن حالات

میں؟ اس کے باپ کو بچانے والا ایک غنڈا تھا۔ وہ شخص، جس کی خدمت کی تمنا میں ماریوس جل رہا تھا، ایک عفریت تھا۔ کرنل پوں مرسی کو بچانے والا ایسا جرم کرنے پر تُلا ہوا ہے، ماریوس ابھی تک جس کی وسعت کا اندازہ نہیں لگا سکا ہے، مگر جو قتل سے مشابہ تھا، اور کس کے قتل سے مشابہ ہے — اللہ اکبر کیسا نصیب ہے! کتنی تلخ مکاری ہے نصیب کی۔ اس کے باپ نے اپنے تابوت کی گہرائیوں سے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اس تین آردیے کے ساتھ جس قدر ممکن ہو بھلائی کرے گا، اور چار برس سے ماریوس اس تمنا کو اپنے سینے سے لگائے رہا ہے کہ وہ اپنے باپ کا قرض اتارے گا، اور اس لمحے، جب وہ ایک لٹیرے کو پکڑنے والا ہے تو قسمت اس سے چیخ کر کہہ رہی ہے "یہ تین آردیے ہے!" بہر حال، وہ اپنے باپ کی زندگی کا قرض چکانے والا تھا، جسے اس نے واٹر لو کے میدان میں گولوں کی بارش کے درمیان بچایا تھا، مگر یہ ادائیگی سولی کی صورت میں ہونے والی ہے۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اگر کبھی وہ تین آردیے سے ملا، تو وہ اس کے پاؤں پڑ کر ہی اس سے مخاطب ہوگا؛ اور آج وہ شخص ماریوس کو مل گیا ہے، مگر اس کو جلاد کے حوالے کرنے کے لیے۔ ماریوس کے باپ نے کہا تھا، "تین آردیے کی دست گیری کرنا" اور وہ اس قابل پرستش صوفیانہ آواز کے جواب میں تین آردیے کو کچلنے جا رہا ہے۔ وہ اپنے باپ کو اس کی قبر میں اس آدمی کا نظارہ پیش کرنے جا رہا ہے، جس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اسے موت کے پنجوں سے چھینا تھا، اب وہ اس کے بیٹے کے ذریعے، جسے اس نے اپنی وصیت میں ایک فرض سونپا تھا، Saint-Jacques میں سولی پر چڑھایا جانے والا ہے۔ اور یہ کیسا مذاق ہے کہ اپنے باپ کے آخری وقت کے احکامات کا، جو اس نے اپنے ہاتھوں سے لکھے تھے، اس پر اس بھیانک اور برعکس طریقے سے عمل ہونے جا رہا ہے۔ مگر دوسری جانب اس پھندے کو دیکھو اور اسے روکنے سے باز رہو۔ قاتل کو بچالو اور مظلوم کو برباد ہو جانے دو۔ کیا کسی کو ایسے بد معاش بد نصیب کے تشکر پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟ ماریوس کے سارے خیالات جو وہ چار برس سے پال پوس رہا تھا، اس مکمل طور پر غیر متوقع جھٹکے سے پارہ پارہ ہو گئے تھے۔

وہ کانپ رہا تھا۔ اب سب کچھ اس پر منحصر تھا۔ وہ تمام لوگ جو وہاں ماریوس کی آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے تھے، اس بات سے لاعلم تھے کہ وہ ماریوس کے قبضے میں ہیں۔ اگر وہ پستول چلاتا ہے تو موسیو لبیلا نک بچ جاتا ہے، اور تین آردیے ہار جاتا ہے؛ اگر وہ گولی نہیں چلاتا ہے تو موسیو لبیلا نک قربان ہو جائے گا، اور پھر خدا ہی جانے؟ تین آردیے فرار ہو جائے گا۔ تو کیا وہ ایک کو دھکا دے دے یا دوسرے کو گر جانے دے؟ دونوں صورتوں میں پشیمانی اس کی منتظر تھی۔

اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ کون سا راستہ منتخب کرے؟ کیا وہ اپنی تمام محکم یادوں کے، جن کے بارے میں اس نے قسم کھائی تھی، اس مقدس فرض کے، اور اس محترم متن کے خلاف چلا جائے؟ کیا وہ اپنے باپ کی وصیت کو نظر انداز کردے، یا ایک جرم کے ارتکاب کی اجازت دے دے؟ ایک جانب تو اسے دکھائی دے رہا تھا گویا اس کی ''اپنی Ursule'' اپنے باپ کے لیے اس سے التجا کر رہی ہے، دوسری جانب اس کا کرنل باپ تین آردیے کو اس کے سپرد کر رہا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پاگل ہونے والا ہے۔ اس کے گھٹنے جواب دے گئے تھے۔ اور اس کے پاس غور کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر مکمل تباہی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کیفیت ایسے گرد باد کی مانند تھی، اس کے خیال میں جس کا مالک وہ خود تھا، جو اسے بھی اڑائے لیے جا رہا تھا۔ اس پر غشی طاری ہونے والی تھی۔

اس دوران تین آردیے، جسے اب ہم کسی اور نام سے نہیں پکاریں گے، میز کے سامنے ایک قسم کے دماغی انتشار اور وحشیانہ کامیابی میں آگے پیچھے چل رہا تھا۔

اس نے موم بتی کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیا، اور اس کو چمنی پر اس دھماکے سے رکھا کہ اس کی لو بجھنے والی تھی، اور دیوار پر اس کی چکنائی کے چھینٹے پڑ گئے تھے۔

پھر وہ موسیو لیبلانک کی طرف خوف ناک انداز میں مڑا اور یہ الفاظ اگل دیے:

''ہو گیا! دھواں لگ گیا! پک گیا! کباب بن گیا!''

اور ایک بار پھر وہ آگے پیچھے چلنے لگا، اور پوری طرح پھٹ پڑا۔

''واہ!'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''تو بالآخر ایک بار پھر میں نے آپ کو تلاش کر لیا ہے، مسٹر غریب نواز! مسٹر فرسودہ کروڑ پتی! مسٹر گڑیاں دینے والے! نرے بدھو! واہ! تو آپ مجھے نہیں پہچانتے! نہیں، وہ آپ نہیں تھے جو Montffermeil آیا تھا، میری سرائے میں، آٹھ برس قبل، کرسمس کی شب 1823 واہ! وہ آپ نہیں تھے جو فانتین کی بچی مجھ سے چھین لے گیا تھا! معتی چڑیا کو! وہ آپ نہیں تھے جس کے پاس پیلے رنگ کا کوٹ تھا۔ نہیں، نہ آپ کے ہاتھ میں فضول چیزوں سے بھری گٹھری تھی، جیسی آپ آج صبح یہاں لے کر آئے ہیں۔ بیوی! تم بھی کچھ بولو، کہ اس شخص کو گھروں میں اونی موزوں کی گٹھریاں لے جانے کا سودا ہے۔ قدیم خیرات بانٹنے والے، لعنت ہو تم پر! کیا تم جراب فروش ہو، مسٹر کروڑ پتی! تم اپنا کاروباری مال مفلسوں پر نچھاور کر دیتے ہو، مقدس انسان! شیخی بگھارا! خوش باش اینڈریو! اچھا، تو تم مجھ کو پہچانتے ہی نہیں؟ خوب! مگر میں تو تمھیں پہچانتا ہوں، اچھی طرح پہچانتا ہوں! میں نے تمھیں اسی وقت پہچان لیا

تھا جب تم نے اپنی تھوتھنی یہاں داخل کی تھی۔ تمھیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں کے گھروں میں اس طرح گھسنا اتنا آسان نہیں ہوتا، اس بہانے کہ وہ شراب خانے یا کلال خانے ہیں، کہ اس کے مکین چیتھڑوں میں ہیں، مفلس آدمیوں کی طرح، جیسے تم ایک سو خیرات میں دو گے، اور جنگلوں میں لوگوں کو دھمکاؤ گے، اور لوگوں کو گھروں سے نکال دو گے اس لیے کہ بعد میں، جب لوگ برباد ہو چکتے ہیں، تو تم ایک کوٹ لے کر آجاتے ہو جو ناپ میں بڑا ہوتا ہے، اور اسپتال کے دو خیراتی کمبل۔ تم لفنگے! تم بچے چرانے والے!"

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، اور چند لمحے خود کلامی کرتا محسوس ہوا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا غصہ کسی سوراخ میں گر گیا تھا، Rhone دریا کی طرح؛ اس کے بعد، گویا وہ ان تمام باتوں کے نتائج بلند آواز میں کہہ رہا تھا جو خود سے سرگوشی میں کہہ چکا تھا؛ اس نے میز پر زور سے مکا مارا، اور چیخ کر کہا "اور یہ پیارا پیارا انداز!"

اور، نہایت جوشیلے انداز میں موسیو لبلا نک سے کہا:

"بخدا، تم نے ماضی میں مجھے کھیل بنا لیا تھا! تم ہی میری ساری بدنصیبی کے ذمے دار ہو۔ پندرہ سو فرانک میں ایک لڑکی لے اڑے، جو میرے پاس تھی، جو یقینی طور پر دولت مندوں کی لڑکی تھی، جن سے کافی رقم وصول ہوئی تھی، اور جس کے ذریعے میں اتنی دولت حاصل کر سکتا تھا جو میری زندگی بھر کے لیے کافی ہوتی۔ ایک لڑکی ہر اس شے کا ازالہ کر سکتی تھی جو میں نے vile cook-shop میں کھویا تھا، جہاں کچھ نہیں تھا سوائے مسلسل فساد کے اور جہاں کسی احمق کی طرح میں اپنا آخری فاردنگ بھی کھا گیا تھا۔ اُف! کاش کہ تمام وائن، ہمارے دوست جو میرے گھر میں پی گئے تھے، ان لوگوں کے لیے زہر ہو جاتی۔ چلو، کوئی بات نہیں۔ اب کہہ دو۔ تم نے مجھے نامعقول سمجھا ہوگا جب تم مغنی چڑیا کے ساتھ فرار ہو گئے تھے۔ جنگل میں تمھارے پاس لاٹھی ہوتی تھی۔ تم زیادہ طاقت ور تھے۔ انتقام! آج ترپ کا پتا میرے ہاتھ میں ہے۔ تمھاری حالت خراب ہے، میرے دوست! اب میں ہنس سکتا ہوں۔ واقعی، اب میں ہنس رہا ہوں۔ کیا وہ پھندے میں پھنس نہیں گیا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اداکار ہوں، کہ میرا نام فاباں تو ہے، کہ میں نے میڈموزیل مارس اور میڈموزیل میوش کے ساتھ مزاحیہ اداکاری کی ہے، کہ میرے مالک مکان نے کل کرایے کی ادائگی پر اصرار کیا ہے، چوتھی فروری کو، اور وہ یہ بھی نہیں دیکھ پایا کہ سہ ماہی کرایہ ادا کرنے کی تاریخ آٹھ جنوری ہے، جس دن سہ ماہی ختم ہوتی ہے، چار فروری نہیں! نامعقول، احمق کہیں کا! اور وہ صرف چار کم بخت Philippes، جو وہ میرے لیے لایا ہے۔ غنڈہ کہیں کا! اس

میں اتنا بھی کلیجہ نہیں تھا سو فرانک تک جاتا۔ اور کس طرح اس نے میری تعریفیں اور التجائیں ہضم کر لیں۔ میں اس پر ہنس پڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس سے کہا تھا: 'بے عقل! آ جا! میں نے تجھے پکڑ لیا ہے۔ آج صبح میں نے تیرے تلوے چاٹے تھے، مگر آج شام میں تیرا کلیجہ چباؤں گا۔''

تین آردیے رُک گیا۔ اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ اس کا چھوٹا سا تنگ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی کم زور، ظالم اور بزدل فطرت کی مخلوق کی طرح بے غیرتی کی خوشی سے معمور ہو رہی تھیں، جو سمجھ رہا تھا کہ بالآخر وہ جس سے ڈرتا تھا آج اس کو پریشان کر سکتا ہے، جس کی چاپلوسی کرتا تھا اس کی توہین کر سکتا ہے، اس بونے کی طرح خوش تھا جو Goliath کے سر پر اپنی ایڑی رکھ سکتا ہے، اس گیدڑ کی خوشی کی طرح ہے جو بیمار بیل کی مرنے سے قبل ہی چیڑ پھاڑ کرنے لگتا ہے جو موت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور زندہ رہ کر بھی دُکھ سہتا رہتا ہے۔

موسیو لیبلا نک نے مداخلت نہیں کی، مگر جب وہ رُک گیا تو اس سے کہا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ میرے بارے میں تم سے غلطی ہوئی ہے۔ میں بہت مفلس آدمی ہوں، کروڑپتی ہرگز نہیں۔ میں تمھیں نہیں جانتا۔ تم مجھے کوئی اور آدمی سمجھ رہے ہو۔''

''واہ!'' تین آردیے بھرائی ہوئی آواز میں گرجا، ''کیا خوبصورت جھوٹ ہے! تم دل لگی پر اڑے ہوئے ہو، ہے نا! تمھیں یاد نہیں، تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں کون ہوں؟''

''معاف کیجیے گا، جناب!'' موسیو لیبلا نک نے شائستگی کے لہجے میں کہا، جو خاص طور پر اس وقت حیران کُن اور طاقت ور تھا، ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس وقت وِلن بن گئے ہیں۔''

کون ہے جس نے اس حقیقت کو آشکار نہیں کیا کہ کریہہ مخلوقات میں بھی خود اپنی بارے میں حساسیت ہوتی ہے، کہ عفریتوں کے بھی گُدگُدی ہوتی ہے۔ اس لفظ وِلن پر عورت تین آردیے بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی، مرد تین آردیے نے کرسی کو اتنی زور سے پکڑا گویا اسے اپنے ہاتھوں سے ریزہ ریزہ کر دے گا۔

''تم ہلنا بھی نہیں۔'' اس نے بیوی سے ڈانٹ کر کہا؛ اور موسیو لیبلا نک کی طرف متوجہ ہوا، ''وِلن! ہاں ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم ہمیں وِلن ہی سمجھتے ہو، تم دولت مند شریف آدمی! ٹھہرو! یہ سچ ہے کہ میں دیوالیہ ہو گیا تھا، اور میں روپوشی میں ہوں؛ کہ ہمارے پاس روٹی نہیں ہے؛ کہ ہمارے پاس ایک سو بھی نہیں ہے؛ کہ میں وِلن ہوں! تین دن گزر گئے ہیں میں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ خوب! تم لوگ اپنے پاؤں گرم رکھتے ہو، تمھارے پاس Sakoski ہے؛ تمھارے

پاس آرچ بشپ کی طرح روئی بھرے شان دار کوٹ ہیں؛ تم مکانوں کی پہلی منزل میں رہتے ہو اس لیے کہ تمھارے پاس مال ہوتا ہے؛ تم کھمبیاں کھاتے ہو؛ تم چالیس فرانس فی گڈی مارچوب (asparagus) کھاتے ہو، جنوری کے مہینے میں؛ اور ہری مٹر بھی؛ خود کو بھر لیتے ہو، اور یہ جاننا چاہتے ہو کہ سردی ہوگی یا نہیں؛ تو تم اخبار میں دیکھ لیتے ہو کہ انجینئر Chevalier کا تھرمامیٹر اس کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ ہم لوگ ہی اصل تھرمامیٹر ہیں۔ ہمیں Tour de l'Horologe کے کونے پر یہ معلوم کرنے کے لیے جانے کی ضرورت نہیں کہ درجۂ حرارت کیا ہے؛ ہمیں سردی محسوس ہوتی ہے، اور ہمارا خون رگوں میں جمتا محسوس ہوتا ہے، اور دل کے اطراف برف جمتی معلوم ہوتی ہے، اور ہم کہتے ہیں 'خدا کا وجود نہیں ہے! اور تم لوگ ہمارے غاروں میں آتے ہو، جی ہاں، ہمارے غاروں میں، ہمیں ولن کہنے کے لیے' مگر ہم لوگ تم کو کھا جائیں گے ۔ مسٹر کروڑپتی ذرا ادھر دیکھیے میں ایک منحوس آدمی رہا ہوں، میرے پاس لائسنس رہا ہے، میں منتخب کرنے والوں میں سے تھا، میں ایک بورژوا ہوں، کہ میں وہی ہوں۔ اور یہ بہت ممکن ہے کہ تم کچھ نہیں ہو۔"

اس مقام پر تین آردیے نے ایک قدم ان لوگوں کی طرف بڑھایا جو دروازے کے پاس کھڑے تھے، اور کپکپی کے ساتھ اضافہ کیا، "میں سوچتا ہوں کہ اس نے یہاں آنے کی کوشش کی ہے اور ایک اناڑی کی طرح بات کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس کے بعد تازہ جنون کے ساتھ موسیولیبلا نک سے مخاطب ہوا:

"اور یہ بھی سنو، مسٹر کروڑ پتی! میں کوئی مشکوک کردار نہیں، ذرہ برابر بھی نہیں۔ میں وہ آدمی نہیں جسے کوئی نہیں جانتا، اور جو آتا ہے اور بچوں کو گھروں سے اغوا کر لیتا ہے۔ میں پرانا فرانسیسی سپاہی ہوں، مجھے اعزازات ملنے چاہئیں۔ میں واٹرلو میں تھا، جی ہاں تھا۔ اور لڑائی کے دوران میں نے ایک جنرل کو بچایا تھا جس کو Comte اور نجانے کیا کہا جاتا تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام بتایا تھا، مگر اس کی نفرت انگیز آواز اتنی کم زور تھی کہ میں ٹھیک سے سن نہیں سکا تھا۔ بس جتنا سن سکا تھا وہ Merci [شکریہ] تھا۔ مجھے اس کے شکریے کے بجائے اس کا نام چاہیے تھا۔ تاکہ اس کے ذریعے میں اسے دوبارہ تلاش کر سکتا۔ یہ تصویر جو تم دیکھ رہے ہو، جسے Bruqueselles میں ڈیوڈ نے بنائی تھی___ تمھیں پتا ہے کہ یہ کیا پیش کرتی ہے؟ یہ مجھے پیش کرتی ہے۔ ڈیوڈ اس بہادری کے کام کو حیاتِ ابدی دینا چاہتا تھا۔ میری پشت پر جنرل ہے، اور میں اسے گریپ شاٹ کے درمیان لیے جا رہا ہوں۔ یہ تصویر [اس بہادری کی] تاریخ ہے۔ اس جنرل نے میرے لیے کچھ

بھی نہیں کیا؛ وہ بھی باقی لوگوں کی طرح تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس کی جان بچائی تھی؛ میرے جیب میں اس کی سند موجود ہے۔ تمام جذبوں اور جوش کے ساتھ میں واٹر لو کا سپاہی ہوں ۔اور اب، کہ میں نے مہربانی کی ہے، اور تم کو یہ سب بتا دیا ہے، ہمیں اس قصے کو ختم کر دینا چاہیے۔ مجھے دولت چاہیے، بہت ساری دولت، بے اندازہ دولت چاہیے، ورنہ میں تم کو پیارے خدا کے غضب کی مدد سے نیست و نابود کر دوں گا۔"

ماریوس نے اپنی روحانی تکلیف پر کچھ قابو پا لیا تھا، اور وہ سن رہا تھا۔ عجبے کا آخری امکان بھی ختم ہو گیا تھا۔ یقینی طور پر یہ شخص وصیت کا تھن آردیے ہی تھا۔ ماریوس اپنے باپ کا ناشکرا پن اور اس کی سرزنش سن کر کانپ گیا تھا۔ یہ بات واقعی کسی قدر حق بجانب تھی۔ اس کی الجھن دگنی ہو گئی تھی۔

مزید یہ کہ، یہ سارے الفاظ تھن آردیے کے تھے، اس کے لہجے میں تھے، اس کے جذبہ اظہار میں تھے، ایسی نظر میں تھے جو ہر لفظ پر شعلے کے تیر پھینک رہی تھی، اس بدخو قسم کے دھماکے میں تھے جو ہر چیز افشا کر رہا تھا؛ اس ڈینگ اور کمینے پن کے آمیزے میں فخرا ور کم ظرفی تھی، غصہ اور نافہمی تھی، اس حقیقی ملال اور نادرست سوچ میں، ایک کینہ پرور آدمی کی ناشائستگی میں جو تشدد کے شہوانی انبساط کا مزہ لے رہا تھا، ایک گھناؤنے نفس کی اس بے شرم برہنگی میں، دکھوں اور ہر قسم کی نفرتوں کے اجماع کی شر انگیزی میں، کوئی شے تھی جو برائی جیسی ڈراؤنی تھی اور سچائی جیسی دل خراش تھی۔

استاد کی تصویر، ڈیوڈ کی پینٹنگ، موسیو لیبلانک کو جس کے خرید لینے کی تجویز پیش کی گئی تھی، کوئی خاص چیز نہیں تھی، جیسا کہ قاری کو اندازہ ہو گیا ہو گا، یہ اس کے شراب خانے کا سائن بورڈ تھا، اور جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا، واحد یادگار تھی جو اس نے Montfermeil میں اپنی تباہی کے دوران بچائی تھی۔

چوں کہ اب تھن آردیے نے ماریوس کی بصری کرن کی راہ میں حائل ہونا چھوڑ دیا تھا، ماریوس اس شے کو غور سے دیکھ سکتا تھا، اور اس لیپا پوتی میں، واقعی اس نے ایک جنگ کا منظر پہچان لیا تھا، جس میں دھوئیں کا پس منظر تھا، اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو اٹھائے لیے جا رہا تھا۔ اس گروہ میں پون مرسی اور تھن آردیے تھے؛ سارجنٹ بچانے والا تھا، اور کرنل بچایا جانے والا تھا۔ ماریوس کی کیفیت کسی شرابی کی سی ہو رہی تھی؛ اس تصویر نے اس کے باپ کو کسی قسم کی زندگی عطا کر دی تھی؛ اب یہ Montfermeil کے شراب خانے کا سائن بورڈ نہیں رہا تھا؛ یہ ایک نوع

کا احیا تھا: ایک مقبرے نے جماہی لی تھی! ایک خیالی شے وہاں سے اٹھی تھی۔ ماریوں کا دل اس کی کنپٹی میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں واٹر لو کی توپ تھی، اور اس نا مبارک تختے نے، جس پر مبہم طریقے سے اس کا خون میں لت پت باپ پیش کیا گیا تھا، اس کو خوف زدہ کر دیا تھا، اور اسے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی بدصورت بھوت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا تھا۔

جب تن آردیے کا سانس سینے میں سمانے لگا تو اس نے اپنی خونیں آنکھ موسیولیبلا نک کی جانب پھیر دی، اور اس سے دھیمی مگر سخت آواز میں کہا:

"قبل اس کے ہم تمھارے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں ڈال دیں تم کیا کہنا چاہو گے؟"

موسیولیبلا نک نے اپنا سکون برقرار رکھا۔

اس خاموشی کے درمیان ایک پھٹی ہوئی آواز نے راہداری سے غمگین طنز کا ایک تیر پھینکا، "اگر پھاڑنے کے لیے کوئی لکڑی ہے تو میں حاضر ہوں۔"

یہ وہی آدمی تھا کلہاڑے والا، جو بہت خوش ہو رہا تھا۔

اسی لمحے ایک مہیب، کھڑے بالوں، اور مٹی جیسے چہرے والا ایک چہرہ دروازے میں سے ظاہر ہوا، ڈراؤنی ہنسی کے ساتھ، جو عام دانت نہیں بلکہ صرف درندوں والے نوکیلے دانت دکھا رہا تھا۔ یہ چہرہ اس آدمی تھا جس کے پاس قصائی کا بغدا تھا۔

"تم نے اپنا نقاب کیوں اتار دیا ہے؟" تن آردیے غصے میں چلایا۔

"تفریحاً۔" آدمی نے فوراً جواب دیا۔

پچھلے چند منٹ سے موسیولیبلا نک تن آردیے کو اور اس کی ہر حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا، جس کو اس کے غصے نے اندھا، اور چکا چوند کر دیا تھا، جو مانند میں اکڑ اکڑ کر آگے پیچھے چل رہا تھا۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ دروازے پر پہرہ ہے اور وہ ایک نہتے آدمی کو پکڑے ہوئے ہے، جب کہ وہ خود مسلح ہے، اور اگر خاتون تن آردیے کو بھی ایک آدمی گنا جائے تو نو افراد کے مقابلے میں وہ گرفتار اکیلا ہے۔

لاٹھی بردار آدمی سے اپنے خطاب کے دوران اس کی پشت موسیولیبلا نک کے سامنے ہو گئی تھی۔

موسیولیبلا نک نے موقعے کا فائدہ اٹھایا، کرسی اپنے پاؤں سے الٹ دی اور میز اپنے گھونسے سے، اور حیرت انگیز چالاکی سے ایک ہی قلابازی میں، قبل اس کے کہ تن آردیے گھومتا، وہ کھڑکی تک پہنچ چکا تھا۔ کھڑکی کو کھولنا، اس کے فریم پر چڑھنا، اس پر سوار ہونا، یہ سب کام صرف

ایک سیکنڈ کا تھا۔ ابھی وہ صرف نصف باہر ہوا تھا کہ چھ عدد تنومند مٹھیوں نے اسے پکڑ لیا اور پھرتی سے اسے واپس کمرے میں کھینچ لیا۔ ان میں سے تین "چمنی بنانے والے" تھے جو چھلانگ لگا کر اس پر جا پڑے تھے۔ اسی وقت خاتون تِمی آردیے نے اپنے ہاتھ اپنے بالوں میں پھنسا لیے تھے۔

اس تیزی اور چالاکی کے درمیان جو بعد میں ہوئی، دوسرے غنڈے راہداری سے دوڑتے ہوئے آ گئے۔ بوڑھا آدمی بستر پر تھا، جو وائن کے نشے میں چور معلوم ہو رہا تھا، تختے نما بستر سے نیچے اترا اور اپنے ہاتھوں میں سنگ شکن ہتھوڑا لیے چکراتا ہوا دوڑ پڑا۔

"چمنی بنانے والوں" میں سے ایک نے، جس کا چہرہ میلا کچیلا تھا اور موم بتی کی روشنی میں روشن ہو گیا تھا، جس میں ماریوس نے، دھبوں کے باوجود، Panchaud عرف Printanier عرف Bigrenaille کو پہچان لیا تھا، موسیو لیبلانک کے سر کے اوپر ایک قسم کی لاٹھی اٹھائی جس کے دونوں سروں پر سیسے کے بنے دو بڑے بڑے گولے لگے ہوئے تھے۔

ماریوس اس منظر کو برداشت نہیں کر سکا۔ "میرے بابا" اس نے سوچا، "مجھے معاف کر دیجیے!"

اور اس کی انگلی نے پستول کی لبلبی تلاش کی۔

گولی چلنے ہی والی تھی جب تِمی آردیے کی تیز آواز بلند ہوئی:

"[خبردار!] اس کو گزند نہ پہنچے!"

شکار کی بے جگری سے کی جانے والی کوشش نے تِمی آردیے کو اشتعال دلانے کے بجائے قدرے پُرسکون کر دیا۔ اس کوشش میں دو آدمی شامل تھے، ایک خوں خوار آدمی تھا اور دوسرا شاطر آدمی۔ اس لمحے تک، اس کی کامیابی کے علاوہ جس کے باعث شکار کو گرا لیا گیا تھا اور جو ساکت تھا، خوں خوار آدمی غالب رہا؛ جب شکار نے جد و جہد کی اور مزاحمت کی کوشش کی تو شاطر آدمی دوبارہ سامنے آ گیا اور معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"اسے گزند نہ پہنچانا۔" اس نے دہرایا۔ اس کو شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ اس کی پہلی کامیابی نے پستول کو چلنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا، اور ماریوس کو مفلوج کر دیا تھا، جس کی سوچ کے مطابق معاملے کی فوری اہمیت غائب ہو گئی تھی اور جسے، اس نئے دور کے پیشِ نظر، مزید انتظار کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔

کسے خبر تھی کہ کیا پھر کبھی ایسا کوئی موقع آئے گا جو اس کے سامنے Ursule کے باپ کو کچل دینے یا کرنل کو بچا لینے والے کو تباہ کر دینے کا خوفناک متبادل پیش کرے گا؟

ایک صبر آزما جد و جہد شروع ہو گئی تھی۔ موسیو لیبلانک کی، سینے پر پوری طاقت سے

لگائی جانے والی ایک ضرب نے حملہ آور بوڑھے آدمی کو لڑکھڑا دیا، اور وہ کمرے کے درمیان جا گرا؛ اس کے بعد، پیچھے سے لہرا کر آنے والے ہاتھ کی دو ضربوں نے دو مزید حملہ آوروں کو ٹھکانے لگا دیا، اور موسیو لیبلانک نے اپنے دونوں گھٹنوں کے نیچے دو آدمیوں کو دبا لیا؛ دونوں بدنصیب اس طرح تڑپ رہے تھے گویا وہ چکی کے سنگِ خارا سے بنے پاٹوں کے درمیان آ گئے ہوں، مگر دوسرے چار افراد نے اس طاقت ور بوڑھے آدمی کو دونوں ہاتھوں اور گردن کی پشت سے پکڑ لیا تھا، اور اس کو فرش پر پڑے دو "چمنی بنانے والوں" کے اوپر ڈال کر دبا لیا تھا۔

کچھ پر غالب، اور بقیہ کا مغلوب، ان کو کچلتا ہوا جو نیچے تھے، اور ان کے گلے گھونٹتا ہوا جو اس کے اوپر تھے، ان تمام کوششوں سے جان چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جو اس پر مسلط کر دی گئی تھیں،، موسیو لیبلانک ان خوف ناک غنڈوں کے نیچے اسی طرح غائب ہو گیا جیسے کوئی جنگلی خنزیر بھونکتے ہوئے شکاری کتوں کے غول کے نیچے آ جاتا ہے۔

وہ لوگ اس کو کھڑکی کے قریب لگے بستر پر گرا دینے اور اس کو خوف میں رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تھن خاتون آردیے کے ہاتھوں میں اب بھی اس کے بال تھے۔

"تم اس معاملے میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔" تھن آردیے نے کہا، "تمھاری شال پھٹ جائے گی۔"

خاتون تھن آردیے نے اسی طرح حکم مان لیا جیسے بھیڑیے کی مادہ غرا کر نر بھیڑیے کی بات مان لیتی ہے۔

"اب" تھن آردیے نے کہا، "اس کی تلاشی لو۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موسیو لیبلانک نے مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

انھوں نے تلاشی لی۔

اس کے پاس سوائے ایک چمڑی بٹوے کے جس میں چھ فرانک تھے، اور ایک رومال کے کچھ نہیں تھا۔

تھن آردیے نے رومال اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"کیا۔ کوئی پاکٹ بک نہیں تمھارے پاس؟" اس نے مطالبہ کیا۔

"نہیں، نہ کوئی گھڑی ہے۔" چمنی بنانے والوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

"پروا نہیں۔" نقاب پوش آدمی ventriloquist [پتلیوں کو اپنی آواز دینے والے ماہر] کی آواز میں بھنبھنایا جس کے ہاتھ میں بڑی سی کنجیاں تھیں، "یہ بوڑھا بہت سخت جان ہے۔"

تجنی آردیے دروازے کے قریب والے کونے میں گیا، رسیوں کا ایک گٹھا اٹھایا اور ان آدمیوں کی طرف پھینک دیا۔

"اس کو بستر کے پائے سے باندھ دو۔" اس نے حکم دیا۔

اور اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے جو موسیو لبلانک کی ضرب سے کمرے کے فرش پر پڑا تھا، اور کوئی حرکت نہیں کی تھی، اضافہ کیا، "کیا بولاترویل مرگیا ہے؟"

"نہیں۔" Bigrenaille نے جواب دیا، "نشے میں دُھت ہے۔"

"اس کو ایک کنارے کر دو۔" تجنی آردیے نے کہا۔

چمنی بنانے والوں میں سے دو آدمیوں نے اپنے پیروں کی مدد سے نشے میں بے ہوش آدمی کو اس کونے کے قریب دھکیل دیا جہاں پرانے لوہے کی اشیا کا ڈھیر تھا۔

"بابے" تجنی آردیے نے دھیمی آواز میں لاٹھی بردار سے کہا "تم اتنے آدمی کیوں لے آئے ہو؟ ان کی ضرورت نہیں تھی۔"

"کیا کرتا" لاٹھی بردار نے جواب دیا، "یہ سب اس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ زمانہ خراب ہے۔ کہیں کوئی کاروبار بھی تو نہیں ہے۔"

جس پر موسیو لبلانک کو پھینک دیا گیا تھا، ایک قسم کا اسپتال کا بستر تھا، بے ڈھنگے پن سے تراشے چار لکڑی کے پایوں پر بلند کیا گیا تھا۔

موسیو لبلانک نے انھیں اپنا کام کرنے دیا۔

غنڈوں نے اسے نشستہ کیفیت میں کس کر باندھ دیا۔ اس کے پاؤں زمین پر تھے، سر اس طرف تھا جو حصہ کھڑکی سے دور تھا اور آتش دان سے قریب۔

جب آخری گرہ باندھ دی گئی تو تجنی آردیے نے ایک کرسی گھسیٹی اور موسیو لبلانک کے سامنے بیٹھ گیا۔ تجنی آردیے اب تجنی آردیے جیسا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پچھلے چند لمحات میں وہ بے لگام تشدد سے گزر کر آسودہ اور چالاک نرمی کی کیفیت میں آگیا تھا۔

سرکاری ملازموں کی چکنی چپڑی مسکراہٹ، اور چند لمحے قبل کف نکالتے ہوئے وحشی منہ کو دیکھ کر ماریوں کو اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا؛ وہ چشم حیرت سے اس تشاسی جیسی قلب ماہیت کو ہوتا دیکھ رہا تھا، ایسا محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی چیتے کو وکیل کے روپ میں بدلتے دیکھ لیا ہو۔

"موسیو!" تجنی آردیے نے کہا۔

اور ایک اشارے سے ان غنڈوں کو ہٹایا جن کے ہاتھ اب بھی موسیو لبلانک پر تھے:

"تھوڑی دیر کے لیے تم لوگ ہٹ جاؤ، مجھے ان صاحب سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

سب دروازے کی طرف چلے گئے۔

اس نے بات شروع کی:

"موسیو، آپ نے کھڑکی سے کودنے کی کوشش کی غلطی کی ہے۔ آپ اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھتے۔ اب، اگر آپ اجازت دیں تو ہم دھیمی آواز میں بات کریں گے۔ سب سے پہلے تو میں اپنا ایک مشاہدہ بیان کرنا چاہتا ہوں؛ کہ آپ نے اپنے منہ سے ہلکی سی بھی چیخ نہیں نکالی۔"

تھن آردیے صحیح کہہ رہا تھا، یہ تفصیل حرف بہ حرف صحیح تھی، حالاں کہ ماریوں گھبراہٹ میں اس پر غور نہیں کر سکا تھا۔ موسیو لیبلانک نے مشکل سے چند ہی لفظ اپنے منہ سے نکالے تھے؛ حتیٰ کہ کھڑکی کے قریب چھ بدمعاشوں سے جدوجہد کے درمیان بھی اس نے غیر معمولی خاموشی برقرار رکھی تھی۔

تھن آردیے نے اپنا کلام جاری رکھا:

"میرے خدا! آپ 'چور چور' کا شور تو مچا ہی سکتے تھے۔ اور میں اس کو نامناسب بھی نہیں سمجھتا۔ 'قتل' بھی تو ہو سکتا تھا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں، غلط نہیں ہوتا۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جب آپ ایسے لوگوں کے نرغے میں ہوں، جن پر آپ کو اعتماد نہ ہو تو آپ مزاحمت کر سکتے ہیں۔ آپ نے مزاحمت کی ہوتی اور اس معاملے میں آپ کو کوئی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ آپ کا منہ بند کیا جا سکتا تھا، جو نہیں کیا گیا، اور میں اس کی بھی وجہ بتاتا ہوں۔ یہ کمرہ بالکل نجی ہے اور اسے اسی طرح رکھنے کی سفارش کی گئی ہے، مگر یہ بات اس کے حق میں بھی جاتی ہے۔ آپ یہاں سے ایک مارٹر بھی پھینک سکتے ہیں اور اس سے پولیس تھانے تک صرف اتنی آواز جائے گی جیسے کوئی شرابی دُھت ہو کر خراٹے لے رہا ہو۔ یہاں توپ کا گولا بوم کرے گا، اور بادل کی گرج پوف کرے گی۔ یہ رہنے کی بہت اچھی جگہ ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ آپ نے شور نہیں مچایا ہے، یہ اور بھی اچھی بات ہوئی ہے۔ میں آپ کو سراہتا ہوں، اور میں آپ کو یہ بھی بتاؤں گا کہ میں اس نتیجے پر کس طرح پہنچا ہوں۔ جنابِ عالی، جب کوئی آدمی شور مچاتا ہے تو کون آتا ہے؟ پولیس! اور پولیس کے بعد؟ انصاف! آپ نے شور نہیں مچایا ہے؛ اس لیے کہ آپ پولیس اور عدالت نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے — اور مجھے کافی عرصے سے اس کا شبہ بھی ہے کہ آپ کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔ ہماری جانب بھی کچھ ایسی ہی صورت ہے، کہ اسی میں ہمارا فائدہ ہے۔ تو، کیا ہم کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے؟"

جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا حالاں کہ تین آردیے کی آنکھیں جو اس نے موسیولیبلا نک پر مرکوز رکھی تھیں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر اپنے چبھتے ہوئے نکات داخل کر رہی تھیں، جو آنکھ کی پتلیوں سے نکل کر قیدی کے شعور میں تیر کی طرح لگ رہے تھے۔مزید یہ کہ اُس کی زبان جس پر کم درجے کی گستاخی اور حیلہ باز گستاخی کی چھاپ لگی ہوئی تھی، تقریباً مخصوص تھی، اور وہ بدمعاش، جو کچھ دنوں پہلے ڈاکا زنی کرتا تھا تبلیغ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

قیدی کی خود اختیاری خاموشی جس نے زندگی کی تمام پریشانیوں کو بھلا دیا تھا، اور وہ احتیاط جو اس حد تک کی گئی تھی، وہ مزاحمت جو فطرت کی پہلی لہر کے خلاف تھی، یعنی چیخ اٹھنا، جس پر اب اس کی توجہ دلائی گئی ہے، ان سب نے ماریوس کو پریشان کردیا تھا اور اس کے لیے دردناک حیرت کا باعث ہوئی تھی۔تین آردیے کے مبنی برحقیقت مشاہدے نے ماریوس کے لیے اس معمے کو مزید دھندلا کردیا جس نے اس غیر معمولی شخص کو ڈھانپ لیا تھا، جسے کورفیراک نے موسیولیبلا نک کی عرفیت عطا کی تھی۔

مگر وہ رسیوں سے بندھا شخص، جو بھی رہا ہو، اس وقت جلادوں کے نرغے میں تھا، اور ایسی قبر میں ڈالا جانے والا تھا جو ہر گزرتے لمحے اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔تین آردیے کے غصے کی موجودگی میں بھی جو اب نرمی میں بدل گیا تھا، یہ شخص جذبات سے عاری رہا؛ اور ماریوس ایسے وقت میں بھی اس شخص کے اداس بشرے کو آفریں کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

یہاں بظاہر ایک نفس تھا دہشت جس کے قریب پھٹک نہیں سکتی تھی اور جو مایوسی کے معنی سے بھی واقف نہیں تھا۔یہاں ان لوگوں میں، ایک ایسا شخص بھی تھا جو مشکل ترین حالات میں بھی حیرتوں کی سالاری کرتا ہے۔بحران سخت تھا، تباہی ناگزیر تھی، پھر بھی اس شخص کے چہرے پر کرب جیسی کوئی کیفیت نہیں تھی جو کسی ڈوبتے ہوئے انسان پر طاری ہو جایا کرتی ہے جب وہ پانی کے اندر اپنی دہشت سے لبریز آنکھیں کھولتا ہے۔

تین آردیے اپنی جگہ سے اٹھا، آتش دان کے قریب گیا، اس جالی کو سرکایا جو ساتھ والے پلنگ نما تختے کے ساتھ لگا دی گئی تھی، اور اس طرح دہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری انگیٹھی سامنے آگئی قیدی جس میں چھینی کو دیکھ سکتا تھا جو شدید حرارت سے سفید ہو گئی تھی، جگہ جگہ جس پر سرخ رنگ کے ستارے جل بجھ رہے تھے۔

اس کے بعد تین آردیے موسیولیبلا نک کے قریب اپنی نشست پر واپس آگیا۔

"میں اپنی بات پھر سے شروع کرتا ہوں۔" اس نے کہا، "ہم کسی سمجھوتے پر پہنچ سکتے

ہیں۔ آیئے ہم اس معاملے کو پر امن طریقے سے طے کرتے ہیں۔ میں نے ابھی طیش میں آ جانے کی غلطی کی ہے۔ نجانے میں کیا سوچ رہا تھا، کہ میں بہت آگے چلا گیا تھا، کہ میں نے بہت سی غیر ضروری باتیں بھی کی ہیں۔ مثال کے طور پر، چوں کہ آپ ایک کروڑ پتی انسان ہیں، میں نے رقم کا مطالبہ کیا، ایک بہت بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ یہ نا مناسب تھا۔ میرے خدا، اپنی ثروت کے باوجود، آپ کے اپنے اخراجات بھی ہوں گے — کس کے نہیں ہوتے؟ میں آپ کو تباہ نہیں کرنا چاہتا، بہر حال میں لالچی انسان نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو موقع محل کے حساب سے بہتر ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی اپنے آپ کو نامعقول بھی بنا لیتے ہیں۔ میں بہت سی باتوں کو سامنے رکھ رہا ہوں اور اپنی جانب سے قربانی دے رہا ہوں۔ میں صرف دو لاکھ فرانک کا طلب گار ہوں۔"

موسیو لیبلانک بالکل خاموش رہا۔

تھن آردیے نے اپنا کلام جاری رکھا:

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے وائن میں ذرا بھی پانی نہیں ملایا ہے [یعنی زیادتی نہیں کی ہے]؛ میں بہت اعتدال پسند انسان ہوں۔ مجھے آپ کی دولت کا اندازہ نہیں مگر یہ جانتا ہوں کہ آپ دولت سے چمٹے نہیں رہتے، اور آپ جیسا خیر خواہ انسان ایک خاندان کے سربراہ کو جس کی قسمت خراب ہے، یقینی طور پر دو لاکھ فرانک دے سکتا ہے۔ یقینی طور پر آپ سمجھے ہوئے انسان بھی تو ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں نے اس شام یہ سارا انتظام کیا ہے جس میں ان لوگوں کے مطابق، خاصی محنت کی گئی ہے، صرف اس لیے کہ آپ سے صرف اتنا طلب کیا جائے کہ ہم Desnoyer's میں جا کر پندرہ سو میں سرخ وائن پئیں اور بچھڑے کا گوشت کھالیں۔ دو لاکھ فرانک یقینی طور پر اتنے سارے کام کے لیے۔ یہ معمولی سی رقم ایک بار آپ کے جیب سے نکلے تو میں آپ کو اس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ سارا معاملہ ختم ہو جائے گا، اور آپ کو مزید مطالبات کا خوف نہیں رہے گا۔ آپ مجھ سے کہیں گے: مگر میرے پاس دو لاکھ فرانک نہیں ہیں۔ اوہ، میں زبردستی کرنے والا آدمی نہیں۔ میں اس کا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں، اتنی بھلائی کیجیے، کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے تحریر کر دیجیے۔"

یہاں پہنچ کر تھن آردیے رکا، اس کے بعد، اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے اور انگیٹھی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اضافہ کیا، میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ میں اس بات پر صاد نہیں کروں گا کہ آپ کو لکھنا نہیں آتا۔"

کوئی بڑے سے بڑا امراغ رساں بھی اس کے تبسم پر رشک کرتا۔

تین آردیے نے میز موسیولیبلانک کے قریب کر دی، قلم دان اور قلم لایا، میز کی دراز سے کاغذ نکالا، دراز کو نصف کھلا چھوڑ دیا، جس میں رکھا ایک لمبے پھل کا چاقو چمک رہا تھا۔

اس نے موسیو لیبلانک کے سامنے کاغذ رکھ دیا۔

"لکھیے۔" اس نے کہا۔

بالآخر قیدی بولا۔ "تم مجھ سے لکھنے کی توقع کس طرح کر سکتے ہو، کہ میں تو بندھا ہوا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، معاف کیجیے گا!" تین آردیے بولا، اور Bigrenaille کی طرف مڑ کر کہا "ان کا دایاں ہاتھ کھول دو۔"

Panchaud عرف Printanier عرف Bigrenaille نے حکم پر عمل درآمد کر دیا۔

جب قیدی کا دایاں بازو آزاد ہو گیا تو تین آردیے نے قلم کو دوات میں ڈبویا اور اس کو پیش کر دیا۔

"اچھی طرح سمجھ لیجیے جناب، آپ اس وقت ہمارے قابو میں، ہماری اجازت کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو یہاں سے نکال نہیں سکتی اور یہ بھی کہ ہمیں بہت افسوس ہو گا اگر ہمیں ناپسندیدہ حدود تک جانے پر مجبور کیا گیا۔ مجھے نہ آپ کا نام معلوم ہے نہ پتا، مگر میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ اس وقت تک اسی طرح بندھے رہیں گے جب تک کہ وہ آدمی جو یہ خط لے کر جائے گا، واپس نہیں آجاتا۔ اب مہربانی فرما کر لکھیے۔"

"کیا لکھوں؟" قیدی نے سوال کیا۔

"میں لکھواتا ہوں۔"

موسیولیبلانک نے قلم سنبھال لیا۔

تین آردیے نے لکھانا شروع کیا۔

"میری بیٹی ... "

قیدی لرز گیا، اور تین آردیے کی طرف دیکھا۔

"اچھا لکھو، میری پیاری بیٹی ....." تین آردیے نے کہا۔

موسیولیبلانک نے حکم پر عمل کیا۔

تین آردیے نے کہنا شروع کیا، "فوراً آؤ۔"

وہ رُکا، "آپ اسے تو کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، ہے کہ نہیں؟

"کیسے؟" موسیو لیبلا نک نے کہا۔

"اوہ خدایا!" تھن آردیے چیخا، "چھوٹی بچی کو، ننھی چڑیا کو۔"

موسیو لیبلا نک نے بظاہر کسی جوش و ہیجان کے بغیر جواب دیا، "مجھے پتا نہیں، کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"پھر بھی، لکھتے رہو۔" تھن آردیے نے کہا اور املا لکھانا جاری رکھا:

"فوراً آ، مجھے تیری فوری ضرورت آن پڑی ہے۔ جو آدمی یہ خط لے کر جا رہا ہے وہ تجھے میرے پاس لائے گا۔ میں بے چینی سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ پورے اعتماد کے ساتھ آ جا۔"

موسیو لیبلا نک نے پورا جملہ لکھ لیا۔

تھن آردیے نے کہا، "اوہ! 'پورے اعتماد کے ساتھ' کو قلم زد کر دیجیے، اس سے اسے شبہ ہو جائے گا حالات ویسے نہیں ہیں جیسے ہونے چاہئیں، اور بے اعتمادی ممکن ہے۔"

موسیو لیبلا نک نے یہ الفاظ قلم زد کر دیے۔

"اب" تھن آردیے نے اصرار کیا، "اس پر دستخط کر دیجیے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

قیدی نے قلم رکھ دیا اور سوال کیا، "یہ خط کس کے لیے ہے؟"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔" تھن آردیے نے فوراً پلٹ کر جواب دیا "اپنی چھوٹی سی بچی کے لیے، میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں۔"

صاف ظاہر تھا کہ تھن آردیے اس لڑکی کا نام نہیں لینا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے اس نے "ننھی چڑیا" کہا "چھوٹی سی بچی کہا" مگر اس نے نام نہیں لیا — یہ عمل ایک چالاک آدمی کی احتیاطی تدبیر تھی جو اپنے ساتھیوں سے اپنا راز چھپانا چاہتا تھا۔ نام بتا دینے کا مطلب پورے معاملے کو ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دینے کے مترادف تھا، اور ان لوگوں کو وہ کچھ بتا دینا تھا جسے جاننے کی ان کو ضرورت نہیں تھی۔

اس نے کہا۔

"دستخط کیجیے، آپ کا نام کیا ہے؟"

"Urbain Fabre." قیدی نے جواب دیا۔

تھن آردیے نے بلی جیسی پھرتی سے اس کے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا رومال نکال لیا، اس پر نشان تلاش کرنے لگا، اور رومال کو موم بتی تک لے گیا۔

"U.F. ہاں یہی ہے۔ ٹھیک ہے اس پر U.F ہی لکھ دیجیے۔"

قیدی نے دستخط کر دیے۔

"چوں کہ خط کو تہہ کرنے کے لیے دو ہاتھ درکار ہوتے ہیں، آپ یہ مجھ کو دے دیجیے، میں تہہ کر دوں گا۔"

تہہ کرنے کے بعد تین آردیے نے پھر کہنا شروع کیا:

"اس پر لکھیے میڈموزیل Fabre، اور اپنے گھر کا پتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ یہاں سے بہت دور رہتے ہیں، Saint-Jacquesdu-Haut-Pas کے قریب، اس لیے کہ آپ ہر روز گرجا گھر جاتے ہیں، مگر مجھے سڑک کا نام معلوم نہیں۔ آپ حالات کو سمجھ رہے ہیں نا، چوں کہ آپ نے نام غلط نہیں بتایا ہے، اس لیے آپ پتا بھی غلط نہیں بتائیں گے۔ خود ہی پتا بھی لکھ دیجیے۔" قیدی نے ایک لمحہ سوچا، قلم اٹھایا اور لکھا:

میڈموزیل Fabre، مسیو Urbain Fabre کے ہاں، مکان نمبر 17، Saint-Dominique-D'Enfer اسٹریٹ۔

تین آردیے نے بے چینی سے خط اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔

"بیوی!" اس نے چیخ کر کہا۔

خاتون تین آردیے جلدی سے اس کی طرف بھاگی۔

"یہ رہا خط۔ تم جانتی ہو کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔ دروازے پر سواری کھڑی ہے، فوراً جاؤ اور فوراً آؤ۔" اور قصائی کے کلھاڑے والے سے مخاطب ہو کر کہا،

"چوں کہ تم نے اپنا نقاب اتار دیا ہے، تم ہی اس عورت کے ساتھ جاؤ گے۔ تم گھوڑے گاڑی کے پیچھے کھڑے رہو گے۔ تم جانتے ہو کہ تم نے اپنی ٹیم کہاں چھوڑی ہے؟"

"ہاں۔" آدمی نے جواب دیا۔

کونے میں کلھاڑا رکھ کر وہ مادام تین آردیے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

وہ لوگ چلے گئے، تین آردیے نے نصف کھلے دروازے سے اپنا سر نکالا اور راہداری میں چلا کر کہا، "سب سے ضروری بات: خط نہ کھو دینا؛ یاد رہے کہ تمھیں اپنے ساتھ دو لاکھ فرانک لانے ہیں۔"

بیوی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا، "چین سے بیٹھو، میں نے اسے اپنی انگیا میں رکھ لیا ہے۔"

ایک منٹ نہیں گزرا تھا کہ گھوڑے کی آواز سنائی دی، اور یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔

"اچھا!" تبن آردیے غرایا۔ "وہ لوگ کافی تیزی سے جا رہے ہیں۔ اتنی سرپٹ چال میں وہ تین چوتھائی گھنٹے ہی میں واپس آ جائیں گے۔"

اس نے آتش دان کے قریب ایک کرسی کھینچی، اور اپنا بوٹ انگیٹھی کے سامنے کر دیا۔

"میرے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

اب ماند میں پانچ غنڈے، تبن آردیے اور قیدی رہ گیا تھا۔

وہ، جنھوں نے سیاہ نقاب سے یا سیاہ رنگ کی لئی سے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے، اور انھیں خوف کی خاطر کوئلے جلانے والے، نگرو اور عفریت جیسے چہرے بنا لیے تھے، ان کا انداز نہایت احمقانہ اور اداسی سے لبریز تھا، اور صاف محسوس کیا جا سکتا تھا کہ یہ جرم کا ارتکاب کرتے تھے — معمولی کام کے طور پر، سکون کی خاطر، غیظ یا رحم کے بغیر، جس میں بیزاری یا سستی نہیں ہوتی تھی۔ یہ وحشیوں کی طرح ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے اور خاموش تھے۔

تبن آردیے اپنے پاؤں گرم کر رہا تھا۔

قیدی اپنی خاموشی میں گم ہو گیا تھا۔

چند لمحوں پہلے جہاں شور و غوغا ہو رہا تھا، اب اداس خاموشی کا راج تھا۔ وہ چھوٹی سی موم بتی اتنے بڑے علاقے میں دھندلی سی روشنی کر رہی تھی، انگیٹھی کی آگ بجلا گئی تھی، اور وہ سارے عفریت نما سر، دیواروں اور سقف پر بھیانک پر چھائیاں ڈال رہے تھے۔

شراب میں دھت بوڑھے کے خراٹوں کے سوا کوئی آواز سنی نہیں جا سکتی تھی۔

ماریوس فکر کی کیفیت میں انتظار کر رہا تھا جو ہر معمولی سے بات سے بڑھ جاتی تھی۔ معما پہلے سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

وہ "چھوٹی سی بچی" کون تھی جسے تبن آردیے "معنی چڑیا" کہہ رہا تھا؟ کیا وہ اس کی "Ursule" تھی؟ قیدی پر اس لفظ "معنی چڑیا" نے زیادہ اثر نہیں کیا، اور اس نے جواب میں بالکل فطری طور پر کہا تھا، "پتا نہیں اس سے تمھارا مطلب کیا ہے۔" دوسری جانب دو حروف U. F کی تشریح ہو گئی تھی؛ ان کا مطلب Urbain Fabre; تھا۔ Ursule کو Ursule نہیں کہا گیا تھا۔ ماریوس اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

ایک قسم کے خوف ناک افسوں نے اسے اپنی چوکی پر جڑ دیا تھا، جس سے وہ پورے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں وہ کھڑا تھا، نہ ہل سکتا تھا، نہ سوچ سکتا تھا، گویا نظر آنے والی قابلِ نفرت چیزوں نے اس کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ وہ کسی واقعے کے انتظار میں تھا خواہ وہ کسی قسم کا ہو،

اس لیے کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کر پا رہا تھا اور اسے پتا نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

'پھر بھی' اس نے سوچا، ''اگر وہ مقتی چڑیا ہے، تو میں اسے ضرور دیکھوں گا، اس لیے کہ یہ عورت اسے اپنے ساتھ یہاں لانے والی ہے۔ وہ اس کھیل کا اختتام ہوگا، اور جب اگر ضروری ہوا تو میں اپنی زندگی اپنا خون بھی دے دوں گا مگر میں اسے کبھی ان لوگوں کے حوالے نہیں ہونے دوں گا! کوئی شے مجھے روک نہیں سکے گی۔''

اس طرح تقریباً آدھ گھنٹا گزر گیا۔ تِن آردیے اپنے طول خیالات میں غرق تھا۔ قیدی بالکل ساکت تھا۔ اس کے باوجود ماریوس کو گمان ہو رہا تھا کہ وقفے کے دوران، اور پچھلے چند لمحے، اس نے قیدی کی سمت سے آتی نہایت ہلکی سے آواز سنی تھی۔

اور پھر اچانک تِن آردیے نے قیدی کو مخاطب کیا:

''ارے ہاں، موسیو Fabre، مجھے فوراً آپ سے ایک بات کہنی ہے۔'' وہ چند لفظ دراصل تشریحات کی ابتدا تھے۔ ماریوس نے اپنے کان اس کی طرف لگا دیے۔

''میری بیوی جلد ہی واپس آجائے گی، اطمینان رکھیے۔ میرا خیال ہے کہ مقتی چڑیا واقعی آپ کی بیٹی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ اسے آپ ہی کے پاس ہونا چاہیے۔ ذرا سنیے۔ میری بیوی آپ کے خط کے ساتھ اس کو تلاش کر لے گی۔ میں نے خود اپنی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اس طرح کا لباس زیب تن کرے، جیسا کہ وہ پہنے ہوئے ہے، تا کہ اس لڑکی کو اس کے ساتھ آنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ وہ دونوں گاڑی میں داخل ہوں گی، میرا ساتھی پیچھے ہوگا۔ پشتے سے باہر نکلنے کے بعد ایک پھندا ہوگا، یعنی کسی جگہ، دو بہت اچھے گھوڑوں سے جتی ایک اور گاڑی ہوگی۔ وہ گاڑی سے نکلے گی اور دوسری گاڑی میں سوار ہو جائے گی، میرا ساتھی بھی دوسری گاڑی میں اس کے ساتھ سوار ہو جائے گا، اور میری بیوی یہ کہنے کے لیے یہاں واپس آئے گی، 'کام ہو گیا ہے۔' بچی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؛ پھندا اس کو ایک جگہ لے جائے گا جہاں اسے خاموش رہنا پڑے گا، اور جوں ہی آپ دو لاکھ فرانک میرے حوالے کر دیں گے، لڑکی آپ کو واپس کر دی جائے۔ اگر آپ مجھے گرفتار کرا دیں گے تو میرا ساتھی مقتی چڑیا کا کام تمام کر دے گا۔

قیدی بالکل خاموش رہا۔ ایک وقفے کے بعد تِن آردیے نے مزید کہا:

''بالکل سادہ سی بات ہے۔ اگر آپ نہیں چاہیں گے تو آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔ میں آپ کو تنبیہ کر رہا ہوں، تا کہ آپ تیار رہیں۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکا؛ قیدی خاموش رہا، اور تِن آردیے نے پھر کہنا شروع کیا:

"جوں ہی میری بیوی واپس آ کر مجھ سے کہتی ہے، 'معتی چڑیا راستے میں ہے' ہم آپ کو آزاد کر دیں گے، اور آپ اپنے گھر جا کر آرام سے سو جائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ارادے بُرے نہیں۔"

ماریوس کے ذہن میں خوف ناک مناظر گزر رہے تھے۔وہ بچی جسے یہ لوگ اغوا کر رہے تھے، واپس نہیں لائی جائے گی؟ ان عفریتوں میں سے ایک اس کو ظلمات میں لے جائے گا؟ مگر کہاں؟ اور اگر یہ وہی لڑکی ہے تو کیا ہوگا؟

صاف ظاہر تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ماریوس کو دل کی دھڑکن رُکتی محسوس ہوئی۔

اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا پستول خالی کر دے؟ سارے بدمعاشوں کو انصاف کے حوالے کر دے؟ مگر وہ خوف ناک آدمی، قصائی کے بھدے والا، لڑکی کے ساتھ ہماری پہنچ سے باہر ہوگا، اور ماریوس تین آردیے کے الفاظ پر غور کرنے لگا، جن سے خونیں مطلب نکل رہے تھے: "اگر آپ مجھے گرفتار کرا دیں گے تو میرا ساتھی معتی چڑیا کا کام تمام کر دے گا۔"

اب صرف کرنل کی وصیت ہی سامنے نہیں تھی، اس کی محبت نے اسے روکے رکھا تھا۔

اس خوف ناک صورتِ حال کا، جس میں آدھ گھنٹا گزر چکا تھا، منظر لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہو رہا تھا۔

ماریوس کے ذہن میں اتنی تاب تھی کہ یکے بعد دیگرے، تمام دل خراش تاویلات پر غور کر سکے، امید کی تلاش میں رہے، خواہ کچھ بھی حاصل نہ ہو۔

اس کے خیالات میں برپا ہنگامے ماند کی موت جیسی خاموشی کے بالکل برعکس تھے۔

اس خاموشی کے درمیان زینے کے قریب نچلے منزل کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہو جانے کی آوازیں سنائی دیں۔

قیدی نے اپنے بندھنوں میں حرکت کی۔

"بورژوا آ گئی ہے۔" تین آردیے نے کہا۔

اس کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ خاتون تین آردیے تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، ہانپ رہی تھی، آنکھیں شعلہ بار تھیں۔اس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں کو زانو پر مارتے ہوئے چیخ کر کہا، "غلط پتا!"

وہ غنڈہ جو اس کے ساتھ گیا تھا عورت کے عقب سے ظاہر ہوا اور اس نے اپنا کلھاڑا پھر اٹھا لیا تھا۔

عورت نے کہنا شروع کیا، "وہاں کوئی نہیں رہتا! Saint-Dominique اسٹریٹ،

سترہ نمبر میں موسیو Urbain Fabre نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔ انھیں کچھ معلوم نہیں۔"

اس کا سانس رُک رہا تھا، تھوڑی دیر کے لیے رُکی، اور پھر کہنے لگی:

"موسیو تِس آردیے اس بوڑھے نے تمھیں نچا دیا ہے۔" "تم بہت سادہ مزاج آدمی ہو۔ تمھاری جگہ میں ہوتی تو اس وحشی کو چار ٹکڑے کرنے سے ابتدا کرتی۔ اور اگر یہ بدمعاش کرتا تو میں اس کو زندہ اُبال دیتی۔ اس طرح اسے بولنا پڑتا، اور بتاتا کہ لڑکی کہاں ہے، اور وہ چم چم کرتی دولت کہاں رکھتا ہے۔ میں نے اس معاملے میں یہ سب کیا ہوتا۔ لوگ بالکل صحیح کہتے ہیں کہ عورتوں کے مقابلے میں مرد کچھ احمق ہوتے ہیں۔ سترہ نمبر میں کوئی نہیں رہتا۔ وہاں تو صرف گاڑیوں کا ایک بڑا سا پھاٹک ہے! Saint-Dominique اسٹریٹ میں کوئی موسیو Fabre نہیں رہتا۔ اتنی دوڑ بھاگ اور کوچوان کی فیس دینی پڑی ہے۔ میں نے دربان اور خاتون دربان سے بات کی تھی، وہ اس شخص کو نہیں جانتے۔

ماریوس نے ایک بار پھر سُکھ کا سانس لیا۔

وہ لڑکی، Ursule یا معنّی چڑیا محفوظ تھی۔

جب اس کی برہم بیوی گلا پھاڑ کر چلّا رہی تھی، تِس آردیے میز پر بیٹھ گیا تھا۔

کئی منٹ تک اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، بس اپنا دایاں پیر، جو لٹک رہا تھا، ہلاتا رہا اور وحشیانہ انداز میں انگیٹھی کی طرف دیکھتا رہا۔

بالآخر، اس نے دھیمے اور غیر معمولی طور پر خوں خوار لہجے میں قیدی سے کہا:

"غلط پتا؟ تم اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟"

"وقت حاصل کرنے کے لیے۔" قیدی نے گرج دار آواز میں چیخ کر کہا، اور اسی لمحے اپنے سارے بندھن گرا دیے! سارے بندھن کٹے ہوئے تھے۔ قیدی صرف پلنگ کے ایک پائے سے بندھا ہوا تھا۔

قبل اس کے کہ سات آدمیوں کے ہوش و حواس درست ہوتے اور وہ آگے بڑھتے، قیدی آتش دان میں جھک گیا تھا، انگیٹھی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، سیدھا کھڑا ہوگیا، اور اب تِس آردیے، خاتون تِس آردیے مرد اور سارے غنڈے خوف سے کمرے کے کونے میں جمع ہو گئے تھے، اور بے ہوشی کی سی کیفیت میں قیدی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ تقریباً آزاد اور خوف ناک انداز میں تھا، اس نے لال انگارہ دہکتی چھینی کو اپنے سر کے اوپر بلند کر لیا تھا۔

پولیس جب Gorbeau منزل میں ہونے والے اغوا کی تفتیش کر رہی تھی تو

انھیں اس عمارت میں ایک سؤ کا ایک بڑا سا سکہ ملا تھا جو عجیب طرح سے کاٹا گیا تھا اور کام بھی کرتا تھا۔ سؤ کا یہ سکہ اس حیران کن صنعت کی ایجاد تھا جو جہاز کے قیدی پر چھائیوں میں اور پرچھائیوں کے لیے بناتے تھے، وہ حیرت انگیز اشیا جو سوائے فرار کے، کسی اور کام میں نہیں آتی تھی۔ یہ ڈراونی اور نازک مصنوعات جوہریوں کے لیے ویسے ہی فن پارے ہوتی تھیں جیسے کہ شاعری کے لیے بولی کے استعارے ہوتے ہیں، جیسے جہازوں میں Benvenuto Cellinis [جوہری، سنگ تراش 1500ء - 1571ء] ہوتے ہیں، اسی طرح زبان میں Villons [مشہور فرانسیسی شاعر فرانسوا ولن 1431ء -1463ء] ہوتے ہیں۔ وہ بد نصیب جو نجات کی تمنا میں رہتے ہیں، سؤ کے بڑے سے سکے کو، اس پر بنے نقش و نگار کو بچا کر، کبھی کبھی بغیر کسی اوزار کے، اور کبھی چوبی دستے والے چاقو سے دو پتلی پتلی پرتوں میں کاٹ لیتے ہیں اور سؤ کے کنارے پر ایسی نالی بنا لیتے ہیں کہ یہ پرتیں ایک بار پھر یک جا کی جا سکیں اور سؤ کا سکہ دوبارہ وجود میں آجائے۔ ان پرتوں کو ایک دوسرے میں پیچ سے اس طرح یک جا کردیا جاتا ہے کہ وہ اصلی سکہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور بہ وقتِ ضرورت اسے ایک ڈبیے کی طرح کھولا اور بند بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی ڈبے میں گھڑی کی کمانی بھی چھپائی جاتی ہے، اور گھڑی کی یہ کمانی اگر ہنرمندی سے استعمال کی جائے تو اس سے زنجیر اور لوہے کی سلاخیں تک کاٹی جا سکتی ہیں۔ بدقسمت سزا یافتہ کو اپنے پاس صرف ایک سو رکھنے کی اجازت ہوتی ہے؛ مگر یہ سو صرف سؤ ہی نہیں آزادی ہوتا ہے۔ بعد میں اس عمارت کی تلاشی کے دوران پولیس کو اسی قسم کا ایک بڑا سا سؤ کا سکہ ملا تھا، جو کھڑکی کے قریب رکھے بستر کے نیچے پایا گیا تھا۔ سؤ کے ساتھ ہی نیلے رنگ کے اسٹیل کی ایک چھوٹی سی آری بھی ملی تھی۔

اس کا امکان ہے کہ اس وقت بھی جب غنڈے اس کی جامہ تلاشی لے رہے تھے، قیدی کے پاس یہ سؤ کا یہ سکہ رہا ہوگا، جو اس نے اپنے ہاتھ میں چھپا لیا تھا، اور بعد میں جب اس کا دایاں ہاتھ آزاد ہو گیا تھا، اس نے پیچ نکالا ہوگا اور سکے کی پرتوں کو اس رسی کو کاٹنے میں استعمال کیا ہوگا جس سے اسے باندھا گیا تھا، اور یہ عمل اسی ہلکی سی آواز کا باعث تھا جو ماریوس کو بھی سنائی دیتی تھی۔

چوں کہ قیدی جھک نہیں سکتا تھا، اپنے آپ سے غداری کرنے کے خوف سے اس نے بائیں پیر کا بندھن نہیں کاٹا تھا۔

غنڈے اپنی پہلی حیرانی سے نجات پا چکے تھے۔

”پریشان نہ ہو۔“ Bigrenaille نے جین آردیے سے کہا، ”اس کا ایک پیر ابھی گرفت میں ہے، یہ بھاگ نہیں سکتا۔اس کا میں ذمے دار ہوں۔ یہ بندھن میں نے باندھا تھا۔“

اس دوران قیدی نے بولنا شروع کر دیا تھا:

”تم لوگ بدنصیب ہو، مگر میری زندگی بچائے جانے کے قابل نہیں۔تم سمجھتے ہو کہ تم مجھے بولنے پر مجبور کر سکتے ہو، کہ تم وہ کچھ لکھوا سکتے ہو جو میں لکھنا نہیں چاہتا، کہ تم مجھے وہ کہنے پر مجبور کر سکتے ہو، جو میں کہنا نہیں چاہتا۔“ [اتنا کہہ کر] اس نے اپنے اپنی بائیں آستین الٹی، اور کہا، ”ادھر دیکھو۔“

ساتھ ہی اس نے اپنا بازو آگے بڑھا دیا اور روشن چھینی کو جسے وہ چوبی دستے کے ذریعے اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا اپنے برہنہ بازو پر رکھ لیا۔

جلتے ہوئے انسانی گوشت کی کڑ کڑاہٹ سنائی دینے لگی، اور پورا کمرہ کسی اذیت رسانی کے کمرے جیسی بو سے بھر گیا۔

شدید ترین خوف سے ماریوس لڑکھڑانے لگا، غنڈے لرز گئے، مگر اس شخص کے چہرے پر کسی قسم کی تکلیف کے آثار دکھائی نہیں دیے، اور جب کہ لال بھبھوکا آہن، دھواں دیتے ہوئے زخم میں دھنس گیا تھا، جذبات سے عاری اور تقریباً عالی شان انداز میں اس شخص نے اپنی خوب صورت نظریں جین آردیے پر جمائے رکھیں، جن میں نفرت کا شائبہ تک نہ تھا، اور جہاں دکھ پُرسکون جلالت کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔

عظیم الشان اور بلند و بالا فطرت کو، گوشت اور احساسات کی بغاوت کو، جب جسمانی دکھ دیے جاتے ہیں تو ان کا نفس ابھر کر ان کی پیشانی پر اپنا اظہار کرتا ہے، اسی طرح جیسے سپاہیانہ قوتوں کے درمیان ابھرنے والی بغاوت اپنا اظہار کرنے لگتی ہے۔

”بدنصیب لوگو!“ اس نے کہا، ”مجھ سے زیادہ خوف نہ کھاؤ، جس طرح میں تم سے خوف زدہ نہیں ہوں۔“ اور پھر اس نے چھینی کو زخم سے اکھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا، جو نصف کھلی ہوئی تھی؛ وہ خوف ناک اور سرخ چھینی رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی، جو جاتے ہوئے فضا میں گھوم رہی تھی، اور بہت دور برف میں جا کر گر گئی تھی۔

قیدی نے کہنا شروع کیا:

”میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔“ وہ اس وقت بالکل نہتا تھا۔

”پکڑ لو۔“ جین آردیے نے کہا۔

دو غنڈوں نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیے، اور وہ نقاب پوش، جوف صوتی کا ماہر [بے جان پتلیوں کے لبوں سے اپنی آوازیں نکالنے والا]، ہلکی سے بھی جنبش پر اس کی کھوپڑی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے، اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

عین اسی وقت ماریوں نے کسی کو درمیان کی دیوار کے بالکل نیچے اس قدر قریب سے دھیمے لہجے میں کہتے سنا کہ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کون بول رہا ہے۔

"بس ایک ہی کسر باقی رہ گئی ہے۔"

"اس کا گلا کاٹ دو۔"

"ٹھیک کہا۔"

یہ شوہر اور بیوی تھے، جو ایک دوسرے کو مشورے دے رہے تھے۔

تبن آردیے آہستہ آہستہ میز کی طرف چلا، دراز کھولی اور چاقو نکال لیا۔ ماریوں نے پستول کے دستے کی نقش کاری پر اپنی انگلیاں پھیریں۔ ایک بے نظیرا الجھاوے کی کیفیت تھی۔ پچھلے ایک گھنٹے سے ماریوں کے ضمیر میں دو آوازیں اٹھ رہی تھیں، ایک آواز اسے اپنے والد کی وصیت کی تاکید کر رہی تھی، دوسری آواز قیدی کو چھڑانے کے لیے چیخ رہی تھی۔ یہ دونوں آوازیں مسلسل آ رہی تھیں جس نے اس کے کرب کو اذیت میں بدل دیا تھا۔ اس وقت تک اس کو مبہم سی امید تھی کہ ان دو فریقوں کے درمیان مصالحت کی کوئی راہ نکل آئے گی، مگر اب اس کے امکانات نظر نہیں آ رہے تھے۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا، تاخیر کی آخری حد آ چکی تھی؛ تبن آردیے قیدی سے چند قدم دور کھڑا سوچ رہا تھا۔ ماریوں نے اپنے اطراف دیکھا، آخری میکانکی حربہ سامنے تھا۔ اچانک اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ پورے چاند کی ایک روشن کرن، اس کے قدموں کے قریب، میز پر رکھے، کاغذ کے ایک ٹکڑے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ تبن آردیے کی بڑی بیٹی نے اسی صبح اس کاغذ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا:

"پولیس آ گئی ہے۔"

ماریوں کے دماغ میں ایک خیال آیا، ایک جھماکا سا ہوا؛ یہی ایک مناسب طریقہ تھا اسے جس کی تلاش تھی۔ اس خوف ناک مسئلے کا حل تھا جو اسے مارے ڈال رہا تھا، کسی طرح قاتل کو چھوڑ دیا جائے اور شکار کو بچا لیا جائے۔

وہ اپنے کموڈ پر جھکا، اپنا ہاتھ بڑھایا، کاغذ کے ٹکڑے کو پکڑا، آہستگی سے دیوار سے پلستر کا ایک ٹکڑا اکھاڑا، کاغذ کے اس ٹکڑے کو اس کے اطراف لپیٹا، اور دراز کے ذریعے مانند کے

درمیان پھینک دیا۔

بڑا نازک وقت آ گیا تھا۔ تین آردیے نے اپنے آخری خطرات، یا اپنے ضمیر کے آخری ذرّے پر قابو پا لیا تھا، اور قیدی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"کچھ گرا ہے" خاتون تین آردیے چیخی۔

"کیا ہے؟" اس کے شوہر نے پوچھا۔

عورت تیر کی طرح لپکی، پلستر کا ٹکڑا اٹھایا، اور اپنے شوہر کو پکڑا دیا۔

"یہ کہاں سے آ گیا؟" شوہر نے سوال کیا۔

"خدایا!" عورت نے جواب دیا، "تمھارا کیا خیال ہے، یہ کہاں سے آیا ہوگا؟ کھڑکی سے، اور کہاں سے؟"

"میں نے اس آتے دیکھا ہے۔" Bigrenaille نے جواب دیا۔

تین آردیے نے تیزی سے کاغذ کھولا اور اس کو موم بتی کے قریب لے گیا۔

"یہ تو شیطان ایپونین کی تحریر ہے۔"

اس نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا، جو جلدی سے قریب آئی، اور اسے کاغذ پر لکھی تحریر دکھائی، اس کے بعد بہت آہستگی سے کہا "جلدی کرو، سیڑھی لگاؤ، بیکن کو چوہے دان میں پڑا رہنے دو، بھاگو!"

"اس آدمی کا گلا کاٹے بغیر ہی؟ خاتون تین آردیے نے پوچھا۔

"اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

"کدھر سے؟" Bigrenaille نے پوچھا۔

"کھڑکی کے ذریعے۔" Bigrenaille نے جواب دیا، "چوں کی ایپونین نے یہ پتھر کھڑکی کے ذریعے پھینکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرف سے مکان کی نگرانی نہیں ہو رہی ہے۔"

جوف صوتی کے ماہر نے اپنی نقاب اور بڑی سی کنجی فرش پر رکھی، دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیے، اور منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر جلد جلد تین بار اپنی مٹھیاں کھولیں اور بند کیں۔ یہ اس اشارے جیسا اشارہ تھا جو ہنگامی حالات میں جہاز خالی کر دینے کے لیے کیا جاتا ہے۔

غنڈوں نے، جو قیدی کو پکڑے ہوئے تھے، چھوڑ دیا؛ پلک جھپکتے ہی رسی والی سیڑھی کھڑکی سے باہر لٹکا دی گئی اور رسی میں لگے لوہے کے دونوں آنکڑوں کو کھڑکی سے باندھ دیا گیا۔ قیدی نے اپنے اطراف ہونے والی حرکات کی پروا نہیں کی۔ وہ یا تو [جاگتے میں] خواب

دیکھ رہا تھا یا دعا مانگ رہا تھا۔

جوں ہی سیڑھی تیار ہو گئی، ژبن آردیے چلایا۔

''آؤ، پہلے بورژوا!''

ژبن آردیے اپنا پیر نکالنے ہی والا تھا کہ Bigrenaille نے اسے کالر سے پکڑ لیا۔

''بہت ہو گیا بڈھے! تو ہمارے بعد نکلے گا۔''

سارے غنڈے یک زبان ہو چیخے، ''ہمارے بعد۔''

''تم لوگ بالکل بچے ہو۔'' ژبن آردیے نے کہا، ''وقت ضائع ہو رہا ہے۔ پولیس قریب آ گئی ہے۔''

''اچھا'' غنڈوں نے کہا، ''تو قرعہ نکالو، کون پہلے جائے گا؟''

ژبن آردیے چیخا، ''پاگل ہو گئے ہو؟ دیوانے ہو گئے ہو؟ کتنے احمق ہو تم لوگ! کیا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو؟ قرعہ نکالنا چاہتے ہو، احمقو، اور وہ بھی گیلی انگلی سے، چھوٹے سے تنکے سے، جن پر سب کے نام لکھے ہوں گے اور جو ہیٹ میں ڈالے جائیں گے۔''

''کیا تم میری ہیٹ لینا پسند کرو گے؟'' ڈیوڑھی سے ایک آواز آئی۔

سب نے گھوم کر دیکھا۔ [انسپکٹر] جاویر کھڑا تھا۔

اس کے ہاتھ میں اس کی ہیٹ تھی، مسکراتے ہوئے جیسے وہ ان لوگوں کو پیش کر رہا تھا۔

❋

شکار کی گرفتاری

شام ہوتے ہی جاویر نے Barrieredes-Gobelins اسٹریٹ کے درختوں کے درمیان Gorbeau ہاؤس کے بالکل سامنے اپنے آدمی تعینات کر دیے اور خود بھی گھات لگانے والوں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے کارروائی کی ابتدا ”اپنی جیب“ کھول دینے سے کی تھی جس میں وہ دونوں لڑکیاں ڈالی جانے والی تھیں جن کو راستوں پر نگاہ رکھنے پر متعین کیا گیا تھا۔ وہ صرف آزلما کو پکڑ سکا تھا۔ اپونین نہیں ملی اس لیے کہ وہ اپنی چوکی پر نہیں تھی؛ وہ غائب ہو گئی تھی اور جاویر اس کو پکڑ نہیں سکا تھا۔ اس کے بعد جاویر کان لگائے اس اشارے کا منتظر تھا جو طے ہو چکا تھا۔ گھوڑا گاڑیوں کی بار بار آمد و رفت نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ بالآخر، اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہاں کوئی اڈہ ضرور ہے اور یہ بھی کہ اس کی قسمت یاوری کرنے والی ہے؛ کہ وہ داخل ہونے والے غنڈوں کو پہچانتا تھا اور اس نے پستول کی گولی کی آواز کا انتظار کیے بغیر عمارت میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

قاری کو یاد ہوگا کہ اس کے پاس ماریوس کی داخلے کی کنجی تھی۔

وہ بالکل صحیح وقت پر پہنچ گیا تھا۔

خوف زدہ غنڈے ان ہتھیاروں پر ٹوٹ پڑے جنھیں فرار کے وقت انھوں نے تمام کونوں میں ڈال دیا تھا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں یہ ساتوں آدمی جن کو دیکھ کر خوف آتا تھا اپنے دفاع کے لیے یک جا ہو گئے تھے؛ ایک، جس کے پاس گوشت کاٹنے کا کلہاڑا تھا؛ دوسرا جس کے پاس کنجی تھی؛ ایک اور، جس کے پاس لاٹھی تھی۔ بقیہ سب، قینچیوں، چمٹوں اور ہتھوڑوں سے لیس تھے۔ تین آردیے کی مٹھی میں اس کا چاقو تھا۔ خاتون تین آردیے نے فرش کا وہ بڑا سا

پتھر اٹھا لیا تھا، جو کھڑکی کے پاس پڑا تھا جسے اس کی لڑکیاں اسٹول کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔

جاویر نے اپنی ہیٹ دوبارہ پہن لی اور وہ کمرے میں چند قدم بڑھا۔ وہ اپنے ہاتھ باندھے ہوئے تھا، ایک بغل میں بید دبی تھی، تلوار نیام میں تھی۔

''وہیں رُک جاؤ۔'' اس نے کہا ''تم کھڑکی کے ذریعے باہر نہیں جاؤ گے؛ دروازے کے ذریعے جاؤ گے۔ یہ طریقہ معتبر ہوتا ہے۔ تم سات لوگ ہو، ہم پندرہ افراد ہیں۔ یاد رہے کہ ہمیں Auvergne کے لوگوں کی طرح تمھارے گریبان پکڑنے نہ پڑیں۔''

Bigrenaille نے پستول نکالا جو اس نے اپنے بلاؤز کے نیچے چھپا رکھا تھا، تین آردیے کے ہاتھ میں دے دیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی، یہ آدمی جاویر ہے، میں اس پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کرسکتا، ''کیا تم میں ہمت ہوگی؟''

''بلاشبہ۔'' تین آردیے نے جواب دیا۔

''اچھا، تو پھر چلاؤ گولی۔''

تین آردیے نے پستول لیا اور جاویر کا نشانہ لیا۔

جاویر نے، جو صرف تین قدم فاصلے پر تھا اس کی طرف گھور کر دیکھا اور صرف اتنا کہنے پر اکتفا کی، ''خبردار، گولی نہ چلانا، تمھارا نشانہ خطا ہو جائے گا۔''

تین آردیے نے لبلبی دبا دی۔ پستول نہیں چلا۔

''میں نے کہا تھا نا۔'' جاویر نے کہا۔

Bigrenaille نے اپنی لاٹھی جاویر کے قدموں میں ڈال دی۔

تم بھوتوں کے شہنشاہ ہو! میں دستبردار ہوتا ہوں۔''

''اور تم؟'' جاویر نے بقیہ غنڈوں سے سوال کیا۔

انھوں نے جواب دیا، ''ہم بھی دستبردار ہوتے ہیں۔''

جاویر نے پُرسکون انداز میں پھر کہا، ''خوب! بالکل ٹھیک، میں نے کہا تھا نا کہ تم اچھے لوگ ہو۔''

''میری بس ایک ہی التجا ہے۔'' Bigrenaille نے کہا، ''اور وہ یہ کہ حوالات میں تمباکو سے انکار نہ کیا جائے۔''

''منظور۔'' جاویر نے کہا اور پھر مڑ کے پیچھے کی طرف آواز دی، ''اب تم لوگ آسکتے ہو۔''

پولیس والوں کا دستہ، ہاتھوں میں تلواروں اور ساتھ ہی لاٹھیوں سے لیس، جاویر کی طلبی

پر دوڑ پڑا۔انھوں نے غنڈوں کو پکڑ لیا۔اتنے سارے آدمیوں کے مجمعے نے موم بتی کی روشنی میں کمرے کو پرچھائیوں سے بھر دیا تھا۔

"سب کو ہتھکڑیاں لگا دو۔" جاویر نے چیخ کر کہا۔

"ادھر تو آؤ۔" ایک آواز چیخی جو کسی مرد کی آواز نہیں تھی مگر جس کے بارے کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ "یہ عورت کی آواز ہے۔"

خاتون تین آردیے نے خود کو کھڑکی کے زاویوں میں سے ایک کے پیچھے مورچہ بند کر لیا تھا، اور وہی تھی جو ابھی دہاڑی تھی۔

پولیس کے سپاہی اور ان کے ساتھی ایک دم پسپا ہو گئے۔

عورت نے اپنی شال پھینک دی مگر اپنا ہیٹ سنبھال رکھا تھا؛ اس کا شوہر اس کی پھینکی ہوئی شال سے تقریباً پورا چھپ گیا تھا۔عورت نے اس کو اپنے جسم کے پیچھے کر لیا اور جوں ہی اس نے دیوتی کی طرح پتھر کو اپنے سر سے بلند کیا، اس نے چیخ کر کہا، "ہوشیار!"

سب بھاگ کر راہداری میں جمع ہو گئے۔ کمرے کے بیچ خاصی جگہ خالی ہو گئی۔

خاتون تین آردیے نے غنڈوں پر نظر ڈالی جنھوں نے خود کو گرفتار کرا دیا تھا، اور بھرائی آواز اور نیچے لہجے میں کہا "بزدل کہیں کے!"

جاویر مسکرایا؛ خالی جگہ کی طرف بڑھا جسے خاتون تین آردیے اپنی آنکھوں سے نگل جانا چاہتی تھی۔"میرے قریب نہ آنا۔" وہ چیخی، "ورنہ میں تمھیں کچل دوں گی۔"

"واہ ری grenadier!" جاویر نے کہا، "تیرے چہرے پر مردوں جیسی ڈاڑھی ہے، اماں، مگر میرے پاس عورت جیسے پنجے ہیں۔"

اور وہ آگے بڑھتا ہی گیا۔

خوف ناک بھتنی تین آردیے نے اپنے دونوں پیر پھیلائے، پیچھے کی طرف ہوئی اور پتھر کو جاویر کے سر کی طرف اچھال دیا۔جاویر نے جھکائی دی، پتھر اس کے سر سے اوپر چلا گیا، اور پیچھے دیوار سے جا ٹکرایا، پلستر کا بہت بڑا سا ٹکڑا گرا، پتھر کھڑ کھڑ کرتا فرش پر لڑھکا، جو خوش قسمتی سے خالی ہو چکا تھا اور جاویر کے قدموں میں آ کر رُک گیا۔

اسی لمحے جاویر تین آردیے جوڑے کے پاس پہنچ گیا تھا۔اس کا ایک مہیب ہاتھ عورت کے کاندھے پر تھا اور دوسرا اس کے شوہر کے سر پر۔

"ہتھکڑیاں۔" وہ چیخا۔

پولیس کے سپاہی تیزی سے بڑھے اور چند منٹ میں جاوید کے حکم پر عمل درآمد ہو گیا۔
مغلوب خاتون تین آردیے عورت نے اپنے جھکڑیوں میں بندھے ہاتھ دیکھے اور شوہر کے ہاتھ بھی دیکھے، جو فرش پر گرا چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا، "ہائے میری بیٹیاں!"
"لڑکیاں جیل میں ہیں۔" جاوید نے کہا۔
اس دوران کارندوں کو شراب کے نشے میں دُھت دروازے کے پیچھا موٹا آدمی نظر آ گیا تھا، اور وہ اسے ہلا جلا رہے تھے۔
وہ ہکلاتا ہوا اُٹھا، "سب کام ہو گیا، شاندر بیت؟"
"ہاں۔" جاوید نے جواب دیا۔
چھ غنڈے ہتھکڑیاں پہنے، بھوتوں جیسی بھنگل بنائے کھڑے تھے؛ تین کے چہرے پر کالک ملی تھی، چھ نقاب پوش تھے۔
"نقابیں پہنے رہو۔" جاوید نے کہا۔ فریڈرک دوئم کی طرح Potsdam پریڈ میں کھڑے لوگوں کا معائنہ کرتے ہوئے، اس نے تین "چمنی بنانے والوں" سے کہا، "صبح بخیر Bigrenaille! صبح بخیر بروژوں! صبح بخیر Deuxmilliards!"
اس کے بعد تین نقاب پوشوں سے مخاطب ہوا، اور قصاب کے کھاڑے والے آدمی سے کہا، "صبح بخیر گویلمر!"
"اور لاٹھی والے سے، "صبح خیر بابے!"
اور جوف صوتی کے ماہر سے کہا "تمھاری صحت کیسی ہے، کیا کہو؟"
اسی لمحے اسے غنڈوں کا قیدی بھی نظر آ گیا، جس نے جب سے پولیس آئی تھی منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا، اپنا سر جھکائے ہوئے تھا۔
"ان صاحب کے بند کھول دو!" جاوید نے کہا، "کسی کو بھی باہر نہ جانے دینا۔"
یہ کہا اور وہ شاہانہ وقار سے میز کے سامنے بیٹھ گیا جہاں موم بتی اور لکھنے کا سامان رکھا ہوا تھا؛ اپنی جیب سے ایک اسٹامپ پیپر نکالا اور اپنی رپورٹ تیار کرنی شروع کی۔
پہلے چند سطریں لکھ چکا، ہر رپورٹ سے جن کی ابتدا ہوتی ہے اور جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، تو اس نے نظریں اٹھائیں، "ان صاحب کو بلاؤ جنھیں ان حضرات نے باندھ رکھا تھا۔"
پولیس کے سپاہیوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔
"کہاں ہیں وہ صاحب؟" جاوید نے سوال کیا۔

غنڈوں کا قیدی، موسیو لیبلانک، موسیو Urbain Fabre، Ursule یا معثنی جینا کا باپ غائب تھا۔

دروازے پر پہرہ تھا مگر کھڑکی پر نہیں۔ جیسے ہی اس نے اپنے بندھن کھلے پائے، اور جب جاویر اپنی رپورٹ کی ابتدا کر رہا تھا، اس نے ابتری کا فائدہ اٹھایا، مجمع، اندھیرا، ایک لمحہ جس میں لوگوں کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی تھی، اور وہ کھڑکی سے نکل بھاگا تھا۔

کارندے کھڑکی کی طرف دوڑ پڑے اور باہر دیکھا۔ باہر کوئی نظر نہیں آیا۔

سیڑھی کی رسّی ابھی تک ہل رہی تھی۔

''شیطان!'' جاویر نے دانت پیستے ہوئے کہا، ''ان میں سب سے اہم وہی رہا ہوگا۔''

❂

دوسری جِلد والا چھوٹا لڑکا

جس دن l'Hopital بلیوارڈ کے مکان میں یہ واقعات ہوئے تھے اس کے اگلے دن ایک لڑکا جو شاید Austerlitz کے پُل کی طرف سے آرہا تھا Fontainebleau پشتے کی دائیں جانب والی بغلی گلی میں اتر رہا تھا۔

پوری طرح رات ہو چکی تھی۔

یہ لڑکا دُبلا پتلا اور چیتھڑوں میں تھا۔ فروری کے مہینے میں سوتی کپڑے کی پتلون پہنے تھا اور اپنی پوری آواز سے گا رہا تھا۔

Petit-Banquier اسٹریٹ کے نکّڑ پر ایک کُبڑی عورت سڑک کی لالٹین کی روشنی میں کوڑے کے ڈھیر میں کچھ تلاش کر رہی تھی؛ لڑکے نے گزرتے ہوئے اس کو کہنی ماردی، مگر بعد میں پلٹ کر کہا،

"ہیلو! میں تو اسے ایک بڑا، بہت مہیب کتا سمجھا تھا!" اس نے لفظ 'مہیب' تضحیک کے انداز میں دوبارہ استعمال کیا تھا، جیسا کہ بڑے حروف میں لکھا جاتا ہے۔

بوڑھی عورت نے غصے میں سیدھی کھڑی ہونے کی کوشش کی۔

"کمینہ لڑکا!" وہ غرائی، "اگر میں جھکی نہ ہوتی تو مجھے معلوم ہے کہ میں تمھیں کس جگہ ٹھوکر مارتی۔"

لڑکا دور جا چکا تھا۔

"بوسہ! بوسہ!" اس نے چیخ کر کہا "اس کے بعد میرا خیال ہے کہ میں نے غلطی نہیں کی ہے۔"

نفرت سے بھری بوڑھی عورت، اب سیدھی کھڑی تھی اور لالٹین کی سرخ روشنی نے اس کے نیلگوں چہرے کو، اس کے تمام زاویوں، تمام جھرّیوں اور جاف کے دونوں کونوں پر پڑی

لکیروں کو واضح کر دیا تھا۔

لڑکے نے اس کا غور سے معائنہ کیا۔

''مادام!'' اس نے کہا'' آپ اس انداز کے حسن کی مالک نہیں جو مجھے خوش کر دیتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ آگے چلا گیا، اور پھر گانا شروع کیا:

بوٹ کی ٹھوکر شہزادہ

کوے کرے شکار

بانس کی دو ٹانگوں پہ چڑھا تو......

یہ تین مصرعے پڑھ کر وہ رُک گیا۔ وہ مکان نمبر 52-50 کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اسے دروزہ بند ملا تو اس نے اپنی بہادرانہ اور آواز پیدا کرنے والی ٹھوکروں سے دروازے پر حملہ کر دیا اور آدمی کے جوتے کو جو وہ پہنے ہوئے تھا، خراب کیا، چہ جائے کہ لڑکے کے پیروں کو خراب کرتا جو اس کے اپنے تھے۔

اس دوران وہ نہایت بوڑھی عورت جس سے اس کا Petit-Banquier اسٹریٹ پر مجادلہ ہوا تھا، اس کے عقب میں شور وغوغا کرتی اپنے اعضا ہلاتی تیز تیز چلی آ رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ مالک! یہ تو دروازہ توڑے ڈال رہا ہے۔ یہ تو گھر بھی گرا دے گا۔''

ٹھوکریں جاری رہیں۔

بوڑھی عورت چیخ رہی تھی، ''کیا آج کل عمارتوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟''

پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ وہ آوارہ لڑکے کو پہچان گئی تھی۔ ''اچھا تو یہ وہی بھتنا ہے۔''

''کیا بات ہے بوڑھی بی؟'' لڑکے نے کہا، ''سلام علیکم، Bougonmuche۔ میں اپنے پُرکھوں سے ملنے آیا ہوں۔''

بوڑھی بی نے منہ بنا کر جواب دیا؛ اس کی کم زوری اور بدصورتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نفرت کی حیرت انگیز برجستگی جنم لے رہی تھی، بدقسمتی سے جو اندھیرے میں ضائع ہو رہی تھی۔

''یہاں کوئی نہیں رہتا۔''

''ہونہہ'' لڑکے نے جواب دیا، ''مرا باپ کہاں ہے؟''

''La Force میں ہے۔''

''اچھا، بتاؤ میری ماں کہاں ہے؟''

''Saint-Lazare میں۔''

"اچھا! اور میری بہنیں؟"

"Madelonettes میں۔"

لڑکے نے کان کے پیچھے اپنا سر کھجایا، مادام بوگوں کی طرف دیکھا اور کہا، "اُف!"

پھر وہ اپنی ایڑی کے بل ناچنے لگا؛ ایک لمحے بعد بڑی بی نے، جو ڈیوڑھی پر کھڑی رہ گئی تھی، اس کو صاف اور نوجوان آواز میں گاتے سنا، اور وہ سردی کے موسم کی ہوا میں سیاہ صنوبر کے درختوں کے پیچھے جا کر گم ہو گیا تھا:

بوٹ کی ٹھوکر شہزادہ
کوے کرے شکار
بانس کی دو ٹانگوں پہ چڑھا تو
جو کوئی نیچے سے گزرا
اس نے دو سو دیے

❂

خوب صورت تراش

1831ء اور 1832ء وہ دو برس ہیں جو اپنے خاص اور حیرت انگیز لمحات کی وجہ جولائی کے انقلاب سے قریبی طور پر متصل رہے ہیں۔ یہ دونوں برس ان برسوں کے اور آنے والے برسوں کے درمیان کے دو بڑے پہاڑوں کی طرح بلند نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک انقلابی شان ہے۔ ان چٹانوں کی شناخت ضرور ہوتی ہے۔ ان کے سماجی اجتماعات، تہذیب کی جمہوری عدالتیں، بالا مقام سے چپٹے رہنے والے مفادات کے ٹھوس گروہ قدیم فرانسیسی پیکروں کے صدیوں پرانے نقوش ہر لمحہ ان میں ابھرتے اور غائب ہوتے ہیں سوائے جذباتی اور نظریاتی بادلوں کے طوفانی نظاموں کے۔ اس ابھرنے اور غائب ہونے کو تحریکات اور مزاحمتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ وقفے وقفے سے سچائی کی دریافت شدہ چمک ہے، جو نفسِ انسانی کی روشن حقیقت ہوتی ہے، نظر آتی رہتی ہے۔

صریحاً، اس قابلِ ذکر عہد کی حد بندی ہوتی ہے اور یہ ہم سے دور ہونا شروع ہو جاتا ہے، تا کہ ہم آج کے دور کے اہم خطوط کو بھی اپنی گرفت میں لے سکیں۔

ہم اس کی کوشش کریں گے۔

بحالی کا دور اُن درمیانہ ادوار میں سے ایک ہے، جس کی حد بندی مشکل ہے؛ جس میں تھکاوٹ، جھنجھناہٹ، سرگوشیاں، نیند اور شورش ہوتی ہے جو کسی عظیم قوم کے منزل پر پہنچ جانے کے آثار کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔

یہ زمانے بھی عجیب ہیں اور اہلِ سیاست کو گمراہ کرتے ہیں جو اُن کو فائدے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں قوم سوائے سکون کے کچھ نہیں مانگتی! یہ صرف امن کی پیاسی ہوتی ہے، مگر اس

کی ایک آرزو ہوتی ہے، چھوٹا رہنے کی۔ جس کا ترجمہ ہوتا ہے پُرسکون رہنا۔ بڑے واقعات، بڑے اتفاقات، بڑی مہمات، بڑے آدمی؛ خدا کا شکر ہے، ہم نے بہت دیکھے ہیں اور ہم نے تو اپنے سروں سے اونچے ان کے انبار بھی بنائے ہیں۔ ہم نے سیزر کی جگہ Prusias کو لیا ہے، اور نپولین کی جگہ Yvetot کے بادشاہ کو۔ ''کیا اچھا بادشاہ تھا وہ بھی!'' ہم نے طلوعِ فجر سے پیش قدمی شروع کی ہے، اور ایک طویل و پُرمشقت دن کے بعد شام کی ہے؛ ہماری پہلی تبدیلی Mirabeau ہے؛ دوسری Robespierre، اور تیسری بونا پارٹ ہے؛ ہم تھک چکے ہیں۔ اب ہر ایک بستر کا طالب ہے۔

سپردگی جو تھک چکی ہے، بہادری جو پرانی ہو چکی ہے، آرزوئیں جو پوری ہو چکی ہیں اور تقدیریں جو بن چکی ہیں، تلاش کرتی ہیں، مطالبہ کرتی ہیں، التجا کرتی ہیں، اصرار کرتی ہیں، کس شے کا؟ پناہ کا۔ وہ مل جاتی ہے۔ وہ امن، وہ آسودگی انھیں مل جاتی ہے؛ دیکھو، وہ کتنے مطمئن ہیں، مگر ساتھ ہی کچھ حقائق بھی ابھرتے ہیں، اعتراف پر مجبور کرتے ہیں، اور اپنی باری پر دروازے پر دستک بھی دیتے ہیں۔ یہ حقائق انقلابات اور جنگوں کی پیداوار ہوتے ہیں، یہ ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ہوتا ہے، انھیں خود کو سماج میں قائم کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور یہ خود کو قائم بھی کر لیتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر یہ نگہبان اور ڈیموکریٹ ہوتے ہیں، جن کو کوئی کام نہیں ہوتا سوائے قائم کیے گئے اصولوں کی تیاری کے۔

تو! فلسفیانہ سیاست دانوں پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

ساتھ ہی تھکے ہوئے لوگ سکون کے طالب ہوتے ہیں، اور حاصل کیے ہوئے حقائق ضمانتیں طلب کرتے ہیں۔ حقائق کے لیے ضمانتوں کا وہی کردار ہوتا جو آدمیوں کے لیے سکون کا۔

یہی ہے جو انگلستان اسٹیورٹ [شاہی خاندان] سے طلب کرتا تھا؛ یہی ہے جو سلطنت کے بعد فرانس نے Bourbons سے طلب کیا تھا۔

یہ ضمانتیں وقت کی ضروریات ہوا کرتی ہیں۔ ان پر رضامندی ہونی چاہیے۔ شہزادے ''عطا'' کرتے ہیں، مگر دراصل یہ حقائق کی مجبوریاں ہوتی ہیں جو عطا کرتی ہیں۔ اصل سچائی ہے، جس کا جاننا ضروری ہے، 1662ء میں اسٹیورٹ کو جس کی توقع نہیں تھی، اور 1814ء تک Bourbons کو جس کی جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ خاندان نپولین کے زوال کے بعد جسے فرانس پر حکومت کرنا تھی، نہایت مہلک سادگی سے یہی سمجھتا رہا تھا کہ اس کو شاہی عطا ہوئی ہے اور جس نے انھیں عطا کی ہے وہی اسے واپس بھی لے سکتا ہے؛ کہ Bourbon خاندان کے پاس ربانی حق تھا، کہ فرانس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، اور یہ بھی کہ لوئی ہشت دہم کے فرمان میں جو

سیاسی حق دیا گیا تھا وہ ربانی حق کی محض ایک شاخ تھی، جو Bourbon خاندان نے از راہ تلطف الگ کر لی تھی اور عوام کو اس وقت تک کے لیے دی گئی تھی جب تک کہ بادشاہ چاہے گا۔ پھر بھی، اس تحفے کی پیدا کردہ نا خوشی کے باعث، Bourbon خاندان کو احساس ہونا چاہیے تھا کہ یہ ان کے پاس سے نہیں آئی ہے۔

انیسویں صدی تک یہ خاندان بالکل اُجڈ تھا۔ قوم کی ہر ترقی اس پر ناگوار گزرتی تھی۔ سادہ ترین الفاظ میں کہا جائے تو یہ خاندان ہمیشہ خفا خفا سا دکھائی دیتا تھا۔ عوام یہ سب دیکھ رہے تھے۔

وہ سمجھتا تھا کہ اس کے پاس سلطنت کی طاقت ہے جو تھیٹر کے اسٹیج کی ترتیب کی طرح، اس کے سامنے لائی گئی ہے۔ اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ خود اسے بھی اسی انداز میں لایا گیا ہے۔ اسے یہ گمان بھی نہیں تھا، یہ بھی ان ہی ہاتھوں میں ہے جنھوں نے نپولین کو فارغ کیا تھا۔

وہ سمجھتا تھا کہ اس کی اپنی جڑیں ہیں، اس لیے وہی ماضی بھی تھا۔ وہ غلطی پر تھا؛ وہ ماضی کا ایک حصہ تھا، جب کہ مکمل ماضی تو فرانس خود تھا۔ فرانس کی سوسائٹی کی جڑیں Bourbon خاندان میں پیوست نہیں تھیں، بلکہ قوموں میں پیوست تھیں۔ یہ دھندلی اور متحرک جڑیں، کسی خاندان کا حق نہیں عوام کی تاریخ مرتب کرتی ہیں۔ یہ جڑیں ہر جگہ تھیں مگر تختِ شاہی کے نیچے نہیں تھیں۔

Bourbon خاندان فرانس کی تاریخ کے لیے ایک شان دار گرہ تھا جس سے خون بہہ رہا تھا، مگر نہ یہ فرانس کے مقسوم کا مرکزی عنصر تھا اور نہ اس کی سیاست کی بنیاد کے لیے ضروری تھا۔ Bourbon کے بغیر بھی فرانس چل سکتا تھا؛ بیس برس تک اس کے بغیر گزارا ہوا تھا؛ اس میں تسلسل ٹوٹا، مگر اسے اس حقیقت کا شبہ تک نہیں ہوا تھا۔ اور یہ شبہ کرتے بھی کیسے، وہ جو لوئی ہفت دہم کو پسند کرتے تھے اور Thermidor کی نویں تاریخ پر بھی حاکم تھے، یعنی لوئی ہشت دہم تک جو Marengo کی جنگ تک حاکم تھا؟ تاریخ کی ابتدا سے اب تک، شہزادوں نے کبھی ان حقائق کی موجودگی میں حقائق کو نظر انداز نہیں کیا ہے جو ربانی اختیار کے اس حصے کے حامل ہوتے ہیں اور ان کو مشتہر کرتے ہیں۔ کبھی ان وجوہ سے جو نیچے بیان کیے گئے ہیں، جو بادشاہوں کا حق سمجھے جاتے ہیں، اوپر سے بھی انکار نہیں کیا گیا ہے۔

سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی ہے کہ اس خاندان نے ایک بار پھر 1814ء کی ضمانتوں پر ہاتھ ڈالا ہے جسے یہ رعایات سمجھتے تھے۔ افسوس! بڑے افسوس کی بات ہے! جسے یہ لوگ رعایات کہتے تھے وہ دراصل ہماری فتوحات تھیں؛ جسے یہ بے جا مداخلت سمجھتے تھے، وہ ہمارے حقوق تھے۔

جب وقت اس کے نزدیک آتا محسوس ہوا، یعنی بھائی نے، جو خود کو بونا پارٹ کا فاتح

سمجھتی تھی، ملک میں جس کی جڑیں پیوست ہو گئی تھی، یعنی ملک خود کو طاقت ور اور گہرا سمجھنے لگا تھا، اچانک اس نے اپنے منصوبے پر عمل کا فیصلہ کر لیا، اور پہلا تیر چلا دیا۔ ایک صبح اس نے خود کو فرانس کے سامنے پیش کر دیا، اور اپنی آواز بلند کرتے ہوئے حاکمیت پر انسان کے انفرادی حق، اور آزادی پر شہری اجتماعی حق کا مطالبہ کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے قوم کو وہ دینے سے انکار کر دیا جس نے قوم کو قوم بنایا تھا، اور اس نے باشندے کو وہ دینے سے انکار کیا جس نے باشندے کو باشندہ بنایا تھا۔

یہ ان مشہور کارگزاریوں کی بنیاد ہے جسے جولائی کے فرامین کہا جاتا ہے۔ بحالی ناکام ہو گئی تھی۔ اس کا گرنا حق بہ جانب تھا، مگر ہم اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہر قسم کی نشو و نما کے مکمل طور پر خلاف نہیں تھی۔ ساتھ ہی اس نے بڑی کامیابیاں بھی حاصل کی تھیں۔

بحالی کے زیرِ اثر قوم پُرسکون بحث کی عادی ہو گئی تھی، جمہوریہ کے دور میں جس کی کمی تھی، اور جو امن کے زمانے میں شان دار تھی، سلطنت کے دور میں جس کی طلب تھی۔ آزاد اور طاقت ور فرانس نے یورپ کی دوسری قوموں کو ہمت افزا نظارہ پیش کر دیا تھا۔ Robespierre کے ماتحت انقلاب بالادست تھا، بونا پارٹ کے ماتحت توپیں بالا دست تھیں؛ یہ لوئی ہشت دہم اور چارلس دہم کے دور میں ہی ہوا تھا کہ ذہانت کے بالادست ہونے کی باری آ گئی تھی۔ ہوا رُک گئی تھی، مشعل ایک بار پھر روشن کر دی گئی تھی۔ بلندیوں پر ذہن کی خالص روشنی جھلملاتی دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ ایک عظیم الشان، فائدہ مند اور دل رُبا نظارہ تھا۔ پندرہ برس کے عرصے کے درمیان، وہ بڑے اصول جو صاحبانِ فکر کے لیے جتنے قدیم تھے، مدبرین کے لیے اتنے ہی نئے تھے، ان کو مکمل امن میں عوام کے میدانوں میں کام کرتے دیکھا جا سکتا تھا، قانون کی نظر میں برابری، ضمیر کی آزادی، تقریر کی آزادی، پریس کی آزادی، اور ہر قسم کے کام کی آزادی تھی۔ 1830ء تک سب کچھ اسی طرح چلتا رہا۔ Bourbons تہذیب کے اوزار تھے جو عاقبت نا اندیشی کے ہاتھوں میں آ کر ٹوٹ گئے تھے۔

Bourbons کا زوال شان و شوکت سے بھرپور تھا، ان کے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ انھوں نے متانت سے تخت چھوڑ دیا تھا، مگر اختیار نہیں چھوڑا؛ رات کے اندھیرے میں ان کا زوال اس طرح نہیں ہوا تھا جو تاریخ میں کسی قسم کا اداس کرنے والا احساس چھوڑ جاتا؛ یہ نہ چارلس اوّل کی آسیبی خاموشی تھی نہ نپولین کی عقابی چیخ۔ بس وہ چلے گئے۔ انھوں نے تاج اتار کر رکھ دیا تھا، اپنے لیے نور کا ہالہ بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ لائق تھے مگر بلند پایہ نہیں تھے۔ ان کی بدقسمتی میں بھی جاہ و جلال کی کمی تھی۔ Cherbourg سے سفر کے دوران جب چارلس دہم نے گول میز کو کٹوا کر مربع کروا دیا تھا، اسے گرتی ہوئی شاہی کے مقابلے میں خطرے کی زد میں آنے والے آدابِ معاشرت کی

زیادہ فکر تھی۔اس زوال نے ان وفا شعار لوگوں کو بھی آزردہ کر دیا تھا جو ان کی شخصیات سے پیار کرتے تھے، اور ان سنجیدہ لوگوں کو بھی جو ان کی نسل کا احترام کرتے تھے۔عوام قابلِ ستائش تھے۔ ایک قسم کی شاہی بغاوت کے ذریعے قوم نے ایک صبح ان پر ہتھیاروں سے حملہ کر دیا، اور خود کو اس قدر طاقت ور پایا کہ وہ بپھری نہیں۔اس نے اپنا دفاع کیا، اپنے آپ کو قابو میں رکھا، چیزوں کو ان کی جگہ پر بحال کیا، حکومت کو، قانون کو، اور افسوس! کہ Bourbons کو جلا وطن کر دیا، اس کے بعد رُک گئی تھی۔اس نے بوڑھے بادشاہ چارلس دہم کو اس شہ نشین کے نیچے سے اٹھایا جس نے لوئی چہاردہم کو پناہ دی تھی، اور آہستگی سے اسے زمین پر بٹھا دیا تھا۔اس نے شاہی افراد کو صرف آزردگی اور احتیاط سے ہاتھ لگایا تھا۔وہ ایک آدمی نہیں، چند آدمی نہیں، پورا فرانس تھا؛ فرانس جو اپنی فتح کے نشے میں چور ہو رہا تھا، اور اپنے آپ میں آتا محسوس ہو رہا تھا، جس نے پوری دنیا کی آنکھوں کے سامنے پشتوں کے دن کے بعد Guillaume du Vair کے کہے گئے الفاظ پر عمل کر کے دکھا دیا تھا۔

"ان لوگوں کے لیے جو بڑوں کی مہربانیوں کی بالائی اتارنے کے عادی ہوتے ہیں، جو بہار کے موسم میں چڑیوں کی طرح ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں، مصیبت زدہ قسمت سے خوش نصیب قسمت کی طرف پھدکتے ہیں، یہ دکھانے کے لیے کہ وہ بدبختی میں گرفتار اپنے شہزادے سے بخشی سے پیش آتے ہیں؛ مگر میرے نزدیک بادشاہوں کی، بالخصوص مصیبت زدہ بادشاہوں کی، قسمت ہمیشہ واجب التکریم رہے گی۔"

Bourbons اپنے ساتھ، ندامت نہیں، عزت و احترام لے گئے تھے۔جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، ان کی بدقسمتی قد میں ان سے بڑی تھی۔وہ افق میں تحلیل ہو گئے تھے۔

جولائی کے انقلاب کے، پوری دنیا میں ایک ساتھ، دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔پہلے والے لوگ اس کی طرف خوشی، جوش اور ولولے کے ساتھ دوڑ پڑے تھے، دوسروں نے اپنے منہ موڑ لیے تھے۔سب کا ردِعمل ان کی اپنی اپنی فطرت کے مطابق تھا۔پہلی شرمندگی پر یورپ کے شہزادوں نے، طلوعِ صبح کے زخمی اور مدہوش شب خیز پرندوں کی طرح اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور صرف دھمکانے کے لیے کھولتے تھے۔ایک خوف تھا جو قابلِ ادراک تھا، ایک طیش تھا جس کو معاف کیا جا سکتا تھا۔اس حیرت انگیز انقلاب نے زیادہ جھٹکا نہیں دیا تھا؛ اس نے تو غائب ہو جانے والی شاہی کو دشمن ہونے کا، اور اس کا خون بہانے کا اعزاز بھی نہیں دیا تھا۔جابر حکومتوں کی نظروں میں، جن کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ آزادی خود بخود ختم ہو جائے، جولائی کے انقلاب نے ہیبت ناک ہونے کے باوجود نرم رہنے کی غلطی کی تھی، مگر اس کے خلاف کسی قسم کی سازش کی کوشش نہیں کی گئی۔سب

سے زیادہ نا خوش، سب سے زیادہ ناراض، سب سے زیادہ لرزاں نے بھی اس کو سلام کیا تھا۔ ہم میں جتنی بھی خود فریبی یا عداوت کیوں نہ ہو، ان واقعات سے ایک پُر اسرار احترام ضرور ابھرتا ہے جس میں ہمیں کسی ایسے شخص کے اشتراک کا احساس ہوتا ہے جو آدمیوں کے اوپر کام کرتا رہتا ہے۔

جولائی کا انقلاب راست کی فتح تھی جس نے حقیقت کو پرے پھینک دیا تھا؛ وہ شے جو جاہ و جلال سے لبریز تھی۔ راست نے حقیقت کو پرے پھینک دیا تھا۔ یہی 1830ء کے انقلاب کی چمک دمک تھی، ساتھ ہی اس کی نرمی بھی۔ راست کو تشدد کی ضرورت نہیں تھی۔

راست انصاف بھی ہے اور سچ بھی۔

راست کی خصوصیت ہے ابدی طور پر خوب صورت اور خالص رہنا۔ جب اسے ہر قسم کے اظہار کی سخت ضرورت ہوتی ہے، اس وقت بھی، جب ہم عصر اس کو پوری طرح قبول کر لیتے ہیں، اگر یہ حقیقت کے طور پر وجود میں رہتا ہے، اس میں راست بہت کم ہوتا ہے، یا بالکل نہیں ہوتا ہے، اس کو وقت کے ساتھ ساتھ عیب دار، ناپاک، بلکہ دیو ہیکل بھی ہونا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایک ہی ضرب میں یہ جاننا چاہیں کہ حقیقت کتنا ڈراؤنا پن حاصل کر سکتی ہے، تو میکاولی کو دیکھنا چاہیے۔ میکاولی نہ بدکار جو ہر قابل تھا، نہ شیطان، نہ ہی بزدل ادیب؛ وہ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور صرف ایک اطالوی حقیقت بھی نہیں تھا؛ وہ یورپی حقیقت ہے، سولہویں صدی کی حقیقت ہے۔ وہ ڈراؤنا محسوس ہوتا ہے، اور انیسویں صدی کی اخلاقیات کے سامنے وہ ڈراؤنا ہے بھی۔

راست اور حقیقت کے درمیان کا یہ تنازعہ ہمیشہ سے، بلکہ سماج کی ابتدا سے ہے۔ اس لڑائی کو ختم کرنا، خالص خیال کو نرم حقیقت میں آمیز کرنا، راست کو حقیقت میں، اور حقیقت کو راست میں داخل کرنا، خرد مندوں کی یہی ذمے داری ہوتی ہے۔

۞

بدنما سلائی

مگر خردمندوں کے کام ایک طرف، اور چالاک آدمیوں کے کام دوسری طرف۔ 1830 کا انقلاب اچانک رُک گیا تھا۔ جیسے ہی کوئی انقلاب ساحل پر پہنچتا ہے، ہنرمند لوگ جہاز کی تباہی کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔

ہماری صدی کے ہنرمندوں نے اپنے لیے مدبّروں کا لقب اختیار کر لیا ہے؛ سو یہ لفظ 'مدبّر' گالی سا بن گیا ہے۔ یہ امر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جہاں ہنرمندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا وہاں کم ظرفی کا ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ کسی کو ہنرمند کہنے مطلب ہوتا ہے کہ دراصل وہ اوسط درجے کا آدمی ہے۔

اسی طرح کسی کو مدبّر کہنے کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ غدار ہے۔ تب، اگر ہم ہنرمندوں پر یقین رکھتے ہیں تو جولائی کے انقلاب جیسے انقلابات محض کٹی ہوئی شریانیں بن جاتے ہیں؛ ان کی فوری سلائی ضروری ہوتی ہے۔ بڑے زور شور سے مشتہر کیا ہوا راست بھی بدل جاتا ہے۔ اور جب راست ایک بار مستحکم ہو جاتا ہے تو حالات کو بھی استحکام دینا چاہیے۔ جب آزادی یقینی ہو جائے تو طاقت پر توجہ دی جانی چاہیے۔

یہاں، خردمند ابھی تک ہنرمندوں سے الگ نہیں کیے گئے ہیں، پھر بھی وہ بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ طاقت بہت اچھی چیز ہے، مگر سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ طاقت کہتے کسے ہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے آتی ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہنرمندوں نے سرگوشی میں کیے جانے والے اعتراضات سنے نہیں ہیں، اور وہ اپنے داؤ لگاتے رہتے ہیں۔

سیاست دانوں کے مطابق، جو فائدہ مند انسانوں پر ضرورت کی نقاب ڈال دینے میں بہت چالاک ہوتے ہیں، انقلاب کے بعد، جو عوام کی سب سے پہلی ضرورت ہوتی ہے، یہ لوگ کسی

شخصی بزاعظم کا حصہ بن جاتے ہیں تا کہ اپنے لیے کوئی شاہی خاندان حاصل کرلیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح ہمیں انقلاب کے بعد اپنے زخموں پر پٹی باندھنے اور گھر کی مرمت کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔ شاہی خاندان پھانسی گھاٹ چھپا دیتے ہیں اور ایمبولینس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اب شاہی خاندان کا حصول آسان نہیں رہا ہے۔

اگر یہ بہت ضروری ہے،تو جوہرِ قابل والا پہلا آدمی، حتیٰ کہ پہلا مقتدر والا آدمی، جو ہاتھ آتا ہے ایک بادشاہ تخلیق کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔آپ کے سامنے سب سے پہلی مثال نپولین کی ہے، اور دوسری Iturbide [میکسیکو کے جرنیل اور سیاست داں] کی۔

مگر پہلا آدمی جو ہاتھ آجائے شاہی خاندان بنانے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔اس دوڑ کے لیے قدامت کی محدود مقدار اور صدیوں کی جھری کی ضرورت ہوتی ہے جو از خود بنائی نہیں جا سکتی۔

اگر ہم تمام رعایات دینے کے بعد خود کو کسی مدبر کے نقطۂ نظر سے پرکھتے ہیں تو بلاشبہ، انقلاب کے بعد، نتیجے میں بادشاہ کی وہ کون سی خوبیاں ہیں جو سامنے آتی ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ وہ، اور یہ فائدہ مند ہوسکتا ہے کہ، انقلابی ہو؛ یعنی اس نے خود انقلاب میں حصہ لیا ہو، یا اس کی امداد کی ہو، کہ اس نے اس پر مصالحت کی ہو یا اس سے پچھتا گیا ہو، یعنی ان نے کلھاڑے کو ہاتھ لگایا ہو، یا اس میں تلوار نکال لی ہو۔

کسی شاہی خاندان کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ اس کو قومی ہونا چاہیے، یعنی دور سے دیکھا جائے تو انقلابی ہو، اس میں صرف حصہ لینا ہی نہیں بلکہ اس کے تصورات کو قبول کیا ہو۔ یہ ماضی پر بنا ہوا اور اسے تاریخی ہونا چاہیے؛ مستقبل سے بنا ہوا اور اس کا ہم درد ہو۔

یہ ساری باتیں اس امر کی تشریح کرتی ہیں کہ انقلابات ایک آدمی کو تلاش کرنے پر کیوں مطمئن ہو گئے تھے: کرامویل یا نپولین؛ اور وہ اس بات پر کیوں مصر تھے کہ ایک شاہی خاندان تلاش کیا جائے، وہ Brunswick کا گھرانا ہو یا Orleans کا۔

شاہی گھرانے اس ہندوستانی برگد کے درخت کی مثال ہوتے ہیں جس کی ہر شاخ زمین کی طرف جھکتی ہے، زمین میں جڑ پکڑ لیتی ہے اور خود بھی برگد کا درخت بن جاتی ہے۔ ہر شاخ ایک خاندان بن سکتی ہے۔ صرف ایک شرط پر کہ یہ عوام کی طرف جھکے گی۔

یہ ہوتا ہے ہنر مندوں کا نظریہ۔

یہی وہ مقام ہے جہاں وہ عظیم فن ملتا ہے: کہ کامیابی میں ایک طرح کی تباہی کا خوف بھی رہے تا کہ وہ لوگ جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس سے لرزاں بھی رہیں، کہ اٹھتے ہوئے ہر

قدم میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو، کہ تغیر کے موڑ کو بس اس حد تک بڑھایا جائے کہ رُکاوٹ کی حد تک پہنچ جائے، کہ [فتوحات کے] نورانی ہالے کو مدھم کر دیا جائے، کہ ولولے کی سختی کو کم کیا جائے اور اس کو ناگوار بنا دیا جائے، کہ فتح [کے جوش کو] کونرم کیا جائے، کہ راست کو چھپایا جائے، کہ بڑے آدمیوں کو فلالین میں ڈھانپ دیا جائے، اور انھیں کو نہایت تیزی سے سُلا دیا جائے، کہ غیر ضروری صحت مندی پر نشو ونما کی پابندی لگا دی جائے، غیر معمولی جسامت کو رُو بہ صحت جسم جیسے علاج پر ڈال دیا جائے، کہ [ہر] واقعے کو مناسب حد تک تحلیل کر دیا جائے، جذبوں کو ایسی مثالیت کے حصول کی پیاس عطا کی جائے جو رس کو گھونٹ کے قابل پتلا کر دے، کہ بہت زیادہ کامیابی سے پرہیز کیا جائے، کہ انقلاب کو پرچھائیں سے سجایا جائے۔

1830ء میں اسی نظریے پر عمل کیا گیا تھا، جس کا 1688ء میں انگلستان میں اطلاق کیا گیا تھا۔

1830ء کا انقلاب آدھے راستے میں روک دیا گیا تھا۔ آدھی کامیابی بظاہر راست ہوتی ہے۔ اب منطق ''تقریباً'' کو بالکل نہیں جانتی، جیسے سورج موم بتی کو نہیں جانتا۔

انقلابات کو آدھے راستے کون روکتا ہے؟ بورژوائی لوگ؟

''مگر کیوں؟''

اس لیے کہ بورژوا وہ مفاد ہے جو مطمئن ہو گیا ہے۔ کل تک یہ اشتہا تھا، آج یہ فراوانی ہے؛ آنے والے کل یہ آسودگی بن جائے گا۔

نپولین کے بعد، 1814ء کا تجربہ 1830ء میں چارلس دہم کے بعد دہرایا گیا تھا۔

غلطی سے ایک بورژوا درجہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بورژوائی دراصل عوام کا مطمئن حصہ ہوتے ہیں۔ بورژوا وہ آدمی ہے جس کے پاس بیٹھ جانے کا وقت ہوتا ہے۔ کرسی ذات پات نہیں ہوا کرتی۔

مگر بہت جلد بیٹھ جانے کی خواہش کے ذریعے انسان کی پیش قدمی رُک سکتی ہے۔ اور اکثر یہی بورژوائیوں کی غلطی رہی ہے۔

اگر آپ نے غلطی کی ہے تو آپ درجہ نہیں بن جاتے۔ خودغرضی سماجی نظام کے حصوں میں سے ایک حصہ نہیں ہوا کرتی۔

مزید یہ کہ، خودغرضی سے بھی انصاف کرنا پڑے گا۔ وہ کیفیت جس میں قوم کا وہ حصہ جس کو بورژوائی کہا جاتا ہے 1830ء کے بعد جسے سکون نہیں تھا جو لاپرواہی اور کاہلی کے وجہ سے

پیچیدہ ہو گیا ہے، جس میں کچھ شرم کی بات بھی ہے؛ یہ غنودگی نہیں تھی جس میں خواب دیکھنے میں وقتی غفلت کے امکانات ہوتے ہیں؛ یہ دراصل ایک پڑاؤ تھا۔

پڑاؤ کا لفظ ایک غیر معمولی دہری شے سے بنا ہے اور تقریباً متضاد ہے: ایک دستہ پیش قدمی کر رہا ہے، یعنی، حرکت میں ہے؛ ٹھہرنے کی ایک جگہ، یعنی، آرام گاہ ہے۔

پڑاؤ فوجوں کی بحالی کا مقام ہوتا ہے؛ یہ فوجیوں کی آرام گاہ ہوتی ہے جو ہمیشہ چوکنی رہتی ہے؛ یہ طے شدہ حقیقت ہے جو پاسبان متعین کرتی ہے اور خود کو محفوظ کر لیتی ہے۔

پڑاؤ گزرے ہوئے کل، اور آنے والے کل کی لڑائی کا قیاس کرتا ہے۔

یہ 1830ء اور 1848ء کے درمیان کی تقسیم ہوتا ہے۔

ہم جسے لڑائی کہتے ہیں اس کو ترقی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

تب بورژوائیوں کو، اور مدبروں کو بھی ایک آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو پڑاؤ کے لفظ کا اظہار کر سکے۔ جس میں ایک جیوں کہ۔ چناں چہ کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک مرکب انفرادیت، جو انقلاب کا اظہار کرتی ہے اور استحکام کا انکار کرتی ہے؛ دوسرے معنوں میں ماضی اور مستقبل کی مطابقت سے حال کو مضبوط کرتی ہے۔

وہ آدمی پہلے ہی مل گیا تھا۔ اس کا نام تھا لوئی فیلیپ، آرلین والا۔

221 کے ہندسے نے شاہ لوئی فیلیپ کی تشکیل کی تھی۔ [جرنیل] لافایت نے تاج پوشی کی ذمے داری لے لی تھی۔

وہ اسے بہترین جمہوریہ کہتا تھا۔ پیرس کے ٹاؤن ہال نے Rheims کے کلیسا کی جگہ لے لی تھی۔

نصف تخت کی پورے تخت میں تبدیلی "1830ء کی کارگزاری تھی"۔

جب ہنر مند اپنا کام ختم کر چکے تو ان کے حل کی بھیانک خرابی ظاہر ہو گئی۔ یہ سب کچھ راست کی مکمل حدود سے باہر انجام دیا گیا تھا۔ مکمل راست نے چیخ کر کہا کہ "میں احتجاج کرتا ہوں" اور پھر بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ ظلمت میں داخل ہو گیا تھا۔

۞

لوئی فلیپ

انقلابات کے بازو مضبوط اور چالاک ہوتے ہیں، سختی سے ضرب لگاتے ہیں اور اچھی طرح کرتے ہیں۔ نامکمل ہوتے ہوئے، بے آبرو ہوتے ہوئے اور 1830ء کی طرح، نچلے درجے کے انقلاب کی طرح، وہ تقریباً ہمیشہ اپنے اندر ایک مناسب تابندگی باقی رکھتے ہیں جو ان کو بے جا طور پر زوال سے بچاتی ہے۔ گرہن لگنے کا مطلب دستبرداری کبھی نہیں ہوا کرتا۔

پھر بھی ہمیں بلند آواز میں ڈینگ نہیں مارنی چاہیے؛ انقلابات کو بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے، اور اس سلسلے میں سخت غلطیاں دیکھی گئی ہیں۔

آیئے اب ہم 1830ء میں چلتے ہیں۔ 1830ء کج روی کے باوجود خوش قسمت سال تھا۔ سرکاری نظام نے انقلاب کے بعد اپنی اصلاح کر لی تھی؛ بادشاہ شاہی سے زیادہ ہو گیا تھا۔ لوئی فلیپ (Louis Philippe) واقعی نرالا آدمی تھا۔

اُس باپ کا بیٹا، حالات کے پیشِ نظر جسے تاریخ کچھ موقع دے گی جو اسی طرح احترام کے لائق ہے، جس طرح اس کے باپ کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا تھا؛ تمام نجی اور کئی عوامی خوبیوں کا مالک؛ اپنی صحت، اپنی دولت، اپنی شخصیت، اپنے حالات کے بارے میں محتاط؛ صرف سال کی نہیں ایک ایک منٹ کی قدر کرنے والا؛ سنجیدہ، پُرسکون، امن پسند، صابر؛ اچھا آدمی اور اچھا شہزادہ؛ اپنی بیوی کے ساتھ وقت گزارنے والا، اور اپنے محل میں خوشامدیوں کو رکھنے والا جو بورژوائیوں کو اس کے ازدواجی بستر کا نظارہ کراتے، اور ایک عام قسم کی خواب گاہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے جو ماضی کے بزرگوں کے بعد زیادہ کارآمد ہو گئی تھی؛ جسے یورپ کی تمام زبانوں سے واقفیت تھی، اور سب سے زیادہ نرالی بات یہ تھی کہ وہ تمام زبانیں اور ان کے تمام مفادات کو

نہ صرف جانتا تھا بلکہ ساری زبانیں بولتا بھی تھا؛ وہ درمیانہ درجے کا ایک قابلِ تعریف نمائندہ تھا
حکمران سے آگے نکل گیا تھا اور ہر بڑھتی ہر طرح بڑھتا ہی جاتا تھا؛ لاجواب احساسات کا مالک اور
اس خون کی تعریف کرتا تھا وہ خود جس سے بنا تھا؛ اپنی تمام قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا۔ بالخصوص
اپنی نسل کا، اور خود کو Bourbon نہیں، آرلین والا کہلاتا تھا؛ باقاعدہ شاہی خون کا پہلا شہزادہ،
اس دن سے نہ صرف ایک پُرسکون عزت مآب تھا، بلکہ بورژوا بن گیا تھا جس دن بادشاہ بنا تھا؛
عوام میں گھل مل جاتا تھا؛ نجی معاملات میں بلیغ تھا؛ کنجوس مشہور تھا مگر کنجوسی ثابت نہیں ہوئی تھی؛
بنیادی طور پر وہ ان ماہرینِ معاشیات میں سے تھا جو اپنے کام اور اپنے فرائض ادا کرتے وقت
مسرف ہو جاتے ہیں؛ وہ عالم تھا، مگر اپنے علم کے بارے میں زیادہ حساس نہیں تھا؛ جنگجو نہیں،
مہذب انسان تھا؛ سادہ، خاموش اور مضبوط؛ اپنے خاندان اور اہلِ خانہ کا پسندیدہ؛ حیران کُن
گفتگو کرنے والا، دھوکے سے ماورا، ہمیشہ کا ٹھنڈا، فوری مفاد کا مغلوب، ہمیشہ قریب سے حکومت
کرنے والا؛ کینہ پروری اور احسان مندی کے معاملے میں نالائق؛ پارلیمانی اکثریت حاصل کرنے
میں چالاکی دکھانے والا، اور ان پُراسرار متفق لوگوں کو رد کر دینے والا جو تختِ شاہی کے پیچھے
سازشیں کرتے رہتے ہیں؛ بے تکلف، اور تکلف کی کمی کے باعث کبھی کبھی بیوقوفی کر جانے والا،
مگر بے تکلفی میں بھی لاجواب مقام رکھنے والا؛ ضرورتوں کے، چہرے بشرے کے، نقابوں کے
معاملات میں زرخیز ذہن کا مالک؛ فرانس کو یورپ سے اور یورپ کو فرانس سے ڈرانے والا!
ناقابلِ تردید حد تک اپنے ملک سے محبت کرتا، مگر خاندان کو فوقیت دینے والا؛ اختیار کے بجائے
زیادہ غلبہ اور زیادہ غلبے کے بجائے عزت کا حامل، ایک کیفیت بدقسمتی کی جس کی یہ خصوصیت ہوتی
ہے کہ یہ ہر شے کو کامیابی میں بدل دیتی ہے، جو چالاکی کو قبول کر لیتی ہے مگر کمینے پن کو مکمل طور پر
رد نہیں کرتی، مگر جس کا ایک قابلِ قدر پہلو یہ ہوتا ہے کہ یہ سیاست کو شدید صدموں سے، ریاستوں
کو ٹوٹنے سے اور سماج کو آفت سے بچاتی ہے؛ خفیف، درست، چوکس، متوجہ، زیرک، ان تھک؛
کبھی کبھی اپنے آپ کو رد بھی کرتا اور خود سے جھوٹ بھی بولتا ہے؛ Ancona میں آسٹریا کے سامنے
نڈر ہوتا ہے، ہسپانیہ میں انگلستان کے خلاف سرکشی کرتا ہے، Antwerp پر بم باری کرتا ہے
Pritchard کو ہرجانہ ادا کرتا ہے؛ اعتماد کے ساتھ قومی ترانہ گاتا ہے، دل شکستگی سے، بے کیفی سے
پیش آتا ہے، ان سے جو خوب صورت ہوتے ہیں مثالی ہوتے ہیں، باہمت فراخ دلی کرنے والے
ہوتے ہیں، یوٹوپیا والوں کے لیے، عجیب الخلقت کے لیے، طیش کے لیے، خودنمائی کے لیے، خوف
کے لیے؛ جس میں ہر نوع کی ذاتی بے باکی ہوتی ہے؛ Valmy میں عامی؛ Jemappes

میں فوجی؛ جس پر آٹھ دفعہ شاہ کشوں نے حملہ کیا، پھر بھی مسکراتا رہا۔ دستی گولا پھینکنے والے سپاہیوں کی طرح بہادر، مفکر کی طرح ہمت والا؛ صرف یورپ کے ہل جانے کے امکانات کے خوف سے پریشان ہو جانے والا، اور بڑی سیاسی مہمات کے لیے ناموزوں؛ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے لیے ہمیشہ تیار، مگر کام کے لیے نہیں؛ اپنی خواہش کو رسوخ میں چھپاتا، تاکہ شاہ کے بجائے ذہین کی طرح اس کی اطاعت کی جائے؛ علم غیب کا نہیں غور کرنے کی صلاحیت کا حامل؛ دماغوں پر توجہ دینے والا نہیں مگر آدمیوں کو جاننے والا، یعنی اندازہ کرنے کے لیے دیکھنے والا؛ مستعد اور اثر پذیر احساس رکھنے والا، عملی دانش، آسان تقریر، انوکھی یادداشت والا؛ یادداشت پر مسلسل انحصار کرنے والا، صرف سیزر، سکندر اور نپولین سے مشابہ؛ عمل سے، حقائق سے، تفصیلات سے، تاریخوں سے، ناموں سے واقف؛ میلانات سے، جذبات سے، ہجوم کے مختلف جوہر قابل سے، اندرونی تمناؤں سے، نفس کی خفیہ اور مبہم بغاوتوں سے واقف؛ مختصر یہ کہ ہر اس شے سے ناواقف جسے شعور کی غیر مرئی لہر کہا جا سکتا ہے؛ عام سطح کے لیے قابلِ قبول مگر فرانس کے نچلے طبقے سے دور؛ خود کو چالاکی کے زور پر الگ کرتا؛ بہت زیادہ، مگر ناکافی حکمرانی کرتا؛ اپنا خاص وزیر رکھنے والا؛ حقائق کی کم مائیگی میں سے بڑے بڑے خیالات نکالنے میں ماہر؛ اصلی تہذیبی تخلیقی لیاقت کو، تنظیم کو، اور ناقابلِ بیان کارکردگی اور مہر بجھیر کے جذبے کو خلط ملط کرتا۔ ایک شاہی خاندان کا بنیاد گزار وکیل؛ جس میں کچھ شارلیمیں اور کچھ مختار کی سی کیفیت ہے؛ مختصر یہ کہ وہ ایک بلند اور خالص شخصیت ہے، ایک شہزادہ ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ فرانس کی بے چینی کے باوجود اختیار کو کس طرح تخلیق کیا جا سکتا ہے، اور یورپ کی بدگمانی کو کس طرح طاقت میں بدلا جا سکتا ہے۔ لوئی فیلیپ کو اس صدی کے اعلیٰ ترین افراد کے درجے میں رکھا جائے گا، اور تاریخ کے شان دار حاکموں میں اس کا شمار ہوتا اگر وہ تھوڑی بہت توصیف بھی پسند کرتا، اور اس میں یہ احساس بھی ہوتا کہ آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے اسی وجہ فائدہ مند بھی ہوتا ہے۔

لوئی فیلیپ وجیہہ انسان تھا؛ عمر رسیدہ ہونے کے بعد بھی دل کش تھا؛ اگرچہ قوم نے اسے منظور نہیں کیا تھا مگر عوام کے نزدیک وہ ان جیسا ہی تھا؛ وہ خوش کر دینے والی شخصیت تھا۔ اس میں مسحور کرنے کی خداداد صلاحیت تھی۔ اس میں دبدبے کی کمی تھی؛ وہ تاج نہیں پہنتا تھا حالاں کہ وہ بادشاہ تھا؛ اس کے بال سفید نہیں ہوئے تھے، حالاں کہ وہ بوڑھا ہو گیا تھا؛ اس کے طور طریقے پرانے نظام سے متعلق تھے اور اس کی عادت نئے نظام سے متعلق تھی؛ ایک آمیزہ تھا امیر زادوں اور بورژوا کا جو 1830ء کے لیے مناسب تھا؛ لوئی فیلیپ عبوری حاکم تھا؛ اس نے قدیم

تلفظ اور قدیم املا محفوظ کر رکھے تھے جنھیں جدید خیالات میں استعمال کرتا تھا؛ اسے پولینڈ اور ہنگری سے محبت تھی مگر وہ پولش زبان کم لکھتا تھا اور ہنگرین زبان کم بولتا تھا؛ وہ نیشنل گارڈ کی وردی پہنتا تھا، بالکل چارلس دہم کی طرح، اور نپولین کی طرح لیجن آف آنر کا ربن لگاتا تھا۔

وہ کلیسا میں جاتا، شکار گاہ میں کبھی نہیں، نہ اوپیرا میں۔ اس کو کلیسا والے، شکار گاہ والے اور نہ بیلے ڈانسر ہی بگاڑ سکے تھے؛ اسی نے اس کی بورژوا مقبولیت قائم رکھی تھی۔ اس میں مروّت نہیں، بغل میں چھتری داب کر باہر نکل جاتا تھا اور اس کی چھتری ہی اس کا [نورکا] ہالا بن جاتی تھی۔ وہ راج بھی تھا، مالی بھی تھا، ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے ایک بار ایک گھڑ سوار کا [صحت مندی کی خاطر] تھوڑا سا خون بھی نکالا تھا جو اپنے گھوڑے سے گر گیا تھا؛ لوئی فلیپ اپنے نیزے کے بغیر باہر نہیں نکلتا تھا، جس طرح ہنری دہم اپنے خنجر کے بغیر قدم نہیں نکالتا تھا۔ شاہ پرست اس فضول قسم کے بادشاہ پر آوازے کستے تھے، وہ جس نے پہلی بار شفا کی خاطر خون بہایا تھا۔

لوئی فلیپ کے خلاف ایک ہی بات جاتی تھی جو شاہی پر الزام تھی، جو حکمرانی کو الزام دیتی تھی، جو بادشاہ کو مورد الزام ٹھہراتی تھی۔ ہندسوں کے تین کالم، اور تینوں کے میزان الگ الگ۔ جمہوری حق غصب کر لیا گیا تھا، ترقی ثانوی مفاد بن گئی تھی، احتجاج شدت سے کچل دیا گیا تھا، بغاوتوں کو موت کی فوجی سزائیں دی جاتی تھیں، اختلاف کو ہتھیار کے ذریعے دبا دیا جاتا تھا، Transnonain اسٹریٹ، جنگی مشورے، اصل ملک کو قانونی ملک میں ضم کر دیا گیا تھا، یہ سب تین ہزار مراعات یافتہ لوگوں میں بٹ گیا تھا — یہ تھیں شاہی کی کارستانیاں؛ بلجیم نے انکار کر دیا تھا، الجیریا کو تہذیبی طریقوں کے بجائے بے حد ظلم اور بربریت سے، جس طرح انگریزوں نے ہندوستان میں کیا تھا، فتح کر لیا گیا تھا۔ عبدالقادر، Blaye ، Deutz کو خرید لیا گیا تھا، Pritchard کو مراعات دے دی گئی تھیں — یہ تھیں حکمرانی کی کارستانیاں؛ وہ پالیسی جو قومی ہونے کے بجائے اندرونی تھی جو شاہ نے بنائی تھی۔

جیسا کہ آپ دیکھیں گے، باقاعدہ رعایت دی گئی تھی اور شاہ پر لگائے گئے الزامات میں کمی کر دی گئی تھی۔

یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی؛ فرانس کے معاملے میں وہ بہت اعتدال پسند ہو جاتا تھا۔

تو یہ غلطی کہاں سے نکلی تھی؟

اسے ہم بیان کریں گے۔

لوئی فیلیپ کچھ زیادہ ہی مشفق بادشاہ تھا؛ اس طرح بنتے والا خاندان ہر شے سے خوف زدہ ہوتا ہے، اور نہیں چاہتا کہ اسے مضطرب کیا جائے؛ اسی وجہ سے اس میں ضرورت سے زیادہ بزدلی آجاتی ہے، عوام جس سے ناخوش ہو جاتے ہیں، جن کی غیر فوجی روایات میں 14 جولائی ہے اور فوجی روایات میں Austerlitz ہے۔

مزید یہ کہ اگر ہم عوامی ذمے داریوں کو ایک جانب رکھ دیں تو، لوئی فیلیپ کی اپنے اہلِ خاندان سے انسیت ان کا جائز حق تھا، کہ اس کا گھرانا قابلِ تعریف تھا۔لیاقت کے ساتھ ساتھ ان میں خوبیاں بھی تھیں۔

فیلیپ کی بیٹیوں میں سے ایک، آرلینز کی میری نے فن کاروں کو اپنی نسل کے نام دیے تھے، جس طرح آرلینز کے شارل نے شاعروں میں سے کچھ کو نام دیے تھے۔شہزادی نے مرمر کا ایک مجسمہ بنایا تھا جس کو جون آف آرک' کا نام دیا تھا۔لوئی فیلیپ کی دو بیٹیوں نے جرمن نژاد مدبر اور سیاست دان Metternich کا یہ قول دہرایا تھا، "یہ وہ نوجوان لوگ ہیں جو خال خال دیکھے جاتے ہیں، اور وہ شہزادے ہیں جو کبھی نہیں دیکھے جاتے۔"

یہ بغیر کسی ریا کاری کے، اور بغیر کسی مبالغے کے، لوئی فیلیپ کے بارے میں سچائی تھی۔

عوامی سطح پر برابری کا شہزادہ ہونا، خود اپنی شخصیت میں 'بحالی' اور انقلاب کے تضاد کو جگہ دینا، انقلابیوں کی بے چینی کے پہلو کو اپنے اندر رکھنا جو حاکمانہ طاقت کے لیے تسکین آمیز ہو جاتا ہے، اسی کے اندر 1830ء کے لوئی فیلیپ کا نصیب چھپا ہوا تھا؛ وہ پہلے کبھی کسی واقعے سے، متعلق نہیں رہا ہے؛وہ جو دوسرے شخص کے اندر داخل ہوا اور اس کا ایک نیا وجود سامنے آگیا ہو۔لوئی فیلیپ بھی آدمی تھا 1830ء کا۔مزید یہ کہ اس کے حق میں تخت کی وہ بڑی بھاری سفارش تھی — ترکِ وطن۔وہ غریب آوارہ ہوا جب اُسے مشتبہ قرار دے دیا گیا۔وہ اپنی محنت کے بل پر زندہ رہا تھا۔فرانس کے امیر ترین شاہی حلقوں کے اس وارث کو روٹی کے لیے اپنا ایک گھوڑا فروخت کرنا پڑ گیا تھا۔Reichenau میں وہ ریاضی پڑھاتا تھا، جب کہ اس کی بہن Adelaide اونی بُنائی اور سوزن کاری کرتی تھی۔ایسی نشانیاں جو کسی بادشاہ سے متعلق ہوں بورژوائیوں کو پُرجوش بنا دیتی ہیں۔اس نے خود اپنے ہاتھوں سے لوئی یازدہم کا بنوایا ہوا آہنی کٹہرا، جسے لوئی یازدہم استعمال کرتا تھا، توڑا تھا۔وہ Dumouriez کا ساتھی تھا، لافایت کا دوست تھا؛ اس کا تعلق جیکوبنی کے کلب سے تھا؛ Mirabeau نے اس کے کاندھے پر مُکا مارا تھا؛ ڈانٹن اسے "نوجوان" کہتا تھا۔ستر اور چار (چوہتر سال) کی عمر میں، سن 93ء میں، جب وہ موسیو

Chartres تھا، اس نے لوئی سیزدہم پر، جسے ظالم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، چلائے جانے والے مقدمے کی کارروائی کو بکس کی گہرائی سے دیکھا تھا۔ انقلاب کی بے بصر غیب دانی نے شاہ کے اندر کی شاہی کو، اور شاہی کے ساتھ بادشاہ کو، مسمار کر دیا تھا اور یہ سب اس آدمی کو دیکھے بغیر کیا تھا جس نے خیالات کے بھیانک دباؤ میں اسے مقدمے کی کارروائی کی طوفانی کیفیت کو دیکھا تھا، جب عوامی غصہ سوال کر رہا تھا، Capet بھی جس کا جواب نہیں دے سکتا تھا؛ غم انگیز سانسوں کے بوجھ تلے، اس معصومیت کی تباہی کے عالم میں بادشاہی سر پریشان گمن، مدہوش کر دینے والے تذبذب میں، ان لوگوں کے لیے ہل رہا تھا جنھوں نے الزام لگایا تھا اور جس پر الزام دھرا گیا تھا—— اس نے ان چیزوں پر نظر کی، اسے اس کم ظرفی کی توقع تھی؛ اس نے اسمبلی کنونشن کے وکلا کے سامنے صدیوں کو پیش ہوتے دیکھا؛ اس نے، لوئی سیزدہم کے عقب میں اس بد قسمت گزرنے والے کو، اس بد بخت ملزم، یعنی شاہی کو، جسے ذمے دار ٹھہرایا گیا، اندھیروں میں سر اٹھاتے دیکھا تھا؛ اور اس کی روح میں، عوام کا قابلِ احترام خوف ناک انصاف لہریں لے رہا تھا، جو تقریباً خدائی انصاف ہی کی طرح بے لاگ تھا۔

اس کے اندر انقلاب کا چھوڑا ہوا نشان غیر معمولی تھا۔اس کی یادداشت ان عظیم برسوں کے، لمحہ بہ لمحہ، زندہ نشانات کی طرح تھی۔ایک دن، ایک گواہ کی موجودگی میں، ہمیں جس پر شبہ کرنے کی اجازت نہیں، اس نے اپنی یادداشت سے دستور ساز اسمبلی کی فہرست سے، حرف A کو مکمل طور پر مٹا دیا تھا۔

لوئی فیلیپ دن کی روشنی میں بادشاہ بنا تھا۔جب تک اس کی حکمرانی رہی پریس آزاد تھا، عدالت آزاد تھی، ضمیر اور تقریر آزاد تھی۔ستمبر کے قوانین سب کی نظروں کے لیے کھلے تھے۔ استحقاق کی کاٹ کھانے والی روشنی سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے اس نے تخت کو روشنی میں چھوڑ دیا تھا۔تاریخ اس وفاداری کے لیے اس سے انصاف کرے گی۔

تاریخ کے تمام آدمیوں کی طرح جو منظر سے گزر چکے ہیں آج لوئی فیلیپ انسانی ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہے۔اور ابھی تک اس کا مقدمہ صرف زیریں عدالت میں ہے۔

وہ گھنٹا جب تاریخ اپنے آزاد اور محترم لہجے میں بولتی ہے، اس کے لیے ابھی بجا نہیں ہے؛ اس بادشاہ کے بارے میں قطعی فیصلے کے اعلان کا لمحہ آیا نہیں ہے؛ درشت اور معروف مؤرخ لوئی بلانک نے حال ہی میں اپنے پہلے فیصلے کو خود ہی نرم کر دیا ہے؛ لوئی فیلیپ ان دو "زیادہ تر" کا منتخب کردہ ہے جن کو 221 اور 1830 ، کہتے ہیں، یعنی نصف پارلیمان اور نصف انقلاب؛

اور بہر حال بالاتر "نقطۂ نگاہ" وہ ہے جہاں فلسفہ خود کو رکھتا ہے، ہم یہاں سے اسے پرکھ نہیں سکتے، جیسا کہ قاری نے اوپر دیکھا ہے، سوائے مکمل طور پر جمہوری اصول کے نام پر کچھ مخصوص تحفظات کے؛ مطلق کی نظروں میں، ان دو صحیح حقیقتوں کے باہر، آدمی کا حق پہلے ہے، اور عوام کا حق بعد میں ہے، باقی سب چھینا جھپٹی ہے؛ مگر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی، اس قسم کے تحفظات کے بعد بھی، اگر ہم خلاصہ پیش کریں تو، جن معنوں میں بھی اس پر غور کیا جائے، اور لوئی فیلیپ کی تمام انسانی خوبیوں کو نظر میں رکھا جائے، تو قدیم تاریخ کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوئی فیلیپ ان تمام بہترین شہزادوں میں سے ایک ہوگا جو کبھی تخت نشین ہوئے ہیں۔

مگر اس کے خلاف کیا جاتا ہے؟ تختِ شاہی! اگر آپ بادشاہ لوئی فیلیپ کو الگ کر لیں تب بھی وہاں ایک آدمی رہ جائے گا۔ اور وہ اچھا آدمی ہوگا۔ کبھی کبھی وہ صرف اچھا ہی نہیں، قابلِ تعریف بھی ہوتا ہے۔ اکثر، مشکل ترین یادداشتوں میں، تنازعے اور براعظم کے تنازعات اور سفارت کے مشکل دن کے بعد بھی، جب وہ واپس اپنے گھر پہنچا، تھکن سے چور، نیند کے غلبے میں ہوتے ہوئے بھی، وہ کیا کرتا تھا؟ اس نے سزائے موت کے ایک فیصلے کو اٹھایا اور یورپ کے تناظر میں اس پر غور کرتے ہوئے، پوری رات اس مقدمے پر نظرِ ثانی میں گزار دی۔ پھر بھی اس کے نزدیک سب سے بڑا مرحلہ ایک انسان کو جلاد سے محفوظ رکھنا تھا۔ وہ اپنے مہر بردار کے خلاف اپنے ارادے پر اڑا رہا؛ اس نے گلوٹین لے جانے والے شاہی وکیلوں کے تمام اسباب کے ہر ہر قدم پر اعتراض کیا، اور ان کو قانونی بکواس کرنے والے کہتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی پوری میز جملوں کے انبار سے بھر جاتی؛ اور وہ ان سب کو سنجیدگی سے پرکھتا تھا۔ اس کے نزدیک ان مجرم سروں سے لاتعلقی پر اتنی سخت کوفت کی بات ہوتی ہے۔ ایک دن اس نے اس گواہ سے کہا، ہم نے حال ہی میں جس کا حوالہ دیا ہے، "پچھلی رات، میں سات بار جیتا ہوں۔" اس کے دورِ بادشاہت کے ابتدائی برسوں میں سزائے موت اس قدر کم ہو گئی تھی گویا اس سزا کا خاتمہ ہو گیا ہو، اور سولی کی تعمیر بادشاہ کے احکام کی خلاف ورزی ہو۔ چوں کہ Greve اور اس کے ساتھ کا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، Barriere-Saint-Jacques نام کی سزا دینے کی ایک بورژوا جگہ تیار کی گئی تھی؛ "عملی لوگوں" کو گلوٹین کے مماثل ایک جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی تھی؛ اور یہ Casimir Perier کی فتوحات میں سے ایک فتح تھی جو لوئی فیلیپ کے مقابلے میں بورژوائیوں کی نمائندگی کرتا تھا، جو آزاد خیال لوگوں کا نمائندہ تھا۔ لوئی فیلیپ نے اپنے ہاتھ سے Beccaria [اطالوی ماہرِ قانون اور سیاست داں (1794ء-1738ء) جس نے سزائے موت اور تشدد کے خلاف اپنا مشہور مقالہ پیش کیا تھا] کی

تشریح کی تھی۔ Fieschi کی مشین؛ 28 جولائی 1835ء کو Fieschi نامی ایک شخص نے پچیس نالوں کو ملا کر ایک توپ بنائی تھی جس کے ذریعے لوئی فلیپ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کوشش میں وزیر اعظم سمیت اٹھارہ افراد مارے گئے تھے۔ جسے گلوٹین سے سزائے موت دی گئی تھی] سے بچ جانے کے بعد لوئی فلیپ نے چیخ کر کہا تھا، ”کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں زخمی بھی نہیں ہوا۔ مجھے اسے بخش دینا چاہیے تھا۔“ ایک اور موقعے پر اس نے اپنی وزارت کی جانب سے مزاحمت کے اشارے کے جواب میں ایک سیاسی مجرم کے بارے میں لکھا تھا، جو آج کی سب سے فیاض شخصیت ہے، ”اس کو معاف کیا جاتا ہے؛ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس پر عمل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔“ لوئی فیلیپ لوئی نہم اور ہنری ہشتم کی طرح نرم دل انسان تھا۔

اب ہمارے خیال میں تاریخ میں، جس میں مہربانی ایک نایاب ترین موتی ہوتی ہے، وہ آدمی جو مہربان ہو عظیم انسان سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔

لوئی فیلیپ، کچھ لوگوں کی سخت ترین نکتہ چینی کے باوجود، فطری اعتبار سے ایک انسان تھا اور جو دوسروں کی نظر میں آج ایک خیالی آدمی بن چکا ہے، جو اچھی طرح جانتا تھا کہ بادشاہ کو تاریخ کے سامنے آکر اپنے حق میں گواہی دینی چاہیے؛ اس کا بیان جو کچھ بھی ہو، ظاہر ہے کہ بالکل غیر دل چسپ ہوگا؛ مگر وہ ایک کتبۂ مزار ہوگا جسے ایک مردہ انسان نے سنجیدگی سے لکھا ہوگا؛ ایک سایہ دوسرے سایے کی دل جوئی کرے گا؛ ان ہی سایوں میں شراکت اس کو تعریف کا حق دیتی ہے؛ اس سے بالکل خوف نہیں کھانا چاہیے کہ دو تارکِ وطن قبروں کے بارے میں کبھی کہا جائے گا، ”اس نے اُس کی چاپلوسی کی ہے۔“

بنیادوں میں شگاف

ایسے وقت میں جب ہم وہ ڈراما بیان کرنے جا رہے ہیں جو لوئی فلیپ کی حکمرانی کی ابتدا پر چھائے ہوئے الم ناک بادلوں میں داخل ہو رہا تھا، ضروری ہے کہ اس میں کوئی ابہام نہ ہو، اور یہ امر ناگزیر ہو گیا ہے کہ یہ کتاب بادشاہ کے بارے میں کچھ تشریح بھی پیش کرے۔

لوئی فلیپ بغیر تشدد کے اپنے شاہی اختیار کو اپنے ہاتھ میں لے رہا تھا، اپنے طور پر کسی راست اقدام کے بغیر، ایک انقلابی تبدیلی کے طفیل بہ ظاہر جو انقلاب کا اصل مقصد تھا، مگر جس میں اس نے، یعنی آرلین کے ڈیوک نے کوئی ذاتی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ وہ شہزادہ پیدا ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہی بادشاہ منتخب ہوگا۔ یہ اختیار اس نے خود اپنے اوپر نافذ نہیں کیا تھا، نہ اسے قبول کیا تھا؛ یہ تو اسے پیش کیا گیا تھا، اور اس نے قبول بھی کر لیا تھا، اس غلط یقین کے ساتھ کہ یہ پیشکش حق کے عین مطابق تھی اور اس کی منظوری بھی فرائض کے مطابق تھی۔ لہٰذا اس کا قبضہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اب ہم نیک دلی سے کہہ رہے ہیں کہ لوئی کا قبضہ صحیح تھا، اور جمہوریت حملہ کرنے میں حق بجانب تھی، اور سماجی تنازعات کی پیدا کردہ شدت کا بوجھ نہ بادشاہ پر تھا نہ جمہوریت پر۔ اصولوں کا ٹکراؤ عناصر کے ٹکراؤ سے مشابہ ہوتا ہے۔ سمندر اپنے پانی کا دفاع کرتا ہے، طوفان اپنی ہوا کا دفاع کرتا ہے، بادشاہ اپنی شاہی کا دفاع کرتا ہے جمہوریت اپنے عوام کا دفاع کرتی ہے؛ اس کی رشتے دار جو بادشاہت ہوتی ہے محکم کی مزاحمت کرتی ہے، اور محکم جمہوریہ ہوتی ہے؛ اس تنازعے میں سماج کا خون بہتا ہے مگر وہ جو آج دُکھ کہلاتا ہے ایک دن وہی تحفظ کہلائے گا؛ اور جو کچھ بھی ہو، وہ جو لڑتے ہیں قابلِ گرفت نہیں ہوتے؛ ظاہر ہے کہ دو پارٹیوں میں سے ایک غلطی پر ہوتی ہے؛ حق، Colossus of Rhodes [تیسری صدی قبلِ مسیح میں نصب کیا جانے والا سورج

کے دیوتا کا مجسمہ] کی طرح، ایک وقت میں دو ساحلوں پر نہیں ہوتا، کہ ایک پیر جمہوریہ میں ہو، اور دوسرا شاہی ہیں؛ یہ تو ناقابلِ تقسیم ہے، بس سب ایک ہی جانب ہیں سوائے ان کے جو اتنی سنجیدگی سے غلطی پر اڑے ہوئے ہیں: ایک ناپیا شخص جو Vendean سے زیادہ مجرم نہیں، بس ایک بدمعاش ہے تو اب ہمیں اس ہیبت ناک تصادم کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔یہ طوفان یا دوبارہ اس جیسا بھی ہو انسانی غیر ذمے داری اس میں گھلی ملی ہوئی ہے۔

اب ہمیں اس انکشاف کی تکمیل کر دینی چاہیے۔

1830ء کی حکومت کو فوراً ہی سخت حالات کا سامنا ہوا۔گویا کل اس کی ولادت ہوئی اور آج سے جنگ درپیش۔

ابھی اس کو قائم ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اسے ہر سمت ہونے والی مبہم حرکات کے کھنچاؤ کا اور جولائی کے ساز و سامان کا احساس ہونے لگا تھا جو حال ہی میں پھیلایا گیا تھا اور جمود سے ماورا تھا۔

مزاحمت ابھی کل ہی تو پیدا ہوئی تھی، شاید کل شام ہی، اور جنگ ماہ بہ ماہ بڑھتی گئی اور مخفی ہونے کے بجائے ظاہر ہوتی گئی۔

جولائی کا انقلاب فرانس سے باہر کے بادشاہوں کو کم کم قبول تھا؛ اور فرانس کے اندر اس کی تشریح ویسی ہی کی جارہی تھی جیسی کہ ہم نے بیان کی ہے۔

خدا اپنے واضح ارادے کو واقعات کے ذریعے پُر اسرار زبان میں لکھے دھندلے متن میں انسان پر ظاہر کرتا ہے۔آدمی فوراً اس کا ترجمہ کر لیتے ہیں؛ ترجمہ بھی کیسا -عجلت میں کیا گیا، غلط، بلکہ غلطیوں سے، رخنوں سے، حماقتوں سے پُر۔بہت کم اذہان اس ربانی زبان کا پوری طرح ادراک کر پاتے ہیں۔سب سے زیادہ سمجھ دار، پُرسکون، سب سے زیادہ عمیق رفتہ رفتہ عقدے کھولتے جاتے ہیں، اور جب وہ متن تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کا کام مکمل ہو جاتا ہے؛ ان کے بیس ترجمے عوام میں موجود ہیں۔ہر ایک سے ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے اور ہر غلط تعبیر سے ایک فرقہ؛ اور ہر گروہ سمجھتا ہے کہ روشنی صرف اسی کے پاس ہے۔

کبھی کبھی خود طاقت بھی ایک فرقہ بن جاتی ہے۔

انقلابات میں ایسے پیراک بھی ہوتے ہیں جو بہاؤ کے خلاف پیرتے ہیں؛ وہ قدیم گروہوں والے ہوتے ہیں۔

اس لیے کہ قدیم گروہوں والے جو خدا کے فضل سے وراثت سے چمٹے ہوتے ہیں،

سوچتے ہیں کہ انقلابات جو بغاوت کرنے کے حق سے ابھرتے ہیں کسی نہ کسی کو ان کے خلاف بغاوت کا حق مل جاتا ہے۔ غلط۔ اس لیے کہ ان انقلابات میں جو لوگ بغاوت کرتے ہیں وہ عوام نہیں ہوتے؛ وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ انقلاب بغاوت کا بالکل برعکس عمل ہوتا ہے۔ ہر انقلاب جو ایک عام قسم کا نتیجہ ہوتا ہے، اپنے اندر اپنے وجود کا جواز رکھتا ہے جسے نقلی انقلابی کبھی کبھی بدنام کر دیتے ہیں، مگر وہ بدنامی کے دھبے کے باوجود باقی رہتا ہے، اور خون کے دھبوں کے باوجود بچ جاتا ہے۔

انقلابات حادثاتی نہیں ہوتے، ضرورت کی ایجاد ہوتے ہیں۔ انقلاب نادرستی سے اصلیت کی طرف کا سفر ہوتا ہے۔ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اسے ہونا ہوتا ہے۔

اس کے باوجود، قدیم جوازی گروہ غلط وجوہ کی بنا پر، جو تمام تر شدت کی پیداوار ہوتی ہیں، 1830ء کے انقلاب پر حملے کرتے ہیں۔ غلطیاں بہترین حربے ہوتی ہیں۔ اور یہ حربے، ذرہ بکتر کی کوتاہی کے اور منطق کی کمی کے باعث، چالاکی سے کم زور مقامات کو نشانہ بناتے ہیں؛ انھوں نے ہی انقلاب کی شاہی پر حملے کیے تھے۔ وہ چیخ کر کہتے تھے، "انقلاب ہے تو اس بادشاہ کی کیا ضرورت ہے۔" فرقے اندھے آدمیوں جیسے ہیں جو صحیح صحیح نشانے لگاتے ہیں۔

جمہوریہ والوں نے بھی کم شور نہیں مچایا، مگر ان کا شور منطقی تھا۔ جوازی جسے بے بصارتی سمجھتے تھے، وہ جمہوریت پسندوں کے لیے نظر کی صفائی تھی۔ 1830ء نے عوام کو دیوالیہ کر دیا تھا۔ یہ غضبناک جمہوریت کی جانب سے سرزنش تھی۔

ماضی کے حملوں اور مستقبل کے حملوں کے درمیان جولائی کی قوتیں جد و جہد میں مصروف تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی احمق کا ایک منٹ اور شاہ پسندوں کی ابدی حق رکھنے والی صدیاں۔

اس کے علاوہ، چوں کہ یہ انقلاب نہیں شاہی بن گیا تھا، 1830ء کو یورپ میں سب سے آگے ہونا چاہیے تھا۔ اس وقت امن کا قائم رکھنا پیچیدگی بڑھانے کے مترادف تھا۔ احساس سے ماورا ہم آہنگی کا قیام اکثر جنگ سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس قسم کے پُراسرار تنازعے سے، جن کو ہمیشہ دبا کر رکھا گیا، مگر جو ہمیشہ غراتے رہے ہیں، امن پیدا ہوا تھا؛ تہذیب کی وہ تباہ کن تدبیر تھی جو خود یورپی حکومتوں کے قابو میں ہوتے ہوئے بھی مشکوک تھی۔ جولائی کی بادشاہی نے عقب سے سر اٹھایا اس امر کے باوجود کہ یہ خود کو یورپی حکومتوں کی لگام میں پاتی تھی۔ Metternich نے بہ خوشی اس کو بندھنوں میں جکڑ دیا ہوتا۔ یہ ترقی کے ذریعے فرانس میں داخل ہوا، اس نے شاہی کو، یورپ کے آوارہ خراموں کو بھی اکسایا۔ پہلے ان کو دھکا دے کر آگے کیا جاتا

تھا، اب یہ فرض خود اس نے سنبھال لیا تھا۔

اس دوران اس کے اندرون کی مفلسی، پرولتاریت، تنخواہ، تعلیم، تعزیری خدمت گاری، عصمت فروشی، عورتوں کی تقدیر، دولت، بدحالی، پیداوار، استعمال، تقسیم، مبادلہ، سکّہ، قرض، سرمایے کے حقوق، محنت کشوں کے حقوق — یہ سارے سوالات سماج سے بالا بالا بڑھ گئے تھے، اور ایک خوف ناک ڈھلان پر تھے۔

نام نہاد سیاسی جماعتوں سے باہر، ایک اور تحریک ظاہر ہوئی۔ فلسفیانہ ہیجان نے جمہوری ہیجان کا جواب دیا۔ منتخب لوگوں اور عوام نے خود کو مشکل میں محسوس کیا، ایک اور انداز میں مگر اس قدر نہیں۔ مفکرین نے مراقبہ کیا، جب کہ مٹی، یعنی عوام، انقلابی لہروں کے اوپر تھے، ان کے نیچے ناقابلِ بیان مبہم مرگی کے صدموں سے لرزاں تھے۔ ان خواب دیکھنے والوں نے، جن میں کچھ الگ کردیے گئے تھے، جب کہ دوسرے خاندانوں میں اور تقریباً رازداری میں متحد رہے، نئے سرے سے سماجی سوالات اٹھائے، صلح جوئی کی مگر عمیق انداز سے: بے چین کان کنی، جنھوں نے پُرسکون انداز میں اپنی راہداریوں کو آتش فشانوں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا، مادہ لوح شورش اور جھٹکیوں کی جھلکیوں سے پریشان نہیں ہوئے۔

یہ خاموشی اس بجھ کے ہوئے عہد کا خوب صورت نظارہ ہرگز نہیں تھی۔ ان لوگوں نے حقوق کے بارے میں سوالات سیاسی جماعتوں کے لیے چھوڑ دیے، اور خود کو مسرتوں کے سوالات میں مصروف کرلیا تھا۔ بنی نوعِ انسان کی خیر و عافیت میں؛ جو وہ سماج سے اخذ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اہم سوالات اٹھائے تھے، زراعت کے، صنعت کے، تجارت کے، حتیٰ کہ مذہب کے وقار کے سوالات بھی۔ کسی بھی تہذیب میں، جس نے کچھ احکامِ خداوندی کے ذریعے اور زیادہ تر انسانی ذرائع سے خود اپنی تشکیل کی ہو، ہمیشہ مفادات یک جا، متحد ہوکر اور حرکیاتی قوانین کے مطابق سنگِ خارا کی چٹان کی طرح آمیز ہوجاتے ہیں اور ماہرینِ معاشیات، سیاست کے ماہرین، ارضیات کی طرح جس کا صبر سے مطالعہ کرتے ہیں؛ ان لوگوں نے، جنھوں نے مختلف ناموں سے اپنے گروہ بنالیے تھے، مگر جن کو ان کے اصل نام سے اشتراکی کہا جاسکتا ہے، اس سنگِ خارا کی چٹان میں سوراخ کرنے اور انسانی آسودگی کے زندہ پانیوں کے فوارے نکالنے کی کوشش کی ہے۔

سولی کے سوال سے جنگ کے سوال تک، ان کے کام نے ہر شے کو گلے سے لگا لیا ہے۔ حقوقِ انسانی میں، جیسا کہ انقلابِ فرانس نے اعلان کیا تھا، انھوں نے عورتوں اور بچوں کے حقوق کا اضافہ کیا ہے۔

قاری کو حیرت نہیں ہوگی اگر، کئی وجوہ کی بنا پر، نظریاتی نقطۂ نگاہ سے ہم اشتراکیت کے بارے میں سوالات اٹھاتے ہیں۔ ہم ان کی جانب صرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

ان تمام مسائل کو، جو اشتراکی خود تجویز کرتے ہیں، ہم دو بڑے مسائل میں محدود کر سکتے ہیں۔

پہلا مسئلہ: سرمائے کی پیداوار۔

دوسرا مسئلہ: اس میں شرکت۔

پہلا مسئلہ مشتمل ہے کام کے سوال پر۔

دوسرا مسئلہ تنخواہ کے سوال پر مشتمل ہے۔

پہلے مسئلے میں توانائیوں کے استعمال پر سوال کیے جا سکتے ہیں۔

دوسرے میں، لطف اندوزی کی تقسیم پر۔

توانائیوں کا باقاعدہ استعمال عوام کی قوت پر منتج ہوتا ہے۔

لطف اندوزی کی اچھی تقسیم، انفرادی مسرتوں پر منتج ہوتی ہے۔

اچھی تقسیم کا مطلب صرف برابری نہیں، مساواتی تقسیم ہونی چاہیے۔

ان دو باتوں کے یک جا ہونے سے عوامی قوت بیرونی، اور مسرت اندرونی ہو جاتی ہے، جس سے سماجی خوش حالی جنم لیتی ہے۔

سماجی خوش حالی کا مطلب ہوتا ہے: آدمی خوش، باشندہ آزاد، قوم عظیم۔

انگلستان ان دو مسائل میں سے پہلے مسئلے کو حل کر لیتا ہے۔ سرمایہ بطریقِ احسن پیدا کرتا ہے، مگر تقسیم بری طرح کرتا ہے۔ یہ حل کو جو ایک جانب مکمل ہوتا ہے، مہلک انداز میں دو انتہاؤں کی طرف لے جاتا ہے: عفریت صفت فراوانی اور عفریت صفت بد نصیبی کی طرف۔ کچھ کے لیے تمام خوشیاں، اور بقیہ کے لیے ہر قسم کی محرومیاں؛ یعنی، عوام کے لیے: استحقاق، استثنا، اجارہ، جاگیرداری، جو خود محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک باطل اور خطرناک کیفیت ہے جو عوامی طاقت اور نجی بد نصیبی کو آسودہ کر دیتی ہے، جو افراد کے دکھوں میں ریاست کی جڑوں کو داخل کر دیتی ہے۔ یعنی، ایک بری طرح تشکیل کردہ عظمت جس میں تمام اہم عناصر یک جا ہوتے ہیں، اور جس میں کوئی اخلاقی عنصر داخل نہیں ہوتا۔

اشتراکیت والے اور زمیں ندار سمجھتے ہیں کہ انھوں نے دوسرا مسئلہ حل کر لیا ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی آپس کی تقسیم پیداوار کو مار دیتی ہے۔ مساوی بٹوارا تقلید کو منسوخ کر دیتا ہے اور اس

کے نتیجے میں محنت کو بھی۔ وہ قصائی کا کیا ہوا ہوتا ہی ہوتا ہے جو اسے بھی مار ڈالتا ہے جس کو تقسیم کرتا ہے۔ لہٰذا، ان بناوٹی حلوں پر ٹھہرنا ممکن نہیں ہوتا۔ دولت کا قتل اس کی تقسیم جیسا عمل نہیں ہوتا۔

ان دو مسائل کو اگر اچھی طرح حل کرنا ہو تو انھیں ایک ساتھ حل کیا جانا چاہیے۔ ان دونوں مسائل کو ملا کر ایک بنا دینا چاہیے۔

پہلے دو مسائل میں سے صرف ایک کو حل کر لو؛ تم وینس ہو جاؤ گے، تم انگلستان بن جاؤ گے۔ وینس ملا تو تمھارے پاس مصنوعی طاقت ہو گی، یا انگلستان کی طرح ایک اہم طاقت بن جاؤ گے؛ تم فاسق دولت مند ہو گے۔ تشدد تمھیں مار دے گا، جیسے وینس مرا تھا، یا دیوالیہ ہو کر جیسے انگلستان کا زوال ہوگا۔ اور دنیا ہر اس شے کو مر جانے دے گی، اور جو محض خود غرضی ہے اسے زوال ہو جائے گا، اس سب کا بھی جو نہ نسلِ انسانی کی نمائندگی کرتا ہے نہ کسی نیکی کی نہ کسی خیال کی۔

سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وینس یا انگلستان کے لفظوں سے مراد وہاں کے عوام نہیں تھے، سماجی ڈھانچے تھے؛ قوموں پر لادی ہوئی امیر شاہیاں تھی، خود قومیں نہیں تھیں۔ قوموں کے لیے ہمیشہ احترام اور ہماری ہم دردی ہوتی ہے۔ عوام کے طور پر وینس ایک بار پھر زندہ ہوگا؛ انگلستان اور اس کی اشرافیہ کو زوال ہو گا، مگر انگلستان بہ حیثیتِ قوم لافانی ہے۔ بس اتنا کہنا کافی ہے، اور اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔

ان دو مسئلوں کو حل کر لو، دولت مند کی ہمت افزائی کرو اور مفلس کی حفاظت کرو، بدنصیبی کو کچل دو، مضبوط کے ہاتھوں کم زور سے کی جانے والی ناانصافی کو ختم کرو، انسان کے ناحق حسد کو لگام دو جو ہدف تک پہنچ جانے والے آدمیوں کے خلاف کام کر رہا ہے، ریاضیاتی اور برادرانہ طور پر محنت کش کی تنخواہ درست کرو، بچپنے کی نشوونما کے ساتھ ساتھ مفت اور لازمی تعلیم کو آمیز کرو، اور آدمیت کے لیے سائنس کی بنیاد تیار کرو، اذہان کو ترقی دو اور بازوؤں کو مصروف رکھو، طاقت ور عوام ہونے کے ساتھ ساتھ خوش و خرم آدمیوں کا خاندان بنو، جائیداد کو جمہوری بناؤ، اس کو ختم کرنے سے نہیں بلکہ اس کو آفاقی بنانے سے، تا کہ بغیر کسی استثنا کے ہر باشندہ مالک بنے، جو عام طور پر ہونا چاہیے؛ اور دو لفظوں میں، یہ دیکھو کہ دولت کس طرح پیدا کی جاتی ہے، اور اسے کس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے اور تمھیں فوراً اخلاقی اور مادی عظمت مل جائے گی؛ تب تم خود کو فرانس کہنے کے قابل ہو گے۔

یہ ہے وہ بات جو اشتراکیت نے فرقوں سے بلند ہو کر کہی تھی جو ضائع ہو گئی ہے؛ یہی ہے وہ جس کی انھیں تلاش تھی جو ذہنوں میں منقوش ہے۔

قابلِ تعریف کوششیں! مقدس سرگرمیاں!

یہ نظریات، یہ مزاحمتیں، مدبرین کے لیے فلسفیوں کی یہ غیر متوقع ضرورت، وہ پیچیدہ سلوک ہیں ہم جن کی ایک جھلک دیکھتے ہیں، سیاست کا ایک نیا نظام ہے جس کی تخلیق ہوئی ہے، جو پرانی دنیا کے مطابق ہو، جو نئے انقلابی آدرش سے زیادہ غیر متعلق ہو، اور یہ ایسی صورت تھی جس میں ضروری ہو گیا تھا کہ Polignac کے دفاع کے لیے لافایت کو استعمال کیا جائے، انقلاب کی تہہ میں شفاف ترقی کے ادراک نے؛ کمروں اور سڑکوں پر ہونے والے مقابلوں نے؛ اس کے اطراف کے توازن نے؛ انقلاب میں اس کے یقین نے؛ دوڑ میں شامل رہنے کی خواہش کی کمی نے؛ اس کے گھریلو جذبات نے؛ عوام کے بارے میں اس کے احترام نے اور اس کی اپنی دیانت داری نے لوئی فیلیپ کو تقریباً دردناک انداز میں مصروف رکھا تھا؛ اور ایسے بھی لمحات آئے تھے جب مضبوط اور باہمت ہونے کے باوجود شاہ ہونے کی مشکلات اس پر غالب ہو گئی تھیں۔

اس کو اپنے پیروں کے نیچے ایک مہیب کیفیت انتشار کی محسوس ہوئی، جو اسے خاک میں ملانے کے لیے نہیں، بلکہ فرانس کو پہلے سے زیادہ فرانس بنانے کے لیے تھی۔

افق پر سایے ہی سایے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک عجیب قسم کا سایہ تھا، رفتہ رفتہ جو اس کے قریب آ رہا تھا، پھیلتا جا رہا تھا آدمیوں پر، اشیا پر، خیالات پر؛ وہ سایہ جو نظاموں اور خصوں سے نکلا تھا۔ ہر وہ شے جس کو جلدی میں دبا دیا گیا تھا، اب حرکت میں آ گئی اور جوش میں آنے لگی تھی۔ ایسا بھی ایک وقت آیا جب اس فضا میں جس میں موفسطائیت سچائیوں میں گھل مل گئی تھی، بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ ایمان دار انسان کے ضمیر نے دوبارہ سانس لینی شروع کر دی تھی۔ سماجی افکار میں جذبات اس طرح لرز رہے تھے جیسے طوفان کے شروع ہوتے ہی پتیاں لرزنے لگتی ہیں۔ خاص موقعوں پر وہ مسرت انگیز تناؤ ایسا تھا، کہ پہلا آنے والا اجنبی بھی اپنے ساتھ روشنی لا رہا تھا۔ اس کے بعد پھر شام کی دھند چھا گئی۔ وقفے وقفے سے آنے والی سرگوشیوں سے بادلوں میں چھپی کڑک کی مقدار کا اندازہ ہوتا تھا۔

جولائی کے انقلاب کے بعد مشکل سے بیس ماہ گزرے تھے کہ 1832ء نے ایسی چیزوں کے امکانات پیدا کر دیے جن میں خطرات تھے۔

عوام کی مشکلیں، روٹی کو ترستے مزدور، آخری شہزادہ de Conde پر چھائیوں میں غرق، برسلز نے نساؤ والوں کو اس طرح نکال باہر کیا جیسے پیرس نے Bourbons کے ساتھ کیا تھا؛ بلجیم نے خود کو فرانسیسی شہزادے کے حوالے کرنے کی پیش کش کی اور خود کو انگریز شہزادے کے حوالے کر دیا؛ نکولاس سے روسیوں کی نفرت، ہمارے عقب میں جنوب کے عفریت، ہسپانیہ میں فرڈیننڈ،

پرتگال میں مگیل (Miguel)، اطالیہ میں زلزلہ، Bologna کی طرف Metternich کا بڑھتا ہوا ہاتھ، فرانس کا Ancona میں آسٹریا کو چرکہ دینا، شمال میں کسی کو پتا نہیں تھا کہ پولینڈ کو اس کے تابوت میں بند کرنے والی ہتھوڑی کی منحوس آواز کیسی ہوتی ہے؛ مشتعل نظریں تقریباً پورے یورپ پر چھانے لگیں، انگلستان، ایک مشتبہ اتحادی، اس کو دھکا دے رہا تھا جو خود لڑکھڑا رہا تھا، اور خود کو اس پر تیار کر رہا تھا جو خود ہی گرنے والا تھا؛ نوابی Beccaria کے پیچھے پناہ لے رہی تھی تا کہ وہ چار سرداروں کو قانون کے حوالے کرنے سے بچ جائے؛ بادشاہ کی بگھی سے پھولوں کے شاہی نشان کا مٹا دیا جانا؛ ناترے ڈیم کی صلیب کا توڑ دیا جانا؛ لافاییت کی حدوں کا کم کر دیا جانا، لافیت کی تباہی بحروی میں، بن یامین کونستاں کی موت؛ اپنی طاقت کی تحلیل سے Casimir Perier کی موت؛ سیاسی اور سماجی بیماریوں کا ایک ساتھ دو بادشاہتوں کے دارالحکومتوں میں پھوٹ پڑنا، ایک شہر خیال میں اور دوسرا شہر مشقت میں؛ پیرس میں خانہ جنگی، Lyon میں غلامانہ جنگ؛ دو شہروں میں بھٹی کی ایک جیسی تابش؛ عوام کے ابروؤں پر ارغوانیت سے پُر گڑھے؛ دیوانہ جنوب، بے چین مغرب، مادام ڈچس ڈی بیری کی Vendee میں موجودگی، سازشیں، شورشیں، کالرا کی وبا؛ ان سب نے مل کر خیالات کی اداس گونج میں بے چینی کے اداس واقعات کا اضافہ کر دیا تھا۔

۞

حقائق اور تاریخ

اپریل کے اختتام تک ہر شے خراب ہو چکی تھی۔ خمیر کی کیفیت اُبال تک پہنچ گئی تھی۔
1830ء کے بعد سے یہاں وہاں چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ہوتی رہیں اور تیزی سے فرو کی جاتی رہیں، مگر بار بار نئی شورشوں کا ابھرنا کسی زیریں شعلہ زنی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ کچھ ضرور تھا جس کی تیاری ہو رہی تھی۔ کسی ممکنہ انقلاب کے دھندلے اور مٹے مٹے نقوش ظاہر ہو رہے تھے۔ فرانس کی آنکھیں پیرس پر لگی تھیں؛ اور پیرس کی آنکھیں Saint-Antoine کے مضافات پر تھیں۔
Saint-Antoine دھندلکے میں تھا اور اس کی کیفیت اُبال کی طرف بڑھ رہی تھی۔
Charonne اسٹریٹ پر واقع وائن کی دکانوں کی حالت ناگفتہ بہ اور طوفانی سی تھی۔

حکومت کے بارے میں سوالات اٹھ رہے تھے۔ لوگ لڑنے یا خاموش رہنے کی باتیں سرِعام کر رہے تھے۔ عقبی دکانوں میں کام کرنے والوں سے قسمیں لی جا رہی تھیں کہ الارم کی پہلی آواز سنتے ہی وہ سڑکوں پر نکل آئیں گے اور یہ بھی کہ "وہ دشمنوں کو گنے بغیر لڑنا شروع کر دیں گے۔" یہ بات طے ہو چکی تو ایک آدمی جو ایک وائن کی دکان کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا، بچوں کی طرح چیخ کر بولا، "سمجھ گئے نا، تم قسم کھا چکے ہو۔"

وہ لوگ کبھی پہلی منزل کے ایک نجی کمرے میں جاتے اور وہاں تقریباً فری میسن جیسے نظارے دیکھے جا سکتے تھے۔ وہاں حلف اُٹھائے جا رہے تھے کہ وہ نہ صرف اپنی خدمت کریں گے، بلکہ اپنے آبا اور اہلِ خاندان کے لیے بھی لڑیں گے۔ یہ تھا اس وقت کا فارمولا۔

مے کشی کے لیے مخصوص کمروں میں "تخریب کاری" کے کتابچے پڑھے جا رہے تھے۔ اس وقت کی ایک خفیہ رپورٹ کے مطابق حکومت کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔

مندرجہ ذیل جیسے الفاظ سنے جا سکتے تھے:

"ہم تو اپنے رہنماؤں کے نام بھی نہیں جانتے۔ ہم بیچاروں کو آخری گھنٹوں تک بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" ایک کام کرنے والے نے کہا "یہاں ہم تین سو افراد ہیں۔ آؤ، ہم سب دس سو فی کس چندہ دیں، ایک سو پچاس فرانک جمع ہو جائیں گے، جس سے گولہ بارود خریدا جا سکے گا۔"

ایک اور بولا، "شاید چھ مہینے بھی نہیں لگیں گے، حتیٰ کہ دو مہینے بھی نہیں۔ دو ہفتوں ہی میں ہم حکومت کے متوازی ہو جائیں گے۔ دوسرا بولا، "میں رات میں سوتا بھی نہیں، اس لیے کہ پوری رات میں کارتوس بناتا ہوں۔" وقتاً فوقتاً، اچھے اچھے کوٹ میں ملبوس، بورژوا جیسے لوگ آ کر "شرمندہ" کر دیتے اور "حکمانہ" انداز میں سب سے اہم شخص سے ہاتھ ملاتے اور چلے جاتے۔ وہ دس منٹ سے زیادہ کبھی نہیں ٹھہرتے۔

دھیمے دھیمے لہجوں میں معنی خیز جملوں کے تبادلے ہوتے۔ "منصوبہ تیار ہے، سب انتظام ہو گیا ہے۔" وہاں موجود ہر شخص سرگوشی کر رہا تھا۔ یہ تھے ان کے خیالات جو اس رپورٹ سے مستعار لیے گئے تھے۔ عروج کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک دن ایک کاریگر نے وائن کی دکان کے سامنے کھڑے ہو کر چیخ کر کہا تھا، "ہمارے پاس اسلحہ نہیں۔" اس کے ایک ساتھی نے جواب میں کہا، "سپاہیوں کے پاس تو ہے۔" حقیقت سے ناواقف لوگ بونا پارٹ کی نقل کر رہے تھے جب اس نے اطالیہ میں اپنی فوج سے کہا تھا، "جب ان کے پاس کوئی خفیہ چیز ہوتی ہے، تو وہ دوسرے کو بتاتے بھی نہیں۔" یہ سمجھنا آسان نہیں کہ اتنا سب کہنے کے بعد وہ کیا چھپا سکتے تھے۔

ایسے اجتماعات اکثر میعادی ہوتے تھے۔ ان میں کچھ ہی ایسے ہوتے تھے جن میں آٹھ یا دس تک افراد شریک ہوتے، اور ہمیشہ وہی چہرے ہوتے تھے۔ کچھ ایسے اجتماعات بھی ہوتے تھے جن میں جو چاہے شریک ہو سکتا تھا، اور کمرہ اس طرح بھر جاتا کہ انھیں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ کچھ جوش و جذبے میں ادھر اُدھر چلے جایا کرتے؛ دوسرے اس لیے شریک ہو جاتے کہ وہ مقامات ان کے راستے میں پڑتے تھے۔ جیسا کہ انقلاب میں ہوا تھا، کچھ وائن کی دکانوں پر ایسی وطن دوست عورتیں کام کرتی تھیں جو نو واردوں کو بڑھ کے گلے لگا لیتی تھیں۔

اور بھی ولولہ انگیز حقائق سامنے آئے تھے۔

ایک آدمی وائن کی دکان میں داخل ہوتا، پیتا پلاتا، اور یہ کہتا ہوا چل دیتا، "وائن مرچنٹ! انقلاب تمھیں اس کی قیمت ادا کر دے گا۔"

Charonne اسٹریٹ پر واقع وائن کی ایک دکان پر کچھ انقلابی متعین کر دیے گئے

تھے۔ان کی ٹوپیوں میں قرعہ اندازی کی جاتی تھی۔

کچھ کارکن تلوار سے لڑنے کا کھیل سکھانے والے کے گھر پر جمع ہوئے جو انھیں Cotte اسٹریٹ پر کھیل سکھاتا تھا۔وہاں لکڑی کی چوڑی تلواروں، چھڑیوں اور دھات کی پتریوں سے بنی ہوئی ایک انعامی ٹرانی رکھی تھی۔ایک دن دھات کی پتریوں میں لگے ہوئے بٹن نکال دیے گئے۔

ایک کارکن نے کہا "یہاں ہم پچیس لوگ ہیں، مگر وہ مجھے گنتے ہی نہیں، اس لیے کہ مجھے مشین سمجھتے ہیں۔" بعد میں وہی مشین ایک دن Quenisset ستارہ شناس بن گئی تھی۔

[یہاں Quenisset سے مراد Ferdinand Quenisset مشہور فرانسیسی ستارہ شناس جس نے کئی دُم دار ستارے دریافت کیے تھے جن کے نام اس کے نام پر رکھے گئے تھے۔]

وہ ناممکن چیزیں رفتہ رفتہ جن کی کشید ہو رہی تھی، حیرت انگیز اور ناقابلِ بیان شہرت کی حامل ہوگئیں۔ایک عورت نے جو اپنے گھر کے باہر سیڑھیوں کی صفائی کر رہی تھی، دوسری عورت سے کہا تھا، "کافی دنوں سے بہت سارے لوگ کارتوس بنا رہے ہیں۔" کھلے بندوں نیشنل گارڈ کے نام لکھے گئے۔فرامین دکھائی دینے لگے تھے۔ان میں سے ایک فرمان پر Burtot وائن فروش کے دستخط تھے۔

ایک دن اطالوی لہجے کا ایک آدمی، جس کی ڈاڑھی کالر کی طرح اس کی گردن پر لپٹی ہوئی تھی، Lenoir Marche کے علاقے کے ایک مے فروش کی دُکان کے دروازے کے قریب لگے پتھر کے چھوٹے سے ستون پر چڑھا اور بلند آواز میں ایک دستاویز پڑھنے لگا، جو کسی پُراسرار قوت کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔اس کے اطراف ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا، جو تالیاں بجا رہا تھا۔

متن کے جو ٹکڑے ہجوم پر اثر کر رہے تھے یک جا کر کے لکھ لیے گئے تھے:

"ہمارے نظریات پر پابندیاں ہیں، ہمارے فرامین خستہ ہیں، ہمارے چسپاں اشتہارات سے جاسوسی کی جاتی ہے اور لوگ قید خانوں میں ڈال دیے جاتے ہیں"۔"حال میں کپاس کے معاملے میں جو تباہی ہوئی ہے اس نے ہمیں کئی اور ذرائع کی طرف متوجہ کر دیا ہے"۔"قوموں کے مستقبل ہماری مخفی صفوں میں بنائے جا رہے ہیں"۔"یہ ہیں وہ اصطلاحات: عمل یا ردِ عمل، انقلاب یا ردِ انقلاب۔اس لیے کہ اپنے عہد میں اب ہم نہ اپنے اندرون پر یقین رکھتے ہیں نہ اپنی بے حرکتی پر عوام کے لیے، عوام کے خلاف! یہ ہے سوال۔اس کے علاوہ کوئی سوال نہیں"۔"جس دن ہم تمھارے کام کے نہ رہیں، ہمیں توڑ دو، مگر اس وقت تک ہمیں آگے بڑھنے میں مدد فراہم کرتے رہو۔" اور یہ سب دن کی روشنی میں ہو رہا تھا۔

دوسرے کام، جو اس سے بھی زیادہ گستاخ تھے، گستاخی کے باعث عوام کی نظروں

میں مشتبہ تھے۔ 4 اپریل 1832ء کو ایک راہ گیر اس کونے پر نصب ایک چھوٹے سے ستون پر کھڑے ہو کر جو Sainte-Marguerite اسٹریٹ کے زاویے بناتا ہے اور چیخ کر کہتا "میں بابوفی ہوں۔" مگر بابوفی کے پس پردہ لوگوں کو Gisquet کی بو آ رہی تھی۔ [یہاں مصنف کی مراد ہے فرانس کی مشہور سیاسی محرک اور فرانسوا Babeuf سے]

اس کے علاوہ، اس شخص نے کہا:

"جائیداد مردہ باد! بائیں جانب کے مخالفین بزدل اور دغا باز ہیں۔ جب یہ دائیں جانب والے ہونا چاہتے ہیں تو انقلاب کی تبلیغ کرتے ہیں، شکست سے فرار کے لیے یہ جمہوری طریقہ ہوتا ہے، اور شاہی بھی، تاکہ ان کو لڑنا نہ پڑے۔ جمہوریت پسند ایسے وحشی ہیں جن کے پر بھی ہیں۔ ان پر بھروسا نہ کرو، یہ مزدور طبقے کے باشندے ہیں۔"

"خاموش، باشندوں کے جاسوس۔" ایک مزدور نے چیخ کر کہا۔

اس چیخ نے گفتگو ختم کر دی۔

بہت سے پُر اسرار واقعات ہوئے۔

رات کے وقت، ایک کارکن کا نہر کے نزدیک "نہایت عمدہ لباس میں ملبوس آدمی" سے سامنا ہوا اور اس نے کہا، "کدھر جا رہے ہو، میاں باشندے؟" "جناب! مجھے آپ سے ملنے کا شرف حاصل نہیں۔" کارکن نے جواب میں کہا، "مگر میں تو تمھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" اور پھر مزید کہا، "پریشان نہ ہو، میں کمیٹی کا ایجنٹ ہوں۔ تم پر شبہ ہے کہ تم بالکل وفادار نہیں ہو۔ اگر تم کوئی انکشاف کرو گے تو یاد رکھو کہ ایک آنکھ ہمیشہ تم پر جمی ہوتی ہے۔" اس کے بعد اس نے کارکن سے ہاتھ ملایا اور یہ کہہ کر چل دیا، "پھر جلد ملاقات ہو گی۔"

پولیس والے جو چوکنے تھے، ایسی غیر معمولی گفتگو جمع کرتے رہتے تھے، صرف وائن کی دکانوں ہی میں نہیں، سڑکوں پر بھی۔

بُنائی کا کام کرنے والے ایک مزدور نے الماریاں بنانے والے سے کہا، "جلد ہی کوئی تم سے ملنے والا ہے۔"

""کیوں؟""

""گولی چلنے کے لیے تیار ہے۔""

دونوں پیادہ پا راہگیروں نے آپس میں ان غیر معمولی جملوں کا تبادلہ کیا جو بظاہر عوامی بغاوت سے پُر تھے:

''ہم پر حکومت کون کرتا ہے؟''

''موسیو فیلیپ۔''

''نہیں! اصل حاکم بورژوائی ہیں۔''

ایک اور موقعے پر دو آدمیوں کو سنا گیا۔ جب وہ گزرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''ہمارے پاس حملے کا بہت اچھا منصوبہ ہے۔''

چار آدمیوں کے درمیان ہونے والی مندرجہ ذیل نجی گفتگو پکڑی گئی تھی جو Trone نامی پشتے میں ایک گڑھے میں جھکے بیٹھے تھے:

''اب پیرس میں چلتے ہوئے باتیں کرنا بھی ممنوع ہونے والا ہے۔''

وہ کون تھا؟

''مرکزی رہنما'' جیسا کہ مضافات میں انھوں نے کہا اور پھر دور چلے گئے۔ قیاس کیا گیا کہ وہ Saint-Eustache کے قریب ایک وائن کی دکان میں مشورے کے لیے ملے بھی تھے۔ ایک شخص Aug، جو Mondetour اسٹریٹ پر واقع درزیوں کی امداد کرنے والی سوسائٹی کا سربراہ تھا، جو رہنماؤں اور Saint-Antoine مضافات کے درمیان مرکزی ثالث تھا۔

پھر بھی، ان رہنماؤں کے بارے میں ہمیشہ شبہات رہے ہیں، اور کوئی حقیقت اس جواب کے غیر معمولی تکبر کو کالعدم نہیں کر سکتی جو بعد میں ایک ملزم نے Court of Peers میں کہا تھا، ''تمھارا رہنما کون تھا؟''

''میں کسی کو نہیں جانتا، میں کسی کو نہیں مانتا۔''

بس فقط الفاظ تھے؛ شفاف مگر بے معنی؛ کبھی کبھی ناکارہ رپورٹیں، افواہیں، سنی سنائی باتیں ہوتی تھیں۔ جن میں کچھ اشارے ضرور ہوتے تھے۔

Reuilly اسٹریٹ کے ایک قطعہ زمین پر ایک مکان زیرِ تعمیر تھا، اور وہاں ایک بڑھئی اس زمین کے اطراف لگائی جانے والی باڑ کے تختوں میں کیلیں جڑ رہا تھا۔ اس کو اس قطعہ زمین پر ایک خط کا پھٹا ہوا ٹکڑا ملا جس کی مندرجہ ذیل سطریں پڑھی جا سکتی تھیں:

''کمیٹی کو مختلف سوسائٹیوں کے حلقوں میں بھرتی روکنے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔''

اور پس نوشت کے طور پر لکھا تھا:

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ Faubourg-Poissonniere, اسٹریٹ نمبر پانچ میں بندوقیں بنانے والے کے گھر میں بندوقیں ہیں جو پانچ یا چھ ہزار کے لگ بھگ ہوں گی۔ یہ

علاقہ آنکھوں کا مالک نہیں ہے"۔

جس بات نے بڑھئی کو بھڑکا دیا، اور اس نے یہ ٹکڑا پڑوسیوں کو دکھا دیا تھا، یہ تھی کہ چند قدم آگے کاغذ کا ایک اور ٹکڑا ملا، پہلے ٹکڑے ہی کی طرح کٹا پھٹا ہوا، مگر زیادہ اہم، ہم جس کی نقل پیش کر رہے ہیں اس لیے کہ اس قسم کی دستاویزات تاریخی اہمیت اور دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں۔

+---+

| Q | C | D | E | Learn this list by heart. After so doing
| | | | | | you will tear it up. The men admitted
| | | | | | will do the same when you have transmitted
| | | | | | their orders to them.
| | | | | | Health and Fraternity.
| | | | | | u og a fe L. |

+---+

جن لوگوں کو اس راز میں شامل کیا گیا تھا، بعد میں انھیں چار بڑے حروف کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ | Q | C | D | E | سے مراد: quinturions, centurions, decurions, eclaireurs اسکاؤٹ تھے اور دوسرے حروف u og a fe ایک تاریخ تھی، یعنی اپریل 1832ء کی پندرہویں تاریخ۔ ہر capital حرف کے نیچے نام لکھے ہوئے تھے جو کچھ اس طرح تھے:

Q. Bannerel. 8 guns, 83 cartridges. A safe man.--C. Boubiere. 1 pistol, 40 cartridges.--D.Rollet. 1 foil, 1 pistol, 1 pound of powder.--E. Tessier. 1 sword, 1 cartridge box.

Exact.--Terreur. 8 guns. Brave, etc.

آخر میں، اس بڑھئی کو اسی احاطے میں تیسرا ٹکڑا کاغذ کا ملا جس پر پنسل سے صاف لفظوں میں مندرجہ ذیل معمے جیسی فہرست درج تھی:

Unite: Blanchard: Arbre-Sec. 6.
Barra. Soize. Salle-au-Comte.
Kosciusko. Aubry the Butcher?

J. J. R.

Caius Gracchus.

Right of revision. Dufond. Four.

Fall of the Girondists. Derbac. Maubuee.

Washington. Pinson. 1 pistol, 86 cartridges.

Marseillaise.

Sovereignty of the people. Michel. Quincampoix. Sword.

Hoche.

Marceau. Plato. Arbre-Sec.

Warsaw. Tilly, crier of the Populaire.

وہ ایمان دار بورژوا جن کے ہاتھ یہ فہرست پڑی، اس کی اہمیت کو جانتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست Society of the Rights of Man کے چوتھے arondissement [فرانس کے حصوں کے انتظامی اضلاع] کے القابات پر مشتمل تھی جس میں حصوں کے سرداروں کے گھروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ آج جب یہ تمام حقائق بے کار ہو چکے ہیں، تاریخ سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں، اس لیے ہم ان کو شائع کر سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ Society of the Rights of Man کی بنیاد اس تاریخ سے پہلے کی ہے جس دن یہ کاغذ پایا گیا تھا۔ شاید یہ پہلا ہی مسودہ تھا۔

اس کے باوجود، تمام مشاہدوں اور الفاظ کے مطابق، جیسا کہ تحریر تھا، اہم حقائق ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

Popincourt اسٹریٹ کے اتوار بازار میں کاروبار کرنے والے کے گھر سے بھورے رنگ کے کاغذ کے سات صفحات ضبط کیے گئے تھے، چاروں ایک طرح سے لمبائی میں تہہ کیے گئے تھے اور ان کے ساتھ اسی بھورے کاغذ کے چھبیس مربعے ملفوف تھے جو کارتوس کی شکل میں بنائے گئے تھے، اور ان کے ساتھ ایک کارڈ تھا جس پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی:

Saltpetre . . . . 12 ounces.

Sulphur . . . . 2 ounces.

Charcoal . . . . 2 ounces and a half.

Water . . . . 2 ounces.

ضبطی کی رپورٹ میں تحریر تھا کہ ملنے والے کو ان میں سے پاؤڈر کی تیز بو محسوس ہوئی تھی۔

ایک معمار جو اپنے دن بھر کے کام کے بعد واپس جا رہا تھا Austerlitz کے پُل کر قریب بنچ پر ایک پوٹلی چھوڑ گیا تھا۔ پوٹلی پولیس اسٹیشن لے جائی گئی۔ وہاں اس کو کھولا گیا اور اس میں طبع شدہ بات چیت کی دو تحریریں تھیں، جس پر Lahautiere کے دستخط تھے، ایک گانا تھا "کارکنو، ایک ساتھ ہو جاؤ" اور کارتوسوں سے بھرا ایک ٹین کا ڈبا تھا۔

ایک دستکار نے جو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مے نوشی کر رہا تھا ساتھی کو احساس دلانے کے لیے اپنے بدن کو محسوس کرنے کے لیے کہا؛ ساتھی کو اس کی واسکٹ کے نیچے پستول محسوس ہوا۔

Pere-Lachaise اور Trone پشتے کے درمیان بولیوارڈ پر ایک گڑھے میں جو ایک بہت سنسان جگہ تھی، کچھ بچوں کو کھیل کے دوران لکڑی کے ٹکڑوں اور رندہ کی ہوئی لکڑی کے چھلکوں کے درمیان بکٹ کا سانچا، کارتوس بنانے کا ایک چوبی پیالہ، ایک بڑا سا چوبی پیالہ جس میں شکار کرنے کے پاؤڈر کے کچھ ریزے تھے اور ایک چھوٹا سا لوہے کا ڈھلا ہوا برتن جس کے اندر پگھلے سیسے کے آثار تھے۔

پولیس کے ایجنٹ جب بالکل غیر متوقع طور پر پانچ بجے صبح ایک شخص کے گھر میں داخل ہوئے، جو بعد میں Merry پشتے کا رُکن بنا اور اپریل 1834ء میں مارا گیا تھا، تو انھوں نے اس شخص کو اپنے پلنگ کے قریب کھڑا پایا؛ اس کے ہاتھوں میں کچھ کارتوس تھے جو بنائے جا رہے تھے۔

اس وقت جب کام کرنے والوں کے آرام کا گھنٹا شروع ہوتا ہے، Picpus پشتے اور Charenton پشتے کے درمیان، دو دیواروں کے درمیان سے گزرتی ایک چھوٹی سی گلی میں، وائن کی دُکان کے قریب جس کے بالکل سامنے t Jeu de Siam. کی گیم کی دُکان تھی، دو آدمی ملتے نظر آئے تھے۔ ایک نے اپنے بلاؤز کے نیچے سے پستول نکالا اور دوسرے کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب وہ پستول دے رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سینے سے بہنے والے پسینے سے پاؤڈر بھیگ گیا تھا۔ اس نے پستول کو صاف کیا اور اس میں مزید پاؤڈر بھر دیا۔ اس کے بعد دونوں آدمی جدا ہو گئے۔

t Gallais کی ایک شخص نے، جو بعد میں Beaubourg اسٹریٹ پر اپریل کے ایک قضیے میں مارا گیا تھا، شیخی بگھارتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے گھر میں سات سو کارتوس اور چوبیس چقماق ہیں۔

حکومت کو ایک دن انتباہ وصول ہوا کہ مضافات میں اسلحے اور دو سو کارتوس تقسیم کیے جا

رہے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ تھی پولیس کچھ بھی برآمد نہیں کر سکی تھی۔

ڈاک میں روکے گئے ایک خط میں لکھا تھا، ”وہ دن دور نہیں جب، چار گھنٹوں کے اندر اندر، اسی ہزار محبِ وطن ہتھیاروں سے لیس ہوں گے۔“

یہ سارا جوش عوامی تھا، یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پُر اطمینان تھا۔ آنے والے فساد کے بادل حکومت کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ اس خفیہ بحران میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو نا قابلِ تصور تھی۔ جس کی تیاریاں ہو رہی تھی اس کے بارے میں بورژوا بڑے اطمینان سے مزدور طبقے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے، ”کیسی شورش اٹھنے والی ہے؟“ اور اسی لہجے میں وہ یہ بھی کہہ دیتے تھے، ”تمھاری بیویوں کا کیا حال ہے؟“

Moreau اسٹریٹ کا ایک فرنیچر بیچنے والا پوچھتا تھا، ”اچھا، تم لوگ کب حملہ کرنے والے ہو؟“

ایک اور دُکان دار نے کہا، ”حملہ جلدی ہونے والا ہے۔“

”میں جانتا ہوں، پہلے تم لوگ پندرہ ہزار تھے، اور اب بیس ہزار ہو گئے ہو۔“ وہ اپنی بندوق پیش کرتا، اور ایک پڑوسی اپنا چھوٹا سا پستول سات فرانک میں فروخت کرنے کی پیش کش کرتا۔

مزید یہ کہ انقلاب کا بخار بڑھتا جا رہا تھا۔ نہ پیرس اور نہ فرانس، ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جو اس سے خالی تھی۔ ساری شریانیں دھڑک رہی تھیں۔ ان جھلیوں کی طرح جو کسی مرض کے سبب جسم میں بڑھنے اور تشکیل پانے لگتی ہیں خفیہ سوسائٹیوں کا جال پورے ملک میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ”عوام دوست“ کی طرح جس کے ارکان عوام میں اور سڑکوں پر نظر آتے تھے ’سوسائٹی برائے حقوقِ انسان‘ بھی وجود میں آ گئی تھی اور جو Court of Assizes کے فرمان کے باوجود بچ جانے والی تھی جس نے اس کی تحلیل کا حکم دے دیا تھا، اور جسے اپنے مختلف حصوں کو مندرجہ ذیل نام دینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی تھی:

Pikes.
Tocsin.
Signal cannon.
Phrygian cap.
January 21.
The Beggars.
The Vagabonds.
Forward March.

Robespierre.
Level.
Ca Ira.

'سوسائٹی برائے حقوقِ انسان' سے 'سوسائٹی برائے عمل' پیدا ہوئی۔ یہ وہ بے صبرے افراد تھے جو اس سے جلد ہی علاحدہ ہو گئے تھے۔ دوسرے ادارے بڑی مادر سوسائٹیوں سے بھرتی کرنے میں کوشاں تھے۔ ان کے کچھ حصوں کے ارکان شاکی تھے کہ وہ مندرجہ ذیل ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے۔ اس طرح Gallic Society اور شہری انتظامیہ کی کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ اور سوسائٹی برائے آزادیِ پریس، آزادیِ افراد کے لیے، اور لوگوں کو بالواسطہ ٹیکسوں کے مارنے میں متنبہ کرنے کے لیے۔ سوسائٹی برائے مساواتِ مزدور، تین حصوں میں بٹ گئی تھی: سماجی مساوات والے، اور اشتراکی اصلاح کرنے والے۔

اس کے بعد Army of the Bastilles، قبیلے کی بنیاد پر بننے والی فوج؛ چار افراد پر ایک کارپورل ہوتا تھا؛ بیس کے لیے نائب لفٹنٹ، چالیس پر ایک لفٹنٹ، اس کے بعد یہ صورت ہو گئی تھی کہ ایسے پانچ سے زیادہ افراد نہیں ہوتے تھے جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ تخلیق میں احتیاط کے ساتھ گستاخی ہوتی تھی، جس پر وینس کے جوہرِ قاتل کی مہر محسوس ہوتی تھی۔

مرکزی کمیٹی کہ سب سے اوپر تھی، دو بازو تھے، 'سوسائٹی برائے عمل' اور Army of the Bastilles، ایک جائز انجمن Chevaliers of Fidelity بھی تھی جو جمہوری افراد پر مشتمل تھی۔ اس کو ملزم ٹھہرایا گیا اور نکال باہر کر دیا گیا۔

پیرس کی سوسائٹیوں کی اپنی شاخیں تھیں جو اہم شہروں Lyons وغیرہ میں موجود تھیں۔ Nantes, Lille, Marseilles میں بھی، اور ہر ایک کی اپنی اپنی 'سوسائٹی برائے حقوقِ انسان' Charbonniere اور The Free Men وغیرہ تھیں۔ سب میں ایک انقلابی سوسائٹی ہوتی تھی جس کو Cougourde کہا جاتا تھا۔ ہم اس لفظ کو پہلے بھی استعمال کر چکے ہیں۔

پیرس میں Saint-Marceau مضافات نے Saint-Antoine مضافات کے مساوی پُر جوش سرگوشیاں جاری رکھی تھیں؛ مضافات کے اسکول بھی کم متحرک نہیں تھے۔ Saint-Antoine اسٹریٹ میں ایک کیفے اور Seven Billiards نامی وائن کی دُکان، اور Mathurins-Saint-Jacques اسٹریٹ وہ جگہیں تھیں جہاں طلبہ جمع ہوتے تھے۔

The Society of the Friends of the A B C منسلک تھی Mutualists of Angers سے اور Cougourde of Aix سے، اور جیسا کہ ہم نے دیکھا

ہے سب کیفے Musain میں ملتے تھے۔جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں،یہی لوگ Mondetour اسٹریٹ پر ریستوران کی وائن شاپ پر بھی ملتے تھے جس کا نام Corinthe تھا۔ یہ اجتماعات خفیہ ہوتے تھے۔ جب کہ دوسری ملاقاتیں جس قدر ممکن ہو عام ہوتی تھیں، اور قاری ان کی ہمت کا ان تفتیشی سرگرمیوں والے لہجوں سے اندازہ لگا سکتا ہے جو ایک مقدمے میں سامنے آئے تھے:

"میٹنگ کہاں ہوئی تھی؟"

"Paix اسٹریٹ پر۔"

"کس کے گھر میں؟"

"سڑک پر۔"

"کون کون سے حلقے موجود تھے؟"

"صرف ایک حلقہ۔"

"کون سا؟"

"The Manuel."

"سردار کون تھا؟"

"میں۔"

"حکومت پر حملے کا فیصلہ کرنے کی ہمت کے لیے تم بہت کم عمر ہو۔ تمھیں احکامات کہاں سے ملتے تھے؟"

"مرکزی کمیٹی سے۔"

عوام کی طرح فوج میں بھی لوگ داخل کر دیے گئے تھے، جیسا کہ بعد میں Beford اور Luneville اور Epinard میں ثابت ہوا تھا۔ اور باون، پانچ، آٹھ اور سینتیس رجمنٹ پر اور بیسویں Light Cavalry پر انحصار کرتے تھے۔ Burgundy اور جنوبی شہروں میں بھی انھوں نے آزادی کے پودے لگا دیے تھے؛ جس کا مطلب ہے، ایک کھمبا نصب کر دیا جاتا تھا جس پر سرخ ٹوپی رکھی ہوتی تھی۔

یہ تھی کیفیت۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں دوسرے گروہوں کے مقابلے میں Saint-Antoine مضافات نے ان حالات پر زیادہ زور دیا تھا۔ یہی دکھتی رگ تھی۔ یہ قدیم مضافاتی بستی، ایک محنتی، باہمت، اور ناراض زنبور خانہ تھی جو توقعات اور ہنگاموں کی خواہش سے لرز رہی تھی۔ وہاں کی ہر شے ہلچل سے عبارت تھی، مگر کام کاج میں کوئی تعطل نہیں ہوا تھا۔ اس پُرجوش مگر

تاریک کیفیت کی قیافہ شناسی ممکن نہیں تھی۔اس مضافاتی علاقے کی دو چھتوں میں پریشانی چھپی ہوئی تھی؛ وہاں پُرجوش اذہان بھی تھے مگر کم کم۔خفیہ کے لیے بالخصوص یہ بڑی پریشانی کی بات تھی کہ دو خطرناک سرے آپس میں مل گئے تھے۔

Saint-Antoine مضافات بھی بلا جواز کانپ نہیں رہا تھا؛ اس لیے کہ اس کو تجارتی بحران، ناکامیوں، ہڑتالوں، خراب موسموں، کا جوابی صدمہ ملا تھا جو سب بڑے سیاسی خلل کا باعث تھے۔انقلاب کے دنوں میں بدنصیبی وجہ بھی ہوتی ہے اور اثر بھی۔یہ صدمہ پہنچاتی ہے، اور وہی صدمہ اس پر واپس وار کرتا ہے۔یہ آبادی نیکیوں کے فخر سے لبریز ہے۔بلند درجے کی لیاقت کی گرمی ہے، اسلحہ اٹھانے پر ہمیشہ آمادہ، پھٹنے پر تیار، بے چین، عمیق، گرنے والی چنگاری کی منتظر۔جب کبھی کوئی چنگاری افق پر نظر آتی ہے حالات کی ہوائیں جس کا تعاقب کر رہی ہوں تو ممکن ہی نہیں کہ Saint-Antoine مضافات یاد نہ آئے اور وہ ذرا سا اتفاق جس نے ہر شے کو پیرس کے پھاٹکوں پر رکھ دیا تھا، وہی جو اس وقت دکھوں اور خیالات کا بارود خانہ بن چکا تھا۔

Faubourg Antoine کی وائن کی دکانیں، ایک بار سے زیادہ جن کے خاکے کھینچے گئے ہیں، تاریخی انگشت نمائی کے لیے مشہور ہیں۔مشکل وقتوں میں لوگ وہاں وائن سے کم اور لفظوں سے زیادہ مست ہو جایا کرتے ہیں۔ایک قسم کا پیمبرانہ جذبہ اور مستقبل کا کشف وہاں لہراتا رہتا ہے، جو دلوں کو بھر دیتا ہے اور جوہر کو بڑھا دیتا ہے۔Saint-Antoine مضافات کے رقص و سرود خانے Mont Aventine کے مے خانوں سے مشابہ ہیں جو کوہ Aventine کی Sibyl کی کھوہ کے اوپر بنائے گئے ہیں اور مقدس سانسوں کے ذریعے تکلم کرتے ہیں؛ ایسے مے خانے جن کی میزیں تقریباً تپائیوں جیسی ہیں اور جہاں وہ وائن پی جاتی ہے Ennius نے جس کو sibylline وائن کہا تھا۔

Saint-Antoine عوام کا مخزن ہے۔جہاں انقلابی ہلچل دراڑیں پیدا کرتی ہے جس میں سے حاکمیت قطرہ قطرہ ٹپکتی ہے۔یہ حاکمیت شیطنت کر سکتی ہے؛ اس کو دوسروں کی طرح غلط سمجھا جا سکتا ہے؛ مگر جب یہ گم کردہ راہ پر ہو تب بھی عظیم ہی رہتی ہے۔ہم اس کو کسی غیر معمولی یک چشم نابینا دیو کی پیداوار بھی کہہ سکتے ہیں۔

سن 93 میں اس تصور کے مطابق جو نیکی اور بدی کے بارے میں پھیلا ہوا تھا، وہ شدت پسندی اور پُرجوش جذبات کا دن تھا جہاں Saint-Antoine سے جو آپ جنگی legions بن چکا تھا، بہادر گروہ نکل رہے تھے۔

جنگلی! آیئے ذرا اس لفظ کی تشریح کریں۔ جب ان بڑے بڑے بالوں والے لوگوں نے ، جو ابتدائی دنوں کی انقلابی اتھل پتھل میں خستہ حال، غراتے، جنگلی، ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھائے اور بلندی پر تھے، اور خود کو قدیم ہیرن کے ہنگاموں میں جھونک دیا تھا، تو وہ کیا چاہتے تھے؟ وہ چاہتے تھے جبر کا خاتمہ، ظلم کا خاتمہ، تلوار کا خاتمہ، آدمیوں کے لیے کام، بچوں کے لیے تعلیم، عورتوں کے لیے سماجی شیرینی، آزادی، مساوات، بھائی بندی، سب کے لیے روٹی، اور دنیا کو سب کے لیے جنت بنانا چاہتے تھے۔ ترقی! اور وہ مقدس، پیاری اور اچھی شے، ترقی اپنی حدود سے نکل گئی اسی حال میں وہ جس میں تھے، نیم برہنہ، ہاتھوں میں تلواریں تھامے، منہ سے شور کرتے۔ وہ جنگلی تھے، جی ہاں؛ مگر وہ تہذیب کے جنگلی تھے۔

انھوں نے غصے سے اپنے حقوق طلب کیے؛ خوف کے عالم میں لرزتے ہوئے انھیں خواہش تھی کہ وہ نسلِ انسانی کو دھکیلتے ہوئے جنت تک لے جائیں۔ وہ جنگلی تھے، اور وہ نجات دہندہ تھے۔ انھوں نے روشنی طلب کی مگر رات کے نقاب میں۔

ان لوگوں کا سامنا کرتے ہوئے، جو خوں خوار تھے، ہم مانتے ہیں کہ وہ خوف زدہ کردینے والے تھے، مگر خوں خوار اور خوف زدہ کردینے والے تھے بہتر انجام کے لیے؛ وہاں اور لوگ بھی ہیں، مسکراتے، کڑھتے ہوئے، سونے چاندی سے منقش، ستاروں سے مزین، لانبے لانبے ریشمی موزوں میں، سفید کلغیوں میں، زرد دستانوں میں، چمکتے جوتوں میں، مخملیں میز پر اپنی کہنیاں ٹکائے، جو سنگِ مرمر کی چمنی کے قریب، نرمی سے ماضی کی نگہداشت پر اصرار کرتے ہیں، قرونِ وسطیٰ کے ربانی حقوق پر اصرار کرتے ہیں مذہبی جنون پر، پاک دامنی پر، غلامی پر، سزائے موت پر، جنگ پر، دھیمے لہجوں اور شائستگی سے، تلوار پر، سولی پر اصرار کرتے ہیں۔ ہماری جانب سے، اگر ہمیں تہذیب کے وحشیوں اور بربریت کے مہذب لوگوں میں انتخاب کرنا پڑا تو ہمیں وحشیوں کا ہی انتخاب کرنا چاہیے۔

لیکن، خدا کا شکر ہے، کہ اس کے علاوہ بھی پسندیدگی ممکن ہے۔ عقب میں موجود بہت سے لوگوں کے مقابلے میں سامنے والوں کے آگے عمودی زوال ضروری نہیں۔

نہ آمریت نہ دہشت گردی۔ ہمیں ترقی کی خواہش ضرور ہے مگر ایک شریفانہ ڈھلان کے ساتھ۔

یہ سب خدا کرتا ہے۔ خدا کی پالیسی صرف ڈھلان فراہم کرنے کی ہوتی ہے جس کا نشیب کم ہو۔

۞

انجولرا اور اُس کے نائب

یہ وہی عہد ہے جس میں انجولرا نے ممکنہ معیبت کے بعد ایک قسم کی پُر اسرار مردم شماری کا ادارہ ترتیب دیا تھا۔

سب کیفے Musain میں ہونے والے ایک خفیہ اجتماع میں شریک تھے۔

انجولرا نے اپنے الفاظ کو چند نصف معموں مگر اہم استعاروں میں ملاتے ہوئے کہا تھا:

"یہ درست ہے کہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہم کس پر بھروسا کریں۔ اگر لڑنے والوں کی ضرورت ہے تو ان کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں کہ حملہ کرنے کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔ ہماری سڑکوں پر بَیل ہی بَیل ہوں تو راہ گیر کا زخمی ہونے کا زیادہ امکان ہوتا بہ نسبت اس وقت کے جب بَیل نہ ہوں۔ تو آیئے ذرا ہم اپنے جھنڈ پر بھروسا کرتے ہیں۔ وہاں ہم کتنے افراد ہوں گے؟ اس کام کو کل پر چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انقلابیوں کو ہمیشہ جلدی کرنی چاہیے؛ ترقی کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوا کرتا۔ ہم غیر متوقع پر اعتبار نہیں کرتے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم نے تیاری نہ کی ہو اور پکڑے جائیں۔ ہمیں سلائی کے ہر ٹانکے پر یقین کر لینا چاہیے کہ وہ ٹھیک سے لگا ہوا ہے۔ یہ سارا کام آج ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ کوفیراک، تم آج پالی ٹیکنیک کے طلبہ سے ملو گے۔ آج باہر جانے کی ان کی باری ہے۔ آج بدھ ہے۔ فیولی، آج تم وگلیشر دیکھو گے، ہے کہ نہیں؟ کامفیر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ Picpus جائے گا۔ آج وہاں بہت اچھا ہجوم ہو گا۔ باوریل Estrapade جائے گا۔ پرووئیر! میسنوں میں بے اتفاقی بڑھ رہی ہے؛ تم Grenelle-Saint-Honore اسٹریٹ کے مکان سے کچھ خبریں لاؤ گے۔ جولی Dupuytren کے کلینک کے لیکچر میں کے

لیے جائے گا، اور میڈیکل اسکول کی نبض محسوس کرے گا۔ بڑے سے عدالت میں چکر لگائے گا اور نئے وکیلوں سے بات کرے گا۔ میں خود Cougourde کی ذمے داری لوں گا۔"

"اس طرح سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" کوفیراک نے کہا۔

"نہیں۔"

تو وہاں کیا باقی رہ گیا ہے؟"

"ایک بہت اہم چیز۔"

"وہ کیا ہے؟" کوفیراک نے سوال کیا۔

"Maine پشتہ۔" انجولرا نے جواب میں کہا۔

انجولرا نے ایک لمحے توقف کیا، گویا وہ کسی گہری سوچ میں ہو، اس کے بعد گویا ہوا:

"Maine پشتے میں مرمر کے کاریگر، پینٹر اور سنگ تراشی کرنے والوں کے اسٹوڈیو میں ہنر مند مزدور ہوتے ہیں۔ یہ سب ایک پُر جوش خاندان والے ہیں مگر اعتدال پر آجاتے ہیں۔ نہ معلوم ماضی کے کچھ دنوں سے انھیں کیا ہوگیا ہے۔ شاید وہ کسی اور بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ بجھے جا رہے ہیں۔ اب وہ ختم ہو گئے ہیں اور کھیلنے میں وقت گزارتے ہیں۔ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ کوئی جائے اور ان سے بات کرے مگر ذرا سختی سے بات کرے۔ وہ Richefeu میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہ بارہ اور ایک بجے دن کے درمیان وہاں ہوتے ہیں۔ ان راکھوں کو چمک میں اُڑا دینا چاہیے۔ اس مختصر دوڑ بھاگ کے لیے میں نے غائب دماغ ماریوس پر بھروسا کیا تھا، بہن حیث الکل وہ اچھا آدمی ہے مگر اب ہمارے پاس نہیں آتا۔ مجھے Maine پشتے کی ضرورت ہے۔ میرے پاس کوئی نہیں۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" گرانتیر نے کہا، "میں ہوں نا۔"

"تم؟"

"میں۔"

"تم جمہوریت پسندوں کو سکھا پڑھا دیتے ہو؟ تم ان دلوں کو گرما دیتے ہو جو اصول کے نام پر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔"

"کیا تم کسی کام کے ہو؟"

"اس سمت میں میری ایک مبہم سی خواہش ہے۔" گرانتیر نے کہا۔

''تم کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے۔''

''میں تم پر یقین رکھتا ہوں۔''

''گرانتیر کیا تم میرے لیے ایک کام کردو گے؟''

''ہر کام! میں تمھارے جوتے بھی صاف کردوں گا۔''

''میرے معاملات میں دخل اندازی نہ کرو۔ absinthe پی کر پڑ رہا کرو۔''

''تم بہت ناشکرے ہو، انجولرا۔''

تم Maine جاؤ! تم اس کے قابل ہو۔''

''میں Gres اسٹریٹ سے گزرنے کے قابل ہوں، Place Saint- Michel پار کرنے کے، Monsieur-le-Prince اسٹریٹ کی ڈھلان پر اترنے کے، Vaugirard اسٹریٹ پر چلنے کے، Carmelites سے گزر جانے کے، d'Assas اسٹریٹ پر مڑ جانے کے، Cherche-Midi تک پہنچ جانے کے، Conseil de Guerre کو اپنے پیچھے چھوڑ جانے کے، Vielles Tuileries اسٹریٹ پر تیز تیز چلنے کے، بولیوارڈ کو چڑھ کر پار کرنے کے، Chaussee du Maine کی طرف چلنے کے، پشتے سے گزرنے کے اور Richefeu's میں داخل ہونے قابل ہوں۔'' میں اس سب کے قابل ہوں۔ میرے جوتے بھی اس قابل ہیں۔''

''کیا تم ان کامریڈوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو جو Richefeu میں جمع ہوتے ہیں؟''

''بہت زیادہ تو نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو 'تو' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔''

''تم ان سے کیا کہو گے؟''

''بخدا! میں ان سے Robespierre کے بارے میں بات کروں گا۔ اصولوں کے بارے میں۔''

''تم؟''

''میں! مگر مجھے انصاف نہیں ملتا، جب میں اس کی کوشش کرتا ہوں۔ میں بھیانک آدمی ہوں۔'' میں نے Prudhomme کو پڑھا ہے میں سماجی کانٹریکٹ کے بارے میں جانتا ہوں، مجھے اپنی دو برس کی عمر کی جسمانی حالت یاد ہے۔ 'باشندے کی آزادی وہاں ختم ہوتی ہے جہاں سے دوسرے کی شروع ہوتی ہے۔ کیا تم مجھے جانور سمجھتے ہو؟ میری میز کی دراز میں جمہوریہ کا

بینک نوٹ ہے۔ The Rights of Man، عوام کی حاکیت، لغو! میں جڑی بوٹیوں کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہوں۔ میں چھ گھنٹے تک بہترین لغو گوئی پر بات کرسکتا ہوں، گھڑی ہاتھ میں لے کر۔"

"بس، اب سنجیدہ ہو جاؤ۔" انجولرا نے کہا۔

"میں وحشی ہوں۔" گراتیر نے جواب دیا۔

انجولرا نے ایک لمحے کے لیے غور کیا، اور اس شخص کی طرح حرکت کی جو کوئی فیصلہ کر لیتا ہے۔

"گراتیر" اس نے اداسی کے لہجے میں کہا، "میں تمھیں آزماؤں گا۔ تمھیں Maine پتے پر جانا ہوگا۔"

گراتیر کیفے Musain کے قریب ہی کرایے کے مکان میں رہتا تھا۔ وہ باہر گیا، اور پانچ منٹ کے اندر واپس لوٹ آیا۔ دراصل وہ Robespierre واسکٹ پہننے کے لیے گیا تھا۔

"سرخ" اس نے واپس آتے ہوئے کہا، اور پھر غور سے انجولرا کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اپنے توانا ہاتھ کی ہتھیلیوں سے اس نے واسکٹ پر چھاتی کی جانب دو قرمزی نشان لگا لیے۔ اور انجولرا کی طرف قدم بڑھا کر اس کے کان میں سرگوشی کی:

"اطمینان رکھو۔" اس نے بڑے اطمینان سے اپنی ہیٹ سر پر جمائی اور چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد کیفے Musain کا عقبی کمرہ ویران ہو گیا تھا۔ A B C کے سارے دوست اپنی اپنی سمت، اپنے اپنے کام نمٹانے جا چکے تھے۔ انجولرا جس نے Cougourde کا Aix اپنے لیے مختص کر رکھا تھا، سب سے آخر میں باہر گیا۔

Cougourde of Aix کے ارکان جو اس وقت پیرس میں تھے Issy کے میدان میں جمع ہوئے، ایک متروکہ کان میں ملے۔ پیرس کے اطراف ایسی بہت سی متروکہ کانیں ملتی ہیں۔

انجولرا اپنی جگہ کی طرف جاتے ہوئے اپنے ذہن میں پورے معاملے کا تجزیہ کر رہا تھا۔ واقعات بظاہر گمبھیر تھے۔ جب حقائق آہستہ آہستہ گزر رہے ہوں تو معمولی سی پیچیدگی بھی رکاوٹ بن جایا کرتی ہے اور معاملات الجھ جاتے ہیں۔ کھنڈروں سے کھنڈر بھی ابھرتے ہیں اور نئی چیزیں بھی۔ انجولرا کو مستقبل کے سایے کے نیچے ایک تابانی نظر آنے لگی تھی۔ کون جانے؟ شاید وقت قریب آ گیا ہے۔ لوگ ایک بار پھر دائیں طرف جا رہے تھے، اور کیا خوب نظارہ تھا۔ انقلاب پھر پورے جلال کے ساتھ فرانس پر چھاتا جا رہا تھا اور دنیا سے کہہ رہا تھا، "کل انجام کا دن ہو گا!"۔ انجولرا پُراعتماد تھا۔ بھٹی گرم کی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کے دوستوں کی بارودی ٹرین پورے پیرس میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں پُرسکون تھا، جب کہ کامفیر کی فلسفیانہ اور دل

میں داخل ہو جانے والی خطابت، فیولی کی وسیع المشرب پُرجوشی، کوفیراک کی ہمت، باؤریل کا تبسم، پرووِیر کی اداسی، جولی کی سائنس، بوسے کے طنز سے تقریباً ہر طرف چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ سارے ہاتھ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ یقیناً، نتیجہ کوشش کا جواب ہونے والا تھا۔ اب تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ اب اسے گرانتیر یاد آرہا تھا۔

"ٹھہرو" اس نے اپنے آپ سے کہا، "Maine مجھے زیادہ دور تک نہیں لے جائے گا۔ اگر ہمیں Richefeu تک جانا پڑا تو کیا ہوگا؟ دیکھیں گرانتیر کے ارادے کیا ہیں، اور وہ کہاں تک پہنچا ہے۔"

انجولرا جب Richefeu کے تمباکو نوشی کے کمرے تک پہنچا، Vaugirard کا گھنٹا گھر ایک بجا رہا تھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا، اندر داخل ہوتے ہی، اپنے ہاتھ باندھ لیے، دروازے کو اپنے کاندھے سے ٹکرانے دیا، اور دھوئیں، میزوں اور آدمیوں سے بھرے اس کمرے کو غور سے دیکھا۔ دھوئیں کے درمیان سے ایک آواز ابھری، اور دوسری آواز نے مداخلت کی۔ وہ گرانتیر تھا، جو اپنے ایک مخالف سے گفتگو کر رہا تھا۔

گرانتیر دوسرے شخص کے سامنے، سنگِ مرمر کی ایک میز کے قریب بیٹھا ہوا تھا، جس پر چوکر کے ٹکڑے اور پانسے بکھرے تھے۔ وہ میز پر زور زور سے مکے مار رہا تھا اور انجولرا جو گفتگو سن پایا وہ یہ تھی:

"ڈبل چھکا!"

"چوکے۔"

"سؤر! میرے پاس اور نہیں۔"

"تم مر گئے بیٹا۔ ایک دُکی۔"

"چھکا۔"

"پنجی۔"

"اِکا۔"

"اب میری چال ہے۔"

"چار پوائنٹ۔"

"یہ زیادہ تو نہیں۔"

"اب تمھاری باری ہے۔"

"میں نے بڑی بھاری غلطی کی ہے۔"
"تم ٹھیک چل رہے ہو۔"
"چھ اور۔"
"مزید سات۔"
"اس طرح میرے بائیس ہو گئے [اس نے اپنے تئیں کہا بائیس]۔"
"تمھیں اس ڈبل چھکے کی امید نہیں تھی۔ اگر میں نے پہلے ہی مار لیا ہوتا تو کھیل بدل گیا ہوتا۔"
"ایک بار پھر ڈگی۔"
"اِکا۔"
"اِکا — لو پنجا۔"
"میرے پاس کچھ نہیں۔"
"یہ کھیل تمھارا رہا، یقیناً۔"
"ہاں۔"
"بلیک۔"
"اوہ! کیا قسمت ہے تمھاری بھی! [طویل وقفہ] ڈگی۔"
"اِکا۔"
"نہ پنجا نہ اِکا۔ یہ تمھارے لیے بُرا ہوا۔"
"پانسا۔"
"طاعون لے جائے اس کو۔"

۞

مغنّی چڑیا کا مرغزار

ماریوس نے اس چھاپے کے غیر متوقع خاتمے کا نتیجہ دیکھا جس کے راستے پر اس نے جاویر کو ڈال دیا تھا؛ مگر جوں ہی جاویر اپنے ملزمان کو کرایے کی گاڑی میں ڈال کر اس عمارت سے باہر نکلا، ماریوس بھی مکان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس وقت رات کے صرف نو بجے تھے۔ کوفیراک اب لاطینی علاقے کا باسی تھا جس کو پریشان نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ بھی سیاسی وجوہ کی بنا پر Verrerie اسٹریٹ پر منتقل مکانی کر گیا تھا، اس عہد میں ایسا علاقہ تھا جہاں سرکشی اپنے قدم جمانا چاہتی تھی۔ ماریوس نے کوفیراک سے کہا، "میں تمھارے ساتھ رات بسر کرنے آیا ہوں۔" کوفیراک نے اپنے پلنگ سے ایک گدا کھینچا، جس پر دو گدے تھے، گدے کو فرش پر ڈالا اور کہا، "اس جگہ۔"

دوسرے دن صبح سات بجے ماریوس اپنے کمرے میں واپس پہنچا، مادام بوگوں کو واجب الادا کرایہ ادا کیا، اپنی کتابیں، اپنا پلنگ، اپنی میز، اپنا کموڈ اور اپنی دو کرسیاں ٹھیلے پر لادیں اور اپنا پتا بتائے بغیر وہاں سے غائب ہو گیا؛ اس لیے جب صبح کو جاویر پچھلے شام ہونے والے واقعات کی تفتیش کے لیے واپس آیا تو اسے صرف مادام بوگوں ہی ملیں، اور ان کا جواب تھا "وہ مکان چھوڑ گیا ہے۔"

مادام بوگوں کو یقین تھا کہ ماریوس کسی حد تک ان ڈاکوؤں کے ساتھ تھا جو پچھلی رات پکڑے گئے تھے۔ "کیا کوئی کبھی کہہ سکتا تھا؟" اس نے حیرت بھرے لہجے میں چوکیدارنی سے کہا، "کہ ایسا نوجوان آدمی، جو بالکل لڑکی جیسا لگتا تھا، ایسا ہوگا!"

ماریوس نے دو وجوہ کی بنا پر اپنی رہائش تبدیل کی تھی۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اب یہ گھر بھوت خانہ بن چکا تھا، جہاں اس نے اتنے قریب سے بے حد گھناؤنے اور خوں خوار واقعات دیکھے تھے؛ ایسی سماجی خرابی دیکھی جو بدمعاش دولت مند اور بدمعاش سے بھی زیادہ خراب

تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ کسی قانونی مقدمے کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا، جس میں بالآخر اسے تین آردیے کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔

جاوید نے سوچا کہ یہ نوجوان آدمی، جس کا نام اسے یاد نہیں رہا، خوف زدہ ہے، اس لیے فرار ہو گیا ہے، یا شاید چھاپے کے وقت تک گھر واپس بھی نہیں آیا تھا؛ جاوید نے اسے تلاش کرنے کی کچھ کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ ماریوس اب بھی کوفیراک کے پاس تھا۔ اسے اپنے ایک قانونی ساتھی سے پتا چلا جو ہمیشہ عدالت میں موجود رہتا تھا، کہ تین آردیے حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اب ہر دوشنبے کی صبح وہ پانچ فرانک پولیس کے دفتر کے کلرک کو تین آردیے کے لیے پہنچا دیتا تھا۔

چوں کہ ماریوس قلاش ہو چکا تھا، اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوفیراک سے قرض لیا۔ پانچ فرانک کا یہ میعادی قرض کوفیراک کے لیے دہرا معما بن گیا تھا، اس لیے کہ ماریوس کو جو قرض دے رہا تھا، وہ تین آردیے کو پہنچ رہا تھا۔ ”یہ رقم کیسے دی جاسکتی ہے؟“ کوفیراک سوچتا تھا۔ اور ”یہ کہاں سے آرہی ہے؟“ تین آردیے بھی خود سے ایسا ہی سوال کرتا تھا۔

ماریوس بہت دل شکستہ ہو رہا تھا۔ ہر شے ایک بار پھر اس کے اوپر برس رہی تھی۔ اسے اپنے مستقبل میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا؛ اس کی زندگی ایک بار پھر اسرار میں غرق ہو گئی جس میں وہ ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ ایک لمحہ اس دھند میں اسے ایک نوجوان لڑکی نظر آئی جسے وہ پیار کرتا تھا، اور وہ بوڑھا آدمی بھی نظر آیا جو اس کا باپ معلوم ہوتا تھا؛ یہ دونوں نامعلوم وجود ہی اس کی زندگی کے مقصود اور دل چسپی کا باعث ہو گئے تھے۔ اور عین اس وقت جب وہ سمجھا تھا کہ وہ ان کو پا جائے گا، ہوا کا ایک جھونکا ان سایوں کو اڑا لے گیا۔ بے حد خوف ناک صدموں کے باوجود یقین اور سچائی کا ایک شرارہ بھی خارج نہیں ہوا۔ کوئی قیاس بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے تو ان کے نام تک نہیں معلوم تھے جنھیں وہ سمجھتا تھا کہ وہ جانتا ہے۔ اس لڑکی کا نام ارسلے یقینی طور پر نہیں تھا، اور مکھی چڑیا اس کی عرفیت تھی۔ اور اس بوڑھے آدمی کے بارے میں وہ کیا سوچتا تھا؟ تو کیا واقعی وہ پولیس سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا تھا؟ وہ سفید بالوں والا جس سے اس کا Invalides کے علاقے میں مقابلہ ہوا تھا اس کے ذہن میں پھر ابھر آیا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کام کرنے والا اور موسیو لیبلانک ایک ہی شخص تھا۔ لہٰذا اس نے خود کو نئے بھیس میں چھپا لیا تھا۔ اس آدمی کے اپنے بہادرانہ اور ذومعنی پہلو تھے۔ اس نے مدد کیوں نہیں طلب کی؟ وہ فرار کیوں ہوا؟ کیا وہ اس نوجوان لڑکی کا باپ تھا یا نہیں؟ مختصر یہ کہ کیا یہ وہی شخص تھا جسے تین آردیے سمجھا تھا کہ اس نے پہچان لیا

ہے؟ کس آدرشے سے غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔ یہ سب ایک ناقابل حل مسائل بن گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان سب نے لگسمبرگ کی اس لڑکی کے ملکوتی حسن سے اس کی توجہ نہیں ہٹائی تھی۔ دل دکھانے والی پریشانی تھی؛ ماریوں کا دل جذبوں سے بھر گیا تھا، اور اس کی آنکھیں نیند سے عاری ہو گئی تھی۔ وہ کبھی آگے دھکیلا جاتا کبھی پیچھے کھینچا جاتا مگر وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا سوائے محبت کے۔ محبت کی ساری جبلتیں اور اچانک ہونے والی تابانیاں گم ہو گئی تھیں۔ وہ شعلہ جو عام طور پر ہمیں جلاتا ہے تھوڑا سا روشن بھی کر دیتا ہے، مگر اس میں تابانی نہیں ہوتی۔ مگر ماریوں کو محبت کے یہ خاموش مشورے مشکل سے ہی سنائی دیتے۔ اس نے خود سے کبھی نہیں کہا کیا ہوگا اگر میں ایسی جگہ چلا جاؤں؟ کیا ہوگا اگر میں ایسی ایسی چیزوں کو استعمال کرنے کی کوشش کروں؟ وہ لڑکی جسے وہ ارسلے کے نام سے پکارتا تھا ظاہر ہے کہ کسی جگہ ہوگی۔ کسی نے ماریوں کو اشارہ بھی نہیں کیا کہ وہ اسے کس جگہ تلاش کرے۔ اس کی پوری زندگی اب ان چند لفظوں کے اندر بند ہو کر رہ گئی تھی؛ ناقابل تسخیر کہر میں مکمل بے یقینی کی کیفیت تھی۔ اس کو دوبارہ دیکھنا اس کی خواہش تھی، مگر اب اس کی توقع نہیں رہی تھی۔

سونے پہ سہاگا! اس کی مفلسی واپس آگئی تھی۔ اسے اب برفیلی سانسیں قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔ اس روحانی کیفیت کے درمیان، بلکہ اس سے بہت پہلے، اس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کام چھوڑنے سے زیادہ خطرناک کوئی بات نہیں ہوتی؛ یہ ایک عادت ہوتی ہے جو چھوٹ جاتی ہے۔ وہ عادت جس کا چھوڑنا آسان ہوتا ہے اور دوبارہ ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک حد تک خواب دیکھنا اچھا بھی ہوتا ہے، جیسے چھوٹی مقدار میں مسکّن دوائیں۔ یہ محنت کے وقت بڑھنے والے بخارات کو سُلا دیتے ہیں جو کبھی کبھی بہت شدید ہو جاتے ہیں؛ اور جذبوں میں ایک نرم اور تازہ پھوار پیدا کر دیتے ہیں جس کی مدد سے خالص خیالات کے ضرورت سے زیادہ سخت کنارے درست ہو جاتے ہیں؛ یہاں وہاں کے خلا کو پُر کر دیتے ہیں؛ ایک ساتھ بندھ جاتے ہیں اور خیالات کے زاویوں کو گول بنا دیتے ہیں۔ مگر بہت زیادہ خواب دیکھنا انسان کو غرق کر دیتا۔ افسوس اس ذہنی کام کرنے والے پر جو خود کو خیالات سے مکمل طور پر واہمی استغراق میں گرا دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اتنی ہی آسانی سے خیالات میں واپس بھی آیا جا سکتا ہے، اور وہ خود سے کہتا ہے کہ بہر حال یہ ایک ہی جیسی شے ہے، مگر یہ غلط ہے۔

خیال ذہانت کی مشقت ہوتا ہے، واہمی استغراق اس کی عیاشی ہوتا ہے۔ خیال کو واہمی استغراق میں بدل دینا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے غذا اور زہر کو گڈمڈ کر دیا جائے۔

قاری کو یاد ہوگا کہ ماریوں نے بھی اسی طرح ابتدا کی تھی۔ ایک ولولہ سا حائل ہو گیا تھا

اور اس کو عجیب و غریب واہموں میں تبدیل کر دیا تھا جس کا نہ کوئی پیدا تھا نہ مقصد۔ کوئی بھی خواب دیکھنے کے لیے وہ اب اپنے آپ سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ یہ کیفیت سُستی پیدا کرتی ہے۔ ایک خلیج بن جاتی ہے ہنگاموں اور جمود میں۔ اور جب محنت میں تخفیف ہوتی ہے تو اس کے تناسب سے ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ ایک قانون ہے۔ آدمی ذہنی استغراق کی کیفیت میں فضول خرچ اور کاہل الوجود ہو جاتا ہے؛ آزاد ذہن زندگی کو حدود کے اندر گرفتار نہیں رکھ سکتا۔

زندگی کے اس ڈھرے میں نیکی برائی میں گھل مل ہو جاتی ہے، اس لیے کہ نقاہت ظالمانہ ہو تو فیاضی اچھی اور صحت مند ہوتی ہے، مگر مفلس آدمی جو فیاض اور شریف ہوتا ہے، اور وہ کوئی کام نہیں کرتا تو گم ہو جاتا ہے۔ وسائل ختم ہو جاتے ہیں، ان کو ابھارنا پڑتا ہے۔

مہلک ڈھلان نیچے کی طرف لے جاتی ہے جس پر سب زیادہ ایمان دار اور مضبوط اور ساتھ ہی کم زور اور فاسق لڑھکتے ہیں، جو ایک یا دو رکاوٹوں پر ختم ہو جاتی ہے؛ خودکشی پر یا جرم پر۔ سوچنے کے لیے باہر جانے والوں کا دن اس روز آتا ہے جب کوئی پانی میں کودنے کے لیے نکلتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ ذہنی استغراق [فرانسیسی ادیب] Escousse اور Lebras کو جنم دیتی ہے۔

ماریوس اس ڈھلان پر آہستہ آہستہ سرک رہا تھا؛ اس کی آنکھیں اس لڑکی پر جمی تھیں جو اَب اسے نظر نہیں آتی تھی۔ ابھی ہم نے جو لکھ دیا ہے وہ حیرت انگیز ہے، مگر یہ سچ ہے۔ غیر حاضر شخص کی یاد دل کے اندھیروں میں روشن ہوتی ہے؛ جتنا وہ غائب ہو اتنا ہی زیادہ چمکنے لگتا ہے؛ اداس اور مایوس شخص کو یہ روشنی افق پر نظر آنے لگتی ہے، اندرونی شب کے ستارے کی طرح۔ وہ ماریوس کا سب کچھ تھی۔ وہ اس کے سوا کسی کے بارے میں غور نہیں کرتا تھا؛ وہ غیر واضح طور پر جانتا تھا کہ اس کا پرانا کوٹ ناممکن کوٹ بنتا جا رہا تھا، اور یہ بھی کہ اس کا نیا کوٹ پرانا ہوتا جا رہا تھا، کہ اس کی قمیصیں پھٹتی جا رہی تھیں، کہ اس کی ہیٹ پھٹتی جا رہی تھی، کہ اس کے جوتے جواب دیتے جا رہے تھے، اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا تھا: ”کاش میں مرنے سے پہلے اسے ایک بار دیکھ سکتا۔“

اس کے لیے صرف ایک پیارا سا خیال رہ گیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے، کہ اس کی نظروں نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کا نام بھی نہیں جانتی، مگر وہ اس کی روح سے واقف ہے، اور یہ بھی کہ جہاں بھی وہ ہوتی، کتنی بھی پُر اسرار جگہ ہو، شاید پھر بھی وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ کون جانے کہ وہ ماریوس کے بارے اس طرح نہیں سوچتی تھی جس طرح ماریوس اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ کبھی کبھی، ان ناقابلِ تشریح گھنٹوں میں، جن کا اُن سب کو تجربہ ہوتا ہے جو محبت کرتے ہیں، اگر چہ اس کے پاس اداسی کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا، پھر بھی اس کے دل میں

خوشی کی ایک مبہم سی لہر اٹھی تھی، اور اس نے خود سے کہا تھا، "یہ اس کے خیالات ہیں جو مجھ تک آتے رہتے ہیں۔" پھر اس نے اضافہ کیا، "شاید میرے خیالات بھی اس تک پہنچتے ہوں۔"

یہ سراب جس پر ایک لمحہ پہلے اس نے اپنا سر ہلا دیا، کافی تھا اس کی روح میں کچھ کرنیں ڈالنے کے لیے، جو امید سے مشابہ تھیں۔ وقتاً فوقتاً، بالخصوص شام کے وقت، جو خیال میں محو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ مایوس کن ہوتا ہے وہ اپنے خالص ترین خیالات جو اس کے ذہن میں بھرے ہوتے تھے ایک نوٹ بک پر انڈیل دیتا، جس میں اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس عمل کو وہ "اس کے لیے لکھنا" کہتا تھا۔

یہ قیاس صحیح نہیں ہوگا کہ اس کے ذہن میں فتور تھا، بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے کام کرنے اور کسی ہدف کی طرف پوری قوت سے بڑھنے کی صلاحیت کھو دی تھی، مگر اس میں ژرف نگاہی اور راست بازی کی قوت پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ جو کچھ، حتیٰ کہ لوگوں کے بے حد غلط کام بھی اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے تو ماورا ان کو پُرسکون اور حقیقی، بلکہ ایک مخصوص روشنی میں دیکھتا تھا؛ وہ ہر چیز کی منصفانہ تنقید کرتا مگر ایمان دارانہ افسردگی اور شفاف بے تعصبی سے۔ اس کے فیصلے تقریباً مکمل طور پر امید سے عاری اور بلند پرواز ہوتے تھے۔

ایسی ذہنی کیفیت میں کوئی شے اس سے بچی نہیں تھی، کوئی شے اس کو دھکا نہیں دے سکتی تھی؛ ہر لمحہ وہ زندگی کی، انسانیت کی اور مقدر کی بنیادوں کو دریافت کرتا رہتا تھا۔

وہ تو پریشانیوں کے درمیان بھی خوش رہتا ہے، جسے خدا نے ایک شخصیت دی ہے محبت کے قابل اور بدنصیبی کی! وہ جس نے اس دنیا کو اور آدمی کے دل کو اس دہری روشنی میں نہیں دیکھا تو اس نے کچھ نہیں دیکھا، اور نہ وہ سچی بات جانتا ہے۔

وہ فرد جو محبت کرتا ہے اور دکھ اٹھاتا ہے، ایک ارفع کیفیت میں ہوتا ہے۔

مگر، دن پر دن گزرتے رہے، اور کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا۔ اسے محض یہ محسوس ہوا کہ وہ دھندلا خلا جو اس کے قدموں کے انتظار میں ہے، ہر لمحہ چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک لا انتہا پاتال کا دہانہ نظر آ رہا ہے۔

"کیا!" وہ خود سے بار بار کہتا "اس سے پہلے میں اسے ایک بار پھر دیکھ بھی نہیں سکوں گا؟"

جب آپ Saint-Jacques اسٹریٹ کی چڑھائی چڑھ چکتے ہیں، اور پشتے کو ایک جانب چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ فاصلہ قدیم اندرونی بولیوارڈ پر طے کرتے ہیں تو آپ Rue Sante اسٹریٹ پر پہنچ جاتے ہیں، اس کے بعد Glaciere، اور Gobelins دریا سے ذرا پہلے آپ

ایک میدان میں پہنچتے ہیں جو پیرس کی اکتا دینے والی بولیوارڈوں کے سلسلے میں واحد کھلا علاقہ ہے جہاں Ruysdael [سترھویں صدی کا مناظر بنانے والا ایک مشہور مصور] بھی بیٹھ جانے کی خواہش کرے گا۔

ضرور کوئی ناقابلِ بیان شے ہے جو آن بان دکھاتی ہے: ایک سبزہ زار جس پر کھنچی ہوئی ڈوریاں جن پر پھڑ پھڑاتے کپڑے ہوا میں خشک ہوتے رہتے ہیں؛ جہاں ایک قدیم باغبانی مکان ہے جو لوئی سیزدہم کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا، جس کی چھتوں کی ڈھلانوں میں دریچے پیوست ہیں، خستہ حال جنگلے ہیں، سفیدے کے درختوں کے درمیان تھوڑا سا پانی ہے، عورتیں، آوازیں، قہقہے ہیں؛ افق پر عبادت گاہیں ہیں، گونگے پیروں کے پل، Val-de-Grace، جہاں سے شان دار، دل چسپ، پُرشکوہ، اور پس منظر میں ناترے ڈیم کے میناروں پر بنی بڑی بڑی مربع کلغیاں نظر آتی ہیں۔

چوں کہ وہ جگہ دیکھنے کے قابل نہیں، کوئی وہاں جاتا نہیں۔ مشکل سے پندرہ منٹ میں ایک گاڑی یا ویگن وہاں سے گزرتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ماریوس کی تنہا چہل قدمی اس کو پانی کے قریب اس قطعۂ زمین تک لے گئی۔ اس دن بولیوارڈ پر کسی راہ گیر کا ہونا اتفاق تھا۔ اس جگہ کے بیابانی حسن سے متاثر ہو کر ماریوس نے ایک راہ گیر سے پوچھا، "اس قطعۂ زمین کا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب میں کہا، "یہ مغنّی چڑیا کا مرغزار ہے۔" اور اس نے مزید اضافہ کیا، "اسی جگہ [انیسویں صدی کے فرانسیسی ادیب] Ulbach نے Ivry کے علاقے کی گلے بانی کرنے والی عورت کو قتل کیا تھا۔"

مگر ماریوس لارک، یعنی "مغنّی چڑیا" کے بعد کے الفاظ سن نہیں سکا تھا۔ استغراق میں اچانک جما دینے والی کیفیت، جو ایک لفظ سے یادوں کو تازہ کر دیتی ہے، واقع ہوتی ہے۔ ایک مکمل خیال فکر کے اطراف جامد ہو جاتا ہے، جو کسی اور شے کا تصور کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

لارک وہ اصطلاح تھی جس نے ماریوس کی غم زدگی کی گہرائیوں میں ارسلے کی جگہ لے لی تھی۔ اس نے خود سے کہا، "ٹھہرو"۔۔۔ ایسی کیفیت ایک قسم کی بے مقصد مدہوشی میں ہوتی ہے جو اس قسم کی پُر اسرار یکسوئی سے مخصوص ہوتی ہے — "یہ اسی کا مرغزار ہے۔ تو مجھے پتا چل جائے گا کہ اب وہ کہاں رہتی ہے۔"

یہ بالکل فضول بات تھی، مگر ناقابلِ مزاحمت تھی۔

اور پھر وہ روزانہ مغنّی چڑیا کے اس مرغزار میں جانے لگا۔

۞

قید خانوں میں جرم

جاویر کی Gorbeau منزل میں فتح مکمل محسوس ہوئی مگر ایسا تھا نہیں۔

سب سے پہلے تو یہ غلطی ہوئی، اور یہ اس کی سب سے بڑی پریشانی تھی، کہ قیدی کو قیدی بنایا نہیں گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کیے جانے والا آدمی اگر بچ کر نکل جائے تو وہ قاتل سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے، اور اغلب ہے کہ یہ شخصیت، جو بدمعاشوں کے نزدیک بہت قیمتی گرفتاری تھی، حکام کے لیے بھی کم اچھا انعام نہ ہوتی۔ اور پھر مونٹ پارناس بھی جاویر کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

اب اس "بانکے شیطان" کو پکڑ لینے کے لیے ایک اور موقعے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مونٹ پارناس نے دراصل ایپونین کا اس وقت مقابلہ کیا جب وہ بولیوارڈ کے درختوں کے نیچے نگرانی کے لیے کھڑی تھی، اور اس کو جانے دیا تھا تاکہ وہ لڑکی کے ساتھ Nemorin کا کردار ادا کرے بجائے اس کے کہ باپ کے ساتھ مشہور جرمن قزاق Schinderhannes کا۔ جو کچھ اس نے کیا ٹھیک تھا۔ وہ آزاد تھا۔ جہاں تک ایپونین کا سوال تھا، جاویر نے اسے گرفتار کروا دیا تھا، جو ایک معمولی درجے کی اشک شوئی تھی۔ ایپونین Les Madelonettes میں ازیلما سے جا ملی تھی۔

اور بالآخر، Gorbeau منزل سے La Force تک راستے میں مرکزی مجرموں میں سے ایک مجرم کیا کسو (Claquesous) گم ہو گیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس کی وجہ کیا تھی، پولیس کے ہرکارے اور سارجنٹ بھی "بالکل سمجھ نہیں سکے تھے"۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے خود کو بخارات میں تبدیل کر لیا تھا، وہ ہتھکڑیوں سے نکل گیا تھا، سواری کے درازوں میں سے قطرہ قطرہ ڈھلک گیا تھا، سواری میں شگاف تھے اور وہ اس میں سے فرار ہو گیا تھا؛ بس وہ اتنا کہہ سکتے تھے کہ

قید خانے پہنچنے پر کیا کسو اس میں موجود نہیں تھا۔ اس میں یا تو پریوں کا ہاتھ تھا یا پولیس کا۔ تو کیا کسو کیا سایوں میں پگھل گیا تھا جیسے پانی میں برف کا گالہ گھل جاتا ہے؟ کیا اس میں پولیس والوں کی شرارت تھی؟ کیا یہ آدمی قانون اور بے قانونی کے دہرے چیستاں سے متعلق تھا؟ کیا یہ آدمی انحراف اور تحفظ کا مجموعہ تھا؟ کیا اس بُرسنگھ کے پنجوں کے اگلے ناخن جرم میں اور پچھلے ناخن اقتدار میں گڑے ہوئے تھے؟ جاویر اس قسم کے عذابِ الٰہی کا قائل نہیں تھا، اور وہ ایسی مفاہمتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا؛ مگر اس کے دستے میں اس کے علاوہ دوسرے انسپکٹر بھی تھے جو شاید اس سے زیادہ پیش قدم تھے، حالاں کہ پولیس کے رازوں میں وہ اس کے ماتحت تھے اور کیا کسو ایسا ولن تھا جو ایک اچھا ایجنٹ بن سکتا تھا۔ رات میں ایسی اشاروں والی جادوگری کی کیفیت میں ہونا بدمعاش کے لیے بہترین اور پولیس کے لیے قابلِ تعریف بات ہوتی ہے۔ دھوکے باز بدمعاش ہوتے ضرور ہیں۔ جو کچھ بھی ہو، کیا کسو غائب ہوگیا اور واپس پکڑا نہیں گیا تھا۔ اس بات پر جاویر حیرت زدہ کم اور خفا زیادہ تھا۔

جہاں تک ماریوں کا سوال تھا، "وہ وکیل نما احمق"، جاویر کو جس کا نام یاد نہیں رہا تھا، شاید خوف زدہ ہوگیا تھا؛ مگر جاویر کے نزدیک اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ مزید یہ کہ کسی وکیل کو آسانی سے پکڑا بھی جا سکتا ہے۔ مگر کیا واقعی وہ وکیل تھا بھی؟

تفتیش شروع ہوگئی۔

مجسٹریٹ کا خیال تھا کہ غنڈوں کے گروہ میں سے ایک شخص کو قیدِ تنہائی میں رکھنا مناسب نہ ہوگا، اس خیال سے کہ وہ آپس میں بات کریں گے۔ یہ شخص Petit-Banquier اسٹریٹ کا بڑے بالوں والا رُکن برزوں تھا۔ اسے شارلیمین کے صحن میں آزاد چھوڑ دیا گیا اور نگرانی کرنے والوں کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

برزوں کا نام اب بھی لافورس کی نشانیوں میں شامل تھا۔ اس خوف ناک صحن میں، جس کو "نئی عمارت" کہا جاتا تھا، انتظامیہ جسے سینٹ برنارڈ کورٹ کہتی تھی، اور ڈاکو جسے "شیر کی ماند" کہتے تھے، جس کے بائیں جانب کی چھت تک اونچی دیوار کوڑھ زدہ تھی اور جگہ جگہ سے مچھلی کے سہرے جیسے چھلکے اتر رہے تھے، جس میں لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا جو لافورس کے ڈیوک کی رہائش گاہ کے قدیم گرجا کی طرف کھلتا تھا، جو اب غنڈوں کی آماج گاہ تھی، جو بارہ برس قبل کندہ پتھروں سے بنا تھا اس کے نیچے اس کے دستخط تھے:

برزوں، 1811ء

1811ء کا بورژوں 1832 والے بورژوں کا باپ تھا۔

لڑکا، جس کی ایک جھلک Gorbeau منزل میں دیکھی گئی تھی، بہت ہوشیار اور بہت شاطر چنگاری تھا جس سے حیرت زدگی اور غم انگیزی جھلکتی تھی۔ یہ اس کی غم انگیزی ہی کا نتیجہ تھا کہ مجسٹریٹ نے بجائے قیدِ تنہائی کے اسے شارلیمیں کے صحن میں آزاد چھوڑ دیا تھا۔

ڈاکو اپنے پیشے میں خلل نہیں ڈالتے اس لیے کہ وہ ہمیشہ انصاف کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ وہ بھی خود کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے نہیں دیتا تھا۔ قید میں ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسرے جرم کی ابتدا نہ کی جائے۔ یہ لوگ فن کار ہوتے ہیں جو سیلون میں تصویر لگاتے ہیں او راسٹوڈیو میں نئے کام کے لیے محنت کرتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بورژوں قید خانے کے نام سے ہی مخبوط ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اسے کئی کئی گھنٹے شارلیمیں کے صحن میں لشکری بیچے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے دیکھا جا سکتا ہے جہاں وہ احمقوں کی طرح قیمتوں کی خستہ فہرست کو گھورتا رہا رہتا ہے جو لہسن 62 سینٹ سے شروع ہوتی ہے اور سگار 5 سینٹ پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا وقت لرزتے اور دانت پیستے اور یہ کہتے گزارتا ہے کہ اسے بخار ہے، اور معلوم کرتا رہتا ہے کہ بخار کے وارڈ کے 82 بستروں میں سے ایک بھی بستر خالی ہے یا نہیں؟

پھر اچانک فروری 1832ء میں پتا چلا کہ وہ نیم خوابیدہ آدمی بورژوں تھا، اس نے تین مختلف قسم کی ذمے داریوں کو قید خانے کے عام قسم کے کام کرنے والوں کے ذریعے پورا کرایا تھا، مگر اپنے نام سے نہیں، بلکہ اپنے تین کامریڈوں کے نام سے؛ اور ان سب پر پچاس سو کی لاگت آئی تھی، جو بہت زیادہ لاگت تھی جس کی وجہ سے وہ قید خانے کے کارپورل کی نظروں میں آ گیا تھا۔

تفتیش کی گئی اور مجرم کے پارلر میں آویزاں ادائیگیوں پر نظر کی گئی تو معلوم ہوا کہ پچاس سو اس طرح خرچ کیے گئے تھے: تین ادائیگیوں میں سے پہلی، Pantheon پر دس سو؛ دوسری Val-de-Grace پر پندرہ سو؛ اور تیسری ادائیگی Barriere de Grenelle پر پچیس سو کی ہوئی تھی۔ آخری ادائیگی سب سے مہنگی تھی۔ اب Pantheon پر، Val-de-Grace پر اور Barriere de Grenelle پر تین مشتبہ شکاری گھومتے رہتے تھے، Kruideniers عرف انوکھا، Glorieux ایک سابق سزا یافتہ، اور Barre-Carosse؛ اس واقعے کے باعث پولیس کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو گئی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ Patron Minette نامی گینگ کے ارکان تھے؛ ان کے رہنماؤں میں سے دو، یعنی بابے اور گولمر گرفتار کیے جا چکے تھے۔ یہ بھی قیاس کیا گیا تھا کہ پیغامات جو بھیجے گئے تھے، گھروں کو نہیں، بلکہ ان لوگوں

کو بھیجے گئے تھے جو سڑکوں پر ان کا انتظار کرتے رہتے تھے، اور ان میں سے کچھ جرائم سے متعلق اطلاعات رہی ہوں گی جن کے منصوبے بنائے گئے تھے۔ان کے پاس اور بھی اشارے رہے ہوں گے: کہ وہ تین مشتبہ لوگ پکڑے جا چکے تھے، اور قیاس تھا کہ انھوں نے بورژوں کی ایک یا مزید سازشوں میں دھوکے بازی کی ہوگی۔

ان اقدامات کے ایک ہفتے بعد، ایک رات جب نگرانی کرنے والوں کے سپرنٹنڈنٹ نے، جو نچلی منزل کی مشترکہ خواب گاہ کے معائنے پر تھا، بکس میں اپنا چسٹ نٹ (chestnut) ڈالنے والا تھا— یہ یقین کرنے کے لیے کہ نگرانی کرنے والے پابندیِ وقت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں یا نہیں، ہر ایک کو ہر گھنٹے ایک بکس میں ایک چسٹ نٹ ڈالنا ہوتا تھا— مشترکہ خواب گاہ میں جھانکا، تو دیکھا کہ بورژوں اپنے بستر پر بیٹھا خواب گاہ کے لیمپ کی روشنی میں کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا، اور بورژوں کو ایک ماہ کی قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا، مگر وہ تحریر پکڑی نہیں جا سکی جو لکھی جا رہی تھی۔ پولیس کو بھی اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔

مگر جو بات یقینی تھی، وہ یہ تھی کہ اگلی صبح شارلیمین کے صحن سے شیر کی مانند نامی گڑھے میں، جو پانچویں ہی منزل پر واقع تھی اور دو صحنوں کو الگ کرتی تھی، ایک postilion پھینکا گیا تھا۔

قیدیوں کی زبان میں جسے postilion کہتے ہیں وہ دراصل خوب صورتی سے ڈھالی ہوئی روئی سے بنا ایک گولا ہوتا ہے، جو 'آئرلینڈ' میں پھینکا جاتا ہے، یعنی قید خانے کی چھت کے اوپر سے، ایک صحن سے دوسرے صحن میں: ایک زمین سے دوسری زمین پر، یعنی انگلستان کے اوپر سے آئرلینڈ میں۔ یہ چھوٹا سا گولا صحن میں گرتا ہے۔ جو آدمی اس کو اٹھاتا ہے، اس کو کھولتا ہے اور اس میں سے ایک رقعہ برآمد ہوتا ہے جو اس صحن کے کسی قیدی کے نام ہوتا ہے۔ اگر اس خزانے کو پانے والا کوئی قیدی ہوتا ہے تو اسے اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اگر پانے والا محافظ ہوتا ہے، یا کوئی قیدی، جو خفیہ طور پر بکا ہوتا ہے، قید خانوں میں جسے بھیڑ کہتے ہیں اور دخانی جہازوں میں کام کرنے والے قیدیوں میں اس کو لومڑی کہا جاتا ہے، وہ رقعہ دفتر لے جاتا ہے اور پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

اس موقعے پر وہ گولا اپنے پتے پر پہنچ گیا، حالاں کہ وہ فرد جس کے لیے لکھا گیا تھا، اس وقت قیدِ تنہائی میں تھا۔ وہ فرد بابے کے سوا کوئی اور نہیں تھا، وہی جو Patron Minette کے چار سرداروں میں سے ایک تھا۔

اس گولے میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ تھا جس پر صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں:

"بابے! Plumet اسٹریٹ پر، ایک باغیچے کے پھاٹک پر ایک معاملہ کیا جا رہا ہے۔"

یہی وہ رقعہ تھا جو بورژوں نے ایک رات قبل تحریر کیا تھا۔

مذکر اور مؤنث، ہر قسم کے تلاش کرنے والوں کے باوجود یا بے کے اس رقعے کو لافورس سے Salpetriere، اس کے ایک "قریبی دوست" تک پہنچا دیا گیا جو وہاں بند تھا۔ اس عورت نے رقعے کو ایک اور جاننے والی عورت ،میگنن کے حوالے کر دیا، ، قاری جس کا نام پہلے دیکھ چکا ہے، پولیس جس پر بہت شبہ کرتی تھی مگر وہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوئی تھی ۔اس میگنن کے، جس کا نام قاری دیکھ چکا ہے، تین آر دیے سے تعلقات تھے، جس کا بعد میں تفصیل سے تذکرہ کیا جائے گا، اور وہ اپونین سے ملنے جائے گی، اور Salpetriere اور Les Madelonettes کے درمیان پل کا کام کرے گی۔

پھر یوں ہوا کہ عین اس وقت جب تین آر دیے کی لڑکیوں کے خلاف تفتیش میں ثبوت نہیں ملے تو اپونین اور آزیلما دونوں کو آزاد کر دیا گیا ۔جب اپونین باہر نکلی اس وقت میگنن نے، جو Madelonettes کے پھاٹک پر نگہداری کر رہی تھی، اسے یا بے کے نام بورژوں کا رقعہ پکڑا دیا اور اسے اس کام پر لگا دیا۔

اپونین Plumet اسٹریٹ گئی، پھاٹک اور باغیچے کو پہچان لیا، مکان کا مشاہدہ کیا، جاسوسی کی، گھات لگائی، اور چند دنوں بعد اسے میگنن کے پاس لے گئی، جس نے Clocheperce اسٹریٹ پر ایک بسکٹ پہنچایا، جسے میگنن نے Salpetriere میں یا بے کی داشتہ کو دے دیا تھا۔ قید خانے کی سازش میں بسکٹ کا مطلب ہوتا ہے: کچھ نہ کرنا۔

اس طرح ایک ہفتے سے کم عرصے میں، جب بورژوں اور یا بے لافورس کے حلقے میں ملے، ایک تفتیش کے لیے جا رہا تھا اور دوسرا اس کی مخالف سمت:

"اچھا تو پھر؟" بورژوں نے سوال کیا "وہی P اسٹریٹ؟"

"بسکٹ" یا بے نے جواب میں کہا۔ اس طرح جرم کا حمل جو بورژوں نے لافورس میں قائم کیا تھا، ساقط ہو گیا۔

اس اسقاط کے بھی نتائج تھے، مگر وہ بورژوں کے پروگرام سے بالکل الگ تھے۔ قاری کو نظر آجائے گا کہ وہ کیا تھے۔

ہم اکثر سوچتے ہیں کہ ہم کسی ایک دھاگے میں گرہ دے رہے ہیں، جب کہ اصلاً ہم کسی اور ہی دھاگے میں گرہ ڈال دیتے ہیں۔

۞

فادر مابوف کا آسیب

ماریوس پھر کسی سے ملنے نہیں گیا، مگر کبھی کبھی اتفاق سے اس کی فادر مابوف سے مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ ماریوس آہستہ آہستہ غم انگیزی کی سیڑھیاں اتر رہا تھا جس کو کسی تہہ خانے کی سیڑھیاں کہا جا سکتا ہے، جو ایسی جگہوں پر لے جاتی ہیں جہاں روشنی نہیں ہوتی، جہاں اوپر چلتے ہوئے خوش باش لوگ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ مابوف بھی ایسی ہی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

Cauteretz کے پھول اب فروخت نہیں ہوتے تھے۔ Austerlitz کے چھوٹے سے باغ میں نیل کے پودوں پر تجربات کامیاب نہیں ہوئے تھے، جس کا خراب اثر ہوا۔ مابوف وہاں صرف چند پودے اگا سکتا تھا جو سایہ اور نمی پسند کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس نے Jardin des Plantes میں ایک کونا لے لیا، جس پر روشنی اچھی طرح آتی تھی، تا کہ "اپنے خرچ پر" نیل کے پودوں کے تجربات کر سکے۔ اس کے لیے اس نے اپنے تانبے کے برتن رہن رکھ دیے تھے۔ اس نے ناشتے کو دو انڈوں تک محدود کر دیا، جن میں سے ایک اپنے بوڑھے ملازم کے لیے چھوڑ دیتا تھا، جسے پچھلے پندرہ مہینوں سے تنخواہ نہیں دے سکا تھا۔ اور اکثر ناشتا ہی اس کا کھانا ہوتا تھا۔ اب اس کے لبوں پر بچگانہ ہنسی بھی نہیں آتی تھی؛ وہ ترش رو ہو گیا تھا اور کسی سے ملاقات نہیں کرتا تھا۔ اس نے ایک کام اچھا کیا تھا۔ اِدھر اُدھر جانے کے خواب بھی نہیں دیکھتا تھا۔ کبھی کبھی، جب موسیو مابوف Jardin des Plantes جاتا تو ایک بوڑھا آدمی اور ایک نوجوان آدمی اسپتال بولیوارڈ پر آمنے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ وہ آپس میں بات نہیں کرتے تھے، بس غم زدہ نظریں ملاتے اور سر ہلا دیا کرتے تھے۔ دل توڑنے والی بات یہ ہوتی ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب بدبختی کے بندھن ڈھیلے ہو جاتے ہیں، اور دو آدمی جو

کبھی دوست تھے، اتفاقیہ طور پر گزرنے والے بن جاتے ہیں۔

رائل کتاب فروش انتقال کر گیا۔ موسیو مابوف جسے نہ اب اپنی کتابوں کی فکر تھی نہ باغ کی اور نہ نیل کے پودوں کی؛ بس یہی تین اس کی دل چسپی کا سامان تھے جو اسے مسرت، لطف اور امید فراہم کرتے تھے۔ اس کی زندگی کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا تھا، 'جب میں نیل بنانے والی گیند تیار کرلوں گا تو دولت مند ہو جاؤں گا، اپنے تانبے کے برتن رہن کی دکان سے چھڑا لاؤں گا۔ میں اپنا Flora ایک بار پھر چالاکی سے، دولت سے اور اشتہارات کے ذریعے شروع کردوں گا، اور میں 1655ء کا Pierre de Medine's Art de Naviguer کا شمارہ خریدوں گا، میں جانتا ہوں کہاں سے۔'' اس دوران وہ اپنی نیل کی کھیتی پر سارا دن محنت کرتا، رات کے وقت اپنے باغیچے کو پانی دینے اور کتابیں پڑھنے کے لیے گھر واپس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں موسیو مابوف تقریباً اسی برس کا تھا۔

ایک شام اسے ایک نرالا آسیب نظر پڑا۔

وہ گھر واپس آیا تو روشنی تھی۔ مدر پلوٹارک، جس کی صحت جواب دے رہی تھی، بستر میں بیمار پڑی تھی۔ موسیو کو کھانے میں صرف ایک ہڈی نصیب ہوئی تھی جس پر تھوڑا سا گوشت لگا ہوا تھا، اور ایک ٹکڑا ڈبل روٹی کا جو باورچی خانے کی میز پر پڑا مل گیا تھا۔ وہ پتھر کے ایک ستون پر بیٹھ گیا جو الٹا پڑا تھا اور اس کے باغیچے میں بنچ کا کام دیتا تھا۔

اس بنچ کے قریب فیشن کے مطابق پھلوں کا باغ تھا، ایک بڑا سا صندوق، کچھ شہتیر بہت خراب حالت میں، زمینی منزل پر خرگوش کا ایک ڈربا، اوپری منزل پر پھل رکھنے کا ایک کمرہ سا تھا۔ ڈربا خالی تھا، مگر پھل رکھنے والے کمرے میں، سردی کے موسم کے باقی ماندہ چند سیب رکھے تھے۔

موسیو مابوف نے چشمے کی مدد سے وہیں بیٹھ کر دو کتابیں پڑھنے کا ارادہ کیا، وہ جنون کی حد تک جن کو پسند کرتا تھا؛ ان میں ایک خاص چیز تھی جسے اس عمر میں وہ زیادہ پسند کرتا تھا۔ اپنی فطری بزدلی کے باعث آسیبی معاملات میں وہ ایک خاص حد تک آگے چلا جاتا تھا۔ ان کتابوں میں سے ایک کتاب صدر Delancre کی آسیبوں کے بارے میں تھی؛ دوسری کتاب Rubaudiere کی شیاطین کے اور بدروحوں کے بارے میں تھی۔ دوسری کتاب میں اسے زیادہ دل چسپی تھی، اس لیے کہ ماضی میں اس کے باغیچے کے ایک حصے میں کسی آسیب نے ڈیرا جما لیا تھا۔

شفق دھیرے دھیرے ڈھلتی جا رہی تھی اور اندھیرا اس کی جگہ لے رہا تھا۔ کتاب پڑھتے ہوئے موسیو مابوف اپنے پودوں پر بھی نظر ڈالتا جا رہا تھا، جن میں ایک نہایت خوب صورت پودا

rhododendron کا بھی تھا جو اس کے لیے باعثِ طمانیت ہوتا تھا؛ چار دنوں کی تپش، ہوا اور تیز دھوپ ہو چکی تھی، بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا؛ لمبے پودوں کی کمریں جھک گئی تھیں، کلیاں مرجھا کر گرنے لگی تھیں؛ باغیچے کو بس پانی چاہیے تھا؛ rhododendron بالخصوص افسردہ ہو گیا تھا۔فادر مابوف ان آدمیوں میں سے تھا جن کے نزدیک پودوں کی بھی اپنی روح ہوتی ہے۔بوڑھے آدمی نے سارا دن اپنے نیل کے پودوں پر محنت کی تھی، وہ بہت تھک چکا تھا، پھر بھی اٹھا، کتابیں بنچ پر رکھیں اور لڑکھڑاتے قدموں کنویں کی طرف چلا مگر جب اس نے پانی نکالنے کی زنجیر پکڑی تو اس حد تک اٹھا نہیں سکا کہ اس کو ہُک سے الگ کر سکتا۔تب وہ مڑا، اور آسمان کی طرف اپنی پریشان نظریں دوڑائیں، جو ستاروں سے بھرتا جا رہا تھا۔

شام میں وہ سکون تھا جو انسان کی دن بھر کی کلفتوں کے نیچے ناقابلِ بیان غم انگیزی اور ابدی مسرتوں پر بھی غالب آجاتا ہے۔رات میں بھی ویسی ہی تپش تھی، جیسی دن میں ہوئی تھی۔

'ہر طرف ستارے ہی ستارے ہیں۔' بوڑھا سوچ رہا تھا، 'بادل کا نام و نشان نہیں۔ بارش کے ایک قطرے کا بھی امکان نہیں!'

اور اس کا سر، جو ایک لمحے کے لیے بلند ہوا تھا، اس کے سینے سے جا لگا۔

اس نے ایک بار پھر سر اٹھایا، آسمان پر پھر نظر کی، اور بڑبڑایا:

''شبنم کے آنسو بھی نہیں، کتنے افسوس کی بات ہے!''

اس نے کنویں کی زنجیر کو ایک بار پھر ہُک سے آزاد کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوا۔اسی لمحے اسے ایک آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی، ''فادر مابوف، کیا میں آپ کے باغ کو پانی دے سکتی ہوں؟''

عین اسی وقت ایسی آواز بھی سنائی دی جیسے کوئی جانور جھاڑیوں سے گزر رہا ہو۔اس نے پودوں کے درمیان سے ایک لمبی نازک سی لڑکی کو ابھرتے دیکھا، جو اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔وہ انسان نہیں، بلکہ شام کے دھندلکے سے ابھرنے والے کسی وجود جیسی لگ رہی تھی۔قبل اس کے کہ فادر ماریوف ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکتا، جو آسانی سے خوف زدہ ہو جاتا، اور شور مچانے لگتا تھا، اس وجود نے اندھیرے میں، جس کی حرکات میں عجیب قسم کا ناگہانی پن تھا، زنجیر کو ہُک سے علاحدہ کر دیا، بالٹی کنویں میں ڈالی، نکالی اور پانی دینے والے برتن کو بھرا۔اس دوران یہ نیک طینت انسان اس آسیب کو دیکھتا رہ گیا، جس کے پاؤں ننگے تھے، جھنی کوٹ جگہ جگہ سے پھٹا تھا، اور وہ دوڑ دوڑ کر پھولوں کے تھالے میں اپنے اطراف

پودوں کو زندگی بخش رہی تھی۔ پتیوں پر گرتے ہوئے پانی کی آواز سن کی فادر مابوف کی روح وجد میں آ گئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا rhododendron اب خوش ہو گیا ہے۔

پہلی بالٹی خالی ہوئی؛ لڑکی نے دوسرے بالٹی نکالی، پھر تیسری نکالی۔ اور اس نے پورے باغیچے کو سیراب دیا۔ اس میں عجیب سے کیفیت تھی؛ جب وہ پودوں کے درمیان دوڑ رہی تھی، پس منظر میں اس کا خاکہ بالکل سیاہ نظر آ رہا تھا، اور جب پانی دیتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ ہلاتی تو اس کا ململ کا گلوبند اس طرح لہراتا گویا کوئی چمگادڑ اڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

جب وہ کام ختم کر چکی تو فادر مابوف اس کی طرف بڑھا، اس کے آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں، اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ''خدا تمھیں خوش رکھے'' فادر نے کہا، ''تم واقعی فرشتہ ہو اس لیے کہ تم پھولوں کو زندگی بخش رہی ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے جواب میں کہا ''میں آسیب ہوں، مگر میرے لیے یہی سب کچھ ہے۔''

بوڑھے نے لڑکی کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا، ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں اتنا بدقسمت اور مفلس ہوں کہ تمھارے لیے کچھ کر نہیں سکتا۔''

''آپ کر سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟''

''مجھے اتنا بتا دیجیے کہ موسیو ماریوس کہاں رہتے ہیں؟''

بوڑھا کچھ سمجھ نہیں سکا ''کون موسیو ماریوس؟'' بوڑھے نے اپنے شیشے جیسی چمک دار آنکھیں اٹھائیں، اور یوں محسوس ہوا گویا وہ ایسی شے تلاش کر رہا ہے جو غائب ہو گئی ہے۔

''ایک نوجوان جو یہاں آیا کرتا تھا۔''

اس دوران موسیو مابوف نے اپنی یادداشت کھنگال لی تھی۔

''اوہ، اچھا۔'' اس نے کہا ''میں سمجھ گیا تم کس کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ ٹھہرو، وہ تمھارا مطلب ہے موسیو ماریوس — یعنی بیرن ماریوس پوں مرسی — بلاشبہ، وہ رہتا ہے — بلکہ وہ یہاں نہیں رہتا — اوہ، مگر میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔''

جس وقت وہ یہ باتیں کر رہا تھا، وہ rhododendron کی ایک شاخ پر جھکا ہوا تھا؛ اور وہ کہتا رہا ''ذرا ٹھہرو، اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ اکثر وہ اس بولیوارڈ سے گزرتا ہے، گلیشیر اور Croulebarbe اسٹریٹ کی طرف جاتا ہے۔ وہی جگہ جس کو معشق چڑیا کا مرغزار کہتے ہیں۔ وہاں جاؤ۔ اس سے ملنا کچھ مشکل نہیں۔''

موسیو مابوف نے سر اُٹھایا تو وہاں کوئی نہ تھا؛ وہ لڑکی غائب ہو چکی تھی۔

وہ واقعی خوف زدہ ہو گیا۔

"واقعی" اس نے سوچا، "اگر میرا باغیچہ سینچا نہ گیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ لڑکی کوئی آسیب تھی۔"

ایک گھنٹے بعد جب وہ بستر میں تھا اس کے دل میں یہ خیال پھر اُبھرا— ایسے موقعے پر جب خیال کسی پرندے کی طرح خود کو مچھلی میں تبدیل کر لیتا ہے تا کہ وہ سمندر پار کر سکے اور رفتہ رفتہ خواب کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے تا کہ نیند سے گزر سکے--اس نے خود سے حیرانی کے عالم میں کہا، "سچ کہوں تو وہ اس سے بہت مشابہ تھی، جسے Rubaudiere نے آسیب کہا ہے۔ تو کیا واقعی وہ آسیب ہی تھی؟"

❁

ماریوس کے لیے ایک آسیب

کاشت کار مابوف کے پاس اس بد روح کے آنے کے چند دن بعد، ایک صبح، جب دوشنبے کا دن تھا اور اسی دن ماریوس نے کوفیراک سے ایک سو سو کا سکّہ ادھار لیا تھا، اُس نے وہ سکّہ اپنی جیب میں ڈالا اور کلرک کے دفتر جانے سے پہلے "تھوڑی سی چہل قدمی" کے لیے گیا، اس اُمید پر کہ واپسی پر کام کرے گا۔ روز وہ اسی طرح جاتا تھا، مگر اس دن جوں ہی اٹھا، ایک کتاب اور کاغذ کا ایک صفحہ لے کر بیٹھ گیا، تا کہ کچھ ترجمے کا کام بھی نمٹا دے؛ ان دنوں اس کا کام تھا کہ وہ فرانسیسی زبان میں ایک جرمن ، Gans اور Savigny کے درمیان کے مشہور لڑائی کے تنازعے کو منتقل کر دے: اس نے Savigny اٹھائی، اس نے Gans اٹھائی، چار سطریں پڑھیں، ایک سطر کو لکھنا چاہا، مگر لکھ نہیں سکا، اور اس کاغذ اور اس کے اپنے درمیان اسے ایک ستارہ نظر آیا۔ وہ اپنی کرسی سے یہ کہتا ہوا اٹھا کہ "میں باہر جا رہا ہوں۔ یہ چہل قدمی مجھے تازہ دم کر دے گی۔" اور وہ مغنّی چڑیا کے مرغزار کی طرف چل دیا۔

آج وہاں اسے ہمیشہ سے زیادہ ستارے نظر آئے، اور ہمیشہ سے کم Savigny اور Gans۔

وہ گھر واپس آیا، اپنے کام کو ایک بار پھر شروع کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا؛ اس کے دماغ میں ٹوٹ جانے والے دھاگوں میں سے ایک دھاگے کو بھی دوبارہ جوڑنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا: تب اس نے خود سے کہا "کل میں چہل قدمی کے لیے نہیں جاؤں گا۔ کہ یہ مجھے کام کرنے سے روکتی ہے"۔ پھر بھی وہ ہر روز چہل قدمی کے لیے جاتا رہا۔

کوفیراک کی قیام گاہ سے زیادہ وقت وہ مغنّی چڑیا کے مرغزار میں گزارتا تھا۔ اس کا

اصل پتا تھا: سانتے بولیوارڈ، Croulebarbe اسٹریٹ سے آگے ساتواں درخت۔

اس صبح اس نے ساتواں درخت چھوڑ دیا اور دریائے گوبلس کے پشتے پر دھوئی رہا تھی تھی۔ دل خوش کر دینے والی سورج کی روشنی تازہ نکلی ہوئی پتیوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔

وہ اس لڑکی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا مراقبہ جو ایک قسم کی سرزنش میں بدلتا جا رہا تھا، اسی پر واپس آ پڑا؛ اس نے اپنی کاہلی پر بے چینی سے غور کیا، اس کی روح کا فالج اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا، رات ہر لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی، اس حد تک کہ اسے سورج بھی نظر نہیں آتا تھا۔

اس کے باوجود، اس کے مبہم خیالات کی تکلیف رساں نجات خود کلامی بھی نہیں تھی، اس کا فعل اتنا کم زور ہو چکا تھا کہ اب اس میں بیزاری کی قوت بھی نہیں رہ گئی تھی؛ اس کی غم انگیزی کے جذب ہو جانے کے باوجود بیرونی احساسات اس تک پہنچ رہے تھے۔ اس کو آوازیں آ رہی تھیں اپنے عقب سے، اپنے نیچے سے، دریا کے دونوں کناروں سے جہاں Gobelin کے قالین دھونے والی دھوبنیں پٹخ پٹخ کر کپڑے دھو رہی تھیں؛ اور اس کے سر کے اوپر اونچے اونچے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں، گا رہی تھیں۔ ایک طرف آزادی کی آواز تھی، بے پروا فرصت کی مسرت تھی جس کے پَر ہوتے ہیں؛ دوسری جانب مشقت کی آواز تھی۔ یہی دو آوازیں تھیں جنھوں نے اس کو گہرے مراقبے میں ڈال دیا تھا۔

اچانک، اپنی افسردگی کے وجد میں اسے ایک مانوس آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی:

آؤ! وہ یہاں ہے!

اس نے آنکھیں اٹھائیں اور اس بدنصیب بچی کو پہچان لیا جو ایک صبح اس کے پاس آئی تھی؛ وہ جن آرو بے کی بڑی بیٹی، ایپونین تھی؛ اب اسے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ زیادہ مفلس اور زیادہ حسین ہو گئی تھی، جس کے لیے دو قدم اٹھانا آسان نہیں تھا، اس نے دُگنی ترقی کر لی تھی، روشنی کی طرف اور پریشانی کی طرف۔ وہ اسی طرح ننگے پاؤں اور چیتھڑوں میں ملبوس تھی، جیسی اُس دن تھی جب وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی؛ اب اس کے چیتھڑے صرف دو ماہ زیادہ پرانے تھے؛ ان کے سوراخ بڑے ہو گئے تھے، خستہ حالی زیادہ غلیظ ہو گئی تھی۔ وہی سخت آواز تھی، وہی سیاہی مائل دھندلی پیشانی تھی، وہی آزاد، وحشی اور گھومتی ہوئی نگاہ تھی۔ اس کے علاوہ، پہلے کے مقابلے میں، اس کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوف زدہ اور افسوس ناک جیسی کوئی شے تھی، جو قید میں چند روزہ قیام کے بعد بدنصیبی میں اضافہ کر دیتی ہے۔

اس کے بالوں میں یہاں وہاں تنکے تھے— اوفیلیا کی طرح نہیں جو ہیملٹ کی دیوانگی کی وبا کے اثر سے پاگل ہو گئی تھی— اس لیے کہ وہ کسی اصطبل کی دوچھتی میں سوئی تھی۔ اور ان سب کے باوجود وہ خوب صورت تھی۔ واہ رے جوانی! تو بھی کیا جگمگاتی شے ہوتی ہے۔

اس دوران، وہ ماریوس کے سامنے رُک گئی تھی، اپنے خاکستری بشرے میں خوشی کی جوت لیے، جو تبسم کے مشابہ تھی۔ کئی لمحے وہ خاموش کھڑی رہی گویا وہ بولنے کے قابل ہی نہ ہو۔

''لو، تو آج تم سے ملاقات ہو ہی گئی۔'' اس نے کہا، ''فادر مابوف صحیح کہہ رہے تھے، یہی بولیوارڈ تھی۔ میں نے کس طرح تمھیں تلاش کیا ہے، کاش تم جان سکتے۔ تم کیا جانو؟ میں حراست میں تھی۔ پندرہ دن کی۔ انھوں نے مجھے چھوڑ دیا، یہ دیکھ کر کہ میرے خلاف کچھ نہیں تھا، اور یہ بھی کہ میں ابھی اختیار کی عمر کو نہیں پہنچی ہوں۔ صرف دو ماہ کی کمی تھی۔ اف! ان چھ ہفتوں میں کس کس طرح میں نے تمھیں تلاش کیا ہے۔ تو کیا اب تم یہاں رہتے؟

''نہیں۔'' ماریوس نے کہا۔

''ارے ہاں، اب میں سمجھی۔ اسی قصے کی وجہ سے۔ وہ ساری تحریریں ناموافق ہیں۔ تم صاف بچ نکلے۔ سنو، تم ایسی پرانی ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ تم جیسے جوان آدمی کو اچھے کپڑے پہننے چاہئیں۔ موسیو ماریوس کیا تمھیں معلوم ہے کہ فادر مابوف تمھیں بیرن ماریوس کہتا ہے۔ میں نہیں جانتی کیوں؟ یہ سچ نہیں کہ تم بیرن ہو؟ بیرن وہ لوگ ہوتے ہیں جو لکسمبرگ جاتے ہیں، شیتو کے سامنے بیٹھتے ہیں، جہاں سب سے زیادہ دھوپ ہوتی ہے، اور وہ ایک سو کے عوض Quotidienne پڑھتے ہیں۔ ایک بار میں ایسے ہی ایک بیرن کے پاس خط لے کر گئی تھی۔ وہ سو برس سے زیادہ عمر کا تھا۔ اچھا، بتاؤ اب تم کہاں رہتے ہو؟''

ماریوس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ارے، تمھاری قمیص میں سوراخ ہے۔ تمھارے لیے میں اسے سی دوں گی۔''

اس نے دوبارہ بات شروع کی جو رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی۔

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔''

ماریوس نے خاموشی برقرار رکھی؛ وہ بھی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بولی، ''مگر میں چاہوں، تو تم کو خوش ہونے پر مجبور کر سکتی ہوں۔''

''کیا؟'' ماریوس نے سوال کیا، ''کیا مطلب ہے تمھارا؟''

''ارے، تم تو مجھے تو کہتے تھے۔'' اس نے فوراً کہا۔

''اچھا، تو بتا تیرا مطلب کیا ہے؟''

لڑکی اپنے ہونٹ کاٹنے لگی؛ اسے تامل ہوا، گویا وہ کوئی شکار ہو۔ بالآخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ ''اس سے زیادہ خرابی اور کیا ہوگی۔ مجھے بالکل پروا نہیں۔ تم غم زدگی کے عالم میں ہو؛ میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے صرف اتنا وعدہ کرو کہ تم مسکراؤ گے۔ میں تمھیں مسکراتا دیکھنا چاہتی ہوں: ارے واہ! بہت اچھا۔ بے چارے موسیو ماریوں! تمھیں یاد ہے نا، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ میں چاہوں گی تم مجھے دو گے....''

''ہاں، تو کہو۔''

لڑکی نے ماریوں کو آنکھ بھر کر دیکھا، اور کہا، ''مجھے پتا مل گیا ہے۔''

ماریوں زرد پڑ گیا۔ شاید سارا خون بہہ کر اس کے دل میں پہنچ گیا تھا۔

''کون سا پتا؟''

''وہی جو تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے کہا تھا۔'' اور اس نے اضافہ کیا، گویا اس میں اسے کوشش کرنی پڑ رہی تھی، ''وہی پتا — تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''ہاں۔'' ماریوں ہکلایا۔

''اس نوجوان لڑکی کا۔'' ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اس نے ایک گہری آہ بھری۔

ماریوں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اوہ، اچھا تو مجھے لے چلو۔ بتاؤ نا۔ جو مانگو میں دوں گا، مگر وہ ہے کہاں؟''

''چلو میرے ساتھ۔'' اس نے جواب میں کہا، ''میں اس سڑک کو یا نمبر کو اچھی طرح جانتی ہوں؛ یہاں سے وہ بالکل مختلف سمت میں ہے، مگر میں اس گھر کو اچھی طرح جانتی ہوں، میں تمھیں وہاں لے چلوں گی۔''

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہتی رہی، ایسے لہجے میں، جو مشاہدہ کرنے والے کا دل چیر کر رکھ دیتا ہے، مگر جس کا ماریوں کے نشے کی سی اور وجد کی حالت پر ہلکا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا، ''اوہ! تم کتنے خوش ہو گئے ہو!''

ماریوں کی پیشانی پر سے ایک بادل سا گزر گیا۔ اس نے ایپونین کو بازو سے پکڑ لیا، ''ایک بات کی قسم کھاؤ!''

''قسم کھاؤ؟'' اس نے کہا، ''کیا مطلب ہے تمھارا؟ آؤ چلو۔ تم مجھ سے قسم لینا چاہ رہے ہو؟'' اور اس نے ایک آہ بھری۔

"تمھارا باپ، مجھ سے وعدہ کرو ایپونین، قسم کھاؤ، کہ تم یہ پتا اپنے باپ کو نہیں دوگی۔"
لڑکی اس کو کسی احمق کی طرح دیکھنے لگی۔ "ایپونین! تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام ایپونین ہے؟"

"پہلے وعدہ کرو، میں جو کچھ بتاؤں گا، کسی اور سے نہیں کہوگی۔"

مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ سن نہیں رہی تھی۔ "مجھے بہت اچھا لگا، تم نے مجھے ایپونین کہا۔"

ماریوں نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ گرفت میں لے لیے۔ "خدا کے لیے، میری بات کا جواب دو۔ سنو، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، غور سے سنو۔ قسم کھاؤ کہ تم اپنے باپ کو یہ پتا نہیں بتاؤگی، جو تمھیں معلوم ہے۔"

"میرا باپ!" اس نے کہا "ارے ہاں، اطمینان رکھو۔ وہ تو حراست میں ہے۔ اس کے علاوہ، میں اپنے باپ کی کب پروا کرتی ہوں۔"

"مگر تم مجھ سے وعدہ نہیں کر رہی ہو۔" ماریوں نے چیخ کر کہا۔

"چھوڑو مجھے۔" اس نے کہا، اور اچانک زور سے ہنس پڑی، "تم مجھے کس طرح جھنجھوڑ رہے ہو۔ ہاں، ہاں! میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ مجھے کیا پروا ہے۔ میں اپنے باپ کو یہ پتا نہیں بتاؤں گی۔ اب تو ٹھیک ہے نا، بس اتنا ہی؟"

"نہ کسی اور کو؟" ماریوں نے سوال کرتے ہوئے کہا۔

"نہ کسی اور کو۔"

"اب" ماریوں نے کہا، "مجھے وہاں لے چلو۔"

"فوراً؟"

"فوراً۔"

"میرے ساتھ آؤ۔ ارے، یہ کتنا خوش ہو رہا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ رُک گئی۔

"تم میرے بہت قریب ہو کر چل رہے ہو، موسیو ماریوں۔ مجھے آگے جانے دو اور اس طرح پیچھے چلو کہ پتا نہ چلے کہ تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔ تم جیسے اچھے آدمی کو مجھ جیسی عورت کے ساتھ نظر نہیں آنا چاہیے۔"

کوئی بھی زبان ان سب باتوں کا اظہار نہیں کر سکتی جو اس لفظ 'عورت' میں چھپی تھیں

جسے اس بچی نے اپنی زبان سے ادا کیا تھا۔

دس بارہ قدم چل کر وہ ایک بار پھر کھڑی ہو گئی۔ ماریوس اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے ماریوس کی طرف رُخ کیے بغیر ہی کہا، "ارے ہاں، تمھیں یاد ہے نا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، کچھ دینے کا؟"

ماریوس نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اس وقت دنیا میں اس کے پاس جو کچھ تھا، وہ صرف پانچ فرانک تھے، اور وہ بھی اس کے باپ تین آر دیے کے لیے ہی تھے۔ اس نے سکّہ نکال کر ایپونین کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس نے اپنی انگلیاں کھولیں، سکّے کو زمین پر گر جانے دیا، اور افسردگی سے اسے گھور کر دیکھا۔ "میں تمھاری دولت کی خواہاں نہیں۔" اس نے کہا۔

❁

مکان اور اُس کے راز

پچھلی صدی کے درمیان پیرس کی پارلیمان کا ایک چیف جسٹس تھا جس کی ایک داشتہ تھی اور وہ اس حقیقت کو پوشیدہ رکھتا تھا، مگر اس زمانے کے عالی مرتبہ لوگ اپنی داشتاؤں کو سب کے سامنے رکھتے تھے، جب کہ بورژوا خفیہ رکھتے تھے۔ اس نے اپنا ایک چھوٹا سا مکان بنایا تھا سینٹ جرمین کے مضافات میں، بالکل سنسان بلومے اسٹریٹ پر، جس کو اب پلومے اسٹریٹ کہا جاتا ہے، جو اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جسے .Combat des Animaux کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔

اس مکان میں ایک چھوٹا سا ایک منزلہ بنگلہ بھی تھا: مکان کی زمینی منزل پر دو کمرے، پہلی منزل پر بھی دو کمرے، نیچے کی منزل میں باورچی خانہ تھا، اوپری منزل میں ایک خلوت گاہ تھی، چھت کے نیچے ایک دو چھتی تھی، اور اس کے سامنے ایک باغیچہ تھا، اور ایک بڑا سا پھاٹک تھا جو سڑک پر کھلتا تھا۔ باغیچہ تقریباً ڈیڑھ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ راہ گیروں کو اس مکان کا بس اتنا ہی حصہ نظر آتا تھا؛ مگر اس بنگلے کے عقب میں ایک تنگ سا صحن تھا، اور اس کے آخر میں ایک نیچی سی عمارت بھی تھی جس میں دو کمرے اور ایک تہہ خانہ تھا، جس میں ضرورت کے وقت ایک بچہ اور ایک نرس کو خفیہ طور پر رکھا جا سکتا تھا۔ اس عمارت کے عقب میں ایک خفیہ دروازہ تھا جو ایک خفیہ اسپرنگ سے کھلتا تھا، اور پتھروں کے فرش کی ایک طویل اور تنگ گلی تھی، جو آسمان سے دکھائی دیتی تھی؛ اس کے دونوں جانب اونچی دیواریں تھیں جن کو نقش و نگار سے چھپایا گیا تھا، جو باغیچے اور کاشت کی ہوئی زمین کے درمیان تھیں، اور ان سب کے زاویے اور راستے ایسے تھے جو ایک اور دروازے پر ختم ہوتے تھے جس میں خفیہ تالا لگا ہوا تھا جو ایک اور علاقے میں لے جاتا تھا، اور دور جا کر بابل اسٹریٹ کے آخری حصے سے مل جاتا تھا۔

اسی راستے سے چیف جنٹس داخل ہوتا تھا، اس طرح کہ اگر کوئی اس کا پیچھا بھی کر رہا ہوتو وہ صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ چیف جنٹس ہر روز کسی خفیہ راستے سے جاتا ہے اور کوئی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بابل اسٹریٹ جانے والا شخص پلومے اسٹریٹ جاتا ہے۔اس قطعہ زمین کے چالاک خریداروں کے طفیل، چیف جنٹس اپنی عمارت میں جانے کے لیے ایک بد رَو جیسا خفیہ راستہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا، جس میں کوئی مزاحمت نہیں ہو سکتی تھی۔بعد میں اس نے اس راہ داری سے ملے چھوٹے چھوٹے حصے بنا کر باغیچوں اور مارکٹ باغیچوں کے لیے فروخت کر دیے تھے؛ ان حصوں کے مالکوں کے سامنے بس ایک دیوار سی تھی، اور انھیں شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے پیچھے دو دیواروں کے درمیان اور، پھولوں کے تھالوں اور پھلوں کے درختوں کے درمیان ربن کی طرح ایک گلی بھی جاتی ہے۔صرف پرندے ہی اس کو دیکھ سکتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پچھلی صدی کے پرندے چیف جنٹس کے بارے میں گپ شپ کرتے رہے ہوں۔

بنگلہ، جو پتھروں سے بنا تھا جس پر تختوں کے حاشیے سے بنی چوگوشی چھت تھی۔ اس کو فرانسیسی مصور انتواں ویٹو (Watteau) کے انداز میں سجایا گیا تھا، اندر نقش ونگار اور باہر سے یہ پرانے زمانے کا نظر آتا تھا؛ اس کے چاروں طرف پھولوں کی باڑھ، اور اندر محتاط انداز میں جنسی تلذذ ابھارنے والے نقوش جو مجسٹریٹ جیسے رومانوی شخص کے لیے خوب تھے۔

گھر اور راہداری، جو اب نابود ہو چکے ہیں، پندرہ برس قبل تک سالم تھے۔'93 میں ایک ٹھٹھیرے نے منہدم کرنے کی غرض اس مکان کو خرید لیا تھا مگر چوں کہ وہ پوری قیمت ادا نہیں کر سکا تھا، ریاست نے اس کو دیوالیہ کر دیا۔گویا، خود مکان نے ٹھٹھیرے کو منہدم کر دیا تھا۔اس کے بعد سے یہ مکان غیر آباد رہا اور آہستہ آہستہ کھنڈر بن گیا، جیسا کہ ہر مکان کے ساتھ ہوتا ہے جسے اس کے مکین زندگی نہیں بخشتے۔اس میں وہی پرانا فرنیچر موجود تھا اور یہ ہمیشہ فروخت یا کرایے کے لیے لگا رہتا تھا؛ 1819ء کے بعد سے پلومے اسٹریٹ سے گزرنے والوں کو، جو دس یا بارہ سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، زرد رنگ کے کاغذ اور مٹے ہوئے حروف سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمارت برائے فروخت ہے۔

محاذ کے اختتام پر ان ہی راہ گیروں نے دیکھا ہوگا کہ وہ اشتہار غائب ہو گیا ہے، حتیٰ کہ پہلی منزل کا آہنی پردہ بھی اٹھا دیا گیا ہے۔ دراصل اب مکان رہائش کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں پر چھوٹے پردے پڑے ہوئے تھے، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اس میں خواتین بھی رہتی ہیں۔

1829ء کے اکتوبر میں ایک عمر رسیدہ شخص نے اس مکان کو اسی حالت میں کرایے پر لے لیا جس میں عقبی عمارت اور وہ گلی بھی شامل تھی جو بابل اسٹریٹ پر ختم ہوتی تھی۔اس نے گلی

میں کھلنے والے دو خفیہ دروازوں کی مرمت بھی کرائی تھی۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، مکان میں اب بھی جیمس کے زمانے کا پرانا فرنیچر موجود تھا؛ نئے کرایے دار نے کچھ مرمت بھی کرائی، اور اس میں ان چیزوں کا اضافہ بھی کر دیا جن کی یہاں وہاں کمی تھی؛ صحن میں لگے پتھر، اینٹیں اور فرش بھی بدلوا دیے، سیڑھیوں کے قدمچے، فرش کے غائب ٹکڑے، جنگلے والی کھڑکیوں کے شیشے بدلوا دیے، اور اس کے بعد بغیر کسی ہنگامے یا شور شرابے کے ایک نوجوان لڑکی اور بوڑھی ملازمہ کے ساتھ عمارت میں منتقل ہو گیا تھا، ایسے آدمی کی طرح جو اپنے ہی گھر میں داخل ہونے کے بجائے آہستہ سے رینگ جاتا ہو۔ پڑوسیوں میں اس کے بارے میں کوئی چہ می گوئیاں نہیں ہوئیں، اس لیے کہ اس مکان کا کوئی پڑوس تھا ہی نہیں۔

یہ کم آمیز کرایہ دار ژاں ولژاں تھا، نوجوان لڑکی کوزیٹ اور بوڑھی عورت توسا (Toussaint) تھی، جسے ژاں ولژاں نے اسپتال سے اور بدنصیبی سے بچایا تھا، عمر رسیدہ تھی، ہکلانے والی اور صوبوں سے تعلق رکھتی تھی۔ یہی تین صفات تھیں جن کے باعث ژاں ولژاں نے اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ مکان اس نے ایک آزاد و خود مختار آدمی فوشلووں کے نام سے لیا تھا۔ اس سے پہلے اس شخص کے بارے میں جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کی روشنی میں قاری کو اسے پہچاننے میں ابھی آر دیلے سے زیادہ وقت نہیں ہوئی ہوگی کہ یہ شخص ژاں ولژاں ہی ہے۔

ژاں ولژاں نے خانقاہ کیوں چھوڑ دی تھی؟ کیا ہوا تھا؟

کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

قاری کو یاد ہوگا کی ژاں ولژاں خانقاہ میں بہت خوش تھا، اس قدر خوش کہ بالآخر اس کے ضمیر نے اس کو متنبہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ کوزیٹ کو ہر صبح دیکھتا، اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے خیالات میں پیدا ہونے والی پدریت کی کیفیت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے اس بچی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا؛ وہ خود سے کہتا کہ وہ اس کی ہے، کہ کوئی اس بچی کو اس سے چھین نہیں سکتا، کہ یہ سلسلہ ہمیشہ اسی طرح رہے گا، کہ وہ یقینی طور پر راہبہ بن جائے گی، کہ ہر روز اسے اس کردار کے لیے اُکسایا جاتا ہے، کہ جس طرح اب خانقاہ ژاں ولژاں کے لیے دنیا ہے، اسی طرح اُس بچی کے لیے بھی دنیا بن چکی ہے، کہ وہ خود یہیں بوڑھا ہوگا، کہ اس بچی کی بھی یہیں نشو و نما ہوگی، کہ وہ یہیں بوڑھی بھی ہوگی، کہ خود اسے [ژاں ولژاں کو] یہیں مرنا بھی ہے؛ مختصر یہ کہ اب اس خانقاہ سے علاحدگی ممکن نہیں۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے سے وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے خود سے سوال کرنا شروع کیا، کہ کیا یہ ساری مسرت واقعی اسی کی ہے،

کہ اگر یہ کسی اور کی خوشیوں پر مشتمل نہیں، اس بچی کی بھی نہیں ہے، تو یہ بوڑھا شخص اس بچی کی خوشیاں ضبط کر رہا ہے، چوری کر رہا ہے، اگر یہ چوری نہیں ہے؟ اس نے خود سے کہا: کہ اس بچی کو اس زندگی کو جاننے پرکھنے کا حق ہے، قبل اس کے وہ اس سے دستبردار ہو جائے؛ کہ اس سے مشورہ کیے بغیر ہی اسے قبل از وقت زندگی کی تمام تر مسرتوں سے محروم کر دیا جائے، اس عذر پر کہ اس کو ہر قسم کی آزمائشوں سے بچایا جا رہا ہے؛ اس کی لاعلمی اور علاحدگی کے باعث کہ اس میں ایک مصنوعی پیشے کے بیج بوئے جا رہے ہیں، اور اس طرح ایک انسانی مخلوق سے اس کی فطرت چھینی جا رہی ہے، اور خدا سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ اور کون جانے، اگر کسی دن اسے یہ سب معلوم ہو گیا، اور وہ خود کو بدقسمت راہبہ پاتی ہے تو کیا کوزیت اس سے نفرت نہیں کرنے لگے گی؟ بالآخر، اس کے دل میں ایک تقریباً خود غرضانہ، مگر بہادرانہ خیال ابھرا؛ اس کا خانقاہ میں رہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اور اس نے خانقاہ کو خیر باد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے اچھی طرح سوچ لیا؛ اسے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ قدم اٹھانا ضروری ہے۔ اور اعتراضات؟ ایک بھی نہیں۔ ان چار دیواروں کے درمیان پانچ برس کے عارضی قیام اور معاشرے سے غیاب نے یقینی طور پر اس میں خوف کے عناصر کو تباہ کر دیا تھا یا بکھیر دیا تھا۔ اب وہ اطمینان سے آدمیوں میں واپس جا سکتا تھا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا، اور اس میں ہر طرح کی تبدیلی آ گئی تھی۔ اب اسے کون پہچان سکے گا؟ اور زیادہ سے زیادہ خرابی یہ ہو گی کہ اس کا اپنا وجود خطرے میں ہو گا۔ اور اسے کوئی حق نہیں کہ وہ کوزیت کو خانقاہ میں محبوس کر دے، اس بنا پر کہ وہ گیلیز کا [مفرور] قیدی تھا۔ اس کے علاوہ، ایسی نیکی کرنے میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اب ایسی کوئی شے نہیں تھی جو اس کو مصلحت اندیشی اور عاقبت اندیشی سے روک سکتی۔

اور جہاں تک کوزیت کی تعلیم کا سوال تھا، تو اس کی تعلیم پوری اور ختم ہو چکی تھی۔

فیصلہ کر لینے کے بعد، اب وہ صرف موقعے کے انتظار میں تھا۔ اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ بوڑھا مالی فوشلوون انتقال کر گیا تھا۔

اب ژاں والژاں محترم منتظم راہبہ کے سامنے پیش ہوا؛ اس کو بتایا کہ بھائی کی موت سے وراثت میں ملنے والی جائیداد کے باعث اب وہ کام کیے بغیر ہی بقیہ زندگی گزار سکتا ہے، اور اب اس کو خانقاہ کی ملازمت چھوڑ دینی چاہیے، اور اسے اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہیے؛ مگر چوں کہ یہ انصاف نہیں ہو گا کہ کوزیت، جس نے ابھی حلف نہیں اٹھایا ہے، اس کی تعلیم مفت ہو۔ اس نے بڑے انکسار سے درخواست کی کہ وہ کوزیت کی پانچ سالہ تعلیم کے عوض

اُس کی جانب سے خانقاہ کے لیے پانچ ہزار فرانک قبول کر لے۔

اس طرح ژاں ولژاں خانقاہ سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

خانقاہ سے نکلتے وقت اس نے اپنے بازوؤں میں اپنا چھوٹا سے بکس اٹھا لیا تھا جس کی کنجیاں ہمیشہ اس کے اپنے پاس ہی ہوتی تھیں، جسے وہ کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتا تھا۔ کوزیٹ اس میں سے نکلنے والے حنوط کرنے والے مصالحے کی بُو سے پریشان ہو گئی تھی۔

ہمیں یہ بات فوراً کہہ دینی چاہیے کہ یہ صندوق کبھی زیادہ دیر اس سے دور نہیں رہا۔ یہ ہمیشہ اس کے کمرے ہی میں رہا ہے۔ جب وہ کہیں منتقل ہوتا تو سب سے پہلے یہ صندوق نکلتا تھا۔ کوزیٹ اس پر ہنسا کرتی تھی، کہ اسے ژاں ولژاں سے علاحدہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اور کہتی تھی، "میں اس صندوق سے حسد کرنے لگی ہوں۔"

پھر بھی، جب تک کوئی تشویش نہ ہو، ژاں ولژاں باہر نہیں نکلتا تھا۔

اس نے پلومے اسٹریٹ میں ایک مکان دریافت کیا، اور خود کو دنیا کی نظروں مخفی رکھنے کے لیے اس میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس نے اپنا نام الٹیمے فوشلووں (Ultime Fauchelevent) رکھ لیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے خود پر توجہ کو کم کرنے کے لیے پیرس میں دو فلیٹ کرایے پر لے لیے، جو کم نہ ہوتی اگر وہ ایک ہی علاقے میں رہتا۔ اس طرح اس پر حملہ آور ہونے والے شوروغوغا کی صورت میں وہ وقتی نقلِ مکانی کر سکتا تھا اور اس کیفیت سے بچ سکتا تھا جو اس رات ہوئی تھی جب وہ معجزانہ طور پر جاویر کے ہاتھ سے بچ نکلا تھا۔ یہ دونوں فلیٹ دیکھنے میں بھی بہت خراب حالت میں تھے، دو مختلف علاقوں میں تھے جو ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے؛ ایک l'Ouest اسٹریٹ پر تھا تو دوسرا l'Homme Arme اسٹریٹ پر۔

وقتاً فوقتاً وہ کبھی l'Homme Arme اسٹریٹ پر جاتا کبھی l'Ouest اسٹریٹ پر، اور وہاں ایک مہینہ یا چھ ہفتے گزارتا مگر اپنی ملازمہ توسا کے بغیر۔ دربانوں نے اس کی بارہا خدمت کی تھی، اور اس نے بھی خود کو مضافات کا شریف آدمی ثابت کیا تھا، کہ وہ اپنی پس انداز دولت پر زندگی گزارتا ہے اور اس نے اپنے آرام کے لیے شہر میں بھی ایک جگہ لے لی ہے۔ پیرس میں رہنے اور پولیس کی دست اندازی سے بچنے کے لیے اب اس کے پاس تین جگہیں تھیں۔

ژاں ولژاں نیشنل گارڈ کے روپ میں

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو وہ پلومے اسٹریٹ پر رہتا تھا اور اس نے اپنے قیام کی تنظیم اس طرح کی تھی:

کوزیٹ اور ملازمہ بنگلے میں رہتی تھیں؛ کوزیٹ کو بڑی خواب گاہ ملی جس میں کھڑکیوں کے درمیان کی جگہوں پر پینٹ کیے ہوئے آئینے لگے تھے، خلوت گاہ میں سونے کے ملمعے کی پٹیاں لگی تھیں، بیٹھک میں منقش دیوار پوش قالین آویزاں تھے اور بڑی بڑی آرام کرسیاں تھیں؛ کوزیٹ کے پاس باغیچہ تھا۔ ژاں ولژاں کے پاس ایک چھتر لگا قدیم damask کا سہ رنگا پلنگ تھا جو Figuier-Saint-Paul اسٹریٹ پر واقع Mother Gaucher کی دکان سے خریدا گیا تھا۔ فارسی قالین کوزیٹ کے کمرے میں ڈالا گیا تھا؛ ان قدیم اور بیش بہا اشیا کی شان و شوکت کو کم کرنے کے لیے اس نے اس ادھر اُدھر کی اشیا کے ساتھ کچھ فرنیچر نوجوان لڑکیوں کے مزاج کا بھی ڈال دیا تھا؛ ایک آرائشی الماری، سنہری جلدوں سے بھری کتابوں کی الماری، قلم دوات، روشنائی خشک کرنے کا کاغذ، صدف کے ٹکڑوں سے مزین لکھائی کی میز، روپہلے ملمعے کا کپڑے رکھنے والا بکس، غسل خانے میں چینی سے بنے جاپانی ظروف، پھول دار کپڑوں کے سہ رنگے لانبے پردے جو بستر کی چادروں سے ملتے تھے، پہلی منزل کی کھڑکیوں میں ڈالے گئے تھے۔ زمینی منزل کی کھڑکیوں میں منقش پردے پڑے تھے۔ سردی کے موسم میں کوزیٹ کا کمرہ اوپر سے نیچے تک گرم کیا جاتا تھا۔ ژاں ولژاں دربانوں جیسے مخصوص حصے میں رہتا تھا، جو عقبی صحن کے بالکل کنارے پر واقع تھا، جس میں تہہ ہو جانے والا گدے دار پلنگ تھا، سفید رنگ کی لکڑی کی ایک میز، پیال سے بنی دو کرسیاں، مٹی سے بنا پانی کا جگ، الماری میں چند قدیم کتابیں، ایک کونے

میں رکھا، اس کا پسندیدہ صندوق۔ گرم کرنے کے لیے آگ نہیں جلائی جاتی تھی۔ وہ کوزیت کے ساتھ کھانا کھاتا تھا، اور اس کی میز پر اس کے اپنے لیے سیاہ ڈبل روٹی ہوتی تھی۔

جب توسا آئی تو اس نے ژاں ولواں سے کہا تھا، "یہ نوجوان خاتون ہی اس گھر کی مالکن ہے۔" "اور آپ، موسیو؟" توسا نے حیرت سے سوال کیا— "میں مالک سے کہیں زیادہ بہتر ہوں، کہ میں اس کا باپ ہوں۔"

کوزیت کو خانقاہ میں امورِ خانہ داری کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ گھر کے اخراجات سنبھالتی تھی، جو اعتدال میں ہوتے تھے۔ ژاں ولواں ہر روز کوزیت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی کے لیے جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کولکسمبرگ بھی لے جاتا تھا۔ ہر اتوار اسے Saint-Jacques-du-Haut-Pas کی عبادت کے اجتماع میں لے جاتا تھا، اس لیے کہ وہ کافی فاصلے پر تھا۔ چوں کہ وہ مفلس لوگوں کا علاقہ تھا، وہ لوگوں کو خیرات بانٹتا تھا، اور لوگ کلیسا کے اندر اسے گھیر لیتے تھے، جس کی وجہ سے اس تک تین آردیے کا رقعہ "Saint-Jacques-du-Haut-Pas کے مخیر، ذی مرتبہ جناب کے نام" پہنچا تھا۔ وہ کوزیت کو مفلس اور بیمار لوگوں کے پاس لے جایا کرتا تھا۔ پلومے اسٹریٹ کے مکان میں کبھی کوئی اجنبی داخل نہیں ہوا تھا۔ توسا سودا سلف لینے جاتی تھی، اور ژاں ولواں بولیوارڈ کے قریب فوارے سے پانی لینے جاتا تھا۔ ان کی لکڑیاں اور وائن کی بوتلیں ایک نصف زمیں دوز خلا میں رکھی جاتی تھیں جس میں پتھر استعمال کیے گئے تھے جو بابل اسٹریٹ کے قریب ملتے تھے، اور یہ خلا مشکل سے چیف جسٹس کی سرداب کی ضرورت کو پورا کرتا تھا؛ اس عہد کے "چھوٹے چھوٹے گھروں" میں 'سرداب نہیں تو کچھ بھی نہیں' والا معاملہ تھا۔

بابل اسٹریٹ والے دروازے کے پاس خطوط اور کاغذات کی وصولی کے لیے ایک بکس تھا؛ اس گھر کے تینوں مکینوں کے لیے نہ کوئی خط آتا تھا نہ کوئی کاغذ؛ اس سے پہلے اسے محبت کے خطوط لانے اور لے جانے والے استعمال کیا کرتے تھے؛ اب یہ ٹیکس کے نوٹس اور گارڈ کے سمن کی وصولی تک محدود تھا۔ فوشلواں خود مختار آدمی تھا، وہ نیشنل گارڈ کا حصہ تھا کہ وہ 1831ء کی مردم شماری کے جھمیلوں سے بچ نہیں سکا تھا۔ اس زمانے کی میونسپلٹی کی اطلاعات جمع کرنے والے خانقاہ تک پہنچ گئے تھے جو ایک قسم کا ناقابلِ گزر مقدس بادل تھا، جس میں سے ژاں ولواں قابلِ احترام بھیس میں ظاہر ہوا، اور وہ ٹاؤن ہال کی نظروں میں گھڑسوار گارڈ ہونے کے لائق تھا۔

سال میں تین یا چار بار ژاں ولواں وردی پہنتا اور گارڈ کا کام کرتا تھا؛ یہ وہ بہ رضا و رغبت کرتا تھا؛ اس کے لیے یہ صحیح قسم کا بھیس تھا جس نے اسے لوگوں میں گھلا ملا دیا تھا، اس کے

باوجود وہ تنہا ہی تھا۔ژاں ولواں کی ساٹھویں سالگرہ گزر چکی تھی؛ قانونی طور پر وہ اب آزاد تھا؛ مگر دیکھنے میں وہ پچاس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا تھا؛ مزید یہ کہ اس کی خواہش نہیں تھی کہ وہ اپنے سارجنٹ میجر سے بچ نکلتا، نہ وہ Comte de Lobau سے بحث میں پڑنا چاہتا تھا؛اس کا کوئی شہری درجہ نہیں تھا، وہ اپنا نام چھپا رہا تھا، وہ اپنی شناخت چھپا رہا تھا، اس لیے اس نے اپنی عمر چھپائی تھی، اس نے اپنی ہر بات چھپائی؛ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس نے یہ رضا و رغبت نیشنل گارڈ کے فرائض انجام دیے تھے؛اس کی ساری کوششیں کسی اور شخص سے شباہت پیدا کرنے میں تھیں جو اپنا ٹیکس ادا کر رہا ہو۔اس کا آئیڈیل تھا: اندر سے فرشتہ اور باہر سے بورژوا۔

ایک خاص بات مگر غور کے قابل ہے۔ژاں ولواں کوزیت کے ساتھ باہر جاتا تو وہ ریڈر جیسا لباس پہنتا، مگر ریٹائرڈ افسر معلوم ہوتا تھا۔جب وہ اکیلا باہر جاتا، جو عام طور رات کے وقت ہوتا تھا، تو وہ ہمیشہ کام کرنے والوں جیسا پتلون اور بلاؤز پہنتا، اور ایسی ٹوپی لگاتا جو اس کا چہرہ چھپا لیتی تھی۔ یہ حفظِ ما تقدم تھا یا انکسار؟ دونوں ہی۔کوزیت اپنے مقدر کی پُر اسراریت کی عادی ہو چکی تھی؛ اب وہ اپنے باپ کی خصوصیات پر غور ہی نہیں کرتی تھی۔اور تُوسا— وہ تو ژاں ولواں کی پرستار تھی اور سمجھتی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، ٹھیک کرتا ہے۔

ایک دن قصائی کو، جس سے وہ گوشت خریدتی تھی، ژاں ولواں کی جھلک دکھائی دی تو اس نے کہا:''عجیب حیرت انگیز شخص ہے یہ۔'' تُوسا نے جواب میں کہا:''وہ سینٹ ہے۔''

ژاں ولواں، کوزیت اور تُوسا ہمیشہ بابل اسٹریٹ والے دروازے سے ہی نکلتے تھے۔ جب تک وہ باغیچے والے پھاٹک سے دکھائی نہ دیتے، یہ قیاس بھی مشکل تھا کہ وہ اس مکان میں رہتے ہیں۔وہ پھاٹک ہمیشہ بند رہتا تھا۔ژاں ولواں نے باغیچے کو یوں ہی چھوڑ دیا تھا تا کہ اس مکان پر کوئی توجہ نہ کرے۔

اس معاملے میں شاید اس نے غلطی کی تھی۔

۞

برگ اور شاخیں

اس طرح نصف صدی تک لاپروائی سے چھوڑا ہوا باغیچہ غیر معمولی اور دل پسند ہوگیا تھا۔ چالیس برس قبل ادھر سے گزرنے والے راہ گیر رُک کر اس کو دیکھنے لگتے تھے، ان رازوں کے تجسس کے بغیر بھی جو اس کی سرسبز گہرائیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اس عہد کا خواب دیکھنے والا ایک شخص بھی مشکل سے اپنی نظروں اور اپنے خیالات کو کائی زدہ سبز دو کھمبوں میں، جن کو عربی انداز کی مخروطی کلغی سے سجایا گیا تھا، لگائے گئے قدیم، قفل شدہ، ٹیڑھے میڑھے، ڈگمگاتے پھاٹک کی سلاخوں کے درمیان سے اندر جانے کی اجازت دیتا۔

ایک کونے میں پتھر سے بنی ایک بنچ تھی، ایک یا دو ڈھلے ہوئے مجسمے تھے، کئی قسم کی جالیاں تھیں، وقت کے گزرنے کے ساتھ جن کی کیلیں نکل گئی تھیں، اور دیوار سے لگی گل سڑ رہی تھیں؛ نہ کہیں قدموں کے نشان تھے نہ گھاس کے تختے تھے؛ مگر ہر طرف وافر گھاس تھی۔ باغبانی رخصت ہو گئی تھی، فطرت واپس آ گئی تھی۔ خودرو پودوں کی ریل پیل تھی، جو زمین کے غریب ٹکڑے کے لیے خوش قسمتی کی نشانی تھی۔ طرح طرح کے پھولوں کا میلا بہت خوب لگ رہا تھا۔ باغیچے میں ایسی کوئی شے نہیں تھی جو زندگی کی مقدس کوششوں کو روکتی؛ ان کے درمیان مقدس نشوونما کا راج تھا۔ پیڑ بچھو بوٹی کی جانب خم ہو گئے تھے، پودے اوپر اٹھ گئے تھے، شاخیں لچک گئی تھیں؛ وہ جو زمین پر رینگتا ہے اس کی تلاش میں نکل گیا تھا جو ہوا میں پھیلتا ہے، وہ جو تیز ہوا میں لہراتا ہے اس کی طرف جھک گیا تھا جو کائی میں پھیلتا ہے؛ تنے، شاخیں، پتیاں، ریشے، گچھے، سوت، انکھوے، خار، سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے، چلیپا بن گئے تھے، یک جا ہو گئے تھے، ایک دوسرے سے حیرت زدہ ہو گئے تھے: اس تین سو مربع فٹ خطۂ ارض پر، برادری کی متحرک پُراسراریت پر، انسانی برادری کی علامت پر، ایک دوسرے سے گلے ملتے نباتات خالق کی مسرور

نظروں کے نیچے جشن منا رہے تھے، اپنی کامیابی کی تکمیل کر رہے تھے۔ یہ باغیچہ اب باغیچہ نہیں رہ گیا تھا، جھاڑیوں کا گنجان جنگل ہو گیا تھا، نا قابلِ دخول جنگل، اس طرح آباد جیسے کوئی شہر، کسی گھونسلے کی طرح لرزاں، اداس جیسے کلیسا، خوش بو دار جیسے گل دستہ، مجرد جیسے کوئی مقبرہ، زندہ جیسے کوئی ہجوم۔

فصلِ گُل میں جھاڑیوں کا یہ مہیب جنگل، اپنے پھاٹک کے عقب میں آزاد اور چار دیواروں کے درمیان محبوس، جس میں نمو کی خفیہ محنت شروع ہو جاتی تھی، ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں کسمساتا ہے، بالکل کسی جانور کی طرح سانسوں کے ذریعے کائناتی محبت کو جرعہ جرعہ پیتا ہے، اور جوار پَیلا کے عرقِ حیات کو اپنی رگوں میں بڑھتا اور اُبلتا محسوس کرتا ہے، تیز ہوا میں اپنی بڑی بڑی سبز زلفیں جھٹکتا ہے: گیلی زمین پر، گھسے ہوئے مجسموں پر، بنگلے کے جھڑتے ہوئے قدمچوں پر، حتیٰ کہ سنسان سڑکوں کے بغلی راستوں پر، ستاروں جیسے پھول، موتیوں جیسے شبنم کے قطرے، زرخیزی کے بیج، حسن، زندگی، مسرت اور خوش بوئیں چھڑکتا ہے۔ دوپہر کے وقت ایک ہزار سفید تتلیاں اس میں پناہ لیتی ہیں، اور یہ ایک ربانی نظارہ تھا کہ گرمی کے موسم کی زندہ برف کو سایوں کے درمیان گالوں کی صورت لہراتے گرتے دیکھا گیا ہے۔ وہاں، سبز پودوں کے سرور کر دینے والے سایوں میں، معصوم آوازوں کا ایک ہجوم روحوں سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا، اور چوں چوں کرتی آوازیں جو کچھ کہنا بھول گئی تھیں انھیں بھنبھناہٹ نے مکمل کر دیا تھا۔ شام کے وقت باغیچے سے نکلنے والا خواب انگیز بخار باغیچے پر چھا گیا تھا: کہر کے کفن نے، خاموشی اور آسمانی افسردگی نے اسے ڈھانپ لیا تھا: نقل (honeysuckle) اور عشق پیچاں بیلیں اپنے ہر عضو سے، نہایت لطیف اور پُر اسرار زہر جیسی مسحور کر دینے والی خوش بوئیں انڈیل رہی تھیں۔ ہدہدوں کی اور ممولوں کی آخری دُہائیاں سنائی دے رہی تھی جب وہ شاخوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے: پرندوں اور پیڑوں کی مقدس دوستیاں صاف محسوس کی جا سکتی تھیں: دن میں بازو پتیوں سے شادماں ہوتے ہیں، رات میں پتیاں بازوؤں کی حفاظت کرتی ہیں۔

سردی کے موسم میں یہ سیاہ جنگل قطرہ قطرہ ٹپکتا تھا، اس کے رُوئیں کھڑے ہو جاتے تھے اور اس گھر کی جھلک دیکھنے کی اجازت فراہم کرتا تھا۔ شاخوں پر پھولوں اور شبنم کے قطروں کے بجائے زرد پتیوں کے ٹھنڈے موٹے غالیچے پر گھونگھوں کی طویل نقرئی لکیریں دکھائی دیتی تھیں: مگر کسی انداز میں، کسی رُخ میں، ہر موسم میں، بہار میں، زمستاں میں، موسم گرما میں، خزاں میں یہ چھوٹا سا قطعۂ زمین افسردگی، غور و فکر، تنہائی، آزادی، آدمی کی غیر موجودگی، خدا کی موجودگی کے احساس کی سانسیں لیتا تھا؛ اور زنگ آلود قدیم پھاٹک کہتا معلوم ہوتا تھا، "یہ باغیچہ میری ملکیت ہے۔"

اس کا کوئی فائدہ نہیں کہ پیرس کی سڑکوں کے بغلی راستے دونوں جانب ہوتے ہیں، کہ

Varennes اسٹریٹ سے چند قدم دور پیرس کے کلاسیکی اور شان دار ہوٹل تھے، Invalides کا گنبد بھی قریب تھا، Chamber of Deputies زیادہ دور نہیں تھا؛ Bourgogne اسٹریٹ اور Saint-Dominique اسٹریٹ پر چلنے والی سواری گاڑیاں نہایت آرام سے گزرگزراتی گزر جاتی تھیں، بے کار قرب و جوار میں بے کار پیلی، خاکی، سفید، اور سرخ اومنی بسیں قریبی چوراہے پر ایک دوسرے کے راستے کے سامنے سے گزرتی تھیں؛ پلومے اسٹریٹ سنسان ہو گئی تھی؛ سابقہ مالکوں کے انتقال سے، انقلاب سے جو گزر گیا تھا، قدیم قسمتوں کی ریزہ ریزی، غیر حاضری، غفلت، چالیس برس کی دست برداری اور بیوگی کافی تھی بحالی کے لیے، اس مقام کے قرن، مولائن، ہملاک، یارو، اونچی خود رو گھاس، کریپ جن کی پتیاں لمبے سبز کپڑے کی طرح ہوتی ہیں، گرگٹ، وِیْل، بے چین اور تیز دوڑنے والے کیڑوں کے ذریعے؛ جو بہار کو زمین کی گہرائیوں سے نکال کر کسی نا قابلِ بیاں جنگلی شان والی چار دیواروں میں دوبارہ لے آتے ہیں؛ اور فطرت کے لیے، جو انسان کی چھوٹی چھوٹی ترتیب میں بدنظمی پیدا کر دیتی ہے، اور خود کو ہمیشہ اس جگہ با قاعدہ پھینک دیتی ہے، جہاں خود کو ہر طرح سے منتشر کر دیتی ہے چیونٹیوں میں اور چیلوں میں بھی، اور خود کو پیرس کے معمولی باغیچوں میں ایک نہایت بے درد طاقت اور جلال میں اس طرح پیدا کر لیتی ہے کسی نئی دنیا کے جنگل میں جہاں انسان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔

کوئی بھی شے بے مقصد نہیں ہوتی؛ ہر کوئی جس میں فطرت کا گہرا اور اثر انگیز رسوخ ہوتا ہے یہ جانتا ہے۔ حالاں کہ فلسفے کو کوئی تسلی نہیں دی جاتی، وجود کی حد بندی کرنے کے لیے یا اس کے اثر کو محدود کرنے کے لیے تصور کرنے والا وجدان کی ان نا قابلِ پیمائش گہرائیوں میں گر جاتا ہے جن کی وجہ سے قوت کی یہ بوسیدگی یکتائی میں ختم ہو جاتی ہے۔ ہر شے، ہر شے پر سخت محنت کرتی ہے۔

الجبرا کا اطلاق بادلوں میں کیا جاتا ہے؛ ستاروں کی تاب کاری گلاب کو فائدہ پہنچاتی ہے؛ ایسا کوئی مدبر نہیں جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ پُرت سنگی (hawthorn) پودے کا عطر کہکشاؤں کے لیے بے کار ہوتا ہے۔ تو پھر کون ہے جو مالیکیول کے راستے کا حساب لگا سکتا ہے؟ ہمیں کس طرح پتا چلے کہ دنیاؤں کی تخلیق ریت کے گرتے ہوئے ریزوں سے نہیں ہوتی؟ کون جانتا ہے متبادل انحطاط کو اور لا انتہا عظیم اور لا انتہا قلیل بہاؤ کو، بازگشت کی گونج کی وجوہ کو، وجود کی کھڑی چٹانوں کو، اور تخلیق کے برفانی طوفانوں کو؟ پنیر کا مختصر ترین کیڑا بھی اہم ہوتا ہے؛ عظیم حقیر ہوتا ہے اور حقیر عظیم ہوتا ہے؛ ہر شے ضرورت کے مطابق متوازن کی جاتی ہے؛ ذہن کے لیے چونکا دینے والا وژن ہوتا۔ یہ وجود کے اور اشیا کے الوکھے رشتے ہیں؛ اس کبھی نہ ختم ہونے والے کُل میں، سورج سے زمین میں پیوست جڑوں تک کوئی شے دوسری شے سے نفرت نہیں کرتی۔ سب کو ہر ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ روشنی زمینی خوشبوؤں کو

نیلگوں گہرائیوں میں انھیں لے جاتی جب تک اسے علم نہ ہو کہ یہ کیا کرے گی: رات کو نخی جوہروں کو خوابیدہ پھولوں میں تقسیم کرتی ہے۔تمام اڑنے والے پرندوں کے پیروں میں لامتناہیت کا دھاگا لپٹا ہوتا ہے۔ کسی شہاب ثاقب کے شگافتہ ہونے سے اور ابابیل کی چونچ سے اس کے انڈے تڑکنے سے، اور بچھوے کی پیدائش اور سقراط کی آمد سے جنھیں ایک ہی درجے پر رکھا جاتا ہے، آنکھوں سے نکلنے کا عمل پیچیدہ ہو جاتا ہے۔جس منزل پر ٹیلی اسکوپ ختم ہوتی ہے وہیں سے مائیکرا سکوپ شروع ہوتی ہے۔ان میں سے کون زیادہ بڑے میدان کی نظر رکھتی ہے؟ انتخاب کیجیے۔معمولی سی پھپھوند پھولوں کا، رات ستاروں کا جھرمٹ ہوتی ہے: نیبولا ستاروں کا ant-hill ہوتا ہے۔ایک ہی قسم کا اختلاط جو بے مثال ہو ذہین اشیا اور مادوں کی حقیقتوں کے درمیان موجود ہوتا ہیں۔عناصر اور اصول گڈ مڈ ہوتے ہیں، متحد ہوتے ہیں، شادی کرتے ہیں، ایک دوسرے سے مل کر اپنی نسل بڑھاتے ہیں، اس حد تک کہ اخلاقی دنیا اور مادے بالآخر فراوانی لاتے ہیں۔یہ عجوبہ ہمیشہ اپنے آپ پر واپس آتا ہے۔کائناتی مبادلے میں عالمی زندگی نامعلوم مقدار میں آتی جاتی ہے، جس میں مکمل طور پر مرئی اسراریت میں لپٹی ہوئی، ہر شے کو استعمال کرتی ہوئی، جو ایک خواب بھی ایک اونگھ بھی نہیں گنواتی: ادھر ایک جرثومہ بوتی ہوئی، ادھر ایک سیارے کو ریزہ ریزہ کرتی ہوئی، جھلتی ہوئی اور لپیٹتی ہوئی، روشنی کو قوت اور خیال کو عنصر بناتی، منتشر شدہ اور غیر مرئی، جیومیٹری کے نقطے کے سوا ہر شے، یعنی میں، کو تحلیل کرتی، ہر شے کو واپس ایٹم میں لاتی ہوئی، خدا کی ہر شے کو پھیلاتی، ہر سرگرمی کو الجھاتی ہچوئی سے بنیاد ہلا دینے والے میکانزم کے ابہام میں بکھرتی، ہر کیڑے کی پرواز کو زمین کی حرکت سے منسلک کرتی ہوئی، ماتحت کرتی ہوئی — کون جانے؟ اگر یہ صرف قانون کی شناخت ہوتی تو دم دار ستارے کا آسمان میں ارتقا پانی کے قطرے میں گھومتے ہوئے آبی جراثیم میں ہوتا۔اس مشین کے ذریعے جو ذہن نے تخلیق کی ہے، بڑے بڑے دندانوں والی، جس کی ابتدائی حرکت ایک مچھر ہوتا ہے، جس کا آخری پہیہ راس چکر (zodiac) ہوتا ہے۔

پھاٹک کی تبدیلی

ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اس باغیچے کی، جو پرانے زمانے میں بے مہار رازوں کو چھپانے کے لیے بنایا گیا تھا، قلبِ ماہیت ہو چکی ہے اور اب یہ خاص رازوں کے پناہ دینے کے لیے موزوں ہو گیا ہے۔ اب وہاں نہ آرام کی جگہ تھی اور نہ بانگ کے سبزہ زار تھے، نہ سرنگیں تھیں اور نہ غار رہ گئے تھے؛ وہاں اب ایک پُرشکوہ، پریشان حال اندھیرا تھا جو نقاب کی طرح ہر شے پر پڑا ہوا تھا۔ Paphos [ساحلی مقاماتِ تفریح] عدن بنا دیے گئے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہو گیا تھا کہ توبہ کے کس عنصر نے اس مقامِ تفریح کو صحت مند بنا دیا ہے۔ یہ گُل فروش لڑکی اپنے پھول روحوں کو پیش کرتی تھی۔ یہ بانکا باغیچہ، پہلے یقینی طور پر جس پر مصالحت کی گئی تھی، اب پاک دامنی اور شرم وحیا کی طرف لوٹ گیا تھا۔ ایک باغبان کی مدد سے ایک جج نے، جو اچھا آدمی تھا اور خود کو Lenotre کا تسلسل سمجھتا تھا، اس کو بدل دیا، کاٹا، اتر کیا، آراستہ کیا، اور نازبرداری کی جگہ میں ڈھال دیا تھا؛ فطرت نے ایک بار پھر اس کا قبضہ لے لیا، اسے سایے سے بھر دیا، اور اس کو محبت کے لیے سنوار دیا تھا۔

اس عالمِ تنہائی میں وہاں ایک دل بھی تھا جو بالکل تیار تھا۔ محبت کو صرف ظہور کرنا تھا؛ اس کے پاس ایک عبادت گاہ بھی تھی، تر و تازگی تھی، گھاس تھی، کائی تھی، پرندوں کے نظارے تھے، مہربان سایے تھے، ہلچل پیدا کرنے والی شاخوں اور ایک روح کے ساتھ جو مٹھاس سے، یقین سے، صاف دلی سے، آرزو سے اور فریبِ نظر سے بنی تھی۔

کوزیت خانقاہ چھوڑ کر جا چکی تھی، جب وہ تقریباً بچی سی تھی؛ چودہ برس سے کچھ زیادہ کی تھی جو احسان فراموش عمر ہوتی ہے؛ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ آنکھوں کے علاوہ وہ گھریلو سی

نہیں خوب صورت بھی تھی؛ اس میں کوئی بدنما نقوش نہیں تھے، مگر وہ ذرا بے ڈھب، دبلی تھی، بزدلی کے ساتھ بہادر بھی تھی، مختصر یہ کہ وہ خاصی بڑی لڑکی ہو گئی تھی۔

اس کی تعلیم ختم ہو چکی تھی، یعنی اسے مذہب کی بلکہ تاریخ کے بجائے دین داری کی تعلیم دی جا چکی تھی، ان چیزوں کے بارے میں بھی جنھیں خانقاہ میں جغرافیہ، گرامر، صفاتِ فعلی، فرانس کے بادشاہ، تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی نقش نگاری، وغیرہ کہا جاتا تھا؛ مگر اور معاملات میں وہ بالکل کوری تھی اور یہ بڑی موہ لینے والی خاصیت اور بہت خطرے کی بات بھی تھی۔ کسی نوجوان لڑکی کے نفس کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے؛ کہ بعد میں نظر کے دھوکے جو اچانک بھی ہوتے ہیں اور دل چسپ بھی، اس اندھیرے میں تشکیل پانے لگتے ہیں۔ اس کو نرمی اور احتیاط سے بلکہ حقائق پر غور و خوض سے روشن خیال بنانا چاہیے، بجائے اس کے کہ اس پر سخت اور براہِ راست روشنی ڈالی جائے۔ ایک کارآمد اور مہربان سادہ نصف روشنی ڈالنی چاہیے جو بچکانہ خطروں کو منتشر کرتی ہے اور زوال پذیری کو باز رکھتی ہے۔ وہاں کچھ نہیں ہوتا سوائے جبلتِ مادری کے، قابلِ تعریف باطنی دانش کنوار پن کی یادوں کے اور عورت کے تجربات کے، جو جانتی ہے کی یہ نصف روشنی کس طرح تخلیق کی جاتی ہے اور اسے کن باتوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

اس جبلت کو بڑھاپا نہیں جا سکتا۔ دنیا کی تمام راہبائیں مل کر بھی صرف ایک ماں کے برابر نہیں ہو سکتیں، جو ایک نوجوان لڑکی کے نفس کی تشکیل کرتی ہے۔

کوزیٹ کی اپنی ماں نہیں تھی۔ اس کی بہت سے مائیں تھیں۔

اور جہاں تک ژاں ولژاں کا معاملہ تھا، وہ تمام تر نرم دلی تھا، تمام تر تنہائی تھا؛ مگر وہ ایک بوڑھا آدمی تھا، اور کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اور اب، اس تعلیم کے کام میں زندگی کے لیے ایک عورت کی تیاری کے سنجیدہ معاملے میں، سائنس کو جس شے سے جنگ کرنی پڑتی ہے، وہ وسیع لاعلمی ہے، جسے معصومیت کہا جاتا ہے۔ کسی نوجوان لڑکی کو خانقاہ جس طرح تیار کرتی، کوئی اور شے نہیں کر سکتی۔ خانقاہ خیالات کو لاعلمی کی سمت موڑ دیتی ہے۔ اس طرح دل کو بھی خود اسی پر چھوڑ دیا جاتا ہے؛ اپنے اندر ہی وہ نیچے نیچے کام کرتا رہتا ہے، اس لیے کہ امڈ نہیں سکتا، [پیڑ کی جڑ کی طرح] نیچے کی طرف بڑھتا ہے، اس لیے کہ یہ پھیل نہیں سکتا۔ اس لیے ذہنی بصارتیں، مفروضات، تاویلات، رومانوں کے خاکے، مہمات کی خواہش، خیالی تعمیرات، شان دار عمارتیں پوری طرح اندر ہی اندر تعمیر ہوتی ہیں، اور جوں ہی کھلا دروازہ اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے ولولے اداس اور خفیہ رہائشوں میں فوراً

ہی رہنے کی جگہ پا جاتے ہیں۔ خانقاہ ایک دباؤ ہوتی ہے، انسانی دل پر فتح پانے کے لیے، جسے پوری زندگی قائم رہنا چاہیے۔

خانقاہ سے نکل جانے کے بعد کوزیت کو زیادہ پیاری اور پلومے اسٹریٹ کے گھر سے زیادہ خطرناک جگہ بھی مل سکتی تھی۔ آزادی کی شروعات سے تنہائی کا تسلسل آغاز ہوا تھا؛ پہلے ایک باغیچہ تھا جو بند تھا مگر اب ایک فطرت تھی جو تلخ و تیز تھی، زرخیز تھی شہوت پرست تھی اور معطر تھی؛ خواب ویسے ہی تھے جو خانقاہ میں آتے تھے مگر اب ان میں جوان آدمیوں کی جھلک ہوتی تھی، ایک قسم کی جالی تھی، مگر وہ جو سڑک پر کھلتی تھی۔

پھر بھی، جب وہ وہاں پہنچی، اور ہم اس حقیقت کو دہرانا چاہتے ہیں کہ، وہ صرف ایک بچی تھی۔ ژاں ولژاں نے یہ نظر انداز کردہ باغیچہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا، ''اب تم جو چاہو اس کے ساتھ کرو۔'' اس نے کوزیت کو خوش کر دیا؛ کوزیت نے سارے کنج، سارے تودے، سارے پتھر الٹ پلٹ دیے، غیر ضروری پودے نکال دیے؛ اس میں کھیلتی کودتی، اس وقت کا انتظار کرتی جب اس میں خواب دیکھتی؛ وہ اس باغیچے سے محبت کرتی تھی ان کیڑے مکوڑوں کے لیے جنھیں گھاس کے درمیان اپنے پیروں تلے پاتی تھی، اور اس دن کا انتظار کرتی جب اسے سر کے اوپر کی شاخوں کے درمیان سے ستارے نظر آنے لگتے۔

اور وہ اپنے باپ، یعنی ژاں ولژاں سے دل و جان سے محبت کرنے لگی تھی، معصومانہ اور دخترانہ ولولوں کے ساتھ جس نے اس نیک انسان کو اس کا چاہنے والا اور دل ربا ساتھی بنا دیا تھا۔ قاری کو یاد ہوگا کہ موسیو میڈیلین کو مطالعے کی عادت تھی۔ ژاں ولژاں نے یہ عادت برقرار رکھی تھی؛ وہ باتیں اچھی کرنے لگا تھا؛ خفیہ دولت کا حامل تھا اور اس میں ایک سچے اور منکسر ذہن کی خوش بیانی تھی جو طبعی طور پر از خود پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی مہربان عادتوں کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے اندر معقول تیزی قائم رکھی تھی۔ اس کا ذہن سخت اور دل نرم تھا۔ لگزمبرگ میں اپنی گفتگو کے دوران وہ کوزیت کو ہر شے کی تشریح پیش کرتا تھا، اپنے مطالعے کی بنیاد پر اور اس بنیاد پر بھی کہ اس نے کس کس بات پر دکھ اٹھائے تھے۔ اس کو سنتے وقت کوزیت کی آنکھیں بے مقصد ادھر اُدھر گھومتی رہتی تھیں۔

یہ سیدھا سادہ آدمی کوزیت کے خیالات کے لیے کافی تھا، اسی طرح جیسے اس کی آنکھوں کے لیے۔ وہ تتلیوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک جاتی تو اس کے پاس آکر کہتی تھی ''اف، میں کتنا دوڑی ہوں۔'' اور ژاں ولژاں اس کی پیشانی چوم لیتا تھا۔

کوزیٹ اس نیک طینت آدمی کی پرستش کرتی تھی۔ وہ ژاں ولواں کے لیے ہمیشہ مستعد رہتی تھی۔ جہاں ژاں ولواں ہوتا وہاں مسرت ہوتی تھی۔ ژاں ولواں نہ بنگلے میں رہتا تھا نہ باغیچے میں، اس کو پھولوں بھرے حصے سے زیادہ پکے عقبی صحن میں اور اپنی چھوٹی سی رہائش گاہ میں لطف آتا تھا؛ اسے منقش دیوار پوش پردوں اور طرے دار کرسیوں سے مزین بیٹھک کے مقابلے میں پیال سے بنی کرسیاں اچھی لگتی تھیں۔ کبھی کبھی ژاں ولواں اس سے منت سماجت کے لہجے میں کہتا، "اب جاؤ نا اپنے گھر میں، کچھ دیر کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

کوزیٹ اس کی نرمی سے فہمائش کرتی، جو بہت دلکش لگتی ہیں جب بیٹی کی جانب سے باپ کے لیے ہوتی ہیں۔ "بابا، میں آپ کے کمروں میں سردی محسوس کرتی ہوں؛ آپ یہاں کوئی قالین کیوں نہیں ڈال لیتے اور ایک اسٹوو بھی۔"

"پیاری بچی، دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو مجھ سے بہتر ہیں جن کے سروں پر چھتیں بھی نہیں ہیں۔"

"تو پھر میرے کمرے میں آگ کیوں ہوتی ہے، اور وہ سب چیزیں کیوں ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"اس لیے کہ تم عورت بھی ہو اور بچی بھی۔"

"ہونہہ، تو کیا آدمیوں کو سرد ہونا اور بے آرام رہنا چاہیے؟"

"مخصوص لوگوں کو۔"

"اچھا، تو پھر میں آپ کے پاس اتنی بار آؤں گی کہ آپ کو آگ جلانی پڑے گی۔"

اور پھر اس نے مزید کہا، "بابا، آپ ایسی بھیانک روٹی کیوں کھاتے ہیں؟"

"اپنی بیٹی کے لیے۔"

"اچھا، اگر آپ یہ کھائیں گے تو میں بھی یہی کھاؤں گی۔"

تب، کوزیٹ کو سیاہ روٹی کھانے سے روکنے کے لیے ژاں ولواں سفید روٹی کھانے لگا۔

کوزیٹ کے بچپن کی یادیں بہت الجھی ہوئی تھیں۔ وہ صبح شام اپنی ماں کے لیے دعا کرتی تھی جسے وہ جانتی بھی نہیں تھی۔ تھن آردیے میاں بیوی خواب کی دو ڈراؤنی صورتوں کی طرح اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ اسے یاد تھا کہ "ایک روز، رات کے وقت" وہ پانی لینے جنگل میں گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جگہ پیرس سے بہت دور تھی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا گویا وہ جہنم میں رہتی تھی۔ وہ ژاں ولواں تھا جس نے اسے رہائی دلائی تھی۔ اس کے بچپن

میں وہ وقت بھی آیا تھا کہ اسے اپنے اطراف سوائے بزارپا، مکڑیوں، اور چھپکلیوں کے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ سونے سے پہلے جب وہ غور کرتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ژاں ولیواں کی بیٹی تھی، کہ واقعی وہ اس کا باپ تھا۔ وہ تصور کرتی تھی کہ اس کی ماں کی روح اس نیک طینت آدمی میں حلول کر گئی ہے اور وہ اس کے پاس ہی رہتی ہے۔

جب وہ اس کے قریب بیٹھا ہوتا تو کوزیٹ اپنے رخسار اس کے سفید بالوں سے لگا دیتی، اس کی آنکھوں سے ایک خاموش آنسو ڈھلک جاتا اور دل ہی دل میں وہ خود سے کہتی تھی، ''شاید یہ آدمی ہی میری ماں ہے۔''

اگرچہ یہ کہنا بہت حیرت انگیز ہوگا، کوزیٹ کی معصومیت کے لیے جس کی نشوونما خانقاہ کے ماحول میں ہوئی تھی — کہ دوشیزگی ممتا کی کیفیات کو سمجھ ہی نہیں سکتی — اب کوزیٹ نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ اس کی کبھی کوئی ماں تھی۔ اسے تو اپنی ماں کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ جب کبھی وہ ژاں ولیواں سے سوال کرتی، ژاں ولیواں خاموش ہو جاتا۔ اگر وہ اپنا سوال دہراتی تو وہ مسکرا کر رہ جاتا۔ ایک بار اس نے اصرار کیا تھا اور اس کا تبسم ایک آنسو پر ختم ہوا تھا۔

ژاں ولیواں کی خاموشی نے فانتین پر اندھیروں کا پردہ ڈال دیا تھا۔

کیا یہ عاقبت اندیشی تھی؟ کیا یہ احترام تھا؟ کیا یہ خوف تھا کہ خطرات اس کی یاد سے کسی اور کی یادوں میں منتقل ہو جائیں گے؟

جب تک کوزیٹ بچی تھی ژاں ولیواں اس کی ماں کے بارے میں باتیں کرتا تھا؛ جب وہ نوجوان عورت بن گئی تو اس کے لیے یہ ناممکن ہو گیا تھا۔ اس کو اب ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ کیا یہ کوزیٹ کی وجہ سے تھا؟ کیا یہ فانتین کی وجہ سے تھا؟ ژاں ولیواں کے نزدیک اس سایے کا کوزیٹ کے خیالوں میں داخل ہونا ایک مذہبی دہشت ہوگی؛ اور اپنے مقسوم میں ایک تیسری شخصیت کی شمولیت ہوگی۔ یہ پرچھاؤں اس کے لیے جس قدر محترم تھا اسی قدر خوف زدہ کر دینے والا بھی تھا۔ جب بھی فانتین کا خیال آتا اس پر خاموشی کا غلبہ ہو جاتا تھا۔

اندھیرے میں اسے کوئی مبہم سی شے لبوں پر انگلی رکھے دکھائی دیتی تھی۔ کیا وہ ساری شرم وحیا جو فانتین میں تھی، جو اس کی زندگی ہی میں اچانک اسے چھوڑ گئی تھی، اس کی موت کے بعد واپس آ گئی ہے اور قبر میں اس کو سکون سے رکھنا چاہتی ہے۔ تو کیا ژاں ولیواں نے لاشعوری طور پر دباؤ کے آگے سر جھکا دیا تھا؟ ہم جو موت پر یقین رکھتے ہیں، ان میں سے نہیں جو اس پُراسرار تشریح کو رد کر دیں گے۔

لہٰذا کوزیت کی خاطر بھی فانتین کا نام لینا ممکن نہیں تھا۔

ایک دن کوزیت نے اس سے کہا "بابا، میں نے کل رات ماں کو خواب میں دیکھا ہے۔اس کے شانوں پر دو بڑے بڑے پَر تھے۔اپنی زندگی میں وہ سینٹ جیسی رہی ہوگی۔"

"شہادت کے ذریعے۔" ژاں والژاں نے جواب میں کہا۔

ژاں والژاں بہر حال خوش تھا۔

جب بھی کوزیت ژاں والژاں کے ساتھ باہر جاتی دل کی گہرائیوں سے خوش اور مطمئن،اس کے بازو کے سہارے چلتی تھی۔ژاں والژاں کو نرمی اور شفقت کی ان تمام چنگاریوں سے جو خصوصاً اس کے لیے تھیں، اپنا دل اندر ہی اندر خوشی سے پگھلتا محسوس ہوتا تھا۔ ملکوتی مسرتوں کی طغیانی اس بے چارے کو لرزہ دیتی تھی؛ وجد کے عالم میں وہ خود سے کہتا کہ وہ ان نعمتوں کو زندگی بھر نہیں بھولے گا؛ وہ خود سے کہتا کہ اس نے اتنے دکھ نہیں سہے ہیں کہ ایسی تابندہ نعمت کا حق دار ہوتا۔اپنی روح کی گہرائیوں سے وہ خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اس نے اس جیسے بدنصیب کو ایک معصوم وجود سے اس طرح چاہے جانے کی اجازت دی ہے۔

۞

گلاب سمجھتا ہے کہ وہ جنگ کا انجن ہے

ایک دن اتفاق سے کوزیٹ نے اپنے آپ کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ اس نے خود سے کہا، ''واقعی؟'' اسے تقریباً ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ حسین عورت ہے۔ وہ عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ اب تک اس نے اپنے چہرے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا ضرور تھا، مگر خود پر غور نہیں کیا تھا۔ اور یہ بھی کہ اب تک اس سے یہی کہا جاتا تھا کہ وہ سادہ سی بھدی سی لڑکی ہے؛ صرف ژاں ولژاں نے کہا تھا، ''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!'' ہر موقعے پر کوزیٹ نے خود کو بھدی اور سادہ لڑکی ہی سمجھا اور اسی تصور کی چھاؤں میں وہ بچپنے سے لڑکپن میں داخل ہوئی تھی۔ اور اب، اچانک اس کا آئینہ اس سے وہی کہہ رہا تھا جو ژاں ولژاں نے کہا تھا، ''نہیں، ہرگز نہیں!'' اس رات وہ سو نہیں سکی۔ ''اور اگر میں خوب صورت ہوں تو کیا ہوا؟'' اس نے سوچا۔ 'اور اگر میں واقعی خوب صورت ہوئی تو کتنا عجیب عجیب سا محسوس ہوگا؟' اور پھر وہ اپنی ان ساتھیوں کو یاد کرنے لگی جن کے حسن نے خانقاہ میں سنسنی پھیلا دی تھی اور پھر اس نے خود سے کہا، ''واقعی، کیا میں میڈموزیل فلاں اور فلاں جیسی حسین ہوں؟''

اگلی صبح اس نے خود کو ایک بار پھر دیکھا؛ اس بار دیکھنا حادثاتی نہیں تھا اور خیالات اس پر حملہ آور ہو گئے تھے، ''ارے یہ خیال میرے دل میں کہاں سے آ گیا؟'' اور اس نے خود سے کہا تھا، ''نہیں، نہیں، میں بدشکل ہوں۔'' رات وہ ٹھیک سے سوئی بھی نہیں تھی، یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور وہ زرد ہو رہی تھی۔ پچھلی شام اسے اس خیال سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی کہ وہ خوب صورت ہے مگر وہ افسردہ بھی تھی کہ وہ اس بات پر مزید یقین نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پھر خود کو آئینے میں نہیں دیکھا اور دو ہفتے تک وہ اپنے بال بناتی تو آئینے کی طرف پشت رکھتی۔

شام کے وقت، ڈنر کے بعد بیٹھک میں عام طور پر وہ اُونی بُنائی کرتی یا خانقاہ کے لیے کچھ کڑھائی اور کروشیا کاری کرتی، اور اس کے قریب بیٹھا ژاں ولیواں مطالعے میں مصروف ہوتا تھا۔ ایک بار یوں ہوا کہ اس نے اپنے کام سے نظریں اٹھائیں اور یہ دیکھ کر وہ بہت مضطرب ہوئی کہ اس کا باپ اسے عجیب انداز سے گھور رہا تھا۔

ایک اور موقعے پر، جب وہ سڑک پر جا رہی تھی، اسے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی اس کے پیچھے تھا، جسے وہ دیکھ نہیں سکی تھی، اور اس نے کہا تھا، "خوب صورت عورت! مگر بد صورت لباس میں۔" "ہونہہ!" اس نے سوچا، "یہ بات وہ میرے بارے میں نہیں کہہ رہا ہے۔ میں اچھے لباس میں ہوں اور بد صورت ہوں۔" اس وقت وہ رویں دار ہیٹ اور مالینے کی پیشواز میں ملبوس تھی۔

آخرش، ایک دن جب وہ باغیچے میں تھی اس نے بے چاری تُوسا کو کہتے سنا، "جناب عالی! آپ نے غور کیا، کوزیت کتنی حسین ہوتی جا رہی ہے؟" کوزیت نے اپنے باپ کا جواب تو نہیں سنا مگر تُوسا کے الفاظ نے اس کے اندرون میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ وہ باغیچے سے بھاگی، دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی، اُڑتی ہوئی آئینے کے پاس پہنچی — تین ماہ ہو گئے تھے، کہ اس نے خود کو نہیں دیکھا تھا — اور وہ چیخ پڑی۔ اس نے خود کو خیرہ کر دیا تھا۔

وہ واقعی خوب صورت اور دل فریب لگ رہی تھی؛ اب وہ تُوسا اور اپنے آئینے دونوں سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس کے خدوخال اُبھر آئے تھے۔ اس کی جلد سفید ہو گئی تھی، اس کے بال چمک دار ہو گئے تھے، اس کی نیلی آنکھوں میں ایک غیر مانوس سی تاب ناکی آ گئی تھی۔ ایک ہی جھماکے میں، اچانک آ جانے والی دن کی روشنی کی طرح اس پر اپنا حسن منکشف ہوا تھا؛ اوروں کو بھی اس کا احساس ہو چلا تھا؛ تُوسا نے بھی یہی کہا تھا، ظاہر ہے کہ وہ کوزیت ہی تھی جس کے بارے میں سڑک پر چلنے والے نے کہا تھا؛ اس میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا؛ وہ ایک بار پھر باغیچے میں آئی اور اب وہ خود کو کسی ملکہ کی طرح محسوس کرنے لگی تھی؛ اس کے خیالوں میں چڑیوں کے چہچہے گونج رہے تھے حالاں کہ سردی کا موسم تھا؛ آسمان اچانک زرنگار ہو گیا تھا، پیڑوں کے درمیان سورج آ گیا تھا، جنگلوں میں پھول کِھل اُٹھے تھے، خیالات میں انتشار پیدا ہو گیا تھا، ایک وحشت سی آ گئی تھی، اور ایک ناقابلِ بیان سرور سا چھا گیا تھا۔

ادھر ژاں ولیواں تھا۔ اس کے دل کو بھی ایک عمیق اور ناقابلِ وضاحت افسردگی کا تجربہ ہو رہا تھا۔ دراصل، وہ بھی کافی دنوں سے خوف کے عالم میں اس حسن کو دیکھ رہا تھا جو روز بہ روز کوزیت کے پیارے چہرے پر درخشاں ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سویرا جو سب کے لیے مسکرا رہا تھا،

اس کے لیے افسردگی ہو گیا تھا۔

کوزیٹ کافی دنوں سے خوب صورت نظر آنے لگی تھی جس کی خود اسے بھی خبر نہ تھی۔
مگر پہلے ہی دن سے، اس غیر متوقع اجالے نے جو آہستہ آہستہ اس نوجوان لڑکی کے وجود پر غالب آتا جا رہا تھا ژاں ولژاں کی ملول آنکھوں کو زخمی کر دیا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ یہ تبدیلی ہے ایک خوش وخرم زندگی میں، ایسی خوش باش زندگی میں، جسے تہ وبالا کرنے کے خوف سے وہ کوئی قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔ یہ شخص، جو ہر قسم کے مصائب سے گزرا تھا، آج بھی جس کے مقسوم کے زخموں سے خون رس رہا تھا، جو تقریباً بدمعاش تھا، اور تقریباً سنت بن گیا تھا، جس نے بادبانی جہازوں کے چپو چلائے تھے اور زنجیریں کھینچی تھیں، آج لامتناہی بدنصیبی کی غیر مرئی اور بھاری زنجیریں کھینچ رہا تھا؛ وہ شخص، قانون نے ابھی تک جسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا تھا، جو کسی لمحے گرفتار کیا جا سکتا تھا اور اپنی نیک نامی کے دھند سے عوامی رسوائی کی روشنی میں واپس لایا جا سکتا تھا، سب کچھ قبول کر لیا تھا؛ ہر بات پر افسوس کر چکا تھا؛ سب کو معاف کر چکا تھا، اور آدمی سے، قانون سے، سماج سے، فطرت سے، دنیا سے صرف ایک امر پر تال اندیشی کا طالب تھا اور وہ کوزیٹ کی محبت تھی۔

کہ ہو سکتا ہے کوزیٹ اس سے محبت کرتی رہے — کہ خدا اس بچی کے دل کو اس تک آنے سے، اس کے ساتھ رہنے سے نہیں روکے گا۔ کوزیٹ کا محبوب ہو کر اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے سارے زخم مندمل ہو گئے ہیں، اسے سکون مل گیا ہے، تشفی ہو گئی ہے، اجرت مل گئی ہے، اور وہ سرفراز ہو گیا ہے۔ کہ کوزیٹ کا محبوب ہونا اس کے لیے بہت تھا۔ وہ اور کچھ نہیں چاہتا تھا۔ اگر کوئی اس سے کہتا، ''کیا تمھیں اور کچھ بہتر چاہیے؟'' تو اس نے جواب دیا ہوتا ''نہیں۔'' اگر خدا اس سے کہتا، ''کیا تمھیں جنت چاہیے؟'' اس کا جواب ہوتا۔ ''میرا نقصان ہو جائے گا۔''

ہر وہ شے جو اس کیفیت پر اثر انداز ہوتی تھی، خواہ وہ سطحی ہی کیوں نہ ہو، اسے کسی نئی ابتدا کی طرح لرزہ دیتی تھی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ عورت کے حسن کا مطلب کیا ہوتا ہے، مگر جبلی طور پر وہ اسے کوئی خوف ناک شے سمجھتا تھا۔

اس حسن کو وہ خوف سے گھورتا تھا جو ہمہ وقت اس کے پہلو میں، اس کی آنکھوں کے نیچے، اس بچی کی معصوم پیشانی پر، بھدے پن کی گہرائیوں سے نکل کر اس کی عمر رسیدگی میں، اس کی بدبختی میں اس کی نجات سے محرومی میں بھی فاتحانہ انداز میں کھل رہا تھا۔

وہ خود سے کہتا تھا، ''کتنی خوب صورت ہے یہ لڑکی! میرا کیا حال ہو گا؟''

مگر ایک فرق تھا اس کی شفقت اور مادرانہ شفقت کے درمیان۔ جسے وہ پریشانی سے دیکھتا تھا، ایک ماں اسے مسرت سے نظر بچا کر دیکھتی۔

تبدیلی کے پہلے آثار پیدا ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

جس دن اس نے خود سے کہا تھا، ''میں واقعی خوب صورت ہوں۔'' اس کے اگلے دن ہی سے کوزیٹ نے اپنی سنگھار پر توجہ دینی شروع کردی تھی۔ وہ اس راہ گیر کا تبصرہ ''خوب صورت عورت! مگر بدصورت لباس میں۔'' بھولی نہیں تھی۔ ایک غیبی آواز تھی جو اس کے پاس سے ہو کر گزر گئی تھی مگر اس کے دل میں دو جراثیم چھوڑ گئی تھی، ایک وہ جو بعد میں عورت کی پوری زندگی کو ناز و ادا سے بھر دے گا، دوسرا محبت سے۔

حسن پر اس کے یقین نے اس کے اندرون میں پورے نسوانی نفس کو پھیلا دیا تھا۔ اسے اپنی مالینے کی پیشواز پر خوف اور روئیں والی ہیٹ پر شرم آنے لگی تھی۔ اس کے بابا نے اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کی تھی۔ اس نے ایک ساتھ ہی سرپوش، پیشواز، جالی، بوٹ، آستین کے کف اور جو کچھ فیشن میں تھا سب منگوا لیا تھا؛ وہ نئے رنگ بھی، اور نئی سائنسی اشیا بھی جو پیرس کی عورتوں کو دل ربا، عمیق اور خطرناک بنا دیتی تھیں۔ ایک نئی اصطلاح heady woman پیرس کی عورتوں کے لیے ہی ایجاد کی گئی تھی۔

ایک ماہ سے کم عرصے میں بابل اسٹریٹ کے قدیم علاقے میں ننھی کوزیٹ پیرس کی سب سے خوش لباس عورتوں میں سے ایک بن گئی تھی، جو بہت بڑی بات تھی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کبھی اپنے اس راہ گیر سے مجادلہ کرتی اور دیکھتی کہ اب وہ کیا کہتا ہے اور اس کو سبق سکھا دیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر طرح سے بے حد و حساب خوش تھی اور اب تو وہ Gerard اور Herbaut کی بنائے ہوئے سرپوشوں کے فرق میں حیران کن امتیاز بھی کر سکتی تھی۔

ژاں ولژاں اس غارت گری کو دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ سوائے رینگنے کے وہ اور کچھ نہیں کر سکتا، یا زیادہ سے زیادہ چل پھر سکتا تھا، اب کوزیٹ کے پر پُرزے نکلتے دیکھ رہا تھا۔

کوزیٹ کے سنگھار کو دیکھ کر کوئی بھی عورت بتا سکتی تھی کی اس کی ماں نہیں ہے۔ کوزیٹ چھوٹی چھوٹی معقولیات، مخصوص نوعیت کے رسوم و آداب کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر اس کی ماں ہوتی تو اس نے کوزیٹ کو بتایا ہوتا کہ نوجوان لڑکیوں کو damask نہیں پہننا چاہیے۔

پہلے دن جب کوزیٹ اپنا سیاہ damask کا گاؤن اور سفید کریپ کا سرپوش پہن کر باہر گئی تو اس نے ژاں ولژاں کا بازو تھام لیا تھا؛ وہ بہت خوش، تابندہ، گلابی، پُرتکلف، فاخرہ اور

خیرہ کُن ہو رہی تھی۔ ”بابا“ اس نے کہا تھا، ”میں اس لباس میں کیسی لگتی ہوں؟“ ژاں ولواں نے ایسی آواز میں جواب دیا تھا جو کسی حاسد انسان کی تلخ آواز سے مشابہ تھی، ”بہت دل فریب!“ چہل قدمی کے دوران ژاں ولواں عام دنوں کی طرح ہی تھا۔ گھر واپسی پر اس نے کوزیٹ سے پوچھا تھا، ”تم وہ دوسرا گاؤن کیوں نہیں پہنتیں — تم سمجھ گئی ہوگی، وہی والا؟“

یہ بات کوزیٹ کے کمرے میں ہوئی تھی۔ کوزیٹ الماری کی طرف مڑی جس میں اسکول کے زمانے کے ازکار رفتہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

”وہ کپڑے!“ اس نے کہا ”بابا، آپ کیا چاہتے ہیں؟“ ”ارے نہیں! میں ان خوف ناک کپڑوں کو اب کبھی نہیں پہنوں گی۔ اس سرپوش کے ساتھ تو میں بالکل ’مادم پاگل کتیا‘ لگوں گی۔“

ژاں ولواں نے ایک گہرا سانس لیا۔

اس لمحے کے بعد، اس نے غور کرنا شروع کیا کہ کوزیٹ، جو ہمیشہ گھر ہی میں رہنا چاہتی تھی اور کہتی تھی: ”بابا، میں آپ کے ساتھ رہ کر زیادہ خوشی محسوس کرتی ہوں۔“ اب ہمیشہ باہر جانا چاہتی تھی۔ دراصل، اس کا خیال تھا کہ ایسے خوب صورت چہرے اور عمدہ لباس سے کیا فائدہ، اگر اس کا مظاہرہ نہ کیا جا سکے۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ اب کوزیٹ کو عقبی باغیچے سے کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی ہے۔ اب وہ اگلے باغیچے کو پسند کرتی تھی، اور اسے جنگلے والی باڑھ کے سامنے آگے پیچھے چلنا ناپسند نہیں تھا۔ ژاں ولواں جو ذرا شرمیلا تھا، باغیچے میں قدم بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ کسی کتے کی طرح خود کو عقبی صحن تک ہی محدود رکھتا تھا۔

یہ جانتے ہیں کہ وہ خوب صورت ہے، کوزیٹ حسن کو نظر انداز کرنے کی نعمت کھو بیٹھی تھی۔ اس حسن کے لیے جو سادگی سے بڑھایا جاتا ہے نزاکت کی نعمت ناقابلِ بیان ہوتی ہے، اور کوئی شے اتنی پیاری نہیں ہوتی جتنی کہ ایک چکاچوند کر دینے والی اور معصوم مخلوق جو اپنے ہاتھ میں جنت کی کنجی لیے ساتھ چل رہی ہو اور اس کو اس بات کا احساس بھی نہ ہو۔ مگر کوزیٹ نے جو کچھ معصومانہ نعمت میں کھویا تھا اپنی اداس دل ربائی میں حاصل کر لیا تھا۔ اس کے پورے وجود میں جوانی کا لطف، معصومیت اور حسن سرایت کر گیا تھا اور اس کی شخصیت ایک دلکش غمگینی پیش کر رہی تھی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب، چھ ماہ بعد، ماریوس نے ایک بار پھر اسے، لکزمبرگ میں دیکھا تھا۔

اور جنگ شروع ہوگئی

ماریوں کی طرح کوزیت بھی اپنے سایے میں جلنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ مقدر اپنے پُر اسرار اور مہلک صبر کے ساتھ دھیرے دھیرے ان دونوں کو قریب لا رہا تھا۔ جذبات کی طوفانی بجلی سے پُر یہ دونوں نفوس محبت کا بار لیے بجلی سے بھرے دو بادلوں کی طرح تھے جو ابل پڑنے پر اور اس طرح مل جانے پر تیار تھے، جیسے بجلی کے جھماکے کے درمیان دو بادل۔

محبت کی داستانوں میں نظر کو اس بُری طرح استعمال کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بدنام ہوگیا ہے۔ آج کل مشکل ہی سے کہا جا سکے گا کہ دو وجود ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں انھوں نے ایک دوسرے کی طرف نظر کی تھی۔ پھر بھی، یہی طریقہ ہے محبت میں گرفتار ہونے کا، باقی سب کچھ بعد میں ہوتا ہے۔ اس قسم کی سنسنی سے زیادہ حقیقی کوئی شے نہیں ہوتی، دو نفوس چنگاری کی صورت میں ایک دوسرے تک جس کی ترسیل کرتے ہیں۔

اس وقت جب کوزیت نے لاشعوری طور پر وہ نظر ڈالی تھی ماریوں جس سے پریشان ہوگیا تھا، ماریوں کو شبہ بھی نہیں تھا کہ اس نے بھی ایسی نظر ڈالی تھی جس نے کوزیت کو پریشان کر دیا ہے۔

ماریوں نے بھی کوزیت کے ساتھ ویسی ہی اچھائی اور ویسی ہی برائی کی تھی۔

کوزیت کو اسے غور سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی اور اس نے بھی ماریوں کی اسی طرح جانچ پڑتال کی تھی جیسے دوسری لڑکیاں کرتی ہیں، جب کہ وہ کسی اور طرف دیکھتی نظر آتی ہیں۔ ماریوں کوزیت کو اب بھی بدصورت سمجھتا تھا، جب کہ کوزیت نے اس کو خوش رو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر چوں کہ ماریوں اس پر توجہ نہیں کرتا تھا، کوزیت کے لیے یہ نوجوان کچھ بھی نہیں تھا۔

پھر بھی، کوزیت خود سے یہ کہنے سے باز نہیں آتی تھی کہ اس کے بال خوب صورت ہیں،

آنکھیں خوب صورت ہیں، دانت اچھے ہیں، اور اس کی آواز بھی اچھی ہے، جب اس نے ماریوں کو اپنے ساتھیوں سے بات کرتے سنا تھا۔ جب وہ چلتا تھا تو اس کا انداز اچھا نہیں ہوتا تھا، مگر اس کی چال میں شان تھی جو خود اس کی اپنی تھی کہ وہ احمق نہیں معلوم ہوتا تھا، کہ اس کی پوری شخصیت شریفانہ، نرم خو، سادہ تھی، فاخر تھی اور مختصر یہ کہ اگر چہ وہ مفلس معلوم ہوتا تھا، مگر اس کا انداز اچھا تھا۔

اس دن بالآخر جب ان کی آنکھیں مل گئیں، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے وہ پہلی مبہم، اور ناگفتنی باتیں ہوئی تھیں جو ہکلا ہکلا کر ہوتی ہیں، کوزیٹ جنھیں پہلے سمجھ نہیں سکی تھی۔ خیالات میں غرق وہ l'Ouest اسٹریٹ واپس ہوئی جہاں عادت کے مطابق ژاں ولژاں چھ ہفتوں کے لیے آتا تھا۔ دوسری صبح آنکھ کھلی تو وہ اس حیرت انگیز آدمی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس قدر مختلف اور سرد مہر تھا، اور اب اس کی طرف توجہ دینے لگا تھا، اور اسے خبر بھی نہیں تھی کہ یہ توجہ صرف اسی کے لیے تھی۔ اس کے برعکس کوزیٹ اس وجیہ اور متکبر نوجوان سے ناراض تھی۔ اس کے اندرون میں ایک جنگ کی سی کیفیت تیار ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں اچانک ایک خیال ابھرا، جس نے اسے بچوں کی سی خوشی سے بھر دیا، اور وہ خیال یہ تھا وہ اس سے بدلہ لینے والی ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ وہ خوب صورت عورت تھی، اسے اچھی طرح احساس تھا، اگر چہ مبہم تھا، کہ وہ ہتھیار سے لیس تھی۔ عورتیں اپنے حسن سے اسی طرح کھیلتی ہیں جیسے نا سمجھ بچہ چاقو سے کھیلتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا تھا۔

قاری کو ماریوں کا تامل، اس کے دل کی دھڑکنیں، اس کی خوف زدگی یاد ہو گی۔ ماریوں اپنی جگہ بیٹھا رہتا اور اس کے قریب آتا بھی نہیں تھا۔ اس نے کوزیٹ آزردہ کر دیا تھا۔ ایک دن کوزیٹ نے ژاں ولژاں سے کہا: ''بابا آج ذرا اس طرف چہل قدمی ہو جائے۔'' حیرت کی بات ہے کہ نوجوان مرد میں محبت کی پہلی نشانی بزدلی ہوتی ہے اور جوان لڑکی میں دلیری ہوتی ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے مگر سادہ بھی نہیں ہے۔ اسی کو دو جنسوں کا ایک دوسرے کی طرف مائل ہونا کہتے ہیں، اور یہ ان کی فطری خصوصیات ہوتی ہیں۔

اسی دن کوزیٹ کی نظر نے اسے ماریوں کی طرف راغب کر دیا، اور ماریوں کی نظر نے کوزیٹ کو لرزہ دیا تھا۔ ماریوں اعتماد کے ساتھ اور کوزیٹ بے چین واپس ہوئی۔ اس دن کے بعد سے دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگے تھے۔

پہلی بات جو کوزیٹ نے محسوس کی تھی، کہ وہ الجھی ہوئی اور افسردہ تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس دن کے بعد سے اس کا نفس سیاہ ہو گیا تھا۔ جوان لڑکی کے اندرون کا اجلا پن،

سرد مہری اور چٹیلے پن سے لبریز، بالکل برف کی مانند ہوتا ہے۔ محبت میں یہ پگھلنے لگتا ہے، جو اس کے لیے سورج بن جاتی ہے۔

کوزیٹ نہیں جانتی کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اس نے نہ کبھی یہ لفظ سنا تھا نہ دنیاوی معنوں میں ادا کیا تھا۔ غیر مذہبی موسیقی کی کتابیں جب خانقاہ میں داخل ہوتی تھیں تو عاشقانہ لفظ (محبت) کو ڈھولک یا طبلے سے بدل دیا جاتا تھا۔ یہ عمل ایک پہیلی بن جاتا تھا جو بڑی لڑکیوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا جیسے، ارے واہ! یہ ڈھولک کتنی خوب صورت ہے! یا، افسوس کہ یہ ڈھولک نہیں! مگر کوزیٹ تو ''ڈھولک'' سے پہلے ہی خانقاہ چھوڑ چکی تھی۔ اس لیے جن اشیا کا اسے اب احساس ہوتا تھا وہ انھیں کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ کیا وہ شخص خود کو کم بیمار محسوس کرتا ہے، اگر اسے بیماری کا نام معلوم نہ ہو؟

وہ اور بھی زیادہ جذبے کے ساتھ محبت کرنے لگی تھی، اس لیے کہ اس کی محبت معصومیت سے لبریز تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ اچھی ہے یا بُری، فائدہ مند ہے یا نقصان دہ، ابدی ہے یا عارضی، حلال ہے یا حرام: بس وہ محبت کرتی تھی۔ بتیناوہ اچنبھے میں پڑ جاتی تھی اگر کوئی اس سے کہہ دیتا، ''کیا تم سوتی نہیں ہو؟ مگر یہ تو ممنوع ہے! کیا تم کھانا نہیں کھاتیں؟ کیوں، یہ تو بہت بُری بات ہے۔ کیا تمھارا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے؟ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جب کوئی آدمی سیاہ لباس پہنے سبزہ زار کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے تو تم شرما کر زرد کیوں پڑ جاتی ہو؟ مگر یہ تو قابلِ نفرت ہے۔'' وہ ایسی تمام باتوں کو سمجھ نہ پاتی اور جواب میں کہہ دیتی، ''ایسے معاملات میں میرا کیا قصور ہے میں جن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور جن کو کرنے کی مجھ میں سکت نہیں؟''

پھر یوں ہوا کہ محبت جس کا ظہور ہوا تھا، اس کے نفس کی کیفیات کے لیے بالکل موزوں نکلی۔ یہ ایک قسم کی فاصلے سے تعریف جیسی بات تھی، ایک بے زبان تصور تھا، ایک اجنبی کی پرستش تھی۔ یہ آسیب تھا جوانی سے جوانی تک کا؛ راتوں کا خواب تھا جو حقیقت ہونے کے باوجود خواب ہی تھا کسی خیالی وہمی صورت نے جس کی تشکیل کی تھی اور بالآخر اسے گوشت پوست بنا دیا تھا، اور اس کے باوجود اس کا نہ کوئی نام تھا، نہ غلطی تھی، نہ کوئی جگہ تھی، نہ کوئی احتیاج تھی، نہ کوئی عیب تھا؛ اگر اسے ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکے گا کہ دور سے محبت کرنے والی جو آورش میں مست تھی، کوئی محبوبہ تھی جس کا اپنا وجود تھا۔ کسی قریبی یا زیادہ حسی ملاقات نے کوزیٹ کو ابتدائی منزل ہی میں متنبہ کر دیا ہوتا جب اس کا آدھا وجود خانقاہ کی مبالغہ آمیز دھند میں غرق تھا۔ اس میں بچوں کے تمام خوف اور راہباؤں کے تمام خوف یک جا ہو گئے تھے۔ خانقاہ کے جذبات پانچ برس کے عرصے میں جو اس میں سرایت کر گئے تھے، بخارکی صورت رفتہ رفتہ خارج ہو رہے تھے

اور اس کے اطراف کی ہر شے کو لرزہ رہے تھے۔ ایسی صورت میں وہ شخص عاشق نہیں تھا، اس کا شیدائی تک نہیں تھا، وہ ایک کشف تھا۔ اب وہ ماریوں سے کسی دل آویز، نورانی اور ناممکن شے کی طرح محبت کرنے لگی تھی۔

چوں کہ حد سے زیادہ معصومیت عشوہ گری سے ملتی ہے، کوزیٹ بڑی فراخ دلی سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔

کوزیٹ ہر روز بے صبری سے اپنی چہل قدمی کا انتظار کرتی، اور وہاں ماریوں کو موجود پاتی؛ پہلے تو وہ بے حد خوش ہوتی اور پوری سنجیدگی سے اپنے تمام تر خیالات کا اظہار کرتی تھی؛ ایک دن اس نے ژاں ولژاں سے کہا تھا، لکسمبرگ کا باغ کتنا دل خوش کن ہے۔"

ماریوں اور کوزیٹ ایک دوسرے کے بارے میں اندھیرے میں تھے۔ وہ ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوتے تھے، ایک دوسرے کو سلام نہیں کرتے تھے، ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں تھے؛ مگر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے؛ اور آسمان کے ستاروں کی طرح جو کئی ملین لیگ کے فاصلے پر ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر زندہ رہتے تھے۔

اور اس طرح ہوا کہ کوزیٹ رفتہ رفتہ عورت بنتی گئی، اور اپنے حسن کے شعور کے ساتھ اپنی محبت سے لاپروا، خوب صورت اور پیار کرنے والی بن گئی۔ وہ اپنی معصومیت کے بہانے عشوہ گری بھی کرتی تھی۔

۞

افسردگی سے بڑھ کر افسردگی

ہر قسم کے حالات کی اپنی اپنی خاصیت ہوا کرتی ہے۔ قدیم اور ابدی مادرِ فطرت نے ژاں ولواں کو چپکے سے ماریوس کی موجودگی کے بارے میں تنبیہ کر دی تھی۔ ژاں ولواں اپنی روح کی گہرائیوں تک لرز گیا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا پھر بھی اس کی مرتکز توجہ اسے وہ ظلمت دکھا رہی تھی وہ جس میں چل رہا تھا، گویا اس کی ایک جانب کسی قسم کی تعمیر ہو رہی تھی اور دوسری جانب کوئی شے مسمار ہو رہی تھی۔

ماریوس کو بھی اسی قدیم مادرِ فطرت اور قانونِ خداوندی کی جانب سے اشارہ مل گیا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ "اس باپ" کی نظروں سے دور رہے۔ مگر اب ژاں ولواں نے اس کی جاسوسی شروع کر دی تھی۔ ماریوس کے ارادے فطری نہیں رہ گئے تھے۔ وہ ذومعنی زیرکی اور بے معنی دلیری دکھا رہا تھا۔ اب وہ ان کے قریب آنے سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ اب وہ ان سے دور جا بیٹھتا اور ظاہر داری کرتا کہ وہ پڑھ رہا ہے؛ وہ ایسا کیوں کرنے لگا تھا؟ پہلے وہ پرانا کوٹ پہن کر آتا تھا، اب وہ ہر روز ایک نیا کوٹ پہن کر آنے لگا تھا؛ ژاں ولواں کو یقین نہیں تھا کہ اس نے اپنے بال گھنگھریالے کرا نہیں لیے ہیں، اس کی آنکھیں بہت کھوجتی تھیں؛ وہ دستانے پہنتا تھا؛ مختصر یہ کہ ژاں ولواں اب ماریوس سے سخت نفرت کرنے لگا تھا۔

کوزیت نے بھی اب خود سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سمجھے بغیر کہ معاملہ کیا ہے وہ قائل ہو گئی تھی کہ کوئی بات ہے ضرور اور اسے چھپانا بھی پڑے گا۔

کوزیت کے ذوقِ آرائش میں، جو حال ہی میں پیدا ہوا تھا اور اجنبی کی ہر روز نیا کوٹ پہننے کی روش میں بھی ایک اتفاق تھا جو ژاں ولواں کو بہت ناگوار تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حادثاتی

ہو سکتا تھا، مگر یہ ایک خطرناک حادثہ تھا۔

ژاں ولیواں نے اس اجنبی کے بارے میں کوزیت سے کبھی کوئی بات نہیں کی، مگر ایک دن وہ ایسا کرنے سے باز نہیں رہ سکا اور اس مبہم نا امیدی سے جو اچانک امیدوں کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے، اس نے کوزیت سے کہا تھا، ''عجیب خودنمائی کی عادت ہے، اس شخص میں!''

ایک برس پہلے، جب وہ محض ایک لاپروا لڑکی تھی، اگر اس بارے میں سوال کیا جاتا تو اس کا جواب ہوتا، ''کیوں؟ نہیں تو! یہ تو بہت دل رُبا ہے۔'' اور دس برس بعد جب ماریوس کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتی تو اس کا جواب ہوتا: ''واقعی خودنما ہے۔ نظروں کے لیے ناقابلِ برداشت! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''— اس وقت کے حالاتِ زندگی اور دل کے معاملات کے پیشِ نظر اس کا پُرسکون جواب تھا، ''وہ نوجوان!'' گویا، اس نے زندگی میں پہلی بار اسے دیکھا ہے۔

'میں بھی کتنا احمق ہوں۔' ژاں ولیواں نے سوچا، ''کوزیت نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے خواہ مخواہ اسے اس کی طرف متوجہ کر دیا۔''

اُف! یہ سادگی بزرگوں کی، اف! یہ گہرائی بچوں کی۔

دُکھوں اور مشکلات کے ان ابتدائی دنوں کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہوتا ہے کہ محبت کے پہلے شگفتہ تنازعات اور پہلی مزاحمتوں کے باعث نوجوان لڑکیاں خود کو کسی جال میں پھنسنے کی اجازت نہیں دیتیں اور نوجوان لڑکے ہر جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ژاں ولیواں نے ماریوس کے خلاف ایک غیر اعلانیہ جنگ شروع کر دی تھی جسے ماریوس نے اپنی ارفع حماقت اور اپنی عمر کی جذباتیت کے ذریعے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ژاں ولیواں نے کئی حربے استعمال کیے؛ وہ اپنا وقت تبدیل کر دیتا، اپنی بنچ بدل دیتا، اپنا رومال بھول جاتا، لگزمبرگ اکیلا چلا جاتا؛ اور ماریوس بے سمجھے بوجھے ان جالوں سے ٹکرا جاتا تھا؛ اس کے راستے میں لگائے گئے ژاں ولیواں کے ان تمام استفہامیہ نشانات کا کشادہ دلی سے جواب ''ہاں'' میں دیتا تھا۔ مگر کوزیت نے خود کو اپنی ظاہری لاپروائی اور مستقبل مزاجی کے حصار میں قید کر رکھا تھا تاکہ ژاں ولیواں اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ:

''وہ گاؤدی کوزیت کی محبت میں پاگل ہے، مگر کوزیت کو اس کے وجود کی بھی خبر نہیں۔''

اس کے باوجود اس کے دل میں ایک غم انگیز زلزلہ سا طاری تھا۔ کسی وقت بھی کوزیت اپنی محبت کا اظہار کر سکتی تھی۔ کیا ہر کیفیت بے توجہی سے شروع نہیں ہوا کرتی؟

کوزیت نے صرف ایک بار غلطی کی تھی اور ماریوس کو چونکا دیا تھا۔ تین گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد وہ روانہ ہونے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ کوزیت نے کہا، ''کیا، اتنی جلدی؟''

ژاں ولژاں نے لکزمبرگ کے پھیرے لگانے ترک نہیں کیے، اس لیے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا نہیں چاہتا تھا جو غیر معمولی معلوم ہو۔ سب سے اہم بات یہ تھی وہ کوزیٹ کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر ان گھنٹوں میں جو محبت کرنے والوں کے لیے بہت دل فریب ہوتے ہیں، کوزیٹ سرشار ماریوس کی جانب اپنے تبسم کے تیر پھینکتی رہتی تھی جسے اس وقت تک کسی بات اندازہ نہیں تھا، اور جس نے دنیا میں کچھ دیکھا بھی نہیں تھا سوائے ایک قابلِ پرستش چہرے کے۔ ادھر ژاں ولژاں، ماریوس پر اپنی خوف ناک اور شعلہ بار آنکھیں جمائے تھا۔ وہ جو بالآخر خود کو بد اندیشی کے قابل نہیں سمجھتا تھا ان لمحات کا تجربہ کر رہا تھا جب ماریوس موجود ہوتا تھا؛ جس دوران اس کے خیالات ایک بار پھر وحشی اور خوں خوار ہوتے جا رہے تھے، اور وہ اپنی روح کی پرانی گہرائیوں کو محسوس کرنے لگا تھا، جن پر پہلے بہت ظلم ہو چکا تھا، جو ایک بار پھر کھل رہی تھیں اور اس نوجوان آدمی کے خلاف کھڑی ہو رہی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے سینے میں نامعلوم قسم کے گڑھے پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔

کیا، یہ جانور وہاں تھا؟ وہاں کس لیے تھا؟ اور وہ باہر نکلا، رینگتا، بدبو پھیلاتا، تفتیش کرتا، کوشش کرتا ہوا، اور کہتا ہوا آیا ہے: ''واہ! کیوں نہیں؟'' وہ ژاں ولژاں کی زندگی کی جستجو میں تھا۔ اس کی مسرتوں کی تلاش میں تھا؛ اس کو پکڑ لینے کے لیے اور لے جانے کے لیے۔

ژاں ولژاں نے اس میں اضافہ کیا، ''ہاں، یہی بات ہے۔ وہ کسی شے کی تلاش میں ہے۔ وہ بس ایک مہم تھی۔ وہ چاہتا کیا ہے؟ محبت! محبت! کیا میں پہلا انسان ہوں، سب سے بدنصیب، اور سب سے بدقسمت انسان! اور میں ساٹھ برس گھٹنوں کے بل اپنی زندگی گزارتا رہا ہوں، میں نے وہ سب دُکھ اُٹھائے ہیں جو ایک آدمی اٹھا سکتا ہے؛ میں جوان ہوئے بغیر ہی بوڑھا ہو گیا ہوں؛ میں زندہ رہا ہوں بغیر خاندان کے، بغیر رشتے داروں کے، بغیر دوستوں کے، بغیر زندگی کے، بغیر بچوں کے؛ میرے خون کے دھبے بکھرے ہیں پتھر کے ہر ٹکڑے پر، ہر جھاڑی پر، ہر سنگِ میل پر، ہر دیوار پر؛ میں بہت نرم دل ہوں، مگر ہر شخص نے مجھ پر سختی کی ہے اور مجھ پر مہربان بھی رہا ہے، اگر چہ دوسرے لوگوں نے کینہ پروری کی ہے؛ ہر خرابی کے بعد میں ایک بار پھر ایمان دار آدمی بن گیا ہوں؛ میں نے ان تمام گناہوں سے توبہ کر لی ہے جو میں نے کیے ہیں، اور اس برائی کو بھی معاف کر دیا ہے جو میرے ساتھ کی گئی ہے، اور عین اس وقت جب مجھے اس کا معاوضہ ملنے والا ہے، عین اس وقت جب میں اپنے ہدف کو چھونے والا ہوں، میں نے جس کی خواہش کی ہے؛ یہ سب بہت خوب ہے جو میں نے ادا کیا ہے، جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، یہ سب ہوا ہو جائے

والا ہے، یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا، اور میں کوزیت کو کھو دوں گا؛ میں اپنی زندگی ہار جاؤں گا، اپنا نفس ہار جاؤں گا، اس لیے کہ ایک احمق آ گیا ہے، اور لکسمبرگ میں آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔"

اور اس کی آنکھیں افسردگی اور غیر معمولی روشنی سے بھر گئیں۔

اب وہ گھورنے والا آدمی نہیں رہا؛ اب ایک دشمن دوسرے دشمن کا محاسبہ کر رہا تھا؛ ایک کتا تھا جو چور کی تلاشی لے رہا تھا۔

باقی سب کچھ قاری کے علم میں ہے۔ ماریوس اپنے احمقانہ راستے پر چلتا رہا۔ ایک دن اس نے .l'Ouest اسٹریٹ تک کوزیت کا پیچھا کیا۔ دوسرے دن دربان سے باتیں کیں۔ دربان نے اس کی جانب سے ژاں ولژاں سے باتیں کیں، "موسیو، یہ کون متجسس آدمی ہے جو آپ کے بارے میں پوچھ رہا ہے؟" دوسرے دن ژاں ولژاں نے ماریوس پر مہربانی کی نظر ڈالی، وہ نظر جس کی ماریوس کو تلاش تھی۔ ایک ہفتے بعد ژاں ولژاں وہاں سے چلا گیا۔ اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ اب کبھی نہ لکسمبرگ کی زمین پر قدم رکھے گا اور نہ l'Ouest اسٹریٹ پر۔ اور وہ واپس پلومے اسٹریٹ چلا گیا۔

کوزیت نے شکایت نہیں کی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا، اس نے کوئی سوال نہیں کیا، اس نے ژاں ولژاں سے وجہ نہیں پوچھی؛ وہ اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ رازداری خصوصیت والی بننے اور اپنے آپ سے غداری کرنے سے خوف زدہ تھی۔ ژاں ولژاں کو ان مشکلات کا تجربہ نہیں تھا، وہ مشکلات جو دل رُبا ہوتی ہیں اور صرف وہ مشکلات ژاں ولژاں جن سے واقف نہیں تھا؛ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کوزیت کی سنجیدہ خاموشی کی وجوہ کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس نے صرف اتنا دیکھا کہ وہ افسردہ ہو گئی ہے، غم زدہ ہو گئی ہے۔ ژاں ولژاں اور کوزیت، دونوں جانب مسئلہ نا تجربے کاری کا تھا۔

ایک بار اس نے کوشش کی تھی۔ اس نے کوزیت سے پوچھا، "کیا تم لکسمبرگ چلنا پسند کرو گی؟"

کوزیت کے بے رنگ چہرے پر ایک کرن سی دوڑ گئی۔ "ہاں۔" اس نے کہا۔

اور وہ دونوں وہاں چلے گئے۔ تین ماہ سے ماریوس وہاں نہیں گیا تھا۔ ماریوس وہاں نہیں تھا۔

اگلے دن، ژاں ولژاں نے ایک بار پھر کوزیت سے پوچھا، "کیا تم لکسمبرگ چلنا پسند کرو گی؟"

اس نے افسردگی اور آہستگی سے جواب دیا، "نہیں۔"

ژاں ولژاں کو اس کی افسردگی سے دکھ ہوا، اور اس کی آہستگی نے ژاں ولژاں کا دل توڑ دیا تھا۔

اس کے دماغ میں کیا ہو رہا تھا، جو اتنی نا تجربے کار تھی پھر بھی اس کو سمجھا نہیں جا سکتا

تھا؟ اس میں کیا ہونے والا تھا؟ کوزیٹ کی روح میں کیا ہو رہا تھا؟ کبھی کبھی ژاں ولژاں اپنے بستر پر جانے کے بجائے تختے پر ہی بیٹھا رہتا اور پوری رات خود سے سوال کرتا رہتا، ''کوزیٹ کیا چاہتی ہے؟'' اور ان کے بارے میں سوچتا رہتا، جن کے بارے میں کوزیٹ سوچ رہی ہوگی۔

اُف! ایسے لمحات میں، اس نے خانقاہ پر کیسی غم زدہ نظریں ڈالی ہوں گی، اس پاکیزہ بلندی پر، فرشتوں کی جائے قیام پر، نیکی کے اس ناقابلِ رسائی برفانی تودے پر۔ کیا کیا تصورات آئے ہوں گے، اس ناامید بے خودی کے عالم میں، بھلائے ہوئے پھولوں اور تیاگ کی ہوئی کنواریوں سے بھرے خانقاہ کے اس باغیچے پر، جہاں سے ہر عطر اور ہر نفس سیدھا سوئے بہشت چلا جاتا ہے۔ وہ اس باغِ بہشت سے کتنی محبت کرتا تھا جو اب اس کے لیے بند ہو گئی تھی، جہاں سے وہ رضا کارانہ اور دیوانہ وار نکلا تھا۔ کتنا افسوس ہو رہا تھا اسے اپنی اس دستبرداری پر اور اپنی اس غلطی پر کہ وہ کوزیٹ کو دنیا میں واپس لانا چاہتا تھا۔ بے چارہ قربانی کا ہیرو، اس کے اپنے خود ساختہ عقیدے نے اسے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا تھا۔ اور وہ اب کس طرح کہہ رہا تھا، ''میں نے یہ کیا کر دیا؟''

مگر کوزیٹ کے لیے یہ سب ناقابلِ تصور تھا۔ اسے نہ غصہ آتا تھا اور نہ درشتی ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ پُرسکون اور مہربان نظر آتا تھا۔ ژاں ولژاں کا رویہ زیادہ نرم اور پہلے سے زیادہ پدرانہ ہو گیا تھا۔ اس میں اگر کسی شے کا اضافہ ہوا تھا تو وہ شائستگی تھی، خوش اخلاقی تھی۔

ادھر کوزیٹ بھی سُست ہو گئی تھی۔ ماریس کی غیر موجودگی کا دُکھ ویسا ہی تھا جیسی کہ اس کی موجودگی کی مسرت ہوتی تھی، بالخصوص جس کا اسے احساس نہیں ہوتا تھا۔ جب ژاں ولژاں نے اسے اپنی روزانہ کی چہل قدمی پر لے جانا بند کر دیا، تو اس کی نسوانی جبلت نے الجھ کر اپنے دل کی گہرائیوں میں اپنے آپ سے سرگوشی شروع کر دی تھی، کہ اس کا لکسمبرگ باغ پر انحصار کرنا نظر نہیں آنا چاہیے، اور اگر یہ ثابت ہو بھی جائے تب بھی اسے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس کا باپ اسے وہاں لے جاتا ہے یا نہیں۔ مگر دن گزر رہے، ہفتے گزر رہے اور مہینے گزر گئے۔ ژاں ولژاں نے خاموشی سے کوزیٹ کی خاموش منظوری کو قبول کر لیا تھا۔ کوزیٹ کو افسوس تو ہوا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ ماریس غائب ہو گیا تھا؛ قضیہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی وہ لکسمبرگ جاتی، ماریس وہاں نہیں ہوتا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ کیا اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھے گی؟ اس کا دل پریشان تھا، کوئی بات اسے سکون نہیں پہنچاتی تھی، پریشانی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی؛ اب اسے یہ خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ یہ گرمی کا موسم ہے یا سردی کا، کہ بارش ہو رہی ہے یا دھوپ چمک رہی ہے، کہ چڑیاں چہچہا رہی ہیں، کہ یہ ڈیلیا کا موسم ہے یا گلِ داؤدی کا، کیا Tuileries کے مقابلے

میں لگتو بہر گ زیادہ دل رُبا ہے، کہ دھوبن جو چادریں دھو کر لائی ہے ان میں کلف کم ہے یا نا کافی، کہ تُوسا نے اپنی خریداری اچھی کی ہے یا بُری طرح۔ اور کوزیٹ قنوطی ہو گئی تھی، منہمک اور متوجہ رہی ہے مگر صرف ایک ہی خیال پر، اس کی آنکھیں بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھتی تھیں جیسے کوئی رات کے وقت کسی سیاہ یا اتھاہ جگہ پر نظریں جمائے ہوئے ہو جہاں سے ایک آسیب غائب ہو گیا ہے۔

مگر اس نے پوری کوشش کی تھی کہ ژاں ولژاں کو اس کے خیالات کی بھنک بھی نہ ملنے پائے، سوائے اس کے چہرے کی زردی کے۔

وہ اب بھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی تھی۔

اس کے چہرے کی زردی مگر ژاں ولژاں کے لیے پریشان کُن تھی۔

کبھی کبھی وہ اس سے پوچھتا تھا، ''تمھارا مسئلہ کیا ہے؟''

کوزیٹ جواب میں کہتی، ''کوئی مسئلہ نہیں۔'' اور خاموشی کے بعد، جب اسے خیال آتا کہ وہ افسردہ ہے تو مزید کہتی، ''اور، بابا— کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟''

''میری طبیعت؟ نہیں تو۔'' وہ جواب میں کہتا۔

یہ دونوں وجود، ایک دوسرے سے بلا شرکتِ غیرے محبت کرتے تھے، اور اتنے عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے تھے اور ساتھ ساتھ بغیر جتائے ہوئے، بغیر شکایت کیے، مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے دُکھ بھی سہہ رہے تھے۔

۞

زنجیر بردار

ان دونوں میں زیادہ بدقسمت ژاں ولژاں تھا۔ جوانی آزردگی کے عالم میں بھی اپنی مخصوص تابندگی برقرار رکھتی ہے۔

ژاں ولژاں نے اتنے دکھ اٹھائے تھے کہ وہ بچوں جیسا ہو گیا تھا۔ رنج کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انسان میں بچپن کو پھر سے ظاہر کرنے لگتا ہے۔ اس کو پورا یقین تھا کہ کوزیٹ اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ وہ مزاحمت کرنا چاہ رہا تھا، اس کو روکنا چاہتا تھا، اور کسی شاندار بیرونی معاملے کی طرف اس کی سرگرمی کو ابھارنا چاہ رہا تھا۔ یہ خیالات —— جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں طفلانہ ہوتے ہیں، مگر ساتھ ہی بڑھاپا بھی طاری کر دیتے ہیں —— بچپن نے ابھارے تھے اور یہ عام نظریے کو بھی اسی طرح ابھارتے ہیں جیسے نوجوان لڑکیوں کے تصورات پر سنہری جھالریں اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسے ایک بار گھوڑے پر سوار ایک جرنیل کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو پیرس کا کمان دار تھا، اور سڑک سے گزر رہا تھا۔ اس چم چم کرتے آدمی پر اسے رشک ہوا تھا؛ کتنی مسرت کی بات ہو گی، اس نے خود سے کہا، اگر وہ بھی ایسی ہی وردی پہن سکتا؛ اور اگر کوزیٹ اس کو اس میں ملبوس دیکھ سکتی تو اس کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں، اور کوزیٹ کے ہمراہ وہ Tulleries کے پھاٹکوں سے گزرتا، اور گارڈ اس کو بندوقوں کی سلامی پیش کرتے، تو کوزیٹ کو تشفی ہو جاتی اور وہ نوجوان آدمیوں کی طرف دیکھنے کے خیال ہی کو ترک کر دیتی۔

اداس کر دینے والے ان تصورات میں ایک غیر متوقع صدمے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

تنہائی کی اس زندگی میں جو وہ اب تک گزار رہے تھے، اور چوں کہ وہ پلومے اسٹریٹ پر رہنے لگے تھے، ان میں ایک عادت پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے کے

لیے تفریحی سفر کرنے لگے تھے جو ایک معمولی قسم کی تفریح ہوتی ہے، ان کے لیے جو زندگی میں داخل ہو رہے ہوں اور اس سے خارج ہو رہے ہوں۔

جو تنہائی پسند ہوتے ہیں ان کے لیے صبح کی سیر بھی شبینہ چہل قدمی جیسی ہوتی ہے اور مزاج میں فطری خوش دلی آجاتی ہے۔ سڑکیں سنسان ہوتی ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ کوزیٹ جو خود ایک چڑیا تھی، سویرے اٹھنا پسند کرتی تھی۔ ایسی صبح گاہی تفریحات سرِشام ہی طے ہو جاتی تھیں۔ ژاں ولژاں نے ایک تجویز پیش کی اور کوزیٹ نے قبول کر لی تھی، جو کسی ڈرامے کے خاکے کی طرح تیار کی گئی تھی؛ اور دونوں صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے گھر سے روانہ ہو گئے۔ ایسی تفریحات کوزیٹ کو خوش کر دیتی تھیں۔ اس قسم کی معصومانہ بے قاعدگی نوجوانوں کے لیے مسرت کا باعث ہوا کرتی ہے۔

ژاں ولژاں کے ارادے نے اس کی رہنمائی کی تھی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان جگہوں پر، ان کونوں اور فراموش کردہ مقامات کی جانب جہاں لوگ کم ہی جایا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں معمولی چراگاہیں ہوتی تھیں جو پیرس سے فاصلے پر تھیں، جہاں گرمی کے موسم میں ہمیشہ کچھ پودے اُگتے تھے جو خزاں کے موسم میں فصل کٹ جانے کے بعد باقی رہ جاتے، اور ایسا نظر آتا تھا گویا فصل کاٹی نہیں، بلکہ چھیلی گئی ہے۔ ژاں ولژاں کو ایسے میدان بہت پسند تھے۔ کوزیٹ وہاں اکتاتی نہیں تھی۔ ایسی جگہیں ژاں ولژاں کے لیے تنہائی اور کوزیٹ کے لیے آزادی جیسی ہوتی تھیں۔ وہاں پہنچ کر کوزیٹ ایک بار پھر بچی بن گئی، دوڑ سکتی تھی، کھیل کود کر سکتی تھی؛ اس نے اپنی ہیٹ اتار کر ژاں ولژاں کے گھٹنوں پر رکھ دی اور پھولوں کے گچھے بنانے لگی۔ پھولوں پر بیٹھی تتلیوں کو غور سے دیکھتی، مگر انھیں پکڑتی نہیں تھی؛ محبت کے ساتھ نرمی اور شائستگی پیدا ہو جایا کرتی ہے، اور وہ نوجوان لڑکی جو اپنے سینے کے اندر کم زور اور لرزاں آئیڈیل کی پرورش کرتی ہو وہ تتلی کے پروں پر رحم کیا کرتی ہے۔ اس نے گُلِ لالہ کے ہار بنائے اور اپنے سر پر سجا لیے، جن میں چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنوں نے انھیں روشن کر دیا تھا، جو اس کے گلابی چہرے کے لیے چنگاریوں کا تاج سا بن گیا تھا۔

اس کے بعد بھی، جب ان کی زندگی افسردگی سے مملو ہو گئی تب بھی انھوں نے اپنی صبح کی چہل قدمی جاری رکھی تھی۔

اکتوبر میں، 1831ء کے خزاں کی ایک خوش گوار صبح وہ گھر سے نکلے اور طلوعِ فجر تک دریائے مین کے بند تک پہنچ گئے تھے۔ طلوعِ فجر تھی، دن نکلنے والا تھا جو ایک کڑا مگر خوش گوار وقت ہوتا ہے۔ یہاں وہاں نیلگوں اور زرد آسمان کی گہرائیوں میں ستاروں کے جھرمٹ تھے، زمین بالکل سیاہ تھی، گھاس کی پتیوں کے درمیان لرزہ تھا، ہر طرف، دھندلکے میں ایک پُر اسرار سی ٹھنڈک

تھی ۔ایک مغنی چڑیا ،جو ستاروں میں ملی محسوس ہو رہی تھی حیرت انگیز بلندیوں پر نغمہ سرائی کر رہی تھی، اور اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ مناجات نے بے اعتنائی کو پُرسکون بنا دیا تھا۔مشرق میں Valde-Grace کلیسا نے اپنے فولاد کے سیاہ تودے کو افق تک پھیلا دیا تھا؛ گنبد کے عقب سے تاباں وینس اس طرح طلوع ہو رہا تھا گویا ایک غم انگیز عمارت سے فرار ہو جانے کی کوشش کر رہا ہو۔

ہر طرف امن اور خاموشی تھی؛ سڑک سنسان تھی؛ کچھ مزدور، جن کی جھلک بھی مشکل سے دکھائی دیتی، بغلی راستوں سے اپنے کام کی جانب رواں تھے۔

ژاں ولژاں عمارتی لکڑیوں کے باڑے کے پھاٹک کے سامنے ایک چوراہے پر پڑے تختوں پر بیٹھا تھا۔اس کا چہرہ شاہراہ کی طرف اور پشت روشنی کی جانب تھی؛وہ سورج کو بھول گیا تھا جو بس نکلنے ہی والا تھا؛ وہ ان گہرے تصورات میں غرق تھا جن میں ذہن مرتکز ہو جاتا ہے، جو آنکھوں کو قید کر دیتے ہیں اور جو چار دیواروں کے برابر ہو جاتے ہیں۔ایسے بھی مراقبے ہوتے جن کو عمودی کہا جانا چاہیے؛ جب کوئی ان کے نیچے ہوتا ہے اسے زمین پر واپس پہنچنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ژاں ولژاں ایسی ہی خام خیالیوں میں کود پڑا تھا۔ وہ کوزیت کے بارے میں سوچ رہا تھا، اور خوش بختی کے بارے میں بھی جو ممکن ہوگی اگر اس کے اور کوزیت کے درمیان کوئی اور شے نہیں آتی؛ اس روشنی کے بارے میں بھی جس سے اس نے ژاں ولژاں کی زندگی کو بھر دیا تھا، ایسی روشنی جو اس کے نفس کے ظہور کے سوا کچھ اور نہیں تھی۔اس خیالِ خام میں وہ بہت خوش تھا۔کوزیت جو اس کے پہلو میں کھڑی تھی، بادلوں کو گلابی ہوتے دیکھ رہی تھی۔

اچانک کوزیت چیخ پڑی،"بابا، دور، کوئی آ رہا ہے۔" ژاں ولژاں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔

کوزیت نے ٹھیک کہا تھا۔وہ سڑک ،جو دریائے مین کے بند کی توسیع ہے، جیسا کہ قاری جانتا ہے، Sevres اسٹریٹ کی اور اندرونی بولیوارڈ کی دائیں جانب سے نکلتی ہے۔اس سڑک کے موڑ پر اور بلیوارڈ کے قریب ایک جگہ ہے جہاں سے وہ شاخ کی صورت نکلتی ہے،انھیں آواز سنائی دی، اس وقت جس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ادھر سے ایک انبوہ سا ظاہر ہو رہا تھا۔کوئی بے شکل سی شے تھی جو بلیوارڈ سے آ رہی تھی اور اس سڑک پر مڑ رہی تھی۔

وہ شے بڑی ہوتی جا رہی تھی، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت منظم انداز میں آگے بڑھ رہی تھی، اور لرزتی دکھائی دے رہی تھی؛ وہ کوئی سواری معلوم ہوتی تھی، مگر اس کے انبار کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس میں گھوڑے تھے، پہیے تھے، چیخیں تھیں؛ کوڑے برس رہے تھے۔رفتہ رفتہ ان خاکوں کا تعین ممکن ہو گیا، اگرچہ وہ سایوں میں نہائے ہوئے تھے۔دراصل وہ ایک سواری تھی، جو

بولیوارڈ سے مڑ کر شاہراہ پر آگئی تھی، جس کا راستہ اس بند کے قریب سے گزرتا تھا، ژاں ویلژاں جہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی قسم کی دوسری سواری نمودار ہوئی، پھر تیسری، پھر چوتھی؛ اس طرح یکے بعد دیگرے سات رتھ ظاہر ہوئے؛ ان کے گھوڑوں کے سر سامنے کے رتھ سے مَس ہو رہے تھے۔ ان سواریوں پر ہیولے حرکت کر رہے تھے؛ اندھیرے میں ایسی جھماکے نظر آ رہے تھے جیسے وہاں ننگی تلواریں چل رہی ہوں؛ ایک جھنکار تھی جو زنجیروں کی چھن چھن سے مشابہ تھی، جیسے کوئی شے آگے بڑھ رہی تھی، اور وہ آواز ایسی خوف ناک ہو گئی تھی جیسی خوابوں کے کسی غار سے آ رہی ہو۔

جیسے جیسے وہ سواری آگے بڑھ رہی تھی، اس کے شکل واضح ہوتی جا رہی تھی، اور اس کا خاکہ درختوں کے پیچھے چھپے زرد صورت آسیب کے تودے جیسا تھا؛ تو وہ سفید ہوتا جا رہا تھا؛ دن آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور اس مہیب تودے پر بے نور روشنی ڈال رہا تھا جو قبر جیسا بھی تھا اور زندگی جیسا بھی، جن کی شکلیں گھوڑوں کے سروں میں تبدیل ہو گئی تھیں، اور چہرے لاشوں جیسے ہو گئے تھے، اور پھر یہ ہے جو ظاہر ہوا تھا:

سات عدد گاڑیاں سڑک پر ایک قطار میں چل رہی تھیں۔ پہلی چھ غیر معمولی انداز میں بنائی گئی تھیں۔ وہ ''کوپر ز'' کی بنائی ہوئی گاڑیاں، دو پہیوں پر رکھی لمبی سیڑھیوں پر مشتمل تھیں اور ان کے انتہائی عقبی حصے میں سامان لے جانے والے چھکڑے بندھے تھے۔ ہر گاڑی، یا یوں کہیے کہ ہر سیڑھی، میں ایک ساتھ چار گھوڑے بجتے تھے۔ ان سیڑھیوں پر عجیب قسم کے لوگوں کے جھنڈ لے جائے جا رہے تھے؛ مدھم روشنی میں ان لوگوں کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ہر سواری پر چوبیس تھے، بارہ ایک جانب اور بارہ دوسری جانب، اور دونوں کی پشت سے پشت ملی ہوئی تھی، ان کے چہرے راہگیروں کی طرف تھے، ان کے پاؤں ہوا میں جھول رہے تھے — یہ تھا وہ طریقہ جس میں یہ لوگ سفر کر رہے تھے -- ان کے عقب میں کوئی شے تھی جو چھن چھن کر رہی تھی؛ وہ ایک زنجیر تھی، اور ان کی گردنوں میں بھی کوئی شے تھی جو چمک رہی تھی، اور وہ شے طوق تھی۔ ہر آدمی کا اپنا طوق تھا، مگر ان میں سے گزرتی ہوئی زنجیر ایک ہی تھی۔ یعنی اگر ان چوبیس افراد کو گاڑی سے اتر کر چلنا پڑے، تو ایک قسم کی بے رحم اکائی میں گرفتار، زمین پر ہزار پا کی طرح ہاتھوں کے بل چلتے اور زنجیر ان کی ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتی۔ گاڑی کے آگے اور پیچھے سیدھے کھڑے، دو بندوق بردار آدمی تھے، اور ہر ایک کے پیروں تلے زنجیر کا ایک سرا دبا ہوا تھا۔ آہنی طوق گول نہیں، مربعے کی شکل کے تھے۔ ساتویں گاڑی، ایک بڑی سی سامان بردار گاڑی تھی جس پر کوئی سایہ یا چھتری نہیں تھی، چار پہیے تھے اور چھ گھوڑے۔ اس پر آہنی چھکڑوں کا کھڑ کھڑ کرتا ڈھیر تھا، لوہے کے ڈھلے ہوئے برتن تھے، انگیٹھیاں تھیں، زنجیریں

تھیں، جن کے درمیان کئی آدمی تھے ہتھکڑیوں میں، اور پوری طرح لپٹے ہوئے، جو بیمار معلوم ہوتے تھے۔ یہ گاڑی، تمام جالیوں سے بنی، اس میں پرانی ٹٹیاں تھیں، غالباً جو پہلے سزا کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ ساری گاڑیاں سڑک کے بیچ چل رہی تھیں۔ دونوں جانب دو رویہ، تین کونوں والی ہیٹ پہنے، بدنامِ زمانہ محافظ چل رہے تھے، جیسے ڈاڑ کنڑی کے سپاہی؛ بھدی، دھبوں اور سوراخ والی وردیوں میں ٹھنسے، اور ان کے پاجامے کفن دفن کرنے والوں جیسے تھے؛ نصف بھورے، نصف نیلے، بالکل چیتھڑوں جیسے، کاندھوں پر سرخ تمغے تھے، کاندھے پر پہنی جانے والی پیلے رنگ کی پیٹیاں تھیں، ہاتھوں میں نیچے تھے، لاٹھیاں تھیں؛ یہ بلیک گارڈ سپاہیوں کی ایک قسم تھی۔ یہ کرایے کے غنڈے، بھکاریوں جیسی پستی اور جلادوں جیسے اختیار والے تھے۔ ان میں سے ایک، جو اُن کا سردار معلوم ہوتا تھا، گھڑی انگلی کی طرح ہاتھوں میں کوڑا اُٹھائے ہوئے تھا۔ یہ ساری تفصیلات، جو فجر کے اندھیرے میں مدھم تھیں بڑھتی روشنی کے ساتھ رفتہ رفتہ واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ اس قافلے کے آگے اور پیچھے گھڑسوار سپاہی چل رہے تھے؛ جو سنجیدہ تھے، مٹھیوں میں ان کی تلواریں تھیں۔

یہ جلوس اتنا لمبا تھا کہ جب پہلی گاڑی بند تک پہنچی، آخری گاڑی بولیوارڈ سے نکل رہی تھی۔ چشمِ زدن میں نجانے کہاں سے، ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا، جیسا کہ پیرس میں ہوتا ہے، اور سڑک کی دونوں جانب آگے بڑھ رہا تھا اور جلوس کا نظارہ کر رہا تھا۔ ساتھ والی گلیوں میں لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو پکار رہے تھے؛ بازاری باغبانوں کے لکڑی سے بنے جوتوں کی آوازیں آ رہی تھیں جو جلوس کو دیکھنے کے لیے بھاگ رہے تھے۔

گاڑیوں پر لدے آدمی، خاموش، جھٹکے لے رہے تھے۔ صبح کی ٹھنڈک سے ان کے جسم نیلے پڑ گئے تھے۔ وہ سب سوتی پاجامے پہنے تھے، اور ان کے ننگے پاؤں لکڑی کے جوتوں میں ٹھنسے تھے۔ ان کا بقیہ لباس بدبختی کی انوکھی مثال تھا۔ ان کی چادریں نہایت نامناسب تھیں؛ چیتھڑوں میں ملبوس مسخرے سے زیادہ دردناک کوئی شے نہیں ہوتی۔ پچکی پرانی نمدے کی ہیٹ، ترپال سے بنی ٹوپیاں، ڈراؤنی اونی ٹوپیاں، اور اُنگھے سے بلاؤز، کالے رنگ کے کوٹ کہنی سے پھٹے ہوئے؛ کئی تو زنانی ٹوپیاں پہنے تھے، کچھ نے اپنے سروں پر چھابیاں اوندھائی تھیں: بال دار سینے نظر آ رہے تھے، اور ان پھٹے لباسوں کے شگاف سے جسم پر گڑھے سادہ نقوش کو سمجھا جا سکتا تھا؛ ان نقوش میں محبتوں کے مندر تھے، شعلہ بردار دل تھے، اور کیوپڈ گڑھے ہوئے تھے؛ ان شگافوں میں پھنسیاں اور بہتے زخم بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ دو یا تین نے تنکوں سے بنی رسیاں گاڑی کی cross-bar سے اس طرح لٹکا دی تھیں کہ وہ رکاب جیسی نظر آتی تھیں، جو ان کے پیروں کو سہارا فراہم کرتی تھیں۔ ان

میں سے ایک کے ہاتھ میں کوئی شے تھی، سیاہ رنگ کے پتھر جیسی، جسے وہ اپنے منہ تک اٹھائے اور اس پر اپنے دانت جمائے ہوئے تھا؛ وہ دراصل ڈبل روٹی تھی جسے دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ ان میں ایسی کوئی ایک بھی آنکھ نہیں تھی جو نہ خشک تھی، نہ غمی تھی نہ بدکار روشنی سے فروزاں تھی۔ نگہبان محافظ گالیاں دیتے، اور وہ لوگ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتے تھے؛ وقتاً فوقتاً کسی ضرب کی آواز سنائی دی جاتی جو کسی آدمی کے کاندھے یا کھوپڑی پر لاٹھی پڑنے سے پیدا ہوتی تھی۔ ان میں سے کچھ جمائیاں لے رہے تھے؛ ان کے چیتھڑے جیسے لباس مہیب تھے؛ ان کی ٹانگیں لٹکی ہوئیں، ان کے کاندھے لرزتے ہوئے، ان کے سر آپس میں ٹکراتے ہوئے، ان کی بیڑیاں کھڑ کھڑ کرتیں، ان کی آنکھیں خوں خوار نظروں سے دیکھتیں، ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئیں، یا مُردوں کے ہاتھوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں؛ قافلے کے پیچھے لڑکوں کا ایک گروہ چیختا، قہقہے لگاتا دوڑ رہا تھا۔

گاڑیوں کی قطار، وہ جیسی بھی رہی ہوں، غم ناک ضرور تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ کل، یعنی ایک گھنٹے بعد، موسلا دھار بارش ہونے والی ہے، کہ اس کے بعد ایک اور، پھر ایک اور ریلا بارش کا آنے والا ہے، کہ ان کے کٹے پھٹے لباس بارش سے تر بتر ہو جائیں گے، اور ایک بار بھیگنے کے بعد یہ لوگ کبھی خشک نہیں ہوں گے، کہ ایک بار ٹھنڈے ہونے کے بعد وہ کبھی گرم نہیں ہو سکیں گے، کہ موسلا دھار بارش سے ان کے سوتی پاجامے ان کی ہڈیوں سے چپک جائیں گے، کہ ان کے جوتے پانی سے بھر جائیں گے، کہ کوڑوں کی مار بھی ان کے جبڑوں کو کٹکٹانے سے روک نہیں سکے گی، کہ یہ زنجیر ان کی گردنوں سے اسی طرح بندھی رہے گی، کہ ان کے پیر اسی طرح جھولتے رہیں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان آدمیوں کو خزاں کے ٹھنڈے بادلوں کے نیچے، تڑتڑاتی بارش میں، ہواؤں کے جھکڑ میں، طوفان میں، ہواؤں کی غضب ناکی میں اس طرح بندھے، اور پژمردہ دیکھنے والے میں خوف سے تھرتھری نہیں آئے گی۔

ساتویں گاڑی کے بیمار، جو بدبختی سے بھرے بوروں کی طرح گاڑی پر ڈال دیے گئے تھے، رسیوں سے بندھے اور بے سُدھ لیٹے ہوئے بھی لاٹھیوں کی ضرب سے محفوظ نہیں تھے۔

اچانک، سورج ظاہر ہوا؛ مشرق کی بے انتہا روشنی پھوٹ پڑی، جس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ان تمام خوں خوار سروں میں آگ لگا دی تھی۔ ان کی زبانیں کھل گئی تھیں، منکرا ہٹوں، قسموں اور گانوں کے شعلے لپکنے لگے تھے۔ روشنی کی وسیع افقی چادر نے قطار کو دو حصوں میں بانٹ دیا، تاباں سر اور چہرے ایک طرف ہو گئے تھے، اور پاؤں اور پہیے دھند میں ڈوب گئے تھے۔ خیالات نے ان چہروں پر ظہور کیا؛ یہ ایک خوف ناک لمحہ تھا؛ آشکار دیو جن کی نقابیں اتار دی

گئی تھیں، اور آتش مزاج نفوس عریاں ہو گئے تھے۔ اگر چہ روشنی ہو گئی تھی، وحشی ہجوم اداس ہو گیا تھا۔ جو خوش تھے، اپنے منہ میں نلکیاں لگائے تھے جن کے ذریعے مجمعے پر کیڑے پھینک رہے تھے؛ عورتیں ان کا خاص نشانہ تھیں۔ سویرے نے ان غم زدہ شخصیتوں کو ان کے سایوں کی سیاہی کی مدد سے بڑھا دیا تھا؛ وہاں ان مخلوقات میں سے ایک بھی مخلوق نہیں تھی جو بد بختی کے باعث معذور نہ ہو گئی ہو؛ اور سب کچھ ایسا عفریتی ہو گیا تھا کہ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ سورج کی چمک بجلی کے کوندے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ گاڑی پر لدے انبار نے جو قطار میں چل رہا تھا، گانا شروع کر دیا، اور وہ سب وحشت زدہ زندہ دلی سمیت اپنی پوری طاقت سے چیخ رہے تھے؛ بیزغم زدگی سے لرز رہے تھے؛ چوراہے پر بور ژوا چہرے احمقانہ مسرت سے ان اناڑی نسل والوں کو سن رہے تھے جنھیں بھوت پریت نے آسمان سے گرا دیا تھا۔

جیسا کہ ابتری کے ماحول میں ہوا کرتا ہے، اس جلوس میں ہر قسم کی تکلیف گھل مل گئی تھی؛ اس میں ہر قسم کے زاویوں والے چہرے تھے؛ حیوانی، عمر رسیدہ، نوجوان، گنجے، بھوری داڑھیوں والے، ترش رُو عفریتی، وحشی تبسم والے، بے معنی رویوں، ٹوپیوں میں چھپائی گئی تھوتھنیوں، لڑکیوں جیسے سروں والے جن کی کنپٹیوں پر گھنگریالے بال لہراتے تھے، لڑکیوں جیسے طفلانہ ڈھانچے نما چہرے جن میں صرف موت کی کمی تھی۔ پہلی گاڑی میں ایک سیاہ فام تھا جو غلام رہ چکا تھا، جو اپنی زنجیروں کا تقابل کر سکتا تھا۔ اور روہ ذا ماؤنی نیچے سے ہموار کرنے والی صفت، شرم، ان ابروؤں سے گزر گئی تھی؛ اس درجے کی رسوائی ان لوگوں کو اپنی گہرائیوں تک محسوس ہوئی تھی، اور معصومیت نے، جو بھدے پن میں بدل دی گئی تھی، ذہانت کو مایوسی میں بدل دیا تھا۔ ان آدمیوں کا کوئی متبادل نہیں تھا جو آنکھوں کو دلدل کے پھول جیسے دکھائی دیتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص جس نے اس جلوس کا حکم دیا تھا، ان کی درجہ بندی نہیں کی تھی۔ یہ وجود جکڑ بندی میں اور حروفِ تہجی کے اعتبار سے جوڑوں میں خلط ملط تھے، اور انھیں بے ترتیبی سے ان گاڑیوں پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود، خوف، جب یک جا کر دیا جاتا ہے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی نتیجہ نکال ہی لیتا ہے؛ تمام بد بخت آدمیوں کے اضافے کُل میزان فراہم کرتے ہیں، اور ہر زنجیر ایک مشترکہ روح خارج کرتی ہے، اور ہر گاڑی بھر وزن کی اپنی قیافہ شناسی ہوتی ہے۔ ان کے پہلو میں جوگا رہے تھے، ایک شخص موجود تھا جو دردناک آواز میں چیخ رہا تھا؛ اور ایک تیسرا تھا جو بھیک مانگ رہا تھا؛ ان میں سے ایک وہ بھی تھا جو دانت پیس رہا تھا؛ ایک اور یوں تھا جو دیکھنے والوں کو دھمکا رہا تھا، ایک اور تھا جس نے خدا سے بے ادبی کی تھی؛ اور آخری شخص ایسا خاموش تھا جیسے مقبرہ۔ دانتے نے کہا تھا کہ اس نے جہنم

کے سات حلقے دیکھے ہیں: شاید آج وہی حلقے مارچ کر رہے تھے۔ سزا رسیدہ لوگوں کا مارچ ان کی اذیت کے بارے میں تھا جو نامبارک طریقے سے دی گئی تھی، الہام کے شعلہ بردار رتھ پر بیٹھ کر نہیں، بلکہ، وہ اذیت زیادہ غم انگیز تھی جو سولی کی گاڑی پر دی گئی تھی۔

ان محافظوں میں سے ایک نے، جن کی لاٹھیوں کے نچلے سرے پر ٹک لگی ہوئی تھی، وقتاً فوقتاً اس انسانی غلاظت کو جنبش دینے کا بہانہ کیا۔ مجمعے میں موجود ایک بوڑھی عورت نے اپنے پانچ برس کے چھوٹے سے بچے کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا، "بدمعاش، اپنے لیے اسے تنبیہ سمجھ۔"

جوں ہی گانے اور کلمۂ کفر میں اضافہ ہوا، اس آدمی نے جو نگہبانوں کا کپتان تھا، اپنا کوڑا چلانا شروع کر دیا اور اس اشارے پر، ساتوں گاڑی کے آدمیوں پر، ژالہ باری جیسی آواز میں، خوفناک اور بے بھاؤ ڈنڈے برسنے شروع ہو گئے تھے؛ کئی افراد نے دہاڑنا شروع کر دیا اور ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا، جس نے سڑک کے شریر لڑکوں کی تفریح کو دوبالا کر دیا جو زخموں پر مکھی کی طرح تیزی سے جمع ہو گئے تھے۔

ژاں والژاں کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس کی آنکھیں اب اس کی آنکھیں نہیں رہی تھیں؛ وہ موٹے شیشے جیسی ایسی گہری چیزیں بن گئی تھیں جو مخصوص بدنصیب لوگوں کے معاملے میں نظروں کی جگہ لے لیتی ہیں، جو حقیقت سے بے بہرہ معلوم ہونے لگتی ہیں، اور جن میں دہشت کے شعلوں کا اور مصائب کا عکس دکھائی دینے لگتا ہے۔ وہ کوئی تماشا نہیں دیکھ رہا تھا، کوئی کشف ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی، بھاگنے کی، فرار ہونے کی کوشش کی؛ اس کے پیروں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کو آپ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ آپ ہی کو پکڑ لیتی ہے۔ وہ خوف زدہ، احمق کی طرح اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا، اور مخاصمانہ انداز میں الجھا اور ناقابلِ اظہار پریشانی میں خود سے پوچھنے لگا، کہ یہ موت جیسی بھیانک مخلوقات کس چیز کی غمازی کر رہی ہے اور یہ طوفانِ بے تمیزی کہاں سے آ گیا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنا ہاتھ پیشانی تک اٹھایا، جو اس امر کا اشارہ ہوتا ہے کہ اس کا حافظہ واپس آ گیا ہے: اسے یاد آیا کہ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ Fontainebleau جانے والے سڑک پر شاہی کا سامنا ہونے کے تمام امکانات کو دور کرنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کر لیا کرتا تھا اور یہ بھی کہ، پینتیس برس قبل وہ خود بھی اسی بند سے ہو کر گزرا تھا۔

کوزیت بھی کم خوف زدہ نہیں تھی، مگر مختلف طریقے سے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی؛ جو کچھ اس نے دیکھا، اس کے نزدیک ممکن ہی نہیں تھا؛ بالآخر وہ چیخ کر پوچھنے لگی، "بابا، ان گاڑیوں میں یہ کون لوگ ہیں؟"

''مجرم۔'' ژاں ویلواں نے جواب دیا۔

''کہاں جا رہے ہیں، یہ لوگ؟''

''گیلیز (بحری جہازوں) میں۔''

عین اس وقت لاٹھیوں کی برسات، جو اب سو ہاتھوں سے ہونے لگی تھی، تیز ہو گئی، اس عمل میں چپٹے رُخ سے تلواروں سے ضرب لگانا بھی شامل ہو گیا، اور ایک طوفان تھا کوڑوں اور چپٹی تلواروں کا؛ اس کے سامنے مجرم جھکنے پر مجبور ہو گئے، اذیت کے ذریعے فرماں برداری کے حصول کا عمل شروع ہو گیا تھا؛ سب پُرامن ہو گئے اور زنجیروں میں بند تھے بھیڑیوں کی نظروں کے تیر برسنے لگے تھے۔

کوزیت کا بند بند کانپ رہا تھا؛ اس نے پھر پوچھا، ''بابا، کیا یہ لوگ بھی آدمی ہیں؟''

''کبھی کبھی۔'' بدقسمت آدمی نے جواب دیا۔

دراصل یہ زنجیروں میں بند تھے مجرم تھے جو علی الصبح Bicetre سے نکلے تھے، اور Mans کی سڑک پر لے جائے جا رہے تھے تا کہ Fontainebleu سے گریز کیا جا سکے، اس وقت جہاں شاہ موجود تھا۔ اس وجہ سے یہ ڈراؤنا سفر تین یا چار دن مزید طویل ہو گیا تھا؛ یقینی طور پر شاہی شخصیتوں کو اس اذیتی نظارے سے بچانے کے لیے۔

بے حد دل برداشتہ ژاں ویلواں گھر واپس ہوا۔ اس قسم کے واقعات صدمے کا باعث ہوا کرتے ہیں، اور جو یادیں اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں وہ زلزلے سے کم نہیں ہوا کرتیں۔

پھر بھی ژاں ویلواں نے اس کی طرف نظر نہیں کی؛ کوزیت کے ہمراہ بابل اسٹریٹ جاتے ہوئے، وہ اس موضوع پر اٹھنے والے دوسرے سوالات پر غور کر رہا تھا؛ شاید وہ اپنے ملال کی کیفیت میں اتنا محو تھا کہ وہ کوزیت کے سوالات پر غور نہیں کر سکا نہ ان کے جوابات دے سکا تھا۔ مگر شام کے وقت، اپنی خواب گاہ کی طرف جاتے ہوئے ژاں ویلواں نے کوزیت کو سرگوشی کے انداز میں خود سے کہتے سن لیا تھا، ''او خدایا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی مجھے راستے میں مل جاتا تو اس کو قریب سے دیکھتے ہی میرا دم نکل جاتا۔''

خوش قسمتی، کہ اس الم ناک دن کے اگلے دن کوئی سرکاری مذہبی تقریب تھی — کس بات کی، اس کا مجھے قطعی علم نہیں — پیرس میں کوئی تہوار منایا جانے والا تھا، جس میں Mars کے میدان میں، دریائے سین کے کنارے ایک جھوٹی لڑائی ہونے والی تھی، شانزے لیزے پر کوئی ڈراما کھیلا جانے والا تھا، اور Arc de l'Etoile پر آتش بازی کا مظاہرہ تھا۔ اپنی عادت پر ظلم کرتے ہوئے، ژاں ویلواں اس شادمانی کے نظارے کے لیے کوزیت کو اپنے ساتھ لے گیا، تا کہ پیرس کے

ان تجسم انگیز ہنگاموں میں پچھلے دن کی اذیت ناک یادیں اس کے ذہن سے محو ہو جائیں۔ اس جشن کے دوران معائنے میں وردی کی موجودگی کی چناپئی عین فطری تھی؛ ژاں ولژاں نے ایسے شخص کے مبہم خیال سے جو خود کو کسی پناہ گاہ میں لے جا رہا ہو، نیشنل گارڈ کی اپنی وردی زیب تن کی۔ اس دورے میں اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ کوزیٹ نے، جو اپنے باپ کو خوش رکھنا اپنا قانون بنا چکی تھی اور جس کے لیے یہ سارے نظارے ایک انوکھی بات تھے — روشنی سے اور نوجوانی کی نعمتوں سے انحراف اور مذہبی جلسے کی مسرتوں کے اضطراب سے دستبرداری کو قبول کر لیا؛ اس طرح ژاں ولژاں کو یقین ہو گیا تھا کہ کوزیٹ پر اس دن کے ڈراؤنے منظر کا ہلکا سا بھی اثر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

کچھ دنوں بعد، ایک صبح، جب سورج پوری آب تاب سے چمک رہا تھا، اور وہ دونوں باغیچے تک لے جانے والی سیڑھیوں پر تھے، ایک اور خلاف ورزی ہوئی، اس قانون کی جو ژاں ولژاں نے اپنے آپ پر نافذ کر لیا تھا، اور اس عادت کی جو کوزیٹ نے غم زدگی کے ساتھ اپنے کمرے میں رہنے کی بنا لی تھی۔ کوزیٹ ایک چادر نما لباس میں خود کو لپیٹے سیدھی کھڑی تھی، جو نہ ہونے کے برابر تھا، جسے نوجوان لڑکیاں عام طور پر صبح سویرے بڑے پیارے انداز میں اپنے جسم پر اس طرح ڈال لیتی ہیں، جیسے بادل کسی ستارے کو ڈھانپ لیتا ہے؛ کوزیٹ کا سر روشنی میں نہایا ہوا تھا، نیند کے بعد اس کے رخسار گلابی ہو رہے تھے اور اس نے خود کو اس نرم دل انسان کی محبت بھری نظروں کے حوالے کر دیا تھا؛ وہ ڈیزی کے ایک پھول کو ہاتھ میں لیے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ کوزیٹ کو شاید اس دل ربا روایتی گیت — I love a little, passionately, etc. — کا علم نہیں تھا، مگر وہاں تھا کون جو اسے یہ سب سکھاتا؟ وہ عادتاً، اور معصومانہ انداز میں پھول سے کھیل رہی تھی، یہ سوچے بغیر کہ ڈیزی کے پھول کا ٹکڑے ٹکڑے کرنا ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی کا دل توڑا جا رہا ہو۔ ژاں ولژاں کو پھول پر ان ننھی ننھی انگلیوں کے تصور نے مسحور کر دیا، اور اس بچی کے وجود سے خارج ہونے والی تابندگی میں وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اور ایک جانب سرخ پروں والی ایک چڑیا جھاڑیوں میں خوش الحانی سے گانے لگی تھی۔ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمان میں تیر رہے تھے، ایسے بے فکر انداز میں، جیسے ان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ کوزیٹ بڑی توجہ سے اپنے پھول کی پتیاں توڑتی رہی؛ شاید وہ کسی بارے سوچ رہی تھی، جو کچھ بھی ہو، یقیناً وہ کوئی دل ربا شے رہی ہو گی؛ اور اچانک اس نے کسی راج ہنس کی جیسی نازک ناتوانی سے اپنا سر موڑا اور ژاں ولژاں سے سوال کیا، "بابا! یہ گیلیز کیا ہوتی ہیں؟"

بیرونی زخم اور اندرونی شفا

اس طرح رفتہ رفتہ ان کی زندگی پر بادل چھانے لگے۔

مگر [زندگی کا] ایک موڑ، جو پہلے مسرت کا باعث تھا وہ ان کے ساتھ رہا، جس میں وہ بھوکے لوگوں کے لیے روٹی لے جاتے، اور ان لوگوں کے لیے لباس جو سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ مفلس لوگوں سے ملاقات کے لیے کبھی کبھی کوزیت بھی ساتھ جاتی، جس میں ساتھ آزادانہ ملاقات باقی گفتگو کی بازیافت بھی ہو جاتی؛ اور کبھی کبھی، جب ان کا دن اچھا گزرتا تو مشکل میں گرفتاروں کی دست گیری کرتے، چھوٹے چھوٹے بچوں کی دل جوئی کرتے اور ان کے دلوں کو گرماتے تھے۔ شام میں کوزیت خوش نظر آتی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب وہ ژاں ریت کی مانند میں گئے تھے۔

اس ملاقات کے اگلے دن، صبح کے وقت ژاں والژاں بنگلے سے باہر آیا، معمول کے مطابق وہ پُرسکون تھا، مگر اس کے بائیں بازو پر ایک بڑا سا زخم تھا، بہت سوجن تھی اور بہت تکلیف ہو رہی تھی، جیسے اسے جلانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس نے اس کا کوئی مبہم سا جواز پیش کر دیا تھا۔ اس زخم کی وجہ سے اسے ایک ماہ گھر میں بند رہنا پڑا تھا! اسے بخار رہتا تھا۔ وہ ڈاکٹر بلانے پر راضی نہیں تھا۔ جب کوزیت نے اصرار کیا تو اس کا جواب تھا، ”اچھا! کتے کے ڈاکٹر کو بلا لو۔“

کوزیت صبح شام عبادت کی طرح اس کے زخم کی مرہم پٹی کرتی۔ اتنی محبت اور خوشی سے کہ ژاں والژاں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی مسرتوں کے گئے دن واپس آ گئے ہیں، اور خطرات اور اندیشے دور ہو رہے ہیں۔ اور وہ کوزیت کو گھورتے ہوئے کہتا تھا، ”واہ! کتنا مہربان ہے یہ زخم۔ واہ، کیا خوب ہے یہ بدنصیبی!“

یہ دیکھ کر کہ اس کا بابا بیمار ہے، اس نے بنگلہ چھوڑ دیا اور عقبی صحن کے چھوٹے سے کمرے میں

واپس چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن ژاں ولژاں کے ساتھ گزارتی، اور اس کی پسندیدہ کتابیں پڑھ کر سناتی تھی۔ عام طور پر یہ کتابیں سفر سے متعلق ہوتی تھیں۔ ژاں ولژاں نیا جنم لے رہا تھا؛ یہ قابل بیان کرنیں اس کی خوشیاں واپس لا رہی تھیں، لگزمبرگ، کوچہ گرد اجنبی اور کوزیٹ کی سرد مہری — اس کی روح پر چھائے تمام بادل چھٹتے جا رہے تھے۔ وہ اس نقطے پر پہنچ گیا جہاں وہ خود سے کہنے لگا تھا، ''میں بھی کتنا بیوقوف ہوں، میں نے یہ سب فرض کر لیا تھا۔''

اس کی مسرت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ژاندریت کی ماند میں تین آردیے کی بھیانک دریافت، جس کی بالکل توقع نہیں تھی، آہستہ آہستہ تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا؛ اس کی تلاش کے سارے نشانات غائب ہو گئے تھے — اسے اور کیا چاہیے تھا۔ وہ صرف ان بدنصیب لوگوں کے بارے میں سوچتا اور ان پر افسوس کرتا رہتا تھا۔ 'اب وہ قید میں ہیں، اب وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔' پھر سوچتا، 'کیسا افسوس ناک خاندان اور کیسی مصیبت میں گرفتار ہے!'

Barriere du Maine کے بھیانک نظارے کے بارے میں کوزیٹ نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔

خانقاہ میں سسٹر Sainte-Mechtilde نے کوزیٹ کو موسیقی پڑھائی تھی؛ کوزیٹ کی آواز بلبل جیسی تھی۔ کبھی کبھی شام کے وقت زخمی آدمی کی قیام گاہ میں بیٹھ کر اس نے غم زدہ گیت گائے جنھوں نے ژاں ولژاں کو خوش کر دیا تھا۔

بہار آئی؛ اس برس باغیچہ اتنا خوش نما ہو گیا تھا کہ ژاں ولژاں کو کوزیٹ سے کہنا پڑا تھا:

''تم وہاں کبھی نہیں جاتیں؛ میری خواہش ہے کہ تم اس میں چہل قدمی کیا کرو۔''

''بابا، جو حکم آپ کا!'' کوزیٹ نے کہا۔

اپنے بابا کا حکم بجا لانے کی خاطر اس نے باغیچے میں چہل قدمی دوبارہ شروع کر دی، اس لیے کہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ژاں ولژاں جسے باڑ سے دیکھ لیے جانے کا خدشہ تھا، وہ ادھر جاتا ہی نہیں تھا۔

ژاں ولژاں کے زخم نے ایک موڑ پیدا کر دیا تھا۔

کوزیٹ نے دیکھا کہ اس کے بابا کی تکلیف کم ہو گئی ہے، کہ اس کی صحت بحال ہو رہی تھی، اور یہ بھی کہ اب وہ خوش و خرم نظر آتا تھا؛ کوزیٹ کو اطمینان ہو گیا جس کا اس نے تصور نہیں کیا تھا کہ اتنی آہستگی اور فطری طور پر یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ تب مارچ کا مہینہ شروع ہو گیا تھا، سردی کا موسم رخصت لے رہا تھا۔ یہ موسم افسردگی کا ایک حصہ اپنے ساتھ لیتا جاتا ہے؛ پھر اپریل آیا، اور گرمی کے موسم کی ابتدا

ہونے لگی؛ دن بڑے ہونے لگے، تازہ سویرا جیسا کہ وہ ہمیشہ ہوتا ہے، بچپنے کی طرح خوش، اور کبھی کبھی تو مولد کی طرح رونے لگتا ہے۔ اس مہینے میں فطرت کی پاس دل ربا کرنیں ہوتی ہیں جو گزرنے لگتی ہیں آسمان سے، پیڑوں پر سے، چراگاہوں سے اور آدمی کے دل میں کھلتے پھولوں پر سے۔

کوزیٹ اپریل کے اثرات کے سرور سے بچ نکلنے کے معاملے میں بہت کم عمر تھی جو خود اس سے بہت مشابہ تھے۔ بتدریج اور حقیقت کو سمجھے بغیر اس کے اندرون سے سیاہی رخصت ہو گئی تھی۔ چوں کہ بہار کے موسم میں دوپہر کے وقت روشنی تہہ خانوں تک پہنچ جاتی ہے، اس لیے افسردہ نفوس خوش مزاج ہونے لگتے ہیں۔ کوزیٹ اب افسردہ نہیں تھی۔ اور اگر ایسا تھا بھی تو یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ صبح کے وقت دس بجے کے قریب ناشتے کے بعد جب وہ اپنے بابا کو پندرہ منٹ کے لیے باغیچے میں لے جانے میں کامیاب ہو گئی اور اس کے ساتھ دھوپ میں اوپر نیچے چل رہی تھی اور اس کے بازو کو سہارا دے رہی تھی، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ہر لمحے وہ ہنس رہی ہو گی اور بہت خوش ہو گی۔

ژاں ولژاں، عالم سرور میں، ایک بار پھر اسے تازہ اور گلابی ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"واہ! کتنا اچھا پھیرا تھا!" اس نے سرگوشی میں دوبارہ کہا۔

اور وہ تنی آرد یے کا شکر گزار تھا۔

زخم کے بھرتے ہی اس نے دھندلکے میں اپنی چہل قدمی دوبارہ شروع کر دی تھی۔

یہ قیاس کرنا غلط ہو گا کہ پیرس کے غیر آباد علاقوں میں بغیر کسی ماجرے کے اس طرح چہل قدمی کی جا سکتی ہے۔

مادر پلوٹارک اور عجوبہ

ایک شام، ننھے گاوروش کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا؛ اسے یاد آیا کہ اس نے گزشتہ روز بھی کچھ نہیں کھایا تھا؛ اس کی تھکن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے طے کیا کہ وہ رات کے کھانے کے لیے کچھ کرے گا۔ Salpetriere سے پرے سنسان علاقوں میں وہ چہل قدمی کر رہا تھا جہاں کچھ مل جایا کرتا ہے۔ جہاں کوئی نہ ہو وہاں ہمیشہ کچھ مل جاتا ہے۔ وہ ایک بستی میں پہنچا جو اس کو Austerlitz کے گاؤں جیسی لگی۔

اپنی پہلی تفریح میں اس نے دیکھا تھا کہ پرانے باغ پر ایک بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کا سایہ تھا، اور اس باغیچے میں سیب کا ایک درخت تھا۔ سیب کے درخت کے پہلو میں پھل رکھنے کی ایک کوٹھری تھی جس کو ٹھیک سے بند نہیں کیا گیا تھا، جہاں حیلے سے داخل ہو کر ایک آدھ پھل حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ایک سیب رات کا مکمل کھانا ہو سکتا ہے؛ ایک سیب زندگی ہوتا ہے۔ وہی جو آدم کی بربادی کا باعث بنا تھا آج گاوروش کی نجات ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ کچی گلی والا باغیچہ تھا جس کے کنارے جھاڑیاں تھیں؛ جسے کانٹے دار تار لگا کر مکانوں سے الگ کر دیا گیا تھا؛ اور باغیچے کو بھی ایک باڑ کے ذریعے الگ کر دیا گیا تھا۔

گاوروش نے باغیچے کی طرف قدم بڑھائے؛ اسے ایک گلی مل گئی، اس نے سیب کے پیڑ کو پہچان لیا، اس نے پھل کی کوٹھری کی تصدیق کی؛ اب باڑ صرف چند قدم رہ گئی تھی۔ دن ڈھلتا جا رہا تھا، گلی میں ایک بلی تک نہیں تھی، موقع سازگار تھا۔ گاوروش نے باڑ پھلانگنے کی تیاری کی پھر اچانک رک گیا۔ باغیچے میں کوئی باتیں کر رہا تھا۔ گاوروش نے باڑ میں بنے شگاف سے جھانک کر دیکھا۔

چند قدم کے فاصلے پر، باڑ کے نیچے دوسری جانب عین اس جگہ پر جہاں شگاف تھا،

ایک کرسی نما پتھر تھا جس کو بنچ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس بنچ پر باغیچے کا بوڑھا آدمی بیٹھا تھا جب کہ بوڑھی عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بوڑھی عورت بڑبڑا رہی تھی۔ گاوَروش جو بہت محتاط نہیں تھا، سن رہا تھا:

''موسیو مابوف!'' بوڑھی عورت نے کہا۔

''مابوف!'' گاوَروش نے سوچا، ''یہ نام تو بالکل مزاحیہ ہے۔''

بوڑھا آدمی جسے اس نام سے مخاطب کیا گیا تھا ہلا تک نہیں۔ بوڑھی عورت نے دوبارہ کہا:

''موسیو مابوف!''

بوڑھے آدمی نے زمین سے نظریں اٹھائے بغیر ہی جواب دینے کا فیصلہ کیا:

''کیا بات ہے، مادر پلوٹارک؟''

'مادر پلوٹارک!' گاوَروش نے سوچا، 'لو ایک اور مزاحیہ نام'

مادر پلوٹارک نے دوبارہ بات شروع کی؛ بوڑھے کو بات کرنے پر مجبور ہونا پڑا:

''زمیں دار نا خوش ہے۔''

''کیوں؟''

''ہم پر تین سہ ماہی کا کرایہ قرض ہے۔''

''تین ماہ بعد ہم پر چار سہ ماہی کا کرایہ قرض ہو جائے گا۔''

''وہ کہتا ہے کہ وہ تمھیں بے دخل کر دے گا۔''

''تو میں چلا جاؤں گا۔''

''سبزی فروش ادائیگی پر اصرار کر رہا ہے۔ اب وہ لکڑی کے گٹھے بھی نہیں چھوڑے گی۔ سردی کے موسم میں تم خود کو گرم کس طرح رکھو گے؟ ہمارے پاس جلانے کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''سورج تو ہوگا۔''

''قصائی قرض دینے سے انکار کر رہا ہے، ہمیں مزید گوشت نہیں ملے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ گوشت مجھ سے اچھی طرح ہضم بھی نہیں ہوتا، بہت ثقیل ہوتا ہے۔''

''تو ہم ڈنر میں کیا کھائیں گے؟''

''ڈبل روٹی۔''

''نان بائی بھی حساب چکانے پر اصرار کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے نقدی نہیں، روٹی نہیں۔''

''ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔''

''کھاؤ گے کیا؟''

''پھلوں کی کوٹھری میں سیب تو ہیں۔''

''مگر موسیو، نقدی بغیر ہم اس طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔''

''میرے پاس تو دھیلا بھی نہیں۔''

بوڑھی عورت وہاں سے چلی گئی، بوڑھا اکیلا رہ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ گاوروش بھی اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔

گاوروش کے پہلے مراقبے کا نتیجہ یہ نکلا کہ باڑ پھلانگنے کے بجائے وہ اس کے نیچے گھس گیا اور جھاڑی کی شاخیں اِدھر اُدھر ہو گئیں۔

''آجاؤ۔'' گاوروش نے خود سے کہا، ''یہاں ایک کونا ہے۔'' اور وہ اسی میں دبک کے بیٹھ گیا۔ اس کی پشت فادر مابوف کی بنچ سے تقریباً لگی ہوئی تھی۔ اسے اسی سالہ بوڑھے کی سانس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس کے بعد، ڈنر کے بجائے، اس نے سونے کی کوشش کی۔

یہ نیند بلی جیسی نیند تھی۔ ایک آنکھ کھلی تھی۔ اونگھ میں بھی گاوروش ہوشیار رہتا تھا۔

دھندلکے کی زردی نے زمین کو اُجلا کر دیا تھا، اور وہ گلی دو رویہ سیاہ جھاڑیوں کے درمیان سیاہی مائل لکیر سی بن گئی تھی۔ اچانک، اس سفیدی مائل پٹی پر دو لوگ ظاہر ہوئے۔ ایک آگے اور، دوسرا کچھ فاصلے پر پیچھے تھا۔

''لو، اب دو جنے اور آ گئے ہیں۔'' گاوروش بڑبڑایا۔

پہلا شخص ایک عمر رسیدہ بوڑھا تھا، جیسا کہ وہ معلوم ہوتا تھا؛ جھکا ہوا اور متفکر انسان سادہ لباس میں تھا اور اپنی عمر کے باعث آہستہ چل رہا تھا۔ گویا شام کی کھلی فضا میں چہل قدمی کر رہا تھا۔

دوسرا آدمی مستعد، سیدھا اور دبلا پتلا تھا۔ یہ اپنی رفتار پہلے آدمی جیسی ہی رکھ رہا تھا؛ مگر اس کی رضاکارانہ سست رفتاری، ملائمت اور ہوشیاری صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اس شخص میں تیز و تند اور بے آرام کر دینے والی بات بھی تھی۔ اس کا پورا وجود ویسا ہی تھا جس کے لیے شائستہ کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے؛ کہ وہ اچھی حالت میں تھا، سیاہ رنگ کا کوٹ نفاست سے سِلا ہوا، غالباً بہت اچھے کپڑے کا پہنے ہوئے تھا، جو کمر پر خوب صورتی سے فٹ کیا گیا تھا۔ اس کا سر ایک قسم کی قوی شان سے سیدھا رہتا تھا اور اس کی ہیٹ کے نیچے زرد رنگ کے نوجوان جیسی شخصیت تھی جو مدھم روشنی میں بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دانتوں میں گلاب کا ایک پھول دبا رکھا تھا۔

گاؤروش دوسرے شخص سے اچھی طرح واقف تھا؛ وہ مونٹ پارناس تھا۔ پہلے شخص کے بارے میں سوائے اس کے کہ وہ ایک محترم بزرگ آدمی تھا اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ گاؤروش نے فوراً ہی مشاہدہ کرنا شروع کر دیا۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں پا پیادوں کا ایک دوسرے سے منسلک کوئی منصوبہ تھا۔ گاؤروش ایسی جگہ تھا کہ واقعات کو ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ بڑے موقعے سے اسے روپوش ہونے کی جگہ مل گئی تھی۔ مونٹ پارناس اس وقت کسی شکار کی تلاش میں تھا؛ اسے کوئی ذرا وُنی سی شے نظر آئی۔ گاؤروش کے آوارہ دل کو اس بوڑھے شخص پر ترس آرہا تھا۔

اسے کیا کرنا تھا؟ مداخلت؟ ایک کم زوری دوسری کم زوری کی مدد کو آرہی تھی۔ مونٹ پارناس کے لیے یہ محض معمولی سی بات تھی۔ مونٹ پارناس نے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ اس اٹھارہ برس کے بد معاش دہشت انگیز کے لیے وہ بوڑھا آدمی اور وہ دوسرا بد معاش دو لقموں کے برابر تھے۔

گاؤروش ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ حملہ ہو گیا؛ بالکل اچانک اور خوف ناک انداز میں حملہ ہو گیا تھا۔ یہ کسی چیتے کا وحشی گدھے پر، اور مکھی پر مکڑی پر حملہ تھا۔ اچانک مونٹ پارناس نے گلاب کا پھول پھینک دیا، بوڑھے آدمی کو باندھا، اس کو کالر سے پکڑا اور اس سے لپٹ گیا؛ گاؤروش بڑی مشکل سے اپنی چیخ روک سکا تھا۔ ایک لمحے بعد ان میں سے ایک آدمی کراہتا، کوشش کرتا، دوسرے کے نیچے تھا؛ اس کا مرمر کا گھٹنا اس کی چھاتی پر تھا۔ گاؤروش جس کی توقع کر رہا تھا وہ نہیں ہوا۔ وہ جو زمین پر لیٹا ہوا تھا مونٹ پارناس تھا؛ جو اوپر چڑھا ہوا تھا وہ بوڑھا آدمی تھا۔ یہ سب کچھ گاؤروش سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہو رہا تھا۔

بوڑھے آدمی کو دھکا لگا تھا، اس نے جواب دیا، اور اس خوف ناک انداز میں کہ پلک جھپکتے ہی حملے کرنے والے اور حملہ سہنے والے دونوں کے کردار آپس میں بدل گئے تھے، یعنی، اوپر والا نیچے اور نیچے والا اوپر تھا۔

"بڑا دلیر معلوم ہوتا ہے۔" گاؤروش نے سوچا۔

وہ تالی بجائے بغیر رہ نہیں سکا، مگر یہ تعریف ضائع گئی۔ تالی کی آواز لڑنے میں مصروف افراد تک پہنچ نہیں سکی، اس لیے کہ وہ ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ مونٹ پارناس نے اپنی کوشش ختم کر دی۔ گاؤروش سوچنے لگا، "کیا یہ مر جائے گا؟"

نیک آدمی نے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ اُٹھ کھڑا ہوا، اور گاؤروش نے اسے کہتے سنا تھا، ''اُٹھا!''

موننٹ پارناس اُٹھا، مگر نیک آدمی اسے سختی سے پکڑے ہوئے تھا۔ موننٹ پارناس کا رویہ اس غضب ناک بھیڑیے کی طرح تھا جسے کسی بھیڑ نے پکڑ لیا ہو۔

گاؤروش دیکھتا رہا، سنتا رہا اور اپنی آنکھوں پر اور کانوں پر زور دیتا رہا۔ یہ سب دیکھ کر اسے بہت لُطف آ رہا تھا۔

کسی نظارہ کرنے والے کی طرح اسے اپنی شعوری فکر مندی کا صلہ مل گیا تھا۔ وہ اندھیرے سے آتے ہوئے ناقابل بیان مکالمے کے حزنیہ لہجے کو سُن سکتا تھا۔ نیک آدمی سوال کر رہا تھا، موننٹ پارناس جواب دے رہا تھا، ''تمھاری عمر کیا ہے؟''

''انیس برس۔''

''تم توانا ہو، صحت مند ہو؛ کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟''

''اُکتا جاتا ہوں۔''

''تمھارا پیشہ کیا ہے؟''

''کاہلی۔''

''سنجیدگی سے بات کرو۔ کیا تمھارے لیے کچھ کیا جا سکتا ہے؟۔ تم کیا بننا چاہتے ہو؟''

''چور۔''

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ بوڑھا آدمی اپنے خیالات میں غرق ہو گیا، ساکت کھڑا رہا، مگر اس نے موننٹ پارناس پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔''

پھرتیلا بدمعاش نوجوان جال میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی طرح جد و جہد کر رہا تھا۔ اس نے جھٹکے دیے، گھٹنوں کو آنکڑے کی طرح استعمال کرنے کی کوشش کی، دست و پا موڑے اور فرار ہونے کی ہر کوشش کر ڈالی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بوڑھے کو یہ حرکتیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ شاہانہ لاپروائی اور پوری قوت سے وہ گرفتار کے دونوں بازو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ بوڑھے آدمی کی مراقبے کی سی کیفیت کچھ دیر قائم رہی ۔ پھر اس نے موننٹ پارناس کو غور سے دیکھا، اور اس سے نرم لہجے میں مخاطب ہوا؛ اندھیرے کے درمیان جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے، سنجیدہ خطابت شروع ہوئی؛ گاؤروش اس کا حرف حرف غور سے سن رہا تھا جو بھلایا نہیں جا سکتا تھا:

"بیٹے! تم اپنی زندگی کے مشکل ترین دور میں داخل ہو رہے ہو، مگر کاہلی اور سُستی کی کیفیت میں سارے، تم خود کو کاہل کیے رہے ہو۔ محنت کی تیاری کرو۔ ایک بہت مہیب مشین ہے، کیا تم نے دیکھی ہے؟ اسے rolling-mill کہتے ہیں۔ اس سے بچ کر رہنا، یہ بہت چالاک اور خوں خوار شے ہوتی ہے؛ اگر یہ تمھارے کوٹ کا کونا پکڑ لے تو تمھارے پورے وجود کو اندر کھینچ لے جائے گی۔ اس مشین کو کاہلی کہتے ہیں۔ رُک جاؤ، ابھی وقت ہے، اپنے آپ کو بچاؤ، ورنہ یہ تم پر چھا جائے گی؛ تھوڑے ہی عرصے میں تم اس کے دندانوں میں پھنسے ہو گے۔ ایک بار گرفت میں آگئے، تو کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔ کاہل آدمی! محنت کرو۔ تمھارے لیے مزید آرام کا وقت نہیں۔ محنت کے آہنی ہاتھ نے تمھیں پکڑ لیا ہے۔ تم کام نہیں کرنا چاہتے، ذمے داری نہیں لینا چاہتے، فرض نہیں نبھانا چاہتے۔ یہ سب تمھیں اوروں کی طرح اُکتا دیتے ہیں؟ اچھا، تو تم مختلف ہو گے۔ محنت ایک قانون ہے؛ جو اسے رَد کر دیتا ہے، وہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ تم کام کرنے والے آدمی نہیں بننا چاہتے تو غلام بن جاؤ گے۔ تمھیں انسانوں کی ایمان دارانہ محنت نصیب نہیں ہو گی، صرف ملامت کا پسینہ ملے گا۔ جہاں دوسرے گا رہے ہوں گے، تمھارے گلے سے صرف شور وغل نکلے گا۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب تم دیکھو گے کہ لوگ کام کر رہے ہیں مگر تم سمجھو گے کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ مزدور، کسان، ملاح، لوہار سب تم کو بہشتی ارواح کی عظمت سے معمور دکھائی دیں گے۔ بھٹی کے اطراف کیسی تابانی ہوتی ہے۔ وہ دراصل ہل چلانے اور سپر بنانے کی خوشی ہوتی ہے۔ آزادی سے ہوا میں چھنا بھی دل خوش کن ہوتا ہے۔ سُست کاہل آدمی، چھان بین کرو، کرتے رہو، گھومو پھرو، کوچ کرو۔ اپنی رکاوٹ کو اپنے ساتھ کھینچ لے جاؤ۔ تم جہنم کی ٹیم پر وحشت کا بار رہو! اوہ! کچھ نہ کرنا تمھارا مقصد ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے لیے ایک ہفتہ تو کیا، ایک دن بھی زیادہ ہے، بلکہ تم تو ایک گھنٹے کے دباؤ سے بھی آزاد نہیں رہو گے۔ بغیر پریشانی سے تم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔ گزرتا ہوا ہر منٹ تمھارے عضلات کو توڑ دے گا۔ اوروں کے لیے جو پر جیسا ہلکا ہوتا ہے، تمہارے لیے پتھر جیسا گراں ہوگا۔ سادہ ترین شے بھی پہاڑ جیسی بلند ہوگی۔ تمھارے لیے زندگی بھیانک ہو گی۔ آنا، جانا، سانس لینا بھی تمھارے لیے خوف ناک کام ہو جائے گا۔ تمھارے پھیپھڑے من من بھر کے ہو جائیں گے۔ یہاں چلو یا وہاں چلو، تمھارے لیے چلنا دوبھر ہو جائے گا، اور یہ مسئلہ تمھیں ہی حل کرنا پڑے گا۔ کوئی باہر جانا چاہے تو اسے صرف دروازے کو دھکا دینا ہوتا ہے۔ اگر تم باہر جانا چاہو گے تو دیوار توڑ کر جانا پڑے گا۔ جو کوئی بھی باہر جانا چاہتا ہے اسے کیا کرنا پڑتا ہے؟ وہ سیڑھیوں سے اتر جاتا ہے۔ تمھیں اپنی چادروں کو رسیوں میں تبدیل کرنا پڑے گا، رفتہ

رفتہ تم اس سے ایک رسی بنو گے، پھر تم کھڑکی پر چڑھ کر پاتال میں اس رسّی سے اترنے کی کوشش کرو گے، اور وہ رات کا وقت ہوگا، طوفان ہوگا، بارش ہو رہی ہوگی، جھکڑ چل رہے ہوں گے، اور اگر رسّی چھوٹی ہوئی تو نیچے اترنے کا ایک ہی طریقہ ہوگا، کود پڑنے کا۔ بلا سمجھے بوجھے، نامعلوم بلندی سے خلا میں کودو گے تو کس شے پر کودو گے؟ یا پھر تم چمنی کے سہارے اوپر چڑھو گے۔ اس میں خطرہ جل جانے کا ہوگا۔ یا پھر تم گندے پانی کے پائپ کے سہارے اترنے کی کوشش کرو گے، مگر اس میں بھی خطرہ ہوگا، ڈوب جانے کا۔ میں ان سوراخوں کے بارے میں بات نہیں کر رہا ہوں جو تمھیں بند کرنے پڑیں گے؛ ان پتھروں کے بارے میں بھی نہیں جو تمھیں اوپر لے جانے پڑیں گے دن میں بیس بار بدلنے کے لیے اس پلاسٹر کے بارے میں بھی نہیں جسے تمھیں اپنے پیال کے جھابے میں چھپانا پڑے گا۔ تمھارا تالے سے بھی سابقہ پڑے گا۔ بورژوا کے پاس تالا کھولنے والے کی بنائی ہوئی کنجی ہوتی ہے۔ اگر تم جانا چاہو گے تو تمھیں جرمانے کے طور پر ایک خوف ناک فن کاری کرنی پڑے گی؛ تم سو کا ایک بڑا سا سکہ لو گے، اس کو دو پلیٹوں میں کاٹو گے، مگر کن اوزار سے؟ وہ تمھیں خود ایجاد کرنے پڑیں گے۔ کیسے؟ یہ تم جانو۔ اس کے بعد تمھیں ان پلیٹوں کو اندر سے کھوکھلا کرنا پڑے گا، اور ان کے کناروں پر ایسی جھری بنانی پڑے گی، اور انھیں اوپر تلے آراستہ کر کے ایک بکس اور اس کا ڈھکنا بنانا پڑے گا۔ اس طرح کہ اگر اوپر نیچے سے بیچ لگا دیے جائیں تو اس پر شبہ نہ ہو سکے۔

اوپر سے دیکھنے والوں کے لیے یہ سو کا سکہ ہوگا تو تم اس میں کیا رکھو گے؟ فولاد کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ کسی گھڑی کی اسپرنگ، جس میں کاٹ کر دندانے بنا دیے گئے ہوں گے، اور وہ آری کا کام کرے گی۔ اس آری سے جو ایک پن جتنی لمبی ہوگی، اور اس سو میں پوشیدہ ہوگی، اس سے تم تالے کا بولٹ کاٹو گے؛ بولٹ کو کاٹو گے، تالے میں لگی زنجیریں کاٹو گے، کھڑکی میں لگی سلاخیں کاٹو گے، اپنی بیڑیاں کاٹو گے۔ یہ شاہکار تیار، عجیب وغریب شے مکمل، فن کے یہ معجزے، ہنر اور صبر کا تمھیں کیا انعام ملے گا اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے موجد تم ہو؟ قید خانہ ملے گا۔ یہ ہے تمھارا مستقبل۔ کاہلی اور مسرت کیسی عجیب چٹانیں ہوتی ہیں۔ تم جانتے تو ہونا، کہ کچھ نہ کرنے کا فیصلہ ایک غم انگیز فیصلہ ہوتا ہے۔ سماج میں رہ کر کاہلی کرنا، بے کار رہنا، بقول شخصے مہلک ہوتا ہے۔ یہ سیدھا تمھیں بدنصیبی کی طرف لے جاتا ہے۔ اُف، اس شخص پر جو پیر تسمہ پا ہونا چاہتا ہے۔ سو وہ موذی جانور ہو جاتا ہے۔ ارے، تو تم کام کرنے سے خوش نہیں ہوتے۔ تم تو بس ایک ہی بات سوچتے ہو۔ اچھا کھاؤ، اچھا پیو اور مزے سے سوؤ۔ تم پانی پیو گے، سیاہ ڈبل روٹی کھاؤ گے، تختے پر سوؤ گے، تمھارے پیروں میں بیڑیاں ہوں گی، پوری رات تمھیں جس کی ٹھنڈک محسوس ہوگی جو

تمھارے پیروں میں بستہ ہو گی۔تم وہ بیڑیاں کاٹو گے،تم فرار ہو جاؤ گے۔یہاں تک تو ٹھیک ہے۔تم اپنے پیٹ کے بل جھاڑیوں میں رینگو گے، اور جنگل کے جانوروں کی طرح گھاس کھاؤ گے۔ دوبارہ پکڑے جاؤ گے۔ اس کے بعد دیوار میں لگی زنجیر سے بندھے برسوں قیدِ تنہائی میں پڑے رہو گے؛ پانی کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھاؤ گے، پیاس بجھانے کے لیے؛ سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی نوچ نوچ کر کھاؤ گے جسے کتے بھی نہیں چھوتے؛تم وہ لوبیا کھاؤ گے تم سے پہلے جنھیں کیڑے کھا چکے ہوں گے۔تم قید خانے کی لکڑی کے کیڑے بن جاؤ گے۔اب اپنے آپ پر رحم کرو، بدنصیب نوجوان! بیس برس پہلے تم دودھ پیتے بچے تھے، جس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ میں صدقِ دل سے تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میری بات غور سے سنو۔ میں تم سے التجا کر رہا ہوں۔ تمھیں سیاہ رنگ کے نفیس کپڑے کا کوٹ پہننے کی، اپنے بال گھنگریالے کرنے کی، اپنے بالوں میں خوش بودار تیل ڈالنے کی خواہش ہے؛ تم مفلس عورتوں کو خوش کرنا چاہتے ہو، تم خوب صورت نظر آنا چاہتے ہو! تمھارے چہرے کے بال صاف کر دیے جائیں گے، تمھیں سرخ رنگ کا بلاؤز پہنا دیا جائے گا اور لکڑی کے جوتے پہنا دیے جائیں گے۔انگلیوں میں انگوٹھی کی خواہش ہے نا؛ تمھاری گردن میں لوہے کے طوق ڈال دیے جائیں گے۔عورت پر نظر ڈالو گے تو گھونسے پڑیں گے۔ اور یہ سب کچھ بیس برس کی عمر میں ہو جائے گا۔ پچاس برس کی عمر میں رہائی پاؤ گے۔ جوانی میں گلابی، تازہ، چمکیلی آنکھوں، پورے اور سفید دانتوں، خوب صورت بالوں سمیت داخل ہو گے؛ باہر نکلو گے تو شکستہ، جھکے ہوئے، جھریوں والے، پوپلے، خوف ناک اور سفید بال کے گچھوں میں ہو گے۔ مفلس بچے! تم غلط راہ پر ہو؛ کاہلی تمھیں غلط مشورے دے رہی ہیں؛ چوری سب سے سخت کام ہوتا ہے۔ مجھ پر یقین کرو، کاہلی کا پیشہ مت اپناؤ۔ بدمعاش ہونا آرام دہ نہیں ہوتا۔ اب جاؤ اور غور کرو کہ میں نے کیا کہا ہے۔تم مجھ سے کیا چاہتے تھے؟ میرا بٹوہ؟ یہ رہا میرا بٹوا۔"

اور اس بوڑھے آدمی نے مونٹ پارناس کو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے اپنا بٹوا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مونٹ پارناس نے ایک لمحہ توقف کیا، اور بٹوے کو اپنے کوٹ کی جیب میں اس احتیاط رکھ لیا، جیسے چرایا گیا ہو۔

یہ سب کہنے اور کرنے کے بعد، بوڑھا مڑا اور دوبارہ چہل قدمی شروع کر دی۔

"احمق!" مونٹ پارناس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

وہ نیک خو آدمی کون تھا؟ بلا شبہ قاری سمجھ گیا ہے۔

مونٹ پارناس اسے دھندلکے میں غائب ہوتے ہوئے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس

کے لیے یہ تصور ہی مہلک تھا۔

جب بوڑھا آدمی جا رہا تھا، گاوروش اس کے قریب چلا گیا۔

گاوروش نے کن انکھیوں سے یقین کر لیا تھا کہ فادر مابوف اب بھی بنچ پر بیٹھا ہوا ہے، شاید گہری نیند میں ہے۔ وہ آوارہ جھاڑی سے بر آمد ہوا، اندھیرے میں مونٹ پارناس کی طرف کھسکنے لگا، جب وہ بالکل بے حرکت کھڑا تھا۔اس طرح نظر میں آئے بغیر وہ مونٹ پارناس تک پہنچ گیا؛ آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ سیاہ کپڑے کے فراک کوٹ کی عقبی جیب کی طرف بڑھایا، بٹوا پکڑا، اپنا ہاتھ باہر نکالا، ایک بار پھر رینگنے لگا، اور اندھیرے میں سانپ کی طرح جھاڑی میں چلا گیا۔مونٹ پارناس، جسے چوکنا رہنے کی ضرورت نہیں تھی، زندگی میں پہلی بار اپنے خیالات میں محو تھا؛ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

گاوروش جب اسی جگہ پہنچ گیا جہاں مادر مابوف تھا، اس نے جھاڑی کے اوپر سے بٹوا اس کی جانب پھینک دیا، اور اپنی پوری قوت سے واپس بھاگ گیا۔

بٹوا فادر مابوف کے پیر کے پاس گرا۔اس ہڑبونگ سے وہ جاگ گیا تھا۔

وہ جھکا، اور بٹوا اٹھا لیا۔

وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا تھا اور بٹوے کو کھول کر دیکھا۔

بٹوے کے اندر دو حصے تھے؛ ان میں سے ایک میں کچھ چھوٹے چھوٹے سکے تھے؛ دوسرے حصے میں چھ عدد نپولین۔

موسیو مابوف، نے حیرانی کے عالم میں دربان کو بٹوے کا واقعہ بیان کر دیا۔

"یہ آسمان سے گرا ہے۔" مادر پلوٹارک نے کہا۔

عزلت اور بیرکیں

کوزیٹ کا غم، جس کا خود اسے بھی احساس نہیں تھا، پچھلے چار پانچ ماہ نہایت دل خراش رہا تھا اب شفا کی منزل میں داخل ہو گیا تھا۔ فطرت، بہار، جوانی، باپ کی محبت، پھولوں اور پرندوں کی دل خوش کن آوازوں میں پاک دامنی اور غفلت جیسی کوئی نوخیز شے تھی جو اس کی روح میں قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔ تو کیا وہ آگ بالکل سرد ہو گئی تھی؟ یا محض اس پر خاکستر کی تہیں جم گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ درد ناکی اور جلن اب اسے محسوس بھی نہیں ہو رہی تھی۔

ایک دن اسے اچانک ماریس یاد آ گیا، "کیوں!" اس نے خود سے کہا، "اب میں اس کے بارے میں سوچتی بھی نہیں۔"

اسی ہفتے اسے ایک نہایت وجیہ، چیتے جیسی کمر، دل رُبا وردی میں ملبوس، نوجوان لڑکیوں جیسے گلابی رخساروں والا نیزہ بردار فوجی افسر نظر پڑا، جس کی بغل میں ایک تلوار تھی، چہرے پر سوئی کی نوک جیسی مونچھیں تھیں، سر پر چمک دار روغنی ٹوپی تھی، پھاٹک کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس پر مستزاد اس کے سنہرے بال، گہری نیلگوں آنکھیں، گول چہرہ، خوب صورت مگر گستاخ چہرہ، یہ شخص ماریس کے بالکل برعکس تھا۔ ہونٹوں میں سگار دبا تھا۔ کوزیٹ کا خیال تھا کہ اس کا تعلق یقیناً بابل اسٹریٹ کی فوجی بیرکوں سے تھا۔

اگلے دن، وہ پھر نظر آیا۔ کوزیٹ نے وقت یاد کر لیا تھا۔

اس کے بعد سے یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہر روز نظر آنے لگا تھا۔

اس افسر کے ساتھیوں نے غور کیا تھا کہ وہاں، اس بے ہنگم باغیچے والے مکان اور اس قدیم طرز کی بد اندیش باڑ کے عقب میں ایک خوب صورت مخلوق رہتی ہے جو ہمیشہ تقریباً اسی

وقت موجود رہتی ہے جب وہ وجیہ فوجی افسر — قاری کے لیے جو اجنبی نہیں، جس کا نام تھیوڈول بلیر نورما ہے — وہاں سے گزرتا تھا۔

"ادھر دیکھو" افسر کے ساتھی نے اس سے کہا، "وہاں ایک حسینہ رہتی ہے جو تم کو گھورتی رہتی ہے؛ دیکھا تم نے!"

"کیا میرے پاس اتنا وقت ہوتا ہے۔" افسر نے جواب دیا "کہ میں ان تمام لڑکیوں کی طرف دیکھتا رہوں، جو مجھے دیکھتی ہیں؟"

یہ بالکل وہی وقت تھا جب ماریوس ذہنی کرب کی گہرائیوں میں گرتا جا رہا تھا اور خود سے کہتا تھا، "کاش مرنے سے قبل میں اسے دیکھ سکتا۔" اگر اس کی خواہش پوری ہوگئی ہوتی اور وہ کوزیٹ کو اس تیز و برد دار فوجی افسر کو اس طرح گھورتے دیکھ لیتا تو اس منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پاتا؛ رنج سے اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

اس میں غلطی کس کی تھی؟ کسی کی بھی نہیں۔

ماریوس ان خصلتوں میں سے ایک کا حامل تھا جو انسان کو افسردگی میں دفن کر دیتی ہیں اور اس میں وبائے رکھتی ہیں؛ اور کوزیٹ ان لوگوں میں سے تھی جو غم میں ڈوب جاتے ہیں مگر اس میں سے نکل بھی آتے ہیں۔

مزید یہ کہ کوزیٹ ایک خطرناک عرصے سے گزر رہی تھی؛ وہ مہلک دور جس میں نسوانیت استغراق میں ڈوب جایا کرتی ہے، جس میں نوجوان لڑکی کا دل انگور کی بیل کے ریشے جیسی شاخ سے مشابہ ہوتا ہے، اتفاق جسے سنگِ مرمر کے ستون پر یا وائن کی دکان کے باہر لگے کھمبے پر چڑھنے کی طرف راغب کر دیتا ہے۔ تیز اور فیصلہ کُن لمحہ ہر لاوارث کے لیے اہم ہوتا ہے، وہ دولت مند ہو یا مفلس، اس لیے کہ دولت غلط فیصلے کو نہیں روکتی؛ ہر بڑے حلقے میں بے تکی بے جوڑ رفاقتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اصل بے جوڑ رفاقت دلوں کے درمیان ہوتی ہے؛ اور چوں کہ ہر اجنبی آدمی، جس کا نام معلوم ہو نہ پیدائش، بے قسمت مرمر کا ستون ہوتا ہے جو عظیم جذبوں اور بلند و بالا خیالات کے محل کا بوجھ سنبھالے ہوتا ہے، اس لیے دنیا کے مطمئن اور دولت مند آدمی کو اگر باہر سے دیکھا جائے تو اس کے جوتے چمکتے ہوں گے، الفاظ پر ملمع کاری ہوگی، مگر اندر وہ چیز جو بیوی کے لیے مخصوص ہوتی ہے، کسی آسیب زدہ، مبہم اور سخت و تند خطے، گندے اور نشے جیسے جذبات سے کم نہیں ہوتی، جس میں شراب خانے کے باہر کا کھمبا بھی شامل ہوتا ہے۔

کوزیٹ کے اندرون میں کیا تھا؟ لوریوں سے سلائے گئے جذبات؛ نیم شفاف،

درخشاں، مخصوص گہرائیوں تک بے چین، اور سرتاپا افسردہ شخصیت۔ اس وجیہ افسر کا تصور سطح پر جھلکتا نظر آرہا تھا۔ کیا اس کی گہرائیوں میں کوئی نشانی لہرا رہی تھی؟ بالکل نشیب میں، بہت ممکن ہے کہ ہو، مگر کوزیت کو اس کا علم نہیں تھا۔

اور پھر ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا۔

۞

کوزیٹ کے خدشات

اپریل کے پہلے پندرہ دنوں کے دوران ژاں ولژاں نے سفر اختیار کیا۔ جیسا کہ قاری کے علم میں ہے، وقتاً فوقتاً طویل عرصے تک وقفے وقفے سے یہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ زیادہ سے ایک یا دو دن غیر حاضر رہتا۔ کہاں جاتا تھا؟ کوئی نہیں جانتا، کوزیٹ کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ اس قسم کی تین روانگیوں میں صرف ایک بار وہ کرایے کی گاڑی میں اس کے ساتھ اس اندھی گلی تک گئی تھی جس کے کنارے اس نے لکھا دیکھا تھا: Impasse de la Planchette۔ ژاں ولژاں اسی جگہ اتر گیا تھا، اور سواری کوزیٹ کو واپس بابل اسٹریٹ لے گئی تھی۔ یہ پھیرے عام طور ان دنوں لگتے تھے جب گھر میں نقدی کی کمی ہو جاتی تھی۔

سو، ژاں ولژاں غیر حاضر تھا۔ اس نے کہا تھا، ”میں تین دن بعد واپس آؤں گا۔“

اس شام کوزیٹ اپنی بیٹھک میں اکیلی تھی۔ اپنی بیزاری دور کرنے کے لیے اس نے پیانو کھول لیا اور تنہائی دور کرنے کے لیے Euryanthe [اوپرا] کا کورس Hunters astray in the wood! گانا شروع کر دیا تھا، اس دور کی موسیقی میں جو شاید سب سے خوب صورت گیت تھا۔ گانا ختم کرنے کے بعد وہ اپنے خیالات میں غرق ہو گئی تھی۔

پھر اچانک اسے باغیچے میں قدموں کی آواز محسوس ہوئی۔

یہ اس کا بابا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ غیر حاضر تھا؛ یہ توسا بھی نہیں ہو سکتی تھی، کہ وہ اپنے بستر میں تھی؛ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔

وہ بیٹھک کی کھڑکی میں لگی جھلملی کے قریب گئی، جو اس وقت بند تھی، اور کان لگا کر سننے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا یہ کسی آدمی کے قدموں کی چاپ تھی، اور وہ بہت آہستگی سے

چل رہا تھا۔ وہ فوراً پہلی منزل پر اپنے کمرے میں گئی، جھلملی کی درز میں سے جھانک کر باغیچے میں دیکھنے لگی۔ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر چیز اتنی صاف دکھائی دے رہی جیسے دن کا وقت ہو۔

اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس نے کھڑکی کھولی۔ باغیچے میں مکمل خاموشی تھی؛ بس اتنا دکھائی دے رہا تھا کہ عام راتوں کی طرح سڑک سنسان تھی۔ کوزیٹ نے سوچا کہ اسے مغالطہ ہوا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ اسے کوئی آواز سنائی دی تھی۔ وہ واہمہ تھا، جو اس کی افسردگی اور Weber کے دل خوش کن کورس کی پیداوار تھا، جو ذہن کے سامنے خوف زدگی کی گہرائیوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے، جو نظر کے ارتکاز کے سامنے چکرا کر جنگل کی طرح لرزنے لگتی ہیں، اور جہاں بے چین شکاریوں کے قدموں کے نیچے خشک شاخوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، جو دھندلکے میں دکھائی دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

کوزیٹ فطرتاً بہت بزدل نہیں تھی۔ اس کی رگوں میں بوہیمیائی اور ننگے پاؤں دوڑنے والی مہم جو خواتین کا خون دوڑتا تھا۔ قاری کو یاد ہوگا کہ وہ فاختہ کم اور مغنی چڑیا زیادہ تھی۔ اس کی بنیادوں میں خودسری اور بہادری بھری ہوئی تھی۔

اگلے دن، رات ہونے سے پہلے وہ باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ اپنے الجھے ہوئے خیالات کے درمیان جو اسے مصروف رکھے ہوئے تھے، اسے محسوس ہوا گویا ایک لمحے کے لیے پچھلی شام جیسی آواز آرہی تھی، گویا کوئی تھا جو شام کے دھندلکے میں پیڑوں کے نیچے چل پھر رہا تھا، اور اس سے زیادہ دور نہیں تھا؛ مگر پھر اس نے خود سے کہا کہ یہ آواز ایسی ہے جیسے دو شاخیں ایک دوسرے رگڑ کھا رہی ہوں؛ اور اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے علاوہ اسے کچھ دکھائی بھی نہیں دیا تھا۔

وہ جھاڑیوں سے برآمد ہوئی؛ اسے قدمچے تک پہنچنے کے لیے سبزہ زار کو پار کرنا تھا۔

کوزیٹ جس وقت جھاڑیوں سے باہر نکلی تو اس کے عقب سے طلوع ہوتے ہوئے چاند کی روشنی سے کوزیٹ کا سایہ سبزہ زار پر پڑ رہا تھا۔

کوزیٹ چونکی ہوکر اپنی جگہ کھڑی ہوگئی۔

چاند کی روشنی میں، اس کے اپنے سایے کے ساتھ سبزے پر ایک اور سایہ نمودار ہوا، جو زیادہ خطرناک تھا۔ اس سایے کے سر پر گول سی ہیٹ تھی۔

وہ سایہ کسی آدمی کا تھا جو گنجان جھاڑیوں کے قریب، کوزیٹ کے عقب میں چند قدم کے فاصلے پر برابر کھڑا رہا ہوگا۔ کوزیٹ خوف سے جم کر رہ گئی؛ نہ وہ بول پارہی تھی، نہ چیخ سکتی، نہ کسی کو

بلا سکتی تھی اور نہ پلٹ کر دیکھ سکتی تھی۔ بہرحال، اس نے اپنے ہوش مجتمع کیے اور ہمت کر کے پلٹی۔
وہاں کوئی نہیں تھا۔

کوزیٹ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ وجود غائب ہو گیا تھا۔ کوزیٹ دوبارہ جھاڑی میں گئی، ہمت کر کے سارے کونے چھان مارے، پھاٹک تک گئی، مگر اسے کچھ نہیں ملا۔ خوف سے اس کا جسم سرد پڑ گیا۔ تو کیا یہ ایک اور واہمہ تھا؟ یہ کیا— مسلسل دو دن میں دوبارا ایک واہمہ بھلایا جا سکتا ہے مگر ایک ساتھ دو واہمے؟ اس بارے میں پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ سایہ ہرگز خیالی نہیں تھا۔ خیالی وجود گول ہیٹ نہیں پہنا کرتے۔

اگلے دن ژاں ولژاں واپس آ گیا۔ کوزیٹ نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے سنا اور دیکھا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی اس کا بابا یہ سب سن کر اس سے ہم دردی کرے، اور اپنے کندھے ہلا کر کہے، ''تم بالکل بیوقوف ہو۔''

ژاں ولژاں فکر مند ہو گیا۔ ''ارے! یہ کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ اور وہ کسی بہانے وہاں سے ہٹ گیا، اور باغیچے میں گیا' کوزیٹ نے دیکھا کہ وہ پھاٹک کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

دوسری رات کوزیٹ [کوئی آواز سن کر] جاگ اٹھی؛ اس بار اسے پورا یقین تھا کہ اس نے اپنی کھڑکی کے قریب کسی کے قدموں کی آواز صاف سنی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف دوڑی، جھلملی کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ درحقیقت، اس وقت باغیچے میں ایک آدمی تھا جس کے ہاتھوں میں لمبی سی چھڑی تھی۔ وہ چیخ مارنے ہی والی تھی کہ چاندنی نے اس ہیولے کو روشن کر دیا۔ وہ آدمی اس کا بابا تھا۔ کوزیٹ اپنے آپ سے کہتی ہوئی بستر کی طرف واپس ہوئی، ''وہ بہت پریشان معلوم ہوتا ہے۔''

ژاں ولژاں نے وہ رات اور مزید دو مسلسل راتیں باغیچے میں گزاریں۔ کوزیٹ جھلملی سے اپنے بابا کو دیکھ لیتی تھی۔ تیسری رات چاند گھٹ رہا تھا اور دیر سے طلوع ہونے لگا تھا؛ ایک بجے کے قریب، اسے زوردار قہقہے کی آواز سنائی دی؛ اس کے بابا کی آواز اسے بلا رہی تھی، ''کوزیٹ!''

کوزیٹ بستر سے کودی، گاؤن بدن پر ڈالا اور اپنی کھڑکی کھول دی۔

اس کا بابا نیچے سبزہ زار پر کھڑا تھا۔

''میں نے تمھیں اطمینان دلانے کے لیے بلایا ہے۔'' اس نے کہا، ''وہ دیکھو، گول ہیٹ کے ساتھ وہ تمھارا ہی سایہ ہے نا۔''

اور اس نے سبزہ زار پر چاند سے پڑنے والے ایک سایے کی طرف اشارہ کیا جو کسی آدمی کا بالکل ویسا ہی تھا سایہ تھا جو ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ سایہ دراصل اس چمنی کے پائپ کا تھا

جس کے اوپر لوہے کے چادر کی چھتری تھی؛ اور یہ چمنی ہمسایے کی چھت کے اوپر تھی۔

کوزیٹ بھی اس کے قہقہے میں شریک ہو گئی؛ اس کے تمام معصوم قیاسات کم زور ہو گئے، اور اگلی صبح جب وہ اپنے بابا کے ساتھ ناشتا کر رہی تھی آہنی چمنی کی چھتری اور پُر اسرار باغیچے کے سایوں پر ہنس رہی تھی۔

ژاں ولژاں ایک بار پھر پُر سکون ہو گیا؛ جہاں تک کوزیٹ کا سوال ہے، اس نے اس نکتے پر زیادہ توجہ نہیں دی کہ اس سایے کی سمت میں چمنی ہی تھی جو اس رات دیکھا گیا تھا، اور کیا چاند بھی آسمان میں اسی مقام پر تھا۔

کوزیٹ نے خود بھی کسی چمنی کے انوکھے پن پر سوال نہیں اٹھایا، جس میں پکڑے جانے کا خوف تھا، اور جو غائب ہو جاتا ہے جب کوئی سایے کی طرف دیکھنے لگتا ہے، اس لیے کہ وہ سایہ چوکنا ہو گیا تھا جب کوزیٹ نے مڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس بارے میں کوزیٹ بہت سنجیدہ تھی۔ کوزیٹ کا اطمینان بحال ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک ثبوت مکمل تھا اور یہ فکر اس کے ذہن سے بالکل فرو ہو گئی تھی کہ اب کوئی شام میں یا رات میں باغیچے میں چلتا نظر آئے گا۔

چند دنوں بعد پھر ایک تازہ واقعہ رونما ہو گیا۔

۞

ٹوسا کی حاشیہ آرائیاں

سڑک پر گجی بازو کے قریب باغیچے میں پتھر کی ایک بنچ تھی جو متجسس نگاہوں سے بچنے کے لیے درختوں کی آڑ میں تھی مگر ضرورت کے وقت کوئی بازو درختوں اور پھاٹک کے ذریعے اس تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔

ایک شام اپریل کے مہینے میں ژاں ویلژاں باہر گیا ہوا تھا؛ سورج غروب ہو چکا تھا، کوزیت بنچ پر بیٹھی تھی۔ ہوا درختوں میں ہولے ہولے چل رہی تھی، کوزیت مراقبے کی سی کیفیت میں تھی: آہستہ آہستہ ایک بے مقصد قسم کی افسردگی کی پرچھائیاں اس کو اپنے حصار میں لیتی جا رہی تھیں، وہ ناقابلِ تسخیر افسردگی جو شام کی نازل کردہ تھی، جیسی شاید کسی مقبرے سے ابھرتی ہے جو ایسے وقت نیم وا ہوتا ہے۔

اس سائے میں شاید فانتین جلوہ گر تھی۔

کوزیت اٹھی اور دھیرے دھیرے باغیچے کا گشت کیا۔ اس وقت وہ خواب خرامی کی غم انگیز کیفیت میں غرق تھی اور خود سے کہہ رہی تھی، "واقعی ایسے وقت میں باغیچے میں چہل قدمی کے لیے لکڑی کے جوتوں کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ ٹھنڈ لگ جاتی ہے۔"

وہ واپس جا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

ابھی بیٹھی ہی رہی تھی کہ اسے اس جگہ، جہاں واپس آئی تھی، ایک بڑا سا پتھر نظر آیا، ظاہر ہے کہ جو ایک لمحے پہلے وہاں نہیں تھا۔

کوزیت غور سے اس پتھر کو دیکھنے لگی اور خود سے سوال کر رہی تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ یہ پتھر وہاں خود تو نہیں پہنچ سکتا تھا، اسے ضرور کسی بازو نے وہاں رکھ

دیا تھا اور وہ بار زوبار میں سے داخل کیا گیا تھا۔ اس خیال ہی سے وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس بار وہ خوف حقیقی تھا کہ پتھر اس جگہ اب بھی موجود تھا۔ اس پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا؛ اس نے پتھر کو ہاتھ نہیں لگایا، پلٹ کے دیکھے بغیر ہی وہاں سے بھاگ نکلی، گھر میں پناہ لی اور فوراً ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا، چٹخنی چڑھائی، اور دروازے جیسی کھڑکی کو جو زینے پر کھلتی تھی، بند کر لیا۔ اس نے توسا سے معلوم کیا، ''کیا میرا بابا ابھی واپس نہیں آیا ہے؟''

''نہیں میڈموزیل، ابھی تک تو نہیں۔''

(ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ توسا ہکلاتی تھی۔ کیا ہمیں اجازت ہے کہ ہم اس امر کو مستقبل کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس لیے کہ کسی جسمانی عیب کا موسیقی کا musical notation ہمارے نزدیک ناگوار ہوتا ہے۔)

ژاں ولژاں متفکر انسان تھا اور اگر دورانِ شب چہل قدمی کا موقع ملتا تو اکثر کافی دیر سے واپس آتا تھا۔

''توسا!'' کوزیت نے مزید کہا، ''کیا تم باغیچے کی طرف کھلنے والی کھڑکی احتیاط سے بند کر دیتی ہو اور لوہے کی وہ تمام اشیا ان چھوٹے چھوٹے حلقوں میں ڈال دیتی ہو جو کھڑکی کو بند رکھتے ہیں؟''

''اوہ، اس بارے میں بالکل فکر نہ کیجیے، مس۔''

توسا اپنے فرائض بڑی مستعدی سے ادا کرتی تھی۔ کوزیت بھی اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی، مگر اتنا کہنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی، ''یہاں بہت تنہائی ہوتی ہے۔''

''جہاں تک تنہائی کا معاملہ ہے، واقعی سچ ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اُف کر سکیں، ہمیں قتل بھی کیا جا سکتا ہے! موسیو بھی یہاں نہیں سوتے۔ مگر ڈریے نہیں مس، میں کھڑکیوں کو جیل کی طرح بند کر دیتی ہوں۔ اکیلی عورتیں! کسی کو لرزہ دینے کے لیے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔ ذرا تصور کیجیے، اگر رات کے وقت آپ کے کمرے میں کچھ آدمی گھس آئیں، اور آپ سے کہیں، 'خبردار! منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا' اور آپ کا گلا کاٹنا شروع کر دیں تو؟ مرنے کی پروا نہیں، کہ مرنا تو سب کو ہے اور یہ حقیقت بھی ہے، مگر ان لوگوں کے ہاتھ لگانے کا ناگوار احساس، اس پر ان کے چاقو، جن سے وہ آپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ اُف خدا کی پناہ!''

''آہستہ بولو۔'' کوزیت نے کہا، ''ہر چیز کو اچھی طرح بند کر دو۔''

توسا کے پیش کیے ہوئے جذبات انگیز ناٹک نے کوزیت کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ پچھلے

ہفتے کی آسیبی کیفیات کی یاد نے اس میں مزید اضافہ کردیا، جو اسے یاد آنے لگی تھیں: باغیچے کے پھاٹک کے کھلنے، اور ''ان آدمیوں'' کے گھس آنے کے خوف کے باعث وہ اپنے آپ سے یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتی تھی کہ جاؤ، اور اس پتھر کو دیکھو جو بنچ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس نے تمام دروازے اور کھڑکیوں کا معائنہ کیا کہ وہ اچھی طرح بند کر دیے گئے ہیں، اور نوسا کو سارے مکان اور تہہ خانے کا معائنہ کرنے کی تاکید کی، اپنے کمرے میں گئی، اندر سے تالا بند کرلیا، صوفے کے نیچے جھانک کر دیکھا، اور سونے چلی گئی؛ اس رات اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔ پوری رات [خواب میں] اس پتھر کو دیکھتی، وہی جو اب پہاڑ جیسا بڑا ہوگیا تھا جس میں بہت سے غار تھے۔۔

سورج کے طلوع کے وقت — اُبھرتے ہوئے سورج کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیں اپنی دشمنوں پر ہنساتا ہے اور ہمارے قہقہے ہماری دشمنوں کے تناسب سے ہوتے ہیں — جب کوزیت سو کر اٹھی، اس نے اپنے خوف کو محض خواب سمجھا اور خود سے کہا، ''میں بھی نہ جانے کیا سوچتی رہی ہوں؟ یہ بھی ان قدموں کی چاپ ہی کی طرح ہے جو میں سمجھی تھی کہ میں نے ایک ہفتہ قبل ایک رات اس باغیچے میں سنے تھے۔ یہ بھی چمنی کی سایے ہی کی طرح ہے۔ تو، کیا میں بزدل ہوتی جارہی ہوں؟'' سورج کی کرنوں نے، جو اس کی جھلملی کی درزوں سے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں، damask کے پردوں کو ارغوانی کر دیا تھا، اور کوزیت کو اس درجہ مطمئن کردیا تھا کہ اس کے خیالات سے ہر شے محو ہوگئی تھی؛ وہ پتھر بھی۔

''وہاں، اس بنچ پر کوئی پتھر نہیں ہے، جیسے اس رات باغیچے میں گول ہیٹ پہنے کوئی آدمی نہیں تھا؛ میں نے پتھر کا بھی اسی طرح خواب دیکھا ہے، جیسا پہلے ہو چکا ہے۔'' کوزیت خود کلامی کررہی تھی۔

اس نے کپڑے پہنے، باغیچے میں اُتری، بنچ کی طرف دوڑی گئی اور اس کو ٹھنڈا پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ پتھر وہیں موجود تھا۔ مگر یہ کیفیت صرف ایک لمحے رہی۔ وہ شے جو رات کے وقت خوف ہوتی ہے دن کی روشنی میں تجسس ہو جایا کرتی ہے۔ ''ہونہہ! آؤ دیکھتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے پتھر اٹھایا جو قابلِ برداشت حد تک بڑا تھا۔ اس کے نیچے کوئی شے تھی جو خط جیسی تھی۔ وہ سفید رنگ کا ایک لفافہ تھا۔ کوسٹ نے اسے جھپٹ لیا۔ اس پر نہ کوئی پتا تھا نہ اس کو بند کیا گیا تھا۔ بند نہ ہونے کے باوجود لفافہ خالی نہیں تھا۔ اس کے اندر کے کاغذات دیکھے جاسکتے تھے۔ کوزیت نے لفافے کا معائنہ کیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، نہ تجسس کی تھی۔ بس ایک

تشویش کی ابتدا تھی۔

کوزیٹ نے لفافہ خالی کیا، اس میں کاغذ کی ایک چھوٹی سے نوٹ بک تھی ۔اس کے ہر صفحے پر نمبر لگے ہوئے تھے، اور کوزیٹ کے خیال کے مطابق اس نوٹ بک میں بہت نفیس بلکہ نہایت خوب صورت خط میں چند سطریں تحریر کی گئی تھیں۔

کوزیٹ نے [لکھنے والے کا] نام تلاش کرنے کی کوشش کی؛ اس میں نام نہیں تھا۔تو یہ کس کے نام لکھا گیا تھا؟ شاید اسی کے نام، اس لیے کہ کوئی ہاتھ تھا جس نے لفافے کو بنچ پر رکھ دیا تھا۔کس کی طرف سے آیا تھا؟ ایک ناقابل مزاحمت تجسس نے کوزیٹ کو اپنی گرفت میں لے لیا؛ اس نے ان پرچوں سے نظریں ہٹانے کی کوشش کی، جو اس کے ہاتھوں میں لرز رہے تھے؛ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، سڑک پر نظر ڈالی، تمام درختوں پر غور کیا جو رات کے اندھیروں میں نہائے ہوئے تھے؛ کبوتروں کو دیکھا جو ہمسایے کی چھت پر پھڑ پھڑا رہے تھے، اور پھر اچانک اس کی نظر اس تحریر پر پڑی؛ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں کیا ہے۔

اور یہ ہے جو اس نے پڑھا تھا۔

۞

قلب تہہِ سنگ

کائنات کو گھٹا کر ایک وجود بنا دیا جانا؛ کسی واحد وجود کو پھیلا کر خدا بنا دیا جانا؛ یہی محبت ہے!

فرشتوں کا ستاروں کو سلام محبت ہے!

نفس محبت میں افسردہ ہو تو زیادہ افسردہ ہو جاتا ہے۔

اس وجود کے نہ ہونے سے کیسا خلا ہو جاتا ہے جو از خود دنیا کو بھر دیتی ہے۔ اف! کتنی سچ ہے یہ بات کہ [ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب] محبوب وجود خدا بن جاتا ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر خدا نے، جو سب کا باپ ہے، نفس کے لیے مخلوق پیدا نہ کی ہوتی، اور محبت کے لیے نفس کو پیدا نہ کیا ہوتا، تو وہ خود بھی بدگمان ہو سکتا تھا۔

سفید کتاں کے سرپوش تلے بنفشی پردے سے چھن کر آنے والے تبسم کی جھلک نفسِ انسانی کو خیالوں کے محل میں پہنچا دیتی ہے۔

ہر شے کے عقب میں خدا ہوتا ہے؛ پھر بھی ہر شے خدا کو چھپاتی ہے۔ اشیا سیاہ ہوتی ہیں، مخلوقات غیر شفاف ہوتی ہیں۔ کسی وجود سے محبت کرنا اس کو شفاف بنانے کے مترادف ہوتا ہے۔

کچھ خیالات دعائیں ہوتے ہیں؟ ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب جسم کا رویہ کچھ ہو، نفس گھٹنوں کے بل ہوتا ہے۔

جدا کیے جانے والے عاشق و معشوق کی غیر حاضری ہزاروں وہمی اشیا سے چھپائی جاتی ہے، مگر ان میں کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے ملنے سے روکا جاتا ہے؛ وہ ایک دوسرے کو خط نہیں لکھ سکتے؛ پھر بھی وہ خط لکھنے کے بے شمار مخفی طریقے دریافت کر لیتے

ہیں۔ ایک دوسرے کو چڑیوں کے راگ، پھولوں کے عطر، بچوں کے تبسم، سورج کی روشنی، ہوا کی سرسراہٹ، ستاروں کی کرنیں بھیجتے ہیں۔ کیوں نہیں؟ خدا کی ہر تخلیق محبت کی خدمت کے لیے ہوتی ہے۔ محبت میں وافر قوت ہوتی ہے؛ اپنے پیغامات سے پوری کائنات کو توانا کرسکتی ہے۔

اے موسم بہار! تو ہی تو وہ خط ہے جو میں اپنی محبوب کو لکھتا ہوں۔

مستقبل دلوں کی ملکیت ہوتا ہے، دماغ سے کہیں زیادہ۔ صرف محبت ہی وہ شے ہے جو ابدیت پر قابض ہوسکتی ہے اور اسے بھرسکتی ہے۔ لامحدودیت کے لیے لامتناہیت ناگزیر ہوتی ہے۔ محبت، نفس کی شریک ہوتی ہے۔ دونوں ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کو پسند کیجیے، یہ ملکوتی چنگاری پیدا کرتی ہے؛ اس کو پسند کیجیے، اس کو بگاڑا نہیں جاسکتا؛ ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے، دیرپا ہوتی ہے۔ محبت وہ آگ ہے جو ہمارے اندرون میں موجود ہوتی ہے، جو غیر فانی اور ابدی ہوتی ہے، جسے کوئی شے محبوس نہیں کرسکتی، جسے کوئی شے بجھا نہیں سکتی۔ ہم اس کو اپنے مغزِ استخواں تک جلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، اور ہم اس کی درخشانی کو بہشت کی گہرائیوں میں دیکھتے ہیں۔

اے محبت! بندگی تیرے لیے، دو دماغوں کی شہوانیت کے لیے، جو ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں؛ دو دلوں کے لیے جو دو نظروں کا تبادلہ کرتے ہیں جو ایک دوسرے میں داخل ہوجاتی ہیں! تم مجھ تک آؤ گے، ہے کہ نہیں! خوش رہو، تنہائیوں میں جوڑے بن کر رہو، خوش اور روشن دل بن کر رہو۔ میں کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں کہ فرشتوں کی زندگی سے گھنٹے الگ ہوجاتے ہیں، اور آدمیوں کے مقدر میں شامل ہوجاتے ہیں۔

ان لوگوں کی زندگی میں کچھ شامل نہیں کیا جاسکتا جو محبت کرتے ہیں، سوائے اس کے کہ ان کو لامتناہی عرصہ دے دیا جائے، محبت کی زندگی کے بعد، محبت کی ابدیت کے بعد؛ بلکہ تکثیر کے بعد بھی۔ اس ناقابلِ بیان آسودگی کی شدت کو بڑھایا نہیں جاسکتا جو انسان کو دنیا میں عطا ہوتی ہے، بہشت کی فراوانی خدا ہے؛ محبت کی فراوانی آدمی ہے۔

تم ستاروں کی طرف دو وجوہ سے دیکھتے ہو؛ اس لیے کہ وہ چمک دار ہوتا ہے اور اس لیے کہ اس میں داخل نہیں ہوا جاسکتا، مگر تمھارے پہلو میں تو ایک زیادہ دل ربا تابندگی ہے، ایک زیادہ بڑا معما ہے جسے عورت کہتے ہیں۔

ہم سب، خواہ کوئی بھی ہوں، سانس لینے والے وجود ہوتے ہیں۔ ہوا میں کمی ہو تو ہمارا دم گھٹ جاتا ہے اور ہم ہوا ہوجاتے ہیں۔ محبت کی کمی سے مرنا کتنا خوف ناک ہوتا ہے، نفس کے حبس سے۔

جب محبت دو وجود کو آپس میں آمیز کردیتی ہے، ایک مقدس اور ملکوتی اکائی بنا دیتی ہے،

ان کے لیے جو زندگی کے راز کو پا لیتے ہیں؛ اس کے بعد وہ ایک ہی نصیب کی دوسری حدوں سے زیادہ نہیں ہوتے؛ وہ ایک ہی جذبے کے دو شہروں سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اور محبت بلند ہونے لگتی ہے۔

کسی دن، جب عورت تمھارے سامنے سے گزرتے ہوئے روشنی خارج کرتی ہے، تم گم ہو جاتے ہو، تم محبت کرنے لگتے ہو۔ اس کے بعد تمھارے لیے صرف ایک ہی کام رہ جاتا ہے، اس کے بارے میں اتنی توجہ سے سوچنا کہ وہ بھی تمھارے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

محبت جس شے کو شروع کرتی ہے، صرف خدا ہی اسے ختم کر سکتا ہے۔

سچی محبت ہوتی ہے ناامیدی میں، اور مسحور ہو جاتی ہے کسی دستانے کے کھو دینے میں، کسی رومال کو پا لینے میں، اور اس کی پرستش میں اور اس کی امیدوں میں۔

اگر تم پتھر ہو تو ڈٹے رہو؛ اگر تم پودے ہو تو حساس پودے ہو؛ اگر تم آدمی ہو تو محبت ہو۔

محبت کبھی کافی نہیں ہوتی۔ ہم خوش ہوں تو ہم باغ کی تمنا کرتے ہیں؛ باغ مل جائے تو بہشت کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔

اے وہ کہ جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، محبت ہی میں سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی میں تلاش کرنا سیکھو۔ محبت بہشت بھی ہے اور بہشت سے زیادہ بھی، اس میں شہوت رانی ہوتی ہے۔

"کیا وہ اب بھی لکسمبرگ آتی ہے؟"

"نہیں جناب۔"

"یہی وہ کلیسا ہے جہاں وہ عبادت میں شریک ہوتی ہے؟"

"اب وہ یہاں نہیں آتی جناب۔"

"کیا وہ اب بھی اسی گھر میں رہتی ہے؟"

"وہ یہاں سے چلی گئی ہے۔"

"اب کہاں رہنے لگی ہے؟"

"اس نے بتایا نہیں۔"

"کتنے غم کی بات ہے کہ ہمیں اپنے نفس کا پتا معلوم نہیں۔"

محبت کا اپنا بچپنا ہوتا ہے؛ دوسرے جذبات کی اپنی کم مائیگی ہوتی ہے۔ شرم ان جذبات پر جو آدمی کو کمتر کر دیتے ہیں۔ سلام اسے جو انسان کو بچہ بنا دیتا ہے۔

ایک حیرت انگیز بات — کیا تمھیں اس کا علم ہے؟ میں شب باش شخص ہوں — اور ایک وجود ہے جو جاتے جاتے میرا آسمان لے گئی ہے۔

اوہ، کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم لیٹے ہوں ایک ہی قبر میں، پہلو بہ پہلو، دست در دست،

اور وقتاً فوقتاً اندھیرے میں ایک انگلی کو نرمی سے سہلاتے ہوں — میرے ابد کے لیے اتنا کافی ہوگا۔

وہ جو دُکھ اٹھاتے ہیں اس لیے کہ وہ محبت کرتے ہیں، وہ اور زیادہ محبت کرنے لگتے ہیں۔ محبت میں مرنا، اسی میں زندہ رہنے جیسا ہوتا ہے۔

محبت کیا ہے؟ تشدد! اداسی اور ستاروں بھری تبدیلیِ ہیئت اس تشدد میں آمیز ہو جاتی ہے۔ درد میں بے خودی بھی ہوتی ہے۔

اُف پرندوں کی مسرت! اس لیے ہوتی ہے کہ ان کے آشیانے ہوتے ہیں کہ وہ چہچہاتے ہیں۔

محبت آسمانی تنفس ہوتی ہے، بہشت کی ہوا میں سانس لیتی ہے۔

عمیق دل، عاقل دماغ، زندگی کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسی خدا نے بنائی ہے؛ زندگی ایک طویل آزمائش ہوتی ہے، نامعلوم نصیب کی ناقابلِ فہم تیاری ہوتی ہے۔ نصیب! سچا نصیب، آدمی کے لیے قبر میں پہلے قدم سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ ظاہر ہوتا ہے، اور وہ حقیقت کی شناخت کرنے لگتا ہے۔ زندہ لوگ لاانتہا کا تصور کرنے لگتے ہیں: حقیقت اپنے آپ کو دیکھنے کی اجازت صرف مردے کو دیتی ہے۔ اس دوران، محبت ہوتی ہے اور دُکھ، امید ہوتی ہے اور تصور۔ وائے اس پر جو صرف جسموں سے، پیکروں سے، شکلوں سے محبت کرتا ہے۔ موت اسے ان سب سے محروم کردے گی۔ نفوس سے محبت کرنے کی کوشش کرو، تم انھیں دوبارہ حاصل کرلو گے۔

میرا ایک بہت مفلس نوجوان سے سڑک پر سامنا ہوا جو محبت کرتا تھا۔ اس کی ہیٹ پرانی تھی؛ اس کا کوٹ پھٹا ہوا تھا، اس کی آستینوں میں سوراخ تھے؛ اس کے جوتوں سے پانی کے قطرے ٹپکتے تھے، اور روح سے ستارے۔

محبت کیا جانے، کتنی عظیم الشان بات ہوتی ہے! اس سے بھی زیادہ عظیم الشان بات محبت کرنا ہوتا ہے۔ جذبات کی قوت سے دل بہادرانہ ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہوتا سوائے اس کے جو خالص ہو؛ اس پر انحصار نہیں کرتا جو بلند اور عظیم نہ ہو۔ لائق خیال اس میں اُگ نہیں سکتے۔ پُرسکون اور بلند و بالا نفس، بیہودہ جذبات اور ولولے، حاوی ہوجانے والے بادل اور اس دنیا کی پرچھائیاں، اس کی نافہمیاں، اس کی غلط بیانیاں، اس کی نفرتیں، اس کی خودنمائیاں، اس کی بدنصیبیاں جنت کے آسمان میں رہنے لگتی ہیں، اور انھیں کچھ محسوس نہیں ہوتا سوائے نصیب کے، زیرِ زمین صدموں کے، اسی طرح جیسے پہاڑ کی چوٹیاں زلزلے کے صدموں کو محسوس کرتی ہیں۔

اگر کوئی محبت کرنے والا زندہ نہ ہوتا تو سورج ناپید ہو گیا ہوتا۔

۞

کوزیٹ اور وہ خط

کوزیٹ خط پڑھتی گئی اور خیالات میں غرق ہوتی گئی۔تین اس وقت جب اس کی نظریں نوٹ بُک کی آخری سطر سے اٹھی تھیں، وہ وجیہ افسر پھاٹک کے سامنے سے فاتحانہ انداز سے گزر رہا تھا۔

کوزیٹ کا ذہن ایک بار پھر اس نوٹ بُک کی طرح متوجہ ہو گیا۔بے حد دل رُبا انداز میں لکھی گئی تحریر ہے۔خط تحریر ایک ہی ہے، مگر یہ رنگ رنگ کی روشنائیوں میں غرق ہو کر لکھا گیا ہے، کوزیٹ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی، کبھی بہت سیاہ، کبھی سفیدی مائل سیاہی میں، گویا قلم دان میں، مختلف دنوں میں مختلف قسم کی روشنائیاں ڈالی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ لکھنے والے نے بغیر کسی مقصد کے، بے ترتیبی سے اپنا ذہن کھول کر رکھ دیا ہے۔کوزیٹ کی نظروں سے ایسی تحریر کبھی نہیں گزری تھی۔یہ تحریر جس میں اسے روشنی سے زیادہ ابہام نظر آ رہا تھا، اس پر کسی نصف وا عبادت گاہ کی طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔پُر اسرار سطریں اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھیں اور اس کا دل حیرت انگیز تابانی سے بھر گیا تھا۔اب تک جو تعلیم اس نے حاصل کی تھی اس میں ہمیشہ نفس اور روح کی باتیں کی جاتی تھیں، محبت کی کبھی نہیں؛ بالکل اسی طرح جیسے کوئی آگ کی نہیں مگر سوزش کی باتیں کر رہا ہو۔پندرہ صفحوں پر پھیلی اس تحریر نے بڑے دل رُبا پیرایے میں اس پر محبت، غم، نصیب، زندگی، ابدیت، ابتدا اور انتہا کو آشکار کر دیا تھا۔بالکل اسی طرح جیسے کسی ہاتھ نے اچانک اس پر طرح طرح کی روشنی کی کرنیں ڈال دی ہوں۔ان چند سطروں میں جذباتیت، گرم جوشی، فیاضی، ایمان دار فطرت، مقدس وصیت، لا انتہا غم اور لا انتہا افسردگی، دکھا ہوا دل، اور شدید بے خودی کی کیفیت محسوس ہوئی۔کیا تھا یہ مسودہ؟ ایک خط تھا، ایسا خط جس میں کوئی نام نہیں تھا، پتا نہیں تھا،

تاریخ نہیں تھی، دستخط نہیں تھے، تکلیف دہ اور بے لوث تھا، صداقتوں سے ترتیب دیا ہوا معما تھا، ایک پیغام تھا محبت کا جو کوئی فرشتہ لایا تھا، جسے ایک کنواری نے پڑھا تھا، کرۂ ارض کے حدود سے پرے کیا جانے والا عہد تھا، ایک محبت نامہ تھا جو کوئی فرضی شخصیت ایک پرچھائیں کو دے گئی تھی۔ وہ فرضی شخصیت نظروں سے اوجھل تھی، پُرسکون مگر قنوطی تھی، جو پناہ کی خواہاں تھی موت میں، جس نے اپنی ناموجود محبت، اس خاتون کو اپنے مقسوم کے راز کی اپنی زندگی کی کنجی، محبت بھیجی تھی۔ یہ تحریر لکھی گئی تھی جب لکھنے والے کا ایک قدم قبر میں تھا، اور ایک انگشت بہشت میں تھی۔ ان سطروں کو، جو ایک ایک کر کے کاغذ پر گری تھیں، روح سے ٹپکے ہوئے قطرے کہا جا سکتا ہے۔

یہ صفحات کہاں سے آسکتے تھے؟ کس نے انھیں لکھا ہوگا؟

کوزیت کو ایک لمحے بھی توقف نہیں ہوا۔ اس کے خیال میں صرف ایک ہی آدمی ہے۔

وہی!

اس کے جذبات میں ایک بار پھر سویرا ہو گیا! سب کچھ دوبارہ ظاہر ہو گیا۔ اس کو ان جانی سی خوشی اور گہری اذیت محسوس ہوئی تھی۔ وہی تھا، جس نے لکھا تھا اور وہاں سے ہی آیا تھا۔ وہ اُسی کا بازو تھا جو جنگلے سے گزر کر آیا تھا۔ کوزیت اسے بھول چکی تھی مگر اسے وہ دوبارہ مل گیا تھا! تو کیا کوزیت نے اسے بھلا دیا تھا؟ نہیں، ہر گز نہیں! ایک لمحے کے لیے بھی نہیں! یہ خیال ہی احمقانہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس سے محبت کرتی تھی، اس کی پرستش کرتی تھی۔ محبت کی آگ کو دبا دیا گیا تھا، صرف کچھ عرصے کے لیے، مگر اب وہ سب کچھ صاف دیکھ سکتی تھی: پہلے کوئی راستہ پیدا نہیں ہوا تھا، اب نئے سرے سے پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے اس کے پورے وجود میں اک آگ سی لگا دی تھی۔ یہ نوک تک چنگاری تھی، جو اُس دوسرے نفس سے اس نفس میں گری تھی۔ اسے اپنے اندر دوبارہ شعلے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔

کوزیت نے خود کو مکمل طور پر اس تحریر کے ہر لفظ کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ”ارے ہاں!“ اس نے کہا، ”کتنی اچھی طرح میں یہ سب پہچان گئی ہوں! یہی سب تو ہے وہ، جو میں اس کی آنکھوں میں دیکھ چکی ہوں۔“ جس وقت وہ تیسری بار اس تحریر کو ختم کر رہی تھی، لفٹنٹ تھیوڈول ایک بار پھر پھاٹک کے سامنے سے گزرا، اور اپنے جوتے کے کانٹے کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے کھڑکھڑایا۔ کوزیت کو مجبوراً آنکھ اٹھا کر دیکھنا پڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے چھچھورا، سادہ لوح، احمق، فضول، خود نما، گھناؤنا اور بے حد بدصورت کہہ رہی تھی۔ شاید افسر کا خیال تھا کہ اس کا فرض ہے کہ اس لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرا دے۔

کوزیٹ نے شرمندگی اور طیش میں آ کر منہ پھیر لیا تھا۔ کوئی شے ہاتھ آ جاتی تو وہ بے خوشی اس پر دے مارتی۔

وہ بھاگ کر گھر میں گئی، اور خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تا کہ اس تحریر کو ایک بار پھر پڑھ سکے، تا کہ اسے یاد ہو جائے، اور اس کے خواب بھی دیکھ سکے۔ جب وہ اسے پوری طرح پڑھ چکی تو اسے بوسہ دیا اور اپنی انگیا میں چھپا لیا۔

سب کچھ ہو چکا تھا۔

کوزیٹ واپس اس پاکیزہ اور گہری محبت میں ڈوب گئی تھی۔

باغِ عدن کے تحت الثریٰ میں ایک بار پھر جمائی لے رہی تھی۔

سارا دن کوزیٹ کا بے کلی میں گزرا۔ وہ کچھ سوچ نہیں پا رہی تھی؛ اس کے خیالات ذہن میں الجھے ہوئے گچھے کی طرح گھوم رہے تھے؛ لرزے کے عالم میں امید کر رہی تھی، کس بات کی؟ فضول چیزوں کی۔ اسے اپنے آپ سے وعدے کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بشرے پر زردی کے جھماکے آ رہے تھے، جا رہے تھے، اس کے وجود میں کپکپی دوڑ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ عجیب الخلقت مخلوقات کی سرزمین میں داخل ہو رہی تھی؛ اور وہ خود سے کہہ رہی تھی، ''کیا یہ سب حقیقت ہے؟''

ایک بار پھر اسے اس پیارے کاغذ کا خیال آیا جو اس کی انگیا کے، گاؤن کے اندر پوشیدہ تھا۔ اسے اپنے دل سے لگا لیا۔ اس کاغذ کے زاویے اسے اپنے گوشت میں محسوس ہو رہے تھے؛ اور اگر ایسے میں ژاں والژاں نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو اس تابندہ اور اَن جانی خوشی کے باوجود وہ کانپ گیا ہوتا، جو اس کی پلکوں کے نیچے سے بہہ رہی تھی — 'ارے ہاں!' اس نے سوچا، ''یقیناً یہ وہی ہے۔ یہ اسی کے پاس سے آیا ہے، اور یہ صرف میرے لیے ہے۔''

وہ خود سے کہہ رہی تھی کہ ایک ملکوتی مداخلت نے، ایک کائناتی اتفاق نے اسے مجھے واپس دے دیا ہے۔

اے محبت کی تبدیل شدہ شکل!

اے خوابو!

وہ کائناتی اتفاق، وہ ملکوتی مداخلت، روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جسے ایک ڈزد نے دوسرے ڈزد کی طرف، شارلیمین کے صحن سے شیر کی کھائی میں، 'لا فورس' کی چھت کے اوپر سے اچھال دیا ہے۔

✡

صحیح وقت پر بزرگوں کا ہٹ جانا

شام ہوتے ہی ژاں ولواں باہر چلا گیا۔ کوزیٹ نے لباس تبدیل کیا۔ موزوں طریقے سے اپنی زلفیں سنواریں اور ایسا لباس زیب تن کیا جس کی چولی میں ذرا زیادہ ہی قینچی لگ گئی تھی، اور اس کے گلے کا ابتدائی حصہ نظر آنے لگا تھا، جوان لڑکیوں کی زبان میں جو "قدرے بے شرمی" کی بات تھی۔ وہ بے شرمی ہرگز نہیں تھی، بس ذرا معمول سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے سنگھار ہی اس طرح کیا تھا، مگر اسے علم نہیں تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔

تو کیا وہ بھی باہر جانا چاہتی تھی؟ نہیں۔

کیا وہ کسی مہمان کی توقع کر رہی تھی؟ نہیں۔

شام کے دھندلکے میں، وہ باغیچے میں گئی۔ توسا باورچی خانے میں مصروف تھی، جس کا دروازہ عقبی صحن میں کھلتا تھا۔

وقتاً فوقتاً بہت نیچے لٹک جانے والی شاخوں کو اپنے ہاتھوں سے پرے کرتے ہوئے کوزیٹ نے درختوں کے نیچے ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ بنچ تک پہنچ گئی۔ پتھر اب بھی اسی جگہ رکھا ہوا تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھ گئی، اور آہستگی سے اپنا سفید ہاتھ اس پتھر پر رکھ دیا، گویا وہ اس کو سہلانا اور شکریہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔

اچانک اس پر وہ کیفیت طاری ہو گئی، جب کسی کو احساس ہو جاتا کہ اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا ہے، خواہ اس شخص کو دیکھا بھی نہ ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اور کھڑی ہو گئی۔

وہی تھا۔

اس کا سر برہنہ تھا، رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے کپڑے سیاہ تھے کہ مشکل سے نظر آتے

تھے۔ دھندلکے کی ہلکی ہلکی روشنی اس کے ابروؤں پر پڑ رہی تھی۔ شام کے سایے نے اس کی آنکھوں کو چھپا لیا تھا۔ بے مثل نرمی کے نقاب میں، کچھ ایسی کیفیت تھی جو بھوت آور اور شب جیسی تھی۔ ڈوبتے ہوئے دن کی روشنی نے اور اس روح کے خیال سے جو پرواز کرنے والی ہو، اس کا چہرہ روشن کر دیا تھا۔

وہ کوئی بھوت پریت نہیں تھا، مگر آدمی بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اس نے اپنی ہیٹ، چند قدم دور، جھاڑیوں پر پھینک دی تھی۔

کوزیٹ پر غشی کا دورہ پڑنے والا تھا مگر اس کے منہ سے چیخ نہیں نکلی۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹی، اس لیے کہ اسے اس شخص میں ایک کشش سی محسوس ہو رہی تھی، مگر وہ پریشان نہیں ہوئی۔ ایک ناقابلِ بیان اور غم انگیز کیفیت تھی جو اس پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ کیفیت محسوس ہو رہی تھی جسے وہ دیکھ نہیں سکی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے کوزیٹ درخت کے تنے سے ٹکرا گئی اور اس کا سہارا لے لیا تھا۔ اگر وہ درخت اس جگہ نہ ہوتا تو وہ گر پڑی ہوتی۔

کوزیٹ کو اس شخص کی آواز سنائی دی، وہ آواز جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی، جو پتوں کی سرسراہٹ سے ذرا بلند تھی، اور وہ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ معاف کیجیے گا، آج میں آپ کے سامنے آ گیا ہوں۔ میرا جی بھر چکا ہے۔ میں اس طرح جی نہیں پا رہا ہوں جس طرح جینا چاہتا ہوں، اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ کیا آپ نے وہ تحریر پڑھ لی ہے جو میں نے وہاں، اس بنچ پر رکھ دی تھی؟ کیا آپ مجھے پہچان پا رہی ہیں؟ مجھ سے خوف نہ کھائیے۔ بہت دن گزر چکے ہیں، آپ کو وہ دن یاد ہے نا، جب آپ نے مجھے لگزم برگ میں دیکھا تھا، Gladiator کے قریب۔ اور وہ دن بھی، جب آپ میرے سامنے سے گزر گئی تھیں؟ وہ جون کی سولھویں اور جولائی کی دوسری تاریخ تھی۔ تقریباً ایک برس قبل۔ میں نے بہت دن سے آپ کو دیکھا نہیں ہے۔ میں نے اس عورت سے پوچھا تھا، جس نے اس دن آپ کو کرسی فراہم کی تھی، مگر اس نے بھی اس دن کے بعد سے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ ان دنوں آپ l'Ouest اسٹریٹ پر مقیم تھیں، ایک نئی عمارت کی تیسری منزل پر سامنے والے فلیٹوں میں — دیکھا آپ نے، مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں آپ کا پیچھا کرتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ اور پھر آپ کہیں غائب ہو گئیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک بار میں نے آپ کو دیکھا تھا، جب میں اوڈین کے محرابی بازار میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں آپ کے پیچھے بھاگا تھا۔ مگر نہیں، وہ کوئی اور لڑکی تھی جو آپ جیسا سرپوش پہنے ہوئے تھی۔ میں رات ہی یہاں داخل ہوا ہوں۔ ڈریے نہیں، مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے۔ میں روزانہ آپ کی نیچے والی کھڑکی پر نظریں جمائے رکھتا تھا۔ میں بہت آہستہ چلتا تھا، تاکہ آپ کو سنائی نہ دے، کہ آپ خبردار نہ ہو جائیں۔ اس شام بھی میں آپ کے عقب میں تھا، جب اچانک آپ گھوم گئی تھیں۔ میں بھاگ گیا

تھا۔ میں نے آپ کو گاتے بھی سنا ہے۔ میں سن کر خوش ہوا تھا۔ کیا آپ پر کچھ اثر ہوا تھا، کہ میں نے جھلملی کے ذریعے آپ کو گاتے سنا تھا؟ آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی؟ نہیں، ہوئی تو نہ ہوگی؟ دیکھیے، آپ میری من موہنی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے آجانے دیا کیجیے؛ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اب میں مرنے والا ہوں۔ شاید آپ کو معلوم ہو، میں آپ کی پرستش کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے کہ میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں، مگر مجھے خبر نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں: میں نے آپ کو ناراض کر دیا ہوگا؛ کیا واقعی میں نے آپ کو ناراض کر دیا ہے؟"

"ارے! میری ماں!" کوزیٹ کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا اور وہیں ڈھیر ہوگئی، جیسے مرنے والی ہو۔

اس شخص نے کوزیٹ کو پکڑ لیا، وہ گری، اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا، گلے سے لگا لیا، سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو سہارا دیا، حالاں کہ وہ خود لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا گویا اس کا دماغ دھوئیں سے بھر گیا ہے؛ اس کے ہونٹوں کے درمیان بجلیاں کوند رہی تھیں؛ اس کے خیالات محو ہو گئے تھے؛ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ کوئی مذہبی عمل کر رہا ہے، اور یہ بھی کہ وہ بے حرمتی کا گنہ گار ہو رہا ہے۔ اس کے دل میں اس خوب صورت عورت کے بارے میں کسی قسم کا فاسد خیال نہیں تھا، جس کا بوجھ اس کی چھاتی پر محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت کی قربت میں محبت کا دخل نہیں تھا۔

کوزیٹ نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے وہ کاغذ محسوس ہوا؛ اور اس نے ہکلاتے ہوئے کہا، "تو، تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

لڑکی نے اتنی آہستگی سے جواب دیا، کہ وہ آواز نہیں، مشکل سے سنائی دینے والی سانس محسوس ہو رہی تھی، "شش! تو آپ جان گئے ہیں۔" اور اس نے اپنا تمتماتا ہوا چہرہ اس نفیس اور نشے میں مست نوجوان کے سینے پر رکھ دیا۔

وہ بنچ پر گر پڑا، لڑکی اس کے پہلو میں تھی۔ ان کے پاس الفاظ نہیں رہ گئے تھے۔ ستاروں نے دمکنا شروع کر دیا تھا۔ اسے کیسے علم ہوا کہ لب ملتے ہیں؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ پرندے گاتے ہیں، کہ برف پگھلتی ہے، کہ کلی کھلتی ہے، کہ مئی کا مہینہ وسیع ہوتا ہے، کہ سیاہ درختوں کے عقب میں، پہاڑیوں کی کپکپاتی چوٹی پر، سویرا سفید ہونے لگتا ہے۔

ایک بوسہ! بس اتنا ہی ہوا تھا۔

ستاروں جیسی چمکتی آنکھوں سے، دونوں اندھیرے میں گھور رہے تھے۔

انھیں نہ ٹھنڈی رات محسوس ہو رہی تھی، نہ ٹھنڈا پتھر، نہ نم زمین، نہ بھیگی گھاس؛ وہ بس ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے؛ ان کے ذہن خیالات سے بھر گئے تھے۔ لاشعوری طور پر ایک

دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

کوزیت نے اس سے پوچھا نہیں، نہ ہی اسے تعجب ہوا، کہ وہ اندر کیسے پہنچا، باغیچے میں کیسے آیا؟ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس لڑکے کو وہاں ہونا تھا۔

کبھی کبھی ماریوں کا گھٹنا کوزیت کے گھٹنے سے لگ جاتا، اور دونوں کانپ جاتے۔ وقفے وقفے سے، کوزیت ہکلا کر ایک آدھ لفظ ادا کر دیتی۔ اس کی روح اس کے ہونٹوں پر بے قرار ہو رہی تھی جیسے پھول پر قطرۂ شبنم۔

رفتہ رفتہ دونوں نے بات کرنی شروع کی۔ خاموشی کے بعد فضول گوئی شروع ہو جاتی ہے۔ رات پُرسکون اور شان دار ہو رہی تھی۔ دونوں وجود، روحوں جیسے پاک، ایک دوسرے سے سب کچھ کہہ گئے، اپنے خواب، اپنی سرشاریاں، اپنے وجد، اپنے توہمات، اپنی کم زوریاں، دور رہ کر ایک دوسرے سے پیار کرنے کی کیفیت، ایک دوسرے کے انتظار کی کیفیت؛ اپنی مایوسیوں کی باتیں کیں جب وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس مثالی قربت میں ایک نے دوسرے سے سب کچھ کہہ دیا تھا؛ جس سے زیادہ کہا نہیں جا سکتا تھا؛ دونوں نے اپنے تمام پُراسرار خیالات اور خفیہ ترین راز بیان کر دیے تھے۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کو نہایت صاف دلی سے اپنے سراب، اپنی محبت، اپنی جوانی اور بچپن کی باقیات جو اَب بھی ان کے دلوں میں لہراتی تھیں، سب کچھ بیان کر دیا تھا۔ دو دل کھلے اور اس طرح گھل مل گئے کہ صرف ایک چوتھائی گھنٹے کے اندر نوجوان لڑکے میں لڑکی کی، اور نوجوان لڑکی میں لڑکے کی روح سما گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں سرایت کر گئے، دونوں نے ایک نے دوسرے پر جادو سا کر دیا، دونوں نے ایک دوسرے کو خیرہ کر دیا تھا۔

جب وہ کہہ سن چکے تو لڑکی نے اپنا سر لڑکے کے کاندھے پر رکھ کر اس سے سوال کیا:

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ماریوں ہے۔" اس نے کہا۔ "اور تمھارا؟"

"میرا نام کوزیت ہے۔"

ہوا کی حاسدانہ شوخیاں

1823ء سے جب Montfermeil کا کلال خانہ تباہی زدہ جہاز پر بھیجا جا رہا تھا اور بتدریج دیوالیہ پن کی گہرائیوں میں نہیں، بلکہ قرضوں کے بدرو حوض میں غرق ہوتا جا رہا تھا، تین آردیے جوڑے کے دو اور بھی بیٹے تھے۔ اس طرح ان کی کُل اولاد پانچ تھی؛ تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔

خاتون تین آردیے غیر معمولی خوش قسمتی سے آخری دو سے اپنا پیچھا چھڑا چکی تھی، جب وہ بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ پیچھا چھڑانا ہی صحیح الفاظ ہیں۔ اس عورت میں مگر فطرت کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا باقی تھا۔ وہ عجوبہ پیکر جس میں ایک سے زیادہ مثالیں تلاش کی جا سکتی تھیں۔ مارشل de La Mothe-Houdancourt کی طرح، خاتون تین آردیے بھی صرف اپنی بیٹیوں کی ماں تھی۔ اس کی زچگی کی ذمے داریاں اسی نکتے پر ختم ہو گئی تھیں۔ نسلِ انسانی سے اس کی نفرت اس کے اپنے بیٹوں سے شروع ہوتی تھی۔ اپنے بیٹوں کے معاملے میں اس کی شیطنت مصالحت پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دل کے اس علاقے میں رنجیدگی کی ایک دیوار سی تھی۔ جیسا کہ قاری دیکھ چکا ہے سب سے بڑے لڑکے سے اسے شدید نفرت تھی؛ دوسرے دو لڑکوں کو وہ بد دعائیں دیا کرتی تھی۔ کیوں؟ کوئی پوچھے تو پلٹ کر جواب میں کہتی تھی، ''مجھے چیختے چلاتے لونڈوں کی کوئی ضرورت نہیں۔''

آیئے، اب ہم بتاتے ہیں کہ تین آردیے نے اپنے دو بیٹوں کو کس طرح ٹھکانے لگایا اور اس عمل سے فائدہ بھی اُٹھایا تھا۔

خانم میگنن، جس کا پچھلے صفحات میں تذکرہ کیا جا چکا ہے، وہی عورت تھی جو بوڑھے بلیر نورما کو اپنے دو بچوں کی سرپرستی پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ Celestins؛ ی گھاٹ پر رہتی تھی جو Petit-Musc کی قدیم سڑک کے کونے پر واقع تھا جہاں پہنچ کر اس کو اپنی

شیطانی شہرت کو خوش بو میں تبدیل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ قاری کو شناق کی وہ خوف ناک وبا یاد ہو گی جس نے پیرس میں دریائے سین کے ضلعوں میں پینتیس برس قبل تباہی مچا دی تھی، جس سے سائنس کو بڑے پیمانے پر پھٹکری سے بننے والی سونگھنے کی دواؤں کے تجربات کا موقع فراہم ہوا تھا، جس کو اب بیرونی استعمال کے آئیوڈین (iodine) ٹنکچر سے بدل دیا گیا ہے۔ اس وبا میں میگلن کے دونوں بیٹے کم عمری ہی میں مر گئے تھے؛ ایک صبح کو مرا تھا، دوسرا اس شام کو۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ یہ بچے اپنی ماں کے لیے بہت قیمتی تھے؛ اسّی فرانک فی ماہ آمدنی کا ذریعہ تھے۔ یہ اسّی فرانک موسیو بلیز نورما کی جانب سے کرایہ وصول کرنے والے موسیو برگے (Barge) پابندی سے ادا کرتے تھے، جو ریٹائرڈ چوب دار تھے اور Roi-de-Sicile سڑک پر رہتے تھے۔ بچوں کے مرنے کا مطلب آمدنی بند ہو جانا تھا۔ میگلن نے اس کے توڑ کا ایک مناسب طریقہ تلاش کر لیا۔ فری میسن شیطنت میں، وہ جس کا حصہ تھی، ارکان کو ہر بات معلوم ہوتی ہے؛ سارے راز خفیہ رکھے جاتے ہیں اور سب ہر رکن کو مدد فراہم کرتے ہیں۔ میگلن کو دو بچے درکار تھے۔ تنی آردیے کے پاس دو تھے، اسی جنس اور اسی عمر کے۔ ایک عورت کے لیے اچھا انتظام تھا، دوسری عورت کے لیے اچھی سرمایہ کاری تھی۔ تنی آردیے، میگلن بن گئے۔ میگلن نے Quai des Celestins کی رہائش ترک کر دی اور Clocheperce اسٹریٹ پر رہنے لگی۔ پیرس شہر میں رہنے والے اگر ایک سڑک چھوڑ کر دوسری سڑک پر چلے جاتے تھے تو ان کی شناخت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔

متعلقہ سرکاری دفتر کو مطلع نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا، اور دنیا کے سب سے آسان انداز میں تبدیلی مکمل ہو گئی۔ تنی آردیے نے بچوں کے قرض دیے جانے کا معاوضہ دس فرانک ماہانہ طے کیا، اور میگلن نے یہ رقم دینے کا وعدہ کر لیا، اور جو اس نے واقعی پورا کیا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ بلیز نورما بھی معاہدہ پورا کرتا رہا تھا۔ ہر چھ ماہ بعد وہ بچوں سے ملنے آتا تھا۔ وہ تبدیلی کو پہچان نہیں سکا تھا۔ "موسیو" میگلن اس سے کہتی تھی، "ان میں کتنی مشابہت ہے آپ سے۔"

تنی آردیے نے، جو دیوتاؤں کی طرح روپ بھرنے میں ماہر تھا، موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ژاندریت بن بیٹھا۔ اس کی دو بیٹیوں اور گاوروش کو یہ معلوم کر لینے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی کہ ان کے دو بھائی بھی تھے۔ جب بدنصیبی ایک خاص درجے تک پہنچ جاتی ہے اور انسان پر ایک قسم کی آہنی بے توجہی غالب آ جاتی ہے تو انسان دوسرے انسانوں کو بھی آسیب سمجھنے لگتا ہے۔ آپ کے قریب ترین رشتے دار بھی آپ کے لیے اکثر مبہم سایہ نما پیکروں سے زیادہ نہیں رہ جاتے، زندگی کے غیر واضح پس منظر بن جاتے ہیں اور ایک بار پھر آسانی سے نادیدہ کے ساتھ

درہم برہم ہو جاتے ہیں۔

اس شام، جب خاتون تین آردیے نے اپنے دو بچے میگنن کے حوالے کر دیے تھے، اس مصمم ارادے کے ساتھ کہ ان کو ہمیشہ کے لیے بھلا دے گی، وہ خود کو حقیر محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا تھا، ''مگر یہ تو اپنے بچوں سے دستبردار ہو جانے کے مترادف ہے!'' تین آردیے نے جو آگہی اور فن کاری کا ماہر ہے، حقیر ماں کو یہ کہہ کر داغ دیا تھا'' ژاں ژاک روسو (Jean Jacques Rousseau) تم سے کہیں بہتر تھا!'' حقیر ماں نے بے چینی سے کہا تھا، ''اور اگر پولیس نے ہمیں پریشان کیا تو؟ موسیو تین آردیے، آپ ہی کہیے کہ ہم نے جو کیا ہے کیا وہ جائز ہے؟'' تین آردیے نے جواب دیا ''ہر کام جائز ہوتا ہے، مگر اس میں ایک تو خالص شرافت نظر آئے گی، اس کے علاوہ جن کے پاس ایک سو بھی نہیں ہوتا انھیں بچوں کی دیکھ بھال کرنے میں دلچسپی نہیں ہوا کرتی۔''

جرائم کی منزل میں میگنن اس قسم کی فیشن پرست عورت تھی۔ وہ اپنے سنگھار کے معاملے میں بہت محتاط رہتی تھی۔ اس نے اپنی جائے قیام میں، جس کی آرائش بھی بدنصیبوں جیسی تھی، ایک فرانسیسی نما چالاک انگریز کو شریک کر رکھا تھا۔ یہ انگریز عورت، جو بہت سے رئیس رشتے داروں، کتب خانوں کے تمغا بردار رسوخ اور میڈموزیل مار (Mademoiselle Mar) کے ہیروں سے قربت کے ذریعے اصیل پیرس والی بن گئی تھی، اہل عدل میں باوقار شخصیت سمجھی جاتی تھی۔ وہ مامزیل مس (Mamselle Miss) کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔

ان بے چارے دو بچوں کو، جو میگنن کے ہو چکے تھے، اپنے گروہ سے شکایت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اسی فرانک کے سفارشیوں کو اچھی طرح رکھا جاتا تھا، ان اشیا کی طرح جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے؛ انھیں نہ کبھی خراب کپڑے پہنائے جاتے اور نہ کبھی بری غذا دی جاتی؛ ان سے ''ننھے شرفا'' کا سا سلوک کیا جاتا تھا— گویا، جھوٹی ماں، اصل ماں سے بہتر تھی۔ میگنن ہمیشہ باوقار خاتون کی طرح پیش آتی تھی؛ بچوں کی موجودگی میں چوروں بدمعاشوں کی زبان میں کبھی بات نہیں کرتی تھی۔

اس طرح کئی برس گزر گئے۔ تین آردیے اپنے اصل سے بہتر ثابت ہوا۔ ایک دن، جب میگنن اسے دس فرانک ماہانہ مشاہرہ ادا کرنے آئی تو اس نے یوں ہی میگنن سے پوچھ لیا تھا، ''ان کے باپ نے انھیں کچھ تعلیم ضرور دی ہوگی۔''

پھر یوں ہوا کہ ایک دن یہ دو بچے، اس وقت تک جن کی شیطانی مقسوم کے ہاتھوں بھی اچھی طرح نگہداشت کی گئی تھی، اچانک زندگی کے طوفان کے تھپیڑوں میں آ گئے، اور انھیں اس سے

خود تبرد آزما ہونا پڑا۔

بڑے پیمانے پر بدمعاشوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں، ویسی ہی جیسی کہ ژاندریت کی مانند میں ہوئی تھیں؛ پیچیدہ تفتیش اور اس بعد کی قید و بند ایک منتقمانہ مصیبت آئی تھی، اس ذراؤنی اور اخفا۔مخالف سوسائٹی کے لیے جو اپنی زندگی عام سوسائٹی کے سایے میں گزارنے کی سعی کرتی ہے؛ اس قسم کی مہم اداس دنیا کے تمام قسم کے مصائب پر منتج ہوتی ہے۔تس آردیے کے مصائب میں میگنس کے مصائب بھی پوشیدہ تھے۔

ایک دن جب میگنن نے ایپونین کو پلومے اسٹریٹ کے بارے میں ایک رقعہ دیا تھا، پولیس نے Clocheperce پر چھاپا مارا؛ میگنن پکڑی گئی اور ساتھ ہی اس کی دوست مام زیل مس بھی؛ اور تمام باسی اس گھر کے جو بہت مشتبہ تھا، جال میں آگئے تھے۔ جب یہ عمل جاری تھا، دونوں بے چارے بچے عقبی صحن میں کھیل کود میں مشغول تھے؛ انھیں پکڑ دھکڑ کا علم نہیں ہوا تھا۔ جب انھوں نے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی تو دروازہ مقفل ملا اور گھر خالی۔گھر کے سامنے جفت سازی کی دُکان والے نے انھیں آواز دی اور ایک رقعہ پکڑا دیا جو اُن کی ماں اُن کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اس رقعے پر ایک پتا لکھا ہوا تھا: موسیو برگے، کرایہ وصول کرنے والے، Roi-de-Sicile اسٹریٹ، مکان نمبر ۹۔ دُکان کے مالک نے ان سے کہا، ”اب تم یہاں نہیں رہ سکتے۔ وہاں چلے جاؤ، زیادہ دور نہیں ہے۔بائیں جانب کی پہلی سڑک ہے۔اس کاغذ پر لکھے پتے سے راستہ دریافت کر لینا۔“

بچے چل پڑے، بڑا بچہ چھوٹے کی رہنمائی کر رہا تھا، وہ رقعہ اسی کے ہاتھ میں تھا۔ سردی بہت تھی، اور اس بچے کی سُن انگلیاں ٹھیک سے بند نہیں ہو پا رہی تھیں، اور رقعے کو اچھی طرح گرفت میں نہیں رکھ سکیں۔Clocheperce اسٹریٹ کے کونے پر ہوا کا ایک جھکڑ آیا اور اس کاغذ کو ان کے ہاتھوں سے اڑا لے گیا؛ رفتہ رفتہ رات ہو رہی تھی اور بے چارہ بچہ رقعہ تلاش نہیں کر سکا۔

انھوں نے سڑکوں پر بے مقصد پھرنا شروع کر دیا۔

۞

گاوروش کا نپولین سے فائدہ اٹھانا

پیرس میں بہار کا موسم اکثر چھیدنے والی ہواؤں کی زد پر ہوتا ہے جو سرد ہی نہیں جما دینے والی ہوتی ہیں۔ یہ شمالی ہوائیں جو خوب صورت ترین دلوں کو بھی اداس کر دیتی ہیں، سرد ہوا کی ان پھونکوں جیسا اثر پیدا کرتی ہیں جو خراب طریقے سے لگائے ہوئے دروازوں کھڑکیوں کے شگاف کے ذریعے کسی گرم کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سرما کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو اور اس میں تیز ہوا کے جھکڑ داخل ہو رہے ہوں۔ 1832ء کے موسم بہار میں جب یورپ میں اس صدی کی پہلی وبا پھوٹی تھی، شمالی ہوا کے تند جھونکے ہمیشہ سے زیادہ سخت اور چھیدنے والے ہو گئے تھے۔ ایک دروازہ تھا جو سرما سے زیادہ برفانی تھا اور کھلا رہ گیا تھا۔ یہ قبر کا دروازہ تھا۔ ان ہواؤں میں کالرا کی بو محسوس ہوتی تھی۔

موسمیات کے نقطۂ نظر سے یہ ہوائیں ایسی خصوصیات کی حامل ہوتی تھیں کہ ان سے سخت برقیاتی تناؤ کو خارج از امکان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ متعدد طوفان، جو گرج چمک کے حامل ہوتے تھے، اسی زمانے میں آیا کرتے تھے۔

ایک شام جب ایسی ہی طوفانی ہوائیں تندی سے چل رہی تھیں، اور اس درجے کی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جنوری کا مہینہ واپس آ گیا ہے اور بورژوا نے اپنے لبادے دوبارہ نکال لیے تھے، بے چارہ گاوروش جو ہمیشہ اپنے چیتھڑوں میں کانپتا نظر آتا تھا، Orme-Saint- Gervais کے جوار میں ایک وگ بنانے والے کی دکان کے سامنے بے خودی کے عالم میں کھڑا تھا۔ اس پر زنانہ اونی شال پڑی تھی جو نہ جانے کہاں سے چرائی گئی تھی، جس کو گلو بند بنا لیا گیا تھا۔ گاوروش کی نظریں موم سے بنی دلہن پر تھیں، جس کا لباس کھلے گلے کا تھا، سر پر

نارنجی پھولوں کا تاج تھا، جو گیس سے جلنے والے دو لیمپوں کے درمیان دُکان کی کھڑکی میں گھوم رہی تھی اور راہ گیروں پر اپنے تبسم کا مظاہرہ کر رہی تھی، مگر درحقیقت وہ دُکان کا اس مقصد سے جائزہ لے رہا تھا کہ وہاں سے کسی طرح صابن کی ایک ٹکیا اڑا لے اور مضافات کے کسی حجام کے ہاتھ ایک سو میں فروخت کر دے۔ کئی بار وہ اسی طرح ناشتا اڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنے اس نوعیت کے کام کو، جس کی اس میں خاص صلاحیت تھی، وہ "حجام کی حجامت بنانا" کہا کرتا تھا۔

موئی دلہن کے تصور کے ساتھ ہی، جب وہ صابن کی ٹکیا چرانے کی فکر میں تھا، وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا، "منگل، آج منگل تو نہیں۔ کیا آج منگل ہے؟ شاید منگل ہی ہے! ارے ہاں آج منگل ہی تو ہے۔"

کیا آج تک کسی کو پتا چلا ہے کہ اس کی وہ خود کلامی کس بارے میں تھی؟

ہاں! شاید اس خود کلامی کا اس موقعے سے کچھ تعلق تھا جب، تین دن قبل، اس نے رات کا کھانا کھایا تھا، اس لیے کہ آج جمعے کا دن تھا۔

حجام اپنی دُکان میں جو بڑی سی انگیٹھی سے گرم ہو رہی تھی، اپنے گاہک کی داڑھی بنا رہا تھا، اور رہ رہ کر اس دشمن پر سرسری نظر بھی ڈالتا جا رہا تھا؛ اس ٹھٹھرتے ہوئے گستاخ سر راہ اُچکے پر، جس کے دونوں ہاتھ جیب میں تھے مگر صاف ظاہر ہے کہ دستانے سے عاری تھے۔

جس وقت گاؤروش دُکان کی کھڑکی اور ونڈسر صابن کے چکر میں تھا، صاف ستھرے لباس میں ملبوس مختلف حیثیت کے دو لڑکوں نے، جو اس سے چھوٹے تھے، ایک سات برس کا تھا، دوسرا پانچ برس کا، ڈرتے ڈرتے دُکان کے دروازے کا دستہ گھمایا اور دُکان میں داخل ہو گئے، کسی نہ کسی قسم کی التجا کے ساتھ، یا شاید خیرات کے لیے، جس میں حزن کم تھا اور کراہ زیادہ تھی۔ دونوں ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے اس لیے کہ چھوٹے کی ہچکیاں آوازوں میں خلل پیدا کر رہی تھیں اور بڑے کے دانت سردی کے باعث بج رہے تھے۔ حجام نے گھوم کر ان پر قہر بھری نظر ڈالی، اور استرا رکھے بغیر ہی بائیں ہاتھ سے بڑے کو اور گھٹنے سے چھوٹے کو باہر دھکیل دیا، اور یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر لیا، "اندر آ کر خواہ مخواہ ہر ایک کو سردی سے جمائے دے رہے ہو۔"

دونوں روتے ہوئے اپنے راستے چل پڑے۔ اس دوران بادل آ گئے اور بارش شروع ہو گئی تھی۔

گاؤروش ان کے پیچھے دوڑا اور فہمائش کی، "لونڈو! تمھارا مسئلہ کیا ہے؟"

''خدا ہی جانے، آج رات ہم سوئیں گے کہاں؟'' بڑے نے جواب میں کہا۔

''بس، یہی اتنا؟'' گاوروش نے کہا، ''مسئلہ تو واقعی بڑا ہے۔اسی لیے رو دھو رہے ہو؟ کیا سبزہ زار کم ہو گئے ہیں؟'' اور برتری جتاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا جس میں ہلکی سی دل لگی بھی تھی اور تھوڑی سی سرپرستی بھی، ''میرے ساتھ آؤ بچو۔''

''بہت اچھا جناب!'' بڑے نے کہا۔ اور دونوں اس طرح اس کے پیچھے چل پڑے لوگ جیسے کسی آرچ بشپ کے پیچھے چلتے ہیں۔انھوں نے رونا بند کر دیا تھا۔

گاوروش انھیں Saint-Antoine اسٹریٹ تک لے گیا، جو Bastille کی طرف لے جاتی ہے۔ان کے ساتھ چلتے ہوئے گاوروش نے پلٹ کر حجام کی دکان پر غضب ناک نظر ڈالی۔

''اس شخص کے سینے میں دل نہیں۔'' بڑبڑاتے ہوئے کہا، ''یہ انگریز ہے نا۔''

ایک عورت جس نے ان تینوں کو قطار میں چلتے دیکھا تھا، گاوروش جن کی سربراہی کر رہا تھا، زوردار قہقہہ مار کر ہنسی۔اس کا قہقہہ اس چھوٹے سے گروہ پر طنز تھا۔

''سلام، مامزیل آمنی بس (Mamselle Omnibus)۔'' گاوروش نے اُسے دیکھ کر کہا۔ایک لمحے بعد ہی اس کے ذہن میں حجام کا خیال آگیا، اور اس نے مزید کہا، میں نے اس جانور کے بارے میں غلطی کی ہے؛ وہ مچھلی نہیں اژدہا ہے۔اے حجام، میں کسی قفل ساز کی تلاش میں ہوں۔تیری دم میں گھنٹی بندھوا کر ہی دم لوں گا۔''

حجام نے اسے غصہ دلا دیا تھا۔ایک بدرو پار کرتے ہوئے اسے گچھی ڈاڑھی والی ایک دربان عورت نظر آئی جو Brocken (پہاڑ کی چوٹی) پر Faust سے ملنے کے قابل تھی، اور جس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔

''مادام!'' اس نے کہا، ''کیا تم اپنے گھوڑے پر سفر کر رہی ہو؟''

اس کے بعد اس نے ایک پیدل راہ گیر کے جوتے خراب کر دیے۔

''راہ گیر نے چیخ کر کہا، ''بدمعاش۔''

گاوروش نے شال سے باہر اپنی ناک نکالی۔''کیا موسیو شکایت فرما رہے ہیں؟''

''ارے!'' اس آدمی نے بے ساختہ کہا

''دفتر بند ہے۔'' گاوروش نے کہا، ''اب مزید شکایات نہیں لی جا سکتیں۔''

اس دوران، وہ سڑک پر آگے بڑھا تو اسے بھیک مانگنے والی ایک لڑکی دکھائی دی، تیرہ یا چودہ برس کی رہی ہوگی، اتنی اونچی پیشواز میں ملبوس تھی کہ اس کے گھٹنے نظر آ رہے تھے، سردی

میں گٹھری porte-cochere کے نیچے لیٹی تھی۔ ایسے کام کرتی رہی تو بہت جلد بوڑھی ہو جائے گی۔ نشوونما کا عمل ہمیشہ ایسا ہی داؤ چلتا ہے۔ جب بدبختی نا شائستہ ہو تو زیر جامہ چھوٹا ہو جاتا ہے۔

"بے چاری لڑکی!" گاوروش نے کہا۔ "اس کے پاس پاجامہ بھی نہیں۔ ٹھہرو، لو، یہ لے لو۔"

اپنی گردن سے آرام پہنچانے والا اونی گلوبند کھولا، اور دبلی پتلی فقیر لڑکی کے شانوں پر ڈال دیا، جہاں پہنچ کو گلوبند ایک بار پھر شال بن گیا تھا۔

لڑکی نے اسے حیرت سے دیکھا اور خاموشی سے شال وصول کر لی۔

بدنصیبی میں جب مصیبت ایک حد تک بڑھ جاتی ہے تو غریب آدمی تباہی پر کراہنا چھوڑ دیتا ہے، نیکی کا شکریہ تک ادا نہیں کرتا۔

"ایک کام تو ہو گیا۔" کپکپاتے ہوئے گاوروش کے منہ سے بس "Brrr!" ہی نکل رہا تھا۔ وہ سینٹ مارٹن سے زیادہ کانپ رہا تھا، اس لیے کہ سینٹ نے ایک نصف لبادہ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس brrr! پر بارش تیز ہو گئی تھی۔ شریر آسمان نیک کاموں کی سزا دیتے ہیں۔

"اچھا، بہت ہو چکا۔" گاوروش نے بلند آواز میں کہا، "اب! اس کا مطلب کیا ہے؟ پھر بارش ہونے لگی! خدایا! اگر یہی ہوتا رہا تو میں اپنا چندہ دینا بند کر دوں گا۔"

اور وہ پھر چل پڑا۔

"اب ٹھیک ہے۔" فقیر لڑکی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جو شال میں گٹھری سے بن گئی تھی، اس نے کہا، "اس کو ایک مشہور چھلکا مل گیا ہے۔"

اور بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا، "پکڑے گئے نا!"

وہ موٹی موٹی جالیوں کے پاس سے گزر رہے تھے جو نان بائی کی دُکان کی نشانیاں ہوتی ہیں، اس لیے کہ روٹی سونے کی طرح سلاخوں کے پیچھے رکھی جاتی ہے۔

گاوروش کہا۔ "ارے ہاں، لڑکو! کیا ہم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"موسیو!" بڑے لڑکے نے جواب دیا، "صبح سے ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"

"تو، تمھارا نہ باپ ہے، نہ ماں؟" گاوروش نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

"معاف کیجیے جناب، ہمارے پاپا بھی ہیں اور مما بھی، مگر پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔"

"کبھی کبھی یہ جاننا بہتر ہوتا ہے کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟" گاوروش نے کسی مدبر کی طرح کہا۔

"ہم دو گھنٹوں سے آوارہ گردی کر رہے ہیں۔" بڑے لڑکے نے کہا، "ہم سڑکوں کے

کونوں پر چیزوں کی تلاش میں رہے ہیں، مگر کچھ ملا نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے فوراً جواب دیا "کہ گھٹیے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔"

ایک لحظہ توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا، "ہم نے اپنے منصف کھو دیے ہیں۔ نہ معلوم ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ لاوارث لڑکے تو نہیں۔ بوڑھے لوگوں کو اس طرح گمراہ چھوڑ دینا کتنی بڑی حماقت ہے۔ چلو ہمیں بھی تھوڑی سی نیند لے لینی چاہیے۔"

پھر بھی، اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ سادہ سی بات یہ تھی کہ ان کے پاس رہنے کو گھر نہیں تھا۔

دو بچوں میں بڑا، جو بچپنے کی لاپروائی سے نکل آیا تھا اس نے احتجاج کیا، "کتنی عجیب بات ہے۔ مما نے کہا تھا کہ ہمیں Palm Sunday پر ایک مقدس پھوار لینے جانا ہوگا۔"

"بکواس!" گاوروش نے کہا۔

"مما وہی خاتون ہے جو مادمزیل مس کے ساتھ رہتی ہے۔" بڑے لڑکے نے کہا۔

"اب بھی؟" گاوروش نے پلٹ کر پوچھا۔

اس دوران وہ رُک گیا تھا، اور پچھلے دو منٹ سے اپنے چیتھڑوں کا کونا کونا ٹٹول رہا تھا۔ بالآخر، اس نے اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ مطمئن ہے، مگر دراصل وہ خود کو فاتح محسوس کر رہا تھا۔ "گھبراؤ نہیں جوانو! یہ رہا تین آدمیوں کا کھانا۔" اور اپنی جیب میں سے ایک سُو کا سکہ نکالا۔

ان دو لڑکوں کو حیران ہونے کا وقت دیے بغیر، دونوں کو نانبائی کی دُکان میں دھکیل دیا، کاؤنٹر پر سُو کا سکہ اچھالا اور چلّا کر کہا، "بیٹا! پانچ سنٹ کی ڈبل روٹی۔"

نانبائی نے، جو دُکان کا مالک بھی تھا، ڈبل روٹی اٹھائی اور چاقو سنبھالا۔

"تین ٹکڑوں میں دینا بیٹا۔" گاوروش نے مزید کہا، اور بڑے وقار سے اضافہ کیا، "ہم تین ہیں۔"

یہ دیکھ کر نانبائی نے تینوں گاہکوں پر نظر ڈالی اور ایک کالی ڈبل روٹی اٹھائی، گاوروش نے اپنا ہاتھ اتنی دور تک بڑھایا تھا کہ انگلی ناک تک پہنچ جاتی، ایسی سانس کے ساتھ گویا اس کے انگوٹھے پر Frederick کی ناس لگی ہو، اور نانبائی کے چہرے کو کوستے ہوئے کہا، "Keksekca?"

وہ قاری جنھیں تجسس ہو کہ گاوروش نانبائی سے روسی یا پولش زبان میں کچھ کہہ رہا ہے، ان کے لیے عرض ہے کہ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک Yoways اور Botocudos

[قبائلی لوگ] ایک دوسرے کو ان ہی الفاظ میں مخاطب کرتے ہیں، یہ ان ہی الفاظ کا نعم البدل ہے جو [ہمارے قاری] روز استعمال کرتے ہیں یعنی "Qu'est-ce que c'est que cela?" [یہ کیا؟]۔

نانبائی فوراً سمجھ گیا، اور جواب میں کہا "مگر، یہ بھی ڈبل روٹی ہی ہے، دوسرے درجے کی بہت اچھی ڈبل روٹی ہے۔"

"یعنی یہ کالی ڈبل روٹی ہے!" گاوروش نے پُرسکون اور تحقیر کے لہجے میں کہا، "بیٹا، ہمیں سفید ڈبل روٹی چاہیے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔"

نانبائی اپنا تبسم چھپا نہیں سکا، اور ڈبل روٹی کاٹتے ہوئے ترحمانہ انداز میں ان سب پر نگاہ ڈالی، جو گاوروش کو اچھا نہیں لگا۔

"نانبائی بیٹا" اس نے کہا، "ہمیں اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟" وہ تینوں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح کھڑے تھے کہ انھیں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

روٹی کٹ گئی تو نانبائی نے سو کا سکہ میز کی دراز میں ڈال لیا، اور گاوروش نے دونوں بچوں سے کہا "اب ذرا محنت کرو۔"

بچوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

گاوروش زور سے ہنسا۔ "اوہ! اچھا۔ یہ سمجھ نہیں سکے ہیں؛ ابھی بہت چھوٹے ہیں نا۔"

اور اس نے دوبارہ کہا "اب کھاؤ نا۔"

ساتھ ہی دونوں کو ڈبل روٹی کا ایک ایک ٹکڑا پیش کر دیا۔

یہ سوچ کر کہ بڑا لڑکا اس کی بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اور اس کو اپنی بھوک مٹانے کے لیے تحیر سے نکالنا پڑے گا، اس کو روٹی کا سب سے بڑا ٹکڑا دیتے ہوئے کہا "اس کو اپنی تھوتھنی میں ٹھونس لو۔"

سب سے چھوٹا ٹکڑا اپنے لیے رکھ لیا۔

غریب بچے، گاوروش سمیت، تقریباً فاقے سے تھے۔ جب وہ اسی جگہ کھڑے تو الے برابر روٹی کے ٹکڑے توڑ رہے تھے تو دکان گھر گئی تھی، اور چوں کہ قیمت چکائی جا چکی تھی، نانبائی ان کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔

"آؤ اب واپس سڑک پر چلیں۔" گاوروش نے کہا۔

ایک بار پھر وہ Bastille کی سمت چل پڑے۔

جب بھی روشن دُکانوں کی تنی کھڑکیوں کے پاس سے گزرتے، تو چھوٹا لڑکا رُک کر گھر میں دُور سے لگی گھڑی دیکھنے لگتا۔

''واہ، بڑا بہت ہوشیار لڑکا ہے'' گاوَروش کہتا۔ پھر کچھ سوچ کر منہ ہی منہ میں کہنے لگتا، ''سارے بچے ایک جیسے ہوتے ہیں، اگر بچے میری ذمے داری ہوتے تو میں ہمیشہ، انھیں تالے میں بند ہی رکھتا۔''

جب وہ اپنی روٹی ختم کر رہے تھے، اور سنسان Ballets اسٹریٹ کے اس زاویے پر پہنچ گئے تھے جس کے دوسرے سرے پر لافورس کی ڈراؤنی کھڑکی نظر آتی تھی، ایک آواز آئی:

''ہیلو! ارے! یہ تم ہو، گاوَروش'' کسی نے کہا۔

''ہیلو! تم ہو، مونٹ پارناس؟'' گاوَروش نے کہا۔

تھوڑی دیر پہلے، ایک آدمی نے آوارہ لڑکوں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ نیلا چشمہ لگائے، بھیس بدلے، مونٹ پارناس کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ گاوَروش اسے پہچان گیا تھا۔

''واہ بھئی واہ!'' گاوَروش نے کہا، نیلے چشمے میں تو بالکل ڈاکٹر لگ رہے ہو۔''

''ہونہہ، آہستہ بولو۔'' مونٹ پارناس نے کہا۔

اور گاوَروش اس کا بازو پکڑ کے روشن دُکانوں سے پرے لے گیا۔

میکانکی انداز میں دونوں چھوٹے بھی، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس کے پیچھے چلے۔

جب وہ لوگ بارش سے اور لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے گاڑی بانوں کی محراب کے نیچے چھپ گئے تو مونٹ پارناس نے سوال کیا، ''تمھیں پتا ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟''

''Abbey of Ascend-with-Regret'' گاوَروش نے جواب دیا۔

''مسخرے!''

مونٹ پارناس کہتا رہا، ''میں بابے کی تلاش میں جا رہا ہوں۔''

''اوہ، تو اس لڑکی کا نام بابے ہے؟'' گاوَروش نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

مونٹ پارناس نے دھیمی آواز میں کہا، ''لڑکی نہیں لڑکا ہے۔''

''اوہ بابے؟''

''ہاں بابے!''

''میں تو سمجھا تھا کہ وہ پکڑا گیا ہے۔''

''تڑا کر بھاگ نکلا ہے۔'' مونٹ پارناس نے جواب دیا۔ اور اس نے تیزی سے

بیان کرنا شروع کیا کہ اسی دن صبح کے وقت، جب بابے کو La Conciergerie منتقل کیا جا رہا تھا، پولیس کے دفتر میں، دائیں مڑنے کے بجائے اچانک بائیں مڑا اور فرار ہوگیا تھا۔

گاؤروش نے اس کی ہنر مندی کی تعریف کی۔ ''بڑا فن کار آدمی ہے!'' اس نے تیخ کر کہا۔

مونٹ پارناس نے اس کے فرار کی چند مزید تفصیلات بیان کیں، اور اس جملے پر ختم کیا:

''ارے یہی نہیں، اور بھی بہت کچھ ہے۔''

اس کی بات سننے کے دوران گاؤروش نے مونٹ پارناس کے ہاتھ سے اس کی چھڑی چھین لی تھی اور بالکل میکانکی انداز میں اس کا اوپری حصہ گھمانے لگا تھا؛ اس میں سے چھپی خنجر جیسی ایک شے برآمد ہوئی۔

''واہ!'' خنجر کے پھل کو جلدی سے واپس دھکیلتے ہوئے کہا، ''تم تو بورژوا کے بھیس میں سپاہی ساتھ لیے پھرتے ہو۔''

جواب میں مونٹ پارناس نے صرف آنکھ ماردی۔

''خبیث! کیا تو پولیس سے دودو ہاتھ کرنے والا ہے؟'' گاؤروش نے سوال کیا۔

''کہا نہیں جاسکتا۔'' مونٹ پارناس نے جواب دیا، ''کچھ نہ کچھ ہاتھ میں رکھنا اچھا ہوتا ہے۔''

گاؤروش نے اصرار کیا، ''آج رات کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

مونٹ پارناس نے بس ایک لفظ منھ سے نکالا، ''کچھ۔'' اور یکا یک بات بدلتے ہوئے کہا، ''ارے ہاں!''

''کیا؟''

''اس دن عجیب واقعہ ہوا۔ تصور کرو۔ میں ایک بورژوا سے ملا تھا۔ اس نے مجھے تحفے میں ایک خطبہ اور ایک بٹوا دیا۔ میں نے دونوں جیب میں ڈال لیے۔ ایک منٹ بعد میں اپنی جیب ٹٹولتا ہوں تو جیب خالی ملتی ہے۔''

''سوائے خطبے کے۔'' گاؤروش نے کہا۔

''مگر تمھارا'' مونٹ پارناس نے بات جاری رکھی، ''اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

گاؤروش نے دونوں لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ان بچوں کو ان کے بستر میں ڈالنے جا رہا ہوں۔''

''بستر کہاں ہے؟''

''میرے گھر میں۔''

''تمھارا گھر کہاں ہے؟''

''میرے گھر میں۔''

''تو تمھارے پاس کرائے کا کمرہ ہے؟''

''ہاں ہے۔''

''اور وہ کمرہ کہاں ہے؟''

''ہاتھی کے اندر۔'' گاؤروش نے کہا۔

موئنٹ پارناس، جو عام طور پر حیرانی کا اظہار نہیں کرتا، اپنی چیخ کو روک نہیں سکا تھا۔

''ہاتھی کے اندر؟''

''ہاں! ہاتھی کے اندر۔ گاؤروش نے پلٹ کر جواب دیتے ہوئے کہا، "Kekcaa?" ایک اور لفظ جو لکھا نہیں جاتا، جسے ہر کوئی بولتا ہے۔

Kekcaa کا مطلب ہے: Quest que c'est que cela a? [یعنی، معاملہ کیا ہے؟]

اس جواب نے موئنٹ پارناس کو خاموشی اور نیک نیتی کی طرف راغب کر دیا۔ گاؤروش کے مکان کے بارے میں اب وہ بہتر طریقے سے سوچنے لگا تھا۔

''بلاشبہ'' اس نے کہا، ''اچھا، وہ ہاتھی! کیا وہ آرام دہ جگہ ہے؟''

''بہت'' گاؤروش نے کہا، ''زیادہ سردی نہیں ہوتی اس لیے کہ وہاں پُل ہیں۔''

''تم اندر کیسے جاتے ہو۔''

''اوہ، بس داخل ہو جاتا ہوں۔''

''یعنی اس میں سوراخ ہے؟'' موئنٹ پارناس جاننا چاہتا تھا۔

''بخدا، مجھے بتانا نہیں چاہیے، مگر کسی سے بتانا نہیں۔ اگلے دو پیروں کے درمیان سے۔ ابھی تک پولیس والوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔''

''اور تم اوپر چڑھ جاتے ہو؟ ہاں، میں سمجھ گیا۔''

''ذرا ہاتھ ہلاؤ، کھٹ، کھٹ، اور بس کھل جاتا ہے۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔'' ایک وقفے کے بعد گاؤروش نے مزید کہا، ''ان بچوں کے لیے مجھے سیڑھی لینی ہوگی۔''

موئنٹ پارناس زور سے ہنس پڑا، ''تمھیں، یہ لونڈے کہاں مل گئے؟''

گاوروش نے نہایت سادگی سے جواب دیا، ''آوارہ لڑکے ہیں، دُکھ بتانے والے نے تحفے میں دیے ہیں۔''

مونٹ پارناس سوچ میں پڑ گیا، ''تم تو مجھے فوراً پہچان گئے تھے'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

مونٹ پارناس نے جیب سے دو عدد چھوٹی چھوٹی نلکیاں نکالیں، جو کاغذ میں لپٹی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں نتھنوں میں اُڑس لیں۔ اس سے اس کی ناک بالکل مختلف ہو گئی۔

''یہ تمھیں بالکل بدل دیتی ہیں۔'' گاوروش نے تبصرہ کیا، ''بالکل مختلف لگ رہے ہو۔ اسے ہر وقت پہنے رہا کرو۔''

مونٹ پارناس وجیہ انسان تھا، مگر گاوروش مسخرہ تھا۔

''سچ!'' مونٹ پارناس نے سوال کیا، ''میں کیسا لگ رہا ہوں؟'' اب اس کی آواز بھی مختلف ہو گئی تھی۔ ایک پل میں مونٹ پارناس نامعلوم شخص بن گیا تھا۔

''اچھا، اب ہمیں کچھ مسخرہ پن بھی کر کے دکھاؤ۔'' گاوروش نے بلند آواز میں کہا۔

دونوں بچے جو اس مرحلے تک سن نہیں رہے تھے، کہ وہ اپنی ناک میں اپنی انگلیاں ٹھونسنے میں مصروف تھے، یہ الفاظ سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے چہرے خوشی سے روشن ہو گئے، اور مونٹ پارناس کو گھور کر دیکھنے لگے تھے۔

بدقسمتی سے مونٹ پارناس پریشان تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ گاوروش کے کاندھے پر رکھا، اور اپنے الفاظ پر زور دے کر کہنے لگا ''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، غور سے سنو۔ اگر میں چوک پر، اپنی بیوی، اپنے گھے اور اپنے چاقو کے ساتھ ہوتا، اور تم مجھ پر دس سو لٹانے پر تیار ہوتے، تو میں کام کرنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا، مگر آج یومِ استغفار (Shrove Tuesday) نہیں۔''

اس نرالے جملے کا لاوارث لڑکے پر غیر معمولی اثر ہوا۔ وہ تیزی سے مڑا، بہت توجہ سے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسے ایک پولیس افسر نظر آیا جو چند قدم آگے کھڑا تھا، اس کی پشت ان لوگوں کی طرف تھی۔ گاوروش ''اوہ، اچھا!'' کہہ کر اس سے رخصت لینا چاہتا تھا، مگر اس نے فوراً اپنی زبان روک لی اور مونٹ پارناس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، ''اچھا، خدا حافظ!'' اس نے کہا، ''میں ان لڑکوں کے ساتھ ہاتھی کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر کبھی تمھیں رات بسر کرنی ہو تو آ کر مجھے تلاش کر لینا۔ میں دو چھتی میں رہتا ہوں۔ وہاں دربان نہیں ہوتا۔ تم موسیو گاوروش کہہ کر مجھے تلاش کر لینا۔''

"بہت اچھا۔" مونٹ پارناس نے کہا۔

اور وہ رخصت ہو گئے۔ مونٹ پارناس Greve کی طرف چلا اور گاؤروش Bastille کی جانب۔ پانچ سالہ بچے نے جسے اس کا بھائی کھینچ رہا تھا، جس کو گاؤروش کھینچ رہا تھا، جاتے ہوئے کئی بار پلٹ کر مسخرے (Porrichinelle) کو دیکھا تھا۔

ان مبہم جملوں میں سوائے چار پانچ احتقانہ اشاروں کے کوئی جادو ٹونا نہیں تھا، جن کی مدد سے مونٹ پارناس، گاؤروش کو پولیس کی موجودگی کی اطلاع کر رہا تھا۔ لفظ dig کے استعمال سے، وہ الگ ہو یا جملوں میں فن کاری سے پیوست کر دیا گیا ہو، مراد ہوتا ہے "احتیاط کرو، اب ہم آزادی سے بات نہیں کر سکتے۔" اس کے علاوہ مونٹ پارناس کے جملے میں ادبی حسن بھی تھا جو گاؤروش پر ضائع ہو گیا تھا، اور وہ تھا mon dogue, ma dague et ma digue یعنی "میرا کتا، میری بیوی اور میرا چاقو" یہ چور اچکوں کی بولی میں بولا جاتا تھا جو اس عظیم صدی کے مسخرے اور سرخ دم کوٹ والے بولتے تھے جس میں Moliere ادب لکھ رہا تھا اور Callot مصوری کر رہا تھا۔

بیس برس قبل Bastille کے محل کے جنوب مغربی کونے میں، نہر کے، تالاب کے قریب، قدیم جیل کے گڑھے کی کھدائی میں ایک غیر معمولی یادگار رہی تھی جسے پیرس والوں کی یادداشت سے مٹا دیا گیا ہے، جس کا کوئی نشان چھوڑنا چاہیے تھا، اس لیے کہ یہ خیال تھا انسٹی ٹیوٹ کے ایک رکن، مصری فوج کے سب سے بڑے جنرل کا۔"

ہم اسے یادگار کہتے ہیں حالاں کہ یہ ایک معمولی سا ماڈل تھا، مگر یہ ماڈل جو ایک لاجواب خاکہ تھا نپولین کے پُرشکوہ خیال کا ڈھانچا تھا، جسے بار بار آنے والے تیز ہوا کے جھونکے اڑا کر لے گئے اور کہیں پھینک دیا ہے، جو تاریخی چیز بن گیا تھا اور جسے خاص قسم کی فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ ایک چالیس فٹ بلند ہاتھی تھا، جو عمارتی لکڑی اور اینٹوں سے، راج گیروں کے ہاتھوں تیار کیا گیا تھا؛ اس کی پشت پر ایک مینار تھا جو مکان سے مشابہ تھا، جسے پہلے پلستر کرنے والے نے سبز رنگ سے پینٹ کر دیا تھا، اور اب آسمانی ہواؤں اور گزرتے وقت نے اسے سیاہ پینٹ کر دیا ہے۔ اس سنسان جگہ کے غیر محفوظ کونے میں اس دیوہیکل کا مستک، اس کی سونڈ، اس کے دانت، اس کا مینار، اس کا بھیانک لید خمار (crupper)، ستونوں جیسے اس کے چار پاؤں، رات کے وقت، ستاروں بھرے آسمان کے نیچے ایک حیرت انگیز اور ڈراؤنے پیکر کی صورت پیش کرتے تھے۔ یہ ایک قسم کی ہر دل عزیز قوت کی علامت تھا۔ یہ اداس، پُر اسرار

اور بہت بڑا تھا۔ یہ طاقت ور دکھائی دینے والا وہمی پیکر تھا، کوئی جس سے واقف نہیں تھا، Bastille کے غیر مرئی اور خیالی پیکر کے برابر سیدھا ایستادہ تھا۔

چند اجنبی اس شان دار عمارت کو دیکھنے آتے تھے، کسی عام راہگیر نے اس پر کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔ یہ کھنڈر بنتی جا رہی تھی؛ ہر موسم میں پلستر جو اس کے پہلوؤں سے الگ ہو جاتا ڈراؤنے زخم کی شکل اختیار کر جاتا تھا۔ 1814ء سے قدیم عمارتوں کی نگہداشت کرنے والے افسر اسے بھلا چکے تھے۔ اس کے کونوں میں، افسردہ، بیمار، قریب المرگ لوگ کھڑے ہوتے تھے، جن کے اطراف جلانے والی نوکیلی لکڑیوں کی باڑ تھی، اور جس پر شرابی گاڑی بان پیشاب کرتے تھے؛ اس کے پیٹ کے علاوہ ہر طرف شگاف نمودار ہو گئے تھے، اس کی دُم سے ایک تختہ نکل آیا تھا، اس کے پاؤں کے درمیان اونچی اونچی گھاس اُگ آئی تھی، اور چوں کہ تیس برس کے عرصے میں اس جگہ کے اطراف کی زمین، دھیمی اور مسلسل حرکت سے، جو بڑے شہروں کی مٹی کو زمین کی سطح سے بے حسی بلند کرتی رہتی ہے، اونچی ہوتی جا رہی تھی، یہ عمارت کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے نیچے کی زمین دھنستی جا رہی ہو۔ یہ گندی، حقیر، گھناؤنی، بورژوا کی نظروں میں بدصورت، اور مدبروں کی نظروں میں اداس ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اطراف کوئی شے گرد جیسی تھی جو اُڑتی جا رہی تھی، اور کوئی شے جلالت جیسی تھی جو الگ کی جا رہی تھی۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رات کے وقت اس کا منظر تبدیل ہو جاتا تھا۔ رات ہر اس شے کا اصل عنصر ہوتی ہے جو سیاہ ہوتی ہے۔ شام کے اترتے ہی اس قدیم ہاتھی کی ہیئت میں تبدیلی ہو جاتی تھی؛ پرچھائیوں کی بے پناہ خاموشی میں اس کی شکل پُرسکون ہو جاتی تھی۔ ماضی کی شے ہونے کے باعث یہ رات کی ملکیت ہو گئی تھی؛ اور اس کا اندھیرا بھی اس کی شان کے مطابق ہو گیا تھا۔

یہ ناہموار، چوڑی، بھاری، سخت، سادہ، تقریباً بے شکل، مگر یقینی طور پر جلیل، شان و شوکت والی اور ظالمانہ اہمیت کی حامل یادگار غائب ہو گئی ہے، اور اسے آرام سے راج کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، چمنی سے مزین ایک قسم کے دیو ہیکل آتش دان میں، جس نے سنسان قلعے اور اس کے نو عدد میناروں کی جگہ لے لی ہے، بالکل اسی طرح جیسے بورژوا طبقے جاگیردار طبقوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ آتش دان ایک عہد کی علامت ہو، جس کا ایک برتن طاقت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ عہد گزر جائے گا۔ لوگ اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ اگر کسی جوش دان (بوائلر) میں طاقت ہو سکتی ہے، تو دماغ کے سوا بھی کوئی طاقت نہیں ہو سکتی؛ دوسرے معنی میں، وہ شے جو دنیا کی رہنمائی کرتی ہے، اسے کھینچتی ہے، وہ از خود چلنے والے مشین ریلوے کے انجن

نہیں، خیالات ہوتے ہیں۔ان چلنے والی مشینوں کو خیالات کی لگام دو، وہ بھی بہتر ہوگا؛ مگر سوار کو گھوڑا سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔

سارے واقعات گھوم پھر کر ہمیں Bastille کے محل میں واپس لے آتے ہیں؛ اس ہاتھی کا بنانے والا پلستر سے ایک شان دار شے بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا؛ آتش دان بنانے والا کانسی سے ایک خوب صورت شے بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

یہ چمنی، جس کا ایک صدا دینے والے نام سے بپتسمہ کیا گیا ہے، اور اسے جولائی کا ستون کہا جاتا ہے، یادگار ہے ایک انقلاب کی جو ساقط ہوگیا تھا، جو اب بھی 1832ء کے غلاف میں ہے، ایک عظیم چوبی قمیص کے مانند، ہم جس پر نادم ہیں، جس نے اس ہاتھی کو الگ کردینے کا کام مکمل کردیا ہے۔

دور لگے ہوئے سڑک کے لیمپ کی مدھم روشنی سے روشن یہی وہ کونا ہے جہاں وہ لاوارث لڑکا دو لڑکوں کو لے آیا تھا۔

قاری کو ہمیں اجازت دینی چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو اور اس کو بھی یاد دلائیں کہ ہم صرف ایک حقیقت کے بارے میں بات کر رہے ہیں، کہ بیس برس قبل عدالتیں قائم کی گئی تھیں، ایک آوارہ گرد لڑکے کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے جس پر الزام تھا عوامی یادگار کو خراب کرنے کا، جو Bastille کے اسی ہاتھی میں سوتا پکڑا گیا تھا۔اس حقیقت کو جتانے کے بعد اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔

اس دیوہیکل شے کے جوار میں آکر، گاوروش کو اس اثر کا ادراک ہوا جو لاانتہا بڑوں، لاانتہا چھوٹوں پر پڑتا ہے، اور کہا، ”ڈرو نہیں، بچو۔“

پھر وہ ہاتھی کے احاطے کی باڑ میں موجود خلا سے اندر داخل ہوا اور اسی خلا سے ان بچوں کو داخل ہونے میں مدد دی۔دونوں بچے جو قدرے خوف زدہ تھے، بغیر کچھ کہے گاوروش کے پیچھے پیچھے چلے اور چیتھڑوں سے بھرے اس علاقے میں خود کو چھپا لیا جس نے اسے روٹی فراہم کی تھی اور پناہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

وہاں، احاطے کی طویل باڑ کے قریب، ایک سیڑھی پڑی تھی جو دن میں پڑوس کے لکڑی کے گودام کے مزدوروں کے کام آتی تھی۔گاوروش نے غیر معمولی محنت سے اس کو بلند کیا اور ہاتھی کے اگلے پیروں میں سے ایک کے سہارے لگادیا۔جس جگہ سیڑھی ختم ہوتی تھی وہیں اس دیوہیکل ہاتھی کے پیٹ میں ایک قسم کا سیاہ رنگ کا سوراخ دیکھا جا سکتا تھا۔

گاؤروش نے سیڑھی اور سوراخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مہمانوں سے کہا
"چڑھو اور اندر داخل ہو جاؤ۔"
دونوں بچوں کے درمیان خوف زدہ نظروں کا تبادلہ ہوا۔
"لڑکو، شاید تم ڈر رہے ہو" گاؤروش نے کہا۔ اور مزید اضافہ کیا، "تم ابھی دیکھ لو گے!"
اس نے ہاتھی کے کھردرے پیر پر اپنے ہاتھ جمائے، ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے پلک جھپکتے، سیڑھی کے استعمال کا تکلف کیے بغیر ہی، سوراخ تک پہنچ گیا۔ وہ اس میں اس طرح داخل ہوگیا جیسے سانپ کسی درز سے اندر داخل ہو جاتا ہے؛ چند ثانیوں میں غائب ہوگیا، اور چند لمحوں بعد لڑکوں کو اس کا سر دکھائی دیا، جو بد رنگ، اور غیر واضح، کسی مریض کے بے نور چہرے والے بھوت پریت کی طرح جھانک رہا تھا۔
"اچھا۔ تو لڑکو اب تم بھی اوپر آجاؤ۔ تم دیکھو گے کہ یہ کتنی آرام دہ جگہ ہے۔ چلو، چڑھنا شروع کرو۔" اس نے بڑے لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، "میں تمھیں سہارا دوں گا۔"
بچوں نے ایک دوسرے کو کہنی ماری، لاوارث نے انھیں ایک ساتھ ہی، ڈرایا بھی اور ہمت بھی بڑھائی، اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بڑے لڑکے نے خطرہ مول لے لیا۔ بڑے بھائی کو چڑھتے دیکھ کر چھوٹا، اور اس خیال سے کہ وہ اس بھاری بھرکم جانور کے پیروں کے درمیان اکیلا رہ جائے گا، رونا چاہتا تھا، مگر اس کو ہمت نہیں ہوئی۔
بڑا لڑکا، لڑکھڑاتے قدموں سیڑھی کے ڈنڈے چڑھنے لگا؛ اس دوران گاؤروش اس طرح ہمت افزائی کرنے لگا تھا جیسے تلواروں کا کھیل سکھانے والے یا خچر بان کی طرح آوازیں نکالا کرتے ہیں۔ "ڈرو نہیں! بالکل ٹھیک — چلو نا — میرا ہاتھ پکڑ لو — بہادری سے۔"
اور جب بچہ اس کی پہنچ میں آیا تو بڑھ کر اسے بازو پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔
"پکڑ لیا!" اس نے کہا۔
اور وہ لڑکا سوراخ سے گزر کر اندر داخل ہوگیا۔
"اب" گاؤروش نے کہا، "میرا انتظار کیجیے۔ موسیو! تشریف رکھیے۔"
اور اسی سوراخ سے نکل کر جس سے اندر داخل ہوا تھا، وہ بندر کی سی پھرتی سے ہاتھی کے پیر پر پھسلتا نیچے گھاس پر پہنچ گیا، پانچ سالہ بچے کے جسم کے اطراف اپنا ہاتھ ڈالا، اور اٹھا کر اسے سیڑھی کی درمیان رکھ دیا، اس کے بعد اس نے بچے کے نیچے خود بھی سیڑھی چڑھنا شروع کیا، اور بڑے لڑکے سے چیخ کر کہا، میں اس کو اوپر دھکیل رہا ہوں، کیا تم اسے اوپر کھینچ سکو گے؟"

اور ایک لمحے کے اندر ہی، چھوٹا لڑکا دھکیلا، کھینچا اور سوراخ میں ٹھونسا جا چکا تھا۔ قبل اس کے وہ خود کو سنبھالتا، گاوُروش نے، جو اس کے بعد اندر داخل ہوا تھا، سیڑھی کو ایک ٹھوکر لگا کر گھاس پر ڈال دیا، اپنے ہاتھ ملے، اور چیخ کر کہا تھا، "پہنچ گئے نا! جنرل لافایت!"

یہ دھماکا ختم ہوا۔

"لڑکو! اب تم میرے گھر میں ہو۔" دراصل گاوُروش گھر میں تھا۔

اُف، یہ افادیت بے کار اشیا کی! بڑی چیزوں کی خیرات! غیر معمولی دیو ہیکل کی نیکی! یہ جسیم یادگار، جو ایک شہنشاہ کے خیالات کا پیکر تھی، اب آوارہ لڑکوں کی آماج گاہ بن گئی تھی۔ اس دیو ہیکل شے نے آوارہ لڑکوں کو پناہ دے دی تھی۔ اتوار کو سج بن کر نکلنے والے بورژوا کو جو Bastille کے ہاتھی کے پاس سے گزرتے تھے، اس کو کراہت سے دیکھ کر کہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی کہ "اس کا فائدہ کیا ہے؟" یہ بچاتا تھا سردی سے، پالے سے، ژالے سے، بارش سے، سردی کے موسم کی ہواؤں سے، کیچڑ میں لت پت ہونے سے جو بخار پیدا کرتا ہے؛ اور آرام کی جگہ سے برف میں جانے سے جو موت دیتا تھا ایک چھوٹے سے وجود کو جس کا باپ تھا نہ ماں، نہ غذا تھی، نہ لباس تھا، اور نہ جسے پناہ میسر تھی۔ یہ معصوم کی خدمت کرتا تھا جسے سوسائٹی نکال باہر کر دیتی تھی۔ عوامی جرائم میں کمی کرتا تھا۔ یہ جانوروں کی ماند تھا جو ان لوگوں کے لیے کھلا ہوتا تھا جن کے لیے سارے دروازے بند ہوتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ہاتھی جیسے کیم شحیم قدیم جانور پر حشرات الارض اور فراموشی نے حملہ کر دیا تھا، جو مہاسوں سے، پھپھوند سے اور ناسوروں سے بھرا، لڑکھڑاتا، کرم خوردہ، کنارہ کش، ملامت شدہ، ایک قسم کا بھکاری دیو ہیکل تھا جو چوراہے کے درمیان فیض رساں جیسا منہ بنائے فضول خیرات کا طلب گار تھا؛ اور دوسرے غریب کوتاہ قد بھکاری پر رحم کھا رہا تھا جو ننگے پاؤں گھومتا، اپنی انگلیوں پر پھونک مارتا، چیتھڑوں میں ملبوس، بھوسی ٹکروں سے اپنی بھوک مٹاتا تھا۔ یہ سب تھا جس کے لیے Bastille کا ہاتھی بہت اچھا تھا۔ نپولین کے اس خیال کو، لوگ جس سے کراہت کرتے تھے، خدا نے واپس بلا لیا تھا۔ وہ جو محض مشہور تھا بلند پایہ بن گیا تھا۔ اپنے خیالات کو حقیقت بنانے کی خاطر شہنشاہ کو اپنے پاس سنگِ سماق [سیاہ رنگ کا سنگِ خارا]، پیتل، لوہا، سونا، سنگِ مرمر رکھنا چاہیے تھا؛ پرانے تختے، شہتیریں اور پلستر خدا کے لیے کافی تھے۔ شہنشاہ نے ایک جوہر قابل کا خواب دیکھا تھا؛ یہ زبردست طاقت کا حامل ہاتھی، مسلح، انوکھا، سونڈ اٹھائے، اپنا مینار اٹھائے ہر طرف اپنا زندگی بخش، دل خوش کر دینے والا اور جان ڈالنے والا پانی چھڑکتا لوگوں کو انسانیت کا نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ خدا نے اس سے کہیں زیادہ شان دار بات

کی تھی، اس نے ایک بچے کو وہاں ٹھہرا دیا تھا۔

وہ سوراخ جس کے ذریعے گاؤروش داخل ہوا تھا ایک شگاف تھا جو باہر سے مشکل سے دکھائی دیتا تھا، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ہاتھی کے پیٹ کے نیچے مخفیہ تھا، اور اتنا تنگ تھا کہ اس میں سے صرف بلیاں اور بے گھر بچے ہی گزر سکتے تھے۔

''آؤ، اب ہم شروع کرتے ہیں۔'' گاؤروش نے کہا، ''دربان کو اطلاع دینے سے کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔'' اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ایک شخص کی ڈھارس سے جو ان مکانوں سے اچھی طرح واقف ہے؛ اور ایک تختہ لے کر اس شگاف کو بند کر دیا۔

ایک بار پھر گاؤروش دھند میں غائب ہو گیا تھا۔ بچوں کو دیا سلائی کی چڑ چڑاہٹ سنائی دی جو فاسفورس کی بوتل میں ٹھونس دی گئی تھی۔ اس وقت تک کیمیائی دیا سلائی ایجاد نہیں ہوئی تھی؛ اس زمانے میں اس عمل میں آگ پیدا کرنے والا فولاد (fumad) استعمال کیا جاتا تھا۔

اچانک ہو جانے والی روشنی سے ان کی پلکیں جھپک گئی تھیں؛ گاؤروش نے ڈوری کے ان ٹکڑوں کو روشن کر لیا تھا جو رال میں ڈبوئے گئے تھے، جنھیں تہہ خانے کے چوہے کہا جاتے تھے، جو روشنی کم اور دھواں زیادہ پیدا کرتے تھے، اور ہاتھی کے اندرون کو دھندلا کر دیتے تھے۔

گاؤروش کے دونوں مہمانوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، اور جس سنسنی کا انھیں تجربہ ہوا، کچھ ایسی ہی تھی جیسے کسی کو ہائیڈل برگ [بیئر بنانے والا کارخانہ] کے کسی بڑے سے پیپے میں بند کر دیا گیا ہو۔ یا اس سے بہتر مثال [حضرت] یونس کی دی جا سکتی ہے جنھیں ایسا ہی محسوس ہوا ہو گا جب وہ مچھلی کے پیٹ میں تھے۔ ایک بڑا سا ڈھانچہ چھایا ہوا تھا۔ اوپر بھورے رنگ کی ایک شہتیر، بہت بڑی سی، جگہ جگہ سے جس میں سے پسلیوں کی طرح شاخیں نکلی تھیں، جو ریڑھ کی ہڈی معلوم تھی، پلستر کے نوکیلے ٹکڑے جو آنتوں کی طرح چپکے ہوئے تھے، بڑی بڑی مکڑی کے جالے ایک جانب سے دوسری جانب پھیلے گندے پردۂ شکم کی طرح تھے۔ یہاں وہاں، کونوں میں، بڑے بڑے دھبے تھے جو زندہ نظر آتے تھے اس لیے کہ وہ تیزی سے اور اچانک اس طرح اپنی جگہ تبدیل کرتے کہ ان سے خوف آنے لگتا تھا۔

ان ٹکڑوں نے جو ہاتھی کی پیٹھ سے اس کے پیٹ میں گرے تھے جنھوں نے خلا کو بھر دیا تھا، اس طرح، کہ اس پر فرش کی طرح چلا جا سکتا تھا۔

چھوٹا بچہ اپنے بھائی کی گود میں گھسا ہوا تھا، اور سرگوشی میں کہہ رہا تھا، ''یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔''

اس جملے نے گاؤروش کو چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دونوں لڑکوں کی پتھر بنا دینے والی کیفیت کے لیے کچھ جھٹکا ضروری ہو گیا تھا۔ ''کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے؟'' اس نے چیخ کر کہا، ''مجھ پر طنز کر رہے ہو؟ کیا تمھیں بد بو آ رہی ہے؟ کیا تمھیں شاہی مہمان خانہ چاہیے؟ کیا تم بالکل جنگلی ہو؟ بولو نا! میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں، میں اناڑی سپاہی نہیں۔ اوہ! اچھا بتاؤ، کیا تم پوپ کے نظام سے آئے ہو؟''

خوف کے ماحول میں تھوڑی سے سختی اچھی ہوتی ہے۔ اطمینان دلا دیتی ہے۔ دونوں بچے گاؤروش کے قریب چلے گئے۔ اس اطمینان سے اس میں پدرانہ شفقت آ گئی، اور اس کو سختی سے نرمی پر مائل کر دیا، اور اس نے چھوٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ''بیوقوف'' اب اس کا لہجہ مشفقانہ ہو گیا تھا، ''اندھیرا باہر ہے۔ باہر بارش ہو رہی ہے، اندر بارش نہیں ہوتی؛ باہر سردی ہے، اندر ہوا کا ایک ذرّہ بھی نہیں؛ باہر لوگوں کا ہجوم ہے، یہاں کوئی نہیں ہے؛ باہر تو چاند بھی نہیں، یہاں تو میری شمع جل رہی ہے۔''

دونوں بچے اس جگہ کو کم خوف سے دیکھنے لگے؛ مگر گاؤروش نے انھیں زیادہ سوچنے نہیں دیا۔ ''جلدی کرو۔'' اس نے کہا۔ ان کو اس جانب دھکیلا، جس کو ہم بہ خوشی کمرے آخری حصہ کہنے کے قائل ہو گئے تھے۔ جہاں اس کا پلنگ تھا۔ گاؤروش کا بستر مکمل تھا، یعنی، اس پر گدا تھا، کمبل تھا اور ایک طاقچہ، جس میں پردے رکھے تھے۔ گدا پیال سے بنا تھا، کمبل بھورے رنگ کا ایک بڑا سا اونی ٹکڑا تھا، بہت گرم اور تقریباً نیا تھا۔ اور کمرے میں کیا تھا، وہ بھی سن لیجیے:

تین قدرے لمبے بانس، مضبوطی سے ٹھونسے گئے تھے، ان فضولیات میں جو ہاتھی کے پیٹ میں پڑی تھیں۔ دو چیزیں آگے، اور ایک عقب میں لگا تھا، ان کو اوپر رسی سے اس طرح باندھا گیا تھا، کہ اہرامِ مصر سا بن گیا تھا۔ اس اجتماع اشیا پر پیتل کے تاروں سے بنی ایک جالی صرف ڈال دی گئی تھی، مگر اس کا اطلاق فن کاری سے کیا گیا تھا، اور اس کو لوہے کے تاروں سے بنی رسی سے اس طرح باندھا گیا تھا کہ تینوں سوراخ بند ہو گئے تھے۔ بڑے بڑے پتھروں کی ایک قطار نے اس ڈھانچے کو فرش پر ایستادہ رکھا تھا؛ کہ اس کے نیچے سے کچھ گزر نہیں سکتا تھا۔ یہ جنگلا پیتل کے تاروں سے بنی جالی کے سوا کچھ نہ تھا، جانوروں کے باڑے میں جس سے چڑیوں کے پنجرے ڈھکے جاتے ہیں۔ گاؤروش کا بستر، اس جال کے عقب پنجرے میں تھا۔ سارا تام جھام اسکیمو کے خیمے جیسا تھا۔

یہ جال تماشے پردے کا کام دیتی تھی۔

گاؤروش نے پتھر ایک طرف کر دیے جو سامنے کی جالی کو اپنی جگہ پر قائم کیے ہوئے

تھے، اور جالی کی دو تہیں ادھر اُدھر ہو گئی تھیں۔

"لڑکو! جا روں پر" گاوروش نے کہا۔

اس نے اپنے مہمانوں کو بہت احتیاط سے پنجرے میں داخل کیا، اس کے بعد خود بھی اندر رینگ گیا، پتھروں کو یک جا کیا، اور سوراخ کو دوبارہ بند کر دیا تا کہ اس میں ہوا داخل نہ ہو سکے۔

تینوں چٹائی پر لیٹ گئے۔ گاوروش کے ہاتھ میں اب بھی تہہ خانے کا چوہا (شمع) تھا۔

"اس میں" اس نے کہا، "سو جاؤ! میں شمع بجھانے جا رہا ہوں۔"

"موسیو!" بڑے لڑکے نے جالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گاوروش سے سوال کیا "یہ کس لیے ہے؟"

"یہ" گاوروش نے سنجیدگی سے کہا، "چوہوں کے لیے ہے۔ بس اب سو جاؤ۔"

پھر بھی، اس نے سوچا کہ ان جوان مخلوقات کے لیے چند الفاظ احکامات کے شامل کر دیے جائیں، اور اس نے اپنی بات جاری رکھی، "یہ ایک چیز ہے Jardin des Plantes سا لایا ہوں۔ اس کو خطرناک جانوروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں کی تمام دکانوں میں دستیاب ہے۔ تمھیں بس اتنا کرنا ہوگا: کسی دیوار پر چڑھ جاؤ، کھڑکی سے اندر رینگ کر دروازے کے اندر چلے جاؤ۔ جتنی چاہیے، تمھیں مل سکتی ہے۔"

یہ سب کہتے ہوئے اس نے چھوٹے لڑکے کو کمبل میں لپیٹ دیا۔ چھوٹا بھنبھنایا، "واہ، بہت خوب! یہ تو گرم ہے۔"

گاوروش نے پیار سے کمبل پر نظر کی۔ "یہ بھی Jardin des Plantes ہی سے آیا ہے۔" اس نے کہا "یہ میں نے بندروں سے چھینا ہے۔" اور اس چٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، بڑا جس پر لیٹا ہوا تھا، خاصی موٹی اور ہنر مندی سے بنائی گئی تھی، مزید کہا "اور یہ بھی زرافے کی ملکیت تھی۔" قلیل وقفے کے بعد اس نے کہا، یہ سب چیزیں جانوروں کے پاس تھیں۔ میں نے ان سے چھینی ہیں۔ مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا، یہ ہاتھی کے لیے ہے۔ اس نے توقف کیا اور پھر کہنے لگا، "دیواروں پر رینگ جاؤ اور حکومت کی ذرہ برابر بھی پروا نہ کرو!"

دونوں بچے بزدلی اور احمقانہ احترام سے اس دلیر اور ذہین شخص کو غور سے دیکھنے لگے، جو اُن جیسا ہی آوارہ، ان جیسا ہی تنہا، ان جیسا ہی ناتواں تھا، جس میں کوئی شے قابلِ تعریف اور طاقت ور تھی؛ جو انھیں مافوق الفطرت محسوس ہوا تھا، اور جس کے ذہانت سے پُر اور دل ربا تبسم آمیز بشرے میں کسی قدیم عطائی کی تمام بناوٹیں خلط ملط تھیں۔

"سمجھو!" بڑے لڑکے نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا "یعنی، آپ کو پولیس سے ڈر نہیں لگتا؟"

گاؤروش نے بس اتنا کہنے پر اکتفا کی، "لڑکے! کوئی انھیں پولیس نہیں کہتا، لوگ انھیں 'بابی' کہتے ہیں۔"

چھوٹے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ چوں کہ وہ چٹائی کے کنارے پر تھا، اور بڑا بیچ میں، گاؤروش نے کمبل کو اس کے اطراف لپیٹ دیا، جیسا کسی ماں نے کیا ہوتا، اور پرانے کپڑے ٹھونس کر چٹائی کو اس طرح بلند کیا کہ بچے کے لیے تکیہ سا بن گیا تھا۔ اس کے بعد، وہ بڑے کی طرف مڑا، "اب ہم یہاں بہت آرام سے ہیں، ہیں نا؟"

"جی، ہاں!" بڑے نے جواب دیا، گاؤروش کی طرف دیکھا، اس فرشتے کی طرح جسے بچا لیا گیا ہو۔

دونوں بچے جو بالکل بھیگ گئے تھے، ایک بار پھر گرم ہونے لگے۔

"ارے ہاں!" گاؤروش نے پوچھا، "تم چیخ کیوں اٹھے تھے؟"

اور اس نے چھوٹے کو بڑے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "اس ذرّے کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہتا، مگر تم جیسے بڑے کو رونا زیب نہیں دیتا۔ رونا بالکل احمقانہ حرکت ہے؛ تم کسی بچھڑے جیسے نظر آ رہے تھے۔"

"مہربانی!" بچے نے جواب دیا، "ہمارے پاس lodging نہیں۔"

"بھائی!" گاؤرش نے پلٹ کر کہا، "lodging نہیں کہتے، پالنا کہا کرو۔"

"اور اب، ہم اس طرح رات میں تنہا رہنے سے ڈرتے ہیں۔"

"رات نہیں، darkmans کہا کرو۔"

"شکریہ جناب!" بچے نے کہا۔

"سنو!" گاؤروش نے بات جاری رکھی، "اب تم کسی چیز پر چیخو گے نہیں۔ میں تمھاری حفاظت کروں گا۔ گرمی کے دنوں میں دیکھنا، کیسا مزہ آئے گا۔ گرمی میں ہم اپنے دوست Navet کے ساتھ برف زار پر جائیں گے، Gare میں نہائیں گے، Austerlitz کے پل کے سامنے مال بردار بحری بیڑوں کے سامنے مادر زاد ننگے بھاگیں گے — اور دھوبنیں دیکھ کر غصہ کریں گی۔ وہ بہت چیختی ہیں، پاگل ہو جاتی ہیں۔ کاش تم دیکھتے کہ وہ کتنی نامعقول ہوتی ہیں۔ ہم انسانی ڈھانچا دیکھنے جائیں گے۔ اور پھر میں تمھیں ڈراما دکھانے لے جاؤں گا۔ میں تم کو Frederick Lemaitre دکھانے لے جاؤں گا۔ میرے پاس اس کے ٹکٹ ہیں۔ میں کچھ اداکاروں سے بھی واقف ہوں،

میں نے ایک ڈرامے کے ٹکڑے میں ایک بار کام بھی کیا تھا۔ بہت سارے دوست تھے، اور ہم نے[نیلے رنگ کی] ایک بڑی سی چادر کے نیچے دوڑ کر سمندر کا نقشہ پیش کیا تھا۔تم کو اپنے تھیٹر میں کام بھی دلاؤں گا۔ہم جنگلیوں کو دیکھنے جائیں گے۔ وہ اصلی نہیں، وہ جنگلی اصلی نہیں۔وہ گلابی رنگ کی کسی کسی چڈیاں پہنتے ہیں جن میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں، اور تم دیکھو گے کہ ان کی کہنیاں سفید دھاگوں سے رفو کی گئی ہیں۔اس کے بعد ہم 'اوپیرا' دیکھنے جائیں گے۔ ہم کرایے کے تالیاں بجانے والوں کے ساتھ بیٹھیں گے۔میں بولیوارڈ پر تالی بجانے والوں میں شامل نہیں ہوں گا۔اوپیرا میں بس گھمسان ہوتا! کچھ تو انھیں بیس سو دیتے ہیں، مگر وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔وہ صافی[برتن صاف کرنے کا کپڑا] کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سر قلم کرنے کا منظر دیکھنے جائیں گے۔میں تمھیں جلاد بھی دکھاؤں گا۔وہ Marais اسٹریٹ پر رہتا ہے۔موسیو سنساں (Sanson)۔اس کے دروازے پر ایک لیٹر بکس لگا ہے۔اوہ! خوب مزہ آئے گا۔"

اسی لمحے گاوروش کی انگلی پر موم کا ایک قطرہ گرا اور اسے زندگی کی حقیقتوں کی یاد دلائی۔

"دوہری پریشانی!" اس نے کہا"شمع کی بتی گرنے والی ہے۔ ہوشیار! میں روشنی پر فی ماہ ایک سو سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ جب جسم بستر میں ہو تو ہمیں سو جانا چاہیے۔موسیو Paul de Kock کے معاشقے پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ آگ، porte-cochere کے شگافوں سے روشنی نکل رہی چاہیے، اور 'بابیوں' کو بس اتنا کرنا ہوتا ہے کہ اسے دیکھتے رہیں۔"

اور پھر، بڑے لڑکے نے ڈرتے ڈرتے کہا، اس میں گاوروش سے بات کرنے کی ہمت تھی، "پیال میں چنگاری گر سکتی ہے، ہمیں گھر کو جلنے سے بچانا چاہیے۔"

"لوگ 'گھر جلانا' نہیں کہتے بیٹا!" گاوروش نے کہا 'پالتے کو آگ لگانا' کہتے ہیں۔"

طوفان کی شدت بڑھتی جا رہی تھی، اور گھن گرج کے دوران اس دیو ہیکل کی پشت پر چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔"تم بارش میں پھنس گئے ہو!" گاوروش نے کہا "مجھے یہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ مکان کے پیروں کے ذریعے decanter نیچے جاتا سنائی دیتا ہے۔سردی کا موسم اکتا دینے والا ہوتا ہے؛ اپنا سارا مال تجارت خراب کر دیتا ہے، اپنی محنت ضائع کر دیتا ہے، ہم کو بھگو نہیں سکتا، اور یہ کہ یہ جھگڑا مول لے لیتا ہے۔ ہے نا، پرانا بہشتی!"

بادل کی گرج کے اس کنایے کے بعد، جس کے سارے نتائج کو گاوروش نے انیسویں صدی کے کسی فلسفی کی طرح قبول کر لیا تھا، آسمانی بجلی کا جھماکا ہوا، اتنا خیرہ کن کہ اس کی ایک رتی شگاف کے ذریعے ہاتھی کے پیٹ میں بھی داخل ہو گئی تھی۔تقریباً اسی وقت، پوری شدت

سے گرج ہوئی۔دونوں بچوں کے منہ سے چیخ نکل گئی، گویا پورا تام جھام مسمار ہونے والا تھا، مگر گاوروش نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا، اور گرج کے بہانے زور سے ہنس پڑا۔

"بچو، خاموش ہو جاؤ۔ عمارت کو گرا نہ دینا۔ ٹھیک ہے، اول درجے کی گرج تھی؛ کوئی بات نہیں۔بجلی کم زور نہیں۔ اچھے خدا کے لیے واہ واہ! ایک بار پھر! یہ تو اتنا خوب ہے، جیسا Ambigu [تاش کے کھیل] میں ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے جالی کو ٹھیک کیا، دونوں بچوں کو آہستگی سے بستر پر دھکیل دیا، ان کے گھٹنوں کو دبایا تا کہ ان کے ٹانگیں پوری طرح پھیل جائیں، اور بلند آواز میں کہا، چوں کہ خدا اپنی شمع جلا رہا ہے تو میں اپنی شمع بجھا سکتا ہوں۔ اب، بچو، میرے نوجوان انسانو، تم کو اپنی پلکیں بند کر لینی چاہئیں۔ نہ سونا بہت بری بات ہوتی ہے۔اچھی طرح سے اوڑھ لپیٹ لو۔ میں روشنی گُل کرنے جا رہا ہوں۔ تیار ہو نا؟"

بڑے لڑکے نے جھنجھناتے ہوئے کہا،"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے سر کے نیچے پر بھرے ہوئے ہیں۔"

"لوگ سر نہیں کہتے، ناریل (nut) کہتے ہیں۔"

دونوں بچے ایک دوسرے سے لپٹ گئے، گاوروش نے چٹائی پر ان کا انتظام کر دیا، کان تک کمبل اوڑھا دیا، اس بعد تیسری بار پادری کی زبان میں کہا، "دریچے بند!" اور اس نے پھونک مار کر شمع گُل کر دی۔

شمع مشکل سے گُل ہوئی تھی کہ اس جالی میں جس کے اندر تینوں لیٹے تھے، لرزش ہونے لگی۔ دھات کی کسی شے کو بار بار کھرچنے کی سی آواز تھی، گویا کوئی جانور تانبے کے تار کو دانت اور پنجوں سے کھروچے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ چھیدنے اور چیخنے کی قسم کی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔

پانچ سالہ بچے نے اس ہلچل کے سننے اور خوف سے سرد ہو جانے پر اپنے بھائی کی کہنی ہلائی؛ مگر بڑا بھائی اپنی آنکھوں کے دریچے بند کر چکا تھا، جیسا کہ گاوروش نے حکم دیا تھا۔تب، چھوٹے نے جو خوف پر قابو نہیں پا سکا گاوروش سے سوال کیا، مگر بہت دھیمی آواز اور گھٹی گھٹی سانسوں میں، "جناب؟"

"کیا ہے؟" گاوروش نے کہا جس نے ابھی ابھی آنکھیں بند کی تھیں۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

"چوہے ہیں۔" گاوروش نے جواب دیا۔

اور ایک بار پھر اس نے اپنا سر چٹائی پر رکھ دیا۔

ہزاروں کی تعداد میں چوہے ہاتھی کے جسم میں رہنے لگے تھے۔ وہی تھے جو زندہ سیاہ دھبوں کی صورت دکھائی دیتے تھے، ہم جن کا پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں؛ اور جب تک شمع کی لو ہوتی خوف زدہ رہتے؛ مگر جوں ہی غار میں، جو اُن کا اپنا شہر تھا، اندھیرا ہو جاتا تو اس خوش بو سے، جسے مشہور داستان گو Perrault نے ''تازہ گوشت'' کہا تھا، انھوں نے گاوروش کے خیمے پر حملہ کر دیا تھا، اس کے اوپر چڑھ گئے تھے اور جالی کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔

پھر بھی چھوٹا سو نہیں پا رہا تھا۔

''جناب!'' اس نے ایک بار پھر کہا۔

''کیا ہے؟'' گاوروش نے کہا۔

''چوہے کیا ہوتے ہیں؟''

''چھوٹے چھوٹے جانور ہوتے ہیں۔''

اس تشریح سے چھوٹا کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں سفید رنگ کے چھوٹے چوہے دیکھے تھے اور ان سے ڈرا نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے ایک بار پھر اپنی آواز بلند کی، ''جناب؟''

''کیا ہے؟'' گاوروش نے ایک بار پھر کہا۔

''آپ ایک بلی کیوں نہیں رکھ لیتے؟''

''رکھی تھی۔'' گاوروش نے جواب دیا، ''میں اسے یہاں لے آیا، یہ چوہے اسی کو کھا گئے۔''

اس تشریح نے پہلی بات کے اثر کو ضائع کر دیا۔ چھوٹا ایک بار پھر کانپنے لگا تھا۔

گاوروش اور چھوٹے کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چوتھی بار پھر شروع ہوا۔

''موسیو؟''

''کیا ہے؟''

''وہ کون تھا جسے کھا لیا گیا تھا؟''

''بلی۔''

''کس نے کھایا تھا؟''

''چوہوں نے۔''

''چھوٹے چوہوں نے؟''

"ہاں، چوہوں نے۔"

اس خیال نے کہ چھوٹا چوپائی کو کھا گیا تھا بچے کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا اور اس نے مزید سوال کیا، "جناب، کیا چھوٹے چوہے ہمیں بھی کھا لیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ ہو سکتا ہے۔" گاؤروش نے پلٹ کر جواب دے دیا۔

بچے کا خوف انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر گاؤروش نے اضافہ کیا، "وہ اندر آ نہیں سکیں گے۔ اس کے علاوہ، میں یہاں ہوں۔ لو میرا ہاتھ پکڑ لو۔ زبان بند رکھو اور اپنے دریچے بند کر لو۔"

اس کے ساتھ ہی گاؤروش نے بھائی کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر چھوٹے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بچے نے اس کے ہاتھ کو قریب کر لیا، اور مطمئن محسوس کرنے لگا۔ ہمت اور قوت ان ہی پُراسرار طریقوں سے آپس میں رابطہ کرتی ہیں۔ ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ ان کی گفتگو کی آواز سے چوہے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ چند منٹ گزرنے کے بعد غصے میں پھر واپس آ گئے، مگر بے کار، کہ تینوں گہری نیند سو رہے تھے اور مزید کچھ سنائی نہیں دیا۔

رات کا وقت تیزی سے گزر گیا۔ Bastille کے محل پر اندھیرے کا راج تھا۔ بارش سے ملی سرما کی تیز ہوا جھونکوں کی صورت چل رہی تھی، چوکیداروں نے شبینہ غنڈوں کی تلاش میں ساری راہداریاں، گلیاں، بند علاقے اور تاریک کونے چھان مارے اور خاموشی سے ہاتھی کے سامنے سے گزر گئے؛ اور یہ دیو ہیکل، بے حرکت، ایستادہ، کھلی آنکھوں سے اندھیرے میں گھور رہا تھا، گویا وہ اپنی نیکی پر مگن بہ ظاہر خواب دیکھ رہا تھا کہ اس نے آسمان سے، اور آدمیوں سے پناہ کے طالب تین غریب افراد کو سونے کی جگہ فراہم کر دی تھی۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ کیا ہونے والا ہے، قاری کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس زمانے میں Bastille کی نگہداشت کرنے والی چوکی چوک کے دوسری جانب قائم تھی، اور ہاتھی کے اطراف جو کچھ ہوتا تھا، پاسبان اسے نہ سن سکتے تھے نہ دیکھ سکتے تھے۔

فجر سے تقریباً ایک گھنٹا قبل، ایک آدمی Saint-Antoine سے دوڑتا ہوا آیا، جولائی کے ستون کے اطراف چکر لگایا، اور لکڑیوں سے بنی باڑ کے درمیان سے خاموشی سے گزرتا ہاتھی کے پیٹ کے نیچے پہنچ گیا۔ اگر اس پر روشنی ڈالی جاتی تو دیکھنے والے کو صاف نظر آ جاتا کہ وہ پانی سے تر بتر تھا، کہ اس نے ساری رات بارش میں گزاری تھی۔ ہاتھی کے پیٹ کے نیچے پہنچ کر اس نے عجب قسم کی چیخ ماری، جس کا کسی انسانی زبان سے تعلق نہیں تھا، جس کی نقل صرف لمبی دم والا طوطا ہی کر سکتا تھا۔ یہ چیخ اس نے دو بار نکالی تھی، املا یا ہجے کا فن بھی جس سے کوئی معنی نہیں

نکال پاتا۔ ''کیر یکیکیو!''

دوسری چیخ پر ہاتھی کے پیٹ سے ایک صاف ستھری، نوجوان، اور خوش باش آواز میں جواب آیا، ''اچھا!'' اور فوراً ہی وہ تختہ جس سے سوراخ بند تھا، ایک طرف ہوا، اور ایک لڑکے کو راستہ مل گیا، جو ہاتھی کے پیر پر تیزی سے پھسلتا ہوا اس آدمی کے پاس آ گرا۔ وہ گاوروش تھا۔ اور وہ آدمی مونٹ پارناس تھا۔

اور جہاں تک اس چیخ 'کیر یکیکیو' کا معاملہ تھا، بلا شبہ لڑکا اسے سمجھ گیا تھا، جب اس نے کہا، ''تم موسیو گاوروش کی تلاش میں ہو، نا!''

اس چیخ کو سنتے ہی وہ جاگ اٹھا تھا، جالیوں کو ہٹا کر اپنے حجرے سے رینگ کر نکلا، جالی کو دوبارہ احتیاط سے بند کر دیا، پھر اس نے پٹ کھولا اور نیچے آ گیا تھا۔

اس آدمی اور اس لڑکے نے ایک دوسرے کو اندھیرے میں خاموشی سے پہچان لیا تھا۔

مونٹ پارناس نے کہا، ''ہمیں تمھاری ضرورت ہے، ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔''

نوجوان لڑکے نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔

''میں تمھارے ساتھ ہوں۔'' اس نے کہا۔

اور دونوں نے Saint-Antoine کی راہ لی، جدھر سے مونٹ پارناس آیا تھا؛ وہ بازار کے باغبانوں کی گاڑیوں کی طویل قطار میں سے جو اس وقت بازار کی طرف رواں تھیں، بچتا بچاتا تیزی سے نکل آیا تھا۔

بازار کے باغبان، جھکے ہوئے، نیم خوابیدہ کیفیت میں، سلاد اور ترکاریوں کے درمیان، تیز بارش سے بچنے کے لیے گلوبند سے اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے تھے، اور انھیں ان حیرت انگیز پیدل چلانے والوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔

۞

فرار کے خطرات

اسی رات لافورس میں جو کچھ ہوا یہ تھا:

بابے، بروژوں، گولیمر اور تس آردیے کے درمیان فرار کا منصوبہ بنایا گیا حالاں کہ تس آردیے قیدِ تنہائی میں تھا۔ اسی دن بابے نے یہ سب اپنے فائدے کے لیے منظم کیا تھا جو کچھ قاری نے مونٹ پارناس اور گاؤروش کے درمیان ہوتے دیکھا ہے۔ مونٹ پارناس کو انھیں باہر سے مدد فراہم کرنی تھی۔

عقوبت خانے میں ایک ماہ گزارنے کے بعد بروژوں کو کچھ وقت مل گیا جس میں سب سے پہلے اس نے ایک رسی بُن لی تھی؛ دوسرا کام ایک پکا منصوبہ تیار کرنا تھا۔ پرانے زمانوں میں وہ سخت جگہ جہاں قید کا نظم و ضبط قیدیوں کے اپنے ہاتھوں میں دے دیا جاتا تھا، پتھر سے بنی چار دیواریں، پتھریلی چھت، نشان زدہ راستے، ایک بستر، ایک جالی لگی کھڑکی اور ایک دروازہ ہوتا تھا، جس پر لوہے کی چادر چڑھی ہوتی تھی، جسے کوٹھری کہا جاتا تھا؛ مگر ان دنوں کوٹھری بہت خوف ناک جگہ سمجھی جاتی تھی؛ آج کل لوہے کے دروازے، لوہے کی جالی لگی کھڑکی، ایک بستر، نشان زدہ راستے، پتھر سے بنی چار دیواروں، اور پتھریلی چھت پر مشتمل جگہ کو عقوبت خانہ کہا جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت ذرا سی روشنی آتی ہے۔ ان کمروں میں، جیسا کہ قاری دیکھ سکتا ہے، تکلیف دہ نکتہ یہ ہوتا ہے کہ یہ کوٹھریاں نہیں ہوتیں کہ ان میں لوگ، جنھیں کام پر لگا دیا جانا چاہیے، بیٹھے سوچتے رہتے ہیں۔

لہٰذا بروژوں نے مراقبہ کیا، اور رسی کے ساتھ عقوبت خانے سے نکل گیا۔ چوں کہ شارلیمین کے احاطے میں وہ بہت خطرناک آدمی کے نام سے مشہور تھا، اسے نئی عمارت میں رکھا گیا تھا۔ پہلی بات اسے نئی عمارت میں معلوم ہوئی کہ وہاں گولیمر تھا، دوسری چیز ایک کیل تھی، یعنی گولیمر

جرم تھا، مکمل آزادی تھی۔ ضروری ہے کہ قاری کو اس کے بارے میں پورا اندازہ ہو کہ بروژروں دبلا پتلا، بہت سوچ سمجھ کر بولنے والا، متمدن، ذہین، اور چوڑا انسان تھا جس کی نظریں مہربان اور تبسم بے رحم تھا۔ اس کی نظر اس کے ارادے کا، اور اس کا تبسم اس کی فطرت کا نتیجہ تھا۔ اپنے فن کے اعتبار سے وہ پہلے چھتوں کا معائنہ کرتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی حرفت میں ترقی کی تھی جو چھت سے سیسہ چرانے، چھتوں کو تاراج کرنے اور پرنالے سے محروم کردینے کے ماہر تھے جس عمل کو "دہری چوری" کہا جاتا تھا۔

وہ صورت حال جس نے خاص طور پر اس لمحے کو ساز گار کر دیا تھا جس میں فرار کی کوشش کی جا سکتی تھی، یہ تھی کہ چھت کی مرمت کرنے اور کھپریل بدلنے والے ان دنوں قید خانے کی چھت کے ایک حصے پر کام کر رہے تھے۔ Saint-Bernard اور شارلیمین اور سینٹ لوئی احاطے مکمل طور پر علاحدہ علاحدہ نہیں رہ گئے تھے؛ اور وہاں اوپر تک مچان اور سیڑھیاں تھیں؛ دوسرے معنوں میں جو آزادی کے لیے پُل اور زینے بن گئے تھے۔

نئی عمارت، جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ خستہ حال اور پرانی ہو چکی تھی، حقیقی اعتبار سے بھی قید خانے کی کمزوری تھی۔ دیواروں کو شورہ اس حد تک کھا گیا تھا کہ ہر وقت سنگ ریزے الگ ہوتے اور گرتے رہتے تھے؛ کہ ارباب اختیار اجتماعی خواب گاہوں کو چوبی تختوں سے ڈھانپنے پر مجبور ہو گئے تھے تاکہ قیدیوں کو ان کے بستروں میں محفوظ رکھا جا سکے۔ اتنی فرسودگی اور قدامت کے باوجود، ارباب اختیار نے سب سے زیادہ پریشان کرنے والے قیدیوں کو جنھیں قید خانے کی بول چال میں "مشکل قیدی" کہا جاتا تھا، نئی عمارت میں بند کرنے کی غلطی کی تھی۔

نئی عمارت میں، تلے اوپر چار اجتماعی خواب گاہیں تھیں؛ سب سے اوپر والی منزل کو Bel-Air کہا جاتا تھا۔ لافورس کے ڈیوک کے قدیم باورچی خانے کا دھواں خارج کرنے والی چمنی جو زمینی منزل سے شروع ہو کر، چاروں منزلوں سے ہوتی ہوئی، خواب گاہوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی سپاٹ کھمبے کی طرح چھت سے باہر نکلی تھی۔

گوئیمر اور بروژروں اسی خواب گاہ میں سوتے تھے۔ احتیاط کے باعث انھیں نچلی منزل میں رکھا گیا تھا، اور اتفاق ایسا ہوا تھا کہ دونوں کے بستروں کے سرہانے چمنی سے لگے تھے۔

تھن آردیے ان کے بالکل اوپر، سب سے اوپر والی منزل Bel-Air میں تھا۔ کوئی پیدل راہ گیر جو Culture-Sainte-Catherine پر آگ بجھانے والوں کی بیرک سے گزرتا ہوا، porte-cochere کے حوض کے سامنے رُکتا تو اسے ایک گز چوڑا پھولوں سے بھرا تھالا،

لکڑی کے گملوں میں لگے پودے، جس کے آخر میں چھوٹا سا دو بازوؤں والا سفید گول مکان، سبز رنگ سے روشن شجر، اور ژاں ژاک کے خواب جیسا منظر نظر آتا تھا۔

دس برس قبل اس گول مکان کے اوپر ایک سیاہ ڈھلوانی سی دیوار تھی جو اس کو سہارا دیے تھی۔ یہ لافورس کی بیرونی دیوار تھی۔ گول گھر سے متصل دیوار Milton تھی جو Berquin سے نظر آتی تھی۔

اس بلند دیوار کے اوپر بھی اس سے زیادہ سیاہ چھت تھی، جو پرے نظر آتی تھی۔ یہ نئی عمارت کی چھت تھی۔ وہاں خواب گاہ کی چار کھڑکیاں دیکھی جا سکتی تھی، جنھیں لوہے کے چھڑوں سے محفوظ کیا گیا تھا؛ وہ Bel Air کی کھڑکیاں تھیں۔

چھت میں چھید کرتی ہوئی ایک چمنی نکلی تھی؛ وہی چمنی تھی جو خواب گاہوں سے ہو کر اوپر جاتی تھی۔

نئی عمارت کی سب سے اونچی منزل Bel-Air ایک قسم کے وسیع ہال کمرے جیسی تھی، جس پر دو رویہ ڈھلان والی چھت، تہری حفاظتی جالیاں، لوہے کی چادر کے دو دروازے تھے، جن پر بڑے بڑے بولٹ لگے تھے۔ آپ جب شمال کی جانب سے داخل ہوتے ہیں تو بائیں جانب خواب گاہوں کی چار کھڑکیاں ملتی ہیں، دائیں جانب کھڑکی کے سامنے برابر برابر فاصلے پر چار عدد کہنی تک بلند انگیٹھیں، بقیہ چھت تک لوہے کے چھڑوں سے بنے مربع وسیع قفس ملتے ہیں۔

ان ہی میں سے ایک قفس میں فروری کی تیسری تاریخ کی رات سے تین آرد یے قید تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ کسی کو خبر نہیں ہو سکی، کیسے اور کس قسم کی چشم پوشی سے وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا— جیسا کہ اس پر لکھا تھا، Desrues کی ایجاد کردہ— وائن کی ایک بوتل، جس میں نشہ آور دوا آمیز تھی، جسے Endormeurs کے، یا نیند پر مجبور کرنے والے گروہ نے مشہور قرار دیا تھا۔

کئی قید خانوں میں، ایسے بہت سے لوگ بھی ہیں: دغاباز ملازمین، نصف جیلر، نصف چور جو فرار میں مدد دیتے ہیں، جو پولیس کو بے ایمانی پر مبنی خدمات پیش کرتے ہیں اور جب بھی ممکن ہو کچھ رقم بنا لیتے ہیں۔

اُسی رات جب گاوروش نے گم شدہ دو لڑکوں کا ہاتھ پکڑا تھا، برو ژوں اور گولیمر جو بابے سے واقف تھے، جو اسی صبح فرار ہو گیا تھا اور سڑک پر ان کے اور مونٹ پارناس کے انتظار میں تھا، آہستہ سے اٹھے تھے، اس کیل کے ساتھ جو بروژوں کو مل گئی تھی اور انھوں نے اپنے بستر کے

مرحانے چمنی میں سوراخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے نکلنے والا ملبہ برو ژوں کے بستر پر گر رہا تھا اس لیے کسی کو سنائی نہیں دیا۔ بارش اور بادلوں کی گرج مل کر دروازوں کو ان کے قلابوں میں ہلا رہے تھے۔ قید خانے میں خوف ناک طوفان کا سا سماں تھا۔ وہ قیدی جو جاگ اُٹھے تھے دوبارہ سوجانے کا بہانہ کر رہے تھے، اور گولیمر اور برو ژوں اپنے اوزار کے ساتھ آزاد تھے۔ برو ژوں پھرتیلا آدمی تھا؛ گولیمر محنتی تھا۔ قبل اس کے کہ چوکی دار تک کسی قسم کی آواز پہنچتی جو جنگلے لگے حجرے میں سو رہا تھا جس کا دروازہ خواب گاہ میں کھلتا تھا، دیوار میں سوراخ ہو چکا تھا، چمنی عبور کی جا چکی تھی، دود کش کا اوپری حصہ پھلانگا جا چکا تھا اور دونوں خوف ناک بدمعاش چھت پر پہنچ گئے تھے، بارش ذرا کم ہو گئی تھی، چھت پر پھسلن ہو گئی تھی۔

"کتنی اچھی رات ہے فرار ہونے کے لیے۔" برو ژوں نے کہا۔

اُن کے اور احاطے کی دیوار کے درمیان چھ فٹ چوڑا اور اسّی فٹ گہرا خلا تھا۔ خلا کی تہہ میں اندھیرا ہونے کے باوجود انھیں پاسبان کی بندوق چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔ انھوں نے رسی کا ایک سرا، جو برو ژوں نے کوٹھری میں بٹی تھی، لوہے کی چھڑوں کے ٹھنٹھ سے باندھ دیا، دوسرے حصے کو بیرونی دیوار کے اوپر سے ڈال دیا، رسی ایک ہی جھٹکے میں خلا کو پار کر گئی، اور دیوار پر بنے چھجے میں اٹک گئی تھی، اور وہ دونوں اس پر یکے بعد دیگرے بیٹھ کر پھسلنے لگے، اس چھوٹی سی چھت تک جو حمام سے ملتی تھی۔ بعد میں انھوں نے رسی کھینچ لی، حمام کے صحن میں کود پڑے، اسے پار کیا، دھکا دے کر دربان کی کھڑکی کھولی، porte-cochere کو کھولا، اور وہ سڑک پر پہنچ گئے تھے۔

اندھیرے میں بستر سے اٹھنے کے بعد سے ابھی تین چوتھائی گھنٹا نہیں گزرا تھا، کیل ہاتھ میں اور منصوبہ ان کے دماغ میں تھا۔

چند لمحوں بعد وہ بابے اور مونٹ پارناس سے مل گئے تھے، جو قرب و جوار میں چکر لگا رہے تھے۔

قید خانے سے نکل جانے کے بعد کھینچنے کے دوران رسی ٹوٹ گئی تھی، اور اس کا چھوٹا سا ٹکڑا چھت کی چمنی میں پھنس گیا تھا۔ انھیں اور کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا، سوائے خراش کے جس کے باعث ان ہاتھوں کی تقریباً پوری کھال اُدھڑ گئی تھی۔

اس رات تھن آردیے کو تنبیہ کی گئی تھی، کسی کو معلوم تھا کیوں، اور وہ سو نہیں رہا تھا۔

صبح کے نو بجے کے قریب، جب رات بہت اندھیری تھی، اس نے بارش اور ہوا کے جھکڑ میں دو پرچھائیوں کو خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے، اپنے قفس کے مقابل چھت سے گزرتے

دیکھا تھا۔ ایک کھڑکی کے پاس رُک گیا تھا، اتنی دیر کے لیے اطراف پر ایک نظر ڈال لے۔ وہ بروڈوں تھا۔

تین آردیے نے اس کو پہچان لیا، اور سمجھ گیا۔ اتنا کافی تھا۔

تین آردیے کو رات کے وقت اسلحے کے زور پر گھات لگانے کے الزام میں، نقب زن کا درجہ دے کر گرفتار کرلیا گیا تھا اور وہ ہمیشہ نظروں کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ پاسبان، جو ہر دو گھنٹے پر تبدیل ہوتے تھے، بھری بندوق لیے اوپر نیچے اس کے قفس کے سامنے گشت کرتے تھے۔ Bel Air آسمانی کھڑکی سے آنے والی روشنی سے روشن ہوتی تھی۔ قیدی کے پاؤں میں پچاس پاؤنڈ وزنی بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ ہر روز چار بجے شام قید خانے کا داروغہ دو کتوں کی نگہبانی میں قفس میں داخل ہوتا، اس کے بستر کے پاس دو پاؤنڈ وزن بھر کالی ڈبل روٹی، ایک جگ پانی، ایک بڑے سے پیالے میں پتلا سا شوربا رکھتا جس میں تیرتے ہوئے چند لوبیہ کے دانے ہوتے تھے، اس کی بیڑی کی جانچ کرتا، اور چھڑ کو تھپتھپاتا چلا جاتا تھا۔ یہ آدمی اور کتے رات میں دو بار اُسے دیکھنے آتے تھے۔

تین آردیے نے اپنے پاس ایک قسم کا آہنی بولٹ رکھنے کی اجازت لے لی تھی -- جیسا کہ اس نے بتایا تھا — جسے ڈبل روٹی کو چوہوں سے بچانے کے لیے دیوار کے ایک شگاف میں میخ کی طرح گاڑ دیتا تھا۔ چوں کہ تین آردیے کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھا جاتا تھا اس لیے میخ رکھنے پر اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک داروغہ نے کہا تھا، ''بہتر ہوگا کہ اسے چوبی میخ فراہم کر دی جائے۔''

رات کے دو بجے اس پاسبان کو، جو پرانا سپاہی تھا، فارغ کر دیا گیا اور اس کی جگہ 'جبری بھرتی' سپاہی تعینات کیا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد حسبِ معمول وہ آدمی اپنے کتوں کے ساتھ معائنے کے لیے آیا اور دیکھ بھال کر چلا گیا۔ تین آردیے کو اس میں سوائے ضرورت سے زیادہ جماہی اور ''نئے رنگروٹ'' پن اور دیہاتی پن کے کچھ نظر نہیں آیا۔ دو گھنٹے بعد، چار بجے کے قریب، جب وہ رنگروٹ کو فارغ کرنے کے لیے آئے تو وہ تین آردیے کے قفس کے قریب فرش پر پڑا سوتا پایا گیا۔ تین آردیے غائب تھا۔ اس کے قفس کی سقف میں ایک سوراخ تھا، اور اس کے اوپر چھت میں بھی سوراخ تھا۔ اس کے بستر کے تختوں میں سے ایک تختہ اکھڑا ہوا تھا، جسے شاید وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا، کہ وہ بھی غائب تھا۔ اس کے حجرے میں نصف خالی بوتل بھی ملی تھی جس میں بے ہوش کر دینے والی وائن کا بقیہ حصہ موجود تھا جس سے سپاہی کو بے ہوش کیا گیا تھا۔ سپاہی کی سنگین بھی غائب تھی۔

اس لمحے جب یہ دریافت ہوئی، یہ قیاس کیا گیا تھا کہ تین آردیے پہنچ سے باہر تھا۔ سچ

یہ تھا کہ وہ نئی عمارت میں نہیں تھا، مگر یہ بھی کہ وہ خطرے میں تھا۔

ژاں آردویے نئی عمارت کی چھت پر پہنچا تو اسے چمنی کی اوپر والے trap میں جھولتا بروڈژوں کی رسی کا بقیہ ٹکڑا ملا، مگر چوں کہ ٹوٹا ہوا ٹکڑا بہت چھوٹا تھا، وہ بروڈژوں اور گولیمر کی طرح، بیرونی دیوار کے ذریعے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

جب آپ Ballets اسٹریٹ سے مڑ کر Roi-de-Sicile اسٹریٹ میں داخل ہوتے ہیں تو تقریباً بالکل سامنے ایک کھنڈر نظر آتا ہے۔ اس کھنڈر میں پچھلی صدی میں ایک مکان ہوتا تھا؛ اب جس کی صرف عقبی دیوار باقی رہ گئی ہے، اینٹوں سے بنی دیوار جو متصل سہ منزلہ عمارتوں کے برابر اونچی ہے۔ اس کھنڈر کی پہچان بڑی بڑی دو مربع کھڑکیاں تھیں جو اب بھی موجود ہیں؛ ان میں سے ایک، دائیں کونے کے قریب والی، گھن لگی شہتیر کے سہارے بند کر دی گئی ہے۔ ان کھڑکیوں سے آگے ایک بلند اور خستہ حال دیوار نظر آتی ہے، جو لافورس کی بیرونی دیوار کا ایک ٹکڑا تھا۔

اس سڑک پر منہدم شدہ مکان کی خالی زمین ٹوٹے پھوٹے تختوں سے بھری ہے، جس کو پتھر کے پانچ کھمبوں کی باڑ کے سہارے بند کیا گیا ہے۔ اسی میں چھپی ایک جھونپڑی ہے جو کھنڈر کے سہارے قائم ہے۔ اس باڑ میں ایک پھاٹک ہے جو چند برس قبل صرف ایک زنجیر سے بند کیا جاتا تھا۔

وہ اسی کھنڈر کی چوٹی تھی، جہاں تک ایک بجے رات سے ذرا پہلے ژاں آردویے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس جگہ پہنچا کس طرح؟ یہی وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں مل سکا ہے اور نہ سمجھا جا سکا ہے۔ یقینی طور پر بجلی کی کڑک ہی آڑے آئی تھی اور اس کی مدد بھی کی تھی۔ تو کیا اس نے ایک چھت سے دوسری چھت، ایک احاطے سے دوسرے احاطے، ایک حصے سے دوسرے حصے، شارلیمین کے احاطے کی عمارتوں اور اس کے بعد Saint-Louis کے احاطے، اس کے بعد بیرونی دیوار، اور پھر Roi-de-Sicile کی جھونپڑی تک پہنچنے میں چھت بدلنے والوں کی سیڑھی اور مچان کا استعمال کیا تھا؟ مگر اس سفر میں ایسی رکاوٹیں تھیں جن کے باعث اس کی تکمیل ناممکن نظر آتی تھی۔ تو کیا اس نے اپنے بستر سے نکالے گئے تختے کو پیٹ کے بل رینگنے میں پُل کی طرح استعمال کیا تھا، Bel-Air کی چھت سے بیرونی دیوار تک جانے کے لیے، اور کیا اسی طرح اس نے بیرونی دیوار کے چھجے تک اور قید خانے سے جھونپڑی تک کا پورا فاصلہ بھی طے کیا تھا؟ مگر لافورس کی بیرونی دیوار کنگورے دار اور ناہموار تھی؛ کہیں اوپر اٹھتی، کہیں نیچے چلی جاتی؛ آگ بجھانے والوں کی بیرک پر ختم ہوتی حمام کی عمارت کے قریب طلوع ہوتی تھی؛ بیچ میں پڑنے والی دو عمارتوں نے اسے علاحدہ بھی کر دیا تھا؛ Pavee اسٹریٹ کی طرح Lamoignon ہوٹل پر بھی اس کی بلندی ایک

جیسی نہیں تھی؛ اس میں جگہ جگہ زوال بھی تھے اور زاویے بھی؛ اور پھر چوکیدار نے بھی تو فراری ہیولے کی جاسوسی کی ہوگی؛ لہٰذا، ژاں آروبے کا اختیار کیا ہوا راستہ ناقابل تشریح ہے۔ دونوں طریقوں سے فرار ناممکن تھا۔ تو کیا ژاں آروبے نے آزادی کی تشنگی ہی پر بھروسا کیا تھا جو بلندیوں کو پتھیوں میں، لوہے کے چھڑوں کو بید کی شاخوں میں، بغیر ٹانگوں والے آدمی کو کھلاڑی میں، گٹھیا کے مریض کو پرندے میں، حماقت کو جبلت میں، جبلت کو ذہانت میں اور ذہانت کو جوہر قابل میں تبدیل کر دیتی ہے؛ اور کیا ژاں آروبے نے تیسرا کوئی تیسرا طریقہ ایجاد کر لیا تھا؟ کسی کو کبھی پتا نہیں چلا۔

فرار کی حیرانیوں کا کبھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ آدمی جو فرار میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور ہمیں اس بات پر اصرار ہے، کہ فرار اس کے وجدان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ فرار کی پُراسرار کرن میں ستارے اور آسمانی بجلی کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے؛ نجات کی کوششیں رفعت کی اڑان سے کم حیرت انگیز نہیں ہوتیں، اور ہم فرار ہو جانے والے چور کے بارے میں کہتے ہیں، "اس نے یہ دیوار عبور کرنے میں کیا تدبیر کی ہوگی؟" اسی طرح جیسے ہم [سولہویں صدی کے مشہور فرانسیسی المیہ ڈراما نگار] Corneille کے بارے میں کہتے ہیں، "اس نے مرنے کے طریقے کیسے دریافت کر لیے تھے؟"

کسی نہ کسی طرح، پسینے میں شرابور، بارش میں تر بتر، ہاتھوں کی ادھڑی جلد، کہنیاں خونم خون، گھٹنا زخمی، ژاں آروبے وہاں پہنچ گیا تھا، بچے جسے اپنی تمثیلی زبان میں کھنڈر کی دیوار کا کنارہ کہتے ہیں؛ وہاں وہ پوری طرح دراز ہو گیا تھا کہ وہاں اس کی قوت جواب دے گئی تھی۔ اب اس کے اور سڑک کے درمیان تین منزلہ بلند ڈھلان حائل تھی۔

رسی جو اس کے پاس تھی بہت چھوٹی تھی۔

اب وہ انتظار کر رہا تھا، زرد، تھکا ماندہ، ناامیدی سے بدحال جس سے وہ گزر چکا تھا، اب بھی رات کے اندھیرے میں چھپا اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ صبر کر صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں؛ اس خیال سے بھی خوف زدہ تھا کہ چند منٹ بعد قریبی سینٹ پال کا گھنٹا گھر چار بجانے والا ہے، کہ ایک گھنٹے قبل پاسبان فارغ کیا گیا ہے اور وہ سوراخ شدہ چھت کے نیچے سوتا ہوا پایا جائے گا؛ وہ خوف سے گہرائی میں گھور رہا تھا، سڑک کے لالٹینوں کی روشنی میں، گیلے، سیاہ راستے پر، وہ راستہ جو مزید خوف کا منتظر تھا، جس کا مطلب موت بھی ہو سکتا ہے اور آزادی بھی۔

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا: "کیا اس کے تین شرکائے جرم کامیاب ہو گئے ہیں، اور اگر وہ اس کے بارے میں سنیں گے تو اس کی مدد کو آئیں گے یا نہیں؟ وہ بالکل خاموش بیٹھا غور سے سن رہا تھا۔ جب سے وہ یہاں بیٹھا تھا، گشت کرنے والوں کے سوا اس سڑک سے کوئی نہیں

گزرتا تھا۔ Montreuil سے، Charonne سے، Vincennes اور Bercy سے آنے والے تمام سبزی فروش Saint-Antoine اسٹریٹ ہی سے گزرتے تھے۔

چار کا گھنٹا بجا۔ تین آردیے کانپ گیا۔ چند لمحے بعد وہ خوف ناک ہڑبونگ سنائی دی جو قید سے بھاگے ہوئے کسی قیدی کی گرفتاری پر برپا ہوتی ہے۔ کھلتے بند ہوتے دروازوں کی آوازیں، جالیوں کے قلابوں سے نکلنے والی چرچراہٹ، نگہداری کی چوکی میں ہونے والا ہنگامہ، کلید برداروں کی بھرائی ہوئی چیخیں، صحن کے راستوں پر بندوقوں کے کندے مارنے کی آوازیں، سب کچھ اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ خواب گاہوں کی کھڑکیوں میں روشنیاں جل بجھ رہی تھیں، نئی عمارت کی سب سے اونچی منزل پر ایک ٹارچ دوڑ رہی تھی، دائیں جانب کی بیرک سے آگ بجھانے والے طلب کر لیے گئے تھے۔ ان کی ٹارچ بردار آہنی ٹوپیاں بارش میں چھتوں پر آ جا رہی تھیں۔ اسی وقت تین آردیے کو Bastille کی جانب ایک مدھم سی زردرو روشنی دکھائی دی جو آسمان کے کنارے کو روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ دس انچ چوڑی دیوار کی بلندی پر، موسلا دھار بارش میں لیٹا تھا، اس کے دائیں بائیں دو خلیجیں تھیں، مگر گر جانے کے خوف سے پیدا ہونے والے چکر کے اور گرفتاری کے خوف کے باعث حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے خیالات کسی گھڑی کے پنڈولم [شاقولِ متحرک] کی طرح ایک جانب سے دوسری جانب جھول رہے تھے: ''گرا تو موت، ٹھہرا تو گرفتاری۔'' اس اذیت کے درمیان، جب سڑک پر اندھیرا باقی تھا، اچانک اسے Pavee اسٹریٹ کی جانب سے آتا ایک آدمی دکھائی دیا؛ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، اور اس کٹاؤ کے اوپر رکا جس کے اوپر تین آردیے تھا، یعنی پھنسا ہوا تھا۔ اسی جگہ ایک اور آدمی ملا جو اسی احتیاط سے چل رہا تھا، اس کے بعد تیسرا، پھر چوتھا۔ جب یہ سب پھر یک جا ہو گئے تو ان میں سے ایک نے باڑ میں لگے پھاٹک کا دروازہ کھولا اور سب اس احاطے میں داخل ہو گئے جہاں پر جھونپڑی تھی۔ وہ تین آردیے کے بالکل نیچے جمع ہوئے، انھوں نے اس خیال سے اس جگہ جمع ہونے کا فیصلہ کیا تھا کہ کسی راہگیر کی یا پاسبان کی نظروں میں آئے بغیر مشاورت کر سکیں جو چند قدم کے فاصلے پر لافورس کی کھڑکی کی نگہداری کر رہا تھا۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ موسلا دھار بارش نے پاسبان کو اس کے بکس تک محدود کر رکھا تھا۔ چوں کہ تین آردیے ان کے چہروں کو دیکھ نہیں سکتا تھا، کسی نا امید بدنصیب کی سی توجہ کے ساتھ ان کی باتوں پر کان لگائے تھا جو خود کو گم شدہ محسوس کر رہا ہو۔

تین آردیے کو امید کی کرن دکھائی دی — وہ لوگ بدمعاشوں کی بولی میں باتیں کر رہے

تھے۔ پہلے شخص نے بلند مگر صاف آواز میں کہا: "چلو بھاگ چلیں۔ ہم یہاں آئے کس لیے ہیں؟"

دوسرے شخص نے جواب دیا: "موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ہر قسم کی آگ بجھ جائے گی۔ عین موقعے پر پانی پہنچ جائیں گے۔ ادھر، سامنے سپاہی نگہبانی کر رہا ہے۔ ہم یہاں دھر لیے جائیں گے۔"

دو حروف ہیں icigo اور icicaille؛ دونوں کا مطلب ici ہوتا ہے، پہلا لفظ پشتے کی بولی سے متعلق ہے؛ دوسرا Temple کی بولی ہے؛ تین آردیے کے لیے یہ روشنی کے جھماکے تھے۔ icigo سے اس نے برؤژوں کو پہچان لیا جو بند کے اطراف چکر لگاتا رہتا تھا؛ icicaille کے ذریعے بابے پہچانا گیا جو کئی کام کے علاوہ Temple میں کپڑے کی دلالی کرتا تھا۔

عظیم صدی کی قدیم بولی Temple کے سوا کہیں اور نہیں بولی جاتی، اور بابے واقعی پہلا شخص تھا جو تمام تر نزاکتوں کے ساتھ یہ بولی بولتا تھا۔ اگر icicaille نہ بولا گیا ہوتا تو تین آردیے اسے پہچان نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنی آواز مکمل طور پر بدل لی تھی۔

اس دوران تیسرا آدمی بھی دخیل ہو گیا۔

"کوئی جلدی نہیں، ذرا انتظار کرو۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس کو ہماری ضرورت نہیں؟"

اس سے، جو فرانسیسی کے سوا کچھ نہیں تھی، تین آردیے نے مونٹ پارناس کو پہچان لیا تھا، جس نے اپنی نفاست سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ تمام بولیاں سمجھتا ہے، مگر بولتا ایک بھی نہیں۔

چوتھا شخص پُرسکون تھا، مگر اس کے جسیم کاندھے چغلی کھا رہے تھے۔ تین آردیے کو اسے پہچان لینے میں تامل نہیں ہوا۔ وہ گوئیمر تھا۔

برؤژوں تقریباً تیزی سے بولا مگر آواز دھیمی رکھی: "کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ شراب خانے والے نے اپنا کام ٹھیک سے نہیں کیا ہے۔ وہ شور نہیں مچاتا، کہ وہ غل غپاڑے والا آدمی نہیں۔ تمھیں اتنا تو معلوم ہے کہ قمیص کیسے پھاڑی جاتی ہے، رسی بنانے کے لیے چادر کاٹو، دروازوں میں سوراخ کرو، جعلی کاغذات حاصل کرو، نقلی کنجیاں بناؤ، اپنی رسی لٹکاؤ، چھپ جاؤ، بھیس بدلو، مگر وہ بے چارہ تو یہ سب نہیں جانتا، ایسے کام اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔"

بابے نے مزید کہا، وہ بھی اسی کلاسیکی بولی میں جیسی Poulailler اور Cartouche بولتے تھے، جس میں بہادری ہوتی ہے؛ وہ نئے، بہت حد تک رنگین اور Andre Chenier کے پُرخطر لہجے میں برؤژوں کی طرح بول رہا تھا: "تمھارا شراب خانے والا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوگا۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے۔ وہ بالکل احمق ہے۔ اس نے خود پانی کو گرفتار کرنے کا موقع دیا ہوگا،

اس نے بابی سے مذاق کیا ہوگا۔ سنو مونٹ پارناس! کیا تم ویسی ہی تیخ قید خانے میں سن نہیں رہے ہو؟ تم نے وہ تمام روشنیاں دیکھی ہیں۔ وہ پھر پکڑ لیا گیا ہے۔ بیس برس کی سزا ہو گی۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں، نہ میں بزدل ہوں، مگر اب کچھ کرنا بھی نہیں، ورنہ وہ ہمیں نچا کر رکھ دیں گے۔ پاگل نہ بنو، آؤ چلیں، چل کر پرانی وائن کی بوتل چڑھاتے ہیں۔

''مشکل وقت میں دوست کا ساتھ نہیں چھوڑا جاتا۔'' مونٹ پارناس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ وہ پکڑا گیا ہے۔'' برؤژوں نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''اس لمحے شراب خانے والا ایک پینی کے برابر بھی نہیں۔ ہم اس کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ چلو چلیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں بابی کی مٹھی میں ہوں۔''

مونٹ پارناس زیادہ مزاحمت نہیں کر سکا؛ حقیقت یہ ہے کہ یہ چار آدمی، بد معاشوں جیسے وفادار جو ایک دوسرے کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتے، خطرے کے باوجود اس امید میں لافورس میں چکر لگاتے رہے کہ شاید تین آردیے کسی دیوار پر نظر آجائے گا، مگر رات جو واقعی گزرتی جا رہی تھی — اس لیے کہ ایسی بارش ہو رہی تھی جس نے ساری سڑکیں سنسان کر دی تھیں — سردی جو انھیں بے بس کیے دے رہی تھی، ان کے لباس جو بھیگ گئے تھے، جوتے جن میں سوراخ ہو گئے تھے، پریشان کن آوازیں جو ابھی قید خانے سے بلند ہوئی تھیں، گھنٹے جو گزر گئے تھے، گشت جس کا سامنا تھا، امید جو ختم ہوتی جا رہی تھی؛ سب انھیں پسپائی کی راہ پر چلنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ مونٹ پارناس بھی جو تین آردیے کا تقریباً داماد تھا، ہمت ہار گیا تھا۔ ایک لمحے بعد وہ چلے گئے ہوتے۔ تین آردیے اپنی دیوار پر بیٹھا ہانپ رہا تھا، تختے پر بیٹھے تباہ شدہ جہاز Meduse کے مسافروں کی طرح، جنھیں گزرتا ہوا جہاز دکھائی دیا تھا اور ان کی نظروں سے افق میں اوجھل ہو گیا تھا۔

تین آردیے کو ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ انھیں پکارے۔ ایک پکار سب کچھ برباد کر دیتی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا، آخری خیال، وجدان کا ایک جھماکا؛ اس نے جیب سے برؤژوں کی رسی کا آخری سرا نکالا، جو اس نے نئی عمارت کی چمنی سے الگ کیا تھا، اور اسے اس جگہ پھینک دیا جو باڑ کے درمیان تھی۔

رسی ان کے پیروں پر گری۔

''بیوہ۔''

''میرا tortouse۔'' برؤژوں نے کہا۔

"شراب خانہ۔" مونٹ پارناس نے کہا۔

اور انھوں نے اپنی آنکھیں اوپر کی جانب کیں۔ تین آردیے نے اپنا سر ذرا سا آگے کیا۔

"جلدی کرو۔" مونٹ پارناس نے کہا، "تمھارے پاس بروژوں کی رسی کا دوسرا سرا ہے؟"

"ہاں۔"

"دونوں ٹکڑوں کو گرہ لگا کر ایک کر دو، ہم رسی اس کی طرف اچھالیں گے، وہ اسے دیوار سے باندھ دے گا؛ نیچے آنے کے لیے رسی کافی ہوگی۔"

تین آردیے نے خطرہ مول لیا، اور بولا، "میں سردی سے سُن ہو گیا ہوں۔"

"ہم تمھیں گرم کر دیں گے۔"

"میں سرک بھی نہیں سکتا۔"

"پھسل کر نیچے آ جاؤ، ہم تمھیں سنبھال لیں گے۔"

"میرے ہاتھ بے حس ہیں۔"

"صرف رسی کو دیوار سے باندھ دو۔"

"میں نہیں کر سکتا۔"

"تب، ہم میں سے کسی کو اوپر آنا پڑے گا۔" مونٹ پارناس نے کہا۔

"تین منزل!" بروژوں نے فوراً کہا۔

دیوار کے ساتھ ساتھ پلستر کا ایک قدیم دودکش تھا جو گزرے زمانے میں بھٹی کا کام دیتا تھا اور تقریباً اس جگہ تک تھا جہاں سے وہ تین آردیے کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ دودکش ٹوٹا پھوٹا اور شگاف سے بھرا تھا، اب گر چکا ہے، مگر اس کے نشانات ابھی تک نظر آتے ہیں، بہت تنگ تھا۔

"اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔" مونٹ پارناس نے کہا۔

"مگر وہ دودکش؟" بابے نے بلند آواز میں کہا "بڑوں کے لیے مناسب نہیں۔ لڑکا مناسب رہے گا۔"

"کوئی چھوکرا لانا پڑے گا۔"

"مگر ملے گا کہاں؟" گولمر نے کہا۔

"ٹھہرو۔" مونٹ پارناس نے کہا، "میرے پاس ہے۔"

اس نے باڑ میں لگے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور یقین کر لیا کہ کوئی سڑک پر گزر نہیں رہا ہے، احتیاط سے باہر نکلا، پھاٹک بند کیا اور Bastille کی جانب دوڑنے لگا۔

سات یا آٹھ منٹ گزرے ہوں گے، تین آدمیوں کے لیے یہ سات منٹ سات صدیوں کے برابر تھے! بابے، بروڈروں اور گوئیمر نے اپنے لب نہیں کھولے تھے؛ بالآخر پھاٹک ایک بار پھر کھلا اور مونٹ پارناس ظاہر ہوا، اس کا سانس چڑھ رہا تھا، اس کے عقب میں گاوروش تھا۔ بارش کے باعث سڑک اب بھی سنسان تھی۔

ننھا گاوروش احاطے میں داخل ہوا اور پُرسکون انداز میں ان بدمعاشوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ اس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ گوئیمر اس سے مخاطب ہوا، ''لڑکے! کیا تم آدمی ہو؟''

گاوروش نے اپنے کاندھے ہلائے، اور کہا، ''میری طرح کا جوان لڑکا آدمی ہوتا ہے اور تم جیسے مرد بچے ہوتے ہیں۔''

''بہت لمبی زبان ہے اس چھوکرے کی۔'' بروڈروں نے بلند آواز میں کہا ''پیرس کے چھوکرے پیال کے بنے نہیں ہوتے۔'' بروڈروں نے اضافہ کیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' گاوروش نے سوال کیا۔

مونٹ پارناس نے جواب میں کہا ''اس دودکش پر چڑھ جاؤ۔''

''اس رسی سمیت۔'' بابے نے کہا۔

''اور اِسے باندھ دو۔'' بروڈروں نے کہا۔

''دیوار کی بلندی پر۔'' بابے نے اضافہ کیا۔

''اس کھڑکی کی آڑ تک۔'' بروڈروں نے مزید اضافہ کیا۔

''اس کے بعد؟'' گاوروش نے سوال کیا۔

''وہاں۔'' گوئیمر نے ادھر اشارہ کیا۔

لاوارث لڑکے نے رسی کا، دودکش کا، کھڑکیوں کا معائنہ کیا اور منہ سے اپنی کوفت کی آواز نکالی، جس کا مطلب تھا، بس، اتنا ذرا سا کام!

''اوپر ایک آدمی ہے، تمھیں جسے بچانا ہے۔'' مونٹ پارناس نے کہا۔

''کرو گے؟'' بروڈروں نے ایک بار پھر کہا۔

''مبتدی!'' لڑکے نے جواب میں کہا، گویا یہ سوال اس کے نزدیک غیر معمولی ہو۔

لڑکے نے اپنے جوتے اتار دیے۔

گوئیمر نے گاوروش کو ایک ہاتھ سے پکڑا، جھونپڑی کی چھت پر دھرا، جس کے دیمک لگے تختے اس لڑکے کے وزن سے جھک گئے، اور اسے رسی پکڑا دی جو مونٹ پارناس کی غیر موجودگی

میں گرہ ڈال کر تیار کر دی گئی تھی۔ لاوارث لڑکا دو دگش کی طرف بڑھا، جس میں داخل ہونا اس کے لیے آسان تھا جو ایک بڑے سے شگاف کے طفیل چھت تک جاتا تھا۔ عین اس وقت جب وہ چڑھنا شروع کرنے والا تھا، تھن آردیے، جسے زندگی اور اس کا تحفظ قریب آتا دکھائی دیا، دیوار کے کنارے پر جھکا؛ فجر کی پہلی سفید کرن اس کی پسینے سے تر بتر پیشانی اس کے چہرے کی نیلی ہڈیوں، اس کی نوکیلی وحشی ناک، اس کی سخت بالوں والی ڈاڑھی سے ٹکرائی، اور گاوروش نے اسے پہچان لیا۔ چیلو! یہ تو میرا باپ ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

دانتوں میں رسی دبائے، اس نے مستقل مزاجی سے چڑھنا شروع کر دیا۔

وہ چوٹی پر پہنچ گیا، دیوار پر اس طرح سوار ہوا جیسے وہ کوئی گھوڑا ہو، اور رسی کو کھڑکی کی اوپر والی cross-bar سے مضبوطی سے باندھ دیا۔

چند لمحوں بعد، تھن آردیے سڑک پر تھا۔

جیسے ہی وہ سڑک پر آیا، جیسے ہی اس نے خود کو خطرے سے باہر محسوس کیا، اب نہ اس کو تھکن تھی نہ اس کی سردی باقی رہ گئی تھی؛ وہ تمام خوف ناک اشیا جس سے فرار ہوا تھا دھوئیں کی طرح غائب ہو گئی تھیں، وہ آزاد اور سیدھا کھڑا ہو گیا، آگے بڑھنے کو تیار۔

اور یہ تھے اس آدمی کے پہلے الفاظ، "اب، ہم کسے کھانے والے ہیں؟"

ذرا نے حد تک شفاف جملے کی تشریح غیر ضروری ہوتی؛ شاید وہ لوٹ مار، قتل کے ارادے کا اظہار کر رہا تھا کھانے سے اس کی مراد نگل جانا تھا۔

"ہمیں کسی کونے میں ہو جانا چاہیے۔" برؤژوں نے کہا، "ہمیں سب کچھ تین لفظوں میں طے کرنا اور فوراً الگ ہو جانا ہوگا۔ اب ایک معاملہ تھا جو بہت ضروری ہے، پلو مے اسٹریٹ، سنسان سڑک، الگ تھلگ مکان، باغیچے کے قدیم و خستہ پھاٹک کے پیچھے اکیلی عورت۔"

"اچھا! کیوں نہیں؟" تھن آردیے نے مطالبہ کیا۔

"تمھاری لڑکی، اپونین، اس معاملے کو دیکھنے گئی تھی۔" بابے نے جواب میں کہا۔

"اور وہ میگنان کے لیے ایک بسکٹ لے گئی تھی۔" گولیمر نے لقمہ دیا، "وہاں کچھ کرنا نہیں ہے۔"

"لڑکی احمق نہیں۔" تھن آردیے نے کہا، "پھر بھی دیکھنا تو ہوگا۔"

"ہاں، ہاں۔" برؤژوں نے کہا، "دیکھنا ہوگا۔"

اس دوران آدمیوں میں سے کسی نے گاوروش کی خبر نہ لی، جو، اس گفتگو کے دوران باڑ

کے ایک گھٹنے پر بیٹھ گیا تھا؛ اس نے چند منٹ انتظار کیا، اس امید پر کہ اس کا باپ اس کی طرف متوجہ ہوگا؛ اس نے اپنے جوتے پہنے، اور کہا، ”بس اتنا ہی؟ اب تمھیں میری اور میرے آدمیوں کی ضرورت نہیں رہی؟ اب تم اپنی مشکل سے نکل گئے ہو۔ میں چلا۔ مجھے جانا چاہیے اور بچوں کو بستر سے اٹھانا چاہیے۔“

اور وہ چلا گیا۔

وہ پانچوں آدمی یکے بعد دیگرے احاطے سے باہر نکلے۔

جب گاؤ روش Ballets اسٹریٹ کے کونے پر جا کر غائب ہو گیا، تو بابے، رتین آردیے کو ایک طرف لے گیا۔

”تم نے اس نوجوان لڑکے پر غور نہیں کیا؟“ اس نے سوال کیا۔

”کون نوجوان لڑکا؟“

”وہی جو دیوار پر چڑھا تھا اور تم تک رسی پہنچائی تھی۔“

”نہیں، واقعی غور نہیں کیا۔“

”اچھا، مجھے معلوم نہیں، مگر مجھے ایسا لگا کہ وہ تمھارا بیٹا تھا۔“

”ہت تیرے کی!“ رتین آردیے نے کہا، ”واقعی؟“

۞

عامی بولی کی ابتدا

ایک ہولناک لفظ ہے Pigritia۔

یہ دو لفظوں la pegre سے بنا ہے، جس کا مطلب ہے سرقہ! ایک اور خراب لفظ ہے la pegrenne جس کا مطلب ہے گرسنگی۔

گویا کاہلی ماں ہے۔

اس کا ایک بیٹا ہے سرقہ، اور لڑکی ہے گرسنگی۔

ہم اس وقت کہاں ہیں؟ عامی بولی (slang) کی سرزمین پر۔

عوامی بولی کسے کہتے ہیں؟ یہ قوم بھی ہے اور بولی بھی۔ اس کی دو اور قسمیں ہیں: عوام اور زبان۔

چار اور تیس (چونتیس) برس قبل جب اس سنگین اور غمگین تاریخ کے بیان کرنے والے نے اسی جیسے مقصد کی تحریر (Argot of the Temple) میں ایک چور کے بارے میں کہا تھا کہ وہ argot میں کلام کرتا تھا، تو حیرت اور ہنگامہ برپا ہو گیا تھا— کیا؟ کیسے؟ Argot؛ argot بھیانک کیوں ہے؟ یہ زبان ہے قید خانوں کی، گیلیز [چپو بردار بحری جہازوں] کے قیدیوں کی، ہر اس شے کی سماج میں جو قابل نفرت ہوتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

ہم اس قسم کے اعتراضات کو کبھی سمجھ نہیں سکے ہیں۔

اس کے بعد سے رومانس لکھنے والے کے دو نہایت طاقت ور کردار ہیں، ان میں سے ایک انسانی دل کا مشاہدہ کرنے والا ہے، دوسرا دلیر دوست ہے عوام کا، بالزاک اور Eugene Sue کا، جنھوں نے اپنے بدمعاشوں کو ان کی فطری زبان میں بات کرتے پیش کیا ہے، جس طرح The

Last Days of a Condemned Man کے مصنف نے 1828ء میں کیا تھا، اس پر بھی ایسے ہی اعتراضات کیے گئے ہیں۔ لوگوں نے بار بار اعتراضات کیے ہیں۔ "اس قابلِ نفرت بولی سے مصنفین کی مراد کیا ہے؟ عامی بولی معیوب ہے۔ عامی بولی سننے والی میں تھرتھری پیدا کر دیتی ہے۔"

اس سے انکار کون کرتا ہے؟ بلا شبہ یہ مصنف کا فیصلہ تھا۔

جب بھی کسی زخم، کسی خلیج، کسی سماج کو کریدنے کا سوال پیدا ہوا ہے، تو کب اور کس نے اس قدر دور اور گہرائی تک جانے کو غلط قرار دیا ہے؟ ہم نے تو ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ جب بھی باہمت کام اور کم از کم، ایک معمولی اور فائدہ مند کام توجہ کے لائق ہوا ہے، فرض نے اور لیاقت نے ہمیشہ اسے قبول کیا۔ ایسا کیوں ہے کہ کوئی ہر شے کی جستجو نہ کرے، ہر شے کا مطالعہ نہ کرے؟ کوئی راستے میں ہی کیوں رُک جائے؟ رُک جانے کا انحصار گہرائی ناپنے والی رسی پر ہوتا ہے نہ کہ رہنمائی کرنے والے پر۔

یقینی طور پر بھی، وہ کام نہ پُرکشش ہوتا ہے نہ آسان، جس میں سماجی نظام کی انتہائی گہرائیوں کی تفتیش کرنی پڑے، جس میں خشک زمین ختم ہو جاتی ہے؛ جہاں دلدل شروع ہو جاتی ہے؛ جس میں تلاش ہوتی ہے تاریک لہروں کی؛ جس میں کوشش ہوتی ہے کانپتی تھرتھراتی، نفرت انگیز بولی کو گرفت میں لینے اور سڑک پر پھینک دینے کی؛ جس میں سے اس وقت بھی گندگی ٹپکتی ہے جب وہ دن کی روشنی میں لائی جاتی ہے؛ ایسی آبلے دار لغت کا ہر لفظ عفریتی کیچڑ اور پرچھائیوں سے نکلنے والے ناپاک چھلے کی مانند ہوتا ہے۔ تصور سے زیادہ کوئی شے غم ناک نہیں ہوتی جس طرح عریانیتِ خیال کی کھلی روشنی: جیسے بھیانک ہجوم میں عامی بولی۔ دراصل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی خوف ناک جانور جو رات کے لیے بنایا گیا ہو اپنی غلاظتوں سے علاحدہ کر دیا گیا ہے۔ آپ سوچتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں وحشت انگیز وجود کو اور چبھنے والی گھنی جھاڑی کو جو تھرتھراتی ہے، سرسراتی ہے، لہراتی ہے، واپس پرچھائیں بن جاتی ہے، ڈراتی ہے اور چمکتی ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ ناخن والے پنجے سے مشابہ ہوتا ہے، دوسرا بجھی ہوئی اور خوں ریز آنکھ جیسا؛ اور فلاں، فلاں جملہ کیکڑے کے پنجے کی طرح حرکت کرتا ہے۔ یہ سب کچھ زندہ رہتا ہے اشیا کی ہیبت ناکی میں، قوتِ حیات کی بے ترتیبی میں جن کی ترتیب کی گئی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خوف نے کب مطالعے کو رد کیا ہے؟ آزار نے کب دوا کو نکال باہر کیا ہے؟ کیا کوئی قیاس کر سکتا ہے کہ کوئی ماہرِ فطرت سانپ کا، چمگادڑ کا، بچھو کا، ہزار پا کا، سیاہ زہریلی مکڑی کا مطالعہ کرنے سے انکار کر سکتا ہے، اور کیا ایسا بھی ہوگا جو ان کو یہ کہتے ہوئے ان کی ظلمتوں میں واپس ڈال سکتا ہے: "اُف، یہ کتنا بدصورت ہے۔" وہ مدبر جو عامی بولی سے منہ پھیر لیتا ہے اس جراح سے مشابہ ہوگا جو کسی ناسور یا پھوڑے کو دیکھ کر اپنا منھ پھیر لیتا ہے۔ وہ ایسے ماہرِ لسانیات

جیسا ہوگا جو زبان کی کسی حقیقت کی پڑتال کرنے سے انکار کردیتا ہے، اور ایسا فلسفی ہوگا جو انسانیت کی کسی حقیقت کو جانچنے میں تردد کرتا ہے۔اس لیے کہ ان لوگوں سے یہ کہنا لازمی ہوگا جو اس معاملے سے ناواقف ہیں کہ argot ایک ادبی عجوبہ بھی ہے اور سماجی نتیجہ بھی۔صحیح معنوں میں عامی بولی کسے کہتے ہیں؟ یہ زبان بدنصیبی کی زبان ہے۔

ہمیں روکا جا سکتا ہے؛ یہ حقیقت ہمارے سامنے عام معاملات کی طرح پیش کی جا سکتی ہے، جو طریقہ ہے اس کو خفیف کرنے کا؛ ہم سے کہا جا سکتا ہے کہ تمام تجارتیں، تمام پیشے، سماجی طبقات کے تمام جانشات، اور ذہانت کی تمام شکلوں میں ان کے اپنے مخصوص عامی الفاظ ہوتے ہیں۔جب تاجر کہتا ہے: "Montpellier not active, Marseilles fine quality,"، — جب ایکسچینج میں دلالی کرنے والا کہتا ہے "Assets at end of current month"، جب جوا کھیلنے والا کہتا ہے "Tiers et tout, refait de pique,"؛ جب جزیرۂ نارمن کا ناظم عدالت کہتا ہے، "فیس کے ذریعے حق رکھنے والا جب اپنی آراضی پر واپس آتا ہے تو جائیداد کے ان فوائد پر دعویٰ نہیں کر سکتا جو مارگیج رکھنے والے کو جائیداد کی وراثتی ضبطی کے دوران ہوئے ہوں"، جب ڈراما نگار کہتا ہے، "The piece was hissed,"، جب مزاح نگار کہتا ہے: "I've made a hit,"، جب فلسفی کہتا ہے: "Phenomenal triplicity,"؛ جب شکاری کہتا ہے: "Voileci allais, Voileci fuyant"، جب ماہر علم دماغ کہتا ہے: "Amativeness, combativeness, secretiveness,"، جب گھڑسوار سپاہی کہتا ہے: "My turkey-cock,"؛ جب تلوار کی لڑائی کا کھیل سکھانے والا کہتا ہے: "Tierce, quarte, break,"؛ جب طباعت کرنے والا کہتا ہے: "My shooting-stick and galley," — ہر طباعت کرنے والا، تلوار کا کھیل سکھانے والا، گھڑسوار سپاہی، پیدل سپاہی، ماہرِ علم دماغ، شکاری، فلسفی، مزاح نگار، ڈراما نگار، ناظم عدالت، جواری، اسٹاک بروکر اور تاجر عامی بولی بولتا ہے۔جب پینٹر کہتا ہے: "My grinder,"، جب دستاویزات کی تصدیق کرنے والا کہتا ہے: "My Skip-the-Gutter,"، جب حجام کہتا ہے "My mealyback,"، جب جفت ساز کہتا ہے: "My cub," تو وہ عامی بولی بولتا ہے۔سچ یہ ہے کہ اور کوئی اس نکتے پر اصرار کرتا ہے تو وہ تمام فیشن جن میں دایاں اور بایاں کہا جاتا ہے، sailor's port اور starboard، ڈراموں میں مناظر بدلنے میں court-side اور garden-side کہا جاتا ہے، عدالت کا کارندہ Gospel-side اور Epistle-side

کہتا ہے، یہ سب عامی بولی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ایک اور عامی بولی ہے معشوق لیڈی کی اور precieuses کی Rambouillet۔ ہوٹل Cour des Miracles سے تقریباً ملا ہوا ہے۔ ڈیوک کی بیویوں کی بھی اپنی عامی بولی ہے، یہ محبت بھرا خط ملاحظہ کیجیے جو ایک عظیم اور بحالیِ فرانس کی بہت خوب صورت خاتون نے تحریر کیا تھا: "You will find in this gossip a fultitude of reasons why I should libertize." سفارتی صحفر بھی عامی بولی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پاپائی وزارتوں کے عہدے جب 26 for Rome, grkztntgzyal for despatch اور abfxustgrnogrkzu tu XI for the Due de Modena کہتے ہیں تو یہ بھی عامی بولی ہوتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے معالجین گاجر، مولی، اور شلجم کے لیے reptitalmus, dracatholicum, Opoponach, perfroschinum, angelorum, postmegorum استعمال کرتے تھے تو عامی بولی ہی بولتے تھے۔ چینی بنانے والا جب کہتا ہے: "Loaf, clarified, lumps, bastard, common, burnt," تو ایمان دار صنعت کار عامی بولی بولتا ہے۔ تنقید کا ایک مخصوص دبستان جب "Half of the works of Shakespeare consists of plays upon words and puns," کہتا تھا تو عامی بولی بولتا تھا۔ شاعر یا فن کار جو کچھ بوجھ کر موسیو Montmorency کو "بورژوا" قرار دے تو اگر وہ اشعار کا اور قوانین کا پارکھ نہیں تو عامی بولی بولتا ہے۔ اگر کوئی کلاسیکی تعلیم کا ماہر پھولوں کو "فلورا"، پھلوں کو "Pomona,"، سمندر کو "Neptune,"، محبت کو "fires,"، حسن کو "charms,"، گھوڑے کو "a courser,"، سفید یا سرخ رنگ کے تمغے کو، "the rose of Bellona," گولی پیٹ کو "Mars' triangle," کہتا ہے تو ماہرِ تعلیم بھی عامی بولی بولتا ہے۔ الجبرا، ادویہ اور نباتیات ہر ایک کی اپنی عامی بولی ہوتی ہے۔ وہ زبان جو جہازوں پر استعمال کی جاتی ہے، سمندر کی وہ حسین زبان، جو اتنی مکمل تصویر کی مانند دلکش ہوتی ہے، جسے ژاں بارٹ، Suffren, Duquesne, اور Duperre, بولتے تھے، جس میں سیٹیاں اور گھنٹیاں، سمندری لہریں، ہوا، آندھی اور توپیں سی بجتی سنائی دیتی ہیں تو یہ بھی مکمل طور پر بہادرانہ اور چکا چوند کر دینے والی عامی بولیاں ہوتی ہیں؛ جو آتش مزاج چوروں کی عامی بولی ہوتی ہے جیسے گیدڑ کے لیے شیر۔

کوئی شبہ نہیں۔ کہیں، ہم جو کچھ بھی کہتے ہیں، مگر عامی بولی کا یہی طریقہ ہے، عامی بولی کے لفظ کی جو وسعت ہے اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ ہم خود کو اس لفظ تک محدود رکھتے ہیں جو قدیم ہوتا ہے اور قطعی محدود اور طے شدہ معنویت پر مشتمل ہوتا ہے اور ہم اسے عامی بولی میں محدود

کردیتے ہیں۔اصلی عامی بولی وہ عامی بولی ہے جو پہلے سے ممتاز عامی بولی ہوتی ہے، اگر وہ الفاظ اس طرح جوڑے بنا دیے جاتے ہیں تو قدیم عامی بولی، جو ایک بادشاہت تھی؛ سادہ، مضطرب، فریبی، ناقابل اعتبار، زہریلی، ظالمانہ، ذومعنی، حقیر، عمیق اور بدنصیبی کی مہلک زبان کے سوا کچھ نہیں تھی ۔تمام تر بے عزتی اور تمام تر بدقسمتی کی انتہا کی ایک آخری بدبختی ہوتی ہے جو منحرف ہوجاتی ہے اور طے کر لیتی ہے کہ وہ ہر قسم کے مبارک حقائق اور حاکم صداقتوں کے انبار سے تنازعے میں شامل ہوگی؛ ایسا خوف ناک تنازعہ جس میں آج کا چالاک، آج کا شہ زور، مضرِ صحت اور خوں خوار ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں سماجی نظام پر برائی کے نوکیلے خار اور جرم کے تنگنے کی ضرب سے حملہ آور ہوتا ہے ۔اس تنازعے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بدنصیبی نے دو بہ دُو مبارزت کی ایک زبان ایجاد کی ہے، جسے عامی بولی کہتے ہیں۔

اسے رائج رکھنے اور نسیان سے بچانے، خلا سے اوپر رکھنے کے لیے،وہ کسی زبان کا ٹکڑا ہو جسے انسان نے زبان سے ادا کیا ہو، اور جو بہ صورتِ دیگر گم جائے گا، یعنی ان کے عناصر میں سے ایک عنصر، اچھا ہو یا برا، تہذیب جس پر مشتمل ہوتی ہے، یا جس سے پیچیدہ ہو جاتی ہے، سماجی مشاہدے کی دستاویز کو وسیع کرنا ہوتا ہے؛ جو خود سماج کی خدمت کرنے کے مترادف ہوتا ہے ۔یہ خدمت Plautus نے، دو Carthaginian سپاہیوں کے درمیان فونیشیائی (Phoenician) زبان میں گفتگو کے ذریعے شعوری یا لاشعوری طور پر ادا کی تھی؛ اور وہ خدمت مولیئر (Moliere) نے اپنے کئی کرداروں کو Levantine میں اور ہر قسم کی مقامی بولیوں میں گفتگو سے کی تھی ۔اس مقام پر از سر نو کچھ اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں فونیشیائی، بہت اچھی! Levantine بالکل صحیح! عامی بھی ہے، مگر اس کو ایک طرف رکھیے۔ یہ زبانیں ہیں جو قوموں اور صوبوں سے متعلق رہی ہیں؛ مگر عامی بولی؟ عامی بولی کو محفوظ رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ عامی بولی کو بچا رکھنے کی مدد سے کون سی نیکی ہوگی؟

اس کا جواب ہم ایک لفظ، صرف، سے دیں گے۔ بے شک، اگر ایک زبان جو ایک قوم یا ایک صوبے نے استعمال کی ہے دل چسپی کے لائق ہے، اور وہ زبان جو بدنصیبی نے استعمال کی ہے مزید توجہ اور مطالعے کی مستحق ہوگی۔

یہی وہ زبان ہے جو فرانس میں بولی گئی ہے، مثال کے طور پر چار صدیوں سے زیادہ عرصے تک، نہ صرف بند نصیبی کے ذریعے، بلکہ انسان کی ہر ممکنہ بدنصیبی کے ذریعے۔

اور پھر، ہم اصرار کرتے ہیں سماجی ناہمواریوں اور کم زوریوں کے مطالعے پر، اور اس کے علاج کے نقطۂ نظر پر، جو ایسا کام نہیں جس میں انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے ۔آداب و رسوم کے تاریخ

داں کا سادگی پسند مقصد واقعات کے تاریخ داں سے کم نہیں ہوتا۔ تاقی اللہ کر کے پاس تہذیب کی سطح، شاہی کے تنازعات، شہزادوں کی ولادت، بادشاہوں کی شادیاں، لڑائیاں، اجتماعات، عظیم عامی لوگ، دن کی روشنی میں گردشِ زمانہ، سب کچھ بیرونی حالات میں ہوتا ہے۔ دوسرے تاریخ داں کے پاس اندرون، گہرائیاں، محنت کرنے کا دکھ، انتظار، دبائی ہوئی عورتیں، تکلیف دینے والے بچے، آدمی اور آدمی کے درمیان خفیہ جنگیں، غیر واضح درندگی، تعصبات، منصوبہ بندی سے کی ہوئی ناانصافیاں، زمین دوز غیر واضح تھرتھراہٹوں کی افراط، بھوک سے ہونے والی اموات، قانون کی انتقامی ضربیں، روحوں کا خفیہ ارتقا، برہنہ پائی، ننہاپن، وراثتوں سے محرومی، بے پدری، بدنصیبی، اور بدنامی ہوتی ہیں، جن کی ہر قسم کی صورتیں اندھیروں میں پھرتی رہتی ہیں۔ اس کو خیرات سے بھرے دل، اور بے رحمی کے ساتھ اترنا چاہیے، بھائی اور منصف کی طرح، ان ناقابلِ نفوذ گنبدوں میں جہاں خلط ملط رینگتے ہیں، وہ جن کا خون بہتا ہے اور وہ جو ضرب لگاتے ہیں، وہ جو بد دعا کرتے ہیں، وہ جو فاقہ کرتے ہیں، وہ جو ہڑپ کرتے ہیں، وہ جو خرابی کو برداشت کرتے ہیں اور وہ جو اسے طاری کرتے ہیں۔ کیا دلوں اور نفسوں کے ان تاریخ دانوں کے فرائض بیرونی حقائق کے تاریخ دانوں سے کسی طرح کم ہوتے ہیں؟ کیا کسی کو یہ خیال بھی آتا ہے کہ Alighieri کے پاس کہنے کے لیے میکاؤلی سے کم چیزیں ہیں؟ کیا تہذیب کا نچلا پہلو اوپری پہلو سے کسی طرح کم محض اس لیے ہے کہ وہ زیادہ گہرا ہے اور زیادہ تاریک ہے؟ کیا ہم پہاڑ کو اچھی طرح جانتے ہیں جب کہ ہم غار سے ناآشنا ہیں؟

چند نئے الفاظ میں ہمیں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ کسی مخصوص علاحدگی سے پہلے جو کچھ ہوتا ہے وہ تاریخ دانوں کی دو قسموں میں قیاس بھی کیا جا سکتا ہے، ہمارے دماغ میں جن کا وجود نہیں ہوتا۔ کوئی بھی اچھا تاریخ داں نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ امتیازی، قابلِ دید، قابلِ توجہ اور لوگوں کی عامی زندگی کا، اور کسی حد تک ان کی عمیق اور خفیہ زندگی کا تاریخ داں نہیں بنتا۔ اور کوئی اندرون کا بھی اچھا تاریخ داں نہیں ہوتا جب تک کہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ ضرورت کے وقت کس طرح وہ بیرون کا تاریخ داں بن سکتا ہے۔ آداب و رسوم اور خیالات کی تاریخ، واقعات کی تاریخ میں سرایت کر جاتی ہے، اور بالعوض بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ حقائق کے دو طریقوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں، جو ہمیشہ ایک دوسرے میں گندھے ہوں اور اکثر جو نتائج بھی پیش کرتے ہیں۔ تمام خاندانی خصوصیات، عاقبت اندیشی جنھیں کسی قوم کی سطح پر تلاش کرتی ہے ان کے متوازی ہوتے ہیں، تاریک مگر واضح، اور ان کی گہرائیوں میں ہوتے ہیں، اور گہرائیوں کے تمام تشنج سطح پر ابال پیدا کرتے ہیں۔ صحیح تاریخ تمام اشیا کی آمیزش ہوتی ہے اور سچا تاریخ داں ہر شے میں آمیزش کرتا ہے۔

آدمی واحد مرکز کا گول دائرہ نہیں ہوتا؛ وہ بیضوی شکل کا دائرہ ہوتا ہے جس کے دو مرکز نگاہ ہوتے ہیں۔ ایک حقائق کا اور دوسرے خیالات کا۔

عامی بولی کمرۂ آرائش کے سوا کچھ نہیں، جہاں زبان کو خراب عمل بجا لانا پڑتا ہے، جہاں وہ اپنا بھیس بدل لیتی ہے۔ وہیں وہ خود کو لفظوں کے نقاب میں، استعارات کی دھجیوں میں ملبوس کر لیتی ہے۔ اس بھیس میں آ کر وہ ڈراؤنی بن جاتی ہے۔ اس کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعی، کیا یہ فرانسیسی زبان، عظیم انسانی زبان ہے؟ اس کو اس وقت دیکھیے جب یہ سٹیج پر قدم رکھنے والی ہوتی ہے، جرم کی تردید کرتی ہے، اور مخزنِ خرابی کے ہر قسم کے استعمال پر تیار ہوتی ہے۔ یہ چلتی نہیں، لڑکھڑاتی ہے، لنگڑاتی ہے Court of Miracles کی بیساکھی پر، اس میڑھی لکڑی پر چلتی ہے جس کی جھنکے میں قلبِ ماہیت کر دی گئی ہو؛ یہ خانہ بدوش کہلاتی ہے؛ ہر قسم کے بھوت پریت نے، اس کے لباس پہنانے والوں نے، اس کے چہرے کو [اپنے رنگ میں] رنگ دیا ہے، یہ رینگتی ہے، پیچھے کی طرف چلتی ہے، یہ دہری چال والی چھپکلی ہے۔ آئندہ کے لیے، یہ ہر قسم کے کردار کے لیے موزوں ہے، جعل سازی کرنے والے اس کو مشتبہ بنا دیتے ہیں، جعل ساز اسے زنگار سے آلودہ کر دیتا ہے، جلنے والی اشیا اسے اپنے کاجل سے سیاہ کر دیتی ہیں، اور قاتل اس کے چہرے پر اپنی سُرخی مل دیتا ہے۔

جب لوگ اسے سنتے ہیں، کسی ایمان دار آدمی کے پہلو میں، سماج کے کسی دروازے پر تو انھیں ان لوگوں کی گفتگو سنائی دیتی ہے جو باہر ہوتے ہیں۔ لوگ سوالات اور جوابات میں تمیز کرتے ہیں۔ بغیر اسے سمجھے ہوئے لوگ اسے ڈراؤنی سرسراہٹ کی طرح، تقریباً انسانی لہجے کی طرح پاتے ہیں، مگر اس کی شباہت ایک صریح لفظ کے بجائے دردناک آواز سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ یہ عامی بولی ہے۔ اس کے الفاظ بے ڈھنگے ہیں اور ان پر ناقابلِ بیان اور خیالی حیوانیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ اور سننے والے کو گمان ہوتا ہے کہ وہ سو سروں والے آبی سانپوں کی آوازیں سن رہا ہے۔

اندھیرے میں یہ ادراک سے بالاتر ہوتی ہے۔ اداسی میں دانت پیستی ہے اور راز میں سرگوشی کرتی ہے۔ بدقسمتی میں سیاہ ہوتی ہے، اور جرم میں زیادہ سیاہ ہو جاتی ہے؛ دونوں سیاہیاں یک جا ہو کر عامی بولی ترتیب دیتی ہیں۔ اس کی فضا میں سیاہی ہوتی ہے، عمل میں سیاہی ہوتی ہے، آوازوں میں بھی سیاہی ہوتی۔ اس کی خوفناک مینڈک جیسی زبان باہر جاتی ہے، واپس آتی ہے، اچھلتی ہے، رینگتی ہے، اس کی رال بہتی ہے، بارش اور رات کے بے حد بھونڈے کہرے میں، بھوک میں، برائی میں، جھوٹ میں، ہتیا ہے میں، ننگے پن میں، دم گھٹنے میں اور سردی کے موسم میں، بدنصیبی کی دوپہر میں یہ دیو کے انداز میں حرکت کرتی ہے۔

ہمیں سزا یافتہ پر رحم کرنا چاہیے۔ افسوس! خود ہم بھی کیسے ہیں؟ کون ہوں میں جو تم سے مخاطب ہوں؟ کیا واقعی تمھیں یقین ہے کہ اپنی ولادت سے پہلے ہم لوگوں نے کچھ نہیں کیا ہے؟ یہ زمین کسی قید خانے کی شباہت سے محروم نہیں ہے۔ کون جانے کہ انسان ربانی انصاف کے خلاف دوبارہ پکڑا ہوا مجرم نہیں ہے؟ زندگی کو غور سے دیکھو۔ یہ اسی طرح بنائی گئی ہے، کہ ہر جگہ ہمیں سزا کے ادراک کا احساس ہوتا ہے۔

کیا آپ وہی ہیں جسے خوش قسمت آدمی کہا جاتا ہے؟ اچھا، آپ ہر روز اداس رہتے ہیں۔ ہر دن کا اپنا عظیم ملال ہوتا یا اس کا اپنا چھوٹا سا اندیشہ ہوتا ہے۔ کل آپ اس صحت کے لیے پریشان تھے جو آپ کو پیاری ہے، آج آپ کے اپنے وجود کو خطرہ ہے۔ کل دولت کے بارے میں تشویش ہوگی، پرسوں بدگوئی کرنے والے کی گالیوں کی بوچھاڑ ہوگی، اس کے اگلے دن کسی دوست کی بدقسمتی ہوگی؛ اس کے بعد موسم ہوگا، پھر کوئی شے ہوگی جو ٹوٹ گئی ہے یا گم ہوگئی ہے، اس کے بعد ایک خوشی ہوگی جس پر آپ کا ضمیر اور آپ کی ریڑھ کی ہڈی آپ پر ملامت کرے گی؛ اس پر مستزاد عامی معاملات۔ اور یہ دل میں بے حساب درد کا باعث ہوتا ہے۔ اور سب کچھ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ ایک بادل جاتا ہے، دوسرا بننے لگتا ہے۔ سو میں مشکل سے ایک دن ہوتا جو پُرمسرت اور سورج کی کرنوں سے روشن ہوتا ہے۔ اور آپ کا تعلق اس طبقے سے ہے جو خوش قسمت ہوتا ہے، اور بقیہ نوع انسانی پر وہی آہستہ رَو رات طاری رہتی ہے۔

فکر کرنے والے دماغ اس فقرے کو کم ہی استعمال کرتے ہیں: خوش قسمت اور بدقسمت۔ اس دنیا میں، بظاہر جو دوسرے کی دالان ہوتی ہے، خوش قسمت کوئی بھی نہیں ہوتا۔

اصل انسانی تقسیم ہوتی ہے: منوّر اور مشتبہ۔

مشتبہ کی تعداد کم کرنا، منوّر کی تعداد بڑھانا — یہی مقصد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم چیختے رہتے ہیں: تعلیم! سائنس! پڑھنے کی تربیت دینے کا مطلب آگ جلانا ہوتا ہے؛ ادا ہونے والے الفاظ کا ہر ٹکڑا چنگاری کی طرح چمکتا ہے۔

پھر بھی، وہ جو کہتا ہے روشنی، اس کا مطلب مسرت نہیں ہوتا۔ روشنی کے بھی دُکھ ہوتے ہیں: ضرورت سے زیادہ جل جانا۔ شعلہ پروں کا دشمن ہوتا ہے۔ اڑنے سے رُکے بغیر جلنا — اسی میں جوہرِ قابل کی حیرت انگیزی ہوتی ہے۔

آپ کو علم کا ادراک ہو، اور محبت کرنے کا، پھر بھی آپ دُکھ اٹھائیں گے۔ دن آنسوؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ منوّر لوگ بھی روتے ہیں مگر اس وقت جب وہ اندھیرے میں ہوتے ہیں۔

۞

اساس

عامی بولی ان لوگوں کی زبان ہوتی ہے جو اندھیرے میں بیٹھتے ہیں۔

خیال اپنی تاریک ترین گہرائیوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ایسی چیستاں بولی کی موجودگی میں جو گرم خوردہ اور آمادہ بہ فساد ہو سماجی فلسفہ اپنے سب سے سخت ترین مراقبوں میں محو رہتا ہے۔ اس میں تادیب صاف نظر آتی ہے۔ لفظ کے ہر ٹکڑے کا اپنا مخصوص ماحول ہوتا ہے۔ بازاری زبان کے الفاظ میں زبان کے اندر ہی جھریاں پڑ جاتی ہیں اور وہ سوکھ جاتے ہیں، گویا وہ ion بھرے گرم لوہے کے نیچے رہے ہوں۔ کچھ تو دھواں بھی دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ فلاں اور فلاں فقرہ آپ پر ایسا رعب ڈالتا ہے جیسے کسی چور کے کاندھے پر 'شاہی پھول' بنے تھے اور اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ خیالات ان اثباتیات میں شامل ہو کر اظہار سے انکار کر دیتے ہیں جو انصاف کے فراری ہوتے ہیں۔ استعارہ کبھی کبھی اس قدر بے شرم ہو جاتا ہے کہ آپ کو محسوس ہوتا ہے گویا اس کے گلے میں لوہے کا طوق پڑا ہے۔

مزید برآں، ان سب کے باوجود، اور ان سب کی وجہ سے اس حیرت انگیز بولی کا اپنا الگ خانہ ہوتا ہے جس میں زنگ آلود دمڑی کے ساتھ سونے کے تمغے کی بھی جگہ ہوتی ہے، جسے ادب کہا جاتا ہے۔ عوام مانیں یا نہ مانیں، عامی بولی کی اپنی گرامر ہوتی ہے اور شاعری بھی۔ یہ زبان ہوتی ہے۔ ہاں مخصوص اصطلاحات کے عیوب کے باعث ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے [چینی زبان] مینڈرن (Mandrin) چبائی ہے اور مخصوص مجازوں کی شان کے ذریعے معلوم ہوتا ہے Villon نے اسے استعمال کیا ہے۔

وہ نفیس اور مشہور مصرع:

مگر گزرے برسوں کی ٹھنڈک کہاں ہے

عوامی بولی کا مصرع ہے۔ Antam — سابقہ برس — Thunes عامی بولی کا ایک لفظ ہے، جس سے مراد ہے گزرجانے والا برس، اور یہ بڑھ کے سابقہ بن جاتا ہے۔ پینتیس برس قبل زنجیری ٹولے کی روانگی کے زمانے میں Bicetre کی کوٹھریوں کی دیوار پر کیل کی مدد سے Thunes کے بادشاہ نے جسے سزا کے طور پر گیلیز میں بھیج دیا گیا تھا، یہ کہاوت کندہ کی تھی جو صاف پڑھی جا سکتی تھی: Les dabs d'antan trimaient siempre pour la pierre du Coesre۔ اس کا مطلب تھا کہ "گزرے دنوں میں بادشاہ ہمیشہ تیل یا مرہم کی مالش کرانے جایا کرتے تھے۔" اس بادشاہ کے نزدیک مرہم کی مالش سے مراد گیلیز تھیں۔

ایک لفظ ہے decarade جو سرپٹ دوڑنے والی بھاری گاڑیوں کے بیان میں استعمال کیا جاتا ہے، جو Villon سے منسوب ہے، اور وہی اس کا مستحق تھا۔ اس لفظ کے ذریعے، جو اپنے چاروں پیروں سے آگ نکالتا ہے، لا فانتین نے اپنی ماہرانہ انداز میں بنائی گئی صوتی ترکیب میں مندرجہ ذیل پورے مصرعے کو سمو دیا ہے:

چھ جفاکش گھوڑے ایک سواری کھینچ لے گئے

خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے عامی بولی کے چند ہی مطالعے ایسے ہوں گے جو زیادہ راز جو اور فائدہ مند ثابت ہوں گے۔ عامی بولی زبان کے اندر پوری زبان ہے، ایک قسم کی مریضانہ گھٹی ہے، غیر صحت مند پیوند ہے جس نے روئیدگی پیدا کی ہے؛ ایک طفیلی کیڑا ہے جس نے اپنی جڑیں فرانسیسی زبان کے تنے میں پیوست کر رکھی ہیں، اور جس کی نامبارک پتیاں زبان کے اطراف رینگ گئی ہیں۔ یہ ہے وہ بولی جسے عامی بولی کا بازاری پہلو کہا جا سکتا ہے۔ مگر جو لوگ زبان کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں ویسا ہی مطالعہ کرنا چاہیے، جس طرح ماہرینِ ارضیات مٹی کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں انھیں عامی بولی زرخیز خزانے کی طرح ملتی ہے۔ لہٰذا آپ مختصر یا طویل فاصلے تک کھدائی کرتے ہیں تو آپ کو قدیم اور پسندیدہ فرانسیسی، Provencal، ہسپانوی، اطالوی، Levantine، بحیرۂ روم کے ساحلوں کی زبان، انگریزی اور جرمن، اور تین قسم کی رومانوی، انگریزی، اطالوی، رومانش، لاطینی اور بالآخر Basque اور Celtic کی تہوں میں عامی بولی ہی ملتی ہے۔ ہر مردود نسل نے اپنی تہہ بنائی ہے، ہر دکھ نے اس میں اپنا پتھر ڈالا ہے، ہر دل نے اس میں اپنے کنکر شامل کیے ہیں۔ گنہگار بے عزت یا ناخوش روحوں کا ایک ہجوم ہے جو زندگی گزار کر ابدیت میں گم ہو گیا ہے، اس میں موجود ہے، اور آپ کو کسی دیوہیکل لفظ کے پیکر کے نیچے بے مقصد گھومتا مل جائے گا۔

آپ کو ہسپانوی کی طلب ہے؟ اس میں قدیم Gothic عامی بولی کثرت سے ملے
گی۔ لیجیے، یہ رہا boffete جو bofeton سے بنا ہے؛ vantane، یعنی کھڑکی (جو بعد
میں vanterne ہوگیا تھا)؛ gat، بلی جو gato سے نکلا ہے؛ acite، تیل، جو aceyte
سے آیا ہے۔ آپ کو اطالوی کی ضرورت ہے؟ یہ رہا spade، بیلچہ جو spada سے بنا ہے؛
carvel، کشتی جو caravella سے نکلا ہے۔ آپ کو انگریزی چاہیے؟ یہ رہا bichot، یہ بشپ
سے بنا ہے؛ raille، جاسوس جو rascal، rascalion سے بنا ہے؛ pilche، بچوں کو لپیٹنے کا
کپڑا، pilcher یا غلاف سے بنا ہے۔ آپ کو جرمن درکار ہے؟ یہ رہا caleur، ویٹر یا kellner
سے نکلا ہے؛ hers، مالک، herzog (duke) سے بنا ہے۔ آپ کو لاطینی چاہیے؟ یہ رہا
frangir، یعنی توڑنا، frangere سے نکلا ہے؛ affurer، چوری کرنا، fur سے بنا ہے؛
cadene، زنجیر، catena سے بنا ہے۔ ہم نے ایک لفظ دیکھا ہے جو ہمارے براعظم کی ہر
زبان میں پایا جاتا ہے، اور پُر اسرار قوت اور اقتدار کے ساتھ۔ یہ لفظ ہے magnus؛ اسکاٹ
لینڈ والے نے اس کو اپنا mac بنا لیا ہے جو قبیلے کا سردار مقرر کرتا ہے؛ Mac-Farlane یا
Mac-Callumore، عظیم Farlane، عظیم Callumore سے بنا ہے؛ عامی بولی اس
کو meck بنا دیتی ہے اور بعد میں یہ Mac اور le meg بن جاتا ہے، یعنی خدا۔ آپ کو
Basque پسند ہے؟ یہ رہا gahisto، یعنی شیطان، جو gaiztoa، evil سے نکلا ہے؛
sorgabon، شب بخیر، جو gabon سے نکلا ہے یعنی good evening۔ آپ کو Celtic
چاہیے؟ یہ رہا blavin، یعنی رومال، جو blavet سے نکلا ہے جو پھوٹ کر نکلنے والے پانی کو کہتے
ہیں؛ menesse جو بُرے معنوں میں عورت کو کہتے ہیں جو meinec سے نکلا ہے جس کا
مطلب ہے پتھروں سے بھری؛ barant، یعنی brook، جو baranton سے بنا ہے، یعنی
چشمہ یا فوارہ؛ goffeur، تالا بنانے والا، goff یعنی لوہار سے نکلا ہے؛ guedouze یعنی
موت، جو guenn-du، یعنی سیاہ و سفید سے نکلا ہے۔ آخر میں، کیا آپ کو تاریخ پسند ہے؟ عامی
بولی تاج کو les malteses، یعنی اس سکے کی یادگار کو کہتے جو مالٹا کی گیلیز میں چلتا ہے۔

اس کے علاوہ لسانی شروعات جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے، عامی بولی اس کے
علاوہ بھی فطری جڑوں کی حامل ہے، جو انسانی دماغ سے پھوٹ نکلتی ہیں۔

پہلا مرحلہ براہِ راست الفاظ کی تخلیق ہوتا ہے۔ اس میں زبانوں کی پُر اسراریت
پنہاں ہوتی ہے۔ الفاظ کو اس طرح رنگ دینا جن میں صورتیں بن جاتی ہیں؛ کوئی نہیں جانتا یہ کیسے

مٹتی ہیں، کیوں مٹتی ہیں اور کہاں سے آتی ہیں۔ یہ قدیم بنیاد ہے تمام انسانی زبانوں کی، جس کو ہم ان کا سنگِ خارا کہتے ہیں۔

عامی بولی میں ان کیفیات کے الفاظ بے شمار ہوتے ہیں: حاضر الفاظ؛ وہ الفاظ جو برمحل خلق کیے جاتے ہیں کسی کو جن کی خبر نہیں ہوتی کہ کس نے خلق کیے ہیں یا کہاں سے آئے ہیں، لسانیاتی اشارات کے بغیر، مناسبت کے بغیر، ماخذ کے بغیر، تنہا، بے رحم، کبھی ڈراونے، جو کبھی کبھی غیر معمولی قوت اظہار بھی رکھتے ہیں اور جو زندہ ہوتے ہیں۔ جیسے کٹا د- le taule؛ جنگل- le sabri؛ خوف، اُڑان -taf؛ خدمت گار- le larbin؛ بعات- the prefect, minister, pharos؛ شیطان- le rabouin۔ ان الفاظ سے زیادہ اجنبی کوئی شے نہیں جو ہر شے کو چھپاتے بھی ہیں اور آشکار بھی کرتے ہیں۔ کچھ الفاظ، جیسے le rabouin، بے جوڑ بھی ہوتے ہیں اور خوف ناک بھی، اور آپ پر جناتی اور بناوٹی اثر ڈالتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ استعارات کا آتا ہے۔ کسی زبان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سب کچھ کہا جاتا ہے پھر بھی چھپا ہوتا ہے اور یہ اعداد و شمار سے پُر ہوتی ہے۔ استعارہ ایک معما ہوتا ہے جس میں چور جو واردات کا منصوبہ بناتا ہے، قیدی جو فرار کا انتظام کرتا ہے سب اس میں پناہ لیتے ہیں۔ عامی بولی محاورے سے زیادہ استعاراتی ہوتی ہے۔ مثال: devisser le coco (پچبری کھولنا) گردن مروڑنا؛ tortiller (کلبلانا) کسی شے کا کھا جانا؛ etre gerbe کا مطلب ہوتا ہے کوشش کرنا؛ rat (چوہا) روئی چور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے؛ il lansquine کا معنی ہیں، بارش ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی عامی بولی کی ترقی ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہوتی ہے تو الفاظ قدیم اور غیر مہذب جس سے استعاراتی جس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ابلیس le rabouin نہیں رہتا le boulanger (نان بائی) ہو جاتا ہے جو بھٹی میں ڈبل روٹیاں پکاتا ہے۔ یہ زیادہ مزاحیہ، مگر کم درجے کے ہو جاتے ہیں؛ جیسے Corneille بعد میں Racine، جیسے AEschylus بعد میں Euripides ہو جاتا ہے۔ عامی بولی کے کچھ مخصوص جملے جو دو زمانوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ایک ساتھ وحشیانہ اور استعاراتی کردار ادا کرتے ہیں سراب سے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ Les sorgueuers vont solliciter des gails a la lune جس کا مطلب ہوتا ہے، اچکے رات کو گھوڑے کھول لے جائیں گے۔ اس سے ذہن میں بھوت پریت لہرانے لگتے ہیں اور آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔

تیسرا مرحلہ مصلحت اندیشی کا ہوتا ہے۔ عامی بولی زبان کے سہارے زندہ رہتی

ہے۔اسے اپنی پسند کے مطابق استعمال کرتی ہے۔اس میں hap-hazard غوطے لگاتی ہے، اور جب موقع ملے تو تبدیل کرنے کے لیے خود کو اس تک محدود کر لیتی ہے۔کبھی کبھی معمولی الفاظ خالص عامی بولی سے خراب اور پیچیدہ ہوتے ہیں تو تصویر نما جملے بن جاتے ہیں، جن میں پہلے کے دو عناصر کا، براہِ راست تخلیق اور استعارے کا امتزاج محسوس کیا جا سکتا ہے: جیسے le cab jaspine, je marronne que la roulotte de Pantin trime dans le sabri ، یعنی کتا بھونک رہا ہے، اور مجھے شبہ ہو رہا تھا، کہ پیرس کی مرگری جنگلے سے گزر رہی ہے۔ Le dab est sinve, la dabuge est merloussiere, la fee est bative یعنی بورژوا احمق ہے، بورژوا ہوشیار ہے، بچی خوب صورت ہے۔ عام طور پر سننے والے کو گمراہ کرنے کے لیے، عامی بولی بغیر کسی تمیز کے زبان کے تمام الفاظ an ignoble tail، aille، iergue، uche شامل کر لیتی ہے۔اس طرح: trouvaille bonorgue ce Vousiergue gigotmuche? یعنی تمھارا کیا خیال ہے، بکرے کی ٹانگ اچھی ہوتی ہے۔یہ جملہ Cartouche نے کلید بردار کو مخاطب کرنے کے لیے کہا تھا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ فرار کے لیے جو رقم پیش کی جا رہی ہے، کافی ہے۔

عامی بولی جو بدعنوانی کی بولی ہوتی ہے جلد ہی خود بدعنوان ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ، چوں کہ یہ ہمیشہ روپوشی کی متلاشی ہوتی ہے، جیسے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ سمجھی جا رہی ہے، اپنا روپ تبدیل کر لیتی ہے۔اس سے قطعِ نظر ہر دوسری روئیدگی کے ساتھ کیا ہوتا ہے، روشنی کی ہر کرن جس شے پر پڑتی ہے اسے مار ڈالتی ہے۔گویا عامی بولی ہمہ وقت بے ترتیب کرنے اور دوبارہ ترتیب کے عمل سے گزرتی رہتی ہے؛ گویا ایک غیر واضح اور تیز رو کام ہوتا رہتا ہے جس میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔عامی بولی جتنی مسافت دس برسوں میں طے کر لیتی ہے، زبان دس صدیوں میں نہیں کر پاتی۔اس طرح le larton (ڈبل روٹی) le lartif بن جاتی ہے؛ le gail (گھوڑا) le gaye بن جاتا ہے؛ la fertanche (پیال) la fertille بن جاتا ہے؛ le momignard (بچونگڑا) le momacque بن جاتا ہے؛ les fiques (بے کار آدمی) frusques بن جاتے ہیں؛ la chique (کلیسا) l'egrugeoir بن جاتا ہے؛ le colabre (گردن) le colas بن جاتی ہے۔شیطان پہلے gahisto تھا، le rabouin ہوا پھر the baker ہو گیا؛ مبلغ ratichon ہوتا ہے، پھر جنگلی سور (le sanglier) بن گیا۔خنجر le vingt-deux (بائیس) تھا، پھر le surin ہوا پھر le lingre؛ پولیس railles

تھی، پھر roussins پھر rousses ہوئی پھر marchands de lacets، اس کے بعد coquers ہوئی پھر cognes ہو گئی؛ تھانہ le taule، اس کے بعد Charlot, l'atigeur پھر le becquillard ہو گیا۔ سترھویں صدی میں لڑنا "ایک دوسرے کو snuff کرنا" کہلاتا تھا، انیسویں صدی میں "ایک دوسرے کا گلا چبانا" بن گیا ہے۔ بیس عدد ایسے جملے تھے جو دو انتہاؤں پر تھے۔ Cartouche کی بات Lacenaire کے لیے عبرانی رہی ہوگی۔ اس زبان کے سارے الفاظ جب ادا کیے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے ادا کرنے والے آپس میں لڑ رہے ہوں۔

پھر بھی، وقتاً فوقتاً اور اس قسم کی حرکت کے نتیجے میں قدیم عامی بولی ایک بار پھر ظہور کرتی ہے اور نئی بن جاتی ہے۔ اس کا صدر مقام وہیں ہوتا ہے جہاں یہ جھومتی لہراتی ہے۔ ٹیمپل نے سترھویں صدی کی عامی بولی محفوظ رکھی تھی؛ Bicetre جب قید خانہ تھا، Thunes کی عامی بولی کو بچا کر رکھتا تھا۔ وہاں آپ پرانے Thune والوں کے خاتمے[کی آوازیں] سن سکتے تھے۔ Boyanches-tu (bois-tu)[یعنی کیا تم شراب پیتے ہو؟]" بن گیا تھا، مگر دائمی حرکت ہمیشہ اس کا قانون رہی ہے۔

اگر فلسفی چند لمحوں کے لیے ہی، اس زبان کو جو مسلسل بھاپ بن کر اڑتی جا رہی ہے ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو وہ فنا کر دینے والے غور و فکر میں غرق ہو جاتا ہے۔ کوئی مطالعہ اصلاح کے معاملے میں زیادہ ذہن رسا نہیں ہوتا۔ عامی بولی میں ایک بھی استعارہ، ایک بھی تناسب نہیں ہوتا جس میں کوئی سبق نہ ہو۔ ان لوگوں کے نزدیک شکست دینے کا مطلب حیلہ کرنا ہوتا ہے؛ وہ ایک عارضے کو شکست دیتے ہیں؛ چال بازی ان کی قوت ہوتی ہے۔

ان کے نزدیک آدمی کا تصور ظلمت کے تصور سے الگ نہیں ہوتا۔ رات کو la sorgue کہتے ہیں؛ آدمی کو l'orgue۔ گویا، آدمی رات کا اخراج ہوتا ہے۔

انھوں نے سماج کو اس ماحول کی روشنی میں دیکھنے کی مشق شروع کر دی ہے جو انھیں مار ڈالتی ہے، ایک مہلک قوت کی طرح، اور وہ اپنی آزادی کی اس طرح بات کرتے ہیں جیسے لوگ اپنی صحت کے بارے میں بات کرتے ہیں۔[ان کے نزدیک]گرفتار انسان بیمار انسان ہوتا ہے، اور جو سزا پا جاتا ہے وہ مردہ آدمی ہوتا ہے۔

قیدی کے لیے ان چار دیواروں کے درمیان جن میں وہ مدفون[قید] ہوتا ہے سب سے خوف ناک مسئلہ ایک قسم کی برفانی پاکیزگی کا ہوتا ہے، اور وہ اپنی قید کے کمرے کو castus کہتا ہے۔ قبر جیسی اس جگہ میں، بیرون کی زندگی ہمیشہ اپنا متبسم پہلو پیش کرتی ہے۔ اس کے بیروں

میں لوہے [کی بیڑیاں] ہوتی ہیں؛ آپ شاید سمجھتے ہیں کہ جب وہ چلتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ اس کے پاؤں ہوتے ہیں جس پر وہ چل رہا ہے؟ جی نہیں؛ وہ سمجھتا ہے کہ پیروں سے رقص کیا جاتا ہے؛ لہٰذا، جب وہ اپنی بیڑیاں کاٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا سب سے پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ اب وہ رقص کر سکتا ہے، اور وہ آری کو bastringue (public-house ball) کہتا ہے — نام ایک مرکز ہوتا ہے، عمیق انجذاب ہوتا ہے — بدمعاش انسان کے دو سر ہوتے ہیں؛ ایک جو اس کے اعمال کو جواز بناتا ہے اور پوری زندگی اس کی رہنمائی کرتا ہے؛ دوسرا جو موت کے دن اس کے کاندھوں پر ہوتا ہے؛ اس سر کو، جو اسے جرم کا مشورہ دیتا ہے، وہ la sorbonne کہتا ہے، اور وہ سر جو تلافی کرتا ہے، اس کو la tronche کہتا ہے۔ جب کسی آدمی کے پاس جسم پر سوائے چیتھڑوں کے اور دل میں سوائے برائیوں کے کچھ نہیں رہ جاتا، جس کے باعث وہ اخلاقی اور مادی رسوائی کی دہری منزل پر پہنچ جاتا ہے blackguard کا لفظ ان دو قبولیتوں میں جس کو مخصوص کرتا ہے، تو وہ جرم کے لیے تیار ہو جاتا ہے؛ وہ رگڑ کر تیز کیے ہوئے چاقو کی طرح ہو جاتا ہے؛ اس کی دو دھاریں ہوتی ہیں — اس کی تکلیف اور اس کی عداوت؛ لہٰذا، عامی بولی اس سے blackguard نہیں کہتی، un reguise کہتی ہے۔ گیلیر کیا ہوتی ہیں؟ عذاب کی انگیٹھیاں، جہنم۔ مجرم خود کو لکڑیوں کا گٹھا کہتا ہے — اور بدمعاش اپنے قید خانے کو کیا نام دیتے ہیں؟ کالج۔ اس لفظ سے ایک پورا نظامِ اصلاح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

کیا قاری جاننا چاہتا ہے کہ گیلیر کے گانوں کی اکثریت، وہ رکاوٹیں جنھیں خاص قسم کے لغت میں lirlonfa کہتے ہیں، کہاں پیدا ہوئی ہیں؟

اس کو مندرجہ ذیل باتیں سننے دی جائیں:

پیرس میں Chatelet کے مقام پر ایک طویل سرداب تھی۔ یہ سرداب دریائے سین کی سطحِ آب سے آٹھ فٹ نیچے واقع تھی۔ اس میں نہ کھڑکیاں تھیں نہ ہوا دان، اس کا شگاف صرف ایک دروازہ تھا۔ اس میں آدمی داخل ہو سکتے تھے مگر ہوا داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی چھت پتھروں سے بنی تھی، دس انچ موٹی کیچڑ کی تہہ اس کا فرش تھا۔ پانی اُبلنے کی وجہ سے فرش میں جگہ جگہ شگاف پیدا ہو گئے تھے۔ فرش سے آٹھ فٹ اوپر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بہت بڑی شہتیر تھی جو اس زیرِ زمین کھدائی کی وجہ سے ایک طرف سے دوسری طرف ہو گئی تھی؛ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس شہتیر سے تین تین فٹ لمبی زنجیریں لٹکی تھیں، اور زنجیر کے آخر میں گردن کے لیے چھلے لگے تھے۔ اس تہہ خانے میں وہ آدمی بند کیے جاتے جنھیں گیلیر کی سزا دی جاتی تھی، اور وہ Toulon

روانگی تک اسی میں قید رہتے تھے۔انھیں اس شہتیر کے نیچے ٹھونس دیا جاتا تھا جہاں اندھیرے میں زنجیروں میں لٹکے طوق ان کے منتظر ہوتے تھے۔

بازووں کی طرح لٹکی زنجیروں میں لگے طوق بدقسمت لوگوں کو گردن سے پکڑ لیتے تھے۔ چوں کی زنجیر چھوٹی ہوتی تھی، گرفتار لیٹ نہیں سکتے تھے۔ اس غار میں وہ بے حرکت کھڑے رہتے تھے۔ اس اندھیرے میں، شہتیر کے نیچے، تقریباً لٹکے اپنی ڈبل روٹی، پانی کے جگ تک پہنچنے کے لیے سخت محنت پر مجبور، گھٹنوں سے نیچے تک کیچڑ میں لت پت، پنڈلی تک غلاظت بہتی ہوئی، مشقت کے باعث جانگھیں اور گھٹنے جواب دیتے ہوئے، زنجیروں سے چمٹے ہوتے تھے تاکہ کچھ آرام مل جائے، ایستادہ کیفیت کے سوا وہ سو نہیں سکتے تھے، ہر لمحے طوق سے دم گھٹنے سے جاگ جاتے تھے؛ کچھ ہمیشہ کے لیے سوئے رہ جاتے تھے۔ کھانے کے لیے دی جانے والی ڈبل روٹیاں کیچڑ پر پھینک دی جاتی تھی، انھیں بمشکل ہاتھ تک پہنچانے کے لیے ایڑیوں اور پیروں کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔

اس حال میں انھیں کب تک رہنا پڑتا تھا؟ ایک مہینہ، دو مہینے، چھ مہینے؛ کبھی پورا سال گزر جاتا تھا۔ یہ جگہ کیلیو کی ڈیوڑھی کی مثال تھی۔ بادشاہ کے خرگوش پکڑنے کی پاداش میں اس میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس مقبرے جیسے جہنم میں یہ لوگ کیا کرتے تھے؟ وہی جو آدمی گور میں کرتے ہیں، موت کی اذیت سے گزرتے تھے؛ جہنم میں کیا کرتے ہیں، گانا گاتے تھے؛ کہ جہاں کوئی امید نہیں ہوتی وہاں گیت ہی لہراتے ہیں۔ مالٹا کے پانیوں میں، جب کوئی گیلی [چپو بردار بحری جہاز] داخل ہونے لگتا تھا تو کشتی رانی کی آوازوں سے پہلے کے گیت سنائی دینے لگتے تھے۔ بے چارے Survincent، خرگوش پکڑنے والے نے، جو Chatelet کی قید سے گزر چکا تھا، کہا تھا: وہ گیت ہی تھے جنھوں نے مجھے زندہ رکھا تھا" ورنہ شاعری میں کیا رکھا ہے؟

اس قید خانے میں عامی بولی کے تقریباً تمام گیت وجود میں آئے تھے۔ وہ پیرس کے عظیم Chatelet کا قید خانہ تھا جہاں سے منٹگمری نامی گیلی کے غم زدہ گیت کا ٹیپ کا مصرع تھا:

Timaloumisaine, timaloumison.

یہی ہے وہ تھیٹر!

یہی ہے وہ پیکاں چلانے کے ماہر (کیوپڈ) کا تھیٹر!

آپ کچھ بھی کر لیجیے انسان کے دل کی ابدی یادگار محبت کو مٹا نہیں سکتے۔

تیرہ کاری کی اس دنیا میں لوگ اپنے راز چھپا رکھتے ہیں۔ راز دوسرے تمام کاموں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ان بدنصیب افراد کی نظروں میں وحدانیت کی، یکجائی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ کسی

راز سے غداری کرنا اس آتش مزاج کمیونٹی کی شخصیت سے کچھ چھین لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ عامی بولی کے لہجے میں اس کے خلاف خبر رسانی کو to eat the bit کہتے ہیں۔ گویا، خبر رساں اپنی پرورش کی خاطر سب کے گوشت پوست میں سے تھوڑا تھوڑا اپنے لیے نکال لیتا ہے۔

To receive a box on the ear سے کیا واضح ہوتا ہے؟ عام استعارہ جواب میں کہتا ہے: ''اس کا مطلب چھتیس موم بتیاں دیکھنا'' ہوتا ہے۔

یہاں عامی بولی مداخلت کرتی ہے کہتی ہے: موم بتی، camoufle کا مترادف ہوتا ہے۔ اس طرح استعارے کی مدد سے نیچے سے اوپر ایک قسم کی مداخلت ہوتی ہے، اور عامی بولی غار سے بڑھ کر اکیڈمی تک پہنچ جاتی ہے؛ اور Poulailler کہنے لگتا ہے "I light my camoufle," اور جو والٹیر سے "Langleviel La Beaumelle deserves a hundred camouflets." لکھواتا ہے۔

عامی بولی میں تحقیقات کا مطلب ہر قدم پر دریافتیں ہوتا ہے۔ اس حیرت انگیز محاورے کا مطالعہ اور تفتیش ہمیں عام سماج کے ساتھ سماج کے اس پُر اسرار نقطۂ انقطاع پر لے جاتا ہے جو راندۂ درگاہ ہوتا ہے۔

چور کے پاس بھی اس کی بندوق کے لیے گولی، چوری کے قابل شے، ہوتی ہے جو تم، ہم، میں سے کوئی فراہم کر دیتا ہے، le pantre (Pan, everybody)۔

عامی بولی سزا یافتہ زبان ہوتی ہے۔

آدمی کی سوچ کے طور طریقے کو دبایا جا سکتا ہے، اسے ہلاکت کے ظالمانہ جبر کے ذریعے گھسیٹا جا سکتا ہے، اور کون جانے اسے قعر میں کن طوق وسلاسل میں گرفتار کیا جا سکتا ہے؛ خوف پیدا کرنے کے لیے یہی کافی ہوتا ہے۔

اُف، ارے بدبختی کی بدنصیبیاں!

افسوس! کیا اس اندھیرے میں کوئی روحِ انسانی کی مدد کو نہیں آ سکے گا؟ کیا اس کا یہی مقدر ہے کہ اسے ہمیشہ انتظار کرنا پڑے گا دماغ کا، آزادی دلانے والے کا، Pegasi اور hippo-griffs پر سواری کرنے والے عظیم شہسوار کا، سویرے سے لڑنے والے مستقبل کے نورافشاں بہادر کا جو دوشیزوں کے درمیان آسمان سے اترے گا؟ کیا وہ ہمیشہ اپنی مدد کے لیے آدرش کی روشنی کے نیزے کو بے کار ہی طلب کرے گی؟ کیا اسے مقدر کی خلیج کی کثافت کے ذریعے شیطنت کی خوف ناک آمد کی آواز سننے جھلک دیکھنے، اسے اژدھے نما سر کے نیچے کے

بھیا نک پانی ، اور اس جھاگ بھرے معدے ، اور پہلو بدلتے ہوئے پنجوں کی سوجن اور شکنوں کے دیکھنے کی سزا دی گئی ہے؟ کیا اسے روشنی کی کرن کے بغیر، امید کے بغیر اس خوف ناک راستے پر رہنا لازمی ہوگا، جس پر اس عفریت کی بو ہے، تھرتھراتی، بکھرے بالوں کے ساتھ، ملتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ، وہ رات کی چٹان سے ہمیشہ کے لیے بندھی ہے گی، پرچھائیوں کے درمیان گوری، برہنہ اور اداس [اسطوری شہزادی] Andromeda کی طرح!

❋

روتی ہنستی عامی بولی

جیسا کہ قاری نے تصور کیا ہے، اس زمانے کی عامی بولی میں حیثیت بالکل چار سو برس قبل کی عامی بولی کی طرح ہے، جس میں وہ اندھیرے اور علامتی جذبے سرایت کر گئے ہیں جو تمام لفظوں کو ایک انداز فراہم کرتے ہیں، اب جو غمگین ہیں، پریشان کن ہیں۔ آپ کو اس میں Court of Miracles کے ان خانہ بدوشوں کی وحشیانہ اور قدیم افسردگی بھی محسوس ہوگی جو اپنے اپنے تاش کے پتوں سے کھیل کھیلتے تھے، جن میں سے کچھ ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر پھول کا اکا ایک بڑے بھاری درخت کی نمائندگی کرتا تھا جس کی آٹھ بڑی بڑی شش پہلو پتیاں تھیں، جو کسی جنگل کی ایک قسم کی خیالی تجسیم تھی۔ اس درخت کے نیچے، تنے کے قریب، آگ جل رہی تھی جس پر تین خرگوش سلاخ پر لگے ایک شکاری کو بھون رہے تھے، اور اس کے پیچھے ایک اور الاؤ تھا جس پر ایک پتیلا لٹک رہا تھا جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی، جس میں کتے کا سر دکھائی دیتا تھا۔ تاش کے پتوں پر پینٹ کی ہوئی بدلہ لینے کی اس بھیانک تصویر سے زیادہ خوف ناک کوئی شے نہیں ہو سکتی تھی، جس میں اسمگلروں کو آگ پر بھونے جانے کے لیے لکڑی کی نوکیلی میخیں تھیں اور جعل سازی کرنے والوں کے ابالے جانے کے لیے پتیلا دکھایا گیا تھا۔ عامی بولی کی حدود میں اس طرح کے مختلف قسم کے قیاس کردہ پیکر، گانے، ظرافت، حتیٰ کہ دھمکاوا بھی تھا اور سب کو اس بے اختیار اور رنجیدہ کردار میں شریک کر دیا گیا تھا۔ سارے گانے، سارے نغمے جن میں سے کچھ جمع کیے گئے تھے، اتنے فروتن اور قابل فریاد تھے کہ انھیں دیکھ کر آنسو نکلے پڑتے تھے۔ ایسی خفیہ دنیا ہمیشہ خراب دنیا ہوتی ہے، اس میں چھپنے کی جگہ ہمیشہ خرگوش، بھگوڑا چوہا، اڑتی چڑیا ہی ہوتی ہے۔ یہ دنیا شکایت نہیں کرتی، ٹھنڈی آہیں بھرنے پر قناعت کرتی ہے؛ اس کی کراہوں

میں سے ایک کراہ ہم تک پہنچ گئی ہے: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا، جو انسانوں کا باپ ہے، کس طرح اپنے بچوں، اپنے پوتوں پر اس طرح [معاذ اللہ] ظلم کر سکتا ہے اور ان کو روتے چیختے سن سکتا ہے، جب کہ خود اس نے ایسے دکھ نہیں سہے ہوں گے۔" ایک بدنصیب شخص، جب بھی اسے غور کرنے کا وقت میسر ہوتا ہے، کم تر کے سامنے خود جھک جاتا ہے اور سماج کے سامنے خود کو ناتواں پیش کرتا ہے، منہ کے بل لیٹ جاتا ہے، التجا کرتا ہے، رحم سے اپیل کرتا ہے؛ ہمارا خیال ہے کہ اسے اپنے جرم کا احساس ہو جاتا ہے۔

پچھلی صدی کے درمیانی عرصے میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ قید خانے کے گانے، اور چوروں کے ritournelles [موسیقی کے کورس] نے گستاخ اور زندہ دل انداز اختیار کر لیا تھا۔ [گویا] ایک غم انگیز مرد حزن کی جگہ لا روانے لے لی تھی۔ اٹھارہویں صدی کی تمام گیلیز اور قید خانوں کے گیتوں میں ایک شیطانی اور رمز آمیز بے فکری ملتی ہے۔ ہمیں تیکھی آواز اور ترنم سے احتراز بھی دکھائی دیتا ہے، ہمارے خیال میں جسے ایک نہایت روشن کرن نے ابھارا ہے اور جسے، ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے بانسری بجاتے اور مندرجہ ذیل مصرعے گاتے ہوئے آگیا بیتال (غول بیابانی) نے جنگل میں پھینک دیا ہے۔

Miralabi suslababo
Mirliton ribonribette
Surlababi mirlababo
Mirliton ribonribo.

یہ کسی قید خانے یا جنگل کے کسی کونے میں اس وقت گائے گئے تھے جب کسی آدمی کا گلا کاٹا جا رہا تھا۔

ایک اور نہایت خراب علامت: اٹھارہویں صدی میں، ملول طبقات کی قدیم افسردگی غائب ہو گئی تھی۔ انھوں نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ وہ عظیم meg اور عظیم dab کے ساتھ ہو لیے تھے۔ فرانس کے بادشاہ لوئی پانزدہم کو [مغل شہنشاہ، شاہ عالم — از دلی تا پالم کی طرح] Pantin کا مارکوئی کہنے لگے تھے۔ [Pantin پیرس کا ایک مضافاتی قصبہ ہے جو اُس دور میں آبادی کے لحاظ سے یورپ کا سب سے گنجان علاقہ سمجھا جاتا تھا]۔ اور دیکھیے، وہ خاصے خوش نظر آتے ہیں۔ ان بدنصیبوں سے ایک قسم کی کرن نکل رہی ہے، گویا ان کے ضمیر پر زیادہ بوجھ نہیں ہے۔ ظلمات کے ان محزوں قبائل میں محض عمل کرنے کی ناامیدی ہی نہیں ان میں ذہنی لاپروائی کی جرأت بھی آ گئی ہے۔ یہ اشارہ ہوتا ہے اس امر کا کہ انھیں اپنی معصیت کا احساس بھی نہیں رہا، اور

وہ سمجھ رہے ہیں کہ مفکرین اور خیالی لوگوں میں بھی ان کے لیے کچھ غیر معین قسم کا سہارا پیدا ہو گیا ہے جس سے وہ خود بھی واقف نہیں۔ یہ اشارہ تھا، کہ نظریات اور سوفسطائیت میں چوری اور لوٹ مار کی شمولیت شروع ہو گئی ہے، اس انداز میں کہ ان کی کراہت میں کمی واقع ہونے لگی ہے اور اس دوران نظریات اور سوفسطائیت سے ان کے روابط جاری ہیں۔ مختصر یہ کہ، یہ اشارہ ہے کسی شورش کا جو شروع والی ہے، اگر اس کا رُخ موڑا نہیں گیا۔

اب ہم ایک لمحے کی لیے توقف کریں گے، مگر ہم الزام کسے دے رہے ہیں؟ اٹھارہویں صدی کو؟ فلسفے کو؟ ہرگز نہیں! اٹھارہویں صدی میں کیا جانے والا کام صحت مند ہے، اچھا ہے اور خوش گوار ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کا ماہر ڈڈیرو (Diderot) ان کا سربراہ ہے؛ حیاتیات کا ماہر ٹرگو (Turgot) ان کا سربراہ ہے؛ فلسفی والٹیئر ان کا سربراہ ہے؛ یوٹوپیائی روسو ان کا سربراہ ہے— یہ چار مقدس لشکر ہیں۔ انسانیت کی روشنی کی طرف بے پناہ ترقی ان ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ نسلِ انسانی کے چار ہراول دستے ہیں جو ترقی کے عظیم نکتوں کی طرح ہیں۔ ڈڈیرو خوب صورت کی طرف ہے، ٹرگو مفید کی طرف، والٹیئر سچ کی طرف، روسو انصاف کی طرف ہے۔ مگر ان فلسفیوں کے شانہ بہ شانہ، صحت مند نشوونما میں ملے جلے زہریلے نباتات کی طرح، سوفسطائی بھی تھے، اسی طرح جیسے اچھوتے جنگل میں ہلاک ہوتے ہیں۔ ایک جانب جلاد court-house کے شاہانہ زینے پر صدی کے آزادی دہندگان کی کتابیں نذرِ آتش کر رہے تھے، دوسری جانب وہ ادیب جو اب بھلا دیے گئے ہیں، شاہ کی اجازت سے نہ جانے کیسی حیرت انگیز بے ترتیبی پیدا کرنے والی تحریریں شائع کر رہے تھے، بد قسمت لوگ جسے شوق سے پڑھتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ان میں سے کچھ مطبوعات، ایک شہزادہ جن کی سرپرستی کر رہا تھا، خفیہ کتب خانوں میں پائی جاتی تھیں۔ یہ حقائق جو معنی خیز مگر نادیدہ تھے، سطحی طور پر ناقابلِ تصور تھے۔ کبھی کبھی کسی حقیقت کی تاریکی میں پوشیدہ کوئی خطرہ تاک میں رہتا ہے۔ تاریک اس لیے کہ یہ خفیہ ہوتا ہے۔ ان سب لکھنے والوں میں شاید ایک ہی تھا Restif de La Bretonne، تھا جس نے عوام کی غیر صحت مندانہ حرکات کو افشا کیا تھا۔

اس کام نے جو مخصوص تھا پورے یورپ کے لیے، اور جگہوں کے مقابلے میں جرمنی میں نیا دہ تباہی مچائی تھی۔ جرمنی میں ایک عرصے کے دوران Schiller کے مطابق اس کے مشہور کھیل The Robbers کی وجہ سے چوری اور لوٹ مار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کھیل میں کچھ مخصوص قسم کے نتائج اور غلط خیالات ملا دیے گئے تھے، حقیقت میں جو اگر چہ نا معقول تھے، اور

بعد میں خود بخود غائب ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد یہ کھیل نئے خلاصے، نئے نام، نئے نظریات سے محنت کشوں، دکھی اور ایمان دار عوام کے لیے پیش کیا گیا، جن کا ان نا تجربے کار کیمیا گروں کو بھی علم نہ تھا جنھوں نے اسے تیار کیا تھا نہ ان عوام کو جنھوں نے اس کو قبول کیا تھا۔ جب بھی اس قسم کے حقائق سامنے آتے ہیں تو مسئلہ گمبھیر ہو جاتا ہے۔ دُکھ غیظ وغضب پیدا کرتا ہے؛ اور جب با مراد طبقات اس سے چشم پوشی کر لیتے ہیں یا سو جاتے ہیں، جو جان بوجھ کر آنکھ موند لینے کے مترادف ہوتا ہے، تو بد قسمت طبقات کی نفرتیں کسی رنج یا نا مناسب طریقے سے بنائے جذبے پر اپنی نارچ روشن کر لیتی ہیں جو کسی کونے میں خواب دیکھتا ہے اور خود کو سماج کی پڑتال کرنے پر مامور کر لیتا ہے۔ نفرت کی جانچ پڑتال بڑی خوف ناک ہوتی ہے۔

چناں چہ اگر، زمانے کی بدقسمتی یہی چاہتی ہے تو، وہ اندیشہ ناک ہلچل جو پہلے کسانوں کی شورش کہلاتی تھی، جس کے نزدیک خالص سیاسی مناقشے بچوں کا کھیل ہوتے ہیں، جو اَب ستم سہنے اور ستم کرنے والوں کے درمیان تنازعہ نہیں رہی، آرام کے خلاف بے چینی کی بغاوت بن جاتی ہے۔ تب ہر شے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

کسانوں کی شورشیں عوام کا زلزلہ کہلاتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک، غالباً یہی اندیشہ تھا، سچائی کے جس عظیم عمل کو انقلابِ فرانس نے روک دیا تھا۔ انقلابِ فرانس جو تلوار سے مسلح خیال کے سوا کچھ نہ تھا، اٹھا، اور ویسی ہی بے ربط حرکت نے خرابی کے دروازے کو بند، اور بھلائی کے دروازے کو وا کر دیا تھا۔ اس نے اذیت کو روک دیا، سچائی کا اعلان کیا، سڑاند کو دور کیا، صدی کو صحت مند کیا، عوام کو سرفراز کیا تھا۔

اس بارے میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے دوسری قسم کی، اور صحیح روح دے کر انسان کی دوبارہ تخلیق کی تھی۔

انیسویں صدی کو یہ وراثت ملی اور اس کام سے فائدہ بھی ہوا تھا، اور جس سماجی تباہی کے بارے میں حال ہی میں اشارے کیے گئے تھے، آج نا ممکن ہے۔ اندھا ہے وہ جو اس کا اعلان کرتا ہے۔ احمق ہے وہ اس سے خوف زدہ ہے۔ انقلاب کسانوں کی شورش کے لیے حفاظتی ٹیکا ہے۔

یہ انقلاب ہی کا فیض ہے کہ سماجی حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ جاگیر دارانہ اور شاہی بیماریاں اب ہمارے خون میں نہیں دوڑتیں۔ ہمارے آئین میں اب قرونِ وسطیٰ جیسی کوئی شے نہیں۔ ہم اس دور میں نہیں جی رہے ہیں جس میں ڈراؤنے ہجوم ہمارے اندرون میں خلل ڈالتے تھے، جب لوگوں کو ان کے پیروں کے نیچے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی، جب تہذیب کی سطح پر کودموش کی

بنائی ہوئی ناقابلِ بیان سرنگیں سر ابھارتی تھیں، جہاں زمین میں شگاف پڑ جاتے تھے، جہاں عماروں کی چھتیں جمائیاں لیتی تھیں اور جہاں آپ کو اچانک زمین سے عفریتی سر ابھرتے دکھائی دیتے تھے۔

انقلابی حس ایک اخلاقی حس ہوتی ہے۔ ایک بار حق کا احساس پیدا ہو جائے تو فرض کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ آزادی کا قانون سب کے لیے ہے، جو اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب دوسروں کی آزادی شروع ہوتی ہے اور Robespierre کے مطابق یہ قابلِ تعریف صفت ہوتی ہے۔ '89 کے بعد سے سارے عوام پھیل کر ایک ارفع فرد بن گئے ہیں؛ اب کوئی مفلس آدمی نہیں جسے حق رکھتے ہوئے بھی اپنے حصے کی سورج کی روشنی نہیں ملتی؛ بھوک کی موت مرنے والا بھی اپنے اندرون میں فرانس کی ایمان داری محسوس کرتا ہے؛ باشندے کا وقار اندرونی زرہ بکتر ہوتا ہے؛ وہ جو آزاد ہے محتاط ہوتا ہے؛ وہ جو ووٹ دیتا ہے حکومت کرتا ہے؛ چناں چہ غیر صحت مند ہوائے نفس ساقط ہو گئی ہے؛ چناں چہ آنکھیں ترغیبات کے آگے بہادری سے نیچی ہو گئی ہیں۔ انقلابی خوش اسلوبی ایسی ہوتی ہے کہ 14 جولائی کے یومِ نجات میں، 10 اگست کے یومِ نجات میں عوام کا ایک بھی آدمی نظر نہیں آتا۔ روشن خیال اور بڑھتے ہوئے ہجوم کا پہلا مطالبہ ہوتا ہے: چور مردہ باد! ترقی ایمان دار آدمی ہوتی ہے؛ آدرش اور مطلق ایک دوسرے کے رومال نہیں چراتے۔ کون تھے وہ جنھوں نے 1848 میں Tuileries کی [قدیم فرانس کے شاہی محلات] مال و دولت سے بھری مال بردار گاڑیوں کی حفاظت کی تھی؟ Saint-Antoine کے کوڑے چننے والوں نے چیتھڑوں کے ڈھیر نے حفاظت کی تھی۔ اخلاقی نیکی نے یہ Marvel Comics]tatterdemalions چیتھڑوں میں ملبوس کردار] فراہم کیے تھے۔ ان مال بردار گاڑیوں میں صندوق تھے جو بند نہیں کیے گئے تھے، کچھ ادھ کھلے تھے، جن میں چاندی سونے کے چم چم کرتے ہزاروں ڈبوں کے درمیان ایک ڈبے میں، ہیرے جواہرات سے مزین، قائم مقام بادشاہ کے ہیرے اور شاہی کے پھوڑوں سے بھرا، فرانس کا قدیم تاج تھا جو تقریباً تیس ملین قیمت کا تھا۔ ننگے پیروں نے تاج کی حفاظت کی تھی۔

چناں چہ کسانوں کی شورش نہ تھی۔ میں ہنر مندوں کی جانب سے افسوس کا اظہار کرتا ہوں۔ پرانے خوف نے اس علاقے میں اپنے آخری اثرات ثبت کر دیے تھے؛ آئندہ کے لیے اس کا استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ عفریتِ سُرخ کی سب سے اہم اسپرنگ ٹوٹ گئی تھی۔ ہر ایک اب اسے پہچان گیا ہے۔ پرندوں کو ڈرانے والے پتلے سے اب کوئی نہیں ڈرتا۔ پرندے [کھیت میں ایستادہ] انسانی پتلے سے کھلواڑ کرتے ہیں، ناپاک مخلوقات اس پر سواری کرتی ہیں، بورژوا اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

۞

نگہبانی اور اُمید

اگر یوں ہے، تو کیا سماجی خطرہ ٹال دیا گیا ہے؟ ہرگز نہیں!

اب کمیون کی شورش نہیں ہے؛ سماج کو اطمینان رکھنا چاہیے؛ اب اس کے سر میں دورانِ خون نہیں بڑھے گا۔ سماج کو اس پر اس طرح توجہ دینی چاہیے جس میں وہ سانس لیتی ہے۔ اس مرگی سے ڈرنا نہیں چاہیے، مگر تپِ دق کا عارضہ تو ہوگا۔ سماجی تپِ دق بدنصیبی کہلاتا ہے۔

انسان جڑ کاٹنے سے بھی اسی طرح تباہ ہو سکتا جیسے کہ برقِ آسمانی سے۔

ہمیں تھکنا نہیں چاہیے کسی بات یا کسی عمل کو دہرانے سے، اور دردمند نفوس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ آبائی فرائض میں پہلا فرض ہے، اور خودغرض دلوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ سیاسی ضروریات میں پہلا فریضہ ہوتا ہے وراثت سے محروم، اور آزردہ ہجوم کے بارے میں سوچنا، دل جوئی کرنا، واقعات کو بیان کرنا، معلومات فراہم کرنا، ان سے محبت کرنا، ان کے آفاق کو شان و شوکت کی حد تک وسیع کرنا، ان کو ہر قسم کی وافر تعلیم فراہم کرنا، ان کو محنت کی مثال پیش کرنا، کاہلی کی مثال ہرگز نہیں، انفرادی بوجھ کو آفاقی مقصد کے خیال سے وسیع کرنا، دولت کی حد معین کیے بغیر مفلسی کی حد معین کرنا، ہر دل عزیز سرگرمیوں کے لیے وسعت پیدا کرنا، Briareus [یونانی اساطیر کی سو ہاتھوں والی مخلوق] کی طرح کم زور اور مظلوم کی لیے ہر سمت سیکڑوں بازو پھیلانا، اجتماعی قوت کو استعمال کرنے کے لیے ہر قسم کے کارخانے کھولنا، ہر صلاحیت اور ہر سطح کی ذہانت کے لیے اسکول اور تجربہ گاہیں قائم کرنا، تنخواہیں بڑھانا، مصیبتیں کم کرنا، "ہے" اور "ہونے" کی درمیان توازن پیدا کرنا، یعنی، کوشش کرنے کی مسرت اور ضرورت کے لیے افراط میں تناسب پیدا کرنا؛ سماجی آلات سے زیادہ ہلکے اور زیادہ آرام دہ فوائد پیدا کرنا، ان کے لیے جو دُکھی ہوتے ہیں اور وہ جو جاہل ہوتے ہیں۔

اور، یہ کہنے کی بھی اجازت دیجیے کہ یہ ابتدا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے: محنت حق ہوئے بغیر قانون نہیں بن سکتی۔

ہم اس نکتے پر اصرار نہیں کریں گے: اس کے لیے یہ مناسب جگہ نہیں۔

اگر فطرت خود کو عاقبت اندیش کہتی ہے تو سماج اپنے آپ کو دوراندیش کہے گا۔

عقلی اور اخلاقی نشوونما مادی ترقی سے کم ناگزیر نہیں۔ جاننا تبرک ہوتا ہے، سوچنا ضرورت ہوتی ہے، سچائی غذا بھی ہوتی ہے اور اناج بھی۔ منطق سائنس اور دانش سے دور رہے تو کمزور ہو جاتی ہے۔ آیئے، ذرا معدوں اور دماغوں کے بارے میں ایک جیسی شکایات پر غور کرتے ہیں جو کھاتے نہیں ہیں۔ روٹی کی غیر موجودگی میں اگر کوئی شے ہے جو جسم کی تباہی کے معاملے میں زیادہ دل شکن ہوتی ہے، تو وہ روح ہوتی ہے جو روشنی کے لیے بھوک سے مرتی ہے۔

ترقی کا میلان حل کی رہنمائی کی جانب ہوتا ہے۔ کسی دن ہم یہ سب کچھ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ جیسے جیسے نسلِ انسانی بلند ہوتی ہے، فطری طور پر پریشانی کی عمیق تہیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ سطح کی معمولی سی بلندی سے بد نصیبی نیست و نابود جائے گی۔

اگر ہم نے اس مبارک تکمیل پر شبہ کیا تو ہم غلطی پر ہوں گے۔

ماضی بہت طاقت ور ہے، اس لمحے یہی سچ ہے۔ یہ ہمیں ٹوکتا ہے۔ کسی لاش کی حیات نو حیرت انگیز ہوتی ہے۔ دیکھو، یہ چل رہی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ فاتح محسوس ہو رہی ہے! یہ مردہ جسم فاتح ہے۔ یہ آ رہا ہے اپنے لشکروں کے ساتھ، توہمات کے ساتھ، اپنی تلوار کے ساتھ، اپنی ظالمانہ حکمرانی کے ساتھ، اپنے پرچم کے ساتھ، جہالت کے ساتھ؛ کچھ عرصہ قبل اس نے دس جنگیں جیتی ہیں۔ یہ پیش قدمی کرتا ہے، دھمکاتا ہے، اور ہمارے دروازے پر موجود ہے۔ اپنی جانب، ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

آیئے، ہم اس میدان کو فروخت کر دیتے ہیں جس میں وحشی بال خیمہ زن ہے۔

ہو جو ایمان پہ قائم اسے ڈر کس بات کا ہے؟

خیالات کی ندی کے اُلٹے بہنے جیسی بات کا وجود نہیں، بس ندی اپنے راستے پر واپس آجاتی ہے۔

وہ جو مستقبل کے خواہاں نہیں ہوتے، انھیں اس معاملے پر غور کرنے دیجیے۔ جب وہ ترقی کے لیے "نہیں" کہتے ہیں تو وہ مستقبل کو نہیں اپنے آپ کو مطعون کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو افسردگی کا عارضہ لگاتے ہیں؛ وہ اپنے آپ کو ماضی کا ٹیکا لگاتے ہیں۔ آنے والے کل کو رد کرنے کا

ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے موت۔ جسم کی موت دیر سے ہو سکتی ہے مگر روح کو موت نہیں، ہرگز نہیں — ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔

جی ہاں، معما خود اپنا لفظ ادا کرے گا، ابولہول بولے گا، مسئلہ حل ہو جائے گا۔

جی ہاں، وہ جنھوں نے اٹھارہویں صدی کا خاکہ تیار کیا ہے، انیسویں صدی تک ختم ہو جائیں گے۔ وہ جو اس پر شبہ کرتا ہے احمق ہے۔ مستقبل کی نمود، آفاقی بہبود کی بڑھتی ہوئی نمود بھی وہ ربانی عجوبہ ہے جس سے مفر نہیں۔

بڑی بڑی متحدہ تحریکیں انسانی معاملات کی رہنمائی کرتی ہیں اور وقتِ مقررہ میں ان کو منطق اور مساوات کی کیفیت میں لے جاتی ہیں جسے منصفانہ کہا جاتا ہے۔ زمین اور آسمان سے بنی طاقت، جو انسانیت کے نتیجے میں مخفی ہے اس پر حکومت کرتی ہے؛ یہ طاقت معجزے کرتی ہے؛ زمانے کی غیر معمولی گردشوں کے مقابلے میں تعجب خیز مسائل زیادہ مشکل نہیں ہوا کرتے۔ سائنس کی معاونت سے جو ایک آدمی کی طرف سے آتی ہے، اور واقعے سے جو دوسرے کی طرف سے آتا ہے، اس کو مسائل کے رویوں کے ان تضادات پر زیادہ تشویش نہیں ہوتی جو عامیانہ غول کے لیے ناممکنات معلوم ہوتی ہیں۔ حقائق کی موافقت سے سبق لینے کے مقابلے میں خیالات سے صلح کرنے اور ان سے حل پیدا کرنے میں یہ کم ہنر مند نہیں، اور ہم ترقی کی اس پُر اسرار قوت سے کس بات کی توقع رکھ سکتے ہیں، جو ایک دن مشرق و مغرب دونوں کو رو بہ رو لے آئی ہے، قبر کی گہرائیوں میں، اور عظیم اہرام کے اندرون میں اس نے اماموں کی بوناپارٹ سے گفتگو کرائی ہے۔

اس دوران دماغوں کے پُر شکوہ سفر میں نہ پس و پیش ہو نہ کوئی رکاوٹ۔ سماجی فلسفہ بنیادی طور پر سائنس اور امن پر مشتمل ہوتا ہے۔ دشمنیوں کے مطالعے سے اس کے غیظ و غضب کو ختم کر دینا اس کا مقصد ہوتا ہے، اور یہی اس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ یہ جانچتا ہے، چھان بین کرتا ہے، تجزیہ کرتا ہے؛ تب ہر قسم کی نفرت کو رد کرتے، کم کرتے ہوئے ان کو ایک بار پھر یک جا کر دیتا ہے۔

ہم نے کئی بار دیکھا ہے کہ سماج نے بنی نوعِ انسان پر نازل کی جانے والی تیز ہوا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ تاریخ قوموں اور سلطنتوں کے تباہ شدہ جہازوں سے بھری پڑی ہے؛ اور کسی خوب صورت دن وہ نادیدہ قوت، جسے طوفان کہتے ہیں، گزرتا ہے اور رویوں، رسوم، قوانین، مذاہب سب کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یکے بعد دیگرے ہندوستان کی، بابل کی، فارس کی، شام کی، مصر کی تہذیبیں غائب ہو گئی ہیں۔ کیوں؟ ہم نہیں جانتے۔ ان تباہیوں کی وجوہ کیا ہیں؟ ہم نہیں جانتے۔ کیا یہ سماج بچائے جا سکتے تھے؟ ان کی غلطی کیا تھی؟ کیا وہ ان مہلک برائیوں پر مصر تھے

جنھوں نے ان کو تباہ کردیا تھا؟ قوم اور نسل کی ان خوف ناک اموات میں خودکشی کی تعداد کیا تھی؟ان سوالات کے جواب نہیں ملتے۔سزا یافتہ تہذیبوں کو ظلمت میں ڈھانپ لیا کرتی ہیں۔ان میں رساؤ پیدا ہوگیا تھا،اس کے بعد وہ غرق ہوگئیں۔ہم اس سے زیادہ کچھ کہہ نہیں سکتے؛ اور سمندر کی تہہ میں جسے ماضی کہا جاتا ہے، ان پہاڑ جیسی لہروں کے عقب میں، مہیب جہازوں کے تباہ شدہ ڈھانچوں میں،بابل، نینوا، ترسوس، Thebes، روما کو، اور نیچے چلنے والی خوف ناک ہوا کے جھکڑوں کو جو پرچھائیوں کے دہانوں سے نکلتی ہیں، ہم خوف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔مگر ان میں پرچھائیاں ہوتی ہیں، روشنی یہاں ہوتی ہے۔ہم ان قدیم تہذیبوں کے آزار سے واقف نہیں،ہمیں اپنی کم زوریوں کا بھی علم نہیں۔ ہرجگہ ان پر روشنی ڈالنا ہمارا حق ہے، ہم ان کے حسن کا تصور کرتے ہیں، ہم ان کی خامیوں کو برہنہ کردیتے ہیں۔جہاں بیماری ہو، ہم تحقیق کرتے ہیں: اور ایک بار بیماری کی تشخیص ہو جائے تو اس کی وجہ کا مطالعہ علاج کا تعین کرتا ہے۔ہماری تہذیب، میں صدیوں کی محنت، اس کا قانون ہے، اس کا معجزہ ہے۔اس کا تحفظ بے کار نہیں جاتا۔یہ بچائی جائے گی۔اس کی تشفی ضروری ہوتی ہے؛ اس کی بصیرت ایک اور نکتہ ہے۔سماجی فلسفوں کی تمام محنتوں کو اس نکتے پر مائل ہونا چاہیے۔آج کے مدبر کا سب سے بڑا فرض اس تہذیب کے دل کی دھڑکن کو سننا ہے۔

مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ ان دھڑکنوں کی آواز ہماری حوصلہ افزائی کرتی ہے؛ اس حوصلہ افزائی پر اصرار ہی وہ عمل ہے جس کے نتائج ہم ان صفحات پر پیش کرنا چاہتے ہیں، ایک غم انگیز ڈرامے کا چھوٹا سا وقفہ۔سماجی اخلاقیات کے نیچے ہمیں انسان کی دائمیت محسوس ہوتی ہے۔کرۂ ارض برباد نہیں ہوتا اس لیے اس میں، یہاں وہاں زخم ہیں، جوالامکھی گڑھے ہیں، گندھک کی کانیں ہیں، آتش فشاں کے سبب جو اپنی پیپ خارج کردیتا ہے۔عوام کے آزار آدمی کو مارتے نہیں۔

پھر بھی، جو کوئی سماجی شفا خانوں کے طریقوں پر نظر رکھتا ہے کبھی کبھی اپنا سر ہلا دیتا ہے۔سب سے زیادہ طاقت ور، سب سے زیادہ نرم دل، سب سے زیادہ منطقی بھی کبھی کبھی کم زور ہو جایا کرتے ہیں۔

کیا مستقبل آئے گا؟ جب بھی ہمیں یہ بھیانک اندھیرا دکھائی دیتا ہے،ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم اب یہ سوال اٹھانے والے ہیں۔ کہ غم زدہ خودغرض اور بدنصیب آمنے سامنے آگئے ہیں۔خودغرضی کی جانب تعصبات ہیں، مہنگی تعلیم کے سایے ہیں، نشے کے ذریعے بھوک میں اضافہ ہے، خوش حالی کی کم ظرفی ہے جو احمق بنا دیتی ہے، دکھ اٹھانے کا خوف ہے جو دکھ سے نفرت تک لے جاتا ہے، سنگ دل تسکین ہے جو 'میں' کو اتنا بڑھا دیتی ہے کہ وہ نفس پر قدغن لگا

دیتی ہے؛ بدنصیب کی جانب ہوس ناکی ہے، رشک ہے، دوسروں کی خوشی سے نفرت ہے، انسان کے اندروں کے حیوان کی دھڑکن سے اپنی خواہشات کو تسلی دینا ہے، دھند بھرے دل ہیں، افسردگی ہے، ضرورت ہے، ہلاکت ہے، ناپاکی اور سادہ لاعلمی ہے۔

تو کیا ہم اپنی آنکھیں آسمان کی جانب بلند رکھیں؟ کیا وہ تاباں نقطہ جسے ہم پہچان رہے ہیں ان ہی نقطوں میں سے ہے جو غائب ہو جاتے ہیں۔ آدرش دیکھنے میں خوف ناک معلوم ہوتا ہے؛ چھوٹی چھوٹی گہرائیوں میں، الگ کی ہوئی، ناقابل تابانی میں، سیاہ ڈرانے والے ڈھیر کے درمیان محصور ہے۔ مگر جانور کے پیٹ جیسے بادلوں میں گھرے ستاروں سے زیادہ خطرے میں نہیں۔

۞

پوری روشنی

قاری شاید سمجھ گیا ہے کہ اپونین نے پھاٹک کے ذریعے پلومے اسٹریٹ کے باسی کو پہچان لیا ہوگا، جہاں مگنس نے اسے بھیجا تھا، اور اس نے بدمعاشوں کو پلومے اسٹریٹ سے دور رکھنے کی کوشش شروع کردی تھی، اور پھر ماریوس کو پھاٹک کے سامنے لے گئی تھی، جہاں شادیِ مرگ کی کیفیت میں کئی دن گزارنے کے بعد ماریوس کو ایک قوت نے پھاٹک کی طرف کھینچ لیا تھا جیسے مقناطیس اپنی طرف لوہے کو کھینچتا ہے، اور وہ عاشق کو ان پتھروں کی طرف لے گئی، جن سے بنے گھر میں اس کی معشوق رہتی تھی، اور بالآخر وہ کوزیٹ کے باغیچے میں داخل ہوگیا، جس طرح رومیو جولیٹ کے باغیچے میں داخل ہوا تھا۔ رومیو کے مقابلے میں اس کا داخلہ آسان تھا؛ رومیو کو دیوار پھلانگنی پڑی تھی، جب کہ ماریوس کو خستہ حال پھاٹک کی ایک سلاخ پر صرف معمولی سا زور لگانا پڑا تھا جو اپنے زنگ آلود قلابے میں بوڑھے آدمیوں کے دانتوں کی طرح ہل رہا تھا۔ ماریوس دبلا پتلا آدمی تھا اور آسانی سے اندر داخل ہوگیا تھا۔

چوں کہ سڑک پر کبھی کوئی آدمی نہیں ہوتا تھا، اور چوں کہ ماریوس صرف رات کے اندھیرے میں داخل ہوتا تھا، اس لیے اس کے دیکھے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔

اس مبارک اور مقدس گھنٹے سے شروع ایک بوسے نے ان دو نفوس کو ایک کر دیا تھا، اور ماریوس ہر شام وہیں ہوتا تھا۔ اگر اپنے وجود کے اس عرصے میں کوزیٹ کسی غیر محتاط یا عیاش آدمی کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہوتی تو وہ ہاتھ سے نکل جاتی؛ اس لیے کہ ایسی فیاض فطرتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو دوسروں کے سپرد کر دیتی ہیں؛ کوزیٹ ان ہی میں سے تھی۔ عورت کی فراخ دلی میں سپردگی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ محبت، جب اپنی تکمیل کی بلندیوں پر ہوتی ہے، اس وقت وہ

ناقابلِ بیان آسمانی کورچشمی اور پاک دامنی کی منزل پر ہوتی ہے، مگر اے عجیب نفس عورتو! تم کتنے خطرات میں گھری ہوتی ہو؟ اکثر یہی ہوتا ہے کہ تم دل دے دیتی ہو اور جسم ہم لے لیتے ہیں۔ تمھارا دل تمھارے پاس ہی ہوتا ہے اور تم اس کو اداسی میں لرزتے دیکھتی رہتی ہو۔ محبت میں درمیانہ راستہ نہیں ہوتا؛ یا تو یہ تمھیں تباہ کر دیتی ہے یا بچالیتی ہے۔ پوری انسانی قسمت اسی کشش و پیچ میں ہوتی ہے۔ کشش و پیچ کی یہ کیفیت، تباہی ہو یا تحفظ، سنگ دلانہ ہلاکت کے باعث نہیں، محبت میں ہوتی ہے۔ محبت اگر موت نہیں تو زندگی ہے۔ پالنا بھی تو تابوت ہی ہوتا ہے۔ قلبِ انسانی کا ایک ہی جذبہ "ہاں" اور "نہیں" کہتا ہے۔ خدا کی پیدا کردہ تمام اشیا میں قلبِ انسانی ہی وہ شے ہے جو سب سے زیادہ روشنی ڈالتی ہے، افسوس! کہ سب سے زیادہ اندھیرا بھی وہی شے کرتی ہے۔

خدا نے چاہا تھا کہ کوزیٹ کی محبت کا مجادلہ اس محبت سے ہو جو بچاتی ہے۔

1832ء مئی کے پورے مہینے، ہر رات اس غریب فراموش کردہ باغیچے میں اس جھاڑی کے نیچے جو روز بہ روز گھنی اور معطر ہوتی جا رہی تھی، دو وجود تمام تر پاک دامنی، تمام تر معصومیت پر مشتمل، آسمانی آسودگی سے لبریز، بنی نوع انسان کے بجائے اعلیٰ ترین فرشتے سے قریب، خالص، ایمان دار، مدہوش اور نور افشاں پرچھائیوں میں ایک دوسرے کے لیے چمکتے تھے۔ کوزیٹ کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ماریوس تاج پہنے ہوتا ہے، اور ماریوس کے نزدیک کوزیٹ نور کے ہالے میں ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کو مَس کرتے، ایک دوسرے کو گھورتے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے، ایک دوسرے کو گلے لگاتے؛ مگر ان میں ایک فاصلہ تھا جسے وہ دور نہیں کرتے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ اس فاصلے کا احترام کرتے تھے، وہ اس کے وجود ہی سے ناواقف تھے۔ ماریوس کو ایک رُکاوٹ کا احساس تھا، یعنی کوزیٹ کی معصومیت؛ اور کوزیٹ کو سہارے کا احساس تھا، یعنی ماریوس کی وفاداری۔ ان کا پہلا بوسہ آخری بوسہ بھی تھا۔ اس کے بعد سے ماریوس اس کے ہاتھ یا اس کے رومال، یا اس کے بالوں کے ایک گچھے کو اپنے ہونٹوں سے چھو لینے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس کے لیے کوزیٹ عورت نہیں ایک خوش بو تھی۔ وہ اس خوش بو کو سونگھتا تھا۔ کوزیٹ نے کسی چیز سے انکار نہیں کیا، نہ کوئی شے طلب کی تھی۔ کوزیٹ خوش تھی، اور ماریوس مطمئن تھا۔ دونوں ایک عالمِ بے خودی میں زندہ تھے جسے ایک نفس کا دوسرے نفس کو چکا چوند کرنا کہا جا سکتا تھا۔ ایک ناقابلِ بیان مثالی ہم آغوشی تھی، دو کنوارے نفسوں کی۔ دو ہنسوں کا جوڑا Jungfrau [سوئٹزرلینڈ کی ایک پہاڑی] کی چوٹی پر مل رہا تھا۔

محبت کے اس لمحے، جب شہوانیت بالکل گونگی ہو جاتی ہے، جب وجد کی کیفیت میں، پاکیزہ اور فرشتہ خو ماریوس، بجائے اس کے کہ کوزیٹ کے لبادے کو گھٹنے تک اٹھاتا، شہر کی کسی عورت

کے پاس جا سکتا تھا۔ ایک بار، چاندنی میں، کوزیٹ زمین سے کسی شے کو اُٹھانے کے لیے جھکی تھی کہ اس کا سینہ بند زمین پر گر پڑا اور اس کے گلے کی ابتدا کا نظارہ سامنے تھا۔ ماریوس نے اپنی آنکھیں پھیر لی تھیں۔

ان دونوں وجود کے درمیان کیا ہوا؟ کچھ نہیں ہوا تھا۔ بس، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

رات کے وقت جب وہ وہاں ہوتے تو باغیچہ ایک مقدس اور زندہ جگہ محسوس ہوتا تھا۔ ان کے اطراف کی ساری کلیاں پھول بن جاتی تھیں اور ان کو اپنی اپنی خوش بوئیں پیش کرتی تھیں؛ اور ان دونوں اپنے اپنے نفس کھول دیے اور پھولوں پر پھیلا دیے تھے۔ چنچل اور تن درست سبزہ، اپنی پوری توانائی کے ساتھ ان دو معصوموں کے اطراف لرزتا تھا، اور جب وہ محبت بھرے الفاظ ادا کرتے تو پیڑ تھرتھرانے لگتے تھے۔

کیا تھے وہ الفاظ؟ وہ فقط سانسیں تھیں، اور کچھ نہیں۔ یہ سانسیں اطراف کی فطرت کو پریشان اور مَس کرنے کے لیے کافی تھیں۔ یہ جادوئی طاقت تھی جسے سمجھنے میں ہمیں وقت محسوس ہونی چاہیے، کہ ہم ایسی کتاب میں کی جانے والی گفتگو پڑھتے ہیں جو کہ ہی اس لیے جاتی ہے کہ اسے دھوئیں کے بادل کی طرح پتوں کے نیچے پھیلا دیا جائے۔ ان دو محبت کرنے والوں کی وہ سرگوشیاں نظر انداز کر دیجیے جو روح کی گہرائیوں سے نکلتی ہیں اور اُن کے ساتھ قدیم زمانے کے سرُود کی طرح چلتی ہیں، تو ایک پرچھائیں کے علاوہ باقی کیا رہ جائے گا۔ آپ کہیں گے: کیا؟ بس اتنا ہی؟ جی ہاں، بچوں کی بڑبڑ، تکرار، بے مقصد قہقہے، لغویات، اور ہر شے جو اس دنیا کی عمیق ترین اور ارفع ترین ہے، وہی چیزیں ہیں، جو کہنے اور سننے کے لائق ہوتی ہیں۔

وہ جس نے کبھی ایسی بے حقیقت باتیں نہیں سنیں، جس نے کبھی منہ سے ایسی فضولیات نہیں نکالیں، ضعیف العقل اور کینہ پرور آدمی ہے۔

کوزیٹ نے ماریوس سے کہا تھا، ”تم جانتے ہو؟“

(انھوں نے اب ایک دوسرے کو you کے بجائے thou کہنا شروع کر دیا تھا)

”کیا تمھیں میرا نام معلوم ہے؟ میرا نام یوفرازی (Euphrasie) ہے۔“

”یوفرازی! نہیں تو، کیوں! تمھارا نام تو کوزیٹ ہے۔“

”اوہ، کوزیٹ بہت بھدا نام ہے، جو مجھے اس وقت دیا گیا تھا جب میں چھوٹی سی بچی تھی۔ مگر میرا اصل نام یوفرازی ہے۔ تمھیں یہ نام اچھا لگتا ہے! -- یوفرازی؟“

"ہاں، مگر کوزیت بھی بھدا تو نہیں۔"

""کیا یہ تمھیں یوفرازی سے زیادہ اچھا لگتا ہے؟""

""کیوں، ہاں۔"

"تب تو مجھے بھی یہی بہتر لگتا ہے۔ سچ، یہ بہت خوب صورت نام ہے۔ کوزیت! تم مجھے کوزیت ہی کہا کرو۔"

اور جس تبسم کا اس نے اس گفتگو میں اضافہ کیا تھا، اس نے گفتگو کو دیہاتیوں کا چھوٹا سا آسمانی گیت بنا دیا تھا۔ ایک اور موقعے پر اس نے ماریوس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا:

"موسیو! آپ بہت وجیہ ہیں، خوب صورت ہیں، بذلہ سنج ہیں، آپ بیوقوف ہرگز نہیں، آپ مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں مگر آپ کچھ بھی کہیں میں یہی کہوں گی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں!"

اور ماریوس کو ایسا لگا گویا اس نے آسمان میں کسی ستارے کو موسیقی کا ایک ٹکڑا گنگناتے سن لیا ہے۔ اور کوزیت نے ماریوس کو ایک نرم سی تھپکی دی تھی اس لیے کہ وہ کھانسنے لگا تھا۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا:

"کھانسیے نہیں، جناب! میں اپنے علاقے میں کسی کو کھانسنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کھانس کر مجھے پریشان کرنا اچھی بات نہیں۔ میں آپ کو تندرست دیکھنا چاہتی ہوں، اس لیے کہ اگر آپ تندرست نہیں ہوں گے تو میں بہت پریشان ہوں گی۔ تو میں کیا کروں گی؟""

اور یہ بہت نیکی کی بات تھی۔

ایک بار ماریوس نے کوزیت سے کہا تھا:

"ذرا تصور تو کرو، کبھی میں سمجھتا تھا کہ تمھارا نام اُرسلے (Ursule) ہے۔"

اس پر دونوں پوری شام ہنستے رہے۔

ایک اور گفتگو کے دوران اس نے کہا:

"ارے ہاں! ایک دن میں نے لگزمبرگ میں طے کر لیا تھا کہ میں اس تجربہ کار آدمی کو ختم کر دوں گا۔" اتنا کہہ کر ماریوس رُک گیا، اور مزید کچھ نہیں کہا، اس لیے کہ اسے کوزیت سے اس کے زیر جامے کے بارے میں کچھ کہنا پڑتا، اور یہ ممکن نہیں تھا اس لیے اس کے ڈانڈے ایک عجیب موضوع "گوشت" سے ملتے تھے جس کے سامنے وہ عظیم محبت بھی خوف سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

کوزیت کے ساتھ ماریوس اپنی موجودہ زندگی کو کچھ اس طرح دیکھتا تھا: روز پلومے اسٹریٹ آنا؛ چیف جسٹس کے پھاٹک میں لگائی ہوئی پرانی باڑ ہٹانا؛ کہنی سے کہنی ملا کر اس بنچ پر

بیٹھنا؛ درختوں کے درمیان سے اترتی ہوئی رات کی جھلملں دیکھنا؛ اپنے گھٹنے کو موڑ کر کوزیت کے لبادے کے نیچے کر لینا؛ اس کے پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن کو آہستہ آہستہ سہلانا؛ اسے 'تم' کہنا؛ باری باری ایک ہی پھول سونگھنا۔ اس دوران ان کے سروں سے بادل گزرتے جاتے تھے۔ ہر بار جب ہوا چلتی تو اپنے ساتھ بادلوں سے زیادہ آدمیوں کے خواب لے جاتی تھی۔

یہ پاکیزہ، تقریباً شرمیلی محبت بہادری سے کسی طرح بھی خالی نہیں تھی۔ کسی عورت کو سراہنے کا پہلا طریقہ، جس سے کوئی مرد محبت کرتا ہے، اس کو سہلانا ہوتا ہے، اور وہ شخص نصف بے ادب ہوتا ہے جو سہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ تعریف کا ایک طریقہ نقاب کے ذریعے بوسے جیسا کوئی کام کرنا بھی ہوتا ہے۔ اور شہوت کا غلبہ ہونے سے پہلے دل پیچھے ہٹ جاتا ہے تاکہ محبت بڑھے۔ ماریوں کی خوشامدیں، تمام لاجوردی الیلیے پن سے پُر ہوتی تھیں۔ پرندے جو آسمان کی بلندیوں پر، فرشتوں کے جانب پرواز کرتے ہیں انھیں ایسے الفاظ ضرور سنائی دیتے ہوں گے۔ پھر بھی، ان میں ملی ہوتی تھی زندگی، انسانیت اور وہ تمام وجوب واثبات، ماریوں جن کے قابل تھا۔ وہ کچھ جو خلوت کدے میں کہا جاتا تھا خواب گاہ میں کیے جانے کا ابتدائی الاپ تھا؛ غنائی ریزش تھی، [یونانی] گیت تھے، اور گھلے ملے سانیٹ تھے، پُرلطف اور ضرورت سے زیادہ تعریف کی گنگناہٹ تھی؛ عشق کی تمام نفاستیں گلدستے میں ترتیب دی ہوئی تھیں، جو آسمانی خوش بوئیں پھیلاتا، دل سے دل کے درمیان ایک ناقابلِ بیان پرندوں کے چہچہے جیسا تھا۔

"اوہ!" ماریوں سرگوشی میں کہتا، "کتنی حسین ہو تم! تم پر نگاہ کرنے کی ہمت نہیں مجھے۔ جب بھی تمھارے بارے میں سوچتا ہوں تو تمھارے خیال کی چادر مجھے ڈھانپ لیتی ہے۔ تم ایک لطیف انعامِ خداوندی ہو۔ نجانے تم میں کیا ہے۔ تمھاری پاپوش کی نوک لبادے کے دامن سے باہر نکلی دیکھتا ہوں تو مدہوش ہو جاتا ہوں۔ اور جب تم اپنے معمولی سے خیالات بھی ظاہر کرتی ہو تو دل موہ لینے والی ایک کرن سی نکل کر مجھ پر برس جاتی ہے۔ تمھاری باتیں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تم مجھے خواب سی لگتی ہو۔ کچھ کہو، میں سنوں، آفریں کہوں۔ اے کوزیت! یہ سب کچھ کتنا حیرت زا ہے، کتنا دل رُبا ہے۔ میں عجب عالمِ کیف میں ہوں۔ میڈموزیل، تم قابلِ پرستش ہو۔ میں تمھارے پاؤں دیکھتا ہوں مائیکروسکوپ سے، اور تمھاری روح کو دیکھتا ہوں ٹیلی اسکوپ سے۔

کوزیت کا جواب تھا:

"صبح سے گزرنے والے اس تمام وقت سے مجھے زیادہ محبت ہو رہی ہے۔"

اس گفتگو میں ہونے والے سوالات اور جوابات میں کسی اور کی ضرورت نہیں تھی کیوں

پھر کر جن کی تان محبت پر ہی ٹوٹتی تھی، اسی طرح جیسے پالے ہوئے جانور گھوم پھر کر اپنے کھونٹے پر واپس آ جاتے ہیں۔

کوزیٹ مجسم ذہانت تھی، ندرت تھی، صنعت کاری تھی، شفافیت تھی، پاکیزگی تھی، صفائی تھی، تاب ناکی تھی۔ کوزیٹ کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ پاک اور مقفیٰ تھی۔ جو اسے دیکھتا اسے اپریل اور سویرے کی سنسنی محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں شبنم تھیں۔ کوزیٹ عورت کے روپ میں انوارِ قطبی کا نچوڑ تھی۔

بالکل سادہ سی بات تھی کہ ماریوں کو اس کی تعریف کرنی چاہیے، اس لیے کہ کوزیٹ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ مگر سچ یہ ہے کہ، تازہ تازہ خانقاہ سے نکلی یہ اسکول کی لڑکی پاکیزگی اور فراست سے بات کرتی تھی اور جب بولتی تھی تو ہر قسم کے، سچ اور نازک اقوال استعمال کرتی تھی۔ اس کی بچکانہ باتیں بھی گفتگو ہوتی تھیں۔ اس نے کبھی کسی بارے میں غلطی نہیں کی، اور ہر شے کو صحیح تناظر میں دیکھتی تھی۔ عورت سوچتی ہے، نرم دل جبلت سے بات کرتی ہے، اور معصوم ہوتی ہے۔

عورت سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ بات کس طرح کی جاتی ہے، جو ایک ہی وقت میں عمیق بھی ہو اور شیریں بھی۔ شیرینی اور گہرائی، عورت کا سراپا ہوتی ہیں؛ اور ان ہی میں پوری جنت ہوتی ہے۔

مکمل آسودگی کے ایک لمحے میں بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ پیر تلے کچلا ہوا کیڑا، گھونسلے سے گرا ہوا پر، گلاب کی ٹوٹی ہوئی شاخ اس کے دل کو رحم کے جذبے سے بھر دیتے ہیں، جس میں نرم افسردگی کی ملاوٹ بھی ہوتی ہے، اور ایسے وقت میں رونے سے بہتر کوئی شے نہیں ہوتی۔ محبت کی سب سے شاہانہ علامت وہ نرمی ہوتی ہے، جو کبھی کبھی تقریباً ناقابلِ برداشت بھی ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ — ان سارے تضادات کے علاوہ جو محبت کے کھیل کے جھمیلے ہوتے ہیں — وہ دل کھول کر اور لطیف آزادی سے ہنسنا پسند کرتے تھے، ایسی بے باکی سے کہ کبھی کبھی وہ دو لڑکوں جیسے لگتے تھے۔

اگرچہ پاکیزگی کے نشے سے لبریز دل کو احساس نہیں ہوتا، پھر بھی فطرت ہمیشہ موجود ہوتی ہے اور اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے بے رحم اور ارفع مقصد کے ساتھ ہر جگہ موجود ہوتی ہے؛ نفوس کی معصومیت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، آپ کو بے حد پاک دامن نجی گفتگو میں محبت کے قابل اور پُراسرار پرچھائیں ملتی ہے جو محبت کرنے والے جوڑے کو دو عدد دوستوں سے ممیز کرتی ہے۔

وہ ایک دوسرے کی پرستش کرنے لگے تھے۔

مستقل اور ناقابلِ تغیر ثابت قدم ہوتے ہیں۔ لوگ زندہ رہتے ہیں، مسکراتے ہیں، قہقہے

لگاتے ہیں، ہونٹوں کی مدد سے منہ چڑاتے ہیں، آپس میں انگلیاں پھنساتے ہیں، ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں؛ یہ دوام میں رُکاوٹ نہیں ہوتی۔

دو محبت کرنے والے خود کو شام میں، دھند لکے میں، اخفا میں، پرندوں میں، گلابوں میں چھپا لیتے ہیں؛ اندھیرے میں دل سے ایک دوسرے کو مسحور کر لیتے ہیں، بڑبڑاتے ہیں، سرگوشی کرتے ہیں، اور اس دوران اجرامِ فلکی کی جنبشیں لاانتہا ہی کائنات کو بھر دیتی ہیں۔

❂

مسرتوں کی گمراہیاں

ان کا وجود غیر واضح تھا؛ وہ اپنی خوشی سے خوف زدہ تھے۔ انھیں کالرے کی وبا کا احساس نہیں تھا جس نے اسی مہینے میں پیرس کو تباہ کر دیا تھا۔ انھوں نے، جہاں تک ممکن ہوا ایک دوسرے کو رازدار بنا لیا تھا، مگر یہ صورت ان کے نام جاننے سے زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی۔ ماریوس نے کوزیٹ کو بتا دیا تھا کہ وہ یتیم تھا؛ اس کا نام ماریوس پوں مرسی تھا، کہ وہ وکیل تھا، کہ اس کا ذریعۂ آمدنی ناشروں کے لیے لکھنا پڑھنا تھا، کہ اس کا باپ کرنل تھا اور وہ ہیرو بھی تھا، کہ نانا سے، جو دولت مند آدمی تھا اس کے اپنے تعلقات خراب تھے۔ اس نے اشارتاً یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ بیرن ہے، مگر کوزیٹ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

کوزیٹ کو ماریوس کے نام کے معنی بھی معلوم نہیں تھے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک ماریوس صرف ماریوس تھا۔ اپنے بارے میں اس نے ماریوس کو بتایا تھا کہ اس کی نشوونما Petit-Picpus خانقاہ میں ہوئی تھی، کہ ماریوس کی طرح اس کی ماں بھی مر چکی تھی، کہ اس کے اپنے باپ کا نام موسیو فوشلیوں ہے؛ کہ وہ بہت اچھا آدمی ہے اور مفلس لوگوں کے لیے بہت کام کرتا ہے، مگر وہ خود مفلس ہے، کہ اس نے خود کو ہر شے سے محروم کر رکھا ہے جب کہ، اس نے کوزیٹ کو کسی چیز سے محروم نہیں رکھا ہے۔

بہت حیرت کی بات ہے کہ جب سے ماریوس کوزیٹ سے واقف ہوا تھا، اس قسم کی سمفنی میں زندگی گزار رہا تھا کہ ماضی، بلکہ قریب ترین ماضی بھی اس کے لیے اتنا پیچیدہ اور سر بمہر ہو گیا تھا کہ کوزیٹ نے اسے جو کچھ بتا دیا اس سے وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ اسے خیال بھی نہیں آیا کہ وہ کوزیٹ کو اس غلیظ حجرے (hovel) کی اس شبینہ مہم کے بارے میں، تین آردیے کے

بارے میں، جلن کے بارے میں، اور کوزیت کے باپ کے عجیب رویے اور فرار کے بارے میں کچھ بتاتا۔ وقتی طور پر ماریوس سب کچھ بھول گیا تھا؛ شام کو اسے یہ بھی یاد نہیں ہوتا تھا کہ صبح ہوئی تھی، کہ اس دن اس نے کیا کیا تھا، ناشتا کہاں کیا تھا، کس سے بات کی تھی؛ اس کے کانوں میں گیت سے بج رہے تھے جن کے باعث وہ دوسرے خیالات کے لیے بالکل بہرا ہو گیا تھا۔ وہ ان ہی ساعتوں میں اپنے وجود میں ہوتا جب کوزیت اس کے سامنے ہوتی تھی۔ جو شخص اس طرح آسمان میں اڑ رہا ہو، فطری طور پر وہ زمین کو بھول جاتا ہے۔ دونوں کاہلی میں ناقابلِ تعین مسرتوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ محبت کرنے اور کہلانے والے دو خواب خرام اس طرح جی رہے تھے۔

افسوس! کون ہے جسے ایسی چیزوں کا احساس نہیں ہوتا؟ ایسا وقت کیوں آتا ہے کہ کسی کو آسمان سے اترنا پڑتا ہے، اور بعد میں زندگی اسی رفتار سے چلنے لگتی ہے۔

محبت سوچ کی جگہ لے لیتی ہے۔ محبت سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ چاہو تو جذبے میں منطق تلاش کرو۔ قلبِ انسانی میں اتنا منطقی تسلسل نہیں ہوتا جیسا مکمل جیومیٹری میکانزم کا کائناتی نظام میں ہوتا ہے۔ کوزیت اور ماریوس کے نزدیک دنیا میں کوئی شے نہیں تھی سوائے ماریوس اور کوزیت کے۔ ان کے اطراف کی کائنات ایک سوراخ میں گر پڑی تھی۔ وہ ایک سنہرے لمحے میں جی رہے تھے۔ نہ ان کے آگے کچھ تھا، نہ پیچھے کچھ تھا۔ ماریوس کو خیال بھی نہیں گزرا کہ کوزیت کا کوئی باپ بھی تھا۔ اس کا ذہن چکا چوند اور مسخ ہو گیا تھا تو پھر یہ دو محبت کرنے والے بات کیا کرتے تھے؟ ہم نے دیکھا ہے پھولوں کو، ابابیلوں کو، ڈوبتے سورج کو، ابھرتے چاند کو، اور ہر قسم کی اہم اشیا کو۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہر شے کے بارے میں بتایا ہے سوائے ہر شے کے۔ محبت کرنے والوں کی ہر شے کوئی شے نہیں ہوتی۔ مگر اس باپ کا، ان حقیقتوں کا، اس ماند کا، ان بد معاشوں کا، اس مہم کا مقصد کیا تھا؟ اور کیا ماریوس کو پورا یقین تھا کہ اس خواب کا وجود تھا؟ وہ دو وجود تھے، اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے، اور اس کے پرے کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی اور شے کا وجود نہیں تھا۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے عقب میں غائب ہوتے ہوئے جہنم میں بہشت کا ورود پوشیدہ تھا۔ کیا ہم نے دیو دیکھے ہیں؟ کیا بہت سے ہیں؟ کیا ہم انھیں دیکھ کر تھرتھرائے ہیں؟ کیا ہمیں تکلیف ہوئی ہے؟ ہم کچھ نہیں جانتے۔ بس، ایک گلابی بادل سا لہرا رہا ہے۔

گویا، دو وجود اس انداز سے زندہ تھے، بہت بلندی پر، تمام تر بے امکانی کے ساتھ جو فطرت میں ہوتی ہے؛ نہ پاتال میں، نہ نقطۂ عروج پر، آدمی اور فرشتے کے درمیان، دلدل کے اوپر، خلا کے نیچے، بادلوں کے درمیان؛ نہ گوشت اور خون میں، نہ نفس اور روح میں؛ زمین پر چلنے کے

لیے بے حد ارفع، آسمان میں غائب ہونے کے لیے انسانیت کے بوجھ سے بھاری، ایٹم کے ذروں کی طرح معلق؛ سرنگوں ہونے کے منتظر؛ بظاہر مقسوم کے حدود سے پرے؛ [مقدر کی] لیکھ سے لاعلم؛ گزرے کل سے، آج سے، آنے والے کل سے لاعلم؛ حیران، مست، تیرتے ہوئے، بلندی کی طرف اڑتے ہوئے؛ کبھی کبھی اتنے ہلکے کہ لا انتہا میں پہنچ جاتے؛ اُڑ کر ابدیت میں جانے کے لیے تیار۔ سوتے تو ہوشیار ہوتے، گویا لوریوں سے سلائے گئے ہوں۔ آہ، آدرش سے بے بس شاندار کھولت!

کبھی کبھی حسین کوزیت کی موجودگی میں ماریوس اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا، کہ کسی نفس کو دیکھنے کا بہترین طریقہ بند آنکھوں سے دیکھنا ہی ہوتا ہے۔

ماریوس اور کوزیت نے خود سے کبھی نہیں پوچھا کہ یہ سب انھیں کدھر لیے جا رہے تھے۔ وہ سمجھے تھے کہ وہ پہنچ گئے ہیں۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ محبت کسی شے کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔

۞

پرچھائیں کی ابتدا

ژاں ولژاں کو بالکل شبہ نہیں ہوا۔

کوزیت، جو ماریوس سے قدرے کم خواب گوں تھی، خوش تھی، اور ژاں ولژاں کی خوشی کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ خیالات کوزیت جن کو پسند کرتی تھی اس کی معصومانہ مصروفیتیں، اس کے دل پر چھائی ماریوس کی صورت، اس کی خوب صورت، پاکیزہ اور مسکراتی پیشانی سے کچھ چھین نہیں سکے تھے۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جب کنواری اپنی محبت کو اس طرح سنبھالے رکھتی ہے جیسے کوئی فرشتہ اپنی پاک دامنی کو۔ سو ژاں ولژاں آرام سے تھا۔ اور جب دو چاہنے والے دل کسی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں تو سب کچھ ٹھیک چلنے لگتا ہے۔ تیسرا فریق جو ان کی محبت میں خلل کر سکتا ہے مختلف قسم کی پابندیوں کے ذریعے مکمل طور پر اندھیرے میں رکھا جاتا ہے، جو تمام چاہنے والوں کے لیے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس طرح، کوزیت نے ژاں ولژاں کی تجاویز پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ''چہل قدمی کے لیے چل رہی ہو؟'' ''ہاں میرے پیارے بابا۔'' ''گھر پر ہی رہنا چاہتی ہو؟'' ''بہت خوب۔ اب وہ کوزیت کے ساتھ شام گزارے گا؟ کوزیت مسرور تھی۔ چوں کہ ژاں ولژاں ہمیشہ دس بجے سو جاتا تھا، ایک گھنٹے بعد تک ماریوس باغیچے میں داخل نہیں ہوتا تھا جب تک وہ برآمدے کی کھڑکی کھولنے کی آواز سن نہیں لیتا تھا۔ بلا شبہ دن میں کبھی کسی کی ماریوس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ژاں ولژاں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ماریوس کا وجود تھا۔ اس نے ایک صبح اتفاق سے کوزیت سے پوچھا تھا، ''تمھاری پشت پر یہ سفیدی کیسی لگی ہے؟'' پچھلی شام ماریوس نے چلتے ہوئے کوزیت کو دیوار کی طرف دھکا دے دیا تھا۔

بوڑھی توسا، جو جلد سو جاتی تھی، سونے کے سوا کچھ نہیں سوچتی تھی، اور ژاں ولژاں کی

طرح وہ بھی سارے معاملے سے لاعلم تھی۔

ماریوں نے گھر کے اندر کبھی قدم نہیں رکھا۔ جب وہ کوزیت کے پاس ہوتا تو دونوں خود کو قدمچے کے قریب دراز میں چھپا لیتے تا کہ سڑک سے نظر نہ آئیں، سنائی نہ دیں۔ اور وہ وہیں بیٹھ جاتے، باتیں کرتے، منٹ میں تیس بار ایک دوسرے کا ہاتھ دباتے، اس دوران ان کی آنکھیں درختوں کی شاخوں پر مرکوز ہوتی تھیں۔ ایسے وقت میں اگر تیس قدم فاصلے پر آسمانی بجلی بھی گرتی تو انھیں خبر نہ ہوتی؛ اتنی گہری ہوتی تھی ان کی محویت؛ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح ڈوب ہو جاتے تھے۔

شفاف پاکیزگی، مکمل سفیدی؛ سب کچھ ایک جیسا۔ اس قسم کی محبت سوسن کی پنکھڑیوں، اور فاختہ کے بال و پر کی یاد دلاتی ہے۔

باغیچے کا پورا علاقہ ان کے اور سڑک کے درمیان ہوتا تھا۔ ہر بار، جب ماریوں داخل ہوتا یا باہر جاتا بہت احتیاط سے پھاٹک پر لگی رکاوٹ کو اس طرح ٹھیک کرتا کہ اس کے بار بار ہٹائے جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

عموماً وہ آدھی رات کے قریب باہر نکلتا، اور کوفیراک کے مکان پر واپس پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن کوفیراک نے باؤریل سے کہا، ''تم یقین نہیں کروگے، آج کل ماریوں ایک بجے رات گھر آتا ہے۔''

باؤریل نے جواب دیا، ''کیا فرق پڑتا ہے؟ خاموش پانی گہرا ہوتا ہے۔''

کبھی کبھی کوفیراک نے اپنے بازو سمیٹے، اکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور ماریوں سے کہتا:

''نوجوان! تمھاری عادتیں خراب ہوتی جا رہی ہیں۔''

کوفیراک چوں کہ عملی آدمی تھا اس نے ماریوں کی غیر مرئی جنت کے تصور میں حصہ نہیں لیا؛ وہ جذبات خفیہ رکھنے کا قائل نہیں تھا؛ وہ ماریوں کے حالات پر بے چین ہو رہا تھا، اور اس کو حقیقی دنیا میں واپس آنے کی تنبیہ کرتا رہتا تھا۔

ایک صبح اس نے تادیبی انداز میں کہا، ''پیارے دوست، تمھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم چاند پر، خوابوں کی دنیا میں، سرابوں کے علاقوں میں، صابن کے بلبلے میں رہنے لگے ہو۔ چلو، اب اچھے بچے بن جاؤ، اچھا بتاؤ، اس کا نام کیا ہے؟''

مگر وہ بات کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ اس کے ناخن کھینچ لیے جاتے تب بھی وہ اس ناقابلِ بیان نام، کوزیت، کا ایک ٹکڑا بھی منہ سے نہ نکالتا۔ سچی محبت سویرے جیسی روشن اور مقبرے جیسی خاموش ہوتی ہے۔ صرف کوفیراک ہی اس تبدیلی کو دیکھ پایا تھا کہ اس کی کم سخنی کرن جیسی ہو گئی تھی۔

اس مہربان مہینے مئی کے دوران ماریوس اور کوزیت بڑے بڑے لطف اٹھانا سیکھ گئے تھے۔ اس بات پر بحث کرنا کہ thou کے بجائے you کہا جائے محض اس لیے کہ بعد میں شاید وہ بہتر طریقے سے thou کہہ سکیں گے۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ لمبی لمبی باتیں کرنا، ان لوگوں کے بارے میں جن میں وہ معمولی سی بھی دل چسپی نہیں لیتے تھے: ایک اور ثبوت کہ اس وجد آور اوپیرا میں جسے محبت کہتے ہیں، متن کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

ماریوس کے لیے؛ کوزیت کو زیبائش پر باتیں کرتے سننا۔

کوزیت کے لیے؛ ماریوس کو سیاست پر باتیں کرتے سننا۔

گھٹنے سے گھٹنا ملائے بابل اسٹریٹ پر دوڑتی ہوئی سواریوں کی آوازیں سننا۔

خلا کے ایک ہی ستارے کو، یا گھاس میں چمکتے ہوئے ایک ہی جگنو کو گھورتے رہنا۔

اپنے سکون کا برقرار رکھنا؛ جو گفتگو سے کہیں زیادہ مسرور کن ہوتا ہے۔

وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران گونا گوں پیچیدگیاں بھی درپیش تھیں۔

ایک شام ماریوس Invalides بولیوارڈ کے راستے اپنی جائے ملاقات کے لیے نکلا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ پلومے اسٹریٹ کی طرف مڑنے ہی والا تھا اس نے بہت قریب سے کسی کو کہتے سنا: "شام بخیر، موسیو ماریوس!"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور ایپونین کو پہچان لیا۔

اس پر غیر معمولی اثر ہوا۔ اس دن کے بعد، جب ایپونین اسے پلومے اسٹریٹ پہنچانے آئی تھی، ماریوس نے اسے دیکھا نہیں تھا، اور وہ اسے بالکل بھول گیا تھا۔ اس کے لیے ماریوس بہت شکر گزار تھا، اور اس نے اپنی خوشی کا اظہار بھی کر دیا تھا، پھر بھی اس سے اس وقت کی ملاقات پر وہ گھبرا سا گیا تھا۔

یہ سوچ بالکل غلط ہے کہ ولولہ، جب بے لاگ اور دل خوش کن ہو تو انسان کی کمال کی جانب رہنمائی کرتا ہے؛ محض رہنمائی ہی نہیں کرتا، اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اسے فراموشی کی کیفیت میں بھی لے جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو نہ برائی یاد رہتی ہے نہ اچھائی۔ تشکر، فرض اور اہم معاملات جن کا یاد رکھنا ضروری ہو، یکسر غائب ہو جاتے ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ماریوس ایپونین سے بالکل مختلف انداز میں ملتا، مگر اس وقت کوزیت کے خیالوں میں غرق، اسے یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ اس ایپونین کا نام ایپونین تھن آردیے تھا، اور یہ وہی نام تھا جو اس کے باپ کی

وصیت میں تحریر تھا، وہ نام، جس کے لیے چند ماہ پہلے وہ نہایت جوش سے خود کو قربان کر سکتا تھا۔ ہم ماریوں کو اسی انداز میں پیش کر رہے ہیں جیسا کہ وہ تھا۔ اپنی محبت کی چمک دمک میں، خود اس کا باپ بھی کسی حد تک اس کے ذہن سے محو ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے قدرے شرمندگی سے جواب دیا، "اچھا، یہ آپ ہیں، ایپونین؟"

"تم مجھے 'آپ' کہہ کر کیوں بات کر رہے ہو؟ کیا میں نے تمھارے خلاف کوئی کام کیا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب میں کہا۔

بلاشبہ ایپونین نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا۔ ہرگز نہیں، مگر اب، جب کہ وہ کوزیٹ سے thou کہہ کر بات کرنے لگا تھا تو وہ ایپونین کو صرف 'آپ' ہی کہہ سکتا تھا۔

چوں کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا؛ اس نے بلند آواز میں کہا، "بولو ...."

پھر وہ خاموش ہو گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ الفاظ اس مخلوق کے حلق میں اٹک گئے تھے جو کبھی بہت بے پروا اور دلیر ہوا کرتی تھی۔

"اچھا۔"

وہ پھر رُک گئی، اور نظریں نیچی کیے کھڑی رہی۔

"خدا حافظ، موسیو ماریوں!" اس نے کہا اور اچانک ہوا ہو گئی۔

✧

چوکیدار

اگلے دن 1832ء جون کی تیسری تاریخ تھی، وہ تاریخ جس میں ایسے خطرناک واقعات ہو چکے تھے جو ایک زمانے تک پیرس کے افق پر بجلی بھرے بادلوں کی طرح چھائے رہے۔ آغازِ شب ہوتے ہی ماریوس اس سڑک پر چلا جس پر وہ پچھلی رات تھا۔ اچانک اسے بولیوارڈ کے درختوں میں ایپونین آتی دکھائی دی۔ ایسا مسلسل دو دن ہوا تھا — اور یہ عجیب سی بات تھی۔ اس نے تیزی سے بولیوارڈ چھوڑ دی، موسیو اسٹریٹ سے ہوتا ہوا پلومے اسٹریٹ پر مڑ گیا۔

یہ دیکھ کر ایپونین بھی پلومے اسٹریٹ پر چل پڑی، ایسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس رات تک وہ ماریوس کو اس سڑک پر چلتے دیکھنے تک ہی اکتفا کرتی: کبھی اس کا سامنا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پچھلی شام، پہلی بار، اس نے ماریوس کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔

سو ایپونین ماریوس کا پیچھا کرتی رہی۔ ماریوس کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔ ایپونین نے اسے پھاٹک کی رُکاوٹ اٹھاتے اور باغیچے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سڑک پر لگے جنگلے کی طرف بڑھی، یکے بعد دیگرے اس کے ڈنڈوں کو چھوتی چلی، اور اسے فوراً وہ باڑ نظر آ گئی ماریوس نے جسے اپنی جگہ سے ہٹایا تھا۔ وہ دھیمی آواز اور افسردہ لہجے میں اپنے آپ سے بڑبڑا رہی تھی، "بس کر، لڑکی، بس کر۔"

وہ جنگلے کے پایوں سے لگ کر بیٹھ گئی، پھاٹک کی رُکاوٹ کے بالکل قریب، اس طرح، گویا وہ اس کی نگہداری کر رہی ہو۔ بالکل اسی جگہ جہاں جنگلا دیوار سے مل گیا تھا، وہاں ایک اندھیرا سا کونا تھا، ایپونین جس میں پوری طرح چھپ گئی تھی۔

ایک گھنٹے تک اسی طرح، بغیر ہلے اور ہلکے ہلکے سانس لیتی، اپنے خیالات میں گم بیٹھی رہی۔

رات کے دس بجے کے قریب، پلومے اسٹریٹ سے گزرتے تین آدمیوں میں سے، بوڑھا، دیر آید بوڑھوا اس بدنام جگہ سے بھاگنے میں جلدی کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ دیوار کے قریب پہنچا تو اس نے دھیمی مگر دھمکی کے لہجے ایک آواز کو کہتے سنا، ''تعجب نہیں کہ ہر شام وہ یہاں آتا ہے۔''

راہ گیر نے اپنے اطراف نظر ڈالی، وہاں کوئی نہیں تھا، اسے اندھیرے کونے میں جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی، وہ چوکنا ہو گیا۔ اور اپنی رفتار دگنی کر دی۔

راہ گیر کے رفتار تیز کرنے کی کوئی وجہ تھی۔ چند لمحوں بعد، چھ آدمی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے، جو غیر قانونی گشت کرنے والے سمجھے جا سکتے تھے، پلومے اسٹریٹ میں داخل ہو گئے۔ پہلا آدمی جو باغیچے کے جنگلے کے پاس پہنچ گیا تھا، رکا، اور دوسروں کا انتظار کرنے لگا؛ چند سیکنڈ بعد سب یک جا ہو گئے۔

ان لوگوں نے دھیمی آواز میں باتیں کرنا شروع کیا۔

''یہی وہ جگہ ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''باغیچے میں کوئی کیکڑا (کتا) تو نہیں؟'' دوسرے نے سوال کیا۔

''پتا نہیں۔ پھر بھی، میں ایک گیند لایا ہوں، جو ہم اسے کھانے کے لیے ڈال دیں گے۔''

''تختے کو توڑنے کے لیے تمھارے پاس پتی ہے؟''

''ہاں۔''

''جنگلا بہت پرانا ہے۔'' پانچویں نے دخل اندازی کی۔ اس کی آواز چلیوں کا تماشا کرنے والے جیسی تھی۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔'' اب دوسرا آدمی بولا تھا، ''آری چلنے میں آواز نہیں ہوگی، اور کاٹنا مشکل بھی نہیں ہوگا۔''

چھٹا آدمی جس نے ابھی تک لب نہیں ہلائے تھے، پھاٹک کا معائنہ کرنے لگا، جیسا ایک گھنٹا قبل اپونین نے کیا تھا، یکے بعد دیگرے ایک ایک ڈنڈے کو پکڑا اور احتیاط سے ہلایا۔

ابھی وہ اس باڑ کے قریب پہنچا ہی تھا، ماریوں نے جسے ڈھیلا کر دیا تھا، کہ اندھیرے میں سے ایک ہاتھ نکلا، اور اس شخص کے بازو پر پڑا؛ اس کو اپنے سینے پر ایک زوردار دھکا محسوس ہوا، اور ایک بھرائی ہوئی آواز آئی، مگر بلند نہیں تھی، ''اندر کتا ہے۔''

ساتھ ہی، ایک کم زور سی لڑکی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

آدمی چونک پڑا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی غیر متوقع واقع ہو جانے پر ردِ عمل ہوتا ہے۔ اس

کے جسم کے سارے بال کھڑے ہو گئے۔ جیسا کسی خوف ناک جانور کو اچانک دیکھ لینے سے ہوتا ہے۔
آدمی ہکلاتے ہوئے پیچھے ہٹا، ''کون چھنال ہے یہ؟''
''تمھاری بیٹی۔''
دراصل وہ ایپونین تھی جس نے تین آردیے کو مخاطب کیا تھا۔
ایپونین کی، آسیب جیسی پرچھائیں دیکھ کر، دوسرے پانچ، یعنی کیا کسؤ، گولیمر، بابے، برؤژوں اور مونٹ پارناس خاموشی سے، بغیر عجلت، بغیر کچھ کہے، شرارت آمیز آہستگی سے جو رات کے ان لوگوں کا خاصہ تھی، قریب آ گئے تھے۔
ان کے ہاتھوں میں ناقابلِ بیان کوئی ڈراؤنا سا چمٹا نظر آ رہا تھا، جسے اس قسم کے آوارہ لوگ fanchon [یونانی زبان کے اس لفظ کا مطلب آزاد، یا موجی ہوتا ہے] کہتے تھے۔
''ارے یہ تم ہو! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟'' تین آردیے نے بلند آواز میں کہا۔ آواز بلند کرنے کے بعد بھی نیچی ہی رکھی تھی: ''تم ہمارے کام میں خلل ڈالنے آئی ہوئی ہو؟''
ایپونین زور سے ہنس پڑی اور اس کے گلے لگ گئی۔
''جی ہاں، میں ہی ہوں ابا جان، اس لیے کہ میں یہاں ہوں۔ آج کل پتھروں پر بیٹھنا منع ہو گیا ہے کیا؟ دراصل وہ آپ ہیں، جسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟ اس لیے کہ یہ بسکٹ ہے؟ یہاں آپ کا کوئی کام نہیں۔ مگر میرے پیارے ابا جان، مجھے گلے تو لگا لیجیے۔ بہت دن ہو گئے آپ کو دیکھے ہوئے۔ گویا، آج کل آپ آزاد ہیں؟''
تین آردیے نے بڑبڑاتے ہوئے خود کو ایپونین کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ''بہت اچھا ہوا تم نے مجھے گلے لگایا۔ ہاں میں آزاد ہوں۔ اندر نہیں ہوں۔ اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''
ایپونین نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی، زیادہ زور سے ابا کو سہلانے لگی۔
''مگر بابا، یہ سب کیسے ہوا؟ آپ بہت چالاک آدمی نکلے کہ آزاد ہو گئے۔ مجھے بتایئے، کیسے؟ اور میری ماں؟ میری ماں کہاں ہے؟ مما کے بارے میں بھی بتایئے۔''
تین آردیے نے جواب دیا، ''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ معلوم نہیں کہاں ہے؛ چلی جاؤ یہاں سے، پھر کہہ رہا ہوں، دفع ہو جا یہاں سے۔''
''میں آسانی سے جانے والی نہیں۔'' وہ کسی بگڑے بچے کی طرح منہ بنا کر بولی، ''اور آپ مجھے یہاں سے واپس کر رہے ہیں۔ چار مہینے سے میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔ بوسہ لینے تک کا

وقت نہیں ملا۔" اور اس نے اپنے باپ کو پھر گلے سے پکڑ لیا۔

"بس کرو، کیا بدتمیزی ہے۔" بابے نے کہا۔

"جلدی کرو۔" گوئیمر نے کہا، "پولیس آجائے گی۔"

پچھلی تماشا کرنے والے کی آواز نے یہ مصرعے دہرائے:

"یہ نئے سال کا دن نہیں ہے،

کہ پاپا کو ماما کو شگونیں لگاؤں"

اب ایپونین ان پانچوں بدمعاشوں سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں، موسیو برو ژوں، کیا حال ہے؟ موسیو بابے Good day، موسیو گیا کسو Good day۔ آپ مجھے جانتے ہیں، موسیو گوئیمر؟ کیا حال ہے مونٹ پارناس تمھارا؟"

"ہاں، ہاں سب تمھیں اچھی طرح جانتے ہیں" تین آروئے نے فوراً کہا "گڈ ڈے، گڈ ڈے، دفع ہو جا یہاں سے، جان چھوڑ ہماری۔"

"لومڑیوں کے لیے چار گھنٹے ہیں، مرغیوں کے لیے نہیں۔" مونٹ پارناس نے کہا۔

"تم دیکھ رہی ہو، ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔" بابے نے اضافہ کیا۔

ایپونین نے مونٹ پارناس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہوشیار!" اس نے کہا، "زخمی ہو جاؤ گے، میرے پاس کھلا چاقو ہے۔"

"پیارے مونٹ پارناس!" ایپونین نے نرمی سے جواب دیا، "تمھیں لوگوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں اپنے باپ کی بیٹی ہوں، شاید موسیو بابے، موسیو گوئیمر، میں ہی وہ شخص ہوں جسے معاملے کی تفتیش کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔"

غور کرنے کی بات ہے کہ وہ عوامی بولی نہیں بولی۔ وہ خوفناک زبان اب اس کے لیے ناممکن ہو گئی ہے، اس لیے کہ وہ ماریوس کو جانتی ہے۔

اس نے چھوٹی، ہڈی والے نازک ہاتھ میں گوئیمر کا مہیب موٹی موٹی بھدی انگلیوں والا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور بات جاری رکھی، "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں بیوقوف نہیں۔ عام طور پر لوگ مجھ پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے کئی موقعوں پر تمھارا کام بھی کیا ہے۔ میں نے معلومات کی ہیں۔ دیکھو، تم خواہ مخواہ اس میں الجھ رہے ہو۔ میں قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ اس گھر میں کچھ نہیں ہے۔"

"اس میں اکیلی عورتیں ہیں۔" گوئیمر نے کہا۔

"نہیں، وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

"ہاں، مگر موم بتیاں نہیں لگی ہیں۔" بابے نے لقمہ دیا۔ اور اس نے اشارے سے ایپونین کو دکھایا؛ درختوں کے اوپر سے، دو رویہ سلامی والی چھت والے کمرے میں ایک روشنی حرکت کر رہی تھی۔ وہ لو سا تھی، جو سکھانے کے لیے کچھ کپڑے پھیلانے اوپر گئی تھی۔

ایپونین نے آخری کوشش کی۔ "ہاں" اس نے کہا، "مگر یہ بے چارے مفلس لوگ ہیں، یہ نادار ہے اور یہاں ایک سو بھی نہیں ملے گا۔"

"جہنم میں جاؤ۔" تین آردیے نے چیخ کر کہا۔ "جب ہم گھر کو الٹ پلٹ دیں گے، تہہ خانہ اوپر اور دو چھتی نیچے کر دیں تب تمہیں بتائیں گے کہ اندر کیا ہے، فرانک ہیں، سو ہیں یا نصف فاردنگ۔" اور اس نے گھر میں داخل ہونے کی نیت سے ایپونین کو ایک طرف دھکیل دیا۔

"پیارے دوست، مسٹر مونٹ پارناس!" ایپونین نے کہا، "میں تم سے التجا کرتی ہوں، تم اچھے آدمی ہو، اندر داخل نہ ہونا۔"

"احتیاط کرو، تم خود کو کاٹ لوگی۔" مونٹ پارناس نے جواب دیا۔

تین آردیے نے فیصلہ کن انداز میں کہا، "چلی جا میری بچی، چلی جا؛ مردوں کو اپنا کام کرنے دے۔"

ایپونین نے مونٹ پارناس کا ہاتھ چھوڑ دیا، جو اس نے دوبارہ پکڑ لیا تھا، اور کہا:

"اچھا، تو تم لوگ گھر میں داخل ہونا چاہتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔" پتلی تماشے والا مسکرایا۔

تب وہ پھاٹک کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی، اس نے چھ بدمعاشوں کا سامنا کیا، جو سر سے پاؤں تک مسلح تھے، اور رات کے اندھیرے نے جن کو عفریت بنا دیا تھا؛ اس نے سخت مگر دھیمی آواز میں کہا، "میں کہہ رہی ہوں کہ تم داخل نہیں ہو گے۔"

حیرانی کے عالم میں وہ رک گئے۔ پتلی تماشے والے نے اپنے دانت بند کر لیے۔ اور وہ کہتی رہی، "دوستو! کان لگا کر سنو۔ تم یقیناً یہ نہیں چاہو گے۔ اب میں کہے دے رہی ہوں۔ سب سے پہلی بات، کہ اگر تم اس باغیچے میں داخل ہوئے، اگر تم نے اس پھاٹک کو ہاتھ لگایا، تو میں چیخنے لگوں گی، میں دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگوں گی، میں سب کو ہوشیار کر دوں گی، میں سب کو پکڑوا دوں گی، میں پولیس بلا لوں گی۔"

"یہ لڑکی، یہ بھی کر گزرے گی۔" تین آردیے نے دھیمی آواز میں برہاڑوں اور پتلی تماشے والے سے کہا۔

لڑکی نے اپنا سر ہلایا اور مزید کہا، ''اپنے باپ سے پہل کروں گی۔''

ژین آردیے آگے بڑھا۔

''پیارے آدمی، اتنا قریب نہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

وہ غراتا ہوا پسپا ہوگیا۔ ''کیوں، کیا ہوگیا ہے اس کو؟'' اس کے بعد مزید کہا، ''کُتیا!''

لڑکی نے خوف ناک انداز میں ہنسنا شروع کیا۔

''آپ چاہتے ہیں، مگر آپ داخل نہیں ہوں گے۔ میں کُتے کی بیٹی نہیں اس لیے کہ میں بھیڑیے کی بیٹی ہوں۔ آپ چھ لوگ ہیں، مجھے اس سے کیا؟ آپ لوگ مرد ہیں، تو میں عورت ہوں۔ مجھے خوف زدہ نہ کیجیے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ آپ اس گھر میں داخل نہیں ہوں گے، اس لیے کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ اور اگر آپ آگے بڑھے تو میں بھونکنے لگوں گی۔ میں کہہ چکی ہوں کہ میں بھیڑیے کی بیٹی ہوں، مجھے آپ لوگوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔ اپنا راستہ ناپیے، آپ مجھے بور کر رہے ہیں۔ جایئے جہاں جاتے ہیں، مگر یہاں نہیں آئیں گے، یہ میرا حکم ہے۔ آپ اپنے چاقو استعمال کر سکتے ہیں۔ میں ٹھوکر استعمال کروں گی؛ میرے نزدیک دونوں برابر ہیں، تو آیئے!''

لڑکی ایک قدم بدمعاشوں کی طرف بڑھی، وہ وحشت ناک ہو رہی تھی، اور اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا، ''بخدا، میں ڈرتی نہیں۔ اس گرمی میں بھوکی رہوں گی، اور اس جاڑے میں سرد رہوں گی۔ یہ بدبخت، نامعقول سوچ رہے ہیں کہ یہ ایک لڑکی کو ڈرا سکتے ہیں۔ کیا ڈر؟ ارے، ہاں بہت۔ اس لیے کہ تمھاری چھوٹی چھوٹی داشتائیں ہیں، جو بستر کے نیچے گھس جاتی ہیں جب تم زور سے بولتے ہو، سچ ہے نا؟ میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی، کہ میں ڈرتی نہیں۔'' اس نے گھور کر ژین آردیے کی طرف دیکھا، اور بولی، ''آپ سے بھی نہیں، بابا!'' پھر بولی، ساتھ ہی اس نے بھوت جیسی سُرخ آنکھیں یکے بعد دیگرے بدمعاشوں پر ڈالیں۔ ''مجھے کیا پروا اگر کل میں اپنے باپ کی لگائی چوٹ سے مردہ، پلومے اسٹریٹ سے، یا ایک سال بعد Saint-Cloud یا Isle of Swans کے جالوں میں، سڑی ڈاٹوں کے درمیان، اور ڈوب کر مرجانے والے کتوں کے درمیان سے اٹھائی گئی؟''

لڑکی کو رُکنا پڑ گیا تھا؛ خشک کھانسی سے اس کا گلا رُندھنے لگا تھا، اس کی سانس کم زور اور تنگ سینے سے موت کی ہچکیوں کی طرح آنے لگی تھی۔

وہ دوبارہ بولی، ''مجھے صرف چیخنا پڑے گا، لوگ دوڑے آئیں گے، اور پھر تھپیڑ، گھونسے۔ تم چھ آدمی ہو، میں پوری دنیا کی نمائندگی کرتی ہوں، سنا تم نے؟''

ژین آردیے اس کی طرف بڑھا۔

"خبردار! قریب مت آنا۔" وہ چیخی۔

وہ رک گیا، اور نرمی سے کہا، "اچھا، نہیں نہیں! میں آگے نہیں بڑھوں گا، مگر اتنی زور سے تو نہ بولو۔ تم ہمارے کام میں رکاوٹ ڈال رہی ہو، میری بچی! اگر ہمیں زندہ رہنے کے لیے بھی تو کچھ چاہیے۔ تمھیں اپنے باپ کا بھی خیال نہیں؟"

"آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔" اپونین نے کہا۔

"مگر ہمیں زندہ رہنا ہے، ہمیں کھانا بھی تو کھانا ہے۔"

"چلے جائیے!"

اتنا کہہ کر وہ فصیل کے نیچے بیٹھ گئی اور گنگنانے لگی:

"میرے بازو بھرے بھرے،
مرے پاؤں سڈول،
اور، وقت گزرتا جائے"

اس نے اپنی کہنی اپنے گھٹنے پر رکھ لی، ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں، اور لاپروائی سے پیر ہلانے لگی۔ اس کے چیتھڑے لبادے سے شانے کی نازک ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ قریبی سڑک کی لالٹین اس کے سراپے اور اس کے رویے کو روشن کر رہی تھی۔ اس سے زیادہ اور حیرت انگیز چیز دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔

چھ بدمعاش گونگے اور افسردہ کہ انھیں ایک لڑکی نے روک لیا تھا، لالٹین کے نیچے پسپا ہوئے، جلتے ہوئے کاندھوں اور غصے میں مشورے کرنے لگے۔

اس دوران لڑکی بے رحمی سے مگر پُرسکون انداز میں انھیں دیکھ رہی تھی۔

"اس لڑکی کا معاملہ کیا ہے؟" بابے نے کہا، "ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اس گھٹو سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس طرح خالی ہاتھ جانا بہرحال ہمارے لیے بڑے شرم کی بات ہو گی۔ دو عورتیں اور ایک بوڑھا، جو عقبی صحن میں رہتا ہے، اور کھڑکیوں پر پڑے پردے بھی بُرے نہیں۔ بڈھا یہودی معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام اچھا ہے۔"

"ٹھیک، تو پھر باقی تم لوگ اندر جاؤ۔" مونٹ پارناس نے بلند آواز میں کہا، "کام کر ڈالو۔ میں یہیں اس لڑکی کے پاس ٹھہروں گا، اور اگر وہ ہمیں ناکام کرتی دیتی ہے تو......" اتنا کہہ کر اس نے چاقو لہرایا جو کھلا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا اور لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

تھنارڈیے نے منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا، باقی لوگ جو چاہتے تھے اس کے

لیے تیار تھا۔

بروژوں جو صدائے غیبی کی طرح تھا، اور جیسا کہ قاری جانتا ہے، جس نے اس کام کی تیاری بھی کی تھی، ابھی تک بولا نہیں تھا۔ کسی سوچ میں تھا۔ وہ کسی بھی قسم کا کام کر بیٹھنے کے لیے مشہور تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس نے صرف ایک دھمکی سے ایک پولیس چوکی لوٹ لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اشعار اور گیت بھی لکھتا تھا جس نے اسے مقتدر بنا دیا تھا۔

بابے نے اس سے پوچھا، ''تم بولتے کیوں نہیں، بروژوں؟''

بروژوں کچھ دیر خاموش رہا، اس کے بعد اس نے اپنے کاندھے اور اپنے سر کو مختلف طریقوں سے ہلایا، اور بالآخر بولنے کا فیصلہ کیا، ''سنو، آج صبح میں نے دو چڑیوں کو لڑتے دیکھا ہے؛ اس شام میں نے ایک عورت کو دھکا دیا تھا جو لڑائی کر رہی تھی۔ یہ سب بُری نشانیاں ہیں۔ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

اور وہ چلے گئے۔

جاتے وقت مونٹ پارناس بڑبڑا رہا تھا، ''کوئی بات نہیں، اگر وہ بھی چاہتے، تو میں اس لڑکی کی گردن کاٹ سکتا تھا۔''

بابے نے کہا، ''میں ایسا نہیں کرتا۔ میں کسی خاتون کو ہاتھ نہیں لگاتا۔''

سڑک کے کونے پر رُک کر انھوں نے آپس میں دھیمی آواز میں مندرجہ ذیل معمے جیسی گفتگو کی، ''آج رات ہم سوئیں گے کہاں؟''

''پیرس میں۔''

''تین آردیے، تمھارے پاس پھاٹک کی کنجی ہے؟''

"Pardi."

ایپونین، جس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں ان پر سے ہٹائی نہیں تھیں، ان کو اسی سڑک کی طرف لپیا ہوتے دیکھ رہی تھی جدھر سے وہ آئے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوار اور مکانوں کی جانب رینگنے لگی۔ اس طرح اس نے بولیوارڈ تک ان کا پیچھا کیا۔

۞

رات اور رات کی چیزیں

بدمعاشوں کے چلے جانے کے بعد پلومے اسٹریٹ معمول کے مطابق پُرسکون اور شبینہ حالت میں واپس آ گئی تھی۔ جو کچھ اس رات وہاں ہوا، جنگل بھی اس سے بالکل حیران نہ ہوتا۔

اونچے اونچے درخت، چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں، سبزہ زار، بے ہنگم الجھی شاخیں، لمبی لمبی گھاس، سب کچھ اداس اداس تھا۔ وہاں کا غیر مہذب اجتماع غیر مرئی آسیب کی جھلک کی مانند دکھائی دیا تھا۔ وہ جسے عام آدمی جنگل کی طرح دیکھتا ہے، وہ جو آدمی سے پرے ہوتا ہے، اور وہ اشیا ہم زندہ لوگ جن سے واقف ہوتے ہیں، رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کے سامنے ہوتی ہیں۔

ظلمتوں کی قوتیں ایک دوسرے اچھی طرح واقف ہوتی ہیں، اور حیرت انگیز طور ایک دوسرے کو متوازن رکھتی ہیں۔ دانت اور ناخن پنجے اس سے خوف کھاتے ہیں جسے پکڑ نہیں سکتے۔

خوں آشام درندگی، بسیار خور رغبتیں، شکار کی تلاش میں بھوک، ناخنوں اور پنجوں کی مسلح جبلتیں، وسائل کے لیے جن کے پاس مقصد بھی ہوتا ہے اور شکم بھی، کفن کے نیچے سڑتے ہوئے بدبو دار بے حس پیکر کی صورت اپنے مبہم اور لرزتے ہوئے لبادے میں ایستادہ ہوتے ہیں، جو انہیں مردہ اور خوف ناک زندگی میں زندہ محسوس ہوتے ہیں۔ بے رحمی کو خوف ہوتا ہے کہ اسے بے حد ابہام سے معاملہ کرنا ہوتا ہے جو ایک نامعلوم شے کی صورت جما ہوتا ہے۔

ایک سیاہ ہیولا راستہ روک کر وحشی کو قریب آنے سے روک دیتا ہے۔ وہ جو قبرستان سے ابھرتا ہے، غار سے نکلنے والے کو دھمکاتا بھی ہے اور پریشان بھی کرتا ہے۔

بھیڑیے بھی غول کو دیکھ کر پسپا ہو جایا کرتے ہیں۔

۞

ماریوس کا پتا کوزیٹ کے لیے

جس وقت آدمی کی شکل میں ایک کتیا پھاٹک کی حفاظت کر رہی تھی؛ جب چھ بدمعاش ایک لڑکی کے سامنے سرنگوں ہو رہے تھے اس وقت ماریوس کوزیٹ کے پہلو میں تھا۔ شاید پہلے کبھی آسمان اس طرح ستاروں سے مزین ہوا نہ تھا؛ پہلے کبھی درخت اس سے زیادہ لرزے نہ تھے؛ پہلے کبھی گھاس کی خوش بو اس طرح مشامِ جاں میں داخل نہیں ہوئی تھی؛ پہلے کبھی پرند اتنا شیریں شور سن کر پتوں کے درمیان اس طرح سو نہیں گئے تھے؛ پہلے کبھی کائناتی سکون کی ہم آہنگی نے اندرونی موسیقی پر اس طرح ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا؛ پہلے کبھی ماریوس اس طرح فریفتہ، اس قدر زیرِ حرم اور اتنا بے خود نہیں ہوا تھا۔ مگر اسے کوزیٹ افسردہ ملی؛ کوزیٹ روتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

اس حیرت ناک خواب پر پہلی بار بادل چھا گیا تھا۔

ماریوس کے پہلے الفاظ تھے، ”کیا بات ہے؟“

اور کوزیٹ نے جواب دیا تھا، ”یہ۔“

اتنا کہنے کے بعد وہ بنچ پر بیٹھ گئی، اور ماریوس کو بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اس کے بعد اس نے کہا، ”میرے والد نے آج صبح مجھ سے کہا ہے میں تیار رہوں، اس لیے کہ اسے کوئی کام ہے، اور شاید ہمیں یہاں سے کوچ کرنا پڑے۔“

ماریوس سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

جب کوئی زندگی کے آخری سرے پر ہو، تو مرنے کا مطلب کوچ کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی اپنی زندگی کے ابتدائی لمحات میں ہو تو کوچ کا مطلب موت ہوتا ہے۔

گزرے چھ ہفتوں سے ماریوس رفتہ رفتہ، درجہ بہ درجہ ہر روز کوزیٹ کو اپناتا جا رہا تھا۔

ہم پہلے تشریح کر چکے ہیں کہ پہلی محبت میں جسم سے بہت پہلے نفس لے لیا جاتا ہے؛ اس کے بعد [والی محبت میں] نفس سے بہت پہلے جسم لے لیا جاتا ہے؛ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے نفس لیا ہی نہیں جاتا؛ Faublas اور Prudhommes نے اس میں اضافہ کیا ہے، "اس لیے یہ ہوتا ہی نہیں۔" مگر یہ طنز (نعوذباللہ) توہینِ الٰہی کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا ماریوس کوزیٹ کا اسی طرح مالک تھا، جیسے بد روحیں لوگوں پر قابض ہو جاتی ہیں، مگر اس نے کوزیٹ کو اپنے تمام تر نفس کے ساتھ ڈھانپ رکھا تھا، اور اسے حاسدانہ انداز میں یقین کے ساتھ گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ کوزیٹ کے تبسم پر، اس کی سانسوں پر، اس کی خوش بو پر، اس کی نیلی آنکھوں کی تابانی پر، اس دلربا نشان پر جو اس کی گردن پر تھا، اس کے تمام خیالوں پر قابض ہو گیا تھا۔

وہ اس کی گردن کے پیچھے لٹکے بالوں کے ایک گچھے کو مسلسل گھورتا تھا، کبھی اس کو ہلکے سے چھو بھی لیتا تھا، اور اپنے آپ سے کہتا تھا کہ اس گچھے کا ایک بھی بال ایسا نہیں جو اس کی، یعنی ماریوس کی ملکیت نہیں۔ وہ غور سے ان تمام چیزوں کو دیکھتا ان سے والہانہ محبت کرتا جو وہ پہنتی تھی، اس کے ربن کی گرہوں کو، اس کے دستانوں کو، اس کی آستینوں کو اور اس کے جوتوں کو مقدس اشیا کی طرح سمجھتا جیسے وہی ان سب کا مالک تھا۔ وہ خواب دیکھتا کہ وہ حاکم ہے صدف سے بنی ان کنگھیوں کا جو وہ بالوں میں لگاتی تھی— حتیٰ کہ اس نے اپنے آپ سے اُبھی اور دبی دبی شہوانی لکنت میں کہا تھا جو ظاہر نہیں ہوئی تھی— کہ اس کے لبادے کا ایک بھی ربن، اس کے لانبے موزوں کا ایک بھی سوراخ، اس کی انگیا کی ایک بھی شکن ایسی نہیں جو اس [ماریوس] کی نہیں۔ کوزیٹ کے علاوہ، وہ اپنی اشیا کو، اپنے اندر کے جابر حکمران کو اور اپنے غلام کو اپنی جائیداد سمجھتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب چیزیں ایک ساتھ اس کے نفس میں گھل مل گئی تھیں، کہ ان کو الگ الگ کرنا ممکن نہیں رہا تھا— "یہ میری ہے۔" "نہیں، یہ میری ہے۔" "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔ یہ میری جائیداد ہے۔" "جسے تم اپنا سمجھ رہی ہو وہ میں ہوں۔" ماریوس وہ شے تھا جو کوزیٹ کے وجود کا حصہ تھی، اور کوزیٹ وہ شے تھی جو ماریوس کے وجود کا حصہ تھی۔ ماریوس کوزیٹ کو اپنے اندر سمایا محسوس کرتا تھا۔ کوزیٹ کو لینا، کوزیٹ کا مالک ہونا، یہ اس کے نزدیک سانس لینے سے مختلف نہیں تھا۔ اس قسم کے عقیدے کی، نشے کی، بے مثال اور مکمل کنواری کی اور ان الفاظ کی حاکمیت کے دوران اچانک یہ کہا جانا کہ: "ہم کوچ کرنے والے ہیں" ایک شدید صدمہ تھا، اور حقیقت کی سخت زبان چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ "کوزیٹ تمھاری نہیں ہے!"

ماریوس کی آنکھیں کھل گئیں۔ چھ ہفتوں سے ماریوس، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، زندگی

سے باہر رہ رہا تھا؛ اور وہ الفاظ — ہم کوچ کرنے والے ہیں — اس کو بختی سے زندگی میں واپس لے آئے تھے۔ اس کے پاس کہنے کو الفاظ نہیں تھے۔ کوزیٹ کو محض اتنا محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ بہت ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اپنی باری آنے پر اس نے ماریوس سے پوچھا، ”کیا بات ہے؟“

ماریوس نے اتنے دھیمے لہجے میں کچھ کہا تھا کہ وہ مشکل سے سن سکی تھی، ”کیا کہا؟ میں سمجھ نہیں سکی ہوں۔“ کوزیٹ نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”آج صبح میرے والد نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات نمٹا دوں اور تیار رہوں، اس لیے کہ وہ بکس میں رکھنے کے لیے مجھے اپنے کپڑے دے گا، کہ اُسے سفر پر جانا پڑ گیا ہے، کہ ہم لوگوں کو بھی یہاں سے چلا جانا پڑے گا، اور چوں کہ ہمیں جانا ہے تو ضروری ہے کہ میرے لیے ایک بڑا اور اس کے لیے چھوٹا صندوق ہو، اور یہ تیاری ایک ہفتے کے اندر ہو جانی چاہیے، کہ ہم لوگ شاید انگلستان چلے جائیں گے۔“

”مگر یہ تو ظلم ہوگا۔“ ماریوس نے زور سے کہا۔

یہ یقینی ہے کہ اس لمحے نہ طاقت کا غیر ضروری استعمال کیا جا رہا تھا، نہ زبردستی کی جا رہی تھی، نہ بدترین ظالموں کی طرح نفرت کی جا رہی تھی، نہ ماریوس کے خیال کے مطابق ایسا کوئی عمل کیا جا رہا تھا جو Busiris یا Tiberius یا ہنری ہشتم کے ظلم کے مماثل ہوتا؛ موسیو فو شلووں اپنی بیٹی کو انگلستان لے جا رہا تھا اس لیے کہ وہاں کچھ کام کرنے تھے۔

ماریوس نے نہایت کم زور آواز میں پوچھا ”اچھا، تم لوگ کب جاؤ گے؟“

”اس نے یہ نہیں بتایا ہے، کب؟“

”اور تمھاری واپسی کب ہوگی؟“

”اس نے یہ بھی نہیں بتایا ہے۔“

ماریوس اُٹھ کھڑا ہوا، اور سرد مہری سے کہا، ”کوزیٹ کیا واقعی تم چلی جاؤ گی؟“

کوزیٹ نے اپنی خوب صورت آنکھوں سے اسے دیکھا، جو اس وقت اذیت کے احساس سے پُر تھیں، اور ایک قسم کی پراگندہ دلی سے جواب دیا، ”مگر؟“

”واقعی، کیا تم انگلستان چلی جاؤ گی؟“

”تم مجھے 'تم' کیوں کہہ رہے ہو؟“

”میرا سوال صرف اتنا ہے کہ تم چلی جاؤ گی یا نہیں؟“

”تمھارا کیا خیال ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"کیا تم چلی جاؤ گی؟"

اگر میرا باپ جاتا ہے تو——"

"سو تم چلی جاؤ گی؟"

کوزیٹ نے ماریس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کوئی جواب دیے بغیر دبانے لگی۔

"ٹھیک۔" ماریس نے کہا، "تو میں بھی کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

کوزیٹ اس کے الفاظ کے معنی کے بجائے اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ وہ اتنی زرد پڑ گئی کہ افسردگی میں اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا، "کیا مطلب ہے تمھارا؟"

ماریس نے اس کی طرف دیکھا، پھر آسمان کی جانب نظر کی اور جواب دیا، "کچھ بھی نہیں۔"

اس کی نظریں آسمان سے نیچے آئیں، تو اسے کوزیٹ مسکراتی نظر آئی۔ جس عورت سے کوئی محبت کرتا ہے تو رات کے اندھیرے میں بھی اس کے تبسم میں ایک خاص قسم کی تابانی ہوتی ہے۔

"ہم بھی کتنے احمق ہیں۔ ماریس! میرا ایک مشورہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر ہم لوگ یہاں سے چلے جاتے ہیں، تو تم بھی چلے آؤ۔ میں بتا دوں گی، کہاں۔ میں جہاں بھی ہوں وہیں تم بھی چلے آنا۔"

اس وقت تک ماریس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور حقیقی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔ اس نے کوزیٹ سے بلند آواز میں کہا۔

"تمھارے پاس چلا آؤں! تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ مجھے نقدی کی ضرورت ہوگی، جو میرے پاس نہیں! انگلستان چلا جاؤں؟ مگر میں کسی کا قرض دار ہوں، مجھے نہیں معلوم کتنے کا، شاید دس لوئی کا، کوفیراک کا قرض ہے مجھ پر، جو میرا دوست ہے جسے تم نہیں جانتیں۔ میرے پاس ایک پرانی ہیٹ ہے جو تین فرانک کی بھی نہیں، میرے پاس ایک کوٹ ہے، جو سامنے کے بٹن سے محروم ہے، میری قمیص پھٹی ہوئی ہے، میری آستین کی کہنیوں میں سوراخ ہیں، میرے جوتوں میں پانی بھر جاتا ہے؛ میں نے پچھلے چھ ہفتوں سے اس کے بارے سوچا بھی نہیں، اور تمھیں بھی اس کے بارے میں بتایا نہیں۔ تم مجھے صرف رات میں دیکھتی ہو، اور اپنی محبت نچھاور کرتی ہو؛ اگر تم مجھے دن میں دیکھ لوگی تو ایک سو بھی دینے کی روادار نہیں ہوگی۔ کہتی ہو، انگلستان چلے آؤ۔ ہونہہ! میرے پاس تو پاسپورٹ کی فیس تک نہیں۔"

ماریس کھڑا ہوا، ایک درخت سے لپٹ گیا، جو قریب ہی تھا۔ تنے سے لگا کھڑا تھا، اس

کی پیشانی تنے سے لگی ہوئی تھی، اسے تنے کی چھال کا بھی احساس نہیں تھا جو اس کی جلد کو کھرچ رہی تھی، نہ اس بخار کا خیال تھا جو اس کی کنپٹی میں پھڑکن پیدا کررہا تھا۔ وہ بالکل ساکت کھڑا تھا، بہت بھاری ہوئی مورت کی طرح، اور گرنے ہی والا تھا۔

اس خاموشی کے عالم میں وہ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ایسے گہرے غاروں میں ابد تک رہا جا سکتا ہے۔بالآخر وہ مڑ کر کھڑا ہوگیا۔اسے پیچھے سے ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی، جو پیاری مگر اداسی سے لبریز تھی۔

کوزیٹ سسکیاں لے رہی تھی۔

ماریوس کے قریب ہی، جو ساکت کھڑا تھا، دو گھٹنے سے رو رہی تھی۔

ماریوس اس کے قریب گیا، اس کے گھٹنے تک گرا، سجدے کی صورت گر پڑا، اس نے کوزیٹ کے پیر کی انگلیوں چوم لیا، جو اس کے لبادے سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔

کوزیٹ خاموش کھڑی، اسے دیکھتی رہی۔کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب عورت ایک غمگین اور مجبور دیوی کی طرح محبت کا مذہب اختیار کر لیتی ہے۔

"رو نہیں۔" ماریوس نے کہا۔

کوزیٹ نے دھیرے سے کہا، "اس وقت بھی نہیں، جب میں جا رہی ہوں گی، اور تم ساتھ نہیں آسکو گے؟"

ماریوس نے پوچھا، "تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

کوزیٹ نے سسکی لیتے ہوئے، جنت جیسے الفاظ میں جواب دیا، جو کبھی اتنا دل رُبا نہیں ہوتا جتنا کہ آنسوؤں کے درمیان لگتا ہے، "میں تمھاری پرستش کرتی ہوں!"

ماریوس ایسے لہجے میں کہتا رہا جو ناقابلِ بیان حد تک پیارا تھا، "رو نہیں۔ وعدہ کرو، اور یہ تم میرے لیے کروگی، کہ تم رونا چھوڑ دوگی؟"

"کوزیٹ نے سوال کیا، "تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

ماریوس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔"کوزیٹ! میں نے آج تک کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا ہے، اس لیے کہ وعدہ مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے گویا میرا باپ میرے پہلو میں کھڑا ہے۔اچھا، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم چلی گئیں تو میں مر جاؤں گا۔"

وہ لہجہ جس میں اس نے یہ الفاظ ادا کیے تھے ایسا غم انگیز، اتنا متین، اور اتنا پُرسکون تھا، کہ کوزیٹ سُن کر لرز گئی تھی۔اسے وہ تھرتھری محسوس ہوئی جیسی کسی اداس چیز کے پاس سے گزرنے

سے پیدا ہوتی ہے۔اس صدمے نے اسے چپ کردیا تھا۔

''اچھا، سنو!'' ماریوس نے کہا، ''کل میرا انتظار نہ کرنا۔''

''کیوں؟''

''پرسوں تک میرا انتظار نہ کرنا۔''

''مگر، کیوں؟''

''خود دیکھ لینا۔''

''ایک دن، بغیر تمھیں دیکھے گزرے ـــ یہ ناممکن ہے!''

''ہمیں ایک دن کی قربانی دینی چاہیے، تا کہ ہم اپنی پوری زندگی حاصل کرسکیں، شاید۔'' اور ماریوس نے دھیمے لہجے میں مزید کہا، ''وہ ایسا آدمی تھا جو اپنی عادت کبھی نہیں بدلتا تھا، اور اس نے کبھی کسی سے ملاقات نہیں کی تھی، سوائے شام کے وقت کے۔''

''تم کس آدمی کے بارے میں بات کررہے ہو؟'' کوزیٹ نے سوال کیا۔

''میں؟ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔''

''تو تمھارا کیا خیال ہے؟''

''پرسوں تک انتظار کرو ـــ راضی؟''

''راضی!'' کوزیٹ نے جواب دیا۔

کوزیٹ نے ماریوس کا سر اپنے ہاتھوں میں لیا، خود پنجوں کے بل کھڑی ہوگئی، اور اس کی آنکھوں میں اس کی امیدوں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

ماریوس بولا، ''ارے ہاں! میرا خیال ہے کہ تمھیں میرا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ میں اپنے دوست کوفیراک کے ساتھ Verrerie, No. 16 اسٹریٹ پر رہتا ہوں۔ ماریوس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، قلم بنانے والا چاقو نکالا، اور اس کی نوک سے دیوار کے پلستر پر لکھ دیا، ".Verrerie اسٹریٹ، مکان نمبر 16''

اس دوران کوزیٹ نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنا شروع کردیا تھا۔

''مجھے اپنے خیال سے آگاہ کرو۔ ماریوس، کوئی خیال ہے ضرور۔ مجھ کو بتاؤ وہ خیال ہے کیا۔ اُف، بتادونا، تا کہ میں آرام سے رات گزار سکوں۔''

''میرا خیال ہے: یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا ہم کو الگ کرنا چاہتا ہے۔ انتظار کرو؛ بس، پرسوں میرا انتظار کرنا۔''

''اس وقت تک میں کیا کروں گی؟'' کوزیٹ نے کہا ''تم باہر رہتے ہو، تم آتے ہو، جاتے ہو۔تم کتنے خوش قسمت آدمی ہو۔میں بالکل اکیلی رہوں گی۔اُف! میں کتنی اداس ہوں گی۔ کیا بات ہے جو تم کل شام کرنے والے ہو؟ بتاؤ تو مجھے۔''

''کل میں کچھ کام کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''تب تو میں خدا سے دعا کروں گی اور یہاں تمھارے بارے میں سوچتی بھی رہوں گی، تا کہ تم کامیاب ہو۔میں مزید سوال نہیں کروں گی، اس لیے کہ تم نہیں چاہتے۔تم میرے مالک ہو۔ میں کل کی شام Euryanthe کا وہ گیت گاتے گزاروں گی جو تمھیں بہت پسند ہے، وہی جسے سننے کے لیے تم میری کھڑکی کی جھلملی کے باہر کھڑے رہتے تھے۔مگر پرسوں تم ذرا پہلے آجاؤ گے۔ میں ٹھیک نو بجے شام تمھارا انتظار کروں گی، اچھی طرح یاد رکھنا۔میرے خدا، کتنے افسوس کی بات ہے کہ دن اتنے لمبے ہوتے ہیں۔اچھا، نو بجتے ہی آجانا۔سمجھے! میں باغیچے میں ہوں گی۔''

''اور میں بھی ہوں گا''

اور، بغیر کوئی لفظ ادا کیے، اسی خیال میں غرق، انھیں برقی لہروں کے زور پر جو محبت کرنے والوں کو مسلسل گفتگو میں مصروف رکھتے ہیں، دونوں اپنی اپنی اداسیوں اور خوشیوں کے سرور میں، ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے، یہ دیکھے بغیر کہ ان کے لب ملے ہوئے تھے اور، سرمستی اور آنسوؤں سے پُر ان کی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھی ہوئی تھیں اور ستاروں کو گھور رہی تھیں۔

ماریوس باہر نکلا تو سڑک سنسان تھی۔یہ وہی لمحہ تھا جب اپونین بولیواز دپر بدمعاشوں کا پیچھا کر رہی تھی۔

جس وقت ماریوس درخت کے تنے پر سر رکھے خواب دیکھ رہا تھا، اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا تھا: وہ خیال، افسوس— کہ خود اس نے اس خیال کو ناممکن اور احمقانہ سمجھا تھا۔وہ ایک نراس فیصلے پر پہنچا تھا۔

۞

بوڑھا دِل اور جوان دِل

چند دن قبل فادر ژیلیر نورما اکیانوے برس کا ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی میڈموزیل ژیلیر نورما کے ساتھ Filles-du-Calvaire اسٹریٹ نمبر 1 پر رہتا تھا جو اس کی ملکیت تھا۔ قاری کو یاد ہوگا کہ وہ ان قدیم لوگوں میں سے تھا جو دلیری سے موت کا انتظار کرتے ہیں جنھیں عمر جھکا نہیں سکتی، جنھیں افسردگی بھی ختم نہیں کر سکتی۔

اس کے باوجود اس کی بیٹی کافی دنوں سے کہہ رہی تھی کہ "میرے بابا ڈھلتے جا رہے ہیں۔" اب وہ اپنی ملازمہ کو تھپڑ نہیں لگاتا تھا، جب باسک دروازہ کھولنے میں دیر کرتا تو وہ اپنی بید کی چھڑی کو دروازے پر زور سے مارتا نہیں تھا۔ جولائی کے انقلاب نے چھ ماہ کے عرصے میں اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے تقریباً خاموشی سے مانیٹر کی جانب سے الفاظ کے جوڑے بنانے — مثال کے طور پر Humblot-Conte — کا عمل دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بوڑھا آدمی بہت رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ وہ جھکا نہیں، اس نے شکست نہیں مانی؛ یہ اس کے لیے جسمانی نہیں اخلاقی مسئلہ تھا، مگر وہ اندر سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ چار برس سے وہ ماریوں کے انتظار میں تھا، اس یقین پر کہ وہ نا کارہ انسان ایک نہ ایک دن اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا؛ اب وہ اس منزل پر پہنچ گیا تھا، جہاں کسی افسردہ لمحے اس نے اپنے آپ سے کہا تھا، اگر ماریوں نے اسے مزید انتظار کرایا تو اس کی موت ہی اسے روکے گی؛ شاید اس کا دل کہے گا کہ اب اسے ماریوں کی شکل نہیں دیکھنی چاہیے۔ ماریوں کی شکل کبھی نہ دیکھنے کا خیال اس دن سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا؛ یہ خیال دوبارہ آیا اور اسے سر سے پا تک سرد کر گیا۔ اس کی غیر موجودگی نے نانا کے دل میں ناشکرے نواسے کی محبت میں اضافہ کر دیا تھا، جو ایک جھماکے کی طرح چلا گیا تھا۔ دسمبر کی راتوں میں، جب سردی

دس درجے پر پہنچ جاتی اکثر [بچھڑے] بیٹے کا خیال آنے لگتا ہے۔

موسیو ہیلیر نورما اپنے نواسے کی طرف ایک قدم بھی اٹھانے کا روادار نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا تھا" بلکہ میں مر جانا پسند کروں گا۔" وہ خود کو ذمے دار نہیں ٹھہراتا تھا؛ پھر بھی وہ ماریوس کے بارے میں بہت محبت اور مہربان بزرگ کی بے آواز ناامیدی سے سوچتا تھا، جو ایک دن اندھیروں میں غائب ہو جانے والا تھا۔

اس کے دانت گرنے شروع ہو گئے تھے، جو اس کی افسردگی میں اضافہ کر رہے تھے۔

موسیو ہیلیر نورما نے شاید اپنے آپ سے بھی اعتراف نہیں کیا ہوگا، اس لیے کہ ایسا خیال اسے شرمندہ کرنے والا ہوتا ہے، کہ اس نے کسی معشوق سے اتنی محبت نہ کی ہوگی جتنی کے اسے ماریوس سے تھی۔

اس نے اپنے کمرے میں، اپنی پلنگ کے بالکل سامنے، اپنی دوسری لڑکی مادام پوں مرسی کی تصویر آویزاں رکھی تھی جو اس وقت کھینچی گئی تھی جب وہ صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ ہر وقت اس تصویر کو گھورتا رہتا تھا۔ ایک دن حسبِ عادت جب اس کی نظریں تصویر پر جمی ہوئی تھیں اس کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا تھا، میرا خیال ہے کہ اس میں بہت شباہت ہے"

"میری بہن کی؟" میڈموزیل ہیلیر نورما نے کہا "یقیناً۔"

بوڑھے نے اس میں اضافہ کیا تھا،" اور اس سے بھی۔"

ایک بار، جب وہ اپنے گھٹنے دبائے، آنکھیں تقریباً بند کیے، مایوس انداز میں بیٹھا ہوا تھا، اس کی بیٹی نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا،" بابا، کیا ہمیشہ کی طرح آپ اس سے ناراض ہیں؟"

وہ اتنا کہہ کر رک گئی، اس لیے کہ مزید سوال کرنے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"کس سے؟" اس نے پوچھا۔

"بے چارے ماریوس سے؟"

"اس نے اپنا عمر رسیدہ سر اٹھایا، اپنی مرجھایا مکا میز پر رکھا اور بے حد جھلائے ہوئے لرزتے لہجے میں کہا،" کیا کہا تم نے؟ وہ جناب! بڑے حیار، بدبخت، حرام زادے، ناشکرے، سنگ دل، خود پسند، اور بدمعاش آدمی ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے منہ پھیر لیا تا کہ اس کی بیٹی اس کے آنکھوں میں تیرتا ہوا آنسو نہ دیکھ لے۔

تین دن بعد اس نے چار گھنٹے سے جاری اپنی خاموشی توڑی جو اپنی بیٹی سے براہِ

راست صرف اتنا کہنے کے لیے تھی، ''میں میڈموزیل بلیر نورما سے یہ کہنے پر فخر محسوس کر رہا ہوں کہ وہ مجھ سے آئندہ اس کے بارے میں بات کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔''

آنٹی بلیر نورما نے ہر قسم کی کوشش سے دستبرداری کا اعلان کرتے ہوئے یہ تشخیص کی، ''میرے والد نے اس غلطی کے بعد میری بہن کی کبھی پروا نہیں کی۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ماریوں سے نفرت کرتے ہیں۔''

''غلطی کے بعد'' سے مراد تھی، ''کرنل سے شادی کرنے کے بعد۔''

بہرحال، جیسا کہ قاری قیاس کر چکا ہے، میڈموزیل اپنے پسندیدہ شخص، نیز وبازوں کے افسر کو ماریوں کا متبادل بنا نہیں سکی تھیں۔ تھیوڈول متبادل کے طور پر اچھا نہیں تھا۔ موسیو بلیر نورما نے کسی قسم کی ادل بدل کو قبول نہیں کیا۔ دل کا حجرہ عارضی انتظام کے لیے خالی نہیں ہوا کرتا۔ تھیوڈول، جسے وراثت کی سُن گُن ہو گئی تھی، خوش نہیں تھا۔ لفٹنٹ تھیوڈول، بلاشبہ، خوش مزاج آدمی تھا مگر باتونی، غیر سنجیدہ، عامیانہ، بلند درجے کی زندگی گزارنے والا، بری صحبت میں بار بار شامل ہونے والا تھا؛ یہ سچ ہے کہ اس کی داشتائیں بھی تھیں، اور وہ ان کے بارے میں بہت باتیں کرتا تھا، مگر وہ بات بہت بری طرح کرتا تھا، جو اس کی تمام اچھی خوبیوں میں ایک عیب تھا۔ بابل اسٹریٹ کے نواح میں اس کے معاشقوں کی باتیں سُن سُن کر موسیو بلیر نورما کے کان پک گئے تھے۔ اس پر مستزاد، کبھی کبھی لفٹنٹ بلیر نورما سہ رنگی کلغی لگی وردی پہن کر آ جاتا تھا۔ یہ موسیو بلیر نورما کے لیے کسی طرح بھی قابلِ برداشت نہ تھا۔ بالآخر، بابا بلیر نورما نے ایک دن اپنی بیٹی سے کہہ دیا، ''میں اب اس تھیوڈول کے بچے سے تنگ آ گیا ہوں۔ امن کے دنوں میں مجھے جنگجوؤں سے زیادہ رغبت نہیں ہوتی۔ مگر تم چاہو تو اسے آنے دیا کرو۔ نجانے کیوں مجھے تلواریں چمکانے والوں کے مقابلے میں کاٹ کرنے والے اچھے لگتے ہیں۔ نیام کی کھڑکھڑ کے مقابلے میں تلواروں کی دھار کا آپس میں ٹکراؤ کم ہولناک ہوتا ہے۔ اور لڑاکوں کی طرح سینہ تان کر چلنا، لڑکیوں کی طرح سنگھار کرنا اور زرہ بکتر کے اندر رہنا دوگنی نامعقولیت کی بات ہوتی ہے۔ آپ سچے آدمی ہیں تو اکڑفوں والے اور متاثرہ ماحول سے بے تعلق رہتے ہیں۔ نہ وہ ہنگامہ کرنے والا آدمی ہے نہ ڈرپوک ہے۔ اپنے تھیوڈول کو اپنے پاس رکھیے۔''

اس کی بیٹی نے کہا، ''مگر وہ تو آپ کا نواسا ہے۔'' مگر اس کی بات رائگاں گئی۔ موسیو بلیر نورما نانا تو کیا، اس کا ماموں بھی نہیں بن سکا۔

دراصل، وہ سمجھ دار آدمی تھا اور اس نے اپنے تئیں دونوں رشتوں کا تقابل کر لیا۔

تھیوڈول نے اسے ماریوں سے کہیں زیادہ افسردہ کر دیا تھا۔

ایک شام — وہ جون کی چوبیس تاریخ تھی، پھر بھی فادر ہیلیر نورما نے آتش دان میں آگ جلا رکھی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہا، جو برابر والے کمرے میں بیٹھی کچھ سی پرو رہی تھی۔ موسیو ہیلیر نورما پادریوں کی طرح، آتش دان کے جنگلے پر پاؤں پسارے، نو حصوں والی پالش کی ہوئی چوبی اسکرین کے پیچھے، اس میز پر اپنی کہنی ٹکائے جس پر پر سبز شیڈ تلے دو موم بتیاں جل رہی تھیں، پٹے ہوئے پارچے سے ڈھکی آرام کرسی میں دھنسا، ہاتھ میں ایک کتاب لیے تھا، جسے وہ پڑھ نہیں رہا تھا، بس اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ عادت کے مطابق ملبوس، کسی رنگیلے کی طرح نظر آرہا تھا جس میں Garat کی بنائی ہوئی کسی قدیم تصویر کی شباہت تھی۔ جب بھی وہ، بشپ کے روئی بھرے بڑے سے لبادے میں ملبوس، جس میں اس کی اصلیت چھپ جاتی تھی، سڑک پر نکلتا تو جب تک اس کی بیٹی اس کے آڑے آنہ جاتی، لوگ اس کے پیچھے دوڑنے لگتے تھے۔ گھر میں وہ ڈریسنگ گاؤن نہیں پہنتا تھا، سوائے اس وقت کے جب وہ سونے جاتا۔ اس لیے کہ اس کے خیال میں ''اس کو پہن کر آدمی عمر رسیدہ نظر آتا ہے۔''

فادر ہیلیر نورما ماریوں سے محبت بھی کرتا اور تلخی سے پیش بھی آتا تھا؛ اور تلخی ہمیشہ قوی تر ہوتی تھی۔ اس کی نرم دلی کو اگر کوئی بد مزہ کر دیتا تو نرمی اُبل کر غیظ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ وہ اس نقطے پر پہنچ گیا تھا جہاں انسان اپنے ذہن کو تیار کر لیتا ہے اور اسے قبول کر لیتا ہے جو اس کا دل توڑتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتا رہتا تھا کہ اب کوئی وجہ باقی نہیں رہی جس کی بنا پر ماریوں واپس آئے، کہ اگر وہ واپسی کا ارادہ کرتا بھی تو بہت پہلے آچکا ہوتا، کہ اس کی واپسی کے خیال کو بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے، کہ اسے ''ان حضرت'' کو دیکھے بغیر ہی مر جانا چاہیے۔ اس کی فطرت باغی ہو گئی؛ اس کی عمر رسیدہ پدریت نے اسے منظور نہیں کیا۔ ''اچھا!'' اس نے خود سے کہا — یہ اس کا بے چین اندازِ ضبط تھا — ''وہ واپس نہیں آئے گا!'' اور اس کا بالوں سے محروم سر اس کی اپنی چھاتی سے لگ گیا، اور اس کی غم انگیز نظریں اس کے آتش دان کی راکھ پر مرکوز ہو گئیں۔

ابھی وہ مراقبے کی سی کیفیت میں تھا کہ اس کا پرانا ملازم باسک داخل ہوا اور اپنے آقا سے سوال کیا،

''موسیو! کیا آپ ماریوں کو اندر آنے کی اجازت فراہم کریں گے؟''

بوڑھا آدمی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، اس کا چہرہ زرد ہو گیا، جیسے بجلی کا کرنٹ لگ جانے

سے کوئی مردہ اُٹھ بیٹھے۔ اور اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا، "کیا کہا تم نے.... موسیو ماریوں؟"

"معلوم نہیں۔" باسک نے جواب دیا۔ اپنے مالک کی کیفیت سے ڈر کر بولا، "میں نے نہیں دیکھا۔ نکولے آئی تھی اور اس نے مجھ سے کہا ہے ایک نوجوان آیا ہے، اور بتادو کہ وہ موسیو ماریوں ہے۔"

بابا ہلیر نورما ہکلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا، "اندر بلالو۔"

اور وہ اسی کیفیت میں، سر ہلاتا رہا۔ اس کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں، جو ایک بار پھر کھلیں۔ دروازے سے ایک آدمی داخل ہوا۔ اور وہ ماریوں ہی تھا۔

ماریوں دروازے پر ہی رُک گیا، گویا وہ داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہا ہو۔

سایے کے دھندلکے میں اس کا گندہ لباس نظر نہیں آیا۔ صرف اس کا سکون، سنجیدہ مگر حیرت انگیز اداس چہرہ نظر آیا تھا۔

کئی منٹ تک فادر ہلیر نورما حیرانی اور خوشی سے مبہوت اس چمک کے سوا کچھ دیکھ نہیں سکا تھا جو کسی اگیا بیتال کے آنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چکرا کر گر جانے والا تھا؛ اس نے ماریوں کو چکاچوند کردینے والی روشنی میں دیکھا۔ یقینی طور پر وہی تھا، یقینی طور پر وہ ماریوں ہی تھا۔ بالآخر چار برس بعد، وہ اسے مجسم دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماریوں کو عمدہ، وجیہ، ممتاز، مکمل آدمی، وضع قطع میں مناسب اور دل رُبا کیفیت میں پایا۔ بے ساختہ اس کا جی چاہا کہ اپنے بازو پھیلا دے، اسے اپنی طرف بلائے اور خود آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لے۔ اس کا دل بے خودی سے پگھل گیا، محبت بھرے الفاظ کا ہجوم اُبھرا اور اس کے سینے کو لبریز کر گیا؛ اس کی ساری نرم دلی ابھر کر اس کے لبوں پر آ گئی، مگر اس ختلاف نے جو اس کی فطرت کی بنیاد تھا، اس میں سختی پیدا کر دی تھی۔ اس نے اچانک کہا، "کس لیے آئے ہو؟"

ماریوں نے گھبراہٹ میں جواب دیا، "موسیو......"

موسیو ہلیر نورما بہت خوش ہوتا اگر ماریوں خود کو اس کے بازوؤں میں ڈال دیتا۔ وہ ماریوں سے اور خود اپنے آپ سے بھی ناراض تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس نے اکھڑپن کا مظاہرہ کیا تھا، اور ماریوں نے سرد مہری کا۔ اسی وجہ سے وہ نیک انسان ناقابل برداشت ہو گیا تھا اور اس میں الجھن کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی تاکہ اندر سے وہ نرم اور باہر سخت معلوم ہو۔ تلخی واپس آ گئی تھی۔ اور وہ چڑچڑے انداز میں ماریوں سے مخاطب ہوا، "تو پھر، آئے کس لیے ہو؟"

"تو پھر"! ان دو لفظوں سے وہ کہنا چاہ رہا تھا تم مجھ سے گلے کیوں نہیں ملتے۔ ماریوں

نے اپنے نانا کی طرف دیکھا، خوف نے اس کے چہرے کو سفید پتھر کر دیا تھا۔

"موسیو....."

"کیا تم مجھ سے معافی مانگنے آئے ہو؟ کیا تم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہو؟"

اس کا خیال تھا کہ وہ ماریوس کو صحیح راستے پر ڈال رہا تھا اور یہ بھی کہ "بچہ" سرنگوں ہو جائے گا۔ ماریوس کانپ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اپنے باپ کو ترک کر دیا تھا؛ ماریوس نے نظریں نیچی کر لیں اور جواب میں کہا: "نہیں، جناب!"

"پھر" بوڑھے آدمی نے تند لہجے میں کہا، جو غم اور تلخی سے بھرپور تھا، "مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

ماریوس نے اپنے ہاتھ باندھ لیے، ایک قدم آگے بڑھا اور کم زور، لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "جناب، مجھ پر رحم کیجیے۔"

ان لفظوں نے موسیو ژیلنورما کو موم کر دیا؛ اگر یہ الفاظ پہلے کہے گئے ہوتے تو وہ ٹھنڈا ہو گیا ہوتا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ نانا اٹھا، دونوں ہاتھوں سے اپنی بید کی چھڑی کا سہارا لیا؛ اس کے لب سفید ہو گئے تھے، اس کے ابرو اوپر نیچے ہو رہے تھے، مگر اس کا جثہ جھکنے کے بعد بھی ماریوس سے اونچا تھا۔

"جناب! آپ پر رحم کریں! یعنی، ایک جوانی اکیانوے برس کے بوڑھے انسان سے رحم کی طلب گار ہے۔ تم زندگی شروع کر رہے ہو، میں اسے خیر باد کہہ رہا ہوں؛ تم بلیرڈ کھیلتے ہو، کیفے میں کھیل کود کرنے جاتے ہو؛ تم میں مزاح ہے، تم عورتوں کو خوش کر دیتے ہو، تم بہت وجیہ انسان ہو؛ اور میں! میں، موسمِ گرما کے بیچ اپنی جلتی ہوئی شاخ پر پانی ڈال رہا ہوں؛ تم اس دولت سے دولت مند ہو جو واقعی دولت ہوتی ہے، میرے پاس کیا ہے؟ عمر کا افلاس ہے؛ ضعف ہے، تنہائی ہے؛ تمھارے بتیس دانت ہیں، اچھا ہاضمہ ہے، شوخ آنکھیں ہیں، توانائی ہے، اشتہا ہے، صحت ہے، سرور ہے، سر پر کالے بالوں کا جنگل ہے؛ میرے پاس تو سفید بال بھی نہیں، میرے دانت جھڑ گئے ہیں، میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں، میری یادداشت ختم ہو رہی ہے؛ میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ میں ان تین سڑکوں Charlot، du Chaume اور Saint-Claude کے ناموں میں الجھتا رہتا ہوں؛ تمھارے آگے سورج کی روشنی سے بھرا پڑا مستقبل ہے، میری آنکھ کی روشنی ختم ہوتی جا رہی ہے، میں رات کے اندھیرے کی طرف بڑھ رہا ہوں؛ تم محبت کر رہے ہو، پوری دنیا میں کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا؛ اور تم مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہو؟ خدایا! تم

نے تو مولیئر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔کیا اسی طرح تم عدالت میں وکیلوں سے بھی ٹھٹھا کرتے ہو۔تم واقعی تعریف کے قابل ہو۔تم انوکھے آدمی ہو۔"

اور نوّے سالہ سنجیدہ اور غصے سے بھری آواز سے بولتا رہا، "اچھا،تم کیا چاہتے ہو؟"

"جناب!" ماریوس نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ میری موجودگی آپ کو پریشان کر رہی ہے،مگر میں تو آپ سے ایک شے مانگنے آیا ہوں، اور فوراً واپس چلا جاؤں گا۔"

"تم احمق ہو۔"بوڑھے نے کہا،"کس نے کہا کہ تمھیں واپس جانا ہوگا؟"

بوڑھے کے دل میں جو جذبات موجزن تھے، ان کا مطلب یہ تھا:

"مجھ سے معافی مانگو اور گلے لگ جاؤ!"

موسیو کو محسوس ہو رہا تھا کہ چند لمحوں بعد ماریوس واپس چلا جائے گا، کہ اس کی سخت باتوں نے نوجوان کو پسپا کر دیا ہے، کہ اس کی سختی نوجوان کو بھگا رہی تھی؛ اس نے یہ سب اپنے آپ سے کہا اور اس نے اس کے غم میں اضافہ کر دیا تھا؛ اس کے غم کو طیش میں بدل دیا، اس کی سختی میں اضافہ کر دیا۔وہ چاہتا تھا کہ ماریوس اسے سمجھنے کی کوشش کرے، اور ماریوس سمجھ نہیں رہا تھا۔اور بوڑھا برہم ہوتا جا رہا تھا۔

وہ پھر بولا، "کیوں،تم مجھے،اپنے نانا کو چھوڑ کر بھاگ گئے،تم میرا گھر چھوڑ کر چلے گئے، نجانے کہاں،کسی کو خبر نہ ہوئی،تم نے اپنی خالہ کو اداس کر دیا،تم چلے گئے،صاف ظاہر ہے،کنواری زندگی گزارنے کے لیے؛ بانکے، چھیل چھبیلے بننے کے لیے،جب چاہتا گھر آتا، تفریح کرتا؛ مجھے ابھی تک تم میں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے، مجھے بتائے بغیر تم مقروض ہو گئے ہو، کھڑکیاں توڑنے والے، ہنگامہ کرنے والے بن گئے ہو اور اب چار برس بعد میرے پاس آئے ہو صرف اتنا کہنے کے لیے!" اس طرح کا سخت انداز نواسے کو بھگانے کا انداز، صرف ماریوس کی خاموشی پر منتج ہوا۔موسیو ییلر نورمانے اپنے ہاتھ باندھ لیے، جو متکبرانہ انداز تھا جس نے ماریوس کو تلخ کر دیا تھا۔

"اب یہ ساری باتیں ختم۔تم مجھ سے کچھ مانگنے آئے ہو تو کہو کیا ہے؟ کیا بات ہے؟ بولو۔"

"جناب!" ماریوس نے اس عورت کی طرح کہا جو کسی کھڑی چٹان سے کودنے والی ہو "میں آپ سے شادی کرنے کی اجازت مانگنے آیا ہوں۔"

موسیو ییلر نورمانے گھنٹی بجائی۔باسک نے دروازہ کھول کر جھانکا۔

"میری بیٹی کو بلاؤ۔"

ایک سیکنڈ بعد ایک بار پھر دروازہ کھلا، میڈموزیل ییلر نورما اندر داخل نہیں ہوئی مگر نظر

آرہی تھی؛ ماریوس بالکل خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ لٹکے ہوئے تھے، چہرہ کسی مجرم جیسا تھا؛ موسیو ژلینر نورما کمرے میں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا، ''کچھ نہیں۔ بس موسیو ماریوس آئے ہیں۔ ان کو دن بخیر کہو۔ موسیو شادی فرمانا چاہتے ہیں۔ بس اتنا ہی کہنا تھا۔ جاؤ۔''

بوڑھے کی ناخوش گوار بھرائی آواز نے ایک حیرت بھرا اعلان کر دیا۔ پھوپھی نے خوف زدہ نظروں سے ماریوس کو گھور کر اس طرح دیکھا گویا اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو؛ اس کے منہ ایک لفظ کا ٹکڑا بھی نکل نہیں پایا، اور اپنے بابا کی سانس کے طوفان سے پہلے پیال کے تنکے کی طرح تیزی سے غائب ہو گئی۔

اس دوران فادر ژلینر نورما واپس آ کر چمنی کے طرف پشت کر کے ایک بار پھر بیٹھ گیا تھا۔

''تم ہیں اور ایک (اکیس برس) میں ہو! تم شادی کرنا چاہتے ہو۔ تم نے طے کر لیا ہے۔ تمھیں صرف اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ بھی رسمی سی۔ [طنزاً] بیٹھ جایئے، جناب عالی! گویا، کسی Jacobin کو برتری مل گئی ہے۔ آپ تو بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ چوں کہ آپ بیرن ہیں اس لیے کیا آپ ریپبلکن نہیں؟ جمہوریہ تو بیرنوں کو خوب مزے کراتی ہے۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو جولائی کے فوارے ہوئے ہیں؟ جناب عالی، کیا آپ کبھی Louvre تشریف لے گئے ہیں؟ بہت قریب ہے، Saint-Antoine اسٹریٹ پر، des Nonamdieres کے بالکل سامنے، وہاں ایک مکان کی تیسری منزل پر توپ کا ایک گولا دھنسا ہوا ہے دیوار میں جس پر July 28th,1830 لکھا ہے۔ جایئے اور غور سے دیکھیے۔ اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اُف! آپ کے وہ دوست کتنے اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ کیا وہ موسیو le Duc de Berry کی یادگار پر فوارہ نہیں بنا رہے ہیں؟ اچھا! تو آپ شادی فرمانا چاہتے ہیں؟ مگر کس سے؟ کیا بد احتیاطی کے بغیر آپ سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے؟''

اس نے توقف کیا، اور قبل اس کے کہ ماریوس کو جواب دینے کا وقت ملتا، اس نے نہایت شدت سے اپنی بات میں اضافہ کیا، ''اچھا بتاؤ تو سہی، تمھارا پیشہ کیا ہے؟ کیا بہت دولت جمع کر لی ہے تم نے؟ وکالت کے پیشے میں تم کتنا کما لیتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' ماریوس نے بڑے استقلال، ہمت اور تندی سے جواب دیا۔

''کچھ نہیں؟ تو زندگی گزارنے کے لیے بس وہی بارہ سو چاندی کے سکے ہیں جو میری جانب سے ملتے ہیں؟''

ماریوس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ موسیو نے بات جاری رکھی، ''تب تو، میرا خیال ہے لڑکی دولت مند ہو گی؟''

''ویسی ہی دولت مند ہے جیسا میں ہوں۔''

''کیا—! جہیز بھی نہیں ملے گا؟''

''جی نہیں۔''

''توقعات؟''

''میں اس کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔''

''لاحول ولا.....! باپ کیا کرتا ہے؟''

''مجھے علم نہیں۔''

''اچھا، تو لڑکی کا نام کیا ہے۔''

''میدموزیل فوشلواں۔''

''فوش..... کیا؟''

''فوشلواں۔''

''آخ تھو—! بوڑھے نے فوراً کہا۔

''جناب!'' ماریوس نے چیخ کر کہا۔

موسیو جلیر نورمانے اس کی بات کاٹی، اس انداز میں جیسے وہ خود کلامی کر رہا ہو:

''ٹھیک ہے، عمر ایک اور بیس (اکیس سال)، کام نہیں کرتے، آمدنی چاندی کے بارہ سو سکّے سالانہ، مادام بیرن پوں مرسی سبزی فروش سے چند سو قیمت کا پارسلے خریدنے جایا کریں گی!''

''جناب!'' ماریوس نے اپنی بات دہرائی آخری امید پر جو ختم ہوتی جا رہی تھی، ''میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ میں صدقِ دل سے، ہاتھ جوڑ کر، آپ کے قدموں میں گر کر، خدا کے واسطے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس سے شادی کرنے کی اجازت دے دیجیے۔''

بوڑھا زور سے چیخا پھر قہقہہ مار کر غم انگیز انداز میں ہنسنے لگا، جس میں اس کی کھانسی بھی شامل تھی۔ ''آہا..... آہاہا..... آہاہاہا! تم نے خود سے کہا ہو گا، خدا کی قسم میں اس بے مغز بوڑھے، اس بیوقوف کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ افسوس کہ میں پچیس کا نہیں ہوا ہوں۔ پھر بھی بہت آرام سے اسے طلب کروں گا۔ کتنے مزے سے اس کے بغیر ہی زندگی گزار رہا ہوں۔ کوئی مشکل نہیں ہو گی، اور میں اس سے کہوں گا 'تم مجھ سے مل کر خوش ہو رہے ہو، احمق انسان، میں میدموزیل نجانے کون،

بنتِ نامعلوم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، میرے پاؤں میں جوتے نہیں، اس کے بدن پر قمیص نہیں، پھر بھی ٹھیک ہے: میں اپنا معاش، اپنا مستقبل، اپنی جوانی، سب کچھ کتوں کے آگے ڈال رہا ہوں؛ میں ایک عورت گلے باندھ کر بدنصیبی کے تالاب میں چھلانگ مارنا چاہتا ہوں، یہ بھی ایک خیال ہے، تم کو جس پر صاد کردینا چاہیے۔ اور وہ بڈھا کھوسٹ اجازت دے دے گا۔ جاؤ نوجوان، جو چاہے کرو، کمر میں پتھر باندھ لو، اپنی پوسلوون، اپنی کوپلوون، جو بھی ہو، سے شادی کر لو۔ نہیں جناب عالی، کبھی نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"بابا!"

"ہرگز نہیں۔"

جس لہجے میں "ہرگز نہیں" کہا گیا تھا اس نے ماریوس کی امیدیں ختم کر دی تھیں۔ آہستہ آہستہ، سر جھکائے، لڑکھڑاتے، کسی مرتے ہوئے انسان کی طرح جو صرف وداع کہنے آیا ہو، اس نے کمرہ پار کیا۔ موسیو ژیلنورما نے اپنی نظروں سے اس کا پیچھا کیا، اور اس وقت تک جب دروازہ کھلا اور ماریوس باہر قدم رکھنے والا تھا، موسیو ژیلنورما چار قدم آگے بڑھا، اور بڑھاپے کی زندہ دلی، تیزی سے اور کسی بگڑے بوڑھے کی طرح اس نے ماریوس کو گلے سے پکڑ لیا، گھسیٹتا ہو واپس کمرے میں لایا، ایک آرام کرسی میں دھکیل دیا۔

"مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔"

بس وہ ایک لفظ "بابا" تھا جس نے یہ انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

ماریوس حیران پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔ موسیو ژیلنورما کے بلتے ہو چہرے سے تندی غائب ہوگئی تھی اور ناقابلِ بیان نیک دلی آشکار تھی۔ نانا کے سامنے بزرگی نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"آؤ، دیکھو، بولو، مجھے اپنے عشق کے بارے میں، بیہودہ باتوں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے سب کچھ بتا دو۔ اُف، یہ نوجوان لوگ بھی کیسے ہوتے ہیں۔"

"بابا!"

بوڑھے کا پورا وجود ناقابلِ بیان تابناکی سے روشن ہوگیا۔

"ہاں، بس تم مجھے بابا کہتے جاؤ اور دیکھتے جاؤ۔"

اس کے اکھڑپن میں، پدرانہ انداز میں اتنی صاف دلی تھی، اتنی نرمی تھی، اتنی مہربانی تھی کہ مایوسی سے امید میں اس کی اچانک تبدیلی نے ماریوس کو حیران پریشان کردیا تھا اور اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ میز کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور موم بتی کی روشنی اس کے لباس

کی خستہ حالی کو اجاگر کر رہی تھی، جسے فادر ہلیر نورما نے حیرانی سے دیکھا۔

"اچھا بابا—!" ماریوس نے کہا۔

"ارے ہاں" موسیو ہلیر نورما نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یعنی، تمھارے پاس دمڑی بھی نہیں؟ تم تو کسی گرہ کٹ کے سے لباس میں ہو۔"

اس نے میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا، ایک بٹوہ نکالا اور میز پر رکھ دیا، "یہ رہے ایک سو لوئی، اپنے لیے ہیٹ خرید لینا۔"

"بابا!" ماریوس نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "کاش آپ جان سکتے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے؛ پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ لکسمبرگ آئی ہوئی تھی؛ پہلے تو میں نے اس کی پروا نہیں کی، اور پھر نہ جانے کیا ہوگیا، کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ اُف! کیا بتاؤں کہ اس محبت نے مجھے کتنے دُکھ دیے تھے، مگر اب، کم از کم، میں اسے ہر روز دیکھ سکتا ہوں، اس کے اپنے گھر میں، اس کے باپ کو علم نہیں، اور ذرا غور کیجیے کہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں۔ میں اس کے باغیچے میں اس سے ملتا ہوں، شام کے وقت۔ اب اس کا باپ اسے انگلستان لیے جا رہا ہے؛ تو میں نے خود سے کہا، میں اپنے نانا سے ملنے جاؤں گا اور اس کے بارے میں انھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یا تو مجھے پاگل ہو جانا چاہیے، یا مر جانا چاہیے، یا بیمار ہو جانا چاہیے یا میں دریا میں چھلانگ لگا لوں۔ مجھے ضرور اس سے شادی کر لینی چاہیے، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ ہے سچائی، پوری سچائی، اور میرا خیال ہے کہ میں نے کچھ چھوڑا نہیں ہے۔ وہ پلومے اسٹریٹ پر ایک باغیچے والے گھر میں رہتی ہے جس کے اطراف لوہے کا جنگلا لگا ہے، Invalides کے بالکل قریب۔"

فادر ہلیر نورما اپنے دمکتے چہرے کے ساتھ ماریوس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ماریوس کی باتیں سنتے ہوئے اس نے ایک چٹکی ناس کی ناک میں ڈال لی تھی۔ پلومے اسٹریٹ کا نام سنتے ہی اس نے سانس روک لی اور بقیہ ناس نکل کر اس کے گھٹنوں پر جا پڑی۔

"پلومے اسٹریٹ، پلومے اسٹریٹ، یہی کہا تھا نا تم نے؟ اچھا۔ اس کے جوار میں بیرکیں بھی تو ہیں نا۔ تمھارے عم زاد نے اس کے بارے میں مجھے بتایا ہے— نیزے بردار دستے کا افسر، ایک خوش مزاج لڑکی، بہت اچھی دوست! خدایا۔ ہاں، اچھا، پلومے اسٹریٹ۔ وہی جو کبھی بلومے اسٹریٹ کہلاتی تھی— اب مجھے یاد آ رہا ہے۔ میں نے پلومے اسٹریٹ کی جنگلے والی لڑکی کے بارے میں سنا ہے۔ تمھاری پسند اچھی ہے۔ لڑکی بہت صاف ستھری مخلوق ہے۔ آپس کی بات

ہے، وہ احمق نیزہ باز اس سے پینگیں بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ یہ سب کہاں کرتا ہے۔ مگر ہمیں اس سے مطلب نہیں۔ مگر اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ ماریوں! وہ بڑا شیخی باز شخص ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم جیسے نوجوانوں کو محبت کرنی چاہیے۔ تمھاری عمر میں یہ سب چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ تم Jacobin کے بجائے عاشق اچھے لگتے ہو، تم مجھے پیٹی کوٹ سے محبت کرتے اچھے لگتے ہو، موسیو Robespierre کے مقابلے میں میں پیٹی کوٹ سے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے، میں سچ کہوں گا کہ میں نے بغیر جانگھیہ والیوں کی قطار میں سے کسی سے نہیں، صرف عورت سے محبت کی ہے۔ خوب صورت لڑکیاں خوب صورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور وہ چھوٹی سی اپنے باپ کی اجازت کے بغیر تمھارے پاس آتی ہے۔ ان معاملات میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ میں نے بھی اس قسم کی حرکتیں کی ہیں۔ ایک سے زیادہ بار۔ تمھیں پتا ہے کہ اس کے بعد ہم کیا کرتے ہیں؟ ایسا معاملہ ورندے پن سے حل نہیں کیا جاتا۔ انسان کو عقل مندی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ آدمیوں کے ساتھ بھاگ جاؤ؛ شادی مت کرو۔ اپنے نانا سے مدد لو، جو اچھا آدمی ہے، جس کے پاس میز کی پرانی دراز میں ہمیشہ نقدی ہوتی ہے: تم اس سے کہو گے 'نانا ذرا ادھر دیکھو' اور نانا کہے گا 'یہ معمولی بات ہے' جوانی کو مزے اڑانا چاہیے، اور بڑھاپے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں بھی کبھی جوان تھا، تم بھی کبھی بوڑھے ہو گے۔ اور بیٹا، تم یہ اپنے پوتوں کو وراثت میں دو گے۔ لو یہ دو سو سونے کے سکے لے جاؤ اور عیش کرو۔ اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ اس طرح معاملے سے نمٹنا ہوتا ہے۔ شادی مت کرو، کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ سمجھے کہ نہیں؟"

ماریوں خوف سے گنگ تھا، منہ سے ایک لفظ بھی نکال نہیں سکا، بس سر ہلا کر کہہ دیا وہ کچھ بھی نہیں سمجھا۔

بوڑھا قہقہہ مار کر زور سے ہنسا، اپنی بوڑھی آنکھ ماری، اس کے گھٹنے پر چپت رسید کی، اس کی جانب پُراسرار طریقے سے گھور کر دیکھا، کندھے ہلا کر کہا، "احمق لڑکے! اس کو اپنی داشتہ بنا لے۔"

ماریوں زرد پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس کے نانا نے ابھی کیا کہا ہے۔ بلومے اسٹریٹ، پامیلا، بیرکوں، نیزے باز افسر وغیرہ کے بارے میں مہمل باتیں کسی گھلتے ہوئے نقطۂ نگاہ کی طرح ماریوں کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ اس تمام گفتگو میں سوسن جیسی کوزیت کا کوئی حوالہ نہیں آیا۔ وہ اپنے ذہن میں آوارہ گردی کر رہا تھا، مگر یہ آوارہ گردی ان الفاظ پر ختم ہوئی ماریوں جن کو سمجھ نہیں سکا، جو کوزیت کے لیے مہلک توہین تھی۔ اور وہ الفاظ "اس کو اپنی داشتہ بنا لے" اس نوجوان کے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔

ماریوس اٹھا، اپنی ہیٹ اٹھائی جو زمین پر پڑی تھی، اور اعتماد کے ساتھ دروازے کی طرف چلا۔ وہاں پہنچ کر گھوما، اپنے نانا کے آگے سر جھکایا، سر اٹھایا اور کہا، پانچ برس قبل آپ نے میرے باپ کی توہین کی تھی؛ آج آپ نے میری بیوی کی توہین کی ہے۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ الوداع۔"

پریشان فادر ہلیر نورمانے اپنا منہ کھولا، بازو پھیلائے، اٹھنے کی کوشش کی، اور قبل اس کے منہ سے ایک لفظ نکال سکتا، ایک بار پھر دروازہ بند ہوا اور ماریوس غائب ہو گیا۔

بوڑھا کئی منٹ اس طرح خاموش رہا گویا اس پر بجلی گر پڑی ہو، بولنے یا سانس لینے کی طاقت کے بغیر گویا کسی نے اس کا گلا دبوچ لیا ہو۔ آخر، اس نے آرام کرسی سے اپنا پیچھا چھڑایا، دوڑا، اتنی دور جہاں تک اکانوے برس کا آدمی دوڑ سکتا ہے، دروازہ کھولا اور چیخا:

"مدد، مدد!"

اس کی بیٹی دوڑی آئی، اس کے بعد گھر کے ملازمین۔ اس نے بہت دردمندی سے کہا، "دوڑو— اسے واپس لاؤ— ارے! میں نے کیا کر دیا— وہ پاگل ہو گیا ہے۔ وہ جا رہا ہے۔ او میرے خدا! او میرے خدا۔ اب وہ واپس نہیں آئے گا!"

اور پھر بوڑھا کھڑکی پر گیا جو سڑک پر کھلتی تھی، اپنے عمر رسیدہ اور لرزیدہ ہاتھوں سے کھڑکی کے پٹ کھول دیے، آدھے دھڑ سے لٹک گیا، جب کہ باسک اور نکولے پیچھے سے اسے پکڑے ہوئے تھے، اور چیخنے لگا:

"ماریوس! ماریوس! ماریوس! ماریوس!"

مگر ماریس اسے سُن نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ اس وقت وہ Saint-Louis اسٹریٹ پر مڑ رہا تھا۔

نوّے سالہ بوڑھا روحانی اذیت کا اظہار کرتے ہوئے دو تین بار اپنے ہاتھ کنپٹی تک لے گیا، لڑکھڑایا، اور ایک آرام کرسی پر گر پڑا، نبض رک گئی، آواز بند ہو گئی، آنسو غائب ہو گئے، سر ہلنے لگا، ہونٹ تھرتھرانے لگے، آنکھیں خالی ہو گئیں اور دل کسی غمگین سی شے کے علاوہ ہر شے سے خالی رات سے مشابہ ہو گیا تھا۔

ژاں وِلژاں

اسی شام، تقریب چار بجے، ژاں ولژاں Champ-de-Mars کی سب سے الگ تھلگ ڈھلان کے عقب میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ یا تو یہ اس کی عاقبت اندیشی تھی یا بالکل تنہا بیٹھنے کی خواہش تھی، یا یہ نتیجہ تھا عادات کی ان نامعقول تبدیلیوں کا جو رفتہ رفتہ ہر ایک میں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کے باعث اب وہ کوزیٹ کے ہمراہ کم ہی باہر جاتا تھا۔ وہ بھورے رنگ کے سوتی کپڑے کی پتلون اور کام کے وقت پہننے والی اپنی واسکٹ میں ملبوس تھا اور اس کی چھجے والی ٹوپی اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھی۔

وہ کوزیٹ کے پہلو میں ہوتو بہت پُرسکون اور خوش ہوتا تھا، مگر پچھلے ایک یا دو ہفتے سے اسے ایک اور قسم کی تشویش شروع ہو گئی تھی۔ ایک دن جب وہ بولیوارڈ پر چہل قدمی میں مصروف تھا، اسے تھن آردیئے نظر آ گیا؛ اس کے بہروپ کے طفیل تھن آردیے اسے پہچان نہیں سکا تھا؛ مگر اس کے بعد ژاں ولژاں نے اسے کئی بار اس اطراف میں دیکھا، اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ تھن آردیے اس کے علاقے میں کسی جستجو میں چکر لگا رہا ہے۔

کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

مزید یہ کہ پیرس میں بھی سکون نہیں تھا؛ جس کسی کو اپنی شناخت چھپانی ہوتی، اس کے لیے یہاں کی سیاسی پریشانیاں دُگنی مصیبت بن جاتی تھیں، اس لیے کہ پولیس بے چینی اور بدگمانی کے عالم میں رہتی تھی، اور یہ بھی کہ کبھی کبھی کسی بیوقوف کی، یا Pepin یا Morey جیسے کسی انسان کی تلاش ہو تو ژاں ولژاں جیسے آدمی ہاتھ لگ جایا کرتے ہیں۔

ژاں ولژاں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پیرس، بلکہ فرانس ہی چھوڑ دے گا، اور انگلستان چلا

جائے گا۔ اس نے کوزیٹ کو خبردار کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس ہفتے کے اندر ہی روانہ ہو جائے۔

وہ Champ-de-Mars کی ڈھلان پر بیٹھا تھا اور طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے — تھن آردیے، پولیس، سفر اور پاسپورٹ حاصل کرنے کی مشکلات وغیرہ۔ ان سارے مسائل نے اسے خاصی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اب ایک اور ناقابلِ تشریح امر نے، جس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی، اس کو درپیش خطرات میں اضافہ کر دیا تھا۔

اسی دن صبح کے وقت جب صرف گھر کے اندر وہی جاگ رہا تھا، چل پھر رہا تھا، قبل اس کے کہ باغیچے کی جانب کھلنے والے کوزیٹ کی جھلملی کھلتی، اچانک اس کی نظر دیوار پر پڑی اور اسے مندرجہ ذیل سطر دکھائی دی جو شاید کسی کیل کی نوک سے کندہ کی گئی تھی:

16، Verrerie اسٹریٹ۔

یہ سطر اس جگہ کندہ تھی، جہاں بچھو بوٹی کی ایک جھاڑی تھی، اور دیوار پر تازہ پلستر تھا اور سفیدی کی گئی تھی۔ یہ شاید پچھلی رات ہی لکھی گئی تھی۔ کیا تھی یہ؟ اوروں کے لیے اشارہ؟ اس کے لیے تنبیہ؟

بہرحال یہ واضح تھا کہ باغیچے میں داخلہ ہوا تھا، اور کوئی اجنبی تھا جو اندر پہنچ گیا تھا۔

یکے بعد دیگرے اسے اور بھی واقعات یاد آنے لگے جنھوں نے اہلِ خانہ کو خبردار کر دیا تھا۔ اس کے ذہن کا کینوس نقوش سے بھرتا جا رہا تھا۔ اس نے محض اس خوف سے نوشتۂ دیوار کے بارے میں کوزیٹ سے کوئی بات نہیں کی، کہ وہ پریشان ہو جائے گی۔ اپنے اس گیان دھیان کے دوران اس دھوپ میں ایک سایہ نظر پڑا جو اس کے بالکل پیچھے ڈھلان کی چوٹی پر ٹھہر گیا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنے والا تھا کہ کسی نے چار پرتوں میں تہہ کیا کاغذ کا ایک ٹکڑا پھینکا جو اس کے گھٹنوں پر آ گرا تھا۔ اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا اٹھایا، اس کی تہیں کھولیں، وہ الفاظ پڑھ لیے جو خطِ جلی میں پنسل سے تحریر کیے گئے تھے:

"اس گھر سے چلے جاؤ"

ژاں ولژاں تیزی سے اٹھا، اس وقت ڈھلان پر کوئی نہ تھا؛ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے ایک مخلوق دکھائی دی جو بچے سے بڑی مگر پورے انسان جتنی نہیں تھی، بھورے رنگ کے بلاؤز اور خاکی رنگ کے سوتی پارچے کے پتلون میں ملبوس تھی۔ وہ شخص Champde-Mars کی خندق میں کود کے بھاگ گیا۔

ژاں ولژاں، خیالات میں گم، فوراً اپنے گھر واپس آ گیا۔

❋

ماریوس

ماریوس نے موسیو بلیر نورما کو اداس کردیا تھا۔ وہ اس کے گھر میں بہت کم اُمیدی میں داخل ہوا تھا اور بے پناہ مایوسی کے عالم میں خارج ہوا۔

مگر وہ لوگ جنھوں نے انسانی دل کی گہرائیوں کا مشاہدہ کیا ہے اسے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ فوجی افسر، نیزہ باز، احمق، یعنی عم زاد تھیوڈول اس [موسیو بلیر نورما] کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکا۔ کوئی ڈرامائی شاعر اس اظہار سے کچھ پیچیدگیاں اخذ کر سکتا ہے جو ایک نانا نے اپنے نواسے سے صاف صاف بیان کردی تھیں، مگر اس سے ڈرامے کو جس قدر کچھ حاصل ہوگا، اسی قدر اس کی سچائی کم ہوجائے گی۔ ماریوس عمر کے اس حصے میں تھا جس میں برائی برائی نہیں لگتی؛ اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب سب کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ شکوک وشبہات چہرے کی جھرّیوں جیسے ہوتے ہیں۔ جوانی کی ابتدا میں جھرّیاں نہیں ہوتیں۔ وہ جس نے Othello کو مغلوب کر لیا تھا، Candide [Candide, ou l'Optimisme والٹیر کا ایک طنزیہ کھیل تھا] پر سے بے ضرر خاموشی سے گزر گیا۔ اب کوزیت ہی کو لے لیجیے، ایسے بے شمار جرم تھے جو ماریوس کر سکتا تھا۔

ماریوس نے سڑکوں پر آوارہ گردی شروع کر دی، وہی جو دکھی لوگ کیا کرتے ہیں۔ وہ کسی کے بارے میں سوچ نہیں رہا تھا جسے بعد میں یاد رکھ سکتا۔ دن کے دو بج گئے تھے، جب وہ کوفیراک کے گھر واپس ہوا اور جاتے ہی لباس تبدیل کیے بغیر جسم سے بستر پر گر پڑا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا؛ ماریوس اپنے اداس اندھیروں میں ڈوبا تھا جس میں ذہن میں طرح طرح کی خیال آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب وہ اٹھا تو اس نے کوفیراک، انجولرا، فیوئی اور کامبیر کو کمرے میں، ہیٹ پہنے، جانے کے لیے تیار کھڑا پایا۔

کوفیراک نے اس سے کہا، ''کیا تم جنرل لامارک(Lamarque's) کے دفن میں چلو گے؟''

اسے ایسا محسوس ہوا گویا کوفیراک چینی زبان میں کچھ کہہ رہا ہو۔

کچھ دیر بعد ماریوس باہر نکلا۔ اس نے پستول اپنی جیب میں رکھ لیے تھے جاویر نے جو 3 فروری کی مہم میں اسے فراہم کیے تھے اور ابھی تک اس کے قبضے میں تھے۔ پستول اب بھی بھرے ہوئے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے ذہن میں کس قسم کے خیالات اُبھر رہے تھے جب وہ پستول ساتھ لے کر نکلا تھا۔

سارا دن وہ بے مقصد آوارہ گردی کرتا رہا؛ کبھی بارش ہونے لگتی، جس کا پہلے اسے خیال نہیں آیا تھا؛ رات کے کھانے کے لیے نان بائی سے ایک چینی کا رول خرید کر جیب میں رکھ کر بھول گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا رول کا خیال کیے بغیر ہی دریائے سین میں نہانے اتر گیا ہو۔ ایسے لمحات بھی ہوتے ہیں جب آدمی کے کاسۂ سر میں بھٹی سی روشن ہو جاتی ہے۔ اب اسے کسی چیز کی تمنا نہیں تھی؛ یہ قدم اس نے پچھلی شام کے بعد پہلی بار اٹھایا تھا۔ وہ بے قراری سے رات کے انتظار میں تھا؛ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا جو بالکل واضح تھا؛ خیال یہ تھا کہ اسے نو بجے کوزیٹ سے ملنا چاہیے۔ اس کی یہ آخری خواہش، اس احاس کے بعد اب اس کا پورا مستقبل تھی۔ سنسان ترین سڑکوں پر آوارہ گردی کے دوران، وقفے وقفے سے اسے پیرس سے آتی عجیب قسم کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ اپنے عالمِ استغراق سے نکل کر وہ خود سے کہتا، ''کیا وہاں جنگ ہو رہی ہے؟''

رات ہوتے ہی، کوزیٹ سے وعدے کے مطابق، ٹھیک نو بجے وہ پلومے اسٹریٹ پر تھا۔ جالی کے پاس پہنچتے وقت وہ سب کچھ بھول گیا۔ اسے کوزیٹ سے ملے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے؛ اسے ایک بار اور دیکھنے کا موقع ملنے والا تھا؛ اس کے سارے خیالات محو ہو گئے تھے اور صرف ایک ہی نامعلوم قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند منٹ جن میں آپ صدیاں گزار دیتے ہیں ایسی شاہانہ اور تعجب خیز خصوصیت پر مشتمل ہوتے ہیں کہ اس وقت جب وہ گزرتے ہیں تو دل کو مکمل طور پر بھر کر دیتے ہیں۔

ماریوس نے رکاوٹ ایک طرف کی اور سیدھا باغیچے کی طرف گیا۔ کوزیٹ موجود نہیں تھی، عام طور پر جہاں وہ انتظار کیا کرتی تھی۔ اس نے جھاڑی پار کی اور زینوں کے نزدیک خلا کی طرف بڑھا، ''وہاں وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔ کوزیٹ وہاں بھی نہیں تھی۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو گھر کی جھلملی بند ملی ، باغیچہ سنسان تھا ۔وہ گھر کی طرف واپس گیا اور محبت کے نشے میں مدہوش، خوف زدہ، غم اور بے چینی سے برانگیختہ آدمی کی طرح جھلملی کھڑکائی ۔ ایک بار کھٹکا کیا، دوسری بار پھر کھٹکا کیا، اس امکانی خطرے کے باوجود کہ کھڑکی کھلے گی اور اس کے والد کا غم زدہ چہرہ ظاہر ہوگا، اور اس سے سوال کرے گا، ''کیا چاہتے ہو؟'' جو کچھ آگے نظر آنے والا تھا اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں تھا ۔ جب وہ کھٹکا کر چکا ، اس نے اپنی آواز بلند کی اور چیخ کر کہا، ''کوزیت!'' پھر اس نے تحکمانہ انداز میں پکارا، ''کوزیت!'' کوئی جواب نہیں ملا ۔ اب واقعی سب کچھ ختم ہو گیا تھا ۔ باغیچے میں کوئی نہیں تھا؛ بلکہ پورے گھر میں کوئی نہیں تھا ۔

ماریوس نے اپنی مایوس کن آنکھیں اس ہول ناک گھر پر جما رکھی تھیں جو اتنا سیاہ اور اتنا خاموش تھا جیسے کوئی مزار ، اور وہ بھی خالی ۔ اس نے پتھر کی بنچ پر نظر کی، کوزیت کے ساتھ جس پر بیٹھ کر اس نے کتنا حسین وقت گزارا تھا ۔ پھر وہ زینوں پر جا کر بیٹھ گیا؛ اس کا دل شیرینی اور ہمت سے بھر گیا تھا؛ اس کے خیالات محبت کی گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے اور اس نے خود سے کہا کہ چوں کہ کوزیت چلی گئی ہے تو میرے پاس سوائے مرجانے کے کوئی چارہ نہیں ۔

اچانک اسے ایک آواز سنائی دی جو سڑک کی جانب سے آتی محسوس ہوئی، جو اسے پیڑوں کی جانب بلا رہی تھی ۔ ''مسٹر ماریوس!''

ماریوس کھڑا ہو گیا ۔

''مسٹر ماریوس، آپ یہیں ہیں؟''

''ہاں ۔''

''مسٹر ماریوس!'' آواز نے مزید کہا، ''آپ کے دوست Chanvrerie اسٹریٹ پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں ۔''

آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی ۔ ایپونین کی بھرائی آواز سے مشابہ تھی ۔ ماریوس جلدی سے پھاٹک کی طرف گیا ، رکاوٹ ایک طرف کی ، جھروکے میں سے سر باہر نکالا ، اور اسے بظاہر ایک نوجوان شخص دکھائی دیا جو فوراً ہی اداسی کے اندھیرے میں غائب ہو گیا ۔

۞

موسیو مابوف

ژاں ولیوں کا بٹوا موسیو مابوف کے لیے بے کار تھا۔ موسیو مابوف نے اپنی پیدائشی کفایت شعاری کے باعث آسمانی تحفہ قبول نہیں کیا تھا؛ وہ نہیں مانتا تھا کہ کوئی ستارہ خود کو louis d'or (فرانس کا 1640 میں جاری والا سونے کا سکہ جو انقلاب تک رائج رہا تھا) میں تبدیل کر سکتا تھا۔ وہ یہ بھی ماننے پر تیار نہیں تھا کہ جو کچھ بھی آسمان سے گرا ہو وہ گاوروش کی جانب سے ہی آیا ہوگا۔ وہ بٹوا لے کر علاقے کے پولیس کمشنر کے پاس گیا تا کہ پانے والی گم شدہ چیز کو دعوے داروں کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ دراصل، بٹوا گم ہو گیا تھا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ کسی نے اس کا دعویٰ نہیں کیا، اور یہ موسیو مابوف کے کام کا بھی نہیں تھا۔

پھر بھی، موسیو مابوف کے زوال کی شروعات ہو گئی تھی۔

Jardin des Plantes میں نیل کی کاشت کا تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا، اسی طرح جیسے اس کے Austerlitz کے باغیچے میں کامیاب نہیں تھا۔ پچھلے برس وہ اپنے دربان کی تنخواہ ادا نہیں کر سکا تھا؛ اب، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، مکان کا تین سہ ماہی کا کرایہ بھی چڑھ گیا تھا۔ رہن رکھنے والی دُکان نے تین ماہ گزر جانے کے بعد اس کی فلورا (گل دستے) بنانے کی تانبے کی چادریں فروخت کر دی تھیں۔ کچھ کشمیریے ان میں اسٹیو پکانے لگے تھے۔ تانبے کی چادریں گئیں، گل دستے نامکمل رہ گئے، تو ان کے نقوش کی کتابیں بھی بے کار ہو گئیں، پرانی کتابیں فروخت کرنے والے نے جنھیں ردی کے بھاؤ نہایت کم قیمت پر خرید لیا تھا۔ اس کے زندگی بھر کے کام میں سے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ بیچی جانے والی اشیا سے حاصل ہونے والی نقدی کھانے پینے میں ختم ہو گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے وسائل ختم ہوتے جا رہے ہیں، تو باغیچے سے ہاتھ

اٹھا لیا، باغیچہ ویرانہ بن گیا۔ اس سے قبل، بہت عرصہ پہلے اس نے دو انڈے اور گائے کے گوشت کا ایک لقمہ کھانا بھی ترک کر دیا، جو کبھی کبھی ناشتے میں کھا لیا کرتا تھا۔ رات کا کھانا بھی ڈبل روٹی اور آلوؤں تک محدود ہو گیا تھا۔ اس نے فرنیچر کا آخری حصہ بھی فروخت کر دیا، اس کے بعد فالتو پلنگ، اپنے کپڑے، اور اپنے کمبل، اس کے بعد خشک گل دستے اور ان کی تصاویر بھی فروخت کر دیں؛ اگرچہ اس نے اپنی قیمتی کتابیں بچا رکھی تھیں، جن میں کئی نہایت قدیم اور نہایت قیمتی تھیں۔ ان میں 1560ء میں شائع ہونے والی Les Quadrins Historiques de la Bible، پیئر ڈی بیس کی La Concordance des Bible؛ ژاں باپے کی Les Marguerites de la Marguerite تھی جسے Navarre کی ملکہ کے نام معنون کیا گیا تھا؛ بات مین کی کتاب de la Charge et Dignite de l'Ambassadeur؛ 1644ء کی Florilegium Rabbinicum؛ 1567ء کی Tibullus جس پر یہ شان دار متن 'Venetiis, in aedibus Manutianis' تحریر تھا؛ اور آخر میں 1644ء کی Lyon سے شائع ہونے والی کتاب Diogenes Laertius، جس میں 411 کے مسودے کے مختلف ٹکڑے، تیرہویں صدی کے Vatican کے، 393 اور 394 کے وینس کے مسودے، جن سے ہنری اسٹین (Henri Estienne) نے بہت مفید نتائج اخذ کیے تھے، اور Doric بولی کے متن کے بے شمار مشہور ٹکڑے شامل تھے جو نیپلس کے انیسویں صدی کے کتب خانے کی ملکیت تھے۔ موسیو مابوف اپنے کمرے میں کبھی آگ روشن نہیں کرتا تھا، غروب آفتاب کے بعد سیدھا بستر میں چلا جاتا تا کہ موم بتیاں استعمال نہ کی جائیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا کوئی ہمسایہ نہ تھا: باہر جاتا تو لوگ اسے نظر انداز کر دیتے تھے؛ اسے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا۔ بچے کی بدنصیبی میں ماں کام آتی ہے، نوجوان آدمی کی بدنصیبی میں جوان لڑکی کام آتی ہے؛ بوڑھے کی بدنصیبی میں کوئی بھی کام نہیں آتا۔ تمام تکالیف میں یہ سب سے خراب تکلیف ہوتی ہے۔ پھر بھی فادر مابوف کی بچگانہ طمانیت پوری طرح گئی نہیں تھی۔ کتابوں پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں زندہ دلی عود کر آتی تھی، اور Diogenes Laertius کو دیکھ کر مسکرا دیتا تھا، جو ایک نہایت منفرد کتاب تھی۔ شیشے کے دروازوں والی کتابوں کی الماری فرنیچر کے نام کی واحد شے تھی، اس کے نزدیک جو قطعی طور پر ناگزیر تھی۔

ایک دن مادر پلوٹارک نے اس سے کہا "رات کے کھانے کے لیے میرے پاس نقدی نہیں۔"

رات کے کھانے سے اس کی مراد ایک ڈبل روٹی اور پانچ عدد آلو تھے۔

"قرض پر لے لو۔" موسیو مابوف نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ لوگ مجھے ادھار دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔''

موسیو مابوف نے کتابوں کی الماری کھولی، یکے بعد دیگرے، تمام کتابوں کو اس طرح غور سے دیکھا جیسے کوئی باپ اپنے بچوں کو ختم کرنے سے پہلے ان پر نظر ڈالے گا۔ پھر اس نے تیزی سے ایک کتاب نکالی بغل میں دبائی اور باہر چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد واپس آیا تو اس کی بغل ویران تھی؛ اس نے میز پر تیس سو رکھ دیے اور کہا، ''کھانے کا کچھ انتظام کرو۔''

اس کے بعد سے مادر پلوتارک کو اس کے روشن چہرے پر ہمیشہ غم کی نقاب پڑی دکھائی دیتی تھی، جو پھر کبھی نہیں اٹھی۔ اس کے بعد اگلے دن، اور اس دن کے اگلے دن بھی یہی کرنا پڑا تھا۔

موسیو مابوف ایک کتاب لے کر جاتا اور ایک سکہ لیے واپس ہوتا۔ پرانی کتابوں کا کاروبار کرنے والے سمجھ گئے تھے کہ وہ بیچنے پر مجبور ہے۔ وہی کتاب بیس سو میں فروخت کر دیتا جس کے لیے اس نے اسی دکان پر بیس فرانک خرچ کیے تھے۔۔۔ ایک جلد کے بعد دوسری جلد؛ پورا کتب خانہ اسی راستے چلا گیا۔ کبھی وہ کہتا تھا، ''میں اسی برس کا ہو گیا ہوں'' یعنی اس کی خواہش تھی کہ کتابوں کے دن ختم ہونے سے قبل اس کے دن ختم ہو جائیں۔ اس کی غم انگیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ بس ایک بار ایسا ہوا تھا کہ اسے کچھ راحت نصیب ہوئی تھی۔ وہ رابرٹ اسٹین کی ایک کتاب لے کر گیا جو پینتیس سو میں فروخت کی، اور ایلڈس (Aldus) لیے واپس ہوا جو اس نے Gres اسٹریٹ سے چالیس سو میں خریدی تھی — ''میں پانچ سو کا قرض دار ہوں'' دمکتے چہرے کے ساتھ اس نے مادر پلوتارک سے کہا تھا۔ اس رات انھیں فاقہ کرنا پڑا تھا۔ فادر مابوف کا تعلق Horticultural Society سے تھا۔ وہاں اس کی بدنصیبی سب پر واضح تھی۔ سوسائٹی کا صدر نشین اس سے ملنے آیا؛ وزیر زراعت اور تجارت سے اس کے بارے میں بات کرنے کا وعدہ کر گیا، اور کیا بھی — ''کیوں، کیا!'' وزیر نے زور دے کر پوچھا، ''اچھا، اب سمجھا۔ ایک قدیم خدمت گار ہے، ماہر نباتیات ہے۔ بے ضرر آدمی ہے۔ اس کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے۔'' دوسرے دن صبح کے وقت موسیو مابوف کو وزیر کی جانب سے کھانے کا دعوت نامہ ملا۔ خوشی سے بے حال، اس نے مادر پلوتارک کو دعوت نامہ دکھایا۔ ''ہم بچا لیے گئے ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔ معینہ دن، وہ وزیر کے گھر پہنچا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا خستہ بالاپوش، اس کا لانبا کوٹ اور اس کے موم بھرے جوتے نے دربان کو حیران کر دیا تھا۔ کسی نے اس سے بات بھی نہیں کی، وزیر نے بھی۔ تقریباً دس بجے رات، جب وہ انتظار میں تھا، اسے وزیر کی خوب صورت بیوی کی آواز سنائی دی جو پوچھ رہی تھی، ''یہ بوڑھے صاحب کون ہیں؟'' آدھی رات کے وقت طوفانی ہواؤں کے جھکڑ میں وہ پیدل گھر واپس پہنچا۔ اس نے وزیر کے گھر جانے کی سواری کا کرایہ ادا کرنے کے لیے Elzevir کا ایک قدیم نسخہ فروخت کر دیا تھا۔

ہر رات، سونے سے قبل، اسے Diogenes Laertius کا مطالعہ کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کو یونانی زبان اتنی آتی تھی، اور وہ اس کتاب کے متن کو پڑھ کر لطف لے سکتا تھا۔ اب اس کے پاس تفریح کا اور کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔ کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ اچانک، ایک دن مادر پلوٹارک بیمار ہو گئی۔ روٹی پانی کے لیے نقدی کا نہ ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا کہ دوا خانوں سے دوا دارو خریدنے کے لیے نقدی کا نہ ہونا۔ ایک شام ڈاکٹر نے ایک بہت قیمتی دوا تجویز کر دی۔ بیماری بڑھتی جا رہی تھی، نرس کی بھی ضرورت تھی۔ موسیو مابوف نے کتابوں کی الماری کھولی؛ وہاں کچھ باقی نہ تھا۔ آخری جلد بھی جا چکی تھی۔ بس، Diogenes Laertius رہ گئی تھی۔ اس نے یہ انفرادی کتاب بھی بغل میں دبائی اور باہر چلا گیا۔ وہ 1832ء کے جون کی چوتھی تاریخ تھی۔ وہ Porte Saint-Jacques گیا اور ایک سو فرانک لیے واپس آیا۔ اس نے ملازمہ کے سرھانے پانچ فرانک کے سکے ڈھیر کر دیے اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

اگلی صبح، فجر کے وقت اپنے باغیچے میں زمین پر گرے ایک کھمبے پر جا کر بیٹھ گیا۔ جھاڑیوں کی باڑ سے اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ بالکل ساکت سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں پھولوں کے بیمار تھالوں پر پھر رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی؛ بوڑھا آدمی دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا رہا۔

سہ پہر کے وقت پیرس کی جانب سے غیر معمولی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں گولیاں چلنے اور مختلف قسم کے ہنگاموں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

فادر مابوف نے سر اٹھایا۔ ایک باغبان جاتا نظر آیا؛ اس سے سوال کیا، ''کیسا شور غل ہے؟''

باغبان نے فوراً مگر بے حد لا پروائی سے جواب دیا، ''بلوہ ہو رہا ہے۔''

''کیسا بلوہ؟''

''بس لوگ لڑ رہے ہیں۔''

''کس بات پر لڑ رہے ہیں؟''

''خدا جانے۔'' باغبان نے فوراً جواب دیا۔

''کہاں ہو رہا ہے یہ سب؟''

''Arsenal کے علاقے میں۔''

موسیو اپنے کمرے میں گیا، اپنی ہیٹ اٹھائی، میکانکی انداز میں بغل میں دبانے کے لیے کتاب تلاش کی، ایک بھی باقی نہیں تھی؛ اس کے منہ سے، ''اُف، واقعی!'' نکل گیا، اور حیرانی کے عالم میں وہ گھر سے نکل پڑا۔

۞

سوال کا بیرونی پہلو

انقلاب کس چیز پر مشتمل ہوتا ہے؟ کسی چیز پر نہیں اور ہر چیز پر! ایسی بجلی پر بھی جو رفتہ رفتہ شعلے سے الگ ہو کر آوارہ گردقوت کی طرح اچانک آگے بڑھنے لگتی ہے۔ سانس کا مقابلہ کر نے لگتی ہے ان مردوں سے جو بولتے ہیں، دماغوں سے جو خواب دیکھتے ہیں، نفوس سے جو برداشت کرتے ہیں، جذبات جو آگ لگاتے ہیں، بدنصیبی جو غراتی ہے اور انھیں اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

”کیسے؟“

بے اصولی سے۔ ریاست کی، قانون کی، خوش حالی کے برعکس اور دوسروں کی توہین سے۔

برانگیختہ اعتماد، تلخی آمیز پُر جوشی، بھڑکایا ہوا طیش، دبا کر رکھی گئی جنگی جبلتیں، نوجوانی کی بلند ہمتی، عام قسم کا اندھا پن، تجسس، تبدیلی کا ذائقہ، غیر متوقع کی تشنگی، نئے کھیل کے اشتہارات پڑھنے کا لطف، محبت، تھیٹر میں یاد دلانے والے کی سیٹی؛ مبہم نفرتیں، تلخیاں، مایوسیاں، ہر قسم کی خود پسندی جو سمجھتی ہے کہ مقدر نے اسے دیوالیہ کر دیا ہے؛ بے اطمینانی، کھوکھلے خواب، محدود کر دہ ہوس ناکیاں، زوال کے امکانات، کوئی نتیجہ، مختصر یہ کہ ہر بنیاد میں بھری فضولیات جو آگ پکڑ لیتی ہیں — یہ ہوتے ہیں بغاوت کے عناصر۔ وہ جو سب سے عالی شان ہوتا ہے، جو سب سے نیچا ہوتا ہے؛ وہ لوگ جو شکار کی تلاش میں آوارگی کرتے ہیں، موقعے کے متلاشی، بوہیمیائی، خانہ بدوش، چوراہوں کے خانہ بدوش، مکانوں کے صحرا میں سونے والے جن پر آسمان کے ٹھنڈے بادلوں کے سوا کوئی چھت نہیں ہوتی، وہ جو ہر روز کی روٹی محنت سے نہیں امکانات سے طلب کرتے ہیں، جنھیں افلاس اور عدمیت (nothingness) کا مزہ معلوم نہیں ہوتا، اسلحے سے عاری، نعلین سے عاری ہوتے ہیں بغاوت کا حصہ ہوتے ہیں۔ جو شخص ریاست، زندگی یا مقسوم کے کسی عمل کے خلاف اپنے اندر خفیہ

بغاوت کی اُمیدوں کی پرورش کرتا ہے بلوے کے لیے زرخیز ہوتا ہے، اور جوں ہی اس کا ظہور ہوتا ہے کانپنے لگتا ہے اور خود کو گرداب میں گھرا پاتا ہے۔

بغاوت سماج کی فضا کا فوارہ ہوتا ہے جو مخصوص قسم کی حرارت میں پھوٹ نکلتا ہے، اور جب یہ گرداب کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو بڑھتا ہے، کم ہوتا ہے، پھاڑتا ہے، تہس نہس کرتا ہے، کچلتا ہے، منہدم کرتا ہے، جڑ سے اکھاڑتا ہے، اور ادنیٰ و اعلیٰ کو، فطرتوں کو، توانا اور کم زور آدمیوں کو، درخت کے تنوں اور تنکوں کو، ہر شے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ وائے ہو اس پر جسے یہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے، اور اس پر بھی جس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ ایک کو دوسرے سے الگ کر دیتا ہے۔ یہ ان سے رابطے میں رہتا ہے جنھیں گرفت میں لے لیتا ہے، اور جن کے پاس ناقابلِ بیان طاقت ہوتی ہے۔ یہ پہلے سامنے آجانے والے کو واقعات کی قوت سے بھر دیتا ہے؛ یہ ہر شے کو حرکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ بے ہنگم پتھر سے توپ کا گولا بنا لیتا ہے، اور جرنیل کو دربان بنا لیتا ہے۔

اگر ہم مخصوص چالاک سیاسی نظریات کی ندا پر یقین کر لیتے ہیں تو قوت کے نقطۂ نگاہ سے بغاوت مرغوب ہو جاتی ہے۔ اس کا نظام کیا ہوتا ہے: بغاوت ان حکومتوں کو مضبوط کرتی ہے، جنھیں اُلٹتی نہیں۔ یہ فوج کا امتحان لیتی ہے، بورژوا کو تقدس دیتی ہے، پولیس کا خون چوس لیتی ہے۔ یہ جسمانی کسرت کی مشق ہوتی ہے؛ یہ تقریباً ایک اصولِ صحت ہوتی ہے۔ بغاوت کے بعد قوت کی صحت اچھی ہو جاتی ہے، اسی طرح جیسے اچھی طرح مالش کے بعد کسی انسان کی حالت ہوتی ہے۔

تیس برس قبل بھی بغاوت کو دوسرے نقطہ ہائے نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔

ہر شے کے لیے ایک نظریہ ہوتا ہے جو خود کو ''اچھے معنوں'' میں مشتہر کرتا ہے؛ جیسے صدق اور کذب کے درمیان مصالحت؛ تشریح، تنبیہ، بلکہ ہلکا پن جو، چوں کہ الزام اور چشم پوشی میں مل جل جاتا ہے خود کو دانش سمجھنے لگتا ہے، اور اکثر صرف اظہارِ تفاخر کرتا ہے۔ پورا دبستانِ سیاست جسے ''سنہرا تعاون'' کہا جاتا ہے اسی کی پیداوار ہوتا ہے۔ جیسے ٹھنڈے اور گرم پانی کے درمیان نیم گرم پانی کی موجودگی۔ ایسے دبستان میں گہرائی نہیں ہوتی ہے، جو کچھ ہوتا ہے بالائی سطح پر ہوتا ہے، جو اثرات کو اولین وجوہ کی طرف راغب ہونے سے روک دیتا ہے، اور اپنی دیوتا جیسی سائنس کی بلندی سے، عوامی بلچل سے اس کی سرزنش کرتا ہے۔

اگر ہم اس دبستان کی بات مان لیں تو ''ان بلووں نے، جنھوں نے معاملات کو اُلجھا دیا تھا اس عظیم واقعے کو اس کی پاکیزگی کے ایک حصے سے محروم کر دیا تھا۔ جولائی کا انقلاب ایک عوامی آندھی تھی جس کے درمیان اچانک نیلا آسمان نظر آجاتا تھا۔ اس نے نیلے آسمان کو دوبارہ ظاہر

کر دیا تھا۔ انقلاب کو ابتدا میں، جو اتحاد رائے میں غیر معمولی تھا، معمولی لڑائی بنا کر ذلیل کر دیا تھا۔ جولائی کے انقلاب میں بھی، جیسا کہ ابتدائی غیر معمولی کامیابیوں میں ہوا کرتا ہے، خفیہ شگاف تھے؛ بلووں نے ان کو قابلِ ادراک بنا دیا تھا۔ اس کے لیے یہ بھی کہا جا سکتا تھا، 'اوہ! یہ تو شکستہ ہے۔' انقلاب کے بعد آپ کو احساسِ نجات تھا؛ بلووں کے بعد آپ کی تباہی سے آگاہی ہو گئی تھی۔"

"ہر بغاوت میں دُکان بند ہو جاتی ہے؛ سرمائے پر دباؤ پڑتا ہے؛ زرِ مبادلہ حیرت زدگی کا شکار ہو جاتا ہے؛ تجارت عارضی طور پر رُک جاتی ہے؛ کاروبار میں رکاوٹیں آجاتی ہیں؛ ناکامیابیاں ہوتی ہیں؛ سرمایے میں کمی ہو جاتی ہے؛ نجی دولت مندی پریشان ہو جاتی ہے؛ عوامی قرضوں پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے؛ صنعت کاری بدحواس ہو جاتی ہے؛ سرمایہ پسپا ہونے لگتا ہے؛ کام میں کمی واقع ہو جاتی ہے؛ ہر طرف خوف کا عالم ہوتا ہے؛ ہر شہر میں تبادل جھٹکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ نتیجے میں ایک خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ پہلے دن کے بلوے سے فرانس کو بیس ملین کا، دوسرے دن چالیس ملین کا، تیسرے دن ساٹھ ملین؛ تین دن کے بلوے کے باعث ایک سو بیس ملین کا نقصان اٹھانا پڑا تھا؛ یعنی اگر صرف مالیاتی نتائج کو دیکھا جائے تو یہ ایسی ہاری ہوئی جنگ کے برابر ہوں گے جس میں ساٹھ جہازوں کا پورا تباہ بیڑا ہو گیا ہو۔"

"بلاشبہ، تاریخی اعتبار سے شورشوں کا اپنا حسن ہوتا ہے؛ سڑکوں کی جنگیں جنگلوں کی جنگوں سے کم شان دار نہیں ہوتیں، کم دل سوز بھی نہیں ہوتیں؛ ایک میں جنگلوں کی روح ہوتی ہے، دوسری میں شہروں کا دل ہوتا ہے۔ بغاوتوں نے ابالیانِ پیرس کے کردار، فیاضی، اعتقاد، طوفانی مسرت کے اصل نکات کو سرخ روشنیوں سے منور کر دیا ہے؛ طلبہ کی بہادری، نیشنل گارڈ کی جراری، دکان داروں کے پڑاؤ، سڑک کے آوارہ گردوں کی قلعہ بندیاں، راہگیروں کی موت سے حقارت ان کی ذہانت کی دلیل بن گئی ہے۔ اسکول اور فوجی دستے مل کر ایک ساتھ لڑے تھے۔ لڑنے والوں کے درمیان تفاوت عمری تھا۔ نسلاً سب ایک ہی تھے؛ وہی غیر جذباتی آدمی تھے جو اپنے خیالات اور اپنے خاندان والوں کی خاطر بیس برس کی عمر میں ہی موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ جیسا کہ خانہ جنگیوں میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، فوج نے گستاخی کے مقابلے میں دانائی سے اختلاف کیا تھا۔ شورشوں نے، عوامی دلیری ثابت کرتے ہوئے بورژوا کی ہمت کی تعلیم بھی کی تھی"۔

"یہ تو ٹھیک ہے، مگر کیا خوں ریزی حق بجانب تھی؟ اور اس خوں ریزی میں شامل ہوتا ہے مستقبل کا اندھیرا، ترقی کے معاملات میں مصالحت، بہترین افراد کے درمیان بے چینی، سچے اور روشن خیال افراد کی مایوسی، انقلاب پر اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے زخموں پر غیر ملکی استبدادیت کی

خوشی؛ اور 1830ء کے لاف زن تفاخر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم پہلے ہی کہہ رہے تھے۔' اس میں وسیع شدہ پیرس کا، بلکہ یقینی طور پر کوتاہ کردہ فرانس کا اضافہ کر دیجیے۔ اس میں اس کا بھی اضافہ کر دیجیے کہ تمام ضروری باتیں بتا دینی چاہئیں، یعنی وہ قتل عام بھی۔ جس نے اکثر ان لوگوں کی فتح کو ذلیل کر دیا ہے جن کی خوں ریزی آزادی پر غالب آ گئی تھی۔ مختصر یہ کہ شورشیں ہمیشہ تباہ کن ہوتی ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بورژوائی، دانش کے مقابلے میں تناسب کو، انسانوں کے تناسب کو، کس قدر آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔

جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہم شورش کو بہت بڑا معاملہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں، اور یہ ہمارے لیے زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ ہم ایک عوامی تحریک اور دوسری عوام تحریک میں امتیاز کرتے ہیں۔ ہم اس پر غور نہیں کرتے کہ لڑائی کی طرح شورش بھی اتنی ہی مہنگی پڑتی ہے تو پھر لڑائی ہی کیوں؟ اس موقعے پر جنگ کا سوال آ کھڑا ہوتا ہے تو کیا جنگ کے مقابلے میں شورش کم درجے کی آفت ہوتی ہے؟ تو کیا تمام شورشیں آفات ہی ہوتی ہیں؟ تو، اگر جولائی کے انقلاب میں ایک سو بیس ملین خرچ آیا بھی ہے، تو کیا ہوا؟ ہسپانیہ میں فلپ پنجم کو قائم کرنے میں فرانس کے دو ارب فرانک خرچ ہوئے تھے۔ اتنی قیمت پر تو ہمیں چودہ جولائی ہی کو بہتر سمجھنا چاہیے۔ پھر بھی، ہم ان اعداد و شمار کو رد کرتے ہیں، جو صرف وجوہ ہیں، جو صرف الفاظ ہیں لہٰذا ہم شورش کا اسی کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں، یعنی نظریات کا ماہر بھی وہی کہتا ہے جو ہم ابھی پیش کر چکے ہیں؛ کہ اثر کچھ بھی ہو، ہم وجہ کے متلاشی ہیں۔

اب ہم صاف صاف بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

۞

مسئلے کی بنیاد

ایک چیز ہوتا ہے ہنگامہ اور ایک چیز ہوتی ہے بدامنی۔ غم و غصے کے یہ دو ادوار ہوتے ہیں۔ ایک دور غلطی پر ہوتا ہے، دوسرا حق پر ہوتا ہے۔ جمہوری ریاستوں میں، جو ہمیشہ انصاف کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک جزو حق تلفی کرنے لگتا ہے؛ ایسی صورت میں کُل اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے حق کے حصول کے لیے اس حد تک جا سکتا ہے کہ وہ اسلحہ استعمال کرنے لگتا ہے۔ ان تمام معاملات میں جو اجتماعی حاکمیت کا نتیجہ ہوتے ہیں، جز کے خلاف کُل کی جنگ بدامنی ہوتی ہے، کُل پر جز کا حملہ شورش ہوتی ہے؛ جیسے کہ Tulleries کا اپنا بادشاہ ہوتا ہے، ان کے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں، ان پر صحیح یا غلط، حملہ کیا جاتا ہے۔ عوام کی جانب ایک توپ کا رُخ 10 اگست کو غلط ہوتا ہے جب کہ 14 تاریخ کو Vendemiaire کی جانب توپ کا رُخ حق بجانب ہوتا ہے۔ دیکھنے میں دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں مگر حقیقت میں بنیادی طور پر مختلف ہوتے ہیں؛ سوئس غلط کو بچاتے ہیں، بونا پارٹ صحیح کو بچاتا ہے۔ رائے عامہ نے جسے اپنی آزادی سے اور حاکمیت کے ذریعے قائم کیا ہے اس کو سرِ عام برباد نہیں کیا جا سکتا۔ تمدن سے متعلق معاملات میں بھی یہی ہوتا ہے؛ آج کی صاف ستھری عوامی جبلت کل مشکل میں ہو سکتی ہے۔ ایک ہی قسم کا غصہ جب Terray کے خلاف ہو تو جائز ہوتا ہے، مگر Turgot کے خلاف ہو تو ناجائز ہو جاتا ہے۔ مشینوں کی تباہی، گوداموں کی لوٹ مار، ریل کی پٹڑیوں کی توڑ پھوڑ، بندرگاہوں کی مسماری، غلط راہوں پر چلنا، انصاف کی ترقی پر عوام کا انکار، طلبہ کے ہاتھوں Ramus کی ہلاکت، روسو کی سوئٹزرلینڈ سے بے دخلی اور اس پر سنگ باری — بدامنی کے زمرے میں شمار کی جائے گی۔ موسیٰ کے خلاف اسرائیلیوں کا اقدام، Phocian کے خلاف ایتھنز کا اقدام، سِسرو

کے خلاف روما کا اقدام شورش کہلائے گا۔ سکندر کے خلاف سپاہیوں کا اقدام، کولمبس کے خلاف ملاحوں کا اقدام — بغاوت ہے؛ فاجرانہ کام بغاوت ہے۔ مگر کیوں؟ سکندر جو کچھ ایشیا کے ساتھ اپنی تلوار سے کر رہا ہے، وہی کچھ کولمبس امریکا کے لیے قطب نما سے کر رہا ہے؛ کولمبس کی طرح سکندر بھی نئی دنیا دریافت کر رہا ہے۔ دنیا کے یہ انعامات تمدن کے لیے روشنی میں ایسے اضافے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی مزاحمت قابلِ مواخذہ ہو گی۔ کبھی کبھی عوام خود اپنے لیے جعلی وفاداری بھی کرتے ہیں۔ انبوہ عوام سے غداری کرتے ہیں۔ کیا نمک فروشی کرنے والوں کی طویل اور خوں ریز غیر قانونی ہڑتال کی کوئی مثال ہے، جو جائز قدیم بغاوت تھی، جو، یوم نجات کے فیصلہ کن مرحلے پر، عوامی فتح کے موقعے پر تختِ شاہی کی حمایت کر رہے تھے، شاہ پرستی کرنے والے فتنہ انگیز بن گئے تھے، اور اس کے بعد یہ فتنہ انگیز لاعلمی شورش میں تبدیل ہو گئی تھی۔ غیر قانونی نمک فروشی کرنے والا اس طرح شاہی تختۂ دار سے فرار ہو جاتا ہے کہ رسّی کا ایک سرا اس کی گردن میں بندھا ہوا تھا۔ ”نمک پر لگائے جانے والے محصول مردہ باد“ اس نے چیخ کر کہا تھا، ”شاہ زندہ باد“۔ Saint-Barthelemy کے قاتل، تبر کے گلے کاٹنے والے، مردم کشان Avignon، Coligny کے قاتل، مادام Lamballe کے قاتل، Brune کے قاتل، Miquelets, Verdets, Cadenettes، Jehu کے مصاحبین، Brassard کے جنگجو، شورش کو دیکھ رہے تھے۔ La Vendee کی شورش ایک عظیم الشان کیتھلک شورش تھی۔ تحریک میں درستی کی آواز پہچانی جاتی ہے، کہ یہ ہمیشہ لرزاں اور ہجز کاوے سے نہیں نکلتی؛ اس میں پاگل پن ہوتا ہے، ان میں شگفتہ گھنٹیاں ہوتی ہیں، خطرے کی ہر گھنٹی سے کانسی کی آواز نہیں نکلا کرتی۔ جذبات اور لاعلمی کے فسادات ترقی کے صدموں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مجھے دکھاؤ کہ تم کس طرف جا رہے ہو۔ اٹھو، اگر تم اٹھ سکتے ہو، مگر اسی وقت جب تم عظمت حاصل کر سکتے ہو۔ آگے کی سمت بڑھنے والی سرکشی بغاوت نہیں ہوا کرتی۔ اس سے مختلف شورش، خراب شورش ہوتی ہے؛ پیچھے کی طرف لے جانے والا ہر متشدد قدم بغاوت ہوتا ہے؛ ایسا ہونا نسلِ انسانی کے خلاف تشدد کے برابر ہوتا ہے۔ بغاوت سچائی کی جانب سے اٹھنے والی غصے کی لہر ہوتی ہے؛ پختہ راستے، شورش جن میں خلل ڈالتی ہے اچھائی کے اشارے فراہم کرتے ہیں۔ ایسے راستے شورش کو صرف کیچڑ فراہم کرتے ہیں۔ لوئی چہاردہم کے خلاف Danton کا اٹھنا بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ Danton کے خلاف Hebert کا اٹھنا شورش ہے۔

گویا، نتیجہ یہ نکلتا ہے، جیسا کہ لافایت (Lafayette) کہتا ہے کہ کچھ معاملات میں

اگر بغاوت مقدس ترین فرض ہوتا ہے، تو کوئی شورش مہلک ترین جرائم میں شمار کی جا سکتی ہے۔

حرارت کی شدت بھی مختلف نوعیات کی ہوتی ہیں؛ کبھی بغاوت آتش فشاں ہوتی ہے، کبھی شورش محض بھوسے میں لگی آگ ہوتی ہے۔

باغی پنا، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کبھی کبھی ان میں ہوتا ہے جو اقتدار میں ہوتے ہیں۔ Polignac فسادی ہے، Camille Desmoulins ان میں سے ہے جو اقتدار کی طاقت رکھتے ہیں۔ بدامنی کبھی کبھی حیات نو بن جاتی ہے۔

مسائل کا رائے عامہ کے ذریعے حل نکالنا جدید ترین طریقہ ہے، اور چار ہزار برس کے عرصے میں، جس میں حقوق سلب کیے گئے عوام کو دکھ دیے گئے تھے، تاریخ کا ہر عہد وہ احتجاج پیش کرتا ہے، جو کیا جا سکتا تھا۔ قیصر بادشاہوں کے عہد میں بغاوت نہیں ہوئی مگر Juvenal باغی تھا۔

قیصر بادشاہوں کے عہد میں اُسوان کی جانب جلا وطنی ہوئی تھی؛ ان میں Annales [روما کی تاریخ کے بارے میں Quintus Ennius کی رزمیہ نظم] کا [لکھنے والا] آدمی بھی تھا۔ ہم Patmos کی جلا وطنی کے بارے میں بات نہیں کر رہے ہیں جو مثالی دنیا کے نام پر احتجاج سے پوری دنیا پر غالب آجاتا ہے، جو اپنے تصور کو روما و نینوایر، روما و بابل پر، روما و سدوم پر ایک عظیم طنز بنا دیتا ہے [Sodom، خطا کاروں کی وہ بستی تھی جو عذاب الٰہی سے تباہ ہو گئی تھی]۔ جان اپنی پہاڑی پر وہی ہے جیسا کہ اپنے چبوترے پر ابولہول ہے؛ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں، کہ وہ یہودی ہے، اور یہ عبرانی ہے؛ مگر وہ انسان جو Annales لکھتا ہے لاطینی نسل کا انسان ہے، بلکہ ہم اسے رومائی (Roman) بھی کہہ سکتے ہیں۔

نیرو بادشاہوں نے ظالمانہ انداز میں حکومت کی ہے، تو ان کو اسی انداز میں پیش کیا جانا چاہیے۔ صرف قبریں کھودنے والے اوزاروں کا کام بہت ہلکا ہوگا؛ ان کو ایسی سخت نثر کے سوراخ میں ڈالنا چاہیے جو تکلیف دہ ہوتی ہے۔

جابر حکمراں فلسفیوں کے کام بھی آتے ہیں۔ زنجیروں میں جکڑا لفظ خوف ناک ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کا حاکم اس پر یہ جبر خاموشی لازم کر دیتا ہے تو ادیب اپنے انداز تحریر کو دہری، تہری تہوں میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اس خاموشی سے ایک خاص قسم کی پُر اسرار کثرت ابھرتی ہے جو خیالات کو کانسی میں منجمد کر دیتی ہے۔ تاریخ کا ایجاز تاریخ دانوں میں بلاغت پیدا کر دیتا ہے۔ سنگ خارا جیسی نامی گرامی نثر جابر کے اثرات کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

جابر حکمرانی ادیب کو ایسے دائرے میں محبوس کر دیتی ہے جو طاقت کی تکثیر ہوتا ہے۔

ٹیمبر و کا عہد، جو Verres کے لیے ناکافی تھا، Caligula پر آزمایا گیا۔ جملے میں جتنا کم پھیلاؤ ہوتا ہے اس کے صدمے میں اتنی ہی شدت ہوتی ہے۔ ٹیسی ٹس Tacitus [سلطنتِ روما کا مبصر اور تاریخ داں] اپنی پوری قوت سے سوچتا ہے۔ کسی عظیم دل کی ایمان داری، جو انصاف اور صدق سے مملو ہو، بجلی طرح غالب ہو جاتی ہے۔ یہ بات یاد رکھی جانی چاہیے کہ ٹیسی ٹس کو تاریخی اعتبار سے قیصر پر تھوپا نہیں گیا تھا۔ Tiberii [روما کے شہنشاہوں] کو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ قیصر اور ٹیسی ٹس دو متواتر مظہر ہیں، جن کے درمیان ملاقات میں پُر اسرار طریقے سے پرہیز کیا گیا ہے، ایک اس وقت جب وہ صدیوں کو اسٹیج پر رکھتا ہے، اور دوسرا داخل ہونے اور خارج ہونے کو منظم کرتا ہے۔ قیصر عظیم ہے، ٹیسی ٹس بھی عظیم ہے؛ خدا نے ان دونوں عظمتوں کو آپس میں ٹکرانے کی اجازت نہ دے کر بچا لیا ہے۔ انصاف کے محافظ قیصر پر وار کرنے میں زیادہ سخت اور غیر منصفانہ ہو سکتے ہیں۔ خدا یہ نہیں چاہتا ہے۔ افریقا اور ہسپانوی عالمی جنگوں میں سسلی کے قزاق تباہ ہو گئے، گال کے باشندوں میں، برٹنی میں، جرمنی میں تمدن متعارف کرایا گیا — یہ ساری شان Rubicon کے علاقے پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ اس معاملے میں ایک قسم کا نازک ربانی انصاف ہے، جو عالی شان قابض تاریخ داں پر حملہ کرنے میں لیت و لعل کر رہا ہے، قیصر اور ٹیسی ٹس کو بچا رہا ہے، اور جوہرِ قابل کے لیے سزا میں کمی کر رہا ہے۔

استبداد یقیناً استبداد رہتا ہے خواہ کسی جوہرِ قابل جابر حکمران کے ہاتھوں ہی ہو۔ تمام مشہور جابروں میں بدعنوانی ہوتی ہے، مگر اخلاق کا طفیلی جرثومہ رسوائے زمانہ جابروں کے تحت زیادہ ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔ ایسی شاہیوں میں شرم بھی نہیں ہوا کرتی؛ اور جو ٹیسی ٹس کے ساتھ ساتھ Juvenal کو مثال بناتے ہیں، ان رسوائیوں کے رخساروں پر خلقِ خدا کے سامنے اس طرح طمانچے مارتے ہیں کہ وہ جواب بھی نہیں دے سکتے۔

Sylla کے مقابلے میں Vitellius کے دور میں روما زیادہ خراب ہوا ہے۔ جابر حکمرانوں سے کراہت کے مقابلے میں Claudius اور Domitian کے زیرِ حکمرانی کمینگی کا عیب زیادہ واضح ہوا ہے۔ غلاموں کا سفلہ پن جابر حکمران کی براہِ راست پیداوار ہوتا ہے۔ ان خوف زدہ حق شناسیوں سے جن میں ان کے آقاؤں کا عکس ابھرتا ہے بدبو خارج ہوتی ہے؛ عوامی قوتیں گندی ہوتی ہیں، دل چھوٹے ہو جاتے ہیں؛ شعور بزدل ہو جاتے ہیں، نفوس پِسّوؤں کی طرح ہو جاتے ہیں؛ Caracalla کے زمانے میں ایسا ہی ہوا ہے، Commodus کے زمانے میں ایسا ہی تھا، Heliogabalus کے زمانے میں بھی یہی تھا، جب کہ قیصر کے زمانے

میں روما کی سینیٹ سے ایسی بو آتی ہے جیسی چیلوں کی بیٹ سے آتی ہے۔

ٹیسی ٹس اور Juvenal جیسوں کی بظاہر سست آمد، اس امر کا ثبوت ہے کہ معظم ظاہر ہو گیا ہے۔

مگر انجیل کے Isaiah کی طرح، قرونِ وسطیٰ میں Juvenal اور ٹیسی ٹس بھی آدمی تھے اور دانتے بھی آدمی تھا؛ بلوے اور بد امنیاں بے شمار ہیں، جو کبھی صحیح ہوتی ہیں کبھی غلط ہوتی ہیں۔

بلوہ زیادہ تر کسی اصل حقیقت کی وجہ سے ہوتا ہے؛ بد امنی ہمیشہ اخلاقی عجوبہ ہوتی ہے۔ بلوہ Masaniello ہے؛ سرکشی اسپارٹا کس ہے۔ بد امنی کی دماغ میں نشو ونما ہوتی ہے، بلوہ پیٹ کی پیداوار ہوتا ہے؛ Gaster بے چین ہے؛ مگر یقینی طور پر Gaster ہمیشہ غلطی پر نہیں ہوتا۔ قحط سالی اور بلوے میں، مثال کے طور پر Buzancais کا اپنا صحیح اور منصفانہ اندازِ نظر ہے۔ بلوہ پھر بھی بلوہ ہی ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی غلط ہوتی ہے۔ صحیح ہو تب بھی دور دور رہتا ہے، طاقت ور ہو تو شدید ہوتا ہے؛ بے تکے پن سے حملہ کرتا ہے۔ اندھے ہاتھی کی طرح چلتا ہے؛ اپنے پیچھے بوڑھے مردوں کی عورتوں اور بچوں کی لاشیں چھوڑتا جاتا ہے؛ اسے بے خطا لوگوں کے خون کی خواہش ہوتی ہے، یہ سمجھے بغیر کہ یہ خواہش ہوتی کیوں ہے۔ عوام کو غذا فراہم کرنا اچھا مقصد ہوتا ہے، ان کو قتل کر دینا برا طریقہ ہوتا ہے۔

مسلح احتجاج، جائز ہو تب بھی، وہ 10 اگست کا ہو، حتیٰ کہ 14 جولائی کا ہو تب بھی، اہم قسم کی مشکلات سے شروع ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ حق کو آزاد کر دیا جائے، اس میں جھاگ اُٹھتا ہے، ہنگامہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں بد امنی ہوتی ہے، جیسے دریا میں سیلاب۔ عام طور پر یہ اس سمندر میں گر کر ختم ہو جاتی ہے، جسے انقلاب کہتے ہیں، مگر کبھی کبھی پہاڑوں کی بلندیوں سے آتے ہوئے جو حاوی ہوتا ہے اخلاق کے افق پر، انصاف پر، دانش پر، سبب پر، حق پر؛ اور جو مثالیت کی خالص برف سے تشکیل پاتا ہے، ایک چٹان سے دوسری چٹان پر گرتا ہے اور اپنی شفافیت میں کئی گنا بڑھا کر آسمان کا عکس ڈالتا ہے؛ اور بد امنی اچانک کسی دلدل میں گم ہو جاتی ہے جیسے دریائے رہائن دلدل میں غائب ہو جاتا ہے۔

یہ سب ماضی کی باتیں ہیں، مستقبل کچھ اور ہی چیز ہوتا ہے۔ عالمی رائے عامہ میں یہ قابلِ تعریف خصوصیت ہوتی ہے کہ یہ بلوے کو ابتدا ہی میں حل کر دیتی ہے، اور بغاوت کو ووٹ دے کر اسے ہتھیاروں سے محروم کر دیتی ہے۔ سڑکوں اور سرحدوں پر ہونے والی جنگوں کا خاتمہ

ہو جانا ناگزیر ترقی ہوتی ہے۔ آج کچھ بھی ہو رہا ہو، کل امن ہو گا۔

پھر بھی، بغاوت، بلوہ، اور سابقین و متاخرین کے درمیان نکاتِ اختلاف کے بارے میں بورژوا کچھ نہیں جانتا۔ اس کے ذہن میں سوائے سرکشی، خالص اور سادہ بغاوت کے کچھ نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح جیسے کُتّے کی اپنے مالک سے بغاوت، اور کاٹ کھانے کی کوشش، جسے زنجیر میں جکڑنے اور کُتّے خانے میں بندش، بھونکنے، اور اس وقت تک اونگھنے کی سزا دی جاتی ہے جب تک کہ کُتّے کا سر اچانک بڑا ہو کر اندھیرے میں شیر جیسا نظر نہیں آنے لگتا۔

اس کے بعد بورژوا چلّا کر کہتا ہے، ''عوام زندہ باد!''

اس کی توضیح یہ پیش کی جاتی ہے کہ جہاں تک تاریخ کا معاملہ ہے جون 1832ء کی تحریک سے کیا مترشح ہوتا ہے؟ کیا یہ بغاوت ہوتی ہے؟ کیا یہ بدامنی ہوتی ہے؟

اس قسم کے خوف ناک واقعے کو عوام الناس کی نظروں کے سامنے لے آنے سے، کبھی کبھی اسے بغاوت کا نام دینے سے، مگر محض سطحی حقائق، اور بغاوت اور بدامنی کے درمیان تمیز کرنے کی غرض سے جو بنیاد ہوتی ہے، ہمارے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔

1832ء کی اس تحریک میں، اس کے تیزی سے پھیلنے اور اس کی غم انگیزی سے ختم ہو جانے میں بھی اتنا شکوہ تھا کہ وہ بھی جو اس کو شورش سمجھتے تھے، اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ 1830ء کی ایک یادگار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بھڑکے ہوئے تصورات ایک دن میں ٹھنڈے نہیں ہوا کرتے۔ انقلاب کو ایک آن میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سکون کی کیفیت میں آنے سے پہلے اونچ نیچ سے گزرنا ہوتا ہے، اسی طرح جیسے کسی میدان میں کوئی پہاڑ دھنستا جا رہا ہو۔ نہ Jura [اسکاٹ لینڈ کے جزیرے] کے بغیر کوہِ ایلپس ہوتا ہے، نہ Asturia کے بغیر Pyrenees [فرانس اور ہسپانیہ کے درمیان کا پہاڑی سلسلہ] ہوتا ہے۔

ہم عصر تاریخ کا قابلِ رحم بحران جسے اہالیانِ پیرس کی یادداشت ''بلووں کا عہد'' کہتی ہے، یقینی طور پر اس صدی کے طوفانی ادوار کی نمایاں صفات میں سے ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اپنا بیان شروع کریں، چند جملے ضروری ہوں گے۔

وہ صداقتیں ہم جنھیں بیان کرنے والے ہیں، اس ڈرامائی زندہ حقیقت سے متعلق ہیں، تاریخ داں کبھی کبھی جن کو وقت اور جگہ کی کمی کے بہانے نظر انداز کر دیتا ہے۔ ہمیں اس امر پر اصرار ہے کہ ان میں بھی انسانی دل کی دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات، ہمارے خیال میں ہم جن کا تذکرہ کر چکے ہیں، تاریخ کے فاصلوں میں گم ہو جایا کرتی ہیں۔ اس عہد میں ہم نے

جس کو "بلووں کا زمانہ" کہا ہے اس میں، اس قسم کی تفصیلات پوشیدہ ہیں۔ تاریخی وجوہ کے علاوہ بھی کچھ وجوہ تھیں جن کے باعث عدالتی تفتیش بھی ان کی گہرائیوں میں نہیں گئی۔ شائع شدہ اور معلوم خصوصیات سے قطع نظر، ہم ان حقائق پر روشنی ڈالیں گے جو کچھ لوگوں کی غفلت کے، اور اموات کے باعث سامنے نہیں آسکے ہیں۔ ان بڑے بڑے نظاروں کے کرداروں کی اکثریت غائب ہو چکی ہے؛ اس دن سے ابتدا کرتے ہوئے جب انھیں سکون ہوا تھا؛ مگر ہم جو کہنا چاہتے ہیں گے اس طرح کہیں گے کہ "ہم نے بھی دیکھا ہے"۔ ہم چند نام تبدیل کر دیں گے اس لیے کہ چوں کہ تاریخ ان کے بارے میں یا ان کے خلاف کچھ بتاتی نہیں، مگر جو منظر ہم پیش کریں گے وہ اصلی ہوگا۔ اس کتاب کی شرائط کے مطابق جو ہم تحریر کر رہے ہیں، ہم اب صرف ایک واقعہ پیش کریں گے اور اس کا ایک ہی پہلو پیش کریں گے، ان دو دنوں، یعنی 1832ء کی پانچویں اور چھٹی تاریخ کا ذکر کریں گے، جس کے بارے میں بہت کم بتایا گیا ہے، مگر ہم، اس پر پڑی غم انگیز نقاب اٹھا کر اس انداز میں بیان کریں گے کہ قاری کو اس خوف ناک عوامی مہم کے اصل کی ایک جھلک نظر آجائے۔

۞

تدفین؛ حیاتِ نو کا ایک موقع

اگرچہ 1832ء کے موسمِ بہار میں کالرے کی وبا پچھلے تین ماہ سے تمام دماغوں کو سُن کیے دے رہی تھی، اور ان کے احتجاج پر ایک ناقابلِ بیان غم انگیز کیفیت چھاتی جا رہی تھی، پیرس ہلچل کے لیے بالکل تیار نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، ہر بڑا شہر ایک توپ کی مثال ہوتا ہے؛ توپ جب بھری ہو، تو ایک چنگاری کا گرنا ہی گولے کے چل جانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ 1832ء کے ماہِ جون میں جنرل لامارک کی موت بھی ایک چنگاری ہی تھی۔

لامارک ایک عملی اور مشہور آدمی تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے سلطنت اور بحالی دونوں میں وہ بہادری دکھائی تھی جو دونوں ادوار کے لیے ناگزیر تھی؛ بہادری میدانِ جنگ کی، اور بہادری میدانِ جمہور کی۔ وہ جتنا شجاع تھا اتنا ہی بڑبولا بھی تھا؛ اس کی تقریر میں بھی تلوار کی کاٹ سنائی دیتی تھی۔ کمان سنبھالنے کے بعد اپنے پیش رو فوئے (Foy) کی طرح، اس نے بھی آزادی برقرار رکھی تھی؛ وہ دائیں بازو اور بائیں بازو کے درمیان ہوتا تھا؛ عوام اس سے محبت کرتے تھے اس لیے کہ وہ مستقبل کے مواقع کو قبول کرتا تھا؛ عوام الناس اسے پسند کرتے تھے اس لیے کہ اس نے شاہ کی اچھی طرح خدمت کی تھی؛ وہ کاؤنٹ Gerard اور کاؤنٹ Drouet کا ساتھی تھا جو نپولین کے رازداں مارشل میں سے تھے۔ 1815ء کے معاہدوں نے اس کو ذاتی ضرر کے باعث نکال دیا تھا۔ وہ وِلنگٹن سے کھلے انداز میں نفرت کرتا تھا جس کے باعث اکثریت اس سے خوش تھی؛ سترہ برس اس نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ واٹرلو کے حزن کی حفاظت کی تھی، اور آڑے آنے والے واقعات پر مشکل سے توجہ دیتا تھا۔ اپنی موت کے کرب کے آخری لمحے تک اس نے تلوار اپنے سینے سے لگا رکھی تھی جو "Hundred Days" کے افسروں نے اسے پیش کی تھی۔ مرتے وقت نپولین کے

لیوں پر فوج تھا، لامارک کے لبوں پر ملک تھا۔

اس کی موت، جیسا کہ توقع تھی، لوگوں کے نزدیک بڑا نقصان اور حکومت کے لیے ایک بڑا موقع تھا۔ اس کی موت ایک بلا تھی۔ ایسی تلخی تھی جو شورش میں بدل سکتی تھی۔ اور پھر یہ کچھ ہوا۔

پچھلی شام، یعنی جون کی پانچویں تاریخ، جس دن لامارک کی تدفین ہونی تھی، Saint-Antoine، جہاں سے جنازہ گزرنے والا تھا، ایک بھیانک پہلو اختیار کر گیا تھا۔ سڑکوں کا یہ جال طرح طرح کی افواہوں سے بھر گیا تھا۔ اس کے باسیوں نے جہاں تک ممکن ہوا اسلحہ بندی کر لی تھی۔ بڑھئی اپنے کارخانوں سے دروازے توڑنے کے اوزار لے آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے موزے بُننے والی ہک توڑ کر اس سے تیز چھری بنالی تھی۔ ایک اور شخص "حملہ" کرنے کے بخار میں مبتلا ہوگیا تھا اور تین دن تک پورا لباس پہنے سویا تھا۔ ایک بڑھئی جس کا نام Lombier تھا ایک کامریڈ سے ملا، جس نے اس سے سوال کیا تھا، "کہاں جا رہے ہو؟" "اوہ! میں بالکل نہتا ہوں۔" "تو پھر؟" "میں لکڑی کے گودام جا رہا ہوں اپنا پرکار لانے کے لیے۔" "کس لیے؟" "معلوم نہیں۔" Lombier نے جواب میں کہا تھا۔ Jacqueline نام کے ایک شخص نے، جو بہت پھرتیلا آدمی تھا، گزرتے ہوئے کاریگروں کو بلایا "ذرا ادھر تو آنا" اور ان لوگوں کو دس سو قیمت کی وائن پلائی اور پوچھا، "تم کچھ کام بھی کرتے ہو؟" "نہیں۔" "Charonn اور Montreuil نامی پشتوں کے درمیان Filspierre جاؤ، وہاں تمھیں کام مل جائے گا۔" Filspierre میں انھیں کارتوس اور اسلحہ مل گئے تھے۔ بہت سے مشہور لیڈر ایک گھر سے دوسرے گھر دوڑے جا رہے تھے، اپنے حمایتیوں کو جمع کرنے کے لیے۔ Trone پشتے کے قریب، Capel میں، Petit-Chapeau کے قریب پینے والے کہتے سنے گئے تھے، "ہمارے پاس پستول ہے۔" "بلاوز کے نیچے ہے۔" "اور تم؟" "میری قمیص کے نیچے ہے۔" Traversiere اسٹریٹ پر، Bland نامی کارخانے کے سامنے، اور Maison-Brulee کے احاطے میں، Bernier's نامی اوزار ساز کے کارخانے کے سامنے، ٹولیاں آپس میں سرگوشی کرتی دیکھی گئی تھیں۔ ان میں ایک آدمی تھا Mavot، جس نے کسی ایک دکان میں ایک ہفتے سے زیادہ کبھی کام نہیں کیا، اس لیے کہ دکان کے "مالکان کو اس سے ہمیشہ اختلاف ہوتا تھا۔" ایک دن بعد Menilmontant اسٹریٹ کی رکاوٹ کے قریب اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ Pretot جو اس جدوجہد میں ختم ہو جانے والا تھا، Mavot کی نیابت کرتا تھا اور اس سوال پر "تمھارا مقصد کیا ہے۔" اس کا جواب ہوتا تھا، "بغاوت۔" کام کرنے والے Bercy اسٹریٹ کے کونے پر جمع ہو

گئے اور Lemarin نامی ایک شخص کا انتظار کیا تھا جو Faubourg Saint-Marceau کا انقلابی تھا۔ تقریباً سب کے سامنے خفیہ سوال جواب پوچھے گئے تھے۔

جون کی پانچویں تاریخ کو، جس دن بارش بھی ہوئی اور سورج بھی چمکا تھا، جنرل لامارک کا جنازہ سرکاری اور فوجی شان وشوکت سے پیرس سے گزرا، جس سلسلے میں ذرا زیادہ ہی پیش بندی کی گئی تھی۔ رنگین غلافوں سے آراستہ نقارے اور الٹے پکڑے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ فوجیوں کی دو بٹالین، دس ہزار نیشنل گارڈ، جن کی تلواریں ان کے پہلوؤں میں آویزاں تھیں، تابوت کی حفاظت پر مامور تھے۔ تابوت لے جانے والی گاڑی کو نوجوان آدمی کھینچ رہے تھے۔ Invalides کے افسران گاڑی کے عقب میں laurel نامی پودوں کی شاخیں اٹھائے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے بے شمار، اجنبی، مشتعل مجمع، Friends of the People کے وفادار، قانون کے اسکول اور طبی اسکول کے طلبہ، ہر قسم کی قومیتوں کے مہاجرین، ہسپانوی، اطالوی، جرمن لوگ اور پولیس، اپنے اپنے پرچم اٹھائے، افقی سہ رنگے جھنڈے لیے، طرح طرح کے جھنڈے اٹھائے، ہری ہری شاخیں ہلاتے چھوٹے چھوٹے بچے، پتھر کاٹنے والے اور بڑھئی جو اُن دنوں ہڑتال پر تھے، چھاپے خانے والے جو اپنی کاغذ کی ٹوپیوں سے پہچانے جاتے تھے، دو دو، تین تین کی صفیں بنائے چیختے، مارچ کر رہے تھے۔ تقریباً سب کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے، جن میں کوئی ترتیب نہیں تھی پھر بھی سب ایک نفس کی طرح تھے، اور ہلچل مچاتے ایک قطار میں چل رہے تھے۔ دستوں نے خود کو رہنما منتخب کر لیا تھا؛ ایک آدمی اپنے دونوں ہاتھوں میں پستول اٹھائے ہوئے، جلوس کا معائنہ کرنے والوں کے بالکل سامنے سے گزرا تھا اور اس کے سامنے چلنے والی قطاریں علاحدہ ہو گئی تھیں۔ بولیوارڈ کی بغلی گلیوں میں، درختوں کی شاخوں پر، مکانوں کے چھجوں پر، کھڑکیوں میں، چھتوں پر ایک ہجوم تھا آدمیوں کے، عورتوں کے اور بچوں کے سروں کا۔ سب کی آنکھیں تشویش سے پُر تھیں۔ اسلحوں سے لیس ایک جلوس گزر رہا تھا، اور خوف زدہ مجمع دیکھ رہا تھا۔

اپنی جانب، حکومت سب کچھ غور سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے ہاتھ ان کی تلواروں کے دستوں پر تھے۔ قرابین بندوقوں سے لیس چار اسکواڈرن، اپنی اپنی زینوں پر سوار Place Louis XV میں دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کے بگل ان کے سروں کے اوپر سے نظر آرہے تھے، کارتوس سے بھرے بکس اور بھری بندوقوں سمیت، مارچ کرنے پر بالکل تیار کھڑے تھے۔ لاطینی محلے میں، اور Jardin des Plantes میں میونسپل گارڈ سڑک سڑک قطار در قطار موجود تھے؛ Halle-aux-Vins میں گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک اسکواڈرن متعین تھا؛ Greve میں بارھویں

پیدل سپاہیوں کا دستہ موجود تھا، اس کا دوسرا حصہ Bastille میں تھا؛ گھڑ سوار سپاہیوں کا چھٹا دستہ Celestins میں تھا؛ اور Louvre کا صحن توپوں سے بھرا ہوا تھا۔ بقیہ فوج، بے شمار رجمنٹوں کے علاوہ وہ جو پیرس کو گھیرے میں لیے ہوئے تھیں، بیرکوں میں تھی۔ چوبیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ڈرانے والی طاقت شہر میں، اور تیس ہزار Banlieue میں دم سادھے کھڑی تھی۔

جنازے کے آگے چلنے والی قطاروں میں احمقانہ افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ Legitimist کی چالوں کے اشارے ہو رہے تھے؛ لوگ Reichstad کے ڈیوک کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، جسے خدا نے عین اس وقت موت کے لیے چن لیا تھا جب خلقِ خدا اسے سلطنت کے لیے مقرر کرنے والی تھی۔ ایک شخصیت نے، جو نادیدہ رہی ہے، اعلان کیا تھا کہ وقتِ مقررہ پر دو مجتمع افراد، جن کو اپنا بنا لیا گیا ہے، عوام کے لیے اسلحوں کے کارخانے کے دروازے کھول دیں گے۔ موجود لوگوں کی اکثریت کے واضح ابروؤں پر ایک ولولہ تھا جس میں ملال گھلا ملا تھا۔ یہاں وہاں، ان لوگوں میں بھی جو ایسے شدید محرکیک جذبات سے پُر تھے، مجرموں کے چہرے اور کم ظرف ذہن شامل تھے جو کہہ رہے تھے ''آؤ لوٹ مار کریں۔'' ایسے احتجاج بھی ہوتے ہیں جو دلدلوں کی تہوں میں جنبش پیدا کر دیتے ہیں، اور پانی میں سے کیچڑ کے بادل پیدا کر دیتے ہیں۔ پوری طرح تربیت یافتہ پولیس والے ایسے عجوبوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔

مرنے والے گھر سے، شاہراہوں سے ہوتا ہوا آہستہ آہستہ گزرتا جنازے کا جلوس Bastille تک چلتا رہا۔ کبھی کبھی بارش ہونے لگتی، ہجوم کو جس کی بالکل پروا نہ تھی۔ تابوت Vendome کے مینار کے پاس سے گزرا ہی تھا کہ Fitz-James کے ڈیوک پر سنگ باری ہوئی جو بالکونی میں ہیٹ پہنے کھڑا تھا؛ گال کے پرچم کی کلغی توڑ کر دلدل میں پھینک دی گئی تھی، PorteSaint-Martin میں موجود بارھویں پیدل فوج کے دستے کے ایک افسر نے تلوار سے پولیس کے ایک سپاہی کو زخمی کر دیا تھا جو چلا کر کہہ رہا تھا، ''میں ریپبلکن ہوں'' پولی ٹیکنک والوں کے لیے حکم تھا کہ وہ باہر نہ نکلیں، وہ غیر متوقع طور پر باہر آ گئے تھے اور انھوں نے ''پالی ٹیکنک زندہ باد، ریپبلک زندہ باد'' کے نعروں سے جنازے کے جلوس کو غیر معمولی رنگ دے دیا تھا۔ Bastille میں Saint-Antoine سے آنے والے متجسس لوگوں کی قطاروں سے جنازے کا جلوس جنکشن سا بن گیا، اور ہجوم میں ایک قسم کا ابال سا پیدا ہو گیا تھا۔

ایک آدمی کو دوسرے سے آدمی سے کہتے سنا گیا تھا، ''تم سرخ رنگ کی داڑھی والے کو دیکھ رہے ہو، نا۔ یہی وہ شخص ہے جو ہمیں گولی چلانے کا حکم دے گا۔'' معلوم ہوا کہ ایک اور بلوے

Quenisset کے معاملے میں بھی یہ سرخ ڈاڑھی موجود تھی جسے یہی کام سونپا گیا تھا۔

تابوت کی گاڑی Bastille سے نکل کر چھوٹے سے پُل سے گزری اور Austerlitz کے پُل کے قریبی سبزہ زار میں پہنچ کر رُک گئی تھی۔ کسی پرندے کی آنکھ سے دیکھا جاتا تو مجمع ایک دُم دار ستارے کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جس کا سر سبزہ زار میں تھا اور دُم Quai Bourdon سے ہوتی ہوئی Bastille تک پھیلی تھی اور اس کا آخری سرا Porte Saint-Martin پر تھا۔ تابوت گاڑی کے اطراف ایک گھیرا سا بنایا گیا تھا۔ لافایت نے تقریر کی اور لامارک کو الوداع کہا۔ یہ ایک دل گداز اور بلند پایہ لمحہ تھا، سارے سر برہنہ تھے، سارے دلوں کی دھڑکنیں تیز تھیں۔

اچانک گھوڑے پر سوار سیاہ لباس میں ملبوس ایک آدمی سرخ پرچم والے ایک گروہ کے درمیان ظاہر ہوا، وہ ایک نیزے کی نوک پر سرخ رنگ کی آزادی کی ٹوپی اٹھائے ہوئے تھا۔ لافایت نے اپنا منہ پھیر لیا۔ Exelmans جلوس چھوڑ کر چلا گیا۔

سرخ ٹوپی نے ایک طوفان برپا کردیا اور خود اس کے درمیان غائب ہو گئی تھی۔ Bourdon بولیوارڈ سے Austerlitz کے پُل تک غوغا کرنے والوں میں سے ایک نے اکثریت کو اکسایا تھا۔ دو غیر معمولی قسم کی آوازیں بلند ہوئی تھیں، "لامارک Pantheon میں — لافایت ٹاؤن ہال میں۔" کچھ نوجوانوں نے، ہجوم کے درمیان جذباتی تقریریں کیں، پُل کے اس پار خود تابوت کی گاڑی کے ساتھ باندھ لیا اور لافایت کو کرایے کی سواری میں Quai Morland کی طرف لے جانے لگے۔

لافایت کے حق میں نعرے لگانے والے ہجوم کے درمیان Ludwig Snyder نام کا ایک جرمن نظر آیا، بعد میں جو سو برس کی عمر کا ہو کر مرا تھا، جس نے 1776ء کی جنگ میں بھی حصہ لیا تھا، اور جو واشنگٹن کی کمان میں Trenton میں اور لافایت کی کمان میں Brandywin میں لڑا تھا۔

اس دوران، بائیں کنارے کے شہری گھڑ سواروں کا دستہ حرکت میں آیا، پُل کے جنگلے کے قریب آیا، جب کہ دریا کے دائیں کنارے پر Celestins سے سپاہی ظاہر ہوئے اور انھوں نے Quai Morland کے ساتھ پَرے جما لیے تھے۔ جو لوگ لافایت کی سواری کو گھسیٹ رہے تھے، گودی کے کونے پر ان کی سپاہیوں پر نظر پڑی اور انھوں نے بلند آواز میں چیخ کر کہا "سپاہی"۔ سپاہیوں نے خاموشی سے آگے بڑھنا شروع کیا، ان کے پستول چمڑے کی تھیلیوں میں تھے، ان کی تلواریں نیام میں تھی، اور بندوقیں چمڑے کے غلافوں میں تھیں۔

وہ لوگ پُل سے دو سو قدم دور رُک گئے۔ لافایت جس میں سوار تھا وہ سواری ان کی طرف بڑھی، ان کی صفیں کھل گئیں اور اسے گزرنے کا راستہ دے دیا، اور پیچھے سے صفیں پھر مل گئیں۔ اس لمحے گھڑسوار اور ہجوم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ عورتیں خوف سے بھاگنے لگی تھیں۔ اس خطرناک لمحے میں کیا ہوا تھا؟ کوئی بتا نہیں سکتا۔ جب دو بادل ملتے ہیں وہ بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ کچھ نے کہا کہ Arsenal کی جانب حملہ کرنے والی آواز میں بگل بجے تھے، کچھ کہتے ہیں کہ کسی بچے نے کسی سپاہی پر قرولی سے ضرب لگائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اچانک تین گولیاں چلی تھیں؛ پہلی گولی سے دستے کا سردار مرا، دوسری گولی سے ایک بوڑھی بہری عورت مر گئی جو اپنی کھڑکی بند کر رہی تھی، تیسری گولی سے ایک سپاہی کا کاندھا زخمی ہو گیا تھا۔ ایک عورت نے چیخ کر کہا، ”یہ بہت جلد شروع کر رہے ہیں!“ اور اچانک گھڑسواروں کا ایک دستہ جو اس وقت تک بیرک میں بند رکھا گیا تھا، ننگی تلواریں لہراتا Bassompierre اسٹریٹ اور Bourdon بولیوارڈ سے ہوتا ہوا نکل پڑا، اور راستے پر جھاڑو سی پھر گئی تھی۔

تب، بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک طوفان سا آ گیا تھا؛ پتھر برسنے لگے تھے؛ توپوں کا ایک دستہ نکل پڑا تھا؛ بہتوں نے دریا کے کنارے میں کود کر پناہ لی تھی، اور سین کی ایک پتلی سی نہر کو پار کیا تھا جو اس وقت بھری ہوئی تھی، Isle Louviers کے لکڑی کا گودام، جو ایک بڑا سا انبار تھا، ہاتھ لگ گیا اور لڑنے والوں سے بھر گیا تھا، جس کے ہاتھ جو آیا لے دوڑا، پستولوں سے گولیاں چلنے لگی تھیں؛ مورچہ بندی شروع ہو گئی تھی؛ نوجوان جومیت گاڑی کے ساتھ Austerlitz کے پُل کی جانب پسپا ہو گئے تھے بھاگنے لگے تھے اور خودکار رائفلوں سے مسلح مونسپل گارڈ دوڑے، مجمع ہر سمت بکھر گیا تھا، پیرس کے چاروں علاقوں میں جنگ کی افواہ پھیل گئی تھی؛ لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے، ”ہتھیار سنبھالو!“ اور بھاگ رہے تھے، گر رہے تھے، مزاحمت کر رہے تھے۔ اور جنگ اس طرح پھیل گئی تھی جیسے تیز ہوا میں آگ کے شعلے پھیلتے ہیں۔

۞

گزرے دنوں کا جوش

بلوے کی شروعات سے زیادہ غیر معمولی کوئی بات نہیں ہوا کرتی۔ ہر شے اچانک ہر جگہ پھٹ پڑتی ہے۔ کیا پہلے سے اس بات کا اندازہ تھا؟ جی ہاں۔ کیا اس کی تیاری تھی؟ جی نہیں۔ تو پھر یہ کہاں سے آ گئی؟ سڑکوں سے۔ کہاں سے آ گری تھی؟ بادلوں سے۔ اس مقام پر بدامنی ایک سازش کا کردار اختیار کر لیتی ہے؛ اس میں ہر جنگی کا ایک پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ پہلے آنے والا شخص ہجوم کی ایک لہر پا لیتا ہے، اور جدھر چاہے اسے لے جاتا ہے۔ خوف سے ابتدا ہوتی ہے جس میں ایک قسم کی مہیب خوشی شامل ہوتی ہے۔ پہلے ہنگامے ہوتے ہیں، دُکانیں بند ہو جاتی ہیں، تاجروں کے اشتہارات غائب ہو جاتے ہیں؛ اس کے بعد اکا دُکا گولیاں چلتی ہیں؛ لوگ بھاگتے ہیں، دروازوں پر بندوق کے کندے مارے جاتے ہیں، ملازمین صحنوں میں ہنستے ہیں اور کہتے سنے جاتے ہیں "کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔"

ابھی ایک چوتھائی گھنٹہ نہیں گزرا تھا کہ اچانک پیرس کے مختلف مقامات پر یہ سب ہونے لگا تھا۔

Sainte-Croix-de-la-Bretonnerie اسٹریٹ پر ڈاڑھی اور لمبے بالوں والے بیس نوجوان شراب کی دُکان میں داخل ہوئے، اور چند لمحوں بعد باہر نکلے؛ ایک کے ہاتھ میں سہ رنگا جھنڈا تھا اور ان میں تین سردار تھے، ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی، دوسرے کے ہاتھ میں بندوق، اور تیسرے کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔

Nonaindieres اسٹریٹ میں، ایک خوش پوش بوڑھا تھا جس کی بڑی سے توند، گونج دار آواز، سر گنجا، اوپر کی جانب اٹھے ہوئے ابرو تھے، سیاہ ڈاڑھی تھی، اور روشنی تنی ہوئی

مونچھیں تھیں جو سیدھی نہیں ہو سکتی تھیں، اور وہ سر عام راہگیروں کو کارتوس پیش کر رہا تھا۔

Saint-Pierre-Montmartre اسٹریٹ پر برہنہ بازوؤں والے لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں سیاہ پرچم تھے جن پر سفید حروف میں لکھا تھا "جمہوریہ یا موت!" Jeuneurs اسٹریٹ پر، Cadran اسٹریٹ پر، اور Montorgueil اسٹریٹ پر، پرچم لہراتے گروہ کے گروہ ظاہر ہوئے جن پر سنہرے حروف کی جگہ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ ان پرچموں میں سے ایک سرخ اور نیلے رنگ کا تھا جن کے درمیان نہایت باریک سفید رنگ کی پٹی سی بنی ہوئی تھی۔

انھوں نے چھوٹے ہتھیار بنانے والے کارخانے کو اور Saint-Martin بولیوارڈ پر ہتھیاروں کی تین دکانوں کو، جن میں پہلی Beaubourg اسٹریٹ پر تھی، دوسری Michel-le-Comte اسٹریٹ پر اور تیسری Temple اسٹریٹ پر تھی لوٹ لیا تھا۔ چند لمحوں میں مجمعے کے ہزاروں ہاتھوں میں دو سو تیس بندوقیں آ گئی تھیں جو تقریباً سب دو نالی تھیں، چونسٹھ تلواریں اور تراسی پستول آ گئے تھے۔ زیادہ افراد کے ہاتھوں کو ہتھیار فراہم کرنے کی خاطر ایک کو بندوق دی گئی تو دوسرے کو سنگین ملی تھی۔

Quai de la Greve کے سامنے توڑے والی بندوقوں سے لیس نوجوان گولی چلانے کے قصد سے کچھ عورتوں کے گھروں میں مورچہ بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بندوق میں flint-lock [بندوق پر لگا وہ گھوڑا جو چنگاری پیدا کرکے گولی چلاتا ہے] تھا۔ انھوں نے کام کی شروعات کی اور کارتوس بنانے میں جٹ گئے۔ ان عورتوں میں سے ایک نے کہا تھا "کارتوس کسے کہتے ہیں، مجھے علم نہیں؛ میرے شوہر نے مجھے ان کے بارے میں بتایا تھا۔"

ایک گروہ Vielles Haudriettes اسٹریٹ کی ایک دکان میں زبردستی گھس گیا اور بہت سے ترکی ہتھیار چھین لیے۔

ایک عورت کی لاش جو بندوق کی گولی سے مری تھی Perle اسٹریٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ اور پھر دائیں ساحل پر، بائیں ساحل پر، گودیوں میں، بولیوارڈ پر، لاطینی محلے میں، Halles کے محلے میں جوش میں آئے آدمی، دستکار، طلبہ اور بہت سے حلقوں کے ارکان اعلانات پڑھ رہے تھے اور چیخ رہے تھے، "ہتھیار اٹھاؤ!" انھوں نے سڑکوں کی لالٹینیں توڑ ڈالیں، سواریوں میں جتے گھوڑے کھول دیے، سڑکوں کی اینٹیں اکھاڑ دیں، گھروں کے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے، درخت اکھاڑ دیے، تہ خانے چھان مارے، شراب کے پیپے لڑھکا دیے، راستوں پر پتھر، پتھروں کے ٹکڑے، فرنیچر اور لکڑی کے تختے جمع کر دیے اور رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔

انھوں نے بورژوا کو اپنی مدد کرنے پر مجبور کیا۔ عورتوں کے گھروں میں گھس گئے، غیر موجود شوہروں کی تلواریں اور بندوقیں دینے پر مجبور کیا، اور ان کے دروازوں پر کھریا مٹی سے لکھ دیا گیا تھا، ''ہتھیار وصول کر لیے گئے۔'' کچھ نے تلواروں اور بندوقوں کی وصولی پر اپنے نام بھی لکھ دیے تھے اور کہا تھا، ''کل میئر کے دفتر سے واپس منگا لینا۔'' انھوں نے ٹاؤن ہال کی طرف جانے والے پاسبانوں کو اور نیشنل گارڈ کو الگ الگ کر دیا، افسروں کے کاندھوں کے تھبنے نوچ لیے تھے۔ Cimitiere-Saint-Nicholas اسٹریٹ پر تلواروں اور درانتیوں سے مسلح ہجوم نے نیشنل گارڈ کے ایک افسر کا پیچھا کیا اور اسے بڑی مشکل سے ایک مکان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، جہاں سے وہ رات میں بھیس بدل کر نکل سکا تھا۔

Saint-Jacques کے علاقے میں طلبا اپنے ہوٹلوں سے نکل کر جھنڈ کے جھنڈ Sain-Hyacinthe اسٹریٹ سے Progress کیفے تک جمع ہوگئے، یا Mathurins اسٹریٹ پر واقع Sept-Billards کیفے تک آگئے تھے۔ وہاں ایک دروازے کے سامنے پتھر کے چھوٹے سے ستون پر کھڑے نوجوان ہتھیار تقسیم کر رہے تھے۔ رکاوٹیں بنانے کے لیے Transnonain اسٹریٹ پر واقع لکڑی خانے کو لوٹ لیا۔ ایک مقام پر Sainte-Avoye اسٹریٹ اور Simon-Le-Franc اسٹیٹ کے کونے پر باسیوں نے مزاحمت کی اور اپنے ہاتھوں سے رکاوٹوں کو مسمار کر دیا تھا۔ ایک مقام پر بلوائیوں نے ہتھیار ڈال دیے؛ انھوں نے نیشنل گارڈ کے ایک دستے پر گولیاں چلائیں اور Temple اسٹریٹ پر شروع کی جانے والی رکاوٹیں چھوڑ کر Corderie اسٹریٹ ہوتے ہوئے بھاگ گئے۔ اس دستے کو رکاوٹ کے اندر ایک سرخ پرچم، کارتوس کا ایک پیکٹ، اور پستول کی تین سو گولیاں ملی تھیں۔ نیشنل گارڈ نے پرچم پھاڑ دیا اور ان کے چیتھڑے اپنی سنگینوں پر لہرا دیے۔

ہم جن چیزوں کی باتیں کر رہے ہیں، ایک ساتھ شہر کے ہر مقام پر، بجلی کی کڑک جیسی وسیع ہلچل کے درمیان آہستہ آہستہ اور دھیمے دھیمے ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے سے کم عرصے میں صرف Halles کے علاقے میں ستائیس رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ مرکز شہر میں وہ مشہور مکان نمبر 50 تھا جو Jeanne اور اس کے چھ سو ساتھیوں کا قلعہ تھا جس کی ایک جانب Saint-Merry کی رکاوٹ تھی، اور دوسری جانب Maubuee اسٹریٹ کی۔ اور وہاں سے تین سڑکوں Arcis اسٹریٹ، Saint-Martin اسٹریٹ اور Aubry-le-Boucher اسٹریٹ پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ دائیں جانب تین رکاوٹیں تھیں، پہلی Montorgueil اسٹریٹ پر، اور Grande-Truanderie

کے علاقے میں دوسری Geoffroy-Langevin اسٹریٹ پر تھی اور تیسری Sainte-Avoye اسٹریٹ پر۔ پیرس کے دوسرے تین علاقوں میں بے شمار رکاوٹوں کا حساب لگائے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ Marais میں، ایک رکاوٹ Mont-Sainte-Genevieve کے مقام پر تھی، ایک اور Menilmontant اسٹریٹ پر تھی، جہاں سواری گاڑیوں کے اندر جانے کا پھاٹک تھا جس کو قلابوں کے پاس سے اکھاڑ دیا گیا تھا؛ اور ایک رکاوٹ Hotel-Dieu کے قریب تھی جس کو پولیس پر فیچر سے تین سو قدم دور پھینک دیا گیا تھا۔

Menetriers اسٹریٹ کی رکاوٹ پر ایک خوش لباس آدمی کام کرنے والوں کو نقدی بانٹ رہا تھا۔ Grenetat اسٹریٹ پر ایک گھڑ سوار ظاہر ہوا اور اس نے ایک آدمی کو جو رکاوٹ کا کماں دار معلوم ہوتا تھا چاندی کی کوئی شے پیش کی جو گولے جیسی تھی۔ "یہ" اس نے کہا، "اخراجات، وائن وغیرہ کی ادائیگی کے لیے ہے۔" ایک شخص جس کے بال ہلکے رنگ کے تھے، گلے میں گلوبند نہیں تھا، "pass-words" لے گیا۔ ایک اور، جس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی، سر پر نیلے رنگ کی ٹوپی تھی، چوکیداروں کو تعینات کر رہا تھا۔ رکاوٹوں سے پرے اندرونی علاقے میں مکانات کو چوکیوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بلوے کو بے حد سائنسی اور فوجی حکمتِ عملی کے انداز میں قابو میں رکھا گیا تھا۔ تنگ، اونچی نیچی، پیچ دار اور زاویوں، موڑوں والی سڑکوں کو قابلِ تعریف انداز میں منتخب کیا گیا تھا؛ بالخصوص Halles کے علاقے میں پتلی پتلی سڑکوں کا جال بچھا تھا جو کسی جنگل سے بھی زیادہ پیچیدہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ The Society of the Friends of the People نے ذمے داری لی تھی کہ بد امنی کو Sainte-Avoye کے علاقے کی طرف موڑ دیا جائے گا۔ ہلاک ہو جانے والے ایک آدمی کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے پیرس کا نقشہ برآمد ہوا تھا۔

وہ کیفیت جس نے شورش کی رہنمائی کی تھی، فضا میں ایک قسم کی شدت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ بد امنی نے ایک جانب رکاوٹیں تعمیر کی تھیں، اور دوسری جانب چھاؤنی کی تقریباً تمام چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جیسے بارود سے بھری ریل گاڑی میں آگ بھڑک اٹھے، تین گھنٹے سے کم عرصے میں بلوائیوں نے دریا کے دائیں ساحل پر حملہ کر کے Arsenal، Place Royale کے میئر کے دفاتر پر، پورے Marais پر، Popincourt کے اسلحہ ساز کارخانے پر، la Galiote پر، Chateau-d'Eau پر اور Halles کے علاقے کی قریبی سڑکوں پر قبضہ کر لیا تھا؛ بائیں ساحل پر واقع بیرکوں پر، Sainte-Pelagie پر، Place Maubert پر، Deux-Moulins کے بارود خانے پر اور تمام رکاوٹوں پر بھی قبضہ کر لیا گیا تھا۔ سہ پہر کے پانچ

بجے تک، وہ Bastille کے، Lingerie کے اور Blancs-Manteaux کے مالک ہو گئے تھے۔ ان کے اسکاؤٹ Place des Victoires تک پہنچ گئے تھے، اور ساحل کو، Petits-Peres پرکوں کو، اور ڈاک خانے کو تاراج کر دیا تھا۔ پیرس کا ایک تہائی حصہ بلوائیوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔

تنازعہ ہر مقام پر بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا تھا؛ اور گھریلو ملاقاتوں کے سلسلے کے خاتمے اور اسلحے کی دکانوں کی تیزی سے لوٹ مار کے نتیجے میں لڑائیوں میں جو سنگ باری سے شروع ہوئی تھی بندوق کی گولیوں کے ذریعے جاری رہی۔

شام کے چھ بجے تک Saumon گلی میدانِ جنگ بن گئی تھی۔ ایک طرف شورشی تھے تو دوسری جانب فوجیں تھیں۔ ایک مبصر، خواب دیکھنے والا، اس کتاب کے مصنف نے جو اس آتش فشاں کو قریب سے دیکھنے کی غرض سے گیا تھا خود کو اس گلی میں دو آگ کے درمیان پایا۔ خود کو گولیوں سے بچانے کے لیے اسے دو بڑے بڑے نصف ستونوں کی آڑ لینی پڑی تھی جو دکانوں کو علاحدہ کرتے تھے؛ وہ اس حالت میں تقریباً نصف گھنٹے تک گرفتار رہا تھا۔

اس دوران اسلحے کی طلب ختم ہو گئی تھی، نیشنل گارڈ تیزی سے مسلح ہو گئے، بلدیاتی علاقوں سے فوجی دستے نکلے اور پیرکوں سے رجمنٹیں نکلیں۔ l'Ancre نامی گلی کے سامنے ایک ڈرم بجانے والا قرولی سے گھائل ہوا۔ دوسرا Cygne اسٹریٹ پر پٹ گیا اور تیس نوجوانوں نے اس کا ساز توڑ ڈالا اور تلوار چھین لے گئے۔ Grenier-Saint-Lazare اسٹریٹ پر ایک مارا گیا، یکے بعد دیگرے تین افسر مارے گئے۔ کئی میونسپل گارڈ گھائل ہو کر Lombards اسٹریٹ پر پسپا ہو گئے تھے۔

Cour-Batave کے سامنے نیشنل گارڈ کے ایک دستے کو سرخ رنگ کا ایک پرچم ملا جس پر لکھا تھا: ری پبلکن انقلاب نمبر 127۔ واقعی، کیا یہ انقلاب تھا؟

بدامنی نے پیرس کے مرکز کو کبھی نہ سلجھنے والی پیچیدہ اور بھیانک جائے پناہ بنا دیا تھا۔

کیا یہ آتش دان کا دروازہ بن گیا تھا؟ بظاہر یہی ایک سوال تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں، بس جھڑپیں تھیں۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس وقت تک باقاعدہ لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دستوں کے فوجیوں کو یقین نہیں تھا، جس نے بحران میں ایک خوفناک بے یقینی پیدا کر دی تھی۔ انھیں جولائی 1830ء یاد آ گئی جس میں تریپنویں قطار کی غیر جانب داری کو خوش آئند قرار دیا گیا تھا۔ دو مدبر آدمی، جن پر عالمی جنگ میں مقدمہ چلایا گیا تھا، مارشل Lobau اور جنرل

نیشنل گارڈ کے مجیس Bugeaud کے ماتحت تھا Lobau کے۔ Bugeaud کمان کر رہے تھے
میں ایک پوری کمپنی گشت میں تھی، اور ان سے پہلے پولیس کے سرکاری اسکارف پہنے بغاوت والی سڑکوں پر حرکات وسکنات پر نظر رکھنے والے لیے گئے تھے۔ سرکش آدمیوں نے اپنے جانب سے کھلی جگہوں کے کونوں پر سنتری رکھے تھے، ڈھٹائی سے رکاوٹوں کے باہر اپنے گشت کرنے والے بھیجے تھے۔ ہر فریق دوسرے فریق پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ حکومت، جس کے پاس فوج تھی، ہچکچا رہی تھی؛ رات تقریباً سر پر آ گئی تھی، اور Saint-Merry کی گھنٹی اپنے ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ اس زمانے کے وزیرِ جنگ، مارشل Soult، جنھوں نے Austerlitz دیکھا تھا، اس کو اس انداز میں ہی لیا گیا تھا۔

یہ پرانے مزاج، جو صحیح قسم کے داؤ چلانے کے عادی ہوتے ہیں، اور جن کے پاس وسیلے کی طور پر رہنمائی کے داؤ پیچ ہوتے ہیں اس بھیانک تجاگ کی موجودگی سے لاپروا ہوتے ہیں جسے عوامی غیظ کہا جاتا ہے۔

مضافات کے نیشنل گارڈ سرعت اور بے ترتیبی سے دوڑ پڑے تھے۔ 12th Light کی ایک بٹالین Saint-Denis کی جانب سے آئی، اور Courbevoie سے the 14th of Line آئی۔ فوجی اسکول کی مشینوں نے Carrousel پر پوزیشن سنبھال لی تھی؛ اور Vincennes سے توپیں اتر رہی تھیں۔

Tuileries کے اطراف ویرانی چھا گئی تھی۔ لوئی فلیپ مکمل طور پر پُرسکون ہو گیا تھا۔

پیرس کی ندرت

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، پچھلے دو برسوں کے درمیان پیرس ایک سے زیادہ بد امنی دیکھ چکا تھا۔ عام طور پر کوئی شے غیر معمولی طور پر اتنی پُر سکون نہیں ہوتی شورش کے دوران جو بغاوت کرنے والے علاقوں کی حدود سے دور ہوتی ہے۔ صرف بلوے ہی میں نہیں، پیرس بہت سرعت سے اپنے آپ کو ہر چیز کا عادی بنا لیتا ہے۔ پیرس کے لیے اتنے سارے معاملات ہوتے ہیں کہ وہ کسی معاملے کو معمولی سمجھ کر ایک طرف نہیں کر دیتا۔ ایسے بڑے شہر ہی اس قسم کے نظارے پیش کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے بے حد بڑے علاقے ہی خانہ جنگی اور خاموشی کو ایک ساتھ برداشت کر سکتے ہیں۔ عام طور پر، جب کوئی بد امنی شروع ہوتی ہے، جب دکان دار کو ڈھول کی، ہتھیار اٹھانے کی، عام قسم کے خطرے کی آواز سنائی دیتی ہے تو بس اتنا کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتا ہے:

''شاید Saint-Martin اسٹریٹ پر فساد ہو گیا ہے۔'' یا ''Saint-Antoine کے علاقے میں کچھ ہوا ہے۔''

کبھی وہ لاپروائی سے اس میں اضافہ کر دیتا ہے، ''یا، کہیں اسی سمت کچھ ہوا ہے۔''

بعد میں، جب دل دکھانے والی اور غم انگیز بندوق بازی اور سپاہیوں کے ہاتھوں کوئی چپقلش سنائی دیتی ہے تو دکان دار کہتا ہے، ''یہ معاملہ تو بڑھتا جا رہا ہے، سنا تم نے، بڑھتا ہی جا رہا ہے۔''

ایک لمحے بعد، جب بلوہ قریب آنے لگتا ہے اور تیز ہونے لگتا ہے تو وہ تیزی سے اپنی دکان بند کر لیتا ہے اور اپنی وردی اتار پھینکتا ہے، یعنی وہ اپنے مالِ تجارت کی حفاظت کے بدلے خود کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

لوگ کسی چوراہے پر، کسی راستے پر، کسی بند گلی میں گولیاں چلاتے ہیں؛ دکانوں پر قبضے

اور دوبارہ قبضے کیے جاتے ہیں؛ خون بہتا ہے، گھروں کی پیشانیاں گریپ شاٹ کے چھوٹے چھوٹے گولوں سے چھد جاتی ہیں، گولے بستر میں لیٹے لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں، لاشیں سڑکوں کا بوجھ بن جاتی ہیں۔ جب کہ ایک گلی چھوڑ کر، اگلی گلی کے ریستورانوں سے بلیرڈ کے گیندوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

تھیٹر اپنے دروازے کھول دیتے ہیں اور اپنے ہفت رنگ تماشے پیش کرتے ہیں؛ جنگ سے بھری گلیوں سے چند قدم آگے تجسس کرنے والے بھی ہنستے اور گپ ہانکتے سنائی دیتے ہیں۔ کرایے کی سواری گاڑیاں دور دور جاتی رہتی ہیں؛ راہگیر شہر کے کسی بھی علاقے میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی، اسی علاقے میں بھی جاتے ہیں جہاں لڑائی جاری ہوتی ہے۔

1831ء میں یہ بھی ہوا تھا کہ ایک برات کے گزر جانے کے لیے حملہ روک دیا گیا تھا۔

1839ء کی بدامنی کے دوران Saint-Martin اسٹریٹ پر ایک بوڑھے اور کم زور آدمی کے ٹھیلے پر، جس پر سہ رنگا کپڑا پڑا تھا اور قرابے رکھے ہوئے تھے، جس میں کسی قسم کا رقیق بھرا تھا، رکاوٹ سے سپاہی کی جانب، اور سپاہی سے رکاوٹ کی طرف، آرہا تھا، جا رہا تھا، اور بلا تفریق، کوکو سے بھرے گلاس پیش کرتا دیکھا گیا تھا— حکومت کو بھی، اور غیر قانونیت کو بھی۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا ہو سکتی ہے؛ پیرس میں ہونے والی شورشوں کا ایسا ہی مخصوص کردار ہوتا ہے، جو کسی اور دارالحکومت میں پایا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے دو باتیں ضروری ہوتی ہیں، پیرس جیسے طوالت، اور اس کی خوش دلی اور والٹیئر اور نپولین کا شہر ضروری ہے۔

مگر اس موقعے پر 1832ء جون کی پچیسویں تاریخ پر ہتھیار اٹھانے کے دوران اس عظیم شہر کو کچھ محسوس ہوا تھا، جو شاید اس کے اپنے وجود سے زیادہ طاقت ور تھا، یعنی پیرس خوف زدہ ہو گیا تھا۔

سب سے زیادہ ''غیر جانب دار'' فاصلے پر واقع علاقوں میں بھی ہر طرف بند دروازے، بند کھڑکیاں اور آہنی چقیں گری دکھائی دینے لگی تھیں۔ ہمت والے ہتھیار لیے ہوئے تھے اور ڈرپوک چھپے ہوئے تھے۔ اپنے کام میں مصروف اور بے پروا راہگیر غائب ہو گیا تھا۔ بہت سی سڑکیں صبح کے چار بجے خالی تھیں۔

پریشان کُن تفصیلات پھیرے لے رہی تھیں، ہلاکت کی خبریں پھیلائی جا رہی تھیں— کہ وہی بینک کے مالک تھے — کہ صرف Saint-Merry کی خانقاہ میں چھ سو آدمی، لڑنے کو تیار گرجا گھر میں مورچے لگائے تھے-- کہ صرف انھیں پر انحصار نہیں تھا، کہ Armand Carrel

مارشل Clausel سے ملنے گیا تھا اور مارشل نے کہا تھا، ''پہلے ایک رجمنٹ فوج بلالو''؛ کہ لافایت بیمار تھا، مگر اس نے اُن سے کہا تھا کہ جو کچھ بھی ہو ''میں تمھارے ساتھ ہوں، جہاں بھی کُرسی کی جگہ ہوگی میں تمھارے ساتھ ساتھ چلوں گا''؛ کہ کسی کو کسی کی حفاظت کرنی ہوتی ہے؛ کہ رات کے وقت لوگ پیرس کے سنسان علاقے کے تنہا مکانات کو لوٹ لیں گے (یہاں پولیس کا خیال، کہ Anne Radcliffe حکومت سے ملا ہوا ہے، صاف نظر آرہا تھا)؛ کہ توپ خانے کی ایک چوکی Aubry le Boucher میں قائم کی گئی ہے؛ کہ Lobau اور Bugeaud مل کر سوچ رہے تھے، اور یہ بھی کہ، آدھی رات کے وقت، یا کم از کم طلوع فجر کے وقت چار فوجی دستے شورش کے مرکز میں ایک ساتھ مارچ کرتے آئیں گے؛ پہلا دستہ Bastille سے آئے گا، دوسرا Porte Saint-Martin سے، تیسرا Greve سے، چوتھا Halles سے؛ کہ شاید سپاہی پیرس کو خالی کر دیں گے اور Champ-de-Mars میں پسپا ہو جائیں گے؛ کہ کسی کو علم نہیں کہ کیا ہوگا، مگر یہ ضرور ہے کہ اس بار معاملہ بہت حساس ہوگیا ہے۔

لوگوں نے خود کو مارشل Soult کی ہچکچاہٹ پر مصروف کر لیا تھا۔ اس نے فوراً حملہ کیوں نہیں کر دیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت مصروف تھا۔ اس اداسی کے عالم میں تجربے کار شیر کو کسی نامعلوم عفریت کی بو آرہی تھی۔

شام ہوئی، تھیٹر نہیں کھلے؛ گشتی گروہ الجھن میں گرفتار گھوم رہے تھے؛ راہگیروں کی تلاشی لی جا رہی تھی؛ مشتبہ لوگ گرفتار کیے جا رہے تھے۔ نو بجے تک آٹھ سو سے زیادہ افراد گرفتار ہو چکے تھے؛ پولیس تھانوں پر ان کا بوجھ پڑ گیا تھا، اور یہی حال Conciergerie کا تھا؛ یہی حال لافورس کا تھا۔

بالخصوص Conciergerie میں ایک طویل تہہ خانہ ہے جسے پیرس اسٹریٹ کہا جاتا تھا، اس میں پیال کے گٹھے بکھرے ہوئے تھے، جن پر قیدی انبار تھے، Lyons کے، Lagrange کے لوگ بہادری سے خطاب کر رہے تھے۔ وہ سارا پیال، ان لوگوں کی حرکت کے باعث، تیز بارش کی سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ دوسری جگہوں پر قیدی کھلے میدانوں میں ایک دوسرے پر لاد دیے گئے تھے۔

ہر طرف فکرمندی کا، اور ایک مخصوص قسم کی لرزش کا راج تھا، پیرس جس کا عادی نہیں تھا۔

لوگوں نے خود کو اپنے گھروں میں مورچہ بند کر لیا تھا؛ بیویاں اور مائیں بے چین تھیں؛ سوائے اس کے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا، ''اوہ، میرے خدا! وہ ابھی تک گھر نہیں آیا ہے۔'' دور سے

آنے والی گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

لوگ اپنی ڈیوڑھیوں پر بیٹھے، افواہوں، چیخوں، ہلچل، دور سے آنے والی دھیمی آوازوں پر، اور ان چیزوں پر کان لگائے بیٹھے تھے جن کو سُن کر کہا جا سکتا تھا، "یہ گھڑ سواروں کا دستہ ہے۔" یا "اسلحے سے بھری گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔" "وہ بگل ہے، ڈھول ہے، گولی کی آواز ہے، اور Saint-Merry سے اٹھنے والا سب سے زیادہ افسوس ناک شور ہے۔"

وہ توپ کے پہلے وار کے منتظر تھے۔ لوگ سڑکوں کے کونوں پر نکلتے، اور "گھر جاؤ" کہتے ہوئے غائب ہو جاتے تھے۔ لوگ اپنے دروازوں کی چٹخنی چڑھانے میں جلدی کر رہے تھے، اور کہہ رہے تھے، "یہ سب کس طرح ختم ہو گا؟" لمحے لمحے، جیسے جیسے رات کی سیاہی بڑھتی جا رہی تھی، پیرس بغاوت کے بھیانک شعلوں کے باعث زیادہ غم انگیز صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

❋

گاوروش کی شاعری

اس لمحے جب بدامنی نے، جو Arsenal کے سامنے عوام اور فوج کو صدمہ پہنچانے سے پیدا ہوئی تھی، ابتدا اور عقب کی جانب ایک اور تحریک شروع کر دی تھی، بولیوارڈ کی پوری لمبائی اور چوڑائی میں بہت سے لوگ میت گاڑی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے کہ جلوس کی ابتدا میں ایک خوف ناک زوال شروع ہو گیا۔ پسپائی متزلزل ہو گئی، صفیں تتر بتر ہو گئیں، سب دوڑ پڑے، بھاگے، فرار ہو گئے، کچھ تو حملے کی چیخ سے، دوسرے فرار کے خوف سے۔ [انسان کا] یہ عظیم دریا جو بولیوارڈ پر چھایا ہوا تھا ایک جھٹکے میں دائیں بائیں تقسیم ہو گیا تھا اور اس کی لہریں دو سو سڑکوں میں پرنالے کی طرح آزاد بہہ نکلی تھیں۔

عین اس لمحے چیتھڑوں میں ملبوس ایک لڑکا Menilmontant اسٹریٹ سے آ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں laburnum [پیلے پھول دینے والے ایک درخت] کے پھولوں ایک شاخ تھی جو اس نے چند لمحے پہلے Belleville کی بلندیوں سے توڑی تھی۔ اس کی نظر پستول کے ایک پرانے ہولسٹر پر پڑی جو نوادرات کی دکان کی کھڑکی میں سجا ہوا تھا۔

''مادر، آپ کا نام کیا ہے، میں آپ کی مشین ادھار مانگنے والا ہوں؟'' اور وہ پستول لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

دو منٹ بعد خوف زدہ بورژوائیوں کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا جو Amelot اسٹریٹ اور Basse اسٹریٹ کے ذریعے فرار ہو رہے تھے۔ انھیں ایک لڑکے کا سامنا ہوا جو پستول تانے کھڑا گا رہا تھا:

رات میں کچھ نظر نہیں آتا

دن میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے
جعل سازی کی ساری تحریریں
بورڈوا نے خراب کر ڈالیں
مشق اچھا عمل تو ہے لیکن
بیٹ "ٹوٹو" کی کہتی ہے کچھ اور

وہ لڑکا گاوُروش تھا جو جنگ کی طرف جا رہا تھا۔
بولیوارڈ پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پستول میں لبلبی نہیں تھی۔

ان مصرعوں کا، جن کی تھاپ پر وہ چل رہا تھا، اور دوسرے تمام گانوں کا تخلیق کار کون تھا، جن کا ایسے موقعوں پر گانا اسے پسند تھا؟ ہمیں علم نہیں تو پھر کون جانتا ہے؟ شاید وہ خود ہی جانتا ہے۔ پھر بھی وہ ان دھنوں کو خوب جانتا تھا جو اس وقت رائج تھیں، جن میں اس نے اپنے چہچہے بھی شامل کر دیے تھے۔ عجب غور کرنے والا شریر اور لچا تھا وہ، اس نے فطرت کی اور پیرس کی آوازوں کو ملا کر ایک مرکب بنا دیا تھا۔ اس نے پرندوں کی آوازوں کے مخزن میں کارخانوں کی آوازوں کے مخزن کی آمیزش کر دی تھی۔ وہ چوروں سے واقف تھا، جو اس کے اپنے قبیلے سے مماثل تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تین ماہ تک اس نے کسی چھپائی کرنے والے سے کام سیکھا تھا۔ گاوُروش ایک آوارہ ادیب تھا۔

مزید یہ کہ گاوُروش کو اس حقیقت پر کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس نے دو آوارہ لڑکوں کو اس بھیانک باراں رات میں اپنی ہاتھی [والی قیام گاہ] کی میزبانی پیش کی تھی کہ وہ اس کے اپنے بھائی تھے، اور یہ بھی اس نے دانش مندی کا کام کیا تھا۔ شام کو وہ اس کے بھائی تھے، اور صبح کو وہ ان کا باپ تھا؛ ایسی تھی وہ رات۔ فجر کے وقت Ballets اسٹریٹ چھوڑنے کے بعد، وہ جلدی سے ہاتھی میں واپس آیا، اور فن کاری سے ان دو لڑکوں کو وہاں سے نکالا تھا، ان کے ساتھ کسی قسم کا ناشتا کیا تھا جو اس نے خود ایجاد کیا تھا، اور پھر انھیں اس ماں کے حوالے کر کے چلا گیا تھا، اس سڑک پر جہاں مکمل طور پر ان کی نشوونما ہوئی تھی۔ ان سے الگ ہوتے وقت اس نے اس شام اسی وقت ملاقات طے کر لی تھی اور الوداعی طور پر یہ الفاظ ان کے کان میں ڈال دیے تھے، "میں بید توڑتا ہوں، اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں، کہ میں اپنی چھتری کاٹتا ہوں، یا، جیسا کہ وہ عدالت میں کہتے ہیں، میں غائب ہو جاتا ہوں۔ اگر تم دونوں کو پاپا اور ماما نہیں ملتے تو شام کو ادھر ہی چلے آنا۔ میں تمھارے رات کے کھانے کا بندوبست کر دوں گا اور تمھاری مکمل تلاشی بھی لوں گا۔"

دونوں ہی بچے واپس نہیں پہنچے، اس لیے کہ کسی پولیس والے نے انھیں پکڑ لیا تھا، اور کسی پناہ گاہ میں ڈال دیا تھا، یا انھیں کسی عطائی نے غائب کر دیا تھا جہاں سے واپس نہیں آسکے تھے۔ عملی سماجی دنیا کی کم سے کم گہرائی ایسے غائب زدہ نشانات سے پُر ہے۔ گاؤروش کو وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے۔ اس رات کے بعد سے دس یا بارہ ہفتے گزر چکے تھے۔ اس نے ایک سے زیادہ بار اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا تھا، ''میرے دونوں بچے کہاں چلے گئے؟''

اس دوران ہاتھ میں پستول لیے وہ Pont-aux-Choux اسٹریٹ پر وارد ہوگیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس سڑک پر ایک سے زیادہ دُکانیں کھلی تھیں، اور تصور کیا جاسکتا تھا کہ ان میں ایک اہم دُکان پیسٹری بنانے والے کی تھی۔ یہ ایک اچھا موقع تھا نامعلوم میں داخل ہونے سے قبل ایک اور سیب کا سموسہ کھانے کا۔ گاؤروش رُکا، اپنی جیب ٹٹولی، جیب کو الٹ دیا، کچھ نہیں ملا، ایک سو بھی نہیں تھا، اور اس نے چیخنا شروع کر دیا، ''میری مدد کرو!''

آخری کیک چھوڑ دینا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔

پھر بھی گاؤروش نے کوشش جاری رکھی۔

دو منٹ بعد وہ Saint-Louis اسٹریٹ پر تھا۔ Parc-Royal اسٹریٹ کو پار کرتے ہوئے اسے سیب کے سموسے کا نقصان پورا کرنے کا خیال پیدا ہوا جو ناممکن تھا، اور اسے دن دہاڑے تھیٹر کے اشتہار پھاڑنے میں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد، مطمئن دکھائی دینے والے لوگوں کا ایک گروہ نظر آیا، جو دکانوں کے مالک محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے کاندھوں کو جنبش دی اور ان کے سامنے اپنا فلسفہ اُگل دیا:

''کتنے موٹے یہ دولت مند لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نشے میں بدمست ہیں۔ یہ قیمتی غذا میں لوٹ لگاتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے۔ یہ اسے کھا لیتے ہیں، اور بس یہی کچھ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور سب کچھ ہوا ہو جاتا ہے۔''

گاوروش کی پیش قدمی

سرِ عام بغیر لبلبی کا پستول لہرانا ایسا مذاق تھا کہ گاوروش کو اپنے اندرون کی گرمی ہر لمحہ بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔ مارسیلیز [فرانسیسی قومی ترانے] کے ٹکڑے گاتے ہوئے، اس نے چیخ کر کہا:

"سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ میرے بائیں پیر میں کھجلی بہت ہو رہی ہے، مجھ پر گٹھیا طاری ہوتا جا رہا ہے، مگر لوگو میں بہت مطمئن ہوں۔ بورژوا کو بس اتنا کرنا ہے کہ وہ ٹھیک سے رہیں، [ورنہ] میں مخرب اشعار پھینکنا شروع کر دوں گا۔ پولیس کے جاسوس کیا کرتے ہیں؟ کتے ہیں وہ۔ بس، مجھے ان میں سے ایک کو اپنے پستول کے نشانے پر رکھنا ہوگا۔ دوستو، میں بولیوارڈ والا ہوں۔ وہاں گرمی بڑھ رہی ہے، مجھ میں اُبال آنے والا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ برتن کا ڈھکنا ہٹا دیا جائے۔ آگے بڑھو، لوگو! کھیتوں کی نالیوں کو گندے خون سے بھر دو۔ میں اپنا سارا وقت اپنے ملک کو دے رہا ہوں۔ اب میں اپنی داشتہ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ بس! ختم ہو گئی ہے، ہاں ہاں، بنی؟ مگر کوئی بات نہیں۔ مسرت زندہ باد! اسے پھانسی چڑھا دو! میں جبریت سے تنگ آ چکا ہوں۔"

اسی لمحے نیشنل گارڈ کے ایک نیزہ باز کا گھوڑا زمین پر گر پڑا تھا۔ گاوروش نے اپنا پستول سڑک پر رکھا، اس آدمی کو اٹھایا اور پھر گھوڑے کو اٹھانے میں مدد کی۔ اس کے بعد اس نے اپنا پستول اٹھایا اور اپنے راستے چل پڑا۔ Thorigny اسٹریٹ پر ہر طرف امن اور خاموشی تھی۔ Marais [پیرس کی اشرافیہ کے علاقے] کے اطراف کی مخصوص سرد مہری کی تفریق واضح تھی۔ چار باتونی عورتیں ایک ڈیوڑھی میں گپ بازی کر رہی تھیں۔

اسکاٹ لینڈ میں بھتنوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں؛ پیرس میں گپ باز چڑیلوں کی رباعیاں ہوتی ہیں؛ اور Carrefour Baudoyer میں بوناپارٹ کے لیے "تو بادشاہ بنے گا" اسی

طرح کہا جائے گا جیسے Armuyr کے میدان میں میکبتھ کے لیے کہا گیا تھا۔ اور کائیں کائیں بھی بالکل ایک جیسی ہوگی۔

Thorigny اسٹریٹ کی گپ باز عورتیں اپنے معاملات میں مصروف تھیں۔ ان میں سے تین دربان عورتیں تھیں اور چوتھی جھاڑو بردار چیتھڑے چننے والی تھی۔

چاروں گپ باز بڑھاپے کے چار کونوں — کم زوری، زوال پذیری، کھنڈر اور افسردگی — پر کھڑی محسوس ہو رہی تھیں۔

چیتھڑے چننے والی فروتن تھی۔ اس کھلی سوسائٹی میں وہ چیتھڑے چننے والی ہوتی ہے جو سلامی دیتی ہے، اور وہ دربان ہوتی ہے جو دست گیری کرتی ہے۔ یہ سب کوڑے دان کے لیے ہوتا ہے، جو دربان کی مرضی کے مطابق چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے، اور اس کی پسند کا ہوتا ہے جو ڈھیر کرتا ہے۔ اس میں جھاڑو کی مہربانی بھی ہو سکتی ہے۔

چیتھڑے چننے والی خوش مزاج تھی، وہ مسکراتی بھی تھی، اور اس کی مسکراہٹ بھی کیا خوب تھی۔ ان تینوں کے لیے۔ ان کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں:

"ارے ہاں، کیا تمھاری بلی اب بھی کتے سے ملتی ہے؟"

"او خدایا! بلیاں فطری طور پر کتوں کی دشمن ہوتی ہیں، تم تو جانتی ہی ہو۔ وہ کتے ہیں جو شکایت کرتے ہیں۔"

"اور آدمی بھی تو۔"

"مگر بلی کے پسّو آدمیوں پر نہیں جاتے۔"

"مشکل یہ نہیں، مشکل یہ ہے کہ کتے خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک برس جب کتے بہت ہو گئے تھے تو اخبار میں دینا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب شاہی محلات میں اعلیٰ درجے کی بڑی بڑی بھیڑیں ہوا کرتی تھیں جو روما کے بادشاہ کی سواری میں جوتی جاتی تھیں۔ تمھیں یاد ہے نا، وہ روما کا بادشاہ؟"

"مجھے تو Bordeau کا ڈیوک زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"لوئی ہشت دہم کو جانتی ہوں، لوئی ہشت دہم اچھا آدمی ہے۔"

"گوشت بہت مہنگا ہو گیا ہے، ہے کہ نہیں مدر Patagon؟"

"اُف، اس کا تو نام بھی نہ لو۔ قصائی کی دکان دہشت ہو گئی ہے۔ ہیبت ناک دہشت — آج کل تم سوائے چھچھڑوں کے کچھ خرید ہی نہیں سکتیں۔"

اس موقعے پر چیتھڑے چننے والی نے مداخلت کی، "خواتین! کاروبار بہت مندا ہے۔ کوڑے کے ڈھیر بھی بدنصیب ہو گئے ہیں۔ اب ان پر کوئی کچھ بھی نہیں پھینکتا۔ لوگ سب کچھ کھا جاتے ہیں۔"

"la Vargouleme تم سے بھی زیادہ مفلس لوگ ہوتے ہیں۔"

"افسوس، کہ یہ سچ ہے۔" چیتھڑے چننے والی نے تفاخر سے جواب دیا، "مگر میرا اپنا پیشہ ہے۔"

ایک لمحے کا توقف ہوا، اور چیتھڑے چننے والی، اس بڑبولے پن کے زیرِ اثر بولی جو انسان کی خصلت میں ہوتا ہے، "صبح کے وقت، جب میں گھر واپس جاتی ہوں، اپنی چھابی اٹھاتی ہوں، اور اپنی چیزیں الگ الگ کرتی ہوں۔ میرے کمرے میں ڈھیر لگ جاتا ہے۔ میں چیتھڑوں کو اک چھابی میں رکھتی ہوں، سخت چیزیں اور ٹہنیاں بالٹی میں، کپڑے الماری میں، اونی چیزیں طشت میں، پرانے کاغذ کھڑکی کے کونے پر، اور چیزیں جو کھانے کے قابل ہوتی ہیں پیالے میں، شیشے کے ٹکڑے اپنے آتش دان میں، پرانے جوتے اپنے دروازے کے پیچھے، اور ہڈیاں اپنے پلنگ کے نیچے صاف دیتی ہوں۔"

گاوروش، اس کے پیچھے کھڑا سن رہا تھا۔ "بڑھیو!" اس نے کہا، "کیا سیاست بگھار رہی ہو؟"

اس پر چوگنی آواز سے ایک حملہ ہوا۔ "لو، ایک اور بدمعاش مل گیا ہے۔"

"اس کے تھیلے میں کیا ہے؟ پستول؟"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ کس قسم کا بھکاری لونڈا ہے؟"

"اس قسم کا جانور آسان نہیں ہوتا بشرطیکہ صاحبانِ اقتدار کو اُلٹنے والا ہو۔"

گاوروش نے حقارت سے توقف کیا اور پاداش میں اپنے انگوٹھے کی مدد سے اپنی ناک کی نوک اونچی کی، اور اپنی ہتھیلی کھول دی۔

چیتھڑے چننے والے چیخ کر بولی، "تو بدباطن، خالی ہتھیلی والا، بدنصیب!"

جو Patagon کہنے پر جواب دیتی تھی اس نے خوف سے اپنے ہاتھ باندھ لیے۔

"میں کہہ رہی ہوں، کہ آج ضرور کوئی بدمعاشی ہونے والی ہے۔ پڑوس کا وہ آوارہ لڑکا، جس کی نوکیلی سی ڈاڑھی ہے، میں اسے روزانہ ایک نوجوان کے ساتھ گزرتے دیکھتی ہوں، اس کے ہاتھ میں گلابی رنگ کی ٹوپی ہوتی ہے، آج پھر اسے جاتے دیکھا ہے، مگر اس بار اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ماں Bacheux کہتی ہے کہ پچھلے ہفتے Pontoise میں کوئی انقلاب آیا تھا۔ اور اب اس خارشی بدمعاش کے ہاتھ میں پستول ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہر Celestin کے پاس پستول ہوتا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے، حکومت کو ان فضول لوگوں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، جنھیں

کچھ بھی نہیں آتا سوائے دنیا کو برباد کرنے کے، جس کو ہم کسی نہ کسی طرح پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، ان تمام بدنصیبیوں کے بعد، میرے خدا، آج میں نے اس بے چاری ملکہ کو tumbril [موت کی سزا کے لیے لے جانے والی گاڑی] پر گزرتے دیکھا تھا اور اس سب کے بعد تمبا کو مزید مہنگا ہو جائے گا۔ کتنی بُری بات ہے اور میں اس بدنصیب کا گلوٹین پر سر کٹتے دیکھنے جاؤں گی۔"

"بڑی بی، تمھارے ناک میں ناس لگی ہوئی ہے" گاوروش نے کہا "اپنی ناک تو صاف کرلو۔"

اور پھر وہ چلا گیا۔ جب وہ Pavee اسٹریٹ پر تھا، اس کے ذہن میں کوڑے چننے والی کا خیال آگیا، اور وہ خود کلامی کرنے لگا۔ "انقلابیوں کی توہین کرنا غلط بات ہوتی ہے، مدر کوڑے کی ڈھیری! یہ پستول آپ کی بھلائی کے لیے ہے۔ اسی طرح جیسے کھانے کے لیے تمھاری ٹوکری میں اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔"

اچانک اسے عقب سے چیخ کی آواز آتی سنائی دی؛ یہ آواز مدر Patagon کی تھی جو اس کے پیچھے آرہی تھی، اور مکّے ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی، "تم بڑے حرامی ہو۔"

"ارے، بس بھی کرو۔" گاوروش نے کہا "مجھے دھیلے بھر بھی پروا نہیں تمھاری باتوں کی۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ Hotel Lamoignon کے پاس سے گزرا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی درخواست پیش کی۔ "آگے بڑھو، لڑائی کے لیے۔" اور اس پر غم انگیزی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس نے اپنے پستول کو سرزنش کی نظر سے دیکھا، جو اس کو بہلانے کی کوشش محسوس ہو رہی تھی،

"میں چلا۔" اس نے [اپنے پستول سے مخاطب ہو کر] کہا، "مگر تم نہیں چلو گے!"

ایک کتا دوسرے کتے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لمحے ایک دُبلا پتلا کتا سامنے آگیا تھا۔ گاوروش کو اس پر رحم آگیا۔

"بے چارے کتے!" اس نے کہا، "تم نے پورا پیپا [اپنے اندر] انڈیل لیا ہوگا، اس لیے کہ تمھارے سارے پنجلے نظر آرہے ہیں۔"

اس کے بعد وہ l'Orme-Saint-Gervais کی طرف چل پڑا۔

حجّام کا غصہ

وہ لائق حجام جس نے اپنی دُکان سے ان دو بچوں کو بھگا دیا تھا جن کے لیے گاوَروش نے پدری شفقت کے زیرِ اثر ہاتھی کے اندرون میں اپنی قیام گاہ کا دروازہ کھول دیا تھا، اس وقت اپنی دُکان میں ایک عمر رسیدہ سپاہی کی حجامت بنا رہا تھا، جس نے سلطنت کی فوجی ملازمت کی تھی۔دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔فطری طور پر حجام نے سپاہی سے بلوے کی بات شروع کی، اس کے بعد جنرل لا مارک کی، اور لا مارک کے بعد بات شہنشاہ تک پہنچ گئی تھی۔اس گفتگو سے حجام اور سپاہی کے درمیان وہ مکالمہ شروع ہوگیا جسے، اگر شاعر پرودہوم (Prudhomme) سُن رہا ہوتا تو اس نے عربی آرائش کی طرح اس کو "ریزر اور تلوار کے درمیان گفتگو" کا عنوان دیا ہوتا۔

"شہنشاہ گھڑسواری کیسی کرتا تھا جناب؟" حجام نے پوچھا۔

"بُری طرح۔اسے گرنا نہیں آتا تھا — اس لیے کہ وہ کبھی گرا نہیں تھا۔"

"کیا اس کے پاس نفیس گھوڑے تھے؟۔اس کے پاس اچھے گھوڑے ضرور رہے ہوں گے۔"

"اس دن جب اس نے مجھے میرا تمغا دیا تھا، میں نے اس کے جانور کو دیکھا تھا۔وہ دوڑ میں حصہ لینے والی، مکمل طور پر سفید رنگ کی گھوڑی تھی۔اس کے کانوں کے درمیان زیادہ فاصلہ تھا۔اس کا سر خوب صورت تھا، پیشانی پر سیاہ رنگ کا ستارہ تھا، گردن لانبی، مضبوط گھٹنے، نمایاں پسلیاں، جھکے ہوئے کاندھے، پندرہ ہاتھ سے ذرا زیادہ قد تھا اس کا۔"

"خوب صورت گھوڑی۔" حجام نے کہا۔

"وہ واقعی اس کی شان دار گھوڑی تھی۔"

حجام نے محسوس کیا کہ اتنے غائر مشاہدے کے بعد، خاموشی کا چھوٹا سا وقفہ بہتر ہوگا، سو

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا، اور پھر گویا ہوا، ”شہنشاہ کبھی زخمی بھی ہوا تھا جناب؟“

بوڑھے سپاہی نے ایسے پُرسکون اور حاکمانہ انداز میں کہا گویا وہ وہاں موجود تھا۔

”ایڑی میں۔ Ratisbon میں۔ میں نے اس دن بھی اسے بہترین لباس میں ملبوس پایا۔ وہ کسی نئے ڈھلے سکے کی طرح صاف ستھرا تھا۔“

”اور تم، مسٹر سولجر، تم تو بار ہا زخمی ہوئے ہو گے؟“

”میں؟“ سولجر نے کہا ”بہت زیادہ تو نہیں۔ Marengo کے مقام پر تلوار کے دو زخم میری گردن پر لگے تھے؛ Austerlitz میں دائیں بازو پر ایک گولی لگی تھی، ایک اور لگی تھی بائیں جانب کمر میں، Jena کے مقام پر۔ Friedland میں سنگین کی ایک ضرب کھائی، ماسکو میں نیزوں کے سات یا آٹھ زخم لگے، نہ جانے کہاں کہاں؛ Lutzen میں گولے کے ایک ٹکڑے سے میری انگلی کچل گئی تھی۔ اور! اور واٹرلو میں، توڑے کی بندوق کا ایک گولا جانگھ میں لگا تھا؛ بس۔“

کتنی خوب ہے یہ [تفصیل]! حجام نے [یونانی شاعر] پنڈار کے لہجے میں کہا، ”مرحبا، میدانِ جنگ میں! اپنے حلف کی پاسداری کرتے ہوئے، بجائے اس کے کہ بستر میں مرنا، بیمار ہو کر، ذرا ذرا، ہر روز، جڑی بوٹی سے، مرہم سے، انجکشن کی سوئیوں سے؛ میں تو پیٹ میں توپ کے گولے لگنے سے مرنا پسند کروں گا۔“

”تم ضرورت سے زیادہ باذوق تو نہیں معلوم ہوتے۔“ سپاہی نے کہا۔

حجام کا رنگ فق ہو گیا۔ ”او خدایا!“ وہ چیخا، ”دیکھا! وہی ہوا نا!“

”کیا ہوا؟“

”توپ کا گولا۔“

”یہ رہا۔“ سپاہی نے کہا۔ اور اس نے کوئی شے اٹھائی جو فرش پر لڑھک رہی تھی۔ گولے جیسا ایک سنگ ریزہ تھا۔

حجام ٹوٹی کھڑکی کی طرف دوڑا اور اس نے گاڈروش کو Marche Saint-Jean کی طرف پوری رفتار سے بھاگتے دیکھا۔ وہ حجام کی دُکان کی طرف سے گزر رہا تھا، کہ اس وقت بھی اس کے ذہن میں دو آوارہ لڑکے آ گئے تھے، اس لیے وہ ”گڈ ڈے“ کہنے کی لہر کو روک نہیں سکا تھا، اور اس نے دُکان کی کھڑکی کے شیشے پر ایک پتھر پھینک دیا۔

”دیکھا تم نے!“ حجام نے چیخ کر کہا، جو سفید سے نیلا ہو گیا تھا، ”یہ شخص جب بھی واپس آتا ہے، محض تفننِ طبع کے لیے شرارت کر جاتا ہے۔ اس آوارہ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟“

❁

بچے کی حیرانی

اس دوران Marche Saint-Jean میں، جس کی چوکی سے ہتھیار واپس لیے جا چکے تھے، گاؤروش نے انجولرا، کوفیراک، کومفیر، اور فیوئی کے گروہ سے سلسلہ جنبانی کر لی تھی۔ یہ لوگ اس زمانے کے فیشن کے مطابق مسلح تھے۔ باؤریل اور ژاں پرووییر بھی ان سے مل گئے تھے اور ان کا گروہ بڑا ہو گیا تھا۔ انجولرا کے پاس ایک دو نالی ریوالور تھا، کومفیر کے پاس نیشنل گارڈ کے نمبروں والی بندوق تھی اور اس کی پیٹی میں دو عدد پستول ہوتے تھے جو اس کے کوٹ کے بٹن بند نہ ہونے پر دکھائی دیتے تھے؛ ژاں پرووییر کے پاس گھڑسواروں والی ایک قدیم زمانے کی توڑے والی بندوق تھی، باؤریل کے پاس رائفل؛ کوفیراک ہر وقت ایک چھڑی جیسی تلوار (گپتی) تانے رہتا تھا۔ فیوئی کے ہاتھ میں برہنہ تلوار رہتی تھی، اور وہ سب سے آگے مارچ کرتا ہوا چیخ کر کہتا تھا، "پولینڈ زندہ باد۔"

یہ لوگ Quai Morland پہنچ گئے۔ ان کے پاس نہ اسکارف تھے، نہ ہیٹ، سانسیں چڑھی تھیں، بارش سے شرابور تھے، اور چمکتی آنکھیں تھیں۔ گاؤروش نے پُرسکون انداز میں چھیڑتے ہوئے پوچھا، "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"چلتے رہو۔" کوفیراک نے کہا۔

مارچ کرتے فیوئی کے عقب میں یا مجبوراً چلتا، باؤریل تھا جو بلوے میں ایسا تھا جیسے پانی میں مچھلی۔ سرخ رنگ کی واسکٹ پہنے تھا، اور اس قسم کے الفاظ منہ سے نکال رہا تھا جو ہر شے کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی واسکٹ نے ایک راہگیر کو حیران کر دیا، اور اس نے پریشانی میں چیخ کر کہا، "ٹمر سے آگئے۔"

"ٹمر ٹے، ٹمر ٹے!" باؤریل نے دہرایا، "بورژوا! یہ انوکھا خوف ہے۔ میں خود تو گُلِ لالہ کے سامنے بھی نہیں تھرتھراتا، میں سرخ ہیٹ سے بھی نہیں ڈرتا۔ میری مانو، بوژوا، سُرخ رنگ کو سینگ والے جانوروں کے لیے رہنے دو۔"

اسے دیوار کا ایک کونا نظر آگیا جس پر نہایت پُر امن انداز میں ایک کاغذ چسپاں تھا، انڈا کھانے کی اجازت کے بارے میں، جو ایک مذہبی تنبیہ تھی پیرس کے آرچ بشپ کی جانب سے اس کے اپنے "جھنڈ" کے لیے۔

باؤریل چیخا، "جھنڈ یہ مہذب طریقہ ہے لوگوں کو بیج بنانے کا!" اور اس نے وہ اشتہار کیل کی مدد سے اکھاڑ دیا۔ گاؤرش اس عمل سے اس کا پیرو بن گیا تھا۔ اس کے بعد سے گاؤروش نے باؤریل کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔

"باؤریل!" انجولرا نے کہا، "تم غلطی پر ہو۔ تمھیں اس حکم کو ویسا ہی چھوڑ دینا تھا، ہمارا اس شخص سے کوئی جھگڑا نہیں، تم اپنا غصہ بے مقصد صرف کر رہے ہو۔ اپنی رسد کی حفاظت کرو۔ نفس کے بجائے بندوق سے گولی برسانا اچھا نہیں ہوتا۔"

"ہر ایک اپنے فیشن کے مطابق کام کرتا ہے، انجولرا۔" باؤریل نے پلٹ کر جواب دیا، "یہ بشپ مجھے پریشان کر دیتا ہے؛ میں بغیر کسی کی اجازت کے انڈا کھانا چاہتا ہوں۔ تمھارا انداز بالکل گرم اور ٹھنڈا جیسا ہے؛ میں تو ایسی باتوں پر صرف ہنس دیتا ہوں۔ مزید یہ کہ میں اس طرح اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ میں اپنا کام شروع کر رہا ہوں؛ اور اگر میں اس قسم کے حکم کو پھاڑ ڈالوں تو وہی ہوگا— 'ہرقل! ہاں، یہ تو میری بھوک بڑھانے کے لیے تھا۔'" [یہ کنایہ ہے مذہبی یونانی مصوری کے ایک منظر کا، جس میں یونی نام کی ایک عورت بالغ ہرقل کو دودھ پینے کے لیے اپنی چھاتی پیش کرتی دکھائی گئی ہے۔]

ہرقل لفظ نے گاؤروش کو ہلا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سیکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور اس اشتہار کا پھاڑا جانا اس پر گراں گزرا تھا۔ اس نے باؤریل سے سوال کیا، "ہرقل، یعنی؟"

باؤریل نے جواب دیا، "لاطینی زبان میں خراب کتے کو ہرقل کہتے ہیں۔"

ادھر باؤریل نے ایک کھڑکی میں ایک زرد چہرہ دیا سیاہ ڈاڑھی والے ایک جوان کو دیکھا جو انھیں گزرتے دیکھ رہا تھا، شاید وہ Friend of the A B C میں سے تھا۔ اس نے چیخ کر کہا، "جلدی— کارتوس— جنگ کی تیاری۔"

"اچھا آدمی ہے، اس میں شک نہیں۔" گاؤروش نے کہا، جو اب لاطینی سمجھ سکتا تھا۔

ان کے ساتھ ہلچل کی ایک برات چل رہی تھی— طلبہ، فن کار، Cougourde of

Aix, سے متعلق نوجوان لوگ، دستکار، تلواروں اور سنگینوں سے مسلح بندرگاہ کے قلی، کچھ کومفیر کی طرح اپنے پتلون میں پستول اڑسے ہوئے تھے۔

ایک بوڑھا آدمی بھی، جو خاصا عمر رسیدہ نظر آتا تھا، گروہ میں شامل چل رہا تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا، اور بہت تیز تیز چل رہا تھا تا کہ پیچھے نہ رہ جائے، حالاں کہ وہ بہت سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔

گاوَروش نے اسے دیکھ لیا، "ارے! یہ تو Keksekca ہے۔" اس نے کوفیراک سے کہا۔

"بہت پرانا احمق ہے۔"

وہ موسیو مابوف تھا۔

۞

بوڑھا آدمی

آیئے، ذرا دیکھتے ہیں کہ اب تک کیا ہوا ہے۔

انجولرا اور اس کے دوست اس وقت عوامی گودام کے قریب، Bourdon بولیوارڈ پر تھے جب گھڑ سوار سپاہیوں نے حملہ کیا تھا۔ انجولرا، کوفیراک اور کومفیراِن میں سے تھے جو Bassompierre اسٹریٹ پر To the barricades! کے نعرے لگا رہے تھے۔ Lesdiguieres اسٹریٹ پر انھیں ایک بوڑھا آدمی ملا جو ٹیڑھے میڑھے انداز میں چل رہا تھا، جیسے نشے میں ہو۔ مزید یہ کہ صبح سے خاصی تیز بارش ہو رہی تھی مگر وہ اپنی ہیٹ ہاتھ میں لیے چل رہا تھا۔

کوفیراک فادر مابوف کو پہچان گیا۔ وہ ماریوں کے ساتھ کئی بار اس کے دروازے تک گیا تھا اس لیے اس پہچانتا تھا۔ چوں کہ وہ عدالت کے اس بوڑھے کارندے کی پُر امن اور ضرورت سے زیادہ بزدل عادتوں سے واقف تھا، اور اس ہنگامے کے درمیان، گھڑ سوار سپاہیوں کے حملے کی جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر، تقریباً ایک قتلِ عام کے درمیان، بارش میں برہنہ سر، چلتی گولیوں کے درمیان ٹہل رہا تھا، اس کی موجودگی پر حیران تھا۔ اس نے بوڑھے کو تنبیہ کی تھی اور بلوے اور گولیوں کی بارش میں اسی سالہ کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

"موسیو مابوف، اپنے گھر جایئے۔"

"کیوں؟"

"بہت فساد ہونے والا ہے۔"

"اچھا ہے۔"

"تلواروں سے حملے ہوں گے اور گولیوں سے، موسیو مابوف۔"

"اچھا ہے۔"

"توپوں سے گولہ باری ہوگی۔"

"بہت اچھا ہے، مگر آپ سب کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم حکومت کو زمیں بوس کرنے جا رہے ہیں۔"

"اچھا ہے۔"

اور وہ بھی سب کے ساتھ چل پڑا۔

اس مکالمے کے بعد اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ اچانک اس کے قدم زیادہ مستحکم ہو گئے تھے؛ دست کاروں نے اسے اپنے اسلحے پیش کیے؛ اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا تھا۔ وہ آگے کی صفوں کے قریب پہنچ گیا تھا، ایسے آدمی کی طرح جو سو بھی رہا ہے اور مارچ بھی کر رہا ہے۔

"کیسا آتش مزاج ہے یہ بوڑھا۔" طلبہ آپس میں سرگوشی کر رہے تھے۔

سپاہیوں کی جانب سے افواہ پھیلی کہ وہ سابقہ رُکن تھا Convention کا — قدیم شاہ کُش تھا یہ شخص۔ ہجوم Verrerie اسٹریٹ سے واپس پلٹ پڑا۔

گاؤروش بہت بلند آواز میں یہ نغمہ گاتا آگے آگے چل رہا تھا جس نے اسے بھونپو جیسا بنا دیا تھا۔ نغمے کے بول تھے:

Voici la lune qui paratt.

Quand irons-nous dans la foret?

Demandait Charlot a Charlotte

Tou tou tou

Pour Chatou.

Je n'ai qu'un Dieu, qu'un roi, qu'un liard, et qu'une botte.

Pour avoir bu de grand matin

La rosee a meme le thym.

Deux moineaux etaient en ribotte.

Zi zi zi

Pour Passy.

Je n'ai qu'un Dieu, qu'un roi, qu'un liard, et qu'une botte.

"Et ces deux pauvres petits loups,
Comme deux grives estaient souls;
Une tigre en riait dans sa grotte.
Don don don
Pour Meudon.
Je n'ai qu'un Dieu, qu'un roi, qu'un liard, et qu'une botte.
L'un jurait et l'autre sacrait.
Quand irons nous dans la foret?
Demandait Charlot a Charlotte.
Tin tin tin
Pour Pantin.
Je n'ai qu'un Dieu, qu'un roi, qu'un liard, et qu'une botte.

اور انھوں نے اپنا رُخ Saint-Merry کی طرف کر لیا۔

۞

نئے لوگوں کی بھرتی

اس گروہ میں ہر لمحے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ Billettes اسٹریٹ کے قریب دراز قامت ایک شخص، جس کے بال بھورے ہو چلے تھے جس کی عمر اور با ہمت وضع قطع کوفیراک، انجولرا اور کومفیر کی نظر میں آ گئی تھی، مگر جسے ان میں سے کوئی جانتا نہیں تھا، ان میں شامل ہو گیا تھا۔ گاوروش نے، جو گانے، سیٹی بجانے، گنگنانے، آگے آگے دوڑنے، دُکانوں کے شٹر پر بغیر لبلبی کے پستول کے دستے مارنے میں مصروف تھا، اس آدمی پر کوئی توجہ نہیں دی۔

اتفاق کی بات ہے کہ ان کا گزر Verrerie اسٹریٹ پر واقع کوفیراک کے دروازے کے سامنے سے ہوا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔" کوفیراک نے کہا "میں اپنا بٹوا بھول گیا تھا، اور میری ہیٹ بھی غائب ہے۔" وہ ہجوم کو چھوڑ کر پوری رفتار سے بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔ اپنی پرانی ہیٹ سنبھالی اور اپنا بٹوا لیا۔ اس نے وہ مربع صندوق بھی سنبھال لیا، جو سپاہیوں کے تھیلے کی پیمائش کا تھا، اور اس کے میلے کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھا گیا تھا۔

وہ دوڑتا واپس لوٹ ہی رہا تھا، کہ دربان خاتون نے اسے آواز دی۔ "موسیو کوفیراک!"

"دربان خاتون، تمھارا نام کیا ہے؟"

دربان حیران پریشان کھڑی رہی۔ "کیوں؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں یہاں کی پہرے دار ہوں؛ میرا نام مدر Veuvain ہے۔"

اچھا اگر تم مجھے موسیو ڈی کوفیراک کہہ کر پکارو گی تو میں بھی تمھیں مدر ڈی Veuvain کے نام سے پکاروں گا۔ اچھا بولو، کیا کام ہے؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

کوئی آدمی ہے جو آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"میرے گھر میں۔"

"شیطان!" کوفیراک کے منہ سے نکل گیا۔

"مگر وہ شخص تو ایک گھنٹے سے آپ کی واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔"

عین اسی وقت، ایک زرد رو، دبلا، چھوٹا، چھائیوں بھرا چہرہ، نوجوان دست کار، پھٹے بلاؤز اور مخمل کی پیوند لگی پتلون میں ملبوس، لڑکی جیسے حلیے میں، گھر سے باہر نکلا اور کوفیراک سے کہا، ایسی آواز میں جو کسی طرح بھی عورت جیسی آواز نہیں ہو سکتی تھی، "موسیو ماریوس، از راہِ کرم ....."

"مگر وہ تو یہاں نہیں ہے۔"

"کیا وہ اس شام یہاں آئیں گے؟"

"مجھے اس بارے میں علم نہیں۔"

اور کوفیراک نے مزید اضافہ کیا، میرے خیال میں وہ واپس نہیں آئے گا۔"

نوجوان اسے مسلسل دیکھتا رہا، اور کہا، "کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ....."

"تو، آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"تمھیں اس سے کیا؟"

"کیا آپ پسند کریں گے کہ میں آپ کا صندوق لے چلوں؟"

"میں پشتوں کی طرف جا رہا ہوں۔"

"کیا آپ مجھے اپنے ساتھ لے جانا پسند کریں گے؟"

"اگر تم چاہو۔" کوفیراک نے جواب میں کہا "سڑک سب کے لیے ہے، راستے ہر ایک کی ملکیت ہوتے ہیں۔"

اور وہ اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے چل پڑا۔ جب وہ دوستوں سے ملا تو اس نے اپنا صندوق لے جانے کے لیے ایک دوست کو دے دیا۔ ابھی چوتھائی گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے وہ نوجوان نظر آیا، جو ظاہر ہے کہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

ہجوم اس جگہ نہیں جانے پاتا جہاں کا قصد ہوتا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ تیز ہوا کا جھونکا اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ لوگ Saint-Merry سے آگے چلے گئے اور نجانے کس طرح خود کو Saint-Denis اسٹریٹ پر پایا۔

تاریخ، Corinth کی ابتدا سے

اہالیانِ پیرس جو آج کل Halles کے قریب Rambuteau اسٹریٹ کے ختم ہونے پر شہر میں داخل ہوتے ہیں، انھیں دائیں جانب، بالمقابل Mondetour اسٹریٹ جھابیاں بنانے والے کی دُکان میں نشان کے طور پر نپولینِ اعظم کی شکل کی ایک جھابی آویزاں نظر آتی ہے جس پر لکھا ہوا ہے، ''بید مجنوں کی لکڑی سے — نپولین کی تشکیل۔'' ان لوگوں کو ان وحشت ناک مناظر کے بارے میں قطعی شبہ نہیں ہوتا جو اسی جگہ تیس برس قبل دیکھے گئے تھے۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں کبھی Chanvrerie اسٹریٹ ہوا کرتی تھی، قدیم دستاویزات میں جس کے ہجے Chanverrerie کیے جاتے تھے اور ایک مشہور شراب خانہ تھا جسے Corinth کہا جاتا تھا۔

قاری کو وہ سب یاد ہوگا جو اس مقام کے کچے پشتے کے بارے میں کہا گیا ہے، Saint-Merry نام کے کچے پشتے نے جسے گہنا دیا ہے۔ Chanvrerie اسٹریٹ کے اسی مشہور کچے پشتے پر، جو اب گہری گم نامی کے اندھیرے میں غائب ہو گیا ہے، ہم روشنی ڈالنے والے ہیں۔

اجازت ہو تو بیان کی صفائی کی خاطر ہم وہ سادہ طریقے استعمال کریں جو واٹرلو کے معاملے میں پہلے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ وہ لوگ جو تصور کرنا چاہتے ہیں بالکل اصلی انداز میں مکانات کی بناوٹ کو جو ان دنوں Pointe Saint-Eustache کے قریب ہوتے تھے، جہاں سے Rambuteau اسٹریٹ شروع ہوتی ہے، انھیں اپنے ذہن میں انگریزی حرف تہجی N کا تصور کرنا پڑے گا، اس طرح کہ اس کا اوپری حصہ Saint-Denis اسٹریٹ کو چھو رہا ہو اور Halles اس کی بنیاد ہو، اور اس کے عمودی حصے Grande-Truanderie اور

Chanvrerie اسٹریٹ کی تشکیل کریں، اور اس کا آڑا چھڑ Petite-Truanderie اسٹریٹ سے بنتا ہو۔ پرانی Mondetour اسٹریٹ اس N کو سب سے ٹیڑھے زاویے سے کاٹتی تھی، اس طرح کہ ان چار سڑکوں کی بھول بھلیاں جیسی پیچیدگی میں Halles اور Saint-Denis اسٹریٹ ایک جانب اور Cygne اسٹریٹ اور Precheurs اسٹریٹ دوسری جانب ہو جن میں مکانوں کے سات جزیروں کے لیے تین fathoms مربع جگہ کافی سمجھی گئی تھی، جنھیں مختلف پیمائشوں میں بے ترتیبی سے کاٹا گیا تھا، اور بے قاعدہ طریقے سے رکھ دیا گیا تھا، اور پتھر کے بڑے بڑے بلاکوں میں تنگ دراڑوں کے ذریعے مشکل سے الگ کیا گیا تھا۔

ہم تنگ دراڑیں کہہ رہے ہیں، اس لیے کہ ہم اس سے بہتر تصور پیش نہیں کر سکتے ان اندھیری سکڑی کٹی، کثیر زاویائی گلیوں کا جن کی دونوں جانب آٹھ منزلہ عمارتیں کھڑی تھیں۔ یہ عمارتیں اتنی شکستہ اور معذور تھیں کہ Chanvrerie اسٹریٹ اور Petite-Truanderie اسٹریٹ کے سامنے شہتیریں جمع کر دی گئی تھیں، جو ایک مکان سے دوسرے مکان تک جاتی تھیں۔ سڑک تنگ اور نالے چوڑے تھے، اور پیدل چلنے والے ان کچے راستوں پر چلتے جو ہمیشہ گیلے ہوتے تھے، ان پر چھوٹے چھوٹے اسٹال تھے جو تجروں جیسے لگتے تھے، بڑے بڑے کھمبے جن کے اطراف لوہے کے چھلّے تھے، کوڑے کے اونچے اونچے ڈھیر تھے، صدیوں پرانی بھیانک جالیوں سے مسلح پھاٹک تھے۔ Rambuteau اسٹریٹ نے یہ سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔

سڑکوں کے اس نظام کے پیچ وخم پر Mondetour کا نام ہی لاجواب رنگ چڑھا دیتا ہے۔ ذرا آگے بڑھیے تو اسے Pirouette اسٹریٹ بہتر طریقے سے پیش کر دیتی ہے، جو آگے چل کر Mondetour اسٹریٹ سے مل جاتی ہے۔

وہ راہگیر جو Saint-Denis اسٹریٹ سے Chanvrerie تک سفر میں الجھ جاتا تھا، اسے رفتہ رفتہ قریب آتے آتے اسے اس طرح دکھنے لگتا تھا گویا وہ کھنچ کر طول دیے گئے کسی دودکش میں داخل ہو گیا ہو۔ سڑک کے آخر میں، جو بہت چھوٹی تھی، اسے ایک اور راستہ مل جاتا تھا Halles کی جانب جو آگے چل کر بلند مکانوں کی قطار سے بند ہو گیا تھا، اور وہ خود کو کسی بند گلی میں موجود محسوس کرتا تھا، اگر چہ دائیں بائیں دونوں جانب دو اندھیرے راستے بنے تھے جن سے وہ فرار ہو سکتا تھا۔ یہ تھی Mondetour اسٹریٹ جو ایک جانب تو Precheurs اسٹریٹ سے اور دوسری جانب Cygne اسٹریٹ اور Petite-Truanderie میں ضم ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی بند گلی کے آخر میں، کنائی کے دائیں زاویے پر ایک مکان نظر آتا تھا جو اتنا بلند نہیں تھا جتنے کہ

دوسرے مکان تھے، اور اس نے سڑک میں ایک جزیرہ نما سا بنا دیا تھا۔ یہی وہ دو منزلہ مکان تھا، جس میں تین صدی قبل وہ دل خوش کن اور مشہور وائن کی دُکان قائم کر دی گئی تھی۔ یہ شراب خانہ عین اس مقام پر پُرمسرت شور کا باعث ہوتا تھا جسے قدیم Theophilus نے اپنے مندرجہ ذیل مصرعوں میں بیان کیا ہے:

وہ جھول رہا ہے خوف ناک پنجر
اک عاشقِ نامراد کا، جو خود ہی
پھانسی پہ لٹک گیا تھا اک دن

جگہ بہت اچھی تھی اور وہاں، باپ سے بیٹے تک شراب خانہ چلانے والے سب خاصے کامیاب رہے تھے۔

Mathurin Regnier [سولھویں صدی کے فرانسیسی طنز نگار] کے زمانے میں یہ ناچ گھر "گلابوں کا برتن" کہا جاتا تھا، اور چوں کہ اس زمانے میں علامتیت فیشن میں تھی، اس کی دیوار کا رنگ گلابی کر دیا گیا تھا۔ پچھلی صدی میں، محترم Natoire، جو اس زمانے کا لاجواب مصور تھا، ہماری صدی کے دبستان جسے پسند نہیں کرتے، اس شراب خانے میں کئی بار بدمست ہو گیا تھا، اسی میز پر جس پر Regnier نے جی بھر کر پی تھی، اور شکرانے کے طور پر گلابی رنگ کی دیوار پر Corinth انگوروں کے ایک گچھے کی تصویر بنا دی تھی۔ ناچ گھر چلانے والے نے خوش ہو کر اپنے ناچ گھر کا نام بدل دیا تھا اور گلٹ کے چمک دار حروف سے یہ الفاظ لکھوا دیے تھے "خوشۂ انگور کارنتھ" (Au Raisin de Corinthe)۔ اس طرح اس جگہ کا نام Corinth پڑ گیا۔ نشے میں چور لوگوں کو بیضوی اشکال سے زیادہ کوئی شے فطری نہیں معلوم ہوتی۔ جملے کے پیچ داری اختصار میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ Corinth میں رفتہ رفتہ "گلابوں کے برتن" کو بے دخل کر دیا گیا۔ خاندان کا آخری مالک فادر ہوشیلو (Hucheloup) روایات سے اتنا بیگانہ ہو گیا تھا کہ اس نے دیوار نیلے رنگ میں رنگوا دی تھی۔

زمینی منزل پر ایک کمرے میں شراب خانہ، پہلی منزل کے ایک کمرے میں بلیرڈ کی میز، سقف میں داخل ہوتا لکڑی کا پیچ دار زینہ، میزوں پر وائن، دیواروں پر سگرٹ نوشی کا دھواں، دن کی روشنی میں فروزاں موم بتیاں — یہ تھا اس ناچ گھر کا انداز۔ نچلے کمرے کا ایک ڈھکنے والا دروازہ تہ خانے میں کھلتا تھا۔ دوسری منزل ہوشیلو خاندان کی قیام گاہ تھی۔ اس پر جانے کا راستہ زینے کے بجائے سیڑھی سے تھا۔ پہلی منزل میں داخلے کے لیے ایک نجی دروازہ تھا۔ دو رویہ ڈھلان والی چھت کے نیچے دو چھتی میں ملازموں کے ڈربے تھے۔ باورچی خانہ زمینی منزل پر تھا

جس میں داخلہ ناچ کرے سے ہوتا تھا۔

فادر ہوشیلو پیدائشی کیمیا گر تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ باورچی تھا؛ لوگ وہاں صرف شراب نوشی کے لیے نہیں، کھانا کھانے بھی آتے تھے۔ ہوشیلو نے ایک بڑی شے ”بھری مچھلی“ ایجاد کی تھی، جو کسی اور جگہ نہیں صرف اس ریستوران میں کھائی جا سکتی تھی، جسے وہ carpes au gras کہتا تھا۔ یہ بھری مچھلیاں بھیڑوں کی چربی سے بنی موم بتیوں یا لوئی شانز دہم کے زمانے کے لیمپ کی روشنی میں کھائی جاتی تھی، ان میزوں پر جن پر میز پوش کے بجائے کیلوں سے جڑے موم جامے ہوتے تھے۔ لوگ یہاں دور دور سے آتے تھے۔ ایک صبح فادر ہوشیلو نے مناسب جانا کہ راہ گیروں کو اپنے ہاں کی خاص چیز سے متعارف کرایا جائے۔ اس نے کالے رنگ کے پینٹ میں برش ڈبویا، اور چوں کہ اپنے طور پر وہ خطاط بھی تھا اور باورچی بھی، اس نے دیوار پر غیر معمولی تخلیق تحریر کردی:

CARPES HO GRAS

ایک بار سرما کے موسم کی طوفانی بارش پہلے لفظ کا کو آخری حرف S پسند آگیا، اور G جس سے تیسرا لفظ شروع ہوتا تھا؛ اور پھر جو بچ رہا وہ کچھ یوں تھا:

CARPE HO RAS

بارش کی بار بار مدد اور فنِ شکم پروری سے تخلیق شدہ اعلان، راہ گیروں کے لیے ایک قسم کا مشورہ سا بن گیا تھا۔

اس طرح یہ معلوم ہوا کہ اگر چہ وہ فرانسیسی زبان جانتا تھا، فادر ہوشیلو لاطینی زبان بھی سمجھتا تھا، کہ اس نے اپنے باورچی خانے سے فلسفے کی یاد تازہ کردی تھی، اور یہ بھی کہ چالیس دن کا عیسائی روزہ (Lent) ختم کرنے کی کوشش میں وہ Horace [قبلِ مسیح کے شاعر اور طنز نگار] کا ہم سر ہوگیا تھا۔ اور اس میں سب میں اہم بات یہ ہوئی کہ اس جملے کا مطلب ”میری وائن کی دکان میں تشریف لائیے“ بھی نکلتا تھا۔

اب اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ Mondetour کی بھول بھلیاں کی آنتیں 1847ء میں کھول دی گئی تھیں، اور شاید اب موجود نہیں۔ Chanvrerie اسٹریٹ اور Corinth دونوں Rambuteau اسٹریٹ کے نیچے دفن ہو گئے ہیں۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں Corinth کو فیراک اور اس کے دوستوں کی جائے اجتماع تھی۔ وہ گرانتیر ہی تھا جس نے Corinth کو دریافت کیا تھا۔ وہ Carpe horas کے لیے اس میں داخل ہوا، اور Carpes au gras کے باعث وہاں سے خارج ہوا تھا۔ وہیں یہ لوگ

پیتے، وہیں کھاتے، وہیں چیختے تھے؛ زیادہ قیمت ادا نہیں کرتے تھے، کبھی ادا بھی نہیں کرتے تھے، مگر انھیں ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ فادر ہوشیلو نہایت خوش مزاج میزبان تھا۔

ہوشیلو، ایک صلح پسند انسان، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، وائن کی دُکان کا مونچھوں والا مالک تھا؛ ایک دل چسپ قسم کا آدمی، ہمیشہ غصے میں دکھائی دیتا، اپنے گاہکوں پر رعب ڈالتا، ان لوگوں پر گرجتا برستا جو اس کی ملکیت میں داخل ہوتے، اور ان کو شوربا پیش کرنے کے بجائے لڑائی پر آمادہ دکھائی دیتا تھا۔ پھر بھی، ہم اس امر پر اصرار کریں گے کہ وہاں آنے والوں کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ یہی انوکھا پن گاہکوں کو اس کی دکان کی طرف متوجہ کرتا تھا، اور نوجوانوں کو اس کے پاس لے آتا تھا، جو ایک دوسرے سے کہتے تھے، "آؤ چلیں، ذرا فادر ہوشیلو کا غرانا سنتے ہیں۔" وہ تلوار بازی کے کھیل کا ماہر تھا۔ اچانک قہقہے لگانے لگتا تھا۔ بھاری آواز والا، اچھا دوست تھا۔ وہ حزنیہ بیرون کے نیچے ایک مزاحیہ بنیاد کی مانند تھا۔ جب بھی کچھ پوچھتا خوف زدہ کرنے کے لیے پوچھتا، بالکل ناس کی ان ڈبیوں کی طرح جو پستول کی شکل کی ہوتی ہیں، جن کو چلاتے ہی چھینک آنے لگتی ہے۔

مدر ہوشیلو، اس کی بیوی، ایک باریش خاتون اور نہایت سادہ مخلوق تھی۔

1830ء میں فادر ہوشیلو کا انتقال ہو گیا تھا۔ "بحری مچھلی" کا راز بھی اس کے ساتھ قبر میں چلا گیا۔ اس کی غم زدہ بیوہ وائن کی دُکان چلاتی رہی، مگر پکوان کے معاملے میں کام خراب ہو گیا تھا؛ وائن جو ہمیشہ خراب ہوا کرتی تھی، اب خوف ناک حد تک خراب ہو گئی تھی۔ پھر بھی، کوفیراک اور اس کے ساتھی Corinth جاتے رہتے تھے — ہم دردی کی بنیاد پر، جیسا کہ بوسے نے کہا تھا۔

بیوہ ہوشیلو بے جان اور بدشکل ہو گئی تھی۔ اس کی گنوار یادداشت عود کر آئی تھی۔ اس کے بات کرنے کے اپنے طریقے تھے، جو اس کی گاؤں کی یادوں میں اور بہار کے موسم میں مرچ مسالہ بھر دیتے تھے۔ پہلے بھی یہ سب باتیں اس کو مسرور کر دیا کرتی تھیں۔ اس کی پسندیدہ ترین شے گلاب کی جھاڑیوں میں گاتی سُرخ چڑیوں کے چہچہے تھے جنھیں سننے کا اس نے اعلان کر دیا تھا۔

پہلی منزل کا تالار، جس میں ریسٹورنٹ قائم کیا گیا تھا، ایک بڑا اور طویل حصہ تھا جس میں اسٹول، کرسیاں، بنچ اور میزیں بھری ہوئی تھیں، اور ایک لنگڑی، معذور پرانی بلیرڈ کی میز بھی تھی۔ اس کمرے تک پہنچنے کے لیے پیچ دار زینہ استعمال کرنا پڑتا تھا جو کمرے میں موجود، کسی جہاز کے تختہ بند کواڑ کی طرح، ایک مربع سوراخ میں کھلتی تھی۔

یہ کمرہ ایک تنگ سی کھڑکی سے، اور ایک لیمپ سے جو ہمیشہ جلتا رہتا تھا، روشن ہوتا تھا۔ تمام چار پایوں والے فرنیچر اس طرح سجائے گئے تھے کہ تین پائے والے نظر آتے تھے۔

سفیدی شدہ دیواروں کی واحد زینت ایک رباعی تھی جو مام ہوشیلو کے اعزاز میں پیش کی گئی تھی:

دس قدموں پر ششدر کر دے، دو کو خوف زدہ؛
ایک مہاسہ ناک کے اندر خطرے سے مملو؛
لحظہ لحظہ خوف سے لرزاں، ہم پر چھینک نہ دے؛
اک دن اس کی ناک گرے گی منہ کے بیچوں بیچ

یہ چار مصرعے دیوار پر کوئلے سے لکھے ہوئے تھے۔

مام ہوشیلو کی اچھی خاصی صورت صبح سے رات تک، نہایت پُرسکون انداز میں اس رباعی کے سامنے سے آتی جاتی تھی۔ دو خدمت گار ملازمائیں تھیں، جن کے نام Matelote [یعنی: مختلف طریقوں سے پکائی ہوئی مچھلیاں] اور Gibelotte [یعنی: خرگوش کا اسٹیو] تھے، جنھیں کسی اور نام سے کبھی جانا نہیں گیا تھا؛ دونوں میزیں سجانے، وائن سے بھرے جگ رکھنے، اور مٹی سے بنے پیالوں میں مختلف قسم کے شوربے پیش کرنے میں مام ہوشیلو کی مدد کرتی تھیں۔ Matelote بڑی، گٹھی ہوئی، سرخ بالوں والی، غل غپاڑا کرنے والی، آنجہانی ہوشیلو کی سابق سلطانہ، کسی دیوتا نما عفریت سے زیادہ سادہ مزاج تھی، جو کچھ بھی تھی پھر بھی، جیسا کہ ہر خادمہ کو داشتہ کے عقب میں ہونا ہوتا ہے، وہ مام ہوشیلو سے زیادہ سادہ مزاج تھی۔ Gibelotte! طویل قامت، نازک بدن، سفید رنگ میں زلالی زردی کا شائبہ، جو اس کی آنکھوں میں گھومتا رہتا تھا، جھکی جھکی پلکیں، ہمیشہ ناتواں اور تھکی تھکی سی، ایسی تکلیف میں مبتلا جسے مزمن کاہلی کہا جا سکتا تھا، گھر میں سب سے پہلے اٹھنے والی، اور سب سے آخر بستر میں جانے والی، ہر ایک کی، حتیٰ کہ دوسری ملازمہ کی بھی، خاموشی اور نرمی سے خدمت گزاری کرنے والی، اپنی تھکن کے ذریعے مسکرانے والی، جس میں ایک مبہم اور خوابیدہ تبسم ہوتا تھا۔

ریستوران میں داخل ہوتے ہی، مہمان کو دروازے پر کوفیراک کے ہاتھوں کھریا مٹی سے لکھی عبارت نظر آتی تھی:

”آؤ، اگر آ سکتے ہو— کھاؤ اگر کھا سکتے ہو۔“

۞

ابتدائی خوشیاں

جیسا کہ قاری کو علم ہے، Laigle de Meaux [جس کو اب لیگلے کہا جائے گا] کسی اور جگہ کے مقابلے میں شوفی کے ساتھ زیادہ عرصے رہا تھا۔ پرندوں کی طرح ان کا قیام ایک ہی شاخ پر تھا۔ دونوں دوست ایک ساتھ رہتے، ایک ساتھ کھاتے اور ایک ساتھ سوتے تھے۔ دونوں کی ہر شے مشترکہ تھی، اور کسی حد تک Musichetta بھی۔ وہ راہبوں کے ساتھ رہنے والے ماتحت راہب تھے جنھیں بینی (bini) کہا جاتا ہے۔ پانچویں جون کی صبح ناشتا کرنے وہ Corinth گئے تھے۔ شوفی، پوری طرح بھرا تھا، اور اسے زکام ہو گیا تھا جو لیگلے کو لگنا شروع ہو گیا تھا۔ لیگلے کا کوٹ تار تار ہو رہا تھا، مگر شوفی اچھے لباس میں تھا۔

صبح کے نو بجے تھے، جب انھوں نے Corinth کا دروازہ کھولا تھا۔

وہ پہلی منزل چڑھے۔ Matelote اور Gibelotte نے ان کا استقبال کیا۔

''سیپیاں، پنیر اور ہیم۔'' لیگلے نے حکم دیا۔

اور وہ دونوں ایک میز کے قریب بیٹھ گئے۔

وائن کی دکان خالی تھی؛ ان لوگوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔

Gibelotte شوفی اور لیگلے سے واقف تھی، اس نے وائن کی بوتل لا کر میز پر رکھ دی۔

ابھی وہ پہلی سیپ کھانے میں مصروف تھے کہ زینے کے اوپر کے مربع سوراخ میں ایک سر نمودار ہوا، اور ایک آواز نے کہا، ''میں ادھر سے گزر رہا ہوں، سڑک پر مجھے بری پنیر کی لطیف خوش بو آ رہی ہے۔ میں آ رہا ہوں۔'' وہ گرانتیر تھا۔

گرانتیر نے ایک اسٹول کھینچا اور میز کے قریب بیٹھ گیا۔ گرانتیر کو دیکھتے ہی Gibelotte

نے وائن کی ایک اور بوتل میز پر رکھ دی۔ اب بوتلیں تین ہو گئی تھیں۔

''کیا تم یہ دونوں بوتلیں پی جاؤ گے؟'' لیگلے نے گراتیر سے سوال کیا۔

گراتیر نے جواب دیا، ''سب ذہین ہیں، تم اکیلے بے خطا ہو۔ دو بوتلیں کبھی کسی آدمی کو ششدر نہیں کر دیتیں۔'' دوسروں نے کھانا شروع کیا، گراتیر نے پینے سے ابتدا کی۔ نصف بوتل دیکھتے دیکھتے حلق سے نیچے اتر گئی۔

''کیا، تمھارے پیٹ میں سوراخ ہے؟'' لیگلے نے پھر شروعات کی۔

''تمھاری کہنی میں بھی ایک سوراخ ہے۔'' گراتیر نے کہا۔ اور اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے اس نے اضافہ کیا، ''ارے! ہاں، جنازے کی خطابت والے لیگلے، تمھارا کوٹ بہت پرانا ہو گیا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' لیگلے نے فوراً جواب دیا، ''یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں کی خوب بنتی ہے، میں اور میرا کوٹ۔ اس نے میری جھریاں سمیٹ لی ہیں، یہ اب مجھے کہیں مجبور نہیں کرتا، یہ میرے عیوب پر ڈھل سا گیا ہے، یہ میری ہر حرکت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ مجھے اس کا اس لیے بہت احساس رہتا ہے کہ یہ مجھے گرم رکھتا ہے۔ پرانے کوٹ پرانے دوستوں کی طرح ہوا کرتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' شوبی نے، گفتگو میں دخیل ہوتے ہوئے کہا، ''پرانا کوٹ، پرانا دوست ہوتا ہے۔''

بالخصوص اُس آدمی کے منہ میں، جس کا سر بند ہو جاتا ہے۔'' گراتیر نے کہا۔

''گراتیر!'' لیگلے نے پوچھا، ''کیا تم بولیوارڈ سے آ رہے ہو؟''

''نہیں۔''

''ہم نے اور شوبی نے جلوس کا ابتدائی حصہ ابھی گزرتے دیکھا ہے۔''

''کتنا لاجواب منظر ہے۔'' شوبی نے کہا۔

''سڑک کتنی سنسان ہے۔'' لیگلے نے حیرت سے کہا، ''کون شبہ کر سکتا ہے کہ پیرس بالکل تلپٹ ہو گیا تھا؟ کتنی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ گزرے دنوں میں یہاں سوائے خانقاہوں کے کچھ نہیں ہوتا تھا، اس قرب و جوار میں Du Breul اور Sauval کے نام لیے جا سکتے ہیں، اور Abbe Lebeuf کا بھی۔ یہ سب اس اطراف میں رہتے تھے، ہجوم کی صورت میں، بوٹوں میں، ننگے پاؤں، شیو کیے، ڈاڑھی والے، بھورے، کالے، سفید، فرانسسکن، بونے، پادری، کارمَلی، چھوٹے آگسٹینی، بڑے آگسٹینی، پرانے آگسٹینی وغیرہ وغیرہ۔''

"راہبوں کی تو ہم بات بھی نہیں کرتے۔" گرانتیر نے لقمہ دیا، "ان کو سوچ کر ہی کھجلی ہونے لگتی ہے۔" اور پھر وہ بلند آواز میں بولنے لگا:

"ارے باپ رے! میں ایک خراب سیپی نگل گیا ہوں۔ اب پھر مراق (hypochondria) شروع ہو جائے گا مجھ میں۔ سیپیاں خراب ہیں، خادم بدصورت ہیں۔ مجھے نسلِ انسانی سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے Richelieu اسٹریٹ سے گزرا ہوں، بڑے عوامی کتب خانے کے سامنے سے۔ سیپیوں کے خول کا وہ ڈھیر جسے کتب خانہ کہتے ہیں، اس کو سوچ کر بھی نفرت ہوتی ہے۔ کیسا کاغذ! کیسی روشنائی! کیسی لکیریں! اور یہ سب کچھ لکھا گیا ہے! کون نامعقول تھا جس نے کہا تھا کہ آدمی بغیر پروں والا دوپایہ ہے؟ اور پھر میں ایک خوب صورت شناسا لڑکی سے ملا تھا، جو بہار جیسی حسین ہے، واقعی Floreal کہلانے کے لائق ہے۔ اور کون خوش ہے، وجد میں ہے، ایسا خوش جیسے فرشتے، اس لیے کہ کل ایک بدنصیب، ڈرپوک بینکر، سارے چیچک کے نشان والے، اس پر قربان ہوئے جا رہے تھے۔ افسوس! کہ عورت کو عاشق کی طرح ایک محافظ بھی رکھنا پڑتا ہے؛ بلیاں چوہوں کے علاوہ پرندوں کو بھی پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دو ماہ قبل وہ نوجوان عورت دوچھتی میں بہت پاک باز بن رہی تھی، اس نے اپنی شکم بند کے پیتل کے چھلے ٹھیک کیے تھے؛ آپ اسے کیا کہیں گے؟ وہ کچھ سی رہی تھی، اس کے پاس خیمے جیسا بستر تھا، وہ پھولوں کے گملے کے پاس سوتی تھی، وہ مطمئن تھی۔ آج وہ بینکر بن گئی ہے۔ یہ قلبِ ماہیت کل رات ہی ہوئی ہے۔ میں نے ایک مظلوم کو صبح خوش و خرم دیکھا تھا۔ سب سے ذرا نازک نکتہ یہ ہے کہ وہ چھنال آج بھی اتنی ہی خوب صورت ہے جتنی کل تھی۔ اس کو مال دینے والا نظر نہیں آیا۔ گلاب کے پھولوں کو عورتوں پر یہی سبقت یا عدم سبقت ہوتی ہے، اس لیے کہ ان پر لاروا کے چھوڑے نشان نظر آتے ہیں۔ اوہ! زمین پر نیک چلنی کا نام و نشان نہیں۔ میں گواہی میں بلاتا ہوں مہندی کو جو محبت کی علامت ہوتی ہے، لارل کو جو شان کی علامت ہوتا ہے، زیتون کو، وہ احمق، جو امن کی علامت ہوتا ہے، سیب کے درخت کو، جو اپنے بیجوں کے ساتھ آدم کے قریب ترین تھا، اور انجیر کے درخت کو، جو پیٹی کوٹوں کا جدِ امجد ہے۔ اور جہاں تک حقوق کا سوال ہے، کون جانے کہ حق پر کون ہے؟ گال [فرانسیسی] تمنا کرتے ہیں Clusium [اطالیہ کے شہر] کا، روما تحفظ کرتا ہے، اور پوچھتا ہے کہ Clusium نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ Brennus جواب دیتا ہے: وہی برائی جو Alba [اسکاٹ لینڈ کا قدیم نام] نے تم سے کی ہے؛ وہی برائی جو Fidenae [ایک شہر] نے تم سے کی ہے؛ وہی برائی جو Eques نے، Volsci نے اور Sabines نے تمھارے ساتھ کی ہے۔ وہ سب

تمھارے ہمسایے تھے۔ Clusians ہمارے اپنے ہیں۔ ہم ہمسائیگی کو اسی طرح سمجھتے ہیں جیسے تم سمجھتے ہو۔ تم نے Alba چرایا ہے، ہم Clusium کو چرالیں گے۔ روما نے کہا، 'تم Clusium کو نہیں لوگے۔' Brennus نے روما کو فتح کر لیا۔ تب اس نے چیخ کر کہا تھا، 'Vae victis!'۔ یہ ہے جسے حق کہتے ہیں۔ اوہ! اس دنیا میں کتنے جانور ہیں جو دوسرے جانور کا شکار کرتے ہیں۔ کون عقاب؟ یہ مجھے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ اس نے شولی کو اپنا گلاس پیش کیا، شولی نے گلاس بھر دیا، اور پی کر وہ دوبارہ اس طرح شروع ہو گیا، گویا وائن کے جام نے اس کی گفتگو کا سلسلہ توڑا ہی نہیں تھا، جس کی نہ خود اسے خبر ہوئی نہ کسی اور کو:

"Brennus، جو روما کو فتح کرتا ہے، عقاب ہے؛ بینکر جو نوجوان فرانسیسی عورت کو پکڑ لیتا ہے، عقاب ہے۔ کسی میں اخلاق کا نام و نشان نہیں۔ اسی لیے ہم کسی پر یقین نہیں کرتے۔ بس ایک ہی حقیقت ہے: شراب نوشی۔ تمھاری جو بھی رائے ہو دبلے مرغے کے حق میں، جیسے Uri کا صوبہ یا اس موٹے مرغے کے بارے میں جیسے Glaris کا صوبہ؛ سب فضول ہیں، پیو! تم مجھ سے بولیوارڈ کی بات کرتے ہو، اس جلوس کی، وغیرہ وغیرہ۔ بتاؤ، کیا ایک اور انقلاب آنے والا ہے؟ پیارے خدا کی جانب سے وسائل کی تنگی مجھے حیران کر دیتی ہے۔ اسے ہر لمحے ہونے والے واقعات کو ہونے دینا چاہیے۔ یہاں ایک الجھن آجاتی ہے، کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ فوراً، ایک انقلاب آجاتا ہے۔ میرا پیارا خدا گاڑی کے پہیے کی سیاہ گریس سے اپنا ہاتھ میلا رکھتا ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اس بارے میں بالکل سادہ سا کام کرتا، میں ہر منٹ اپنی میکانزم کو پریشان نہیں کرتا، میں نسلِ انسانی کی بے لاگ طریقے سے رہنمائی کرتا، میں دھاگا توڑے بغیر ایک جالی سے دوسری جالی کی بُنائی کرتا، میں عارضی انتظامات نہیں کرتا، میں غیر ضروری مخزن نہیں رکھتا۔ جسے تم ترقی کہتے ہو، وہ دو حرکیوں سے آگے بڑھتی ہے: آدمی اور واقعات۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی استثنائی بھی ضروری بن جاتا ہے۔ عام قسم کا طائفہ نہ آدمیوں کے لیے کافی ہوتا اور نہ واقعات کے لیے۔ آدمیوں میں جوہر قابل کی ضرورت ہوتی ہے اور واقعات میں انقلاب کی۔ بڑے حادثات قانون ہوا کرتے ہیں؛ چیزوں کی ترتیب ان کے بغیر نہیں ہو سکتی؛ دُم دار ستاروں کے حیران کُن تماشے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آسمانوں کو بھی اپنی کارگزاریاں پیش کرنے کے لیے اداکاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لمحے، جب اس کی بالکل توقع نہیں ہوتی، خدا فلک کی دیوار پر شہاب ثاقب کا اشتہار چسپاں کر دیتا ہے۔ کوئی انوکھا ستارہ اپنی بے انداز طویل دُم کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور وہ قیصر کی موت کا باعث ہو جاتا ہے۔ بروٹس اس پر چاقو سے حملہ کرتا

ہے، اور خدا دُم دار ستارے سے حملہ کرتا ہے۔ شگاف اور طلوعِ فجر کو دیکھو، انقلاب کو دیکھو، عظیم آدمی کو دیکھو؛ بڑے حرفوں میں لکھا 93، چوکنا نپولین، 1811ء کا دُم دار ستارہ اشتہار میں سب سے اوپر ہے۔ اوہ، کتنا خوب صورت ہے یہ نیلا تھیٹر، غیر متوقع جھماکوں سے مزین۔ بوم بوم! غیر معمولی مظاہرہ ہے۔ احمقو، آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر شے درہم برہم ہے، ستارہ بھی اور ڈراما بھی۔ میرے خدا، بہت ہوگیا، مگر اتنا کافی نہیں ہے۔ یہ تمام وسائل، استثنا سے جمع کیے ہوئے، شان وشوکت اور تنگ دستی کافی نہیں۔ میرے دوستو! مآل اندیشی مصلحتوں تک اتر آئی ہے۔ انقلاب کیا ثابت کرتا ہے؟ [معاذ اللہ] خدا شبہے میں پڑ گیا ہے۔ وہ بغاوت کراتا ہے اس لیے کہ وہ، یعنی خدا، سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکا ہے۔ دراصل وہ میرے قیاس میں Jehovah کی تصدیق کرتا ہے؛ اور جب میں اتنی پریشانیاں دیکھتا ہوں آسمان اور زمین کی، پرندے کی چنے چاندی کے سوسکوں کی آمدنی کے عوض جوار کا ایک دانہ بھی میسر نہیں ہوتا؛ جب میں انسان کے مستقبل کی طرف دیکھتا ہوں جو تار تار ہے؛ جب میں شہزادے Conde کو سولی چڑھا دیکھتا ہوں؛ جب میں سرما کے موسم کو دیکھتا ہوں جس سے سوائے شگاف کے، صرف تیز ہوا آتی ہے؛ جب میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بالکل نئی ارغوانی صبح میں بھی اتنے سارے چیتھڑے دیکھتا ہوں؛ جب میں شبنم کے قطرے [کی صورت میں]، وہ مضحکہ موتی دیکھتا ہوں؛ جب میں پالے [کی صورت میں] نقلی جواہر بنانے والی ٹٹی کو دیکھتا ہوں؛ جب میں انسانیت کو چاک چاک، اور واقعات پر پیوند کاری دیکھتا ہوں؛ اور سورج پر اتنے سارے دھبے، چاند میں اتنے سارے گڑھے دیکھتا ہوں؛ جب میں ہر جا اتنی بدنصیبی دیکھتا ہوں تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ خدا مال دار نہیں ہے۔ [خدا صرف] اظہار ہے، اور سچ ہے، مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مشکل میں ہے۔ وہ اس طرح انقلاب دیتا ہے جیسے کوئی تاجر جس کا کیسہ خالی ہو [کھیلنے کے لیے] ایک گیند دے دیتا ہے۔ خدا کو [صرف] مظاہر کی بنیاد پر نہیں جانچنا چاہیے۔ چمکتی دمکتی جنت کے نیچے مجھے تنگ دستی کی ماری کائنات دکھائی دیتی ہے۔ تخلیق دیوالیہ ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نامطمئن ہوں۔ ذرا 4 جون پر نظر کیجیے، بالکل رات جیسا ہے؛ آج صبح سے میں روشنی کے انتظار میں ہوں، روشنی نہیں آئی، اور میں شرط لگاتا ہوں کہ دن بھر نہیں آئے گی۔ یہ ایک کم تنخواہ والے کلرک کی جیسی نادرستی ہے۔ جی ہاں، ہر شے بری طرح مرتب کی گئی ہے؛ کوئی شے کسی شے سے نہیں ملتی؛ یہ قدیم دنیا بالکل ٹیڑھی میڑھی ہے؛ میں مخالفین کے ساتھ ہوں، ہر چیز یک طرفہ ہے؛ کائنات ایک چھیڑ خانی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بچے جس شے کی خواہش کرتے ہیں وہ انھیں نہیں ملتی، اور جنھیں اس شے کی ضرورت نہیں ہوتی انھیں مل جاتی ہے۔ نتیجہ؟ میں تنگ آگیا ہوں۔ اس کے

علاوہ وہ گنجا، لنگڑے، میری نگاہوں کو دق کرتا ہے۔ وہ مجھے اس قدر رذیل کرتا ہے کہ میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں بھی شاید اس گنجے کی عمر کا ہوں، مگر میں اس پر تنقید کرتا ہوں۔ اس کی توہین نہیں کرتا۔ کائنات جو ہے وہی ہے۔ میں اس وقت بدنیتی سے بات نہیں کر رہا ہوں، نہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔۔لے، اے میرے ابدی باپ! میں تیری خدمت میں اپنی نمایاں سوچ اور اپنا یقین پیش کر رہا ہوں۔ اوہ، قسم ہے Olympus کے تمام [صوفوں] سنتوں کی، اور جنت کے تمام خداؤں کی، کہ میں نے کبھی پیرس والا بننا نہیں چاہا تھا، یعنی، دو بتوں کے درمیان 'شٹل کاک' کی طرح، خراماں خراماں چلنے والوں کے گروہ سے غل غپاڑہ کرنے والوں کے گروہ کے درمیان آنے جانے والا نہیں ہونا چاہا ہے۔ میں ترک بنا دیا گیا تھا، تا کہ میں دن بھر مشرقی حوروں پریوں کو نفیس مصری رقص کرتے دیکھتا رہوں، کوئی جو خوابوں میں ہی دیکھ سکتا ہے نیک انسان کی طرح، حفاظت کرنے والے کتوں جیسے کسانوں کی طرح، یا وینس کی شریف عورتوں کے نرغے میں گھرے شریف آدمی کی طرح، یا ایک معمولی جرمن شہزادے کی طرح جو اپنے نصف پیدل سپاہی جرمن متحدہ ریاستوں کو دے دیتا ہے اور اپنا فالتو وقت جھاڑیوں پر، یعنی اپنی سرحدوں پر اپنی برجیس سکھانے پر صرف کرتا رہتا ہے۔ یہ ہیں وہ کیفیات، میں جن کے لیے پیدا ہوا تھا۔ جی ہاں! میں نے خود کو ترک کہا ہے، اور میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ عادتاً ترکوں کو برے معنوں میں کیوں لیتے ہیں؛ محمد (ﷺ) کے اپنے اچھے نکات تھے؛ احترام ان لوگوں کے لیے جنھوں نے حوروں اور پریوں سے لونڈیوں اور باندیوں سے، سلاطینِ عثمانیہ کے حرم ایجاد کیے تھے۔ ہمیں محمدیت کی توہین نہیں کرنی چاہیے، یہ واحد مذہب ہے جو hen-roost سے مزین کیا گیا ہے۔ اب میں ایک جام کا اصرار کروں گا۔ زمین سب سے بڑی حماقت ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ضعیف العقل لڑنے والے ہیں، اور ایک دوسرے کی شخصیتوں کو مسمار کرنے والے ہیں، ایک دوسرے کو موسمِ گرما کے بیچ، جون کے مہینے میں، تہِ تیغ کرنے والے ہیں، جب کہ وہ اپنے بازو پر کسی مخلوق کو رکھ کر جا سکتے ہیں سبزہ زاروں میں نئی گھاس کی خوش بو سونگھنے کے لیے۔ واقعی، لوگ، سب مل کر، بہت زیادہ غلطیاں نہیں کرتے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی پرانی لالٹین جو میں نے آج ہی ایک کباڑی کی دکان پر دیکھی ہے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ بنی نوعِ انسان کو روشن خیال بنانے کا وقت آ گیا ہے۔ جی ہاں! میں پھر افسردہ ہو گیا ہوں۔ ایک خراب سیب نگل جانے اور انقلاب کے غلط استعمال کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بار پھر مجھ پر غم زدگی چھا رہی ہے۔ اے ڈراونی قدیم دنیا! لوگ ایک دوسرے کو نکال باہر کرنے، اپنے آپ سے فحاشی کرنے، اور اس کا

عادی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اور خطابت کے اس دورے کے بعد گرانتیر پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا، جس کا وہ حق دار تھا۔

"انقلاب کا مقصد کیا تھا۔" شولی نے کہا" یہ طے ہے کہ ماریس محبت کرتا ہے۔"

"کسی کو معلوم ہے، کس سے؟" لیگلے نے سوال کیا۔

"بتاؤ۔"

"نہیں؟"

"میں کہتا ہوں، بتاؤ۔"

"ماریس کے معاشقے!" گرانتیر نے جانچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،" میں تصور کر سکتا ہوں۔ ماریس معما ہے اور اسے جنگ مل گئی ہوگی۔ ماریس شاعروں کی نسل سے ہے۔ وہ جو کسی کو کہتا ہے شاعر ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے احمق ہے، پاگل آدمی ہے، [اپالو کا خاندانی نام Tymbraeus ہے۔ماریس اور اس کی میری، یا اس کی میرین، یا اس کی ماریا، یا اس کی میریٹ، دونوں انوکھی محبت کرنے والا جوڑا بنیں گے۔میں جانتا ہوں کہ یہ کیسا ہوتا ہے۔اتنے خوش ہوتے ہیں کہ بوسہ لینا بھول جاتے ہیں۔زمین پر تنہا مگر جنت میں یک جا۔وہ ایسی روح ہیں جن پر احساس قابض ہو جاتا ہے۔وہ ستاروں کے درمیان ہوتے ہیں۔"

گرانتیر اپنی دوسری بوتل پر حملہ آور ہو رہا تھا، اور شاید دوسری تقریر پر بھی، کہ اچانک سیڑھی کے مربع شگاف سے ایک نئی شخصیت وارد ہوئی۔وہ ایک لڑکا تھا جس کی عمر دس برس سے کم تھی، چیتھڑوں میں ملبوس، بہت چھوٹا، زرد رو، غیر معمولی چہرے والا، زندگی سے بھرپور آنکھوں والا، بارش سے بھیگے بالوں، اور مطمئن چہرے والا۔

لڑکا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر لیگلے سے مخاطب ہوا،" کیا آپ موسیو بوسے ہیں؟"

"بوسے میری عرفیت ہے۔" لیگلے نے جواب میں کہا،"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"بس اتنا۔ایک بلند قامت سنہرے بالوں والے شخص نے بولیوارڈ پر مجھ سے پوچھا تھا 'کیا تم مادر ہوشیلو سے واقف ہو؟' میں نے کہا تھا،'ہاں Chanvrerie اسٹریٹ والی، اس بوڑھے کی بیوہ؟' اس نے مجھ سے کہا،'وہاں جاؤ۔تمھاری موسیو بوسے سے ملاقات ہوگی۔میری طرف سے ان سے کہنا،'A B C'۔یہ ایک مذاق ہے لوگ جو تم سے کر رہے ہیں، ہے کہ نہیں؟ اس نے مجھے دس سو بھی دیے تھے۔"

"شولی، مجھے دس سو ادھار دے دو۔" لیگلے نے کہا، اور گرانتیر کی طرف مڑا،" گرانتیر،

مجھے دس سُو ادھار دے دو۔"

اس طرح میں سُو جمع ہو گئے، جو لیگلے نے لڑکے کے حوالے کر دیے۔"

آوارہ لڑکے نے کہا "جناب، آپ کا شکریہ۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟" لیگلے نے معلوم کیا، "Navet، گا وروش کا دوست۔"

"ہمارے پاس قیام کرو۔" لیگلے نے کہا۔

"ناشتا ہمارے ساتھ۔" گرانتیر نے کہا۔

لڑکے نے جواب دیا، "ناممکن۔ میں جلوس میں شریک ہوں۔ میں ہی وہ ہوں جو Polignac' مردہ باد' کا نعرہ لگاتا ہے۔" اور پیچھے کی طرف جوتے کی ایک طویل رگڑ لگائی، جو تمام سلیوٹ میں سب سے زیادہ محترم ہوتا ہے، اور واپس روانہ ہو گیا۔

لڑکا چلا گیا، گرانتیر نے بات آگے بڑھائی۔

"یہ خالص آوارہ لڑکا ہے۔ آوارہ لڑکوں کی بہت قسمیں ہوتی ہیں۔ مصدقہ آوارہ لڑکا Skip-the-Gutter کہلاتا ہے، باورچی کا آوارہ لڑکا صفائی کرنے والا کہلاتا ہے، نانبائی کا آوارہ لڑکا mitron، وردی پوش خدمت گار کا آوارہ لڑکا دولھا کہلاتا ہے، بحری آوارہ لڑکا کیبن بوائے کہلاتا ہے، سپاہی کا آوارہ لڑکا ڈھول بجانے والا لڑکا کہلاتا ہے، مصور کا آوارہ لڑکا رنگ گھسنے والا کہلاتا ہے، تاجر کا آوارہ لڑکا پیغام رساں لڑکا کہلاتا ہے، طوائف کا آوارہ لڑکا پیارا کہلاتا ہے، شاہی آوارہ لڑکا ولی عہد کہلاتا ہے، اچھا آوارہ لڑکا بچہ کہلاتا ہے۔"

اس دوران لیگلے کسی سوچ میں پڑ گیا تھا؛ اس نے نیم بلند آواز میں کہا

"A B C یعنی لامارک کی تدفین۔"

"بلند قامت سنہرے بالوں والا" گرانتیر نے یاد دلایا، "انجولرا ہے، جو تمھیں تنبیہ بھیج رہا ہے۔"

"تو کیا ہم بھی چلیں؟" بوسے بولا۔

"اس وقت بارش ہو رہی ہے۔" شولی نے کہا، "میں نے آگ پر چلنے کی قسم کھائی ہے مگر پانی میں چلنے کی نہیں۔ میں نزلے میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔"

"میں یہیں ٹھہروں گا۔" گرانتیر نے کہا، "میں تابوت کے جلوس پر ناشتے کو فوقیت دوں گا۔"

"نتیجہ: ہم یہی ٹھہریں گے۔" لیگلے نے کہا، "اچھا، آئے کچھ اور کچھ شراب آئے۔

اس کے علاوہ ہم بلوے سے بچے بغیر میت کے جلوس سے بچ جائیں گے۔"

"اُف بلوے! میں تیرے ساتھ ہوں۔" شولی نے بلند آواز میں کہا۔

لیگلے اپنے ہاتھ ملنے لگا۔ ''اب ہم 1830ء کے انقلاب کی باتیں کریں گے۔ در اصل، یہ لوگوں کو بہت تکلیف دے رہا ہے۔''

''میں تمھارے انقلاب کے بارے میں زیادہ پُرجوش نہیں۔'' گرانتیر نے کہا، ''میں حکومت سے اظہارِ نفرت نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تاج میں سوتی ٹوپی کی ملاوٹ کے مترادف ہے، اور وہ بھی سونے کے وقت کی ٹوپی کی۔ یہ عصائے سلطانی ہے جو چھاتے پر ختم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آج، اس موسم میں، لوئی فیلپ اپنی شاہی کو دومقتوں میں استعمال کرے گا، عصائے سلطانی کی نوک کو عوام پر، اور چھاتے کو آسمان کے خلاف استعمال کرے گا۔''

کمرے میں اندھیرا تھا، گہرے بادل روشنی کو مٹانے کا کام تمام کر چکے ہیں۔ وائن کی دکان سنسان تھی، اور سڑکیں بھی؛ سب کے سب کھیل دیکھنے گئے تھے۔

''یہ دوپہر ہے کہ آدھی رات؟'' بوسے نے چیخ کر کہا، ''آپ اپنے سامنے کے ہاتھ کو دیکھ نہیں سکتے۔ Gibelotte روشنی لاؤ۔''

گرانتیر غم انگیز کیفیت میں مے نوشی کر رہا تھا۔

''انجولرا مجھے حقارت سے دیکھتا ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا، ''انجولرا نے کہا تھا شولی بیمار ہے، گرانتیر مدہوش ہے' وہ بوسے تھا جس نے Navet کو بھیجا تھا۔ اگر وہ میرے لیے آیا ہوتا تو میں اس کے ساتھ چلا جاتا۔ یہ انجولرا کی خرابی ہے۔ میں اس کے جنازے میں نہیں جاؤں گا۔''

یہ تجویز پیش ہوگئی، تو بوسے، شولی اور گرانتیر وائن کی دکان سے ہلے نہیں۔ دو بجے دوپہر تک میز جس کے اطراف وہ لوگ بیٹھے تھے خالی بوتلوں سے بھر چکی تھی۔ اس پر دو موم بتیاں جل رہی تھیں، ایک تانبے کے شمع دان میں تھی جو بالکل سبز ہو چکا تھا، دوسری، ایک شکستہ قرابے کی گردن میں لگی تھی۔ گرانتیر نے شولی اور بوسے کو وائن کی طرف رجھایا تھا، اور گرانتیر کو خوش مزاجی کی طرف واپس لے گیا تھا۔

گرانتیر کا یہ حال تھا کہ، وہ جو دوپہر تک خوابوں کی تعریف کر رہا تھا، وائن سے پرے چلا گیا تھا۔ سنجیدہ پینے والوں میں روایتی طور پر صرف وائن ہی پسند کی جاتی ہے۔ مخمور رہنے کی کیفیت میں دو جادو ہوتے ہیں، سفید جادو اور کالا جادو؛ وائن صرف سفید جادو ہوتی ہے۔ گرانتیر خوابوں کی مے نوشی کرنے والا باہمت انسان تھا۔ بدمستی کی خوفناک سیاہی اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی تھی، مگر اس نے اُسے گرفتار نہیں کیا، اپنی طرف رجھا لیا تھا۔ وہ بوتل سے دست کش ہوگیا اور بیئر کا گلاس تھام لیا تھا۔ بیئر پاتال ہوتی ہے۔ اُسے نہ افیون میسر تھی نہ حشیش،

اپنے دماغ کو اُجالوں سے بھر لینے کی خواہش اسے اُس خوف ناک آمیزے کی طرف لے گئی جس میں برانڈی، تیز مزاج اور گہرے رنگ کی بیئر اور absinthe [wormwood کے عرق سے بنا تیز نشہ آور مشروب] کے آمیزے پر انحصار کرنا پڑا تھا جو بے حد گہری کاہلی پیدا کرتا ہے۔ یہی تین بخارات — بیئر، برانڈی اور absinthe — ہیں جن سے روح کو رہنمائی ملتی ہے۔ یہ تینوں شاہی محلوں کے داروغہ کہے جاتے ہیں؛ سماوی تتلی ان ہی میں ڈوب جاتی ہے؛ اور یہ تتلیاں ایک جھلی دار دھوئیں میں ملتی ہیں جو چمگادڑ کے بازوؤں میں غیر واضح طور پر جما ہوتا ہے، تین بے آواز جذبے، ڈراؤنے خواب اور موت، اس کے خوابیدہ نفس پر منڈلاتے رہتے ہیں۔

گرانتیر ابھی افسوس ناک دور میں نہیں پہنچا تھا، بلکہ اس سے بہت دور تھا۔ وہ بے حد خوش و خرم ہو رہا تھا؛ بوسے اور شولی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ گرانتیر نے اپنے الفاظ اور خیالات میں کج رو قسم کے اضافے کیے، جو جذبوں کے اظہار کی ایک خصوصیت ہوتی ہے؛ اس نے وقار سے اپنا بائیں ہاتھ گھٹنے پر رکھا، اس کا ہاتھ زاویہ قائمہ بنا رہا تھا اور کھلے گلوبند کے ساتھ وہ قریبی اسٹول پر بیٹھ گیا، اس کا بھرا ہوا گلاس دائیں ہاتھ میں تھا، اور اس نے شاہانہ انداز میں موٹی خادمہ Matelote کی جانب کچھ الفاظ پھینک دیے:

"محل کے دروازے سب پر کھول دیے جائیں۔ ہر ایک کو فرانسیسی اکادمی کا رُکن بننے دیا جائے اور مادام ہوشیلو کو گلے لگانے کا حق دیا جائے۔ مے نوشی شروع کی جائے۔"

اور مادام ہوشیلو سے مخاطب ہو کر اس میں اضافے کیے:

"استعمال کے لیے قدیم اور مقدس بنائی جانے والی عورت، میرے قریب آ، تا کہ میں تیرا ارادہ کر سکوں!"

شولی نے بلند آواز میں کہا:

"Matelote اور Gibelotte، گرانتیر کو مزید مشروب نہ دینا۔ وہ بہت پی چکا ہے، حد بندی کے بعد سے، وحشیانہ شاہ خرچی میں دو فرانک اور پچانوے سینٹ اُٹھ چکے ہیں۔"

گرانتیر پھر شروع ہو گیا:

"کون ہے جو ستاروں کو میری اجازت کے بغیر کھونٹیوں سے اُتارتا رہا ہے، اور موم بتیوں کے بھیس میں میز پر رکھتا رہا ہے؟"

بوسے نے، اگرچہ مدہوش ہو چکا تھا، اپنا تحمل برقرار رکھا تھا۔ وہ کھلی کھڑکی کے چوکھٹ پر ٹکا، اپنی پشت بارش سے تر کر رہا تھا، اور اپنے دونوں دوستوں کو گھور رہا تھا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے تیز قدموں اور "ہتھیار اٹھاؤ" کی پکار سے پیدا ہونے والی ہلچل سنائی دی۔ وہ مڑ کر کھڑا ہوا، اور Saint-Denis اسٹریٹ کی طرف نظر کی، Chanvrerie اسٹریٹ کے آخری سرے پر اسے نظر آیا، انجولرا ہاتھوں میں پستول اٹھائے، گاوروش اپنا پستول لیے، فیولی اپنی تلوار، کوفیراک اپنی تلوار، اور ژاں پروویر اپنی [بڑے منہ کی چھوٹی] بندوق، کومفیر اپنی بندوق، باؤریل اپنی بندوق اٹھائے تھے، اوران کے پیچھے پورا مسلح طوفانی انبوہ تھا۔

Chanvrerie اسٹریٹ بندوق کی مار سے زیادہ طویل نہیں تھی۔ بوسے نے اپنی دو ہتھیلیوں کی مدد سے ایک بھونپو سا بنا لیا اور پکارنے لگا، "کوفیراک! کوفیراک! کہاں ہو تم!"

کوفیراک کو پکار سنائی دی، بوسے نظر آیا، اور وہ Chanvrerie اسٹریٹ پر پہنچا ہوا، چند قدم آگے بڑھا، "کیا چاہتے ہو؟" جس کا جواب تھا، "تم کدھر جا رہے ہو؟"

"پشتہ بنانے۔" کوفیراک نے جواب دیا۔

"اچھا، اس جگہ! یہ اچھی جگہ ہے، ضرور بناؤ!"

"ٹھیک ہے بے بگلے!" کوفیراک نے کہا۔

کوفیراک کے اشارے پر پورا ہجوم Chanvrerie اسٹریٹ پر ٹوٹ پڑا۔

گرانتیر پر رات کا نزول

وہ جگہ قرینے سے موافق بنائی گئی تھی؛ سڑک پر داخل ہونے والا راستہ چوڑا کر دیا گیا تھا؛ اس کا دوسرا سرا اتنا تنگ کر دیا گیا تھا کہ سڑک ایک بند گلی سی بن گئی تھی۔ Corinth رکاوٹ بن گیا تھا، Mondetour اسٹریٹ کے دائیں اور بائیں جانب پشتہ بنا دیا گیا تھا، اور سوائے Saint-Denis اسٹریٹ کے اس پر کسی طرف سے حملہ ممکن نہیں تھا۔

دہشت کے باعث ہجوم کی چڑھائی کی جگہ سے آگے پوری سڑک بند کر دی گئی تھی۔ وہاں سے ایک بھی راہگیر گزر نہیں سکتا جو نظر میں نہ آ سکے۔ جتنی دیر میں آسمانی بجلی کا جھماکا ہوتا، پیچھے، آگے، دائیں اور بائیں، دکانیں، اصطبل، علاقے کے تمام دروازے، کھڑکیاں، جھلملی، تہہ خانے کی آسمانی کھڑکیاں، زمینی منزل سے چھت تک ہر قسم کے شٹر بند ہو جاتے تھے۔ دہشت کی ماری ایک بوڑھی عورت نے اپنی کھڑکی کے سامنے، سکھانے کے لیے کپڑے ٹانگنے والے بانسوں کے درمیان بستر کا گدا اڑا دیا تھا، تا کہ بندوق بازی کے اثرات کو کم کیا جا سکے۔ صرف وائن کی دکان کھلی تھی؛ اور وہ بھی اس لیے کہ ہجوم اس میں گھس آیا تھا — اور مام ہوشیلو، "اوہ میرے خدا، اوہ میرے خدا!" کر رہی تھی۔

بوسے کوفیراک سے ملنے گیا تھا۔

شولی نے جو کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا، بلند آواز میں کہا

"تم کو چھاتا لے آنا چاہیے تھا، ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

اس دوران، صرف چند منٹ کے اندر، وائن کی دکان کے جالی دار چھانک سے بیس عدد لوہے کے چھڑ نکال لیے گئے، سڑکوں کے پتھر نکال لیے گئے تھے؛ گاوروش اور باوریل نے اس

راستے میں لیموں فروش Anceau کا ٹھیلا پکڑ کر اُلٹ دیا تھا۔ اس ٹھیلے پر لیموں کے تین ڈبے لدے ہوئے تھے جو انھوں نے راستے سے نکالے پتھروں کے انبار کے نیچے چھپا دیے تھے۔ انجولرا نے تہہ خانے کا دروازہ اٹھایا اور بیوہ ہوشیلو کے تہہ خانے میں موجود تمام خالی پیپے لیموں سے بھر دیے گئے؛ فیولی نے، جو پنکھوں میں استعمال ہونے والی نازک چھڑیوں کو پینٹ کرنے کا ماہر تھا، پیپے اور ٹھیلا استعمال کیا جس پر کھردرے پتھروں کا بہت بڑا انبار رکھا۔ بلاک جو دوسری چیزوں کی طرح بروقت بن گئے تھے، حاصل کیے گئے مگر کہاں سے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ شہتیریں جو ٹیک لگانے کے لیے استعمال کی گئی تھیں ہمسایے کے مکان سے نکلی تھیں، اور پیپوں پر رکھ دی گئیں۔ بوسے اور کوفیراک واپس آئے تو آدھی سڑک آدمی کے قد سے بلند پشتے سے بند کر دی گئی تھی۔ عوام کے ہاتھوں بنی عمارتوں کو گرا کر نئی عمارتیں بنانے سے بڑھ کر کیا کام ہو سکتا ہے۔

Matelote اور Gibelotte کام کرنے والوں میں گھل مل گئی تھیں۔ Gibelotte آتے کوڑا لاتی، جاتے کوڑا لے جاتی۔ اس کی کم زوری پشتے میں مددگار ہوئی۔ اس نے پشتے پر بھی اسی طرح کام کیا جیسا کہ وہ وائن پیش کرنے میں کرتی تھی، غنودگی کی سی کیفیت میں۔

ایک اومنی بس جس میں دو گھوڑے جتے ہوئے تھے، سڑک کے آخری حصے سے گزر رہی تھی۔

بوسے سڑک بنانے والے پتھروں کے اوپر چڑھ کر دوڑا، اومنی بس تک گیا، کوچوان کو روکا، مسافروں کو اُتارا، خواتین کو سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا، کنڈیکٹر کو فارغ کیا اور گاڑی کے سامنے جا کر گھوڑوں کی لگام پکڑی اور گاڑی واپس لے آیا۔

"اومنی بسیں" اس نے کہا، "Corinth سے نہیں گزرا کرتیں۔"

ایک لمحے بعد گھوڑوں کو آزاد کر دیا گیا، وہ Mondetour اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے جدھر چاہا چلے گئے، اور ایک پہلو لیٹی اومنی بس نے سڑک کی آڑی رکاوٹ کو مکمل کر دیا۔

مام ہوشیلو نے، جو بہت ناراض تھی، پہلی منزل پر پناہ لے لی تھی۔

اس کی آنکھیں بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں، اور وہ دھیمی آواز میں رو رہی تھی۔ اس کی خوف ناک چیخوں کو اس کے گلے سے نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"دنیا ختم ہونے والی ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

شوبی نے مام ہوشیلو کی موٹی، سُرخ، بھری بھری گردن پر ایک بوسہ جڑ دیا اور گرانتیر سے کہا، "میرے پیارے دوست، میں نے عورت کی گردن کو ہمیشہ بے حد لذیذ شے سمجھا ہے۔"

مگر گرانتیر [یونانی زبان کی قدیم] حمد کے اعلیٰ ترین درجات تک پہنچ چکا تھا۔ Matelote

ایک بار پھر پہلی منزل پر چڑھتی گرا ہتیر نے اُسے کمر سے پکڑ لیا اور کھڑکی میں لمبے لمبے قہقہے لگانے لگا۔
"Matelote بہت سادہ مزاج ہے۔" اس نے چیخ کر کہا، "Matelote بدصورتی کا خواب ہے! Matelote انوکھی مخلوق ہے۔ اس کی پیدائش کا راز سنیے: ایک Pygmalion نے [قبرص کا بادشاہ جس نے پتھر کاٹ کر عورت کا ایک مجسمہ بنایا اور پھر اسی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا، جسے بعد میں Aphrodite نے زندگی دے دی تھی] جو کلیساؤں کے لیے gargoyles [انسانی صورت کے پتھر سے بنے پرنالے جن سے بارش کا پانی گرتا ہے] بنا رہا تھا، ان میں سے ایک سے، جو سب سے بھیانک تھی، ایک صبح محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے اسے زندگی دینے کے لیے ہم بستری کی خواہش کی، اور Matelote پیدا کی۔ لوگو! اس کی طرف دیکھو۔ اس کے بال سیسے کے رنگ کے ہیں، جیسے Titian کی داشتہ کے تھے، اور یہ اچھی لڑکی ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ یہ خوب لڑے گی۔ ہر اچھی لڑکی کے اندرون میں ایک ہیرو ہوتا ہے۔ اور مدر ہوشیلو، وہ ایک پرانی جنگجو ہے۔ اس کی مونچھیں تو دیکھو، اس کے شوہر سے وراثت میں ملی ہیں۔ بلاشبہ یہ ہُسار [گھڑ سوار سپاہی] ہے۔ یہ بھی لڑے گی۔ یہ دونوں اکیلی Banlieue میں دہشت پیدا کر دیں گی۔ دوستو! ہم اس حکومت کو، جو چربی سے بنے تیزاب اور پارچے رنگنے والے، کیڑے مکوڑے مارنے والے مادّوں کے تیزاب کے درمیان کے تیزاب کی طرح ہے، اُلٹ دیں گے۔ حضرات! میرے والد نے ہمیشہ مجھ سے نفرت کی تھی اس لیے میں ریاضی سمجھ نہیں پاتا تھا۔ میں صرف محبت اور آزادی کو سمجھتا ہوں۔ میں ہوں گرا ہتیر، ایک اچھا آدمی۔ میرے پاس کبھی دولت نہیں رہی، اس لیے کہ میں نے اسے حاصل کرنے کی عادت نہیں ڈالی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے دولت کی کبھی کمی نہیں ہوئی، لیکن، اگر میں دولت مند ہوتا، تو آپ کو مفلس لوگ نظر نہیں آتے۔ آپ دیکھ لیتے۔ اگر نرم دل والوں کے بٹوے بھرے ہوتے تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ میں خود کو Rothschild کے مقدور والا یسوع مسیح جیسا دیکھتا ہوں۔ وہ کتنی نیکی کرتا۔ Matelote مجھے گلے سے لگاؤ! تم شہوت پرست اور بزدل ہو۔ تمھارے رخسار ایسے ہیں جو بہن کا سا بوسہ مانگتے ہیں، اور لب ایسے ہیں کہ عاشق کا بوسہ طلب کرتے ہیں۔"

"زبان سنبھال کر بات کر، شراب کے پیپے!" کوفیراک نے چیخ کر کہا۔

گرا ہتیر نے پلٹ کر جواب دیا:

"میں Toulouse کی میونسپلٹی کا افسر ہوں، اور floral کھیلوں کا ماہر ہوں۔"

انجولرا نے، جو ہاتھ میں پستول لیے پشتے کی چوٹی پر کھڑا تھا، اپنا خوب صورت چہرہ بلند کیا۔ جیسا کہ قاری کو علم ہے، انجولرا کی ساخت میں کچھ اسپارٹائی اور پیوریٹان آمیزش تھی۔ وہ

Thermopylae کی جنگ میں [اسپارٹا کے بادشاہ] Leonidas کے ساتھ تباہ ہوگیا ہوتا، اور کرامویل کے ساتھ [آئرلینڈ کے علاقے] Drogheda میں جل گیا ہوتا۔

"گراہتیر!" وہ چیخا، "جا، اور اپنی وائن کے بخارات یہاں کے بجائے کہیں اور جا کر نکال۔ یہ مقام پُر جوشی ہے، مدہوشی نہیں۔ پیشے کو بدنام نہ کر!"

غصے میں کی گئی اس تقریر کا گراہتیر پر غیر معمولی اثر ہوا۔ اس کو یقین بھی کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس کے چہرے پر ایک گلاس بھر ٹھنڈا پانی پھینک دیا گیا تھا اور وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا، اور اپنی کہنیاں کھڑکی کے قریب رکھی میز پر ٹکا لیں، ناقابلِ بیان شرافت سے انجولرا کی طرف دیکھا، اور اس سے کہا، "میں سونا چاہتا ہوں۔"

"چلے جاؤ یہاں سے، کہیں اور جا کر سوؤ۔" انجولرا نے چیخ کر کہا۔

مگر گراہتیر کی نرم اور پریشان نظریں اسی پر مرکوز رہیں، اور اس نے کہا:

"مجھے یہاں سو جانے دو — جب تک میں مر نہ جاؤں۔"

انجولرا نے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا:

"گراہتیر، تم یقین کرنے، سوچنے، چاہنے، زندہ رہنے اور مرنے کے قابل نہیں۔"

گراہتیر نے دُکھ بھرے لہجے میں جواب دیا، "تم دیکھ لو گے۔"

اس نے ہکلاتے ہوئے کچھ اور الفاظ کہے۔ اس کے بعد اُس کا سر زور سے میز پر گر پڑا، اور جیسا کہ مدہوشی کے دوسرے دور میں عام طور پر ہوتا ہے جس میں انجولرا نے اسے دھکیل دیا تھا، ایک لمحے بعد اسی کیفیت میں وہ سو گیا۔

۞

بیوہ ہوشیلو کی دل جوئی

باؤزریل پشتوں کے اوپر سے عالمِ وجد میں چیخا:

"یہ رہی سڑک، نیچے گلے والے بلاؤز میں—— کتنی اچھی لگ رہی ہے۔"

کوفیراک نے کسی حد تک وائن کی دکان کو مسمار کردیا تو بیوہ مالکن کی دلجوئی کی کوشش کی۔ "مدر ہوشیلو، کل آپ ہی تو تھیں جو شکایت کر رہی تھیں کہ آپ کو قانون شکنی پر تنبیہ کی گئی تھی، اس لیے کہ Gibelotte نے آپ کی کھڑکی کا پردہ ہٹادیا تھا؟"

"جی ہاں! میرے مہربان موسیو کوفیراک۔ اوہ خدایا، کیا آپ میری میز کو بھی اپنی دہشت کی نذر کردیں گے؟ پردے کے بارے میں اور گملوں کے بارے میں بھی، جو دو چھت سے سڑک پر گر گئے تھے، حکومت نے ہم سے سو فرانک جرمانہ وصول کر لیا تھا۔ اگر یہ ظلم نہیں ہے، تو پھر اور کیا ہے!"

"ہاں مدر ہوشیلو، ہم آپ سے بدلہ لے رہے ہیں۔"

مدر ہوشیلو کو ان فوائد کا اچھی طرح اندازہ نہیں تھا جو اس کی پاداش میں ہونے والے تھے۔ وہ بھی اس عرب عورت کی طرح تھی جس کے شوہر نے ایک دن اس کی پٹائی کر دی تھی؛ وہ اپنے باپ کے پاس شکایت لے کر گئی، کہتی ہوئی، "فادر، آپ پر لازم ہے کہ آپ میرے شوہر کو میری ہتک کا بدلہ ہتک سے دیں۔" فادر نے سوال کیا، "تمھارے کس گال پر تھپڑ پڑا تھا؟" "بائیں گال پر"۔ فادر نے اس کے دائیں گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا اور کہا، "اب تم مطمئن ہو۔ جاؤ، اپنے شوہر سے کہہ دو کہ تم نے میری بیٹی کی پٹائی کی تھی، اب میں نے تمھاری بیوی کی پٹائی کردی ہے۔"

بارش رک گئی تھی۔ رنگروٹ آگئے تھے۔ کاریگر بارود بھری ایک نال اپنے بلاؤز کے اندر چھپا کر لائے تھے، گندھک کے تیزاب کی بوتلوں سے بھری ایک چھابی، کارنوال کی دو یا تین

تاریخ، اور ایک بکس بھر آتش بازی بھی لائی گئی تھی — "بادشاہ کے جشن کی باقیات —" جشن حال ہی میں ہوا تھا، مئی کی پہلی تاریخ کو۔ کہا گیا تھا کہ یہ سارا گولا بارود Faubourg Saint-Antoine کے ایک کریانہ فروش کے ہاں سے آیا تھا، جس کا نام تھا Pepin۔ انھوں نے Chanvrerie اسٹریٹ کی اکیلی لالٹین تباہ کر دی تھی، اور اسی جیسی لالٹین Saint-Denis اسٹریٹ کی بھی، اور تمام لالٹینیں اطراف کی سڑکوں کی: Mondetour، Cygne، اور Grande اور Petite-Truanderie۔

انجولرا، کومفیر اور کورفیراک ہر چیز کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ایک ساتھ دو پشتوں کی تعمیر ہو رہی تھی، دونوں Corinth ہاؤس سے متصل تھے اور ایک زاویہ قائمہ بنا رہے تھے؛ بڑے پشتے نے Chanvrerie اسٹریٹ کو بند کر دیا تھا، دوسرے نے Mondetour اسٹریٹ کو اور Cygne اسٹریٹ کو۔ یہ آخری پشتہ جو بہت تنگ سا تھا، لکڑی کے پیپوں اور سڑک بنانے والے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ وہاں تقریباً پچاس مزدور کام کر رہے تھے؛ تیس آدمی بندوقوں سے لیس تھے؛ جو، اپنے طور پر، انھوں نے کسی اسلحے کی دکان سے تھوک کے بھاؤ قرض پر حاصل کی تھیں۔

کوئی شے اس غول سے زیادہ بے سروپا اور ساتھ ہی بوقلموں نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک کے پاس کارتوس کی جیکٹ، گھڑسواروں کی دو دھاری تلوار اور دو ہولسٹر پستول تھے؛ دوسرا آستینوں والی قمیص میں تھا، سر پر گول ہیٹ تھی، اور ایک پاؤڈر بھری سینگ تھی جو اس کے پہلو میں آویزاں تھی، تیسرا بھورے رنگ کے کاغذ کی نو چادروں سے بنی صدری پہنے تھا اور موچیوں کی چمڑا سینے کی سوئی سے لیس تھا۔ ایک اور بھی تھا جو چیخ کر کہہ رہا تھا، "ان کو آخری آدمی تک ختم کر دو، اور اپنی سنگین کی نوک پر مر جاؤ۔" اس آدمی کے پاس سنگین نہیں تھی۔ ایک اور جو اپنے کوٹ پر آڑی پٹی پہنے تھا اور اس کے پاس کارتوس سے بھرا نیشنل گارڈ کا بکس تھا۔ کارتوس کے بکس پر سرخ رنگ کے اون سے Public Order کاڑھا گیا تھا اور بہت بڑے بڑے ہورہا تھے جن کی پشت پر انجمن کے نمبر لکھے تھے؛ چند ہیٹ پہنے تھے، کچھ بے گلوبند تھے، کئی کھلے بازو تھے، اور کچھ نیزہ بردار تھے۔ اس میں اضافہ کر لیجے، کہ ہر عمر کے، ہر قسم کے چہروں والے، چھوٹے، زرد رو نوجوان، اور سانولے رنگ کے بندرگاہ کے قلی بھی تھے۔ سب کو جلدی تھی، اس لیے کہ ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے، اور آپس میں ممکنہ مواقع کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ انھیں صبح کے تین بجے کے قریب مدد پہنچے گی، کہ انھیں ایک رجمنٹ کا یقین تھا، کہ پیرس بغاوت کرے گا۔ خوف ناک کہاوتیں تھیں، جس میں شیریں زندہ دلی بھی شامل تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی کہہ

رہے تھے مگر ان کے نام سے واقف نہیں تھے۔ اجنبی لوگوں میں بھائی چارہ پیدا کرنے کی اس قسم کی صفات میں بڑے خطرات بھی ہوتے ہیں۔ باورچی خانے میں آگ جلائی گئی تھی اور کچھ لوگ جست کے مگ، چمچے، کانٹے اور ہر قسم کے پیتل کے برتن گلا کر گولیوں کے خول ڈھالنے میں مصروف تھے۔ اس دوران مے نوشی بھی ہو رہی تھی۔ میز پر رکھے وائن کے گلاسوں کے ساتھ ٹوپیاں، بڑے بڑے چھرے گڈمڈ تھے۔ بلیئرڈ کے تالار میں مام ہوشیلو، Matelote، اور Gibelotte، طرح طرح سے خوف زدہ ہو رہی تھیں؛ ایک کا دماغ مختل ہو گیا تھا، دوسری کی سانسیں چڑھ گئی تھیں، اور تیسری کو بھڑکا دیا گیا تھا، اور سب مل کر برتن سکھانے والے کپڑوں کو پھاڑ کر پٹیاں اور پھائے بنا رہی تھیں؛ تین فتنہ انگیز ان کی مدد کر رہے تھے، تین جھاڑی جیسے بالوں والے، ڈاڑھیوں مونچھوں والے زندہ دل نوجوان، ان عورتوں کے ہاتھ سے وہ کپڑے نوچتے تو وہ خوف سے کانپنے لگتی تھیں۔

وہ بلند قامت آدمی جسے کوفیراک، کومفیر اور انجولرا نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ Billettes اسٹریٹ کے کونے پر ہجوم میں شامل ہوا تھا، اس وقت چھوٹے پشتوں پر کام کر رہا تھا۔ گاوروش بڑے پشتے پر کام کر رہا تھا اور وہ نوجوان جو کوفیراک کے مکان پر اس کا انتظار کر رہا تھا، اور جس نے ماریئس کے بارے میں بھی پوچھا تھا، اس وقت غائب ہو گیا جب اومنی بس اُلٹی تھی۔

پوری طرح مصروف اور تابندہ رُو گاوروش ہر کام کے لیے مستعد ہوتا تھا۔ وہ آتا، جاتا، چڑھتا، اُترتا، دوبارہ چڑھتا، سیٹی بجاتا اور ہمیشہ جھلملاتا رہتا تھا۔ وہ سب کی ہمت افزائی کے لیے آیا تھا۔ کیا اس عمل کا کوئی محرک تھا؟ جی ہاں، یقینی طور پر اس کی مسرت اس کی محرک تھی؛ کیا اس کے بال و پر تھے؟ جی ہاں! یقینی طور پر اس کی مسرت ہی اس کی بال و پر تھی۔ گاوروش ایک گرد باد تھا؛ ہر دم نظر آتا تھا؛ ہمہ وقت سنائی دیتا تھا۔ فضا پر چھایا ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ ایک ساتھ ہر جگہ پر ہوتا تھا۔ اس کی ہر جگہ موجود ہونے کی صفت تقریباً جھنجھلا دینے والی تھی؛ اس کے ساتھ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ وہ بھیا تک پشتہ اس کو اپنے اوپر لدا پاتا تھا۔ وہ آرام پسندوں کو پریشان کرتا، کاہلوں کو اُکساتا، تھکے ہوؤں میں نئی جان ڈالتا، غور کرنے والوں سے اُکتا جاتا، کچھ لوگوں کو مسرور کرتا، کچھ میں دم ڈالتا، دوسروں میں طیش پیدا کرتا، سب کو متحرک کرتا، کبھی طالب علم کو چھیڑتا، کبھی دستکار کو دانت کاٹتا؛ باہر نکلتا، رُکتا، ایک بار پھر اُڑ جاتا، ہلچل پر اور کوشش پر منڈلاتا، ایک جماعت سے دوسری جماعت میں اچھل کر پہنچ جاتا، بھن بھن کرتا، گنگناتا اور پوری کمپنی کو پریشان کرتا؛ بہت بڑی سواری پر وہ بیٹھی مکھی جیسا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بازوؤں میں مسلسل حرکت ہوتی اور پھیپھڑوں میں ابدی ہنگامہ ہوتا تھا۔

''ہمت! مزید پتھر کی سلیں! مزید پیپے! مزید مشینیں! کہاں ہو تم؟ گارے کا ایک ٹوکرا چاہیے پلستر کا سوراخ کو بند کرنے کے لیے۔ تمھارا پشتہ بہت چھوٹا ہے، اس کو اور بلند کرنا چاہیے۔ اس پر سب کچھ لاد دو، اس پر ہر چیز پھینک دو، سب کچھ اس میں پھینک دو۔ مکان کو گرا دو۔ یہ پشتہ تو مدر Gibou کی چائے ہے۔ ہیلو! یہ رہا شیشے کا دروازہ۔''

اس بات نے کام کرنے والوں میں شور و غل برپا کر دیا۔

''شیشے کا دروازہ؟ ہم شیشے کے دروازے کو لے کر کیا کریں گے؟''

''ہرکولیس بنو۔'' گاوروش نے کہا ''پشتے میں شیشے کا دروازہ لاجواب چیز ہوگا۔ یہ حملہ روک تو نہیں سکتا، مگر دشمن اسے لے نہیں جا سکتا۔ شیشے کا دروازہ نیشنل گارڈ کے گھٹنوں کو کاٹ دیتا ہے، جب وہ اسے پشتے پر لگانے لگتے ہیں۔ قسم خدا کی، شیشہ بڑی بے وفا چیز ہے۔ ساتھیو، تم لوگوں میں ہوشیاری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

مگر وہ بغیر لبلبی کے پستول پر بہت ناراض تھا۔ وہ ہر ایک کے پاس گیا، ''تمھارے پاس بندوق ہے؟ مجھے بندوق چاہیے! تم مجھے بندوق کیوں نہیں دیتے؟''

''تمھیں بندوق دیں؟'' کومفیر نے کہا۔

''اچھا!'' گاوروش نے کہا، ''مگر کیوں نہیں؟ 1830ء میں میرے پاس ایک بندوق تھی، جب ہمارا چارلس دہم سے تنازعہ چل رہا تھا۔''

انجولر نے اپنے کاندھے ہلا دیے۔

''جب آدمیوں کے لیے کافی ہو جائیں گے تو کچھ بچوں کو بھی دے دیں گے۔''

گاوروش مغرور تکبرانہ انداز میں مڑ گیا، اور جواب دیا:

''اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے، تو میں تمھاری بندوق لے لوں گا۔''

''بدمعاش!'' انجولرا نے کہا۔

''بیوقوف!'' گاوروش نے کہا۔

ایک بانکا جو راستہ بھول گیا تھا پاس سے گزرا، وہ سڑک کے آخر میں مڑنے والا تھا کہ گاوروش نے چیخ کر اس سے کہا، ''ہمارے ساتھ چلو نوجوان! کیا ہم اپنے ملک کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے؟''

بانکا بھاگ گیا۔

۞

تیاریاں

اس زمانے کے رسائل کہتے تھے کہ Chanvrerie اسٹریٹ کے پشتے کا تقریباً ناقابلِ تسخیر ڈھانچا جو اُن کے قول کے مطابق دوسری منزل کی بلندی تک پہنچ گیا تھا، غلط تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اوسط بلندی چھ یا سات فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ لڑنے والے اپنی مرضی کے مطابق یا اس کے پیچھے چھپ سکتے تھے یا پشتے پر حاوی ہو سکتے تھے یا اس کی چوٹی پر سیڑھی کی طرح جمائی ہوئی پتھر کی سلوں کے ذریعے اوپر پہنچ سکتے تھے۔ باہر کی جانب، یعنی پشتے کے سامنے، جو پتھر کی سلوں اور لکڑی کے پیپوں کے ڈھیر کو شہتیروں اور تختوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر کے Anceau کے ٹھیلے اور اُلٹی ہوئی اومنی بس کے پہیوں کو اُلجھا کر بنایا گیا تھا کھردرا اور لاینحل منظر پیش کرتا تھا۔

مکانوں کی دیوار اور پشتے کی لمبائی کے درمیان جو شگاف بنایا گیا تھا اتنا وسیع تھا جس میں سے پورا آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا، وائن کی دُکان سے دور تھا۔ اس طرح اس مقام سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ اومنی بس کا ایک بمبر اعمودی انداز میں رکھا اور رسیوں سے باندھا گیا تھا، اور اس پر ایک سُرخ پرچم لگایا گیا جو پشتے پر لہراتا تھا۔

Mondetour کا چھوٹا پشتہ، جو وائن کی دُکان کی عمارت کے عقب میں تھا، نظر نہیں آتا تھا۔ ان دو پشتوں کے اتحاد سے ایک اچھا خاصا محفوظ مورچے جیسا پشتہ بن گیا تھا۔ انجولرا اور کوفیراک کا خیال تھا کہ Mondetour اسٹریٹ کے دوسرے حصے کی مورچہ بندی مناسب نہیں تھی، جو Precheurs اسٹریٹ کے ذریعے Halles کے علاقے میں کھلتی تھی، اس خیال سے کہ بیرون سے ممکنہ راستہ قائم رہنا چاہیے، اور مشکل اور پُرخطر Precheurs اسٹریٹ کی جانب

سے حملے کا خوف نہ رہے۔

اس مسئلے سے قطع نظر جو فی الوقت ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور جو ایسا منظر پیش کرتا تھا جسے Folard [فرانسیسی سپاہی اور فوجی معاملات کے عظیم مصنف] نے اپنی فوجی مصلحت سے ایک شاخ تصور کیا ہوتا: Chanvrerie اسٹریٹ کے درمیان بنائے گئے شگاف کے ذریعے، جہاں وائن کی دکان ایک نمایاں زاویہ بناتی تھی، ایک ناہموار مربع سا بن گیا تھا، جو چاروں جانب سے بند تھا۔ اونچے اونچے مکانوں اور بڑے پشتے کے درمیان بیس قدم کا ایک وقفہ پڑتا تھا جو اسٹریٹ کا عقبی حصہ بن گیا تھا اس طرح کہ دیکھنے والا سمجھے کہ پشتہ ان مکانات پر انحصار کرتا ہے جو پوری طرح آباد ہیں مگر اوپر سے نیچے تک بند ہیں۔

یہ سارا کام بغیر کسی رکاوٹ کے اور بغیر ان مٹھی بھر بہادر آدمیوں کے جنھیں بھالو کی کھال کی ٹوپی اور سنگین والوں کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی مکمل ہو گیا تھا۔ ہر وہ بورژوا جو بلوے کے حالات میں بھی Saint-Denis اسٹریٹ پر آنکلتا اور Chanvrerie اسٹریٹ پر ایک نظر ڈالتا اور پشتے کو دیکھتا تو وہاں سے اپنی رفتار دگنی کر دیتا تھا۔

دو پشتوں کی تکمیل اور جھنڈا لہرانے کے بعد، وائن کی دکان سے ایک میز گھسیٹ کر باہر نکالی گئی؛ اور کوفیراک اس میز پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ انجولرا ایک مربع صندوق لے آیا اور کوفیراک نے اسے کھولا۔ یہ صندوق کارتوسوں سے بھرا تھا۔ ہجوم نے کارتوس دیکھے تو بہادر ترین آدمیوں میں بھی ایک لرزہ سا دوڑ گیا، اور ایک عارضی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

کوفیراک مسکرا کر انھیں تقسیم کر رہا تھا۔

ہر شخص کو تیس کارتوس ملے۔ کئی کے پاس پاؤڈر تھا، وہ ان خولوں سے بلٹ بنانے لگے جو انھوں نے ڈھال رکھے تھے۔ پاؤڈر کا بیپا دروازے کے قریب ایک طرف میز پر رکھ دیا گیا جو بعد میں کام آنے کی خاطر محفوظ کیا گیا تھا۔

خطرے کی گھنٹی کی آواز جو پورے پیرس میں بار بار سنائی جا رہی تھی، رکی نہیں، مگر بالآخر ایسی آواز بن گئی جس کی حقیقت ایک یاد دلانے والے شور سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ لوگوں نے جس پر توجہ دینا تک چھوڑ دیا تھا۔ یہ شور کیا تھا، ایک غم انگیز دھڑکن جیسا شور تھا جو کبھی کم کبھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

سب نے ایک ساتھ، بغیر کسی قسم کی جلدی کے، مگر سنجیدہ اہمیت کے ساتھ اپنی اپنی بندوقیں اور توڑے والی چھوٹی بندوقیں بھر کر تیار کر لیں۔ انجولرا گیا اور اس نے پشتے سے باہر تین چوکی دار تعینات کر دیے؛ ایک Chanvrerie اسٹریٹ پر، دوسرا Precheurs پر اور تیسرا

Petite Truanderie کے کونے پر۔

پشتے بنائے جا چکے تھے؛ چوکیاں مقرر کی جا چکی تھیں؛ بندوقیں بھری جا چکی تھیں؛ چوکی دار تعینات کیے جا چکے تھے؛ وہ ان مہیب تاریک سڑکوں پر اکیلے کھڑے تھے جہاں سے اب کوئی گزرتا نہیں تھا، جو ان گونگے اور مُردوں جیسے مکانات کے گھیرے میں تھے جن میں کوئی انسانی دھڑکن سنائی نہیں دیتی تھی، جن پر شفق کے گہرے ہوتے سایے بڑھتے جا رہے تھے، اور اس خاموشی کے درمیان کوئی شے آگے بڑھتی محسوس کی جا رہی تھی جس میں کچھ المناک، خوف آور، مسلح، مقتدر اور پُر سکون کیفیات بھی تھیں۔

۞

انتظار

انتظار کے ان لمحات میں وہ کیا کر رہے تھے؟

ہمیں ان کا ذکر ضرور کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ تاریخ کا معاملہ ہے۔

جب مرد گولیاں بنا رہے تھے، عورتیں پھائے تیار کر رہی تھیں؛ جب پگھلے پیتل اور سیسے سے بھری ایک کڑھائی، جس کا مقدر گولیوں کے خول ڈھالنا تھا، بھڑکتی ہوئی انگیٹھی پر دھواں دے رہی تھی، جسے پشتے پر متعین مسلح چوکی دار دیکھ رہے تھے؛ جب انجولراس، جس کا کسی اور طرف متوجہ ہونا ممکن نہیں تھا، چوکیداروں پر نظر گاڑے ہوئے تھا، کومفیر، کورفیراک، ژاں پرووییر، فیوئی، بوسے، شوئی، باؤریل اور کچھ دوسرے، ایک دوسرے کی تلاش میں تھے، اور اپنی گفتگو میں طالب علمی کے اور امن کے دور کی طرح متحد تھے، وائن کی دکان کے ایک کونے میں جو ایک جھروکے میں تبدیل ہو گیا تھا، اور قلعے جیسی جگہ سے چند قدم آگے، جو انھوں نے بنائی تھی، اپنی چھوٹی چھوٹی بندوقیں بھرے، اپنی کرسیوں سے پیٹھ لگائے آرام کر رہے تھے۔ ان نوجوان لڑکوں نے، جو ایک عظیم لمحے سے بہت قریب تھے، محبت بھرے اشعار پڑھنے شروع کر دیے۔

کیسے اشعار؟ یہ تھے وہ اشعار:

Vous rappelez-vous notre douce vie,
Lorsque nous etions si jeunes tous deux,
Et que nous n'avions au coeur d'autre envie
Que d'etre bien mis et d'etre amoureux,

Lorsqu'en ajoutant votre age a mon age,

Nous ne comptions pas a deux quarante ans,
Et que, dans notre humble et petit menage,
Tout, meme l'hiver, nous etait printemps?

Beaux jours! Manuel etait fier et sage,
Paris s'asseyait a de saints banquets,
Foy lancait la foudre, et votre corsage
Avait une epingle ou je me piquais.

Tout vous contemplait. Avocat sans causes,
Quand je vous menais au Prado diner,
Vous etiez jolie au point que les roses
Me faisaient l'effet de se retourner.

Je les entendais dire: Est elle belle!
Comme elle sent bon! Quels cheveux a flots!
Sous son mantelet elle cache une aile,
Son bonnet charmant est a peine eclos.

J'errais avec toi, pressant ton bras souple.
Les passants croyaient que l'amour charme
Avait marie, dans notre heureux couple,
Le doux mois d'avril au beau mois de mai.

Nous vivions caches, contents, porte close,
Devorant l'amour, bon fruit defendu,
Ma bouche n'avait pas dit une chose
Que deja ton coeur avait repondu.

La Sorbonne etait l'endroit bucolique
Ou je t'adorais du soir au matin.
C'est ainsi qu'une ame amoureuse applique
La carte du Tendre au pays Latin.

O place Maubert! o place Dauphine!
Quand, dans le taudis frais et printanier,
Tu tirais ton bas sur ton jambe fine,
Je voyais un astre au fond du grenier.

J'ai fort lu Platon, mais rien ne m'en reste;
Mieux que Malebranche et que Lamennais,
Tu me demontrais la bonte celeste
Avec une fleur que tu me donnais.

Je t'obeissais, tu m' etais soumise;
O grenier dore! te lacer! te voir
Aller et venir des l'aube en chemise,
Mirant ton jeune front a ton vieux miroir.

Et qui done pourrait perde la memoire
De ces temps d'aurore et de firmament,
De rubans, de fleurs, de gaze et de moire,
Ou l'amour begaye un argot charmant?

Nos jardins etaient un pot de tulipe;
Tu masquais la vitre avec un jupon;
Je prenais le bol de terre de pipe,
Et je te donnais le tasse en japon.

Et ces grands malheurs qui nous faisaient rire!
Ton manchon brule, ton boa perdu!
Et ce cher portrait du divin Shakespeare
Qu'un soir pour souper nons avons vendu!

J'etais mendiant et toi charitable.
Je baisais au vol tes bras frais et ronds.
Dante in folio nous servait de table

Pour manger gaiment un cent de marrons.

La premiere fois qu'en mon joyeux bouge
Je pris un baiser a ton levre en feu,
Quand tu t'en allais decoiffee et rouge,
Je restai tout pale et je crus en Dieu!

Te rappelles-tu nos bonheurs sans nombre,
Et tous ces fichus changes en chiffons?
Oh que de soupirs, de nos coeurs pleins d'ombre
Se sont envoles dans les cieux profonds!

وہ گھنٹا، وہ مقام، وہ نشانیاں نوجوان جنھیں یاد کرتے ہیں، چند ستارے جنھوں نے آسمان میں جگمگانا شروع کیا تھا، سنسان سڑکوں کا وقار جن پر جنازے کا جلوس رواں تھا، ان سب نے مل کر ان اشعار کو، شام کے دھندلکے میں جو ژاں پرویر سرگوشی کے لہجے میں پڑھ رہا تھا، ہم جس کے بارے میں کہہ چکے ہیں کہ وہ ایک نرم دل شاعر تھا، ایک دل سوز جادو فراہم کردیا تھا۔

اس دوران چھوٹے پشتے پر ایک لیمپ روشن کردیا گیا تھا، اور بڑے پشتے پر لاکھ کی وہ مشعلیں جلادی گئی تھیں جیسی Shrove-Tuesday کو ان گاڑیوں کے سامنے آپ کو ملیں گی جو پردوں سے لدی ہوئی تھیں اور Courtille کی طرف رواں تھیں۔ یہ مشعلیں، جیسی کہ قاری نے دیکھی ہیں، Saint-Antoine کی مضافاتی بستی سے لائی گئی تھیں۔

مشعل جو پتھر کی سلوں سے بنے ایک پنجرے میں رکھی گئی تھی، جسے تیز ہوا سے بچانے کے لیے تین طرف سے بند کردیا گیا تھا، اور اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ ساری روشنی پرچم پر پڑتی تھی۔ سڑک اور پشتہ دونوں غم انگیز اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے، اور سوائے سُرخ پرچم کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا جسے ایک مہیب سی لالٹین سے روشن کیا گیا تھا۔

اس روشنی نے پرچم کی سُرخی کو، ایک ناقابلِ بیان اور خوفناک ارغوانی رنگ نے بڑھا دیا تھا۔

Billettes اسٹریٹ کا رنگروٹ

رات پوری طرح اتر آئی تھی؛ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پریشان کن آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا؛ وقفے وقفے سے توپیں حملہ کر رہی تھیں؛ مگر یہ سب غیر معمولی تھا، بُری طرح کیا جا رہا تھا اور دور دور ہو رہا تھا۔ یہ مہلت، جو طویل تھی، اس امر کا اشارہ تھی کہ حکومت وقت لے رہی تھی اور اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہی تھی۔ پچاس افراد ساٹھ ہزار کا انتظار کر رہے تھے۔

انجولراس پر بے صبری کا حملہ ہو گیا، جو دہشت انگیز واقعات کی ڈیوڑھی پر بڑے بڑے مضبوط انفاس کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ گاوروش کی تلاش میں نکلا جو مے نوشی کے کمرے میں دو موم بتیوں کی غیر معتبر روشنی میں جو میزوں پر رکھی ہوئی تھیں، کارتوس بنا رہا تھا۔ ان موم بتیوں کی روشنی کمرے سے باہر نہیں پہنچ رہی تھی۔ فتنہ انگیزوں نے مزید اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اوپر کی منزلوں میں کسی قسم کی روشنی نہ ہو۔

گاوروش اس وقت پہلے سے بھی زیادہ مصروف تھا، مگر محض کارتوسوں میں نہیں۔ Billettes کا آدمی ابھی ابھی مے نوشی کے کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس میز کے قریب بیٹھ گیا جس پر سب سے کم روشنی تھی۔ بڑے ماڈل کی توڑے کی ایک بندوق اس کے ہاتھ آئی تھی، جسے وہ اپنے پیروں کے درمیان رکھے ہوئے تھا۔ گاوروش نے، جسے اس لمحے تک سیکڑوں دل چسپی پیدا کرنے والی اشیا نے اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا، اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

جب سے وہ آدمی کمرے میں داخل ہوا تھا، گاوروش اس کی بندوق کی تعریف کے بہانے، آنکھوں ہی آنکھوں میں، میکانکی انداز میں اس کا پیچھا کر رہا تھا؛ اور پھر اچانک، جب وہ آدمی بیٹھ گیا تو سڑک پر گھومنے والا آوارہ لڑکا اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی بھی شخص نے، جس نے اب تک

اس آدمی کی جاسوسی کی ہو، غور کیا ہوگا کہ وہ پشتے کی ہر شے کا، اور تمام سرگشی کرنے والوں کا غیر معمولی توجہ سے جائزہ لے رہا تھا؛ مگر اس لمحے سے جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا وہ ایک قسم کے مراقبے میں منہمک ہوگیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ اس کے اطراف کیا ہو رہا ہے۔ آوارہ لڑکا اس فکر مند شخصیت کے قریب گیا اور اس کے اطراف اس طرح پنجوں کے بل چلنے لگا، جیسے کوئی شخص کسی محوِ خواب آدمی کے اطراف اس طرح چلتا ہے کہ وہ جاگ نہ جائے۔ ساتھ ہی، اس کے بچکانے بشرے پر، جو اچانک اتنا سنجیدہ، اتنا چکراتا اور اتنا عمیق، اتنا خوش اور اتنا دل خراش ہوگیا تھا، کہ اس پر کسی عمر رسیدہ آدمی کا تمام بناوٹی انداز آگیا تھا جو اس طرح ردعمل کرتے ہیں: اُف! افسوس! ناممکن! شاید میری نظر کم زور ہوگئی ہے! شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں! کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہوتا! مگر ہاں! کیوں نہیں! وغیرہ وغیرہ۔ گاوروش ایڑیوں کے بل کھڑا ہوا دونوں مٹھیوں کو بھینچ کر اپنی جیب میں ڈالا، کسی پرندے کی طرح گردن گھمائی، اور اپنی تمام تر فراست کے ساتھ، تُرش روئی کے انداز میں اپنا بڑا سا ہونٹ لٹکا لیا۔ وہ ہکا بکا تھا، بے یقینی کی کیفیت میں تھا، قائل بھی تھا اور خیرہ بھی ہو رہا تھا۔ اس کا انداز خواجہ سراؤں کے اس سردار کا سا تھا جس نے غلاموں کے بازار میں، زنانہ بلاؤزوں کے درمیان ایک مشتری دریافت کرلی ہو، اور کسی ناتجربے کار نے رنگوں کے ڈھیر میں Raphael [پندرھویں صدی کے مصور کی کوئی پینٹنگ] پہچان لی ہو۔ اس وقت اس کا پورا وجود کام کر رہا تھا: جبلت بھی جو سونگھنے لگتی ہے، اور ذہانت بھی جو یک جا ہو جاتی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ گاوروش کی زندگی میں ایک بڑا واقعہ ہوگیا ہے۔

اپنی مشغولیت کے اسی شدید مرحلے پر انجولرا نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"تم ابھی چھوٹے ہو۔" انجولرا نے کہا، "نظر میں نہیں آؤ گے۔ پشتے سے نکلو، گھروں کے قریب جاؤ، سڑکوں پر ذرا لڑائی بھڑائی کرو، اور واپس آکر مجھے بتاؤ کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔"

گاوروش کھڑا ہوگیا۔

"اچھا، تو چھوٹے لوگ بھی کسی کام کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔ اس دوران چھوٹوں پر بھروسا کرو، اور بڑوں سے دور رہو۔" اور گاوروش نے اپنا سر اٹھاتے اور اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے Billettes کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا، "تم نے اس بڑے آدمی کو دیکھا ہے؟"

"اچھا؟"

"یہ پولیس کا جاسوس ہے۔"

""کیا تمھیں اس کا یقین ہے؟""

""ابھی دو ہفتے بھی نہیں ہوئے ہیں، جب اس نے مجھے کان پکڑ کر Port Royal کی کارنس سے گھسیٹ کر نکالا تھا جہاں میں لیٹا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔

انجولرا نے لڑکے کو تیزی سے باہر نکالا اور سرگوشی میں winedocks کے ایک قلی سے کچھ کہا جو اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ قلی کمرے سے باہر گیا اور تقریباً فوراً ہی واپس آگیا؛ اس کے ساتھ دوسرے تین آدمی تھے۔ یہ چاروں، چار مضبوط کاندھوں والے قلی، گئے اور اس کی توجہ بنائے بغیر اس میز کے پیچھے بیٹھ گئے جس پر کہنی ٹکائے Billettes والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ چاروں اس آدمی پر ٹوٹ پڑنے کو تیار تھے۔

تب انجولرا اس آدمی کے قریب گیا اور اس سے سوال کیا، ""تم کون ہو؟""

اس اچانک سوال پر، وہ آدمی شروع ہوا۔ اس نے انجولرا کی صاف آنکھوں میں گھور کر دیکھا، گویا وہ اس میں ان الفاظ کے اصل معنی تلاش کر رہا تھا۔ وہ اس مسکراہٹ کے ساتھ مسکرایا جو تنفر سے، توانائی سے اور اعتماد سے کم نہ تھی، اور مغرور سنجیدگی سے جواب دیا:

""اچھا، میں سمجھ رہا ہوں۔ فرمایئے!""

""تم پولیس کے جاسوس ہو؟""

""میں سرکار کا ایجنٹ ہوں۔""

""تمھارا نام؟""

""جاویر!""

انجولرا نے ان چاروں کو اشارہ کیا۔ پلک جھپکتے ہی، قبل اس کے جاویر مڑتا، اس کو کالر سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا گیا، اور اس کی تلاشی لی گئی۔

انھیں اس کے پاس ایک چھوٹا سا دائرہ نما کارڈ ملا جو شیشے کے دو ٹکڑوں کے درمیان محفوظ کیا گیا تھا، جس پر ایک طرف فرانس کا سرکاری نشان بنا تھا اور یہ قول لکھا تھا، ""نگرانی اور بیداری"" اور دوسری جانب لکھا تھا، ""جاویر، پولیس انسپکٹر، عمر باون برس"" اور اس پر اس زمانے کے پولیس کے سربراہ موسیو Gisquet کے دستخط تھے۔

اس کے علاوہ اس کے پاس اس کی گھڑی تھی، بٹوا تھا جس میں سونے کے کئی ٹکڑے تھے۔ بٹوا اور گھڑی اسے واپس دے دی گئی۔ گھڑی کی جیب میں انھیں ایک کاغذ رکھا محسوس ہوا جو لفافے میں تھا۔ انجولرا نے لفافہ کھولا، اور کاغذ پر لکھی یہ پانچ سطریں پڑھیں، جو پولیس کے سربراہ کی اپنی تحریر تھی:

''جوں ہی یہ سیاسی مقصد حاصل ہو جائے۔ انسپکٹر جاوید اپنی مخصوص نگرانی میں معلوم کرے گا کہ یہ سچ ہے کہ نہیں، کہ بدمعاشوں نے دریائے سین کے دائیں ساحل پر، Jena پُل کے نیچے منصوبہ بندی کی ہے۔''

تلاشی ختم ہوئی، انھوں نے جاوید کو اٹھا کر کھڑا کر دیا، اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے، اور اس کو کمرے کے درمیان موجود مشہور زمانہ کھمبے سے باندھ دیا، جس نے وائن کی دُکان کو اس کا سابقہ نام دیا تھا۔

گاوَروش جس نے یہ سارا منظر دیکھا اور سر کی خاموش حرکت سے جس کی منظوری دی تھی، جاوید کی طرف بڑھا اور اس سے کہا ''یہی وہ چوہا ہے جس نے بلّی کو پکڑ لیا ہے۔''

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ قبل اس کے کہ وائن کی دُکان کے لوگوں کی اس پر نظر پڑتی، سارا کام ہو چکا تھا۔

جاوید نے منہ سے آواز تک نہیں نکالی تھی۔

جاوید کو کھمبے سے بندھا دیکھ کر، کوفیراک، بوسے، شولی، کومفیر اور پشتے پر بکھرے تمام لوگ دوڑتے ہوئے دُکان میں آ گئے۔

کھمبے سے بندھے جاوید نے، جسے رسیوں سے اس طرح گھیر کر باندھا گیا تھا کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا، ایسے آدمی کے بہادرانہ سکون سے اپنا سر اٹھایا جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

''یہ پولیس کا جاسوس ہے۔'' انجولرا نے کہا۔ اور مڑ کر جاوید سے کہا، پشتے پر قبضہ ہونے سے دس منٹ پہلے تمھیں گولی مار دی جائے گی۔''

جاوید نے نہایت تحکم پسندانہ انداز میں کہا، ''فوراً ہی کیوں نہیں؟''

''ہم اپنا پاؤڈر بچا رہے ہیں۔''

''تو چاقو سے کام تمام کر دو۔''

''جاسوس!'' وجیہ انجولرا نے کہا، ''ہم منصف ہیں، جلاد نہیں۔''

اس کے بعد اس نے گاوَروش کو پکارا، ''اب تم اپنا کام شروع کرو۔ وہی کرو، جو تم سے کہا گیا ہے۔''

''جا رہا ہوں۔'' گاوَروش نے چیخ کر کہا۔ اور جاتے ہوئے رُکا، ''ارے ہاں، تم مجھے اس کی بندوق دو گے۔'' اور اس نے اضافہ کیا ''میں موسیقار کو چھوڑ دوں گا، مگر مجھے بانسری چاہیے۔''

لاوارث لڑکے نے فوجی سیلوٹ کیا اور خوشی خوشی بڑے پشتے کے شگاف سے نکل کر چلا گیا۔

۞

'لی کابک' کے نام کی تفتیش

وہ الم ناک منظر جس کو پیش کرنے کا ہم نے بیڑہ اٹھایا ہے مکمل نہ ہوگا، اور قاری سماجی دردِ زہ کے عظیم لمحات کا انقلاب کی پیدائش کے عمل میں تصور نہیں کر سکے گا جس میں کوشش کے ساتھ ساتھ تشنج بھی ہوتا ہے، صحیح معنوں میں جس سے سکون بھی ملتا ہے، اگر ہم اس منظر میں اس بہادری اور دہشت سے پُر واقعے کو بھی نظر انداز کر گئے جو کاورش کی روانگی کے فوراً بعد پیش آیا تھا۔

قاری کو علم ہے، کہ پُر جوش انسانوں کا رواں دواں ہجوم بھی لڑھکتے ہوئے برف کے گولے کی طرح ہوتا ہے، جو آدمیوں کو جمع کرتا جاتا ہے اور اس کا حجم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہجوم میں موجود لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے بھی نہیں کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ ان راہگیروں میں جو انجولرا، کومفیر اور کوفیراک کی رہنمائی میں چلنے والے انبوہ میں شامل ہو گئے تھے، ایک شخص شامل تھا جو قلی کی وردی پہنے تھا جو کندھوں کے پاس پھٹی تھی، لوگوں فدائی کر رہا تھا، گلا پھاڑ کر چیخا رہا تھا اور بد مست وحشی معلوم ہو رہا تھا۔ اس آدمی کی عرفیت 'لی کابک' (Le Cabuc) تھی۔ وہ شخص ان لوگوں کے لیے بالکل اجنبی تھا جو یہ ظاہر کر رہے تھے، وہ اس کو جانتے ہیں۔ وہ شخص نشے میں چور تھا یا ایسا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور ان میزوں میں سے ایک کے قریب جا کر بیٹھ گیا جو وائن کی دکان سے گھسیٹ کر باہر نکالی گئی تھیں۔ لی کابک باقی لوگوں سے کم نشے میں نہیں تھا، مگر وہ پشتے کے آخر میں واقع اس پانچ منزلہ مکان پر غور کر رہا تھا جس سے پوری Saint-Denis اسٹریٹ پر نگاہ رکھی جا سکتی ہے، اور اس نے بلند آواز میں کہا تھا، کامریڈو، کیا تم جانتے ہو کہ یہی وہ مکان ہے جس کے سامنے سے ہمیں گولیاں چلانی چاہئیں۔ اگر ہم کھڑکیوں پر ہوں گے تو خدا کی قسم کوئی بھی سڑک پر آگے بڑھ نہیں سکے گا۔"

"ہاں، مگر وہ مکان تو بند ہے۔" مے نوشی کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"آؤ، ہم کھٹکا کر کے دیکھتے ہیں۔"

"وہ کھولیں گے نہیں۔"

"تو ہم دروازہ توڑ ڈالیں گے۔"

ڈی کا بک دروازے کی طرف بڑھا، جس پر بہت بھاری سا کھٹکا لگا ہوا تھا اور اس نے کھٹکا کیا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ دوسری بار کھٹکا کیا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ تیسری بار کھٹکا کیا۔ پھر وہی خاموشی۔

"کوئی ہے؟" ڈی کا بک نے چیخ کر کہا۔

کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

تب اس نے بندوق سنبھالی؛ اس کے کندے سے دروازہ توڑنے کے لیے۔

دروازہ قدیم زمانے کا تھا، چھوٹا سا، تنگ، شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا، اندر سے جس پر لوہے کی چادر چڑھائی گئی تھی، بالکل قید خانے کے پچھلے دروازے جیسا۔ بندوق کے کندے کی مار سے پورا گھر لرز گیا، مگر دروازہ نہیں کھلا۔

خیال تھا کہ رہنے والے اگر اندر ہیں تو پریشان ہوں گے؛ بالآخر تیسری منزل پر لگی ایک مربع کھڑکی کھلتی نظر آئی، اور بھورے بالوں والے، ایک بوڑھے آدمی کا ایک خوف زدہ چہرہ ظاہر ہوا۔ وہ اس گھر کا دربان تھا، اور اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی ایک موم بتی تھی۔

کھٹکھٹانے والا رُکا۔

"جناب!" دربان نے سوال کیا، "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"دروازہ کھولو۔"

"جناب، یہ تو ممکن نہیں۔"

"کھولو، ورنہ...."

"ناممکن، جناب!"

ڈی کا بک نے اپنی بندوق سے دربان کا نشانہ لیا؛ مگر چوں کہ ڈی کا بک نیچے تھا اور اندھیرا ہو چکا تھا، دربان اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"کھولتے ہو کہ نہیں؟"

"نہیں، جناب!"

"تم کہہ رہے ہو، نہیں؟"

"جی ہاں! میں 'نہیں' کہہ رہا ہوں، میرے ......"

دربان کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ گولی چلا دی گئی؛ گولی دربان کی ٹھوڑی کے پاس سے اندر داخل ہوئی اور گردن کے پیچھے شہ رگ کاٹتی ہوئی، باہر نکل گئی تھی۔

بوڑھا آدمی کراہ کے بغیر ڈھیر ہوگیا۔ موم بتی بھی گر کر بجھ گئی تھی؛ سوائے کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑے بے سدھ سر اور ہلکے سے سفید رنگ کے دھوئیں کے جو چھت کی طرف لہراتا بلند ہوا تھا، کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"دیکھا!" ڈی کا بک نے کہا اور بندوق کے کندے کو سڑک پر لٹکا دیا۔

"گھٹنوں کے بل ہوجا۔" عقب سے ایک آواز نے مطالبہ کیا

قاتل نے مڑ کر دیکھا تو اسے انجولرا کا سفید اور بے تاثر، سپاٹ چہرہ نظر آیا۔

انجولرا کے ہاتھ میں پستول تھا، اور ڈی کا بک کا کالر، بلاؤز، قمیص اور گیلس، سب اس کے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

"گھٹنے کے بل ہوجا!" ایک بار پھر اس نے کہا، اور ایک تحکمانہ جنبش سے، بیس برس کے کم زور نوجوان نے بھٹے کٹے دربان جیسے آدمی کو اس کے گھٹنوں پر کھڑا کر دیا تھا۔

ڈی کا بک نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر اس وقت وہ ایک سپر ہیومن شخص کے ہاتھوں میں تھا۔ زرد رو، بکھرے بالوں، عورتوں جیسے چہرے والا انجولرا اس وقت [قدیم زمانے کی ترازو بردار انصاف کی دیوی Themis] کی جیسی کیفیت میں تھا۔ اس کے پھولتے نتھنے اور جھکی آنکھیں اسے سنگ دل، غیظ بھری، اور پاکیزہ اظہار والی یونانی شخصیت میں پیش کر رہے تھے، قدیم زمانے میں جس کو انصاف کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔

پورا پشتہ حرکت میں آگیا، کچھ فاصلے پر سب ایک گھیرے میں جمع ہو گئے، اور اس خیال سے کہ وہ کچھ دیکھنے والے ہیں انھوں نے منہ سے ایک لفظ بھی سے نہیں نکالا۔

مغلوب ڈی کا بک نے کسی قسم کی جد و جہد کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

انجولرا نے اسے چھوڑ دیا۔ "اپنے حواس مجتمع کرو" اس نے کہا "سوچو یا دعا کرو تمھارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔"

"رحم!" قاتل گڑگڑایا؛ اپنا سر جھکا لیا اور طرح طرح کی قسمیں کھانے لگا۔

انجولرا نے اس پر سے اپنی نظریں ہٹالیں۔ ایک منٹ انتظار کیا اور اپنی گھڑی جیب میں

رکھ دی۔ اس نے ان کا ایک کو بالوں سے پکڑا، اور جب وہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر گٹھری سا بن گیا اور چیخنے لگا، تو آنجولرا نے پستول کی نال اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ کئی بہادر لوگوں نے، جو پُرسکون انداز میں اس خوف ناک مہم میں داخل ہوئے تھے، اپنے سر دوسری جانب پھیر لیے۔

ایک دھماکا سنا گیا؛ قاتل فرش پر منہ کے بل پڑا تھا۔

آنجولرا سیدھا کھڑا ہوا اور قائل اور سنجیدہ نظر سے اپنے اطراف پر نظر کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے پیر سے لاش ایک طرف دھکیل دی اور کہا "اسے باہر پھینک دو۔"

تین آدمیوں نے اس بدنصیب کی لاش اٹھائی، جس میں اس کی زندگی کی آخری میکانکی حرکت ہو رہی تھی جو اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ جسم کو Mondetour اسٹریٹ پر ڈال دیا گیا۔

آنجولرا کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس کے خوف ناک سکون پر آہستہ آہستہ کیسے کیسے سایے پھیلتے جا رہے تھے۔

ہر ایک خاموش ہو گیا تھا۔

"باشندو!" آنجولرا نے کہا، "جو کچھ اس آدمی نے کیا خوف ناک تھا، جو کچھ میں نے کیا دہشت ناک ہے۔ اس نے قتل کیا تھا، سو میں نے بھی اسے قتل کر دیا۔ مجھے یہ کرنا تھا، اس لیے کہ بدامنی میں بھی نظم و ضبط قائم کرنا ہوتا ہے۔ کسی اور جگہ کے مقابلے میں یہاں کا قتل زیادہ بڑا جرم ہے، مگر ہمیں انقلاب کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، ہم جمہوریہ کے مبلغ ہیں، ہم فرض کے شکار ہیں، اور ہماری لڑائی کے بارے میں بدگوئی نہیں ہونی چاہیے۔ اسی لیے میں نے اس پر فیصلہ سنا دیا اور اسے موت کی سزا دے دی۔ اور جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے، میں یہ کرنے پر مجبور تھا، اور اس کو برا بھی کہہ رہا ہوں؛ مگر میں نے اپنے بارے میں بھی فیصلہ کر لیا ہے، اور تم لوگ دیکھو لو گے کہ میں نے خود کو بھی سزا دی ہے۔"

جو لوگ اُسے سن رہے تھے، کانپ گئے۔

"ہم تمھارے حال میں شریک ہوں گے۔" کومفیر نے کہا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" آنجولرا نے جواب دیا۔ "ایک بات اور۔ اس آدمی کو سزا دے کر میں نے ضرورت کی فرماں برداری کی ہے؛ مگر ضرورت تو پرانی دنیا کی عفریت ہے۔ ضرورت کا نام جبریت ہے۔ اب قانون عمل کر رہا ہے؛ اب سارے عفریت فرشتوں کے سامنے غائب ہو جائیں گے، اور بھائی چارے کے سامنے جبریت غائب ہو جائے گی۔ محبت کا نام لینے کے لیے یہ وقت برا ہے خواہ اسے کسی بھی نام سے پکارا جائے۔ میں محبت کی توصیف کر رہا ہوں۔

اے محبت! مستقبل تیرا ہے۔ اے موت! میں تجھے استعمال کر رہا ہوں، مگر میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔ باشندو، مستقبل میں نہ اندھیرا ہوگا نہ بجلی کڑکے گی؛ نہ خوں خوار دانائی ہوگی، نہ خوف انگیز مکافات ہوں گے۔ چوں کہ شیطان نہیں رہے گا اس لیے میکائیل بھی نہیں ہوگا۔ مستقبل میں کوئی کسی کو قتل نہیں کرے گا، زمین تاب ناکی پھیلائے گی، نسلِ انسانی محبت کرے گی۔ اور وہ دن بھی آئے گا جب ہر طرف مطابقت ہوگی، ہم آہنگی ہوگی، روشنی ہوگی، مسرت ہوگی اور زندگی ہوگی؛ اور یہ ٹھیک بھی ہے، اس لیے کہ ہم سب مر جانے والے ہیں۔"

انجولرا خاموش ہوگیا۔ اس کے پاک لب بند ہو گئے؛ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا جہاں اس نے خون بہایا تھا۔ اس کی گھورتی آنکھوں نے اپنے اطراف کے لوگوں کو دھیمے لہجے میں بات کرنا سکھا دیا تھا۔

ژاں پروویر اور کومفیر خاموشی سے ایک دوسرے کے ہاتھ دبائے پشتے کی طرح ایک دوسرے پر جھکے، روشنی سے بنے، بلور جیسے نوجوان آدمی کو، جلاد اور مبلغ کو، اور اس چٹان کو تحسین کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جس میں کچھ رحم بھی تھا۔

ہمیں یہ بھی کہہ لینے دیجیے کہ اس عمل کے بعد جب میتیں مردہ خانے میں لے جائی گئیں اور ان کی تلاشی لی گئی تو لی کابک کے پاس سے پولیس ایجنٹ کا شناخت نامہ ملا تھا۔ اس کتاب کے مصنف نے 1848ء میں وہ خاص دستاویز بھی دیکھی تھی جو 1832ء میں پولیس کے پریفیکٹ کو پیش کی گئی تھی۔

ہم اس میں یہ اضافہ بھی کریں گے کہ اگر ہم پولیس کی روایت پر یقین کرتے ہیں، جو حیرت انگیز بھی ہے اور شاید صحیح بھی، کہ لی کابک کا اصل نام کیا کسو تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لی کابک کی موت کے بعد سے کیا کسو کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھا تھا۔ کیا کسو نے اپنے غائب ہونے کا کوئی سراغ نہیں چھوڑا؛ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ کسی غیر مرئی وجود میں ضم ہوگیا ہو۔ اس کی زندگی تمام سایہ تھی، اور اس کا اختتام رات کا اندھیرا تھا۔

ابھی سرکشوں کا پورا گروہ اس الم ناک واقعے کے زیرِ اثر تھا جو اتنی تیزی سے نمٹایا گیا تھا اور اتنی تیزی سے سزا دے دی گئی تھی کہ کوفیراک نے ایک بار پھر اس شخص کو پشتے پر دیکھا جس نے اس صبح اس سے ماریوس کے بارے میں سوال کیا تھا۔

وہ لڑکا بہادر اور لاپروا سا تھا؛ اور رات کے وقت سرکشوں میں شامل ہونے آیا تھا۔

❁

پلومے اسٹریٹ سے Saint-Denis

وہ صدا جس نے دھندلکے میں ماریس کو Chanvrerie اسٹریٹ پر طلب کیا تھا، اس میں مقدر کی آواز کا اثر پیدا کر دیا تھا۔ وہ مرجانا چاہتا تھا، ٹھیک ساعت اس پر مہربان ہوئی؛ اس نے مزار کے دروازے پر دستک دی، اندھیرے میں سے ایک ہاتھ نکلا اور اسے کنجی پیش کر دی۔ وہ غم انگیز راستے جو نا امیدی سے قبل اندھیرے میں ہوتے ہیں، اکسانے والے ہوتے ہیں۔ ماریس نے اس باڑ کو ایک جانب دھکیل دیا جس نے کتنی بار اسے گزر جانے دیا تھا؛ وہ باغیچے سے نکلا اور کہا، "میں جاؤں گا۔"

وہ غم سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ کسی مستحکم یا جمی ہوئی شے کے شعور سے ماورا ہو گیا تھا۔ ان دو مہینوں کے بعد جو جوانی اور محبت کے مقسوم کو قبول کرنے کے قابل نہیں رہے تھے، ہر قسم کے خیالات سے فوراً پر جوش ہو جانے والے ماریس کی بس ایک ہی خواہش رہ گئی تھی، کہ ہر شے کا تیزی سے اختتام ہو جانا چاہیے۔ وہ تیزی سے چل پڑا۔ چوں کہ جاویر کا دیا ہوا پستول اس کے پاس تھا وہ خود کو باقاعدہ طور پر مسلح سمجھ رہا تھا۔ وہ نوجوان جسے وہ سمجھا تھا کہ اس نے دیکھ لیا ہے، سڑک پر اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

ماریس نے، جو پلومے اسٹریٹ سے بولیوارڈ پر نکل آیا تھا، Esplanade اور Invalides کو، شانزو لیز ے(Champs Elysees) کو اور Place Louis XV کو پار کیا اور Rivoli اسٹریٹ پر پہنچ گیا تھا۔ دکانیں کھلی تھیں، محرابی بازاروں میں گیس کی لالٹینیں جل رہی تھیں، خواتین خریداری کر رہی تھیں، لوگ کیفے Laiter میں آئس کریم کھا رہے تھے، انگریزی پیسٹری بنانے والے کی دکان پر کیک کھائے جا رہے تھے۔ پرنسز ہوٹل اور ہوٹل میوریس

سے چند قدم آگے صرف چند عدد کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔

ماریوں Delorme گلی سے ہوتا ہوا Saint-Honore اسٹریٹ پر نکل آیا۔ وہاں دکانیں بند تھیں، تاجر اپنی دکانوں کے نصف کھلے دروازوں کے سامنے کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، لوگ آ جا رہے تھے، سڑک کی لالٹینیں روشن کی جا رہی تھیں، عام دنوں کی طرح پہلی منزل سے شروع ہو کر تمام کھڑکیاں روشن ہو گئی تھیں۔ Palais-Royal اسٹریٹ پر ایک گھڑ سوار دستہ موجود تھا۔

ماریوں Saint-Honore اسٹریٹ پر جا رہا تھا۔ وہاں Palais-Royal کے تناسب میں، جسے وہ پیچھے چھوڑ چکا تھا، کم کھڑکیاں روشن تھیں، دکانیں مضبوطی سے بند تھیں، ڈیوڑھیوں پر کوئی باتیں نہیں کر رہا تھا، سڑک کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی، مجمع گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ مسافروں کے حساب سے اب خاصا مجمع ہو گیا تھا۔ اس ہجوم میں کوئی بولتا نظر نہیں آ رہا تھا، پھر بھی ایک گہری اور دھیمی سرگوشی کا سا عالم تھا۔

t Arbre-Sec فوارے کے قریب، ''اجتماعات'' ہو رہے تھے، اور ان لوگوں کے نزدیک، جو آ جا رہے تھے ساکت اور ملول گروہ بہتے پانی میں پتھر کی طرح تھے۔

چوں کہ Prouvaires اسٹریٹ پر داخلے کے قریب لوگ چل پھر نہیں رہے تھے، مجمع اب مزاحمتی، گراں، ٹھوس، کسا ہوا، ناقابل گزر لوگوں کے بلاک کی طرح تھا جو ایک دوسرے میں ٹھنسے جا رہے تھے، اور دھیمی آوازوں میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اب وہاں شاید ہی کوئی کالا کوٹ، یا گولا ہیٹ رہی ہوگی، بلکہ لبادے، فراک، بلاؤز، ٹوپیاں، بالوں والے مردار جیسے سر نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ اداسی کے اندھیروں میں لہروں کی مانند بے مقصد حرکت کر رہے تھے۔ ان کی سرگوشیاں بھرائے ہوئے لہجے کی لرزش سی بن گئی تھیں۔ اگرچہ کوئی چل پھر نہیں رہا تھا، ہجوم کے پیروں تلے کچلے جانے کی سی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ٹھنسے ہجوم سے پرے، Roule اسٹریٹ پر، Prouvaires اسٹریٹ پر Saint-Honore اسٹریٹ کے آگے، اب ایک بھی کھڑکی ایسی نہیں تھی جس میں موم بتی جل رہی ہو۔ صرف غائب ہوتی ہوئی تنہا لالٹینوں کی قطاریں تھیں جو فاصلے کے اندھیروں میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ اس زمانے کی لالٹینیں، سرخ رنگ کے بڑے ستاروں سے مشابہ، رسی سے آویزاں کچے راستوں پر ایسے سایے ڈالتی تھیں جو بڑی سی مکڑی کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ یہ سڑکیں سنسان نہیں تھیں۔ وہاں بندوقوں کے ڈھیر، حرکت کرتی سنگینیں اور سپاہیوں کے پڑاؤ دیکھے جا سکتے تھے۔ کوئی متجسس مبصر اس حد سے آگے جا نہیں سکتا تھا۔ آمد و رفت بند کر دی

گئی تھی۔ ہجوم کا اختتام فوج کی ابتدا تھی۔

ماریوس کی خواہش، اس آدمی کی خواہش کی طرح تھی جس میں کوئی امید باقی نہ رہی ہو۔ اس کو طلب کیا گیا تھا؛ اسے پہنچنا ضرور تھا۔ اس نے ہجوم کا اور سپاہیوں کے پڑاؤ کو پار کرنے کا ایک طریقہ نکالا۔ اس نے گشت کرنے والوں کو نظر انداز کیا، اس نے چوکیداروں کی پروا نہیں کی۔ اس نے ایک چکر کاٹا، Bethisy اسٹریٹ پہنچا، اور Halles کی طرف چل پڑا۔ Bourdonnais کے کونے پر لالٹینوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔

مچھے کے علاقے سے گزرنے کے بعد وہ سپاہیوں کے دستے کی حدود سے گزر چکا تھا: اس نے خود کو کسی چونکا دینے والی کیفیت کے درمیان پایا۔ اب نہ کوئی راہگیر تھا، نہ سپاہی، نہ روشنی، نہ کوئی انسان؛ بس، تنہائی تھی، خاموشی تھی، رات تھی، اور نہ معلوم کیسی ٹھنڈک تھی وہ جو آدمی کی حرکت سلب کر لیتی تھی۔ اب کسی سڑک پر داخل ہوا تہہ خانے میں داخل ہونے جیسا ہو گیا تھا۔

وہ آگے بڑھتا رہا۔

اس نے چند قدم اٹھائے۔ کوئی اس کے قریب سے گزرا۔ کیا وہ کوئی مرد تھا؟ یا وہ کوئی عورت تھی؟ کیا وہاں بہت سے آدمی تھے؟ وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ گزر گیا اور غائب ہو گیا تھا۔

ایک چکر سے دوسرے چکر، جاتے ہوئے وہ ایک گلی میں پہنچ گیا جسے وہ Poterie اسٹریٹ سمجھا تھا؛ سڑک کے درمیان اُسے قریب سے ایک رُکاوٹ ملی۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اپنے ہاتھ بڑھائے۔ رُکاوٹ الٹی ہوئی ایک ویگن تھی۔ اس کو اپنے پیروں تلے پانی کے جوہڑ محسوس ہوئے، نالیاں اور پتھر کی سلیں بکھری اور ڈھیر کی صورت ملیں۔ وہاں ایک پشتہ شروع کیا گیا تھا جو نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ پتھروں پر چڑھا تو خود کو پشتے کی دوسری جانب پایا۔ سڑکوں پر لگے کھمبوں کے بہت قریب قریب چلتا رہا، اور اپنا رُخ گھروں کی دیواروں کی طرف رکھا تھا۔ پشتے سے تھوڑی دور آگے اسے محسوس ہوا جیسے کوئی سفید سی شے اس کے آگے آ گئی ہے۔ ماریوس اس کی طرف بڑھا، اب وہ شے پیکر بن گئی تھی۔ وہ سفید رنگ کے دو عدد گھوڑے تھے؛ اومنی بس کے گھوڑے، صبح کو جسے بوسے چلا رہا تھا، جو تمام دن ان سڑکوں پر ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا، اور آخر میں وہیں رُک گیا تھا، اُن وحشیوں کے صبر کی طرح جو آدمیوں کی حرکتوں کو سمجھ نہیں پاتے، بالکل اُسی طرح جیسے آدمی دور اندیشی کی حرکتوں کو سمجھ نہیں پاتا۔

ماریوس نے مکانات پیچھے چھوڑ دیے۔ وہ ایک سڑک کی طرف جا رہا تھا جو اسے Contrat-Socia اسٹریٹ جیسی لگی تھی، کہ ایک گولی چلی، کسی کو خبر کیا کہاں سے چلی، اندھیرے

سے گزری، اس کے قریب سے شائیں سے گزر کر پیتل کی ایک تھالی کو چھید گئی، جو ایک حجام کی دکان پر لگی تھی، اور بالکل ماریوس کے سر کے اوپر تھی۔ یہ سوراخ شدہ تھالی Contrat-Social اسٹریٹ اور مارکٹ کے کونے کے ستونوں پر 1848ء میں بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

یہ گولی کیا تھی، زندگی کی طرف ایک اشارہ تھی۔ اس لمحے کے بعد ماریوس کو کسی لڑائی کا سامنا نہیں ہوا۔

اس کا سارا سفر سیاہ قدمی سے مشابہ تھا۔

پھر بھی وہ آگے بڑھتا رہا۔

۞

پیرس، پرندے کی نظر میں

اگر کوئی وجود اس رات کسی چمگادڑ یا الّو کے بازوؤں کی مدد سے پیرس کی فضاؤں میں پرواز کرسکتا تو اس کی آنکھوں تلے ایک ملال انگیز نظارہ ہوتا۔

قدیم Halles کا پورا علاقہ، جو شہر کے اندر ایک شہر کے مانند ہے، جس کے بیچ سے Saint Denis اور Saint Martin نامی سڑکیں گزرتی ہیں، جہاں ہزاروں گلیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں، جس کو سرکشوں نے اپنی آماج گاہ اور قلعہ بنا لیا تھا، پیرس کے درمیان بنائی گئی سیاہ اور مہیب کھوکھلے غار جیسا دکھائی دیتا تھا۔ وہاں ڈالی جانے والی نگاہ پاتال میں غائب ہو جاتی تھی۔ ٹوٹی لالٹینوں اور بند کھڑکیوں کے طفیل، وہاں کی تمام چمک دمک، تمام زندگی، تمام آوازیں، تمام حرکتیں ختم ہو گئی تھیں۔ سرکشوں کی نظر نہ آنے والی پولیس ہر جگہ موجود تھی اور اس نے رات میں بھی نظم و ضبط قائم کر رکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کے بارے میں بھی سرکشی کی حکمتِ عملی تیار کی جاتی ہے؛ بدامنی کی حکمتِ عملی یہ ہوتی ہے کہ کم کو وسیع گم نامی میں غرق کر دیا جائے، اور اس گم نامی میں موجود ہر لڑنے والے کی سطح کے امکانات کو بڑھا دیا جائے۔ غروبِ آفتاب کے وقت ہر کھڑکی پر جس میں شمع جل رہی ہو گولی چلائی جاتی ہے۔ اس طرح روشنی گل ہو جاتی ہے، اور کبھی کبھی مکین قتل بھی ہو جاتا ہے۔ مکانوں میں خوف کے، ماتم کے، بے حسی کے سوا کچھ نہیں ہوتا؛ سڑکوں پر ہر طرف ایک نوع کی مقدس دہشت تھی۔ حتیٰ کہ کھڑکیوں اور دکانوں کی لمبی قطاریں، چمنیوں اور چھتوں کی اونچ نیچ اور کیلے اور کیچڑوں سے بھرے راستوں کے سیاہ عکس نظر آتے تھے۔ سایوں کے اس ڈھیر پر ڈالی جانے والی نظر کو شاید یہاں وہاں ایک آدھ جھلک، وقفوں وقفوں میں، واضح شعاعوں کے ذریعے مل جاتی تھی، جنھوں نے ٹوٹی یا کج رو لکیریں اور غیر معمولی عمارتوں کے پروفائل

پیش کیے تھے، اسی طرح جیسے کسی کھنڈر میں کبھی روشنی ہوتی ہے اور کبھی اندھیرا ہوتا ہے؛ ایسے مقامات تھے جہاں پشتے قائم کیے گئے تھے۔ بقیہ ایک جھیل تھی دھند کی، کہر کی اور جنازے جیسی افسردگی کی، جس کے اوپر، ساکت اور اداس خاکے جیسے Saint-Jacques کے مینار، Saint-Merry کا گرجا گھر اور دو یا تین عالی شان چہرے تھے عمارتوں کے، انسان جن کو دیو بنا دیتے ہیں اور رات جنھیں فینٹم بنا دیتی ہے۔

بے چین کر دینے والی اس بھول بھلیاں کے اطراف، اس علاقے میں جہاں پیرس میں کیا جانے والا گشت ختم نہیں کیا گیا تھا، اور جہاں اب بھی سڑکوں کی چند لالٹینیں جلتی تھیں، ہوائی معائنہ کرنے والا تلواروں اور سنگینوں کی چمک کے مقابلے میں توپ خانے کی بھدی گڑگڑاہٹ میں تمیز کر سکتا تھا، اور خاموش بٹالین کا ہجوم جن کے عہدے ہر منٹ بڑھ رہے تھے؛ ایک مہیب کمر بند تھا جو آہستہ آہستہ بدامنی کے اندر اور اطراف بن رہا تھا۔

وہ علاقہ اب ایک دیو ہیکل غار سے زیادہ نہیں رہا تھا؛ وہاں کی ہر چیز یا تو خواب میں تھی یا ساکت تھی، اور جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، کوئی سڑک اندھیرے کے سوا کچھ فراہم نہیں کر سکتی تھی۔

وحشی اندھیرا، جالوں سے بھرا، ان دیکھے اور ڈراؤنے صدموں سے بھرا، جس میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا اور جس میں رہنا دہشت ناک تھا، جہاں وہ جو داخل ہو رہے تھے، تھرتھراتے تھے ان لوگوں کے سامنے جو آ رہے تھے۔ نادیدہ لڑنے والے سڑک کے ہر کونے کی خندق میں موجود تھے؛ رات کے گھور اندھیرے میں پوشیدہ موت کے جال تھے۔ سب کچھ ہو چکا تھا۔ مزید روشنی کی امید نہیں تھی سوائے بندوقوں سے نکلنے والی چنگاریوں کے؛ مزید کوئی مقابلے نہیں تھے سوائے اچانک اور تیز رو موت کے آسیب کے۔ کہاں؟ کیسے؟ کب؟ کوئی نہیں جانتا تھا، مگر وہ یقینی تھا اور ناگزیر تھا۔ اس جگہ جہاں جد وجہد، حکومت اور بدامنی ہونی تھی، نیشنل گارڈ، اور ہر دل عزیز سوسائٹیاں، بورژوا، اور احتجاج میں اٹھنے والے، اپنا راستہ تلاش کرنے والے، ربط میں آ جاتے تھے۔ ضرورت دونوں کی ایک جیسی تھی۔ اس کے بعد بس ایک ہی مسئلہ تھا کہ وہاں سے مر کر نکلو یا فاتح بن کر۔ حالت اتنی شدید ہے اور اندھیرا اتنا طاقت ور ہے، کہ سب سے زیادہ بزدل خود کو ارادوں کا گرفتار پاتے ہیں، اور سب سے زیادہ ہمت والے خود کو دہشت میں پاتے ہیں۔

مزید یہ کہ دونوں جانب، جوش، جذبہ اور ہمت ایک جیسے تھے۔ ایک گروہ کے لیے آگے بڑھنا موت تھی؛ پسپائی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا؛ دوسرے گروہ کے لیے رکنا موت تھی، فرار کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ ناگزیر تھا کہ دوسرے دن ہی سب کچھ ختم کر دیا جائے، کہ کامیابی یہاں یا وہاں کا انتظار کرے، کہ بدامنی خود کو انقلاب یا مار پیٹ ثابت کرے۔ حکومت یہ سب کچھ اسی طرح سمجھتی تھی جیسے سارے گروہ سمجھتے تھے؛ سب سے زیادہ غیر اہم بورژوا بھی اسے سمجھتے تھے۔ چناں چہ، ایک اذیت کا خیال تھا جو اس علاقے کے ناقابلِ دخل ملال میں گھل مل گیا تھا، جہاں ہر ایک فیصلہ کُن مرحلے پر تھا؛ چناں چہ، وہاں جہاں تباہی آنے کے قریب تھی وہاں خاموشی دہری اذیت بننے والی تھی۔ چناں چہ، یہاں سنائی دینے والی ایک ہی آواز تھی، وہی آواز جو موت کی آہٹ جیسی دل چیرنے والی تھی، ایسی پریشان کُن جیسے بد دعا، جیسے Saint-Merry کی خطرے کی گھنٹی۔ اس وحشی اور ناامید کے شور سے زیادہ خون جما دینے والی کوئی شے نہیں ہو سکتی تھی، جیسے سایوں کے درمیان گریے کی آواز۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، فطرت بھی وہی چاہنے لگی تھی، جو آدمی کرنے والے تھے۔ پورے اثر کی ہم آہنگی نے کسی شے کو پریشان نہیں کیا۔ ستارے غائب ہو گئے، بادلوں نے اپنی غم انگیزیوں سے افق کو بھر دیا۔ سنسان سڑکوں پر سیاہ آسمان اس طرح چھا گیا جیسے کسی مہیب مقبرے پر ایک بہت مہیب چادر ڈال دی گئی ہو۔

جب ایک جنگ، جو مکمل طور پر سیاسی تھی، تیاری میں تھی، اسی علاقے میں جو پہلے بھی بے شمار انقلابی واقعات دیکھ چکا تھا؛ جب نوجوان، خفیہ انجمنیں، اسکول، اصولوں کے نام پر، کلاسوں کے درمیان مفادات کے نام پر، آپس میں ٹکرانے کی تیاری کے قریب تھے، ایک دوسرے کو پکڑ رہے تھے اور چھینک رہے تھے، جب ایک نے جلدی میں آخری اور فیصلہ کُن مرحلے کو دعوت دی تھی، دور اور اس بد قسمت علاقے کے باہر، بد نصیب قدیم پیرس کے غاروں کی بے حد عمیق گہرائیوں میں، شان دار اور خوش باش پیرس غائب ہو رہا تھا، اس وقت عوام کی سنجیدہ آوازیں کامل شور بلند کرتی سنائی دیتی تھیں۔ پُرخوف اور مقدس آوازیں جو بے رحم شور اور کلامِ خدا پر مشتمل ہوتی ہیں، جو کم زور کو خوف زدہ کر دیتی ہیں، اور دانش مندوں کو تنبیہ کرتی ہے، جو شیر کی آواز کی طرح نیچے سے آتی ہیں، اور بادلوں کی گرج کی طرح اوپر سے آتی ہیں۔

تیز دھار

ماریوس Halles پہنچ گیا۔

وہاں کے حالات اس وقت پُرسکون، قریبی سڑکوں سے زیادہ بے حرکت، اور بے نور تھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ مقبرے کا برف جیسا امن زمین سے نکل کر آسمانوں پر پھیل گیا ہے۔

پھر بھی اس سیاہ پس منظر میں ان اونچی چھت والے مکانوں سے ایک سُرخ روشنی نکل رہی تھی، جنھوں نے Saint-Eustache کی جانب Chanvrerie اسٹریٹ کو بند کر رکھا تھا۔ دراصل یہ اس ٹارچ کا عکس تھا جو Corinth کے پشتے پر جل رہی تھی۔ ماریوس نے اس سرخ روشنی کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ یہ اسے Marche-aux-Poirees کی طرف لے گئی جہاں اسے Precheurs اسٹریٹ کے اندھیرے داخلے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ سڑک میں داخل ہو گیا۔ سرکشوں کا چوکیدار جو دوسرے سرے پر پہرہ دے رہا تھا اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ ماریوس کو محسوس ہوا کہ وہ اس کے بہت قریب ہے اس لیے پنجوں کے بل چلنے لگا تھا۔ اس طرح وہ Mondetour اسٹریٹ کے گلی جیسے چھوٹے سے حصے تک پہنچ گیا، جیسا کہ قاری کو یاد ہو گیا، جو بیرونی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا جسے انجولرا نے محفوظ بنا دیا تھا۔ آخری گھر کے کونے پر، بائیں جانب، اس نے اپنا سر آگے کی طرف بڑھایا اور Mondetour اسٹریٹ کے بقیہ حصے پر نظر ڈالی۔

Chanvrerie اسٹریٹ اور گلی کے زاویے سے ذرا آگے جس پر سایے کا پردہ سا تھا، جس میں ماریوس نے خود کو چھپا لیا۔ اسے سڑک کے پیدل چلنے والے راستے پر اور وائن کی دکان کے ایک حصے پر، اور اس کے آگے کچھ روشنی نظر آئی؛ وہاں ایک جھلملاتا لیمپ تھا اور کچھ لوگ

اپنی بندوقوں کے سہارے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے۔ یہ اس سے تقریباً دس فیتھم [یعنی تقریباً ساٹھ فٹ] فاصلے پر تھا۔ یہ پشتے کا اندرونی حصہ تھا۔

دائیں جانب گلی میں، جس کے دونوں جانب مکان تھے جن سے وائن کی دکان کا باقی حصہ، یعنی پشتے کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔

ماریوں بس ایک قدم آگے بڑھ سکتا تھا۔ تب یہ بدقسمت نوجوان چھوٹے سے قریبی ستون پر بیٹھ گیا، اپنے بازو لپیٹ لیے اور اپنے والد کی بارے میں سوچنے لگا۔

وہ اپنے بہادر باپ کرنل پوں مرسی کے بارے میں سوچ رہا تھا، جسے سپاہی ہونے پر بہت فخر تھا، جس نے جمہوریہ کے ماتحت فرانس کی سرحدوں کی حفاظت کی تھی، اور نپولین کی ماتحتی میں ایشیا کی سرحدیں چھو لی تھیں۔ اس نے، جینووا، اسکندریہ، ملان، تیورن، میڈرڈ، ویانا، ڈریسڈن، برلن، ماسکو دیکھا تھا؛ اس نے جنگ کے تمام مفتوحہ میدانوں میں اسی خون کے قطرے بہائے تھے جو ماریوں کی اپنی رگوں میں دوڑ رہا تھا؛ جس کے بال نظم و ضبط اور کمانڈ میں عمر سے پہلے سفید ہو گئے تھے؛ جس نے اپنی ساری عمر تلوار کی پیٹی باندھے زندگی بسر کی تھی؛ جس کے جھبے اس کی چھاتیوں پر گر جاتے تھے؛ جس کی کلغی بارود سے سیاہ ہو گئی تھی؛ جس کے ابرو ہلمٹ پہنتے پہنتے ہالی جیسے ہو گئے تھے، جو بیرکوں میں، کیمپ میں، خیموں میں، ایمبولینس میں، بیس برس گزر جانے کے بعد عالمی جنگوں سے اپنے رخساروں پر زخموں کے نشان کے ساتھ مسکراتا، پُرسکون، قابلِ تعریف، بچوں جیسے معصوم چہرے کے ساتھ واپس ہوا تھا۔ اس نے فرانس کے لیے سب کچھ کیا تھا، اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

ماریوں نے خود سے کہا کہ اب اس کا دن آ گیا ہے، وہ گھنٹا بج چکا ہے اور اپنے باپ کی پیروی کرتے ہوئے وہ خود کو بھی جواں مرد، نڈر، بہادر، گولیوں کی بوچھاڑ میں دوڑنے والا، سنگینوں کو اپنا سینہ پیش کرنے والا، اپنا خون بہانے والا، دشمن کا سامنا کرنے والا اور موت کی آرزو کرنے والا ثابت کرے گا کہ وہ اپنی باری آنے پر جس جنگ میں لڑنے والا ہے، سڑکیں جس کا میدان بننے والی ہیں، اور وہ جنگ جس میں وہ کودنے والا ہے، وہ خانہ جنگی ہو گی۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ خانہ جنگی اس کے سامنے خلیج کی طرح کھلی ہوئی ہے، جس میں وہ گرنے والا ہے۔ یہ سوچ کر ایک بار وہ کانپ گیا تھا۔

وہ اپنے باپ کی تلوار کے بارے میں سوچنے لگا جو اس کے نانا نے پرانے اسلحوں کے تاجر کے ہاتھ فروخت کر دی تھی، جس پر اسے بے حد افسوس تھا۔ اس نے خود سے کہا کہ اچھا ہوا وہ

نیک خو اور بہادر تلوار اس کے [نانا کے] ہاتھ سے نکل گئی، اور غیظ و غضب سے ملال میں چلی گئی ہے؛ کہ وہ اس طرح فرار ہوئی ہے، اس لیے کہ وہ ذہین تھی، اور اس لیے کہ اس نے اس نال کا، اس بد امنی کا، گندی نالیوں کی جنگ کا، سڑکوں پر لڑی جانے والی جنگ کا، تہہ خانے کی کھڑکیوں سے کی جانے والی گولا باری کے ذریعے پہنچانے اور اٹھانے والے نقصانات کا مستقبل دیکھ لیا تھا۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ Marengo اور Friedland سے آرہا تھا، کہ وہ Chanvrerie اسٹریٹ پر جانا نہیں چاہتا تھا؛ اس لیے جو کچھ وہ اپنے باپ کے لیے کرے گا، وہ نہیں چاہتا کہ اپنے بیٹے کے لیے بھی وہی کرے۔ اس نے خود سے کہا کہ اگر وہ تلوار اس وقت موجود ہوتی، اگر اس نے باپ کے تکیے کے نیچے سے اسے حاصل کر لیا ہوتا، اور اسے سڑکوں پر لڑنے والے فرانسیسیوں کے لیے لے جاتا، تو یقیناً یہ اس کی آنکھوں کے سامنے فرشتے کی تلوار کی طرح شعلوں میں گھر جاتی اور اس کے ہاتھ کو جلا ڈالتی۔ اس نے خود سے کہا کہ وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ تلوار وہاں نہیں ہے، کہ تلوار غائب ہو گئی ہے، کہ اچھا ہوا، کہ یہی ٹھیک تھا، کہ اس کا نانا اس کے والد کی شان و شوکت کا محافظ تھا، اور بہت اچھا ہوتا کہ کرنل کی تلوار نیلام کی جاتی، پرانے کپڑے کے تاجر کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی، کباڑ میں ڈال دی جاتی، بجائے اس کے کہ وہ آج اپنے ملک کے پہلو کو زخمی کر دیتی۔

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

بہت بُرا ہوا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ کوزیٹ کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ وہ چلی گئی ہے، اب اسے مر جانا چاہیے۔ کیا اس نے عہد نہیں کیا تھا کہ وہ مر جائے گا؟ کوزیٹ یہ جانتے ہوئے گئی تھی؛ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خوش تھی کہ ماریوس مر جائے گا۔ اور پھر، صاف ظاہر تھا کہ اب وہ ماریوس سے محبت نہیں کرتی تھی، وہ بغیر اطلاع دیے چلی گئی تھی، ایک لفظ کہے بغیر، خط لکھے بغیر، حالاں کہ اسے ماریوس کا پتا معلوم تھا۔ ایسی زندگی کس کام کی، اور اب وہ کیوں زندہ رہے؟ اور پھر، اتنی دور تک جانے کے بعد کیا وہ پسپا ہو جائے؟ کیا وہ خطرے سے قریب ہونے کے بعد فرار ہو جائے؟ کیا وہ پشتے پر آنے اور اس میں سے جھانکنے کے بعد وہاں سے لرزتا ہوا اور یہ کہتا ہوا کھسک جائے؟ "بالآخر میرے نزدیک جو کچھ ہوا، بہت ہو چکا ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے، اتنا ہی کافی ہے، یہ خانہ جنگی ہے، اور مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔" تو کیا وہ اپنے دوستوں کو چھوڑ دے جو اس کے انتظار میں تھے؟ کیا واقعی کسی کو اس کی ضرورت تھی؟ کون ہیں وہ جو کسی فوج کے مقابلے میں مٹھی بھر تھے۔ تو کیا وہ اپنی محبت سے، اپنے ملک سے، اپنے وعدے سے بے وفائی کرے؟ کیا

وہ اس بزدلی کو حب الوطنی کا بہانہ فراہم کرے؟ مگر یہ سب ناممکن تھا، اور اگر اس اندھیرے میں اس کا خیالی باپ ہوتا، اور اس کو پسپا ہوتے دیکھتا، تو اس کے زانو پر تلوار کو چوڑی جانب سے مارتا اور اس سے چیخ کر کہتا، ''چل بزدل، آگے بڑھ۔''

اس طرح اپنے خیالات کی متنازعہ حرکات کا شکار ہو کر اس نے اپنا سر جھکا دیا۔

اور پھر اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کے دماغ پر شتان دار قسم کی ورینی اثر انداز ہوئی تھی۔ کبھی کبھی خیالات کی وسعت ایسی بھی ہوتی ہے جو مخصوص ہوتی ہے قبر کی قربت سے، اور انسان موت کو قریب سے دیکھنے لگتا ہے۔ عمل کا تصور جس میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہے، یا شاید ہونے کے قریب ہے، اس کے نزدیک اتنا افسوس ناک نہیں ہوتا مگر اتنا ہی نفیس ہوتا ہے۔ اچانک اس کے نفس کی کسی اتھاہ اندرونی کارکردگی سے سڑک کی جنگ اس کے خیالات کی آنکھوں کے سامنے تبدیل ہو گئی تھی۔ سوچ کے سارے نقطوں کی فتنہ انگیز تفتیش ہجوم کی صورت میں، اس کو پریشان کیے بغیر، اس کے سامنے واپس آ گئی تھی۔

آیئے اب ہم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا باپ اس پر برہم کیوں ہو؟ کیا ایسے معاملات نہیں ہوتے جن میں بدامنی فرض کی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لڑائی میں جو شروع ہونے والی تھی، ایسی کون سی بات تھی جو کرنل پوں مرسی کے بیٹے کے لیے بے عزتی کا باعث ہوتی؟ اب نہ تو Montmirail ہے نہ Champaubert؛ یہ تو کچھ مختلف ہے۔ اب سوال مقدس علاقے کا نہیں رہا، مقدس خیالات کا ہے۔ ملک واویلا کر رہا ہے، تو کرتا رہے، مگر انسانیت تو اظہار پسندیدگی کر رہی ہے۔ فرانس کا خون بہہ رہا ہے مگر آزادی مسکرا رہی ہے۔ فرانس اپنے زخم بھلا دیتا ہے۔ اور اگر ہم معاملات کو زیادہ بلند نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں، تو ہم خانہ جنگی کی بات کیوں کرتے ہیں؟

خانہ جنگی! یہ کیا شے ہے؟ کیا جنگ غیر ملکی بھی ہوتی ہے؟ کیا تمام جنگیں آدمیوں کے درمیان — بھائیوں کے درمیان — نہیں ہوتیں؟ جنگ صرف مقصد کی ہوتی ہے۔ بدیسی جنگ یا خانہ جنگی جیسی کوئی شے نہیں ہوتی۔ جنگ بس بے جا جنگ ہوتی ہے۔ اس دن تک، جب تک عظیم انسانی معاہدہ انجام نہیں پا جاتا ہے، جنگ کم از کم وہ جو مستقبل کی کوشش ہوتی ہے، جو عجلت میں ہوتی ہے اور ماضی کے خلاف ہوتی ہے، جو پیچھے رہ جاتی ہے، ضروری ہو سکتی ہے۔ ہم ایسی جنگ پر سرزنش کیسے کریں گے؟ جنگ بے عزتی نہیں ہوتی، تلوار بے عزتی نہیں ہوتی جب تک کہ حقوق کے قتل، ترقی، وجوہ، تمدن، صدق کے لیے استعمال نہ کی جائے۔ تب جنگ، وہ غیر ملکی ہو یا ملکی، خطاوار ہوتی ہے؛ جرم کہلاتی ہے۔ اس مقدس شے انصاف، کی حدود سے پرے کسی انسانی پیکر کو دوسرے انسانی پیکر سے

نفرت کا کیا حق پہنچتا ہے؟ کس حق کی بنا پر واشنگٹن کی تلوار Camille Desmoulins کے نیزے کو رد کرسکتی ہے۔ Leonidas بمقابلہ ایک اجنبی، Timoleon بمقابلہ ایک جابر، کون بڑا سمجھا جائے گا؟ پہلا محافظ ہے تو دوسرا آزادی دلانے والا ہے۔ کیا ہم شہر کی حدود کے اندر اسلحے کی ہر اپیل کو مقصد پر توجہ کیے بغیر قبول کرلیں؟ تب ہمیں بدنامی کو نظر میں رکھنا چاہیے بروٹس کی، مارسل(Marcel) کی، آرنلڈ فان بلینکن ہائم کی (Arnould von Blankenheim)، کالیگنی کی(Coligny)، اور ہیجر وا (Hedgerow war) کی جنگ؟ سڑکوں کی جنگ؟ کیوں نہیں؟ وہ Ambiorix کی اور Artevelde کی فرانس کے خلاف، Marnix کی اور Pelagius کی جنگ تھی۔ مگر Ambiorix روما کے خلاف، Artevelde فرانس کے خلاف، Marnix ہسپانیہ کے خلاف، Pelagius موروں (افریقی مسلمانوں) کے خلاف لڑا تھا: سب غیر ملکیوں کے خلاف تھے۔ اچھا تو شاہی غیر ملکی ہے؛ جبریت اجنبی ہے؛ مابالی حق اجنبی ہے۔ جبر اخلاقی سرحد کو پامال کرتا ہے، حملہ جغرافیائی سرحد کو پامال کرتا ہے۔ جابر کو نکال باہر کرنا، یا انگریز کو مار بھگانا دونوں صورتوں میں اپنے علاقے کو واپس لینا ہوتا ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب صرف احتجاج کافی نہیں ہوتا؛ فلسفے کے بعد عمل کی ضرورت ہوتی ہے؛ قوت خیال کے بنائے ہوئے خاکے کو ختم کر دیتی ہے؛ پرومیتھیوس [یونانی اساطیر کا ایک کردار، جسے سزا کے طور زنجیر سے ایک چٹان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے باندھ دیا گیا تھا؛ ایک عقاب، جو Zeus کا نشان تھا، روزانہ اس کے جگر سے اپنی بھوک مٹانے آتا تھا، اور روزانہ اس کا جگر اتنا ہی بڑھ جاتا تھا] کی زنجیری بندش شروع ہوتی ہے، Arostogeiton اسے ختم کر دیتا ہے؛ مجمع العلوم نفوس کو روشن کر دیتا ہے، 10th of August ان میں برقی قوت دوڑا دیتا ہے۔ AEschylus [قبل مسیح کا یونانی حزن نگار ادیب] کے بعد Thrasybulus [قبل مسیح کا یونانی جرنیل اور آمر]۔ ڈیڈیرو کے بعد ڈانٹن (Danton)۔ بے شمار لوگوں میں آقا کو قبول کرنے کا رجحان ہوتا ہے۔ ان کا انبوہ مردہ دلی کا گواہ ہوتا ہے۔ مجمع آسانی سے تابع دار بن جاتا ہے۔ مردوں کو ہلانا پڑتا ہے، دھکا دینا پڑتا ہے، ان کی بھلائی کے لیے سختی سے پیش آنا پڑتا ہے، ان کی آنکھوں کو سچ کا زخم لگانا پڑتا ہے، اور ان پر ڈھیروں روشنی پھینکنی پڑتی ہے۔ ان کو خود ان کی بھلائی کے لیے حیرت زدہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے خطرے کی گھنٹیوں اور جنگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ عظیم جنگجوؤں کو اٹھنا چاہیے، قوموں کو جرأت کے ساتھ روشن خیال بنانا چاہیے، اور افسردہ انسانیت کو ہلانا چاہیے جو غم زدگی کی، قیصری شان کی، قوت کی، مذہبی جنون کی، غیر ذمے دار طاقت کی، اور مکمل جلال کی چادر اوڑھے ہوتے ہیں، رذیلوں کی ایک ٹولی جو ارادے میں مصروف ہوتی ہے، اپنی شفق کے شکوہ میں،

رات کی ان اداس فتوحات میں۔ ظالموں پر لعنتِ خدا! آپ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں؟ کیا آپ لوئی فیلپ کو ظالم کہہ رہے ہیں؟ نہیں! لوئی شانزدہم سے زیادہ نہیں۔ دونوں وہ ہیں جنھیں عادت کے مطابق تاریخ اچھے بادشاہ کہتی ہے؛ مگر اصولوں کے حصے بخرے نہیں کیے جائیں گے، سچ کی منطق خطِ مستقیم ہوتی ہے، سچ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں اخلاق کی کمی ہوتی ہے؛ تب کوئی رعایات نہیں ہوں گی؛ آدمی پر ہونے والی تمام مداخلتوں کو روکا جانا چاہیے۔ لوئی شانزدہم کو آسمانی حقوق میسر تھے، اس لیے کہ Bourbon میں ایک لوئی فیلپ بھی ہے؛ دونوں ایک خاص حد تک حق کی ضبطی کی نمائندگی کرتے ہیں، اور عالمی بدامنی کو ختم کرنے کی خاطر ان سے لڑائی کی جانی چاہیے؛ یہ سب کیا جانا چاہیے، فرانس ہمیشہ اس کی شروعات کرتا ہے۔ جب حاکم فرانس میں شکست کھاتا ہے، تو اسے ہر جگہ شکست ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ مقصد زیادہ صحیح ہوتا ہے، اور نتیجے میں، وہ جنگ جو زیادہ بڑی ہے، اس کے مقابلے میں جو سماجی سچ کو دوبارہ مستحکم کرتا ہے؛ اپنا تخت آزادی کو واپس دے دیتا ہے؛ عوام کو عوام کے حوالے کر دیتا ہے؛ حکمرانی آدمی کو واپس کر دیتا ہے؛ فرانس کے حاکم کو اس کا عہدہ واپس کر دیتا ہے؛ ان کی فراوانی میں حق کو اور ویٹل کو رد کر دیتا ہے؛ ہر قسم کی دشمنی کے جرثومے کو، اپنے آپ میں واپس کرنے کے ذریعے دبا دیتا ہے؛ شاہی جس عظیم عالمی مصالحت میں رکاوٹ تھی ہے، اس رکاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور نسلِ انسانی کو دوبارہ اس کے صحیح مقام پر فائز کر دیتا ہے؟ ایسی جنگیں امن قائم کرتی ہیں۔ اس دنیا میں اب بھی بدگمانیاں، استحقاق، توہمات، کذب، جبری محصولات، بدسلوکیاں، تشدد، بے انصافی، اور ظلم کا ایک مہیب قلعہ نفرت کے میناروں سمیت موجود ہے۔ اس کو گرا دینا چاہیے۔ اس دیوہیکل ڈھیر کو ریزہ ریزہ ہو جانا چاہیے۔ Austerlitz کی فتح عالی شان ہے؛ Bastille پر قبضہ کر لینا لا انتہا ہے۔

دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں جس نے کبھی خود اپنے نفس پر غور نہیں کیا ہوگا۔ ہر انسان کے نفس میں اس کے اتحاد کی حیرانیاں ہوتی ہیں جو ہر جگہ موجود ہونے کی صفت کے باعث پیچیدہ ہو جاتی ہیں؛ جن کی توجیہات کا اپنا تقریباً حیرت انگیز اور سرد مہر رویہ ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شکستہ دل جذبہ اور عمیق نا امیدی، اپنی بدترین خود کلامیوں کے کرب کے باوجود موضوعات کو سلجھاتی ہے اور نظریات پر بحث کرتی ہے۔ منطق میں تشنج ملا ہوتا ہے، اور اخذ نتیجہ (syllogism) کا دھاگہ، خیالات کے غم زدہ طوفان میں، ٹوٹے بغیر، لہراتا رہتا ہے۔ یہ تھی ماریس کی دماغی کیفیت۔

ماریس کا رنجیدہ مگر مستحکم مراقبہ ہر کام میں تذبذب پیدا کر رہا تھا، مختصر یہ کہ، وہ جو کچھ کرنے والا ہوتا، اس میں کانپنے لگتا تھا اور اس کی نظر پیچھے کے اندرون میں بھٹکنے لگتی تھی۔ سارے

سرگوشی، حرکت کیے بغیر، دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے، اور صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ ظاہرہ خاموشی ان کی آخری درجے کی امید تھی۔ اوپر کی جانب، تیسری منزل کی کھڑکی میں ماریوس کو ایک قسم کا تماشا دیکھنے والا نظر آیا جو غیر معمولی طور محتاط تھا۔ یہ وہی دربان تھا جسے لی کابک نے قتل کر دیا تھا۔ نیچے، ٹارچ کی روشنی میں، جو پتھروں کے درمیان گھسی ہوئی تھی، اس کا سر مشکل سے پہچانا جاتا تھا۔ اس دھندلی سی کرن میں وہ سیسے کے رنگ کا، بے حرکت، حیران چہرہ، اس کی آنکھیں جمی اور گھورتی ہوئی، اور اس کا جمائی لیتا ہوا کھلا منہ، تجسس کی کیفیت میں سڑک کی طرف جھکا ہوا بہت حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدمی جو مر چکا ہے، ان کا معائنہ کر رہا تھا جو مرنے والے تھے۔ اس سر سے بہنے والے خون کی، سرخ دھاگے کی مانند لکیر، پہلی منزل تک پہنچ کر رک گئی تھی۔

۞

پرچم — پہلا منظر

ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔ Saint-Merry سے دس بجنے کی صدا بلند ہوئی۔ انجولرا اور کومفیر، اپنی بندوقیں لیے بڑے پشتے سے نکلنے کے راستے کے قریب جا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے، سن رہے تھے؛ دور سے آنے والی مارچ کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھے۔

اچانک افسردگی بھرے سکون کے درمیان ایک واضح، خوش دل، نوجوان آواز بلند ہوئی جو بظاہر Saint Denis اسٹریٹ سے آتی معلوم ہو رہی تھی اور اس نے دل پسند اشعار "چاند کی روشنی میں" گانا شروع کر دیا، جس میں تھوڑی سی شاعری بھی تھی، جسے کسی کوے جیسی آواز ختم ہوئی:

Mon nez est en larmes,
Mon ami Bugeaud,
Prete moi tes gendarmes
Pour leur dire un mot.

En capote bleue,
La poule au shako,
Voici la banlieue!
Co-cocorico!

انھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ دبائے۔

"گانے والا گاوروش ہے۔" انجولرا نے کہا۔

"وہ ہمیں تنبیہ کر رہا ہے۔" کومفیر نے کہا۔

سنسان سڑک پر ایک تیز حملہ ہوا؛ انھوں نے ایک شخص کو اومنی بس پر چڑھتے دیکھا جو کسی مسخرے سے زیادہ پھرتیلا تھا، اور گاوروش پشتے کی طرف چڑھتی سانسوں کے ساتھ دوڑ پڑا:

"میری بندوق، یہ رہی!"

پورے پشتے پر بجلی کی سی تھرتھری دوڑ گئی، اور اپنی اپنی بندوقوں کو ڈھونڈنے والے ہاتھوں کی آوازیں سنائی دیں۔

"تم میری چھوٹی بندوق لینا پسند کرو گے؟" انجولرا نے لڑکے سے پوچھا۔

مجھے بڑی بندوق چاہیے۔" گاوروش نے کہا۔

اور اس نے جاویر کی بندوق پکڑ لی۔

دو پہرے دار جو پیچھے رہ گئے تھے، عین اس وقت پہنچ گئے جب گاوروش آیا تھا۔ یہ پہرے دار سڑک کے سرے اور Petite-Truanderie اسٹریٹ کے کونے پر تعینات گھڑسوار پہرے داروں کے دستے سے آئے تھے۔ Precheurs لین کا گھڑسوار دستہ اپنی چوکی پر قائم رہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ پلوں اور Halles کی جانب سے کوئی آ نہیں رہا تھا۔

Chanvrerie اسٹریٹ جس کی پتھر کی صرف چند سلیں پرچم کو روشن رکھنے والی مدھم روشنی کے عکس میں نظر آ رہی تھیں، سرکشوں کو دھوئیں میں کالے رنگ کے ادھ کھلے دروازے کا منظر پیش کر رہی تھی۔

تنازعے کے لیے ہر شخص نے اپنی جگہ سنبھال لی تھی۔

43سرکش، جن میں انجولرا، کومفیر، کوفیراک، بوسے، شولی، باوریل اور گاوروش بڑے پشتے کے اندر کھڑے تھے، ان کے سر پشتے کی چوٹی کے برابر تھے، ان کی بندوقوں کی نالیں پتھروں کا نشانہ لیے تیار تھیں۔ چھ افراد جو فیولی کی کمان میں تھے، کاندھے پر بندوقیں سیدھی کیے Corinth کی دومنزل کی کھڑکیوں پر تعینات تھے۔

اس حالت میں کئی منٹ گزر گئے، تب Saint-Leu کی جانب سے آتے، نپے تلے، بھاری اور بے شمار قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ آواز پہلے بہت ہلکی تھی، اس کے بعد باقاعدہ، پھر بھاری اور بغیر رکے، بے توقف، آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ یہ آواز اور خاموشی کا کمان وار کے مجسمے کا اتحاد تھا مگر اس سنگی قدم میں کوئی شے ناقابلِ بیان

مہیب اور بہ کثرت تھی، جس نے ہجوم کے اور بھوت پریت کے خیالات کو جگا دیا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ اس نے اس خوف ناک مجسمے والے پتّھر کو آگے مارچ کرتے سنا تھا۔ چلنے کی آواز قریب آ گئی؛ اور بھی قریب، اور پھر رُک گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سڑک کے آخر میں موجود لوگوں کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا تاہم اس گہری دھند کے نیچے دھات کے بے شمار دھاگے تھے، اتنے مہین جیسے سوئی، تقریباً نا قابلِ تصور، جو فاسفورس سے بنے اس نا قابلِ بیان نظام کے اطراف حرکت کر رہے تھے جو غنودگی کی پہلی کہر میں بند پلکوں کے نیچے دکھائی دینے لگتے ہیں جب نیند غالب ہونے لگتی ہے۔ یہ سنگینیں اور بندوق کی نالیاں تھیں جو دور تاریخ کی روشنی کے عکس کی پیچیدگی سے منور ہو گئی تھیں۔

ایک وقفہ ہوا، گویا دونوں طرف والے انتظار کر رہے تھے۔ پھر اچانک، اندھیرے کی گہرائیوں سے ایک آواز نے جو زیادہ نا مبارک تھی اس لیے کہ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، گویا اندھیرا اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو، چیخ کر کہا "ادھر کون جا رہا ہے؟"

اسی لمحے بندوقوں کے کھٹکے سنائی دیے، اس لیے کہ وہ پوزیشن لینے کے لیے جھکائی جا رہی تھیں۔

انجولرا نے متکبرانہ اور لرزتے لہجے میں جواب دیا، "انقلابِ فرانس"

"فائر!" آواز نے چیخ کر کہا۔

سڑک کی ساری عمارتوں کے چہرے جھماکے سے ارغوانی ہو گئے، گویا کسی بھٹی کا دہانہ کھلا، اور فوراً ہی بند ہو گیا تھا۔

پشتے پر ایک خوف انگیز دھماکا ہوا۔ سرخ پرچم زمیں بوس ہو گیا۔ دھماکے سے خارج ہونے والا مادہ اتنا شدید اور اتنا دبیز تھا کہ اس نے اومنی بس کے ایک سرے کو کاٹ دیا تھا۔

گولیاں جو مکانوں کی کارنس سے ٹکرا کر واپس ہوئی تھیں پشتے میں داخل ہو گئیں اور بہت سے لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ پہلے اخراج کا اثر جما دینے والا تھا۔ حملہ سخت تھا، اس نوعیت کا جو دلیر ترین پر بھی اپنا اثر چھوڑ گیا تھا۔

"دوستو!" کوفیراک نے چیخ کر کہا "اپنا بارود ضائع نہ کرو۔ جب تک وہ سڑک پر نہ آ جائیں، جواب نہ دو۔"

"سب سے پہلے" انجولرا نے کہا، "ہم اپنا پرچم بلند کریں گے۔"

اس نے پرچم اٹھایا، جو اس کے بالکل قریب ہی گرا تھا۔

باہر، بندوق بھرنے والے چھڑوں کی کھڑکھڑ سنی جا سکتی تھی: سپاہی اپنی بندوقیں بھر رہے تھے۔

انجولرا نے کہا، ''ہے کوئی بڑے دل والا؟ ہے کوئی پشتے پر پرچم گاڑنے والا؟''

کسی نے جواب نہیں دیا۔ پشتے پر چڑھنا، جو اس وقت نشانے پر تھا، موت تھا۔ بہادر ترین بھی ہچکچا کر رہ گیا۔

''کیا کوئی بھی رضا کار نہیں؟''

۞

پرچم—دوسرا منظر

چوں کہ وہ لوگ Corinth آ گئے تھے اور پشتے کی تعمیر شروع ہو گئی تھی، فادر مابوف پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ موسیو مابوف نے ہجوم چھوڑا نہیں تھا پھر بھی وہ وائن کی دُکان کی زمینی منزل میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں، بقول شخصے، وہ اپنے آپ میں پسپا ہو گیا تھا۔ نہ وہ کچھ دیکھتا تھا نہ سوچتا تھا۔ کوفیراک اور دوسروں نے دو یا تین بار اسے چھیڑنے کی کوشش کی، اس کو خطرات سے آگاہ کیا، اس سے واپس جانے کی التجا کی، مگر اس نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ وہ اس سے بات نہیں کرتے تب بھی وہ اس طرح منہ چلاتا تھا جیسے وہ کسی کی بات کا جواب دے رہا ہو، اور جوں ہی اس سے بات کی جاتی اس کے لب ساکت ہو جاتے اور آنکھوں میں سے زندگی کے آثار غائب ہو جاتے تھے۔

پشتے پر حملے سے کئی گھنٹے پہلے اس نے ایک طریقہ اختیار کر لیا تھا جسے بعد میں کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر گھٹنوں پر رکھ لیتا اور سر آگے کی طرف جھکا لیتا جیسے کسی چٹان سے نیچے دیکھ رہا ہو۔ وہ اس طریقے سے کسی بھی طرح باز نہیں آیا؛ ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس کا ذہن پشتے پر ہوتا ہے۔ جب ہر کوئی لڑائی کے لیے اپنی جگہ سنبھال لیتا، وہ مے نوشی کے کمرے میں ہوتا، جہاں جاویر کو ایک کھمبے سے باندھ دیا گیا تھا اور وہ اور اس کے ساتھ ایک سرکش ننگی تلوار لیے جاویر پر نگاہ رکھتا تھا۔ حملے کے وقت اور دھماکے کے لمحے جوں ہی اسے جسمانی صدمہ پہنچا، جس نے اسے جگا دیا تھا، اچانک وہ کھڑا ہو گیا، کمرے کو پار کیا، اور عین اس وقت جب انجولرا نے اپنی اپیل ''کیا کوئی بھی رضا کار نہیں؟'' دہرائی، بوڑھا وائن کی دُکان کی ڈیوڑھی پر نظر آیا تھا۔ اس کی موجودگی سے مختلف گروہوں میں ہلچل پیدا ہو گئی، اور ایک چیخ بلند ہوئی تھی:

"یہ تو ووٹر ہے۔ یہ کاؤنسل کا رُکن ہے، یہ عوام کا نمائندہ ہے۔"
اس کا امکان ہے کہ بوڑھے نے ان کی باتیں سنی نہیں تھیں۔
بوڑھا لمبے لمبے قدم اٹھاتا انجولرا تک گیا، سارے سرکش ایک قسم کے مذہبی خوف سے اس کے سامنے سے ہٹتے گئے؛ اس نے انجولرا کے ہاتھ سے پرچم چھین لیا جو اچنبھے کی کیفیت میں پیچھے ہٹا، اس لیے کہ کسی کو بوڑھے کو روکنے یا اس کی مدد کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسّی برس کا بوڑھا، جس کا سر ہل رہا تھا مگر قدم ثابت تھے، آہستہ آہستہ پشتے پر پتھر کی سِلوں سے بنے زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ ایسا سنجیدہ اور اس قدر شان دار منظر تھا کہ اس کے اطراف کے تمام لوگوں نے چیخ کر کہا "اپنی ٹوپیاں اتارلو!"۔ اوپر کی طرف اٹھتا اس کا ہر قدم ایک خوف ناک نظارہ تھا؛ اس کے کنپٹی کے سفید بال، اس کا بوڑھا چہرہ، اس کی بلند اور شکن زدہ پیشانی، اس کا حیرت انگیز اور کھلا ہوا منہ، بوڑھے ہاتھوں میں پرچم اٹھائے باہر نکلا۔ تاریکی کی روشنی نے اسے اس طرح بڑا کر دیا تھا کہ لوگ سمجھے کہ وہ 93ء کے عفریت کو خوف کا پرچم اٹھائے زمین سے نکلتے دیکھ رہے ہیں۔
جب وہ آخری زینے پر پہنچا، جب یہ خوف ناک کانپتا فینٹم، بارہ ہزار نظر نہ آنے والی بندوقوں کے ہجوم میں کوڑے کے ڈھیر پر سیدھا کھڑا ہوا، اور موت کا اس طرح سامنا کیا جیسے کہ وہ موت سے بڑا تھا، تو پورا پشتہ سمجھا کہ اندھیرے میں ایک بڑے قد کا مافوق الفطرت پیکر اس کے سامنے تھا۔ اس وقت ان لوگوں میں ایسی خاموشی تھی جو عجیب وغریب پیکروں کو دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔ اس خاموشی کے درمیان اس بوڑھے آدمی نے سُرخ پرچم لہرایا اور چیخ کر کہا،
"انقلاب زندہ باد! جمہوریہ زندہ باد! برادری! مساوات! اور موت۔"
پشتے میں جو لوگ موجود تھے انھوں نے ایک دھیمی اور تیز سرگوشی سنی جیسے کوئی مبلغ عجلت میں دعا کر رہا ہو۔ وہ شاید پولیس کمشنر تھا جو سڑک کی دوسری جانب کھڑا قانونی حکم جاری کر رہا تھا۔
اور پھر چیخنے والی ایک تیز آواز بلند ہوئی "کون جا رہا ہے۔"
"واپس جاؤ۔"
زرد، دبلے پتلے، خلاف ورزی کے غم انگیز شعلے سے روشن آنکھوں والے موسیو مابوف نے اپنے سر کے اوپر پرچم بلند کیا اور اپنا نعرہ دہرایا، "جمہوریہ زندہ باد!"
"فائر!" اس آواز نے کہا۔
پہلی بارش کی طرح، پشتے پر گولیوں کی دوسری بارش شروع ہو گئی۔
بوڑھا اپنے گھٹنوں پر گرا، دوبارہ کھڑا ہوا، پرچم گرا دیا، اور زمین پر کسی تختے کی طرح

گر پڑا؛ اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے سے خون کی نالی بہہ نکلی تھی۔ اس کا عمر رسیدہ، زرد اور افسردہ سر آسمان کو گھورتا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ جذبات جو انسان سے بڑے ہوتے ہیں، جن میں وہ خود کو بچانا بھول جاتا ہے، سرکشوں پر طاری ہو گئے، اور وہ بصد احترام اس جسم کی طرف بڑھے۔

''شاہ کُش بھی کیسے لوگ ہوتے ہیں۔'' انجولما نے کہا۔

کوفیراک نے جھک کر انجولرا کے کان میں کہا ''یہ صرف تم سے کہہ رہا ہوں، اس لیے کہ میں لوگوں کے جوش وجذبات کو دبانا نہیں چاہتا۔ یہ شخص کچھ بھی رہا ہو مگر شاہ کُش نہیں تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام فادر مابوف تھا۔ نہ جانے آج اسے کیا ہو گیا تھا۔ یہ بہادر احمق تھا۔ ذرا اس کے سر کی طرف دیکھو۔''

''سر احمق کا، اور دل بروٹس کا۔'' انجولرا نے جواب میں کہا۔

اس کے بعد اس کی آواز بلند ہوئی:

''باشندو! یہ ہے وہ مثال جو بوڑھے نوجوانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم تامل کر رہے تھے، یہ آ گیا! ہم پسپا ہو رہے تھے، یہ آگے بڑھا! یہ ہے وہ سبق جو عمر کے باعث لرزاں، خوف سے لرزنے والوں کو دیا کرتے ہیں۔ یہ بوڑھا آدمی اپنے ملک کی نظروں میں بلند پایہ انسان ہے۔ اس نے لمبی عمر پائی تھی، اور اسے شان دار موت ملی ہے! اب ہم اس کے جسم کو اندر رکھ دیتے ہیں، تاکہ ہم میں سے ہر ایک اس مردہ آدمی کی اسی طرح حفاظت کرے جیسے وہ اپنے زندہ باپ کی حفاظت کرتا ہے، اور ہو سکتا ہے اس کی ہمارے درمیان موجودگی پشتے کے لیے ناقابلِ شکست ثابت ہو!''

ایک توانا اور غم انگیز سرگوشی ہونے لگی، جو ان الفاظ پر صاد تھی۔

انجولرا جھکا، بوڑھے کا سر بلند کیا، اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور بوڑھے کے جسم کو اس طرح اٹھایا جیسے وہ اسے دُکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا؛ اس کا کوٹ اُتارا، اس میں بنے سوراخ سب کو دکھائے، اور کہا: ''اب یہی ہمارا پرچم ہے۔''

✿

گاوروش کی بندوق

انھوں نے بیوہ ہوشیلو کی سیاہ رنگ کی بڑی سی شال فادر مابوف پر ڈال دی۔

چھ آدمیوں نے اپنی بندوقوں کی مدد سے ایک پالکی بنائی۔ اس پر میت رکھی، اور ننگے سر، متبرک آہستگی سے اس کو مے نوشی کے کمرے کی بڑے سی میز پر لے جا کر رکھ دیا۔

یہ لوگ اس سنجیدہ اور مقدس فرض میں اتنے مصروف تھے کہ انھوں نے اس خطرناک حالت کی پروا نہیں کی جس میں وہ اس وقت گھرے تھے۔

جس وقت میت جاویر کے پاس سے گزر رہی تھی، جو اس وقت بھی بد حواس تھا، انجولرا نے اس جاسوس سے کہا، "تمھارا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔"

اس دوران گاوروش کو، صرف جس نے اپنی چوکی نہیں چھوڑی تھی بلکہ پشتے کی پاسبانی کرتا رہا تھا، کچھ لوگوں نے دیکھ لیا تھا جو چوری چوری پشتے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے اچانک چیخ کر کہا، "دیکھنا، ہوشیار!"

کوفیراک، انجولرا، ژاں پرودیر، کومفیر، شوفی، باؤریل، بوسے، اور باقی سب وائن کی دکان سے شور مچاتے باہر دوڑے، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ چمکتی ہوئی سنگینوں کا ایک ہجوم لہراتا ہوا پشتے پر موجود تھا۔ بلند قامت میونسپل گارڈ پشتے میں داخل ہو رہے تھے، کچھ اومنی بس پر سوار تھے، دوسرے راستہ کاٹ کر اس لڑکے کے سامنے پہنچ گئے، جو پسپا تو ہو گیا، مگر فرار نہیں ہوا تھا۔

بہت نازک وقت تھا۔ یہ ویسا ہی غرقابی کا پہلا دہشت ناک لمحہ تھا جب چشمہ بند کی سطح تک بلند ہو جاتا ہے اور جب پانی بند کی درازوں میں سے بہنے لگتا ہے۔ ایک سیکنڈ اور؛ اور

پشتے پر قبضہ ہو جاتا۔

باؤریل داخل ہونے والے پہلے میونسپل گارڈ پر حملہ آور ہوا، اور اپنی بندوق کی ایک ضرب سے اس کا کام تمام کر دیا۔ دوسرے گارڈ نے اپنی سنگین کے ایک وار سے باؤریل کو ختم کر دیا۔ ایک اور کوفیراک کو پہلے ہی مار چکا تھا، جو چیخ کر کہہ رہا تھا، ”میرے پیچھے پیچھے آؤ۔“ ان میں جو سب سے قد آور تھا سنگین لیے گاوروش کی طرف بڑھا۔ گاوروش نے جاوید کی بندوق اٹھائی، اس دیوہیکل آدمی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ بندوق چلی نہیں۔ جاوید کی بندوق بھری نہ تھی۔ میونسپل گارڈ قہقہہ مار کر ہنسا اور اپنی سنگین لڑکے کی طرف بلند کی۔

قبل اس کے کہ سنگین گاوروش تک پہنچتی سپاہی کے ہاتھ سے بندوق پھسل کر زمین پر گر پڑی۔ میونسپل گارڈ کے ماتھے کے بیچوں بیچ ایک گولی لگی، اور گارڈ چت فرش پر گر پڑا۔ دوسری گولی، ایک اور میونسپل گارڈ کو لگی، جس نے کوفیراک کے سینے کو زخمی کیا، اور اسے فرش پر ڈال دیا تھا۔

یہ کام ماریس کا تھا، جو عین اس وقت پشتے میں داخل ہوا تھا۔

پاؤڈر سے بھرا پیپا

ماریوس نے جو ابھی تک Mondetour اسٹریٹ کے موڑ پر چھپا ہوا تھا، کانپتے ہوئے اور تذبذب کے عالم میں لڑائی کا پہلا دور دیکھا، مگر وہ تباہی کے اس پُر اسرار گھمنڈ کی مزاحمت نہیں کر سکا تھا جس کو پاتال کی پکار کہا جا سکتا ہے۔ اس قدر مہیب خطرے کی موجودگی میں، موسیو مابوف کی موت، غم انگیز معمے، باؤریل کی ہلاکت، اور کوفیراک کی چیخ، "میرے پیچھے پیچھے آؤ" لڑکے گاوروش کو درپیش خطرے اور دوستوں کی امداد یا انتقام کے باوجود اس کا سارا تذبذب ہوا ہو گیا تھا؛ اور وہ دونوں ہاتھوں میں پستول لیے لڑائی میں کود پڑا۔ اپنی پہلی گولی سے اس نے گاوروش کو، اور دوسری گولی سے کوفیراک کو بچا لیا تھا۔

گولیوں کی آواز کے درمیان محافظوں کی چیخوں کے درمیان حملہ آور ان مورچوں پر چڑھ گئے جن کی بلندی پر میونسپل گارڈ سپاہیوں کی قطار اور مضافات سے آنے والے نیشنل گارڈ ہاتھوں میں بندوقیں لیے جھکے جھکے چلتے دیکھے جا سکتے تھے۔

وہ پشتے کے دو تہائی حصے پر قابض ہو چکے تھے مگر انھوں نے اندر کودنے کی کوشش نہیں کی کہ کسی دام میں نہ پھنس جائیں۔ وہ پشتے کے اندھیرے میں اس طرح دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے شکاری کسی شیر کی ماند کے اندر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاریخ کی روشنی صرف ان کی سنگینوں، بھالو کی کھال سے بنی ٹوپیوں اور ان کے بے چین اور غصہ ور چہروں کے اوپری حصے کو اُجاگر کر رہی تھی۔

ماریوس کے پاس اب کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا؛ فائر کرنے کے بعد اس نے گولیوں سے خالی اپنے پستول پھینک دیے تھے، مگر اسے مے نوشی کے کمرے میں دروازے کے قریب پاؤڈر سے بھرا ایک پیپا نظر آ گیا تھا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے جوں ہی وہ مڑا ایک سپاہی نے اس پر اپنی بندوق تان لی۔ سپاہی ماریوس پر گولی چلانے ہی والا تھا، کہ کسی نامعلوم ہاتھ نے بڑھ کر بندوق کی نال پکڑ لی اور نشانے کی گھنڈی سپاہی کی نظروں سے غائب ہوگئی۔ یہ کام اس شخص نے کیا تھا جو تیر کی طرح آگے بڑھا تھا ــــ وہ ایک نوجوان دست کار تھا جو مخمل کے پتلون میں ملبوس تھا۔ گولی چلی، ہاتھ کے پاس سے اور دست کار کے قریب سے گزری مگر اصل نشانہ خطا ہوگیا تھا۔ دستکار بھی گر گیا، مگر گولی ماریوس کو نہیں لگ سکی۔ دھوئیں کی گہرائیوں میں یہ سب دیکھنے کے بجائے اس کا تصور ہی کیا جاسکتا تھا۔ ماریوس نے جو رے نوشی کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا، کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اب بھی اسے نشانہ باندھنے والی بندوق کی نال اور وہ ہاتھ جس نے نشانہ روک لیا تھا بار بار یاد آرہا تھا۔ ایسے لمحات میں جو کچھ بھی نظر آجائے وہ خیالات میں ہمیشہ لہراتا رہتا ہے اور کوئی شے اسے روک نہیں سکتی۔ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے جیسے اسے مزید اندھیرے کی جانب دھکیلا جارہا ہے اور اس کے اطراف سب کچھ بخار بن کر اڑ جاتا ہے۔

مر گشن حیرت زدہ تھے مگر خوف زدہ نہیں تھے۔ انجولرا نے چلا کر کہا تھا، "ٹھہرو، بے مقصد فائر نہ کرو"۔ بوکھلاہٹ میں وہ ایک دوسرے کو زخمی کر سکتے تھے۔ ان میں بیش تر پہلی منزل کی کھڑکیوں پر چڑھ گئے۔ اس کے بعد وہ چھتی کی کھڑکیوں پر، جہاں سے وہ حملہ کرنے والوں کو حکم دے رہے تھے۔

انجولرا، کوفیراک، ژاں پروویر اور کومفیر کے ساتھی، بغیر کسی تحفظ کے، سپاہیوں اور محافظین کی صفوں کے مقابل جو پشتے پر چھا گئے تھے، عقبی مکانوں کی جانب اپنی پیٹھ کر کے کھڑے ہوگئے۔ یہ سب کچھ دوڑ بھاگ کے بغیر اس حیرت انگیز اور متانت سے ہوگیا تھا جو لڑائی سے قبل ہوا کرتا ہے۔ دونوں جانب والے ایک دوسرے کو نشانے پر رکھ کر کھڑے تھے؛ اس قدر قریب تھے کہ آواز بلند کیے بغیر آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔

جب وہ اس مرحلے پر پہنچ گئے جب چنگاریاں نکلنے والی ہوتی ہیں، گلا پوش پہنے ایک افسر نے اپنی تلوار آگے کرتے ہوئے کہا، "ہتھیار ڈال دو۔"

"فائر کرو۔" انجولرا نے کہا۔

ایک ہی لمحے میں دونوں جانب سے گولیاں چلیں، اور ہر طرف دھواں پھیل گیا۔

نہایت تیز اور دم گھونٹ دینے والا دھواں پھیل گیا، جس میں مرتے ہوئے اور زخمی کم زور آوازوں سے کراہ رہے تھے۔ دھواں کم ہوا تو دونوں جانب لڑنے والوں میں کمی ہوگئی تھی، مگر سب اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بندوقیں بھر رہے تھے۔ اچانک ایک گرج دار آواز چیختی سنائی دی،

"رُک جاؤ، ورنہ میں پشتہ اڑا دوں گا۔"

سب نے اس طرف مڑ کر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔

ماریوس مے فوشی کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا، اُس نے پاؤڈر سے بھرا پیپا اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور دھوئیں کا سہارا لیتے ہوئے، اور ایسی دھند میں جو پورے پشتے پر چھا گئی تھی، پشتے کے ساتھ ساتھ پتھر کی سلوں سے بنائے گئے پنجرے تک گیا جہاں ٹارچ لگی ہوئی تھی۔ ٹارچ کو نکالنا، اس کی جگہ پاؤڈر کا پیپا رکھنا، پتھروں کے ڈھیر کو پیپے کے نیچے جمانا، اور وہ بھی ایک قسم کی خوفناک فرماں برداری سے — ماریوس کے لیے جھکنا اور جھٹک کر اٹھنا بہت مہنگا پڑا، مگر وہ جھکا؛ کہ اب سارے نیشنل گارڈ، میونسپل گارڈ، افسران، سپاہی، پشتے کے دوسرے سرے پر جمع اس کی طرف احمقانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ پتھروں پر ٹارچ ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا، اس کا مغرور چہرہ ایک مہلک فیصلے سے روشن ہو رہا تھا، اور اس نے ٹارچ کا ٹمٹماتا رُخ اس طرف کر دیا تھا جہاں سے وہ پاؤڈر کے ٹوٹے ہوئے پیپے کو دیکھ سکتے تھے، اور چونکا دینے والی آواز بلند کر سکتے تھے:

"رُک جاؤ، ورنہ میں پشتہ اڑا دوں گا۔"

ماریوس اس پشتے پر اس وقت پہنچا تھا جب قدیم آسیب جیسا وہ اسّی سالہ اس نئے انقلاب کا تصور بن چکا تھا۔

"پشتے کو اُڑا دو۔" ایک سارجنٹ نے کہا "اور اس کے ساتھ خود بھی اُڑ جاؤ۔"

ماریوس نے پلٹ کر جواب دیا "ہاں! میں بھی اُڑ جاؤں گا"

اور اس نے ٹارچ پاؤڈر کے پیپے کی طرف پھینک دی۔

مگر اس وقت پشتے پر کوئی نہیں تھا۔ حملہ آور اپنے مُردوں اور زخمیوں کو لیے سڑک کے آخری سرے کی طرف سر کے بل فرار ہو گئے تھے اور ایک بار پھر پشتے پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

پشتہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔

❁

ژاں پرو ویر کا مقطع

سب ماریوں کے گرد جمع ہو گئے۔ کوفیراک نے اس گلے لگا لیا۔

"تم آ گئے۔"

"کیسی خوش قسمتی ہے۔" کومفیر نے کہا۔

"تم وقت پر پہنچ گئے۔" بوسے نے کہا۔

"اگر تم نہ ہوتے تو میں مر گیا تھا۔" کوفیراک نے کہنا شروع کیا۔

"اگر تم نے ہوتے تو میں بھی موت کے منہ میں چلا گیا ہوتا۔" گاوروش نے اضافہ کیا۔

"ماریوں نے پوچھا، "چیف کہاں ہے؟"

"اب، تم ہی چیف ہو۔" انجولرا نے کہا۔

صبح سے اس کا دماغ بھٹی بنا ہوا تھا؛ اس کے بعد گرد باد بن گیا۔ یہ گرد باد پہلے سے اس کے اندرون میں تھا۔ اس پر ایسا اثر ہوا تھا جیسے کہ گرد باد باہر تھا اور اس کو اڑائے لے جاتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ پہلے سے ہی زندگی بہت فاصلے پر ہے۔ وہ جگمگاتے مہینوں کے بعد اچانک وہ ایک خوف ناک کھڑی چٹان پر کھڑا ہے، کوزیٹ گم ہو چکی ہے، اور ماؤف جمہوریہ کے لیے ہلاک ہو گیا ہے، اور وہ خود سرکشوں کا رہنما بن گیا ہے — یہ سب اسے ڈراؤنے خواب کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اسے یہ دیکھنے کے لیے واقعی دماغی کوشش کرنی پڑ رہی تھی کہ اس کے اطراف جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت ہے یا کچھ اور۔ ماریوں نے زندگی کو صرف یہ معلوم کرنے کے لیے نہیں دیکھا کہ کوئی شے ناممکن سے زیادہ ممکن نہیں ہوتی، اور یہ بھی کہ جسے ہمیشہ بھانپ لینا چاہیے وہی غیر متوقع ہوتا ہے۔

اس دھند میں، جو اس کے خیالات پر چھائی ہوئی تھی، اس نے جاوید کو پہچانا نہیں جو کھمبے سے بندھا ہوا تھا، اور پشتے پر حملے کے دوران اپنا سر تک ہلا نہیں سکا تھا۔ اس نے بغاوت کو، ایک شہید کی دست برداری اور جج کے مرتبے کی نظر سے اپنے اطراف اُبلتے دیکھا۔ ماریس نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔

اس دوران حملہ کرنے والے اپنے مقصد پر جمے رہے، مارچ کرتے اور سڑک کے آخری سرے پر ہجوم کی صورت جمع ہوتے سنا، مگر اس میں کوئی مداخلت نہیں کی شاید اس لیے کہ انھیں حکم کا انتظار تھا یا وہ اس ناقابلِ تسخیر مورچے میں کود پڑنے سے پہلے کمک کے منتظر تھے۔ سرکشوں نے نگہبان مقرر کر رکھے تھے، جن میں سے کچھ، جو طب کے طالب علم تھے، زخمیوں کی نگہداشت کے لیے روانہ ہو گئے۔

انھوں نے سے دو میزوں کے علاوہ، جن میں سے ایک چھاپے اور کارتوسوں کے لیے مخصوص تھی اور دوسری پر مابوف کی میت رکھی تھی، وائن کی ساری میزیں دکان سے باہر پھینک دی تھیں۔ مے نوشی کے کمرے میں میزوں کی جگہ بیوہ ہوشیلو اور اس کی خادماؤں کے بستروں کے گدے ڈال دیے گئے تھے۔ ان گدوں پر زخمیوں کو لٹایا گیا تھا۔ اور Corinth میں رہنے والی بے چاری تین مخلوقات کا کیا حال ہوا، کسی کو پتا نہیں۔ بعد میں وہ تہہ خانے میں چھپی پائی گئی تھیں۔

ایک تکلیف دہ جذبے نے مزاحمت سے آزاد پشتے کی خوشیوں کو گہنا دیا۔

حاضری لی گئی۔ سرکشوں میں سے ایک غائب تھا۔ کون؟ سب سے پیارا۔ سب سے دلیر۔ ژاں پرووپر۔ اسے زخمیوں میں تلاش کیا گیا، وہاں نہیں تھا۔ ہلاک ہونے والوں میں تلاش کیا گیا، وہاں بھی نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ وہ قیدی بنا لیا گیا تھا۔ کومفیر نے انجولرا سے کہا، "ان کے پاس ہمارا دوست ہے؛ ہمارے پاس ان کا ایجنٹ ہے۔ کیا تم نے اس جاسوس کی موت کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ہاں!" انجولرا نے جواب دیا "مگر ہمیں ژاں پرووپر زیادہ عزیز ہے۔"

ساری باتیں مے نوشی کے کمرے میں ہو رہی تھیں، جہاں جاوید کھمبے سے بندھا ہوا تھا۔

"اچھا" کومفیر نے کہا، "میں اپنی بید کی چھڑی سے اپنا رومال باندھ لوں گا، اور اپنے آدمی سے ان کے آدمی کے تبادلے کے لیے، جنگ بندی کے پرچم کی صورت لے کر جاؤں گا۔"

"سنو!" انجولرا نے کومفیر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "سڑک کے آخری سرے پر اسلحے کا استعمال ہو رہا ہے۔"

اور انھوں نے ایک مردانہ آواز کو چیختے سنا، "فرانس زندہ باد! مستقبل زندہ باد!"

وہ پرویز کی آواز پہچان گئے۔

ایک جھٹکا ہوا اور گولی کی آواز آئی۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”انھوں نے جاوید کو قتل کر دیا۔“ کومفیر نے چیخ کر کہا۔

انجولا نے جاوید پر ایک نظر ڈالی، اور اس سے کہا، ”تمھارے دوستوں نے تمھیں گولی ماردی ہے۔“

۞

زندگی کے کرب کے بعد موت کا کرب

اس نوع کی جنگوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پشتوں پر کیے جانے والے حملے ہمیشہ سامنے سے کیے جاتے ہیں اور حملے کرنے والے عام طور پر اپنا مقام تبدیل کرنے سے پرہیز کرتے ہیں یا تو اس لیے کہ انھیں گھات لگا کر کیے جانے والے حملے کا خوف ہوتا ہے یا اس لیے کہ وہ پیچ در پیچ سڑکوں میں الجھ جانے سے خوف کھاتے ہیں۔ سرکشوں کی پوری توجہ عظیم پشتے پر مرکوز تھی، اس لیے کہ بظاہر وہ جگہ ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی ہے، اور دوبارہ جد و جہد ہمیشہ وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ماریوس نے اسی چھوٹے پشتے کے بارے میں سوچا تھا اور وہیں گیا بھی تھا۔ پشتہ سنسان تھا؛ اس کی حفاظت ایک الاؤ کر رہا تھا پتھر کی سلوں کے درمیان جس کے شعلے لرز رہے تھے۔ اس کے علاوہ Mondetour نامی کوچے، Petite Truanderie اسٹریٹ اور Cygne اسٹریٹ کی تمام شاخیں گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

معائنے کے بعد، ماریوس جب واپس جا رہا تھا تو اس نے کسی کم زور آواز کو اپنا نام لیتے سنا، ”موسیو ماریوس!“

اس نے پلٹ کر دیکھا، اس لیے کہ آواز جانی پہچانی تھی، وہی جس نے دوبار Plume اسٹریٹ کے پھاٹک سے اسے پکارا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اب وہ آواز سانس کی آواز سے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ماریوس نے ادھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ ماریوس سمجھا اس سے غلطی ہوئی ہے کہ یہ کوئی التباس تھا جس میں اس کے دماغ نے غیر معمولی حقیقتیں شامل کر دی تھیں، جو آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتا کہ اس فاصلے سے گزر جائے جس میں پشتہ واقع تھا۔

”موسیو ماریوس!“ آواز نے دوبارہ پکارا۔

اس بار اسے التباس کا شبہ نہیں ہوا اس لیے اس نے آواز کو واضح طور پر سن لیا تھا۔
"تمھارے قدموں میں۔" آواز نے کہا۔

اس نے جھک کر اندھیرے میں دیکھا؛ ایک وجود اس کے جانب خود کو گھسیٹ رہا تھا۔ وجود فرش پر رینگ رہا تھا۔ یہی تھا وہ وجود، جس نے اسے پکارا تھا۔ الاؤ کی روشنی میں اس نے اس وجود کو دیکھا، جو بلاؤز، گاڑھے مخمل کے پھٹے ہوئے پتلون میں ملبوس تھا، اس کے پیر ننگے تھے، اور اس کے اطراف کچھ اور بھی تھا جو خون سے مشابہ تھا۔ ماریوس کو ایک بے نور سر نظر آیا جو اس کی جانب اٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا، "تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"نہیں۔"

"ایپونین!"

ماریوس تیزی سے جھکا۔ دراصل یہ وہی بدقسمت لڑکی تھی۔ اس وقت وہ لڑکوں کے لباس میں تھی۔ "تم یہاں کیسے؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں مر رہی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

یہ وہ الفاظ اور واقعات ہیں جو رنجیدہ ترین دلوں کو بھی گرما دیتے ہیں۔ ماریوس چیخا، "تم زخمی ہو! ٹھہرو، میں تمھیں کمرے میں لے چلتا ہوں۔ وہ تمھارا علاج کریں گے۔ کیا تم بہت زخمی ہو؟ میں کس طرح تمھیں اٹھاؤں کہ تمھیں تکلیف نہ ہو؟ زخم کہاں لگے ہیں؟ مدد! اوہ خدایا مدد! مگر تم یہاں آئیں کیوں؟" ماریوس نے اپنا ہاتھ اس کے نیچے ڈالا تا کہ اسے اٹھا سکے۔ لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کیا میں نے تمھیں تکلیف پہنچائی ہے؟"

"تھوڑی سی۔"

"مگر میں نے تو صرف تمھارا ہاتھ چھوا تھا۔"

اس نے ماریوس کی طرف اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ہاتھ کے درمیان ماریوس کو ایک سیاہ سوراخ نظر آیا۔
"یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"چھد گیا ہے۔"

"چھد گیا ہے؟"

"ہاں۔"

"مگر کس چیز سے؟"

"بندوق کی گولی سے۔"

"کیسے؟"

"کیا تم نے وہ بندوق دیکھی تھی جو تمھارا نشانہ لے رہی تھی؟"

"ہاں!— اور ایک ہاتھ نے اسے روک لیا تھا۔"

"وہ میرا ہی ہاتھ تھا۔"

ماریوس یہ سن کر سر سے پا تک کانپ گیا تھا۔

"کیسا پاگل پن ہے، بے چاری بچی! کوئی بات نہیں؛ اگر اتنا ہی ہے تو کچھ نہیں ہے، میں تمھیں بستر پر لے جاتا ہوں۔ وہ تمھارے زخم کی مرہم پٹی کردیں گے؛ ہاتھ کے سوراخ سے کوئی مر نہیں جاتا۔"

اس نے سرگوشی میں کہا، گولی میرے ہاتھ کے پار ہوگئی تھی مگر میری گردن کو بھی پار کر گئی تھی۔ یہاں سے مجھے اٹھانا بے کار ہوگا۔ میں بتاتی ہوں کہ تم کس طرح سرجن سے بہتر میری نگہداشت کرسکتے ہو۔ میرے قریب اس پتھر پر بیٹھ جاؤ۔"

اس نے لڑکی کا کہنا مانا؛ لڑکی نے اپنا سر ماریوس کے گھٹنوں پر رکھ دیا، اور اس کی جانب دیکھے بغیر کہا، کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کتنا آرام دہ ہے یہ۔ اب مجھے کوئی دُکھ نہیں۔"

لڑکی ایک لمحے خاموش رہی، پھر کوشش سے اپنا سر موڑا اور ماریوس کی طرف دیکھا۔ موسیو ماریوس، کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں الجھن میں تھی، اس لیے کہ تم اس باغیچے میں داخل ہوئے تھے؛ یہ احمقانہ بات تھی، اس لیے کہ وہ میں ہی تھی جس نے تمھیں وہ گھر دکھایا تھا؛ اور پھر، مجھے خود سے کہنا چاہیے تھا کہ تم جیسا نوجوان آدمی.... "وہ رکی، دماغ میں ہونے والی تبدیلیوں کو جو یقینی طور پر اس کے دماغ میں ہو رہی تھیں، ایک طرف رکھتے ہوئے، غم ناک انداز میں مسکراتے ہوئے کہا، "تم تو مجھے بدصورت سمجھتے تھے، ہے نا؟" اور پھر بولی، "تم دیکھ رہے ہو کہ تم ہار چکے ہو! اب کوئی بھی اس پشتے سے بچ کر نکل نہیں سکے گا۔ وہ میں ہی تھی جو تم کو یہاں لے آئی تھی۔ تم بھی مرنے والے ہو۔ میں شرط لگا سکتی ہوں۔ اس کے باوجود جب میں نے تم کو نشانہ بنتے دیکھا تو بندوق کی نالی کے سامنے اپنا ہاتھ کردیا تھا۔ کیسی انوکھی بات تھی، مگر اس لیے کہ میں تم سے پہلے مرجانا چاہتی تھی۔ جب مجھے وہ گولی لگی میں گھسٹتی ہوئی یہاں آگئی۔ کسی نے دیکھا نہیں، کسی نے اٹھایا نہیں، میں تمھارا انتظار کر رہی تھی؛ میں نے خود سے کہا تھا، اچھا! تو وہ یہاں آ نہیں رہا ہے۔ کاش میں جان سکتی۔ میں نے اپنا بلاؤز پھاڑ ڈالا، مجھے دُکھ ہوا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ تم کو وہ دن یاد ہے

جب میں تمھارے کمرے میں داخل ہوئی تھی، جب میں نے خود کو تمھارے آئینے میں دیکھا تھا، اور جب میں اس دھوبن کے قریب بولیوارڈ میں تمھارے پاس آئی تھی؟ پرندے کس طرح چہچہا رہے تھے۔ یہ بہت دن پہلے کی بات ہے۔ تم نے مجھے سو سو دیے تھے، اور میں نے تم سے کہا تھا، 'مجھے تمھاری دولت کی ضرورت نہیں۔' شاید تم نے وہ سکہ واپس اٹھا لیا تھا؟ تم دولت مند نہیں۔ میں نے تم سے سکہ اٹھا لینے کے لیے کہا نہیں تھا۔ سورج تیزی سے چمک رہا تھا، اس وقت سردی نہیں تھی۔ تم کو یاد ہے نا، موسیو ماریوس؟ اوہ! آج میں کتنی خوش ہوں۔ ایک دن سب مر جانے والے ہیں۔"

وہ پاگل ہو رہی تھی، بہت دل شکستہ تھی۔ اس نے اپنا بلاؤز پھاڑ ڈالا تھا اور اپنے گلے کو برہنہ کر دیا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس نے اپنا سوراخ شدہ ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ لیا تھا، جہاں ایک اور سوراخ تھا، اور جہاں سے کبھی کبھی خون ابلنے لگتا تھا، جیسے کسی مصنوعی سوراخ سے وائن کا فوارہ نکل پڑے۔

ماریوس اس بدنصیب مخلوق کو رحم کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اوہ!" اس نے پھر کہنا شروع کیا، "یہ پھر آ رہا ہے، میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔" اس نے اپنا بلاؤز پکڑ لیا، مزید پھاڑ ڈالا؛ فرش پر پڑے اس کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے۔

اسی وقت پشتے سے گاؤروش کی بندوق کے گھوڑے کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس لڑکے نے میز پر چڑھ کر اپنی بندوق بھری تھی، اور وہ خوش خوش وہی گیت گا رہا تھا، جو ان دنوں بہت پسند کیا جاتا تھا:

"لافاییت کو دیکھتے ہی،
سارے سپاہی چیخ پڑے:
آؤ بھاگیں، آؤ بھاگیں!
آؤ بھاگ چلیں"

ایپونین اٹھی اور گانا سننے لگی؛ پھر اس نے سرگوشی میں کہا، "یہ وہی ہے۔"

اور ماریوس سے مخاطب ہو کر کہا، "یہیں کہیں میرا بھائی موجود ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے دیکھ لے۔ وہ بہت ناراض ہوگا۔"

"تمھارا بھائی؟" ماریوس نے سوال کیا۔ ماریوس اس وقت دل ہی دل میں اپنے باپ کی جانب سے تھن آردیے کے بارے میں سوچتے ہوئے فرائض پر غور کر رہا تھا، "تمھارا بھائی؟ کون ہے؟"

"وہی چھوٹا شخص۔"

"وہ جو گانا گا رہا ہے؟"

"ہاں۔"

ماریوس اپنی جگہ سے اٹھا۔

"اوہ! ابھی جاؤ نہیں۔" اس نے کہا "زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

اب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، مگر اس کی آواز بہت دھیمی تھی، ہچکیوں کے درمیان ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ وقفے وقفے سے موت کی جھجن جھناہٹ اسے روک رہی تھی۔ اس نے عجیب انداز میں کہا "سنو! میں تم سے دھوکا نہیں کرنا چاہتی۔ میری جیب میں ایک خط ہے جو تمھارے نام ہے۔ ڈاک میں ڈالنے کے لیے کہا گیا تھا، مگر میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ خط تم تک پہنچے۔ شاید تم مجھ سے ایک بار پھر ناراض ہو جاؤ گے! اپنا خط لے لو۔"

اس نے اپنے لرزتے سوراخ شدہ ہاتھ سے ماریوس کا ہاتھ پکڑا، مگر اب اسے تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ماریوس کا ہاتھ اپنے بلاؤز کی جیب کی طرف بڑھایا۔ ماریوس کو جیب میں کچھ کاغذ سا محسوس ہوا۔

"نکال لو۔"

ماریوس نے خط لے لیا۔

ایپونین نے اظہار اطمینان کا اشارہ کیا۔

"اب میری خاطر، مجھ سے وعدہ کرو....." اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔

"کیا؟" ماریوس نے سوال کیا۔

"پہلے وعدہ کرو، مجھ سے!"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"وعدہ کرو کہ جب میں مر جاؤں گی تو تم میرے ماتھے کو بوسہ دو گے ــــ مجھے محسوس ہوگا۔"

ایک بار پھر اس نے اپنا سر ماریوس کے گھٹنوں پر رکھ دیا، اور اس کی پلکیں بند ہو گئیں۔ ماریوس سمجھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی ہے۔ ایپونین بالکل ساکت رہی۔ ابھی ماریوس اس کی نیند کو ہمیشہ کی نیند سمجھ رہا تھا کہ اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں، جن میں موت کی گہرائی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایسے لہجے میں کہا جس کی مٹھاس خود بتا رہی تھی کہ وہ دوسری دنیا میں جانے والی ہے، "ارے ہاں! موسیو ماریوس! میرا خیال ہے کہ میں بھی تم سے تھوڑی بہت محبت کرتی تھی۔"

اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

۞

فاصلوں کی پیمائش کا ماہر، گاوروش

ماریوس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس نے سیسے جیسے رنگ کی پیشانی پر بوسہ دیا، جس پر پسینہ موتیوں کی طرح جم گیا تھا۔ یہ کوزیٹ سے بے وفائی نہیں تھی۔ یہ ایک شریفانہ اور غم زدہ الوداع تھی ایک بدقسمت روح کے لیے۔

یہ واقعہ کسی زلزلے سے کم نہیں تھا کہ اسے ایپونین نے ایک خط دیا تھا۔ اسے فوراً ہی محسوس ہو گیا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔ وہ خط کو پڑھنے کے لیے بے چین تھا۔ انسان کا دل بھی عجیب شے ہوتا ہے۔ اس بدقسمت بچی کی آنکھ بند ہوتے ہی اس نے خط کھولنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

ماریوس نے ایپونین کو آہستہ سے فرش پر لٹا دیا، اور وہاں سے چلا گیا۔ کسی شے نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اس میت کی موجودگی میں وہ خط پڑھ نہیں سکے گا۔ وہ مے نوشی کے کمرے میں جلتی شمع کے قریب گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پرچہ تھا، جو کسی خاتون کی نفاست سے تہہ کیا اور بند کیا گیا تھا۔ پتا بھی نسوانی تحریر میں تھا، جو یہ تھا:

برائے موسیو ماریوس پول مرسی،

معرفت موسیو کوفیراک،

Verrerie سٹریٹ، مکان نمبر 16

ماریوس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگا:

میرے پیارے!

افسوس کہ میرا باپ فوراً سفر کرنے پہ اصرار کر رہا ہے۔ ہم اس شام پیرس

میں l'Homme Arme اسٹریٹ کے مکان نمبر 7 میں ہوں گے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ہم انگلستان چلے جائیں گے۔ کوزیٹ۔ 4 جون۔"

ان کی محبت میں اتنی معصومیت تھی کہ ماریوس کوزیٹ کی تحریر بھی نہیں پہچانتا تھا۔

پھر جو کچھ ہوا تھا، چند الفاظ میں بیان کیا جا رہا ہے۔

سارے مسئلے کی جڑ ایپونین تھی۔ جون کی تیسری تاریخ کی شام کے بعد ایپونین نے ایک دہرا منصوبہ بنایا، کوزیٹ کے والد اور پلومے اسٹریٹ کے بدمعاشوں کے منصوبوں کو شکست دینا، اور کوزیٹ اور ماریوس میں جدائی کرانا۔ اسے جوں ہی کوئی اوباش لڑکا نظر آیا اسے اپنے نسوانی لباس میں ملبوس ہو کر لوگوں کو ہنسانے کا خیال پیش کیا، اور خود اس کا مردانہ لباس پہن کر بھیس بدل لیا۔ یہی تھی وہ جس نے ژاں ولژاں کو Champ de Mars میں خبردار کیا تھا کہ "اپنا گھر چھوڑ دو۔" ژاں ولژاں گھر واپس پہنچا تو کوزیٹ سے کہا تھا کہ "ہم آج شام l'Homme Arme اسٹریٹ، یو سے کے گھر چلے جائیں گے۔ اگلے ہفتے ہم لندن میں ہوں گے۔" کوزیٹ اس غیر متوقع ضرب سے بہت پریشان ہوئی، اور فوراً ہی چند سطریں ماریوس کے لیے تحریر کیں، مگر یہ خط ڈاک میں کس طرح ڈالا جاتا؟ وہ کبھی گھر سے باہر اکیلی نہیں گئی تھی۔ اگر توسا کو یہ کام سونپتی تو وہ فوشلووں کو بتا دیتی اور وہ پریشان ہو کر یہ خبر یقیناً ژاں ولژاں تک پہنچا دیتی۔ اس حیص بیص میں اتفاق سے اُسے باڑ کے ذریعے ایپونین نظر آ گئی جو لڑکوں کے لباس میں ملبوس تھی، اور جو ہمہ وقت باغیچے کے اطراف کسی تلاش میں گھومتی رہتی تھی۔ کوزیٹ نے "اس نوجوان دست کار" کو بلایا، پانچ فرانک اور ایک خط اس کے ہاتھ پر رکھا اور کہا، "یہ خط فوراً اس پتے پر پہنچا دو۔" ایپونین نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اگلے دن جون کی چھٹی تاریخ کو وہ ماریوس کی تلاش میں کوفیراک کے گھر گئی، خط پہنچانے کے لیے نہیں، صرف اسے دیکھنے کے لیے — وہ عمل جو محبت کرنے اور حسد کرنے والے کو مجبور کر دیتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اس نے ماریوس کا انتظار کیا یا کم از کم کوفیراک کا، اور وہ بھی فقط دیکھنے کے لیے تھا۔ کوفیراک نے اسے بتایا تھا کہ "ہم لوگ پشتے پر جانے والے ہیں۔" اور اس کے ذہن میں اچانک اس قسم کی موت میں کود پڑنے کا خیال ابھرا، جو اقدام وہ کسی اور جگہ بھی کر سکتی تھی، ساتھ ہی ماریوس کو بھی اس میں جھونک دیتی۔ ایپونین کوفیراک کے پیچھے چل پڑی اور اس جگہ کی نشان دہی کر لی جہاں پشتہ تعمیر کے مراحل میں تھا۔ چوں کہ ماریوس کو کوئی تنبیہ نہیں ملی تھی، اور چوں کہ ایپونین نے ماریوس کا خط روک لیا تھا، اسے یقین تھا کہ ماریوس شام کو پھر ملاقات کی اس جگہ ضرور جائے گا۔ اس نے بھی وہیں جانے کا فیصلہ کر لیا، اور ماریوس کا انتظار کیا۔ اس نے

اپنے دوستوں کے نام سے ماریوس کو سرکشوں کی رہنمائی کرنے کے اپیل بھی بھجوائی تھی جو، اس کے خیال کے مطابق، اسے پیشتے پر ضرور لے جائے گی۔ اس نے ماریوس کی نا امیدی پر انحصار کیا تھا، جو کوزیٹ کے نہ ملنے پر اسے ہوگی۔ ایپونین کا منصوبہ پورا ہوگیا۔ وہ خود بھی Chanvrerie اسٹریٹ پہنچ گئی۔ اور وہاں جو کچھ ہوا، قاری ابھی دیکھ چکا ہے۔ ایپونین ان حاسدروں کی الم ناک خوشیوں کی موت مری جو معشوقوں کو بھی اپنی موت میں گھسیٹ لے جاتی ہیں، اور کہتی ہیں، ''کوئی اسے نہیں پا سکے گا۔''

ماریوس نے کوزیٹ کے خط کو بوسوں سے بھر دیا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ ابھی اسے مرنا نہیں چاہیے۔ پھر اس نے خود سے کہا کہ ''وہ تو جا رہی ہے۔ اس کا والد اسے انگلستان لے جا رہا ہے، اور میرا نانا اس سے شادی کی اجازت دینے سے انکار کر رہا ہے۔ ہماری تقدیروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے والی۔'' ماریوس جیسے خواب دیکھنے والوں پر ملال کے حملے ہوتے رہتے ہیں اور نتیجہ نا امیدی ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں زندہ رہنے کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوا کرتی ہے؛ موت سب کچھ جلد آسان کر دیتی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ اسے دو فرائض پورے کرنے ہیں: کوزیٹ کو اپنی موت کی اطلاع دینا اور اسے وداعی پیغام دینا، اور ایپونین کے بھائی اور تھنارڈیے کے بیٹے، بے چارے لڑکے کو تباہی سے بچانا جس کی تیاری ہو رہی تھی۔

اس کے پاس ایک جیبی کتاب تھی؛ وہی جس میں اس نے کوزیٹ سے کہے جانے والے محبت کے سارے خیالات لکھ رکھے تھے۔ اس میں سے اس نے ایک صفحہ پھاڑا اور پنسل سے چند سطریں لکھ دیں:

''ہماری شادی ناممکن تھی۔ میں نے اپنے نانا سے اجازت مانگی، اس نے انکار کر دیا؛ نہ میرے پاس کچھ ہے، نہ تمھارے پاس۔ میں فوراً تم سے ملنے آیا تھا، تم وہاں نہیں تھیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے کیا وعدہ کیا تھا۔ میں اس پر قائم ہوں۔ میں مر رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ جب تم یہ رقعہ دیکھو گی تو میری روح تمھارے قریب ہوگی، اور تم مسکراؤ گی۔''

خط بند کرنے کے لیے اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ ماریوس نے اس کاغذ کو چار بار تہہ کیا، اور اس پر پتا لکھ دیا:

بنام: میدموذیل کوزیٹ فوشلواں
بہ مکان: موسیو فوشلواں، نمبر 7

l'Homme Arme اسٹریٹ

خط کو تہہ کرنے کے بعد وہ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے سوچا، خط کو جیب سے ایک بار پھر نکالا، اسے کھولا، اسی پنسل سے مزید چار سطریں لکھ دیں:

میرا نام ماریوس پون مرسی ہے۔ میری میت میرے نانا کے پاس، موسیو جلیر نورما، مکان نمبر 6، Filles-du-Calvaire اسٹریٹ، Marais پہنچا دینا۔"

اس نے کتاب جیب میں واپس رکھی، اور Gavroche کو بلایا۔

وہ لاوارث لڑکا، ماریوس کی آواز سنتے ہی خوش خوش دوڑا آیا اور اس کے قریب پہنچا۔

"کیا تم میرے لیے کچھ کرو گے؟"

"جو بھی کہو۔" گاوروش نے جواب دیا، "اگر میں تمھارے کام نہ آیا تو کس کام کا؟"

"تم یہ خط دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"یہ لو اور پشتے کو فوراً چھوڑ دو۔" (گاوروش نے اپنا کان کھجلانا شروع کر دیا تھا)۔ کل صبح تم یہ خط اس پتے پر میڈموزیل کوزیٹ کو پہنچا دینا:

بنام میڈموزیل کوزیٹ،

بر مکان موسیو فو شلووں،

نمبر 7، l'Homme Arme اسٹریٹ۔"

بہادر لڑکے نے جواب میں کہا، "اچھا مگر اس دوران پشتے پر قبضہ ہو جائے گا اور میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

حملہ کرنے والوں نے پشتے والوں کو جو تازہ مہلت دی، وہ طویل کر دی گئی تھی۔ یہ وقفہ ان وقفوں میں سے تھا جو شبینہ لڑائیوں میں اکثر ہوتے رہتے ہیں، جن کے بعد ہمیشہ شدت میں اضافہ ہو جایا کرتا ہے۔

"اچھا" گاوروش نے کہا، "اور اگر میں کل جاؤں اور تمھارا خط لیتا جاؤں تو؟"

"بہت دیر ہو جائے گی۔ امکان ہے کہ پشتے کا محاصرہ کر لیا جائے گا، تمام سڑکیں بند کر دی جائیں گی، اور تم نکل نہیں سکو گے۔ فوراً چلے جاؤ۔"

گاوروش کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا، وہ پس و پیش میں کھڑا مایوسی کے عالم میں اپنا کان کھجلا رہا تھا۔" اور پھر اس نے پرندوں کی سی حرکت سے، جو اس کی عادت تھی، وہ خط اُچک لیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا، اور اس نے Mondetour کی گلی سے دوڑنا شروع کر دیا۔

گاؤروش کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا، جس کے باعث اس نے یہ فیصلہ کیا تھا، مگر ماریوس کے خوف سے اس کا تذکرہ نہیں کیا، مبادا وہ اس پر اعتراض کر دے۔

وہ خیال یہ تھا:

"ابھی مشکل سے آدھی رات ہوئی ہے، l'Homme Arme اسٹریٹ زیادہ دور نہیں؛ میں ابھی جاؤں گا، خط دوں گا اور وقت سے پہلے واپس پہنچ جاؤں گا۔"

پیٹ کا ہلکا بلا نوش

روح کی سرکشی کے مقابلے میں شہر کی کپکپی کیا ہوتی ہے؟ آدمی کی گہرائی عوام کی گہرائی سے زیادہ ہوتی ہے۔ عین اس وقت ژاں ولواں ایک دہشت ناک ہلچل کا شکار تھا۔ اس کے خلاف ہر قسم کی خلیج کے منہ کھل گئے تھے۔ وہ بھی پیرس ہی کی طرح لرز رہا تھا جو ایک مبہم اور خوف ناک انقلاب کے کنارے پر تھا۔ اس کے آنے کے لیے چند لمحے کافی تھے۔ اچانک اس پر اداسی کا غلبہ ہو گیا۔ اس کے اور پیرس کے بارے میں کہا جا سکتا تھا: "دو اصول ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ نیکی کا فرشتہ اور بدی کا فرشتہ پاتال کے پُل پر ایک دوسرے کو پکڑ لینے والا ہے۔ ان میں سے کون دوسرے کو نیچے پھینک دے گا؟ یہ دن کس کی فتح کا دن ہو گا؟"

اسی پانچویں جون سے پہلے کی شام ژاں ولواں کوزیت اور توسا کے ہمراہ l'Homme Arme اسٹریٹ منتقل ہو گیا تھا۔ تبدیلی اس کے انتظار میں تھی۔

کوزیت نے مزاحمت کی کوشش کے بغیر ہی پلومے اسٹریٹ نہیں چھوڑی تھی۔ جب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں، پہلی بار کوزیت کی مرضی اور ژاں ولواں کی مرضی واضح ہوئی تھی، جو ٹکرائی تو نہیں مگر ایک دوسرے کے خلاف ضرور تھی۔ ایک جانب اعتراضات تھے تو دوسری جانب کرختگی تھی۔ اس اچانک تنبیہ نے کہ "اپنا گھر چھوڑ دو" جو ژاں ولواں کو کسی اجنبی نے کی تھی اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کو تلاش کیا گیا ہے اور اس کا پیچھا بھی کیا گیا ہے۔ کوزیت کے پاس راضی ہونے کے سوا چارہ نہ تھا۔

دونوں اپنے لب ہلائے بغیر، ایک لفظ کہے بغیر l'Homme Arme اسٹریٹ منتقل ہو گئے؛ دونوں کی اپنی اپنی مصروفیتیں تھیں؛ ژاں ولواں اتنا پریشان تھا کہ اسے کوزیت کی اداسی نظر

نہیں آئی، اور کوزیٹ اتنی اداس تھی کہ اسے کو ژاں ولژاں کی پریشانی کا احساس نہیں ہوا۔

ژاں ولژاں تُوسا کو اپنے ساتھ لے گیا؛ وہ کام جو اس نے ماضی میں اپنی غیر موجودگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ پلومے اسٹریٹ واپس نہیں آئے گا، اور نہ وہ تُوسا کو وہیں چھوڑ سکتا تھا، نہ اسے اپنے راز میں شریک کر سکتا تھا۔

اس کے علاوہ، اس کا خیال تھا کہ تُوسا اس کی وفادار اور قابلِ اعتبار بھی تھی۔ مالک اور خادم کے درمیان بے وفائی تجسس سے شروع ہوا کرتی ہے۔ اب تُوسا، اگرچہ ژاں ولژاں کی خادمہ رہنے والی تھی، راز جوئی نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی دیہاتی بولی میں ہکلاتی کر کہا کرتی تھی، ''میں ایسی ہی بنی ہوں؛ میں اپنا کام کرتی ہوں؛ اس کے علاوہ مجھے کسی معاملے سے سروکار نہیں۔''

پلومے اسٹریٹ سے روانگی کے وقت، جو تقریباً فرار تھا، ژاں ولژاں اپنے ساتھ کچھ نہیں لے گیا تھا، سوائے ایک چکنائی سے بھرے سفری تھیلے کے جسے کوزیٹ اپنے وجود کا حصہ سمجھتی تھی۔ بھرے صندوقوں کے لیے قلیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور قلی گواہ ہو جاتے ہیں۔ کرایے کی ایک گاڑی Babylone اسٹریٹ پر طلب کی گئی تھی اور وہ اسی پھاٹک سے روانہ ہوئے تھے۔

بڑی مشکل سے تُوسا کو کچھ چادریں، کچھ کپڑے اور سنگھار کا کچھ سامان ساتھ لے جانے کی اجازت ملی تھی۔ کوزیٹ اپنے ساتھ اپنا تھیلا اور اپنی نم نوٹس کتاب لے گئی تھی۔

روانگی کے راز کو خفیہ رکھنے اور تنہائی کو بڑھانے کی غرض سے ژاں ولژاں نے شام کے وقت اپنا بنگلہ چھوڑنے کا اہتمام کیا، جس کے باعث کوزیٹ کو ماریس کے نام خط لکھنے کا وقت مل گیا۔ وہ l'Homme Arme اسٹریٹ اس وقت پہنچے جب پوری طرح رات ہو چکی تھی۔

وہ خاموشی سے سونے چلے گئے۔

l'Homme Arme اسٹریٹ کا مکان، دوسری منزل پر، عقبی صحن کی طرف تھا، جس میں دو کمرے سونے کے لیے تھے، کھانے کا ایک کمرہ تھا، کھانے کے کمرے سے ملا باورچی خانہ تھا۔ اوپری منزل میں ایک کمرہ تھا جس میں تہہ ہو جانے والا پلنگ تھا جو تُوسا کے حصے میں آیا۔ کھانے کا کمرہ بغلی کمرے کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، اور سونے کے دونوں کمروں کو مکان کے بقیہ حصے سے الگ بھی کرتا تھا۔ مکان کے ساتھ ضروری برتن وغیرہ بھی فراہم کیے گئے تھے۔

لوگ اسی احمقانہ انداز میں اعتبار دوبارہ حاصل کر لیتے ہیں جس میں وہ اعتبار کھو دیتے ہیں؛ انسانی فطرت اسی طرح بنی ہے۔ ژاں ولژاں ابھی l'Homme Arme اسٹریٹ پہنچا ہی تھا کہ اس کی پریشانی کم ہو گئی، بلکہ کافی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ ایسی سکون پہنچانے والی جگہیں بھی

ہوتی ہیں جو دماغ میں میکانکی انداز میں کام کرتی ہیں۔ جیسے اندھیری گلی، جیسے امن پسند مکین۔ پیرس کی اس گلی میں ژاں ولیواں کو ایک ناقابلِ بیان اچھوت جیسی خاموشی کا تجربہ ہو۔ گلی اتنی تنگ تھی کہ اس کی دونوں جانب کھمبوں میں ایک شہتیر اڑا کر گاڑیوں کا راستہ بند کر دیا گیا تھا؛ گلی ہلچل سے پُر شہر کے درمیان گونگی بہری جیسی تھی جس میں دن کے وقت بھی روشنی کم کم ہوتی تھی، جو بقول شخصے، صدیوں پرانے مکانوں کی دو قطاروں کے درمیان رسلِ جذبات کے قابل نہیں تھی، جس میں قدیم لوگ اپنا امن برقرار رکھتے تھے۔ وہاں ایک قسم کی بے حرکت فراموشی کا احساس ہوتا تھا۔ ژاں ولیواں نے ایک بار پھر سکون کا سانس لیا۔ وہاں اسے کون پا سکے گا؟

اس کا پہلا کام ناقابلِ علاحدگی کو اپنے ساتھ رکھنا تھا۔

وہ اچھی طرح سویا۔ رات دانش مندی ساتھ لاتی ہے؛ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رات سکون پہنچاتی ہے۔ اگلی صبح وہ اٹھا تو اچھے موڈ میں تھا۔ اسے کھانے کا کمرہ اچھا لگا، حالاں کہ کچھ ڈراؤنا سا تھا؛ ایک گول قدیم میز؛ ایک طویل سائیڈ بورڈ جس پر آگے کی طرف جھکا ترچھا آئینہ نصب تھا؛ ایک خستہ حال آرام کرسی، کئی معمولی قسم کی کرسیاں تھیں جن پر تُوسا کے بکس لدے تھے۔ ایک بکس میں ژاں ولیواں کی نیشنل گارڈ کی وردی تھی جو ایک شگاف سے نظر آ رہی تھی۔

کوزیت نے تُوسا سے اپنے کمرے میں کچھ شوربا لانے کے لیے کہا اور دوسرے دن شام تک باہر نظر نہیں آئی تھی۔ پانچ بجے کے قریب تُوسا نے، جو آ جا رہی تھی اور اپنے چھوٹے موٹے کام نمٹا رہی تھی، میز پر مرغی کا ٹھنڈا گوشت رکھ دیا تھا۔ کوزیت نے والد کی تعظیم کی خاطر جس پر صرف ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد کوزیت نے، دردِ سر کے بہانے، ژاں ولیواں سے اجازت لی اور خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ ژاں ولیواں کو کھل کر بھوک لگی تھی۔ اس نے مرغی کا ایک بازو کھایا، اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں؛ رفتہ رفتہ اس کا سکون واپس آ رہا تھا، اور وہ پوری طرح اپنے حواس میں واپس آ گیا تھا۔

کھانے کے بارے میں گفتگو کے دوران اس نے دو یا تین بار تُوسا کو پریشانی کے عالم میں اور ہکلاتے ہوئے کہتے سنا تھا، ''موسیو، کچھ گڑبڑ ہے۔ شاید پیرس میں لڑائی ہو رہی ہے۔'' مگر ژاں ولیواں کے خیالات کا ہجوم اسے گھیرے ہوئے تھا؛ اس نے تُوسا کی بات پر غور نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے تُوسا کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور دروازے سے کھڑکی اور کھڑکی سے دروازے کی جانب ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس میں سکون کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔

اس خاموشی کے ساتھ کوزیت، جو اس کی واحد پریشانی تھی، اس کے خیالات میں واپس

آ گئی تھی۔ وہ اس کے دردِ سر سے ذہنی طور پر کچھ پریشان ہوا مگر ایک نوجوان لڑکی کی ناراضی کے دورے وقتی بادل کی طرح ہوتے ہیں ایک یا دو دن میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تھا؛ وہ مستقبل پر غور کر رہا تھا، اور جیسا کہ اس کی عادت تھی، وہ یہ سب سوچ کر لطف لے رہا تھا۔ بہر حال، اسے اپنی خوش حال زندگی کو اپنی راہ پر واپس آنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر بات ناممکن معلوم ہوتی ہے، اور کبھی سب کچھ آسان معلوم ہونے لگتا ہے؛ ژاں ولژاں اس وقت اچھے وقت سے گزر رہا تھا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اچھا وقت برے وقت کی جگہ لے لیتا ہے، اور تواتر کے قانون کے مطابق، رات کے بعد دن آ جاتا ہے، جسے معمولی قسم کے دماغ والے anti thesis کہتے ہیں۔ اس پُرسکون سڑک پر پہنچ کر جہاں اس نے اب پناہ لی تھی، ژاں ولژاں نے وہ سب کچھ پرے ڈال دیا، جو ماضی میں اسے پریشان کر رہا تھا۔ چوں کہ وہ بہت پریشانیوں سے گزر چکا تھا اب اسے آسمان کچھ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ پلومے اسٹریٹ سے کسی پیچیدگی یا واقعے کے بغیر نکل آنا اچھا اقدام تھا۔ شاید چند ماہ کے لیے ملک چھوڑ دینا اور لندن چلے جانا زیادہ بہتر ہوگا۔ اب وہ جانے والے ہیں۔ وہ فرانس ہو یا انگلستان، کوزیٹ بھی اس کے ساتھ ہو تو کیا فرق پڑے گا؟ کوزیٹ اس کے لیے ایک قوم کی مانند تھی۔ اس کی خوشیوں کے لیے کوزیٹ ہی کافی تھی۔ وہ خیال کہ شاید وہ کوزیٹ کے لیے کافی نہیں تھا جو اس کے بخار اور بے خوابی کا باعث ہوتا تھا، اب ذہن سے غائب ہو چکا تھا۔ اس کے لیے اب ماضی کی تمام پریشانیاں ختم ہو چکی تھیں، اب وہ پوری طرح خوش امیدی کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ کوزیٹ اس کے پہلو میں تھی اور اسے اپنی محسوس ہو رہی تھی؛ یہ ایک التباسِ بصری تھا ہر ایک جس تجربے سے کبھی نہ کبھی گزرتا ہے۔ اس نے انگلستان روانگی کے لیے اپنے ذہن میں ہر قسم کی آسودگی کا انتظام کر لیا تھا اور اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ جب چاہے ان آسودگیوں سے بہرہ مند ہو سکے گا۔

چہل قدمی کے لمبے لمبے قدم اٹھانے کے دوران اچانک اسے کوئی حیرت انگیز شے دکھائی دی۔ آگے کی طرف جھکے ہوئے آئینے میں، جو سنگھار کی میز پر نصب تھا اسے چار سطریں نظر آ گئیں:

"میرے پیارے! افسوس کہ میرا باپ فوراً سفر کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔ ہم اس شام پیرس میں l'Homme Arme اسٹریٹ کے مکان نمبر 7 میں ہوں گے۔ ایک ہفتے کے اندر ہم انگلستان چلے جائیں گے۔ کوزیٹ۔ 4 جون۔"

ژاں ولژاں پریشان ہو کر رُک گیا۔

کوزیت نے یہاں پہنچ کر اپنی نم پوش کتاب سائیڈ بورڈ پر ترچھے آئینے کے سامنے رکھ دی تھی، اور اپنے دُکھ بھرے رنج کے عالم میں نہ صرف اس کتاب کو بالکل بھول گئی تھی، بلکہ اس کو بند کرنا بھی یاد نہیں رہا تھا، کہ وہ صفحہ بھی کھلا تھا جسے اس نے ان چند سطروں پر مشتمل خط کو خشک کرنے کے لیے استعمال کیا، جو اس نے پلومے اسٹریٹ کے اس دست کار لڑکے کو ڈاک میں ڈالنے کے لیے دیا تھا۔ یہ تحریر روشنائی خشک کرنے والے کاغذ پر صاف نظر آ رہی تھی۔

آئینے میں اس تحریر کا عکس نظر آ رہا تھا۔

نتیجہ وہی تھا جسے جیومیٹری میں symmetrical image کہتے ہیں، یعنی وہ تحریر جو روشنائی نم پوش کاغذ پر الٹی نظر آ رہی تھی، آئینے میں اس کا عکس سیدھا ہو گیا تھا، اور ژاں ولژاں اسے پڑھ سکتا تھا! اب ژاں ولژاں کی نظروں میں کوزیت کا وہ خط تھا جو اس نے پچھلی شام ماریوس کے نام تحریر کیا تھا۔

یہ بات سادہ مگر جاں کاہ تھی۔

ژاں ولژاں آئینے کی طرف بڑھا۔ اس نے وہ چار سطریں دوبارہ پڑھیں، مگر اسے ان پر یقین نہیں آیا۔ یہ سطریں روشنی کے جھماکے کی طرح تھیں۔ یہ ایک فریبِ نظر تھا! یہ ناممکن تھا! ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کے تصورات زیادہ واضح ہو رہے تھے؛ وہ کوزیت کی نم پوش کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا، اور اس پر حقیقت واضح ہونے لگی تھی۔ اس نے نم پوش اُٹھایا اور کہا، "اچھا تو یہ اس طرح ہوا ہے۔ اس نے بے چینی سے ان چار سطروں پر غور کیا جن کے الٹے نقوش نم پوش صفحے پر بن گئے تھے۔ یہ نقوش چوں کہ اُلٹے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ تب اس نے خود سے کہا، "مگر اس سے تو کچھ ظاہر نہیں ہوتا! اس پر تو کچھ لکھا نہیں ہے۔" اور پھر اس نے ناقابلِ بیان سکھ کا سانس لیا۔ ایسا کون سا شخص ہوگا جسے خوف ناک لمحات میں اس قسم کی احمقانہ خوشیاں نہیں ملی ہوں گی۔ انسان اور وقت کبھی ہتھیار نہیں ڈالتا جب تک کہ وہ ہر قسم کے التباسات آزما نہیں لیتا۔

وہ نم پوش ہاتھ میں اُٹھائے اپنی احمقانہ خوشی سے اس پر غور کر رہا تھا، اور اس التباس پر ہنسنے ہی والا تھا جس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک بار پھر آئینے پر پڑی، اور ایک بار پھر اسے وہی منظر نظر آیا۔ وہ چار سطریں بے رحم صفائی سے اس کے سامنے تھیں۔ اس بار کوئی سراب نہیں تھا۔ کسی منظر کا دوبارہ نظر آنا سراب نہیں حقیقت ہوتا ہے؛ یہ منظر نظر اور ذہن دونوں کے لیے بالکل صاف تھا۔ وہ تحریر اب آئینے میں اپنی اصل صورت میں دکھائی دے رہی تھی۔

ژاں ولژاں لڑکھڑا گیا، نم پوش اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کھانے کی میز کے قریب پرانی آرام کرسی پر گر پڑا تھا، اور اس کی بے نور آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ اس نے خود سے کہا کہ یہ بالکل سادہ سی بات ہے، کہ دنیا کی روشنی ہمیشہ کے لیے گہنا گئی ہے، اور یہ بھی کہ یہ تحریر کوزیٹ نے کسی شخص کے لیے لکھی ہے۔ پھر اس نے اپنے نفس کی آواز سنی جو ایک بار پھر خوف زدہ ہو گیا تھا اور اداسی میں دبی دبی آواز میں چیخ رہا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا، ''ذرا اس کتے کو شیر سے چھیننے کی کوشش کیجیے جو اس کے پنجرے میں موجود ہے!''

حیرت اور غم انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت تک کوزیٹ کا خط ماریوس تک پہنچا نہیں تھا؛ خط کو ماریوس تک پہنچنے سے پہلے ہی اتفاق نے اسے ژاں ولژاں تک پہنچا دیا تھا۔ اس دن تک ژاں ولژاں کو اس نوعیت کا امتحان کبھی در پیش نہیں ہوا تھا۔ اسے خوف سے پُر شبہوں کا سامنا ہوا تھا؛ اس پر ہر طرح کا بد قسمت تشدد ہو چکا تھا، ہر طرح کا انتقام اور سماجی ملامت سے مسلح مقدر کی خوں خواری اس پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ جب بھی ضرورت ہوئی اس کو شدت سے قبول کیا گیا تھا؛ اس نے ایک اصلاح شدہ انسان کی طرح اپنی حرمت قربان کر دی تھی، اپنی آزادی سلب ہو جانے دی تھی، اپنا سر خطرے میں ڈال دیا تھا، سب کچھ کھو دیا تھا، ہر قسم کا دکھ اٹھایا تھا، اور اس حد تک غیر جذباتی اور لاپروا رہا تھا کہ اس کا وجود اسے شہید کی طرح اپنے آپ سے الگ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا ضمیر جو مقدر کے ہر حملے کا عادی تھا، ہمیشہ کے لیے ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ جس نے بھی اس کے روحانی وجود کو دیکھا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس لمحے وہ کم زور ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ ان تمام اذیتوں میں یہ اذیت سب سے زیادہ خوف ناک تھی جو اس کے مقدر نے ایک طویل عرصے کی تحقیقات کے دوران اس پر طاری کی تھی۔ ایسے کسی چھٹے نے آج تک اسے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ اسے اپنی اندرونی حساسیت کی پُر اسرار لرزش محسوس ہو رہی تھی۔ کسی نامعلوم جنبش نے اس کے دل کا تار توڑ دیا تھا۔ افسوس! کہ اسے سب سے بڑا امتحان در پیش تھا کہ جس وجود سے اسے محبت تھی، وہ چھوٹ رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بے چارے ژاں ولژاں نے کوزیٹ سے باپ کی محبت کے علاوہ کسی قسم کی محبت نہیں کی تھی؛ ہم پہلے بھی اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اس کی زندگی کی بیوگی نے اس کی پدری محبت میں ہر قسم کے رنگ گھول دیے تھے۔ وہ کوزیٹ سے بیٹی کی طرح محبت کرتا تھا؛ وہ اس سے اپنی ماں کی طرح محبت کرتا تھا؛ وہ اس سے اپنی بہن کی طرح محبت کرتا تھا، اور چوں کہ اسے محبت کے لیے کوئی عورت یا بیوی میسر نہیں ہوئی تھی، اور چوں کہ فطرت اس قرض

خواہ کی مانند ہوتی ہے جو احتیاج پسند نہیں کرتی، اور وہ جذبہ جو کھویا نہیں جا سکتا، ابہام، معصومیت، بے بصری پاکیزگی، بے ہوشی، سماوی، ملکوتی اور ربانی جذبوں سمیت اس محبت میں گھل مل گیا تھا؛ مگر اس محبت میں جہالت کے بجائے جذبہ پیدا ہو گیا تھا؛ جذبے کے بجائے ایک ناقابلِ تصور اور مخفی بلکہ حقیقی کشش پیدا ہو گئی تھی؛ اور اپنی تمام تر نزاکتوں اور نرمی کے ساتھ کوزیٹ سے اس کی محبت سونے کے اس تار کی مانند تھی جو کسی ایسے پہاڑ میں پوشیدہ تھا جس تک کسی کے قدم نہیں پہنچے تھے۔

اب قاری کو دل کی اس کیفیت کو خود محسوس کرنے دیا جائے ہم نے جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جسمانی ہی نہیں روحانی شادی بھی ممکن نہیں تھی؛ مگر یقینی طور پر ان کے مقدر آپس میں شادی شدہ تھے۔ کوزیٹ کے سوا اور اس کے لڑکپن کے سوا ژاں والژاں کو کبھی اپنی طویل زندگی میں ایسی کسی شے سے شناسائی نہیں ہوئی تھی جس سے محبت کی جا سکتی۔ ان ولولوں اور محبتوں میں جو ایک دوسرے کی جگہ لیتی ہیں متواتر اس ہلکے سبز یا گہرے سبز رنگ کی نمو نہیں ہوئی تھی جو پتوں میں نظر آتا ہے، جو موسم سرما سے گزرتا ہے اور ان آدمیوں میں ہوتا ہے جو پچاس کی عمر سے گزر جاتے ہیں۔ مختصراً ہم اس پر ایک بار سے زیادہ اصرار کر چکے ہیں کہ وہ ساری اندرونی گھلاوٹ اور ساری تکمیل، جس کا نتیجہ بلند درجے کی شرافت ہوتی ہے، ژاں والژاں میں کوزیٹ کے باپ کی صورت میں رونما ہوئی تھی۔ ایک انجانی باپ، جو دادا بھی تھا، بیٹا بھی تھا، بھائی بھی تھا اور شوہر بھی تھا، ژاں والژاں کے اندرون میں موجود تھا؛ ایک باپ تھا جس میں ایک ماں بھی موجود تھی؛ ایک باپ تھا جو کوزیٹ سے محبت بھی کرتا تھا اور جو اس بچی کو اپنی روشنی، اپنا گھر، اپنا خاندان، اپنا ملک، اپنی جنت سمجھتا تھا۔

پس، جب اس نے دیکھا کہ خاتمہ حتمی طور پر قریب آ گیا ہے، کہ وہ لڑکی اس کے ہاتھ سے جا رہی ہے، کہ وہ اس سے پرے بادل کی طرح پانی کی طرح تیرتی جا رہی ہے، جب اس کی آنکھوں کے سامنے ریزہ ریزہ ثبوت موجود تھا کہ "اس کے دل کا ہدف کوئی اور ہے، اس کی زندگی کی خواہش کوئی اور ہے؛ کہ وہاں سب سے پیارا کوئی اور ہے، کہ وہ سوائے باپ کے کچھ اور نہیں، اب اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔" جب اسے یقین ہو گیا، جب اس نے خود سے کہا تھا: "وہ مجھ سے دور جا رہی ہے۔" جو غم اسے محسوس ہوا امکانات کی حدود سے گزر گیا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا اسے اسی طرح ختم ہونا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تب، جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے، اس کے سر سے پا تک بغاوت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے بالوں کی جڑ تک میں انا کی ایک مہیب نو بیداری محسوس ہوئی، اور اس انسان کے اندرون کی گہرائی کا "میں" درد سے چیخ اٹھا تھا۔

ایسی بھی ایک چیز ہوتی ہے جسے اچانک دی جانے والے بچل پرت کہا جاتا ہے۔ مایوس کردینے والا مختلبی کچھ مخصوص عناصر کو ایک طرف ہٹائے اور توڑے بغیر انسان کے اندر داخل نہیں ہوتا جو کچھ معاملات میں، خود وہ آدمی ہی ہوتا ہے۔ رنج جب ایسی صورت اختیار کرلیتا ہے ضمیر کی تمام قوتوں کا بے تحاشا فرار ہونے لگتا ہے۔ یہ بحران مہلک ہوتے ہیں۔ ہم میں سے چند ہی ان میں سے ابھرتے ہیں جو ہماری طرح فرائض کی بجا آوری میں مستحکم ہوتے ہیں۔ جب برداشت کی حد پار ہوجاتی ہے تو سب سے پُرسکون شکی میں بے ترتیبی پیدا ہوجاتی ہے۔ ژاں ویلواں نے نم پوش ایک بار پھر اٹھایا اور خود کو نئے سرے سے قائل کرلیا؛ وہ اس طرح سرنگوں رہا جیسے اپنی گھورتی ہوئی آنکھوں سمیت ان چار سطروں سے خوف زدہ ہوگیا تھا جن پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا؛ اور اس کے اندر ایسا بادل اٹھا جسے دیکھنے والا یہ سمجھے کے اس کا نفس اندر سے ریزہ ریزہ ہورہا ہے۔

اس نے اس انکشاف کا نمایاں اور خوف زدہ کردینے والے سکوت سے مشاہدہ کیا اس لیے کہ جب انسان کا سکوت کسی مجسمے جیسا ٹھنڈا ہوجائے تو خوف ڈراؤنی شے بن جاتا ہے۔

اس نے اس خوف ناک قدم کی پیمائش کی جو اس کے مقسوم نے حقیقت پر شبہ کیے بغیر اٹھائے تھے؛ اس نے پچھلے موسم گرما کے خوف یاد کیے جو اتنے احمقانہ طریقے سے ضائع کیے گئے تھے؛ اسے وہ جھکاؤ یاد تھا جو ویسا ہی تھا؛ فرق صرف یہ تھا کہ ژاں ویلواں کنارے پر نہیں اس کی تہہ میں تھا۔ اس بارے میں بے مثال اور دل توڑنے والی بات یہ تھی کہ وہ اس کا تصور کیے بغیر ہی شکست کھا گیا تھا۔ اس کی زندگی کی ساری روشنی چلی گئی تھی، جب کہ وہ ابھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ سورج کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی جبلت نے تامل نہیں کیا۔ اس نے مخصوص حالات، مخصوص تاریخوں، اور کوزیت کے چہرے کی مخصوص زردی اور شرمندگی کو یک جا کیا اور خود سے کہا "یہی ہے وہ شخص۔"

ناامیدی کی غیب دانی وہ کمان ہے جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی پہلی ہی تاویل سے ماریوس کو نشانہ بنالیا تھا۔ اسے اس کا نام معلوم نہیں تھا مگر اس نے اس آدمی کی فوراً شناخت کرلی۔ اس نے اپنی یادوں کی سنگ دلانہ خلفشار کے پس منظر میں لکسمبرگ کے اس نامعلوم، محبت کے مہمات کے متلاشی، بدنصیب، رومان میں وقت ضائع کرنے والے، اس احمق، اس بزدل کو یقینی طور پر پہچان لیا تھا اس لیے کہ اس کی بزدلی اسے ان جوان لڑکیوں سے آنکھ لڑانے لاتی تھی جن کے پہلو میں ان کے چاہنے والے باپ موجود ہوتے تھے۔

اچھی طرح سے تصدیق کرلینے کے بعد کہ اس معاملے کی تہہ میں یہی نوجوان آدمی تھا اور یہ بھی کہ جو کچھ ہورہا تھا اُسی جانب سے کیا جارہا تھا، ژاں ویلواں نے، نئے سرے سے جنم لینے

والے آدمی نے، جس نے اپنے نفس کو سدھارنے، اپنی زندگی بنانے میں بہت کوشش اور محنت کی تھی، تمام دُکھوں اور محبت میں ہونے والے تمام غموں کے ساتھ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو اسے ایک عفریت نظر آیا: وہ نفرت کا عفریت تھا۔

بڑے بڑے غموں میں ملال بھی ہوتا ہے۔ ملال انسان کی بے ہمتی کا باعث ہوتا ہے۔ جس شخص میں غم داخل ہو جاتے ہیں اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے اندرون سے کوئی شے اس سے علاحدہ ہو رہی ہے۔ جوانی کے دنوں میں غم رنجیدگی کا باعث ہوتے ہیں کہ بعد میں وہ نامبارک ہو جاتے ہیں۔ افسوس کہ ناامیدی ڈراؤنی شے ہو جاتی ہے جب خون گرم ہوتا ہے؛ جب بال سیاہ ہوتے ہیں؛ جب دوش پر سر اس طرح ایستادہ ہوتا ہے جیسے مشعل پر شعلہ؛ جب مقسوم کی روانی اپنی کشادت قائم رکھتی ہے؛ جب محبت سے بھرا دل بار بار ہونے والی دھڑکن کا مالک ہوتا ہے؛ جب انسان کے پاس تلافی کا وقت ہوتا ہے؛ جب تمام عورتیں اور تمام مسکراہٹیں اور تمام مستقبل اور تمام آفاق اس کے سامنے ہوتے ہیں؛ جب زندگی کی قوت مکمل ہوتی ہے، اس وقت بڑھاپے میں کیا ہوتا ہے؟ عمر تیزی سے گزرنے لگتی ہے؛ زردی زیادہ ہونے لگتی ہے اور اس کے دھندلکے میں انسان کو مقبرے کے ستارے نظر آنے لگتے ہیں؟

وہ مراقبے میں تھا، کہ تُوسا داخل ہوئی۔ ژاں ولژاں کھڑا ہو گیا اور اس سے سوال کیا:

''کس علاقے میں ہے؟ کیا تمھیں معلوم ہے؟''

تُوسا خاموش ہو گئی، اور جواب میں صرف اتنا کہہ سکی، ''کیا چیز، جناب؟''

ژاں ولژاں نے پھر بات شروع کی: ''تم نے ابھی کہا نہیں تھا کہ لڑائی ہو رہی ہے؟''

''اوہ جی ہاں، جناب!'' تُوسا نے جواب دیا، ''Saint-Merry کی جانب ہو رہی ہے۔''

ایک شے ہوتی ہے میکانکی حرکت جو لاشعوری طور پر، ہمارے خیالات کی تمام ترین گہرائیوں سے نکل کر ہماری جانب آتی ہے۔ وہ بلا شبہ اسی قسم کی حرکت تھی جس کا اسے بالکل احساس نہیں ہوا تھا کہ ژاں ولژاں پانچ منٹ بعد سڑک پر موجود تھا۔

وہ سر برہنہ اپنی گھر کی دہلیز پر بیٹھا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور رات آ چکی تھی۔

۞

روشنی کا دشمن لڑکا

وہ اس حالت میں کب تک رہا؟

اس کے الم ناک مراقبے کی انتہا کیا تھی اور بہاؤ کیا تھا؟ کیا وہ سیدھا کھڑا ہوا تھا؟ کیا وہ جھکا تھا؟ کیا وہ ٹوٹنے کی حد تک جھکا رہا؟ کیا وہ اب بھی اُٹھ سکتا تھا اور اپنے شعور کی کسی ٹھوس شے پر اپنے قدم جما سکتا تھا؟ ان سوالوں کا جواب شاید وہ خود بھی نہیں دے سکتا تھا۔

سڑک سنسان تھی۔ چند بے چین بورژوا جو تیزی سے اپنے گھروں کی طرف واپس ہو رہے تھے، اسے دیکھ نہیں سکے تھے۔ ہر ایک خود کو خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سڑک کی لالٹین جلانے والا وہ لالٹین جلانے آیا جو 7 نمبر دروازے کے بالکل سامنے تھی اور جلا کر واپس چلا گیا۔ اس اندھیرے میں بیٹھے ژاں ولژاں کو اگر کوئی دیکھتا تو وہ زندہ آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دروازے کے ڈیوڑھی پر برف سے بنی مورت جیسا بے حرکت بیٹھا تھا۔ جیسے اداسی جم گئی ہو۔

گھنٹا بجتا ہے اور ایک طوفانی شور سنائی دیتا ہے۔ بغاوت اور گھنٹے کے اس ملے جلے تشنج کے دوران Saint Paul کی گھڑی نے سنجیدگی سے اور عجلت کے بغیر گیارہ بجائے؛ اس لیے کہ تشنج آدمی کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے؛ وقت خدا ہوتا ہے۔ ایک گھنٹا گزر گیا، ژاں ولژاں پر کوئی اثر نہیں ہوا؛ ژاں ولژاں ہلا بھی نہیں۔ Halles کی جانب سے خبر آئی کہ مزید تشدد شروع ہو گیا ہے؛ Chanvrerie اسٹریٹ پر ہونے والا شاید وہی حملہ تھا جسے ہم نے دیکھا ہے کہ ماریوس نے پسپا کر دیا تھا۔ اس دوہرے حملے پر جس کی شدت رات کی بے حس خاموشی نے بڑھا دی تھی، ژاں ولژاں نے اپنی حرکت کی ابتدا کی؛ وہ اُٹھا اور اس علاقے کی طرف بڑھا جدھر سے آواز آ رہی تھی؛ پھر وہ واپس اپنی ڈیوڑھی پر آ بیٹھا، اپنے بازو تہ کیے اور اس کا سر آہستہ آہستہ پھر

اس کے سینے سے لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے دوبارہ غم آلود گفتگو شروع کر دی تھی۔

اچانک اس نے سر اٹھا کر دیکھا؛ کوئی سڑک پر چلا آ رہا تھا؛ اسے اس کے قدموں کی آواز اپنے قریب سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اس پر نظر کی۔ لالٹینوں کی روشنی میں aux-Archives اسٹریٹ کی جانب جہاں یہ سڑک جا کر ملتی تھی، اس ایک نوجوان منور چہرہ نظر آیا۔

گاؤروش l'Homme Arme اسٹریٹ پر پہنچ گیا تھا۔

گاؤروش ادھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا؛ شاید کسی شے کی تلاش میں تھا۔ اس نے ژاں ولواں کو دیکھ لیا تھا مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ادھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد اس نے نظر نیچے کی، خود کو پنجوں کے بل بلند کیا، اور زمینی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کو ہاتھ لگا کر آزمایا؛ سب بند تھے، چٹخنیاں لگی تھیں اور تالے لگے تھے۔ سارے بند دروازوں کو ٹٹولنے کے بعد، آوارہ لڑکے نے لاپروائی سے اپنے شانے ہلائے، اور خود سے کہا، "لاحول ولا!" اس نے پھر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔

ژاں ولواں، جو چند لمحے پہلے ایسی ذہنی کیفیت میں تھا کہ وہ نہ کسی سے بات کرتا نہ کسی کو جواب دیتا مگر اب وہ اس لڑکے سے مخاطب ہونے پر مجبور ہو گیا۔

"چھوٹے میاں، تمھیں کیا پریشانی ہے؟" اس نے کہا۔

"پریشانی یہ ہے کہ میں بہت بھوکا ہوں۔" گاؤروش نے سادگی سے جواب دیا اور رک کر کہا، "چھوٹے میاں ہو گے تم خود!"

ژاں ولواں نے اپنی جیب ٹٹولی اور پانچ فرانک کا ایک سکہ نکالا۔

مگر، گاؤروش نے جو موسے کی نسل سے تھا، جو شرارتاً طرح طرح کے اشارے کر رہا تھا اور پتھر کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔ اس کی نظر لالٹین پر تھی۔

"وہ دیکھو،" اس نے کہا، "تمھاری لالٹین اب بھی جلی ہے۔ تم قانون شکنی کر رہے ہو میرے دوست! یہ غلط ہے، میری خاطر اسے توڑ ڈالو۔"

اور اس نے پتھر مار کر لالٹین توڑ ڈالی، جس کا ٹوٹا شیشہ اتنی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ گرا، کہ سامنے والے مکانوں کے پردوں کے پیچھے چھپے بورژوا چیخ پڑے: "کیا پھر ترانوے (1893) آ گیا ہے؟"

لالٹین تیزی سے جھولی اور بجھ گئی اور سڑک اچانک تاریکی میں ڈوب گئی۔

"پیاری سڑک، بالکل ٹھیک۔" گاؤروش نے کہا، "لے، اب اپنی رات کی ٹوپی پہن لے۔" اور ژاں ولواں کی طرف مڑتے ہوئے بولا، "تم لوگ اس دیوہیکل یادگار کو کیا کہتے ہو، وہی

جو سڑک کے آخری حصے پر ہے؟ وہ Archives ہے، ہے نا؟ مجھے یہ لمبے لمبے فضول متون مسمار کرنے ہیں اوران سے ایک اچھا سا پشتہ تعمیر کرنا ہے۔"

ژاں ولژاں گاوروش کے قریب گیا۔

"بے چارہ" اس نے دبیمی آواز میں خود کلامی کے انداز میں کہا، "بہت بھوکا ہے۔"

اور اس نے لڑکے کو سو سو کا سکہ پیش کر دیا۔ گاوروش نے اپنا سر اٹھایا، سکے کی بڑائی سے حیرت زدہ اس نے اندھیرے میں سکے پر نظر کی۔ اس بڑے سے سکے کی چمک نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ اس نے پانچ فرانک کے سکوں کے بارے میں صرف سنا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا، مگر اس کی شہرت کا قائل تھا؛ سکہ پا کر بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا، "میرے نزدیک یہ کسی چیتے سے کم [بھیا نک] نہیں۔" وہ کئی منٹ جاذب کے عالم میں اس سکے کو دیکھتا رہا؛ اس کے بعد وہ ژاں ولژاں کی طرف مڑا، سکہ اسے واپس کر دیا اور شاہانہ انداز میں کہا، "بورژوا! میں لالٹینیں تباہ کرنا پسند کرتا ہوں۔ اپنا یہ خوں خوار سکہ واپس لے لو۔ تم مجھے رشوت نہیں دے سکتے۔ اس کے پانچ ناخن ہیں؛ مگر یہ مجھے نوچ نہیں سکتا۔"

"تمھاری کوئی ماں بھی ہے؟" ژاں ولژاں نے سوال کیا۔

گاوروش نے جواب میں کہا، "شاید تم سے زیادہ۔"

"اچھا!" ژاں ولژاں نے جواب دیا، "تو یہ سکہ تم اپنی ماں کے لیے رکھ لو۔"

گاوروش جذباتی ہو گیا تھا۔ مزید یہ کہ اسے ابھی خیال آیا کہ وہ آدمی جو اس سے مخاطب ہے، ننگے سر ہے؛ یہ دیکھ کر اس میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔

"واقعی" اس نے کہا، "تو یہ لالٹین توڑنے سے باز رکھنے کے لیے نہیں تھا؟"

"توڑو، جو تمھارا جی چاہے۔"

"تم بہت اچھے آدمی ہو۔" گاوروش نے کہا اور پانچ فرانک کا سکہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس کا اعتماد بڑھ گیا تھا؛ سو، اس نے ژاں ولژاں سے پوچھا، "کیا تم اسی سڑک پر رہتے ہو؟"

"ہاں، مگر کیوں؟"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ نمبر 7 کدھر ہے؟"

"تمھیں نمبر 7 سے کیا کام؟"

لڑکے نے توقف کیا؛ اسے خوف ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گیا ہے: اس نے اپنی انگلیاں اپنے بالوں میں اڑس لیں اور اتنا کہنے پر اکتفا کی، "اوہ، یہ رہا۔"

ژاں ولژاں کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ تکلیف کے عالم میں ایسی کیفیات ہوا کرتی ہیں۔ اس نے لڑکے سے پوچھا: "تم وہی شخص ہو نا، جو ایک خط لانے والا ہے، جس کا مجھے انتظار ہے؟"

"تم؟" گاوروش نے کہا "تم عورت تو نہیں!"

"خط میڈموزیل کوزیٹ کے نام ہے، ہے نا؟"

"کوزیٹ!" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا، "ہاں، شاید یہی انوکھا سا نام ہے اس کا۔"

"اچھا" ژاں ولژاں نے کہا، "تو میں ہی وہ شخص ہوں جسے وہ خط تمھیں پہنچانا ہے۔ بس مجھے یہیں دے دو۔"

"تو پھر تمھیں یہ بھی علم ہو گا کہ میں پشتے سے آ رہا ہوں۔"

"یقیناً۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

گاوروش نے اپنی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکالا جو چار بار تہہ کیا گیا تھا۔

پھر اس نے فوجی سلام کیا۔ "احترام کے ساتھ۔" اس نے کہا "عارضی حکومت کی جانب سے۔"

"لاؤ، مجھے دے دو۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

گاوروش نے کاغذ اپنے سر پر بلند کیا۔

"اس پر اترانا نہیں، یہ نامۂ شوق ہے۔ ایک عورت کے لیے ہے، پھر بھی، یہ عوام کے لیے ہے۔ ہم مرد لوگ لڑتے ہیں، اور ہم صنفِ نازک کا احترام کرتے ہیں۔ ہم اتنے نفیس نہیں جیسے سوسائٹی والے ہیں: جہاں شیر ہوں وہاں اونٹوں کو مرغیاں (نامۂ شوق) کون بھیجتا ہے؟ لاؤ، مجھے دے دو۔"

"کم از کم" گاوروش نے کہا "تم ایمان دار آدمی دکھائی دیتے ہو"

"جلدی کرو۔"

"لو، پکڑ لو۔" اور اس نے خط ژاں ولژاں کو تھما دیا۔

"اور جلدی جاؤ موسیو— کیا نام ہے تمھارا؟ مامزیل انتظار میں ہوں گی۔"

گاوروش خوش تھا کہ اس نے ایسی باتیں کیں۔

ژاں ولژاں نے پھر بات شروع کی۔

"کیا اس کا جواب Saint-Merry کے پتے پر بھیجا جانا ہے؟"

"واہ جناب! آپ تو پہیلیاں بنا رہے ہیں، جنھیں عامیانہ زبان میں غلطیاں کہا جاتا ہے۔ یہ خط آیا ہے Chanvrerie اسٹریٹ کے پشتے سے، اور میں وہیں واپس جا رہا ہوں۔ شب بخیر، باشندے صاحب!"

اتنا کہہ کر گاوروش رفوچکر ہو گیا یا اگر صحیح معنوں میں کہا جائے تو کسی آزاد کیے جانے والے پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا اُڑ گیا تھا۔ وہ واپس اندھیرے غار میں کسی راکٹ کی سی سخت پھرتی سے کود گیا، جیسے خود اسی نے اس میں سوراخ کیا ہو۔ l'Homme ا اسٹریٹ کی گلیاں ایک بار پھر ویران ہو گئی تھیں؛ چشمِ زدن میں وہ حیرت انگیز لڑکا جس سے مسلک سایے جیسی کوئی شے تھی، سیاہ مکانوں کی قطار کی دھند میں اس طرح غائب ہو گیا جیسے اندھیرے میں دھواں؛ اور ہمارے خیال میں وہ غائب ہو گیا تھا، اگرچہ اس کے غائب ہونے سے چند منٹ پہلے لرزا دینے والی شیشے ٹوٹنے کی آوازیں، سڑک پر ٹوٹ کر گرنے والی لالٹینوں کی تباہیاں جس نے اچانک برہم بورژوا کو جگا دیا تھا، اب تک سنائی دے رہی تھیں۔

❂

کوزیٹ اور ٹوسا کی نیند میں

ژاں ولژاں ماریوس کا خط لیے گھر کے اندر چلا گیا۔

اندھیرے میں ٹٹولتا سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا؛ وہ اندھیرے سے ایسا ہی خوش تھا جیسے کوئی الو اپنے شکار کو گرفت میں لے لیتا ہے؛ دروازہ آہستہ سے کھولا اور آہستہ سے بند بھی کر لیا؛ آواز سننے کی کوشش کی، یقین کر لیا کہ کوزیٹ اور ٹوسا دونوں سو رہی ہیں؛ گیس سے جلنے والے لائٹر کو تین چار بار جلانے کی کوشش کی؛ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ جو کچھ اس نے ابھی کیا تھا سراسر چوری تھی۔ بالآخر شمع روشن کر لی گئی؛ وہ اپنی کہنیوں کے بل میز پر جھکا، کاغذ کھولا اور پڑھنے لگا۔

جب جذبات بجز کے ہوں تو کوئی پڑھتا نہیں، خود کو زمین پر گرا دیتا ہے، ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو کچوٹتا ہے، اس کو شکار کی طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے، اس میں اپنے غضب کے یا مسرت کے ناخن گاڑ دیتا ہے؛ اور تیزی سے آخر تک پہنچنا چاہتا ہے؛ اچھل کر ابتدا پر پہنچ جاتا ہے؛ توجہ کی کیفیت بخار کی سی ہو جاتی ہے؛ اہم نکات پر غور کرنے لگتا ہے؛ ایک نکتے کو پکڑ لیتا ہے، بقیہ سب غائب ہو جاتا ہے۔ کوزیٹ کے نام ماریوس کے رقعے میں ژاں ولژاں کو صرف مندرجہ ذیل الفاظ دکھائی دیے تھے:

"میں مر رہا ہوں۔ جب تم اس کو پڑھ رہی ہو گی میری روح تمھارے قریب ہو گی۔"

ان سطروں کو پڑھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں؛ ایک لمحے کے لیے جذبات کی تبدیلی نے جو اس کے اندرون میں ہو رہی تھی، اس کو کچل کر رکھ دیا؛ وہ ماریوس کے رقعے کو ایک قسم کے نشے کی کیفیت میں گھور رہا تھا؛ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ چمک دمک تھی جسے قابلِ نفرت فرد کی موت کہتے ہیں۔ اس کے منہ سے اندرونی مسرت کی چیخ سی نکل گئی تھی۔

گویا جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ تباہی، جس کی امید تھی، اپنے وقت سے بہت پہلے آ گئی تھی۔ وہ شخص جو اس کے مقسوم کی راہ میں مزاحم تھا، غائب ہو رہا تھا۔ وہ آدمی اپنی مرضی سے، آزادی سے، خود ہی راستے سے ہٹ گیا تھا۔ وہ آدمی موت کے منہ میں جا رہا تھا اور اس کا، یعنی ژاں ولژاں کا اس معاملے ہاتھ نہ تھا، اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ شاید وہ مر چکا تھا۔ ادھر قیاس میں صرف اس کا بخار شامل ہو رہا تھا۔ نہیں، وہ ابھی مرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خط کوزیٹ کے لیے تھا جسے اگلی صبح پڑھا جانا تھا؛ ان دو دھماکوں کے بعد، جو رات کے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان سنے گئے تھے، کچھ نہیں ہوا تھا؛ طلوع صبح سے پہلے پشتے پر سنجیدگی سے حملہ نہیں ہو گا؛ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؛ کہ جس لمحے وہ شخص اس جنگ سے متعلق ہو گا، وہ ختم ہو جائے گا؛ وہ اس دندانے میں پھنس چکا ہے۔ ژاں ولژاں خود کو کامیاب محسوس کر رہا تھا۔ یعنی ایک بار پھر کوزیٹ کے ساتھ تنہا وہی ہو گا۔ رقابت ختم ہو جائے گی؛ مستقبل کی نئے سرے سے شروعات ہو رہی تھی۔ اسے یہ رقعہ اپنی جیب میں ہی رکھنا تھا۔ کوزیٹ کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ اس آدمی کا کیا حشر ہوا۔ بس حالات کو اپنی ڈگر پر چلنے دیا جائے۔ یہ آدمی بچ نہیں سکتا۔ اگر مر نہیں گیا ہے تو یقیناً وہ مرنے والا ہو گا۔ واہ ری قسمت!

اپنے آپ سے یہ سب کہہ چکنے کے بعد وہ افسردہ ہو گیا۔

اس کے بعد وہ نیچے گیا اور دربان کو جگایا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اپنی نیشنل گارڈ کی وردی میں ملبوس، اپنے ہتھیار سمیت باہر نکلا۔ دربان نے اس کے سارے لوازم آسانی سے مہیا کر دیے تھے۔ اس نے اپنی ایک بندوق بھر لی تھی اور کارتوس کے بکس کو بھی کارتوسوں سے بھر لیا تھا۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بازاروں کی جانب روانہ ہو گیا۔

❁

گاؤروش کا جوش و خروش

اس دوران گاؤروش ایک مہم میں مصروف تھا۔
Vielles-Chaume اسٹریٹ کی لالٹین پر جان بوجھ کر حملے کے بعد گاؤروش Haudriettes اسٹریٹ پر گیا۔ وہاں ایک بلی بھی نظر نہیں آئی۔ اس نے سوچا کہ یہ بہترین موقع ہے کہ اس وقت وہ سارے گیت گا لیے جائیں جنھیں وہ گا سکتا ہے۔ اس کے مارچ پر اس کی گائیکی سے کوئی خراب اثر نہیں پڑے گا، بلکہ اس میں روانی آجائے گی۔ اس نے ان سوئے ہوئے یا خوف زدہ مکانوں کے پاس یہ آگ لگا دینے والے اشعار گیج کی طرح بونے شروع کر دیے:

"L'oiseau medit dans les charmilles,
Et pretend qu'hier Atala
Avec un Russe s'en alla.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Mon ami Pierrot, tu babilles,
Parce que l'autre jour Mila
Cogna sa vitre et m'appela,
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Les drolesses sont fort gentilles,
Leur poison qui m'ensorcela
Griserait Monsieur Orfila.

Ou vont les belles filles,
Lon la.
"J'aime l'amour et les bisbilles,
J'aime Agnes, j'aime Pamela,
Lisa en m'allumant se brula.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Jadis, quand je vis les mantilles
De Suzette et de Zeila,
Mon ame aleurs plis se mela,
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Amour, quand dans l'ombre ou tu brilles,
Tu coiffes de roses Lola,
Je me damnerais pour cela.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Jeanne a ton miroir tu t'habilles!
Mon coeur un beau jour s'envola.
Je crois que c'est Jeanne qui l'a.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Le soir, en sortant des quadrilles,
Je montre aux etoiles Stella,
Et je leur dis: 'Regardez-la.'
Ou vont les belles filles,
Lon la.

گاوروش گا رہا تھا، اس کی گائیکی نزت سے بھرپور تھی۔ اشارہ ضبط کا بہترین طریقہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا چہرہ جو لامتناہی نقابوں کا خزانہ تھا، ایسے تشکیلیں پیش کر رہا تھا جو طوفانی ہوا میں کپڑے کی لہراتی دھجیوں اور خیالوں جیسی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ تنہا تھا اور چونکہ رات کا وقت تھا،

اس کو نہ دیکھا جا رہا تھا، نہ دیکھا جا سکتا تھا۔ ہنر کی ایسی پامالی اکثر ہوا کرتی ہے۔

اچانک، اس نے گانا مکمل چھوڑ دیا۔

"اب رومانس میں گڑبڑ کرنی چاہیے۔" اس نے خود سے کہا۔

اس کی بلی جیسی آنکھ نے سواری گاڑی کے دروازے کی دراڑ سے وہ دیکھا، جسے مصوری کی زبان میں نظارۂ کہا جاتا ہے، یعنی ایک شخص تھا اور ایک شے تھی؛ وہ شے ایک ٹھیلا تھا، اور فرد ایک آدمی تھا Auvergene والا، جو سویا ہوا تھا۔

ٹھیلے کا بتھا فٹ پاتھ سے ٹکا تھا، اور Auvergnat والے آدمی کا سر ٹھیلے کے ماتھے پر ٹکا تھا۔ آدمی کا جسم کنڈلی مارے تھا، اور اس کے پاؤں زمین سے لگے ہوئے تھے۔

اس دنیا کی اشیا کے تجربے سے گاؤروش سمجھ گیا تھا کہ وہ آدمی کوئی بلا نوش تھا۔ وہ شخص سڑک کے کونے پر سامان لانے لے جانے کا کام کرتا تھا، جس نے اس رات زیادہ پی لی تھی، اور نشے میں بدمست سو رہا تھا۔

'دیکھا تم نے!' گاؤروش نے سوچا، 'گرما کی راتیں اس کام کے لیے خوب ہوتی ہیں۔ اب ہم یہ گاڑی جمہوریہ کے لیے لے جائیں گے، اور Auvergnat والے آدمی کو شاہی کے لیے چھوڑ جائیں گے۔' اس کے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا، 'ہمارے پشتے پر یہ ٹھیلا کیسا لگے گا' وہ سوچنے لگا۔

Auvergnat والا آدمی خراٹے لے رہا تھا۔

گاؤروش نے آہستگی سے ٹھیلے کو پیچھے کی طرف کھینچا، اور سامنے سے Auvergnat والے کی ٹانگیں کھینچیں، اور ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا، کہ Auvergnat والا مست، آرام سے فٹ پاتھ پر لیٹا تھا۔

ٹھیلا آزاد ہو گیا۔

گاؤروش کے پاس، جو عادتاً ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہتا تھا، ہر شے ہوتی تھی۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور کاغذ کا ایک ٹکڑا اور سُرخ رنگ کی پنسل کا ایک ٹوٹا نکالا جو کسی بڑھئی کی دُکان سے اُڑا لیا تھا۔ اور اس نے لکھا:

منجانب جمہوریہ فرانس

تیرا ٹھیلا وصول پایا

گاؤروش، بقلم خود

اس کے بعد اس نے کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر Auvergnat والے کی مخملیں واسکٹ کی جیب میں اڑس دیا، ٹھیلے کے ہتھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور Halles کی جانب چل پڑا۔ ٹھیلا آگے تھا اور گاوروش فاخرانہ انداز میں شور مچاتا اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔

کام خطرناک تھا۔ سرکاری چھاپے خانے کے قریب ایک چوکی تھی، گاوروش کو جس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس چوکی پر مضافات کے نیشنل گارڈ متعین تھے۔ رہتے والے شور سے جاگ اٹھے، ان کے سر کیمپ کے بستروں سے اٹھتے نظر آ رہے تھے۔ متواتر دو لالٹینوں کی توڑ پھوڑ، اس پر مستزاد اس راگنی کا پوری آواز میں گانا۔ ان بزدل سڑکوں کے لیے یہی بہت تھا جو شام ڈھلے ہی سو جانا چاہتی ہیں اور اتنی جلد ہی موم بتیاں بجھائی جانے لگتی ہیں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے اس لڑکے نے اس پُرسکون سرکاری محلے میں وہ شور مچا رکھا تھا جیسے کسی بوتل میں پھنسی مکھی شور مچاتی ہے۔ مضافات کا سارجنٹ سُن رہا تھا۔ اس نے انتظار کیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔

ٹھیلے کی پاگل کر دینے والی آواز نے، اور انتظار کا پیمانہ لبریز ہو جانے نے، سارجنٹ کو اس کی جاسوسی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ''وہاں ان کا ایک پورا غول موجود ہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔'' یہ واضح ہو گیا تھا کہ سیاسی افراتفری کا سو سروں والا سانپ اپنے بکس سے باہر آ گیا ہے اور وہ علاقے سے باہر، غیر ملکوں میں بھی اپنے پھن پھیلا رہا ہے۔ سارجنٹ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔

پھر اچانک، اپنے ٹھیلے کو پیچھے سے دھکیلتا گاوروش آگے بڑھنے لگا، اور جب وہ Vielles-Haudriettes اسٹریٹ پر مڑنے والا تھا کہ اسے کلغی لگی مخروطی ٹوپی والے وردی پوش کا سامنا ہوا! اس کے ہاتھ میں بندوق بھی تھی۔

یہ دوسری بار ہوا کہ وہ پہلے ہی رُک گیا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے کہا ''یہی ہے وہ۔ خوش رہو، عوام کا حکم ہے۔''

گاوروش کی حیرانی ہمیشہ چند لمحوں کی ہوتی تھی، اور جلد ہی ختم ہو جاتی تھی۔

''کہاں جا رہا ہے، بدذات؟'' سارجنٹ نے چیخ کر کہا۔

''باشندے!'' گاوروش نے پلٹ کر جواب دیا، ''میں نے ابھی تک تمھیں بورژوا نہیں کہا ہے۔ تم میری بے عزتی کیوں کر رہے ہو؟''

''کہاں جا رہا ہے بے لفنگے؟''

''موسیو!'' گاوروش نے پلٹ کر جواب دیا، ''کل تک تو تم شاید عقل والے تھے، مگر آج

صبح سے تم کمینے ہو گئے ہو۔"

"میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں، غنڈے! تو کہاں جا رہا ہے؟"

گاوروش نے جواب دیا، "تم بات تو خوش اسلوبی سے کرتے ہو۔ واقعی، کوئی تمھیں اس عمر کا نہیں سمجھے گا جتنی تمھاری عمر ہے۔ تمھیں چاہیے کہ تم سو فرانک فی بال اپنے سارے بال بیچ دو، تمھیں پانچ سو فرانک مل جائیں گے۔"

"تو کہاں جا رہا ہے؟ تو کہاں جا رہا ہے؟ تو کہاں جا رہا ہے، ڈاکو کہیں کا؟"

گاوروش نے پھر پلٹ کر جواب دیا، "کیسے لفنگے پن کے الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ قبل اس کے کہ وہ تمھاری خبر لیں اپنا منہ تو پونچھ لو۔"

سارجنٹ نے اپنی سنگین نیچے کر لی۔

"بدنصیب، تجھے بتانا پڑے گا کہ تو کہاں جا رہا ہے؟"

"جنرل!" گاوروش نے کہا "میں اپنی بیوی کے لیے ڈاکٹر کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ بے چاری دردِ زہ میں مبتلا ہے۔"

"ہتھیار اٹھاؤ۔" سرجنٹ چیخا۔

طاقت ور لوگوں کی استادی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ اسی عمل سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں جس سے وہ تباہ ہوتے ہیں؛ گاوروش نے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ وہ ٹھیلا تھا جو اس کے خلاف گیا تھا۔ اب وہی ٹھیلا اسے بچانے والا تھا۔ عین اس وقت جب سارجنٹ گاوروش پر نازل ہونے والا تھا، گاوروش نے اپنی پوری قوت سے ٹھیلے کو راکٹ کی صورت اس پر لڑھکا دیا، جو سیدھا سارجنٹ کے پیٹ میں لگا اور گٹر میں الٹ گیا، جب کہ اس کی بندوق ہوا میں چل گئی تھی۔

چوکی پر موجود لوگ سارجنٹ کی چیخ سن کر گرتے پڑتے دوڑ پڑے۔ بندوق بغیر کسی نشانے کے چل پڑی تھی، جس کے بعد اسے پھر بھر دیا گیا اور دوبارہ استعمال شروع ہو گیا تھا۔ ایک چوتھائی گھنٹے کی اندھا دھند بندوق بازی میں شیشے کی کئی کھڑکیاں شہید ہو گئیں۔

اس دوران، گاوروش پوری قوت سے الٹے پاؤں پانچ یا چھ اسٹریٹ پرے بھاگا، اور لمبی لمبی سانسیں لیتا پتھر کے ایک صف ستون پر بیٹھ گیا، جو Enfants-Rouges کے کونے پر نصب تھا۔ وہ کان لگائے سُن رہا تھا۔

چند منٹ لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد گاوروش اس سمت مڑا جہاں گولیاں چل رہی تھی، اس نے اپنی ناک کے برابر اونچائی تک اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا اور اسے تین بار آگے کی طرف

بڑھاپا، اور ساتھ ہی اپنے سر کی پشت پر دائیں ہاتھ سے تھپڑ مارے؛ یہ ایک تکبرانہ طرزِ اظہار تھا، جس میں پیرس کے آوارگانِ راہ نے فرانس کی سنگ دلی کو سمو دیا تھا، اور جو بظاہر موثر پایا گیا ہے اس لیے کہ یہ نصف صدی سے ہوتا آیا ہے۔

اس خوش دلی میں تلخی کا پہلو بھی تھا۔

"جی ہاں" اس نے کہا، "میں قہقہے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہوں، میں خوشی سے بل دار رسی کی طرح بٹا جا رہا ہوں، میں مسرتوں میں گھرا ہوں، مگر میرا راستہ گم ہوتا جا رہا ہے، اب مجھے چکر والا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ کاش میں وقت پر پہنچنے پر پہنچ سکتا۔"

اس کے بعد ایک بار پھر وہ دوڑنے لگا۔

"اوہ، تو میں کیا کہہ رہا تھا۔" اس نے دوڑنے کے دوران کہا۔

اور جب وہ سڑکوں پر کود پڑا، تو اس نے اس نے اپنی راگنی دوبارہ شروع کی، اور وہ راگنی یہ تھی جو اندھیرے میں ختم ہو گئی تھی:

"Mais il reste encore des bastilles,
Et je vais mettre le hola
Dans l'orde public que voila.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Quelqu'un veut-il jouer aux quilles?
Tout l'ancien monde s'ecroula
Quand la grosse boule roula.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Vieux bon peuple, a coups de bequilles,
Cassons ce Louvre ou s'etala
La monarchie en falbala.
Ou vont les belles filles,
Lon la.
"Nous en avons force les grilles,
Le roi Charles-Dix ce jour la,
Tenait mal et se decolla.

Ou vont les belles filles,

Lon la."

چوکی والوں کی ہتھیار کی طرف توجہ بے نتیجہ نہیں تھی۔ ٹھیلا قبضے میں آ گیا، بلا نوش قیدی بنا لیا گیا تھا۔ پہلی چیز باڑے میں بند کر دی گئی، دوسرے کو جنگ کاؤنسل کے سامنے شریکِ جرم کہہ کر دِق کیا گیا۔ اس معاملے میں اس وقت کی عوامی وزارت نے سماج کے دفاع میں اپنے مصمم جوش کو ثابت کر دیا تھا۔

گاؤروش کا واقعہ — شاہی چھاپے خانے کی مقتدرہ پر چوکی والوں کا حملہ — جو معبد کے علاقے میں ایک روایت بن کر جاری رہا تھا، Marais کے بزرگ بورژوا کی سب سے خوف ناک یادگار ہے اور ان کی یادوں میں باقی رہنے کا حق دار بھی ہے۔

❂

بھنور اور بحری چڑیل

دو سب سے زیادہ یادگار پشتے جن کے نام سماجی خرابیوں کا مشاہدہ کرنے والا ہی بتا سکتا ہے، اس زمانے سے متعلق نہیں تھے جس میں اس کام پر عمل کیا گیا تھا۔ یہ دونوں پشتے علامتیں ہیں دو مختلف اندازِ نظر کی، خوف ناک حالات کی، جو زمین سے اُبھرے تھے، جون 1848ء کی مہلک بدامنی کے دوران جسے سڑکوں کی سب سے بڑی جنگ کہا جا سکتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام جو سب سے بڑا ادارہ ہوتے ہیں، انبوہ ہوتے ہیں، خود احتجاج کرنے لگتے ہیں اور جنگ کرتے ہیں! حالاں کہ جنگ خلاف ہوتی ہے اصولوں کے، مساوات کے بھائی چارے کے، حتیٰ کہ عالمی رائے کے بھی؛ اور یہ جنگ کی جاتی ہے روحانی اذیت کی گہرائیوں سے حکومت کی طرف سے، سب کی طرف سے، سب کے لیے؛ مایوسی اور محرومی کے خلاف، بخارات کے خلاف، تکلیفات کے خلاف، سڑاند کے خلاف، نادانیوں کے خلاف اور ظلمتوں کے خلاف۔ فقیر عوامی حق پر حملہ کرتے ہیں؛ عامیانہ حکومتیں فوجی خدمات سے سبک دوش ہونے والوں کے خلاف کھڑی ہو جاتی ہیں۔

یہ غم انگیز دن ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ اس پاگل پن میں ہمیشہ تھوڑی بہت رات بھی ہوتی ہے، اس شخصی لڑائی میں خودکشی ہوتی ہے، اور وہ الفاظ ہوتے ہیں جو توہین ہوتے ہیں، مظاہرہ ہوتے ہیں بھکاریوں، رذیلوں، انبوہ گردی، عوام الناس کے لیے؛ افسوس کہ وہ غلطی ہوتی ہے ان کی جو حکومت کرتے ہیں نہ کہ ان کی جو دُکھ اٹھاتے ہیں؛ بلکہ یہ تو غلطی ہوتی ہے ان کی جو استثنا والے ہوتے ہیں نہ کہ ان کی جو محروم وراثت ہوتے ہیں۔

ہم اپنی طرف سے، وہ الفاظ، بغیر احساسِ درد کے اور بغیر احترام کے منہ سے بھی نہیں

نکالتے اس لیے کہ جب فلسفہ تعریف بیانی کرتا ہے ان حقیقتوں کی وہ جن سے رابطہ رکھتے ہیں تو اکثر انھیں ان دکھوں کے ساتھ شان و شوکت بھی ملتی ہے۔ ایتھنز انبوہ گردی تھا؛ فقیر ہالینڈ کی پیداوار تھے؛ عوام الناس نے ایک بار پھر روما کو بچا لیا تھا اور رذیلوں کی ٹولی یسوع مسیح کی پیروی کر رہی تھی۔

ایسا کوئی مفکر نہیں ہوتا جس نے کبھی نچلے درجے کے لوگوں کی شان و شوکت کو نظر انداز کیا ہو۔ یہی وہ انبوہ تھا بلا شبہ Saint Jerome جن کے بارے میں تفکر کر رہا تھا، اور مفلس لوگوں، ان خانہ بدوش لوگوں اور ان تمام بدنصیب لوگوں کے لیے جن میں نبی اور شہدا پیدا ہوتے ہیں، جب اس نے یہ پُر اسرار قول ''شہر کے تلچھٹ! ارض کا قانون'' اپنی زبان پر جاری کیا تھا۔

اس مجمعے کی برہمی جو دُکھ اٹھاتا ہے، جس کا خون بہتا ہے، اور اس کا جوش و خروش ہر قسم کے احساس کے برعکس ان اصولوں کے خلاف ہوتا ہے جو اس کی زندگی ہوتے ہیں؛ حق کے خلاف اس کی ماہرانہ کارگزاریاں اس کی عوامی بغاوتیں ہوتی ہیں اور ان کو کچل دیا جانا چاہیے۔ دیانت دار آدمی خود کو قربان کر دیتا ہے، وہ عوام سے اپنی محبت کے لیے لڑتا ہے، مگر وہ خود کو کتنا قابلِ عفو سمجھتا ہے، اس وقت بھی، جب وہ اس کے خلاف ڈٹ جاتا ہے اور جب اس کی مزاحمت کرتا ہے تو اسے کتنا قابلِ احترام سمجھتا ہے یہی وہ غیر معمولی لمحات ہوتے ہیں جب اسے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے احساس ہونے لگتا ہے کہ کوئی شے ہے جو اسے پریشان کر دیتی ہے اور اسے آگے بڑھنے سے باز رکھے گی؛ وہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ضروری ہے مگر ضمیر اگرچہ مطمئن ہوتا ہے، افسردہ ہوتا ہے اور فرض کی بجا آوری دردِ دل کے باعث پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

جون 1848ء ایک غیر معمولی حقیقت تھا، فلسفے کی تاریخ میں جس کی درجہ بندی تقریباً ناممکن تھی۔ وہ تمام الفاظ جو ابھی منہ سے نکالے گئے ہیں رد کر دیے جانے چاہئیں، جب معاملہ اس غیر معمولی بغاوت کا ہو، جس میں حق طلب کرنے کی محنت میں ایک مقدس تشویش کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس سے لڑنا ضروری تھا اور فرض تھا، اس لیے کہ اس نے جمہوریہ پر حملہ کر دیا تھا، مگر حقیقتاً جون 1848ء کیا تھا؟ عوام کی بغاوت تھی خود ان کے اپنے خلاف!

جب موضوع نظر انداز نہیں کیا جاتا تو انحراف نہیں ہوا کرتا؛ تو پھر ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم قاری کی توجہ ایک لمحے کے لیے دو مکمل طور پر منفرد پشتوں پر قائم رکھیں جن کے بارے میں ابھی بات کی گئی ہے اور جو اس بغاوت کی خصلت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

ایک نے Saint Antoine میں داخلے کا راستہ بند کر دیا تھا؛ دوسرا Temple کے راستے کا دفاع کر رہا تھا؛ وہ جن کے سامنے خانہ جنگی کے یہ دو پُرخوف شاہکار جون کے چمک دار

نیلے آسمان کے نیچے ظاہر ہوئے تھے، انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

t Saint-Antoine ئی پشتہ زبردست تھا؛ یہ تین منزل بلند اور سات سو فٹ چوڑا تھا۔ اس نے مضافات کے وسیع راستے کو بند کر دیا تھا، یعنی تین سڑکیں، پہاڑی نالے، ناہموار، کٹے پھٹے، تقسیم شدہ شہر پناہ جیسے بڑے سے شگاف تھے، جن میں مضافات کے دو بڑے گھروں کا ابھار بھی تھا۔ کُل انیس عدد پشتے تھے، صف بہ صف، آگے پیچھے، سڑکوں کی گہرائیوں میں، جو سب سے بڑے پشتے کے عقب میں بنائے گئے تھے۔ صرف ایک پشتے کو دیکھ کر ہی بے حد بڑے مضافات کے دکھوں کا احساس ہوتا تھا جو اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ کوئی پریشانی بھی بڑی تباہی کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہ پشتہ کس شے سے بنا تھا؟ کسی نے کہا کہ تین چھ منزلہ عمارتوں کو باقاعدہ مسمار کر کے بنایا گیا تھا۔ کچھ نے کہا کہ غیظ و غضب کی عجیب شے سے بنا تھا۔ اس پر نفرت اور تباہی کے درد انگیز پہلوؤں کی تعمیرات کا غلبہ تھا۔ پوچھا جا سکتا تھا کہ اسے کس نے تعمیر کیا تھا؟ یہ بھی پوچھا جا سکتا تھا کہ اسے تباہ کس نے کیا تھا؟ جواب ملتا کہ جوش و جذبات کی برجستگی نے۔ ٹھہرو، یہ دروازہ لیتے جاؤ۔ اور یہ جالی بھی، یہ سائبان بھی، یہ چمنی بھی، یہ خستہ انگیٹھی بھی، یہ ٹوٹا گملا بھی، سب دے دو۔ سب پھینک دو۔ اس رولر کو دھکیل دو۔ گڑھا کھودو، اس کو منہدم کرو، اُسے اُلٹ دو، ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالو۔ یہ اشتراک تھا سڑکوں پر بچھائی جانے والی پتھر کی سِلوں کا، پتھر کے ٹکڑوں کا، شہتیروں کا، لوہے کے چھڑوں کا، کپڑے کے چیتھڑوں کا، پس ماندہ اشیا کا، کھڑکیوں کے ٹوٹے شیشوں کا، بے کار کرسیوں کا، بند گوبھی کے ڈنٹھلوں کا، ٹوٹی پھوٹی اشیا کا، چیتھڑوں کا اور لعنتوں کا۔ یہ شان دار بھی تھا اور معمولی بھی۔ یہ عوامی جگہوں کی اکھاڑ پچھاڑ سے بنے غار کی نقل تھا۔ یہ ایٹم کے پہلو کے انبار کا، مسمار دیوار کا، اور ٹوٹے پیالے کا ٹکڑا تھا جو ہر قسم کی فضولیات کا اجتماع تھا، دھمکی تھا۔ سسی فس نے اسی پتھر کا ٹکڑا [بار بار پہاڑ کی چوٹی سے] لڑھکایا تھا، اور Job نے اپنا ٹھیکرا پھینکا تھا۔ مختصر یہ کہ یہ خوف ناک تھا۔ یہ ننگے پاؤں والوں کا بالا حصار تھا۔ اُلٹی ہوئی گاڑیوں نے اس کی ڈھلان کی انفرادیت مجروح کر دی تھی؛ ایک بہت بڑا ٹھیلا آڑا پڑا تھا، جس کا دُھرا آسمان کی طرف بلند تھا، اور اس پُر آشوب تعمیر کے چہرے پر داغ تھا؛ ایک اومنی بس گھوڑوں سے ماورا، اپنے بوجھ کے ڈھیر کی مرکزی قوت کی وجہ سے اُلٹی پڑی تھی اور وہ ڈنڈے جن کے بیچ گھوڑا جوتا جاتا ہے، آسمان کی طرف اُٹھے، نہ جانے کس گھوڑے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ دیو ہیکل ڈھیر، بغاوت کا کیچڑ، ذہن پر تمام انقلابات کا Ossa on Pelion تھا [Pelion کے پہاڑی سلسلے کے اوپر Ossa کی چوٹی کا بوجھ۔ یونانی محاورہ جس کا اردو میں قریب ترین محاورہ "ستم بالائے ستم" ہو سکتا ہے]؛ جیسے '89 کے اوپر '93؛ جیسے اگست

کی دس پر Thermidor [فرانس کے ریپبلکن کیلنڈر کا گیارھواں مہینہ] کی نویں؛ جیسے جنوری کی گیارہویں پر Brumaire [فرانس کے ریپبلکن کیلنڈر کا دوسرا مہینہ] کی اٹھارہویں؛ جیسے Prairial [فرانس کے ریپبلکن کیلنڈر کا نواں مہینہ] پر Vendemiaire [فرانس کے ریپبلکن کیلنڈر کا پہلا مہینہ]؛ جیسے 1830ء پر 1848ء، یہ جگہ بہت مناسب تھی اور اس کی حالت ایسی تھی کہ خرابی لازمی تھی اور جہاں Bastille غائب ہو جاتا یہ پشتہ فوراً ہی نظر آ جاتا تھا۔ اگر سمندر بند باندھنے لگیں تو پھر ہر طرف بند ہی باندھے جائیں گے۔ اس بے ہنگم ڈھیر پر سیلاب کی شدت کے نشانات مرتسم تھے۔ کون سا سیلاب؟ مجمعے کا! ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ اس نے غوغا کو پتھرایا ہوا دیکھا ہے۔ ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ اس نے اس پشتے پر جھنجھناہٹ سنی ہے، گویا شہد کے چھتے پر بھیانک سیاہ رنگ کی مکھیاں کام کر رہی تھیں۔ کیا وہ جھاڑی تھی؟ کیا یہ روما کے کسی cult کا جشن تھا؟ کیا وہ کوئی حصار بندی تھی؟ شاید دوراں سر نے اسے اپنے پروں کی ضرب سے بنایا تھا۔ اس مورچے میں کچھ جوہڑ جیسا بھی تھا، اور اس کی الجھن میں کوئی اولمپیائی شے بھی پوشیدہ تھی۔ ہر کسی کو اس گڈمڈ میں مایوسی سے پُر چھتوں کے شہتیر، اوپری کمروں کی منقش کاغذوں والی کھڑکیاں اور کھڑکیوں کے پٹ دکھائی دیتے تھے جن میں لگے شیشے توپ کے گولوں کے منتظر تھے؛ چمنیوں کے ملبے، الماریاں، میزیں، بنچیں، افراتفری، اور وہ ہزاروں افلاس کی ماری اشیا، فقرا کے گھروں کی الا بلا تھیں جس میں طیش بھی ہوتا ہے اور نیستی بھی۔ ہر کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ چیتھڑے ہیں عوام کے، ٹکڑے ہیں لکڑی کے، لوہے کے، کانسی کے، پتھر کے، اور یہ بھی کہ Saint Antoine نے ہی یہ سب اس کے دروازے پر ڈھیر کر دیا ہے اور ایک مہیب جھاڑو کی جھاڑ سے بدنصیبی ہی پشتہ بن گئی ہے۔ مردار کے بلاکوں جیسے بلاک، ٹوٹی زنجیریں، پھانسی گھاٹ جیسے بریکٹ لگے لکڑی کے ٹکڑے، کباڑ سے جھانکتے الٹی پہیے سرکش عوام پر کی جانے والی عقوبتوں کے غم انگیز نشان تھے۔ Saint Antoine کے پشتے کی ہر شے ہتھیار میں تبدیل کر دی گئی تھی؛ ہر شے جو خانہ جنگی سماج کی طرف پھینک سکتی تھی وہیں سے نکلتی تھی؛ یہ لڑائی نہیں تھی یہ دورہ تھا۔ توڑے دار بندوقیں جو مورچے کا دفاع کر رہی تھیں، جن میں کچھ blunderbusses [چھوٹی اور چوڑی نالی والی قدیم بندوق] شامل تھیں جن میں بارود کے ساتھ برتنوں کے ٹکڑے، کوٹ کے بٹن، حتیٰ کہ night-stand [بستر کے سرھانے کی میز] میں لگائے جانے والے ٹکّے سِکّے پیسے بھی شامل ہوتے تھے جو پیتل کے بنے ہونے کی وجہ سے خطرناک حربے بن جاتے تھے۔ پشتہ بہت غضبناک تھا؛ بادلوں تک ناقابلِ بیان شور پہنچا رہا تھا؛ اکثر اوقات، جب کسی فوج کو حملہ کرنا ہوتا تو اس پر ہجوم کا اور آندھیوں کا شور برپا کر دیا جاتا تھا؛ ایک انبار بن جاتا تھا طرح طرح کی بندوقوں

کا، دو دھاری تلواروں کا، لاٹھیوں کا، کلہاڑوں کا، برچھیوں اور سنگینوں کا؛ ایک بہت بڑا سا سرخ رنگ کا پرچم ہوا میں پھڑ پھڑاتا رہتا تھا؛ احکامات کی چیخیں، حملے کے گیت، ڈھولوں کی تھاپ، عورتوں کی سسکیاں اور بھوکے افراد کے غم انگیز قہقہے سنائی دیتے تھے۔ یہ پشتہ بہت جسیم تھا، زندگی تھا، جس میں سے شعلے بھی نکلتے تھے۔ انقلاب کی روح اس کی چوٹی پر بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی جس سے خدائی آواز سے مشابہ گڑگڑاہٹ بلند ہوتی تھی۔ یہ پشتہ بڑے، مہیب، جسیم اور بھیانک جھاڑ جیسا تھا جس سے حیرت انگیز جلال ابھرتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ ڈھیر تھا غلاظت کا اور [صحرائے مصر] Sinai تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ [دشمن پشتہ] انقلاب کے نام پر حملہ کرتا تھا — کس پر؟ انقلاب پر۔ اس — یعنی یہ پشتہ، اتفاق، خطرے، بے ترتیبی، خوف، غلط فہمی اور نامعلوم — کے سامنے آئین ساز اسمبلی تھا، عوام کی حاکمیت تھا، رائے دہندگی تھا، قوم تھا، جمہوریہ تھا؛ اور یہ Carmagnole تھا [وہ چھوٹی سی صدری جو اس زمانے کے مزدور پہنا کرتے تھے] جو Marseillaise [فرانس کا قومی ترانہ] کی نافرمانی کر رہا تھا۔

یہ زبردست مگر دلیرانہ فرمانی تھی، جو قدیم مضافاتی علاقے کی ہیرو تھی۔

مضافاتی علاقہ اور اس کا مورچہ، ایک دوسرے کو مدد فراہم کرتے تھے۔ مضافاتی علاقہ مورچے کو سنبھالے تھا۔ مورچہ مضافات کی آڑ لیے تھا۔ یہ وسیع پشتہ پہاڑ کی کھڑی چٹان کی طرح پھیلا تھا جس کے مقابل افریقی جرنیل کی حکمتِ عملی بھی مات تھی۔ اس کے غار، اس کے پھوڑے اس کے مہاسے، اور اس کا کبڑا پن منہ بناتا تھا اور دھوئیں کے نیچے مسکراتا تھا۔ گریپ شاٹ اس کی بےصورتی میں غائب ہو جاتے تھے؛ اس میں بم صرف گرتے تھے؛ گولیاں اس میں صرف سوراخ کرنے میں کامیاب ہوتی تھیں۔ توپ بازی کی افراتفری کس کام کی تھی؟ اور رجمنٹ، جو جنگوں کے خوں خوار منظروں کی خوگر ہوتی ہیں اس نسل کے مورچے کو بے چین نظروں سے دیکھتی تھیں، جو خنزیر جیسا وحشی تھا اور جسامت میں پہاڑ جیسا تھا۔

ایک چوتھائی لیگ کے فاصلے پر، اس کونے کے قریب جہاں ایک تنگ سی جگہ ہے Temple اسٹریٹ Chateaud'Eau بولیوارڈ پر نکلتی تھی؛ اگر کوئی Dallemagne کی دکان کے آگے سر نکال کر جھانکے تو اسے فاصلے پر، نہر سے پرے، اس سڑک پر جو Belleville کی چڑھائی کی طرف جاتی ہے ایک عجیب قسم کی دیوار ملے گی جو سڑک کے آخر میں پہنچ کر مکانوں کے سامنے دوسری منزل تک بلند ہو جاتی ہے اور دائیں جانب کے مکانوں اور بائیں جانب کے

مکانوں کے درمیان خطِ ربط بن جاتی ہے، گویا وہ سڑک واپس آ کر اچانک اپنی بلندترین دیوار پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ دیوار پتھر کی سلوں سے بنی تھی۔ دیوار سیدھی، صحیح، ٹھنڈی، عمودی، ہموار اور قاعدے قانون کے مطابق بنی تھی۔ اس میں سیمنٹ استعمال نہیں ہوئی تھی، مگر جیسا کہ روما کی دیواروں میں پایا جاتا ہے، تعمیر کے استحکام میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے منقش ستون بنیاد کے متوازی تھے۔ ایک فاصلے سے دوسرے فاصلے تک، بھوری رنگ کی سطح پر، سیاہ رنگ کے دھاگوں جیسے تقریباً نظر نہ آنے والے غیر قانونی سوراخ تھے۔ یہ سوراخ ایک دوسرے سے برابر برابر فاصلے پر تھے۔ جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، سڑک سنسان تھی۔ ساری کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ پس منظر میں ایک پُرسکون، بے حرکت دیوار جیسا پشتہ نظر آتا تھا؛ آدم نہ آدم زاد، سائیں سائیں کرتے کان، نہ شور نہ غوغا، سانس تک کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جیسے کوئی مزار۔

جون کے سورج نے اس خوف ناک شے کو آگ جیسی روشنی میں نہلا دیا تھا۔

یہ Temple کا پشتہ تھا۔

جو بھی اس جگہ پہنچ جاتا، وہ اسے حیرت سے دیکھتا تھا؛ اس کے لیے ناممکن تھا، خواہ وہ کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو، کہ وہ اس پُراسرار آسیب کو دیکھ کر غور نہ کرنے لگے۔ اس کو باقاعدہ ترتیب دیا گیا تھا، ایک دوسرے سے اس طرح ملایا گیا تھا جیسے کھپریل ایک دوسرے پر چڑھا دیے جاتے ہیں؛ اس کو سیدھا، دونوں طرف سے مساوی ڈھلان جیسا کر دیا گیا تھا۔ گویا سائنس اور غم یک جا ہو گئے تھے۔ دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس پشتے کا حاکم اقلیدس کا ماہر تھا یا کوئی عفریت تھا۔

کبھی کبھی اگر کوئی سپاہی، کوئی افسر یا عوام کا نمائندہ اتفاق سے اس شاہراہ سے گزرتا تو [گولی کے گزرنے سے] سیٹی کی سی تیز آواز سنائی دے جاتی اور گزرنے والا گر کر مر جاتا یا زخمی ہو جاتا، یا اگر وہ گولی سے بچ جاتا تو کسی بند شٹر کے پیچھے، دو دیواروں کے درمیان چھٹے ہوئے خلا کے درمیان پناہ لے لیتا تھا۔ پشتے کے لوگوں نے خود لوہے کے ڈھلے ہوئے گیس پائپ سے چھوٹی چھوٹی توپیں بنائی تھیں، جن کا ایک سرا بھٹی میں لگائی جانے والی اینٹ اور سن سے بنی رسّی سے بند کر دیا گیا تھا۔ بارود کا بے مقصد ضیاع نہیں ہوتا تھا۔ ہر نشانہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں، اور فٹ پاتھ پر جگہ جگہ خون تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک سفید رنگ کی تتلی سڑک پر اڑتی پھر رہی تھی، کہ گرما کا موسم ہمیشہ اپنے وقت پر آتا ہے۔

پڑوس میں صدر دروازے کے سائبان زخمیوں سے بھرے پڑے تھے۔ ہر کسی کو محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نظر نہ آنے والا شخص اس کو نشانہ بنا رہا ہے، وہ جانتا تھا پوری سڑک پر بندوقیں تنی

ہوئی ہیں۔

ڈھلان کی قسم کے اُبھار کے عقب میں جمع، جہاں محراب نما نمبر Temple کا داخلہ بناتی ہے، حملہ کرنے والے فوجی دستے اس بھیانک مورچے کو، اس کی بے حرکتی کو اور اس جمود کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ وہاں سے موت کیسے نکل رہی ہے۔ سپاہی پُل کے موڑ کی چوٹی تک منہ کے بل لیٹے رینگ رہے تھے، اس احتیاط سے کہ ان کی مخروطی ٹوپیاں نظر نہ آ ئیں۔

بہادر کرنل Monteynard وحشت سے بھرے اس پشتے کی تعریف کر رہا تھا — ”یہ کیسے تعمیر کیا گیا ہے۔“ اس نے ایک نمائندے سے کہا ”دیکھو، اس کے پڑوں سے پتھر کا ایک ٹکڑا بھی باہر نکلا نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہ چینی [کے برتنوں کے ٹکڑوں] سے بنا ہے — عین اس وقت ایک گولی اس کے چھاتی پر لگی، صلیب ٹوٹ گئی اور وہ گر پڑا تھا۔

”بزدل!“ لوگوں نے کہا تھا، ”سامنے آئیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں۔ وہ چھپ کر وار کرتے ہیں۔“

Temple کے پشتے پر، اسّی آدمی جس کا دفاع کر رہے تھے، جس پر دس ہزار نے حملہ کیا تھا، تین دن تک لڑائی ہوئی تھی۔ چوتھے دن حملہ کرنے والوں نے وہی کیا جو Zaatcha [1849 کے محاصرے کے دوران] میں ہوا تھا، جیسے قسطنطنیہ میں کیا گیا تھا: انھوں نے گھروں میں سوراخ کر دیے، چھتوں پر چڑھ آئے؛ اور پشتے پر قبضہ ہو گیا تھا۔ اسّی ”بزدل“ میں سے ایک نے بھی فرار کی کوشش نہیں کی تھی، سوائے ان کے سردار Barthelemy کے — جس کے بارے ہم آگے چل کر بات کریں گے — سب مارے گئے تھے۔

Saint-Antoine کا پشتہ گرج چمک کا ہجوم تھا؛ Temple کا پشتہ مکمل خاموشی تھا۔ ان دو مورچوں کے درمیان وہی فرق تھا جیسا کہ خوفناک اور پُراسرار میں ہوتا ہے۔ ایک معدہ تھا تو دوسرا نقاب تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ جون کی افسوسناک بدامنی طیش پر اور معمے پر مشتمل تھی تب بھی ایک پشتے کے پس منظر میں اژدھا نظر آئے گا اور دوسرے کے عقب میں ابوالہول۔

یہ دونوں قلعے دو آدمیوں نے بنائے تھے، پہلا آدمی تھا Cournet، اور دوسرا آدمی تھا Barthelemy۔ Cournet نے Saint-Antoine کا پشتہ تیار کیا تھا؛ Barthelemy نے Temple کا پشتہ بنایا تھا۔ دونوں اپنے اپنے آدمیوں کی تصویر تھے جنھوں نے انھیں بنایا تھا۔

Cournet بلند قامت انسان تھا؛ اس کے شانے چوڑے تھے، سرخ چہرہ اور کچل

دینے والی مٹھی، بہادر دل، فرماں بردار نفس، اور خوف ناک آنکھیں تھیں؛ ایک مذرہ، توانائی سے بھرپور، تنک مزاج، طوفانی کردار تھا؛ انسان پُر جوش تھا، لڑنے والوں میں زبردست۔ جنگ، نزاع، تنازعہ اس کا عنصر تھا، اور یہی اس کو خوش باش رکھتے تھے۔ وہ بحریہ میں افسر رہا تھا، اور اس کے انداز اور اس کی آواز ایسی تھی جیسے وہ سمندر سے نکلا ہو، کسی طوفانی ہوا کی دین ہو؛ لڑائی میں اس کے ساتھ تیز ہوا کے جھکڑ ہوتے تھے۔ جوہرِ قابل کی استثنا کے ساتھ Cournet میں ڈانٹن کی جھلک آتی تھی اور روحانیت کی استثنا کے ساتھ اس ڈانٹن میں تھوڑا سا ہرقل بھی نظر آتا تھا۔

Barthelemy کم زور، دُبلا پتلا، زرد رو اور کم گو تھا، ایک قسم کا خار پشت، پولیس کا تنبیہ شدہ، ہمیشہ اس کے تلاش میں رہتا تھا، وہ قتل بھی کر چکا تھا، اور سترہ برس کی عمر میں اسے گیلیز کی سزا ہو چکی تھی۔ وہاں سے نکلا تو یہ پیشہ تغیر کیا تھا۔

بعد میں، مہلک حالات، لندن میں قیام، اور سب سے زرد کردہ Barthelemy نے Cournet کو شخصی لڑائی میں قتل کر دیا تھا۔ ان دونوں کی بڑی الم ناک لڑائی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں بعد ان پُر اسرار حالات کے دندانوں میں پھنس کر جس میں جذبات کی تیزی کردار ادا کرتی ہے، اس تباہی میں جس میں فرانسیسی انصاف سزا کی کمی پر اتر آتا ہے، جس میں برطانوی انصاف صرف موت کی سزا پسند کرتا ہے، Barthelemy کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ یہ تاریکی سے پُر سماج اس طرح بنا تھا کہ محرومی کے طفیل، اخلاق بے راہروی کے طفیل، وہ بد قسمت وجود جو ذہانت کا مالک ہوتا تھا، یقینی طور پر مستحکم ہوتا تھا، امکانی طور پر عظیم ہوتا تھا، اس کی سزا گیلیز سے شروع ہوتی تھی، اور انگلستان میں پھانسی گھاٹ پر ختم ہوتی تھی۔ Barthelemy نے صرف ایک بار ایک ہی پرچم لہرایا تھا؛ اور وہ موت کا سیاہ پرچم تھا۔

۞

بات نہ کی جائے تو غار میں کیا کِیا جائے

بدامنی کی خفیہ تعلیم میں سولہ برس صرف ہوئے ، اور جون 1848ء، جون 1832ء کے بارے میں وہ لوگ بہت کچھ جانتے تھے۔ گویا Chanvrerie محض اولین خاکہ تھا؛ دو ویونیکل پشتوں کے مقابلے میں ایک جنین جیسا تھا، جس کا ابھی ہم خاکہ پیش کر چکے ہیں؛ مگر اس دور کے لیے وہ نہایت شان دار تھا۔

انجولرا اور ماریئس کی نگہبانی میں سرکشوں کو کوئی کام نہ تھا، رات اچھی گزر رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ پشتے کی مرمت کی گئی تھی، بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا گیا تھا۔ اس کی بلندی میں دو فٹ اضافہ کر دیا گیا تھا۔ راستوں پر نصب کیے گئے لوہے کے چھڑ نیزوں سے مشابہ تھے۔ ہر طرف سے لائے جانے والے ہر قسم کے کباڑ نے بیرونی الجھن کو مزید پیچیدہ کر دیا تھا۔ اندر کی طرف دیوار میں، اور باہر کی جانب جھاڑی میں مورچہ بڑی چالاکی سے بنایا گیا تھا۔

پتھر کی سلوں کا زینہ قلعے کی دیوار جیسا تھا اور دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔

پشتہ ٹھیک کر دیا گیا تھا؛ مے نوشی کا کمرہ خالی کر دیا گیا تھا؛ باورچی خانہ ایمبولینس کے استعمال میں تھا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاتی تھی؛ زمین اور میز پر بکھرا بارود اکٹھا کیا جاتا تھا؛ گولیاں ڈھالی جاتی تھیں؛ کارتوس بھرے جاتے تھے؛ خراب ہتھیار دوبارہ تقسیم کیے جاتے تھے؛ مورچے کے اندرون کی صفائی کی جاتی تھی، کوڑا کرکٹ صاف کر دیا جاتا تھا؛ لاشیں ہٹا دی جاتی تھیں۔

مرنے والے Mondetour؛ کی گلی میں ڈھیر کر دیے گئے، جس کے وہ ابھی مالک تھے۔ وہ جگہ ایک عرصے تک (بہتے خون سے) سرخ رہی تھی۔ مرنے والوں میں مضافات کے چار نیشنل گارڈ شامل تھے۔ انجولرا نے ان کی وردیاں ایک جانب لگا دی تھیں۔

انجولرا نے دو گھنٹے کی نیند کا مشورہ دیا۔ انجولرا کا مشورہ حکم تھا پھر بھی صرف تین یا چار اس کا فائدہ اٹھاتے تھے۔

فیولی نے وہ دو گھنٹے غار کے سامنے کی دیواروں پر یہ تحریر کندہ کرنے میں صرف کر دیے تھے:

عوام زندہ باد!

یہ تین الفاظ کھردرے پتھر کی سل پر کیل کی نوک سے کندہ کیے گئے تھے اور 1848ء میں بھی پڑھے جا سکتے تھے۔

تین عورتیں رات کے دو گھنٹے کی فرصت میں وہاں سے غائب ہو گئی تھیں؛ جس کے باعث سرکشوں کو آزادی کا سانس نصیب ہوا تھا۔ عورتوں نے پڑوس کے مکانوں میں پناہ لے لی تھی۔

زخمی افراد میں سے بیشتر لڑنے کے قابل تھے، اور لڑنا چاہتے تھے۔ باورچی خانے میں بکھرے گدّوں اور پیال پر، جسے ایمبولینس میں تبدیل کر دیا گیا تھا، پانچ افراد تھے جو شدید زخمی تھے؛ ان میں سے دو میونسپلٹی کے گارڈ تھے۔ پہلے ان دونوں کا علاج کیا گیا تھا۔

مے نوشی کے کمرے میں صرف مابوف کی میت تھی، اس کے اپنے سیاہ کپڑوں میں؛ اور کھمبے سے بندھا ہوا جاویر تھا۔

انجولرا نے کہا تھا "یہ مرنے والوں کا تالار ہے۔"

اس تالار کے اندر جس کے ایک سرے پر ایک موم بتی روشن تھی، ستون کے عقب میں، جاویر جس سے بندھا ہوا تھا، مردے کی میز افقی انداز میں رکھی تھی۔ گویا، لیٹے مابوف اور کھڑے جاویر سے ایک صلیب سی بن گئی تھی۔

اومنی بس کا ستون، اگرچہ توپ کی بم باری سے ٹوٹ گیا تھا مگر اب بھی اتنا موجود تھا کہ اس پر پرچم لہرایا جا سکتا تھا۔

انجولرا نے، جس میں رہنما کی ساری خصوصیات تھیں وہی کرنے کی اجازت دی تھی جو وہ کہتا تھا؛ بوڑھے آدمی کی گولیوں سے چھلنی وردی اس کے عصا پر ٹانگ دی گئی تھی۔

کھانا، ناشتا ممکن نہیں تھا۔ وہاں نہ روٹی تھی نہ گوشت۔ ان سولہ گھنٹوں کے قیام کے دوران پشتے کے پچاس آدمیوں نے جو تھوڑی بہت رسد تھی، ختم کر دی تھی۔ کسی لمحے، ہر پشتہ ناگزیر طور پر [یونانی اساطیر کے مطابق] Meduse کا بیڑا بن جاتا ہے۔ انھیں بھوک میں گزارا کرنا پڑتا ہے۔ جون کی چھٹی تاریخ کے پہلے چند گھنٹوں میں Saint-Merry کے پشتے میں، Jeanne

نے، جسے سرکشوں نے گھیر لیا تھا اور روٹی کا مطالبہ کر رہے تھے، تمام لڑنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے، جو چیخ کر کہہ رہے تھے، ''کھانے کے لیے کچھ دو'' کہا تھا، ''کیوں؟ اس وقت تین بجے ہیں؛ چار بجے تک تو ہم سب مرجانے والے ہیں۔''

اور چوں کہ وہ لوگ کچھ کھا نہیں سکے تھے، انجولرا نے ان پر پینے کی پابندی لگا دی تھی۔اس نے وائن پینے کی ممانعت کردی اور برانڈی تقسیم کر دی تھی۔

ان کو تہہ خانے میں پندرہ بوتلیں سربمہر ملی تھیں۔انجولرا اور کومفیر نے ان کی جانچ پڑتال کی۔کومفیر جب دوبارہ تہہ خانے میں آیا تو کہا تھا، ''یہ فادر ہوشیلو کا اس وقت کا مال ہے، جب اس نے کریانے کی دُکان شروع کی تھی۔بوسے نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا، ''بہت عمدہ وائن ہوگی۔خوش قسمتی کی بات ہے کہ گرانتیر سو رہا ہے۔اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو ان بوتلوں کو بچانے میں بہت دشواری ہوتی۔'' سرگوشیوں کے باوجود انجولرا نے ان بوتلوں کو چھونے کی سخت ممانعت کردی، اور ان کو ان کی دست برد سے بچانے کے لیے میز کے نیچے رکھ دیا تھا جس پر مابوف کی میت رکھی تھی۔

تقریباً دو بجے رات انھوں نے اپنی طاقت کا اندازہ لگایا۔اس وقت سینتیس افراد موجود تھے۔

دن نکلنا شروع ہو گیا۔وہ مشعل جو راستے کے قریب خالی جگہ نصب تھی اسی وقت بجھا دی گئی تھی۔پشتے کا اندرون جو سڑک سے پشتے کے اندر ختم کرنے سے صحن کی صورت بنایا گیا تھا سائے میں نہایا ہوا تھا، اور کسی معذور بحری جہاز کے عرشے سے مشابہ تھا۔لڑنے والے جو اس کے اندر باہر آ جا رہے تھے سیاہ پیکروں جیسے معلوم ہو رہے تھے۔گھونسلے جیسی اس خوف ناک جگہ کے اوپر گنگ مکانوں کی اوپری منزلوں کے خاکے نظر آ رہے تھے؛ سب سے اوپر ان کی چمنیاں نکلی دکھائی دیتی تھیں۔آسمان اس دل فریب رنگ کا ہو رہا تھا جس کو سفید بھی کہا جا سکتا اور نیلا بھی۔خوشی میں چہچہاتی چڑیاں اُڑ رہی تھیں۔اونچے مکانات کی چھتیں جو پشتے کا عقبی حصہ بن گئے تھے، گلابی عکس پیش کر رہی تھیں۔تیسری منزل کی کھڑکی پر پڑے مردہ دربان کے سفید بال نسیمِ سحری میں لہرا رہے تھے۔

''میں خوش ہوں کہ مشعل بجھا دی گئی ہے۔'' کوفیراک نے فیولی سے کہا، ''اس مشعل کے لہراتے شعلے مجھے غصہ دلا رہے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشعل خود بھی خوف زدہ تھی۔مشعلوں کی روشنیاں بزدلوں کی دانش سے مشابہ ہوتی ہیں؛ مشعل خراب روشنی فراہم کرتی ہے اس لیے کہ وہ لرزتی رہتی ہے۔''

سویرا انسانی دماغوں کو جگا دیتا ہے، اسی طرح جیسے چڑیوں کو جگاتا ہے؛ ساری چڑیاں

بولنے لگی تھیں۔ شوفی نے ایک بلی کو نالی میں پھرتے دیکھا اور اس سے فلسفہ اخذ کیا۔

''بلی کیا ہوتی ہے؟'' اس نے کہا، ''ایک ازالہ ہے۔ اچھے خدا نے چوہا بنایا تو کہا تھا [معاذ اللہ]، سنو! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔' سو اس نے بلی خلق کر دی۔ بلی چوہے کا غلطی نامہ ہے۔ چوہا مثبت بلی ثبوت ہے تخلیق میں ترمیم اور اصلاح کا۔

کومفیر، طلبہ اور دست کاروں کے حصار میں ہلاک شدگان، ژاں پرووِیر، باؤریل اور مابوف کے بارے میں باتیں کر رہا تھا، حتیٰ کہ لی کابک کے بارے میں بھی افسردگی اور سنجیدگی سے بات کر رہا تھا؛ اور اس نے کہا تھا، ''Harmodius اور Aristogiton، Brutus, Chereas, Cromwell, Stephanus، Sand, Charlotte Corday سب پر مصائب گزرے تھے مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہمارے دل بھی اسی طرح لرزتے ہیں، اور انسانی زندگی ایسی پُراسرار شے ہے کہ سماجی قتل میں، حتیٰ کہ آزادی کے بارے میں قتل میں بھی اگر کبھی ہوتا ہے تو اس بات پر افسوس کیا جاتا ہے کہ کسی آدمی کا مارا جانا انسانی خدمت کی خوشی سے سبقت لے جاتا ہے۔

اور تقریر کے تبادلے میں اتنے پیچ ہوتے ہیں کہ ایک لمحے بعد ژاں پرووِیر کے اشعار کی لائی ہوئی تبدیلیوں کے ذریعے، کومفیر، Georgics، Raux کے ترجمے کرنے والوں کا تقابل کر رہا تھا Cournand سے، Cournand کا Delille سے، اور ان ٹکڑوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا جن کا [فرانسیسی زبان کے مشہور شاعر] Malfilatre نے ترجمہ کیا تھا، بالخصوص سیزر کی اتوکھی موت کا؛ اور سیزر کے لفظ پر آتے ہی گفتگو بروٹس کی طرف پلٹ گئی تھی۔

''قیصرِ روم کا زوال صحیح تھا۔'' کومفیر نے کہا۔ ''سسیرو قیصرِ روم کا سخت مخالف تھا اور وہ صحیح تھا، کہ سختی برائی کا اظہار نہیں ہوتی۔ جب Zoilus ہومر کی توہین کرتا ہے، جب Maevius ورجل کی توہین کرتا ہے، جب Vise مولیئر کی توہین کرتا ہے، جب پاپائے روم شیکسپیئر کی توہین کرتا ہے، جب فریڈرک والٹیئر کی توہین کرتا ہے تو یہ قانون ہوتا ہے رشک اور نفرت کا، جس پر عمل کیا جاتا ہے؛ جوہر قابل توہین کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، سارے بڑے آدمیوں پر کم یا زیادہ بھونکا جاتا ہے۔ مگر Zoilus اور سسیرو دو مختلف اشخاص ہیں۔ سسیرو سوچ میں فیصلہ کرنے والا ہے، اسی طرح جیسے بروٹس تلوار کے ذریعے فیصلہ کرتا ہے۔ میں خود آخری انصاف، تلوار کی دھار کو الزام دیتا ہوں؛ مگر قدامت نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ [دریائے] Rubicon کو نقصان پہنچانے والا قیصرِ روم، وہ عظمتیں جو اسے عوام کی جانب سے ملی تھیں۔ اس طرح عطا کرتا تھا گویا یہ اسی کی دین ہیں، سینیٹ میں اس کے داخلے سے جس میں اضافہ نہیں ہوا تھا؛ اس نے بادشاہ کے کام کیے تھے جو تقریباً

ایک جابر جیسے تھے ۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا؛ مگر بہت خراب بھی تھا اور بہت اچھا بھی۔ قیصرِ روم کو سینیٹ میں چھرا مار کر قتل کر دیا جاتا ہے؛ یسوع مسیح کو ان کے خدمت گار ہتھکڑی پہنا دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خدا بہت زیادہ غصے میں ہے۔

یوسے رائفل ہاتھ میں لیے پتھر کی سلوں کے ڈھیر کے اوپر بلند ہو کر خطاب کرتا ہے:

"اے Cydathenaeum [سقراط کے پیروکارو]، اے Myrrhinus کی، اے Probalinthus کی اور اے AEantides کی شان والو! ہے کوئی جو مجھے ہومر کے اشعار سنانے کی اجازت دے۔

روشنی اور پرچھائیں

انجولرا جاسوسی کرنے گیا۔ اس نے Mondetour گلی سے، مکانوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے اپنا راستہ بنا لیا تھا۔

سرکش بہت پُرامید تھے۔ جس طرح انھوں نے پچھلی رات کے حملے کو پسپا کیا تھا، اب انھیں صبح کے ممکنہ حملے کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں تھی۔ وہ مسکرا کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انھیں اب اپنی کامیابی کے بارے میں اور اپنے مقصد کے بارے کوئی شبہ نہیں تھا۔ مزید یہ کہ بظاہر کمک بھی آنے والی تھی۔ وہ اس پر انحصار کر رہے تھے۔ فتح کی پیش بینی کی یہ سہولت فرانسیسی لڑنے والوں کی طاقت کا سرچشمہ تھی؛ انھوں نے آنے والے دن کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ صبح چھ بجے ایک رجمنٹ "جس کے ساتھ محنت کی گئی تھی" واپس آئے گی؛ دوپہر کے وقت پورے پیرس میں بدامنی ہوگی؛ غروبِ آفتاب کے وقت انقلاب مکمل ہو جائے گا۔

انھوں نے Saint-Merry کی خطرے کی گھنٹی سنی، پچھلی رات سے جو ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوئی تھی؛ یہ ثبوت تھا کہ دوسرا پشتہ، جو سب سے بڑا تھا، اب بھی سرکشوں کے ہاتھ میں تھا۔

یہ تمام اُمیدیں مختلف گروہوں کے درمیان، ایک قسم کی پُرامید سرگوشی میں گردش کر رہی تھیں، جو شہد کی مکھیوں کی جنگ جیسی ڈراؤنی بھنبھناہٹ سے مشابہ تھی۔

انجولرا دوبارہ ظاہر ہوا۔ وہ اندھیرے میں اپنی بیرونی عقابی پرواز کے بعد واپس ہوا تھا۔ وہ ان تمام خوش امیدی کی باتوں کو اپنے منہ پر ایک ہاتھ رکھے سن رہا تھا۔ تب اس نے طلوعِ فجر کی تازہ گلابی اور بڑھتی ہوئی سفیدی میں کہا تھا:

"پیرس کی پوری فوج حملہ کرنے والی ہے۔ایک تہائی فوج ان پشتوں پر لگی ہے جن میں اب تم لوگ ہو۔اس کے علاوہ ان کے ساتھ نیشنل گارڈ بھی ہیں۔میں نے پانچویں صف کی اور چھٹے انجن والوں کی ٹوکیلی ٹوپیاں دیکھی ہیں۔ایک گھنٹے کے اندر تم لوگوں پر حملہ ہوگا۔کل تک عوام جوش میں اُبل رہے تھے، آج سب ساکت ہیں۔کسی چیز کی توقع نہیں، نہ کسی بات کی امید ہے۔نہ مضافات سے نہ کسی رجمنٹ سے۔تم لوگوں کو بھلا دیا گیا ہے۔"

یہ الفاظ گروہوں کی کانا پھوسی پر گرے، اور ان پر ایسا اثر ہوا جیسے شہد کی مکھیوں کے جھنڈ پر طوفان کے پہلے قطرے کا ہوتا ہے۔ایک لمحے کی ناقابلِ یقین خاموشی ہوئی، جس میں موت کی پھڑکن کی آواز سنی جا سکتی تھی۔

یہ لمحہ بہت مختصر تھا۔

گروہ کی مبہم ترین گہرائیوں سے ایک آواز چیخ کر انجولراس سے مخاطب ہوئی تھی:

"جو ہوا ہے، سو ہو۔ہمیں پشتے کو بیس فٹ بلند کرنا چاہیے اور ہمیں اس کے اندر ہی رہنا چاہیے۔باشندو! ہم لاشوں سے احتجاج کریں گے۔ہمیں دکھا دینا چاہیے کہ عوام ری پبلکن کو چھوڑ دیتے ہیں، ری پبلکن عوام کو نہیں چھوڑتے۔" ان الفاظ نے لوگوں کو انفرادی تشویش کے دردناک بادلوں سے آزاد کر دیا اور اس کو ایک پُرجوش تائید سے پسند کیا گیا تھا۔

آج تک کسی کو اس آدمی کا نام معلوم نہیں ہوا ہے جو اس طرح بولا تھا۔وہ کوئی نامعلوم بلاؤز پہننے والا، کوئی اجنبی، کوئی بھلایا ہوا آدمی، کوئی گزرتا ہیرو تھا، وہ عظیم گم نام تھا، جو انسانی بحرانات اور سماجی وجود میں گھل مل جاتا ہے؛ کسی لمحے بڑے بلند تر انداز میں وہ فیصلہ کن لفظ ادا کرتا ہے اور جو ایک منٹ تک بجلی کے جھماکے میں خدا کے لوگوں کی نمائندگی کرنے کے بعد پرچھائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

یہ بے رحم ارادہ 1832ء جون کی چھٹی تاریخ کو فضا میں اس طرح آمیز ہو گیا تھا کہ تقریباً اسی گھنٹے Saint-Merry کے پشتے پر سرکش وہ ہنگامہ کر رہے تھے جو تاریخ کا حصہ بن گیا ہے اور دستاویزات میں درج ہو گیا ہے، "ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ ہماری مدد کو آتے ہیں یا نہیں، ہم یہاں آخری آدمی تک اپنی جانیں دے دیں گے۔"

جیسا کہ قاری دیکھ رہا ہے، دو پشتے، اگرچہ مادی اعتبار سے الگ الگ تھے، ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔

منفی پانچ، مثبت ایک

اس نامعلوم آدمی کے بعد جس نے ''احتجاج بذریعہ لاش'' کا اعلان کیا تھا، اور اپنے تمام مشترکہ نفوس کا فارمولا پیش کیا تھا، ہر منہ سے حیرت انگیز اور خوف ناک آواز بلند ہوئی جو احساس میں غم انگیز، اور لہجے میں فاتحانہ تھی:

''موت زندہ باد! ہم سب یہیں رہیں گے۔''

''ہم سب، کیوں؟'' انجولرا نے کہا۔

''سب! سب!''

انجولرا پھر بولا، ''صورت حال اچھی ہے: پشتہ بھی ٹھیک ہے۔ تیس آدمی کافی ہیں، تو چالیس کی قربانی کیوں دی جائے؟''

سب نے جواب میں کہا، ''اس لیے کہ ایک بھی جانے والا نہیں۔''

''باشندو!'' انجولرا نے چیخ کر کہا: اس کی آواز میں ایک قسم کی خفگی کی لرزش تھی، ''جمہوریہ آدمیوں کے معاملے میں کفیل نہیں کہ ان کی بے کار قربانی دی جائے۔ بے کار شان غیر ضروری ہوتی ہے۔ اگر کسی پر جانا فرض ہے تو دوسرے فرائض کی طرح یہ فرض بھی نبھایا جانا چاہیے۔''

اصولی آدمی انجولرا کو اپنے ہم مذہب پر ایسی فوقیت حاصل تھی جو مطلق سے نکلتی ہے۔ پھر بھی اس کی قدرت کے باوجود سرگوشی شروع ہو گئی۔ انجولرا جیسے رہنما نے جب دیکھا کہ سرگوشیاں جاری ہیں تو اس نے اصرار کیا:

اچھا، تو وہ لوگ جو تیس سے زیادہ نفری نہیں چاہتے، اپنا خیال ظاہر کریں۔''

سرگوشیاں دگنی بڑھ گئیں۔

"اس کے علاوہ" ایک گروہ سے ایک آواز بلند ہوئی، "نکل جانے کے بارے میں بات کرنا بہت آسان ہے۔ پشتہ محاصرے میں ہے۔"

"مگر Halles کی جانب نہیں۔" انجولرا نے کہا۔ Mondetour اسٹریٹ کھلی ہے، اور Precheurs اسٹریٹ کے ذریعے Marche des Innocents تک پہنچا جا سکتا ہے۔

"اور وہاں" دوسری آواز نے کہا، "آپ گرفتار ہو سکتے ہیں۔ آپ مضافات کے کسی عظیم گارڈ کے ہاتھ لگ سکتے ہیں؛ وہ ہر بلاؤز اور ٹوپی والے پر نگاہ رکھتے ہیں۔ 'آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ آپ پشتے والے تو نہیں؟' اور پھر وہ آپ کے ہاتھ سونگھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں تمہارے ہاتھ سے چلے ہوئے کارتوس کی بو آرہی ہے۔"

کوئی جواب دیے بغیر، انجولرا نے کومفیر کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ دونوں سے نوشی کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

ایک لمحے بعد وہ باہر نکلے۔ انجولرا کے ہاتھوں میں وہ چار وردیاں تھیں جو اس نے الگ لٹکا دی تھیں۔ اس کے بعد کومفیر نکلا، اس کے ہاتھوں میں shoulder-belts اور کچھ مخروطی فوجی ٹوپیاں تھیں۔

"یہ وردی پہن کر۔" انجولرا نے کہا، "تم صفوں میں گھل مل سکتے ہو اور فرار ہو سکتے ہو؛ چار آدمیوں کے لیے وردیاں موجود ہیں۔" اور اس نے وہ چاروں وردیاں زمین پر ڈال دیں۔

حاضرین میں کوئی حرکت نہیں کر سکا۔ اب کومفیر گویا ہوا:

"دیکھو" اس نے کہا، "تمھیں کچھ رحم کرنا چاہیے۔ کیا تم جانتے ہو کہ سوال کیا ہے؟ سوال عورتوں کے بارے میں ہے۔ ادھر دیکھو۔ یہاں کوئی عورت ہے کہ نہیں؟ کیا یہاں بچے ہیں، یا نہیں ہیں؟ کیا یہاں مائیں ہیں، ہاں یا نہیں؟ اپنے پیروں سے پالنے کون ہلا رہا ہے، اور کس کے اطراف بے شمار بچے ہیں؟ جس نے نرس کی چھاتیاں کبھی نہ دیکھی ہوں، اپنا ہاتھ اٹھائے۔ اُف، تم مرجانا چاہتے ہو، میں بھی۔ وہ جو تم سے مخاطب ہے، وہی چاہتا ہے؛ مگر میں خیالی عورتوں کے بازوؤں میں گھرا نہیں چاہتا۔ مر جاؤ، اگر یہی چاہتے ہو، مگر دوسروں کو تو نہ مارو۔ وہ خودکشی ارفع ہوتی ہے جو حصولِ مقصد سے قریب ہو؛ اور جوں ہی یہ تمھارے ساتھی تک پہنچتی ہے، خودکشی قتلِ عمد بن جاتی ہے۔ ان گنجے سروں کا خیال کرو، کنپٹی کے سفید بالوں کے گچھوں کا خیال کرو۔ سنو! انجولرا نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ اس نے Cygne اسٹریٹ کے کونے پر ایک روشن جھروکا دیکھا ہے، ایک کھڑکی میں شمع روشن دیکھی ہے، پانچویں منزل پر؛ اور شیشے پر ایک بوڑھی عورت کے ہلتے ہوئے سر کی

پر چھائیں دیکھی ہے جس نے شاید پوری رات چوکی داری کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تم میں سے کسی شخص کی ماں ہو۔ اس شخص کو چلا جانے دو اور جلدی کرو، کہ وہ اپنے ماں سے کہے، لو ماں میں آ گیا ہوں۔ اسے سکون فراہم کرو۔ یہی وہ فریضہ ہے جو ہمیں ادا کرنا ہے۔ جو کوئی بھی اپنی محنت سے کسی کے رشتے دار کو سہارا دیتا ہے، اسے خود کو قربان کر دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کا مطلب اپنے خاندان کو بے سہارا چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اور وہ جن کی لڑکیاں ہیں، تم کیا سوچ رہے ہو؟ تم ان کو ہلاک کر دیتے ہو، تم مر جاتے ہو، یہ تو ٹھیک ہے، مگر کل؟ نوجوان لڑکیاں روٹیوں کو ترستی ہوں گی — یہ کتنی خوف ناک بات ہو گی۔ آدمی بھیک مانگتا ہے، عورت خود کو فروخت کر دیتی ہے۔ اُف وہ دل رُبا اور نیک خو عورتیں! اتنی نیک خو اور اتنی پیاری، پھولوں بھری ٹوپیوں والی، جو گھر کو پاکیزگی سے بھر دیتی ہیں؛ جو گنگناتی ہیں، بک بک کرتی ہیں، جو زندہ خوش بو کی طرح ہوتی ہیں؛ جو زمین پر پاکیزہ کنواریوں کا اور آسمانوں میں فرشتوں کا ثبوت ہوتی ہیں؛ اُف خدایا، وہ جینی، وہ لسی، وہ ممی، وہ قابلِ پرستش مخلوقات جو تمھارے لیے نعمت ہیں، عزت ہیں: اُف، وہ گرسنگی جو دکھ اٹھائے گی۔ تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو؟ ادھر انسانی گوشت کا بازار ہے؛ اور یہ نہیں کہ تم اپنے لرزتے اور سایے جیسے ہاتھوں سے انھیں روک لو گے! ذرا سڑکوں کے بارے میں سوچو؛ ذرا راہگیروں سے بھرے راستوں کا خیال کرو؛ ان دکانوں کے بارے میں سوچو عورتیں جن میں جاتی ہیں اور کیچڑ میں آلودہ اور برہنہ گردنیں لیے واپس آتی ہیں۔ یہ عورتیں بھی کبھی پاکیزہ تھیں۔ جن کی بہنیں ہیں وہ اپنی بہنوں کے بارے میں سوچیں۔ بدنصیبی، جسم فروشی، پولیس، Saint-Lazare — ان خوب صورت، نازک لڑکیوں، پاک دامنی کی کم زور اور انوکھی صورتوں، شرافت اور دلکشی کے وجود، مئی کے مہینے کے بنفشی پھولوں سے زیادہ تر و تازہ چہروں والیوں کا کیا حال ہوگا۔ اُف! تم نے خود کو ہلاک کر دیا ہے۔ اب تم کسی کام کے نہیں رہے۔ یہ ٹھیک ہے؛ تم چاہتے ہو کہ عوام کو شاہی سے آزاد کر دیا جائے، اور تم اپنی بیٹیوں کو پولیس کے حوالے کر دو۔ دوستو! ذرا سوچو، رحم کرو۔ عورتیں، بد قسمت عورتیں، ہمیں ان کے بارے سوچنے کی عادت نہیں۔ ہم مردوں کی تعلیم والی عورتوں پر بھروسا نہیں کرتے؛ ہم انھیں پڑھنے سے روکتے ہیں، سوچنے سے روکتے ہیں، سیاست میں آنے سے روکتے ہیں؛ کیا تم اس شام انھیں مردہ خانے میں جانے اور تمھاری لاشوں کو پہچاننے سے روک سکتے ہو؟ آؤ، جو گھر بار والے ہیں ہم انھیں تلاش کرتے ہیں؛ ان سے ہاتھ ملاتے ہیں، اور ان کو روانہ کر دیتے ہیں؛ اور ہم ان کے بغیر اس معاملے کو خود سنبھال لیتے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ رخصت ہونے کے لیے ہمت چاہیے ہوتی ہے، کہ یہ مشکل کام ہوتا ہے؛ مگر یہ جتنا مشکل ہوتا ہے

اتنا ہی واجب الاحر ہوتا ہے۔تم کہتے ہو، میرے پاس بندوق ہے، میں پشتے پر ہوں؛ کتنی خرابی کی بات ہے، میں تو یہیں رہوں گا۔ کتنی خرابی کی بات ہے اور کتنی آسانی سے کہی جا رہی ہے۔ میرے دوستو، ایک کل بھی آنے والا ہے، تم کل یہاں نہیں ہو گے، مگر تمھارے گھر والے ہوں گے؛ اور کتنے دکھ ہوں گے۔ ذرا دیکھو، یہاں ایک خوب صورت، تندرست بچہ ہے، جس کے سیب جیسے رخسار ہیں، جو بڑبڑ کرتا ہے، بک بک کرتا ہے، باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے، جو تمھارے بوسے کی خوش بو سونگھتا ہے— تمھیں کچھ خبر ہے کہ اس کا کیا حال ہو گا جب اس کا کوئی نہیں ہو گا؟ میں نے ایسے ہی ایک چھوٹے سے بچے کو دیکھا ہے، جو قد میں اس سے سوا نہیں تھا۔ اس کا باپ مارا گیا تھا۔ مفلس لوگ از روئے خیرات اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے، مگر ان کے پاس صرف ان کے اپنے لیے روٹی تھی۔ بچا ہمیشہ بھوکا رہتا تھا۔ سرما کا موسم تھا۔ وہ روتا نہیں تھا۔ تم اسے آتش دان کی طرف جاتے دیکھ سکتے تھے، جس میں کبھی آگ نہیں ہوتی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی، اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں نرم پڑ گئے تھے، اس کا پیٹ نکل آیا تھا۔ وہ کچھ کہتا نہیں تھا۔ اگر کوئی اس سے بات کرتا تو وہ جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ مر چکا ہے۔ اسے Necker اسپتال لے جایا گیا تھا، جہاں میں نے اس کا علاج کیا تھا۔ میں اس اسپتال میں ہاؤس سرجن تھا۔ اب، اگر تم میں باپ ہیں، وہ باپ جن کی خوشی اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ اتوار کے دن اپنے مضبوط ہاتھوں میں اپنے بچوں کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ تھامے ٹہلنے جاتے ہیں؛ وہ باپ اب اس بچے کو اپنا بچہ تصور کریں۔ وہ بے چارہ بچہ، جسے میری آنکھیں کبھی نہیں بھولتیں، جب وہ برہنہ، چیر پھاڑ کرنے والی میز پر پڑا تھا، اس کی پسلیاں جلد میں سے ابھری ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی قبر سے نکالا گیا ہو۔ اس کے معدے میں کیچڑ پایا گیا تھا۔ اس کے دانتوں میں راکھ تھی۔ آؤ، ذرا ہم دیانت داری سے اپنے دل کی بات سنتے ہیں۔ شماریات بتاتی ہیں کہ بچوں کی شرحِ اموات پچپن فی صد ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ یہ معاملہ ہے عورتوں کا، ماؤں کا، نوجوان لڑکیوں کا، چھوٹے بچوں کا۔ تم سے تمھارے اپنے بارے میں کون بات کر رہا ہے؟ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم کیا ہو؛ ہم اچھی طرح جانتے ہیں، بخدا، کہ تم سب بہادر ہو؛ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمھارے نفوس میں ایک بڑے مقصد کے لیے جان دینے کی خوشی اور رفعت ہے؛ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم لوگوں نے خود کو شان سے مرنے کے لیے چن لیا ہے، اور یہ بھی کہ تم میں سے ہر ایک فتح میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ بہت خوب! مگر اس دنیا میں تم اکیلے نہیں ہو۔ ایسے بھی وجود ہیں تمھیں جن کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ تمھیں انا پرست نہیں ہونا چاہیے۔"

سارے سر اداسی کے ماحول میں جھک گئے تھے۔

قلبِ انسانی کا حیرت انگیز تضاد اپنے ارفع ترین لمحات میں تھا۔ کومفیر جو اس طرح باتیں کر رہا تھا، یتیم نہیں تھا۔ اس نے اوروں کو اُن ماؤں کی یاد دلائی اور خود اپنی ماں کو بھول گیا تھا۔ وہ خود بھی ہلاک ہو جانے والا تھا۔ وہ بڑا ''آدرش پرست'' انسان تھا۔

بھوکا، مبتلائے بخار، تمام امیدوں سے ماوراء میدانِ رنج وغم میں گم گشتہ، شدید بربادی کا مارا جذبات میں شرابور ماریوس، جسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اختتام قریب ہے، اس بے ہوشی کے عالم میں تھا جو اس مہلک وقت سے پہلے آتا ہے جسے رضاکارانہ طور پر قبول کر لیا گیا ہو۔

کسی ماہرِ علم الحیات نے بخار میں جذب ہو جانے والی ان بڑھتی ہوئی علامات کا مطالعہ کیا ہوتا، سائنس جس سے واقف ہے اور جس کی درجہ بندی کی جا چکی ہے، جو دُکھ کے لیے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی لذت کے لیے شہوت پرستی۔ مایوسی میں بھی سرمستی کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ ماریوس اسی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ وہ ہر شے کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے کہ اس کا وجود ہی نہ ہو؛ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کہ وہ چیزیں جو اس کے سامنے سے گزر رہی ہیں اب بہت دور محسوس ہونے لگی تھیں؛ اس نے کُل کی تشکیل کر لی تھی، مگر اس کی تفصیل نہیں دیکھی تھی۔ اس نے آدمیوں کو شعلوں میں جاتے آتے دیکھا تھا۔ اس نے ایسی آوازوں کو بولتے سنا تھا، گویا وہ پاتال سے آ رہی تھیں۔

مگر اس نے اسے حساس بنا دیا۔ اس منظر نامے میں ایک نقطہ تھا جو اس کے اندرون میں داخل ہو گیا تھا، اور اسے بیدار کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس بس ایک ہی خیال تھا، مر جانے کا؛ وہ اس سے پلٹنا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ اپنے ملول عالمِ بے خوابی میں اس امر پر غور کرتا رہتا تھا، کہ اپنے آپ کو تباہ کرتے ہوئے اسے کسی اور کو بچانے کی ممانعت نہیں تھی۔

اس نے اپنی آواز بلند کی:

''انجولرا اور کومفیر ٹھیک ہی کہتے ہیں۔'' اس نے کہا، ''غیر ضروری قربانی نہیں ہونی چاہیے۔ میں ان میں شامل ہوں، اور تمھیں جلدی کرنی چاہیے۔ کومفیر نے تم سے معقول باتیں کی ہیں۔ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بال بچے ہیں، مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بیویاں ہیں، بچے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صفوں سے نکل جانا چاہیے۔''

کوئی نہیں ہلا۔

''شادی شدہ مرد اور خاندانوں کے سہارے صفوں سے نکل جائیں!'' ماریوس نے دوبارہ کہا۔ اس کا اختیار بہت بڑا تھا۔ انجولرا یقیناً پشتے کا سردار تھا، مگر ماریوس اس کا بچانے والا تھا۔

''میں اس کا حکم دیتا ہوں۔'' انجولرا نے چیخ کر کہا۔

''میں تم سے التجا کرتا ہوں۔'' ماریوس نے کہا۔

تب، کوفیر کے الفاظ سے جذباتی، انجولرا کے حکم سے لرزاں، ماریوس کی التجا سے متزلزل، ان بہادر لوگوں نے ایک دوسرے کو الزام دینا شروع کر دیا— "یہ سچ ہے" ایک نوجوان نے ایک مرد سے کہا، "تم ایک خاندان کے باپ ہو، چلے جاؤ، بلکہ یہ تو تمھارا فرض ہے۔ تمھاری دو بہنیں ہیں، تم جن کی کفالت کرتے ہو۔" اور پھر ایک بے مثال تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ ہر ایک نے وہ کوشش شروع کر دی، کہ اسے مقبرے کے دروازے پر کھڑا ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔

"جلدی کرو" کوفیراک نے کہا، "سوا گھنٹے بعد بہت دیر ہو چکی ہو گی۔"

"باشندو" انجولرا نے اصرار کیا، "یہ جمہوریہ ہے اور یہاں عوام کی رائے حکومت کرتی ہے۔ تم لوگ خود ان کی نشان دہی کرو جنھیں جانا ہو گا۔"

انھوں نے حکم مانا۔ چند منٹ گزرنے کے بعد، پانچ افراد منتخب کیے گئے، اور وہ صفوں سے الگ ہو گئے۔

"پانچ لوگ ہیں۔" ماریوس نے بلند آواز میں کہا۔

وہاں صرف چار وردیاں تھیں۔

"اچھا۔" پانچوں نے کہا، "تو پھر ایک کو رُکنا ہو گا۔"

پھر یہ جدوجہد شروع ہوئی کہ کون رُکے گا، اور نہ رُکنے والوں کی وجوہ کون معلوم کرے گا۔ پھر نئے سرے سے جھگڑا شروع ہو گیا۔

"تمھاری بیوی تم سے بہت محبت کرتی ہے۔" "تمھاری ماں بہت بوڑھی ہے۔" "تمھارا نہ باپ ہے نہ ماں، تمھارے چھوٹے چھوٹے بھائیوں کو کون سنبھالے گا۔" "تم پانچ بچوں کے باپ ہو۔" "تمھیں زندہ رہنے کا حق ہے، کہ تم صرف سترہ برس کے ہو، اور تمھیں اتنی جلدی نہیں مرنا چاہیے۔"

یہ عظیم انقلابی پشتے شجاعانہ کردار کا جواز یک جا کر رہے تھے۔ وہاں ناممکن بہت آسان ہو گیا تھا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو حیران نہیں کر سکتے تھے۔

"جلدی کرو۔" کوفیراک نے پھر کہا۔

گروہوں میں سے لوگوں نے چلا کر ماریوس سے کہا:

"کیا تم طے کرو گے کہ کون رُکے گا؟"

"ہاں۔" ان پانچوں نے یک زبان ہو کر کہا، "تم منتخب کرو، ہم تمھارا حکم مانیں گے۔"

ماریوس کو یقین نہیں تھا کہ وہ ایک بار پھر جذبہ ابھارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر بھی، اس خیال سے کہ اسے کسی ایک کو موت کے لیے منتخب کرنا ہے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اگر مزید زرد ہونا ممکن ہوتا تو وہ اور زرد ہو جاتا۔

وہ ان پانچوں کی طرف بڑھا، جو اسے دیکھ کر مسکرا دیے، اور ہر ایک نے ان شان دار شعلہ بار آنکھوں سے، جنھیں آپ تاریخ کی گہرائیوں میں Thermopylae پر لہراتا دیکھتے ہیں، چلا کر اس سے کہا تھا، "میں! میں! میں!" اور ماریوس نے احمقوں کی طرح انھیں شمار کیا؛ اب بھی وہی پانچ تھے، اس کی نگاہیں چار وردیوں پر جا کر رک گئیں۔

عین اسی وقت، پانچویں وردی، جیسے کہ آسمان سے آئی ہو، دوسرے چار پر گری۔

پانچواں آدمی بچا لیا گیا تھا۔

ماریوس نے نظریں اٹھائیں اور موسیو فوشلوں کو پہچان لیا۔

ابھی وقت ژاں ولژاں پشتے میں داخل ہوا تھا۔

وہ کسی تفتیش کے بہانے یا اپنی جبلت کے باعث، یا اتفاق سے Mondetour گلی کی طرف سے نیشنل گارڈ کی اپنی وردی کے طفیل بغیر کسی مشکل کے آ گیا تھا۔

سرکشوں کی جانب سے Mondetour اسٹریٹ پر متعین کیے گئے چوکی داروں کے نزدیک ایک واحد نیشنل گارڈ کے داخلے پر لوگوں کو ہوشیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اور اس نے خود سے یہ کہہ کر سڑکوں پر گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی کہ "غالباً یہ کمک ہے، بہر حال یہ قیدی ہے۔" اس وقت یہ قبول کر لینا کہ چوکی دار نے اپنا فرض ادا نہیں کیا ہے، بہت مشکل تھا۔

اس وقت جب ژاں ولژاں مورچے میں داخل ہوا کسی نے اس پر توجہ نہیں کی، اس لیے کہ سب کی توجہ ان پانچ منتخب افراد پر اور چار عدد وردیوں پر مبذول تھی۔ ژاں ولژاں نے بھی سب کچھ دیکھا اور سنا اور خاموشی سے اپنا کوٹ اتارا اور سب کوٹوں کے ڈھیر پر ڈال دیا تھا۔

ابھرے ہوئے جذبات ناقابل بیان تھے۔

"یہ کون شخص ہے؟" بوسے نے پوچھا۔

"یہ شخص وہ ہے جو دوسروں کو بچاتا ہے۔" کومفیر نے جواب دیا۔

ماریوس نے سنجیدہ آواز میں اضافہ کیا، "میں اسے جانتا ہوں۔"

اس ضمانت نے سب کو مطمئن کر دیا۔

انجولرا ژاں ولژاں کی طرف متوجہ ہوا۔

"خوش آمدید، باشندے!" اور اس نے مزید کہا، "تم جانتے ہو کہ ہم لوگ مرنے والے ہیں۔"

ژاں ولژاں نے کوئی جواب دیے بغیر سرکش کی مدد کی، جسے وہ اپنی وردی دے کر بچا رہا تھا۔

پشتے کی بلندی سے اُفق کا نظارہ

اس مہلک لمحے اور اس قابلِ رحم جگہ پر انجولرا کی حالت بے حد غم انگیز تھی۔

انجولرا کے اندرون میں انقلاب بھرا پڑا تھا؛ وہ خود جہاں تک ممکن تھا، نا مکمل رہا، مگر اس کے اطراف Saint-Just [انقلابِ فرانس کا فوجی اور سیاسی رہنما] بہت تھا اور Anacharsis Cloots [پروشیائی خاندان کا ایک فرانسیسی مدبر] ناکافی تھا۔ پھر بھی، اس کا دماغ، Friends of the A B C کی سوسائٹی میں کومفیر کی ایک مخصوص قطبیت تک پہنچ کر رُک گیا تھا؛ اس لیے کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ درجہ بدرجہ ایک تنگ نظر اصول سے نکل رہا تھا اور ترقی کے پھیلتے ہوئے اثرات کی طرف مائل ہو رہا تھا، اور اس نے فرانسیسی جمہوریہ کی قلبِ ماہیت کو ایک فیصلہ کُن ارتقا کی صورت میں، زبردست انسانی جمہوریہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اور فوری ذرائع کے معاملے میں، جب تشدد کی کیفیت پیشِ نظر تھی، اس نے بھی متشدد ہونا چاہا تھا؛ اس معاملے میں اس نے کبھی اختلاف نہیں کیا کہ وہ اس بہادر اور دہشت ناک دبستان سے وابستہ رہا تھا جس کو Eighty-three کہا جاتا تھا۔ انجولرا، اپنی بندوق کے کندے پر کہنی لگائے، پتھر کی سِلوں سے بنے زینے پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے خیالات میں غرق تھا؛ اس کی آنکھوں سے تیر کی مانند شعلے نکل رہے تھے۔ اچانک اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف کیا، اس کی کنپٹی کے سنہرے بالوں کے گُچھے چار ستاروں جیسے پہیوں کی گاڑی پر بیٹھے اس فرشتے کے بالوں کی مانند پیچھے گر گئے تھے، جو چونک پڑنے والے شیر کی گردن کے بال کی طرح حلقۂ نور میں شعلہ زن تھے، اور انجولرا نے چیخ کر کہا تھا:

"لوگو، کیا تم اپنا مستقبل دیکھ سکتے ہو؟ شہروں کی سڑکیں روشنیوں سے لبریز ہیں، ڈیوڑھیوں پر سبز شاخیں [لہرا رہی] ہیں، قومیں بہنوں کی طرح ہیں، آدمی انصاف پسند ہیں، بوڑھے بچوں کو دعائیں

دے رہے ہیں، حال کو ماضی اچھا لگ رہا ہے، سوچنے والے سوچ میں بالکل آزاد ہیں، اہلِ ایمان پوری طرح مساوات برت رہے ہیں، اس لیے کہ آسمان مذہب ہے، خدا مبلغ ہے، انسانی ضمیر قربان گاہ ہے، نفرت ختم ہو گئی ہے، کارخانوں اور اسکولوں میں بھائی بندی ہے، کام سب کے لیے ہے، امن سب کے لیے ہے، خون بہنا بند ہو گیا ہے، جنگیں ماضی کا حصہ بن گئی ہیں، مائیں خوش ہیں۔ مادّے کی فتح پہلا قدم ہے، آدرش کا حصول دوسرا قدم ہے۔

ذرا غور کرو کہ ترقی نے کیا حاصل کیا ہے۔ ماضی میں، پہلے نسلِ انسانی کی آنکھیں سَو سَروں والے سانپوں کو گزرتے اور پانیوں پر تیرتے دیکھتی تھیں؛ اژدہوں کے منہ سے شعلے نکلتے تھے؛ سیمرغ جو ہواؤں کا عفریت تھا عقاب کے پروں سے اُڑتا تھا؛ چیتے جیسے ناخن تھے اس کے؛ آدمی سے زیادہ خوف ناک جانور تھے۔ پھر بھی آدمی نے خدا کی دی ہوئی ذہانت کے جال پھیلا دیے، اور بالآخر ان عفریتوں کو ختم کر دیا۔ ہم نے سَو سَروں والے سانپ ختم کر دیے ہیں، اور اب اسے حرکت کرنے والا جانور کہتے ہیں؛ ہم نے سیمرغ کو بھی ختم کر دیا ہے، اب یہ ہمارے قابو میں ہے اور اس کو غبارہ کہا جاتا ہے۔ اس دن، جب یہ تخلیقی کام مکمل ہو جائے گا، اور جب آدمی قدیم زمانوں کی ان تین عجیب الخلقت مخلوقات، سَو سَروں والے سانپوں، آگ اگلنے والے اژدہوں، اور سیمرغوں کو مکمل طور پر قابو میں کر لے گا تو وہ پانی پر، آگ پر اور ہوا پر حاکم ہو جائے گا، اور وہ بقیہ تمام متحرک مخلوقات کے لیے وہی ہو جائے گا، جیسے قدیم زمانے کے خدا ہوا کرتے تھے۔

ہمت کرو، آگے بڑھو!

لوگو! ہم کدھر جا رہے ہیں؟ سائنس کی طرف جو حکومت بن گئی ہے۔ ان قوتوں کی طرف جو عوامی قوتیں بن چکی ہیں۔ فطری قانون کی طرف جس کی اپنی پابندیاں ہیں، اپنی سزائیں ہیں، جو ثبوت کے ذریعے حاوی ہوتی جا رہی ہیں نئی سچائیوں پر اور نئے زمانوں پر۔ ہم عوام کے اتحاد کی طرف بڑھ رہے ہیں؛ ہم انسان کی وحدت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب مصنوعی کہانیاں نہیں ہوں گی؛ اب طفیلی جراثیم نہیں ہوں گے۔ سچائی حقیقت پر حکومت کرے گی؛ یہی ہمارا ہدف ہے۔ تمدن ذہانت کی شان دار پارلیمانوں کے ذریعے اپنی عدالتیں لگائے گا یورپ کی بلندیوں پر، اس کے بعد براعظموں کے مراکز پر۔ اسی جیسی چیز پہلے بھی دیکھی گئی ہے۔ ہر برس amphictyons [یونانی اداروں] کی نشست ہوتی ہے، ایک یونانی جزیرے Delphos پر ہوتی ہے جو خداؤں کی کرسی ہے، دوسری یونانی میدانِ جنگ Thermopylae پر ہوتی ہے جو بہادروں کی جگہ ہے۔ یورپ کے اپنے ادارے ہوں گے؛ کرۂ ارض کے اپنے ادارے ہوں گے۔ فرانس اس ارفع مستقبل کو اپنے

سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ یہ انیسویں صدی کا زمانۂ حمل ہے۔ یونان نے جو خاکہ پیش کیا ہے، فرانس اس کی تکمیل کرے گا۔

سنو! فیوئی، میرے بہادر دست کار، عوام کے آدمی!

میں تمھاری عزت کرتا ہوں۔ ہاں، تم مستقبل کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔ ہاں، تم بالکل صحیح ہو۔ تمھارا نہ کوئی باپ تھا، نہ ماں؛ تم نے انسانیت کو اپنی ماں باپ بنا لیا تھا۔ اب تم مرنے والے ہو، یعنی کامیاب ہونے والے ہو۔

لوگو! آج جو کچھ بھی ہونے والا ہے، ہماری شکست ہو یا ہماری فتح، یہ ایک انقلاب ہوگا ہم جو پیدا کرنے والے ہیں۔ جس طرح آتش زنی پورے شہر کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح انقلابات پوری نسلِ انسانی کو روشنیوں سے سجا دیتے ہیں۔ اور وہ انقلاب کیا ہوگا جو ہم برپا کرنے والے ہیں؟

میں نے ابھی بیان کیا ہے، وہ سچے لوگوں کا انقلاب ہوگا۔ سیاسی نقطۂ نگاہ میں بس ایک ہی اصول ہوتا ہے، آدمی کی خود پر حاکمیت۔ ہم اپنے وجود پر اپنی حاکمیت کو آزادی کہتے ہیں۔ جہاں دو یا تین حاکمیتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں، وہیں سے ریاست شروع ہو جاتی ہے، مگر اس انجمن میں دستبرداری کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ہر حاکمیت ایک مشترکہ حق کی تشکیل کی خاطر اپنا تھوڑا سا حصہ دینا منظور کر لیتی ہے۔ ہمیں بھی یہی کرنا ہوگا۔ اس رعایت کو جو ہم سب دیتے ہیں مساوات کہا جاتا ہے۔ مشترکہ حق سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ حق کی اس حفاظت کو بھائی بندی یا فرقہ بندی کہا جاتا ہے۔ حاکمیت کے اس نقطۂ انقطاع کو سماج کہا جاتا ہے۔ یہ نقطۂ انقطاع ایک جوڑ ہوتا ہے، اور یہ نقطہ ایک گرہ بن جاتا ہے۔ اسی کو سماجی بندھن کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے عمرانی معاہدہ کہتے ہیں۔ دونوں ایک ہی چیز ہوتے ہیں، معاہدے کو لسانیات والے بندھن کہتے ہیں۔ اب ہمیں مساوات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے؛ اس لیے کہ اگر آزادی چوٹی ہے تو مساوات بنیاد ہوتی ہے۔

لوگو! مساوات دیوار پر اُگا سبزہ نہیں ہوتی؛ سوسائٹی گھاس کی تنظیم اور بڑی بڑی چیتاں ہوتی ہے اور مُنّے مُنّے شاہ بلوط ہوتی ہے؛ مسابقتوں کی قربتیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو زرد اور بے مقصد کر دیتی ہیں۔ قانون کی زبان میں، یہ صرف صلاحیتیں ہوتی ہیں؛ ایک ہی موقعے کے لیے؛ سیاست میں سارے ووٹ ایک ہی وزن کے ہوتے ہیں؛ مذہبی اعتبار سے سارے ضمیر ایک ہی سچائی کے حامل ہوتے ہیں۔ مساوات کا اپنا آلہ ہوتا ہے: مفت اور لازمی ہدایت۔ حروفِ تہجی

سب کا حق ہوتا ہے، جہاں سے شروعات کی جاتی ہے۔ ابتدائی اسکول سب پر لازم ہوتا ہے، دوسرے درجے کے اسکول کی سب کو پیش کش کی جاتی ہے، یہی قانون ہوتا ہے؛ ایک جیسے اسکول سے ایک ہی جیسی سوسائٹی پیدا ہوگی۔

جی ہاں، ہدایت، روشنی، روشنی!، ہر شے روشنی ہی سے ملتی ہے، اور روشنی ہی کی طرف واپس جاتی ہے۔

لوگو! انیسویں صدی عظیم ہے، مگر بیسویں صدی اچھی ہوگی۔ اس کے بعد ماضی کی تاریخ جیسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں، یہ منظر دیکھنا ہوگا آج کی طرح، فتح کا، حملے کا، قبضے کا، قوموں کے درمیان مقابلے کا، ہاتھوں میں ہتھیار کا، بادشاہوں کی شادی پر تمدن کے انحصار کا یا وراثتی جبر کی پیدائش کا، کانگریس کے ذریعے عوام کی تقسیم کا، شاہی خاندان کی ناکامی کے باعث ہونے والے ایک قتل کا، دوبدو دو مذاہب کی لڑائی کا، جیسے لامتناہی پُل پر اندھیرے میں دو جانور سینگ پھنسائے زور آزمائی کر رہے ہوں؛ اب ہمیں بالکل خوف نہیں ہوگا قحط کا، زراعت کی فراوانی کا، دُکھوں کے باعث ہونے والی جسم فروشی کا، بدنصیبی کے باعث کام میں ناکامی کا، سولی کے ستون کا اور تلوار کا، اور واقعات کے جنگل میں اتفاقیہ غنڈہ گردی کی لڑائیوں کا۔

شاید کوئی کہے کہ اب ایسے واقعات نہیں ہوں گے۔ ہم بہت خوش ہوں گے۔ نسلِ انسانی اسی طرح اپنا قانون مکمل کرلے گی، جس طرح خاکی کرۂ ارض اپنا قانون مکمل کرتا ہے؛ نفس اور ستارے کے درمیان ہم آہنگی دوبارہ قائم ہو جائے گی؛ نفس سچائی کے اطراف اسی طرح چکر لگائے گا جیسے کرۂ ارض روشنی [سورج] کے گرد مدار میں گھومتا ہے۔

دوستو! یہ وقت جب میں تم سے مخاطب ہوں ملال کا وقت ہے؛ مگر یہ مستقبل کی خوف ناک خریداریوں کا وقت ہے۔ انقلاب خطرے کا گھنٹا بجا رہا ہے۔ جی ہاں، انسانیت کامیاب ہوگی، اٹھائی جائے گی، اس کی دل جوئی کی جائے گی۔ اس پشتے پر ہم اس کا وعدہ کرتے ہیں۔

بھائیو! محبت کی پکار اگر قربانی کی بلندیوں سے نہیں اٹھے گی تو کہاں سے اُٹھے گی؟ یہی مقامِ اتصال ہے ان کا جو سوچتے ہیں اور جو دُکھ اٹھاتے ہیں؛ یہ پشتہ صرف پتھروں کی سِل سے، شہتیروں سے، لوہے کے ٹکڑوں سے ہی نہیں بنا ہے؛ یہ تو ڈھیریوں سے بنا ہے؛ ایک ڈھیر تھا خیالات کا اور دوسرا ڈھیر تھا غموں کا۔ اسی جگہ بدنصیبی آدرش سے ملتی ہے۔ دن رات کو گلے لگاتا ہے اور اس سے کہتا ہے، "میں مرنے والا ہوں، اور تمھیں ایک بار پھر میرے ساتھ پیدا ہونا ہوگا۔" تمام ویرانیوں کے معانقوں سے یقین ابھرتا ہے۔ ان بدنصیبیوں ہی میں ذہنی کرب کو اور خیالات کو ابدیت

ملتی ہے۔ یہ کرب اور یہ ابدیت مل کر ہماری موت مقرر کرنے والے ہیں۔ بھائیو، وہ جو یہاں مرے گا، مستقبل کی تابندگی میں مرے گا اور ہم سب سیلاب فجر کے ساتھ مقبرے میں داخل ہو رہے ہیں۔"

انجولا نے خاموش ہونے کے بجائے توقف کیا؛ اس کے لب آواز کے بغیر ہی ہل رہے تھے، گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو، جس کے باعث سب کی نظریں اسی پر جمی رہیں، اس کوشش میں کہ مزید کچھ سنیں۔ کسی قسم کی تحسین نہیں ہوئی؛ مگر لوگ دیر تک سرگوشیاں کرتے رہے۔ تقریر اگر سانس ہے تو ذہانت کی سرسراہٹ پتیوں کی سرسراہٹ سے مشابہ ہوتی ہے۔

۞

پریشاں حال ماریوس اور کم سخن جاویر

اب ہم بیان کرتے ہیں کہ ماریوس اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔

قاری کو اپنے نفس کی کیفیت کو یاد کرنا چاہیے۔ہم نے تو یاد کر لیا ہے۔ ماریوس کے نزدیک اب ہر شے ایک تصور تھی۔ اس کا ذہن الجھن میں تھا۔ہمیں اس امر پر اصرار کرنا چاہیے کہ ماریوس اس وقت ایسے سیاہ اور بڑے بڑے پروں کے نیچے تھا جو مرنے والوں پر چھائے ہوتے ہیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مقبرے میں داخل ہو گیا ہے؛ ایسا لگ رہا تھا گویا وہ دیوار کے اس طرف تھا، اور اب وہ سوائے مرنے والے کی آنکھوں کے، زندہ لوگوں کے چہرے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

موسیو فوشلووں وہاں کس طرح پہنچا؟ وہ وہاں کیوں ہے؟ وہاں کیا کرنے آیا ہے؟ ماریوس نے خود سے یہ سوالات نہیں پوچھے۔ اس کے علاوہ چوں کہ ہماری مایوسی مخصوص قسم کی ہے یہ ہمارے ساتھ دوسروں پر بھی چھا جاتی ہے، اسے یہ منطقی طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ پوری دنیا کو مرنے کے لیے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔

اس کے دل میں بس ایک خلش تھی — کوزیت کا خیال۔

فوشلووں نے اس سے کسی قسم کی بات نہیں کی؛ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، نہ اس کو سننے کی خواہش کی، جب ماریوس نے بلند آواز میں کہا تھا، ”میں اسے جانتا ہوں۔“

ماریوس کے نزدیک، موسیو فوشلووں کا رویہ تسلی بخش تھا۔ اگر اس رویے کے متعلق کچھ کہنا ہو تو کہنا کہ وہ اس سے خوش ہے۔ معمے کی طرح پیچیدہ اس انسان سے گفتگو کرنے میں اسے ہمیشہ دشواری محسوس ہوئی تھی، جو اس کی نظر میں مشکوک بھی تھا اور حاوی بھی۔ مزید یہ کہ ایک عرصہ ہو گیا تھا اس سے ملے ہوئے؛ اس وجہ سے ماریوس کی بزدلی اور محتاط فطرت میں نا ممکنات کا اضافہ ہو گیا تھا۔

پانچوں منتخب افراد Mondetour گلی کے راستے پشتے سے چلے گئے؛ دیکھنے میں وہ بالکل نیشنل گارڈ معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک تو جاتے وقت رو دیا تھا۔ روانگی سے پہلے وہ پیچھے رہ جانے والوں سے گلے ملے تھے۔

جب وہ پانچوں افراد جنھیں زندگی کی طرف واپس بھیجا گیا تھا، چلے گئے تو انجولرا کو وہ شخص یاد آیا جس کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ انجولرا مے نوشی کے کمرے میں داخل ہوا۔ جاویر اب بھی ستون سے بندھا اور مراقبے میں تھا۔

"تمھیں کچھ چاہیے؟" انجولرا نے اس سے پوچھا۔

"تم لوگ کب مجھے قتل کرنے والے ہو؟" جاویر نے جواب دیا۔

"انتظار کرو۔ ابھی ہمیں اپنے کارتوسوں کی سخت ضرورت ہے۔"

"اچھا تو مجھے کچھ پینے کے لیے دو۔" جاویر نے کہا۔

انجولرا نے اسے ایک گلاس پانی پیش کیا، اور چوں کہ جاویر بندھا ہوا تھا، پینے میں اس کی مدد بھی کی۔

"بس، اور کچھ نہیں؟" انجولرا نے پوچھا۔

"اس ستون سے بندھا میں بہت بے آرام ہوں۔" جاویر نے کہا "تم اتنے نرم دل نہیں کہ مجھے یہاں رات گزارنے دو گے؛ مجھے باندھ دو مگر اس آدمی کی طرح مجھے بھی میز پر لٹا دو۔" جاویر نے سر کی جنبش سے مابوف کی میت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

قاری کو یاد ہوگا تھا کہ کمرے کے آخر میں ایک لمبی چوڑی میز تھی، جس پر وہ گولیاں ڈھال رہے تھے اور کارتوس بھرے جا رہے تھے۔ سارے کارتوس بھرے جا چکے تھے، اور سارا بارود استعمال ہو چکا تھا۔ میز اب خالی تھی۔

انجولرا کے حکم پر چار سرکشوں نے مل کر جاویر کو ستون سے الگ کیا۔ جس وقت اسے کھولا جا رہا تھا، ایک شخص اپنی سنگین اس کے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

اس کے ہاتھ پس پشت بندھے تھے اور اس کے پاؤں پھانسی دی جانے والے مجرم کی طرح باندھ دیے گئے تھے کہ وہ پندرہ انچ سے بڑا قدم اٹھا نہیں سکتا تھا؛ اسے کمرے میں رکھی میز کے قریب لے جا کر اس پر لٹا دیا گیا، اور اس کے جسم کو رسیوں سے کس کر باندھ دیا گیا تھا۔

تحفظ کے خیال سے، اس کی گردن سے بندھی رسی اس طرح باندھی گئی تھی جس میں قیدی کا فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بندش اسی طرح تھی جیسی قید خانوں میں کی جاتی ہے جس کو martingale

کہا جاتا ہے۔ اس طریقے میں گلے سے بندھی ہوئی رسّی کو پیٹ پر سے قینچی کی طرح گزارا جاتا ہے، اور پاؤں کے درمیان سے گزارنے کے بعد اس سے ہاتھ بھی باندھ دیے جاتے ہیں۔

جس وقت جاوید کو باندھا جا رہا تھا، ایک آدمی ڈیوڑھی پر کھڑا غیر معمولی توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کا سایہ پڑنے پر جاوید نے اپنی گردن گھمائی؛ اپنی آنکھیں بلند کیں اور ڈال ولیوال کو پہچان لیا۔ اس نے ابھی کچھ کہنا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ خودداری سے اپنی پلکیں جھکا لیں اور صرف اتنا کہا، "بالکل ٹھیک ہے۔"

۞

دِگر گوں حالات

صبح کی روشنی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ نہ کوئی کھڑکی کھلی تھی نہ دروازہ۔ یہ فجر کا وقت تھا، مگر جاگنے کا نہیں۔ Chanvrerie اسٹریٹ کے سرے اور پشتے کے سامنے کا علاقہ فوجی دستوں نے خالی کرا لیا تھا، اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وہاں کوئی باقی نہیں رہا تھا اور راہ گیروں کو پُر اسرار اور سنسان دکھائی دیتا تھا۔ Saint-Denis اسٹریٹ اسی طرح بے آواز تھی، جیسی Thebes میں Sphinxes کی شاہراہ۔ چوراہے پر، جو سورج کی روشنی میں بالکل سفید ہو رہا تھا، ایک بھی زندہ نفس نہیں تھا۔ کوئی شے اتنی غمگین نہیں ہوتی جیسی کہ اس دن ان سنسان سڑکوں پر روشنی تھی۔ نہ کچھ دکھائی دیتا تھا نہ سنائی دیتا تھا۔ ایک خاص فاصلے پر پُر اسرار حرکت ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ تشویش کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔ پچھلی شام کی طرح چوکیوں پر چوکی دار آئے، مگر اس بار سب کے سب آگئے تھے۔

پہلے حملے کے موقعے پر پشتہ زیادہ مستحکم تھا۔ ان پانچ افراد کی روانگی کے بعد پشتے والوں نے پشتے کی بلندی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

چوکی دار کے مشورے پر، جس نے Halles کے علاقے کا معائنہ کیا تھا، عقب والوں کی حیرت کے خوف سے انجولرا نے ایک مشکل فیصلہ کیا۔ اس نے Mondetour گلی کے نالے کو جو اس وقت تک کھلا تھا، بند کرا دیا۔ اس کے لیے انھوں نے کئی مکانوں کی لمبائی کے برابر پیدل چلنے والوں کا راستہ کھود دیا تھا۔ اس طرح پشتہ تین سڑکوں پر کھڑی دیواروں سے محفوظ کر دیا گیا: Chanvrerie اسٹریٹ کے سامنے سے، Cygne اسٹریٹ کی بائیں جانب سے اور Petite Truanderie اسٹریٹ سے سب راستے بند ہو گئے تھے، اور Mondetour اسٹریٹ کی طرف کا راستہ بھی ناقابلِ دخول ہو گیا تھا؛ یہ سچ ہے کہ وہ سب حصار میں تھے۔ اس کے تین محاذ تھے، مگر نکلنے کا کوئی راستہ

نہیں تھا۔ "یعنی ایک قلعہ ہے جس میں چوہے کا سوراخ بھی ہے۔" کوفیراک نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

انجولرا نے اندازاً پتھر کی تیس سلیں اکھڑوائیں جو بوسے کے مطابق وائن کی دکان کے دروازے کے قریب ڈھیر کر دی گئیں۔

اس علاقے میں خاموشی گہری ہو گئی تھی، حملہ ہونا لازمی تھا، اور انجولرا نے ہر ایک کو اس کی لڑائی کی جگہ تعینات کر دیا تھا۔ ہر ایک کو بارودی کی مقررہ مقدار بھی فراہم کر دی گئی تھی۔

کسی پشتے سے زیادہ متجسس شے نہیں ہو سکتی جسے حملے کی تیاری کا سامنا ہو۔ ایسی صورت میں ہر آدمی کسی تھیٹر کی طرح اپنی جگہ منتخب کرتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں، کہنی مارتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پتھروں کے ڈھیر لگا لیتے ہیں۔ اُدھر اس دیوار کا ایک کونا نکلا ہے جو راستے میں مخل ہوتا ہے، اسے توڑ دیا جاتا ہے؛ اِدھر ایک مٹی کا دمدمہ ہے جو تحفظ فراہم کر سکتا ہے، لوگ اس کے پیچھے پناہ لے لیتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ زیادہ شائستہ ہوتے ہیں جو ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں جس میں کم دشواری ہو۔ کئی لوگ بیٹھ کر لڑنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مارتے بھی آسانی سے ہیں، اور مرتے بھی آرام سے ہیں۔ جون 1848ء کی افسوس ناک جنگ میں ایک سرکش شخص جو بے پناہ نشانے باز تھا، اور ایک مکان کی چھت سے گولی چلا رہا تھا، اپنے استعمال کے لیے ایک آرام کرسی لے آیا تھا؛ افسوس کہ گریپ شاٹ کے ایک وار نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

جوں ہی رہنما عمل کے لیے جگہ خالی کر دینے کا حکم جاری کرتا ہے، تمام بے ترتیب حرکات ختم ہو جاتی ہیں؛ اس وقت کسی قسم کی چھینا جھپٹی نہیں ہوتی؛ مزید گروہ بندیاں نہیں ہوتیں؛ آنا کانی نہیں ہوتی؛ چھت پر قبضے نہیں ہوتے؛ ہر شے جذبے کے مطابق حملہ کرنے والوں کے انتظار میں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے اور دوسری اشیا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خطرے کی آمد سے پہلے پشتے پر ابتری ہوتی ہے، مگر خطرے کی صورت میں خود بخود ہی نظم و ضبط بن جاتی ہے۔ خطرہ ترتیب پیدا کر دیتا ہے۔

جیسے ہی انجولرا کو اس کی دونالی رائفل ملی وہ روشن دان جیسی ایک جگہ بیٹھ گیا جو اس کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی؛ سب لوگ مطمئن ہو گئے۔ ہر قسم کی ہلکی آوازوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو پتھروں سے بنی دیواروں سے ٹکرا کر آ رہی تھیں۔ لوگ اپنی اپنی بندوقوں کے گھوڑے چڑھا رہے تھے۔

مزید یہ کہ ان کے رویے زیادہ فاخرانہ، زیادہ پُراعتماد ہو گئے تھے؛ ضرورت سے زیادہ قربانی قوت بخش ہو جایا کرتی ہے؛ پھر ان میں کوئی امید نہیں رہی، وہ مایوس ہو گئے تھے، مایوسی — جو آخری حربہ ہوتی ہے، کبھی کبھی فتح کا باعث بن جایا کرتی ہے؛ ورجل نے بھی یہی بات کہی ہے۔

بلند و برتر وسائل سخت قسم کی ہمت اور ارادوں سے نکلتے ہیں۔ موت سے آنکھ لڑانا کبھی کبھی ڈوبتے جہاز سے نکل جانے کا ذریعہ بن جاتا ہے؛ تابوت کا سرپوش کبھی کبھی تحفظ کا تختہ بن جاتا ہے۔

پچھلی شام کی طرح سب کی توجہ سڑک کے آخری سرے کی طرف ہو گئی تھی، جو اَب روشن تھا اور دکھائی دینے لگا تھا۔ انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ Saint-Leu کے علاقے میں ایک واضح حرکت ہوئی، مگر وہ پہلے حملے جیسی حرکت نہیں تھی۔ ٹکراتی زنجیروں کی چھن چھن، بے چین کر دینے والے جھٹکے، پُر اعتماد قدموں کی کھڑک، ایک قسم کا سنجیدہ شور اعلان کر رہا تھا کہ نامبارک قدموں کا سلسلہ پشتے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پُر امن سڑکوں کے سینوں میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی، جو جنگ کے پہیوں کی خوف ناک گڑگڑاہٹ کے لیے نہیں، زرخیز خیالات اور دل چسپیوں کی گشت کے لیے بنائی گئی تھیں۔

سڑک کے آخری سرے پر تمام لڑنے والوں کی نظروں کے ارتکاز نے ایک خوف ناک روپ دھار لیا تھا۔

ایک توپ نظر آئی۔

توپ خانے کے سپاہی اسے دھکیل رہے تھے؛ توپ گولا اندازی کے لیے تیار تھی۔ اس کے کھینچنے والی گاڑی الگ کر دی گئی تھی؛ دو افراد توپ گاڑی کو سنبھالے تھے، چار اس کے پہیوں کو چلا رہے تھے؛ دو گولہ بارود کی گاڑی کے پیچھے چل رہے تھے۔ وہ جلتے چیتھڑوں کے ڈھیر سے اٹھنے والا دھواں دیکھ سکتے تھے۔

"فائر!" انجولرا چیخا۔

پورے پشتے نے ایک ساتھ فائر کیا، نتیجہ بھیانک تھا؛ توپ اور اس کے سپاہی دھوئیں کے بادل میں چھپ گئے تھے؛ چند لمحوں بعد بادل منتشر ہوا، توپ اور سپاہی دوبارہ نظر آئے؛ توپ چلانے والے آہستہ آہستہ، صحیح طریقے سے، بغیر عجلت کے بڑھتے ہوئے پشتے کے سامنے پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے کسی کو گزند نہیں پہنچی تھی۔ اس کے بعد توپ کے کپتان نے توپ کے دہانے کا رُخ اس طرح درست کیا جیسے کوئی ستارہ شناس اپنی دوربین کو درست کرتا ہے۔

"توپ چلانے والوں کے لیے شاباشی!" بوسے نے چیخ کر کہا۔

پورے پشتے نے تالیاں بجائیں۔

ایک لمحے بعد، سڑک کے بیچ، نالے کے ساتھ قرینے سے لگائی گئی توپ عمل کے لیے تیار تھی۔ نشانہ لگانے والی دو خوف ناک توپیں تیار تھیں۔

”خوشی خوشی کام شروع کرو۔“ کوفیراک نے کہا، ”یہی سب سے بے رحم کام ہوتا ہے۔ ناک سے اشارہ دینے کے بعد، مکے سے ضرب لگانا۔ فوج ہماری طرف اپنے پنجے بڑھا رہی ہے۔ پشتے کو شدید جھٹکا لگنے کا امکان ہے۔ گولیوں کی باڑھ کوشش کرتی ہے، توپ قبضہ کر لیتی ہے۔“

”اس میں نئے ماڈل کی آٹھ مشینیں ہیں۔“ کومفیر نے اضافہ کیا، ”جیسے ہی ان میں ٹن کا تناسب بڑھے گا، یہ مشینیں پھٹ جائیں گی۔ ضرورت سے زیادہ ٹن ان کو نرم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس میں گولوں کے گزرنے کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اگر ان کی نال میں جھانک کر دیکھا جائے تو چھوٹے چھوٹے غار اور چیمبر نظر آئیں گے جن میں سے گولوں کو گزرنا ہوتا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے اور گولوں کو زور سے چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ چودھویں صدی کے تعامل کی طرف رجوع کیا جائے — چھلے ڈالنا، اور مضبوط بنانے کے لیے نال کے باہر چاروں طرف بے جوڑ فولاد کی پٹیاں چڑھانا۔ اس دوران جس قدر ممکن ہو خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؛ تلاش کرنے والے آلے کی مدد سے توپ کی نال میں سوراخ ڈھونڈے جاتے ہیں، مگر ایک بہتر طریقہ بھی ہے جسے Gribeauval's movable star کہتے ہیں [Gribeauval، سولھویں صدی میں فرانسیسی توپ خانے کا ایک افسر تھا جس نے نئی قسم کی ہلکی، مگر اتنی ہی دور کی مار والی توپ بنانے کے لیے یہ فارمولا پیش کیا تھا۔]

”سولھویں صدی میں“ بوسے نے کہا، ”توپوں کی نالوں میں رائفل [چکر دار جھری ڈالنا، جن میں سے گزرنے کے بعد وقت گولی گھومنے لگتی ہے اور اس کی ولائی میں اضافہ ہو جاتا ہے] ڈالی جاتی تھی۔“

”ہاں“ کومفیر نے جواب دیا، ”یہ جھری حرکیے کی آگے بڑھنے کی قوت میں اضافہ کرتی ہے، مگر نشانے کی درستی کم ہو جاتی ہے۔ کم فاصلے کے ہدف میں خطِ پرواز حسبِ خواہش بے لوچ نہیں ہوتی، گولی کی بیضویت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور حرکیے کی لکیر ہدف پر لگنے کے لیے تسلی بخش خطِ مستقیم نہیں رہتی، جو جنگ کے لیے ضروری ہوتی ہے، اور جس کی اہمیت دشمن کے فاصلے اور مشین سے چارج کی تیزی سے بڑھ جاتی ہے۔ رائفل شدہ توپ سے نکلنے والے حرکیے کا خم چارج کے چھوٹے ہونے کی صورت میں سولھویں صدی میں بڑھ گیا تھا؛ اس قسم کے انجن کے لیے منجنیق جیسی ضروریات چھوٹے چارج پر حاوی ہو جاتی ہیں، مثال کے طور پر توپ گاڑی کی محافظت۔ مختصر یہ کہ توپ وہ سب کچھ نہیں کر سکتی جس کی توقع کی جاتی ہے؛ یعنی قوت ہی سب سے بڑی کمزوری بن جاتی ہے۔ توپ کا گولا چھ سو لیگ فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرتا ہے؛ روشنی ستر ہزار لیگ فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ ایسی ہی فوقیت ہے یسوع مسیح کی نپولین پر۔“

''اپنی بندوقیں دوبارہ بھر لو۔'' انجولرا نے کہا۔

توپ کے گولے پشتے کو کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں؟ کیا وہ دراڑ ڈال سکیں گے؟ یہ سب سے اہم سوال تھا۔ جب سرکش اپنی بندوقیں بھر رہے تھے، توپ خانے والے بھی اپنی توپیں بھر رہے تھے۔

مورچے میں پریشانی بڑھ گئی تھی۔

''ہوشیار!'' انجولرا خوشی سے چیخا۔

جیسے ہی گولا ٹکرایا، گاوروش پشتے میں کود پڑا۔

وہ Cygne اسٹریٹ کی طرف سے آیا تھا، اور جلدی سے معاون پشتے پر چڑھ گیا جو Petite Truanderie اسٹریٹ کی بھول بھلیاں کے سامنے تھا۔

گاوروش نے پشتے پر توپ کے گولے سے زیادہ سنسنی پھیلا دی تھی۔

گولا کوڑے کے ڈھیر میں دھنس گیا تھا۔ صرف ایک اومنی کا پہیہ ٹوٹا، اور ایک قدیم ٹھیلا مسمار ہو گیا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر پورا پشتہ ہنسنے لگا۔

''اپنا کام جاری رکھو۔'' بوسے نے بکتر بند والوں سے کہا۔

۞

توپچی کی اہمیت

لوگوں نے گاوروش کو گھیر لیا، مگر اس کے پاس کچھ بتانے کا وقت نہیں تھا۔ ماریوس کانپتا ہوا اسے ایک طرف کھینچ لے گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہیلو" لڑکے نے کہا، "تم خود یہاں کیا کر رہے ہو؟" اور وہ اپنی رزمیہ گستاخی سے ماریوس کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں اپنے اندر کی متکبر روشنی سے بڑی ہو گئی تھیں۔

ماریوس نے بد سلوکی کے لہجے میں کہا، "تم سے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟ کیا تم نے خط اس پتے پر پہنچا دیا ہے؟"

اس خط کے معاملے میں گاوروش کچھ پریشان سا تھا۔ پشتے پر واپس پہنچنے کی جلدی میں اس نے خط پہنچایا نہیں، بس کسی طرح ٹھکانے لگا دیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ اس نے لاپروائی سے اس اجنبی پر بھروسا کر لیا تھا؛ ٹھیک ہے جس کا چہرہ بھی دیکھ نہیں سکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ شخص ننگے سر تھا، مگر یہ کافی نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے آپ سے کچھ گلہ کر رہا تھا، اور ماریوس کی امکانی سرزنش سے بھی خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اس مشکل سے خود کو نکالنے کے لیے اس نے سب سے آسان راستہ اختیار کیا: صاف جھوٹ بول دیا۔ دوست! میں نے خط دربان کو دے دیا تھا۔ خاتون سو رہی تھی۔ جب اٹھے گی تو خط اسے مل جائے گا۔"

اس خط کے بھیجنے میں ماریوس کے دو مقاصد تھے: کوزیٹ کو الوداع کہنا، اور گاوروش کو بچانا۔ اسے اپنی نصف خواہش کے حصول پر قناعت کرنی پڑی۔"

خط کی روانگی اور موسیو فوشلوواں کی پشتے پر موجودگی، یہ ایک اتفاقی مطابقت تھی جو اس

کے ساتھ پیش آئی تھی۔ اس نے موسیو فوشلوون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گاوروش سے پوچھا:
"تم اس شخص کو جانتے ہو؟"
"نہیں۔" گاوروش نے جواب دیا۔

گاوروش نے دراصل جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ژاں ولژاں کو صرف رات کے وقت دیکھا تھا۔ ماریس کے ذہن میں جو مشکل اور غلط قسم کی تاویلات اُبھر رہی تھیں یک لخت غائب ہو گئیں۔ کیا وہ موسیو فوشلوون کے خیالات سے واقف تھا؟ غالباً موسیو فوشلوون ری پبلکن تھا۔ گویا، اس لڑائی میں اس کا موجود ہونا فطری تھا۔

اس دوران پشتے کے دوسرے سرے پر گاوروش چیخ رہا تھا، "میری بندوق!"

کوفیراک نے بندوق واپس کر دی۔

گاوروش نے اپنے "کامریڈوں" کو تنبیہ کر دی تھی کہ پشتے کو محصور کر دیا گیا ہے کہ اسے یہاں پہنچنے میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔ صف کی ایک بٹالین جس کے ہتھیار Petite Truanderie اسٹریٹ پر ڈھیر تھے، Cygne کی طرف سے نگرانی کر رہی تھی؛ اس کی دوسری جانب میونسپل گارڈ نے Precheurs اسٹریٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ پوری فوج ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس اطلاع میں گاوروش نے اضافہ کیا، "میں تم لوگوں کو ان کی زبردست پٹائی کا اختیار دیتا ہوں"

اس دوران اَنجولرا کان لگائے سُن رہا تھا اور اس روشن دان پر نگاہ بھی رکھے ہوئے تھا۔

حملہ کرنے والے اپنے حملے سے خوش نہیں تھے، اس لیے انھوں نے اسے دہرایا نہیں۔

پیدل فوج کی صف کے ایک دستے نے فوجی رسد گاہ کے عقب میں سڑک کے آخری سرے پر قبضہ کر لیا۔ سپاہی فٹ پاتھ اکھاڑ کر پشتے کے سامنے ایک چھوٹی سی تقریباً اٹھارہ انچ بلند راستہ نما دیوار بنا رہے تھے۔ اس کی بائیں جانب ایک زاویے پر مضافات سے آنے والی ایک بٹالین کا ابتدائی سرا نظر آ رہا تھا جو Saint-Denis اسٹریٹ پر جمع ہو گئی تھی۔

اَنجولرا کا خیال تھا، جو اطراف پر نظر رکھے ہوئے تھا، کہ وہ اس مخصوص قسم کی آواز کو پہچان سکتا تھا جو گولا بارود لے جانے والی گاڑی سے گریپ شاٹ اتارنے سے پیدا ہوئی تھی، اور اس نے دیکھا کہ اس حصے کے کماں دار نے توپ کے دہانے کی بلندی میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسے بائیں جانب کر دیا تھا۔ اس کے بعد توپچیوں نے توپ کو بھرنا شروع کر دیا۔ چیف نے روئی کا گالا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے نال کی طرف جھکا دیا تھا۔

"سر جھکا لو، اور دیوار سے چمٹ جاؤ" اَنجولرا نے چیخ کر کہا۔ "پشتے کے سب لوگ اپنے

گھنٹوں کے بل ہو جائیں۔"

سرکش لوگ جو وائن کی دکان کے سامنے آوارہ پھر رہے تھے اور جنھوں نے گاڑ روش کی آمد پر اپنی اپنی چوکیاں چھوڑ دی تھیں بے ترتیبی سے پشتے کی طرف دوڑے، مگر قبل اس کے کہ انجولرا کے حکم پر عمل کیا جاتا گریپ شاٹ کی کھڑکھڑ کے ساتھ ایک فائر ہوا۔ یہی تھا جو ہونے والا تھا۔

فائر کا رُخ مورچہ نما قلعے کے شگاف کی طرف تھا؛ گولے دیوار سے ٹکرا کر واپس ہوئے اور اس خوف ناک واپسی سے دو مرے اور تین زخمی ہوئے۔ اگر اسی طرح ہوتا رہتا تو پشتہ قابلِ مدافعت نہیں رہتا۔ گریپ شاٹ کے گولے اندر داخل ہو گئے تھے۔

خوف زدہ سرگوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"ہمیں دوسرے فائر کو باز رکھنا ہوگا۔" انجولرا نے کہا۔ اور اپنی رائفل کی نال نیچے کرتے ہوئے اس نے توپ کے کپتان کا نشانہ لیا، جو اس وقت اپنی توپ پر جھکا ہوا اس کے رُخ کو درست کر رہا تھا۔

کپتان توپ خانے کا ایک خوب صورت سارجنٹ تھا، بہت کم عمر، سنہرے بال، شریفانہ چہرہ اور اس میں ذہانت کی وہ کیفیت، جو اس خوف ناک ہتھیار کے لیے ضروری ہوتی ہے، موجود تھی، دہشت میں کمال حاصل کرنے کے لیے، جس کا ہلاکت کرنے والی جنگ میں ختم ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

کومفیر نے، جو انجولرا کے قریب ہی کھڑا تھا، اس نوجوان کو غور سے دیکھا۔

"افسوس!" کومفیر نے کہا، "یہ قصائی پن کتنا ڈراؤنا کام ہے۔ اگر بادشاہ نہ ہوں تو جنگ نہیں ہوگی۔ انجولرا، تم اس سارجنٹ کا نشانہ لے رہے ہو، تم اس کی طرف دیکھ نہیں رہے ہو۔ ذرا تصور تو کرو، یہ کتنا دل رُبا نوجوان ہے، بہادر ہے اور ظاہر ہے کہ ذہین بھی ہے۔ وہ توپ خانے والے بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں؛ اس کا باپ ہے، ماں ہے، خاندان ہے؛ وہ شاید کسی سے محبت بھی کرتا ہے؛ یہ زیادہ سے زیادہ بیس اور پانچ [پچیس] کا ہوگا؛ یہ تمھارا بھائی بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہے۔" انجولرا نے کہا۔

"ہاں" کومفیر نے کہا، "یہ میرا بھی بھائی ہے۔ تو پھر اس کو مارو نہیں۔"

"چلے جاؤ یہاں سے۔ یہ کام ضروری ہے۔" اور آنسو کا ایک قطرہ انجولرا کے سفید رخسار سے آہستہ آہستہ ڈھلک رہا تھا۔

اسی لمحے، اس نے اپنی رائفل کی لبلبی دبا دی۔ ایک شعلہ نکلا۔ توپ خانے والا دو بار

چکرایا، اس کے ہاتھ آگے کی طرف بڑھے، اس کا سر بلند ہوا، شاید سانس لینے کے لیے، اور وہ اپنی توپ کے قریب زمین پر گر پڑا اور وہیں ساکت پڑا رہا۔ وہ دونوں اس کی پشت دیکھ سکتے تھے، جس کے بیچ سے خون کا ایک چشمہ اُبل رہا تھا۔ گولی اس کی چھاتی کی ایک جانب لگ کر دوسری جانب سے نکل گئی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔

اسے لے جایا جانا تھا اور دوسرے کو اس کی جگہ لینی تھی۔

اس طرح کئی منٹ کا وقفہ حاصل کر لیا گیا تھا۔

تجربہ کار لیاقت کا استعمال

پشتے والوں نے آپس میں اپنی رائے اور خیالات کے تبادلے کیے۔ توپ کی نشانہ بازی ایک بار پھر شروع ہونے والی تھی۔ گریپ شاٹ کے مقابلے میں وہ ایک چوتھائی گھنٹے سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ بے حد ضروری تھا کہ کسی طرح حملے روک دیے جائیں۔

انجولرا نے اپنا حکم جاری کر دیا، ''ہمیں اس جگہ ایک گدا لگا دینا چاہیے۔''

''ایک بھی نہیں ہے۔'' کومبیر نے کہا ''ان پر زخمی لیٹے ہیں۔''

ژاں ولژاں نے جو ذرا دور شراب خانے کے کونے پر اپنی بندوق گھٹنوں کے درمیان رکھے بیٹھا تھا۔ اُس نے اس وقت تک جو کچھ ہو رہا تھا اس میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا تھا۔ بظاہر اس نے یہ جملہ کہ ''ایک بندوق ہے جو کچھ نہیں کر رہی ہے'' سنا نہیں تھا جو اس کے اطراف لڑنے والے کہہ رہے تھے۔

انجولرا کے حکم پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

قاری کو یاد ہوگا کہ جب Chanvrerie اسٹریٹ پر ہجوم آیا تھا تو ایک بوڑھی عورت نے گولیوں کی پیش بینی کرتے ہوئے اپنی کھڑکی کے سامنے اپنا گدا اڑا دیا تھا۔ کھڑکی جو دو چھتی کی کھڑکی تھی ایک چھ منزلہ مکان کی چھت میں تھی جو پشتے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس گدے کو کپڑے سکھانے والے دو ڈنڈے لگا کر روکا گیا تھا، اور اوپر سے اسے دو رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا، جو دور سے دھاگے جیسی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ رسیاں دو کیلوں سے بندھی تھیں جو کھڑکی کے فریم میں ٹھونک دی گئی تھیں۔ یہ رسیاں آسمان کے پس منظر میں بال جیسی دکھائی دیتی تھیں۔

''کیا کوئی مجھے عاریتاً اپنی دونالی رائفل دے سکتا ہے؟'' ژاں ولژاں نے کہا۔

انجولرا نے اپنی رائفل دوبارہ بھر لی تھی، جو اس کے حوالے کر دی۔ ژاں ولژاں نے اس دوچھتی کی کھڑکی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گدے کی ایک رسّی کٹ گئی۔ اب گدا صرف ایک رسّی کے سہارے لٹکا تھا۔ ژاں ولژاں نے دوسرا فائر کیا۔ دوسری رسّی ٹوٹ کر دوچھتی کی کھڑکی سے ٹکرائی اور ڈنڈوں کے درمیان پھنسا گدا سڑک پر گر پڑا۔ پشتے والوں نے تالیاں بجائیں۔ سب نے مل کر شور مچایا، ''ایک گدا مل گیا!''

''ہاں، مل تو گیا ہے۔'' کومفیر نے کہا، ''مگر اسے لینے کون جائے گا؟''

دراصل، گدا پشتے سے باہر حصار کرنے والوں اور محصورین کے درمیان گرا تھا۔ اب جب کہ توپ خانے کے سارجنٹ کی موت نے سپاہیوں کو برہم کر دیا تھا، کئی منٹ تک سارے سپاہی پیٹ کے بل پتھروں سے بنے ان راستوں پر لیٹے تھے جو انھوں نے بنائے تھے، اور توپوں کی اس جبری خاموشی کو طول دینے کی خاطر، جو خاموش تھی اور نئے سرے سے مرتب کی جا رہی تھی، انھوں نے پشتے پر فائر شروع کر دیے تھے۔ سرکشوں نے اپنے گولے بارود بچانے کی خاطر اس بندوق بازی کا جواب نہیں دیا؛ پشتے پر گولیوں کی برسات ہو رہی تھی مگر سڑک جو سپاہیوں سے بھری تھی، خوف ناک ہو رہی تھی۔

ژاں ولژاں شگاف سے باہر نکلا سڑک پر گیا، گولیوں کے طوفان سے گزرا، گدے تک گیا، اس کو اپنی پشت پر لادا اور پشتے پر واپس آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے گدے کو شگاف پر رکھ دیا۔ اسے دیوار سے اس طرح لگا دیا تھا کہ توپ خانے والے اسے دیکھ نہ پائیں۔ اس کے بعد پشتے والے گرجِ ثبات کے اگلے فائر کا انتظار کرنے لگے۔

اس کو شروع ہونے میں دیر نہیں لگی۔

گھن گرج کے ساتھ توپ نے اپنا گولا اُگل دیا، مگر اس بار گولے دیوار سے ٹکرا کر پلٹے نہیں۔ انھوں نے جس اثر کی پیش بینی کی تھی حاصل ہو گئی، پشتہ بچا لیا گیا تھا۔

''ساتھی!'' انجولرا نے ژاں ولژاں سے کہا، ''جمہوریہ تمھاری شکرگزار ہے۔''

بوسے نے بھی تعریف کی اور ہنسا۔ اس نے بلند آواز میں کہا:

''کتنی بداخلاقی کی بات ہے کہ ایک گدے میں اتنی طاقت ہو۔ فتح اسی کی ہوتی ہے جو بجلی کی طرح حملہ کرتا ہے۔ پھر بھی، اس گدے کو مبارک باد جو توپ کو بے کار کر دیتا ہے۔''

سویرا

عین اسی وقت کوزیت جاگ اُٹھی تھی۔

اس کا کمرہ تنگ، صاف ستھرا، اور پُرسکون تھا جس میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی جو مشرق کی سمت اور مکان کے پچھلے صحن میں کھلتی تھی۔ کوزیت کو کچھ خبر نہیں تھی کہ پیرس میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ پچھلی شام اس جگہ نہیں تھی، اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھی جب توسا نے کہا تھا، "ایسا معلوم ہوتا ہے لڑائی چھڑ گئی ہے۔"

کوزیت صرف چار گھنٹے سوئی مگر نیند گہری تھی۔ اسے اچھے اچھے خواب دکھائی دیے جو شاید اس وجہ سے تھے کہ اس کا بستر بالکل سفید تھا۔ کوئی شخص، جو ماریوس تھا، اسے روشنی میں نظر آیا تھا۔ وہ جاگی جب سورج کی روشنی اس کی آنکھوں پر پڑنے لگی تھی جو پہلے تو اسے اپنے خوابوں کا تسلسل معلوم ہوا تھا۔ خواب سے اُٹھتے ہی اس کا پہلا خیال تبسم خیز تھا۔ کوزیت خود کو پوری طرح مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ ژاں ولژاں کی طرح وہ بھی پچھلے چند گھنٹے اپنے نفس کے اس ردِعمل سے گزر رہی جو بدقسمتی کا لفظ بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ نجانے کیوں وہ اپنی تمام تر قوت سے امید پر قائم تھی۔ پھر اسے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس ہوئی۔ اسے ماریوس کو دیکھے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ اس نے خود سے کہا کہ اسے میرا خط مل گیا ہوگا۔ کہ اسے علم ہوگا کہ میں کہاں ہوں، اور یہ بھی کہ وہ اتنا چالاک ضرور تھا کہ اس تک پہنچنے کی کوئی راہ نکال لے گا۔ اور یہ بھی کہ یقینی طور پر اس صبح بھی ـــ شاید ہر صبح کی طرح ـــ دن روشن تھا مگر روشنی کی کرنیں ترچھی پڑ رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ ابھی بہت سویرا ہے، پھر بھی اسے ماریوس کے استقبال کے لیے تو اُٹھنا ہی تھا۔

اسے محسوس ہوا گویا وہ ماریوس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی؛ اس کے لیے بس یہی کافی

تھا کہ ماریوس آئے گا۔ کوئی بہانہ جائز نہ ہوتا۔ اس کا آنا یقینی تھا۔ یہ کیا کم بھیانک بات تھی کہ وہ تین دن سے پریشان تھی۔ ماریوس تین دن سے غیر حاضر تھا۔ ماریوس آنے والا تھا اور اچھی خبر لائے گا۔ نوجوانی اسی طرح بنی ہے: اس کے آنسو جلد خشک ہو جاتے ہیں، آزردگی کو بے کار سمجھتی ہے، اور اسے قبول نہیں کرتی۔ جوانی مستقبل کا تبسم ہوتی ہے، اس کے لیے خوش رہنا فطری عمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شخص امید سے بنایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ، کوزیٹ کو بالکل یاد نہیں تھا کہ ماریوس نے اپنی غیر حاضری کے بارے میں کہا تھا کہ وہ صرف ایک دن کے لیے ہوگی اور اس نے اس کی کیا توضیح پیش کی تھی۔ ہر ایک نے دیکھا ہوگا کہ زمین پر گرایا ہوا سکہ کس پھرتی سے گھومتا چلا جاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے اور وہ کون سا فن ہے جس سے یہ خود کو ناقابلِ دریافت بنا لیتا ہے۔ خیالات بھی اسی طرح ہم سے مکر کرتے ہیں: وہ ہمارے دماغ کے کسی کونے میں جا کر بس جاتے ہیں: اور یہی ان کا اختتام ہوتا ہے: وہ کھو جاتے ہیں: اور ان کو یاد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کوزیٹ اپنی یادداشت کی اس چھوٹی سی ناکامی سے آزردہ ہو رہی تھی۔ اس نے خود سے کہا یہ بڑی خراب بات ہے کہ میں نے وہ الفاظ بھلا دیے ہیں جو ماریوس نے مجھ سے کہے تھے۔

کوزیٹ بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنے نفسانی اور جسمانی دونوں فرائض انجام دیے: دعائیں کیں اور سنگھار کیا۔

کبھی کبھی کسی اہم ضرورت کے پیشِ نظر ادیب قاری کو حجلۂ عروسی میں لے جانے پر مجبور ہو جاتا ہے: کنوارپنے کے حجلے میں نہیں۔ اشعار مشکل سے ہی اس میں قدم رکھ سکتے ہیں، نثر کو اس کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔

ہر پھول کے اندرون میں، جو ابھی کھلا نہ ہو، اندھیرا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ایک سفیدی ہوتی: یہ ایک نجی خلیہ ہوتا ہے بند کلی کا: جب تک سورج اسے دیکھ نہ لے انسان کو اس پر نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔ عورت بھی اپنی کلی میں مقدس ہوتی ہے۔ وہ معصوم کلی جو کھل جاتی ہے: وہ قابلِ پرستش نیم برہنگی جو اس کا اپنا معاملہ ہوتی ہے: وہ سفید پیر جو سلیپر میں قدم رکھتا ہے: وہ گردن جو خود کو آئینے کے سامنے اس طرح آشکار کرتی ہے گویا وہ آئینہ نہیں ہے کوئی آنکھ ہے: وہ قمیص جو اٹھنے میں عجلت کرتی ہے اور شانے کو فرنیچر کے کسی نکلے ہوئے کونے سے یا گزرتی ہوئی کسی سواری سے چھپاتی ہے: وہ بندھے ہوئے دھاگے، وہ کھسوئے جو بند ہوتے ہیں: وہ جالی کے پردے جو پڑے ہوتے ہیں: وہ کپکپی، وہ ٹھنڈک اور حیا کی لرزش: ہر حرکت کی وہ نفیس خوف زدگی: وہ بے کلی جس میں

خطرے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی؛ وہ متواتر آدوار سجاوٹ کے، ایسے دلربا جیسے صبح کے بادل — مناسب نہیں کہ ان سب کو بیان کیا جائے؛ اور توجہ منعطف کرنے لیے بھی یہ ضرورت سے زیادہ ہوگا۔

ستارے کے طلوع کے نظارے کے مقابلے میں نوجوان لڑکی کے طلوع کے آگے مَرد کی آنکھ کو زیادہ محترم ہونا چاہیے۔ دُکھ پہنچانے کے امکان کو اضافی احترام کا باعث ہونا چاہیے۔ آڑو کے روئیں، آلوچے کی کلیاں، برف کی تاب کار قلمیں، تتلی کے پروں کے نرم بال اس پاک دامنی کے مقابلے میں زیادہ سخت ہوتے ہیں جسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ پاک دامن ہے۔ نوجوان لڑکی خواب کی تجسیم نہیں ہوتی، صرف ایک جھماکا ہوتی ہے۔ اس کی خواب گاہ آدرش کے کسی دھندلے حصے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ غیر محتاط نگاہ کا احساس بھی اس کی نیم سایے کی سی کیفیت کو زخمی کر دیتا ہے۔ یہاں تصور بھی بے ادبی ہو جاتا ہے۔

اس لیے ہم کوزیت کی اُٹھان کی بے قراری کے ذکر سے پرہیز کریں گے۔

ایک مشرقی داستان بتاتی ہے کہ خدا نے گلاب کو سفید خلق کیا تھا مگر جب کلی پھول بن رہی تھی اور آدم نے اس پر نظر کی تو وہ شرم سے گلابی ہو گئی۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو نوجوان لڑکیوں اور پھولوں کے سامنے گُنگ ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ توقیر کی حق دار ہوتی ہیں۔

کوزیت نے پھرتی سے لباس تبدیل کیا، کنگھی چوٹی کی، بال بنائے، جو اس زمانے میں بہت آسان کام ہوا کرتا تھا جب عورتیں گھنگریالے بال اور موباف کا تکلف نہیں کرتی تھیں، گیسوؤں میں [انھیں سخت کرنے کے لیے] گھوڑوں کے بال نہیں ڈالتی تھیں۔ اس کے بعد اس نے کھڑکی کھولی اور ہر سمت نظر دوڑائی، اس امید پر کہ کسی سڑک پر، کسی مکان کے سامنے، کسی راستے کے کنارے اسے ماریوس دکھائی دے گا۔ مگر وہاں سے باہر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ عقبی صحن بلند دیواروں سے گھرا تھا اور نظر صرف چند باغیچوں تک ہی محدود رہتی تھی۔ کوزیت نے ان باغیچوں کو ذرا دنا کہا اس لیے کہ زندگی میں پہلی بار اسے پھول بدصورت لگے تھے۔ سڑک کا کوئی مختصر ترین علاقہ بھی اس کی خواہشوں کو بہتر طریقے سے پورا کر دیتا۔ پھر اس نے آسمان پر نظر ڈالنے کا فیصلہ کیا، گویا اس کے خیال کے مطابق، ماریوس اس طرف سے آ سکتا تھا۔

پھر ایک دم وہ رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ یہ اس کے نفس کی بے ثباتی تھی؛ مگر ملال کی کیفیت میں اُمیدیں دو دھاری تلوار بن جاتی ہیں۔ یہ تھی اس کی کیفیت۔ اس کا اُلجھا ہوا شعور خوف ناک تصورات پیش کر رہا تھا۔ خیالات ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ اس نے خود سے کہا کہ اب اسے کسی بات کا یقین نہیں، کہ نظریں ہٹانے کا مطلب گم ہو جانا تھا اور یہ خیال کہ ماریوس آسمان سے

اس کے پاس آ سکتا تھا، دل رُبا نہیں تھا، غم انگیز ہو گیا تھا۔

تب، جیسا کہ بادلوں کی فطرت ہوتی ہے، وہ پُرسکون اور پُرامید ہو گئی، اور اس کے لبوں پر ایک قسم کا لاشعوری تبسم کھیلنے لگا، جو خدا پر اس کے یقین کو ظاہر کرتا تھا۔

گھر میں سب محوِ خواب تھے۔ دیہات جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک جھلملی بھی کھولی نہیں گئی تھی۔ دربان کا حجرہ بھی بند تھا۔ تُوسا بھی نہیں اُٹھی تھی، اور کوزیٹ، فطری طور پر سمجھی کہ اس کا باپ بھی محوِ خواب تھا۔ اس نے بہت دُکھ اٹھائے تھے، وہ اب بھی بہت دُکھی تھی اس لیے کہ اس نے خود سے کہا تھا کہ اس کا باپ نامہربان تھا؛ مگر اسے ماریوس پر بھروسا تھا۔ روشنی کی بے نوری یقینی طور پر ناممکن تھی۔ کبھی کبھی اسے دور سے آتی تیز آوازیں سنائی دیتی تھیں اور وہ خود سے کہتی تھی، ''عجیب بات ہے کہ لوگ اتنے سویرے گاڑیوں کے پھاٹک کھولنے لگتے ہیں۔'' دراصل وہ پشتے پر توپوں کی گولا باری کی آوازیں تھیں۔

کوزیٹ کی کھڑکی کے چند فٹ نیچے، دیوار میں کارنس تھی جو بالکل سیاہ تھی جس میں ابابیل کی نسل کے پرندوں کے جوڑے نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کا ایک کنارہ کارنس سے باہر تک نکلا ہوا تھا، اس طرح کہ اوپر سے اس چھوٹی سی جنت میں دیکھنا ممکن ہو گیا تھا۔ ماں گھونسلے میں چھوٹے چھوٹے بچوں پر اپنے پنکھے جیسے پَر پھیلائے موجود تھی؛ باپ نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور اڑ کر دور چلا گیا، پھر واپس آیا؛ وہ اپنی منقار میں غذا اور بھوسا لے کر آیا تھا۔ اس نکلتے ہوئے دن نے اس خوش قسمت شے کو زرنگار کر دیا تھا، عظیم قانون ''نسل بڑھاؤ'' مسکرا رہا تھا اور وہ خوب صورت معما اس شان دار صبح میں حل ہو رہا تھا۔ کوزیٹ سورج کی روشنی میں اپنے بال پھیلائے کھڑی تھی، اس کا ذہن عجیب الخلقت مخلوقات میں کھویا اندرونی محبت اور بیرونی سویرے سے جگمگا رہا تھا؛ یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ اس وقت ماریوس کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی وہ میکانکی انداز میں جھکی اور اس نے ان پرندوں پر، اس خاندان پر اس نر اور مادہ پر، اس پریشانی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا جو کسی کنواری کو گھونسلے سے بہرہ مند کر دیتی ہے۔

گولی لگ جاتی ہے لیکن مرتا کوئی نہیں

حملہ آور مسلسل فائر کر رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے بندوق اور توپ بازی ہو رہی تھی مگر سچ یہ ہے کہ زیادہ تباہی نہیں ہو رہی تھی۔ Corinth کے صرف اوپری حصے کا نقصان ہوا تھا؛ پہلی منزل کی کھڑکی اور دوچھتی کی کھڑکیاں، جو گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھیں، خراب ہو گئی تھیں۔ وہاں تعینات لڑنے والوں کو پسپا ہونا پڑا تھا۔

پشتے کے بارے میں حکمتِ عملی یہ تھی:

اس پر دیر تک فائر کیا جائے تا کہ اگر وہ لوگ جواب دینے کی غلطی کریں تو سرکشوں کا گولا بارود جلد ختم ہو جائے۔ ان کی جانب سے فائر میں تساہلی برتی جانے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے پاس پاؤڈر اور گولیوں کی کمی ہے تب ان پر حملہ کر دیا جائے گا۔

آنجولرا ان کے دام میں نہیں آیا؛ پشتے نے فائر کا جواب نہیں دیا۔

پلاٹونوں کے ہر حملے پر گاؤروش منہ چڑاتا اور زبان نکالتا، جو بے حد نفرت کی علامت ہوتا ہے۔ "تمھیں مبارک ہو۔" اس نے کہا۔ "کپڑے پھاڑ ڈالو۔ ہمیں بھی کچھ دھجیاں درکار ہیں۔"

کوفیراک نے گریپ شاٹ کے کم اثر ہونے پر سرزنش کی اور توپ والوں سے کہا:

"میرے پیارے دوستو، تم لوگ منتشر ہوتے جا رہے ہو۔"

رقص گاہ کی طرح لوگ لڑائی میں بھی الجھن میں پڑ جایا کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ مورچے والوں کی اس خاموشی سے محاصرہ کرنے والوں میں بے چینی شروع ہو گئی تھی، اور ان کو کسی غیر متوقع واقعے سے خوف زدہ کرنے کے لیے اور اس لیے بھی کہ انھیں معلوم ہو کہ پتھروں کے اس ڈھیر کے اور اس ناقابلِ عبور دیوار کے پیچھے کیا ہو رہا تھا جس پر حملے ہوئے تھے جن کا جواب نہیں

دیا جاسکا تھا۔

اچانک سرکشوں کو پڑوس کی چھت پر سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی ایک آہنی ٹوپی نظر پڑی۔ ایک فائر مین ایک بلند چمنی سے ٹیک لگائے اس طرح کھڑا تھا، گویا وہ کوئی چوکی دار ہے۔ دراصل وہ پشتے کے اندر چھانک رہا تھا۔

"دیکھو، اُدھر کوئی ہے جو ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔" انجولرا نے کہا۔

ژاں ولژاں نے انجولرا کی رائفل واپس کردی تھی مگر اس کی بندوق اسی کے پاس تھی۔

منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر اس نے فائر مین پر بشست باندھی اور ایک سیکنڈ بعد گولی کی ضرب سے شکستہ آہنی ٹوپی، کھڑکھڑ کرتی، سڑک پر جاگری پڑی تھی۔ خوف زدہ سپاہی فوراً ہی وہاں سے غائب ہوگیا۔ ایک اور مشاہدہ کرنے والے نے اس کی جگہ لے لی۔ یہ شخص افسر تھا۔ ژاں ولژاں نے، جس نے اپنی بندوق دوبارہ بھر لی تھی، نئے آنے والے کا نشانہ لیا اور چشم زدن میں افسر کا خود سپاہی کی شکستہ آہنی ٹوپی کے ساتھ پڑا تھا۔ افسر وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔ اس کے بعد چھت پر کوئی نظر نہیں آیا؛ پشتے کی جاسوسی کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔

"تم نے اس آدمی کو ہلاک کیوں نہیں کیا؟" بوسے نے ژاں ولژاں سے سوال کیا۔

ژاں ولژاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

۞

نظم و ضبط کی طرف دار بدنظمی

بوسے نے کومفیر کے کان میں چپکے سے کہا:
"اس شخص نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"
"یہ وہی آدمی ہے جو بندوق کی گولی سے اچھے کام کرتا ہے" کومفیر نے کہا۔

جن لوگوں کو وہ زمانہ یاد ہے، جانتے ہیں کہ مضافات کے نیشنل گارڈ نے بدامنی کے خلاف بہادری کے کام کیے تھے۔ جون 1832ء میں بالخصوص یہ بہت پُر جوش اور بہادر تھے۔ Pantin des Vertus یا la Cunette پر گھونٹ گھونٹ پینے والی ایک شراب کی دکان والا، جس کا کاروبار فسادات کے باعث بند تھا، اپنی رقص گاہ کو سنسان دیکھ کر شیر دل ہو گیا تھا اور چائے کے ایک باغ کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں مارا گیا۔ اس بورژوائی اور بہادرانہ وقت میں ان خیالات کی موجودگی میں جن کے اپنے سورما ہوتے تھے، اپنی جائیدادوں کی حفاظت کے لیے جیالے ملازم رکھا کرتے تھے۔ مالکان کی بیوقوفی تحریک کو بہادری سے باز نہ رکھ سکی۔ بادشاہتوں کے زوال نے بیکاروں کو قومی ترانہ گانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے مال خانوں کی حفاظت میں جھوم جھوم کر قدیم یونانی ولولے کی دھن میں اپنا خون بہایا اور دُکان کا دفاع کیا تھا۔

حقیقتاً یہ کوئی ڈھنگ کا کام نہیں تھا۔ سارے سماجی عناصر اس نزاع میں شامل ہو گئے تھے، اور اس دن کے انتظار میں تھے جب لوگ ہوش میں آ ئیں گے۔ اس زمانے کی ایک اور پہچان تھی، لاقانونیت اور سرکاریت کی آمیزش۔ لوگ نظم اور بے نظمی کے میل کے حق میں تھے۔

نیشنل گارڈ کے فلاں فلاں کرنل کے حکم پر نقارہ نامناسب دھنیں بجانے لگا؛ فلاں فلاں کپتان نے وجدان کی بنیاد پر لڑائی شروع کر دی؛ فلاں فلاں نیشنل گارڈ اپنے طور پر "کسی خیال" کے

لیے لڑ پڑے۔ ان دنوں تشویش ناک لمحات میں لوگ اپنے رہنماؤں سے کم اور اپنی جبلت سے زیادہ رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے۔ منظم فوج میں حقیقی گوریلا گروہ موجود تھے؛ کچھ تلوار کے دھنی تھے؛ کچھ قلم کے دھنی تھے، جیسے Henri Fonfrede [اٹھارہویں صدی کا فرانسیسی ادیب اور مدیر]۔

بدقسمتی یہ تھی کہ اس زمانے کا تمدن اصول پرستوں کے گروہوں کے بجائے اجتماعی مفادات کی نمائندگی کرتا تھا؛ واقعی خطرے میں تھا یا خود کو خطرے میں محسوس کرتا تھا؛ اس نے خطرے کی گھنٹی تیار کر دی تھی؛ ہر ایک نے خود کو مرکز بنا لیا، اس کا دفاع کرتا، اس کی امداد کرتا، اور خود اپنے سر سے اس کی حفاظت کرتا تھا؛ اور پہلے آنے والا سوسائٹی کو بچانے کا ٹھیکا لے لیتا تھا۔

ولولہ کبھی کبھی تجاوز کرنے لگتا ہے۔ نیشنل گارڈ کی ایک پلٹن از خود اپنے آپ کو جنگ کی نجی کاؤنسل بنا لیتی ہے، اور گرفتار باغی کا پانچ منٹ کے اندر فیصلہ صادر کر دیتی ہے اور موت کی سزا دے دیتی۔ وہ اسی قسم کی وقتی تدبیر تھی جس نے ژاں پرووییر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ فوری موت دینے کا قانون (Lynch law) جس کی بنیاد پر کسی جماعت کو بقیہ جماعتوں کی سرزنش کا حق نہیں تھا، مگر اب امریکا کی جمہوریہ نے اور اس کے ساتھ یورپ کی شاہی نے اس کا اطلاق کر دیا ہے۔ یہ قانون غلطیوں سے پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ایک دن کے فساد پر Paul Aime Garnier نامی ایک نوجوان شاعر کو Place Royale میں پکڑا گیا اور اس کی رانوں میں سنگین بھونک دی گئی تھی۔ وہ بے چارہ صرف اس وجہ سے بچ گیا تھا کہ اس نے porte-cochere نمبر 6 میں پناہ لے لی تھی۔ لوگ چلا رہے تھے، "یہ بھی Saint-Simonians میں سے ہے۔" اور اسے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ اب اس کی بغل میں ڈیوک Saint-Simon کی یادداشت کی ایک جلد تھی اور وہ چیخ کر کہہ رہا تھا، "موت!"

جون 1832ء کی چھٹی تاریخ کو مضافات سے آنے والے نیشنل گارڈ کے ایک دستے نے، جس کی کمان کپتان Fannicot کر رہا تھا، Chanvrerie اسٹریٹ پر اچانک ارادے کی تبدیلی کے باعث اور اپنی بھلائی کے لیے خود کو تباہ کر لیا تھا۔ یہ حقیقت جو غیر معمولی معلوم ہوتی ہے، عدالتی تفتیش کے دوران کھلی جو 1832ء کی بدامنی کے نتیجے میں کی گئی تھی۔ کپتان Fannicot، جو ایک نڈر اور بے چین بورژوا، ایک قسم کا کرایے کا سپاہی، کٹر اور بے لگام سرکار پرست تھا، قبل از وقت فائر کرنے کے لالچ میں تنہا یعنی اپنے دستے سمیت اور بغیر کسی مدد کے پشتے کو فتح کرنے کی مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ سرخ پرچم اور اس پرانے کوٹ کے آسیب سے عاجز آ کر جو اس نے سیاہ پرچم کے عوض لیا تھا، اس نے یہ بانگ دہل جرنیلوں اور کورز کے سرداروں پر الزام لگایا تھا جو کاؤنسل

کے اجلاس کر رہے تھے اور انھیں خیال نہیں تھا کہ فیصلہ کن حملے کا وقت آ گیا ہے، اور جو بدامنی کو اپنے ہی خنجر سے خودکشی کی اجازت دے رہے تھے۔ اپنے طور پر وہ سمجھا تھا کہ پشتہ پکے ہوئے آم کے مانند ہے اور چوں کہ وہ جو پک جاتا ہے اسے گر جانا چاہیے، اسے فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔

جیسا کہ ایک گواہ نے بتایا، وہ اپنے جیسے مستعد، ثابت قدم اور "غضب ناک لوگوں" کی کمان کر رہا تھا۔ یہ وہی دستہ تھا جس نے شاعر ژاں پرووییر کو گولی ماری تھی، جو اُن دستوں میں پہلا تھا جو سڑک کے زاویے پر تعینات کیے گئے تھے۔ اس لمحے جب انھیں بالکل توقع نہیں تھی، کپتان نے اپنے سپاہیوں کو پشتے پر جھونک دیا تھا۔ یہ حرکت، جو حکمتِ عملی کم اور نیک خواہش زیادہ تھی، Fannicot کے دستے کو بہت مہنگی پڑی تھی۔ قبل اس کے کہ اس کا دستہ سڑک کا دو تہائی حصہ پار کرتا، اس کو پشتے سے آنے والے گولوں کی بوچھاڑ کا سامنا ہوا۔ چار سب سے نڈر سپاہی جو آگے آگے دوڑ رہے تھے، مورچے کے بالکل قریب پہنچ کر مارے گئے اور نیشنل گارڈ کے اس با ہمت گروہ کو، جو بے حد بہادر مگر فوجی استحکام کے اعتبار سے کم زور تھا، کچھ تامل کے بعد چند رہ لاشیں چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا تھا۔ اس وقتی تامل نے سرکشوں کو اپنے ہتھیار بھر لینے کا موقع فراہم کر دیا، اور قبل اس کے کہ وہ سڑک کے کونے کو لے سکتے، جو اُن کی پناہ گاہ تھا، کمپنی کو ایک دوسری زیادہ تباہ کن بوچھاڑ لگی۔ ایک لمحہ گزرا تھا کہ کمپنی دوطرفہ فائر کی زد میں آ گئی اس لیے کہ توپ خانے والوں تک فائر نہ کرنے کا حکم پہنچ نہیں سکا تھا۔

اس گریپ شاٹ سے مرنے والوں میں نڈر اور غیر محتاط کپتان Fannicot شامل تھا۔ وہ توپ سے نہیں بلکہ تھم سے مارا گیا تھا۔

اس حملے نے، جو تشویش ناک کم اور غضب ناک زیادہ تھا، انجولرا کو برہم کر دیا— "احمق!" اس نے کہا تھا، "وہ اپنے ہی آدمی مروا رہے ہیں اور ہمارا گولا بارود ضائع کروا رہے ہیں۔"

انجولرا بدامنی کے اصلی جرنیل کی طرح بول رہا تھا، اور وہ تھا بھی۔ بدامنی اور جبر ایک جیسے ہتھیار سے نہیں لڑا کرتے۔ بدامنی جو جلد ختم ہو جاتی ہے گنتی کی گولیاں چلاتی ہے اور اس کے پاس ضائع کرنے کو بھی گنتی ہی کی جانیں ہوتی ہیں۔ کارتوس کا خالی تھیلا، ایک مرے ہوئے آدمی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ جبر کے پاس فوج ہوتی ہے، وہ آدمیوں کی گنتی نہیں کرتا، اور چوں کہ Vincennes ان کے قبضے میں ہے وہ اپنی چلی ہوئی گولیوں کی گنتی کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایک کی جدوجہد ہوتی ہے سو کے خلاف، جو آخر میں پشتے کو کچل دیتی ہے جب تک کہ انقلاب اچانک نکل کر اپنے شعلہ زن فرشتے کی تلوار کو متوازن نہیں کر دیتا۔ کبھی یہ نہیں بھی ہوتا۔ تب ہر شے بغاوت کرنے لگتی ہے،

راستے اُبلنا شروع کر دیتے ہیں اور مورچے وافر ہو جاتے ہیں۔ پیرس کسمسانے لگتا ہے، سوال اٹھنے لگتے ہیں، ایک دن اگست فضا میں ہوتی ہے؛ ایک انتیس جولائی فضا میں ہوتی ہے؛ حیرتوں بھری روشنی ظاہر ہوتی ہے؛ جمائی لیتا ہوا وقت کا جبڑا ایسا ہو جاتا ہے اور فوج، یعنی شیر، اپنے سامنے اس پیغمبر، [یعنی] فرانس کو مستعد اور ایستادہ دیکھتا ہے۔

۞

جاتی کرنیں

احساسات اور جذبات کی افراط و تفریط میں جو پشتے کا دفاع کرتے ہیں، تھوڑی تھوڑی ہر شے ہوتی ہے؛ بہادری ہوتی ہے؛ نوجوانی ہوتی ہے؛ عزت ہوتی ہے؛ ولولہ ہوتا ہے؛ آدرش ہوتا ہے؛ یقین ہوتا ہے؛ جواری کا غصہ ہوتا ہے، اور سب سے بڑھ کر امیدوں کی بے ترتیبی ہوتی ہے۔

بار بار ہونے والے وقفوں سے Chanvrerie اسٹریٹ کے پشتے پر امید کی ایک لہر سی پھیل گئی، اس وقت جب اس کی بالکل توقع نہیں تھی۔

''سنو!'' اچانک انجولرا چیخا، جواب بھی پُرامید تھا، ''مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پیرس جاگنے والا ہے۔''

یہ سچ ہے کہ جون کی 6 تاریخ کو ایک یا دو گھنٹے کے لیے بدامنی پھر شروع ہو گئی تھی۔ Saint-Merry کے گھنٹا گھر کی گرج کے بار بار اصرار نے مخصوص قسم کے خیالات کو دوبارہ متحرک کر دیا تھا۔ Poirier اسٹریٹ اور Gravilliers اسٹریٹ پر پشتوں کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ Saint-Martin کے دروازے کے سامنے رائفل سے مسلح ایک نوجوان نے گھڑسواروں کے ایک اسکواڈرن پر حملہ کر دیا تھا۔ بظاہر رواں دواں بولیوارڈ پر اس نے زمین پر اپنا گھٹنا ٹیکا، اپنا ہتھیار شانے پر جمایا، فائر کیا، اسکواڈرن کے کمان دار کو ہلاک کیا، اور یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا، ''ایک اور بھی، جو ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

اس کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ Saint Denis اسٹریٹ پر ایک عورت بند جھلملی کے پیچھے سے نیشنل گارڈ پر گولی چلا رہی تھی۔ ہر فائر پر جھلملی ہلتی نظر آ رہی تھی۔ چودہ برس کا ایک لڑکا Cossonerie اسٹریٹ پر گرفتار کیا گیا؛ اس کی جیب کارتوسوں سے بھری تھی۔ کئی چوکیوں پر

حملے ہوئے۔ Bertin-Poirier اسٹریٹ کے داخلے پر ایک بہت پُر جوش اور قطعی طور پر غیر متوقع توپ کے حملے سے آہنی صدری پوش رجمنٹ کا خیر مقدم کیا گیا جس کے آگے مارشل جنرل Cavaignac de Baragueمارچ کر رہا تھا۔ Planche-Mibray اسٹریٹ پر لوگ چھتوں پر چڑھے پرانے مٹی کے برتن اور دوسرے گھریلو برتن پھینک رہے تھے؛ جو ایک بُرا شگون تھا؛ اور جب یہ معاملہ مارشل Soult کے سامنے پیش کیا گیا تو نپولین کا یہ پرانا نائب سوچ میں پڑ گیا، اور Saragossa میں کہا گیا کہ سوشے(Suchet)کا مقولہ یاد آگیا ہے، "جب بوڑھی عورتیں ہم پر اپنے برتن پھینکنے لگیں تو سمجھو کہ ہمارا کام تمام ہو گیا ہے۔"

یہ عام قسم کی علامتیں جو اس وقت ظاہر ہوئی تھیں جب یہ سمجھا جا رہا تھا کہ بغاوت کو مقامی بنا دیا گیا ہے؛ یہ غیظ و غضب اور یہ چنگاریاں جو دھما کا خیز مادوں کے ڈھیروں پر، جنھیں مضافات پیرس کہا جاتا ہے، اِدھر اُدھر اڑتی پھر رہی تھیں — ان سب نے فوجی سرداروں کو پریشان کر دیا اور انھوں نے اس آگ کو بجھانے میں تیزی دکھائی تھی۔

انھوں نے Saint-Merry اور Chanvrerie ،Maubuee کے پشتوں پر حملہ اس وقت تک کے لیے موخر کر دیا جب تک یہ چنگاریاں بجھا نہ دی جائیں تاکہ صرف پشتوں ہی پر توجہ کی جائے اور سب کو ایک ہی ضرب میں ختم کر دیا جائے۔ سڑکوں پر جہاں زیادہ سرگرمی تھی فوجیوں کی قطار بھیج دی گئی؛ بڑے لوگ ہٹا دیے گئے، چھوٹوں کو اشارہ کر دیا گیا، دائیں بائیں، سب کچھ اب آہستگی اور احتیاط سے ہو رہا تھا؛ اس وقت سب کچھ قابو میں آگیا تھا۔ سپاہیوں نے مکانوں کے دروازے توڑ دیے جہاں سے گولیاں چلائی گئی تھیں؛ ساتھ ہی گھڑ سوار دستے کی آمد نے شاہراہوں پر سرگرم گروہوں کو منتشر کر دیا تھا۔ یہ سب ممکن نہ ہوتا اگر کوئی شورش نہ ہوتی، جو فوج اور عوام کے درمیان مخصوص ہوتی ہے۔ یہی وہ بات تھی جو انجولرا نے توپ بازی اور بندوق بازی کے وقفے کے درمیان دیکھی تھی۔ مزید یہ کہ اس نے زخمی لوگوں کو سڑک پر گزرتے دیکھا تھا، اور کوفیراک سے کہا تھا، "وہ زخمی ہمارے آدمی نہیں ہیں۔"

ان کی اُمیدیں زیادہ دیر قائم نہیں رہیں؛ ساری چمک دمک جلد ہی گہنا گئی۔ آدھے گھنٹے کے اندر جو کچھ فضا میں تھا غائب ہو گیا تھا؛ وہ گرج چمک کے ساتھ آسمانی بجلی جیسی تھی، اور سرکشوں کو محسوس ہوا کہ وہ ایک قسم کا سخت مقابلہ تھا جو اُن کو درپیش تھا۔

وہ عام حرکت جو اَب مبہم سا خاکہ رہ گئی تھی، ناکام رہی؛ اور اب جنگ کے وزیر اور جرنیلوں کی حکمت عملی کی توجہ تین یا چار پشتوں پر مرتکز کی جا سکتی تھی جو اَب بھی مقابلہ کر رہے تھے۔

سورج اُفق پر اُبھر رہا تھا۔

مزگشوں نے اُنجولا سے پکار کر کہا:

"ہم لوگ، بہت بھوکے ہیں۔ کھانا پانی بغیر، کیا ہم لوگ اس طرح مر جائیں گے؟"

اُنجولا نے، جو اَب بھی اپنے جھروکے پر کہنی ٹکائے کھڑا تھا، سر کی جنبش سے مثبت اشارہ کیا، مگر اس کی آنکھیں سڑک کے آخری سرے پر جمی ہوئی تھیں۔

۞

انجولرا کی محبوبہ

کوفیراک، جو اس وقت انجولرا کے پہلو میں پتھر کی ایک سل پر بیٹھا ہوا تھا، مسلسل توپ کی توہین کر رہا تھا؛ اور ہر بار جب، چھوٹے چھوٹے گولوں سے بھرا وہ غم انگیز بادل، جسے گریپ شاٹ کہتے ہیں، بھیانک آواز کے ساتھ اوپر سے گزرتا، وہ اس پر طعنوں کی بوچھاڑ سے حملہ کر دیتا تھا۔ ''ظالمو، تم ہمارے پھیپھڑے برباد کر رہے ہو؛ تم ہمیں دُکھ دے رہے ہو، تم اپنا غصہ ضائع کر رہے ہو۔ ہمارے نزدیک یہ گرج نہیں، محض کھانسی ہے۔'' اور قریب کھڑے لوگ ہنس دیتے تھے۔

کوفیراک اور بوسے، جن کا دلیرانہ مزاج خطرے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا، مادام Scarron کی طرح، غذا کی کمی کو اپنی خوش طبعی سے پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور چوں کہ وائن کی کمی تھی، وہ چنچل بازیاں بھی کر رہے تھے۔

''میں انجولرا کو پسند کرتا ہوں۔'' بوسے نے کہا، ''اس کی احساس سے عاری جاں بازی مجھے حیران کر دیتی ہے۔ وہ اکیلا رہتا ہے، اور شاید یہی اس کی افسردگی کا باعث ہے؛ انجولرا اپنی بڑائی کا شاکی ہے، جس نے اسے بیوگی پر مجبور کر دیا ہے۔ اور ادھر، ہم سب کی محبوبائیں ہیں جو کم و بیش ہمیں پاگل کیے رکھتی ہیں جس کو ہم بہادری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر انسان چیتے کی طرح محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے تو کم از کم اتنا تو کر سکتا ہے کہ شیر کی طرح لڑے بھی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم اس اچھل کود اور چنچل بازی کا بدلہ لے سکتے ہیں جو عام درجے کی خواتین ہم سے روا رکھتی ہیں۔ ہمارا ہیرو پن ہماری خواتین کے باعث ہی ہوتا ہے۔ رولاں انجلی کے لیے جان دے دیتا ہے۔ عورت کے بغیر آدمی اس پستول کی طرح ہوتا ہے جس میں لبلبی نہ ہو۔ وہ عورت ہی ہوتی ہے جو مرد کو آگے بڑھاتی ہے۔

""ٹھیک ہے، انجولرا کی اپنی کوئی عورت نہیں۔ اسے کسی سے محبت نہیں، پھر بھی وہ بہادر اور نڈر انسان ہے۔ ایسا کبھی نہیں سنا کہ آدمی برف کی طرح یخ ہونا چاہیے اور آگ کی طرح بے باک۔""

بظاہر انجولرا یہ سب سُنی نہیں رہا تھا، مگر کوئی اس کے قریب ہوتا تو اس نے سرگوشی میں اسے ""پیٹریا"" کا نام لیتے سن لیا ہوتا۔ بوسے ہنس رہا تھا جب کوفیراک نے بلند آواز میں کہا تھا، ""تازہ خبر!"" اور کسی نقیب کے لہجے میں جو اعلان کر رہا ہو، اس نے اضافہ کیا، ""میرا نام Eight-Pounder [بحری جہازوں پر نصب کی جانے والی ہلکی توپ] ہے۔""

دراصل اس منظر میں ایک نئی شخصیت داخل ہو گئی تھی۔ یہ توپ خانے کی دوسری مشین تھی۔ بکتر بند سپاہیوں نے تیزی سے حرکت کی اور دوسری مشین کو پہلی صف میں رکھ دیا۔ یہ تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ چند منٹ بعد، ان دو مشینوں نے تیزی سے کام کرتے ہوئے مورچے پر بہت قریب سے فائر کرنا شروع کیا؛ مضافات کی پلٹن کی صف اور سپاہیوں کے فائر نے توپ خانے کا بھرم رکھ لیا۔ کچھ دور ہونے والی ایک اور گولا باری سنائی دی۔ اس کے ساتھ، دو توپیں Chanvrerie اسٹریٹ سے مورچے پر شدید حملے کر رہی تھیں؛ دوسری دو توپیں قطار میں لگی، Saint Denis اسٹریٹ سے اور Aubry Boucher اسٹریٹ سے Saint-Merry کے پشتے کو چھلنی کر رہی تھیں۔ چار توپیں غم انگیز گونج میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔

دو جنگجو کتے آپس میں اپنی بھونکوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔

دو توپیں جو اس وقت Chanvrerie اسٹریٹ کے پشتے پر حملے کر رہی تھیں گریپ شاٹ استعمال کر رہی تھیں؛ جب کہ دوسری توپیں دوسرے قسم کے گولے پھینک رہی تھیں۔

وہ توپ جو عام قسم کے گولے پھینک رہی تھی اس کا رُخ اوپر کی جانب تھا اور نشانہ اتنے حساب سے لگایا گیا تھا کہ گولا پشتے کے سب سے اونچی جگہ پر لگے، اور پتھر چور چور ہو اور گریپ شاٹ کے گولوں میں مل کر سرکشوں پر جا گرے۔ اس قسم کی گولا باری کا مقصد سرکشوں کو مورچے کی بلندی سے بھگانا، اور ان کو اندرون میں جمع ہونے پر مجبور کرنا تھا۔

ایک بار لڑنے والوں کو گولوں اور گریپ شاٹ کے گولوں کے رقص سے بننے والی کھڑکیوں کی مدد سے پشتے کی چوٹی سے بھگا دیا جاتا تو حملے کرنے والے سپاہیوں کی قطار چپکے سے، کسی کی نظر میں آئے بغیر، سڑک میں داخل ہو جاتی اور تیزی سے مورچے کی بلندی پر چڑھ سکتی تھی؛ جس طرح پچھلی شام ہوا تھا، اور مورچے والے حیرت زدہ رہ جاتے۔

”یہ اشد ضروری ہے کہ ان توپوں کی تکلیف کم کردی جائے۔“ انجولرا نے کہا اور چیخا ”بکتر بند دستے پر فائر کرو۔“

سب پوری طرح تیار تھے۔ پشتے نے جو بہت دیر سے خاموش تھا، پوری قوت سے فائر کردیا؛ یکے بعد دیگرے غصے اور خوشی کے عالم میں سات یا آٹھ فائر کیے گئے؛ سڑک اندھا کردینے والے دھوئیں سے بھر گئی، اور چند منٹ بعد ہر طرف شعلے ہی شعلے تھے اور اپنی توپوں کے پہیوں کے درمیان لیٹے ہوئے دو تہائی توپچی پہچانے جا سکتے تھے۔ اور وہ جو کھڑے رہ گئے تھے بڑے آرام سے توپوں کو بھر رہے تھے، مگر فائرنگ سست ہو گئی تھی۔

”اب سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔“ بوسے نے انجولرا سے کہا۔ ”کامیابی۔“

انجولرا نے اپنے سر کو جنبش دی اور کہا، ”یہ کامیابی چوتھائی گھنٹے تک جاری رہی تو پشتے میں ایک کارتوس بھی باقی نہیں بچے گا۔“

اور ایسا محسوس ہوا جیسے اتفاقاً گاوروش نے یہ جملہ سن لیا تھا۔

۞

گاؤروش کی روانگی

کوفیراک کو اچانک پشتے کی بنیاد سے ذرا آگے سڑک کے درمیان کوئی شخص جھکا دکھائی دیا۔

گاؤروش نے وائن کی دکان سے وائن کی بوتلوں کی ایک جھابی اٹھائی، شگاف سے باہر نکلا اور نیشنل گارڈ کے کارتوس سے بھرے ڈبے خالی کرنے اور چپکے چپکے ان کے کارتوسوں سے اپنی جھابی بھرنے لگا جو مورچے کی ڈھلان پر مارے گئے تھے۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو؟" کوفیراک نے سوال کیا۔

گاؤروش نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، "اپنی جھابی بھر رہا ہوں، دوست!"

"تمھیں گریپ شاٹ نظر نہیں آتے کیا؟"

گاؤروش نے جواب دیا، "ہاں، بارش ہو رہی ہے، تو پھر؟"

کوفیراک نے چیخ کر کہا، "اندر آجاؤ!"

"ابھی آیا۔" گاؤروش نے کہا، اور ایک چھلانگ میں وہ سڑک پر تھا۔

قاری کو یاد ہوگا کہ Fannicot کی کمپنی اپنے پیچھے لاشوں کی ایک قطار چھوڑ گئی تھی۔ سڑک کے طول و عرض میں بیس لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ گاؤروش کو پشتے کے لیے بیس مرنے والوں کے کارتوس جمع کرنے تھے۔

سڑک پر پھیلا دھواں کہر جیسا لگ رہا تھا۔ جس کسی نے پہاڑ کی دو چوٹیوں کے درمیان نشیب میں اترے بادل دیکھے ہوں اسے اس دھوئیں کا اندازہ ہوگا جو مکانوں کی دو بلند اور اداس بھری قطاروں کے درمیان گہرا اور دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ دھواں رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا اور اس میں متواتر نئے دھوئیں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس نے دن کی روشنی تک کو دھندلا دیا تھا۔ سڑک کے ایک

سرے سے دوسرے سرے تک لڑنے والے مشکل سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے، باوجود اس کے کہ سڑک چھوٹی سی تھی۔

یہ دھندلا پن جو شاید کمان داروں کی خواہش کے مطابق تھا جو پشتے پر حملے کی رہنمائی کر رہے تھے، گاوروش کے لیے فائدہ مند تھا۔ دھند کی اس نقاب کے نیچے جس کا پھیلاؤ زیادہ نہیں تھا، کسی کو نظر آئے بغیر وہ سڑک پر آگے بڑھ سکتا تھا؛ اس نے زیادہ خطرہ مول لیے بغیر پہلے سات یا آٹھ کارتوس کے بکس خالی کر لیے تھے۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا دانتوں میں چھابی پکڑے، لاشوں سے بچتا بچاتا کسی چھپکلی کی طرح رینگتا کارتوس کے سارے بکس اس طرح خالی کرتا چلا گیا جیسے کوئی بندر مونگ پھلی میں سے دانے نکال لیتا ہے۔ اس خوف کے باعث کہ اس پر دشمن کی نظر نہ پڑ جائے کسی نے اسے پشتے سے پکارنے کی ہمت نہیں کی حالاں کہ وہ پشتے سے زیادہ دور نہیں تھا۔
ایک مردہ جسم پر جو شاید کسی دفعدار کا تھا، گاوروش کو پاؤڈر سے بھری بارودی کپی مل گئی۔

"یہ پیاس کے لیے ہے۔" کپی کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔

آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں دھند صاف ہو گئی تھی۔ پتھروں سے بنائے گئے ڈھیروں کے پیچھے چھپے نشانہ باز سپاہیوں کی ایک قطار تھی جنھوں نے ایک دوسرے کو اشارے سے بتایا کہ ادھر کوئی شے حرکت کر رہی۔ اس وقت جب گاوروش ایک سارجنٹ کے کارتوس نکال رہا تھا جس کا مردہ جسم قریب میں گھرے کھمبے کے پاس پڑا تھا، ایک گولی سارجنٹ کے جسم پر لگی۔ "واہ" گاوروش نے کہا، "وہ مُردوں کو بھی میرے لیے مار رہے ہیں۔"

دوسری گولی اس کے قریب پتھر پر لگی اور چنگاری نکلی — تیسری گولی نے اس کی چھابی اُلٹ دی تھی۔ گاوروش نے پلٹ کر دیکھا۔ گولی مضافات کے آدمیوں کی طرف سے آئی تھی۔

وہ اچھل کر سیدھا کھڑا ہوا؛ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے؛ اس کے ہاتھ اس کی کمر پر تھے؛ آنکھیں نیشنل گارڈ والوں پر جمی تھیں جو گولیاں چلا رہے تھے، اور گانے لگا:

"Nanterre والے بدصورت ہیں؛
والٹیر کی غلطی ہے؛
Palaiseau والے گھامڑ ہیں؛
یہ روسو کی غلطی ہے۔"

گاوروش نے اپنی چھابی اُٹھائی؛ اس میں سے گر جانے والا ایک ایک کارتوس اٹھایا؛ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھا جہاں پڑا ہوا کارتوس کا بکس اسے خالی کرنا تھا۔ چوتھی گولی چلی؛

نشانہ پھر خطا ہوگیا اور گاوروش پھر گانے لگا:

"میں دستاویزی منشی نہیں؛
والٹیئر کی غلطی ہے؛
میں چھوٹی سی چڑیا ہوں؛
یہ روسو کی غلطی ہے۔"

پانچویں گولی اس سے صرف پانچواں قطعہ پڑھوانے میں کامیاب ہوئی:

"خوش رہنا مرا شیوہ ہے؛
والٹیئر کی غلطی ہے؛
دکھ میری دلھن کا جوڑا ہے؛
یہ روسو کی غلطی ہے۔"

کچھ دیر یہی سلسلہ چلتا رہا۔

نظارہ دلربا بھی تھا اور خوف ناک بھی۔ گاوروش نشانے بازوں سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی توجہ کسی اور جانب ہو گئی تھی۔ چڑیا نشانہ بازوں کو ٹھونگیں مار رہی تھی۔ ہر گولی کے بعد وہ ایک قطعہ پیش کر دیتا۔ دشمن مسلسل اسے نشانہ بنا رہا تھا اور ہر بار وہ بچ جاتا تھا۔ وہ لیٹ جاتا، اچھل کر کھڑا ہو جاتا، ڈیوڑھی کے کونے میں چھپ جاتا، پھر پلٹتا، غائب ہو جاتا، دوبارہ ظاہر ہوتا، بھاگتا، واپس ہوتا، اپنی ناک پر انگلی رکھ کر گریپ شاٹ والوں کو چڑاتا، بکھرے کارتوس اٹھاتا، کارتوس کے ڈبے خالی کرتا اور اپنی جھابی بھرتا جا رہا تھا۔ سرکش اپنی سانسیں روکے تھے؛ ان کی آنکھیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ پشتہ تھرتھرا رہا تھا اور وہ گا رہا تھا۔ وہ بچہ نہیں تھا، وہ آدمی نہیں تھا؛ وہ حیرت انگیز آوارہ گرد پری نا دوں جیسا تھا۔ اسے ، ڈرانے والا، رو ئیں تن، ہنگامہ خیز بونا کہا جا سکتا تھا۔ گولیاں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ موت سے آنکھ مچولی کا خوف ناک کھیل کھیل رہا تھا؛ ہر بار چپٹی ناک والا عفریت اس کا پیچھا کرتا اور شریر لڑکا ہر بار اسے جُل دے جاتا۔

بالآخر ایک گولی جو یا تو بہتر نشانہ بازی تھی یا پچھلی گولیوں سے زیادہ دغا باز تھی، غول بیابانی لڑکے کو لگ ہی گئی۔ گاوروش کو لڑکھڑاتے دیکھا گیا، اور پھر وہ زمین پر گر پڑا۔ پورا پشتہ رو پڑا، مگر اس بونے میں Antaeus [یونانی اساطیر کے ایک جنگجو کردار] جیسی کوئی شے تھی؛ اس شریر کے لیے زمین پر گرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی عفریت زمین بوس ہو جائے؛ گاوروش ایک بار اٹھنے کے لیے گرا تھا؛ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے چہرے پر بہتے خون سے ایک لکیر بن گئی تھی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ

فضا میں بلند کیے، ان کی طرف دیکھا جہاں سے گولی آئی تھی، اور گانا شروع کر دیا:

"میں مٹی میں مل جاؤں گا؛
والٹیئر کی غلطی ہے؛
میری ناک ہے نالی میں؛
یہ غلطی ہے.........."

قطعہ ختم نہیں ہو سکا۔ اسی نشانہ باز کی دوسری گولی نے گاوروش کو خاموش کر دیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا؛ پھر کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ایک عظیم الشان چھوٹی سی روح [قفسِ عنصری سے] پرواز کر گئی تھی۔

۞

بھائی باپ کیسے بنا

عین اس وقت لکسمبرگ کے باغ میں دو بچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ ایک سات برس کا رہا ہوگا، دوسرا پانچ برس کا۔ بارش نے انھیں تر بتر کر دیا تھا؛ اب وہ دھوپ بھرے راستے پر چلے جا رہے تھے؛ بڑا لڑکا چھوٹے سے آگے چل رہا تھا؛ دونوں زرد رو اور خستہ حال، جنگلی چڑیوں جیسے تھے۔ چھوٹے لڑکے نے کہا "میں بہت بھوکا ہوں۔"

بڑا لڑکا محافظ کی طرح بائیں ہاتھ سے بھائی کی رہنمائی کر رہا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی۔ باغ میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ باغ بالکل سنسان تھا اور بدامنی کی وجہ سے پولیس کے حکم پر پھاٹک بند کر دیے گئے تھے۔ وہ سپاہی جنھوں نے وہاں پڑاؤ ڈال رکھا تھا، لڑائی کی ضروریات کے پیشِ نظر جا چکے تھے۔

یہ بچے یہاں کس طرح پہنچے؟ شاید دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے اسکول سے فرار ہو گئے تھے؛ یا شاید اس کے قرب و جوار میں، Barriere d' Enfer پر، یا Esplanade de l'Observatoire میں، یا قریبی carrefour سے بھاگے تھے جس پر لکھا تھا: "یہاں لاوارث پائے جانے والے بچے رکھے جاتے ہیں"۔ یہ کسی عطائی کی لگائی ہوئی عارضی دکان تھی، جہاں سے، شام کو جب باغ کے بند ہونے کا وقت ہوا تھا، دونوں باغ کے انسپکٹر کی نظر بچا کر فرار ہوئے تھے، اور رات سنتری کے اس کھوکھے میں گزاری تھی جہاں لوگ بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بے چارے گم راہ لگتے جیسے تھے اور آزاد معلوم ہوتے تھے۔ بے چارے بچے راستہ بھٹک گئے تھے۔

یہ وہی دو بچے تھے جن کے باعث، قاری کو یاد ہوگا، گاوروش کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ تھن آردیے کے بچے تھے جو میگنن کو ٹھیکے پر دیے گئے تھے، جلز نورما جن کے اخراجات اٹھاتا

تھا۔ یہ بغیر جڑوں کے درخت سے گرے ہوئے پتے تھے جنھیں تیز ہوا نے بکھیر دیا تھا۔ میگدین کے زمانے میں ان کے کپڑے صاف ستھرے ہوا کرتے تھے، جو ہیلر نورما کے لیے کتا بچے کا کام دیتے تھے، جواب چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

اب یہ بچے شماریات کے حساب میں "لاوارث" تھے جنھیں پولیس جہاں پاتی اُٹھا کر لے جاتی؛ غلط جگہ پر چھوڑ دیتی اور پھر پیرس کی سڑکوں پر پڑا پاتی تھی۔

ان بدنصیب بچوں کی باغ میں موجودگی کے لیے ایک دن فساد کافی تھا۔ اور جب بھی یہ افسروں کو دکھائی دے جاتے فوراً نکال باہر کر دیے جاتے تھے۔ بے چارے عوامی باغوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے؛ پھر بھی لوگوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ یہ بچے ہیں اور انھیں بھی پھولوں تک پہنچنے کا پورا حق ہے۔

مقفل پھاٹکوں کے طفیل یہ بچے باغ میں موجود تھے۔ ضابطوں کے باوجود یہ وہاں تھے۔ چپکے سے باغ میں گھس گئے تھے اور وہیں چھپے رہے۔ پھاٹکوں کے بند ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انسپکٹر وہاں سے نکال دیے جاتے ہیں؛ بھول چوک ہوتی رہتی ہے، مگر غلطی، کاہلی اور آرام طلبی بن جاتی ہے۔ اور انسپکٹر عوامی پریشانیوں اور اندرونی سے زیادہ بیرونی مصروفیتوں کے باعث باغ پر نظر نہیں رکھ پاتے تھے، اس لیے وہ ان دو مجرموں کو دیکھ نہیں سکے تھے۔

پچھلی رات بارش ہوئی تھی، بلکہ صبح بھی کچھ کچھ ہو رہی تھی، مگر جون کے مہینے میں زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ طوفان کے ایک گھنٹے بعد محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ خوب صورت دن تھوڑی دیر پہلے رو رہا تھا۔ گرما کے موسم میں زمین بچے کے رخسار کی طرح تیزی سے خشک ہو جاتی ہے۔ ان دنوں جب دن بڑے ہوتے ہیں، دوپہر کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ روشنی سب کچھ لے جاتی ہے، سب کچھ چوس لیتی ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دنوں سورج پیاسا ہو جاتا ہے اور بارش گلاس بھر پانی سے زیادہ نہیں ہوتی؛ طوفانی بارش بھی چند لمحوں بعد غائب ہو جاتی ہے۔ صبح ہر شے شرابور اور، شام ہر شے پاؤڈر کی طرح خشک ہو جاتی ہے۔

بارش کے دھوئے، دھوپ کی کرنوں کے پونچھے برگ و بار سے زیادہ کوئی شے خوب صورت نہیں ہوتی۔ ان میں ایک قسم کی گرم تازگی ہوتی ہے۔ باغ اور سبزہ زار، جن کی جڑوں میں پانی ہوتا ہے اور پھولوں میں سورج، خوش بو بنانے والے برتن جیسے ہو جاتے ہیں۔ ہر شے مسکراتی ہے، گاتی ہے اور خود کو پیش کرنے لگتی ہے۔ دیکھنے والے پر سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بہار کا موسم عارضی جنت ہوتا ہے، سورج انسان کو صبر کرنا سکھاتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مزید کچھ طلب نہیں کرتے؛ جنھیں نیلگوں آسمان کی پہنائیاں نصیب ہوتی ہیں تو کہتے ہیں، ''یہی کافی ہے۔'' خواب دیکھنے والے حیرتوں میں غرق، فطرت کی پرستش میں شرابور، نیکی اور بدی سے لاپرواہ کائنات کا تصور کرنے والے اور انسان کو بھول جانے والے کبھی بھی نہیں سمجھ سکتے کہ لوگ کس طرح اپنی بھوک اور اپنی پیاس میں خود کو مصروف رکھ سکتے ہیں؛ سرما کے موسم میں مفلسوں کی بے لباسی کے ساتھ، ریڑھ کی ہڈی کی کجی کے ساتھ، وہ چھتی میں، عقوبت خانے میں، سردی میں کپکپاتی لڑکیوں کے چیتھڑوں کے باوجود، وہ پیڑوں تلے خواب دیکھ سکتے ہیں؛ پُرامن اور خوف زدہ روحیں بے رحمی سے مطمئن ہو جاتی ہیں۔ حیرت، کہ ان کے لیے لامتناہیت کافی ہوتی ہے۔ اور وہ سب سے بڑی ضرورت محدودیت کو، جو اعتراف کی اجازت دیتی ہے، نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور وہ محدودیت جو ترقی اور ارفع محنت کو قبول کرتی ہے اس بارے میں وہ سوچتے بھی نہیں۔ وہ غیر محدودیت جو انسانی اور ربانی لامحدودیت اور محدودیت کے اتصال سے پیدا ہوتی ہے، ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ فراوانی کے سامنے مسکراتے ہیں۔ مسرت، کبھی نہیں؛ ضرورت سے زیادہ مسرت، ہمیشہ۔ ان کے نزدیک زندگی کا تصور شخصیت کی دستبرداری ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت کی تاریخ محض ایک تفصیلی منصوبہ ہے۔ اس میں سب کچھ نہیں ہوتا؛ سچ، کہ سب اس سے ماورا رہتے ہیں؛ تفصیل میں جانے کی ضرورت کیا ہے؟ آدمی دُکھ اٹھاتا ہے، یہ بالکل ممکن ہے؛ مگر ذرا اُبھرتے ستارے Aldebaran کی طرف نظر کرو۔ ماں کی چھاتیوں میں مزید دودھ نہیں، نو زائیدہ بچہ مر رہا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں بالکل علم نہیں، مگر ذرا اس خوب صورت مصنوعی پھول کی طرف دیکھو جو مائیکرو اسکوپ کے نیچے دیوار کی کڑی کے خلیے پیش کرتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو [قدیم زمانے کی] خوب صورت ترین جالی سے اس کا تقابل کرو [خواتین جسے زیر جامے میں استعمال کرتی ہیں]۔ مدبّرین محبت کرنا بھول گئے ہیں۔ ان میں راس چکر (zodiac) اتنا فزوں تر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے روتے بچوں کو بھول جاتے ہیں۔ خدا ان کی روحوں کو گہنا دیتا ہے۔ یہ دماغوں کا ایک خاندان ہے جو عظیم بھی ہوتا ہے اور کمتر بھی۔ ہوریس بھی ان ہی میں سے تھا اور گوئٹے بھی۔ شاید La Fontaine بھی وہی تھا؛ لامتناہیت کے شان دارانا پرست، افسردگی کو سکون سے دیکھنے والے اگر موسم اچھا ہو تو Nero کو نہیں دیکھتے؛ جن کے لیے سورج چتا کو چھپا لیتا ہے، جو گلوٹین سے دی جانے والی سزا کے وقت روشنی کے اثر کے متلاشی ہوتے ہیں، جو نہ رونا سنتے ہیں نہ سسکی، نہ موت کی آمد کو، نہ خطرے کی کڑک کو؛ جن کے لیے سب اچھا ہوتا ہے؛ اس لیے کہ مئی کا مہینہ ہوتا ہے، اور جب تک ان کے سروں پر ارغوانی اور سنہرے

رنگ کا بادل ہوتا ہے، وہ خود کو مطمئن کہتے ہیں، اور اس وقت تک خوش رہنے پر مصر ہوتے ہیں جب تک ستاروں کی چمک اور پرندوں کے چہچہے ختم نہیں ہو جاتے۔

یہ سیاہ قسم کی نور افشانیاں ہوتی ہیں۔ انھیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہوتا کہ ان سے ہم دردی کی جائے گی۔ یقیناً وہ ایسے ہی ہیں۔ وہ جو روتے نہیں دیکھتے بھی نہیں۔ ان کی تعریف بھی اور ہم دردی بھی کی جاتی ہے، جیسے کوئی دن رات اُس وجود سے ہم دردی بھی کرتا ہے اور اس کی تعریف بھی کرتا ہے جس کی پلکوں تلے آنکھیں نہیں ہوتیں مگر ابرو پر ستارہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کے خیال میں، ان مدہوں کی بے تو جہی بلند درجے کا فلسفہ ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے، مگر اس برتری میں ایک قسم کی معذوری ہوتی ہے۔ کوئی شخص لافانی ہو سکتا ہے پھر بھی لنگڑاتا ہے: Vulcan ہی کو دیکھ لیجیے۔ کوئی شخص آدمی سے زیادہ ہو سکتا ہے اور آدمی سے کم ہو سکتا ہے۔ فطرت میں نامکمل فراوانی ہوتی ہے۔ کون جانے کہ سورج اندھا آدمی نہیں ہے۔

"تو پھر، کیا؟ ہم کس پر بھروسا کریں؟ کون ہے جو کہہ سکتا ہے کہ سورج دھوکا ہے؟ اس طرح تو سارے عقل کل سارے بڑے بڑے فانی لوگ، ستاروں جیسے لوگ بھی غلط ہوں گے۔ وہ جو بلندی پر، پہاڑ کی چوٹی پر، مسندِ عروج پر بیٹھا زمین پر اتنی روشنی ڈالتا ہے، دیکھتا ہے مگر بہت کم، بُری طرح دیکھتا ہے، یا بالکل نہیں دیکھ پاتا۔ کیا یہ مایوس کن کیفیت نہیں؟ نہیں۔ تو پھر سورج سے اوپر کیا ہے؟ خدا۔

جون کی چھ تاریخ کو صبح کی تقریباً گیارہ بجے، تھا، سنسان لکسمبرگ بہت دل رُبا لگ رہا تھا۔ پانچ پودوں والا مربع اور پھولوں کی کیاریاں دھوپ میں خوش بو اور چکا چوند کر دینے والا حسن پھیلا رہی تھیں۔ دوپہر کی شان دار چمک دمک میں خودسر شاخیں آپس میں گلے لگنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ انجیر کے درختوں میں linnets [چڑیوں] کا شور تھا، ننھی چڑیاں جشنِ کامیابی منا رہی تھیں؛ ہُدہُد شاہ بلوط کے درختوں کے تنوں پر ٹھونگیں مار رہے تھے۔ پھولوں کی کیاریوں نے سوسن کی جائز بادشاہت قبول کر لی تھی؛ سب سے محترم خوش بوئیں وہ ہوتی ہیں جو سفیدی سے جاری ہوتی ہیں۔ کارنیشن پھولوں کی تیز خوش بو قابلِ مشام تھی۔ Marie de Medici کے بوڑھے کوے بلند درختوں میں عشق بازی کر رہے تھے۔ ارغوانی رنگ کا چمکتا سورج گُلِ لالہ میں آگ لگا رہا تھا اور انھیں روشن کر رہا تھا جو مختلف قسم کے پھولوں میں شعلوں کے سوا کچھ نہیں تھے۔ گُلِ لالہ کی ان شعلہ بداماں کیاریوں کے اطراف مکھیاں گنگنا رہی تھیں۔ سب کچھ شان دار اور مسرت انگیز تھا، حتیٰ کہ ممکنہ بارش بھی؛ اس باز آید ابتلا میں، جس سے وادی کے سوسن اور honeysuckles کو

فائدہ پہنچا تھا، کوئی پریشانی نہیں تھی؛ ابابیلیں نیچی اُڑان کے دل چسپ خطرات مول لے رہی تھیں۔ اُس کے لیے جو مسرت کی توقع میں وہاں تھا سب کچھ خوش آئند تھا؛ ہر شے صاف دلی، امداد، تعاون، شفقت، پدریت، اور نیا آغاز پیش کر رہی تھی۔ آسمان سے آنے والے خیالات اتنے ہی پیارے تھے جیسے کسی بچے کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جن کو پیار کیا جاتا ہے۔

پیڑوں تلے نصب سفید اور برہنہ مجسموں کی قباؤں میں روشنی نے سوراخ کر دیے تھے؛ ان دیویوں کو سورج کی روشنی نے خستہ حال کر دیا تھا؛ ان پر ہر جانب سے کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اس بڑے سے فوارے کے اطراف کی زمین تقریباً جل سی گئی تھی۔ یہاں وہاں بکھری خاک کو اڑانے کے لیے کافی ہوا چل رہی تھی۔ چند خزاں زدہ پتیاں اس طرح ایک دوسرے کے پیچھے اُڑ رہی تھیں جیسے کھیل رہی ہوں۔

فراواں روشنی میں کوئی شے تھی جو ناقابلِ بیان حد تک تسکین افزا تھی۔ زندگی، رس، گرمی اور بو کا سیلاب رواں تھا؛ انسان اس بے انداز تخلیق تلے موجود وسیلے سے واقف تھا؛ تمام سانسوں میں محبت سرایت کر گئی تھی؛ بازگشت کی ان تمام آوازوں میں اور انعکاس کے تبادلے میں، کرنوں کی اس حیرت انگیز لاگت میں، اس رقیق سونے کے لامتناہی بہاؤ میں ایک لامتناہی اصراف محسوس ہو رہا تھا؛ اور اس شان و شوکت کے عقب میں، شعلے جیسے پردے کے عقب میں، ستاروں کے اس ارب پتی خدا کی ایک جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

ریت کا شکریہ کہ کیچڑ کا کہیں نام نہیں تھا۔ بارش کا شکریہ کہ وہاں راکھ کا ایک ذرہ بھی نہیں تھا۔ شگوفوں کا انبار غسل کر چکا تھا؛ ہر قسم کا مخمل، اطلس، سونا اور ملمع جو زمیں سے پھولوں کی شکل میں نکل رہا تھا، بے عیب تھا۔ یہ رونق صفائی سے کی گئی تھی۔ باغ خوش مزاج فطرت کی عظیم خاموشی سے لبریز ہو گیا تھا۔ ہر طرف ایسی کائناتی خاموشی تھی جو ہزاروں قسم کی موسیقی سے موزوں ہوتی ہے؛ گھونسلوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے؛ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے؛ بادِ صبا کی پرافشانیاں ہوتی ہیں۔ موسم کی ہر قسم کی ہم آہنگی ایک ٹھیک خو وحدت میں تکمیل پا گئی تھی؛ بہار کا داخلہ اور خروج نظم و ضبط کے مطابق ہو رہا تھا؛ بنفشے کے پھول ختم ہو گئے تھے؛ چنبیلی شروع ہو گئی تھی؛ کچھ پھول سست رفتار تھے؛ کچھ حشرات اپنے وقت سے پہلے نکل پڑے تھے؛ جون کی سرخ تتلیوں کا ہراول دستہ مئی کی سفید تتلیوں کے سپاہِ عقب سے ہم رشتہ ہو گیا تھا؛ کیلے کے درختوں کو نئی جلدیں مل رہی تھی۔ بادِ صبا شاہ بلوط کے درختوں کی عالی شان زیادتی کے تموج کو کم کر رہی تھی۔ سب کچھ بہت دل کش تھا۔ ایک پختہ کار سپاہی نے جو اپنے بیرک کی باڑ سے دیکھ رہا تھا، کہا تھا، ”وردی میں ملبوس بہار سلامی دے رہی ہے۔“

تمام فطرت ناشتا کر رہی تھی؛ خلقت میز پر تھی؛ یہ اسی کا وقت تھا؛ عظیم نیلی چادر آسمان پر پھیلی ہوئی تھی؛ عظیم سبز چادر زمین پر بچھی تھی؛ سورج نے اسے روشن کر دیا تھا۔ خدا کائناتی غذا فراہم کر رہا تھا۔ ہر مخلوق کی اپنی چراگاہ یا طعام گاہ تھی۔ قمری کو اس کا بٹ سن کا بیج مل گیا تھا؛ مرغ کو باجرے کا دانہ مل گیا تھا؛ سنہرے پروں والے مشقی پرندے کو chickweed مل گئی تھی؛ چڑیوں کو کیڑے مل گئے تھے؛ ابابیل کو مکھیاں مل گئی تھی؛ مکھی کو مختصر ترین جراثیم مل گئے تھے؛ ہنس کو پھول مل گئے تھے۔ سب ایک دوسرے کو کسی قدر کھا گئے تھے؛ یہ سچ ہے، یہ نیکی سے ملی برائی کی بد نصیبی ہے، مگر ان میں ایک بھی خوں خوار نہیں تھا جو خالی شکم تھا۔

اس عظیم فوارے کے نواح میں دو چھوٹے چھوٹے دھتکارے بچے آ گئے تھے اور اس روشنی میں قدرے حیران تھے؛ انھوں نے خود کو چھپانے کی کوشش کی تھی اور ہنسوں کے پنجرے کی آڑ میں ہو گئے تھے۔

یہاں وہاں، وقفے وقفے سے، جب تیز ہوا چلتی، چیخیں، ہلچل، موت کی ایک قسم کی پُرشور گڑگڑاہٹ، جو دراصل گولیاں چلنے کی آواز تھی، اور بھاری ضرب، جو توپوں سے نکلنے والے گولوں کی آوازیں تھیں، کانوں کو پریشان کر رہی تھیں۔ Halles کی جانب مکانوں پر دھواں چھایا ہوا تھا۔ ایک گھنٹا، جس میں استغاثے کی سی کیفیت تھی، دور کہیں بج رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان بچوں کو ان آوازوں کا بالکل احساس نہیں تھا۔ چھوٹا بچہ بار بار کہہ رہا تھا، ”میں بہت بھوکا ہوں۔“

عین اس وقت، بچوں کے ساتھ ہی ایک اور جوڑا اس چھوٹے سے تالاب کے قریب آیا۔ اس میں ایک نیک خو آدمی تھا جس کی عمر تقریباً پچاس برس تھی جو ایک چھ سالہ بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ بلاشبہ یہ باپ بیٹے تھے۔ چھ سالہ بچے کے ہاتھ میں انڈے مکھن سے بنا ایک بڑا سا توس تھا۔

اس زمانے میں دریا سے متصل، Madame اور t d'Enfer نامی سڑکوں پر کچھ مکانات تھے، جن کے پاس لکسمبرگ باغ کی کنجیاں ہوتی تھیں اور ان مکانوں کے مکین اس باغ سے اس وقت بھی استفادہ کرتے تھے جب پھاٹک بند ہوتے تھے۔ یہ حق بعد میں ختم کر دیا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ باپ بیٹے ان ہی مکانات سے آئے تھے۔

یہ دونوں بدنصیب بچے اس ”شریف انسان“ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر چھپ گئے۔

وہ کوئی بورژوا تھا۔ شاید یہ وہی شخص تھا جسے ماریوس نے، جب اس پر محبت کا بخار چڑھا تھا، اپنے بیٹے کو ”غیر ضروری فراوانیوں سے پرہیز“ کی تعلیم دیتے سنا تھا۔ وہ ایک خود پسند اور خوش

اخلاق آدمی معلوم ہوتا تھا جس کے لب ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اس لیے کہ وہ بند نہیں ہوتے تھے۔ یہ میکانکی تبسم، جو ضرورت سے زیادہ جبڑے اور ضرورت سے کم جلد کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہتا تھا، اپنے نفس کے بجائے اپنے دانت دکھاتا تھا۔ بچہ اپنے توس سے سیر معلوم ہو رہا تھا، جسے اس نے تھوڑا کھایا، مگر ختم نہیں کیا تھا۔ بدامنی کے باعث، بچہ نیشنل گارڈ کی وردی میں ملبوس تھا، اور انکسار کے باعث بورژوا عام لباس ہی میں تھا۔

باپ بیٹے فوارے کے قریب اسی جگہ رکے جہاں دو ہنس کھیل کود رہے تھے۔ بورژوا کو ہنس اس قدر پسند تھے کہ خود اس کی چال بھی ہنسوں کی چال سے مشابہ ہو گئی تھی۔ اس وقت ہنس پانی پر تیر رہے تھے اور بہت شان دار لگ رہے تھے۔ اگر یہ دونوں بے چارے بچے سننے اور سمجھ لینے کی عمر کے ہوتے تو انھوں نے بورژوا کے یہ الفاظ اپنے پلّے باندھ لیے ہوتے۔ باپ اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا، "عاقل لوگ کم کو بہت سمجھتے ہیں۔ بیٹے مجھے دیکھو۔ میں شان و شوکت پسند نہیں کرتا۔ میں نے کبھی زرنگار اور جواہر نگار لباس نہیں پہنا۔ میں اس جھوٹی شان کو بد نظم نفوس کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس موقعے پر تیز چیخیں سنائی دیں جو دراصل Halles کی جانب سے آنے والے گھنٹے اور شور و غل کی آوازیں تھیں۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔" بچے نے سوال کیا۔

باپ نے جواب میں کہا، "یہ Saturnalia [جشنِ زحل جو قدیم روما والے دسمبر کے مہینے میں مناتے تھے] ہو رہا ہے۔

اور اچانک ہنسوں کے سبز رنگ کے پنجرے کے پیچھے اسے چیتھڑوں میں ملبوس دو لڑکے نظر آ گئے تھے۔ "یہ ابتدا ہے۔" اس نے کہا۔

اور ایک وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا، "بدامنی باغ میں داخل ہو رہی ہے۔" اس دوران اس کے بیٹے نے توس کا ایک ٹکڑا دانت سے کاٹا، اور تھوک دیا، اور اچانک رونے لگا۔

"تم رو کیوں رہے ہو؟" باپ نے پوچھا۔

"اب مجھے بھوک نہیں رہی۔" لڑکے نے کہا۔

باپ کا تبسم الفاظ میں تبدیل ہو گیا۔ "کیک کھانے کے لیے بھوکا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔"

"میرا توس مجھے تھکا دیتا ہے۔ یہ خراب ہو گیا ہے۔"

"کیا تمھیں اور توس نہیں چاہیے؟"

"نہیں۔"

باپ نے ہنسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کی طرف پھینک دو۔"

بچے نے تامل کیا۔ آدمی کو توس کی ضرورت نہ ہو تب بھی اسے پھینک دینا ضروری نہیں۔

باپ نے پھر کہا، "انسان بنو۔ جانوروں پر رحم کرنا چاہیے۔" اور بیٹے سے توس لے کر تالاب میں پھینک دیا۔

توس کنارے کے بالکل قریب گرا تھا۔ ہنسوں کا جوڑا تالاب میں بہت دور چلا گیا تھا؛ کسی اور شے کی تلاش میں تھا۔ اس نے نہ بورژوا کو دیکھا تھا، اور نہ توس کو۔ اس خوف سے کہ توس ضائع نہ ہو جائے اس نے ایک بے کار کشتی کو حرکت دی اور ہنسوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ ہنسوں نے دیکھا کہ کوئی شے تیر رہی ہے، دونوں کسی جہاز کی طرح کنارے کی طرف چلیں اور اس احمقانہ شان سے آہستہ آہستہ توس کی طرف چلیں، جو اس قسم کی سفید مخلوقات کے لیے ہی موزوں ہوتی ہے۔

"ہنس اشارے سمجھتے ہیں۔" بورژوا نے مزاح کے انداز میں کہا۔

عین اس وقت شہر میں ہونے والی شورش میں اچانک اضافہ ہوا۔ اس بار یہ اضافہ بدگمانی پر مبنی تھا۔ ہوا کے کچھ جھونکے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صاف انداز میں بات کرتے ہیں۔ وہ ہوا جو اس وقت چل رہی تھی اپنے ساتھ ڈھول کی تھاپ، غوغا، پلٹن کی گولیوں کی آوازیں، خطرے کی گھنٹی اور توپوں کی کم زور آوازیں لا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کالے کالے بادل آ گئے اور سورج کو چھپا لیا تھا۔

ہنسوں کا جوڑا ابھی تک توس تک پہنچا نہیں تھا۔ "آؤ، اب واپس چلتے ہیں" باپ نے کہا "Tuileries پر حملہ ہو رہا ہے۔" اس نے ایک بار پھر بیٹے کا ہاتھ تھاما، اور کہنا شروع کیا، "Tuileries سے لگسمبرگ تک کا فاصلہ اتنا ہے جتنا کہ شاہی اور نوابی میں ہوتا ہے؛ اور وہ زیادہ نہیں ہوا کرتا۔ جلد ہی گولیاں برسنے لگیں گی۔" اس نے بادل پر ایک نظر ڈالی۔ "شاید بارش بھی ہونے ہی والی ہے؛ آسمان بھی اس کا ساتھ دے رہا ہے؛ آؤ، گھر واپس چلتے ہیں۔"

"میں ہنسوں کو توس کھاتے دیکھنا چاہتا تھا۔" بچے نے کہا۔

باپ نے جواب میں کہا "یہ نامناسب ہوگا۔" اور وہ اپنے بورژوا بیٹے کو ساتھ لے گیا۔

بیٹا ہنسوں سے رخصت ہوتے ہوئے افسردگی میں اپنا سر تالاب کی طرف موڑے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ کیاریاں آڑے نہیں آ گئیں۔

اس دوران ہنسوں کے ساتھ ساتھ دونوں لاوارث بچے بھی اس توس کی طرف متوجہ

ہو گئے تھے۔ توس پانی پر تیر رہا تھا۔ چھوٹے بچے کی نظریں توس پر گڑی تھیں، بڑے والے کی نظریں واپس جاتے بورژواؤں پر لگی تھیں۔

باپ بیٹا پگڈنڈیوں کی بھول بھلیاں میں داخل ہو گئے جو اس شان دار زینے کی طرف لے جاتی تھیں جہاں Madame اسٹریٹ کے کنارے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جیسے ہی وہ منظر سے اوجھل ہوئے، بڑا بچا تالاب کے قریب گولائی میں بنے curb کے قریب تیزی سے پہنچا اور بائیں ہاتھ سے اسے پکڑ کر وہ پانی پر اتنا جھکا کہ گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی چھڑی توس کی طرف بڑھائی۔ ہنسوں نے دشمن کو دیکھتے ہی پھرتی دکھائی اور تیرتے ہوئے آگے بڑھے؛ پانی پیچھے اور ہنس آگے اور اس سے بننے والی ہلکی ہلکی ہم مرکز لہریں توس کو بچے کی چھڑی کی طرف لے گئیں اور چھڑی توس سے ٹکرائی۔ بچے نے توس کو ہلکا سا جھٹکا دیا، اس کو اپنی جانب کھینچا، ہنسوں کو ڈرا کر دور بھگایا، توس پکڑا، اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ توس بھیگ گیا تھا، مگر وہ دونوں بہت بھوکے پیاسے تھے۔ بڑے لڑکے نے توس کے دو ٹکڑے کیے، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا؛ چھوٹا ٹکڑا اپنے لیے رکھ لیا، بڑا اپنے بھائی کو دے دیا اور اس سے کہا:

"اسے اپنی تھوتھنی میں ٹھونس لو۔"

۞

باپ مُردہ، بیٹا قریب المرگ

ماریوس تیزی سے پشتے سے نکلا، کومفیر اس کے پیچھے پیچھے چلا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ گاوروش مر چکا تھا۔ کومفیر نے کارتوس سے بھری جھابی اٹھائی۔ ماریوس نے لڑکے کو اٹھالیا۔

"افسوس!" وہ خود سے کہہ رہا تھا، "جو کچھ اس کے باپ نے اس کے باپ کے لیے کیا تھا، وہی وہ اس کے بیٹے کے لیے کر رہا ہے؛ مگر تھن آردیے اس کے باپ کو زندہ اٹھا لایا تھا؛ یہ لڑکے کو مردہ لے جا رہا ہے۔"

ماریوس گاوروش کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے مورچے میں داخل ہوا۔ لڑکے کی طرح اس کا چہرہ بھی خون سے لال تھا۔ عین اس وقت جب وہ گاوروش کو اٹھانے کے لیے جھکا، ایک گولی اس کے سر کو ہلکا سا زخم لگاتی گزر گئی تھی؛ اسے اس زخم کا احساس بھی نہیں ہوا۔ کوفیراک نے اپنا گلو بند کھولا اور اسے ماریوس کی پیشانی پر باندھ دیا۔ انھوں نے گاوروش کو مابوف کے ساتھ ہی میز پر لٹا دیا؛ دونوں لاشیں سیاہ رنگ کی شال سے ڈھک دی گئیں۔ شال بوڑھے آدمی اور بچے کے لیے کافی تھی۔

کومفیر نے جھابی میں رکھے کارتوس تقسیم کر دیے جنھیں وہ اٹھا لایا تھا۔ ہر فرد کو چلانے کے لیے پندرہ گولیاں مل گئیں۔

ژاں ویلژاں، بالکل بے حرکت وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ جب کومفیر نے اسے پندرہ کارتوس پیش کیے تو اس نے اپنے سر کی جنبش سے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔

"یہ انوکھا کج رو انسان ہے۔" کومفیر نے دھیمی آواز میں انجولرا سے کہا، "وہ اس پشتے پر نہ لڑنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔"

"جو اس کا دفاع کرنے سے اسے روکتا نہیں۔" انجولرا نے جواب میں کہا۔

”بہادرانہ کردار کے بھی کچھ اصل طریقے ہوتے ہیں۔“ کومفیر نے بات جاری رکھی۔ اور کوفیراک نے اس کی باتیں سنیں تو اس میں اضافہ کیا، ”یہ شخص ایک اور قسم کا فادر مابوف ہے۔“

ایک بات جس پر غور کیا جانا چاہیے یہ ہے کہ وہ گولیاں جو پشتے پر برس رہی تھیں، اندرون میں کسی قسم کا خلل نہیں ڈال رہی تھیں۔ وہ لوگ جنھیں گردباد جیسی جنگ کا کبھی تجربہ نہ ہوا ہو، انھیں ان غیر معمولی طور پر تشنج زدہ پُرسکون لمحات کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لوگ آتے ہیں، جاتے ہیں، مذاق کرتے ہیں تفریح کرتے ہیں۔ کسی شخص نے ہم جسے جانتے ہیں گریپ شاٹ حملے کے دوران ایک لڑنے والے سے کہتے سنا تھا، ”ہم یہاں اس طرح ہیں جیسے کوئی کنوارا ناشتے کی میز پر ہو۔“ ہم ایک بار پھر کہنا چاہ رہے ہیں کہ Chanvreri اسٹریٹ کا پشتہ اندر سے بہت پُرسکون محسوس ہوتا ہے۔ تمام تغیر و تبدل اور تمام درجات پر عمل کر کے دیکھ لیا گیا ہے۔ ہماری حالت جو تشویش ناک سے پریشان کُن ہو رہی تھی شاید اب مایوس کُن ہوتی جا رہی ہے۔ چوں کہ حالات خراب ہوتے جا رہے تھے، بہادری کی چمک پشتے کو زیادہ سے زیادہ ارغوانی کرتی جا رہی تھی۔ انجولرا اس نوجوان اسپارٹائی کی طرح، جس نے اپنی برہنہ تلوار ایک تمکین جوہرِ قاتل کے لیے قربان کر دی تھی، حالات پر غالب آتا جا رہا تھا۔

کومفیر ایپرن پہنے زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہا تھا: بوسے اور فیولی اس ڈبے کے پاؤڈر سے کارتوس بنا رہے تھے جو گاوروش اس مردہ کارپورل کے پاس سے اٹھا لایا تھا؛ بوسے نے فیولی سے کہا تھا، ”ہم جلد ہی کسی دوسرے سیارے کے لیے جاں فشانی کرنے والے ہیں؛“ کوفیراک پتھر کی سلوں پر جو اس نے اپنے اور انجولرا کے لیے محفوظ کر رکھی تھیں، پورا اسلحہ خانہ؛ اپنی گُپتی [وہ چھڑی جس میں پتلا سا دودھارا والا خنجر چھپا ہوتا ہے۔ مترجم نے اپنے خاندان میں اس قسم کی چھڑی دیکھی تھی، جسے گُپتی کہا جاتا تھا]، بندوق، پستول کے دو ہولسٹر، اور ایک لاٹھی سے کسی نوجوان لڑکی کی طرح، ایک چھوٹا سا dunkerque [دوسری عالمی جنگ میں جنگ کا محور فرانسیسی ساحلی شہر] ترتیب دے رہا تھا۔ ژاں ولژاں خاموش اپنے سامنے کی دیوار کو گھور رہا تھا۔ ایک دست کار رمدر ہوشیلو کی تکلوں سے بنی ہیٹ کو ”نو کے خوف سے“ اپنے سر پر ڈور سے باندھ رہا تھا۔ Cougourde d' Aix کے جوان خوش گپیوں میں مصروف تھے گویا وہ آخری بار عامی بولی بولنا چاہ رہے تھے۔ ژولی، جس نے بیوہ ہوشیلو کا آئینہ دیوار سے اُتار لیا تھا، اپنی زبان کا معائنہ کر رہا تھا۔ کچھ لڑنے والے جنھیں کسی میز کی دراز میں سوکھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے مل گئے تھے، شوق سے کھانے میں مصروف تھے۔ ماریوس پریشان تھا کہ اس [گاوروش] کا باپ اس سے کیا کہے گا۔

۞

گرگس بنا شکار

ہمیں پشتوں سے مخصوص ایک نفسیاتی حقیقت پر ضرور اصرار کرنا چاہیے۔ سڑکوں کی اس حیران کر دینے والی جنگ کی کسی بھی نمایاں صفت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اندرونی طمانیت جتنی بھی غیر معمولی رہی ہو، جس کا ہم ابھی تذکرہ کر چکے ہیں، پھر بھی پشتہ ان کے لیے جو اس کے اندر رہتے ہیں، بصیرت کا باعث ہے۔ خانہ جنگی میں کوئی کشف جیسی شے ہوتی ہے جو نامعلوم کی ساری دھند کو خوف ناک جھماکوں میں آمیز کر دیتی ہے، انقلابات [مصری] ابوالہول کی طرح پُر اسرار ہوتے ہیں اور جو کوئی بھی پشتے سے گزرتا ہے، سمجھتا ہے کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔

ماریوں کے بارے میں ان جگہوں پر ہونے والے احساسات کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور ہم ان کے نتائج بھی دیکھیں گے: دونوں زندگی سے کم بھی ہوتے ہیں اور زیادہ بھی۔ پشتے سے نکلنے کے بعد انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے وہاں کیا دیکھا تھا۔ انسان خوف ناک ہو جاتا ہے مگر اُسے بات کا علم نہیں ہوتا۔ انسان ایسے متضاد خیالات کے نرغے میں رہا ہے جن کے چہرے انسان جیسے ہوتے ہیں اور ان کا سر مستقبل کی روشنی ہوتا ہے۔ وہاں ہر طرف لاشیں بکھری تھیں اور خیالی عفریت کھڑے تھے۔ وقت اتنا طولانی تھا کہ لامحدود محسوس ہوتا تھا۔ انسان موت میں بھی زندہ رہا ہے۔ یہ پرچھائیاں گزر گئی ہیں، مگر وہ کیا تھیں؟

وہ ہاتھ دیکھے گئے تھے جن پر خون تھا؛ بہرا کر دینے والا خوف تھا؛ اور خوف زدہ کر دینے والی خاموشی تھی؛ کچھ کھلے منہ تھے جو چیخ رہے تھے، اور دوسرے کھلے منہ تھے جو بالکل پُرسکون تھے؛ انسان دھوئیں کے درمیان تھا، شاید وہ رات کا دھواں تھا۔ اس کا قیاس تھا کہ اس نے نامعلوم گہرائیوں کا نامبارک کیچڑ مس کیا ہے؛ وہ اپنی انگلی کے ناخن پر کوئی سرخ شے دیکھ رہا ہے۔ اور اسے کچھ یاد نہیں۔

آیئے ہم Chanvrerie کی طرف واپس چلتے ہیں۔

اچانک، گولوں کے دو جھونکوں کے درمیان دور گھنٹا بجانے والی گھڑی کی آواز سنائی دی۔

''دوپہر کا وقت ہے۔'' کومفیر نے کہا۔

ابھی بارہ کا گھنٹا ختم نہیں ہوا تھا کہ انجولرا اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور پشتے کی چوٹی سے گرج دار آواز میں پہنچا، ''گھروں میں پتھر جمع کرو؛ کھڑکیوں میں اور چھتوں پر ان کی قطار بنا دو۔ نصف لوگ اپنی بندوقیں سنبھالیں گے؛ دوسرے نصف پتھر اٹھائیں گے۔ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا جائے گا۔''

سڑک کے کنارے جاری جنگ میں ایک جتھا قلعہ بندی کرنے والوں کا، ایک جتھا کان کنی کرنے والوں، اپنے کاندھوں پر کلھاڑا رکھے، ظاہر ہوا۔ یہ کسی کالم کا بالائی سرا ہو سکتا تھا؛ مگر کس کالم کا؟ بظاہر وہ حملہ کرنے والا کالم تھا؛ قلعہ بندی کرنے والوں کو جنھیں پشتے کے انہدام کا فرض سونپا گیا تھا سپاہیوں سے آگے ہونا چاہیے جنھیں پشتے پر چڑھائی کرنی تھی۔ وہ بظاہر اس لمحے کے قریب تھے جسے موسیو Clermont-Tonnerre نے 1822ء میں ''رسا کشی'' کہا ہے۔

انجولرا کے حکم پر مناسب عجلت سے عمل درآمد کیا گیا۔ جو خاصہ ہوتا ہے جہازوں کا اور پشتوں کا؛ صرف یہی دو مناظر ہیں جن سے فرار ناممکن ہوتا ہے۔ ایک منٹ سے کم عرصے میں، ان پتھروں کا دو تہائی حصہ، جو انجولرا نے Corinth کے دروازے پر ڈھیر کیا تھا پہلی منزل کی دو چھتی تک پہنچا دیا گیا تھا، اور ایک سیکنڈ بھی نہیں گزرا تھا کہ ان پتھروں سے جو فن کاری سے ایک دوسرے پر رکھے گئے تھے کھڑکیوں کی نصف بلندی تک دیوار سی بن گئی تھی۔ فیولی نے، جو اس منصوبے کا مرکزی معمار تھا، اس میں جان بوجھ کر کچھ سوراخ چھوڑ دیے تھے، جن سے بندوق کی نالیں نکالی جا سکتی تھیں۔ اس طرح کھڑکیوں کا آسانی سے تحفظ کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ گریپ شاٹ حملے رُک گئے تھے۔ دو توپیں اب راستہ بنانے کے لیے یا حملے کے لیے دراڑ بنانے کی خاطر رُکاوٹوں کے مرکز پر گولا باری کر رہی تھیں۔

جب وہ پتھر فیصلہ کن دفاع کے لیے رکھ دیے گئے تو انجولرا نے وہ بوتلیں پہلی منزل پر بھجوا دیں جو اس میز کے نیچے رکھی تھیں جس پر مابوف کی میت رکھی تھی۔

''اسے کون نوش کرے گا؟'' بوسے نے اس سے پوچھا۔

''وہی لوگ۔'' انجولرا نے جواب دیا۔

اس کے بعد انھوں نے نیچے والی کھڑکیوں کے پیچھے رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور لوہے کی صلیبی سلاخیں اڑا دیں جنھیں واٹن کی دکان میں رات کے وقت اڑایا جاتا تھا۔ اب گڑھی نما قلعہ

مکمل ہو گیا تھا۔ پشتہ فصیل تھا اور وائن کی دکان کمیں گاہ۔ بچ جانے والے پتھروں سے انھوں نے نکاس کو بند کر دیا تھا۔

چوں کہ پشتے کا دفاع کرنے والے ہمیشہ اپنا گولا بارود بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور چوں کہ حملے کرنے والے اس سے واقف ہوتے ہیں، حملہ آور اپنے انتظامات غصہ دلانے والی کاہلی سے کرتے ہیں اور اس کی تلافی کے لیے قبل از وقت گولی چلا دینے سے اپنے آپ کو ظاہر کر دیتے ہیں، حالاں کہ بظاہر، اور در حقیقت، وہ سستی کا شکار ہوتے ہیں۔ حملے کی تیاریاں ہمیشہ با قاعدہ غور و فکر سے کی جاتی ہیں، جس کے بعد بجلی کی سی سرعت سے حملہ کیا جاتا ہے۔

اس غور و فکر کے دوران انجولرا کو ہر چیز پر نئے سرے سے غور کرنے اور ٹھیک کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ چوں کہ ایسے لوگ مرنے والے ہوتے ہیں لہٰذا ان کی موت کو شاہکار ہونا چاہیے۔

اس نے ماریوس سے کہا، "ہم دو رہنما ہیں۔ میں اندر آخری حکم دوں گا۔ تم باہر رہ کر مشاہدہ کرو گے۔"

ماریوس نگاہ رکھنے کے لیے پشتے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

انجولرا نے باورچی خانے کے دروازے کو کیل سے جڑوا دیا۔ قاری کو یاد ہو گا کہ یہ جگہ علاج گاہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

"زخمیوں کی آمد بند۔" اس نے کہا۔

اس نے مے نوشی کے کمرے میں سخت مگر نہایت پُرسکون انداز میں آخری احکامات جاری کیے۔ فیوئی نے سنے اور سب کی جانب سے جواب دیا۔

"پہلی منزل پر زینے کاٹنے کے لیے اپنے کلھاڑے تیار رکھو۔ تمھارے پاس کلھاڑے ہیں، کہ نہیں؟"

"ہاں۔" فیوئی نے کہا۔

"کتنے؟"

"دو کلھاڑے اور ایک pole-axe۔"

"بہت اچھا! ہمارے پاس اب چھبیس پیدل لڑنے والے ہیں، اور بندوقیں کتنی ہیں؟"

"چونتیس عدد۔"

"یعنی آٹھ فالتو ہیں۔ ان کو بھی بھر کر تیار رکھو۔ تلواریں اور پستول کمر بند میں ہونے

جائیں۔ بیس آدمی پشتے پر ہوں۔ چھ آدمی دو چھتی کی کھڑکیوں میں گھات پر اور ایک پہلی منزل کی کھڑکی پر، حملہ آوروں پر پتھروں کے سوراخوں سے گولیاں چلانے کے لیے۔ یہاں کا ایک نفر بھی بے حرکت نہیں ہوگا۔ ابھی، جب حملے کے ڈھول بجیں گے نیچے والے بیس نفر پشتے پر پہنچ جائیں گے۔ پہلے پہنچنے والے بہترین جگہ پائیں گے۔ تمام انتظامات کرنے کے بعد وہ جاویر سے مخاطب ہوا، ''میں تمھیں بھولا نہیں ہوں۔'' اور سامنے رکھی میز پر پستول رکھتے ہوئے کہا، ''اس کمرے سے جانے والا آخری آدمی اس جاسوس کی کھوپڑی اڑائے گا۔''

''یہیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں، ہم ان کی لاشوں میں اپنی لاشیں ملانا نہیں چاہتے۔ Mondetour اسٹریٹ کے پشتے پر آسانی سے چڑھا جا سکتا ہے؛ وہ صرف چار فٹ اونچا ہے۔ یہ شخص اچھی طرح جکڑا ہوا ہے۔ اسے وہاں لے جا کر ہلاک کیا جائے گا۔''

وہاں ایک ہی شخص تھا جو اس وقت انجولرا سے زیادہ بے حس و بیزار تھا؛ وہ پولیس کا جاسوس جاویر تھا۔ اسی لمحے ژاں ولژاں ظاہر ہوا۔

وہ بھی سرکشوں کے گروہ میں شامل تھا۔ وہ آگے بڑھا اور انجولرا سے کہا، ''تم کمان دار ہو؟''

''ہاں۔''

''تم نے تھوڑی دیر پہلے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔''

''جمہوریہ کی جانب سے، اس پشتے کے دو بچانے والے ہیں؛ ماریوس اور تم۔''

''تمھارا کیا خیال ہے، میں کسی اجر کا حق دار ہوں؟''

''یقیناً۔''

''اچھا، تو میری ایک درخواست ہے۔''

''کیا ہے؟''

''کہ اس شخص کا بھیجا میں اڑاؤں گا۔''

''جاویر نے اپنا سر اٹھایا، ژاں ولژاں کو دیکھا، ایک نامعلوم قسم کی حرکت کی اور کہا، ''یہ صحیح ہوگا۔''

اس دوران انجولرا نے اپنی رائفل بھرنی شروع کی تھی؛ اور نظر جما کر اس کی طرف دیکھا بھی تھا، ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اور پھر ژاں ولژاں کی طرف متوجہ ہوا۔

''اس جاسوس کو لے جاؤ۔''

ژاں ولواں نے اسی میز پر بیٹھ کر جاویر کی وصولیابی کی، پستول اٹھایا اور ہلکی سی ہونے والی آواز نے اعلان کیا کہ اس نے پستول کا گھوڑا چڑھالیا ہے۔

عین اسی وقت بگل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ماریوس نے پشتے کی چوٹی سے چیخ کر کہا، "ہوشیار!"

جاویر نے بغیر آواز کی ہنسی ہنسنا شروع کردیا جو اس کی مخصوص عادت تھی؛ سرکشوں کی طرف غور سے دیکھا، اور ان سے کہا، "تم لوگ مجھ سے بہتر حالت میں نہیں۔"

"سب باہر نکل جاؤ۔" انجولرا نے چیخ کر کہا۔

سرکش شور مچاتے باہر بھاگے، اور جب وہ بھاگ رہے تھے تو انھیں جاویر کی یہ چھیڑ سنائی دی، "ہم جلد ہی دوبارہ ملنے والے ہیں۔"

۞

ژاں ولِژاں کا انتقام

ژاں ولژاں نے خود کو اکیلا پایا تو اس نے جاویر کی رسّی کھول دی جس سے قیدی کے جسم کو باندھا گیا تھا، جس کی گرہ میز کے نیچے تھی۔ اس کے بعد اسے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ جاویر نے اس ناقابلِ تعریف تبسم کے ساتھ اس کا حکم مانا جس میں زنجیر شدہ اختیار کی برتری شامل ہوتی ہے۔

ژاں ولژاں نے جاویر کو اس کے پیٹی بند سے پکڑا، جس طرح کسی وحشی درندے کو اس کے سینے کے بند سے پکڑا جاتا ہے، اور اسے گھسیٹتا ہوا آہستہ آہستہ وائن کی دکان میں لے گیا۔ جاویر کے پاؤں اس طرح باندھے گئے تھے کہ اسے قدم اٹھانے میں دقت ہوتی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم ہی اٹھا سکتا تھا۔

ژاں ولژاں کے ہاتھ میں اس کا پستول تھا۔ اسی طرح وہ پشتے کے چوکور اندرون سے گزرے۔ چوں کہ کسی دم حملہ ہونے والا تھا، سرکشوں کی پشت ان دونوں کی طرف تھی۔

اس وقت ماریوس پشتے کی انتہائی جانب تھا اور مجرم اور جلاد کو گزرتے دیکھ رہا تھا جس پر مردنی کی زردی چھائی تھی جو اس کی روح میں پہلے سے موجود تھی۔ ژاں ولژاں خاصی مشکل سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کیے بغیر، جاویر کو Mondetour گلی میں لے گیا اور اس کی چھوٹی سے بلندی عبور کرنے میں مدد کی۔

دونوں نے پشتے کو پار کیا تو خود کو اس گلی میں تنہا پایا۔ کسی نے انھیں دیکھا نہیں تھا۔ مکان کے کونے نے انھیں سرکشوں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ چند قدم فاصلے پر پشتے سے لے جائی جانے والی لاشوں کا ایک دل خراش ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پر انھیں بکھرے بال، سوراخ شدہ ہاتھ اور نصف برہنہ چھاتی والا ایک نسوانی جسم نظر آیا۔ وہ ایپونین کی لاش تھی۔ جاویر نے شبے کی نظر سے

اس لاش کو دیکھا اور نہایت پُرسکون انداز اور دھیمی آواز میں کہا،" ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔" پھر وہ ژاں ولژاں کی طرف مڑا۔

ژاں ولژاں نے اس کی بغل میں پستول ٹھونس دیا اور جاویر کو ایسی نظروں سے دیکھا جن کی تشریح کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی،" جاویر، یہ میں ہوں۔"

جاویر نے جواب دیا،" اپنا انتقام لے لو۔"

ژاں ولژاں نے اپنی جیب سے چاقو نکالا، اور اسے کھولا۔

" قبضے والا چاقو!" جاویر نے بلند آواز میں کہا،" تم ٹھیک کر رہے ہو۔ یہ تم پر زیادہ موزوں ہے۔"

ژاں ولژاں نے پیش بند کاٹا جو جاویر کی گردن تک کسا ہوا تھا، پھر اس نے وہ رسیاں کاٹیں جن سے اس کے ہاتھ بندھے تھے، اس کے بعد جھک کر وہ رسیاں کاٹیں جن سے اس کے پاؤں بندھے تھے؛ سیدھا کھڑا ہو گیا، اور اس سے کہا،" اب تم آزاد ہو۔"

جاویر آسانی سے ششدر ہونے والا انسان نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا ہوتے ہوئے بھی اس اچنبھے کی ابتدا کو روک نہیں سکا تھا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا اور وہ بے حرکت کھڑا تھا۔

ژاں ولژاں نے کہا،" میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے فرار نہیں ہوں گا، لیکن اگر اتفاقاً میں فرار ہو گیا تو یاد رکھنا کہ میں فوشلوون کے نام سے l'Homme Arme اسٹریٹ کے مکان نمبر سات میں رہتا ہوں۔"

جاویر چیتے کی طرح غرّایا، جس سے اس کے منہ کا ایک کونا نصف وا ہو گیا تھا اور دانتوں کے درمیان بڑبڑاتے ہوئے کہا،" اپنی حفاظت کرو۔"

" چلے جاؤ یہاں سے" ژاں ولژاں نے کہا۔

" تو نے کہا ہے، فوشلوون، l'Homme Arme اسٹریٹ؟"

" نمبر سات۔"

جاویر نے دھیمی آواز میں دہرایا" مکان نمبر سات"۔

اس نے ایک بار پھر اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے، شانوں کے درمیان ایک بار پھر فوجی سختی اختیار کی، نصف مڑا، اپنے ہاتھ تہ کیے، اور Halles کی جانب چل پڑا۔ ژاں ولژاں نظروں سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد جاویر پلٹا اور چیخ کر ژاں ولژاں سے کہا،" تم مجھے اذیت دے رہے ہو،

بس مجھے ہلاک کردو۔"

جاویر کو احساس نہیں ہوا کہ اب اس نے ژاں ولژاں کو "تو" نہیں کہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

جاویر آہستہ آہستہ پسپا ہوا۔ ایک لمحے بعد وہ Precheurs اسٹریٹ کے کونے پر مڑ کر جا چکا تھا۔

جاویر غائب ہو گیا تو ژاں ولژاں نے اپنے پستول سے ہوا میں فائر کیا۔

اس کے بعد وہ پشتے پر واپس پہنچا اور کہا "کام ہو گیا ہے۔"

اس دوران پشتے پر جو کچھ ہوا اس کی تفصیل یہ ہے:

ماریوس اندرون کے بجائے بیرون پر زیادہ توجہ دے رہا تھا اور اب تک وہ اندھیرے پس منظر والے مے نوشی کے کمرے میں جکڑ بند جاسوس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکا تھا۔

جب اس نے دن کی روشنی میں اسے پشتے پر چڑھتے اور اپنی موت کی طرف جاتے دیکھا، تو اسے پہچان گیا تھا۔ اچانک اسے Pontoise اسٹریٹ کا پولیس انسپکٹر یاد آ گیا جس نے ماریوس کو وہ پستول دیے تھے جو ماریوس نے پشتے پر استعمال کیے تھے۔ اسے نہ صرف اس کا چہرہ یاد آیا بلکہ اس کا نام بھی یاد آ گیا تھا۔

یہ یاد بھی اس کے دوسرے خیالات کی طرح دھندلی تھی اور پریشان کن تھی۔

یہ کوئی تصدیق نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے آپ سے ایک سوال پوچھ رہا تھا:

"کیا یہ وہی پولیس انسپکٹر نہیں جس نے مجھے اپنا نام جاویر بتایا تھا؟"

شاید ابھی اس آدمی کی طرف سے مداخلت کے لیے کچھ وقت باقی تھا، مگر سب سے پہلے، اسے یہ یقین کرنا ہوگا کہ وہ آدمی جاویر ہی ہے، یا کوئی اور۔

ماریوس نے انجولرا کو پکارا، جس نے خود کو ابھی پشتے کے سب سے آخری سرے پر تعینات کیا تھا۔ "انجولرا۔"

"کیا بات ہے؟"

"اس آدمی کا کیا نام ہے؟"

"کون آدمی؟"

"پولیس کا جاسوس۔ کیا تم اس کا نام جانتے ہو؟"

"بلاشبہ، اس نے خود ہمیں بتایا تھا۔"

”کیا تھا وہ نام؟“

”جاوید۔“

ماریوس اچھل پڑا۔

عین اسی وقت انھیں پستول چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔

اور چند لمحوں بعد ژاں ولیواں واپس آیا اور بلند آواز میں کہا تھا، ”کام ہو گیا ہے۔“

ماریوس کے دل میں ایک غمگین سی کپکپی سے دوڑ گئی۔

◇

مرنے والے صحیح، مگر زندہ غلطی پر نہیں

پشتے پر موت کی اذیت کی ابتدا ہونے والی تھی۔

اس اعلیٰ ترین لمحے ہر شے اس کے حزنیہ جلال میں اضافہ کر رہی تھی؛ فضا میں ہونے والے ہزاروں پُر اسرار دھماکے؛ سڑکوں پر مسلح ہجوم کی نظر نہ آنے والے چڑھتی ہوئی سانسیں؛ وقفے وقفے سے گھڑ سواروں کی ہونے والی سرپٹ دوڑ بھاگ؛ مارچ کرتے بکتر بند دستوں کی دھمک؛ دستوں کی فائرنگ؛ پیرس کی بھول بھلیاں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کے مقابلے میں گولا باری؛ چھتوں سے اوپر لڑائی سے پیدا ہونے والا لڑائی کا چڑھتا ہوا دھواں؛ ہر طرف ڈراونی بجلیاں؛ Saint-Merry کی خطرے کی گھنٹی جس کا لہجہ اب سسکی والا ہو گیا تھا؛ موسم کی نرمی؛ سورج کی روشنی اور بادل بھرے آسمان کی چمک دمک؛ اور مکانوں کی چونکا دینے والی خاموشی۔

اس لیے کہ گزری شام کے بعد سے Chanvrerie اسٹریٹ کے مکانات کی دو قطاریں دو دیواریں بن چکی تھیں؛ دیواریں خوں خوار ہو گئی تھیں، دروازے بند تھے؛ کھڑکیاں بند تھی؛ جھلملیاں گرا دی گئی تھیں۔

وہ دن کتنے مختلف تھے ان دنوں سے ہم جن میں زندگی گزار رہے ہیں؛ جب وقت آ گیا تھا اور عوام اس حالت کو ختم کرنا چاہتے تھے، جو بہت دیر جاری رہی تھی ایک فرمان کی مدد سے یا ایک قانونی ملک کی مدد سے؛ جب عالمی غیظ وغضب کو فضا میں منتشر کر دیا گیا تھا؛ جب شہر نے راستوں کی پتھر کی سلیں اکھاڑ دینے کی منظوری دے دی تھی؛ جب بد امنی نے بورژوائیت کو، اس کے کان میں اس کا خفیہ لفظ سرگوشی میں بتا کر مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا؛ تب ہر بیچ رہنے والا، جس میں بغاوت پوری طرح سرایت کر گئی تھی لڑنے والوں کا مددگار ہو گیا تھا، اور ہر گھر کو بہادری میں تبدیل کر دیا گیا

تھا، فی البدیہہ بنائے گئے اس قلعے نما مورچے کے ساتھ جو اس پر انحصار کرتا تھا۔ جب حالات موزوں نہیں تھے، جب بدامنی کو طے شدہ طور پر قبول نہیں کر لیا گیا تھا؛ جب عوام نے تحریک کو ماننے سے انکار کر دیا تھا؛ لڑنے والوں کے نزدیک سب کچھ ختم ہو گیا تھا؛ شہر کو ریگستان میں تبدیل کر دیا گیا تھا؛ نفوس ٹھنڈے پڑ گئے تھے؛ پناہ گاہیں بند کر دی گئی تھیں اور فوج کو پشتے پر قبضہ کرنے میں مدد فراہم کرنے کے لیے سڑکوں کو گندگی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

حیرانی کے ذریعے عوام کو ان کی پسند کے خلاف تیز چلنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس، اس شخص پر جو زبردستی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عوام خود کو بے بابرو نہیں کرتے، بدامنی کو خود ہی ترک کر دیتے ہیں۔ سرکش فاسد ہو جاتے ہیں گویا طاعون کے عارضے میں مبتلا ہوں۔ گھر طویل ڈھلان ہو جاتا ہے؛ دروازہ انکار بن جاتا ہے، مکان کا چہرہ دیوار ہو جاتا ہے۔ یہ دیوار سنتی ہے مگر دیکھتی نہیں۔ یہ آپ کو بچانے کے لیے کھل سکتی ہے؟ جی نہیں۔ یہ منصف بن جاتی ہے۔ آپ کو غور سے دیکھتی اور سزا دیتی ہے۔ بند مکان بھی کتنے ہولناک ہوتے ہیں۔ زندہ ہوتے ہیں مگر مردہ معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی جو وہاں معلق ہوتی ہے، وہیں قائم رہتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چوبیس گھنٹوں کے لیے باہر نہیں جاتا، مگر ان میں سے کوئی غائب نہیں ہوتا۔ اس چٹان کے اندرون میں لوگ آگے ہوتے ہیں، جاتے ہیں، سوتے ہیں، پھر اٹھتے ہیں اور ایک خاندانی پارٹی بن جاتے ہیں؛ وہیں کھاتے ہیں، پیتے ہیں، خوف زدہ ہوتے جو بہت خراب بات ہوتی ہے۔ مہربانی کی خوف زدگی، خوف کا بہانہ بن جاتی ہے؛ اس میں دہشت مل جاتی ہے، جو ایک کم اہمیت کی حالت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خوف کھانا جنون میں تبدیل ہو جاتا ہے؛ دہشت غصے میں تبدیل ہو سکتی ہے، جس طرح عاقبت اندیشی طیش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے یہ دانش ورانہ کہاوت ہے، ''طیش والے اعتدال پسند ہو جاتے ہیں۔'' اس میں اونچ اور نیچ کے ہیجانات ہوتے ہیں، جس میں سے غیظ و غضب غم انگیز دھوئیں کی طرح نکلتا ہے — ''یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ انھیں اس گرید سے نکل جانے دو۔ وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو وہی ملتا ہے وہ جس کے قابل ہیں۔ ہمیں اس سے مطلب نہیں۔ یہ ہے ہماری غریب سڑک جو گولوں سے چھلنی ہے۔ یہ گروہ ہے بدمعاشوں کا۔ کچھ بھی کرو، مگر دروازہ مت کھولو۔'' گھر مقبرے جیسا ہو جاتا ہے۔ اس گھر کے سامنے سرکش موت کے کرب میں ہوتا ہے؛ وہ گریپ شاٹ دیکھتا ہے برہنہ تلواریں اس کے قریب آنے لگتی ہیں؛ وہ شور مچاتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ وہ اسے سن رہے ہیں، اور یہ بھی جانتا ہے کہ کوئی نہیں آئے گا؛ وہاں بس ایک دیوار کھڑی ہوتی ہے جو اسے بچا سکتی ہے، وہاں ایسے

آدمی ہوتے ہیں جو اسے محفوظ رکھ سکتے ہیں؛ ان دیواروں کے گوشت کے کان ہوتے ہیں، اور ان آدمیوں کے پتھر کے معدے ہوتے ہیں۔

ہم کس کی سرزنش کریں؟
کسی کی نہیں اور ہر ایک کی۔
یہ زمانہ نامکمل ہے ہم جس میں زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ سب ہم اپنی ذمے داری پر کرتے ہیں اور خطرہ ہوتا ہے، یوٹوپیا انقلاب میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور فلسفیانہ احتجاج مسلح احتجاج بن جاتا ہے اور Minerva [عقل و دانش کی دیوی] Pallas [کائنات کا اب تک معلوم ہونے والا سب سے بڑا سیارچہ جو سورج کے اطراف گردش کر رہا ہے] بن جاتی ہے۔

یوٹوپیا بے صبر ہوکر انقلاب بن جاتی ہے، اور اچھی طرح جانتی ہے کہ کیا ہونے والا ہے، اور جو ہوتا ہے بہت جلد ہو جاتا ہے۔ تب یہ راضی بہ رضا ہو جاتی ہے، اور فتح کے بجائے تباہی قبول کر لیتی ہے۔ یہ ان کے کام آتی ہے جو بغیر کسی شکایت کے اس کی تردید کرتے ہیں، بلکہ انھیں معاف بھی کر دیتے ہیں؛ انھیں الزامات سے بری بھی کر دیتے ہیں اور اس کی فراخ دلی دستبرداری پر راضی ہو جاتی ہے۔ یہ رکاوٹوں کے سامنے بے قابو ہوتی ہے اور احسان فراموشی کے سامنے نرم خو ہو جاتی ہے۔

تو کیا یہ احسان فراموشی ہے؟
جی ہاں، نسلِ انسانی کے نقطۂ نگاہ سے!

انسان کا وجود ترقی کے ذریعے ہی قائم رہتا ہے۔ نسلِ انسانی کی عام زندگی کو ترقی کہتے ہیں، اور اجتماعی اقدامات کو ترقی کہا جاتا ہے۔ ترقی آگے بڑھتی ہے؛ یہ عظیم نسلِ انسانی اور ارضی سفر کو کائناتی اور ربانی بناتی ہے؛ اس کے اپنے رکنے کے مقامات ہیں جہاں یہ پیچھے رہ جانے والے سپاہیوں کو جمع کرتی ہے، اس کے اپنے مقامات ہیں جہاں یہ غور کرتی ہے، اس کی اپنی راتیں ہوتی ہیں جن میں یہ سوتی ہے؛ اور یہ کسی مدبر کی ان دل خراش پریشانیوں میں سے ہے کہ وہ پرچھائیں کو انسانی روح پر انحصار کرتے دیکھتا ہے اور یہ بھی کہ وہ نیند کے عمل کو ختم کیے بغیر اندھیرے میں ٹٹولتا ہے۔

ترقی کو خدا سے گڈمڈ کرتے ہوئے اور حرکت میں خلل کو اس وجود کی موت سمجھتے ہوئے ان سطور کے لکھنے والے سے ایک دن Gerard de Nerval نے کہا تھا کہ [معاذ اللہ] ”شاید خدا مر گیا ہے۔“

وہ جو نا اُمید ہوتا ہے غلطی پر ہوتا ہے۔ ترقی یقینی طور پر ہوشیار کرتی ہے، اور اگر مختصراً کہا جائے تو یہ نیند کی کیفیت میں بھی قدم آگے کی طرف بڑھاتی ہے اس لیے کہ یہ پیائش میں بڑھ جاتی ہے۔ ہم اسے ایک بار پھر اپنا دوہ دیکھتے ہیں، تو اس کو مزید بلند پاتے ہیں۔ ہمیشہ پُرامن ہونا اب ترقی پر منحصر نہیں، دھارے میں شامل ہونے سے ہوتا ہے۔ رُکاوٹیں مت بناؤ، ستون مت بناؤ؛ مزاحمت پانی میں جھاگ، اور انسانیت میں اُبال پیدا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں؛ مگر ان مشکلات کے بعد، ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ جب تک کہ نظم و ضبط قائم نہیں ہوتا، جو کائناتی امن کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جب تک ہم آہنگی اور اتحاد کا راج نہیں ہوتا، ترقی کے عمل میں رُکنے کی جگہوں کی صورت انقلابات ہوتے رہیں گے۔

تو پھر ترقی کیا شے ہے؟ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ عوام کی مستحکم زندگی ہی ترقی ہوتی ہے۔

اب، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ افراد کی عارضی زندگی نسلِ انسانی کی ابدی زندگی میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ بغیر کسی تلخی کے ہمیں مان لینا چاہیے کہ ہر فرد کے اپنے واضح مفادات ہوتے ہیں، اور وہ کچھ کھوئے بغیر اپنے مفاد کے لیے شرائط پیش کرتا ہے اور ان کا دفاع کرتا ہے؛ حال کی اپنی خود فریبی قابل معافی [دوا کی] خوراک ہوتی ہے؛ عارضی زندگی کے اپنے حقوق ہوتے ہیں، اور وہ ہر دم خود کو مستقبل کے لیے قربان کرنے کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ نسل جو زمین پر اپنی باری سے گزر رہی ہو، اسے آنے والی نسلوں کے لیے اپنی زندگی کو مختصر کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا جو بہر حال اس کی ہمسر ہوتی ہیں جن کی باری بعد میں آتی ہے — وہ جس کا نام ہے All سرگوشی میں کہتا ہے، "میں موجود ہوں"؛ "میں جوان ہوں اور محبت کرتا ہوں، میں بوڑھا ہوں اور میں ستانا چاہتا ہوں، میں ایک خاندان کا باپ ہوں، میں محنت کرتا ہوں، میں خوش حال ہوں، میں تجارت میں کامیاب ہوں، میرے پاس پٹے پر دینے کے لیے مکانات ہیں، میرے پاس دولت ہے جو حکومت کے کھاتے میں جمع ہے، میں خوش ہوں، میری بیوی ہے، بچے ہیں، میرے پاس یہ سب ہے، مجھ میں زندہ رہنے کی خواہش ہے، مجھے سکون سے رہنے دو۔" چناں چہ مخصوص اوقات میں نسلِ انسانی کے بلند حکمت ہراول دستے پر ایک گہری بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔

مزید یہ کہ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ یوٹوپیا جب جنگ کرتا ہے تو اپنا شان دار دائرہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ آنے والے کل کی سچائی [بن کر]، گزرے کل کے جھوٹ سے اپنا کام کرنے کا پرانا طریقہ، جنگ، ادھار مانگ لیتا ہے۔ یہ مستقبل سے ماضی کی طرح پیش آتا ہے۔ یہ خالص خیال، یعنی تشدد کی دستاویز بن جاتا ہے۔ یہ اپنی ہیرو ازم کو ایسے تشدد میں الجھا دیتا ہے جس کے

لیے اس کو جواب وہ ہونا چاہیے؛ یہ اصول کے خلاف، موقعے اور مناسبت سے تشدد کرتا ہے جس کے لیے اس کو قرار واقعی سزا دی جاتی ہے۔ بدامنی کی صورت میں یوٹوپیا فوجی کوڈ کو اپنے قابو میں لے کر جنگ کرتا ہے؛ جاسوسوں کو گولی مارتا ہے، غداروں کو پھانسی دیتا ہے؛ زندہ لوگوں کو دباتا ہے اور ان کو نامعلوم اندھیروں میں پھینک دیتا ہے۔ یہ موت کے استعمال کو سنجیدہ معاملہ بنا دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا یوٹوپیا کو تابندگی پر، اپنی ناقابلِ مزاحمت اور ناقابلِ تحلیل قوت پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ یہ تلوار سے حملہ کرتا ہے۔ اب کوئی تلوار سادہ نہیں رہی ہے۔ اب ہر تلوار میں دو دھاریں ہوتی ہیں؛ وہ جو ایک سے زخم کھاتا ہے، دوسروں سے بھی زخم کھانے لگتا ہے۔

یہ طے کر لینے، اور تمام تر شدت سے کیے جانے کے بعد، خواہ مستقبل کے شان دار لڑنے والے اور یوٹوپیا کا اعتراف کرنے والے کامیاب ہوں یا نہ ہوں، ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا کی ان کی تعریف نہ کی جائے۔ اس وقت بھی جب وہ ناکام ہوتے ہیں احترام کے حق دار ہوتے ہیں؛ اور شاید اس ناکامیابی میں انھیں سب سے زیادہ شان بھی ملتی ہے۔ فتح جب ترقی کے ساتھ ہو تو عوام کی پسندیدگی کی حق دار ہوتی ہے؛ مگر بہادرانہ شکست ان کے نرم دل تلطف کی طلب گار ہوتی ہے۔ ایک شان دار ہوتی ہے، دوسری ارفع ہوتی ہے۔ ہم اپنے طور پر کامیابی کی شہادت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جان براؤن واشنگٹن سے بڑا ہے، اور پیساکان [Pisacane — سب سے پہلا اطالوی سماجی مدبر] گاری بالدی [Garibaldi — اطالوی تاریخ کے عظیم جرنیل] سے بڑا ہے۔

یقینی طور پر، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مغلوب کی طرف داری کی جائے۔

ہم اِن عظیم لوگوں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں جو مستقبل کی کوشش کرتے اور ناکام ہو جاتے ہیں۔ انقلابیوں کو الزام دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بڑے پیمانے پر خوف کے بیج بوتے ہیں۔ ہر پسپا جرم محسوس ہوتا ہے۔ ان کے نظریات مزاحمانہ ہوتے ہیں، ان کے مقاصد پر شبہ کیا جاتا ہے، ان کے درپردہ مقاصد سے خوف آتا ہے، ان کے ضمیر پر ملامت کی جاتی ہے۔ سماجی ریاست کے خلاف بدنصیبی پر، تکلیفوں پر، ناانصافیوں، غلطیوں پر، مایوسیوں پر اور عمیق ترین گہرائیوں سے گڑے مردے اکھاڑنے والے ہجوم کی پرورش کرنے، ایستادہ کرنے اور یک جا کرنے پر ان کی سرزنش کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی مورچہ بندی کریں اور لڑیں۔ لوگ چلّا کر ان سے کہتے ہیں، ”تم راستوں کو تباہ کر رہے ہو۔“ اور شاید وہ جواب دیتے ہیں کہ ”یہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ ہمارے پشتے نیک ارادوں سے بنے ہیں۔“

سب سے اچھی چیز صلح جوئی ہوتی ہے۔ ہمیں اس امر پر متفق ہونا چاہیے کہ جب ہم

راستے پر نظر رکھتے ہیں تو ہم برداشت کے بارے میں سوچتے ہیں اور یہ اچھی خواہش ہوتی ہے جو سوسائٹی کو بے چین رکھتی ہے، مگر یہ سوسائٹی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھے، اور یہ نیک خواہش ہوتی ہے ہم جس سے اپیل کرتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی شدت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بدی کا خوش خلقی سے مطالعہ اس کے وجود کو ثابت کرنا اور اس کو دور کرنا ہوتا ہے۔ ہم سوسائٹی کو اسی کی دعوت دیتے ہیں۔

وہ جس طرح بھی ہو، یہ لوگ جب بھی مرتے ہیں دنیا کے ہر قطعے پر، فرانس پر اپنی نظر رکھتے ہوئے آدرش کی بے لچک منطق کے ساتھ عظیم کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ اور یہ لوگ عالی شان ہوتے ہیں؛ یہ لوگ اپنی زندگی کو ترقی کے ساتھ گزارنے کی پیش کش کرتے ہیں؛ یہ لوگ عاقبت اندیشی کی خواہش پوری کرتے ہیں؛ یہ لوگ مذہب پر عمل کرتے ہیں۔ وقتِ مقررہ پر ویسی ہی بے دلی کے ساتھ —— جس طرح ادا کار ربانی اسٹیج منیجر کے اشارے پر ڈائیلاگ بولتا ہے —— یہ مقبرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ، اس بے مقصد لڑائی، اس غیر جذباتی گم شدگی کو قبول کر لیتے ہیں تاکہ اعلیٰ درجے کے دنیاوی نتائج حاصل کیے جا سکیں، اور اس طرح چودہ جولائی 1789ء کی یہ عالی شان انسانی تحریک شروع ہوئی تھی۔ فرانس کا انقلاب فعلِ الٰہی تھا۔

اس کے علاوہ، ایسے مقبول انقلاب بھی ہیں جنھیں انقلاب کہا جاتا ہے؛ رد کردہ انقلابات بھی ہیں جن کو فسادات کہا جاتا ہے۔ بدامنی جو پھیل جائے، دراصل ایک خیال ہوتی ہے، عوام کی کامیابی کا امتحان ہوتی ہے۔ اگر عوام ایک سیاہ گیند جیسی شے کو زمین پر گر جانے دیتے ہیں تو دراصل وہ ایک خیال، یعنی، خشک میوہ ہوتا ہے؛ بدامنی محض نوک جھونک ہوتی ہے۔

ہر ضرورت پر جنگ، یوٹوپیا جس کی خواہش کرتا ہے، وہ عوام کے کام کی چیز نہیں ہوا کرتی۔ قوموں کی طبیعت ہمیشہ اور ہر گھنٹے ہیرو اور شہید کی نہیں ہوتی۔ عوام مثبت مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ بغیر سمجھے بوجھے مان لیتے ہیں کہ بدامنی ان کے نزدیک ایک ناگوار شے ہے۔ اور یہ اکثر تباہی کا باعث ہوتی ہے، اس لیے نقطۂ انحراف کی صورت اس میں ہمیشہ ایک قسم کی تجریدیت ہوتی۔

چوں کہ یہ شے عالی ظرف ہوتی ہے، یہ ہمیشہ آدرش کے لیے، اور صرف آدرش کے لیے ہوتی ہے، ان کے لیے جو خود کو قربان کرتے ہیں اور اسی طرح قربان کرتے ہیں۔ بدامنی ایک ولولہ ہوتی ہے، اور ولولہ غیض و غضب کو بڑھا سکتا ہے اسی وجہ سے اسلحہ اچھا لگتا ہے، مگر ہر بدامنی جو کسی حکومت یا نظام کو نشانہ بناتی ہے، اس کا نشانہ بلند ہوتا ہے۔ اس طرح، مثال کے طور پر ہم

اس پر اصرار کرتے ہیں کہ 1832ء کی بدامنی کے سرخیل، اور خصوصاً Chanvrerie اسٹریٹ کے جوشیلے جوان جس سے لڑ رہے تھے، وہ لوئی فیلپ نہیں تھا۔ ان کی اکثریت جب آزادانہ باتیں کر رہی تھی، تو اس بادشاہ سے انصاف کر رہی تھی جو انقلاب اور شاہی کے بیچوں بیچ کھڑا تھا؛ کسی نے اس سے نفرت نہیں کی تھی۔ مگر انھوں لوئی فیلپ کے ربانی حق کی نئی شاخ پر اسی طرح حملہ کیا جیسے چارلس دہم کی عمر رسیدہ شاخ پر؛ اور وہ جسے الٹ دینا چاہتے تھے اسے فرانس کی شاہی کو الٹ دینے سے کر دیا گیا تھا اور وہ عمل، اور جیسا کہ ہم تشریح کر چکے ہیں، آدمی کی آدمی پر دست درازی ہوتا ہے، اسی طرح جیسے استحقاق کا حق پوری کائنات پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کے پیرس کا وہی حال ہے جیسا جابر حکمرانوں کے بغیر دنیا کا۔ یہ تھا وہ انداز جس میں انھوں نے حجت کی تھی۔ ان کا مقصد بلا شبہ مبہم تھا، اور ان کی کوششوں سے لپا ہوا؛ مگر بہت خوب ہوا تھا۔

اور پھر، سب اسی طرح ہوتا ہے۔ ہم خود کو ان تصورات پر قربان کر دیتے ہیں جو قربان ہو جانے والے کے لیے ہمیشہ فریبِ نظر ہوتے ہیں، مگر وہ فریبِ نظر نہیں جس میں پورا انسانی ایقان آمیز ہو۔ ہم اپنے آپ کو ان المناک معاملات میں ڈال دیتے ہیں اور اس سے مدہوش ہو جاتے ہیں جو ہم کرنے والے ہوتے ہیں۔ کون جانے؟ ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم چند نفر ہیں اور ہمارے مقابل پوری فوج صف بہ صف کھڑی ہے؛ مگر ہم حق کا، قانونِ فطرت اور ہر شخص کی اپنے اوپر حاکمیت کا جس سے دستبرداری ممکن نہیں؛ انسان اور سچائی کا دفاع کر رہے ہیں؛ اور ضرورت کی صورت میں ہم تین اسپارٹنیوں کی طرح مر بھی جاتے ہیں۔ ہم Don Quixote کے بارے میں نہیں Leonidas [اسپارٹا کے بادشاہ] کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اور ایک بار وعدہ کر لیا تو ہم پیچھے نہیں ہٹتے، اور ہم ایک بے نظیر فتح، تکمیل شدہ انقلاب، آزاد ترقی، نسلِ انسانی کی سرفرازی، عالمی نجات کی امید لیے سر جھکائے قدم بڑھاتے سیدھے چلے جاتے ہیں؛ اور بدترین حالات میں Leonidas] اور فارس کے شہنشاہ سائرس اعظم کے درمیان ہونے والی جنگ[Thermopylae کو یاد کر لیتے ہیں۔

ترقی کی خاطر اسلحوں کی آمد و رفت اکثر تباہی کا باعث ہوتی ہے، کیوں؟ ہم ابھی اس کی وجہ بیان کر چکے ہیں۔ باغیوں کی تحریکات کی موجودگی میں مجمع بے قابو ہو جاتا ہے۔ بھاری گروہ، جن کی کثرت اپنے وزن کی وجہ سے کم زور ہو جاتی ہے، مہم جوئی سے خوف کھاتے ہیں؛ اور اس آدرش میں مہم جوئی کا شائبہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ مفادات آدرش پر مہربان نہیں ہوتے، اس لیے کہ ان کی راہ میں جذبات ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی معدہ دل کو مفلوج کر دیتا ہے۔

فرانس کی شان وشوکت اور حسن اس میں ہے کہ یہ اپنے معدے سے کم اور دوسری قوموں سے زیادہ لیتا ہے: یہ اپنے آپ کو آسانی سے قابو میں کر لیتا ہے۔ یہ سب سے پہلے جاگتا ہے اور دیر میں سوتا ہے۔ یہ آگے کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ یہ تلاش کرنے والا ہے۔

یہ اس حقیقت سے بلند ہوتا ہے کہ یہ فن کار ہے۔

آدرش منطق کے نقطۂ اوج کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح جیسے خوب صورتی محبت کی بلندترین چوٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ جو لوگ فن کار ہوتے ہیں وہ بااصول بھی ہوتے ہیں۔ حسن سے محبت کرنا روشنی کو دیکھنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی مشعل سب سے پہلے یونان نے بلند کی تھی جس نے اسے اطالیہ کے حوالے کردیا، اور اطالیہ نے اسے فرانس کے حوالے کردیا تھا۔ وہ زندگی کی مقدس مشعل تھی!

قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ عوام کی شاعری اس کی ترقی کا عنصر ہوتی ہے۔ تمدن کی پیمائش تصور کے مقدار سے کی جاتی ہے۔ صرف متمدن عوام ہی بیدار عوام ہوتے ہیں۔ Corinth، جی ہاں Sybaris، نہیں! جو بھی نامرد ہوجاتا ہے خود کو ناجائز اولاد بنا لیتا ہے۔ اسے نہ عطائی ہونا چاہیے اور نہ نیکوکار، مگر اس میں فن کاری ہونی چاہیے۔ تمدن کے معاملے میں اسے نفیس نہیں ارفع ہونا چاہیے۔ ایسی حالت میں لوگ نسلِ انسانی کو آدرش کا نمونہ فراہم کرتے ہے۔

جدید آدرش کا نمونہ اس کے فن میں ملتا ہے۔ سائنس کے ذریعے ہی اس کو شاعروں کے بلند پایہ تصور کا احساس ہوتا ہے، جو اجتماعی طور پر خوب صورت ہوتا ہے۔ 'الف' اور 'بے' مل کر جنت کی تعمیرِ نو کریں گے۔ تمدن آج جس مقام پر پہنچ گیا ہے، اس کی شان وشوکت کا ضروری عنصر درستی ہے! سائنسی آلے نہ صرف فن کارانہ جذبات واحساسات کی خدمت کرتے ہیں، بلکہ ان کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔ خوابوں کا تخمینہ کیا جانا چاہیے۔ فن کو، جو فاتح ہوتا ہے، سائنس کا سہارا بننا چاہیے، جو چلنے والی ہوتی ہے: مخلوق کی انجمادی حالت جسے سواری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جدید دور کی روح یونان کا جوہرِ قابل ہے جو ہندوستان کے جوہرِ قابل کو سواری کے طور پر استعمال کرتی ہے؛ [مثال] سکندر اور ہاتھی پر سوار۔

وہ نسلیں جنھیں اصول وقواعد پتھر کردیتے ہیں، نفع جنھیں اخلاقی طور پر ابتر کردیتا ہے، تمدن کی رہنمائی کے قابل نہیں رہتیں۔ بُت یا دولت کے آگے رکوع کا عمل عضلات کو اور آگے بڑھتی خواہش کو تباہ کردیتا ہے۔ Hieratic [تصویر کے ذریعے تحریر کرنا] یا تاجرانہ مشغولیت عوام کی تابندگی کی قوت کو کم کردیتی ہے۔ اس کی سطح کو نیچی کرنے کے ذریعے اس کے آفاق کو بھی نیچا کر

دیتی ہے اور اس کو انسانی اور ربانی ذہانت کے ہدف سے محروم کر دیتی ہے، قوموں کو تبلیغی جماعت بنا دیتی ہے۔ بابل کا کوئی آدرش نہیں تھا؛ Carthage کا کوئی آدرش نہیں تھا۔ ایتھنز اور روم کا اپنا اپنا آدرش ہے اور وہ اسے صدیوں کی ظلمتوں سے، تمدن کے حلقۂ نور سے بچا کر رکھتے ہیں۔

فرانس کا معیارِ نسلی یونان اور اطالیہ جیسا ہے۔ یہ حسن کے معاملے میں یونانی ہے اور اپنی عظمت میں اطالوی ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہ اچھا ہے۔ خود کو پیش کر دیتا ہے۔ دوسری نسلوں میں ایسا کم ہوتا ہے، کہ ان میں مزاح بھی ہو، خود وابستگی بھی ہو اور قربانی بھی ہو۔ مزاح کبھی اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور کبھی اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسی میں سارے خطرات ہوتے ہیں، ان کے لیے جو دوڑتے ہیں، جب یہ صرف چلنا چاہتا ہے؛ یا وہ چلتے ہیں جب یہ رُکنا چاہتا ہے۔ فرانس میں مادیت عود کر آتی ہے، اور کبھی کبھی وہ خیالات جو ارفع دماغ کو روک دیتے ہیں جس میں وہ شے باقی نہیں رہتی جو فرانس کی عظمت کی یاد دلاتی ہے، اور مسوری یا جنوبی کیرولائنا کے طول و عرض کی ہوتی ہے۔ اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ دیو پستہ قد کا کردار ادا کرنے لگتا ہے؛ عظیم فرانس میں بھی کم مائیگی کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ بس!

اس کے بارے میں مزید کچھ کہنا نہیں ہے۔ سیاروں کی طرح انسان بھی گہن کا حق رکھتا ہے۔ اور سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے بہ شرطے کہ روشنی واپس آئے اور گہن رات میں خوار نہ ہو جائے۔ سویرا اور حشر مترادف ہیں۔ روشنی کی واپسی 'میں' کے اصرار سے مشابہ ہوتی ہے۔

آیئے، اب ہم ان حقائق کو سکون سے بیان کرتے ہیں۔ موت پشتے پر ہو، یا جلا وطنی کے مقبرے میں، یہ عقیدت کے اظہار کا ایک قابلِ قبول موقع ہوتا ہے۔ عقیدت کا اصل نام بے تعصبی ہے۔ متروک کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ خود کو ترک کر دے؛ جلا وطن کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ جلا وطن ہو جائے، اور ہمیں اپنے آپ کو التماس کرنے والی عظیم قوموں تک محدود رکھنا چاہیے کہ جب وہ پسپا ہوں تو زیادہ دور تک پسپا نہ ہو جائیں۔ دیکل پر واپسی کے بہانے زوال کی کیفیت میں کسی کو زیادہ دور تک دھکیلنا نہیں چاہیے۔

مادّہ موجود ہو، لمحہ موجود ہو، دل چسپی موجود ہو، ہمت موجود ہو؛ مگر ہمت کو عقلِ کُل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم مانتے ہیں کہ لمحے کی زندگی کا اپنا حق ہوتا ہے، مگر دیرپا زندگی کا بھی اپنا حق ہوتا ہے۔ افسوس، یہ حقیقت کہ کوئی بلند ہے، زوال کو خارج از امکان نہیں کرتی۔ یہ حقیقت تاریخ میں ضرورت سے زیادہ تواتر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ قوم جو عظیم ہے، آدرش کا مزہ چکھتی، اس کے بعد دلدل میں کودتی ہے اور اسے اچھا پاتی ہے؛ اور اگر اس سے پوچھا جائے کہ یہ کس طرح ہوا کہ اس

نے [شیکسپیر کے کھیل کے کردار] Falstaff کے لیے سقراط کو ترک کر دیا ہے، تو وہ جواب دیتی ہے، ''اس لیے کہ میں مدیرہ کو پسند کرتی ہوں۔''

اپنے موضوع، تنازعے پر واپس ہونے سے پہلے چند لفظ اور۔

وہ لڑائی ہم جس کے تذکرے میں مصروف ہیں، آدرش کی طرف تشنج کے سوا کچھ نہیں۔ پھندوں کے ذریعے ترقی کی رُکاوٹ مریضانہ کیفیت ہوتی ہے، اور الم ناک مرگی کا باعث ہوتی ہے۔ ترقی کے اس عارضے کے ساتھ اپنے راستے میں ہمارا سامنا خانہ جنگی سے ہوتا ہے۔ یہ ایک مہلک دور ہے، جس کے ڈرامے کے ایک حصے کے درمیان کے وقفے کا محور اجتماعی ملامت ہوتا ہے، اور جس کا حقیقی عنوان ترقی ہے۔

ترقی!

وہ چیخ جو اکثر ہمارے لبوں سے صادر ہوتی رہتی ہے، وہی ہماری مکمل سوچ ہوتی ہے؛ اور اس ڈرامے کے اس مقام پر جہاں ہم ابھی پہنچے ہیں، اور جو خیال اس میں شامل ہے اس کو ایک سے زیادہ آزمائش سے گزرنا ہوگا؛ اور اگرچہ ہمیں اس پر پڑی نقاب اُٹھانے کی اجازت نہیں، تاہم کم از کم، ہمیں اس کی روشنی کو رُونما کی اجازت دینی ہوگی۔

قاری کی آنکھوں کے سامنے اس لمحے یہ جو کتاب ہے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک، مکمل طور پر اور بالتفصیل، اپنے تمام وقفوں سمیت، استثنا اور خرابیوں کے باوصف، برائی سے اچھائی تک، ناانصافی سے انصاف تک، رات سے دن تک، اشتہا سے ضمیر تک، تعفن سے زندگی تک، جہنم سے جنت تک، عدمیت سے خدا تک ایک کوچ ہے۔ اس کا نقطۂ انحراف مادّہ ہے؛ اس کا نقطۂ ورود روح ہے۔ اس کی ابتدا سو سروں والا آبی سانپ ہے، تو اختتام فرشتہ ہے۔

❁

ہیرو

اور اچانک حملے کا طبل بجنے لگا۔

حملہ طوفانی تھا۔ پچھلی شام اندھیرے میں پشتے پر بڑی خاموشی سے کسی اژدھے کی مانند کیا گیا تھا۔ اب دن کی روشنی میں، چوڑی سی سڑک پر اچانک حملہ یقینی طور پر ممکن نہ تھا، مگر پوری قوت جھونک دی گئی تھی، توپ کی گھن گرج شروع ہو گئی تھی؛ فوج پشتے پر چڑھ دوڑی تھی۔ جوش اب ہنر بن گیا تھا۔ صفوں میں موجود پیدل فوج کا ایک دستہ، جسے پیدل نیشنل گارڈ اور میونسپل گارڈ نے جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا جسے ایک دوسرے میں پیوستہ عوام کی حمایت حاصل تھی؛ جس کو سنا جا سکتا تھا مگر سڑکوں پر بے اندازہ دوڑتے دیکھا نہیں جا سکتا تھا، طبل بجاتا، بگل پھونکتا، سنگینیں برابر کرتا، آگے آگے راستہ ہموار کرنے والے سپاہیوں کی طرح چلتا، حرکیوں سے بے پروا، دیوار کے مقابل ایک شہتیر کا وزن اٹھائے سیدھا پشتے پر چڑھا آ رہا تھا۔

دیوار مستحکم کھڑی تھی۔

سرکشوں نے شدت سے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ پشتے پر ایک بار چڑھائی ہوئی تو روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے پشتہ حملہ آوروں سے بھر گیا تھا؛ مگر انھوں نے سپاہیوں کو اس طرح دور کر دیا جیسے شیر کتوں کو دور کر دیتا ہے؛ اور اس پر صرف محاصرہ کرنے والے رہ گئے تھے، جس طرح کوئی چٹان جھاگ سے ڈھکی ہو، اور تھوڑی دیر بعد اس کی خوف ناک سیاہی کیڑے کی طرح رینگ کر دوبارہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

وہ دستے جنھیں مجبور ہو کر پسپا ہونا پڑا تھا، سڑک پر جمع ہو گئے تھے، اور قلعے کے اندرونی حصے پر اپنی بندوق بازی سے جواب دے رہے تھے۔ جس کسی نے آتش بازی دیکھی ہوا سے آپس میں

گنبد نما روشنیوں سے بننے والے گچھے یاد ہوں گے جن کو گل دستہ کہا جاتا ہے۔ قاری اس گل دستے کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کرے کہ وہ عمودی حالت میں نہیں افقی حالت میں ہیں، جن سے نکلنے والے شعلے کے ہر فوارے کی نوک پر ایک گولی یا ایک یک شاٹ ہے اور وہ اپنے جھماکے کے پیچھے سے یکے بعد دیگرے مردہ لوگوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ پشتہ اُن کے نیچے تھا۔

دونوں جانب ہمت اور ارادے ایک جیسے تھے۔ پشتے پر نظر آنے والی بہادری تقریباً بہیمانہ تھی، جس میں ایک قسم کی بہادرانہ پیچیدگی تھی جوان کی اپنی قربانی سے شروع ہوئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نیشنل گارڈ دست بہ دست لڑنے والے سپاہیوں کی طرح لڑا کرتے تھے۔ سپاہی اس کو ختم کرنا چاہ رہے تھے، جب کہ سرکش جاری رکھنے کے خواہش مند تھے۔ جوانی اور صحت کے عالم میں موت کی اذیت کی قبولیت جواں مردی کو جنون میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس کیفیت میں ہر کسی کو موت کا لمحہ وسیع ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ سڑک پر لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

پشتے کے ایک سرے پر انجولرا تھا اور دوسرے سرے پر ماریوس۔ انجولرا جو اپنے دماغ میں پورا پشتہ لیے پھرتا تھا، اپنے آپ کو بچا کر اور پناہ میں رکھتا تھا؛ اس کے جھروکے کے نیچے، اس کو دیکھے بغیر، یکے بعد دیگرے تین سپاہی ہلاک ہو گئے تھے؛ ماریوس بغیر کسی تحفظ کے لڑ رہا تھا۔ اس نے خود کو آسان ہدف بنا رکھا تھا۔ اس کے جسم کا آدھے سے زیادہ حصہ سینے تک بلند عارضی دیوار سے اوپر تھا۔ بے حد کنجوس آدمی شدت کی کیفیت میں زیادہ فضول خرچ ہو جاتا ہے؛ خواب دیکھنے والا جب عمل میں ہوتا ہے تو زیادہ خوف ناک ہو جاتا ہے۔ ماریوس خوف ناک بھی تھا اور متفکر بھی۔ لڑائی کے عالم میں بھی وہ خواب کی سی کیفیت میں تھا۔ اس عالم میں اسے دیکھنے والے کہہ اٹھتے کہ وہ کوئی خیالی انسان تھا جو گولیاں برسا رہا تھا۔

سرکشوں کے کارتوس ختم ہو رہے تھے، مگر وہ طنز و تشنیع سے بھرپور تھے۔ قبرستان کے اس گرداب میں بھی وہ، جس میں ایستادہ تھے، ہنس رہے تھے۔

کورفیراک ننگے سر تھا۔

"تمھاری ہیٹ کیا ہوئی؟" بوسے نے پوچھا۔

کورفیراک نے جواب میں کہا، "بالآخر ان کے توپ کے گولے اسے اڑا لے گئے۔"

یا اس نے کچھ ایسے ہی خود پسند جملے کہے تھے، "کیا کوئی اس بات کا یقین کرے گا۔" اس نے تلخی سے کہا، "کہ وہ لوگ.... "اور اس نے کچھ نام لیے، مشہور نام، بڑے بڑے نمایاں نام، جن میں سے کچھ پرانی فوج کے نام تھے — جنھوں نے شامل ہونے کا وعدہ کیا تھا، جنھوں نے ہماری مدد

کی قسمیں کھائیں تھیں، جنھوں نے اپنی عزت داؤ پر لگا دی تھی، اور جو ہمارے جرنیل ہیں، وہ ہمیں چھوڑ جاتے ہیں!"

کومبفیر نے خود کو ایک طنزیہ تبسم تک ہی محدود رکھا۔

"ایسے بھی لوگ ہیں جو عزت کے قوانین کی اسی طرح پاس داری کرتے ہیں جیسے کسی ستارے کا دور سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔"

پشتے کے اندرون میں کارتوس کے ٹکڑے اس طرح بکھرے تھے گویا وہاں سے برف کا کوئی طوفان گزرا ہو۔

تعداد میں حملہ آور زیادہ تھے؛ موقع محل میں سرکش بہتر تھے۔ جو دیوار کے اوپر تھے، اور ان سپاہیوں پر کامیابی سے حملے کر رہے تھے جو ڈھلان پر پڑی لاشوں اور زخمیوں سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے۔ یہ پشتہ کچھ اس خوب صورتی سے تعمیر کیا گیا تھا، اور واقعی ایسی کیفیت میں تھا، جہاں سے گنتی کے چند لوگ پورے لشکر کو آڑے ہاتھوں لے سکتے تھے، مگر حملہ آور دستے میں مسلسل نئے سپاہی شامل کیے جا رہے تھے، اور وہ قریب آتے جا رہے تھے، اور اب آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم، یقین کے ساتھ فوج پشتے کے اطراف اس طرح بڑھ رہی تھی جیسے انگور کا عرق نکالنے والا آلہ اپنی گرفت مضبوط کرنے لگتا ہے۔

ایک بعد دوسرا حملہ ہوتا ہے۔ حالات کی خرابی بڑھتی جا رہی تھی۔

اور پھر، پتھر کی سلوں کے اس ڈھیر پر، اس Chanvrerie اسٹریٹ کے علاقے میں، وہ جنگ ہوئی جو ٹرائے (Troy) کی دیوار کے مماثل تھی۔ وہ منہ زور، چیتھڑوں میں ملبوس تھے، جنھیں چوبیس گھنٹوں سے کھانا سوا نصیب نہیں ہوا تھا، جن کی جیبوں میں صرف کارتوس کے خول رہ گئے تھے، اور تقریباً سب ہی زخمی تھے، جن کے سر اور دست و پا سیاہ اور خون آلود پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے؛ جن کے لباس میں سوراخ تھے جن میں سے خون رس رس کر بہہ رہا تھا؛ جن کے پاس مشکل سے بے کار بندوقیں یا ٹوٹی تلواریں رہ گئی تھی، وہ دیو پیکر مخلوق جیسے ہو گئے تھے۔ پشتے پر دس بار حملہ ہوا؛ ہر بار اس پر چڑھنے کی کوشش کی گئی مگر قبضہ نہیں ہو سکا۔

اس جد و جہد کا اندازہ لگانے کے لیے یہ تصور کرنا ضروری ہوگا جیسے کسی خوف ناک ہمت والے ہجوم کے ہر فرد کو آگ لگا دی گئی ہو اور اس سے اٹھنے والے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ یہ لڑائی نہیں تھی، یہ کسی بھٹی کا اندرون تھا؛ وہاں دہنوں سے سانس کے بجائے شعلے نکل رہے تھے؛ وہاں کے چہرے بشرے غیر معمولی ہو رہے تھے۔ وہاں اب انسان ممکن نہیں تھے، لڑنے والے، شعلوں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے، اور ان آگ کے کیڑوں جیسے لڑاکا افراد پر نظریں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔

اس متواتر اور بہ یک وقت ہونے والے قتلِ عام کی تصویر کشی کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ اس جنگ کو خود بارہ ہزار مصرعوں پر مشتمل مثنوی تحریر کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ کوئی لکھنے والا اسے بربریت کا ستر ہ پرتوں والا خوف ناک جہنم ہی کہے گا، رگ وید نے جسے تلواروں کا جنگل کہا ہے۔

وہ لڑے، دست بہ دست، قدم بہ قدم، پستول کی گولیوں سے، تلوار کی ضرب سے، مکوں سے، قریب سے، دور سے لڑے، اوپر سے نیچے سے لڑے، ہر جگہ لڑے، مکانوں کی چھتوں سے، وائن کی دکان کی کھڑکیوں سے، تہہ خانوں کی کھڑکیوں سے لڑے جہاں سے کچھ رینگتے ہوئے نکلے بھی تھے۔ تناسب میں ساٹھ حملہ آور تھے اور ایک دفاع کرنے والا تھا۔

Cornith کا سامنے کا حصہ بالکل تباہ ہو کر ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ گریپ شاٹ کی گولیوں نے کھڑکیوں پر نقش و نگار بنا دیے تھے، ان کے شیشے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے؛ اور اب کچھ باقی نہیں رہا تھا سوائے کچھ بے ترتیب سوراخوں کے، جنھیں پتھر کی سلوں سے بند کر دیا گیا تھا۔

بوسے مارا گیا؛ فیوئی مارا گیا؛ کوفیراک مارا گیا؛ کومبفیر کے سینے کو، جب وہ ایک زخمی سپاہی کو اٹھا رہا تھا، سنگین کی نوک سے تین بار چھید دیا گیا تھا اور اسے صرف آسمان کی طرف ایک نظر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

ماریوس اب بھی لڑ رہا تھا، اور اس طرح کی سر زخموں سے چور تھا، اس کا بشرہ خون میں غائب ہو گیا تھا جیسے اس کا چہرہ سرخ رومال سے ڈھک دیا گیا ہو۔

انجولرا کو چوٹ نہیں لگی تھی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر جب اس نے دائیں بائیں اپنا ہاتھ بڑھایا تو ایک سرکش نے اس کی مٹھی میں کوئی ہتھیار پکڑا دیا تھا۔ اس کے پاس چار ٹوٹی ہوئی تلواروں کے دستے رہ گئے تھے — Marignan کی جنگ میں فرانسوا اول سے ایک زیادہ، جس کے پاس صرف تین دستے تھے۔

ہومر کہتا ہے، ”Diomedes [ٹروجن جنگ کے ہیرو] نے Teuthranis, کے بیٹے Axylus کا سر کاٹا تھا جو خوش حال علاقے Arisba میں رہتا تھا؛ Mecistaeus کے بیٹے Euryalus نے Dresos کو، Opheltios کو اور Esepius کو تہِ تیغ کر دیا تھا، اور Pedasus کو جسے جل پری Abarbarea نے معصوم Bucolion کے نام سے جنم دیا تھا؛ یولیسس Pidytes اور Percosius کا، Antilochus اور Ablerus کا؛ Polypaetes اور Astyalus کا؛ Polydamas اور Otos اور Cyllene کا؛ اور Teucer اور Aretaon کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ Euripylus نیزے کی ضرب سے مر جاتا ہے۔

دلیروں کا بادشاہ Agamemnon، Elatos کو زمین پر پھینک دیتا ہے جو پتھریلے شہر میں پیدا ہوا تھا جسے Satnois t ی پُرشور دریا چومتا ہے۔ ہماری پرانی نظموں میں Esplandian دیو ہیکل مارکوئی Swantibore کو نگلنے والے کے ڈنڈے سے حملہ کرتا ہے، اور ثانی الذکر میناروں سے سنگ باری کے ذریعے دفاع کرتا ہے جنھیں اس نے جڑ سے اکھاڑ لیا تھا۔ چھتوں پر بنائی گئی ہماری قدیم تصاویر Bretagne اور Bourbon کے دو ڈیوکوں کو پیش کرتی ہیں جو جنگی لباس میں ملبوس ہیں، گھوڑوں پر سوار ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان کے ہاتھوں میں جنگ کے دوران استعمال ہونے والے کلہاڑے ہیں، سر سے پا تک آہن میں غرق ہیں، ان کے دستانے بھی آہنی، جوتے بھی آہنی ہیں اور لباس نیلے رنگ کا ہے: Bretagne کا نشان دو تاجوں سے لگی سینگوں کے درمیان ایک شیر ہے، اور Bourbon کے آہنی خود پر بنے دیو ہیکل شاہی پھول اس کا نشان ہیں۔ مگر شان میں اضافے کے لیے ضروری نہیں کہ ڈیوکوں کے خود پہنے جائیں اور مشعلوں میں Esplandian کی طرح مشعلیں ہوں، یا Polydamas کے باپ Phyles کی طرح Ephyra سے بکتر کا لباس لایا جائے، جو Euphetes شاہ کا اپنی رعایا کے لیے تحفہ تھا؛ کہ یہ شاہی کے لیے یا کسی عقیدے کے لیے جان کا نذرانہ ہوسکتا تھا۔ یہ ذہین سپاہی جو ماضی میں Bauce یا Limousin کا کاشت کار تھا، جو اپنے پہلو میں چاقو لیے، بچوں کی دایاؤں کے اطراف لکزمبرگ باغ میں چکر لگاتا رہتا ہے؛ اور اس زرد چہرہ نوجوان طالب علم کو جو استخواں کے ڈھانچے یا کتاب پر جھکا ہوا ہے، سنہرے بالوں والا نوجوان جو اپنی ڈاڑھی قینچی سے بناتا ہے—ان دونوں کو ساتھ لے لیجیے، فرض نبھانا سکھائیے؛ انھیں Carrefour Boucherat یا Planche-Mibray کی بند گلیوں میں ایک دوسرے کے رو بہ رو کیجیے، اور ایک کو اپنے پرچم کے لیے اور دوسرے کو اپنے آدرش کے لیے لڑنے دیجیے؛ ان دونوں کی جدوجہد مہیب ہوگی؛ اور وہ پرچھائیں جو یہ نوجوان رنگروٹ اور تنازعے کے جراح اس عظیم رزمیے کے میدان میں پیدا کریں گے جہاں انسانیت جاں فشانی کر رہی ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ پرچھائیں اس پرچھائیں جیسی ہے جو Lycia کے شاہ Megaryon نے اس وقت ڈالی تھی جب وہ خداؤں جیسے Ajax کے عظیم جسم کو گلے لگا کر کچل دینا چاہ رہا تھا۔

قدم سے قدم تک

سوائے انجولرا اور ماریوس کے جب کوئی رہنما باقی نہیں رہ گیا تھا جو دونوں سروں پر تھے، مرکز، جسے اب تک کوفیراک، شولی، بوسے، فیولی اور کومفیر کو سنبھالے ہوئے تھے، ناکام ہو گیا تھا۔ توپ نے، جو ابھی تک عملی طور پر کوئی شگاف ڈال نہیں سکی تھی، مورچے میں بڑا سا خلا پیدا کر دیا تھا؛ وہاں دیوار کا اوپری حصہ غائب ہو گیا تھا، اور گرنے والے ملبے کو اکٹھا کیا گیا تو دو عدد ڈھیر بن گئے تھے: ایک ڈھیر اندر کی جانب اور دوسرا باہر کی جانب تھا، اور بیرونی ڈھلان حملے کی دعوت دے رہی تھی۔

فیصلہ کن حملے کی کوشش کی گئی اور یہ حملہ کامیاب ہو گیا۔ سنگینوں سے مسلح ہجوم آگے بڑھا؛ ایک ناقابلِ مزاحمت قوت بن گیا اور لڑائی سے پیوستہ محاذ نے دھویں کے ذریعے اپنے حملے کا اظہار کیا۔ اس بار یہ حملہ فیصلہ کن تھا۔ سرکشوں کا گروہ جو مرکز کا دفاع کر رہا تھا ابتری میں پسپا ہو گیا۔

ان میں سے کچھ میں ایک بار پھر زندگی کی اداس محبت عود کر آئی تھی۔ بہت سے لوگ جنھوں نے خود کو بندوق کی نالوں تلے پایا تھا، مرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں تحفظ کی جبلت دردناک آوازیں نکالتی ہے، جب آدمیوں کے اندر کا وحشی دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ سب چھ منزلہ بلند مکان کے کنارے تھے جو ان کے مورچوں کا پس منظر بن گیا تھا۔ یہ مکان ان کا نجات دہندہ بن سکتا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ایک دیوار اس عمارت کو گھیرے ہوئے تھی۔ قبل اس کے کہ صف کے سپاہی مورچے کے اندر پہنچتے، ایک دروازے کے لیے بس اتنا وقت تھا کہ کھلتا اور بند ہو جاتا، اور اس کے لیے روشنی کے جھماکے کا موقع تھا؛ اور اچانک اس مکان کا دروازہ کھلا اور پھر فوراً ہی بند ہو گیا جو ان مایوس لوگوں کے لیے زندگی تھا۔ اس گھر کے پیچھے گلیاں تھیں اور ممکنہ

فرار کے لیے جگہ بھی تھی۔ انھوں نے اس دروازے پر کھٹکا کرنا شروع کیا اپنی بندوقوں کے کندے سے، ٹھوکروں سے، چلانے سے، آوازوں سے، ہاتھ ملتی التجاؤں سے۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ تیسری منزل کی چھوٹی سی کھڑکی سے مردہ آدمی کا لٹکتا ہوا سر ان کو گھور رہا تھا۔

مگر انجولرا اور ماریوس، اور سات یا آٹھ افراد جو ان کے اطراف تھے، اچھل کر آگے بڑھے اور ان کو تحفظ فراہم کیا۔ انجولرا نے سپاہیوں سے چیخ کر کہا تھا، ''آگے مت بڑھنا!'' اور چوں کہ ایک افسر نے اس کا حکم نہیں مانا، انجولرا نے اس افسر کو قتل کر دیا۔ اب وہ مورچے کے اندورن کے چھوٹے سے علاقے میں تھا، اس کی پشت Cornith کی عمارت پر لگی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں تلوار، دوسرے ہاتھ میں رائفل، اور وہ وائن کی دُکان کا دروازہ کھولے ہوئے تھا، جسے اس نے حملہ کرنے والوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس نے مایوس لوگوں سے چیخ کر کہا تھا، ''بس ایک ہی دروازہ کھلا ہے، اور وہ یہی دروازہ ہے۔'' اور اپنے جسم کو ڈھال بنا کر ان کو پناہ دیتے ہوئے، اور تن تنہا پوری ایک بٹالین کا سامنا کرتے ہوئے اس نے سب کو اپنے عقب سے گزار دیا۔ سب وہاں سے تیزی سے گزر گئے۔ انجولرا نے اپنی رائفل سے کام لیا، جسے اب وہ بید کی طرح استعمال کر رہا تھا، جس کی سنگین اس کے سامنے تھی، اور وہ خود آخری فرد تھا جو اندر داخل ہوا تھا؛ اور پھر ایک خوف ناک لمحہ آیا، جب سپاہی اندر داخل ہونے کی اور سرکش انھیں باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پھر دروازہ اتنی شدت سے بند ہو گیا جیسے کہ وہ اپنے چوکھٹ میں جا گرا ہو، اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک سپاہی کی پانچوں انگلیاں کٹ کر چوکھٹ پر چپک گئی تھیں۔

ماریوس باہر ہی رہا۔ ایک گولی نے اس کی ہنسلی کی ہڈی توڑ دی تھی؛ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بے ہوش کر گرنے والا ہو۔ عین اسی لمحے، جب اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اسے ایک طاقت ور ہاتھ کا جھٹکا محسوس ہوا جو اسے پکڑ رہا تھا، اور اس غشی میں، جس میں اس کے حواس جاتے رہے تھے، مشکل سے کوزیت کی یاد کے آخری لمحات گذر ہو گئے تھے اور وہ کہہ رہا تھا، ''میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اب مجھے گولی مار دی جائے گی۔''

انجولرا نے ماریوس کو ان لوگوں میں نہ پایا جنھوں نے وائن کی دُکان میں پناہ لے لی تو اس کے ذہن میں بھی وہی خیال گزرا، مگر وہ سب اس حالت میں پہنچ گئے تھے جس میں ہر ایک کو اپنی موت کے بارے میں غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ انجولرا نے دروازے پر شہتیر لگا کر اسے بند کر دیا، کنجی سے دُہرا تالا لگا دیا۔ وہ لوگ جو باہر رہ گئے تھے شد و مد سے اس کو پیٹ رہے تھے، سپاہی اپنی بندوقوں کے کندے مار رہے تھے، اور راستہ صاف کرنے والے اپنے کلھاڑے مار رہے تھے۔ حملہ آور اس

دروازے کے باہر جمع ہو گئے تھے۔اب وائن کی دکان کا محاصرہ شروع ہو رہا تھا۔

ہم تصور کر سکتے ہیں کہ سپاہی کتنے غصے میں رہے ہوں گے۔

توپ خانے کے سارجنٹ کی موت سے وہ پہلے ہی طیش میں تھے، اوراس پر مستزاد ایک اورغم انگیز بات ہوئی۔حملے سے پہلے چند گھنٹوں کے دوران انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ سرکش اپنے قیدیوں کے اعضا کاٹ رہے ہیں، اور یہ بھی کہ وائن کی دکان میں ایک سر بریدہ لاش دیکھی گئی تھی۔اس قسم کی مہلک افواہیں خانہ جنگیوں کا حصہ ہوتی ہیں، اور اسی قسم کی ایک غلط اطلاع تھی جو Transnonain اسٹریٹ کی تباہی کا باعث ہوئی تھی۔

جب دروازے کو سختی سے بند کردیا گیا تو انجولرا نے دوسروں سے کہا:

"اب ہمیں اپنی زندگیاں مہنگی فروخت کرنی چاہییں۔"

اس کے بعد وہ اس میز کی طرف گیا جس پر مابوف اور گاوروش کی میتیں رکھی ہوئی تھیں۔ سیاہ رنگ کی چادر کے نیچے رکھے دو سیدھے اور اکڑے ہوئے جسم دکھائی دے رہے تھے؛ ایک بڑا تھا دوسرا چھوٹا، اوراس کفن کی ٹھنڈی شکنوں کے درمیان ان کے چہروں کے مبہم نقوش کے خاکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔اس چادر کے نیچے سے نکلا ہوا ایک ہاتھ فرش تک لٹکا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ بوڑھے آدمی کا تھا۔ انجولرا نے جھک کر اس محترم ہاتھ کواسی طرح چوما جس طرح پچھلی شام اس کے ماتھے کو چوما تھا۔صرف یہی یہ دو بوسے تھے جو اس نے اپنی زندگی میں کسی کو دیے تھے۔

آیئے اب ہم اپنی داستان کو مختصر کرتے ہیں۔اس پشتے نے Thebes کے پھاٹک جیسی لڑائی لڑی؛ اوروائن کی دکان نے Saragossa کی میدان جیسی لڑائی لڑی تھی۔ یہ مزاحمتیں ضد کی پکی مزاحمتیں ہیں۔ان کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔لہذا جنگ بندی ممکن نہیں ہوتی۔آدمی مرنے کے لیے تیار ہیں، بہ شرطے کہ ان کے مخالفین ان ماریں۔

جب موشے کہتا ہے، "ہتھیار ڈال دو۔" Palafox جواب میں کہتا ہے، "جنگ کے بعدتوپ کے ساتھ، جنگ کے دوران چاقوؤں کے ساتھ۔" ہوشیلو کی دکان پر حملے سے شکست میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی تھی؛ نہ کھڑکیوں سے نہ چھت سے محاصرہ کرنے والوں اور سپاہیوں پر پتھروں کی بارش ہوئی کہ وہ کچل دیے جاتے، نہ دوچھتی کی کھڑکیوں سے اورنہ تہ خانے سے گولیاں چلائی گئیں، نہ خوف ناک حملہ ہوا، اور جب دروازہ ہاتھ سے گیا تو پاگل پنے کا قتل عام ہوا تھا۔ جب حملے کرنے والے وائن کی دکان میں گھس رہے تھے تو ان کے پاؤں دروازے کے تختوں سے الجھ گئے جن کو زمین پر پٹخ دیا گیا تھا؛ وہاں ایک بھی لڑنے والا نہیں ملا تھا۔ چکر دار زینہ کلہاڑے

سے کاٹ کر مے نوشی کے کمرے کے درمیان پھینک دیا گیا تھا، چند زخمی آخری سانسیں لے رہے تھے؛ ہر وہ شخص جو قتل نہیں ہوا تھا پہلی منزل پر تھا، اور وہاں سے، دو چھتی میں سوراخ کے ذریعے جو زینے کا دروازہ بن گیا تھا، خوف ناک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہ ان کے آخری کارتوس تھے۔ جب یہ ختم ہو گئے، جب یہ بھیانک آدمی موت کے قریب پہنچ گئے، تو ان کے ہاتھ میں نہ پاؤڈر تھا نہ گولے تھے، ہر ایک کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں جو انجولرا نے مخصوص کر رکھی تھیں، جن کے بارے میں ہم بات کر چکے ہیں۔ وہ شورے کے تیزاب کی بوتلیں تھیں۔

ہم قتل و غارت گری کے ان دل خراش واقعات کو اسی طرح بیان کر رہے ہیں جیسے یہ ہوئے تھے۔ افسوس! محاصرے میں گھرا آدمی ہر شے کو ہتھیار بنا لیتا ہے۔ یونانی آگ نے ارشمیدش کو رسوا نہیں کیا تھا، ابلتے ہوئے کولتار کے آدمیوں پر گرائے جانے نے بایارڈ کو رسوا نہیں کیا تھا۔ جنگ دہشت کے سوا کچھ نہیں تھی، اور اس سے مفر نہیں۔ محاصرہ کرنے والوں کی بندوق بازی، گو نیچے سے اوپر کی طرف کی جانے پر محدود تھی، خوف ناک تھی۔ دو چھتی میں بنے سوراخوں کے کنارے کٹے ہوئے سروں سے جلد ہی بھر گئے تھے، جن سے سرخ اور دھویں دار قطرے ٹپکتے تھے، اور ہنگامے ناقابلِ بیان تھے؛ دہشت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس کے بیان کے لیے الفاظ میسر نہیں۔ اس تنازعے میں، جو اَب جہنم بن گیا تھا، انسان نہیں رہ گئے تھے۔ اب ایسے دیو بھی نہیں رہے جو [فرعون کے مہیب مجسموں] colossi کی برابری کرتے۔ یہ ہومر کے بجائے ملٹن اور دانتے سے مشابہ تھے۔ دیو حملے کر رہے تھے، اور عفریت مزاحمت کر رہے تھے۔

یہ دلاوری تھی جو خوف ناک ہو گئی تھی۔

فاقہ اور مدہوشی

آخر کار، ایک دوسرے کی پشت پر چڑھ کر، زینے کے ڈھانچے کی مدد سے دیوار پر چڑھ کر، چھت سے چمٹے ہوئے آخری شخص نے حملہ آوروں کے خلاف، سپاہیوں کے خلاف، نیشنل گارڈ کے اور میونسپل گارڈ کے خلاف، انتہائی بے ترتیبی کے عالم میں مزاحمت کی، جن کی اکثریت کے چہرے اس بے پناہ چڑھائی میں زخم آلود ہو گئے تھے؛ جن کی آنکھیں بہتے ہوئے خون سے چندھیا گئی تھیں؛ جن کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے تھے؛ جن پر وحشت طاری ہو گئی تھی اور جنھوں نے پہلی منزل کے فلیٹ پر دھاوا بول دیا تھا۔ وہاں انھیں صرف ایک آدمی ملا جو اپنے پیروں پر کھڑا تھا؛ وہ انجولرا تھا۔ وہ بغیر کارتوس تھا، بغیر تلوار تھا، اس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا سوائے ایک بندوق کے جس کی نال ان لوگوں نے توڑ ڈالی تھی جو اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس نے بلیرڈ کی میز اپنے اور حملہ آوروں کے درمیان اَڑا رکھی تھی، اور وہ خود کمرے کے ایک کونے میں پسپا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس سنگ دل آنکھ تھی، اٹھا ہوا سر تھا اور ہاتھ میں ہتھیار کا ٹکڑا تھا۔ اب بھی وہ اتنا چوکنا تھا کہ اس نے تیزی سے اپنے اطراف تھوڑی سی جگہ خالی رکھ لی تھی۔ اور پھر ایک چیخ بلند ہوئی:

”یہی ہے ان کا رہنما! اسی نے توپ خانے کے آدمی کو قتل کیا تھا۔ اچھا ہوا کہ یہ شخص یہاں موجود ہے۔ اس کو یہیں رہنے دو۔ ہمیں اس کو اسی جگہ گولی مار دینی چاہیے۔“

”مجھے گولی مار دو۔“ انجولرا نے کہا، اور بندوق کی ٹوٹی ہوئی نال کو ایک جانب پھینکتے ہوئے، اس نے اپنے ہاتھ باندھ لیے اور اپنی چھاتی پیش کر دی۔

خوب صورت موت کو گلے لگانے کی جرأت ہمیشہ دیکھنے والے آدمیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جوں ہی انجولرا نے اپنے ہاتھ باندھے اور اپنا انجام قبول کیا، کمرے میں تصادم کا

شور ختم گیا، اور ساری ابتری اچانک ایک گورستانی تقدس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انجولرا کا بے ہتھیار، بے حرکت، اور تباہ کُن جلال، اس ہلچل پر حاوی ہوتا محسوس ہو رہا تھا، اور یہ سنگ دل، خوں خوار، اور دل رُبا جوان، واحد فرد تھا جس کے جسم پر ایک بھی زخم نہیں لگا تھا، اور اتنا لاپروا تھا جیسے وہ کوئی روئیں تن وجود ہو، جو اپنی پُرسکون نظروں کے ذریعے اس انبوہ سے کہہ رہا تھا کہ اسے احترام سے قتل کیا جائے۔ اس کا حسن، جو اس لمحے اس کے افتخار سے بڑھ گیا تھا اور درخشاں ہو گیا، اور خوف سے پُر چوبیس گھنٹوں کے باوجود ایسا تر و تازہ اور گلابی ہو رہا تھا کہ اسے زخمی کیا تو گیا، اسے زیادہ تھکایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ گواہ جس نے بعد میں جنگ کی کاؤنسل کے سامنے اپنا بیان دیا تھا، اسی کے بارے میں کہا تھا، ''وہاں ایک سرکش تھا جس کو اپالو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔'' ایک نیشنل گارڈ نے، جو انجولرا کا نشانہ لے رہا تھا، یہ کہتے ہوئے اپنی بندوق نیچے کر لی تھی کہ ''مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی پھول کو گولی مارنے والا ہوں۔''

بارہ آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ اس کونے کے مقابل اپنی بندوقیں سیدھی کر رہا تھا جہاں انجولرا کھڑا ہوا تھا۔

پھر، ایک سارجنٹ نے چیخ کر کہا، ''نشانہ باندھو۔''

ایک افسر نے بڑھ کر مداخلت کی، ''ٹھہرو!'' اور اس نے انجولرا سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوانا پسند کرو گے؟''

''نہیں۔''

''کیا وہ تم ہی تھے جس نے توپ خانے کے سارجنٹ کو قتل کیا تھا؟''

''ہاں!''

چند لمحے قبل ہی گرانتیر جاگ اٹھا تھا۔

قاری کو یاد ہو گا کہ پچھلی شام سے وائن کی دوکان کے اوپری کمرے میں گرانتیر کرسی پر بیٹھا، میز پر سر لٹکائے، سو رہا تھا۔ اس نے اس جگہ ''بدمست'' کے قدیم استعارے کو صحیح معنوں میں استعمال کیا تھا۔ Absinthe-porter [جڑی بوٹیوں سے بنی شراب] اور الکوحل سے ملے مشروب کی ایک بھیانک خوراک نے اس کے حواس شل کر دیے تھے۔ اس کی میز اتنی چھوٹی تھی کہ پشتے کے کسی کام کی نہیں تھی اس لیے اس کے پاس چھوڑ دی گئی تھی۔ وہ اب بھی اسی حالت میں تھا؛ اس کی چھاتی میز پر تھی؛ اس کا سر اس کے بازوؤں پر دھرا تھا جن کے اطراف گلاس، بیئر کے جگ

اور بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کی نیند ریچھ کی سستی جیسی، اور پیٹ بھری جونک کی طویل عرصے کی نیند جیسی تھی (جس میں جانور بغیر غذا اور ہوا کے دیر تک اپنی زندگی قائم رکھ سکتے ہیں)۔ کوئی شے اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی— نہ گولیوں کے باڑھ، نہ توپ کا گولا، نہ گریپ شاٹ کے گولے جو کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوئے تھے— جہاں وہ محوِ خواب تھا۔ نہ ہونے والے حملے کا شور وغل اسے بیدار کر سکا تھا۔ وہ توپ بازی کا جواب اپنے خراٹے سے دے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ اس گولی کے انتظار میں تھا جو اسے جاگ اٹھنے کی زحمت سے باز رکھ سکتی۔ کئی لاشیں اس کے اطراف بکھری تھیں؛ اور پہلی نظر میں، اس میں اور موت کی گہری نیند سوئے ہوؤں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

شراب کے نشے میں بدمست آدمی کو شور وغل جگا نہیں سکتا، خاموشی اسے جگا دیتی ہے۔ اطراف میں گرنے والی اشیا نے گرانتیر کی پژمردگی میں اضافہ کر دیا تھا؛ اشیا کا ریزہ ریزہ ہونا اس کے لیے لوری کا کام کر رہا تھا، مگر جس قسم کی رکاوٹ انجولرا کی موجودگی کی ہلچل میں ہوئی وہ اس کی نیند کے لیے ایک بہت بھاری صدمہ تھا۔ یہ ویسا ہی اثر تھا جیسا پوری رفتار سے بھاگنے والی کسی گاڑی کے اچانک رک جانے سے ہوتا ہے؛ گاڑی میں سویا ہوا آدمی بڑبڑا کر جاگ اٹھتا ہے۔ گرانتیر اٹھ بیٹھا، اپنے بازو پھیلائے، اپنی آنکھیں ملیں، ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، جمائی لی اور وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ نشے کی بدمستی کا اپنے اختتام پر پہنچنا ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی پڑے ہوئے پردے کو یک دم نوچ لیا جائے۔ اور دیکھنے والے کو وہ سب کچھ ایک آن میں نظر آ جاتا ہے پردہ جسے چھپائے ہوئے تھا۔ اچانک سب کچھ یادداشت کے سامنے آ جاتا ہے؛ اور بدمست آدمی کو، جسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ چوبیس گھنٹوں کے درمیان کیا ہو رہا تھا، آنکھ کھلتے ہی سب کچھ پوری طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ بے ربط تابندگی سے خیالات واپس عود کرنے لگتے ہیں؛ نشے کی نیستی، جو دماغ پر چھائی ایک قسم کی بھاپ ہوتی ہے، چھٹ جاتی ہے، اور حقائق کے خاکوں کے معروضات صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

گرانتیر اچھل کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بلیرڈ کی میز کے پیچھے پناہ لے لی، اور چوں کہ سپاہیوں کی نظریں انجولرا پر لگی ہوئی تھیں، انھیں گرانتیر کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ سارجنٹ اپنا حکم دہرانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ابھی اس نے "نشانہ باندھو" کہا ہی تھا کہ اس کے قریب سے ایک تیز آواز بلند ہوئی۔ "جمہوریہ زندہ باد! میں ان میں سے ایک ہوں۔"

گرانتیر کھڑا ہو گیا تھا۔ لڑائی کی ساری بھیانک چکا چوند اس کی آنکھ جس سے محروم رہی تھی، جس میں اس نے کوئی حصہ بھی نہیں لیا تھا، اس تبدیل شدہ بسیار نوش آدمی کی چمک دار نگاہوں میں ظاہر ہو گئی تھی۔

اس نے اپنا اعلان "جمہوریہ زندہ باد" دہرایا؛ ایک ہی جست میں کمرے کو پار کیا اور خود کو انجولا پر تنی ہوئی بندوقوں کے سامنے کر دیا۔

"ہم دونوں کو ایک ساتھ ہی ختم کر دو۔" اس نے کہا۔

اور پلٹ کر آہستگی سے انجولا سے پوچھا،

"کیا تم اس بات کی اجازت دیتے ہو؟" انجولا نے مسکرا کر اس کا ہاتھ دبایا۔ ابھی انجولا کی مسکراہٹ ختم نہیں ہوئی تھی کہ حکم دوبارہ صادر ہوا۔

آٹھ عدد گولیوں سے چھلنی انجولا کا جسم دیوار سے ٹکا ہوا تھا، گویا گولیوں نے کیل کا کام کر دیا تھا۔ صرف اس کا سر ڈھلک گیا تھا۔

گرانتیر اس طرح انجولا کے قدموں میں گر پڑا، جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔

چند لمحوں بعد، سپاہیوں نے ان باقی سرکشوں کا صفایا کر دیا جنھوں نے گھر کے اوپر پناہ لے رکھی تھی۔ انھوں نے دو چھتی میں جالیوں کے ذریعے گولی چلائی۔ انھوں نے اسی چھت کے نیچے لڑائی لڑی۔ انھوں نے کچھ جسموں کو، جن میں سے کچھ ابھی زندہ تھے، کھڑکیوں کے باہر پھینک دیا۔ دو پیدل لڑنے والوں نے تباہ شدہ اومنی بس کو اٹھانے کی کوشش کی۔ انھیں دو چھتی سے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بلاؤز میں ملبوس ایک شخص کو دو چھتی سے نیچے پھینک دیا گیا جس کے پیٹ میں سنگین پیوست تھی، اور زمین پر اس نے آخری سانس لی تھی۔ ایک سپاہی اور ایک سرکش، سلیٹ سے بنی چھت کی ڈھلان پر ایک ساتھ پھسلے، اور چوں کہ انھوں نے ایک دوسرے کو چھوڑا نہیں تھا، دونوں خوں خوار بغل گیری کے عالم میں زمین پر گر کر مر گئے۔ کچھ ایسا ہی واقعہ دو چھتی میں بھی ہوا تھا۔ چیخ، پکار، خوں خوار پامالی۔ پھر خاموشی۔ پشتے پر قبضہ ہو گیا۔

سپاہیوں نے اطراف کے مکانوں کی تلاشی لینی شروع کی اور بھگوڑوں کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔

۞

قیدی

ماریوس دراصل قیدی تھا۔

وہ ہاتھ جس نے اُسے پیچھے سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور گرتے اور ہوش اُڑتے وقت جس کا اسے احساس ہوا تھا۔ ژاں ولژاں کا مضبوط ہاتھ تھا۔

اب تک، ژاں ولژاں نے اپنی موجودگی کی نمائش کے سوا اس لڑائی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو اذیت کے اس تکلیف دہ عالم میں زخمی ہونے والوں کا کسی کو خیال بھی نہ آتا۔ اس کا شکریہ، کہ اس قتل و غارت میں، نیکی کی صورت میں وہ ہر جگہ موجود تھا۔ جو زخمی ہو کر گرتے اٹھائے جاتے، مے نوشی کے کمرے میں لے جائے جاتے، اور ان کی دیکھ بھال کی جاتی۔ وقفوں کے درمیان وہ پشتے پر دوبارہ نمودار ہو جاتا تھا۔ مگر کسی ضرب یا حملے، حتیٰ کی اپنی حفاظت کے لیے بھی اس کے ہاتھ سے ضرب جیسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا تھا۔ وہ خود پُرسکون تھا، اور لوگوں کو مدد فراہم کر رہا تھا۔ اسے صرف کچھ خراشیں آئی تھیں۔ گولیاں اسے چھو بھی نہیں سکی تھیں۔ اگر وہ خودکشی کے ارادے سے اس گورستان نما جگہ میں آیا تھا تو واقعی وہ ناکام تھا، مگر ہمیں شبہ ہے کہ اس نے خودکشی، ایک لامذہب عمل، کے بارے میں سوچا بھی ہوگا۔

لڑائی کے دوران ژاں ولژاں بظاہر ماریوس سے ملا نہیں تھا؛ سچ تو یہ ہے کہ اس کی نظریں ثانی الذکر سے کبھی ہٹی بھی نہیں تھیں۔ جب ایک گولی نے ماریوس کو لیٹ جانے پر مجبور کیا تو ژاں ولژاں چیتے کی سی سرعت سے جھپٹا، اس پر اس طرح گرا جیسے چیتا اپنے شکار پر گرتا ہے، اور اس کو اٹھا لے گیا۔

اس لمحے حملے کا گردباد اتنی شدت سے انجولرا پر اور وائن کی دُکان پر مرتکز تھا کہ کسی

نے ژاں ولژاں کو ماریوس کو اپنے بازوؤں میں بھر کر پشتے کی کچی زمین کو پار کرتے اور Cornith کی عمارت کے پیچھے غائب ہوتے دیکھ نہیں سکا تھا۔

قاری کو وہ زاویہ یاد ہوگا جس نے سڑک پر ایک راس تی سا بنا دی تھی؛ چند گز پر مشتمل یہ جگہ گولیوں سے، گریپ شاٹ سے، اور ہر طرح کی آنکھوں سے بچنے کی جگہ بن گئی تھی۔ کبھی کبھی ایک ایسا مقام بھی ہوتا ہے جو شعلوں کے درمیان ہو کر بھی جلتا نہیں، بپھرے سمندروں کے درمیان، کسی ٹیلے پر یا اتھلے پانی سے بنی کسی بند گلی کا ایک پُرسکون کونا بن جایا کرتا ہے۔ پشتے کے اندرون میں بھی ایسا ہی ایک چوکور علاقہ تھا جس میں اپونین نے اپنی آخری سانس لی تھی۔ وہاں پہنچ کر ژاں ولژاں رُکا، ماریوں کو زمین پر پھسل جانے دیا، اسے ایک دیوار کے سہارے بٹھا دیا، اور اس کو غور سے دیکھا۔

حالات بہت تشویشناک تھی۔

ایک لمحے کے لیے یا شاید دو یا تین لمحوں کے لیے، دیوار کا یہ حصہ پناہ گاہ بن گیا تھا تھا، مگر وہ اس قتلِ عام سے فرار کس طرح حاصل کرتا؟ ایسے میں اسے وہ پریشانی یاد آئی جس کا اسے آٹھ برس قبل Polonceau اسٹریٹ پر تجربہ ہوا تھا، اور کس طرح اس نے فرار ہو جانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا؛ اُس وقت یہ کام مشکل تھا، آج یہ ناممکن نظر آرہا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے وہ گونگا بہرا، کھنڈر دل، چھ منزل بلند مکان تھا، جس کا صرف ایک مردہ مکین تھا، جو کھڑکی سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کی دائیں جانب ایک نیچا سا پشتہ تھا جس نے Petite Truanderie اسٹریٹ کو بند کر رکھا تھا؛ اسے رکاوٹ سے گزرنا آسان محسوس ہوا، مگر اس رکاوٹ کی چوٹی سے پرے سنگینوں کی ایک صف نظر آرہی تھی۔ اس صف کے سپاہی پشتے کے عقب میں نگہ داری پر مامور تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس پشتے کو پار کرنا ایک پلٹن کی گولیوں کی تلاش میں جانے کے مماثل تھا، اور یہ بھی کہ اگر کوئی سر اس دیوار سے اوپر اٹھنے کا خطرہ مول لیتا تو وہ ساٹھ عدد گولیوں کا ہدف بننے کے کام آتا۔ اس کی بائیں جانب لڑائی کا میدان تھا اور دیوار کے اس کونے سے پرے موت گھات لگائے بیٹھی تھی۔

سو اب کیا کیا جا سکتا تھا؟

اس کیفیت سے کوئی پرندہ ہی خود کو نکال سکتا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ اسی لمحے کسی فیصلے پر پہنچنا تھا۔ چند قدم دور لڑائی جاری تھی؛ خوش قسمتی سے سب کے سب وائن کی دُکان کے دروازے کے قریب ہی مصروف تھے؛ لیکن، اگر ایک سپاہی کو بھی مکان کے اس کونے کی جانب مڑنے کا خیال آجاتا، یا ان پر حملہ کر دیتا تو سارا کام تمام ہو جاتا۔

ژاں ولژاں نے غور سے سامنے کے مکان کو دیکھا، اس نے اپنے پہلو کی جانب پشتے

پر نظر ڈالی، پھر میدان کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ اپنی آنکھوں سے مکان کی دیوار میں سوراخ کرنا چاہتا ہے۔

شاید یہ اس کی گھور کر دیکھنے کی قوت تھی، کہ اس نوعیت کی پریشانی میں بھی اس کے قدموں کے قریب کوئی مبہم سی شے اس کی خواہش کا روپ دھارنے لگی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر، ایک چھوٹے سے پشتے کی بنیاد کے قریب، جہاں پتھر کی بے ترتیب پڑی سلوں سے ایک ڈھیر سا بن گیا تھا، جس کے نیچے زمین کی سطح کے برابر لوہے کی سلاخیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان سلاخوں سے دو مربع فٹ کی ایک مضبوط سی جالی سے بن گئی تھی۔ پتھر سے بنا ڈھانچا جو اس جالی کو سہارا دیے ہوئے تھا، کسی نے اکھاڑ دیا تھا اور وہ جالی بندھی نہ ہونے کے باعث مخدوش ہو گئی تھی۔

ان سلاخوں کے درمیان کنویں جیسا ایک سیاہ خلا دیکھا جا سکتا تھا، جو یا تو کسی چمنی کا چوڑا سا دودکش جیسا تھا، یا کسی ٹنکی کا موٹا سا پائپ۔ ژاں ولژاں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کا فرار کا قدیم فن روشنی کی طرح اس کے دماغ میں پھیل گیا۔ پتھروں کے ڈھیر کو ایک طرف دھکیلنا، جالی کو اٹھانا، ماریس کو اپنے کاندھے پر لادنا جو اس وقت کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت تھا، اور اپنے کمر کے پٹھے، بازوؤں اور گھٹنوں کی مدد سے اس بوجھ کو لے کر اس کنویں جیسے غار میں اترنا جو خوش قسمتی سے زیادہ گہرا نہیں تھا، اور اس بھاری جالی نما دروازے کو واپس گر جانے دینا اس طرح کی اس پر پتھروں کا تازہ ڈھیر بن جائے، اور اس کے پیچھے وہ اپنی جگہ پر واپس پہنچ جائے اور اس سطح پر پہنچ جانا جو سطحِ زمین سے تین میٹر نیچے تھی—— یہ سارا کام کسی دیو کی سی طاقت، اور عقاب کی سی تیزی کے ساتھ اس طرح ہوا جیسے کوئی خواب میں کر رہا ہو؛ اور اس میں صرف چند منٹ صرف ہوئے تھے۔

ژاں ولژاں نے خود کو ماریس کے ساتھ پایا، جو اس وقت بھی بے ہوشی کے عالم میں، ایک طویل زیرِ زمین سرنگ جیسی جگہ میں تھا۔ اس جگہ امن کا، مکمل خاموشی کا اور رات کے اندھیرے کا راج تھا۔

اس وقت ژاں ولژاں کو ویسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسا اسے خانقاہ میں گرتے وقت ہوا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ اس وقت اس کے کاندھے پر کوزیت نہیں تھی، ماریس تھا۔ وہ واٹن کی دکان میں ہونے والی اس خوف ناک ہلچل کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا جو اس وقت حملہ کرنے والوں کی زد میں تھی، اور جو کسی مبہم جھنجھناہٹ کی طرح اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

سمندر کی درماندہ زمین

پیرس ہر سال پانی میں پچیس ملین مادّہ خارج کرتا ہے اور یہ بغیر کسی استعارے کے۔ کیسے اور کس طرح؟ دن رات کس مقصد سے؟ بغیر کسی مقصد کے کس ارادے سے؟ بغیر کسی ارادے کے کیوں؟ بلاوجہ کس عضو کے ذریعے؟ اپنی آنتوں کے ذریعے؟ اس کی آنت کیا ہے؟ اس کی غلاظت کی زیرِ زمین نالی، جسے نابدان کہا جاتا ہے۔ پچیس ملین ایک نہایت معتدل اندازہ ہے، جس کا تعین ایک مخصوص سائنس نے کیا ہے۔

سائنس کو طویل تجسس کے بعد، معلوم ہوا ہے کہ انسانی فضلہ سب سے زیادہ بارآور اور سب سے زیادہ مؤثر کیمیائی کھاد ہوتا ہے۔ ہمارے لیے بڑے شرمندگی کی بات ہے کہ اہلِ چین کو ہم سے بہت پہلے اس کا علم تھا۔ Eckberg کہتا ہے کہ کوئی چینی کسان شہر سے اس وقت تک واپس نہیں آتا تھا جب تک کہ اس کے کاندھے پر رکھے ایک لمبے سے بانس کے دونوں سِروں پر دو بالٹیاں نہیں ہوتی تھیں جو اس سے بھری ہوں جس کو ہم غلاظت کہتے ہیں۔ انسانی فضلے کے طفیل چین کی مٹی آج بھی اتنی ہی زرخیز ہے جتنی [حضرت] ابراہیم کے زمانے میں تھی۔ چین کے گندم کے ایک دانے سے سیکڑوں بیج پیدا ہوتے ہیں۔ زرخیزی کے معاملے میں ایسی کوئی کھاد نہیں جس کا کسی بڑے شہر کے فضلے سے تقابل کیا جا سکے۔ ایک عظیم شہر سب سے بڑا کھاد بنانے والا ہوتا ہے۔ شہر کے فضلے کے استعمال سے کسی بھی میدان کی زرخیزی یقینی ہوتی ہے۔ اگر ہمارا سونا کھاد ہے تو دوسری جانب ہماری کھاد بھی سونا ہے۔

ہم اپنی سونے جیسی کھاد کیا کرتے ہیں؟ اس کو پاتال میں پھینک دیتے ہیں۔

بحری پرندوں کی بیٹ جمع کرنے اور لانے کے لیے بے شمار دولت کے خرچ سے بحری

بیڑے بھیجے جاتے ہیں، اور وہ بے اندازتموّل جو ہمارے پاس ہے اسے سمندر کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ تمام انسانی اور حیوانی فضلہ، دنیا والے جس کو ضائع کر دیتے ہیں، اگر پانی کے بجائے زمین پر محفوظ کر دیا جائے تو دنیا کو زرخیز بنا دینے کے لیے کافی ہوگا۔

غلاظت کے ڈھیر پھاٹکوں کے باہر پڑے ہوتے ہیں؛ غلاظت ڈھونے والے ٹھیلے جو رات کے وقت سڑکوں پر ٹھوکر کھاتے ہیں؛ سڑکوں کے محکمے کی کوڑے لے جانے والی گاڑیاں جن سے زمینی دلدل کا بدبودار کیچڑ ٹپکتا ہے— آپ جانتے ہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے؟ پھولوں کا مرغزار ہوتا ہے؛ ہری گھاس ہوتی ہے؛ جنگلی پودینے کا پودا ہوتا ہے؛ شکار کیے جانے والا پرندہ ہوتا ہے؛ مویشی ہوتے ہیں؛ شام کے وقت سنائی دینے والے بیلوں کی ڈکار ہوتی ہے؛ خوش بودار پیال ہوتا ہے؛ سنہرا گندم ہوتا ہے؛ وہ آپ کی میز پر رکھی ڈبل روٹی، وہ آپ کی رگوں کا گرم خون، وہ آپ کی صحت، آپ کی خوشیاں، اور آپ کی زندگی ہوتا ہے۔ یہی اس پُراسرار تخلیق کی خواہش ہوتی ہے جس کی زمین پر قلبِ ماہیت ہوتی ہے اور آسمان میں تبدیلیِ شکل۔

اس کو عظیم کٹھالی میں بحال کر دیجیے؛ اسی سے فراوانی ہو جائے گی۔ میدانوں کی غذا، آدمیوں کی غذا فراہم کرتی ہے۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ اس کی دولت گنوا دیں، اور ہمیں اسے سنبھالنے کے لائق نہ سمجھیں۔ یہ آپ کی لاعلمی کا شاہکار بن جائے گا۔

شماریات کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ تنہا فرانس ہر سال اپنے دریاؤں کے دہانوں کے ذریعے بحرِ اوقیانوس میں نصف ارب قیمت کا فضلہ جمع کرتا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ اس پانچ سو ملین سے ہم اپنے بجٹ کا ایک چوتھائی خرچ پورا کر سکتے ہیں۔ آدمی کی 'چالاکی' ایسی ہے کہ وہ یہ پانچ سو ملین اپنی نالیوں میں بہا دیتا ہے۔ یہ عوام کی اصل دولت ہے جو قطرہ قطرہ، لہر کے بعد لہر کی صورت، نالیوں کے ذریعے دریاؤں میں انڈیلی جاتی ہے؛ اور دریاؤں کی جمع پونجی سمندر میں چلی جاتی ہے۔ ہماری نالیوں کی ایک ہچکی ایک ہزار فرانک ضائع کر دیتی ہے۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں؛ زمین کنگال ہو جاتی ہے، اور پانی آلودہ ہو جاتا ہے۔ کھیتوں کی لیکھوں میں بھوک اُگتی ہے اور چشموں میں بیماری جاری ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر، مشہور ہے کہ آج کل دریائے ٹیمز لندن کو زہر دے رہا ہے۔

اور جہاں تک پیرس کا سوال ہے، اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ نالیوں کے دہانے [دریا کے] آخری پُل کے نیچے تک لے جائے جائیں۔

دہری نالیوں سے بنا ایک بنیادی نظام جس میں یک طرفہ کھلنے والے سوراخ، والو،

بنے ہوں اور پانی روکنے اور کھولنے کا انتظام ہو، جس میں رقیق کو کھینچنے اور واپس دھکیلنے کی صلاحیت ہو، جو انسانی پھیپھڑے جیسا سادہ کام کرے— انگلستان کی کئی کمیونٹی میں ایسے نظام کام کر رہے ہیں— سادہ قسم کے تبادلے کی صورت، میدانوں کا خالص پانی شہروں تک لے جائے، اور شہروں کا گندہ مگر زرخیز پانی شہروں سے کھیتوں تک لے جائے تو ہمارے پانچ سوملین بچ سکتے ہیں جو ہم ضائع کر دیتے ہیں۔ لوگ دوسرے طریقوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

اس وقت جو نظام استعمال میں ہے، دراصل نیکی کے ارادے سے بدی کر رہا ہے۔ ارادہ نیک ہے مگر نتیجہ افسردگی ہوتا ہے۔ شہر کو برائی سے پاک کرنے کی خاطر آبادی کو پودوں کی طرح اُجاڑا کیا جاتا ہے اور تہہ خانوں میں اُگلایا جاتا ہے۔ زمین دوز نالیوں کا نظام، نابدان ایک بڑی بھاری غلطی ہے۔ جب پانی کی نکاسی کا دوطرفہ نظام زمین دوز نالی کی جگہ لے لے گا، جو سادہ دھلائی کا طریقہ ہے، اور یہ سماجی معاشیات میں مشترک ہو گا تو زمین کی پیداوار دس گنا زیادہ ہو جائے گی، اور بدحالی کا مسئلہ از خود ہلکا ہو جائے گا۔ اس میں طفیلیت کو دبا دیا جائے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس دوران، عوام کی دولت بہہ کر دریا میں جا رہی ہے، اور رساؤ ہو رہا ہے۔ اصل مسئلہ رساؤ ہے۔ اس طرح یورپ تباہ ہو رہا ہے۔

فرانس کے بارے میں ہم نے ابھی اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ اس وقت فرانس کی پوری آبادی کا چار فی صد حصہ پیرس میں رہتا ہے اور پیرس کا فضلہ سب سے زیادہ زرخیزی کا حامل ہوتا ہے، اور ہم حقیقت کو کم بیان کرتے ہیں، جب ہم پانچ سوملین میں سے پیرس کے حصے کا نقصان صرف پچیس ملین بتاتے ہیں، فرانس جسے عام طور پر رد کر دیتا ہے۔ یہی پچیس ملین اگر پیرس کی امداد اور لطف اندوزی میں استعمال کیے جائیں تو پیرس کی شان و شوکت دوبالا ہو جائے گی۔ یہ شہر اس رقم کو نابدان میں خرچ کر دیتا ہے۔ سو، جب ہم کہتے ہیں کہ پیرس کی فضول خرچی، اس کے شان دار جشن، اس کے Beaujon [لوئی پانزدہم کے دربار کا بینکار] کی حماقت، اس کا رقص و سرود، ہاتھوں کے ذریعے بہتا اس کا سونے کا چشمہ، اس کا طمطراق، اس کا عیش و عشرت، اس کی رونق دراصل اس کا نابدان ہے۔

تو واضح رہے کہ اسی طرح، سیاسی معاشیات کی کورچشمی میں، ہم ڈوبتے ہیں اور سب کو سمندر کی جانب بہتی لہروں پر بہہ کر غائب ہونے دیتے ہیں۔ عوام کی قسمت کے لیے Saint-Cloud کے قریب جال لگا دیے جانے چاہئیں۔

معاشیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس معاملے کا یہ خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

پیرس ایک فضول خرچ شہر ہے۔ پیرس وہ مثالی شہر، منظم داراشکوہوں کا سرپرست ہے ہر قوم جس کی ایک نقل اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتی ہے؛ وہ مثالی عظیم شہر، پیش قدمی کرنے والی تحریکات اور کوششوں کا محترم ملک؛ دماغوں کے قیام کا مرکز؛ قوم جیسا شہر؛ مستقبل کا زنبور خانہ Cornith اور بابل کا شان دار امتزاج ہے جو اس نقطۂ نظر سے ہم نے جس کی طرف اشارے کیے ہیں، Fo-Kian کے کسان کو بھی زچ کر دے گا۔

آپ نے پیرس کی نقل کی تو خود کو تباہ کر لیں گے۔

ستم بالائے ستم، اور بالخصوص اس قدیم اور احمقانہ زیاں کے معاملے میں پیرس خود نقال ہے۔

حماقتوں کی یہ حیرت انگیز نمائش انوکھی نہیں؛ نہ ہی یہ نوجوانی کی نا سمجھی ہے۔ قدیم لوگ بھی جدید لوگوں کی طرح کے کام کیا کرتے تھے۔ "روم کے بدرو نے" بقول Liebig "روم کے کسانوں کی خوش حالی جذب کر لی ہے۔" جب روم کے بدرو نے روم کے نشیبی علاقے کو تباہ کر دیا تو روم نے اطالیہ کو بے حال کر دیا، اور جب اس نے اطالیہ کو اپنے بدرو میں ڈالا تو سسلی کو، پھر سارڈینیا کو پھر افریقا کو بہا دیا۔ روم کا بدرو دنیا پر چھا گیا۔ غلاظت کے اس تالاب نے اپنی احاطہ بندی شہروں کو ہی نہیں کائنات کو بھی پیش کر دی تھی۔ ابدی شہر اور اتھاہ نالی Urbi et orbi!

ان چیزوں میں، بلکہ اور باتوں میں بھی روم دوسروں کے لیے مثال بن جاتا ہے۔

پیرس اپنی تمام تر شہری ذہانت کے باوجود اس کی پیروی کرتا ہے۔

اس کارکردگی کے بارے میں، ہم جس پر اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں، پیرس اپنے نیچے ایک اور پیرس رکھتا ہے؛ بدرو کا پیرس؛ جس کی اپنی سڑکیں ہیں، چوراہے ہیں، میدان ہیں، بند گلیاں ہیں، رگیں ہیں، دوران ہے، جو دلدل سے بنے ہیں مگر ان میں انسان نہیں۔

عظیم عوام کی بھی کسی قسم کی چاپلوسی نہیں کی جانی چاہیے؛ وہاں، جہاں سب کچھ ہوتا ہے، وہاں ترفع کے پہلو میں رسوائی بھی ہوتی ہے؛ اور اگر پیرس کے اندر روشنی کا شہر ایتھنز ہے، طاقت کا شہر ٹائر ہے، راست بازی کا شہر اسپارٹا ہے، معجزوں کا شہر نینوا ہے، تو اس میں کیچڑ کا شہر Lutetia بھی شامل ہے۔

اگر نظر اس کی سطح میں سوراخ کر سکے تو پیرس کی مٹی کی نچلی پرت ایک بہت بڑے عالم حیوانیات کا نظارہ پیش کرے گی۔ کسی اسفنج میں بھی اتنی تقسیم اور اتنی نالیاں نہیں ہوتیں جتنی کہ زمین کے چھ لیگ گولائی کے ایک ڈھیر میں ہوتی ہیں جس پر یہ عظیم اور قدیم شہر قائم ہے۔ اس

میں وہ شراب رکھنے والے سرداب شامل نہیں جو علاحدہ تہہ خانے ہیں، گیس کی نلکیوں کا ایک ناقابلِ حل جالیوں جیسا سلسلہ ہے، جس میں تازہ پانی کی تقسیم کے نلکے شامل نہیں جو ستونوں میں بنے فواروں تک پہنچتے ہیں ــ بدان خود ایک مبہم سلسلہ ہے جو دھاگوں کی طرح دونوں ڈھلانوں کے نیچے پھیلا ہوا ہے۔

نمی سے پُر اس دھند میں چوہے بھی ہیں، جو بیرن کی پیداوار ہیں۔

۞

نابدان کی قدیم تاریخ

قاری کو تھوڑی دیر کے لیے تصور کر لینے دیجیے کہ پیرس کو کسی ڈھکنے کی طرح زمین سے اٹھا لیا گیا ہے اور کسی پرندے کی نظر میں نابدان کے پورے نظام کا خاکہ ایک قسم کی بڑی سی شاخ کی طرح نظر آرہا ہے جسے دریا کے اوپر پیوند کر دیا گیا ہے۔ اور دائیں کنارے پر، نابدان کی پیچ اس شاخ کا تنا بن جاتی ہے، اور ذیلی نالیاں اس کی شاخیں ہیں جن میں کوئی کونپل نہیں۔

یہ خاکہ ایک خلاصہ ہے جو نصف درست ہے، اور اس کا زاویہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اس قسم کے زیر زمین شعبدے کا ہوتا ہے جس میں شاذ و نادر ہی پیچھا آتا ہے۔

اس اقلیدس جیسے حیرت انگیز منصوبے کا ایک زیادہ درست خاکہ اس تصور کے ذریعے کیا جا سکتا ہے کہ آپ کسی کج رو مشرقی زبان کے کسی حرف کو دیکھ رہے ہیں جو پرچھائیوں کے پس منظر میں کسی جھاڑی کی طرح الجھا ہوا ہے، اور اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف کو مزید پیچیدگی کے انداز میں ایک دوسرے سے ویلڈ کر دیا گیا ہے، اور اب جو اپنے زاویوں اور حروں کے باعث بے ترتیب طور پر زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کی زیریں سلطنت اور قدیم مشرق کے زمانے میں گڑھے اور نابدان بڑا کردار ادا کرتے تھے۔ عوام سڑاند کے گڑھوں، موت کے بھیانک جھولوں سے خوف کھانا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ بنارس کے کیڑوں مکوڑوں کے جوہڑ بابل کے شیروں کی ماند سے کم چکرا دینے والے نہیں ہوتے تھے۔ یہودیوں کی مقدس کتابوں کے مطابق Phalasar Teglath [اسیریا کے شاہ] نے نینوا کے گڑھے کی قسم کھائی تھی۔ Leyden کے جان نے [جرمنی کے شہر] Munster کی نالیوں سے اپنا نقلی چاند نکالا تھا، اور Kekscheb کے گندے نالے سے خراسان کی ایک

نقاب پوش مشرقی شخصیت Mokanna [المقنع] نے جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اپنا جعلی سورج نکالا تھا۔ آدمیوں کی تاریخ کا عکس نابدان کی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جرمونیا نے روم کو بیان کیا تھا [Gemoniae سیڑھیاں جن کے پیچ دار زینوں پر مجرموں کو گھسیٹ کر لایا جاتا تھا اور ان کے درمیان کے خلا میں ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا اور انہیں سوکھتا لٹکتا اور سڑتا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہاں سزا پانے والوں میں شہنشاہ Vitellius بھی شامل تھے]۔ پیرس کے نابدان بہت قدیم اور بھیانک چیز تھے۔ یہ مقبرہ تھے اور انھوں نے پناہ گاہوں کا کام بھی کیا تھا۔ جرم، آگاہی، سماجی احتجاج، شعور کی آزادی، خیال، چوری، وہ سب، انسانی قوانین جن کے لیے ایذا دیتے تھے اس سوراخ میں چھپے ہوئے ہیں — چودھویں صدی کا maillotin [غدر]، پندرہویں صدی کا tire-laine، اور سولھویں صدی کے [عیسائیوں کا ایک مذہبی فرقہ] Huguenots۔ سترہویں صدی میں ظاہر ہونے والے Morin، اٹھارہویں صدی کے ڈاکو بھی ان میں شامل ہیں۔ ایک سو برس قبل، رات میں دیے جانے والے چھریوں کے زخم یہیں سے ابھرے تھے؛ خطرے سے دوچار ہونے والے جیب کترے یہیں غائب ہو جاتے تھے؛ جنگل کے اپنے غار تھے، تو پیرس کے اپنے نابدان تھے۔ خانہ بدوش آبادی، نابدان کو [پیرس کی بھکاری آبادی] Cour des Miracles کا اضافہ گردانتی تھی اور شام کے وقت Maubuee کے راستے تھکے ہارے اس طرح داخل ہوتے تھے، جیسے اپنی خواب گاہ میں جا رہے ہوں۔

یہ بالکل فطری بات تھی کہ وہ جن کی خالی جیب بند گلی ہوتی ہیں، یا جن کی سڑک گلے کٹنے کی جگہ ہوتی ہے، دن بھر کی محنت کے بعد ان کے آرام کی جگہ کوئی سبز گھاس والا راستہ یا Hurepoix کا علاقہ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے اندر یادگار تختوں کا ایک ہجوم بھی ہوتا۔ یہ طویل اور تنہا راہداریاں ہر قسم کے بھوت پریت کی جولاں گاہ ہوتی ہیں؛ ہر جگہ اخلاقی خرابیاں اور بدبو ہوتی ہے؛ کہیں کہیں تازہ ہوا کے لیے سوراخ ہوتے ہیں، جہاں اندرون کا [پندرہویں صدی کا شاعر] Villon بیرون کے [پندرہویں صدی کے] ادیب Rabelais سے گفتگو کرتا ہے۔

قدیم پیرس کا نابدان تھکاوٹ اور کوششوں کا اکھاڑہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر کی سیاسی معیشت ملبے کی جاسوسی کرتی ہے، اور وہاں کا سماجی فلسفہ ادنیٰ درجے کے لوگوں کو دیکھتا ہے۔

نابدان شہر کا ضمیر ہوتے ہیں۔ وہاں کی ہر شے ہر طرف مائل ہوتی ہے اور ہر ایک کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان کے دھندلکے کی اپنی پرچھائیاں ہوتی ہیں، مگر ان میں کوئی شے خفیہ نہیں ہوتی۔ ہر شے اپنی اصل کیفیت میں ہوتی ہے، یا کم از کم اپنے فیصلہ کن پیکر میں ہوتی ہے۔ غلاظت کی ایک بات اس کے حق میں جاتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ سادگی نے وہاں پناہ لے رکھی ہے۔ تلسی (Basil) کی نقاب بھی وہاں پائی جاتی ہے، مگر دیکھنے والے کو اس کی دفتی (cardboard)

اور اس کی ڈوریاں، اس کا اندرون اور بیرون نظر آتا ہے، اور ایمان دار کیچڑ اسے بڑھا دیتا ہے۔ [مسخرے] Scapin کی مصنوعی ناک اس کی پڑوسی ہے۔ تمدن کی ساری گندگی ایک بار استعمال ہوجائے تو اپنی حقیقت کی خندق میں گر جاتی ہے جہاں سماجی اتار چڑھاؤ ختم ہوجاتا ہے۔ وہ وہاں پہنچ کر ڈھک جاتی ہے، مگر وہاں اپنی نمائش کرتی ہے۔ یہ آمیزہ ایک نوع کا اعتراف ہوتا ہے۔ وہاں مزید جھوٹے اظہار نہیں ہوتے؛ ان کی استرکاری ممکن نہیں؛ گندگی اپنی قمیص اتار دیتی ہے؛ مکمل عریاں کاری تمام فریب ہائے نظر اور سرابوں کو شکست دے دیتی ہے؛ سوائے اس کے جو واقعی موجود ہوتا ہے، وہاں مزید کوئی شے نہیں ہوتی، اور اس کے نامبارک پیکر کو پیش کر دیتی ہے جو اپنے اختتام پر پہنچنے والی ہوتی ہے۔ وہاں، بوتل کا تلا بلا نوشی کو ظاہر کرتا ہے، جھاڑو کا دستہ گھریلو کہانی بیان کرتا ہے؛ وہاں سیب کا مغز جس نے ادبی خیالات کی پرورش کی ہے ایک بار پھر سیب کا مغز بن جاتا ہے؛ سو کے بڑے سکے پر بنے نقش پر زنگار چڑھ جاتا ہے، Caiphas [یہودی پادری اور عالم جس نے یسوع مسیح کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا، جس کا ذکر عہد نامہ جدید میں موجود ہے] کا تھوک Falstaff کی قے سے ملتا ہے؛ جوئے خانے سے آنے والا louis-d'or [فرانسیسی سکہ] جو ناخن سے دھکا دیتا ہے کہ رسی کے کس سرے سے خودکشی کی جائے گی۔ سلمہ ستارے میں لپٹا ایک نیلگوں جنین (foetus) جو پچھلے Shrove-Tuesday اوپیرا میں رقص کر رہا تھا چکراتا آرہا ہے؛ ایک ٹوپی جس نے آدمیوں کا فیصلہ کیا تھا سڑاند کے ڈھیر کے قریب کیچڑ میں لوٹ رہی ہے جو کبھی Margoton کی پیٹی کا حصہ تھی؛ یہ میل جول سے کہیں زیادہ ہے، یہ ہر ایک کو 'تو' کہنے کے برابر ہے۔ سب کچھ جو پہلے غازے میں ملفوف تھا، اب دھلا ہوا ہے۔ آخری نقاب پھٹ گئی ہے۔ نابدان ترش رو ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ بیان کر دیتا ہے۔

غلاظت کی راست بازی ہمیں خوش کرتی ہے اور روح کو سکون پہنچاتی ہے۔ جب کوئی شخص زمین پر ریاست کی وجوہ کی بنا پر زمین کے سارے تماشے برداشت کر لیتا ہے، حلف، سیاسی فراست، انسانی انصاف، پیشہ ورانہ دیانت، حالات کی سادگی اور ناقابل تحلیل جبہ پہن لیتا ہے تو اسے نابدان میں داخل ہوجانا اور موزوں کیچڑ کا دیکھنا تسکین پہنچاتا ہے۔

ساتھ ہی یہ سبق آموز بھی ہے۔ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ تاریخ نابدان سے گزرتی ہے۔ وہاں پتھر کی سلوں کے درمیان سے قطرہ قطرہ Saint-Barthelemys [پندرھویں صدی میں کولمبس کا دریافت کردہ غرب الہند کا مجمع الجزائر جو صدیوں مختلف سلطنتوں کی حکمرانی میں رہا ہے جس کا ایک حصہ فرانس کی عمل داری میں ہے] منقطر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی قتل، سیاسی اور مذہبی خون خرابے تمدن کے اس رستے سے گزرتے ہیں اور اس میں اپنی لاشیں ٹھونستے ہیں۔ کسی مدبر کی نظر کے لیے، تمام

تاریخی قاتل، اس ڈراؤنے دنبالے میں، گھٹنوں کے بل جھکے، کشن کے ایک ٹکڑے سے بنے ایپرن کے ساتھ، افسردگی کے عالم میں اپنے کام کو سمیٹے ہوئے ہمیں پائے جاتے ہیں۔ وہاں Tristan [بارہویں صدی کے ایک کھیل کا کردار] کے ساتھ لوئی یازدہم وہاں ہے؛ Duprat کے ساتھ فرانسوا اوّل ہے؛ اپنی ماں کے ساتھ چارلس نہم ہے، لوئی ہشتم کے ساتھ Richelieu [سولہویں صدی کا فرانسیسی مدبر] ہے؛ وہاں Louvois [سترہویں صدی کا فرانسیسی وزیرِ جنگ] ہے، Letellier [فرانس کی بحری فوج کا اعلیٰ افسر] ہے، اس کوشش میں پتھروں کو کھرچتے ہوئے کہ ان کے اعمال کے سارے نشان مٹ جائیں اور Hebert [سولہویں صدی کا فرانسیسی صحافی] اور Maillard بھی وہیں ہیں۔ اس کے حجروں کے نیچے آپ کو بھوت پریت کی جھاڑو کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہاں کی سانسوں میں سماجی تباہیوں کی بے حد و اندازہ شامل ہوتی ہے۔ وہاں کے کونوں میں سرخی مائل پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک خوف ناک چشمہ بہتا ہے جس میں خون بھرے ہاتھ دھوئے گئے ہیں۔

معاشرتی مبصر کو ان پرچھائیوں میں داخل ہونا چاہیے۔ یہ پرچھائیاں اس کی تجربہ گاہ کا حصہ ہیں۔ فلسفہ خیال کی خوردبین ہوتا ہے۔ ہر شے ان میں سے فرار ہونا چاہتی ہے، مگر کوئی ان سے نکل نہیں پاتی۔ انحراف بے کار ہوتا ہے۔ انحراف میں کون سے پہلو کی نمائش کی جاتی ہے؟ قابلِ شرم پہلو کی۔ فلسفہ اپنی نظر سے تعاقب کرتا ہے؛ برائی کی چھان بین کرتا ہے اور اس کو نیستی میں فرار ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ چیزوں کی نیستی میں جو غائب ہو جاتی ہیں، ان اشیا پر نگاہ رکھنے میں جو غائب ہو جاتی ہیں، یہ سب کو پہچان لیتی ہیں۔ یہ چیتھڑوں میں سے دوبارہ ارغوان، اور اس کے لباس کی ٹکڑوں سے عورت تیار کرتی ہیں۔ یہ غلاظت کے جوہڑ سے شہر کو دوبارہ تعمیر کرتی ہیں؛ کیچڑ سے انداز و آداب تخلیق کرتی ہیں؛ ٹھیکری سے صراحی کو پہچانتی ہیں؛ چرم کے ٹکڑے پر بنے انگلی کے ناخن کے نقش سے یہ جھونپڑیوں والے یہودیوں اور Judengasse کے یہودیوں کے فرق کو واضح کرتی ہیں۔ یہ دریافت کرتی ہیں اس میں جو باقی رہتا ہے، جو اچھا ہے، سراب ہے، حقیقت ہے، جو محل کے خون کا دھبا ہے، جو غار کی روشنائی کا دھبا ہے، قحبہ خانے سے آنے والے پسینے کا قطرہ ہے، کیے گئے تجربات ہیں، پسندیدہ ترغیبات ہیں، پہلے سے طے شدہ رقص و سرود ہیں، وہ موڑ ہیں جو کرداروں نے اس وقت کاٹے جب وہ ذلیل ہو گئے تھے، نفوس کی جسم فروشی کے دھبے ہیں وہ جس کے لائق ہیں، اور روم کے دربانوں کے لباس کے وہ نشانات ہیں جو Messalina [روم کے شہنشاہ کلاڈیس کیم کی تیسری ملکہ جس کو کسی مرد سے تعلق رکھنے پر موت کی سزا دی گئی تھی] کے کہنی مارنے سے بنے ہیں۔

برونی زو

(Bruneseau)

پیرس کے نابدان قرونِ وسطیٰ میں داستان کی حیثیت رکھتے تھے۔ سولھویں صدی عیسوی میں ہنری دوئم نے ان میں اوپر سے سوراخ کرنے کی کوشش کی، جو ناکامیاب ہوئی تھی۔ سو برس قبل، Mercier نے اس حقیقت کا اعتراف کیا اور اس غلاظت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کا وہی حال ہوا جو اس کے لیے بہتر تھا۔

ایسا تھا قدیم پیرس، جسے جھگڑوں کے، تذبذب کے اور تلاش کے حوالے کر دیا گیا تھا اور ایک عرصے تک اسی احمقانہ کیفیت میں رہا۔ بعد میں، 89' اس نے دکھایا کہ شہروں میں اتفاقِ رائے کس طرح ہوتا ہے۔ مگر اچھے پرانے زمانے میں یہ دارالحکومت آگے بڑھ نہیں سکا تھا۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ اپنے مسائل کی اخلاقی اور مادی اعتبار سے کس طرح تنظیم کی جائے، اور یہ خرابی کے بجائے اپنی گندگی کی صفائی کس طرح کر سکتا ہے۔ [مشکل یہ ہے کہ] ہر شے ایک مسئلہ بن جاتی تھی، ہر شے ایک سوال اٹھاتی تھی۔ مثال کے طور پر، نابدان اپنے اندر ہر سطر کی تفصیل کے لیے دشوار ہو جاتے تھے۔ شہر میں اپنے مقام کا تعین کر لینے کی طرح زیرِ زمین نابدان میں مقام کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اوپر ادراک سے بالاتر ہوتے ہیں، اور نیچے بے حد پیچیدہ؛ زبانوں کی الجھن کے نیچے غاروں کی الجھن کا راج تھا؛ Daedalus بابل کی مدد کر رہا تھا۔

بعض اوقات پیرس کی زیرِ زمین نالیاں ابلتی محسوس ہوتی تھیں؛ جیسے غلط فہمی میں نیل اچانک غصے میں آ جاتا ہے، زیرِ زمین نابدان میں بھی سیلاب آ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تمدن کا پیٹ بری طرح خراب ہو جاتا تھا اور غلاظت کا جوہڑ الٹا نکل پڑتا اور غلاظت شہر کے گلے میں واپس

آجاتی تھی، اور پیرس کو اپنی واپس آتی غلاظت کا مزہ چکھنا پڑ جاتا تھا۔ نابدان کی ان مشابہتوں کے کچھ اچھے پہلو بھی تھے؛ یہ ایک طرح کی تنبیہات ہوتی تھیں، جو بے دلی سے قبول کی جاتی تھیں؛ شہر اپنے دلدل کی جرأت پر برہمی دکھاتا، اور اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ غلاظت واپس آئے۔ اس کو واپس کر دیا جاتا تھا۔

پیرس کے اسّی برس کے بوڑھوں کو 1802ء کا نابدان کا سیلاب ضرور یاد ہوگا۔ جس جگہ لوئی چہاردہم کا مجسمہ نصب ہے وہاں تک پورے Place des Victoires میں کیچڑ پھیل گیا تھا؛ شانزہ لیزے میں واقع نابدان کے دو دہانوں سے Saint-Honore اسٹریٹ تک کیچڑ ہی کیچڑ تھا، اور Saint-Florentin اسٹریٹ کی نالی سے بہتا ہوا Saint Florentin اسٹریٹ تک، Sonnerie, کی نالی سے Pierre-a-Poisson اسٹریٹ تک، Chemin-Vert کی نالی سے Popincourt, اسٹریٹ تک، Lappe اسٹریٹ کی نالی سے Roquette اسٹریٹ تک کیچڑ پھیل گیا تھا؛ اس نے شانزہ لیزے کے برساتی نالے کو پینتیس سینٹی میٹر کی بلندی تک ڈھک لیا تھا؛ اور جنوب کی طرف سین کے سوراخ کے ذریعے، اپنا کام الٹا کرتا ہوا Mazarine اسٹریٹ، l'Echaude اسٹریٹ، اور Marais اسٹریٹ میں داخل ہو گیا تھا، جہاں پہنچ کر ایک سو نو میٹر فاصلے پر رک گیا تھا، جو اس مکان سے چند قدم فاصلے پر تھا جس میں پیرس کا سترہویں صدی کا عظیم ڈراما نویس [Racine] رہتا تھا، جس کا بادشاہ سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ یہ Saint-Pierre اسٹریٹ میں زیادہ سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا، جہاں اس کی اونچائی water-spout [طوفان میں سطح سمندر کی بلندی کی پیمائش کرنے والے] پتھر سے تین فٹ زیادہ بلند ہو گئی تھی، اور Saint-Sabin اسٹریٹ میں پھیل کر اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی اڑتیس میٹر ہو گئی تھی۔

اس صدی کی ابتدا تک پیرس کا نابدان ایک پُر اسرار جگہ تھی۔ کیچڑ کو کبھی اچھی شہرت نہیں ملتی؛ مگر اس معاملے میں اس کی برائی کی شہرت خوف ناک حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ لوگ اس کے بارے میں Thebes [موجودہ مرکزی یونان کا ایک علاقہ جس کا ذکر Cadmus, Oedipus, Dionysus کی کہانیوں میں آیا ہے] کے اس ہیبت ناک گڑھے کی بات کرتے تھے جو پچیس فٹ لمبے ہزار پا (centipedes) سے بھر گیا تھا، اور جو Behemoth نامی درندے [جس کا انجیل مقدس کے Job 40:15-24 میں تذکرہ کیا گیا ہے جو دیو مالائی ہاتھی، hippopotamus، rhinoceros یا گھڑیال تھا] کے نہلانے کے ٹب کا کام کر سکتا تھا۔ نابدان میں کام کرنے والوں کے بڑے بڑے جوتے ایک

خاص اور مشہور مقام سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ ہم اس وقت اس عہد سے بہت قریب تھے جب مہتروں کی گاڑیاں Sainte-Foix اور Marquis de Crequi کی چوٹیوں سے اپنی سارا کوڑا کرکٹ براہِ راست نابدان میں ڈال دیتی تھیں۔ صفائی کے معاملے میں— یہ کام گھٹا ٹوپ بارش تھی، اور بہانے کے بجائے سب کچھ بوجھ بن جاتا تھا۔ روم نے اپنے نابدان کے لیے کچھ شاعری چھوڑی تھی جس کو Gemoniae کہا جاتا تھا؛ پیرس نے اپنے نابدان کی توہین کی تھی اور اس کو Polypus-Hole کا نام دیا تھا۔ خوف کے معاملے میں سائنس اور توہم پرستی ہم رکاب تھے۔ Polypus سوراخ اُصولِ صحت کے کم بہ خلاف نہیں تھا جتنا کہ legend کے۔ Mouffetard کے بدبو دار نابدان میں بد روح غول تیار کیا گیا تھا۔ Marmousets کی (فرانس کے بادشاہ چارلس ششم کے حواری جن کو اس زمانے کے انگلستان میں بدمعاش کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) لاشیں Barillerie کے نابدان میں پھینک دی گئی تھیں؛ Fagon والی چار دہم کا طبیب خاص جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مریضوں کا خون بہا کر انھیں مار ڈالتا تھا؛ کہ اس نے بادشاہ کا صحیح علاج نہیں کیا تھا؛ کہ اس نے نوجوان ڈیوک Bretagne کو بھی مار ڈالا تھا) کا خیال تھا کہ 1685ء کا خوف ناک مہلک بخار Marais کے زیرِ زمین نابدان کی پیداوار تھا، جو 1833ء تک Saint-Louis اسٹریٹ میں، Gallant Messenger کے بالکل سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ Mortellerie اسٹریٹ کے نابدان کے دہانے کے بارے میں مشہور تھا کہ وبائی بیماریاں اسی کی دین تھیں؛ اس کی لوہے کی جالیاں جن کی نکلی ہوئی نوکیں دانتوں کے سلسلے جیسی دکھائی دیتی تھیں، اس مہلک اسٹریٹ پر اژدھے کے معدے کی طرح تھی اور اس سے نکلنے والی گندی ہوائیں آدمیوں پر دوزخ کے شعلوں کی طرح گرتی تھیں۔ پیرس کے اندھیرے نابدان کے بارے میں لوگوں کا تصور تھا کہ ان کی تہہ ناقابلِ بیان ڈراونی اور لامتناہی ہے۔ ان کی نالیاں اتھاہ تھیں۔ نیچے کی دنیا تھیں۔ پولیس کو ان جذامی علاقوں میں داخل ہونے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ نامعلوم چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا، شاقول کو اندھیروں میں ڈالنا، پاتال میں دریافت کا سفر اختیار کرنا ہوتا— کون ان کی ہمت کر سکتا تھا؟ سب کچھ خطر انگیز تھا۔ پھر بھی، کوئی تھا جس نے خود کو پیش کر دیا تھا۔ اس غلاظت کے جوہڑ کا بھی ایک کرسٹوفر کولمبس تھا۔

ایک دن، 1805ء میں، جب شاہ نے پیرس میں ظہور کیا تھا، وزیرِ داخلہ اپنے حواری افسران یا دوسرے اپنے آقا کے قریب پہنچا۔ وہاں موجود عظیم جمہوریہ اور عظیم سلطنت کے غیر معمولی سپاہیوں کی تلواروں کی کھڑ کھڑ کی آوازیں آ رہی تھیں؛ اس وقت نپولین کے دروازے کو

رہائین کی وادی سے، Escaut کی، Adige کی اور شمال سے آنے والے دلیروں نے بند کر رکھا تھا؛ جنرل Joubert کے، جنرل Desaix کے، جنرل Hoche کے، Marceau کے، Genoa کے پُل بنانے والے، اہرام کے بُمساروں نے تو ممیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جن کو Junot کی توپوں کے گولوں نے کیچڑ سے بھر دیا تھا، اور cuirassiers [بکتر پوش گھڑ سوار سپاہیوں] کو جنھوں نے Zuyderzee میں لنگر انداز بیڑے پر حملہ کر دیا تھا؛ کچھ Lodi کے پُل پر بونا پارٹ کے ساتھ گئے، دوسرے Murat کے ساتھ Mantua کی خندقوں میں گئے، کچھ اور Montebello کی خالی سڑک پر Lannes میں گئے تھے۔ اس وقت کی پوری فوج Tuileries کے صحن میں موجود تھی، جس کی نمائندگی ایک اسکواڈرن یا ایک پلاٹون کر رہی تھی، اور آرام کی حالت میں نپولین کی حفاظت کر رہی تھی؛ وہ ایک شان دار زمانہ تھا جب عظیم فوج کے عقب میں Marengo اور آگے Austerlitz تک ہوا تھا۔

"عالی جاہ!" وزیرِ داخلہ نے نپولین سے کہا، "کل میں نے آپ کی سلطنت کا سب سے دلیر آدمی دیکھا ہے۔"

کون ہے وہ آدمی؟" شہنشاہ نے کھردرے لہجے میں پوچھا، "اور اس نے کیا کام کیا ہے؟"

"عالی جاہ، وہ کچھ کام کرنا چاہتا ہے۔"

""کیا ہے وہ کام؟"

وہ پیرس کے نابدان کو دیکھنا چاہتا ہے۔"

اس آدمی کا وجود تھا اور اس کا نام تھا بروُنی زو۔

۞

ان جانی تفصیلات

معائنہ کیا گیا۔ یہ ایک بڑا مرحلہ تھا؛ یہ ایک شبینہ جنگ تھی وبائی امراض کے اور جبس دم کے خلاف۔ اس کے ساتھ ہی یہ ایک سفر تھا دریافت کا۔ اس مہم سے بچ نکلنے والے ایک ذہین کارکن نے جو اس وقت بہت کم عمر تھا چند برس قبل، اس کی بابت بہت پُر اسرار تفصیلات بتائی ہیں، بیرونی زونے جنھیں پولیس کے افسر کو پیش کی جانے والی روداد میں ظاہر کرنے سے پرہیز کیا تھا کہ یہ سرکاری انداز کے مطابق نہیں تھیں۔ اس زمانے میں جراثیم کش طریقے بے حد بنیادی تھے۔ ابھی برونی زونے نابدان کے اس پیچیدہ نظام کے پہلے پیچ وخم سے مشکل سے قدم پار کیے ہوں گے کہ بیس میں سے آٹھ مزدوروں نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ یہ نہایت پیچیدہ کام تھا؛ معائنے کے لیے ضروری تھا کہ صفائی کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے تا کہ پانی کے داخلے کی جگہوں کا مشاہدہ کیا جائے؛ نالیوں اور سوراخوں کو گنا جائے؛ نالیوں کی شاخوں کی تفصیلات کا خاکہ بنایا جائے؛ راستوں کے الگ ہونے کے مقامات پر آنے والی لہروں کی نشان دہی کی جائے؛ تالابوں کے غوطہ خوروں کی حدود کا تعین کیا جائے؛ بڑی نالیوں میں ملائی جانے والی نالیوں کو واضح کیا جائے؛ اندر آنے والے ہر برساتی نالے کے نشان والے پتھروں کے نیچے کی اونچائی اور چوڑائی کی پیمائش کی جائے، تا کہ پانی داخل ہونے کی سطح کے انتظام کا، تہہ میں یا محراب کی جگہ پر یا سڑک کی مٹی پر تعین کیا جائے۔ یہ لوگ بہت محنت سے آگے بڑھے۔ اس ماحول میں لالٹینیں خراب ہو رہی تھیں۔ بے ہوش ہونے والے کارکنوں کو وقتاً فوقتاً باہر لے جایا گیا۔ کچھ مقامات پر ڈھلانیں بھی تھیں۔ زمین بیٹھ گئی تھی، راستے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے، نالیاں اتھاہ کنوؤں میں تبدیل ہو گئی تھیں؛ کوئی شے ٹھوس نہیں رہ گئی تھی؛ اچانک ایک آدمی غائب ہو گیا؛ بڑی مشکل

سے اسے باہر نکالا جا سکا تھا۔ Fourcroy کے مشورے پر انھوں نے جگہ جگہ، ان علاقوں میں جو کافی حد تک جراثیم سے پاک کر دیے گئے تھے، رال میں ڈوبی رسیوں سے بھرے بڑے بڑے کھانچوں کو ہلکا کیا گیا۔ کچھ جگہوں پر دیواریں بد شکل پھپھوند سے ڈھکی ہوئی تھیں — جن پر ٹیومر کا گمان ہوتا تھا؛ اس حبس زدہ ماحول میں پتھر تک بیمار نظر آتے تھے۔

اپنی دریافت کے سلسلے میں بروتی زو نیچے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس جگہ Grand-Hurleur کی دو نالیاں علاحدہ ہو رہی تھیں وہاں ایک پتھر پر 1550ء لکھا نظر پڑا؛ یہ پتھر ان حدود کی طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں Philibert Delorme رکا تھا جو ہنری دوئم کے حکم پر زیرِ زمین برساتی نالوں کے معائنے کے لیے داخل ہوا تھا۔ یہ پتھر سولھویں صدی کی زیرِ زمین نالیوں کی نشانی تھا؛ بروتی زو کو ایک بار پھر پرانی Vielle-du-Temple اسٹریٹ کے برساتی نالے میں سترھویں صدی کا ایک کام ملا جو 1600ء اور 1650ء کے تجربوں کے درمیان ہوا تھا۔ پانی جمع کرنے والے اس شہر کے مغربی حصے میں بھی اٹھارھویں صدی کا کچھ کام ملا تھا جو 1840ء میں کیا گیا تھا۔ نالیوں کے ان دو تجربوں کی، بالخصوص وہ جو کم قدیم ہیں، راج گیری زیادہ شگاف زدہ اور ناکارہ ہیں جن کی تاریخ 1412ء تک پہنچتی ہے، وہ عہد جس میں Menilmontant کے میٹھے پانی کے چشمے کو پیرس کے زیرِ زمین نالیوں کے نظام کے وقار تک بلند کر دیا گیا تھا۔ یہ ترقی اس کسان کی ترقی جیسی تھی جو شاہ کا پہلا خدمت گار خاص بن جاتا ہے: Gros-Jean جیسی کوئی شے جس کی Lebel میں قلب ماہیت ہو گئی تھی۔

یہاں وہاں، بالخصوص Court-House کے نیچے نالیوں کے اندر کھدائی کی گئی اور ان کا خیال تھا کہ انھوں نے قدیم عقوبت خانوں کے خلا دریافت کر لیے ہیں۔ بہت ڈراؤنی جگہ تھی یہ ان حجروں میں سے ایک میں لوہے کا ایک گلو بند جھول رہا تھا۔ انھوں نے اسے دیوار اٹھا کر بند کر دیا تھا۔ ان کی دریافتوں میں چند غیر معمولی تھیں؛ دوسری اشیا کے علاوہ (ourang-outan) لنگور کا ڈھانچا بھی ملا جو 1800ء میں Jardin des Plantes سے غائب ہو گیا تھا؛ ایک گم شدگی جو غالباً Bernardins اسٹریٹ کے اٹھارھویں صدی کے آخری برس کے مشہور آسیب سے متعلق تھی۔ بے چارے نے نابدان میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی۔

اس طویل محرابی نالی کے نیچے جو Arche-Marion پر ختم ہوتی تھی کسی چیتھڑے جمع کرنے والے کی نہایت خوبی سے محفوظ شدہ جھابی ملی تھی جو پُر جوش صاحبانِ ذوق کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اس دلدل میں، جسے نابدان کے کارکن بڑی دلیری سے قابو میں رکھتے تھے، ہر طرف

قیمتی اشیا، سونے چاندی کے زیور، قیمتی پتھر اور سکے پائے جاتے تھے۔ اگر کوئی دیو اس غلاظت کے تالاب کو چھان سکتا تھا تو اس دلدل سے صدیوں کی قیمتی اشیا حاصل کر سکتا تھا۔ اس مقام پر جہاں Temple اسٹریٹ اور Sainte-Avoye اسٹریٹ کی شاخیں الگ ہوتی تھیں، انھیں ایک غیر معمولی تانبے کا Huguenot تمغا ملا تھا، جس کی ایک جانب کارڈینل کی بیٹ پہنے ایک خنزیر بنا ہوا تھا اور دوسری جانب ایک بھیڑیا تھا جس کے سر پر تاج رکھا ہوا تھا۔

نابدان کے مرکزی داخلے کی جگہ سب سے حیرت انگیز شے کا سامنا ہوا۔ پہلے یہ داخلہ ایک جالی سے بند کیا گیا تھا جس کے قلابوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان قلابوں میں سے ایک میں ایک بے وضع چیتھڑا لٹکا ہوا تھا جو بلاشبہ اس جگہ اندھیرے میں اس وقت تک لہراتا رہا ہے جب تک کہ اس کے ٹکڑے نہیں ہو گئے تھے۔ بروئی زو نے اس کے قریب اپنی لالٹین لے جا کر اس کا معائنہ کیا۔ یہ بہت نفیس batiste سے بنا تھا، اور اس کے کونوں میں سے ایک میں جو کم خستہ تھا، ایک مثلث بنا ہوا تھا اور اس کے اوپر کشیدہ کاری سے سات الفاظ بنائے گئے تھے: LAVBESP۔ مثلث مارکوئی کا تھا، اور اس سات لفظوں سے مراد Laubespine تھا۔ انھوں نے یہ حقیقت جان لی، کہ ان کی نظروں کے سامنے جو کچھ تھا وہ Marat کے کفن کا ایک ٹکڑا تھا۔ اپنے جوانی کے دنوں میں Marat نے بہت عاشقانہ سازشیں کی تھیں۔ یہ سب اس وقت ہوا تھا جب وہ Comte d'Artois کے گھرانے کے اصطبل میں کام کرتا تھا۔ تاریخ سے ثابت ان عشق بازیوں میں جو ایک لیڈی سے ہوئی تھیں، اس نے لوٹ کے مال کی طرح یا یادگار کے طور پر ایک چادر سنبھال کر رکھ لی تھی۔ اس کی موت پر اس کے گھر سے یہی ایک اچھا کپڑا نکلا تھا جس میں اس کو دفن کیا گیا تھا۔ کسی بوڑھی عورت نے قبر کے لیے اسے اس کپڑے سے بنائی گئی پٹی میں لپیٹا تھا جس پر عوام کے اس بے حیا دوست نے کبھی شہوانی حرکات کی تھیں۔ بروئی زو آگے بڑھ گیا۔ ان لوگوں نے اس چیتھڑے کو اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں وہ لٹکا تھا۔ انھوں نے اس کا کریا کرم نہیں کیا۔ کیا یہ عمل نفرت کے باعث تھا یا احترام کے؟ Marat دونوں کا حق دار تھا۔ اور پھر اس کو ہاتھ لگانے سے پرہیز میں کچھ مقدر کا معاملہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ، قبر سے متعلق اشیا کو اسی جگہ رہنے دینا چاہیے جوان کے لیے منتخب کی گئی ہو۔ مختصر یہ کہ یہ نشانی حیرت انگیز شے تھی۔ اس پر ایک مارکوئی سویا تھا؛ Marat اسی میں سڑا گلا تھا؛ اس نے Pantheon [روم کی ایک عمارت] کو آخر تک، نابدان کے چوہوں کے ہمراہ پار کیا تھا۔ چیتھڑوں کا یہ حجرہ [فرانس کے مشہور مصور] Watteau نے خوشی خوشی جس کی ہر تہہ کا خاکہ بنایا ہوتا، دانتے کی چھیدتی نظروں پر ختم ہوا تھا۔

پیرس کے غلاظت کے اس زیرِ زمین چشمے کا معائنہ 1805ء سے 1812ء تک ہوا تھا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا بروئی زو رہنمائی کرتا گیا اور یہ کام کافی حد تک مکمل ہو گیا تھا؛ 1808ء میں اس نے Ponceau کی محراب نیچے کی اور ہر طرف نئی لکیریں کھینچیں؛ اس نے 1809ء میں Saint Denis اسٹریٹ سے Innocents کے فوارے تک، 1810ء میں Froidmanteau اسٹریٹ کے نیچے اور Salpetriere تک؛ 1811ء میں Neuve-des-Petits-Peres اسٹریٹ کے، Mail اسٹریٹ کے، l'Echarpe اسٹریٹ کے اور Place Royale کے نیچے تک، 1812ء میں Paix اسٹریٹ کے نیچے اور Chaussee d'Antin کے نیچے تک نالیوں کو پھیلا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی، اس نے پورے نظام کو جراثیم سے پاک کرایا اور اس کو صحت مند بنا دیا تھا۔ اپنے کام کے دوسرے برس، بروئی زو نے اپنے داماد Nargaud کو بھی اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا۔

اس طرح، صدی کی ابتدا پر اس قدیم سوسائٹی نے اپنے دہرے پیندے کو صاف کر دیا اور اس کے نابدان کو سنوار دیا تھا۔ اب، ہر موقعے پر یہ سب نالیاں صاف ستھری ہوتی تھیں۔

پیچیدہ، شگاف آلودہ، دراڑوں والی، کائی اور بے ڈھنگے طور پر اوپر جاتی اور نیچے آتی گلیاں، بدبودار، وحشی، شدید، دھند میں غرق، خراش شدہ راستے اور دیواریں — یہ تھا حال پیرس کے نابدان کے قدیم نظام کا۔ ہر طرف نکلتی ہوئی شاخیں، خندقوں اور چوراہوں، بطخوں کے پنجوں اور ستاروں جیسی پیچیدہ؛ فوجی بارودی سرنگیں، اندھی گلیاں، شورے کی تہوں والے حجرے، وبائی جراثیم سے پُر جوہڑ، اکھڑتے پلستروں جیسی دیواریں، ٹپکتی چھتیں اور ہر طرف اندھیرا تھا؛ اس قدیم خوف ناک اور پیچیدہ، بابل کے نظامِ ہضم، غار، گڑھے، سڑکیوں سے کٹا پھٹا علاقہ، دیو ہیکل چوہوں کے بلوں جیسا کوئی نظام نہیں ملتا، جس میں دماغ کو بڑے بڑے اندھے چوہے نظر آتے محسوس ہوتے تھے؛ جس میں سایوں میں گھات لگائے بیٹھا ماضی ایسی غلاظت میں بیٹھا تھا جو کبھی شان دار تھی۔

یہ تھا ماضی کا نابدان۔

۞

حالیہ کیفیت

آج زیرِ زمین نالیوں کا نظام صاف، ٹھنڈا، سیدھا سادہ اور صحیح حالت میں ہے۔ اس کی وہی کیفیت ہے جسے انگلستان میں ''قابلِ احترام'' کہا جاتا ہے۔ ٹھیک بھی ہے اور خوش حال بھی؛ اصول کے مطابق بنایا گیا ہے؛ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی کاغذ کے ڈبے سے بنا بنایا نکلا ہے۔ یہ اس تاجر سے مشابہ ہے جو ریاست کا کاؤنسلر بن گیا ہو۔ اس کو واضح طور پر موجود دیکھا جا سکتا ہے۔ وہاں کی دلدل از خود نفاست سے متفق ہوگئی ہے۔ پہلے کوئی دیکھے تو اسے زیرِ زمین غلام گردش سمجھے گا جو پہلے زمانے میں بہت عام تھیں، اور شاہوں اور شہزادوں کے فرار میں بہت کام آتی تھیں، اس عہد میں ''جب عوام اپنے بادشاہوں سے محبت کرتے تھے۔''

موجودہ زیرِ زمین نابدان خوب صورت نالیاں ہیں؛ اب وہ خالص انداز کی سلطنت ہے؛ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سکندری خطِ مستقیم نے، جسے شاعری سے دیس نکالا مل گیا ہے، تعمیرات میں پناہ لے لی ہے؛ ان طویل راہ داریوں کے پتھروں میں؛ سیاہ اور سفیدی مائل تجروں میں؛ نکاسی کا ہر سوراخ ایک محرابی بازار کے مانند ہے؛ Rivoli اسٹریٹ زیرِ زمین نالیاں نمونے کا کام کرتی ہیں۔ پھر بھی، اگر کہیں اقلیدس کا وجود ہے تو یقینی طور پر عظیم شہر کے بدرو کی خندقوں میں ہے۔ وہاں کی ہر شے کو چھوٹی چھوٹی سڑکوں کے ماتحت ہونا پڑتا ہے۔ آج کل زیرِ زمین نابدان نے سرکاری پہلو اختیار کر لیا ہے۔ وہ پولیس رپورٹوں کی طرح، کبھی کبھی جو اس کا موضوع بن جاتا ہے، اب احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ جن کو کبھی اوجھڑی کہا جاتا تھا، اب گیلری کہلاتی ہیں؛ جن کو کبھی سوراخ کہا جاتا تھا اب وہ معائنہ کرنے والے روزن کہلاتے ہیں۔ اب پندرہویں صدی کے فرانسیسی شاعر Villon کو اپنی قدیم عارضی قیام کی جگہ نصیب نہیں ہوگی۔ تہہ خانوں کے اس

جال کے اپنے کوچہ گرد ہیں؛ گوشت خور چوہے ہیں جو پہلے کے مقابلے میں تعداد میں کہیں زیادہ ہیں؛ وقتاً فوقتاً ایک عمر رسیدہ چوہا زیرِ زمین نالیوں کی کسی کھڑکی سے اپنا سر نکالتے اور پیرس والوں کا معائنہ کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ مگر یہ موذی بھی مطیع ہو کر اپنے زیرِ زمین محل میں مطمئن ہو گئے ہیں۔ اس جوہڑ میں اب وہ فرسودہ خوں خواری نہیں رہی ہے۔ وہ بارش جو کبھی نالیوں کو گندہ کر دیتی تھی، اب اسے صاف کر دیتی ہے۔ پھر بھی، آپ کو اس پر زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں اب بھی بدبو پائی جاتی ہیں۔ یہ پاک صاف ہونے کے بجائے زیادہ فریب کار ہو گئی ہے۔ پولیس کے افسرانِ اعلیٰ اور صحتِ عامہ کے ادارے نے اپنی پوری کوشش کی ہے، مگر جراثیم کُشی کے باوجود اس میں سے ویسی ہی مبہم اور متجسس بو آتی ہے جیسی کہ [ریاکار] Tartuffe کھیل میں اعتراف کے بعد محسوس ہوتی ہے۔

ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان سب کے باوجود ایک قسم کا احترام ہے جو نابدان کا نظامِ تمدن کو پیش کرتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے Tartuffe کا ضمیر ایک ترقی ہے جو [Eurystheus کی جانب سے ہرقل کو سونپی گئی ذمے داری] Augean stables کی صفائی سے بڑھ کر ہے، اور یہ امر یقینی ہے کہ پیرس کا زیرِ زمین نابدان اب کافی بہتر ہو گیا ہے۔

یہ ترقی سے زیادہ ہے؛ اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ یہ قدیم اور جدید نالیوں کے نظام کے درمیان ایک انقلاب کے مانند ہے۔ یہ انقلاب کس کے ہاتھوں ہوا ہے؟

وہ آدمی جسے پوری دنیا فراموش کر دیتی ہے، جس کا تذکرہ ہم نے کیا ہے—بروفی نِو کے ہاتھوں ہوا ہے۔

۞

مستقبل کی ترقی

پیرس کے زیرِ زمین نابدان کی کھدائی آسان کام نہیں تھا۔ پچھلی دس صدیوں کے دوران ان پر جو محنت کی گئی ہے، اس کا اختتام نہیں ہو سکا ہے۔ زیرِ زمین نالیوں پر پیرس کی ترقی کا دباؤ بھی پڑا ہے۔ یہ زمین کے سینے میں چھپا ہوا ایک پُراسرار مرجانی جانور ہے جس کی ہزاروں شاخیں ہیں جو شہر کی اوپری ترقی کے ساتھ ساتھ نیچے پھیلتی جاتی ہیں۔ ہر بار جب شہر نئی سڑک بناتا ہے، تو یہ نظام اپنا ایک اور بازو پھیلا دیتا ہے۔ قدیم شاہی نے صرف 23,300 میٹر نالیاں بنائی تھیں؛ یہ اعداد و شمار پہلی بار جنوری 1806ء میں سامنے آئے تھے۔ اس عہد کی ابتدا کے ساتھ، ہم جس کے بارے میں تھوڑی دیر میں بات کریں گے، سارا کام سہولت اور محنت کے ساتھ دوبارہ کیا گیا تھا؛ نپولین نے 4,804 میٹر؛ لوئی شانزدہم نے 5,709 میٹر؛ چارلس دہم نے 10,836 میٹر؛ لوئی فیلپ نے 89,020 میٹر؛ 1848ء کی جمہوریہ نے 23,381 میٹر؛ موجودہ حکومت نے 70,500 میٹر۔ اب تک، کُل جمع 226,610 میٹر کام ہوا ہے؛ چھ لیگ لمبائی کی زیرِ زمین نالیاں پیرس کی غیر معمولی طور پر بڑی آنتیں ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تصور کام تھا؛ ایسی تعمیر تھی جو بے پایاں ہے، جسے نظر انداز کیا گیا ہے۔

جیسا کہ قاری نے دیکھا ہے، آج پیرس کی زیرِ زمین بھول بھلیاں اُس وقت سے دس گنا بڑی ہے جتنی کہ صدی کی ابتدا میں تھی۔ ان کوششوں اور مشکلات کا اندازہ لگانا مشکل ہے جن کی بدولت غلاظت کا یہ جوہڑ ایک متناسب تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ جن مشکلات سے قدیم شاہی کی نگہ داری میں، اور پچھلے دس برسوں کی انقلابی بلدیات نے 1806ء کے قبل سے موجود ان پانچ لیگ طویل نالیوں میں سوراخ کرنے میں کامیابی حاصل کی، اس سے ان کا اندازہ لگانا

آسان نہیں۔ اس کام میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیش آئی تھیں، جن میں سے کچھ تو زمین سے متعلق تھیں، اور کچھ پیرس کی محنت کش آبادی اور ان کے تعصبات سے مخصوص تھیں۔ پیرس اس مٹی پر آباد ہے جو خاص طور پر کھدائی، گوڑائی، سوراخ اور انسانی کارپردازی کے قائل نہیں۔ اس قسم کی ارضیاتی اور حیرت انگیز تاریخی تشکیل میں جس کو پیرس کا نا بدان کہا جاتا ہے، داخل ہونے یا سوراخ کرنے سے مشکل کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا؛ جوں ہی کوئی کام شروع کیا جاتا ہے تو سیلابی مٹی کے اس علاقے میں ہر طرح کی زیرِ زمین مزاحمتیں آڑے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس میں رقیق کچی مٹی، چشمے، سخت چٹانیں اور وہ نرم اور گہرے دلدل ملتے ہیں، جنھیں ایک خاص سائنس mustard کا نام دیتی ہے۔ کھدائی کرنے والی کدال کو بڑی محنت سے کھریا مٹی کی تہوں سے گزرنا پڑتا ہے جن میں بار بار مٹی کی تہیں اور قلبِ ماہیت شدہ تہیں ملتی ہیں جن میں قبل از آدم سمندروں کے زمانے کی صدف کے خول پائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تعمیر کیے جانے والے کسی حجرے میں اچانک ایک آبجو پھوٹ پڑتی ہے اور کام کرنے والوں کو ڈبو دیتی ہے؛ یا زرخیز مٹی کی ایک تہہ سامنے آ جاتی ہے جو پانی کی چادر کی سی تیزی سے ہر شے کو توڑتی ہوئی نیچے کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ حال ہی کی بات ہے کہ Villette کے مقام پر، جب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ Saint Martin کے نیچے جمع ہونے والے نالیوں کے پانی کی روانی کو خلل ڈالے بغیر، یا نہر کو خالی کیے بغیر گزار دیا جائے، تو نہر کے پیندے میں ایک شگاف ظاہر ہوا اور اچانک زیرِ زمین سرنگ میں پانی کی مقدار اتنی بڑھ گئی کہ اس کو نکالنے والے انجن ناکام ہو گئے؛ اس وقت ضروری ہو گیا تھا کہ اس شگاف کے معائنے کے لیے کسی غوطہ خور کو نیچے بھیجا جائے، اور بہت مشکل سے اس شگاف کو بند کیا جا سکا تھا۔ دریائے سین کے قریب، حتیٰ کہ دریا سے خاصے فاصلے تک، مثال کے طور پر Belleville تک، شاہراہ اور Lumiere Passage تک ریگِ رواں کے دلدل پائے جاتے ہیں جس میں اگر کوئی آدمی قدم رکھے تو دیکھتے دیکھتے ریت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس میں بدبو سے ہونے والے حبسِ دم کا، ریت میں دھنسا کر دفن کرنے کے عمل کا، اور زمین کی اچانک ٹوٹ پھوٹ کا عمل بھی شامل ہوتا ہے۔ اس میں ٹائی فس کو بھی شامل کر دیجیے جو رفتہ رفتہ کام کرنے والوں کو لگ جاتا ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں، Clichy کی گیلری کی کھدائی کے بعد، جس میں چاند ماری کرنے والی ایک دیوار بھی شامل تھی، جس تک Ourcq سے آنے والی پانی کی ایک سرنگ شامل تھی، وہ کام تھا جو دس میٹر گہری خندق میں کیا گیا تھا؛ زمین کی ریزش کے درمیان اور کھدائی کی مدد سے، جو اکثر بہت گندی ہوتی ہے، اور سہارا دینے کے بعد، دریائے سین تک، Bievre سے l'Hopital

اسٹریٹ تک سب کچھ بند کر دیا گیا تھا؛ پیرس کو Montmartre کے سیلاب سے بچانے اور اس دریا جیسے جوہڑ کو نو ہمگیر طویل راستہ فراہم کرنے کے بعد، جو Martyrs نامی پشتے کے قریب سے گزرتا تھا، ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ Blanche نامی پشتے سے Aubervilliers کی سڑک تک چار ماہ کے عرصے میں دن رات کام کے بعد گیارہ میٹر گہرا نالیوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا گیا تھا؛ اس کے بعد ایک زیرِ زمین نالی بنائی گئی — جیسی اس وقت تک پہلے دیکھی نہیں گئی تھی — جس میں خندق نہیں تھی؛ جو سطحِ زمین سے چھ میٹر نیچے تھی؛ جس کے دوران سپرنٹنڈنٹ Monnot کا انتقال ہو گیا تھا۔ شہر کے ہر علاقے میں، Traversiere-Saint-Antoine اسٹریٹ سے l'Ourcine اسٹریٹ تک تین ہزار میٹر طویل زیرِ زمین نالیاں بنانے کے بعد، Carrefour Censier-Mouffetard کو دریائے Arbalete کے سیلابی پانی سے بچانے کے بعد، ریتلی جیسی ریت میں چٹانوں اور کانکریٹ پر Saint-Georges کی زیرِ زمین نالیاں بنانے کے بعد، اور نا ترے ڈیم کے چوبی فرش کو نیچا کرنے کے بعد انجینئر Duleau کا انتقال ہو گیا تھا۔ بہادری کے اس قسم کے کارنامے کی، جو میدانِ جنگ میں ہونے والے وحشیانہ قتلِ عام سے کہیں زیادہ کارآمد ہوتے ہیں، کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔

پیرس کی 1832ء کی زیرِ زمین نالیوں کا آج کے نظام سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ بروقی زو اس کو بڑھانے میں کامیاب ہوا تھا مگر کالرے کی وبا کے بعد اس کی تعمیرات میں وسیع اضافے کیے گئے تھے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا حیرت انگیز ہو گا کہ 1821ء میں زیرِ زمین نالیوں کی پٹی کا ایک حصہ، جس کو وینس کی طرح "عظیم نہر" کہا جاتا تھا، Gourdes اسٹریٹ میں آسمان تلے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ 1821ء کی بات ہے کہ پیرس شہر کو دو لاکھ ساٹھ ہزار فرانک ملے تھے جن سے غلاظت کے اس ڈھیر کو بند کیا گیا تھا۔ Combat، Cunette اور Saint-Mande کے ریتلی جذب کرنے والے کنویں اپنے کھلے دہان، اپنے ساز و سامان، اپنی غلاظت کے جوہڑوں اور گندگی صاف کرنے والی شاخوں کے ساتھ 1836ء میں موجود تھے۔ پیرس کا آنتوں جیسا زیرِ زمین نالیوں کا نظام نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے؛ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، صدی کی پچھلی چوتھائی میں اس میں دس گنا اضافہ کیا جا چکا ہے۔

تیس برس قبل، جون کی پانچویں اور چھٹی تاریخ والی سرکشی کے زمانے میں بھی، کئی علاقوں میں نالیوں کا وہی قدیم نظام تھا۔ کئی سڑکیں جو اب محدب (convex) ہیں، دھنسی ہوئی گزرگاہیں تھیں۔ ایک ڈھلان کے سرے پر، جہاں کوئی سڑک یا چوراہا ختم ہوتے ہیں موئی

موٹی آہنی سلاخوں سے بنی مربع جالیاں ہوتی تھیں جو ہجوم کے گزرتے قدموں سے گھس کر چمک دار ہو گئی تھیں، جن کے باعث گاڑیاں پھسلتیں اور گھوڑے گر جایا کرتے تھے۔ ان جالیوں کا سرکاری نام گردن توڑ جالیاں (Cassis) پڑ گیا تھا۔

1832ء میں l'Etoile اسٹریٹ، ساں لوئی Saint Luis اسٹریٹ، Temple اسٹریٹ، Vielle-duTemple اسٹریٹ، نوترے ڈیم نصران اسٹریٹ، Folie Mericourt اسٹریٹ، Petit-Muse، Quai aux Fleurs اسٹریٹ، ناربنڈی اسٹریٹ، Pont-Aux-Biches اسٹریٹ، Marais اسٹریٹ، مضافات Saint Martin، Notre Dame des-Victoires اسٹریٹ، مضافات Montmartre، Grange-Bateliere اسٹریٹ میں، شانزہ لیزے میں، Jacob اسٹریٹ، Tournon اسٹریٹ میں اور قدیم gothic زیرِ زمین نالیوں کے معدے طعنہ زنی کے انداز میں کھلے ہوئے تھے۔ ان کے اپنے سنگی تالاب تھے جن کے اطراف گستاخانہ انداز میں پتھر کے نشانات لگے ہوئے تھے

1806ء کے پیرس میں بھی اعداد کے حساب سے اتنی ہی زیرِ زمین نالیاں تھیں جتنی کہ 1663 میں تھیں— یعنی پانچ ہزار تین سو fathoms۔ بروٹی زو کے بعد، یکم جنوری 1832 میں چالیس ہزار تین سو میٹر طویل نالیاں تھیں۔ 1806ء اور 1831ء کی درمیان اوسطاً ہر سال سات سو پچاس میٹر نالیاں بنائی جاتی تھیں، اس کے بعد ہر سال اینٹوں، چھوٹے چھوٹے پتھروں، اور hydraulic mortar سے، جو سیمنٹ کی بنیاد پر پانی کے اندر بھی سخت ہو جاتا ہے، آٹھ، بلکہ دس ہزار میٹر طویل گیلریاں بنائی جاتی تھیں۔ دو سو فرانک فی میٹر لاگت کے حساب سے ساٹھ لیگ طویل پیرس کی زیرِ زمین نالیاں اب اڑتالیس ملین فرانک کی ہوں گی۔

اس معاشیاتی ترقی کے علاوہ، جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے، صحتِ عامہ سے متعلق سب سے بڑا مسئلہ پیرس کا نابدان ہے۔

پیرس دو چادروں کا مرکز ہے؛ ایک چادر پانی کی ہے، دوسری چادر ہوا کی۔ پانی کی چادر زیرِ زمیں گہرائیوں میں، سبز مٹی کی ایک تہہ اور کھریا مٹی اور Jurassic چونے کے پتھروں سے بنی تہہ کے درمیان ہے؛ اس تہہ میں پچیس لیگ گولائی کا ایک تُوا (disk) سا ہے؛ اس میں سے کئی دریا اور چشمے ابلتے ہیں؛ آپ کو Grenelle کے کنویں سے نکلے ہوئے ایک گلاس پانی میں دریا ہائے Seine، Marne، Yonne، Oise، Aisne، Cher، Vienne اور Loire کا پانی ملے گا۔ پانی کی چادر صحت مند ہے، کہ یہ پہلے آسمان سے آتی ہے اس کے بعد

زمین سے نکلتی ہے۔ ہوا کی چادر غیر صحت مند ہے، کہ یہ زیرِ زمین نالیوں سے نکلتی ہے۔ غلاظت کے جوہڑ کی تمام بد بو شہر کی سانس میں مل جاتی ہے؛ اسی وجہ سے یہ سانس خراب سانس ہوتی ہے۔ جیسا کہ سائنس نے ثابت کیا ہے، گوبر کے ڈھیر سے لی جانے والے ہوا پیرس کی ہوا کے مقابلے میں زیادہ صاف ہوتی ہے۔ ایک وقت وہ ہوگا جب ترقیات کی مدد سے، میکانک درست ہو جائیں گی اور جیسے جیسے روشنی بڑھتی جائے گی، ہوا کی چادر کو صاف کرنے کے لیے پانی کی چادر کو استعمال کیا جائے گا؛ یعنی نابدان کو دھونے میں استعمال کیا جائے گا۔ قاری کو علم ہے کہ "نابدان کو دھونے" سے ہماری مراد کیا ہے— غلاظت کی زمین کو واپسی؛ یعنی، گوبر کی زمین کو واپسی اور کھاد کی کھیتوں کو واپسی۔ اس سادہ سے عمل کے ذریعے پوری سماجی کمیونٹی کو بدنصیبی میں کمی اور صحت میں بہتری کا تجربہ ہوگا۔ اگر ہم Louvre کو ایک ہمہ وقت گھومتے پہیے کا دھرا تصور کر لیں، تو اس وقت، پیرس کی بیماریوں کی تاب کاری Louvre کے اطراف پچاس لیگ تک پہنچتی ہے۔

اسے ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ دس صدیوں سے یہ غلاظت کا جوہڑ ہی پیرس کی بیماریوں کا باعث رہا ہے۔ زیرِ زمین نابدان کا یہ نظام وہ خرابی ہے جو پیرس کے خون میں شامل رہی ہے۔ زیرِ زمین نالیوں میں کام کرنے والوں کا پیشہ لوگوں کے نزدیک اتنا ہی خطرناک، اتنا ہی ناگوار سمجھا جاتا تھا جتنا کہ انھیں ایک عرصے تک خوف کے عالم میں رکھا جائے اور پھر جلاد کے حوالے کر دیا جائے۔ اس غلیظ اور بدبو دار گان میں کسی معمار کو بھیجنے کے لیے خطیر مشاہرہ ضروری ہوتا تھا؛ غلاظت کے جوہڑ کی صفائی کرنے والے اس میں اترنے سے ہچکچاتے تھے؛ محاورے کے طور پر کہا جاتا تھا، "زیرِ زمین نابدان میں اترنا قبر میں اترنے جیسا ہوتا ہے۔" اس مہیب جوہڑ کے بارے میں طرح طرح کی ڈراؤنی کہاوتیں مشہور تھیں۔ اس خوف ناک سوراخ میں عالمی انقلابات کے سراغ کے ساتھ ساتھ سیلاب کی باقیات اور Marat کے چیتھڑے پائے جاتے ہیں۔

❋

نابدان اور اس کی حیرتیں

وہ پیرس کی زیرِ زمین نالیاں تھیں جن میں ژاں ولژاں نے خود کو پایا۔

پیرس اور سمندر کے درمیان ایک اور مشابہت۔ سمندر کی طرح اس میں بھی غوطہ خور غائب ہو سکتا ہے۔

یہ ایسی تبدیلی تھی جس کے بارے میں پہلے سنا نہیں گیا تھا۔ شہر کے بالکل درمیان ژاں ولژاں شہر سے فرار ہو گیا، اور پلک جھپکتے، جتنی دیر میں کوئی ڈھکنا اٹھا کر واپس رکھا جائے، وہ دن کی روشنی سے مکمل دھند میں، دوپہر سے رات کے درمیان، ہلچل سے خاموشی میں، گرج چمک کے گرداب سے قبر کے جمود میں، اور Polonceau اسٹریٹ سے کہیں زیادہ گرداب میں، سب سے زیادہ سخت خطرے سے، مکمل گم نامی میں چلا گیا تھا۔

اچانک کسی کھوہ میں گر جانا، پیرس کے کسی چور دروازے میں غائب ہو جانا؛ ایک قسم کے مزار کے لیے جہاں زندگی تھی اس سڑک کو چھوڑ دینا اور جہاں ہر طرف موت تھی، ایک حیرت انگیز لمحہ تھا۔ چند سیکنڈ وہ بہت پریشان رہا؛ وہ سن رہا تھا مگر اس کا دماغ مختل تھا۔ فرش میں لگا کوڑے پھینکنے والا دروازہ اچانک اس کے نیچے کھل گیا تھا۔ آسمانی مہربانی نے اپنے انداز میں اس کو دھوکے سے پکڑ لیا تھا۔ کتنی پیاری گھات تھی کارسازی کی۔

صرف زخمی آدمی نے بالکل حرکت نہیں کی تھی، اور ژاں ولژاں کو علم نہیں تھا کہ جسے وہ اس قبر میں لے جا رہا تھا، وہ کوئی زندہ وجود تھا یا میت تھی۔

اس کا پہلا احساس اندھے پن کا سا تھا۔ ایک لمحے بعد وہ کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اسے ایسا بھی محسوس ہوا تھا گویا وہ بالکل بہرا ہو گیا ہے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ موت

کا بے قابو طوفان جو اس کے سر سے چند فٹ اوپر لہرا رہا تھا اس تک پہنچ نہیں پایا؛ زمین کی موٹائی کا شکریہ جس نے اسے طوفان کی گڑگڑاہٹ سے الگ کر رکھا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے کی زمین ٹھوس تھی؛ بس! اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے ایک بازو پھیلایا اور اس کے بعد دوسرا، دونوں جانب کی دیواروں کو ٹٹولا، اور اس طرح اسے پتا چلا کہ راہ داری پتلی تھی؛ پھسلا تو معلوم ہوا کہ زمین نم تھی۔ اس نے، کسی سوراخ کے، گڑھے کے، خلیج کے خوف کے باعث احتیاط سے ایک قدم آگے رکھا؛ اس طرح اس معلوم ہوا کہ آگے راستہ ہے۔ بدبو کے ایک جھپکے سے اسے اس جگہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کہاں تھا۔

چند منٹ گزر جانے کے بعد وہ بالکل اندھا نہیں رہ گیا تھا۔ 'مین ہول' سے، جس کے ذریعے وہ اندر داخل ہوا تھا تھوڑی سی روشنی آ رہی اور اب اس کی آنکھیں اس غار کی عادی ہو گئی تھیں۔ اسے کچھ محسوس ہونے لگا۔ اس کے عقب میں راستہ نہیں تھا جس میں وہ گھسا تھا — اس سے بہتر بیان ممکن نہیں — بس ایک دیوار سی تھی۔ یہ ان اندھی گلیوں میں سے ایک تھی، جس کو نالیوں کی خاص زبان میں شاخیں کہا جاتا ہے۔ اس کے سامنے بھی ایک دیوار تھی، رات جیسی ایک کالی دیوار۔ ژاں ولژاں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے بارہ قدم آگے ہوا کے لیے بنے ہوئے سوراخ سے آتی روشنی ختم ہو گئی تھی اور چند میٹر آگے نالیوں کی نم دیوار پر ایک بے نوری زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس سے پرے بس ایک دھندلا پن تھا؛ جہاں سے آگے بڑھنا خوف ناک محسوس ہو رہا تھا، کہ اس میں داخل ہونا کسی بڑی شے تلے ڈھک جانے کے مانند تھا۔ دھند کی اس دیوار میں کوئی آدمی کود سکتا تھا، اور ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس میں کچھ سرعت بھی ضروری ہو گئی تھی۔ ژاں ولژاں کو اندازہ ہوا کہ پتھروں کے ستونوں کے پاس والی آہنی جالی جو اسے نظر پڑی تھی وہ سپاہیوں کی نظر میں آ سکتی تھی، اور اب سب کچھ اتفاق پر مبنی تھا۔ سپاہی بھی اس میں اتر سکتے تھے اور اس کی تلاشی لے سکتے تھے۔ اب ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ماریوں کو زمین پر لٹا دیا تھا؛ اسے دوبارہ اٹھا لیا، اسے ایک بار پھر اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور چل پڑا۔ بڑی ہمت سے وہ اس اندھیرے میں کود پڑا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ اتنے محفوظ نہیں تھے جتنا کہ ژاں ولژاں سمجھا تھا۔ طرح طرح کے اتفاقیہ خطرات ان کے انتظار میں تھے۔ بجلی کی سرعت کی سی لڑائی کے بعد، بدبو کا غار اور جگہ جگہ کھٹکے؛ ابتری کے بعد زیرِ زمین نالیاں۔ ژاں ولژاں پریشانیوں کے ایک حلقے کے بعد دوسرے حلقے میں گرتا گیا تھا۔

پچاس قدم آگے بڑھنے کے بعد رُکنا ضروری ہو گیا۔ اب ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ راستہ ایک اور آنت کی طرف مڑ گیا تھا جو اسے راستے میں ملی تھی۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے۔ کون سا راستہ اختیار کرنا تھا؟ بائیں جانب مڑے یا دائیں جانب؟ اسے یہ کس طرح معلوم ہو گا کہ اس اندھیری بھول بھلیاں میں وہ کس مقام پر ہے؟ جس بھول بھلیاں کی جانب ہم نے قاری کی توجہ مبذول کرائی تھی، اس میں ایک اشارہ پنہاں تھا؛ وہ اشارہ اس کی ڈھلان میں مضمر تھا! ڈھلان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے سے دریا تک پہنچا جا سکتا تھا [جہاں پہنچ کر نالیوں کا سیل نالیوں میں گرتا تھا]۔

ژاں ولژاں اس نکتے پر فوراً پہنچ گیا۔

اس نے خود سے کہا کہ اس وقت شاید وہ Halles کی زیرِ زمین نالیوں میں ہے؛ کہ اگر اس نے دائیں جانب کا راستہ منتخب کیا تو پندرہ منٹ سے کم عرصے میں وہ Pont au Change اور Pont-Neuf کے درمیان دریائے سین کے کسی دہانے پر ہو گا، اور وہ دن کی روشنی میں اس جگہ ظاہر ہو گا جو پیرس کا سب سے گنجان علاقہ ہے۔ شاید وہ سڑکوں کے چوراہے کے 'مین ہول' سے باہر نکلے گا۔ دو زخمی آدمیوں کا لوگوں میں اچانک اس طرح باہر نکلتے دیکھنا کیسی حیرانی کا باعث ہو گا۔

پولیس کی آمد اور قریبی چوکی سے نیشنل گارڈ طلب کی جائیں گے۔ باہر نکل کر جانے سے پہلے ہی وہ پکڑے جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ وہ بھول بھلیاں میں واپس کود جائیں اور خود کو اندھیروں میں چھپا لیں، اور مقسوم کی کارسازی پر بھروسا کریں۔

وہ ڈھلان کے طرف بڑھا اور دائیں جانب مڑ گیا۔

جب وہ گیلری کے زاویے پر مڑا تھا، دور ہوا کے سوراخ سے آنے والی ٹمٹماہٹ غائب ہو گئی اور اس پر دھند کا پردہ ایک بار پھر گر گیا، اور ایک بار پھر وہ کور چشم ہو گیا تھا۔ پھر بھی جس قدر ممکن ہوا وہ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ ماریس کے دونوں بازو اس کی گردن کے اطراف تھے، اور ثانی الذکر کی ٹانگیں اس کے عقب میں گھسٹ رہی تھیں۔ دونوں بازوؤں کو اس نے ایک ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دیواریں ٹٹولتا تھا۔ ماریس کا رخسار اس کے رخسار سے مس ہو رہا تھا، اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے ماریس کے جسم سے نکلتا ایک گرم چشمہ سا محسوس ہوا جو اس کے کپڑوں کے نیچے قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا، مگر اس کے کان کے قریب ایک گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی، جس کے بالکل قریب زخمی آدمی کا دہن تھا؛ گویا وہ گرمی اس کی سانس تھی، اور نتیجتاً اس میں

اب بھی زندگی باقی تھی۔ وہ راستہ ژاں ولژاں جس پر آگے بڑھ رہا تھا پہلے جیسا تنگ نہیں تھا۔ ژاں ولژاں اس میں خاصی مشکل سے چل رہا تھا۔ گزرے دن کی بارش کے پانی کا بہاؤ ابھی پوری طرح تھما نہیں تھا، اور اس کی روانی سے راستے کے درمیان پانی کا تیز دھارا بہہ رہا تھا۔ اس لیے اسے مجبوراً دیوار سے چمٹ کر چلنا پڑ رہا تھا تا کہ اس کے قدم پانی میں نہ پڑیں۔

اس طرح وہ اندھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ وہ اندھیروں کے ایسے کسی وجود سے مشابہ تھے جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں اور زمین کے نیچے اندھیروں کی شریانوں میں کھو گئے ہوں۔ پھر بھی، اس دھند میں وہ دور افتادہ ہوا کے لیے بنے سوراخ سے آتی روشنی کی جھلملی تھی، یا اس کی آنکھیں اس دھند کی عادی ہو گئی تھیں، کہ اس میں رفتہ رفتہ ایک عجیب سی بصارت آ گئی تھی اور اسے ایک بار پھر ایک الجھن بھرا خیال آنا شروع ہو گیا تھا، جو اس بار اس دیوار سے متعلق تھا جسے وہ چھو رہا تھا، اور اس علاقے سے متعلق تھا جس کے نیچے سے وہ گزر رہا تھا۔ اندھیرے میں آنکھ کی پتلیاں پھیل جایا کرتی ہیں اور بدقسمتی کے عالم میں نفس پھیل جاتا ہے، اور ایسے میں خدا مل جاتا ہے۔

اس راستے پر آگے بڑھنا آسان کام نہیں تھا۔

زیرِ زمین نالی میں اس کے عین اوپر سڑک کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس زمانے میں پیرس میں دو ہزار دو سو سڑکیں تھیں۔ قاری ان شاخوں کے اس جنگل کا تصور کر سکتا ہے جن کو نابدان کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کی ساری نالیاں اگر ایک کے بعد دوسری، ملا کر رکھ دی جائیں تو ان کی لمبائی گیارہ لیگ کے برابر ہو گی۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ نالیوں کے نظام کی لمبائی، پچھلی تیس برسوں کی تعمیرات کے طفیل، ساٹھ لیگ سے کم نہ رہی ہوں گی۔

ژاں ولژاں نے ایک غلطی سے شروعات کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ Saint Denis اسٹریٹ کے نیچے تھا، مگر بدقسمتی کہ اس کا خیال غلط تھا۔ Saint Denis اسٹریٹ کے نیچے ایک قدیم نالی ہے جو لوئی سیزدہم کے زمانے کی ہے۔ جو سیدھی اس جگہ جاتی ہے جہاں تمام نالیوں کا فضلہ جمع ہوتا ہے جس کو Grand Sewer کہتے ہیں، جو صرف ایک بار دائیں مڑتی ہے، قدیم Cour des Miracles کے قریب، اور وہ نالی واحد نالی تھی جس کے چار بازو تھے جو صلیب کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ مگر Petite-Truanderie کی آنت، جس میں داخلے کی جگہ کارنتھ کی وائن کی دکان کے علاقے میں تھی، جس کا Saint Denis اسٹریٹ کے نیچے والے نالی سے کوئی رابطہ نہیں تھا؛ یہ Montmartre کی نالی پر جا کر ختم ہو جاتی تھی، اور یہی وہ جگہ تھی جہاں ژاں ولژاں پھنس گیا تھا۔ وہاں گم ہو جانے کے بہت امکانات تھے۔

Montmartre کی زیرِ زمین نالیاں قدیم نابدان کی سب سے زیادہ پیچیدہ نالیاں ہیں۔ خوش قسمتی سے ژاں ولژاں بازاروں کے نیچے والی نالیاں پیچھے چھوڑ آیا تھا جن کا اقلیدسی نظام ایسا تھا جیسے بے شمار خطوطے ایک دوسرے کے اوپر بیٹھے ہوئے ہوں؛ مگر اس سے پہلے اسے ایک اور پریشان کن شے کا سامنا ہوا، اور وہ ایک کونا تھا جو اس اندھیرے میں اس طرح نکلا ہوا تھا جیسے وہ کوئی مقامِ تفتیش ہو؛ پہلے اس کی بائیں جانب Platriere کی وسیع نالی آتی تھی، جیسے کوئی چینی معما؛ جو پوسٹ آفس کے نیچے تھی اور آگے کو نکلی ہوئی تھی، جو گندم بازار سے دریائے سین تک گولائی میں جا کر انگریزی حرفِ تہجی نما Y پر ختم ہو جاتی تھی؛ دوسری اس کے دائیں جانب، Cadran اسٹریٹ کے موڑ کی طرح تھی جس کی، دانتوں کی طرح، تین شاخیں نکلی ہوئی تھیں، اور وہ بھی اندھی گلیوں کی طرح تھیں؛ تیسری اس کی بائیں جانب، Mall کی پیچیدہ شاخ تھی، جو شروع میں ہی ایک دو شاخے کی طرح بڑھی تھی اور ایک zig-zag سے دوسرے zig-zag تک آگے بڑھتی گئی تھی حتیٰ کہ Louvre کے مقامِ اخراج کی کھوہ پر ختم ہو جاتی تھی؛ اور کٹ پھٹ کر ہر سمت اس کی شاخیں پھیل گئی تھیں؛ آخر میں Jeuneurs اسٹریٹ تک لے جانے والی اندھی گلی تھی جس سے نکلنے والی نالیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھا جائے تو وہ محفوظ فاصلے تک لے جاتی تھی۔

اگر ژاں ولژاں کو ان تفصیلات کا علم ہوتا، ہم نے جن کی طرف اشارے کیے ہیں تو، محض دیوار کو چھو لینے ہی سے اسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ وہ Saint Denis اسٹریٹ والی زیرِ زمین گیلری میں نہیں تھا۔ قدیم پتھر اور قدیم تعمیرات کے بجائے، جو زیرِ زمین نالیوں میں بھی خود بینی اور شاہی کا مظہر ہوا کرتی ہیں، جن کی راہداریاں سنگِ خارا اور mortar سے بنی ہوتی ہیں، جن کی قیمت آٹھ سو livre فی فیتھم ہوتی تھی، اسے احساس ہو جاتا کہ اس وقت اس کے ہاتھوں تلے ہم عصر ارزاں معاشی مصالحے کے باعث، کھردرے پتھروں سے بنی بنیادیں تھیں جن کی قیمت محض دو سو فرانک فی میٹر ہوتی ہے، اور یہ سب بورژوائی سامان سے بنی تعمیرات پر مبنی تھیں جن کو عام قسم کا سامان کہا جاتا ہے؛ مگر اسے یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا۔

وہ پریشانی کے عالم میں، مگر پُرسکون انداز میں بغیر دیکھے، بغیر جانے، اتفاقات تلے دبا، عاقبت اندیشی میں ڈوبا آگے بڑھتا رہا۔

ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ اس پر ایک خاص قسم کے خوف کا غلبہ تھا۔ وہ اندھیرا جو اس پر چھا گیا تھا اس کی روح میں داخل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک معمے میں چل رہا تھا۔ زیرِ زمین پانی کا یہ نالا مہیب ہے؛ وہ مدہوشی کے انداز میں جا رہا تھا۔ پیرس کی پرچھائیوں میں اس کا پکڑا

جانا نہایت غمگین بات ہوگی۔ لہٰذا ژاں ولژاں پر لازم تھا کہ دیکھے بغیر ہی وہ اپنا راستہ تلاش کرے یا ایجاد کرے۔ ایسی اجنبی جگہ میں اس کا ہر پُر خطر قدم آخری قدم ہو سکتا تھا۔ وہ وہاں سے کس طرح باہر نکل سکتا تھا؟ کیا اسے کوئی طریقہ اختیار کرنا تھا؟ کیا وہ اسے جتنی جلد ہو سکے تلاش کرلے؟ کیا سوراخوں سے بھرے پتھروں والا بے حد وحساب بڑا زیرِ زمیں اسفنج اپنے اندر سوراخ کی اور دخول کی اجازت دے گا؟ کیا وہاں اندھیرے میں اسے کسی غیر متوقع گرہ کا سامنا کرنا ہوگا؟ کیا اسے کسی ان دیکھی الجھن اور ان دیکھے راستے کا سامنا کرنا پڑے گا؟ کیا یہاں ماریوس خون بہہ جانے سے، اور وہ خود بھوک سے مر جائے گا؟ کیا ان دونوں کا اختتام گم ہو جانے اور اس رات، کونے میں دو ڈھانچے فراہم کرنے سے ہوگا؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ تمام سوالات اس نے خود سے کیے جن کے جوابات نہیں دیے جا سکتے تھے۔ پیرس کی آنتیں ایک مہیب چٹان بن گئی تھیں۔ ایک نبی کی طرح وہ بھی ایک عفریت کے پیٹ میں تھا۔

اور پھر اچانک ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ کسی بالکل غیر متوقع لمحے، جب اس نے سیدھی راہ پر چلنا بند نہیں کیا تھا، اسے محسوس ہوا جیسے اب وہ بلند نہیں ہو رہا ہے؛ نالے کا پانی اب اس کے پاؤں کے انگوٹھوں کے بجائے ایڑیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ مگر کیوں؟ کیا وہ اچانک دریائے سین کے کنارے پہنچنے والا تھا؟ یہ خطرہ بڑا خطرہ تھا، مگر پسپا ہونے میں زیادہ بڑا خطرہ تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔

وہ دریائے سین کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔ پیرس کی مٹی کے پانی میں بہنے سے جو اس کے دائیں کنارے پر ابھار بنتا تھا وہ دریا میں جانے والے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا تھا، ایک حصہ دریا میں جاتا تھا اور دوسرا Grand Sewer میں چلا جاتا تھا۔ اس ابھار کی چوٹی جو پانی کی تقسیم کرتی ہے، نا مناسب طریقے سے کرتی ہے۔ اس کا آخری نقطہ، جو بہاؤ کی لہروں کی تقسیم کا نقطہ ہوتا ہے، Michelle-Comte سے پرے Sainte-Avoye کی نالیوں میں ہے؛ بولیوارڈوں کے قریب Louvre کی نالیوں میں ہے، اور Halles کے قریب Montmartre کی نالیوں میں ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں ژاں ولژاں پہنچ گیا تھا۔ وہ نالیوں کی پٹی کی طرف بڑھ رہا تھا؛ وہ صحیح راستے پر تھا، مگر اسے اس بات کا علم نہیں تھا۔

ہر بار، جب بھی اسے کسی شاخ کا سامنا ہوتا، وہ اس کے زاویے پر غور کرتا، اور اگر اس کے سامنے آنے والا دہانہ اس راستے کے مقابلے میں چھوٹا معلوم ہوتا وہ جس میں چل رہا تھا، تو وہ اس دہانے میں داخل نہیں ہوتا تھا؛ بس اپنے راستے آگے بڑھتا رہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر تنگ راستہ کسی اندھی گلی میں پہنچ کر ختم ہو جائے گا، اور اس پر چلنا اپنے ہدف سے، یعنی باہر نکل

جانے سے مزید دور ہوجاتا تھا۔اس طرح اس نے خود کو اس بدھ مکھے جال میں پھنسنے سے بچا لیا جو اندھیری بھول بھلیاں اسے پیش کر رہی تھی، جس کو ہم ابھی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا، جب اسے محسوس ہوا کہ وہ پیرس کے نیچے سے نکلنے والا ہے جو شورش کے باعث پتھرا گیا ہے، جہاں بنے پشتوں نے چلنا پھرنا دوبھر کر دیا تھا، اور یہ بھی کہ وہ زندگی سے بھرپور اور عام حالات والے پیرس میں داخل ہونے والا ہے۔اچانک اسے اوپر سے آنے والی گرج جیسی دھمک سنائی دی، جو دور سے آرہی تھی مگر مسلسل آرہی تھی۔ وہ دراصل چلتی گاڑیوں کے پہیوں کی آوازیں تھیں۔

اپنے اس قیاس کی مطابق ژاں ولژاں تقریباً آدھ گھنٹے سے چل رہا تھا، اور ابھی تک اس نے کسی قسم کے آرام کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔بس، وہ ماریوس کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر لے لیتا۔اندھیرا پہلے سے بہت گہرا ہوگیا تھا مگراس کی گہرائی ہی اسے اعتماد دے رہی تھی۔

اچانک اپنے سامنے اسے اپنا ہی سایہ دکھائی دیا۔ یہ خاکہ تھا ایک ہلکی سی تقریباً غیر واضح سرخی مائل چمک کا، جس نے پیروں کے نیچے والے تہہ خانے کو اور سر کے اوپر والے تہہ خانے کو ارغوانی کر دیا تھا، اور راستے کی داہنی اور بائیں لعاب دار دیواروں کو چمکا دیا تھا۔ مدہوشی کی سی کیفیت میں وہ پلٹا۔

اس کے پیچھے، راستے کے اس حصے میں جس سے وہ گزر چکا تھا، ایک فاصلے پر جو اس کو بہت بڑا لگ رہا تھا، دھند میں گھستا ہوا، ایک قسم کا ستارہ روشن ہوتا محسوس ہوا جو اس پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

وہ پولیس کا ستارہ تھا جو زیرِ زمین نالیوں میں طلوع ہو رہا تھا۔

اس ستارے کے عقب میں، الجھے ہوئے انداز میں سیاہ، مستقیم، غیر واضح، خوف ناک آٹھ یا دس پیکر حرکت کر رہے تھے۔

۞

تشریح

جون کی تیسری تاریخ کو زیرِ زمین نابدان کی جنگ شروع کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس امر کا خوف تھا کہ مغلوب لوگوں نے ان میں پناہ لی ہوگی، اور پولیس کا افسرِ اعلیٰ Gisquet مخفی پیرس کی تلاشی لے گا جب کہ جنرل Bugeaud عوامی پیرس کی صفائی کروائے گا؛ عوامی طاقت ایک دہری اور ایک دوسرے سے منسلک حکمتِ عملی اپنائے گی، جس میں سے ایک کی نمائندگی اوپر فوج کرے گی اور دوسری کی نیچے پولیس کرے گی۔ ہرکاروں کے تین دستے اس کام پر متعین کیے گئے۔ نالیوں میں کام کرنے والوں نے نابدان کی جستجو شروع کی؛ پہلا دستہ دائیں کنارے پر، دوسرا بائیں کنارے پر اور تیسرا شہر میں سرگرم ہوگیا۔ پولیس کے ہرکارے اپنی بندوقوں سے، لاٹھیوں سے، تلواروں اور قرولیوں سے لیس تھے۔

وہ دستہ جسے ژاں ولژاں کی تلاش میں بھیجا گیا تھا، وہ دائیں کنارے کے گشت کی لالٹین تھا۔ اس دستے نے خم کھاتی گیلریوں اور تین اندھی گلیوں میں تلاشی لی جو Cadran اسٹریٹ کے نیچے واقع تھیں۔ جس وقت وہ ان اندھی گلیوں میں اپنی لالٹین لیے گزر رہے تھے، ژاں ولژاں گیلری کے اسی راستے پر تھا؛ اس نے دیکھا کہ یہ بڑے راستے کے مقابلے میں بہت تنگ تھا، اور اس جگہ اندر داخل نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ آگے چلا گیا۔ Cadran گیلری سے نکلنے کے بعد پولیس نے سمجھی کہ اس نے پٹی والی نالیوں کی جانب قدموں کی آوازیں سنی ہیں۔ وہ دراصل ژاں ولژاں کے قدموں کی آوازیں تھیں۔ گشت کی کمان کرنے والے سارجنٹ نے اپنی لالٹین بلند کی، اور جدھر سے آوازیں آتی محسوس ہوئی تھیں، دستے نے دھند میں اس جانب دیکھنے کی کوشش کی۔

یہ ژاں ولژاں کے لیے ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔

خوشی کی بات یہ تھی کہ اس نے لالٹین کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا مگر لالٹین والے اسے صاف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ روشنی تھے تو یہ سایہ تھے۔ وہ کافی فاصلے پر تھا اور اس جگہ کے اندھیرے میں گھل مل گیا تھا۔ وہ دیوار سے لپٹ کر رُک گیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ جو عقب میں حرکت کر رہی تھی، کیا شے تھی۔ نیند اور غذا کے نہ ہونے اور جذبات نے اسے ایک خواب دیکھنے والے کی سی کیفیت میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ایک کرن دیکھ رہا تھا اور اس کرن کے اطراف کچھ ہیولے تھے۔ وہ سب کیا تھا؟ وہ سمجھ نہیں پایا۔

ژاں ولژاں کے رُک جانے کے بعد آواز ختم ہو گئی تھی۔

گشت والے سننے کی کوشش کرتے رہے، اور انھیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

اس زمانے میں Montmartre کی نالیوں کے مقام پر ایک قسم کا چوراہا بن گیا تھا جو خدمات کا چوراہا کہا جاتا تھا، جسے بعد میں بند کر دیا گیا تھا، اس لیے کہ وہاں ایک چھوٹا سا جوہڑ سا ہو گیا تھا جس میں طوفانی بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا تھا۔ اس وسیع جگہ پر گشت والے جمع ہو سکتے تھے۔ ژاں ولژاں نے ان ہیولوں کو ایک قسم کے دائرے کی صورت میں کھڑا دیکھ لیا تھا۔ یہ بلڈاگ جیسے سر ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔

رکھوالے کتوں کی اس کونسل کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں غلط فہمی ہوئی؛ کہ وہاں کسی قسم کی آواز نہیں تھی؛ کہ پٹی والے اس نالے میں الجھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں؛ کہ یہ تضیعِ اوقات ہو گی۔ مگر چوں کہ انھیں Saint-Merry کی طرف جلد پہنچنا تھا، اور اگر ان زیرِ زمین نالیوں میں کوئی ''غنڈوں کا سرغنہ'' پوشیدہ ہے بھی تو اسی علاقے میں ہو گا۔

اس قسم کے گروہ وقتاً فوقتاً اس قسم کے قدیم توہین آمیز الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ 1832ء میں ''غنڈوں کا سرغنہ'' jacobin (حکومت مخالف) کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا جو متروک ہو چکا تھا اور یہ بہت مناسب تھا۔

سارجنٹ نے بائیں جانب مڑنے کا حکم دیا؛ اس طرف جہاں سے دریائے سین کی دھاروں کی صورت نکلتا تھا۔ اگر انھیں یہ خیال آجاتا کہ یہ لوگ دو گروہوں میں بٹ جاتے اور دونوں جانب چل پڑتے تو ژاں ولژاں پکڑا جاتا۔ مگر سب ایک ہی طرف چل پڑے۔ بہت ممکن ہے کہ پولیس افسر نے یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ شاید سرکشوں سے لڑائی کرنی پڑ جائے، اس لیے ایسے وقت میں گشت کرنے والوں کو الگ نہیں ہونا چاہیے۔ گشت والے اپنی راہ چل پڑے، اور

ژاں ولواں پیچھے رہ گیا۔ اس حرکت سے ژاں ولواں کو کچھ اندازہ نہیں ہوا، سوائے گھبراتی ہوئی لالٹین کے جو اچانک ایک طرف مڑ گئی تھی۔

روانگی سے پہلے، سارجنٹ نے پولیس والے ضمیر کو بے گناہ قرار دینے کے لیے اپنی بندوق اس طرف چلا دی جس طرف ژاں ولواں تھا۔ بندوق چلنے کی آواز کی گونج اور گرج اس کھوہ میں چابق چلی گئی۔ پلستر کا ایک ٹکڑا نالی میں بہتے پانی میں گرا، اور اس سے اڑنے والے چھینٹیں ژاں ولواں سے چند قدم دور گریں۔ یہ اس امر کی تنبیہ تھی کہ گولی اس کے سر کے اوپر والے محراب میں لگی تھی۔

تھوڑی دیر تک قدموں کی آوازیں گونجتی رہیں اور آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھیں؛ سیاہ رنگ کے پیکروں کا گروہ غائب ہوتا گیا، روشنی کی ہلکی ہلکی جھلک لہراتی ہوئی دور ہوتی گئی، اور وہ سرخی مائل چمک بالکل غائب ہو گئی۔

خاموشی ایک بار پھر گہری ہو گئی تھی، دھند پھر مکمل ہو گئی، اندھے پن اور بہرے پن نے سایوں کی جگہ لے لی تھی؛ ژاں ولواں، جو ابھی تک حرکت کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا، کافی دیر تک دیوار سے چمٹا کھڑا، کان لگائے، آنکھوں کی پھیلی پتلیوں سے اس واہمی گشت کاروں کے گروہ کو غائب ہوتا دیکھتا رہا۔

❁

سکھایا پڑھایا آدمی

سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے کی پولیس کے ساتھ انصاف کیا جانا چاہیے، کہ بے حد مشکل عوامی حالات میں بھی اس نے نابدان اور کڑی نگرانی سے متعلق اپنے فرائض بڑی جاں فشانی سے انجام دیے تھے۔ اس کی نظر میں بغاوت اس امر کا بہانہ نہیں تھا کہ ایذا پسندوں کو اپنی من مانی کرنے دیا جائے، اور اس وجہ سے سوسائٹی کو نظر انداز کر دیا جائے کہ حکومت خطرے میں ہے۔ غیر معمولی خدمات انجام دینے والے اداروں کے ساتھ مل کر وہ ہر قسم کی خدمات انجام دے رہی تھی، اور ثانی الذکر کی موجودگی سے اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ایک غیر متوقع سیاسی واقعے کے درمیان، جو شروع ہو چکا تھا، اور ایک امکانی انقلاب کے دباؤ کے پیشِ نظر پولیس کے ایک ایجنٹ نے ایک "چور" خلق کر لیا تھا تاکہ سرکشوں اور پیٹنے والوں کی توجہ ان کی طرف مبذول نہ ہو سکے۔

یہ کچھ ویسا ہی کام تھا جو چھ جون کی شام دریائے سین کے کناروں کی ڈھلانوں پر Pont des Invalides سے ذرا فاصلے پر کیا گیا تھا۔ وہاں اب کوئی کنارہ باقی نہیں۔ اس علاقے کا سارا منظر تبدیل ہو چکا ہے۔

اس ساحل پر دو آدمی، ایک مخصوص فاصلے سے علاحدہ، ایک دوسرے پر نگاہ رکھنے والے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ جو آگے تھا فرار ہونا چاہتا تھا، اور جو عقب میں تھا آگے والے سے آگے چلا جانا چاہتا تھا۔ یہ شطرنج کے کھیل جیسی کیفیت تھی جو فاصلے پر اور خاموشی میں کھیلا جا رہا تھا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی عجلت نہیں تھی، اور دونوں آہستہ چل رہے تھے، گویا انھیں عجلت سے خوف تھا کہ اس کے باعث دوسرا اپنی رفتار دگنی کر دے گا۔

ایک یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ دراصل اشتہا تھی جو شکار کے پیچھے جانے پر مجبور کر رہی تھی، اور

وہ جان بوجھ کر ویسا ہی کر رہا تھا، جب کہ شکار چالاک تھا اور بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔

ان کے درمیان ویسا ہی رشتہ تھا جیسا شکار ہونے والے اور شکاری کتے کے درمیان پایا جاتا ہے۔ وہ جو فرار ہو جانا چاہتا تھا اس کا انداز غیر معمولی اور پُر اثر نہیں تھا؛ وہ جو اسے پکڑ لینا چاہتا تھا اس کا انداز گستاخانہ تھا اور مقابلے کے وقت بھی وہ گستاخ رہا ہوگا۔

آگے والا، جسے احساس تھا کہ وہ کم زور تھا، پیچھے والے سے پرہیز کر رہا تھا؛ مگر اس طرح پرہیز کر رہا تھا جیسے وہ بہت غصے میں ہو؛ ہر کوئی جس نے ان کو دیکھا ہو وہ صاف دیکھ سکتا تھا کہ ان کے فرار میں دشمنی اور وہ تمام خرابیاں نمایاں تھیں جو خوف میں ہوتی ہیں۔

ساحل سنسان پڑا تھا؛ وہاں کوئی راہ گیر بھی نہیں تھا؛ حتیٰ کہ ملاح بھی نہیں تھے، نہ ہلکی کشتیاں چلانے والے تھے جو یہاں وہاں لنگر انداز تھیں۔

گودی کے دوسرے کنارے کے علاوہ کہیں اور سے ان دو آدمیوں کو دیکھنا آسان نہیں تھا، اور کوئی شخص جس نے دور سے ان کی جانچ کی ہو اسے آگے والا آدمی سخت کوش، پریشان اور مشکوک وجود محسوس ہوگا جو اپنے نیلے بلاؤز کے نیچے پریشان اور لرزاں وجود لگے گا، اور دوسرا شخص ایک کلاسیکی سرکاری ملازم نظر آئے گا جو حاکمیت کا نشان یعنی فراک کوٹ پہنے ہوئے تھا، ٹھوڑی تک جس کے بٹن بند تھے۔

ہوسکتا ہے کہ اگر ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل جائے تو قاری ان کو پہچان بھی لے۔

دوسرا آدمی کیا چاہتا تھا؟

غالباً آگے بھاگنے والے کو زیادہ گرم لباس پہنانے میں کامیابی۔

سرکاری لباس میں ملبوس کوئی شخص چیتھڑے میں ملبوس آدمی کا پیچھا کرتا دکھائی دے تو اسے بھی سرکاری لباس ہی میں ملبوس گردانا جائے گا۔ مسئلہ صرف لباس کے رنگ کا ہوگا۔ نیلے رنگ میں ملبوس ہونا اونچے درجے کی نشانی ہوتا ہے؛ سرخ لباس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ مخالف ہے۔

نیچے درجے کا ایک اور رنگ ہوتا ہے — ارغوانی۔

ممکن ہے کہ کچھ بدمزگی ہو اور کچھ اس کا ارغوانی پن ہو، پہلا آدمی جس سے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے۔

اگر دوسرا آدمی بھاگنے والے کو صرف چلنے کی اجازت دیتا، اور اس کو ابھی پکڑنا نہیں چاہتا، تو ایسا محسوس ہوتا گویا دونوں ملاقات کے کسی خاص مقام پر پہنچ جانا چاہتے تھے جہاں پہنچ کر کسی قابلِ گرفت گروہ میں مل جائیں۔ اسی قسم کے باریک طریقے کو spinning کہا جاتا ہے۔

غالباً ایسے موقعے پر ممکن تھا کہ ٹھوڑی تک بٹن بند کوٹ والے آدمی نے ساحل سے ہی دیکھ لیا تھا کہ گودی سے گزرتی ہوئی کرایے کی سواری گاڑی خالی تھی، اور کوچوان کو کچھ اشارہ کر دیا تھا؛ کوچوان اشارہ سمجھ گیا تھا، اور بظاہر اس آدمی سے واقف بھی تھا جس سے معاملہ کرنا تھا۔ کوچوان نے اپنی گاڑی موڑی اور ان دونوں آدمیوں کا گودی کی جانب آہستہ روی سے پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ آگے چلنے والا چیتھڑے میں ملبوس آدمی یہ سب دیکھ نہیں سکا تھا۔

کرایے کی سواری گاڑی شانزہ ولیزے کے درختوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ کنگورے کی دیوار کی دوسری جانب کوچوان کا نصف جسم کوڑا لہراتا دکھائی دے رہا تھا۔

پولیس کی جانب سے اپنے ہرکاروں کو خفیہ ہدایات دی جاتی ہیں، "ہنگامی ضروریات کے دوران استعمال کے لیے ہمیشہ کرایے کی سواری کا انتظام رکھا جائے۔"

جس وقت یہ دو آدمی ساحل پر اپنے اپنے داؤ چل رہے تھے، وہ گودی کے ایک ڈھلواں میدان کے ساحل کی طرف گئے جس کی ڈھلان ساحل کی طرف مائل تھی، جہاں Passy سے آنے والے کرایے کی سواری گاڑیوں والے اپنے گھوڑوں کو دریا پر پانی پلانے لایا کرتے تھے۔ بعد میں اس نشیبی میدان کو تناسب بنانے کی خاطر اونچا کر دیا گیا تھا۔ بے شک گھوڑے مر جائیں مگر آنکھوں کو مسطح میدان تو اچھا لگے گا۔

ممکن ہے کہ نیلے رنگ کے بلاؤز والے آدمی کا ارادہ تھا کہ وہ ڈھلان والے میدان پر چڑھ جائے گا، تاکہ شانزہ لیزے سے فرار ہو سکے؛ وہ جگہ جو خوب صورت درختوں سے سجی ہوئی ہے، مگر اس کے نتیجے میں پولیس والوں سے بھری ہوتی ہے، اور جہاں لوگ آسانی سے فساد برپا کر سکتے ہیں۔

گودی کا یہ مقام پیرس کے اس مکان سے زیادہ دور نہیں، جسے 1824ء میں Moret نے کرنل بلیک سے خریدا تھا اور اس کو "فرانسوا اوّل کی جائے قیام" کے نام سے موسوم کر دیا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک حفاظتی چوکی بھی تھی۔

جس آدمی کا پیچھا کیا جا رہا تھا اس پر نظر رکھنے والے کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ گھوڑوں کو پانی پلانے والے میدان پر چڑھا نہیں تھا۔ وہ ساحل کے کنارے کنارے گودی کی طرف بڑھتا رہا۔

بظاہر اس آدمی کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔

اگر وہ دریائے سین میں کودنا نہیں چاہتا تھا تو اس کا ارادہ کیا تھا؟

اب گودی میں چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا؛ وہاں نہ کوئی ڈھلان جیسی جگہ تھی، نہ سیڑھیاں

تھیں؛ اور وہ اس جگہ سے قریب تھی جہاں سے دریائے سین Pont de Jena کی طرف مڑتا ہے، جہاں سے ساحل تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا، اور زبان کی طرح پتلا ہو کر پانی میں غائب ہو گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ خود کو دائیں جانب عمودی دیوار اور بائیں جانب دریا، اور سامنے اسباب احتیار کے درمیان محبوس پائے گا۔

یہ سچ ہے کہ ساحل کا یہ اختتام سات یا آٹھ فٹ بلند کوڑے کے ڈھیر اور کچھ انہدام کے باعث آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا، مگر کیا اس آدمی کو امید تھی کہ وہ اپنے آپ کو کوڑے کے ڈھیر کے پیچھے پوشیدہ کر لے گا؟ یقینی طور پر وہ اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چوروں کی معصومیت اس حد تک نہیں بڑھ جایا کرتی۔ کوڑے کا یہ ڈھیر پانی کے کنارے ایک قسم کا ابھار تھا، جو گودی کی دیوار تک بڑھ کر ایک قسم کے راس کی صورت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

پیچھے والا آدمی چوں کہ خود دیکھ نہیں سکتا تھا، اسے بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے اس امر کا فائدہ اٹھایا تا کہ وہ ہر قسم کے فریب کو خیر باد کہہ دے اور تیزی سے چل سکے۔ چند لمحوں کے اندر وہ اس ٹیلے تک پہنچا اور گھوم کر اس کے پیچھے گیا۔ وہاں پہنچ کر حیرانی کے عالم میں رک گیا۔ جس آدمی کا وہ پیچھا کر رہا تھا وہاں موجود نہیں تھا۔

بلاؤز میں ملبوس آدمی مکمل طور پر گہنا گیا تھا۔

کوڑے کے ڈھیر سے شروع ہونے والا ساحل صرف تیس فٹ لمبا تھا، اس کے بعد وہ دریا کے پانی میں غرق ہو گیا تھا جو گودی کی دیوار پر تھپیڑے مار رہا تھا۔ پیچھا کرنے والے کی نظروں سے بچ کر بھگوڑا دریائے سین میں کود نہیں سکتا تھا۔ تو پھر اس کا کیا حشر ہوا؟

تھوڑی دیر تک بٹن بند کوٹ والا ساحل کے کنارے تک گیا، کھڑا سوچتا رہا؛ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، اس کی آنکھیں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ جس جگہ زمین ختم ہو گئی تھی اور پانی شروع ہوا تھا، وہاں اسے لوہے کی ایک بڑی سی نیچی محرابی جالی نظر پڑی جس میں تین بڑے بڑے قلابے اور ایک بھاری سا تالا لگا ہوا تھا۔ یہ جالی ایک قسم کا دروازہ تھا جو گودی کی بنیاد میں دھنسا ہوا تھا، جو دریا میں اور ساتھ ہی ساحل پر بھی کھلتا تھا۔ اس کے نیچے سے سیاہی مائل چشمہ گزرتا تھا۔ اور یہ چشمہ دریائے سین میں گرتا تھا۔

لوہے کی موٹی موٹی زنگ آلود سلاخوں سے پرے ایک قسم کی اندھیری اور محفوظ شدہ راہ داری دیکھی جا سکتی تھی۔ اس آدمی نے اپنے بازو تہہ کیے اور غصے سے جالی کو دیکھا۔

چوں کہ اس کو گھورنا کافی نہ تھا، اس نے جالی کو ایک جانب کرنے کی کوشش کی؛ اسے

زور سے حرکت دی۔ جالی سخت مزاحم تھی۔ بہت ممکن تھا کہ یہ ذرا دیر پہلے کھولی گئی تھی، حالاں کہ کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دی تھی جو ایک زنگ آلود جالی کے لیے غیر معمولی کیفیت تھی، مگر یہ امر یقینی تھا کہ جالی دوبارہ بند کی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ جس آدمی کے لیے جالی کھلی تھی اس کے پاس کوئی آنکڑا نہیں بلکہ ایک کنجی تھی۔ وہ آدمی، جو جالی کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک سب کچھ سمجھ گیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل پڑے:

"بہت ہو گیا! ایک سرکاری کنجی!"

اس کے بعد، اس کے اندرون کے سارے خیالات طنزیہ انداز میں سیلاب کی طرح نکلنے لگے: "آو! آو! آو! آو!"

اور پھر، اس امید میں کہ وہ اس شخص کو باہر نکلتے یا کسی کو اندر جاتے دیکھے گا، اس نے کسی جاسوس کے مانند کوڑے کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھ کر صبر کے ساتھ چوکیداری شروع کر دی۔

کرایے کی گاڑی، جو اس کی حرکات سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھی، گودی پہنچ کر دیوار کے قریب رُک گئی۔ کوچوان نے طویل انتظار کے پیش نظر گھوڑے کا سر چارے کے تھیلے کے اندر کر دیا جس کے پیندے میں چارہ نم ہوتا ہے، پیرس والے جس نظارے کے عادی ہیں، اور حکومت کے ہرکارے بھی، جو اس قسم کی حرکات کرتے ہیں۔ Pont de Jena کے اِکا دُکا راہ گیر چلتے چلتے گردنیں گھما کر، منظر میں شامل ان دو ساکت اشیا، ساحل والے آدمی اور گودی پر کھڑی سواری گاڑی، پر نظریں ڈالتے گزرتے جا رہے تھے۔

۞

وہ بھی کاندھے پہ صلیب اپنی اٹھائے ہوئے ہے

ژاں ولژاں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ دوبارہ کہیں رُکا نہیں تھا۔

اس کی پیش قدمی ہر قدم زیادہ محنت کی طلب گار ہوتی جا رہی تھی۔ زیرِ زمین حجروں کی سطح مختلف ہوتی ہے؛ ان کی اوسط اونچائی پانچ فٹ اور چھ انچ ہے، جو ایک عام آدمی کے قد کے حساب سے رکھی گئی تھی؛ ژاں ولژاں کو جھکنا پڑتا تھا تاکہ ماریوس کا سر حجروں کی چھتوں سے ٹکرا نہ جائے؛ ہر قدم اسے جھکنا اور پھر اُٹھنا پڑتا، اور مسلسل دیوار کو محسوس کرنا پڑتا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں دونوں کے لیے، پتھروں کی نمی اور چوبی ڈھانچوں کی چپکنے والی خاصیت کے باعث دیوار سے چمٹنے میں سہارا کم تھا۔ وہ شہر کی غلاظت کے ڈراؤنے ڈھیر سے ٹکراتا چلتا رہا۔ طویل وقفوں کے بعد ہوادانوں سے کہیں کہیں روشنی کی کرنیں نظر آجاتی تھیں جو اتنی زرد ہوتی تھیں کہ پورے سورج کی روشنی چاندنی جیسی نظر آتی تھی۔ باقی سب دھند، بدبو، دھندلاپن اور سیاہی تھا۔ ژاں ولژاں بھوکا بھی تھا اور پیاسا بھی۔ بالخصوص پیاسا تھا؛ اور یہ جگہ جو سمندر کی طرح ایسے پانی سے بھری تھی جسے کوئی انسان پی نہیں سکتا۔ قاری کو علم ہے کہ اس میں طاقت کی فراوانی تھی جو اس کی پاک دامن اور سنجیدہ زندگی کے طفیل بہت گھٹی نہیں تھی، پھر بھی کم ہونی شروع ہو گئی تھی۔ تھکن اس پر غالب آتی جا رہی تھی، جس نے اس کا بوجھ زیادہ بھاری کر دیا تھا۔ ماریوس جو شاید مر چکا تھا، اس کے سُست ہوتے جسم کے لیے بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ ژاں ولژاں نے اسے اس طرح اٹھا رکھا تھا کہ اس کے سینے پر دباؤ نہیں تھا، تاکہ جہاں تک ممکن ہو سانس چلتی رہے۔ پیروں کے نیچے چوہوں کی بھاگ دوڑ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک چوہا تو اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اس نے ژاں ولژاں کو کاٹ لیا تھا۔ نالیوں میں بنے ہوادانوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً تازہ ہوا پہنچ رہی تھی اور اس کے جسم میں تازہ جان ڈال رہی تھی۔

ژاں والژاں نالیوں کی پٹی کے پاس پہنچا تو دن کے تین بجے تھے۔

پہلے تو وہ ان کی اچانک وسعت سے اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے خود کو ایسی گیلری میں پایا جس میں پھیلے دونوں ہاتھ دیوار تک نہیں پہنچتے تھے، اور وہ ایسے حجرے میں تھا کہ اس کا سر چھت سے لگتا نہیں تھا۔ یہ بڑی نالی دراصل آٹھ فٹ چوڑی اور سات فٹ اونچی ہے۔

اس نقطے پر جہاں بڑی نالی Montmartre کی نالی سے مل جاتی ہے، دو مزید زیرِ زمین گیلریاں ہیں، Provence اسٹریٹ والی اور ذبح والی، اور یہ دونوں مل کر ایک مربع ہال بناتی ہیں۔ اگر کوئی کم درجے کی ذہانت والا آدمی ہوتا تو درپیش چار راستوں کے درمیان فیصلہ نہ کر پاتا کہ کدھر جانا چاہیے۔ ژاں والژاں نے سب سے چوڑا راستہ، یعنی پٹی والا نالا، منتخب کیا۔ مگر یہاں بھی وہی سوال درپیش تھا— وہ نیچے کی طرف جائے یا اوپر کی جانب؟ اس نے سوچا کہ حالات عجلت چاہتے ہیں، اور اب اسے ہر خطرے کے باوجود دریائے سین پہنچنا ہے۔ اس لیے اسے نیچے کی طرف جانا چاہیے۔ اور وہ بائیں جانب مڑ گیا۔

یہی ٹھیک تھا جو اس نے کیا، اس لیے کہ یہ قیاس غلط تھا کہ پٹی والے نالے کے دو دہانے ہیں؛ ایک Bercy کی جانب ہے اور دوسرا Passy کی طرف، اور جیسا کہ نام سے معلوم ہوتا ہے، یہ پیرس کے دائیں کنارے کا زیرِ زمین کمربند ہے۔ یاد رہے کہ بڑا نالا Menilmontant کے قدیم چشمے کے سوا کچھ نہیں اور یہ Menilmontant کی کسی اندھی گلی میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس شاخ سے براہِ راست کوئی رابطہ نہیں جو Quartier Popincourt کی ابتدا سے پیرس کے پانی کو جمع کرتی ہے اور Amelot نالے کے ذریعے، قدیم Isle Louviers سے ہوتا ہوا دریائے سین میں گر جاتی ہے۔ یہ شاخ جو جمع کرنے والی نالی کو مکمل کرتی ہے Menilmontant اسٹریٹ کے نیچے اس سے علاحدہ ہو جاتی ہے جو خارج ہونے والے پانی کو اوپر اور نیچے جانے والے دھاروں میں تقسیم کرتی ہے۔ اگر ژاں والژاں گیلری کی طرف گیا ہوتا تو ہزار کوشش کے بعد وہ تھکا ماندہ، قریب المرگ ایک دیوار تک پہنچتا۔ اور وہ گم ہو گیا ہوتا۔

ضرورت کے پیشِ نظر، تھوڑی دور تک پیچھے جاتے ہوئے اور Filles-du-Calvaire کے راستے میں داخل ہوتے ہوئے، اس شرط پر کہ وہ Carrefour Boucherat کے زیرِ زمین کی چوراہے نما نالیوں پر متذبذب نہیں کرے گا، اور Saint-Louis کی راہداری میں چلتے ہوئے، اور پھر Saint-Sebastian گیلری کو نظر انداز کرتے ہوئے دائیں جانب مڑ جائے گا تو وہ Amelot نالے پر پہنچ جاتا، اور اس جگہ کے ایک قسم کے F پر کھو نہ جاتا جو بستی کے نیچے واقع

ہے، تو اسے Arsenal کے قریب والا مین کا دہانہ مل جاتا۔ مگر اس کے حصول کے لیے اسے موتگے کے پودوں والے مہیب نالے اور اس کی تمام شاخوں اور تمام دہانوں سے اچھی طرح واقف ہونا لازم تھا، مگر اب ہمیں ایک بار پھر اصرار ہے کہ اسے اس افقی خوف ناک نالے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا؛ اور اگر کسی نے اس سے پوچھا ہوتا کہ وہ کس نالے میں ہے، تو اس کا جواب ہوتا: "رات کے اندھیرے میں۔"

اس کی جبلت اس کے کام آئی۔ نیچے کی طرف جانے کا مطلب دراصل ممکنہ تحفظ تھا۔

اس نے اپنی دائیں جانب تنگ راستے چھوڑ دیے تھے جو Laffitte اسٹریٹ اور Saint-Georges کے نیچے کسی پنجے کی مثال پھیل گئے تھے، اور Chaussee d'Antin کی راہ داری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔

ذرا آگے، جہاں Madeleine شاخ تھی، وہ رُک گیا۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ d'Anjou اسٹریٹ میں ایک بڑا سا قابلِ عبور ہوا دان، یا شاید 'مین ہول' تھا جس کی روشنی خاصی صاف تھی۔ حرکت کی ایسی نرمی سے جس سے ایک بھائی دوسرے بھائی سے پیش آتا ہے، ژاں ولژاں نے ماریوس کو نالے کے کنارے لٹا دیا۔ ماریوس کا خون بھرا چہرہ ہوا دان سے آتی ہلکی ہلکی روشنی میں اس مردے کی طرح لگ رہا تھا جو کسی مقبرے کے فرش پر رکھا ہو۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے بال کنپٹیوں پر کسی مصور کے برش کی طرح چپکے ہوئے تھے جو سرخ رنگ میں دھو دیا گیا ہو؛ اس کے ہاتھ لٹکے ہوئے تھے اور مردہ تھے۔ اس کے گلوبند میں خون جمع ہو گیا تھا؛ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے، اور اس کی باچھوں میں خون جم گیا تھا؛ اس کی قمیص اس کے زخموں میں دھنس گئی تھی، اور اس کے کوٹ کا کپڑا اس کے زندہ گوشت میں لگے گہرے زخموں پر چپک گیا تھا۔ اپنی انگلیوں کی نوک سے لباس کو ہٹاتے ہوئے ژاں ولژاں نے اپنا ہاتھ ماریوس کے سینے پر رکھا؛ ماریوس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ژاں ولژاں نے اس کی قمیص پھاڑی، نوجوان کے زخموں کو اس طرح باندھا کہ بہتا خون رُک گیا؛ اور پھر ماریوس کے اوپر جھکا جو بے ہوش پڑا ہوا تھا، جس کی سانس تقریباً رُک گئی تھی، اور اس نیم روشنی میں ناقابلِ بیان نفرت سے اسے گھورنے لگا۔

ماریوس کے لباس کو بے ترتیب کرنے کے دوران اس کی جیب میں ژاں ولژاں کو دو چیزیں ملیں: ڈبل روٹی جو پچھلی شام بھلا دی گئی تھی، اور ماریوس کی جیبی کتاب۔ اس نے ڈبل روٹی کھائی، اور جیبی کتاب کھولی۔ پہلے صفحے پر ماریوس کی لکھی ہوئی چار سطریں نظر پڑیں، جو قاری کو یاد ہوں گی:

"میرا نام ماریوس پوں مرسی ہے۔ میری میت کو میرے نانا موسیو ژیلے نورماں کے پاس پہنچا دینا؛

Filles-du-Calvaire اسٹریٹ، مکان نمبر 6، Marais"

ژاں ولژاں نے یہ چار سطریں ہوا دان سے آنے والی روشنی میں پڑھیں، اور تھوڑی دیر توقف کیا، گویا کچھ سوچ رہا ہو، اور دھیمی آواز میں دہرایا:

"Rue des Filles-du-Calvaire, number 6, Monsieur Gillenormand."

اس نے جیبی کتاب ماریوس کے جیب میں رکھ دی۔ اس دوران وہ ڈبل روٹی کھا چکا تھا اور اس کی جسمانی قوت واپس آ چکی تھی ۔اس نے ایک بار پھر ماریوس کو اپنی پشت پر لادا اور نالیوں کا نچلی سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

Menilmontant کی وادی میں بڑا نالا تقریباً دو لیگ طویل تھا، اور کافی دور تک اس کی نالیاں پتھر سے بنائی گئی تھیں۔

پیرس کی سڑکوں کی مشعل، جو ہم ژاں ولژاں کی زیرِ زمین نالیوں میں کی جانے والی پیش قدمی کے قاری کے لیے روشن کیے ہوئے ہیں، ژاں ولژاں کے پاس نہیں تھی ۔اسے ایسی کوئی شے مہیا نہیں تھی جو بتاتی کہ وہ کس علاقے سے گزر رہا تھا، نہ اسے خبر تھی کہ وہ کس راستے پر تھا۔ روشنی کی بڑھتی ہوئی زردی جو وقتاً فوقتاً اسے نظر آ رہی تھی، اشارہ کر رہی تھی کہ سورج ڈھل رہا ہے، کہ جلد ہی دن ڈوب جائے گا؛ اوپر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کی دھمک مسلسل ہونے کے بجائے اب وقفے وقفے سے آ رہی تھی، اور پھر بالکل رک گئی تھی ۔اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب وہ پیرس کے مرکز کے نیچے نہیں تھا، اور وہ کسی سنسان علاقے کی طرف جا رہا تھا جہاں بیرونِ شہر شاہراہیں تھیں۔ جہاں کم مکانات، کم سڑکیں تھیں، اور نالیوں میں کم ہوا دان تھے۔ ژاں ولژاں کے اطراف اداسی گہری ہوتی جا رہی تھی ۔اس کے باوجود، اندھیرے میں راستے ٹٹولتا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک یہ اندھیرا خوفناک ہو گیا۔

۞

بے اعتبار ریت

اسے محسوس ہوا کہ وہ پانی میں داخل ہو رہا تھا، اور اس کے پیروں تلے سنگین فرش نہیں، صرف کیچڑ تھا۔

کبھی کبھی Brittany یا اسکاٹ لینڈ کے مخصوص ساحلوں پر چلنے والے آدمی کو، وہ مسافر ہو یا ماہی گیر، اترتے ہوئے پانی میں چلتے ہوئے دشواری محسوس ہوتی ہے۔ پیروں تلے ساحل رال جیسا ہوتا ہے؛ تلوے اس سے چپک جاتے ہیں؛ ریت ریت نہیں رہتی، چڑیا پھنسانے والا لاسا [برگد کے دودھ سے بنایا گیا چپکنے والا مادہ] بن جاتی ہے۔ ساحل بالکل خشک ہوتا ہے، مگر ہر قدم، جوں ہی چلنے والا اپنا پیر اٹھاتا ہے اس کا نقشِ قدم پانی سے بھرنے لگتا ہے۔ آنکھوں کو تبدیلی نظر نہیں آتی، ساحل بالکل چکنا اور پُرسکون ہوتا ہے، ریت ایک جیسی ہوتی ہے، اور زمین کو دیکھ کر بتایا نہیں جا سکتا کہ کس جگہ ٹھوس ہے اور کس جگہ ٹھوس نہیں؛ ریت کی مکھیوں کا خوش باش چھوٹا سا بادل مسافر کے پیروں تلے سے اڑتا رہتا ہے۔

آدمی اپنے راستے چلتا رہتا ہے، زمین کی طرف مڑتا ہے، اور ساحل کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پریشان نہیں ہوتا، یہی سب سے بڑی پریشانی کی بات ہوتی ہے۔ کس بات کی؟ اسے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیروں کا بھاری پن ہر اٹھتے قدم کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر اچانک وہ دھنسنے لگتا ہے۔ دو یا تین انچ دھنستا ہے، یعنی یقینی طور پر وہ صحیح سڑک پر نہیں ہے؛ وہ اپنے مقام کا تعین کرنے کے لیے رُکتا ہے۔ اچانک اس کی نظریں اپنے پیروں پر پڑتی ہیں؛ اس کے پاؤں نظر نہیں آتے۔ وہ اپنے پاؤں ریت سے باہر نکالتا ہے، اپنے پچھلے قدموں کے نشان تلاش کرتا ہے، پلٹتا ہے، اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ دھنس جاتا ہے۔ ریت اس کے

ٹخنوں تک آ گئی ہے، اپنے پاؤں چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور خود کو بائیں جانب اچھالتا ہے؛ ریت اس کے نصف پاؤں تک پہنچ گئی ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو دائیں جانب اچھالتا ہے، اور ریت اس کے گھٹنوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تب، ناقابل بیان خوف سے، اسے احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ریت کے دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اور اس کے پیروں کے نیچے وہ خوف ناک کیفیت ہے جس میں نہ انسان چل سکتا ہے نہ مچھلی تیر سکتی ہے۔ اگر کوئی بوجھ ہے تو، وہ اپنا سارا بوجھ پھینک دیتا ہے، مشکل میں پھنسے جہاز کی طرح خود کو ہلکا کر لیتا ہے؛ مگر بہت دیر ہو چکی ہے؛ ریت اس کے گھٹنوں سے اوپر ہو چکی ہے۔

وہ چیختا ہے۔ اپنی ہیٹ ہلا ہلا کر اشارے کرتا ہے یا رومال لہراتا ہے؛ ریت مسلسل اس پر غالب ہوتی جاتی ہے؛ اگر ساحل سنسان ہے، اگر زمین بہت دور ہے، اگر ساحل بدنام ہے، اگر پڑوس میں کوئی نہیں ہے، تو قصہ تمام سمجھو؛ دھنس کر دفن ہو جانا اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔ ایسی خوف ناک تدفین جو طویل ہو، یقینی ہو، سنگ دلانہ ہو، جس کو یا تو موقوف کیا جا سکے یا سرعت سے کی جا سکے، جس کو ہونے میں گھنٹے لگ جاتے ہیں، جس کا اختتام نہیں ہوتا، عین صحت مندی کے عالم میں جو آپ کو کھڑے کھڑے گرفت میں لے لیتی ہے، جو آپ کو پیروں سے کھینچتی ہے، جو ہر بار آپ کوشش پر، ہر چیخ پر جو آپ کے منہ سے نکلتی ہے، آپ کو مزید نیچے کھینچ لیتی ہے، آپ کو آپ کی مزاحمت پر سزا دینا چاہتی ہے، آہستہ آہستہ آدمی کو زمین میں واپس جانے پر مجبور کرتی ہے، تب وہ اپنے نظریں دوڑانے لگتا ہے آفاق پر، درختوں پر، سرسبز ملک پر، میدان میں بسے گاؤں سے نکلتے دھوئیں پر، سمندر میں چلتے جہازوں کے بادبانوں پر، ان پرندوں پر جو فضاؤں میں اڑتے ہیں چہچہاتے ہیں، سورج پر اور آسمان پر۔ یہ تدفین ایک نوع کی تربت ہوتی ہے جو چڑھتے سمندر کی صورت اختیار کر لیتی ہے؛ جو زمین کی گہرائیوں سے ابھر کر زندہ آدمی پر سوار ہو جاتی ہے۔ ہر منٹ مردے سے نکلنے والی بے رحم تہہ ہوتا ہے۔ بدنصیب آدمی بیٹھنے کی، لیٹنے کی، اوپر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے؛ ہر حرکت جو وہ کرتا ہے اسے زیادہ گہرائی میں لے جاتی ہے؛ وہ خود کو سیدھا کرتا ہے، اور وہ مزید دھنس جاتا ہے؛ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کو نگلا جا رہا ہے؛ وہ چیختا ہے، التجا کرتا ہے، بادلوں کو پکارتا ہے، اپنے ہاتھ ملتا ہے، اور زیادہ ناامید ہو جاتا ہے۔ ناف تک اسے ریت میں دھنسا دیکھیے؛ ریت اس کے سینے تک پہنچ جاتی ہے، اب وہ صرف سینے تک باقی رہ گیا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے، غصے سے کراہتا ہے، ساحل کو اپنے ناخن سے دبوچتا ہے، اس نرم غلاف سے باہر نکلنے کی کوشش میں کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کرتا ہے، اضطراب کے عالم میں

ہچکیاں لے کر روتا ہے؛ ریت کی سطح بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ ریت اس کے شانوں تک پہنچ چکی ہے، ریت اس کے حلقوم تک پہنچ چکی ہے؛ اب صرف اس کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی ہیں، ریت اسے بھر دیتی ہے۔ خاموشی! اس کی آنکھیں اب بھی گھور رہی ہیں، ریت انھیں بھی بند کر دیتی ہے، اور اس کے لیے رات ہو جاتی ہے۔ تب اس کے ابرو نیچے جانے لگتے ہیں، ریت سے اوپر تھوڑے سے بال لرزتے ہیں؛ ایک ہاتھ نکلتا ہے، ساحل کی سطح کو چھیدتا ہوا، لہریں آتی ہیں، اور وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اور ایک انسان پُراسرار طریقے سے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

کبھی کبھی کوئی سوار اپنے گھوڑے سمیت غائب ہو جاتا ہے؛ کبھی گاڑی بان اپنی گاڑی سمیت غائب ہو جاتا ہے؛ اور اس ساحل کے سارے قائم کرنے والے بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ پانی کے بجائے، تباہ شدہ جہاز ہوتا ہے۔ زمین ایک آدمی کو غرق کر رہی ہے۔ زمین کا وہ حصہ جس میں سمندر جذب ہو جائے، خطرناک جگہ بن جاتا ہے۔ خود کو میدان کے بھیس میں پیش کرتا ہے، مگر یہ لہر کی طرح ہر شے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ پاتال میں بھی ایسے فریب ہوتے ہیں۔ اس قسم کا غم انگیز مقسوم، جو مخصوص قسم کے سمندری ساحلوں میں ممکن ہوتا ہے، پیرس کے نابدان میں تیس برس پہلے بھی ممکن تھا۔ 1833ء میں کیے جانے والے ضروری کام سے پہلے پیرس کے زیرِ زمین نالوں میں اچانک پھسلن ہوتی رہتی تھی۔

پانی منتشر ہو کر زمین کی مخصوص قسم کی تہوں میں جمع ہو جاتا تھا جو خاص طور پر نرم اور بھربھری ہوتی تھیں؛ اس قسم کے فرش میں شکن کا مطلب شگاف یعنی، ٹوٹ پھوٹ جانا ہوتا ہے۔ ڈھانچا ایک خاص لمبائی تک ٹوٹ جاتا تھا۔ اس قسم کی دراڑ — دلدل میں خالی جگہ — کو خاص زبانوں میں fontis کہا جاتا تھا۔ fontis کسے کہتے ہیں؟ ساحلِ سمندر کے دلدل کو کہتے ہیں جو اچانک سطح زمین کے نیچے پیدا ہو جاتا ہے؛ یہ نابدان کے Mont Saint-Michel ساحل کی مثال ہے۔ جذب شدہ تیل ایک قسم کی حالت میں ہوتا ہے، اس کے سارے مالیکیول soft medium میں معلق ہوتے ہیں؛ یہ نہ زمین ہوتا ہے نہ پانی۔ کبھی کبھی یہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس سے خوف ناک کوئی معاملہ نہیں ہوتا۔ اگر پانی کا غلبہ ہو تو موت فوری ہوتی ہے، آدمی غرق ہو جاتا ہے؛ اگر زمین غالب ہو تو موت آہستہ آہستہ آتی ہے۔

کیا کوئی اس قسم کی موت کا تصور کر سکتا ہے؟ اگر زمین میں کسی وجود کا غرق ہو جانا خوف ناک ہو تو غلاظت کے جوہڑ میں کیسا ہوگا؟ بجائے کھلی ہوا کے، دن کی روشنی کے، صاف افق کے، وہ وسیع آوازیں، وہ آزاد بادل جن سے زندگی برستی ہے، بجائے ان آوازوں کے جو

فاصلے سے بجھولی جاتی ہیں، اس اُمید پر جو مدد کے آخری لمحے تک ہر قسم کے پیکروں سے، اور ممکنہ راہ گیروں سے لگائی جاتی ہیں — اس تمام بہرے پن کے باوجود مزار کے اندر سیاہ حجرہ تیار کیا جاتا ہے، غلاف کے نیچے دلدل میں موت کے لیے، غلاظت کے ذریعے آہستہ آہستہ حبس دم کیا جاتا ہے، جہاں سانس بند کر دینے والے پتھر کے بکس میں کیچڑ اپنے پنجے پھیلا دیتا ہے اور آپ کا گلا پکڑ لیتا ہے؛ موت کی کھڑکھڑاہٹ سے ملی عفونت؛ ساحل کے بجائے کیچڑ، طوفان کی جگہ گندھک، سمندر کی جگہ گوبر ہوتا ہے، چیخنے کے لیے، دانتوں کو پیسنے کے لیے، مچلنے کے لیے، جدوجہد کرنے کے لیے، اور تکلیف دینے کے لیے۔ اس مہیب شہر میں کسی کو خبر نہیں ہوتی اور مصیبت آدمی کے سر پر سے گزر جاتی ہے۔

کتنا ناقابلِ اظہار ہوتا ہے اس طرح مرجانے کا خوف موت کبھی کبھی خاص قسم کے خوف ناک وقار کے ساتھ اپنے ظلم سے نجات فراہم کرتی ہے۔ ہوتا پر تباہ شدہ جہاز پر کوئی عظیم بن سکتا ہے؛ ٹوم کی طرح شعلوں میں بھی ایک خوب صورت انداز ممکن ہوتا ہے؛ معدوم ہوتا ہوا انسان تبدیلیِ ہیئت کر لیتا ہے۔ مگر یہاں نہیں۔ موت غلاظت ہے۔ مر جانا ذلت ہے۔ عظیم لہراتے ہوئے تصورات قابلِ شرم ہوتے ہیں، بیہودہ ہوتے ہیں، بدنما ہوتے ہیں اور بدنام ہوتے ہیں۔ Clarence کی طرح شراب کے پیپے میں مر جانے کی اجازت ہوتی ہے؛ کسی جاروب کش کے گڑھے میں مرنا خوف ناک ہوتا ہے۔ اس کے اندر جدوجہد کرنا ڈراؤنا ہوتا ہے؛ اس وقت جب کوئی موت کی اذیت سے گزرتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے۔ سایے بھی جہنم کے لیے کافی ہوتے ہیں اور کیچڑ بھی، جو اسے تالاب کے سوا کچھ نہیں دیتے، اور مرنے والے کو پتا بھی نہیں ہوتا کہ وہ بھوت بننے والا ہے یا مینڈک۔

تمام جگہوں پر مزار پُر اسرار ہوتے ہیں؛ یہاں بدنما ہوتے ہیں۔

fontis کی گہرائی مختلف وجوہ پر منحصر ہوتی ہے؛ اسی طرح اس کی لمبائی اور اس کی دبازت، نیچے کی مٹی کے خراب معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں fontis تین یا چار فٹ گہری ہوتی تھی، کبھی آٹھ یا دس فٹ؛ کبھی اس کا تلا ناقابلِ پیمائش ہوتا تھا۔ یہاں کیچڑ تقریباً ٹھوس تھا، وہاں رقیق تھا۔ Luniere کے fontis میں ایک آدمی کو غرق ہونے میں ایک دن لگتا تھا، جب کہ fontis کے تالاب میں وہ پانچ منٹ میں غائب ہو جاتا تھا۔ کیچڑ اپنی دبازت کے مطابق کام کرتا ہے۔ بچہ بچ سکتا ہے جب کہ آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ تحفظ کے قانون کا پہلا اصول ہر قسم کے وزن سے چھٹکارا پانا ہوتا ہے۔ نالیوں میں کام کرنے والا ہر شخص جب محسوس کرتا ہے کہ اس کے نیچے زمین دھنس رہی ہے تو وہ اپنے اوزار کا تھیلا، اپنی جھابی یا اپنا گارے کا ٹوکرا پھینک دیتا ہے۔

fontis مختلف وجوہ کی بنا پر بنتے تھے: مٹی کا بھربھراپن؛ آدمی کی پہنچ سے پرے گہرائی میں زمین کا دھنسنا؛ بے تحاشا بارش کا ہونا؛ سرما کے موسم میں مسلسل سیلابی کیفیت کا ہونا؛ طویل عرصے تک بارش کا ہونا۔ کبھی کبھی زرخیز یا ریتیلی مٹی پر بنے اطراف کے مکانات کے باعث زیرِ زمین گیلریوں کے حجرے دھنس جاتے ہیں جن کے باعث مکانات ایک طرف کو جھک جاتے ہیں، یا ان کے بوجھ سے زیرِ زمین نالیوں کے حجرے پھٹ جاتے اور ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے تھے۔اسی طرح، ایک صدی قبل Parthenon (یونانی عبادت گاہ) کے ڈھیر کر دیے جانے سے Saint-Genevieve کی نالیوں کے حجرے تباہ ہو گئے تھے۔ جب مکانوں کے بوجھ سے ایک نالی ٹوٹ گئی تھی؛ یہ سطحِ زمین پر ہونے والی شرارت کے باعث ہوئی تھی، اوراس کا فوری علاج کیا جا سکا تھا۔اور کئی بار ایسا ہوا تھا، کہ اندرونی تباہی کا کوئی بیرونی شگاف ظاہر نہیں ہوا تھا، اوراس معاملے میں نالیوں میں کام کرنے والوں کی شامت کا باعث ہوا تھا۔ جب وہ کسی حفظِ ما تقدم کے بغیر داخل ہوئے تو وہ غائب ہو سکتے تھے۔قدیم دستاویزات میں بہت سے خاکروبوں کے تذکرے ملتے ہیں جو اس انداز میں fontis میں دفن ہو گئے تھے۔ان میں بہت سے نام دیے گئے ہیں؛ اوروں کے علاوہ، نالیوں کے اس کارکن کا نام Blaise Poutrain بھی دیا گیا ہے، وہ جو Careme-Prenant اسٹریٹ کے 'مین ہول' کے نیچے بن جانے والے دلدل میں غرق ہوگیا تھا؛ یہ شخص Nicholas Poutrain کا بھائی تھا، وہی جو Charnier des Innocents نامی قبرستان کا آخری گورکن تھا، 1785ء میں جس میں تدفین بند کر دی گئی تھی۔

ایک اور نوجوان اور حسین وجمیل شخص تھا، Vicomte d'Escoubleau، ہم جس کے بارے میں بات کر چکے ہیں جو Lerida کے محاصرے کے بہادروں میں سے ایک تھا، جس پر ریشمی موزوں اور سر پر وائلن سجا کر حملے کیے گئے تھے۔D'Escoubleau نے، ایک رات اپنی عم زاد Duchess de Sourdis کو حیران کر دیا تھا، Beautreillis کی نالیوں کے دلدل میں غرق ہو گیا تھا، جہاں اس نے ڈیوک سے بچ کر بھاگتے ہوئے پناہ لی تھی۔مادام Sourdis کو جب اس کی موت کا علم ہوا تو انھوں نے اپنی خوش بو کی بوتل طلب کی، اور نمک سنگھیوں کے باعث رونا بھول گئی تھیں۔ایسے معاملات میں، وہ محبت نہیں ہوتی جو باقی رہ جائے؛ نالی اس کو خارج کر دیتی ہے۔ہیرو، Leander کی لاش کو غسل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ Thisbe اپنی ناک صاف کرنے کے بعد کہتا ہے، "Phew!" Pyramus کی موجودگی میں

۞

نابدان کا دلدل

ژاں ولژاں کو بھی ایک دلدل کا سامنا تھا۔

اس زمانے میں شانزہ ولیزے کی سطح کے نیچے ضرورت سے زیادہ ریتلی کی موجودگی کے باعث اس قسم کے دلدل عام تھے جن میں پانی کی قوت سے چلنے والی مشین سے کیے جانے والے کام بہت مشکل ہوا کرتے تھے۔ یہ ریتلی Saint-Georges کے پڑوس کی ریت سے زیادہ تھی، جس کو کنکریٹ کی بنیاد پر پتھر کی تعمیرات سے جس میں Quartier des Martyrs کی گیس ملی ہوئی مٹی کی تہوں سے ہی قابو میں لایا جا سکتا تھا، جو اتنی سیال ہوتی ہے کہ اسے Martyrs کی گیلری کے نیچے ڈھلائی سے بنائے جانے والے لوہے کے نلکوں کے ذریعے ہی لے جایا جا سکتا تھا۔ جب 1838ء میں Saint-Honore مضافات کے نیچے والی نالیاں، اس وقت جس میں ہم ژاں ولژاں کو دیکھ رہے ہیں، دوبارہ بنائی جانے کے لیے مسمار کی گئی تھیں، ریت کا دلدل، جو شانزہ ولیزے سے دریائے سین تک کی مٹی کا کام دیتا تھا، ایسی رکاوٹ کا باعث بنا تھا کہ اس کام میں تقریباً چھ ماہ کا عرصہ لگ گیا تھا، اور دریا کے کنارے رہنے والوں نے ہنگامہ برپا کر دیا تھا، بالخصوص ان لوگوں نے جو ہوٹلوں اور کرایے کی سواری گاڑیوں کے مالک تھے۔ سارا کام غیر صحت مند ہونے کے علاوہ خطرناک بھی تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہاں ساڑھے چار ماہ بارش ہوئی تھی اور دریائے سین میں تین بار سیلاب آئے تھے۔

ژاں ولژاں کو جس دلدل کا سامنا تھا وہ پچھلے دن ہونے والی بارش کے باعث ہوئی تھی۔ پتھریلا راستہ، جسے نیچے کی مٹی کا ٹھیک طرح سہارا نہیں ملا تھا، بہہ گیا تھا اور سیلاب کے پانی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ پانی جذب ہو گیا تھا، مٹی بہہ گئی تھی اور بنیاد دھنس گئی تھی۔ کس حد

تک؟ یہ جاننا ممکن نہیں۔ دوسری جگہوں کے مقابلے میں اس جگہ اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا۔ رات کا اندھیرا غار تھا اور دلدل کے گڑھے کا سامنا تھا۔

ژاں ولژاں کو محسوس ہوا کہ اس کے پیروں کے نیچے راستہ سرک رہا ہے۔ اسے اس پھسلن میں داخل ہونا پڑا تھا۔ سطح پر پانی تھا اور نیچے سیال کیچڑ۔ اور اس پر سے گزرنا اس کی مجبوری تھی۔ واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ ماریوس مر رہا تھا اور ژاں ولژاں بری طرح تھک چکا تھا۔ مزید یہ کہ نکلنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ژاں ولژاں آگے بڑھا۔ پہلے چند قدم گڑھا زیادہ گہرا محسوس نہیں ہوا تھا، مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا، تناسب کے اعتبار سے اس کے قدم گہرائی میں جاتے محسوس ہوئے۔ جلد ہی سیال کیچڑ اس کی پنڈلیوں اور پانی اس کے گھٹنوں سے اوپر پہنچ گیا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوا ماریوس کو پانی سے اوپر اپنے بازوؤں میں اٹھائے وہ آگے بڑھتا رہا۔ دلدل اب اس کے گھٹنوں تک پہنچ گیا تھا اور پانی کمر تک۔ واپسی ممکن نہیں تھی۔ اس کیچڑ میں، جو ایک آدمی کے لیے بہت تھا، ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کا بوجھ گزر نہیں سکتا تھا۔ ماریوس اور ژاں ولژاں اگر الگ الگ ہوتے تو ان کے نکل جانے کا امکان ہوتا۔ ژاں ولژاں آگے بڑھتا رہا اور مرتا ہوا آدمی، جو اب شاید میت بن چکا تھا اس کے بازوؤں میں تھا۔

پانی اس کے بغل تک پہنچ گیا؛ اسے محسوس ہوا کہ وہ غرق ہو رہا ہے؛ دلدل کی اس گہرائی میں آگے بڑھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ دلدل کی دبازت بھی، جو اس کا سہارا تھی، رکاوٹ بنتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی ماریوس کو پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے تھا، اور ناقابلِ بیان قوت سے وہ آگے بڑھ رہا تھا؛ مگر ساتھ ہی وہ غرق بھی ہوتا جا رہا تھا۔ اب صرف اس کا سر پانی سے اوپر رہ گیا تھا اور دونوں ہاتھ اوپر تھے جو ماریوس کو اٹھائے ہوئے تھے۔ ہم نے طوفانِ نوح کی قدیم تصاویر میں ایک ماں کو اس طرح اپنے بچے کو اٹھائے دیکھا ہے۔

وہ مزید گہرائی میں چلا گیا، اس نے پانی سے بچنے اور سانس لینے کے لیے اپنا سر پیچھے کی جانب کر لیا تھا؛ اگر کوئی اسے اس اندھیرے میں دیکھ سکتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس نے سایوں پر تیرتا ہوا نقاب دیکھ لیا ہے، اور اسے ماریوس کا ڈھلکتا ہوا سر اور نیلگوں چہرہ نظر آجاتا۔ ژاں ولژاں نے بڑی مشکل سے اپنا قدم آگے بڑھایا؛ اور اچانک اس کا پیر کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا؛ اسے ایک سہارا ملا، جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔

وہ سیدھا کھڑا ہوا، اور ایک قسم کے غصے کے عالم میں سہارے پر اپنا پیر جما لیا۔ یہ سہارا اس سیڑھی کے پہلے قدمچے کی طرح تھا جو اسے زندگی کی طرف واپس لے جا رہا تھا۔

یہ سہارا جو اس بلند ترین لمحے اسے دلدل میں فراہم ہوا تھا، وہ جگہ تھی جہاں سے نالیوں کے پانی کو مختلف سمتوں میں بہانے کے لیے سنگی راستے بنائے گئے تھے، جو سیلاب کے باعث بیٹھ گیا تھا مگر بہا نہیں تھا اور پانی کے اندر ایک تختے کی طرح مڑ گیا تھا۔ مضبوطی سے بنائے گئے سنگی راستے حجرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ان میں اس قسم کی مضبوطی آ جاتی ہے۔ جزوی طور پر پانی میں ڈوبے ہوئے حجرے کا یہ ٹھوس ٹکڑا وقتی طور پر ایک ڈھلان سا بن گیا تھا؛ اس ڈھلان پر قدم پڑتے ہی وہ محفوظ ہو گیا تھا۔ ژاں ولژاں اس ڈھلان پر چڑھ گیا اور دلدل کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔

جیسے ہی وہ پانی سے ابھرا، ایک پتھر سے ٹکرایا، اور گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ وہ تھوڑی دیر تک پڑا کچھ سوچتا رہا؛ اس کا نفس خدا سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا تھا۔

وہ ہانپتا کانپتا، لرزتا، بدبو میں نہایا، مرتے ہوئے آدمی کے نیچے جھکا، جسے وہ گھسیٹ رہا تھا۔ ہر شے سے کیچڑ ٹپک رہا تھا، اور اس کا نفس ایک عجیب قسم کی روشنی سے بھر گیا تھا۔

۞

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا

وہ ایک بار پھر اپنے راستے چل پڑا۔

اگرچہ اس نے اپنی زندگی نالیوں کے دلدل میں چھوڑ نہیں دی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کی ساری قوت وہیں رہ گئی تھی۔ اتنی زبردست کوشش نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اب اس کی سستی اس درجے بڑھ گئی تھی کہ ہر تین چار قدم چلنے کے بعد سانس لینے کے لیے اسے رُک کر دیوار کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اک بار تو اسے نالیوں کے کنارے بیٹھ جانے پر مجبور ہونا پڑ گیا تھا، تاکہ وہ ماریوس کے بوجھ کی کیفیت تبدیل کر سکے؛ اور وہ سمجھا کہ اب اسے وہیں رہنا پڑے گا۔ اس کی توانائی مر گئی تھی، مگر ہمت نہیں مری تھی۔

وہ نا اُمیدی کے عالم میں چل رہا تھا؛ تقریباً بغیر سانس لیے ایک سو قدم چلا ہوگا، کہ اچانک اسے ایک دیوار کا سامنا ہوا۔ وہ دراصل ایک موڑ تھا نالیوں کا اور سر جھکائے چلتے ہوئے وہ اس موڑ تک پہنچا تھا کہ دیوار سامنے آ گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بلند کیں، تھوڑی دور سامنے اسے روشنی کا احساس ہوا۔ وہ روشنی کا وقت نہیں تھا؛ اچھی، سفید روشنی تھی۔ وہ سورج کی روشنی تھی۔ ژاں ولیواں کو باہر نکلنے کا راستہ نظر آ گیا۔

ایک مردود نفس، جو کسی بھٹی کے درمیان ہو، اور اسے Gehenna تو ریت کے مطابق

یہ ایک وادی کا نام تھا جہاں Moloch خدا کے لیے بچے قربان کیے جاتے تھے۔ اس لیے اس کو جہنم کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

سے باہر نکلنے کا راستہ نظر آ جائے تو اس کا وہی تجربہ ہوگا جیسا ژاں ولیواں کو محسوس ہوا تھا۔ وہ نفس اپنے جلے ہوئے بازوؤں کے تحفظ کی مدد سے فوراً اس روشن ڈیوڑھی کی طرف پرواز کرے گا۔ ژاں ولیواں کو اب اپنی تھکن کا احساس نہیں تھا، اسے ماریوس کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا،

اسے اپنے پاؤں فولاد سے بنے محسوس ہو رہے تھے، چلنے کے بجائے وہ دوڑ رہا تھا۔ جوں جوں وہ دہانے کے قریب ہوتا جا رہا تھا راستہ زیادہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک نوکیلی محراب تھی، جو رفتہ رفتہ تنگ ہوتی جا رہی تھی، گیلری سے بھی زیادہ تنگ، جو آگے چل کر ایک سرنگ کے اندرون کے بجائے قیف جیسی ہو گئی تھی۔ یہاں ایک تعمیراتی نقص تھا جو کسی قید خانے کے لیے منطقی ہو سکتا ہے، مگر زیرِ زمین نابدان کے لیے غیر منطقی تھا، جسے اب درست کیا جا چکا ہے۔

ژاں ولژاں دہانے پر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر وہ رُک گیا۔

وہ یقیناً دہانہ تھا، مگر وہ باہر نکل نہیں سکا۔

محراب ایک بھاری سی جالی کے دروازے سے بند تھی، جو اپنے زنگ آلود قلابوں پر شاید ہی کبھی کھولا گیا ہوگا۔ اس میں ایک موٹا سا تالا لگا تھا جو زنگ کے باعث سُرخ ہو کر بڑی سی اینٹ جیسا لگ رہا تھا۔ کنجی کے لیے بنا سوراخ دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک موٹی سے چپٹی فولاد سے بنی پٹی کے اندر دھنسی ہوئی تھی۔ دروازے میں دہرا تالا لگا تھا۔ یہ تالا پیرس کے قید خانوں کے پسندیدہ تالوں جیسا تھا۔

جالی سے پرے کھلا میدان تھا، دریا تھا، دن کی روشنی تھی، ساحل تھا، تنگ راستہ تھا مگر فرار کے لیے کافی تھا۔ دور کشتیوں سے سامان اتارنے کے گھاٹ تھے، پیرس تھا، ایک خلیج تھی جس میں کوئی بھی آسانی سے غائب ہو سکتا تھا، وسیع افق تھا، آزادی تھی۔ دائیں جانب، جدھر دریا کا پانی بہتا تھا، Jena کا پُل دیکھا جا سکتا تھا، بائیں جانب جدھر سے دریا میں پانی آتا تھا Invalides کا پُل تھا؛ یہ جگہ رات میں انتظار کرنے اور فرار ہونے کے لیے سازگار ہوتی۔ یہ پیرس کے سنسان ترین مقامات میں سے تھا؛ اس کا کنارہ Grand-Caillou کے مقابل تھا۔ جالی کی سلاخوں کے درمیان سے مکھیاں داخل خارج ہو رہی تھیں۔

اس وقت شام کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا۔

ژاں ولژاں نے ماریئس کو دیوار کے قریب لٹا دیا، اس کے بعد وہ جالی کی طرف گیا اور اس کے سلاخوں کو دونوں مٹھیوں میں پکڑ کر ہلانا شروع کیا۔ سلاخوں کو زور زور سے جھٹکے دیے مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ جالی بدستور اپنی جگہ قائم رہی۔ ژاں ولژاں نے ایک کے بعد دوسری سلاخ کو پکڑا، اس اُمید پر کہ کسی کم ٹھوس سلاخ کو توڑ کر اس کی مدد سے تالا توڑ سکے گا۔ کوئی سلاخ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ رُکاوٹ ناقابلِ تسخیر تھی۔ پھاٹک کھولنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

تو کیا وہ وہیں ٹھہرا رہے؟ وہ کیا کر سکتا تھا؟ اس کا کیا حشر ہوگا؟ اس میں اتنی توانائی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ الٹے قدم واپس جاتا، اور وہی سفر پھر اختیار کرتا جدھر سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ، وہ اس دلدل کو کس طرح پار کرے جس کے نکل آنا معجزے سے کم نہیں تھا؟ دلدل کے بعد، کیا وہاں پولیس گشت نہیں ہوگی، جس سے کسی طرح بھی بچا نہیں جا سکتا تھا۔ اور پھر، وہ جائے گا کہاں؟ اسے کس طرف جانا چاہیے؟ ڈھلان اسے ہدف کی طرف نہیں لے جائے گی۔ اور اگر وہ کسی اور دہانے پر پہنچ بھی گیا تو وہ بھی جالی سے بند ہوگا۔ یقینی طور پر ہر دہانہ اسی طرح بند کیا گیا ہوگا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ دہانہ کھلا مل گیا تھا، جہاں سے وہ داخل ہوا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس نظام کا ہر دہانہ اسی طرح بند ہوگا۔ وہ فرار ہو کر صرف ایک قید خانے میں پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ جو کچھ بھی ژاں ولژاں نے کیا بے کار گیا۔ مکمل ناکامی پر ختم ہوئی تھی۔

وہ دونوں موت کے خوف ناک جال میں پھنس گئے تھے اور ژاں ولژاں کو ایک خوف ناک مکڑی سیاہ جال میں دوڑتی اور سایے میں کلبلاتی محسوس ہوئی۔ اس نے جالی کی طرف اپنی پشت کر لی اور فرش پر گر گیا، بیٹھنے کے بجائے خود کو زمین پر گرا دیا، ماریوس کے قریب، جو اب بھی بالکل بے حرکت تھا۔ اس نے اپنا سر اپنے گھٹنوں میں دے لیا۔ یہ اذیت کا آخری قطرہ تھا۔

اس ذہنی دباؤ کی کیفیت میں وہ کس بارے میں سوچ رہا تھا؟ نہ اپنے بارے میں، نہ ماریوس کے بارے میں، وہ صرف کوزیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

۞

کوٹ سے پھاڑا ہوا ٹکڑا

اس ناطاقتی کے درمیان اس کے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا، اور کسی نے دھیمی آواز میں اس سے کہا،

""آدھا آدھا۔""

اس اندھیرے میں اور ایک آدمی؟ اس جیسا کوئی خواب نہ ہوگا۔ ژاں ولژاں سمجھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا؟ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔

آدمی نیلے رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھا؛ اس کے پاؤں ننگے تھے؛ اپنے جوتے بائیں ہاتھ میں لیے تھا؛ بظاہر اس نے ژاں ولژاں تک پہنچنے کے لیے جوتے اتار لیے تھے تاکہ اسے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے۔

ژاں ولژاں نے ایک لمحے کو بھی تذبذب نہیں کیا۔ یہ سامنا بالکل غیر متوقع تھا کہ وہ اس آدمی سے واقف تھا۔ وہ آدمی تھیں آردیے تھا۔

حالاں کہ وہ جگایا گیا تھا، حیرتوں کا عادی ژاں ولژاں جو ایسے غیر متوقع صدموں کے لیے فولاد کے مانند تھا فوراً پوری حاضر دماغی کی کیفیت میں واپس آ گیا۔ مزید یہ کہ اس کے لیے حالات اس سے زیادہ خراب نہیں ہو سکتے تھے کہ مخصوص درجے کی پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ بڑھنے کے قابل نہیں ہوتیں، اور اس رات جیسی سیاہی میں تھیں آردیے خود بھی کچھ اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک وقتی وقفہ آ گیا۔

تین آردیے نے اپنے ماتھے تک اپنا دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے ایک سائبان سا بنایا،
پھر اس نے بار بار اپنی پلکیں جھپکائیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے ہونٹوں کو ہلکی سے حرکت دی،
جس کا مطلب کسی آدمی کی طرف ذہانت بھری توجہ دینا ہوتا ہے جو دوسرے آدمی کو پہچاننے کی
کوشش کر رہا ہو۔ وہ کامیاب نہیں ہوا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی بتایا ہے، ژاں ولژاں روشنی کی جانب
اپنی پشت کیے ہوئے تھا؛ اس کے علاوہ اس کی شکل اتنی بگڑ گئی تھی، کیچڑ میں اتنا لت پت تھا، اس
کے جسم سے اتنا خون بہہ رہا تھا کہ وہ دوپہر کی روشنی میں بھی پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس،
جالی سے آنے والے کا چہرہ روشنی میں ہیسے کے رنگ جیسا نظر آرہا تھا۔ عام استعارے کے زبان میں
کہا جائے تو، تین آردیے، فوراً ژاں ولژاں کی آنکھوں میں گھس گیا تھا۔ حالات کی ناہمواری ژاں
ولژاں کے لیے فائدہ مند رہی اور ان دو آدمیوں کے درمیان شروع ہونے والے پُراسرار مقابلے میں
اس کا پلڑا بھاری رہا۔ نقاب پوش ژاں ولژاں اور بے نقاب تین آردیے کے درمیان مقابلہ تھا۔

ژاں ولژاں فوراً سمجھ گیا کہ تین آردیے اسے پہچان نہیں سکا ہے۔ تھوڑی دیر تک اس
آدھے اندھیرے میں دونوں نے ایک دوسرے کا معائنہ کیا، اس طرح جیسے ایک دوسرے کی پیمائش
کر رہے ہوں۔ تین آردیے پہلا شخص تھا جس نے خاموشی توڑی۔ ''تم باہر کس طرح نکلو گے؟''

ژاں ولژاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تین آردیے نے گفتگو جاری رکھی۔ ''اس پھاٹک
کا تالا توڑنا ممکن نہیں۔ پھر بھی تمھیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ژاں ولژاں نے کہا۔

''اچھا، تو پھر آدھا آدھا۔''

''تمھارا مطلب؟''

''تم نے اس آدمی کو مار ڈالا ہے؛ مگر کوئی بات نہیں۔ میرے پاس کنجی ہے۔'' تین
آردیے نے ماریوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گفتگو آگے بڑھائی۔ ''میں تم سے واقف نہیں،
مگر میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم ضرور میرے دوست ہو گے۔''

ژاں ولژاں اس کی بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ تین آردیے اس کو قاتل کہہ رہا تھا۔

تین آردیے نے گفتگو جاری رکھی، ''سنو، کامریڈ! تم نے اس شخص کو یہ دیکھے بغیر قتل کر دیا
کہ اس کی جیبوں میں کیا کچھ تھا۔ مجھے آدھا حصہ دو۔ میں تمھارے لیے یہ دروازہ کھول دوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک بڑی سی کنجی نصف نکالتے ہوئے،
اضافہ کیا، کیا تم دیکھنا چاہتے ہو کہ آزادی کیسے حاصل کی جاتی ہے؟ ادھر دیکھو۔''

ژاں ولژاں "بیوقوف بنا" رہا۔ یہ کنایہ فرانسیسی ڈراما اور طنز نگار Corneille سے مخصوص ہے۔ اس درجے تک کہ اسے شبہ ہونے لگا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے واقعی وہ حقیقت ہے۔ یہ مآل اندیشی تھی جو خوف ناک بھیس میں اس کے سامنے تھی اور اس کے اندر کا فرشتہ تین آردیے کے روپ میں زمین سے نکل آیا تھا۔

تین آردیے نے اپنا ہاتھ اپنے بلاؤز کے نیچے چھپی ایک چور جیب میں داخل کیا، ایک رسی نکالی اور ژاں ولژاں کو پیش کر دی۔

"ٹھہرو۔" اس نے کہا، "میں تمھیں یہ رسی باندھنے کے لیے دے رہا ہوں۔"

"رسی کس لیے؟"

"تمھیں ایک پتھر کی بھی ضرورت ہو گی، مگر وہ تمھیں باہر مل جائے گا۔ وہاں بڑا سا ڈھیر موجود ہے۔"

"میں پتھر لے کر کیا کروں گا؟"

"احمق! تمھیں اس کو دریا میں پھینکنے کے کام آئے گا؛ تمھیں ایک پتھر اور ایک رسی کی ضرورت ہو گی ورنہ یہ پانی پر تیرنے لگے گا۔"

ایسا کوئی شخص نہیں جو اس طرح پیش کی ہوئی کسی چیز کو لینے کے لیے میکانکی انداز میں اپنا ہاتھ بڑھا نہ دے۔

تین آردیے نے چٹکی بجائی، گویا اچانک اس کے ذہن میں کوئی خیال آ گیا تھا۔

"اوہ، ادھر دیکھو کامریڈ! تمھیں اس غلاظت کے تالاب سے اس طرح برآمد ہونے کی کیوں سوجھی؟ میں تو اس قسم کا خطرہ مول لینے کا تصور بھی نہیں کر سکا ہوں۔ چھی چھی، تم سے تو بدبو بھی آ رہی ہے۔"

ایک وقفے کے بعد اس نے مزید کہا،

"میں تم سے سوال کر رہا ہوں، تمھیں پورا حق ہے کہ جواب نہ دو۔ یہ تمھارے لیے تفتیش کرنے والے مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے لعنتی چوتھائی گھنٹے کی تربیت ہے۔ اور اس کے بعد تم بات بھی کرو گے تو زیادہ بات کرنے کا خطرہ مول نہ لو گے۔ کوئی بات نہیں، چوں کہ میں تمھارا چہرہ دیکھ نہیں سکتا ہوں اور چوں کہ مجھے تمھارا نام بھی نہیں معلوم، تم اس قیاس میں بالکل غلط ہو گے کہ میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تم کیا چاہتے ہو۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تم اس شخص سے ناراض ہو گئے تھے؛ اب تم اسے ٹھکانے لگانا چاہتے ہو۔ تمھیں یہ دریا

درکار ہے جو غلطیوں کا سب سے بڑا چھپانے والا ہوتا ہے۔ میں تمھیں بچا لوں گا۔ چٹکی بجاتے کسی اچھے آدمی کو بچا لینا میرے لیے بال برابر کام ہے۔"

وہ ژاں ولژاں کی خاموشی کے باوجود اسے بات کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ اس کا ناک نقشہ دیکھنے کی کوشش میں اس کے شانے ہلائے، اور لہجہ سخت کیے بغیر اونچی آواز میں کہا "دلدل تمھارے سامنے تھا۔ تم توانا انسان ہو۔ تم نے اس آدمی کو اس میں پھینک کیوں نہیں دیا؟"

تھن آردیے نے اس چیتھڑے کو ایک طرف کرتے ہوئے، جو اس کی گردن میں گلوبند کی طرح لپٹا ہوا تھا، اور جس میں وہ ایک سنجیدہ انسان لگ رہا تھا، کہا:

"بہر حال، تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں کام کرنے والے جب اس جھروکے کو بند کرنے آئیں گے تو اس مردے کو یہاں پڑا پائیں گے؛ اس بات کا بہت امکان ہے کہ وہ دھاگے دھاگے، تنکے تنکے، تمھاری خوشبو تلاش کرتے تم تک پہنچ جائیں گے، کہ ان نالیوں سے کوئی گزرا ضرور ہے۔ کون ہے وہ؟ وہ نکلا کہاں سے؟ کیا کسی نے اسے باہر نکلتے دیکھا ہے؟ پولیس والے بہت چالاک ہوتے ہیں۔ زیر زمین نالیاں غدار ہوتی ہیں، ساری کہانیاں سنا دیتی ہیں۔ اس قسم کی دریافت کبھی کبھی ہی ہوا کرتی ہے؛ بہت کم لوگ ہیں جو نالیوں کو اپنے اس کام کے لیے استعمال کرتے ہیں، جب کہ دریا موجود ہے جو عوام الناس کے لیے ہوتا ہے۔ دریا ہی سب سے اچھی قبر ہو سکتا ہے۔ ماہ کے آخر میں وہ Saint-Cloud میں جال ڈالتے تو تمھارا آدمی نکل آتا۔ اس کی کون پروا کرتا؟ سڑا ہوا گوشت! اس آدمی کو کس نے قتل کیا ہے؟ پیرس نے۔ اور پھر انصاف والے تفتیش نہیں کرتے۔ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔"

تھن آردیے نے جتنی فضول گوئی کی، ژاں ولژاں نے اتنی ہی خاموشی کا مظاہرہ کیا۔

تھن آردیے نے ایک بار پھر اس کا شانہ ہلایا، "آؤ، اب ہم کام کی بات کرتے ہیں۔ آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں۔ تم نے میری کنجی دیکھ لی ہے، اب تم مجھے اپنی دولت دکھاؤ۔" تھن آردیے منہ زور تھا، خوں خوار تھا، شک کر رہا تھا، دھمکیاں دے رہا تھا، پھر بھی دوستانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔

ایک غیر معمولی بات ضرور تھی؛ تھن آردیے کا انداز کار سادہ نہیں لگ رہا تھا؛ وہ مکمل طور پر پُرسکون نہیں تھا؛ جذبات ابھارنے پر قادر ہونے کے باوجود وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا؛ وقتاً فوقتاً وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بڑبڑاتا اور "ہُشش" کہتا۔ خدا جانے وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ ان دو کے علاوہ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ ژاں ولژاں سمجھا کہ اس کے بدمعاش ساتھی قریب ہی کسی

کونے میں چھپے ہوں گے اور شاید تین آردیے نے ان کو شریک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

تین آردیے نے مزید کہا،" آؤ، اب ہم آپس میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس کے پاس کتنی رقم تھی؟"

ژاں ولژاں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔

قاری کو یاد ہوگا کہ ژاں ولژاں کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنی جیب میں کچھ نقدی رکھتا تھا۔ غمگین زندگی والے خود پرست لوگ، جیسا کہ وہ تھا، اس عادت کو اپنے لیے قانون بنا لیتے ہیں، مگر اس موقعے پر وہ اس تیاری سے چوک گیا تھا۔ پچھلی شام نیشنل گارڈ کی وردی پہنتے ہوئے، اپنی مصروفیتوں کے باعث اپنا بٹوہ لینا بھول گیا تھا۔ اس کی خفیہ جیب میں اس وقت صرف کچھ سکے پڑے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی غلاظت بھری جیب الٹ دی، اور جو کچھ تھا تہ خانے کی دیوار کے پاس انڈیل دیا۔ اس میں ایک[سونے کا سکہ] louis d'or تھا، پانچ فرانک کے دو سکے تھے، اور پانچ یا چھ عدد بڑے سو کے سکے تھے۔

تین آردیے نے ایک خاص انداز میں اپنی گردن گھمائی اور اپنا نچلا ہونٹ باہر نکالا۔

" تو تم نے اسے بہت سستا مار ڈالا۔" اس نے کہا۔

اس نے دوستانہ انداز میں ژاں ولژاں اور ماریوس کی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں۔ ژاں ولژاں نے، جو جان بوجھ کر اپنی پشت اندر آتی روشنی کی طرف رکھنا چاہتا تھا، اسے جو چاہتا تھا کرنے دیا۔

جس وقت وہ ماریوس کے کوٹ کی تلاشی لے رہا تھا، گرہ کٹ کی سی ہنر مندی سے اور ژاں ولژاں کی آنکھ بچا کر اس نے کوٹ سے ایک پٹی پھاڑ لی اور اپنے بلاؤز کے نیچے چھپائی تھی، شاید یہ سوچ کر کہ کپڑے کا یہ ٹکڑا شاید مارے گئے آدمی اور مارنے والے کی شناخت میں کام آجائے۔ بہرحال اسے تیس فرانک سے زیادہ نہیں ملا۔

" یہ سچ ہے۔" اس نے کہا،" کہ تم دونوں کے پاس اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

اور اپنے مقولے" آدھا آدھا" کو بھلا کر اس نے پوری رقم اپنے پاس رکھ لی۔

سو کے بڑے سکوں کے بارے میں کچھ تذبذب کیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بھی اپنے پاس رکھ لیے، بڑبڑاتے ہوئے،" کوئی بات نہیں، تم لوگوں کے گلے بہت سستے کاٹتے ہو۔"

اس کے بعد اس نے اپنے بلاؤز کے اندر سے بڑی کنجی ایک بار پھر نکالی۔" اب، میرے دوست تمھیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ یہاں جوئے خانے کی طرح ہوتا ہے، باہر نکلتے

وقت کچھ دینا پڑتا ہے۔ تم نے دے دیا ہے، اب دفع ہو جاؤ۔" اور پھر وہ ہنسنے لگا۔

ایک اجنبی کو کنجی کی مدد فراہم کرنے، اس کے علاوہ ایک اور آدمی کے دروازے سے نکل جانے میں صرف ایک قاتل کے فرار ہو جانے کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں تھا؟ ہمیں اس پر شبہ ہے۔

تین آردیے نے ماریوس کو اوپر لادنے میں ژاں ولژاں کی مدد کی، اس کے بعد وہ خود پنجوں کے بل اور ننگے پاؤں جالی طرف چلا اور ژاں ولژاں کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کرنے کے بعد، جھانک کر باہر دیکھا، اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور چند سیکنڈ توقف کیا، اور اس معائنے کے ختم ہو جانے کے بعد اس نے تالے میں کنجی داخل کی۔ چٹخنی پیچھے کی طرف سرکی اور پھاٹک گھوم کر کھل گیا۔ نہ اس میں رگڑ پیدا ہوئی اور نہ کوئی آواز نکلی۔ دروازہ نہایت نرمی سے کھل گیا۔

ظاہر ہوا کہ اس پھاٹک اور اس میں لگے قلابوں میں باقاعدہ تیل ڈالا جاتا تھا، اور قیاس سے کہیں زیادہ بار یہ کھولا بند کیا جاتا تھا۔ اس کی نرمی پر شبہ ہوا؛ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رات میں گھومنے پھرنے اور بھیڑیوں کی چال چلنے والے مجرم اس کو استعمال کیا کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ نالیاں کسی پُراسرار گروہ کی مددگار ہیں۔ یہ خاموش جنگلا چوری کے مال کو حاصل کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

تین آردیے نے پھاٹک ذرا سا کھولا، اتنا کہ اس میں سے ژاں ولژاں نکل سکے؛ جنگلے کو دوبارہ بند کیا؛ کنجی کو دو بار گھمایا اور سانس کے علاوہ کسی قسم کی آواز کیے بغیر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ وہ چیتے کی طرح مخملیں پنجوں کے بل چلتا محسوس ہو رہا تھا۔

ایک لمحے بعد، وہ ڈراؤنی عاقبت اندیشی، اخفا میں لپٹا ہو گئی تھی۔

ژاں ولژاں اب کھلی فضا میں تھا۔

۞

مردے جیسا ماریوس

ژاں ولژاں نے ماریوس کو ساحل پر پھسل جانے دیا۔

اب دونوں کھلی فضا میں تھے۔

بدبو، اندھیرا اور خوف پیچھے رہ گئے۔ خالص، صحت مند، زندہ، خوش رکھنے والی ہوا جس میں آسانی سے سانس لی جا سکتی تھی، اس پر پوری طرح طاری ہو گئی تھی۔ ہر طرف، اس کے اطراف خاموشی کا راج تھا، ویسی دل رُبا خاموشی جب بادلوں سے خالی نیلے آسمان میں سورج ڈوب جاتا ہے۔ شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا؛ سب سے بڑی نجات دہندہ رات، ان سب کی دوست جنھیں اندھیرے کے چھٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، آہستہ آہستہ اترتی آ رہی تھی تاکہ وہ اذیت سے فرار حاصل کر سکیں۔ آسمان میں ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ دریا اس کے قدموں میں بوسے کی آواز کی طرح آہستگی سے رواں تھا۔ شانز ولیزے پر ایستادہ دیودار کے درختوں میں بنے آشیانوں کا ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے والا فضائی مکالمہ سنائی دے رہا تھا۔ چند ستارے نقطۂ عروج کی ہلکی نیلگوں وسعتوں میں نزاکت سے چھید کرتے ہوئے، جو صرف مراقبے کی کیفیت میں نظر آتے ہیں، بے کرانی کے درمیان ناقابلِ ادراک جلوے پیش کر رہے تھے۔ لاانتہا کی تمام تر مٹھاس کے ساتھ شام ژاں ولژاں کے اوپر اپنے پر پھیلا رہی تھی۔

یہی وہ نتھیں اور مذبذب لمحہ تھا جو نہ ہاں کہتا ہے نہ ہی ناں۔ رات اتنی گزر چکی تھی جس میں تھوڑے فاصلے پر بھی آدمی گم ہو جاتا ہے؛ پھر بھی اتنی روشنی باقی تھی جس میں قریب کے آدمی کو پہچانا جا سکتا تھا۔

کئی سیکنڈ تک ژاں ولژاں اس بہلانے والے سکون میں کھویا رہا؛ ایسے فراموشی کے

لمحات آدمیوں پر آتے رہتے ہیں؛ جب دُکھ بدنصیب لوگوں کو پریشان کرنے سے پرہیز کرتا ہے؛ خیالات میں گم امن کے خواب دیکھنے والوں پر رات روشنی کی طرح طاری ہو جاتی ہے؛ دھند کے تلے مسکراتا نیلی آسمان جگمگاتا ہے اور روح تاروں سے مزین ہو جاتی ہے۔ ژاں ولژاں اس واضح سایے پر غور کرنے سے باز نہیں رہ سکا جو اس کے اوپر ٹھہر گیا تھا؛ وہ سرمستی اور دعاؤں کے ابدی اور شان دار خاموشی کے سمندر میں نہا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے ماریوس کی طرف جھکا اس طرح جیسے اسے کسی فرض کا خیال آگیا تھا، اور اپنے چلو میں پانی لے کر ماریوس کے چہرے پر چھڑکاؤ کیا۔ ماریوس کی پلکیں تو نہیں کھلیں مگر اس کا ادھ کھلا منہ اب بھی سانسیں لے رہا تھا۔

ژاں ولژاں ایک بار پھر دریا میں اپنا ہاتھ ڈالنے والا تھا کہ اچانک اسے ایک ناقابلِ بیان شرمندگی کا احساس ہوا، ایسا جو آدمی کو اس وقت محسوس ہوتا ہے جب کوئی اس کے عقب میں ہوتا ہے جسے وہ دیکھ نہیں سکتا۔

ہم پہلے بھی کنایے میں اس تصور کا اظہار کر چکے ہیں، ہر شخص جس کا عادی ہوتا ہے۔

وہ پلٹا۔ واقعی، کوئی اس کے عقب میں تھا۔ ایک بلند قامت انسان لمبے سے کوٹ میں ملبوس ہاتھ باندھے اپنی مٹھی میں لوہے کی کیلوں کا جڑا ڈنڈا پکڑے، جس کا سیسے کا بنا سرا صاف نظر آرہا تھا، اس جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا جہاں ژاں ولژاں ماریوس پر جھکا ہوا تھا۔ اندھیرے میں وہ آسیب جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی عام انسان ہوتا تو دھند میں اس طرح ڈنڈا سنبھالے کسی آدمی کو دیکھ کر چونکتا ہو جاتا۔ ژاں ولژاں نے جاویر کو پہچان لیا تھا۔

بلاشبہ، قاری کو یاد ہوگا کہ تھن آردیے کا پیچھا کرنے والا جاویر ہی ہو سکتا تھا۔ پشتے سے غیر متوقع طور پر فرار ہو جانے کے بعد وہ پولیس کے اعلیٰ افسر کے پاس گیا تھا اور اس کو سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد ایک بار پھر اسے ایک مخصوص قسم کی نگرانی کے لیے شانزہ ولیزے کے قریب دریائے سین کے ساحل پر متعین کر دیا گیا تھا— قاری کو وہ رقعہ یاد ہوگا جو اس کے پاس سے ملا تھا— جہاں پولیس کی توجہ بڑھ گئی تھی وہاں اسے تھن آردیے نظر پڑا اور وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ قاری کو باقی سارے قصے کا علم ہے۔

اس طرح آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ نابدان کی جالی کا پھاٹک جو اتنی مہربانی سے ژاں ولژاں کے لیے کھول دیا گیا تھا، تھن آردیے کی چالاکی تھی۔ تھن آردیے کو الہامی طور پر محسوس ہوگیا تھا کہ جاویر وہاں موجود ہے؛ جس آدمی کی جاسوسی کی جا رہی ہو اس کی ایک خاص قسم کی خوش بو ہوتی ہے جو کبھی دھوکا نہیں دیتی؛ اس لیے ضروری تھا کہ شکاری کتے کے سامنے ایک ہڈی

پھینک دی جائے۔ قاتل — ایک نعمتِ غیر مترقبہ۔ ایسے موقعے کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ ژاں ولژاں کو باہر نکال کر تین آردیے نے اپنے بجائے پولیس کو ایک شکار فراہم کر دیا؛ خود اپنی خوش بو چھوڑ دینے پر مجبور کیا؛ ایک اور بڑے معاملے میں پھنسا کر اپنے آپ کو فراموش کر دینے پر مجبور کیا؛ جاویر کو اس کے انتظار کا اجر فراہم کر دیا، جاسوس کے لیے جو بہترین چاپلوسی ہوتی ہے؛ تیس فرانک کما لیے، اور اس ترکیب کی مدد سے اپنے فرار کو یقینی بنا لیا تھا۔

ژاں ولژاں ایک خطرے سے نکلا تو دوسرے خطرے میں گھر گیا۔ تین آردیے کے چنگل سے نکل کر جاویر کے ہتھے چڑھ جانا بہت بڑا صدمہ تھا۔ جاویر ژاں ولژاں کو پہچان نہیں سکا، جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ اب وہ اپنا جیسا نہیں لگتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ نہیں کھولے، ڈنڈے کو اپنی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑے رہا، اور ناخوش گوار مگر پُرسکون آواز میں کہا، ''کون ہو، تم؟''

''میں ہوں۔''

''میں! کون میں؟''

''ژاں ولژاں۔''

جاویر نے اپنا ڈنڈا اپنے دانتوں میں دبایا، گھٹنے موڑے، خم ہوا، اپنے دونوں توانا ہاتھ ژاں ولژاں کے شانوں پر رکھے، غور سے اس کا معائنہ کیا اور اسے پہچان لیا۔ ان دونوں کے چہرے اتنے قریب ہو گئے کہ ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔ جاویر کی نگاہ خوف ناک تھی۔ ژاں ولژاں جاویر کے قبضے میں تھا، جیسے کوئی شیر کسی جنگلی بلے کے پنجوں کی گرفت میں آ جائے۔

''انسپکٹر جاویر!'' اس نے کہا ''میں تمھارے قبضے میں ہوں۔ آج صبح سے ہی میں نے خود کو تمھارا قیدی سمجھا ہے۔ میں نے فرار ہونے کی نیت سے تمھیں اپنا پتا نہیں بتایا ہے۔ مجھے گرفتار کر لو۔ بس مجھ پر ایک مہربانی کرو۔''

ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا جاویر نے اسے سنا ہی نہیں۔ اس نے اپنی نظریں ژاں ولژاں پر جمائے رکھیں۔ اس کی ٹھوڑی سکڑی۔ اس نے اپنے ہونٹ اپنی ناک کی طرف سکیڑے جو ایک وحشیانہ انداز ہوتا ہے۔ بالآخر اس نے ژاں ولژاں کو چھوڑ دیا، سیدھا کھڑا ہو گیا، اپنے ڈنڈے کو پھر مضبوطی سے پکڑ لیا، اور اس طرح بڑبڑایا جیسے وہ خواب کی کیفیت میں سوال کر رہا ہو، ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یہ آدمی کون ہے؟''

اس نے ابھی تک ژاں ولژاں کو ''تو'' کہنے سے پرہیز کیا تھا۔

ژاں ولژاں نے جواب دیا اور اس کی آواز نے جاویر کو اس کی خواب کی سی کیفیت سے جگا دیا تھا۔

"میں تم سے اس آدمی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میرا جو چاہو حال کرو، مگر پہلے اسے اس کے گھر پہنچانے میں میری مدد کرو۔ بس تم سے اتنا ہی چاہتا ہوں۔"

جاویر کا چہرہ سکڑا، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے جب کوئی اس سے توقع کرتا ہے کہ وہ کوئی رعایت دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہر حال اس نے انکار نہیں کیا۔ جاویر ایک بار پھر جھکا، اپنی جیب سے رومال نکالا، اسے پانی سے تر کیا اور ماریوس کی خون بھری پیشانی صاف کی۔ "یہ آدمی پشتے پر تھا۔" اس نے دھیمی آواز میں اس طرح کہا گویا خود کلامی کر رہا ہو۔ "یہ وہی ہے جسے وہ لوگ ماریوس کے نام سے پکار رہے تھے۔"

اوّل درجے کا جاسوس جاویر، جس نے سب کچھ دیکھا تھا، سب کچھ سنا تھا اور ہر بات برداشت کی تھی اس وقت بھی جب وہ سمجھا کہ وہ مرنے والا ہے؛ جو اپنی اذیتوں میں بھی جاسوسی کر رہا تھا پہلے درجے کی، اس مُردے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے ماریوس کا ہاتھ پکڑا اور نبض محسوس کرنی چاہی۔

"بہت زخمی ہے۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

"مر چکا ہے۔" جاویر نے کہا۔

"نہیں، ابھی مرا نہیں ہے۔"

"تو، تم اسے پشتے سے اٹھا کر یہاں تک لائے ہو؟" جاویر نے سوال کیا۔

یقینی طور پر وہ اتنا مصروف تھا کہ اس نے نابدان کے ذریعے اسے یہاں تک لانے پر حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ ژاں ولژاں بھی اس کے سوال پر خاموش رہا تھا۔

ژاں ولژاں کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا۔ اس نے پھر کہا:

"یہ Marais میں Filles-du-Calvaire اسٹریٹ پر اپنے tt کے ساتھ رہتا ہے۔ مجھے اُس کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔"

ژاں ولژاں نے ماریوس کی جیب ٹٹولی، اس کی جیبی کتاب نکالی، اس صفحے کو کھولا جس پر ماریوس نے پنسل سے لکھا تھا، اور جاویر کے آگے بڑھا دیا۔

ابھی اتنی روشنی باقی تھی جس میں تحریر کو پڑھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ، جاویر کی آنکھوں میں شبینہ پرندوں کی سی روشنی تھی۔ اس نے وہ چند سطریں پڑھیں اور بڑبڑایا، "گلیر نورماں،

Filles-du Calvaire اسٹریٹ، نمبر 6۔"

پھر اس نے پکار کر کہا، "کوچوان!" قاری کو یاد ہوگا کہ ضرورت کے وقت کے لیے کرائے کی سواری گاڑی موجود ہوتی تھی۔

جاویر نے ماریوس کی جیبی کتاب اپنے پاس رکھ لی۔

ایک لمحے بعد، سواری گاڑی جو پانی پلانے والی ڈھلان سے اتری تھی ساحل کے قریب آ گئی۔ ماریوس کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا اور ژاں ولژاں کے ساتھ جاویر اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ دروازہ بند ہوا، گاڑی گودی کے نشیب سے ہوتی ہوئی Bastille کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئی۔

وہ گودی سے نکل کر سڑکوں پر آ گئے تھے۔ سیاہ لباس میں ملبوس کوچوان اپنے دبلے پتلے گھوڑوں کو چابک لگا رہا تھا۔ گاڑی میں برف زار جیسا سناٹا تھا۔ ماریوس کا بے حرکت جسم ایک کونے میں تھا، اس کا سر سینے پر ڈھلک گیا تھا، اس کے ہاتھ لٹک رہے تھے، اس کے پاؤں اکڑ گئے تھے، گویا وہ اپنے تابوت کا منتظر تھا۔ ژاں ولژاں سایے سے بنا محسوس ہو رہا تھا، اور جاویر پتھر کا، اور گاڑی جو اندھیرے سے بھری تھی، ہر بار جب کسی لالٹین کے پاس سے گزرتی تو اس کا بے نور اندرون چمک اٹھتا، اور الم ناک سکوت کے تین پیکر، میت، بھوت اور مجسمہ آمنے سامنے نظر آ جاتے تھے۔

۞

شاہ خرچ بیٹے کی واپسی

ہر جھٹکے پر ماریوس کے بالوں سے خون کا ایک قطرہ ٹپک جاتا۔

گاڑی Filles-du-Calvaire کے مکان نمبر 6 پر پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔

سب سے پہلے جاویر گاڑی سے اترا۔ اس نے گاڑی کے پھاٹک کے نمبر پر نظر ڈال کر یقین کر لیا اور لوہے سے بنا قدیم طرز کا بکرے کے سر اور کسی یونانی دیوتا جیسا بھاری کھٹکا کھڑکایا۔ تیز آواز پیدا ہوئی۔ پھاٹک تھوڑا سا کھلا، جاویر نے اسے دھکا دے کر کھول دیا۔ جمائی لیتے، آدھے سوتے آدھے جاگتے دربان نے اپنے ہاتھوں میں لی موم بتی کی روشنی میں جھانک کر دیکھا۔

گھر میں ہر شخص سو رہا تھا۔ Marais میں لوگ جلدی ہی سو جایا کرتے تھے، بالخصوص غدر کے زمانے میں۔ یہ اچھا خاصا قدیم علاقہ انقلاب سے خوف زدہ خواب میں پناہ لے لیتا تھا۔ جس طرح بچے کسی خیالی ڈراؤنی شے کی چاپ سنتے ہی تیزی سے اپنے سر لحاف کے اندر چھپا لیتے ہیں۔

اس دوران ژاں ولژاں اور کوچوان نے ماریوس کو گاڑی سے نکال لیا تھا، ژاں ولژاں اس کی بغل میں اور کوچوان اس کے گھٹنوں کی نیچے سے سہارا دے رہا تھا۔

جس وقت وہ ماریوس کو اٹھائے ہوئے تھے ژاں ولژاں نے اپنے ہاتھ سے اس کے لباس کے نیچے، جو پھٹا ہوا تھا، اس کے سینے کو محسوس کیا اور خود کو مطمئن کر لیا کہ اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ اب اس کی دھڑکن اتنی کم زور نہیں تھی، گویا گاڑی کی حرکت نے اس کے جسم میں زندگی کی تازگی بڑھا دی تھی۔

جاویر نے حکومت کے کارندے کے لہجے میں دربان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
''یہاں کوئی صاحب رہتے ہیں جن کا نام جیلنورماں ہے؟''

''یہاں، کیا کام ہے ان سے؟''

''ان کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔''

''ان کا بیٹا؟'' دربان نے احمقانہ انداز میں سوال کیا، ''وہ تو مر چکا ہے۔''

ژاں ولژاں نے، جس کے کپڑے مٹی میں سنے ہوئے اور پھٹے تھے، جو جاویر کے پیچھے کھڑا تھا، دربان جسے خوف کی نظروں سے دیکھ رہا تھا، اشارے سے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔

دربان نہ جاویر کو کچھ پایا تھا نہ ژاں ولژاں کا اشارہ سمجھا تھا۔

جاویر نے مزید کہا، ''یہ پشتے پر چلا گیا تھا۔ اب تمھارے سامنے ہے۔''

''پشتے پر؟'' دربان نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس نے خود کو مار لیا ہے۔ جاؤ اس کے باپ کو بیدار کرو۔''

دربان اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

''جاؤ۔'' جاویر نے اصرار کیا۔ اور مزید اضافہ کیا، ''یہاں سے کل اس کا جنازہ اٹھے گا۔''

شہر کی شاہراہوں پر ہونے والے عام واقعات کو مختلف زمروں میں منقسم کیا گیا تھا، جو کڑی نگرانی اور پیش بینی کی ابتدا ہوتی ہے، اور ہر واقعے کا اپنا الگ درجہ ہوتا ہے؛ تمام ممکنہ حقیقتیں مختلف درازوں میں ترتیب سے رکھی جاتی تھیں، اور جب ضرورت ہو تو مختلف مقدار میں نکالی جاتی تھیں؛ سڑکوں پر ہلچل میں، بغاوت میں، جشن کے اور جنازے کے مواقع پر۔

دربان نے باسک کو جگانے پر اکتفا کی۔ باسک نے نکولے کو جگایا؛ نکولے نے پھوپھی بلیر نورما کو اٹھایا۔ انھوں نے نانا کو سونے دیا، اس خیال سے کہ یہ خبر اس کے اٹھتے ہی اس تک پہنچ جائے گی۔

گھر کے کسی اور حصے میں خبر کیے بغیر ماریوس کو پہلی منزل پر لے جایا گیا اور موسیو بلیر نورما کی ڈیوڑھی میں رکھے صوفے پر لٹا دیا گیا، جب کہ باسک کسی ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گیا، اور جب نکولے چادریں نکال رہی تھی، ژاں ولژاں کو اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ وہ سمجھ گیا اور زینے سے نیچے اتر گیا۔ جاویر اس کے پیچھے تھا۔

دربان ان کو اسی طرح جاتے دیکھ رہا تھا جیسے کہ آتے وقت دیکھا تھا — خوف اور غنودگی کی عالم میں۔

وہ لوگ ایک بار پھر سواری گاڑی میں داخل ہوئے اور کوچوان اپنے بکس پر جا بیٹھا۔

''انسپکٹر جاویر!'' ژاں ولژاں نے کہا ''ایک اور مہربانی کیجیے۔''

"آپ کیا چاہیے؟" جاوید نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"مجھے تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر جانے دیجیے۔ اس کے بعد جو چاہے میرے ساتھ کیجیے گا۔"

اپنی ٹھوڑی کوٹ کے کالر میں چھپائے جاوید چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے سامنے کا شیشہ نیچے سرکایا۔ "ڈرائیور" اس نے کہا "l'Homme Arme اسٹریٹ، مکان نمبر 7۔"

❁

حیرت کی انتہا

سفر کے دوران دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔

ژاں ولژاں کیا چاہتا تھا؟ وہ سب کچھ ختم کر دینا چاہتا تھا جو شروع ہوا تھا: کوزیٹ کو تنبیہ کرنا اور یہ بتانا چاہتا تھا کہ ماریئس کہاں ہے اور ممکن ہو تو کچھ آخری کام بھی نمٹانا چاہتا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنا سوال تھا، سب کچھ ختم ہو چکا تھا: وہ جاویر کے ہاتھوں میں تھا اور اس نے مزاحمت بھی نہیں کی تھی! ایسے حالات میں اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے، اس رسی سے متعلق جو تین آردیے نے اسے فراہم کی تھی، اور پہلی کوٹھڑی کی سلاخوں کے بارے میں جس میں اسے داخل ہوا تھا: مگر ہم قاری پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ بشپ سے ملنے کے بعد سے ژاں ولژاں میں تشدد کی موجودگی میں تذبذب کرنے کی عادت پڑ گئی تھی، خاص کر ایسی صورت میں جب وہ خود بھی تشدد کا نشانہ بن رہا ہو۔

خودکشی یا تشدد دونوں، اور نامعلوم کے خلاف، وہ پُر اسرار عمل ہے جس میں کسی حد تک روح کی موت بھی ہو سکتی ہے، اور یہ ژاں ولژاں کے لیے ناممکن تھے۔

l'Homme Arme اسٹریٹ میں داخل ہوتے ہی سواری گاڑی رُک گئی، اس لیے کی راستہ اتنا تنگ تھا کہ اس میں سواری گاڑی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ جاویر اور ژاں ولژاں گاڑی سے برآمد ہوئے۔

کوچوان نے نہایت انکسار سے ''موسیو انسپکٹر'' سے کہا تھا کہ اس کی گاڑی میں لگے Utrecht کے مخمل پر مقتول آدمی کے خون کے اور قاتل کے کپڑوں میں لگے دلدل کے دھبے لگ گئے ہیں۔ وہ اس مسئلے کو اسی طرح سمجھا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ اس کی تلافی واجب ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے سرٹیفکیٹ کی کتاب نکالی اور انسپکٹر سے التجا کی کہ وہ اس پر

چند الفاظ اپنے تاثرات کے لکھ دے۔

جاوید نے کتاب کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کوچوان سے کہا:

''کیا چاہتے ہو۔ اس میں گاڑی چلانے اور انتظار کا وقت بھی شامل کرلو۔''

''سوا سات گھنٹے ہوتے ہیں۔'' کوچوان نے جواب دیا، ''اور میرا گھوڑا بالکل نیا تھا۔ اتنی فراغت، مسٹر انسپکٹر۔''

جاوید نے اپنی جیب سے چار نپولین نکالے اور کوچوان کو روانہ کر دیا۔

ژاں ولواں کا گمان تھا کہ جاوید اسے Blancs-Manteaux کی یا Archives کی چوکی تک، جو بالکل قریب ہیں، پیدل لے جائے گا۔

دونوں سڑک پر پہنچے۔ حسب معمول سناٹا تھا۔ جاوید ژاں ولواں کے عقب میں چل رہا تھا۔ وہ سات نمبر مکان پر پہنچے۔ ژاں ولواں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھل گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' جاوید نے کہا ''اوپر چلے جاؤ۔'' اس نے حیرت انگیز انداز میں مزید کہا، گویا اُسے بولتے میں دقت ہو رہی ہو: ''میں اسی جگہ تمھارا انتظار کروں گا۔''

ژاں ولواں نے جاوید پر نظر کی۔ یہ اس کی دیرینہ عادتوں میں سے ایک تھی۔ اسے اس بات پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ جاوید کو اب اس پر اعتماد ہو گیا تھا، ویسا ہی اعتماد جو بلی کو اس چوہے پر ہو جاتا ہے جو اس کے پنجے کی پہنچ کے اندر رہتا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ژاں ولواں نے خود کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ حتمی نتیجے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اس نے دھکا دے کر دروازہ کھولا، گھر میں داخل ہوا، دربان کو آواز دی جس نے اپنے صوفے پر بیٹھے بیٹھے دروازہ کھولنے کی ڈور کھینچی تھی، ''میں ہوں!'' کہا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

پہلی منزل پر پہنچ کر رُکا۔ تمام سڑکوں پر ٹھہرنے کی جگہیں ہوا کرتی ہیں۔ زینے کی درمیانی جگہ پر اوپر سرکا کر کھولنے والی کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ بہت سے قدیم مکانات میں ان ہی کھڑکیوں سے زینوں پر روشنی بھی ہوتی ہے، اور سڑک کا نظارہ بھی۔ مکان کے سامنے لگی سڑک کی لالٹین سے کچھ روشنی زینوں پر بھی ہوتی تھی اور اس طرح روشنی کے اخراجات میں کچھ بچت بھی ہو جایا کرتی تھی۔

ژاں ولواں نے کچھ تازہ ہوا کے لیے، یا محض میکانکی طور کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ سڑک مختصر ہے اور لالٹین کی روشنی شروع سے آخر تک اسے روشن رکھتی ہے۔ ژاں ولواں کی حیرت کی انتہا نہ رہی؛ سڑک پر کوئی نہیں تھا۔

جاوید جا چکا تھا۔

نانا جان

وریان اور باسک دونوں ماریوس کو ملاقات کے کمرے میں لے گئے۔ وہ بے حس و حرکت صوفے پر لیٹا ہوا تھا؛ اسے اندر آتے ہی اس جگہ لٹا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر جسے طلب کیا گیا تھا، فوراً پہنچ گیا تھا۔ پھوپھی بلیر نورما وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

پھوپھی بلیر نورما خوف کے عالم میں آتی جاتی، اپنے ہاتھ ملتی اور کہتی، "خدایا! کیا یہ ممکن ہے؟" کبھی کبھی اس میں اضافہ بھی کرتی، "ہر طرف خون ہی خون ہو جائے گا۔" اس کی ابتدائی دہشت دور ہوئی تو اس کے ذہن میں ایک قسم کا فلسفہ داخل ہوا جو بلند آواز میں تبدیل ہو گیا تھا، "ایک دن یہی ہوا تھا۔" وہ اس حد تک نہیں گئی تھی کہ کہتی، "میں نے کہا تھا نا۔" جو اس قسم کے حالات میں عام طور پر کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے حکم پر صوفے کے برابر ایک کیمپ بیڈ تیار کیا گیا۔ ڈاکٹر نے ماریوس کا معائنہ کیا اور یہ دیکھنے کے بعد کہ اس کی نبض چل رہی ہے، کہ زخمی کی سینے پر کوئی گہرا زخم نہیں، اور یہ بھی کہ ہونٹوں کے کونوں سے بہنے والا خون اس کے نتھنوں سے نکل رہا ہے، اس نے مریض کو بغیر تکیے کے عام سے بستر پر منتقل کرا دیا اور اس کا سر بدن کی سطح پر کر دیا گیا، بلکہ تھوڑا سا نیچے کر دیا گیا، اور سینہ برہنہ کر دیا تا کہ اسے سانس لینے میں آسانی ہو۔ یہ دیکھ کر وہ ماریوس کا لباس اتار رہے ہیں میڈموزیل بلیر نورما وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مالا جپنے لگی۔

جسم میں کوئی اندرونی زخم نہیں لگا تھا: ایک گولی جیبی کتاب سے ٹکرا کر ایک طرف گھوم گئی تھی اور اس کی پسلیوں میں ایک ڈراؤنا زخم آ گیا تھا، جو زیادہ گہرا نہیں تھا، اس لیے خطرناک نہیں تھا۔ ناہموار کے طویل سفر نے ہنسلی کے اکھڑ جانے کا عمل پورا کر دیا تھا، اس کی بے ترتیبی خطرناک تھی۔ بازوؤں پر تلواروں سے کئی زخم لگے تھے۔ چہرے پر کوئی زخم نہیں آیا تھا مگر اس کا سر زخموں

سے بھرا تھا؛ سر کے زخموں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا وہ بالوں کی جڑوں تک محدود ہوں گے یا دماغ پر بھی حملہ آور ہوئے ہوں گے، ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ سب سے خطرناک علامت یہ تھی کہ ان کی وجہ سے وہ غنودگی میں چلا گیا تھا، اور یہ بھی کہ لوگ غنودگی سے ہمیشہ جاں بر نہیں ہوا کرتے۔ مزید یہ کہ، زخمی کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ پیٹے میں اس کے جسم کا نچلا حصہ زخموں سے بچ گیا تھا۔

باسک اور نکولے نے چادریں پھاڑ کر پٹیاں بنائیں؛ نکولے نے انھیں سیا، باسک نے انھیں لپیٹا۔ چوں کہ روئی دستیاب نہیں تھی فی الوقت ڈاکٹر نے کپڑوں کی تہہ سے دبا دبا کر خون روکا۔ بستر کے ساتھ ہی ایک میز تھی جس پر موم بتیاں روشن تھیں اور جراحی کے سارے آلات پھیلے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے ماریوس کے چہرے اور بال ٹھنڈے پانی سے دھوئے۔ ایک لمحے کے اندر پوری بالٹی سرخ ہو گئی۔ دربان نے، جو ہاتھ میں شمع لیے ہوئے تھا، بالٹی کا پانی باہر لے جا کر پھینکا۔

افسردگی کے عالم میں ڈاکٹر کچھ سوچ رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنا سر ہلا کر منفی اشارے کرتا، گویا وہ اپنے اندرون میں اٹھنے والے سوالات کا خود ہی جواب دے رہا تھا۔ زخمی آدمی کے لیے ڈاکٹر کے اپنے آپ سے اس قسم کے پُراسرار مکالمے بُرے اشارے ہوا کرتے ہیں۔

اس لمحے جب ڈاکٹر ماریوس کا چہرہ صاف کر رہا تھا اور اپنی انگلیوں سے اس کی بند آنکھوں کو چھو رہا تھا، ملاقات کے کمرے کے آخر کا دروازہ کھلا اور ایک قد آور بے رونق چہرے والا آدمی ظاہر ہوا۔

یہ زخمی آدمی کا نانا جان تھا۔

پچھلے دو دنوں کے غدر نے موسیو بلیر نورما کو مشتعل اور رنجور کر دیا تھا۔ پچھلی رات وہ سو نہیں سکا تھا اور سارا دن اسے بخار رہا تھا۔ شام کے وقت وہ جلد ہی سونے چلا گیا، گھر میں ہر قسم کے ہلچل پر پابندی لگا دی گئی اور تھکن کے باعث اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

عمر رسیدہ لوگ ہلکی نیند سوتے ہیں؛ موسیو بلیر نورما کی خواب گاہ ملاقاتی کمرے سے متصل تھی؛ احتیاط کے باوجود شور سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ دروازے کے نیچے سے آتی روشنی سے حیران ہو کر وہ بستر سے نکلا اور راستہ ٹٹولتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ ایک ہاتھ سے نصف وا دروازے کا دستہ پکڑے ڈیوڑھی پر حیران کھڑا تھا؛ اس کا سر آگے کی طرف جھکا ہوا اور ہل رہا تھا، اس کا جسم سفید رنگ کے شب خوابی کے گاؤن میں لپٹا تھا، اور اس کی ہیئت کسی خیالی آدمی کی طرح تھی جو مزار کے اندر کچھ دیکھ رہا ہو۔

اس نے بستر پر نظر کی، گدے پر ایک نوجوان آدمی کو دیکھا جس کے جسم سے خون بہہ رہا

تھا، جو موم کی طرح سفید تھا، آنکھیں بند تھیں، منہ کھلا تھا، ہونٹ بے رونق تھے، کمر تک برہنہ گلابی رنگ کے زخموں سے بھرا، بے حرکت اور روشنی میں نہایا ہوا تھا۔

نانا جان سر سے پاؤں تک ہڈیوں پر مشتمل ڈھانچے کی طرح لرز گیا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے عمر رسیدہ ہونے کے باعث پیلے پڑ گئے تھے اور ان پر کانچ کی سی چمکیلی نقاب پڑی ہوئی تھی؛ اس کا پورا چہرہ مٹی کے سے کاسۂ سر میں تبدیل ہو گیا تھا؛ اس کے بازو اس طرح لٹک گئے تھے گویا ان کی اسپرنگ ٹوٹ گئی ہو؛ اس کے عمر رسیدہ ہاتھوں کی انگلیاں پھیلی اور لرز رہی تھیں؛ اس کے گھٹنے سامنے سے ایک زاویے کی صورت تھے اور شب خوابی کے گاؤن کے چاک میں سے اس کے پاؤں برہنہ نظر آ رہے تھے، جن کے سارے سفید بال کھڑے تھے اور وہ بڑبڑا رہا تھا:

''ماریوس!''

''جناب!'' باسک نے کہا، ''موسیو کو ابھی لایا گیا ہے۔ وہ پشتے پر گئے تھے، اور......''

''وہ مر گیا ہے!'' بوڑھا آدمی خوف ناک آواز میں چیخا، ''ارے، بدمعاش!'' اور پھر ایک قسم کی آسیبی قلب ماہیت کے باعث یہ سو سالہ شخص کسی نوجوان آدمی کی طرح اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''جناب!'' اس نے کہا، ''آپ ڈاکٹر ہیں۔ پہلے مجھے ایک بات بتا دیجیے۔ یہ مر گیا ہے، کہ نہیں؟''

ڈاکٹر، جس کی پریشانی انتہائی درجے پر تھی، خاموش رہا۔

موسیو ژیلے نورما ایک خوف ناک قہقہے کے ساتھ اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

''یہ مر گیا ہے! مر گیا ہے! مر گیا ہے! اس نے پشتے پر اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ مجھ سے نفرت کی وجہ سے۔ اس نے یہ سب میری دشمنی میں کیا ہے۔ اُف، اے خون پینے والو! کیا یہ طریقہ ہوتا ہے واپس آنے والوں کا۔ مجھے پوری زندگی کے لیے دُکھ دے کر، یہ مر چکا ہے۔''

اس نے کھڑکی کی پَٹ کھول دیے، گویا اس کی سانس رُک رہی ہو؛ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور سڑک پر پھیلی رات کے اندھیرے سے باتیں کرنے لگا:

''چھدا ہوا، تلوار سے گھائل، زخمی، ٹکڑے ٹکڑے — ذرا دیکھو تو اس بدمعاش کو۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میں اس کے انتظار میں ہوں، کہ میں نے اس کا کمرہ بھی تیار کرا دیا تھا؛ میں نے اپنے سرہانے اس کے بچپنے کی تصویر بھی رکھ لی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اسے صرف واپس آنا ہے، کہ میں ایک عرصے سے اس کا منتظر تھا، کہ میں آتش دان کے قریب گھٹنوں پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہوں اور نہیں جانتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، کہ میں پاگل ہو رہا ہوں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمھیں

صرف واپس آ کر کہنا تھا، 'یہ میں ہوں۔' اور تم اس مکان کے مالک ہو جاتے، اور میں تمھاری اطاعت کرتا، اور تمھارا جس طرح جی چاہتا اپنے احمق نانا کے ساتھ پیش آتے۔ تم سب کچھ اچھی طرح جانتے تھے، اور تم یہ بھی کہہ سکتے تھے، 'نہیں، یہ شاہ پرست ہے، میں نہیں جاؤں گا۔' مگر تم پشتوں پر گئے، اور تم نے محض میری عداوت میں خود کو مار ڈالا۔ صرف اس بات کے انتقام میں جو میں نے موسیو Duc de Berry کے بارے میں کی تھی۔ یہ بے عزتی کی بات ہے۔ بستر میں جاؤ اور سکون سے سو جاؤ۔ وہ مر گیا ہے، اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جگا دیا ہے۔"

ڈاکٹر، جسے ذرا سکون ہو گیا تھا ایک لمحے کے لیے وہاں سے ہٹا، موسیو جلیر نورماں کے پاس گیا اور اس کا بازو تھام لیا۔ نانا جان اس کی جانب مڑا، خون جیسی سرخ بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور اطمینان سے اس سے کہا:

"جناب میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں بالکل پُر سکون ہوں، میں مرد ہوں، میں نے لوئی شانز دہم کو مرتے دیکھا ہے؛ میں جانتا ہوں کہ حالات کو کس طرح برداشت کیا جاتا ہے۔ خوف ناک بات یہ ہے کہ یہ سب آپ لوگوں کے اخبارات ہی ہیں جو ساری خرابیوں کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس لکھنے والے ہیں، باتیں کرنے والے ہیں، وکیل ہیں، خطیب ہیں، مباحث ہوتے ہیں، ترقیات ہوتی ہیں، بصیرت ہوتی ہے، آدمی کے حقوق کی باتیں ہوتی ہیں، پریس کی آزادی کی باتیں ہوتی ہیں؛ اور کیا آپ لوگوں کے بچے بھی اس طرح گھر لائے جاتے ہیں؟ ارے ماریوس! بڑے افسوس کی بات ہے۔ تو مار دیا گیا ہے، تو میری زندگی میں مرا ہے۔ پشتہ اوباش لوگوں کی جگہ ہے۔ ڈاکٹر! غالباً آپ اسی علاقے میں رہتے ہیں؟ میں آپ سے واقف ہوں۔ میں اپنی کھڑکی سے آپ کی سواری گزرتے دیکھتا ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا خیال غلط ہے کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ مرے ہوئے آدمی پر غصہ نہیں کیا جاتا۔ یہ بہت احمقانہ بات ہوتی ہے۔ یہی وہ بچہ ہے میں جس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جب یہ جوان ہوا اس وقت میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ یہ Tuileries کے باغیچے میں اپنے چھوٹے سے بیلچے اور اپنی چھوٹی سی کرسی سے کھیلا کرتا تھا؛ اس لیے کہ انسپکٹر غصہ نہ کرے، میں نے سارے سوراخ بند کرا دیے تھے جو اس نے بیلچے سے، اور میری بید سے زمین میں کیے تھے۔ اور پھر ایک دن اس نے چیخ کر کہا، لوئی شانز دہم مردہ باد! اور گھر سے چلا گیا۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ گلاب جیسا، اور سنہرے بالوں والا تھا۔ اس کی ماں مر چکی ہے۔ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ سارے بچے سنہرے بالوں والے ہوتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ ان ڈاکوؤں میں سے ایک کا بیٹا ہے، مگر بچے باپ کے جرم کے معاملے میں معصوم

ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ قد آور نہیں تھا۔ D کو صحیح طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا بات کرنے کا طریقہ اتنا پیارا تھا جیسے چڑیوں کا چہچہا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ Hercules Farnese کے سامنے، لوگوں نے ایک حلقہ بنایا تھا اس کی تعریف کرنے کے لیے۔ بہت حسین وجمیل لڑکا تھا۔ اس کا سر ایسا ہی تھا جیسا کہ آپ ان تصویروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں اس سے بھاری آواز میں بات کرتا تھا اور اس کو اپنی بید سے ڈراتا تھا، مگر وہ سمجھتا تھا کہ میں یہ سب اسے ہنسانے کے لیے کرتا ہوں۔ صبح کے وقت جب یہ میرے کمرے میں آتا تو میں غصہ کرتا تھا، مگر میرے لیے یہ سورج کی روشنی کی طرح تھا۔ آپ ان لڑکوں سے بچ نہیں سکتے۔ وہ آپ کو گرفت میں لے لیتے ہیں، زور سے پکڑ لیتے ہیں، اور پھر نہیں چھوڑتے۔ سچ تو یہ ہے کہ کیوپڈ بھی اس بچے جیسا جمیل نہیں تھا۔ اب آپ Lafayettes، اپنے Benjamin Constants اور Tirecuir de Corcelles کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں، جنھوں نے اسے مار ڈالا ہے؟ انھیں ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا؟''

پھر وہ ماریوس کی طرف گیا، جو اب بھی بے حرکت لیٹا ہوا تھا، ڈاکٹر جس کے پاس واپس پہنچ چکا تھا اور ایک بار پھر اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ بوڑھے کے بے رونق ہونٹ میکانکی انداز میں ہل رہے تھے، اور ان میں سے لفظ اس طرح نکل رہے تھے جیسے مرتے وقت سانس لی جاتی ہے، مگر انھیں مشکل سے ہی سنا جا سکتا تھا۔

''اے سنگ دل لڑکے! اے کلب پرست! اے بدنصیب! اے تجبر والے!''

یہ سرگوشی کے انداز میں کی جانے والی سرزنش تھی جو ایک دکھی شخص، کسی میت سے بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے اس قسم کے الفاظ اندرونی آتش فشاں کی صورت نکل رہے تھے مگر نانا میں اب اتنی توانائی نہیں رہ گئی تھی کہ انھیں ادا کر سکتا؛ کہ اس آواز اتنی کم زور اور معدوم ہو گئی تھی کہ پاتال کی دوسری جانب سے آتی محسوس ہو رہی تھی، ''میرے نزدیک سب ایک ہی جیسا ہے۔ میں بھی مرنے جا رہا ہوں۔ اور یہ سوچ رہا ہوں کہ پیرس میں ایک بھی بدکردار عورت نہیں جو اس بدنصیب کو خوش کرنے میں خوشی محسوس کرتی۔ ایک آوارہ گرد جو خود کو ہنسانے اور زندگی کا لطف اٹھانے کے بجائے لڑنے چلا گیا تھا اور جانور کی طرح مارا گیا۔ اور کس کے لیے؟ اور کیوں؟ جمہوریہ کے لیے! بجائے اس کے وہ Chaumiere میں رقص کے لیے جاتا، جسے نوجوان لوگ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بیس برس والے بھلا اور کس کام کے ہیں؟ جمہوریہ، ایک لغتی خوب صورت دھوکا ہے۔ بے چاری مائیں، اچھے اچھے بچے جنتی ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس گاڑی کے پھاٹک سے ایک

ساتھ طرح دو جنازے گزرتے ہیں۔ گویا تم نے جنرل لامارک کی خوب صورت آنکھوں کی خاطر اس طرح کا انتظام کرلیا ہے۔ جنرل لامارک نے تمھارے لیے کیا انتظام کیا تھا؟ ایک قصائی کا! ایک چرب زبان کا۔ تاکہ آپ ایک مرے آدمی کے لیے مارے جائیں۔ کیا یہ کسی کو پاگل کر دینے کے لیے کافی نہیں؟ ذرا سوچیے تو، بیس کی عمر میں! اور وہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا کہ وہ اپنے پیچھے کچھ چھوڑے جا رہا ہے۔ یہی طریقہ ہے جس میں آج کل پرانے لوگ اکیلے مرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اپنے کونے میں جا کر مرجا، آئو! یہ تو بہت اچھا ہے، مجھے اسی کی امید تھی، یہ مجھے اسی جگہ مار ڈالے گا۔ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، میں سو برس کا ہوں، مجھ کو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔ یہ صدمہ مری زندگی ختم کر دینے کے لیے کافی ہے۔ کیسی خوشی! سب ختم ہو چکا ہے۔ اس کو امونیا سنگھانے اور اتنی ساری دوائیں دینے سے کیا بھلائی ہوگی؟ احمقوں کے ڈاکٹر، تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو! چلو، یہ مر چکا ہے، مکمل طور پر مر گیا ہے۔ میں اس کے بارے سب کچھ جانتا ہوں، میں خود بھی مر گیا ہوں۔ یہ آدھا کام نہیں کرتا۔ یہ عمر بہت بدنام ہے، بدنامی، جس کے بارے میں تم سوچ رہے ہو، تمھارے خیالوں کی، تمھارے نظام کی، تمھارے آقاؤں کی، تمھارے سروش غیبی کی، تمھارے ڈاکٹروں کی، تمھارے مشہور ادیبوں کی، تمھارے بدمعاش فلسفیوں کی اور ان تمام انقلابات کی ہے جو پچھلے ساٹھ برس سے Tuileries میں کووں کے غولوں کو ڈرا رہے ہیں۔ مگر اس طرح خود مر جانے سے تجھے رحم نہیں آیا! مجھے تیری موت پر افسوس نہیں کرنا چاہیے، سمجھا کہ نہیں، قاتل!''

اسی لمحے ماریوس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، اور اس کی نظر، جو حیرت انگیز سستی سے دھندلی ہو رہی، موسیو ٹیلر نورماں پر ٹھہر گئی تھی۔

''ماریوس!'' بوڑھا چیخا، ''میرے ماریوس! میرے بیٹے! میرے پیارے بیٹے! تم آنکھیں کھول رہے ہو، تم مجھے دیکھ رہے ہو؟ تم زندہ ہو — شکر ہے!''

اور بوڑھا گر کر بے ہوش ہو گیا۔

۞

انسپکٹر جاویر

جاویر آہستہ آہستہ l'Homme Arme اسٹریٹ سے گزر گیا۔

زندگی میں پہلی بار جاویر سر جھکائے چل رہا تھا، اور اسی طرح زندگی میں پہلی بار اس کے ہاتھ پشت پر تھے۔ اس دن تک جاویر نپولین کے طور طریقے پر عمل کرتا تھا۔ جب ہمت کا اظہار کرنا ہوتا اپنے بازو سینے پر باندھے رکھتا؛ جب بے یقینی کا اظہار کرتا تو پیچھے ہاتھ باندھتا — وہ مگر اس سے واقف نہیں تھا کہ اب اس میں ایک تبدیلی ہوگئی تھی؛ اس کے پورے آہستہ اور ماندہ اس وجود پر تشویش کی مہر لگی ہوئی تھی۔

وہ خاموش سڑکوں پر چل رہا تھا۔

پھر بھی، وہ ایک ہی سمت جا رہا تھا۔

اس نے دریائے سین کا قریب ترین راستہ لیا، Quai des Ormes پہنچا، گودی کے کنارے کنارے گیا، Greve سے گزرا، Place du Chatelet کی چوکی سے کچھ فاصلے پر Pont Notre Dame کے قریب رُک گیا۔ وہاں ایک جانب ناترے ڈیم اور Pont au Change اور دوسری جانب Quai de la Megisserie اور Quai aux Fleurs؛ دونوں کے درمیان دریائے سین ایک قسم کی جھیل بن جاتا ہے، جہاں زمیں ڈھلوان ہے، جس میں سے دریا تیزی سے گزر جاتا ہے۔

ملاح دریائے سین کے اس مقام سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایک زمانے میں چاروں طرف سے گھری ان تیز لہروں سے زیادہ خطرناک کوئی شے نہیں تھی، پُل کے ستون جس میں ہلچل پیدا کرتے تھے، جو اب توڑے جا چکے ہیں۔ محرابوں سے پانی تیزی سے گزرتا ہے! اس تیز رفتاری

سے وسیع اور خوف ناک لہریں مخفی ہیں جو اس جگہ جمع ہو جاتی ہیں؛ سیلاب پلوں کے ستونوں پر حملہ کرتا ہے، جیسے بڑی بڑی رقیق رسیوں کی مدد سے انھیں اکھاڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آدمی جو اس میں گر جاتے ہیں کبھی نظر نہیں آتے؛ اس میں بہترین پیرنے والے بھی غرق ہو جاتے ہیں۔

جاویر پُل پر بنی نیچی دیوار پر دونوں کہنیاں ٹکائے جھکا ہوا تھا، اس کی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کے درمیان تھی، اس کے ناخن میکانکی انداز میں مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے، اور وہ ایک قسم کے مراقبے میں تھا۔

اس کے اندرون کی گہرائیوں میں ایک انوکھی چیز، ایک انقلاب، ایک تباہی ہو گئی تھی؛ اسے غور و خوض کرنے کے لیے کچھ مل گیا تھا۔

جاویر ایک خوف ناک دُکھ سے گزر رہا تھا۔

کئی گھنٹوں جاویر کے اندرون میں اتھل پتھل ہوتی رہی۔ وہ مشکل میں تھا؛ اس کا دماغ اپنے اندھے پن میں اتنا ساکن ہو گیا تھا کہ اس کی شفافیت غائب ہو گئی تھی؛ بلّور میں دھبے پڑ گئے تھے۔ فرائض کے معاملے میں جاویر کو اپنا وجود شعور میں تقسیم شدہ محسوس ہو رہا تھا، اور وہ اپنے آپ سے حقائق کو چھپا نہیں پا رہا تھا۔ جب دریائے سین کے ساحل پر غیر متوقع طور پر اس کا ژاں ولژاں سے سامنا ہوا تھا، اس کے اندر کا بھیڑیا اپنے شکار پر جھپٹ پڑنا چاہتا تھا، اور اس کے اندرون ایک کتا بھی تھا جسے اپنا آقا مل گیا تھا۔

اس کے سامنے دو راستے تھے، دونوں بالکل سیدھے تھے؛ مگر وہ دونوں کو دیکھتا رہا؛ وہ خوف زدہ ہو گیا تھا؛ اس نے اپنی تمام زندگی ایک سیدھی لکیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ان دو سیدھے راستوں میں ایک پریشانی مضمر تھی، کہ دونوں راستے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ان لکیروں میں سے ایک لکیر دوسری لکیر کو منسوخ کر رہی تھی۔ ان دو میں کون سی لکیر تھی جو صحیح تھی؟

اس کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔

اس پر ایک وقت آیا تھا، جب اس کی زندگی ایک بد معاش کے ہاتھ میں تھی؛ اس نے ایک قرض قبول کیا تھا اور اس کو ادا بھی کیا؛ انصاف سے علاحدہ ہوا، خود کو ایک مفرور کی حیثیت میں پایا، اور اس خدمت کا معاوضہ دوسری خدمت کے ذریعے ادا کیا؛ اُس سے کہا، "چلے جاؤ۔" اور بعد میں جب خود اس کی باری آئی تو اس نے کہا، "تم آزاد ہو۔" اس نے ذاتی معاملے کے عوض فرض سے پہلو تہی کی اور اپنے فرائض سے، جو کہیں زیادہ ارفع تھے، غداری کی اور اپنے شعور کے کہے پر کام کیا؛ اب اسے ان تمام نامعقولیات کا احساس ہو رہا تھا، جو اس پر بوجھ بن گئی تھیں۔

جس بات سے وہ حیران تھا، وہ یہ تھی کہ ژاں ولژاں نے اس پر احسان کیا تھا؛ اور جس بات نے اسے چکرا دیا تھا، وہ یہ تھی کہ جاویر جیسے شخص نے ژاں ولژاں جیسے شخص پر احسان کیا ہے۔ اب وہ کہاں کھڑا ہے؟ وہ اپنے مقام کی تلاش میں تھا، اور اسے اپنا آپ مل نہیں رہا تھا۔

اب وہ کرتا بھی کیا؟ ژاں ولژاں کو انصاف کے حوالے کرنا بہت بُری بات تھی؛ ژاں ولژاں کو آزاد چھوڑ دینا اور بھی بُری بات تھی۔ پہلی صورت میں ایک با اختیار انسان ایک سزا یافتہ انسان سے نیچے گر گیا تھا؛ دوسری صورت میں سزا یافتہ انسان قانون سے بالاتر ہو گیا تھا اور اس کا پیر قانون کے گلے پر تھا۔ وہ جس طرح بھی غور کرتا، دونوں صورتوں میں جاویر کی بدنامی تھی۔ قسمت کی بھی کیسی انتہائیں ہوتی ہیں، جو ناممکن سے عمودی انداز میں ابھرتی ہیں، جن سے پرے زندگی سوائے ایک عمودی چٹان کے کچھ نہیں ہوتی۔ جاویر ان ہی میں سے ایک انتہا پر تھا۔ اس کی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی اس کا سوچنے پر مجبور ہونا تھا۔ ان تمام متنازعہ جذبات کی شدت نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سوچ وہ چیز تھی جس کا وہ عادی نہیں تھا، اور جو بالخصوص تکلیف دہ تھی۔

خیالات میں ہمیشہ مخصوص قسم کی اندرونی بغاوت ہوتی ہے؛ اور ان خیالات کا ہونا اسے اندر سے بھڑکا رہا تھا۔ کسی بھی موضوع کے خیالات جو اس کے فرائض کے دائرے سے باہر تھے، اس کے نزدیک فضول اور تکان کا باعث تھے؛ گزرے ہوئے دن کے خیالات اس کے لیے اذیت بن گئے تھے۔ پھر بھی، اس کے لیے اپنے ضمیر کے اندر جھانکنا ناگزیر تھا، اور اس سے ہونے والے صدمے اس کے اپنے احتساب کا باعث ہو رہے تھے۔

جو کچھ اس نے ابھی کیا تھا، اسے لرزہ رہا تھا۔ اس نے — جاویر نے — پولیس کے قوانین کے خلاف، تمام سماجی اور عدالتی تنظیم کے خلاف، قواعد کے خلاف ایک رہائی کی تھی جو اس کے موافق تھی؛ اور اس نے اپنے معاملات کو عوامی معاملات پر ترجیح دی تھی؛ کیا یہ عمل غیر معقول نہیں تھا؟ ہر بار جب وہ اپنے آپ کو اس نادیدہ عمل کے روبرو کرتا، سر سے پا تک لرز جاتا تھا۔ تو اسے کیا فیصلہ کرنا چاہیے تھا؟ اس کے سامنے بس ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا تھا؛ کہ وہ فوراً l'Homme Arme اسٹریٹ جاتا اور ژاں ولژاں کو قید خانے کے حوالے کر دیتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ مگر وہ کر نہیں سکا۔

اس سمت جانے میں کوئی بات رُکاوٹ کا باعث تھی۔

کوئی بات؟ کون سی بات؟ کیا دنیا میں کوئی شے عدالتوں سے، تعمیل کرنے والی سزاؤں سے، پولیس سے اور صاحبانِ اختیار کے اختیار سے باہر تھی؟ جاویر مغلوب ہو گیا تھا۔ کیلیر کا غلام

مقدس ہو گیا تھا۔ سزا یافتہ قانون کی گرفت سے اور جاویر کے فعل کے باعث، قید سے باہر تھا۔

کیا یہ خوف ناک بات نہیں تھی کہ جاویر اور ژاں ولژاں — ایک آدمی کو ہمت سے آگے بڑھنا تھا، اور ایک آدمی کو اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا تھا — دونوں قانونی حیثیتیں، ایسی نہج پر آ گئی تھیں کہ دونوں نے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر کر لیا تھا؟ پھر کیا ہوتا تھا۔ گناہ ہوئے تھے، اور کسی کو سزا نہیں ملی تھی۔ پورے سماجی نظام سے زیادہ طاقت ور ژاں ولژاں آزاد رہتا ہے اور وہ، جاویر — حکومت کی روٹیاں کھاتا ہے۔

اس کا مراقبہ خوف ناک ہو گیا تھا۔

مراقبے کے برعکس، وہ اس سرکش آدمی کے سلسلے میں اپنی سرزنش کر سکتا تھا۔ اسے Filles-du-Calvaire اسٹریٹ لے جایا گیا تھا؛ مگر اس کا خیال نہیں آیا۔ چھوٹی غلطی بڑی غلطی میں گم ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ، وہ سرکش مرا ہوا آدمی تھا، اور قانونی اعتبار سے موت کی صورت میں تعاقب ختم کر دیا جاتا ہے۔

ژاں ولژاں وہ بوجھ تھا جو اس کے نفس کے لیے بھاری ہو رہا تھا۔

ژاں ولژاں نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ سارے مسلمات جو ساری زندگی اس کے لیے سہارا بنے، اس آدمی کی موجودگی میں مسمار ہو گئے تھے۔ ژاں ولژاں کی فیاضی نے اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے حقائق جو اسے اب یاد آ رہے تھے، جو پہلے جھوٹ اور فریب گردانے گئے تھے، اب حقائق بن کر ابھر رہے تھے۔ ژاں ولژاں کے عقب میں موسیو میڈلین دوبارہ ظاہر ہو گیا تھا، اور یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک ہو گئی تھیں، جو نہایت قابلِ احترام تھیں۔ جاویر کو محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی خوف ناک شے اس میں حلول کر رہی ہے — ایک سزا یافتہ کی تعریف۔ گیلیز کے غلام کے لیے احترام، کیا یہ ممکن بات ہوتی ہے؟ یہ سوچ کر وہ لرز جاتا تھا مگر اس سے مفر نہیں تھا۔ اس کی جد وجہد بے کار تھی؛ وہ ایک بدنصیب کی رفعت کے اعتراف تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ عمل نہایت مکروہ تھا۔

ایک مخیر بدمعاش، رحم دل، شریف، مددگار، حلیم، سزا یافتہ برائی کے بجائے نیکی پیش کر رہا تھا، نفرت کے عوض درگزر کر رہا تھا، انتقام کے بدلے ہم دردی کر رہا تھا، دشمن کو تباہ کرنے کے بجائے خود تباہ ہونے کو ترجیح دے رہا تھا، اسے بچانا چاہ رہا تھا جس نے اسے ضرب لگائی تھی، بلند ترین نیکی کے سامنے دو زانو ہو رہا تھا، آدمی کے بجائے فرشتے سے قریب ہو رہا تھا۔ جاویر ماننے پر مجبور تھا کہ اس قسم کے عفریت کا وجود ہوتا ہے۔

اس طرح معاملات آگے بڑھ نہیں سکتے تھے۔

یقینی طور پر اس نے بلا مزاحمت اس عفریت، اس بدنام فرشتے، اس ڈراؤنے ہیرو کو قبول نہیں کر لیا تھا، جس نے تقریباً اتنا ہی طیش دلایا جتنا حیران کیا تھا۔ جب وہ سواری گاڑی میں ژاں ولژاں کے سامنے بیٹھا تھا اس کے اندرون کا قانونی چیتا میں بار دہاڑا تھا۔ کئی بار تو چیتے نے اسے دبوچ لینے اور کھا جانے پر، یعنی گرفتار کر لینے پر، جاویر کو اکسایا تھا۔ اس سے آسان کیا ہو سکتا تھا کہ پہلی ہی چوکی سے گزرتے وقت وہ فوجوں کو طلب کرنے کی خاطر چیخ کر کہتا، "یہاں انصاف سے مفرور ایک شخص ہے جس نے اپنے اوپر لگی پابندی کو توڑا ہے۔ یہ اب تمھارا ہے۔" اور اس آدمی کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا بقیہ کو نظر انداز کر دیتا، اور ان کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرتا۔ یہ آدمی ہمیشہ کے لیے قانون کا قیدی ہے. قانون جو چاہے اس کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ ٹھیک بات اور کیا ہو سکتی تھی؟ جاویر نے خود سے یہ سب کہا؛ اس کے آگے بڑھتا چاہا تھا، کچھ کرنے کے لیے، اس آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے، مگر، جیسا کہ اب ہے، وہ کچھ کر نہیں سکا ہے؛ اور ہر بار جب اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ژاں ولژاں کے کالر کی طرف اٹھا ہے، اس کا ہاتھ ایک بار پھر گر گیا ہے، ایک بھاری وزن کے نیچے، اور اس کے خیالات کی گہرائیوں میں اس نے ایک آواز سنی ہے؛ ایک اجنبی آواز اس سے چیخ کر کہہ رہی تھی، "یہ سب ٹھیک ہے۔ اپنے نجات دہندے کو قانون کے حوالے کر دو۔ تب Pontius Pilate کا جوا منگاؤ اور اپنے ہاتھ دھو لو۔"

تب اس کے تصورات اس کی اپنی جانب پلٹے اور ژاں ولژاں کو شان دار ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے خود، جاویر، کو کم رتبہ دیکھا۔

ایک سزا یافتہ شخص اس کا محسن تھا۔

مگر اس نے خود کو زندہ چھوڑ دینے کی اجازت کیوں دی تھی؟ وہ پشتے پر مار دیے جانے کا حق دار تھا۔ اس نے اس حق پر اصرار کیا ہوتا۔ بہتر ہوتا کہ ژاں ولژاں کی امداد سے بچانے کے لیے دوسرے سرکشوں کو بلا کر بہ زور اسے مار دیا جاتا۔

اس کی سب سے بڑی پریشانی یقین کا ختم ہو جانا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جڑ سے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک قواعد وضوابط ایک معمولی سے ڈنڈے کے سوا کچھ نہیں تھے۔ اسے نامعلوم نوعیت کے تاملات سے معاملہ کرنا تھا۔ قانونی اقوال سے بالکل الگ، اس کے اندر کچھ جذباتی انکشافات ہوئے تھے اب تک جو اس کے نزدیک صرف معیار کی پیمائش تھے۔ اس کے لیے پہلی راست بازی پر قائم رہنا کافی نہیں تھا۔ غیر متوقع حقائق کا ایک پورا نظام ابھر آیا

تھا اور اس کو مغلوب کر لیا تھا۔ اس کی روح میں ایک بالکل نئی دنیا طلوع ہو رہی تھی: مہربانی کا قبول کرنا اور اس کا اجر دینا، اعتقاد، رحم دلی، عنایات افراد کے لیے احترام، مذمت کا خاتمہ، سزا کا خاتمہ، قانون کی آنکھ میں شگاف کا امکان، کون جانے خدا کے مطابق کون سا انصاف ہے جو انسان کے مطابق انصافِ معکوس کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ پرچھائیوں کے درمیان اسے ایک نادیدہ اخلاقی سورج ابھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ گویا اُلو عقاب کی قہر آلود نگاہ کی زد میں تھا۔

اس نے اپنے آپ سے کہا، یہ سچ ہے کہ ایسے غیر معمولی معاملات بھی ہوتے ہیں جن میں اختیار بے دخل ہو سکتا ہے، کہ حقیقت کے پیشِ نظر ہر چیز ہمیشہ ناکافی قواعد کے متن میں فٹ نہیں ہو سکتی، کہ نادیدہ حالات نے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا، کہ کسی سزا یافتہ کا نیک عمل عامل کو بھی نیکی پر مجبور کر سکتا ہے، کہ مقسوم ایسی گھاتوں میں شریک ہوا ہے، اور اس نے مایوسی سے سوچا کہ اسے کسی حیرت کے خلاف مستحکم نہیں کیا گیا تھا۔

اسے اعتراف کرنے پر مجبور کیا گیا تھا کہ اچھائی کا وجود ہے۔ یہ سزا یافتہ شخص اچھا رہا ہے۔ اور وہ خود بھی بے مثال کیفیت میں اچھا تھا۔ لہٰذا وہ بگڑتا جا رہا تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بزدل ہے۔ وہ خود کو خوف زدہ تصور کرنے لگا تھا۔

جاویر صرف انسان نہیں، عظیم اور ارفع بننا چاہتا تھا؛ جو بے داغ ہو۔

اب وہ اس میں ناکام ہو گیا تھا۔

وہ ایسے مقام پر کیسے پہنچ گیا؟ یہ سب کیسے ہوا؟ وہ خود بھی بتا نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، مگر اس سب کے باوجود وہ خود اپنے خلاف سازش نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے یقینی طور پر ہمیشہ یہی چاہا تھا کہ وہ ژاں ولژاں کو قانون کو حوالے کر دے جس کا وہ قیدی تھا، جاویر جس کا غلام نہیں تھا۔ جس وقت ژاں ولژاں اس کی گرفت میں تھا، جاویر نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کو رہا کر دے گا۔ وہ کوئی لاشعوری تحریک تھی جس نے اس کے ہاتھ ڈھیلے کر دیے تھے اور ژاں ولژاں آزاد ہو گیا تھا۔

طرح طرح کی تفتیش کے نکات اس کی آنکھوں میں جھلکے تھے۔ اس نے خود سے سوالات کیے اور اپنے آپ کو جوابات بھی دیے؛ اس کے جوابوں نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ اس نے خود سے سوال کیا، ”اس سزا یافتہ نے، اس مایوس دوست نے، کون سی برائی کی ہے کہ میں ایذا دینے کے لیے اس کا پیچھا کرتا رہا ہوں؟ میں اس کے پیروں تلے دبا تھا، اور وہ مجھ سے انتقام لے سکتا تھا؛ اپنے عناد کے اور اپنے تحفظ کے خطرات کے باوجود اس نے مجھے میری زندگی کے

حوالے کیوں کر دیا تھا، اور مجھ سے رحم دلی سے کیوں پیش آیا تھا؟ کیا یہ اس کا فرض تھا؟ نہیں! اس سے بڑھ کر کوئی بات ہوئی تھی۔ اب میری باری ہے اور میں اس پر رحم کھا رہا ہوں — تو میں نے کیا کچھ غلط کیا ہے؟ اپنا فرض نبھایا ہے؟ نہیں۔ یہاں بھی اس سے بڑھ کر کوئی بات ہوئی ہے۔ تو کیا کچھ ہے جو فرض سے بڑھ کر بھی ہوتا ہے؟" اس پر وہ خوف زدہ ہو گیا؛ اس کے ذہن کا توازن بکھر گیا؛ میزان کا ایک سرا پاتال میں جا گرا، دوسرا آسمان کی طرف بلند ہو گیا، اور جاویر نیچے والے کے مقابلے میں اس سے کم خوف زدہ نہیں تھا جو اوپر ہو گیا تھا۔ اس دنیا میں جسے والٹیئر یائی یا فلسفی یا بے عقیدہ کہا جاتا ہے اپنی جبلت سے مجبور وہ کلیسا کے لیے احترام بھی رکھتا تھا، اور اسے سماجی کُل کے ایک محترم ریزے کے طور پر جانتا تھا؛ حکم اس کا اصول تھا، اور اس کے لیے کافی تھا؛ جب سے وہ انسانی ریاست کے اور ایک عامل کے عہدے پر پہنچا تھا اس نے تقریباً اپنا سارا مذہب پولیس میں مرکوز کر دیا تھا۔ جس طرح مبلغین بالادست ہوتے ہیں، جاسوس کی حیثیت میں وہ بھی ایک بالادست تھا۔ موسیو Gisquet؛ اس دن تک اس نے کبھی دوسرے بالادست — خدا — کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہ اس نئے چیف — خدا — سے غیر متوقع طور پر واقف ہو گیا تھا، اور اس سے شرمندہ بھی ہوتا تھا۔ اس نا دیدہ موجودگی نے اسے اپنے محور سے دور پھینک دیا؛ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس بالادست سے کس طرح پیش آئے، وہ جو اس حقیقت سے لاتعلق نہیں تھا کہ ماتحت پر ہمیشہ جھکنا لازم نہیں ہوتا، کہ اسے حکم عدولی نہیں کرنی چاہیے، اس میں غلطی تلاش نہیں کرنی چاہیے، نہ اس بالادست کی موجودگی میں کسی قسم کی بحث کرنی چاہیے جو اسے بہت حیران کر دیتا ہے، اور زیر دست کے لیے اپنا استعفیٰ پیش کر دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہتا۔

مگر وہ خدا کو اپنا استعفیٰ کس طرح پیش کرتا؟

پھر بھی، جیسی بھی صورت ہو اس کے نزدیک ایک حقیقت ہر شے پر غالب آ گئی تھی، اور وہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے ابھی قانون کی خوف ناک خلاف ورزی کی ہے۔ اس نے ایک مفرور سزا یافتہ کو نظر انداز کر دیا ہے جس نے حکم امتناع کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس نے گیلیز کے ایک غلام کو بھی آزاد کر دیا ہے۔ اس نے ابھی ایک آدمی کے بارے میں قانون توڑا ہے جو گیلیز کی ملکیت تھا۔ یہ عمل تھا جو اس نے کیا ہے۔ وہ اب اپنے آپ کو سمجھ نہیں پا رہا ہے۔ صرف اس کے عمل کے باعث ہی وہ فرار ہو گیا تھا؛ صرف اس کا دورانِ سر ہی اس کے ساتھ رہ گیا ہے۔ اب تک وہ اس اندھے عقیدے پر قائم تھا جو ملول دیانت پیدا کرتی ہے۔ یہ یقین بھی اسے چھوڑ

گیا ہے، یہ دیانت بھی اس سے دور چلی گئی ہے۔ وہ سب جس پر اسے یقین تھا، پگھل کر بہہ گیا ہے۔ سچائیوں نے جنھیں وہ جاننا نہیں چاہتا تھا بے رحمی سے اس کا محاصرہ کر لیا ہے۔ لہٰذا اب اسے ایک مختلف آدمی ہونا چاہیے۔ اب وہ اپنا حیرت انگیز دور دیکھ رہا تھا، اس کے شعور نے جس کے موتیا بند کی جراحت کر دی ہے۔ اسے اب وہ بھی دکھائی دے رہا تھا جس کی ممانعت تھی۔ وہ خود کو خالی شدہ، بے کار، اپنے ماضی سے بیگانہ، بے دخل کیا ہوا، اور تحلیل شدہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اندرون کا اختیار مر گیا تھا۔ اب اس کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔

عجیب خوف ناک کیفیت تھی۔

سنگِ خارا ہونا اور شبہ کرنا۔ تا دیب کا وہ مجسمہ بن جانا جو قانون کے سانچے میں ڈھلا ہو، اور اچانک اس حقیقت سے آگاہ ہو جانا کہ لوگ اپنے کانسی سے بنے سینے کے اندر نامعقولات کی اور تخمِ عدوانی کی پرورش کرتے ہیں جو تقریباً دل سے مشابہ ہوتی ہے۔ اچھائی کے بدلے اچھائی فراہم کرنا، اگرچہ آپ سے اس دن تک یہی کہا گیا ہے کہ وہ اچھائی شیطنت تھی۔ چوکی داری کرنے والا سنگ بننا اور نقب زن کا ہاتھ چاٹنا۔ اچانک اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو کھلتا محسوس کرنا۔ اپنی گرفت ڈھیلی کر دینا — کتنی خوف ناک چیز ہے، یہ سب!

انسانی مشین پسپائی کے اس راستے واقف نہیں تھی۔

اپنے آپ سے اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا: کہ معصومیت بے خطا نہیں ہوتی؛ اصول غلط ہو سکتا ہے؛ اشاروں کی زبان بولتی ہے مگر سب کچھ کہہ نہیں سکتی؛ سوسائٹی عیوب سے خالی نہیں ہوتی؛ تذبذب اختیار کو پیچیدہ کر دیتا ہے؛ ناقابلِ تغیر میں بھی تغیر ہو سکتا ہے؛ جج بھی انسان ہوتے ہیں؛ قانون میں لغزش ہو سکتی ہے؛ عدالتیں غلطی کر سکتی ہیں؛ آسمان کے مہیب نیلے شیشے میں بھی دراڑ پڑ سکتی ہے۔

جاوید جس کیفیت سے گزر رہا تھا وہ شعور کے سیدھے راستے کی تحلیل تھی؛ نفس کا بھٹک جانا تھی؛ دیانت کا کچلا جانا تھی، جو ایک سیدھی لکیر کی صورت پیش کی گئی تھی اور خدا کے خلاف ٹوٹ رہی تھی۔ یقینی طور پر یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ نظام کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والے کو، اختیار کی تشکیل کرنے والے کو، آہنی اندھے گھوڑے پر سوار کو، اس بے لوچ راستے پر رواں کو روشنی کی ایک چمک سے گرایا جا سکتا تھا؛ کہ وہ غیر متحرک، راست، صحیح، اقلیدسی، مجہول، مکمل، ختم ہو سکتا تھا؛ کہ از خود حرکت کرنے والے کے لیے دمشق جانے والی سڑک موجود ہونی چاہیے۔

خدا، اس انسان کے اندر بھی ہوتا ہے جو سرکش ہوتا ہے؛ اور وہی، [یعنی خدا] سچا

ضمیر ہوتا ہے، وہی دروغ کے خلاف رُکاوٹ ہوتا ہے؛ اس چنگاری کے لیے رُکاوٹ ہوتا ہے جو بجھ جانے والی ہوتی ہے؛ ہر کرن کے لیے حکم ہوتا ہے کہ وہ سورج کو فراموش نہ کرے؛ نفس کے لیے ہدایت ہوتا ہے کہ جب اس کا سامنا جعلی مطلق سے ہو تو وہ اصلی مطلق کو پہچان لے؛ انسانیت گم نہیں ہو سکتی؛ قلبِ انسانی کو تباہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شان دار مظہرِ قدرت ہے، وہ ہماری اندرونی حیرتوں کا نفیس ترین جز ہے؛ کیا جاویر یہ راز سمجھ گیا تھا؟ کیا جاویر اس میں داخل ہو گیا تھا؟ کیا جاویر نے اسے اپنا لیا تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا؟ مگر اس نا قابلِ تردید اور بعید از فہم دباؤ تلے اسے اپنا دماغ پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اس تبدیل شدہ شخص سے کم تھا، جو عجیب کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان سب میں اسے صرف وجود کی بے پناہ مشکل نظر آئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ آج کے بعد سے اس کا تخئیل ہمیشہ کے لیے تسخیر کر لیا گیا ہے۔ وہ اس بات کا عادی نہیں تھا کہ کوئی نا دیدہ شے اس کے سر کے اوپر لٹکتی رہے۔

اس نقطے تک اس کے اوپر کی ہر شے، اس کی نگاہ میں محض ایک چکنی، شفاف اور سادہ قسم کی سطح تھی؛ کوئی شے محدود نہیں تھی، مبہم نہیں تھی؛ ایسی کوئی شے نہیں تھی جس کو حد بند، حسبِ معمول ختم، منسلک، با قاعدہ، محدود، درست، بند اور پوری طرح طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اختیار ایک ہموار سطح کی مانند ہوتا ہے؛ اس میں کوئی گراؤ نہیں ہوتا، نہ اس کی موجودگی میں دوران سر ہوتا ہے۔ جاویر نے کبھی کسی نا معلوم کو نہیں دیکھا تھا سوائے اس کے جو نیچے سے آتا ہے۔ بے قاعدہ، غیر متوقع، ابتری کی بے ترتیب ابتدا، عمودی ڈھلان سے امکانی چوک وغیرہ — یہ کام تھا نچلے درجے کے باغیوں، بدمعاشوں، اور بدنصیبوں کا۔ اب جاویر پیچھے ہٹ گیا تھا، اور اچانک اس -- بڑھتی ہوئی خلیج — بے مثال عفریت سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔

کیا ہوا؟ ایک کو سر سے پا تک برہنہ کر دیا۔ ایک کا مکمل طور پر کام بگاڑ دیا۔ کس پر بھروسا کیا جائے۔ جو طے ہوا تھا وہ ہاتھ سے جا رہا تھا۔ کیا سماجی بکتر کی خامی ایک عالی حوصلہ بدنصیب دریافت کر سکا تھا؟ قانون کے ایک ایمان دار خدمت گار نے اچانک دو خلاف ورزیاں کیں — ایک آدمی کو فرار ہونے کی اجازت دینے کا جرم کیا اور اس کو گرفتار نہ کرنے کا جرم کیا۔ ریاست کے عامل کے دیے ہوئے احکامات میں ہر بات طے نہیں کی گئی تھی۔ فرض کے راستے میں بند گلیاں بھی ہو سکتی ہیں یا یہ سب کچھ حقیقی تھا؟ کیا یہ سچ تھا کہ سزاؤں سے لدا ایک سابق غنڈا، ایستادہ ہو سکتا تھا اور حق پر ہو سکتا تھا؟ کیا وہ بھروسے کے قابل تھا؟ کہ اس کے سارے مقدمات

میں قانون کو تبدیل شدہ ہیئت سے پہلے کنارہ کش ہو جانا چاہیے اور اس کے بہانوں پر شکست کرنا چاہیے تھا؟ جی ہاں، اس مقدمے کی یہی کیفیت تھی اور جاوید نے اس کیفیت کو دیکھ لیا تھا۔ اور جاوید نے اسے چھو لیا تھا، اور نہ صرف یہ کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس نے اس میں حصہ بھی لیا تھا۔ یہ تھے حقائق۔ قابلِ نفرت بات یہ تھی کہ ایسا عیب ہو سکتا تھا۔ اگر حقائق اپنا فرض ادا کرتے تو وہ خود کو قانونی شہوتوں تک محدود رکھتے! اور حقائق!— وہ خدا ہے جو حقائق فراہم کرتا ہے۔ تو کیا بدامنی اس وقت اپنی بلندی سے نیچے آ رہی تھی؟

اس طرح، اور تکلیف کے مبالغے میں، اور خوف کے بصری فریب میں، وہ سارا تصور جو شاید درست کیا اور روگ لیا گیا تھا، مٹا دیا گیا تھا، اور سوسائٹی اور نسلِ انسانی اور کائنات کا خلاصہ ایک سادہ خوف ناک صورت میں اس کی آنکھوں میں جمع ہو گیا تھا— اس طرح تعزیراتی قوانین، کم زور فیصلے، قانون سازی سے ملنے والی طاقت، مقتدر عدالتیں، نظامِ فوجداری، حکومت، تدارک، جبر، سرکاری ظلم، دانش، قانونی معصومیت، اصولِ اقتدار اور وہ سارے کفر ہیں جن پر دارومدار ہوتا ہے سیاسی اور شہری تحفظ کا، حاکمیت کا، انصاف کا، عوامی صداقتوں کا، سب کوڑا کرکٹ تھا، بد صورت ڈھیر تھا، ابتری تھی؛ جاوید نے خود کو، اعلیٰ درجے کے جاسوس کو، پولیس میں جس کی بے داغ خدمات تھیں، جو سماجی عاقبت اندیشی کا bull-dog تھا، غائب کر دیا تھا، زمین پر پھینک دیا تھا، اور اس کھنڈر کی چوٹی پر کھڑا تھا، ایک آدمی جس کے سر پر سبز رنگ کی ٹوپی تھی، اور جس کی پیشانی کے اطراف ہالۂ نور تھا؛ یہ تھی وہ ششدر کر دینے والی ابتری جو اس کے سامنے تھی؛ یہ تھا وہ خوف انگیز تصور جو اس کی روح میں سما گیا تھا۔

تو کیا اسے برداشت کر لیا جائے؟ نہیں!

یہ ایک متشدد کیفیت تھی، اور واقعی اس کا وجود تھا۔ اس کے بچنے کے صرف دو راستے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ ہمت کر کے ژاں ولژاں کے پاس جائے، اور گیلیز کے سزا یافتہ کو قید خانے میں بحال کر دے۔ اور دوسرا راستہ.....

جاوید حفاظتی دیوار سے ہٹ گیا، اور اس بار اپنا سر بلند کیے، اسٹیشن ہاؤس کی چوکی پر گیا جو Place du Chatelet کے کونے پر واقع تھا۔

وہاں پہنچا تو کھڑکی سے اسے ایک پولیس سارجنٹ نظر آیا؛ اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ پولیس والے ایک دوسرے کو دروازہ کھولنے کے انداز سے پہچان لیتے ہیں۔ جاوید نے اپنا نام بتایا، سارجنٹ کو اپنا کارڈ دکھایا، اور چوکی میں موجود ایک میز پر بیٹھ گیا جس پر ایک موم بتی جل

رہی تھی۔ میز پر ایک قلم بھی رکھا تھا، سیسے سے بنی ایک دوات، اور کاغذ بھی تھا، شبینہ گشت والوں کی ممکنہ رپورٹیں اور احکامات درج کرنے کے لیے۔ اس میز کے پاس پیال سے بُنی ایک کرسی تھی، جو آج بھی ایک ادارے کی مانند ہوتی ہے؛ ہر پولیس اسٹیشن میں ایسی میزیں رکھی ہوتی ہیں؛ ان پر لکڑی کی ایک رکابی رکھی ہوتی ہے جس میں لکڑی کا برادہ ہوتا ہے اور دفتی سے بنے wafer بکس میں سرخ رنگ کے wafer رکھے ہوتے ہیں۔ یہ بالکل نچلے درجے کا سرکاری انداز ہوتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سرکاری ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔

جاویر نے قلم اور کاغذ لیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اس نے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے:

پولیس کی بہتری کے لیے کچھ مشاہدات

پہلی بات: میں موسیو پرشیکیٹ سے درخواست کروں گا کہ وہ اس پر نظر ڈالیں۔

دوسری بات: تفتیش کے بعد آنے والے قیدی اپنے جوتے اتارتے ہیں اور جسمانی تلاشی کے دوران ننگے پیر چبوترے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ قید خانے واپسی پر وہ کھانستے رہتے ہیں۔ اس کے باعث اسپتال کے اخراجات ہوتے ہیں۔

تیسری بات: جگہ جگہ پر متعین پولیس ایجنٹوں کے ذریعے، ایک فاصلے سے دوسرے فاصلے تک، کسی آدمی پر نگاہ رکھنا اچھا ہے، مگر اہم موقعوں پر چاہیے کہ کم از کم دو ایجنٹ ایک دوسرے کی نگاہ میں رہیں، اس لیے کہ اگر کسی وجہ ایک اپنے فرائض انجام دینے میں کم زور ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا اس کام کو انجام دے سکے۔

چوتھی بات: یہ امر قابل تشریح ہے کہ خاص قواعد کے مطابق کرایہ ادا کرنے کے بعد بھی Madelonettes قید خانے میں قیدی کو کرسی فراہم کرنے کی ممانعت کیوں ہے؟

پانچویں بات: Madelonettes قید خانے کی کینٹین میں صرف دو سلاخیں ہیں، جس کے باعث کینٹین میں کام کرنے والی عورت قیدیوں کو چھو سکتی ہے۔

چھٹی بات: ہر قیدی ان قیدیوں کو جنھیں آواز لگانے والا کہا جاتا ہے— جو دوسرے قیدیوں کو پارلر میں پکار کر بلاتے ہیں— دو سُو ادا کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اس کا نام واضح طور پر پکارا جائے۔ یہ چوری ہے۔

ساتویں بات: بُنائی کی دکان میں ایک دھاگا ٹوٹنے پر بھی دس سُو روک لیے جاتے ہیں؛ یہ ٹھیکے دار کی بد معاشی ہے، اس لیے کہ کپڑا خراب نہیں ہوتا۔

آٹھویں بات: لا فورس کے ملاقاتی اس بات پر برہم ہوتے ہیں کہ انھیں Sainte Marie Egyptienne کے پارلر میں پہنچنے کے لیے لڑکوں کی عدالت میں ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

نویں بات: یہ سچ ہے کہ روزانہ پر فیکٹ کے دفتر کے صحن میں سپاہیوں کو قیدیوں کی تفتیش کی تفصیلات بیان کرتے سنا جاتا ہے۔ سپاہی کو رازداری کا حلف اٹھانا چاہیے اور سنی ہوئی تفصیل کا اس طرح دہرانا بڑی بے قاعدگی کی بات ہے۔

دسویں بات: مادام ہنری ایک راست باز خاتون ہے؛ اس کی کینٹین بہت صاف ستھری ہوتی ہے؛ مگر قید خانے کے خفیہ چور دروازوں کی چھوٹی کھڑکیوں پر ایک عورت کو مامور کرنا بری بات ہے۔ یہ ایک عظیم تہذیب کے ConcIergerie و Palais de Justice کا جیل سے متصل ہو ہیں) کے شایانِ شان نہیں۔"

جاویر نے یہ سطور نہایت پُرسکون درست ترین خطاطی میں تحریر کی تھیں جن میں ایک واحد رمزِ وقف (comma) کی بھی کمی نہیں تھی، نہ لکھتے وقت کاغذ سے کسی قسم کی آواز بلند ہوئی تھی۔ آخری سطر کے نیچے اس نے دستخط کیے تھے:

"جاویر
انسپکٹر، درجہ اول

چوکی Place du Chatelet، 7 جون، 1832ء، تقریباً ایک بجے صبح"

جاویر نے روشنائی خشک کی، کاغذ کو خط کی طرح تہہ کیا، اسے گوند سے بند کیا اور اس کی پشت پر "انتظامیہ کے لیے رقعہ" لکھا، خط کو میز پر چھوڑا اور چوکی سے چلا گیا۔ شیشے اور آہنی جالی سے بنا دروازہ بند ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر Place du Chatelet سے گزرا، گودی پر پہنچا اور عین اس جگہ واپس ہوا جہاں ایک چوتھائی گھنٹا پہلے کھڑا تھا؛ اسی طرح نیچے دیوار پر اپنی کہنیاں ٹکائیں اور اس کے ساتھ بنے راستے پر اسی انداز سے کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔

اندھیرا مکمل ہو گیا تھا۔ قبر کا سا لمحہ تھا جس کے بعد رات آدھی ہو جاتی ہے۔ بادل کے سقف نے تاروں کو ڈھانپ لیا تھا۔ شہر کے گھروں میں ایک روشنی بھی جلتی دکھائی نہیں دیتی تھی؛ راہ گیر بھی نہیں تھے؛ تمام سڑکیں اور گودیاں سنسان دکھائی دے رہی تھیں؛ ناترے ڈیم اور کورٹ ہاؤس رات کے نقوش محسوس ہو رہے تھے۔ سڑک کی ایک لالٹین نے گودی کے کنارے کو سرخ کر دیا تھا۔ پلوں کے خاکوں کے خطوط دھند میں بے شکل ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔

حائیہ بارش نے دریا میں سیلابی کیفیت پیدا کردی تھی۔

وہ مقام جہاں جاوید جھکا ہوا تھا، قاری کو یاد ہوگا، دریائے سین کی ڈھلان کے خوف ناک بھنور کے عین اوپر تھا جسے کی لہریں ایک دوسرے میں پیچ کی طرح لپٹی ہوئی گھوم رہی تھیں۔

جاوید نے اپنا سر جھکا لیا تھا اور انھیں گھور رہا تھا۔ سب کچھ سیاہ تھا۔ ایسی کوئی شے نہیں تھی جس کو بیان کیا جاسکتا۔ بنتے بگڑتے ہوئے جھاگ کی آواز سنائی دے رہی تھی، مگر دریا نظر نہیں آرہا تھا۔ کسی کسی لمحے، اس چکرا دینے والی گہرائی میں روشنی کی کرن دکھائی دے جاتی تھی، جو مبہم طریقے سے نہ جانے کہاں سے آتی اور گدھر جاتی تھی اور پانی اور روشنی کی طاقت مل کر سانپ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ روشنی غائب ہوکر ایک بار پھر غیر واضح ہو گئی تھی۔ بے کرانی کھلی محسوس ہو رہی تھی۔ جو کچھ نیچے تھا وہ پانی نہیں تھا، ایک خلیج تھی۔ گودی کی بے ربط، پیچیدہ، بخارات میں گڈمڈ، نظروں سے اوجھل دیواریں ایک لامتناہی نشیب کا اثر پیش کر رہی تھیں۔ دیکھنے کی کوئی شے نہیں تھی، مگر پانی کی معاندانہ سردی اور گیلے پتھروں کی باسی بو محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس پاتال سے ایک تند سانس اٹھی۔ دریا کا سیلاب، واضح نہیں بلکہ غیبی تھا، لہروں کی الم ناک سرگوشیاں، پلوں کی محرابوں کی اداس وسعتیں، اس غم انگیز بے کرانی اور ان تمام پر چھائیوں میں ناقابلِ تصور گراؤ کی مانند دہشت سے پُر تھیں۔

جاوید کئی منٹ ساکت رہا، پرچھائیوں کے اس سوراخ کو گھورتا رہا؛ وہ نادیدہ کو ایسی محویت دے رہا تھا جو توجہ سے مشابہ تھی۔ پانی دھاڑ رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنی ہیٹ اتاری اور گودی کے کنارے رکھ دی۔

ایک لمحے بعد ایک سیاہ ہیولا، جسے پاس سے گزرنے والا خیالی پیکر سمجھتا، گودی کی نچلی دیوار پر ایستادہ ہوا، دریائے سین کی طرف جھکا، اپنے آپ کو ایک بار پھر واپس سیدھا کیا اور سیدھا پر چھائیوں میں جا گرا۔

زور دار چھینٹے اڑے اور مبہم پیکر اپنی تمام مخفیہ کپکپیوں اور تشنج کے ساتھ پانی میں غائب ہو گیا تھا۔

❂

جست کے پلستر والا درخت

جن واقعات کو ابھی قلم بند کیا گیا ہے، ان کے کچھ دنوں بعد مسٹر بولاتروویل (Sieur Boulatruelle) کو ایک دل خوش کن جذبے کا تجربہ ہوا۔

بولاتروویل سڑکوں کی مرمت کرنے والا ٹھیکے دار تھا، قاری جس سے اس کتاب کے غمگین حصوں میں متعارف ہو چکا ہے۔ قاری کو یہ بھی یاد ہوگا کہ بولا تروویل وہ آدمی ہے جو غوطہ خوروں کی طرح پریشان کن معاملات میں مصروف رہتا تھا۔ وہ شاہراہوں پر پتھر توڑتا اور راہ گیروں کو لوٹتا رہتا تھا۔ سڑکوں کی مرمت کرنے والا اور چور تو تھا ہی، وہ ایک اور خواب دیکھا کرتا تھا؛ اسے Montfermeil کے جنگل میں دفن خزانوں پر یقین تھا۔ اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ایک درخت کے نیچے کی مٹی سے دولت نکال لے گا؛ اس اثنا میں وہ راہ گیروں کی جیب کترنے پر گزارا کرتا تھا۔

پھر بھی، ایک لمحے کے لیے وہ معقولیت پر آ گیا تھا۔ دراصل ایک دن وہ بال بال بچ گیا۔ جیسا کہ قاری کو علم ہے، اسے دوسرے بدمعاشوں کے ساتھ ژاندریت کی ماند میں پکڑ لیا گیا تھا۔ ایک برائی بھلائی بن گئی۔ اس کی شراب میں بدمستی اس کی نجات بن گئی تھی۔ ارباب اختیار کو پتا نہیں چل سکا کہ وہاں وہ ڈاکو کی حیثیت سے موجود تھا یا ڈکیتی کا شکار ہوا تھا۔ ارباب اختیار کے مطابق اس شام وہ شراب کے نشے میں بدمست پایا گیا تھا، اس لیے اس کے مقدمے کی پیروی نہ کرنے کا حکم جاری ہوا اور وہ آزاد کر دیا گیا۔ وہاں سے فرار ہونے کے بعد وہ Gagny سے Lagny جانے والی سڑک پر ہونے والے کام کی نگہ داری کرتا، فکرمندی کے عالم میں ریاست کی بھلائی کے لیے پتھر توڑتا تھا۔ چوری کا اشتیاق ٹھنڈا پڑ گیا مگر وائن کا نشہ نہیں چھوٹ سکا جس نے حال ہی میں اسے بچا لیا تھا۔

سڑک کی مرمت کی ٹھیکے داری پر واپسی کے تھوڑے دنوں بعد اسے جو دلچسپ اور

جذباتی تجربہ ہوا، وہ درج ذیل ہے:

ایک صبح، جب بولاتروئیل حسبِ معمول اپنے کام پر، اور ممکنہ طور پر اپنی گھات پر جا رہا تھا، پَو پھوٹنے سے ذرا پہلے درختوں کی ٹہنیوں کے بیچ اسے ایک آدمی نظر پڑا، جس کی صرف پشت دکھائی دی۔ مگر دھندلکے میں اتنے فاصلے سے دیکھنے کے باوجود وہ اس کے شانوں کی بناوٹ سے بالکل ناواقف نہیں تھا۔ بولاتروئیل اگرچہ نشے میں تھا، اس کی یادداشت اس وقت بھی بالکل صحیح وسالم تھی؛ ایک دفاعی پہلو، جو قانون کے نظام سے تنازعہ کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

"میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے؟" اس نے اپنے آپ سے کہا، مگر اس سوال کا وہ خود کوئی جواب فراہم نہیں کر سکا، سوائے اس کے کہ اس آدمی میں کسی کی شباہت ضرور تھی جو اس کی یادداشت میں ایک پیچیدہ نشان چھوڑ گئی تھی۔

اس کی شناخت کا معما حل نہیں ہوا۔ بولاتروئیل اپنے ذہن میں کچھ چیزیں شامل کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس آدمی کا تعلق دیہی علاقوں سے نہیں تھا۔ یہ حال ہی میں وہاں آیا تھا۔ بظاہر پیدل چل کر آیا تھا، کہ اس وقت Montfermeil سے ہو کر کوئی سواری نہیں گزرتی تھی۔ وہ ساری رات پیدل چلا۔ کہاں سے آیا تھا وہ؟ یقیناً زیادہ فاصلے سے نہیں آیا تھا؛ اس لیے کہ اس کے پاس نہ زادِ راہ کا نہ کوئی تھیلا تھا نہ کوئی پوٹلی تھی۔ بلاشبہ، وہ پیرس سے آیا تھا۔ وہ اس جنگل میں کیا کر رہا تھا؟ وہ اس وقت یہاں کیوں تھا؟ وہ یہاں کس لیے آیا تھا؟

بولاتروئیل اچانک خزانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنی یادداشت کو کھنگالا تو اسے یاد آیا کہ چند برس پہلے اسے ایک آدمی ملا تھا، اور شاید یہ وہی آدمی تھا۔

"بخدا" بولاتروئیل نے کہا "میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ Patron-Minette کا یہ کوچہ گرد ضرور کسی خاص وجہ سے یہاں آیا ہے، اور میں اس کی وجہ معلوم کر لوں گا۔ میں جس بات میں شامل نہ ہوں اس جنگل میں کوئی اسے خفیہ نہیں رکھ سکتا۔"

اس نے اپنی تیز نوک والی کدال سنبھالی۔ "اب میرے پاس کوئی چیز ہے۔" وہ بڑبڑایا، "جو اس جگہ کو اور اس آدمی کو ڈھونڈ نکالے گی۔"

جیسے گرہ کے ذریعے ایک دھاگا دوسرے دھاگے سے منسلک کیا جاتا ہے، اس نے اسی سمت اپنی پیش قدمی شروع کی جدھر وہ آدمی گیا تھا۔ اور وہ گھنی جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

وہ لمبے لمبے سو ڈگ بھر چکا تو نکلتے ہوئے دن کی روشنی سے اسے مدد ملی۔ ریت میں قدموں کے نشان، یہاں وہاں کچلے ہوئے خودرو پودے، ٹوٹی ہوئی جھاڑیاں، تازہ ٹوٹی جھاڑیوں کی

مڑی ہوئی شاخوں نے — جو سیدھا کرنے کے عمل میں اس طرح پھیل گئی تھیں جیسے کسی خوب صورت عورت کے بازو پھیل جاتے ہیں جب وہ سو کر اٹھنے کے بعد انگڑائی لیتی ہے — اس کی اس راستے کی طرف رہنمائی کی۔ وہ اسی جانب چلا، اور بھٹک گیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ گھنے جنگل میں گھس گیا اور ایک بلندی پر پہنچا۔

بہت سویرے آنے والا ایک شکاری Guillery کی فضاؤں میں سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ اس نے اسے درخت پر چڑھ جانے کا مشورہ دیا۔ عمر رسیدہ ہوتے ہوئے بھی وہ پھرتیلا تھا۔ قریب ہی ایک بہت بڑا سفیدے کا درخت تھا۔ بولاترویل درخت پر چڑھ گیا اور جہاں تک ممکن ہوا بلندی پر گیا۔ خیال اچھا تھا۔ اس جانب جدھر گھنا اور خودرو جنگل تھا، اچانک بولاترویل کو وہی آدمی پھر دکھائی دیا۔ اس کی نظریں ابھی اس آدمی پر مشکل سے جمی تھیں، کہ وہ پھر اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔

وہ آدمی جنگل میں داخل ہوا، بلکہ جنگل کے درمیان ایک چھوٹے سے کھلے میدان میں پہنچ گیا تھا، جو خاصے فاصلے پر تھا، اور بڑے بڑے درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ بولاترویل اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھا، اس لیے کہ وہاں اس نے پتھروں کے ڈھیر کے پاس ایک بیمار شاہ بلوط درخت دیکھا تھا جس کے تنے پر براہِ راست کیلوں سے جڑی جست کی چادر چڑھی تھی۔ یہ وہی کھلا میدان تھا جس کو پہلے Blaru-bottom کہا جاتا تھا۔ پتھروں کا یہ ڈھیر، جو نہ جانے کس کام کے لیے تھا، تیس برس پہلے بھی دیکھا جا سکتا تھا، اور بلا شبہ اب بھی وہیں تھا۔ پتھروں کے ڈھیر، اگر وہ احاطے کی دیوار کی صورت میں نہ ہوں تو برسوں اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ یہ عارضی ضروریات کے لیے ہوتے ہیں۔

بولاترویل خوشی کی عجلت میں اترنے کے بجائے درخت سے کود پڑا۔ ماند مل گئی تھی، مگر اب سوال یہ تھا کہ درندے کو کس طرح پکڑا جائے۔ اس کے خیالوں کا مشہور خزانہ غالباً اسی جگہ تھا۔

اس کھلی جگہ پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ عام چلنے والے راستوں سے، جن میں پریشان کرنے والے ہزاروں موڑ تھے، وہاں پہنچنے میں سوا گھنٹا لگتا تھا۔ اور اگر عام چلنے والے راستے کے بجائے ناک کی سیدھ میں، گھنی جھاڑیاں پھلانگتے ہوئے چلا جائے، جو گھنی ہوتی ہیں جن میں کانٹے بھی ہوتے ہیں، تو کم از کم آدھ گھنٹا لگتا ہے۔ بولاترویل نے ان پریشانیوں کو نظر انداز کر دیا۔ وہ صراطِ مستقیم کا قائل تھا؛ قابلِ احترام بصری دھوکا بھی لوگوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ جھاڑیوں والا راستہ جس میں کانٹے بھی تھے، اس کو بہترین راستہ محسوس ہوا۔ بولاترویل نے، جو ٹیڑھے میڑھے راستوں کا عادی تھا، اس بار سیدھی راہ چلنے کی غلطی کی۔

ہمت کر کے وہ ایک جھاڑی میں کود پڑا۔ اس کا holly کی جھاڑیوں، بچھو بوٹی، پھولوں کی جھاڑیاں، اونٹ کٹارے، اور بیری کی جھاڑیوں سے پالا پڑا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا تھا۔ نالے میں نیچے کی طرف اسے پانی بھی ملا، جس سے گرنا پڑا تھا۔ بالآخر، چالیس منٹ بعد، پسینے میں شرابور، بے حال، زخمی اور خوف ناک حالت میں وہ Blaru-bottom پہنچ گیا۔

میدان میں کوئی نہیں تھا۔ بولاتروپل تیزی سے پتھروں کے ڈھیر کی طرف گیا۔ ڈھیر اپنی جگہ موجود تھا۔ اسے کہیں اور منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ آدمی جنگل میں گم ہو گیا۔ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کہاں؟ کس سمت؟ کس جھاڑی میں؟ اندازہ لگانا ناممکن تھا۔

اور دل دکھانے والی بات یہ ہے کہ پتھروں کے اس ڈھیر کے پیچھے، جست کی چادر لگے درخت کے سامنے، تازہ کھدی زمین تھی، پاس ہی پڑی یا فراموش کردہ ایک کدال تھی، اور قریب ہی ایک سوراخ تھا۔

اور وہ سوراخ خالی تھا۔

بولاتروپل نے ہوا میں اپنا مکا لہراتے ہوئے چیخ کر کہا، ''چور کہیں کا!''

❁

ماریوس گھریلو جنگ میں

ایک طویل عرصے تک ماریوس مردہ تھا نہ زندہ۔ کئی ہفتے بخار اور سرسامی کیفیت میں رہا اور اس میں ایسی علامات ظاہر ہو رہی تھیں جو سر کے زخموں کے صدموں کے باعث تھیں بہ جائے کہ خود زخموں کی وجہ سے تھیں۔

رات بھر وہ غم آلود بڑبڑاہٹ اور جاں کنی کے عالم میں بار بار کوزیت کا نام لیتا تھا۔ کچھ زخم بہت خطرناک تھے؛ بڑے زخموں سے نکلنے والی رطوبتیں جو ہمیشہ دوبارہ جذب ہو جائیں مخصوص ماحولیاتی کیفیت میں بیمار انسان کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں؛ موسم کی ہر تبدیلی پر، معمولی سی تکلیف پر بھی اس کا معالج مضطرب تھا۔

"اس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔" اس نے دوبارہ کہا "کہ زخمی انسان کو جوش نہ دلایا جائے۔" زخموں کی مرہم پٹی پیچیدہ اور مشکل ہوتی تھی، آلات اور پٹیوں کا موم جامے کے ذریعے لگایا جانا اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ جیسا کہ اس نے خود بتایا تھا، نکولے "سقف کے برابر چادر" کو پھاہے کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ کلورائیڈ سے بنے مرہموں اور سلور نائٹریٹ کی مدد سے گوشت کی سڑن پر قابو پایا جا سکا تھا۔ جب تک کسی خطرے کا امکان تھا، موسیو بلیر نورما اپنے نواسے کے تکیے کے قریب افسردہ بیٹھے نظر آتے تھے، اور ماریوس نہ زندہ تھا نہ مردہ۔

ہر روز، اور کبھی کبھی دن میں دو بار، سفید بالوں والا اور نفیس لباس میں ملبوس ایک شخص — یہ تفصیل دربان نے بیان کی تھی — زخمی کا حال دریافت کرنے کے لیے آتا اور مرہم پٹی کے لیے پھاہے کا ایک بڑا سا بنڈل چھوڑ جاتا تھا۔

جب ماریوس تقریباً مردہ حالت میں اپنے نانا کے گھر لایا گیا تھا، اس کے چار ماہ اور ایک دن بعد معالج نے ماریوس کے بچ جانے کا اعلان کر دیا۔ صحت یابی کی شروعات ہوئی، مگر ہنسلی

کی ہڈی کے ٹوٹنے کے باعث مزید دو ماہ تک ماریوس کو ایک لمبی آرام کرسی پر لیٹنے رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ہمیشہ کوئی آخری زخم ہوتا ہے جو بھرتا نہیں، جس کی طویل عرصے تک مرہم پٹی کی جاتی ہے، بیمار کے لیے جو نہایت تکلیف دہ بات ہوتی ہے۔

مگر اس طویل بیماری اور صحت یابی نے اسے ہر قسم کی دوڑ بھاگ سے بچا لیا۔ فرانس میں ایسا غصہ نہیں ہوتا جو عوامی ہوتے ہوئے بھی چھ ماہ کے عرصے میں ختم نہ ہو جائے۔ سوسائٹی کی موجودہ کیفیت میں بغاوتیں اتنی غلطیوں کے باعث ہوتی ہیں کہ بعد میں خاص قسم کی ضروریات کے پیشِ نظر انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس میں ، معروف بیکار اور پولیس کے سربراہ Gisquet کے اس t قابلِ انکار حکم کو بھی شامل کر دیا جائے جو ڈاکٹروں کو زخمی کے بارے اطلاعات فراہم کرنے کا پابند کرتا ہے، جس نے نہ صرف عوام کو بلکہ سب سے پہلے بادشاہ کو بھی ناراض کر دیا تھا، اور جس کے تحت زخمی اس تفتیش سے محفوظ رکھے جاتے تھے؛ جو لوگ لڑائی کے عمل کے دوران قیدی بنائے جاتے تھے وہ اس سے مستثنیٰ تھے، اور جنگ کی کاؤنسل ان کو پریشان کرنے کی ہمت بھی نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا، ماریوس کو سکون سے رہنے دیا گیا۔

پہلے موسیو ہلیر نورما، ہر طرح کی اذیت سے اور پھر ہر نوع کی خوشی سے دوچار ہوا۔ اس کو زخمی کے پاس ہر رات گزارنے سے روکنا مشکل تھا؛ اس نے اپنی بڑی آرام کرسی ماریوس کے بستر کے قریب رکھوائی تھی؛ اس نے اپنی بیٹی کو گھر میں موجود بستر کی بہترین چادروں سے زخم پر باندھنے والی پٹیاں بنانے پر مامور کر دیا تھا۔ میڈموزیل ہلیر نورما، خردمند اور عمر رسیدہ شخص کی طرح کسی نہ کسی بہانے اچھی قسم کی چادروں کو بچا لیتی تھی، جب کہ اس کا باپ سمجھ رہا تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل کی جا رہی ہے۔ موسیو ہلیر نورما کسی کو اس امر کی تشریح کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس بات پر حجت کرے کہ ململ سے اتنا اچھا پھایا نہیں بنایا جا سکتا جتنا کہ موٹے کپڑوں سے بنی چادروں سے یا نئی چادروں کے مقابلے میں پرانی چادروں سے بن سکتا تھا۔ وہ زخموں کی ہر مرہم پٹی کے وقت موجود ہوتا جب کہ میڈموزیل خاموشی سے وہاں سے غائب ہو جایا کرتی تھی۔ جب قینچی سے مردہ گوشت کاٹا جاتا تو وہ "اُف! اُف" کرنے لگتا تھا۔ اسے ماریوس کو اپنے بوڑھے لرزیدہ ہاتھوں سے ٹھنڈی دوا پیش کرتے دیکھ پر دل کھنچ جاتا تھا۔ وہ ڈاکٹر پر سوالوں کی بھرمار کر دیتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ پوچھے ہوئے سوالات بار بار دہراتا تھا۔

ایک دن جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کی ماریوس اب خطرے سے باہر ہے، تو وہ نیک خو انسان [خوشی سے] تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دربان کو تین سو تختے میں دے دیے

تھے۔ اس شام جب وہ اپنے کمرے میں واپس گیا تو اپنے انگوٹھے اور پہلی انگلی کو جھانجھ بنا کر gavotte [ایک قسم کا فرانسیسی] رقص کیا اور جھوم جھوم کر مندرجہ ذیل گانا بھی گایا تھا:

Jeanne est nee a Fougere
Vrai nid d'une bergere;
J'adore son jupon,
Fripon.

Amour, tu vis en elle;
Car c'est dans sa prunelle
Que tu mets ton carquois,
Narquois!

Moi, je la chante, et j'aime,
Plus que Diane meme,
Jeanne et ses durs tetons
Bretons.

اس کے بعد وہ کرسی پر گھٹنوں کے بل جھک گیا تھا اور باسک نے، جو نصف وا دروازے سے جھانک کر اسے دیکھ رہا تھا، یقین کر لیا تھا کہ وہ دعا کر رہا ہے۔

حالاں کہ اس وقت تک، اسے خدا کے وجود پر یقین نہیں تھا۔

بہتری کے ساتھ ساتھ، جو زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی، نانا دیوانہ ہوتا جا رہا تھا۔ طرح طرح کی میکانکی حرکتوں سے خوشی کا اظہار کرتا؛ بلاوجہ سیڑھیاں اترتا چڑھتا تھا۔ ایک خاتون ڈاکٹر کو بہت حیرانی ہوئی جب اسے صبح سویرے ایک گل دستہ ملا؛ گل دستہ موسیو ہلیر نورما نے بھیجا، جس پر اس کے شوہر نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ موسیو ہلیر نورما نے نیکولے کو گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے پر مجبور کیا۔ وہ ماریوس کو "موسیو ڈی پون مرسی" کہہ کر پکارتا؛ چیخ چیخ کر "جمہوریہ زندہ باد!" کہتا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سے سوال کرتا، "کیا اب وہ خطرے میں نہیں؟" وہ ماریوس کو نانی کی سی آنکھوں سے گھورتا۔ کھانا کھاتے وقت اس پر جھک جاتا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بھول گیا تھا؛ اپنے آپ سے سوال جواب کرتا رہتا تھا۔ اس کے نزدیک اب ماریوس گھر کا مالک تھا؛ نانا اپنی خوشی سے گھر سے دستبردار ہو گیا تھا، وہ اپنے نواسے کا نواسہ بن گیا تھا۔

خوشی کی جس کیفیت میں وہ تھا، اس میں بچوں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس خوف میں کہ کہیں وہ صحت مند ہونے والے ماریوس کو تھکا یا ناخوش نہ کر دے، ہنستے وقت اس کے پیچھے چلا جاتا۔ وہ مطمئن، پُر مسرت، خوش و خرم، دل رُبا اور جوان ہو گیا تھا۔ اس کی سفید زلفیں اس کی شکل میں ایک نرم جلال کا اضافہ کر رہی تھیں۔ جب جھریوں میں وقار مل جائے تو بوڑھا لائقِ احترام ہو جاتا ہے۔ منور بڑھاپے میں ناقابلِ بیان صبح طلوع ہونے لگتی ہے۔

جہاں تک ماریوس کا سوال تھا، جب وہ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کی اجازت اور نگہداری

کی اجازت دیتا تو اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال ہوتا تھا: کوزیٹ!

بخار اور بے ہوشی کے ختم ہو جانے کے بعد اس نے ایک بار بھی اس کا نام نہیں لیا تھا، اور شاید یہ قیاس کر لیا گیا تھا کہ اب وہ اس کے خیالوں سے محو ہو گئی ہے۔ وہ اس لیے پُر امن تھا کہ اس کی روح اس کے پاس تھی۔

اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ کوزیٹ کا کیا حال تھا؛ la Chanvrerie اسٹریٹ کا سارا قضیہ اس کی یادوں میں بادل کی طرح تھا؛ پرچھائیاں جو بالکل غیر واضح تھیں، اس کے دماغ میں تیرتی پھرتی تھیں؛ ایپونین، گاوروش، مابوف، تھن آردیے، اور اس کے تمام دوست پٹنے کے دھویں میں گھل مل گئے تھے؛ اس ماجرے میں سے موسیوفوشلوں کے حیرت انگیز گزرہونے سے اس پر آندھی کا سا اثر ہوا تھا؛ اسے اپنے زندگی سے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا، اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کس طرح بچا تھا، اور کس نے بچایا تھا؛ نہ ہی اس کے اطراف موجود 'فادر' کو اس بات کا علم تھا؛ اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ ماریوس کو کرایے کی سواری گاڑی میں رات کے وقت Filles-du-Calvaire اسٹریٹ پر لایا گیا تھا؛ اس کے نزدیک ماضی، حال، مستقبل مبہم خیال کی دھند سے زیادہ نہ تھے، مگر اس کہر میں ایک غیر متحرک نقطہ تھا، ایک صاف اور بالکل واضح خاکہ تھا، کوئی شے تھی جو سنگِ خارا جیسی تھی، ہمت تھی، خواہش تھی: کوزیٹ کو ایک بار پھر پا لینے کی۔ اس نے اپنے دل کو حکم دے دیا تھا کہ وہ ایک کے بغیر دوسرے کو قبول نہیں کرے گا، وہ اس شخص کے تعین کرنے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا، جو اسے زندہ رکھنے کا خواہش مند تھا — اپنے نانا جان سے دور، اپنے مقدر سے دور، جہنم سے دور — اس کی گم شدہ جنت کی بحالی کا خواہش مند تھا۔

اس نے اپنے آپ سے وہ حقیقت پوشیدہ نہیں رکھی کہ رکاوٹوں کا وجود ہے۔

ہم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں، کہ اپنے بارے میں نانا کی تمام تر نرم دلی اور فکر مندی سے اس کا دل کھنچ گیا تھا؛ اسے جیتا نہیں گیا تھا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ کہیں چھپا نہیں تھا؛ اور ایک معذور انسان کے خیالوں میں پوشیدہ نرم دلی کو ایک نئی اور حیرت انگیز چیز سمجھ رہا تھا، جس میں اس کو فتح کر لینے کی خواہش تھی۔ اس کا رویہ بالکل سرد رہا۔ نانا اپنا بے جان تبسم ضائع کر رہا تھا۔ ماریوس نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ سب اس وقت تک ٹھیک رہے گا جب تک ماریوس نانا سے بات نہیں کرے گا، اور واقعات کو اپنے راستے چلنے دے گا؛ مگر جب کوزیٹ کا سوال اٹھے گا تو اسے ایک بالکل دوسرا چہرہ نظر آئے گا، اور اس کے نانا کا اصلی رویہ کھل کر سامنے آجائے گا۔ تب منظر بہت ناخوش گوار ہو گا۔ خاندانی سوالات اور معاملات ایک بار پھر تیزی سے ابھر کر سامنے آجائیں گے؛ نقطہ ہائے نظر کا تصادم ہوگا؛ ہر قسم کا طنز و تشنیع ہوگا اور ایک ہی وقت میں Fauchelevent،

Coupelevent، قسمت، افلاس اور مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات ہوں گے؛ شدید مزاحمت ہوگی؛ نتیجہ کیا ہوگا؟ انکار۔ اسی لیے ماریوس قبل از وقت سخت ہو گیا تھا۔

اور پھر جیسے جیسے اس کی زندگی واپس آتی جائے گی، اس کی یادوں کے پرانے ناسور ایک بار پھر ہرے ہونے لگیں گے۔ اس نے ایک بار پھر ماضی پر نظر ڈالی؛ کرنل پون مرسی نے ایک بار پھر خود کو اپنے اور موسیو ہلیر نورما کے درمیان کر لیا تھا، اور خود سے کہہ دیا تھا کہ اسے اس شخص سے مہربانی کی توقع نہیں تھی، جو اس کے باپ سے اتنا غیر منصفانہ اور اتنا سخت رویہ رکھتا تھا۔ اور صحت کے ساتھ ساتھ اس میں اپنے نانا کے لیے ایک قسم کی سختی واپس آتی جا رہی تھی۔ وہ بوڑھا آدمی اس سے آہستہ آہستہ دل برداشتہ ہوتا جا رہا تھا۔ موسیو ہلیر نورما نے اس بات کا اظہار کیے بغیر مشاہدہ کیا تھا کہ جب سے ماریوس اس کے پاس واپس لایا گیا تھا، اور اس نے دوبارہ ہوش سنبھالا تھا، اس نے ایک بار بھی اسے 'فادر' کہہ کر مخاطب نہیں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے اسے 'موسیو' نہیں کہا تھا مگر وہ اپنے جملے اس طرح بدلتا تھا کہ اسے نہ 'فادر' کہنا پڑتا تھا نہ 'موسیو'۔ ظاہر ہے کہ ایک بحران آنے والا تھا۔

جیسا کہ اس قسم کے معاملات میں ہوتا ہے، ماریوس نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے جھڑپ شروع کر دی تھی۔ اس عمل کو "feeling the ground." کہا جاتا ہے۔ ایک صبح ایسا ہوا کہ موسیو ہلیر نورما نے Convention کو برا کہا اور Saint-Juste ،Danton اور Robespierre وغیرہ کے بارے میں شاہی پرستوں کی خطابت کا حوالہ دیا۔ ماریوس نے سختی سے کہہ دیا کہ "'93 کے لوگ غیر معمولی تھے۔" بوڑھا خاموش ہو گیا، اور پورے دن اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

ماریوس نے، جسے اپنے ابتدائی برسوں کا بے لچک نانا یاد تھا، اس خاموشی کو غضب کا ارتکاز سمجھا، جو شدید تنازعے کا باعث ہونے والا تھا؛ وہ ذہن کے اندرون ترین وقفے میں اس کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انکار کی صورت میں وہ ساری پٹیاں نوچ ڈالے گا؛ اپنی ہنسلی کی ہڈی کو دوبارہ اکھاڑ پھینکے گا؛ سارے زخم کھول دے گا اور ہر قسم کی غذا سے انکار کر دے گا۔ اس کے زخم جنگ کے گولا بارود بن گئے تھے۔ یا وہ کوزیٹ کو حاصل کرلے گا یا اپنی جان دے دے گا۔

وہ ہنرمند صبر کے ساتھ موافق لمحے کے انتظار میں تھا۔

اور ایک دن وہ موقع آ ہی گیا۔

۞

ماریوس کا حملہ

ایک دن جب موسیو ٹیلیر نورما کی بیٹی سنگِ مرمر کی چوکی پر دواؤں کی شیشیاں وغیرہ قرینے سے رکھ رہی تھی، وہ ماریوس پر جھکا اور نرم ترین لہجے میں اس سے کہا "دیکھو بیٹا ماریوس، اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو مچھلی کی جگہ گوشت کھانے لگتا۔ تلی ہوئی سول مچھلی صحت مندی کی ابتدا کے لیے لاجواب ہوتی ہے مگر بیمار آدمی کو پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے اچھی کٹلٹ ضروری ہوتی ہے۔"

ماریوس جو اپنی جسمانی قوت تقریباً بحال کر چکا تھا، اسے پوری طرح مجتمع کیا، اُٹھ کر بیٹھا، اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر اپنے بستر کی چادر پر رکھ لیں؛ اپنے نانا کے چہرے کی طرف دیکھا، خوف ناک صورت بنائی اور کہا "اب مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں!"

"ضرور کرو۔" نانا نے اس سے کہا اور ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"آپ واقعی راضی ہیں؟"

"ہاں، راضی ہوں۔ تم اسی لڑکی سے شادی کرو گے نا؟"

ماریوس اس کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ اس پر سر سے پا تک لرزہ طاری ہو گیا۔

موسیو ٹیلیر نورما نے مزید کہا، وہ تمھاری ہو گی؛ وہ خوب صورت لڑکی تمھاری ہی ہے؛ وہ بوڑھے آدمی کی طرح روزانہ تمھاری خیریت پوچھنے آتی ہے۔ جب سے تم زخمی ہوئے ہو وہ اپنا سارا وقت رونے اور پھائے بنانے میں صرف کرتی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں معلومات کر لی ہیں۔ وہ l'Homme Arme اسٹریٹ، 7 نمبر مکان میں رہتی ہے۔ اچھا، تو تم اسی سے شادی

کرنا چاہتے ہو؟ تمھاری شادی اس سے ہوگی۔ تم پکڑے گئے! تم نے منصوبہ بنایا تھا، تم نے اپنے آپ سے کہا تھا: میں اپنے ٹاٹا کو صاف صاف بتا دینے والا ہوں؛ سلطنت اور ڈائریکٹری کی اس خشک شدہ لاش کو، اس قدیم البیلے کو، اس Dorante [سترھویں صدی کے ایک طربیہ کھیل کا جھوٹ بولنے والا کردار] کو جو اب [مزاحیہ کردار] Geronte بن گیا ہے؛ کہ وہ اپنا کھیل کود کر چکا ہے، وہ بھی محبتیں کر چکا ہے، اس کی اپنی بھی داشتائیں اور کوزیٹیں رہ چکی ہیں؛ وہ اپنی جھرجھریاں لے چکا ہے، اس میں بھی پر پرواز تھے، اس نے بھی اپنی جوانی کی بہاریں دیکھی ہیں؛ اسے یقینی طور پر یہ سب یاد ہوگا۔"
ارے! تم نے اس طلائی بھنورے کو پکڑ لیا ہے۔ بہت اچھا گیا۔ میں تمھیں ایک کٹلٹ پیش کرتا ہوں اور تم اس کے جواب میں کہو "ذرا سنیے، ناناجان! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

تمھارے لیے تبدیلی کا ایک موقع ہے۔ ارے تم تو مجھ سے نوک جھونک کرنے لگے تھے۔ تم نہیں جانتے کہ میں بزدل بوڑھا آدمی ہوں۔ کیا خیال ہے تمھارا؟ تم ناراض ہو گئے تھے؟ تم کو توقع نہیں تھی کہ تمھارا ٹاٹا تم سے زیادہ احمق ہے؛ تم اس گفتگو کو ضائع کر رہے تھے، جو مجھ سے کرنا چاہتے تھے، وکیل صاحب! اور یہ بہت تکلیف دہ بات تھی۔ جو کچھ بھی ہوا، بُرا ہوا۔ اب تم دیوانے ہو جاؤ۔ میں بھی وہی کروں گا، جو تم چاہتے ہو۔ میں نے اپنی جانب سے ساری معلومات کر لی ہیں۔ میں چالاک بھی ہوں؛ وہ لڑکی بہت دل رُبا ہے، دور اندیش ہے؛ نیزہ بردار افسر [سے عشق] کی بات صحیح نہیں تھی؛ اس لڑکی نے تمھارے لیے پھائے کے ڈھیر بنائے ہیں، وہ نگینہ ہے؛ تمھاری پرستش کرتی ہے؛ اگر تم مرجاتے تو ہم تین کے جنازے ایک ساتھ اٹھتے؛ اس کا تابوت بھی میرے تابوت کے ساتھ ہوتا۔ جب سے تم ٹھیک ہو گئے ہو، میرا ارادہ تھا کہ ایک دن میں اس کو تمھارے بستر کے پاس لا کر بٹھا دوں گا؛ یہ سب رومانس میں ہوتا ہے کہ پسندیدہ لڑکیاں خوب صورت اور نوجوان زخمی مردوں کے بستر کے قریب بٹھائی جاتی ہیں، مگر یہ اس لیے کیا نہیں گیا تھا کہ تمھاری پھوپھی اس کے بارے میں کیا سوچتی؟ تین چوتھائی وقت تم بالکل برہنہ ہوتے تھے، میرے پیارے دوست! نکولے سے پوچھ لو، جو ایک لمحے کے لیے بھی تمھارے پاس سے ہٹی نہیں تھی، تو تمھارے پاس کسی عورت کا کوئی امکان کیسے ہو سکتا تھا؟ بخار زدہ مرد محض خوب صورت لڑکی سے ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ مختصر یہ کہ، اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے؛ اب ہم اس بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے؛ سب کچھ کہا سنا جا چکا ہے؛ اب وہ تمھاری ہے۔ یہی میری زندگی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ میں نے خود سے کہا تھا:

اب میرے پاس میری پیاری کوزیٹ ہے؛ میں اسے اس کے حوالے کرنے والا ہوں؛

اس کے بعد وہ مجھ سے تھوڑی سی محبت کرنے پر مجبور ہو جائے گا، ورنہ اسے وجہ بتانا ہوگی، کیوں؟"

اوہ اچھا، تم سمجھے تھے کہ بوڑھا ہنگامہ کرنے والا ہے، شور مچانے والا ہے اور اس طلوعِ صبح کی طرف اپنی بید اٹھانے والا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کوزیت، ٹھیک ہے؛ محبت، ٹھیک ہے؛ مجھے اس سے زیادہ نہیں چاہیے۔ دعا کیجیے، شادی کرنے کی زحمت کیجیے، جناب والا! خوش رہو، میرے بہت پیارے بیٹے۔" اتنا کہہ کر بوڑھا سسکیاں لینے لگا۔

اس نے ماریوس کا بازو پکڑا، اس کو دونوں ہاتھوں سے اپنے چھاتی پر دبایا؛ اور دونوں رونے لگے۔ اعلیٰ درجے کی خوشی کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے۔

"فادر؟" ماریوس نے چیخ کر کہا۔

"اوہ اچھا، تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" بوڑھے نے کہا۔

اس کے بعد ایک ناقابلِ بیان لمحہ گزرا۔ دونوں کے گلے رُندھ گئے، اور وہ بول نہیں پا رہے تھے۔ "بالآخر، بوڑھے نے ہکلاتے ہوئے کہا، "آ میرے پاس، گلے لگ جا! بالآخر، تیرا منہ کھلا تو سہی۔ ارے اس نے مجھے 'فادر' کہا ہے!"

ماریوس نے اپنا سر اپنے نانا کی گرفت سے آزاد کیا اور نرمی سے کہا، "مگر! فادر اب میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں، مجھے اس سے ملنا چاہیے۔"

"ضرور، تم کل اس سے ملو گے۔"

"فادر!"

"کیا بات ہے؟"

"آج ہی کیوں نہیں؟"

"اچھا، آج ہی سہی۔ آج ہی ملاقات ہوگی۔ تم نے تین بار مجھے فادر کہا ہے۔ میں اس کا انتظام کروں گا۔ اسے اسی جگہ لایا جائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ یہ بات اشعار میں کہی جا چکی ہے۔ یہ Andre Chenier کے لکھے ہوئے ایلیے 'Jeune Malade' کے اختتام کے مصرعے ہیں، Andre Chenier جس کا گلا 93' کے . . . ras عفریتوں نے کاٹا تھا۔

موسیو ژیلر نورما کی خواہش تھی کہ وہ ماریوس کے ماتھے پر ہلکی سی شکن دیکھے، جو سچ یہ ہے کہ، اس کی بات سن نہیں رہا تھا، اور 1793ء کے [واقعات کے] بجائے کوزیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس طرح بے موقع Andre Chenier کا نام لینے پر نانا کانپنے لگا تھا۔

اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی:

"اس کا گلا کاٹا گیا تھا، کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم انقلابی جوہر قابل کینہ پرور نہیں تھے، ہیرو تھے؛ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے، Andre Chenier نے ان کو شرمندہ کردیا تھا، اور انھوں نے ہی اسے گلوٹین کروایا تھا، یعنی Thermidor [فرانس کی جمہوریہ کے کیلنڈر کے گیارہویں مہینے] کی ساتویں تاریخ کوان بڑے لوگوں نے عوام کے تحفظ کی خاطر Andre Chenier سے التجا کی تھی کہ وہ مہربانی کرکے .... کی طرف چلا جائے۔"

موسیو بلیر نورما، جس کا اپنا جملہ گلوگیر ہوگیا تھا، مزید کچھ کہہ نہیں سکا۔ وہ نہ اسے ختم کرسکتا تھا نہ واپس لے سکتا تھا؛ اس کی بیٹی ماریس کا تکیہ ٹھیک کررہی تھی جو طرح طرح کے جذبات سے مغلوب ہوگیا تھا؛ اور بوڑھا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، جتنی کہ اس کی عمر برداشت کرسکتی تھی؛ کمرے میں جاکر اس نے دروازہ بند کرلیا تھا؛ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، اس کی آنکھیں پھیل کر بڑی ہوگئی تھیں؛ اس نے خود کو ایمان دار باسک کے دوبدو پایا، ناک کے سامنے ناک تھی؛ باسک ڈیوڑھی میں اس کے کالے جوتے پر پالش کررہا تھا۔ بوڑھے نے باسک کو کالر سے پکڑلیا اور پوری قوت سے چیخ کر کہا، "شیطانوں کی ایک لاکھ Javottes [رقاصاؤں] کی قسم، ان بدمعاشوں نے ہی اسے قتل کرایا تھا!"

"کسے، جناب؟"

"Andre Chenier کو!"

"جی ہاں، جناب!" باسک نے چونک کر جواب میں کہا۔

ہلیر نورما اور فوشلووں

کوزیت اور ماریوس نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

وہ ملاقات کیسی رہی، ہمیں اس کی تفصیل بتانے سے انکار ہے۔ ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کا منظر پیش کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے؛ سورج ان میں سے ایک ہے۔

جب کوزیت داخل ہوئی باسک اور نکولیٹ سمیت پورا خاندان اس وقت ماریوس کے کمرے میں جمع تھا۔ عین اس وقت نانا اپنی ناک صاف کرنے والا تھا؛ وہ رُک گیا، ناک کو رومال سے پکڑے رکھا، اور اس کے اوپر سے کوزیت کو دیکھ رہا تھا۔ نہایت باوقار انداز میں کوزیت ڈیوڑھی پر نمودار ہوئی "قابلِ پرستش!" موسیو ہلیر نورما نے حیرانی سے کہا۔ اس کے بعد اس نے زور سے اپنی ناک صاف کی۔

کوزیت اس وقت سرشاری، مسرتوں اور خوف کی جنت میں تھی۔ وہ بھی اتنی ہی حیران تھی جیسا کوئی اور خوشی کے عالم میں ہوتا ہے۔ لجائی، شرمائی کوزیت ماریوس کے بازوؤں میں گر جانا چاہتی تھی، مگر ہمت نہیں ہوئی۔ ان تمام لوگوں کی موجودگی میں اظہارِ محبت کرنے سے شرما گئی تھی۔ لوگ محبت کرنے والوں سے بہت بے رحمی کرتے ہیں کہ آخری لمحے تک انھیں اکیلا نہیں چھوڑتے۔ محبت کرنے والوں کو دوسروں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

کوزیت کے ہمراہ، مگر عقب میں، ایک اور آدمی داخل ہوا تھا جس کے بال سفید تھے، جو سنجیدہ تھا مگر مسکرا رہا تھا، اگرچہ اس کا تبسم مبہم اور شکستہ دل جیسا تھا۔ یہ شخص "موسیو فوشلووں" تھا؛ جس کا اصل نام ژاں ولژاں تھا۔

وہ شائستہ انسان تھا، جیسا کہ دربان نے کہا تھا؛ سر سے پا تک سیاہ، بالکل نئے لباس

میں ملبوس ؛ سفید گلے میں گلو بند ڈالے ہوئے تھا۔ دربان اس باقاعدہ بورژوا، اس ممکنہ مشہور شخصیت، اس خوف زدہ کر دینے والے شخص کو پہچان نہیں سکا تھا جو اس کے دروازے پر 7 جون کو ایک لاش لیے وارد ہوا تھا، جس کے کپڑے تار تار تھے، کیچڑ میں لت پت، ڈراؤنا، پریشاں حال تھا، اس کا چہرہ خون اور کیچڑ سے بھرا تھا، جو اپنے بازوؤں میں بے ہوش ماریوس کو سنبھالے ہوئے تھا؛ دربان کی حس بیدار ہو گئی تھی؛ جب موسیو فوشلوون کوزیٹ کے ہمراہ آیا تو دربان اپنی بیوی سے کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا: ''نہ جانے کیوں میرا قیاس کہہ رہا ہے کہ میں نے یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

موسیو فوشلوون ماریوس کے کمرے کے دروازہ کے قریب ہی رہا۔ اس کی بغل میں کاغذ کا ایک گٹھا تھا جو کسی کتاب کے مانند تھا اور کاغذ میں لپیٹا گیا تھا۔ لپیٹے جانے والے کاغذ کا رنگ سبزی مائل تھا اور اس پر دھبے لگے ہوئے تھے۔

''کیا یہ صاحب اپنی بغل میں ہمیشہ اسی طرح کتابیں دبائے رکھتے ہیں؟'' میڈموزیل بلیر نورما نے، جسے کتابیں پسند نہیں تھیں، چپکے سے یہ سوال کیا۔

''بھئی'' موسیو بلیر نورما نے اسی لہجے میں جواب میں کہا، جس کے کان میں اس کی آواز پڑ گئی تھی، ''یہ تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ کیا یہ بُری عادت ہے؟ میرے دوست موسیو بولارڈ (Boulard) بغل میں کوئی کتاب دبائے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے، اور ان کے پاس ہمیشہ کوئی قدیم کتاب ہوتی تھی، جسے وہ سینے سے چمٹائے رہتے تھے۔'' اور، پھر جھک کر اس نے زور سے کہا، ''موسیو ٹرانش لیوین (Tranchelevent) .....'' فادر بلیر نورما نے جان بوجھ کر صحیح نام نہیں لیا تھا، یہ اس کی اشراف والی عادت تھی۔ ''موسیو ٹرانش لیوین، میں اپنے نواسے بیرن ماریوس پون مرسی کی جانب سے آپ سے میڈموزیل کا رشتہ مانگنے میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔''

موسیو ٹرانش لیوین ادب سے خم ہو گئے۔

''تو یہ طے ہو گیا۔'' نانا نے کہا۔

اور ماریوس اور کوزیٹ کی طرف رُخ کیا؛ برکات دینے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے اور زور سے کہا، ''دونوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔''

انھوں نے اس جملے کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ اور بھی برا ہوا، اس لیے کہ چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ سب سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ ماریوس اپنی آرام کرسی پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا تھا؛ کوزیٹ اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔

"اُف خدایا!" کوزیت بڑبڑائی، "میں ایک بار پھر تمھیں دیکھ سکتی ہوں۔ تو یہ تم ہی ہو، یعنی، یہ آپ ہی ہیں۔ لڑائی میں اس طرح شریک ہونے کا خیال، مگر کیوں؟ کتنی خوف ناک بات ہے۔ میں چار مہینے مری پڑی رہی۔ اوہ تم کتنے شریر ہو کہ تم جنگ کے لیے چلے گئے تھے۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے تمھیں معاف کیا، مگر پھر ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ مجھے تم سے ملانے کے لیے آئے تھے، اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں مرنے والی ہوں، مگر یہ شادی مرگ ہوتی۔ میں بہت افسردہ تھی۔ مجھے لباس تبدیل کرنے کا بھی وقت نہیں ملا؛ مجھے دیکھ کر لوگ ڈر جائیں گے۔ مجھے مڑے اور ملے ڈلے کالر میں دیکھ کر تمھارے رشتے دار کیا کہیں گے؟ تم بھی تو کچھ بولو۔ میں ہی باتیں کر رہی ہوں۔ ہم اب بھی l'Homme Arme اسٹریٹ پر رہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمھارا شانہ خراب حالت میں تھا۔ اتنا کہ، انھوں نے مجھے بتایا تھا، کہ تم اس کے اندر اپنی مٹھی ڈال سکتے تھے۔ اور پھر شاید انھوں نے قینچی سے تمھارا گوشت بھی کاٹا تھا۔ یہ بہت خوف ناک بات ہے۔ میں رو رو کر اپنی آنکھیں گنوا بیٹھی تھی۔ اس طرح کا دُکھ دینا کتنا عجیب ہوتا ہے۔ تمھارے نانا بہت اچھے آدمی ہیں۔ اپنے آپ کو دُکھ نہ دو، اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش نہ کرو، زخمی ہو جاؤ گے۔ خدایا! میں کتنی خوش ہوں۔ گویا تمھاری بدقسمتی ختم ہو گئی ہے۔ میں بہت بیوقوف ہوں۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں، اب یاد نہیں آرہا ہے کہ کیا باتیں کرنی تھیں۔ کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ ہم l'Homme Arme اسٹریٹ میں ہی رہتے ہیں۔ وہاں باغیچہ نہیں۔ میں ہر وقت پھائے بناتی رہتی تھی۔ ٹھہریے جناب! دیکھیے، یہ سب آپ کی غلطی ہے۔ میری انگلیوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں۔"

"تم فرشتہ ہو۔" ماریوس نے کہا۔

اس زبان کا ایک ہی لفظ ہے، فرشتہ، جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اور کوئی لفظ اس لفظ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ محبت کرنے والے اس کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔

اس جگہ بہت سے تماشائی تھے، اس لیے دونوں خاموش ہو گئے؛ اس کے بعد ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، بس ایک دوسرے کے ہاتھ سہلانے پر اکتفا کرتے رہے۔

موسیو ژیلنورما سب کی طرف متوجہ ہوا جو کمرے میں تھے، اور چیخ کر کہا، تم سب زور زور سے باتیں کرو۔ پیچھے کھڑے لوگو، شور مچاؤ۔ خدا کے لیے ہلچل پیدا کرو، تا کہ بچے آرام سے باتیں کریں۔" اور، ماریوس اور کوزیت کی طرف بڑھ کر اس نے بہت دھیمے لہجے میں ان سے کہا، "ایک دوسرے کو 'تو' کہہ کر بات کرو، تقریب نہ کرو۔"

پھوپھی بلیر نورما اپنے بوڑھے خاندان میں روشنی کی اس یلغار کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس حیرانی میں کسی قسم کی جارحیت نہیں تھی؛ اس میں بدنامی اور رشک کا شائبہ بھی نہیں تھا؛ ستاون برس کی عمر کی احمق آنکھ تھی؛ ناکامیاب زندگی تھی، جس کی ناکامیاب نگاہ، ایک محبت کو فاتح دیکھ رہی تھی۔

"میڈموزیل بلیر نورما سینئر" اس کے باپ نے اس سے کہا "میں نے بتا دیا تھا کہ تمھارے ساتھ یہ ہوگا۔" ایک لمحہ وہ خاموش رہا، اور پھر اپنی بات میں اضافہ کیا، "دوسرے کی خوشیوں پر نظر کرو۔"

اس کے بعد وہ کوزیٹ کی طرف مڑا۔

"کتنی خوب صورت ہے یہ لڑکی! کتنی پیاری ہے یہ۔ یہ [فرانسیسی مصور] Greuze کی تصویر ہے [اردو زبان میں کسانچ چغتائی آرٹ کہا جاتا]۔ تو اب یہ تمھاری ہونے والی ہے، بیوقوف! میرے بد معاش، تم بہت خوبی سے بچ گئے ہو اور تم اس بات پر خوش ہو؛ اگر میں پندرہ برس کم بوڑھا ہوتا تو ہم دونوں آپس میں اس [لڑکی] کی ملکیت کے لیے تلوار سے لڑتے۔ سنو، میڈموزیل، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ یہ بالکل سادہ سی بات ہے۔ تم اس کی حق دار ہو۔ تم صحیح ہو۔ اوہ، کتنی پیاری شادی ہوگی یہ۔ ہمارا پیرش Saint-Denis du Saint Sacrament ہے، مگر مجھے اس بات کی اجازت مل جائے گی کہ تم اپنی شادی Saint Paul میں کر سکو گے۔ وہ کلیسا اس سے کہیں بہتر ہے۔ اسے Jesuits [مسیحیوں] نے تعمیر کیا تھا۔ وہ زیادہ coquettish ہے۔ وہ Cardinal de Birague کے سامنے واقع ہے۔ Jesuit کی شاہ کار تعمیر Namur میں ہے۔ اس کو Saint-Loup کہا جاتا ہے۔ شادی کے بعد تم وہاں ضرور جانا۔ وہ جگہ سفر کے قابل ہے۔ میڈموزیل میری سوچ بالکل تمھاری سوچ سے ملتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ لڑکیوں کو شادی ضرور کرنی چاہیے؛ وہ اسی لیے خلق ہوئی ہیں۔ Sainte- Catherine نام کی ایک خاتون ہیں، جنھیں میں ہمیشہ غیر شادی شدہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کنواری رہنا بھی اچھی بات ہوتی ہے، مگر اس میں ٹھنڈک زیادہ ہوتی ہے۔ انجیل کہتی ہے: اپنی تعداد بڑھاؤ۔ لوگوں کو بچانے کے لیے جون آف آرک کی ضرورت ہوتی ہے، مگر عوام تخلیق کرنے کے لیے Goose Mother چاہیے۔ سو، پیاری پیاری لڑکیوں سے شادیاں کرو۔ مجھے کنواری رہنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مجھے معلوم ہے کہ کلیسا میں عبادت گاہ بھی ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ وہ کنواریوں کی سوسائٹی پر بھروسا کرتے ہیں؛ مگر ایک حسین و جمیل شوہر، ایک نفیس ساتھی، اور ایک سال کے بعد،

سنہرے بالوں والا لفنگا، جس کے زانوؤں پر چربی کی موٹی موٹی تہیں ہیں، اور جو منہ پھاڑ کر ہنستے ہوئے اپنے گلابی پنجوں سے تمھاری چھاتیوں کو الٹ پلٹ دیتا ہے — یہ سب مغرب کی عبادت میں موم بتی اٹھانے، اور آئیوری ٹاور کی گردان کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔"

نانا نے اپنی سو سالہ ایڑیوں پر رقص کیا، اس اسپرنگ کی طرح جو ایک بار پھر ٹوٹ کر بکھر گئی ہو:

Ainsi, bornant les cours de tes revasseries,
Alcippe, il est donc vrai, dans peu tu te maries.

"برسبیلِ تذکرہ!"

"کیا بات ہے، فادر؟"

"کیا تمھارا کوئی جگری دوست نہیں؟"

"ہاں ہے، کوفیراک"

"کہاں ہے وہ؟"

"مر گیا۔"

"ٹھیک ہے۔"

نانا ان کے قریب بیٹھ گیا، کوزیٹ کو بھی بٹھا لیا، اور ان کے چار ہاتھ اپنے عمر رسیدہ جھریوں بھرے ہاتھ میں تھام لیے۔

"بہت اچھی ہے، یہ پیاری لڑکی۔ شاہکار ہے، یہ کوزیٹ! یہ چھوٹی سی لڑکی ہے اور عظیم خاتون ہے۔ یہ صرف ویسی ہی بیرونس ہوگی جو اس کو عطا ہوگی؛ یہ مارکوئیز پیدا ہوئی تھی۔ کیا پلکیں ہیں اس کی۔ ان کو سنبھال کر رکھو، میرے بچو کہ تم صحیح راستے پر ہو۔ ایک دوسرے سے پیار کرو۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ محبت انسان کی حماقت اور خدا کی فراست ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرو۔" اور اچانک اداس ہو کر اس نے کہا، "کتنی بدقسمتی کی بات ہے، مجھے اب احساس ہوا ہے، میری ساری دولت کا نصف سالانہ وظیفے [پنشن] میں صرف ہو گئی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، کوئی بات نہیں، مگر میری موت کے بعد، جس میں شاید کئی برس لگیں گے، تمھیں ایک سو بھی نہیں ملے گا۔ مادام بیرونس، تمھارے پیارے پیارے ہاتھوں کو اس شیطان کو دُم سے پکڑ کر کھینچنا ہوگا۔"

عین اس لمحے ایک سنجیدہ اور پُرسکون آواز نے کہا، "میڈموزیل یوفرازی فوشلواں چھ

لاکھ فرانک کی مالک ہے۔" یہ آواز ژاں ولژاں کی تھی۔

اس وقت تک اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ کسی کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا، اور وہ ان خوش وخرم لوگوں کے عقب میں ساکت کھڑا تھا۔

"[کون] میڈموزیل یوفرازی؟ [ان] کا یہاں کیا دخل؟" حیران نانا نے سوال کیا۔

"میں ہوں۔" کوزیٹ نے جواب میں کہا۔

"چھ لاکھ فرانک؟" موسیو بلیر نورما نے بات آگے بڑھائی۔

"منفی، چودہ یا پندرہ ہزار فرانک، شاید۔" ژاں ولژاں نے کہا۔ یہ کہہ کر اس نے وہ بنڈل میز پر رکھ دیا، میڈموزیل بلیر نورما کو جس پر کتاب کا دھوکا ہوا تھا۔

ژاں ولژاں نے خود بنڈل کھولا؛ اس میں بینک نوٹ تھے۔ ان سب کو نکالا اور گنا گیا۔ ہزار فرانک کے پانچ سو نوٹ تھے، اور ایک سو اڑسٹھ نوٹ پانچ سو فرانک کے۔ سب ملا کر پانچ سو چوراسی ہزار فرانک تھے۔

"کیا اچھی کتاب ہے۔" موسیو بلیر نورما نے کہا۔

"پانچ لاکھ چوراسی ہزار فرانک۔" پھوپھی بڑبڑائی۔

بہت اچھا انتظام ہوگیا ہے؛ ہے کہ نہیں، میڈموزیل بلیر نورما سینئر؟" نانا نے کہا۔ "اس شیطان ماریوس نے اپنے خوابوں کے درخت پر بنے اس لکھ پتی نوجوان عورت کے گھونسلے کو لوٹ لیا ہے۔ اب تو نوجوانوں کے پیار کے معاملات پر یقین کرنا پڑے گا، ہے کہ نہیں؟ طلبہ کو چھ لاکھ فرانک والی طالبات بھی مل جاتی ہیں! Cherubino سے تو Rothschild اچھا رہا۔"

"پانچ لاکھ چوراسی ہزار فرانک!" میڈموزیل بلیر نورما نے دھیمی آواز میں دہرایا، "پانچ لاکھ چوراسی ہزار۔ آپ اسے چھ لاکھ بھی کہہ سکتے ہیں!"

جب یہ سب ہو رہا تھا، ماریوس اور کوزیٹ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے؛ انھیں اس تفصیل کا صحیح معنوں میں ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا۔

۞

جنگل میں دفن رقم

تفصیلی تشریح کے بغیر ہی، بلاشبہ قاری سمجھ گیا ہوگا کہ شومپ ماٹ ٹو کے معاملے کے بعد، چند دن کے فرار کے طفیل، ژاں ولژاں پیرس پہنچ گیا اور بروقت وہ لافیت سے اپنی دولت واپس حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اس نے Montreuil-sur-Mer میں موسیو میڈیلین کے نام سے کمائی تھی؛ اور اس خوف سے کہ وہ گرفتار کیا جا سکتا ہے، اس نے ساری رقم Montfermeil کے جنگل میں Blaru-bottom نامی جگہ پر دفن کر دی تھی۔ چھ لاکھ چھتیس ہزار فرانک، بینک نوٹوں کی صورت میں اتنے بھاری نہیں تھے، اور ایک بکس میں بند کر دیے گئے تھے۔ بکس کو نمی سے بچانے کے لیے اسے ایک تجوری میں رکھ دیا گیا جس میں شاہ بلوط کی لکڑی کی چھیلن بھر دی گئی تھی۔ اس تجوری میں اس نے دوسری قیمتی شے، بشپ کے نقرئی شمع دان بھی رکھ دیے تھے۔ قاری کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اپنے Montreuil-sur-Mer سے فرار کے وقت وہ شمع دان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

وہ آدمی، پہلی بار بولاترویل نے جسے ایک شام دیکھا تھا، ژاں ولژاں ہی تھا۔ بعد میں جب بھی ژاں ولژاں کو رقم کی ضرورت ہوتی وہ Blaru-bottom سے نکال کر لایا کرتا تھا۔ اسی باعث وہ غیر حاضر ہوتا تھا، ہم نے جس کا تذکرہ کیا ہے۔ جھاڑیوں میں ہی کسی جگہ اس نے اپنی کلھاڑی چھپا دی تھی جس کا صرف اسی کو علم تھا۔

ژاں ولژاں نے ماریوس کو صحت مند دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ وقت آ گیا ہے، جب اس کی دولت کسی کام آئے گی، اور اسی کو لینے گیا تھا؛ اس بار پھر بولاترویل نے اسے جنگل میں دیکھا تھا، مگر وہ شام کے بجائے صبح کا وقت تھا۔ بولاترویل کو اس کی کلھاڑی مل گئی تھی۔

اصل رقم پانچ لاکھ چوراسی ہزار پانچ سو فرانک تھی۔ ژاں ولژاں نے پانچ سو فرانک اپنے واسطے نکال لیے تھے۔ اس نے سوچا کہ بعد میں دیکھا جائے گا۔

لافیت سے حاصل ہونے والے چھ لاکھ تیس ہزار فرانک اور اس رقم کے درمیان جو فرق تھا وہ 1823ء اور 1833ء کے دوران ژاں ولژاں کا اپنا خرچ تھا۔ خانقاہ میں اس کے پانچ برس کے قیام کے دوران صرف ہزار فرانک خرچ ہوئے تھے۔

ژاں ولژاں نے دونوں شمع دان تُوسا کی خوشنودی کی خاطر آتش دان کے اوپر سجا دیے تھے۔

مزید یہ کہ ژاں ولژاں کو معلوم تھا کہ جاویر کے ہاتھوں اس کو نجات مل گئی تھی۔ یہ قصہ اس کی موجودگی میں بیان کیا گیا اور اس کی تصدیق Moniteur میں ہو گئی تھی، کہ کس طرح جاویر نامی ایک پولیس انسپکٹر Pont au Change اور Pont-Neuf کے درمیان ایک کشتی کے نیچے غرق پایا گیا تھا جو کسی دھوبن کی ملکیت تھی۔ جاویر کے پاس سے ایک رقعہ برآمد ہوا تھا جو بے تقصیر تھا، اور اس نے اپنے دماغی خلل کے باعث خودکشی کر لی تھی۔ ژاں ولژاں کا خیال تھا کہ ”چوں کہ اس نے مجھے اپنے قابو میں پانے کے بعد آزاد کر دیا تھا، دراصل وہ پاگل ہو گیا تھا۔“

دو بوڑھے اور کوزیٹ کی شادمانی

شادی کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر سے مشورہ کیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ فروری میں شادی کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد دسمبر تک ٹل گئی تھی۔ خوشی سے بھرپور چند ہفتے گزر گئے۔ نانا ان دونوں سے کم خوش نہیں تھا۔ وہ ایک چوتھائی گھنٹے مسلسل کوزیٹ کو دیکھتا رہا۔

"حیرت انگیز، خوب صورت لڑکی!" اس نے زور سے کہا، "اور کتنا پیارا انداز ہے اس کا۔ اپنی پوری زندگی میں، میں نے اس سے زیادہ دل رُبا لڑکی نہیں دیکھی۔ کچھ دن بعد اس کی خوبیوں میں بنفشے کی خوش بو بھی شامل ہو جائے گی۔ کتنی پُر وقار ہے یہ۔ ایسی تخلیق کے ساتھ شرافت کے سوا کسی طرح رہا نہیں جا سکتا۔ ماریوس، میرے بیٹے! تم بیرن ہو، تم رئیس ہو، اس سے کبھی بحث نہ کرنا، میں تم سے التجا کرتا ہوں۔"

کوزیٹ اور ماریوس گور سے اچانک جنت میں پہنچ گئے تھے۔ اگر تبدیلی کی رفتار دھیمی نہ کر دی گئی ہوتی اور ان کی آنکھیں خیرہ نہ ہوئی ہوتیں تو یہ بے ہوش ہو گئے ہوتے۔

"کیا کچھ تمھاری سمجھ میں آرہا ہے؟" ماریوس نے کوزیٹ سے کہا۔

"نہیں،" کوزیٹ نے کہا، "مگر میرا خیال ہے کہ خدا ہماری حفاظت کر رہا ہے۔"

ژاں ولژاں خود سب کچھ کر رہا تھا، ہر مشکل آسان کر رہا تھا، سارے انتظامات کر رہا تھا۔ وہ بعد اشتیاق کوزیٹ کی شادمانی کے لیے جو کچھ، جتنی جلد کر سکتا تھا خوشی خوشی کر رہا تھا، اور کوزیٹ بھی ہاتھ بٹا رہی تھی۔

چوں کہ وہ میئر رہ چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ کوزیٹ کے شہری معاملات کی نزاکتوں کو کس طرح سلجھایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس راز سے اکیلا وہی واقف تھا۔ کون جانے، اگر اس کی

اصلیت صاف گوئی سے بیان کر دی جاتی تو ہو سکتا ہے کہ شادی میں کیا خلل پڑ جاتا۔ اس نے کوزیٹ کو تمام مشکلات سے نکالا تھا۔ کوزیٹ کے لیے اس نے مردہ لوگوں کا خاندان تخلیق کیا تھا، اعتراضات کا مقابلہ کرنے کا جو یقینی طریقہ تھا۔ کوزیٹ ایک معدوم خاندان کی واحد وارث تھی؛ کوزیٹ اس کی اپنی بیٹی نہیں تھی مگر فوشلوون کی بیٹی تھی۔ فوشلوون، دو بھائی Petit-Picpus خانقاہ کے باغبان تھے۔ خانقاہ میں اس امر کی تفتیش کی گئی؛ محترم ترین اطلاعات حاصل کی گئیں؛ نیک خو راہباؤں نے اس کی ولدیت کے بارے میں موزوں مگر خیالی سوالات کیے تھے؛ کسی بات کو غیر ضروری اہمیت نہیں دی گئی مگر یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ کوزیٹ دو فوشلووں میں سے کس کی بیٹی تھی۔ وہ جو چاہتی تھیں اسے کہہ دیتی تھیں۔ ایک قانونی دستاویز تیار کی جا چکی تھی۔ قانون کی نظر میں کوزیٹ میڈموزیل یوفرازی فوشلوون بن گئی تھی۔ اسے یتیمی کا درجہ دیا گیا تھا، جس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے تھے۔ ژاں ولژاں، جس نے یہ انتظام کیا تھا، فوشلوون کے نام سے کوزیٹ کا سرپرست مقرر کیا گیا، اور اس پر موسیو ہیئر نورما سرپرست بنائے گئے تھے۔

جہاں تک پانچ لاکھ چوراسی ہزار فرانک کا معاملہ تھا، وہ ایک مردہ شخص کی جانب سے، جس نے اپنی شناخت نامعلوم رکھنے کی خواہش کی تھی، کوزیٹ کے لیے قانونی طور پر چھوڑی ہوئی موروثی دولت تھی۔ ابتدائی وراثتی رقم پانچ لاکھ چورانوے ہزار فرانک تھی مگر دس ہزار فرانک میڈموزیل یوفرازی کی تعلیم پر خرچ کیے گئے، جن میں سے پانچ ہزار خانقاہ کو ادا کیے گئے تھے۔ یہ وراثت ایک تیسرے شخص کو سونپی گئی، جو اس کی بلوغت پر، یا اس کی شادی کی تاریخ پر اس کے حوالے کی جانے والی تھی۔ یہ سب کچھ بہ حسن وخوبی قابلِ قبول تھا، بالخصوص اس لیے کہ رقم نصف ملین تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں وہاں کچھ اڑنگے تھے مگر ان کو نظر انداز کر دیا گیا؛ دل چسپی رکھنے والے فریقوں میں سے ایک فریق کو محبت نے اور دوسرے فریق کو چھ لاکھ فرانک نے اندھا کر دیا تھا۔

کوزیٹ کو معلوم ہوا کہ وہ اس بوڑھے آدمی کی بیٹی نہیں تھی جس کو وہ باپ کہتی تھی۔ وہ محض اس کا عزیز تھا؛ اس کا حقیقی باپ دوسرا فوشلوون تھا۔ حالات کچھ اور ہوتے تو اس خبر نے اس کا دل توڑ دیا ہوتا۔ مگر اس ناقابلِ بیان لمحے میں جو گزر رہا تھا، اس نے ہلکی پرچھائیں، مبہم سی دھند پیدا کی تھی، اور اسے اس بات کی خوشی تھی کہ یہ دھند زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔ اسے ماریوس مل گیا تھا۔ جوان آدمی آ گیا، بوڑھا آدمی محو ہو گیا تھا؛ زندگی اسی کو کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ، طویل عرصے سے کوزیٹ اپنے اطراف معمے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی؛ ہر وہ شخص جس کا بچپن پُراسرار رہا ہو کچھ مخصوص قسم کی دستبرداریوں کے لیے تیار ہوتا ہے۔

پھر بھی، وہ ژاں ولژاں کو فادر ہی کہتی رہی۔

فرشتہ صفت کوزیٹ فادر بلیر نورما کے بارے میں بہت پُر جوش تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی عاشق مزاج تعریفوں اور تحائف سے اسے مغلوب کر لیا تھا۔ ایک طرف ژاں ولژاں کوزیٹ کو سماج میں عام کیفیت اور نا قابل تردید حیثیت دلانا چاہتا تھا، دوسری طرف موسیو بلیر نورما شادی کے تحفوں کی تجاویوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ کوئی شے اس کی نظر میں اعلیٰ درجے کی نہیں تھی۔ اس نے کوزیٹ کو بلجیم کا جالیوں سے بنا لبادہ تحفے میں دیا جو اس کی اپنی دادی سے اس تک پہنچا تھا۔

"یہ فیشن دوبارہ آئیں گے۔" اس نے کہا "قدیم اشیا جذبات سے مملو ہوتی ہیں اور میرے بڑھاپے میں جوان عورتیں میرے بچپنے کے زمانے کے لباس زیب تن کرتی ہیں۔"

اس نے Coromandel نیوزی لینڈ کے سنہرے روغن سے چمکتے اپنے سارے محترم صندوق کھنگال ڈالے جو برسوں سے کھولے نہیں گئے تھے — "ہمیں ان رئیس بیواؤں کے اعترافات سننے چاہئیں۔" اس نے کہا "دیکھیں، انھوں نے اپنے بڑے بڑے معدوں میں کیا کچھ چھپا رکھا ہے۔" اس نے زور و شور سے اپنی تمام بیویوں، تمام داشتاؤں، اور نانیوں دادیوں کی توندیل درازوں کو کھولنا شروع کیا۔ پیکنگ کے، دمشق کے، زربفت کے، مصور ریلبروں والے، سونے کے تاروں سے کڑھے ہوئے رومال جنھیں دھویا جا سکتا ہے، Genoa اور Alencon کی بنی جالیاں، سناروں کے بنائے ہوئے قدیم زیورات، ہاتھی دانت کے بنے چاکلیٹ رکھنے والے بکس جن پر خوردبینی نقوش میں لڑائیوں کے منظر کھدے ہوئے تھے، چوڑیاں اور ربن — سب کچھ اس نے کوزیٹ پر نچھاور کر دیا۔ ششدر کوزیٹ، ماریوں کی محبت میں گرفتار اور موسیو بلیر نورما کی شکر گزاری میں پاگل ہو رہی تھی۔ وہ ساٹن اور مخمل میں ملبوس خوشیوں کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کی شادی کے تحائف کی تجابی seraphim [عبرانی انجیل کی کوئی آسمانی مخلوق] اٹھائے معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی روح Mechlin کی جالیوں سے بنے شہپروں کے ذریعے آسمان کی نیلگوں گہرائیوں میں اڑ رہی تھی۔

محبت کرنے والوں کی سرمستی tt جان کے وجد سے کم نہ تھی۔ du Filles Calvaire اسٹریٹ پر بگل بجنے شروع ہو گئے تھے۔

ہر صبح tt جان کی جانب سے کوزیٹ کے لیے نوادر نئے نئے تحائف کی صورت ملتے۔ اس کے اطراف ہر قسم کے ممکنہ جھمکے چم چم کرتے تھے۔ ایک دن ماریوں، جو اپنی مسرتوں کے درمیان بھی سنجیدگی سے باتیں کرتا تھا، کسی واقعے کا جس کا مجھے علم نہیں تذکرہ کر رہا تھا:

"انقلابی لوگ اتنے عظیم ہیں کہ ان میں [سلطنتِ روما کے قبل مسیح کے مدبرین] Cato اور Phocion کے زمانے کی آبرو ہے اور وہ سب مجھے قدیم یادوں کے مالک محسوس ہوتے ہیں۔"

"Moire antique" [لہریا ریشمی پارچہ] بوڑھے نے چیخ کر کہا "شکریہ ماریوس۔ میں اسی کی تلاش میں تھا۔"

اور اگلے دن چائے کے رنگ کا شان دار قدیم لباس کوزیٹ کے شادی کے تحائف میں شامل کر دیا گیا۔ ان غیر ضروری اشیا سے نانا جان نے کچھ دانش اخذ کر لی تھی۔

"محبت بہت اچھی چیز ہے؛ مگر اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ فضولیات کو خوش قسمتی میں شامل کر دینا چاہیے۔ صرف خوش قسمتی ضروری ہوتی ہے۔ میری خاطر اس میں فاضل اشیا بھی شامل کر دی جائیں۔ اس کے دل میں جگہ۔ اس کا دل اور Louvre۔ اس کا دل اور ورسائی (Versailles) کا شان دار آبی نظام۔ مجھے میری چرواہن دے دیجیے اور اس کو ڈچس بنانے کی کوشش کیجیے۔ مجھے بھٹے کے پھولوں سے سجی [یونانی اسطوری شہزادی] Phyllis فراہم کیجیے اور ایک لاکھ فرانک آمدنی کا اضافہ کر دیجیے۔ جہاں تک آپ دیکھ سکیں میرے لیے سنگِ مرمر سے بنی مسلسل عمارتوں کے دیہی منظر وا کر دیجیے۔ میں ان دیہی سنگِ مرمر اور سونے کی پری کہانی کے منظر کو قبول کرتا ہوں۔ خشک خوش قسمتی خشک روٹی سے مشابہ ہوتی ہے۔ کوئی کھاتا ہے، کوئی نہیں کھاتا۔ مجھے فاضل، بے کار، فضول خرچی، زیادتی چاہیے جو کسی کام کی نہیں ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اسٹراسبرگ کے گرجا گھر میں ایک گھڑی دیکھی تھی جو تین منزلہ مکان کے برابر بلند تھی، جس میں گھنٹوں کے نشان بنے ہوئے تھے، جو گھنٹے بجانے کی مہربانی کیا کرتی تھی، مگر اس میں وہ خاصیت نہیں تھی جس کے لیے بنائی گئی تھی؛ اور دوپہر یا آدھی رات کا گھنٹا بجانے کے بعد — دوپہر جو سورج کے اعتبار سے دن کی نصف ہوتی ہے یا آدھی رات جو محبت کا وقت ہوتی ہے — یا آپ اسے جو چاہیں نام دے سکتے ہیں، آپ کو دیتی تھی چاند اور ستارے، زمین اور سمندر، پرندے اور ماہی، Phoebus اور Phoebe، اور بے شمار ایسی چیزیں جو خلا سے اور بارہ پیغمبروں سے ابھرتی ہیں، شہنشاہ چارلس پنجم اور اپونین اور Sabinus اور چھوٹے چھوٹے زرنگار آدمی، جو بگل بجاتے تھے، اور مزے دار ہم آہنگ بے شمار گھنٹیوں کے بغیر جو ہر موقعے پر ہوا میں پھیلا دی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر نہیں ہوتی ہے کیوں؟ یہ گھڑی کا معمولی سا چہرہ ہے جو محض ہمیں ان کے برابر گھنٹے بتا دیتا ہے۔ میں اسٹراسبرگ کی گھڑی کے بارے میں اپنی رائے رکھتا ہوں اور اس کو کوئل گھڑی سے بہتر سمجھتا ہوں۔"

موسیو بلیر لورما نے شادی کے بارے میں بے مقصد باتیں کیں، جو اس کی پُرجوش نثری نظم سے اٹھارھویں صدی کی غیر ضروری اشیا کی طرح غیر منظم انداز میں گزر گئیں۔

"تم لوگ فنونِ لطیفہ کی تقریبات سے لاعلم ہو۔ تمھیں معلوم نہیں کہ اس زمانے میں ایک دن کی تفریح کا کس طرح انتظام کیا جاتا ہے۔" اس نے چیخ کر کہا۔ تمھاری انیسویں صدی کم زور ہے۔ اس میں زیادتی کی کمی ہے۔ یہ رئیسوں کو نظر انداز کر دیتی ہے، یہ اشرافیہ کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ ہر چیز میں یہ صاف ستھری نظر آتی ہے۔ تمھاری تیسری جاگیر بے مزہ، بے رنگ، بے بو اور بدوضع ہے۔ تمھارے بورژوائیوں کے خواب نقلی ہوتے ہیں، جیسا کہ وہ ظاہر کرتے ہیں: ایک تازہ تازہ سجائی ہوئی خوب صورت خواب گاہ ہے، بنفشی اور سیاہ و ململ ہے۔ ہٹ جاؤ! ہٹ جاؤ! جناب خصہ ور میڈ موزیل کنجوس سے شادی کر رہے ہیں۔ پُرتکلف اور طمطراق انداز میں۔ ایک سونے کا سکہ موم بتی سے چپکا دیا گیا ہے۔ اس میں تمھارا عہد ہے۔ میرا مطالبہ ہے کہ میں یہاں سے بھاگ کر قدیم ایرانی عوام Sarmatians سے پرے چلا جاؤں گا۔ میری پیشین گوئی ہے کہ 1787ء میں سب کچھ گم ہو جائے گا، اس دن کے بعد جب میں نے ڈیوک Rohan کو، شہزادے Leon، ڈیوک Chabot کو، ڈیوک Montbazon کو، مارکوئی Sonbise کو، وائی کاؤنٹ فرانس کے لارڈ کو Longchamps جاتے دیکھا تھا۔ اس کو اس کا فائدہ ہوا ہے۔ اس صدی میں لوگ اپنے کاروبار پر توجہ دیتے ہیں، تبدیلی پر شرط لگاتے ہیں، رقم جیتتے ہیں، کنجوسی کرتے ہیں۔ لوگ اپنی سطحوں کی حفاظت کرتے ہیں، ان پر وارنش کرتے ہیں؛ ہر ایک اس طرح لباس پہنتے ہیں جیسے وہ ابھی ابھی بینڈ باجے والوں کے بکس سے نکلے ہیں، دھلے، صابن سے صاف کیے، ڈاڑھی منڈائے، کنگھی کیے، چمکائے ہوئے، چکنے بنے ہوئے، رگڑے ہوئے، برش کیے ہوئے، باہر سے صاف کیے ہوئے، بے داغ بنے، پالش کیے سنگ ریزے کی طرح محتاط، صاف اور ساتھ ہی میری زندگی کی موت ہے، ان کے ضمیر میں گوبر کے ڈھیر اور غلاظت کے جوہڑ ہیں، جو گایوں کے ریوڑ بنانے کے لیے کافی ہوتا ہیں جو اپنی انگلیوں میں اپنی ناک جھٹکتا ہے، میں اس عہد کو گندگی کی صفائی کی مشین دیتا ہوں۔ ناراض نہ ہونا ماریوس! مجھے بولنے کی اجازت دو؛ مجھے لوگوں کی بدی نظر نہیں آتی، جیسی کہ تم دیکھتے ہو، میں ہمیشہ تمھارے عوام کے تار چھیڑتا ہوں، مگر تم بورژوا پر میری تھوڑی سے سرزنش کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ میرا اس سے تعلق ہے۔ وہ جو اچھی طرح محبت کرتا ہے، کوڑے بھی اچھی طرح مارتا ہے۔ چناں چہ، میں سادگی سے کہتا ہوں کہ آج کل لوگ شادی کرتے ہیں مگر انھیں شادی کرنا

نہیں آتا۔ اوہ! یہ سچ ہے کہ میں قدیم طریقوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں ان کی ہر بات نا پسند کرتا ہوں، ان کی نفاست، ان کی چال بازی، ان کے مہذب اور نفیس انداز، وہ مسرت آگیں عیش و عشرت جو ہر ایک کو میسر ہوتی ہے، موسیقی شادی کا حصہ ہوتی ہے، اوپری منزل میں سمفنی، نچلی منزل میں بجتے ڈھول، رقص، میزوں کے اطراف خوش باش چہرے، مہارت سے کی گئی شجاعانہ تعریفیں، گانے، آتش بازیاں، صاف دل قہقہے، شیطان کی اپنی قطاریں، ربن کی بڑی بڑی گرہیں۔ دلھن کے زانوؤں کا فیتہ مشتری کا عم زاد ہوتا ہے۔ کس بات پر Troy کی جنگ کا رُخ بدل گیا تھا؟ ہیلن کے زانو کے فیتے کی بنا پر۔ وہ لڑے کیوں تھے، Achilles اور Hector نے ایک دوسرے کو اپنے نیزوں کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا؟ اس لیے کہ ہیلن نے پیرس کو اس کے زانوؤں کی پٹی اتار لینے کی اجازت دی تھی۔ کوزیت کے زانو کی پٹی سے ہومر Iliad تخلیق کرے گا۔ وہ اپنی اس نظم میں میرے جیسے باتونی کو شامل کرے گا اور اسے [یونانی اسطور کے بادشاہ] Nestor کا نام دے گا۔ میرے دوست ان پرانے زمانے کے گزرے دنوں میں سوچ سمجھ کر شادی کرتے تھے؛ ان کو اچھا نکاح نامہ مل جاتا تھا، اور اس کے بعد اچھی طرح ڈٹ کر پیتے تھے۔ [سولھویں صدی کے] ماہرِ قانون Cujas کے جاتے ہی Gamacho داخل ہوا۔ مگر صدق کے ساتھ۔ معدہ وہ قابلِ قبول وحشی ہوتا ہے جو اپنا حق طلب کرتا ہے، اور جو اپنی شادی بھی چاہتا ہے۔ لوگ خوب کھاتے تھے، اور اپنی میز پر بغیر زیر جامے کی خوب صورت پڑوسن بھی رکھتے تھے تا کہ اس کا گلا اعتدال سے چھپا بھی رہے۔ اوہ، وہ بڑے بڑے ہنستے منہ، اور ہم ان دنوں کتنے خوش رہتے تھے۔ جوانی ایک گل دستہ تھی؛ ہر نوجوان آدمی بنفشے کی ایک شاخ پر یا گلابوں کے گچھے پر ختم ہو جاتا تھا؛ وہ چرواہا ہو یا سپاہی؛ اور اگر اتفاق سے کوئی گھڑسوار سپاہی ہوتا تو وہ اپنے آپ کو Florian کہلانے کا طریقہ نکال لیتا تھا۔ لوگ تندرست لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ کڑھے کپڑے پہنتے تھے اور خود کو رنگواتے بھی تھی۔ بورژوا پھول کی مانند اور مارکوئی قیمتی پتھر کی مانند ہوتا تھا۔ لوگ اپنے جوتوں میں فیتے نہیں ڈالتے تھے، ان کے پاس جوتے نہیں ہوتے تھے۔ وہ سجے بنے، چمکیلے، لہریلے، روشن، پھڑ پھڑاتے، خوش مزاج، چونچلے باز ہوتے تھے، اور انھوں نے اپنے پہلوؤں میں تلوار رکھنا ترک نہیں کیا تھا۔ humming-bird کے منقار اور پنجے ہوتے ہیں۔ وہ Galland Indies [سولھویں صدی کا فرانسیسی معمار] کا دن تھا۔ صدی کا ایک پہلو نازک تھا، دوسرا عالی شان تھا؛ سبز رنگ کی بند گوبھی سے خود کو خوش رکھتے تھے۔ آج لوگ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ بورژوا لالچی ہوتے ہیں اور بورژوائیاں مصنوعی رکھ رکھاؤ والی ہوتی ہیں۔ تمھاری

صدی بدقسمت ہے۔ لوگ اپنے وقار اس طرح دور کردیں گے جیسے ان کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔ افسوس حسن اس طرح چھپایا جاتا ہے جیسے وہ کوئی بدصورتی ہو۔ انقلاب کے بعد سے، پہلے رقاصوں کے اپنے پتلون ہوتے تھے؛ عطائی رقاص کو سنجیدہ ہونا چاہیے؛ تمھارے تیز رقص تربیت دینے والے ہوتے ہیں۔ پُرشکوہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لوگ اگر اپنے گلوبند میں اپنی زنجیریں نہیں لے جاسکتے تو بہت ناراض ہوں گے۔ ایک بیس سالہ لفنگے کی خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ شادی کرے تو موسیو Royer-Collard سے مشابہ ہو۔ اور کیا تم جانتے ہو کہ لوگ پُرشکوہ کب بننے کی کوشش کرتے ہیں؟ جب وہ معمولی ہو جاتے ہیں۔ سنو اور دیکھو: خوشی صرف خوشی ہی نہیں ہوتی، عظیم ہوتی ہے۔ تو پھر خوشی خوشی محبت کرو، شادی ہی کیوں نہ کرلو، اور جب شادی کرو تو بے چینی کے ساتھ، بے خودی کے ساتھ، ہلچل کے ساتھ اور خوشی کے شوروغل کے ساتھ۔ گرجا گھر میں سنجیدہ رہو، اچھے اور صحت مند رہو۔ مگر جوں ہی اجتماع ختم ہو وہاں سے غائب ہو جاؤ، اپنی دلھن کے اطراف خیالات کا بھنور بنا دو۔ شادی شاہانہ اور عجیب الخلقت انداز میں ہونی چاہیے؛ اس کا جشن Rheims کے گرجا گھر سے Chanteloup کے پگوڈا تک ہونا چاہیے۔ مجھے معمولی شادی سے خوف آتا ہے۔ Ventregoulette، کم از کم اس دن تو Olympus ہو۔ خداؤں میں سے ایک خدا بنو۔ اوہ، لوگ دبلی پتلی لڑکیاں ہو سکتے ہیں۔ کھیل کود اور قہقہہ! وہ احمق ہوتے ہیں۔ میرے دوستو، تازہ تازہ بنے دولھا کو شہزادہ Aldobrandini ہونا چاہیے۔ راج ہنسوں اور عقابوں کے ساتھ اڑ کر فلک میں پہنچنے کے لیے ہر منفرد لمحے سے فائدہ اٹھاؤ، خواہ اس کے لیے تم کو آنے والے کل کی مینڈکیوں میں گرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ازدواج میں کنجوسی نہ کرو؛ جس دن تم چمک رہے ہو اس دن بخل نہ کیا کرو۔ شادی گرہستی نہیں ہوتی۔ اگر میرا بس چلے تو پُرتکلف ہو، اور سارنگی درختوں کے نیچے بھی سنی جائے۔ میرا پروگرام یہ ہے: آسمانی اور نقرئی۔ میں اس جشن میں دیہی صوفیوں کو بھی شامل کروں گا۔ میں [مونث درختوں کی روحیں] Dryads اور [سمندروں کی مونث روحیں] Nereids کو ایک ساتھ بٹھاؤں گا۔ [سمندر کی دیوی] Amphitrite کی شادیاں، گلابی بادل، سنوری ہوئی زلفوں والی بالکل برہنہ کنواریاں ہوں گی۔ دیوی کو عالمانہ رباعیات پیش کروں گا، ایک رتھ ہوگا جسے بحری دیو کھینچتے ہوں گے۔

Triton trottait devant, et tirait de sa conque
Des sons si ravissants qu'il ravissait quiconque!

جشن کا سماں ہوگا، بہت اچھا ہوگا، ورنہ میرا ایسے معاملات سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔“

جس وقت ناتا، خود کلامی میں شاعرانہ فضول گوئی کر رہا تھا، کوزیٹ اور ماریوس خوشی سے سرشار تھے اور آزادانہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

پھوپھی بلیر نورما اپنے پُرسکون حلم کے ساتھ اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ پچھلے پانچ یا چھ ماہ سے اسے جذبات کا تجربہ ہو رہا تھا۔ ماریوس واپس آیا؛ زخموں سے چور ماریوس لایا گیا؛ ماریوس کسی پشتے سے لایا گیا؛ ماریوس مردہ؛ ماریوس زندہ؛ ماریوس سے مفاہمت؛ ماریوس کی منگنی؛ ماریوس کی مفلس لڑکی سے شادی؛ ماریوس کی کروڑ پتی لڑکی سے شادی۔ چھ لاکھ فرانک اس کی آخری حیرتیں تھیں۔ اس کے بعد، اس کی ایک لڑکی سے غیریت نے اسے پہلی اجتماعی عبادت یاد دلا دی تھی۔ پابندی سے گرجا گھر جاتی، مالا جپتی، دعائیں پڑھتی، گھر کے ایک کونے میں Aves کا ورد کرتی۔ دوسری جانب سرگوشی میں، "میں تم سے محبت کرتا ہوں؛ میں تم سے محبت کرتی ہوں" کہا جاتا تھا، اور وہ ماریوس اور کوزیٹ کو دو پرچھائیوں کی طرح مبہم انداز میں دیکھتی تھی۔ پرچھائیں وہ خود تھی۔

بے عمل پرہیزگاری میں ایک خاص کیفیت ہوتی ہے جس میں نفس بے حسی کے باعث سُن ہو جاتا ہے؛ اس سے اس اجنبی پر، جس کو زندگی کا کاروبار کہا جا سکتا ہے، زلزلوں یا تباہیوں کے علاوہ کسی قسم کا کوئی نقش نہیں بنتا، وہ انسانی ہو، خوش گوار ہو یا تکلیف دہ ہو۔ اس قسم کی جاں نثاری، جیسا کہ بابا بلیر نورما نے اپنی بیٹی سے کہا تھا، سر میں جمی برف کے مترادف ہوتی ہے۔ آپ کو زندگی کی کوئی بو نہیں آتی۔ نہ خوش بو آتی ہے نہ بدبو۔

مزید یہ کہ چھ لاکھ فرانک نے اس عمر رسیدہ کنواری کے تذبذب کو طے کر دیا تھا۔ والد نے بیٹی کو حساب کتاب سے اتنا دور رکھا تھا کہ ماریوس کی شادی کے بارے میں بیٹی سے مشورہ نہیں کیا۔ اس نے اتنی سرگرمی سے اس معاملے میں عمل کیا تھا کہ خود اپنے قول کے مطابق، "بس ایک خیال نے ایک جابر حاکم کو غلام میں تبدیل کر دیا تھا۔" صرف ماریوس کو مطمئن کرنے کے لیے۔ جہاں تک پھوپھی کا معاملہ تھی، اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ پھوپھی کا کوئی وجود بھی تھا، کہ اس کی بھی کوئی رائے تھی، اپنی میمنے جیسی کیفیت نے اسے آزردہ کر دیا تھا۔ اندرونِ روح غصہ تھا، مگر بیرون میں بے حسی تھی۔ اس نے خود سے کہا، میرے والد نے اس شادی کا مسئلہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر طے کر دیا ہے؛ میں بھی اس سے مشورے کے بغیر وارثت کا مسئلہ طے کر دوں گی۔" حقیقت یہ ہے کہ وہ دولت مند تھی، جب کہ اس کا باپ دولت مند نہیں تھا۔ اس نکتے پر اس نے اپنا فیصلہ محفوظ کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر شادی مفلسوں میں ہوتی تو وہ ماریوس کو مفلس

رہنے دیتی۔ "میرے بھتیجے کی بدقسمتی، کہ وہ مفلس سے شادی کر رہا ہے! تو اس کو مفلس ہی رہنے دیا جائے۔" مگر کوزیت کے نصف ملین نے پھوپھی کو خوش کردیا تھا، اور جہاں تک محبت کرنے والے جوڑے کا معاملہ تھا اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو تبدیل کر لیا تھا۔ چھ لاکھ فرانک نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اپنی وراثت ان دو جوانوں کے لیے چھوڑنے کے سوا کچھ نہ کرتی اس لیے کہ انھیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔

طے ہوا کہ شادی شدہ جوڑا ١١ کے پاس رہے گا— موسیو ہلیر نورما کا اصرار تھا کہ وہ اپنا کمرہ ان کے لیے خالی کر دے گا جو اس گھر میں سب سے نفیس تھا۔ "اس طرح میں خود کو ایک بار پھر جوان محسوس کروں گا۔" اس نے کہا تھا، "یہ میرا قدیم منصوبہ تھا۔ میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ میرا کمرہ حجلۂ عروسی بنے۔"

اس نے اپنا کمرہ چھوٹی چھوٹی بے شمار نفیس اشیا سے سجایا۔ سقف اور دیواروں پر غیر معمولی کپڑے لگائے گئے، جو اس کے پاس پہلے سے موجود تھے، جو Utrecht کے buttercup رنگ کے ساٹن کے تھے، جن پر مخمل کے پیلے رنگ کے پھول بنے تھے— "یہی شے تھی۔" اس نے کہا، "جو Duchesse d'Anville at la Roche-Guyon کے بستر پر بچھائی گئی تھی۔" چمنی پر اس نے جرمن چینی سے بنی ایک چھوٹی سے مورتی رکھ دی تھی جو اپنے برہنہ پیٹ کے ساتھ دستانہ لگائے تھی۔

موسیو ہلیر نورما کا کتب خانہ وکیل کے دفتر میں تبدیل ہوگیا۔ یاد رہے کہ کاؤنسل کے حکم کے مطابق ماریوس کو باقاعدہ دفتر کی ضرورت تھی۔

✡

خواب سے ملی خوشی کے اثرات

یہ محبت کرنے والے روزانہ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ کوزیت موسیو فوشلوون کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ ”یہ تو اُلٹی بات ہوئی“ میڈموزیل بلیر نورماں نے کہا ”کہ دلھن خود ہونے والے شوہر سے ملنے آتی ہے۔“ مگر ماریوس کی شفایابی کے مسائل کے باعث یہ عادت سی بن گئی تھی، اور l'Homme Arme اسٹریٹ کی پیال سے بنی کرسی کے مقابلے میں Calvaire Filles اسٹریٹ کی آرام کرسی اس قسم کی ملاقات کے لیے زیادہ مناسب تھی۔ ماریوس اور موسیو فوشلوون ایک دوسرے سے روز ملتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا یہ طے تھا۔ ہر لڑکی کو کسی اتالیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوزیت موسیو فوشلوون کے بغیر آ نہیں سکتی تھی۔ ماریوس کی نظروں میں موسیو فوشلوون کوزیت سے منسلک شرط کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے یہ شرط قبول تھی۔ سیاسی معاملات پر بات کے دوران کبھی کبھی مبہم اور بغیر کسی باقاعدگی کے، انھیں 'ہاں' اور 'نہیں' سے کچھ زیادہ ہی کہنا پڑ جاتا تھا۔ ایک بار جب وہ تعلیم کے موضوع پر تھے، ماریوس جس بارے میں آزادانہ گفتگو کا خواہش مند تھا، دونوں تقریباً یک زبان ہو کر گفتگو میں مشغول ہو گئے تھے۔ موسیو فوشلوون قرینے سے باتیں کر رہا تھا جس میں زبان کی مخصوص قسم کی بلند آہنگی تھی، پھر بھی اس میں کسی قسم کی ناقابل بیان کمی محسوس ہو رہی تھی۔ دنیا کے کسی عام آدمی کے مقابلے میں موسیو فوشلوون میں کسی قسم کی کمی بھی تھی اور زیادتی بھی۔

ماریوس اندرونی طور پر، مختلف قسم کے ان کے سوالات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ موسیو فوشلوون فیاض اور کم گو شخصیت کا مالک تھا۔ ایسے بھی لمحے آتے تھے جب اسے اپنی یادداشت کے بارے میں شبہات پیدا ہونے لگتے تھے۔ اس کی یادداشت میں کوئی خلل تھا،

کوئی سیاہ دھبا تھا، ایک گہرا غار تھا جو چار ماہ کی اذیت نے بنا دیا تھا اور اس میں بہت سی چیزیں گم بھی ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگتا، کہ کیا اس نے کبھی اس شخص، موسیو فوشلوون کو، پیشے پر دیکھا تھا جہاں وہ بہت خاموش، بہت سنجیدہ شخصیت ہوتا تھا۔

صرف یہی ایک خلل نہیں تھا جو اس کے ماضی کے آسیبوں اور غفلتوں نے اس کے دماغ میں چھوڑا تھا۔ یہ قیاس مناسب نہیں ہوگا کہ وہ یادداشت کے تمام خیالی خطرات سے آزاد کر دیا گیا تھا جو ہمیں اس وقت بھی مجبور کرتے ہیں جب ہم افسردگی سے پلٹ کر پیچھے دیکھنے پر خوش ہوتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں۔ وہ سر جوان آفاق کے لیے پیچھے کی طرف نہیں مڑتا جو غائب ہو گئے ہیں؛ اس میں نہ خیال ہوتا ہے، نہ محبت ہوتی ہے۔ اکثر ماریئس اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا اور مبہم اور پُرشور ماضی کی اس دھند سے گزر جاتا جو اس کے دماغ پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ایک بار پھر مابوف کو گرتا دیکھتا، گاوروش کو گریپ شاٹ حملوں کے درمیان گاتے سنتا؛ اسے اپنے ہونٹوں تلے ایپونین کی سرد پیشانی محسوس ہوتی؛ انجولرا، کوفیراک، ژاں پرووئیر، کومبفیر، بوسے، گرانتیر؛ اس کے تمام دوست اس کے سامنے سیدھے کھڑے ہوتے اور پھر فضاؤں میں غائب ہو جاتے تھے۔ کیا وہ پیارے افسردگی کے مارے، بہادر، دل رُبا اور الم ناک وجود محض خواب تھے؟ کیا کبھی ان کا وجود تھا بھی؟ بغاوت نے اپنے دھوئیں میں ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ ایسے عظیم بخارات عظیم خواب تخلیق کرتے ہیں۔ اس نے خود سے باز پرس کی؛ اس نے خود کو محسوس کیا؛ ان سب غائب حقیقتوں نے اس کو چکرا کر رکھ دیا۔ تب وہ سب کہاں تھے؟ کیا یہ سچ ہے کہ وہ سب مر گئے تھے؟ پرچھائیوں کے غار میں سوائے خود اس کے، سب کچھ چلا گیا تھا۔ یہ سب اسے اس طرح غائب ہوتا محسوس ہوا جیسے ان پر تھیٹر کا پردہ گر گیا ہو۔ اسی جیسے پردے ہوتے ہیں جو زندگی پر گرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد بس خدا ہوتا ہے۔

اور وہ خود؛ کیا وہ وہی آدمی تھا؟ وہ مفلس انسان رئیس ہو گیا تھا؛ اس ٹھکرائے ہوئے وجود کا اپنا ایک خاندان تھا؛ وہ نا امید شخص کوزیٹ سے شادی کرنے والا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی مزار سے گزر کر آیا ہے؛ کہ وہ اس میں سیاہ داخل ہوا اور سفید برآمد ہوا تھا، اور اس مزار میں دوسرے سب اندر ہی رہ گئے تھے۔ کبھی کبھی، ماضی کے وہ تمام وجود واپس ہوتے محسوس ہوتے، اس کے اطراف ایک دائرہ بناتے اور اس پر حاوی ہو جاتے تھے؛ تب اس نے کوزیٹ کے بارے میں سوچا، اور دوبارہ اپنا سکون حاصل کر لیا؛ مگر اس کی مسرت کے سوا کوئی شے اس کی تباہی کو مٹانے کے لیے کافی نہیں تھی۔

ان غائب شدہ لوگوں میں فوشلوون کو بھی ایک جگہ مل گئی تھی۔ ماریوس کو یہ یقین کرنے میں تامل ہوتا تھا کہ پیشے کا فوشلوون اور یہ گوشت پوست کا فوشلوون دونوں ایک ہی شخصیت تھی، جو اتنی سنجیدگی سے کوزیٹ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلا والا شخص، غالباً ان ڈراؤنے خوابوں میں سے ایک تھا جسے اس کے اضطراب کے لمحات واپس لائے تھے۔ پھر بھی، دونوں آدمیوں کی فطرتیں بے لوچ تھیں؛ ماریوس اور موسیو فوشلوون کے درمیان سوال جواب ممکن نہیں تھا۔ اسے اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ ہم پہلے ہی اس کی اس نمایاں صفت کی طرف اشارے کر چکے ہیں۔

دو آدمی، جن کے راز مشترک ہیں، اور جو ایک قسم کے خاموش اقرار کے باعث اس موضوع پر ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں کر رہے تھے، عام قیاس شدہ لوگوں کے مقابلے میں کم پائے جاتے ہیں۔ صرف ماریوس تھا جس نے کوشش کی تھی۔ اس نے گفتگو کے دوران Chanvrerie اسٹریٹ کا نام لیا تھا، اور موسیو فوشلوون کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا تھا، ''بلاشبہ آپ اس سڑک سے واقف ہیں۔''

''کون سی سڑک؟''

''وہی Chanvrerie اسٹریٹ۔''

''میں اس نام کی سڑک سے واقف نہیں۔'' موسیو فوشلوون نے بالکل فطری انداز میں جواب میں کہا تھا۔ وہ جواب جو سڑک کے نام کے بارے میں تھا، خود سڑک کے بارے میں نہیں تھا، بظاہر ماریوس کے نزدیک اصل سے زیادہ فیصلہ کُن تھا۔

''یقینی طور پر'' اس نے سوچا، ''میں خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے فریب نظر ہوا تھا۔ وہ اس سے مشابہ کوئی اور رہا ہوگا۔ موسیو فوشلوون وہاں نہیں تھے۔''

دو گم کردہ آدمی

ماریوس کی سحر کاری بہت خوب تھی، مگر اس کا ذہن دوسرے مسائل میں غرق تھا۔

جس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تاریخ کا تعین کیا جانے والا تھا، وہ بہت انہماک سے ماضی کی کچھ مشکل اور ریزہ ریزہ معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ اپنے باپ کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے اس پر مختلف لوگوں کا تشکر قرض تھا۔ ایک تو تین آردیے تھا؛ اور دوسرا وہ نامعلوم آدمی جو ماریوس کو موسیو جلیر نورما کے پاس واپس لایا تھا۔ ماریوس ان دونوں افراد کی تلاش میں کوشاں تھا۔ شادی ہو یا نہ ہو، مسرتیں ملیں یا نہ ملیں، اگر یہ قرض ادا نہ ہوئے تو اس کی زندگی پر ان کے سایے لہراتے رہیں گے، جس کا مستقبل بہت تاب ناک محسوس ہو رہا تھا۔

اس کے نزدیک ناممکن تھا کہ اس بقایا کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ مسرت آگیں مستقبل میں قدم رکھنے سے قبل ماضی سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

یہ حقیقت، کہ تین آردیے بدمعاش انسان ہے، اس باعث نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس نے کرنل پون مرسی کی جان بچائی تھی۔ تین آردیے دنیا کی نظر میں غنڈا تھا، سوائے ماریوس کے۔

ماریوس کو واٹرلو کے میدانِ جنگ کے اصل منظرنامے کا علم نہیں تھا؛ نہ ہی اسے ان مخصوص تفصیلات کا علم تھا کہ اس کا باپ — جہاں تک تین آردیے کا تعلق تھا — ایسی حالت میں تھا کہ وہ زندگی بھر اس کے کسی قسم کے تشکر کا مقروض ہوئے بغیر بھی خود کو اس کا مقروض سمجھتا رہا۔

ماریوس نے مختلف ہرکاروں کو تین آردیے کی تلاش پر مامور کیا مگر کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس معاملے میں مکمل ناکامی تھی۔ مادام تین آردیے کا مقدمے کے دوران قید خانے میں انتقال ہو گیا تھا۔ تین آردیے اور اس کی بیٹی آزلما — اس گروہ کے یہی دو فرد بچے تھے، جو دھند میں گر کر

غائب ہو گئے۔ سماجی لاعلمی کی خلیج نے خاموشی سے ان کو اپنی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا۔ جس کی سطح پر نہ کسی قسم کا لرزہ تھا، نہ لہروں کے وہ مبہم دائرے جو اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ ابھی ابھی کوئی شے غرق ہوئی ہے؛ کہ گہرائی ناپنے والا شاقول فوراً ڈال دیا جائے۔

مادام تھن آردیے انتقال کر چکی تھی؛ بولاتروئیل مقدمے سے بری کر دیا گیا تھا؛ کیاکسلا غائب ہو گیا تھا؛ اہم ملزم کردار قید سے فرار ہو گئے تھے؛ Gorbeau ہاؤس پر چھاپا مارنے کے مقدمے میں کچھ رہ نہیں گیا تھا۔

سارا معاملہ ابہام کی نذر ہو گیا تھا۔ Assizes کی عدالت صرف دو ماتحت ملزمان تک محدود تھی۔ Panchaud عرف Printanier عرف Bigrenaille، اور Demi-Liard عرف Deux-Milliards کو، جنھیں متضاد سزائیں دی گئی تھیں، مقدمے کے دونوں پہلوؤں پر غور کے بعد گیلیز میں دس برس گزارنے کی سزا دی گئی۔ مفرور سرکش شرکائے جرم کو عمر قید مع سخت مشقت سزا کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

ان کے سرغنہ تھن آردیے کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔

تھن آردیے کے بارے میں بس اتنی اطلاعات تھیں کہ اسے سزا دے دی گئی ہے، جو کسی غائب شدہ پُر اسرار نام پر اسی طرح تھیں جیسے تابوت کے پہلو میں روشن شمع۔ مزید یہ کہ تھن آردیے کو گرفتاری کے خوف کے ذریعے عمیق ترین گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ سزا کے ایک جملے نے ان پرچھائیوں کی دبازت کو بڑھا دیا جنھوں نے اس کو ڈھانپ رکھا تھا۔

جہاں تک دوسرے شخص کا معاملہ تھا، اس نامعلوم انسان کے بارے میں، جس نے ماریوس کو بچایا تھا، تحقیقات پہلے تو کچھ حد تک کامیاب ہوئیں مگر اچانک نتیجہ خیز ہو گئی تھیں۔ تحقیق کرنے والے اس سواری گاڑی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ماریوس کو جون کی 6 تاریخ کی شام Filles-du-Calvaire اسٹریٹ لے گئی تھی۔

گاڑی بان نے اپنے بیان میں کہا تھا:

— کہ 6 جون کو ایک پولیس اہل کار کے حکم پر اس نے دوپہر سے رات ہونے تک شانز ولیزے کی گودی کے قریب، بڑی زیرِ زمین نالی کے دہانے پر انتظار کیا تھا۔

— کہ رات کے نو بجے کے قریب نالی کی جالی کھولی گئی تھی جو دریا کے کنارے کی سرحد کے قریب لگی ہوئی ہے؛

— کہ جالی میں سے ایک آدمی برآمد ہوا تھا جس کے شانوں پر ایک اور آدمی تھا، جو مرا محسوس ہوتا

تھا؛

— کہ پولیس کے اہل کار نے، جو اس مقام پر پہرہ دے رہا تھا، اندر سے برآمد ہونے والے زندہ آدمی کو گرفتار کیا تھا اور مردہ آدمی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا؛

— کہ پولیس اہل کار کے حکم پر وہ، یعنی گاڑی بان، سب لوگوں کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا؛

— کہ پہلے وہ لوگ Filles-du-Calvaire اسٹریٹ لے جائے گئے تھے؛

— کہ اسی جگہ انھوں نے مردہ انسان کو کسی کے حوالے کیا تھا؛

— کہ مردہ آدمی موسیو ماریوس تھا، اور یہ بھی کہ وہ، یعنی گاڑی بان، اس کو اچھی طرح پہچانتا تھا حالاں کہ اس وقت وہ شخص زندہ تھا؛

— کہ بعد میں وہ لوگ ایک بار پھر گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور اس نے گھوڑوں کو چابک لگائی تھی؛

— کہ Archives کے پھاٹک سے چند قدم کے فاصلے پر انھوں نے گاڑی کو رکنے کا حکم دیا تھا؛

— کہ وہیں، سڑک پر، انھوں نے کرایے کی ادائیگی کی، اسے فارغ کیا، اور پولیس اہل کار دوسرے آدمی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا؛

— کہ اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں؛

— کہ اس رات بہت اندھیرا تھا۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، ماریوس کو خود کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اتنا یاد تھا کہ اسے کسی توانا ہاتھ نے پیچھے سے اس وقت پکڑ لیا تھا جب وہ پشتے پر پیچھے کی طرف گرنے والا تھا؛ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں۔

اسے موسیو ژیلے نورماں کے گھر ہوش آیا تھا۔

اسے اور کچھ یاد نہیں۔

اسے اپنی شناخت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ پھر بھی، Chanvrerie اسٹریٹ میں اس کا گرنا، دریائے سین کے کنارے Pont des Invalides کے قریب پولیس اہل کار کے ہاتھوں اس کا اٹھایا جانا: یہ سب کیسے ہوا تھا؟

کوئی تھا جو اسے Halles سے شانزہ لیزے تک لے گیا تھا۔ اور کیسے؟ بدرات سے ہوتا ہوا۔ ایسی جاں نثاری پہلے کبھی سنی نہیں گئی۔

کوئی شخص — ؟ کون تھا وہ؟

یہ تھا وہ آدمی، ماریوس جس کی تلاش میں تھا۔

اس نجات دہندے کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا؛ اس کا سراغ بھی نہیں مل سکا؛ ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملا۔ ماریوس نے اس سمت، یعنی پولیس کے افسرِ علیٰ تک، اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی تھی۔ تفتیش سے حاصل ہونے والی اطلاعات سے مسئلہ حل نہیں ہوا۔ افسرِ اعلیٰ کی اطلاعات گاڑی بان کی اطلاعات کے مقابلے میں کم تھیں۔ اسے 6 جون کو بڑی نالی کے دہانے پر ہونے والی گرفتاری کا علم نہیں تھا۔ اس معاملے کی باقاعدہ کوئی اطلاع نہیں ملی، جسے فرضی قصہ سمجھا گیا تھا، اور گاڑی بان کو اس قصے کا موجد قرار دیا گیا تھا۔ ایک معمولی گاڑی بان جسے بخشش کی توقع ہو، کچھ بھی کر سکتا ہے، حتیٰ کہ خیالی قصہ بھی گھڑ سکتا ہے۔ ماریوس کو اس امر کا یقین دلایا گیا تھا، اور وہ اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا، تا وقتیکہ وہ خود اپنی شناخت پر شبہ کرنے لگتا۔

اس غیر معمولی معمے کی ہر بات ناقابلِ تشریح تھی۔

اس پُراسرار آدمی کا کیا حشر ہوا، جسے گاڑی بان نے بڑی نالی کے دہانے پر لگی جالی سے، اپنے شانوں پر بے ہوش ماریوس کو لادے نکلتے دیکھا تھا، اور جسے پہرے پر متعین پولیس کے اہل کار نے ایک سرکش کو بچانے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا؟

وہ اہل کار خاموش کیوں رہا؟ کیا وہ آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ کیا اس نے اہل کار کو رشوت دی تھی؟ اس آدمی نے ماریوس کو اشارتاً بھی کچھ نہیں بتایا، جس کی زندگی اس کے ہاتھوں بچی تھی! اس کی عدم دل چسپی اس کی جاں نثاری سے کسی طرح بھی غیر معمولی نہیں تھی۔ وہ آدمی دوبارہ ظاہر کیوں نہیں ہوا؟ شاید معاوضے سے بالاتر انسان تھا وہ، مگر تشکر سے بالاتر تو کوئی نہیں ہوتا۔ کیا وہ آدمی مر گیا ہے؟ کس قسم کا چہرہ تھا اس کا؟ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

گاڑی بان نے جواب میں کہا تھا، "اس رات بہت اندھیرا تھا۔" باسک اور نکولے، مکمل اضطراب کی کیفیت میں تھے، اور صرف اپنے نوجوان مالک کو خون میں بھرا دیکھ سکے تھے۔

دربان واحد شخص تھا جس کی شمع نے ماریوس کی المناک آمد کو روشنی فراہم کی تھی؛ جس نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا تھا، اور اس نے بس اتنا کہا تھا، "وہ آدمی خوفناک تھا۔"

ماریوس کا خون بھرا لباس، جو اس کے بدن پر تھا جب وہ اپنے نانا کے گھر لایا گیا تھا، اس امید پر محفوظ کر لیا گیا کہ تفتیش میں معاون ہو سکتا ہے۔

اس کے کوٹ کے معائنے پر معلوم ہوا اس کا ایک کنارہ غیر معمولی انداز میں پھٹا ہوا ہے۔ پھٹا ہوا ٹکڑا غائب ہے۔

ایک شام، جب ماریوس کوزیٹ اور ژاں ولژاں کی موجودگی میں اپنی اس غیر معمولی مہم

اور بے شمار تحقیقات کا اور بالخصوص ان کوششوں کی بے ثمری کی کا تذکرہ کررہا تھا جو اس نے کرائی تھیں ' موسیو فو شلووں ' کے چہرے پر اس معاملے سے لاتعلقی پر اسے غصہ آ گیا تھا۔

اس نے، ایک قسم کی تندہ وفی سے جس میں طیش کی جھلک تھی، چیخ کر کہا تھا:

''ہاں، وہ آدمی، جو کوئی بھی رہا ہو، ایک نہایت رفیع انسان تھا۔ آپ کو بتاؤں جناب، کہ اس نے کیا کیا تھا؟ اس نے رئیس الملائکہ جیسا کام کیا تھا۔ اس نے خود کو لڑائی کے درمیان ڈال دیا، مجھے اٹھا لے گیا، زیرِ زمین نالیوں کا راستہ کھولا، مجھے اس میں گھسیٹ کر لے گیا، اور اس کے راستے مجھ نکال کر بھی لے گیا۔ اس نے ڈیڑھ لیگ سے زیادہ فاصلے پر پھیلی ان ڈراؤنی زیرِ زمین گیلریوں کو پار کیا ہوگا، غلاظت کے اندھیرے جوہڑ میں جگہ جگہ جھکا ہوگا، ایسی حالت میں جب کہ اس کی پشت پر ایک لاش کا بوجھ بھی تھا۔ کس مقصد کے لیے یہ سب کام کیا تھا؟ اس لاش کو بچانے کی غرض سے۔ اور وہ لاش میں تھا۔ اس شخص نے خود سے کہا، 'اس میں اب بھی زندگی کی رمق ہو سکتی ہے۔ اس رمق کے لیے میں اپنے وجود کو خطرے میں ڈال دوں گا۔' اور اس شخص نے اپنے وجود کو ایک بار ہی نہیں بیس بار خطرے میں ڈالا تھا۔ ہر قدم ایک خطرہ تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ نابدان سے نکلتے ہی اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں جناب، کہ اس نے یہ سب کس لیے کیا تھا؟ جس کے بدلے کی کوئی توقع نہیں تھی، اور میں کیا تھا؟ ایک سرکش انسان۔ میں کیا تھا؟ مفتوح افراد میں سے ایک انسان۔ ایک سرکش انسان۔ اوہ، اگر کوزیت کے چھ لاکھ فرانک میرے ہوتے تو......''

''وہ تمھارے ہی ہیں۔'' ژاں ولژاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا'' ماریوس نے مزید کہا، ''تو میں وہ سب، ایک بار اس آدمی کو تلاش کرنے میں خرچ کر دوں گا۔''

ژاں ولژاں نے مزید کچھ نہیں کہا۔

۞

فروری 1833ء کی سولھویں تاریخ

فروری 1833ء کی سولھویں سے سترہویں رات مبارک رات تھی۔ اس کے سایوں کے اوپر جنت کھلی ہوئی تھی۔ یہ ماریوس اور کوزیٹ کی شادی کی رات تھی۔

دن بھی بہت پیارا تھا۔

یہ تقریب اتنی شان دار نہیں تھی ما ما نے جس کے خواب دیکھے تھے: پریوں کا نظارہ، جس میں انجمن کے ساتھ شادی کے جوڑے کے سروں پر فرشتے اور کیوپڈ ہوں؛ ایسی شادی جس کی پینٹنگ دروازے پر لگائی جائے؛ پھر بھی یہ پیاری شادی تھی، تبسم انگیز شادی تھی۔

1833ء کی شادیوں کا وہ انداز نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔ اس وقت تک فرانس نے انگلستان [کی طرح] گرجا گھر سے نکلتے ہی بیوی کو اُٹھا کر بھاگنا؛ شرم سے اپنی خوشیوں کے چھپانا اور Song of Songs [جسے حضرت سلیمان کا گانا بھی کہا جاتا ہے جس میں انجیل مقدس کے نفیس الفاظ کے ذریعے اپنی خواہشوں کو بیان کرنے کا طریقہ اپنایا گیا ہے] گانے کی پاکیزگی، نفاست اور شائستگی سے اپنی جنت [محبت] کو ہچکولے کھاتی کھلی گاڑی میں لے بھاگنا، بستر کی کھٹاک کھٹاک کے ذریعے اپنے راز کا اظہار کرنا، کسی سرائے کے بستر کو اپنے ازدواج کا بستر بنانا، اور سب کچھ چھوڑ کر ایک عام سے کمرے میں، دربان عورت کی سرگرمیوں کے باوجود، جس میں دو افراد کے درمیان خواب گاہ میں نجی گفتگو بھی جلد جلد کرنی پڑتی ہے، ایسی رات بسر کرنا نہیں سیکھا تھا جو زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ ہوتی ہے۔

صدی کے اس آخری نصف میں، جس میں اب ہم رہ رہے ہیں، میئر اور اس کا انگوچھا، مبلغ اور اس کا [عبادت کے وقت پہنا جانے والا رنگدار لبادہ] chasuble، قانون اور خدا کافی نہیں ہوتے؛ انھیں [انیسویں صدی کے ڈراما نگار Adolphe Adam کے اوپیرا] Postilion de Lonjumeau کے ذریعے مکمل

کیا جانا چاہیے: نیلے رنگ کا اندر سے سرخ کوٹ، گھنٹی جیسے بٹن، آہنی تختی جیسے بازو پوش، گھٹنوں تک اونچی سبز چمڑے کی برجس، گرہ لگی دُم والے گھوڑوں پر غصہ، ریشم سے بنی مصنوعی پٹیاں، وارنش کی ہوئی ہیٹ، لمبی لمبی پوڈر سے سفید کی ہوئی زلفیں، عجیب چابک اور لمبے لمبے بوٹ۔

فرانس اب تک انگریز اشرافیہ جیسی زیبائش کو پہنچ نہیں سکا ہے، اور جرچل کی، اس کے بعد Marlborough یا Malbruck کی یاد میں، اس کی پھوپھی کے حکم پر شادی شدہ جوڑے کی کھلی بگھی پر، ان کی شادی کے دن، ایڑیوں تک گھسی جوتیوں اور پھٹے جوتوں کی بارش کی گئی تھی جو اُن کے لیے خوش قسمتی کی نوید تھی۔ پرانے جوتے اور چپلیں ابھی تک ہماری ازدواجی تقریبات کا حصہ نہیں بنی ہیں، مگر خوش مذاقی کے طور پر صبر کیا جاتا ہے، ہم جس پر آگے چل کر بات کریں گے۔

ایک سو برس قبل 1833ء میں شادی دوڑتے بھاگتے نہیں کی جاتی تھی۔

یہ کہنا حیرت کی بات ہوگی کہ اس عہد میں، لوگ شادی کو نجی اور سماجی تقریب سمجھتے تھے، کہ آبائی ضیافت گھر میں ہونے والی مذہبی رسم کو خراب نہیں کرتی تھی؛ کہ خوشی، خواہ وہ ضرورت سے زیادہ ہو، یہ شرط ہے کہ دلی ہو، اچھی ہوتی ہے، نقصان نہیں پہنچاتی۔ مختصر یہ کہ یہ اچھی چیز ہوتی ہے اور قابلِ احترام شے ہوتی ہے؛ کہ دو ہستیوں کے آپس میں ملن کو جس میں سے ایک خاندان کا پیدا ہونا مقرر ہوتا ہے گھر کے اندر سے ہی شروع ہونا چاہیے، اور یہ بھی کہ بعد ازاں اہلِ خانہ کو اپنے ازدواجی تجربے کو اس کا گواہ سمجھنا چاہیے۔

لوگ اتنے بے حیا ہو گئے تھے کہ اپنے گھروں میں شادی کرنے لگے تھے۔ لہٰذا، موسیو بلیر نورما کے گھر میں ہی شادی ہوئی۔

شادی ہونا ایک فطری اور معمولی معاملہ ہوتا ہے۔

اعلانِ شادی ہوا، کاغذی کارروائی کی گئی، میئر کے اور میونسپلٹی کے دفاتر نے کچھ پیچیدگیاں پیدا کیں۔ اس لیے وہ لوگ سولہ فروری کے لیے تیار نہیں ہو سکے۔

اب ہم یہ تفصیل صرف اطمینان اور ضروری ہونے کے باعث بتانا چاہتے ہیں، کہ سولھویں تاریخ کو Shrove منگل پڑتا تھا۔ تذبذب، معمولی معمولی اعتراضات، بالخصوص پھوپھی بلیر نورما کی جانب سے ہوئے۔

"Shrove Tuesday!" نانا چیخا، "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اس کے لیے ایک محاورہ ہے، "Shrove Tuesday کی شادی، شکر کرنے والی آبادی۔" شروع کرو۔ سولہ تاریخ طے! ماریوس کیا تم مؤخر کرنا چاہتے ہو؟"

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' عاشق نے جواب دیا۔
''تو کرو شادی۔'' نانا چیخا۔

لہٰذا سولہ تاریخ کو شادی ہوئی، عوام نے خوشیاں منائیں۔ اس دن بارش ہوئی تھی، مگر آسمان میں چھوٹا سا ایک نیلا ٹکڑا ہوتا ہے، جو محبت کرنے والوں کو نظر آتا ہے، اس وقت بھی جب ساری مخلوق چھتری کے نیچے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے والی شام، ژاں ولژاں نے موسیو ژیلنورما کی موجودگی میں پانچ لاکھ چوراسی ہزار فرانک ماریوس کے حوالے کیے۔ چوں کی شادی جائیداد کی حصے داری کے تحت ہو رہی تھی، کاغذی کارروائی سادہ سی تھی۔

اس دن کے بعد سے توسان ژاں ولژاں کے لیے بے کار ہو گئی تھی۔ اسے مادام کوزیٹ کی خدمت گار کے درجے پر فائض کر دیا گیا۔ ژاں ولژاں کے لیے ژیلنورما کے گھر میں ایک خوب صورت سا حجرہ تیار کیا گیا، اور کوزیٹ نے اس سے ایسے ناقابلِ مزاحمت انداز میں کہا تھا، ''فادر، میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔'' کہ اسے مجبور ہو کر وعدہ کرنا پڑا تھا کہ وہ اسی میں قیام کرے گا۔

شادی کے لیے طے شدہ تاریخ سے چند دن پہلے ژاں ولژاں ایک حادثے سے دوچار ہو گیا؛ اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کچل گیا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی؛ اس نے کسی کو اس کے لیے پریشان ہونے نہیں دیا، نہ اس کی مرہم پٹی کے لیے، حتیٰ کہ زخم کو دیکھنے بھی نہیں دیا؛ کوزیٹ کو بھی نہیں۔ پھر بھی، اسے اپنے ہاتھ کو لٹکانے کے لیے کپڑا باندھنا پڑا تھا، جس کی باعث وہ دستخط نہیں کر سکتا تھا۔ موسیو ژیلنورما نے کوزیٹ کے نگراں سرپرست کی حیثیت میں اس کی جگہ لے لی تھی۔

ہم قاری کو نہ میئر کے دفتر لے جائیں گے، نہ گرجا گھر۔ اس حد تک شادی شدہ جوڑے کا پیچھا نہیں کیا جاتا، اور اس وقت اس ڈرامے سے منہ پھیر لیا جاتا ہے جب پھولوں کا گچھا کاج میں اُڑس دیا جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو صرف اس واقعے تک محدود رکھیں گے، اگرچہ اسے برات والے دیکھ نہیں سکے تھے، جو Filles-du-Calvaire اسٹریٹ سے سان پال گرجا تک سفر کے درمیان پیش آیا تھا۔

اس زمانے میں Saint-Louis اسٹریٹ کے شمالی سرے کا راستہ پکا کیا جا رہا تھا۔ Pare-Royal اسٹریٹ کی ابتدا سے اسے بند کر دیا گیا تھا۔ شادی کی گاڑیاں براہِ راست سان پال گرجا گھر تک جا نہیں سکتی تھیں۔ انھیں اپنا راستہ بدلنا پڑتا تھا، اور سادہ ترین راستہ بولیوارڈ سے ہو کر جاتا تھا۔ مدعو مہمانوں میں سے ایک نے غور کیا کہ وہ دن Shrove Tuesday تھا، اور اس دن سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم ہوگا۔۔۔ ''مگر کیوں؟'' ژیلنورما نے پوچھا۔ ''نقاب پوشوں کی وجہ

سے۔"""اچھا" ٹاٹا نے کہا، "تو ہم اسی طرف چلیں۔ یہ نوجوان شادی کرنے والے ہیں؛ زندگی کے سنجیدہ حصے میں داخل ہونے والے ہیں انھیں تھوڑا سا بھیس بدلنا بھی سیکھنا چاہیے۔"

وہ بولیوارڈ کے راستے گئے۔ پہلی ازدواجی گاڑی کوزیٹ، پھوپھی میڈموزیل بلیر نورما، موسیو بلیر نورما، اور ژاں ولژاں پر مشتمل تھی۔ رسم کے مطابق ماریوس اپنی ہونے والی دلہن سے علاحدہ رہا اور دوسری گاڑی میں آیا۔ برات Filles-du-Calvaire سے نکلتے ہی شادی کی سواری گاڑیوں کے طویل جلوس میں اُلجھ گئی جو Madeleine سے Bastille تک، اور Bastille سے Madeleine تک کبھی نہ ختم ہونے والی زنجیر سا بن گیا تھا۔ بولیوارڈ نقاب پوشوں سے بھری تھی۔ باوجود اس حقیقت کے کہ وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی، میری، اینڈ ریو پینٹا لون اور کلاؤن آئے تھے۔ 1833ء کے اس موسم سرما میں پیرس نے وینس کا روپ دھار لیا تھا۔ آج کل ایسے Shrove Tuesdays نظر نہیں آتے۔ ہر بکھری شے کارنیوال ہوتی ہے اور اب کارنیوال نہیں ہوتے۔

راستے پیدل چلنے والوں سے، اور کھڑکیاں متجسس تماش بینوں سے بھر گئی تھیں۔ تھیٹر جیسے ستونوں سے مزین کوٹھوں پر قطار در قطار، تماش بین بیٹھے تھے۔ نقاب پوشوں کے علاوہ، وہ بھی طرح طرح کی مختلف قسم کی گاڑیوں — citadines، tapissieres، carioles، cabriolets — پر مشتمل اس جلوس کو دیکھ رہے تھے جو پولیس کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے قرینے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ان گاڑیوں میں بیٹھنے والے تماش بین بھی تھے اور خود ہی تماشا بھی۔ پولیس کے سارجنٹوں نے بولیوارڈ کے کناروں پر کبھی نہ ختم ہونے والی گاڑیوں کی دو متوازی قطاریں ہموار کی تھیں اور اس امر کو یقینی بنایا تھا کہ دونوں جانب سواری گاڑیوں کے بہتے ہوئے چشموں کی لہروں میں خلل اندازی نہ ہونے پائے، جن میں سے ایک کا رُخ Chaussee d'Antin تھا اور دوسرے کا رُخ Faubourg Saint-Antoine۔ سرکاری نشانوں سے مزین فرانس کے امرا اور سفرا کی سواریاں درمیان میں آزادانہ آجا رہی تھیں۔ کچھ خوش باش اور شاندار، بالخصوص Boeuf Gras [کارنیوال میں کسی کی شبیہ، بالخصوص بیل والی گاڑی] کی قطاروں کو بھی یہی حق حاصل تھا۔ پیرس کی اس خوش باشی میں انگلستان نے اپنے اختیار کا مظاہرہ کیا؛ لارڈ سیمور کی دو پہیوں اور ایک گھوڑے والی کھلی سواری، جسے عوام کی دی ہوئی عرفیت نے پریشان کر دیا تھا، شور مچاتی گزر گئی۔

دوسری قطار میں، جس میں بلدیاتی محافظین تربیت یافتہ کتوں کی طرح اچھل رہے تھے، وادیوں ماتموں سے بھری راست باز خاندانی سواریاں دروازوں پر اپنی تازہ نسلوں کا مختلف قسم کے

بھیس میں مظاہرہ کر رہی تھیں؛ سات برس کے مسخرے، خوشی سے اچھلتے چھوٹے چھوٹے بچے، جو سمجھ رہے تھے کہ وہ عوامی نشاط کا سرکاری حصہ ہیں، بھانڈوں کے رنگ میں رنگے تھے اور سرکاری عمال کی متانت کے حامل تھے۔

وقتاً فوقتاً، گاڑیوں کے جلوس میں کہیں نہ کہیں کوئی الجھن پیدا ہو جاتی تھی؛ ایک دو قطاریں اس وقت تک رُکی رہتی تھیں جب تک کہ قطار میں پڑ جانے والی گرہ کھول نہیں دی جاتی تھی؛ ایک سواری کی سُستی پوری قطار کو مفلوج کر دیتی تھی۔ اس کے بعد ایک بار پھر سب چلنے لگتی تھیں۔

بارات کی گاڑیاں قطار میں Bastille کی طرف رواں تھیں، اور بولیوارڈ کے دائیں کنارے پر چل رہی تھیں۔ houx Pont aux کے قریب کوئی رُکاوٹ تھی۔ تقریباً اسی وقت، دوسری قطار بھی رُک گئی جو Madeleine کی سمت رواں تھی۔ قطار کے اس مقام پر نقاب پوشوں سے بھری ایک گاڑی بھی تھی۔

یہ سواریاں یا صحیح معنوں میں کہا جائے تو، نقاب پوشوں سے لدی گاڑیاں پیرس والوں کے لیے نئی نہیں تھیں۔ اگر ایک بھی Shrove Tuesday یا Mid-Lent رہ جاتا تو اسے غلط انداز میں لیا جاتا تھا، اور لوگ کہتے، "اس کے پیچھے کوئی راز ہے۔ غالباً وزارت میں تبدیلی ہونے والی ہے۔" ڈھیروں Cassandras (یونانی اساطیر کا ایک نسوانی کردار) نقال راہ گیروں کو دھکیلتے چلتے، ہر قسم کی ممکنہ ہفت رنگیاں، ترک سے وحشی تک، ہرقل سے نوابوں تک، گلابی موزے، بانکی ٹوپیاں، مضحک چہرے، بکھوئی تتلی کی ہیٹ، پیدل چلنے والوں پر کسے جانے والے آوازے، کمر پر رکھے ہاتھ، دلیر رویے، برہنہ شانے، آزاد فحاشی؛ بے شرمی کا ایک بے ترتیب مجموعہ تھا جسے پھولوں سے مزین کوچوان چلا رہا تھا؛ ایسا تھا یہ دستور۔

یونان کو (چھٹی صدی کے یونانی المیوں کے اداکار) Thespis کے رتھ کی ضرورت تھی، فرانس کو Vade کی کرایے کی سواری گاڑی کی۔

ہر چیز کا حتیٰ کہ خود مذاق کا بھی مذاق اُڑایا جا سکتا ہے۔ (قدیم رومن جشن) Saturnalia، قدیم حسن کا تصنع بھی، مبالغے پر مبالغے کے ذریعے Shrove Tuesday کو ختم ہو جاتا ہے؛ اور وہ (قدیم رومن جشن کا نسوانی کردار) Bacchanal، کبھی جس پر انگور اور انگور کی پتیاں نچھاور کی جاتی تھیں، سورج کی کرنوں میں نہائی ہوئی، نیم برہنگی کے عالم میں اپنی سنگِ مرمر کی چھاتیوں کا مظاہرہ کرتی تھی، آج شمال کے بھیگے چیتھڑوں کے نیچے اپنے خدوخال کھو چکی ہے، اور بالآخر اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ اسے مزاحیہ کردار کہا جاتا ہے۔

نقاب پوشوں کو لے جانے والی سواریوں کی روایت شاہی کے قدیم ترین دنوں کی یادگار ہے۔ لوئی یازدہم کے زمانے میں تذکروں کے مطابق محل کے سرکاری افسر کو "مسخروں سے بھری تین گاڑیوں کے لیے بیس سو کا ایک سکہ Tournois دیا جاتا تھا۔" ہمارے زمانے میں شور غل کرنے والی یہ مخلوق کسی قدیم cuckoo سواری میں لے جائی جانے کی عادی ہو گئی ہے، جس کی چھت اتار دی جاتی ہے، یا کرایے کی بگھی میں ان کے بے چین گروہ گھس جاتے ہیں، جس کی چھت پیچھے کی طرف گرا دی جاتی ہے۔ چھ مسافروں کے لیے بنی گاڑی میں بیس افراد سوار ہو جاتے ہیں۔ وہ گاڑی کی نشستوں سے چمٹ جاتے ہیں، گاڑی کے گھونگھٹ سے لٹک جاتے ہیں، گھوڑے جوتنے والے ڈنڈوں پر بیٹھ جاتے ہیں، سامان رکھنے والے صندوق میں گھس جاتے ہیں، حتیٰ کہ گاڑی کی لالٹین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھڑے رہتے ہیں، بیٹھتے ہیں، لیٹتے ہیں، اپنی ٹانگوں کو گرہ کی طرح باندھ لیتے ہیں، اور ان کے پاؤں لٹکتے رہتے ہیں۔ عورتیں مردوں کی گود میں بیٹھ جاتی ہیں۔ دور سے، سروں کے ہجوم سے اوپر، ان کا وحشی اہرام دیکھا جا سکتا ہے۔ شور و غوغا کے درمیان گاڑیوں پر مسرتوں کے ان بوجھ سے گالیوں سے بھرے جملے نکل رہے تھے۔ یہ گاڑی جو اپنے وزن کے باعث شان دار لگ رہی تھی فاتحانہ انداز سے مملو لگ رہی تھی۔ شور غل آگے چھا جاتا ہے، اور بے چینی پیچھے رہ جاتی ہے۔ لوگ گلے پھاڑ کر بولتے ہیں، چلاتے ہیں، غراتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں، حظ سے اینٹھتے ہیں؛ خوش باشی دھاڑتی ہے؛ طنز شعلہ پیدا کرتا ہے؛ زندہ دلی سرخ پرچم کی طرح پھڑپھڑاتی ہے؛ یہ قہقہے کی فتح کی گاڑی ہے۔

سچ پوچھو تو قہقہہ بہت ترش رو ہوتا ہے۔ درحقیقت قہقہہ مشتبہ ہوتا ہے۔ قہقہہ ایک مہم ہوتا ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ پیرس والوں کو کارنیوال کا ثبوت فراہم کرے۔

یہ مچھلی فروخت کرنے والی عورتوں کی گاڑیاں ہیں جن کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی کون سی پرچھائیں فلسفی کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان کے اندر بھی حکومت ہوتی ہے۔ یہ عام مردوں اور عورتوں کے درمیان مشابہت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یقینی طور پر، یہ افسوس کی بات ہے کہ ضرورت سے زیادہ بدنمتی جمع ہو کر سجاوٹ بن جاتی ہے، کہ گالی دینے والوں پر رسوائی لا کر لوگوں کو متوجہ کیا جائے، کہ جب ہجوم ان کے مقابل آ جائے تو جاسوسی کے ذریعے اور عصمت فروشی کے لیے عورت کی شکل کے ستون بنا کر گنواروں کو بہلایا جائے، کہ مجمع جھلمل کرتی لہراتی پٹیاں دیکھنا پسند کرتا ہے، نصف غلاظت، نصف روشنی، غراتے اور ہنستے لوگ، چار پہیوں پر گزرتے ہیں، ہر طرح کی شرمندگی پر تالیاں بجاتے ہیں، کہ عوام کے لیے

کوئی جشن نہیں ہوگا، کہ ان کے درمیان پولیس کی سیرگاہ کی [محمد اعول] خوشی [جس میں سرور وفی ساتھ] نہیں ہوگی، مگر اس بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ عوام کے قہقہے ریشمی فیتوں اور پھولوں سے مزین [دو پہیوں والی] گاڑیوں کی تضحیک کرتے ہیں اور معاف کر دیتے ہیں۔ سب کا قہقہہ عالمی رسوائی کا شریک ہوتا ہے۔ کچھ ناخوش گوار جشن لوگوں کو الگ الگ کر کے انھیں عوام بنا دیتے ہیں۔ جابروں کی طرح عوام کو بھی مسخروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بادشاہ کے پاس [ٹخنوں تک اونچا] ریشمی لبادہ ہوتا ہے، عوام کے پاس مسخروں کا لباس (Merry-Andrew) ہوتا ہے۔ پیرس ہمیشہ سے عظیم، پاگل شہر سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ نہایت ارفع شہر ہے۔ اس کے جشن سیاست کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ پیرس جان بوجھ کر بے عزتی کو طنز و مزاح بن جانے دیتا ہے۔ وہ اپنے مالکوں سے، جب مالک ہوتے ہیں، ایک چیز کا مطالبہ کرتا ہے: مجھے کیچڑ میں سان دو۔ روم بھی یہی کرتا تھا۔ وہ نیرو سے محبت کرتا تھا۔ نیرو سب سے بڑا آگ لگانے والا تھا۔

جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، اتفاق سے، چھوٹے پہیوں کی وسیع گاڑی جو نقاب پوش مردوں اور عورتوں کے جھنڈ لیے پھر رہی تھی بولیوارڈ کی بائیں جانب رُکی، جب کہ برات دائیں جانب رُک گئی تھی۔ نقاب پوشوں کو بولیوارڈ کی بائیں جانب ٹھہری برات نظر آئی۔

"ہیلو" ایک نقاب پوش نے کہا، "شادی ہونے والی ہے۔"

"فریب شادی!" دوسرے نے کہا، "ہم اصلی لوگ ہیں۔"

برات سے چھیڑ چھاڑ کے لیے وہ خاصے دور تھے، اور انھیں پولیس کی سرزنش کا بھی خوف تھا؛ اس لیے دو نقاب پوش کسی اور طرف دیکھنے لگے۔

ایک منٹ بعد گاڑی والے نقاب پوش پریشان ہو گئے، اور انھوں نے چیخنا شروع کیا جو ریاکاری سے مجمعے کو بہلانے کا طریقہ ہوتا ہے؛ ان دو نقاب پوشوں کو جو بولے تھے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مجمعے کا سامنا کرنا پڑا؛ مچھلی بازار میں قرینے سے رکھی ہوئی اشیا کو عوام پر پھینکنا مہنگا پڑ سکتا تھا۔ نقاب پوشوں اور عوام کے درمیان استعاروں کا خوف ناک تبادلہ ہوا۔

اس دوران، اسی گاڑی کے دوسرے دو نقاب پوشوں کو ایک بڑی سی ناک، سیاہ مونچھ والے عمر رسیدہ ہسپانوی کو، اور ایک دُبلی سوکھی خاصی جوان سی مچھلی فروش عورت کو بھی برات نظر آ گئی تھی؛ جس وقت ان کے ساتھ اور راہ گیروں کے ساتھ گالیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا، وہ آپس میں دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔

موسلا دھار بارش نے گاڑی کے اگلے حصے کو جو بالکل کھلا ہوا تھا، پانی سے بھر دیا تھا؛

فروری کی ہوائیں گرم نہیں ہوتیں، چوں کہ مچھلی فروش عورت کھلے گلے کا لبادہ پہنے تھی ہسپانوی کو جواب بھی دیتی جا رہی تھی اور اس کی کانپتی کھانسی بھی جا رہی تھی۔

ان کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی:

''اب بول۔''

''کیا بولوں، ڈیڈی؟''

''تمھیں وہ آدمی نظر آ رہا ہے؟''

''کون آدمی؟''

''سامنے، ہماری جانب برات کی پہلی گاڑی والا۔''

''وہ جس کے سیاہ لبادے سے اس کا بازو نکلا ہوا ہے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر؟''

''مجھے یقین ہے کہ میں اسے جانتا ہوں۔''

''اوہ!''

''میں چاہتا ہوں کہ وہ میرا گلا کاٹیں؛ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے زندگی بھر کبھی نہ تم کہا ہے، نہ تو اور نہ میں کہا ہے، میں کسی پیرس والے (pantinois) کو نہیں جانتا۔''

''پیرس آج Pantin بنا ہوا ہے۔''

''اگر جھکو تو کیا تم دلھن کو دیکھ سکتی ہو؟''

''نہیں۔''

''اور دولھا کو؟''

''اس میں دولھا نہیں ہے۔''

''نف۔''

''اگر وہ بوڑھا نہیں ہے!''

''بہت نیچے جھک کر دیکھنے کی کوشش کرو۔''

''ممکن نہیں۔''

''کوئی بات نہیں، اس آدمی کے ہاتھ کے پنجے کو کچھ ہو گیا ہے، مجھے یقین ہے''

''جان کر کیا فائدہ ہوگا؟''

''کہا نہیں جا سکتا۔ کبھی ہو بھی جاتا ہے۔''
''میں عمر رسیدہ آدمیوں کے ساتھ نہیں گھومتی، ہرگز نہیں۔''
''میں اسے جانتا ہوں۔''
''جانو، اگر تمھیں ضرورت ہے۔''
''وہ برات میں کیسے شامل ہو گیا؟''
''ہم بھی تو شامل ہیں۔''
''برات کہاں سے آئی ہے؟''
''میں کیا جانوں؟''
''سنو۔''
''کیا ہے؟''
''تمھیں ایک کام کرنا چاہیے۔''
''کیا؟''
''اپنے چھکڑے سے نکلو، اور اس برات کو بیوقوف بناؤ۔''
''کس لیے؟''
''معلوم کرو کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں، اور یہ ہے کیا؟ جلدی سے کود پڑو بیٹی، تمھارے پاؤں مضبوط ہیں۔''
''میں گاڑی سے نکل نہیں سکتی۔''
''کیوں نہیں؟''
''مجھے کرایے پر لایا گیا ہے۔''
''اُف۔''
''میرا مچھلی فروشی کا دن پولیس کے محکمے کی ملکیت ہے۔''
''صحیح۔''
''اگر میں گاڑی سے نکلوں گی تو پہلا انسپکٹر جو مجھ پر نگاہ جمائے ہے، مجھے گرفتار کر لے گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔''
''ہاں، میں جانتا ہوں۔''
''حکومت نے آج کے دن کے لیے مجھے خرید لیا ہے۔''

"پھر بھی، وہ بڈھا مجھے پریشان کر رہا ہے۔"

"کیا بوڑھے لوگ تمھیں پریشان کرتے ہیں؟ مگر تم جوان لڑکی تو نہیں۔"

"وہ پہلی والی گاڑی میں ہے۔"

"اچھا؟"

"دلھن کے پھندے میں۔"

"تو پھر؟"

"وہ تو باپ ہے۔"

"مجھے اس سے کیا مطلب؟"

"میں بتا رہا ہوں کہ وہی باپ ہے۔"

"جیسے دنیا میں وہی ایک باپ ہے۔"

"سنو۔"

"کہو۔"

"میں نقاب کے بغیر نکل نہیں سکتا۔ میں چھپا ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں یہاں ہوں۔ مگر کل نقاب پوش نہیں ہوں گے۔ کل Ash Wednesday ہوگا۔ پکڑے جانے کا خطرہ ہوگا۔ مجھے اپنے سوراخ میں واپس جانا ہوگا۔ مگر تم تو آزاد ہو۔"

"نہیں تو۔"

"مجھ سے تو زیادہ ہی آزاد ہو۔"

"تو پھر؟"

"تمھیں معلوم کرنا چاہیے کہ برات کہاں جا رہی ہے۔"

"کہاں جائے گی؟"

"ہاں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"کہاں جائے گی؟"

"Cadran-Bleu جائے گی۔"

"مگر اس کا رُخ اُدھر تو نہیں۔"

"اچھا، تو la Rapee جائے گی۔"

"یا کہیں اور۔"

"برائیں آزاد ہوتی ہیں۔"

"بات یہ نہیں ہے۔ میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں ہوں کہ تمھیں میرے لیے معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کس کی شادی ہے؛ اس آدمی کا اس شادی سے کیا تعلق ہے، اور ازدواج کرنے والا جوڑا کہاں رہتا ہے۔"

تمھارے خیال میں یہ معلوم کرنا آسان ہوگا کہ برات جو Shrove Tuesday کے دن سڑک سے گزر رہی ہے، کہاں جائے گی۔ بھوسے گھر میں سوئی ڈھونڈھنا ہے۔ یہ ممکن نہیں۔"

"فرق نہیں پڑے گا۔ تمھیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ تم سب سمجھ رہی ہو، آزیلما!"

بولیوارڈ کی دونوں جانب دونوں قطاریں ایک دوسرے کی مخالف سمت رواں ہو گئیں، اور دلھن کی گاڑی نقاب پوشوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

۞

ژاں ولِژاں کا زخمی ہاتھ

کسی کے خوابوں کو دیکھنا! کسے اس کی اجازت ہے؟ آسمانوں میں رائے شماری ہونی چاہیے؛ ہم سب امیدوار ہیں، مگر خود سے واقف نہیں؛ فرشتے ووٹ دیتے ہیں۔ کوزیٹ اور ماریوس منتخب ہو گئے ہیں۔

میئر کے دفتر میں اور گرجا گھر میں کوزیٹ چمک رہی تھی اور دل نشیں تھی۔ نکولے کی مدد سے توسا نے اسے سنوارا تھا۔ کوزیٹ سفید ریشم کے نیچے کوٹ کے اوپر جالی سے بنا لبادہ، انگریزی پارچے کا نقاب، نفیس موتیوں کا ہار، نارنگی کے پھولوں کا سرپوش پہنے تھی؛ سب کچھ سفید تھا، اور اس سفیدی کے درمیان وہ مسکرا رہی تھی۔ پھیلتی ہوئی اس نفیس شفافیت کی روشنی نے اسے کچھ اور ہی بنا دیا تھا: ایسی کنواری جو دیوی کی صورت اختیار کر رہی ہو۔

ماریوس کے بال چمک دار اور خوش بو دار تھے؛ یہاں وہاں، گھونگریالے بالوں کے نیچے، پٹیوں میں لگے نشانات دکھائی دیتے تھے۔

نانا جان، خود پسند، سر اٹھائے، ہمیشہ سے زیادہ اپنے بناؤ پر توجہ کیے، دواسکاٹ لینڈ کے شہر Barras کے عہد کی تمام تر نفاستوں سمیت کوزیٹ کی نگہبانی کر رہا تھا۔ اس نے ژاں ولژاں کی جگہ لے لی تھی اس لیے کہ ابھی تک اس کا زخمی ہاتھ پٹی میں تھا، اور دلہن کو سہارا نہیں دے سکتا تھا۔

سیاہ لباس میں ملبوس ژاں ولژاں مسکراتا اس کے عقب میں چل رہا تھا۔

''موسیو فوشلووں!'' نانا اس سے مخاطب ہوا، ''آج بہت اچھا دن ہے۔ میں درد اور افسردگی کے اختتام کے حق میں ہوں۔ اب کہیں افسردگی نہیں ہوگی۔ بخدا، میں خوشی کا حکم دیتا ہوں۔ اب برائی کو باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ کسی شخص کا بدقسمت ہونا نیلے آسمان کے لیے شرم

کی بات ہے۔ جو اصلاً نیک ہوتا ہے اس سے بدی سرزد نہیں ہوتی۔ انسان کی بدنصیبی کی جڑ دارالحکومت اور مرکزی حکومت کا جہنم ہوتا ہے جس کو شیطانی محل کہا جا سکتا ہے۔ اچھا ہے کہ اس وقت میں ہر دل عزیز الفاظ منہ سے نکال رہا ہوں۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے، میں اب سیاسی رائے نہیں رکھتا؛ میں بس خوش رہنا چاہتا ہوں، اور اپنے آپ کو اسی تک محدود رکھتا ہوں۔"

سارے رسوم ادا ہونے کے بعد، میئر اور پادری کے سامنے "ہاں، ہاں، ہاں" کہے جانے کے بعد، میونسپلٹی کے اور گرجا گھر کے کاغذات پر دستخط کے بعد، انگوٹھیوں کے تبادلے کے بعد، دونوں ایک ساتھ سفید چادر کے نیچے گھٹنوں کے بل جھکے، سب کی پسندیدگی اور رشک کی نظروں میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے، ماریس سیاہ لباس میں، کوزیٹ سفید لباس میں، شانوں پر کرنل جیسے جھبے لگے سفید پوش لڑکے فرش پر، ہاتھوں میں تھامے برچھوں سے کھٹ کھٹ کرتے چلے؛ گرجا گھر کے کھلے پھاٹک کے باہر اچنبھے میں دیکھنے والے لوگ دورویہ کھڑے تھے، جہاں دونوں کو لے جانے والی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ دونوں نے گاڑی میں داخل ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے انھیں اس حقیقت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کوزیٹ نے ماریس کی طرف دیکھا، مجمعے کی طرف دیکھا اور آسمان پر نظر کی: ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اسے خوف نے آلیا تھا کہ شاید وہ اس خواب سے جاگ اٹھے گی۔ اس کی حیرتوں اور مضطرب انداز نے اس کے حسن کی سحرانگیزی میں اضافہ کر دیا تھا۔ دونوں گھر واپس جانے کے لیے اسی گاڑی میں داخل ہوئے؛ اس بار ماریس کوزیٹ کے ساتھ تھا؛ موسیو ژیلنورماں اور ژاں والژاں ان کے مقابل نشست پر بیٹھ گئے؛ پھوپھی ژیلنورماں ایک درجے پیچھے جا کر دوسری گاڑی میں سوار ہو گئی۔

"میرے بچو!" نانا جان نے کہا، "موسیو بیرن اور مادام بیرونس! اب تمھاری آمدنی تیس ہزار لیورے ہوگی۔"

اور کوزیٹ جو ماریس سے قریب تھی، اس کے کان میں ملکوتی سرگوشی سے کہہ رہی تھی:

"تو، اب یہ سچ ہو گیا ہے۔ میرا نام ماریس ہے؛ میں تمھاری مادام ہوں۔"

دو مخلوق نورانی ہو رہی تھیں۔ دونوں اس ناقابلِ تنسیخ، ناقابلِ تلافی لمحے پر، تمام تر جوانی کے ساتھ اور تمام تر مسرتوں کے ساتھ چکاچوند کر دینے والے چوراہے پر پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے ژاں پرووییر کے مصرعے کو سچ کر دکھایا تھا؛ دونوں مل کر چالیس برس کے ہو گئے تھے۔ یہ ترفع کی شادی تھی؛ یہ دو بچے سوسن کے دو پھول تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو [قریب سے] دیکھا نہیں تھا، دونوں نے ایک دوسرے [کی قربت کا] کا تصور نہیں کیا تھا؛ کوزیٹ نے ماریس کو تصور میں

اوج پر دیکھا؛ ماریوس نے کوزیٹ کو تصور میں گھرجا گھر کی قربان گاہ پر دیکھا۔ اور پس منظر میں نہ جانے کیسے، اس قربان گاہ پر اور اس اوج پر دو دیوتا آپس میں گھل مل گئے تھے؛ کوزیٹ بادل کے عقب میں تھی، ماریوس روشنی کے جھماکے کے اندر تھا؛ ایک مثالی شے تھی؛ ایک حقیقی شے تھا؛ اور ازدواجی بالش پر بوسے اور خواب کا اتصال ہو رہا تھا۔ نشے کی کیفیت میں انھیں ساری عقوبتیں یاد آ رہی تھیں جن سے وہ گزرے تھے۔ انھیں ایسا محسوس ہوا گویا ان کے سارے رنج، ان کی تمام بے خواب راتیں، ان کے سارے ٹپکے ہوئے آنسو، ان کے دُکھ، ان کے خوف، ان کی مایوسیاں، پیار کے لمس میں اور روشنی کی کرنوں میں تبدیل ہو گئے تھے؛ موہ لینے والا وقت جو قریب تھا، زیادہ مسرت آگیں ہوتا جا رہا تھا؛ ان کے غم ان کی شادمانی میں تبدیل ہو گئے تھے، جو اب ان کی مسرتوں کا سنگھار کر رہی تھیں۔ کتنے اچھے تھے یہ دُکھ! ان کی بدقسمتی ان کی خوشیوں کے اطراف ہالہ بن گئی تھی۔ ان کی محبت کی اذیت معراج پر ختم ہو رہی تھی۔

ان دو نفوس میں وہی جادو تھا جو ماریوس میں شہوت کا رنگ، اور کوزیٹ میں شرم کی خو بن گیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے دھیمے لہجوں میں کہا "ہم دونوں Plume اسٹریٹ کا باغیچہ دیکھنے جائیں گے۔" کوزیٹ کے لبادے کی شکنیں ماریوس پر پڑی تھیں۔

یہ دن وہ دن تھا جو حقیقت اور خواب کا ناقابلِ بیان آمیزہ بن جاتا ہے۔ ایک قابض ہو جاتا ہے، دوسرا قیاس میں گم ہو جاتا ہے۔ ایک، دوسرے سے پہلے اسے زیاتی بنا دیتا ہے۔ اس دن کا جذبہ، اس دن کا نصف النہار، اس دن کی نصف شب ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے۔ ان دو دلوں کے سرور مجمعے پر پھیل گئے تھے اور راہ گیروں میں شادمانی پھونک دی تھی۔

لوگ Saint-Antoine اسٹریٹ پر رُک رُک کر گاڑی کی کھڑکی سے کوزیٹ کے سر پر سجے نارنگی کے پھولوں کو گھور رہے تھے۔

وہ Filles-du-Calvaire اسٹریٹ پر واقع اپنے گھر واپس ہوئے۔ تابندہ اور فاتح ماریوس، کوزیٹ کی معیت میں اس زینے پر چڑھ رہا تھا جہاں وہ جاں کنی کے عالم میں لایا گیا تھا۔ دروازے پر جمع مفلس جو اس کے بٹوے کے شریک ہو چکے تھے دونوں کو دعائیں دے رہے تھے۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ بخور اور گلاب کے علاوہ، گھر کا ماحول گرجا گھر سے کم خوش بودار نہیں تھا۔ انھیں خیال کی لاانتہائیت میں مقدس گیتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں؛ ان کے دلوں میں خدا تھا؛ مقدر انھیں ستاروں بھری سقف جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے سروں پر ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک گھڑی کا گھنٹا بجنے کی آواز سنائی

دی۔ ماریوس نے کوزیٹ کے دل رُبا برہنہ بازوؤں پر نظر کی؛ تمام خوش نما چیزوں پر نظر کی جو سینہ بند کی جالی کے باعث مبہم نظر آتی تھیں؛ ماریوس کی نظروں کو دیکھتے ہی کوزیٹ کا بال بال شرما گیا۔

بلیر نورما کے کئی خاندانی دوست مدعو کیے گئے تھے؛ ہر ایک کوزیٹ سے قریب ہونا چاہ رہا تھا، مادام بیرونس کو سیلوٹ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ فوجی افسر، تھیوڈول بلیر نورما، جو اَب کپتان بن چکا تھا، اپنے عم زاد پوں مرسی کی شادی میں شرکت کے لیے Chartres کی چھاؤنی سے آیا تھا جہاں اس کی تعیناتی تھی۔ کوزیٹ نے اسے پہچانا نہیں۔ اپنے طور پر، چوں کہ وہ اس بات کا عادی ہو چکا تھا کہ عورتیں اسے خوبرو سمجھتی ہیں، دوسری عورتوں کی طرح کوزیٹ بھی اسے یاد نہیں تھی۔

"کتنا صحیح تھا میں، کہ میں نے اس نیزہ بردار کے قصے پر یقین نہیں کیا۔" فادر بلیر نورما نے خود سے کہا۔

کوزیٹ ژاں ولژاں سے کبھی اتنی قریب نہیں ہوئی تھی۔ وہ فادر بلیر نورما سے ہم آہنگ تھی۔ جب وہ مقولوں میں شادمانی شامل کرویتا تو کوزیٹ کی سانسوں میں سے خوش بو آنے لگتی تھی۔ خوش قسمتی کی خواہش ہوتی ہے کہ پوری دنیا خوش ہو۔

ژاں ولژاں سے گفتگو کے دوران کوزیٹ کی آواز میں بچپنے جیسی یگانگت آجاتی تھی۔ وہ اپنے تبسم کے ذریعے اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔

کھانے کے کمرے میں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اعلیٰ درجے کی خوشی کے لطیف دن، روشنی جیسی چمک دار روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دھند اور ابہام خوش لوگوں کو پسند نہیں آتے۔ وہ سیاہ پر راضی نہیں ہوتے۔ رات! ہاں؛ پر چھائیاں! جی نہیں۔ اگر سورج نہیں تو ایک بنالیا جانا چاہیے۔

کھانے کا کمرہ خوش نما اشیا سے پُر تھا۔ مرکز میں، سفید چم چم کرتی میز کے اوپر، موم بتیوں کے درمیان وینس کی چمک دار سپاٹ رکابیاں تھیں، جن میں ہر رنگ کے پرندے، نیلے، ارغوانی، سرخ اور سبز رکھے تھے؛ فانوس کے، آتش بازی کی چرخیوں کے اطراف دیواروں پر بگونے اور پنجگوشے sconces آویزاں تھے؛ آئینے، نقرئی ظروف، بلوریں ظروف، رکابیاں، چینی کے ظروف، نقشیں برتن، سونے اور چاندی کے کام کے ظروف؛ سب کچھ چم چم کر رہا تھا۔ شمع دان کے درمیان خلا میں گل دستے رکھے تھے، اس طرح کہ جہاں روشنی نہ ہو وہاں پھول ہوں۔

پیش دالان میں تین وائلن اور ایک بانسری پر چار موسیقار Haydn کا نغمہ بجا رہے تھے۔

ژاں ولژاں کمرۂ ملاقات میں کرسی پر بیٹھا تھا، دروازے کے پیچھے جس کا ایک پٹ اس طرح کھول دیا گیا تھا کہ وہ بالکل چھپ گیا تھا۔ ان کے میز پر بیٹھنے کے چند منٹ بعد کوزیٹ آئی، گویا اچانک کسی ترنگ نے اسے الہام کیا ہو؛ اور اس کے سامنے، اپنی ازدواجی سجاوٹ کو دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر، جھکی اور نرم شرارت بھری نظروں سے سوال کیا:

"بابا، کیا آپ مطمئن ہیں؟"

"ہاں" ژاں ولژاں نے کہا "میں مطمئن ہوں۔"

"تو پھر ذرا ہنسیے تو۔"

ژاں ولژاں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

چند منٹ بعد باسک نے اعلان کیا کہ کھانا چُن دیا گیا ہے۔

مہمانوں سے پہلے موسیو بلیر نورما کوزیٹ کا ہاتھ تھامے کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے، اور میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ دلھن کی دونوں جانب دو آرام کرسیاں رکھی تھیں؛ پہلی موسیو بلیر نورما کے لیے، اور دوسری ژاں ولژاں کے لیے۔ موسیو نورما اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ دوسری آرام کرسی خالی رہی۔ سب لوگوں نے موسیو فوشلوون کے لیے ہر طرف نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

موسیو بلیر نورما نے باسک سے سوال کیا۔ "تمھیں علم ہے کہ موسیو فوشلوون کہاں ہیں؟"

"جناب" باسک نے جواب دیا، "جی ہاں، مجھے علم ہے۔ موسیو فوشلوون نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کو بتا دوں کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان کے ہاتھ میں درد ہو رہا تھا۔ وہ موسیو بیرن اور مادام بیرونس کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ وہ معافی کے خواستگار ہیں۔ وہ کل آئیں گے۔ ابھی چلے گئے ہیں۔"

خالی کرسی نے تھوڑی دیر کے لیے شادی کے کھانے کی فضا کو بوجھل کر دیا تھا۔ موسیو فوشلوون موجود نہیں تو موسیو بلیر نورما تو موجود ہیں، اور نانا جان دونوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انھوں کہا کہ موسیو فوشلوون نے اچھا کیا؛ اگر وہ بیمار ہیں تو اچھا کیا کہ جلدی آرام کرنے چلے گئے ہیں، مگر یہ معمولی سی تکلیف تھی۔ اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ مزید یہ کہ خوشی کی اس دھوم دھام میں ایک اداس کونے سے کیا فرق پڑے گا؟ کوزیٹ اور ماریوس ان خود بیں اور مبارک لمحات سے گزر رہے تھے جن میں ایک شخص کو سوائے خوشیاں حاصل کرنے کے اور کوئی طلب باقی نہیں رہتی۔ اور پھر موسیو بلیر نورما کو خیال آیا "او خدایا! یہ کرسی خالی ہے۔ ماریوس تم یہیں آ جاؤ۔ تمھاری پھوپھی تمھیں اس کی اجازت دے دیں گی، حالاں کہ یہ ان کا حق ہے۔ یہ کرسی اب تمھاری ہے۔ یہ

قانونی بھی ہے اور خوش گوار بھی۔ سارے میز والوں نے تالیاں بجائیں۔ ماریوس نے کوزیت کے برابر والی ژاں والژاں کی نشست سنبھال لی، اور پھر یوں ہوا کہ کوزیت جو پہلے ژاں والژاں کی غیر موجودگی پر افسردہ تھی، اب مطمئن ہو گئی۔ جب ماریوس اس جگہ بیٹھ گیا اور ژاں والژاں کا متبادل بن گیا تو کوزیت نے اپنا پیر، جو ساٹن کے گھیر کے اندر تھا، ماریوس کے پیر پر رکھ دیا۔

آرام کرسی پر قبضہ ہوا، موسیو فوشلوواں منظر سے غائب ہو گیا، اور کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ پانچ منٹ کے اندر، میز پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیٹھے لوگ، سب کچھ بھول کر ہنسنے بولنے لگے تھے۔ شیرینی بعد از طعام کے موقعے پر موسیو ژیلنورماں ہاتھ میں شراب کا جام لے کر کھڑا ہوا — جو صرف نصف بھرا تھا، اس لیے کہ اس کے ہاتھوں کے رعشے سے جام چھلکنے نہ لگے — اور اس نے شادی شدہ جوڑے کی صحت کا جام تجویز کیا۔

"تم دو خطبوں سے بچ نہیں سکتے۔" اس نے بلند آواز میں کہا، "آج صبح ایک خطبہ تم نے متبع سے سنا تھا؛ اس شام دوسرا خطبہ تم اپنے دادا سے سنو گے"۔

"سنو! میں تمھیں ایک مشورہ دے رہا ہوں: ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرو۔ میں گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں؛ میں براہِ راست نقطے پر پہنچنا چاہتا ہوں: خوش رہو۔ تمام مخلوقات میں صرف turtle-doves ہی عقل مند ہوتے ہیں۔ فلسفی کہتے ہیں: 'اپنی خوشی کو اعتدال پر رکھو۔' میں کہتا ہوں: 'اپنی خوشیوں کو کھلی آزادی دو۔' بھوت کی طرح ایک دوسرے میں مبتلا ہو جاؤ۔ آپس میں بجھو جاؤ۔ فلسفی کی باتیں احمقانہ ہوتی ہیں۔ میرا بس چلے تو ان کا سارا ملغوبہ دوبارہ ان کے پیٹ میں ٹھونس دوں۔ کیا زندگی میں بہت زیادہ خوشبوئیں ہو سکتی ہیں؛ بہت زیادہ گلاب کی کلیاں ہو سکتی ہیں؛ بہت زیادہ نغمہ سرا بلبلیں ہو سکتی ہیں؛ بہت زیادہ سبز پتیاں ہو سکتی ہیں؛ بے شمار تیتلی روشنیاں ہو سکتی ہیں؟ کیا لوگ آپس میں ضرورت سے زیادہ محبت کر سکتے ہیں؟ کیا لوگ ایک دوسرے کو زیادہ خوش کر سکتے ہیں؟ [انیسویں صدی کے مشہور اوپرا کی مونث کردار] Estelle، اپنا خیال رکھو، تم بہت خوب صورت ہو! [انیسویں صدی کے مشہور اوپرا کا مرکزی کردار] Nemorin احتیاط برتو، تم بہت جمیل ہو۔ نفیس حماقتیں، اور کسی حق میں۔ کیا لوگ ایک دوسرے کو زیادہ لبھا سکتے ہیں، ایک دوسرے کی زیادہ خوشامد کر سکتے ہیں، ایک دوسرے کو زیادہ موہ سکتے ہیں؟ کیا کوئی بہت زیادہ زندہ رہ سکتا ہے، زیادہ خوش رہ سکتا ہے؟ اپنی خوشیوں کو معتدل کرو۔ ارے ہاں، فلسفی، مردہ باد! دانش خوشی منانے میں ہوتی ہے۔ خوش رہا کرو، خوش رہو۔ کیا ہم اس لیے خوش ہیں کہ ہم اچھے ہیں، یا ہم اس لیے اچھے ہیں کہ ہم خوش ہیں؟ کیا Sancy [وزن دار ہیرا] اس لیے Sancy ہیرا

کہلاتا ہے کہ وہ Harley de Sancy کی ملکیت تھا یا اس لیے کہ اس کا وزن چھ سو قیراط تھا؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؛ زندگی ایسے بہت سے مسائل سے بھری پڑی ہے؛ اہم نکتہ یہ ہے کہ Sancy اور خوشی حاصل کرو۔ الوکھے پن اور ٹال مٹول کے بغیر ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ ہمیں آنکھ بند کر کے سورج کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔ سورج کیا ہے؟ سورج محبت ہے۔ کوئی شخص جو کہتا ہے محبت، در اصل کہتا ہے، عورت! اوہ، اوہ! قدرت مطلقہ، عورت کو دیکھو— اس بزدل عزیز ماریوس سے پوچھو کہ وہ جابر کوزیٹ کا غلام ہے کہ نہیں۔ اور غلامی بھی اپنی مرضی کی! بزدل! عورت! ایک بھی Robespierre نہیں جس میں عورت کی حاکمیت نہ ہو۔ میں اس شاہی کے سوا اب شاہ پرست نہیں۔ آدم کیا تھے؟ حوا کی سلطنت تھے۔ حوا کے لیے '89 نہیں ہوگا۔ ایک شاہی عصا ہوتا تھا جس پر پھول ہوا کرتے تھے، اب شہنشاہی عصا کے اوپر کرۂ ارض رکھا ہوتا ہے؛ شارلیمین کا عصا فولاد سے بنا تھا۔ لوئی اعظم کا عصا بھی تھا، جو سونے سے بنا تھا— انقلاب نے ان سب کو انگوٹھے اور پہلی انگلی سے موڑ کر رکھ دیا تھا؛ یہ سب دمڑی کے برابر تھے؛ یہ ختم ہو چکے ہیں، ٹوٹ چکے ہیں، زمین پر پڑے ہیں، اب کوئی عصا باقی نہیں رہ گیا ہے؛ اب تو کڑھے ہوئے ایک معمولی سے رومال سے بھی انقلاب آجاتا ہے، جس سے پودینے کی بو آتی ہو۔ میں تم سے بھی اسی کی توقع رکھتا ہوں۔ کوشش کر دیکھو۔ یہ اتنا سخت کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ بے کار، بے وقعت شے ہے۔ اوہ، تم تو انیسویں صدی ہو؟ اچھا، تو پھر کیا ہوگا؟ ہم بھی تو تمھاری ہی طرح بیوقوف تھے۔ اس کا تصور بھی نہ کرنا کہ تم نے کائنات میں کوئی تبدیلی کر دی ہے، اس لیے کہ تمھارا تفریحی سفر کالرا کہلاتا ہے، اور تمھاری ٹبدی کو [ہسپانوی] رقص کہتے ہیں۔ در اصل، عورت سے ہمیشہ محبت کی جانی چاہیے۔ میں تمھیں اس سے انکار کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ ہمارے فرشتوں کی دوست ہوتی ہیں۔ ہاں، محبت، عورت اور بوسہ وہ دائرہ بناتے ہیں جن سے تم فرار نہیں ہو سکتے؛ اور جہاں تک میرا معاملہ ہے، مجھے اس میں دوبارہ داخل ہونے پر بے حد خوشی ہوگی۔ تم میں سے کون ہے جس نے زہرہ سیارہ دیکھا ہے، پاتال کی رنجھانے والی عورت، سمندر کی Celimene [Molière کے مزاحیہ کھیل کا نسوانی کردار]، جو لامتناہی میں الجھتی ہے، اور نیچے والوں کو پُر سکون کر دیتی ہے؟ سمندر ٹوٹ کر جا بجنے والا [یونانی اساطیر] Alcestis ہے۔ اچھا، بڑبڑ کرو جیسے وہ کرتا ہے، جب زہرہ ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ جنگلی درندہ ڈر جاتا ہے۔ ہم سب اسی طرح بنے ہیں۔ غضب، آندھی، طوفان، بادلوں کی گرج اور سقف تک جھاگ جھاگ ہیں۔ منظر نامے میں عورت داخل ہوتی ہے،

ایک سیارہ طلوع ہوتا ہے؛ ہم منہ کے بل گر جاتے ہیں۔ چھ ماہ قبل ماریوں لڑ رہا تھا؛ آج اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہاں، ماریوں، ہاں کوزیت، تم صحیح راستے پر ہو۔ ایک دوسرے کے لیے جیو، ہمیں غصے سے پھٹ جانے دو کہ ہم یہ سب نہیں کر سکتے؛ ایک دوسرے کے لیے مثال ہو؛ اپنی منقاروں میں وہ تمام چھوٹی چھوٹی آسودگیاں پکڑ لو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، اور اپنے لیے زندگی کا آشیانہ مرتب کر لو۔ محبت کرنا، محبوب ہونا، کتنا اچھا معجزہ ہوتا ہے جب آپ جوان ہوتے ہیں۔ اس کا تصور بھی نہ کرنا کہ اسے تم نے ایجاد کیا ہے۔ میرے بھی اپنے خواب تھے، میں نے بھی مراقبے کیے تھے، میں نے بھی آہیں بھری تھیں، میری بھی چاندنی جیسی محبوبہ تھی۔ محبت چھ ہزار سالہ بچی ہے۔ محبت کو بھی سفید لمبی ڈاڑھی رکھنے کا حق ہوتا ہے۔ Methusalem عبرانی انجیل مقدس کے مطابق Methusalem دنیا کا طویل ترین (969 برس) عمر پانے والا انسان تھا جس کا انتقال طوفان نوح کی ابتدا کے زمانے میں ہوا تھا؛ عرب کی سڑکوں کا کیوپڈ تھا۔ ساٹھ صدیوں سے مرد اور عورت محبت سے اپنا مقصد حاصل کر رہے ہیں۔ چالاک شیطان نے انسان سے نفرت کی ہے؛ انسان اس سے بھی زیادہ شاطر ہے؛ وہ عورت سے محبت کرنے لگا۔ اس طرح اس نے شیطان کے نقصان پہنچنے سے زیادہ اچھے کام کیے ہیں۔ یہ ہنر آسمانی جنت کے زمانے میں دریافت ہوا تھا۔ دوستو! ایجاد پرانی ہے، مگر اب بھی بالکل نئی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ Philemon اور Baucis کے انتظار میں نہ رہو، Daphnis اور Chloe ہو۔ ایسا انتظام کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے ساتھ ہو تو تمھیں کسی بات کی کمی نہ ہو؛ کہ ماریوں کے لیے کوزیت سورج بن جائے، اور ماریوں کوزیت کے لیے کائنات بن جائے۔ کوزیت، اپنے بہترین موسم کو اپنے شوہر کا تبسم بنا دو؛ ماریوں اپنی بیوی کے آنسوؤں کو اپنی بارش بنا دو۔ اور اپنے گھر میں اس بارش کو کبھی نہ ہونے دو۔ تمھیں لاٹری کی جیت کا نمبر مل گیا ہے؛ تمھیں بہت بڑا انعام مل گیا ہے، اس کی حفاظت کرو، اس کو تالے کنجی میں بند رکھو، اس کو ضائع نہ کرو، ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرو، دوسروں کے لیے اپنی انگلیاں چٹخاؤ۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر یقین کرو۔ یہی عقل کی بات ہے۔ اور عقل کی بات کبھی جھوٹ نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کے لیے مذہب بن جاؤ۔ ہر آدمی اپنے انداز میں خدا سے محبت کرتا ہے۔ بخدا! خدا سے محبت کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اپنی بیوی سے محبت کرو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، یہ میرا استراطی پن ہے۔ وہ جو محبت کرتا ہے قدامت پرست ہوتا ہے۔ ہنری چہارم کا تکلف، جشن منانے اور پی کر مدہوش ہو جانے کے درمیان کہیں تقدس رکھتا ہے۔ میں اس تکلف کے مذہب کو نہیں مانتا۔ اس میں عورت کو بھلا دیا جاتا ہے۔ ہنری چہارم نے مجھے حیران کر

دیا ہے۔ دوستو! عورتیں زندہ باد! وہ کہتے ہیں کہ میں بوڑھا ہوں؛ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں خود کو جوان محسوس کرتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جنگلوں میں جا کر بین باجا سنوں۔ بچے خوب صورت اور مطمئن ہونے کا بہانہ کرتے ہیں — یہ مجھے مدہوش کر دیتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو میں بخوشی شادی کرنا چاہوں گا۔ یہ تصور کرنا ناممکن ہوگا کہ خدا نے ہمیں اس کے سوا کسی اور کام کے لیے خلق کیا ہے: پرستش کے لیے، غٹرغوں کرنے کے لیے، اپنے آپ کو سنوارنے کے لیے، فاختہ کی طرح ہونے کے لیے، نفیس ہونے کے لیے، صبح سے رات تک محبت میں چونچ لڑانے اور غٹر غوں کرنے کے لیے، کسی اور کی بیوی کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنے کے لیے، غرور کرنے کے لیے، فاتح ہونے کے لیے، سر پر کلغی سجانے کے لیے؛ یہ ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ ہم تمھیں یہ کہہ کر ناراض نہیں کرنا چاہتے کہ ہم اپنے زمانے میں یہی سوچتے تھے، جب ہم جوان تھے۔ ان دنوں بھی مسحور کر دینے والے عورتیں ہوتی تھیں؛ ان کے چہرے کتنے حسین ہوتے تھے، اور کتنی پیاری معشوقائیں ہوتی تھیں۔ میں نے ان کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ اگر لوگ ایک دوسرے سے پیار نہ کرتے تو بہار کے دن کس کام کے ہوتے؟ اور تمام خوب صورت چیزوں کو جو وہ ہمیں دکھاتا ہے، ختم کر دینے کے لیے مجھے اپنے پیارے خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ان سب کو واپس لے کر اپنے صندوقوں میں، پھولوں میں، پرندوں میں، اور خوب صورت لڑکیوں میں بند کر دے۔ میرے بچو! ایک بوڑھے سے برکت کی دعائیں سمیٹو!"

شام سہانی تھی، خوش گوار تھی اور دل پذیر تھی۔ نانا جان کے خوب صورت شاہانہ مزاج نے جشن کو مرکزی اہمیت دے دی تھی، اور ہر شخص نے اپنا کردار تقریباً صد سالہ گرم جوشی سے ٹھیک کر لیا تھا۔ انھوں نے کچھ دیر رقص کیا، اور دیر تک ہنسی مذاق کرتے رہے۔ شادی خوش گوار تھی۔ اس میں Goodman کے ماضی کے دن شامل کیے گئے ہوں گے۔ بہر حال، وہ فادر بلیر نورما کی ذات میں شامل تھا۔

کچھ دیر ہلچل ہوئی، پھر خاموشی چھا گئی۔

شادی شدہ جوڑا غائب ہو گیا۔

آدھی رات کے بعد بلیر نورما کا گھر مندر بن گیا۔

اب ہم رک جائیں گے۔ اس لیے کہ شادی کی راتوں کی دہلیز پر ایک متبسم فرشتہ ہونٹوں پر انگلی رکھے کھڑا ہوتا ہے۔

اس معبد کے سامنے، جہاں محبت کا جشن ہوتا ہے، نفس سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

ایسے گھروں سے قطع نظر، وہاں روشنی کے جھماکے ہونے چاہئیں۔ وہ خوشی جو اُن کے اندر ہوتی ہے، اسے چمک دمک میں پتھر سے بنی دیوار سے گزر کر فرار ہو جانا چاہیے اور افسردگی کو مبہم طریقے سے روشن کرنا چاہیے۔ ناممکن ہے کہ یہ مقدس اور مہلک جشن لاانتہا کو کائناتی تاب ناکی فراہم نہ کرے۔ محبت گلانے کا ارفع برتن ہوتی ہے جس میں عورت اور مرد کی مکمل مل جانے والی گلاوٹ ہوتی ہے؛ ایک وجود بن جانے، سہ گنا وجود بن جانے، اور حتمی وجود بن جانے کے لیے افسردگی کو جذبہ بن جانا چاہیے۔ عاشق مشتعل ہوتا ہے؛ ناتجربہ کنواری خوف زدہ ہوتی ہے۔ اس خوشی میں سے کچھ خدا کی طرف بلند ہو جاتا ہے۔ جہاں سچی شادی ہوتی ہے، یعنی جہاں محبت ہوتی ہے، اس میں مثالیت داخل ہو جاتی ہے۔ بستر ازدواج پرچھائیوں میں ایک الگ تھلگ سویرا بن جاتا ہے۔ اگر گوشت سے بنی آنکھ کو عالم بالا کی مہیب اور دل ربا زندگی کے تصورات کو غور سے دیکھنے کا موقع دیا جائے تو ممکن ہے کہ ہم دیکھ سکیں: رات کے مختلف پیکروں کو، پر دار نامعلومات کو، نیلے آسمان سے گزرنے والے مخفی کو، جھکے ہوئے کو، اداس سروں کے ہجوم کو، روشن شدہ مکان کے اطراف، مطمئن، برکتوں کی بارش کرتا، اشارے کرتا، چونکی پیار سے خوف زدہ کنواری بیوی کو اور انسانی مسرت کامل کا عکس لیے ان کے ربانی خد و خال کو۔ اگر اس بلند و برتر وقت شادی شدہ جوڑا شہوت زدگی سے چکا چوند اور خود کو تنہا سمجھتا ہوا سننے کی کوشش کرے تو اسے اپنے کمرے میں پریشان پروں کی سرسراہٹ سنائی دے گی۔ مکمل خوشی فرشتوں سے باہمی مفاہمت جیسی ہوتی ہے۔ اس چھوٹے سے اندھیرے کمرے کی سقف جنت ہی جنت ہوتی ہے۔ جب دو دہان، مقدس محبت سے سرشار، تخلیق کی طرف بڑھتے ہیں تو ممکن نہیں کہ اس انمٹ بوسے کے اوپر تمام ستاروں کے مہیب اسرار میں کپکپی نہ پیدا ہو۔

یہ مسرتیں سچی مسرتیں ہوتی ہیں۔ ان خوشیوں کے باہر خوشیاں نہیں ہوتیں۔ صرف محبت ہی سرمستی ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ رونا دھونا ہوتا ہے۔

محبت کرنا یا محبوب ہونا، کافی ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کی طلب نہ کرو۔ پرچھائیں زدہ زندگی کی سلوٹوں میں اور کوئی گوہر نہیں ملتا۔ محبت کرنا ہی تکمیل ہے۔

۞

ناقابلِ علاحدگی

ژاں ولژاں کا کیا حال ہوا؟

کوزیٹ کے باعزت تحکم پر ہنسنے کے بعد، جب کوئی اس پر توجہ نہیں دے رہا تھا، ژاں ولژاں وہاں سے اٹھ گیا اور اسے پیش والان مشان مل گیا تھا۔ یہی وہ کمرہ تھا جہاں آٹھ ماہ قبل، وہ کیچڑ میں سنا سیاہ رنگ میں، خون اور خاک میں لتھڑا، ایک نواسے کو نانا کے پاس واپس لایا تھا۔ لکڑی سے بنے حاشیے کو پھولوں اور پتوں سے مزین کیا گیا تھا؛ اس صوفے پر موسیقار بیٹھے تھے جس پر ماریوں کو لٹایا گیا تھا۔ باسک، سیاہ کوٹ، گھٹنے تک کی بریچس، سفید رنگ کی گھٹنے تک کی جرابیں اور سفید دستانے پہنے طباقوں کے اطراف پھول سجا رہا تھا جن میں غذا پیش کی جانے والی تھی۔ ژاں ولژاں نے اپنے بازو اور رومال کی طرف اشارہ کیا۔ اور باسک کو اپنی غیر موجودگی کی تشریح کی ذمے داری سونپ کر وہاں سے چلا گیا۔

کھانے کے کمرے کی لانبی کھڑکیاں سڑک پر کھلتی تھیں۔ ژاں ولژاں کئی منٹ تک ان روشن کھڑکیوں کے نیچے اندھیرے میں بے حرکت کھڑا رہا۔ وہ سن رہا تھا۔ دعوت کی الجھی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اسے نانا جان کا بلند، تحکمانہ لہجہ، وائلن، رکابیوں کی کھڑکھڑ، قہقہے سنائی دے رہے تھے، اور اس خوش باش غوغا میں کوزیٹ کی پیاری مسرت بھری آواز بھی آرہی تھی۔

وہ Filles-du-Calvaire اسٹریٹ سے نکلا اور l'Homme Arme اسٹریٹ پر واپس پہنچ گیا۔ وہاں واپسی کے لیے اسے Saint Luis اسٹریٹ، Sainte Culture Catherine اسٹریٹ اور Manteaux Blancs سے گزرنا پڑا تھا؛ یہ راستہ کچھ طویل تھا،

مگر یہ وہی سڑک تھی جس کے ذریعے وہ پچھلے تین ماہ، ہر روز، l'Homme Arme اسٹریٹ سے Filles-du-Calvaire اسٹریٹ جایا کرتا تھا، تا کہ Vielle-du-Temple اسٹریٹ کے کیچڑ اور رکاوٹوں سے بچا جا سکے۔

جس سڑک سے کوزیٹ گزری تھی وہ دوسرے راستوں سے بہتر راستہ فراہم کرتی تھی۔

ژاں ولژاں اپنی قیام گاہ میں داخل ہوا۔ موم بتی روشن کی اور سیڑھیاں چڑھا۔ گھر خالی تھا۔ حتیٰ کہ اب توسا بھی وہاں نہیں رہتی تھی۔ ژاں ولژاں کے قدم کمروں میں عام دنوں سے زیادہ آواز پیدا کر رہے تھے۔ ساری الماریاں کھلی تھیں۔ وہ کوزیٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔ بستر پر چادر نہیں تھی۔ بے غلاف تکیے، پائنتی تہہ کیے ہوئے کمبل پر رکھے تھے، جس پر کوئی سونے والا نہیں تھا۔ ساری نسوانی اشیا کوزیٹ جس کی عادی تھی، لے جائی گئی تھیں؛ سوائے فرنیچر اور چار دیواروں کے کوئی شے باقی نہیں رہی تھی۔ توسا کا بستر بھی اسی طرح ویران تھا۔ صرف ایک بستر کسی کے انتظار میں تھا؛ اور وہ بستر ژاں ولژاں کا تھا۔

ژاں ولژاں نے دیواروں پر نظر ڈالی، کچھ الماریاں بند کیں اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے گیا اور آیا۔ اس کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں گیا، اور موم بتی کو میز پر جما دیا۔ اس نے رومال سے اپنا بازو نکال لیا تھا اور اپنا دایاں ہاتھ اس طرح استعمال کیا گویا اسے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بستر کی طرف گیا اور ایک دم اس کی نظر ٹھہر گئی؛ کیا یہ اتفاق تھا؟ یا دانستہ ہوا تھا؟ اس چرمی تھیلے پر جو ہمیشہ ژاں ولژاں کے پاس ہوتا تھا، کوزیٹ جس سے حسد کرتی تھی، چار جون کو l'Homme Arme اسٹریٹ پر آمد کے موقع پر اس نے اس تھیلے کو ایک گول میز پر رکھ دیا تھا جو اس کے بستر کے سرہانے رکھی رہتی تھی۔ وہ پُر جوشی سے اس تھیلے کی طرف بڑھا، جیب سے ایک کنجی نکالی اور سفری تھیلے کو کھولا۔

اس میں سے آہستہ آہستہ کپڑے نکالنے شروع کیے، دس برس قبل جن میں ملبوس کوزیٹ نے Montfermeil چھوڑا تھا؛ پہلے چھوٹا سا لبادہ نکالا، پھر سیاہ رنگ کی تکونی شال، پھر بھدے مضبوط بچگانے جوتے نکالے جو کوزیٹ اب بھی پہن سکتی تھی، اس لیے کہ اس کے پاؤں بہت چھوٹے تھے؛ پھر موٹے پارچے کی چولی نکالی جو بہت موٹی تھی، پھر بنا ہوا زیر جامہ، پھر جیبوں والا ایپرن، اس کے بعد اونی گھٹنے تک اونچی جرابیں نکالیں۔ جرابیں آج بھی اس کی دل کش چھوٹی ٹانگوں کے پیکر کی یاد دلاتی تھیں، جو ژاں ولژاں کے ہاتھ سے زیادہ بڑی نہیں تھیں۔ یہ سب لباس سیاہ رنگ کے تھے۔ وہ یہ سب خود ہی کوزیٹ کے لیے Montfermeil

لے کر آیا تھا۔ جیسے جیسے انھیں نکالتا گیا، بستر پر پھیلاتا گیا۔ پھر وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یاد کرنا شروع کیا۔ وہ سردی کا موسم تھا، دسمبر کا سخت سرد مہینہ تھا۔ اور وہ نصف برہنہ، چیتھڑوں میں لپٹی کانپ رہی تھی۔ لکڑی کے جوتوں میں اس کے چھوٹے چھوٹے پیر سرخ ہو رہے تھے۔ ژاں ولژاں نے چیتھڑوں کو پھینک کر اسے یہ ماتمی پوشاک پہنائی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی قبر میں خوشی محسوس کی ہوگی کہ اب وہ قرینے سے ملبوس تھی، اور اس لیے بھی کہ وہ گرم کپڑوں میں تھی۔ پھر اسے Montfermeil کا جنگل یاد آ گیا؛ انھوں نے، یعنی کوزیت اور ژاں ولژاں نے، اسے ایک ساتھ پار کیا تھا؛ اسے پھر یاد آیا کہ وہ کیسا موسم تھا، بے برگ درختوں کا، چڑیوں سے خالی جنگل کا، بے سورج آسمان کا؛ اس کے باوجود وہ منظر دل ربا تھا۔ اس نے یہ چھوٹے چھوٹے لباس بستر پر قرینے سے بچھا دیے، جرابیں جوتوں کے قریب رکھ دیں، اور ایک کے بعد دوسرے کو غور سے دیکھا۔ اس وقت وہ زیادہ لمبی نہیں تھی، اس کے بازوؤں میں ایک بڑی سی گڑیا تھی؛ اس نے اپنا سونے کا سکہ ایپرن کی جیب میں رکھ لیا تھا؛ وہ ہنس رہی تھی، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ چلی تھی؛ دنیا بھر میں اس کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔

تب ژاں ولژاں کا قابلِ احترام سفید سر آگے کی طرف بستر پر ڈھلک گیا، اس کا پتھر دل ٹوٹ گیا، اس کا چہرہ کوزیت کے ملبوسات میں چھپ گیا، اور اگر کوئی اس وقت زینے کے قریب سے گزرتا تو اسے ڈراؤنی سسکیاں ضرور سنائی دے جاتیں۔

❁

دائم زندہ رہنے والا یقین

وہ قدیم اور مہیب جد و جہد، ہم جس کے کئی دور دیکھ چکے ہیں، ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔ یعقوب نے فرشتے کے ساتھ جد و جہد کی تھی، مگر صرف ایک رات۔ افسوس، کتنی بار ژاں ولژاں نے خود کو جسمانی طور پر اندھیرے میں اور اپنے ضمیر میں تنازعہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اس کے خلاف جد و جہد کر رہا تھا۔

تنازعہ جس کے بارے میں پہلے کبھی سنا نہیں گیا۔ مخصوص لمحات میں پیر پھسل جاتا ہے؛ دوسرے لمحات میں پیر کے نیچے کی زمین اکھڑ جاتی ہے۔ کتنی بار اس ضمیر نے جو نیک کے لیے اچھا تھا، اس کو پکڑ کر پھینک دیا تھا۔ کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ سچائی نے اس کا گھٹنا سنگ دلی سے اس کی چھاتی سے لگا دیا تھا۔ کتنی بار، جب روشنی نے اسے زمین پر دھکیل دیا تھا، اس نے رحم کی بھیک مانگی تھی۔ کتنی بار اس سنگ دل چنگاری نے اس کے اندرون کو روشن کیا تھا، اور بشپ نے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے اسے چکا چوند کر دیا تھا، جب وہ نابینا ہونا چاہتا تھا۔ کتنی بار اس لڑائی میں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا، چٹان کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، سوفسطائیت کی جانب جھکتے ہوئے اسے خاک میں گھسیٹا گیا تھا، اور اب اس نے اپنے ضمیر کے بالا دست ہاتھ کو ایک بار پھر جھٹک دیا گیا تھا۔ کتنی بار انانیت کی نمائش اور دغا بار توضیح کے بعد اس کے بے چین ضمیر نے اپنے کان میں ایک چیخ سنی تھی، "بدنصیب! ایک اور ٹھوکر!" کتنی بار فرائض کے ثبوت کے زیر اثر اس کے سرکش خیالات اس کے گلے میں تشنجی انداز میں کھڑکھڑائے تھے۔ خدا سے مزاحمت!

وہ کون سے زخم ہیں جن سے تنہا اس نے خون بہتا محسوس کیا ہے! اس کے افسوس ناک وجود میں کیا کیا مذمتیں ہوئیں تھیں؟ کتنی بار وہ اٹھایا گیا تھا، جب اس کا خون بہہ رہا تھا، وہ زخمی

تھا، ٹوٹا ہوا تھا، اس کا دل مایوسیوں سے لبریز تھا، اس کی روح میں سکون تھا، اور وہ بھاگا تھا، اس نے خود کو فاتح محسوس کیا تھا؟ بے کار کیے جانے، توڑے جانے اور آگ میں ضمیر کی لو دیتی ہوئی چیلیوں کے ذریعے اس سے کہا گیا تھا، "اب تم پُرسکون ہو جاؤ۔"

مگر ایسے غم انگیز تنازعے سے نکلنے پر، ایسا معصومانہ سکون! افسوس!

پھر بھی، اس رات ژاں ولژاں کو محسوس ہوا کہ وہ اپنی آخری لڑائی لڑ رہا تھا۔

ایک دل توڑنے والا سوال درپیش تھا۔

تقدیر براہِ راست نہیں چلتی؛ آدمی کے سامنے سیدھی سڑک نہیں ہوتی؛ ان میں بھی ان دیکھے صحن ہوتے ہیں، ناقابلِ گزر گلیاں، مبہم موڑ، پریشان کن چوراہے ہوتے ہیں، جو کئی راستے پیش کرتے ہیں۔ ژاں ولژاں اس لمحے اپنی زندگی کے چوراہوں میں سے سب سے خطرناک چوراہے پر کھڑا تھا۔

وہ نیکی اور بدی کے سب سے بڑے چوراہے پر تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے افسردگی کا چوراہا تھا۔ جیسا کہ اس کے ساتھ کئی بار ہوا ہے، ہمیشہ کی طرح، اس موقعے پر بھی اس کے سامنے دو راستے تھے، ایک راستہ پُرکشش تھا، دوسرا ڈراؤنا تھا۔

اسے کون سا راستہ اختیار کرنا تھا؟

اس پُراسرار انگشتِ شہادت نے اس راستے پر چلنے کا اشارہ کیا جو ہمیشہ اس وقت نظر آتا ہے جب ہم اپنی نظریں اندھیرے پر گاڑے ہوتے ہیں۔

ایک بار پھر ژاں ولژاں کو ایک خوف ناک پھاٹک، اور ایک متبسم جال کے درمیان انتخاب کرنا تھا۔ تو کیا یہ سچ ہے؟ کہ نفس بچ سکتا ہے مگر مقدر نہیں۔ لا علاج مقسوم! بہت خوف ناک بات!

یہ تھا مسئلہ جو اسے درپیش تھا:

ژاں ولژاں کو کوزیٹ اور ماریوس کے خوشیوں کے حوالے سے کیا کرنا چاہیے تھا؟ وہی تو تھا جو اُن کی خوشی چاہتا تھا اور اس نے اس کو ممکن بنایا تھا؛ اس نے خود کو اپنی آنتوں میں دفن کر دیا تھا، اور اس وقت جب وہ اس پر غور کر رہا تھا، وہ اس قسم کے اطمینان سے لُطف اندوز ہو رہا تھا جو ایک زرہ ساز کو محسوس ہوتا ہے، اور جس کا اسے اس وقت تجربہ ہوتا ہے جب وہ اپنے سینے میں لگا چاقو نکالتا ہے اور اس کے پھل پر اسے اپنے ہی کارخانے کا نشان نظر آ جاتا ہے۔

کوزیٹ کو ماریوس، اور ماریوس کو کوزیٹ مل گئی تھی۔ ان کے پاس ہر شے تھی، دولت

بھی تھی۔ اور یہ سب اسی کا کیا ہوا تھا۔

مگر اس خوشی کے بارے میں ژاں ولژاں کیا کرے، جو انھیں مل گئی تھی، اور اس وقت موجود تھی؟ کیا وہ خود کو اس خوشی پر حاوی کر دے؟ کیا وہ اس خوشی کو اپنی خوشی سمجھے؟ بلا شبہ، کوزیٹ کسی اور کی ہو گئی ہے؛ مگر کیا وہ، ژاں ولژاں، اسے جس قدر اپنا سکتا ہے، اپنا لے؟ کیا وہ اس قسم کا باپ بنا رہے، جو نصف نظر آتا ہے مگر اس کا پورا احترام کیا جاتا ہے، جیسا کہ وہ آج تک رہا ہے؟ کیا وہ ایک لفظ بھی کہے بغیر اپنے ماضی کو حال میں لے آئے؟ کیا وہ وہاں اس طرح موجود ہو جیسا اس کا حق ہے، اور روشن آتش دان کے کنارے خاموش بیٹھا رہے؟ کیا اسے، مسکراتے ہوئے، ان معصوم ہاتھوں کو اپنے الم ناک ہاتھوں میں لے لینا چاہیے؟ کیا اسے بلیر نورما کے ملاقاتی کمرے کی پُرسکون آڑ پر اپنے وہ پاؤں رکھ دینے چاہئیں، جو اس کے پیچھے قانون کی بے عزت پرچھائیں گھسیٹ لائے تھے؟ کیا وہ کوزیٹ اور ماریوں کی تقدیر میں حصے دار بن جائے؟ کیا وہ اپنے مقدر کی گم نامی اور دھند کو ان پر اور گہرا کر دے؟ کیا وہ اپنی مصیبت کو، تیسرے شریک کی طرح، ان کی مسرتوں میں شامل کر دے؟ المختصر، کیا اسے ان دو خوش و خرم انسانوں کے درمیان ایک پُر اسرار گونگے مقدر کا کردار ادا کرنا چاہیے؟

شاید ہم انجام اور اس سے مقابلے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ جب ہمارے سامنے اپنی تمام تر برہنگی کے ساتھ کچھ سوالات کھڑے ہو جائیں تو ہم میں آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔ اسی بے رحم نقطۂ استفسار کے عقب میں نیکی یا بدی ہوتی ہے، اور ابوالہول ہم سے سوال کرتا ہے کہ تم اب کیا کرو گے؟

ژاں ولژاں ایسے تجربے کا عادی تھا۔ اس نے ابوالہول کو غور سے دیکھا۔

اس نے اس بے رحم مسئلے پر ہر پہلو سے نظر کی۔

کوزیٹ کا دل ربا وجود اس کے تباہ شدہ جہاز کی جان بچانے والی کشتی تھی۔ اسے کیا کرنا تھا؟ اسے مضبوطی سے پکڑ لینا، یا اس کی گرفت چھوڑ دینا؟

اگر اس کشتی سے چمٹا رہا تو وہ تباہی سے بچ جائے گا، اور ایک بار پھر اسے سورج کی روشنی نصیب ہوگی؛ اسے اپنے لباس اور بالوں سے تلخ پانی کو گر جانے دینا چاہیے؛ وہ بچ گیا تھا، سو اسے زندہ رہنا چاہیے۔

اور اگر اس نے کشتی کو جانے دیا تو؟

پاتال ہی پاتال ہوگا!

اس طرح اس نے اپنے خیالات سے مشورہ کیا یا دوسرے معنوں میں، وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا؛ اب وہ اپنے اندرون کو ٹھوکریں مار رہا تھا، کبھی اپنی خواہش کے خلاف، کبھی اپنے یقین کے خلاف۔

ژاں ولژاں کی خوش قسمتی کہ وہ رو سکا تھا۔ اس سے اس کا جی ہلکا ہو گیا۔ مگر ابتدا بڑی ظالمانہ تھی۔ یہ آندھی، اس آندھی سے زیادہ غضب ناک تھی جس نے پہلے اسے Arras تک دھکیل دیا تھا؛ اب پھر اس کے اندرون میں چل پڑی تھی۔ ماضی اس کے حال پر چڑھائی کر رہا تھا؛ اس نے دونوں کا موازنہ کیا اور سسکیاں لیں۔ آنسوؤں کی خاموشی ایک بار ٹوٹ جائے تو مایوس انسان پہلو بدلنے لگتا ہے۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ جلد ہی ہمت ہار گیا ہے۔

افسوس! کہ جب ہم اپنی انانیت اور اپنے فرض کے درمیان اس طرح قدم بہ قدم پسپا ہوتے ہیں، گم راہ ہوتے ہیں، غصہ کرتے ہیں، شکست کھانے پر برانگیختہ ہوتے ہیں، اصول پر بحث کرتے ہیں، اڑان کی امید رکھتے ہیں، فرار تلاش کرتے ہیں تو ہماری عقبی دیوار کی بنیاد کیسی نامبارک اور اجا یک مزاحمت کرتی ہے۔

مقدس سایے کو محسوس کرنا پڑتا ہے جو آڑ بن جاتا ہے۔

نادیدہ سنگ دل! کیا خوب وہم ہے!

اس کے بعد ضمیر کچھ نہیں کرتا۔ بروٹس! تم فیصلہ کرو؛ Cato، تم فیصلہ کرو۔

اس کی تھاہ نہیں ہوتی، اس لیے کہ یہ خدا ہے۔ کوئی اس کنویں میں اپنی پوری زندگی کی کمائی ڈال دیتا ہے؛ کوئی اپنا سب کچھ ڈال دیتا ہے، کوئی اپنی دولت ڈال دیتا ہے، کوئی اپنی کامیابی ڈال دیتا ہے، کوئی اپنی آبائی سرزمین کی آزادی ڈال دیتا ہے، کوئی اپنی فلاح ڈال دیتا ہے، کوئی اپنا آرام ڈال دیتا ہے، کوئی اپنی خوشی ڈال دیتا ہے وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔ اپنا گل دان خالی کر دو۔ اپنا خاک دان آلٹ دو۔ اب، اپنا دل ڈال کر سب کچھ ختم کر دینا چاہیے۔

قدیم جہنموں کے گہر میں کہیں شراب کی اس قسم کی حوض ہوتی ہے۔

اگر کوئی بالآخر انکار کر دیتا ہے تو کیا وہ قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ کیا ناقابلِ ختم کا کوئی حق ہوتا ہے؟ کیا ایسی زنجیریں نہیں ہوتیں جو انسانی ہمت سے بھی زیادہ لامحدود ہوں؟ کسی شخص اور ژاں ولژاں کو "اتنا کافی ہے" کہنے پر کون ملامت کرے گا؟

اس معاملے کی فرماں برداری کو مزاحمت نے محدود کر دیا ہے؛ کیا نفس کی فرماں

برداری کی کوئی حد نہیں ہوتی؟ اگر دائمی حرکت ممکن نہیں تو کیا دائمی ایثارِ ذات کو درست کیا جائے؟

پہلا قدم کوئی چیز نہیں ہوتا، آخری قدم مشکل ہوتا ہے۔ کوزیت کی شادی کے مقابلے میں شامپ ماٹ ٹو والا معاملہ کیا تھا، اور اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ خالی جگہ میں داخلے کے مقابلے میں گیلیز میں دوبارہ داخلہ کیا ہوتا ہے؟

اوہ، پہلا قدم، اور نیچے کی طرف!

تم کتنے سنجیدہ ہو!

اور دوسرا قدم، تم کتنے بیوقوف آدمی ہو!

اس بار وہ اپنے ذہن میں مڑنے سے کس طرح پرہیز کر سکتا تھا؟

شہادت رفعت ہوتی ہے، تحلیل کر دینے والی رفعت۔ اذیت وہ شے ہے جو تقدیس کرتی ہے۔ پہلے گھنٹے اس کو قبول کیا جا سکتا ہے؛ لو دیتے ہوئے آہنی تخت پر بیٹھا جا سکتا ہے؛ لو دیتا ہوا آہنی تاج سر پر رکھا جا سکتا ہے؛ لو دیتے ہوئے آہنی کرے کو قبول کیا جا سکتا ہے؛ لو دیتا ہوا آہنی عصائے سلطانی لے لیا جاتا ہے، مگر شعلوں کا چغہ پہننا باقی رہتا ہے، اور پھر، جب بدنصیب گوشت بغاوت کر دیتا ہے، اور جب اذیت کے باعث دستبرداری کر دی جاتی ہے، تو یہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آتا۔

آخر کار ژاں ولژاں تھک کر چور ہو گیا۔

اس نے اہمیت کا اندازہ لگایا، سوچا، متبادلات پر غور کیا، پُر اسرار روشنی اور اندھیرے کا پُر اسرار توازن کیا۔

کیا وہ ان دو خوب صورت بچوں پر اپنی گیلیز کی پرچھائیں ڈالے یا خود ہی اپنی ناقابلِ تلافی احاطہ بندی کی تکمیل کرے۔ ایک جانب کوزیت کی قربانی تھی، اور دوسری جانب اس کی اپنی قربانی۔

تو اس کا حل کیا ہے؟ وہ کیا فیصلہ کرے؟

کون سی تجویز اس نے قبول کی تھی؟ انجام کے بارے میں اس کا اپنا اندرونی غیر متزلزل فیصلہ کن ردعمل کیا تھا؟ اس نے کون سا دروازہ کھولنے کا فیصلہ کیا تھا؟ بند کرنے اور مذمت کرنے پر اس نے اپنی زندگی کے کون سے پہلو کی تحلیل کی تھی؟ ان تمام ناقابلِ پیمائش چٹانوں میں سے، جو اسے گھیرے ہوئے تھیں، کون سی چٹان اس کا انتخاب تھی؟ کون سی انتہا اس نے قبول کی تھی؟ خلیجوں میں سے کس خلیج پر اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا تھا؟

اس کا چکرا دینے والا استغراق ساری رات جاری رہا۔

وہ دن نکلنے تک وہیں رہا، اسی انداز میں، بستر پر دہرا جھکا، مقسوم کی سنگینی تلے مغلوب، کچلا، اتفاقیہ، افسوس میں! مٹھیاں بند کیے، چلیپائی انداز میں بازو پھیلائے، اس آدمی کی طرح جسے مصلوب کیا گیا تھا اور جس کی کیلیں نکال دی گئی ہوں اور وہ اوندھا زمین پر پڑا ہو۔ وہاں وہ بارہ گھنٹے تک رہا، سردی کے موسم کی برف جیسی رات کے بارہ گھنٹے ایک بار بھی سر اٹھائے بغیر، اور ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر پڑا رہا۔ وہ میّت کی طرح بے حرکت تھا، جب کہ اس کے کچھڑ میں کسے خیالات، سو سروں والے سانپ کی طرح تھے، اور وہ خود عقاب کی طرح تھا۔ کوئی بھی جو اسے اس طرح بے حرکت دیکھتا تو اس کی موت کا اعلان کر دیتا؛ پھر اچانک تشنجی کیفیت میں وہ تھر تھرایا، اور اس کے لب، کوزیٹ کے لباس سے چپٹے اسے دیوانہ وار چوم رہے تھے؛ تب اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

کون یہ سب دیکھ سکتا تھا؟ اس لیے کہ ژاں ولژاں وہاں اکیلا تھا؛ دوسرا کوئی وہاں نہیں تھا۔

وہ جو پرچھائیوں میں چھپا ہے۔

۞

ساتواں دائرہ اور آٹھویں جنّت

شادی کے بعد کے دن تنہائی کے دن ہوتے ہیں۔ لوگ خوش قسمت جوڑے کے استغراق کا احترام کرتے ہیں، کسی حد تک ان کی کاہلی کا بھی اور نیند کا بھی۔ ملاقاتوں کی ہلچل اور مبارک بادیں بعد میں شروع ہوتی ہیں۔ فروری کی سترہ تاریخ کی صبح تقریباً دوپہر کا وقت تھا جب باسک رومال اور پروں سے بنا صفائی کا جھاڑن بغل میں دبائے پیش دالان ٹھیک کر رہا تھا کہ اسے دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ گھنٹی نہیں بجائی گئی تھی، کہ ایسے دن احتیاط کی جاتی ہے۔ باسک نے دروازہ کھولا اور اسے موسیو ژ شلوون نظر آیا۔ وہ موسیو کو ملاقات کے کمرے میں لے گیا۔ ژاں ولژاں گزری شام کی خوشیوں کے بعد ایسا زیر بار اور بد نظم نظر آرہا تھا گویا کسی میدانِ جنگ سے آرہا ہو۔

"جناب! آج ہم سب دیر سے اٹھے ہیں۔" باسک نے کہا۔

"کیا تمھارے صاحب اٹھ گئے ہیں؟" ژاں ولژاں نے پوچھا۔

"موسیو کا بازو اب کیسا ہے؟" باسک نے جواب میں کہا۔

"بہتر ہے۔ کیا تمھارے صاحب اٹھ گئے ہیں؟"

"کون سے صاحب؟ پرانے یا نئے والے؟"

"موسیو پوں مرسی؟"

"موسیو بیرن!" باسک نے اٹھتے ہوئے کہا۔

زیادہ تر ملازمین کے لیے ہر مالک بیرن ہوتا ہے۔ وہ ان پر ہی انحصار کرتا ہے؛ وہی ملازمین جنھیں ایک فلسفی نے "bespattered with the title" کہا تھا۔ اس طرح وہ

اپنے مالک کی چاپلوسی کرتے ہیں۔ ماریوس جو کبھی ایک شدت پسند ریپبلکن تھا، جیسا کہ اس نے ثابت کیا تھا، اب اپنے آپ بیرن بن گیا تھا۔ اس خطاب کے سلسلے میں اس خاندان میں ایک چھوٹا سا انقلاب آ گیا تھا۔ موسیو ژلیر نورما اس خطاب سے چمٹ گیا تھا، اور ماریوس نے خود کو اس سے الگ کر لیا تھا، مگر کرنل پوں مرسی نے [اپنی وصیت میں] لکھا تھا، "میرا بیٹا میرے خطاب کا حق دار ہوگا۔" ماریوس نے فرماں برداری کی۔ اور کوزیٹ، جس میں عورت طلوع ہو رہی تھی، بیرونس بن جانے سے بہت خوش تھی۔

"موسیو لی بیرن؟" باسک نے دہرایا، "میں جا کر دیکھتا ہوں۔ میں انھیں بتا دوں گا کہ موسیو فوشلواں آئے ہیں۔"

"نہیں۔ انھیں بتانا نہیں کہ میں آیا ہوں۔ کہنا کہ کوئی شخص ہے جو ان سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے؛ میرا نام مت لینا۔"

"اوہ" باسک کے منہ سے نکل گیا۔

"میں انھیں حیران کرنا چاہتا ہوں۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

"اوہ!"

باسک کے منہ سے دوبارہ "اوہ!" نکل گیا تھا، جو پہلے "اوہ" کی تشریح کر رہا تھا۔

اور پھر وہ کمرے سے چلا گیا۔

ژاں ولژاں اکیلا رہ گیا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، ملاقات کا کمرہ بے ترتیبی کے عالم میں تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کسی دم شادی کی بے معنی آوازیں سنائی دینے لگیں گی۔ چمکتے ہوئے فرش پر طرح طرح کے پھول بکھرے تھے جو ہاروں اور سرپوشوں سے گرے تھے۔ موم بتیاں جل کر ٹھنٹھ بن چکی تھیں، موم بتیوں کی پگھلی موم سے فانوسوں میں جھالریں بن گئی تھی۔ فرنیچر کا ہر ٹکڑا اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا؛ تین یا چار آرام کرسیاں ایک ساتھ دائرے نما انداز میں اس طرح رکھی ہوئی تھیں جیسے ان پر بیٹھے لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ پورا ماحول خوش گوار لگ رہا تھا۔ اجڑے ہوئے جشن کے آثار کے اطراف ایک خاص قسم کا وقار تھا۔ اچھا وقت گزرا تھا۔ ان بے ترتیب کرسیوں پر، ان مرجھاتے پھولوں پر، ان بجھی شمعوں کے نیچے لوگوں نے خوشیوں کے بارے میں سوچا ہوگا۔ سورج کی کرن فانوس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی، اور اس کا عکس ملاقات کے کمرے تک پہنچ گیا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ ژاں ولژاں اسی جگہ ساکت کھڑا رہا باسک جہاں اسے چھوڑ گیا

تھا۔ اس کا چہرہ بے نور ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں اور بے خوابی کے باعث اس کے کاسۂ سر میں اس طرح دھنس گئی تھیں کہ اپنے مدار میں تقریباً غائب ہو جانے والی ہوں۔ اس کا سیاہ کوٹ شکنوں سے بھرا تھا جیسے ساری رات اس کی آنکھوں میں گئی ہو۔ اس کی کہنیاں کپڑے کے گھس جانے سے سفید ہو رہی تھیں۔

ژاں ولژاں اپنے پیروں کے قریب بنے کھڑکی کے خاکے کو گھور رہا تھا جو سورج کی اندر آتی کرنوں سے فرش پر بن گیا تھا۔ اور پھر دروازے کے قریب سے آواز آئی اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ ماریوس کمرے میں داخل ہوا، اس کا سر پوری طرح بلند تھا، اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا، چہرے پر ایک ناقابلِ بیان چمک تھی، اس کی پیشانی کشادہ تھی، اس کی آنکھیں فاتحانہ انداز لیے ہوئے تھیں۔ وہ بھی سویا نہیں تھا۔

"ارے یہ آپ ہیں فادر!" اس نے ژاں ولژاں کو دیکھتے ہی حیرانی کے انداز میں کہا۔ "یہ احمقوں کا احمق باسک! عجیب پُراسرار آدمی ہے، مگر آپ بہت سویرے آگئے ہیں۔ ابھی صرف بارہ بجے ہیں۔ کوزیٹ سو رہی ہے۔"

ماریوس کا موسیو فوشلوں سے کہا ہوا لفظ "فادر" معنی خیز تھا: بلند و برتر مسرت کا باعث ہوا۔ جیسا کہ قاری کو علم ہے ایک اونچی دیوار، ایک سرد مہری، ایک مجبوری سی تھی دونوں کے درمیان؛ برف تھی جس کو توڑنا یا پگھلانا ضروری تھا۔ جب یہ دیوار نیچی ہوئی، جب یہ برف پگھلی، اور جب موسیو فوشلوں اس کے لیے باپ بنا، جیسا وہ کوزیٹ کے لیے تھا، تو ماریوس پر نشہ سا طاری ہو گیا۔

اس نے بات جاری رکھی؛ جیسا کہ کسی خداداد خوشی کی خصوصیت ہوتی ہے؛ اس کے منہ سے الفاظ نکلے پڑ رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ کاش آپ کو اندازہ ہو سکتا کہ ہم نے آپ کی کمی کتنی محسوس کی تھی۔ صبح بخیر، فادر۔ آپ کا ہاتھ اب کیسا ہے؟ اچھا ہے، ہے نا؟"

اور ان تمام جوابات کے ساتھ، جو اس نے خود اپنے آپ کو دیے تھے، اس نے مزید کہا، ہم دونوں آپ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کوزیٹ آپ کو بہت چاہتی ہے۔ آپ کو بھولنا نہیں چاہیے کہ یہاں آپ کا ایک کمرہ بھی ہے۔ اب l'Homme Arme اسٹریٹ سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اب ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ ایسی بیماروں جیسی، بے رونق اور نامناسب سڑک پر آپ رہ کیسے سکتے ہیں، جس کے ایک سرے پر پشتہ ہے جہاں بہت سردی ہوتی ہے، اور جس میں کوئی آسانی سے داخل نہیں ہو سکتا؟ آپ کو یہاں آنا اور یہیں رہنا ہوگا۔ اور آج ہی، ورنہ

آپ کو کوزیت کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ ہم سب کو ناک سے پکڑ کر راستہ دکھانے والی ہے؛ میں یہ بات تنبیہ کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ یہاں آپ کا اپنا کمرہ ہے؛ ہم سے قریب ہے؛ اس کا دروازہ باغیچے میں کھلتا ہے؛ گھڑی کا پیدا کردہ مسئلہ حل کر لیا گیا ہے؛ بستر لگا دیا گیا ہے، بالکل تیار ہے؛ بس آپ کو قبضہ لینا ہے۔ آپ کے پلنگ کے قریب کوزیت نے ایک بڑی بھاری سی، Utrecht کی ململ سے بنے گدّوں والی آرام کرسی رکھوا دی ہے، اور کرسی سے کہا ہے اس کے لیے اپنے بازو پھیلا دو۔' آپ کی کھڑکیوں کے مقابل، پیڑوں کے جھنڈ میں، ہر بہار کے موسم ایک بلبل آتی ہے۔ دو مہینوں کے اندر آجائے گی۔ اس کا گھونسلا آپ کے بائیں جانب اور ہمارا گھونسلا آپ کی دائیں جانب ہوگا۔ رات کو وہ گایا کرے گی اور دن میں کوزیت بک بک کیا کرے گی۔ آپ کے کمرے کا رُخ جنوب کی طرف ہے۔ کوزیت آپ کی کتابیں آپ کے لیے سلیقے سے رکھوا دے گی، کیپٹن کک اور دوسروں کے سفرنامے — وانکوور کے، اور آپ کا سارا اثاثہ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک چھوٹا سا سفری تھیلا بھی ہے جو آپ کو بہت عزیز ہے۔ میں نے ایک کونا اس کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ آپ نے میرے نانا کو فتح کر لیا ہے؛ آپ ان کے لیے بہت موزوں ہیں۔ ہم ایک ساتھ رہیں گے۔ آپ کو تاش کے پتوں کا کھیل whist کھیلنا آتا ہے؟ اگر آپ whist کھیلتے ہیں تو نانا بے حد خوش ہوں گے۔ ان دنوں، جب میں عدالت میں ہوا کروں گا آپ کوزیت کو چہل قدمی کے لیے لے جایا کریں گے، اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر، جس طرح آپ لگزمبرگ میں کیا کرتے تھے۔ ہم نے حتمی طور پر طے کر لیا ہے کہ ہم خوش رہیں گے۔ اور آپ بھی اس میں شامل ہوں گے۔ سنا آپ نے، فادر؟ آیئے، کیا آپ آج ہمارے ساتھ ناشتا کریں گے؟''

''جناب!'' ژاں ولژاں نے کہا، ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ میں سابق سزا یافتہ آدمی ہوں۔''

قابلِ فہم چیخ کی آوازوں کی حدود کو دماغ کی طرح کان بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ موسیو فوشلووں کے منہ سے نکلے اور ماریوس کے کان میں داخل یہ الفاظ ''میں سابق سزا یافتہ آدمی ہوں۔'' توقع سے آگے نکل گئے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس سے کوئی بات کہی گئی ہے مگر اسے معلوم نہیں ہوا کہ وہ کیا بات تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا؛ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ آدمی جو اس سے مخاطب تھا، خوف زدہ تھا۔ اپنی چکا چوند کیفیت میں پوری طرح غرق ماریوس نے اس وقت تک اس دوسرے آدمی کے چہرے پر چھائی خوف ناک زردی کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ ژاں ولژاں نے اپنے بالا پوش کی گرہ کھولی جو اس کے دائیں ہاتھ کو سہارا دیے تھا، اپنے

انگوٹھا کھولا اور ماریوس کو دکھا دیا۔

"میرے ہاتھ کو کچھ نہیں ہوا۔" اس نے کہا۔

ماریوس نے انگوٹھے پر نظر کی۔

"کچھ نہیں ہوا ہے۔" ژاں ولژاں نے بات جاری رکھی۔ زخم کا نشان بھی نہیں تھا۔ ژاں ولژاں کہتا رہا "مناسب تھا کہ میں آپ کی شادی سے دور رہوں۔ جہاں تک میرے اختیار میں تھا، میں غائب رہا۔ اسی لیے میں نے یہ زخم ایجاد کیا تھا تا کہ میں جعل سازی نہ کر سکوں، کہ میں شادی کی دستاویز میں خامی نہ پیدا کر سکوں، تا کہ میں دستخط کرنے سے بچ سکوں۔"

ماریوس ہکلایا، "اس سے کیا مراد تھی۔"

"اس سے مراد یہ تھی،" ژاں ولژاں نے جواب میں کہا، "کہ میں گیلیز میں [قید] رہ چکا ہوں۔"

"آپ مجھے پاگل کیے دے رہے ہیں۔" ماریوس نے خوف کے عالم میں بلند آواز میں کہا۔

"موسیو پوں مرسی!" ژاں ولژاں نے کہا، "میں انیس برس گیلیز میں تھا۔ چوری کی پاداش میں۔ اس کے بعد ایک اور چوری کے جرم میں تا حیات قید کی سزا ہو گئی، اس لیے کہ وہ میرا دوسرا جرم تھا۔ اس وقت میں نے پابندی توڑ دی ہے۔"

حقیقت کے سامنے ماریوس کا پیچھے ہٹنا، حقیقت سے انکار کرنا، ثبوت کی مزاحمت کرنا بے کار تھا۔ اس نے فہم کو راستہ دیا۔ اس نے سمجھنا شروع کیا، اور جیسا کہ اس قسم کے معاملات میں ہوا کرتا ہے، وہ کچھ زیادہ ہی سمجھ گیا تھا۔ اس کے پورے بدن میں ایک ڈراؤنی اندرونی بصیرت کا لرزہ سا دوڑ گیا تھا؛ ایک خیال جس نے اسے کپکپا دیا تھا اس کے دماغ سے گزر گیا۔ اسے اپنے مستقبل کی بد قسمتی کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔

"کہیے کہیے، سب کچھ کہہ دیجیے۔" اس نے چیخ کر کہا "آپ کوزیٹ کے باپ ہیں!" اور وہ نا قابلِ بیان خوف سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

ژاں ولژاں نے ایسے جاہ و جلال کے انداز میں سر بلند کیا کہ اس کا قد سقف تک بڑھتا محسوس ہوا۔ "ضروری ہے کہ آپ میری بات پر یقین کریں، جناب؛ اگر چہ ہمارا حلف دوسروں کے نزدیک قانونی نہیں ہوگا۔" اس مرحلے پر اس نے توقف کیا، اس کے بعد ایک قسم کے شاہانہ اور مقبرے جیسے اختیار کے ساتھ اس نے دھیرے دھیرے ہاتھ چلاتے، اور لفظ لفظ پر زور دیتے ہوئے اضافہ کیا، "آپ مجھ پر یقین کریں گے؟ میں کوزیٹ کا باپ، خدا کے سامنے، نہیں،

موسیو پیرن پوں مرسی، میں ایک کسان ہوں Faverolles کا۔ میں درختوں کی چھنٹائی کا کام کرتا تھا۔ میرا نام فوشلیوں نہیں، ژاں والژاں ہے۔ میرا کوزیٹ سے کوئی رشتہ نہیں۔ یقین کیجیے۔"

ماریوس نے ہکلاتے ہوئے کہا، "مجھے اس کا ثبوت کون دے گا؟"

"میں! اس لیے کہ میں خود آپ کو بتا رہا ہوں۔"

ماریوس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا۔ وہ افسردہ مگر پُرسکون تھا۔ ایسے سکون سے دروغ نہیں نکل سکتا۔ وہ جو برفیلا ہوتا ہے، مخلص ہوتا ہے۔ مقبرے کی سی ٹھنڈک میں سچائی محسوس کی جا سکتی ہے۔

"مجھے آپ پر یقین ہے۔" ماریوس نے کہا۔

ماریوس نے اپنا سر جھکایا، گویا اس بات کو لکھ رہا ہو، اور گفتگو جاری رکھی:

"کوزیٹ کے لیے میں کیا ہوں؟ محض ایک راہ گیر! دس برس قبل مجھے اس کے وجود کا بھی علم نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ آپ اس بچے سے محبت کرنے لگتے ہیں جسے آپ بچپن سے دیکھ رہے ہوں اور آپ خود بوڑھے ہوں۔ جب کوئی عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو تمام چھوٹے بچوں کے لیے وہ خود کو نانا، دادا محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں میرے اندر کوئی شے ہے جو دل سے مشابہ ہے۔ وہ یتیم تھی بغیر ماں باپ کی تھی؛ اسے میری ضرورت تھی۔ اسی وجہ سے میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ بچے اتنے کم زور ہوتے ہیں کہ پہلا ہی شخص، حتیٰ کہ میرے جیسا آدمی بھی، ان کا محافظ بن سکتا ہے۔ میں نے کوزیٹ کے لیے یہ فرض پورا کردیا ہے۔ میرے خیال میں اتنی معمولی سے چیز کو نیک کام نہیں کہا جا سکتا؛ لیکن اگر یہ نیک عمل ہے تو کہیے کہ یہ میں نے کیا ہے۔ اس معمولی سے عمل کا اندراج کر لیجیے؛ آج کوزیٹ میری زندگی سے نکل رہی ہے؛ ہمارے راستے الگ ہو رہے ہیں۔ آج کے بعد، میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وہ مادام پوں مرسی ہے۔ اس کی عاقبت تبدیل ہو گئی ہے اور اس تبدیلی سے کوزیٹ کو فائدہ ہوا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ جہاں تک چھ لاکھ فرانک کا معاملہ ہے، آپ نے مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر میں آپ کے خیال کی پیش بندی کر رہا ہوں کہ وہ امانت ہیں۔ یہ امانت میرے ہاتھ کس طرح آئی تھی؟ اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں یہ امانت واپس کر رہا ہوں۔ مجھ سے اور کچھ طلب نہیں کیا جا سکتا۔ میں اپنا اصل نام ظاہر کرکے بھلائی کی تکمیل کر رہا ہوں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے، مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔ اس خواہش کی ایک وجہ ہے۔" اور ژاں والژاں نے ماریوس کی طرف غور سے دیکھا۔

ماریوس کا جتنا تجربہ تھا، فتنہ انگیز اور بے ربط تھا۔ ہمارے نفوس میں مقدر کے کچھ جھونکے اس قسم کی لہریں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہم سب ایسے مشکل لمحات سے گزر چکے ہیں جن میں ہمارے اندر کی ہر شے منتشر ہو جاتی ہے؛ جو کچھ ہم پر پہلے گزرتی ہم کہہ دیتے ہیں، جو ہمیشہ وہ نہیں ہوتی جسے کہا جانا چاہیے۔ اچانک ایسے انکشافات ہوتے ہیں جو برداشت نہیں کیے جا سکتے، اور جو تباہ کن وائن کی طرح بدمست کر دیتے ہیں۔ ماریوس کو اس انوکھی حالت نے مدہوش کر دیا تھا جو از خود اس کے سامنے آ گئی تھی، اس حد تک کہ وہ اس آدمی سے مخاطب ہو گیا تھا اور اس کے اس اعتراف پر ناراض بھی تھا۔

"مگر کیوں۔" اس نے بلند آواز میں کہا، "آپ مجھے یہ سب بتا رہے ہیں؟ کون آپ کو مجبور کر رہا ہے؟ آپ اپنے راز اپنے آپ تک محدود رکھ سکتے تھے۔ نہ آپ کی مذمت کی جا رہی ہے، نہ آپ کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ آپ بغیر کسی جبر کے یہ انکشاف کر رہے ہیں۔ انجام! کچھ اور بھی ہے؟ آپ یہ اعتراف کس سلسلے میں کر رہے ہیں؟ آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"میرا مقصد؟" ژاں ولژاں نے اتنے دھیمے اور بے روح لہجے میں جواب دیا کہ وہ ماریوس کے بجائے خود سے سرگوشی کرتا محسوس ہو رہا تھا، "کس مقصد کے تحت اس سزا یافتہ نے ابھی کہا تھا کہ 'میں سزا یافتہ شخص ہوں؟' اچھا جی ہاں! مقصد حیرت انگیز ہے۔ یہ صرف ایمان داری کے باعث ہے۔ ٹھہریے، بد قسمتی سے نکتہ یہ ہے کہ میرے دل میں ایک دھاگا ہے جو مجھے متحرک رکھتا ہے۔ جب ہم بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بالخصوص یہ دھاگا زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ پوری زندگی ہمارے اطراف تباہی ہوتی ہے؛ ہم مزاحمت کرتے ہیں؛ اگر ہم دھاگا نکال سکتے، توڑ سکتے، اس کی گرہ کھول سکتے یا اس سے دور ہونے کے لیے اسے کاٹ سکتے ہیں تو ہم محفوظ ہو جاتے۔ مجھے صرف دور ہونا تھا؛ Bouloy اسٹریٹ میں جاں فشانی کی جا رہی ہے؛ آپ مطمئن ہیں؛ میں جا رہا ہوں۔ میں نے بھی وہ دھاگا توڑنے کی کوشش کی ہے، اسے جھٹکا دیا ہے، مگر یہ ٹوٹا نہیں، اس کے ساتھ میں نے اپنا دل بھی توڑ دیا ہے۔ وہ وقت میں نے کہا تھا کہ 'میں یہاں کے سوا کہیں اور رہ نہیں سکتا۔' مجھے رہنا چاہیے۔ جی ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں بیوقوف ہوں، کیوں نہ یہیں رہ جاؤں؟ آپ اس گھر میں مجھے ایک کمرہ فراہم کر رہے ہیں؛ مادام پوں مرسی مجھ سے قربت رکھتی ہیں، انھوں نے کرسی سے کہا تھا نا کہ 'اس کے لیے اپنے بازو پھیلا دو؛' آپ کے نانا بھی مجھے رکھنا چاہ رہے ہیں، ان کے لیے بہت موزوں شخص ہوں؛ ہم ایک ساتھ رہیں گے، ایک ساتھ کھانا کھایا کریں گے، میں کوزیت کو اپنے بازو کا سہارا بھی دوں گا — موسیو پوں مرسی!

معاف کیجیے گا، مجھے ایک چھت کے نیچے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے، ہمارے سر پر ایک ہی چھت ہو گی، ایک میز ہو گی، ایک آتش دان ہو گا، سرما کے موسم میں وہی چمنی کا کونا ہو گا، گرما کے موسم میں وہی گلگشت ہو گا، یہی خوشیاں ہوں گی، یہی سب کچھ ہے، ہم ایک خاندان کی طرح رہیں گے۔ ایک خاندان کی طرح۔"

اس لفظ پر پہنچتے ہی ژاں والژاں اچانک بے لگام ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ باندھے۔ اپنے پیروں کے نیچے فرش پر نظریں جمائیں جیسے اس نے زمین کھود کر کوئی غار بنایا ہو، اور اس کی آواز نے اچانک گھن گرج کا لہجہ اختیار کر لیا:

"ایک خاندان کی طرح! ہرگز نہیں۔ میرا کوئی خاندان نہیں۔ میں آپ کے خاندان سے بھی نہیں ہوں۔ میرا آدمیوں کے کسی خاندان سے تعلق نہیں۔ ان گھروں میں جہاں لوگ اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں، میں فاضل آدمی ہوتا ہوں۔ ان میں خاندان رہتے ہیں، مگر میری قسم کے نہیں۔ میں بدقسمت مصیبت زدہ آدمی ہوں؛ میں باہر کر دیا جاتا ہوں۔ کیا میرے ماں باپ تھے؟ مجھے اس بات پر بھی شبہ ہے۔ اس دن جب میں نے اس بچی کی شادی کی تھی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے خوش دیکھا ہے، اور یہ بھی کہ وہ ایسے آدمی کے پاس ہے جس سے وہ محبت کرتی ہے، اور یہ بھی کہ وہاں ایک قسم کا بوڑھا آدمی بھی رہتا ہے' وہ دو فرشتوں کا گھرانا ہے، اور اس گھر میں تمام خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، اور میں نے خود سے کہا تھا 'تم اس میں داخل نہ ہونا۔' میں جھوٹ بول سکتا تھا؛ یہ سچ ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو دھوکا دیا ہے، اور میں موسیو فوشلوواں بنا رہا۔ جو کچھ کوزیٹ سے متعلق تھا میں اس میں جھوٹ بول سکتا تھا؛ مگر اب میرا اپنا معاملہ ہے، مجھے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ میرے لیے پُرسکون رہنا کافی تھا، یہ سچ ہے، اور یہ بھی کہ سب کچھ ٹھیک چلتا رہتا۔ آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے، کہ مجھے کس بات نے بولنے پر مجبور کیا ہے؟ ایک بہت بڑی شے نے؛ میرے ضمیر نے۔ میرے لیے خاموش رہنا بہت آسان تھا۔ میں پوری رات خود کو اس بات پر تیار کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں؛ آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے، اور جو کچھ میں نے جواب میں کہا ہے وہ اس قدر غیر معمولی ہے کہ آپ کو سوال کرنے کا حق ہے؛ جی ہاں! میں نے خود کو الزام دینے میں پوری رات گزاری ہے، اور میں نے خود کو بہت اچھی وجوہ بھی پیش کی ہیں؛ جو کچھ میں کر سکتا تھا میں نے کیا۔ مگر دو چیزیں ہیں، میں جن میں کامیاب نہیں ہوا ہوں؛ وہ دھاگا توڑنے میں جو مجھے باندھے ہوئے ہے جس نے میرے دل کو کیل سے گاڑ دیا ہے، اور اس پر مہر لگا دی ہے یا اس کو خاموش کر دیا ہے جو مجھ سے مہربان لہجے میں بات

کرتا ہے جب میں تنہا ہوتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صبح میں یہاں آیا ہوں آپ کو تقریباً سب
کچھ بتانے کے لیے۔ ہر بات یا تقریباً سب کچھ۔ جو باتیں صرف مجھ سے متعلق ہیں آپ کو بتانا
فضول ہے؛ وہ سب میں اپنے تک ہی رکھوں گا۔ اب آپ کو سارے ضروری نکات معلوم ہو چکے
ہیں۔ سو اب میں اپنے راز آپ تک لایا ہوں۔ میں نے اپنا راز آپ کی آنکھوں کے سامنے اُگل
دیا ہے۔ یہ قدم اٹھانا میرے لیے آسان نہیں تھا۔ میں نے پوری رات کوشش کی تھی۔ اوہ، آپ
سوچ رہے ہوں گے کہ میں خود کو نہیں بتایا کہ یہ شاہ پ مات تو والا معاملہ نہیں تھا؛ کہ اپنا نام چھپا
کر میں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے؛ کہ فوشلووں نام خود فوشلووں نے دیا تھا ایک خدمت
کے عوض جو میں نے کی تھی؛ کہ میں اس نام کو یقین کے ساتھ رکھ سکتا تھا؛ اور یہ بھی کہ میں اس
کمرے میں خوش رہوں گا جو آپ مجھے فراہم کر رہے ہیں؛ کہ میں کسی کے راستے میں نہیں آؤں
گا؛ کہ اپنے چھوٹے سے کونے ہی میں رہوں گا؛ اور یہ بھی کہ جب تک کوزیت آپ کے پاس
رہے گی مجھے احساس ہوگا میں اس کے ساتھ اسی مکان میں ہوں گا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی خوشی کا
حصہ ملے گا۔ اگر میں موسیو فوشلووں ہی رہتا تو سب کچھ ٹھیک رہتا؛ جی ہاں! سوائے میرے نفس
کے۔ میری بیرونی سطح پر ہر طرف مسرت ہی مسرت ہوتی، مگر میرا پیندا سیاہ رہ جاتا۔ خوش رہنا ہی
کافی نہیں ہوتا۔ انسان کو مطمئن بھی ہونا چاہیے۔ ورنہ میں موسیو فوشلووں ہی رہتا؛ ورنہ میں اپنی
اصل صورت چھپا لیتا؛ ورنہ آپ کی موجودگی میں میرے سامنے کوئی معما ہوتا؛ ورنہ آپ کی پوری
دوپہر مجھ پر چھائیاں ہوتیں؛ ورنہ 'دُم چھلا' کہے بغیر میں نے آپ کے آتش دان میں کیفیر
متعارف کرادی ہوتیں، میں آپ کی میز پر بیٹھ گیا ہوتا یہ سوچے بغیر کہ اگر آپ کو معلوم ہو جاتا کہ
میں کون ہوں، تو آپ مجھے نکال دیتے، گھریلو ملازمین میری خدمت گاری کرتے اور اگر انھیں معلوم
ہو گیا ہوتا [کہ میں کون ہوں] تو وہ کہتے: 'کتنی خوف ناک بات ہے۔' میری کہنی آپ کے جسم
سے لگ گئی ہوتی، جسے ناپسند کرنا آپ کا حق ہے، میں نے آپ کے ہاتھوں کے کنڈل جما لیے
ہوتے۔ آپ کے گھر میں معزز سفید زلفوں اور رنگی ہوئی زلفوں کے درمیان تقسیم موجود ہوتی؛ آپ
کے نہایت نجی اوقات میں جب سارے دل اپنے آپ کو دوسروں کے لیے اپنی تمام گہرائیوں کے
ساتھ کھول دیتے ہیں، جب ہم چار ایک ساتھ ہوتے، آپ کے نانا جان، آپ دو اور میں ایک
اجنبی موجود ہوتا! میں آپ کے وجود میں پہلو بہ پہلو صرف اس خیال سے موجود ہوتا کہ میرا خوف
ناک گڑھا بے ترتیب نہ ہو جائے۔ اس طرح میں، ایک مرا ہوا آدمی، اپنے آپ کو آپ زندہ
لوگوں میں ٹھونس دیتا۔ میں اس لڑکی کو ہمیشہ کے لیے اپنے لیے قید کر سکتا تھا۔ آپ اور کوزیت اور

میں، متیوں کے سر سبز ٹوپیوں میں ہوتے! کیا یہ بات آپ کو لرزہ نہیں رہی ہے؟ میں سب سے زیادہ کچلا ہوا آدمی ہوں؛ مجھے سب سے خوفناک دیو جیسا آدمی ہونا چاہیے تھا۔ اور ہر روز میں جرم کرتا رہتا، اور میرے وجود کے چہرے پر ہر روز وہی سیاہی ہوتی۔ ہر روز! اور ہر روز میں اپنی سیاہی میں آپ کے، اپنے عزیز ترین بچوں کو، اپنی معصوم مخلوقات کو شریک کرتا! کیا اپنے لیے خود کو پُرسکون رکھنا بڑی بات نہیں ہوتی؟ کیا خاموشی اختیار کرنا آسان بات ہوتی ہے؟ جی نہیں! یہ آسان بات نہیں ہوتی۔ ایسی خاموشی بھی ہوتی ہے جو جھوٹ بولتی ہے۔ اور میں نے اپنا جھوٹ، اپنا دھوکا، اور اپنی ذلت، اور اپنی بزدلی اور اپنی غداری، اور اپنا جرم قطرہ قطرہ نگل لیا ہوتا، میں نے اسے تھوک کر نکال دیا ہوتا، اور ایک بار پھر اسے چاٹ لیا ہوتا! اور میں نے آدھی رات تک اسے ختم کر دیا ہوتا اور دوسرے دن دوپہر کے وقت دوبارہ شروع کر دیا ہوتا، اور میرا 'سلامِ صبح' جھوٹ بولتا، اور میرا 'سلامِ شب' جھوٹ بولتا، اور میں اس پر سو گیا ہوتا؛ میں نے روٹی کے ساتھ اسے کھا لیا ہوتا؛ اور میں نے کوزیت کی جانب گھور کر دیکھا ہوتا، اور میں نے فرشتہ صفت تبسم کا بدنام فرشتہ صفت تبسم سے جواب دیا ہوتا؛ اور میں قابلِ نفرت ولن ہو جاتا۔ میں نے یہ سب کیوں کیا ہوتا؟ تا کہ میں خوش رہوں۔ صرف اپنی خوشی کے لیے۔ کیا مجھے خوش رہنے کا حق ہے؟ جناب والا! میں [آپ کی] زندگی سے باہر جا رہا ہوں۔"

ژاں ولژاں رُکا۔ ماریوس نے سُنا۔ خیالات کی ایسی زنجیروں اور دُکھوں کا سلسلہ توڑا نہیں جا سکتا۔ ژاں ولژاں نے ایک بار پھر اپنی آواز دھیمی کر لی، مگر اب یہ آواز کم زور نہیں تھی—یہ نامبارک آواز تھی۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ میں کیوں بول رہا ہوں؟ آپ کہتے ہیں کہ نہ میری مذمت کی گئی ہے، نہ میرا پیچھا کیا گیا ہے، نہ مجھے تلاش کیا گیا۔ ہاں، میں مذمت شدہ ہوں۔ ہاں! میں تلاش کیا گیا ہوں، مگر کس نے تلاش کیا ہے؟ خود میں نے۔ وہ خود میں ہوں جو اپنا راستہ روک رہا ہوں، خود میں اپنے آپ کو گھسیٹ رہا ہوں، اور میں خود کو دھکیل بھی رہا ہوں، اور میں خود کو گرفتار کر رہا ہوں، اور میں خود کو سزا دے رہا ہوں؛ اور جب کوئی اپنے آپ کو گرفت میں لیتا ہے تو وہ مضبوط گرفت میں ہوتا ہے۔" اور پھر اس نے اپنے کوٹ کو گریبان سے پکڑ کر ماریوس کے سامنے پیش کیا، "آپ اس مٹھی کو دیکھ رہے ہیں؟" اور وہ کہتا رہا، "کیا یہ مٹھی اس کالر کو اس طرح پکڑے ہوئے نہیں ہے کہ یہ آزاد نہیں ہو سکتا؟ جی ہاں، ایک اور بھی مٹھی ہے جسے ضمیر کہتے ہیں۔ اگر کسی کو خوش رہنا ہے جناب، تو اسے کبھی اپنے فرض کو سمجھنا نہیں چاہیے؛ اس لیے کہ جوں ہی وہ

اسے سمجھ لے گا، تو اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ کے سمجھ جانے پر آپ کو سزا مل رہی ہے؛ مگر نہیں، یہ سزا نہیں ہوتی، یہ انعام ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ آپ کو جہنم میں ڈالتا ہے، جہاں آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا آپ کے قریب ہے۔ جوں ہی کوئی خود اپنی آنتوں کو چیر دیتا ہے، اسے سکون مل جاتا ہے۔"

اور چیخنے والے لہجے میں، اس نے مزید کہا:

"موسیو یوں مریں میں ایمان دار آدمی ہوں۔ میں آپ کی نظروں میں خود کو ذلیل کر کے خود کو بلند کر رہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکا ہے، مگر اس وقت یہ کم دردناک تھا؛ وہ ایک معمولی سی بات تھی۔ جی ہاں، ایک ایمان دار آدمی؛ مگر مجھے ایسا نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ میری غلطی کی وجہ سے آپ مجھے احترام دیتے رہے ہیں؛ اب آپ مجھ سے نفرت کر رہے ہیں، کہ میں ایسا ہوں۔ میرے سر پر مقدر کی تلوار لٹک رہی ہے، اس لیے کہ میں نے ہمیشہ نامعقول مروّت کی ہے؛ وہ مروّت مجھے ذلیل کر رہی ہے اور مجھے اندر سے کچل رہی ہے؛ تاکہ میں خود اپنا احترام کر سکوں، ضروری ہے کہ مجھ سے نفرت کی جائے؛ تب میں ایک بار پھر خود سیدھا ہو جاؤں گا۔ میں گیلیو کا غلام ہوں، وہ جو اپنے ضمیر کی غلامی کرتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے، مگر آپ اس بارے میں مجھ سے کیا کرانا چاہتے ہیں؟ یہ سچ ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کچھ وعدے کیے ہیں؛ میں ان کو پورا کر رہا ہوں۔ کچھ مقابلے ہیں جو ہمیں جکڑے ہوئے ہیں؛ ایسے اتفاقات بھی ہیں جو ہمیں فرائض میں شامل رکھتے ہیں۔ موسیو یوں مریں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری زندگی کے دوران میرے ساتھ بہت کچھ ہوا ہے۔"

ژاں ولژاں نے ایک بار پھر توقف کیا، اپنی بہتی ہوئی رال نگلی اس طرح جیسے اس کے الفاظ نے اس کا منہ تلخی سے بھر دیا ہو، اور اس نے پھر بولنا شروع کیا:

"جب کسی شخص پر اس قسم کا خوف طاری ہو تو اسے یہ حق نہیں ہوتا کہ دوسروں کو اس میں شامل کر لے؛ کسی کو اس بات کا حق نہیں ہوتا کہ دوسروں کو دکھائے بغیر، اس کی اپنی چٹان پر پھسلا دیا جائے؛ کسی کو یہ حق نہیں ہوتا کہ اس کا سرخ بلاؤز کسی اور کو پہنا دیا جائے؛ کسی کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ چالاکی سے اپنے دُکھوں کے بوجھ کو دوسروں کی خوشیوں پر ڈال دے۔ وہ جو صحت مند ہیں ان کی طرف جانا اور اندھیرے میں ان کو اپنا ناسور منتقل کر دینا خوف ناک بات ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ فوشلوں نے مجھے اپنا نام دیا تھا، مجھے اسے استعمال کرنے کا حق نہیں؛ وہ مجھے دے سکتا ہے مگر اسے لے نہیں سکتا تھا۔ ۔۔۔ بھی ایک نام ہوتا ہے؛ آپ دیکھ

رہے ہوں گے کہ اگرچہ میں دیہاتی ہوں، میں نے بھی تھوڑا بہت پڑھا ہے، اور آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ میں اپنی بات قرینے سے پیش کرسکتا ہوں۔ میں باتیں سمجھتا ہوں۔ میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ ہاں، کسی نام کو مختصر کرنا، اور کسی کو اس کے تحت رکھنا بے ایمانی کی بات ہے۔ بٹوے یا گھڑی کی طرح حروف بھی چرائے جا سکتے ہیں۔ گوشت پوست میں جھوٹی علامت ہونا، کچھ حاصل کرنے کے لیے غلط بات کرنا، تالے توڑ کر ایمان دار لوگوں کے گھر میں داخل ہونا، کبھی سیدھا صاف نظر نہ آنا، ہمیشہ شبہات پر نظر رکھنا، _I_ میں ہوتے ہوئے رسوا ہونا؛ نہیں، نہیں! نہیں! نہیں! بہتر ہے کہ دکھ اٹھا لیے جائیں، اپنا خون بہا دیا جائے، رولیا جائے، کسی ناخن سے اپنی کھال اتروا لی جائے، اذیت میں پہلو بدلتے راتیں گزار دی جائیں، اپنے آپ کو جسم اور روح سمیت پیش کر دیا جائے۔ یہی ہے وہ سب کچھ، جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ازخود آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

اس نے ایک دردناک سانس لی، اور آخری بات کہہ ڈالی:

"ماضی میں زندہ رہنے کے لیے میں نے ڈبل روٹی چرائی تھی؛ آج زندہ رہنے کے لیے میں نام نہیں چراؤں گا۔"

"زندہ رہنے کے لیے؟" ماریوس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "آپ کو زندہ رہنے کے لیے اس نام کی ضرورت نہیں؟"

"اوہ، میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔" ژاں ولژاں نے کئی بار سر اٹھاتے جھکاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دونوں نے سکون کا سانس لیا، دونوں نے خیالات کی خلیج میں چھلانگ لگائی۔ ماریوس ایک میز کے قریب اپنی انگلیوں پر اپنے منہ کا ایک کونا ٹکائے بیٹھا تھا۔ ژاں ولژاں آگے پیچھے چہل قدمی کر رہا تھا۔ آئینے کے سامنے رُکا اور بے حرکت کھڑا رہا۔ اس کے بعد، آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے، گویا وہ کسی قسم کی اندرونی توجیہات کا جواب دینے کی کوشش کر رہا ہو، کہا، "اس وقت میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔"

اس نے پھر چلنا شروع کر دیا اور ملاقات کے کمرے کے آخرے سرے تک گیا۔ اس لمحے جب وہ گھوما تو اسے احساس ہوا کہ ماریوس اس کے چلنے پھرنے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ناگفتنی لہجے میں کہا، میں اپنا پاؤں ذرا گھسیٹ رہا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں، کیوں؟"

اور وہ ماریوس کی طرف گھوم گیا، "اور جناب! اب ذرا تصور کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا ہے؛ میں

موسیو فوشلوواں ہوں؛ میں نے آپ کے گھر میں اپنی جگہ بنائی ہے؛ میں آپ لوگوں میں شامل ہوں؛ اپنے کمرے میں رہتا ہوں؛ صبح کے وقت جوتیاں پہنے ناشتے کے لیے آتا ہوں؛ شام کو ہم سب کھیلنے جاتے ہیں؛ میں مادام پوں مرسی کے ساتھ Tuileries، اور اس کے بعد Place Royale جاتا ہوں؛ ہم سب ساتھ ہوتے ہیں؛ آپ مجھے اپنے برابر سمجھتے ہیں؛ اور ایک دن، جب آپ وہیں ہیں، اور میں بھی وہیں ہوں، ہم آپس میں گفتگو کر رہے ہیں، ہنس بول رہے ہیں؛ اچانک آپ ایک آواز کو 'ژاں ولژاں' پکارتے سنتے ہیں، اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوف ناک ہاتھ، پولیس کا، اندھیرے سے تیر کی طرح نکلتا ہے، اور اچانک میرے چہرے کا نقاب کھینچ لیتا ہے۔"

اس نے پھر توقف کیا؛ ماریوس کانپتا ہوا، اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ژاں ولژاں کہتا رہا، "تب آپ کیا کہیں گے؟"

ماریوس کی خاموشی اس کا جواب تھی۔

ژاں ولژاں کہتا رہا؛

"آپ نے دیکھا، کہ میں اپنا سکون برقرار رکھنے میں حق بجانب نہیں۔ خوش رہیے، جنت میں رہیے، فرشتوں کے فرشتے رہیے، دھوپ میں بیٹھے مطمئن رہیے، اور ایک بے چارے بدنصیب کی ان باتوں سے خود کو پریشان نہ کیجیے جو وہ اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے کہہ رہا ہے اور اپنا فرض پورا کر رہا ہے؛ جناب! آپ کے سامنے ایک بدبخت آدمی ہے۔"

ماریوس نے آہستہ آہستہ کمرہ پار کیا، اور جب وہ ژاں ولژاں کے بہت قریب ہو گیا تو اس نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ماریوس آگے بڑھنے اور اس کا ہاتھ تھامنے پر مجبور تھا جو پیش نہیں ہوا تھا؛ ژاں ولژاں نے وہی کیا جو ماریوس نے چاہا تھا؛ اس کے ہاتھ میں سنگِ مرمر جیسا ٹھنڈا ہاتھ تھا جسے وہ دبا رہا تھا۔ "میرے نانا کے بہت دوست ہیں۔" ماریوس نے کہا، "میں آپ کے لیے معافی حاصل کر لوں گا۔"

"بے کار ہے۔" ژاں ولژاں نے جواب دیا، "مجھے مردہ قرار دے دیا گیا ہے، اور یہی کافی ہے۔ مرے ہوئے لوگوں کی نگرانی نہیں کی جاتی۔ وہ امن میں سڑتے گلتے رہتے ہیں۔ موت بھی معافی ہی ہوتی ہے۔" اور اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے جو ماریوس پکڑے ہوئے تھا، اس نے سنگ دلی سے کہا، "مزید یہ کہ وہ دوست میں جن سے رجوع کر سکتا ہوں میری جگہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں؛ مجھے تو بس ایک ہی معافی چاہیے؛ میرے اپنے ضمیر کی معافی۔"

اسی لمحے ملاقاتی کمرے کے دوسرے سرے پر واقع دروازہ آہستہ سے نیم وا ہوا؛ اس

میں سے کوزیٹ جھانک رہی تھی۔ انھوں نے اس کا پیارا چہرہ دیکھا، اس کے بال دل ربا بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، اس کی پلکیں نیند سے ورم کر گئی تھیں۔ اس نے چڑیا کی طرح حرکت کی، جس طرح وہ اپنے گھونسلے سے اپنا سر نکالتی ہے؛ پہلے اپنے شوہر پر نظر کی، اس کے بعد ژاں ولواں پر اور مسکراتے ہوئے ان پر چیخی: انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی گلاب کے پھول کو مسکراتے دیکھ رہے ہیں، میں شرط لگا سکتی ہوں کہ آپ لوگ سیاست پر باتیں کر رہے ہیں۔ کتنی احمقانہ بات ہے! میرے بجائے سیاست۔"

ژاں ولواں لرز گیا۔

"کوزیٹ..... "ماریوں ہکلایا۔

اور وہ دونوں اس طرح خاموش ہو گئے، جیسے دونوں مجرم ہوں۔

کوزیٹ جو چمک رہی تھی، ان دونوں کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں جنت جیسی کوئی روشنی تھی۔ "میں نے آپ لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔" کوزیٹ نے کہا "ابھی ابھی میں نے اپنے باپ فوشلووں کو کہتے سنا ہے، 'ضمیر..... اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔' اسی کو سیاست کہتے ہیں۔ اور درحقیقت یہ فرض ہی ہے۔ میں اسے قبول نہیں کروں گی۔ [شادی کے] دوسرے دن ہی لوگوں کو سیاست پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔"

"تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے" ماریوں نے کہا "ہم کاروبار کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم بات کر رہے ہیں، تمھارے چھ لاکھ فرانک کی بہترین سرمایہ کاری کی۔"

"صرف یہی بات نہیں ہے۔" کوزیٹ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں آ رہی ہوں۔ کیا کسی کو میری ضرورت ہو گی؟"

اور با ہمت انداز میں دروازے سے گزرتے ہوئے وہ ملاقات کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ گلے سے شروع ہو کر پیروں تک طویل ایک بھاری بھرکم سفید رنگ کا چغہ پہنے ہوئے تھی جس میں ہزاروں تہیں اور لمبی آستینیں تھیں۔ قدیم گوتھک تصویروں کے سنہرے آسمانوں میں ایسے ہی ڈھیلے ڈھالے لبادے پہنے فرشتے دکھائے گئے ہیں۔ اس نے لمبے آئینے میں خود کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور ناقابلِ بیان سرمستی کے عالم میں بلند آواز میں کہا:

"ایک تھا راجا، ایک تھی رانی؛
میں کتنی خوش قسمت ہوں!"

اتنا کہہ کر اس نے جھک کر ماریوں اور ژاں ولواں کو احترام پیش کیا۔

''وہاں'' اس نے کہا ''میں بیٹھنے والی ہوں، ایک آرام کرسی پر؛ ہم ایک نصف گھنٹے میں ناشتا کریں گے؛ آپ لوگ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کی مردوں کو گفتگو کرنی چاہیے؛ اب میں مخل نہیں ہوں گی۔''

ماریوں نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ''ہم کاروبار کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔''

کوزیت نے کہا ''میں نے اپنی کھڑکی کھلی دی ہے؛ باغیچے میں مسخروں کا ایک جھنڈ آیا ہے، نقاب پوشوں کا نہیں پرندوں کا۔ آج Ash-Wednesday ہے، مگر پرندوں کے لیے نہیں۔''

''میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ہم کاروبار کی باتیں کر رہے ہیں۔ میری پیاری کوزیت، تھوڑی دیر کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دو۔ ہم اعداد و شمار کی باتیں کریں۔ تم سن کر اکتا جاؤ گی۔''

''آج تم بہت دل رُبا بالا پوش پہنے ہو، ماریوں۔ تم بہت بانکے موں سئیور لگ رہے ہو۔ نہیں، میں اکتاؤں گی نہیں۔''

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں تم اکتا جاؤ گی۔''

''نہیں۔ اس لیے کہ تم میرے پاس ہوگے۔ میں تمھاری باتیں سمجھوں گی نہیں، مگر تمھیں سنتی رہوں گی۔ جب کوئی لڑکی اپنے محبوب کی آواز سن رہی ہو، تو ضروری نہیں کہ جو کچھ کہا جائے وہ سمجھ میں بھی آجائے۔ بس ہمیں ایک ساتھ رہنا چاہیے، اور یہی میری خواہش ہے۔ میں تمھارے پاس بیٹھی رہوں گی۔''

''میری پیاری کوزیت! تم بہت مشکل لڑکی ہو۔''

''مشکل!''

''ہاں۔''

''بہت خوب!'' کوزیت نے کہا ''میں تمھیں کچھ خبریں سنانے والی تھی۔ میں تمھیں بتا سکتی تھی کہ تمھارے نانا ابھی تک سو رہے ہیں؛ کہ تمھاری پھوپھی گرجا گھر گئی ہیں؛ کہ میرے والد فوشلوون کی چمنی سے دھواں نکل رہا ہے؛ کہ نکولے نے چمنی صاف کرنے والے کو بلا بھیجا ہے؛ کہ تُوسا اور نکولے لڑ چکی ہیں؛ کہ نکولے تُوسا کی لُکنت کا مذاق اُڑاتی ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ اوہ، یہ بہت مشکل ہے۔ تو کون پکڑا جائے گا؟ میں تم سے التجا کرتی ہوں، مجھے تم دونوں کے پاس بیٹھی رہنے دو۔''

''میں قسمیہ کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں کا تنہا رہنا ناگزیر ہے۔''

''کیا، میں کوئی نہیں؟''

''ژاں ولواں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ کوزیٹ اس کی طرف مڑی:

''سب سے پہلے فادر، میں چاہتی ہوں کہ آپ آئیں اور مجھے گلے لگائیں۔ بجائے اس کے کہ آپ گفتگو میں حصہ لینے میں میرا ساتھ دیتے، آپ کی خاموشی سے کیا مراد ہے؟ کس نے مجھے ایسا باپ دیا ہے؟ آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ میری شادی شدہ زندگی بہت ناخوش گوار ہے۔ ماریوس مجھے مارتا پیٹتا ہے۔ آئیے، فوراً مجھے گلے لگائیے۔''

ژاں ولواں اس کی طرف بڑھا۔ کوزیٹ ماریوس کی طرف مڑی۔ ''اور، جہاں تک تمھارا معاملہ ہے، میں تمھیں منہ چڑاؤں گی۔'' پھر اس نے اپنی پیشانی ژاں ولواں کو پیش کر دی۔

ژاں ولواں ایک قدم آگے بڑھا۔

کوزیٹ پیچھے ہٹی۔ ''فادر، آپ پیلے ہو رہے ہیں۔ کیا آپ کے بازو میں بہت درد ہے؟''

''اب تو ٹھیک ہے۔'' ژاں ولواں نے کہا۔

''کیا آپ کو ٹھیک سے نیند نہیں آتی؟''

''نہیں تو۔''

''کیا آپ افسردہ ہیں؟''

''نہیں۔''

''آپ اگر ٹھیک سے سوتے ہیں، اگر آپ ٹھیک ہیں، اگر آپ مطمئن ہیں تو مجھے گلے لگا لیجیے۔ میں آپ کو برا بھلا نہیں کہوں گی۔'' ایک بار پھر اس نے اپنی پیشانی پیش کر دی۔

ژاں ولواں نے اس پیشانی پر ایک اور بوسہ ثبت کر دیا، جہاں آسمانی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''مسکرائیے۔''

ژاں ولواں مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ آسیبی مسکراہٹ تھی۔

''اب، میرے شوہر کے خلاف میرا دفاع کیجیے۔''

''کوزیٹ!'' ماریوس نے پلٹ کر کہا۔

''ناراض ہو جائیے فادر۔ کہیے کہ مجھے ٹھہرنا چاہیے۔ آپ یقیناً میرے سامنے بات کر سکتے ہیں۔ گویا آپ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ آپ جو کہہ رہے ہیں حیرت انگیز ہے۔ کاروبار، بینک میں نقدی رکھنا، سچ مچ بڑی بات ہے۔ مرد معمولی سی بات بھی معما بنا لیتے ہیں۔ آج میں بہت

خوب صورت لگ رہی ہوں۔ میری طرف دیکھو ماریوس!"
"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" ماریوس نے کہا۔
"میں بھی تمھیں بہت چاہتی ہوں۔" کوزیٹ نے کہا۔
اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔
"اب" کوزیٹ نے اپنے چغے کی شکنیں دور کرتے ہوئے، فاتحانہ بناوٹی صورت کے ساتھ کہا "اب تو میں ضرور ٹھہروں گی۔"
"نہیں، اس وقت نہیں۔" ماریوس نے ملتجیانہ انداز میں کہا "ہمیں کچھ کام ختم کرنے ہیں۔"
"ہرگز نہیں۔"
ماریوس نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا "میں یقین سے کہہ رہا ہوں، کہ یہ ناممکن ہے۔"
"اوہ، اب آپ نے مردانہ لہجہ اختیار کیا ہے، جناب! ٹھیک ہے، اب میں جا رہی ہوں۔ فادر آپ مجھے روک نہیں رہے ہیں۔ موسیو میرے فادر، موسیو میرے شوہر، آپ دونوں ظالم لوگ ہیں۔ میں ماما سے شکایت کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ میں واپس آؤں گی اور آپ لوگوں کو عام قسم کی باتیں کرنا سکھاؤں گی۔ آپ لوگ غلطی پر ہیں۔ مجھے فخر ہے۔ میں انتظار کروں گی۔ آپ دیکھ لیں گے کہ میرے بغیر آپ لوگ اکتا جائیں گے۔ اچھا، میں جا رہی ہوں۔"
اور وہ کمرے سے چلی گئی۔
دو دقیقے بعد، دروازہ ایک بار پھر کھلا، اس کا تازہ گلابی چہرہ ایک بار پھر دروازے کے دو پٹوں کے درمیان سے نکلا، اور اُن سے چیخ کر کہا "میں واقعی خفا ہوں۔"
دروازہ پھر بند ہو گیا، اور ایک بار پھر سایے اتر آئے۔
ماریوس نے اطمینان کر لیا کہ دروازہ بند ہے۔
"بے چاری کوزیٹ!" جب اسے پتا چلے گا....."
اس جملے پر ژاں ولژاں کا ہر عضو لرز گیا۔ اس نے حیران نظروں سے ماریوس کو دیکھا۔
"کوزیٹ! ارے ہاں، مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ یہ سب آپ کوزیٹ کو بھی بتائیں گے۔ ٹھیک ہے، میں نے تو اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ کسی میں صرف ایک بات کی صلاحیت ہوتی ہے، دوسری بات کی نہیں۔ جناب، میں آپ کو قسم دیتا ہوں، التجا کرتا ہوں، آپ کو مجھ سے مقدس عہد کرنا ہوگا کہ آپ اسے نہیں بتائیں گے۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ آپ کو معلوم ہے؟ میں نے یہ سب بغیر کسی قسم کے، جبر کے بغیر آپ کو بتایا ہے۔ میں پوری کائنات کو بتا سکتا تھا، پوری دنیا

کو۔۔۔یہ مجھ پر منحصر تھا۔ مگر اسے اس بات کا بالکل علم نہیں، وہ خوف زدہ ہو جائے گی۔ سزا یافتہ! کیا معنی۔ یہ ہماری ذمے داری ہوگی کہ اس کو سمجھایا جائے، اس سے کہا جائے: "کہ ژاں ولژاں گیلیو میں رہا ہے۔" اس نے ایک دن ایک زنجیر گرفتہ گروہ کو گزرتے دیکھا تھا۔ اوہ میرے خدا!۔۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ آرام کرسی میں گر پڑا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

اس کا غم سنائی نہیں دیا، مگر اس کے شانوں کی تھرتھراہٹ سے واضح تھا کہ وہ رو رہا تھا؛ خاموش آنسو، خوف ناک آنسو۔ سسکی میں تھوڑی تھوڑی حبس دم کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس پر ایک قسم کا تشنج طاری تھا، اس نے خود کو کرسی کی پشت پر گرا دیا، گویا وہ بہ جبر سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو، اس کے بازو لٹک گئے تھے، اس طرح کہ ماریوس اس کی اشک بار آنکھیں دیکھ سکتا تھا؛ ماریوس کو اس کی بھن بھن بھی سنائی دی، اتنی ہلکی، گویا کسی اتھاہ گہرائی سے آرہی ہو۔

"کاش میں مر گیا ہوتا۔"

"اطمینان رکھیے۔" ماریوس نے کہا، "آپ کا راز ہمیشہ راز رہے گا۔" اب وہ کم پریشان تھا، جیسا اُسے ہونا چاہیے تھا۔ مگر پچھلے ایک گھنٹے کے دوران اس نے اپنے آپ کو بہ جبر پُرسکون کر لیا تھا، تا کہ وہ ان تمام باتوں کا عادی ہو جائے جو غیر متوقع بھی تھیں اور خوف ناک بھی۔ اس کی نظروں میں وہ سزا یافتہ شکل، وہ رنجیدہ حقیقت رفتہ رفتہ موسیو فوشلوں کی شخصیت میں جذب ہوتی جا رہی تھی اور اسے اپنے اور اس شخصیت کے درمیان اس خلیج کا بھی احساس ہونے لگا تھا جو ان دو آدمیوں کے درمیان اچانک پیدا ہو گئی تھی۔ ماریوس نے مزید کہا، "اب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں آپ سے اس امانت کے بارے میں بات نہ کروں جو آپ نے اتنے خلوص اور ایمان داری سے عنایت کی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس میں سے کچھ آپ کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ رقم کا آپ خود تعین کریں گے اور وہ آپ کو پیش کر دی جائے گی۔ رقم کی زیادتی سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں، جناب!" ژاں ولژاں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا تھا، اور میکانکی انداز میں اس کی پہلی انگلی انگوٹھے کے ناخن پر پھسل رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی آواز ذرا بلند کی، "تقریباً سب کچھ ہو گیا ہے۔ مگر ایک آخری بات۔۔۔۔"

"وہ کیا ہے؟"

ژاں ولژاں نے ایک لمحہ تامل کیا اور بغیر آواز کے، بغیر سانس کے، کہنے کے بجائے

وہ ہکلایا، ”جناب، اب، جب کہ آپ سب کچھ جان گئے ہیں، آپ مالک ہیں، آپ کا کیا خیال ہے کہ اب مجھے کوزیٹ سے نہیں ملنا چاہیے؟“

”میرا خیال ہے کہ یہ بہتر ہوگا۔“ ماریوں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

”میں اب اسے کبھی نہیں دیکھوں گا“ ژاں ولژاں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا اور اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔

اس نے اپنا ہاتھ دروازے کی گھنڈی پر رکھا، کھٹکا ہوا اور دروازہ کھل گیا۔ ژاں ولژاں نے بس اس قدر دھکا دیا تھا کہ اس کے گزر جانے کے لیے کافی جگہ بن جائے؛ ایک دقیقے وہ بے حرکت کھڑا رہا، پھر کچھ سوچ کر دروازہ بند کر دیا، اور ماریوں کی طرف مڑا۔

اب وہ زرد نہیں رہا، سرمئی ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں تھے، بس ایک قسم کی الم ناک شعلے جیسی چمک تھی۔ اس کی آواز میں حیرت انگیز اعتماد آ گیا تھا۔

”ذرا ٹھہریے، جناب!“ اس نے کہا، ”اگر اجازت ہو تو میں اس سے ملنے آیا کروں گا۔ سچ کہتا ہوں کہ اس کی سخت ضرورت ہو گی۔ اگر مجھے کوزیٹ سے ملنے کی پروا نہ ہوتی تو میں نے وہ اعتراف نہ کیا ہوتا جو میں نے آپ کے سامنے کیا ہے؛ میں چلا گیا ہوتا؛ مگر چوں کہ میری خواہش تھی کہ میں اسی جگہ رہوں جہاں کوزیٹ ہو گی اور اس سے ملتا رہوں گا، مجھے سب کچھ ایمان داری سے بتانا پڑا تھا۔ آپ میرا استدلال سمجھ رہے ہیں، ہے کہ نہیں؟ یہ آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی بات ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ نو برس میرے ساتھ رہی ہے۔ ہم پہلے بولیوارڈ پر اس جھونپڑے میں رہتے تھے، اس کے بعد خانقاہ میں، پھر لکسمبرگ کے قریب۔ وہی جگہ، جہاں پہلی بار آپ نے اسے دیکھا تھا۔ آپ کو اس کی نیلی، روئیں دار ہیٹ یاد ہو گی۔ پھر ہم Quartier des Invalides منتقل ہو گئے تھے جہاں ایک باغیچہ تھا، اور اس کے کنارے پلوے والے مکان میں، جہاں ایک کٹہرا لگا تھا۔ وہاں میں صحن میں بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا، جہاں میں اس کے پیانو کی آواز سن سکتا تھا۔ وہ میری زندگی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔ نو برس اور کچھ ماہ۔ میں اس کے لیے اس کے اپنے باپ جیسا تھا، اور وہ میری بیٹی تھی۔ موسیو پوں مرسی، مجھے معلوم نہیں کہ آپ میری بات سمجھ بھی رہے ہیں، مگر اب اس طرح چلے جانا، اس سے کبھی نہ ملنا، اس سے کبھی بات نہ کرنا، بہت مشکل ہوگا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کبھی کبھی میں کوزیٹ سے ملنے آ جایا کروں گا۔ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ آپ [دربان کو] حکم دیں گے کہ مجھے اس چھوٹی سی انتظارگاہ میں بٹھایا جائے گا، زمینی منزل پر۔ میں

پچھلے دروازے سے بھی داخل ہو سکتا ہوں، مگر شاید وہ مناسب نہ ہوگا۔ مجھے عام دروازے سے ہی آنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے، کہ میں کوزیٹ سے ذرا زیادہ ملنا چاہتا ہوں، جس قدر آپ اجازت دیں گے۔ ذرا خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھیے، اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں بچا ہے۔ پھر بھی ہمیں محتاط رہنا چاہیے، اگر میں آنا بالکل چھوڑ دوں تو اس کا خراب اثر ہوگا؛ یہ غیر معمولی بات سمجھی جائے گی۔ میں اتنا کر سکتا ہوں، کہ شام کے وقت آیا کروں گا، جب رات ہونے لگتی ہے۔''

''آپ ہر شام آئیں گے۔'' ماریوس نے کہا، ''اور کوزیٹ آپ کا انتظار کیا کرے گی۔''

''جناب! آپ کی بہت مہربانی۔'' ژاں ولژاں نے کہا۔

ماریوس نے ژاں ولژاں کو فوجی سلام کیا؛ خوش قسمتی مایوسی کو دروازے تک لے گئی، اور یہ دو آدمی ایک دوسرے سے علاحدہ ہو گئے۔

۞

انکشافات اور تاریکیاں

ماریوس بہت ناراض تھا۔

اس آدمی سے دوری کی، جو اس نے ہمیشہ محسوس کی تھی، اس کے سامنے تشریح ہو گئی تھی جسے اس نے کوزیٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس شخص میں کچھ پیچیدگی بھی تھی جس کے بارے میں اس کی جبلت نے اسے تنبیہ کر دی تھی۔

بحری جہازوں کی قید [گیلیز] کا یہ معما رسوائیوں میں سب سے ڈراؤنا تھا۔ موسیو فوشلووں ہی سزا یافتہ ژاں ولژاں تھا۔ کسی کی خوشیوں کے درمیان اچانک اس قسم کے راز کا افشا ہو جانا فاختاؤں کے گھونسلے میں عقرب کی دریافت کے مماثل ہوتا ہے۔

اس کے بعد سے کیا ماریوس اور کوزیٹ کی خوشی اس قسم کے قرب و جوار تک محدود رہتی تھی؟ کیا یہ ایک تکمیل شدہ حقیقت تھی؟ کیا اس آدمی کا اعتراف اس شادی کی تکمیل کا حصہ تھا۔ کیا اب کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا؟ کیا ماریوس نے سزا یافتہ سے بھی شادی کی تھی؟

کبھی روشنی اور خوشی بھی بے کار ہو جاتی ہے؛ کبھی زندگی کا ارغوانی لمحہ بھی بے کار ہو جاتا ہے؛ ایسے صدمے بلند درجے کے فرشتوں کو بھی وجد میں مبتلا کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ اوتار بھی اپنے عروج میں لرز جایا کرتے ہیں۔

جیسا کہ اس قسم کے منظر کی تبدیلی میں ہمیشہ ہوتا ہے، ماریوس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ کیا اس کے پاس ایسی کوئی شے نہیں جس سے وہ اپنی سرزنش کر سکے؟ کیا وہ غیب دانی سے محروم ہے؟ کیا وہ دانائی سے بھی محروم ہے؟ کیا اس نے غیر ارادی طور پر اپنی ذہانت کو کند کر لیا ہے؟ شاید، کسی حد تک! کیا وہ اطراف پر روشنی کی وافر پیش بندیاں کیے بغیر اس محبت کے معاملے

میں داخل ہوا تھا جو کوزیٹ سے اس کی شادی پر منتج ہوا ہے؟ اس نے اپنی فطرت کے وہمی اور تصوراتی پہلو کا اعتراف کیا جو بہت سی کیفیات سے مخصوص ہوتا ہے، اور جو جیسے جیسے نفس میں تبدیلی ہوتی ہے، جذبات کے دوروں اور افسردگی میں پھیلنے لگتا ہے، اور پورے آدمی پر حملہ کر دیتا ہے، اس حد تک کہ وہ دھند میں تنہا ضمیر سے زیادہ نہیں رہ جاتا۔ ہم ماریوں کی انفرادیت کے اس غیر معمولی عنصر کی طرف کئی بار اشارہ کر چکے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ اپنی محبت کے نشے میں مست پلومے اسٹریٹ میں سرمستی کے ان ہفتوں کے دوران Gorbeau منزل میں ہونے والے ڈرامے کا اس نے کوزیٹ سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا، جس میں بے چارے شکار نے جد وجہد اور اس کے بعد ہونے والے فرار میں خاموشی کا کیسا غیر معمولی مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کیسے ہوا کہ اس نے کوزیٹ کو اس بارے میں بتایا بھی نہیں؟ یہ کس طرح ہوا کہ اس نے تینی آردیے کا نام تک نہیں لیا، خاص طور پر اس دن بھی جب اس کا ایپونین سے سامنا ہوا تھا۔ اس کے لیے اب اس وقت کی خاموشی کی تشریح بہت مشکل ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ اس کا جواز پیش کر سکتا تھا۔ اس نے یاد کی اپنی بے ہوشی کی کیفیت، کوزیٹ کے ساتھ نشے کی، محبت کی ہر شے کو جذب کر لینے کی اور ایک دوسرے کو زبردستی مثالی بنانے کی جس میں اس نے کوئی کردار ادا کرنا نہیں چاہا تھا، اور جس میں نہ وہ بیان کرنے والا بن سکا تھا اور نہ مدعی بنے بغیر گواہ بن سکا تھا۔

مزید، یہ کہ یہ چند ہفتے روشنی کے جھماکے کی طرح گزر گئے تھے؛ اور ان کے پاس محبت کے سوا کسی کام کے لیے وقت نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ ہر بات کا اندازہ لگائے بغیر، اس نے ہر چیز کو اپنے ذہن میں الٹا پلٹا، ہر چیز کی جانچ پڑتال کی، اور اس کا کچھ نتیجہ نکلتا، اگر اس نے کوزیٹ کو Gorbeau منزل کے گھیراؤ کے باوجود بتا دیا ہوتا کہ ژاں ولواں سزا یافتہ شخص تھا، تو کیا ان سب باتوں نے ماریوں کو بدل دیا ہوتا؟ کیا کوزیٹ کو تبدیل کر دیا ہوتا؟ کیا وہ پیچھے ہٹ جاتا؟ کیا وہ کوزیٹ سے کم محبت کرنے لگتا؟ کیا اس نے اس سے شادی کرنے سے پرہیز کیا ہوتا؟ نہیں۔ تب، نہ پچھتانے کی کوئی بات ہوتی، نہ خود کو سرزنش کرنے کی کوئی ضرورت ہوتی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ شراب میں مدہوش لوگوں کے لیے جن کو عاشق کہا جاتا ہے، وہ ایک دیوتا کے مانند تھا۔ اگر اس کو اپنی نگاہ پر پورا اختیار ہوتا تو ماریوں نے کسی اندھے کی طرح اپنا منتخب راستہ اختیار کیا ہوتا۔ محبت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی تا کہ وہ صرف جنت کی طرف جائے۔ مگر آگے چل کر اس جنت میں ایک جہنمی آگ نے سب کچھ پیچیدہ کر دیا تھا۔

ماریس کی اس آدمی سے — جو فو شلووں سے ژاں ولواں بن گیا تھا — پرانی بے مہری میں اس وقت خوف شامل ہو گیا تھا۔ اس خوف میں کچھ ہمدردی تھی، بلکہ مخصوص قسم کا تعجب بھی تھا۔ اس چور نے امانت بھی واپس کر دی تھی، اور امانت بھی کیسی! چھ لاکھ فرانک! اس امانت کا اکیلا وہی راز داں تھا۔ وہ سارا اپنے پاس رکھ بھی سکتا تھا؛ مگر اس نے سب کچھ واپس کر دیا تھا۔

مزید یہ کہ اس نے از خود اپنی کیفیت آشکار کر دی تھی۔ اس پر کوئی جبر نہیں تھا۔ اگر کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو اسی کے ذریعے ہوا تھا۔ اس اقبال میں جو کچھ تھا امانت کی قبولیت سے زیادہ تھا۔ ایک سزا یافتہ آدمی کے لیے، نقاب صرف نقاب نہیں ہوتا، جائے پناہ ہوتا ہے۔ نقلی نام تحفظ ہوتا ہے؛ اس نے نقلی نام کو رد کر دیا تھا۔ وہ، گیلیر کا غلام، ایک دیانت دار خاندان میں ہمیشہ کے لیے چھپ سکتا تھا؛ اس نے یہ ترغیب برداشت کی اور کس نیت کے ساتھ؟ باضمیر احساسِ تامل کے ذریعے۔ اس نے سب کچھ سچائی کے اٹل لہجے میں خود بیان کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ ژاں ولواں جو بھی تھا، وہ بلا شبہ ایک ضمیر تھا جو خواب سے جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کچھ باطنی بحالی کی ضرورت تھی جس کی شروعات ہو چکی تھی؛ اور کوئی احساسِ تامل ہر انداز میں ایک عرصے اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ انصاف اور نیکی کے ایسے دوروں کی صفات سوقیانہ نوعیت کی نہیں ہوا کرتیں۔ ضمیر کا جاگ جانا نفس کا جاہ و جلال ہوتا ہے۔ کچھ پُر اسرار بحالی کی بھی ضرورت تھی جس کی ابتدا ہو چکی تھی؛ اور بظاہر احساسِ ذمے داری نے کافی عرصے تک اس آدمی کو روکے رکھا تھا۔ انصاف اور نیکیوں کے ایسے غیر معمولی دورے فطرتوں کے نمایاں امتیاز نہیں ہوا کرتے۔ ضمیر کا جاگ جانا نفس کی شان ہوا کرتا ہے۔

ژاں ولواں پُر خلوص تھا۔ اس کا خلوص صاف اور واضح تھا، محسوس کیا جا سکتا تھا، اس دکھ سے ظاہر تھا جو اس کی وجہ بنا تھا، جس نے سوالات کو بے کار کر دیا تھا، اور اس بات کا پورا اختیار دے دیا تھا جو اس آدمی نے کہا تھا۔

جہاں تک ماریس کا سوال تھا، حالات میں حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی تھی۔ موسیو فو شلووں سے کیا حاصل ہوا تھا؟ بدگمانی۔ ژاں ولواں نے کیا فیض دیا تھا؟ اعتماد۔

ژاں ولواں کے پُراسرار توازن میں جو فکر مند ماریس نے دیکھا تھا، اس نے عملی شامل کیا، غیر متحرک اصول اور دونوں کے درمیان توازن حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ سب طوفانی ہواؤں میں اڑ گیا۔ اس آدمی کے بارے میں اپنا ذہن صاف کرنے اور اپنے خیالات کی گہرائیوں میں ژاں ولواں کا پیچھا کرنے کے دوران اسے کھو دیا اور اسے ایک بار پھر مہلک دھند میں پا لیا تھا۔

امانت کی ایماندارانہ بحالی، اعتراف کی دیانت داری — یہ سب اچھے کام تھے۔ ان سب نے ہلکے بادل پیدا کیے، مگر ایک بار پھر بادل سیاہ ہو گئے تھے۔

ماریوں کی پریشان یادداشتوں میں ان کی پرچھائیاں واپس آ گئیں۔

اس کے باوجود، ژاندریت کی دوچھتی میں کیا تماشا ہوا تھا؟ پولیس کی آمد پر شکایت درج کرانے کے بجائے وہ بھاگ کیوں گیا تھا؟ ماریوں کو اس کا جواب مل گیا۔ اس لیے کہ وہ آدمی انصاف سے مفرور تھا، اس نے پابندی توڑ دی تھی۔ ایک اور سوال، وہ آدمی پشتے پر کیوں آیا تھا؟

ماریوں اب ان یادوں کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا جو اس تحریر کی طرح ابھر آتی ہیں جو گرمی ملنے پر روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ آدمی پشتے میں رہ چکا تھا۔ لڑائی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ پھر وہاں کس لیے آیا تھا؟ اس سوال کے ساتھ ہی کسی سایے نے اٹھ کر جواب دیا: "جاویر کے لیے۔"

ماریوں کی آنکھوں کو اب وہ غم انگیز منظر صاف نظر آ رہا تھا جس میں جاویر جکڑا ہو پشتے کے باہر لے جایا جا رہا تھا، اور وہ خوفناک آواز بھی سنائی دے رہی تھی جو Mondetour اسٹریٹ کے کونے پر پستول چلنے سے پیدا ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ پولیس کے اس جاسوس اور گیلیر کے غلام کے درمیان نفرت تھی! ایک، دوسرے کے راستے میں آ گیا تھا۔ ژاں ولژاں بدلہ لینے کے مقصد سے وہاں گیا تھا۔ وہ دیر سے پہنچا تھا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جاویر پکڑا گیا ہے۔ نچلی تہوں میں کارسیکائی انتقام در آیا تھا اور وہاں کا قانون بن گیا تھا؛ سادہ سی بات ہے کہ انتقام ان نفوس کو حیران نہیں کرتا جو جزوی طور پر نیکی کی طرف راغب ہوتے ہیں؛ اور وہ دل اس طرح تیار کیے جاتے ہیں کہ ایک مجرم، جو ندامت کی راہ میں ہو، چوری کے معاملے میں محتاط ہو اور انتقام کے معاملے میں غیر محتاط ہو۔ ژاں ولژاں نے جاویر کو قتل کر دیا تھا۔ کم از کم یہ صاف ظاہر تھا۔

یقین کی خاطر یہ آخری سوال تھا، مگر اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ماریوں کو یہ سوال چمٹنے کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ اتنے عرصے تک ژاں ولژاں کا وجود کوزیت کو چھکیلتا رہا؟ عاقبت اندیشی کا یہ کیسا کھیل ہے جس نے اس بچی کو اس آدمی سے ملا دیا تھا؟ کیا دو کے لیے بھی زنجیریں ہوتی ہیں جو آسمانوں میں بنائی جاتی ہیں؟ اور کیا خدا کسی ملکوتی وجود کو عفریت سے ملا کر خوش ہوتا ہے؟ تو کیا پُراسرار گیلیر میں جرم اور معصومیت ایک ساتھ رہ سکتے ہیں؟ سزا یافتہ لوگوں کی خرابی میں جسے انسانی تعیب کہتے ہیں، کیا بے تکلف اور ذراؤنی، دو پیشانیاں، ایک متبرک سپیدۂ سحری میں نہائی ہوئی، دوسری ہمیشہ کے لیے ابدی روشنی کے جھماکے سے داغ دار، ایک ساتھ رہ سکتی ہیں؟ کیا کوئی اس ناقابلِ تشریح اتصال کو ختم کر سکتا تھا؟ کس طرح، کس قسم کی کارنامے کے نتیجے

میں، اس سماوی مخلوق اور اس پرانے مجرم کے درمیان اتصال قائم ہوسکتا تھا؟

کون میمنے کو بھیڑیے کے ساتھ باندھ سکتا تھا، اور ایسا نا قابلِ یقین کام کر سکتا تھا کہ بھیڑیا میمنے سے محبت کرنے لگتا؟ اس لیے کہ بھیڑیے نے میمنے سے محبت کی تھی، خوف ناک مخلوق نے کم زور کی پرستش کی تھی، نوبرس کے عرصے میں ملکوتی مخلوق نے عفریت کے سہارے پر انحصار کیا تھا۔ کوزیت کے بچپن اور لڑکپن کو، دن کی روشنی میں اس کے ظہور کو، زندگی اور روشنی کی طرف اس کی کنواری نشو ونما کو، ایک بھیانک عقیدت نے پناہ فراہم کی تھی۔ اس مرحلے پر سوالات معمے بن گئے تھے، پاتال، پاتالوں سے منحرف ہو گئے تھے، اور سراسیمگی کے بغیر ماریوس ژاں ولژاں کو مزید جھکا نہیں سکتا تھا۔ یہ آدمی تھا یا کوئی نشان؟

ابتدائے آفرینش کی قدیم علامتیں ابدالآباد کے لیے ہیں: انسانی سماج میں، جیسا کہ اب موجود ہے، اور اس وقت تک کے لیے ہے جب ایک زیادہ وسیع دن اس میں تبدیلی پیدا کرے گا، ہمیشہ دو طرح کے انسان ہوں گے، ایک بہتر ہوگا، دوسرا کم تر ہوگا؛ ایک جونیکی کے مطابق ہابیل ہوگا؛ دوسرا بدی کے مطابق قابیل ہوگا۔ یہ نرم دل قابیل کیا شے تھا؟ یہ بدمعاش ایک کنواری کی پرستش میں، اس کی دیکھ بھال کرنے میں، اس کے عقب میں چلنے میں، اس کا تحفظ کرنے میں، اس کو پاکیزگی میں ڈھالنے میں کیوں غرق تھا، جب کہ وہ خود نا پاک تھا؟

وہ غلاظت کا جوہر کیا تھا جس نے معصومیت کو اتنا متبرک بنا دیا تھا کہ اس میں ایک بھی دھبا نہیں تھا؟ یہ ژاں ولژاں کوزیت کو کیا تعلیم دے رہا تھا؟ سایے کا یہ وجود کیا تھا جس کا ایک ہی مقصد تھا کہ ابھرتے ہوئے ایک ستارے کو ہر قسم کے سایے، ہر قسم کے بادل سے محفوظ رکھا جائے؟

یہ ژاں ولژاں کا راز تھا؛ یہ خدا کا بھی راز تھا۔

اس دہرے راز کی موجودگی میں ماریوس پیچھے ہٹ گیا۔ ایک راز نے دوسرے راز کو کسی طرح یقین دلا دیا تھا۔ اس معاملے میں خدا بھی اتنا ہی واضح تھا جتنا کہ ژاں ولژاں۔ خدا کے اپنے آلات ہیں۔ جس آلے کو چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ وہ آدمیوں کو جواب دہ نہیں؟ کیا ہمیں معلوم ہے کہ خدا کس طرح کام کرتا ہے؟ ژاں ولژاں نے کوزیت پر محنت کی تھی۔ کسی حد تک اس نے اس نفس کی تشکیل کی تھی۔ اس پر تکرار نہیں کی جا سکتی۔ اچھا تو پھر؟ کام کرنے والا ناکارہ تھا مگر کام قابلِ تعریف تھا۔ خدا اپنے معجزے اس وقت دکھاتا ہے جب بہتر سمجھتا ہے۔ اس نے کوزیت کو بنایا تھا اور ژاں ولژاں کو کام پر مامور کیا تھا۔ وہ اس حیرت ناک شریکِ کار کو منتخب کرنے پر خوش تھا۔ ہمیں اس سے سوال کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ کیا یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ گوبر کے ڈھیر نے گلاب

کی تخلیق میں بہار کی مدد کی تھی؟

ماریوس نے یہ سارے جواب خود ہی بنالیے اور خود سے کہا تھا کہ وہ صحیح ہیں۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں وہ ان سارے نکات پر ژاں والژاں کو دبانے کی ہمت نہیں کر سکا مگر اس نے خود سے بھی اعتراف کرنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ کوزیٹ سے محبت کرتا تھا، کوزیٹ کو حاصل کر چکا تھا؛ کوزیٹ نہایت پاکیزہ تھی۔ اتنا ہی کافی تھا۔ اس کو کس قسم کی روشن خیالی کی ضرورت تھی؟ کوزیٹ روشنی تھی۔ کیا روشنی کو روشن خیالی کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس کے پاس ہر شے تھی، اور کیا چاہتا تھا وہ؟ سب کچھ — کیا یہ کافی نہیں تھا؟ ژاں والژاں کے ذاتی معاملات سے اسے سروکار نہیں تھا۔

اور اس آدمی کے مہلک سایے پر جھکتے ہوئے وہ اس بدبخت کے ایک اعلان سے چمٹا ہوا تھا، ''کوزیٹ کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ دس برس قبل مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا وجود تھا۔''

ژاں والژاں محض ایک راہ گیر تھا، اس نے خود سے کہا تھا۔ اچھا، اب تو وہ راہ گیر گزر گیا ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھا، اس کا کردار ختم ہو گیا ہے۔

آئندہ، کوزیٹ لیے سوچنا ماریوس کی ذمے داری تھی۔ کوزیٹ نے اپنے جیسے انسان میں، اپنے عاشق میں، اپنے شوہر میں، اپنے سماوی مرد میں لاجورد کی رفعتیں تلاش کی تھیں۔ جوں ہی کوزیٹ نے، پروں اور تبدیلیِ ہیئت کے ساتھ، پرواز کی تھی وہ اپنے ڈراؤنے اور خالی خول، ژاں والژاں کو زمین پر چھوڑ گئی تھی۔

جس قسم کے دائرے میں بھی ماریوس گھومتا، واپسی پر ہمیشہ ژاں والژاں کے لیے کوئی خوف ضرور چھوڑ جاتا تھا۔ شاید ایک مقدس خوف، جیسا کہ ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے، اس آدمی میں ہمیشہ ایک سوال پیدا کر دیتا تھا۔ وہ کچھ بھی کر لیتا، اپنے آپ میں کتنی بھی کمی کر لیتا اسے ہمیشہ اسی نکتے پر واپس آنا پڑتا، کہ یہ سزا یافتہ آدمی ہے، یعنی، وہ وجود ہے جس کے لیے سماج کے زینے میں ایک قدمچہ بھی نہیں؛ اس لیے کہ وہ پائین ترین قدمچے سے بھی نیچے کا وجود ہے۔ سزا یافتہ آخر ترین آدمیوں کے بعد ہی آتا ہے۔ گویا سزا یافتہ کو زندہ وجودوں میں گنا ہی نہیں جاتا۔ قانون نے اسے انسانیت کی مقدار سے بھی محروم کر دیا تھا۔

ان تعزیری معاملات پر ماریوس اب بھی بے رحم نظام سے چمٹا تھا، حالاں کہ وہ ڈیموکریٹ تھا اور قانون کے ان تمام خیالات سے متفق تھا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس نے ابھی تک اس ضمن میں خاطر خواہ ترقی نہیں کی تھی۔ ابھی تک وہ انسان کے لکھے اور خدا کے لکھے کے درمیان، قانون اور حق کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نہ اس حق پر غور کیا نہ اٹل اور ناقابلِ اصلاح کا تجزیہ کیا تھا، انسان

جس کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ بدلے کے لفظ سے کبھی پریشان نہیں ہوا۔ اس کے نزدیک یہ بالکل سادہ سی بات تھی کہ تحریر شدہ قانون کی خلاف ورزیوں کا ابد تک پیچھا کیا جانا چاہیے، اور وہ سماجی مذمت کو تہذیب کے عمل کے طور پر قبول کرتا تھا۔ فطرتاً وہ نیک طینت انسان تھا مگر اصلاً ترقی معکوس سے بنا تھا۔

اپنے خیالات کے اس درجے پر آ کر ژاں ولژاں کا چہرہ اسے ڈراؤنا اور مکروہ نظر آتا تھا۔ وہ تادیب شدہ آدمی تھا، وہ سزا یافتہ تھا۔ اس کے نزدیک 'سزا یافتہ' یوم حساب کے بگل کی آواز جیسا محسوس ہوتا ہے؛ اور ایک عرصے تک ژاں ولژاں کے بارے میں غور کرنے کے بعد، اس کا حتمی رویہ اپنا منہ پھیر لینے کا ہو گیا تھا۔

ہمیں اس بات کا احساس ہونا، بلکہ اس پر اصرار کرنا چاہیے، کہ ژاں ولژاں سے جرح کے دوران ماریوس اس نقطے پر پہنچ گیا تھا جب اس نے کہا تھا، ''آپ میرے سامنے اعتراف کر رہے ہیں۔'' اس کے باوجود اس نے دو یا تین فیصلہ کن سوال کیے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ لوگ اسے یاد نہیں آئے تھے، مگر یہ ان سے خوف زدہ تھا، ژاندریت کی دو چھتی؟ پشتہ؟ جاویر؟ کیا جانے انکشافات کہاں جا کر تھمتے؟ ژاں ولژاں ایسا انسان آدمی نہیں تھا جو پیچھے ہٹتا، اور کون جانے کہ ماریوس اس کی ہمت افزائی کے بعد خود اسے پیچھے رکھنا چاہتا تھا؟

کیا یہ ہم سب کے ساتھ نہیں ہوتا، کہ کچھ ارفع مواقع پر سوال پوچھنے کے بعد ہم خود اپنے کان بند کر لیتے ہیں تا کہ ہمیں اس کا جواب سنائی نہ دے؟ خاص کر اس وقت جب ہم بزدلی کے ایسے مظاہرے کرنے لگتے ہیں۔ نامبارک کیفیات پر آخری حد تک سوالات اٹھانا عقل مندی نہیں ہوتی، بالخصوص اس وقت جب ان میں قسمت ہماری زندگی کے لاینحل پہلوؤں کو شامل کر دیتی ہے۔ ژاں ولژاں کی مایوسانہ تشریحات سے نہ جانے کیسی کیسی خوف ناک روشنیاں نکلتیں، اور کون جانے کہ وہ ڈراؤنی کرنیں کوزیت تک پہنچ نہ جاتیں؟ گرج میں بھی آلودہ کرنے والے روشنی کے جھماکے ہوتے ہیں۔ معصوم میں بھی ایسے مقاماتِ اتصال آتے ہیں جہاں معصومیت رنگین عکس دینے والے قانون پر خود اپنی مہر لگا دیتی ہے۔ خالص ترین خوف ناک صورتیں بھی ڈراؤنی یک جائی کے عکس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتی ہیں۔ صحیح ہو یا غلط، ماریوس خوف زدہ تھا۔ اسے ضرورت سے زیادہ معلومات ہو گئی تھیں۔ وہ مزید روشنی حاصل کرنے کے بجائے اپنی حس کو سست کر لینا چاہتا تھا۔

بے بختی کے عالم میں ماریوس نے کوزیت کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا تھا اور ژاں ولژاں کی طرف سے اپنے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ آدمی رات تھا، زندگی تھا اور خوف ناک اندھیرا تھا۔ کس طرح وہ اس کی تہہ میں اترنے کی کوشش کرتا؟ سائے سے جرح کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ کون

جانے کہ اس کا جواب کیا ہوگا؟ وہ سویرے کو ہمیشہ کے لیے سیاہ کر سکتا تھا۔ ایسی ذہنی کیفیت میں یہ خیال کہ اب وہ آدمی کوزیٹ سے مل بھی سکتا ہے ماریوس کی دل شکن گھبراہٹ کا باعث تھا۔

اب وہ اپنی سرزنش کر رہا تھا کہ اس کے پیچھے ہٹ جانے سے پہلے ہی یہ خوف ناک سوالات کیوں نہیں کیے، کہ ان سے سخت اور حتمی فیصلہ نکل سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اچھا، زیادہ مہربان، اور نہایت کم زور آدمی تھا۔ اس کم زوری کے باعث اس نے غیر ضروری رعایت دے دی تھی۔ وہ زیادہ رحم دل ہو گیا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی۔ اسے ژاں ولژاں سے صاف انکار کر دینا چاہیے تھا۔ ژاں ولژاں نے آگ کا کردار ادا کیا تھا۔ اسے بھی یہی کرنا چاہیے تھا، اور اپنے گھر کو اس سے آزاد کر لینا چاہیے تھا۔ اب وہ اپنے آپ سے آزردہ تھا، اور اسے اس بات پر غصہ تھا کہ جذبات کے گردباد نے اس کو بہرا اور اندھا کر دیا تھا، اور اسے اپنے ساتھ اڑا لے گیا تھا۔

اب وہ کیا کر سکتا تھا؟ ژاں ولژاں کی [کوزیٹ سے] ملاقاتیں بالکل غیر ضروری تھیں۔ اس آدمی کی اس گھر میں ضرورت کیا رہ گئی تھی؟ وہ آدمی چاہتا کیا تھا؟ اب ماریوس بے ہمت ہو گیا تھا؛ وہ زیادہ کریدنا نہیں چاہتا تھا؛ مزید گہرائی میں جانا نہیں چاہتا تھا؛ وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا؛ اس نے خود کو اس کیفیت میں ڈال لیا تھا؛ ژاں ولژاں نے اس کے وعدے پر عمل کیا؛ سزا یافتہ سے بھی وعدے کا پاس کیا جانا چاہیے۔ پھر بھی، کوزیٹ اس کے لیے زیادہ اہم تھی۔ مختصر یہ کہ وہ مغائرت کے دھاروں میں بہہ گیا تھا، جو اس پر حاوی ہو گئی تھی۔

ماریوس اپنے ذہن میں خیالات کی اس الجھن کو الٹ پلٹ رہا تھا، ایک خیال سے دوسرے خیال پر جا رہا تھا، اور وہ سب مل کر اسے پریشان کر رہے تھے۔ اب وہ بہت بڑی مشکل میں تھا۔ اس کے لیے یہ سب کوزیٹ سے چھپانا آسان نہیں تھا، مگر محبت لیاقت ہوتی ہے، اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔

بہر حال بغیر کسی واضح مقصد کے، اس نے کوزیٹ سے پوچھا، جو اتنی ہی راست باز تھی جیسے فاختہ کی سفیدی؛ جسے کسی قسم کا شبہ نہیں تھا؛ اس نے کوزیٹ سے اس کے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں باتیں کیں، اور اُسے اس بات کا زیادہ یقین ہو گیا کہ سزا یافتہ نے جو کیا، اچھا کیا تھا؛ وہ کوزیٹ کے ساتھ اسی احترام سے پیش آیا تھا جیسا ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ ماریوس جو کچھ دیکھ سکا تھا، جس کا اندازہ کر سکا تھا، سب حقیقی تھا۔

بد دیانت بچھو بوٹی نے سوسن کی حفاظت کی تھی۔

۞

نچلا کمرہ

اگلی شام رات ہوتے ہی ژاں ولواں نے بلیر نورما کے مکان کے گاڑیوں والے پھاٹک پر دستک دی۔ باسک اسے اندر لے گیا۔ طے شدہ وقت پر باسک صحن میں موجود تھا گویا اسے حکم مل گیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ملازم سے کہہ دیا جاتا ہے کہ "موسیو فلاں آنے والے ہیں، تم ان کا انتظار کرو گے۔"

باسک نے ژاں ولواں کے بولنے کا انتظار کیے بغیر کہا، "موسیو لی بیرن نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ اوپر جانا چاہتے ہیں یا نیچے ہی ٹھہرنا چاہتے ہیں؟"

"میں نیچے ہی ٹھہرنا چاہتا ہوں۔" ژاں ولواں نے جواب دیا۔

باسک نے نہایت احترام سے انتظار گاہ کا دروازہ کھول دیا اور کہا، "میں مادام کو مطلع کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ کمرہ جس میں ژاں ولواں داخل ہوا، نمی سے آلودہ، چاروں طرف سے بند کمرہ تھا جو اکثر تہہ خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا، جس پر سُرخ رنگ کے مربع پتھر لگے تھے اور اس میں ایک جالی دار کھڑکی سے ناکافی روشنی آتی تھی۔

یہ کمرہ ان میں سے نہیں تھا جن کو پروں سے بنے جھاڑنوں، پوپ کے بال جھاڑنے والے برش اور جھاڑوؤں سے پریشان کیا جاتا۔ گرد وہاں سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ مکڑیوں کی ایذا رسانی کا انتظام نہیں تھا۔ ایک نفیس نازک جالا جو نہایت سیاہ مُردہ مکھیوں سے مزین تھا، کھڑکی پر کسی پہیے کی طرح پھیلا تھا۔ نیچے سقف کا کمرہ جو چھوٹا تھا، کونے میں لگے خالی بوتلوں کے ڈھیر سے آراستہ تھا۔

اس کی دیوار سے، جسے گیروے رنگ سے پوتا گیا تھا، بڑی بڑی پپڑیاں اکھڑ رہی

تھیں۔ ایک کنارے آتش دان پر بنی چمنی سیاہ رنگ سے رنگی تھی جس پر پتلا سا چھجا بنا تھا۔ آتش دان میں آگ روشن تھی جو اس امر پر اشارہ کر رہی تھی کہ ژاں ولژاں کے جواب ''میں نیچے ہی ٹھہرنا چاہتا ہوں'' کی توقع تھی۔

آتش دان کے دونوں کناروں پر دو عدد آرام کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ کرسیوں کے درمیان خواب گاہ کا ایک پرانا گلیم قالین کے طور پر بچھایا گیا تھا، اُون کے بجائے جس کے تانے بانے زیادہ واضح تھے۔

کمرہ آتش دان میں جلتی آگ سے روشن تھا اور کھڑکی سے شام کے دھندلکا اندر آ رہا تھا۔

ژاں ولژاں تھکن سے چور تھا۔ چار دن سے اس نے نہ کچھ کھایا تھا نہ اسے نیند آئی تھی۔ وہ آرام کرسیوں میں سے ایک پر گر پڑا۔

باسک واپس آیا چمنی پر ایک شمع روشن کی اور واپس چلا گیا۔ ژاں ولژاں نے، جس کا سر جھکا تھا اور ٹھوڑی سینے پر ٹکی تھی، نہ باسک پر نظر کی نہ شمع پر۔ اچانک اس نے اپنے آپ کو مجتمع کیا۔ اس کے پہلو کوزیٹ کھڑی تھی۔ ژاں ولژاں نے اسے داخل ہوتے دیکھا نہیں، مگر اسے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ کمرے میں موجود تھی۔ وہ مڑا۔ اس پر نظر ڈالی۔ کوزیٹ بہت حسین لگ رہی تھی، مگر اپنی نظر سے وہ اس کے حسن کو نہیں اس کی روح میں جھانک رہا تھا۔

''واہ'' کوزیٹ نے حیرت زدگی سے کہا، ''فادر، میں جانتی تھی کہ آپ عجیب آدمی ہیں، مگر مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ کیا خوب، ماریس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ مجھ سے اس جگہ ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں، میری یہی خواہش ہے۔''

''مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اچھا، میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں تماشا کرنے والی ہوں۔ آیئے اس کی ابتدا کرتے ہیں۔ فادر، مجھے گلے لگا لیجیے۔''

اور اس نے اپنا رخسار پیش کر دیا۔

ژاں ولژاں نے حرکت نہیں کی۔

''آپ نے جنبش نہیں کی۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ مجرمانہ رویہ ہے مگر کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔ یسوع مسیح نے کہا تھا: دوسرا رخسار پیش کر دو۔ لیجیے میرا دوسرا رخسار حاضر ہے۔'' اور اس نے اپنا دوسرا رخسار پیش کر دیا۔

ژاں ولژاں نے حرکت نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوا گویا اس کے پاؤں میں کیل ٹھونک دی گئی ہے۔

"معاملہ کچھ خراب ہوتا جا رہا ہے۔" کوزیت نے کہا، "مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ میں اعلان کرتی ہوں کہ میں پریشان ہوں۔ آپ کو تلافی کرنی ہوگی۔ آپ میرے ساتھ رات کا کھانا کھائیں گے۔"

"میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

"یہ صحیح نہیں۔ میں موسیو ہلیر نورماسے آپ کو ڈانٹنے کے لیے کہوں گی۔ نانا، دادا، باپ کی سرزنش کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ آیئے۔ میرے ساتھ اوپر کھانے کے کمرے میں چلیے۔ فوراً!"

"ناممکن۔"

اب کوزیت کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکی۔ اس نے حکم دینا بند کیا اور سوالات کرنے لگی۔ "مگر کیوں؟ اور مجھ سے ملاقات کے لیے آپ نے مکان کا سب سے خراب کمرہ منتخب کیا ہے۔ یہ بہت خوف ناک ہے۔"

"تو اچھی طرح جانتی ہے...."

ژاں ولژاں نے اپنی زبان روک لی۔

"مادام، آپ جانتی ہیں کہ میں عجیب آدمی ہوں، میری بھی مشکلیں ہیں۔"

کوزیت نے اپنے کم زور ہاتھ ایک دوسرے پر مارے۔

"مادام" — آپ جانتی ہیں — مزید انوکھی باتیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

ژاں ولژاں اس کی جانب دیکھ کر دل توڑ دینے والے انداز میں مسکرایا:

"تم نے مادام بننا چاہا تھا، تم بن گئی ہو۔"

"آپ کے لیے نہیں، فادر۔"

"مجھے فادر نہ کہو۔"

"کیا؟"

"مجھے موسیو ژاں کہو یا صرف ژاں، اگر چاہو۔"

"اب آپ میرے فادر نہیں؟ میں اب کوزیت نہیں؟ موسیو ژاں؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ کیوں یہ انقلابات؟ کیا ہوا ہے؟ میری طرف دیکھیے۔ اور آپ ہمارے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتے۔ آپ ہمارا کمرہ بھی نہیں لیں گے۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ کیا کچھ ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر؟"

''سب کچھ اسی طرح ہے۔''

''آپ اپنا نام کیوں بدل رہے ہیں؟''

''تم نے بھی تو اپنا نام بدل لیا ہے۔''

وہ ایک بار پھر اسی طرح مسکرایا، اور مزید کہا:

''چوں کہ تم مادام پوں مرسی ہو گئی ہو، تو میں بھی موسیو ژاں ہو سکتا ہوں۔''

''میں یہ سب سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ یہ احمقانہ باتیں ہیں۔ میں آپ کے لیے اپنے شوہر سے 'موسیو ژاں' کی اجازت لوں گی۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سے اتفاق نہیں کریں گے۔ آپ مجھے بہت تکلیف دے رہے ہیں۔ مشکلیں ہوتی ہیں مگر کوئی اپنی کوزیٹ کو رنج نہیں دیتا۔ یہ بہت غلط بات ہے۔ آپ کو بد اعمال ہونے کا حق نہیں، آپ کتنے اچھے آدمی ہیں۔''

ژاں ولژاں نے جواب نہیں دیا۔

کوزیٹ نے شگفتہ مزاجی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور ان کو اپنے چہرے تک اٹھا کر ان کو ٹھوڑی کے نیچے اپنی گردن پر رکھ لیا اور دبانے لگی۔ یہ نہایت رقت کا طریقہ ہوتا ہے۔

''اوہ'' کوزیٹ نے اس سے کہا ''مہربانی کیجیے۔'' اور اس نے کہنا شروع کیا:

''میں اسی کو مہربانی کہتی ہوں — پُر لطف ہونا، آنا اور یہاں رہنا۔ پلومے اسٹریٹ کی طرح یہاں بھی پرندے ہیں، ہمارے ساتھ رہتے ہیں، l'Homme Arme اسٹریٹ کی وہ کھوہ چھوڑنا، ہمیں بوجھنے کے لیے پہیلیاں نہ دینا، باقی دنیا والوں کی طرح رہنا، ہمارے ساتھ کھانا ناشتا کرنا، میرا باپ ہونا۔'' اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''اب تم کو باپ کی ضرورت نہیں رہی، تمھارا شوہر ہے۔''

کوزیٹ کو غصہ آ گیا۔ ''اب مجھے باپ کی ضرورت نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس پر کیا کہوں، جو ذرا سوجھ بوجھ کی بات نہیں۔''

''اگر تُوسا یہاں موجود ہوتی'' ژاں ولژاں نے اس آدمی کی طرح کہنا شروع کیا جو صاحبانِ اختیار سے قریب ہونا چاہتا ہے اور ہر شاخ کو پکڑ لیتا ہے، ''وہ اس بات سے اتفاق کرنے والی پہلی شخصیت ہوتی کہ میں نے ہمیشہ اپنے طریقے سے کام کیا ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ مجھے ہمیشہ اپنا اندھیرا کونا پسند رہا ہے۔''

''مگر یہاں ٹھنڈ ہے۔ صاف دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں موسیو ژاں بننے کی خواہش کرنا اخلاقی اعتبار سے ناروا ہو گا۔ اب میں آپ کو 'تم' کہہ کر مخاطب نہیں کر سکوں گی۔''

"ابھی، جب میں یہاں آ رہا تھا۔" ژاں ولژاں نے جواب میں کہا۔ "میں نے Saint Louis اسٹریٹ پر فرنیچر کا ایک حصہ دیکھا تھا۔ وہ الماری ساز کی دُکان پر رکھا تھا۔ اگر میں خوب صورت عورت ہوتا تو اس سے لُطف اندوز ہوتا۔ وہ بہت صاف ستھری شاہانہ انداز کی سنگھار میز ہے۔ سرخ رنگ کی لکڑی سے بنی۔ اس پر جڑاؤ کام ہے۔ اس کا آئینہ خاصا بڑا ہے۔ اس میں دراز بھی ہیں۔ بہت خوب صورت میز ہے۔"

"مجھے سُن کر حسد ہو رہا ہے۔" کوزیت نے جواب دیا۔ اور نہایت پُروقار انداز میں، اپنے ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے، ژاں ولژاں پر جھپٹ پڑی۔ بلّی کی نقل کرتے وہ اچھی لگ رہی تھی۔"

"مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔" اس نے دوبارہ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ "کل سے، جب آپ نے غصہ دلایا تھا، میں بہت ناراض ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ ماریوس کے مقابلے میں میرا دفاع نہیں کرتے۔ آپ کے مقابلے میں ماریوس میرا ساتھ نہیں دے گا۔ میں تنہا ہوں۔ میں اپنا کمرہ قرینے سے رکھتی ہوں۔ میرا مالک مکان مجھے دیوالیہ کر دے گا۔ میں نکولے سے کھانے کے لیے کہتی ہوں۔ [وہ کہتی ہے] مجھے آپ کے ڈنر سے واسطہ نہیں، مادام۔ اور میرا فادر فوشلوون مجھ سے خود کو 'موسیو ژاں' کہلوانا چاہتا ہے، اور خود کو خوف ناک، قدیم، بدصورت تہ خانے میں بٹھانے پر اصرار کرتا ہے، جس کی دیواروں کی داڑھیاں ہیں، اور جہاں کے بلوریناتی بوتلوں سے بنے ہیں، اور پردے مکڑیوں کے جالوں سے۔ آپ غیر معمولی آدمی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کا یہی انداز ہے، مگر وہ لوگ جو شادی کر لیتے ہیں انھیں عارضی صلح کرنی پڑتی ہے۔ آپ l'Homme Arme اسٹریٹ کے کمرے میں بہت مطمئن ہیں۔ میں وہاں بہت پریشان تھی، جب وہاں تھی۔ آپ کو مجھ سے کیا شکایت تھی؟ آپ مجھے بہت رنج پہنچاتے ہیں۔" اور اچانک سنجیدہ ہو کر وہ ژاں ولژاں کو گھورنے لگی، اور مزید کہا، "کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں، اس لیے کہ میں بہت خوش ہوں؟"

کبھی کبھی لاشعوری بے تکلّفی بہت اندر تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ سوال، جو کوزیت کے لیے سادہ تھا، ژاں ولژاں کے لیے بہت مشکل تھا۔ کوزیت نے کھرچنا چاہا تھا، مگر اس نے زخمی کر دیا تھا۔

ژاں ولژاں زرد پڑ گیا۔ ایک لمحے اس نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر، ناقابلِ بیان دھیمے لہجے میں، خود سے باتیں کرتے ہوئے وہ سرگوشی کرنے لگا۔ "اس کی خوشی میری زندگی کا مقصد تھی۔ اب خدا مجھے فارغ کر دے۔ کوزیت، تو خوش ہے؛ اب میرا کام ختم ہو گیا۔"

"اوہ، آپ نے مجھے 'تو' کہہ دیا۔" کوزیت نے بلند آواز میں کہا۔ اور وہ اچھل کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔

ژاں ولواں نے بے خودی کی کیفیت میں اس کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ ایسا محسوس ہوا گویا وہ اسے واپس لے جا رہا تھا۔

"شکریہ فادر!"

یہ پُر جوش لہر ژاں ولواں کے لیے بہت تکلیف دہ ہونے والی تھی۔ اس نے آہستگی سے کوزیت کے بازو الگ کیے اور اپنی ہیٹ اُٹھائی۔

"اچھا!" کوزیت نے کہا۔

"مادام میں اجازت چاہتا ہوں، وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور ڈیوڑھی سے اس نے کہا "میں نے آپ کو "تو" کہا ہے۔ اپنے شوہر کو بتا دیجیے گا کہ پھر ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

ژاں ولواں، کوزیت کو اس رمزیہ وداع پر مدہوش چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

۞

اِک اور قدم پیچھے

ژاں ولواں دوسرے دن بھی اسی وقت آیا۔

کوزیت نے کوئی سوال نہیں کیا؛ اسے حیرانی نہیں ہوئی؛ ٹھنڈک کی شکایت نہیں کی؛ ملاقاتی کمرے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا، 'فادر' یا 'موسیو ژاں' کہنے سے پرہیز کیا۔ خود کو آپ کہنے کی اجازت دی۔ خود کو مادام کہنے کی اجازت دی۔ بس، اس کی خوشی کم ہو گئی تھی۔ اگر اس کے لیے افسردگی ممکن ہو سکتی تو افسردہ ہو جاتی۔

بہت ممکن ہے کہ ماریوس سے وہ باتیں ہوئی ہوں جو محبت کرنے والا آدمی جب چاہتا ہے کہتا ہے، کسی چیز کی تشریح نہیں کرتا اور محبوبہ کو مطمئن کر دیتا ہے۔ محبت کرنے والوں کا تجسس ان کی اپنی محبت سے بڑھ کر نہیں ہوا کرتا۔

نچلے کمرے کے ساتھ چھوٹا سا ضروریات کا کمرہ بھی تھا، جس میں باسک نے بوتلیں دبا رکھی تھیں اور نکولیٹ نے لکڑیاں۔

ژاں ولواں اسی وقت آتا تھا۔ بلاناغہ آتا تھا اس لیے کہ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ماریوس کے لفظوں کو کسی اور معنوں میں لے سکتا۔ ماریوس نے اپنی مصروفیات کچھ اس طرح کر لی تھیں کہ جب ژاں ولواں آتا وہ گھر پر موجود نہیں ہوتا تھا۔ گھر والے موسیو فوشلوون کے طور طریقوں کے عادی ہو گئے تھے۔ توسان اس طرح معاونت کرتی تھی، "موسیو ہمیشہ اسی طرح کرتے تھے۔" وہ یہ جملہ دہرایا کرتی تھی۔ نانا جان نے فرمان جاری کر دیا تھا — "یہ آدمی اصلی ہے۔" [اس طرح] سب کچھ کہہ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ چھیانوے برس کی عمر میں دوستی نہیں ہوا کرتی، محض نزدیکی ہو جاتی ہے؛ بس ایک نووارد راستے میں آ جاتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہوتی؛ ساری عادتیں اکتسابی

ہوتی ہیں۔ موسیو فوشلوون، موسیو اُلٹیمیں، فادر بلیر نورما کے نزدیک اس سے بہتر بات نہیں تھی کہ انھیں ''ان صاحب'' سے چھٹکارا مل جائے۔ اس نے [اپنے فرمان میں] اضافہ کیا، ''ان اصلی آدمیوں سے زیادہ عام کوئی شے نہیں۔ یہ ہر قسم کی انوکھی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔ Marquis de Canaples اور بھی خراب آدمی تھا۔ اس نے ایک محل خریدا تھا تا کہ وہ اوپری کمرے میں رہ سکتا۔ لوگ اسی طرح کی خیالی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔''

کسی کو وہ نامبارک بنیاد دکھائی نہیں دی تھی۔ کون ایسی شے کا گمان بھی کر سکتا تھا؟ ہندوستان میں اس قسم کے دلدل ہوتے ہیں۔ ان میں غیر معمولی قسم کا ناقابلِ تصور پانی ہوتا ہے ہوا نہ ہونے کے باوجود اس میں لہریں اٹھتی ہیں؛ اور اس وقت بھی جوش مارتا ہے جب اسے پُرسکون ہونا چاہیے۔ بلاوجہ ہونے والے اس ابال کو لوگ غور سے دیکھتے رہتے ہیں، مگر انھیں سو سروں والا سانپ دکھائی نہیں دیتا جو پیندے میں رینگتا رہتا ہے۔

بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر اسی قسم کا عفریت ہوتا ہے، ایک اژدہا، جو انھیں چباتا رہتا ہے، ان میں ایسی افسردگی ہوتی ہے جو ان کی راتوں میں بسی ہوتی ہے۔ ایسا آدمی دوسرے آدمیوں سے مشابہ ہوتا ہے، جو آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ ان کے اندر انھیں کھا جانے والا درد ہوتا رہتا ہے جس کے ہزاروں دانت ہوتے ہیں؛ جو بدقسمت انسان کے اندر جاگزیں ہوتا ہے، جس سے وہ مرتا رہتا ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ آدمی خلیج ہوتا ہے۔ بے حرکت مگر گہری خلیج۔ اس کی سطح پر وقتاً فوقتاً مشکلات ظاہر ہوتی ہیں، دیکھنے والے جنھیں سمجھتے ہیں۔ ایک پُر اسرار شکن بنتی ہے، پھر غائب ہو جاتی ہے، دوبارہ پھر اُبھرتی ہے؛ ایک بلبلہ اٹھتا ہے اور پھوٹ جاتا ہے۔ یہ بلبلہ اس نامعلوم درندہ صفت انسان کا تنفس ہوتا ہے۔

[ان میں اس قسم کی] کچھ حیرت انگیز عادتیں [ہوتی ہیں]: ایسے وقت آنا جب دوسرے لوگ جانے والے ہوتے ہیں: خود کو پس منظر میں رکھنا جب دوسرے لوگ اپنا اظہار کرتے ہیں؛ ماحول کے رنگ میں رنگ جانا؛ سنسان سڑک پر تنہا چہل قدمی کرنا؛ گفتگو میں حصہ لینے سے پرہیز کرنا؛ ہجوم اور تقریبات سے پرہیز کرنا؛ سادہ انداز زندگی اپنانا؛ اپنی کنجیاں اپنی جیب میں رکھنا؛ اپنی شمع دربان کے گھر میں رکھنا؛ کتنے ہی دولت مند کیوں نہ ہوں، پہلو کے دروازے سے داخل ہونا؛ نجی زینے سے اوپر چڑھنا — اس قسم کی ساری غیر اہم اور غیر معمولی صفات، سطح سے غائب ہو جانے والی شکنیں، اکثر بھیانک بنیاد سے ہی نکلتی ہیں۔

اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ کوزیت پر ایک نئی زندگی غالب آ گئی تھی: رشتے جو شادی پیدا کرتی ہے، ملاقاتیں، مکان کا تحفظ، خوشیاں، سب بڑے معاملات ہوتے ہیں۔

کوزیٹ کی خوشیاں مہنگی نہیں تھیں، بس ایک شے پر مشتمل ہوتی تھیں — ماریوں کی قربت پر۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اسے اپنے ساتھ لے جانا، اس کے ساتھ ہونا تھا۔ دن کی روشنی میں، کھلی سڑک پر، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر جانا خود کو چھپائے بغیر، پوری دنیا کے سامنے، بالکل تنہا جانا ان کے لیے خوشی تھی۔ کوزیٹ کی ایک پریشانی تھی۔ ٹوسا کی بنگو لے سے بنتی نہیں تھی۔ دو ملازماؤں کو ایک ساتھ رکھنا ناممکن تھا؛ ٹوسا ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ نانا ٹھیک تھا؛ ماریوں یہاں وہاں مقدمے میں مصروف رہتا تھا؛ پھوپھی بلیر نورما الگ تھلگ اپنی زندگی گزار رہی تھی جو اس کے لیے کافی تھا۔ ژاں ولژاں ہر روز آتا تھا۔

تو کہہ کر مخاطب کرنا ختم ہو گیا تھا، ''مادام'' اور ''موسیو'' نے اسے کوزیٹ کے نزدیک کوئی اور شخص بنا دیا تھا۔ وہ احتیاط جو ژاں ولژاں نے کوزیٹ کو الگ کرنے کے لیے کی تھی، کامیاب ہو رہی تھی۔ کوزیٹ روز بہ روز زیادہ خوش اور کم نرم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی اس سے پُرخلوص محبت کرتی تھی جس کا اسے احساس تھا۔

ایک دن اچانک کوزیٹ نے ژاں ولژاں سے کہا، ''آپ میرے فادر تھے، اب آپ میرے باپ نہیں رہے؛ آپ میرے چچا تھے، اب چچا نہیں رہے؛ آپ موسیو فوشلوون تھے، آپ ژاں ہو گئے ہیں۔ تو پھر آپ کیا ہیں؟ مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ آپ کتنے اچھے آدمی ہیں، تو میں آپ سے خوف کھاتی۔''

وہ اب بھی l'Homme Arme اسٹریٹ میں رہتا تھا، اس لیے کہ وہ طے نہیں کر سکا تھا کہ وہ اس جگہ سے کتنی دور قیام کرے جہاں کوزیٹ رہتی ہے۔

پہلے اس نے کوزیٹ سے چند منٹ کے فاصلے پر قیام کیا تھا۔ پھر دور چلا گیا۔

رفتہ رفتہ اس نے ملاقات کا دورانیہ کم کیا۔ لوگ کہہ سکتے تھے لمبے دنوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جلدی آتا اور دیر میں واپس جاتا تھا۔

ایک دن اتفاق سے کوزیٹ نے اسے فادر کہہ دیا۔ ژاں ولژاں کا پرانا غم زدہ چہرہ خوشی سے چمک اٹھا؛ اس نے کوزیٹ کو پکڑ لیا، ''کہو، ژاں۔''

''ارے واقعی!'' اس نے جواب میں، ''موسیو ژاں'' کہا اور قہقہہ مار کر ہنسی۔

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے کہا۔

اتنا کہتے ہی وہ گھوم گیا تھا، مبادا وہ اس کو اپنے آنسو پونچھتے دیکھ نہ لے۔

۞

پلوے اسٹریٹ کی یادیں

یہ آخری موقع تھا۔ روشنی کے آخری جھماکے پر مکمل دوری ہو گئی۔ میل ملاپ ختم، بوسے والی "صبح بخیر" ختم ہو گئی۔ "میرے بابا" جیسی میٹھی آواز دور ہو گئی۔ اپنی ہی درخواست اور ساز باز کے باعث اسے ایک کے بعد دوسری خوشیوں سے خارج کر دیا گیا تھا؛ اور یہ اس کی خود ساختہ افسردگی تھی کہ ایک دن کوزیٹ مکمل طور پر اس کے ہاتھ سے گئی تو دوسرے دن اس نے ایک بار پھر اسے تفصیل سے کھو دیا۔

بالآخر اس کی آنکھیں تہہ خانے کی روشنی کی عادی ہو گئیں۔ مختصر یہ کہ ہر روز اس کے سامنے کوزیٹ کا آسیب کھڑا ہوتا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں اس کی پوری زندگی مرتکز ہو گئی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھتا، خاموشی سے اسے تکتا، یا اس سے گزرے دنوں کی باتیں کرتا، اس کے بچپن کی، خانقاہ کی یا اس کے گزرے دنوں کی سہیلیوں کی۔

ایک شام، جو اپریل کے ابتدائی دنوں کی تمازت بھری تازہ شام تھی، سورج اپنے پورے جلال و جمال میں تھا، باغیچے جو ماریس اور کوزیٹ کی کھڑکیوں کو گھیرے ہوئے تھے جاگ رہے تھے، پھولوں کی جھاڑیوں میں شگوفے نکلنے والے تھے، پرانی دیواروں پر خوش بو دار پھولوں کے نگینوں کی زیبائش پھیلی ہوئی تھی، پتھروں کی درازوں میں گلِ میمون (snapdragons) کھل رہے تھے، گھاس کے درمیان ڈیزی کی دل ربا ابتدا ہو رہی تھی اور buttercups سفید تتلیوں کی ابتدا ہو رہی تھی، ابدی ازدواج کی قصیدہ گو ہوا درختوں میں اس عظیم نغمۂ صبح گاہی کے پہلے سُر چھیڑ رہی تھی، قدیم شعرا جسے سیلاب بہار کہتے تھے ــــ ماریس نے کوزیٹ سے کہا، "ہم نے کہا تھا، کہ ہم پلوے اسٹریٹ کا باغیچہ دیکھنے جائیں گے، چلو چلتے ہیں۔ ہمیں اس کا احسان نہیں

بھولنا چاہیے۔'' اور دونوں چل پڑے، جیسے دو ابابیلیں بہار کی تازہ ہوا میں اُڑی جا رہی ہوں۔ پلومے اسٹریٹ کا یہ باغیچہ ان کے نزدیک سویرے کی مانند تھا، جہاں وہ اپنی زندگی کے کچھ لمحات چھوڑ گئے تھے جو ان کی محبت کے لیے موسمِ بہار کی طرح تھے۔ پلومے اسٹریٹ کا مکان پٹے پر لیا گیا تھا اس لیے اب بھی کوزیٹ کی ملکیت تھا۔ دونوں اس باغیچے میں، اس مکان میں گئے۔ وہاں ان دونوں نے خود کو پایا، اور خود کو بالکل بھول گئے۔ اس شام، اپنے وقت پر، ژاں ولژاں Filles-du-Calvaire اسٹریٹ پر پہنچ گیا تھا۔ ''موسیو کے ہمراہ مادام باہر گئی تھیں، ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔'' باسک نے اس سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھ گیا اور ایک گھنٹے تک انتظار کیا۔ کوزیٹ واپس نہیں آئی۔ ژاں ولژاں سر جھکائے واپس روانہ ہو گیا۔

کوزیٹ ''اپنے باغیچے'' کی اس چہل قدمی سے اتنی سرشار تھی، گویا ''اس نے اپنی ماضی کا ایک دن گزار دیا تھا'' اور اتنی خوش تھی کہ اگلے دن تک اس نے کسی اور بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ اسے اس بات کا بھی احساس نہیں ہوا کہ اس نے ژاں ولژاں کو دیکھا نہیں ہے۔

''تم وہاں کیسے گئی تھیں؟'' ژاں ولژاں نے اس سے پوچھا۔

''پیدل۔''

''اور واپس کیسے آئیں؟''

''کرایے کی سواری گاڑی میں۔''

کچھ دنوں سے ژاں ولژاں نوجوانوں کی کفایت شعاری کی زندگی دیکھ رہا تھا جو اسے پریشان کر رہی تھی۔ ماریوس کی کفایت شعاری شدید تھی، اور ژاں ولژاں کے نزدیک یہ لفظ مکمل معانی رکھتا تھا۔ اس نے سوال کر ہی دیا،

''تم خود اپنی سواری گاڑی کیوں نہیں رکھتے؟ ایک خوب صورت سی بند گاڑی پر صرف پانچ سو فرانک ماہانہ خرچ ہوں گے۔ تم دولت مند ہو۔''

''معلوم نہیں۔'' کوزیٹ نے جواب دیا۔

''یہ تو بالکل تُوسا کی طرح ہو گی۔'' ژاں ولژاں نے پھر کہا، ''وہ چلی گئی ہے۔ تم نے اس کی جگہ کسی اور کو نہیں رکھا ہے۔ کیوں؟''

''نکولے ہی کافی ہے۔''

''مگر تمھیں ایک لڑکی رکھنی چاہیے۔''

''کیا میرے پاس ماریوس نہیں؟''

"تمھارے پاس اپنا گھر ہونا چاہیے، اپنے ملازمین، ایک سواری گاڑی، تھیٹر میں ایک حجرہ۔ تمھارے کے لیے بہت اچھی کوئی چیز بھی نہیں۔ اپنی دولت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتیں؟ دولت خوشیوں میں اضافہ کرتی ہے۔"

کوزیٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ژاں ولژاں کی ملاقاتیں مختصر نہیں ہوتی تھیں۔ بالکل نہیں۔ جب دل ہی سرک رہا ہو تو نیچے کی طرف جاتی ڈھلان پر رُکا نہیں جاتا۔

جب ژاں ولژاں اپنی ملاقات کو طویل کرنا چاہتا، اور گزرتے وقت کو بے پروائی میں چھپانا چاہتا تو وہ ماریوس کے گُن گانے لگتا: اسے حسین و جمیل، شریف، باہمت، خوش کلام، لطیفہ گو، اور اچھا کہتا۔ کوزیٹ اس سے زیادہ کہنے لگتی۔ ژاں ولژاں پھر شروع ہو جاتا۔ دونوں کبھی تھکتے نہیں تھے۔ ماریوس — وہ لفظ تھا جو ختم نہیں ہوتا تھا۔ ان چھ حروف میں پوشیدہ ایک پوری کتاب تھی۔ اس طرح ژاں ولژاں کو دیر تک ٹھہرنے کا بہانہ مل جاتا تھا۔

کوزیٹ سے ملاقات اسے بہت اچھی لگتی تھی؛ اس کے پہلو میں وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ اس کے غم ہلکے ہو جاتے تھے۔ ایسا کئی بار ہوا تھا کہ باسک دوبار اعلان کرنے آیا تھا، "موسیو ژیلنورماں نے مجھے مادام بیرونس کو یاد دلانے کے لیے بھیجا ہے کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔"

ان دنوں گھر واپسی پر ژاں ولژاں اپنے خیالات میں گم ہو جاتا تھا۔

تو کیا اس کی حالت ایک پلّے (بچے کے نکل جانے کے بعد رہ جانے والا جو کھوکھلا رہتا ہے) جیسی تھی جو ماریوس کے دماغ پر چھا گئی تھی۔ کیا ژاں ولژاں واقعی ایک پیلا تھا جو اپنی تتلی کو دیکھنے کے لیے باربار آتا تھا؟

ایک دن وہ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ دیر ٹھہرا رہا۔ دوسرے دن اس نے دیکھا کہ آتش دان میں آگ نہیں تھی — اور خود ہی اس کی وجہ بیان کر دی، "سادہ سی بات ہے۔ اپریل کا مہینہ ہے۔ سرد موسم ختم ہو گیا ہے۔"

"خدایا! کتنی سردی ہے یہاں۔" کوزیٹ نے داخل ہوتے ہی کہا۔

"کیوں؟ نہیں تو۔" ژاں ولژاں نے کہا۔

"تو کیا آپ نے باسک کو آگ جلانے سے منع کیا تھا؟"

"ہاں، اب مئی کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔"

"مگر جون کے آخر تک ہمارے ہاں آگ روشن کی جاتی ہے۔ اس تہہ خانے میں تو

سارا سال اس کی ضرورت ہوتی ہے۔"
"میرا خیال تھا کہ آگ کی ضرورت نہیں۔"
"یہ بالکل آپ کے خیالات کے مطابق ہے۔" کوزیٹ نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔
دوسرے دن آتش دان میں آگ روشن تھی، مگر دونوں آرام کرسیاں کمرے کی دوسری جانب دروازے کے پاس رکھ دی گئی تھیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ ژاں ولیواں نے سوچا۔
اس نے کرسیاں دوبارہ اسی جگہ پر رکھ دیں۔
جلتی آگ نے دوبارہ اس کی ہمت بڑھائی۔ اس نے عام حدود سے بھی زیادہ عرصے تک بڑھا دی۔ وہ جانے کے لیے اٹھنے لگا تو کوزیٹ نے کہا "میرے شوہر نے کل مجھ سے عجیب بات کہی۔"
"کیا تھی وہ بات؟"
"اس نے مجھ سے کہا، 'کوزیٹ، ہماری سالانہ آمدنی تیس ہزار لیورے ہے۔ ستائیس ہزار تمھاری ہے، اور تین ہزار وہ ہے جو میرے نانا مجھے دیتے ہیں۔' میں نے جواب میں کہا، 'اس طرح تیس ہزار لیورے ہو جاتے ہیں۔' پھر اس نے کہا، 'کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ تین ہزار میں گزارا کرلو؟' میں نے جواب میں کہا 'کیوں نہیں۔ میں تو بے آمدنی بھی گزارا کرلوں گی بہ شرطے کہ تمھارے ساتھ رہوں۔' میں نے پوچھا، 'تم نے یہ سوال کیوں کیا؟' اس نے جواب میں کہا، 'بس میں جاننا چاہتا تھا'۔"
ژاں ولیواں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کوزیٹ شاید اس سے کسی تشریح کی توقع کر رہی تھی؛ وہ غم انگیز خاموشی میں سُن رہا تھا۔ وہ l'Homme Arme اسٹریٹ واپس گیا تو خیالات میں اتنا غرق تھا کہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے بجائے برابر والے گھر میں داخل ہوگیا۔ ابھی وہ صرف دو منزل چڑھا تھا، کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، واپس نیچے چلا گیا۔
طرح طرح کی تاویلات نے اس کے دماغ کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ماریوس کو چھ لاکھ فرانک کی رقم کے بارے میں شبہات تھے کہ یہ کہاں سے آئی ہے، کہ یہ پاک ہے کہ نہیں؟ اسے شبہ تھا کہ یہ دولت ژاں ولیواں کی تھی۔ پہلے بھی اسے اس مشتبہ دولت کے بارے میں تامّل تھا، اور وہ اس کو اپنانے پر راضی نہیں تھا۔ وہ ناپاک ذریعے سے دولت مند ہونے کے بجائے خود کو اور کوزیٹ کو مفلس رکھنا پسند کرتا تھا۔
مزید یہ کہ ژاں ولیواں کو گمان ہو چلا تھا کہ اسے گھر سے نکالا جا رہا تھا۔

اگلے دن، نچلے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ایک دھچکا سا لگا۔ آرام کرسیاں غائب تھیں۔ وہاں ایک بھی کرسی نہیں تھی۔

''ارے یہ کیا؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی کوزیٹ نے کہا ''ایک بھی کرسی نہیں۔ آرام کرسیاں کہاں گئیں؟''

''اب یہاں نہیں ہیں۔'' ژاں ولیواں نے جواب دیا۔

''بہت زیادتی کی بات ہے۔''

ژاں ولیواں نے لکنت سے جواب دیا ''میں نے باسک سے انھیں ہٹانے کے لیے کہا تھا۔''

''وجہ؟''

''مجھے آج صرف چند منٹ ہی ٹھہرنا تھا۔''

''چند منٹ ٹھہرنے کا یہ مطلب نہیں آپ کھڑے رہیں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ باسک کو ملاقات کے کمرے کے لیے کرسیوں کی ضرورت تھی۔''

''کیوں؟''

''ظاہر ہے کہ آج شام لوگ آنے والے ہیں۔''

''کسی کے آنے کی توقع نہیں۔''

ژاں ولیواں کے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

کوزیٹ اپنے شانے ہلا کر رہ گئی۔ ''کرسیاں ہٹوا دینا، اس دن آگ بجھوا دینا، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''الوداع!'' ژاں ولیواں نے بھنبھناتے ہوئے کہا۔

اس نے ''الوداع کوزیٹ'' نہیں کہا۔ اسے الوداع مادام کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔

وہ بہت برے حال میں واپس گیا۔ اس بار وہ سمجھ گیا تھا۔ اگلے دن وہ نہیں آیا۔

کوزیٹ کو اس بات کا احساس شام ہونے کے بعد ہوا۔

''کیوں'' اس نے کہا ''موسیو ژاں آج نہیں آئے؟''

اور اسے دل میں ایک کسک محسوس ہوئی، مگر ماریوس کے ایک بوسے نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔

اگلے دن بھی وہ نہیں آیا۔

کوزیٹ نے اس پر توجہ نہیں دی؛ شام گزری اور ہر روز کی طرح رات وہ آرام سے

سوئی، اور اس وقت اس بات کا خیال آیا جب وہ سو کر اٹھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے فوراً نکولے کو موسیو ژاں کے گھر یہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کیا کہ وہ بیمار تو نہیں، کہ وہ کل شام آیا کیوں نہیں۔ نکولے جواب لے کر آئی، کہ وہ بیمار نہیں۔ وہ مصروف تھا، کہ وہ جوں ہی ممکن ہوا، ملنے آئے گا۔ مزید یہ کہ وہ کہیں جانے والا بھی تھا۔ مادام کو یاد ہونا چاہیے کہ وقتاً فوقتاً سفر کرنا اس کی عادت تھی۔ وہ اس کے بارے میں پریشان نہیں ہوتے تھے۔ وہ اس بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے۔

موسیو ژاں کے گھر میں داخل ہوتے ہی موسیو ژاں کے سامنے وہی الفاظ دہرا دیے جو اس کی مادام نے کہے تھے کہ مادام نے اسے یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ موسیو ژاں پچھلی شام آئے کیوں نہیں۔

''مجھے وہاں گئے ہوئے صرف دو ہی دن تو ہوئے ہیں۔'' ژاں ولژاں نے نرمی سے کہا۔
مگر نکولے یہ جملہ نظر انداز کر گئی اور کوزیت کو بتایا نہیں۔

۞

کشش اور معدومی

بہار کے آخری مہینوں اور 1833ء کے موسم گرما کے ابتدائی مہینوں میں Marais کے راہ گیر، عام دکان دار، ڈیوڑھیوں پر بیٹھنے والے سیاہ رنگ کے نفیس لباس میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص کو دیکھتے تھے، جو ایک ہی وقت، رات کے اندھیرے میں l'Homme Arme اسٹریٹ کے پہلو سے Sainte-Croix-de-la-Bretonnerie اسٹریٹ پر نکلتا، Blancs Manteaux کے سامنے سے گزرتا، Culture-Sainte-Catherine اسٹریٹ پر چل کر، Saint-Louis اسٹریٹ میں داخل ہو جاتا تھا۔

وہاں اس کی رفتار کم ہو جاتی، سر آگے کی طرف جھک جاتا، جو نہ کچھ دیکھ سکتا نہ سن سکتا تھا؛ اس کی نظریں ایک ہی نقطے پر جمی ہوتی تھیں جو اسے ستارے جیسا محسوس ہوتا تھا، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، جہاں Filles-du-Calvaire اسٹریٹ کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔ وہ سڑک کے اس کونے سے جتنا قریب ہوتا جاتا اس کی آنکھیں زیادہ روشن ہوتی جاتی تھیں؛ ایک نوع کی روشنی نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اندرونی قطبی روشنیوں کی سی چمک پیدا کر دی تھی۔ اس کے لب ایسی مبہم حرکات کرتے تھے گویا وہ کسی ایسے شخص سے باتیں کر رہے ہوں جس کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ گویا لب بام پہنچنے کی خواہش میں وہ کہیں دو چار ہاتھ نیچے ہی نہ رہ جائے۔ اس سڑک کے اور اس کے درمیان چند ہی مکانات رہ گئے تھے، اور اس کی رفتار اتنی کم ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ آگے بڑھ ہی نہیں رہا ہے۔ اس کے سر کی آگے پیچھے حرکت اور اس کی آنکھوں کے جماؤ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مقناطیسی نوک قطب تلاش کر رہی ہو۔ آنے میں اسے جتنا بھی وقت لگتا اسے بہر حال پہنچنا تھا۔ وہ Filles-du-Calvaire

اسٹریٹ پہنچ گیا؛ پھر رُکا، ڈگمگایا، آخری مکان کے کونے پر اپنا سر آگے کی طرف کیا، اور سڑک پر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی اس الم ناک نگاہ میں کوئی شے تھی جو کسی نا ممکن کی چکا چوند کر دینے والے روشنی سے مشابہ تھی اور جنت کا کوئی عکس تھا جو اس سے قریب تھا۔ تب، وہ آنسو جو اس کی پلکوں کے کونے پر آہستہ آہستہ بن رہا تھا، گرنے کے قابل بڑا سا قطرہ بن گیا تو اس کے رخسار پر ڈھلک گیا اور اس کے منہ کے قریب پہنچ کر رُک گیا تھا۔ بوڑھے آدمی نے اس کا تلخ مزہ چکھ لیا تھا۔ پس، وہ کئی منٹ اس طرح ساکت رہا گویا پتھر کا بنا ہو، اور جب وہ پسپا ہونے لگا تو رفتہ رفتہ اس کی نظر بھی ڈھل گئی تھی۔

رفتہ رفتہ اس بوڑھے نے اپنے سفر میں کمی کرنی شروع کی اور وہ Filles- du- Calvaire اسٹریٹ کے کونے تک جاتا؛ Saint-Louis اسٹریٹ پر وہ آدھے راستے جاتا، کبھی اس سے ذرا دور، کبھی اس سے ذرا قریب۔

ایک دن وہ Culture-Sainte-Catherine اسٹریٹ کے کنارے رُکا اور ذرا فاصلے سے Filles-du-Calvaire اسٹریٹ پر نظر ڈالی۔ پھر اس نے اپنا سر دائیں سے بائیں ہلایا، گویا خود کسی چیز سے انکار کر رہا ہو، اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

جلد ہی وہ Saint-Louis اسٹریٹ تک آیا۔ Pavee اسٹریٹ تک گیا، اپنا سر ہلایا اور واپس ہو گیا۔ اس کے بعد وہ Trois-Pavillons اسٹریٹ پر آگے تک گیا۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ [گھڑی کے] اس پنڈولم کی طرح تھا جس میں کوک بھری نہیں گئی تھی، اور جس کے آگے پیچھے کی حرکت بالکل ختم ہونے سے پہلے کم ہوتی جا رہی تھی۔

ہر روز وہ اپنے گھر سے اسی وقت نکلتا تھا، وہی راستہ اختیار کرتا مگر اسے مکمل نہیں کرتا تھا، اس حقیقت سے نا بلد کہ وہ اسے کم کرتا جا رہا تھا۔ اس کا پورا وجود بس ایک ہی خیال کا اظہار کر رہا تھا: کیا فائدہ؟ اس کی آنکھیں مدھم تھیں؛ چمک سے عاری ہو گئی تھیں۔ اس کے آنسو بھی ختم ہو گئے تھے؛ اب وہ اس کی پلکوں کے کونے میں جمع بھی نہیں ہوتے تھے۔ وہ سوچنے والی آنکھ خشک ہو گئی تھی۔ بوڑھے کا سر سارس کی طرح آگے نکلا تھا؛ اس کی ٹھوڑی کبھی کبھی ہل جاتی تھی؛ اس کی پتلی سی گردن کی شکنوں کو دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ جب کبھی موسم خراب ہوتا، اس کی بغل میں چھتری ہوتی تھی، مگر اسے کبھی کھولتا نہیں تھا۔

اس علاقے کی نیک عورتیں کہتی تھیں: "یہ آدمی معصوم ہے۔" بچے اس کا پیچھا کرتے اور ہنستے تھے۔

بدقسمت پر رحم، خوش قسمت پر شفقت

شاداں ہونا [کبھی کبھی بہت] خوف ناک ہوتا ہے۔ آپ کتنے مطمئن ہو سکتے ہیں؟ ہر طرح سے مطمئن ہونے والا اس اطمینان کی کیفیت کو کیسا پاتا ہے! زندگی کا غلط مقصد — خوشی — حاصل کرتے ہوئے لوگ اصل مقصد — فرض — کو بھول جاتے ہیں۔

اس لیے اگر قاری ماریوس کو الزام دے تو یہ اس کی غلطی ہوگی۔

جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں شادی سے پہلے ماریوس نے موسیو فوشلووں سے کسی قسم کے سوالات نہیں کیے تھے، اور شادی کے بعد بھی ژاں ولژاں سے سوال کرتے ہوئے اسے خوف آتا تھا۔ اسے اس وعدے پر بھی افسوس تھا جس میں اس نے خود کو ملوث کیے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس نے اکثر خود سے کہا ہے کہ اس نے یہ رعایت دے کر غلطی کی تھی۔ اس نے ژاں ولژاں کو رفتہ رفتہ اپنے گھر سے دور کرنے اور جہاں تک ممکن ہو، کوزیت کے ذہن سے اس کے نشانات مٹانے تک خود کو محدود رکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ کسی نہ کسی طرح خود کو کوزیت اور ژاں ولژاں کے درمیان رکھا، اس طرح کہ اسے نہ اس بات کا احساس ہو اور نہ وہ اس کے بارے میں سوچ سکے۔ یہ عمل نشان مٹا دینے سے بڑھ کر تھا؛ یہ ایک نوع کا گہن تھا۔

ماریوس نے وہی کیا جو ضروری اور صحیح تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سختی اور کسی کم زوری کے بغیر ژاں ولژاں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس اہم وجوہ تھیں، قاری جنھیں پہلے دیکھ چکا ہے، اور دوسرے جنھیں بعد میں دیکھیں گے۔

عجب اتفاق کہ ماریوس کا لافیت نامی ادارے کے ایک سابق ملازم سے ایک مقدمے میں سامنا ہوا تھا جس میں اس نے [وکیل کی حیثیت میں] پیروی کی تھی، اور بغیر مانگے اسے کچھ

پُر اسرار اطلاعات بھی حاصل ہوئی تھیں جن کو، ژاں ولژاں کی اس وقت کی مخدوش حالت کی وجہ سے، خفیہ رکھنے کا اس نے وعدہ کیا تھا اور رازدانی کے باعث وہ جس کی چھان بین بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے اس کا خیال تھا کہ اس کا کچھ فرض تھا جس کی ادائیگی اس پر لازم تھی — اُس شخص تک چھ لاکھ فرانک کی بازیابی وہ جسے تمام ممکنہ محنت سے تلاش کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے اس رقم کو استعمال کرنے سے پرہیز کیا۔

کوزیٹ کو ان رازوں میں شریک نہیں کیا گیا۔

ماریوس اور کوزیٹ کے درمیان نہایت طاقتور ہم طبیعت تھی جس کی بنا پر فطری اور تقریباً میکانکی طور پر کوزیٹ وہی کرتی ماریوس جس کی خواہش کرتا تھا۔ اسے "موسیو ژاں" کے سلسلے میں ماریوس کی مرضی کا علم تھا اور وہ اسی کے مطابق کام کرتی تھی۔ اس کے شوہر کو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی؛ وہ اس کے مبہم مگر واضح اور خاموش دباؤ پر سرخم کردیتی تھی اور اندھوں کی طرح اس کی فرماں برداری کرتی تھی۔ اس معاملے میں اس کی فرماں برداری ان کاموں پر مشتمل نہیں ہوتی تھی، ماریوس جنھیں بھول جایا کرتا تھا۔ ان کاموں کی تکمیل اس کی ذمے داری نہیں تھی۔ اسے خود پتا نہیں تھا کہ اس کا نفس کیوں اس قدر اس کے شوہر کے قبضے میں ہے؛ کہ جو کچھ ماریوس کے ذہن میں ہوتا، اس کے ذہن پر بھی چھا جاتا تھا۔

ہمیں بہرحال اتنی گہرائی میں نہیں جانا چاہیے؛ ژاں ولژاں سے متعلق معاملات میں فراموشی اور نیست کاری محض اوپری یا دکھاوے کی ہوتی تھی۔ وہ بھولتی نہیں بے پروائی کرتی تھی۔ جب کہ اندر سے، وہ پُرخلوص انداز میں اس آدمی سے منسلک تھی جسے اتنے عرصے سے وہ فادر کہہ رہی تھی؛ پھر بھی وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی۔ یہ کیفیت اس کے قلبی توازن کو پریشان رکھا کرتی تھی، جس کا پلڑا صرف ایک ہی جانب جھکتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوزیٹ ژاں ولژاں کے بارے میں بات کرتی اور حیرت کا اظہار کرنے لگتی تھی۔ تب ماریوس اس کو یہ کہہ کر پُرسکون کر دیتا تھا، "میرا خیال ہے کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ کیا اس نے کہا نہیں تھا کہ وہ سفر پر جانے والا ہے؟" "یہ سچ ہے۔" کوزیٹ سوچتی اس طرح غائب ہوجانا اس کی عادت تھی۔ مگر اتنے عرصے کے لیے نہیں۔ دو یا تین بار اس نے نکولے کو معلوم کرنے کے لیے l'Homme Arme اسٹریٹ بھیجا کہ موسیو ژاں اپنے سفر سے واپس آئے ہیں یا نہیں۔ ژاں ولژاں اس سوال کا جواب "نہیں" میں دلوا دیتا تھا۔

کوزیٹ اور کچھ نہیں چاہتی تھی، اس لیے کہ پوری دنیا میں اس کی ایک ہی ضرورت

تھی — ماریوس!

ہمیں یہ بھی کہنے دیا جائے کہ کوزیٹ اور ماریوس بھی تو غائب رہے ہیں۔ وہ Vernon گئے تھے۔ ماریوس کوزیٹ کو اپنے باپ کی قبر پر لے گیا تھا۔

ماریوس رفتہ رفتہ کوزیٹ کو ژاں ولژاں سے دور کرتا گیا اور کوزیٹ دور ہوتی گئی۔

یاد رہے کہ ہم جسے اولاد کی ناشکری کہتے ہیں، ہمیشہ سزاوار سرزنش نہیں ہوا کرتی۔ یہ دراصل فطری ناشکرا پن ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہیں کہہ چکے ہیں، فطرت اپنے آگے دیکھتی ہے۔ فطرت زندہ مخلوقات کو آنے والوں اور جانے والوں میں تقسیم کرتی ہے۔ وہ جو جانے والے ہوتے ہیں پرچھائیوں کی طرف موڑ دیے جاتے ہیں؛ وہ جو آنے والے ہوتے ہیں روشنی کی طرف کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک فاصلہ ہو جاتا ہے جو بوڑھوں کے لیے تقدیر کا لکھا ہوتا ہے اور آنے والوں کے لیے غیر ارادی ہوتا ہے۔ یہ فرق، جو پہلے محسوس نہیں ہوتا، آہستہ آہستہ تکلتی ہوئی شاخوں کی علاحدگی کی طرح بڑھتا جاتا ہے۔ ڈالیوں کی، تنے سے علاحدہ ہوئے بغیر، نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کسی کی غلطی نہیں ہوتی۔ جوانی ادھر ہی جاتی ہے جدھر لطف ہوتا ہے، جشن ہوتا ہے، جھلمل کرتی روشنیاں ہوتی ہیں، محبت ہوتی ہے۔ بڑھاپا انجام کی طرف جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوتے، مگر ان کے درمیان قریبی ناتا نہیں رہ جاتا۔ جوان لوگ زندگی کے بارے میں اور بوڑھے لوگ مزار کے بارے سوچنے لگتے ہیں۔

بے چارے بچوں کو الزام نہ دو!

❁

بے تیل چراغ کی آخری جِھلمِل

ژاں ولواں اپنے گھر کے زینوں سے نیچے اترا، تین قدم لیے اور سڑک پر پہنچا، اور اسی نصف ستون پر جا کر بیٹھ گیا جس پر جون کی پانچویں اور چھٹی تاریخ کی درمیانی رات میں گاوروش نے اسے مراقبے میں پایا تھا؛ ژاں ولواں وہاں چند منٹ ٹھہرا اور زینے کے ذریعے واپس اوپر چلا گیا۔ یہ پنڈولم کی آخری حرکت تھی۔ اگلے دن وہ اپنی قیام گاہ سے باہر نہیں نکلا۔ اس سے اگلے دن اس نے اپنا بستر نہیں چھوڑا۔

اس کی دربان خاتون نے جو، بند گوبھی یا آلو اور بیگن پر مشتمل اس کا معمولی کھانا تیار کیا کرتی تھی، مٹی سے بنی بھورے رنگ کی رکابی پر نظر کی اور حیرت سے کہا، ”مگر آپ نے تو کل بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔“

”یقیناً، کھایا تو ہے۔“ ژاں ولواں نے جواب میں کہا۔

”مگر رکابی اب بھی اسی طرح بھری ہے۔“

”پانی کے جگ کی طرف دیکھو، خالی ہے۔“

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نشے میں بدمست ہیں؛ یہ ثابت نہیں ہوا کہ آپ نے کھانا کھایا ہے۔“

”ٹھیک۔“ ژاں ولواں نے کہا، ”اگر مجھے صرف پانی ہی کی بھوک ہو تو؟“

”اس کو پیاس کہتے ہیں، اور اگر کوئی اس کے ساتھ کچھ کھائے نہیں تو اس کو بخار کہتے ہیں۔“

”میں کل کھاؤں گا۔“

”یا یومِ ثلاثہ پر۔ آج کیوں نہیں؟ یہ تو وہی بات ہوئی، ’میں کل کھاؤں گا۔‘ رکابی کو

چھوئے بغیر ہی چھوڑ دیا۔ ہنڈی جیسے آلو کے پتلے پتلے قتلے کتنے اچھے تھے۔"

ژاں ولژاں نے بوڑھی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا:

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ انھیں کل کھاؤں گا۔" اس نے اپنی مہربان آواز میں کہا۔

"میں آپ سے ناراض ہوں۔" دربان عورت نے جواب میں کہا۔

وہاں ژاں ولژاں کو اس نیک عورت کے سوا کوئی انسانی مخلوق دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پیرس میں ایسی سڑکیں ہیں جن سے کبھی کوئی نہیں گزرتا اور ایسے مکانات بھی ہیں جن میں کوئی نہیں آتا۔ وہ ان ہی سڑکوں میں سے ایک، اور ان ہی مکانوں میں سے ایک میں رہتا تھا۔

ایک دن وہ باہر گیا تو کٹھیرے سے چند سو کے عوض تانبے سے بنی ایک صلیب خرید لایا، جسے اپنے بستر کے سامنے کیل سے دیوار میں نصب کر دیا۔ صلیب دیکھنے میں ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ژاں ولژاں نے اپنے کمرے سے قدم باہر نہیں نکالا۔ بستر ہی میں رہا۔ دربان عورت نے اپنے شوہر سے کہا "یہ نیک آدمی نہ بستر سے نکلتا ہے، نہ کچھ کھاتا ہے؛ اس طرح زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے اپنے غم ہیں، اور وہ رہیں گے۔ یہ بات میرے دماغ سے کبھی نہیں نکل سکتی کہ اس کی بیٹی نے غلط شادی کی ہے۔"

دربان کے شوہر نے ازدواجی حاکمیت کے لہجے میں کہا "اگر یہ دولت مند ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر بلاؤ۔ اگر دولت مند نہیں، تو اسی طرح رہنے دو۔"

"اگر ڈاکٹر نہیں ملا تو یہ مر جائے گا۔"

"اور اگر مل گیا تو؟"

"یہ مر جائے گا۔" دربان کے شوہر نے کہا۔

دربان عورت زمین پر بیٹھی پرانے سے چاقو سے پیدل چلنے والے راستے کی گھاس چھیل رہی تھی۔ گھاس کی پتیاں چھیلتے ہوئے وہ بڑبڑاتی جا رہی تھی:

"کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنا اچھا بزرگ آدمی ہے، سفید جیسے بگلا۔"

سڑک سے گزرتے ہوئے اسے علاقے کا ڈاکٹر نظر آ گیا: اس نے اپنے طور پر ڈاکٹر سے اوپر چلنے کی درخواست کی۔ "وہ دوسری منزل پر ہے۔" اس نے کہا "تمھیں اندر جانا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ نیک آدمی اپنے بستر سے ہلتا بھی نہیں؛ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔"

ڈاکٹر نے ژاں ولژاں کا معائنہ کیا اور اس سے باتیں کیں۔

ڈاکٹر نیچے اترا تو دربان عورت نے اس سے معلومات کیں۔

''جی ڈاکٹر صاحب؟''

''تمھارا مریض بہت بیمار ہے۔''

''کیا بیماری ہے اسے؟''

''بہت کچھ اور کچھ بھی نہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی شخصیت کو کھو دیا ہے جو اس کو بہت عزیز تھی۔ اس میں لوگ مر بھی جایا کرتے ہیں۔''

''اس نے کیا بتایا ہے؟''

''وہ کہتا ہے کہ وہ صحت مند ہے۔''

''کیا آپ پھر آئیں گے، ڈاکٹر صاحب؟''

''ضرور۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا، ''مگر کسی اور کو بھی آنا ہوگا۔''

۞

فوشلووں کی گاڑی سے بھاری قلم

ایک شام ژاں ولواں کو کہنیوں کے بل اٹھنے میں بھی دقت محسوس ہوئی؛ اس نے اپنی کلائی پر انگلیاں رکھیں مگر نبض نہیں ملی؛ ہلکی ہلکی سانسیں لے رہا تھا جو رک بھی جاتی تھیں؛ اسے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ وہ کم زور ہوگیا ہے، جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کسی اہم کام کے لیے اسے کوشش کرکے اٹھنا پڑا، بیٹھا، اور پھر لباس تبدیل کیا۔ اس نے اپنا کام کے وقت پہننے والا پرانا لباس زیب تن کیا۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے اسے کئی بار رکنا پڑا تھا؛ واسکٹ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں بھی اس کی پیشانی سے قطرے ٹپکنے لگے تھے۔ چوں کہ وہ اکیلا رہتا تھا، اس نے اپنا بستر خواب گاہ سے متصل چھوٹے سے کمرے میں رکھوا دیا تھا تاکہ یہ سنسان قیام گاہ کم سے کم استعمال ہو۔

اس نے اپنا تھیلا کھولا اور اس میں سے کوزیٹ کا لباس نکالا۔ اس کو بستر پر پھیلا دیا۔

بشپ کے دیے ہوئے شمع دان چمنی پر رکھے تھے۔ اس نے میز کی دراز سے دو موم بتیاں نکالیں اور شمع دان میں نصب کردیں۔ گرما کا موسم تھا۔ اگرچہ ابھی تک دن کی روشنی تھی، پھر بھی اس نے موم بتیاں روشن کردیں۔ جس کمرے میں میت رکھی ہو اس میں اسی طرح دن کی روشنی میں بھی شمعیں جلائی جاتی ہیں۔

ایک کرسی سے دوسری کرسی تک جانے میں ہر قدم اسے تھکا دیتا، اور اسے بیٹھ جانا پڑتا تھا۔ یہ وہ معمولی تھکن نہیں تھی جو قوت کی تجدید میں صرف ہوتی ہے؛ ہر ممکنہ حرکت سے بچ رہنے والی قوت تھی؛ [پانی کی طرح] بہنے والی زندگی تھی جو زیادہ محنت سے کی جانے والی کوشش کے باعث قطرہ قطرہ خارج ہوتی ہے، جس کی کبھی تجدید نہیں ہوتی۔

جس کرسی میں اس نے خود کو گر جانے دیا وہ آئینے کے سامنے رکھی تھی، جو مہلک تھا

اس کے لیے، اور فیض رساں ماریوں کے لیے، جس میں اس نے blotting کتاب کے کاغذ پر لکھی کوزیٹ کی تحریر پڑھی تھی ۔آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آئی، اور خود کو پہچان نہیں سکا۔اس کی عمر اسی برس تھی ۔ ماریوں کی شادی سے پہلے وہ مشکل سے پچاس کا لگتا تھا۔ گویا ایک برس میں تیس برس بڑھ گئے تھے۔اس کی پیشانی کی شکنیں عمر کی نہیں موت کی پُر اسرار نشانیاں تھیں؛ ناخن کا کھوکھلا پن محسوس ہوتا تھا؛ رخسار لٹک گئے تھے؛ چہرے کی جلد کا رنگ ایسا ہو گیا تھا جیسے اس پر مٹی جم گئی ہو؛ منہ کے کونے اس طرح ڈھل گئے تھے جیسے قدیم زمانے کے مقبروں پر کھدے ہوئے mask میں بنے ہوتے ہیں۔اس نے سرزنش کے انداز میں خلا پر نظر کی، اس طرح جیسے کسی وجود کو کسی سے شکایت کی وجوہ میسر ہو گئی ہوں۔

اس کی عجیب حالت تھی؛ ملال کا آخری دور، جس میں افسردگی سیال نہیں رہتی، بقول شخصے، جم جاتی ہے؛ نفس کے چہرے پر مایوسی کا ڈھیلا سا جم جاتا ہے۔

رات ہو چکی تھی۔ بڑی محنت سے وہ ایک میز اور ایک آرام کرسی گھسیٹ کر آتش دان کے قریب لے گیا، اور میز پر ایک قلم، دوات اور چند شیٹ کاغذ کے رکھ دیے۔

اس کے بعد اسے بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا۔ ہوش آیا تو پیاس لگی تھی۔ چوں کہ وہ جگ اٹھا نہیں سکتا تھا، اسے اپنی جانب جھکا کر اپنے ہونٹ لگا دیے اور چند گھونٹ بھر لیے۔

چوں کہ بہت دنوں سے نہ قلم استعمال ہوا تھا نہ دوات؛ قلم کی نوک مڑ گئی تھی، روشنائی خشک ہو گئی تھی؛ اسے بہ جبر اٹھ کر دوات میں پانی کے چند قطرے ڈالنے تھے؛ وہ بیٹھے بیٹھے یہ کام کئی بار کی کوشش کے بعد ہی کر سکا تھا؛ اور مجبوراً قلم کے دوسرے سرے سے ہی لکھ سکتا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنی پیشانی صاف کرتا جا رہا تھا۔

اس کے بعد وہ پلنگ کی طرف مڑا، بیٹھا رہا، اس لیے کہ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا اور اپنے سیاہ رنگ کے لبادے اور دوسری پسندیدہ اشیا کو گھور رہا تھا۔

ان سب کاموں میں کئی گھنٹے صرف ہوئے مگر چند منٹ محسوس ہو رہے تھے۔

اچانک اس پر کپکپی طاری ہو گئی؛ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بچہ اس پر غالب آتا جا رہا تھا تھا؛ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں جو بشپ کے دیے ہوئے روشن دان میں نصب شمعوں سے روشن تھی اور قلم اٹھایا۔اس کا ہاتھ کانپا؛ مگر اس نے آہستہ آہستہ مندرجہ ذیل سطریں لکھیں:

"کوزیٹ! شاد باد! میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔تیرے شوہر نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے چلا جانا چاہیے۔اگرچہ وہ صحیح تھا مگر جو کچھ وہ سمجھ رہا تھا اس میں کچھ غلطیاں بھی تھیں، بہت اچھا آدمی

ہے۔ میرے مرنے کے بعد بھی اس سے محبت کرنا۔ موسیو پوں مرجی! میری پیاری بیٹی سے محبت کرنا۔ کوزیٹ! یہ کاغذ تجھے ملے گا؛ میں تجھے یہ سب بتانا چاہتا ہوں؛ تجھے اعداد بھی نظر آجائیں گی، اگر مجھ میں یاد کرنے کی طاقت ہوئی تو؛ ٹھیک سے سُن! یہ دولت واقعی تیری ہے۔ سارا معاملہ یہ ہے: سفید jet [ایک قیمتی نگینہ] ناروے سے آتا ہے، سیاہ jet انگلستان سے آتا ہے، سیاہ شیشے سے بنے زیورات جرمنی سے آتے ہیں۔ Jet سب سے ہلکا، نفیس ترین، اور سب سے قیمتی نگینہ ہوتا ہے۔ اس کی نقل فرانس میں اور جرمنی میں بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے بنانے کے لیے دو مربع انچ کی نہائی (anvil) اور لاکھ کو نرم بنانے کے لیے شراب سے بنی اسپرٹ سے جلنے والے لیمپ درکار ہوتے ہیں۔ لاکھ پہلے رال اور [جلے ہوئے دھوئیں] lampblack سے بنائی جاتی تھی، اور فی پاؤنڈ چار لیورے لاگت آتی تھی۔ میں نے اسے گوند [ایک قسم کے چپچپے مادّے سے جو مخصوص حشرات خارج کرتے ہیں] shellac اور تارپین سے بنانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اس میں تیس سُو سے زیادہ لاگت نہیں آتی اور یہ زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ بکسوئے بنفشئی رنگ کے شیشے سے بنائے جاتے ہیں، جنھیں اسی لاکھ سے چھوٹے ڈھانچوں سے چپکایا جاتا ہے جو سیاہ لوہے کے ہوتے ہیں۔ لوہے سے بننے والے زیور کے لیے بنفشئی رنگ کا شیشہ ضروری ہوتا ہے؛ سونے کے زیورات کے لیے کالے رنگ کا شیشہ درکار ہوتا ہے۔ ہسپانیہ اس کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ وہ jet کا ملک ہے جہاں.....''

یہاں تک لکھنے کے بعد وہ رُک گیا؛ قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اس پر اُن سسکیوں کا دورہ پڑا جو کبھی کبھی وجود کی اندرونی گہرائیوں سے نکلتی ہیں؛ بے چارے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا، اور مراقبے میں چلا گیا۔

''اُف!'' اس نے اپنے اندرون میں چیخ کر کہا (الم ناک چیخیں، صرف خدا ہی سنتا ہے)

''سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اب میں اسے کبھی دیکھ نہیں سکوں گا۔ وہ تبسم ہے جو مجھ پر سے گزر گیا ہے۔ میں اب، اسے دوبارہ دیکھے بغیر ہی، اندھیروں میں چلا جانے والا ہوں۔ اُف! ایک منٹ! صرف ایک لمحہ اس کی آواز سننے کے لیے؛ اس کے لباس کو چھونے کے لیے؛ اسے گھور کر دیکھنے کے لیے؛ اسے، اس ملکوتی وجود کو، اور پھر مر جانے کے لیے! مرنا کوئی بات نہیں، خوف ناک بات اسے دیکھے بغیر مر جانا ہے۔ وہ مجھے دیکھے؛ مجھ سے کچھ کہے؛ کیا کسی کو اس سے کوئی نقصان ہوگا؟ نہیں! سب کچھ ختم ہو گیا ہے، اور ہمیشہ کے لیے۔ یہاں میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرے خدا! میں اسے پھر کبھی نہیں دیکھ سکوں گا!''

عین اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

۞

سیاہ روشنائی کی بوتل جو صرف سفید کر سکتی ہے

اسی دن یا اگر زیادہ درستی سے کہا جائے تو اسی شام، جب ماریوس میز سے اٹھا اور اپنے مطالعے کے کمرے میں جانے والا تھا اس لیے کہ اسے ایک مقدمے کے کاغذات دیکھنے تھے، باسک نے یہ کہتے ہوئے، اسے ایک خط دیا، "وہ شخص جس نے یہ خط لکھا ہے، چھوٹے کمرے میں بیٹھا ہے۔"

کوزیٹ نانا کا ہاتھ تھامے باغیچے میں چہل قدمی میں مصروف تھی۔

خط بھی، جو کسی آدمی کی طرح، بظاہر غیر دلچسپ ہو سکتا ہے، گھٹیا کاغذ، بے احتیاطی سے تہہ کیا ہوا تھا— کچھ مراسلوں کی شکل ہی گھناؤنی ہوتی ہے۔ باسک جو خط لایا تھا اسی نوعیت کا تھا۔

ماریوس نے خط لے لیا۔ اس سے تمباکو کی باس آ رہی تھی۔ بسا اوقات باس بھی یادیں تازہ کر دیتی ہے۔ ماریوس تمباکو کو پہچان گیا۔ اس نے لکھے ہوئے پتے پر نظر کی:

موسیو کے لیے!

موسیو بیرن پوں مرسی بمقام اپنے ہوٹل۔"

تمباکو کی پہچان سے وہ تحریر بھی پہچان گیا۔ حیرت کے بھی روشنی کے اپنے جھماکے ہوا کرتے ہیں۔ ان جھماکوں نے ماریوس کو روشن کر دیا تھا۔

اس باس کے احساس نے، یادوں کی پُر اسرار مدد سے اس کے اندر کی پوری ایک دنیا کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ یقینی طور پر یہ ایک کاغذ تھا؛ اس کے تہہ کرنے کا انداز، اور روشنائی کا مدھم رنگ جانا پہچانا تھا؛ تحریر بھی جانی پہچانی تھی، بالخصوص تمباکو کی باس بھی وہی تھی۔

اس کے ذہن میں تھانردیے کا چہرہ ابھر آیا۔

اتفاق کی لہریں بھی عجیب ہوا کرتی ہیں۔ ان دو خوش بوؤں میں سے ایک، جس کا وہ سرگرمی سے متلاشی تھا، جس کے سلسلے میں اس نے اتنی کوششیں کی تھیں، جسے ہمیشہ کے لیے بھول جانا تھا، از خود آئی اور اس کے سامنے پیش ہوگئی تھی۔

اس نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا:

"موسیولی بیرن!

"اگر اس عظیم ترین وجود نے مجھے لیاقت عطا کی ہوتی تو میں بھی بیرن تین آرد انسٹی ٹیوٹ (آف سائنسز) کا رُکن ہوتا، مگر میں بیرن نہیں ہوں۔ میں ویسا ہی ہوں؛ میں بہت خوش قسمت ہوں گا اگر میرا حافظہ جناب عالی کی مہربانیوں کے لیے میری سفارش کر سکے۔ آپ مجھے جس فائدے کا اعزاز بخشیں گے وہ دو طرفہ ہوگا۔ میرے پاس ایک شخصیت سے متعلق ایک راز ہے۔ یہ شخصیت آپ سے متعلق ہے۔ میں یہ راز آپ کے حوالے کر سکتا ہوں؛ اس خواہش کے ساتھ کہ میں خود بھی آپ کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہوں۔ میں آپ کو وہ راز فراہم کر سکتا ہوں جس کی مدد سے آپ اپنے معزز خاندان سے اس مشکوک طور پر بلند درجے کی شخصیت مادام لی بیرن کو جسے اس میں ہونے کا حق نہیں، آسانی سے خارج کر سکتے ہیں۔ دستبرداری کے بغیر نیکی زیادہ دیر تک جرم کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

موسیولی بیرن کے احکامات کا منتظر!

بصد احترام

تین آرد"

دستخط جعلی نہیں، بس ذرا مختصر تھے۔

مزید یہ کہ بے سروپا باتیں اور علم الحروف انکشاف کی تکمیل کر دیا کرتے ہیں۔

ماریوس کا جوش قابلِ دید تھا۔ ابتدائی حیرت کے بعد، اسے یک گونہ خوشی کا احساس ہوا۔ اگر وہ اس دوسرے آدمی کو پا جاتا وہ بہت دنوں سے جس کی تلاش میں تھا جس نے اُسے، ماریوس کو، بچایا تھا تو اسے مزید کسی خواہش کی ضرورت نہ رہ جاتی۔

اس نے اپنی خفیہ دراز کھولی، کئی بینک نوٹ نکالے، اپنی جیب میں رکھے، دراز بند کی اور گھنٹی بجائی۔ باسک نے دروازے سے جھانکا۔

"اس آدمی کو اندر لے آؤ۔" ماریوس نے کہا۔

باسک نے پکار کر کہا "موسیو تین آرد۔"

ایک آدمی داخل ہوا۔

ماریوس کے لیے ایک اور حیرت! داخل ہونے والا آدمی اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔

آدمی عمر رسیدہ تھا؛ موٹی سی ناک تھی اس کی؛ ٹھوڑی پالاپوش میں چھپی تھی؛ آنکھوں پر سبز رنگ کا چشمہ تھا جس پر سبز کتاں کی دہری جالی پڑی تھی۔؛ انگلستان کی اشرافیہ کے کوچوانوں کی طرح اس کے سر کے بال مصنوعی بالوں کی طرح پیشانی پر چپکے ہوئے تھے۔ اس کے بال بھورے تھے؛ سر سے پیر تک سیاہ لباس میں ملبوس تھا، جو تار تار مگر صاف ستھرا تھا؛ جیبی گھڑی کی زنجیر میں لٹکی کئی مہریں گھڑی کا تاثر دیتی تھیں؛ ہاتھ میں ایک پرانی سی ہیٹ تھی۔ ذرا جھک کر چلتا تھا جس کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی کا خم زیادہ واضح ہو گیا تھا۔

پہلی چیز جو دیکھنے والے کی نظر کو اپنی جانب متوجہ کرتی تھی، وہ اس شخص کا کوٹ تھا؛ اس کے بٹن احتیاط سے بند کیے گئے تھے اور اتنا ڈھیلا ڈھالا تھا کہ اس کے لیے بنایا نہیں گیا تھا۔

یہاں، موضوع سے ایک مختصر انحراف لازم ہو گیا ہے۔

اس زمانے میں پیرس میں Arsenal کے قریب Beautreillis اسٹریٹ پر نچلے درجے کے مکان میں ایک ذہین یہودی رہتا تھا جس کا پیشہ کسی ولن کو ایمان دار آدمی میں تبدیل کرنا تھا۔ یہ تبدیلی طویل عرصے کے لیے نہیں ہوتی تھی جو ولن کے لیے شرمندگی کا باعث ہو سکتی۔ ایک دو دن کی تبدیلی، جس کے لیے تیس سو ادا کرنے پڑتے تھے، صرف لباس کے ذریعے ہوتی تھی جو دنیا بھر کی ایمان داری سے جہاں تک ممکن تھا، مشابہ ہوتی تھی۔ اس لباس کو the Changer کہتے تھے؛ یہ نام پیرس کے جیب کتروں نے دیا تھا، کہ انھیں اس سے بہتر کوئی اور نام نہیں ملا تھا۔ اس کے پاس لباسوں سے بھری ایک الماری تھی۔ چیتھڑے، جن سے وہ لوگوں کو فریب دیتا تھا، تقریباً مکمل ہوتے تھے۔ اس کے پاس طرح طرح کے لباس تھے؛ اس کی دکان کی ہر کھونٹی پر سماجی درجے کا، تار تار اور گھسا ہوا لباس آویزاں ہوتا تھا؛ ادھر مجسٹریٹ کا سوٹ لٹکا ہے؛ ادھر پادری کا لبادہ ٹنگا ہے؛ دور فاصلے پر بینکر کا لباس ہے، تو کونے میں فارغ فوجی افسر کی وردی؛ کہیں کسی جگہ ادیب کی پوشاک اور کہیں مدبرین کا لباس بھی نظر آتا تھا۔

یہ شخص ڈراما کرنے والوں کے لیے لباس سازی کرتا تھا، جو پیرس میں فریب دہی کے کھیلوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کی کارگاہ سبز رنگ کے ایک کمرے میں تھی جس میں بدمعاشی پناہ لیتی تھی۔ خستہ حال لباس میں ملبوس ایک عیار اس کے لباسوں کے کمرے میں داخل ہوا، تیس سو جمع کیے اور اس کردار کے مطابق جو اسے ادا کرنا تھا لباس منتخب کیا، اور زینے سے

اترتے وقت وہ بد معاش کوئی اور ہی شخص بن گیا تھا۔ اگلے دن، کپڑے واپس کیے گئے، اور تبدیلی کرنے والے کے ساتھ، جو ہر چیز کے بارے میں چوروں پر اعتماد کرتا تھا، دھوکا نہیں کیا گیا تھا۔ ان کپڑوں میں اسے ایک تکلیف ہوتی تھی؛ وہ پہننے والوں کے جسم پر فٹ نہیں ہوتے تھے؛ ایک پر ڈھیلے ڈھالے تو دوسرے پر تنگ؛ کسی کے لیے موزوں نہیں ہوتے تھے۔ ہر جیب کترا جو عام انسان سے بڑا یا چھوٹا تھا، اس کے لیے یہ لباس نا مناسب تھے۔ ضروری تھا کہ پہننے والے نہ زیادہ موٹے ہوں نہ زیادہ دبلے پتلے۔ تبدیلی کرنے والے نے صرف عام آدمی کے لحاظ سے لباس تیار کیے تھے۔ جو بدمعاش پہلے ہاتھ لگا، نہ تگڑا تھا نہ کم زور، نہ قد آور تھا نہ بونا، اس کی پیمائش لے لی گئی تھی۔ اس لیے لباسوں کی موافقت میں مشکلات کے باعث تبدیلی کرانے والے گاہک جتنی جلد ممکن ہوا اس سے الگ ہو جاتے تھے۔ اتنا، صرف خصوصی لباسوں کے بارے میں۔

مدبرین کے سوٹ، مثال کے طور پر، جو سر سے پاؤں تک سیاہ ہوتے تھے، مناسب تھے مگر [اٹھارہویں صدی کے مشہور سیاست دان ولیم] پٹ کے لیے بہت بڑے، اور [سلطنت روما کی ریاست] Castelcicala کے کپتان جرنیل کے لیے بہت چھوٹے تھے۔ تبدیلی کرنے والے کی فہرست کے مطابق مدبرین کے لیے بنائے گئے لباس مندرجہ تفصیل کے مطابق بنائے گئے تھے:

''سیاہ کپڑے کا کوٹ، سیاہ اونی کپڑے کا پتلون، ریشمی واسکٹ، جوتے اور دوسرے لوازم۔'' حاشیے پر لکھا تھا: سابق سفیر، اور اس کے ساتھ ایک اور رقعہ تھا: ''علاحدہ ڈبے میں، نفاست سے بنائی گئی مصنوعی گھونگھریالے بالوں کی وگ، سبز شیشے کی عینک، روئی میں لپیٹے ایک انچ لمبے دو عدد پَر'' سابق سفیر، مدبر کے لیے۔ پورا لباس خستہ تھا؛ سلائی کے تاگوں کا رنگ سفید ہو گیا تھا، کہنی کے قریب کاج کے برابر گول سوراخ تھا؛ سینے پر لگے بٹنوں میں سے ایک بٹن غائب تھا؛ یہ تھی تفصیل۔ اور چوں کہ مدبر کا ہاتھ ہمیشہ اس کے کوٹ پر، اس کے دل کے قریب ہونا چاہیے، اس کا کام غائب بٹن کی جگہ کو چھپانا بھی تھا۔

اگر ماریوس، پیرس کے پُراسرار انداز میں کام کرنے والے اداروں کا عادی ہوتا تو اس نے تبدیلی کرنے والے کی دکان سے اٹھائے ہوئے مدبر کے لباس میں ملبوس اس ملاقاتی کو فوراً پہچان لیا ہوتا، جسے باسک ابھی اندر لایا تھا۔ شاید، جس شخص سے اسے ملاقات کی توقع تھی اس کے بجائے کوئی اور آدمی اندر آ گیا تھا اور اس کو موقعے سے فائدہ اٹھاتے دیکھ ماریوس مایوس ہو گیا تھا۔

جب وہ شخص ضرورت سے زیادہ آداب و تسلیمات کر رہا تھا، ماریوس نے اس کا سر سے پاؤں تک معائنہ کرتے ہوئے اکھڑے لہجے میں سوال کیا، ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

اس آدمی نے ایسی خوش خلقی سے دانت نکال کر جواب دیا، گھڑیال کا مصنوعی مجسم بھی جس سے سبق حاصل کر سکتا تھا، "ناممکن ہے کہ سماج میں کہیں اس ناچیز کو موسیو لی بیرن سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں، چند برس قبل، موسیو سے ذاتی طور مادام Bagration Princess کے گھر میں، اور فرانس کے لارڈوائی کاؤنٹ Dambray کے ملاقاتیوں کے کمروں میں مل چکا ہوں۔" دھوکے باز لوگ ہمیشہ اس شخص کو پہچان لینے کا بہانہ کرنے میں طاق ہوتے ہیں جنھیں وہ جانتے بھی نہیں۔

ماریوس اس شخص کے لہجے اور انداز گفتگو پر غور کر رہا تھا، اور اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی؛ کھردری اور تیز آواز میں گفتگو کے بجائے جس کی اسے توقع تھی، اس شخص کے الفاظ ناک سے نکل رہے تھے۔

ماریوس پریشان ہو گیا۔

"میں نہ مادام Bagration اور نہ موسیو Dambray سے واقف ہوں۔" اس نے کہا، "میں نے ان دونوں کے گھروں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھا۔"

جواب بہت غیر اخلاقی تھا جب کہ وہ شخصیت ہر قیمت پر خوش خلقی کے مظاہرے پر تُلی تھی۔ "تب تو ہماری ملاقات شیتو بریاں (Chateaubriand) کے گھر ہوئی ہوگی، جہاں میں نے حضور کو دیکھا ہوگا۔ میں شیتو بریاں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بہت تلطف والا انسان ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا ہے، تھنی آرد، میرے دوست! کیا تم کبھی میرے ساتھ وائن کا ایک جام نہیں پیو گے؟"

ماریوس کی سختی بڑھتی جا رہی تھی، "مجھے موسیو ڈی شیتو بریاں سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں۔ اب ہمیں اس گفتگو کو مختصر کر دینا چاہیے۔ کہیے، آپ کیا چاہتے ہیں؟"

سخت لہجے کے باعث وہ شخص اور زیادہ خم ہوا۔

"موسیو لی بیرن! از راہِ کرم میری عرض تو سن لیجیے۔ امریکا میں، پناما کے ضلع کے قریب ایک گاؤں ہے 'جویا' نام کا۔ یہ گاؤں صرف ایک مکان ہے؛ ایک بڑے سے تین منزلہ مربعوں پر بنے مکان پر مشتمل ہے۔ مکان کی تعمیر سورج کی تمازت میں خشک کی گئی اینٹوں سے کی گئی تھی۔ اس کا ہر مربع لمبائی میں پانچ سو فٹ ہے؛ ہر منزل نچلی منزل سے بارہ فٹ پیچھے کی طرف بنائی گئی ہے، اور اس طرح ہر منزل کے سامنے ایک چبوترا سا بن گیا ہے، اور عمارت کی صورت گرداب کی سی ہو گئی ہے، جس کے مرکز کے اندرون میں ایک صحن ہے جہاں سامان،

ہتھیار اور گولا بارود رکھے جاتے ہیں؛ اس مکان میں نہ کھڑکی ہے؛ نہ موکھے ہیں؛ نہ دروازے ہیں؛ نہ زینے ہیں؛ نہ زمینی منزل سے پہلی منزل تک چڑھنے والی سیڑھیاں ہیں؛ نہ پہلی منزل سے دوسری منزل، دوسری منزل سے تیسری منزل جانے کے زینے ہیں؛ نہ اندرونی صحن میں اترنے کے لیے زینے ہیں؛ نہ کمروں میں دروازے ہیں، نہ trap-doors ہیں، نہ کمروں کے لیے زینے ہیں نہ سیڑھیاں ہیں؛ شام کے وقت traps بند کر دیے جاتے ہیں۔ سیڑھیاں ہٹالی جاتی ہیں؛ توڑے کی بندوقوں اور چھوٹی اور سامنے سے چوڑی نالوں کی بندوقوں کی تربیت دی جاتی ہے؛ دن میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں؛ دن میں گھر ہوتا ہے؛ رات میں قلعہ ہو جاتا ہے؛ اس میں آٹھ سو افراد رہتے ہیں — اس لیے وہ ایک گاؤں ہے۔ اتنی احتیاط کس لیے؟ اس لیے کہ ملک خطرناک ہے: آدم خوروں سے بھرا ہے۔ تو پھر لوگ وہاں جاتے کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ملک دیکھنے کے قابل ہے؛ اس لیے کہ وہاں سونا پایا جاتا ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ماریوس نے مداخلت کی، جو مایوسی سے نکل کر بے صبری کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔

"موسیو لی بیرن! میں ایک پریشان حال سفارت کار ہوں۔ قدیم تہذیب نے مجھے نظر انداز کر دیا ہے۔ میں وحشیوں کو آزمانا چاہتا ہوں۔"

"تو؟"

"موسیو لی بیرن! خود بینی اس دنیا کا قانون ہے۔ پرولتاری کسان عورت جو دن بھر محنت کرتی ہے، جب محنت دیکھتی ہے تو باغی ہو جاتی ہے؛ کسان مالکن، جو اپنے کھیتوں میں محنت کرتی ہے بغاوت نہیں کرتی۔ مفلس آدمی کا کتا دولت مند آدمی پر بھونکتا ہے؛ دولت مند آدمی کا کتا مفلس پر بھونکتا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کے لیے ہوتا ہے۔ خود غرضی — یہی آدمیوں کا مقصد ہوتی ہے۔ سونا مقناطیس ہوتا ہے۔"

"تو پھر؟ بات ختم کیجیے نا۔"

"میں 'جویا' جا کر رہنا چاہتا ہوں۔ ہم تین افراد ہیں۔ میری بیوی ہے اور ایک نوجوان خاتون، بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ سفر طویل ہے اور قیمت گراں۔ مجھے کچھ رقم چاہیے۔"

"مجھے اس سے کیا مطلب؟" ماریوس نے مطالبہ کیا۔

اجنبی نے بالاپوش میں ڈھکی گردن آگے کی طرف نکالی، جو کرگس کا انداز ہوتا ہے، اور اضافہ شدہ تبسم کے ساتھ جواب دیا، "موسیو لی بیرن نے شاید میرے خط پر غور نہیں کیا ہے۔"

اس نے سچ کہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رقعے کا اصل مقصد ماریوس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ اس نے خط کے بجائے تحریر دیکھی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا، مگر ایک لمحہ قبل ایک نئی ابتدا فراہم ہو گئی تھی۔ ''میری بیوی اور ایک نوجوان خاتون۔''

ماریوس کی چھیدنے والی نظریں اس پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ کسی تفتیش کرنے والے جج کی نگاہ اس سے بہتر کام نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے خود کو صرف جواب دینے تک محدود کر لیا تھا۔ ''ٹھیک ٹھیک بیان کرو۔''

اجنبی نے اپنے دونوں ہاتھ، دو چھوٹی جیبوں میں داخل کیے، اپنی کمر سیدھی کیے بغیر کھڑا ہوا؛ وہ اپنے سبز رنگ کے چشمے سے ماریوس کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''یہی سہی، موسیو لی بیرن! اب میں مطلب پر آتا ہوں۔ آپ کو فروخت کرنے کے لیے میرے پاس ایک راز ہے۔''

''راز؟''

''جی ہاں، راز!''

''جو مجھ سے متعلق ہے؟''

''کسی حد تک۔''

''کیا ہے وہ راز؟'' ماریوس اس کی بات سننے اور اسے زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

''میں بلا اجرت اپنی بات شروع کر رہا ہوں۔'' اجنبی نے کہا، ''آپ خود دیکھ لیں گے کہ میں کام کا آدمی ہوں۔''

''بولو۔''

''موسیو لی بیرن! آپ کے گھر میں ایک چور اور قاتل داخل ہو گیا ہے۔''

ماریوس کانپ گیا۔

''میرے گھر میں؟ نہیں تو!'' اس نے کہا۔

پُرسکون اجنبی نے کہنی سے اپنی ہیٹ صاف کرتے ہوئے کہا:

''قاتل بھی ہے اور چور بھی۔ یاد رہے، موسیو لی بیرن! کہ میں یہاں ثبوت کی بات نہیں کر رہا ہوں، ان ثبوت کی جو ناکارہ ہو چکے ہیں، قانون کی حدود کے باعث اور خدا سے ندامت کے اظہار کے باعث مٹ چکے ہیں۔ میں حالیہ ثبوت کی بات کر رہا ہوں، حقائق کی، جو ابھی تک انصاف کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ اس آدمی نے اپنے آپ کو آپ کے اعتماد میں داخل

کر دیا ہے؛ ایک جعلی نام کی مدد سے آپ کے خاندان کا حصہ بن گیا ہے۔ میں آپ کو اس کا اصل نام بتانے والا ہوں۔ اور یہ کسی اجرت کے بغیر ہوگا۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"اس کا نام ژاں ولژاں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میں مفت میں آپ کو یہ بھی بتانے والا ہوں کہ یہ کون ہے؟"

"کہتے رہو۔"

"یہ ایک سابق سزا یافتہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں، اس لیے کہ میں آپ کو بتانے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔"

"جی نہیں! میں پہلے سے جانتا ہوں۔"

ماریوں کے سرد لہجے، "میں جانتا ہوں" کی تکرار، اور اس کے ایجاز نے جو گفتگو میں معاون نہیں تھا، اجنبی کے دھواں دیتے غصے میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے ماریوں کو گھور کر دیکھا، مگر فوراً ہی اس کی نگاہ کی روشنی بجھ سی گئی۔ اس کی تیز نگاہ اس قسم کی تھی جسے وہی پہچان سکتا ہے جو آنکھوں کو دیکھ رہا ہو۔ یہ نگاہ ماریوں سے بچ نہیں سکی۔ کچھ جھما کے کچھ نفوس سے ہی صادر ہوتے ہیں اور خیالات وہ جھروکا جسے آنکھ کہتے ہیں، ان سے روشن ہو جاتا ہے: چشمہ کچھ چھپا نہیں سکتا؛ ذرا جہنم پر شیشے کے چادر رکھنے کی کوشش کیجیے!

اجنبی پھر مسکرانے لگا۔

"میں خود کو موسیو لی بیرن کی تردید کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ بہر حال، آپ کو دیکھنا چاہیے کہ میں باخبر آدمی ہوں۔ اب میں جو بات بتانے جا رہا ہوں وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ اس کا تعلق مادام لی بیرن سے ہے۔ یہ غیر معمولی راز ہے۔ یہ راز برائے فروخت ہے— پہلی پیش کش صرف آپ کے لیے۔ بہت ارزاں؛ صرف بیس ہزار فرانک!"

"دوسرے رازوں کی طرح میں اس راز سے بھی واقف ہوں۔" ماریوں نے کہا۔

اس شخص نے اجرت میں کچھ کمی کی ضرورت محسوس کی۔

"موسیو لی بیرن! دس ہزار فرانک، اور میں راز اگل دوں گا۔"

"میں پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ کے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں۔ جو کچھ آپ کہنا

چاہ رہے ہیں، میں اس سے واقف ہوں۔"

اس آدمی کی آنکھ میں ایک تازہ جھماکا ہوا۔ اس نے چیخ کر کہا:

"مگر آج مجھے کچھ کھانا بھی تو ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ایک غیر معمولی راز ہے۔ موسیو لی بیرن! اچھا، میں بتا دوں گا۔ بس مجھے بیس فرانک دے دیجیے۔"

ماریوس نے اسے غور سے دیکھا، "میں تمھارے غیر معمولی راز سے اسی طرح واقف ہوں جیسے ژاں ولژاں کے نام سے واقف تھا؛ جیسے میں تمھارا اصلی نام جانتا ہوں۔"

"میرا نام؟"

"ہاں!"

"یہ بالکل مشکل نہیں، موسیو لی بیرن! مجھے ہی لکھنے اور آپ کو بتانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ تھن آردا!"

"......ڈیئے"

"نام اے؟"

"تھن آردیئے"

"کون ہے وہ؟"

خطرے کی حالت میں خار پشت کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں، بھنورا موت کا بہانہ بنا لیتا ہے؛ یہ آدمی قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر اس نے چٹکی سے اپنے کوٹ کی آستین پر پڑی گرد جھاڑنے کی کوشش کی۔

ماریوس کہتا رہا، "تم ژاندریت مزدور بھی ہو، فاباں تو مسخرے بھی ہو، Genflot شاعر بھی ہو، ہسپانوی ڈان الوارس بھی ہو، اور Mistress Balizard بھی۔"

"Mistress کیا؟"

"اور Montfermeil میں تم ایک شراب خانہ بھی چلاتے تھے۔"

"شراب خانہ! ہرگز نہیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ تمھارا اصل نام تھن آردیئے ہے۔"

"میں انکار کرتا ہوں۔"

"اور یہ بھی کہ تم اس علاقے کے بدمعاش بھی ہو۔" اور پھر ماریوس نے اپنی جیب سے ایک بینک نوٹ نکال کر اس کے چہرے پر پھینک دیا۔

"شکریہ! معاف کیجیے گا، بس پانچ سو فرانک؟ موسیو لی بیرن!"

وہ مغلوب آدمی جھکا، نوٹ اٹھایا اور اس کی پڑتال کی۔

"پانچ سو فرانک!" حواس باختہ پھر گویا ہوا۔ اس نے دھیمے لہجے میں ہکلاتے ہوئے کہا، "سچا اور تیز آدمی ہے۔"

اور پھر صاف گوئی سے کہا "اچھا، یہی سہی" اس نے چیخ کر کہا "اب ہمیں پُرسکون ہو جانا چاہیے۔"

اور بندر کی سرعت سے، اپنے بال پیچھے کی جانب کرتے ہوئے، اپنا چشمہ کھینچ کر اتارتے ہوئے، اپنی ناک پر لگے دو پروں کو نوچتے ہوئے جن کا ابھی تذکرہ کیا جا چکا ہے، اور اس کتاب کے ایک اور صفحے پر بھی کیا جا چکا ہے، اس نے [اپنے چہرے پر چڑھے ہوئے] چہرے کو اس طرح نوچ لیا جیسے آدمی اپنی ہیٹ اتارتا ہے۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں؛ اس کی ناہموار پیشانی پر، جو کئی جگہ سے دبی اور ابھری تھی، بھیانک شکنیں پڑ گئی تھیں جو صاف نظر آ رہی تھیں؛ اس کی ناک پرندے کی منقار کی طرح نوکیلی ہو گئی تھی؛ اس آدمی کا خوف ناک اور تیز فہم اور شکاری بشرہ دوبارہ ظاہر ہو گیا تھا۔

"موسیو لی بیرن بہت معصوم انسان ہیں۔" اس نے صاف آواز میں کہا، جس کی بھنبھناہٹ غائب ہو گئی تھی، "میں تین آردیے ہوں۔" اور اس نے اپنی خم زدہ پشت سیدھی کر لی۔

تین آردیے، جو دراصل وہی تھا، عجیب حیرانی میں تھا۔ وہ حیران کرنے آیا تھا اور خود حیران ہو گیا تھا۔ اس رسوائی کی قیمت پانچ سو فرانک تھی، اور اس نے یہ قیمت قبول کر لی تھی؛ مگر وہ کم بھونچکا نہیں تھا۔

اس نے بیرن پوں مرسی کو پہلی بار دیکھا تھا، اور بدلے ہوئے بھیس کے باوجود بیرن پوں مرسی نے اسے پہچان لیا، اور پوری طرح پہچان لیا تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ موسیو بیرن تین آردیے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا، وہ ژاں ولژاں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ یہ تقریباً بے ڈاڑھی کا نوجوان آدمی کون تھا، جو برف جیسا، اور اتنا فیاض تھا؛ جو لوگوں کے نام جانتا تھا؛ جو سب کے ناموں سے واقف تھا؛ جس نے ان کے لیے اپنا بٹوا کھول دیا تھا؛ جو بدمعاشوں کو جج کی طرح دھمکا رہا تھا، اور انھیں بھی دھوکے میں رکھا تھا۔

قاری کو یاد ہوگا کہ اگرچہ تین آردیے ماریوس کا ہمسایہ تھا، اس نے ماریوس کو دیکھا نہیں تھا، پیرس جیسے بڑے شہر میں جو غیر معمولی بات نہیں تھی؛ اس نے لاپروائی کے انداز میں،

اپنی بیٹیوں کو ماریوس نامی ایک مفلس نوجوان کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا، جو اسی مکان میں کہیں رہتا تھا۔ تو کیا اس نے اسے جانے بغیر ہی وہ خط لکھا تھا قاری جس سے واقف ہے۔

اس کے ذہن میں ماریوس اور موسیو لی بیرن پوں مرسی میں کوئی ربط ممکن نہیں تھا۔

اور جہاں تک کرنل پوں مرسی کا سوال ہے، یاد رہے کہ واٹرلو کے میدانِ جنگ میں اس نے کسی نام کے دو آخری الفاظ سنے تھے، جس کے لیے اسے ہمیشہ جائز استہزا کا سامنا کرنا پڑا تھا جو دوسروں کے نزدیک محض شکریے کے اظہار کے حق دار تھے۔

پھر بھی، اپنی بیٹی آزیلما کے ذریعے، جو سولہ فروری سے اس شادی شدہ جوڑے کی ٹوہ میں تھی، اور خود اپنی تحقیقات کے ذریعے وہ بہت سی باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اور اپنی افسردگی کی گہرائیوں سے زیادہ سے زیادہ پُراسرار نشانات ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی دست کاری کے عمل پر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ آدمی کون تھا، بڑے نابدان میں جس کا سامنا ہوا تھا۔ آسانی سے وہ آدمی سے اس کے نام تک پہنچ گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ مادام لا بیرون کوزیٹ تھی، مگر وہ اس معاملے میں محتاط رہنا چاہتا تھا۔

کوزیٹ کون تھی؟ اسے خود بھی صحیح علم نہیں تھا۔ اسے اس کے ناجائز ہونے کی بھنک مل گئی تھی، کہ فانتین کا ماضی ہمیشہ اسے مشکوک لگا تھا؛ مگر اس کے بارے میں بات کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ کیا وہ اپنا منہ بند رکھنے کی اجرت چاہتا تھا؟ اس کا خیال تھا کہ اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے اس سے بہتر چیزیں تھیں۔ اور، تمام ظواہر کے مطابق اگر وہ ثبوت کے بغیر بیرن پوں مرسی پر یہ راز آشکار کرنے آتا، "تمھاری بیوی ناجائز اولاد ہے۔" تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا کہ آشکار کرنے والے کی رانیں کوزیٹ کے شوہر کے جوتے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتیں۔

تناردیے کے نقطۂ نظر کے مطابق، ماریوس سے مکالمہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اسے پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا تاکہ وہ اپنی حکمتِ عملی میں ضروری تبدیلی کر لیتا، تاکہ وہ اپنی کیفیت سے دستبردار ہو جاتا، تاکہ اس کا محاذ تبدیل ہو جاتا؛ مگر ابھی تک کسی ضروری شے پر مصالحت نہیں ہوئی تھی، اور اس کی جیب میں پانچ سو فرانک آ گئے تھے۔ مزید یہ کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ فیصلہ کن چیزیں تھیں، اور اس بہت باخبر اور پوری طرح مسلح پوں مرسی کے خلاف وہ اپنے آپ کو مضبوط محسوس کر رہا تھا۔ تناردیے جیسی فطرت کے آدمیوں کے لیے ہر مکالمہ جنگ ہوتا ہے۔ اس ایک مکالمے میں، جس میں وہ مصروف ہونے والا تھا، اس کی حالت کیا تھی؟ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا تھا؛ اس نے اپنی اندرونی قوتوں پر تیزی سے نظرِ ثانی کی اور یہ کہنے

کے بعد، ''میں ہوں، تین آردیے'' اس نے انتظار کیا تھا۔

ماریوس سوچ میں پڑ گیا، اور بالآخر وہ تین آردیے کو پا گیا تھا۔ وہ آدمی جسے پانے کی اس میں شدید خواہش تھی، اب اس کے سامنے تھا۔ اب وہ آنجہانی کرنل پوں مرسی کی سفارش پوری کرسکتا تھا۔

اسے اس بات پر اہانت محسوس ہو رہی تھی کہ ایک ہیرو پر اس ولن کا کسی قسم کا قرض ہو، اور اس بات پر بھی کہ تبدیلی کے بارے میں اس کے باپ کے خط پر، جو اس کے مقبرے کی گہرائیوں سے نکالا گیا تھا، اس دن تک احتجاج کیا جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ تین آردیے کے بارے میں اس کے دماغ میں جو پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی اس وقت موقع تھا کہ کرنل کی بدقسمتی کا انتقام لیا جائے کہ اسے اس جیسے بدمعاش نے بچایا تھا۔ بہر حال وہ مطمئن تھا۔ بالآخر کرنل کا سایہ یہ نامعقول قرض ادا کرنے والا تھا: گویا وہ اپنے باپ کی یادوں کو قرض خواہ کے قید خانے سے چھڑانے والا تھا۔ اس فرض کے پہلو میں ایک اور فرض بھی تھا — کوزیت کی دولت کے حصول کے ذریعے کی وضاحت۔ اب اس کا موقع آ گیا تھا۔ شاید تین آردیے اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ اس آدمی کے اندرون میں جھانکنا فائدہ مند ہوسکتا تھا۔

اس نے اس کام کی ابتدا کردی۔

تین آردیے نے ''دیانت دار چور'' کو اپنے بکر میں غائب ہو جانے دیا، اور وہ ماریوس کی نیکی پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا، جو تقریباً مہربان تھیں۔

ماریوس نے خاموشی توڑی۔

''تین آردیے، میں نے تمھیں تمھارا نام بتا دیا ہے۔ اب، کیا تم پسند کروگے کہ میں تمھیں تمھارا راز بھی بتا دوں — وہی راز جو مجھ پر آشکار کرنے کے لیے تم آئے ہو؟ میرے پاس خود اپنی بھی اطلاعات ہیں۔ اور تم دیکھ لوگے کہ میں اس کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ جیسا کہ تم نے بتایا ہے، ژاں ولژاں قاتل اور چور ہے۔ چور اس لیے کہ اس نے ایک دولت مند صنعت کار کو لوٹا تھا، وہ جس کی تباہی کا باعث ہوا تھا۔ قاتل اس لیے کہ اس نے پولیس ایجنٹ جاویر کو قتل کیا ہے۔''

''جناب، میں سمجھا نہیں۔'' تین آردیے نے فوراً کہا۔

''اب میں ذرا صاف انداز میں بات کروں گا۔ Pas de Calais کے ایک علاقے میں، 1822ء میں ایک آدمی تھا جس کا انصاف سے مقابلہ ہوا تھا، اور جس نے موسیو

میڈیلن کے نام سے بلند رُتبہ حاصل کرلیا تھا اور خود کو بحال کر لیا تھا۔ یہ آدمی اپنی پوری قوت سے نہایت نیک آدمی بن گیا تھا۔ سیاہ شیشے کی اشیا بنانے کے ایک کاروبار کے ذریعے اس نے پورے شہر کو مالامال کر دیا تھا۔ جہاں تک اس کی ذاتی دولت کا سوال ہے، اس نے یہ بھی بنائی تھی، مگر یہ ثانوی بات تھی اور از قسمِ حادثہ بن گئی تھی۔ وہ مفلسوں کا پالنے والا تھا۔ اس نے اسپتال قائم کیے، اسکول کھولے، بیماروں سے ملنے جاتا، نوجوان لڑکیوں کو جہیز فراہم کیے اور یتیموں کو سہارا دیا؛ وہ ملک کے لیے حفاظت کرنے والا فرشتہ تھا۔ اس نے تمغا لینے سے انکار کیا، وہ میئر بنایا گیا۔ آزاد سزا یافتہ اس جرمانے کے راز سے واقف تھا جو اس پر ماضی میں عائد کیا گیا تھا؛ اس نے خود کو رسوا کیا، خود کو گرفتار کرایا، اور گرفتاری سے فائدہ اٹھا کر پیرس آیا تھا اور بینکر لافیت سے — مجھے خزانچی نے خود بتایا تھا — جعلی دستخط کے ذریعے سے وہ نصف ملین فرانک حاصل کیے جو موسیو میڈیلن کی ملکیت تھے۔ یہ سزا یافتہ، جس نے موسیو میڈیلن کو لوٹا تھا، ژاں ولژاں تھا۔ اور جہاں تک دوسرے حقائق کی بات ہے، تمھارے پاس بھی بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ژاں ولژاں نے پولیس ایجنٹ جاویر کو پستول سے قتل کیا تھا۔ میں، وہ شخص جو اس وقت تم سے بات کر رہا ہے، اس کا گواہ ہے۔"

تیں آردیے نے ماریوس پر اس مفتوح آدمی کی سی شاہانہ نظر کی جو ایک بار پھر فاتح ہو گیا تھا، اور جس نے، ایک لمحے کے اندر ہی وہ تمام علاقہ واپس فتح کرلیا تھا جو کھو چکا تھا۔ مگر وہ ایک بار پھر مسکرا رہا تھا۔ برتر کی موجودگی میں کمتر کی فتح یقیناً خوشامد ہوگی۔

تیں آردیے نے ماریوس سے اتنا کہنے پر اکتفا کی:

"موسیو لی بیرن، ہم غلط راستے پر چل رہے ہیں۔" اور اپنے جملے پر زور ڈالنے کے لیے وہ اپنی مہروں کے گچھے سے کھیلنے لگا۔

"کیا؟" ماریوس بول پڑا۔ "کیا تمھیں اس سے اختلاف ہے؟ یہ حقائق ہیں۔"

"یہ محض اوہام ہیں۔ جس اعتماد سے موسیو لی بیرن مجھے اعزاز دے رہے ہیں وہی مجھے یہ سب اس طرح کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ سب سے پہلے سچ اور انصاف۔ مجھے لوگوں پر الزام تراشی قطعی پسند نہیں۔ موسیو لی بیرن! ژاں ولژاں نے موسیو میڈیلن کو لوٹا نہیں تھا، اور ژاں ولژاں نے جاویر کو قتل نہیں کیا تھا۔"

"بہت ہو گیا! مگر یہ کیسے؟"

"دو وجوہ کی بنا پر۔"

"کیا ہیں وہ؟ بولو"

"پہلی وجہ — اس نے موسیو میدیلین کو لوٹا نہیں تھا، اس لیے کہ ژاں ولژاں ہی موسیو میدیلین تھا۔"

"تم مجھے کیسی کہانیاں سنا رہے ہو؟"

"دوسری وجہ — اس نے جاویر کو قتل نہیں کیا تھا، اس لیے کہ جس شخص نے جاویر کو قتل کیا تھا وہ خود جاویر تھا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جاویر نے خودکشی کی تھی۔"

"ثابت کرو! ثابت کرو!" ماریوس چیخا۔

تِن آردیے نے قدیم سکندرانہ انداز میں کہا، "پولیس ایجنٹ جاویر Pont-au-Change کی-ایک-کشتی-کے-نیچے-غرق-پایا-گیا-تھا۔"

"ثبوت؟"

تِن آردیے نے اپنی جیب سے بھورے رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ نکالا جس کے اندر مختلف پیمائشوں کے تہہ کیے ہوئے صفحات محسوس ہو رہے تھے۔

"میرے پاس کاغذات ہیں۔" اس نے پُرسکون انداز میں کہا اور مزید اضافہ کیا:

"موسیو لی بیرن! آپ کی خاطر میں نے ژاں ولژاں کے بارے میں پوری معلومات کی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ژاں ولژاں اور موسیو میدیلین ایک ہی آدمی ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ جاویر کا قاتل خود جاویر کے سوا کوئی نہیں۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس ثبوت ہیں۔ ہاتھ کے لکھے ثبوت نہیں — تحریر مشتبہ ہوتی ہے — بلکہ چھپے ہوئے ثبوت ہیں۔"

بات کرتے ہوئے، تِن آردیے نے لفافے سے دو عدد اخبارات نکالے — پیلے، دھندلے اور تمباکو کی بو میں بسے ہوئے۔ ان دو اخباروں میں سے ایک ہر تہہ پر پھٹ گیا تھا، چیتھڑا بن گیا تھا اور دوسرے اخبار سے بہت پرانا لگ رہا تھا۔ "دو حقائق، دو ثبوت۔" تِن آردیے نے کہا، اور اس نے دونوں اخبار کھول کر ماریوس کو پیش کر دیے۔

قاری ان دو اخبارات سے واقف ہے۔ ایک، جو سب سے قدیم ہے، Drapeau Blanc کا 25 جولائی 1823ء کا شمارہ تھا، جس کا متن پہلی جلد میں دیکھا جا سکتا ہے، جو موسیو میدیلین اور ژاں ولژاں کی شناخت کا تعین کرتا تھا۔

دوسرا اخبار، 15 جون 1832ء کا Moniteur تھا جس نے جاویر کی خودکشی کا اعلان کیا تھا، اس اضافے کے ساتھ کہ جاویر کی پولیس کے سربراہ کو دی گئی زبانی رپورٹ سے معلوم ہوا تھا، کہ اسے Chanvrerie اسٹریٹ کے پشتے پر قیدی بنا لیا گیا تھا، اور اس کی زندگی ایک سرکش کی عالی ظرفی کی مرہونِ منت تھی جس نے اسے پستول کے نیچے پکڑ رکھا تھا اور اس کا بھیجا اڑانے کے بجائے پستول ہوا میں چلا دیا تھا۔

ماریوس نے پڑھا۔ ثبوت اس کے سامنے موجود تھا، تاریخ تھی، یقین ثبوت تھا، یہ دونوں اخبار محض تین آرد یے کے بیان کے ثبوت کے لیے چھاپے نہیں گئے تھے؛ Moniteur میں چھپی خبر انتظامی اطلاع کا حصہ تھی جو پولیس کی جانب سے جاری کی گئی تھی۔ ماریوس اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ خزانچی کی اطلاع غلط تھی۔ اسے خود بھی دھوکا دیا گیا تھا۔

ژاں ولژاں جس کا قد اچانک بڑا ہو گیا، وہ اپنے حصار سے نکل آیا تھا۔ ماریوس خوشی کی اپنی چیخ کو دبا نہیں سکا۔ ''واہ! یعنی یہ بدبخت قابلِ تعریف انسان ہے کہ ساری دولت اس کی اپنی ملکیت تھی۔ وہ میڈلین ہے، سارے دیہی علاقے کی دانش مندی! وہ ژاں ولژاں ہے، جاویر کا بچانے والا! وہ ہیرو ہے! سینٹ ہے!''

''وہ سینٹ نہیں، اور وہ ہیرو بھی نہیں!'' تین آردیے نے کہا ''وہ قاتل ہے، ڈاکو ہے۔'' اور پھر اس نے اس آدمی کی طرح جسے احساس ہونے لگے کہ اسے کچھ اختیار مل گیا ہو کہنا شروع کیا، ''ہمیں پُرسکون ہو جانا چاہیے۔''

ڈاکو، قاتل — وہ الفاظ جو ماریوس کے خیال کے مطابق غائب ہو گئے تھے، واپس آ گئے، اور اس پر برف جیسے ٹھنڈے پانی کی پھوار کی طرح گرے۔ ''پھر!'' اس نے کہا۔

''ہمیشہ'' تین آردیے نے فوراً کہا ''ژاں ولژاں نے موسیو میڈلین کو لوٹا نہیں تھا، مگر وہ چور ہے۔ اس نے جاویر کو قتل نہیں کیا تھا مگر وہ قاتل ہے۔''

ماریوس نے پلٹ کر کہا ''کیا تم اس چوری کے بارے میں بھی بات کرو گے، جو پچاس برس قبل کی گئی تھی اور، جیسا کہ تمھارے اپنے اخبار ثابت کرتے ہیں، ندامت کے، نفس کُشی کے یا نیکی کے باعث جس کی تلافی کر دی گئی تھی؟''

''میں قتل اور چوری ہی کی بات کر رہا ہوں، موسیو لی بیرن! اور میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں جو کچھ آشکار کرنے جا رہا ہوں اسے کوئی نہیں جانتا۔ یہ غیر طبع شدہ مواد سے متعلق ہے۔ اور شاید آپ کو اس میں اس دولت کا ذریعہ بھی معلوم ہو جائے گا

جو ژاں ولیواں نے اتنی جز رسی سے مادام لا بیرون کو پیش کردی ہے۔ میں جز رسی کہہ رہا ہوں، اس لیے کہ اس قسم کا تحفہ اتنی آسانی سے ایک باعزت خانوادے میں پہنچایا نہیں جا سکتا، وہ جس کی آسائشوں میں شامل ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ اپنا جرم بھی چھپا لے گا؛ چوری سے فائدہ اٹھائے گا اور اپنا اصل نام دفن کرنے کے لیے ایک خاندان بھی تخلیق کرنے کے لیے۔"

"شاید اس نقطے پر میں دخل دوں۔" ماریوس نے کہا، "مگر تم کہتے رہو۔"

"موسیو لی بیرن، میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، اور اجرت آپ کی فیاضی پر چھوڑ دوں گا۔ یہ راز ڈھیروں سونے کے برابر ہے۔ آپ مجھ سے کہیں گے، 'تم ژاں ولیواں سے درخواست کیوں نہیں کرتے؟' اس کی سادہ سی وجہ ہے: میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ خالی ہاتھ ہے، آپ کے حق میں اس نے سب کچھ تج دیا ہے، اور اس کو میں اول درجے کی چالاکی سمجھتا ہوں؛ مگر اس کا کوئی بیٹا نہیں، وہ مجھے اپنے خالی ہاتھ دکھا دے گا، اور چوں کہ مجھے 'بجیا' کے سفر کے لیے رقم کی ضرورت ہے، میں آپ سے مانگنے کو ترجیح دوں گا، سب آپ کے پاس ہے؛ تو پھر اس سے کیوں مانگوں جس کے پاس کچھ نہیں ہے؟ میں ذرا تھک گیا ہوں، اجازت دیجیے کہ میں بیٹھ جاؤں۔"

ماریوس خود بھی بیٹھ گیا، اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تین آردیے گدے دار کرسی پر بیٹھ گیا، اپنے دونوں اخبار اٹھائے، ان کو واپس لفافے میں ٹھونسا اور اپنے ناخن سے Drapeau Blanc کو کونچتے ہوئے بڑبڑایا، "اس کو حاصل کرنے کے لیے مجھے بہت خرچ کرنا پڑا ہے"۔

اس کے بعد اس نے پاؤں پر پاؤں رکھا، کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی، ان لوگوں کی طرح جنھیں یقین ہوتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے سنجیدگی سے اپنے موضوع پر آ گیا:

"موسیو لی بیرن! جون 1832ء کی 6 تاریخ کو تقریباً ایک برس قبل، سرکشی کے دن، ایک آدمی پیرس کے بڑے بدرو میں اس مقام پر تھا جہاں، Pont des Invalides اور Pont de Jena کے درمیان، بدرو دریائے سین میں مل جاتا ہے۔"

ماریوس نے اچانک اپنی کرسی تین آردیے کی کرسی کے قریب کھینچ لی۔ تین آردیے نے اس کی اس حرکت کو غور سے دیکھا اور کسی خطیب کی طرح اس کی جانب اس طرح متوجہ ہوا جیسے اس کا دل اس کے مکالمے کے مندرجہ ذیل الفاظ کے زیر اثر زور سے دھڑکنے لگا ہو۔

"یہ آدمی جو اپنے آپ کو چھپانے پر مجبور تھا، ان وجوہ کی بنا پر جن کا سیاست سے کوئی

تعلق نہیں تھا، اس نے نابدان کو اپنی جائے قیام بنا لیا تھا۔ وہ تاریخ 6 جون تھی؛ غالباً شام کے آٹھ بجے تھے۔ اس آدمی نے نابدان میں ایک آواز سنی۔ حیرت زدہ ہو کر اس نے خود کو چھپا لیا، اور انتظار کرنے لگا۔ آواز قدموں کی تھی؛ کوئی شخص اندھیرے میں چل رہا تھا، اور اسی کی جانب آ رہا تھا۔ مزید حیرت، کہ اس کے علاوہ نابدان میں ایک اور آدمی بھی تھا۔ نابدان سے باہر نکلنے کی جالی زیادہ دور نہیں تھی۔ اندر جالی سے اتنی روشنی پہنچ رہی تھی جس سے نو وارد شخص پہچانا جاتا، اور یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ آدمی اپنی پشت پر کچھ لادے ہوئے تھا۔ وہ جھک کر چل رہا تھا۔ جھک کر چلنے والا سابق سزا یافتہ تھا، اور جس شے کو وہ اپنے کاندھوں پر لادے کھینچ رہا تھا کسی کی لاش تھی۔ قتل، اور وہ بھی رنگے ہاتھوں! چوری کا جواز یوں ہوتا ہے، کہ کوئی کسی کو یوں ہی مفت نہیں مارا کرتا۔ سزا یافتہ شخص اس لاش کو دریا میں ڈالنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ ایک بات صاف نظر آتی ہے، کہ باہر نکلنے والی جالی تک پہنچنے سے پہلے اس سزا یافتہ کو، جو نابدان میں کافی دور سے آ رہا تھا، یقیناً کسی خوف ناک دلدل کا سامنا ہوا تھا جس میں وہ لاش کو چھوڑ سکتا تھا، مگر دوسرے ہی دن نابدان میں کام کرنے والوں کو لاش مل جاتی، اور یہ قاتل کے منصوبے کے لیے موزوں نہ ہوتا۔ اسی لیے اس نے اس بوجھ کے ساتھ دلدل کو پار کیا تھا، اور اس میں بے پناہ مشقت ہوئی ہوگی، کہ اس دلدل سے گزرنے میں خود اس کی زندگی کو بہت خطرہ بھی تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ زندہ بچ کیسے گیا۔"

اب ماریوس اس کے اور قریب ہو گیا تھا۔ تن آردییے نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طویل سانس لی۔ اس نے مزید کہا:

"موسیو لی بیرن! نابدان Champ de Mars نہیں ہوا کرتا۔ اس میں ہر شے کی کمی ہوتی ہے، حتیٰ کہ جگہ کی بھی۔ جب وہاں دو آدمی ہوتے ہیں تو ان کا آپس میں ملنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور یہی ہوا۔ وہ آدمی جو وہاں رہتا تھا، اور گزرنے والا، دونوں کو ایک دوسرے کو سلام کرنا پڑا تھا، جو دونوں کے لیے ناپسندیدہ بات تھی۔ راہ گیر نے رہنے والے سے کہا، "آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے کاندھے پر کیا ہے؛ مجھے باہر نکلنا ہے؛ آپ کے پاس کنجی ہے؛ مجھے کنجی دے دیجیے۔" سزا یافتہ بے پناہ طاقت کا مالک تھا۔ انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر بھی وہ آدمی جس کے پاس کنجی تھی، شرائط طے کرنے لگا، محض وقت حاصل کرنے کے لیے۔ اس نے مردہ آدمی کا معائنہ کیا، مگر اسے کچھ ملا نہیں، سوائے اس کے کہ ثانی الذکر ایک نوجوان شخص تھا؛ اچھے لباس میں ملبوس تھا؛ اس میں دولت مندی کے آثار تھے؛ اور اس کا پورا وجود خون میں لت پت تھا۔ جب وہ دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے، اوّل الذکر آدمی نے بہانے سے اور قاتل کی نظر بچا کر مقتول

کے کوٹ سے ایک ٹکڑا پھاڑ لیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سزا دہی کے لیے ثبوت درکار ہوتا ہے۔ یعنی مجرم کو سزا دینے کے لیے کچھ دریافت کرنا ہوتا ہے۔ آدمی نے ثبوت اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اس کے بعد اس نے جالی کا دروازہ کھولا؛ راہ گیر کو شرمندگی کے بوجھ سمیت باہر جانے دیا؛ دروازہ بند کیا، اور وہاں اس فرار ہوگیا تا کہ وہ بقیہ معاملے میں ملوث نہ ہو جائے؛ اور سب سے اہم یہ بات تھی کہ جس وقت قاتل دریا میں لاش کو پھینکتا اس وقت یہ آدمی وہاں موجود نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اب آپ اندازہ لگائیے۔ راہ گیر جو کاندھے پر لاش اٹھائے تھا، ژاں ولژاں تھا؛ اور جس کے پاس کنجی تھی وہ اس لمحے آپ سے بات کر رہا ہے؛ اور کوٹ کا ٹکڑا۔"

تنی آردیے نے دو انگلیوں اور انگوٹھے میں پکڑ کر اپنی جیب سے وہ سیاہ رنگ کا ٹکڑا، جس پر جگہ جگہ داغ تھے، نکالتے ہوئے اور اس کی آنکھ کی سطح پر لہراتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔

ماریوں اچھل کر کھڑا ہو گیا، وہ سانس بھی مشکل سے لے پا رہا تھا؛ اس کی نظریں سیاہ رنگ کے کپڑے پر جم گئی تھیں۔ کپڑے سے نظر اٹھائے بغیر، اور منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر وہ دیوار کی طرف پسپا ہوا اور دائیں ہاتھ سے دیوار پر ٹٹول کر وہ کنجی تلاش کرنے لگا جو چمنی کے قریب رکھی الماری کے تالے میں لگی تھی۔

کنجی مل گئی، اس نے الماری کھولی اور اس ٹکڑے سے اپنی خوف زدہ نظریں ہٹائے بغیر، جو تنی آردیے کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا، اس نے الماری میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔

تنی آردیے کہہ رہا تھا، "موسیو لی بیرن! اس بات پر یقین دلانے کے لیے کہ اس مقتول دولت مند اور کثیر رقم کے مالک نوجوان کو ژاں ولژاں نے اپنے جال میں پھنسایا تھا؛ میں اہم ترین ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔"

"وہ نوجوان آدمی میں تھا، اور یہ رہا وہ کوٹ!" ماریوں نے چیخ کر کہا، اور خون کے دھبوں سے بھرا کوٹ فرش پر ڈال دیا۔

اس کے بعد تنی آردیے کے ہاتھ سے کپڑے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے کوٹ پر جھکا اور اسے خستہ کوٹ پر لگایا۔ پھٹا ہوا کپڑے کا ٹکڑا کوٹ کی پھٹی ہوئی جگہ پر بالکل فٹ تھا۔

تنی آردیے خوف سے پتھرا گیا۔

"میں کسی گھوڑے کے ڈھیر سے ٹکرا گیا ہوں۔" وہ سوچ رہا تھا۔

ماریوں کانپتے پیروں پر کھڑا ہوا۔

اس نے اپنے جیب میں ہاتھ ڈالا؛ غصے سے تنی آردیے کی جانب بڑھا اور اس کے

منہ پر پانچ سو اور ہزار فرانک کے دو نوٹ مارتے ہوئے کہا:

"تم بے عزت، ذلیل ترین انسان ہو! تم جھوٹے ہو، بدگو ہو، ولن ہو۔ تم اس آدمی پر الزام دھرنے آئے تھے، تم نے اسے اچھا ثابت کر دیا ہے؛ تم اسے تباہ کرنا چاہتے تھے، تم نے اسے سرخرو کر دیا ہے! چور وہ نہیں، چور تم ہو۔ تنی آردیے! میں نے خود تمھیں l'Hopital اسٹریٹ پر واقع اس حجرے میں دیکھا تھا۔ میرے پاس اتنی معلومات ہیں جن کی بنا پر تمھیں گیلیز میں ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بھیجا جا سکتا ہے۔ لے بدمعاش، ایک ہزار فرانک اور لے!"

اور اس نے ایک ہزار فرانک کا نوٹ تنی آردیے کی طرف اچھال دیا۔

"اُف! ٹانڈریئے تنی آردیے! خبیث! بدمعاش! دوسرے درجے کے راز فروخت کرنے والے! بُرا سرایت کا کاروبار کرنے والے! پرچھائیاں تلاش کرنے والے کمینے! لے یہ مزید پانچ سو فرانک اور دفع ہو جا یہاں سے! واٹرلو نے تجھے بچا لیا ہے!"

"واٹرلو!" پانچ سو فرانک کا نوٹ جیب میں اڑستے ہوئے تنی آردیے غرایا۔

"ہاں، قاتل! تو نے ایک کرنل کی جان بچائی تھی۔"

"جنرل کی۔" تنی آردیے نے اپنا سر بلند کرتے ہوئے کہا۔

"جنرل نہیں کرنل کی!" ماریوس نے غصے میں کہا۔ "میں جنرل کے لیے تمھیں ایک دمڑی بھی نہ دیتا۔ اور تم یہاں بے عزتی کرنے آئے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے کتنے جرم کیے ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ خوش ہو جاؤ کہ میں بس اتنا ہی چاہتا ہوں۔ اوہ خبیث! لے مزید تین ہزار فرانک۔ اپنے بیٹی کے ساتھ کل امریکا چلا جا! تیری بیوی مر چکی ہے، جھوٹے! میں دیکھوں گا، کہ تو امریکا دفع ہو جائے، بدمعاش! اس وقت میں تجھے مزید بیس ہزار فرانک گن دوں گا۔ جا، کہیں اور جا کر ڈوب مر!"

"موسیو لی بیرن!" تنی آردیے نے زمین تک خم ہوتے ہوئے کہا، "لازوال تشکر!" اور وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا؛ بدحواس مگر خوش تھا، سونے کے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا تھا، اس گرج پر خوش تھا جو اس کے سر پر نوٹوں کی بارش کر گئی تھی۔ تنی آردیے پر بجلی گری تھی؛ مگر وہ مطمئن بھی تھا۔ وہ شدید غصے میں ہوتا، اگر کسی آہنی چھتر نے اس بجلی کو بھگا دیا ہوتا۔

اب ہم اس آدمی کا باب بند کرنے والے ہیں۔

ان واقعات کے دو دن بعد، جو ہم ابھی بیان کر رہے تھے، ماریوس کے طفیل، تنی آردیے کسی اور نام سے، اپنی بیٹی آزیلما کے ہم راہ، مزید بیس ہزار فرانک سمیت امریکا روانہ ہو

گیا۔ تین آردیے کے اخلاقی کمینہ پن سے عام آدمی کے ناجائز پیشے کو مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے امریکا میں بھی وہی کیا جو یورپ میں کرتا تھا۔ بدکار آدمی سے رابطہ اچھے عمل کو خراب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے، اور اس سے برائیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ماریوس کی دی ہوئی رقم سے تین آردیے نے غلاموں کی خرید فروخت شروع کر دی۔

تین آردیے کے جاتے ہی، ماریوس باغیچے کی طرف دوڑا جہاں کوزیت چہل قدمی کر رہی تھی۔ ""کوزیت! کوزیت!"" اس نے چیخ کر کہا ""آؤ، فوراً آجاؤ! ہمیں فوراً جانا ہے۔ باسک، سواری! کوزیت چلو! اوہ میرے خدا! یہی وہ شخص ہے جس نے میری جان بچائی تھی۔ ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کوزیت، اپنی شال اوڑھ لو۔""

کوزیت سمجھی کہ ماریوس پاگل ہو گیا ہے؛ اور جو کچھ کہہ رہا تھا وہی کیا۔ اس کی سانس چڑھ گئی تھی، وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکتے دل کو آہستہ کرنا چاہ رہا تھا۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے آگے پیچھے آ جا رہا تھا؛ اس نے کوزیت کو گلے لگا لیا، ""اوہ کوزیت، میں بد قسمت کمینہ انسان ہوں۔"" اس نے کہا۔

ماریوس حیران تھا۔ اسے ژاں ولژاں میں ایک ناقابلِ بیان بلند اور غم انگیز، بے مثال نیک، اعلیٰ درجے کی مہربان، انکسار میں لا انتہا شخصیت کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ سزا یافتہ کی یسوع مسیح میں قلبِ ماہیت ہو گئی تھی۔ اس حیرت انگیز شخصیت نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا تھا، مگر یہ منظر کتنا عالی شان تھا۔

تھوڑی دیر بعد کرایے کی سواری دروازے پر کھڑی تھی۔ ماریوس نے کوزیت کو سوار ہونے میں مدد دی، اور خود تیر کی طرح گاڑی میں سوار ہو گیا۔

""کوچوان!"" اس نے کہا ""l'Homme Arme اسٹریٹ، مکان نمبر 7۔""

سواری روانہ ہو گئی۔

""اوہ، میں کتنی خوش ہوں۔"" کوزیت نے کہا، ""l'Homme Arme اسٹریٹ — مجھے تو اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ہم موسیو ژاں سے ملنے جا رہے ہیں۔""

""تمھارا باپ! کوزیت، ہمیشہ سے زیادہ تمھارا باپ۔ کوزیت مجھے گمان ہے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھیں میرا خط کبھی نہیں ملا، جو میں نے گاوروش کے ذریعے بھیجا تھا۔ یقیناً اس کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ کوزیت، یہ شخص مجھے بچانے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ چوں کہ فرشتہ بننا اس کی ضرورت ہے، اس نے اوروں کو بھی بچایا تھا؛ اس نے جاویر کو بھی بچا لیا تھا۔ اس نے مجھے اس

خلیج سے نکالا تھا تم تک پہنچانے کے لیے۔ وہ مجھے اس خوف ناک بدان سے اپنی پشت پر لاد کر لے گیا تھا۔ اوہ، میں کیسا ناشکرا عفریت ہوں۔ تمھارے لیے نعمت ہونے کے بعد وہ میرے لیے بھی نعمت ہو گیا تھا۔ ذرا سوچو تو کسی کو سو بار غرق کرنے کے برابر ایک خوف ناک دلدل درپیش تھا۔ وہ مجھے اس کے پار لے آیا۔ میں بے ہوش تھا؛ میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا؛ میں نے کچھ نہیں سنا تھا؛ مجھے اس مہم کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اب ہم اسے اپنے گھر واپس لانے کے لیے جا رہے ہیں؛ وہ مانے یا نہ مانے وہ ہم سے کبھی سے جدا نہیں ہوگا۔ اگر وہ گھر پر ہوا، بشرطیکہ وہ ہمیں مل جائے۔ میں اس کی عزت افزائی میں اپنی ساری عمر گزار دوں گا۔ بس، یہی ہونا چاہیے نا! کیا خیال ہے تمھارا، کوزیٹ؟ گاوروش نے میرا خط ضرور اس تک پہنچا دیا تھا۔ سب کچھ واضح ہو گیا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

کوزیٹ ایک لفظ بھی سمجھ نہیں پائی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے ماریوس سے کہا۔

اس دوران گاڑی چلی جا رہی تھی۔

ہر رات کے پیچھے دن ہوتا ہے

اپنے دروازے پر دستک سُن کر ژاں ولژاں نے پلٹ کر دیکھا۔

"اندر آجایئے۔" اس نے کم زور آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا۔

کوزیٹ اور ماریوس ظاہر ہوئے۔

کوزیٹ بھاگ کر کمرے میں گئی۔

ماریوس دروازے کے چوکھٹ کے سہارے ڈیوڑھی ہی میں کھڑا رہا۔

"کوزیٹ!" ژاں ولژاں نے کہا۔

وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے؛ وہ دُبلا، سیسے کے رنگ کا اور مجزوں شخص تھا، مگر اس کی آنکھوں میں خوشی ناچ رہی تھی۔

کوزیٹ، جذبے سے جس کا سانس رُکنے لگا تھا، ژاں ولژاں کے سینے پر گر پڑی۔

"فادر!" اس نے کہا۔

ژاں ولژاں جذبات سے مغلوب ہو کر ہکلانے لگا تھا۔

"کوزیٹ! آپ! تم! مادام! یہ تو ہے! اوہ میرے خدا!" اور وہ کوزیٹ کے بازوؤں میں بھنچا، چیخ رہا تھا، "یہ تو ہے! تو یہاں ہے! تو پھر تو مجھے معاف کر دے۔"

ماریوس نے اپنی پلکیں نیچی کر لیں مبادا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں؛ ایک قدم آگے بڑھا اور لرزتے ہونٹوں سے اپنی سسکی روکتے ہوئے کہا، "میرے فادر!"

"اور آپ بھی مجھے معاف کر دیجیے۔" ژاں ولژاں نے ماریوس سے کہا۔

ماریوں کو الفاظ نہیں مل رہے تھے، اور ژاں ولژاں کہہ رہا تھا، ''شکریہ، شکریہ!
کوزیٹ نے شال اتاری اور اپنی ہیٹ اس کے بستر پر پھینک دی۔
''یہ مجھے شرمندہ کر رہی ہے۔'' اس نے کہا۔
یہ کہتے ہوئے وہ بوڑھے آدمی کے گھٹنوں پر بیٹھ گئی؛ اس کے سفید گیسوؤں کو پیار بھرے انداز سے ایک طرف کیا اور اس کی پیشانی کو چوم لیا۔
حیران ژاں ولژاں نے اسے روکنا نہیں چاہا۔ کوزیٹ، جو مبہم انداز میں سب کچھ سمجھ گئی تھی، اسے پیار سے سہلانے لگی، گویا وہ ماریوں کا قرض ادا کرنا چاہ رہی تھی۔
ژاں ولژاں نے ہکلاتے ہوئے کہا، ''کتنے احمق ہو تم لوگ۔ میں سمجھا تھا کہ اب میں کوزیٹ کو کبھی دیکھ نہیں سکوں گا۔ موسیو ذرا تصور کیجیے، عین اس وقت جب آپ داخل ہوئے، میں خود سے کہہ رہا تھا؛ ''لو! سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ یہ ہے کوزیٹ کا چھوٹا سا لبادہ؛ میں بہت بد نصیب آدمی ہوں؛ میں کوزیٹ کو پھر دیکھ نہیں سکوں گا۔ یہ میں اس وقت کہہ رہا تھا جب تم لوگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ کیا میں بیوقوف نہیں تھا؟ ذرا دیکھو تو، آدمی کتنا احمق ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے پیارے خدا کے بغیر ہی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ ہمارا پیارا خدا کہتا ہے، 'تم سمجھنے لگتے ہو کہ تمھیں ترک کر دیا گیا ہے؛ احمق! نہیں، اس طرح نہیں ہوا کرتا۔ آؤ، تمھارے سامنے ایک آدمی ہے جسے اس وقت فرشتے کی ضرورت ہے؛ اور فرشتہ آتا ہے؛ اور ایک بار پھر کوزیٹ نظر آتی ہے۔ اور ایک بار پھر ننھی کوزیٹ نظر آ جاتی ہے۔ اوہ اُس وقت میں بہت ناخوش تھا۔''
ایک لمحے وہ بول نہیں سکا، پھر گویا ہوا:
''میں واقعی کوزیٹ کو دیکھنا چاہتا تھا، ذرا زیادہ دیر تک۔ کبھی کبھی دل کو دانت کاٹنے کے لیے ہڈی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے احساس تھا کہ میں آڑے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی وجوہ پیش کر دی تھیں: انھیں تمھاری ضرورت نہیں، اپنے راستے چلو، تمھیں ہمیشہ چمٹے رہنے کا حق نہیں' اوہ، خدا کا شکر ہے، میں اسے ایک بار پھر دیکھ رہا ہوں۔ کوزیٹ! کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرا شوہر حسین و جمیل ہے؟ واہ! تمھاری خوش قسمتی، کہ تم کتنی خوب صورت کڑھائی کا گریبان پہنے ہو۔ مجھے یہ نمونہ بہت پسند ہے۔''
پھر کوزیٹ نے بھی کہنا شروع کیا:
''کتنی بُری بات ہے کہ آپ ہم لوگوں کو اس طرح چھوڑ کے چلے گئے۔ کہاں گئے تھے؟ اتنے دن ہم سے دور کیوں رہے؟ پہلے تو آپ کا سفر تین یا چار دن کا ہوا کرتا تھا۔ جب بھی

میں نے نکولے کو بھیجا، ہمیشہ جواب ملتا تھا، 'غیر حاضر ہیں' آپ واپس کب آئے؟ ہمیں بتایا کیوں نہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ بہت بدل گئے ہیں؟ اوہ، کتنا خراب ہے میرا فادر! بیمار رہا ہے اور ہمیں خبر نہیں۔ ٹھہرو، ماریوں! دیکھو تو، ان کا ہاتھ کتنا ٹھنڈا ہے؟"

"اچھا، موسیو پوں مرسی بھی آئے ہیں! مجھے معاف کر دیجیے۔" ژاں ولژاں نے دوبارہ کہا۔

اس لفظ سے، جو اس نے ایک بار پھر منہ سے نکالا تھا، ماریوں کا دل بھر گیا۔ اور وہ پھٹ پڑا:

"کوزیت، کیا تم سُن رہی ہو یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگ رہے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ انھوں نے میرے لیے کیا نہیں کیا ہے۔ کوزیت، انھوں نے میری جان بچائی ہے۔ انھوں اور بھی بہت کچھ کیا ہے— مجھ کو تم جیسی بیوی دی ہے۔ اور میرے بچانے کے بعد، تمھیں دینے کے بعد، کوزیت، انھوں نے خود اپنے ساتھ کیا کیا؟ انھوں نے خود کو قربان کر دیا ہے۔ اس آدمی کو دیکھو۔ یہ مجھ ناشکرے سے، مجھ لاپروا سے، مجھ بے رحم سے کہتا ہے، شکریہ! کوزیت، میری ساری زندگی اس کے قدموں میں گزرے تو بھی کم ہوگا۔ وہ پشتہ، وہ نابدان، وہ بھٹی، وہ گندگی کا جوہڑ— سب کچھ انھوں نے میرے لیے، تیرے لیے سہا ہے۔ یہ مجھے ہر طرح کی موت سے دور لے گئے، اور اپنے لیے موت قبول کر لی ہے۔ یہ ہر قسم کی ہمت، ہر قسم کی نیکی، ہر قسم کی بہادری، ہر قسم کے تقدس کے حامل ہیں۔ کوزیت، یہ آدمی فرشتہ ہے۔"

"چپ، چپ!" ژاں ولژاں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ سب کیوں کہا جارہا ہے؟"

"مگر آپ!" ماریوں غصے میں چیخا جس میں احترام تھا، "آپ یہ سب مجھ سے کیوں نہیں کہتے؟ اس میں آپ کی بھی غلطی ہے۔ آپ لوگوں کی جان بچاتے ہیں اور ان ہی سے چھپاتے ہیں۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے بہانے خود الزام لے لیتے ہیں۔ یہ بہت بُری اور خوف ناک بات ہے۔"

"میں نے سچ کہہ دیا تھا۔" ژاں ولژاں نے جواب میں کہا۔

"جی نہیں" ماریوں نے پلٹ کر جواب دیا، "سچائی، پوری سچائی ہوتی ہے؛ اور آپ نے مجھے پوری سچائی سے آگاہ نہیں کیا۔ آپ موسیو میدیلن تھے، آپ نے کیوں نہیں بتایا؟ آپ نے جاویر کی جان بچائی تھی، آپ نے کیوں نہیں بتایا؟ میری جان آپ کی مرہونِ منت ہے، آپ نے کیوں نہیں بتایا؟"

"اس لیے کہ میں اسی طرح سوچتا ہوں، جیسے آپ سوچتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ صحیح سوچتے ہیں۔ میرا چلا جانا ضروری تھا۔ میں نا بدان کے واقعے سے واقف تھا، آپ مجھے ساتھ رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ اگر میں بول دیتا تو میرے لیے شرمندگی کا باعث ہوتا۔"

"شرمندگی کا باعث ہوتا؟ کس سے شرمندگی ہوتی؟" ماریوس نے فوراً کہا، "اب آپ یہاں قیام نہیں کریں گے؟ ہم آپ کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اوہ خدایا! میں سوچتا ہوں کہ یہ حادثہ ہے جس سے میں نے یہ سب سیکھا ہے۔ آپ ہمارا حصہ ہیں۔ آپ اس کے باپ ہیں اور میرے بھی۔ آپ اس خوف ناک گھر میں اب ایک دن بھی بسر نہیں کریں گے۔ بھول جایئے کہ آپ کل یہاں ہوں گے۔"

"کل" ژاں ولژاں نے کہا، "میں یہاں نہیں ہوں گا، مگر آپ کے ساتھ نہیں ہوں گا۔"

"کیا مطلب؟" ماریوس نے سوال کیا، "اوہ، بس کیجیے، ہم آپ کو کوئی اور سفر کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس لیے کہ آپ پھر ہمیں چھوڑ دیں گے۔ آپ ہمارے ہیں۔ ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ اچھا موقع ہے۔" کوزیت نے اضافہ کیا، "دروازے پر سواری کھڑی ہے۔ میں آپ کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔ ضروری ہوا تو طاقت بھی استعمال کروں گی۔" اور ہنستے ہوئے بوڑھے آدمی کو اپنے بازوؤں میں اٹھانے کے لیے بڑھی۔

"ہمارے گھر میں آپ کا کمرہ اب بھی خالی ہے۔" اس نے مزید کہا، "کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ اب ہمارا باغیچہ بہت خوب صورت ہو گیا ہے۔ Azaleas میں پھول کھل رہے ہیں۔ روش میں ریت ڈال دی گئی ہے؛ ان میں چھوٹی چھوٹی بنفشی سیپیاں ہیں۔ آپ ہماری اسٹرابری کھائیں گے۔ میں انھیں اپنے ہاتھ سے پانی دیتی ہوں۔ اب نہ کوئی 'مادام' ہے، نہ 'موسیو'؛ ہم جمہوریہ میں رہتے ہیں؛ ہر شخص تو کہہ کر بات کرتا ہے، ہے کہ نہیں ماریوس؟ نظام تبدیل ہو گیا ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ میں بہت رنجیدہ ہوں۔ ہمارے باغیچے کی دیوار میں ایک سرخ چڑیا نے گھونسلا بنایا تھا؛ ایک بد ذات بلی اسے کھا گئی۔ میری پیاری سرخ رنگ کی چڑیا اپنی کھڑکی سے سر نکال کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ اس دن میں بہت روئی تھی۔ میں اس بلی کو مار ڈالنا چاہتی تھی، مگر اب کوئی روتا نہیں۔ ہر شخص ہنستا ہے، ہر شخص خوش رہتا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ نانا جان کتنے خوش ہوں گے۔ باغیچے میں آپ کا اپنا قطعہ ہوگا، آپ اس میں کاشت کریں

گے، اور ہم دیکھیں گے کہ آپ کی اسٹرابری اتنی ہی نفیس ہیں جیسی کہ ہماری۔ اور پھر میں وہی کروں گی جو آپ چاہتے ہیں گے، اور پھر آپ میری بات مانا کریں گے۔"

ژاں والژاں اس کو سُن رہا تھا مگر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کے الفاظ کے معنی سمجھے بغیر اس کی آواز کی موسیقی سُن رہا تھا؛ ان بڑے آنسوؤں میں سے ایک، جو روح کے غم انگیز موتی ہوتے ہیں، اس کی آنکھوں میں تیر رہا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا، "اس لڑکی کا یہاں موجود ہونا خدا کی مہربانی کا ثبوت ہے۔"

"فادر!" کوزیت نے اسے متوجہ کیا۔

اور ژاں والژاں نے بولنا شروع کیا، "اس میں شک نہیں کہ ہمارا ایک ساتھ رہنا بہت اچھا ہوگا۔ درخت چڑیوں سے آباد ہیں۔ میں کوزیت کے ساتھ چہل قدمی کیا کروں گا۔ زندہ لوگوں کے ساتھ ہونا جو ایک دوسرے کو 'صبح بخیر' کہیں اور باغیچے میں ایک دوسرے کو آواز دیں، بہت اچھا لگتا ہے۔ ہم سب کو اپنے اپنے تھالوں میں کاشت کرنی چاہیے۔ وہ مجھے اسٹرابری کھلائے، میرے گلاب جمع کرے۔ یہ سب بہت اچھا لگے گا مگر...." اس نے توقف کیا اور آہستہ سے کہا، "افسوس!"

آنکھ سے آنسو ٹپکا نہیں، واپس ہوگیا اور ژاں والژاں نے اسے تبسم سے بدل دیا۔

کوزیت نے بوڑھے کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"میرے خدا!" آپ کے ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈے ہیں۔ کیا آپ بیمار ہیں؟ کیا آپ کو تکلیف ہو رہی ہے؟"

"کون، میں؟ نہیں تو۔" ژاں والژاں نے جواب دیا، "میں بالکل ٹھیک ہوں، صرف...." اس نے توقف کیا۔ "اب میں مرنے والا ہوں۔"

ماریوس اور کوزیت سُن کر کانپ گئے۔

"مرنے والا ہوں!" ماریوس نے چیخ کر کہا۔

"ہاں، مگر کوئی بات نہیں۔" ژاں والژاں نے کہا۔ اس نے لمبی سانس لی، مسکرایا اور کہا، "کوزیت! ہاں، تو کہہ رہی تھی کہ تیری سرخ چڑیا مرگئی ہے؟ بول۔ تاکہ میں تیری آواز سنتا رہوں۔"

ماریوس نے بوڑھے کو حیرت سے دیکھا۔

کوزیت نے ایک دلدوز چیخ بلند کی۔ "فادر! میرے فادر! آپ زندہ رہیں گے۔ آپ زندہ رہنے والے ہیں۔ میں آپ کے زندہ رہنے پر اصرار کروں گی۔ سنا کہ نہیں؟"

ژاں ولژاں نے پلٹ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"اوہ، مجھے مر جانے دو۔ کون جانے — شاید میں تمھاری بات مان لوں۔ تم لوگ آئے تو میں مر رہا تھا۔ تم نے مجھے مرنے سے روک لیا! ایسا محسوس ہوا جیسے میں دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔"

"آپ زندگی اور قوت سے بھرپور ہیں۔" ماریوس نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اس طرح کے لوگ مر سکتے ہیں؟ آپ کے اپنے غم تھے، اب نہیں رہیں گے۔ میں گھٹنوں کے بل ہو کر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ زندہ رہیں گے؛ ہمارے ساتھ رہنے کے لیے؛ طویل عرصے تک زندہ رہنے کے لیے۔ ہم ایک بار پھر آپ کو اپنا رہے ہیں۔ اب ہم دونوں آپ کی خوشیوں کے سوا کچھ نہیں سوچیں گے۔"

"دیکھا آپ نے!" کوزیت نے کہا جس کا چہرہ آنسوؤں میں نہا گیا تھا "ماریوس کہہ رہے ہیں کہ آپ نہیں مریں گے۔"

ژاں ولژاں مسکراتا رہا۔

"موسیو پوں مرسی، اگر آپ لوگ مجھے اپنا لیں گے تو کیا میں کوئی اور شخص ہو جاؤں گا؟ خدا نے تمھارے اور میرے بارے میں سوچا ہے؛ وہ اپنا ارادہ نہیں بدلتا۔ میرا چلا جانا فائدہ مند ہوگا۔ موت اچھا انتظام ہوتی ہے۔ خدا ہماری ضروریات کے بارے میں ہم سے بہتر جانتا ہے۔ خدا تمھیں خوش رکھے؛ خدا موسیو پوں مرسی اور کوزیت کو یک جا رکھے؛ میرے بچو، خدا کرے تم پھولوں اور بلبلوں میں کھیلو؛ خدا کرے تم ہرے بھرے رہو؛ خدا کرے تمھاری گھاس دھوپ سے بھری رہے؛ خدا تمھیں جنت کی خوشیوں سے مالا مال کرے۔ اور اب مجھے، جو کسی کام کا نہیں، مر جانے دو۔ موت یقینی ہے، اور بالکل ٹھیک ہے۔ ٹھہرو، ہوش کی بات کرو؛ اب کچھ ممکن نہیں رہا؛ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ اور پھر کل رات، میں نے پورا جگ بھر پانی پی لیا تھا۔ تمھارا شوہر کتنا اچھا ہے، کوزیت! تو اس کے ساتھ مجھ سے بہتر رہے گی۔"

دروازے پر کوئی آواز سنائی دی۔

ڈاکٹر داخل ہو رہا تھا۔

"صبح بخیر اور خدا حافظ ڈاکٹر!" ژاں ولژاں نے کہا یہ میرے بچے ہیں۔"

ماریوس ڈاکٹر کے قریب گیا۔ اس نے صرف ایک لفظ کہا، "موسیو؟" مگر یہ ایک لفظ نہیں، پورا سوال تھا۔

ڈاکٹر نے اس سوال کا بے زبان بے زبانی جواب بھی دے دیا۔

''چوں کہ حالات ٹھیک نہیں۔'' ژاں ولژاں نے کہا ''اس لیے، خدا سے شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔''

خاموشی چھا گئی۔

سارے سینے دب گئے تھے۔

ژاں ولژاں نے کوزیٹ کی طرف دیکھا، اس طرح گویا اس کی صورت کو ابد تک کے لیے اپنی آنکھوں میں سمو لینا چاہتا تھا۔ ژاں ولژاں کوزیٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا؛ اس وقت بھی، پرچھائیں کی ان گہرائیوں میں جو اتر آئی تھیں، پہچان ممکن تھا۔ اس کے عکس نے اس کے زردی مائل بشرے کو روشن کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کی نبض محسوس کرنے کی کوشش کی۔

''آہ، وہی ہوا جو اس نے چاہا تھا۔'' ڈاکٹر کوزیٹ اور ماریوس کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ اور جھک کر ماریوس کے کان میں بہت دھیمی آواز میں کہا ''بہت دیر ہو گئی ہے۔''

ژاں ولژاں نے ڈاکٹر اور ماریوس پر، پُرسکون انداز میں طائرانہ نظر ڈالی، اس طرح کہ کوزیٹ پر سے اس کی نگاہ ہٹی نہیں تھی۔

اس کے لبوں سے یہ الفاظ نکلے، جن میں بالکل حرکت نہیں تھی:

''مرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر زندہ نہ رہنا خوف ناک ہوتا ہے۔''

اور اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ قوت کا آ جانا کبھی کبھی موت کی اذیت کی نشانی ہوتا ہے۔ ماریوس اور ڈاکٹر کو ایک جانب دھکیلتے ہوئے، جنھوں نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی، وہ دیوار تک گیا؛ دیوار پر لگی تانبے کی صلیب کھینچ کر اتار لی جو وہاں ٹنگی ہوئی تھی، اور اتنی آزادی سے کرسی تک واپس آیا گویا وہ بالکل صحت مند تھا، اور صلیب کو میز پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا، ''دیکھو اس عظیم شہید [یسوع مسیح] کو۔''

یہ کہتے ہی اُس کا سینہ دھنس گیا، اس کا سر متزلزل ہوا، جیسے اس پر قبر کا نشہ طاری ہو گیا ہو۔ اس کے ہاتھ، جو گھٹنوں پر دھرے تھے، ناخن سے اپنے پتلون کے کپڑے کو دبانے لگے تھے۔

کوزیٹ نے اس کے کاندھے کو سہارا دیا، سسکی بھری اور بات کرنے کی کوشش کی، مگر کر نہ سکی۔ غم انگیز عالم میں، رال میں ملے جلے لفظوں میں، جو ہمیشہ آنسوؤں کے ساتھ نکلا کرتے ہیں، مندرجہ ذیل الفاظ بھی تھے:

''فادر، ہمیں چھوڑ کر نہ جایئے۔ یہ کیسے ممکن ہو گا! کیا ہم نے آپ کو چھوڑ کر جانے ہی

کے لیے پایا ہے؟"

کہتے ہیں کہ اذیت پہلو بدلتی رہتی ہے۔ آتی ہے، جاتی ہے، قبر کی طرف پیش قدمی کرتی ہے، اور زندگی کی طرف واپس آتی ہے۔ مرنے کے عمل میں امتحان کی سی کیفیت ہوا کرتی ہے۔

ژاں ولژاں نے اس نیم غشی کے بعد خود کو مجتمع کیا؛ اس طرح اپنا سر ہلایا گویا وہ پرچھائیوں کو اپنے سر سے اتار پھینکنا چاہتا ہے؛ اور ایک بار پھر بالکل درخشاں ہو گیا۔

اس نے کوزیت کی آستین کی ایک شکن پر بوسہ دیا۔

"ٹھیک ہو رہا ہے، ڈاکٹر، ٹھیک ہو رہا ہے۔" ماریوس چیخا۔

"تم دونوں بہت اچھے ہو۔" ژاں ولژاں نے کہا۔ "میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کس بات نے مجھے دکھ پہنچایا ہے۔ میں اس بات پر غم زدہ ہوں، موسیو پوں مرسی کہ آپ اس رقم سے ایک دمڑی بھی نہیں لینا چاہتے۔ یہ دولت واقعی آپ کی بیوی کی ملکیت ہے۔ میرے بچو! اب میں تمھیں سب کچھ بتاؤں گا: اسی وجہ سے تمھیں دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ سیاہ نگینہ انگلستان سے آتا ہے، سفید نگینہ ناروے سے آتا ہے۔ یہ سب اس کاغذ میں لکھا ہے، جو تم لوگ پڑھو گے۔ بازو بند کے لیے میں نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعے سولڈر کی ہوئی آہنی پٹی کے بجائے، لوہے کی دہری پٹی استعمال کی جاتی تھی۔ اس طرح لگتا ہے؛ بہتر ہوتا ہے اور کم خرچ ہوتا ہے۔ تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ اس طرح کتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے کوزیت کی دولت واقعی اس کی ہے۔ میں یہ تفصیل اس لیے بتا رہا ہوں، تاکہ تمھیں اطمینان ہو جائے۔"

دربان اوپر آئی اور نصف وا دروازے سے جھانکنے لگی۔ ڈاکٹر نے اسے بھگا دیا۔ مگر غائب ہونے سے پہلے اس نے اس قریب المرگ آدمی سے چیخ کر کہا، "آپ کو پادری چاہیے؟"

"پادری آچکا ہے۔" ژاں ولژاں نے جواب دیا۔ اور اس نے اپنے سر کے اوپر انگلی اٹھا کر اس طرح اشارہ کیا تھا جیسے وہ بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی شخص نظر آیا تھا۔

بہت ممکن ہے موت کی اذیت کے وقت اس کے سرہانے بشپ موجود تھا۔

کوزیت نے آہستہ سے اس کی رانوں کے نیچے ایک تکیہ کھسکا دیا تھا۔

ژاں ولژاں نے دوبارہ بولنا شروع کیا:

"ڈریے نہیں، موسیو پوں مرسی، میں قسم کھا کر آپ سے کہہ رہا ہوں کہ چھ لاکھ فرانک واقعی کوزیت کی ملکیت ہیں۔ اگر آپ نے اس دولت سے فائدہ نہیں اٹھایا تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی ضائع گئی ہے۔ ہم نے شیشے کی صنعت میں کافی ترقی کی تھی۔ ہم نے برلن کے

زیورات سے مقابلہ کیا تھا، مگر ہم انگلستان کے سیاہ شیشے کی برابری نہیں کر سکے تھے۔ ایک gross کی قیمت جس میں بارہ سو نگینے کے grains ہوتے ہیں، صرف تین فرانک ہوتی ہے۔''

جب کوئی شخص جو ہمیں بہت عزیز ہو، قریب المرگ ہوتا ہے تو ہم اسے ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جو اس سے چمٹ جاتی اور جو اسے زندہ رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

کوزیت نے ماریوس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا؛ اور وہ دونوں، تکلیف میں گم سُم، نہ جانتے ہوئے کہ مرتے آدمی سے کیا کہا جائے، نا اُمید اور لرزاں کھڑے تھے۔ اس کی نبض رُک رُک کر چل رہی تھی؛ اسے اپنا ہاتھ ہلانے میں قدرے مشکل محسوس ہو رہی تھی؛ اس کے پیروں کی حرکت ختم ہو گئی تھی؛ اس کے دست و پا کی کم زوری بڑھتی جا رہی تھی؛ اس کی روح کا جلال اس کی پیشانی پر پھیلتا جا رہا تھا؛ نا معلوم دنیا کی روشنی پہلے ہی اس کی آنکھوں میں نظر آنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور متبسم تھا۔ اس میں زندگی نہیں، کوئی اور ہی شے آ گئی تھی۔ اس کی سانس ڈوبتی جا رہی تھی؛ آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں؛ وہ ایسی لاش کی مانند ہو گیا تھا جس میں حرکت محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس نے کوزیت کو قریب آنے کا اشارہ کیا، اس کے بعد ماریوس کو۔ بظاہر آخری گھنٹے کا آخری منٹ آ گیا تھا۔

اس نے ان سے ایسی آواز میں بولنا شروع کیا جو بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی، اور اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ ان دونوں کے اور اس کے درمیان ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی۔

''قریب آؤ، دونوں میرے قریب آ جاؤ۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اوہ! اس طرح مرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ اور، میری کوزیت، تو بھی تو مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو اس بوڑھے سے آج بھی قربت محسوس کرتی ہے۔ تو نے کتنی مہربانی کی تھی میری رانوں تلے تکیہ رکھ دیا تھا۔ تو میرے لیے روئے گی نا؟ مگر بہت زیادہ نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھے رنج ہو۔ میرے بچو، بنسی خوشی زندگی گزارنا۔ میں بتانا بھول گیا تھا کہ بغیر زبان کے بکسوئے میں، اور بقیہ چیزوں میں بہت فائدہ تھا۔ بارہ درجن گراس دس فرانک میں ملتے تھے اور ساٹھ میں بکتے تھے۔ یہ واقعی بہت اچھا کاروبار تھا۔ لہٰذا چھ لاکھ فرانک پر حیرت نہیں ہونی چاہیے، موسیو پوں مرسی۔ یہ حلال دولت ہے۔ تم پُرسکون دماغ والے رئیس ہو گے۔ تمھیں سواری خرید لینی چاہیے؛ تھیٹر میں ایک حجرہ، اور اس کے بعد رقص کے خوب صورت لباس، میری کوزیت، اور پھر تجھے اپنے دوستوں کو اچھے ڈنر کھلانے چاہییں، اور بہت خوش ہونا چاہیے۔ تھوڑی دیر پہلے میں کوزیت کے لیے خط لکھ رہا تھا۔ اس کو میرا خط مل جائے گا۔ میں تمھیں وراثت میں دو شمع دان دے رہا ہوں جو آتش دان کی پیشانی پر رکھے ہیں۔ چاندی کے بنے ہیں، مگر میرے نزدیک سونا

ہیں، میرے ہیں؛ یہ شمع دان شمعوں کو لاکھ کی مخروطی بتیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ نا معلوم، وہ جس نے مجھے یہ شمع دان دیے تھے، اوپر آسمان میں خوش ہے کہ نہیں۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔ میرے بچو، یہ نہ بھولنا کہ میں مفلس آدمی ہوں، تم مجھے جہاں بھی زمین ملے دفن کر دینا، پتھر کے نیچے، جگہ کا نشان رکھنے کے لیے۔ یہ میری خواہش ہے، مگر پتھر پر نام نہ لکھوانا۔ اگر کوزیٹ کبھی کبھی، تھوڑی دیر کے لیے آجایا کرے گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اور آپ بھی، موسیو پوں مرسی۔ میں اعتراف کرتا ہوں میں نے ہمیشہ تم سے محبت نہیں کی ہے۔ اس کے لیے میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اب تم اور کوزیٹ میرے نزدیک ایک پیکر ہو۔ میں بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کوزیٹ کو خوش رکھیں گے۔ آپ کیا جانیں، کہ میرے لیے اس کے گلابی رخسار کیسی مسرت کا باعث تھے؛ جب میں انھیں زرد دیکھتا تھا تو افسردہ ہو جاتا تھا۔ میری درازوں والی الماری میں پانچ سو فرانک کا ایک نوٹ رکھا ہے۔ میں نے اسے استعمال نہیں کیا، اس لیے کہ وہ مفلس کے لیے ہے۔ کوزیٹ، کیا تجھے بستر پر پڑا وہ چھوٹا سا لبادہ نظر آرہا ہے۔ کیا تو اسے پہچانتی ہے؟ یہ دس برس پہلے کا ہے۔ وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ ہم بہت خوش تھے۔ مگر اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ گریہ نہ کرو، میرے بچو، میں بہت دور نہیں جا رہا ہوں، تمھیں وہاں سے دیکھتا رہوں گا، تمھیں صرف رات میں ادھر نظر کرنی ہوگی، تم مجھے مسکراتا دیکھو گے۔ کوزیٹ، تجھے Montfermeil یاد ہے؟ تو جنگل میں تھی، تو بہت خوف زدہ تھی؛ تجھے یاد ہے نا، کہ میں نے کس طرح پانی سے بھری بالٹی اٹھائی تھی؟ وہ پہلی بار تھا جب میں نے تیرا ہاتھ چھوا تھا۔ کتنا ٹھنڈا تھا۔ اوہ، میڈموڈیل اس وقت تمھارے ہاتھ سرخ تھے، اب وہ بہت سفید ہیں۔ اور وہ بڑی سی گڑیا، تجھے یاد ہے؟ تو نے اس کا نام کیتھرین رکھا تھا۔ تجھے بہت افسوس تھا کہ وہ خانقاہ تک نہیں گئی تھی! میری پیاری حور، تو مجھے کتنا ہنسایا کرتی تھی۔ جب بارش ہوتی تھی، تو پانی میں پیال کے ٹکڑے بہایا کرتی تھی، اور انھیں گزرتے دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے تجھے بید مجنوں سے بنا بلا اور ایک شٹل کاک دی تھی، جس میں پیلے نیلے اور سبز رنگ کے پر لگے تھے۔ تو بھول گئی ہے۔ تو کتنی شریر لڑکی تھی۔ ہر وقت کھیلا کرتی تھی۔ تو نے میرے کان میں چیری ڈال دی تھی۔ وہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ وہ جنگل جس سے ہم ایک بچی کے ساتھ گزرا کرتے تھے، وہ درخت ہم جن کے نیچے ٹہلا کرتے تھے، وہ خانقاہ ہم جس میں پوشیدہ تھے، وہ کھیل، وہ بچپنے کا ہنسنا ہنسانا، سب سایے جیسے ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ سب میرا تھا۔ وہ میری حماقت تھی۔ تنی آردیے خاندان کتنا بد معاش تھا۔ تمھیں اس کو معاف کر دینا چاہیے۔ کوزیٹ! اب وقت آگیا ہے کہ میں

تجھے تیری ماں کا نام بتا دوں۔ اس کو فانتین کہا جاتا تھا۔ یاد ہے وہ نام — فانتین! اس کا نام لیتے وقت جھک جایا کرو۔ اس نے بہت دُکھ سہے تھے۔ وہ تجھے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ اتنی ہی بدقسمت تھی، جتنی تو خوش قسمت ہے۔ خدا اسی طرح چیزوں کو تقسیم کرتا ہے۔ وہ یہیں کہیں بلندی پر ہے؛ وہ ہم سب کو دیکھتا رہتا ہے، اور عظیم ستاروں کے نیچے جو کچھ کرتا ہے، اسے جانتا ہے۔ میں روانہ ہونے والا ہوں، میرے بچو! ہمیشہ ایک دوسرے سے محبت کرنا۔ اس دنیا میں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ کبھی کبھی تم اس غریب آدمی کے بارے میں سوچا کرو گے جو یہاں مرا ہے۔ میری پیاری کوزیٹ! اس میں میرا قصور نہیں کہ میں نے تجھے ہر وقت دیکھا نہیں؛ یہ بات میرے دل کو کاٹے ڈال رہی ہے۔ میں سڑک کے اس کونے تک گیا تھا۔ جنھوں نے مجھے گزرتے دیکھا تھا، ان پر عجیب اثر ہوا ہوگا؛ میں کسی پاگل آدمی کی طرح تھا، ایک بار میں اپنی ہیٹ کے بغیر ہی باہر چلا گیا تھا۔ اب مجھے صاف دکھائی نہیں دیتا، میرے بچو؛ مجھے اور بہت کچھ کہنا تھا، مگر کوئی بات نہیں۔ مجھے یاد کرتے رہنا۔ اور قریب آؤ۔ میں خوش مر رہا ہوں۔ مجھے اپنے پیارے پیارے سر دو تاکہ میں ان پر ہاتھ پھیر سکوں۔

کوزیٹ اور ماریوس، مایوسی کے عالم میں، آنسو بھری آنکھوں سمیت، ژاں والژاں کے ہاتھوں کے نیچے گھٹنوں پر گر پڑے۔ اس کے بعد ان عالی شان ہاتھوں میں حرکت نہیں ہوئی۔

وہ پشت کے بل گر پڑا۔ شمع کی روشنیاں اسے منور کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے کا رُخ آسمان کی طرف ہوگیا تھا۔ اس نے کوزیٹ اور ماریوس کو اپنے ہاتھوں کو بوسے دینے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ مر گیا۔

بے حد اندھیرے آسمان پر ایک بھی تارا نہ تھا۔ بلا شبہ، اس اندھیرے میں کوئی مہیب فرشتہ پر پھیلائے کھڑا اس روح کا انتظار کر رہا تھا۔

۞

سبزہ چھپالیتا ہے، بارش مٹا دیتی ہے

Pere-Lachaise نامی قبرستان میں، ایک عام سی قبر کے قریب، خوب صورت مزاروں کے شہر سے دور ان تمام آرائشی مزاروں سے دور جو موت کے ڈراؤنے فیشن کی نمائش کرتے ہیں، ایک سنسان کونے میں ایک قدیم دیوار کے ساتھ، ایک اونچے سدا بہار درخت کے نیچے جس پر ڈنڈ بیلین اور کائیوں کے درمیان جنگلی بیلیں چڑھتی ہیں، ایک پتھر لگا ہے۔

یہ پتھر، وقت کے جذام سے، نمی سے، کائیوں سے اور پرندوں کی آلائش سے آلودہ دوسرے پتھروں سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پانی اس کو سبز کر دیتا ہے، ہوا اسے سیاہ کر دیتی ہے۔ یہ کسی پگڈنڈی سے قریب نہیں، اور لوگوں کو اس سمت جانے کا شوق نہیں، اس لیے کہ ادھر گھاس بہت اونچی ہوتی ہے اور جانے والوں کے پیر فوراً گیلے ہو جاتے ہیں۔

جب سورج کی روشنی ہوتی ہے، وہاں گرگٹ آتے ہیں۔ وہاں، ہر طرف خودرو پودے لہراتے رہتے ہیں۔ بہار کے موسم میں درختوں میں خوش الحان پرندے چہچہاتے ہیں۔

وہ پتھر بالکل سپاٹ ہے۔ اس کے کاٹتے وقت صرف مزار کی ضروریات کا خیال رکھا گیا تھا، اور کوئی احتیاط برتی نہیں گئی تھی سوائے اس کے کہ پتھر کی لمبائی اور چوڑائی ایک آدمی کو دفن کرنے کے لیے کافی تھی۔

اس پر کوئی نام کندہ نہیں۔

کئی برس قبل کسی ہاتھ نے اس پر صرف پنسل سے چار سطریں لکھ دی تھیں، جو بارش اور گرد میں رفتہ رفتہ دھندلی ہو گئی ہیں اور پڑھی نہیں جا سکتیں، اور اب تقریباً مٹ گئی ہیں:

Il dort. Quoique le sort fut pour lui bien etrange,
Il vivait. Il mourut quand il n'eut plus son ange.
La chose simplement d'elle-meme arriva,
Comme la nuit se fait lorsque le jour s'en va.

۞

مضراب

باقر نقوی